



• ڈاکٹر ذاکر حسین زکریا •

**DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY**

JAMIA MILLIA ISLAMIA  
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking  
it out. You will be responsible for  
damages to the book discovered while  
returning it.





# تقویم

ادب کا ایام  
مکتبہ خاندانہ اسلامیہ  
پیشکش

۱۲۵۹

۸۰۰

پیشکش

۱۲۵۹

۱۲۵۹

۱۲۵۹

# ترتیب

## عزیم نیرا

- ۱ - بار سے پہلے کاشات
- ۲ - نیکوئی
- ۳ - نفوس کا حال

## نفاذات

- ۱ - کراچی
- ۲ - اصول
- ۳ - تقریر

876

## شعر و شاعر

- ۱ - شہزادہ دزدگی
- ۲ - قہقہہ دہری شاہ قہقہہ آبادی
- ۳ - شہزادہ ہمارے
- ۴ - شہزادہ شعرا اور حالی
- ۵ - شہزادہ
- ۶ - آواز دہ گرد ایشہار
- ۷ - دارا شکوہ کا دہری
- ۸ - خالص کی مقبولیت کے اسباب
- ۹ - آتش کی صفائے شاعری
- ۱۰ - مرے دار شاعر
- ۱۱ - انگریز شاعر
- ۱۲ - فیضی کا نظریہ شعر
- ۱۳ - شہزادہ دزدگی
- ۱۴ - قہقہہ دہری شاہ قہقہہ آبادی
- ۱۵ - شہزادہ ہمارے
- ۱۶ - شہزادہ شعرا اور حالی
- ۱۷ - شہزادہ
- ۱۸ - آواز دہ گرد ایشہار
- ۱۹ - دارا شکوہ کا دہری
- ۲۰ - خالص کی مقبولیت کے اسباب
- ۲۱ - آتش کی صفائے شاعری
- ۲۲ - مرے دار شاعر
- ۲۳ - انگریز شاعر
- ۲۴ - فیضی کا نظریہ شعر

۸۱۵

۷۷۵

۲۹۰۷

- ۱۹ - راجہ ہاشم کی شاعری
- ۲۰ - اردو ادب

۲۹۰ - ...  
 ۲۹۱ - ...  
 ۲۹۲ - ...  
 ۲۹۳ - ...  
 ۲۹۴ - ...  
 ۲۹۵ - ...  
 ۲۹۶ - ...  
 ۲۹۷ - ...  
 ۲۹۸ - ...  
 ۲۹۹ - ...  
 ۳۰۰ - ...

۳۰۱ - ...  
 ۳۰۲ - ...  
 ۳۰۳ - ...  
 ۳۰۴ - ...  
 ۳۰۵ - ...  
 ۳۰۶ - ...  
 ۳۰۷ - ...  
 ۳۰۸ - ...  
 ۳۰۹ - ...  
 ۳۱۰ - ...

فهرست کتب

۳۱۱ - ...  
 ۳۱۲ - ...  
 ۳۱۳ - ...  
 ۳۱۴ - ...  
 ۳۱۵ - ...  
 ۳۱۶ - ...  
 ۳۱۷ - ...  
 ۳۱۸ - ...  
 ۳۱۹ - ...  
 ۳۲۰ - ...

۳۲۱ - ...  
 ۳۲۲ - ...  
 ۳۲۳ - ...  
 ۳۲۴ - ...  
 ۳۲۵ - ...  
 ۳۲۶ - ...  
 ۳۲۷ - ...  
 ۳۲۸ - ...  
 ۳۲۹ - ...  
 ۳۳۰ - ...

فهرست کتب

۳۳۱ - ...  
 ۳۳۲ - ...  
 ۳۳۳ - ...  
 ۳۳۴ - ...  
 ۳۳۵ - ...  
 ۳۳۶ - ...  
 ۳۳۷ - ...  
 ۳۳۸ - ...  
 ۳۳۹ - ...  
 ۳۴۰ - ...

۳۴۱ - ...  
 ۳۴۲ - ...  
 ۳۴۳ - ...  
 ۳۴۴ - ...  
 ۳۴۵ - ...  
 ۳۴۶ - ...  
 ۳۴۷ - ...  
 ۳۴۸ - ...  
 ۳۴۹ - ...  
 ۳۵۰ - ...

فهرست کتب

۳۵۱ - ...  
 ۳۵۲ - ...  
 ۳۵۳ - ...  
 ۳۵۴ - ...  
 ۳۵۵ - ...  
 ۳۵۶ - ...  
 ۳۵۷ - ...  
 ۳۵۸ - ...  
 ۳۵۹ - ...  
 ۳۶۰ - ...

۳۶۱ - ...  
 ۳۶۲ - ...  
 ۳۶۳ - ...  
 ۳۶۴ - ...  
 ۳۶۵ - ...  
 ۳۶۶ - ...  
 ۳۶۷ - ...  
 ۳۶۸ - ...  
 ۳۶۹ - ...  
 ۳۷۰ - ...

- ۵۔ داغ ، ۵۹۱  
۶۔ آنکھی نذیر احمد ، ۵۹۲  
۷۔ مراد تاحانی ، ۵۹۴  
۸۔ خواب حسن الملک ، ۵۹۰  
۹۔ خواب دقار الملک ، ۵۹۰  
۱۰۔ شبلی نعمانی ، ۶۰۱  
۱۱۔ اکبر الہ آبادی ، ۶۰۳  
۱۲۔ عبدالعلیم شرز ، ۶۰۴  
۱۳۔ ریاضی غیر آبادی  
۱۴۔ حبیب الرحمن شروانی ، ۶۱۰  
۱۵۔ علامہ اقبال ، ۶۱۳  
۱۶۔ علامہ محمد علی جوہر ، ۶۱۴  
۱۷۔ راشد الجزری ، ۶۱۸  
۱۸۔ فحشی دیار اثنی عشر ، ۶۱۹  
۱۹۔ نصیر حسین شیال ، ۶۲۰  
۲۰۔ سید سلیمان ندوی ، ۶۲۲  
۲۱۔ خواجہ حسن نظامی ، ۶۲۴  
۲۲۔ فحشی پریم چند ، ۶۳۰

### نظمیں ، غزلیں

- ۱۔ قطعات  
۲۔ جہنمی ہر سات  
۳۔ اگر نہ دہرہ تہینوں کے دریاں گزرے  
۴۔ یہ دن یہاں کے اب کہہ بھی راس آئندہ کے  
۵۔ مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے  
۶۔ جنگلو  
۷۔ بات بچھنے والا  
۸۔ زندگی مجھویوں کا راز ہو کہ رہ گئی  
۹۔ یاوہر الہ پٹھان ، تو کہیں حذاراں  
۱۰۔ ایک میں تھول  
۱۱۔ جو دور پر وہ انہیں جلوہ نمائی کی نہ تھو جوتی  
۱۲۔ مر سے تو میں بیتہ کہ پوچھوں کبھی مر شدہ معان سے  
۱۳۔ حضور یار آفتاب کی آفتاب میں  
۱۴۔ دل پا سے شاد ہو جائے  
۱۵۔ اگلا سا غم کو دنیا ورہ چنے آزار ہے ساقی  
۱۶۔ کسی میں دن تو کٹ رہا ہے میں فریب میں کھار ہوں  
۱۷۔ حملہ جہاں باز یوں کا پار ہے میں  
۱۸۔ کیا مجھ کو سا ہو کسی جہد کا  
۱۹۔ غنیمت ہو کاکھینے !  
۲۰۔ خود دل میں رہ کے آنکھ سے پرہا کر کے کوئی  
۲۱۔ دیکھ گیت  
۲۲۔ غم کے چہرے کیا چھوڑاں اب تم سے بیان کریں  
۲۳۔ وہ کی آغوش میں نہ آئی بھی آ رہی ہے قریب  
۲۴۔ چین پر آستہ دل کو آج نہ لی  
۲۱۔ جوش ملیح آبادی ، ۶۳۱  
۲۲۔ جوش ملیح آبادی ، ۶۳۲  
۲۳۔ عارف آبادی ، ۶۳۶  
۲۴۔ عارف آبادی ، ۶۳۷  
۲۵۔ ذاق گورکھپوری ، ۶۳۸  
۲۶۔ ذاق گورکھپوری ، ۶۳۹  
۲۷۔ حفیظ جالندھری ، ۶۴۶  
۲۸۔ آرزو کھنوی ، ۶۴۷  
۲۹۔ فیض احمد فیض ، ۶۴۸  
۳۰۔ فیض احمد فیض ، ۶۴۹  
۳۱۔ بیابان الہ آبادی ، ۶۵۱  
۳۲۔ عبدالحمید ساکب ، ۶۵۲  
۳۳۔ تاثیر ، ۶۵۳  
۳۴۔ جواہر لعل نہرو ، ۶۵۴  
۳۵۔ اختر شیرانی ، ۶۵۵  
۳۶۔ وحشت کاکھوی ، ۶۵۶  
۳۷۔ اثر کھنوی ، ۶۵۷  
۳۸۔ احمد نیر کاکی ، ۶۵۸  
۳۹۔ احمد نیر کاکی ، ۶۵۹  
۴۰۔ اسرار الحق بھارت ، ۶۶۰  
۴۱۔ میراجی ، ۶۶۱  
۴۲۔ میراجی ، ۶۶۲  
۴۳۔ صوفی جہنم ، ۶۶۴  
۴۴۔ عابد علی مایہ ، ۶۶۵



۲۵ - ترسے کرم سے خدا کی میں یوں تو کیا نہ لا	۶۶۰ - م۔ راشد
۲۶ - انتقامی	۶۶۱ - م۔ راشد
۲۷ - کچھ اس طرح سے ترسے گزر گیا کوئی	۶۶۲ - حفیظ ہوشیار پوری
۲۸ - برہم میں جب وہ وفانا آتھا بھی آئے گا	۶۶۳ - احسان دانش
۲۹ - تقابل	۶۶۴ - معین الحسن چوہان
۳۰ - تعلقات	۶۶۵ - جہاں نثار اختر
۳۱ - خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں	۶۶۶ - اختر انصاری
۳۲ - سینہاں ساقی محفل اب اپنے بیانے	۶۶۷ - سندھ آندراش
۳۳ - کچھ تو مجھے محبوب ترا غم بھی بہت ہے	۶۶۸ - فضل احمد کریم فضلی
۳۴ - وضع کا پاس کہاں تک کرستہ ہم تو پھر دیوانے تھے	۶۶۹ - میکش کیرا بادی
۳۵ - کوئی آواشناں مجھ سے نہیں بتائے	۶۷۰ - مندریب شادانی
۳۶ - ہماری محفلوں میں بے گلاب آئس سے کیا ہوگا	۶۷۱ - عرش رام پوری
۳۷ - آگ دن وہ دل کے تھے سر پر ہنڈر کہیں	۶۷۲ - اشک راہ پوری
۳۸ - پس منظر	۶۷۳ - اختر الیاس
۳۹ - زبان پر آپ کا نام آ رہا ہے	۶۷۴ - عدم
۴۰ - افسانہ آن شبے	۶۷۵ - جگن ناتھ آزاد
۴۱ - نرگس کے نام میں کا پیام لے کے چلے	۶۷۶ - قیاس شنائی
۴۲ - جب کبھی تذکرہ سعد وصال ہوتا ہے	۶۷۷ - نصیر کاشمیری
۴۳ - ایک کہستانی سفر کے دوران میں	۶۷۸ - مجید امجد
۴۴ - کسی کے دم سے راحت بھی چرٹی ہے	۶۷۹ - محمد امجد بخت
۴۵ - غضب ہے جسکوئے دل کا یہ انجام ہو جائے	۶۸۰ - شعری بیوپاری
۴۶ - دولت کی خدائی	۶۸۱ - پروفیسر شوری
۴۷ - کیا منزل غم سمٹ گئی ہے	۶۸۲ - سیف الدین بیگ
۴۸ - ہمیں میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا	۶۸۳ - غلام ربانی تاباں
۴۹ - یہ باتیں بھڑکی باتیں ہیں	۶۸۴ - ابن افشا
۵۰ - کون نگاہ کی ہلاکتی تو کیا ہوگا	۶۸۵ - اداجعفری بدایونی
۵۱ - کھری باتیں بہ انداز سخن کہہ دیں تو کیا ہوگا	۶۸۶ - شاد غازی
۵۲ - میراث	۶۸۷ - یوسف ظفر
۵۳ - دن ہو کہ رات کچھ قفس ہو کہ صحن باغ	۶۸۸ - انجم رومانی
۵۴ - یہ پھول	۶۸۹ - قیوم نظر
۵۵ - وا ہوا پھر درمیانہ گل	۶۹۰ - ناصر کاظمی

## افسانے

۱ - دور کا نشانہ	۷۰۵ - محمد علی روضوی
۲ - اپنے دکھ بھلے سے دو	۷۰۶ - راجندر سنگھ بیدی

کرشن چندر ۷۲۸۰  
 عصمت چغتائی ۷۳۶۱  
 احمد ندیم قاسمی ۷۴۲۱  
 مقبول ۷۵۹۱  
 غلام عباس ۷۷۵۰  
 حیات اختر انصاری ۷۸۵۱  
 خواجہ احمد عباس ۷۹۷۰  
 اختر اور نیوی ۸۰۴۰  
 علی عباس بٹنی ۸۰۹۱  
 ل۔ احمد ۸۲۱۰  
 ممتاز منشی ۸۲۰۰  
 حجاب امتیاز علی ۸۵۲۰  
 قرۃ العین سید ۸۶۰۰  
 داجہ مسرور ۸۷۹۰  
 ممتاز شیریں ۸۸۸۰  
 خدیجہ مستور ۸۹۵۰  
 بلونت سنگھ ۹۰۷۰  
 قدرت اللہ شہاب ۹۲۱۰  
 نسیم سلیم مختاری ۹۳۵۰  
 ابنی نکلعل صدیقی ۹۶۷۰  
 کشمیری لال ڈاکر ۹۷۹۰  
 میرزا ادیب ۹۹۱۰  
 دیو ندرستیاری ۹۹۹۰  
 ابو سعید قریشی ۱۰۰۹۰  
 ہندراتا ۱۰۲۰۰  
 شکیلہ اختر ۱۰۲۹۰  
 اسے حمید ۱۰۳۸۰  
 اشفاق احمد ۱۰۷۴۰

۳ — پریو  
 ۴ — شخصی کی تاجی  
 ۵ — احمد شاہ  
 ۶ — موقوف  
 ۷ — لایہ  
 ۸ — سہارے کی کلاں  
 ۹ — ڈیڈ لٹر  
 ۱۰ — متا  
 ۱۱ — جلی پری  
 ۱۲ — صنف زعفران کا خواب  
 ۱۳ — ادلی اللہ  
 ۱۴ — یہ حادثے  
 ۱۵ — ہندی میٹر  
 ۱۶ — بھال بھری  
 ۱۷ — آندھی میں چراغ  
 ۱۸ — دادا  
 ۱۹ — کالی تیرہوی  
 ۲۰ — دیوے جٹاشی  
 ۲۱ — چارہ گر  
 ۲۲ — بھتیجا دیوچ  
 ۲۳ — پرواز کے زخم  
 ۲۴ — مانی پھانسی  
 ۲۵ — گناری کے آہٹے  
 ۲۶ — زینو  
 ۲۷ — جو نکلیں  
 ۲۸ — آخری سہارا  
 ۲۹ — زرد کلاپ  
 ۳۰ — گکڑیا

## ڈرائے

اوپنڈر ناتھ اشک ۱۱۰۱  
 متیہ امتیاز علی تاج ۱۱۱۱  
 جاوید اقبال ۱۱۲۷

۳۱ — آیا  
 ۳۲ — اصفہان کے بگیند  
 ۳۳ — ہینو

## طنز و مزاح

شرکت قادیانی، ۱۱۵۴  
 بطرس، ۱۱۶۳  
 منیہ لال پور، ۱۱۶۷  
 شفیق الرحمن، ۱۱۷۱  
 خاکس پیا، ۱۱۹۳  
 فقر و نسوی، ۱۱۹۵

۳۴ — تعبیر طلب  
 ۳۵ — دوست کے ہم  
 ۳۶ — برج بانو  
 ۳۷ — سفر نامہ جاز باد سندھی  
 ۳۸ — شہر اور گھاٹی  
 ۳۹ — ایک نساں کی موت

## آرٹ

عبد الرحمن چغتائی، ۱۲۰۳

۱ — چند یادیں

فقوش کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست، ۱۲۰۹

محمد طفیل، ۱۲۳۹

مدیر فقوش (خاکہ)

## کتاب جامعہ اسلامیہ

### طلوع

دوب کی باتیں اس سے پیسے بھی چڑھی ہیں اور بڑے دھوم دھمکوں کے ساتھ چڑھی ہیں۔ ماضی کی یادوں میں گم ہو جائیے گا تو  
شہائیوں کی آوازیں آج بھی سنائی دیں گی۔  
اور لاڈلوں کی طرح، نقوش بھی اس دنیا میں آیا۔ پہلے اس کی پرورش کے فرائض میرے بڑے بھائی، محمد ندیم قاسمی اور چھوٹی بہن  
ابروہ مسرور کے پر جوئے۔ یہاں سے کہتے ہیں۔ ہمیں کی تربیت ہی پر مستقبل کی نشان دہی ہو کر گئی ہے۔  
پھر نقوش میرے سب سے بڑے بھائی سید وقار عظیم کی آغوش میں پلٹا رہا کس کسی نے بھی نہ اٹھا رکھی۔ یہی نے لاڈ پیار رکھا۔  
ابھی نقوش تین ہی ماہ کا ہوا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ شرارتی بچوں کو اس کی پیچھے بھاتی نہ تھی۔ انھوں نے  
ایسی چال چلی کہ یہ بے چارہ چھ ماہ تک بے شہرہ پڑا رہا۔  
جب نقوش ٹھیکے اور ٹوں میں لڑنے لگا تو اس کی پرورش میرے سپرد ہوئی۔ بیماری سمیت اس وقت اس کی عمر کوئی  
تھائی برس ہوگی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ میری راتوں کی نیند اچھٹ گئی۔ میں سوچتا تھا اتنا خوب صورت سا لدا ہونا بچہ، اگر  
میری نگرانی میں پنپ نہ سکا تو کتنی جگہ ہنسائی ہوگی۔ میں توہ جوں مڑا رہا۔  
میرے مالی حالات بھی زیادہ اچھے نہ تھے۔ مگر میں چاہتا تھا اسے ولایت تک بھیجوں۔ جو صلے اتنے وسائل محدود اللہ کی  
بارگاہ میں دن رات دعائیں مانگیں۔  
پھر تو کرنا خدا کا یہ ہوا۔ نقوش نے اپنے پائے کامی ہو لیے۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لیے اتنی عزت کی اور اتنے خلوص  
سے کی کہ اس نے ایک ایک سال میں دو دو تین امتحان بیٹے شروع کر دیے اور خدا کی مہربانی سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔ اس  
کے کئے ہوئے پرچے آج پاکستان اور ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں رکھ کے دیکھ لیں۔ اس شان سے کوئی بھی پاس نہ ہوا ہوگا۔  
اس کی قابلیت نے اس کے بہت سے حامد بھی پیدا کر دیے ہیں۔ جو اس سے ملتی عناد رکھتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات  
نہیں۔ مگر اس سے دل دکھتا ہے۔ حالانکہ یہ اپنی ہی دھن میں دیوانہ مار چلا جا رہا ہے۔ کسی سے کچھ غرض نہیں۔ مگر لوگ ہیں کہ اسے  
ٹکڑیاں مارنے سے باز نہیں آتے۔ اس کے باوجود اس کے دل میں انتقام کا جذبہ نہیں۔ یہ رنجشوں کی بازی کو بھی جیتوں سے جیتنا چاہتا ہے  
ماشاء اللہ نقوش اب جوانی میں قدم رکھ رہا ہے۔ کوئی اس کا بالکلین تو دیکھے۔ ڈنٹا ہوں کہیں اسے میری ہی نظر نہ لگ جائے  
لہذا آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اسے میری نظروں سے نہ دیکھیں۔ میں تو دیوانہ ہوں۔ دیوانہ نہ ہوتا تو آج نقوش کو یہ مرتبہ نصیب نہ ہوتا۔  
مگر مجھے اتنا ہوش ہے۔ آج میرے بھی لاڈلے کی بات چڑھی ہے۔





نماز فتح پوری



بابائے آرڈر



مالک رام



ڈاکٹر محی الدین زویر



ڈاکٹر عابد حسین



قاضی عبدالودود



سید مسعود حسن رضوی



ڈاکٹر ناصر



ڈاکٹر خواجہ احمد قاری



سید احتشام حسین



سید وقار عظیم



ڈاکٹر شوکت سبزواری



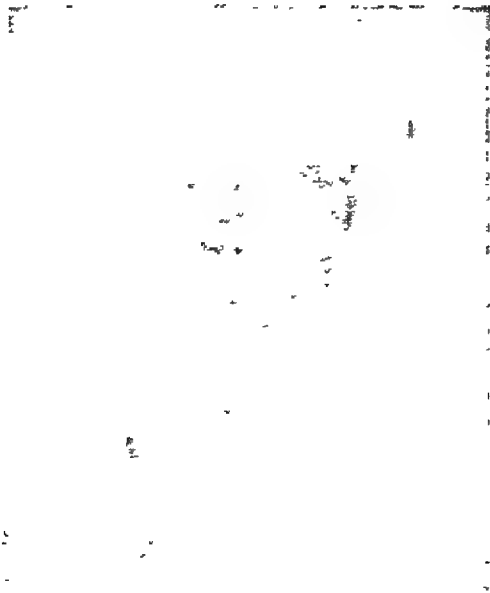
ڈاکٹر ابو الوہید صدیقی



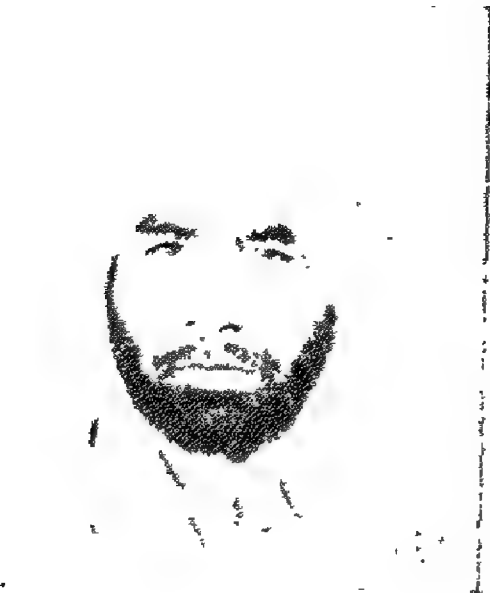
مہد حسن عسکری



ڈاکٹر محمد حسن



مہد علی رذوی



راہیلاز سیدی



حات اللہ انصاری



مروان العزیز



غصنہ حفیظی



خالدہ بیگم سمیع



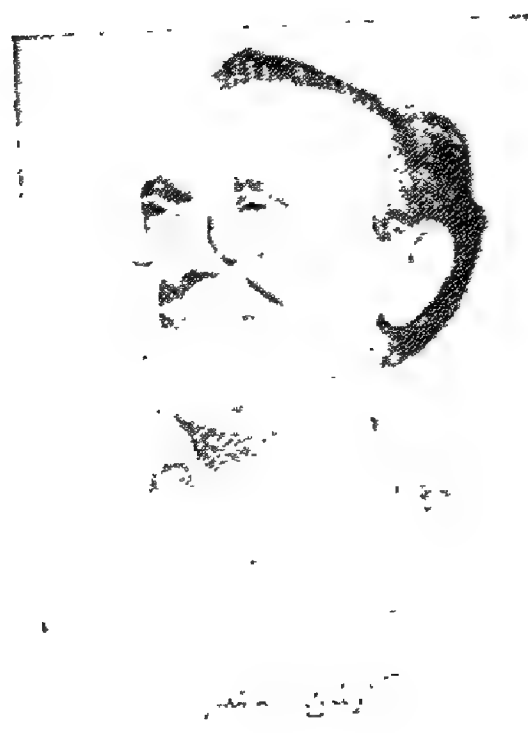
شاجرہ مسرور



منار شہرین



حجاب امتیاز علی



حسنہ شاہد قاسمی

شاہزادہ عباس

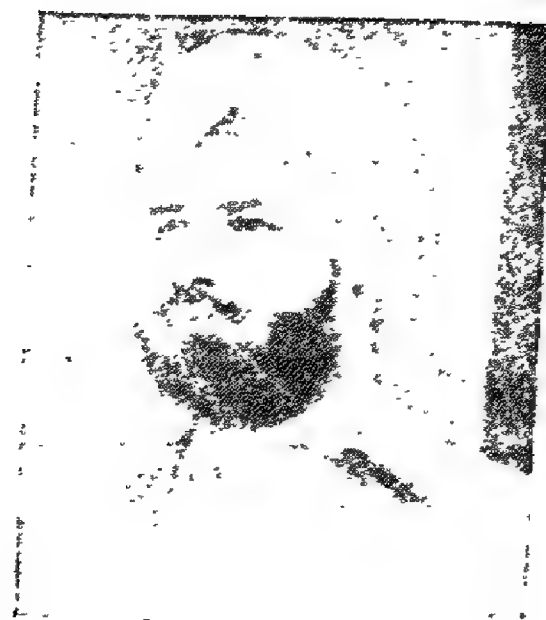


ممتاز مفتی

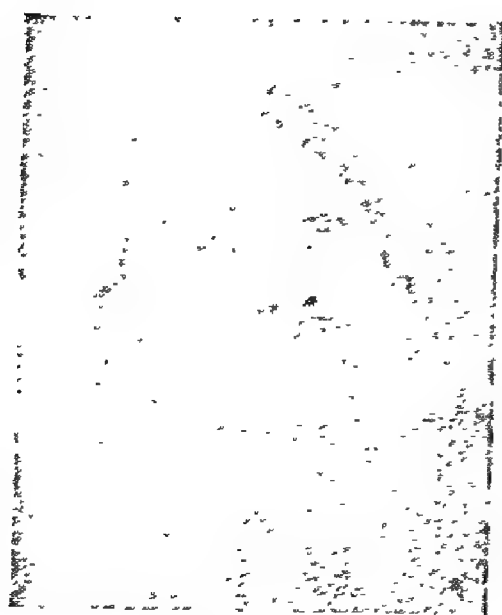
علی عباس حسینی



قلمرو اللہ شمعہا



پرواز سندھو



دیوندر سہا رتی



اوندو شامو اسکا



سمندر ناتھ



کشمیری لال ڈاکٹر



چهار سرافه پادشاهی



پیشتر و سنج آیدادی



حافظه جاله دغری



نرانی نورکله پوزی



اختر شیرانی



انتر لکونوی

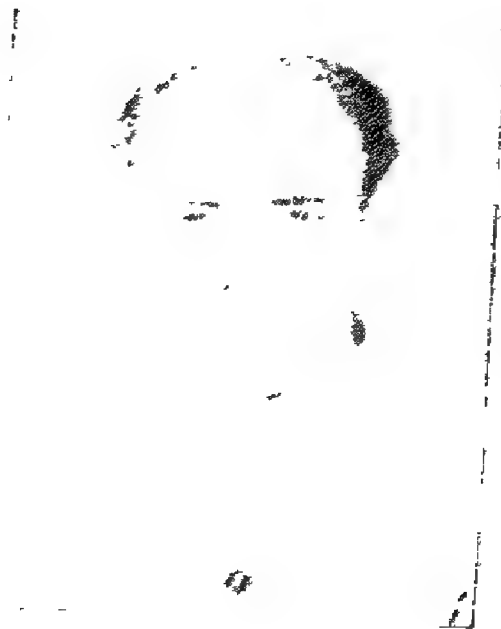




عابد علی عابد



نادر



چندانی



حافظ خوشنویس نوری



اختر انصاری



علم





پیرت شعلوی



ساجد ماسی قراد



میکش امیرآبادی



غلام ربانی قاپان



شاهد احمد دہلوی



قنیل شعلی



شودت تہانوی



خارسی



کنہیا لال کپور



جراج حسن حسرت



سافین الرحمن



امتیاز علی تاج

## ترتیب

نقوش کی اشاعت کو آج بارہ برس ہو گئے ہیں۔ چند لفظوں میں اس کے دس سالہ کارناموں کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہ ہوگا۔ پھر کائنات ان چیزوں کے بارے میں جانتا ہے۔ جسے صرف لکھنے والا ہی جانتا ہو۔ پڑھنے اور سننے والا نہ جانتا ہو۔ اس لیے میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ جن موجودہ فہر کی ترتیب کے سلسلے میں چند باتیں سن ہیں۔

کوئی دوسرا، ایسے نقوش کا یوں انتخاب کرتا تو میں سٹپٹا سکے۔ وہ جانتا۔ اس لیے کہ نقوش میں جو کچھ جی چھپا ہے۔ اُس کی ادنیٰ آبرو پر کوئی بھی حرف نہیں رکھ سکتا (دیسے برائے اعتراض) جو جس کا جی چاہے کہے (یہی وجہ ہے کہ مجھے نقوش کی ہر ہر سطریں حق ہی میں نظر آتا ہے۔ ایسے محبت کے بارے کو نقوش کی دس سالہ تحریروں کا انتخاب اپنے ذمہ نہیں لینا چاہیے تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ میں یہ کام کسی اور کو سونپتا تو پھر میں خود کیسے زندہ رہتا۔ دونوں طرح اپنی موت !

مجھے نقوش کی نسبت سے ہر اچھائی بھی منظور ہے اور ہر بُرائی بھی بُری ہے۔ جس سے کہ اس سراسر جھگڑے والے کام کو جی، سراسر انجام دے کر بُری جلی باتیں سننے کے لیے آمادہ ہو گیا ہوں اب میرے سامنے نقوش کا ایک ایک نقطہ ہے اور یہ جاننا تو اس !

میری مشکلوں کی نوعیت مختلف ہے۔ ایک طرف اہل قلم ہیں۔ دوسری طرف قارئین ایک سے ایک مستند زور و جہل رہا ہوں نہ جانے میری اس عاجزانہ کوشش کو پسند بھی کیا جائے گا یا نہیں۔ ٹھہرا۔ میں کی صرف ایک بات ہے۔ وہ یہ کہ انگریزی کام کوئی دوسرا انجام دیتا (اللہ میاں کے سوا) تو کیا ادیب اور قاری مطمئن ہو جاتے؟ میرا خیال ہے۔ ہرگز مطمئن نہ ہوتے۔ اطمینان تو ابلی موت کی نشانی ہوتا کرتا ہے۔ جو نہ مجھے منظور ہے۔ اور نہ ہی نقوش کے قاری اور نقوش کار کو منظور ہوگا۔

آئیے میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے زیرِ نظر تحریروں کے چناؤ میں اُن کن امور کا خیال رکھا ہے۔ مقالات کے سلسلے میں میں نے یہ چاہا ہے کہ مضمون نگار کی بہت تخلیق کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھوں کہ موضوع بے حد اہم ہو اور اُس موضوع پر بات تو لکھنا نہ گیا ہو یا بہت کم لکھا گیا ہو۔ میں نے ایک چلتے ہوئے موضوع پر ایک اچھا مضمون اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ اُس موضوع پر ادنیٰ چیزیں مل جاتی تھیں (جیسے نظم، غزل یا افسانے پر مضمون) برخلاف اس کے اُس مضمون کو لیا ہے جس میں ہمارے لیے مواد کی ندرت اور موضوع کی اہمیت تھی۔ یعنی میں نے اس حصے کو مصنف کے جذبات سے زیادہ علمی اعتبار سے موقع بنانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں بے بسی بجا ہوں تو راکا ڈکا دیا ایسے مضمون بھی راہ پا گئے ہیں۔ ورنہ میری نیت نہ تھی۔

افسانوں اور نظموں کے سلسلے میں میں نے اس نثر کی کوشش کی ہے کہ اس میں لکھنے والے کا اپنا اسٹائل ضرور ہو۔ میں نے اُن چیزوں کو نہیں چنا جن میں مصنف کا اپنا رنگ نہ تھا۔ اُن چیزوں کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ جو صرف زورِ بازو سے لکھی یا کہی ہوئی ہوتی ہیں۔ میں نے خیال اور اندازِ بیان کے ساتھ افسانہ میں افسانویت، نظم میں فطرت اور غزل میں غزلیت کو دوسری فنکارانہ خوبیوں پر ترجیح دی ہے یعنی میں نے نہیں چاہا کہ ایک خاص رومانی افسانہ نگار کا افسانہ میرا کسی پر آئے۔ اسی طرح میں نے شاعروں کی تخلیقات کے بارے میں سوچا ہے۔

نقوش کے خاص نمبروں کا انتخاب اور بھی کٹھن تھا۔ اس لیے کہ اپنے اپنے موضوع پر اُن میں بہت کچھ ہے۔ ونٹروں کے دفتر، اب میں کہاں تک ابھی چیزوں سے اپنی نظریں چراتا۔ بہ حال خاص نمبروں کی تھوڑی بہت جھلک اس انتخاب میں مل جائے گی۔ غلامِ فہر اور افسانہ نگاروں نے اس میں اس لیے شامل نہیں کیا کہ وہ پہلے ہی انتخاب تھے۔ البتہ اُن دونوں افسانہ نگاروں میں سے انتخاب کیا ہے۔ جس نے افسانوں پر مشتمل تھے۔ میں تو اس نمبر میں اُن چیزوں کو لایا ہوں جو غیر مطبوعہ تھیں اور پہلے پہل نقوش میں چھپی تھیں۔

دیکھ لیجئے اس نمبر کی ضخامت کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ میں ایک ہزار صفحوں سے زیادہ کا انتخاب نہیں چاہتا تھا (ابھی تین چار سو فقاہت شدہ صفحات روک لیے ہیں) اس لیے میرے وہ دوست جن کی تخلیقات اس نمبر میں نہیں آسکیں۔ وہ مجھے میری مجبوری کی بنا پر معاف کریں۔ اس لیے کہ میں تو چاہتا تھا کہ اس انتخاب میں وہ سب کچھ آجائے جو نقوش میں چھپ چکا ہے۔ مگر میری آکس خواہش کی تکمیل ناممکن تھی۔

اس نمبر میں صرف چار مضمون غیر مطبوعہ ہیں۔ تین ابتدائی مضمون جو نقوش کے بارے میں میرے محسنوں اور دوستوں نے لکھے ہیں۔ اسے ان کی محبت جاننے اور اس سے زیادہ کچھ نہ سوچتے۔ البتہ ایک مضمون میرا ہے اور مجھی پر ہے۔ اسے میں نے سب سے آخر میں ٹانگ دیا ہے (یہ وہی مضمون ہے جس کے بارے میں میں نے ایک بار خود معرکہ آرا مضمون کی پھبتی کہی تھی) اگر کوئی اس نمبر میں فاقو اور فضول چیز ہے تو وہ میرا ہی مضمون ہے جس کے لیے میں آپ سے درگزر کی درخواست کروں گا۔

# نقوش کے بارے میں میرے تاثرات

مولانا غلام رسول قمر

مجھے پیش نظر کاموں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اطمینان سے ہر سالہ بلاستیک عاب پڑھ سکوں۔ مگر مایوسی ہوتا ہے کہ مختلف رسالوں کے متفرق مضامین فرصت کے اوقات میں جستہ جستہ دیکھ لیتا ہوں۔ ان میں ایک رسالہ "نقوش" بھی ہے جس کے خاص نمبر اکثر میرے لئے سیر سدا و استغاب کا موجب بنے رہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ اردو رسالوں میں خاص نمبروں کی ابتدا کب سے ہوئی اور کس رسالے کو اس میدان میں سبقت کا شرف حاصل ہے۔ خود میری نظر سے جو پڑائے رسالے گزرے، ان میں سب سے پہلے خاص نمبر "عزیز" کا دیکھا، جو دسمبر ۱۹۷۷ء میں اردو ہفت روزہ کی قارئین پر نکلا تھا اور اس کا نام دربار نمبر "نقا" عزیز "کا سائر چھوٹا تھا اور اس خاص نمبر کی ضخامت "عزیز" کے دو ماہی و نمبروں کے برابر تھی۔ ہمارے ہمدیں جو خاص نمبر نکالتے رہے، ان میں سے بھی اکثر دیکھے۔ تاہم اگر ہم کہوں کہ "نقوش" نے خاص نمبروں میں نیا ٹی کا ایسا معیار قائم کر دیا ہے، جس کی کوئی نظیر کم از کم اردو زبان کے رسالوں میں نہیں مل سکتی، تو غالباً اسے مبالغہ نہیں سمجھا جائیگا۔ میں نے کم از کم محض اعلیٰ طا کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے کہا، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زبان کے رسالوں میں ایسے خاص نمبر کبھی نہیں دیکھے۔ ایک زمانے میں افغانستان کا مشہور مجلہ "کابل" اس سے ملنے چلتے "سالنامے" نکالا کرتا تھا، لیکن یہ دوسری عالمی جنگ کے بیشتر کے دور کا ذکر ہے اور اس وقت مجلہ "کابل" کی زبان پشتو نہیں فارسی تھی۔

## "نقوش" کے خاص نمبر

"نقوش" کے خاص نمبروں کی نیچائی محض ضخامت کی ضمانت یا ظاہری تجسین و تزئین تک کبھی محدود نہ رہی۔ یعنی یہ نہ سمجھنا جیسے کہ ادراک زیادہ سے زیادہ مقدار میں فراہم کر دینے کے اور سرورق کی دلی آویز نقش و نگار کے ذریعے سے یہ طور خاص حادثات میں افزائش دیا گیا۔ اس سلسلے میں جو امر خصوصی توجہ کا مستحق ہے، یہ ہے کہ خاص نمبر کے تنوی و لازم کو ہر لحاظ سے پورا کرنے زیادہ سے زیادہ اہتمام پیش نظر رہا۔ گویا خاص نمبر کا جو موضوع تجویز کر لیا، اس کے ہر پہلو کے متعلق جتنی معلومات ضروری جاسکتی تھیں، وہ سب فراہم کر دیں اور جو بھی خاص نمبر نکالا اسے مجوزہ موضوع کے باب میں جامع، الحقائق بنا دیا گیا، اگر کوئی

افسانوں اور نظموں کے سلسلے میں میں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ اس میں لکھنے والے کا اپنا اسٹائل ضرور ہو۔ میں نے اُن چیزوں کو نہیں چنا جو میں مصنف کا پیار لگ نہ تھا۔ اُن چیزوں کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ جو صرف زور یا زور سے لکھی یا کہی ہوئی تھیں۔ میں نے خیال اور اندازِ بیاں کے ساتھ افسانہ میں افسانویت، نظم میں نطیت اور غزل میں غزلیت کو دوسری فنکارانہ خوبیوں پر ترجیح دی ہے یعنی میں نے نہیں چاہا کہ ایک خاص رومانی افسانہ نگار کا افسانہ میرا کسی پر آئے۔ اسی طرح میں نے شاعروں کی تخلیقات کے بارے میں

سوچا ہے۔ نقوش کے خاص نمبروں کا انتخاب اور بھی دشمن تھا۔ اس لیے کہ اپنے اپنے موضوع پر اُن میں بہت کچھ ہے۔ دونوں کے دھڑا اب میں کہاں تک اچھی چیزوں سے اپنی نظروں پر آتا۔ بہ حال خاص نمبروں کی تھوڑی بہت جھلک اس انتخاب میں مل جائے گی۔ غزل نمبر اور افسانہ نمبر کو میں نے اس لیے شامل نہیں کیا کہ وہ پہلے ہی انتخاب سے خارج تھے البتہ اُن دونوں افسانہ نمبروں میں سے انتخاب کیا ہے۔ جسے افسانوں پر مشتمل تھے) میں تو اس نمبر میں اُن چیزوں کو لایا ہوں جو میرے مطلوبہ تھیں اور پہلے پہل نقوش میں چھپی تھیں۔

دیکھ لیجئے اس نمبر کی ضخامت کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ میں ایک ہزار صفحوں سے زیادہ کا انتخاب نہیں چاہتا تھا (ابھی تین چار سو تک بہت کم تھے) اس لیے میرے وہ دوست جن کی تخلیقات اس نمبر میں نہیں آسکیں۔ وہ مجھے میری مجبوری کی بنا پر معاف کر دیں۔ اس انتخاب کے آداب سے جو نقوش میں چھپ چکا ہے۔ گہری اس خواہش کی

اس نمبر میں صرف چار مضمون زیرِ ملاحظہ ہیں۔ میں ابتدائی مضمون جو نقوش کے بارے میں میرے مضمون اور دوسروں کے مضمون اسے ان کی محبت جاننے اور اس سے زیادہ کچھ نہ سوچتے البتہ ایک مضمون میرا ہے اور بھی پر ہے۔ اسے میں نے سب سے آخر میں ٹانگ دیا ہے (یہ وہی مضمون ہے جس کے بارے میں میں نے ایک بار خود معرکہ آرا مضمون کی پستی کسی تھی) اگر کوئی اس نمبر میں فالتو اور فضول چیز ہے تو وہ میرا ہی مضمون ہے۔ جس کے لیے میں آپ سے درگزر کی درخواست کروں گا۔



# نقوش کے بارے میں میرے تاثرات

مولانا غلام رسول فہر

مجھے پیش نظر کاموں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اہلیانِ علم کے ہر حصہ کو جو مختلف پڑھ سگوں، گونا گویا ہی ہوتا ہے کہ مختلف رسائل کے متفرق مضامین فرصت کے اوقات میں جتنے جتنے دیکھ لیتا ہوں۔ اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ یہ سب سبھی سے بھی ہے جس کے خاص نمبر اکثر میرے لئے ہیرت و استحباب کا موجب بنے رہتے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ اردو رسالوں میں کتنی ہی خبروں کی آمد آج سے ہوئی اور کس رسالے کو اس میدان میں سبقت کا شرف حاصل ہے۔ خود میری نظر سے جو پڑھے رسالے گزرے، ان میں سب سے پہلے خاص نمبر "عزن" کا دیکھا، جو دسمبر سنہ ۱۳۸۷ء میں پڑھا اور وہ مجھے لی تاج پوشی پر نکلا تھا اور اس کا نام دربار نمبر تھا۔ "عزن" کا ساز چھوٹا تھا اور اس خاص نمبر کی ضخامت "عزن" کے دو بار زیادہ ہو گئی تھی۔ ہمارے محمدیوں جو خاص نمبر نکالتے رہے، ان میں سے بھی اکثر ویسے تھے۔ تاہم اگر میں کہوں کہ "نقوش" نے خاص نمبروں میں انکی کا ایسا معیار قائم کر دیا ہے، جس کی کوئی نظیر کم از کم اردو زبان کے رسالوں میں نہیں لی سکتی۔ تو غالباً اسے مبالغہ نہیں سمجھا جائیگا۔ اس سے کم از کم محض احتیاط کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے کہا، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زبان کے رسائل میں ایسے خاص نمبر بھی نہیں ملے۔ ایک زمانہ جن افغانستان کا مشہور مجلہ "دکابل" اس سے ملنے جلتے "سالنامے" نکالا کرتا تھا، لیکن یہ دوسری طرف سے ایک پیشتر کے دور کا ذکر ہے اور اس وقت "دکابل" کی زبان پشتو نہیں فارسی تھی۔

## نقوش

نقوش کے خاص نمبروں کی نیچائی محض ضخامت کی ضمانت یا ظاہری تحسین و تزئین تک کبھی محدود نہیں ہوتی بلکہ یہ ہے

یہ کہ ادراک زیادہ سے زیادہ مقدار میں فراہم کر دئے گئے اور سرورق کردہ اور نقش و نگار کے ذریعے سے ہر طور خاص جاذبِ نظر و فراہم دیا گیا۔ اس سلسلے میں جو امر خصوصی توجہ کا مستحق ہے، یہ ہے کہ خاص نمبر کے منوی لوازم کو ہر لحاظ سے پورا کرنے کا وہ سے زیادہ اہتمام پیش نظر رہا۔ گو یا خاص نمبر کا جو موضوع تجویز کر لیا، اس کے ہر پہلو کے متعلق جتنی معلومات ضروری جاسکتی تھیں، وہ سب فراہم کر دیں اور جو بھی خاص نمبر نکالا اسے مجوزہ موضوع کے باب میں جامع الحقائق بنا دیا گیا۔ اگر کوئی

صاحبِ وقت کی مرضی کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ مجھے فراہم کر لے اور ان میں تفصیلاً دیکھ جانتے رہیں۔ اس کے بعد آپ نے اپنی کتاب میں اتنی معلومات شائع ہی کی تھیں کہ اس کے بغیر نقوش کے ایک خاص فیصلہ کی ضرورت نہ رہتی۔ عام شہیدہ پر دیکھا گیا کہ جب خاص فیصلہ نکالا جاتا ہے تو اس کا ایک حصہ مخصوص خاص فیصلہ کے وقت کیا جاتا ہے۔ باقی ادراک میں دوسرے تین مضامین مختصراً لکھ چکے جاتے ہیں۔ خواہ یہ سب جو کہ ایک ہی موضوع کے تمام مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین فراہم کر لینا پسلی نہیں اور سنی و اہتمام کو اتنی منزل پر پہنچانے کے لئے جس قدر ضرورتی ہو سکتی ہو گا۔ اس سے ہر ادارہ تحریر مسلسل کام نہیں لے سکتا، خواہ یہ سبب ہو کہ شخص کے باوجود تنوع اور بے نقوشی کو نظر انداز نہیں کیا جاتا اور خواجہ عالی مرحوم و منفرد کا یہ ارشاد شملی راہ رہتا ہے کہ:

بزم میں اپنی سخن بھی ہیں، ناشائی بھی

### معنوی محاسن

”نقوش“ نے اس لحاظ سے بھی شیوہ عام کی پیروی نہیں کی اور اپنے اختیار کردہ مسلک ہی پر قائم رہا۔ یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ ”نقوش“ کا ادارہ تحریر تنوع کی جاہلیت سے ناواقف ہے یا اسے علم نہیں کہ مضامین میں بے نقوشی کی رعایت پیش نظر رکھنے تو مختلف ادراک اور مختلف درجاتِ علم کی نگاہوں کے مابین کیجئے آئیں گے۔ حاشا و کلا۔ تاہم اس نے خاص فیصلہ کی ہمیشہ تحریر کردہ موضوع ہی سے وابستہ رکھا البتہ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے تنوع کے اہتمام میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ مثلاً اگر کسی شخصیت کے متعلق تھا تو اس کے سوانح حیات بھی شائع کئے، ان خاص کارناموں کی تفصیل بھی بتائی، محمد کی ہدایت اس شخصیت نے ایک خاص نمبر کا استحقاق پیدا کیا۔ اس کی سیرت کے گونا گوں پہلو بھی اچھارے۔ مختلف اصحابِ علم و فکر کے تاثرات بھی فراہم کئے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تقریبات و نگارشات کو بھی یکجا کر دیا۔ گویا جو کچھ اس نمبر میں چھپا، وہ برابر اصل شخصیت کے متعلق تھا۔ بہ اس پر تمام مضامین میں زیادہ سے زیادہ تنوع موجود تھا۔ و سنز خوان پر طرح طرح کے کھانے چن و سٹے، ہر شخص جن کھانوں کو پسند کرے اور اپنے وقت کے مطابق پائے، اٹھالے۔ بازار میں رنگ و رنگ کے پھولوں کی کیاریاں سجا دیں جن کی خوشبو میں حد درجہ دلی آذرب و شیریں تھیں۔ جسے جس رنگ اور جس خوشبو کا پھول پسند ہو، اس سے اپنے باصرہ و شہنامہ کی ترانہ فرمائے۔ مثالی کے طور پر ”پطرس نمبر“ کو لے لیجئے۔ مجھے معلوم نہیں نجاری مرحوم کے سوانح حیات کبھی ترتیب پائیں گے یا نہیں پائیں گے لیکن ”نقوش“ کے خاص نمبر نہ یہ فرض کھایہ ادا کر دیا اور وہ سب کچھ فراہم ہو گیا جو مرحوم کی سیرت و سوانح، اخلاق و عادات، علم و فضل و خدمت ملک و ملت کے سلسلے میں ضروری اور قابل ذکر تھا، بیان تک کہ ان کی بیشتر تحریریں اور تقریریں بھی شامل کر دیں۔

### یگانگی کے مختلف پہلو

”نقوش“ کے دوسرے خاص شماروں مثلاً ”شہادتِ بزرگ“، ”مکاتیبِ بزرگ“، ”افسانہ نمبر“، ”غزل نمبر“، ”حزبِ لبیبہ“، ”غزل نمبر“ وغیرہ پر تفصیل بحث کر دی تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے گا۔ بہر حال میں نے ”نقوش“ کے خاص نمبروں کو مختلف درجہ



۲۔ سنی اقتدار سے بھی اس نے فیر کھینچ لیا۔ لیکن یہی ہر عرصہ و مضمون کے منتقلیوں کا وہ سب سے زیادہ مطلوبات فراہم کی گئیں۔ بخشش و دیکھ کی اس مضمون کا کوئی بھی پہلو صاحبِ لہجہ کی نظروں سے اوجھل نہ رہا۔ جیسے یہ اپنی ہر توجہ، وقت و فکری اور دھن و محنت و مشق کے گمان سے پیش نظر رکھے۔

۱۔ ان کی اہمیت کا ایک پہلو ظاہراً اب تک پوری طرح ابھر نہیں سکا، اور وہ یہ ہے کہ ان نہروں کی ایک مخصوص تاریخی حیثیت ہے۔ دس بیس سال گزر جانے کے بعد پھر موجودہ علم و فضل اور ذوق و شرب کا نادرو جامع مرقع نہ جابجائے اور جس انہروں سے ہماری زندگی میں ان خصوصیات کے متعلق زیادہ سے زیادہ روشنی ہتیا کی جاسکے گی۔

۱۔ مکاتیب غیر شخصیات پر وغیرہ بھی اس لحاظ سے محدود رہ قابلِ نقد و منقور ہوں گے کہ جو کچھ ان کے ذریعے سے کیا ہو چکا ہے وہ وہ سری سنگ پر گزرنے لے سکے گا۔

آخر میں انما اور مرعی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ تحریر بدلتی تو وہ سالہ غیر کا مقدمہ و تعارف ہے اور نہ اس میں ان مضامین کا اہمیت کی کیفیت پیش کی گئی ہے جو دس سال کے شماروں سے منتخب کر کے بیگزراں قدر مجموعہ تیار کیا گیا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ "فخرش" کے خاص نمبروں کے باب میں اپنے تاثرات پیش کروں ضروری نہیں کہ ادارہ "فخرش" یا اصحاب علم و فضل اسی سے آخر نامہ لکھیں ہوں۔ ان خاص نمبروں کی افادہ حیثیت کے مختلف پہلوؤں کا سامنے آجانا اس لئے بھی ضروری نظر آیا کہ اگر پہلے ادارہ یہ خدمت انجام دے رہا ہے تو اب ان کے لئے بالارادہ اور بالائینہام سرگرم کر کششیں جاری رہنی چاہئیں۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارہ "نقد و نظر" کو بدرجہا زیادہ قابلِ قدر اور یہ اخبار نسل و نسل کے فائدے و اثرات وسیع تر بناتا رہے۔

ایں دسا از من و از جملہ حسان آمین باد

# نقاش و نقوش

## ڈاکٹر اختر اور بیوی

بچے مر کر دھجکتے ہوں تو صبا رفتار و برق یہ کناؤ زندگی کے نقوش رنگ رنگ زمانہ کی راہوں اور منزلوں میں بکھیرے ہوئے پاتا ہوں۔ ماضی کو خواب و خیال کیسے کہہ دوں؟ ماضی سے بڑی حقیقت تو میرے لئے اور کوئی نہیں۔ حال کا زہرِ غم ابھی رگ و پے میں اس طرح سرایت نہیں کر سکا کہ وہ جانِ حشر کا ایک حصہ بن جائے۔ زندگی کا اہم ترین حصہ عبارت ہے ماضی سے۔

کتنی پیاری ہنسٹیاں، کتنے چاہنے والے لوگ، کیسے ہنستے ہوئے چہرے رکھتے تاناک واقعات، کیسی جاندار محبتیں، کتنی گرم مجلسیں، کیسی کیسی ادبی مجلسیں اور کتنے محبوب جریدے میری حیاتِ مستعار کا جز بن چکے ہیں! ماضی کبھی نہیں مٹتا۔ حال ماضی کا پروردہ ہے، ماضی کے نو کا سرا ہے۔ حیاتِ گذشتہ پنہاں ہونے کے باوجود کسی نہ کسی رنگ و آہنگ سے حال و مستقبل کے لالہ و گل میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔

میرے دل میں اس وقت اردو جریدوں کی یادیں بیدار ہو رہی ہیں۔ اور ان یادوں کے ساتھ نہ جانے اور کتنی حبیبی اور پیاری یادیں وابستہ ہیں۔ ماضی سے دوری کا احساس دل میں ایسا گداز پیدا کر دیتا ہے کہ اُس کے پھول تو پھول کاٹے بھی عزیز ہو جاتے ہیں۔

میرے شباب نے دامنِ نگار میں انگلیں کھولیں اور پھر نیرنگ خیال نے اُسے پُرکار بنایا۔ شباب جب اور سا ہوا تو ساقی اور روان کو بیانِ رنگینی سے دوستی اور ٹیکنک و ہوش کی رہبری کے لئے بڑھنے ہوئے دیکھا۔ حسن اور حسنِ کاری کے عالم رنگ و بوم میں میرے ذوق و شوق پل رہے تھے۔ ادب میرا مذہم تھا اور میں ادبِ لطیف کی فضا میں مسطر میں سانس لیتا تھا۔ جریدے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ سب سے اہم نوع رسالوں کی وہ ہے جو ایک منفرد شخصیت، ایک مخصوص فضا اور ایک استوار رہائش رکھتی ہے۔ میں جریدوں کو جیتے جاگتے انسانوں کی طرح پہچانتا اور انھیں یاد رکھتا ہوں۔ پرچے میرے مخلص محبوب و دوستوں کی طرح ہوتے ہیں۔ میں دونوں کو بہت چاہتا ہوں۔ مگر اظہار و فدا داری میں استوار نہیں ہوں۔

شخصیت میں تسلسلِ روایت کا پرتو بھی ہوتا ہے اور ارتقا کی تبدیلیوں کا عکس بھی۔ آدمی اور جریدے دونوں اس قانون کے دائرے میں آتے ہیں۔ آدمی فوت ہوتے ہیں۔ پرچے بھی مر جاتے ہیں۔ کتنے پیارے لوگ اور کتنے اچھے پرچے فنا پا گئے۔ لیکن میرے دل کی دھڑکنوں میں وہ آج بھی زندہ ہیں۔ دومان (لاہور) کتنا محبوب رسالہ تھا! کتنی میری روح میں جھانک کر اُس کی بہادری کو دیکھے!

مُلک کی تقسیم کے بعد کئی رسالے ہجرت کر گئے۔ اور میں ہجرتِ ساقی میں اپنی تشنہ لسی کو دعائیں دے رہا ہوں۔ دلی دُور تھی مگر کراچی بہت دُور ہے، بہت دُور! — اور لاہور؟ وہاں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آتا ہے؟ دہشتہ نگار، نذر، سب سے لئے صرف ارمانوں کا جاندن کر رہ گیا ہے۔ ادبِ لطیف میرا دوست، میرا بھائی میرے لئے غمگین

ہے۔ میں ادبی دنیا سے دور و مجبور ہوں۔ نہ جانے نیرنگِ خیال و ادبی دنیا فوٹ ہو گئے باز نہ ہیں وہ  
سنہ سے لاہور میں نئی بہاریں آئی ہیں۔ وہ سٹریو لبرائن اور رنگ چین بن گیا ہے۔ کچھ گل و یا سمن اور چند  
نقوش حسین اس صنفِ خانہ ہند میں بھی آجاتے ہیں۔ اور کعبہ کے بنائے ویریز رنگ و جن کے کنارے آجسے ہیں۔ اہلِ حرم  
اور اہلِ صنم کدہ میخانہ اردو میں آکر ہم نقوش ہو جلتے ہیں۔

اردو جریدوں کی ادبی اہمیت تو ہے ہی۔ لیکن موجودہ حالات میں ان کی جذباتی، تہذیبی، سیاسی اور انسانی  
حیثیتیں بھی کم اہم نہیں۔ اردو وہ مہم ہے جو تقسیم کے زخم کے اندامِ کال کا باعث ہے۔ یہ لڑنے پر کے دنوں کو جوڑنے والی  
طاقت ہے۔ اردو تو اسے محبت ہے۔ اس نسبتِ ایضاً کا پریم ہی سنگار ہے۔ اردو پرچے سفر لے آتے ہیں۔  
فی الحال میں گلستانِ اردو کے ایک گل کو ویدہ کے متعلق اپنے تاثرات پیش کر رہا ہوں۔ یہ پھول تقسیم کے  
بعد راوی کے کنارے کھلا۔ اس کے آقا مٹھیل کی صحبت میں مسرور گذرے۔ انھوں نے اپنے خونِ جگر سے اس کی بہاریں  
کو پر دان چڑھا یا اور اس کے نقوش آجاسے۔ دوسرا دور آیا تو پُر و قنار آیا۔ شباب کا اظہار اور انقلاب کی سیاست  
دور ہو چکی تھی۔ ثنائت آئی۔ شورش رنگینی اور شعلگی نے پختگی کی طرف قدم بڑھایا۔ نقوش بہار تباہ و برباد گئے، زیادہ سنور  
گئے، زیادہ دل نشیں ہو گئے اور زیادہ فکر انگیز۔ پھول کھلتا رہا، اور کھلتا رہا۔ یہ نگار گلستان کے فیض سے بھی بھرا  
بہار کے طفیل سے بھی۔ م

قیاس کئی زگلستانِ من بہا مرا !

تخیل بہارِ ثروری ہے۔ نقوش بہار نے نقاشی کی اور نقوش گلستان پُر کا روپا بندہ ہو گئے۔ اردو کے گل کو  
ویدہ کے تیسرے دور کو اہلِ مائتہ عہدِ پختگی و ثروری کہتے ہیں۔ نقوش بہار تیکھ بنے، بالیدہ ہوئے، ان کی شخصیتیں ابھریں  
اور یہ گلستان میں نکستہ ابدی بن گئے۔ نقاشی نو نے محض اپنی صلا جینوں کے طفیل صرف اپنے جوشِ اظہار کے بل بوتے  
پر نقوش بہار کو سنوارا، نکھارا اور تاریخ گلستان بنائی۔ نقوش چین کے تیسرے دور کے نقاش نے دامانِ بہاراں  
کو بہت وسیع بنا دیا۔ یہ عہدِ توسیع و شخص ہے۔ اور اردو ادب کی تاریخ میں ایسے ایسے نقوش ابھرے جنہیں ہم نقوشِ مائی  
دہراؤ کہہ سکتے ہیں۔

تیسرے دور کا نقاشِ ساحر ہے۔ یہ اپنے پرائوں کی طرف گل و ثمر بھیکتا ہے مگر خانہ برانداز چین نہیں  
بلکہ خانہ ساز بہار ہے۔ یہ ماضی کے رنگ و نکت کو سمیٹ کر لاتا ہے اور پرائے نقوش بہار کو حیاتِ نازہ عطا  
کرتا ہے۔ یہ غزلِ مرا بھی ہے اور داستانِ گو بھی۔ اس نے شاہدِ بہاراں کا ایک صنم کدہ بھی تعمیر کیا ہے۔  
وہ خارہ شگافی کر کے جوئے شیر بھی لاتا ہے۔ اس نے ایک دیوارِ قلعہ بھی بنوائی ہے۔ وہ تصویرِ بتان اور حبیبان  
ادب کے خطوطِ جگہ کرنا دیتا ہے۔ وہ بہر و پیا ہے۔ دیکھو گل کے تختہ کی کوئی سر پر رکھے مالن کا بھیجیں بد سے جلا  
آ رہا ہے۔

لے خوشا روز کہ آئی وہ صد ناز آئی !

# نقوش کے خاص نمبر

## نثار احمد ساروقی

آرہو میں اخبارات کو لکھتے ہوئے مدت تو ایک صدی سے بھی زیادہ ہی ہو گئی لیکن رسالوں کا رولج، آرہو بھی ایسے رسالے جو آج مضامین، افسانے، مقالے، نظمیں اور غزلیں سما کر لکھتے ہیں، ان کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ آرہو میں علمی اور ادبی رسالوں کا جو معیار آج ہے وہ رفتہ رفتہ بنا ہے۔ ایک زمانے میں تہذیب الاخلاق، معارف، مصنف، عالمگیر، ہمالیوں، ادبی دنیا، صلائے عام، ہیرنگ، خیال، الناظر، نگار اور ساقی ایسے ادبی رسالے تھے کہ ان میں کسی مضمون کا شائع ہونا ہی ادیب کے ذی شعور اور پختہ کار ہونے کی علامت تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان رسالوں نے اس صدی کے بہت سے لکھنے والوں کو بنایا ہے، روشناس کرایا ہے یا ان کا دانشور، کاتب ہے۔

لیکن ہمارے زبان میں بہت سی باتوں کے ساتھ ایک بھیبی یہ بھی ہے کہ اس کے لکھنے والے اجتہادی فکر سے محروم ہیں اور لکیر کے فقیر بننے میں ماہرانہ دسترس رکھنے میں چنانچہ اسی کی بدولت اب وہ روش جو کبھی بعض رسالوں کا طرہ افتاد تھی اتنی عامیانہ ہو چکی ہے کہ عام قاری اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ یورپ اور امریکہ میں جو قلم ایک باضابطہ فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، وہاں باتاویہ صحافت کی تعلیم اور تربیت دی جاتی ہے اس میں نئی نئی راہیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اخبار، رسالے، میگزین اور صحافت ترتیب دینے کے سلسلے میں غور و فکر کے بعد کتابیں لکھی جاتی ہیں لیکن آرہو میں ایسا کوئی فن یا کوئی کتاب موجود نہیں، لطف یہ کہ رسالہ کو ایڈٹ کرنا سب سے زیادہ آسان کام سمجھا جاتا ہے، دو چار مقالے، پارکس، سات افسانے، دس پندرہ نظمیں غزلیں اور خطوط۔۔۔ یہ سب جمع ہوئے تو ایک رسالہ ہو گیا، چنانچہ ہمارے ملک میں یہ ایک روایت بن چکی ہے کہ شاعر، ایڈیٹر اور مولوی "خدا ساز" ہوتا ہے اسے محنت اور مطالعے کی ضرورت نہیں، وہ یہ سمجھتا ہے کہ لکھنے والوں کے لوگ سب کچھ گمراہے ہیں اور علم و ادب کا کوئی گوشہ ناپائیدار نہیں ہے اب کسی اجتہاد یا تہذیب کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسالے اتنی کثرت سے لکھتے ہیں کہ ان میں انفرادیت یا نمایاں فرق بالکل نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ ایک خواندہ جسے ادب سے لگاؤ ہے وہ "غلان" رسالہ کیوں خریدے اور "غلان" کیوں نہ خریدے؟ یعنی کوئی تو خط افتاد اور دوجہ ترجیح ہونا ہی چاہیے۔ مگر آپ آرہو کے دو چار رسالوں کا تقابلی مطالعہ کر دیکھئے کوئی بات تخلیقی یا اجتہادی نہیں ملے گی۔ ادب کے نام پر وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ ادب کی پیر وڈی معلوم ہوتا ہے۔

اب پڑھئے۔ ان کا مذاق بھی دل چکے۔ اگر کسی کام میں بھی جان سے محنت کی جائے تو اس میں کامیابی بھی نصیبی ہے اور اس کا کامیاب ہونا بھی مستحکم ہے۔ اہل لکڑی کی مثال دیکھئے مولانا آزاد نے اسے ایسی مثال سے نکالا تھا کہ نصف صدی کا عرصہ گزر جانے پر بھی کوئی اخبار اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکا۔ مولانا کبھی دوسرے درجے کی چیز پر راضی نہ ہوئے، اخبار بھی نکالا تو پہلے پسے لگا یا وہ بھی ٹائپ کا، جو اس وقت اگرچہ مقبول نہیں تھا لیکن اسے سائنٹفک ہونے کی وجہ سے گوارا کیا۔ معیار کے اعتبار سے انگریزی اور عربی کے بہترین محضروا اخباروں کو نمونہ بنایا ان کی بھی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ 'خفاہ صفا' کا ذکر کے اصول پر عمل کیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ آج اردو کے اخبارات اہل لکڑی کی مقبولیت اور انفرادیت پر رشک کرتے ہیں۔

علمی رسالوں میں معارف، برہان اور نگار آج بھی اپنی اپنی وضع پر نکل رہے ہیں اور انھوں نے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ درجے کے علمی مضامین و مقالات سے اردو کو مریا بہ واد کر دیا ہے۔ اردو میں غالباً 'نیرنگ خیال' نے خاص نمبروں اور سالناموں کی رسم کو آگے بڑھایا اور اب تو یہ رسم سے زیادہ 'روبا' ہو گئی ہے۔ بہت سے رسالے تو خاص نمبر کے بوجھ سے عید جانتے ہیں، مگر نکالنے سے باز نہیں آتے۔ ان میں حسام اشفاق سے صرف ضمانت زیادہ ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ گویا اس اچھی بھلی روش کو بھی اتنا فرسودہ اور غیر دلکش بنا دیا کہ اب کسی رسالے کے خاص نمبر کی کوئی اہمیت یا غیر معمولی حیثیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

'نقوش' اردو کا اعلیٰ ترین ادبی مجلہ ہے۔ اردو کے معیاری علمی اور ادبی رسالوں میں اس کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ پندرہ سو سے نکلنا شروع ہوا اور اب تک جب کہ یہ اپنی زندگی کے بارہ برس طے کر چکا ہے اس نے بہت سے قابل قدر اور عظیم الشان نمبر پیش کئے ہیں۔ شش ماہ سے شش ماہ تک دس سال کی مدت میں نقوش نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کا مکمل پتہ اس کے دس سالہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۷۱۳ مضامین ۴۹۰ افسانے ۱۲۱۳ خطوط، ۱۴۱ ڈرامے، ۶ ناولٹ، ۶۶ نظمیں ۷۳۳ غزلیں چھاپی ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۶۷۷۷ صفحات ہوتی ہے۔ اس کے بعد طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، خاص نمبر اور دو عام شمارے بھی چھپ چکے ہیں ان کے صفحات اور مشمولات بھی شمار میں لائیے تو یہ تعداد کہیں زیادہ بڑھ جائے گی۔

محنت میں برکت ہوتی ہے۔

محمد طفیل نے اپنے زمانہ ادا میں نقوش کو زندہ جاوید کر دیا ہے اور ان کی محنت نے انھیں بھی امر بنا دیا ہے جس طرح نگار کے ساتھ نیاز فتح پوری کا نام، انجمن ترقی اردو کے ساتھ مولوی عبدالحی کا نام یا سلائے عام کے ساتھ میرزا ناصر علی کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا ہے اسی طرح اب نقوش اور محمد طفیل بھی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یہ آج سے زندہ ہے وہ اس سے — عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خاص نمبروں کے میدان میں نقوش کا کوئی حریف ہندوستانی یا پاکستان میں موجود نہیں۔

نقوش نے اب تک مجموعی طور پر اکیس نمبر شائع کئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱) آزادوی نمبر	۱۲) ۱۱ من نمبر	۳) آزادی نمبر	۴) خاص نمبر
۵) سالنامہ	۶) ناول نمبر	۷) افسانہ نمبر ۱	۸) پچ سالہ نمبر
۹) افسانہ نمبر ۲	۱۰) غزل نمبر	۱۱) شخصیات نمبر ۱	۱۲) منٹو نمبر
۱۳) افسانہ نمبر ۳	۱۴) شخصیات نمبر ۲	۱۵) سالنامہ	۱۶) مکتب نمبر ۱
۱۷) مکتب نمبر ۲	۱۸) وہ سال نمبر	۱۹) طنز و مزاح نمبر	۲۰) پطرس نمبر
۲۱) خاص نمبر			

ان خاص اشاعتوں کے صفحات کی مجموعی تعداد کئی ہزار ہوتی ہے اور ان کی افادیت دو گونہ ہے یعنی ان میں کچھ اشاعتیں تو بعض موضوعات سے متعلق ہیں مثلاً افسانہ نمبر، غزل نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر۔ کچھ عمومی افادیت کی حامل ہیں مثلاً سالنامے، خاص نمبر، پچ سالہ نمبر، وہ سالہ نمبر وغیرہ۔ اور وہ اشاعتیں ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں، مثلاً نمبر پطرس نمبر۔ ان نمبروں کا سرسری جائزہ لینے کے لئے بھی کئی ہزار صفحات کو پڑھنا اور ان کے محاسن یا معائب سے بحث کرنا آسان نہیں، ان پر آئینہ تھا ہوا تبصرہ کرنے کے لئے بھی ایک پورا دفتر درکار ہے۔ — میں یہاں ان خاص اشاعتوں کے تعارف کی رسم ادا کرتا ہوں۔ طوالت کے خوف سے ایجاز و اختصار کی پناہ گاہ سے فصداً باہر نہیں نکلا ہوں۔ پھر بھی ہزاروں صفحات کو پڑھنے اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنے میں اچھا خاصا وقت صرف ہوا ہے۔

نقد و نثر نے سب سے پہلے اپنا چوتھا شمارہ آزادوی نمبر کی شکل میں پیش کیا تھا جو اس وقت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ اور ساتواں شمارہ عالمگیر امن نمبر تھا جسے ماجرہ سرور اور احمد ندیم قاسمی نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں تمام چیزیں امن کے موضوع پر شامل تھیں۔ ان دنوں امن کانگریس کا سالانہ اجلاس بھی ہوا تھا اور ہنگامی طور پر یہ موضوع اچھا خاصا چلتا ہوا تھا۔ اس وقت نقد و نثر ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا اور سماجی سیاست کا نقیب بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے کسی تحریک یا ازم یا سیاسی عقیدے سے انکار نہیں لیکن ادب کو کسی ایک نظریہ کا پابند کرنا بھی سودمند نہیں سمجھتا۔ اچھا اور بُرا ادب ملحقہ شام و صبح سے آزاد ہونا ہے اسے وقتی جذبات ہی اسیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس نمبر میں جتنی تحقیقات شامل ہیں وہ سب ادب سے زیادہ سیاست کی نمائندہ تھیں۔ انہیں کسی اخبار کے ادارتی کالم میں جگہ دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ اس اعتبار سے تحریک نے ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچایا۔ سیاست کو ممکن ہے کچھ فائدہ پہنچ گیا ہو۔ اس نمبر کی منظومات میں سے ایک نمونہ آپ بھی دیکھتے چلیں:

”چین، برما، ملائیا، میں اک حمد تو آج اگڑائیاں لے رہا ہے —

ایشیا اپنی کہنہ جگر بند یوں کو —

بحر کابل کے گہرے سببہ پانیوں میں دھیکے چلا جا رہا ہے

آج جا پان میں انقلابی جزم نے رہے ہیں

کو رہا بھی ظلم نہ رہیم کو توڑنے کے لئے مضطرب ہے —

ہند میں ایک طوفان مٹا ہوا ہے

ہندو کش کی ہندی پر جو قاب آگ آگ کی جھلکیاں مٹے رہے ہیں . . .

خدا را بتائے کہ یہ نظم ہے یا قصہ سحر کی داستان! نظم کے اس بند میں اور سن اخبار کے گراماگرم اداسیہ میں آپ کیا فرق و امتیاز کر رہ گئے ہوں؟ کیا اسی روکش پر ادب کی تخلیق ہوتی رہتی تو ”بڑا ادب“ پیدا ہو جاتا۔ اور کیا یہی باتیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ جوش و خروش اور طعنان کے ساتھ نہ تھیں نہیں کہیں جاسکتیں؟ ای باؤں پر غور کیجئے تو فیصلہ آپ خود ہی کر لیں گے۔ — وہ زمانہ انفرافری کا تھا۔ پروپیگنڈے کا زور شور تھا۔ اب جذبات میں وہ ابالی نہیں ہے اب تو یہ سب باتیں آسانی سے سوچی جاسکتی ہیں بیشک کہ ”فقیرؔ“ بہت جلد سیاست کے چکر سے نکل گیا اور اب وہ بغیر کسی لیبل کے شائع ہوتا ہے، ہر مکتب خیال کی نمائندگی کرتا ہے، ہندوستان اور پاکستان میں اردو کے بہترین کھٹے والوں کی بہترین تحریریں پیش کرتا ہے اور کسی سیاسی مسلک کا نمائندہ نہ ہونے کی وجہ سے تمام حلقوں میں یکساں طور پر مقبول و معروف ہے۔

اس کے بعد پھر نفوس کا آٹھواں شمارہ ”آزادی نمبر“ تھا۔ اس میں اچھے لکھے والوں کی اچھی چیزیں سیکھے سے جمع کی گئی تھیں۔

جلد ایسا کیوں نہ ہوتا۔ احمد ندیم قاسمی اور باجرہ سرور جیسے قابل اور سوچے بوجھ والے مدیر جو تھے۔ وہ تو دینی کوتاہی تھی جس کی زد میں یہ لوگ آگئے تھے۔ ورنہ یہ بات نہیں کہ انہیں اولی تحریروں اور سہ ماہی تحریروں میں تمیز نہ تھی۔ کیا رحمان اور بارہواں شمارہ ”خاص نمبر“ کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ مئی ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ اس وقت سید ذوالعظیم اس کے مدیر تھے جو آردو کے اچھے نقاد و مبصر، صافی اور انشائیہ پر لا زہر، ان دونوں یہ رسالہ ایک آزمائش سے گزر چکا تھا یعنی حکومت پاکستان نے جولائی ۱۹۵۸ء میں اس پر پابندی لگا دی تھی جو فروری ۱۹۶۹ء تک نہ ہی اس کے بعد پھر کچھ زمانہ ناسازگار حالات نے جن کی وجہ سے رسالہ وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ مگر بد بسا و زمانہ شر کے حوصلے بلند تھے۔ انہوں نے بڑی آبی بان سے یہ خاص نمبر پیش کیا۔ قدیم اور جدید لکھے والوں کی بہترین نمائندہ تحریریں اس میں موجود تھیں جن میں میر ناصر علی مرحوم (صلواتے عام) کا بہترین انشائیہ ”خطرہ ملے مل“ خاصے کی چیز تھا۔ اس کے علاوہ عبدالرحمن چغتائی، مولانا صلاح الدین احمد، نیاز فتح پوری، ممتاز شیریں وغیرہ کے مضامین موضوع کے اعتبار سے وقیع اور انداز کے لحاظ سے رفیع تھے لیکن سب سے زیادہ محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ قیوم نظر نے اندر بجا کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔

سید وقار عظیم کے زمانہ ادارت میں دو نمبر اور بھی نکلا ایک سالانہ شمارہ ۱۵-۱۶) دوسرا ناولٹ نمبر (شمارہ

۱۷-۱۸) یہ دونوں بہت ہی مقبول ہوئے خصوصاً ”ناولٹ نمبر“ کیونکہ تقسیم ہند کے بعد پہلی بار اتنا اچھا ناولٹ نمبر نکالا گیا تھا۔

شمارہ ۱۹-۲۰ سے محمد طفیل کی ادارت کا آغاز ہوا۔ اور سب سے پہلے اپنے ”سہ ماہی عدلت ہند“ میں انہوں نے اردو نکلنے

کے ساتھ انصاف کیا۔ یہ افسانہ نمبر شمارہ ۲۵-۲۶) موضوع کی نمائندگی کرتا تھا۔ قیسو بی شمس پر نقوش کی عمر دسالی ہو چکی تھی اس کی سالگرہ منائی گئی اور تیغ سارہ نمبر (شمارہ ۲۹-۳۰) شائع کیا گیا۔

تیغ سارہ نمبر کے بعد پھر ایک افسانہ نمبر (شمارہ ۳۷-۳۸) پیش کیا گیا۔ یہ بھی پچھلے خاص نمبروں کی طرح امتیازی

علامت رکھتا تھا۔

لیکن نفوس کی کامیابی اور خاص نمبروں کے میدان میں بیکہ تازی کا آغاز غزل نمبر شمارہ ۴۱-۴۲ سے ہوا ہے۔  
 ترقی پسند تحریک کے زمانہ بروز میں غزل کی حفاظت بھی بڑے ہی جوش و خروش سے ہوئی تھی۔ لیکن اس کا شائبہ ہماری تہذیب  
 اور ثقافت سے ہزاروں برس پرانا ہے۔ یہ رشتہ ایسا "نو شکست" نہیں کہ بیکہ پیش اس سے غم کروا جائے۔ پریم چند شید احمد  
 صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے "غزل یعنی بدنام ہے اتنی ہی جگہ عزت ہے۔ شاعری کا نام آتے ہی میرا وہی غزل کی طرف مائل ہوتا  
 ہے۔ غزل کو بہت فن نہیں، اپنی شاعری کی آبرو بچھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے، دونوں  
 کو محنت و زحمت اور ایک دوسرے سے حاصل ہوئی ہے اس پر مد ہنسنا چاہیے نہ دونا۔ اس کا احترام کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہ غزل کی  
 قوت ہی ہے جو اب تک وہ نہ صرف یہ کہ مقبول رہی بلکہ کسی مخالفت و ایر کا ہلکا سا اثر بھی اس نے لبوں نہیں کیا۔ جموں نے  
 غزل کی مخالفت کی وہ اپنی خاطر کی کج برداشت بنا بیٹھے غزل کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ نفوس نے غزل نمبر پیش کر کے اس کی مقبولیت پر  
 مہر تصدیق ثبت کر دی۔ سارے چھ صفحاتوں میں بہترین غزلیات کا یہ انتخاب اتنی محنت اور سلیقے سے کیا گیا ہے کہ ہر دور  
 کے نمائندہ شاعر اور ان شاعروں کا نمائندہ کلام اس میں آگیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع اور عبارت کے اعتبار سے  
 تیز فن اور خیالات کے لحاظ سے غزل کا عہد بہ عہد ارتقا کس طرح ہوا ہے۔ یہ غزل نمبر نا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے تین  
 ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں اور چوتھا زیر طبع ہے۔ میں یہ تجویز کرنا چاہتا تھا کہ بعض شعرا خصوصاً اساتذہ متقدمین و متوسطین  
 کے کلام کا اچھا اور نمائندہ انتخاب نہیں ہو سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے دوا دیں یا تو چھ نہیں یا عام طور سے دستیاب  
 نہیں ہوتے مثلاً قائم چاند پوری، مفتحی، میر حسن، بیان وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام کا انتخاب مختلف تذکروں اور بیاضوں  
 سے کیا گیا ہو گا۔ اگر ایسے شاعروں کے دوا دیں سے براہ راست انتخاب کیا جاتا تو وہ اور زیادہ اچھا ہو سکتا تھا۔

نفوس کا شمارہ ۴۴-۴۸، ایک ایسا محکم یا انتخاب کا نام تھا جو اردو زبان میں پہلی بار کسی رسالے نے انجام دیا۔  
 پہلی کرشمہ برائے ناقص اور خامیوں سے پرہیز کرتی ہے لیکن یہ اس کے برعکس بڑی سی جامع، منفرد اور عجیب و غریب تھی جس نے  
 اچانک اردو دوا دیں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا میری مراد شخصیات نمبر سے ہے۔ اس نمبر کے دو حصے ہیں۔ دوسرا حصہ (شمارہ ۵۹-۶۰)  
 منظر لہر اور افسانہ نمبر کے بعد چھپا تھا۔ شخصیات نمبر کے بارے میں اپنی رائے کسی حد تک پہلے ظاہر کر چکا ہوں (نفوس شمارہ ۴۲-۴۸)  
 یہاں ان کے تعارف کے طور پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

پہلا حصہ (شمارہ ۴۴-۴۸) چھ سو ساتی (۶۸۰) صفحوں کا محیط ہے اور اس میں کل چھ چھاپائی شخصیتوں پر خاکے  
 اور مضامین شامل ہیں جن پر خاکے ہیں ان کے چند نام یہ ہیں: محمد حسین آزاد، شبلی، مرزا دستار، میرزا معری، مرزا فرحت اللہ، یگ  
 حسرت مرانی، ڈاکٹر عبدالحق، ابو الکلام، رشید احمد صدیقی، آثر لکھنوی، جگر مراد آبادی، چودھری محمد علی وغیرہ۔ ان پر  
 لکھنے والے بھی اتنے ہی بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ایک حصہ اس میں اور بھی ہے جس میں لاہور کی چند ادبی شخصیتیں "اسی طرح دلی،  
 لکھنؤ اور حیدرآباد کی شخصیات کا مختصر اور جامع تذکرہ دیا گیا ہے۔ یہ ہر اعتبار سے دلچسپ ہے اور ان میں بعض نئی باتیں بھی  
 معلوم ہوتی ہیں۔

دوسرا حصہ (شمارہ ۵۹-۶۰) آٹھ سو ساتی (۸۰۷) صفحوں کا ہے۔ اس میں بھی ۸۸ مضامین ہیں۔ (ان شخصیات میں

لحد بہ نسبت سے مفید اضافوں کے ساتھ یک فردی سند کو شاخ ہو گیا ہے۔



بڑے لگ، ادیب، ریاست لاد، سماجی دیفارمر، شاعر، طنز نگار، صحافی، لیڈر، سبھی آگئے ہیں۔ ان پر کھنے والے بھی بیشتر وہ ہیں جو ان سے بہت غریب رہے ہیں۔ یا ہم حصر ہیں۔ اس نمبر کی قدر و قیمت آج بھی بہت ہے گو سو دو سو برس کے بعد تو ایک عجیب گراں بہا ماحذ کا کام دے گا۔ اگر بالفرض اس نمبر میں کوئی کام کی بات نہ ہوتی تب بھی سارے سولہ سو معنوں کا نمبر نکال دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ بڑے بے دلی گروے کا کام ہے۔

یہ نمبر بے حد مقبول ہوا، اس نے نقوش، کو زندہ جاوید کر دیا اور اس کے مرتب محمد طفیل کو بھی۔  
نقوش کا شمار ۱۹۰۹ء - ۱۹۱۰ء مثنوی کے لئے وقف تھا۔ غرض اس عہد میں اردو کا بڑا ذوقین افسانہ نگار تھا۔ ہمارے مردہ پرست ملک نے اپنی روایت کے مطابق جینے ہی اس کی قدر نہیں کی۔ لیکن اب اس کا قلم ہمیشہ کے لئے زندہ کیا ہے تو دوسروں کے قلم اس پر چلنے شروع ہوئے ہیں۔ مثنوی کے انتقال کے بعد بہت سے رسالوں نے "مثنوی نمبر" نکالنے لیکن یہاں بھی انفرادیت نقوش ہی کی باقی رہی۔ اس میں مثنوی کی بیس غیر مطبوعہ کہانیاں چھاپی گئیں جو ایک ایک فن کے وقفے سے لکھی گئی تھیں اور مطبوعہ کہانیوں میں سے بہترین دس کا انتخاب۔ پھر مثنوی کے فن پر سات مضامین جن کے لکھنے والے فرقہ، انجمن حیدر، وقار، تعلیم، حسن، سکری اور نثار حسین جیسے سنجیدہ اور دیدہ و حضرات ہیں۔ چوتھے حصے میں مثنوی کی شخصیت پر بہت ہی دلچسپ مضامین ہیں جو اچھوت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، ابوسعید قریشی، خالد جلال، غلام عباس اور محمد طفیل نے لکھے ہیں۔ ان سے مثنوی کی شخصیت کے بہت سے نقوش ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ مثنوی کے فن پر اب دیر سچ بھی شروع ہو چکی ہے چنانچہ اس کو میں ایک روسی خاؤن جو اردو کی طالبہ ہیں، مثنوی کے فن پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں ہندوستان بھی آئی تھیں۔ آئندہ بھی ہمارے ناقد اور محقق مثنوی کی شخصیت اور فن پر نو بہرہ کریں گے۔ اس وقت ان سب کے لئے مثنوی نمبر بہترین اور سزاوارتہ ماحذ ہو گا۔  
۱۹۱۱ء میں نقوش نے ایک شاندار افسانہ نمبر پیش کیا (شمارہ ۵۳ - ۵۴)۔ یہ ایک ہزار چونتیس صفحات کا ایک ضخیم و وسیع سا بلکہ پیڑیا ہے جس میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک ڈیڑھ سو سال کے افسانوی ادب کا انتخاب آئی ہے۔ اس ڈیڑھ سو برسوں میں اردو افسانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اس کا اندازہ یہ انتخاب دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے اور ادارے میں محمد طفیل نے بہت ہی لطیف استفادہ میں یوں بیان کر دیا ہے :

"بھائی پیٹھے گھر لے میں ایک بچہ پیدا ہوا جسے حدوق میں، موٹا تازہ، اور ساتھ ہی بڑا باتورنی تھا۔ وہ اپنی توئی زبان میں جب باتیں کرنے پر آتا تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اکھڑی اکھڑی اور سلسلہ و سلسلہ باتیں آج بھی سب کو یاد آتی ہیں۔"

مگر ڈیڑھ سو برس کی عمر شروع ہی سے اس بچے کو اپنی ماں کا دودھ نصیب نہ ہوا۔  
جب بچہ کچھ بڑا ہوا اور اس کا شعور بھی کچھ کچھ بختہ ہونے لگا تو اسے اپنے قدرتی اور اپنی معاشرت سے بے حد آفتابیت پیدا ہوئی شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے قدرے سنجس کر اپنے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب اس کی باتوں میں وہ پہلی کی

بادہ کوئی نہ رہی، قدرے انحصار کے ساتھ ایک مٹھراؤ تھا، ایک تسلسل تھا اور ایک نقطہ نظر تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ غلط نہیں تھا۔

اسی بے منزلی میں اس نے اپنے ملک سے دور مغرب کے بچوں سے بار بار نہ گناٹھا کیونکہ وہ اس سے زندگی میں کئی قدم آگے تھے۔ یہاں بیٹھے ہی بیٹھے اس نے انھیں اپنا ذہنی امام تصور کر لیا اور اس کی باتوں کو اپنے الفاظ میں دہرا دہرا کر بہت کچھ سیکھا۔ مغربی بچوں کی دیکھا دیکھی جب اس نے اسی انداز میں یہاں زندہ رہنا چاہا تو اپنی چال بھی غبولی گیا۔ نہ ان بچوں والی کوڑا بات پیدا ہو سکی اور نہ اپنی ہی انفرادیت باقی رہی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ نہ سکا۔ کچھ بول کھلا سا کیا بعضی کو اس کی یہی بول کھلا ہٹ بڑی عزیز ہے۔

تذہیب کی یہ کیفیت اس پر زیادہ عرصہ جاری نہ رہی۔ وہ بچے جن سے وہ بہت زیادہ مرعوب تھا اور جن سے واقعی اس نے بہت کچھ سیکھا تھا ان سے بھی اسے آنکھیں چار کرنے کی بہت پیدا ہوئی۔ اور اس کا یہ گنہ گچھ زیادہ غلط نہیں نہ تھا۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ وہ کیہ جو بعد کو بالغ ہو کر جوان بھی ہوا، آج نہ صالح پڑا زندگی کے دن گزار رہا ہے۔

(طلوع افسانہ نمبر)

یہ کہانی اردو افسانے کی تھی۔

اتنے شگفتہ پیرائے ہیں، اتنے مختصر لفظوں میں، ایسے دل نشیں انداز سے، اردو افسانے کے متعلق اتنی بہت سی باتیں کہہ کر اردو افسانے کی ابتدا، ترقی، عروج اور موجودہ ”تجربہ“ کا ایسا سماں باندھ دیا ہے کہ شاید یہی اس پر کچھ اضافہ کیا جاسکے۔ اسی لئے باوجود اقتباس کی طوالت کے یہاں میں نے تمام وکمال نقل کر دیا۔

اس میں خصوصیت سے آخری فقرہ بہت ہی ”چمکتا ہوا“ ہے۔ کیا واقعی ہمارا افسانہ روبہ زوال ہے؟ یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے جو مسلسل غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ادب میں زوال کا فقرہ لگانا تو کچھ مشکل نہیں لیکن اس کے اسباب و علل پر غور کرنا اور اس کا صحیح حل پیش کرنا بہت مشکل ہے۔

ہمارے افسانے میں بالخصوص اور ادب میں بالعموم اگر زوال آیا ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ باعتبار موضوع ہے یا بلحاظ فن۔ یعنی بات ڈھنگ کی نہیں کی جا رہی ہے یا ڈھنگ سے کی نہیں جا رہی ہے۔ اس موضوع پر بعد میں محمد طفیل نے ایک سمپوزیم بھی کیا تھا اور نقوش خاص نمبر ۱۹۵۹ء میں ملک کے بہت سے لکھے والوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان خیالات پر ہم اپنا اظہار کسی دوسری جگہ کریں گے۔

بہر حال، افسانہ نمبروں سے پہلے تو اردو کی پہلی کہانی ”رانی کیتکی اور کنوڑو سے بھان کی“، ”صنفر انشا اللہ شاہ انشاء شامل ہے۔ یہ انشا کا ایک ہم تجربہ تھا جس سے نہ صرف اردو افسانے کا آغاز ہوتا ہے بلکہ ہندی ولے بھی اسے

آدوی کمال کے چندی گتھا سا ستیہ میں پہلی جگہ دیتے ہیں۔

اس کے بعد طبعی مقصود داستانیں کا دور آتا ہے جس میں عوالم کائناتی، آرائش محفل، بارش و بہار، تنبیل و بھسی، رنگ و نقش، انسانی لہجہ، فسانہ عجائب اور انسانی لہجہ شامل ہیں۔ پھر ناولوں کا دور ہے۔ بیان نام ڈپٹی نذیر احمد، رزقہ نامہ سرشار، شہزادہ، آسمان اور زمین وغیرہ کے نظر آتے ہیں۔ ایک دور ہمارے ادب میں تراجم کا بھی گزرا ہے اور اس کے بہت دور رس ماننے والے ہیں۔ یعنی آدو و افسانے کو کچھ نئے تجربے سے کچھ راہیں دریافت ہوئیں، طرز و ادب میں تنوع اور سادگی پیدا ہوئی، موضوعات میں بھی اسی اعتبار سے وسعت آئی۔ ظفر علی خان، عنایت اللہ دہلوی، عبد اللہ ذاتی، طبع آبادی، خواجہ منظور حسین، حامد علی خان، تیرتھ رام فریو، پوری اور اسی صنف کے نو حضرات تراجم کے دور کی نمائندگی اس نمبر میں کر رہے ہیں۔ لیکن یہ دور ہمیں ختم نہیں ہوا، اب تک جاری ہے۔ اور بعض ادیبوں نے جن میں شاہد احمد دہلوی کا نام سرفہرست ہے، غیر زبانوں کے بہترین تراجم پیش کئے ہیں۔ اس فہرست میں سجاد حیدر، یلدرم، نیاز فتح پوری، ال، احمد اکبر آبادی اور حسن عسکری کے نام بھی شامل ہونا ضروری تھے۔

”افسانوی مضامین“ کا دور خواجہ حسن نظامی سے شروع کیا گیا ہے۔ اس میں ناصر زبیر فراقی، آغا حیدر حسین، چرخ حسرت، اور انشرف جعفری بھی شامل ہیں۔ پھر آدو و افسانے کے پانچ دور کر دیتے ہیں۔ ان میں اسی افسانہ نگاروں کے نام آئے۔ افسانے انتخاب کئے گئے ہیں۔

آخر میں مقالات کا حصہ ہے اور اس میں چار مقالے ہیں۔ ایک مذاکرہ ہے اس میں افسانے کے فن اور موضوعات کے متعلق بہت سے پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

آدو و افسانے پر اب تک کیا کچھ لکھا گیا ہے اسے دیکھتے تو متفرق چھوٹے چھوٹے مضامین سے قطع نظر دو تین کتابیں ہی سامنے آتی ہیں۔ محمد تقی اللہ پرووی کی دنیا کے افسانہ، وقار عظیم کی ”ہمارے افسانے“ اور ”ہماری داستانیں“ کلید الدین احمد کی فن داستان گوئی۔ ”ٹو اکثر احسن فاروقی کی ”ناول کیا ہے“ اور علی عباس حسینی کی ”ناول کی تاریخ و تنقید“ بھی اسی میں شامل کر لیجئے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ان میں بھی افسانے پر دو ہی کتابیں ہیں۔ باقی داستانوں اور ناولوں سے متعلق ہیں۔ گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں آدو کا افسانوی ادب اچھا خاصا قد آور اور جاندار ہو گیا ہے۔ یہ اب عامی اور مختصر سرائیہ نہیں کہ اسے بآسانی نظر انداز کیا جاسکے۔ صرف داستانوں ہی کو لیا جیسے تو امداد میں خفگی داستانیں لکھی گئی ہیں انہیں پڑھنے کے لئے عروج چاہیے۔ صرف ایک داستان امیر حمزہ اپنی ضمانت میں ایسا لکھو بیٹا یا ریشا ٹککے برابر ہے۔ ان داستانوں پر ضفانہ تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے تو اور بھی محنت و کار ہوگی۔ اس کے بعد افسانوں کی طرف آئیے تو ہر دور میں دس پانچ بلکہ اس سے بھی کم زبیر احمد اچھے افسانہ نگار رہیں گے اور موجودہ زمانے کو تو ایک طرح سے افسانوں کا عہد ہی کہا جاسکتا ہے۔ مگر ہماری بے حس بھی قابلِ واہ ہے کہ ہم نے اب تک مغربی نقادوں کے قرائے ہوئے خیالات اور جہانے ہوئے ناولوں سے زیادہ اپنے ادب کے اتنے بڑے بڑے سربراہے پر کچھ نہیں لکھا۔ اگر بڑی ادب میں چارٹر سے پہلے کوئی معقول چیز نہیں مٹی لیکن جو کچھ نامعقول تحریریں بھی ملتی ہیں ان پر بھی تاریخی تنقیدی نظر

ہے اتنا لکھا گیا ہے کہ اسے رسول میں بھی نہیں پڑھا جاسکتا۔ مگر اس بعد میں ابتدائی تفسیر تو ترجمہ و تفسیر کہانی ہوتی، اہم کتابوں کے بھی معنی تک پہنچ کر کے نہیں چیلے تھے اور افسانے جیسی اہم صنعت سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے سیر ایک تازیانہ ہے جو ہمارے سامنے احساس پرکھنے کے بجائے کاش محمد نادر پر لکھا۔

ہمارے نقادوں میں سید قاضی نے اردو افسانے پر کام کیا ہے۔ اور ابتدائی داستانوں سے وہ خاص رنگ تمام ہر مانے کو کھٹا لایا ہے۔ اسی سلسلے میں ان کی دو کتابیں "ہمارے افسانے" اور "ہماری داستانیں" شائع ہو چکی ہیں لیکن اتنے بڑے سرمائے کا تاریخی تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ایک فرد کا نہیں ایک ادارے کا کام ہے۔ نقاد نے اس میدان میں قدم اٹھا کر ایک بڑی ضرورت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کاش اس موضوع کو "بیابانِ خطرناک" سمجھ کر نقاد قدم کا حسرت نہ چھوڑ دیا جائے۔

افسانہ نمبر کے بعد نقوش کے "شخصیات نمبر" کا حصہ ۲ شائع ہوا تھا (شمارہ ۵۹، ۶۰) اس پر جملہ پچھلی صورتوں میں لکھ چکا ہوں۔ (شمارہ ۶۱، ۶۲) سالانہ کی شکل میں نمودار ہوا اور ایک عام اشاعت کے بعد نقوش نے دوسرا افسانہ کا نامہ مکتب نمبر (شمارہ ۶۵، ۶۶) پیش کیا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ۵۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس کی ابتدا میں خطوط نگاری کی ابتدا سے متعلق چار پیر مغز منانے غلام رسول عمر، سید عبداللہ، طاکاب رام اور محمد عبداللہ قریشی کے لکھے ہوئے شامل ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ چار مقالے ہی کی کہ اردو میں مکتوب نگاری پر ایک اچھی تنقیدی کتاب بن سکتے ہیں۔ اس میں ۷۷ مکتوب نگاروں کے خطوط ہیں جن میں سے پہلے غالب کے آٹھ غیر مطبوعہ خطوط آئے ہیں۔ دوسرے اہم مکتوب نگاروں میں میر سید محمد علی محمد حسین آزاد، امیر معانی، داغ، حالی، کاشانی، اکبر، شاد، اقبال، محمد علی جوہر، سلیمان ندوی، حسن نظامی، غشی، پریم چند، فانی، محمود شیرانی وغیرہ شامل ہیں۔

مکتب نمبر کے دوسرے حصے میں ۸۸ صفحات ہیں اس میں بھی ۷۷ مکتوب نگار ہیں اور ان میں میر شکوہ آبادی، جوش امیر علی، سید علی بلگرامی، محمد علی ردوی، میر ناصر علی، اور سید حسین بلگرامی جیسے اہم لوگ ہیں۔ اس طرح مکتب نمبر کے دونوں حصوں کی مجموعی ضخامت ایک ہزار اڑتالیس صفحات اور مکتوبات کی کل تعداد تیرہ سو تیرہ (۱۳۱۳) ہوتی ہے۔ اردو میں آج تک اتنے اہم لکھنے والوں کے خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں چھپایا گیا تھا۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چالیس مکتوب نگاروں کے نوٹ اور ۷۷ مسطوروں پر خطوط کے عکس بھی دیئے گئے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جن کے مکتوب پہلی بار سامنے آئے ہیں اور جنہیں مکتوب نگاران کا درجہ عین کرنے میں مدد دیتے ہیں تقریباً تمام خطوط غیر مطبوعہ اہم اور معلومات افزا ہیں۔

خطوط بھی کسی شخصیت کو پرکھنے کا عجیب آلہ ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت کمی پہلوؤں سے ہوتی ہے، ایک نوبہ کہ مکتوب نگار نے لکھتے ہوئے ہر کر لکھتا ہے اور اس کے سوچنے کا زاویہ، ذہن کی افادہ، فطرت کی پیچ و خم، طبیعت کی سادگی یا پرکاری، فرد معلوم ہو جاتی ہے۔ دوسرے خطوط سے بھی حالات اور بہت سی وہ باقی حقائق عام حالات میں لکھنا یا بیان کرنا پسند نہیں کرتا معلوم ہو جاتی ہیں۔ تیسرے ان کی بے تلافی کے باعث استدلال کا انداز، اسلوب کی بے ساختگی اور زبان پر قدرت کا حال لکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خطوط کی سوانحی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ مرزا غالب نے اگر اپنے خطوط نہ چھوڑے ہوتے تو آج شاید

ان کی اصلاح عمری اتنی تفصیل اور مرشگانی کے ساتھ نہ لکھی جاسکتی۔ چنانچہ ملکاتیب نمبر میں بھی ایسے خطوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچے۔ ان کے مکتوب نگاروں کے بارے میں یا ان کے تعلق سے دوسری ادبی، سیاسی، سماجی یا فابری شخصیتوں کے سبب میں بہت سی نئی اور اہم معلومات ہمیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً ششی پریم چند کے ۲۸ خطوط اس میں شامل ہیں جن سے ان کی بعض کتابوں کے زمانہ تصنیف و طباعت کی تعیین کی جاسکتی ہے۔ بعض افسانے انھوں نے کب لکھے یہ ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جاتا ہے۔ اس معلومات کی اہمیت بڑی زیادہ ہو گئی ہے کہ پریم چند کے بہت سے افسانوں کا محرکہ کوئی سیاسی یا سماجی حلقہ ہے۔ اور اس ہمد کی سیاسی کشش ان کی تحریروں میں اہم محرکہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۸ جولائی سن ۱۹۲۷ء کے خط سے ملکاتیب نمبر ۲: ۵۸۹) اسی کے چھوٹے بچے کی تاریخ وفات کا علم ہوتا ہے۔ ابتدائی تصانیف کے بارے میں بھی ان خطوں سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

۵۸ - ہم خداداد ہم ثواب، کشنا، وغیرہ میری ابتدائی تصانیف ہیں۔ پہلی کتاب تو لکھنؤ کے ناویں پریس نے شائع کی تھی دوسری کتاب بنارس کے میڈیکل کالج پریس نے۔ یہ غالباً سن ۱۹۲۱ء کی تصانیف ہیں۔ (۵۹۲: ۲)

پریم چند کی بڑی شہورانی پریم چند نے ایک کتاب بہت سیدھی اور سرائی زبان میں لکھی ہے جو ہندی میں شائع ہو چکی ہے اس کا نام ہے "پریم چند گھر میں"۔ اس میں انھوں نے پریم چند کی حواقیق، ان کے مشاغل، گھریلو معاملوں میں ان کا رویہ، ان کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات، عمدہ پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ انھوں نے ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ گاندھی جی کا گورکھپور میں آنا پریم چند کی زندگی میں ایک انقلاب کا آغاز تھا۔ اسی کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفا دے کر ترک موالات کرنے والوں کی صف میں شمولیت کی۔ وہ ملک کی آزادی کے لئے جی جان سے لڑنا چاہتے تھے اور ہندوستان کو آزاد بنانے کی قیادت رکھتے تھے۔ لیکن بہت سی غمخیزوں کی وجہ سے وہ کبھی کوئی عملی حصہ تحریک میں نہ لے سکے۔ ۸ فروری ۱۹۳۱ء کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی تاریخ کو گاندھی جی گورکھپور گئے تھے (۵۹۲: ۲)۔ اس تاریخ کا معلوم ہو جانا کوئی بڑی اور قیمتی چیز نہیں ہے لیکن میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ بعض اتنی ہزدی اور لڑنا پر معمولی باتیں بھی سوانح نگار کو بہت مدد دیتی ہیں اور ان سے سوانح عمری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک خط میں پریم چند لکھتے ہیں:

"میں بھی ترک موالاتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں بھی آج کل وہی مسائل گونجا کر رہے ہیں۔ ذہنوں میں بھی وہی خیالات جھلکتے ہیں۔ اور ادبی مسائل میں ان کی گنجائش نہیں" (۵۹۴: ۲)

اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا مصارع اور موانع پریم چند کے سامنے تھے اور وہ کس انداز سے سوچتے تھے اور کی افکار و حوادث کا عکس ان کی تحریروں میں کس کس طرح ملتا ہے۔

پریم چند پر ہندی میں متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں سوانحی حیثیت کی بھی اور تنقیدی بھی۔ لیکن اردو میں اس کے ایک رسالہ زمانہ کانپور کا "پریم چند نمبر" ہے۔ دوسری ایک مختصر سی کتاب "پریم سوگ" یا پھر سنس راج دہر کی کتاب "پریم چند"

اس کا جنسی اور انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ نمانہ کا محمد کا نہر قاضی اہم ہے کیونکہ یہ ایک معاصر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔  
 پریم چند کے تصانیف دیا نرائی نگم سے جتنے گزے اور پڑائے گئے وہ سب جانتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد کسی نے آداب میں پریم چند پر  
 نئے کا حق ادا نہیں کیا۔ دہلی کی کتاب جو ننگہ بلا مقابلہ "بے اس" لئے اسے قیمت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اب ڈاکٹر فرانس کا تحقیق مقالہ  
 پریم چند کا تنقیدی مطالعہ "شائع ہونے والا ہے یہ شاید اس موضوع پر پہلی کامیاب کوشش ہوگی۔

پریم چند کے بعض خطوط سالہ نمانہ میں چھپے تھے اور متفرق طور سے بھی شائع ہوئے تھے لیکن اتنے اجماع اور اتنی اہمیت  
 کو کسی ایک جگہ نہیں ملیں گے۔ جتنے تقریریں پیش کر دیئے ہیں۔

ادبیہ توصیف ایک پریم چند کی بات ہوئی جسے میں نے بطور مثال پیش کر دیا تھا اس طرح کہنے ہی شاعر ادیب انشا پرداز  
 نمانہ نویس اور اہم سیاسی حیثیت کے بزرگ ایسے ہیں جن کے خطوط نہایت معتد ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے  
 اہم دستاویز اور ناگزیر ہوگا۔

ان خطوں میں جو شخصی مباحث، علمی، اسلامی یا ادبی نکات آگئے ہیں وہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ مثلاً ایک جگہ فقط  
 "شریعات" کی بحث (۲: ۵۷۷) یا جیل خانہ بندی کے خط میں اصطلاحاتِ تعلیم کے ترجمے کا مسئلہ (۲: ۵۸۳)۔ ان سے بعض  
 غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ مجھ سے ایک مشہور عالم اور اعلیٰ پیمانے پر ذکر یہ فرمایا تھا کہ حسرت موہانی مرحوم نے "انتخاب سخن" کے  
 عنوان سے جو سلسلہ قدیم شعراء کے بعد کے انتخاب کلام کا چھپایا تھا وہ انتخاب درجہ اولیٰ راست و دواویں سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ  
 حسرت کو غالباً پینے سے ایک ایسی قلمی کتاب مل گئی تھی جس میں بہت سے شاعروں کا منتخب کلام کسی با ذوق جامع نے ترتیب دیا تھا  
 اور اسی کو انھوں نے با تسلط شائع کیا۔ یہ بات کچھ ایسی مستبعد نہیں معلوم ہوئی۔ مگر حسرت موہانی جیسے ثقہ انسان سے یہ توقع نہیں  
 کی جاتی کہ وہ حوالہ دینے سے گریز کریں اور کمال تحقیق کے مرتکب ہوں۔ حسرت کے جو خطوط کا تیب نمبر میں پیش کئے گئے ہیں ان  
 سے حسرت کے مزاج کی جفا کشی، ناگہانی، سادگی، استقلال اور جملے کا اتنا صحیح اندازہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے دیکھنے سے ممکن نہ  
 تھا۔ ان میں بعض خطوط سے ان دواویں کے نام بھی مل جاتے ہیں جن سے حسرت نے یہ انتخاب کر کے چھپایا ہوگا۔ (مثلاً ۲: ۶۰۹)۔  
 مولانا حسرت کی زندگی مختصر و مختصر کا آمیزہ تھی اور ان کے یہ خطوط ان کی بچی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ان خطوں سے بعض اہم باتوں کی نشان دہی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً بیکانہ چنگیزی نے اپنی زندگی میں گھنیمہ نئی ترتیب  
 اضلاع کے ساتھ مرتب کر کے لالہ دوا کا دوسرے شعلہ کے حوالے کر دیا تھا (۲: ۷۱۵)۔ بایہ کہ سر آسمان جاہ کی درخواست پر مسید  
 محبوب علی خان آصف جاہ سلطان سے مولوی فضل جی خیر آبادی مرحوم کے فرزند مولوی عبداللہ خیر آبادی کو دوسروں پر غلبہ میں جیت  
 چلا گیا تھا۔ (۲: ۷۹۴)

ایک خط اس میں منیر بشکوه آبادی کا بھی نشان ہے (۲: ۷۹۸) اس سے پہلے غالباً منیر کا کوئی اور خط شائع نہیں ہوا۔ اس  
 خط سے بعض اور امر کے علاوہ منیر کے طرز نگارش کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مکاتیب نمبر کے آخر میں "مشاہیر ادب" کے عنوان سے ان مکتوب نگاروں کے مختصر سوانح بھی ہیں جن کو محمد عبداللہ قریشی صاحب  
 نے لکھا ہے۔ یہ پتہ بھی بہت اہم ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ لیکن بعض فروگزاشتیں بھی رہ گئی ہیں مثلاً محمد حسین آزاد کے

وہ ایک کا نام باقر علی لکھا ہے (۹۲۲: ۲) مگر صحیح نام محمد باقر ہے (اور غنیل کالج میگزین، غزوی سلسلہ) یا وقار الملک کے بارے میں کہتے ہیں کہ: "امروہر میں کچھ سرکاری خدمات انجام دی جس کی وجہ سے پہلے سرشتہ دار اور پھر منعم صدر الصدور ہو گئے" (۹۲۵: ۲)۔ اسی خدمات کا تعلق امروہر سے نہیں۔

گوانی معمولی فروگزاشتیں قابل گرفت نہیں ہر فن ان سے بچنے کی سہل ترکیب یہ تھی کہ فاضل مرتب ہر جگہ آخر میں اپنا ماتہ ظاہر کر دیتے۔

جہاں اس نمبر میں بہت سے تاریخی حوالے، اہم اور معلومات افزا خطوط ہیں وہیں بعض مکتوبات بہت دلگین، دلچسپ اور پڑھا رہی ہیں مثلاً جوید الحق کا مکتوب (۹۷۱: ۲) یا پطرس کا خط عبدالحمید سالک کے نام (۹۷۵: ۲)۔ آخر میں فاضل مرتب نے یہ صراحت کر دی ہے کہ اس نمبر میں "زندہ ادیبوں" کے مکتوبات شامل نہیں ہیں، اگرچہ بعض مکتوبات شامل ہیں! ہمیں امید ہے کہ وہ اسی طعنان اور ساز و براق کے ساتھ زندہ ادیبوں کے مکتوبات پر مشتمل ایک نمبر نکال کر دے گی جس میں پوری کر دیں گے۔

سلسلہ میں نفوس نے اپنی زندگی کے دس سال پورے کر لئے تو "دس سالہ نمبر نکالا جو ۵۲ صفحات کا تھا اس میں ۱۷ افسانے، ۲ ڈرامے، ۱۱ پورٹریٹ، ۲ مزاحیہ مضامین اور دس مقالے شامل تھے۔ ان میں سے اچھا تنقیدی مضمون "غالب کی شاعری" پر حواشی شعلہ کا ہے۔ انھوں نے غالب کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر بڑی ثنات سے گفتگو کی ہے اور بول و لہجہ میں توازن برقرار رکھا ہے۔

داراشکوہ کے دیوان فارسی پر ایک تعارفی مضمون جناب علم الدین سالک کا بھی اسی نمبر میں شامل ہے اور بہت قابل قدر ہے۔ حضرت سید احمد دہلوی کی داستان جہاد پر غلام جیلانی برق اور گل بکاؤلی پر محمد عبداللہ قریشی کے مضامین بھی علمی افادے کے اعتبار سے اہم ہیں۔

اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مدیر نفوس نے آغاز ہی میں ایک چارٹ پیش کیا ہے جس سے بیک نظر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دس برس کے اندر نفوس نے کیا کیا چھاپا ہے۔ چنانچہ میزان یہ ہے:

۵۱۷ مضامین، ۹۰ کہم، ۱۲۱۳ خطوط، ۶ ناولٹ، ۶ نظمیں، ۱۳۷ غزلیں اور یہ سب چیزیں بارہ ہزار دو سو چھیتر (۱۲۲۷) صفحات میں سمائی ہوئی ہیں۔ جتنا کچھ نفوس نے دس برس میں پیش کر دیا ہے وہ شاید بہت سے رصاوں کے پچاس برس کے فائدوں میں بھی نہ مل سکے۔ دس سالہ نمبر کے بعد طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، خاص نمبر اور دو عالم نمبر بھی نکل چکے ہیں انھیں بھی شامل کر لیں تو یہ تعداد دلچسپ بڑھ جائے گی۔

سلسلہ میں نفوس نے تین نمبر بہت قیمتی اور بنیادی اہمیت رکھنے والے پیش کئے ہیں۔ ان میں ایک طنز و مزاح نمبر ہے (شمارہ ۷۱، ۷۲) جس کی ضخامت ۹۲۸ صفحات ہے۔ تفصیلی تبصرے کے لئے بجائے خود اس پر ایک نمبر نکالا جاسکتا ہے۔ سرسری تعارف کے لئے کہا جائے تو اس کی ترتیب پر ایک نظر ڈالئے۔ پہلے حصے میں آٹھ مقالے ہیں۔ کھنے والوں میں نام ڈاکٹر اجماد حسین، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر کلیم الدین احمد، ڈاکٹر شوکت بھڑواہی، قاضی محمود الحسن، ظفر احمد صدیقی

علم الہدیٰ سلالت کے عیس کے اور موضوعات کی ترتیب یہ ہے :

۱) ہنسنے کی ابتدا اور اس کی بحیثیت (۲) طنز و مزاح (۳) مزاح اور مزاح نگاری (۴) اردو ادب میں طنز و مزاح -

۵) اردو شاعری میں طنز : جو گوئی کی تاریخ (۶) پیر و ڈی اردو ادب میں (۷) فارسی ادب میں طنز و مزاح -

یہ نثر کا طنز و مزاح کا تاریخی و تنقیدی اور تحقیقی جائزہ ہوا، اب دوسرے باب میں دنیا کی بڑی زبانوں کا طنز و مزاح پر احیاء ادب پیش کیا گیا ہے اور ان زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی، فارسی، روسی، سپینی، عربی، اطالوی، ہسپانوی، ترکی، گالی اور ہندی شامل ہیں۔ سب ملاحظہ فرمائیے کہ ان زبانوں کے ادب کی نمائندگی کتنے ہیں۔ ان میں سے سب میں یہ نمائندہ نہیں ہیں ان سے بہتر انتخاب ہو سکتا تھا لیکن بہر حال ان سے ایک اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے - اردو میں ترجمہ ہو کر بھی بعض چیزیں کچھ کچھ ہو جاتی ہیں۔ ایسی مثالیں تو بہت ہی کم ہوں گی کہ اصل کی روح ترجمے میں بھی سی طرح آجائے -

تیسرے باب کا عنوان ہے "طنز و مزاح ادب کے ابتدائی نمونے" ان میں مختلف اخباروں اور مجلوں کی نمائندگی کی گئی ہے خصوصاً "پنچوں کا دور" جس میں رفیق ہند، پنجاب پنچ، دہلی پنچ، لاہور پنچ، بنارس پنچ، آگرہ پنچ، دکن پنچ وغیرہ شامل ہیں -

پھر اردو پنچ کا دور آتا ہے اور اس میں وہ تمام مزاح نگار آگئے ہیں جنہوں نے اردو پنچ سے لکھنا شروع کیا بالکل آبادی فنی سجاد حسین، ترجموں کا ترجمہ بھر، مجھو بیگ تم ظریف، جوا لا پرش و برقی، رتن ناتھ سرشار، نواب سید محمد آزاد، عبد الغفور شہزاد اور حکیم ممتاز حسین عثمانی وغیرہ -

اردو پنچ کے بعد "فنت اور عطر فنت کا دور" ہے۔ اس میں پہلے فنت اور عطر فنت سے متعلق عقیدے اور تحفہ جفری کا ایک اچھا مضمون ہے۔ پھر ان کے انتخابات و سنجے گئے ہیں جن میں ریاض خیر آبادی کا بارغ و بہار اسلوب اپنے شباب پر ہے۔ اس کے بعد شیرازہ کا دور ہے جس میں سند باد جہازی کا "جدید جغرافیہ پنجاب" عبد المجید سائیک کا "منزل ایک معتبر نائی" بھی شامل ہیں -

اس کے بعد موضوع کے تاریخی ارتقاء کے مطابق طنز و مزاح ادب کے شہ پاروں کا انتخاب ہے جو بڑی محنت اور دہرہ دہری سے کیا گیا ہے۔ غالب، سر سید، نذیر احمد، محمد علی جوہر، حمادی، فادی، حفیظ علی بدایونی، ابراہیم کلام، مولوی عبد الحق، عبد المجدد دیبا دی، قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی، فلک پیمیا اور دور حاضر میں ٹیکس کاظمی تک بہت سے نام اور ان کی نمائندہ تحریریں آگئی ہیں -

اسی کے دوسرے حصہ میں جو طنز و مزاح ادب کے ذریعے دور سے منسوب کیا گیا ہے پطرس، رشید احمد صدیقی، فرحت بیگ، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، ملا دوزی، کتبیا لال کپور، شفیق الرحمن، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، فرقت کا کردی، اور احمد جلال پاشا تک سب شامل ہیں -

یہ توجہ تشریف آ - اب اردو کے "طنز و مزاح شاعر" آتے ہیں اس میں پہلے نو شاعری میں طنز و مزاح کی



تاریخ و تنقید پر ایک پرمغز مقالہ محمد عبدالقدوس قریشی کے قلم سے ہے جس میں سب سے آگے جعفر زٹلی ہیں ان کے بعد مسعود امیر، انشا مصحفی، یحییٰ، ضاحک، کمر بن، ہمدان الشعرا، نظیر اکبر آبادی، نازنین، بیگم، وغیرہ ہیں۔ مگر بہت ہے کہ یہ ہم سب کو معلوم نہیں ہیں مثلاً عروں میں اور بھی دو چار اچھے نام چھوڑ گئے ہیں۔ پھر دوسرے جدیدین اکبر، مستحقی، حالی سے لے کر احسن پھولہ ندوی، شاد عارفی، جمیل لاہوری، سید محمد حفیظ، راجہ ہمدی علی خاں وغیرہ بہت سے مزاحیہ شاعروں کا کلام آگیا ہے۔ پھر ایک عنوان ہے ”مزاحیہ کردار“۔ اردو میں بعض کیریکچر اپنی خصوصیات کی وجہ سے زندہ جاوید ہو گئے ہیں مثلاً خوجی، حاجی بنگولی، چچا بھگت وغیرہ ان کرداروں کی فائیدگی بھی موجود ہے۔

خیالوں میں بھی مزاحیہ کلام کا رواج ہے۔ ”مزاحیہ کالم“ کے تحت ہمدرد، ڈیسندہ، انقلاب، صدق، امروز، نوائے وقت، چٹان، نمکدان، کے مزاحیہ کالموں سے نواسے پیش کئے گئے ہیں۔

آخر میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے جمع کئے ہوئے لطائف ہیں جن کا تعلق اردو کساد بولی اور شاعروں سے ہے یہ گویا میں نے سرسری طور پر صرف طنز و مزاح فکر کی درس کا تعارف کر لیا ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس میں کیا کچھ موجود ہے۔ ایک ہزار صفحات کے اس نمبر پر ”تنقیدی“ ”نظر و انشا“ انسان نہیں۔ اردو میں طنز و مزاح پر ایسی بہت کم لکھا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی کتاب ”طنز و بات و مضحکات“ اس سلسلے میں سب سے پہلی گریشن تھی جسے انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی کی فرائزن پر رکھا تھا اور وہیں سے کتاب بھی تھی۔ اس کا مقصد تحقیق یا تنقید سے زیادہ یہ تھا کہ اردو میں طنز و بات و مضحکات پر جو کچھ مراد ہے اس کا ایک بھر پور تعارف ہو جائے۔ اس وقت تو یہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ لیکن اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ رشید صاحب اس پر نظر ثانی کریں۔ اور اضافوں کے ساتھ اس کا نیا ایڈیشن چھاپا جائے۔

رشید احمد صدیقی کے بعد کلید الیقین محمد نے طنز و لطائف پر ایک طویل مقالہ لکھا اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بعض اہم مسائل کی طرف توجہ کی ہے۔ انداز سے اردو کے تمام سرمائے پر ایک نظر ڈالی اور اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دیا۔ غلام احمد فرقت نے بھی بی ایچ ڈی کے لئے اپنا مقالہ اسی موضوع پر لکھ لیا ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی کے سائنس میں کیا جائے گا۔ ”طنز و مزاح“ کے نام سے ان کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے چھاپی ہے جس میں اردو ادب کے طنز و مزاح کا انتخاب کئی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے۔ اس میں فرقت صاحب نے طنز و مزاح کی تعریف اور تاریخ بیان کی ہے اور اس کے علمبردار تقا کا جائزہ لیا ہے۔

ابھی پاکستان سے ایک کتاب ”اردو ادب میں طنز و مزاح“ ڈاکٹر ذریعہ آغا کی شائع ہوئی ہے۔ یہ ان کو بی ایچ ڈی کا تیسرے سال کے اس میں وزیر آغا نے اردو نظم و نثر میں طنز و مزاح کی رفتار متعین کر کے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن حیثیت عمومی یہ کتاب ہمارے توقعات کے مطابق نہیں ہے اس میں بعض خامیاں ایسی رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب تنقید کے معیار سے گزر جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ نظم و نثر کے جائزے میں تناسب نہیں رکھا جن اشعار و نثر کے ٹکڑوں کا انتخاب کیا ہے وہ غیر مربوط ہیں اور جس عنوان کے تحت یا جس مثال کی تصدیق کے لئے پیش کئے گئے ہیں ان کی نمائندگی نہیں کرتے۔ نتائج کے استنباط میں بھی وزیر آغا نے غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہ کہیں زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں مثلاً اکبر کے معاملے میں ان کی رائے معروضی

**OBJECTIVE** ہے۔ اگر نثری زبان سے مثالیں، اقتباس اور حوالے ضرورت سے زیادہ جمع کر لیے ہیں جن سے اردو طنز و مزاح کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی صرف مصنف کی وسعت مطالعہ کا علم ہوتا ہے۔

بعض باتیں دلیل کی محتاج رہ گئی ہیں لکھنؤ میں میر حسن نے عظیم، قصاب اور مکان پر بڑی ہندب اور ہلف ہجوئی غزبر کیس (۸۲) قطع نظر اس بات سے کہ ان نظموں کے لکھنؤ میں لکھے جانے کی کوئی خاص شہادت موجود نہیں، میر حسن کی یہ ہجویات خصوصاً قصاب والا لطیفہ اتنا غیر ہندب اور ناشائستہ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ دہریہ خانے قلم جاندہ پری کی ہجویات پر بھی تو جرح صرف نہیں کہ، قائم کی ہجویات سودا سے پہلو ماتی ہیں۔

اُس وقت ابتدائی شاعری میں ہجویات کا اتنا ذخیرہ باسانی مل سکتا ہے کہ اس پر ایک علیحدہ مقالہ یا کتاب لکھی جاسکے۔ وزیر آخان نے ان ہجویات کو ثانوی درجے میں لائے، افغانا سمجھا ہے۔ انتخاب اشعار کا معاملہ ذاتی ذوق اور پسند کا ہوتا ہے لیکن جہاں تشبیل کی ضرورت ہو وہاں یہ شرط اتنی کڑی نہیں رہتی۔ دعوے کی دلیل ذاتی پسند یا ذوق سے نہیں جھٹکتی ہے اور نظر اترے دی جاتی ہے۔ میرا دعوے ہے کہ جو اشعار وزیر آخان نے مثالوں میں نقل کئے ہیں ان میں بیشتر ایسے ہیں جن سے دعوے کا اثبات نہیں ہوتا اور جو بر محل ہیں ان سے بہتر اشعار کا انتخاب کیا جاسکتا تھا۔

بہر حال اس کتاب پر فصل تبصرہ تو نہیں پھر لکھنؤ کا میر دست پر کہنا چاہتا تھا کہ اردو میں اب تک طنز و مزاح پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت ناکافی ہے۔ نقوش کے طنز و مزاح نمبر نے اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے اتنا کچھ مواد ایک جگہ فراہم کر دیا ہے کہ اس کے سہارے سے طنز و مزاح کی ایک بھرپور تاریخ لکھی جاسکتی ہے اور نہ ہی لکھی جائے تو یہ نمبر خود اپنی جگہ ایک تاریخ ہے جو طنز و مزاح کے تذریجی ارتقا کو آئینہ کر دیتی ہے۔

دہریہ نقوش نے ایک بات اچھی نہیں کی وہ یہ کہ انھوں نے "غش" اور "غیر غش" میں امتیاز نہ کرنے ہمارے ہجوئی شاعری کے بہت سے حصے حذف کر دیئے۔ اس معاملے پر کئی پہلوؤں سے سوچنا چاہیے ایک تو یہ کہ طنز و مزاح نمبر کا مقصد حافظت بخشنا انا نہیں ہے دوسرے یہ کہ ہجو میں دلکب اور پیکرہ مضامین کا استعمال روا ہے زمانہ کے مطابق تھا ان سے آج بات کا نفرت کا اظہار کرنا ایسا ہی ہے جیسے تیر یا سودا سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ مار کسی کیموں نہ مروتے یا میر سید کی بجائے غالب نے پوربوری قائم کیوں نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ان دلکب، مقبذی، اور سو فیاض مضامین سے اس عہد کی معاشرت اور تعلیمات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اشعار جن کا مقصد صرف گالی گلوچ یا گندہ دہنی تھا جیسے میر حسن کا "لطیفہ قصاب" یا قائم کی شہنوی جو کسی لاولد لہعال کی ہجو میں ہے، انھیں نظر انداز کر دینا مناسب بلکہ واجب ہے لیکن اساتذہ متقدمین کی ہجویات کے ساتھ یہ رویہ اچھا نہ ہوگا۔ طنز و مزاح کی تاریخ مرتب کرنے وقت جب ہم ریختی کی نمائندگی بھی کر رہے ہیں تو جعفر زلمی کے ساتھ چوکیں، بزم، زارخ وغیرہ خالص بھکڑے کے شاعروں کی نمائندگی بھی ہونی چاہیے۔ طنز و مزاح کی بہت سی شاخیں ہیں، زمانہ، مکملہ آفرینی، مزاح، ہجو، بھکڑے، بھٹی، ہجو، وغیرہ ان سب کے بہترین نمونے جمع کرنے کے لئے ہمیں کہیں اخلاق سے معذرت بھی کرنی پڑے گی اور موضوع سے انصاف کرنا ہے تو یہ معذرت بھی کرنی چاہیے۔

نقوش نے اب تک جو شاندار نمبر پیش کئے وہ زیادہ تر موضوعاتی تھے یعنی اوکے چند اہم موضوعات مثلاً طنز و مزاح، افسانہ، شخصیات، وغیرہ۔ کسی ایک ادبی شخصیت پر پہلی کرشمش "منٹو غیر" تھی جس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ دوسرا یہ پطرس نمبر شمارہ ۷۶، ۷۷، ستمبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔

پطرس کی شخصیت صحیح معنوں میں باغ و بہار ہے۔ اس کی تحریروں میں سب سے زیادہ شگفتگی اور تخلیقی آن ملے گی اور وہ میں شاید ہی کوئی مثال ایسی ملے کہ ایک شخص چند مضامین کا مجموعہ لے کر آیا ہو اور مودعہ کے لئے اس حمد تک ناگزیر ہو گیا ہو کہ اب اسے نظر انداز کر کے اردو میں طنز و مزاح کی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔

پطرس کی شخصیت اور فن کے بہت سے پہلو تھے۔ ان کی انسانیت، شرافت، اخلاق، وضع داری، مشرقی تہذیب سے ذہنی و ادبی مغربی علوم و افکار کا طبیعت میں رچاؤ، اسلوب کی سادگی اور دل نشینی، مزاح کی وقعت اور بے ساختگی۔ شخصیت کو دیکھتے تو وہ ایسی پرکشش ہے اور فن پر نظر ڈالتے تو موجودہ ادب کی ساری تاریخ میں کسی مزاح نگار کے یہاں وہ لطافت، شیرینی، سرگوشی کا سا انداز، بے ساختگی، جسنگی (ORIGINALITY) بھی نہیں ملے گی جو پطرس کے مضامین کا عادی عنصر ہے۔ محمد طفیل نے ۶۵ صفحوں کا ایسا ضخیم اور شاندار نمبر مرتب کر کے پطرس کو زندہ کر دیا ہے ممکن تھا کہ ہمارا بے غیرت اور بے حس ملک پطرس جیسی شخصیت کو بھی فراموش کر دیتا لیکن اب یہ دھڑکا نہیں ہوا۔ اس نمبر میں ۳۳ مضامین تو پطرس کی شخصیت پر ہیں جن کے لکھنے والوں میں ڈو الفکار بخاری، سر ظفر اللہ خان، عبدالعزیز سالک، رشید احمد صدیقی، فیض، عصمت، قمر، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور اور محمد طفیل جیسے حضرات ہیں۔ بپا مضامین تنقیدی ہیں۔ جو ڈاکٹر احسن فاروقی، نمکیں کاظمی، وزیر آغا اور اثر کھنوی نے لکھے ہیں۔ ان کے بعد پطرس کی تخلیقات میں وہ تمام مضامین، افسانے، ڈرامے، خطوط وغیرہ جمع کر دئے گئے ہیں جو پطرس نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں منظومات بھی ہیں افسانے بھی ڈرامے اور ناولٹ بھی۔ مزاحیہ مضامین، فنی مضامین، تنقیدی مضامین، نیاز مندان، لاہور کا سلسلہ، ادب لطیف، دیباچے، سفر نامے، بچوں اور عورتوں کے لئے خطوط، پطرس کے مضامین (مکمل کتاب) اور تقاریر یہ سب چیزیں سموی گئی ہیں۔

بپا پطرس کی شخصیت پر ہیں مضامین ایسے لوگوں کے ہوں جنہوں نے خود پطرس کو دیکھا ہو اور سمجھا ہو، چار مضامین فن کے مختلف پہلوؤں سے میر حاصل بحث کرتے ہوں۔ پطرس کی کوئی تحریر ایسی نہ ہو جسے تلاش کر کے اس نمبر میں نہ سمویا گیا ہو تو اب کیا کہنے کو باقی وہ جانتا ہے کسی کی شخصیت اور فن کے بارے میں اس سے بہتر نمبر آج تک نہیں نکلا جی تو نیا فتح پوری نے یہاں تک لکھ دیا کہ "اگر طفیل صاحب میرے لئے بھی ایسا ہی خصوصی نمبر نکالنے پر آمادہ ہو جائیں تو میں اسی وقت مرنے کے لئے آمادہ ہوں"

۱۹۵۹ء کا تیسرا خاص نمبر شمارہ ۷۷، ۷۸، دسمبر میں نکلا ہے۔ اب نقوش کے عام نمبر تو "خاص" طور پر نکلتے

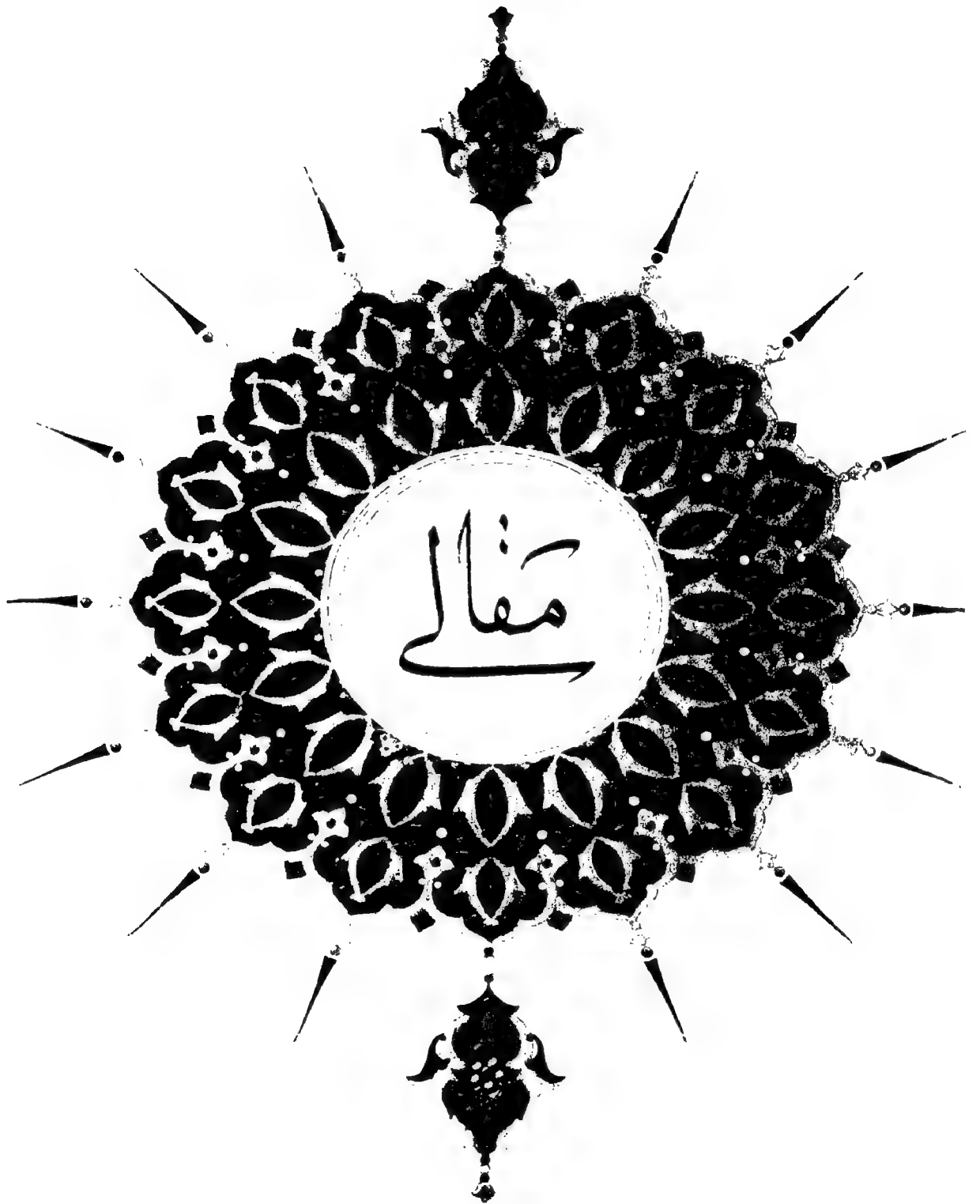
ہیں۔ اس نمبر میں بھی چند وہ افسانے، ایک ایک، ساٹھ نظمیں غزلیں، سات مضامین شامل ہیں لیکن یہ خاص نمبر ایک "خصوصیت" کی وجہ سے ہو گیا ہے یعنی اس میں ایک سمپوزیم بھی ہے جس کا عنوان ہے "کیا موجودہ ادب دوبارہ تیز ہے" اس

میں ۲۵ ذی ہجرت اور نادوں نے اظہار رائے کیا ہے۔ افسانہ، شاعری، تنقید اور طنز و مزاح پر ان موضوعات کے مستند لکھنے والوں کے خیالات ایک جگہ جمع کر دینا معمولی کام نہیں۔ اور آج تک کسی رسالے نے اس نوعیت کا کوئی سمپوزیم پیش بھی نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ حصہ لینے والوں میں منفی اور مثبت، مخالف اور موافق دونوں نظریوں کے لوگ شامل ہیں یعنی کوئی کمنا ہے۔ ادب و رہبر زوال ہے، کوئی کمنا ہے نہیں۔ ایسی صورت میں ایک عام قاری کو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ صحیح صورت حال کیا ہے۔ کیا یہ صرف لفظی نظر کا ایریمیر ہے یعنی —

تفاوت است میان تشیع من و تو      تو بستنی درو من فتح باب می شنوم  
یا ادب کی سمت و رفتار کا یقین اور اس کی ترقی یا زوال کا یقین کسی خاص معیار سے کیا جاسکتا ہے؟ ایسی صورت میں یہ ضروری تھا کہ اس بحث میں ایک حکم بھی مقرر کیا جاتا جو ان سب حضرات کے دلائل و شواہد کو سامنے رکھ کر استخراج کر سکتا۔

جہاں تک افسانے کا تعلق ہے اس کے فن میں نئے تجربے نہیں ہو رہے ہیں اور موضوعات میں تنوع نہیں انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ شاعری بھی پھر پرانی روش کی طرف رجعت فقہری کر رہی ہے۔ تنقید میں فکر انگیز باتوں کا فقدان ہے اور اس کے اصول و ضوابط آج تک نہیں مڑے ہوئے ہیں۔ تنقیدی نظریات اور عقائد ہم آج تک غیر مالک سے درآمد کرنے ہیں اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ فقدان مسائل و تیزی سے بدلتے ہوئے حالات، نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش، نظریات کی فراوانی، کثرتِ تعبیر سے خوابوں کی پریشانی، نئے علوم سے ہماری پیڑائی، اور زبان و ادب پر سیاست کا رد عمل، یہ سب مجموعی طور پر ہمارے ادب کی ترقی میں مائع ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار علیحدہ کیا ہے۔  
پرسیموزیم کوئی ناظر فیصلہ نہیں۔ اس کے موجودہ موقف کی ایک رپورٹ ہے جس پر ہمارے نئے لکھنے والوں کو، ذہین اور ذی شعور آدمیوں کو سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنا چاہیے۔

محمد طفیل نے اپنے زمانہ ادارت میں نقوش کو زندہ جاوید کر دیا ہے اور ان کی محنت نے انھیں بھی امر بنا دیا ہے جس طرح نگار کے ساتھ نیا ذفتح پوری کا نام، انجمن ترقی اردو کے ساتھ بڑی عبدالحق کا نام یا صلاحی عام کے ساتھ میر ناصر علی کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا ہے اسی طرح اب نقوش اور محمد طفیل بھی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یہ ان سے زندہ ہے وہ اس سے —————  
عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خاص نمبروں کے میدان میں نقوش کا کوئی ٹھکانہ ہندوستان یا پاکستان میں موجود نہیں۔





کتاب خانہ جامعہ اسلامیہ دہلی

## تذکرہ رسمانیہ

مولانا الطاف حسین حالی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون

مضمون جن کو شیخ محمد اسماعیل صاحب چھپوا کر شائع کر رہے ہیں والد مرحوم (مولوی الطاف حسین حالی) نے اپنے استاد اور اپنے وطن کے قابل فخر بزرگ حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے چند روز کے بعد شائع میں لکھا تھا۔ شیخ محمد اسماعیل صاحب نے اس مضمون کی ایک نقل کو ششٹی اور کچھ روپیہ خرچ کر کے مولانا مرحوم کے ایک دوست سے حاصل کی ہے اور اس کو شائع کرنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ مضمون کے ساتھ اسلامی دنیا کے ایک مشہور بزرگ کے حالات بھی محفوظ ہو جائیں جو پڑھنے والوں کے لئے سبق آموز اور ان کے دلوں میں اسلامی تعلیم کی وقعت پیدا کرنے والے ہیں۔ یہ بات کہ حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحب کس پاپا کے عالم اور بزرگ تھے اور یہ کہ مضمون نگار کے دل میں اپنے بزرگ استاد کی کس قدر عزت اور محبت تھی وہل کے مضمون کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہوگی۔

شیخ محمد اسماعیل صاحب کا خاص کلاس وجہ سے شکہ گذار ہوں کہ مطبوعہ مضامین حالی میں یہ مضمون پہلے نہیں چھپا اور اگر ان کو اس کا خیال نہ آتا تو ممکن تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد تلف ہو جاتا۔ اور مسلمانوں کی آئندہ میں ایک ایسے بزرگ کے حالات بے خبر رہتے ہیں جو اس اخیر زمانہ میں سلف صالحین کا سچا نمونہ تھے۔ خدا تعالیٰ شیخ صاحب صوف کو جزائے خیر دے اور سب مسلمانوں کو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سے بہت سزا و سبق حاصل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

خاکسار

سجاد حسین حنفی اللہ عنہ

از پانی پت

خلف خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم و مغفور

محمد افغاناں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَمَا مِنْ رَزَقَاتٍ أَكْبَرَ عَلَى الْإِسْلَامِ مِنْ مَوْتِ أَهْلِ اللَّهِ وَعُلَمَاءِ الدِّينِ

(یعنی، اسلام پر کوئی مصیبت اہل اللہ اور علماء دین کی موت سے زیادہ بڑی نہیں۔)

افسوس! ہزار افسوس!! اور صد ہزار افسوس!! کہ قدوة العلماء و یقیۃ السلف الصالحین جناب حاجی قاری مولوی عبدالرحمن صاحب

انصاری پیرس پانی بت۔ نے تابخ ہر بیع الشانی سلسلہ ہجری بوم دوشنبہ شام کے تین بجے بعد از عشاء و پیش آٹھ سات دن بیمار رہ کر کچھ کم تھکے برس کی عمر میں دنیا سے رحلت فرمائی اور رات کے دس بجے امیر مودعہ ولادی قدس برترہ کے مزار کے قریب پڑوائے کھیت میں دفن کئے گئے۔ باوجود میر رات کا وقت تھا اور تجہیز و تکفین میں نہایت عجلت کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہاں میں خبر نہ پہنچی سکی پھر بھی قریب پانچ سو آدمی کے جنازہ کی نماز میں موجود تھا اور سیکڑوں مرد اور عورتیں ڈھائی مار مار کر رونے لگے۔ چاروں طرفوں کے رئیس۔ اہل عرفہ۔ کاشتکار اور سوداگر جنازہ کی مشابعت میں شریک تھے۔

مولانا مفتی رشیدی محمدی صاحب کے خلف الصدق اور قاری قادری شمس صاحب اور قاری احمدی صاحب کے (جو نفع دہلی میں اکثر سلاطین اور خاندانوں کے اولاد کے استاد تھے) حقیقی بھتیجے تھے۔ ان کے والد اور دونوں چچاؤں نے جناب قاری مصلح الدین صاحب پانی پتی سے جن کے صاحبزادے قاری لالہ صاحب تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ تجویز اور قرات سیکھی تھی اور انہیں کے خاندان کی بدولت پانی پتی۔ دہلی اور مصافات دہلی میں من تجویز شائع ہوا حفاظ و قرات کی تعداد ہزاروں سے گذر کر لاکھوں تک پہنچ گئی جس طرح نامور مولانا مرحوم نے جس قدر قرآن مجید کی خدمت دس برس کی عمر سے اخیر عمر تک کی وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔ مولانا نے قرآن اور کسی قدر صرف و نحو اور قرات دہلی میں اپنے والد ماجد سے جبکہ وہ بخشی محمود خاں کے ہاں نے متعلق تھے۔ پڑھی تھی اور وہ اپنے والد کے ساتھ شاہ عبدالعزیز صاحب کے عہد میں جایا کرتے تھے جب والد کا انتقال دہلی میں ہو گیا۔ نور مری سید محمد صاحب۔ حاجی قاسم صاحب۔ مولوی رشید الدین خاں صاحب کے کسی قدر مکتب و مدرسہ اور زیادہ تر مولانا مملوک علی صاحب کے پڑھیں اور صحاح سنہ کی سند جناب مولانا شاہ محمد اسلم صاحب سے من آئی۔ الی آخر یہ حاصل کی اور ان کے ہاتھ پر عبیت طاعت کی۔ اور امر وہ میں جا کر مولوی قاری امام الدین صاحب کے علم قرات اور علم تصوف کا اکتساب کیا۔

طالب علمی کے زمانہ میں جو انہماک اور استغراق ان کو تحصیل علم میں رہتا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کے عزیز اور ہم عمر دوست جو اس زمانہ میں دہلی سے ملے جاتے تھے۔ وہ ان سے سلام علیکم یا سرسری مزاج پرسی کے بعد صرف کہتے تھے کہ اس سے زیادہ فرصت ملنے یا بات چیت کرنے کی نہیں ہے۔ جب خدا بامر امداد ملے گا اس وقت ملیں گے۔ طالب علمی کے زمانہ میں جو سختیاں اور محنت و مشاقق انہوں نے اٹھائی ہیں ان پر اس زمانہ میں یقین آنا مشکل ہے۔

شعبہ میں جب حضرت شاہ محمد اسلم صاحب ہجرت کے ارادہ سے عربین شریفین کو جانے لگے اس وقت مولانا مرحوم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چونکہ مرحوم ذوالفقار بہادر نواب باندہ نے شاہ صاحب کے درخواست کی تھی کہ عربین کو اس طرف تشریف لے جائیں۔ اس لئے شاہ صاحب اول باندہ تشریف لے گئے اور مولانا مرحوم کو نواب ذوالفقار بہادر کے پاس باندہ میں چھوڑ گئے تھے۔ تقریباً سولہ برس مولانا صاحب باندہ میں رہے اور اس عرصہ میں تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کی درس و تدریس کرنے رہے شاہ صاحب کے تشریف لے جانے کے دو سال بعد راج کو جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں جا کر بعد راج کے کچھ کم ایک سال رہے پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہے اور صحاح کی سند دوبارہ مرحوم محترم خاصہ عظیم میں پیش کر کے حاصل کی۔

جب شاہ صاحب عربین کو روانہ ہوئے تو قرآن مجید کا درس جو وہ ہر جمعہ کو فرمایا کرتے تھے اس میں تقریباً نصف قرآن شریف کا درس باقی رہ گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے باجائز شاہ صاحب باندہ میں باقی سہ ماہی کا درس ختم کیا۔ اور اس کے بعد



ابتداء سے قرآن کا درس دینا شروع کیا اور تقریباً پچاس برس بلکہ چھ برس کے بعد کہ ان کا درس ہونا راجح خاص حالات کے سوا کبھی کوئی جمعہ ناغہ نہیں ہوا۔ یہ قرآن بھی مختصر بہ ختم ہونے والا تھا صرف کسی حد و غیرواں بارہ باقی رہ گیا تھا کہ مولانا کے کروج کا وقت آن پہنچا۔

چند سالی سے مولانا مرحوم کی دونوں آنکھوں میں پانی اتر آ رہا تھا۔ آنکھوں نے زیادہ تر اسی خیال سے کہ قرآن مجید کا درس ختم ہو جائے غھر ہو جا کر ایک آنکھ ہوائی مگر اس سے اچھی طرح کارروائی نہ ہوئی اس لئے اودھنا کہ دوسری آنکھ بھی ہو جائے مگر چونکہ اس کی کا وقت تلخہ والا نہ تھا۔ یہ آواز نہ پوری نہ ہوئی۔

مولانا مرحوم کے فضائی و کمالات اور اعلیٰ اخلاق اور بختہ خصائی بیان کرنے کے لئے ایک جدا کتاب درکار ہے۔ مختصر یہ کہ جو خصوصیات علمی و عقلی مولانا مرحوم میں پائی جاتی تھیں ان کے لحاظ سے ان کا تعبیر و دور دورہ نظر نہیں آتا۔ ان کی تمام عمر کتب و رسبہ کی تدريس میں گزری تھی۔ ایک ایک کتاب کو جس میں تیس تیس دھاتوں سے آہر تک پڑھایا تھا۔ اس سب سے تمام کتا ہیں ایسی پیچیدگی تھیں کہ مشکل سے مشکل کتاب بلاترود اور بغیر مطالعہ کے نہایت مددگی سے پڑھاتے تھے صحاح ستہ کو جس حدیثانہ احتیاط اور ادب و تنظیم کے ساتھ وہ پڑھاتے تھے اس کی نظیر کہیں نہیں دیکھی گئی۔

علم قرأت جس میں قرآن سب سے اور ان کے راویوں کے اختلافات اور نیز قرأت غیر متواترہ و شاذہ کا بیان ہے اس میں مولانا مرحوم تمام ہندوستان میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اور چونکہ اس فن کو ان سے مہنت ہی کم لوگوں نے حاصل کیا تھا اس لئے اخیر عمر میں ان کی ولی خواہش یہ تھی کہ لوگ ان سے اس فن کو حاصل کریں۔ اور لوگوں کی اس طرف سے بے توجہی دیکھ کر خوف بھاگتے تھے کہ مبادا یہ علم اس ملک سے ناپید ہو جائے۔

ان کی تمام عمر کتب و رسبہ اور صحاح ستہ کے درس و تدریس میں گزری تھی مگر اب ان کو کوئی کام اور کوئی مشغلہ قرآن مجید کی تلاوت اور قرآنی علم قرأت اور علم تجوید کی تعلیم سے زیادہ عزیز اور مرغوب نہ تھا۔ باوجودیکہ کئی برس سے قوی میں نہایت اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ سماعت بہت کم ہو گئی تھی اور بینائی بالکل نہ رہی تھی مگر ہمیشہ میں پچیس سبب قرآن مجید کے مردوں اور قوم کی عورتوں کو پڑھاتے تھے سخت سے سخت مرض اور تکلیف میں بھی رمضان شریف کے روزے اور ایک قرآن تراویح میں سنا تا کہ کسی نہ کہ نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ گذشتہ رمضان شریف میں باوجود کمال ضعف و ناتوانی کے سارا قرآن شریف تراویح میں سنایا اور تمام رمضان شریف کے روزے رکھے۔

فما زلے جس کی نسبت رسول خدا صلعم نے قَدْ عَلِمَ عَنِّي فِي الصَّلَاةِ فرمایا ہے، انہوں نے عجیب طرح کا فعلی پیدا کیا تھا کہ نماز کا وقت ہوتے ہی وہ بے چین ہو جاتے تھے اور جب تک نماز اول وقت ادا نہ کر لیتے تھے دنیا و مافیہا سے کچھ سروکار نہ رکھتے تھے۔

قرآن مجید جس کی تلاوت اور خدمت و تعلیم میں تقریباً اسی برس گذرے تھے گو با ان کی رگڑے میں سرایت کر گیا تھا۔ اس میں سرور و مبالغہ نہیں کہ اگر بالفرض وہ تمام قرآن سکتے سکتے ختم کر دیتے تو ان کو ایک جگہ بھی منتسابہ نہ لگتا اور ایک حرف بھی قواعد تجوید و تزیل کے خلاف ان کے منہ سے نہ نکلتا۔

وہ قرآن کے الفاظ و حروف کو بے قصد و رویت بخارج سے نہیں نکالتے تھے بلکہ تمام حروف کو اپنے بخارج سے ادا کرنا ان کا سلیقہ اور طبیعت بن گیا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ مکہ معظمہ کی اقامت کے زمانہ میں جب اور ضروری کاموں سے غمت ہوتی تھی تو میں جہاں کہیں عربوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھیلتے دیکھتا وہاں جا کھڑا ہوتا اور ان کے لب و لہجہ پر غور کرتا اور جہاں تک ہر سکنا تھا اُسی طرح حروف و الفاظ کے ادا کرنے میں کوشش کرتا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی نسبت جو حدیث میں آئی ہے کہ ”ہو“ کا لفظ وارد ہوا ہے۔ اُس کے معنی مولانا مرحوم کی نماز اور تلاوت قرآن کا ڈھنگ دیکھ کر بالکل ذہن نشین ہو جانے لگے۔ وہ قرآن مجید بہت جلد پڑھتے تھے مگر کیا امکان ہے کہ تجرید و ترتیل کے خلاف ایک حرف زبان سے نکلے۔

انہوں نے تمام قراءتوں میں سے امام نافع کی وہ روایت جو ان کے شاگرد امام تالون کے توسط سے پہنچی ہے اختیار کی تھی۔ آخر وہ تک اسی روایت کے موافق قرآن مجید پڑھا یا۔ چونکہ اس روایت میں مد و شد بہت کم ہے اور مولانا مرحوم کی مشق و ہمارت منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی اس لئے باوجود نہایت جلد پڑھنے کے بخیر و ترتیل میں سرور فرما آتا تھا۔

ان کے وعظ کہنے کا طریقہ تمام واعظین کے طریقہ کے بالکل برخلاف تھا۔ ان کا وعظ و تحقیق درس ہوتا تھا جس میں لغو و استانیوں اور فضول قصے کہانیاں بالکل نہ ہوتی تھیں اور کوئی بات بخارج از آہنگ معرض بیان میں نہ آتی تھی۔ اول قرآن کی آیت کے صاف اور سیدھے معنی بیان کرتے تھے۔ پھر اُس کی ترکیب کا حال اور نہایت ضروری تفسیر اور مسائل فقہیہ جو ائمہ فقہانہ نے اُس سے مستنبط کئے ہوں یا کوئی ضروری اور مفید بحث حنفی الواقع قرآن کے معانی و الفاظ سے تعلق رکھتی ہو، بیان کرتے تھے۔ اس لئے ان کے وعظ سامعین کو بے انتہا فائدہ ہوتا تھا اور نہایت مفید کام کی باتیں اور مسائل لوگوں کو معلوم ہونے لگتے۔

مذکورہ بالا اوصاف کے علاوہ مولانا مرحوم میں وہ اعلیٰ درجہ کی صفات بھی تھیں جو بڑے بڑے مقدس علماء و مشائخ میں بھی نہیں دیکھی جاتیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی نسبت اِشَاد ہوا ہے کہ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَاحٍ۔ جو کچھ ان کے دل میں تھا وہی زبان پر تھا جس بات میں خدا اور رسول کی مرضی دیکھی گوسارا زمانہ اُس کے برخلاف ہوا ان کو اُس بات کے کرنے میں کچھ باک نہ تھا اور جس امر کو حکم الہی کے خلاف سمجھا۔ گو کہ ساری بیادری اور کتبہ اُس کو اچھا جانے وہ ہمیشہ اس کے مخالف ہے اور جہاں تک ممکن ہوا اُس کے مثلنے میں کوشش کی۔

انہوں نے شادی و عہد کی تمام بہو و رسمیں یک قلم اپنے ہاں سے موقوف کر دیں بلکہ بعض لغویات تمام ہادی اور کتبے سے موقوف کر دیں۔ مگر جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اِنَّ سَلَامَةَ عَرِيْبًا وَسَيِّحًا عَرِيْبًا فُطُوْا فِي الْبَلْعِ بَاب۔ ان کی ہدایتوں اور نصیحتوں پر زیادہ تر عمل کیا۔ نہ دلے اور ان کا حکم بحال لانے والے غریب، اہل حرفہ، کاشتکار اور درکار لوگ تھے جو ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر رہتے۔ آٹھویں روز ان کی مجلس وعظ میں شریک ہوتے۔ اور ہر سو میں دن زاریج میں ان کا ترانہ سنتے تھے۔ ان لوگوں نے حد و رسوم و بدعات صرف مولانا مرحوم کی ہدایت سے ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں۔

وہ صرف زبانی نصیحتوں پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ترک رسوم و بدعات اور احیائے سنن میں خود نمونہ بن کر

لوگوں کو اُس کی طرف مائل کرتے تھے۔

مولانا مرحوم شخص، اتالی اور نوو کی باتوں سے نہایت نصرت کرتے تھے۔ معاملات میں ایسے معاملات اور کھڑے آدمی دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں الیٹ اور ولایت و حل آن کے مزاج میں ملحق نہ تھے۔ نہ اپنا حق کسی کے پاس چھوڑتے تھے اور نہ دوسروں کے حق میں دست اندازی کرنا چاہتے تھے۔ آج کا حساب کل پر اور کل کا حساب پرسوں پر کسی نہ رکھتے تھے۔ انتظام، تدبیر، منزل، اوقات کی پابندی، کاموں کی ترتیب، مستند ہی و استقلال آن کی خاص صفیں تھیں۔ آن کی جڑ رسی اور کفایت شعاری بالکل شغری معنوی کے اس شعر کی مصداق تھی۔

لے بہا ہ سال کر نفاق بہ مال حق راجز براو حق مرد

آریچ وہ ذرا غص و وجاہت و ستم کے سوا اور اعلیٰ و اعلیٰ و اعلیٰ کے زیادہ پابند نہ تھے مگر جس قدر زوال یا اوکا کا انھوں نے التزام کر لیا تھا آن میں لغو رائے احب الایمان اذ و ملھا کھن فرق نہ آتا تھا۔

قصبہ پانی پت میں جو اولاد حضرت ابو یوسف انصاری صاحب الرحل اور ثانیاً شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ پیر ہرات کی تہ سوس برس سے آباد ہے۔ مولانا بھی اسی قوم کے ایک رکن تھے۔ اس قوم میں سنی اور شیعہ دونوں مذہب کے آدمی شامل ہیں مولانا مرحوم کو اپنی قوم کے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سے ایسی محبت تھی کہ اُن کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے۔ باوجودیکہ اُن کی قوم کے آدمی بد نسبت اور قوموں کے اُن کے فیض صحبت سے بہت کم مستفیض ہوتے تھے اور اُن کی خدمت میں کم حاضر ہوتے تھے۔ باب ہر جب کوئی شخص اپنی قوم کا مل جاتا تھا تو اُس سے نہایت مہربانی اور عنایت اور محبت کے ساتھ ملے تھے اور ہمیشہ دل سے اپنی قوم کی تیر خواہی کا خیال رکھتے تھے۔

عملہ کی مسجد جس میں مولانا مرحوم نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس کی مرمت کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی جو انصار یوں کے سوا کسی سے انھوں نے طلب نہیں کیا۔ البتہ اگر کسی نے غیر قوم کے لوگوں میں سے اپنی خوشی سے کچھ دیا تو اُس سے انکار بھی نہیں کیا اور جو کچھ کسی رہی وہ اپنے پاس سے پوری کی۔ غیر قوم کے لوگوں سے انھوں نے صرف اس خیال سے نہیں طلب کیا کہ عملہ کی مسجد کو خود نہ بنانے اور غیر قوموں سے مدد لینے میں اُن کی اپنی قوم کو وجہ لگے گا۔ مسجد کے برابر ایک مکان فرابان اللہ خان مرحوم انصاری کا تھا اس کو اُن سے مانگ کر مسجد میں شامل کر لیا اور اس طرح مسجد کو خالص انصار یوں کی امداد سے تیار کر لیا۔ یہ بظاہر ایک اونٹے بات معلوم ہوتی ہے مگر یہی وہ چیز ہے جس کے نہ ہونے سے روز بروز مسلمانوں کی فام جماعتیں پرانگندہ اور کمزور و ضعیف ہوتی جاتی ہیں۔

مولانا مرحوم کی سیدھی سادھی اور بے تکلف وضع کو دیکھ کر ایک اعلیٰ آدمی اُن کو اَحَدٌ مِنَ النَّاسِ سمجھتا تھا مگر ہندوستان کے تمام اطراف و جوانب میں اُن کے معتقدین و مسترشدین گنتی اور شمار سے خارج تھے۔ ملک کے ہر حصے سے صد ہا مستفہم اُن کے پاس آتا تھا اور سیکڑوں آدمی بیت کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ بظاہر ولایت کے پاس ہیں تھے

مگر حقیقت بہت بڑے شے تھے اور وہ جو کسی بزرگ کا قول ہے کہ "تقطب وقت کو پہاڑوں جھگڑوں اور دیوانوں کی تنہائی اور عزت میں نہ ڈھونڈو بلکہ بازاروں میں، بالی بچوں میں، خرید و فروخت میں اور تمام دنیا وادی کے تعلقات میں تلاش کرو" سو یہ قول مولانا مرحوم کی شان میں پورا پورا صادق ہوتا تھا۔ اُن کے نزدیک نرک و جہنم کا نام فقر و وریشی نہ تھا بلکہ دنیا کو مزرعہ آخرت سمجھنا اور تمام دنیا کے معاملات حکیم خدا اور رسول کے موافق طے کرنا اور بے ہمد و باہمد رہنا اسی کو درویشی سمجھتے تھے۔ اُن کا حال اس شعر کا مصداق تھا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ  
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیان سب سے الگ

اگرچہ اخیر عمر میں سبب ضعف و ناتوانی کے اوقات نماز کے سوا اور وقتوں میں بہت کم باہر نکلتے تھے اور گھر میں ایک عالمیہ بالا خانہ میں رہتے تھے مگر اپنی طاقت اور قوت کے موافق اپنے تمام کام خود ہی سرانجام کونے تھے۔ مولانا مرحوم دین کے معاملات میں اپنی رائے اور قیاس کو کبھی دخل نہ دیتے تھے بلکہ جو کچھ شیوخ اور اساتذہ سے سنا تھا باجس طریقہ پر اُن کو چلتے دیکھا تھا یا جس طرح کتابوں میں پڑھا تھا۔ اُس سے سرمو بخاؤ نہ کرتے تھے۔ تنہائی میں یا مجمع عام میں اگر کوئی اُن سے کچھ نہ کہہ چکا تھا اور اُن کو اس کا جواب سر درست معلوم نہ ہوتا تھا تو باوجود مرجع خلافت ہونے کے وہ صاف کہہ دیتے تھے کہ اس وقت مجھے معلوم نہیں جب تک اُن کو اپنے جواب پر نہایت اطمینان اور وثوق نہ ہوتا تھا کبھی زبان سے نہ نکالتے تھے۔

۱۹۵۵ء کے غریب وہ باندہ میں تھے جہاں کے لوگ اُن کے نہایت معتقد اور اُن کے حکم پر وار تھے۔ تیس چالیس انگریز اور اُن کے بچے اور میمن باغیوں کے خوف سے اُن کی پناہ میں آگئیں۔ انھوں نے سب کو پناہ دی اور اپنے معتقدین کو حکم دے دیا کہ جہاں تک ہو سکے اُن کی حفاظت کرو اور برابر اُن کے کھانے پینے کی خبر لی۔ اور جنھوں نے جان کے خوف سے مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُن کو قاعدہ کے موافق مسلمان کر لیا چنانچہ وہ سب پناہ گیر مولانا مرحوم کے مدرسہ میں امن کے زمانہ تک رہے اور جب قدر و رفع ہو گیا تو وہ بخیریت تمام اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے گئے۔ ایک روز اُن میں سے ایک شخص جو بہت بڑا افسر تھا اپنے اہل لباس میں مولوی صاحب ملے آیا۔ انھوں نے اُسے ملحق نہ پہچانا۔ چونکہ وہ شخص بھی مولانا مرحوم کے ہاتھ پر مسلمان ہو چکا تھا اور انھوں نے اس کا نام بھی مسلمانوں کا سا ہی رکھ دیا تھا اُس نے اپنا وہی نام بیا کہ میں وہ شخص ہوں۔ اُس وقت مولانا نے پہچانا۔ اس پر میں افسر نے کہا کہ آپ اپنے متعلقین کی طرف سے ایک نواست لکھ کر مجھ کو دیجئے۔ کہ اتنے یوہین مردوں اور عورتوں اور بچوں نے ہمارے ہاں پناہ لی تھی اور آخر تک مولوی صاحب نے اُن کو ہر ایک آفت اور حملہ سے بچایا۔ اس کے صلہ میں ہم کو سرکار سے جاگیر یا انعام ملنا چاہیے۔ مولانا یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ میں نے اپنے مذہب کے موافق اس وقت تمھاری حفاظت اور حمایت کرنی ضروری سمجھی تھی سو اُس کے موافق عمل کرنا میرا فرض تھا۔ میں یا میری اولاد ہرگز اس کا عوض تم سے یا سرکار سے نہیں چاہتی۔ تم اس کا خیال نہ کرو۔ یہ سن کر وہ افسر نہایت ادب اور تعظیم سے مولوی صاحب کو سلام کر کے رخصت ہو گیا اور مولوی صاحب چند روز کے بعد باقی پت چلے گئے۔ مولانا مرحوم کے شاگردوں اور مستفیدوں اور مترشدوں کی تعداد دائرہ حصر و احصا سے باہر ہے۔ یہاں تک کہ اُن

کے بعض جلیلی القدر شاگرد عرب میں بھی موجود ہیں۔ اذان جملہ مولوی حبیب الرحمن سندھی جنگالی تریل مدینہ جو ایک مدت کے مدینہ طیبہ میں رہتے ہیں اور جن کا مقام مدینہ کے علما و مشائخ ادب کرتے ہیں مولانا مرحوم کے ارشد تلامذہ ہیں۔ اسے ہیں اور ان کا شیخ ہونے کی وجہ سے وہاں کے علما باوجود عدم ملاقات بھی مولانا مرحوم کا نہایت ادب اور تعظیم کرتے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ پانی پت ایک ایسے بزرگ سے خالی ہو گیا جو نہ صرف اہل پانی پت کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے باعثِ فخر تھا اور جس کا مثل آئندہ زمانہ میں پیدا ہونا محالاتِ عادیہ میں سے معلوم ہوتا ہے۔

فَمَا كَانَ قَبَسًا مِّنْ نَّارٍ هَلْكَ هَلْكَ وَاحِدٌ وَالْعَيْنُ بِشَيْءٍ قَوْمٌ تَهْلِكُوا

یعنی قیس کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہ سمجھو بلکہ وہ قوم کی بنیاد بھی جو گر گئی۔

یہ ایک بات عجیب ہے کہ مولانا مرحوم نے انتقال سے تین چار ہفتے پہلے جامع مسجد میں جو درس فرمایا تھا۔ اس میں زیادہ تر موت کے مسائل یعنی تجزیہ و تحلیل اور غسل میت وغیرہ تشریح کے ساتھ بیان فرمائے تھے۔ یہ گویا آخری وعظ تھا۔ اس کے بعد پھر نہ بت وعظ کی نہیں آئی۔

مولانا مرحوم کی ایک سترہ عادت یہ بھی تھی کہ اپنا درس ہمیشہ اس کلمہ پر ختم کرتے تھے "باقی بیان انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ ہوگا" لہذا اس آخری وعظ میں بھائے اس کے یہ فرمایا کہ "باقی بشرطِ زندگی آئندہ"

عزیزی حافظ اخلاق حسین سلمہ اللہ تعالیٰ برادرِ زادہ <sup>رحمہم اللہ</sup> فرماتے ہیں کہ مولانا مرحوم کے شاگردوں اور محققوں میں سے ہیں مولانا مرحوم کی تاریخ وفات قرآن مجید کے اس جملہ سے کہ لَعَنَ اللَّهُ أَجْمَعِينَ نکالی ہے جس کو الہام کہنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہ جملہ متبرکہ ضرور بالضرور مولانا مرحوم کی قبر پر کندہ کرنا چاہیے۔

(عطیہ محمد اسماعیل پانی پتی)

مولانا حاتی کی ایک بے نظیر غیر مطبوعہ کتاب

# اصول فارسی

(پیش کردہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

حضرت شمس العلماء مولانا لطافت حسین حاتی پانی پتی کے بہت سے نادر و نایاب تہذیبی تہذیبات میں سے نادر و نایاب کی تلاش و جستجو کے بعد فراہم اور جمیائے کتب نے جن میں سے بہت کافیا حصہ تو کتب خانہ کی قیامت خیز آندھی اور ہلاکت آفریں طوفان کی نذر ہو گیا۔ جو بہت ہی غنور و اسما حصہ میرے لڑکے محمد احمد اور مبارک محمد و پانی پتی سے مشکل بچا کر لے آئے تھے۔ اُس میں سے ایک نہایت دلچسپ مضمون ”تذکرہ رحمتیہ“ کے عنوان سے یہ نقوش کے بیچ سالہ قریب میں ہدیہ ثنائی بن کر چکا ہوں۔ کمری محمد طفیل صاحب مدیر نقوش کے اصرار پر آج حضرت مولانا مرحوم کا ایک اور علمی تبرک فاروقی نقوش کی خدمت عالی میں پیش کر رہا ہوں۔ مولانا نے آج سے ۸۵ برس پہلے ۱۲۷۷ھ میں اصول فارسی کے نام سے فارسی صرفت و نحو کے متعلق ایک بسیط اور مفصل کتاب اردو میں لکھی تھی۔ جو نہ مولانا کی زندگی میں زیرِ طبع سے آراستہ ہو سکی اور نہ مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے گرامی قدر فرزند حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب نے اُس کی طباعت کا خیال فرمایا۔ اور وہ اُن کے خانی کتب خانہ میں اُن کے محترم والد کی دوسری نایاب کتابوں کے ساتھ محفوظ رہی۔ ۱۹۷۹ء میں اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔ چونکہ حضرت خواجہ صاحب مرحوم کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لیے مکان بند پڑا اور یہ علمی تبرکات الماریوں میں مقفل رہے۔ ۱۹۸۰ء کے ہنگامہ میں پرنسپل کمرکان مذکور ٹسٹ کیا یا محفوظ رہا۔ اور ان تبرکات کا کیا حشر چلا۔ اور یہ نایاب کتاب اس وقت کہاں ہے اور کس کے پاس ہے؟

میں نے ۱۹۸۱ء میں حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب کی لاٹری میری سے لے کر اس علمی کتاب کا ویسا چہ اور عوایدات و مندرجات کتاب کی نہرست نقل کی تھی۔ جو آج پہلی مرتبہ ناظرین نقوش کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کمری محمد طفیل صاحب کے حوالے کر رہا ہوں۔ تمام کتاب حضرت مولانا حاتی کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ تحریر بہت خوشخط اور صاف ہے۔ میں اسطورہ رکھنا کھلا ہے۔ فی صفحہ ۱۵ سطریں ہیں اور فی سطر چھ یا پندرہ لفظ ہیں۔ کتاب کا سائز قلمی مسکپ ہے۔ اور کتاب میں کہیں داغ و جہ نہیں۔ اہمیت کا غدہ میلا ہو گیا ہے اور کتاب کو مع جلد کے کیرے سے جگہ جگہ سے کھالیا ہے۔ جلد بہت بوسیدہ ہے۔ کتاب کی تہید ۹ صفحات میں آئی ہے۔ اُس کے بعد علم صرف کا حصہ ۲۲ صفحات میں مولانا نے لکھا ہے۔ بعد ازاں علم نحو کا بیان ۲۶ صفحات میں ہے۔ یعنی کل کتاب کے (۹ + ۲۲ + ۱۲۶) = ۱۵۷ صفحات ہیں۔ تمام کتاب کالی سیاہی اور نیزے کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔

اس کتاب کا تصارف ناظرین کرام سے کراتے ہوئے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ چونکہ کتاب مذکور آج سے قریباً ستواہر س پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ لہذا آج کل کے رسم الخط میں اداس وقت کی طرز کتابت میں کچھ فرق ہے۔ مثلاً کتاب مذکور کے مسودہ میں :-

۱۔ ہر جگہ بجائے ”چونکہ“ کے ”جو کہ“ لکھا ہے۔  
۲۔ ساری کتاب میں کہیں ڈیش نہیں۔ اور نہ الگ الگ پیرے ہیں بلکہ مضمون مسلسل چلا گیا ہے۔ جہاں مولانا کو بیافزہ شروع کرنا ہو۔ وہاں علامت (—) بنا دیتے ہیں۔ مگر یہ علامت کتاب مذکور میں اکثر جگہ بغیر نئے فقرہ کے بھی بعض الفاظ پر لکھی ہوئی ہے۔

۳۔ ”انکی۔ اُسکی۔ اُن۔“ وغیرہ الفاظ کو بالعموم اس طرح لکھا ہے ”اونکی۔ ادسکی۔ ادس۔ ادن“ وغیرہ۔  
۴۔ تمام کتاب میں ٹون ختمہ کا استعمال کہیں نہیں کیا گیا۔ ہر جگہ پورا لکھا ہے مثلاً ”ہیں۔ زبانیں۔ نہیں“ وغیرہ کو ہمیشہ ہیں۔ زبانیں۔ نہیں لکھا ہے۔ یعنی لفظ ٹون میں فقط ضرور دیا ہے۔

۵۔ جہاں کتاب میں ”ٹ“ آئی ہے اس کو ہمیشہ اس طرح لکھا ہے ”ٹ“  
۶۔ یاٹے مجموعہ کو بالعموم یاٹے معروف لکھا ہے۔ مثلاً ”نے۔ جتنے۔ ہے۔ کو“ ”نی۔ جتنی۔ ہی“ تحریر کیا ہے۔  
۷۔ حرف گ کو ساری کتاب میں ک کی طرح لکھا ہے۔ مثلاً اگر کو اگر۔ گورنٹ کو کو۔ نرٹ لکھا ہے۔  
۸۔ ”پینچھے۔ لکھی“ وغیرہ الفاظ کو ہمیشہ ”پینچھے۔ لکھی“ وغیرہ لکھا ہے۔ صرف ایک جگہ ”پارسی کھلانے لگی“ کی بجائے ”پارسی کھلانے لگی“ لکھا ہے۔

۹۔ ساری کتاب میں مجھے کہیں اضافت کی علامت یعنی زیرِ نظر نہیں آئی ہیں زیرِ نظر پیشکش میں مولانا کی اس تحریر کو بعینہ اُسی شکل میں بدینہ ناظرین کرام سے رسم الخط کے ساتھ مولانا نے اُسے اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا تاکہ آج سے قریباً سوہر س پہلے کی طرز کتابت سے بھی قارئین کرام روشناس ہو سکیں۔ وہ ہو ہذا :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## تمہید مطالب کتاب

خدا تعالیٰ فی جس طرح نہر ملک اور ہر ولایت میں نئی صورت اور نئی وضع اور نئے ڈھنگ کے آدمی بنائے اس طرح ہر ملک کے آدمیوں کو نئی بولی اور نئی زبان عیایت کی دیکھو عرب کی زبان اور ہے عجم کی زبان اور ہندوستان کی زبان ان دونوں سے جدا ہے انکسٹانی کی زبان تینوں زبانوں سے نہیں ملتی اسی طرح جتنی ملک ہیں اتنی ہی بولیاں ہیں اور ظاہر ہی کہ آدمی مدنی الطبع یعنی ہر کام میں آدمیوں سے میل جُزل اور کہیں دین کرنے کا محتاج ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دنیا کے معاملات کا مدار زبان کے سمجھنے اور سمجھانے پر



بھی پس آئی جس قدر زیادہ زبانیں جانتا ہوگا اسی قدر اس کے معاملات آسانی سے سرانجام ہونگے اور زبان کا جاننا ایک تو یہ ہے کہ انسان جس ملک میں پیدا ہوا اس ملک کی بولی اپنے ماں باپ اور نائے رشتے والوں سے اور پھر ہر ایک کی زبان سے سنتے سنتے تھان کیا اور ضرور اس کے وقت اپنے دل کے مطلب اس بولی میں ادا کرنے لگا اور دوسرے یہ کہ اس زبان میں جو خواص کا محاورہ اور بول چال ہے اس کے موافق قربر اور بھیر کر سیکے سو بہ بات بدوں اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ اہل زبان نے جو اصول اور قواعد اس زبان کے تہذیب اور اصلاح کے لیے مقرر کیے ہیں اور نئے واقعات اور فکر بالعرض اپنی زبان کی تقریر اور تحریر میں اور اصول اور قواعد کے جاننے کا محتاج نہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ دوسرے ملک کی زبان بدوں واقفیت اصول کے ہرگز نہیں آ سکتی جو کہ ہماری کورنٹ کی ہمت عالی اسباب میں بہت معروف ہے کہ جو زبانیں ہندوستان میں رائج ہیں یا جن زبانوں کی کتابیں ہندوستانیوں کی درس و تدریس میں مستعمل ہیں اور اصلاح بخوبی کی جائے اور ان کے اصول اور قواعد ایسے طور پر لکھے جائیں کہ ہر ملحد یہ ادنیٰ توجہ اور قواعدوں کے ذریعے سے اور زبانوں میں تقریر اور تحریر کا سلیقہ پیدا کر سکے اور ایک اشتہار جو کورنٹ پنجاب و ام اقبال نے عیسوی میں جو عدہ انعام جاری فرمایا ہے اس کا عمدہ مطلب یہ ہے کہ زبان فارسی کے اصول اور زبان میں عبارت روشن و واضح کئے جائیں اس لیے خاکسار پیچیدہ ان لطافت حسین انصاری پانی پتی خدا فعلانی کے بہرہ سے پر اس امر کا مقصدی ہوا ہر چند محکم اپنی اور پیچیدہ فی سے نوح بنین کہ میری تالیف حضور کورنٹ و ام اقبالہ میں پسندیدہ اور مقبول ٹھہرے لیکن اس رسالہ میں چند خصوصیات ایسی اصول فارسی کے اگلی کتابوں میں سے کسی خاص کتاب میں شاید نہ پائے جائیں ایک یہ کہ اگلی کتابوں میں لوگوں نے جو زبان فارسی کے لکھے ہیں اور ان میں صرف و نحو کے اصول کو باہم ایسا مخلوط کیا ہے کہ صرف کے مسائل نحو کے مسائل سے ہرگز ممتاز نہیں ہو سکتے بلکہ یہ معہ ہوتا ہے کہ صرف و نحو ایک فن ہے فن کا نام ہی حالانکہ صرف ایک جدا فن ہی بخود جدا فن صرف میں مثلاً ایک حرف کا دوسرے حرف سے جانا اور مصدر کے خفیہ قرار مصدروں کے وزن اور فعلوں کی قسمیں اور اشتقاق کی کیفیت اور ابدال و اسکان و تخریک و قلب و جذب و اشتباہ و اتمام و تخفیف و اشتباہ و اتمام کی بحث اور اسموں کے تغیرات لفظی کا بیان کیا جاتا ہے اور نحو میں مثلاً کلموں کی دینے کا دستور اور اجزای کلمہ کے حالات اور اسناد اور اضافت و صفت و مطلق و تاکید و بدل و مبتدا و خبر و فعل و فاعل و نائب فاعل مفعول و متشبی و تاکید و ترکیب ناقص و ترکیب تام اور حرفوں کے استعمالات معنوی کا بیان کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں بحثیں جدا جدا بیان کرنی منفعت سے خالی نہیں سو اس کتاب میں صرف کی بحث نحو کے بالکل جدا ہے۔

دوسرے اگلی کتابوں کی ترتیب مفید نہیں یعنی جو باتیں پہلے لکھنی ہیں وہ ادن میں پیچھے لکھی گئیں اور جو پیچھے لکھنے کو پہلے لکھی گئیں اور ظاہر ہے کہ حسن ترتیب کو مطالب کے دلچسپی کرنے میں بڑا دخل ہے سو اس رسالے میں رعایت ترتیب کی بہت رہی ہے۔

تیسرے اصول فارسی کی اگلی کتابیں جو رائج ہیں اور ان میں نحو کے اکثر مطالب نہیں بیان کئے گئے اور خاکسار نے حتیٰ الامکان مطالب نحو کو جمع کرنے میں تصور نہیں کیا۔

چوتھے اصول کا لفظ کئی قہنوں کو شامل ہے صرف نحو معانی بدیع سو جب تک کتاب میں یہ سب فنوی بیان نہ کیا

کتاب نامہ ہے حالانکہ اکی کتاویں ہیں کوئی رسالہ ایسا نہیں دیکھا گیا جو ان پانچوں فنون کو شامل ہو اور سارا عبد الواسع ہانسوی اور شجرۃ الامانی اور نہر الفصاحت وغیرہ میں جو ان فنون کا کچھ کچھ ذکر ہے وہ کافی نہیں اس رسالہ میں یہ پانچوں فن اپنے نزدیک اچھی طرح بیان کئے گئے ہیں ان کو جو باقیں سرمدی نہیں سمجھیں یا جن کا بیان کرنا اولیٰ تھا اور مبتدیان کا فہم دل کے بچنے سے فاسد سمجھا گیا وہ باقیں البتہ چھوڑ دی گئیں۔

پانچویں اکثر استادوں کے شعر جو بطور سند کے لائے جاتے ہیں بعضے اول میں سے دقیق ہوتے ہیں اور اول کے بچنے بغیر قاعدہ طالب علم کے سمجھ میں نہیں آتا سو خاکسار نے ایسے شعر نکال کر جو کر کے اس کا مطلب روشن اور واضح کر دیا ہے چھٹے ہر فن کے آخر میں تھوڑے تھوڑے سوال اوسی فن کے لکھ دیئے ہیں اور اول کا جواب نہیں لکھا تا کہ پڑھنے والوں کو اول کے دیکھنے سے بصیرت حاصل ہو اول کے امتحان میں جسے کام آئیں۔

اگرچہ میں خوشہ چین انہیں بزرگوں کا ہون اور اسکے تالیفین اور تصنیفین ہوتیں تو بیشک بلکہ کتاب کہنی بہت دشوار ہوتے بلکہ شاید دیکھ سکتا لیکن دستور یہ ہے کہ جس کام کی طرف سلطان وقت کی توجہ ہوتی ہے وہ کام حد کمال کو پہنچتا ہے اور جرات کوئی اہل علم اپنے دل کی آواز سے کرتا ہے اوس میں کچھ کچھ نقصان رہ جاتا ہے ظاہر ہے کہ کورنٹ کے اختلال امر کے لیے جو اس زمانے میں لوگ سعی و کوشش کر رہے ہیں وہ اکلون نے کامیابی کی ہو کیوں کہ سلطانین ماضیہ نے اصول فارسی کی تہذیب کی طرف توجہ نہیں کی۔

تنبیہ پارس جو ایک ولایت کا نام ہی سو وہ پارس بن ہیلو بن سام بن نوحؑ کی آبادی ہوئی ہے اس سبب سے اوس کو پارس کہتے ہیں جو زبان کہ اوس ملک میں رائج ہوئی وہ پاری کہلانے لگی اور اوسکو فارسی کہتے ہیں فارسی زبان کی کئی قسمیں ہیں درہی پہلوی پارسی ہر وہی سکھتی زاوکی سُغدی۔ درہی کو بعضے کہتے ہیں کہ بہمن اسفندیار کے درباریوں کی زبان ہے اور بعضے کہتے ہیں کہ کیا نیوں کے دربار میں بولی جاتی تھی اور بعضوں کے نزدیک درہی وہ زبان ہے جو وہ کہہ کے رہنے والے بولتے تھے اوس میں کسی غیر زبان کا ملاؤ نہ تھا بہر حال یہ زبان بہت فصیح گئے جاتی تھی پارسی اوس زبان کو کہتے ہیں جو خاص بلاد پارس میں رائج تھے پہلوی کو بعضے کہتے ہیں کہ ولایت ریب اور اصفہان اور ہمدان اور دینور اور اوس کے مضافات کی زبان تھی اور جو کہ اس ملک کو پہلو کہتے ہیں اس لیے وہ ان کی زبان کو پہلوی کہنے لگے اور بعضی کہتے ہیں کہ پہلو پارس بن سام بن نوح کے باپ کا نام تھا یہ زبان اوس کی طرف منسوب ہے بہر حال یہ تینوں زبانیں رائج اور مستعمل رہیں اور باقی چار زبانیں ترک کی گئیں جب سے علم میں اہل اسلام کی حملہ آوری آئی عربی زبان کے لغت فارسی میں مخلوط ہو کر ایک نئی زبان بن گئی جیسے ہندوستان کی تہذیب ان فارسی اور عربی کے ملنے سے بالکل بدل گئی۔

اب جاننا چاہئے کہ فارسی زبان کی ایسی معرفت جس سے آدمی فصحاۃ اہل زبان کے طور پر تقریر اور تحریر کر سکے اور لکھ سکے استعمال کرنے میں اردو کلام کے ترکیب دینے میں غلطیوں سے محفوظ رہ سکے کئی باتوں کے جاننے پر موقوف ہے اول لغت اور اصطلاحیں اور محاورے و دوسریے اشتقاق اور صرفت کے اصول تعمیر یہ نظم کلام کا دستور چوتھے حسب مقتضای حال کشمکش کرنے کا طریقہ پانچویں ایک مطلب کو نئے نئے اسلوب سے ادا کرنے کے قاعدے چھٹے یہ بات کہ بعد رعایت فصاحت و بلاغت کے کلام میں کئی باتوں سے حسن و خوبی زیادہ ہو جاتے ہی۔

انہیں سے پہلی بات برہان قاطع اور فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ رشیدی اور فرہنگ سرمدی اور مدارالافاضل اور مؤید الافضل

اور ہمارے علم اور معلومات و ارسنہ اور سلاح اللغۃ اور سوا انکے اور لغت کی کتابوں سے طلب کرنی چاہی اور باقی پانچ مقدمے اس درجے میں انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد اور شرح کے ساتھ بیان کئے جائیں گے اور اس سوا سطر اس کتاب کے پانچ حصے کئے گئے۔

**پہلا حصہ علم صرف کے بیان میں**  
مقدمہ صرف کی اصطلاح کے بیان میں  
پہلا باب حرفوں کے بیان میں  
دوسرا باب مصدر اور مشتق کے بیان میں  
تیسرا باب جامد کے بیان میں  
خاتمہ سوالات علم صرف میں

**دوسرا حصہ علم نحو کے بیان میں**  
مقدمہ نحو کے اصطلاح کے بیان میں  
پہلا باب اسموں کے بیان میں  
دوسرا باب فعلوں کے بیان میں  
تیسرا باب حرفوں کے بیان میں  
چوتھا باب مرکب ناقص کے بیان میں  
پانچواں باب مرکب تام کے بیان میں  
خاتمہ سوالات علم نحو میں

**تیسرا حصہ علم معانی کے بیان میں**  
مقدمہ علم معانی کی اصطلاح کے بیان میں  
پہلا باب اسناد خبری کے بیان میں  
دوسرا باب مسند الیہ کے بیان میں

تیسرا باب مسند کے بیان میں  
چوتھا باب فعل کے متعلقات کے بیان میں  
پانچواں باب قعر کے بیان میں  
چھٹا باب انشاء کے بیان میں  
ساتواں باب فصل و وصل کے بیان میں  
آٹھواں باب ایجاز و اطناب و مساوات کے بیان میں  
خاتمہ علم معانی کے سوالات میں

**چوتھا حصہ علم بیان میں**  
مقدمہ علم بیان کے اصطلاح کے بیان میں  
پہلا باب تشبیہ کے بیان میں  
دوسرا باب استعارہ کے بیان میں  
تیسرا باب مجاز و مرسل کے بیان میں  
چوتھا باب کنایہ کے بیان میں  
خاتمہ علم بیان کے سوالات میں

**پانچواں حصہ علم بدیع کے بیان میں**  
مقدمہ علم بدیع کے اصطلاح کے بیان میں  
پہلا باب صنائع معنوی کے بیان میں  
دوسرا باب صنائع لفظی کے بیان میں  
خاتمہ علم بدیع کے سوالات میں

# تقریب

مولانا محمد علی جوہر

۱۹۵۷ء کی گرمیوں میں جبکہ میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شرکت علی کے ساتھ جموں نے ہی سال انٹرنس دیا آج کل کی اصطلاح میں میٹرک کمیشن کا امتحان پاس کیا تھا، بریلی کے اسکول سے ملی گڈز کے درستیہ العلوم میں پڑھنے کے لیے آیا، میرے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب کو بہر غالباً ہم سے پہلے ہی ملی گڈز آچکے تھے۔ اس "نیچر گڈز" میں تقریباً سبھی طلباء کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیروانی، اچکن، ترکی ٹوپی، سیدھا حلیہ، ڈھالا جامہ، قمیض، جراب، انگڑی، جو تاجی سب کا لباس تھا۔ کوئی شیروانی کی جگہ ترکی کوٹ پہنا کرتا تھا، ترکی ٹوپی کی جگہ کوئی سیاہ ایرانی ٹوپی اوڑھتا تھا، کوئی کبھی کبھی گڑنا بھی پہن لیا کرتا تھا مگر مڑھیاں سوائے ایک آدمی کے سب کی منڈی ہوتی ہوئی تھیں، گورنگھوں کے بھی صفایا کرانے کا فیشن اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا، ہال سب کے آگے سے بڑھے ہوئے تھپے سے بند رنج زیادہ کترے ہوئے ہوتے تھے جو آج سارے ہندوستان میں رائج ہیں اور جنھیں ولایت تک کی عزتوں نے اسی طرح کتر دانا قبول کر لیا ہے اور جو "ایٹن کراپ" کے نام سے موسم ہیں لیکن جس کی باریک میں ہم نہیں بھائی رہتے تھے اسی کے پاس والی کچی باریک میں اور اس بیچ والے کمرے میں جہاں ایک موصد سے "ٹول ڈاؤس" بن گیا ہے ایک دروازہ قامت مگر خاصے ڈبے پہلے صاحب رہتے تھے جو خاص ہندوستان کی چرائی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے، جن کی ٹوپی ان کے وطن اردو ہند کی ساخت کی کشتی نامہ ہوتی تھی جس کو اب "کانڈی کیپ" کہا جاتا ہے، جن کا جو تاجی کا سلیم شاہی وضع کا سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لائے تھے اور اگرچہ "بردوش" نہ تھی لیکن "تاجا گوش" ضرور آتے تھے تاکہ ان لمبے بالوں کے باعث اچکن تبدیل وغیرہ کا دھبہ نہ پڑ جائے، وہ گردن میں ایک سفید خاصے کا رومال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سر سید رحمۃ اللہ علیہ اپنے گلے کی رسولی چھپانے کے لیے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اس زمانہ کے بزرگوں کی اس وقت تک باقی تھی لیکن ملی گڈز جیسے "نیچر گڈز" کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ ناپا تھا جتنا کہ کسی یورپین لڑکی کا آج بڑے ہال رکھنا، نیچا سایہ پہننا اور گردن باندھنا اور ہاں سب کو کپڑے سے ڈھانپنا ناپا اور

۱۔ اردو ہند (ای۔ پی۔) کی کشتی نامہ ساخت کی ٹوپی اور گاندھی کیپ میں نمایاں فرق یہ تھا کہ گاندھی کیپ نو عمر تا سپید کھد کی ہرتی تھی اور اردو ہند ساخت کی ٹوپی ریشم اور کلاتون کی کڑھی ہوتی تھی۔

اس لیے میری نظر بھی آئے تھے ہی ان بزرگ پڑی اور اگر انھیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ ملے جی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس مجید و عزیز قطع کے بزرگ کون ہیں لیکن محمد اور صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور برآمدی جو سماعت ملی اور جس میں محمد حبیب علی گڑھ صاحب، احمد حبیب مرحوم، تقیم بیگ صاحب چغتائی جیسے علماء شامل تھے۔ اس کے سرواڑی پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر بیسیوں ممتاز ترین طلبہ کا مجمع رہا کرتا تھا جن میں بڑے بھائی ذوالفقار علی خان کوثر بھی ہوتے۔ تھے۔ حیدر آباد کے ممتاز افسر مال قطب الدین صاحب دہلوی (مٹا) بھی ہوتے تھے۔ چودھری ممتاز بیگ صاحب بھی ہوتے تھے اور جیبا کوٹ کے ایک صاحب جن کا نام ذوالا احمد معظم صاحب تھا اور بوڑنگا کے باہر اپنے والد بزرگوار خان بہادر سید زین العابدین صاحب کی کوٹھی پر بستے تھے سید زین الدین بھی بہرہ روز میں آیا کرتے تھے۔ ان ممتاز طلبہ کی سماعت کے پاس ہی رہنے سے خوش بھی تھا۔ نیکو سا لڑکی سا ننگ بھی آگیا تھا کہ وہ ان حضرات کو ہی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے گدگی بھگتی ہے اور مجھے پھر گریہ کر گدگایا کرتے تھے۔ مولانا طفیل احمد صاحب اور

۱۔ یعنی خان بہادر محمد حبیب اللہ خان صاحب بی۔ اسے (علیگ) سا بنی کلکٹریہ۔ بی جنھوں نے مدت العمر اپنے مادر علمی کی پیش ہا خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی اس پرانے سالی میں انجام دے رہے ہیں اور ملی گڑھ ہی میں مقیم ہیں۔

۲۔ احمد حسین بی۔ اسے مرحوم شمس الدین کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۶ء میں بی۔ اسے پاس کر کے ریاست رام پور کے اسٹیٹ لانی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے اور صدر ہوا انتقال ہو گیا۔

۳۔ مرزا تقیم بیگ چغتائی بی۔ اسے (علیگ) اگرہ کے رہنے والے ۱۸۸۵ء میں کالج میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے ۱۸۸۹ء میں بی۔ اسے پاس کر کے اول ملی گڑھ کے ایک کلکٹر کینیڈی کے جس کی آنکھیں خراب تھیں پرنسپل آسٹنٹ ہوئے پھر جی میں مترجم ہو گئے اس کے بعد اگرہ کالج میں وائٹن ہوئے اور پھر اتفاق سے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ خان بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ آخر میں جو چوہدری بھی ہے۔ بڑے لطیفہ گو تھے۔ ان کے کئی بیٹے تھے جن میں مرزا تقیم بیگ چغتائی نے ادبیات و افسانہ نویسی میں بڑی شہرت حاصل کی۔

۴۔ یہ قادیانی فرقہ میں شامل ہو کر قادیان میں بھی مقیم رہے۔ ان کے ہم عصروں کا قول ان کے بارے میں ہے کہ بڑے لغو گو تھے۔ یہ دہلی کے نہیں بارہ بنگی کے رہنے والے تھے ۱۸۸۵ء میں کالج میں آئے اور ۱۸۹۱ء میں بی۔ اسے کیا۔ ابتداً فوج میں ملازمت کی پھر ریاست حیدر آباد میں تعلقداری کا عہدہ ملا اور افسر ہوا رہے۔

۵۔ چوہدری ممتاز حسین ولد علی بخش خاں ساکن پانی پت۔ ۱۰ جون ۱۸۸۵ء کو داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں انٹر میڈیٹ کر کے ماسٹر تحصیلہ پھر تحصیلہ اور ہوئے۔ کچھ عرصہ ریاست دو جہانہ میں شیخ بھی رہے۔

۶۔ مولوی احمد معظم جامی ساکن چنڈا کوٹ، علی گڑھ سے جا کر حیدر آباد میں کسی منصب پر فائز ہوئے۔

۷۔ خان بہادر سید زین العابدین مرحوم سرسید کے اصحاب خاص میں تھے۔ علی گڑھ میں عرصہ تک سب جج رہے۔

۸۔ مولانا طفیل احمد مرحوم ۱۸۸۹ء میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں فوراً ایسے آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوئے طبیعت کی یکسانیت کی وجہ سے ماڈر صاحب سے ان کے بڑے گہرے تعلقات مدت العمر تک رہے۔ کالج دیر نیو رٹلی و کانفرنس کی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ (جہاں)

داؤد صاحب تو اس قدر قطع اور سنجیدہ بزرگ تھے کہ وہ کسی کو کیا دینی کہنے کے علاوہ صاحب اللہ خاں صاحب، قسیم بیگ صاحب اور پیر علی صاحب جیسے بے حد پیشانی کیا کرتے تھے۔ ایک میرے دو دنوں کے بعد پڑھتا دوسرا دونوں ٹانگیں، صاحب میں اس طرح "پادست نگرے دست پادست نگرے" ان زندان باصفا کی صحبت میں گرفتار ہوتا تو تیسرا ہیٹ میں لگا دے گی گزرا وہیں قیاس ہو جایا کرتا۔ اس کے بعد دوسری پریشانی نے اس قدر تنگی کی کہ حبیب اللہ خاں صاحب مجھے دو ہی سے دیکھتے تو اس طرح اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے کہ گویا مجھے گدگد کر رہے ہیں اور میں دوری سے قیاس ہونے لگا۔

اس زمانہ میں یونین کے افسروں کا انتخاب ہوا اور چونکہ اس وقت تک اسکول کے طلبہ بھی یونین کے ممبر ہو سکتے تھے ہم بھی انتخاب میں رائے دیجے تک عرض سے ممبر بنے گئے اور مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے بھی داؤد صاحب کی پوری پارٹی کے جیسے باطل اسی قدر گئے تھے اور بیگ صاحب خوش خوش پھر رہے تھے کہ یونین کی آمد نے بھی طبعی اور خیر اسی وجہ سے سہی نے ممبر تو داخل ہو گئے اس سال غالباً مئی مہینہ صاحب (جہاں بے مشورہ) کے اس عزم کے لیے کالج کے کورس کا یہ شعر گھڑا گیا تھا۔

عجب ہے بھنگ کا پیالہ ادا لا ادا ہو رہا

ہوا بھنگ کا منہ کالا ادا لا ادا ہو رہا

وائس چیمبرلنٹ اور محمد داؤد صاحب کی ٹی مٹھ بڑے۔ دوسرے سال احمد حسین صاحب مرحوم اور حبیب اللہ خاں صاحب ان جہدوں کے لیے منتخب ہوئے اور غالباً تیسرے سال سید زین الدین صاحب مرحوم اور ملا شوکت علی۔ یونین نے ایک نظم کے لیے انعام کا بھی اعلان کیا تھا اور جن دو لکھوں کے لکھنے والوں میں مقابلہ تھا ان میں سے ایک گورکھ پور کے محمد اقبال صاحب عرف "بخار" مرحوم نے بھی لکھی اور ایک اس خاکسار نے اور غالباً کسی کو یہ یمن کر تعجب نہ ہو گا کہ انعام "بخار" صاحب ہی کے حصہ میں گیا اور ہم یوں ہی رہ گئے اور مولانا شبلی مرحوم کی خندانی پر ایک حوصلہ تک بے حد تک کرتے رہے کیونکہ انعام کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔

شعر میں جس شخص کے لیے جاتی کم عمری میں بقول غالب خود خواہش کی ہو کہ اگر دو فن "اد" وہ بھلا داؤد صاحب پر کس طرح عاشق ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہو گیا ہو کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فن تھا۔ میں نے سنا تھا کہ جو دھری فقار حسین صاحب کو آج کل کے کلکٹر

لے سید زین الدین ایم۔ اے (علیگ) ابتدا میں کلکٹر ہونے پہر کلکٹر ریشا ہو کر ریاست رام پور میں ریونیو فٹر ہے۔ شروع شروع میں بڑے فیشن لبل تھے آخر میں اعلیٰ مذہبی کے حدود پر پابند صوفی منش ہو گئے تھے۔

کلکٹر مسٹر ٹی بیگ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۹ء تک کالج کے پرنسپل رہے۔

کلکٹر علی گڑھ کالج کی مشہور ترین کانام "سٹڈنٹ یونین" ہے جو سٹڈنٹس راجیڈ ماسٹر ۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۴ء کے عیثیٰ بن ہونے کے بعد شریک تھے ان کے نام سے قائم کی گئی۔

۱۸۷۸ء جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج میں داخل ہوئے ۱۸۷۸ء میں بی۔ اے کے پہلے نائب تحصیلدار پھر کسٹمر اسپیکٹر اور بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔  
۷ محمد اقبال مرحوم ولد نور الحق ساکن پھلی شہر ۳۳ جون ۱۸۹۰ء کو فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے تھے۔ (عباسی)

سید زین الدین صاحب کے ساتھ خاص الفت تھی مگر زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء میں نان کو آپریٹوں پر ظلم کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں جو دھری صاحب پر یہاں تک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بچا رہے جو دھری صاحب نے خود کشی کی ٹھانی لی تھی۔ اس مقدمہ کو داؤد صاحب نے ایک شہری کی شکل میں منظم کیا تھا اور ۱۸۹۱ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد تھا جس میں زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سنتے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ہے۔

نہ ہوا سر دھنی نہ سر پہ بھاؤں اس پر طرہ یہ تھا کہ بنگے پتوں

اس شہری کو ہمیں بعد ازاں دیکھنا لیکن کسی نہ کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سن لیا تھا اور گویا بیٹس کے باعث اب حافظہ باطلی برآمد ہو گیا ہے لیکن الحمد للہ بچپن کے سنے سنائے شعر اب تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمد صاحب نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس شہری کو وہ پھر شائع کرا دیں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے مجھے وہ شہری دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح شہری میں اسی موقع پر جس کام میں نے اپنے حافظہ سے اوپر ذکر کیا ہے پایا۔ افسوس کہ رحمت سفر باندھنے اور ہمدرد سے رخصت ہونے اور وطن کی شادی کرنے میں اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ اس شہری کو پڑھ سکتا البتہ ”نثر خانہ جاوید“ میں جو چند غزلیں اور متفرق اشعار اور ریوسف خاں مرحوم کا مرثیہ شائع ہوا ہے ان کو پڑھ کر داؤد صاحب مرحوم کی بے تکلف لٹا سوا اور ان کے کمال متبع کا لطف اٹھایا۔ ان اشعار میں سے بھی بچپن کے حافظہ نے ایک شعر کا اندوہ مجھے حکا کیا تھا چنانچہ اس کو بھی اسی مسرت سے پڑھا ہے

پچھوٹ اور ہم سے بس اب رہنے دیجئے

ہم بھی تو رات بھانک رہے تھے دراز سے!

البتہ اب جبکہ میری عمر غالباً داؤد صاحب مرحوم کی عمر سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اس شعر کے ”معاذہ“ پر نظر پڑی تو تعجب ہوا کہ ان میں سے کچھ اور مقطع بزرگ بھی کم از کم شعر میں دراز سے بھانک سکتا تھا! اعداد نہ کرے کہ یہ شعر بھی شہری کی طرح صوبجات متحدہ کے نان کو آپریٹوں کا ایک قہرمان مسلمان کلکٹر کی نشان دہی کما گیا ہوا مگر باوجود پوری سنجیدگی کے داؤد صاحب مرحوم کی طبیعت نہایت شکستہ تھی اور مولانا حالیؒ کی ایک مشہور غزل کے مقطع پر چھپیں انھوں نے لکھی تھی اس نے تو مولانا حالیؒ تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل کے لیے صرف میرا تخلص مقطع سے نکال ڈالیں تو میں خوش میرا خدا خوش مگر نصیب بھی بلا کی تھی۔ ایک ہی مصرعہ نے مولانا مرحوم کے شعر کا مستیا ناس کر دیا، فتنے۔

پہلے یہ دیکھے وہ اس کام کے ہے بھی شبلیاں

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں

ان کو حالیؒ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں

حسن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے آؤ کے ہاں

دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

۱۔ یعنی تحریک عدم ہرالات و تعاون جو کانگریس نے حکومت کے خلاف چلائی تھی۔

(عباسی)

۲۔ داؤد صاحب مرحوم کے کل مجبوزہ کلام کو شائع کرنا مقصود تھا۔



بزرگدلی کی نشان دہی پر راؤ صاحب نے معرفت یہی ایک گستاخی نہیں کی تھی کالج میں ایک سوڑے رنگ پر نسل سے ایک ایسا بیل  
کو بوم کا غضب چلا رہا تھا۔ اس نسل کے بوم کو مولانا شبلی رحمت اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کا حشوق تھا۔ جب کالج کا گروپ ڈسکچن گرو  
بوم صاحب فوراً مولانا شبلی کی کرسی کے نیچے آکر کھڑے ہو گئے جس پر راؤ صاحب نے اسی وقت کھڑیا ہے۔

آج کا بیج نہی ہے دھوم  
علیہ کلبہ ہے ہر طرف سے جرم  
بدل اٹھی روح سعدی جرم  
کس نہ آید بیزیرا یہ جرم  
اَللّٰہُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُکَ

بیل المی روح سعدی مرحوم "کس نہ آید نیز بسایہ بوم"

آلای مولانا شعیب محمد دوم

چودھری خوشی لکھن خان صاحب کالج کے پیریٹ لارٹ "اوراپنے قد کے لحاظ سے" ٹانگ فیلو تھے اور ان کے صاحب اور وفات شعلی خاص طور سے ان کے تراج تھے مگر چودھری صاحب کو زبان پر پوری قدرت نہ تھی اس لیے کبھی نظم میں داؤد صاحب اور کبھی نہ میں عبدالحق صاحب (جو آج کل اورنگ آباد سے اردو کی خدمت کر رہے اور اس زمانہ میں کالج میں سینٹ پال کے معروف سے معروف تھے) چودھری صاحب کا فائق اٹایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب نے "تامن کی نظم" سیزنس "پڑھ کر جو ان کے کیکرل میں داخل تھی ایک نظم لکھی تھی جس پر مولانا قسلی کے مشورے آرٹلز صاحب نے انھیں ایک انعام مرحمت فرمایا تھا۔ اس میں ایک موقع پر چودھری صاحب لکھ گئے تھے کہ

ما نظر اب سیر سبزہ کر ڈالو

ناظر آپ کا تخلص تھا اور قد میں ناظر صاحب کے متعلق کہا جاسکتا تھا کہ 'انظر الی الابل کیف خلقت' اس لیے ناظر بھی کیا کہ اس مصرع کی دہاندہی جابھے جو دائود صاحب نے اس پر لگایا تھا۔

ناطقہ مصاحب فرماتے ہیں۔۔۔ ناظر اب سیر سبزہ کر ڈالو

دعاؤ و صاحب اسی پر فرماتے ہیں — اپنے آگے کی گھانسیں چھڑا لو

نواب محسن الملک مرحوم صاحب حیدر آباد حیدر ٹرک علی گڑھ چلے آئے اور وہ علیہ جو سرسید کے بڈے سے بڑے تھے اب نواب صاحب کے پاس جانے لگے اور علی گڑھ کے سدھار کھانے کی حسب دستور شکایت کرنے لگے تو نواب صاحب نے لمبی

۱۸۹۲ء میں علی گڑھ سے فرسٹ ڈویژن میں انگریزی و فارسی میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے کیا۔ صنفک یا ستمگیر میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ قومی تحریکوں بہت کچھ ہیں۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جنرل میں خاص طور سے بڑھتے تھے۔

ڈاکٹر مریضی عبدالحق صاحب (بابا شے اردو) ولد مشتعلی حسین رحمہماکں بالپر ضلع میرٹھ ۳۱ اپریل ۱۸۹۰ء کو درجہ پنجم میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں فرسٹ ڈیویشن ملی۔ اسے کیا محمد دماز تک ریاست حیدرآباد میں مسلسل ملازمت رہے اور ادنیٰ تا اہم کالج کی پریسیکشن کے زمانہ میں انھیں ترقی اردو کے خدیوہ اور زبان کی سریشیہ باغیادہات انجام دیتے رہے۔ پھر وہاں سے دہلی چلے آئے وہاں کالجی زندگی کا دور کتب خانہ اندر پریس بھی وہیں منتقل کیا جو فسادات کے زمانہ میں سب ڈکٹ لٹا گیا۔ اس بنا ہی کے بعد کہ راجی آئے اور یہاں از سر نو انھیں کا دفتر کتب خانہ پریس قائم کیا اور اردو کالج کی بنیاد ڈالی جو اب ایک اعلیٰ پایہ میں گاہ ہے۔ (عباسی)

صاحب دستور و متحرک کے بہت سے وعدے کیے، ان وعدوں سے خوش ہو کر چودھری صاحب نے فارسی میں ایک نظم لکھی جس کا کافیہ جاب "اور" مان "تھا اور مولانا شمس کے شاگرد رشید اور محبوب خاص نے اسے مولانا ہی کے انداز سے فہن میں پڑھا۔ ان کے بہت سے شاگرد آج نقل آثار کر سکتے ہیں، اسی بحر او کافیہ میں داؤد صاحب نے بھی فوراً ایک شعر لکھ دیا اور اسی انداز سے اپنے خاص حلقہ میں پڑھ کر سنا بھی دیا، وہ یہ تھا۔

محبوب تر محمد انور دینی کسند

اشتر پنجاب در ہندوستان

اب تارین کرام داؤد صاحب کے لکھتے ہوئے مصرعہ کا لطف پوری طرح اٹھائیں گے۔

ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو

اپنے آگے کی گھاس چر ڈالو

مگر جہاں تک مجھے یاد تھا اسی قسم کی ایک اور گستاخی کا نہ جملہ ضلع مظفرنگھ کے مشہور خاندان کی شان میں، داؤد صاحب نے نہیں کی تھی بلکہ وہ میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہری کی شرارت تھی۔ محمد سلیمان صاحب اس زمانہ میں بورنگنگ ماؤس کے "پراکٹر" لکھتے گو اس وقت ان کا لقب "میجر" تھا جسے وہ اس طرح لکھا کرتے تھے کہ عام طور پر طلبہ اسے "میجر" پڑھا کرتے تھے۔ مولوی سعید احمد صاحب غالباً محاسب تھے، مولوی بدرالحسن صاحب مرحوم اجماعی بدوی میرے درجہ کے استاد تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی علاء الحسن صاحب اس وقت تک طالب علم ہی تھے۔ اس خاندان کو کالج کے ساتھ شوق تھا اور متعدد متعلمین اور طلبہ اس نے کالج کو بچھنے تھے

لے یہ گوہر کی شرافت نہ تھی، داؤد صاحب مرحوم ہی کی بذلہ سمجھی تھی۔ گوہر کے کالج میں آئے اور ۱۸۹۹ء میں داخلہ لینے سے بقول خان بہادر مولوی محمد جمیب اللہ خاں صاحب برسوں پہلے سے داؤد صاحب کا یہ لطیفہ کالج میں مشہور اور زبان زد خاص و عام تھا۔ مولانا مظفر علی خان صاحب نے جو گوہر صاحب سے سا لہا سال پہلے سے کالج کے طالب علم تھے، اپنے اخبار "زمیندار" کی ایک اشاعت میں ایک موقع پر لکھا تھا۔

"محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی میں، رتہ العلوم کے ایک تمیز رشید

تھے جسے جبراً فیاض سے سخن سرائی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا، شعر و ادب پر کتنے تھے

ظرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی، اتفاقاً ایسا ہوا کہ کا نہ جملہ سے جتنے لوگ علی گڑھ آئے تھے

امام شعرانی کی سند واقع ہوئے تھے، قدرت نے ان کے جسم کو تو نہیں لیکن سر و کمر و دھڑ بھر اس

فارغ البال کر رکھا تھا، اس پر مرحوم کو ذیل کی چھٹی مصرعہ گئی جو اسی وقت کالج کے سر پر بن کر

کی زبان پر تھی۔

آتا ہے کا مصلیٰ سے جولا ہے سر پہ گئی قاروں نے راستہ میں لٹا یا خزانہ کیا

نور مولانا شمس علی مرحوم نے اپنے مضمون میں جو داؤد صاحب مرحوم کے حالات پر لکھا تھا، اس لطیفہ کو مرحوم ہی سے منسوب کیا ہے۔ (محاسبی)

مگر کالج کے ساتھ اس عشق کے ساتھ ہی ساتھ ایک خاصہ اس خاندان کا اور بھی تھا جس کو گوہر نے اس طرح باندھا تھا۔  
 آتا ہے جو وہاں سے وہ لانا ہے سر پر گنج  
 قاروں نے کاندھلے میں ٹٹیا خزانہ کیا

قاری بھی کرام کو یقیناً آتش کا مشورہ شریاد ہو گا۔

نکلا جو گل زمیں سے سر آیا وہ زربکعت قاروں نے راستہ میں ٹٹیا باخزانہ کیا  
 بیانی مشہور شعر کی غرابی کی گئی ہے اور علامہ الحسن صاحب مرحوم کی شان میں یہ تصرف کیا گیا تھا۔ محمود احمد صاحب جمہاسی کا خیال تھا کہ یہ ان کے  
 مرحوم بھائی کا تصرف تھا کیونکہ انھوں نے داؤد صاحب کو خیر و راستے پر جسے مٹا ہو گا مگر مجھے یاد تھا کہ یہ تصرف میرے بڑے بھائی نے کیا  
 تھا چنانچہ میری لڑکی کی شادی میں جب وہ تشریف لائے تو غور ان سے پوچھا گیا اور میرا حافظہ صحیح نکلا۔

۱۔ مولانا ظفر علی خان و خان بہادر محمد حبیب اللہ خان و مولانا طفیل احمد صاحب مرحوم و غیرہ جو نسبت مولانا محمد علی مرحوم کے اس زمانہ کے حالات  
 سے زیادہ واقف تھے اور ان سے دس بارہ سال پہلے سے کالج میں موجود تھے اس لطیفہ کو داؤد مرحوم ہی کی تشکلف ظہری سے منسوب کرتے  
 رہے ہیں۔ علامہ بریں گوہر صاحب کے کالج میں داخل ہونے سے بارہ برس پہلے سے کاندھل کا یہ خاندان وہاں موجود تھا۔ مولوی محمد اکبر  
 مرحوم ۱۸۷۵ء سے مولوی کے آتا دیتے اور ان کے چھوٹے بھائی محمد سلیمان مرحوم پورٹنگ کے منبر تھے۔ یہ دونوں بھائی بہت سید کے استاد  
 مولوی نور الحسن کے فرزند تھے اور مولوی نور الحسن معنی الہی بخش مرحوم ساکن کاندھل کے پوتے تھے۔ معنی صاحب نے مولانا داؤد صاحب کا ساقا  
 دفتر کھا تھا جو مولانا داؤد صاحب کے کلام کے ہم پایہ تھا۔ معنی صاحب اپنے زمانہ کے جید عالم ہونے کے باوجود بڑے سادہ مزاج  
 اور سید احمد شہید کے دست گرفتہ تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ساری عمر میں نے مذہبی علوم کو پس کیا وہ دلیا تھا سید احمد شہید سے صحبت  
 کرنے کے بعد وہ میدہ ہوا۔ بہت سید کو چونکہ اس خاندان سے ناگرو کی تعلق تھا انھوں نے کالج کی ابتدا اٹھانے کے وقت سے  
 ہی مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد سعید کو کالج میں لاکر رکھا۔ مولوی محمد اکبر کے بڑے بیٹے بدر الحسن (بھائی بدو) ۲۶ جن ۱۸۷۵ء کو کلکتہ میں  
 میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۸ء سے فروری ۱۸۹۰ء تک تعلیم چھوڑ کر کچھ سوداگروں میں مدرس رہے پھر سید محمود مرحوم کی سفارش سے منصف  
 ہوئے اور سب ججی تک ترقی کی۔ علامہ الحسن ۱۸۷۷ء میں جب داؤد صاحب مرحوم نے داخلہ لیا ہے اسکول میں داخل ہوئے اور  
 ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ سید محمود مرحوم کی سفارش پر ڈیپٹی کلکٹر ہوئے ان کے فرزند ظہیر الحسن بی۔ اے ۱۸۹۳ء میں کاندھل میں۔ مولانا  
 محمد علی نے بیٹر بھی غلط نقل کیا ہے بعض الفاظ کا رد و بدل ہو گیا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے صحیح لکھا ہے دونوں کے فرق کا اندازہ  
 اہل ذوق بخوبی کر سکتے ہیں۔ آتش کے شور شرکا پہلا مصرعہ لکھی مولانا غلط لکھ گئے ہیں۔ اصل مصرعہ ہے:

۲۔ زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سوز بکعت

اس میں تصرف کر کے داؤد صاحب نے فرمایا تھا۔

آتا ہے کاندھل سے جوتا ہے سر پر گنج

قاروں نے راستہ میں ٹٹیا باخزانہ کیا (جمہاسی)

یہ سب اس کشتے پر شے پر طوفانِ زمانہ کی یا طبعی جزا گئی اور علی گڑھ کی موجودہ تباہی پر ایک بار اور آنسو گر دلائی۔ بھلا اس کو کس طرح تو یہ کہہ سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام داؤد صاحب مرحوم کے اشعار کو خود ہی پڑھیں گے اور ان کا خلاصہ بھی میں صاحب اور دربار، بن کر یا وہ دیر تک روکنے نہیں چاہتا۔ پردہ اٹھا دیا گیا اور روازہ کھلا ہے آگے بڑھتے اور داؤد صاحب کی شگفتہ نثریں طبیعت سے ملاقات کیجئے اور ان کی روح پر نیا پڑھ جائیے۔ میں بھی دستِ بدعا ہوں اور اشک ریز، لیکن اس دیدہ نظر کے ساتھ ہی ساتھ اس وقت جو مٹوں پر پورے آئے بغیر بھی نہیں رہتا جب اس کا خیال آتا ہے جو لڑکا آج صبح شہر میں پیٹر داؤد صاحب کی بیعتِ طبع پر تعجب کرتا تھا کہ علی گڑھ جیلے مقام پر مگر وہ لائے بال رکھتے ہیں اور امر و بہر کی کشتی ناٹو پی اوڑھتے ہیں لگے ہیں رونال بانہ مٹے ہیں اور دیمی بن گئے ہیں اور وہی کا تسلیم نہ کرنا آج اس کے بال بھی ان ہی کی طرح لائے ہیں وہ بھی گاڑھے کا کرنا اچھا ہے، ایک نئی وضع کا جو تباہیوں میں ہے، واصلی لائی ہے، اب اس بھی نہیں بلکہ عیا اپنے ہوئے ہے اور علی گڑھ ہی نہیں آکسفورڈ میں پڑھ چکا ہے اور اس وقت پی ایٹھ او کمپنی کے جہاز پر صاحب لوگوں اور سیوں اور فیشن ایبل ہندوستانیوں کے درمیان "ٹوئیک" پر بیٹھا ہوا یہ تقریباً "لکھ" ہے اور سترے مرسٹریزپ کے سمت نشا کو بھی آزما دیکھنے کی غرض سے عازمِ انگلستان ہے۔

ع۔ رہے نزل میں ہیں آویں بھی کر دیکھیں

(غیر مطبوعہ)

(اعلیٰ محمد عبدباسی)

# شعر اور زندگی

ڈاکٹر یوسف حسین

آرٹ باشاعری کی جب اجتماعی توجیہ کی جاتی ہے تو ذہنی اور فکری تصورات ایسے چھا جاتے ہیں کہ انفرادیت میں نہیں اور جذبے کی جو کارفرمائی ہوتی ہے وہ نظر انداز ہو جاتی ہے۔ غالب کے کلام کو اگر صرف اس نقطہ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ مغلہ سلطنت کے زعمی آماوہ جاگیر کی نظام سے وابستہ تھے تو یہ بات یک طرفہ ہوگی۔ غالب کی انانیت ان کی شانِ امارت اور طبقاتی زندگی کا عکس سہی لیکن میر صاحب کی انانیت کی کیا توجیہ کیجئے گا جو ایک متوسط طبقے کے فروغ میں سمجھنا ہو کہ ان کی انانیت غالب کی انانیت سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس قسم کی سائنٹیفک توجیہ اکثر میکاٹکی بے جلی اور بے لطف ہو جاتی ہے۔ جس میں من مانے طور پر بندھے گئے اصول مقرر ہو جاتے ہیں جو زندگی کی پیچیدگی پر پوری طرح سے حاوی نہیں ہو سکتے۔ ان سے کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔ ممکن ہے یہ کہنا جائے کہ انفرادیت میں تخلیق اور جذبے کے نفس و فطرت بھی خارجی احوال کا عکس ہوتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جذبہ و تخیل پر خارجی حالات کا اثر ہوتا ہے اور اگر کسی شاعر کے گرد و پیش کے حالات کا علم ہو تو اس کے کلام کو سمجھنے میں ایک حد تک مدد ملے گی۔ اگر یہ حالات بدل جائیں گے تو شاعر کے تجربات میں بھی یقینی طور پر تبدیلی پیدا ہوگی۔ غلط سالی کے زمانے میں عشق و عاشقی کے مشغلے میں اگر کسی اہم جائے تو اس پر غور نہ ہونا چاہیئے۔ شیخ سعدی نے اسی نفسیاتی حکمت کی طرف نہایت بلیغ اشارہ کیا ہے۔

چنان فطرت سالی شد اندر.....

کہ یارای فراموشش کردند عشق

اس شعر میں حقیقت پسندی کہ کٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور عام طور پر انسانوں کی نفسی کیفیات کو دیکھنے والے اس کی صداقت غیر مشتبہ ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اس کی فوری جتنی ضرورت اس نفاض پر حاوی آجاتی ہے جو فوری نہیں ہے آخر الذکر کے نقوش و حندے پڑ جاتے ہیں اور اسی مناسبت سے ان کا احساس مبہم ہو جاتا ہے۔ مثلاً قحط کے زمانے میں جبلت کی ساری قوتیں روٹی کے حصول پر صرف ہوں گی۔ یا اگر کسی کو دشمن سے نبٹنا ہو جو جان کا لاگو ہے تو ایسی حالت میں جسی جبلت عارضی طور پر دب جائے گی۔ ایسا ہونا قدرتی ہے اور زندگی کی حکمت کا بھی نفاض ہے۔ ایسا ہونے کی ضرورت اس واسطے ہے تاکہ ارادے اور بیجا کی سب توانائیاں فوری مقصد کے حاصل کرنے میں موثر بن سکیں اور ایسا نتیجہ برآمد ہو

جو مجموعی طور پر زندگی کو ترقی اور فروغ دینے والا ہو۔ خارجی عالم میں زندگی کا یہ عمل لازمی طور پر انسانی پہلیے ہر ذلہ ہے جو ہمارے شعور کی سطح پر چھا جاتا ہے۔

ممکن ہے فقط سالی کے زمانے میں یاد ہوگے عشق کو فراموش کر دیں لیکن فقط کے کم ہوتے ہی وہی ہوئی خواہشوں کے چٹھے اہل پڑیں گے اور ان کی شدت معمول سے زیادہ ہوگی۔ اور غالب کا قریہ خیال تھا کہ بندہ خارجی احوال کے اگے چلے ہے وہ کیسے ہی نامساعد و بہت شکن کھوئے نہ ہوں اپنا سر نہیں بھگاتا۔ اس کے اسباب خواہش کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس شعر میں اسی جانب اشارہ ہے۔

کو ممکن گر سستہ مزدور طرب گاہ و قیاب  
بے ستوی آئینہ خواب بگرار شیریں

فارسی اور اردو شاعری میں فرغ و ایک علامتی ہوتی ہے۔ وہ انوکھا مزدور ہے۔ وہ میٹ کے لئے نہیں بلکہ عشق کے لئے مزدور ہی کرتا ہے۔ اس کے عمل نے زندگی کی معاشی تعبیر کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ غالب نے ان سب باتوں کو جاننے ہونے بھی ایک جگہ فراد کی مزدوری پر چوٹ کی ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کا عشق فراد کے عشق سے زیادہ بے لوث ہے۔ شعر ہے۔

عشق و مزدوری عشرت گاہ خسرو کیا خوب  
ہم کو تسلیم نہ کہ نامی مسرور نہیں

در اصل غالب اور شیخ سعدی کے خیال میں نضا و نہیں ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور دونوں میں اصلیت اور صداقت موجود ہے۔ بڑا مسئلہ یا حاسن فن کا اپنے تجربے میں ایک صداقت محسوس کرتا ہے جس سے زندگی کے کسی خاص رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ صداقت اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ جب کسی سطحی علم والے کے کان میں اس کی بھنگ پہنچتی ہے تو وہ اسے ایک متعل نظر یہ بنا دیتا ہے جو اس کے نزدیک قانونِ فطرت کی طرح اٹل ہوتا ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ہماری شاعری میں سیاسی اثرات کے تحت ایک خاص قسم کی حقیقت نگاری نے راہ پائی ہے اس میں شبہ نہیں کہ عشق بنان کے ساتھ فکر معاش کا مسئلہ زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ غم عشق اور غم روزگار دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ شعر زندگی کی آئینہ داری اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ اس میں قدرتی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے میں سمونے کی صلاحیت ہو۔ انسانی زندگی کے پیچیدہ نظام میں معاشی عمل کی اہمیت واضح ہے۔ اس مضمون میں بھی حاسن کی اصلیت اور صداقت اسی طرح پیدا کی جاسکتی ہے جس طرح عشق و عاشقی کے مضمون میں۔ اب تک ہمارے شاعروں نے محفلِ حسین خاں کے عیش کا ذکر کیا لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب محفلِ حسین خاں کے عیش میں کلو اور کلیان بھی بابر کی شرکت کے دعوہ دار ہیں۔ اس

لے غالب کے مدح نواب محفلِ حسین خاں الی فرج آباد کی طرف اشارہ ہے جن کی مدح میں غالب نے ایک قطعہ لکھا تھا جو پہلا شعر یہ ہے۔  
وہا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے  
بنادے میں محفلِ حسین خاں کے لئے  
کلو غالب کا خاص نوکر تھا۔ کلیان بھی ان کے ملازم کا نام ہے جو کما ر تھا۔

حقیقت کو کوئی اویسب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے غزل کے مقابلے میں نظم میں معاشی نوعیت کے مضمون زیادہ روانی اور خوبی سے ادا ہو سکیں لیکن غزل میں بھی ان کی نسبت اشارے آجائیں تو کوئی قباحت نہیں۔ لیکن ذرا اس کا خیال رہے کہ شعریت مجرد نہ ہو۔ موضوع چلے کچھ بھی ہو اگر شاعر نے اپنے حیران اور اسے شہرت کو برقرار رکھا تو اس کے کلام کا پایہ بلند رہے گا۔ جس طرح کوئی فقط حیرت نہیں جسے شعر میں نہ استعمال کیا جاسکے اسی طرح کوئی موضوع ایسا نہیں جسے شاعر نہ برت سکے۔ ممکن ہے ”شک“ نامے غزل کی نسبت نظم میں سماجی اور اخلاقی مضمون زیادہ اچھی طرح کھپ سکیں۔ اسی لئے آئندہ ہماری زبان کی توسیع اور ترقی میں نظم جو کام کرے گی وہ شاید غزل نہ کر سکے۔

سائنٹیفک تنقید کی اصطلاح پہلے بہت کچھ سننے میں آ رہی ہے۔ اس سے غالباً مراد وہی ہوگی کہ خارجی احوال سے شعر و سخن کو پرکھا جائے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا خارجی احوال کے مقابلے میں اسی قسم کا رد عمل ہوتا ہے جیسے ایسا کیا۔ یہ ضرور غلط ہے۔ بعض لوگوں کو اس میں شبہ ہے کہ کیا ادبی تنقید واقعی سائنٹیفک ہو بھی سکتی ہے یا نہیں اجتماعی علوم نے بھی بڑے بڑے رد و عموماً کیا تھا کہ ہم سائنٹیفک ہیں۔ ان کے اس دعوے کا پل کھل چکا ہے۔ آج سماجیات، معاشیات اور سیاسیات یہ دعویٰ کرنے ہوئے ہیں۔ ان علوم کو اپنی نارسائیوں کا روز بروز احساس ہوتا جا رہا ہے۔ کیا معاشی اور معاشی قانون طبیعیات کے قانونوں کی طرح اٹلی ہیں۔ اس سوال کا یہ جواب ہے کہ انسانی اعمال کے محرک اور ان کی فرہمیں اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہیں کہ سائنس کی طرح انہیں سادہ اجزاء میں تحلیل نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں ربط و ترتیب اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ ان کے احوال و اسباب کے سلسلے کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نفسیاتی جائزہ میں بھی سائنس کی سی بے لوثی بھی نہیں آ سکتی۔ لیکن پھر بھی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ وہ کی طرح اجتماعی علوم اور طبی علوم کی طرح لے جان اور لے جس اور بے ارادے مادہ سے بحث نہیں ہوتی بلکہ انسان سے بحث ہوتی ہے جو شعور اور ارادہ اور خواہش رکھتا ہے اور جس کو اپنے احوال میں ایک حد تک تصرف کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ وہ مجبور محض نہیں ہے اور یہی عقیدہ اس کی اخلاقی بصیرت کا غماں ہے۔ اسی لئے زندگی کے تمام نظامہ کی تحقیق علمی بھی ہے اور فنی بھی۔ بعض اوقات زندگی کو سمجھنے کے لئے ان غیر عقلی اور جبل رجحانوں کا کھوج لگانا ضروری ہوتا ہے جو کسی خاص زمانے میں اجتماعی یا انفرادی زندگی میں محرک ہوئے ہیں۔

خارجی احوال کے علاوہ فن کار کی روحانی آزادی کو بھی ماننا چاہیے۔ اعلیٰ درجے کے آرٹ کی تخلیق کسی بندھے ایسے اجتماعی پروگرام کے تحت عمل میں نہیں آتی۔ جس میں انفرادیت کا وجود موجود نہ ہو۔ جن قوموں میں عام لوگوں کی تعلیم کا معیار اچھا خاصا ہے ان میں بھی فن کار اپنے آرٹ کو عوام کی ذہنی اور جذباتی سطح پر نہیں لانا بلکہ عوام کو اپنے بلند معیار تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کے جتنے بھی بڑے فن کار یا شاعر ہوئے ہیں انہوں نے عوام سے اپنا رشتہ نہ رکھتے ہوئے بھی اپنے معیار کو ان کی ذہنی سطح سے بلند رکھا ہے۔ ولتے، شیکسپیر، گوٹے اور غالب ایسے اپنے ماحول سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اس سے کسی قدر بلند ہیں۔ گرو و پیش کے اثر کے باوجود ان کے کلام میں کس قدر عالمگیریت ہے۔ جس طرح سیاست و معیشت میں بنیادی سوال یہ ہے کہ فرد کا سوسائٹی سے کیا تعلق ہے اسی طرح آرٹ کا بھی



یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ جدید ہندو کا بڑا عجیب یہ ہے کہ وہ ذہن کو میکا کی پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ فن کار سے تو تخلیق کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ناسے سراجوں کے مطابق اپنی تخلیق کرنے لگے تاکہ پیسے سے ضرورت کی ہوئی سماجی ضروریات کی تکمیل ہو۔ یہ سناچے ایسی معاشرتی قدروں پر مبنی ہونے میں جن سے فنکار چھٹکارا نہیں پاسکتا۔ وہ معاشیات کے رسد و طلب کے قانون کی پابندی اپنے فکر و فن میں بھی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے تمدن میں کام کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ انسان کی روح سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ انسان اپنے کام میں کوئی تخلیقی لطف اور جوش نہیں محسوس کرتا۔ آج کسی کارخانے میں مشین کا کام کرنے والے کی حیثیت ازمنہ و سعی کے کاریگر سے بنیادی طور پر مختلف ہے جو اپنی کاریگری میں اپنی شخصیت کا ایک جزو رکھ دیتا تھا۔ آج مشین پر کام کرنے والا صرف ایک چرخہ یا مشین کے ایک حصہ کی نسبت واقفیت رکھتا ہے اور اسی حد تک اپنے کام کو محدود رکھتا ہے۔ اس کے کام کی تخصیص پوری مشین سے بھی اس کا کوئی عقلی یا جذباتی تعلق نہیں قائم ہونے دیتی۔ اسی لئے اس زمانے کا مزدور یا کاریگر اپنے کام میں کوئی لطف یا شوق نہیں محسوس کرتا۔ اس کا کام بھی میکا کی ہو کہ یہ کیا ہے جس میں حسن نام کو نہیں۔ اسی لئے جدید تمدن کی مشقت انسانی صلاحیتوں پر بڑا ظلم ہے اس تخصیص میں کتنی ہی افادیت کیوں نہ ہو لیکن انسانی تخلیق سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ اس سے انسانی روح کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اس سے فراوانی شکلیں تلاش کرتا ہے جو نئے انقلابوں کا روپ دھارتی ہیں۔ اشتراک سماج بھی اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل نہیں پیش کر سکا جسے تشفی بخش گناہا سکے۔ انسانی تخلیقی آزادی پر اس لئے بھی طرح طرح کی روکیں لگادی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادبی تخلیق یہاں بھی سماجی پابندیوں سے وب کر رہ گئی ہے۔ ادب کو لقیئاً سماج سے بے تعلق نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر کسی سماج میں فن کار کو پوری آزادی میسر نہیں تو وہ جمالیاتی قدروں کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ فن کاری کا ایک انتہائی نظریہ یہ تھا کہ وہ موسیقی ہو جائے اور اب دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ صحافت بن جائے جدید فن کاری کو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اپنی راہ نکالنی پڑے گی اگر وہ انسانی قدروں کو فروغ دینا چاہتی ہے۔

شعر کی تخلیق فلسفی دنیا میں ہوئی۔ مذہب کے دامن میں اس نے ابتدائی نشوونما پائی۔ عقل اور شائستگی نے اس کے جوبن کو نکھارا اور عشق و محبت نے اس سے مستی اور سرور کی کامیاد فراہم کیا۔ اب پرمیگینڈہ سے اس کی جان پر بن آتی ہے جس سے اس کو بچا تا ضروری ہے۔ جدید تمدن کا اوجھا پن شاعر اور ادیب کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ اس کے خارجی مہمات میں ایفون کی سی خاصیت ہے جس کے سبب ذہن اور شعور ماؤف ہو رہے ہیں۔ شاعر اور فن کار ان حالات میں کیا کریں؟ اگر وہ اپنے ماحول سے متاثر ہو کہ اس کی رومیں بہہ جائیں تو وہ اپنی اندرونی پکار پر لبیک نہیں کہتے بلکہ خارجی حالات کا کھیل بن جاتے ہیں۔ جدید انسان تمدن کے خالق کی حیثیت سے خود اپنی مخلوق کی پیچیدگیوں اور تفصیلات سے گھبرا اٹھا ہے۔ وہ خود اپنے آپ سے فراد چاہتا ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں جس طرح انسان کے جسم کی بیماریاں اس کے ساتھ مرنے و مرنے ہیں اسی طرح اس کے روح کی بیماریاں بھی اس سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ وہ اپنی روح سے کتنا ہی بچنا اور چھپنا چاہے وہ نہیں چھپ سکتا۔ ادب کا کام ہے کہ اس کو نہ چھپنے دے۔

ہر اعلیٰ درجے کے فن کاری نظر میں حقیقت کی بدلتی ہوئی شان ہوتی ہے اسی لئے وہ کسی ایسے بندے کے اصول

بنا رہیں کیا جاسکتا جو کسی عارضی سیاسی یا سماجی مصوٰت کا نتیجہ ہو۔ وہ اپنے گرو و پیش کی آئینہ داری کرتے ہوئے بھی اس کی پرورش اپنے خیال میں اس طور پر کرتے ہیں کہ مستقبل کے امکان اُجاگر ہو سکیں۔ وہ انسانیت کی پیچیدہ اور اُن بھی ہوئی زندگی کا لداؤہ ہونا ہے جس میں حقیقت کے مختلف مرحلوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر فن کار کی روح آزاد نہیں تو وہ نقالی کا کام تو کر سکتا، لیکن تخلیق کا فرض ختم نہیں ہو سکتا۔ جب وہ سماجی انقلابوں میں سے گزرتے گا تو ان کے پچ و خم کو اپنی روح سے وابستہ کرے گا تاکہ وہ تخلیق کے محرک نہیں ہو کہ زندگی کی دائمی حرکت اور اس کی بے کمی کی اور انسانی ہراس کی نظر ہوتی ہے اس لئے وہ اس کو خارجی حقیقت سے کہیں زیادہ بلند اور بزرگ تصور کرتا ہے۔ وہ خارجی حقیقت کو غور سے دیکھتا ہے مگر اس کو اپنا وجود زیادہ اہم نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے ذریعہ کائنات کی خواہشوں اور مشقوں میں شرکت کرتا ہے۔ اگر فن کار کو خود اپنے وجود کی اہمیت کا گہرا احساس ہے تو یہ ماضی وقت ممکن ہے کہ اس کو کائنات کی صداقت کا بھی گہرا احساس ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تخلیق اور جذبے کے اندرونی تجربے میں خارجی اس کے تجربے سے زیادہ صداقت اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ تخلیق کافی بالذات رہ جاتا ہے اور اپنے اندر اس کو اتنا اعتماد حاصل ہو جاتا ہے کہ اپنی رمزیت میں خارجی حقیقت کو سمجھ سکے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے دلی و اخلاقی حقیقت باہر کی تمام اور غیر ممکن حقیقت کی جگہ لے لیتی ہے۔ یہ جذبہ اور تجسس کی ہم آمیزی کی کرامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ درجے کا فن کار جب کسی معمولی اور جانی پر بھی بات کو بیان کرتا ہے تو اس کی قلب اہمیت ہو جاتی ہے اور اس میں عجیب انداز دکھائی دیتا ہے اور ایک پریا ہو جاتی ہے۔

جدید زمانے کا انسان آج اپنی نفسرویی اور اجتماعی زندگی کی جس منزل پر ہے وہاں وہ یہ سوچ رہا ہے کہ آیا زندگی اس قابل ہے کہ زندہ رہا جائے۔ اس میں ایک عجیب جھنجھلاہٹ، الجھن اور بے زاری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ فرد اپنی شخصیت کو چمکا رہا ہے اس کا تعلق سرمایہ داری کے نظام سے ہو یا اشتراکی نظام سے۔ قدروں کا احترام اُٹھ گیا۔ 'تلون' برہمی اور بے اعتباری کا ہر طرف دور دورہ ہے جس کا اظہار خاص طور پر سیاست کے میدان میں ہو رہا ہے۔ دل غفیدت اور محبت سے خالی ہیں۔ بغیر عقیدے کی محبت کا نرم اور نازک پودا کیسے پلپ سکتا ہے۔ آرٹ اور ادب کا یہ کام ہے کہ وہ زندگی کے کھنڈے ہرے نوازیں کو چھ سے قائم کرنے میں مدد کریں۔ زندگی کی بے وفاری کو دور کریں۔ انسانیت کی محبت کو عقیدت کی بنیادوں پر استوار کریں۔ صنفی دور کے بعد نہ صرف انسانی زندگی بلکہ خود و نظرت اپنے اعلیٰ حسن سے محروم ہو گئی ہے۔ آرٹ و فنوں کے نقشے ہونے حسن کو بھر پور کر سکتا ہے۔ سوائے اس کے یہ کام امد کوئی نہیں کر سکتا۔ علم اگر اس کی کوشش کرے گا تو اس کو کبھی بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ وہ اور اُن بھلاؤ پیدا کرے گا۔

اب تک مغربی ادب میں کلاسیک ہیروئن ازم کے اثرات کام نہ رہے تھے لیکن کچھ عرصے سے نئے محرک کار فرما ہیں جن کے اثر سے نہ زندگی بچ سکی ہے اور نہ ادب۔ جدید زمانے کا فن کار پُرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں بنانا چاہتا ہے اس واسطے کہ پُرانی دنیا کی جگہ نئی دنیا بسائے گا اسے حوصلہ ہے وہ صرف جاہلیانہ فلسفہ کی نفی نہیں بلکہ وہ زندگی کے مختلف اور پیچیدہ مسائل کی نسبت اپنے حل پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے دعوے میں کامیاب نہیں معلوم ہوتا۔ ایسٹ، سمبولک آرٹ اور سوریل آرٹ فن کا۔ اب تک کوئی ممکنہ فلسفہ حیات نہیں پیش کر سکے۔ وہ پُرانی قدروں کی جگہ کوئی نئی قدریں نہیں لاسکے جو زندگی کے عجیب

خدا کو چکر سکیں۔ یہ خدا روز بروز ہمیشہ سے حبیب تر ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کے حقائق میں جو تعلق پائے جاتے ہیں ان کو ذہنی طور پر درہم و برہم کرنا کافی نہیں جب تک کہ ان کی جگہ دوسرے حقائق نہ لائے جائیں جو زندگی پر حاوی ہوں۔ سوپرین اسٹ فن کار تخت شعوری تلازموں کو شعوری تلازموں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اچھا ترجیح دیں، انہیں اختیار ہے۔ لیکن نتیجہ کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کسی جہن کے ایک تختے میں وہیں جیسے روکیجیس انہیں وہ مجسمہ کسی غلط طرز سے بھرے ہوئے ٹرے میں پڑا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے ایسا اتفاق ہر جگہ کہ جس میں غلطی کی آلودگیوں میں نظر انظر آئے لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا یہ معمول تو نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بھی ماننا کہ سوپرین اسٹ فن کار کو ایسی تخت شعوری کیفیت محسوس کرنے کا حق ہے جس میں خواب کی کسی جگہ ترقیبی اور آئینا میں پایا جاتا ہو۔

### ہم آٹے بات آلتی یا ر آلتا

بہن سوال ہے کہ کیا اس قسم کی تخت شعوری کیفیت محسوس کرنے سے زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ سوپرین اسٹ فن کاروں کی افراطیت پسندی کے ڈانڈے مزاج سے جا کر مل جاتے ہیں۔ ان کے مان تخت شعور میں اس قدر غور دینا کہ یہ کہ گویا محض زندگی میں کچھ دخل ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسکول کے فن کاروں کے یہاں نہ صرف اخلاقی بلکہ جمالیاتی قدریں بھی بانی نہیں رہیں۔ ان کے بیان کی بے ترتیبی اور ایک ہی موضوع پر مضمون کو اتنا تنگ و تاریک بنا دینا ہے کہ پڑھنے والے کے پیشے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ غفلت کی معمولی جلیوں میں ایسا گم ہوتا ہے کہ ان سے باہر نکلنے کا راستہ بھی اسے نہیں ملتا۔ ہر حال سمبولسٹوں کا ہے۔ بورویر، رمبو، ولارین، ولارے اور اس طرز کے دوسرے شاعروں نے جو چھینٹا فی ابہام کی بنا ڈالی اس کا اثر اب تک باقی ہے۔ پال ویرمی نے اپنی سنجیدگی سے ہر چند سمبولسٹوں کی بے راہ روی کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طرز کے پیر و غفلت کے گورکھ و خندے میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور زندگی کی حقیقت سے ان کو کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ کم و بیش یہی کیفیت اکیسٹ کی ہے۔ ان کے خیالی تلازموں تک رسائی حاصل کرنا کہ کندی کا ہزاروں کا مصداق ہے۔ بیان کی بے تعلقی تو انہیں چھو کر بھی نہیں گئی۔ لیکن ان کے عالم تصویر میں بعض ایسی صداقتیں ہیں جن کی طرف سے ادب و شعر انہیں نہیں بند کر سکتے۔ فرض کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی ادب کے ان مختلف طرزوں اور دستاویزوں میں بعض باتیں ایسی ہیں جن سے ہمارا ادب نادمہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ ذوق کی رہنمائی شامل حال رہے۔ اور محض نقالی کا شہیوہ نہ اختیار کیا جائے۔ مغربی ادب کی ان مختلف تحریکوں سے ہم انتخاب تو کر سکتے ہیں لیکن پیروی کسی کی بھی نہیں کرنی چاہیے۔

مغربی ادب کے جدید رجحانوں میں سینما، ریڈیو اور اخباروں سے اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ سینما کی تکنیک یہ ہے کہ کسی جذباتی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف واقعات کے الگ الگ ٹکڑے جوڑ دیئے جاتے ہیں بعض اوقات ان ٹکڑوں میں ہمہ متعلق ہوتا ہے جو پوری داستان کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ریڈیو اور اخبار بھی زندگی کی تصویر کے الگ الگ ٹکڑے پیش کرتے ہیں سمبولسٹ شاعر کی علامتوں اور اکیسٹ شاعر کی قطعی تصویروں میں کچھ ایسی قسم کی کیفیت ملتی ہے ان کی باتیں ان ملے جوڑی معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ان میں تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق جیسے تخت شعوری تلازموں میں

یا جانتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں عقل و شعور بھی تختِ شعور کی فتالی پر تازہ آئے ہیں۔ لیکن کیا واقعی شعور اور تختِ شعور کے بیچ میں ایسی علیحدگی ہے جو پر نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تو نہیں کہ جس طرح وجدان اور عقل کلی کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اسی طرح شعور اور تختِ شعور میں ایک دوسرے سے اتنے دور نہ ہوں جتنا کہ عقلِ نفسی کے ماہرِ ظاہر کرتے ہیں۔ جدید فکری و مذہب کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ جس طرح اس نے وجدان اور عقل کے الگ الگ خانے بنائے اسی طرح اب شعور اور تختِ شعور کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق خیال کیا جا رہا ہے۔ جدیدِ تہذیب کی بنیادی بے آہنگی یہی ہے۔ آرٹ و ادب میں ایک طرف تختِ شعور کے علم برداروں کی جماعت ہے جس میں سمبولسٹ و امپریسٹ اور سوریل اسٹ شامل ہیں جن کے نزدیک انفرادیت یا زبیدت ہی ادب کی جان اور ایمان ہے۔ اور دوسری طرف اشتراکی فکروں میں جو شعور و عقل کے اجتماعی معیار کے علاوہ ادب اور آرٹ کو کسی اور کسوٹی پر پرکھنا نہیں چاہتے اور ان کے سائنس کا جزوِ ناوینے دیکھ رہا۔ جدید فکروں کی اندرونی کشاکش انہی رجحانوں کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ آج یہ دونوں رجحان ہمارے ادب میں بھی آپہنچے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے فن کاروں کی ذہنی الجھنیں بڑھ گئی ہیں۔ یہ کوئی افسوس کی بات نہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ الجھنیں ہمارے ادب کو مالا مال کر دیں گی اور ان کی بدولت ہمارے فن کاروں کی تخلیقی صلاحیتیں آج اُجاگر ہوں گی۔ جس طرح بیسویں صدی کے انگریزی زبان کے سب سے بڑے شاعر ایٹسن کے یہاں ان سب رجحانوں کے امتزاج سے ایک خاص زراکت اور لطافت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے اسی طرح ہمارا ذوق بھی ان مختلف رجحانوں میں توازن قائم کرنے میں کامیاب ہو گا۔

تخلیقِ نفسی کے ماہروں نے شہر اور زندگی کی جزو جید پیش کی ہے اس کی دوسرے ذہنی کو شعور اور تختِ شعور دلا شعور کے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ لیکن ذہنی زندگی تو ایک کل ہے جو دونوں پر حاوی ہے۔ شاعر اس کل کو اس کے ٹکڑوں کی خاطر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انسان کا عقلِ شعوری ارادے سے ہوتا ہے لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس ارادے کی تہ میں کیا ہے۔ تختِ شعوری قوتوں کو جاننا ضروری ہے جب تک کسی انسان کی وہی ہوئی خواہشوں اور باتوں کو نہ معلوم کیا جائے اس کے عمل کی صحیح توجیہ ممکن نہیں۔ جدیدِ شاعری میں چونکہ شعوری اور تختِ شعوری ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق کر دیا گیا ہے اس لئے وہ ایسے مبہم اشاروں کا مجموعہ ہو گئی ہے کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا شخص ان کو نہیں سمجھ سکتا۔ نہ کہ جب تک اس شاعری کے سنسنے والوں یا پڑھنے والوں کے ذہن میں وہی تلازمات (ایسوسی ایشن) موجود نہ ہوں جو شاعر کے ذہن میں شعر کہتے وقت تھے اس وقت تک وہ اس شاعری کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس وجہ سے میں جدیدِ مغربی شاعری میں عجیب سے نکالیں سامعوس ہوتا ہے جو جذوب کی بڑ سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن آپ اس قسم کا بے نکالیں حافظہ، گونٹے اور قاب کے یہاں نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان استادوں نے وجدان اور عقل اور تختِ شعور کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے انسانی فطرت اور ذہن کی سالمیت کو برقرار رکھا۔ ہماری ادبی روایات بھی اسی جانب اشارہ کر رہی ہیں۔ یہ روایات جدیدِ نفسیات کی بنیادی صداقتوں کو جذب کرتے ہوئے ہمارے ادب کو بے راہ روی سے بچا سکتی ہیں۔

انسان کا تجزیہ پورے انسان کا ہونا چاہیے نہ کہ اس کی زندگی کے کسی ایک رخ کا۔ اس میں داخلیت اور خارجیت

دونوں کو اپنا مقام ملنا چاہیے۔ بغیر اس کے جذباتی اور ذہنی انتشار سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ بالذات کہ اپنے ناول سے شے دور این کنو "LE CHEF D'AMR INCONNU" میں اس قسم کی ایک رسمی زندگی کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کا ہیرو مصوری سے دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ایک تصویر کھینچتا ہے جس میں رنگوں کی افراطی اور بتری اپنی انتہائی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے تصویر میں بے تکاپی پیدا ہو گیا ہے۔ اسی تصویر کے ایک کونے میں عورت کی ٹانگ ایک طرف کو نکلی ہوئی ہے۔ یہ ٹانگ کسی انسان کی نہیں بلکہ کسی بھوت کی ٹانگ معلوم ہوتی ہے اس کا انداز بہت کچھ امپرسیونسٹ مصوری کے طرز سے ملتا جلتا ہے جس کے جذباتی انتشار کو اس جگہ حتیٰ بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بالذات کہ جس کا آرٹ سماجی اہمیت میں رچا ہوا ہے۔ اس تصویر کے ذریعہ دروں مٹی کا مذاق اڑایا ہے اس کا جہاں بالکل درست ہے۔ ادب اور فن کا فرض ہے کہ وہ ایسا مٹائی نمونہ پیش کرے جو صلیبت پر مبنی ہو۔ اندر مٹی زندگی بالکل خود مختار تو نہیں کہی جاسکتی اور نہ وہ ایسے آزاد فواین کے تحت نشوونما پاتی ہے جو گرد و پیش کی دنیا سے کوئی تعلق رکھتے ہوں۔ انسانوں کے جذبات اور خیالات بڑی حد تک اس کشاکش سے وابستہ ہوتے ہیں جو انھیں اجتماعی زندگی میں پیش آتی ہے۔ فن کا فرض ہے کہ وہ اوپر، اندر، باہر سب طرف دیکھے اور صلیبت اور صداقت کا جہاں کہیں بھی وہ ملے جیر مقدم کرے۔ یہ صداقت ذہنی تجزیہ نہ ہو بلکہ جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث مجازی اور انسانی ہونی چاہیے۔ زندگی کی صلیبت اور صداقت کا یہ بھی اقتضا ہے کہ تہذیب و ادب کو حیرانی عناصر سے جہاں تک ممکن ہو انک کو کے انسانی بلندی تک لے جائے۔ اس لئے شاعر یا فن کار کا موضوع چاہے کچھ ہی ہو وہ اپنے آپ کو اخلاق سے بے نیاز نہیں کر سکتا اور اگر وہ ایسا کر گیا تو یقیناً اپنے فن میں ایک عیب کو راہ دے گا جس سے اس کے کمالی کو ٹانگ جلے گا۔ شاعر کا یہ کام ہے کہ اس کا موضوع چاہے خارجی حقیقت سے تعلق رکھے یا داخلی سے وہ ہمیں اس کا براہ راست جلوہ دکھا دے اور ہمیں ایسا محسوس ہو جیسے وہ پردہ جو فطرت اور ہمارے خودی کے درمیان اور خود ہمارے شعور اور ہمارے درمیان بڑا ہوا تھا اچانک طور پر ہٹ گیا معلوم ہوتا ہے غالب کو اس بات کا احساس تھا کہ اعلیٰ درجے کے آرٹ میں خامریت اور صلیبت شعور اور تحت شعور اور بیداری اور خواب میں فرق واقفانہ جذباتی نہیں رہنا چاہیے جس کی نسبت اس کے اس غیر مطبوعہ شعر میں اشارہ ہے۔

حزرا حریف کہ اتنا نہیں کوئی غالب

رہا اسی شرح غالب ص ۱۵۱

جو جاگنے کو ملا دیوے کے خواب کے ساتھ

یورپ کے جدید ادب میں بعض فیاض صدائیں ہیں جن کے معنی خیز ہونے میں کلام نہیں۔ ان کو ہمارا ادب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن انھیں جس بک طرف انداز میں بڑھا گیا ہے اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو ان صدائوں کے اعلیٰ عناصر غزل میں صدیوں سے موجود رہے ہیں سمبر لٹ کی رمز و علامت، امیجسٹ کی قطعی تصویر کشی اور صورتوں کی تحت شعوری انجمن بیدار کسی نہ کسی شکل میں غزل میں آپ کو ملیں گے۔ ہمارے غزل نگاروں نے شعر کے سب عناصر کو اس خوبی سے برتا ہے کہ ان میں مے کی کیفیت نہیں پیدا ہونے پائی۔ اگر تغید ابہام کی حد سے آگے بڑھ گئی تو وہ شعر کا عجیب

بھا گیا ہے۔ اس کو اچھی نظر سے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ مستعدہ، کنایہ اور رمز ہیں اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ معانی فرہنگی کے باوجود ذہنی تلازم ایک دوسرے سے بہت دور نہ جا پڑیں اور محنتی کا دامن ادبی ضبط و فرائض سے بندھا رہے۔ اس طرح اجتماعی اہم و تنقیدی کار کو بیکٹے سے روکتی ہے۔ چٹنا بلند تخیل ہو گا اتنا ہی بیکٹے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ غالب کو اپنی مشکل پسندی بہت کچھ اسی اجتماعی تنقید کی وجہ سے چھوڑنی پڑی تھی۔ ان کے دوستوں نے جن میں خاص طور پر میرزا غانی اور مولوی فضل حق خیر آبادی کا نام لیا جاتا ہے انہیں مشورہ دیا کہ شیفے والوں کی خاطر رمز و استعارہ کی پیچیدگی کو دراکم کریں۔ بعض طنز نگاروں نے یہ بھبتی بھی کس دی۔

مزا کھنے کا جب ہے اک کلمہ اور دوسرا کچھ  
مگر ان کا کہا یہ آپ کب میں یا حسد اچھے  
کلام میر کچھ اور زبان میر سدا کچھ

انہیں باتوں کو سن کر غالب کو کھنا پڑا۔

شکل ہے ذہن کلام میر لے دل  
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش  
سن سن کے لیے سخن راں کامل  
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

ہمیں معلوم ہے کہ شروع شروع میں غالب اس قسم کی تنقید پر بہت جھنجھلائے لیکن پھر بھی انہوں نے اس کا اثر قبول کیا اور بڑائی روش کو بڑی حد تک ترک کر دیا۔ اگرچہ ان کے سہل متنع میں بھی خیال کی نزاکت اور رمز و استعارہ کا الجھاؤ موجود ہے لیکن زبان کی سادگی کی وجہ سے عام لوگ بھی ان کے بعد کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس رنگ میں بھی ان کی انفرادیت اور نزنگ باقی رہی۔ یہ حقیقت کا الجھاؤ علامتی طور پر ہی کھوڑا بہت گرفت میں آتا ہے اس لئے اعلیٰ فن کار کے یہاں چاہے وہ کتنی ہی سادگی کیوں نہ برتنے کی کوشش کرے مطالب کا کھوڑا بہت اشکال پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ حقیقت پسندی کے جوش میں بعض نقاد یہ غلطی کرنے میں کہ وہ شعری حیثیت کو اسی حد تک ماننا چاہتے ہیں جس حد تک کہ وہ حاجی سماجی احوال کی ترجمانی کرے۔ لیکن وہ بھولی جاتے ہیں کہ خارجی حقیقت جب شعر کا جزو بنتی ہے تو اس کی خاصیت بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ جب شاعر کی منظر کو بیان کرتا ہے تو وہ صرف اس منظر کی بات نہیں کرتا بلکہ خود اپنے متعلق بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہہ دیتا ہے۔ اس کا اسلوب اور اس کا لفظی کا انتخاب اس کی اندرونی حالت کی جھلکی کھاتے ہیں۔ شعری تعریف اس کی ظاہری صورت (فارم) اور موضوع سے مکمل نہیں ہوتی اس کی صورت (فارم) ضروری ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ وہ ایک خاص قاعدے کے مطابق ہو لیکن یہ اس لئے ضروری نہیں کہ اس سے شاعر خارجی حقیقت کا شعری تعبیر کرتا ہے بلکہ اس واسطے ضروری ہے کہ وہ خود ایک روحانی اصول کی حیثیت رکھتی ہے جسے شعر سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ذریعے حقیقت کی پراسرار کا فرما بیوں کو ظاہر کرنے میں مدد ملتی ہے۔

سائنسٹ کے لئے اس کی ذات باہر جو کائنات ہے وہ زیادہ اہم اور معنی خیز ہے لیکن شاعر کے نزدیک اس کی ذات خارجی حقیقت سے زیادہ اہم ہے جو اس کے احساس کو انفرادیت بخشی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ آیا خارجی حقیقت زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا اس کو اور اک و احساس کرنے والی صلاحیت بالکل اسی طرح جیسے ان سوالوں

کا جواب دینا دشوار ہے نہ جو کہ زیادہ اہم ہے یا روٹی۔ محبوب کی خواہش زیادہ اہم ہے یا خود محبوب۔ جگر نے اس شواہد کی طرف اشارہ کیا ہے۔۔۔

سب کچھ ہوا مگر نہ کھلا آج تک یہ راز

تم حبان آرزو ہو کہ ہم حبان آرزو

شاعر چاہے کتنا بھی جیست پسندی کے دعوے کرے وہ اپنے شعور کے لئے جو اسلوب اور موضوع منتخب کرے گا اس میں اس کی کا ذاتی رجحان لازمی طور پر موجور رہے گا۔ اس کی اندرونی زندگی کا رنگ خارجی تصویر کشی میں اچھا گہرے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کے جذبہ و خواہش کے الجھاؤ اور پیچ و خم چھپانے پر بھی عی ہر ہو جائیں گے۔ بہشت سرا اور خاص طور پر غزل تو شاعر اپنے موضوع سے جذباتی تسبیح کھنسا ہے اور اگر نہ رکھے تو وہ شعر کا حتی نہیں ادا کر سکتا۔ ضروری ہے کہ وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں اندرونی زندگی کے لئے پہلے تو سٹے۔ اس کے بعد ہی اس کو یہ طاقت حاصل ہوگی کہ اپنے سٹے والوں کے شعور اور دل میں جو پردہ حال ہے اسے اٹھا دے تاکہ وہ اپنی اندرونی زندگی کو بہ نسبت پہلے کے بہتر کھنے لگے۔ جب شاعر اپنے موضوع کو زبان و بیان کا جامہ زیب تن کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر وہ اس کو اپنے جذباتی اور ذہنی نظام کا جز بنا لیتا ہے۔ یہ جذباتی اور ذہنی نظام شعور اور تحت شعور مددوں پر جاری ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس زمانے کے ادب اور آرٹ کا عام رجحان یہ ہے کہ زندگی کے خارجی احوال کو زیادہ اہمیت دی جائے اور ان کا اظہار کیا جائے۔ چنانچہ ہمارے ادب کے لئے بھی وقت کا سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ اس میں خارجی مسائل کو کس طرح سے سمجھا جائے تاکہ ان کی نسبت ہماری بصیرت میں اضافہ ہو۔ یہ مضمون جب شعریں ادا کئے جائیں گے تو لازمی طور پر ان میں فکری عنصر داخل کرنا پڑے گا۔ لیکن فیکر تخلیقی فکر ہوگی جو جذبے سے ہم آمیز ہوگی۔ اس طرح جب علامتی تخلیق ہی تصور و فکر پرست ہو جائیں گے تو وہ فزیری حالت میں نہیں رہ سکتے۔ تخلیقی فکر کی قوت اس کی گہرائی میں پوشیدہ ہے۔ یہ قوت صورت پذیری اور نظم آفرینی کے سارے انداز اپنے اندر چھپا رکھتی ہے۔ وہ جب خارجی حقائق کو اپنے اندر جذب کرتی ہے تو موضوع و معروض کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ اس طرح میں اوجھٹت فطرت اور آذادی شعور اور لاشعور اور انفرادیت اور اجتماعیت کے تضاد وہ زہر جلاتے ہیں اور شعر زندگی کے ہر کیف و رنگ کا مظہر بن جاتا ہے۔

اگرچہ سماجی اور اخلاقی مسائل کا بیان نظم میں بہتر طور پر ہو سکے گا لیکن غزل میں بھی انہیں جگہ انکس کے انداز میں داخل کیا جاسکتا ہے تاکہ جدید عہد کے انسان کی ذہنی کیفیت ظاہر ہو سکے۔ لیکن اس اظہار کے بہت سے طریقے ہیں۔ ایک اس طور پر خیالوں کو ظاہر کرنا ہے کہ وہ معاشی عمل یا تحت شعور کی ڈائری یا کھنسی معلوم ہوں اور ایک اس طرح کہ سٹے والا اپنی زندگی میں مسرت اور فراوانی محسوس کرے۔ اس کی بصیرت کو جلا ہو اور اس کی قدروں اور خواہشوں میں بڑا آہستگی اور ہم ربطی پیدا ہو۔ قدر ہی وہ کتنی ہے جس سے زندگی کے سارے فلسفہ کھلتے ہیں۔ شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیئے نہ کہ اس کو شانے والا۔ غزل گشت و گزیر کی زندگی کا ذکر کرے گا تو لازمی طور پر اس کے لامحدود امکانات کی طرف اس کی نظر جائے گی۔ وہ کبھی اپنی خواہشوں کا رنگ ان پر چڑھائے گا اور کبھی ان کے اثر سے اپنی آرزوؤں کی صورت گری

رہے گا۔ وہ حسنِ آفرینی بھی کرے گا اور مستِ رافرنی بھی۔ لیکن یہ کام وہ تجربہ دار و منطقی مقدمات سے نہیں انجام دے گا جن کا لازمی نتیجہ کلام میں ہے لطفِ یکسانیت اور سپاٹ پر ہوگا۔ شاعر کی فکر تخیلی اور وجدانی ہوتی ہے چاہے جس میں مذہبی جذبہ کا رس درجہ ہوا ہو۔ بغیر اس کے کلام میں تاثیر اور دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں یہاں ہے اور نہ موضوع میں بلکہ شعریت میں جو دونوں سے بالاتر ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ سائنس کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شعریت تخیلی فکر اور جذبہ کی ہم آمیزی کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتی اور یہی دونوں جزو و تفزل کی جان ہیں۔ انھیں سے سخنِ ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جو ادب کی بنیادی فکر ہے۔



# قتیل دہلوی تھا یا فیہ آبادی؟

مختار الدین احمد

بارہویں صدی ہجری کے آخر اور تیرہویں صدی کی ابتدا میں مرزا قلیل کی ذات بھی عجیب و غریب گزری ہے۔ فارسی زبان کا مشہور مصنف و شاعر متعدد اردو شعرا کا استاد، لیکن آج تک اس کے نام کے متعلق جھگڑا ہے، اس کی وطنیت مشکبہ ہے، اس کی عمر کا پتہ نہیں، کہاں کہاں رہا، ہمیں معلوم کیا کیا کرتا رہا؟ ہمیں کہا جاسکتا، کب وفات پائی؟ اس میں اختلاف کب پیدا ہوا؟ اس کی تحقیق نہیں۔

اٹھارہ سال کی عمر تک اس کا کیا نام رہا؟ یہ ایک سیدھی دھند ہے، ایک تذکرہ نگار نے اس کا نام دہلوی ہی لکھا، ایک مورخ نے دہلوی سنگھ، ایک مضمون نگار نے، دہلوی سنگھ، ایک مستشرق نے دہلوی سنگھ اور ایک شاعر نے دہلوی سنگھ بنایا ہے۔

مسلمان ہونے کے بعد اس کا نام تبدیل ہوا، نام کیا رکھا گیا؟ مختلف صحاب مختلف نام بناتے ہیں۔ ابو طالب نے اس کا نام محمد قلیل، نواب صدیقی حسن، حکیم عبد الغنی، صاحب ریاض الفردوس، مصطفیٰ اور عمرتی نے محمد حسین، ڈاکٹر عبد الحق اور پنڈت کبھی نے محمد حسن، بعض تذکرہ نگاروں نے عمرتی کا بھی ایک جگہ ہی بیان ہے محمد حسن۔ اور صاحب قاموس المشاہیر نے احمد حسن لکھا ہے۔

اب تقریباً تمام تذکرے جو میری نظر سے گزرے ہیں قلیل کی اردو شاعری کے بارے میں خاموش ہیں، اس کے دیوان و کلیات کے متعدد نسخے دیکھنے میں آئے لیکن کسی میں اس کے اردو اشعار نہیں ملے۔ صرف سعادت خاں ناصر کے ناباب تذکرہ خوش معرکہ زیبا، میں اس کا ایک اردو شعر درج ہے، اصل عبارت یہ ہے۔

چونکہ مولد اس کا ہندوستان تھا، حکم کل شمی، یرجی الی اصلہ، کبھی کوئی مصرع یا بیت زبان ریختہ میں بھی لکھا چنانچہ یہ شعر۔

زنگی سچے کا حسن عظیم المثال ہے ثانی جو اس کا ہے تو کوئی خال خال ہے

اگرچہ یہ شعر اس کا دون مرتبہ ہے مگر یہ ہندی گروں کا تذکرہ ہے اور اکثر ہندی گواس کے شاگرد ہیں، لکھا گیا۔

دہلیے لطافت میں بہت اردو شعر ہیں جن کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ کس کے لکھے ہوئے ہیں، مندرجہ ذیل شعر تعجب نہیں کہ قلیل کا ہو۔

جہاں میں جنس محبت کا جا رہا ہے قوط میں جانا ہوں کہ دشمن مرا ہے یار مرا

سال ولادت، فرقی و بطوری عظیم آبادی (۹۰) (بحوالہ امید ایشوری) ۶۶ھ، عمر قی شہزادہ اور حسین قلی خان عاشق عظیم آبادی  
سنہ ۱۰۰۰ھ کے ہیں۔ صاحب نتائج الافکار کے بیان کے موجب اس کی وفات تیرھویں صدی ہجری کے عشرہ ۶۰ھ میں ہوئی۔ صاحب  
تجربہ یمن کے نزدیک ساری وفات سنہ ۱۰۰۰ھ ہے۔ عمر قی سنہ ۱۰۰۰ھ لکھتے ہیں۔ اور بیل سنہ ۱۰۰۰ھ لکھتے ہیں۔ قاسم انشا بہرہ ورتا بیرغ  
اور وہ میں سنہ ۱۰۰۰ھ درج ہے۔

میرزا بھی عمر قی اس کی عیادت سنہ سال جہیں قلی خان اکٹھ سال اور فرقی و بطوری (۹۰) (بحوالہ امید ایشوری) سنہ ۱۰۰۰ھ سال  
بنائے ہیں۔

عمر قی کا بیان ہے کہ اسلام لائے وقت اس کی عمر سنہ سال تھی، مضمونی اور قدرت اللہ انشا رہ سال بتاتے ہیں۔ عاشق کا  
ایمان ہے کہ جو وہ سال کی عمر میں اس کے دل میں اسلام کی محبت موجیں مار رہی تھی۔ "تذکرہ سفینہ ہندی" میں ہے کہ وہ مصر میں  
اسلام میں لاشن مشتاقی میں درج ہے کہ مضمون ان شباب میں اسلام لایا۔

سفینہ ہندی اور نتائج الافکار کے مطابق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمد کے بعد وادشاہ جہان آباد ہوا اور وہیں عربی  
و فارسی کی تعلیم کی مکتبہ تھی لکھتا ہے کہ اس کی تعلیم شاہ جہان آباد میں نہیں بلکہ فیض آباد میں ہوئی۔

ان معاملات کے علاوہ قلی کی وطنیت میں بھی کافی اختلاف رہا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا مضمون میں اور  
مستاد بن رولوں کے اقوال اس معاملہ میں مختلف ہے۔ تیرھویں صدی کے مورخ اور تذکرہ نگار بھی نہیں ہمارے زمانہ کے محققین اور  
مضمون ان صاحبزادہ بھی اس معاملہ میں مختلف اقوال نظر آتے ہیں کہ اس کا وطن کہاں ہے۔

مضمونی نے اس کے بزرگوں کا وطن بٹالی، جھکوان واس نے بٹالہ، عمر قی نے پٹالہ، صاحب "بدیعیا" (۳) نے بٹالہ  
نواب صدیقی حسن نے لاہور، محمد حسین آزاد نے لکھنؤ، ابو طالب نے دہلی بتایا ہے۔ ناصر نے "مولد اس کا ہندوستان تھا" کہنے پر خلافت  
لی ہند۔ اوروں وہ اس بکڑے سے صاف نقل کیا ہے۔

آزاد نے اس کا وطن لکھنؤ اس لحاظ سے بتایا ہوگا کہ اس کی نصف زندگی سے زائد لکھنؤ میں تمام ہوئی۔ وہیں اس نے وفات  
پائی اور وہیں کی خاک میں ہمیشہ کئے گئے ہو گیا۔ جن تذکرہ نگاروں نے اس کا وطن لاہور بتایا، وہ شاید اس طرح کہ ریاست پٹیلہ  
مضافات لاہور میں ہے۔ پٹیلہ اور پٹالہ اس لئے اس کا وطن کہا جاتا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد بٹالہ کے رہے تھے اور کاتبوں  
کی غلط نویسی کی وجہ سے اس نام کی مختلف شکلیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ابو طالب اور عمر قی نے اگر اس کا وطن دہلی بتایا تو منظم تعجب

۱۔ نثار مضمونی نمبر ۱ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا "مضمونی کی دو بیاضیں" جس میں دعوے کیا گیا تھا کہ "بدیعیا" مضمونی کی تالیف ہے اور ثبوت  
میں کچھ شعرا کے ترجمے ای پیش کئے گئے تھے۔ من جملہ ان کے تبدیل کا ترجمہ بھی تھا جس میں اسے بٹالہ کا بتایا تھا۔ پورا مضمون جملہ و تحریک سے بھرا  
ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی ایک طویل مکتوب حضرت نیاز فقیر کی لکھا جس میں اس نمبر پر ایک تنقیدی نظر ڈالی تھی اور "بدیعیا"  
و سے مضمون کے جملہ و تحریک کا پروردہ چاک کر دیا گیا تھا۔ نیاز صاحب نے وہ خط "مضمونی نمبر کی بعض غرضیں کے عنوان سے شائع کر دیا  
تھا۔ ملاحظہ ہو نگار اہل سنہ ۱۹۴۲ء۔

نہیں سب کے قریب خود۔ سو ہمیں خاک و مٹی کے قریب ————— ایسی یہ جگہ میں نہیں آتا کہ قریب کے رتبہ کی نسبت فرید آباد کی مرتبہ کس طرح جاتی ہے ؟

زمانہ حالی یہ قریب کو فرید آباد کی سمجھنے والوں میں زیادہ میسر پیش سید اسد علی انوری صاحب ہیں جن کو بھی فرید آباد کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالہ "قریب کا وطن" میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا وطن فرید آباد تھا۔ انھوں نے قدیم تذکروں کے متعدد واقعات سے بھی درجہ کے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کسی میں اس کے فرید آباد ہونے کا ذکر نہیں بلکہ بعض الغزوس میں اسے لکھنؤ کی شاخ الادب اور شمع انجمن میں لاہوری، ملا صاحبہ انوار کا رہیں دہلوی، عقد تریا میں بنا لوی لکھا ہے پھر انھوں نے طاش شانی، خوش معرکہ، ریاس میں اس کی وطنیت کے متعلق کوئی اطلاق نہیں ملے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے فرید آبادی ہونے کا ثبوت قدیم تذکروں میں نہیں ملتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ سب سے پہلے کس نے اسے فرید آباد ہی لکھا۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، اس کی اولیت کا سہرا مرزا غالب کے سر ہے۔ اور ان کے بعد اگر کسی نے اسے فرید آباد ہی لکھا ہے مثلاً حاتی اور عجم انجمن تو یہ غالب کی تقلید میں ہے اور اس معاملہ میں یہ اصحاب غالب کے تقلید میں ہیں۔ اور انہیں جہاں انھوں نے قریب کی وطنیت سے تعلق ذاتی تحقیقات نہیں کی۔

غالب نے اپنے خطوط میں اسے متعدد جگہ فرید آباد کا بتایا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مرزا نے تاریخ و تحقیق کے آدمی تھے اور نہ وہ اس نام کے بے مزوں تھے۔ یہ سچی نہیں کہ انھیں قریب سے کوئی خاص تعلق رہا ہو کہ حالات جاننے کی کوشش کی ہو۔ انھیں تو قریب کا نام تک صحیح نہیں معلوم۔

ان کی حاشیہ فرقی کے تذکرہ شیعہ انجمن "طاش شانی" جلد اول، باب ۱، ج ۱، ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸

نی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک دہائی آدو کا قریب ہی جو آرو وئے معنی یا عود ہندی میں شامل نہیں ہے، وہ اسے کھنوی بتاتے ہیں۔ غالب مولوی ضیاء الدین خاں کو لکھتے ہیں:-

..... مستند یا مشہور ہیں ہر ناک لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ نہ ایک دو حکیم ہزار و ہزار نہیں فرماہم ہو کہیں بیان تک کہ قیس و مسلم کھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتب دار رام پور اور گمان تک کہوں کوں کوں، اس کے جی میں آنی و مہمندی مخری قواعد الشاہو گیا.....

اس عبارت سے بیکہ خیال کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ مرزا نے قیس کے وطن کے بارے میں کوئی خاص تحقیق نہیں کی۔ یہ جی میں آیا فرید آباد کا لکھو، یا جب دل چاہا کھنوی بنا دیا، مرزا نے ایک جملہ است و ہوی لکھی کہ وہاں ہے۔ مرزا کا بیان اگر مستند ہے تو ان کے سارے بیانات پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

یہ مکتوب سنہ ۱۲۰۷ کے بعد کا لکھا ہوا ہے اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے وہ واقعی ضلی کو فرید آبادی سمجھتے ہوں پھر بعد ازاں اس کا بطلان ثابت ہو گیا ہو تو اس لحاظ سے کہ اس کی زیادہ تر زندگی کھنوی میں گزری (بہر حال عاشقی عظیم آبادی) اسے کھنوی لکھنا زیادہ مناسب سمجھا ہو۔ فرق دہلی ضرور ہیں لیکن یہ بھی نو دیکھئے کہ وہ بارہ سال بی کی عمر میں دہلی پہنچے، عظیم آباد کے بھی۔ پینڈت بھٹی نے بھی اسے فرید آبادی لکھا ہے۔ لیکن ان کے پاس یہ ظاہر مرزا غالب کی تحریر کے سوا اور کوئی ثبوت نہیں۔

## ۲

فرید آبادی کا وطن کس طرح ہے؟ نہ وہ دہلی پیدا ہوا، نہ دہلی وفات پائی، نہ وہاں قیام کیا اور نہ وہاں سکونت اختیار کی۔ فرید آبادی میں نہ اس کا وطن ثابت ہے اور نہ اس کے آباؤ اجداد کا۔

اس کا باپ ڈیڑھ سہ ماہی شاہ جہاں آبادی میں، وہ خود ۱۶۷۲ء میں دہلی میں پیدا ہوا۔ ۱۷ سال کی عمر تک یہاں رہا، لیکن تحصیل علم کے سلسلے میں یا تو دہلی رہا یا فیض آباد۔ ۱۶۸۷ء میں فیض آباد میں شہید کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اب تک وہ دہلی سے لگے تھا اب وہ محمد حسن ہو گیا مسلمان ہونے کے بعد گنگا بارچھو کر رانگ ہو گیا اور ایک زمانہ تک اطراف شہر جہاں آیا یہیں خیرت خاں

سے اس کو کتاب کاغذی ملی مرتبہ محمدی ڈاکٹر عبد الستار صدیقی رالپتوں نے رسالہ ہندوستانی میں چھاپا اور پھر انہیں کی عنایت سے رقم نہ ہونے کے حال میں علی گڑھ میگزین میں غالب میرزا میں شائع کیا۔ مکمل خط چار صفحوں میں آیا ہے۔ ملاحظہ ہو غالب میرزا ص ۸۴۔

سلطہ غالب کا قول میں نے کہاں دیکھا ہے قیمتی سے بیکہ غذات میں اس کا حوالہ درج نہیں۔ یہ قول جی ممکن مصداق مل سکتا تھا، دیکھ لیکن کچھ تیز چل سکا، افسوس کہ اس امر پر میں اس وقت زیادہ توجہ نہ دے سکا۔

اسے صحیفہ کا بیان ہے۔ دراصل اس کے متعلق اس نے جب آب خود فیض آباد رفتہ استقامت گرفتہ بروستہ شہید ہیز وہ سالہ بود نہ شمرست اسلام پیوستہ "عقد ثریا ص ۶۰۔



حتیٰ کہ پتہ چلتا ہے۔ لیکن نہ رید آتا، لاکھیں نوکر نہیں ملتا۔

ملک رام صاحب قیاس کے ایک بیان سے اس کے وطن کا کوئی لگانا چلتے ہیں، "خیر متبیل کے خاندان کے ایک سے ایک خیرہ و بے حس سے وہ ثابت کر چاہتے ہیں کہ اس کا خاندان شاندار ہے، والدین اور تعلیم کی پیدائش ہی شاندار ہی رہی۔ صبح ہے کہ، صلیب لعل کا خاندان شاندار ہے والدین، لیکن ان کا یہ خیال کہ اس کی پیدائش شاندار میں ہوئی، متبیل نظر ہے۔ اس کے بزرگوں کی ولعبت کے بارے میں تحقیق طایان کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، تعلیم سے جو اختلافات چھٹی کے لئے اور ان کے پرستار نہیں، اندر دیکھو عقد تریا، تعلیم ہی کی عمر لیتے اس نے کھانا شروع کیا تھا بلکہ بہت سا مواد تعلیم ہی کا جمع کر دیا تھا، متبیل کے خاندان میں نہیں بنایا لیکن اس کے اس فوری سے دراصل بزرگ کاش قوم خیرہ ہی خاندانی بودہ اندہ" سے اس کے بزرگوں کی ولعبت شاندار ثابت ہوئی ہے۔

[illegible]

فتیان کے آباء: جی، ایک چھوٹے سے قصبہ ہالہ کے ستھانے تھے۔ پٹیلہ کے قریب جلالپور  
کے قریب واقع ہے۔ چھ زمانہ کے بعد جتہ سوم (غالباً سورت سنگھ احمد) ایک شخص کے ساتھ جو کھجری  
نقا اور جس سے موافقت و برادری تھی، ہالہ سے ہجرت کر کے باغیچت چلا آیا۔ پٹیل کے باپ اور  
۱۰۰ گناہاں مل اور لے لال جی مل کی ولادت یہیں باغیچت میں ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں لے لال جی  
مر گیا۔ اس کے بعد لڑکھائی لے لے باغیچت کو چھوڑ کر ڈاسنہ میں جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور وہی  
ستھانہ اب پر واقع ہے، ہو دو باجش اختیار کی، ۳۰ سال تک وہاں قیام کیا تھا کہ ۱۹۱۷ء میں اس  
نواب صاحب علی خاں نے بعد نظر استحقاق روابط و تعلقات جو ستھانہ فیض آباد اور لے لال جی مل تھے

نئے مہماتیں کے واقعات، مظاہرے کے مفصلہ، عجوبے ہیں۔ "عرفت" واقعات، تفصیل "میں اس کے مختلف سفروں کا پتہ چلتا ہے۔ رقعہ ۵۹ سے سفر لہ آباد، سلطان پور، بہاولپور، گڑھ کا پتہ چلتا ہے۔ رقعہ ۶۰ سے سفر کان پور کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ رقعہ ۸۲ سے قیام سلطان پور پر۔ وطنی ٹی ہے اور رقعہ ۸۳ سے یہیں اس کے وہ بار سفر بھرانے کا علم ہوتا ہے۔

۱۰۰. ملاحظہ ہو سالانہ کار۔

تسلیم۔ فیصل کی پیدائش بٹالہ توخیر احمد کی چیز ہے، نشتر عشق کا بیان مان لیا جائے اور نہ مانے کی کوئی وجہ نہیں تو اس کے باپ اور دادا اور کا ہی مل اور رائے جی مل کی بھی پیدائش بٹالہ میں نہیں بلکہ باغیچت میں ہوئی ہے۔ فیصل کی پیدائش کیا بٹالہ میں ہوتی، خود اس کی پیدائش سے بہت پہلے اس کے دادا، ایک کھتری کے ساتھ ترک وطن کر کے باغیچت آچکے تھے۔

قبیل کے باب دروہی مل کو اپنے پاس لے لیا۔ بہت دلجوئی کی اور ہزار روپیہ زکوٰۃ کا مفروضہ کر کے  
اجازت دے کر نپٹ گھرا۔ وہاں کے ساتھ رہیں۔ دروہی مل، مدت اسیہ کبھی ڈاسنہ دیا اور کبھی  
غراب ہدایت میں غاں کے جہاں۔ انھیں دنوں شاہ جہاں آباد میں قبیل کی ولادت ہوئی۔

۳

مرزا قسطن کی ولادت شاہ جہاں آباد میں ہوئی۔ اور وہ بلاشبہ دروہی تھے۔ ان کی وطنیت کے بارے میں یہ رائے قائم  
کر لینے سے پہلے تذکرہ نگاروں اور مورخین کے بیانات کے ساتھ ساتھ قبیل کی بیشتر شتر و نظم پر بھی ایک نگاہ ڈال لی گئی ہے  
اور ان کی بعض قصائد کے نیز جو وہ نسخے بھی پیش نظر ہیں۔

(۱) مرزا عیسیٰ والدہ ش از قوم کھتری متوطن پٹیلہ (گڈا) مضافات لاہور اور قربان (رائے لانی جی) بودہ..... خود ش  
ور شاہ جہاں آباد بودہ۔ و ہجر مسن شرت اسلام پذیرفتہ.....

(تذکرہ سفینہ ہندی - ۲۱ ب - مرزا بھگوان واس)

(۲) مرزا محمد حسن :- در شاہ جہاں آباد افغان اہلنا و رشام جہاں آباد افغان و تاجر صنعت و وسالگی از طبع خواہ  
عربی و فارسی تحصیل سائنہ طبیعت عالی پیدا کردہ.....

ان شتر عشق عاشق عظیم آبادی - ص ۱۴۵۰

(۳) غنیل، وہابی کے کھتری تھے، انھوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اب گھڑ میں رہتے ہیں اور فارسی کے بہترین مالوں میں ہیں۔

(سیار اشعار - خوب چند نگاہ)

(۴) اسم نامی آں..... مرزا محمد حسین است، مولد گرامیش شاہ جہاں آباد و اجدادش ساکن قصبہ پٹیلہ قوم کھتری  
بودہ اند، چیلے زادانہ بسر می برد تاں کہ از شاہ جہاں آباد برآمدہ بہ گھڑ پیوست، در شاہ جہاں بصر شصت راگی و ولایت حیات  
سپردہ.....

(تذکرہ معراج الحیال - عبرتی عظیم آبادی)

(۵) نامش مرزا محمد حسن است از خوش معاشان قصبہ پٹیلہ بودہ اند، مولد او پدر بزرگوارش از خاک شاہ جہاں آباد  
بزرگداشتہ اند بہ شصت و چند سالگی در شاہ جہاں ولایت حیات سپردہ۔  
(ریاض لاؤکار - عبرتی عظیم آبادی)

۱۔ رائے لانی، قیاسی تسبیح ہے، سفینہ کا جو محفوظ میرے زیر مطالعہ رہا ہے وہ کرم خورو ہے۔ ناظرین میں اگر کسی صاحب  
کے اس کتاب کے کسی عمدہ نسخے تک رسائی ہو تو براہ کرم مطلع فرمائیں۔

۲۔ اس تذکرے کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے اور ایک ناقص نسخہ پٹنہ کے ایک ذاتی کتب خانہ میں۔ لیکن ہمارا بیان اسپرنگ  
سے ماخوذ ہے۔ در شمس ابھی حالی میں اس تذکرے کے ایک ہم تری نسخہ کا پتہ چلا ہے جو تمام و کمال خود خوب چند ذکا کے ہاتھ کا  
ہوئے۔ یہ نسخہ مصنف کا اصل ابتدائی مسودہ ہے۔

- (۷) محمد قتیل ۔ ہفتش از کھربان ساکن شاہ جهان آباد است ۔  
(خلاصۃ الذکر ۲۴۴ ب - بزطاب صفحہ ۱)
- (۸) میں نے قتیل کا نام محمد حسن - وطن دہلی اور سال وفات ۱۲۳۲ لکھا ہے ۔  
(اوریشٹل بائی گرائیکل لکشری)
- (۹) نقالی بدایونی نے اس کا نام مرزا احمد حسن اور وطن دہلی لکھا ہے ۔  
(خانوس المشاہیر ۱۴۱)
- (۱۰) خواجہ محمد علی نقی عظیم آبادی نے ایک ضخیم بیاض فارسی شعر کی مرتب کی جس پر خود قتیل نے اپنے ہاتھ سے ایک بیاض تحریر کیا ہے ۔ اس بیاض میں قتل نے جو اس کا خاص دوست تھا، اسے دہلوی لکھا ہے ۔  
(۱۱) صاحب مجموعہ سخن نے بھی اسے دہلوی لکھا ہے ۔

۱۔ اس بیاض کا نام "عقبات المعانی" ہے۔ مرتب خواجہ محمد علی نقی خلف خواجہ عبداللہ تائید ہیں۔ جو ۱۲۳۲ھ تک زندہ تھے دیوان فارسی مرتب محمد ایک مجموعہ غالباً "ریاض المنشآت" اور ایک ضخیم بیاض جس میں اساتذہ کی تحریرات مندرجہ کی میں نظر سے گزری ایک مجموعہ کا نام "فشرات" بھی ہے اور کتب خانہ خدائش میں ۲۳۵ نمبر پر موجود ہے ان کا یہ اردو شعر بھی نہیں مچھوٹا ہے

کتب تک صدائے فوجہ دل ہم سنا کریں  
تک آگئے ہیں زیست سے اللہ کیا کریں

اس بیاض میں امامی ہروی، ظفرخان حسن، عنایت خان آتشا خلف احسن، میرزا محمد رضا قزلباش خان امید، میرزا علی محمد آرزو، آبرو، اشتیاق دہلوی، میراث، حبیب، سنگھ پروانہ، حضرت اللہ علیہ خیر، پیام اکبر آبادی، برکت اللہ موری، بیدل، برکت اللہ، بلادی، افضل ثابت، عظیم ثبات، خلف ثابت، نواب سید حسین علی خان، بہرام خٹک، مرشد آبادی، غلام حسین خان (سلہ اللہ)، ذوقی رام، شمس نے علاوہ بہت شعرائے فارسی کے اشعار کا انتخاب کیا۔ امید، آرزو، بیدل کے سوسو شعرا اور افضل ثابت کے ۲۷۸ شعر نقل کئے ہیں جبکہ میراث کا صرف ایک اور آبرو کے صرف دو شعر نقل کئے ہیں۔

شعرائے ہمارے میں خواجہ امین الدین امین عظیم آبادی کے ۲۲۳ میر محمد عظیم خٹک کے ۳، نواب علی ابراہیم خلیل صاحب گلزار ابراہیم کے ۹۸۔ ہاں اس لئے رنگین خلف راجہ مان رائے کے ۳۔ مجرم عظیم آبادی کے ۲ علی بخش مفتون عظیم آبادی کے ۲، آجاگر چند لفت کے ۳، راجہ رام نرائن موزوں عظیم آبادی کے ۵۔ مرتبے خود اپنے دو شعرا اور اپنے والد خواجہ عبداللہ تائید توفی ۱۲۳۲ھ کے ۷۷ اشعار نقل کئے ہیں۔ جو بیاض کے صفحہ ۳۷ سے ۱۲۷ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بیاض کے ابتدا میں مرزا قتیل کا یہ بیاض ہے۔ جو بہ تلباس غالب نردا نہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ مرزا قتیل کی کسی تحریر کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے اس لئے اس تحریر کا عکس ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ راقم کی نظر سے "کلیات قتیل" کا ایک ایسا نسخہ بھی گزرا ہے جو قتیل کے پاس رہ چکا تھا اور سوزوق پراس کے دستخط موجود ہیں۔ قتیل کی تحریر کے علاوہ بیاض کے مرتب خواجہ محمد علی نقی کی تحریر کا عکس بھی شائع کیا جاتا ہے۔ ان دونوں تحریروں کے لئے میں قاضی عبدالودود صاحب، برسر شاہی پور پٹنہ کا ممنون ہوں۔



اوپر کے بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قنیل کا وطن فرید آباد نہیں، بلکہ دہلی تھا۔ اور یہ دلائل ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ لیکن ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خود مرزا قنیل نے اپنے بارے میں کیا لکھا ہے۔

۱۱۱۔ مرزا قنیل کا ایک فارسی شعر ہے۔

گر چہ باشد مولد من خاک دہلی اے قنیل کم کسے چوں من زبرد و امروان ہر خارست  
جب خود وہ اپنا مولد غالب دہلی بتاتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے صحیح نہ مانیں۔ لیکن ممکن ہے کوئی صاحب فرمایاں صاحب یہ تو شعر و شاعری کی باتیں ہیں شعر میں آدمی کیا کچھ نہیں کہہ جاتا ہے۔ ان کے لئے ایک دوسری صاف اور واضح سند بھی پیش کرنا ہوں جس کے بعد شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

۱۱۲۔ قنیل نے مولوی سلامت کے نام ایک طویل رقمہ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دہلی سے کیسی محبت تھی۔ کیا یہ جذبہ حب وطن کے سوا کچھ اور ہے؟ اس رقمہ کے چند جملے یہ ہیں:-

..... داخل شہر شدہ برپاس خاطر داعی آثم روزے رونق افروز مسجد فخری شدہ دکانیں بازار فربہ مسجد مذکورہ را از طرف من سلامہ و درو دیار شہر را اشتباہے رسانیدن ضرورہ و از عنایات دلی بعبہ نہ خواہد بود بہر کس کہ من بر بہر کویتہ و ہر خانہ من مشہر عاشقم ۲۰۹

(۱۳۱) اسی رقمہ کی ابتدا میں ایک جملہ ہے:-

”ستاد ہاں آباد مولد و وطن فقیر است“

میرا خیال ہے کہ قنیل کی وطنیت دہلی پر اب اس سے زیادہ روشن اور واضح دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ اور نہ اس سے بہتر حجت قائم ہو سکتی ہے۔

## ۴

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اب اچھی طرح سے ثابت ہو چکی ہے کہ قنیل کا وطن دہلی تھا جو اصحاب اس بات کے مدعی ہوں کہ وہ فرید آبادی تھا۔ انھیں اس کا ثبوت معتبر معاصرین کے بیانات سے دینا چاہیے۔ مجھے تو تذکرہ و تاریخ کا کوئی بیان ایسا نہیں مل سکا جس سے اسکی وطنیت فرید آباد ثابت ہو سکے۔ وطنیت تو بعد کی چیز ہے۔ قنیل کا تو قیام فرید آباد بھی متحقق نہیں۔ تاریخ و تذکرہ، روزنامہ، لکازینب اور بیاضوں کے مطالعے سے ہمیں قنیل کے مختلف شہروں میں رہنے اور آنے جانے کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی ایک دن کیا ایک لمحہ کے لئے بھی فرید آباد میں قیام ثابت نہیں ہوتا۔

قنیل، عاشقی کے بیان کے مطابق ۱۱۷۲ھ میں پیدا ہوا۔ اور جمہور کے قول کے مطابق ۱۲۳۳ھ میں اس نے وفات پائی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس مدت میں کدھر رہا اور کہاں کہاں کی خاک چھانٹا رہا۔

۱۔ عاشق کا بیان ہے کہ قنیل کی پیدائش ۱۱۷۲ھ دہلی میں ہوئی۔ ۱۱۷۲ھ تو لہ آں و شاہ جہاں آباد اتفاق افتادہ  
۲۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک یعنی تقریباً ۱۱۹۰-۱۱۹۹ھ تک وہ تحصیل علم کرتا رہا۔ یا تو دہلی رہا یا فیض آباد و گرنارنج

- ۸۹-۱۱۹۰ھ : اراک کے محلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کی تخیل انش دہلی میں کی : ۱۱۹۰-۱۱۹۱ھ
- ۱۱۹۱ھ میں وہ اسد مملایا مصطفیٰ کا بیان ہے : درایا ہے کہ متعلقانہ بحسب آب خور فیض آباد منتہا منتہا
- کر فہرہ و ست شہید ہیز وہ سالہ لاؤ کہ بشریت اسلام پر پستہ عقد ثریا : ۱۱۹۰ھ
- مسلمان ہونے کے بعد گھر یا ہمیں گزرا لنگ پر گیا اور ایک زمانہ تک اطراف شاہ جہاں آباد میں نجف خان کے لشکر کے ساتھ گھومتا رہا۔ اہل ریت خود راغیر یا کثفتہ کنرا حبت و آزادانہ قدم بہ راہ تجربہ بہادہ و اطراف شاہ جہاں آباد پر لشکر ذوالفقار الدلہ نواب نجف خان مرحوم می گشت " نشر عشق : ۱۳۵۰
- ۱۱۹۱ھ میں مصطفیٰ عقد ثریا میں فدائی شہیدی کے رجم میں گھٹا ہے کہ مرزا محمد حسن قنبل نے ہرزہ چاندنی چک میں اسکی زیارت کیا۔ اسکی موت : ۱۱۹۲ھ میں از ابو علی فدائی غیاثی ایران سے تھا اور یہ تقریب تحاریر اسلحہ وار و ہندوستان ہوا تھا۔ چوں از وہی مر اجبت بہ وطن مالوف کرد و رشہ تقدیں رسید از مرید افتادہ و ولعت حیات سپرد : اس کا سال وفات او آخر ۱۱۹۶ھ ہے
- ۱۱۹۶ھ میں چاندنی چک : وہی کا مشہور محلہ ہے جہاں قنبل سیر کر رہا تھا۔ (۱۱۹۶ھ)
- ۵۔ بے تاب کے ترجمے میں مصطفیٰ کا خطاب کہیں : ۱۱۹۸ھ میں شاہ جہاں آباد سے لکھنؤ آیا لیکن بسبب بڑی مزل لکھنؤ چھڑنے کا راہ کر رہا تھا کہ قنبل نے ان کی دھما سے بندھوئی " نوخر الذکر مصطفیٰ کے بیان کے مطابق اس وقت نواب کی ملازمت میں آیا تھا : اس سے معلوم ہوا کہ ۱۱۹۸ھ میں قنبل لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۱۹۸ھ)
- ۶۔ اسکی مصطفیٰ کا تذکرہ فارسی عقد ثریا مرتب بھی نہ ہونے پایا تھا کہ قنبل دہلی سے غائب نظر آتا ہے " درایام دہلی اس نشانے موقوف .... ان تھا قدم و راویہ تلاش اشعار و احوال .... مسوودہ سرگزشت ہر یک را بر بارہ کاغذی نگاشتم
- ۷۔ تذکرہ عقد ثریا ۱۱۹۹ھ میں مرتب ہوا : یہ باغ باصفا مادہ تاریخ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۱۹۹ھ میں وہ دہلی سے غائب ہے (۱۱۹۹ھ)
- ۸۔ تذکرہ ہندی میں مصطفیٰ نواب تہرمان خاں زند کے ذکر میں لکھا ہے : " فقیر حسب اتفاق روز سے برائے دیدن آن بزرگ ہمراہ مرزا قنبل در رستم نگہ برکافش گذرا فگندہ بود " ص ۱۱۰
- اس سے معلوم ہوا کہ قنبل بہ زمانہ ترتیب تذکرہ ہندی لکھنؤ میں موجود تھا۔ تاہم تاریخ اختتام تذکرہ ۱۲۰۹ھ ہے لیکن اس کی ترتیب کا کام ۱۲۰۱ھ سے پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ (۱۲۰۱-۱۲۰۹ھ)
- ۹۔ تذکرہ خلاصۃ الافکار میں قنبل کے ذکر میں لکھا ہے : بہ عافیت وصحت بہ معاشرت شاگرداں و دوستان و دربارہ نمونہ بسر می برد۔ یہ عبارت قیام لکھنؤ پر دال ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۰۶ھ میں لکھا گیا ہے۔ (۱۲۰۶ھ)
- ۱۰۔ خواجه محمد علی قنبرا عظیم آبادی خلف خواجه عبداللہ تائب عظیم آبادی منوفی ۱۲۰۶ھ نے جو نواب علی ابراہیم خاں خلی کے معتمد تھے ایک ضخیم بیاض فارسی شعر کی مرتب کی ہے جس میں قنبل نے اپنے ہاتھ سے دیباچہ لکھا ہے۔ اس کے چند جملے یہ ہیں : " قنبل بے سراہا گدیر کہ چوں در سال ہزار دودعد و دوازہ بھری بہ ملاقات شریف خواجه محمد علی متا خلف ارشد خواجه عبداللہ تائب ..... در لکھنؤ بدولت خانہ صاحب عبدالقادر خاں بہادر اتفاق افتاد " اس بیان کے غلط ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔

انڈیا آفس کی فہرست کتب خانہ فارسی جلد دوم میں شہر واقعات اور شہر ادا کا برہن کے سبب ولادت وغیرہ دیتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۱ھ میں عبدالغفار خان کا رکن البیٹ انڈیا کا قیام جان ہندن کی معیت میں لکھنؤ میں تھا۔ بہر حال ۱۲۱۲ھ میں عبدالغفار خان لکھنؤ میں موجود تھا۔ اب رہا اس کے انٹیمیل کے تعلقات کا حال۔ سو اس کا بھی ثبوت ملاحظہ ہو۔

۱۰۔ نہ انصاحت کے دفعہ ۲۶۹ میں قتل اپنے کسی عزیز کو کہہ رہا ہے کہ "نہا را سفر کلنتہ اور خان صاحب مولوی جواد غازی کی وساطت سے مسٹر جان ہندن سے ملاقات کا حال معلوم ہوا"۔ چونکہ اس نے سردار باخان صاحب مدد فرمایا ہے وہ اعلان است معلوم ہوا کہ قتل ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا اور وہیں مولوی عبدالغفار خان کے مکان پر اس کی ملاقات لگتا ہے ہوئی۔ (۱۲۱۲ھ)

۱۱۔ چار شربت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں وہ کاپی کیا اور ڈھائی سال تک ہاں مقیم رہا۔ صاحب تذکرہ شمع انجمن کے قول کے مطابق وہ عماد الملک کا صاحب بن گیا تھا۔ مذکورہ نتائج الا فلا میں بھی یہی ہے کہ کچھ دنوں کاپی رہے اور پھر خوبی بسر کی۔ (۱۲۱۵ھ)

۱۲۔ چار شربت میں یہ ذکر ملتا ہے کہ ۱۲۱۶ھ میں کاپی سے لکھنؤ واپس لوٹا۔ (۱۲۱۶ھ)

۱۳۔ حسین علی خاں عاشقی تلمیذ و جہیز لدین عثمانی عظیم آبادی کا بیان ہے۔ "..... الحال از عرصہ سی و شش سال یہ لکھنؤ تشریف می داند و وزیر و سال بسبب خلعت و اختا و مرزا شجاعت علی خاں شہرورہ آغا صاحب کے مختار رہا۔ دولت دار مرشد زادہ آفاق مرزا سکندر شکوہ ہاورد..... بہ دولت شاہ زادہ مدد و تقاربت پذیرفت۔" بعد پھر یہ احوال ناگماں خبر جان گذار رسید کہ اس فصاحت کیش بہ مرض استغابہ تاریخ بست و سوم بیع الاول و لکھنؤ و بعیت حیات سپرد۔

عاشقی یہ سطر قتل کی بالکل آخری عمر میں لکھ رہا ہے۔ اس کا سال وفات ۱۲۳۳ھ ہے اگر اس سے ۱۵ سال نکال لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قتل ۱۲۱۸ھ میں سکندر شکوہ کے مصاحبوں میں داخل ہو چکا تھا۔ (۱۲۱۸ھ)

۱۴۔ دریائے رافٹ کی تریب میں قتل کا بڑا بانٹھ تھا اور نصف ثانی جو منطق ووقائی اور بیان و بدیع پر مشتمل ہے کلیتہً اس کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سعادت علی خاں مسند پر رونق افروز تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۲۲۱ھ ۱۲۲۲ھ

۱۵۔ عبدالغفار اور قتل کے تعلقات پر روشنی "قانع عبدالغفار خاں" سے بھی پڑتی ہے جس کا ایک ناقص نسخہ کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ ایک نسخہ جامعہ علی گڑھ میں بھی تھا لیکن اب موجود نہیں۔ راقم نے اپنے کام کے لئے کچھ اجزا کی نقل کتب خانہ حبیب گنج کے نسخہ سے کرائی ہے۔ اور اس وقت وہی پیش نظر ہے۔

فہرست کتب میں موجود تھا۔ (۲۲-۲۳)

۱۴۔ آوازوں نے زخمی کئے جو اسے سے لکھا ہے کہ مرزا حاجی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، انشاء اللہ قریب بمقامی اور دوسرے شعراء میں ہونے، ناسخ جانے، سب کو سنتے ہوئے وہاں خود کچھ نہ پڑھتے۔ (آب حیات: ۳۴۵)

مرزا حاجی کے مکان پر مشاعرے کب ہوتے تھے اس کی ہمیں خبر نہیں، لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ انشاء ایک روایت کی بار پر ۲۲۵ھ میں منعقد ہو گیا تھا۔ اس مجمع میں جرأت بھی اظہار آتا ہے۔ اس کا سبب وفات نئی تحقیق کی بنا پر ۲۲۲ھ ہے۔ یہ مشاعرے ظاہر ہے کہ ۲۲۲ھ یا اس کے لگ بھگ منعقد ہوا کرتے تھے جب کہ قمر کے آخری ایام تھے۔ اور ناسخ کا ابتدائی دور۔

۱۵۔ ابن الفوائد مرزا قنبل کے ان رقعات کا مجموعہ ہے جو خواجہ امام الدین امامی نے اس کی زندگی ہی میں مرتب کیا ہے۔ اس کے ایک مکتوب میں قنبل رقمطراز ہے: "اتقا صاحبان مخدوم محترم بن خیریت اندونابہر سنگھہر کو بھی بہت مند و من بہ نحاس و دفا نہ تھا"۔ نحاس لکھنؤ کا ایک محلہ ہے۔ اور یہ مکتوب ۲۰ ربیع الثانی ۲۲۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ (۲۲۶ھ)

۱۶۔ ایک دوسرے مکتوب کے چند جملے یہ ہیں: "پری روز کہ شنبہ غزوہ ربیعہ الثانی ۲۲۵ھ بدو عرضہ شہا خطے کہ اسکی من بود و در جہلی نحاس ہیکہ از حضور بہ این تقریب کہ فرواد و مشاعرہ است رسیدم بہ مطالعہ درآمد"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۲۲۵ھ میں دو مکتوبیں موجود تھیں۔ (۲۲۷ھ)

۱۷۔ مولوی عبدالغفار خان لکھنؤ رام پوری اپنے روزنامہ "ذائقہ عبدالغفار خان" میں سلسلہ سفر لکھنؤ ۲۲۹ھ کے ذیل میں لکھتے ہیں: "۲۲۷ھ سے در محفل مشاعرہ کہ در ایام بہ خانہ میر جعفر می بود رفتم، مرزا محمد حسن قنبل، مصطفیٰ، بہ نصیر و بلوی در اب زیر و سرگودہ بہ شہر می آمدند۔ پیشین امام بخش ناسخ در ایام روز افزونی بہ نام وردی در ایں کار بود"۔ نسخہ رانم، ۵۵۔ معلوم ہوا کہ قنبل ۲۲۹ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۲۲۹ھ)

۱۸۔ ۲۳۱ھ میں ہم اسے پھر کاپی میں موجود پانے میں منظر العجائب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران مالیف کتاب میں وہ کاپی میں ہے۔ یہ کتاب ۲۳۱ھ میں لکھی گئی۔ عفاف ظاہر ہے کہ ۲۳۱ھ میں وہ کاپی میں موجود تھا۔ (۲۳۱ھ)

۱۹۔ راجہ امرت لال اپنے لڑکے کے لکھن لال کی شادی کے موقع پر قنبل کو جو وہیں لکھنؤ میں موجود ہے دعوت نامہ بھیجا ہے۔

• موضع اقدس می رسانا کہ شنبہ برات بندہ زادہ محسن لال بودہ در مکانے کہ برچو میا فروکش کہ دوام، امیدوارم کہ امروز یا فردا برائے یک دو مساحت اگر غلام نوازی فرمائید موجب افتخار است"

مکتوبات امرت لال کے اس قلمی نسخے کی ابتدا میں کچھ اور سادہ اوراق ہیں جن پر کچھ ریختہ کے اشعار، کچھ نسخے اور کچھ قطعات تاریخ و راج ہیں۔ ایک قطعہ تاریخ محسن لال کی شادی کا بھی ہے جس سے عنایت تعبیر میں ۲۳۲ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ تقریب شادی لکھنؤ میں انجام پائی معلوم ہوا کہ قنبل ۲۳۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۲۳۲ھ)

۲۰۔ اس کا سبب وفات ۲۳۳ھ ہے اور اس امر پر تمام مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ اس کی وفات لکھنؤ میں ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ۲۳۱ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۲۳۳ھ)

ذیل کی سطروں سے معلوم ہوا کہ قنبل کس سند میں کہاں رہا۔



کوئی تناقض نہیں ہے۔ کیونکہ فرید آباد، دہلی کے مصافات میں داخل اور دہلی کے لطافت میں اس کا نام دہلی کے معنوں اور بازاروں کے معنوں میں تحریر کیا گیا ہے اور یہ، کتا ہے جس کے آخری دو باب خود مرزا قنبل کے لکھے گئے۔

عرض یہ ہے کہ جب دہلی کو ملانے اور فرید آبادی ہونے میں کوئی تناقض نہیں ہے تو اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔ اب ایسے بیان پر جو دوسرے کرنا زیادہ بہتر ہے جس میں اکثریت کا اتفاق ہو، سارے قدیمہ مذکورہ نویس اسے دہلی کہتے ہیں فرید آبادی کوئی نہیں بتانا۔ اس لئے اسے دہلی ہی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے خصوصاً ایسی شکل میں کہ:-  
 "تاریخی اور تذکروں سے قطع نظر خود فرید آباد کا محل وقوع اور دہلی سے تعلقات ایسے ہیں کہ اگر کوئی تذکرہ نویس قنبل کو ایک نوادی ہستی کی تفصیل لکھنے کے بجائے اجمالاً دہلی لکھتا ہے تو اسے غلط نہیں کہہ سکتے۔"  
 آخر میں تحریر فرماتے ہیں:-

"بہر حال اتنا یقینی ہے کہ غالب نے جو قنبل کے قریب العصر اور دہلی کے رہنے والے تھے، اس کے فرید آبادی ہونے کا حال کسی سے سنا ہوگا۔ ورنہ وہ خود اس کا وطن تصنیف نہ کرنے، یہ بہت بعید از قیاس بات ہے۔ پس جب تک ان کے کسی معصک نہ ہو، مستحسن آئے ہم حالیہ رد و قدر کو ان کے بیان کی نگریں لے کافی نہیں سمجھتے۔"  
 غالب کی تحقیق اور حاسنہ تاریخی کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ پھر غالب نے اسے لکھنؤ اور ایک جگہ دہلی بھی نوٹ کیا ہے۔ غالب کے ایک قول کو تسلیم کیا جائے اور دوسرے اقوال کو کیوں ٹھکرایا جائے خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ اقوال صحت سے قریب تر ہونے کا امکان زیادہ رکھتے ہوں۔ آخری اقوال، ان کی عمر کے آخری دور کے اقوال ہیں اور ہر سکتا ہے کہ انھیں بعد میں صحیح اطلاع ملی ہو اور وہ اپنے پہلے قول سے پھر گئے ہوں۔ اور یہاں تک وطن تصنیف کرنے کا تعلق ہے تو انھیں تو آدمی تصنیف کرنے پر نہیں لگتی۔ عید العصر ہر زمان کی تصنیف نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ سوال بمعصر کی تردید کا، تو پہلے یہ تو معلوم ہو کہ غالب کے علاوہ قنبل کی وفات کے وقت غالب کی عمر تیس سال کی تھی جو زمانہ ان کی جوانی کی رنگینوں کا تھا، مرزا اس زمانہ میں دہلی میں تھے کبھی کبھار ناہیالی اگر سے چلے جاتے ہوں گے۔ ان کا اس زمانہ میں لکھنؤ جانا اور قنبل کا دہلی آنا ثابت نہیں۔ اس لئے ملاقات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان دھڑوں کی معاشرہ بھی کچھ ویسی ہی ہے، اور کوئی ایسے معاصر ہیں جو قنبل کو فرید آبادی بتاتے ہیں۔ اور فاضل ضامن نگار عاشقی عظیم آبادی اور خواجہ فتنہ عظیم آبادی کو قنبل کے معاصر کیوں نہیں سمجھتے۔ جن سے تعلقات، خط و کتابت اور ملاقات سب کچھ ثابت ہے؟

## مصاوریہ:-

مرزا قنبل کی مطبوعہ تصانیف، تاریخ و تذکرے کی کتابوں اور رسائل کے علاوہ ذیل کے مطبوعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

۱۔ تذکرہ خوش معرکہ نیربا مرتبہ سادات عالی ناصر، نسخہ خراج بخش مانگا، لور، جامعہ عارگرہ۔

- |  |                          |
|--|--------------------------|
| مرتبہ بھگوان داس نسخہ خدا بخش بانکی پور۔                                   | ۲۔ تذکرہ سفینہ ہندی      |
| مرتبہ افاجبین قلی خاں عاشق عظیم آبادی نسخہ خدا بخش بانکی پور۔              | ۳۔ تذکرہ کشتی عشق        |
| مرتبہ میر و زبیر علی قبری عظیم آبادی نسخہ الیشیا ملک سوسائٹی بنگال۔        | ۴۔ تذکرہ معراج الخیال    |
| مرتبہ میر و زبیر علی قبری عظیم آبادی نسخہ راقم۔                            | ۵۔ تذکرہ ریاض الافکار    |
| مرتبہ ابو طالب تبریزی اصفہانی نسخہ خدا بخش بانکی پور۔                      | ۶۔ تذکرہ خلاصہ الافکار   |
| مرتبہ خواجہ محمد علی نعمانی عظیم آبادی نسخہ قاضی عبدالودود صاحب بانکی پور۔ | ۷۔ عمان المعانی          |
| از قبیل۔ نسخہ خدا بخش، جامعہ علی گڑھ، جامعہ بنارس، حبیب گنج۔               | ۸۔ کلیات تفتیل           |
| مرتبہ امرت لال نسخہ راقم۔  | ۹۔ رفعات امرت لال        |
| مرتبہ عبدالقادر خان غلجی رامپوری۔ نسخہ راقم۔                               | ۱۰۔ وقائع عبدالقادر خانی |

# تنہوی بہارِ عشق

خواجہ احمد فاروقی

ہماری تنقید ایک عرصہ تک واقعہ و معتدبہ کا کام انجام دیتی رہی ہے۔ اسی سلسلے مرزا شوق کی تنہوی بہارِ عشق کو بھی درجہ اعتدال نہیں سمجھا گیا۔ ہم نے پیار کو مرقع کی آئین میں پوشیدہ رکھا۔ لیکن اس میں عکس یار و بچنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم زائد و زائد سے بچنے میں مصروف رہے اور یہ بھی نہیں سمجھے کہ زبرد قدر خواہ سے بھی بہت سی باتیں کہیں جاسکتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بہارِ عشق کسی کے دل پہ ہونے لگے لیکن پھر غرض جنسی و جھانست کی نشاۃ الچیز و استانت ہے۔ یہ سہ لاری اور پیش گوئی کی کہانی ہے۔ جس کو شاعر نے پوری پے پائی اور بے جہانی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن اس سے رنگین پردہ ڈال کر پردہ کے نقشہ زنگار کو حقیقت باور نہیں کر دیا۔ اور نہ معذرت پیش کر کے اپنے گناہ کو بدتر از گناہ بنا پایا ہے۔

تنہوی پرست کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں؟ کیا مرزا شوق نے محض زندگی کی قربانی ہی کی ہے اسے بلند نہیں کیا؟ کیا ان کی سستی میں عذرت ہی عذرت ہے، کسی قسم کی لطافت نہیں ہے؟ کیا ان کی خداداد جندی کی متنازل قلع کر کے جس کوئی بہن مدد نہیں دے سکتی؟

ایک شخص جو اپنے سر پہ بھاری بوتل اٹھائے ہوئے اندھیری رات میں دشوار گزار سفر طے کرنا رہا ہے۔ وہ اگر راستہ کے کسی ٹھنڈے ٹھکانے پر ڈھیر ہو جائے، دوسرے راہ گیروں کو مطلع کر دیتا ہے تو وہ جس کے اغواف میں اپنا ہی بوجھ بٹا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کا بھی بوجھ بٹا کر دیتا ہے۔

خیال تم نے ایک شین اور ذہن فاحشہ کا مکالمہ کیا ہے۔ زائد سے بڑا عورت کو جھڑکا کہ تو ہر وقت مست و غراب رہتی ہے۔ تو نے خبر سے یہ بات منقطع کر دیا ہے۔ اور شر سے وابستہ ہو گئی ہے۔ اگر تیرے دل کی بھی خبر ہے تجھے؟ اس نے کہا سنو میں تو ہمیشہ ہوں اپنے آپ کو فخر کرتی ہوں کیا آپ بھی ایسے ہیں جیسے اپنے آپ کو فخر کرتے ہیں؟

مرزا شوق نے اپنے انداز میں اسی سوال کو دہرایا ہے اور اس سوال کی حسین اہمیت سے انکار نہیں کیا۔ بالکل۔

یہ فلسفہ جاں عالم و جد علی شاہ کے اس گفتگو سے متعلق ہے جہاں فیض شیم اور جبرہ علی کی کمی نہیں تھی۔ ہر منظر جنت نگاہ اور ہر گوشہ بساط و امان باطن بنا ہوا تھا۔ نقادہ جہاں بھی تھا۔ اور شوق دھماکا بھی، دھم کے سوا کچھ، اندر سجا کی پریوں کے عجیبے، درگاہ



اور شام و سحر کی یہ رنگینیاں فاضل ہو کر رہ گئی ہیں۔

مے و ماسک و رنگ و بو کی یہ فیض بخشیاں صرف آفتاب سے پہر جاہ و شہم ہی کے لیے مخصوص نہیں تھیں جن کے اختیارات کم ہونے ہوئے محدود ہو گئے تھے۔ بلکہ ہر عزیز و امیر اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ہر خاص و عام کے آگے اسی طرح ایک مذاہب جام بہر شادی رکھا ہوا تھا۔ ذہرہ صبح بھی تھا، اور جام بود بھی۔ صراحی سے ناب کی تھی اور سیفہ غزل بھی، لوگ، ماضی و مستقبل کو حال کی ہستیوں اور رنگینوں میں بھلا چکے تھے اور دست افشانی اور پاکلی کا مفہوم صرف یہ رو گیا تھا کہ نہ۔

بیانا یک امشب تماشا کنسیم

جو فروا شود فکر فروا کنسیم

بہار عشق کے قصہ کی ابتدا۔ اور انتہا اسی حسن ریز اور عشق خیز سرزمین میں ہوتی ہے۔

میرا فسانہ لکھو کا ایک خوب صورت نوجوان ہے۔ جس کا وقت ابھی مصروف مقبول اور چھپوں میں گزرتا ہے۔ وہ عشق و عاشقی سے بعض ناواقف ہے اور وام آفت سے نا آشنا۔

نام اُنت سے ہم نہ تھے آگاہ	کسی پرست کی تھی نہ ہرگز جاہ
عیش و عشرت میں گنتی تھی اوقات	چھپوں میں گزرتی تھی اوقات
عشق کا سننے سننے نہ افسانہ	شع و دیوں پہ تھے نہ پہ اند
جان ویت نہ تھے کسی گل پر	بہتے تھے تابا نہ بیل پر
آو و ناری جو کوئی کرتا تھا	اک رہتا تھا ہیں گزرتا تھا

لیکن ایک دن جب کہ وہ کتو کے بیٹے کے دستور کے مطابق چوک میں سیر کرنے جا رہا تھا۔ اتفاقاً ایک کامزا اسے مانجیس جا رہی ہو گئیں۔ اور اس کے ہوش و حذر کا سارا سراپہ چھین گیا۔ وہ دل بہان اب تک مسرت و اطمینان کی طمرانی تھی، وہاں اضطراب و التباب کا پرچم لڑ گیا۔ یہ داستان خود شاعری زبان سے سننے کے قابل ہے۔

ایک دن جو ہر اے سیر انھا	دیکھی کو تھے پہ ایک ماہ لقا
ہام روشن تھا ہو کی صورت	سر سے پاتم تھی نور کی صورت

ماہ لقا کی یہ مقبولیت ممکن اور دل کش ہے۔

حسن پرست بھی اس کے آگے ماند	چہرہ زلفوں میں جیسے ابو میں چاند
گل سے رخسار، گول گول بدن	گات جس طرح لہجے و دشن
دخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال	رنگ گل سے وہ ہونٹ ہان سے لال
بے مہی کے وہ دانت و مشک قمر	بان عاشق نہ ہو جس پر
ناک میں نیم کا فتہ تنکا	شونی چالاکي متن ناسن کا
بہت	حد

قد میں آنا سب قیامت کے      گری گردن میں طوق منت کے  
مخ پر گرمی سے وہ عرق لم کم      جس طرح گل پہ قطرہ شبنم  
عکس رخ مریوں کے انوں میں      بھیاں چھوٹی چھوٹی کاؤں میں  
رنگ گل سی کر لپکتی ہوئی      چوٹی ایڑی نلک ٹھکتی ہوئی  
سرو سا قد تو گل سے دخلکے      شانے باز و بھرے بھرے سانسے

کتنا محک اور صبح نقشہ ہے یہ۔ مہ لقا کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ اس کی جوانی ابھی کانسٹے میں نئی رہی ہے۔ اس کی خوبصورتی آرائش اور تکلف سے بیکر بلے بنا رہے، مرزا شوق نے بکھرے ہوئے بالوں، بے مستی کے دانتوں، آئینوں کی بھینسی کڑتی، جسم کی پھرتی ناک میں نیم کے تنکے، کانوں کی بھیلوں، بھرے بھرے بازوؤں، پائینڈ کے چھوٹے چھوٹے قندروں، اور چوٹی کے شکنے کا ذکر کر کے مہ لقا کی تصویر اپنے ہاں ایک موقوف سے پوری خوبی و صنایع کے ساتھ کھینچی ہے۔ اس سراپا میں اور نہ ہر عشق کے سراپا میں بڑا فرق ہے۔ اس سے مقصود نہ تو روشن کے آگے شمع رکھنا ہے اور نہ ہی متبادل کرنا۔ بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آب و رنگ اور عزیمات کے اعتبار سے بہاؤ عشق کی تصویر بہادور دل پذیر ہے۔ نہ ہر عشق کے اس قسم کے الفاظ، غیرت حور، کمال غلیظ، رشک چشم غزال، بے دلیل و نظیر ہمارے سامنے مصیبت کا بڑا نقشہ پیش نہیں کرتے۔ بہاؤ عشق میں یہ تعیم نہیں ہے۔ مہ لقا کی ادائیں الگ ہیں۔ مخصوص ہیں، اسی کے لیے ہیں۔ سراپا میں جس جگہ بھی نغمہ ہے یہ جی چاہتا ہے کہ ہر ہنس بسر گروی جائے۔ ایک ایک کر کے دامن دل کو کھینچتا ہے اور کہتا ہے، یاد دہاؤں دار و آں ہر زہم!

یہ ٹھنوی اس جبین اور جہان منظر کی تاب نہ لاسکا۔ اور ایک ہی نگاہ میں دل ہی کا سودا نہیں ہوا بلکہ اس کا زمین و آسمان بھی

پھنسا ہوا۔

جب نظر سے نظر دوچار ہوئی      ایک برہمی جگر کے پار ہوئی  
رنگ رخ دیکھتے ہی زور دھڑکا      دل میں بے اختیار درد دھڑکا  
دل جو صدمہ بڑا اٹھاتا تھا      ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا  
حمن نے کی دل سے کج ادائی سی      منہ پہ چھٹنے لگی ہوئی سی  
سوزش داغ دل دو چند ہوئی      آتش عشق سے بند ہوئی  
سوز دل نے یہ آگ بھڑکائی      جان گہرا کے لب تک آئی  
منہ کو تاب و توان سے پھیر لیا      اب گیسو نے دل کو تعمیر لیا  
واں سے حبش ناک ہوئی و شواہ      تبر کھائے جو جس طرح سے شواہ  
جان و دل بتلائے دودھ لکے      ایک ایک لاکھ پاؤں سر دھوئے  
بس بیکر سا کوئی ملنے لگا      فم سے دل دودھ لاکھ اچھلنے لگا

یہ آخری شعر بھی ملاحظہ ہو۔

شہر سارا اجالہ تھا گویا      اتنا رستہ پہاڑ تھا گویا

بہ لطفیت اسبنت سے آتی قریب ہیں کہ نہ جانے والا تھا تو جو کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پہلی نگاہ کی بدست اکثر کلمہ جینزی کی نظر میں نہ رہی، غرض اس کی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محبت کو کسی ترازو میں نہیں تو لا جا سکتا اس کا کوئی رشتہ، کوئی لحاظ نہیں۔ سب سے اس کا نہ کوئی قانون ہے، نہ کوئی تائید، پھر اس قسم کا فیصلہ کر کے وقت نہیں اس شانہ کے، اور اسے کس کے مخصوص حالات کو بھی، اور انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں بہت سی عورتیں ہی نہیں، مرد بھی قص میں بند رہتے ہیں اور کسی فتنہ طراز کو دیکھ کر ان کے تاثرات بھی اسے ہی شدہ ہو جاتے ہیں۔

یہ نہ تم اتنا کاوی تھا کہ میر تقی میر کی تمام شب بے چینی اور اضطراب کے ساتھ گزری — عشق کا رات بھر تو جوش رہا، صبح جیتے ہی پھر نہ جوش رہا، دوست آشنا بنا، پریشان ہوئے، صدقے بیلے اترنے لگے، گلاب چھڑا جانے لگا، اقرار کو بھی تشویش ہوئی، اور بعض کہ یقین ہو گیا کہ یہ تشویش اس کا ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ بات مبالغہ آمیز ہو سکتی ہے لیکن نامکن نہیں۔

دکھے کہتا تھا کوئی غم سے بڑا	ایک بابک آسمان ٹوٹ پڑا
کچھ دوا کرتے دل کو صبر آتا	کاش بیہار پڑے مرجھاتا
دستی، درد نہ کی نہ ابھی کبھی	دل کی حسرت تمام دل میں ہی
اللہ آہیں، سنے اس کو پا رہے	سارے گھر کا یہ ہی اہلا ہے

سارا گھر ماتم کد رہنا جو اتھا کہ خدا خدا کر کے اس مریض غم نے آنکھیں کھولیں اور اس بے ہوشی سے نجات پائی —

تن ہے جاں میں سب کے جاں آئی

ریخ اور غم دونوں سے ہو گئے درد اپنے بیگانے سب ہو گئے سرور

اب لوگوں نے اس زخم بے نشان اور تیرے کماں کا پتہ لگا کر شروع کیا۔ ایک آدمی قمیص دے دے کر پوچھنے لگا۔ ناچار یہی داستان سنانا پڑی۔

ماجرہ سب بت دیا ان کو ان کے گھر کا پتہ دیا ان کو

دوستوں نے غم گساری اور چارہ سازی کا یوہا یقین دے دیا۔

آشنا بوسے شہر چھپائیں گے

ہیں جو اس شہر میں تو آئیں گی

کچھ عرصہ اسی پریشانی اور اضطراب میں گزرا۔ عاشق کا کسی چیز میں دل نہ لگتا تھا۔ دریا کی سیر کی، باغ کی بہار، چورس شطرنج

کوئی چیز اسے سرور نہ کر سکتی تھی۔

بالآخر ایک دوست نے اس کے گھر کا پتہ لگا لیا، اور آکر یہ خوش خبری سنائی، لیکن دیکھتے کتنے طبع انداز میں سنائی ہے۔

جس پر عالم فریفتہ ہے آج

جس کو بے ادعا سے محبت تھی

تبغ ابرو سے جس کی بسل ہو

نیر مڑ گاں سے جس کے گماں کی ہو

جس کی خاطر ہوا ہے حال تباہ  
کھاتے پیتے ہوا درد سوتے ہو  
جس کی الفت میں جان کھوتے ہو  
واسے جس کے نامے کرتے ہو  
دل پڑا جس کے علم میں جلتا ہے  
جس کا درد وہ کے دھماں آلت ہے  
جس پر دم دشمنوں کا جاتا ہے  
گھر بڑی محنتوں سے پایا ہے  
اس کے جواب میں عاشق کا تارڑ مریت یہ ہے

ہنس دیا، بچ دل سے دودھ ہوا

پھر گھبرا کے پوچھتا ہے وہ کب آئیں گی؟

یا مجھے اپنے گھر بلائیں گی؟

دورست بہت ہے اور کہتا ہے: ہوش کی دوا کرو۔ یہ کچھ ایسا سہل اور آسان مقصدی ہے۔

ہنس کے اس نے کہا ہوس میں ڈ  
ایسا آسان ان کا آنا ہے  
ان مری باتوں پر نہ اتر آؤ  
سہل کچھ آپ کا جانا ہے  
کس نے یہ مشورہ بتایا ہے  
دل کہیں اور بھی لگا یا ہے  
عشق آفت آسانی ہے  
برسوں لوگوں نے خاک چھانی ہے

اس کے بعد عشق کے فلسفہ پر تقریر ہے۔ یہ مولانا ضرور ہے۔ لیکن آدو اور پھر میں اس کا بیاب تجزیہ کی مثالیں ایک ہی دو

مگر مل سکیں گی۔

عشق آفت آسانی ہے  
شمع ہو کے کہیں بجھتا ہے  
کہیں سرور ہے چشم تر ہے کہیں  
کہیں ہے کفر اور کہیں اسلام  
کہیں آتش ہے خود کہیں ہے بیل  
کہیں فرقت کا درد مند ہے یہ  
کہیں دہم جگر کا پھٹا ہے  
کہیں عارض کا خال بنتا ہے  
کہیں اضمی زلف یا رہے یہ  
گر یہ چشم غریب کاں ہے کہیں  
برسوں لوگوں نے خاک چھانی ہے  
کہیں پرواز تین کے محتاب ہے  
کہیں صندل ہے درد مر ہے کہیں  
کہیں دوزخ کو کرتے ہیں یہ سلام  
کہیں ساقط ہے شل بغض میں  
کہیں مغرور خود پند ہے یہ  
دردین کو کہیں کراہا ہے  
کہیں چشم خزاں بنتا ہے  
کہیں تریاق زہر مار ہے یہ  
خندہ زخم عاشقاں ہے کہیں

کہیں سو رہیں اس کو نام غروب      کہیں آئینہ ہے رخ مجنوب  
کہیں بجز سے دست قاتل کا      کہیں مرہم جراحت دل کا  
ہے نہیں تاج بادشاہی کا      کہیں کشکول ہے گدائی کا  
ہی رہو رات آتش ہے کہیں      نالہ مجلیٰ حسرت ہے کہیں  
ہنکڑوں ہی سے کھو دیئے اس نے      لاکھوں پرے ڈبو دیئے اس نے  
ہمو لا دیا دس دہائی کوہ کنی      جان شیریں پہ آخر آن بنی  
وصل تم مجھے آج ہی کل میں      قیس برسوں پھر ہے جھل میں

اس سے بعد دوست طریقہ کار بتاتا ہے۔ کہ پہلے ان سے ربط ہڑھایا جائے۔ پھر باتوں باتوں میں تمہارا حال بتلایا جائے۔  
کہ مجھ سے کہ وہ تم کو کھائیں اور دیکھتے ہیں چل آئیں۔

سے بگناہ دار مہا ہیں گئے      ربط آن سے بہت بڑھائیں گئے  
ربط جو سے کاجب کمال ان سے      کچھ کہیں گے تمہارا حال ان سے  
کہیں گے بجز میں وہ مرتے ہیں      رات دن آہ و نالہ کرتے ہیں  
تم فرقت سے ہے لبوں پہ جان      کوئی دو چار دن کے میں وہاں  
خوں کا الزام سسر پہ کیوں لاؤ      ایک دن تم بھی جلا کے دیکھ آؤ  
اجر اس کا تمہیں صدا دے گا      جو سنے گا بہت دعا دے گا

دوست کی ہوشیاری میں شبہ نہیں، وہ پہلے سے سوچ لیتا ہے کہ اس اقدام کے اثبات کیا مرتب ہوں گے۔

پہلے ہوش کے برکت ہیں ہمیں      ایک کر دیں گے آسمان و زمین  
یتیم دانے کی شامت آئے گی      پہلے ہم پر قیامت آئے گی  
لوں ہی جھڑپیں گے مسئلہ دو چلا      فقہر کم ہوتا جائے گا ہر بار  
بہ اثر کتب پہ چاہ ہوتی ہے      دل سے اک و لہ کو راہ ہوتی ہے

جب مجھ سے اپنی تاثیر دکھائے گی تو وہ کوئی نیافقہ بنائیں گے اور خود چیلے آئیں گے۔

”داشتن“ اور ”نہ داشتن“ کی یہ تقریریں قصیدہ بنانا چاہیے اور خاموش سنا دے۔ تمنا کی بے تابیاں اور دل کی بے قراریاں کسی تدبیر  
کی کہ آرزو مند نہیں۔ وہ بے چین ہو کر کہتا ہے۔

اس کی تدبیر اب کتاب کرو

میر کی مٹی نہ یوں مر اب کرو

آخر میں کہتا ہے۔

میرے مرنے پہ ان کو لاؤ گے

جب میں مر جاؤں گا تو جاؤ گے

دوست دودھ کیسے دھکت ہو جاتا ہے۔ لیکن۔ برابر، ششدر اور پریشان ہے کہ یہ کام کس طرح انجام دے اور کس کو ہم انڈے بنائے۔ اتفاق سے ایک ماما مل جاتی ہے، جس کی تقریر مرزا لے ایسی منامی اور چابک دستی سے لکھنی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گوشت و پوست کی صورت میں چھپیں کرتی ہوئی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی دہری اہ را ما دے ابتدائی دقیقیں دور ہو جاتی ہیں۔

اتنے میں نکلی گھر سے ایک صورت	ساؤ لا رنگ ، چلبلی صورت
لال ینفہ ، ازار بند بڑا	گچھا اک کنبیوں کا اس میں بڑا
کھیتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی !	آنکھ ایک ایک سے ہلاتی ہوئی
چاق چوبند سینہ زوری میں	پھول رکھے ہوئے کٹوری میں
آنکھ ایک ایک پر لگاؤٹ کی	ہات ایک ایک سے گھلاؤٹ کی
حسن کے دن جوانی زوروں پر	رات کی باسی مہندی پوروں پر
دھیان ایک اک سے پرگمانی کا	ستیاناں ہر جوانی کا
یہاں ٹھہری کبھی دھال ٹھہری	دو منہ ہنس ہل لی جہاں ٹھہری

یہ ایک متوسط گھر لے کی ماما کا علیحدہ ہے اور اس تاریکی ماحول میں بالکل کمپ گیا ہے۔ غالب نے بھی ایک خط میں ماما کا نقشہ

لکھا ہے اور اس میں ان ہی شوخ رنگوں سے کام لیا ہے۔

دوست نے اپنی ضرورت اس سے بیان کی اور کہا کہ اپنی بیگم کو کھڑے کھڑے دردانے تک بلا دو۔ ان سے ایک دو ضروری

بائیں کہتی ہیں۔ میں کسی کو بچ میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ ہاتھ ان ہی سے کہنے کی ہے۔ اس میں ان کو زحمت تو ہوگی۔ لیکن "یر کے سننے کا پیام نہیں"

— وہ ہی سن لیں تو بہتر ہے۔

ماما اقرار کر لیتی ہے وہ اس کو کوئی بڑا کام نہیں سمجھتی۔ وہ جانتی ہے کہ بات سننے میں ایسی قیامت نہیں ہے

وہ شکتی چل گئی گھر میں

یہ اکیلے کھڑے رہے وہ میں

بیگم بہت خفا ہوئیں۔ وہ کون ہے؟ کہاں ہے آیا ہے؟ بے پردہ کچھ کیوں لے آئی اُسے تعارض کہیں کی؟

بات کرنے کا ہے یہ کون طریق	کہ لیا ہوتا خوب ساتھی
آئے کس جہ سے ہیں پیام بیک	کس نے بھیجا ہے ان کا نام بیک
پوچھا تو ہوتا ما جسرا کیا ہے	تو بھی لے رہی کتنی خیدا ہے
بات کا کچھ سلیقہ خاک نہ حوصل	فوج اتنا ہو کوئی اول جھول
بھڑک سی پانچے ہلاتی آئی	جو چلے کہتی کھل کھلاتی آئی

اور جو کچھ بولوں تو بگڑتی ہے تو تو ماما ہوا سے لڑتی ہے  
منہ لگے کرن تیرے شہکارا شہر بھر کی ٹگوڑی آوارا  
تجھ سے بھجوانے غم کھاتی ہوں خیر کہہ دے میں آپ آتی ہوں  
مرقاۃ فی شرح بیہوشہ - دہلی چل آئی - نہ معلوم ماما کیا سنے اور کیا کہے۔

کیا بس دوست نے وہ نہ چاہا کہا کچھ چپکے کچھ پکار پکار  
یاشقی و یاسب بیان کیا میرا احوال سب بیان کیا  
کہا پہلے تو ہو گیا تھا جوں آج تنگ آ کے کھل گئے ایوں  
نہ دیا ہے گھر قیامت ہے دشمنوں کی عجیب حالت ہے  
بلی آنکھوں سے آبِ دھوا ہے بعض ساقط ہے دم ٹھٹھا ہے

دوست - لحد مراد غلط بیانی سے کام لیا اور اس پر جتنا بھی اعتراض کیا جائے کم ہے۔ لیکن اس نے پوری داستان کو اس غلطی اور ناشیئی سے بیان کیا کہ - تقابلاً نہ ہو گئی۔

نام ایوں کا سن وہ لالہ زاد بولی اچھے نہیں ہیں یہ گرواد  
زہریوں کھائیں اور گنوا میں جان کوئی ہنام ہو نہیں کچھ دھیان

مرقاۃ پر اس تقریر کو سن کر جو اثر ہوتا ہے۔ اس میں دوست کا غم، درد و کافور، جان اور آہ و گداز کا سب ہی کچھ شامل ہے۔ لیکن اس سے اس دوست کی ہرکت اور ہوش جاتی ہے اور وہ اس سے بچنے اور دیکھنے کے لیے کہتا ہے۔

عزم کی دہری کے ہے شایاں چل کے ان کی اگر پہا لو جاں  
ہے بشر کے یے مرقت شرط آدمی کو ہے آدمیت شرط  
قسمیں دے کر دوا چاڑ نہیں چل کے لحد دیکھ آؤ انہیں  
اور کسی کا کہا نہیں کیستے سب بھند ہیں، دوا نہیں کرتے  
اور کہے کوئی جھوٹ مانیں گے بے تہا سے چلے نہ مانیں گے  
گو کہ بچنے کا کوئی طور نہیں دیکھ ہی ہیں گے خیر اور نہیں

بعض نقادوں نے مرقاۃ کے اس فعل کو قابلِ اعتراض سمجھا ہے۔ لیکن مضمین اس کے ان الفاظ کو مہول جاتے ہیں۔

نام چلنے کا سن وہ عاشق کش بولی وہ تیوہر ٹھا کے خیر خیر خوش  
ہوئے سوتوں کو اپنے وہ بولے خوب گرمی کی کیا مرے میں آئے  
دل میں یہ کیا خیال آیا ہے خانہ کسی کچھ بنایا ہے  
کتنی باتیں ٹگوڑی آتی تھیں شائیں کہہ کے تھوڑی آتی ہیں  
کوئی مڑا ہے کیوں جا جلنے ہم بہو بیٹھاں یہ کیا جانیں

اس کے بعد فصد سے کہتی ہے۔

پھر یہ فصد سے بولی اور دوا کام  
کوئی کرتا ہے اس طرح کے کام  
دور دور سے کر رہے قصور و معاف  
پاس کرتی ہوں جان کر اثرات  
ورنہ اس کا مزہ چکھا دیتی ہے۔  
اب کہوں جو نہیں سنا دیتی  
اب خبر دایاں نہ آئے گا  
میری جرتی سے زہر کھا رہا ہے؟  
مجھ کو کس بات پر ڈرایا ہے  
جان جائے گی ان کی جائے گی  
میری پاپوش بھی نہ آئے گی

مذہب کے ذہن میں ایک کشمکش ہے۔ اسے ابرو کا بھی پاس ہے اور طعن ناسخ کا ڈر بھی ہے۔  
دیکھئے یہ الفاظ ایک عام عورت کے کتنے آئینہ دار ہیں۔

اے لوائیوں کھائی قبر کیا  
اور بھی اپنے حق میں دھڑکیا  
اب جو آتی بھی مٹی نہ آؤں گی  
جلے کو ادب بھی جلاؤں گی  
ان کی قسمت میں یوں ہی مرتا تھا  
مجھ کو دسوائے شہرہ کرتا تھا

لیکن پھر سوچتی ہے کہ اس نے خود کشتی کا اقدام کیا ہے۔ اگر وہ اس کی جان بچا سکتی ہے تو اسے بچانا چاہیئے۔ انسانیت  
اور نہ انسانیت دونوں کا تقاضا یہ ہے۔ دسوائی دونوں طرف ہو رہی ہے یوں طعن ناسخ بھی گردن پر رہ جائے گا۔

پھر مراد دل بھی خنجر تھرتاتا ہے  
سن کے لرزہ خدا کا آتا ہے  
دگر نہ کس طرح کر دیں حق سے  
ہول آئے ہے خون ناحق سے  
جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو وہ جھجھلا کر اپنے ذہن میں یہ ہی طے کرتی ہے۔

کیسی جلتی ہے جان رہ رہ کر  
یہ ہی آتا ہے دعبان رہ رہ کر  
گاہاں مند پہ دیکھنے چل کر  
بھوت نکال دیکھ جیسے چل کر

اس کے بعد کہتی ہے۔

خیر بے جلد تم یہاں سے جاؤ  
جس طرح ہو سکے دوا پلو آؤ  
پہلے اپنی طرف سے دم دینا  
پھر میری جان کی قسم دینا

گھر کے اندر بیٹھنے والی۔ دنیا کے گرم دوسروں سے ناواقف، نوجوان، نادان اور متعصب کا رٹو کی اگر اس ہم رنگ نہیں دام  
میں گرفتار ہو گئی۔ تو ایسی حیرت کی یاد دینا سے نرالی بات نہیں ہے۔ اس کا یہ پیام دیکھئے کیا اس میں شرافت نفس کا کوئی جذبہ نہیں ہے

اور یہ کہنا اور خدائی خراب  
یوں بھی کھوتا ہے کوئی اپنی جان  
سب سمجھتے ہیں جان ہے تو جہاں  
سال دو سال بھی نہ ضبط ہوا  
دو چھینے میں تم کو ضبط ہوا



یہ سافر میں ہوش اُڑ گئے وہ کتنے کم غرت ہو معاذ اللہ  
آخر میں کہتی ہے۔

پھر بولی وہیں نہ رہ سکا  
زمین درگاہ آج ہائیں گے  
دورست لے آکر یہ ساری روداد عاشق کو سنائی اور زہرہ اسے فقرے پر زور دیا۔  
وہ اتنے نے پہنائی آج ہم تو سمجھتے تھے منہ کی کھائی آج  
آپ کے لیے یہی منہ ہوتا گریہ فشر نہ کارگر ہوتا  
پچھلے عقدہ تھا طوطے بے طور بکتے تھے قول و فعل اور ہی اور  
جب کہا میں نے زہر کھایا ہے سن کے لرزہ اُنہیں تب آئی ہے  
مردانہ کے آنے کی خوش خبری سن کر میرزا نے کے تالسب بے جاں میں جان سی پڑ گئی۔  
سن کے یہ لٹخ پاؤں پھول گئے رنجِ ذرت تمام معمول گئے

یہ دیوانی لڑکی ایک شریفہ معاش کی باتوں پر اعتبار کر کے اور درگاہ حضرت عباس کے جانے کا بہانہ کر کے یہ شہنوی

کے ہاں پہنچی گئی۔ ماما اس کے ساتھ تھی۔ اس کی خوبی اور عرازی کا وہی عالم تھا۔ جو ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں۔

پوچھتی آئی۔ ہے یہاں ملک لکھ  
اپنے سایہ سے بھی بڑھتی ہے  
ہنسٹھا بگت منہ میں طاق  
کڑی ایک اک کامنہ چراتی ہے  
چوٹی پٹی ہے باسی داڑی سے  
لڑھی ہے بگت کہاؤں سے

مذلقا کو پروہ کر کے باغ میں اتر دیا گی۔ اس کا تا بھی قیامت کا آنا تھا۔

سب جیا سے بدن چرائے ہوئے  
شرم سے گوشتی غنا سب تن میں  
نوک جوک اک جہان سے پیدا  
شوخ و طرار چلبلی کم سب  
کچھ گندے کچھ کھلے دھڑکے بال  
ادامعشوق پن کی گھاتوں میں  
چال انکھیلوں سے چلتی آئی  
جان عشاق ہوتی تھی پا مال  
پہنچے ناز سے اٹھائے ہوئے  
پر شرارت بھری تھی جہنم میں  
باغین چال و حال سے پیدا  
حسن اُبلتا ہوا بہار کے دن  
سارے معشوقوں سے زالی چال  
شرم آنکھوں میں قہراتوں میں  
دل کو پاؤں کے نیچے مٹی آئی  
دیتے تھے نقل کی صدا غلام

مکملہ و جوتی کے جھگڑاتے تھے      ہاں میں ہاں اور یہ لانے تھے  
مقرب حسن اس کا لاکھوں میں      لال دودے نیلی آنکھوں میں  
گوری زنگت پری سی صورت میں      چمکدہن بھرا بیعت میں  
آنکھوں پر سر جو تڑپ رہا جواز      بات کرنے کا اک نسیا اذاز  
مخارج و بیق و تاب لاکھ کا      پھٹا پڑتا تھا جرجہ اس گل کا  
فرس جاں پر حق آفت تھی      قبر تھی ، نقد تھی ، قیامت تھی

مہ لقا اجنبی جگہ آئی تھی۔ سارا جسم پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بار بار اسے یہ ہی ڈر تھا کہ کوئی آکر نہیں رہا۔ کوئی آواز نہ تو نہیں رہے  
رہا۔ میرٹھوی کی چین رستیوں نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ اور نہ ہر کھانے کا افسانہ محض اس کو رہاں بلانے کے  
لیے لکھا گیا تھا۔

میں بڑا چمکے کھا گئی امنوسس      جو تیرے جمل میں آگئی امنوسس  
کاش وہ دھوکا کبھی نہ دیا جاتا۔

اس کے بعد اختلاف اور دھوکے کی داستان ہے۔ چاروں طرف بے حیائی اور بے شرمی کے پردے پڑ جاتے ہیں اور خوب  
دل کھول کر رادھیش دی جاتی ہے۔ قیامت یہ ہے کہ جتنی یہ داستان عریاں اور غیر محذب ہے اتنی ہی اس کی زبان شستہ و رقتہ، سادہ  
اور بے تکلف ہے۔ روانی اور صفائی کا یہ عالم ہے۔ جیسے شفاٹ پانی کا چشمہ پہاڑ کے دامن سے دھسک رہا ہو۔ جو بندش ہے۔ وہ  
چست، جو محاورہ ہے وہ درست، جو لفظ ہے وہ بر محل۔

ہمارے ہند آموز نفا دوں نے ساری بحث اخلاق ہی پر اگر غم کر دی۔ انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ شاعری اچھی بُری  
نہیں ہوتی۔ شاعر اچھے بُرے ہوتے ہیں۔ اور شاعری کی اخلاقیات (Moralities) اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی کہ وہ انہماک  
و اسلوب میں مکمل ہو۔ انہوں نے اخلاقی نکات تو دھونڈے لیکن جذبات نگاری کی قوت، بیان کی سلاست، زبان کی صحت اور دوزخ  
کی قدرت پر غور نہیں کیا۔ یہ عریانی، تو اس زمانہ کے فیشن ہیں داخل تھی۔ خود صاحب عالم اور سلطان عالم اقزادی محرم تھے۔ اور ان  
داستانوں کو مزے لے لے کر نظم کرتے اور محرام کے سامنے بے عیاض پیش کرتے تھے۔ جب اس بارگاہ سلطانی سے فزٹے سے  
حاصل ہو جائے اور چشمہ بادی بھی نہ دیکھنے کے لیے موجود ہو، پھر ایک عام آدمی، معمولی گوشت و پوست کا آدمی، اپنی نظر پر، اپنے  
دل پر، اودا اپنے نظم پر کس طرح قابو رکھ سکتا ہے۔

ہمارے تنقید نگار حوتہ پری کے اس جواب کو بھول جاتے ہیں۔ جو اس نے اپنی برکت میں واجد علی شاہ کو دیا تھا۔

کہا کل ثابت علی خاں کا ہے      خلا کی، خلائام انسان کا ہے  
نہیں میں فقط ایک تقصیر وار      کہ اس دام میں اور بھی ہیں شکار

حقیقت یہ ہے کہ اس حمام میں سب ہی نکلے تھے۔ صاحب عالم ہوں۔ یا بہار عشق کا ہیرو، حمدی ہوں یا ٹھنوی کی

پھر اس زمانہ کا مذاق سنی بھی ایک خاص سا پنڈ میں وصل گیا تھا۔ یہ سا پنڈ ٹوٹ سکتا تھا بدل نہیں سکتا تھا۔ دود بکوں جائیے ابھی کل کی بات ہے مگر ضرر ہمارے پاس ہاشمی بیان کرتے تھے کہ ان کے ایک عزیز داغ کے دیوان سے میلاد شریف پڑھتے تھے اور دار و قنارہ روٹے تھے حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی و زہد میں اتنا سخت تضاد نہیں تھا، جتنا آج ہے۔ پروفیسر صاحب مدسن قادری بیان کرتے ہیں کہ مولوی نصیر غلام صاحب نے ایک مرتبہ علامہ شبلی کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

کارخانے میں خدا کے ہے کسے دخل ہوا

پتہ تم پہلے جنہیں بیاہ ہوا میرے بعد

مولانا آرام کر بھی پڑھتے ہوئے تھے، اٹھ کے بیٹھ گئے۔ پہلے عرب کو بار بار پڑھتے تھے اور اس کے عوارے سے لطف اٹھاتے تھے۔

پروفیسر نعیم الرحمن صاحب ماقول ہیں کہ ایک مرتبہ لاہور کے اردی اعلیٰ کالج کے اہل ریش عربی کے طلباء نے علامہ اقبالؒ سے شکایت کی کہ حسان کا دیوان لغاب سے خارج کر دیکھئے اس لیے کہ اس میں غلیات ہی غلیات ہیں۔ علامہ مرحوم نے نہایت مصدقیت اور استعجاب سے سوال کیا کیا آپ کے دہے میں لڑکیاں بھی ہیں کیا "نہیں" فرمایا۔ تو پھر کیا وجہ ہے۔ آپ سب ماشاء اللہ مرد ہیں اور ڈاڑھی داڑھی ہیں۔ آپ کو یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ عرب شرفا گایاں کیسے دیتے تھے۔ آخر گایاں بھی تو زبان اور اولاد خیال کا ایک مرتبہ ہیں۔ اس سے بھی تو واقفیت مزدوری ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس سخن گستاخہ بحث سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس اختلاط اور وصل کی داستان کو اس مدد کے ذاتی اور حالات سے الگ کر کے نہ دیکھنا چاہیے۔ وہ نہ ہم اپنے اوپر بھی علم کریں گے اور مصنف پر بھی۔ یہاں ایک طرف اصرا وادہ البقا ہے دوسری طرف انکار اور غصہ۔

اچھے آتے ہی اختلاط بڑھائے	خوب نام خدا منے میں آئے
بل بے فقرہ تر امع ذالہ	میرے تو ہوش اُٹ گئے واللہ
لوگ کہتے تھے ہے بوں پر جان	مگر کے صدقے جھوٹ کے قربان
توہ کس وجہ سے جاتی ہے	واہ کیا دیدہ کی صفائی ہے
میں ہر جگہ حب گئی امنوس	جو تڑے جل میں آگئی امنوس
جھوٹا بد ذات فعلیا مکانہ	ان گون پر تڑے خدا کی سنوار
گویہ پہلے سے جان جاتی ہیں	مر بھی جاتا جو تو نہ آتی میں
ایسے فغروں کو کوئی کیا سمجھے	اور تو کیا کہوں۔ خدا سمجھے

گہ ڈر یا کہ کوئی آتا ہے	کبھی بولی کوئی بلاتا ہے
شرم سے سب جن چر لے جئے	آپ ہی آپ کچھ چھائے ہوئے

لاتھا پائی میں صاف نپتے جانا  
 بال رخ کے سنوار تے جانا  
 زور کرنا کسی کو چھوٹیں ماتھ  
 کسی باتوں میں ہوش کھو دینا  
 آنکھیں پھونیں جو جھر نظر دیکھے  
 کسی کہتی کہاں ہیں آن پڑی  
 گھر گئی آگے کیسی آفت میں  
 کئی دن سے بھرا آتا ہے  
 کچھ جب حال میرے جی کا ہے  
 رحم مجھ پر نہیں کچھ آتا ہے  
 کسی جھنجھلا کے سر ٹپک دینا  
 گہہ کائی مردوٹے ٹکٹ  
 کسی تیوری چڑھا کے یہ کہنا  
 کوئی اس طرح بھی پہنڑتا ہے  
 اشتیاق ایسا کیا زیادہ ہے  
 فصد کھواؤ تم کو سودا ہے  
 نچلے بیٹھو تہیں خدا کی قسم  
 فوج اس طرح بھی کوئی بولائے  
 کسی کہنا ہماری بہتی کھائے  
 ہم کو پیٹنے اگر مردوٹے ماتھ  
 گاہ ماتھے پہ ماتھ کو دھرتا  
 کسی کہنا سواری منگواؤں  
 کسی کہنا کہ تم کو سودا ہے  
 کچھ بہت خوش مزاج عالی ہے  
 بے حیائی کا جامہ پہنا ہے  
 چرپی آنکھوں پہ حیری چھائی ہے  
 جان بھان ہو گئی بخندا

چھوٹے کپڑے کو صاف نپتے جانا  
 اودھنی کڑتی اتار تے جانا  
 کسی کہنا اپنی ٹوٹیں ماتھ  
 کسی کھیا فی ہر کے رو دینا  
 ہم کو پیٹنے اگر ادھر دیکھے  
 کیا کروں کس غضب میں جان پڑی  
 پڑ گئی جان کس مصیبت میں  
 تن بدن سن سنایا جاتا ہے  
 دیکھو پنڈا ابھی سے بھیکا ہے  
 کوئی جہاں کو یوں ستا ہے  
 ماتھ سے کہ کسی جھٹک دینا  
 اور کسی ماتھ جوڑنے ٹکٹ  
 گہہ نہاں کو دھا کے یہ کہنا  
 ہاں۔ کوئی ایسی بات کرتا ہے  
 خیر ہے کیجئے کیا ارادہ ہے  
 سنبھلو صاحب ذرا ہنسا کیا ہے  
 بس زیادہ کرو دنیا کی دم  
 فوج کوئی اتنی ہولی ہولی چمائے  
 گرہیں بے طبعی ماتھ کھائے  
 ہم کو کھانے گرد چھوڑے ماتھ  
 کسی اظہار درد سے کرنا  
 ہے یہی شرط گھر چلی جاؤں  
 جان کی خیر ہے ہوا کیا ہے  
 تو نے یہ چڑھری نکالی ہے  
 خیر ہے کھنڈ میں رہنا ہے  
 کچھ گھوڑے کی شامت آئی ہے  
 چھوڑ فادے گئے مرا بھیا

کبھی آفت نہ یہ امثالِ تھی      چھائیں پھوئیں میں نوحہ آئی تھی  
 بہت کے بیٹو بہت ستا رہے      تم نے خیل مجھ سے کیا ہے  
 کیا دھما چڑھ کر سی بھائی ہے      تیری بخاوری کچھ آئی ہے  
 تم تصدق کئے نثار ہوئے      خوب میرے گلے کا مار ہوئے  
 مجھ کو یہ بات ہے نہیں موزن      اچھے کھل کھیلے واہ داکیا خوب  
 بس زیادہ نہ آپ اترا ہیں      دیکھو کچھ شامیں نہ آجائیں  
 مرتقا قصہ میں آکر کہتی ہے۔

کچھ تو ہی نہ مجھ کو جانے گا      دیکھئے پھر بُرا نہ مانئے گا  
 مرنے بیٹے اٹھاؤ ڈالوں گی      کڑی کی طرح جھاڑ ڈالوں گی  
 میں اتر بولنے پہ آؤں گی      لاکھوں دھڑکنے سے اٹاؤں گی  
 بھی سب کہہ کے سن کے کھڑکی      سات پڑی کوئٹن لئے مکدوئی  
 دیکھیں کیسی دھوم ڈالوں گی      مدد کی کی طرح تو مڈالوں گی

تھے اسی دن کو سب اٹھا رکھے      کیا کیا ارمان ہیں خدا رکھے  
 اب میں بھی جو قصہ تیرا ہے      لے لو کم بختوں نے گھبرا ہے  
 اور وہ ہوتا ہوں اب سیل      میں نہیں کچی گولیاں کھیل  
 نوحہ ایسے کا اقتدار کروں      اپنی چوٹی پہ میں تار کروں  
 لاکھ منت کرو جاؤں لو      وہ نہیں ہو گا تم جو کچھ ہو  
 کوئی دل کا مزہ بھی کھتا ہے      یہ نہ بد دوستیوں سے ہوتا ہے  
 میں تو مفت خدا ہوئی بدنام      اس محبت کو آپ کی ہے سلام  
 کچھ عجب ڈھنگ میں طبیعت کے      بہت آسان ہے جو صحبت کے  
 ہم کو بھاتے نہیں ہیں ایسے لو      یہ چہ میگوئیاں دیں کہیں اور  
 بات مجھ کو نہیں یہ خوش آتی      ایسی بندی نہیں ہے اوصافِ قاتی

اب تک یہ لفظی کی منت و سماجیت کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچیں، اور ان کو پہنچا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ صرف مرتقا کی عقل اور عفتہ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن اس مرتبہ عاشق کے ہند بانگ دعوے اتنے جوش اور یقین کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں کہ ان کی آواز ہم تک بھی پہنچ جاتی ہے۔  
 وہ قدموں پر گر کر کہتا ہے۔

ہر گھڑی دم تمہارا بھرتے ہیں  
جوئے کی جان پرستہ ٹوٹے  
ستیا ناس جانے فارت ہو  
بھڑا کوئی خوش جو رہتا ہو  
اسی اللہ کے ولی کی قسم  
بغداد اہم قوم پر مرتے حسین  
شاہ عباس کا علم ٹوٹے  
اور پرجوں کی کچھ طبیعت ہو  
آنکھیں پھوٹیں جو کوئی بھاتا ہو  
روضہ مرتضیٰ علی کی قسم

مرتضیٰ جواب دیتی ہے۔

بولی بائیں بنا نہ میرے ساتھ  
اب تو میں لگ گئی ہوں نیرے ہاتھ  
مجھ پر مرتے ہو تم قرآن کسوں  
سچ کہو تم کو میری جان کسوں  
مجھ کو بھی ہو یقین کہ مرنا ہے تو  
یا فقط اپنے منہ مہاں مٹھو  
اپنے مطلب کی یہ محبت ہے  
تیری تو ذات ہے مرآت ہے  
اس کے بعد بدیتی کا اندھا اچھا جاتا ہے۔ جہاں شرم کا لباس اتر جاتا ہے اور تہذیب کی آنکھیں بھی ہو جاتی ہیں۔  
چمکے چمکے پکارتی سنتی کبھی  
ٹھیلے ہاتھوں سے مارتی تھی کبھی

لو کائی اتر گئی ہے ہے  
کیا غضب ہے میں مر گئی ہے ہے

قبر ہے نعم ہے تیامت ہے  
مجھ پر ہے ہے یہ کیسی آفت ہے

میری ماما کدھر گئی لوگو  
ہائے اللہ میں مر گئی لوگو

بس مرا ہو گیا ہے ناک میں دم  
ہٹ کے بیٹھو تہیں خدا کی قسم  
اب جو کہ بولے گا قرآن کسوں  
اپنی اور تیری جان ایک کردوں  
گاہیاں کیسی کو سنے دوں گی  
میں میں ایک لپٹنے نام کی ہوں گی  
بس بہت میں نے آدمیت کی  
جو نہ کرنا تھی وہ مرآت کی  
دیکھو پھر اب اگر ستاؤ گے  
میری پر چھائیں بھی نہ پاؤ گے

میر تقی کو اس غلام، اس جواہریت، حسن و عشق کی اس توہین کے لیے کسی بھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ مہ لقا کو آفرقت نہم  
اس فریب پر فتنہ، رنج اور ندامت ہے۔ لیکن ایک ٹوکی کی بساط ہی کیا؟ ان مقلدائے دام سے تھکا اس کے پائے اچھٹن تھا۔  
غرب آنے کی دی سزا مجھ کو  
اب نہ لائے کبھی خدا مجھ کو

یہ بھی اک آبرو کا کھونا تھا نام بدنام سب میں ہونا تھا  
 لیکن کیا یہ تو عمل کافی ہے؟ اک مغربی افنا نہ نگار نے اسی طرح ایک قصہ کھا تھا۔ ایک دودھ بیچنے والی لڑکی کو ایک  
 آدمی مزاج راہ گیر چھیڑتا ہے۔ اور اس کی خدمت و نزاکت اس کے جبر و تشدد کا متقابل نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ لڑکی زمین سے اٹھتے ہی وہ  
 دودھ کا برتن جو اس دھبہ لاشتی بین خانہ پر چلا تھا، اس کے سر پر دسے اڑتی ہے۔ اس قسم کا کوئی نہ تو عمل بہا و شوق میں نہیں ہے۔ اور  
 اس کی خائشا و جذبہ یہ ہے کہ جند دستان میں یہ سونا ایک ہی بار ہوتا ہے اور ایک ہی شخص سے جڑتا ہے چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا۔ دوسرے  
 ملکوں میں اس شاعر کم گشتہ کے بعد بھی برا ہو سانا یا بے پناہ ذلّت کی بسر کی جاسکتی ہے۔  
 مگر آٹن کو اب ایک منہ پہاڑ ہے۔ وہ جلد ساری سنگانے کے لیے نہیں کرتی ہے۔

میری خدمت میں اب نہ کُنْ خیر      و نہ ہم صوفیوں میں ہونگی حقیقت  
 میں تو دیاں پڑ گئی تیرے بس میں      چرچے والے اور ہوں گے آپس میں  
 گھر میں سب ہونگے دیکھتے تری راہ      دھوئیں نے جلائے گا کوئی درگاہ  
 تو ادھر کی نہ ہیں ادھر کی رہی      چھر کہو یہ بلا کدھر کی رہی  
 آبرو جلائے میری جلائے گی      تیری تو اس میں بھی بن آئے گی  
 اب تو جلائے سے کبریا کے بیٹے      منتیں کوئی ہوں خدا کے بیٹے

سواری آجاتی ہے، میرٹھوئی، مہلقا سے چلتے وقت کہتا ہے۔

ہواؤ پر توئی مسارتی جاؤ      ہاتھ پر ہاتھ مارتی جاؤ  
 بوکھ آؤ گی متراہ کہو      کچھ تو شکین جان نہ کہو  
 کوئی شے منہ سے نکل جاتی ہے      تم نہیں جانتیں جان جاتی ہے  
 یہ تو بادور نہیں بلاؤ گی      کہہ دو کھا کر قسم کب آؤ گی

مہلقا کہتی ہے کہ اس وقت اس کا جواب کیا دیا جاتا ہے۔ آئندہ کی کیا خبر اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ گھر سے  
 نکلے ہوئے اتنی دیر ہو گئی تھی۔ گھر والے پوچھیں گے تو کیا کہا جائے گا۔ اس کا رنگ فق تھا، چہرہ آٹھ اجڑا تھا۔ دل کا پ رات تھا۔ لیکن پھر بھی  
 اپنے آپ کو بہت سنبھالے ہوئے آئی، اور تیوری پر بن ڈال کے سب کے سامنے کے بیٹے کہنے لگی۔

لوچ تو چند ہی کو میں جاتی آج      آئی ہوں کیسی ہو میں لکھاتی آج  
 بھیڑنے آج دم تمام کیا      ایسی درگاہ کو سدا م کیا  
 ساخدا مانہ آج گر جاتی      کیسی بخنداری مری آتی  
 باخدا جو بھلا بچا ہی کا      جو لٹکایا ہستہ سواری کا  
 کیسی پھنکاتی ہوں میں ہا کر آج      پہنچی یاں تک خدا کر آج  
 گر قسم سے تو کوئی کھاؤں گی      کبھی تو چند ہی میں نہ ہماؤں گی

اس دردِ مصیبتِ آئیز سے سب لوگ ملن تو ہو گئے لیکن خود اس کے دل کا حال عجیب تھا۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیا ہوا۔ اہ۔  
اب کیا ہو گا۔

کچھ مزا دل میں کچھ ندامت تھی      اک شش و پنج میں طبیعت تھی  
کبھی کہتی تھی کیا ہوئی یہ جلا      کبھی کہتی تھی کیوں ہوئی تھی خدا  
یہی الجھن سی تاحرا سس کو      نبیند آئی نہ رات بھر اس کو  
جبہ دل اس کا بہت جلاک ہوا      تب گریبان صبح چاک ہوا  
یہ ہی حال "عاشق" کا تھا۔

ہوئی فرقت سے یہ مری حالت      نہ وہ رنگت رہی۔ وہ صورت  
راحت و عیش سب محال ہوا      دو ہی دن میں عجیب حال ہوا  
ہو گئی دل کی ایسی حالتِ ذرا      جیسے برسوں کا ہو کوئی بیاہ  
نالہ رنگ کہ بول پہ آنے لگا      ضعف سے جسم مقرر نہ لگا  
موجو نہ ضعف یا نہ کا تھا اسیر      ناتوانی تھی پاؤں کی زنجیر  
رنگِ فرقت سے میز محال ہوا      لینا کر دشتِ تلک محال ہوا  
چہین دن کو نہ رات کو آرام      یاد میں اس کی جیسے تا شام

بنیں انیسویں صدی کا جہول عاشق، کوئی اقدام نہیں کرتا۔ پیشِ ہجر سے مجبور ہو کر بڑی ہی ماما کو بھیجتی ہے۔ سیلاب کی پہلی موج  
گزر چکی تھی۔ اور اب وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ماما سے کہتی ہے  
میری ابھی تو اس کے ٹھکانے جا  
دیکھ کر اس کو آٹے پاؤں آ

"اور جو پچیس انہوں نے بھیجا ہے۔ تو کہنا۔"

ان کی پاپوش کو عرض تھی ہاں      جو مجھے بھیجتی خبر سہ کر یہاں  
گوری باتوں کی یاد ہے اب کیا      آپ کو پوچھنے سے مطلب کیا  
اعرض جب کمال ہو ماری      اور کہے تجھ سے منتِ مزاری  
کہنا کیوں پیچھے پڑ گئے کیا ہے      ہاں انہوں نے بھی تم کو پوچھا ہے

ماما کہتی ہے۔

چہین سے تم تو پڑو ہے سو کر      واں کئی رات ساری دور و کر  
ہے انہیں عش پہ فتن چلا آتا      اٹھا بیٹھا تلک نہیں جاتا  
ہوئی ہوئی میں مدد ہے ان کے      رنگ چہرے کا زدو ہے ان کے



دن سٹوق تو کتاب کیا      عشق کا نام بھی طراب کیا  
اپنے سب نکال کر تم نے      جھوٹوں پر بھی نہ پھر خیر تم نے  
دش لہ آزدہ موبجیے صاحب      آپ کے باؤل پر جیجی صاحب  
ماما بھی یہ، رام جی جی کہہ کر تم کو اتنی جی تو لیں نہ ہوئی کہ کسی سے ملنے لقا کی خیر خبر بھی ملتا دیتے۔ اس کے جواب میں وہ  
صوت یہ کہتا ہے۔

دل دجاں سے نثار ان کا ہوں      پر میں تعبیر وار ان کا ہوں  
اس کی فائنا جو ریاں کچھ اس تم کی تعبیر، کہ کوئی انداز نک جا کر پیام نہیں لاسکتا تھا الغرض اس کے بعد سے پیام و سلام  
ہونے لگے۔ خاندان اس طرف سے آتا تھا اور تحفے یہاں سے جاتے تھے۔ ایک دن ان کے ہمسائے میں ایک رات تھی۔ میرا فضا نہ بھی  
دب اعلیٰ کیا تھا، اتفاق سے ماؤ لقا بھی بام پر موجود تھی۔ دونوں کی آنکھیں چاڑھ ہوئیں۔ اسٹک بھر آئے۔ زبردیام کچھ بائیں بھی ہوئیں۔  
جو ریاں اس سے نہایت اہم ہیں۔  
ملاقاتی ہے۔

گڑی لیا کیا نہ جان پر میری      خوب نی آپ نے خبر میری  
اب نہ کہنا کبھی کہ مرتے تھے      بس اسی منہ پہ پیار لڑتے تھے  
جھوٹ دم عاشقی کا بھرتا ہے      کون صاحب کسی پہ مڑتا ہے  
میر شادی سے

سک کے ہیں نہ دیا یہ انکو جواب      بس زیادہ کرو نہ دل کو کتاب  
کس کو تم ملک بست کو بھواتا      کون ایسا تھا جو خستہ لانا  
جندی چھٹی نہ آپ جس جانیں      دو گڑی کو اگر چسلی آتیں

ملاقات کا وہ ب ایک شریعت لڑکی کی جے کسی رہے ہی کا فرق ہے۔ ایسی لڑکی جس کی رسم و رواج کے مطابق جلد شادی  
ہونا چاہیئے لیکن انہی کو نہیں سک ہے۔ جو عورتوں کے سامنے بھی کھل کے ماتہ نہیں کر سکتی اور جس کی نسلست و بر خاست، رفتار و گفتار،  
ایک ایک بات کی زلفت کی برائی ہے۔

ہوئی شکوہ مرا تو ہے بے جا      فوج ہو اور پھر ہو قبر خدا  
نہیں واللہ دسترس اپنا      قیدی بندی ہے کیا ہے بس اپنا  
گو بھی یہ نہیں ہے یہ افتاد      سب کے مار باپ جوتے ہیں جہاد  
سارے عالم میں گویہ آفت ہے      ہم پہ لین وایا مت ہے  
دن بھر ایک ایک منہ کو کھتا ہے      بات کہنے میں عجب لگتا ہے  
ناک میں دم ہے استغباری ہے      زندگی ملک سے جان ماری ہے

اس کے بعد کہتی ہے۔

اپنے دل کا غریب یا مجھے نہ جنگ  
ہو ملے کسی پر تیرے منہ زنگ  
کیا شکایت تہا ری کوئی کرے  
تم کو کیا ہے کوئی جیسے کہ مرے  
دھیان دل میں نہا کہ کب تھا  
اپنے دل سے تم کو مطلب تھا  
یاد رکھنا تہا سے بن رہی  
جان جائے گی ایک دن اپنی  
زہر کھا ہے جان کھو جائے  
ایک دن تم پر طعن ہونا ہے

اسی جگہ درختا کے کچھ عزیز بھی تھے اور انہوں نے یہ ساری ٹیٹکڑش لی تھی۔

تھے جو اثرات بچہ نہ بنی آئی  
مشورت اس طرح سے عمرانی  
شادی ان دونوں کی ہو چلائے  
کچھ تو منہ سے سیاہی دھو جائے  
جب کس طرح یہ چھپائیں گے  
کا لہ منہ کس کو اب دکھائیں گے

والبرین نے سمجھ دیا کہ اس کی اور خاندانی وقار کی غلط پاسداری نہ کرتے ہوئے دونوں کی شادی کر دی۔ اس طرح ٹھنڈی کا خاتمہ

وصل کی شادمانی پر ہوتا ہے اور یہ اختتام زہرِ عشق کے انجام سے بالکل مختلف ہے۔

میں نے اس ٹھنڈی کا قصہ مس بالڈ کو جو سینٹ جانس کالج آگرہ میں انگریزی کی لیکچرار ہیں اسٹایا۔ عرض یہ تھی کہ ایک عزیز ہندوستانی پرچہ مرہ مور شاہی (Restoration) کے ادبیات سے بھی واقف ہیں۔ اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا اسی مرد ستہ برس نے شکی کو خراب کیا ہے شادی ہو جانا انوکھی بات ہے۔ مغرب میں شاید ایسا کبھی نہ ہوتا۔

لیکن میرے خیال میں نفس پرستی کے اس طوفان کے بعد دونوں فریق اپنے دل کا جائزہ لیتے ہیں جس سے یہ لشکرِ گڑھا اٹھتا۔ اور دل کے تقاضے اور دنیا کی محسوسات وہ دونوں سے مجبور ہو کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کی اس لغزش کو دوامی محبت سے کچھ سرور میں تبدیل ہو جانا چاہیے۔ مصنف نے بھی اپنی طرف سے اس نیا و فیض کی اگر کوئی تدبیر کی ہے تو یہ ہی کہ ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دینے کے طریقے اور رشتہ داروں کا بھی یہ نفس قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس شادی کی مخالفت نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر بات مکمل ٹھنی تو سارے عالم میں بدنامی ہوگی اور پھر کوئی شکی کو پوچھے گا بھی نہیں۔

اس مسئلہ پر اس طرح سوچئے کہ اگر اس شکی کی شادی کسی دوسری جگہ ہو جاتی۔ تو فریقین کی زندگی میں کسی عجیب برہمائی پیدا ہو جاتی۔ اس بدنامی کا احساس اس وقت اور قوی ہوگا جب تقدیریت کو چھوڑ کر ملک کے عام حقیقی حالات کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

میرٹھنوی نے اپنے مہمان کے ساتھ جو ہیما نہ سلوک روا رکھا وہ محبت کی دنیا میں کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا اور سخت سے سخت مہربان اور ملامت کا مستحق ہے۔ ممکن ہے اس کی برائت میں یہ کہا جائے کہ وہ مہربان سے مغلوب ہو گیا۔ اور یہ نفسی شکامی اور انتقامی تھی۔ لیکن اگر دامنِ لایہ علاقہ پہلے سے تیار نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن محبت کی نفارست اور نزاکت تو کسی قسم کی آلودگی کو برداشت نہیں کر سکتی اسی کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ میرٹھنوی کی یہ زندگی ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے۔ ہندو سے مجبور کا حادثہ ہے۔ وہ درہمیل شاہ اور قطب الدولہ کے گھنٹو، مہاراجا پرمی اور ہاتھن پرمی کے گھنٹو، مہاراجوں اور سائڈوں کے گھنٹو۔ نواب آبداس پٹنم اور

ادب اصناف کے مختلف اور بہ مردانوں اور عورتوں کے گھونگھٹے وایوں کے گھونگھٹے پیداوار ہے۔ اس کو انیسویں صدی کے اس قبضل ماحول سے جڑ کر اٹھی تو وہ ان مضمون سے پڑ کر اس کا سارا ریزہ پڑ گیا تھا۔ لگ کر اسے دیکھنا تاریک اور تنقید کا خون کرنا ہے۔ چہرہ کوئی زخمی تو جرات میں ہے۔ اسی دنیا کے دول کا اسی کوشت و پورست کا معمولی انسان ہے۔ اس میں کمزوریاں بھی ہیں۔ اور خامیاں بھی۔ عزت و وقار سے اس کی غور و نظر ہے۔ "نعمین" تو اسے بلکہ اس کی "رضیت" اور "عمیبت" کو اور نمایاں کیا ہے۔ اس اعتبار سے "نعمین" کی حقیقت بخاری اور "عمیبت" پسندی قابلِ داد ہے۔

مردان شاقی نہ، مرثیہ کا کہ اور عینِ نونے میں وہ کمال نہیں پڑتا جو نہ "نعرش" کی ملکہ افسانہ کے کردار میں ہے اسی لیے اس کا مجسّمی اثر ہے۔ اس میں نہیں دوتا، میں جگہ نگار ہے اور بعض جگہ رنگ و آنگہ راہو گی ہے کہ مارے میں پھیل گیا ہے۔ ایک لڑکی جس کی شرافت و مہارت پر حلقہ لڑکی سے وہ اپنی گھڑیاں جاتی ہے تو اس انظار سے۔

طرز نگار۔ پاکپن کے ساتھ  
شعر بہتہ میں سخن کے ساتھ  
کچھ لکھا ہی تھا کچھ مٹی کچھ شرم  
جڑے لڑکے بیٹھے گرما گرم

دانا کہ عینِ نونے اور شعر توئی اور زمانہ میں فعلت، نیدرین کی مٹی۔ لیکن ان حالات میں جن کا ذکر شوقی میں کیا گیا ہے۔ ایک لڑکی کی زبان سے بیٹھے و رشتہ نہیں حل سکتے۔ اسی طرح "درد کے وصل پر جب بحث چھڑ جاتی ہے اور امرامہ و انکار کا ایک دفتر کھل جاتا ہے تو ایک بہن اسانی لڑکی کا یہ کہنا۔

"دو مہر قیصر پر حملہ ہے  
ایسا سمجھے کہ شہر شملہ ہے"

کئی طرح ہمارے نہیں۔

نعمین لڑکی کا کردار بہر شوقی سے زیادہ بلند ہے۔ اور اس منظوم افسانہ میں اس کے کافی شواہد موجود ہیں کہ وہ بشریت گھرانے کی لڑکی ہے جو ایک ذہب کا ستارہ ہو گئی ہے۔ لیکن اپنی عزت اور عزت باطل چھوڑ نہیں دیتی ہے۔ بہادر عشق میں نہر عشق کے بر شرافت، عشق ایک طرف ہے۔ بروچہ عزت کرتا ہے اور عزت بعد میں۔ مرد اس راہ میں اپنی عزت اور شرافت سب کچھ کھو بیٹھا ہے اور عورت یہ سب کھو کر جس سب کچھ حیات رہتی ہے۔

گنی، کامنادر بھی مجرب ہے اور سوسائٹی کے قوانین اس سے بھی عجیب ترین۔ ایک جموں آدمی خاقوں سے تنگ آکر چوری کرتا ہے۔ لیکن قانون اسے سزا دیتا ہے۔ ایک تریش رو استاد یا ایک معلم باپ سا ہمارا مال ہمہ بچوں کی ذہنییت مسخ کرتا رہتا ہے لیکن قانون سے کچھ نہیں کرتا۔

ایک جوان پردہ نشین اور نا تجربہ کار لڑکی پہلی دفعہ یسٹن ہے کہ ایک شخص اس کی وجہ سے جاں بلب ہے۔ مرنے اس کی موجودگی ہی اس کو بچا سکتی ہے۔ وہ کچھ عروت، کچھ آدمیت، اور کچھ عورت کی خاطر اس کی جان بچانے کے لیے ہنپتی ہے لیکن وہاں اسے ایک جال

ہر شخص کو یہ جاننا ہے اور وہ کسی کی چہرہ و ستیوں کی تاب نہیں لاسکتی۔ کیا اس کو بھی ہم غصہ یا غم نہ ہی کہیں گے۔ اگر یہ غصہ ہے تو اس کی غصہ میں سلامت و روی کے نشانات موجود ہیں۔ اگر یہ غم ہے تو ایسا غم ہے جس میں پیشانی کے کنارے پتیدہ ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بردباری کے بعد وہ لڑکی اس سے شے کا اقرار کیوں کرتی ہے؟ اس کے لیے بے چین کیوں ہوتی ہے؟ ماما کو کچھ بھیجتی ہے؟ کیا محبت اس نقطہ سے بھی شروع ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب اس لڑکی کو نہیں۔ ہماری معاشرت کو دینا چاہیے۔ اور محبت کو معاشرہ سے جو تعلق ہے اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں یہ اکثر ہوتا ہے کہ جس ساپ نے دوسرا بے اتنی کی پیر کی ٹی ہے۔ یہ محبت یہ پرورش، عصمت، انفس کی آسودگیوں سے پاک ہے اس لیے کہ جو کچھ نذر کرنے کو تیار وہ نذر ہو چکا یا زیادہ صبح غصوں میں لٹ چکا۔ اب مجھ آنسوؤں کی روانی اور دل کی تپش کے اور کیا باقی تھا۔ یہ جوئے کم آب جو جس وحشیانہ غم و تشدد میں نہٹ کر رہ گئی تھی اب بڑھ کر تند و تیز دنیا میں تبدیل ہو گئی۔

مہ تقا کے یہ الفاظ صرف اس کے دھکے ہونے دل کی پکار نہیں۔ بلکہ ہماری عجیب و غریب معاشرت کا مرتبہ بھی ہیں اب تک ہماری نگاہیں واجبہ علی شاہی سرپرست کی طرف منہ نہیں پھرنی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مثبت پہلو کسی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

نہیں داند دست رس اپنا      قیدی بندی ہے کیا ہے بس اپنا  
دن بھر ایک ایک منہ کوڑتا ہے      بات کرنے میں عیب لگتا ہے  
ناک میں دم ہے اشکباری ہے      دندگی ناک سے جان عاری ہے

شاہی کے بعد نہ تو دامن کی گرائی باقی رہتی ہے اور نہ خشک دامن کی بیک سری کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد شاہ یا روڈ گارڈز اب کی اس متانہ نظریں پر مروج کی اندرونی عدالت نے ان دونوں کو تو ہری کر دیا ہے لیکن نادری کے لیے ایک غلط پیدا کر دی ہے۔ دروازے کی کال معمولی نہیں ہے کہ اگر وہ اپنے مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکے تو کم سے کم ان مسائل کو پوری معافی اور دیانت داری سے پیش تو کر سکے۔

معاشرتی قلت یا کمزوری کے اعتبار سے کوئی جملہ پایہ فنی نہیں ہے۔ اس کی ضرورت کا ماننا ہمارے فطرت اور عباد کی جانشینی میں پوشیدہ ہے۔ اس زمانہ میں جب فنی، تحت گری کو سن سنی سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ مرنا شوقی نے سادگی و سلاست کے قیابا رہتے اور عشق و عاشقی اور حسن و جرات کے ناگ کو ایسی میٹھی بول چال میں چھپا کر دہلی کے شیوا بیان اور شیریں زبان بھی نکشت ہر دن راہ گئے اس دہرائے عالم فنی کے کھنڈے اشعار ہیں جو آج بھی زبان زد مولا کی ہیں۔

ناک میں نیم کا فقط تنکا      شوخی چالاک متفلس کا

وصل تم سمجھ آج ہی کل میں      تیس برسوں پہر ہے جگمگ میں

بے اثر کب ہے چاہ ہوئی ہے      دل سے اک کو راہ ہوئی ہے

اور جو کچھ لہروں تو جھڑتی ہے      تو تو رہا ماہوا سے طرتی ہے

کوئی مڑنا ہے کیوں بلا جانے      ہم بہرہ بیٹیاں یہ کیا جانیں

مرزا شوق کی تصویریں سرزمین حقیقت اور اصیبت پر مبنی ہیں۔ انہوں نے اندک و بیبارہ تقریباً ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ جہاں  
کچھ رنحوں کی زد ہے وہاں کچھ ہیں جہاں گہرے کی مزورت ہے وہاں گہرے۔ مثلاً ان معرعوں کی احتیاط اور صحت دیکھئے جن میں خط  
کچھ رنحوں نے ہمارے پیرا لکھی ہے۔

مہم نے کی دل سے کج ادائیگی      منہ پہ چھپنے لگی ہوائی سگی

شہر سارا اجاڑت گویا      اتنا رستہ پہاڑ مت گویا  
۱۔ کچھ گندھے، کچھ کھدے وہ سر کے بال  
۲۔ کچھ رکھی تھی کچھ نکالت تھی  
۳۔ شہر بازو بھرتے بھرتے سارے  
۴۔ قبر یعنی فتنہ تھی، قیامت تھی

مرزا شوق کو حقیقت نگاری میں کہاں ماضی ہے۔ یہ کمال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب مشاہدہ وسیع ہو اور نظر ایک  
ایک جگہ کو دیکھ سکتی ہو۔

ناک میں بنم کا فتنہ تشکا      شوخی چالاک متفلسن کا  
آئینوں کی وہ جھنسی کڑتی      جسم میں وہ شہاب کی پھرتی  
مُخ پر گرمی سے وہ عرق کم کم      جس طرح گل پہ قطرہ شبنم  
مٹس مٹس موتیوں کے دانوں میں      بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں

اس غزلی میں مرقع نگاری کی بہت سی کامیاب نمایاں موجود ہیں۔ مرزا شوق کے خطوط نازک اور سبک ہیں لیکن اس صورت  
گری میں نفاست، اصیبت پر غائب نہیں آئی۔ ماما کی یہ تصویر ملاحظہ ہو۔

اتنے میں مٹی ٹھرتے ایک موت      سا نالایک چسبلی صورت  
لال نیغہ ازار بند بڑا      لکھا ایک کنبوں کا اس میں پڑا  
کیستی ہنسی کھکھلاتی ہوئی      آنکھ ایک ایک سے لاتی ہوئی  
چاق چہرہ سیمہ زوری میں      پھول دکھتے ہوئے کٹوری میں  
آنکھ ایک ایک پر نکالت کی      بات ایک ایک سے نکالت کی

عین کے دن جوانی زدوں پر سات کی باسی مہندی پروں پر  
بعض تصویریں چند خطوں سے کھینچی ہیں لیکن ممکن ہیں۔  
وہ مشکلی چل گئی گھر میں  
یہ اکیلے کھڑے ہے در میں  
مرتقا ایک انہی گھر میں اس طرح آتی ہے۔

سب جہا سے دن چلائے ہوئے  
پانچے ناز سے اٹھائے ہوئے

تھا جب ایک دن اب کاکل کا پٹا پڑتا تھا جو میں اس گل کا  
بعض تصویریں اس سے بھی زیادہ چھوٹی ہیں لیکن ادھوری نہیں ہیں۔

۱۔ رونی ہوئی پڑی پھر گئی ہے

۲۔ شرم آنکھوں میں قبر باتوں میں

۳۔ جسم ڈوبا تھا سب پسینے میں

۴۔ نہیں کرنے لگتا ڈر ڈر کے

۵۔ بال ریش کے سنوارتے جانا

مرزا شوق نے کیفیات و جذبات کی ترجمانی میں بھی اصیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ روزمرہ اور محاورہ ہونے  
ان ناکوں میں حقیقت اور فطرت کا رنگ بھر دیا ہے۔

جب نعرے نعر دو چار ہوئی ایک بڑھی جگہ کے ہمار ہوئی

جان و دل بتلائے دو ہوئے ایک بیک اٹھ پاؤں سرد ہوئے

بس کبھی سا کوئی ملنے لگا غم سے دل دو دو اٹھا پھیلنے لگا

ہو گئی دن کی ایسی حالت زار جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار

ہمیں دن کو نہ رات کو آرام یاد میں اس کی صبح سے ناشام

رہی آج کل سی تاسم اس کو زینہ آئی نہ رات بھر اس کو

جب دل اس کا بہت ہلاک ہوا تب گریبان سے چاک ہوا

یہ نقشے کیسی صاف اور ہمار ایک یکروں سے کھینچے گئے ہیں۔

ہوئی ہوئی ہیں دروہے ان کے      رنگ چہرے کا زرد ہے ان کے

ناگ میں دم ہے آشکاری ہے      ذندگی تک سے جان ماری ہے

صاحب بہار عشق کو اثر آفرینی کے تمام مصلحوں میں۔ دیکھئے اس تہذیبی اور فہرستہ بیان نے تاثیریں کتنا اعلا فہرستہ

جس پر عالم فریفتہ ہے آج  
جس کو ہے دوائے یکمائی  
تیس ابرو سے جس کی ہنسل ہو  
نہر پڑی ہنستوں سے پایا ہے

حسنِ خود جس کا شیفہ ہے آج  
آفتِ جاں ہے جس کی رنوائی  
تیر مڑگاں سے جھکے گئی کئی ہو  
آج اس کا پتہ لگایا ہے

جو گنگو ہے وہ سوتیلے اور مل کے مطابق۔ مہ لقا عقد سے آتش بد امن ہو جاتی ہے۔ لیکن اپنی بلند سطح کو نہیں چھوڑتی یہ گنگو دیکھے کتنی مینج ہے اور اندازہ کتنا شانہ ہے

دودھ ہو بس کہ جسے تصویبات  
ورنہ اس کا مزا کھنکھاتی  
اب ٹیڑھاریاں نہ آئیں گے  
میرے جوتی سے زبر کھیا ہے

پاس کرتی ہیں جان کراشت  
کیا کہوں جو نہیں سزا دیتی  
بھرنے یہ بات منہ پہ لائے گا  
تجہ کو کس بات پر خود پایا ہے

مرزا اشراق نے تعلیم، تہذیب اور استعمار کا بھی انتہام کیا ہے۔ لیکن اس میں وہی سلیقہ ہوتا ہے جو آئینہ میں سرمہ لگانے اور چہرہ پر غارہ مٹنے کے لیے دیکھا ہے۔ تعلیمات و تہذیبات معمولی اور فسادہ ہیں۔ لیکن برستہ اور بے عمل ہیں۔

بام روشن خاطر کی صورت      سر سے ہانک تھی لڑکی کی صورت  
عین یوسف بھی اس کے آگے لگانا      چہرہ زلفوں میں جیسے اپریں چاند

دُش پہ گرمی سے دھروق کم کم  
نگوئل سی کسر چسکتی جھوٹی  
جس طرح گل پہ قطرہ شبنم  
چوٹی ایسی تلک سسکتی جھوٹی  
سرو ساندہ نوحہل سے دھاسے  
منہ کو تاب و قواں نے پھیر لیا  
ابر گیبو نے دل کو گیسر لیا  
تیر کھائے سو جس عرج سے شکار  
واں سے جنبش تلک جھوٹی و شوار

نذرت: دانی یہ شیشہ گری ملاحظہ ہو۔ عشق کے متعلق کہتا ہے۔

گر یہ چشم خونچکاں ہیں کہیں  
خندہ زخم عاشقان ہے کہیں

اس شرم میں دیکھئے۔ دل کی ہلے چینی اور پوری رات کی ہلے قراری کا نقشہ کینہا ہے۔  
 جب دل اس کا بہت ہلاک ہوا تب گریبان صبح چاک ہوا  
 مرزا سنوئی بول چال کی زبان خوب کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گشتو ہمارے سامنے ہمہ ہی ہے۔  
 ہنس کے اس نے کہا عاں میں گھو  
 ان میری باتوں پر نہ اتراؤ  
 ایسا انسان ان کا آنا ہے  
 سہل کچھ آپ کا بلانا ہے  
 کس نے یہ مشورہ بتایا ہے  
 دل کہیں اور بھی لگایا ہے

مذہقا نوکری سے کہتی ہے۔

بات کرنے کا ہے یہ کون طریق  
 کر لیا ہوتا غوسہ سائنقی  
 آئے کس جا سے ہیں پیام ہے کیا  
 کس نے بھیجا ہے ان کا نام ہے کیا

جھوٹ سچ پانچے ہلاتی آئی  
 چوچلے کرتی کھل کھلاتی آئی  
 اور جہر کچھ بولوں تو جھڑتی ہے  
 تو تو ماما ہوا سے لڑتی ہے

ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عورتوں کی زبان اور لب و لہجہ مردوں سے مختلف ہے۔ اب چند دہچند وجوہ سے یہ مہندیاں ٹوٹی جاتی ہیں۔ مرزا اشق نے یہ زبان جس غری اور کامیابی کے ساتھ لکھی ہے۔ اس کی مثالیں اردو لٹریچر میں بہت کم ہیں اس کے اٹھا بہت سے اڈ پر گزر چکے ہیں۔ ہم مرث چند قندمکر کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

فوج و چندی کو میں جاتی آج  
 آئی ہوں کیسی بولیں کھاتی آج  
 بھیرٹنے آج دم تک کیا  
 ایسی درگاہ کو سلام کیا  
 ساعت ماما نہ آج گر جاتی  
 کیسی بخت و سی بری آتی  
 پا خدا ہو سبلا بچاری کا  
 جو لگایا پستہ سواری کا  
 کیسی پچھتاتی ہوں میں جا کر آج  
 پہنچی ہاں تک خدا خدا کہ آج

نیشیر کی یہ عریانی بھی ملاحظہ ہو۔

کچھ مڑھی نہ مجھ کو جاننے کا  
 دیکھئے پھر بڑا نہ ماننے کا  
 مونسے جیتے اکھاڑ ڈالوں گی  
 مڑی کی طرح جھاڑ ڈالوں گی  
 میں اگر بولنے پر آؤں گی  
 لاکھوں دھڑے ترسے آؤں گی  
 ابھی سب کہہ کے سن لکھ دوں گی  
 سات پیری کو پچ کے لکھ دوں گی  
 دیکھنا کیسی دھوم ڈالوں گی  
 رونی کی طرح قوم ڈالوں گی



روزمرہ اور عادیہ کا جو نصف بہار عشق میں ہے۔ وہ اس ذراوانی کے ساتھ مرزا کی کسی شادی میں نہیں ہے۔  
دیکھئے سانپے میں ڈسے ہوئے ہیں۔

شہر سارا اجاڑ تھا گویا اتنا رستہ پہاڑ تھا گویا

نہ سنی اور کی نہ اپنی نہی دل کی حسرت تمام دلی ہیں ہی

اللہ آہیں سے اس کو پالا ہے سارے گھر کا یہی اہلا ہے

آکھو ایک ایک پر ٹکاوٹ کی بات ایک ایک سے گھاٹ کی  
یہاں بھری کبھی دھان بھری دو منہ ہنس بول لی جہاں بھری

ہوتے سوتوں کو لپٹے وہ بولے خوب لڑی کی، کیا مرے میں گئے

ایک ساحل میں ہوش اڑ گئے واہ کتنے کم ظرف ہو مس ڈالو

اپنے سائے سے بھی بڑکتی ہے بوٹی بوٹی پڑی پڑکتی ہے

اچھے آتے ہی احتیاط برعائے خوب نام خدا مرے میں آئے  
لوگ کہتے تھے ہے بول پر جان مگر کے صدقے جھوٹ کے قرآن

اشتباہ ایسا کیا زیادہ ہے غیر ہے کہنے کیا ارادہ ہے

کچھ بہت خوش مزاج عالی ہے تو نے یہ چڑھری نکالی ہے

بے حیائی کا جامہ پہنا ہے غیر ہے کھنڈ ہیں رہنا ہے

کیا دھما پھڑکی پھاتی ہے تیری بختاوری کچھ آئی ہے

تم قصدق کھنڈے نہ ہوئے      خوب میرے گلے کا دار بچئے  
بس زیادہ نہ آپ اترائیں      دیکھو کچھ شامیں نہ آجائیں

تھے اسی دن کو سب اٹھا کئے      کیا کیا ارمان ہیں خدا رکھے  
اب میں بھی جو قصد تیرا ہے      اسے لو کم بختوں نے گھیرا ہے  
ہمزدہ پسیلی شونیاں نہ کرو      بس چو عشقی گریباں نہ کرو

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کچھ عجب و عجایب ہیں طبیعت کے      بہت آسان ہے جو صحبت کے

نہ کہنا ذخائر اور ہے یہ      شاہ داجد علی کا دور ہے یہ

خوش کہ آدروہ ہو جائے مناسب      آپ کے پاؤں پر چسے صاحب

مہندی چسٹی نہ آپ گس جائیں      دو مٹری کو اگر چل جائیں

اس قسم کے میسوں شعر مثنوی میں ہیں گے۔ ہم نے اختصار کی وجہ سے طویل اقتباس سے پرہیز کیا ہے۔

بہار عشق اور زہر عشق کی بھر ایک ہے، انداز ایک، دوزوں کا لقمہ معمولی ہے، کچھ مختصر اور بے ترتیب سا، جس میں نہ کوئی بدلت ہے، نہ فنی مضبوطی۔ لیکن زہر عشق میں جو بوند فسادگی، پریشانی، درد اور کسک ہے وہ بہار عشق میں نہیں ہے، نور و ظلمت اور سفید و سیاہ کا جو خوبصورت پس منظر زہر عشق میں ہے اور جس قسم کی تعصیف کے لیے اذہن مزدوری ہے: وہ بہار عشق میں نہ ملتا کم اور بہت کم ہے زبان کے اعتبار سے بہار عشق مرزا عشق کی سب سے مکمل مثنوی ہے۔ ہر ذرہ کی چاشنی، الفاظ کی ترتیب، عادات کی برجستگی، یہ تمام خوبیاں اس میں ہر درجہ اتم موجود ہیں۔ اس مثنوی کو پڑھ کر بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”وہ آرٹ ناقص ہے جس میں کوئی طرز اور اسلوب نہیں ہے“

# تنقید شعر اور حالی

جدا لقادر مری

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ اردو میں کہ سے کم شاعری کی حد تک حالی کے تنقیدی کا زمانے جدید عہد کے نقیب کہا جکتے ہیں۔ حالی سے پہلے اردو تنقید زیادہ تر صورتی اور اسلوبی تنقید تھی۔ جس میں شعر کے صورتی محاسن اور زبان اور اسلوب کی نزاکتوں کے بارے میں اشارے مل جاتے ہیں۔ اور یہ بیچ معانی اور عروض پر کھل کر بحث کی جاتی ہے۔ شریعہ طور پر ہمارے اہل فکر ادیبوں کی چھان بین سے بے نیاز نہ ہی اور شریکی اہمیت کے بغیر صاحبان ذوق کی توجہ زیادہ تر شاعری پر مرکوز نہ ہی۔ جدید عہد سے پہلے اردو شریکی اصناف بھی گنتی جتنی تھیں۔ اور اگر کبھی کسی نے شری کے بارے میں اظہار خیال کرنا چاہا ہے تو توجہ صرف ہونہ مرہ، محاورہ اور صحت الفاظ ہی تک محدود رہی۔ بعض وقت شری کا ناموں پر مستند ادیبوں کے تقریظیں لکھی ہیں۔ اور اس طرح کی تحریروں کا اچھا خاصہ ذخیرہ اردو میں جہتا ہے۔ لیکن تقریظیں معلق ہاتھیں ہوتی ہیں۔ شری تنقید سے متعلق کچھ اشارے بعض تحریروں میں ایسے بھی ملتے ہیں جن میں کسی ادبی کا نامہ کی زبان یا محاورہ پر تقریظ کی گئی ہے ایسی تحریروں میں جب علی بیگ سرور کے ”فسانہ بجانب“ کا دیباچہ قابل ذکر ہے۔ جس میں سرور نے میرامن کی ”بارغ و بہار“ کی زبان پر تقریظ کی ہے کہ:-

”میرامن صاحب نے چار درویش میں بکیر کیا ہے کہ ہم لوگوں کے  
ذہن دھتے ہیں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے دروڑے ہیں محاورے کے  
خانہ مند توڑے ہیں۔ پتھر پر ہیں ایسی بھہر پری خیال انسان کا خام ہوتا ہے  
مفت میں نیک نام بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دھوئے کب نماز آئے۔  
کاموں کو یہودہ گوئی سے نکال دیکھ ننگ و عار ہے۔ مشک آنت کہ خود  
بہرید نگر عمار گوید۔ یہ وہی مثل سننے میں آئی ہے کہ اپنے منہ سے دھنبا لے

ایسی تحریروں بہت جمل ہیں۔ اور اکثر اوقات تقریظیں اور کبھی کبھی طنز و استہزاء کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی تقریظوں کو ہم ذوقی تنقید بھی نہیں کہہ سکتے ہاں لکھتا جذباتی تنقید کی یہ مثالیں برکتی ہیں۔  
عہد جدید سے پہلے ہمارے یہاں ذوقی تنقید کے کچھ اشارے بعض وقت ہمارے سنجیدہ فکر تکرار نگاروں اور قلم

اور کے چند شعرا کے کارنامے مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر شعر سے تعلق رکھتے ہیں اور صدوی تنقید کی مثالیں کہیں جاسکتی ہیں اس حرج کی تنقید کی ایک بھی مثال گو گنڈہ کے قدیم شعرا میں وجہی کی غنوی قطب مشرقی میں ملتی ہے۔ وہ مترجہ شعر گوید کے عنوان سے اس نے جو چند شعر لکھے ہیں ان میں وجہی نے شعر کو ہانپنے کے معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے۔

کتابوں پر تجھے پنہ کی ایک بات کہ ہے فائدہ اس مجھے دسات حمایت

جو بے ربط اورے نوبتیاں پھیس      جلا ہے جو ایک بیت پرے سیس

خود کو توں میں بٹھانے کا ہوس      اگر عجب ہوئے تو یک بیت بس

اسی لفظ کو ان شعر میں لکھتے تو ان کو کہا جاتا ہے استاد جس لفظ کو بے

اگر فام شہ ہے شعر کا تجھ کوں چھند

چنے لفظ یا ہو کہ معنی بلند

گویا دجہی شعر میں ربط معانی و سلاست کو مزوری سمجھتا ہے۔ اور اس کی نظریں شعر کی خوبی کیت پر نہیں بلکہ کیفیت پر ہے۔ شعری مستند اور منتخب الفاظ اور ہندی معانی کی اہمیت پر بھی وہ زور دیتا ہے۔

گولڈنڈہ کا ایک اور شاعر، ابن شامی بھی اپنی غزلیں ’پھولین‘ کے ’خزری جتے ہیں شعر کے فن کے ہاے میں کچھ اصونی  
 انہیں بنانا جمعہ دو کہتا ہے۔

اگرچہ شاعری کا فن ہے عالی  
وے کیا کام آوے بات خالی

کہے ہیں شرکوں کو تخرید و حکمت کہ آپسے شرط کچھ ہونا نصیحت

اول بار سے نصیحت اس میں اچھٹا نصیحت نہیں کہ نہ صنعت اس میں اچھٹا

یہ شعر کا پرانا اخلاقی نظریہ ہے۔ ابن نشاوی معنوی اعتبار سے شرکی اخلاقی قدروں پر زور دیتا ہے اور صوری اعتبار سے صنعت پر۔ صنعت نگاری کا وہ دل دادہ تھا۔ چنانچہ مہموبین میں اس نے جو ضائع جالغ استعمال کیے ہیں ان کے بارے میں کہتا ہے۔

ہنر کوئی دکھ دے سو دکھایا      مینا ہے ایک تم چاہیے لایا!

ہندو ہر حرف سین میں یوں قرینہ  
 بوجھے سچ بھی یہ صنعت کا نگینہ

غزاسی نے کوئی عام مہیار شعر کے نہیں پیش کیچہ لیکن خود اپنی شاعری کے بارے اس نے جملہ باتیں کہی ہیں۔ ان سے بھی من شعر کے کچھ مہیاں درج ہوئے ہیں۔ تہذیبی اور ادبی شعری میں غزاسی مسلم اہلثروت اُستاد مانا جاتا تھا اور اپنی اہلیت کا احساس بھی اسے تھا چنانچہ شذی بیف اسلوک و درجہ اہمال میں ”و حسب حال خود گوید کے عنوان سے وہ لکھتا ہے :

دکھایا ہنر مولانا کی سیب سلاست کے نہیں سرتے صافی دیا

اے کہتا ہے میں تم طرح کے مت شے بہت کم کو شے لائے شے ہم کم اور کم کر کے بیان کر کے لے یہ ملے رہنا ملے نہیں۔  
 کم سے ملے جان پڑے کم کو اندر نو صفائی بخوشی۔

زناکت کون میر آپنے خیال تلخ دکھایا ہوں یا ایک کیر بال تھے  
 دیا تا زلی شر کی دعائے کون سحر کو دکھایا ہر ایک بات کون  
 ”دوہلی نامہ ہیں بھی۔ در سبب نظم میں دستان گوید کے عنوان کے تحت قدیم اساتذہ شعر کے محاسن کی طرف اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے۔

جو ایک بیت لڑن کی اگر کوئی پڑھے اثر ذات کون بیگ بن مد چڑھے  
 گئے شعر کون ہیرو تھے کر دی ہا کئے اپنا ناٹوں پر تڑ دی !!  
 ان اشعار سے شعر کے جو معیار ملاحظہ آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ شعر میں سلاست اور صفائی، نزاکت اور تازگی ضروری ہے۔ اور اثر شعر کا بنیادی وصف ہے۔

بیجا پور کے شعرا میں صنعتی نے (۱۰۵۵ھ) میں اپنی فنوئی ”بے نظیر“ کے آغاز میں سخن اور شعر کی تعریف میں کئی شعر لکھے ہیں۔ قدیم شعرا سخن، کلام اور شعر دونوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ صنعتی شعر کی روحانی قدروں کا زیادہ فائل شعرا آتا ہے کہتا ہے۔

سخن گنج ہے عالم الغیب کا  
 سخن موج زن ملک لاریب کا  
 آگے وہ شعر کی عبادت اور اس کی جان بخش خصوصیت کے بارے میں کہتا ہے۔  
 سخن ات مشائی میں ملوا اٹھے سخن سفرۂ من و سلا اٹھے  
 رکن ہمارے سر سبز دل کا چمن !! سخن ہے سخن ہے سخن ہے سخن  
 وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جنی اور کند ذہن عمدہ شعر سر انجام نہیں کر سکتا۔  
 کہاں ہو کے کودن تھے شعر سلیم  
 کرے کاٹ کاٹ آدہ برگ نیم  
 صنعتی سخن سخی پر سخن ہمیں کو فوقیت دیتا ہے۔  
 زیادہ ہے زدیک اہل قیاس  
 سخن ہر لئے تھے سخن کا قیاس

شعر کے حسن و قبح کو جانچنے کے یہ معیار قدیم ہیں۔ مشرق میں یہی معیار ہر لئے زمانے سے مسلم رہے ہیں مغرب میں یونانیوں کے یہاں بھی کچھ اسی طرح کے معیار ملتے ہیں۔ موما یہ ہوا ہے کہ ہر زبان کے ہمارا اپنی معیاری اور سلا ادبی اصناف کی بنا پر ادبی اور تنقید شعر کے اصول مرتب کرتے رہے ہیں۔ عربوں میں ابن رشیق اور دوسرے علما نے تنقید شعر کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ

زیادہ تر تنقید کو معیار مان کر لکھا۔ اصناف ادب کے اذکار میں قومی مزاج اور طبیعت کو بہت دخل ہوتا ہے۔ طوائف نے اکثر یہ کہا ہے کہ اپنی مانوس ادبی اصناف کی بنا پر جو تنقیدی اصول مرتب ہوتے تھے انہیں عمومیّت کی شکل دے دی۔ برٹانی مانے عموماً یہی کہا ہے۔ مثلاً قواعد زبان مرتب کرتے ہوئے انہوں نے اپنی زبان کے جو قواعد ہو سکتے تھے انہیں معیار مان کر دنیا کی دوسری ساری زبانوں پر انہیں کو منطبق کرنے کی کوشش کی۔ زبان کی طرح شعری تنقید میں بھی انہوں نے یہی کیا۔ اپنی ادبی اصناف کے مطابق سے جو اصول استخراج ہوئے تھے انہیں عمومی شکل دے دی۔ یونانی شاعری میں مذہبیہ، بزرگ (عجائی) اور فوجی جہزی کو شری اہمیت حاصل تھی۔ اس اعتبار سے جو اصول تنقید شعری کے ان کے یہاں مرتب ہوئے۔ ان کی بنیاد یہی اصناف تھیں اور جس طرح انہوں نے زبان کے قاعدوں میں تقسیم کر کے انہیں ساری دنیا کی زبانوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اپنے شعری تنقید کے اصولوں کو شعری عام طور پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ یونان کے بہت کم ملاحی سے تھے جو اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جانتے ہوں۔

یونان کی قدیم ترین شعری تنقید کے جو آثار ملتے ہیں۔ ان سے تنقید کے بارے میں دو تصورات واضح ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ شعر میں انشائیہ دل کشی ہونی چاہیئے اور دوسرے یہ کہ شعر صداقت کا مظہر ہوتا ہے۔

جہاں تک شعر کے اثر اور دل کشی کے اصول کا تعلق ہے مغرب اور مشرق میں ہم آہنگی ہے صداقت شعری کے سلسلے میں تصورات بہت سے نشیب و فراز سے گزرے ہیں۔ شعری صداقت کا سائنٹیفک اور واضح تصور ابھرتے ابھرتے بہت عرصہ لگا رہا ہے پہلے شعرا کے کلام کے علاوہ تنقید شعری کے کچھ اشارے ہم کو بعض تذکروں میں بھی مل جاتے ہیں۔ یہاں اشارے اصول کی ضرورت میں بہت کم ہیں۔ مگر کچھ اصول عملی تنقیدوں سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اس تلاش اور تحقیق سے جو اصول تنقید شعری کے بارے میں ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک ذخیرہ ہوں گے دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر عربی اور فارسی شاعری میں مروج اور مقبول اصناف کی بنا پر مدون اور مرتب ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان اصول کو ساری دنیا کی شاعری پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح کسی اور زبان کے مخصوص اصناف شعری کے اصول پر اردو شاعری کی تنقید نہیں کی جاسکتی۔

اصل بات یہ ہے کہ تنقید شعری کے مجرد اور مطلق اصولوں کو ترقی پانے اور نشوونما پانے کا کافی عرصہ لگ گیا۔ یہ اصول رفتہ رفتہ اور دوہری نشوونما اور تحقیق اور جماع بھی کے طریقوں کے ترقی پانے کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔ سائنسی انداز تحقیق کے طریقوں سے مشرق اور ہندوستان عام طور پر انیسویں صدی عیسوی سے پہلے مانوس نہیں تھے۔ انیسویں صدی کے وسط سے اور خاص طور پر انگریزی ادب ایک برتر اور فائقین کے ادب کی حیثیت سے اردو کے طائر سے روشناس ہوا تو اس سے ہماری طیار کی اثر پذیری ایک نئی بات تھی۔ آزاد ادب حاکم کو لاہور میں کچھ تو بعض انگریزوں کی تزیین دلانے پر خاص طور پر حاکم کو تہجے کے حلقے میں کام کرتے ہوئے مغربی ادبی کارناموں اور ان کے دیباچوں اور منقدمات سے آگاہی کی وجہ سے اپنے ادبی کارناموں کو بھی مغربی اصول تنقید پر جانچنے کی خواہش نظر پائی ہوئی۔ اس میں کچھ ضرورت کو دخل تھا۔ اور کچھ تعصبات نہ دت۔

حالی جب شعر و شاعری کا جائزہ لینے بیٹھے تو ان کے سامنے شعری تنقید کے کچھ عمومی اور مجرد اصول تھے جن پر انہوں نے اپنے کارنامے متعدد شعر و شاعری کے ابتدائی حصے میں بحث کی ہے۔ اس کے آخری حصے میں ان اصولوں پر اردو شاعری کی مختلف اصناف کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقدمہ شعرو شاعری ہندوستان کی جدید دہاؤں میں شاعری تنقید کے مغربی اصولوں پر لکھی ہوئی اولین کتاب ہے۔ اردو میں بلاشبہ یہ اولین مستقل کتاب ہے جس میں شعر کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور مرد و جد شعری اصناف اور اسلوب پر بھی برسرہ کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے شعر کو پرکھنے کے جو معیار سارے اثنائہ پردازوں کے سامنے تھے وہ بہت کچھ مختلف تھے۔ عام طور پر منظوم اور مثنوی، م کو شعر سمجھا جاتا تھا یہ صحیح ہے کہ شعر کا معنوں اور اسلوب بھی پیش نظر ہوتا تھا، لیکن بحقیقت مجموعی یہ کم دیکھا جاتا تھا کہ کیا کہ حادہ ہے۔ بلکہ تو سہ اس بات پر زیادہ دستی تھی کہ کس طرح کہا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصیبت زیادہ تر اس بات کو دئی جاتی تھی کہ کوئی شاعر بحر و نفاذ کے اصول کی کہاں تک پابندی کرتا ہے اور نہ ان دو ذرہ اور غز و سہ کی صحت کا کس حد تک خیال رکھتا ہے۔

مالی سے پہلے کی تعقیبہ کے دنوں ہمارے شعرا کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ تذکروں کا آغاز کسی شاعر کے کلام کی پسندیدہ ہوتا تھا۔ اچھے شعر یا غزل میں یادداشت کے لیے کچھ لے جاتے تھے اور شاعر کے بارے میں بھی کچھ معلومات قلمبند کر لی جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ تذکرہ نگاری کے کچھ اصولی بھی نشوونما پا گئے اور یہ شاعری کی تاریخ کی شکل اختیار کرنے لگے۔ لیکن شعرا کی بہت سی تاریخ دراصل حوالے کے لیے خام بن اٹھا کر دی جاتی تھی۔ کیونکہ شاعر کی زندگی اور حالات کے بارے میں بہت کم جہان بین کی جاتی تھی۔ شعور کی پسند یا ناپسند کی بنا پر محض انفرادی ذوق ہوتا تھا۔ شعر کی تنقید جیسا کہ عصرِ محمد صالح ماہر حسین نے لکھا ہے۔ شعر کو عروص کی کسوٹی پر کرنا۔ اس کے لفظوں اور ترکیبوں پر اساتذہ کی سند لانا اور تذکرہ نگاری کی کشتوں میں اٹھنا سمجھا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ سائنس سے پہلے آزادانہ انجمن پنجاب کے نئے مشاعرہوں کی طرح ڈالتے ہوئے جو تہذیبی پھر ۱۸۶۷ء میں دیا تھا۔ اس میں حد بہ تنقید کے کچھ اشارے ملتے ہیں۔ آزادانے نظم اور کلام موزوں کے بارے میں خیالات ظاہر کرتے ہوئے شعر کی حیرت انگیز تاثیر بہرہٴ زور دہا تھا اور فلاسفہ یونان کے کچھ خیالات کی ترجمانی بھی کی تھی۔ آزاد کو فارسی شاعری سے جو لگاؤ تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ انہوں نے رومی اور سعدی کی شاعری کو نمونہ سمجھا اور شعر کا اہم مقصد ہند و نصیحت اور ہدایت ظاہر باطن قرار دیا تھا۔ آزاد کا یہ نظریہ دراصل شعری اخلاقی تدبیروں والا پڑانا نظریہ تھا جو شعر کے موجودہ نقادوں کے پاس تمام و کمال قابل قبول نہیں۔ اخلاقی قدر حقیقت میں جاتی قدر میں سے صرف ایک قدر ہے۔ شعری قدر میں اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اسی تقریب میں آزاد نے اردو شاعری کے مروجہ انداز پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک عبارت کا زور، معنوں کا جوش و خروش اور لطافت و صنائع کے سامان کا تعلق ہے۔ ہمارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ اس معاملے میں ہماری زبان کسی سے کم نہیں۔ لیکن انہیں انوس مزنا ہے کہ ہمارے شمار اس زور اور جوش کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ وہ چند غیر ضروری احاطوں میں گھر کر جھوس ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں۔ کیسی حسرت آتی ہے جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مفنا میں نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کہتے ہیں اور حتیٰ یہ ہے کہ کلام میں جان ڈال دیتے ہیں وہ جوش میں آکر اپنے آرزو وطن کو ہمارے تھے ہیں کہ ۔

”مقبہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوشش کر دو نہیں تو مقبہاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گئی۔“

آزاد کی تقریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں کچھ تو فغان تھا۔ مگر فخر یا کبر یا غرور کے ایسا ہوا۔ کچھ انگریزی شاعری دیکھ کر اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ آزاد و شاعری کچھ غیر مزدوری حدود میں گھر گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس اوجھٹ بخنے کی کیا سبب انہوں نے بتائی تھی؟ اور شاعروں کے لیے کیا مبینہ نظام تجویز کیا تھا؟ اس بارے میں آزاد کی تقریر بتاتی رہتی رہی نہیں ہوئی۔ صرف اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ منزل کا انہیں کچھ شعور تھا لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی بنیاد نہ تھی۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ آزاد ایک انشاپور و دانشور تھے۔ تجزیہ اور تحلیل سے ان کی طبیعت کو محاذ نہ تھا۔ وجہ کچھ یہ ہے کہ آزاد مرض کی تشویش تو کر سکتے لیکن علاج تجویز نہ کر سکتے۔ اس لیے آزاد کی تقریر اور نظم شریقی تنہا کا کوئی نظام نہ تھا۔ ان سے اصل شاعر کے مطالعے میں نئے مباحث کی تلاش کا پتہ چلتا ہے۔ اور موجودہ شاعری کے بیچ سے اکتاہٹ کا اظہار اس بات کو آزاد نے اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ کہ ہمارے شعر نے اپنی فضا کو غیر مزدوری طرز پر محدود کر لیا ہے۔ حالانکہ فضا کی وسعتوں سے کام لے سکتے تھے۔

آزاد کے شاعر و غلام جبردار کے ایک بیان سے جو نظم آزاد کے آخر میں چھاپا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کی تقریروں میں ایک کمر دی تھی۔ اور آزاد کے بیروہ آغا محمد باقر بتاتے ہیں کہ آزاد کے دو قدم راہ غلط کرتے ہی برطرف سے علامت ملنے لگتی۔

اس پس منظر میں جب ہم ”مقدمہ شعر و شاعری“ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان ادراک میں پہلی دفعہ ہم کو شعر اور مطالعہ شعر کے فرق پر ایک نئے انداز سے روشنی پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ حالی کی بحث اور تحقیق کا اندازہ اور ان کے اثر و مباحث پر نظر تنقید کے موضوع ہیں۔

حالی کو شعر و شاعری پر غم اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے شعر کی ضرورت کا جواز دریافت کرنا تھا اس کی ضرورت اس معنی کی کہ زمانہ کے سب سے بڑے مفکر، فلاطون نے اپنے جہود پر یہ خیالی ڈھانچے سے شاعر کو مرے سے خارج فلاطون کے ذہن سے صحیح با غلط طور پر سوچنے والے اور بھی کئی ملامت کے پاس سماجی نظام میں شاعر کی ضرورت مستحکم ہی رہی رہے ایسے بھی ہیں۔ جو شعر کو جاہلیت کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اس لیے آج کی سائنسی دنیا میں انہیں شعر کا کوئی مقام نہ ہے۔ حال کے لیے اس نقطہ خیال کو رد کرنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے علامہ جلیعت اور محمد علی دہلوی سے سوچنے کی مدد سے اس نقطہ خیال کی جڑی خوبی سے اصلاح کی ہے۔ حالی نے شعر کے جواز میں یہ استدلال پیش کیا ہے کہ ”حکیم نے اس دیرانہ آہ دنیا یعنی کارخانہ دنیا کی رونق اور انظام کے لیے انسان کے مختلف گروہوں میں مختلف صلاحیتیں رکھی۔ اگرچہ ان میں بعض جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں چنداں سود مند نہیں معلوم ہوتے مگر چونکہ ان کو یہی حصہ پہنچا ہے۔ اس لیے وہ اپنی قسمت پر قانع اور اپنی کوششوں میں مصروف ہیں۔ جو شخص اس عطیہ الہی کو فطرت کے موافق کام میں لائے گا۔ ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے۔“

حالی کا یہ استدلال اس انداز کا ہے کہ منکر بھی سوچنے پر مائل ہو جائے گا۔ حالی نے سماج میں شعر کی ضرورت کے مسئلے پر حسانے کے لیے شعر کی تاثیر کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ استدلال کا یہ طریقہ جدید ملکی طریقہ ہے جو کسی مسئلے کو ثابت کرنے



میں بہت وزنی ہوتا ہے۔

حال نے ان دلوں کے خیال کی بھی بڑے سچے سے اصلاح کی ہے جو شر کو دائرہ جاہلیت کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری شناسگی میں بھی قائم رہ سکتی ہے۔

شرکی اخلاقی قدروں کے بارے میں بہت کچھ کہا اور دکھایا گیا ہے۔ کچھ علما تو شعر کے ساتھ کسی انفرادی یا ترمیمی مقصد کے وابستہ کیئے جانے کے خیال ہی سے جزمہ نہ جوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس پر زور دیتے ہیں کہ شعر کا مقصد محض شعر ہے۔ شعر سے وہ امر شعر کا کوئی مقصد قراء و بینا اس کے خیال میں ہر ذوقی ہے۔ کچھ اور علماء اس خیال کو رد کیے بغیر شرکی اخلاقی قدروں کو سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ آزاد کا خیال اس بارے میں اوجہ بہت اچھا ہے۔ حالی بھی اس مسلک کے حامی ہیں۔ چنانچہ مقدمہ میں یہ بحث انہوں نے بڑی خوبی سے کی ہے کہ شرع انسان کی روحانی خوشیوں کو اُکھٹاتا ہے۔ انسان کی روحانی خوشیوں کے ساتھ اخلاقی کا شوق بدھی ہے۔ پھر انہوں نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ شعر علم اخلاق کی طرح براہ راست فقیہین اور تربیت نہیں کرتا لیکن اندرونِ انصاف اس کو عام اخلاق کا نائب مناسب کہہ سکتے ہیں۔ اس کی تائید میں ان صوفیاء کے مسلک کو پیش کیا ہے جو سامع کو قریب الہی اور تذکیۃ نفس کا ذریعہ مانتے ہیں۔ حالی کہتے ہیں کہ سامع کا یہ کن شعر ہی ہے۔

شعری ضرورت اور اہمیت کے مسئلے کو زینہ بزمینہ اٹھانے کے بعد حالی ذہنی و شعری عظمت کی طرف منتقل کرتے ہیں شعری تاثیر کو مستحکم اور اس کی اخلاقی قدر کو بدیہی ماننے کے بعد حالی اپنے پیش رو عالم کی ہم قدمی پر قناعت نہیں کر لیتے۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شاعری سب کچھ ہونے کے باوجود سوسائٹی کے تابع ہے۔ اس مسئلے پر حالی نے طویل اور مدلل بحث کی ہے۔ اور شعر کو عالم خیال سے دہناتے آہ دہن میں اتار دیا ہے۔ حالی کی بحث سے بغاوت پر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ شاعری میں جب بلا پیدا ہوتا ہے تو اس کی وجوہات کی تلاش ہم کو سماج میں کرنا چاہیئے۔ لیکن اس اصول کو مان لینے کے بعد یہیں پور کا نہیں جاسکتا۔ استغراقی مدد سے ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ شاعری کا بعد اجماع سماج ہے۔ شاعری سماج سے اٹھتی ہے سماج میں جیتی ہے۔ سماج جہات ملی ہے اور جہات ملی میں جہات ہے۔ جو شاعری سماج سے اپنے رشتے کو ڈھیلیتی ہے وہ جہات سے اپنا رشتہ تو ڈھیلیتی ہے۔ اور اپنے مبداء سے کٹ جاتی ہے۔ حالی نے شاعری کو سوسائٹی کے تابع بنا کر حقیقت میں آرو و شاعر اول اور نقادوں کے ذہن کو نہایت ترقی پر رغبہ سے رہنمائی کر دیا تھا۔

شعر کی اہمیت اور شعر کے عناصر پر بلازم سے بھی حالی نے بحث کی ہے۔ یہ بحث بھی چند دھماکو عناصر سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً قافیہ اور ردیف کی جگہ اور سبار سے پرہیز و اسے شاعروں سے حالی کا یہ کہنا کہ قافیہ اور ردیف شعر کے بلازم سے نہیں بلکہ نظم کے لوازمات سے ہیں۔ ان کی ساری ذہنی پیداواری کو دھما ویسے کے مترادف تھا۔

اپنے تجزیہ پسند ذہن کی مدد سے حالی نے شعر اور نظم یعنی "پوستری" اور "دس کے درمیان" پہلی دفعہ فرق کیا۔ شاعری کی شرطوں میں سب سے اہم شرط انہوں نے مطالعہ کائنات کی مقبولیت ہے۔ یہی دراصل وہ پہلو ہے جہاں ہمارے پرانے شاعر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اپنے الہام کے لیے، حیثیت فطرت کا مطالعہ کرنے کی بجائے، انہوں نے اساتذہ کے دیوان ٹھٹھنے کو زیادہ پسند کیا ہے۔ دوسروں کی ذہنی غزل پر تقریر کرنا، ہرے فھرے بات سمجھی جاتی تھی۔ مضمون پر مضمون بانڈھنے کی عادت بھی، دراصل اسی کوتاہی کا

تجربہ ہے۔

حالی نے یہ بھی تفصیل لکھی ہے کہ شاعری کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ یہ مواد ان کو انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن سے حاصل ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں تاریخ تنقید میں۔ ملٹن کے تنقیدی خیالات کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں۔ ملٹن کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شعر میں قافیہ کے التزام کی مخالفت اور سہلے قافیہ نظم کی ولایت کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ بڑا شاعر تھا۔ اور حالی کے زمانہ میں وہ بقول انگریزی شاعر تھا۔ اس لیے حالی نے اس کے مینہ اصول کو تنقید شعر کے بنیادی اصول سمجھ لیا۔ اور اسی سے انہوں نے جہاں تک شرکی معنوی تنقید کا تعلق تھا، کام لیا۔ سادگی، اصلیت اور جوش، جو ملٹن کی نظریں، شعر کے لازمی اجزاء ہیں۔ ان میں دو اجزاء یعنی سادگی اور اصلیت سے۔ حالی سے عین پہلے کی شاعری بیگانہ ہو رہی تھی۔ جوش یا ایک اور نفاذ کے الفاظ میں۔ ہدایت کا اندر دھپکاؤ یا تو سرے سے پایا ہی نہیں جاتا تھا، اور شعر ذہنی لادش کا نمونہ بن گیا تھا یا پھر بے موقع اور مد سے بڑھا ہوا تھا۔

حالی نے مطلق حیثیت سے سادگی اور اصلیت کا اس احتیاط سے تجزیہ کیا ہے کہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ شاعری میں جوش کے مفہوم کو سمجھانے پر اسے انہوں نے روبرو اندوز شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ اور اس میں وہ سارے امور کی ہیں جن کی وجہ سے ہماری شاعری سادگی، اصلیت اور جوش، سب سے محروم رہی ہے۔ یہ تبصرہ حقیقت میں حالی کے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا پتہ دیتا ہے۔ انہوں نے ملٹن کے اصول کی روشنی میں، اردو غزل اور قصیدہ کا بھی جائزہ دیا ہے۔ حالی کی صحت پسند طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ غزل کے سخن میر کی شاعری میں سادگی خوبیاں ہی خوبیاں دیکھے چنانچہ سادگی بیان کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے بعض شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے سادگی بیان کو سب چیزوں پر مقدم سمجھا ہے جیسے پیر و قدو، آثار و معنی وغیرہ۔ لیکن چونکہ انہوں نے قمار کے خیالات و مضامین سے بہت کم تجاوز کیا ہے۔ اس لیے ان کے دیوان زیادہ تر بھرتی اور زکین اشعار سے بھرے ہوئے ہیں۔

مرسید اور حالی کے زمانے میں ایک اصطلاح "نیم نچرل شاعری" کی چل پڑی تھی جیسے ادبی محققوں میں اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ نیم نچرل شاعری کو وہ یہ مفہوم پہناتے تھے کہ وہ شاعری ہے جو نیم نچرلوں سے منسوب ہے اور جس میں نیم نچرل خیالات اور اقوال پیش کیے جاتے ہیں۔ مرسید اور حالی "نیم نچرل" کہلاتے تھے۔ چنانچہ مرسید کی اصلاحی ماسمی کے مخالفین اور ادیبوں کا وہ گروہ جو اس وقت سے وابستہ تھا۔ انہیں "نیم نچرل" کے لقب سے موسوم کرتا تھا۔ اور مرسید اور ان کے رفقاء کے کار کی خوب ہنسی اڑائی جاتی تھی۔ حالی نے نیم نچرل شاعری کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں یا دانستہ پھیلانی گئی تھیں ان کا تذکرہ کیا ہے اور نیم نچرل شاعری کے حقیقی مفہوم کو، جو ان کے ذہن میں تھا، واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

حالی نے شعر میں صوری لازم یعنی زبان اور اس کی دستگی کی اہمیت پر بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ ان کو خاص طور پر نیم نچرل شاعری کے جس کے وہ مرگم دکھاتے تھے۔ اعراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے، اردو کے مروجہ ذمیرو الفاظ اور اسالیب کی ننگ دمانی کا احساس تھا۔ اسی لیے وہ ہندی بھاشا سے استفادہ اور ہندی کے الفاظ کو اردو میں داخل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اس موقع پر حالی، بعض ایسی ذیلی بحثوں میں الجھ گئے ہیں جن کی یہاں قطعاً ضرورت نہیں تھی یہ زبان کے مشہور رکڑوں

کی بحث ہے۔ یہ بحث دراصل حالی سے پہلے کے عہد کی ایک نزاعی بحث تھی۔ حالی کی بحث میں ایک کھلا تضاد ہے کہ وہ اردو کو ہندوستان کی سب سے زیادہ وسیع اور عام زبان مانتے ہوئے بھی اسے کھنڈ اور دہلی کے مرکزوں میں قید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصل میں یہاں حالی اپنے آپ کو ان ملکوں سے وابستہ رکھنا اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اہل دہلی اور اہل کھنڈ میں سے کوئی بھی حالی کو اہل زبان نہیں مانتا تھا۔ اور یہ روایت آج تک برسرِ پل رہی ہے۔ حالانکہ خود حالی کو اردو دنیا نے ایک ایسی سند کے طور پر مان لیا ہے جس کی زبان نے اردو کو دہلی اور کھنڈ کی شخصی اور جغرافیائی قیود سے آزاد کر دیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حالی زبان کے سلسلے میں کوئی تعمیری اور منظم تجویز پیش نہ کر سکے۔ ان انہوں نے اردو زبان کو رستہ دینے اور اس کی سند کے شخصی اور جغرافیائی معیاروں کو معروضی اور ملی بنانے کے لیے اردو کی مستند لغات اور قواعد زبان کی ترمیم کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

مقدمہ شعری و شاعری کا براہِ راست تنقید شعر کی نظری بحثوں پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں عملی تنقید کے بھی چند نمونے اس سلسلے میں لی جاتے ہیں۔ جہاں انہوں نے اپنے مبینہ اصولوں پر اردو شاعری کو چند اصول پر جانچا ہے۔ مقدمہ کا آخری حصہ اردو شاعری کی عملی تنقید سے متعلق ہے۔ اس حصے میں انہوں نے اردو کی مختلف اصناف شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ میں غزل، قہقہہ، رباعی، غنوی اور دوسری اہم یا غیر اہم اصناف کو حالی نے تنقید شعر کے لیے نئے اصولوں پر جانچنے کی کوشش کی ہے۔ غزل کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کی حالت فی زمانہ اتر ہے۔ اور وہ محض ایک بے سوکڑا اور دوسرا کارِ صنف ہو کر رہ گئی ہے۔ قہقہہ کی حالت کو بھی وہ ناگفتہ بہ مانتے ہیں۔ اور غنوی کے محض مشتبہ حقوق ملک محدود ہو کر رہ جانے کی انہیں شکایت ہے۔ مرثیہ قصائد ہی کے نازل ہیں آج کا ہے۔ یہی تین اصناف ایسی ہیں جنہیں حالی، اردو شاعری کا سراپہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے بڑی وقت و فکر کے ساتھ ان کا محاسبہ کیا ہے اور ان کی اصلاح اور انہیں حتمی زمانے کے مطابق بنانے کی یہ تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ حالی کا یہ جائزہ ان لوگوں کے لیے جو اردو شاعری اور اس کی اصناف کو مثال اور خطا سے بالاتر مانتے تھے۔ بڑا ہی ناگوار ثابت ہوا۔ حالی نے خاص طور پر غزل میں جو باتیں بنیادی مانی جا رہی تھیں، ان پر حملہ کر کے، شعر کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اس لیے جیسا کہ محترمہ صاحبہ عابدی نے کہا ہے۔ ”مقدمہ حالی کی سب سے زیادہ مشہور۔ سب سے زیادہ معکوب اور سب سے زیادہ مقبول کتاب ثابت ہوئی۔“

حالی نے محض اصول اور ضابطے مدون کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ان اصناف کو اپنے بیان کیے ہوئے اصولوں کے مطابق برتا بھی۔ حالی کی عظمت کا حقیقت میں بہت بڑا یہ پہلو ہے۔ اصول سازی ہمیشہ آسان کام ہے۔ لیکن عمل ان اصولوں کو اختیار کرنا۔ آسان نہیں۔

عملی شعری تنقید کے کارناموں میں حالی کی تصانیف حیاتِ سعدی اور یادگار غالب حالی کے مروجہ کارنامے ہیں حیاتِ سعدی میں سعدی کے کلام اور تصانیف پر حالی کی تنقید کا ایک حصہ ان کی تصانیف کی تبدیلیت سے متعلق ہے۔ جو حصہ کلام اور تصانیف کی براہِ راست تنقید سے متعلق ہے۔ اس میں بغاوتِ حالی نے مقدمہ کے بیڑہ اصولوں کی سختی سے پابندی نہیں کی۔ بلکہ بعض جگہ تنقید کے روایتی انداز سے بھی کام لیا ہے۔ اس حصے میں وہ تقابلی تنقید کے طریقے سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کرتے ہیں۔

۴۔ و شاعری کی عمل تنقید میں یادگار غائب کا وہ حصہ اہمیت رکھتا ہے جس میں حالی نے مرزا کے کلام پر یہودیہ کیا ہے۔ بحقیقت میں وہ مقام تھا جہاں حالی اپنے مقررہ اصول سے زیادہ سے زیادہ وابستہ رہ سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے بعض اور طاق کی طرح اپنے آپ کو اصول سے سختی کے ساتھ جدا ہوا۔ لکھنے کی بجائے کسی قدر آزاد روی سے بھی کام لیا ہے۔ اور خطرات کے بہاؤ کے رنج پر نکل گئے ہیں۔ اصل میں اچھی تنقید بھی تخلیق ہوتی ہے اور تخلیق کے تحت شوق میں اصول کا رد کیا ہو سکتے ہیں۔ لیکن مصنف کا ان کے ساتھ جھگڑانا اکثر عمدہ تخلیق کا باعث نہیں ہوتا۔ حالی کی تنقید کا اصل موضوع تو مرزا غالب کی غزل گوی ہے۔ لیکن ان کے قطعاً اور رہائیوں کی جانب بھی عمل اشارے ملتے ہیں۔

مرزا کی غزل پر حالی کی تنقید کا اسلوب کچھ روایتی سا بن گیا ہے۔ وہ غزل گوی کا یہ حیثیت مجموعی جائزہ نہیں دے سکے ہیں بلکہ اپنے جائزہ کو انہوں نے خاتون میں پانٹ لیا ہے۔ مختلف حضرات قائم کر کے ان کے ماتحت غالب کے اشعار پیش کئے اور ان کی شرح کرنے کے طریقے کو حالی نے پسند کیا ہے۔ ایک بات ضرور قابلِ توجہ ہے کہ حالی نے تنقید کو محض صوری اور اسلوبی تنقید تک محدود نہیں رکھا۔ اس تنقید میں یہ بات واضح ہے کہ حالی کی معلومات کا دائرہ محدود تھا۔ اس لیے وہ مغرب کے غنائی شعرا سے غالب کی غزلی کا تقابلی مطالعہ نہیں کر سکے۔ انہوں نے عام طور پر فارسی کے غزل گو شعرا سے بھی غالب کا مقابلہ نہیں کیا اور یہ ضروری بھی نہیں تھا بلکہ بعض وقتیں ایسا تاہم ضروراک میں جاتا ہے۔ جہاں تک غالب کے کلام کی شرح اور تنہیم کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالی کی نشریوں سے اعلیٰ کے محاسن اور معنویت کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرانے میں بنیادی خدمت انجام دی۔

”یادگار میں حالی نے مرزا کی اردو نشر پر بھی غور فرمایا ہے لیکن حالی کی نشری تنقید اس انشائیے کے موضوع سے خارج ہے

# رج اکبر

حامد حسن قادری

حضرت اکبر آبادی نے بہت لوگوں کے نام رکھے۔ کسی کا بدھو، کسی کا جتن، کسی کا لیڈر، کسی کا پیڈر۔ مولانا محمد علی رئیس الاحرار نے اکبر کا نام رکھ دیا۔ ”رج اکبر“ بوزن ”رج اکبر“ حضرت اکبر دیسے بہت قطع تھے، صرف شاعری میں ”ہنسور شے“ مولانا محمد علی ظریف شاعر نہ تھے۔ مگر طبیعت سے بڑے چلبے، باتوں میں بڑے مسخرے تھے۔ ایک روز نامہ ہمدرد کو چڑچلیان دہلی سے نکالتے تھے۔ اس میں اکبر آبادی کے تذکرے پر ان کو ”رج اکبر“ لکھا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ اسی لیے اس کو اس مقالے کا عنوان قرار دیتا ہوں۔

شاعری میں رمزیات کے بغیر چارہ کار نہیں۔ نام رکھنا بھی ایک رمز، ایک انیا، ایک استعارہ ہے۔ جس طرح بارہ و ساعر کے بغیر نہیں بنتی، اسی طرح زند و ساقی، شیخ و زاہد، واعظ و مختب کے بغیر نہیں بنتی، اور اسی طرح مولوی مدنی، شیخ چلی، موسے ویسے، اناطون و فرعون کے بغیر کام نہیں چلتا۔

کسی رمز یا نام کے استعمال کا بڑا فائدہ اختصار کے ساتھ بلاغ ہے۔ ایک نام ایک اصطلاح بن جاتا ہے۔ سیرت یا صورت کا بڑا خاکہ یا نقشہ ایک۔ لفظ میں سما جاتا ہے۔ جو نام سنتے ہی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کسی تفصیل سے وہ حسن پیدا نہیں ہوتا اور وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو ایک چھوٹے سے نام سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً بدھو کا نام ہے۔ بدھ یا بدھی عقل کو کہتے ہیں۔ بدھو کے معنی ہوئے عقل مند۔ لیکن ازراہ طنز و طرافت بے عقل اور احمق کو بدھو کو کہتے ہیں۔ اکبر کے ہاں اس کا لطف دیکھئے :-

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں

گوگرد راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

یہاں جتن میں وہ بات نہ نکلتی جو بدھو نہیں ہے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں :-

مرزا غریب چپ ہیں، ان کی کتاب روتی

بدھو اکڑ رہے ہیں، صاحب نے یہ کہا ہے

یعنی صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ اصل میں غلط ہے، بلکہ مرزا کی کتاب میں جو کچھ ہے وہی صحیح ہے۔ لیکن بدھو احمق اس کو کیا سمجھیں، ان کے نزدیک تو صاحب کا فرمودہ ہی سب کچھ ہے۔ اب مرزا غریب صاحب کے خلاف کیا کہیں، چپ ہیں، ان کی کتاب روتی۔

مذہبِ اکبر کی ایجاد نہیں۔ پرانا نام ہے۔ لیکن اکبر نے نئے نام اور اصطلاحات بھی ایجاد کئے ہیں۔ اور بعض بعض کو اس طرح کہہ گئے ہیں کہ اکبر دسے معنی یاد آجائیں تو اچھے غلطے معقول لفظ سے سنجیدگی رخصت ہو جاتی ہے۔ مثلاً لیڈر کا لفظ کس قدر عام ہندو اور کارآمد ہے، ایسا کہ اس کا کوئی مترادف اس قدر معنی خیر نہیں۔ لیکن اس کو اکبر کے اس شعر میں دیکھئے :-

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسین بھی ہے جواں بھی  
شاید نرسے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

انہی کی جگہ لیڈر کہہ کر کیا لیڈروں کی قلمی کھولی ہے !

حضرت احمق پھوپھو ہندی بھی بڑے پختہ کا ظرفیت شعار ہیں۔ لیڈر سے وہ بھی کام لیتے ہیں :-

لیڈر ہے بیرانا نام، فلاکت کا ہوں میں چن

مدت سے اپنی قوم کے سر آ رہا ہوں میں

وہ لچپ بات کہی۔ لیڈروں کے باوجود قوم کی فلاکت دور نہیں ہوتی تو لیڈر کس مرض کی دوا ہیں۔ بلکہ ان کا بار لیڈری اور بھی قوم کی فلاکت کا باعث ہے۔ اکبر کا ایک اور مولیڈر دیکھئے :-

قوم کے غم میں ڈونڈ کھاتے ہیں حکام کے ساتھ

مدد لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کیساتھ

ایک دیل صاحب نے قومی خدمت اختیار کی تو اکبر نے کہا :-

پھپھو بھارا کئے پی کھساں

مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

جسٹہ اودار باعید کی نماز پڑھنے کہی صاحب آجاتے ہیں، وہ صاحب، ارجن کے لیے اکبر کہتے ہیں :-

رہ گئے نا آشنا۔ احباب غائب ہو گئے

ہم نفس و داک جو باقی تھے وہ صاحب ہو گئے

نوپر مسجد میں تماشہ دیکھئے۔ مجھ، دفاتی جیسے غریب نمازی جو نماز کے اہتمام میں دو تین گھنٹے پہلے سے آئے ہوئے بیٹھے ہیں پہلی صوف سے

اٹھائے جاتے ہیں اور حکام کے لیے جگہ خالی کرائی جاتی ہے۔ ایسے ہی منظر پر اکبر کہتے ہیں :-

شان نماز اکبر شاہ اندہ ہو چلی ہے

مسجد الگ بنا میں اپنی میاں دفاتی

بیاں دفاتی پر کیسی بیکسی کا عالم عاری ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی معمرۃ العروس میں ماما عظمت ایک کیرکڑی گئی ہے اور ضرب اٹل۔ اکبر الہ آبادی کی نصیب بھی ایک

کیرکڑی ہیں :-

رہیں ہر صبر کے آیا بی نصیبی وہ گوا اسکول میں برسوں پڑھائیں

اکبر نے ناموں سے دلچسپ کام لے نہیں۔ نام جس قوم کے فرد کا ہوتا ہے، اس قوم کی خصوصیات کا رد و ایما ہوتا ہے۔ اس لیے ناموں کو اکبر نے جہاں صحت مناسبات کے لیے رکھا ہے، وہاں بھی مکملوں میں اس نام اور قوم کے خصائص قومی و شخصی کا خیال رکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

ثانی کے آگے تیز کا دلچسپ پاٹ ہے      گلو کی جانغزائی کو گنگا کا گھاٹ ہے  
دوبے ہوئے پیر بھی مگر اپنی بات میں      پیر بھی بہرے ہیں خیالی فرات میں  
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے      کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمعی  
رات انوس سے کہتے تھے برہمنی بھائی      ہم سے ناشق ہیں الگ کانفرنسی بھائی  
وہ سناتے ہیں بھی سناتے ہیں      کہتے ہیں مان جساؤ منسا رام  
حکم انگلش کا ملک ہندو کا      اب خدا ہی ہے بھائی مستو کا

کہیں نام سے صرف تلافی آرائی مقصود رکھی ہے۔ جیسے :-  
قائم ہی بوٹ اور عوزا رکھیے      دل کو مشتاق مس ڈسوزا رکھیے  
ان باتوں پہ معتبر من نہ ہو گا کوئی      پڑھیے جو نماز اور روزہ رکھیے  
لیکن دوسری جگہ نام سے کوئی خصوصیت ملحوظ رکھتے ہیں، مثلاً :-

حجاب تنگت کو دور کرتا ہے زبیدہ سے  
سو اس کے جو باتیں ہیں فقہا لک پڑہ پڑھیے

”زبیدہ“ کے ہم وزن حمیدہ، حمیرا وغیرہ بھی تھے۔ لیکن ”تنگت“ کے عمل پر ”زبیدہ“ کس قدر موزوں ہے۔ زبیدہ خاتون ملکہ ہارون شہد خلیفہ عباسی کا نام ضرب المثل ہے۔

اصلی ناموں کو بھی علامت بنانے میں اکبر نے لطافت و جدت پیدا کی ہے۔ کہتے ہیں :-

گھنگا ہے سراپا پائے بُت پر۔ زبان پر ہے گلہ جفا کا

مرے عمل میں ہے طرز سید۔ غزل میں اغاز لاجپت ہے

مرسید کی انگریز پرستی اور لالہ لاجپت رائے کی بنیاد پسندی کی طرف کس قدر خوبصورت اشارے ہیں۔

دو اور نام لکھتے ہیں۔ ان میں اگرچہ ”طرز سید“ اور ”اندا لاجپت“ کی خوبی نہیں مگر دونوں کا فرق خوب ہے۔ کہتے ہیں :-

ایک، شوکت اور منیا الدین وضع دعو میں ہیں

فرق اتنا ہی ہے وہ جنگل میں ہیں۔ یہ زو میں ہیں

مولانا شوکت علی کو تن و قوس اور زور و شور کے سبب سے جنگل کا شیر کہا۔ اور ان کے مقابلے میں ٹی اکبر منیا الدین کو محاب غانے کا۔

ڈارون کا نام اکبر نے بڑی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ڈارون کا نظریہ درست ہی تھی، لیکن اس کی گاڑی کا بندر پر آکر لکھ جانا اور انسان کا بندر سے رشتہ جوڑنا، ہندوستانوں کی نظر میں مضحکہ خیز ضرورت تھا جہاں بندر عجیب ذات واقع ہوئے ہیں۔





مجاہدوں سے مراد بنگالی نالوں ہے۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال ہونے کے بعد چھ سال تک بنگالیوں نے ترغی تقسیم کے لیے شورش برپا رکھی۔ اس کی طرف اکبر اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بنگالیوں کی جرأت کا سبب اسپتھر وٹل کی تعلیم تھی۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ ان فلاسفروں کی تعبیر کو بغاوت سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ اس کا دوسرا ہی یہ ہے کہ سیاست میں زور و شور اور بغاوت کی جگہ نہایت عمل و تامل کے ساتھ فکر و تدبیر کے انقلاب کے لیے راستہ بنانا چاہئے۔ اکبر نے اصل میں اسپتھر وٹل کو مغربی تعلیم کے لیے علامت قرار دیا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ بنگالیوں کی شورش خود آفرینوں کی دی ہوئی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ تاہم ان ناموں کا استعمال اس شعر میں بے محل اور نازیبا ہے۔

مشہور تاریخی ناموں سے اکبر نے زیادہ کام نہیں لیا۔ سب سے زیادہ طیلے اور بجنوں سے ان کو دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے متعلق بہترین شریعہ مضمون اردو مجنوں کا استعفا ہے۔ لیکن یہ شعر بھی خوب ہے :-

مجدد میں جی مغربی تعلیم جاری ہو گئی  
لیل و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

مغربی تعلیم کی غربانی کا بیان اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں لیلی و مجنوں جیسے تعلق دے دے سہی۔ پھر بھی مختلف لوگ امن و عافیت سے رہ رہے تھے۔ پہلے مغربی سیاست نے آپس میں فوجداری کرانے کی ضرورت سمجھی اور پھر سیاست بے سیاست خود بخود فوجداری کرنے لگی۔ اس شعر میں اکبر کو مغربی تعلیم کے فائدے سے انکار نہیں، بلکہ اس کے ان عواقب و نتائج کی طرف اشارہ مقصود ہے، جن سے اہل ہند آخر تبر کے ہم نوا ہو گئے :-

باہم سلوک خاتواٹھائے فخر و گرم  
خاہے کو تیر کوئی دے جب بگڑ گئی

ناموں کے علاوہ خطابیوں سے بھی اکبر نے ایما و علامت کا کام لیا ہے۔ مرزا کی آن بان مشہور بات ہے۔ ”میرزا منشی“ محاورہ ہے۔ اکبر بھی پردے کے متعلق کہتے ہیں :-

میرزا باز ادواختی سلطنت کی بات تھی

ذیل کے شعر میں بھی مرزا بطور علامت استعمال ہوا ہے۔

دربار دہلی اک طرف۔ لوکل مجاس اک طرف

مرزا کا چم تھم اک طرف۔ بدھو کی گھس گھس اک طرف

ٹھاکر کے دو معنی ہیں۔ اکبر نے دونوں طرح لکھا ہے۔ کہتے ہیں :-

انہیں کی بھینس ہے بھائی کہ جن کی لاٹھی ہے  
انہیں کا گٹھوں ہے اکبر جو بن سکے ٹھاکر

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

دروید پر میں نے ڈنڈوت کی  
میری غمی مرے دل میں ٹھاکر کی پیت

کیا شور چیلوں نے یہ ہر طرف  
مہاراج کی جے ! گرو جی کی جیت

یہ قطعا اکبر کی ذہانت و عظمت اور صناعت کی عجیب و غریب مثال ہے۔ چوتھے مصرعہ میں صنعت ”محاکات المصوت“ کا استعمال ہے۔ یعنی چوتھے مصرعہ کے الفاظ (جے۔ جی۔ جیت) کو کھینچ کر پڑھنے سے ”چیل“ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اور تیسرے مصرعہ میں ٹبری صنعت کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی چیلوں کا لفظ ”چیلے“ کی جج اور ”چیل“ کی جج دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ گویا چیلے کیا ہیں

چلیں ہیں۔ یہ اکبر کا عجیب سحر اپن ہے۔

یہاں شاید یہ بات بے محل نہ سمجھی جائے کہ اکبر جس بے نیکی انگریز پرستی کے مخالف تھے اس کی ایک دلچسپ مثال شاکر کی جگزی ہوئی صورت ٹیگور ہے۔ ڈاکٹر ابندر ناتھ ٹیگور اصل میں ڈاکٹر ابندر ناتھ شاکر ہے۔ ٹیگور ہندوستان کی کسی زبان کا لفظ نہیں۔ انگریزی نام لفظ بنا لیا ہے۔ بنگالی زبان میں ڈاکٹر صاحب کے نام میں شاکر ہی لکھا جاتا ہے۔

ایک اور دلچسپ خطاب دیکھئے:-

نہ سہی لطف ظم، گہمی ہی سہی شیخ صاحب مہنت جی ہی سہی

اس مضمون کے لیے لاد، پنڈت وغیرہ سب سے زیادہ مہنت جی ہی موزوں تھے۔

دو اور خطاب بڑے مزے سے لکھے ہیں:-

پکا میں پس کر دو دو شیاں تھوڑے سے بھولانا ہمارا کیا ہے اے بھائی نہ مسکر ہیں نہ مولا نا

مستزاد مولانا دونوں کو پیسے پکانے سے مار ہے۔ اس شعر کی قافیہ آرائی تو اکبر کا خاصہ ہی ہے۔ لیکن قافیہ آرائی کے شوق کا اعتراف اور اس کی ”بے پناہ“ مثال ذیل کے شعر میں دیکھئے:-

موج ہے دل میں مرے قافیہ پیمائی کی جا کے گنگا پر کہا کرتا ہوں ”بے مائی کی!“

برگڑ کے مولوی کی اکبر نے ایسی ایسی تواریخ کی ہے کہ ان حضرت کا جی ہی جانتا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے اس ”قوم“ کے ساتھ اکبر کو کچھ ”عظمیٰ“ ہے۔ ہر حال ایک شعر میں بڑی بلیغ بات کہی ہے، یعنی:-

برگڑ کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے مغرب کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے

”مولوی“ کے لیے کننا کہ ”عربی میں ترجمہ ہے“ کس قدر خوبصورت بات ہے۔ اور ظاہر ہے کہ برگڑ کا مولوی مغربی پالیسی کے پروپیگنڈے کا کام دیتا ہے۔ شیخ نہایت قدیم، صمد سال کہنہ علامت ہے، اس میں لطف پیدا کرنا مشکل ہے جب تک ایسے جدید مضامین و اسالیب نہ ہوں جیسے ان دو تین شعر دل میں ہیں:-

یاد کرتا ہے گزشتہ با اثر لاجول کو شیخ کو طعنے دیا کرتا ہے شیطان ان دونوں

یعنی شیخ میں اگلے لوگوں کا سامان اور تقریب نہیں رہا، اس لیے شیخ کے لاجول میں اثر نہیں۔ اب اس سے شیطان نہیں بھاگتا۔

وہ تو گر جا پر کا اور پر گیا کہے کو بھانڈ شیخ کا ٹوٹا انجی سے بھی بڑھ کر تیز ہے

کہے کو بھانڈ جانا یعنی کہے سے بے تعلق رہنا یا کہے کی موت و خدوت کا خیال نہ رکھنا۔ شریف مکہ کی ”کعبہ فروشی“ کے واقعات معلوم و مشہور ہیں۔

شیخ صاحب کی قلمی کی نہ قلمی کھلی جائے لارڈ صاحب کا کہیں حشر میں انہما نہ ہو

لارڈ صاحب کی خوشامد میں شیخ صاحب کی ایمان فروشی کا کیا خوب بیان ہے۔

یا ذیل کے شعر کی سی اعلیٰ اور لطیف ظرافت پیدا کی جائے:-

سچ کہتے ہیں شیخ اکبر، ہے طاقت حق دوزم ہاں ترک مے دشاہد، یہ اُن کی بزدلی ہے

”یہ اُن کی بزدلی ہے“ یعنی، یہ ان کا بدتر سچ ہے۔ اس شعر میں جواب نہیں۔

# آوارہ گرد اشعار

## قاضی عبدالودود

(۱) آوارہ گرد اشعار کی ابتدا سالانہ شاعرانہ سلسلہ سے ہوئی اور اس وقت تک اس کی کئی اور قسطیں مختلف رسائل میں طبع ہو چکی ہیں۔

(۲) کچھ امور کی تحقیق حسب درخواست ہو سکی، مثالہ کتابی شکل میں چھپے گا تو ضروری اصلے کئے جائیں گے۔

(۳) مواد کافی نہ ہو تو اور امور درکار یہ فیصلہ بھی نہیں ہو سکا کہ کوئی شاعر جس کی طرف کوئی خاص شعر منسوب ہوا ہے فی الواقع اس کا مدعی تھا یا نہیں کہ پیشہ میرا ہے۔

(۴) ایسے اشعار پر بھی جن میں خفیف اختلافات ہیں "آوارہ گرد" کا اطلاق ہوا ہے لیکن یہ التزام نہیں کہ اختلافات کا ذکر کیا جائے۔

(۵) اس قسط میں حسب ذیل صفحات مستعمل ہوئے ہیں:

آب = آب حیات ط ۱۹۱۴، آصفیہ = فرہنگ آصفیہ، انجن = انجن ترقی اردو، بیاض کو اتمہ = بہ بیاض جو ناکش ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن پٹنہ فروری ۱۹۵۶ء میں کو اتمہ سے آئی تھی ناقص لاطین ہے اس لئے اس سے اس کے مولف کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ وہی ہے جس کا ذکر صفحہ ۹۸ میں ہے جس = تذکرہ شعرائے اردو از میر حسن ط ۱۔ نحمدہ = نحمدہ ماہود۔ سوسائٹی = کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، شفیق = چمنستانی شعور شفیق۔ شورش = کس مخطوطہ آکسفورڈ۔ بہ شورش عظیم آبادی منوفی ۱۹۵۱ء کا تذکرہ شعرائے ریختہ ہے مگر اس میں کسی شخص نے تصریح کی ہے۔ شوق = تذکرہ قدرت اللہ شوق۔ شیفہ = گاش بے خارا از شیفہ ط ۱۹۱۴، صغیر = جلد ۱ خضر جلد ۲ از صغیر بکراچی۔ ط = طبع۔ طبقات = طبقات شعرائے ہند از کریم الدین۔ طوفان = تذکرہ شعرا از ابن طوفان، مرتبہ راقم عشق = تذکرہ عشقی عظیم آبادی نسخہ راقم۔ قاسم = مجموعہ نغز از قاسم۔ قائم = محزون نکات از قائم۔ گرویزی = تذکرہ ریختہ گریاں از فتح علیا حسینی گرویزی۔ گلزار = گلزار ابراہیم فہم۔ م = کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ۔ مسرت = تذکرہ مسرت افزا، یہ معاصر پٹنہ میں بالفاظ طبع ہو رہا ہے۔ میر تقی میر و حیات اور شاعری از جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ نساخ = سخی شعرا از نساخ۔ نکات = نکات اشعار از میر ط ۲۔ نکست = محزون فراد از نکست و ہلوی، یہ طبع ہو چکی ہے لیکن اس وقت پیش نظر نہیں اس

کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مخطوطہ اردو ۵۰ ص سے ماخوذ ہے۔ وے ورق - ہندی سے تذکرہ ہندی از مصنفی۔  
 (۶) لفظ آوارہ گرد، ممکن ہے کہ ایرانیوں کی زبان پر نہ ہو، لیکن محض اس بنا پر اسے فکر و اردو سے خارج نہیں کیا  
 جاسکتا۔ یہ ہرزہ گرد کی طرح ہے جو ایران میں مستعمل ہے۔ "آوارہ گرد" ہندوستان میں صدیوں سے رائج ہے۔ ۱۔ تاریخ اراکشاں  
 واضح متوفی ۱۲۳۵ھ: "آوارہ گرد و زوالِ اعظم شاہ آمد" ۶۶۹ - ۲۔ سفرنامہ اندرام محض متوفی ۱۲۳۵ھ: "آوارہ گرد و ان کوہ"  
 ۵۵ - ۳۔ بہار بے خزان، مصنفہ اواسط ماہ سیزدہم، منقول از "میر" "آوارہ گرد و بہار امید" ۵۵ - ۴۔ کلیات میر  
 اشاعت آسی "بھرتا" اہوں گلیوں میں آوارہ گرد و "۵۵ - ۵۔ "آوارہ گردی اپنی کچی میردوں پر" ۵۹ - "آوارہ گرد و بادیا  
 ایتلاہوں میں" ۵۵ - ۵۔ آپ بقا از خواجہ عشرت لکھنوی: "آوارہ گردی" ۵۹ - ۶۔ اندر سبھا امانت "از حضرت مولیٰ  
 منقول از نگار و سیر ۱۹۵۲ھ: "سیر پر ی آوارہ گرد و ہو جاتی ہے" ۵۲ - ۷۔ حاشیہ طام الفتا از مرزا محمد عسکری لکھنوی:  
 "آوارہ گرد و عورت" ۵۲ - ۸۔ خیام مصنفہ سید بیان ندوی: "آوارہ گرد و رہا میوں" ۵۲ -  
 (۷) ان اصحاب کا تذکرہ دل سے شکر یہ ادا کیا جاتا ہے جن سے اس مفلس کی قرب میں مدد ملی ہے۔ ان کے نام اپنی  
 اپنی جگہ پر دیے گئے۔

- (۱) کوچہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے خضر کیا جاں غریب اگلے زمانے ملے  
 صبا، شاگرد و دانش کا شعر ہے دیوان ط ۱۲۹۳ھ ۱۸۸۰، لیکن تصفیہ ۳ ص ۳۳ میں بنام میر۔
- (۲) میں اور بزم سے سے پوئی شہ کام آؤں گہ میں نے کی تھی تو بے ساقی کو کیا ہو تھا  
 غالب کا طبع زاد ہے دیوان مطبع نظامی کا پتہ ۱۳۱۱ھ ۱۹۰۱ء میں میر کے نام سے ہے۔
- (۳) گرم عجب سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا آگ بیٹھ کر آئے تھے یہ آنا کیا تھا  
 تیر کا مطلع ہے کلیات ۱۲۵۵ھ عشقی، لیکن تصفیہ ۳ ص ۱۲ میں ورد سے منسوب ہے۔
- (۴) یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں ایک خانہ خراب ہیں دونوں  
 انتخاب دیوان میر مولفہ جناب ڈاکٹر عبدالحق ص ۱۱ میں مطلع شامل ہے اور باوجود اس کے کہ کلیات غیر حاضر ہے  
 مقدمہ کلیات نوشتہ آسی مرحوم میں تیر کے نام سے ہے ص ۱۱ "میر" میں ان اصحاب کی تقلید کی گئی ہے ص ۳۶، اور جناب عطا  
 کا بیان ہے کہ "اکثر لوگ" اسے تیر کی ملک سمجھتے ہیں (نگار جولائی ۱۳۵۲ھ ص ۱۱) یہ درست ہو یا نہ ہو، ان کا یہ قول ضرور صحیح  
 ہے کہ یہ مطلع طبقات میں بالکل نہ حضور شاگرد ورد کے نام سے ہے اس پر یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ اشاعت طبقات سے  
 کہ و بیش ۱۲ سال قبل شیعہ (ص ۱۱) اور ان سے بھی بہت پہلے قاسم (ص ۲۱) اسے حضور کی طرف منسوب کر چکے ہیں۔ کوئی  
 لے جناب شاہ عطاء الرحمن عطا کا کوئی نے بھی ایک مقالہ "آوارہ گرد و اشعار" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس کی ۶ قطعیں نگار  
 ۱۹۵۲ء میں (اہر بل تا دسمبر) شائع ہوئی ہیں۔ ۱۲ طبقات ۱۳۵۲ - ۱۳ حضور و مجرہ نغز کے اختتام ۱۳۵۲ء سے قبل  
 ہی مرچکے تھے مگر مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے مشاعرہ کریم الدین میں شریک ہیں۔

تقدیم شہادت اس امر کی کہ میر کی تصنیف ہے، میرے علم میں نہیں۔  
 ۵۵۔ ”فغانِ دہلی“ ایک مجموعہ اشعار ہے جو افضل حسین کوکت نے ۱۳۲۵ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں بہت سی نئی  
 بعض وہ نظمیں ہیں جو شورش شہر سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں۔ اردو کی مشہور غزل جو بحذف ۵ اشعار درج ذیل ہے جہاں  
 تک میر اعظم ہے پہلے پہل اسی مجموعے کی وساطت سے منظر عام پر آئی تھی۔ ”فغانِ دہلی“ میں یہ حسامی، ”کی طرف فسوس ہے  
 گئی ایک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے  
 ساری رعایائے ہند تباہ ہوئی کہوں کیا کیا ان چٹا ہوا  
 شے شہر دہلی یہ جانا چن کہ سب طرح کا بہاں تھا اس  
 شب روز بھولوں میں جو نظمیں کیوں خار غم نے چک چکیں  
 جو سلوک کرتے تھے اور سے اب ہیں دیکھو وہ کس طور سے  
 یہ بالِ تن پہ ہے سر نہ رہیں جان جانے کا ڈر ورا  
 یہاں ننگے حال جو سبک ہے پر کرشمہ قدرت بکا ہے  
 یہ قسم کسی نے جی سنا کہ دی بھانسی لاکھوں کو بے گناہ  
 نہ تو دشمنائی ہے بغیر میں نہیں اپنا یاں کوئی دہر میں  
 کیا حسامی ڈر تجھے حشر کا جو حسد ارکے تجھے بر ملا  
 تجھے ہے وسینہ رسول کا کہ ترا وہ حسامی کا رہے ملے

یہ اشعار جو مختلف الانواع اسقام سے ملو ہیں مثنوی، فغانِ دہلی، طاسکۃ، سے نقل کئے گئے ہیں ۱۳۴۹ء  
 کے ہریت بعد ہمارے گلشن“ نامی ایک مجموعہ اشعار غالباً لکھنؤ کے کسی مطبع نے چھاپ کر شائع کیا تھا۔ یہ اس وقت پیش نظر نہیں  
 لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس میں اس غزل کے کچھ اشعار ظفر کے نام سے درج ہوئے تھے اور منقطع میں ”حسامی“ کی  
 جگہ ”ظفر“ تھا۔ میرا خیال ہے کہ متن اشعار میں اور بھی اختلافات تھے۔ لیکن یہ یاد نہیں کہ اس میں کتنی ایسا شعر بھی تھا یا  
 نہیں جو ”فغانِ دہلی“ میں موجود نہیں۔ غمانہ ۴ اشعار پذیر ہوئے اس میں یہ تقلیدِ فغانِ دہلی اس غزل کے شعر حسامی  
 کے نام سے مرقوم ہوئے مگر ۱۱ اشعار شامل ہیں جن میں سے ایک ہے

سبھی جاوہ نام نہ سخت ہے کہوں کیسی گردشِ بخت ہے  
 نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ وہ باد ہے

”فغانِ دہلی“ سے بغیر حاضر ہے اور نہ معلوم کہاں سے بیا گیا ہے۔ باقی ۹ اشعار فغانِ دہلی میں ہیں لیکن دونوں کا متن بہت

مخلف ہے۔ کتاب مذکور میں اشعار زیر بحث کے متعلق لکھا ہے: ”اس دور و مصیبت (۱۸۵۷ء) کی یادگار ایک نظم ہے جس کو  
اوشاسن ظفر کی تصنیف بتاتے ہیں مگر اس تمام کلام پر نظر کے بعض نکتہ پس اس کو حاکمی مخلص ایک غیر معروف شاعر کی طرف  
منسوب کرتے ہیں۔ اس وار و گہر میں الفاظ کی نشست پر غور کرنے کا کس کو موقع تھا؟ دل کے جذبات زبان پر بے ساختہ  
آئے اور اب تک درو مندوں کی زبان پر ہیں“ ص ۱۱۔ ”حامی“ غالباً ”حسامی“ کا مصحف ہے اور میں نے کہیں اور یہ  
اشعار ”حامی“ کے نام سے نہیں دیکھے۔ خیال ہے غلام آبادی نے ”منزل اور آرزو“ ص ۱۶ میں اس غزل کے ۳ شعر ”فغانِ دہلی“  
میں میں پیش کئے ہیں اور وہ انھیں ظفر کی ملک قرار دیتے ہیں، اس کتاب میں قطع کا مصرع اس طرح ہے۔  
”بچے خوب حشر ہے کیا ظفر تو خدا کے فضل پہ رکھ نظر“

نخاندہ سربراہ کی وفات کے بعد پنڈت کیفی مرحوم نے شائع کیا تھا۔ اس کے ص ۴۴ میں ”فغانِ دہلی“ کے ۳ شعر بحوالہ  
دیوان ظفر مندرج ہیں مگر یہ اشعار دیوان میں نہیں اور نخاندہ میں ان کا شمول غالباً پنڈت صاحب کا فعل ہے۔ میری  
راے میں کوئی قابل قبول شہادت اس کی موجود نہیں کہ یہ اشعار ظفر کے ہیں، سبھی جا..... اتھ“ تو نہ معلوم کس کا ہے باقی  
حاکمی کے ہیں۔

(۶) مضامین فرحت حصہ ۲۔ ”فدر کے کئی برس بعد روتی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا اس میں کوئی طرح نہیں دی گئی  
تھی۔ میں بھی تھا کہ وہی کامرشیہ کہو۔ یہ کل کلام ایک کتاب کی شکل میں چھپا ہے۔ اس مشاعرے میں آرزوہ بھی شریک تھے۔  
انھوں نے وہی کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کیا ہے۔

ہوا اچھا جو مشا نام و نشان دہلی  
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوان دہلی “ ص ۱۵۲  
نخاندہ ۴، ”ترجمہ حبیبی علی خاں شاواں“ فغانِ دہلی کی تحریر کے وقت بھی ان کی عمر تیرہ و دو برس کی ہوگی کہ مضامین شعرا  
کے شہرہ نقض سے عاجز آکر انھوں نے وہی کامرشیہ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشان دہلی  
میری پاپوش بنے مرثیہ خوان دہلی “ ص ۱۵۳  
دربار فرحت اللہ بیگ مرحوم نے جس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ”فغانِ دہلی“ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر  
اس میں مشاعرے کا ذکر نہیں۔ شعر زیر بحث کی زمین میں نہیں سے زیادہ شعر کے اشعار البتہ ہیں جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ مشاعرہ  
ہوا ہوا یا نہ ہوا ہو، طرح ضرور تھی۔ فغانِ دہلی میں آرزوہ کا ایک مسدس ہے جس کا آخری بند یہ ہے۔

دور و حشر مجھے صحرای کی طرف لاتی ہے      سر ہے اور جو جس جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے  
مکھڑے ہوتا ہے جگر ہی ہی پہ بن آتی ہے      مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے  
کیونکہ آرزوہ نکل جائے نہ سودائی ہو      قتل اس طرح سے بے جرم جو صہباتی ہو ص ۱۵۴  
غور علی گھور دہلی (مثنوی سلسلہ ۴) شاگرد و ذوق وغیرہ سے دیوانی طبع (اس وقت تحریر ہی یادداشت پیش نظر)

ہیں آرزو کی ایک غزل کی نصیب ہے۔ یہ بوجب صراحت دیوان شورش شہر سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ دیوان ظہور کیا ہے اور یہ غزل کم کوکوں کی نظر سے گزری ہے اس لئے اس موقع پر نذر ناظرین کی جاتی ہے۔

اگر ہم نہ تھے غم اٹھانے کے قابل	تو کہیں ہوتے دنیا میں آنے کے قابل
کردوں چاک سینہ تو سو بار سیکس	نہیں داغ دل یہ دکھانے کے قابل
طیں تم سے کیونکر رہے ہی نہیں ہم	بلانے کے قابل نہ آنے کے قابل
رہی روز قصہ فنا کی تعمیر	نہ تھا یہ کبھی گھر بنانے کے قابل
چھٹے بھی نفس سے تو کس کام کے ہیں	نہیں جب چین تک بھی جانے کے قابل
بجز اس کے تھے خاک پیئے ہی لے چرخ	نہ تھے خاک میں پھر لانے کے قابل
کیا ترک دنیا میں جب تو یہ مجھے	کہ دنیا نہیں ولی لگانے کے قابل
وہ آئے دم نزع کیا کہہ سکیں ہم	نہیں موت تک بھی بلانے کے قابل
حسد آیا یہ رخ اور یہ ناصبوی	نہ تھے ہم تو اس آزمانے کے قابل
رہے ہم نہ کچھ مٹنے نال کے غم میں	نہ مٹ سکیں نہ پڑھانے کے قابل
نہ چھوڑیں گے محبوب الہی کے در کو	نہیں گو ہم اس آستانے کے قابل
ہمیں قید کرنے سے کیا نفع عباد	نہ تھے دام میں ہم تولانے کے قابل
نہ بال نقش نہ پڑ پائے دیکھیں	نہ آواز خوش کے سنانے کے قابل

وہ آرزو جو خوش بیاں تھے نہیں اب  
اشاد سے سے بھی کچھ بنانے کے قابل

تعب ہے کہ مرزا صاحب شعر زیر بحث کا مصنف آرزو کو سمجھے، یہ شادان کا کہا ہوا ہے جیسا کہ صاحب خجاندہ  
کا بیان ہے۔ لیکن یہ فہم ہی شعرا انھوں نے موزون کیا تھا، فغان دہلی میں صراحتاً مرقوم ہے۔ "بسیب کم فرحتی بر میں یک مطلع  
انفامودہ اندہ" ص ۵۵۔ مصرع انجمن میں اور دوسرا مضامین فرحت میں صحیح لکھا گیا ہے۔

۱۔ اب نذر سوز: "یہ قطعہ بھی ایک خاص موقع پر ہو تھا اور محجب انداز سے پڑھا گیا۔

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

دیوان دیکھے کئی طغیانی ریری رو اسے لے لے لے لے لے لے لے " ص ۱۹۹

مگر دیوان ظہور میں بھی ہے اور چونکہ دیوان سوز (نسخہ گرانٹھ و نسخہ ملوکہ جناب علی حیدر) میں نہیں ہے اور اب کے  
سوا کہیں اور سوز کے نام سے نظر نہیں آتا، لہذا قوی ہے کہ ظہور کے نسخہ کا رخاں سے ہے۔ اس صورت میں اس کی اصلی  
شکل یہ ہے جو دیوان میں ہے:

گیب میں آتف قائل سویرے سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

وہاں بیٹھی ہوئی تھی ان کی صحبت کی  
اسے مجھ سے اپنے مجھ سے مجھ سے

۱۸۱ زندگی زندہ ولی کا ہے نام      مردہ ولی خاک جیا کرتے ہیں

تاریخ کا شریعت و کلیات مطبع مولائی مین (۱۹۰۵ء) مگر تصنیف ۱۲۸۴ھ میں بنام ذوق۔

۱۹) وہ سعی و تدبیر فی کی صحبت محمودہ کی وہ ادبیت

ملازم ابرہیم مصنفہ پڑت ویا شکر نسیم لکھنوی (اشاعت چھپت ۱۹۷۱ء کا شعر ہے لیکن تصفیہ ۱۹۵۲ء میں بنام نسیم ملوی  
(اصغر علی خاں)

(۱۰) کرتی تھی جو بھوک پیاس میں پانی پیتی تھی کھانے کے قسمیں

گلزارِ نسیم کا شعر ہے صفا مگر آصفیہ احسا میں بنام حسن۔

(۱۱) تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بلا دوں

غالب کا شعر ہے روپوان ص ۱۵؛ لیکن تصفیہ ۲ ص ۲۷۵ میں بنام مصحفی۔

(۱۲) سوئے ہے نقشِ پا کی طرح خلقِ یارِ مجھے  
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

و رد کا مطلع ہے و در بیان مصلحت محمدی کھنڈہ ۳۱، حسن متا، قائم عنک، مگر اے قیدم صحت میں بنام ارشد

(۱۳) شکوہ تو کیوں کر ہے مے اشکِ سرخ کا  
تیری کب آستیں مے لوہے سے بھر گئی

فغان کا شعر ہے جو ولہانِ معلوم کے علاوہ ان محظوظات و لہان میں بھی ہے جو میرے پاس ہیں۔ تذکرے بھی اسی کے مؤید

ہیں کہ نفاخ کا زائیدہ طبع ہے (نکات ص ۵۶، قائم ص ۵۳، حسن ص ۱۲۳، گد و پزی ص ۱۱۱ وغیرہ) کیسی ذرا اللغات ہم میں

اسے سزا کا نتیجہ ٹکرتا دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کلیاتِ سزا و معاف میں یہ شعر موجود ہے لیکن صاحبِ نو اللغات

کی نظر اس پر نہیں پڑی کہ سودا نے اسے نصیب کیا ہے۔ وہ قطعہ جس کے آخر میں یہ شعر آتا ہے سودا کی ایک غزل کا جبرو ہے۔

۱۱۔ رقصے کا پہلا شعر یہ ہے۔

سودا فغاں کو خط یہ لکھا اس کے بارے

جس وقت اس کے حال کی اس کو خبر گئی ۱۸۹

اس تفسیر کا ذکر نکات و حسن میں بھی ہے۔

۱۴) محبوبِ گل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑتی ہوئی  
ان دونوں ساٹے چمن کی ہے ہوا بگڑتی ہوئی

نظر کا مطلع ہے دہلیات طبع ۱۸۸۷ء ص ۳۳۳ محمد نور اللغات ص ۱۷۱ میں بنام جلال۔

(۱۵) مرجاشا باش اے رحمت خدا کی آفریں  
میرے حق میں تم نے باور غیر کا کہنا کیا

نشا کا شروع رکلام انشاسلا، گمش ہندسل ۳، لیکن اسمبلیہ ۱۸۰ میں بنام نظیر لطیف یہ کہ ہم ۱۹۴۴ میں انشا کے

نامہ سے بھی ہے۔

(۱۶) تجھ کو وہی لطف ہے سو ملک کو خبر نہیں  
خود تشہید کیا ہے اس کے فلک کو خبر نہیں

خوشید کیا ہے اس کے فلک کو خبر نہیں



نجر کا طبع ہے نکات ص ۵۸، گرویزی ص ۲، شفیق ص ۵۲، حسن ص ۶۵، شیفتہ ص ۴۱، لیکن آب ص ۴۲ میں نام سودا صاحب آصفیہ جو آزاد کو خیر راہ نصیب سمجھتے ہیں، اس اعتراف کے باوجود کہ شمس البیان و طیش اور شیکسپیر کے لغت ہیں نجر کے نام سے ہے، آزاد کے تعلق میں سے سودا کا ملاحظہ ہوتا ہے اور فرماتے ہیں کہ شاید کلیات میں نکلے۔ (ص ۴۲) کلیات ہیں اس زمین کا ایک شعر موجود نہیں۔

۱۱۷۱ آزاد ص ۵۸ سیاہ نوید در محوم پڑی ہے آئینے کے گلشن میں گشتا جھوم پڑی ہے  
اس زلف سیر فام کی کیا دھوم پڑی ہے آئینے کے گلشن میں گشتا جھوم پڑی ہے

از زلف الخ "آب ص ۵۸ میں صرت فطرت کے نام سے ہے اور "اس زلف الخ" ص ۵۸ میں آزاد کے دوسرے اشعار کے ساتھ مذکور ہے لیکن حاشیے میں مرقوم ہے کہ انشا کی دریا کے لطافت میں از زلف الخ مقرر ہوا ہے۔ آئینے سے منسوب ہے، اس زلف الخ کی نسبت حاشیے میں لکھا ہے کہ تذکرہ سودا میں اسی طرح آزاد کے نام سے ہے (لا) آزاد نے تذکرہ سودا کا اس طرح حوالہ دیا ہے کہ گویا ان کی نظر سے گزرا ہے، لیکن آب ص ۵۲ میں اسے "ایا باب" بنانے میں جو اس سورت پر علامہ "ناپید" کے معنی میں متعلق ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ آزاد کا ماخذ اسلامی تذکرہ قاسم ہے جس میں شعر کی دونوں شکلیں درج ہیں، اور ش ۲ کے متعلق لکھا ہے "واللہ اعلم بحقیقتہ الحال کہ۔۔۔ ہمیں ملاحظہ فرمادے (سودا) انصرفت نو" (ص ۴۵) قاسم پہلے کسی نے اس تذکرے کا ذکر نہیں کیا اور اس صورت میں کہ قاسم حسن، تذکرہ سودا کے تذکرہ میں اس کی طرف اشارہ نہیں، صرف قاسم کی شہادت پر اس کے وجود خارجی کا قائل ہونا ممکن نہیں۔ (اب) شعر کا تعلق شکل وہی ہے جس میں فارسی میں زیادہ ہے (ج) دریا کے لطافت (انجمن ص ۲) دیگر نسخ میں امید نہیں، فطرت کے نام سے ہے (د) آزاد کی عبارت میں لفظ "بعض" گمراہ کن ہے۔ یہ ہے کہ تذکرہ قاسم سے قطع نظر کوئی تذکرہ ایسا نہیں جس میں یہ شعر ہوا اور فطرت کے نام سے نہ ہو (نکات ص ۴، قاسم ص ۱۶۸) (لا) آزاد کا اس شعر سے کچھ تعلق نہیں، ہوتا تو میرا سے فطرت کی طرف منسوب نہ کرتے۔

۱۱۷۲ میں غیب پر دسم دیکھی مجھے روزِ عیدِ فرماں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثوابِ انا  
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عیدِ فرماں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثوابِ انا

شعرا آب ص ۴۲ میں بنام مصنف اور بہ نسبت بل بعض الفاظ مصنفی کے دیوان ۳ نسخہ دوم و دیگر نسخ میں موجود ہے۔ شعر ۲۰ آب ص ۴۲ میں انشا کے نام سے ہے اور کلیات انشا طبع وہی میں ہیں ہے مگر عشی کلام انشا کا بیان ہے کہ خطی نسخہ اس سے خالی ہیں ص ۴۲ کلیات کے ہم قلمی نسخوں کا ایک نسخہ مکرر کہ جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی ۲۰ م میں ہیں، اور دیوان (نسخہ ۲) میں

لے شاعر عظیم آبادی نے تذکرہ سودا کا حین آباد میں ہونا لکھا ہے۔ لیکن وہاں بھی نفاذ اب ہے۔ وہ صاحب جو حیات فریاد و نقش پائدار  
و غیرہ کو دیکھ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ شاعر کیسے وادی ہیں۔  
لے یسود آزاد کے والد کے مطلع میں چھپا تھا۔

و اس وقت پیش نظر ہیں۔ یہ شعر جو دہلی میں تقریباً ۱۹۰۰ء میں لکھا گیا ہے۔

۱۹۰۰ء جو کہ لکھی صد مگر کسی مصرع کی زحمت ہے ہمارے خاک یوں اڑتی پھرے لے کر دھرت

بہت شاعر و نثر نویس کا مطلع ہے (گلزار عشق) لیکن انشاء نورتن نے بعضہ مجبوراً شاعرانہ و جرات و طبع عجیبہ کی بنا پر تسلیم میں لکھا ہے۔ آوازوں نے اب ۱۹۰۰ء میں لکھی سو واک کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن اب ۱۹۰۰ء اور یوں تو ان مسئلہ میں آمد کی بابت اسے میر کا طبع زاد کہا گیا ہے۔

۱۹۰۰ء کھل کے گل کوہ تو بہار اپنی صبا دکھلائے حسرت ان غزلوں سے جو ہیں کھلے دم بھلائے

و ان کا مطلع ہے اور اس کی اصلی شکل یہ ہے (اشاعت دیوان وغیرہ ص ۱۳۷) اشاعت آواز عشت (لیکن جناب کلیم الدین نے بہت ہی بعض الفاظ کا آب کے نام سے لکھا ہے (معاصر ص ۱۵۵))

۱۹۰۰ء یا رنگ نہ کرنا صبح ناواں مجھے آنا یا چل کے دکھا دے نہن الیا کڑی سی

آصفیہ ص ۵۲ میں بنام آذرودہ مندرج ہے اور مقدمہ کلبانہ حسرتی و شیعہ نوشتہ قضاوی بدایونی مروجہ میں کسی سند کے بغیر مروجہ ہے کہ یہ آذرودہ کی اس غزل کا شعر ہے جو انھوں نے ۱۸۴۲ء کے ایک شاعر سے پیش بھی گئی ہے شیعہ نے معاذ اللہ بجا صاحب نے جناب عطا مدعی ہیں کہ بعض تذکرہ نویس میں آذرودہ کے نام سے ہے لیکن کسی تذکرہ کا نام نہیں لیتے اور جناب آصفیہ صاحب نے ایک ریڈیا کی فحش کے حوالے پر لکھا کہ انہوں نے (نگار اکتہ بر ص ۱۴۷) کوئی ایسا تذکرہ جو جناب عطا کا مؤید ہو سیکر علم میں نہیں اور نزدیک برقیں ہے کہ جناب عرش کا ماخذ مقدمہ دیوان ہے۔ جناب عطا نے اس پر انہما و حیرت کیا ہے کہ یہ تحریرات میں جناب راسے تاب کشمیری کی طرف منسوب ہے لیکن یہ صرف طبقات ص ۱۵۷ ہی میں اس کے نام سے نہیں، برید الدین سے برسوں پہلے شیعہ نے جناب راسے کی تصنیف قرار دی چکے ہیں ص ۱۳۷، شاعر ۱۸۴۲ء میں اس شعر کا پڑھا جانا باوجود کہ ان کے انہیں شیعہ کا تذکرہ جس پر آذرودہ کی تقریظ ہے کم از کم، و یا اس سے پیشتر معرض طبع پر آچکا تھا۔

(۲۳) محمد اہم ترجمہ سہا، داماد صبا لکھنوی: اگست ۱۸۴۲ء کے گاہ میں بی جو غزل ان کے نام سے ہے اس کے بعض اشعار یوسف علی خان ناظم کے ہیں مثلاً

خون ہونے ہوئے دیکھا کبھی جلتے دیکھا دل کہ ہر بار زب رنگ بدلتے دیکھا  
اسی طرح دوسرا شعر بھی بہ تبدیل الفاظ انہی کا ہے۔

زاد و شیش و برہن مرے ہم شرب ہیں دیش نہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا  
ناظم کا مصرع یہ ہے: زاد و شیش سبھی خوب ہیں کیا بنداؤں "اسی طبع ناظم کا یہ مشہور شعر ہے

ہے یہ ساتی کی کرامت کہ میں یہ سچ پاؤں اور پھر زم میں سب نے اسے چلتے دیکھا

بے تکلف اپنی غزل میں داخل کی ہے۔ شاعری کی کائنات یہ ..... اور ..... استادی کا دعویٰ ۱۸۴۲ء دیوان ناظم ص ۱۵۷ صاحب خجاندہ کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ سہا صاحب دیوان نئے مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ خبر نہیں اس کا خطی نسخہ موجود ہے یا نہیں اور دوسرے تو یہ اشعار اس میں یا نہیں۔

(۲۳) از کشتا کتن ضعفم نگسلد و از اوتن  
ابن کہ من نہ سے میرم ہم زنا تو اینماست  
قاب کا شعر ہے، تھیں تہ ذی ص ۳۸۹، لیکن تھانہ ص ۱۱۱ میں ہے کہ بعد الغنی اور شمس و طری نے یہ شعر اپنی وفات کے  
چند منٹ پیش کر رکھا تھا۔

(۲۴) نیر منظر نظر ٹھہرا ہے چشم یار کو  
نیکوں گنڈا پنچ یا مردم بہار کو  
کلیات آتش طبع محمدی، مسعودی ص ۱۲۸ میں موجود ہے، لیکن شیعہ نے ایک گمان شاعر محمد امین قسبی کی طرف  
مستوی کیا ہے ص ۱۱۵ اور نکات و ۲۰۲ ص ۱۲۸ ص ۱۳۱ میں بہ تبدیل بعض الفاظ سلیمان شکوہ کے نام سے ہے، مگر والدہ  
کا دیوان ہے، لیکن مجھے اب تک اس کے دیکھے ناک اتفاق نہیں ہوا۔

(۲۵) نقوشی بھی نیک و بد کی گردہ نمیزکھے  
کافر ہو پھر جو دل کو اس سے عزیز رکھے  
محمد رضا شکوہ کا مطلع ہے و مہندی ص ۱۱۲، قاسم ص ۱۱۱، لیکن تھانہ ص ۱۱۱ میں میر ضیا کے نام سے ہے۔

(۲۶) اب زار و گاہوں نے ایجا گلستان میں  
رازن کو نگارہنے صبا گلستان میں  
شیخ فتنہ ص ۸۰ و شائع ص ۱۱۱ و تھانہ ص ۱۱۱ میں بنام راسخ و عظیم آبادی، لیکن ان کے دیوان کے کسی نسخے میں  
نہیں اور انتخاب دیوان تہا شاگرد مصطفیٰ مولفہ حسرت موہانی، میں بہ تبدیل بعض الفاظ موجود ہے، بلکہ اس میں اس زمین کے  
اور اشعار بھی ہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تہا کا بیخہ فکر ہے۔

(۲۷) دشمنی در پرہ کئے ملے نہ لے کیا کیا  
آپ تو پرے سے بیٹھے اور ہیں رسوا کیا  
شیخ فتنہ ص ۱۱۱ و شائع ص ۱۱۱ و تھانہ ص ۱۱۱ میں بنام راسخ، لیکن دیوان راسخ کے کل نقوش سے جو میری نظر سے  
گزرے ہیں غیر حاضر ہے اور بہ تبدیل بعض الفاظ عشقی نے مراد بخش مراد شاگرد راسخ کے نام سے لکھا ہے۔ یہی صحیح ہے۔

(۲۸) ہوتے ہم بیک بنے برہمن سے راہ گئے ہیں  
حرم کے بنے والو تم سے عشق اللہ کرتے ہیں  
قاسم ص ۱۱۱ میں بنام جرات، لیکن علامہ جہاں صنفہ حقیقت، شاگرد جرات (ط ۲۶ ص ۱۱۱) میں حسرت استاد جرات  
کے نام سے ہے۔ جرات نے پوری غزل بشمول مطلع کی تصنیف کی ہے و کلیات ص ۸۶ و ۸۷ قطع حسرت کی تصنیف پر ہے،  
نہ پہنچے لڑا لوس تو عاشقوں کی گرد کو ہرگز  
نہیں بنے وہ جرات ان کی آؤ سر کو ہرگز  
بھلاؤں گا نہ میں استاد کی اس فرد کو ہرگز  
سخن آؤ رو کا حسرت نہ پہنچے درد کو ہرگز  
کہ اس پر آہ نکلتے ہے اور اس پر آہ کہتے ہیں

مجھے یاد تھا کہ یہ غزل دیوان حسرت نسخہ کتب خانہ رضا کیہ دامپو میں موجود ہے، جناب عابد رضا، بیدار ناس  
کی تصدیق کر دی۔

(۲۹) حضرات اپنے عاشق کی نہیں مشوقی کو بھاتی  
بیان سنی اپنی رسوائی میں تا مقدر و دست کبجو  
کہا تھا سارباں کے کان میں بیٹے نے آہستہ  
کہ مجنوں کی خرابی کا کہیں مدد کو دست کبجو  
جو ہر سخن ۲ مولفہ جناب کیفی چربا کوٹی میں شعر ۲ بیان کے نام سے ہے، لیکن جس ص ۱۱۱ میں بدالغنا بیگم، دختر

نزدیک خدام، وزیر محمد شاہ کی طرف منسوب ہے۔ میں نے جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے اس کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دیوان بیاض کا جو نسخہ ان کے پاس ہے اس میں دونوں شعر آخر غزل میں یکے بعد دیگرے موجود ہیں۔ اس کا مکان ہے کہ بیت نے نصیبین کی ہوا اور شعر فی الواقع بدرا لفسا نیگم کا ہے۔ واضح ہے کہ موخر الذکر کے شاعر ہونے کا مدار صرف حسن کے بیان پر ہے اور نہ کہا تھا۔۔۔۔۔ الخ کے علاوہ کوئی اور شعر ان کے نام سے نظر نہیں آیا۔

(۳۰) انھیں نہ جینے وہی کی تری ہے وہاں تجھے ان کھڑکیوں سے بھاگنے ہی ہے غنڈہ بھگے  
ریاض خیر آبادی نے لکھا ہے کہ صحیح ہو یا غلط، میں نے یہ شعر شمس ارشاگر دکن کے نام سے سنا ہے ریاض نمبر  
نکار ۱۳۱۲، لیکن دیوانی تکرر، شاگرد و ناسخ مسمی بہ ریاض الخیر بطور ۱۳۵۵ء میں موجود ہے صفحہ ۲۵ اور ریاض کے استاد  
امیر قلیا نے بھی یہ شعر تکرر ہی کی طرف منسوب کیا ہے (انتخاب یا و گار ص ۵)

(۳۱) تو ریت زار دے کیوں مسجد یہ تنہا نہ کیا تب تو اک صورت بھی تھی ایسا بے یار نہ کیا  
حسن ص ۵۶ و گلزار و مسرت ص ۲۴ میں بنام میر علی خلیف میر ولایت اللہ، لیکن کلیات سید محمد خاں، بہار کے  
۲۱ نسخے میں چھ مختلف کی زندگی میں (۱۳۶۹ء) میں طبع ہوا تھا، شکل ذیل میں موجود ہے،  
تو ریت مسجد سنی مسما ریت خانہ ہوا

جب تو اک صورت بھی تھی ایسا بے یار نہ ہوا ص ۱۴۲

زندہ اپنی نثر میں جو دیوان اول کے بعد ہے، اعتراف کیا ہے کہ میں نے اوائل میں میر خلیف، خلیف میر حسن سے  
اسلامی تھی اور تذکرہ حسن مجیب نہیں کہ ان کی نظر سے گزر رہا ہو چکیست کے مفہمہ گلزار نسیم میں یہ حکایت درج ہے کہ  
ناسخ نے ایک مشاعرے میں نسیم لکھنوی کو مخاطب کر کے یہ مصرع کہہ کر پیش کیا، ”بشنے نے مسجد بنا مسما ریت خانہ کیا“ بڑھا اور بولے کہ  
وہ نہ مصرع نہیں سوچتا کہ شعر مکمل ہو جائے۔ ناسخ کی زبان سے یہ مصرع نکلا ہی تھا کہ نسیم نے یہ مصرع لکھا یا۔ تب تو اک  
صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا، حاضرین بچڑک اٹھے۔ ناسخ نے مذہبی جوش کی تھی، فیہرے ٹھنڈا کر دیا، ص ۲۵  
گلزار نسیم مرتبہ چکیست کی اشاعت کے کچھ ہی بعد ریاض خیر آبادی نے لکھا تھا کہ (د) یہ حکایت مضمونی ہے، کہیں اور نہیں  
ملتی (ب) ناسخ و نسیم کے مرتبے میں بڑا فرق تھا۔ ناسخ انھیں قابل خطاب نہ سمجھتے ہوں گے (ج) ناسخ ایسے غیر مہذب  
نہ تھے کہ ایک ہندو اور پھر ”محبوب ہندو“ (د) اگر مخاطب کر کے ایسا دل شکن مصرع پڑھتے۔ (د) نسیم لکھ حاضر جواب  
سی نگہ ناسخ کے سامنے ان کی زبان نہ کھلتی (ریاض نمبر ۱۳۱۲) چکیست نے نہ پہلے یہ بتایا تھا کہ یہ حکایت انھیں  
کہاں سے ملی اور نہ جہان ناک میرا علم ہے انھوں نے ریاض کے اعتراض کے بعد اپنے ناخدا سے متعلق کسی قسم کی اطلاع  
دینے کی ضرورت محسوس کی۔ ریاض کا خیال ہے کہ وہ خود مختار ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے کسی سے سنی ہوگی نسیم  
سے جو غلو تھا اس نے اس پر غور کرنے کا موقع نہ دیا کہ کتنی دور از قیاس ہے۔ اعلیٰ علی نے جس زمانے میں یہ شعر کہا تھا، نسیم  
کیا ان کے استاد آتش بھی اس وقت پیدا نہ ہوئے ہوں گے۔

(۳۲) حسرت لے تازہ اسیر انقض آتی ہے دھوم سے فصل بہار اب کے برس آتی ہے

مدعی مولوی کا مطلع ہے: **انجمن غزل انجمنِ مطلق مخطوطہ دیوان ملوکہ جناب سیدنا و آغا تاجر کتب خانہ میں موجود ہے** مکتوب جناب سیدنا و آغا تاجر راقم پر یہ شعر کے بعد تذکرہ شیفہ میں شامل ہو کر (ص ۹۲) منظر عام پر بھی آچکا تھا۔ لیکن سید محمد خاں رند کے دیوان ۲ ص ۲۹۰ عرف ہی اس میں کا کوئی اور شعر نہیں، میں مرقوم ہے۔ رند نے اپنی شرا و جرح پر اس میں لکھا ہے کہ دیوان میں رجب ۱۲۸۰ھ تک کا کلام ہے، دیوان ۲ ص ۲۹۰ علق اس قسم کی صراحت نہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس میں اس کے بعد لکھے اشعار ہوں گے۔

(۳۳) اے جان اب بہ آگے ٹھہرنے سے باز رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہوا چلے  
کلیاتِ حمصہ کی شیفہ ص ۵۰ میں موجود ہے اور شیفہ نے اپنے تذکرے میں بھی اسے اپنے نام سے لکھا ہے  
ص ۱۲۰ لیکن دیوان رند ص ۱۲۰ میں بھی ہے۔ رند کو اعلیٰ علی، رند کی اور شیفہ سے توارو ہوا ہے، یا یہ سرف کے مرگب ہوتے ہیں، اس کا فیصلہ دشوار ہے۔

(۳۴) کتب کیچ میں ہم کر رہیں ہر سو بدلتے ہیں بل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں  
۱۰۰ الغیب، دیوان ۱۰ میر میرانی پہلی بار ص ۱۹۰ میں لکھا تھا، مطلع ہذا اس میں شامل ہے (ط ۱۳۹ ص ۱۰۰)  
اور شاہ لکھنوی کے دیوان ۲ ص ۱۰۰ میں تو مصنف کی وفات کے بعد طبع ہوا ہے، یہ مطلع ملتا ہے۔  
کتاب کیچ میں کب کر رہیں گے کہ سنبھلتے ہیں  
بل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں ص ۶۱

(۳۵) تجھ میں اب شمع سے فرصت ایک ذرا ہی بات نہیں ۱۰۰ من سے منہ ڈھانکے رہنا دونا پٹروں بات نہیں  
افسوس کا مطلع ہے دیوان م ۵۰۰، عشقی، لیکن قاسم ص ۲۲۴ میں ان کے ہندا حیران کے نام سے ہے۔  
(۳۶) تباہ اور ڈھب کا سبھی میں محفل میں کم کچھ اچھی سب تار جاویر گے نہ اتنا تو سہم کیجے  
انشاء کا مطلع ہے (کلام انش ص ۱۲)

(۳۷) خدا سے ملک تو ڈر نہیں، خبر لے اس بچائے کی کیا فرما دے تیشے سے سر لوہا سنان اپنا  
تذکرہ اشعار میں بنام ظہر حاشیہ چمنستان شعر ۲۵۳، لیکن دراصل اندر رام خلص کا ہے اور انتخاب دیوان  
اس نسخے میں جو خود خلص کے ہاتھ لکھا ہوا ہے، موجود ہے۔ اس پر راقم کا ایک مقالہ نولٹے ادب میں طبع ہو چکا ہے۔  
(۳۸) پرویزِ حشر الہی جو نامہ معلم گفتند باز کہ آن روز باز خواہ من است  
مکن تمنا بلہ آن روز سر نوشت ازل اگر زیادہ کم باشد آن گناہ من است

کلیاتِ غالب اور سید ہیں ط ۱ میں یہ قطعہ نہیں ہے اور جہاں تک میرا علم ہے غالب کے دورانِ حیات میں کبھی یہ ان کے نام سے شائع نہیں ہوا، لیکن سید غوث علی شاہ (متوفی ۱۲۹۰ھ) کے ایک مرید نے غالب اور اپنے پیروؤں کی وفات کے بعد تذکرہ غوثیہ میں شاہِ صائب کی زبانی یہ لکھا ہے کہ یہ ان دو قطعوں میں سے ایک ہے جو غالب نے اپنے نام سے سنائے تھے۔ جناب مالک رام نے سید جلیں ط ۲ میں اسے کتاب مذکور کے حوالے سے سنائی کر دیا ہے ص ۱۲، لیکن جناب ڈاکٹر محمد رفیع

۱۳۹۰ء کی انگریزی کتاب چارم سرمد اور وہ شاعرات ایران میں کچھ الگ تذکرۃ الخواص میں سے چند ارمہ نقاد ہیرا باوی سے منسوب کیا ہے۔ فیصلہ کن بات ممکن ہے کہ تذکرۃ الخواص کا ماخذ معلوم ہونے کے بعد کبھی جا سکے۔

۱۳۹۰ء کوئی کہ آذنت نہ فی مانگے اور ملک عدم کی کچھ نشانی مانگے  
دکھلائے اسے تو اپنی یہ تیغ نگاہ جس کا مارا کبھی نہ پائی مانگے

ہندی صلت و قاسم ۲ ص ۱۹۱ میں بنام مرزا علی طغی، لیکن غرض عشقی میں بہ نہ بدل بعض الفاظ اولیا مولانی کے

ہم سے ہے۔

۱۳۹۱ء خدا کسی کو گرفت از ناف کا نہ کرے نصیب میں کسی کا فر کے یہ بلا نہ کرے  
مفتی محمد رائے بیاب کا مطلع ہے (قاسم ۲ ص ۱۹۱) لیکن قاسم ۱ ص ۱۹۱ میں کسی خاص کے ایک دوسرے

شاعر محمد شعیب سے منسوب ہے۔

۱۳۹۱ء آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا کچھ آگ بج رہی تھی سو عاشق کا دل بنا  
سور کا مطلع ہے (کلیات ص ۱۹۱) اور قاسم نے اپنے تذکرے میں اپنے استاد کے جو اشعار دئے ہیں ان کا آغاز  
اس سے ہوتا ہے۔ لیکن شفیق نے خود قاسم کو اس کا مصنف لکھا ہے ص ۱۹۱۔

۱۳۹۲ء میں کہاں تو کہاں پہ کہتے ہیں کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں  
از قاسم ۲ ص ۱۹۱، قاسم ۱ ص ۱۹۱ لیکن مصنف سرت نے اسے ان کے بھتیجے صاحب میر  
آدم کے نام سے لکھا ہے ص ۱۹۱ اس کا یہ بیان کہ بیان اشعار میں سے ہے جو مجھے خود الم سے ملے تھے بھیج ہے تو یہ سرت ہے۔  
۱۳۹۳ء مغان مجھ مست بن پھر خندہ قاتل نہ ہوئے گا مئے گلگون کا شیشہ چکیاں لے لے کے دوئے کا  
میر کا مطلع ہے (کلیات ص ۱۹۱ نکات ص ۱۹۱) قاسم ۱ ص ۱۹۱، گلزار، لیکن اب ص ۱۹۱ میں آرزو کے نام

سے ہے۔

۱۳۹۴ء کوئی نہیں کہ یار کی لاوے خبر مجھے اے سیل اشک تو ہی بہاؤے اوچھ مجھے  
میر کا مطلع ہے (کلیات ص ۱۹۱) اور آجملہ نسخہ ۸۲۸ میں ملتا ہے لیکن گلزار عشقی میں حسن خیر حسن  
تذکرہ کے نام سے ہے اور قاسم ۱ ص ۱۹۱ میں شوکتہ بڑا و سبقت سے منسوب ہے۔ بدیدہ گوئی مصنفہ ہوش بگر ای میں گل و اشک  
بگڑائی کی زبانی مرقوم ہے کہ پہلا مصرع آصف الدولہ کا ہے، اس نے اعلان کیا تھا کہ مصرع نکالنے والے کو ہزار روپے  
میں گے۔ ایک شہدے نے دوسرا مصرع کہہ کے انعام حاصل کیا۔ ص ۱۹۱

۱۳۹۵ء نکمب گل نے گلکا یا کسے زندان کے بیچ پھیر زنجیر کی جھڈ کار پڑی کان کے بیچ  
مفتی محمد شمس کا مطلع ہے (نکات ص ۱۹۱، قاسم ۲ ص ۱۹۱، قاسم ۱ ص ۱۹۱) مگر قاسم ۱ ص ۱۹۱ میں بنام محمد علی خاں  
حضرت۔ اسی مرحوم نے دونوں اب زبانی بیاضیں اودان کا انتخاب ہم ص ۱۹۱ میں لکھا ہے کہ بعض کے یہاں یہ موقوف الذکر  
حضرت کے نام سے ہے۔ یہ صحیح نہیں، بعض بھی اس معاملے میں میر و قاسم کے ہمنوا ہیں (ہندی ص ۱۹۱)

(۳۶) مجھے صورتیں ملو کس ملک بستیاں ہیں اب دیکھنے کو جن کے انکھیں زرتیاں ہیں  
 آئے تھے کبیر دوسرے کہا کہ چلے جہاں ہیں بیدار زلیست موزوں آپس میں ہستیاں ہیں  
 حسن ملا ۱۲ و گلزارِ حسرت ص ۱۱ میں بنام فرخ علی شیدا، شاگردِ سوادا، لیکن شعر اگلے سنہ ۱۳۵۸ء مولفہ قولاً (ط کلمتہ) میں  
 ہینگا شیدا کے نام سے ہے۔ اور اب ص ۱۳ میں سوادا کو اس کا مصنف لکھا ہے۔ پوری غزل قبول ہر دو شعر کا بات سوادا ۱۹ میں  
 بھی ہے مگر مغزِ سننے اس سے خالی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ غزل شیدا نے مقدم الذکر کی ہے۔

(۳۷) وہ جب تک کہ انیس سوار کیا کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا  
 ابھی دن کو لے کر گیا میرے گراہ وہ چلا رہا میں پکارا کب  
 قمارِ محبت میں بازی سدا وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا  
 کیا قتل اور حسابِ نجی بھی کی حسن اس نے احساں دہارا کیا

آب ص ۲۱ میں بنام میر حسن صاحب بھرا لیاں، مگر آزاد کو یہ مصرعے نہیں کہ ان کا ملکیت میری نظر سے گزرا ہے، بلکہ  
 وہ یہ کہنے پر کہ "اب نہیں ملتا" ۲۵ - یہ فریب پر تعلق ہے کہ آزاد نے یہ اشعار جن بے نظیر سے لئے ہیں جو پہلی بار شورشِ شہد  
 سے چند سال قبل چھپا تھا اور جسے "ناسی برائے غلط فہمی اپنی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی جلد ۲ ص ۳۶۱ میں خود  
 محمد حسین آزاد کی تالیف بتاتا ہے۔ اشعار زیر بحث کتابِ تذکرہ میں بربر عنوان "حسن" (نسخہ نو کشتوری ص ۱۱) موجود ہیں اور  
 اس رہی کا کوئی اور شعر ان کے ساتھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اس شخص کے مقدمہ شاعر گزرتے ہیں تو محض عنوان اس کے لئے کافی نہیں  
 کہ یہ اشعار میر حسن کی طرف منسوب کئے جائیں، بلکہ یہ بات کہ مقطع میں لفظ "نجی" آیا ہے اور بر شیفہ ص ۵۹ و طبقات ص ۲۱  
 دونوں میں خواجہ حسن مودودی کے نام سے ہے، اس کے خلاف پڑتی ہے، مگر آزاد کو میر حسن کے اشعار کی ضرورت تھی اور خواجہ حسن  
 کچھ مطلب نہ تھا۔ انہیں مقدمہ الذکر کے نام سے درج کتاب کرنے میں قائل نہ ہوا۔ مجھے یاد تھا کہ مکمل غزل فیض اللہ کر دیوان (نسخہ  
 موسائقی) میں موجود ہے۔ جناب شاہ مقبول احمد کے خط سے اس کی تصدیق ہو گئی۔

(۳۸) حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا کیا کیا میں نے کہ انہا رستہ کر دیا  
 مجھے یاد آتا ہے کہ حسرت موہانی نے آزاد کے معلقے کے کسی شمارے ۱۹۱۳ء میں لکھا تھا کہ مجھ اس مطلع  
 میں بخود دیوانی سے نوارد ہوا ہے۔ انتخاب دیوانِ حسرت ط ۱۹۱۹ء ص ۱۱ میں یہ موجود ہے لیکن جیسا کہ مجھے جناب ظہیر احمد صدیقی  
 سے معلوم ہوا ہے مطلوبہ دیوانِ بخود اس سے خالی ہے۔ آزاد سے واقف ہو کر اس کی ملکیت سے باز آگئے ہوں گے۔ براہِ کرم  
 وہ اصحاب جن کی رسائی جلداتِ آزاد کے معلقے تک ہے مطلع فرمائیں کہ میرا بیان صحیح ہے یا غلط۔

(۳۹) کس سوچ میں ہو نسیم بولو انکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے  
 نسیم لکھنوی کی ایک غزل کا مقطع ہے جو گلزارِ نسیم میں شامل ہے ص ۳۵ - لیکن تصفیہ ۳ ص ۱۲ میں اس کی نسخہ شدہ  
 شکل میرے منسوب ہے،

میر کس سوچ میں ہو بولو انکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

۵۰۰ غزلوں کو تو واقف ہو کر مجنوں کے مرنے کی  
غزلوں کو تو حاضر ہو کر مجنوں کے نام میں  
تدکیر جس امت میں ہے کہ رام ترانے موزوں سے جو غار سی گرتے اور آردو بالکل نہیں کہتے تھے، پھر اس وقت  
نابیدہ لکھا تھا جب انھیں قتل میراج الدولہ کی خبر ملی تھی "جہیں شعر ز غزالاں ... (۱) اور یادگار ماند ز گن رامہ کے طالب  
نذرانی جو حوا میں ہے صبح نہیں، مسرت میں غزالو ... (۲) اور دیرانے "قیاسی فصیح جملی تھے میں مجھانے" ایک نیم معروف  
نارانی شاعر میرزا ابوالہیثم مشتاق کے نام سے ہے (۲۲۵)  
(۵۱) گلگیرنے کاٹ کہ سر شمع پر دانے سے شب جل کئی کی  
طوفان مسل میں بنام صحتی، لیکن دواہ بن مصطفیٰ رنخ پیٹہ، میں یہ شعر نہیں۔ میں نے کی جگہ عرش و خلف میر کے نام  
سے دیکھ کر جناب عابد رضا، بیدار سے دریافت کیا کہ دیران عرش و کھنڈ میں ہے یا نہیں۔ ان کا جواب اس مضمون کا آبا کہ  
ان میں ہے۔

(۵۲) جبر میں ہوں کہ تیجے تیں لے شبہ صال غاہر میں دلچسپا ہوں کہ عالم ہے خواب کا  
تواشی طوفان مسل میں بحوالہ گلزار بنام درو، لیکن ہدایت کا شعر ہے (نکات مسل، حسن ۲۱۵)  
(۵۳) کیست کہ پیغام من بشہر شراں برو ایک از سخن از من بدان مرخصدراں برو  
گوید خاقانی ابی ہمہ آشوب سیرت نہ ہر کہ گوید و دہیت نسبت بخاقانی برو  
یہ اشعار جمال الدین عبدالرزاق صفہانی کے ہیں جن میں اس نے اپنے معاصر خاقانی سے خطاب کیا ہے اور جہان نمک سے  
ہے جس نے اپنے مقالے "نکات سخن" میں انھیں اسی کے نام سے لکھا تھا، لیکن آردو ادب کے حسرت نمبر ۱۱۴ میں خاقانی کے  
مقالے سے ہے۔ یہ ادارہ آردو ادب کی اصلاح ہے یا میرا سہو فلم، اس کے متعلق مسودے کی طرف رجوع کئے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا  
مذکورہ دفتر آردو ادب میں ہے۔

۱۵۴۰ پس از عشق مرنا عشق کو بدنام کرنا ہے خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو نہ لے  
(۵۵) مرغان فغان کو بچھو لوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے آہا و جوئم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم  
ہماری شاعری "مصنف جناب مسعود حسن رضوی ادیب (طہ) میں شاد و عظیم آبادی کے صرف یہی دو شعر ہیں اور پہلے کو انھوں  
نے سہرا شاد و لکھنوی کی طرف منسوب کیا ہے ۱۱۶۔ یہ کلام شاد و درمیانہ الامام (۱۱۷) دونوں میں ہے اور اس میں کچھ شک نہیں  
رشد و عظیم آبادی کا ہے۔ دوسرا شعر بھی ان دونوں کتابوں میں (میانہ ۱۱۷) موجود ہے۔ مگر ہماری شاعری "صنعت میں اس  
لے پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ کس کا ہے۔ میں نے معاصر ۱۱۷ میں جو اعتراض کیا تھا کہ اس کتاب میں شاد و لکھنوی  
کے نام سے ہے محض بے جا تھا۔ اس کا مجھے سخت افسوس ہے اور میں جناب ادیب سے معذرت خواہ ہوں۔ ہوا یہ کہ یہ بات ذہن  
نظم کی شاد و عظیم آبادی کے دو شعروں میں سے ایک شاد و لکھنوی کی طرف منسوب ہو گیا ہے، وقت تحریر پہلے کی جگہ دوسرا شعر فلم سے  
لے لیا۔ تعجب اس پر ہے کہ نگار تمبر ۱۱۷ میں یہی غلط اعتراض جناب حوٹانے بھی کیا ہے۔



(۵۶) تذکرہ گروہ بڑی کے مرتب جناب خواجہ عبدالحمق نے اس تذکرے کے شعرا کی جو فہرست دی ہے وہ اس پیش نظر ہے کہ اس میں پاکباز کے بعد قزلباش خاں کا ذکر ہے۔ حالانکہ اس میں تراجم کی ترتیب میں حدود پنجابی کا انتظام ملحوظ کیا گیا ہے۔ تذکرہ کے ص ۱۲ میں زیر عنوان ”پاکباز“ عبارت نزا و شعر و بی درج ہے :

جلوسے نکھائے جس کے مرتب ہیں یہ ہم کہاں      رقم تو جن ہمیشہ ہوا فسوس پس ہم نہیں  
اس کے معاً بعد ایک ناخوان ”قزلباش خاں“ ہے اور اس کے تحت قبیل کی نثر و نظم مرقوم ہے (ص ۱۲ و ص ۱۳)  
ابو شعر خوشگاہ قزلباش خاں مرحوم است :  
نفس کے در کو باز لے بل اب عیاں کرتا ہے      خدا جانے کسے کا ذوق یا آقا و کرتا ہے  
اب بیت بنام ”غیرے“ ہم شروع شدہ :  
مجھے درد و الم رہتا ہے نہ گھیرے میاں تھا      خبر پینے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں تھا  
جواب نہ میرے تو کچھ انتظار میں میرے      خدا عزراں نہ دکھائے بہار میں میرے  
دام عمر شرابیں پیائے مساتی      ہزار حیف کہ اب انتظار میں میرے

گروہ بڑی نے پانچوں شعر پاکباز کے نام سے لکھے ہیں، لیکن مرتب نے انھیں اس طرح پیش کیا ہے کہ صرف ایک ناخوان ہے اور کے جیسے باقی قزلباش خاں کو لکھے ہیں۔ شقیں نے کل اشعار گروہ بڑی کے فشا کے مطابق پاکباز سے منسوب کئے ہیں۔ ص ۱۵ لیکن جناب قزلباش کے ہمراہ ہیں اور شعر ہم کے متعلق رقمطراز ہیں کہ متغیر طور پر پاکباز کا سمجھا جا رہا ہے لیکن گروہ بڑی نے اسے پاکباز کے نام لکھ کر مشکوک بنا دیا ہے ونگار ہم ص ۱۳، یہ نکات ص ۱۴، قائم ص ۱۵ اور ص ۱۶ میں پاکباز کے نام سے ہے لیکن گلزار میں صلاح الدین پاکباز کی جگہ صلاح الدین بنات ہے۔ اس نام و شخص کا کوئی شاعر اس زمانے میں نہیں گزرا۔ ”بقیاب“ کتابت کی غلطی ہو تو عجیب نہیں صاحب مسرت نے شعر ہم کو پاکباز کی طرف منسوب کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ”مؤلف ... بنام شمس و گراہی تم شہیدہ“ فرق کیا ہے بلا و مل یا زین میرے خدا الخ۔ ”شاید شاعر برائے حسن مصرع تبدیل نموده یا توارد او داوہ ودا اللہ اعلم“ ص ۱۳۔ یہ تبدیل شدہ شعر یا ص ۱۴ فقرہ صغیر ہے! میں آصف الدولہ کے نام سے ہے مگر اس کا دیوان رسوائی، اس سے خالی ہے۔

(۵۷) کسی نے روم کی قسمت میں کوئی شام لے آیا      ہمیں کچھ لے نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا  
صحفی نے ہندی ص ۱۱ میں مہربان خان ”کد“ ”جابل“ کہا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کا ”عزت زبان“ ”نگ و برت نہ تھا۔ تاہم کاغذی ہے کہ پہلے میر سوز و غیرہ ان کے یہاں پہنچے، اس کے بعد سوز و کاغذ آجائے اور ان کے انھیں اپنے دفعتاً میں داخل کر لیا۔ ص ۱۱ حسن (ص ۱۱) اور صاحب گلزار نے انھیں سوز و سوز کا ناگرہ دکھا ہے لیکن حسن کا بیان ہے کہ ”اکثر

نے میرے نزدیک اس عبارت کا تعلق ”نفس“ سے ہے مگر اس کا ارکان ہے کہ ”جلوسے“ ... الخ ”مے ہو۔  
”یہ عبارت میری رائے میں“ مجھے درد و الم ... الخ ”مے تعلق رکھتی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ ”نفس“ ... الخ ”مے تعلق ہو۔

یہ سوز و سو گاہ و دیوان مہربانِ خاں یافتہ سے نشو و نما از ہی جہت اشعار اور انظمی مکر و مآچہ و وسوسہ تو شتم سراں اکتفا کو دم  
... سنون کہتے ہیں کہ اکثر غزلیات مضبوط و مربوط اور ابھرنا و رفیع و سودا (و تیرسیہ ز و غیر و نسبت بہتند خداوند کہ وہ افق  
... نام سے ترجمہ ترجمہ میں ایک غزل کے متعلق لکھا ہے : ”ابن غزل در کلیات سودا این عاصی و بدو و بسیارنا پسندیدہ“  
... ناصر کا قول ہے کہ ”زندہ کا دیوان مولف کی نظم سے گزرا ہے۔ مگر اکثر یہی غزلیں سوز کے دیوان میں موجود اور نام زندگان  
... نابو۔۔۔ یہ نہ چاہیے، جو جبر جبر بالعموم ہو اس کا دعویٰ افعال سے لپیٹا ہے۔“

شعر از بیعت قائم نے زندہ کے نام سے لکھا ہے اور دیوان زندہ سوسائٹی ہیں اس زمین کے اور اشعار کے ساتھ موجود  
... لیکن شوقی سے زندہ کے ان اشعار میں شمار کرنے میں جنہیں لوگ سودا یا سوز کی ملک سمجھتے ہیں۔ مطبوعہ کلیات سودا ۱۳۱۱ء میں  
... مینا ہے ”انہما ہے اس زمین کے اور اشعار اس کے ساتھ نہیں۔ حسن مسئلہ اس سوز سے منسوب اور مکمل غزل و دیوان سوز  
کو اندر آئے صاحب علی حیدر میں شامل ہے۔“

میرا خیال ہے کہ زندہ یا نوشا و سر بخیر ہی نہیں یا محض رائے نام شعر کہتے تھے بلکہ کسی نے روم ... اور اس زمین  
وز اشعار و اصل سوز کے ہیں جو زمانہ ملازمت ہیں انھوں نے زندہ کو دئے تھے۔ مگر انقطاع تعلقات کے بعد خود اپنے  
اب میں داخل کر لئے۔ سوز کا اس سے کچھ سروکار نہیں، کلیات کے معنی خطی نسخے اس سے خالی ہیں۔

(۵۸) صحبت و عطف تو نام پر ہے گی و اعط  
یہ ہے مینا نہ ابھی بی کے چلے آئے ہیں  
انظم مخاطب کی شرح دیوان غائب (الناظر یک بھنسی ۱۳۵۵ء) میں یہ شعر اسی طرح مرقوم ہے لیکن نظم نے اس کے  
بدنام نہیں بتایا۔ میں نے جہاں غالب (معاصر ۲ جنوری ۱۳۵۵ء) میں لکھا تھا :

”اس دعوے کے ثبوت میں کہ باقر و وجدان صحیح“ کہ کھٹے فٹے و مقدمہ نگار و خلف باقر نے شاہ ظہور الحق مرحوم کی زبانی  
فرمایاں لیا ہے۔ کسی نے باقر کے سامنے یہ شعر پڑھا ہے

محبت و عطف تو نام پر ہے گی غالب

پاس ہی مینا نہ ہے بی کے چلے آئے ہیں

ن بڑی حیرت ہوئی۔ اسی دن خط لکھ کر حقیقت دریافت کی۔ غالب کا جواب جو بقول مقدمہ نگار شاہ ... مرحوم کو انظم بہ لفظ  
خائب ہے : ”اگر یہ شعر میرا ہو تو مجھ پر ایک ہزار لعنت اور نہ جہنم نے اس کو انظم میری جانب منسوب کیا ہے اس پر دس  
... نہت“ مجھ پر کیا شامت آئی تھی کہ پاس ہی سے خانہ ہونے ہوئے مجلس و عطف میں جا بیٹھا۔ مشکا۔ عبارت حاشیہ : ”یہ  
... اصل یوں ہے : مجلس و عطف ... قائم ... آئے ہیں“ اور کچھ لوگ اسے قائم کی تصنیف سمجھتے ہیں مگر  
... قائم“ لازماً بطور خاص آبا ہے اور نہ یہ شعر و دیوان قائم داؤد با آفس میں ہے۔ حکایت صحیح ہونے کا میں ضامن نہیں، اصل  
جناب عطف نے لگا دیریل میں اس شعر کا مصرعہ اولیٰ اسی طرح لکھا ہے جس طرح کہ حاشیہ مصرع میں ہے اور جناب  
نرسول خاں مقدمہ نگار و دیوان نوشا و کے اس قول کی تردید کرتے ہوئے کہ تیر کا طبع عزاو ہے کسی ثبوت کے بغیر قائم کو اس کا

شرقی کہتے ہیں کہ کلیات زندہ ۵۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے لیکن سوسائٹی کا نسخہ زیادہ ضمیمہ نہیں۔

مصنف قرار دیا ہے۔ انھوں نے لگاتار کتب میں اس سے دوبارہ بحث کی ہے اور میری غریب کا ذکر کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک اس کا کوئی دوسرا دعوے دار پیدا نہ ہو قائم کا ہے۔ مسئلہ۔

مقدمہ دیوان باقر میں صریح ۲ کی خوشگلی ہے اس میں ایک سے زیادہ نظم ہیں اور کلیات مرقومہ صبح ہو با غلط غائب کو اس شعر سے کچھ ملانہ نہیں۔ مقدمہ دیوان نوشاد میری نظر سے نہیں گزرا۔ ظاہر اس میں مصرع ۱۱، اسی طرح ہے جس طرح کہ شاعر معاصر میں ہے اور میر کی طرف شعر کے انتساب کی کوئی سند اس میں نہیں۔ کلیات میر اس سے خالی ہے اور جہان تک میر علم ہے مقدمہ نگار دیوان نوشاد میر سے منسوب کرنے میں منفرد ہیں۔ رہا قائم کا معاملہ تو یہ جیسا کہ حاشیہ معاصر میں لکھا گیا تھا دیوان قائم میں نہیں اوشبلی سے قبل کسی نے اسے ان کے نام سے نہیں لکھا۔ شعر کی اس شکل کے بھی جو حاشیہ معاصر میں ہے وہی ذمہ دار ہیں و شعر الجم ۲ ط ۱۹۱۷ء (۱۹۱۷ء) شعر کی اصلی شکل وہی ہے جو شعر دیوانی فاساب میں ہے اور مجھے اس کا علم نہیں کہ وہ اصل کس کا ہے۔

(۵۹) روشن ہے اس طرح دل و برائی میں و ان ایک آجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک  
”میر“ ص ۱۱ و ۲۸۵ میں غیر مصرع شکل بن میر کے نام سے ہے اور مسرت مس ۵ و گلزار میں جرات اس کے مصنف  
تہلے گئے ہیں۔ کلیات میر، کلیات جرات م اس سے خالی ہیں۔ میر کا تو قطعاً نہیں کلیات جرات کے اور نسخوں میں بھی نہ ملے تو  
ان کا بھی نہیں یحسینی نے اسے ثابت، شاگرد دندوی سے منسوب کیا ہے۔

(۶۰) پھیلے مانگ ہیں دل جا کے اب ہیں ڈھونڈوں کدھر

کہ آدھی رات آدھر ہے اور آدھی رات آدھر

یہ شعر کم از کم ۲ شاعروں کی طرف منسوب ہے۔ یہ انقیاد شاید ہی اردو کے کسی دوسرے شعر کو حاصل ہو۔ جس  
نے اسے بدھ سنگھ قلندر کا طبعزاد بتایا ہے ص ۱۵۱۔ شوق کہتے ہیں کہ دیدار بخش دیدار کا نتیجہ فکر ہے۔ گلزار میں حمزہ علی رند  
کے نام سے ہے، قائم داس نے اور غالباً ذکا بھی اسے اصغر علی اصغر مارہروی کی تصنیف سمجھتے ہیں، یحسینی کے نزدیک  
پرسکندر کی ملک ہے۔ شیفتہ (مخطوطہ م) در باطن (نغمہ عند لب ۲۵۵) کی رائے میں عاود الملک نظام کے ذہن  
کی پیداوار ہے اور نکلت ص ۲۵۵ و اصفیہ ص ۲۵۵ کے مطابق منتظر کے رشحات قلم سے ہے۔

# داراشکوہ کا دیوان

پروفیسر محمد علم الدین سالک

مختصر ۱۰۰ داراشکوہ شاہ جہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ماں باپ دونوں اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کی وجہ سے اس کا عمل کی پہلی دو اولادیں لڑکیاں تھیں۔ شاہ جہاں کو رشک کی خواہش تھی۔ وہ اس غرض کے لیے اکثر خواجہ معین الدین شمس آبادی کے آستانہ مبارک پر حاضر ہوا کرتا تھا۔ آخر اس کی دُعا قبول ہوئی اور داراشکوہ ۲۹ صفر المظفر ۱۰۲۲ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۱۱ء کو اکبر کے مقام پر پیدا ہوا اور سترہ عرصہ ۱۰۲۰ھ کو مقام دہلی قتل کیا گیا۔ ایک شاعر نے اس واقعہ کی عجیب و غریب تاریخ لکھی ہے۔

صل باکے ادب گرفت و گفت قتل داراشکوہ شد تاریخ  
۲ ۱۰۶۶ + ۲ = ۱۰۶۸

داراشکوہ کی تعلیم و تربیت مام مثل شہزادوں کی طرح بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ اس زمانے کے مشہور اساتذہ اور علماء اس کی تعلیم و تربیت پر مقرر ہوئے۔ ان میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری، حامیرک اور شیخ بروہی کا ذکر داراشکوہ کے اساتذہ کی فہرست میں ملتا ہے۔

حاصل اس زمانے میں ایک شاندار وصفت سمجھا جاتا تھا۔ داراشکوہ تعلیق کا مشہور عالم استاد قدا عبدالرشید دہلی میں پیدا ہوا۔ اس نے اس فن میں غیب جہارت حاصل کی۔ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں داراشکوہ کی کئی کاپیاں اور وصلیاں آج بھی ملتی ہیں جن سے اس کے کمال فن کا پتہ چلتا ہے۔

فنون سپہ گری کے بغیر شہزادوں کی تعلیم مکمل نہ سمجھی جاتی تھی۔ داراشکوہ اس میں بھی کمال حاصل کیا۔ ساموگڑ کا مسرکہ داراشکوہ کا سپاہیانہ جہارت کا آئینہ دار ہے۔

بہر حال داراشکوہ اپنے دادا جہانگیر اور اپنے باپ شاہ جہاں کی سرپرستی میں رہ کر گونا گوں کمالات حاصل کیے۔ اور اسے شاہ بلند اقبال کا خطاب ملا۔ طبیعت میں تعقوت کا مذاق موجود تھا۔ اس پر تلاش حق کا جزو و مانع نہیں سما گیا۔ اس لیے اس کی تعریف میں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو اسلام کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہیں۔ گو بعض ابواب تعقوت نے انہیں مختلف حصے پہنا کر میں اسلام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ داراشکوہ کی آزاد روی۔ تلاش حق کا سورا اور دیانت و عبادت سے گناہ کشی

کی وجہ سے اس قسم کی باتوں پر بیدار ہو جانا لازمی تھا۔

دارالحرب جو ان بڑے توابعین کا قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ ۱۰۴۹ھ میں عرب و عجم کی ایکس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنی پسین تھنیت و بے رحمی کے سامنے پیش کی۔ یہ نیکو لادیا یعنی۔ جو میں جس نے چار سو گیارہ بزرگان دین کے حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب میں ۱۵۰۰ سے آپ کو اتنی درناواری کہتا ہے۔ یہ کتاب ۲۰ رمضان ۱۰۴۹ھ کو مکمل ہوئی جس کے متواتر امور بعد وہ شاہ جہاں کے مریدوں میں شامل ہوا۔

اس کے تین برس بعد ۱۰۵۰ھ میں اس نے اپنی دوسری کتاب سیکنتہ لادیا رکھی جس میں دارا نے بڑے بڑے مڑے سے نہ کوہستان میں آئے ان کے حالات بیان کیے ہیں وہ اکثر انہیں حالت باری نکالتا کہتا ہے اور حیات اعارفین میں اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے۔

یوں ایرانیوں کو دیا ہے کہ قبضہ اس عورت کریں اور زندان ایشیاں آبادی کشانی می کفتم" دارا کو۔ فنا سے دایا نہ حقیقت تھی۔ وہ اکثر مہو فیا سے مہم و دست اور فنا کے مسائل پر خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ یہ خط و کتابت جسے دل چاہے اس سے دارا کو اور یا نہ شان ظاہر ہوئی ہے۔ فنا کے مسئلے پر وہ سربراہ کو عفو ہے

پیر و زندان بر و نہ قصد ملازمت دارا و۔ میسر نمی شود۔ اگر من نعم ادا  
من محفل چرا؟ و اگر من نیستم چه تعمیر مرا؟ نقل امام حسین اگر چه مشیت ایمان  
ہیں یزید در میان چہیت؟ و اگر غیر مشیت است پس معنی "یفعل اللہ ابائنا  
و یکنم ما یرید" ہے؟ یہی مختصر ہے جگہ کفار می رفت شکست و اسلام  
می آنا و۔ علم کے ظاہر ہی گینہ تعلیم مہر است۔ لہذا یہ تعلیم چہ و عمار؟

سروے اس کا جواب ایک نہایت پیش نظر دیا۔

اسے عزیز ہے

ما آئند خواندہ ایم فراموش کردہ ایم !  
واقہ حدیث و دست کہ "تکوار" می کفتم

غرض دارا نے اپنے اشعار میں بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شاعر تھا اور تادیقی تخلص کرتا تھا۔ بہر حال شہزادہ کی طرح شعر و سخن کا دل دادہ اور شاعر کا قدروان و دربی تھا۔ اچھے شعری واد دل کھول کر دیتا اور شاعر کو انعام سے مالا مال کرتا تھا۔ دینی شہیدی نے ایک وفد ایک فزلی کی۔ اس پر شعر واد کو بہت پسند آیا ہے

"ناک را سر سبز کن اسے اب نیرساں و رہبر

قطرہ نامے تواند شد سپر گویہر شود!

دارا نے اس پر اسے ایک لکھ دیا اور خود اس شعر کے جواب میں یوں کہا ہے

سلفست سہن است خود را آشنائے فقر کن

کلوہ تا دریا قرار شد چرا گوہر شود!

یہ موضوع نہیں کہ وادیا کی تمام تصانیف پر مفصل بحث کی جائے۔ سروسٹ ہم اس کے دیوان کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وادیا کو دیوان نہایت مختصر ہے اور بہت گویا۔ اس وقت تک اس کے بہت کچھ نئے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو نسخہ ہیں اور وہ نئے خوب بظاہر محسن ہیں۔ ایک وضع نگار کے فاضل مددگار نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وادیا کا مکمل دیوان ان کے سامنے موجود ہے اور وہ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر تقریباً چونتالیس صدی گزر چکی ہے۔ مگر دیوان ابھی تک نہ ہو۔ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیوان وادیا کا نہیں کسی اور کا ہے۔ مگر نقوش کلمات اشعار میں اور علامہ نصیر آبادی لپٹے ہوئے کلام ان کا نسخہ دیکھتے ہیں کہ وادیا صاحب کا دیوان تھا۔ اس کی تائید بعض نقلی ہدایت دیباغہ العابدین میں کرتا ہے۔ خود دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہے کہ یہ دیوان وادیا کا ہے چنانچہ اس کا ایک قطع ہے۔

چوں ہمارے خویش دل بہ سپرد

قادر ہی نیز میں وادیا شد

اس کے علاوہ دیوان میں بہت سے ایسے نام بھی خواہ ملتے ہیں۔ اور ایسی تاریخی شخصیتوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ جو وادیا کے متعلق نہیں اور جن پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

دیوان قادر ہی اپنے دور کی فارسی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ زبان صاف، شستہ اور سادہ ہے۔ خیالات صوفیانہ اور انہیں وادیا بڑی آسانی سے بیان کرتا ہے۔ انداز میں سرمئی پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالات اس کے دگ و سپنہ جود، مابیت لہجے میں۔ یہی اس کی زندگی ہے اور یہی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ انہیں بڑی بے تکلفی کے ساتھ نظم و نثر میں ادا کرتا ہے۔ یہ خیالات زیادہ تر عشق و محبت کے نہایت اہم ترین مسائل پر اوست اور غزل کے متعلق ہیں۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر وعدۃ الوجود یا وعدۃ الہیہ کے متعلق کہتا ہے۔

پہر سو کہ نغمہ کنی ہمہ اوست

وہم اللہ حیان ست بہر ودا

پھر اس معنون کو یوں ادا کرتا ہے۔

گفت اما الحق و داد خود فوسلے

وہر گفت و کشید و خود را خود

در پس پردہ گفتار می کرد

پہرہ برداشت وید خود را خود

وہ اس معنون کو بار بار بیان کرتا ہے۔ تقریباً نہیں جانتا۔ وہ ہر بار ایک نیا انداز اختیار کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو

خوشتن دایمہ منی دافم

یک خود را خدا فی دامن  
نظره مانعے کہ بالہر است  
بیشتر ذہن روانی دامن

نہ کے متعلق اس کی یہ غزل دیکھئے کہ سرسری سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

گنج محنتی ست این نمود ما	ہم جوہر در وجود ما
شد ز نغمے عابریں سرود ما	گریہ در پردہ داشتیم آواز
میز نہ نمود در شہر ما	مانہ دیہیم بیچ غیبر خود
ہست باقی ہمہ وجود ما	دیم فانی شود نہ مانسی
از پسے خویش شد سمود ما	سراییم کہ مشد بہا شب ما
اے خوشا ہم چنین نمود ما	خوشیوں را اگر نہ نبستیم
فرق در تادری و تادریست	

میں اخلاق مشد قیود ما

ایک اور غزل میں وہ ہمہ راست اور فنا کے مقامات پر کبریت کرتا ہوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت میں کہتا ہے۔

کہ ہوں بود نور محمد سود	بک جوہر ہست لامع سود
چوں کہ بر حسن گنج محنتی بود	کہ خواہش پریدن ز غیش
از ہی خواست جہل شد بر جود	پس زہو عاشقی ہویدا شد
نام آن گل محمد فرمود	حسن خود بر سبیل غفلت دید
ایک و ز نام احمد و محمود	از غم ہزار گل پر شکفت
شد کلید در غمہ اند بود	گفت محزون خویش و دایں نام
شد خدا و رسول گفت و شنود	بعد ازاں غیرتش فدائی خواست
گشت قرآن خویش را بہ ستود	خاص جہاد و ست حرفہ نگید
شد رحیم و کریم و دود	چوں نظر کرد و در مناسبت خویش
چوں حباب از میاں دریا زدود	آسمان و زمین بشد پسیدا
از ہماں موج و نقش رقص نمود	گفت ز آواز خویش آن دریا
نام خود کرد و شہد و مشہود	گرمی و شور عشق چوں افتاد
ایں کہ جہالت م عشق کشود	آخر از عشق جہل پیداشد
عبد و نام گشتہ شد مجبور	نظر جہر چو شد

قادر سی جملہ از تو پیدا شد

آہنچہ بود است ہست خوابہ بود

قادی تلک نغری سے غلوں ہیئت نااں رہی ہے۔ دارمکے مذہبی اعتقادات پر بھی اکثر سے دسے جوتی رہی ہے اور اس  
مذاہبہ سب سے آگے ہوتا تھا۔ دارا اس کا زعم خود وہ تھا۔ اس واسطے وہ قلا کے متعلق اپنے دلی ہذات کا اظہار یوں کرتا ہے۔

ہشت آہنچہ کہ ملائے نہاں شد

جہاں خالی شد واذ شور و تلا

در آں شہرے کہ قلا خانہ دارد

در آہنچہ میخ دانائے نہاں شد

میں سے قادر سی تو دے قلا

مرد آہنچہ کہ شیدا ئے نہاں شد

پیری مریدی اور ہیئت کے جواز و عدم جواز پر ہمیشہ بحثیں چلتی آ رہی ہیں۔ دارا نے اس کے جواب میں ایک غزل کہی  
جس نے جلد شعر یہ ہیں۔

طعن کو دی تو براداد من

من چو نہ مرید کس نشوم

من مریدم بحضرت میراں

کے ارادت کنی تو باہر سے

من بطن تو کے شور و دل گیر

از ارادت مرا مرشت خمیر

ہست شام پیش من بے پیر

غذا و ترا چوں کنسی شہریر

مردم شہر یا چہلے پیراند

قادر سی ماذ فاش از تقدیر

دیوان میں اس زمانے کے مشہور و دعائی بزرگوں کی منقبت بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ دارا کا پیر طریقت کہی لاہور اور  
کنیر میں رہتا تھا۔ اس لیے پنجاب۔ لاہور اور کشمیر اس کی ارادت کے خاص مرکز تھے۔ وہ پنجاب کی تعریف میں یوں طب لسان  
کے ہیں۔

بازہوں جان و دلم پیا بہت

عشق پنجابم نود و بے مستدار

کعبہ من حضرت لاہور و اں

بازہوں چشماں من بخواب بہت

ذاں کہ نقش دوست پنجاب بہت

سجدہ من سوئے آن طرب بہت

قادر سی را کعبہ دارا پور شد

کا ذراں بسیار فتح الباب بہت

دارا لاہور کا ایک مشہور محدث تھا جہاں حضرت میان میز قیام پذیر تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آج کل آپ کا مزار اور  
داناویگم کی قبر واقع ہے۔ دارا نے یہ عمل اپنے دادا پیر کے نام سے کیا تھا۔ ایک اور غزل میں وہ حضرت میان میز کی منقبت



گونا گونا گوتا ہے ۔

دل شدہ فاسخ اندہ بہندہ بیر  
خی شود آنچه بہست در تقدیر  
خسرو اندر دلم نمی آید  
حرفہ ڈا دور کرد ہاں میسر

دارالحکومہ کی عقیدت کا دوسرا مرکز علامہ شاہ عرف شاہ بندشی ہے۔ جب تک حضرت میاں میر تقی میر جیات رہے وہ شاہ گریہاں کشمیر میں اور سر دیان لاہور میں بسر کیا کرتے تھے۔ مگر جب حضرت ہاں میر ۱۰۴۰ھ میں فوت ہو گئے تو انہوں نے متعلق طور پر لاہور میں رہنا شروع کر دیا۔ جہاں آدابِ حکم نے ان کے لیے ایک نہایت خوب صورت خانقاہ سری گریہاں تیار کر لی جہاں وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ یہ خانقاہ کوہ ماراں کے واس میں واقع تھی۔ اب بھی اس کے کنذرات دفن پائے جاتے ہیں اسی مناسبت سے آدابِ شعرا کی منقبت میں اکثر پڑھا کرتا تھا۔

کوہ ماراں بکھر نعل پرخشاں داد  
ایں چنین بہت کجاخت سلیمان داد  
شاہ کی منقبت میں بھی آداب کے دیران میں کئی طریقیں مئی ہیں۔ ایک غزل ہے ۔  
مرا عیشہ ملک بہریت  
کہ آں ملک مرا بد نہایت  
وہ پر دہشہ و دشمن دارم  
مرا چوں شاہ داد و دہمایت  
تو کروی بخشش شانہ سے نہا  
نہ کہ داد اولیا دیگر طرایت  
تو کروی ستادری راخانہ آباد  
سماعت بر سرش داد و خدا بیت  
ایک اور غزل ہے آپ کی منقبت کرتے ہوئے آداب کہتا ہے ۔

ذات اوہست بیچ الی اللہ  
اہل توحید و اماں باشند  
صورت ہامح حقیقت شاریح  
شرح ذور انجباں باشند

ایک نہایت عمدہ غزل حضرت پیران پیر شیخ عبد اللہ درویشی نے رحمت اللہ علیہ کی مدح میں بھی ہے۔ جس کے لفظ لفظ سے عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ بیان نہایت سادہ و انماز نہایت دلنشین ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

حضرت میراں خداوند جہاں  
خوش جن انس و شاہ سادیاں  
محمدی دین شیخ عبد اللہ دست  
آں کہ اور اعیش باشند آستان  
سید سادات غفر اولیا  
شیریں شہبازہ اوج لامکاں  
دہنائے شاہراہ احمدی  
دھگر جہدہ در ماندگان !  
ہر کجا پاسے نہادوی بر زمین  
خضر کرے آسمان زمین آستان

خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سلسلہ نقشبندیہ کے بانی ہیں دارا کو ان سے بھی عقیدت تھی۔ دہران میں دو غزلیں ان کی مدح میں

نہی موجود ہیں۔ ایک لاطینی ہے۔

تغلب دنیا و دین بہاد الدین

نقشبند یقین بہاد الدین

شاہ جہانی دور کی ایک مشہور شخصیت حضرت ایشانؒ بھی تھی۔ ان کا نام محمد اور عرفت خواجہ خاوند محمد تھا۔ کشمیر میں سلسلہ نقشبندیہ کو انہیں کی وجہ سے مزورج ہوا۔ بعض سیاسی حالات کی بنا پر انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا انتقال قیام لاہور میں رکھیں چنانچہ انہوں نے لاہور کے سب سے امیر اور دولت مند محلہ میں پورہ میں اقامت اختیار کی اور یہیں اپنی مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث اور مفتی تھے۔ ۵۷۰ھ میں فوت ہو کر یہیں دفن ہوئے۔ دامائے آپ کا مرثیہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارائے تعففات آپ سے نہایت خلفا تھے۔ مرثیہ کے چند شعر یہ ہیں۔

چوں باشد آسمان با چشم تو	چوں سفر و مودستیخ بحر و بر
شیخ ہفت تعلیم یافتہ مرام	پیشوائے اولیاء معتبر
آن محمد گزینی آمد بدون	اہل شرق و غرب را گردیدہ سر
روز و شب می گردیدہ گرد و حرم	کاں چناب گردش نیا آید از بشر
اولیاء و مرگ می باشد حسرام	لایق تو است چوں اندر خبر
دو ہزار و پچاس دو و چوں رفت او	دو سہ شنبہ و پنج از صفر

قادر سی گریاں بماند از ہجر او

گرد از دایرے جاسے چوں سفر

دیوان سے دارا کے مذہبی اعتقادات خاص کر توحید رسالت، ختم نبوت، حب اہل بیت اور خلفائے راشدین سے عقیدت

لاہنا چہا ت توحید کے بارے میں اس کا خیال ہے۔

ترک نہ تار کردہ ام ذال رو	تار وحدت بود در زمانہ
قادر نیست یک جز قادر	وعدہ نا اللہ الا ہو!
موجود مشر بطیر حسدا	دشت ہست سجود زمانہ

رسالت کے بارے میں اس کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

چند بازی تو بر نہایت خود احمد مرسل از خداست سوا

ختم نبوت کے متعلق کہتا ہے۔

چوں خاتم النبیین پایادنا را صحبت

تو ہم نشین من شد دیگر جاہ قائم

خلفائے راشدین کے بارے میں کہتا ہے۔

نیست بیچارہ یحییٰ کار و دست

نیمت چیز سے ہم چاہیاد درست  
بہر بخت منی تہیں باید  
پایہ چاہ استرا : درست

پہنچتے

ذاتِ ادہت و نغ اہل اللہ  
اہلِ توحید را امان باشد

دادا کو جس لاٹریو سے ماں باپ نے پالا۔ جس طرح اسے عزیز رکھا۔ اور۔ ہر بات میں اس کی نافرمانی کی۔ اس سے اسے  
یہ وجہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے تمام بھائیوں سے ممتاز ہے۔ چنانچہ دیوان میں اس کے متعلق جا بجا اشارے کئے جاتے ہیں۔ ان اشاروں سے  
پورا پورا حوصلہ اٹھانے کے لیے یہ دلی ہے کہ ہم یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ بھائی اپنی بگڑی ہوئی فہم سے کہتا تھا کہ اس کا جانشین دادا ہو گا۔ اس  
نے اسے شاہ جہاں آباد بھی لکھا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ ایک لڑکا ہی اور دیگر لڑکے اس کی امانت بھی دے دی۔ اس واسطے دادا  
اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے

قرینا ہم جو فتوری باید قادر سی صاحبِ قرآن گشت

ہر چند کہ نیست سیارِ اذاتِ خدا یک نمود سایہ شہ غیر نما

وہ چوں کہ گوئید مرا سایہ حق تو ہم کہ اذیں و دمی آید حق را

بعض اشعار سے دادا کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ متبذو لڑکوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس واسطے کہتا ہے

دستِ ذر آلود پر دمی شود  
جانِ ذر آلود را احوالِ چمیت

دادا کے خیال میں بنیادی سچائیوں پر مذہب ہیں موجود ہیں۔ اس لیے وہ ہر مذہب کے لوگوں سے راہِ درسم رکھتا تھا۔ اور  
ان سے میل ملاپ کر لیتا تھا۔ دوسرے مغلوں میں وہ دنیا پر ہی ہرگز نہ تھا کہ اس کا ملک صلح کی ہے اور اسے کسی مذہب اور کسی فرقے سے  
مداوت نہیں۔ اس کی وہ فلسفہ ہر ادب سے ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

قادر سی ویرتا ترا در کل  
صلح کل کرد از عا و گذشت

مادہ مادہ داری پر بہت زور دیتا ہے۔ اور متعین کرتا ہے کہ روحانی اور مادی دنیا میں کامیابی کا راز یہی ہے کہ اپنے اسرار کو  
چھپاؤ اور اگر کوئی راز دار بنانا چاہتے ہو تو اپنے دل کے سوا کسی کو راز دار نہ بناؤ

ماہِ غورِ البیروں تو گویا  
 دادِ داری بیروں نہ بود  
 بعض بعض اشعارِ شریعت کے نقطہٴ نظر سے لکھتے ہیں جن پر فقہاء غور و گہری بھی کرتے رہے ہیں اور جو آخر میں اس کی  
 تائید کا باعث بنے مثلاً

کفر و دین و درویشی پر ہاں وعدہٴ لاشعہ یکدہاں

قادرِ گشت قادرِ مطلق از پئے ہر فاکمال تقاست

قادرِ زود بین قادرِ مشہد ہوں مدد کرو قادرِ بنوہد

ہم حمد توئی جسم اللہ ایں عنایت تراست ....

قادرِ اذ قدرت کامل قادرِ ذوالجلال ساز وے

یہ دلائل کے دیوان کا ایک نہایت سرسری جائزہ ہے ان میں سے کہ دیوان کا کوئی اچھا شعر میسر نہ آنے کی وجہ سے بعض اشعار نہ پڑھے جاسکے۔ بہر حال جو کچھ مل سکا اس سے دارا کی افتادِ طبیعت، اس کے ماحول اور اس کے اعتقادات کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس سے دارا کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اور وہ اسباب بھی سامنے آ جاتے ہیں جن کی بنا پر اسے ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر دیوان کے ساتھ ساتھ دارا کی دیگر تصانیف کو بھی سامنے رکھا جائے تو دارا اور اس کے دور کی بڑی دلچسپ تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ایسی تاریخ جس کے آئینے میں اس دور کے مسکافوں کی غریبوں اور کمزوریوں کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور ان عوامل کا سراغ بھی مل سکتا ہے جو مفسرین کی عظیم الشان سہولت کے آٹا خانہٴ فعال کا باعث بنے۔

# غالب کی مقبولیت کے اسباب

شیخ محمد اکرام

کلام غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ مرزا کی شاعری زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے لیکن دقیق اور پیچیدہ خیالات کے طالب کے۔ یہ یہاں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے وہ نمونے ہیں جو دیوانِ معنی میں بھی مشکل سے ملیں گے شاعر نے لوگوں کے بے سوچے و نظر آفت ہے اور انسانی فطرت کی داستانیں سننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ہیں کہ جوں جوں چشمِ بصیرت کھلو جائے گی ان کا لطیف بڑھنا جلنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطیف اٹھاتا ہے۔

اس سبب سے بے شمار نغمے ہیں اور ہر نغمہ دل آویز ہے۔ اس دل آویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلام غالب معنی سنانی بالوں کا بیان نہیں بلکہ قلبِ غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس باب پر دستِ قدرت نے سارے شرا ایک ایک کر کے بھائے ہیں اور دیوانِ غالب انہی شروں کی صدا ہے بازگشت ہے۔

زخمِ بر تارِ رنگِ مہمان می زخم  
کس چہ داند تا چہ دستاں می زخم

سرورِ نر رائے نے ٹیکسپیئر کے متعلق لکھا ہے: ”وہ کیا بات تیریں چیزیں تھیں ایک پورا انسان: ٹیکسپیئر کے متعلق تو یہ بات اس کی کتابوں کے مطالعے پر ہی چمکی جن گونا گوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا اگر ان کا مقابلہ ٹیکسپیئر کے حالات سے کریں تو مرزا کا پلہ ٹیکسپیئر سے ہلکا نہیں رہے گا۔ مرزا کی زندگی میں ان کے ایک مخالف نے ان کے متعلق طعنے لکھا تھا: ”آپ انتخابِ زمیں میں ایک درخت ہیں جس طرف طبیعت آتی اس کی خاک اڑاتی۔ چنانچہ غمزدہ سے جتنا کہ لگاتی تو وہ طرف پید کیا کہ مینا کے گردوں میں شرابِ شبنم کا نمی آتا بادِ بھیش کش لایا اور غارِ بازی پر چڑھیاں کیا تو وہ چھٹے جاری ہوئے کہ میر بے باط اور بکھرے داؤں کی کھانے لگے۔“ (گلستانِ بختراں)

لیکن یہ تصویر کا فقط ایک پہلو ہے۔ مرزا اگر سے خائے اور غارِ خائے کی پوری طرح خاک چھان چکے تھے تو شروع اور نصف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ دہلی کے دو بڑے عالمِ فضل حتی حیدر آبادی اور مولانا صدر الدین ان کے عزیز دوست تھے اور جس نفاست سے صرفیانہ راز و نیاز کی باتیں ان کے اشعار میں اداسی ہیں اُردو کے بہت تھوڑے شعرا کے کلام میں ملیں گی۔ دو رنگِ بیوں میں بلی کر جہان ہوتے تھے لیکن زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے رنگِ کش کے سارے تیران پر چلا دیے اور اگر وہ بزمِ شاد اور مہلِ شہر میں اجنبی معلوم نہ ہوتے تھے تو درمندوں کے مصائب بھی خوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میخوار ہو یا مقسب شہر کی اور نظافت کا دلدادہ

انہوں نے فلسفی بریا عاشق مرزاؒ کی اس سبک کے لیے کلامِ غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔

مرزا کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نئے طرز کے آدمی تھے اور ان کے خیالات کا جیسا سلوب تھا آج نانا اس کی تائید کر رہا ہے۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مرزاؒ تقلید کے قائل نہ تھے اپنی بھرپور زیادہ بھر دہر کرتے تھے۔ ان کی جدت پسندی نئے غماہیں اور نئی تکیہیں تلاش کرنے تک محدود نہ تھی بلکہ لغت، شعر، انشا اور دوسری علمی و ادبی باتوں کے علاوہ وضع قطع اور لباس میں بھی وہ اپنے پیشرو اور مساعدا کی پیروی کرتا ضروری نہ سمجھتا اور ان پر آزادانہ لکھ چھٹی کرتے تھے جب تک کہ ان کے اشعار پر یہ اعتراض جہاں انھوں نے عمل لے لے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا تو انھوں نے بڑے جوش سے کہا تھا کہ

مژدہ بردار کس چرا باشم      من مجاہد مگس چرا باشم

یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت عمر بھر ان کی امتیازی خصوصیت رہی اور قوی خیالات کے موجودہ عبوری دور میں بھی بنی طرح جاری رہا۔ اس وقت ہے۔ اسی طرح مرزاؒ نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تبصرے لکھے وہ عام طور پر اگرچہ بلند پایہ نہیں لیکن ان میں ادب و فنی طرز کی تعریفیں یہ بات مشترک ہے کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں رہائے سے پاک ہیں۔ اس کے علاوہ زبان اور محاورے پر مضمون اور خیال کو مدغم رکھنے کی جو خصوصیت کلامِ غالب میں موجود ہے مغربی شاعری کے اصولی تنقید بھی اس کے حامی ہیں۔ مرزاؒ نے اردو محکمے کی سی میں جو رنگ اختیار کیا وہ فارسی فنِ انشا کی نسبت انگریزی خطوط و فہمی سے زیادہ قریب تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے مرزاؒ کے کلام اور اپنے خیالات میں دوسرے شرقی شعراء کی نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پاتا ہے۔

دورِ حاضر میں غالب کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ عام خیال کہ غالب کے معاصرین نے اس کی بالکل قدر نہ کی و انتہات کے غلط اندازہ پر مبنی ہے۔ اگر غالب کی شاعری اور شہنشاہی کی تاریخی تبدیلیوں اور ترقیوں کو ذہن میں رکھیں تو خیال آتا ہے کہ اگر غالب کے اردو کلام کو فوری مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تو اس کا بڑا سبب کلامِ غالب کے اصلاح طلب ہونے تھے۔ ایک بہت نام مرزاؒ انگ تبدیل پر فریفتہ رہے۔ پھر چند روز کے لیے شہیدؒ نو اردو و چھوڑ کر فارسی شاعری شروع کی اور ایک ایسے گلستان کی آبیاری کی جس میں عوام الناس کو بار نہ تھا۔ فارسی شہنشاہی میں غالب نے ان اعانہ کی پیروی کی جن کی پریشانی اور بالکل شہنشاہی کی مصدوعی شہریت کا جواب تھی۔ اگر معاصرین غالب نے ان چیزوں کو سر اٹھوں پر نہ رکھا اور انھیں قبول عام کی سند نہ ہی تو ہمیں حیران نہ ہرنا چاہئے کیونکہ انھیں تو اب بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں اور اگر تمام حالات کو غور سے دیکھیں تو یہ چلتا ہے کہ بعض اہم ادیبوں نے غالب کی نہیں بلکہ معاصرین غالب کی تائید کر رہا ہے۔

عوام الناس مرزا کا یہ صرح

شہرتِ شعر گیتی بعدی خواہد شدن

پڑھنے میں اور سر دھننے میں کہ مرزا کا وہی کلام کج الہامی سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق ان کے معاصرین کہتے تھے کہ

مگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھو تو کیسے سمجھو      مرزا کہنے کا جب ہے اک کہنے اور دوسرا کہے  
کلامِ میرؒ سمجھو اور کلامِ میرزا سمجھو      مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں

# آتش کی صوفیانہ شاعری

احسان حسین

انگریزی، ہندی اور فارسی کی طرح اردو ادب میں بھی صوفیانہ شاعری کی ایک اہم روایت ملتی ہے۔ دکنی، عمود تجری، سراج اوانکب آبادی، خواجہ میر درد، میر تقی میر، غالب، آتش، آشی غازی پوری اور اقبال اس سلسلہ کی مضبوط کڑیاں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک صوفیانہ اور روحانی تجربہ کے مختلف مادرج سے تعلق رکھتا ہے۔

تصوف نہ جہات کائنات کے سمجھنے کی سعی کو شش ہے یا نہیں، اسی بحث سے قطعاً تصوفت سے زندگی اور ادب میں ایسے دھاناست اور ایسی گرائیاں مزور پیدا ہوئیں جنہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ ادب کے ایک مخصوص دور میں تصوف شاعری میں اس طرح بس بس گیا کہ حقیقی اور مصنوعی جدا ہوا۔ اور حال و حال میں تیز کرنا مشکل ہوئی۔ وہ شعرا جو عملاً صوفی تھے ان کا تو پوچھنا ہی کیا، جن کو تصوف سے کوئی خاص تعلق نہ تھا وہ بھی شیع علی حسی کے اس مقدمہ پر عمل کرتے نظر آتے ہیں کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ چنانچہ اردو شعرا میں بھی دونوں طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ وہ واقعی اس وادی کے رہبر اور اس دنیا کے ستارہ ہیں اور وہ جو مسائل تصوفت کو دوسرے مضامین کی طرح ایک مغرب کی طرح دیکھتے ہیں۔ دونوں جہتوں میں محض وہ فرق نہیں ہے جسے اظہار بیان کے ناکاذ اختلاف سے واضح کیا جاسکے۔ بلکہ اس سے تصوفت اور زندگی کے تعلق، روحانی داخل تجربے اور علمی انداز منظر کے اختلاف پر بھی روشنی پڑتی ہے اور حقیقی صوفیانہ شاعری، ایسی صوفیانہ خیالات سے املاک ہوتی ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش صوفی شعراء میں گئے جہات ہیں۔ اور ایسے صوفی شعراء میں جو محض قال کے شاعر نہ تھے بلکہ صاحب حال بھی تھے۔ وہ باقاعدہ صوفی نہ ہی لیکن ان کی زندگی اور شاعری پر غور کر کے انہیں بڑے صوفی شعراء میں شمار کرنا ہی پڑے گا۔ وہ دہلی کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جہاں تصوف اور پیری مریدی کا ذوق تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں گھر کی دہ بھار نہیں دیکھی وہ وطن سے دور چڑھتے ہوئے سراج کے شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ جہاں زندگی کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے انہیں آہائی مسلک کو خیر باد کہنا پڑا۔ بقول آزاد وہ انہوں نے شاعری اختیار کی اور خاندانی طریقہ کو سلام کر کے ان میں سے فقط آزادی اور بے پروائی کو رانقت میں لے لیا۔ آزاد کے یہ چند الفاظ آتش کی شخصیت اور مزاج اور ان کے تصوفت کی نوعیت پر بہت اچھے تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تصوفت کے اعلیٰ میاں کو پیش نظر رکھتے ہوئے آتش کو روحانی، سادگی، عطاء اور درد کی صفت میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ چہ جائے کہ ان صوفی شعراء کا ہم قدم قرار دینا جن کے اقوال اور ملفوظات سے تصوفت کی تاریخ مرتب ہوئی ہے لیکن پھر بھی ان کی زندگی اور شاعری دونوں

ہیں۔ تہذیب کی روح صوفی کی وحدتِ نظر اور صفائے قلب، قناعت پسندی اور استغناء کے وہ جہولے نغمے آتے ہیں کہ انہیں صوفی شعرا کی ہرگز میں جگہ دینا غلط نہ ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ باقاعدہ کسی صوفیانہ تحریک یا سلسلہ سے وابستہ نہ تھے۔ لیکن اپنی ذات سے جدا، صوفی تھے۔

اگرچہ شاعری میں ابتدائی سے صوفیانہ خیالات ملتے ہیں۔ یہ تو کہ صرف غامضی شاعری سے نہیں بلکہ اس زندگی سے ملتا تھا جو مذہب نے حدود کے اندر آزاد خیالی کا اور جاگیر دارانہ تمدن کی تقسیم کے اندر عوام کی بے سودی کا تصور رکھتی تھی۔ اس میں ہندی تصوف کی پیش بھی نظر آتی ہے۔ دنیا کی تاریخ تصوف دیکھی جائے تو بہت سے خیالات میں یک رنگی اور یکسانی پائی جائے گی۔ حالانکہ مرکب میں ان کے شعرا کی نوعیت مختلف ہوگی۔ اسی وجہ سے بعض شعرا کا خیال ہے کہ تصوف کا تعلق کسی مخصوص مذہب یا قوم سے نہیں بلکہ یہ زندگی پر مبنی ہے اور کائنات کی حقیقت کا نام معلوم کرنے کی اس فطری خواہش کا نتیجہ ہے۔ جس سے کوئی دل خالی نہیں۔ لیکن اس راہ کا معلوم کرنا ہر شخص کے اندر انسان میں بھی نہیں ہے۔ لہذا آتش ۔

یہ کیفیت اسے ملتی ہے جو جس کے مقدر میں

مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

ہر شخص قوم اور ملک کی باطنی کردہ مختلف ناک پر آمد کرتی ہے اور مختلف ملک بن جاتے ہیں۔ بعض علماء نے اسے باطن آریائی تصور روحانیت اور باطنیت قرار دیا ہے۔ بعض دوسرے مفکرین کا خیال ہے کہ اسلامی تصوف پر ذرا غلط فہمی فلسفہ اشراق کا گہرا اثر ہے اور ان حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دوسری صدی ہجری سے اسلام پر یونان اور اسکندریہ کے فلسفیوں کا واضح اثر پڑنے لگا تھا اس لیے تو مذہبی اشتراک کے اس دور میں اشراقیت نے مسلمانوں کے عقیدہ توحید کو متاثر کیا تو عجب کی بات نہیں۔ پھر مسلمان عربوں اور مفکروں میں بہت سے ایسے ہیں جو راستہ خاص اسلامی بناتے ہیں۔ یہ علمی بحثیں ہیں۔ اور ان کے پھیلنے کا یہ موقعہ نہیں تاہم اتنا کہنا ضروری ہے کہ اگر نقطہ نظر کا اختلاف نہ ہوتا۔ اگر مختلف اثرات کی کارفرمائی نہ ہوتی اور تلاش حقیقت کا خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان نہ ہوتا تو غرض و مویشوں کے اتنے مختلف خیال اور سلسلے نہ ہوتے۔ اس لیے ہندوستانی شاعر کے صوفیانہ خیالات میں اگر اسلامی اثرات کے علاوہ دیوانی اور اشراقیت ہمدرد کے عناصر میں جھانک اٹھنے میں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ مگر تب تصوف کی پیدائش میں عوامی تحریکوں کے اثرات کی جستجو بھی اس جگہ بے موقع ہوگی۔ لہذا آتش کا تصوف خود صوفیانہ تحریکوں کے ذوال پذیر وود سے تعلق رکھتا ہے۔ آتش کی صوفیانہ شاعری کے کچھ میں تصوف کے کسی مخصوص سلسلہ کو پیش نظر رکھنا بھی مفید نہ ہوگا۔ بلکہ تصوف کی اس عام روح کو دیکھنا ہوگا جو مختلف مکاتب میں مشترک ہے۔

آتش کے صوفیانہ خیالات کی نمونہ سب سے زیادہ توان کی آزادگی پسندی تعصیبِ تعب اور روحانی سرستی میں ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری ہمیں چھیڑتی ہے۔ لیکن تصوف کے وہ مقامات بھی ان کے یہاں آتے ہیں جن کا تعلق معرفتِ نفس، نائے خودی، وحدتِ وجود و ترک دنیا، حجازِ حقیقت، جبر و اختیار، ہستی انسان کی بے ثباتی اور غفلت، ترک رسوم اور شوقِ تحلی سے ہے۔ یہی وہ کسوٹیاں ہیں جن پر آتش کا تصوف اٹھنا جاسکتا ہے۔ اور انہیں اہم مسائل کی تشریح اور توضیح سے تصوف کے حدود و معین کیے جاسکتے ہیں۔ جہاں تک آتش کا تعلق ہے ان کا تصوف کسی یا شاعرانہ نہیں تھا۔ بلکہ ان کی روح اور شخصیت ان کے عقائد اور طرزِ معاشرت کا آئینہ تھا۔ ان کی قناعت پسند اور سادہ زندگی، چاہی کہ اور بے یابی، احساسِ فروتنی اور جذبہِ عظمت سے ان کے اشعار مالامال ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے ٹھکانے میں یہ مائے تصوف



نہیں ہیں۔ لیکن صوفی جس صفائے قلب اور تزکیہ باطن پر زور دیتا ہے اس کی افغانی مغربی مغربیتیں ہیں۔ آتش کی شاعرانہ نشوونما لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر لکھنؤ کی شاعری میں تصوف کی بہت کمی نظر آتی ہے۔ اس کے اسباب تھے جس سے بحث ہمارا مقصد نہیں۔ لیکن یہ حقیقت کہ آتش سے پہلے یہاں تصوف کا ذکر نہ صرف کم تھا بلکہ کسی بھی نہ تھا۔ انہوں نے اپنی آزاد روی، خلوص، ہمتی کردار اور دلدانہ باتیں سے تصوفات کے خالی شیئوں میں تند و تیز شراب بھر دی اور طاعت کی سب سے پناہ آزادی میں باطنی وارفتگی کے چراغ بجائے۔

تصوف کا رتبہ سے اہم مسکو معرفت خداوندی ہے۔ اور اس کے ہزاروں پہلو ہیں۔ مذہب اسلام نے بھی عقائد میں توحید کو اپنی جگہ دی ہے۔ لیکن صوفی کا وحدت وجود کا عقوہ توحید کے عام تصور سے بہت مختلف اور بہت پیچیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سادہ صوفیانہ خام معرفت ہی کے گرد گھومتے ہیں انسانی تاویلات اور شرانے نازک خیالیوں نے اور دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ سادہ الفاظ میں اسے کچھ یوں سمجھ سکتے ہیں، خدا ایک ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسے ایک کہنا بھی ٹھیک نہیں۔ خدا کے سوا کچھ اور نہیں ہے تو ہم کیا ہیں؟ کسی نے کہا ہم خدا ہیں۔ کسی نے کہا اس کا مغربی نام ہے اس کا ایک حصہ روح الہیہ کا پر تو، بھر حقیقت کا ایک قطرہ — یہی وجہ ہے کہ تصوف کے زیادہ تہ مکاتب و مذاہب انسانی کو خدا سے دوری اور ہجرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسی ذات میں مل جانے کو روحانیت کی معراج قرار دیتے ہیں۔ آتش کے یہاں یہ معنوی حقیقت اشراقی، اشراقیوں اور اسنادوں میں دانا نہ جوش کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

جواب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا      نہایت غم ہے اس فقرے کو دریا کی جدائی کا  
تعلق روح سے مجھ کو جس کا ناگوارا ہے      زمانے میں چمن ہے چارون کی آشنائی کا

اور اس قالبِ خاکی میں روح بہتی ہے      مکان سے تنگ ہے شوقِ لا مکان ہوتا

آدمی کو موت کے آنے کی لازم ہے غمش      عید ہے جس روز چھکارا ہوا مجھ پر جس کا  
ان تمام اشعار میں ایک ہی سانس بچ رہا ہے۔ خدا اصل ہے۔ اور انسان اس کا جزد۔ اس سے شے کے لیے بے قرار ہونا ہی حصولِ معرفت کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ دوسرے صوفی شعراء کی طرح آتش بھی بعض اوقات مذہب اور شریعت کی ظاہری قیدوں کو توڑ کر اس اصل حقیقت کی تلاش میں مجنوں بن جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ کوئی اور چیز اپنی طرف مائل ہی نہ کر سکے۔ اس منزل پر پہنچ کر ظاہری رسوم مذہب، کعبہ و بیت خانہ کے اختلافات بہت حقیر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اسے نہ بھونچا جائیے کہ یہ دیوانگی مذہبی دیوانگی سے مختلف ہے۔ یہاں سادہ مذہب کی سما کی ہے۔ اور وہاں اپنے مذہب کے سوا اور کسی کی نہیں۔ آتش کے خیال میں قید مذہب کی گرفتاری سے چھٹنا ایسی دیوانگی ہے جو سب سے بڑی عقل مندی ہے۔

قید مذہب کی گرفتاری سے چھٹ جاتا ہے

ہو نہ دیوانہ تو ہے عقل سے انسان خالی

کعبہ و دیوبند کے اختلاف کی حقیقت یوں بیان کی ہے۔

کعبہ و دیہ میں وہ خانہ بر انداز کہاں      گردشِ کافر و دینِ دادیے پھرتی ہے

قول اپنا ہے یہ سب زنا کے لیے      دو مہندے ہیں یہ کافر و بھزار کے لیے

کوچہ یا دیہ میں ہو دشمنی اپنے دم کی      کعبہ و دیہ کو یہ گرو مسلمان آباد  
کعبہ و دیہ کے باہر اس سرزمین کی تلاش جہاں خدا کی تلاش گرو مسلمان بن کر نہ کی جائے، صرف آزاد خیالی کی مغرب نہیں ہے  
خدا کی رحمت کی حدوں کے باہر نکل کر معرفت اور حقیقت کا پیغامِ معلوم کرنے کی آرزو ہے۔ کعبہ اور بت خانہ کی حد بندی نے نگاہوں کی وسعت  
بھانپ لی ہے۔ ایسے میں اس روحِ کائنات کی جستجو ہو کافر و دینِ داد کی جان ہے۔ شریعت کی حدوں میں رہ کر نہیں کی جاسکتی۔

تیرے کو پتہ کا ہے اے خانہ خراب افشاں آج

شیخ کعبہ چھوڑتا ہے برہمن بت خانہ آج

اس مگر تفصیلی بحث کا موقعہ نہیں۔ ورنہ یہ دیکھنا مشکل نہیں کہ آتش کے یہاں شریعت اور طریقت کی وہ جنگ نہیں ہے جو اکثر  
مردی شرانگہ بہاں مٹتی ہے۔ اور دونوں میں نہ دوستِ علیکِ حائل ہوتی مٹا کرتی ہے۔ آتش کے یہاں مذہبی جذبات اور خیالات بھی بڑی تعداد  
میں جلتے ہیں۔ بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مذہب سے زیادہ درد نہیں جانا چاہتے۔ ان کے یہاں تلکِ نوری باقی نہیں رہتی۔  
ناقوس میں سے آئی صدائے ہوا غنودہ      ہم تیکڑے گئے جو عدل سے ڈرے ہوئے

کوتے ہیں سجدہ اسکی طرف کیا سمجھ کے لوگ      کعبہ ہے نام ایک کنشہ خراب کا  
فرض یہ کہ آتش خدا کی جستجو اور عرفانِ حق کی تلاش میں چل پڑنا چاہتے ہیں۔ اور بعدِ حرسے اس کی آواز سنائی دے اس کی  
جھانک دکھائی پڑے اور چہی مڑ جائے ہیں۔

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی

سمجھ گیا جو کہیں برسے آشنا آئی

یہی مسابہ طریقت کے مقامات ہیں۔ سالک کو بڑی ہوشیاری سے قدم آگے بڑھانا چاہیئے۔ کیونکہ اس راہ میں بہکانے اور  
مٹانے والے بھی ملتے ہیں۔

طریقِ عشق کا سالک ہے، واعظوں کی درس

تعلیم کے کچھنے کا کیا اعتبار راہ میں ہے

اگر کوئی راہِ حبیب کی تو کسی طرف کا نہ ہو گا۔ آتش نے اس خیال کو کتنی خوبصورتی۔ کتنے جوش اور دلہانہ پن سے ادا کیا ہے۔

پادرا زادہ جو عرق ہوا بمسیرِ عشق میں

نہ داغ ہے جو دامنِ ساحل میں رہ گیا

اس طرح ساکب خاص طرح کی مٹی، وعبدان اور بے خودی کے سہاگے اپنی راہ طے کرتا ہے ۔

ساکب راہ محبت کو پس د پیش نہیں  
مصلحت میں نہیں میں وقت اندیش نہیں

اس کے سفر عرقان کی آخری منزل یہی ہے کہ قعر دریا میں لی جائے اور مدیا ہو جائے۔ چنانچہ آتش بھی اسی جہنم میں لگی کی ٹکلیں جھپٹتے ہیں۔ یلک صوفی معتقد کے لیے دیباؤں کی خاک اڑاتے بڑھتے جلتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ خدا مہجد اور بت خانے میں نہیں دل ہی میں ہے۔ لیکن جنبہ تک، یا صفت اور صندے نفس سے آنکھیں روشن نہ ہو جائیں، خودی کا ظلم ٹوٹ نہ جائے اس وقت تک وہ ملی نہیں سکتا۔ تلیخوں اور استعاروں میں یہ خیالات اس طرح ہی ہر مومنے میں سے

شریب نہاں ہوئی ہے نزا کے دہن میں      لیٹے پکارتی ہے محبوں کے پیر حن میں

واہ ری بے بھری واہ ری نابینا کی      صورت آباد سے مشاقی بقا جاتے ہیں

عارف ہے وہ جہنم کا عوایا جہاں میں ہے      باہر نہیں ہے یوسف اسی کا رواں میں ہے  
انہیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ ماتھے آئے گا گر مجاہد کی مزدورت ہے ۔  
تکلیں ہو پاؤں تو پل مر کے لی نہ تھیر آتشیں      گل مراد تو منزل میں خار واہ میں ہے

سمجھ ہے نہ پھر جو راہ میں تیری نکل چلے      نکل ہو گئے جو پاؤں تو ہم سر کے بی چلے

ہے اتحاد میرے ترے سوج آب کا      اسے کھر حن اپنا سمجھ آشنا مجھے

سنا چھپا اب تو نہ مشتاقوں سے لے خود شیدا      چرخ گرداں کی طرح برسوں ہی سرگرداں کیا

صدایہ صید گاہ عشق سے آتی سے برسوں سے      نشہ تیر کا ہو راہ کمر خراک سے پیدا  
عرقان کی ان دباؤں پر آتش ایک واقف کار ساکب کی طرح بے فکری سے چلتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے علاقہ دنیا سے اپنا دامن پاک دکھا ہے۔ آہ و شہوار میں غائب آتش کے یہاں فقر و استغنا کا جذبہ سب سے زیادہ لے گا۔ قناعت اور توکل کی دولت سے کردہ اور تمام چیزوں کو ٹھکرا دینا چاہتے ہیں۔ سینکڑوں اشعار میں سے چند شعر دیکھئے۔ وہ آتش کی ترجمانی خود کریں گے ۔  
منزل فقر و فنا جائے ادب ہے غافل      بادشہ تخت سے یاں پہلے اتر لیتا ہے

کچھ عزت میں قناعت کی جگہ خشک پہ      نصیب دنیا کی جو کچھ تھیں جیتا ہو گئیں

جو قناعت کے سرنے سے آتش ہو جلدے گا      بھیک لگا کا سر اسے دست دے دیا ہو جائے گا

تکلف نہ رہتی ہے غافل رہ کر ہمیشہ      قناعت بھی جبار ہے عزتوں پر

بھوڑ کی ہم نے امیری کی فقیری اختیار      برائی سے پرہیز ہے قناعتیں کو مشکور مار کر

طلب دنیا کو کر کے ذہن مری ہو نہیں سکتی      خیال آبرو نے بہت مروانہ آتا ہے

اس قسم کے لغتوں کے انبار میں شاید ہی آندہ کوئی شاعر آتش کے قریب پہنچ سکے۔ کیونکہ یہ بعض شاعری نہیں ان کی زندگی  
 تھی۔ مولیٰ لباس میں گھبیا سے مکان کے اندر بھوڑ کی آگنی کے سہارے اپنی چٹائی پر بیٹھے زندگی گزار دی۔ وہ حقیقت دنیا کی ان لذتوں کو  
 ٹھکرائیٹ کی طاقت رکھتے تھے جو ان کی شخصیت کو موجود کرتی تھیں۔ ترک دنیا کا یہ جذبہ محض خانقاہ میں بیٹھ کر جہد حیات سے نپکنے کے  
 بدلے میں تھا۔ بلکہ اس میں ان کے مزاج کے استغناء کا عکس ہے اور اگر استغناء میں بھی غرور پیدا ہو جائے تو آتش کی نگاہ اس کا پردہ بھی  
 برباد کر دیتے پر آگاہ نظر آتی ہے۔ مذاپ بھروسہ تھا تو یہ توکل تھا۔

قسمت میں جو رکھا ہے سر آئے گا آپ سے

پھیلائیے نہ اتم نہ دامن پسائیے

اور جب فیروں کے گرد عزت پر نظر جاتی تھی تو کہتے تھے۔

دعوت کو نہی شے پر ہے ان عزت کو یزید کو

حیر کہنہ دیکھا دست خشک و پائے شل پایا

جبر و اختیار بھی صوفیاء خیالات میں اہم جگہ رکھتے ہیں۔ صوفی عام طور سے تسلیم و رضا کا بندہ ہوتا ہے۔ اور سب کچھ خدا

کی مرض سے سمجھتا ہے۔ آتش کے یہاں بھی صوفیاء نہ روایت نظر آتی ہے۔

پہرے بول پھیرتا ہے وہ پردہ نشیں جدمر

پتلی کی طرح سے نہیں میں اختیار ہیں

اختیار کی حرکت جان نہ مجسودوں کی

یہ جاتی ہے جدمر ہم کو قضا جاتے ہیں

وہ بھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجاز کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ۔  
خدا یاد آگیا مجھ کو بتوں کی بے نیازی سے  
ملاہم حقیقت ذہینہ عشق عبادی سے

آتش میں بھی فرو تھی خاکساری اور عاجزی ہے لیکن جہاں انسانی غفلت کے انہار کا مرقعہ آتا ہے۔ وہاں وہ بھی اس عالم  
اصغر میں عالم اکبر دیکھتے ہیں ۔

سمجھ آتش نہ کوئی آدم خاکی کو حقیقت  
نہیں اسرار سے یہ خاک کا پتلا خالی

بہر حال آتش اور دھوئی شعرا میں ایک اہم جگہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے تصوف سے جو خانہ رنگ لیا۔ اس میں سپاہیانہ اور  
مردانہ جذبات کی آمیزش کر کے ذمرف لکھنؤ کے شاعرانہ رنگ میں گرمی اور چمکاپن پیدا کیا بلکہ خود آدو شاعری کو نئے امکانات اور  
میلانات سے آتش کر کے اس کا دامن وسیع اور گراں بار کر دیا۔ ان کی شاعری اسی تصوف کے اثر سے زیادہ تر آزادی اور عظمت انسانی کے  
صحت مند خیالات سے بھری ہوئی ہے۔ جسے وہ اپنے دور کے شاعرانہ رنگ میں غیر معمولی قوت اور جوش اور دانی اور غلوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں  
عموماً یہ خیالات تاریخی عبوریوں کی وجہ سے ابھلائی انداز رکھتے ہیں۔ لیکن جدید حیات کی تمنائیں اور انسان کو حقیقت سے ہم آغوش اور ہم آہنگ  
بنا دینے کی خواہش آتش کو ان روایت پسند بیمار اور اسلوب پرست شاعروں سے بہت بلند کرتی ہے۔ جن کے پاس کھوکھلے الفاظ کے سوا  
اور کچھ نہیں ہوتا ۱

# مزنے دار شاعر

نور محمد حسن عسکری

جراثیم پر مضمون لکھنے میں اس انداز سے بیٹھا ہوں کہ جیسے امتحان کا پرچہ کرنا ہو۔ بلکہ اپنا امتحان بیٹھنے کے لیے ہی میں نے بہترین مضمون چھانا ہے۔ میں نقاد نہ تھا، مگر ایسے مضمون تو لکھنا ہی رہتا ہوں جن میں مختلف قسم کے کھنے والوں پر اپنی راؤں یا اپنے تعصبات کا اظہار کرتا ہوں۔ چنانچہ مجھے لکھنا یہ ہے کہ میں تنقید نگار کس حد تک نکل آسکا اور کتنے لکھا ہے کہ ہر قسم کا اسلوب تو میں تسلیم داسے کہ ہندو آتا ہے۔ یہ غمزہ من کا کہ اس کے لیے تو بڑی حد تک درست ہے اور تنقید نگار کے لیے بھی ایک حد تک درست ہے۔ لیکن پھر بھی ہم تنقید نگار سے یہ توقع کیا کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مزاج کے اندر کھٹ کے نہ رہ جائے۔ بلکہ اپنی کائنات میں ایسی چیزوں کے لیے بھی جگہ نکالے۔ جو اس کے مزاج سے موافقت نہیں رکھتیں۔ موافق اور ناموافق کی کئی کئی قسمیں فن کار کے لیے بھی مفید ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ٹیکسٹ بک ڈائنٹس اور جرنلس، قیر جیسے فن کاروں میں خلعت اور افاقیت اسی کھینچنا تالی کے ذریعہ آتی ہے۔ لیکن جو فن کار اپنے مزاج کے اندر بند ہو کر بیٹھ جاتے اور ناموافق چیزوں سے کراہیت اور حسد کے سوا اور کچھ محسوس نہ کرے۔ اسے بھی ہم کسی نہ کسی حد تک اور تنقیدی ہنس بدحواس کے لیے قبول کر لیتے ہیں۔ جیسے شبلی اور غالب۔ اس کے برخلاف اگر نقاد اپنے مزاج کو ابھی خاصی کال کٹر کر بیٹھا ہے اور جو چیز اس کے اندر نہ سما سکے، اسے کائنات ہی سے خارج کرنا چاہیے۔ اس کے اندر ایک شوق پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کو اس کی ہر نکتہ لگتی ہے۔ یہ حال ایمرسن اور آئن کے ساتھیوں کا ہے یا آج کل ٹی بی ٹی وی کا۔ اگر محمد میں نقاد بننے کی صلاحیت ہی ہو تو میں کم سے کم ایسا نقاد نہیں بننا چاہتا جو لوگوں کو پیام زندگی دیتا پھرے۔ لیکن مزاج کی مانند کردہ ہاندیوں کے علاوہ بعض مجبوریوں اپنی خوش فہمیوں سے بھی پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے دونوں سے کوئی افسانہ تو نہیں لکھا۔ لیکن کہتا ہوں کہ مجھے انسان نہ لکھنا ہے۔ اس اعتبار سے میں اپنا حق سمجھتا ہوں کہ میرے تجربات کا ایک مرکز اور دوسری کادشوں کا ایک مرکز ہو۔ چنانچہ میں پڑھتا بھی ایسی چیزیں ہوں جن سے مجھے بہت چل سکنے کا شوق ہوتا ہے۔ جراثیم ایک مرکز پر لکھے لائے جاسکتے ہیں۔ مجھے نہ تو خم جاننا دل سے پسند ہیں، نہ خم دوراں دل سے۔ نہ ایسے لوگ جو باری باری سے دونوں کا مزہ لیتے ہوں۔ میں تو ایسے لوگوں کو لکھنا چاہتا ہوں جن کے یہاں خم جاٹل اور خم دوراں دونوں مل کر اپنا خم بن جائیں۔ اپنے خم سے میرا مطلب یہ نہیں کہ آدمی ہمیشہ کے اپنی عمر دیکھوں کہ وہ کیا کرے۔ چاہے وہ عروسی نہ کرنا، یا بکنا، یا والی ماہی کی طرح بیزار ہو ہی کیوں نہ ہو۔ اس اپنے خم سے مراد وہ تخلیقی درد ہے جو انسانی ہستی اور انسانی زندگی کی تخلیق کا ذریعہ بننا ہے اور جس میں کائنات کا خم و نشان بن جائے اس وقت آدمی گرائی موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ڈائنٹے۔ چائمر۔ ٹیکسٹیر۔ اور دیگر جو کس کسے یہاں یہ اپنا خم کس طرح شروع ہوتا ہے۔ اس کا بیان میر

نے بڑی اچھی طرح کر دیا ہے۔  
 دل نہیں مجھ کو طایہ نوئی جی کا ہے۔  
 خود بخود جھٹا ہے کتنا آرزو کیا ہے۔  
 یاد میں میری ہوا پر کچھ سبب تو ہے بجا  
 نے کسو کے گیسر واکل کا دل بستہ ہوں میں  
 کیا کروں ایڈلٹے بے موجب عرض تجھ سے بیان  
 لکھتی ہر تو کہوں اسے تیریں کچھ ہنس کا حال  
 چاہتا ہے سیم وزہ یا کوئی دل پر غرض جمال  
 عشق بازی انگلی، آرزو کی، رنج و ملال  
 نے کسی کے چاند سے گھرے کچھ کہتے وہاں  
 نے ہم درود دعا کی ہے : اندوہ وصال  
 میسم عاشق بظاہر لیک

عمر گزشتہ دینی دہم چہ می خواہد را کی ملک حرم تحقیق کا ذریعہ تو بن جاتا ہے مگر انسانی  
 آرد و شاعری کی تاریخ میں بعض لوگ ایسے ہیں جن کے ہاں یہ علم پیدا ہو کر اپنی نفسیات کی ہیں۔ مگر ان کی کامرانی یا عروسی ضمن  
 زندگی یا کائنات کی تفتیش تک نہیں پہنچ جاتا۔ مثلاً سوشل سیرسٹ سے لوگ ایسے ہیں جو کہ درد کا ذکر تو کرتے۔ اس لیے ان کے ہاں وقتاً  
 ایک واقعے تک محدود ہو کے رہ جاتی ہے۔ اور انہیں اپنی پوری شخصیت پر بھی غور کرنے کی توجہ نہیں دینی سے ہم آواز ہوتا ہے۔ میری  
 فرقہ عشق کا نظم تو نظر آتا ہے۔ مگر اپنا علم پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً جرات۔ اسی لیے میں نے اپنا امتحان لینے کے لیے جرات کو چیلے ان کا ایک  
 طبیعت کو جرات سے کتنی مناسبت ہے، یہ اسی سے ظاہر ہے کہ مضمون لکھنے کے لیے میں نے ان کا وہاں تین دفعہ پڑھا۔ مگر۔  
 بھی شعر یاد نہیں ہو سکا۔

CON ہوتا

روایت نے یہاں میری کے تعلقات پر ایک عنوان لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ان دونوں میں ایک فریق تو TAINER ہے۔  
 ہے۔ دوسرا CONTAINED ہے۔ فریق کی شخصیت اتنی پیچیدہ، متنوع اور پہلو دار ہوتی ہے کہ دوسرا اس کے اندر سما جاتا ہے۔ مگر کہنا تو  
 پہلے فریق کے اندر بہت سے خانے خالی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے آسودگی دونوں کو نہیں ملتی۔ آسودگی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ  
 پہلا فریق سکڑے، یا دوسرا فریق پھیلے۔ چنانچہ مکمل ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے میں میری میں ایک کش مکش سی شروعات ہو جاتی ہے۔ میرے خیام  
 میں بالکل یہی نقشہ ایک شاعر اور ایک قاری کے تعلقات کا ہے۔ نیز ایسے شاعروں پر غور کرنے کا تو سوال ہی نہیں جن کی شخصیت ایک عالم  
 قاری سے بھی محدود رہے۔ انہیں تو ہم ادب کی تاریخ میں شامل ہی نہیں کرتے۔ لیکن ایسے شاعر بہت سے ہیں جو ہماری شخصیت کے بعض پہلوؤں  
 کو پوری طرح مطمئن کرتے ہیں۔ اور ہم ان سے محوئی رہ کر کے بیٹے جی بھر کے لطف لے سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ہماری شخصیت کے بہت  
 سے تقاضوں کو تشہر چھوڑتے ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے جیون سماجی نہیں بن سکتے۔ مثلاً اکبر۔ اس کے برخلاف تیر جیسے شاعر کو پڑھتے ہوئے  
 ہم فوراً CONTAINED بن کے رہ جاتے ہیں۔ اور ہمیں نا آسودگی یہ دیتی ہے کہ شاعر کی طبیعت کے بہت سے عناصر کا جواب ہمارے  
 پاس موجود نہیں۔ مگر کہ پڑھنا تو ایک اچھی خامی جنگ ہے جو ہر بھر جاری رہتی ہے۔ اس کا احساس اس آردو کے ہر شاعر کو رہا ہے، اور  
 آردو نے میر کا صرمت ایک CONTAINER پیدا کیا ہے۔ — فراق — میں یہ دعوے نہیں کر رہا ہوں کہ فراق صاحب تیر  
 سے بڑے شاعر ہیں۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ فراق کے بعض مضامین تیر سے بھی پڑے نہیں ہوتے۔ یہ تشنگی ایک طرف نہیں۔ ان کی  
 زندگی میں بھی لوگوں کو تیر سے جتنی عقیدت تھی اس کے باوجود وہ اپنے پڑھنے والوں سے مطمئن نہیں ہو سکے۔

کس کس ادا سے دیکھتے ہیں کچھ مرنے سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیا رہیں  
تاب کس کو جو حال میرے سے حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

ان شعروں میں اس زمانے کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات پر جتنی بھی تنقید شامل بھی جائے اس کے باوجود یہ حقیقت  
فرار دہتی ہے کہ یہ ایک ایسی شخصیت کی ناسودگی ہے جسے اپنے ہیئت مندوں میں بھی تسکین کے سارے پہلوئیں ملتے جگر بات  
غیر ضروری وضاحت سے بھی کہی ہے۔

تری چال پڑھی، تری ہاست روکھی  
تجھے ہر سمجھا ہے یاں کم گھوٹنے

غیر کہ یہاں جو شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی وجہ صرف یہ نہیں کہ ان کی شخصیت اردوں سے زیادہ پیچیدہ اور پیچیدہ دہتی بلکہ  
وہ اپنی شخصیت پر مسلسل مذاق نہ عمل کے ذریعے متنازع عناصر کو گھٹا کر ایک نئی چیز پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اندر جس قسم کا عذابیاتی عمل جاری تھا  
اس کا ایک اشارہ اس شعر میں ملتا ہے۔

نہیں میر متنازع صحبت کا باب  
مصاب کو کوئی ہشیاں سا

متنازع اور ہشیاری کے ان متضاد تقاضوں کو سہلانا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے اپنی سہولت کے لیے کام پڑھنے  
والوں نے یہ مشہور کر دیا کہ میر کی شاعری وہ نہیں کہ ہے لیکن جن شاعروں نے واقعی میر سے آگے کی کوشش کی وہ میر پر بڑے پکارا لکھتے  
سولنے قرآن کے۔ [دوسرے شاعر تو یہی افسوس کیا کیلے کہ نہ ہذا پند ہذا تیر کا انداز نصیب۔ لیکن قرآن صاحب احترام کے ساتھ ساتھ  
اپنے اختلاف کا بھی اعلان کر گئے ہیں۔]

جو ہوتا دیکھ میر و میرزا تو بات ہی کیا تھی۔]

فرمن یہ کہ میر کو پڑھنا میر کا جملہ اصول یہ ہے۔ اس کے مضامین عام آدمی کو جرأت کے معاملے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی یہاں  
نہ کہی CONTAINER بنتا ہے نہ کوئی CONTAINED۔ جرأت جیسے شاعر اور عام پڑھنے والے کا معاملہ بالکل اللہ تعالیٰ جوڑی کا سا  
ہے۔ پچھلے پچھلے پیدا ہوتی ہے۔ نہ تو شاعر کو پڑھنے والے کی گرفت میں آنے کے لیے سکڑنا پڑتا ہے، نہ پڑھنے والے کو شاعر کے ساتھ  
ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے پھینکا ضروری ہے۔ جرأت عام آدمی کے سارے جذباتی تقاضے پر رے کرتا ہے۔ ادنیٰ کو اپنے ذاتی جرأت  
نما کے مل جاسکتے ہیں۔ شاعری کی۔ میں نے یہ جانا کر گویا یہ بھی میر سے دل میں ہے۔ والی تعریف اگر کہیں صادق آتی ہے تو جرأت کی شاعری پر  
یہ بات تیر کے متعلق نہیں کی جاسکتی۔ تیر کی شاعری جذبات کو بقول قرآن صاحب کچھ اور بنا دینے والی شاعری جذبات کے بیان کی شاعری  
ہے۔ تیر کی شاعری مذاق نہ ہے۔ جرأت کی شاعری بیانیہ۔

بجائے شاعری سے میں نکل کر ادلی ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے میں میر اور جرأت کا موازنہ کروں گا۔ تیر کی شاعری  
محض ان کی شخصیت کا انہار نہیں ہے۔ اول تو ان کی شخصیت کے اندر ہی مختلف عناصر میں تضاد اور تقاضا ہے۔ پھر جو فن کار اس تضاد کو سمیٹ  
کر اس کی قلبی ماہیت کو ناجاہتا ہے۔ وہ شخصیت سے الگ اور اوپر بھی رہ سکتا ہے۔ جرأت کی شاعری ان کی زندگی کا کھس ہے۔ میر اپنے



آپ سے ملنے نہیں دیتے، ان کے لیے خالی تجربہ کافی نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کچھ اور نہ بن جائے۔

پڑھے پڑھتے سے اپنی نہیں محبت میں

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

بیر نفی میں اثبات ڈھونڈتے ہیں، ان کے یہاں شکست تو مل جائے گی۔ مگر شکست خوردگی نہیں، ان کی اندرونی ایک نئی تلاش کا ہما نہ ملتی ہے۔ جرات نہ تو ناکامی سے کام لیتے ہیں نہ کامیابی سے۔ بلکہ دونوں چیزیں ان کے کام آجاتی ہیں۔ دونوں چیزیں انہیں دلچسپ سے دلچسپ کرتی ہیں۔ اس لیے دونوں بھگتے خود اور کسی نئی تشکیل کے بغیر بھی ان کے لیے کام آتا ہے۔ یہ چیز ان کے لیے تجربات بھی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ اسی لیے جرات شاعر سے زیادہ واقعہ نگار ہیں۔ شاعری نہیں کرتے بلکہ اپنی سوانح عمری لکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کی فن کاری جڑی آسانی سے ایک ہو جاتی ہیں۔ یا پڑھ لکھنے کے لیے فن کا ایک ماہر شیوہ ان کی طرح ہے جو واقعات انہیں پیش آئے ہیں۔ چاہے وہ خارجی ہوں یا داخلی، جرات ان کی تفتیش کرنے یا ان کا رشتہ دوسری قسم کے واقعات سے حد سے باہر ان کی سرحدوں کو توڑ کر آگے بڑھنے یا انہیں بچھا کر نئے ساکھوں میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ تو نہیں کہا سکتا کہ وہ انشائی کی طرح محض خارج ہیں۔ اور ان میں واقعیت نہیں۔ جتنے واقعات انہوں نے اپنی شاعری میں بیان کیے ہیں۔ ان میں پچاس فی صدی تو مزودہ داخل نوعیت کے ہیں۔ مگر وہ ہر قسم کی وارداتِ غلب سے بچتے ہیں۔ اس کا معاملہ نہیں کرتے۔ ان کے لیے ہر واقعہ اور ہر مزبانی کیفیت بھانسنے خود مکمل ہوتی ہے وہ اسے کسی دوسرے واقعے سے ملنے یا ٹکرائے نہیں دیتے۔ اسی لیے ان کے اندر کسی قسم کی کشمکش یا تعداد یا ٹکراؤ نہیں۔ خوش ہیں تو خوش، رنجیدہ ہیں رنجیدہ، ان کی خوشی آتش کا سا نشاط نہیں بیٹھتی باقی۔ ان کا رنج میر کا سا درد نہیں بنتا۔ بلکہ رنجیدگی سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ جیسا مزاج ملے گا پیدا ہوئے تھے یا جیسا مزاج ان کا بن گیا وہ اسی میں خوش ہے۔ اور اسی کے اندر وہ کے انہوں نے شاعری کی، اگر کسی شاعر کا ظاہر و باطن، ذہنی اور فنی ایک سا دار ہے تو جرات کا۔ اگر کسی کی شاعری میں ممکن غلوں، زوہی غلوں میں نہیں ملے گا تو جرات کے یہاں۔ سکتے ہیں کہ وہ خوش باش، خوش طبع، غریب، لطیف باز اور عاشق مزاج قسم کے آدمی تھے۔ اپنی دل نہیں تھتے، بلکہ دل واسے۔ بلکہ دل پہنچیک۔ یہ میں نے اقراض یا بھنے کے طور پر نہیں کہا۔ میں صرف ان کی شاعری کی صحیح تعریف معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اور میرا احساس یہ ہے کہ جرات کی شاعری ان کی خوش باشی ہی کا ایک حصہ تھی۔ میر سے اندازہ جو شاعر ہے وہ ان کی شخصیت کو کبھی قبول کرتا ہے۔ کبھی رد کرتا ہے کبھی دونوں باتیں ایک ساتھ کرتا ہے۔ ہر حال وہ ان کی شخصیت سے باہر نکل جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ جرات کے اندازہ شاعر ہے۔ وہ ان کی شخصیت کے اندازہ دہتے ہوئے فوراً بھی بے ہمہی محسوس نہیں کرتا وہ تو صرف اس شخصیت کا ترجمان ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ مجھے جرات سے کوئی مر ہے اور میں ان کی شاعری کو محض خوش باشی کہہ کر مان چاہتا ہوں۔ اگر مان ہوتا تو پورا معذور نہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی، ایک فقرے میں ہی کام چل جاتا۔ جرات کی زندگی میں شاعری کا کیا مقام تھا۔ یہ انہیں کی زبان سے سننے میر تو شاعری کے بارگاہ سے گہرا گریخ پڑے تھے۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے

ود و دل اتنے کیے جج تو دیوان ہوا

بقول قرآن صاحب، میر نے شعر نہیں کہا۔ تعریف کرنے والوں کے منہ پر ہوتا مارا ہے۔ اس کے برخلاف جرات کے لیے

یہی سماجی مقبولیت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

جرات جواب تیر تو ایسا ہی کہہ کے بس  
چاروں طرف سے شور مچنے والہ واہ کا

[اس "جواب تیر" کی ستم خیزی کا بھی جواب نہیں] شعر کہہ کر وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ میں مجلس کمالات کی پٹ ہوں اور غنی شعر  
مجھے قدرت حاصل ہے۔ اسی لیے انہیں تیرا معنی، سودا جیسے انسانوں کی زمین میں شعر کہنے کا خاص شوق ہے۔ اس سے اُن کا بہتر تو فرود  
ظاہر ہو جاتا ہے، مگر وہ گھاتے ہیں اس لیے کہ جتنے ہیں کہ دو مزاحوں کا مقابلہ اور تضاد پیدا کرتے ہیں اُن کے شعر کا ہلکا پن ابھر آتا ہے  
معنی کی غزل کا یہ مشہور شعر ہے :-

صبح پر یار کا ہے وعدہ وصل ایک شب اور بھی جیتے ہی بنے

اس کا جواب جرات یوں دیتے ہیں :-

اُس کے آنے تک لے دل بچا جس طرح ہو سکے جیتے ہی بنے

مگر مجلس کا تقاضا ہے کہ استادوں کے رنگ میں یا تم سے کم اُن کی زمین میں کہا جائے! جرات اپنی ہر غیری جو غزل میں یہ بات  
یاد دلا رہے ہیں کہ اُن کے گرد دوسرے آدمی نہیں بلکہ شعر شننے والے یار دوست جمع ہیں۔ اور انہیں اپنا مجرم بلکنا ہے۔ جتنے دوسرے  
اور برے غزلے جرات نے کہے ہیں، شاید ہی کسی شاعر نے کہے ہوں۔ اور وہ ہر دفعہ جتا دیتے ہیں کہ ابھی کیا دیکھا ہے، آگے دیکھنا۔

ایک ہی پڑھ کر غزل جرات ہوا تو کیوں غموش  
شرا بھی تو اور بھی ہیں تھو سے پڑھو انے کئی

ہے شگفتہ یہ غزل جرات غزل ہو اور بھی  
دیکھیں مضمون اس سے بہتر اور تو کیا لائے

کہہ جرات ایک اور غزل وہ کہ سب کہیں  
کھنکھن سے اُس کے دفتر اشعار گرم ہے

جرات غزل اک اور طاقت کہ کہیں سب  
کب ایسی گرہ اور غزل خواں نے لگائی

جرات نے اپنی شاعرانہ ذہنیت کی باطل میں تعریف کر دی ہے، وہ شاعری نہیں کرتے غزل لاتے ہیں۔ دراصل جرات  
اُن لوگوں میں سے نہیں جو اپنی شخصیت اپنے آپ بناتے ہیں اور جانتے، دہتے ہیں۔ جنہیں یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم جو نئی شکل اختیار کر رہے

اُس کے متعلق دوسروں کا اور خود ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ جرأت تو ایک فخر گھڑایا کر دیتی ہے، اُنہیں بھی معلوم ہے اور دوسروں کو بھی کہ اُن سے کن کن باتوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اُنہیں پُرما علم ہے کہ میں دلچسپ آدمی ہوں اور لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ اور وہ کسی بے ایمانی کے بغیر بڑے خلوص کے ساتھ چاہتے ہیں کہ لوگ مجھے اور بھی پسند کریں۔ انہوں نے دنیا بھر کے نمائشے دیکھے ہیں، میں جگہ آگاہ لائی ہے دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر اُن کا دل خوش کرنے کے لیے اُنہیں سینکڑوں قصے یاد ہیں۔ یہ قصے اُنہوں نے مغرب میں نہیں بلکہ شعروں کی شکل میں سنائے ہیں۔ اُن کی شاعری کی بنیادی ترکیب یہی ہے کہ اپنے معاشقوں کے بارے میں دوستوں کے ساتھ میٹھ کر لپ کی جائے تاکہ مجلس میں گرمی آئے اور لوگوں کے دل میں اُن کی قدر ترسے۔ اس مقصد میں وہ کامیاب ہونے میں اور لوگ ایک قصہ سن کر دوسرا قصہ سننا چاہتے ہیں۔

حسب حال اشعار کیلئے اپنے اب جرأت کچھ اور

یہ غزل تو تھی کئی یاروں کی کہوائی ہوئی

یہاں یہ تنبیہ پھر مزودی ہے کہ دلچسپ آدمی بننے اور لوگوں میں مقبول ہونے کی خواہش کوئی بڑی بات نہیں ہے بلکہ اُن میں ایسے مزاج ایسے آدمی اور ایسی شاعری کی بھی ضرورت ہے۔ میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ ایسی شاعری یاروں کی محفل کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ یہ خود کو کسی نہیں جگہ گفتگو ہے۔ جس کے لیے دلچسپ ہونا لازمی ہے۔ یہ شاعری پورے معنوں میں تخلیقی عمل یا داخلی تجربات کی تنظیم یا ماہیتِ قلب نہیں، بلکہ اُن واقعات کا بیان ہے جو شاعر کو پیش آئے۔ یہ مزودی نہیں کہ سارے واقعات طرب ناک ہی ہوں۔ یہ دلچسپ آدمی جسے چسیوں قصے یاد ہیں۔ چونکہ خلوص اور صفا گوئی سے کام لے رہا ہے۔ اس لیے غریبوں کی داستان بھی سنائے گا۔

سنایا اُس کو یہ قصہ کہ اُس نے نکل آئے

لیکن ذہنیتِ جبر کی فتنہ گوئی کی ہی۔ اسی لیے جرأت کو مسلسل غزل بہت عزیز ہے۔ مسلسل غزل لکھنے کے معاملے میں بھی جرأت غالباً سب شاعروں سے آگے ہیں۔ چونکہ یہ قصے یاروں کو سنائے جا رہے ہیں۔ اسی لیے اُن کی غزل میں ایسی روانی اور سلاست آئی ہے اور اسی لیے پڑھنے والے کو بڑی آسانی سے فزیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے اُن کا عشق اُن کی شعر گوئی کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ انہیں سننے کے لیے اسے قصے بل کئے۔ پھر شعر گوئی کی قدرت کے سبب ان کا عشق بھی دلچسپ بن گیا۔ لیکن چونکہ اُن کے عشق کا ایک صرف یہ بھی ہے کہ دوسروں کی تعریفِ بلیغ کا ذریعہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے عشق کو عام طور پر معاشقہ کی سطح سے اُٹھانے نہیں اُٹھنے دیتے۔ ممکن تھا کہ وہ تیر کے ذریعہ اپنے عشق کے معاملے کی طرف بھی دماغ ہو جاتے۔ مگر یاروں کے زیر اثر انہوں نے اپنی بھجوتوں کو واقعات ہی بننے دیا۔ اگر ہم جرأت کے ساتھ ذرا کھینچ کر دیکھیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ یاروں میں مقبول ہونے کے لیے شعر کہتے تھے اور شعر کہنے کے لیے عشق کرتے تھے۔ ہر حال اُن کی شاعری میں یہ احساس غالب ہے کہ شعر اور عشق دونوں مجلسی اوقات کا ایک حصہ ہیں اور خوش وقتی کا ایک وسیلہ۔

چنانچہ اُن کا فن اصل میں ناول نگاریا انسانہ نرین کا فن ہے، اشعار کا نہیں۔ یہاں زندگی کے سارے تجربات کو ایک سلسلہ سمٹی میں لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں واقعات فرداً فرداً دلچسپ ہیں اور سلسلہ وار ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ یہاں تفصیلات ہی اہم

ہیں نہرنا خارجی تفسیلات۔ اس قسم کا مشق مسلسل طول میں بڑی اچھی طرح دھلتا ہے۔ جرأت کی بہت سی مسلسل غزلیں منظوم افسانے ہیں جن پر غزل کی حقیقت سے نہیں بلکہ مختصر افسانے کی حیثیت سے غور ہونا چاہیئے۔ مثلاً وہ غزل جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

نہ گرمی رکے اُس سے کوئی ندایا

شرارت سے بھی جس کے میرا جلا یا

چمکے کہانی عشق کی نہیں بلکہ گرمی کی ہے، اس لیے شاعر کو اپنی پوری پیتا ساری تفسیلات سمیت یاد ہے۔ اور ان تفسیلات میں ایک نطنی سلسلہ قائم ہے۔ اس کہانی کی ایک ابتدا، ایک انتہا، ایک درمیانی حصہ الگ الگ موجود ہے۔ یہاں وہ بیرونی بات نہیں کہ ابتدا اور انتہا۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائے اسی طرح جرأت کا وہ مشہور مستزاد

جادو ہے نگہ جب بنے غضب قرہے گھڑا اور نقد ہے قیامت

ایک مکمل افسانہ ہے بلکہ اگر ہم چاہیں تو جرأت کے کلام سے اُن کی پوری سوانح عمری مرتب کر سکتے ہیں۔ ہم یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ اُن کے محبوب پر وہ نشیں بھی تھے اور بے پردہ بھی۔ معاشرۂ کس طرح شروع ہوا، محبوب کی شکل و صورت کیسی تھی وہ اپنے عاشق کے عاشق کس طرح پیتے آیا، اقربا کا رویہ کیا رہا۔ رقیبوں نے کیا دراندازیوں کیں، عاشق کو کس قسم کی کامیابی یا ناکامی حاصل ہوئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض عجیب واقعات بیان کر کے شاعری کرنا چاہتے ہیں۔

یا تو اُس کے گھر سے آتے تھے نہ اپنے گھر کو ہم یا اب اپنے گھر میں بیٹھے دیکھتے ہیں درد کو ہم

تماشا ہے کہ جن دردوں میں اُس کے قربا خوش تھے تو ناحق پھر گلیا تھا ہم سے دل اُس آفتِ جاں کا

اس لطیف واقعات بیان کرنے والی شاعری میں جرأت کے ذاتی مزاج کے علاوہ ایک اور بات کو بھی دخل ہے۔ معاملہ بندی اُس سماں میں چلتی ہے جہاں مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے باطل الگ رہتے ہوں۔ ایسے حالات میں لوگوں کو گندی باتیں سننے کا شوق بڑھ جاتا ہے اور جن میں سے ایک جسٹس دیکھ لینا یا آنکھل نظر آ جانا بھی گندی بات بن جاتا ہے۔ یہاں دوسری تفصیل بھی بذاتِ خود دلفریب دینے لگتی ہے اور لوگ ذرا کھی کھی نہیں دیتے ہیں۔ اسی لیے ہر آپ کے بیان میں اُس قسم کی دل چسپی پیدا ہوتی ہے جو اکثر کھنڈی شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ یعنی مرایا کا مطلب جسم کی تفصیلات گننانے کا ہو جاتا ہے۔ جرأت جیسے شاعروں کی بدولت اردو شاعری میں حقیقت نگاری کا جو اضافہ ہوا وہ قابلِ قدر ضرور ہے۔ لیکن دلچسپ واقعات یا مزے دار قصہ سنانے کے شوق میں جرأت اور معاملہ بندی والے شاعروں کو بعض دفعہ یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ قصہ تو ہو گیا مگر شر بھی ہو گیا نہیں۔

میں رو کر جو کہنے لگا دید و دل

وہ منہ پھیر کر مسکراتے لگا

جرأت کے یہاں کہنے ہی شر ایسے ملیں گے جو حقیقت نگاری کی وجہ سے چسپ پھسے بن کے رہ گئے ہیں۔ چونکہ ایسی شاعری میں یہ خطرہ ہر وقت رہتا ہے۔ اس لیے جرأت کو زبان و بیان پر اُس قدرت اور اُس مناجی کی ضرورت پڑتی ہے جو میر کے لیے

لازمی نہیں۔ اسی لیے میر نے ہزیت کی ہے کہ ہم کو سارے کھڑے میر کا ذریعہ اظہار ان کا اسلوب، ان کی زبان تجربے کی اندرونی کشش سے پیدا ہوئی ہے۔ جرأت اپنی کہانی کو دل چاہے اور مزے دار بنانے کے لیے اپنی زبان وافی سے کام لیتے ہیں۔ میر کو زبان سے ہر وقت کش کش کرنی پڑتی ہے اس لیے ان کے اچھے شعروں میں بھی بعض شعر بیان کا کچا پن مل جائے گا۔ جرأت کو مروجہ الفاظ میں نئی و مستنیں پیدا کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ انہیں تو صرف مردوں لفظ و معنی نا پڑتا ہے۔ اس لیے ان کے اچھے شعرا عمل گئے گئے لکھائے ہوں گے۔ جو بے ساختگی آپ کو جرأت کے یہاں ملے گی وہ میر کے یہاں نظر نہیں آئے گی۔ جرأت عام طور پر اپنی بات پر ہی کہہ لیتے ہیں میر بعض دفعہ پرری بات نہیں کہہ سکتے۔ یوں وہ مزہ تو دوڑوں ہی استعمال کرتے ہیں۔ مگر میر کے یہاں وہ زبان ملے گی جو وسیع ترین انسانی تعلقات کے داخلی پہلو کی نمائندگی کرتی ہے۔ جرأت کے یہاں وہ زبان ہے جو عادی حرکات کے بیان میں کام آتی ہے۔ میر میر کے یہاں زبان کی ایک اور معنویت بھی ہے۔ اپنی میر جی حال اور دکھی بات کی وجہ سے ان کا دشتہ دوسروں سے منقطع ہو گیا تھا وہ زبان کی مدد سے یہ ٹوٹا ہوا دشتہ پھر جوڑ لے ہیں۔ کیونکہ جو زبان میر استعمال کرتے ہیں وہ سارے سماجی تجربے کا بخور ہے۔ اپنے تجربے کو اس زبان میں سموتے ہوئے وہ اپنے آپ کو دوسروں میں پھر دم لکھ لیتے ہیں۔

نصرت بہت ہے میر نہیں کچھ اسلی گئی میں مت جاؤ  
میر کو کچھ اور بھی صاحب طاقت ہی میں آئے دو

بر احوال اس کی گئی میں ہے میر جو ائمہ جاہلین وال سے تو اچھا کریں

اس کے برخلاف جرأت کی زبان سماجی تجربے کی زبان نہیں بلکہ سماجی تعلقات کی زبان ہے وہ لوگوں سے کیا بھاگتے، لوگ انہیں خود گھیرے رہتے تھے۔ اس لیے انہیں اپنی معنویت دہروں پر اور دوسروں کی معنویت اپنے اوپر واضح کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ میر وہ اپنے الفاظ میں متنازعہ قسم کے تجربے میر نے کیوں کر کئے؟ جن چیزوں کا وہ ذکر کرتے ہیں، ان کی قدر و قیمت خود ان کی نظروں میں اور دوسروں کی نظروں میں بھی معین ہے۔ سماجی تعلقات اسی مفاہمت کے بل پر چلتے ہیں۔ چونکہ انہیں یہ مفاہمت حاصل ہے لہذا وہ سماجی تعلقات کی زبان استعمال کر کے اس مفاہمت کو اور ترقی دیتے ہیں۔

ان کی شاعری کی جو بنیادی ترکیب میری سمجھ میں آتی تھی۔ وہ تو میں نے پیش کر دی۔ اب میں ان کے عشق کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چونکہ میں ایسی باتیں کہوں گا جن میں جرأت کی شخصیت بھلے گی۔ اس لیے میں پسے ہی سے بتائے دیتا ہوں کہ میر فقط مفردہ نہیں جو مفردہ کے بعد سے نیک اور ثقہ لوگوں کا ماہ ہے اگر جرأت کی شاعری فاسقانہ ہے تو مجھے اس سے کوئی گجراہٹ نہیں ہوتی۔ اگر ان کا محبوب بازاری ہے تو بھی کرامتیت کی کوئی وجہ نہیں۔ جو شاعری یا جو محبت جہانی خواہش کی ہائیزگی محسوس نہ کر سکے۔ وہ قوت اور عظمت سے بھی پاک ہوگی۔ ڈائٹسے بیسی پاک محبت کس شاعر نے کی ہے۔ مگر پاؤ تو اور فرانچسکا کی نفسانی محبت کے سامنے اس کا بھی سراسر ماتم کے ساتھ جھک جاتا ہے۔ لیکن جو نفسانی خواہش انسانی ہستی کے باقی عناصر سے انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے اور کائنات کی پیچیدگیوں اور دستنوں سے الگ ہو کر محض اپنے آؤ پر مرکوز ہو جائے وہ بڑی شاعری پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر نفسانی خواہش آدمی کو اپنے چاروں طرف دیکھنے پر ابھار سکے تو گندی سے گندی بات بڑی سے بڑی بات بن سکتی ہے۔ شوا YEATS نے کہا ہے۔

BUT LOVE PITCHED HIS MANSION IN  
THE PLACE OF EXCREMENT;  
IT CAN NEVER BE WHOLE OR SOLE;  
THAT WHICH IS NOT RENT.

جیسی خواہش کے باوجود، بلکہ شاید جیسی خواہش ہی کی مدد سے، آدمی محبوب کے عشق میں ساری کائنات کا شمن دیکھ سکتا ہے

شاعرانہ

”مالٹے بھی ہیں، بیدار ذہن جاگ رہی ہے  
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کھیں جاگ رہی ہے

لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محبوب کو دیکھ کر سبکی بھرتے ہیں۔ اور ان کی شاعری بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔  
میراب جرات کی طرف آئیے، اس میں تک نہیں کہ نقد لوگوں کی رائے کے مطابق ان کے یہاں بازاری قسم کے فقرے بازی،  
ساقیا نہ بد مذاقی، ٹھنڈا اور چھپرے طعنے، ادب بازار حسن میں جا کر آوازے لگنے کا اذاتہ موجود ہے۔

کیا کیا وہ خفا مجھ سے ہوا مگر سے نکل کے      جب میں نے پکارا اُسے آواز نہ بدل کے

بند سے کی سن سفارش پورے وہ یوں کسی سے      عاشق یوں ہی وہ صاحب سائے جہاں پر ہیں

دول جراب سخن اُس کو تو یہ جھنڈا کے کپے      چلے چلے مجھ سے نہ بات میں تکرار نکال

دام میں ہم کو لاتے ہر قسم دل انکا ہے اور کہیں      شعر بڑھا ناہم سے اور مضمون ٹھنڈا ہے اور کہیں

گک جاتے سے تاب اب لے نا نہیں نہیں      ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

ایک طرف سے دیکھئے تو آخری شعر میں جرات نے جو کچھ کہا ہے، اول کائناتی اور جو دن نے اپنی ECSTASY میں مار ڈیل  
نے اپنی COY MISTRESS میں اس سے زیادہ اور کیا کہا ہے؟ بقول خاں صاحب، سب وہی بات ہے، بیترکے شعر میں بھی اس  
کے سوا اور کیا دکھا ہے؟

ہم فیروں سے بے ادائیگی کیا

آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

یہ صرف بڑے شاعر اور چھوٹے شاعر کا فرق نہیں ہے۔ یہ فرق ایک خواہش کو باقی سب خواہشوں سے علیحدہ ایک

سرگرمی کو باقی سب سرگرمیوں سے الگ کر لینے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ صاف صاف تو کیا کہوں، نقد لوگوں کے درمیان رہنا ہے۔ یوں سمجھئے کہ مندر بالا شعرا ایسے آدمی کے ہی ہو سکتے ہیں جو مولانا اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکتے ہو۔

لیکن اس بات پر یوں نہ باوجود یہ کہ انھوں نے جو لگا کر ان کا عشق محض پھیر چھاڑ دیا ہنس دینا چاہئے۔ یا ان کے عشق میں شدت اور خلوص نہیں۔ یہ چیزیں ان کے اندر موجود ہیں۔ بلکہ اس شعر میں بھی موجود ہیں۔

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمارے ہیں آئے ہمارے  
کیا وہ وہاں پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

لیکن بڑی شاعری اور بڑی شخصیت کی تعمیر محض شدت اور خلوص کی بنیادوں پر نہیں ہوتی۔ جذباتی خلوص اور اخلاقی خلوص میں بڑا فرق ہے۔ جذباتی خلوص تو ایک لمحے کی چیز ہوتا ہے۔ اخلاقی خلوص اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب مختلف قسم کے پر خلوص اور شدید جذباتی لحاظ کو ایک دوسرے سے ملنے اور ٹکرائے دیا جائے۔ محض اتنا کہ دینے سے کام نہیں چلتا کہ جرأت کی محبت و پرپائیں ہوتی یا وہ صرف دینی تسکین و معذرت دہن ہیں۔ ہنگامی عشق بازی تو شاید واسطے نئے جرأت سے زیادہ کی ہوگی۔ ایسی محبت جس کے خلوص اور شدت میں ازل سے ملے کہ ایک لمحہ کوئی فرق نہ لگے، انسانوں کا کام نہیں۔ واسطے دلی ذہنیت سے پاک رہ کر بھی فراق صاحب نے کہا ہے۔

یہ کہہ کر میں کوتاہی ہوں حرمِ قفا  
نگاہ محبت کے دھوکے نہ کھانا

جرأت کی محبت جموٹی نہیں، مگر ان میں خامی یہ ہے کہ ان کا خلوص جذباتی ہے، اخلاقی یا عقائدہ نہیں۔ انہیں تجربات تو بہت سے حاصل ہوئے ہیں۔ لیکن وہ سب مل کر ایک تجربہ نہیں بننے پائے۔ انہوں نے ہر تجربے کو اپنی اپنی جگہ قبول کر لیا ہے۔ سب تجربات تو ایک ساتھ اخلاقی یا تخلیقی عمل نہیں کیا۔ ان کی زندگی لمحات کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس کے اندر کوئی ایسا لمحہ نہیں جس میں ساری زندگی سمٹ آئے ان کے یہاں تضاد تو بہت ملے گا۔ لیکن اس تضاد سے کوئی نئی وحدت و جدوہیں نہیں آتی۔ ان کا روحانی سفر ایک رقص کی شکل کبھی اختیار نہیں کرتا بلکہ ایسا ہے جیسے کوئی منہ اٹھائے چلا جا رہا ہو، اور وقتاً فوقتاً راستے کے مختلف متبادلوں سے مختلف قسم کا لطف لے لیتا ہے۔ اسی لیے جرأت کے مزاج یا شاعری یا عشق کی جامع و مانع نہ ہو، اطمینان بخش تعریف بھی پیش کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

اگر ہم یہ کہہ دیں کہ جرأت کے عشق کا متعلق خارجی عمل سے ہے۔ داخلیت سے نہیں تو بات آدمی تنائی بیان ہوگی۔ غرض کہانی اور وقتی خواہش میں بھی کچھ نہ کچھ داخلیت تو آہی جاتی ہے۔ داخلیت صرف غرضاتی معنوں میں نہیں۔ بلکہ ان معنوں میں بھی کہ آدمی کو اپنی جذباتی اور ذہنی پهل کا شعور بہت شعور پیدا ہو۔ داخلیت تو جرأت کے بہت سے خارجی شعروں میں بھی موجود ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ داخلیت ہے کس قسم کی۔ ایک عشق تو وہ ہوتا ہے کہ چاہے آدمی اس پر دل میں دوسرے صفت مرث کرے۔ لیکن وہ دوسری سرگرمیوں پر بھی اثر انداز ہو، دوسری سرگرمیاں عشق پر اثر انداز ہوں۔ اور عشق کی بدولت آدمی کا خارجی اور داخلی رویہ عمل طور سے بدلنا شروع ہو جائے۔ دوسرا عشق وہ ہے کہ چاہے آدمی دن بھر اسی فکر میں پڑا رہے۔ لیکن عشق کا دوسری سرگرمیوں سے کوئی داخلی علاقہ پیدا نہ ہونے پائے۔ اور عشق آدمی کی شخصیت کے صرف ایک حصے میں محدود ہو کر رہ جائے۔ جرأت کے عشق میں اسی انداز کی داخلیت ہے مجھے اس سے انکار نہیں کہ جرأت نے جمالی خواہش کا اظہار بڑی صحت مندی کے ساتھ، بڑی صاف دلی کے ساتھ بلکہ آپ چاہ

بے حسرت کے ساتھ بھی لکھا ہے۔

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا چمپی رنگ اور بدن اُس کا وہ گہرا لایا ہوا

گروہ ماتم آئے تو زانو پہ بٹائے رکھئے لب سے لب سینے سے سینے کو لٹکے رکھئے

بیشعش کی دُور کہ چاہیے ہی کثرتِ شوق آپ کے زانو سے زانو کو بٹرائے رکھئے

بیٹھ آدھل میں نہک لطف اٹھانے سے مجھے اب تھے پاؤں پڑوں ہاتھ ٹکڑے سے مجھے

ایک شب ساتھ اُس کے کمر پر تیرتے ہوئے شام سے رات کو کیا کیا چٹ کر سویئے

تو تو دُور تھے ہی رہے اور پہلی وصل کی رات لوگ نہ بٹھئے بل جائیے اور سو رہیئے

مریت یہی نہیں کہ وہ اپنی لذت یا زاتی تسکین ہی چاہتے ہوں۔ جنسی معاملات میں اُن کی صحت مندی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ مجھ پر سے بھی جسمانی جواب کی آواز دے رکھتے ہیں۔

لب اُس لیے ملتا ہوں تو بس یہ دل میں آتے ہے جود لذت اُس کو بھی مل جائے کچھ تو کیا مزا ہوئے

ہو دے کس مزے سے بیان وہ کہ دم بوس لگا رہا کس کس جس اول سے وہ بھرے ہے کس کی اور جسمانی ہم آہنگی سے جو جذباتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور جسمانی خواہش کی تکمیل جس طرح پیدا بن جاتی ہے۔ اس کا بھی انہیں شعور اُسا احساس ہے۔

یاد آتا ہے یہ کہنا جب تو آڑ جاتی ہے نیند

اپنی ہٹ تو رکھ چکے اب تو ہٹ کے سویئے

لیکن ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک بات یاد رکھنی چاہیئے۔ جب عشق زندگی کی دوسری سرگرمیوں سے بالکل الگ اور شخصیت کے ایک کونے میں بند رہ جائے تو کامیابی اور ناکامی دونوں کی خاص شکلیں بن جاتی ہیں۔ محرومی کی صورت میں آدمی یا تو روئے جھٹکنے بیٹھ جاتا ہے یا پھر واسخت پر اُتر آتا ہے (جس کی ہرارت کی شاعری میں خاصی کثرت ہے)

نکادیں گے دل ایسے سے کہ تم بھی دُشک کھاؤ گے

یہ تم کو تم کہ ہے دُشعب یا دم کو بھی جسد نے کا



یہ تو بڑی عروسی، کامیابی کا حال یہ ہے کہ اس قسم کا عشق اپنا اظہار خارجی عمل میں مزور کرنا چاہتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جسمانی تکیوں کی طلب نہ رکھنا کوئی فخر کی بات ہے۔ اس طرح کے عشق میں تو اور بھی مڑاؤ ہوتا ہے۔ لیکن اگر عشق عصفیاتی تحریک کے علاوہ نفسیاتی تحریک بھی ہے تو اس میں کامیابی کی شکلیں اتنی محدود نہیں ہوتی چاہئیں۔ اگر جسمانی تکیوں سے بے نیاز نہ ہونا شرم کی بات ہے۔ تو جلالت کو اہل تعارف دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہونا بھی کچھ ایسی قابلِ قدر چیز نہیں۔ جرأت کے یہاں جسمانی تکیوں کو ایسی مرکزیت حاصل ہو گئی ہے۔ اُن کا عشق بڑی جلدی میں بچہ بہت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور منہ سے والی ٹپکنے لگتی ہے۔

مرد و خوار منظر آتا ہے یوں خال سے خوب  
کہ لگا دیجئے ہونٹ اپنا تو رے گال سے خوب

دلگ پرچہ کے ہے کیا ہی جوانی کی تپک  
اور بھرے لالوں پہ جی بوسے کو کیا لچائے ہے

پھر اس عشق اور شاعری کے لیے سراپا کی بھی ایک خاص اہمیت ہے اگر آدمی کو محبوب کے حسن یا اس کی شخصیت کا احساس ہی نہ ہے اور وہ ہر وقت اپنے عاشقانہ جذبات ہی سے اُلجھا رہے تو میں اسے بھی کوئی بہت بڑا عشق نہیں سمجھتا۔ لیکن جرأت کو تو عاشق ہونے کے لیے گواہ جسم اور امبری ہوئی گات چاہیئے۔ انہیں محبوب کی تلاش نہیں ہوتی بلکہ ہند مقروضہ جسمانی خصوصیات کی۔ اُن کے یہاں محبوب کے حسن پر محو و غرض اور فکر نہیں طاقت اس قسم کے فقرے پیدا ہوتے ہیں :-

HER BEAUTY LIKE A TIGHTENED BOW (YEATS)

اُن کے یہاں اس فکر کے بجائے ایک چٹا رہے، بلکہ ہونٹ چمٹنے کا انداز، جہاں انہیں اپنی معلومہ اشار نظرائیں اور انہیں نے ان پر ہاتھ مار کے داد دی، جیسے محبوب نے امبری ہوئی گات نہیں دکھائی بلکہ کوئی لطیف سنایا ہے۔

اور ہیں چڑھے بھرے ہیں بالی امبری ہوئی گات سچ دکھو یہ کیا اُس نے دھواں دار نکالی

اک چاند کی جھلک سی جو پرے کی اوت ہے کیونکر ادھر نہ دیکھوں کہ دل لٹ پڑے ہے

اُس کی عزم پہ یہ کہتی ہے بنت رنگس کی دیکھے کوئی کہ لگی آنکھیں ہیں یاں کس کس کی

قد ہے قیامت اور غضب گات آپ کی جو بات ہے سو قہر قیامت ہے آپ کی

سبز کوئی کے سوا کچھ اور بن آتا نہیں یا وجہ ہم کو وہ کچھ امبری ہوئی گات آج ہے

گھڑا ہی فطاس لائیں ہم حسدا گرم      کافروہ سراپا ہے میرا سا بلا گرم

ہے قراری ہیں جوں موج نہ کیوں کر ہو کہ جب      ہر دیا کی طرح یار کا جو بن ماسے  
کراس آخری شہر میں جو ب کی دل کشی کا مجموعی تاؤ آگیا ہے۔ لیکن برکت کی زینت کو سمجھنے کے لیے دو شعروں کا مقابلہ کیجئے۔  
برکت ہوتے ہیں۔

کیا جانے کیا وہ آس میں ہے ہونے ہے آس پہی  
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسین نہیں

فرق صاحب نے کہا ہے۔

کوئی یوں ہی ساتھ جس نے مجھے ملا ڈالا  
نہ کوئی نذر کا پتلا نہ کوئی ذہرہ جسیں

”ملا ڈالنے کا“ مطلب ہے ساری زندگی پر اثر انداز ہونا، اور نہ ہی کوئی شخص سے مراد ہے صرف جنسی کشش۔ ملا ڈالنے میں سراپا کا کوئی دخل نہیں۔ اور یہی لٹا ہے جو ب کا سراپا دیکھ کر کیونکر دوسرے جیسوں سے آس کا مقابلہ ہوا ہے۔  
ہاں تو یہ کہ یہ رہا تھا کہ برکت کے عشق میں جہانی تسکین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بھی نہ بھی تو کسی نہ کسی قسم کے خارجی تعلقات اور خارجی تحریکات کے بغیر اس عشق میں آسودگی نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ عشق روح کی پکار سے زیادہ جسم کی پکار ہے۔ پھر چونکہ یہ عشق شخصیت کے باقی حصوں کو متاثر نہیں کرتا، اس لیے جنسی مطالبات پورے ہوئے بغیر اس میں تسکین کا کوئی پہلو نہیں نکل سکتا۔ یہاں لگاؤ نے ایک ہی صحنہ ہی، یعنی لگاؤ کا خارجی اظہار۔

نئے خط نہ کتابت ہے نہ پیغام نہ بانی      اس دل کی تسلی کی کوئی بات نہیں اب

ہیں مجھے سے وہ مینا تھا اور ہم اس ہر تے تھے      یہی راتیں تھیں اور راتیں تھیں وہ دن کیا گزرتے تھے

ہے وقت خوش انہوں کا کیا لطف ہم دگر ہیں      دل جن کے مل رہے ہیں اور پاس پاس گھر ہیں

یہ کہنا تو برات کے ساتھ ہے انصافی ہے کہ وہ عشق میں جہانی تعلقات سے آگے بڑھتے ہی نیلی۔ لیکن عشق کے خارجی اظہار پر اتنا اور دینے کی وجہ سے ان کا لگاؤ، لگاؤ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ برات تیر کے معنوں میں عاشق نہیں تھے بلکہ عاشق تھے۔ وہ بیکے بعد دیگرے مختلف سببوں سے سچی محبت کرتے چلتے ہیں، اور اپنی عاشقانہ زندگی کے ہر لمحے کو ایک دوسرے سے الگ رکھتے ہیں۔ انہیں مجدوں کی آن گت آواہیں یاد ہیں، لیکن مجرب ایک بھی یاد نہیں۔ کوئی سچی آن کے دل میں اس طرح گھر نہیں کر سکتی کہ ان کی کائنات زبرد و زبر ہو جائے۔ وہ مجرب سے جہانی اور مہذہاتی ہم آہنگی تو چاہتے ہیں۔ لیکن جنسی تعلقات سے باہر نکل کر عام انسانی تعلقات والی ہم آہنگی کے خواہاں نہیں

ہوتے۔ YATS نے اپنی محبوبہ کی سبے جہری کا گلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ محبت تو خیر میں اور بھی کروں گا۔ لیکن یہ دودھ مزہ کی زندگی میں ہو ایک دوسرے کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ہر باتوں ہوتی ہیں یہ کہاں اور ملیں گی؟ جرأت اپنے عشق میں ایسی ہمہ گیر کیس جی کے طالب نہیں ہوتے۔ انہیں تو عشق کی ایک طلب سی ہے۔ اور وہ ہر حال کہیں نہ کہیں ہو ہی کوئی ہے، انہیں تو خدا نے مزے دار جوڑا دیا تھا، اور جی کی مزے۔ انہیں ہر صورت دکھانی ہیں۔ ان کے لیے عشق ایسا تجربہ نہیں جس کے بعد انہیں اپنی ساری زندگی کو اذیت و تزیین دینا پڑے۔ انہیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ عشق کیا چیز ہے اور وہ اپنے آپ کو اس سے سکھنے کے لیے ہر ہر عرصہ تیار رہا۔ تھے ہیں۔ چنانچہ عشق ان کے لیے کوئی روحانی یا شیطانی قوت نہیں بلکہ محض من چاہ پن ہے۔

لگا جانا ہے جرأت اس تبتِ غمخوار سے سکھ ہے      وہی دم عشق کا مال ہے جو ایسا من چلا ہو سکے  
ازل سے گرفتِ دیدار پیدا ہوا ہے      یہ دل کیا مزے دلا پیدا ہوا ہے

پر چھتے کیا جو کہ اب اذیت کسی کے ساتھ ہے      آہ یہ دل کا مزا تو اپنے جی کے ساتھ ہے  
ان مزے داروں نے محبوب کے ساتھ جرأت کے رویتے کو بھی خوب دنگ دے دیا ہے۔ محبوب کو بے اعتنائی پر شرم تو اور شاعروں نے بھی دلائی ہے اور کئی پہلوؤں سے۔

کیا کیا آپ نے کہ حسرت سے  
نہ ملے، حسن کا عنصر دیکھا  
نراق صاحب تو محبوب کے ساتھ ناز بھی کر لیتے ہیں۔  
کل پھر عشق نہ دھوئے سکے گا  
آج منا لے آج منا لے

لیکن یہ وسیع، قوی اور دلچسپ ہرئی شخصیت کا اپنے اذیت و ہر جو محبوب سے بھی ٹکرتے جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جرأت تو اپنی جہنی خواہش ہی کو اس بڑی طرح حق بجانب سمجھتے ہیں۔ کہ اس کے مقابلے میں زندگی کے اور پہلوؤں کو خاطر میں نہیں لاتے جیسا کہ اس کے چہلے پوچھا دکر دم خیز کو جان      جرأت میں جو نہیں سو ایسی بات وہ کیا ہے اور کہیں

موجودیدار اپنا جیسا کر دیا تو نے مجھے      میں بھی جرأت ہوں کوں یوں تجھ کو حیراں تو ہی

دودھ و دھڑانے سے جرأت کے کو مت لیا کر      اس بچکے کی طبیعت تم پر ہے آئی ہرئی

جب یہ من چلا پن اپنی خود امتدادی میں مدد سے گزرنے لگتا ہے تو محبت اچھی خاصی پہلوانی بن جاتی ہے اور اپنی کامرانیوں کا غرور اوجھاپن اور انہال پیدا کر دیتا ہے۔ — ساتھ ساتھ شاعری میں بھی۔

عاشقی کے فن میں جرأت آج غم غموں ہوں میں  
 سامنے ہو جاتے اب جو مرد ہو میدان کا  
 چنانچہ جب اُن کی حیرت کو محسوس کرتے ہیں تو اُس وقت بھی انسانی وقار یا خودداری کے سوال سے زیادہ رنگ یہ ہوتا ہے  
 جیسے اُن کی استاد کی جیسی خواہش کی توہین کی گئی ہو۔  
 آج اس طرح سے ہرگز کا کہہ کر اس سے جا کر  
 کچھ بھی حیرت ہو جو دل کو تو نہ نہ مارے

منہ میں جو آئے ہے سو کہتا ہے مجھ کو کیا بلے زبان پایا ہے  
 اب ذرا اس عاشقی کے فن کو بھی دیکھ لیجئے جس کے وہ ماہر ہیں۔ اصل میں جرأت عاشقی کے فن سے نہیں بلکہ اپنی طبیعت سے  
 اُفت ہیں، انہیں معلوم ہے کہ عشق زمانے کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ اگر محبوب ماتہ آگیا، تو راوی بھی ہی نہیں لکھتا ہے، اپنی استاد کی سلم  
 اور اگر ماتہ نہ آیا تو بھی کی مرے وادیاں سلامت رہیں۔ آگے دیکھیں گے اس کا دفاعی کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی نتائج سے بے نیاز ہو کر  
 عشق لڑ سکتا ہے۔ انسانی کی صورت میں پہلے سے معلوم ہے کہ بچ و بچہ دونوں سے زیادہ نہیں جلتا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے ہی سے اشتغال  
 کر لیا کہ عشق زندگی کا ایک گرواں یا تجربہ نہ بننے پائے۔ جرأت کی اصل پہلو اتنی یہ ہے کہ انہیں دوست سے بچنے کے لیے وادیاں معلوم ہیں  
 وہ محبت کے میدان میں بڑی آسانی سے غم غموں کتے ہیں۔ کیونکہ محبت تو اُن کی کاروائی کے لامحوں علم ہی ہو جاتی ہے اب انہیں  
 کیسے برا کہا جاسکتا ہے۔

حسن اے جان نہیں رہنے کا۔ پھر یہ احسان نہیں رہنے کا  
 ہجر کے غم سے نہ گھبرا جرات اتنا حیران نہیں رہنے کا  
 محبت کا ختم ہو جانا تو انگ، یہ کاروائی تو محبت کو نہیں مذاق اور دل گلی میں بدل دیتی ہے۔  
 ہو وہ مرت منہ سے اٹھانا نہ مار مجھ میں اداسی نہیں رہنے کا  
 اُن کو اپنی امانت ہے جا پھر تجھے و حیاں نہیں رہنے کا  
 پتہ نہیں جرأت نے ساتھ ساتھ یہ بھی کیوں نہ کہہ دیا کہ  
 اُن کو پان تو کھا لے جلدی ورنہ پھر پان نہیں رہنے کا  
 جو چیز اُن کی محبت، اُن کی شخصیت، اُن کی شاعری کو بڑا بننے سے روکتی ہے وہ یہ کہ یہاں وہ نہیں، میں اور کسک  
 ہے۔ ہرگز اُس زمانے میں تعزوت کا رواج تھا۔ پھر وہ حیرت کے رنگ میں کھنڈ کی کوشش وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں، اس لیے وہ نظریاتی  
 طور پر اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ دل میں وہ ہو۔

گرچہ ہر قالب میں جرأت صورتیں ڈھلتی رہیں  
 ہر بنا جو درد کا پتلا وہی انساں ہوتا  
 لیکن اس احساس کے باوجود وہ دوست سے گھبراتے ہیں۔ وقتی بچ تو وہ سہا لیتے ہیں، حیرت کی پیروی کر سکیں مگر میں آخر

انہوں نے نارائن کے مضامین پڑھے ہی ہیں۔ اور تیرنے اُن کی طبیعت کی خاصی اصلاح کی ہے اور کسی جگہ اُن کا لہجہ بدل رہا ہے  
دوئے ہے بات بات پر جرات

ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

لیکن وقتاً فوقتاً دل گداز ہو جائے کہ باوجود اُن کے یہاں وہ "اپنا غم" نہیں مٹا جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا تھا۔ رنج  
ایک وقتی پیرزہ ہے۔ درد میں ایک تسلسل اور ایک استقلال ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ درد صرف عروسی اور ناکامی سے ہی پیدا ہو۔  
حرکت کے یہاں درد و مصیبت ناکامی کا احساس ہے۔ اُن کی خوشی یا رنج کا انحصار محراب کے ٹٹنے یا نہ ٹٹنے پر ہے۔

دل اب ایسا کہیں آئے کہ جی جانے ہے یہ قلق ہم نے اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے  
کھوئے جاتے ہیں ہم اب دیکھ کے اُنکے حرکات ہم نے مجھوٹ پایا ہے کہ جی جانے ہے

کسی خاص عروسی کے وقت انہیں قلق تو ہوتا ہے، لیکن عروسی کو سمجھنے میں جو اذیت پیدا ہوتی ہے اس سے وہ جان چرات  
ہیں وہ وقتی رنج کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو تیر کی طرح اپنے دکھوں سے الگ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے دکھ کی کہانی تو  
سنا سکتے ہیں لیکن اس کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی حالت بیان کر سکتے ہیں، اس حالت پر مصغرانہ سیرت کا اظہار بھی کر سکتے ہیں لیکن اس حالت کے  
اثر ڈوبنے اور اس کی تفتیش کرنے کی خواہش انہیں نہیں ہوتی۔

آرام نہ ہو دل کو تو اسے یاد کر رہی گئی  
تلاش ہے کہ پاس پلٹے وہ بھٹاتا نہیں ہم کو  
تو بے ہنگم حرکات کی بات ہو گئی غم سے  
کو اپنے سے تو اس کو بھر نظر دیکھا نہیں جاتا

اُن کے اندر محبت کے خلاف ایسی مداخلت نہیں جیسی مالتی میں ہے۔ انہیں محبت سونی مدد قبول ہے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم  
ہے کہ اس میں متروکے بہت دکھ بھی جھینے پڑیں گے۔ اکل میں سردیا تو چھوٹی کا کیا ڈو۔ چنانچہ نہ تو اُن کے اندر وہ کش مکش پیدا ہوتی ہے جو  
مالتی کے یہاں ہے۔ نہ وہ تضاد اور کھینچا تانی جو قیر میں ہے۔ قیر کے درد کا ایک سبب یہ الجھن ہے کہ آخر عشق بیک وقت محبت اور عذاب  
کیوں ہے، چونکہ وہ جن عاشق کے ماہر و گرباداں دیدہ ہیں۔ انہیں سب حالات کا پہلے سے علم ہے وہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کیا کرنا ہے  
اس لیے وہ درد کو اُٹھنے ہی نہیں دیتے۔

جو کہ دگے غلم تم ہم سب سہیں گے کیا کریں تم بنے اس کام کے اور ہم بنے اس کام کے

پھر تمہیں دن کو کوڑہ کو گڈے ہے شب کے اہتے بہتے یہ کیوں خرابیاں لگ نہ کسی کو چلہتے  
اپنی توقع کے مطابق انہیں کبھی کبھی عروسی اور ناکامی یا محبوب کی بے اتھالی کے سبب دکھ ہوتا ہے۔ لیکن یہی ہو کہ اُٹھتی ہے  
اور وہ اپنے غم، اپنی حق گوئی کے تقاضے سے مجبور ہو کہ اپنی پہلوانی کے باوجود کراہ لیتے ہیں۔

کیا عالم آپ کا ہے میاں حرکت ان دوزں عالم سے چھٹ گئی ہے ملاقات آپ کی

جب مرے پاس سے اٹھ کر وہ کہیں جا بیٹھے ہیں  
جی میں گزرتے ہیں کہ انے لاش میں جھٹکتے ہیں

ہم نے ہر چند کہا بد مذہب آیا یاں تک  
بعض دفعہ تو وہ اپنی لک میں بھی ایک طرح کا پیر پیدا کر دیتے ہیں۔ بد مذہب بات نہیں کہ تو دشت لعل کی کہ ایک جو بائیں ابلو  
ایں ہے جیسے کسی کو سب سے الگ تھک مزے لکھنے بیٹھ دیکھ کر اس کا غم غلو کرنے کے لیے اسے پھیرنے ہوں۔  
وال سے اول دلی بے تاب تو کب آتا ہے  
اور جو آتا ہے تو سو جا پہ چل کر آتا  
اس کے مقصد میں داغ کا یہ شعر دیکھئے۔

داغ وادفت کو ہم آج ترے کو پہے سے  
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے  
جرات نے محبوب کی تم غریبی کا ذکر ایک جگہ یوں کیا ہے۔  
گل جو دہنے پر مرے ملک دھیان اس کا پڑ گیا  
ہنس کے یوں کہنے لگا کچھ آنکھ میں کیا پڑ گیا  
اس وقت تو میر محبوب بچاؤں کے ساتھ زیادتی کر رہا تھا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جرات کے درد کی نوعیت اسی تھی  
کی ہے جیسے آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہو۔ یعنی ایک ایسا واقعہ جو معنوی و تعلیف دے مگر پھر تکلیف دہ نہ ہو جاسکے۔ جرات اس تکلیف سے اپنا  
گھبراتے ہیں کہ ایک جگہ تو انہوں نے بقول میر کہہ کے پر دم بڑھنا یہ غریبی والہ والا معاملہ کر دیا ہے۔  
آوارہ و بد مذہبوں میں جرات بقول میر  
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا  
اصل میں جرات کا قصہ یہ ہے کہ وہ دو قسم کی شاعری کے درمیان ہٹے ہوئے ہیں، ایک تو لکھنوی شاعری، دوسرے میر کی  
شاعری۔ اپنی طبیعت طبعی کے باعث اور کچھ ماحول کے اثر سے انہوں نے اس طرح کی خیال آرائیاں تو کی ہیں جہاں الفاظ یا تعویذات کو جذبات  
سے الگ کر کے ان سے خیرا جاتا ہے۔ مثلاً

ہے یہ عالم چشم ساقی پر کہ وقت سے خودی

چشم بینا حق سے چاہے ہے کہا بے رنگی

لیکن ان کی طبیعت میں انشا کا سا ہنس و ہن نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس رنگ میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کچھ میر کی پیروی کے  
نثر نے انہیں اور حریک طرح چلنے نہ دیا۔ لیکن دوسری طرف لکھنوی رنگ نے میر کا رنگ خراب کیا۔ پتہ نہیں کہ اگر وہ لکھنوی کے بھٹے دلی میں  
بڑے تو کس قسم کی شاعری کہتے، ان کے حزن میں دہشت اور گہرائی آجاتی یا ان کا طریقہ انداز بھی مرجھا سکے وہ جانا۔ فی الحال صورت یہ ہے  
کہ وہ دیکھتے ہیں آتش موزوں کے من کا ناز گرم ہے اور اپنی گرمی دکھانا چاہتے ہیں۔ عشق میں غار جی کامیابی کی انہیں ایسی ہلاکت پہ گئی ہے

کہ وہ دقتاً فوقاً دکھ چیلنے کے باوجود دکھ سے گھبراتے ہیں۔ اور اسے ہی کا جنجال سمجھتے ہیں۔ جس عشق میں مصیبت اٹھانی پڑے۔ اس کے بعد انہیں افسوس ہوتا ہے۔ کہ آفراس مصیبت میں ہی کیوں پڑے۔ باوجود غم کے بچے تو میر بھی پس پس گئے ہیں۔ مگر جرات کے لیے کامیابی اور ناکامی کا فرق بہت محسوس دکھتا ہے۔ ہوانائی کی فونیک کے باوجود انہیں اپنے اس بچنے پن کا احساس ہے۔ ہر روز کے جھٹکے کو کہاں سے جگر آدے

[ اس کے مقابلے میں میر کا شعر بھی یاد رکھیے۔ ]

جب نام تو ایچھے تب چشم میر آدے  
اس دنگی کرنے کو کہاں سے جگر آدے  
میر کے لیے عشق ایک "دنگی" ہے، جرات کے لیے ایک الجھن۔  
جرات ہلڈ مرتہ عشق ہے بہت  
ہم بہت جیتی سے ابھی ہیں دے دے  
بارا ہے تعلق طبیعت نے نہیں

جی کے لگ جانے کا کچھ پایا ولا تو نے مرہ ہم نہ کہتے تھے جی ہوتی ہے دیوانے لگی

جہاں جا بیٹھے ہر دل نہیں لگتا میاں جرات کہو اب تو اٹھائی کیفیت کچھ دل لگانے کی

لگا یا غم یہ ہوانائی میں کیوں میاں جرات ابھی تو سیر تماشے کے تھے تہارے دن

سختیاں درد و محبت کی نہ پوچھو ہے جی ہی جانے ہے جو کچھ دل نے اذیت پائی

خلاؤں آنکھ ملک اس سے تو سر تن سے جدا ہو جاؤں کہاں لا کر چھٹا یا لے توے دل کا بڑا ہوسے

جرات سے درد تو واقعی برداشت نہیں ہوتا۔ لیکن جن حدوں کے اندر کہ وہ عشق کرتے ہیں، ان کے اندر بہتے ہوئے بھی اور اپنے کھلاؤ پن کے باوجود اپنے من چلے پن کے باوجود بہت سی جگہ جسمانی لگن کی شدت اور غلوں کے ہاؤٹ من کی شاعری میں کئی جگہ بہک اور بہک، واہ نا پن اور شراری جگہ مصومیت تک آگئی ہے۔

کہاں آئے کہاں بیٹھے سمجھتے کچھ نہیں جرات یہ ہو جاتی ہے ہم کو بیخودی سی واں سے گھر آکر

مری وحشت ہے ہو کہ کو دل ہی دل میں یوں کہتا اپنی لگ گئے کیوں ایسے دیر لے کر پیاسے ہم

کیونکہ تم پاس سے ہم جائیں مہربان اور کہیں جی تو گھٹتا ہی نہیں یاں کے سوا اور کہیں

کو چہ جان سے جلتے ہیں یہ جاسکتے نہیں گڑاٹھاتے ہیں قدم پر دل اٹھا سکتے نہیں

جی میں سو بار آئے ہے ہر آنکھ کیلئے یاد ہے یہ مجھ کو دل میں کچھ سرگندھا سکتے نہیں

اگر محض جنسی تسکین ہی کا سوال ہو اور معاشرہ اس سے آگے نہ بڑھے تو ادب بات ہے۔ لیکن اگر آدمی کے دل میں مجسم کا احترام نہ ہو  
نہم اور جہانی خواہش کی مقبوضی بہت قدر ہو رہا ہے وہ ابھری ہوئی گات ہی کی قدر ہی تو یہ کسی نہ کسی حد تک انسانیت کی قدر بن جاتی ہے  
اور پیش پرستی میں بھی عقود اس قدر آجاتا ہے ——— لگاؤ انسان کی نگاہیں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ ہر آنکھ بھی دنیا میں کے سہارے  
اس وقت عقود اس قدر آجاتا ہے کہ اگر سرت مروانی کے برابر بھی نہیں پہنچے۔  
مضطرب ہر کے دل اس شوق کا بھی دھڑکے ہے آکے بیٹھے ہے کبھی پاس جو نہ مضطرب کے

یا لاک دون کی بستی ہم دم ہم انسزدوں یا جی کی رکاوٹ ہے اور اور آدمی بھی  
ہر آنکھ کی زندگی میں دو چار لمحے ایسے بھی آئے ہیں جب یہ نگاہ بڑھ کر محبوب کی قدر اور محبوب کے احترام کی شکل اختیار کرتا  
نظر آتا ہے۔ مگر یہ آتا رہی رہے۔ ان کی نشوونما نہ ہونے پاتی۔

ہوئی اور یاں ہم سے ہر آنکھ تو کیا گڑم کو آکر خفا کر چلے

ہوں وہ آنکھوں میں کہے ہے جب کہ وقت بے کوئی پھوٹ پھوٹ اتنا نہ رو بہ نام ہوتا ہے کوئی

کہا ہے میں نے تجھے لب کہ فیر کے پاس نہ بیٹھ خدا کے واسطے مجھ پاس تو آدمی اس نہ بیٹھ

ایسے وقت اپنی جہانی خواہش کے حق بجانب ہونے کا خیال ہی ان کے دل سے نکل جاتا ہے اور وہ اپنے ماضی تعلقات کو  
بھی عام انسانی تعلقات کے دائرے میں لانے کی مقبوضی بہت کوشش کرتے ہیں۔

جسے یاد اپنی نکلیے اُسے ماضی سے بھلیے ملک اور تو آنکھ ملائیے ہی ہم سے قول و قرار تھا

کسی نے تیری خاطر خانہ ویراں کر دیا اپن مجھ تو بھی اُسے لے خاناں آباد جانے ہے



بھلا دیکھو تو ہم تم ایک ہی جہتی میں بستے ہیں سوتلے پر یہ غضب ہے اور بچنے کو بھی تڑپتے ہیں  
لیکن اس آخری شعر میں انسانی جہتی کی پیچیدگیوں پر وہ استہجاب آمیز ہمارگی کا احساس نہیں آئے پایا جو تیز کے شعر میں ہے۔

وجہ بے لگائی نہیں معلوم

تم یہاں کے ہرداں کے ہم بھی ہیں

جرات کے شعر میں تو صرف محبوب کی بے لگائی کا گواہ ہے۔ برصورت اُن کے یہاں بھی محبوب کے جسم نہیں بلکہ اُس کی شخصیت کی سچی طلب وہ ایک جگہ ملتی ہے۔

گرو دیا وہ پھر پھر کے نہ آئے جرات

وہ درد و تنے پڑے پھرتے پھر جاتے ہم

مگر انہیں محبوب سے ایک مضمی قسم کا فائدہ پہنچا ہے، یعنی وہ رگڑتے نہیں جھٹکتے، آتش کو محبوب کی بے رخی میں بھی ایک مثبت چیز حاصل ہوئی ہے۔ اسی لیے آتش کے شعر میں ایک بے پایاں سکون ہے۔ جس نے اضطراب کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے ایک ایسی عمدہ کیفیت جو جرات کے شعر کو چھوڑ بھی نہیں گئی۔

محبوب نہیں مایہ و پردہ نے سونے نہ دیا

خاک پر سنگ و دیار نے سونے نہ دیا

اچھا، اب جرات کی طرف سے محبوب کا رویہ دیکھتے کہ انہیں اپنی محبت کا جواب کیا ملتا ہے۔ عام طور سے جرات کا محبوب اُن سے چھوڑا اور لگاؤ کی باتیں کرتا ہے جو بے رخی اور بے اعتنائی سے خالی ہیں۔ جرات کو، دو انسانی ہستیوں کی درمیانی سطح کا تجربہ نہ ہونے کے برابر ہے ————— یعنی بعض وقت کی عروسی کے باوجود۔

دیکھ، ہم ناک نشیمنوں کو وہ بولا کہ کہیں اور جاگ نہیں کیا یہ جو ہیں بیٹھتے ہیں

دیکھ منت سے مرا کوئی بھٹانا جرات اندر اُس شوخ کا کہنا کہ نہیں بیٹھتے ہیں

میں یہ نفروں میں بہک ہوں کہ وہ گم گم وہ شوخ جس کے چھوڑے ہے کہ وہیں نہ کر دوں بھاری

کچھ لگاؤ کا سبب اور نہیں پر جرات یہ وہ چاہتے ہے کہ اس کو بھی لگائے دیکھ

لیکن جب یہ لگاؤ میں ہرلتی ہے تو محبوب رفاقت کا حق ادا کر دیتا ہے۔ محبوب کے معاملے میں بھی یہ ربط اور رفاقت کا احساس حیرانی آسودگی سے پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ انسانی تعلقات کی شکل اختیار کر لے لگتا ہے۔ فراق صاحب نے ایک دفعہ اس تعجب کا اظہار کیا تھا کہ بعض شاعر محبوب کی بے اعتنائی کا ردنا تو دتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں محبوب خود اُن پر عاشق ہو جائے تو کیا ہو؟ لیکن جرات کو ان شاعروں کی طرح، اس قسم کی پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔ وہ عشق کا نام بھی جانتے ہیں اور عشق و محبت کو نام بھی۔ کیونکہ اُن کے یہاں

عشق کا سارا کار و بار جبرانی منافقت پر منحصر ہے۔ چنانچہ انہیں محبوب کے ٹکڑا کا احساس ہے اور اس کی قدر بھی ————— بلکہ انہیں عشق میں سب سے بڑی ضرورت اسی چیز کی ہوتی ہے

کیا جائیئے کم بہت سے کیا ہم پہ کیا محسوس  
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے محسوس

حیرت ہے کہ کل اُس نے کبھی کان میں اپنے  
وہ بات کہ مطلق جو نہ تھی دھیان میں اپنے

کئی دن بعد جانے پر ذرا جس سے کہ الفت  
غضب ہے اس کا یہ کہنا کہ کتنے ہے مروت جو

دوست نے اُس شوق تم گرے تو اُس نے ہم کو  
کامیاب عشق میں محبوب سے اتنی ہم آہنگی اور ربط حاصل کر لینے کے بعد بھی عشق حرکت کے لیے انسانی زندگی یا کائنات سے ہم آہنگی حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں بنا۔ یہ ربط مروت ایک آدمی سے حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی اپنی شخصیتوں کے درجہ و گشتوں میں۔ محبوب اُن سے دُور نہ جانے سے تو ڈرتا ہے اور اُن کے کان میں ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے جو اُن کے دھیان میں بھی نہ آتی تھی۔ لیکن یہ محبت کرنے والا محبوب اُن کے لیے کبھی وہ چیز نہیں بنتا جو فراقی صاحب کا محبوب اُن کے لیے بن گیا ہے —

تو دن کی طرح جس رات کی طرح پُر کیفیت

جہاں بھی جلسے بہ اندازہ ضرور نہ جانے

جس عشق پر بسیط انسانی زندگی اور کائنات کا پُر تو نہ پڑے اور اُس سے زیادہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟ جو آدمی محبوب کی اداؤں کو گننا رہ جائے اور دوسری چیزیں چھوڑ دے محبوب کو بھی نہ دیکھ سکے۔ وہ اس سے بڑی شاعری کیا کر سکتا ہے؟ یوں تو جرات نے سر سے پرتک محبوب کے سارے ولی کش اعضا کا نام لے دیا۔ لیکن وہ ہیں اپنا محبوب تک نہ دکھا سکے معاشقے کی تفصیلات بیان کرنے کے باوجود وہ مشقیہ تعلقات کی پیچیدگیوں سے واسن بچا سکتے رہے۔ انہیں ان پیچیدگیوں کا احساس تو ضرور ہوا۔ آخر یہ ہوا ان عشق تھے چنانچہ اس کا اشارہ انہوں نے کیا ہے —

دل دیکھتے مدت ہوئی ہے اب تک لیکن مزاج

اُس بہت کافر کاکس کا فرسے کھما جائے ہے

لیکن وہ اس الجھن میں نہیں پڑنا چاہتے۔ جب ایسی بات آتی ہے تو اُسے ہنس ہنسا کر صاف اُڑا جاتے ہیں۔ وہ تو سب دیکھتے ہیں کہ محبوب کی دلچسپی انہیں ملی رہا، اور کس طرح۔ یہ کس طرح؟ ہی اصل میں اُن کی شاعری ہے لیکن یہ سوالات کہ محبوب کیوں دل رہا ہے اور کیوں نہیں ملی رہا۔ غرض دہشتی میں غل جھڑکتے ہیں، یہ باتیں یاد لوگ معلوم نہیں کرنا چاہتے۔ لہذا جرات کئی کث جاتے ہیں۔ محبوب کی کیا۔ تو بس اللہ نہ لانا تو خیر تھا۔ اور اگر عشق میں مرنے کی ذہنت آگئی تو بھی —

تو الحمد للہ محنت ٹھکانے لگی

دیا اُس کے در پہ جو جرات سب نے جی

عرض انجام ہر طرح نقشے کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیونکہ انہیں تو ایک کردار بنانا ہے۔ کامیابی میں بھی اور محرومی میں بھی۔ ہر حال خاتمہ اس طرح ہونا چاہیے کہ یار دوست بھی اس کی صحیح نوعیت پہچان کر اطمینان کے ساتھ اطمینان نہ کہہ سکیں۔ چونکہ حرکات کی مکمل سوانح عمری تو قلم نہیں۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی وہ بھی دلچسپیاں محدود تھیں یا وسیع۔ یوں ہونے کو انہوں نے یا سست پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

سبھی ۔ امیر کوئی ان کو نہ دذیر  
انگریزوں کے ہاتھ اک نفس میں ہیں امیر  
جو کچھ وہ پڑھا میں سو یہ منہ سے بولیں  
بٹگلے کی مینا ہیں یہ پووب کے امیر

پھر انہوں نے دبی یا جرمنی طرز پر لادواں، نفس و مزہ کے مضامین بھی باندھے ہیں جن کی سیاسی تفسیریں کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان کی عشقیہ شاعری سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ان کے انگریزوں کی ذہنی دلچسپیاں محدود نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنی عشقیہ زندگی میں انہیں داخل نہیں ہونے دیا بلکہ یا تو اپنی شخصیت کا بہت بڑا حصہ عشق بازی کے حوالے کر دیا۔ ورنہ پھر عشق کو اپنی جہتی کے ایک الگ تھلک کونے میں بند کر دیا۔ چنانچہ ان کا عشق دوسری دلچسپیوں اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے بالکل الٹ پذیر نہیں ہوا۔ اوپر سے ایک حرکت انہوں نے یہ کی کہ اپنے عشق کو الگ الگ لمحوں میں پائے دیا۔ ان کا عشق اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوا کہ وہ اسے ایک کلی سمجھ کر کبھی نہیں دیکھ سکے۔ اجڑا ہی سے اُٹھتے رہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو یہ نام نہ تو مزدہ پہنایا کہ ہماری شاعری چھوٹی چھوٹی اداؤں اور لمحاتی تاثرات کو بیان کرنا سیکھ گئی۔ لیکن حرکات میں اتنی قوت نہیں تھی کہ ان کا تخیل ان اداؤں کو پوری شخصیت کا نمائندہ بنا سکے۔ چنانچہ وہ تاثرات کے شاعر ہیں۔ تجربے کے شاعر نہیں، ان کا فن ملاسی ہے، غلطی نہیں۔ اس لیے ان کا عشق عام تندرست آدمی کا عشق ہے اور ان کی عشقیہ شاعری کم سے کم عاشق مزاجوں میں مزب المل بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

# اختر شیرانی

آل احمد سرور

تقریباً بیس سال ہوئے جب میں کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ میں سائنس کا طالب علم تھا۔ مگر ادب سے دلچسپی زیادہ تھی۔ اس میں ہر دھیر کیسا اور طبعیات کے فارمولے یا تجربات بیان کیا کرتے تھے۔ اور ہم کچھ بیٹھے آدھ کے شاعروں کا کلام پڑھتے یا ان کے حالات اور تذکرے دیکھتے۔ اس زمانے میں داغ کا کلام ڈرامے وار معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی شوخی اور نثرات میں کچھ باری پن کا احساس ہوتا تھا۔ حسرت کی غزلیں زیادہ اچھی معلوم ہوتیں۔ اور جوش اور اختر شیرانی کی غزلیں۔ اس زمانے میں جگل کی شہزادی۔ نامہ ارجوانی۔ دیکھو وہ کوئی جو گل جگل میں گا رہی ہے۔ جنہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے۔ تری تصویر سینے سے لگاؤں اور مریاؤں، پڑھنا اور دوسروں کو سنانا میرا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اختر کی سنے اس وقت ایک عجیب آسانی معلوم ہوتی تھی۔ ان کی تصویر کو سینے سے لگا کر مرجانا زندگی کا سب سے مقدس فریضہ نظر آتا ہے۔ اتنا اب بھی یاد ہے کہ جوش کی غزلیں ایک طوفان کی طرح بہا لے جاتیں۔ مگر اختر کے اشعار میں ایک نشہ ہوتا تھا۔ ایک لذت ہوتی تھی۔ جو تھوڑی دیر کے لیے کسی اور دنیا میں پہنچا دیتی تھی۔

اور آج جب میں نے اختر شیرانی کے مجموعے نغمہ حرم، اخترستان، لالہ طور دیکھے تو مجھے وہ نشہ پھر یاد آ گیا۔ نغمہ حرم میں اختر کی اچھی غزلیں کم ہیں۔ دیہاتی لڑکی کا گیت، دیکھو وہ کوئی جو گل جگل میں گا رہی ہے۔ حوریت، لکھو بیڑا تاروں کی بستی۔ یہی اس مجموعے کی کائنات ہے۔ اختر دراصل ایک روحانی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری۔ ہماری جدید عشقیہ شاعری میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر نورتوں اور بچوں کے لیے غزلیں لکھتے وقت وہ بعض اخلاقی، سماجی اور آئی عشاق کے چکر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان کے ایسے اشعار میں روحانی اور دل کشی ہے۔ مگر جو کائنات اخترستان کی بیشتر غزلوں میں ہے وہ نہ نغمہ حرم میں ہے نہ لالہ طور میں۔

اودیس سے آئے واسے بتا۔ جہاں ریحانہ رہتی تھی۔ ایک حادثہ۔ سرزمین عشق، سلی، وادی لکھا میں ایک رات، اختر اور جودھویں ساگر کا کھنہ، ایک تصویر دیکھ کر ایک نوجوان بت تراش کی آرزو۔ تاثرات نغمہ۔ دنیا کی بہاریں اختر کی نمائندہ غزلیں ہیں۔ ان کے علاوہ اختر کی غزلیں اور دنیا میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان ہی میں وہ جوان۔ چغل، شوخ اور مضطرب مشق ہے جو مرث حسن کا شہنائی نہیں پڑتا بھی ہے۔ اس کی خاطر مرجانا چاہتا ہے۔ اور اس موت کو کیش کی طرح نعمت سمجھتا ہے۔ ان میں وہ شدید طوفانی دنیا پر چھا جھلسے والا ہند ہے جو انسان کی حسین ترین کمزوریوں میں سے ہے۔ اس میں غزلیں، جذبات، متناقضی اور آرزوں کی وہ

جنت ہے جس سے کائنات کی آبرو قائم ہے۔ اختر کا عشق معشوقانِ شباب کا وہ فطری اور سچا عشق ہے۔ جب ہر عورت میں عورتوں کا تقدس اور شہزادیوں کا حلال نظر آتا ہے۔ جب عورت سے بھی زیادہ عزیز اس کا تصور ہوتا ہے۔ جس میں دوری جادو ہے اور وحدت کا حس۔ جس میں حقیقت خوابوں کے تانے بانے سے آراستہ ہو کر آتی ہے۔ جس میں جذبہ ہے ذہنی نہیں۔ گرمی ہے روشنی نہیں شرت ہے کھراں اور استواری نہیں جو زندگی کو شراب و شکر بھرتا ہے۔ اور اس لیے اس کی تلخوں کی شکل سے تاب لاسکتا ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ عقل کی تیز روشنی اور ذہن کی پختہ کاری بھی اس کا مذاق نہیں اڑا سکتی۔ اس کی مصروفیت فطری رنگ، بے ساختگی اور بے تکلفی اسے زندگی کا ایک روشن لمحہ بنا دیتا ہے۔ اس عشق میں ذہنی پہچان ہے۔ مگر زندگی کا ایک اہم دور یہ بھی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خواہوں، جادو کے جزیروں اور سنہرے وحدتوں کی یہ دنیا ہمیشہ زندگی سے گریز اور فراق کھلاتی ہے۔ لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ خواہوں سے حقیقت کی طرف آگئے ہیں اور دنیا کو جنت بنانے کی یہ آرزو انہیں سدا بے چین رکھتی ہے۔ کچھ زندگی سے ایسے بیزار ہو جاتے ہیں کہ (AXEL) کی طرح مین عالم حسرت میں مرجان بہتر سمجھتے ہیں اور زندگی کو اپنی ناکروں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ اختر بھی جیسے ہیں۔ چنانچہ لائق طور کا اختراع کیا، تنگنہ اور زندہ ملی نہیں۔ اسے محبت میں ناکامیاں ہوئی ہیں۔ وہ آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے پتلے دنیا اس کے لیے فردوس تھی۔ اب وہ "فریب جہنم" سے آگاہ ہو گیا ہے اور کبھی کبھی یہ بھی کہہ سکتا ہے۔

حسّ نو کچھ بھی نہیں، عشق جواں کچھ بھی نہیں  
ہوش بے دل کہ جہاں گزراں کچھ بھی نہیں

اب اس کے لیے ماضی کی سنہری یادیں اور زیادہ سنہری ہو گئی ہیں۔ یاد رفتہ "کوہ چوڑ نہیں سکتا۔ اس کی دانتان جو کبھی تاروں کی کہانی" تھی اب شعلوں کا بیان بھی ہو گئی ہے۔ اس میں تخیلی، ذہنی، رنگینیت وینا سے بے زاری اور فراق کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا نثر بہادر جہاں نئے سرے سے ہر مہم پیش ہمارے کا عزم کا ہرگز آتا ہے وہ ہر مہم پیش کا زیادہ حقیقی مقصد یہی پیش کرتا ہے۔

ایک سلطان کو لشکر لگائی دے کہ

ہر گدا کو کئی مہمروں کا سلطان کر دیں

منتظر عالم نو کا ہے جہاں کہنہ

شبِ تیرہ سے حیاں صبح درخشاں کر دیں

اس مجرمے کی اچھی نظموں میں سے داستانِ حیات، نغمہ بہار، انصافِ قاصد اور میرا موجودہ شغلہ ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں اختر کی شاعری میں یہاں ایک انصافِ عروس ہوتا ہے۔ اختر کی شاعری میں عشق کا جوش بھی ہے (PASSION) اور وجد و کیفیت بھی (ECSTASY) لیکن وجد و کیفیت زیادہ ہے اور ظاہر ہے صرف اسی کے سہارے انسان کیت تک پہنچ سکتا ہے۔

اختر کی شروع کی نظموں میں عورت سب کچھ ہے۔ انہوں نے جا بجا کہا ہے کہ جب تک یہ دنیا اور اس کی خوش فانی ہے۔ ہماری زندگی پر عورت کی خدائی ہے۔ یہ عورت سبھی ہو یا عذرا، دیوانہ یا خیریں، شمشیر یا کوئی اور، اختر نے اس کا سراپا بیان نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختر نے اسے نگاہِ سیرک دیکھا بھی نہیں۔ سلمیٰ بقول دانش کے، اختر کا جمال ذہنی ہے اور وہ دور دورہ کی لوسی (LUCY) یا کیش کی (FANNY BROWNE) کی طرح شاعر کے دل کی ملک۔ وہ بھی صاف نثر نہیں آتی۔ ایک مقدس پرچھائیں ایک پیر بہت

یہ اس کی عورت ہے۔ دیکھئے :-

بہارِ من کا تو خیرِ شاداب ہے سلی  
تجھے ندرت نے اپنے دستِ بگیں سے سزا دیا ہے  
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک تھا دیا ہے  
تو صورتِ مرادِ بیکرِ منساب ہے سلی  
تراجمِ اک جہمِ لیشم و کخواب ہے سلی  
یہی حالِ سلی کی تصویر کا ہے ۔

یہ منِ ناز نہیں یہ جلوہ نازِ آئینہ میں تیرا  
یہ معصومانہ چہرہ فخرِ شاداب کا عالم  
یہ متانہ نگاہیں اک بشتِ خراب کا عالم  
سراپائے خیالی عودِ جہمِ ناز نہیں تیرا  
مجموعہ خندہ خراب پڑی دیکھ میں تیرا

اختر کی تصویر میں عین و دل کش ہیں مگر واضح نہیں۔ ان کے رنگ نہایت شوخ ہیں مگر مددِ خیال صاف نظر نہیں آتے۔ ہر چیز پر ایک سببِ شاداب ہے قشقیہات و استقامات نئے نہیں۔ احساس کی صداقت اور شدت نے انہیں بھی زندگی دے دی ہے۔  
اختر کے کلام کی پہلی خصوصیت جو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یہ ہے کہ ان کا عشق قدیم شہر کی طرح نہ کسی جعلی مروجہ کلام کا عشق ہے۔ نہ مروجہ عین کی شاد باندازی کا۔ نہ ایک مرد و بے رنگ عورت کا۔ بلکہ ایک ایسی عورت کا عشق ہے جو اس دنیا کی ہے۔ پہلو میں دل رکھی ہے اور دل میں لطیف مہذبات جو شاعر کے عشق سے متاثر بھی ہوتی ہے، اور اپنے مہذبات کا انہماک بھی کرتی ہے۔ لیکن بعض اوقات سماجی بدشعیں اسے اہوازت نہیں دیتیں کہ محبت کا جواب محبت سے دے۔ اختر کے اس عشق میں کوئی نئی بات نہیں ہے بقول نراق کے ۔  
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے

مگر الفاظ یہ ہے کہ اختر سے پہلے کسی نے اس جوش اور جذبہ سے اپنی مجاہدہ کا نام نہیں لیا۔ عشق بہت سوں نے کیا اور غزل کے لطیف بیخ اشاروں میں اسے بیان بھی کیا۔ مگر یوں اپنی مجاہدہ، اپنے عشق، اپنی واردات، اپنی جوانِ راقوں اور اپنی کمینتِ شاموں کا مزے لے لے کر بیان نہیں کیا۔ بہت حم یا ستم پیشہ دوشی یا موقی اور جاہر یا حجاب کے نام نہیں معلوم ہو جاتے ہیں مگر اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ اختر نے جہاں سلی یا ہزار یا ایمانہ کا ذکر کیا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں بلکہ اسی فردوسِ ارضی کی عورت ہیں جو عشق کا جواب عشق سے دیتی ہیں، اور جن کے عشق پر ندرت مگر آتی ہے۔ ایمانہ کے متعلق لکھتے ہیں ۔

اسے چھوڑوں نے میری یاد میں لے لیا ہے  
ستاروں کی نگرانی رات بھر بے خواب دیکھا ہے  
وہ شمعِ من تھی، پر صورتِ پروانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ بہم جہاں دیکھنا دہتی تھی

ہزار کے ساتھ ہندوؤں کی نگاہ ملاحظہ ہو۔

خداؤں کو جلووں سے روشن کیا  
ہزاروں کو خوشبو سے مہکا گئی  
شبستان میں آئی کچھ اس ناز سے  
کہ پیچھے چن میں بہار آگئی  
تنہا کی بے تابیاں بخشش کو  
جوانی کی رازوں کو تو پا گئی

سلی کے وادی میں آنے کا انتظار اس طرح ہوتا ہے۔

تقا و حیا کی کش مکش کیوں کر مٹاؤں گا  
میں اس کے پاس بیٹھ کر کیونکر گدازوں گا  
اور اس کے لیے سب کس طرح زنگت چرائوں گا

وہ چھوٹوں اور ستاروں سے بھی شرمائے گی وادی میں

سنا ہے میری سلسلے رات کو آئے گی وادی میں

یعنی اختر کی شاعری میں ایسی دنا کامی برکت و حیران، ہمالی و برادری کے بجائے چاہنے اور چاہے جانے کی لذت ہے  
اختر ان شرا میں سے ہیں جو اپنی مشرقیت کے باوجود عشق کی لذت کو عروس کہتے ہیں اور اسے بیان کرنا انہ نہیں سمجھتے۔ ہماری پہلی عشقیہ  
شاعری میں اس میں گاہ کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ لوگ کھل کر عشق ہی نہیں کہہ سکتے۔ وہ اس پر شرمندہ و پشیمان سے ہیں۔ اختر اس لحاظ سے  
جدید شاعر ہیں کہ ان کے اس پیشانی نہیں ہے۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ کائنات میں سے ANNA KRENINA جیسی لازوال  
تخلیق میں بھی (ANNA) کے عشق کو ایک مہم، ایک مذاہب اور روح کو، وہ کہہ کر کے مگانے والا نشر قرار دیا ہے۔ چنانچہ  
(ANNA) اور اس کا عاشق جب پہلی دفعہ یک جا ہوتے ہیں تو بھی خوشی ان کی قسمت میں نہیں ہوتی۔ اختر کے لیے  
عشق ایک عبادت ہے۔ وہ اس فریضے کو ادا کرنے میں خوش رہتے ہیں۔ ان کا عشق سرور و معانیت، ماد و مائیت یا مابعد الطبیعی حسن کے  
بجائے ایک حسین جسم کا متلاشی ہے۔ ان کے یہاں جسم کی یہ سستی (BODY'S RAPTURE) ایک لازمت رکھتی  
ہے۔ اخلاق چاہے اسے کتنا ہی ہراساں کرے لیکن انسانی عظمت اس کا جواز ہے۔ اس دور میں فراق اور جدش کے یہاں جسم کی یہ سستی ابدی  
نایاں ہے۔ پچھلے ہوئے خطوط اور سنیہ شفاف اندو میں بالکل نئے نہیں ہیں۔ تیز اور دوسرے شرا کے یہاں ان کی بہادر بڑی منظر  
فریب ہے۔ لیکن نیچر کے بعد ایک مہذب، اشریف اور اخلاقی نقطہ نظر نے اسے بازاری قرار دیا۔ وہ بھی اس پر صراحت پردہ ڈالی سکی  
اسے فائز نہ کر سکی چنانچہ عشقیہ شاعری میں جنسی کیفیات سے لگنی آتی ہے۔ اور یوں بھی شعرو ادب کے خزانوں میں سب سے  
چمک دار موتی وہی ہیں جو جنسیات کے سمندر سے فراخی کے بعد نکالے گئے ہیں۔ ہمارا پرانا ادب عقور جنس کو پردے پردے میں

ان کے مقابل تھا۔ سید شمس کے بھائے سق ہی کہنے ہوئے ہیں یا صاحب غاستہ از بحر کا فرد زیادہ مجذب تھا۔ اب جنسی بے کے صحت مند شہاد کو اتنی بڑی نغرسے نہیں دیکھا جاتا اور ادب میں یہ ذہنی خلگی دودھ دوز کم ہو رہی ہے۔  
 اختر کے یہاں ترقیت ہے مگر عربی نہیں۔ جہانی محبت ہے مگر پستی اور ابتذال نہیں۔ عورت ان کی نغریں کوئی دانا نہیں بلکہ دیوی ہے۔ ان کے نزدیک کائنات اور اس کی ہر چیز پر عورت کی خدائی ہے۔ مگر اختر کی عورت سے زیادہ اختر کا فی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اقبال کے عاشق ہر جانی کی یاد دلاتا ہے جسے حسن جہاں بھی ہے اور جس مالی میں بھی ہے عزیز ہے۔

گو حسین نازہ ہے ہر لحظہ مفقود نغز

مسن سے مضبوط پیمانہ دنا رکھتا ہوں میں

KEATS نے شاعری میں انکار کی بلکہ حسیات اور خیالات کی جگہ جذبات پر زور دیا ہے۔ خدائی یا حقیقی شاعری جذبات کی گہرائی اور صداقت بہت کچھ ہیں۔ مگر عشیقہ شاعری میں بھی بڑی شاعری محض عشیقہ نہیں ہوتی اور بڑی شاعری کے لیے خیالات کی جلدی یعنی تخلیق کی ضرورت اور کائناتی یا آفاقی رنگ ضروری ہیں۔ یعنی عشق کو محض عشق نہیں دنگی بھی ہو بلکہ جیسے اختر کے ماں انکار کی گہرائی یا جلدی نہیں ہے۔ ان کے یہاں جذبات ہی جذبات ہیں۔ جذبات میں شوق اور شوق کی مصدقہ، سن اور سن کے ذات اکثر خوب بیان کرتے ہیں۔ ان کا یہ شعر دیکھیں۔ مگر ان کی شاعری کی ابھی نمائندگی کرتا ہے۔  
 یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے ہم سہتی کو  
 کہ جو شے ہے خدائی میں حسیں معلوم ہوتی ہے

ان کی طووں میں بھی کھانا اسلوب کے بھائے شاعرانہ رنگ اور جذباتی کیفیت ہے۔ مگر اس میں وہ والہانہ پن اور ہر جانی ہے جو نغیر، واقع، حسرت، جوش اور فراق کی یاد دلاتی ہے۔ اور وہ میں یہی عاشق ہیں جو اپنے عشق پر شراتے نہیں بلکہ فز کہتے ہیں۔

یہ سے چمک کے بھی اس حسن کو پہنچ نہ سکی	یہ چمک کھل کے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا
نازت گیسوئے سلمیٰ پہ بڑھے ہاتھ اختر	یوں گدایا نہ تماشا کے لب بام نہ کہ
اس کے عہد شباب میں جینا	بیٹھے والہ نہیں ہوا کیا ہے
مجھے سے خانہ خزاں ہوا عروس ہوتا ہے	وہ میرے سامنے شہزاد کے جب ہیام نہ رکھتے ہیں
مہلا کیوں کہ نہ ہوں راتوں کو نیندیں میرا اسکی	کبھی لہر چکی ہو جس پہ لعل مشک ہار آس کی
میں تو ہر دم پہ لپکتے نظر آئے دامن	کھینچتے ناز سے جس کو وہی دامن نہ ملا
خواب نشیں میں ہے وہ جان ہمارا	لارہ و نگہت کی داستان غموش

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اختر کی غزلیں باوجود پستی اور لغوی اور شگفتہ ہونے کے اس درجہ کی نہیں جو ان کی نغموں کہے۔ غزل میں جس بلاغت، جس بحر پر ہمارا، جس نکتہ آفرینی کا کمال ملتا ہے۔ وہ ان غزلوں میں نہیں ہے۔ نغموں میں جہاں تصویریں زیادہ بڑی اور رنگ زیادہ شوش میں انہیں دیا دہ کامیابی ہوئی۔ ان کی موسیقی بھی نغموں ہی میں طعنت دیتی ہے۔



چنانچہ اختر کے یہاں ایک نوجوان عشق اس کی پہول اور لذتیت ہے۔ یہ لاکھ سلی ہی مگر صحت مند ہے۔ اختر کی جنت یوں تو سلی، دیکھا نہ یا عذرا کی آخرین ہے۔ مگر اس کی جنت کی تصویر میں فطرت کا حسن بھی ہے۔ یوں ہی فطرت کے آفریں میں اختر کو ملتا تھا ہے۔ ان کی جنت ارضی ہندوستان کی ایک ایسی بستی ہے جو ان کو یہ ہے۔ پہاڑوں کا پس منظر اس کی عظمت اور تقدس کا ضامن ہے۔ اس کے گرد ایک دیبا کے حین ہوتا ہے۔ جیسے حمد کی گردن میں لڑکی کی ہنسی۔ یہ وہ یاد دہانی کی روانی اور ایک مسلسل حرکت کے احساس کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر دنا زینت ہیں، جھوسے ہیں۔ دلچسپ انصاریاں ہیں۔ کام کی شاخوں کے حریری پردوں میں مغفوں کے خزانے ہیں۔ تارے نور کے پیمانے ہیں، اور چاند لڑکی کا پردہ بری ہے۔ مگر یہ سب یادیں ان کی فطرت ایسا اور شمع شہستان کی یاد کو اور روشن کرتی ہیں۔ اختر کے یہاں فطرت (WORDSWORTH) وہ گورنر فطرت کی طرح ایک مقدس بستی ہے۔ نہ بغیر کی طرح محبوب کے لیے پھولوں کی بجائے، اختر اور جوش دونوں فطرت پرست ہیں۔ اگرچہ اختر حسن کی طرح فطرت کی مصدقہ ہیں بھی دھندلے یا ایک حین ابھام کے عاشق ہیں۔ جوش اختر سے زیادہ واضح ہیں۔ اور ان کی نظر فطرت کی بے مری پر بھی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اختر کو اردو کا پہلا روحانی شاعر سمجھتا ہوں۔ فطرت عورت یا ماضی، ان سب کی مصدقہ ہیں اختر چیز سے زیادہ اس کے عقیدے کے عاشق ہیں۔ ان کا نوجوان عشق انہیں کسی چیز کو عذر سے دیکھنے نہیں دیتا۔ ان کے یہاں رنگوں، نقوش اور خطوط کی بہاریں ہیں۔ پہاڑ کی پھولیں اور فردوسی مناظر کی قلعہ ہیں۔ حسن اتفاقات یہ یادیں انہیں اس دنیا اور اس کی تہذیبوں سے دور لے جاتی ہیں مثلاً سر زمین عشق میں ہے

ہنگامہ عالم سے دور، آفت گرمی سے دور

اس مگر کی دنیا سے دور اس ظلم کی بستی سے دور

اس رات اس دن سے الگ اس ادھ اس بستی سے دور — اک سر زمین عشق ہے

اسی طرح تاثرات منفرد ہیں وہ ایک خیالی جنت کی تصویر کھینچتے ہیں۔ مگر وہ اس دنیا کی بہاروں کے بھی دلدادہ ہیں۔ اور اس حد

تک دلدادہ ہیں کہ جنت کی بھی آمد نہیں کرتے

یہ دنیا، یہ بھاری سے اور یہ رنگینی فضاؤں میں

یہ جلوسے چاند سوج کے، یہ تانہائی ستاروں کی

یہ نزہت لالہ لڑکوں کی، یہ رفت کو بہاروں کی

یہ بھینی بھینی آوارہ سی غریبوں کی جواؤں میں

یہ بھری بھری مٹی جھوننے والی گھٹاؤں میں

یہ تیزی آبشاروں کی، روانی جوبہاروں کی

یہ پھولوں کا ہجوم اور یہ لطافت سبزہ زاروں کی

یہ موسیقی جو قصاں ہے پردوں کی صداؤں میں

یہ نغمہ یہ ترانے یہ شراب و شعر کا عالم  
یہ آرائش مکالموں کی یہ زیبائش کیموں کی  
یہ دماغی حسینوں کی یہ صحبت نازنینوں کی

یہ عروسیں یہ بہادریں یہ شباب و شعر کا عالم  
نہ لے جا غلام میں یا رب یہیں پہنچے دے تو مجھ کو  
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

اس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختر کی دماغی شاعری میں فراہیت کے بجائے زندگی کے حسن و مرتت کو مذہب کو لینے کی تمنا ہے۔ اختر اور دیوی نے لکھا ہے کہ اختر کی شاعری میں گریز و ہجرت کی تمنا کو دھڑلے سے دھکی دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں اختر گریز و ہجرت کی طرف بھی جاتے ہیں۔ مگر زندگی اس کا حسن و اداس کا دھماکا انہیں اپنی جنتِ ارضی کی طرف لے آتا ہے۔  
اختر کے یہاں عشق میں مرنے کی خواہش بھی ہے اور جگ جگ جوئی اور شمشیر زنی کا ولولہ بھی۔ اود آزادی کے نام پر مار مار کر مارنے کی آواز بھی۔ ان چیزوں میں بظاہر تضاد و تفرق آتا ہے۔ مگر دراصل اختر کی روحانیت کے یہ مختلف پہلو ہیں۔ سطلے کی تصویر کو سینے سے لگا کر ہانا ایک مقدس طریقہ ہے۔ اود آزادی کی جدوجہد میں وطن کی خاطر تورا اور اٹھانا اود نہ خوں سے لکھنا ایک جادو ہے۔ جوانی کو جہاں جہاں جیو ہیں وہاں خوں چکاں لکھنا کا ہنا تو بھی۔ وہ محبوب کی خاک کے ساتھ اپنے لبوں کی رنگینی کو نہیں بھولتی۔ اس لیے یہ سپاہیانہ عشق جو بھول داند نے لڑنے و سطلے کے ایک نایب کی یاد دلاتا ہے۔ جوانی اور لبوں کی روانی کا عشق ہے۔ اود اس کی شدت اور تیزی باوجود سطلے بونے کے دھپ ہے۔

وہی اختر کی فن کاری تو رنگوں۔ کمرن اود ترانوں کے اس شاعر نے تشبیہات و استعارات سے بٹا کام لیا ہے۔ اختر کی تشبیہات نئی نہیں۔ لیکن اختر کے مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ اس سے اختر کا شعور فنی ظاہر ہوتا ہے۔ دماغی شاعری میں فوق فطری عناصر اود ان فن میں فوق بشری عناصر کو دیکھتا ہے۔ اختر نے اپنے استعاروں میں اسی اصول سے کام لیا ہے تاثراتِ نغمہ اور چوڑھویں ساگر کا تختہ روان میں یہی اصول کار فرما ہے۔ جن کی وجہ سے ان میں روانی اود دل کشی آگئی ہے۔

نفر کے سامنے رخصاں ہیں رنگین دایاں گویا

شراب و شعر میں مودی ہوئی ساری نغمائیں ہیں

افق پر موجزن متانہ خوابوں کی ہوائیں ہیں

فضا پر بس رہی ہیں لڑکی آبادیاں گویا

ملا میں پر فشاں ہیں حسن کی شہزادیاں گویا

تساے نذر کروں آفتاب نذر کروں  
کلی کا حسن لگوں کا شباب نذر کروں

دیباچہ غزل کی شادایاں کردوں حاضر      نغمہ و حرکات زنجیں حجاب نذر کردوں  
ذیل سائوہ چرخوں سے محروم ہے      کہ میں بھی جو دھوپ کا مہتاب بندہ کردوں

غزل اختر کی رنگین، وحشیانہ، سنہری پردوں میں پیش ہوئی فضا کے لیے یہی فکری موزوں ہے۔ جہیں تاروں سے بے اختیار دیکھا ہے، یا یہی وادی ہے۔ وہ ہم جہاں دیکھنا نہ سکتی تھی یا خوش آمدید میں تشبیہات خیالی، انگریز نہیں ہیں۔ خیال کو ہلانے کے لیے ہیں اور پڑھنے والے کا ذہن چھلکاؤ ایک رنگین دنیا میں پہنچا رہا ہے۔ اس رنگین دنیا کا مسن کچھ عرصہ کے بعد ماند پڑ جاتا ہے یہاں کے پھولوں میں لائے یہاں کی پانڈی دائروں میں سائے بھرتے نظر آتے ہیں۔ مگر سب ذرا بعد میں ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ نعین ہیں جادو کے دیو کچھ نکل پھرا دیتی ہیں۔ اور وہیں اختر ایسے شاعر ہیں جنہوں نے سانیٹ کی حدود اور تنگ دنیا میں شگفتگی اور روانی پیدا کی۔ سانیٹ ان سے پہلے محنت اللہ خاں وغیرہ نے بھی لکھے۔ اور بعد میں ان کے آٹھ سے زائد عام ہو گئے مگر انہوں نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اگرچہ اردو میں سانیٹ کی وجہ سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اور اسی وجہ سے سال میں اسے ترک کیا جا رہا ہے۔

لیا اختر کی شاعری بے وقت کی راگنی ہے؟ کیا اس کی عمر بہت کم ہے؟ کیا اس کا سن ایک رنگین لمحہ، ایک میٹھی یاد کا حسن ہے؟ کیا اس شاعری کی ہمارے ادب میں کوئی بہتیت نہیں؟ آج یہ سوال قدرتی طور پر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ آج کی دنیا اور آج کے ذہن کی ELIOT نے اپنی ایک نظم میں بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے۔

I HAVE LOST MY PASSION: WHY SHOULD I NEED TO KEEP IT,  
SINCE WHAT IS KEPT MUST BE ADULTERATED

یہ ذہن بڑا سخت کافر ہے۔ یہ ہر حسین و حسد کے میں چھپے ہوئے فدا ہر ملکوتی حسن کے زوال، ہر جذبے کے نشیب و فراز سے واقف ہے اس لیے یہ رومان کے بجائے حقیقت، جذبے کے بجائے فکر، خواب کے بجائے بیداری اور ذہنی ایجنٹ کے بجائے ذہنی تول کو پسند کرتا ہے۔ یہ مفید صحیح ہے۔ مگر اس کے باوجود اختر کی محنت ادنیٰ کا حسن کم نہیں ہوتا۔ اس میں زندگی اور صداقت ہے۔ یہ زندگی ساری زندگی نہیں ہے۔ حسن مرث شباب کی آوارہ نگہی میں نہیں بلکہ قدرت کے بدلتے ہوئے نظاروں، زندگی کے نئے نئے انقلابات، نئے تجربات اور دعوات میں بھی ہے۔ اختر کی شاعری کا بڑا حصہ حسن کے اس تصور تک نہیں سمجھتا۔ اس میں ایک ذہنی بچپن ہے مگر اس بچپن کے باوجود اس کی کشش زندگی اور رنگینی میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری اردو شاعری میں رونا بسودنا بہت ہے۔ پرانی شاعری ایک مریض سرسائی اور مریض عشق کی وجہ سے زندگی سے اور زندگی کے نشا و انبساط سے محروم تھی۔ موجودہ دور میں زندگی کی سخت چٹکی نوجوانوں کو بہت جلد پس والتی ہے۔ ان کے منہ کا مڑا کر دیا ہوا جانا ہے۔ وہ وقت سے بہت پہلے پڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کا احساس محرومی انہیں کبھی کبھی کہنے نہیں دیتا۔ اختر کی شاعری شباب اور اس کے رومان کی شاعری ہے۔ کیا ہوا اگر ان کا جادو زیادہ دیر تک نہیں رہتا۔ ان کے یہاں جادو تو ہے اور شاعری میں جہاں بھی جادو ہے بڑی چیز ہے اور جہاں جادو نہیں وہاں بڑی سے بڑی چیزیں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔

# فیضی کا نظریہ شعر

## ڈاکٹر وحید قریشی

فیضی کے نظریہ شعر کو سمجھنے کے لیے ابو الفضل کے نظریہ فن سے واقف ہونا ضروری ہے۔ فیضی ایک انفعالی کردار تھا۔ اس کا اپنے سے بھائی کے نظریہ فن سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ اسی میں ابو الفضل کی عظمت اور فیضی کے نقطہ نظر کی صحت کا راز ہے۔ زندگی کے ابتدائی ایام ہی سے چھوٹے بھائی کی علمی فتوحات اور عام زندگی میں اس کے فیصلوں کی درستی نے مبارک پر واضح کر دیا تھا کہ فیضی پر ابو الفضل کو ترجیح حاصل تھی۔ اس ترجیحی سلوک کو فیضی نے فوراً قبول کر لیا۔ اور ہمیشہ اپنے بھائی کی علمی نگ و دو اور معاملہ شناسی کا معترف رہا۔ اس انداز نظر کا اثر فیضی کے نظریہ شعر پر بھی پڑا۔

ابو الفضل کے نظریہ فن کے تین بنیادی نکات ہیں (دو) الفاظ و معانی کا رابطہ (دب) تقلید و انفرادیت اور تصوف (ج) ادب اور صوفیانہ انداز کی اہمیت۔ اگر کسی دور نے باقاعدہ الفاظ اور معانی کی برابری اور گہرے رابطے کو تسلیم کیا ہے تو وہ فیضی اور ابو الفضل ہی کا دور ہے۔ اگر فیضی نے قدیم ادب کی پیروی کو عملی شکلات کے پیش نظر نا درست قرار دیا اور اپنے فن اور نظریہ فن کو میکا کی ہونے سے بچا لیا۔ اس طرح جاندار اسلوب بیان کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ قدیم اسلوب پر ابو الفضل کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے۔

ہم کی بیچ برائش الفاظ باشد و معنی را پیرو لفظ دانستہ بر داز گویں روئے نگاہ بویں روئے

لے بوئن دیباچہ امین اکبری ص ۲) لے انشائے ابو الفضل ص ۳۳ لے ابو الفضل نے ایک جگہ اکبر نے میں اپنے باپے میں فیضی کا یہ شعر نقل کیا جسے

صد سالہ رہ میان من و دوست در کمال در و اگر از دو و دو سہ سالے فروں ترم

لے عبد القادر بدایونی لے منتخب التواریخ جلد سوم ص ۹۹ پر فیضی کے حال میں لکھا ہے :-

فیضی در اواخر بقریب برادر خود کہ اور اغلامی می نویسنده بکشت علوشان دران وزن تخلص فیاضی اختیار نموده و سازگار نیامد و بعد از یک دو ماہ رخت حیات از عالم برداشته

لے انشائے ابو الفضل ص ۲۸ لے اس لیے فیضی بھی عتشم کا شی کی شاعری میں فقط و معنی کی برابری کا قائل ہے :-

حیرت یافت معنی عتشم کہ در کاشاں	بطر تازہ تر از ہر سخنوری دارد
یکے زنگتہ و راں گفت ویدم اشعارش	عبارت معنی کہ سر سہری دارد
بگفتش معنی او عبارت است لے	عبائے کہ بہ معنی برامری دارد
چہ طوط بندم ازین ہر دوان نافلہ کش	کہی کشتہ نخست از تن خیال لباس

ابو الفضل قدس سرہ نے اپنی نظریہ شعر کا تصور سے ناظر چرٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگیری دور میں یہ آسانی اس لیے بھی ہے کہ اس زمانے سے ہندوستان میں ادب اور فن کے تصور سے متاثر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تصوف کی تخلیقات میں یہ امتیاز کہ رومی تو صوفی شاعر ہے اور جاتی محض نمک بند زیادہ گہرا ہونے لگا۔ نتیجہ تفریق کی وہ ہفت رنگ چمک دمک شروع ہوئی جو ”تازہ گوئی“ کہلاتی ہے ”رسمیات“ کی مخالفت کا رجحان بھی بڑے زور شور سے اُٹھا۔ یہ بھی ایک حد تک رومی کا فیض ہے کہ ابو الفضل اور فیضی کا صوفیانہ درجہ ”مطلقہ“ کی منزل سے کہیں آگے اور بد تحقیق ”کے دم قدم سے“ بادل ہے۔ شعر اور تصور کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا اس لیے بھی ممکن تھا کہ جیسے تصوف زندگی بسر کرنے کا ایک انداز تھا اسی طرح فن شعر بھی اپنے تمام لوازم کے ساتھ ایک مضابطہ معیات ایک راہ عمل بن جاتا ہے فیضی تو یہاں تک کہہ جاتا ہے :-

فیضیم عاشقِ جمالِ سخن      کز دو عالم مراد من سخن است  
از ہر روئے در سخن دارم      قبلہ اعتقاد من سخن است  
بیچ گاہے از دگر بزم نیست      پیر من او ستاد من سخن است

یہ پُر خلوص ذہنی رجحان جہاں فیضی کی شاعری کو جذباتی گہرائی اور وسعت عطا کرتا ہے وہاں اس کے نظریہ شعر کو بھی صوفیانہ انداز فکر سے متاثر کرتا ہے۔ اس دور میں اس کے بغیر جذباتی وسعت ممکن ہی نہ تھی۔ یہ اثر اک عمل نظریہ شعر اور تصور کو ہم گام کر دیتا ہے۔ اور ہر دور رجحانات میں زبان کی وحدت بڑی آسانیاں پیدا کرتی ہے۔ ”معنی“ اور ”صورت“ و ”احد وغیرہ الفاظ ہی کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ ایک ذہنی افق کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ ابو الفضل کے نزدیک قدما و معاصرین ”وہ زدہ پندار“ اور ”غارت کردہ تقلید“ ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں اس کا اپنا اسلوب بیان ”مباح شاد کاظمی“ جس ادب پارے میں محبتات صوفیانہ نہیں مان کا کھٹے والا لہجہ الہی الامجاد عبادت آئے اور وہ محتاج ”برادران صورت“ کے لیے ”بازار پر سبابت“ ہے۔ دنیا داری کے معاملات انسان کو ”کیا کرے“ نہیں بنا سکتے۔ اس کیمیا گری کے لیے تو ضرورت ہے ”معاملات صوری و معنوی کا از صدق فروغی داشتہ باشد“ کیونکہ یہی چیز تو بد بخت و نژادوں کے کام آتی ہے۔ بڑے ریاض کے بعد کہیں جا کر یہ نقطہ نظر حاصل ہوتا ہے :-

چشم جان را مہر مہ کشت فیضی کہ اربابِ نطس      روئے سخن را بردن ہائے سرفاں دیدہ اند

لہ رومی کہتے ہیں :-

خلق را تقلیدِ مشاں زیاد داد      اے درد لعلت برین تقلید باد

فیضی کہتا ہے :-

دل بستگی بستر تحقیق بخشش      آزادگی ز قید تسلیمِ دہ

لہ انشائے ابو الفضل ص ۲۴

لہ ایضاً ص ۲۴ - (انوری کے بارے میں)

لہ ایضاً

لہ ایضاً (ظہیر زاریابی کے بارے میں) ص ۲۴

لہ ایضاً (حکیم سنائی کے بارے میں) ص ۲۴

نصوت کی چھاپ جب نظریہ شعرچہ لگی تو فیضی اور ابوالفضل کا ادبی زاویہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ نصوت میں ان کی مندرجہ ذیل نظیہ ہے آگے نقلی کو فیضی میں بھی ”غارت کو“ تقلید“ کو انھوں نے ناپسند کیا۔ اس طرح ”تحقیق“ اور ”انفرادیت“ ہم معنی ہو گئے اور آگے راستہ صاف تھا۔

اس سے پہلے نصوت اور شاعری کو یوں گھلا کر دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ سبب شاید یہ تھا کہ ہر علم کی حدود مقرر تھیں اور ہر ضروری نہ تھا کہ ایک علم دوسرے کے ساتھ مل کر عقلی وحدت بنا سکے (جد باقی وحدت کا سوال ہی نہ تھا) اس لیے نظریہ فن نصوت کا اثر اقدار اس سے پہلے ہمیں نہیں ملتا۔ اگرچہ اصطلاحات کی یکسانیت پہلے بھی پائی جاتی تھی لیکن نظریہ فن کا بنیادی تعلق نصوت کی بجائے عموماً علم معانی و بیان ہی سے رہا ہے۔ یہ اکبری دور کی خصوصیت ہے کہ محض کوششیں اجتماعی رنگ اختیار کرتی تھیں اور ترقی خواہ عناصر یہ دوسے کارا گئے۔ ان عناصر کی زیادتی نے فارسی شعر و ادب کی کاپیٹ کر دی۔ اور اقدار ادب جیسے بنیادی مسائل جو اس سے قبل محض زبان کو اپنی اساس قرار دیتے تھے نصوت کے زیر اثر اقدار حیات کو بنیادی ماننے لگے۔ اگرچہ اس دور کے ادب سے بھی ”زبان“ کی اہمیت سے پورا انکار نہ ہو سکا۔ پھر بھی قطعی فیصلہ خیالات و جذبات کی اہمیت کے پیش نظر ہی ہو سکتا تھا۔ وہ ادب گھٹیا ہے جس کے محتوبات ارفع و اعلیٰ انہیں اور ارفع و اعلیٰ محتوبات صرف صوفیانہ ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ ابوالفضل اور فیضی کا عقیدہ تھا اس تراز میں انوری کی شاعری پوری نہیں اترتی بلکہ اسی پر سنائی کی شاعری کا ایک حصہ ناقص قرار پانا سکتا ہے۔ اسی وہ مقام ہے جہاں خاقانی کی ”خود سنائی“ لائق تعزیر بنتی ہے۔

اسے کاش اور اسجن خودش اس قدر نفع رساندے تا از حسرت نیافت مراتب  
دیوی نجات یافتہ بگلشن سراسے خوشندی رسیدے گئے

یہ انداز نظریہ اتنا ہی خام ہے جتنا زبان کو بنیادی قرار دینا تاہم اس سے ”جدت“ کا اندازہ تو ہوتا ہے۔ اگرچہ صوفیانہ شاعری کے سوا ہر شاعری کو گھٹیا قرار دے لینا خود فریبی سے کم نہیں۔ پھر اس نظریے میں یہ خرابی بھی تو ہے کہ نقاد محض صوفیانہ خیالات ہی کے اعتبار کو اہم مان لے اور اس طرح جامی اور امی کے ساتھیوں کی خشک شاعری کے لیے راہ نکل آئے۔ اور جامی بھی رومی کے درجے کا شاعر سمجھ لیا جائے۔ اگرچہ ابوالفضل کو اس کا احساس خفی ہے ورنہ وہ ”صدق“ کا لفظ استعمال نہ کرتا۔ لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ محض خلوص اچھی شاعری کا ماسم نہیں تو بات وہیں رہ جاتی ہے۔ اور اس طرح ابوالفضل کے اپنے وہ اشعار جو صوفیانہ خیالات کے حامل ہیں وہ بھی اعلیٰ درجے کی شاعری کہلا سکتے ہیں۔ حالانکہ ابوالفضل کی شاعری ایک خشک مولوی کی شاعری ہے اس کے برخلاف فیضی کی شاعری ایک زندہ دل صوفی کی شاعری ہے جس میں جذبات و احساسات کی رنگارنگی اور زندگی کی تمام نشانیوں کا وجود ہے۔ تو پھر فیضی اس پھیلے پھیلے سے کیسے دامن بچا گئے؟ حالانکہ صوفیانہ خیالات کی عظمت کے وہ خود بھی قائل تھے۔ اور با حیات میں اس کا اعتبار انھوں نے بڑے کھلے انھوں میں کیا ہے۔ اس کا جواب ہمیں اس رد عمل میں ملتا ہے جو جامی کے رفا کے خلاف اس دور میں ہوا۔ اور جس میں فیضی، عربی، نظیری اور ظہوری بھی شریک

۱۔ انشائے ابوالفضل ص ۲۲۲ - ۲۔ انشائے ابوالفضل ص ۲۲۲

۳۔ ” ص ۲۲۲ - ۴۔ ” ص ۲۲۲

ہیں۔ یہاں پہنچ کر فیضی بہتے نہایت سے ایک سوکڑے دوسرے معاصرین کے گروہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔  
 فارسی شاعری کی یہ نصیبی کے دور کا اگر کبھی جائزہ لیا جائے گا تو حتمی اور اس کے معاصرین کی تقریریں بہت بڑے فوہاد  
 میں شمار ہوں گی۔ فنون لطیفہ کی ترقی و اشاعت کا زمانہ بھی کم و بیش یہی ہے اسی دور سے بہت زیادہ جیسے بھی کاروں کو پیدا کیا۔ اور اسی دور  
 نے شعری۔ فن تعمیر اور دوسری صنعتوں کو عروج تک پہنچایا۔ لیکن یہی وہ بد قسمت دور ہے جس نے فارسی شاعری کی آبرو کو خاک میں  
 ملا دیا۔ خود نظریہ شعر بھی اس دور سے اگر متاثر ہوا تو صرف اس قدر کہ تنقیدی اصطلاحوں میں ”سمن گذاری“ DESCRIPTIVE  
 کی ترکیب کا اضافہ ہوا۔ ورنہ شاعری تک بندی ہی گئی۔ اور نظریہ شعر لفظی بحثوں کی آماجگاہ ہوا۔ شاعری ادب پر کوئی بڑا احسان  
 نہ علیٰ غیر لڑائی کا ہے نہ جانی کا ممکن ہے منگووں کے حملوں کے دور رس اثرات خاص کر اقتصادی اثرات نے زندگی کی بنیادیں  
 ہلا کر غیر معیہ علوم کی برپا دی۔ سامان کیا ہو۔ لیکن یہ تو قلعی ہے کہ فارسی شاعری خشک فلسفیانہ موٹنگائیوں اور بے جان صوفیانہ خیالات  
 کا مجموعہ بن گئی۔ جس میں جذبات و احساسات کی عمدہ اہمیت تو کھانڈ و جذبات و احساسات کی موجودگی تک بحث طلب ہے۔ سراسر کا  
 بلا واسطہ رد عمل فغانی کی اور امش درنگ کی تحریک ہے۔ جس میں تسنوت کی جگہ دنیا داری نے لے لی۔ بہار و نگار کی بزم آرائیاں۔  
 چنگ و نے کی فخریہ آرائیاں اور باد و ساغر کی جنگامہ آرائیاں مطیع نظر بن گئیں۔ ہندوستان کی سرزمین اس کے مقابلے میں بہار و نگار  
 سے خالی تھی۔ لیکن یہاں صوفیانہ ادب کی روایات مسلسل اور مربوط شکل میں باقی تھیں۔ یہاں تو متضاد عناصر میں یکا نگت کی تلاش ہی  
 سے نیا راستہ ممکن تھا۔ باہر کی آمد کے بعد ایرانیوں کا تائید و تائید چکا تھا۔ اور افغانستان کی سرحدیں بھی سمٹ سمٹ کر مغلوں کی آغوش  
 میں آچکی تھیں۔ اور درنا۔ شاہی میں فارسی زبان و ادب کے مرتبی پیدا ہو گئے۔ اس نئی فضا میں اکبری دور تک نکھارا گیا۔ اس  
 زمانے میں محمد شاہی جہان تو نہ تھے لیکن محمد شاہی کس بل مزور موجود تھا۔ مغلیہ تہذیب کی شائستگی، لطافت اور بے سمنے کے  
 انداز کو آرٹ کا سلیقہ دینے کا دستور عروج پر تھا۔ اس فضا نے عرقی۔ فیضی۔ ابو الفضل اور سینکڑوں ادبا کو پروان چڑھایا۔  
 جن پر نازی ادب کو آج بھی ناز ہے۔ بالکل اسی طرح کی اچھائی شریک دکن میں بھی پیدا ہو رہی تھی۔ جس سے ظہوری۔ ملک قمری اور  
 بعض دوسرے شعرا نے کسب فیض کیا۔ اور یہ سب ادبا ادب کو نئی زندگی عطا کرنے والے تھے۔

شاعری ایک نئی تحریک سے زندہ ہو گئی۔ تازہ گوئی کا رواج ہوا۔ اگرہر سیکری۔ اور دلی کی لگیاں اس نئی بوہاس  
 سے بس گئیں۔ یہ تبدیلی محض لفظی نہ تھی۔ اس نئی تہذیب میں عالم گیر علم و ادب اور جذبات کی امٹ توانائی تھی۔ ترقی۔ عرقی اور فیضی کو گرد پیش  
 کے تغیرات کا احساس تھا۔ اور اسی احساس نے انھیں نازہ گوئی کا نمائندہ بنا دیا۔ وہ بات کہنے کا جذباتی انداز وہ چاہتا تھا۔  
 جو جانی کو نصیب نہ تھا۔ انھوں نے اسے پایا۔ عظیم فن کاروں (حافظ۔ سعدی۔ رومی۔ خواجہ غفری وغیرہ) کے شہ پاروں  
 کے زیر سایہ اظہار کے راستے دکھائے۔ رسمیات کو ترک کر کے روایات کے جاندار حصوں سے کسب فن کیا۔ انسانی شخصیت کی  
 تدریجہ جذباتی حیثیتوں کو اجاگر کیا گیا۔ مثلاً بے کی قدرت اور فن کی پختگی سے تغزل کی ایک انوکھی سطح کا اکتشاف ہو گیا۔

گفت و گوئے خم یعقوب بویں پیرا  
 بولے پیراہن بوسند دہرا اندیشہ ما

کو کبھی صنعت و اثرات دے فرق ہے است  
 قوت بازوئے دل ہی طہ تیشہ ما

لے بازرگان سخن صاف ندیدیم دولت بے سبب نیست کہ چندین سخت نامعات است (فیضی)

دردِ دل مانجھ دنیا بھم معشوق شود بادہ گر خام بود بخون کند شیشہ مانجھ  
یہی وہ نقطہ نظر ہے جس سے فیضی نے اپنے بھائی کے زہد خشک، کاتوڑنگی اور اپنی شاعری کو مادی اور خاص کر "بہار و نگار" کے علائم سے ملاکر اسے جادو شرب اور نور شید کا ہم سنگ بنا دیا۔ جہاں مرقی نے غم دنیا کو غم معشوق بنا کر اپنے زمانے کی نئی رو کا ساتھ دیا تھا۔ فیضی نے بھی تصوف کو جذبات کی سطح پر لا کر دیکھا۔ اور اس کی وسعت، پختگی اور صد رنگی کو نمایاں کیا۔ اس سے اس کا نغمہ زیادہ شیریں اور طرب آلود ہو گیا۔

فیضی ایں بزم نشاط است لب شوق پر بند	از سخن زمر مرہائے طرب آلود بیار
بہار و فیضی چو آمد بہ دورِ ما فیضی	بشعر ترجمہ آفتاق را فرد گیم
مگر کہ از اثر گریہ ام بود فیضی	چنین کہ گفت من آبدار می آید
گرچہ فیضی براؤ زہد افتاد	غرضش عاشقانہ افتاد است
حال خود گویم کہ می باشد بدول	حرف عشق از ہر عن نزدیک نور

انسانی عشق کو بیان کرنے والے الفاظ اور آداب و اشغال کو تصوف میں بہر تنے سے رہ رومانی اور جذباتی فضا میں ساتھ رہی جو مادی عشق سے وابستہ ہے۔ یوں بعض مخصوص الفاظ (سے) نغمہ جادو، شرباب، نور شید، جامہ، آنکش، مشعل قدسیں، سرمستی، خواہ ارفوں، حرولیت، نعرہ مستانہ، صہبا، بیکدہ، سے خانہ) کو ان کے INOTONA CONTEXT سے علیحدہ کر کے وسیع تر کینوس پر استعمال کیا گیا ہے۔ تصوف کے ساتھ ساتھ اس دور کے شعر اکادوسر محبوب موضوع فن شعر ہے جو دستور کو موضوع بنانے میں بھی یہی علائم کار آمد ثابت ہوئیں۔

جب تصوف طریق حیات ہے اور شعر بھی طریق حیات ہے تو خود شعر کا موضوع بن جانا آسان ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تباہی تو بزم پہلو اور مرکز جذبات موضوع یا تو معاصر شاعر (رقیب یا حرولیت) ہمہ سکتے ہیں یا پھر غایتی کے وہ مراحل جو اپنے اندر عذاباتی قدر و قیمت رکھتے ہوں۔ کیونکہ الہام کا سرچشمہ اور شعر کا منبع تو ہر حال میں دل ہے۔ دل، سوز و دل، تجزیہ، اظہار، اثرات باہر الفاظ دیگر شاعرانہ عمل POETIC PROCESS کے مختلف مظاہر یقیناً موضوع شعر بننے کا آسان ترین حق رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر اس دور کے شعر کا سرمایہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ اور فیضی کے ہاں تو دیوان کا تقریباً ایک ثلث حصہ انہیں موضوعات پر مشتمل ہے۔ مرقی اور ظہوری کے ہاں بھی ایسے اشعار کافی ہیں۔ لیکن نظیری اور فیضی اس معاملے میں سب پر سبقت لے گئے ہیں۔ شعر کو الہام تو پہلے سے مانا جاتا ہے۔ اور اکبری دور سے کہیں پہلے شعر اُنے شعر اور صوفیانہ الہام، کامر کز دل تو مان لیا تھا۔ بہر حال عشق کامر کز ہے چاہے یہ عشق شعر ہو یا عشق خدا۔ اس لیے شعر کو جب فیضی نے موضوع بنایا تو اس کے اثرات میں غیبی کی تمام صفات اور عشوہ طرازیوں میں شامل ہو گئیں :-

لہذا دیوان مرقی (تو لکھنؤ پریس) ص ۱۷۷

بزم خاص است در دیکتہ بدستور بیار  
معنی نمودر طلب کن سخن دور بیار

لحد نظیری کتاب ہے :-



مست ز سخی رسد از دل بر لب ما  
باشع ز سوز و درد جنتاب نسا زیم  
مضطرب بلند ساز کن آتش ترانه را  
فیضی اگر ز نظم خود صیبت بلند بر کشی  
چہ جادو نیست ندانم بطور گفتارش  
مریر کلک ز فیضی بہ بزم گاہ صبح  
فیضی بد بخت ماز نگاران بند پرس  
دوش رندانہ شیندند فیضی غرضے  
فیضی حدیث عشق رقم زد کہ علامت  
گر چہ فیضی راجہوں انگیزی آید سخن  
کلک فیضی می و ہد کلک سے نر  
بتاں گرم نفس اند بر شعر فیضی

عشقست کہ بر بستہ زبانی ادب ما  
خورشید پور سخن غرور و شش  
وز شعر من بخوان غزل عاشقانہ را  
مشعل ندر سیان کنی معنی دل فروز را  
کہ باز بستہ زبانی سخن طرازاں را  
نوا بلند کند از غنوں نوازاں را  
کین کار گاہ سحر بہ جادو گداختیم  
کہ بہ صد نعرہ ستانہ ز محفل برخاست  
معنی نگار و نکتہ طراز آفریدہ اند  
طراز گفتار سخن گوئے مراد پورانہ کرد  
می رود معنی رنگیں شلخ شلخ  
ز سب جادو آموزہ جادو غیا لاں

فیضی اس طرز دل آویز کہ دای بہمن

مکران شویخ سخند ان من آموختہ

فیضی کے نزدیک شعر کی یہ الہامی صفات اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب دل عشق کی چوٹ کھائے ہوئے ہو۔ یہ

خلش اضطراب شعر کی روح رواں ہے :-

بشوق تازہ گلے گفتہ اس غزل فیضی  
گر چہ فیضی از جہاں طواریتی در لوت  
شب کہ فیضی سخن از سوز دل خود گفت  
فیضی از حال دل و دیدہ سخن می رانی  
بجلس ماکراں چنیں گرم است  
دل من سوخت فیضی از سخند  
نظم فیضی راجہ می بینی کہ عشق  
بروند ز بردہ راز مستی فیضی

بیاد آر کہ از نکتہ تائید حیدہ ماست  
حسب حال عشق بازاں مانند یوای غزل  
دل صاحب نظر از گرمی معنی می سخند  
کہ سیاهی زہر کلک تو غول آمیز است  
از نفسہائے آتشیں گرم است  
کہ ز معنی دل ششیں گرم است  
صد چنیں گلہائے رنگارنگ داشت  
گل پیر چنان چاک دامن

نظم من معنی ترشہ شدہ ہواں می دارد کہ سیاهی بنویسند و نمایند شگرت (فیضی)

لیکن اصل موضوع وہ تحقیقی عمل ہے جس سے جذبات اکائیں میں تبدیل ہو کر شعر بنتے ہیں۔ بعض اوقات جذبات کی طرح نکلا جاتی ہے۔ کھنکھالہ زنگ خود اپنے جذبات کے اعلان میں کامیاب ہوتا ہے لیکن شعر اپنا اثر نہیں دکھاتا۔  
دوش ہر بادہ کہ بر باد و حیران  
دل میں سوخت و لگے گری احباب نداشت

بعض اوقات جذبات لگ لگ کر کہتے ہیں :-

گو ہر دل کم قد بہ دست فیضی      پاکبش افتادہ چہو کہ خود ادی  
خوں گرم ازین بخت کہ ہرگز گیلکا      گلہ سستہ تر بند و سن غار بہ بندم

پھر جن لمحے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جذبات کا دھواں دھار لاد اٹھتا چلا جاتا ہے :-

فیضی پہنچا کہ شد نکتہ سلسلے قدسیا      ہر دوش از نے قلم زمزمہ ساز یا نتم  
مگر زنا ز گئی طبع زو رستم فیضی      کہ خلد تر شدہ از نیک خاصہ آب چکید  
ز فرق تا بہ قدم موبوٹے من معنی مست      گماں میر کہ درین خانہ نقش و دیو ام

اس کا تجربہ تو ممکن نہیں جس ایک اندر و فی خلش ہے جس پر نچ پانے کے لیے فیضی اپنی ناکامی کا سہارا دہمت "کو

بناتا ہے

با خود بہ نبردیم دریں معرکہ فیضی      وقت است کہ ہمت برساندند و ما  
از خود و ہمت خود ایں قدر امید ہنوز      کہ بگنجینہ عجب آیں ہمہ بر بندم طرٹ

یہاں پہنچ کر شعری عمل کے تجزیے کی منزل آتی ہے :-

عجب ترا ز دل فیضی ندیدہ ایم طلسم  
کہ ہم گم بود و ہم محیط و ہم خواص

لیکن شعری عمل میں ایک غیر واضح اور ناقابل فہم الہامی کیفیت ہی نہیں۔ اس کے سرے تو زندگی ہی سے ملے ہوئے ہیں۔ ایک طرف روایت (TRADITION) ہے اور دوسری طرف اپنی شخصیت کے گہرے نقوش اور تجربات کی انتہا گہرائیاں۔ تجربہ دل کے راستے ان گہرائیوں اور جھیلیں میں ڈوبتا ہے۔ روایت بھی اسی پر اثر انداز ہوتی ہے، شخصیت بھی اپنا رنگ روغن لے جاتی ہے۔ جب کہیں جا کر شعر میں نکھار بائیں اور جا دو بھر تا ہے۔ اسی تمام پیچہ اور منزلوں کو ایک قطعے میں فیضی نے یوں پیش کیا ہے :-

فیضی ہم کہ با حسنہ آسمان نورد  
یک چند سیر عالم انصاف کرد لہم

ابو الفضل اسلوب کی دالا پاگی کے لیے "معلوم درست" کو ضروری قرار دیتا ہے اور اسکی تشریح میں کینٹائی انویسٹ  
جہتوں سخت، تنومندی خود نیاز مندی اور عنایت ایزدی کا شامل حال ہونا اہم شمار کرتا ہے (انشائے ابو الفضل  
ص ۷۸) ہمت سے مراد غالباً ہی عزم درست ہے۔

۱  
 باگو نہ گو نہ مردوم عالم شمسۂ ام  
 سیر پرشت و عوزخ و اعراف کردہ ام  
 ہم در زبان متاع احتلاق بودہ ام  
 ہم در سخن تنبیح اسلاف کردہ ام  
 گرد و نیست در سخن من مجب عمار  
 کیں بادہ را بہ پردہ دل صاف کردہ ام

اور یہی اس کے نظریہ شعر کا خلاصہ ہے۔

## کتابیات

- ۱) انشائے ابوالفضل (نو لکچر ایڈیشن) ۲۰۲۰، آئین اکبری مرتبہ بلوخن (انگریز)  
 شائع کردہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ام، منتخب المتوابع، بدایہ النبی (۵)  
 ۶) دیوان نظیری (۷) دیوان عرفی (۸) دیوان فیضی (مرتبہ مولوی فیروز زاد)

# برج بھاشا کی پہلی گرامر

سید مسعود حسن رضوی ادیب

شہنشاہ اورنگ زیب مالگیر کے عہد سلطنت میں کوکناش خانی یعنی بادشاہ کے کوکر کی فرمائش سے ایک کتاب تحفۃ الہند کے نام سے طبعی گئی جس کا موضوع ہے اہل ہند کے علوم مند اولہ۔ یہ کتاب چھپ کر کبھی شائع نہیں ہوئی، مگر اس کے چند نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔ ایک نسخہ میرے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔ مصنف نے کتاب کا دیب چ خود لکھا ہے، جو میرے نسخے میں مخمف اور دوسرے نسخوں میں طولانی ہے۔ مخمف دیب پاچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اورنگ زیب کے مطالعے کے لیے لکھی گئی اور طولانی دیب پاچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے کسی بیٹے کے لیے لکھی گئی۔ اس کا نام بعض نسخوں میں اعظم شاہ اور بعض میں معزالدیہی جہاندار بتایا گیا ہے۔ مصنف کے والد کا نام سب نسخوں میں فخر الدین محمد ہے، لیکن خود اس کا نام بعض نسخوں میں میرزا محمد اور بعض میں میرزا خان ہے۔

میرے کتب خانے میں تصانیف عتی کی ایک شرح، مضارح النکات کے دو طبعی نسخے ہیں۔ شارح کا نام میرزا جان بن فخر الدین محمد ہے۔ یہ شرح مسکنہ میں یعنی اورنگ زیب کے عہد سلطنت میں لکھی گئی۔ کچھ عجب نہیں کہ مضارح النکات اور تحفۃ الہند کے مصنف جوائی جانی ہوں۔ اگر تحفۃ الہند کے مصنف کا صحیح نام میرزا خان تھا تو میرزا جان بن فخر الدین محمد اور میرزا خانی بن فخر الدین محمد کا حقیقی جوائی ہونا اور زیادہ قرین قیاس ہو جاتا ہے۔

تحفۃ الہند میں ایک مقدمہ سات باب اور ایک خاتمہ ہے، جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

مقدمہ - ناگہری رسم خند اور بھاکھا کے قواعد کلیہ۔

پہلا باب - پیکل یعنی اہل ہند کا علم عروض۔

دوسرا باب - ٹیکل یعنی اہل ہند کا علم قافیہ۔

تیسرا باب - التکار یعنی اہل ہند کا علم بیان و بدیع۔

چوتھا باب - سنگار رس یعنی اہل ہند کا علم عاشقی و معشوقی۔

پانچواں باب - عذلیت یعنی اہل ہند کا علم موسیقی۔

چھٹا باب - کوک یعنی عورت مرد کے اقسام اور عورتوں کے ساتھ معاشرت۔

ساتواں باب - ساندربک یعنی اہل ہند کا علم قیادہ  
خاتمہ - اہل ہند کے لغات و مصطلحات و کنایات۔

معارف کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ناگری حروف اور رسم خط کا تفصیلی بیان ہے اور دوسرے میں بھاشا کے مفاد و کتبہ ہیں۔ مصنف اعمد کو ان مفاد کا مختصر "کتاب" ہے۔ یعنی اس کا دعویٰ یہ ہے کہ بھاشا، برج بھاشا، کی گرامر اس نے پہلے پہل لکھی ہے۔ اس نے ہند کی مسند عالموں سے دریافت کیا کہ وہ اس سے پہلے کی لکھی ہوئی برج بھاشا کی کسی گرامر کا نام نہ بنا سکے۔ یہ ظاہر مصنف کا یہ دعوئے صحیح ہے کہ یہ برج بھاشا کی پہلی گرامر ہے۔ اگرچہ یہ گرامر کی کوئی جامع کتاب نہیں ہے، پھر بھی تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اور اردو کے بارے میں لسانی تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہے۔ اس سے کھڑی ہوئی اور برج بھاشا کا باہمی تعلق آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مقدمہ کتاب کے اسی دوسرے حصے کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مصنف نے ہندی لفظوں کا وہ تلفظ اختیار کیا ہے جو بھاشا والوں کی زبانوں پر جاری تھا اور ہر لفظ کا تلفظ تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کر دیا ہے کہ کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں نے اختصار کے خیال سے ان بیانات کو حذف کر کے ہندی لفظ پر عربی لگا دیئے ہیں۔

## زبان کی کیفیت

اہل ہند کی زبانیں متعدد ہیں، لیکن وہ زبانیں جن میں نثر کی کتابیں اور نظم کے دیوان تصنیف کئے جاسکتے ہیں۔ اور جو نظم اور ذہین مستقیم گویند آتی ہیں تین ہیں۔  
۱۔ سہنسکرت - وہ ہر طرح کے علوم و فنون کی کتابیں زیادہ تر اس زبان میں تصنیف کرتے ہیں۔ ان کے اعتقاد میں وہ عالم علوی کی زبان ہے اور وہ اس کو آکاس بانی، اور دیو بانی، کہتے ہیں، یعنی آسمان والوں کی زبان اور دیوتاؤں کی زبان جو کہ آسمانی اور عادی ہیں۔

۲۔ پتھراکھرت - بادشاہوں، وزیروں اور بڑے بڑے لوگوں کی مدح زیادہ تر اس زبان میں لکھتے ہیں۔ وہ عالم سفلی یا یعنی اس عالم کی زبان ہے جو زمین کے نیچے ہے اور اس کو پاتاال بانی، اور ناگ بانی، بھی کہتے ہیں، یعنی اسفل آسمانوں کے رہنے والوں اور سانپوں کی زبان جو کہ زمینی اور سفلی ہیں۔ یہ زبان مرکب ہے سہنسکرت سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا اور بھاشا سے جس کا ذکر اس کے بعد ہوگا۔

۳۔ بھاشا - زمین، اشعار اور عاشق و معشوق کا بیان زیادہ تر اس زبان میں کرتے ہیں۔ یہ اس عالم کی زبان ہے جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ بھاشا، کا اطلاق عموماً سہنسکرت اور پراکرت کے سوا اور کل زبانوں پر ہوتا ہے اور خصوصاً برج والوں کی زبان پر۔ برج، ہندوستان کی ایک سرزمین کا نام ہے۔ اصل اس کی منقرعہ ہے (جو ایک مشہور معرہ و نظام کا مستحق و کئی نے اس لفظ کو اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے) "رکھاکم سہنسکرت کے اس بولی میں ہے"

(دشنوی قصہ سے نظیر)

نام ہے۔ اور منفرد کے گرد چار کوس تک ہرج کی حد ہے۔ ہرج داؤں کی زبان سب زبانوں سے زیادہ فصیح ہے مشہور و یا فاضل لکھا اور جو نام کے دو آپ میں جو خطہ واقع ہے جیسے چننہ دار وغیرہ وہ فصاحت کے لیے مشہور ہے۔ چننہ دار ایک مشہور و معروف مخفم نام ہے۔ چونکہ زبانیں شعروں، شہریہ، جوارقوں اور عاشق و معشوق کے بیان پر مشتمل ہے اور شاعرانہ اور لطیفیت داؤں میں زیادہ تریماخ اور مستعمل ہے اس بنا پر اس کے قواعد کلیہ بنائے گئے ہیں اور اس چیز کا اختراع کرنے والا یہ مخفیت ہے۔

## شہد کا بیان

فہرہ سنسکرت زبان میں کلمے کو کہتے ہیں۔ بھاکھا والے اس لفظ کو سین مہر سے بولتے ہیں۔ جمادے غویوں کی اصطلاح میں مہر وہ ہے جو کسی معنی کو ادا کرنے کے لیے بولا جائے۔ ہل ہند کی اصطلاح میں اس کی تین قسمیں ہیں۔ سنیپاؤن، کزکٹ اور کزوتا۔ سنیپاؤن اس کلمے کو کہتے ہیں جو تینوں زمانوں میں ماضی، مستقبل اور حال میں سے کسی سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں :-

ایک وہ جو معنی پر دلالت کرنے میں کسی دوسرے لفظ کا محتاج نہ ہو مثلاً رام جو ان کے مشہور دیوتاؤں میں سے ایک کا نام ہے۔ یا جمل جس کے معنی ہیں پانی۔ اس قسم کے کلموں کو سنیپاؤن کہتے ہیں۔ عربی کی اصطلاح میں ان کو اسم کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو معنی پر دلالت کرنے میں کسی لفظ کا محتاج ہو۔ مثلاً پرتو عربی کے اعلیٰ اور فارسی کے بر کے معنی ہیں۔ اس قسم کے کلموں کو بزوت کہتے ہیں۔ عربی کی اصطلاح میں ان کو حرف کہتے ہیں۔

گزتہ تہ فعل کو کہتے ہیں اور فعل کے معنی ہیں کچھ کرنا۔ کرتب وہ کلمہ ہے جو تینوں زمانوں میں ماضی، حال اور استقبال میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی تینوں زمانوں کو تیز کال کہتے ہیں۔ کرتب کی پانچ قسمیں ہیں، بھڑت، بھڑت، بھڑت، بھڑت، بھڑت۔

## بھڑت کا بیان

بھڑت فعل ماضی کو کہتے ہیں۔ اور فعل ماضی وہ ہے جو گزشتہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ فعل ماضی لازمی صیغوں میں آتا ہے اور فعل لازمی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام ہو جائے ادا آگے بڑھ کر مفعول تک نہ پہنچے۔ وہ چار صیغے یہ ہیں :-

- ۱۔ آئیو، یہ صیغہ واحد مذکر غائب، واحد مذکر حاضر اور واحد مذکر محکم میں مشترک ہے۔
- ۲۔ آئے، یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مذکر حاضر اور جمع مذکر محکم میں مشترک ہے۔
- ۳۔ آئی، یہ صیغہ واحد مؤنث غائب، واحد مؤنث حاضر اور واحد مؤنث محکم میں مشترک ہے۔
- ۴۔ آئیں، یہ صیغہ جمع مؤنث، جمع مؤنث حاضر اور جمع مؤنث محکم میں مشترک ہے۔

لہ معنی بھاکھا والے شہد کو شہد کہتے ہیں۔

فعل متعدی ہی اسی میں چار صیغوں میں آتا ہے۔ اور فعل متعدی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام نہ ہو بلکہ آگے بڑھ کر مفعول تک پہنچے یعنی متعدی کے نیچے مفعول کے بعد اس کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی اگر مفعول مذکر ہو تا ہے تو فعل مذکر لاتے ہیں۔ اور اگر مفعول مؤنث ہوتا ہے تو فعل مؤنث لاتے ہیں۔ مثلاً اگر مفعول واحد مذکر ہو تو کہیں گے راجو اور اگر مؤنث ہو تو کہیں گے ماری اور اسی قیاس پر باقی صیغوں کو سمجھ لیا جائے۔

## بڑنتمان کا بیان

بڑنتمان فعل حال کو کہتے ہیں۔ اور فعل حال وہ ہے جو گزشتہ اور آئندہ زمانوں کے درمیان میں ہو فعل حال چار صیغوں میں آتا ہے۔

- ۱۔ کرت ہے۔ یہ صیغہ واحد مذکر غائب، واحد مؤنث غائب، واحد مذکر حاضر اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
  - ۲۔ کرت ہیں۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مؤنث غائب، جمع مذکر متکلم اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔
  - ۳۔ کرت ہو۔ یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
  - ۴۔ کرت ہوں۔ یہ صیغہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔
- ان چاروں صیغوں میں دفعتاً کرت کی ت کو اگر مفہوم پڑھیں تو مذکر کا صیغہ ہو جاتا ہے اور اگر کمسور پڑھیں تو مؤنث کا صیغہ ہو جاتا ہے۔

## مجھو کھ کا بیان

مجھو کھ فعل مستقبل کو کہتے ہیں۔ اور فعل مستقبل وہ ہے جو آئندہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ فعل مستقبل آٹھ صیغوں میں آتا ہے۔

- ۱۔ کرے گا۔ یہ صیغہ واحد مذکر غائب اور واحد مذکر حاضر میں مشترک ہے۔
- ۲۔ کریں گے۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب اور جمع مذکر متکلم میں مشترک ہے۔
- ۳۔ کر دو گے۔ یہ جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔
- ۴۔ کر دوں گا۔ یہ واحد مذکر متکلم کا صیغہ ہے۔
- ۵۔ کر دوں گی۔ یہ واحد مؤنث متکلم کا صیغہ ہے۔
- ۶۔ کرے گی۔ یہ صیغہ واحد مؤنث غائب اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
- ۷۔ کریں گی۔ یہ صیغہ جمع مؤنث غائب اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔
- ۸۔ کر دوں گی۔ یہ جمع مؤنث حاضر کا صیغہ ہے۔

## گز یا کا بیان

گز یا چار طرح ہے :-

- ۱۔ ستم بجاؤ۔ یہ اثبات فعل ماضی ہے۔ مثلاً آج۔
  - ۲۔ اُسٹم بجاؤ۔ یہ نفی فعل ماضی ہے۔ مثلاً نالو۔
  - ۳۔ بجاؤ۔ یہ اثبات فعل حال و فعل مستقبل ہے۔ مثلاً گزٹ ہے۔ کرنے کو۔
  - ۴۔ آئی بجاؤ۔ یہ نفی فعل حال و فعل مستقبل ہے۔
- نفی اور سنی کے لیے تون مفتوح (نہ) یا فاعلاً تاکمے کے شروع میں لگا دینے ہیں۔

## گزٹ کا بیان

گزٹ مفعول کو کہتے ہیں۔ سو مفعول وہ ہے کہ فعل اُس پر واقع ہو مفعول کے آخر میں لاتے ہیں مثلاً بھینو رام راو نہ یعنی رام نے راو نہ مارا۔ اور کبھی مفعول کو فاعل سے پہلے لے آتے ہیں۔ مثلاً بھینو راو نہ رام۔ اور کبھی تا کو جو ضمیر مفعول ہے، لفظ کے آخر سے حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً بھینو رام راو نہ۔ اس محل پر فاعل کو مفعول سے پہلے لانا بہتر ہے۔ ورنہ قرینے اور تیناس پر نفیر کر کے معنی نکال بیٹے ہیں۔

## گزٹا کا بیان

گزٹا فاعل کو کہتے ہیں۔ اور فاعل فعل کرنے والا ہے۔ اُس کی در قسمیں ہیں :-

- ۱۔ سوا دھین۔ وہ فاعل جو خود کام کرے۔ مثلاً کاجی یعنی کام کرنے والا۔
  - ۲۔ پرا دھین۔ وہ فاعل جو کسی دوسرے کو کوئی فعل کرنے کا حکم دے، خواہ امر کے ساتھ ہو خواہ نفی کے ساتھ۔
- اور امر کسی کو کوئی کام کرنے کا حکم دینا ہے اور نفی کسی کو کسی کام سے روکنا ہے۔ امر حاضر تین مینوں میں آتا ہے :-

- ۱۔ گزٹا۔ یہ امر واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔
  - ۲۔ گزٹ۔ یہ امر واحد مؤنث حاضر کا صیغہ ہے۔
  - ۳۔ گزٹا۔ یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
- امر غائب بھی تین مینوں میں آتا ہے :-

- ۱۔ گزٹ۔ یہ صیغہ واحد غائب مذکر اور واحد غائب مؤنث میں مشترک ہے۔
- ۲۔ گزٹ۔ یہ صیغہ جمع غائب مذکر، جمع غائب مؤنث اور جمع متکلم میں مشترک ہے۔
- ۳۔ گزٹا۔ یہ امر واحد متکلم کا صیغہ ہے۔



نئی حاضر و غائب کے جی ہی ہر حاضر و غائب کے چہ میسنے ہیں جن کے شروع میں نہ یا تا بڑھا دیتے ہیں۔

## پُر لنگ کا بیان

پُر لنگ مذکر کو کہتے ہیں۔ اور مذکر کے معنی ہیں مرد یا نر۔ اس کی دو قسمیں ہیں :-

- ۱۔ وہ جو علم ہو اور اس کے مقابل میں کوئی مؤنث ہو۔ مثلاً رستم اور کاخ جو مشہور دیوتاؤں کے نام ہیں۔ علم وہ ہے جو کسی معینی شخص کا نام ہو۔
- ۲۔ وہ کہ اسم مذکر غیر علم کے آخر میں الف لگائیں۔ مثلاً ہرگا کہ لفظ مرگ (ہرنی) پہا لٹ بڑھا دیا گیا ہے۔

## آئٹری لنگ کا بیان

آئٹری لنگ مؤنث کو کہتے ہیں۔ اور مؤنث کے معنی ہیں عورت یا مادہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں :-

- ۱۔ وہ جو علم ہو یعنی کسی معینی شخص کا نام ہو۔ مثلاً سینتا اور رادھا، جو دو مشہور عورتوں کے نام ہیں۔
- ۲۔ وہ جو علم نہ ہو۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں :-

- (۱) وہ جس کا مقابل کوئی مذکر اور نر نہ ہو۔ مثلاً ترنگنی یا ترنگنی (گھوڑی) اور رشتنی (رشتنی)۔
- (۲) وہ جس کے مقابل مذکر اور نر نہ ہو۔ مثلاً بیار (بھلا) اور آگنی (آگ)۔

یہ آخری قسم مؤنث سماعی ہے اور اس کا استعمال فقط محاورے کے سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

جب پُر لنگ کو آئٹری لنگ یعنی مذکر غیر علم کو مؤنث کر دینا چاہتے ہیں تو مذکر اسم کے آخر میں چند حرف بڑھا دیتے ہیں۔ وہ حرف یہ ہیں :-

۱۔ الف۔ مثلاً بڑدو (بڑھا) سے بڑدھا (بڑھیا)

۲۔ ی۔ مثلاً دیو سے دیوی۔

۳۔ آئی۔ مثلاً دوتے سے دوتائی یعنی رُودر کی بیوی۔ رُودر عموماً دیوتا کے معنی میں آتا ہے۔ اور خصوصاً مہادیو کو کہتے ہیں۔

۴۔ نی۔ مثلاً ترنگ سے ترنگنی۔ کبھی آخری نی کو گرادیتے ہیں اور صرف نون باقی رہ جاتا ہے مثلاً ترنگنی۔

## نپن سکت لنگ کا بیان

نپن سکت لنگ۔ غنٹی کو کہتے ہیں یعنی وہ جو حقیقت میں نر مرد ہو نہ عورت۔ محاورے میں ایسے گنتی کے چند اسم ہیں۔

ان سب کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ ان میں سے ایک لفظ گنڈل ہے، جس کے معنی ہیں حلقہ۔ اس جنس کا استعمال سنسکرت لٹ ایک نسخے میں ہستنی ہے۔

یہ وہ ہے جس سے کسی ہے۔ بالکل میں متعلق نہیں ہے۔

## نیز پکن کا بیان

نیز پکن جمع کو کہتے ہیں اور واحد سے زیادہ کو جمع خیال کرتے ہیں۔ جمع بنانے کے لیے واحد لفظ کے آخر میں حرف نون لگا دیتے ہیں مثلاً ملک (مذکار عورت) سے ملکات اور نون سے پہلے کا حرف اگر ساکن یا موقوف ہو تو اس پر زبر لگا دیتے ہیں جیسے کز (کزن) سے کزن اور پگ (پانوں) سے پگین۔ اور جس لفظ کے آخر میں و ساکن یا ی ساکن ہو تو کسی اس و او یا یے کو اپنے حال پر ساکن رہنے دیتے ہیں اور کسی اس پر زبر کی حرکت لگا دیتے ہیں۔ مثلاً سکسی سے سکسین اور جٹو سے جٹون اور کسی الف ہن سے جمع بناتے ہیں مثلاً سکسی سے سکسیاں۔

## اسم اشارہ کا بیان

اسم اشارہ وہ اسم ہے جس سے کسی کی طرف اشارہ کریں۔ اسمائے اشارہ سات ہیں :-

- ۱۔ وا - یہ واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے یعنی وہ
- ۲۔ تا - یہ بھی واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے یعنی وہ
- ۳۔ یا - یہ واحد حاضر کے اشارے کے لیے ہے یعنی یہ
- ۴۔ جا - یہ بھی واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے یعنی جو
- ۵۔ اُن - یہ جمع غائب کے اشارے کے لیے ہے۔
- ۶۔ اِن - یہ جمع حاضر کے اشارے کے لیے ہے۔
- ۷۔ جن - یہ جمع غائب کے اشارے کے لیے ہے۔

یہ ساتوں اسمائے اشارہ مذکور اور مونث میں مشترک ہیں۔

## پند پرث کا بیان

پند پرث کلام کو کہتے ہیں۔ اور کلام دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔ مثلاً رام آیو

## سمبندھ کا بیان

سمبندھ ترکیب امانی کو کہتے ہیں۔ اور ترکیب امانی وہ ترکیب ہے جس میں کلمہ اول کو کلمہ ثانی سے نسبت میں اصطلاح عرب میں کلمہ اول کو مضاف اور کلمہ ثانی کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔ اہل ہند کی ترکیب امانی تین کلموں سے مرکب ہوتی ہے۔ مثلاً پوتہ نام کو یعنی پسر نام۔ اس میں کلمہ پوتہ مضاف ہے اور کلمہ نام مضاف الیہ ہے اور لفظ کو جو آخر میں ہے علامت نسبت ہے۔ جو عربی

کی مثال غلامِ آزاد پر ہیں لاسِ مکتور کی جگہ اور فارسی کی مثال غلامِ قید میں مصفات کے آخری کسبے کی جگہ آید ہے۔ ہندی میں جب مصفات ایل کے مصفات پر مقام کرتے ہیں تو لفظ کو جو علامت نسبت ہے۔ درمیان میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں رام کو پوت۔ اس عمل پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ علامت نسبت کو حذف کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں رام پوت۔

## ان حرفوں اور کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع اور درمیان میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

(۱) الف (مفتوح)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبيت کے معنی دیتا ہے اور اس کو اصطلاح میں ناس مین نفی کہتے ہیں۔ مثلاً: اَیامو یعنی نہ جانے والا نادان۔

(۲) الف۔ اسموں کے درمیان میں آکر تواتر اور توالی کے معنی دیتا ہے مثلاً چلا چلا یعنی رد اور۔ یہ الف فارسی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(۳) فب (بائے مکتور)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبيت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً اَیَل یعنی بے قرار اور بے آرام۔ کیونکہ اَیَل کے معنی ہیں قرار اور آرام۔

(۴) س (سین مفتوح)۔ اسم کے شروع میں آکر جمعیت اور تہراتی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سُجَل یعنی سیلاب اور شاداب، کیونکہ سُجَل کے معنی ہیں پانی۔ یہ س کبھی لیاقت اور قابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سُپُوت یعنی قابل اور رشید بیٹا۔ اور یہ حوت اس معنی میں اس لفظ کے سوا اور کہیں نہیں سنا گیا۔

(۵) س (سین مضموم)۔ اسم کے شروع میں آکر خوب اور اچھا کے معنی دیتا ہے مثلاً سُباس یعنی اچھی بو والا خوشبودار۔  
(۶) ک (کاف مفتوح)۔ اسم کے اول میں آکر عام لیاقت اور قابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کُپُوت یعنی ناقابل یا نالائق بیڑ۔ اور یہ حوت اس معنی میں اس لفظ کے سوا اور کہیں نہیں سنا گیا۔

(۷) ک (کاف مضموم)۔ اسم کے شروع میں آکر بد اور بُرائی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کُرُنک یعنی بادرنگ، بُرے رنگ والا۔

(۸) ن (نون مکتور)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبيت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً نَمُج یعنی بے شرم، سبچا، کیونکہ نَمُج اور نَمُج کے معنی ہیں شرم و حیا۔

## ان حرفوں کا بیان جو لفظوں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

(۱) الف۔ اسم کے آخر میں آکر وصفیت اور قابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً اَیَلتا یعنی شاعر اور موصوف بہ صفت شاعری، کیونکہ اَیَلتا کے معنی ہیں شعر۔ دیو آجینی دینے والا اور موصوف بہ صفت دیندگی۔ کبھی الف تائید کے لیے آتا ہے مثلاً بَرَدحا یعنی بوڑھی عورت، کیونکہ بَرَدحا بوڑھے مرد کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اور کبھی تائید کیلئے صفت اور قابلیت کے معنی بھی دیتا ہے۔ مثلاً کُرَبَا یعنی غور کرنے والی اور موصوف بہ صفت غور، کیونکہ کُرَبَا کے معنی ہیں غور۔ اور کبھی الف تذکیر اور نری کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً بَرَدکا یعنی نر ہرن۔ اسم علم کے آخر میں الف مذکر کا

- ۲) مادہ دیتا ہے۔ اور نہ کسی کو پہلے ملے۔ مثلاً راما یعنی لے رام۔ الف ندانیہ فارسی اور عربی میں بھی مستعمل ہے۔
- ۳) پت۔ اسم کے آخر میں اگر صاحتی اور خداوندی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بھوپ یعنی صاحب و خداوند زمین، کیونکہ بھو کے معنی ہیں زمین۔
- ۴) پت۔ اسم کے آخر میں اگر مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً گشت یعنی گشتا شمار کرنا۔
- ۵) پت۔ اسم کے آخر میں اگر فاعلیت کے معنی دیتا ہے مثلاً کھیٹا یعنی ناڑ کھینے والا۔ اس پت کے آخر میں مادہ معرفت بھی لگا دیتے ہیں مثلاً کھیٹو۔
- ۶) پت۔ اسم کے آخر میں اگر پیدہ ہونے کے معنی دیتا ہے مثلاً بارو یعنی پانی سے پیدا ہونے والا۔ اس لفظ کا حلاق کنول کے پھول پر اور براس چیز پر ہوتا ہے جو پانی سے پیدا ہو، کیونکہ بار کے معنی ہیں پانی۔
- ۷) د (دال مکسور)۔ اسم کے آخر میں اگر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے مثلاً بارو یعنی بادل۔ کیونکہ بار کے معنی پانی ہیں جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے۔
- ۸) دھ۔ یہ بھی کسی معنی کا فائدہ دیتا ہے مثلاً اشدھ یعنی سمندر، کیونکہ اشدھ کے معنی ہیں پانی پر قاعدہ قائم ہے کہ پانی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں و بادل کے معنی کا اور دھ سمندر کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔
- ۹) ک۔ اسم کے آخر میں فاعلیت کے معنی دیتا ہے مثلاً سیوک یعنی خادم، کیونکہ سیو اور سیوا کے معنی ہیں خدمت۔ یہ کات کبھی مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً تبارک یعنی طہارت۔
- ۱۰) گ۔ اسم کے آخر میں اگر راہ، روش اور رفتار کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً ارگ یعنی سیڑھی سے راہ چلنے والا، کیونکہ ار کے معنی ہیں سینہ۔ اس لفظ سے سانپ مراد لیتے ہیں۔
- ۱۱) ق۔ اسم کے آخر میں مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً بچن یعنی بچنا، رواج۔ کیونکہ بچل اور بچال کے معنی ہیں رفتار اور طریقہ حرکت و فن کبھی فاعلیت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً موہن یعنی موہنے والا، فریفتہ کرنے والا، کیونکہ موہ کے معنی ہیں فریفتگی اور کبھی جمع کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کران جو کران کی جمع ہے اور کرانہ کے معنی ہیں ہاتھ۔ اور کبھی تائید کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کرانگن یعنی گھوڑی، کیونکہ کرانگ کے معنی ہیں گھوڑا، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔
- ۱۲) و (واو معرفت)۔ اسم کے آخر میں اگر فاعلیت کا فائدہ دیتا ہے مثلاً پاترو یعنی پیرا دینے والا، پاس بان، کیونکہ پاسرہ اور پسرہ کے معنی ہیں پاس بانی اور نگہبانی۔
- ۱۳) ہ (ہائے مکسور)۔ اسم کے آخر میں اگر مفعول بہ کے معنی دیتا ہے مثلاً واہ یعنی اُس کو، کیونکہ وا کے معنی ہیں وہ۔
- ۱۴) ی۔ (ہائے معرفت)۔ اسم کے آخر میں اگر نسبت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً بھیری یعنی منسوب بہ بھیر۔ بھیر بنوستان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ سوریہ ی فارسی میں بھی مستعمل ہے۔ کبھی ی صفت اور فاعلیت کا فائدہ دیتی ہے مثلاً کرنتی یعنی خود کی صفت سے موصوف، غرور کرنے والا۔ کیونکہ کرنت کے معنی ہیں غرور۔ اور کبھی ی تائید کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دیوی یعنی دیوی کی عورت جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔

## اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

ا۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر خدا کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں :-

(۱) آجے۔ مثلاً آجے رام۔

(۲) آجے۔ مثلاً آجے رام۔

(۳) آجے۔ مثلاً آجے رام۔

(۴) آجے۔ مثلاً آجے رام۔

(۵) آجے۔ مثلاً آجے رام۔ یہ کلمہ فارسی میں بھی مستعمل ہے۔

(۶) آجے۔ جو آجے اور آجے سے مرکب ہے۔ مثلاً آجے ہو رام۔

(۷) آجے۔ مثلاً آجے رام۔ اس کلمے کو مونث کی نر اہیں یا بے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً آجے سکھی۔ اور سکھی کے معنی ہیں زن صاحبہ۔

(۸) آجے۔ بغیر اے اول کے۔ مثلاً آجے رام۔ اس کلمے کو بھی نر اہیں یا بے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً آجے سکھی۔

(۹) آجے۔ جو آجے اور آجے سے مرکب ہے۔ مثلاً آجے رام۔ نر اہیں یا بے معروف کے لیے اس کے دوسرے جز کے کو یا بے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً آجے سکھی۔

(۱۰) آجے۔ جو آجے اور آجے سے مرکب ہے۔ مثلاً آجے رام۔ نر اہیں یا بے معروف کے لیے اس کے پہلے جز آجے کو یا بے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً آجے سکھی۔

ب۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ دو کلمے ہیں :-

(۱) نہ۔ مثلاً نہ تیرے بھوتے، بے ترس، کیونکہ بھوتے کے معنی ہیں خوف اور ترس۔

(۲) نہ۔ مثلاً نہ اس میں بے مزہ، بے ذوق، کیونکہ نہ کے معنی ہیں مزہ اور ذوق۔

## اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

ا۔ وہ کلمے جو اسم کے آخر میں آکر صاحبی اور خداوندی کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں :-

(۱) اونت۔ مثلاً اونت روپ و نت یعنی صاحب حسن و جمال، کیونکہ روپ کے معنی ہیں حسن و جمال۔ کبھی مذکر کے لیے اس کلمے کے

آخر میں الف لگا دیتے ہیں اور لکھتے ہیں روپ و نتا اور مننت کے لیے یا بے معروف لکھتے ہیں روپ و نتی۔

(۲) کار۔ مثلاً کار میں صاحب علم و ہنر، کیونکہ کار کے معنی ہیں علم و ہنر۔

(۳) پال۔ مثلاً پال میں صاحب زمین و ملک۔ بادشاہ، زمیندار اور صاحب ملک پر اس لفظ کا اطلاق کرتے ہیں، کیونکہ بھوتے کے معنی ہیں زمین۔

۴) زینت۔ مثلاً معی پت یعنی صاحبِ و خداوند زمین اور صاحبِ مملکت۔ اس لفظ کا اطلاق معی بادشاہ، زمیندار اور صاحبِ مملکت پر کرتے ہیں، کیونکہ معی اور میر زمین کو کہتے ہیں۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جوب زمین، ملک، دنیا اور مرد کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں پت کا لفظ آتا ہے تو وہ بادشاہ کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً معی پت، ویس پت، جنگ پت، زینت۔ لہذا کنت معی ای اسموں کے آخر میں اسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً معی کنت۔ کلت پت۔ جب تازہ اور رات کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں آتا ہے تو چاند کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً تار پت۔ پخت پت اور پس پت۔ اور کار پت جب ندی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آتا ہے تو دریا کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً ندی پت۔

۵) اپس۔ جب اس لکھے کو کسی دوسرے لکھے سے ملاتے ہیں تو لکھنے میں الف کو حذف کر دیتے ہیں، کیونکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس لکھے کے شروع میں الف ہوتا ہے جب اُس کو کسی دوسرے لکھے سے مل کر ملتے ہیں تو الف کو حالت تحریر میں حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً معیس یعنی صاحبِ و خداوند زمین، کیونکہ معی اور میر کے معنی ہیں زمین جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس لکھے کو جی بادشاہ، زمیندار اور صاحبِ ملک پر اطلاق کرتے ہیں۔

۶) اپسر۔ مثلاً کابی پسر یعنی صاحبِ و خداوند شعر، کیونکہ کاب کے معنی ہیں شعر۔ سنسکرت میں لفظ اپسر کو شبنم کے ساتھ بولتے ہیں۔

۷) اندر۔ مثلاً نرندر۔ یعنی صاحبِ و خداوند مردوں، کیونکہ ندر کے معنی ہیں مرد۔

۸) راج۔ مثلاً کب راج یعنی ملکِ اشعرا، کیونکہ کب کے معنی ہیں شاعر۔

۹) ایث۔ مثلاً دھلیث یعنی صاحبِ سپر، کیونکہ دھال سپر کو کہتے ہیں۔

۱۰) آدت۔ مثلاً چھاوت یعنی دولت والی عورت، کیونکہ چھی کے معنی ہیں دولت۔ اور ت کے آخر میں بائے معروف بھی لاتے ہیں۔ مثلاً چھاوتی۔ اور یہ کلمہ کنول کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پد معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً پدماوتی۔

ب۔ وہ لکھے جو اسموں کے آخر میں آکر فاعلیت کے معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ پانچ لکھے ہیں۔

۱) آبادی کی نشاندہ کے ساتھ، مثلاً دھلیا یعنی کھیلنے والا۔

۲) وار مثلاً بھلوار یعنی کھیلنے والا۔

۳) آر۔ مثلاً کھلار یعنی کھیلنے والا۔ اس کے آخر میں یلے معروف بھی لاتے ہیں مثلاً بھلاری۔

۴) آگ۔ مثلاً پیرک یعنی پیرنے والا۔

۵) آؤ۔ مثلاً بٹاؤ یعنی راستہ چھنے والا اور مسافر۔

ج۔ وہ لکھے جو اسموں کے آخر میں آکر مصدری معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ آٹھ لکھے ہیں۔

۱) بور۔ مثلاً بور یعنی بولنا۔

۲) آئی۔ مثلاً نرانی یعنی جوانی، کیونکہ نر کے معنی ہیں جوان۔

(۳۴) آچو۔ مثلاً آچو یعنی ذہبی، کیونکہ موٹا کے معنی ہیں غریب۔ روزمرہ کی بول چال میں اس لفظ کے آخر والے واؤ کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں نٹاچا۔

(۳۵) آچی۔ مثلاً آچی یعنی پچیس ہفتہ گیت۔ پچیس کے آخر میں واو مہولی اور نون مختہ بھی لگاتے ہیں اور کہتے ہیں ہال پچوں مختہ کی بات چیت میں واو مہولی کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہال پچاں۔

(۵۱) آون۔ مثلاً آون یعنی آنا۔ روزمرہ کی بول چال میں واو کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں آوناں۔

(۶۱) پت۔ مثلاً پت یعنی رعنائی، زریباٹی اور خودنائی۔

(۶۲) آپ۔ مثلاً آپ یعنی ملنا، ملاقات کرنا۔

(۶۳) آو۔ مثلاً آو یعنی مینا نا، آراستہ کرنا۔

د۔ وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر وصفیت کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں :-

(۱) آئی۔ مثلاً آئی یعنی سیاہی، کیونکہ سیاہ کے معنی ہیں سیاہ۔ اس کلمے کو اس کے دوسرے جزوفی کے بغیر بھی استعمال کرتے ہیں جیسے سیاہ۔

(۲) آٹ۔ مثلاً آٹ یعنی دہشت اور چکنے ہونے کی صفت۔

(۳) آڈٹ۔ مثلاً آڈٹ یعنی زمانہ ہیں، کیونکہ ہمری کے معنی ہیں عورت۔

(۴) آس۔ مثلاً آس یعنی بیٹھے ہونے کی صفت۔

(۵) آیل۔ مذکر کے لیے لام کے آخر میں واو مہولی لگاتے ہیں اور کہتے ہیں آیل یعنی رنگین کی صفت سے موصوف مرد روزمرہ کی بول چال میں واو کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں آیل معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ رنگینی یعنی رنگینی کی صفت سے موصوف عورت۔

(۶) آسار۔ مثلاً آسار یعنی ملاقات یا میل جول کی صفت سے موصوف۔

(۷) آکا۔ یہ لفظ مونث کے لیے مخصوص ہے مثلاً آکاسار یعنی فسق و بدکاری کی صفت سے موصوف عورت، کیونکہ آکاسار کے معنی ہیں فسق و بدکاری۔

(۸) آکوں۔ مثلاً آکوں یعنی بے حیائی اور بے شرمی کی صفت۔

(۹) آول۔ مذکر کے لیے لام کے آخر میں واو مہولی لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں آول یعنی مجھلا ہونے کی صفت سے

موصوف مرد روزمرہ کی بات چیت میں واو مہولی کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں آول یعنی مجھلا ہونے کے لیے یا بے معروف لگاتے ہیں اور کہتے ہیں آول۔

(۱۰) آڈہاں۔ مثلاً آڈہاں یعنی نیم رنگ سرخی کی صفت سے موصوف مرد، کیونکہ آڈہاں نیم رنگ سرخ کو کہتے ہیں۔ مونث کے لیے اس لفظ میں الف کی جگہ یا بے معروف لگاتے ہیں۔ مثلاً آڈہاں یعنی مذکورہ صفت سے موصوف عورت۔

## وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر تصغیر کا فائدہ دیتے ہیں

- عربی کی اصطلاح میں تصغیر کسی کو چھوٹا اور حقیر کرنا ہے۔ یہ کلمے چار ہیں۔
- ۱۔ ثَلَاثًا۔ مثلاً ثَلَاثًا سے ثَلَاثًا اور ثَلَاثًا کے معنی ہیں شوخ۔ عورت کی تصغیر کے لیے ثَلَاثًا یا ثَلَاثًا کہتے ہیں۔ مثلاً ثَلَاثًا کا گھر سے ثَلَاثًا اور ثَلَاثًا کے معنی ہیں گھر۔ ثَلَاثًا یا ثَلَاثًا ذکر کے لیے نسبت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً ثَلَاثًا کنوچیا یعنی کنوچ کی طرف منسوب مرد۔ ثَلَاثًا ہندوستان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔
  - ۲۔ سَا۔ مثلاً سَا سے سَا اور سَا کے معنی ہیں بارش۔
  - ۳۔ اَوْنَا۔ مثلاً اَوْنَا سے اَوْنَا اور اَوْنَا کے معنی ہیں لڑکا۔
  - ۴۔ اَوْنَا۔ مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں اَوْنَا یا اَوْنَا لگاتے ہیں اور کہتے ہیں اَوْنَا اور کہیں اس کلمے میں اَوْنَا معروف کی جگہ اَوْنَا یا اَوْنَا لگاتے ہیں۔ مثلاً اَوْنَا یعنی چھوٹی گھڑی۔ ان دونوں صورتوں میں اَوْنَا کی بول چالی میں آخری اَوْنَا کی جگہ اَوْنَا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اَوْنَا اور اَوْنَا۔ اور اَوْنَا کے لیے اَوْنَا کی جگہ یا اَوْنَا معروف لگاتے ہیں۔ مثلاً اَوْنَا اور اَوْنَا۔

## وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر دارندگی کے معنی کا فائدہ دیتے ہیں

- یہ دو کلمے ہیں:-
- ۱۔ دَحْر۔ مثلاً دَحْر یعنی دارندہ کوہ۔ دَحْر کا دَحْر کا نام ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ دَحْر نے ایک وقت پہاڑ کو ہاتھ پر لے لیا تھا۔ اُس وقت سے اُن کا نام دَحْر ہو گیا۔ یہ کلمہ زمین کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پہاڑ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دَحْر اور دَحْر یعنی دارندہ کوہ، کیونکہ دَحْر کے معنی ہیں زمین۔ اور امرت یعنی آب حیات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں چاند کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دَحْر اور دَحْر۔ اور چاند کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں ہادی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دَحْر۔
  - ۲۔ دَحَارِی۔ مثلاً دَحَارِی یعنی جٹا رکھنے والا۔ اور جٹا کے معنی ہیں سر کے بال جو آپس میں چپک کر ایک ہو گئے ہوں۔

## وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر دہندگی کے معنی دیتے ہیں

- یہ دو کلمے ہیں:-
- ۱۔ دَا۔ مثلاً دَا کا دَا یعنی دینے والا۔
  - ۲۔ دَا۔ مثلاً دَا کا دَا یعنی امام دینے والا۔



## وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر کنسندگی کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :-

۱۔ کنسندہ مثلاً کنسندہ یعنی دن کرنے والا۔ اس کا اطلاق آفتاب پر کرتے ہیں۔

۲۔ کنسندہ مثلاً کنسندہ یعنی فائدہ کرنے والا۔

## وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر لوٹ لینا، چھین لینا، لے بھاگنا کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :-

۱۔ کنسندہ مثلاً کنسندہ یعنی دل لے لینے والا۔ اس کلمے کے آخر میں نون بھی لگا دیتے ہیں اور کتنے میں مخ بھی لگاتے ہیں۔ اور

موصوف کے لیے نون کے بعد یا سے معروف لگا دیتے ہیں اور کتنے میں مخ بھی لگاتے ہیں یعنی دلربا عورت۔

۲۔ کنسندہ مثلاً کنسندہ یعنی چھین لینا یا لے بھاگنا۔

## وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

۱۔ ہا۔ ایک کلمہ ہے جو کسی اسم کے آخر میں آکر لہذا اور بعد ازاں کے معنی دیتا ہے مثلاً ہا یعنی ہونے کے لائق مثلاً

۲۔ اوش۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر آلے کے معنی دیتا ہے مثلاً اوش یعنی وہ چیز جس سے کافی کی جائے۔

مگر کے لیے اس کلمے کے آخر میں کبھی الف لگا دیتے ہیں اور کتنے میں کچھ ما یعنی وہ چیز جس سے ستر عورت کیا جائے

یعنی آگ بھیا چھپایا جائے۔ کیونکہ کما چھ کے معنی ہیں عورت یعنی جسم کا وہ حصہ جس کو چھپا رہنا چاہئے اور عورت

کے لیے اس کلمے کے آخر میں یا سے معروف لگاتے ہیں مثلاً کوش یعنی وہ چیز جس سے سونا چاندی پکتے ہیں

کیونکہ کس کے معنی ہیں پر کھنا۔ کبھی یہ کلمہ ظرفیت کے معنی دیتا ہے مثلاً کوش یعنی وہ چیز جس میں کابل یا شہر لکھنا

۳۔ بن۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر بے اور بغیر کے معنی دیتا ہے مثلاً بن یعنی بے معشوق اور لال کے معنی

ہیں معشوق۔ اس کلمے کے آخر میں الف نون بھی بڑھا دیتے ہیں اور کتنے میں لال بنال۔ اس کلمے کو کبھی اسم کے پسے

بھی لاتے ہیں اور کتنے میں بن لال اور بنال لال۔

۴۔ سال۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے مثلاً سال یعنی عبادت، خیرات

دینداری اور خیر سستی کی جگہ۔ اس کلمے کو کبھی بغیر آخری الف کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً سال یعنی سنے

بنانے اور سونے چاندی کے پر کھنے کی جگہ۔

۵۔ آہنقد۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر پوس کے معنی دیتا ہے مثلاً آہنقد یعنی پھسل کی سی نیز اور بڑی باز۔

۶۔ چر۔ ایک کلمہ ہے جو درخت کے معنی دیتا ہے اس کے آخر میں آکر ہرن اور بندر کے معنی دیتا ہے مثلاً چر۔

اور جمل، بیابان کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر یہی معنی اور جمل، بیابانی آدمی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بن چہ پانی کے معنی  
 مسینے والے اسم کے آخر میں آکر ابرو، باران کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً جل چہ اور بات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں  
 آکر صہوت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً قس چہ۔  
 مٹی۔ ایک لکھ ہے جو اسم کے آخر میں آکر کثرت کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً حل مٹی یعنی وہ جگہ جہاں کٹی دیا جتنے ہوں  
 یا آبسا دریا جس میں بہت پانی ہو، کیونکہ جس کے معنی ہیں پانی۔  
 آشن۔ ایک لکھ ہے جو اسم کے آخر میں آکر حصہ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دسواشن یعنی دسواں حصہ۔  
 آفتی۔ ایک لکھ ہے جو اسم کے آخر میں آکر مقدار اور اندازے کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کھوتی یعنی سمجھنے کی  
 مقدار اور اندازہ۔

# اردو ادب کی بانی

## ڈاکٹر محی الدین زور

زبان اردو کا پنجابی سے جتنا قدیم اور جتنا گہرا تعلق ہے، اتنا ہی اور زبان سے نہیں ہے۔ اردو و ہندیا کے عربی زبان کے جو ہمیشہ غلط فہمیاں میں گھری رہی اور جس کو اپنی اور بے گانوں نے اس کی بے وقعتی، ہمہ گیری اور اس کے باوجود جوتہ نہ ماریاں میں غائب کی گوتہ شکی۔ اس کی تعلق و صورت پر دور میں بہت سوں کو دھوکہ دیتی رہی۔ اسی دوران تھا کہ نسبت بھی بڑے بڑے ادیب اور محقق انگریزوں کی جلیوں میں پھٹتے رہتے ہیں۔ اور بعض اب تک بھی جھگڑا، گمراہی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی وجہ سے پنجابی زبان کے اس حصے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو ان کے بننے اور ترقی کرنے میں ادا کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو کے آغاز و ارتقاء کے سرچشمہ اس وقت تک کسی ماہر لسانیات کو نہیں مل سکتا۔ ساتھ پنجابی کے تعلق پر غور نہیں کیا جاتا۔

بعض لوگ غلط فہمی یا متعاقبی تہ صوب کی وجہ سے اردو کو ہندی یا سندھی یا برہم بھاشا یا کھڑی اور دوسروں کو بھی بھاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایسی غلطی ہے کہ اس کو مان لینے کی وجہ سے ہر منرا گوارا کر لینا پڑتا ہے۔ اور یہ سلسلہ لانا ہی بن کر ہندو پارہ صابان فضل و کمال کو بھی گمراہ کر دیتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ اردو اول چوں نہ ہمارا کچھ تاثیر یابی رسد ویرا کچھ

یہ غلطیاں اور غلط فہمیاں زیادہ تر یورپی محققین اور ماہرین لسانیات کی پیدا کردہ ہیں۔ اس میں فرانسیسی اور انگریزی ماہرین لسانیات نے ہماری زبانوں سے متعلق قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور ہم ان میں گمراہی کے یہی نہیں ہیں کہ احسان کے سعادت مندانہ اعتراف کے ساتھ ساتھ ہم ان کی غلطی قبول کر لیں۔

ہمارے ملک کی سیاسی و سماجی آزادی کے بعد سے ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے گمراہی اور اپنی زبانوں اور ان کے ادب کے متعلق آزادانہ اور صحت مندانہ نقطہ نظر کو پیش نظر رکھ کر تحقیق، نظریوں اور پاور ہا خیالات کو جانیں جن کے بعد علم و ادب کے سرسبز و سرخ رنگ ہوں گے۔

یہ ان کے بے جا رعب کی وجہ سے صحیح مان لیا کرتے تھے اور مان رہے ہیں۔  
 یہ رعب بات ہے کہ اردو اور پنجابی کے اصلی تعلق کی نسبت کسی یورپی ماہر سانیات کا ذہن اب تک متغزل نہیں ہوا۔  
 اس کی طرف سب سے پہلے ہم ہی لوگوں کی توجہ منطقت ہوئی اور ہندوستانی اہل قلم ہی نے اردو اور پنجابی کے اس بنیادی تعلق کو  
 سب سے پہلے بے نقاب کیا۔

آج سے راج صدی قبل مسیح میں پرفیور حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو میں اس خیال کو نہایت  
 واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی راقم الحروف اردو کے آغاز و ارتقاء  
 پر لندن یونیورسٹی میں سانیاتی تحقیقات میں مصروف تھا میرے مطالعے اور تلاش میں تو میں بھی یہی حقیقت بے نقاب ہوئی تھی فرق  
 صرف اتنا تھا کہ میں نے یہ واضح کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دو آب گنگ وجہ کی زبان میں بہت کم  
 فرق پایا جاتا تھا۔ برج بھاشا کھڑی بولی اور بعد پیدہ پنجابی زبانیں بعد کے عالم وجود میں آئیں جیسا کہ میں نے اپنے مقالے میں اس نظریہ  
 کو ثبوت دینے کے ساتھ بیان کیا۔ اس مقالہ کی تکمیل کے بعد راقم الحروف نے صوبائی لفظ نظر سے اس کی مزید توثیق کی اور اس سلسلے  
 میں جو علمی غلطیاں کی تھیں ان کو کئی صورت میں "ہندوستانی فونٹیکس" کے نام سے ۱۹۳۲ء میں پریس میں شائع کیا بعد میں اس نظریہ  
 کی مزید وساحت اور اہل اردو میں اشاعت کے لئے ایک اردو کتاب "ہندوستانی سانیات" لکھی جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔  
 اس مقالہ کے بعد سے اہل اردو اور ماہرین سانیات کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اردو کے سر زمین پنجاب میں پیدا ہونے  
 و سامانی نشو و نما حاصل کرنے کا نظریہ مستحکم اور مسلم الثبوت ہو گیا۔

۱۹۳۲ء میں ہادی زبان کے ایک قابل احترام شاعر اور ادیب پنڈت برج بھوین دتا نے یہ کہتی دہلوی نے اپنی کتاب "کیفیت  
 اردو" میں بھی انھوں نے راقم الحروف اور محمود شیرانی کے اس نظریہ سے اختلاف نہیں کیا بلکہ صفحات ۵۷ تا ۶۴ پر  
 اس کی تائید کی کہ اردو کی پیدائش کے وقت شمالی اور شمال مغربی ہند کی زبان تقریباً ایک ہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی شل  
 نے ہی وجہ سے اس واقعہ کا صاف طور پر اعتراف نہیں کیا کہ اردو پنجاب ہی میں پیدا ہوئی بعد ورو میں پھلتے  
 پھرتے گئے۔

راقم کا ہرگز یہ فٹا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطے کو اردو کا مولد ہونے  
 کے اعتبار سے محروم کیا جائے یا یہ طرہ اختیار کیا جائے جس سے کسی کو  
 اس سے انکار ہو جائے۔

بات یہ ہے کہ اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی حقیقت میں کسی کی تردید نہیں ہے بلکہ اس کی تردید کرنے والے  
 صرف وہ ہیں جن سے اردو اور پنجابی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے جس سے ان کے دل میں  
 یہ حسرت پیدا ہوتی ہے کہ اردو ان کے لیے نہیں تھا۔

اس کے علاوہ اردو کے مولد اور زبان کا اصل سرچشمہ اردو کے مولد اور زبان کا اصل سرچشمہ اردو کے مولد اور زبان کا اصل سرچشمہ

اور خطبے شامل ہیں۔ ان میں سے بعض بہت ہی قدیم یعنی ۱۹۱۵ء کے لکھے ہوئے ہیں لیکن ۱۹۳۳ء کے متنازعہ میں مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو سارہ میں بنی ہے چنانچہ وہ طویل بحث کے بعد جو نتیجہ اخذ فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ ”قریبی فیاس یہی ہے کہ عربی کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا جیوولی اس واوی

سندھ میں تیار ہوا ہوگا : اس

اس سے پہلے کے ایک خطبے میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ

اور دوزبان کا یہ ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں بلکہ مختلف

قوبوں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے۔۔۔۔۔

اور وہ شہا سبھان کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں

خلیوں اور تعلقوں ہی کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔ ص ۷

ایک اور مضمون میں مولانا نے یہ رائے قائم فرمائی ہے کہ

یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، وکن، پنجاب اور بمبائل ہر جگہ کی

میرہ وارث باغوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی ۲۵

واضح ہو کہ مولانا سلیمان ندوی کے یہ عجیب و غریب اور متضاد بیانات ”پنجاب میں اردو“ اور ”ہندوستانی سائنات“ کی اشاعت کے بعد شائع ہو رہے ہیں۔ جتنی میں اس مسئلہ کی پوری طرح واضح کر دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان تحقیق اور سائناتی کتابوں کے مطالعہ کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائی۔ لیکن ان متضاد بیانات اور راپوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد جب پٹنہ کی کمیٹی نے فلم ”ٹھکانہ قطعی“ طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے سے گریز کیا۔ اور چونکہ یہ دونوں اصحاب سائنات سے زیادہ تاریخ ادب و نقد شعر کے ماہر ہیں، اس لئے اپنے علم و فضل اور وسعت معلومات کے باوجود اہل مسئلہ سے وعدہ ہو گئے۔

یاشاید دوسرے مصنفوں کی تحقیق یا نظریہ سے ہم خیال ہونے کو اپنے تجربہ علم کے لئے کسر نشان تصور کیا۔

غرض "نقوش سلیمانی" اور "کیغیہ" کی اشاعت کے بعد اردو کے آغاز و ارتقاء اور جائے پیدائش کے بارے میں اردو اور ہندی کے اربابِ فہم پھرتہ مذہب میں پڑ گئے۔ اور اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کے مسلم القہر فطریہ کو نظر انداز کرنے کا میلان شروع ہو گیا۔ اس میلان میں شاید اس لئے بھی تقویت پیدا ہونے لگی کہ اس نظریہ کے آغاز کا سہرا کسی یورپی محقق کے سر نہیں باندھا گیا تھا اور ہم ہندوستانیوں کے نزدیک اب تک انگریز یا جرمن یا فرانسیسی مصنف کا نام ہی کسی خیال یا نظریہ یا رائے کی صداقت و صحت کی نسبت بڑی ضمانت ہے۔

دوسری وجہ شاید یہ ہے کہ اس میلان کو ہوا دینے والے آرد اور ہندی اویب چونکہ خود ساینات پر کافی عبور نہیں رکھتے، اس لئے خود ذاتی تحقیق و تفتیش کرنے سے معذور ہیں۔

تیسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے اکثر تصویر داری مصیقت کے شکار ہیں اور ان پر دوش اور وہی کے سوا کسی اور مقام کو اردو اور ہندی کا مرکز و منبع ملنے کے لئے تیار نہیں اور نہیں چاہتے کہ بیچ کی مقدس سرزمین اور اس کے فوجی علاقے

اس وقت نہ محروم ہو جائیں اور اردو کے آغاز کا سراپا بن جائے۔  
 اردو کے آغاز و ارتقاء سے متعلق اردو کی جدید ترین لسانیاتی تحریروں کے تجزیہ سے قبل ضروری معلوم ہونا ہے کہ  
 پروفیسر آکٹر سیٹی کمار چٹرجی کی انگریزی کتاب "انڈو آریہ اور ہندی" اور پروفیسر ڈاکٹر صدیشور داس کی اردو کتاب  
 "انڈو آریہ" کا بھی تذکرہ کیا جائے۔

ڈاکٹر سیٹی کمار چٹرجی لکھتے ہیں نیوٹنی میں لسانیات کے پروفیسر اور ہندوستان کے سب سے بڑے عالم لسانیات اور  
 محقق ہیں۔ ان کی تصانیف کی اولیت و اہمیت اور ان کے تحریروں کی وجہ سے اگر ان کو ہندوستان میں ہندوستانی لسانیات کا امام  
 کہنا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی تحقیقات نے یورپ کے بڑے بڑے ماہرین اور خاص کر "لسانی جائزہ" کے مرتب سر جارج  
 برنارڈ شاویئر کی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ گجرات کی درنا کر راجسوساٹی نے سنگھڑ میں ان کو ہندی، ہندوستانی  
 کے لفظ و بنا پر تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا تھا اور یہ تقریر ہی اس سوسائٹی کی طرف سے "انڈو آریہ اور ہندی"  
 کے نام سے ناپی صورت میں شائع کی گئی تھیں۔ پروفیسر چٹرجی نے اپنی اس کتاب میں "ہندوستانی لسانیات" سے ان الفاظ میں  
 اذعان کیا ہے کہ

The language that they (Muslims) first adopted was naturally that current in the Punjab. Even in these days, there is not much difference between the Punjab dialects, particularly those of Eastern Punjab, from those spoken in the western most parts of the United Provinces; and eight or nine hundred years ago, we might imagine that the difference was still less: it is even likely that an almost identical speech was current in Central and Eastern Punjab and Western United Provinces." (p. 167)

اس کے بعد وہی میں مسلمانوں کی آمد اور وہاں اپنی بنائی ہوئی بولی کو پنجاب سے ساتھ لائے گا، کران الفاظ میں کیا ہے۔

"It is likely that Punjabi Mohamaddans who came to Delhi as followers of the Turki and Persian conquerers had the greatest importance of all the Indian groups, in the new capital. They brought their dialect to Delhi; and their dialect, which agreed with those of the districts to the North and North West of Delhi in some important matters, gave the tone and supplied some salient characteristics to the new vernacular which came into being in the new capital city." (pp. 168-169)

اس بیان کے آخری حصے میں چیرچی نے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی عظمت قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے آگے جید صفحات بعد ہی ڈاکٹر چیرچی آدو وشر پارے کے حوالے سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ آدو وشر پارے نے پنجاب ہی سے آئے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"Judging from the kind of speech the descendants of the North Indian Muslims, still speak in the Deccan, and from the language of early Dakvi Poetry of the 16th-17th centuries (cf. Urdu Shahpare, by Dr. S. Mohiuddin Qadri, Hyderabad Dakan Part I, 1929), it is clear that they mostly hailed from the Punjab and from the Bangaru and "Vernacular Hindustani" dialects areas of North India." (p. 184)

مگر بڑا تعجب ہوتا ہے جب سینٹی مار جیسا محقق آگے کی چند سطروں میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ وکٹی آدو وکٹی اور بولی سے بنی اور شمالی آدو وکٹی اور بولی سے۔ وہ کہتے ہیں۔

"The North Indian Vernacular which became established in the South was sister speech to Hindustani, if not exactly identical with it, being of some Punjab and Western United Provinces origin." (p. 184)

چند اور سطروں کے بعد چیرچی مہر آدو کا اصلی وطن پنجاب ہی کو قرار دینے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ شاہ برہان الدین حاتم کی نظم "سکہ سہیلا" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

Shah Burhan's language has some distinct Punjabi affinities, and it is noteworthy that he calls it Guj (a) ri as contrasted with Bhaka, i.e. Braj Bhaka. This name Gujri gives an indication of the origin and affinity of this dialect: evidently the Gujars of the Punjab ..... had come in good numbers with the North Indian armies, and they maintained their name and their dialect in the Deccan for some time." (pp. 185-186)

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ پروفیسر سینٹی مار چیرچی کے ان نمایاں متضاد بیانات کے اسباب اور ان کے حسن و قبح پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ البتہ اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ یہ ہم بیانات بھی ان غلط تعبیروں کا باعث ہیں جو بعد کے

انداز پر باقیہ سلم کی سانیاتی تحریروں کو گمراہ کر دینے کا باعث ہوئے اور جن کا ذکر آئندہ درج ہے۔

پروفیسر چٹرجی کی تقریروں کے اس مجموعہ کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی اوارہ ادبیات اردو کی طرف سے پروڈیوسر ڈاکٹر سدھیشو روماک کی ایک کتاب ”آریائی زبانیں“ میرے ہی مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔ سدھیشو روماک اپنی آف دبلہ کالج جموں میں سنسکرت اور سانیات کے پورے تک پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے موضوع کی مناسبت سے آریائی زبانوں پر اس کتاب میں تفصیل سے بحث کی ہے لیکن اس کی تمہید میں ہندوؤں نے ان کے مآخذ و ارتقا پر بھی سرسری طور پر غماز کیا ہے۔ لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا۔ نہ تو محمود شیرانی کی کتاب ”پنجاب میں اردو“ ہی پڑھی۔ نہ پنڈت کپھڑی کی ”کیفیہ“ اور نہ ہندوستانی سانیات ہی کا مطالعہ کیا۔ اگرچہ چٹرجی کی مذکورہ بالا کتاب کے جا بجا ترانے ملتے ہیں لیکن اردو یا ہندوؤں کے آغاز کی نسبت اسی پرانے خیال کو دہرایا ہے کہ وہ دہلی کے بازاروں اور ضلع میرٹھ کی زبان سے لی گئی ہے۔ (صفحات ۱۲، ۱۳)

آخر میں اردو ادب ہندی کی ان کتابوں کا ذکر ضروری ہے جو گذشتہ چار پانچ سالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں خاص طور پر دو کتابیں اہمیت رکھتی ہیں اس لئے کہ وہ سانیاتی انداز میں لکھی گئی ہیں اور اردو کی ان معدومے چند کتابوں میں سے ہیں جو اس مخصوص موضوع پر اب تک شائع ہوئی ہیں۔

پہلی کتاب پروفیسر احتشام حسین کی ”ہندوستانی سانیات کا خاکہ“ ہے۔ احتشام حسین صاحب نے دراصل جان ہیئرلینڈ کی کتاب ”این آڈٹ لائن“ کا ترجمہ اپنے ایک میر حاصل مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۷ء میں شائع کیا ہے۔ ان کا مقدمہ اگرچہ بطور ویجاچہ، کتاب کے ساتھ شریک ہے لیکن بجائے جو ایک مبسوط مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں احتشام صاحب نے اس موضوع کی تمام مطبوعہ کتابوں کے مطالعہ کا بہت عمدہ ٹیڑھ نہایت سچے سچے انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن بڑی حیرت ہوئی ہے جب یہ جملہ بھی اس مقدمے میں نظر سے گذرنا ہے کہ

”جیولز بلاک (فرانسیسی ماہر سانیات) نے جلفوہ پیش کیا ہے اور جسے ڈاکٹر زور نے تسلیم کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اہل۔ ایس پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا۔ بعد میں ایک پنجابی بن گئی۔ دوسری کھڑی بولی“ (صفحہ ۵۳)

حالانکہ نہ تو پروفیسر جیولز بلاک نے یہ نظریہ پیش کیا اور نہ میں نے کہیں اپنی کتابوں میں ان کے کسی نظریہ کی وضاحت کی۔ اس نظریہ کے اگر کوئی باقی قرار دے جائے تو وہ دراصل پروفیسر چٹرجی ہیں جن کی طرف میں نے ”ہندوستانی سانیات“ میں صفحہ ۹۰ اور ”ہندوستانی فونٹیکس“ میں صفحہ ۱۹ پر اشارہ بھی کیا ہے۔ پروفیسر جیولز بلاک نے دراصل اپنے ایک مضمون میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوستانی کے آغاز و ارتقا پر غور کرنے وقت دہلی کے اطراف و اکناف کی بولیوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے اور ان کا یہ مضمون اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن کے پبلیشنگ ہاؤس نے ۱۹۲۷ء میں اس وقت چھپا تھا جب کہ میرا مقالہ جی۔ ایچ۔ ڈی مکمل ہو چکا تھا۔ اگر یہ مضمون اس کی ترتیب کے دوران ہی چھپتا تو میں



اس کی تائید تو یقیناً نہیں شاید زبردستی کرتا۔

پروفیسر جرنل خود بھی محمود شیرانی کی کتاب اور میری تحقیقات سے اس وقت تک ناواقف تھے اور جب میں ۱۹۲۹ء میں لندن سے بی ایچ ڈی کر لینے کے بعد ڈی لٹ کے لئے بیرس ہینچا اور پروفیسر جرنل بلاک کے ساتھ گجراتی فارم آف ہندوستانی پر مقالہ لکھنا شروع کیا، اس وقت ان مباحث اور نظریہ سے پوری طرح واقف ہوئے۔ چنانچہ جب بیرس ہی سے ہندوستانی نوے لکس مسائل دیے تو اس پر خود پروفیسر جرنل بلاک ہی نے مقدمہ تحریر فرمایا اور چونکہ وہ اس نظریہ کو سمجھ چکے تھے اس لئے اپنے مقدمے میں اس کی کوئی مخالفت بھی نہیں کی۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ہندوستانی مصنفین کے لئے کسی پوری محقق کا نام ہی ضمانت کا کام دیتا ہے چنانچہ جرنل بلاک کے اس ابتدائی خیال کو بھی سمجھ لینے کے بعد پروفیسر احتشام حسین نے اپنے مقدمے کو اردو کے آغا زاد جیسے پیدائش کے بارے میں کوئی قطعی نتیجہ قائم نہ کر سکتے بغیر ہی ختم کر دیا ہے۔

یہ حال اس کی دیکھ کر ایک دوسری کتاب مقدمہ تاریخی زبان اردو کا بھی ہے۔ اس کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی بی ایچ ڈی کے مقالے کے طور پر مرتب کیا تھا۔ یہ مقالہ ابھی حال میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے اس مقالہ میں اگرچہ زیادہ تر پروفیسر بینی کی رچرچ کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور ان کی تحقیقات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن جرنل بلاک کے ذکر رہا مضمون کو بنیاد قرار دے کر پوری کتاب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ پنجابی سے توجہ جٹا کر ہریانوی کو آگے بڑھایا جائے اور کچھ اس انداز میں کتاب لکھی گئی ہے کہ پنجابی واقعی میں نظر میں چلی جاتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین یہ تو مانتے ہیں کہ :-

”یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانوی اور پنجابی میں خط فاصلی قائم کرنا دشوار تھا۔ (دست)  
لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عجیب و غریب خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ :-

”البتہ شوریہینی اپ بھرنش کی جائنہیں ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابل میں ہریانوی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا بڑھکا۔ (دست)

اس کتاب میں مسعود صاحب نے ایک اہم فرد گناشت یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانوی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کئے ہیں۔ حالانکہ وہی اردو نے جس وقت پنجاب میں نشو و نما حاصل کیا اس وقت ہریانوی اور کھڑی بولی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور خود انھوں نے پروفیسر شیرانی کے اس نظریہ کو قبول کیا ہے کہ ہریانوی کی پیدائش مسلمانوں کی آمد و بلی کے بعد ہی آئی ہے (دست) ڈاکٹر مسعود حسین مانتے ہیں کہ لاہور کی ترکی ہندی فصاحت میں خواجہ مسعود سلطان پرورش پاتے ہیں۔ جو ہندی زبان کے بھی بڑے گوشت خور تھے۔ (دست ۱۲۹)

اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ”خواجہ مسعود کسی ہندی زبان میں بھی شایع کر تے تھے اور شاید ان کا دل ان خسرو کے وقت

مستطاب تھا۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہندوی زبان کو ہی مسمیٰ تھی۔ اس لئے قیاس قائم کرتے ہیں کہ زبان لاہوری ہوگی۔  
یہ ایک عجیب قیاس ہے جب کہ ہم کو معلوم ہے کہ امیر خسرو ہر جگہ کی زبانوں کا فرق جانتے تھے اور اپنے حمد کے  
تبرکے بڑے ماہر محقق مسانیات تھے چنانچہ انھوں نے اپنے حمد کی ہندوستانی زبانوں کی فرست بھی لکھ دی تھی جس کو مسعود صاحب  
بھی سفر ۳ پر نقل کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مسعود سکدھان کی زبان لاہوری ہوتی تو امیر خسرو اس کو لاہوری ہی لکھتے اور  
ان کی زبان اور مسعود کے دیوان کی زبان میں فرق ہوتا تو وہ ضرور یہ بھی واضح کر دیتے کہ میں نے دہلوی میں شاعری کی اور مسعود  
نے لاہوری میں۔

لیکن اس کی بجائے انھوں نے اپنی اور مسعود دونوں کی زبان کا نام ہندوی ہی لکھا۔  
اس سلسلے میں ایک اور بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ امیر خسرو نے اپنی زبانوں کی فرست ہندوی کو الگ  
ہی لکھا اس لئے کہ یہ زبان میں صوبجاتی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ان کے حمد میں یہ کوئی مقامی زبان نہیں رہی تھی۔ اور انھوں  
سے جن زمانوں کے نام لکھے ہیں، وہ صرف مقامی ہیں اور ان مقامی زبانوں کی فرست میں برج بھاشا کو انھوں نے دہلوی اور  
پنجابی کو لاہوری لکھا ہے۔

مسعود صاحب دہلوی کو اردو سمجھتے ہیں اگر یہ صحیح ہوتا تو خسرو پر یہ الزام رہتا کہ انھوں نے برج بھاشا جیسی اہم زبان  
کو ذکر ہی نہیں کیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ہر بانی کو اردو کا ماخذ ثابت کرنے کی کوشش میں ڈاکٹر مسعود حسین کی پوری کتاب ایسی گنجلک اور مبہم و  
منفصا و باتات سے معمور ہو گئی ہے کہ ان پر ایک سرسری تبصرہ کے لئے بھی کافی وقت اور فرصت درکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں  
کہ یہ کتاب محنت اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی ہے اور مصنف نے مسانیات مسائل سے گہرے شغف کا ثبوت دیا ہے لیکن محض  
تعمید و تکرار کی سند پر ایک پورا نظریہ قائم کرنے اور پنجاب میں آغاز اردو کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کی سعی میں اپنی ساری قابلیت  
وقت کر دی ہے۔

اس کی اشاعت کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اردو کے آغاز اور ارتقا کے بارے میں عام طور پر انتشار خیالی پیدا ہوا اور ہر شخص  
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان سب کتابوں اور ان کے مندرجہ مبہم و منفصلہ  
بیانات کی جانچ کی جائے اور ان میں جہاں غلطی ہے، اس کی ترمیم و ترمیم کے ساتھ پیش ہو۔ اور پنجابی اور اردو دونوں زبانوں  
میں ایک ایسی مبسوط کتاب مرتب اور شائع کی جائے جس میں مسانیات نقطہ نظر سے اور دلائل و براہین کے ساتھ اردو کے آغاز اور ارتقا  
درآمد اور پنجابی کے تعلق پر روشنی ڈالی جاسکے۔

اس کتاب میں ان امور کا پھر سے تفصیلی جائزہ لینا بیگانہ جن کے بارے میں شیرانی، کیفی، چٹرجی اور مسعود حسین خاص نے جہی  
بحث کی ہے اور جس کے سلسلے میں ان کے آپس میں اتفاق یا اختلاف رائے پیدا ہوا ہے۔

اس بات کو صاف طور پر واضح کرنا چاہئے کہ ہر بانی زبان کی پیدائش اردو کی پیدائش کے بعد عمل میں آئی ہے۔  
اور اگر قدیم و کئی اردو کی بعض خصوصیات ہر بانی زبان سے ملتی جلتی ہیں تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ اردو ہر بانی سے بنی بلکہ اس کا اصلی

سبب یہ ہے کہ اردو اور ہریانی دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔

تدویم کوئی اردو کی بہت سی کتابیں اس اثنائیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں اور آ رہی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جو تک پیڑھی و شیرانی اور مسعود حسین خاں کسی کی وسائی نہیں ہوئی۔ اس لئے اب قدیم ترین زبان کے ان نمونوں کا گورنمنٹ، کبیرا، فلسی واکس، مسود واکس اور سٹو وچندر برہمے کی زبان سے مقابلہ کر کے ان کے آپس کے لسانی اختلافات کو واضح اور محسوس کرنا چاہیگا۔ وکن کی طرح کجرات مالوہ اور خاندیس کے قدیم مصنفین کی کتابوں اور نٹھوں کی زبان بھی اس مقابلہ و موازنہ میں زبردست آئی ضروری ہے۔ اس لئے کہ ان علاقوں میں بھی سرزمین پنجاب ہی کے فیض یافتہ صدیوں سیاسی اور علمی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہے ہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر جو کتاب مرتب ہوگی اس سے نہ صرف اردو کی ابتدا اور جائے پیدائش کے مسئلہ کی بجھوت ہو جائے گی بلکہ پنجابی اور پنجابی اردو کے درمیان اور بنیادی تعلق کے بارے میں جو غلط نظریات حمد حاضر کے ادیبوں اور محققوں کے دماغوں میں نشوونما پا رہے ہیں، ان کی تردید ہو جائے گی۔ اور اردو، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں کے ارباب کو معلوم ہو گا کہ یہ تینوں زبانیں باہم و گہرے تعلق پر مشتمل ہیں اور یہ کہ سرزمین پنجاب نے ہندی اور اردو کی شکل میں ہندوستان اور پاکستان کو کیسی عظیم الشان نعمتیں عطا کی ہیں۔

# تنقید میں نقطہ نگاہ کی اہمیت

## شوکت سبزواری

تنقید ایک مفید فن ہے جس سے اچھا اور مفید کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب صحیح تنقیدی شعور سے کام لے کر تنقید میں باقاعدگی پیدا کی جائے اور ایک فن کی طرح اس کی عمارت ٹھوس علمی بنیادوں پر استوار ہو۔ تنقید کو باقاعدہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ تنقید کے اصول نہیں، شعر و فنی کے بندے محکے قاعدے ہیں۔ کچھ پیمانے ہیں۔ جن کی مدد سے شعر یا نثر یا رے کو ناپ کر اس کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ سونے اور چاندی کے پرکھیا کے پاس ایک کسوٹی ہوتی ہے۔ جس پر رگڑ کر وہ کھوٹے کھرے کی جانچ کر لیا جاتا ہے۔ تنقید کے اصول بھی کسوٹی کی طرح ہیں۔ جن پر شعر کے کھرے کھوٹے کو پرکھا جاتا ہے۔ یہ اصول اگر طے ہو جائیں تو تنقید میں باقاعدگی آجائے۔ اور وہ ایک مفید اور علمی بنیادوں پر استوار فن کی حیثیت اختیار کرے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک زمانہ تھا جب تنقید کے اصول مقرر تھے۔ جن پر شعر کو پرکھا جاتا تھا اور جوان اصولوں کو جانتے تھے۔ وہ نقاد نکلتے تھے۔ ان کے فیصلے اٹل ہوتے تھے۔ لیکن یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تنقید لغتوں کی جانچ پر کھ اور ترکیب تول سے آگے نہ بڑھی تھی۔ نقاد لکھے کی فصاحت اور کلام کی بلاغت کے فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔ اب تنقید بدلت آگے بڑھ گئی ہے اب اس میں زندگی کی سوسائٹ آگئی ہے۔ آج چند اصول مقرر کر کے انہیں معیارِ نقد قرار دینا ایسا ہے جیسے چھینیں اپنی گز کی مدد سے اس وسیع ادب پہنا اور کائنات کی وسعتوں کو ناپنا۔ آج کسی طرح بھی تنقید کے بندے محکے اصول نہیں ہو سکتے۔ پھر تنقید میں باقاعدگی اور ایک فن کی سی استواری کس طرح پیدا ہو؟

اس سوال کا جواب مختلف نقادوں نے مختلف طریقوں سے دیا ہے۔ یہ نقاد مختلف نقطہ ہائے نگاہ کے مالک تھے۔ وہ زمانہ کو جن زاویوں سے دیکھتے تھے۔ شعر و ادب کے کارناموں کے پرکھنے میں انہی زاویوں سے انہوں نے کام لیا۔ اس لیے ہر ایک نے اپنی تنقید کا معیار الگ بتایا۔ میرے خیال میں اس سے تنقید کی حیثیت واضح نہیں ہوتی اور نہ اس میں باقاعدگی آتی ہے۔ تنقید میں باقاعدگی اسی وقت آسکتی ہے جب زندگی کی بابت اسی نقادوں کے زاویہ نگاہ کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور معیارِ نقد مقرر کرنے سے پہلے اس نقطہ نگاہ کی حقیقت دریافت کر لی جائے۔ جو اس معیار کے لیے اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے جس طرح تنقید کے بندے محکے اصول نہیں۔ اس کا کوئی قطعی معیار بھی نہیں۔ معیار یا تو چند اصولوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں اصول نہ ہوں۔ وہاں مجموعہ کہاں ہو سکتا ہے یا معیار ایک جامع اور کسی قدر مبہم اصول کا نام ہے جو اپنی جامعیت اور ابہام کی وجہ سے نہ تو واضح ہی ہے اور نہ قطعی۔ منطق کے

اصولوں کی سی رتختی اس میں پائی جاتی ہے اور نہ پرے کے گزری کی سی سطحیت۔ مثلاً حسن کاری، یا افادیت یا زندگی کی تنقید، یا سماجی شعور وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کو معیار نقد قرار دیا گیا ہے۔ کسی کے نزدیک حسن کاری ادب ہے۔ کسی کے نزدیک افادیت، کوئی زندگی کی تنقید کو ادب بتاتا ہے اور کوئی سماجی شعور کو۔ حسن کاری کی حدود کیا ہیں؟ افادیت کسے کہتے ہیں؟ زندگی کی تنقید کا معیار کیا ہونا چاہیے؟ سماجی شعور کی اساس کیا ہے؟ اور اس سے کوئی چیز بھی واضح نہیں۔ تنقید کے اصولوں کی طرح ان میں سے کسی معیار کے بھی بندے ملے، اصول میںیں بتائے گئے۔

ادب کے معنی دو بڑے نقطہ نگاہ ہیں۔ جن پر تنقیدی نظریوں کی بنیاد قائم ہے۔ ایک نقطہ نگاہ تو یہ ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے جسے زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ادب خود ایک متغی اور آزاد نظام ہے۔ اس کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے زندگی کا تانا جوڑنے والے آج کل اکثریت میں ہیں اور ان کے نقطہ نگاہ کو آہستہ آہستہ سبھی ماننے جارہے ہیں۔ یہ ادب کو زندگی کا پر تو سمجھتے ہیں اس لیے ان کا خیال ہے کہ آج زندگی میں جو تنوع ہے جو رنگارنگی ہے۔ ادب میں بھی وہی تنوع اور رنگارنگی پائی جانی چاہئے۔ ان کے نزدیک ادب کی کسوٹی خود زندگی ہے۔ زندگی کے تمام گوشے ادب کا موضوع ہیں۔ اس کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کو ادب میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ زندگی میں سادگی بھی ہے۔ اور پرکاری بھی۔ چیل بل بھی ہے۔ اور رس جس بھی۔ یہ سادگی، پرکاری، چیل بل، رس جس ادب میں بھی سمویا جاسکتا ہے۔ ادب زندگی کا ترجمان ہی نہیں نقاد بھی ہے۔ اس میں زندگی کی تصویر کشی ہی نہیں کی جاتی، زندگی کی تنقید اور اصلاح کا کام بھی اس سے لیا جاتا ہے۔

لیکن اتنا کافی نہیں۔ زندگی کی بابت ان کا نقطہ نگاہ کیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہئے۔ اور ان کی تنقید کی حیثیت متعین کرنے کے لیے بھی دیکھنا چاہئے کہ ان کا یہ نقطہ نگاہ کہاں تک حقیقت کے مطابق ہے۔ دنیا میں ہر چیز کی قدر و قیمت اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب اسے پرکھ کر دیکھا جائے۔ اس کا براہ راست ادبی تنقید سے تعلق نہ سہی۔ لیکن پھر بھی اس کی جانچ پڑتال ضروری ہے۔ اس مکتب خیال کے تنقیدی فیصلوں کا دار و مدار حسن نقطہ نگاہ پر ہے۔ اگر اس کی حقیقت واضح ہو جائے۔ تو اس کا اثر تنقیدی فیصلوں پر بھی پڑ سکتا ہے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک مادی، دوسرے غیر مادی۔ زندگی کی تعمیر جن دو کائناتی عناصر سے ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک مادہ ہے۔ دوسرے قوت۔ جسم مادہ کا مظہر ہے اور ذہن قوت کا۔ جسم کثافت ہے۔ اور ذہن لطافت۔ یہاں تک تو کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے بعد ایک مکتب خیال کے نقاد زندگی کے مادی عنصر یعنی کثافت کو اصل زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مادہ قوت سے پہلے ہے۔ اول اول مادہ تھا۔ قوت بعد میں رونما ہوئی۔ بلکہ قوت مادہ سے الگ اور اس سے مختلف کوئی حقیقت نہیں۔ وہ مادے کی کسی قدر لطیف صورت کا نام ہے۔ اس میں تو شاید ہی کسی کو شبہ ہو کہ مادے کے تقدم و تاخر کا سوال براہ راست تنقید سے متعلق نہیں۔ وہ طبیعیات کا مسئلہ ہے جسے نقاد کی بجائے ماہر طبیعیات ہی حل کر سکتا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادبی نقاد بعض ادب و شعر کے نقاد نہ تھے۔ فلسفہ، نفسیات اور طبیعیات کے ماہر بھی تھے۔ اس لیے انہوں نے اگر مادے کے تقدم کا دعویٰ کیا اور اسے اپنے تنقیدی نظریات کی بنیاد ڈھکرایا۔ تو کچھ سوچ سمجھ کر اور جانچ پرکھ کر ہی کیا۔ جس طرح ادبی تنقید ان کے غور و فکر کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح ان کے تنقیدی نظریے اور ان کی اساس بھی ان کی ذاتی کج گامی کی پیداوار ہے۔ لیکن اردو کے شاعروں نے اس بنیادی نظریہ کو کیسے اپنایا؟ وہ ان کے ذاتی فکر اور کائنات کا نتیجہ نہ تھا۔ اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ فلسفہ اور سائنس کے ماہروں کی ایک بڑی تعداد آج بھی اس نقطہ نگاہ کو صحیح نہیں سمجھتی۔

۱۰۰ اور قوت اگر ساتھ ساتھ ہیں تو یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ ان میں سے مقدم کون ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی

یہ دیکھنے سے پہلے ہے یا رات۔ اصل سوال حقیقت کا ہے۔ زندگی کی حقیقت مادی ہے یا غیر مادی فیصلہ جدیدہ طبیعیات کی روش سے  
 کرنا چاہیے۔ اور اس کا ایک افادہ یہ بھی ہے۔ اگر پہلے ہو جائے کہ زندگی کی حقیقت غیر مادی ہے۔ تو ادب میں مادی مطالعوں کو جو  
 غیر معمولی اور اپنی حیثیت سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ قدرتی طور پر ان کی وہ اہمیت نہ رہے گی۔ اور اس کا ادب کے دوسرے  
 ادبی افسانوں پر بھی اثر پڑے گا۔ نیوٹن کے زمانہ تک مادے اور زندگی کے مادی عنصر کی بڑی اہمیت تھی۔ اس وقت تک مادے کو ایک  
 شے سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خیالی عام تھا کہ مادہ مقدار رکھنے والے چھوٹے چھوٹے ذرات کا نام ہے جو اسے سخت اور دبیز ہیں کہ وہ  
 کٹ سکتے ہیں اور نہ بٹ سکتے ہیں۔ مادی دنیا کی بنیاد یہ ذرات ہیں جو مادہ کی نئی ابتدائی صفات یعنی وزن، صلاحیت اور حجم (بعد) کے حامل  
 ہیں۔ جدیدہ طبیعیات کے نظریہ اضافیت و کثیت نے نیوٹن اور ڈالٹن کے قدیم طبیعیاتی نظریہ کا تار و پود کجیہ کر رکھا۔ اور جدید  
 نظریات نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ذرات کی کوئی اصلیت نہیں۔ جسم کی ترکیب برقی ذروں سے ہوتی ہے۔ جن میں الیکٹرون کے لفظوں میں  
 "سہترانہات کا نظام" اور پروٹون و نیوٹرون کے لفظوں میں "محضوہ" کہہ سکتے ہیں۔ برقی ذروں کی تعمیر میں منفی اور مثبت دو قسم  
 کا کارج شامل ہیں۔ جدیدہ طبیعیات کی روش سے زندگی کی حقیقت برقی ذرات کا ہوا ہے۔ اس نظام میں مادے کا درجہ بہت بعد میں آیا۔ اور یہ ترکیب  
 کا مادہ برقی سرے برقی پارے سے اور برقی پاروں کی ترکیب سے ذرات سے وجود میں آئے۔ اور آفریں ان ذرات کے اجتماع سے جسم کی دنیا خلق  
 ہوئی۔ ان طبیعیات میں زندگی کی اصل لطافت ہے۔ کثافت کو لطافت نے اپنی روحانی کاسما را بنایا۔ غالب اردو کا ناول گوشتا ہے۔ اس نے جدیدہ طبیعت  
 کی روش کو اپنی عقل کا رنگ دے کر اس طرح پیش کیا ہے۔

لطافت ہے کثافت جلو پیدا کہ نہیں سکتی  
 چہی رنگار ہے آئینہ یاد بہاری کا  
 مولانا رومی ہی بات اس سے پہلے اپنے سید سے انداز میں کہہ چکے تھے۔

پیکر از مابست شد نے مازو  
 باوہ از ماست شد نے مازو!  
 اردو کے سب سے مکار شاعر انبال کا خیال بھی یہی ہے۔

دما دم دواں ہے بیم زندگی!  
 اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود  
 ہر آن شے سے پیدا بیم زندگی  
 کہ شے ہیں پوشیدہ ہے موج دود  
 گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل  
 خوش آئی سے محبت آب و گل

اردو کے نقاد پر دعویٰ نہیں کر سکتے کہ زندگی کی اصل حقیقت مادہ ہے۔ یہ ان کی اپنی دریافت ہے۔ یہ بات وہ ایک خاص  
 مادے پرست مفکر کی تخلیق دیکھتے ہیں۔ یہ بالکل اتفاق ہے کہ ہمارے بزرگ زندگی کی بابت جو نظریہ رکھتے تھے۔ جدیدہ طبیعیات نے اس کی  
 تردید کی اور وہ مادہ پرست نقادوں کو ایک خاص خیالی کے مفکروں کی تائید بھی جنہیں جذباتی طور پر کرنا زیب نہیں دیتا۔ علمی مسائل میں ہمارے بزرگ بھی  
 بہت سے کام لیا کرتے تھے مگر بزرگوں سے اختلاف کہ وہ صاحب نظری شے۔ تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ زندگی کی بابت وہ اپنے اس مادی نظریہ کے  
 انداز میں جذبات سے کام لیں بلکہ دلائل کا پیشانی میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

بدلی ایک اور بحث ملنے آتی ہے جس کا تعلق تنقید کے بعض اجماع نظریوں سے ہے۔ اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اکثر نقاد یہ کہتے  
 سے ملتے ہیں کہ انقلاب رجعت پسندانہ نظریہ ہے۔ ہم انقلاب کے ماننے والے ہیں۔ لیکن یہ نقاد کبھی ارتقاء کی وضاحت نہیں کرتے اور انقلاب ارتقاء

ہیں جو نازک فرق ہے۔ اس کا ذکر بھی وہ فراموش کر گئے ہیں۔ عام طور سے ارتقا اور انقلاب میں فرق مدت کی کمی بیشی سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ جس تبدیلی میں وقت کم لگے وہ انقلاب ہے اور جس میں زیادہ وقت لگے وہ ارتقا ہے۔ یہ غلط ہے۔ مدت کی کمی بیشی کوئی معیار نہیں۔ خود ارتقا کی صورت میں کہیں زیادہ وقت لگتا ہے اور کہیں کم۔ ایک تجربہ مند زمین میں ڈالا جاتا ہے۔ اکثر چھ ماہ کی مدت میں ایک سرسبز اور لہلہاتے ہوئے گیٹ کی شکل اختیار کر دیتا ہے۔ لیکن بعض محرم ایسے جی ہیں جن کے برگ و بار لانے میں سال دو سال سے کم مدت نہیں لگتی۔ ارتقا اور انقلاب دونوں کی حقیقت تبدیل ہے۔ تغیر ایک ایسا عنصر ہے جو دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن ارتقا میں تغیر آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوتا ہے۔ اور انقلاب میں ایک سبک اور دفعتاً ارتقا کی صورت میں ہونے والی چیز کے درمیانی مدارج بھی ہوتے ہیں۔ انقلاب میں ان درمیانی مدارج کی گنجائش نہیں ایک نچے کی پیدائش کی مثال لیجئے۔ اول اول وہ ایک پانی کا قطرہ تھا۔ جس نے پہلے ایک چمک کی شکل اختیار کی۔ پھر گوشت کے کوشٹ کی۔ اس کے بعد ہتھکے اور پٹی کی تھیں چڑھیں اس کے بعد کھال کا پردہ آیا۔ اور آخر میں جان پرگڑی بالکل یہی کیفیت تھم کی ہے۔ زندگی میں ارتقا ہے۔ آج تک انقلاب نہیں دیکھا گیا۔ ڈارون نے انسان کی پیدائش کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ درجہ دنیا کے سبھی ماہرین حیاتیات نے صحیح مانا ہے۔ وہ بھی ارتقا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندو فلسفی نظریہ انقلاب یا کون و قساد کے قائل ہیں۔ اور انھیں عالمی مناسب کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلا انسان ایک سبک وجود میں آیا۔ اور درمیان کی تمام ارتقائی منزلوں کو ہمارے نگاہ سے غور کی آخری سرحد پہنچ گیا۔

انھیں بہت ہیں۔ کوئی گمان نہ لگتا ہے۔ یہ طبعی ارتقا کا ذکر تھا۔ معاشرے کا ارتقا بھی انہی خطوط کے برابر برابرا ہے۔ زندگی میں پیچیدگیوں کے باوجود ایک طرح کی عبوری ہے جنھیں قوموں کے درجہ زوال اور انسانی معاشرے کے مدہ جزر کی داستانیں یاد ہیں۔ وہ طبعی ارتقا کی روشنی میں ارتقا کے قائل ہیں۔ آج تاہم یہی وہ رفتار ترقی پہلے کے معاشرے میں تیز رفتاری جاتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ دیکھتے ہیں کہ جہت تک کوئی قوم معاشرتی ارتقا کی تمام درمیانی منزلوں سے نہیں گزرتی۔ وہ جمہوریت اور مساوات کی آخری منزل پر نہیں پہنچتی (اور یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آخری منزل ہے) اس میں شبہ نہیں کہ انسانی مساوات کی منزل بھی دور ہے۔ آج دنیا میں ایسی قومیں ہیں جو جمہوریت کے احساس سے محروم ہیں۔ اور ایسی قومیں بھی ہیں جو اس سے آگے بڑھ کر معاشرتی مساوات کے قریب پہنچ چکی ہیں۔ اس سے آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ جب تک کسی معاشرے میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ کبھی آگے نہیں بڑھتا۔ صرف چند افراد کی کوششیں اسے آگے بڑھانے یا انقلاب لانے میں مستقل طور سے نہ کبھی کامیاب ہوتی ہیں اور نہ آج اس کی امید ہے۔

ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ معاشرے کی تاریخی رفتار میں ارتقا کا امکان نہیں۔ دوسری طرف پر لے اور نے نظام حیات کے درمیان ایک عبوری دور بتایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتیں۔ عبوری دور کا امکان صرف ارتقا کی صورت میں ہے۔ اگر معاشرے کی تاریخی رفتار کے لیے ناسازگار ہے۔ اس میں صرف انقلابی طوفان ہشتے ہیں۔ اور انقلابیہ جنگ نامہ خیز زلزلے ہستے ہیں۔ تو اس میں کسی طرح بھی عبوری دور کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اور اگر نکل سکتی ہے تو صرف اس وقت جب زندگی کے دواں دواں کارواں کو کسی ایک مقام پر ٹھہرا دیا جائے۔ جو زندگی کی تغیر پذیر اور سفر پسند فطرت کے خلاف ہے۔ انہی کو لوگ رجعت پسند بتاتے ہیں لیکن اس نے قبل کے شعریں زندگی کی جو فطرت بتائی ہے اس پر اس زمانہ کی ترقی پسندی کو قربان کیا جاسکتا ہے۔

حضرتا نہیں کاروان وجود

کہ غلط ہے تازہ نشان وجود

ارتقا کی حالت میں زندگی دوجہ بدرجہ آگے بڑھتی ہے۔ چھوٹک چھوٹک کر قدم رکھتی ہے اس لیے جب تک وہ آخری منزل پر نہ پہنچ جائے۔  
 ہے۔ اور زندگی نامی زندگی تیز ہو جانے کی وجہ سے آگے بڑھنے کی اب صرف یہی ایک مسدودت رہ گئی ہے (اور یہی انقلاب ہے) تو عبوری دور کا  
 انسان اس صورت میں چھوٹا کہ زندگی کسی منزل پر اتنی مدت تک ٹھہر جائے کہ اس کی ناز کی جاتی رہے۔ یہ سکون ہے ابدیہ زندگی کے مزاج کو سازگار نہیں۔  
 پھر عبوری دور کی جو علامت بتائی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمائے غمازوں کے ذہن میں زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں  
 زندگی کی زندگی کی حالت لگاتے ہیں لیکن اس کی فطرت اور مزاج سے ناواقف ہیں۔ زندگی کی فطرت میں تضاد کا یہ ہے جو اس کی روز افزوں ترقی  
 انسانی کی ذمہ دار ہے۔ اگر زندگی میں اہم آویزش رکھنے والی کیفیات کا اٹھنا نہ ہوتا تو ہم اس کی فطرت کو بدل لیا کرتے۔ زندگی کے  
 انسان کی آویزش ہی اس کی جدیت ہے۔ میں نے زندگی کی حقیقت بے نقاب کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ وہ ایک برقی رو ہے جس میں مثبت  
 اور منفی دو طرح کی لہریں گھٹی ہوئی ہیں۔ زندگی اسیلیت کے ہفتاب سے اگرچہ لطافت ہے۔ لیکن جوہر نمائی کے لیے اسے کثافت کا سہارا لینا پڑا۔  
 تضاد و تعبیتوں میں توازن برقرار رکھنا بڑا دشوار کام ہے۔ جب توازن بگڑتا ہے تو زندگی سہارا ڈھونڈتی ہے یہی جدلیاتی عمل ہے۔  
 ادب کا زندگی سے جو تعلق ہے اس کا تقاضا ہے کہ زندگی کی تضاد کا یہی کی جھلک ادب میں بھی نظر آئے۔ آج ادب میں جو تضاد  
 نظر ہے زور پکڑتے جا رہے ہیں، چاہے بقا: اس کی وجہ یہ سمجھیں کہ زندگی اس وقت عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ ابھی ہم کسی منزل  
 پر نہیں پہنچے اس لیے ہمارے ادبی نظریوں میں تضاد ہے۔ ہمیں ہر مختلف میلانات پسند جاتے ہیں۔ جن میں بظاہر مجبوراً ناخکی ہے۔  
 اندرونیات و اجتماعیت۔ روایت و بناوٹ۔ واقعیت و خیالیات۔ مقصدیت و دروہانیت۔ داخلیت و خارجیت۔ جدت و قدامت، مادیت  
 و معنویت۔ یہ تضاد نظر ہے اگر ہماری موجودہ زندگی کی الجھنیں اور آزمائشیں ہیں۔ تو ہمارے ادب میں لہریں رہیں۔ وہ ان آزمائشوں سے کبھی  
 ثابت نہ پاسکیں گے۔ وہ انہیں عبوری دور کے مذہب کی پیداوار کہہ کر ان سے بچا نہیں چھڑا سکتے۔ یہ تضاد نظریے ضرور ہیں۔ ان میں  
 اختلاف و آویزش مسلّم ہے۔ لیکن یہ عبوری دور کی پیداوار نہیں۔ ان میں زندگی کی تضاد کا یہی ہے۔ زندگی کے تضاد و پہلوؤں کی جھلک ہے  
 ان تضاد و میلانات میں توازن قائم رکھنا ادب ہے ان الجھنوں سے حل کھن پیدا کرنا ادب ہے۔ ان کے پیچ و خم کو قائم رکھتے ہوئے ان میں  
 سے یہ بھی زیادہ نکال لینا ادب ہے یہ بھولی جھلیاں ضرور ہے لیکن کامیاب وہ ہے جو اس بھول جھلیاں سے بچ کر نکل آئے اور اس میں کھو  
 نہ جائے۔ اس میں کھو جانے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کو توڑ پھوڑ کر نئی راہ نکال سکیں گے۔ یہ زندگی سے منہ موڑنا ہے۔ دریا کی موجوں سے  
 ٹکراتا زندگی ہے موجوں کی تاب نہ لا کر ماحول پر محض آزمائی کرنے والے زندہ نہیں بلکہ زندگی طرب کاہ خسر و نہیں دکوہ بے سنوں ہے۔ زندگی  
 کا ادب طرب کاہ خسر و کا ضرور نہیں ہوتا۔ کوہ کی چوٹا ہے۔ آج کے بے بھرا دیووں سے تیز نظر تو وہ فساد و فحاشی کی زندگی کی تضاد کا یہی کی وجہ  
 کھٹے ہوئے کہہ گیا تھا۔

زندگی انجی آراؤ گمبیدی خود داست

اے کہ در قافلہ یا چہ شویے ہر شوا !

یہاں نئی نسل کی ایک ذہنی الجھن کھاتے چلیں۔ جو پیش کے لفظوں میں یہ پیکان غامبی ہی دل امیل آج کے اردو ادب کی مصاری ابتوی  
 اور اردو تنقید کی افراطی کے ذمہ دار ہیں۔ زندگی کے مزاج کو پہچان کر ہی ہم ادبی نظریوں کی چھان بھنگ کر سکتے ہیں۔ اس وقت جمائے سامنے





صنعتی محبت کے جذبے کی تہذیب بھی بھڑی اور اس کی مثالیں بھی پرانی تہذیبوں میں ملتی ہیں۔ قدیم ہندوستان میں عورت کو اور اس پر کما جاتا تھا۔ اور کہیں کہیں ناکتھرا لڑکیوں کی پرستش کا رواج بھی تھا۔ بہت ایدیش۔ اور بیچ منتر کی بعض کہانیاں ہندوؤں کے مذہب سے اور عمل کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ لہجہ پ کے سورما کی عہد میں ہمیں بڑے بڑے سودا عورت کے نام پر ہمیں سر کرتے مانتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے اشعار میں عرب کے رہائندوں کو عورت کی نظر میں اقدار حاصل کرنے کے لیے مردِ حرم کی بازی لگاتے لکھا گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت کا مزاج ابتدائی فطری تقاضوں کی تحسین و تہذیب ہے جو معاشری ارتقاء کے قدم بہ قدم بڑھتی رہی اور اب بھی اس کے لیے اوپر عرض کیا، سماج کے تمدنی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اس لیے تہذیب (یا تہذیب) فطرت کا مزاج ہی ہے۔ ابتدائی روح اور ادب کا سماج بھی ہے۔ جو لوگ ادب کی بنیاد ابتدائی جنسی جذبے یا غور و فکر دیتے ہیں۔ وہ لٹریچر کے لیے اس پر مبنی جانا چاہتے ہیں اور حیات و کائنات ساتھ سے چلنے کی جگہ اسے پیچھے دھکیں رہے ہیں۔ یہ اگر ترقی ہے تو ممکن تو ان کے عقائد جو شے نے ذیل کے شعروں میں شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حیف دل کو شکست زندان سے

کہ دیا نسل تازہ سے مایوس

وائے بد وضع شاعرانِ جدید

راگ لکھنؤ، زبانہ لکھی چوس

ان کے اسلوب میں یہ سہمی بلیغ

اہستہ نام ترقی مملکت

جنسی نظریہ حیات کے اثر سے عورت اور مرد کے نئے ادب میں اپنی پرانی جسمانی گرمیوں اور صنعتی دعوؤں کے ساتھ آہری نہ ہوئی۔ بلکہ لادنس وغیرہ جنس زدہ ادبوں کی تقلید میں جمائے یہاں بیگو اور کلونٹ کو جیسے کردار تخلیق کئے جا رہے ہیں انسان کی نئی ہستی دھڑکیں کر رہی جا رہی ہیں۔ سویا ہوا حیوان۔ پاک رہا ہے۔ انقباض نے اور ادب کے اسی رجحان کو دیکھ کر کہا تھا۔

ہندو کے شاعر و صورت گرد افسانہ نویس!

آہ بیچاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار

غذائی نظریہ حیات کی برکت سے آج روحی انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی جگہ بے چکی ہے۔ ہر خیال کی اچھائی اور برائی کا معیار بن گیا۔ وہی گئی ہے۔ مارکس نے جب یہ کہا تھا کہ ”اپنے ماحول کے ساتھ میرا تعلق ہی میرا شعور ہے“ تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ شعور اور ماحول کے تعلق پر زور دینا چاہتا تھا۔ ماحول سے وابستگی اس کے پیش نظر تھی۔ اور اس کی تکمیل پرستی کو دیکھنے ہونے ماحول پر زور دینا کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ لیکن اس کا مطلب آج یہ لیا جا رہا ہے کہ ادیب اپنے ماحول سے مار رہا ہے اور اس سے بلند ہو کر نہ دیکھے۔ یہ ادب کی غایت، فطرت کے مزاج، معاشرے کے ارتقائی رخ سے ناواقفیت ہی نہیں، اور اس کی اپنی نارسائی بھی ہے۔

زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں

جسم سے تیرے پلٹ سکتا تو ہوں!

زندگی پر جھپٹنا نہ ماحول سے چھٹنا ہے اور نہ جسم سے پٹنا۔ یہ اعلیٰ اخلاقی اور روحانی قدروں کے مطابق اس کو ڈھالنا ہے۔ اس کے لیے فکر کی پہاڑ اور بقول گوڑ کی واقعات کی سطح سے بلند ہو کر واقعات پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے ہماری نئی نسل محروم ہے۔ مارکس اور اس کے ہم خیال مفکرین نے فکر کی پرواز کو لامرکزیت سے بچانے کے لیے ماحول اور حقیقت پر زور دیا تھا۔ بقول اقبالؒ

آنکھ عاثر کی نشیمنی پر رہی پرواز میں

یہ رہے پروبال رقص دکھانے والے طاؤس" عاثر فکر کے پر تلنے پر ناچ رہے ہیں۔

یہاں ادب اور سیاست کا فرق واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سیاست میں براہ راست تبلیغ ہوتی ہے۔ ادب میں بوسطہ ادب اور عوام کے ذہنی کی تربیت کرتا ہے۔ اور انہیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ آئندہ الی تبدیلی کو نبھوں کر سکیں۔ سیاست شورش بیا کر کے انقلاب لاتی ہے اور انقلاب جیسا کہ پریم چند نے لکھا ہے جمہوریت مند طریقوں کی ناکامی ہے۔ ادب زندگی اور معاشرے کا خادم ہے۔ ہمارے ادیب اسے سیاست بنا نا چاہتے ہیں۔ یہ خود مار کسی نظریہ ادب کے منافی ہے۔ ٹرائسکی نے اپنی مشہور کتاب اور انقلاب میں ادیب کا اپنے ماحول سے تعلق بناتے ہوئے لکھا تھا۔

روشنی تحقیق فن سے باہر وجود میں آنے والے جدید محرکات کے زیر اثر قدیم ہیئتوں کو

پہچیدہ انداز سے الٹ کر کام لینے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے فن کی حیثیت ایک خادم

کی سی ہے۔ یہ کوئی ایسا منقطع حصہ نہیں جو خود اپنے کو کاٹ کاٹ کر کھائے۔ یہ ایک

متمدن انسانی کا عمل ہے جو اپنی زندگی اور ماحول سے غیر منقطع طور پر وابستہ ہے۔"

ایک متمدن انسانی کی ماحول سے وابستگی اس قسم کی نہیں ہوتی۔ یا نہیں ہو سکتی۔ جس قسم کی وابستگی ایک غیر متمدن انسان کی اپنے ماحول سے ہوتی ہے۔ انسان کبھی ماحول کی پیداوار تھا۔ آج وہ اس کا خالق ہے۔ اپنے ماحول پر یہ تسلط سخت جنگ و پیکار کے بعد اسے حاصل ہوا ہے۔ تسخیر فطرت اس طویل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ادب نے اس جنگ و پیکار میں انسان کا قدم قدم پر محفوظ کیا۔ آج بھی اسے انسان کا معاون ہونا چاہیے۔ آج بھی اسے انسان کی اعلیٰ قدروں کا تحفظ کرنا چاہیے۔ انسان کی ضرورت قدر نہیں۔ اس کی تندرست قدر ہے پانی پینا قدر نہیں۔ خشک زمیں سے پانی کے چشے لگانا قدر ہے۔ ماحول سے چمٹے رہنا قدر نہیں۔ اس کو ڈھالنا، بنانا اور سنوارنا قدر ہے۔ ادیب کو قدروں کا خالق اور ان کا محافظ ہونا چاہیے یہ زندگی کی خدمت ہے۔ زندگی کو آگے بڑھانا ہے۔ رونی کو آگے بڑھانا ہے۔ رونی کو زندگی کی قدر قرار دینے والے زندگی کو آگے بڑھانے کی بجائے پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ رونی سیاست کی قدر ہو سکتی ہے۔ زندگی کا سہارا بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ نہ زندگی کی قدر ہے نہ ادب کی۔ جیسی خواہش انسان کی فطرت ہے جس طرح غذا اس کی فطرت ہے۔ لیکن یہ دونوں جسم کے مطالبے ہیں اور انسان جسم ہی نہیں شعور بھی ہے۔ بلکہ جسم سے زیادہ شعور ہے۔ شعور نے انسان کو جیسی خواہش سے احساس جمال تک پہنچایا اور غذا کی طلب سے اخلاقی توانائی تک۔ ادیب کو جمال، قوت، اور جرات

کا یہ راہ ہوتا ہے۔ انبال نے ذیل کے اشعار میں انسان کی انہیں قد آفریں تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے۔  
 نوشب آفریدی چمن آفریدم      سفال آفریدی ایان آفریدم  
 بیابان و کسار و ران آفریدی      خیابان و گلزار و باغ آفریدم

میں آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

میں آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اگر زندگی سے فرار ادب نہیں تو زندگی کی دلدل میں پھنس کر رہ جانا اور اس میں ٹوٹ لگانا بھی ادب نہیں ہو سکتا۔ آج کے سماج میں معاشیات کی جو اہمیت ہے۔ وہ مناسب ہے بلکہ ادب میں اس کو جو جگہ دے دی گئی ہے وہ نامناسب ہے۔ اس اخلاقی اور روحانی تقدیر میں نظر میں جا پڑی ہیں۔ ادب میں سیاست آگئی ہے۔ پھول کی پتی سے پتھر کا جگہ کاٹا جا رہا ہے۔ سوئی سے چوڑے کا کام لیا جا رہا ہے۔ یہ ادب نہیں۔ ایک مشہور نقاد کے نغموں میں یہ ایسا ہے۔ جیسے کسی چل کی تعمیر سے اصلاح اخلاق کا کام لینا یا گھنٹا مار کے آٹھ چھوڑنا۔ موجودہ نظام حیات اس قابل نہیں کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے۔ لیکن اس کی شکست و ریخت میں ادب کو اپنا مزاج، اپنا نظام اور اپنی روش فراموش نہ کرنی چاہئے۔ ادب قدروں کا خالق ہے۔ سیاست کے میدان میں اتارنا اور معاشی برکتیں ایک طبقے سے چھین کر دوسرے طبقے کے حوالہ کرنا۔ اس کو زیب نہیں دیتا۔ یہ اس کے مزاج و منہاج کے لیے ناسازگار ہے اور بقول ہر پڑے ریڈر سخی سی سلی کو نرم و نازک پھول کی پتیوں سے اڑا کر گھر گھر آنے والی مشین کے آہٹا پیٹے پر بٹھانا ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ کسی کے نزدیک تاریخ کا رخ متغی کرنے والا تنہا عنصر معاشیات ہے۔ اس کے رفیق اینگلس نے اپنے ایک خط میں اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بد سیاست، قانون، فلسفیانہ نظریات، مذہبی خیالات بھی تاریخی مابعات پر اثر ڈالتے ہیں اور اکثر ان مابعات کی شکل متغی کرنے میں غالب اور نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ ادب بھی اسی مؤثر عناصر میں سے ہے۔ ادب نے آج سے پہلے فلسفہ اور مذہب کا ساتھ دے کر ایک صالح انسانی تہذیب کی تعمیر کی تھی۔ آج بھی وہ یہ خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اگر ادب نے سیاست کی جگہ لی اور اپنی ساری کوششیں غیر طبقاتی سماج کے قیام کے لیے وقف کر دیں تو اس کی موت زیادہ دور نہیں۔ طبقاتی کشاکش ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی دفن ہو جائے گا۔

اب کا براہ راست معاشی مسائل میں دخل دینا اور طبقاتی اور طبقہ منانے کا بیڑا اٹھانا ایسا ہے جیسے مذہبی خیالات کی تبلیغ اور اخلاقیات کی نشر و شاعت کا کام ادب سے لینا۔ دونوں ادب کے عمل دخل سے باہر ہیں۔ ادب ابلاغ ہے تبلیغ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود موجودہ معاشی تفاوت کو ادب کی حمایت حاصل نہ ہونی چاہئے۔ ادب اپنی حدود میں رہ کر بھی ترقی پسند رجحانات کی رو بروی میں حصہ لے سکتا ہے۔ ادب کا کوئی خاص موضوع نہیں۔ ادب زندگی کا رفیق ہے۔ اس میں زندگی کی سی وسعت ہے۔ کسی ایک طبقے کے لحاظ سے، وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ کسی ایک موضوع کے ساتھ ادب کو مخصوص کر لینا ادب کی بند فطرت کے خلاف ہے۔ ادب سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا چاہتا ہے۔ آسانی اور عام فہم زبان میں کہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی سطح سے اتر کر وہ بات کہے جو عام چاہتے ہیں۔ عوام کو اٹھانے کی بجائے خود گر جائے۔ اسی کی ذہنی تربیت کو نظر انداز کر کے ان کے جسم پر تنیل کی مالش کرنے لگے۔

مولانا اسماعیل میر تقی نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں تو ان کی ذہنی سطح کے مطابق انہوں نے ”کو آ“، ”ریل گاڑی“ اور ”ایک لڑکی گھبراتی ہے دال“ جیسے سامنے کے موضوعات پر منتخب کئے۔ آج زندگی کے گونا گوں موضوعات میں سے کسان، مزدور، درانتی، ہتھیوڑا، جہیں دروس کو ادب کے لیے مخصوص کیا جا رہا ہے۔ جس معنی میں اسماعیل میر تقی کی شاعری بچوں کی شاعری تھی۔ اس معنی میں آج کا اردو ادب تمام کا ادب ہے۔ وہ بھی محدود تھی یہ بھی محدود ہے۔ بوش کہتے ہیں :-

وہ دو سالہ کا شاعر کیٹا !      شعر میں گانٹھ دے جو چینی دوس  
اس کے ذوق سخن کی ذیبا میں      صرف اک فصل ہے، نہ ماہ نہ پوس  
ایک ہی میکہے میں سہ سہ بوش  
ایک ہی دارے میں سب عجوس

# طبقہ معترکہ

نیاز معجز پوری

افراد کی طرح قوموں کی بھی نفسیات ہوا کرتی ہے جس میں واقعات و حوادث کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں برتی رہتی ہیں اور جنہیں عروج یا زوال کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض قوموں کی بھی تاریخ کا مطالعہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ کسی کسی ایسا بھی ہوا ہے کہ صرف ایک واقعہ نے ایک ملت ساری نفسیات کو بدل کر رکھ دیا اور ہوا کا رخ و فضا اور سرے اور ہوجا۔ تاریخ اسلام میں ہم ایسا ایسا ہی واقعہ ملتا ہے جس کو عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ حالانکہ اس کی اہمیت انہی بڑی ہے کہ اگر وہ واقعہ پیش آئے تو آج ساری دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

رسول اللہ کی حیات میں اسلام کی اجتماعی حیثیت ایک ایسی رہتی تھی جس کی تمام تر ہیں ایک دوسرے سے گنتی ہوتی تھیں۔ آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ لڑی ایک دوسرے سے جدا ہونے لگیں۔ اور اسلام کی "جلی متین" کمزور ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس سوال کے ختم ہونے کا سبب کیا تھا؟ اس کا جواب مشکل نہیں۔ کیونکہ جس نے تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کیا ہے وہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ ان کا سبب رسول اللہ کی جانشینی یا خلافت کا جملہ تھا۔ لیکن یہ بات میں ختم نہیں ہو جاتی۔ ذہن انسانی پھر سوال کرتا ہے کہ یہ جملہ کیا نہیں ہوا۔ اس اختلاف کی وجہ کیا تھی۔ اور اس کا جواب ہم اس کے سوا کچھ نہیں دے سکتے کہ اس اختلاف و نزاع کا سبب صرف یہ تھا کہ رسول اللہ وقت رحلت نے اپنا جانشین نامزد کر گئے اور نہ کوئی واضح ایسا اصول متعین فرما گئے جس کو سامنے رکھ کر ان کی جانشینی کا مسئلہ کیا جاسکتا۔ اور تاریخ اسلام کا یہی وہ ایک واقعہ ہے جس نے نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کا رخ اور سرے اور ہوجا۔ ہر چند اس باب میں اہل السنۃ و الجماعۃ اور شیعہ حضرات اپنی اپنی طرف سے متعدد دلائل پیش کرتے ہیں لیکن ان میں کسی کو کوئی دلیل قطعی اذعان نہیں ہے۔ بجز اوداع کے خطبے میں رسول اللہ کا حضرت علی کے متعلق یہ ارشاد کہ

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاكُمْ فَعَلَيْكُمْ مَوْلَاكُمْ

اپنی جگہ رقم۔ رحلت کے وقت آپ کا ہم کا فخر طلب کرنا جسے واقعہ قرعہ اس کہتے ہیں۔ اپنی جگہ باطل و درست۔ اسی مرتبہ زندگی کی آخری ساعتوں میں رسول اللہ کا حضرت ابو بکرؓ کو امامت کی خدمت تفویض کرنا باطل صحیح لیکن ان میں سے کوئی ایک ثابت ہی ایسی نہیں ہے ہم رسول اللہ کا کھلا جہا اور واضح فرمان یا قطعی دلیل قرار دے سکیں۔

رسول اللہ کے ہمیشہ و محاسن نے تقریباً آخر وقت تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ اور اگر وہ چاہتے تو نہایت آسانی

کے ساتھ صاف صاف انفاق میں منکر خلافت کو طے کر سکتے تھے۔ آپؐ اگر یہ کہہ سکتے تھے کہ کاغذ قلم ہاؤ تاکہ میں اپنے بعد کچھ ہدایات چھوڑ جاؤں یا یہ کہ فلاں شخص ذرا حق نامت انجام دے تو کیا وہ اس سے زیادہ حق پرست یا نہ کہہ سکتے تھے کہ میرے بعد فلاں شخص کو اپنا سردار منتخب کرنا۔ یا وہ یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ صحابہ میں سے کسی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دوسروں کو بھی دست ارادت پر حملے کا اشارہ فرما دیتے۔ یقیناً آپؐ ایسا کہہ سکتے تھے۔ اگر آپؐ چاہتے ہیں آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس نہ چاہنے سے ہوا کا رخ دفعتاً بدل دیا۔ آپؐ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ یہ بالکل مبہم مسئلہ ہے۔ جس کا بالکل موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا مقصد تو یہ صورتِ مفہید صرف یہ بتانا تھا کہ اسلام کی اجتماعیت کے دہم پر ہر جانے کا تعلق جب کیا تھا جس کی بنیاد پر اسلام مقدس جماعتوں میں بٹ گیا اور آپؐ کی خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔

یوں تو یہ تقریباً اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ کو غیظ بنایا گیا۔ کیونکہ یہ حضرت علیؓ کی تو قیادت کے خلاف ہوا تھا۔ اور ان کا ساتھ دینے والے اعزہ کو بھی یہ فیصلہ پسند نہ آیا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت علیؓ بڑے صلحی کُل انسان تھے۔ اس لیے وہ بالکل خاموش رہے۔ اور آخر وقت تک کوشش کرتے رہے کہ اسلام کا شیرازہ منقسم نہ ہو۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے بعد اس نے جنگ جمل اور جنگ صفین کی مسدست اختیار کی تو وہ پھر راجہ عرصے سے پٹا چلا آ رہا تھا پھوٹ گیا۔ اور جماعت اسلامی سنی، شیعہ، خارجی، باطنیہ وغیرہ متعدد فرقوں میں بٹ گئی۔ جن میں سے ایک معتزلہ طبقہ بھی تھا۔

اس وقت ہم سنی، شیعہ اور خوارج کے متعلق کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتے بلکہ صرف معتزلہ جماعت کی بابت مختصر عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ انتخاب ہم نے صرف اس لیے کیا ہے کہ اس طبقہ سے زیادہ اسلام کی علمی و ذہنی خدمت کسی اور طبقہ نے انجام نہیں دی۔

رسول اللہؐ کے زمانے میں اسلام بہ لحاظ عقائد بہت سادہ مذہب تھا اور یہ سادگی اس وقت تک قائم رہی۔ جب تک اسلام سرزمینِ عرب تک محدود رہا۔ لیکن رسول اللہؐ کے بعد جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور عرب و عجم ایک دوسرے سے ملے تو دوسری قوموں کو مذہبِ اسلام کی حقیقت سمجھانے کے لیے نقل کے علاوہ قتل سے بھی کام لینا پڑا۔ اور یہی وہ چیز تھی جس نے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ اور معتزلہ مہذب ہی وہ طبقہ تھا جس نے علم کلام کو انتہائی ترقی تک پہنچایا۔

سب سے پہلے اختلافی مسئلہ جسے امتزال کی اسباب اور مبنیٰ کہنا چاہیے۔ مسئلہ جبر و قدر تھا۔ یعنی یہ عقیدہ کہ انسان سے جو کچھ سرزد ہوتا ہے وہ خود اس کے اختیاری افعال میں اور خدا کی مرضی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس عقیدے کو سب سے پہلے معاہدہٴ غابر کیا اور اسی لیے اس کی ماننے والی جماعت قدریہ کے نام سے موسوم ہو گئی۔ لیکن چونکہ اس اعتقاد کا اثر وقت کی سیاست پر بھی پڑتا تھا اور معاہدہٴ حکومت بنی امیہ کا شدید مخالفت تھا اس لیے عبدالملک بن مروان نے سنہ ۶۵ھ میں معاہدہ کو قتل کرادیا۔ مگر یہ عقیدہ معاہدہ کے زمانہ ہی میں اس قدر رواج پا گیا تھا کہ بڑے رئیس اسے بھانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ معاہدہ کے بعد فیلان دمشق نے اس کی ترویج شروع کر دی اور اس میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے مسئلہ کو بھی شامل کر دیا۔ جو حکومت کے لیے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ لیکن چونکہ یہ زمانہ عربوں کے معاہدہ کا تھا وہ دیانت و امانت میں اپنا شل نہ دکھتے تھے اور فیلان کی سخت نکتہ چینیوں کو

بڑی خوشی سے گراما کر بیٹے تھے۔ اس لیے ان کے مہذب ترک میدان پر سی طرح کھن کر اپنے عقائد کی تبلیغ کرتا رہا۔ لیکن جب منام بن عبد الملک تخت نشین ہوا تو اس نے اسے گرفتار کر کے پہلے ہاتھ پاؤں کٹوا دیے اور پھر قتل کر دیا۔  
 واصل رہے کہ اس وقت تک مجدد اور فیلان کی جماعت کو صرف قدریر یا مدیہ کہتے تھے اور اعتزال یا معتزلہ کا نام کوئی نہ جانتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بصرہ دارالعلوم کی حیثیت رکھتا تھا اور من بصری کے حلقہ درس کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کے شاگردوں میں مروان بن عیینہ اور واصل بن عطاء و شخص ایسے بھی تھے جو غیر معمولی قرب اجتہاد رکھتے تھے اور منقرلات سے زیادہ معتزلات کے ماننے تھے۔

اس وقت نقد اسلامی کی چار اصحاب میں کافر، فاسق، فاجر و منافق شذیت کے ساتھ زیر بحث تھیں اور خصوصیت کے ساتھ یہ مسئلہ زیادہ مایہ المزاج تھا کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کیا سمجھنا چاہیے۔ اس سے قبل ثناء بصرہ کے مرتکب کو فاسق و فاجر کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ لیکن خواجه نے کہا کہ ایسے شخص کو کافر کہنا چاہیے۔ چنانچہ ایک دن یہی مسئلہ پیش ہوا کہ حسن بصریؒ نے کہا میرے نزدیک ایسا شخص مسلمان تو ہے لیکن منافق مسلمان۔ واصل بن عطاء نے کہا میں ایک تیسری صورت اختیار کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ایسا شخص نہ مسلمان ہے نہ کافر حسن بصریؒ یہ سن کر بہت پرہم ہوئے اور واصل و عمرو دونوں دس گاہ سے اٹھ کر چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے چلے جانے کے بعد حسن بصریؒ نے واصل کی بابت کہا "قد اعتزلت منی" یعنی اس نے مجھ سے روگردانی اختیار کی اور اس کے بعد ہی اس کا لقب معتزلی ہو گیا۔

مجھے روایت کے اس آخری ٹکڑے سے اختلاف ہے کیونکہ حسن بصریؒ کے یہ الفاظ تو ہیں کے تھے اور معتزلہ جماعت جو اپنے آپ کو فخریہ منزل کہتی تھی کبھی اس نام سے موسوم ہونا گوارا نہ کرتی۔ جس کی بنیاد تو ہیں و تہمیل ہی ہو۔ علاوہ اس کے یہ بات تاریخی حیثیت سے بھی صحیح نہیں کیونکہ سیاسی نقطہ نظر سے معتزلہ جماعت بہت پہلے وجود میں آ چکی تھی۔

جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو بعض اکابر صحابہ نے بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ جن میں طلحہ، زبیر، اسعد بن ابی وقاص، عبد اللہ بن عمر، زید بن ثابت و حذیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے طلحہ اور زبیر نے تو علائہ حضرت علیؓ کی مخالفت شروع کر دی۔ لیکن اور حضرات غیر جانب دار رہے۔ اہل مدینہ کی روش بھی عموماً غیر جانب دارانہ تھی۔ اور بصرہ کی قسیمی جماعت بھی نیورٹل تھی۔ اور حاجب بصری نے اس جماعت کی غیر جانب دارانہ پالیسی کے لیے لغت اعتزال استعمال کیا ہے۔ تو کجی نے بھی ان نیورٹل رہنے والوں کو معتزلہ کہہ کر یا دیکھا ہے۔ اس لیے اعتزال اور معتزلہ کا لفظ حسن بصریؒ کی دس گاہ سے نہیں نکلا بلکہ اس سے پہلے ہی وجود میں آ چکا تھا۔ اور چونکہ خلافت علیؓ کے مسئلہ میں واصل اور مروان بن عیینہ نیورٹل تھے اس لیے اگر حسن بصریؒ ان کو معتزلہ نہ کہتے تو بھی وہ معتزلہ ہی کہلاتے۔ اس غیر جانب داری کی غذا بھی توجیہ انہوں نے یہ کی تھی کہ حضرت علیؓ، طلحہ، زبیر اور حضرت عائشہؓ سب اپنی اپنی جگہ سچے مسلمان تھے لیکن آپس کی لڑائی نے ان کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پھر ظاہر ہے کہ ان دونوں سے صرف ایک جماعت ہی حق پر ہوگی۔ جس کا ہم کو علم نہیں۔ اس لیے نیورٹل رہنا ہی مناسب ہے لیکن اس غیر جانب داری کے کچھ سیاسی اسباب بھی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ واصل بن عطاء ایک حد تک علویین کا مخالفت اور علویین کا طرف دار تھا۔ یعنی وہ حضرت ابو بکرؓ اور



حضرت عرف کو فرما صاحب خلافت نہ کھتا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر مزدور تہیج دیتا تھا۔ اور یہی مقیدہ ذہن پر شیعیہ حضرت کا بھی تھا۔ جس کی نقد و اصل بنی معاشرے ہی مرتب کی تھی۔ عوامین کے ساتھ اس کی ہمدردی ایک سیاسی سبب بھی تھا اور وہ یہ کہ شیعہ اس وقت اموئین کا دور دورہ تھا، جہاں تک شیعہ نے سحرنا شروع کیا جو اہل بیت ہونے کے علاوہ اپنے آپ کو مستحق خلافت ظاہر کرتے تھے اور جن سے اصل کو بڑی دل چاہی تھی اور جن کو کامیاب بنانے کے لیے عوامین کو ملائے دیکھا ضروری تھا۔ لیکن وہ حکم کھلا اموئین کی مخالفت بھی نہ کر سکتا تھا کیوں کہ مذہب اعتزال آہستہ آہستہ عوامی و باد میں بھی جگہ پیدا کرنا جا رہا تھا۔ جگر پید پر عبد اللہ نے تو علامہ اس سبب کو قبول کر لیا تھا۔

معتزل کی ترقی کا زمانہ بڑھا اس کا وہ خلافت تھا۔ سناح پہلا مزاراں روا تھا لیکن وہ صرف چار سال حکومت کر سکا۔ اور قیام سلطنت کی ابتدائی دستاویزوں کی وجہ سے وہ کسی اور حرفت زور نہ کر سکا۔ لیکن دوسرے مزاراں، و انصوریہ کے زمانے میں معتزل کے قدم پوری طرح جم گئے۔ اصل کو ساتھی مرو بن جہیر چونکہ منصور کا بچپن کا دوست تھا اور دونوں ہم سبق رہ چکے تھے۔ اس لیے اس کے دربار میں مرو بن جہیر کو بہت درخوار حاصل ہو گیا اور منصور اس سے اس قدر محبت کرنے لگا کہ جب اس کا انتقال ہوا تو منصور نے اس کا مرثیہ لکھا جو اپنی اوجیت کا باطنی پہلو واضح تھا۔

داصل بن معا چونکہ پہلے ہی سے آل عباس کا حرفت روا تھا اس لیے اس زمانے میں اس کے مسلک کو یوں بھی مقبول ہونا چاہیے تھا لیکن اس کا ایک سبب اور بھی تھا وہ یہ کہ منصور انتظام سلطنت کی طرف سے عین ہر مہم و مذہب کی طرف مائل ہو گیا۔ اور مذہبی منافروں کی فہم اہانت و سے دی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسلام پر جو کچھ چینیایا ہوتی ہیں ان کا بعضی وفاق سے کیا جائے اور اس وقت کو معتزل ہی پوری طرح انجام دے سکتے تھے جن کا کل ہر سہاں وقت واصل بن معا تھا۔

داصل کی زبان دانی اور سانی عبارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کوئی تقریر کرتا تھا وہ صرف اس سے باطن خالی ہوتی تھی کیونکہ یہ حرفت اس کی زبان سے ادا نہ ہوتا تھا۔ ایک شخص نے اس کا نام لیا کہ اس سے پوچھا کہ اگر تمہیں یہ کہنا ہو کہ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ تانا تو تم رکب علی فرسہ و جرد حمہ کی جگہ کیا کہو گے۔ اس نے جواب دیا میں کہوں گا "امتنی علی جوادہ و سبب عالمہ" علوم مذہبی میں اس کے تجربے ثبوت میں اس قدر کہنا غالباً کافی ہو گا کہ مسائل فقہیہ کے استناد کے لیے جو چار مآخذ: قرآن حدیث۔ اجماع اور قیاس ماننے گئے ہیں وہ اس کے مقبول کیے ہوئے ہیں۔ اصول فقہ کے بڑے بڑے مسائل سب سے پہلے اسی سلسلہ پیش کیے جاتے تھے سب سے پہلے اس نے کیا اور علم کلام کا موجودہ تودہ غیر تھا ہی۔

الغرض معتزل جماعت میں داصل بن معا بڑی فہر دست شخصیت کا نام تھا اور اس کے عقائد اس قدر مقبول ہوئے کہ ملک کے تمام بڑے بڑے علماء اپنے آپ کو معتزلی ظاہر کر سہر و فکر کرتے گئے۔ اور ایک فرقہ اسی نام سے منسوب ہو گیا جسے داصلیہ کہتے ہیں۔

خلیفہ منصور کے بعد ہارون الرشید کے عہد میں مذہبی آزادی ختم ہو گئی کیونکہ اس میں قدامت پسندی نہادہ عقل اور وہ مذہبی منظر کو پسند نہ کرتا تھا۔ تاہم چونکہ دربار خلافت میں براہ کا اثر زیادہ تھا جو بڑے علم دوست اور آزاد خیال تھے۔ اس لیے اعتزال کی آیادی کچھ نہ کچھ ہوتی رہی۔ ہارون الرشید کے عہد جب اموئین کا زمانہ آیا تو معتزل کو آگے بڑھنے کے لیے کھلا میدان دیا گیا۔ کیونکہ اموئین خود معتزلی

شاعر رکھتا تھا۔ ابوالبندیل اور انعام مشہور مستزلی صاحب فلسفہ و طریقت کے ذہر دست، ہر تھے ماموں کے استاد رہ چکے تھے ابوالبندیل کے متعلق ماموں کہا کرتا تھا کہ اہل ابوالبندیل علی الملکوم کا عدول انعام علی الانام یعنی ابوالبندیل کا ساہ کلام پر ایسا ہے جیسے بادلوں کا سایہ انسانوں پر۔

ماوراء کے تعصب نے یزید قمر کو یہ سمجھنے کا موقعہ دے دیا تھا کہ اسام قتل کے مقابلے میں نہیں آسکا۔ اور اس کی جیت نہ ہوتی تو اسے ہر جگہ ملتی ہے۔ لیکن ماموں نے اس پر نامی کو دھوکہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑی مجلس مناظرہ قائم کی اور جس میں مختلف مذاہب کے بڑے بڑے علماء کو شرکت کی دعوت دی۔ ان میں مانویہ مذہب کا پیشوا یزدان بخت بھی شریک تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے ماموں نے ابوالبندیل کو اعتراضات کا جواب دینے کے لیے مامور کیا۔ یہ مناظرہ وصال تک جاری رہا اور آخر کار میدان ابوالبندیل کے ہاتھ رہا۔ ماموں نے نہ صرف بخت اور جگہ خاک کے تمام اعضاء میں مجالس مناظرہ کو رواج دیا اور ہر جگہ آزادی سے مذہبی گفتگو ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں طرف اسلام کی آزدی پائی اور قتل پسندی کا شہرہ ہو گیا اور ہزاروں لوگ حق اسلام میں داخل ہو گئے۔

ابوالبندیل کا استدلال بہت دل چسپ ہوتا تھا وہ فریق خطنی کے مسلمات کو سامنے رکھ کر جواب دیا کرتا تھا۔ ایک بار کسی عجمی عالم سے مناظرہ ہوا جو اپنے مذہب کو اسلام پر فائق قرار دیتا تھا۔ ابوالبندیل نے وہاں بحث میں اس سے پوچھا کہ آگ کیا چیز ہے؟ اس نے کہا "خدا کی بیٹی ہے۔"

ابوالبندیل :- "اور لگے کا کیا مراد ہے؟"

عجمی :- "میں خدا کے فرشتے ہیں جن کے بازو کاٹ کر دنیا میں کاشت کاری کے لیے بھیج دیا ہے۔"

ابوالبندیل :- "پانی کیا ہے؟"

عجمی :- "خدا کا نور۔"

ابوالبندیل :- "بھوک پیاس کیا ہے؟"

عجمی :- "شیطان کا فقر و فاقہ۔"

یہ سن کر ابوالبندیل نے کہا کہ مجھ سے بھی عجیب طبقہ ہے۔ جس نے خدا کے فرشتوں کو ذبح کیا، خدا کے نور سے دھویا، خدا کی بیٹی پر لک کر اسے بھونا اور پھر شیطان کے فقر و فاقہ کے حوالے کر دیا۔

ابوالبندیل کی ذہانت کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو۔

ایک بار وہ امیر حسن بن کی مجلس میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک دروازہ بند کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ ابوالبندیل نے پوچھا یہ کون

ہے؟ "میر نے کہا کہ یہ بخوی ہے اور بخویم کے حساب سے پیشین گوئی کی گئی ہے۔ ابوالبندیل نے کہا: اگر اجازت ہو تو اس سے کوئی سوال کروں؟" امیر نے کہا: ضرور۔"

ابوالبندیل نے ایک سیب جو امیر کے سامنے ہی رکھا ہوا تھا، اٹھایا اور بخوی سے پوچھا: بتاؤ میں اسے کھاؤں گا یا نہیں؟

بخوی نے حساب کر کے جواب دیا کہ آپ اسے کھائیں گے۔ ابوالبندیل نے سیب اٹھ کر دیا اور کہا: میں اسے کھانے کو نہیں کھاؤں گا۔ بخوی نے کہا کہ آپ اسے کھاتے ہیں، میں پھر کھانے کو نہیں کھاؤں گا۔ ابوالبندیل نے اس مرتبہ دوسرا سیب اٹھایا، امیر

نے پوچھا: ”وہ سب کیوں آیا؟“ ابوہندیل: ”اس لیے کہ اگر اس مرتبہ بخیر نہ پہنچا کریں۔ اسے نہ کھاؤں گا تو کھائے گا۔“ بخیر بہت خفیف ہوا اور وہ ہارے ہوئے چلا گیا۔

ابوہندیل کا ساتھی بلکہ اس کا شاگرد نظام بن کا نام ابھی یاد تھا۔ تمام معتزلی علماء میں تنہا اس خصوصیت کا مالک تھا کہ اسے کھانا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ پھر بھی ادب، تاریخ، فقہ، کلام اور فلسفہ و حکمت کا زبردست ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے حافظہ کا یہ ماحول تھا کہ قرآن اہل، تہذیب، زبور مع تفسیروں کے اس کو یاد تھے اور شریعہ عرب کے ہزاروں اشعار اور فلسفہ و کلام کے تمام مسائل اس درجہ مستشرق تھے کہ وہ بلا تحقیق ان کا حوالہ دے سکتا تھا۔

ایک دفعہ جعفر بن علی کی مجلس میں اسے ملو کا ذکر آیا تو نظام نے کہا کہ مجھے اس کے بعض مغربیوں سے اختلاف ہے۔ جعفر نے کہا کہ تم تو پڑھنا جانتے ہی نہیں۔ تم کہا کچھ کہتے ہو؟ پس کہ نظام نے اسے ملو کی کتاب کا ایک ایک مسئلہ اور ساتھ ہی ساتھ اس پر اپنا اعتراض بیان کرنا شروع کیا تو جعفر حیران رہ گیا۔

جمیعات میں سب سے پہلے اس نے ثابت کیا کہ رنگ، بو، آواز، ذائقہ، روشنی و حرارت وغیرہ مادی اعراض ہیں اور مادہ اعراض ہی سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ وہ ہر دو مادیات کو قائل نہ تھا۔ وہ معجزہ شق القمر اور وجود جنات کا بھی منکر تھا۔ وہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو بھی معجزہ نہ کہتا تھا، لیکن تاریخ کا قائل تھا۔

وہ بڑا لطیف خیال شاعر بھی تھا۔ چنانچہ اس کا ایک شعر جس میں محبوب کی انتہائی نزاکت کا اندھا کیا گیا ہے ملاحظہ ہو۔

وہ بقیہ خواہو انجھو حشم

ولما رخلقا فظہو حصد الفکر

یعنی جب میں نے اس کا تصور کیا اور اس کا گزر میرے قلب میں ہوا تو وہ زخمی ہو گیا۔ میں نے آج تک کوئی انسان ایسا نہیں دیکھا جو محض قصہ و خیال سے زخمی ہو جائے۔

افسوس ہے کہ میں مام شباب میں اس کا انتقال ہو گیا۔ پھر بھی وہ اپنے بعد کافی تعداد شاگردوں کی چھوڑ گیا۔ بن میں صلیح کا شمار ائمہ اعتزال میں ہوتا ہے۔ اور جس کی تعائیف میں کتاب النہایان اور کتاب البیان و التہیین اب بھی مشہور و مقبول ہیں۔ بعد کو معتزلہ جماعت کے دو فرقے نظام اور جاحظ ہی کے نام سے منسوب ہو گئے جنہیں نظامیہ اور جاحظیہ کہتے ہیں۔

اتفاق دیکھئے کہ مامون کے بعد معتزم اور واثق ثنوت نشین ہوئے اور یہ بھی دونوں معتزلی تھے۔ ان کے عہد کے تاحی القضاۃ احمد بن ابی داؤد جو سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے، وہ بھی معتزلی تھے۔ اس لیے معتزلہ کی وہ ترقی جو مامون کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی معتزم اور واثق کے عہد میں انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ اور ساری دنیا کھنکھاتی ہوئی اعتزال کی طرف آنے لگی۔

اس کے بعد متوکل ثنوت نشین ہوا تو یہ ترقی رک گئی۔ کیونکہ وہ فلسفہ و حکمت کا دشمن تھا۔ پھر بھی چون کہ عہد ان عرب، خراسان، فارس، ارمان اور خوزستان وغیرہ اکثر اسلامی ممالک میں اعتزال پھیل گیا۔ اس لیے متوکل اسے آسانی سے مٹا نہ سکا۔ اور چھٹی صدی ہجری کی ابتدا میں بھی جب معتزلہ پر زوال آچکا تھا۔ ابوعلی حائمی ایسا شخص پیدا ہوا جسے امام الاعتزال مانا جاتا ہے

معتزلہ کے زوال کی صحیح تاریخ ابوالحسن اشعری کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جو عقائد معتزلہ کے سمیت مخالفین نے جو انکسار ابوبائین کی سلطنت آخری کا ختم ہو چکی تھی۔ اور مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ جو مذہبی آزادی کے سخت دشمن تھے اس لیے اب معتزلی کو جبر، یزور و شیعہ بنایا جانے لگا۔ اور چونکہ سلاجقہ کے بعد بھی جتنی مسلم حکومتیں ظہور میں آئیں سب کی سب اشعری عقائد کی بندھنیں اس لیے انہوں نے یہی قوت سے معتزلی کا استیصال شروع کر دیا۔ اور آخر کار رفتہ رفتہ عقلی اداروں کے دیرازے احرام پا بیٹھے کے لیے بند ہو گئے۔

---

# واجد علی شاہ کی ایک نیا تصنیف

## ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

واجد علی شاہ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ایک بدنام شخص ہے۔ اس کی عیش پرستی اور سلطنت سے بے خبری، ترقی اور کامیابی کے جلسے، نقالوں کی غلطیوں، شاعروں کے اجتماع اور صحافیوں کی کثرت کو بعض لوگ سلطنت اور حکمرانی کی غلطی کا قیاس کرتے ہیں۔ ہم اس وقت واجد علی شاہ کی زندگی کے اس سیاسی پہلو سے غفلت نہیں رکھتے لیکن اننا ضرور کہیں گے کہ واجد علی شاہ میں یہ خامیاں نہ بھی ہوتیں تو ایک نہ ایک نہ سلطنت اور ضرور برطانوی جنہ میں شامل ہو جاتی۔ آخر یہاں درشلہ نظر اپنے کردار میں واجد علی شاہ سے مختلف تھے۔ ان پر عیش پرستی، ناچ گانے اور انعطاف پرستی کا لازم نہیں لگایا جاسکتا۔ لیکن ان کا کردار سلطنت و ملی گونہ پیاس کا، واصل حشمت سے کم از کم سو سال پہلے سے ہندوستانی سیاست پر برطانوی اقتدار پر آمیزہ آمیزہ چھٹا جارا تھا۔ یہاں تک کہ انگریز اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک ایسی سلطنت کے مالک بن بیٹھے جہاں دریاؤں میں امرت بہتا تھا۔ زمین سونا اگلتی تھی، لیکن جہاں کے لوگ پیٹ بھر کر کھانے اور تن ڈھونڈنے کے لئے کیڑے سے بھی محروم تھے۔

اس سیاسی تاریخ کی بحث کو چھوڑ کر اگر تاریخ اور سیاست کی طرف آئیں تو یہ زمانہ جو ایسے انتشار اور زوال کا ہے نہایت اہم معلوم ہوتا ہے۔ خود واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر اور ان سے متعلق شعرا اور ادیبوں نے جو تخلیقات کی ہیں وہ اس ادبی تاریخ کا ایک متنفس باب ہیں۔ واجد علی شاہ اپنی ایک کتاب میں خود اپنی تصانیف کی تعداد اہم بتاتے ہیں اور ان میں سے بعض کی حوالہ دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

”یہ سب فقیر کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور جو نثر و نثر سلطنت اور غارت بد معاشان میں تاراج ہوئیں وہ خارج الاستاذ ہیں۔“ اس عبارت کے کھنڈے کے بعد بھی واجد علی شاہ زندہ رہے اور غارت سے اس عرصے میں اس تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہو گا۔ اس اعتبار سے واجد علی شاہ اپنے دور کے ایک ممتاز شاعر اور مصنف قرار پاتے ہیں۔ سلاطین اور امرا کے متعلق اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ جو کلام ان کے نام سے شہرت پاتا ہے وہ سب ان کی تصنیف نہیں ہوتا بلکہ درباری شعرا اور ادیبوں کی کاوشیں بھی ان کے نام سے منسوب ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے بعض حالتوں میں ایسا ہی ہو لیکن واجد علی شاہ کے بارے میں ہماری قطعی رائے یہ ہے

نہ ہوتا یہ ای کے نام سے غسوب ہیں وہ واقعی ان کی اپنی تصنیف ہیں۔  
 ان تصانیف کے تنوع اور موضوعات کو دیکھ کر بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ان کے معاصرین میں سے جن شعرا  
 ، ان کا رد کی تحقیقات محفوظ ہیں ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ ان کے خوشہ چیں نہیں ہیں۔ شاعری میں ان کا انداز  
 اگرچہ عام کھنوی مذاق کا ترجمان ہے لیکن ان کا اپنا کردار اور ذاتی واقعات و حواثات اس کثرت سے اس کلام میں موجود  
 ہیں کہ میں ماننے میں تامل ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کی تصنیف نہیں۔ لیکن شاعری کے دفتر سے قطع نظر واجد علی شاہ کی  
 بعض تصانیف ایسی ہیں جیسی ان کے معاصرین میں کسی اور نے تصانیف نہ کیں انھیں سے واجد علی شاہ کی طبیعت کی لچک اور  
 ہر انداز ان کے ذاتی مشاغل مختلف علوم و فنون میں ان کی مہارت غرض ان کے مکمل کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک  
 کتاب ”بنی“ ہے۔

اس کتاب میں واجد علی شاہ اپنا تعارف اس طرح کرتے ہیں۔  
 ”آخر شاہ آخر ادھ۔ یہ فقیر خیر اقام و صنف و مولف مرزا تقصیر ہے۔ پندرہ برس کے سن میں  
 والد حجت کان نے دیسہ دار وزیر کیا۔ میں برس کے سن میں تخت ادودھ بجائے حضرت اعلیٰ قائم ہو اقبیس بر  
 کے سن میں بلاعد و ظلم و نا انصافی و بے آزاری و محبت بے سبب سخت سے محروم کیا گیا۔ میں برس سے  
 کلکتہ محلہ موچکھولہ لعل بے مٹیا برج میں قیام ہے۔ پچاس برس کا سن ہوا چھتیس مینے قلعہ دہلیم فورڈ کلکتہ  
 میں ناقد قید رہا۔ ساٹھ سے اوپر پر شاہ احمد چیم بر و اور اولاد ذکر و ناماں ہیں۔ ۱۲۹۱ھ سے باعانت  
 گورنمنٹ میں ہزار روپوں میں دو دختر وں کا عقد کر دیا۔ سنا جاتا ہے کہ اس حساب سے بارہ دختریں سن آئندہ  
 میں بہ اعانت گورنمنٹ من عقد ہوں گی۔ پچاس برس کے سن میں اتنی جلدی کتابوں کی تصنیف کیں۔ اس  
 حساب سے ”بنی“ کا سنہ تصنیف ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ھ قرار پاتا ہے۔“

کتاب کا موضوع یہ کتاب جو تقریباً چار صفحات پر مشتمل ہے مختلف موضوعات پر حلوی ہے مثلاً: (۱) راگ مالار (۲) ناگ و دیا۔  
 (۳) بھنڈ تیوں اور مٹھک نفلوں کے باب میں (۴) تمثیلی مشاعرہ (۵) شجدرے اور لطیفے (۶) پہیلیاں (۷) خطاب محلات و  
 اشعار و خطاب شہزادگان و ارباب عالم پسند (۸) خطاب جانوراں (۹) خطاب کبوتر خانہ مع نام (۱۰) خطاب بینڈھا خانہ۔  
 (۱۱) خطاب مچھلیوں کے (۱۲) درخت (۱۳) خطاب کوٹھیوں اور کمروں کے (۱۴) تالون اختری حفظ عصمت مرد و زنی اور  
 ہر اہمیت گیات کے واسطے۔

راگ مالار:۔ موسیقی۔ ہندوؤں میں جزو عبادت ہے۔ چنانچہ ابتدائے تاریخ سے ہندوؤں نے اس فن کو پران چڑھایا۔

۵۱۰	ایضاً ۵۱۲	۵۱۵	۵۱۸	۵۲۱	۵۲۴	۵۲۷	۵۳۰	۵۳۳	۵۳۶	۵۳۹	۵۴۲	۵۴۵	۵۴۸	۵۵۱	۵۵۴	۵۵۷	۵۶۰	۵۶۳	۵۶۶	۵۶۹	۵۷۲	۵۷۵	۵۷۸	۵۸۱	۵۸۴	۵۸۷	۵۹۰	۵۹۳	۵۹۶	۵۹۹	۶۰۲	۶۰۵	۶۰۸	۶۱۱	۶۱۴	۶۱۷	۶۲۰	۶۲۳	۶۲۶	۶۲۹	۶۳۲	۶۳۵	۶۳۸	۶۴۱	۶۴۴	۶۴۷	۶۵۰	۶۵۳	۶۵۶	۶۵۹	۶۶۲	۶۶۵	۶۶۸	۶۷۱	۶۷۴	۶۷۷	۶۸۰	۶۸۳	۶۸۶	۶۸۹	۶۹۲	۶۹۵	۶۹۸	۷۰۱	۷۰۴	۷۰۷	۷۱۰	۷۱۳	۷۱۶	۷۱۹	۷۲۲	۷۲۵	۷۲۸	۷۳۱	۷۳۴	۷۳۷	۷۴۰	۷۴۳	۷۴۶	۷۴۹	۷۵۲	۷۵۵	۷۵۸	۷۶۱	۷۶۴	۷۶۷	۷۷۰	۷۷۳	۷۷۶	۷۷۹	۷۸۲	۷۸۵	۷۸۸	۷۹۱	۷۹۴	۷۹۷	۸۰۰	۸۰۳	۸۰۶	۸۰۹	۸۱۲	۸۱۵	۸۱۸	۸۲۱	۸۲۴	۸۲۷	۸۳۰	۸۳۳	۸۳۶	۸۳۹	۸۴۲	۸۴۵	۸۴۸	۸۵۱	۸۵۴	۸۵۷	۸۶۰	۸۶۳	۸۶۶	۸۶۹	۸۷۲	۸۷۵	۸۷۸	۸۸۱	۸۸۴	۸۸۷	۸۹۰	۸۹۳	۸۹۶	۸۹۹	۹۰۲	۹۰۵	۹۰۸	۹۱۱	۹۱۴	۹۱۷	۹۲۰	۹۲۳	۹۲۶	۹۲۹	۹۳۲	۹۳۵	۹۳۸	۹۴۱	۹۴۴	۹۴۷	۹۵۰	۹۵۳	۹۵۶	۹۵۹	۹۶۲	۹۶۵	۹۶۸	۹۷۱	۹۷۴	۹۷۷	۹۸۰	۹۸۳	۹۸۶	۹۸۹	۹۹۲	۹۹۵	۹۹۸	۱۰۰۱	۱۰۰۴	۱۰۰۷	۱۰۱۰	۱۰۱۳	۱۰۱۶	۱۰۱۹	۱۰۲۲	۱۰۲۵	۱۰۲۸	۱۰۳۱	۱۰۳۴	۱۰۳۷	۱۰۴۰	۱۰۴۳	۱۰۴۶	۱۰۴۹	۱۰۵۲	۱۰۵۵	۱۰۵۸	۱۰۶۱	۱۰۶۴	۱۰۶۷	۱۰۷۰	۱۰۷۳	۱۰۷۶	۱۰۷۹	۱۰۸۲	۱۰۸۵	۱۰۸۸	۱۰۹۱	۱۰۹۴	۱۰۹۷	۱۱۰۰	۱۱۰۳	۱۱۰۶	۱۱۰۹	۱۱۱۲	۱۱۱۵	۱۱۱۸	۱۱۲۱	۱۱۲۴	۱۱۲۷	۱۱۳۰	۱۱۳۳	۱۱۳۶	۱۱۳۹	۱۱۴۲	۱۱۴۵	۱۱۴۸	۱۱۵۱	۱۱۵۴	۱۱۵۷	۱۱۶۰	۱۱۶۳	۱۱۶۶	۱۱۶۹	۱۱۷۲	۱۱۷۵	۱۱۷۸	۱۱۸۱	۱۱۸۴	۱۱۸۷	۱۱۹۰	۱۱۹۳	۱۱۹۶	۱۱۹۹	۱۲۰۲	۱۲۰۵	۱۲۰۸	۱۲۱۱	۱۲۱۴	۱۲۱۷	۱۲۲۰	۱۲۲۳	۱۲۲۶	۱۲۲۹	۱۲۳۲	۱۲۳۵	۱۲۳۸	۱۲۴۱	۱۲۴۴	۱۲۴۷	۱۲۵۰	۱۲۵۳	۱۲۵۶	۱۲۵۹	۱۲۶۲	۱۲۶۵	۱۲۶۸	۱۲۷۱	۱۲۷۴	۱۲۷۷	۱۲۸۰	۱۲۸۳	۱۲۸۶	۱۲۸۹	۱۲۹۲	۱۲۹۵	۱۲۹۸	۱۳۰۱	۱۳۰۴	۱۳۰۷	۱۳۱۰	۱۳۱۳	۱۳۱۶	۱۳۱۹	۱۳۲۲	۱۳۲۵	۱۳۲۸	۱۳۳۱	۱۳۳۴	۱۳۳۷	۱۳۴۰	۱۳۴۳	۱۳۴۶	۱۳۴۹	۱۳۵۲	۱۳۵۵	۱۳۵۸	۱۳۶۱	۱۳۶۴	۱۳۶۷	۱۳۷۰	۱۳۷۳	۱۳۷۶	۱۳۷۹	۱۳۸۲	۱۳۸۵	۱۳۸۸	۱۳۹۱	۱۳۹۴	۱۳۹۷	۱۴۰۰	۱۴۰۳	۱۴۰۶	۱۴۰۹	۱۴۱۲	۱۴۱۵	۱۴۱۸	۱۴۲۱	۱۴۲۴	۱۴۲۷	۱۴۳۰	۱۴۳۳	۱۴۳۶	۱۴۳۹	۱۴۴۲	۱۴۴۵	۱۴۴۸	۱۴۵۱	۱۴۵۴	۱۴۵۷	۱۴۶۰	۱۴۶۳	۱۴۶۶	۱۴۶۹	۱۴۷۲	۱۴۷۵	۱۴۷۸	۱۴۸۱	۱۴۸۴	۱۴۸۷	۱۴۹۰	۱۴۹۳	۱۴۹۶	۱۴۹۹	۱۵۰۲	۱۵۰۵	۱۵۰۸	۱۵۱۱	۱۵۱۴	۱۵۱۷	۱۵۲۰	۱۵۲۳	۱۵۲۶	۱۵۲۹	۱۵۳۲	۱۵۳۵	۱۵۳۸	۱۵۴۱	۱۵۴۴	۱۵۴۷	۱۵۵۰	۱۵۵۳	۱۵۵۶	۱۵۵۹	۱۵۶۲	۱۵۶۵	۱۵۶۸	۱۵۷۱	۱۵۷۴	۱۵۷۷	۱۵۸۰	۱۵۸۳	۱۵۸۶	۱۵۸۹	۱۵۹۲	۱۵۹۵	۱۵۹۸	۱۶۰۱	۱۶۰۴	۱۶۰۷	۱۶۱۰	۱۶۱۳	۱۶۱۶	۱۶۱۹	۱۶۲۲	۱۶۲۵	۱۶۲۸	۱۶۳۱	۱۶۳۴	۱۶۳۷	۱۶۴۰	۱۶۴۳	۱۶۴۶	۱۶۴۹	۱۶۵۲	۱۶۵۵	۱۶۵۸	۱۶۶۱	۱۶۶۴	۱۶۶۷	۱۶۷۰	۱۶۷۳	۱۶۷۶	۱۶۷۹	۱۶۸۲	۱۶۸۵	۱۶۸۸	۱۶۹۱	۱۶۹۴	۱۶۹۷	۱۷۰۰	۱۷۰۳	۱۷۰۶	۱۷۰۹	۱۷۱۲	۱۷۱۵	۱۷۱۸	۱۷۲۱	۱۷۲۴	۱۷۲۷	۱۷۳۰	۱۷۳۳	۱۷۳۶	۱۷۳۹	۱۷۴۲	۱۷۴۵	۱۷۴۸	۱۷۵۱	۱۷۵۴	۱۷۵۷	۱۷۶۰	۱۷۶۳	۱۷۶۶	۱۷۶۹	۱۷۷۲	۱۷۷۵	۱۷۷۸	۱۷۸۱	۱۷۸۴	۱۷۸۷	۱۷۹۰	۱۷۹۳	۱۷۹۶	۱۷۹۹	۱۸۰۲	۱۸۰۵	۱۸۰۸	۱۸۱۱	۱۸۱۴	۱۸۱۷	۱۸۲۰	۱۸۲۳	۱۸۲۶	۱۸۲۹	۱۸۳۲	۱۸۳۵	۱۸۳۸	۱۸۴۱	۱۸۴۴	۱۸۴۷	۱۸۵۰	۱۸۵۳	۱۸۵۶	۱۸۵۹	۱۸۶۲	۱۸۶۵	۱۸۶۸	۱۸۷۱	۱۸۷۴	۱۸۷۷	۱۸۸۰	۱۸۸۳	۱۸۸۶	۱۸۸۹	۱۸۹۲	۱۸۹۵	۱۸۹۸	۱۹۰۱	۱۹۰۴	۱۹۰۷	۱۹۱۰	۱۹۱۳	۱۹۱۶	۱۹۱۹	۱۹۲۲	۱۹۲۵	۱۹۲۸	۱۹۳۱	۱۹۳۴	۱۹۳۷	۱۹۴۰	۱۹۴۳	۱۹۴۶	۱۹۴۹	۱۹۵۲	۱۹۵۵	۱۹۵۸	۱۹۶۱	۱۹۶۴	۱۹۶۷	۱۹۷۰	۱۹۷۳	۱۹۷۶	۱۹۷۹	۱۹۸۲	۱۹۸۵	۱۹۸۸	۱۹۹۱	۱۹۹۴	۱۹۹۷	۲۰۰۰
-----	-----------	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	-----	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------

اگرچہ اپنے دور زوال میں یہ فن بھی دوسرے فنون لطیفہ کی طرح صرف پست جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فنکاروں نے اسے مختلف زمانوں میں اپنے خون جگر سے سیخا اور بڑے ریاض سے اس میں محنت کر کے اصول اور قاعدے مرتب کئے۔ مسلمان روایتی طور پر گانے بجانے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان میں بھی صوفیوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو سماج کی عبادت سمجھتا اور اس سے تزکیہ نفس کا کام لیتا۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ سلطان فنکاروں نے اسے بحیثیت فن اختیار کیا اور اس میں بہت کچھ اضافہ کئے، اور لوگوں کے علاوہ صرف ایک حضرت امیر خسرو کا تاریخی نام لینا کافی ہے۔ انھوں نے عربی اور ان کو ہندی راگوں میں ڈھالا۔ چنانچہ ہندی اور عربی موسیقی کی بھی آمیزش حضرت امیر خسرو کے مشہور قول میں ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار راگ اور راگینیاں بھی ایجاد کیں۔ مغلوں نے موسیقی کی سرپرستی کی تو تان سین جیسا فنکار پیدا ہوا اور سلسلہ بطور وضعداری بعض ریاستوں میں اب تک جاری ہے۔ واجد علی شاہ گانے بجانے کے عاشق تھے۔ بعض لوگ اسے محض ان کی عیش پرستی اور جذبات جس کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن خود ان کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فن کو استادوں سے حاصل کیا تھا اور اس پر اس قدر محنت کی تھی کہ خود استادوں کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت اور تحریروں کے علاوہ بنی کے پتے چھتے میں ملتا ہے جو راگ مالہ سے متعلق ہے۔

اس باب میں مختلف فصلیں ہیں اور ہر فصل میں ایک ایک راگ کی تفصیل لکھی گئی ہے۔ مثلاً چوتھی فصل ”خیال“ کے باب میں ہے۔ اس میں راگ کے نام، اس کے گانے کا وقت، بول وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔  
 (۱) خیال راگنی۔ رام کلی۔ تالی وحید۔ تالہ۔ اس کا وقت صبح سے پہر دن چڑھنے تک ہے۔  
 (۲) خیال ٹوڈی تالی وحید۔ تالہ۔ اس کا بھی وقت صبح سے پہر دن چڑھنے تک ہے۔  
 اس خیال کی مثال یہ ہے :-

آستائی مائی ری یہ جو بن مدھ ماتیاں  
 اکھتر کے سنگ پریت کروں گی دھک دھک ہووت موری چھاتیاں  
 انترا  
 (۳) خیال راگنی بھٹیار۔ اس کو ہر وقت برتتے ہیں۔  
 آستائی، آج مویے گھر کاج مندیل بلجے مائی ری  
 گلیوں گلیوں ہن رست ہے دھکت ہے نگارا اکھتر پیارا ملک اووہ راجے  
 انترا  
 پانچویں فصل سانوں کے بیان میں ہے۔

سا نون تلک کا مور تالی روپک اور پیش بانہ روز نہرتا جاتا ہے۔  
 آستائی۔ سیان بن لاگت بوند کٹا ری  
 سچنے میں آو مر امن لے گیوا اکھترن جیہ بہا ری  
 آستائی۔ پدینیاں بوندوں برے دے کھنیا بوندوں برے  
 انترا  
 ایضا





کھڑے میں فقط پانچ گیتیں ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ پہلی پھیری گت۔ دہانے ہاتھ کی تقبلی بائیں ہاتھ کی پھیپر پر رکھ کر دونوں انگڑھوں کو کہ لہجے میں حرکت دے اور ایک دو کی گنتی پر نلچے۔ دہانے پاؤں سے ایک اور بائیں پاؤں سے دواور کھڑے کا سم ایک پہی ہوتا ہے اور دہانے طرف سے گھومنا کھڑی مقرر ہے۔  
باقی چار گیتیں ہنگام گت۔ ٹھیکہ گت۔ لہنگام گت اور پکچھا گت ہیں۔ ان کی بھی اسی طرح تفصیل بیان کی ہے۔ خانداس عبارت پر ہوتا ہے۔

جان چاہیے کہ کھڑے میں فقط چار توڑے مستقل ہیں۔ پہلا بائیں چوڑے پر دوسرا دہانے پر تیسرا دونوں زانوؤں پر چوتھا کھڑے ہو کر۔ ان پانچوں گتوں کو تصویروں کے ذریعے سے بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان تصویروں کے متعلق سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ان تصویروں میں مردوں کی ہیں کسی عورت کی تصویر نہیں ہے۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ تاج ایک طرح کی تلاش مہنی ہے۔ حوالہ ان کے زدن نے غالباً اس غلط فہمی کو تغیرت پہنچاتی ہے۔ ان تصویروں میں تقاص مرد ہیں اور صورت شکل سے پتہ چل جاتا ہے۔ اسی قسم کی علامہ۔ اسی انداز کے بالی اور ٹھیکے۔ اہلئے لباس میں پیشوا زینے ہوئے ہیں۔ دواور علی شاہ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ گتے میں بھی ان کے پاؤں کا انگوٹھ تالی پر حرکت کرتا تھا۔ اور نقص میں انھیں ایسی ہمارت تھی کہ گنگھروہین کر اس طرح دھس کرنے کے جس گنگھروہ سے چاہتے آواز پیدا کرتے اور جس گنگھروہ کو چاہتے ساکن وسا گت رکھتے۔

اس کے بعد کتاب کا۔ سیم اہم باب شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ جس کے متعلق ہے۔ امانت کو زانوؤں سے کا باور آدم اور اکی اندر پہنکا کر اردو کا رتبے پہلا ڈرامہ تیار کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ دواور علی شاہ کو ریس سے دلچسپی تھی اور انھوں نے ریس تصانیف کئے تھے یہ سلسلہ اخلاقی تیار کیا جاتا ہے کہ دواور علی شاہ نے خود بھی اس ریس میں کام کیا تھا۔ یا نہیں، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ان ریسوں میں کس قسم کی گنگھروہ کیا استعمال کی گئی تھی بعض لوگ کہتے ہیں کہ دواور علی شاہ کے ریس کی تعمیر میں گنگھروہ کیسی اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس میں نہ تو کوئی گنگھروہ کے مذہبی ریس کا سا انداز ہے۔ یہ سلسلہ بھی اخلاقی ہے کہ دواور علی شاہ کے ریس اور امانت کی اندر بجا کو ڈرامہ کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ ان میں سے ہر ایک سوالوں کا جواب خود دواور علی شاہ کے توڑے اس حقیقہ میں مل جاتا ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ تحریر اردو ڈرامے کے ایک اہم باب کو وضاحت اور سند کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

اس باب میں بر کتاب کا دہانہ حصہ ہے، دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں چھتیس آبیادوی ریس ہیں۔ یہ لفظ دواور علی شاہ نے خود استعمال کیا ہے اور اس لئے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ دہنی کہ یہ جملہ ریس خود دواور علی شاہ کی آبیاد یا تصنیف ہیں۔ ریس کی تیاری کے سلسلے میں دواور علی شاہ تھکے ہیں۔

سکھیاں پیشوا زینے سے آہستہ ہو کر آئیں اور خاموش بیٹھ جائیں۔ سا زینے ان کے ہمراہ تصنیف رقم کا ہیں جس کی جگہ سکھی اب ریس کریں۔ اکثر بی کے من کو زنجائیں جس وقت رقم کا تخلص لبوں پر لگے فوراً سب سکھیاں کھڑی ہو جائیں اور جملہ

ہر ایک کے واسطے صرف باندھ کر کھڑا ہونا مقرر ہو چکا ہو وہاں پر صرف بستہ ہوا راستادہ ہوں اور جس کے وقت ہر گنہ اکل و شرب اور غفلت سے محفوظ رہیں اور نہ مقام رہیں سے تا اختتام باہر جائیں اور وہ جوڑ چھوٹی پھرتی جھانچوں کی ہاتھ بیٹے کن بجائے ان کے کم ہر جس کے قابل ضرور ہے کہ راقم کی تصانیف گائیں۔ بعدہ بچھاو جی کے ٹکڑے کے ہمراہ وہ ہفتہ سم پر تمام کیا رہا اور ہر جس کے محکم کے بعد چرخی رہو جان عالم یا جان عالم کی بجائے سر میں کہا کریں اور ایک محکمہ اور اپنی جانب اور دوسرا میں حسب اور تیسرا بالائے ناف تمام کریں اور اس کی شکل یہ ہے کہ پیٹے داہنی جانب دونوں ہاتھ لے میں بڑے حائیں اور دوسری بعد بائیں جانب بھی اسی طرح سے اور تیسری مرتبہ ناف پر بائیں ہاتھ کی انگشت کلہ اور انگشت منہ ملا کر چکی کی صورت بنا کر کہیں اور ہاتھ چکی بندھی ہوئی پیشانیوں پر اور ایک دونوں پر کہ کہ ہلا میں ایک ہاتھ لے کر لھے پر دو بائیں کو لھے پر اور تین پھر بنے کو لھے پر ہر ایک اور ہر محکمہ میں گارے اٹھایا اور دھرا کر بیٹے

یہ عام ہدایات ہیں جن کا اطلاق ہر جس پر ہوتا ہے۔ خاص رہسوں کے متعلق تفصیلی ہدایات الگ دی گئی ہیں۔ اس طرح پنج باب کا ایک حصہ یعنی ہدایت کاری اپنے اولین نقوش اور ابتدائی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ مختلف رہسوں میں سے ان کی ہدایات ملاحظہ ہوں۔

رہس مہتاب کھچی نام :- دونوں ہاتھوں کی کھچی کی انگلیاں جوڑ کر مثل ہلال پیشانی پر رکھیں اور ایک کے بازو سے دوسری اپنے بازو والے بائیں اور نہ خیر و بندہ کریں اور مہتاب کھچی ناچو کھچی ری "گافی ہوئی آگے آئیں اور حلقہ کریں یعنی مدور ہوں اور رقص کریں۔ من نہ ہاتھ جوڑ کر گافی ہوئی ایک دو ایک و و تال میں پاؤں سے نکالتی ہوئی پسپا ہو کر جائے معمولی پر جائیں اور چرخی رہو جان عالم

رہس آسمان کھچی نام :- دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملا کر اس کے بعد دونوں ہاتھوں کی انگشتان میں نہ کو سادہ کی ایک طرف سے اس طرح سے کہ انگوٹھا چلچلہ رہے ای ای پیشانیوں پر رکھیں اور ایک کے بازو سے دوسری اپنا بازو نکالی کر نہ خیر و بندہ کریں۔ مہتاب کھچی ناچو کھچی ری "گافی ہوئی آگے آئیں اور حلقہ کریں اور رقص کریں اور بطریق اول عمل میں لائیں۔

اجائی تہا نے نمیدیں جن چھتیس ایجاوی رہسوں کا ذکر کیا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں :-

رہس سلام نام	(۲) دوسرا رہس بیدہ کی مال نام	رہس تیسرا رہس ملاؤں کھچی نام	(۴) چوتھا رہس مروجہ نام
سنائی	(۶) رہس مہتاب کھچی	(۷) رہس آفتاب کھچی	(۸) رہس آسمان کھچی
جوطرہ	(۱۰) " " چو رخہ	(۱۱) " " افسر مبارک	(۱۲) " " آداب
چوٹ	(۱۴) " " خوش بنیاد	(۱۵) " " برفق	(۱۶) " " بھلا نام
بیاد	(۱۸) " " جان کھچی	(۱۹) " " ہبہ کھچی	(۲۱) " " چہن کھچی
ست و ن	(۲۲) " " چپ دست	(۲۳) " " راوٹھا	(۲۴) " " تعلیم

(۲۵) رہس	خود	(۲۶) رہس	ششاد	(۲۷) رہس	ہالیوں	(۲۸) رہس	خندہ
(۲۹) =	بالوب	(۳۰) =	خوب	(۳۱) =	مغنی	(۳۲) =	مطلوب
(۳۳) =	ہمزاد	(۳۴) =	مغنی	(۳۵) =	میں سکھی	(۳۶) =	معشوق

پچھتیس رہس واقعی واجد علی شاہ کی ایجاد ہیں اور ان کا تعلق ہندوؤں کے مروجہ مذہبی یا نیم مذہبی رہسوں سے قطعاً نہیں ہے۔ قیاس میں رہس کا نام راوہا ضرور ہے لیکن اس میں راوہا یا کرشن کے روحانی قصے کا کوئی اشارہ نہیں رہس بلکہ ہے۔

دینیسیہاں رہس راوہا نام۔ گھونگھٹ مطرینی لکھنؤ گھونگھٹ گت نکالیں اور بطرینی حکام سابقہ عمل کریں۔ یہ رہس شیخ ڈرامے کے تین اجزاء پر مشتمل ہیں۔ راجہ رایت کا دی (۲) مہینے (۳) رقص۔ لیکن انھیں صلیح معنوں میں ڈرامے نہیں کہہ سکتے۔ ان میں کوئی قصہ کہانی یا پلاٹ نہیں۔ نہ مکالمے اور نہ مناظر ہیں۔ جب تک یہ عناصر شامل نہ ہوں ڈرامے کا یہ تصور کہہ دوں گا کہ مکمل کے ذریعے سے پیش کرنے میں تشبیہیں رہتا ہے۔ پہلے تین عناصر ہیں۔ دو یعنی رقص اور موسیقی اگرچہ آج تک کسی نہ کسی حد تک اور ڈرامے کے لازمی جزو بنے ہوئے ہیں تاہم ان کا فیادوی تعلق ڈرامے سے کچھ نہیں ہے۔ لیکن واجد علی شاہ نے راوہا کہانیا کے دو قصوں کو الگ الگ دو رہسوں کی شکل میں ترتیب دیا ہے اور ان میں ڈرامے کے باقی عناصر بھی آگئے ہیں۔ پہلا قصہ راوہا اور کہانیا کے اظہار حالات اور تعلق میں ہے۔

دو کہانیاں کا درجہ چہ پرت لگا کر بھاری جاوید حسن نہیں۔ ایک کا نام ارخوان پری اور دوسری کا نام زعفران پری ہے اور ایک مردانہ شکل ویکر بہرہ نظر ہے۔ اس کا نام عفرین ہے اور ایک سکھی جو گن بنے اس کا نام صرا ہے اور ایک مرد خادم جو گن کا بنے اس کا نام غربت ہے۔ بعد ختم جس سب کہانیاں بھیجے جائیں اور ایک جانب وہ دونوں بہریاں کرسیوں پر بیٹھیں اور ایک طرف جو گن کرتی پراجا ہے اور وہ دونوں بہریوں کے سامنے گزرتے پانچ باندھے کھڑا ہوا اور غربت جو گن کے سامنے دست بستہ اٹھتا ہوا اور ایک جانب راوہا کہانیا بالکل اور نہ مینہ لگائے ہوئے گھونگھٹ بڑکا لہ کھائے ہوئے کرسیوں پر اجلاس کریں اور دھوم چیراؤ دونوں کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہو۔ اور چار کہانیاں ایک کا نام ہندا، دوسری ساکھا، تیسری چنیدہ، چوتھی لڑوا، اچھتہ کلنی لگائے ہوئے جھڑٹ کھائے ہوئے علیحدہ کھڑی ہوں اور چار پتہ مارچھنوی کھڑی ہوں سے ٹھٹھری کافی ہوئی راقم کی تصنیف پانی بھرتی ہوئی ہوں اور ایک مرد مسافر کی صورت بنا کر مہر گھٹھری اور عصاب دست حاضر ہوا اور چار کھن والیاں ہوئی راقم کی تصنیف کافی ہوئی اور مکھی نکالتی ہوئی ہوں۔ جو گن کو کہانیاں غمزہ بنائیں۔

(رسوالی غربت کا اور عرض صرا ہے) جگ جگ جیو آنند رہو جو گن صاحب کیوں ملول ہو۔ کا ہے جیا ملیں ہے ؟

صرا اور شاہ و غربت ہے، جو میں بہن ہوئے ایک راجہ ہے۔ وہ کیا راجہ ہے، ہم سے کہنے کا ہر تو کیئے۔

- جوتیس برس ہونے کا اس غم میں گم راوہا کنہیا کے نالغ نہیں دیکھا۔  
 بسا اے مہرا،  
 میں غارت ہے۔  
 غارت کا تہمت کرنا۔ غرت، چلا اور غرت سے جھٹلہ ملاقات کی اور کہہ  
 اسلام علیکم میاں غرت  
 وعلیکم اسلام استبین واللام الطعام والکلام لکشمش والنباء ام میاں غرت علی خلیں ہما اور  
 ہما وران کھٹ پٹ جنگ نام نہ سوچو جو۔  
 دھرووں بنگلہ میرے غرت اس طرح سے ہنس کاؤن کاؤن کھل کھل کھل  
 غرت ماسوالی غرت سے) میاں غرت ہمارے تھارے دہت سے بھاڑی چل رہے ہیں کہ ہم سے ایک امر ضروری کہنا  
 ہے اگر تم سے ہو سکے۔  
 کیا کلم ہے؟  
 ایک جگہ ہے اس کو ایک غم ہے۔  
 وہ کونسا غم ہے؟  
 جو کہ صاحبہ کہتی ہیں کہ مجھے راوہا کنہیا کے نالغ نہ دیکھنے کا غم ہے۔ میں وعدہ کر آیا ہوں کہ شش  
 گزنا ہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو میرے وعدے کو پورا کروں۔  
 تنہی تھی تم جی کو شک ملا نا جھوٹا جھاننا حسد و حق معلق شرہ کا فکی دم اور بچوں کی قسم جو میرے  
 کئے مطلب برآمد ہو گا ہر گز ورین نہ کروں گا۔ میں سعی کرتا ہوں۔  
 وہیں اسی وقت غرت غرت کو ہمراہ لے کر روانہ ہوا اور کہنے لگا۔  
 بابا سا تو رہا بازی۔ جمال بازی۔ نیزہ بازی۔ خلا بازی۔ شمشیر بازی۔ راست بازی۔ اعلیٰ میرے  
 ساتھ اور بھنور زعفران پری وارغوان پری حاضر ہوا اور عرض کی ایک جو کہ راوہا کنہیا کے  
 نالغ کے غم میں جو کہ ہوئی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ نالغ دیکھے۔  
 زعفران پری اور وارغوان پری جو کہ کو طلب کر کے اس کے غم کا حال پوچھتی ہیں اور یہ معلوم  
 کر کے کہ چوبیس برس سے راوہا کنہیا کے نالغ دیکھنے کے غم میں مبتلا ہے غرت کو حکم دیتی ہیں کہ  
 جو کہ راوہا کنہیا کا نالغ دیکھا جائے چنانچہ نالغ کی تیاری ہوتی ہے)  
 اس تیاری اور نالغ کو راوہا کنہیا اس طرح بیان کرتے ہیں :-  
 راوہا کنہیا کھیاں ناچو ہنڈولے کا نالغ

اس وقت سب کھیاں برابر رتادہ ہوں اور ایک سر اوپٹے کانگھیا تھا مے دوسرا سر ارا و حاجی وسط صف میں تھا مے اور یہ تہذو نہ کافی جا میں۔ اور ایک دو کی پلوں آٹال میں لٹا فی جا میں، اور سب کھیاں مے متابعت را و حاجی کی کرتی جا میں اور کانگھیا جی پی پیڈ پر مقابل را و حاجی کے سر کھیدو پٹے کھینچ لیا گئیں اور جس قدر جی پٹو جھیل دیا گئیں۔

آستیانی کا ہنڈو لہجے سیاہا سیم گھنٹیس گھنٹہ چلیت چون سنہ تنہ تنہ تنہ  
پیلاندر۔ مسک کھیال مل پنیگ بڑھاوے کے تان تنہ تنہ تنہ تنہ

یوسف انتر - موریکٹ کٹر اکھرو دکنڈر پابل باجے جھنڈ نہ جھنڈ نہ جھنڈ نہ

بعد اختتام ہندو نہ سب کھیاں راجہ رام چندر کی سب کھیاں میں بعد راجہ کھیاں مقابل استاود ہوں اور نصف سکھیا کھیا کی جانب اور آجی راجہ کی طرف کھیاں ہوں اور راجہ کھیاں سے سوال جواب شروع ہوں اور نصف کھیاں ہوتا جاتے اور ارکانی کھیاں میں وہی جانب سے دونوں کے پاؤں سے ہر ہیت اور ہر وہ ہرے کے بعد او ا ہونے جاتے۔

جمع غیر میں ایسا مستحق اربابا دیکھا  
مستحق قبول کے ہم کو نہ کبھی یاد کیا  
میں برہنہ سنگ نہ کر پوچھا  
نارہی جھوٹ بیاد کے پھیلنا ہو گئے ہاتھ

اجواب کنہیا لمضطرہ نام میرا ہے کنہیا میں کھجے جانتا ہوں

راوہاجی جان میں نچھ کو میں بیٹا جانتا ہوں

دوہرا  
برادھاجی کے انگ پر بندیا اور چھپے بیت

ما نو چو لبس کینگی چو ر باس لبت

(جواب: رازِ حاکم)

میں تیرے عشق میں دیوانی ہوں اے کانا

میں نے جی جان سے تجھ کو تو یہاں پہچانا

دوہرا آؤ پیارے موہن ٹیکڑے ڈھانپ تو ہے لمبیوں

نامیں دیکھیں اور یہ کہ اور ناتو ہے دیکھیں دیوڑوں

چنانچہ یہ سوال جواب اسی طرح ہوتے رہتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے بعد تنہا حاضرین اور حاضرین سب کو زچا کرن  
تعمیم کرے اور سب مامختوں میں لکھیں اور ان مکتوں سے لکھا میں اور چاہیں۔ اس کے بعد رادھا کا گانا شروع ہوتا ہے۔  
ربانی رادھا

ہندی کنارے دھواں اٹھنے لگے میں جانوں کچھ ہوئے

جا کے کارن جوگ کما یا نہ ہو نہ جوتا ہوئے

کتابیا  
موندہ کتاب و اگلا بی چشماں دے اتھو وچ سونٹراں دی ہتھکڑیاں  
داں بھی ویلیا پر دیس لہجی حسب مذا راہ دی دیکھیں کھڑیاں

کنہیا کے سوال پر اب کے درمیان راوہا کہتی ہے ۔

راجن کے راج اصرار ہمارا جگ جگ جیہا آندر نہ ہو دہ مری ؟ جا میں چھراگ بھنیں رانہیاں جت  
نہیں دہ مری کناں پر چھوڑ گئے وہی بجاؤ ۔

کنہیا جی اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ وہ مری کھو گئی ۔ راوہا کہتی ہے میں نہیں خوب جانتی ہوں دہ مری تم تو کبھی کو سے  
نہیں کہہ کر راوہا روٹھ جاتی ہے ۔ کنہیا نہانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ راوہا راضی نہیں ہوتی ۔ کنہیا جی اپنے ملازم رام چیرا کو بلاتے ہیں  
اور رام کو منانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ راضی نہیں ہوتی تو ایک ایک کر کے کھجور کو بیچ میں ڈالتے ہیں لیکن مقصد حاصل نہیں  
ہوتا ۔ اس وقت رام چیرا عرض کرتا ہے کہ ہمارا ج راوہا کو دانا سے مانگوا اور تپسیا کہہ دیا جائے ۔ اس وقت کنہیا جی آسن مار کر  
اپنے بھروسے سے ناک پکڑ کر سانس روکیں فوراً راوہا جی اٹھ کر گلے سے چمٹ جائیں ۔ پھر شکریاں لڈو لو جا کریں ، اڈو لو جا ۔ سوال جواب  
اور راوہا کا ہوتا رہتا ہے ۔ راوہا کہتی ہے ہمارا ج ابیں جب ہی خوش ہوں گی جب مری ڈھونڈ کر لاؤ گے ۔ اور کنہیا مری کی تلاش میں  
ہے ۔ ایک سے بڑھتے ہیں ہم مری کسی نے دیکھی ہے ۔ ہم مری کسی نے دیکھی ہے ۔ رام چیرا مذاقہ کر داریں کہ سامنے آتا ہے  
اور کہتا ہے ہم مری کسی نے دیکھی ہے ۔ اس کے بعد کنہیا جی ایک کنوئیں پر بیٹھتی ہیں جہاں چار پنہاریاں پانی بھرتی ہیں ۔ کنہیا ان سے  
سوال کرتے ہیں اور وہ کہتی ہیں ہاں ہم نے دیکھی ہے ۔ ماکھن لاؤ تو ہم دیں ۔ پنہار میں کنوئیں پر واجد علی شاہ کی تصبیف بھری گئی رہتی ہیں اور  
کنہیا کی تلاش میں جاتے ہیں اور ماکھن چرا کر لاتے ہیں ۔ پنہاریوں کو دیتے ہیں اور مری واپس لے کر بجاتے آتے ہیں ۔ راوہا مری کی آواز  
سین کو دھڑک کر کنہیا کے گلے سے چمٹ جاتی ہے اور ۔ دل رانی ہو جاتی ہے ۔ راوہا اس وقت سازندوں کے بیچ میں جا کر بھٹ مری گاتی ہے اور  
توبہ دینے سے روٹھ ہوا دکھہ بالاس سمیت ادا کرتی ہے ۔

استانی : بجن لاگی سیام کی بانسری رے  
انتر : ندیا کنا سے اکھتر بانسری بجاوت کس جات جیا سے سانس رے

یہاں پہنچ کر اصرار ختم ہو جاتا ہے ۔ خاتمہ پر واجد علی شاہ لکھتے ہیں :-

نصنہ ختم ہوا ۔ اگر شب بیداری منظور ہو تو ہر سبھی علیحدہ علیحدہ ناچ اور گانا کر دات گا  
سکتی ہے مگر یہ قصے اور رسم وقت شب مزید اور بہتر معلوم ہوتے ہیں ۔ دن کو  
نہیں اچھے گئے اس واسطے جب اس قصہ اور رسموں کی کیفیت دیکھیں وقت  
آرا سند کریں ۔

اس کہ میں واجد علی شاہ نے صرف قص اور مسبقی متعلق ہدایات دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ پوشاک اور لوازمات کی بھی

دہی ۔ یہ تفصیل پوشاک کنہیا جی کی : گھٹہ معہ جاگلیہ ۔ گھانگرہ ۔ گھونڈ کا چوٹی ۔ کٹ کا چوٹی چار عدد ہوئے ۔

نہیں پوشاک اور زیور راوہا جی کی :- مندر ۔ مینہ ۔ تمام ہندوستانی زیور بھریہ ۔ انگا ۔ پیشواز ۔ بندی یعنی سرسری ۔ نقو بانسری

معدنری اٹھ رہے۔

اسی طرح سکھوں اور پلوں کی پوشاک کی تفصیل ہے۔ دیو کی پوشاک دیکھیے۔

جاگت سیاہ۔ پتلون سیاہ دوستانہ سیاہ۔ موزہ یعنی حجاب سیاہ۔ چہرہ خنوی کریمہ نظر گہرے چوٹی سیاہ۔ پوکھلاں کاغذی بنا  
عقد ہوئے۔ اسی طرح جوگن کی آلات و پوشاک ماگھن والیوں کی۔ زیور اور پوشاک پنہا دیوں کی پوشاک مسافر کی۔ پوشاک غربت کی۔  
پوشاک رام چیر اور ریس والیوں کی الگ الگ تفصیل بیان کی ہے۔

اسی انداز کا رادھا اور کنہیا کا ایک دو سرا ریس بھی واحد علی شاہ نے لکھا ہے اس میں رادھا کنہیا۔ چاروں سکھیاں اور گڑبگڑ  
بارہ ریس والیاں شریک ہوتی ہیں۔ دونوں قصوں کے خاتمے پر لکھتے ہیں۔

نوشہ باند سیاہ برغیدہ نویسنہ رانیت فرد امید

المفتہ القہر ۱۲۹۶ھ مقام کلکتہ محلہ دیا برت میں یہ دونوں قصے الگ الگ جھنپیں

رہوں کے تیار اور مرتب ہیں البتہ مقدمات جلی اور زیور میں راقم سے اس قدر مینا

منہیں ہو سکا جو تکمیل کرتا۔ زمانہ سلطنت اور استقلال میں سب کچھ بدلنے عطا کیا

تھا اور اب بھی اسی کی ذات سے امید ہے۔

رہیں میں جن لوگوں نے کام کیا ہے اور جو مختلف گھرا انھوں نے ادا کئے ہیں اور جو ان کی نخواستہ میں مقرر تھیں ان سب  
کی تفصیل ایک باب میں بیان کی گئی ہے جس کا عنوان خطاب محلات اور یکایات اور خطابات شہزادگان اور راجا ب عالم ہے۔  
وغیرہ ہے۔

فصل پہلا چوتھے پہلے نیا رکھیں رادھا منزل والیاں یہ اٹھارہ اسم ہیں: نواب عتیق محل صاحبہ والدہ اختری بیباہ مرزا  
محمد شام بہادر۔ دوسری نواب تمیز دار صاحبہ بیگم اختر محل موصوفہ۔ موصوفہ معشہ زوہ ایک سوزنا لڑکے دو پلے جیسے کے خواہ دار اور باقی  
سترہ اسموں کے فی اسم ایک سو تین روپے مقرر ہیں۔ مجموع ایک ہزار نو سو چالیس روپے کے ماہواری رادھا منزل کی ریس والیوں کو  
دیتا ہے۔ تیسری نواب محلی بیگم صاحبہ عاشقہ راقم۔ چوتھی نواب عباسی بیگم صاحبہ کنہیا۔ پانچویں نواب نامدار بیگم صاحبہ رادھا چچھی نواب  
جہانانہ بیگم صاحبہ ارغوان پری۔ ساتویں نواب ستارہ بخت بیگم صاحبہ زعفران پری۔ آٹھویں نواب سلطان بیگم صاحبہ صحرایی جوگن  
نویں نواب محلی بیگم صاحبہ لقا سکھی۔ دسویں نواب بھی بیگم صاحبہ ساکھ سکھی۔ گیارھویں نواب عروسانہ بیگم صاحبہ عین سکھی۔ بارھویں  
نواب جاناں بیگم صاحبہ لڑا سکھی۔ تیرھویں نواب محبت بیگم صاحبہ۔ چودھویں نواب ریحان بیگم صاحبہ۔ پندرھویں نواب وزیر بیگم صاحبہ  
سولھویں نواب جناب بیگم صاحبہ۔ سترھویں نواب خوش قد بیگم صاحبہ۔ اٹھارھویں نواب نور بان بیگم صاحبہ۔ غلام حسین خاں مغنی شریک  
بندہ اور قائم خان رفاص شاگر و بندہ اس جلسے کے محکم ہیں اور یہ اٹھارہ اسم باقیم کی مصوعات ہیں۔ سترکار باقیم سے رہیں کے وقت  
بجاری پیشوا زین مسالہ وار معہ دوپٹہ برز رادھا گھٹنے تختہ فی اسم علیحدہ ملا کرتے ہیں اور بعد قص میرے تو شک خانہ میں احتیاط سے  
صندوقوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں اور رادھا کنہیا، پریوں، جھرا، حفزیت و مسافر رام چیر، ان سب کا بھی اسباب مع

ہزاروں اور لاکھوں والیوں کے میری طرف عامہ اور مسکے حسابات میں شامل ہیں۔ ان کی خواہوں سے کچھ علاقہ نہیں۔ اس دہس کو  
ناشا۔ لہذا نیز حوالہ چرو حوالہ برس شروع ہے۔ فنِ مصطفیٰ میں طاق مشرہ آفاق ہیں۔

اس بیان سے راہِ کنہیا کے رہس کی ابتدا کی تاریخ ۱۴۸۰-۱۴۹۲ قرار پائی ہے اور اس طرح امانت کی  
اندازاً بعینہً اس سے پہلے کی تصنیف قرار پائی ہے۔ ناکہ مسافر کے مصنفین اندر سجا کی تاریخ ۱۳۱۳ بتاتے ہیں اور اس کے  
ثابت میں پیش کر رہے ہیں۔

نور دے وجد بولی اٹھے پر نرادر جہاں میں وجود ہے اندر سجا کی  
اس سے وجد کے دو یعنی "و" کے نتیجے سے ۱۴۵۰ برآمد ہوتے ہیں لیکن ان کے دیوان موسومہ غزلی الفصاحت میں  
یہ ان کے سا جزا کے لئے مرتب کیا ہے۔ یہ عبارت موجود ہے:-

بعد اس کے احباب نے فرمائش کی کہ قصہ راجہ اندر اس طرح نظم کیجئے کہ جس میں  
غزلیں اور مثنوی اور نثر اور ٹھہریاں اور ہولیاں اور لبنت اور سلون اور واک  
اور چہند ہوں تاکہ اس زبان میں بھی طبیعت کی جوت اور زمین کی رسائی دیکھیں  
بسیب احمر اور دوست و بیار چار و ناچار ۱۴۹۵ میں بی قصہ تصنیف کیا اور  
اندرا سجا اس کا نام رکھا۔

اگر ۱۴۹۵ سن تصنیف ہے تو پھر تاریخ مصرعہ بن اشاعت طباعت ہو سکتا ہے۔  
واحد علی شاہ کی اس عبارت سے اس قضیہ کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے دہس میں کوئی پارٹ اور نہیں کیا بلکہ  
منازل والیوں میں سے نواب عباسی یگم صاحب کنہیا کا کردار ادا کرتی تھیں۔ یہ عبارت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ مردوں کا پارٹ بھی ایک  
خورت کو ادا کرنے کے لئے دیا جاتے۔ کیونکہ دہس میں عام طور پر نہ نام کرو اور مرد ہی ادا کرتے تھے اور یہ روش ایک عرصہ تک قائم رہی  
نور واحد علی شاہ نے رفاص کا نام قائم خان لکھا ہے۔ تبصرے اس تمام تفصیل میں ایک موقع بھی ایسا نہیں آتا جہاں بعض حضرات کا  
مان کر دہ فراموشی اثر ظاہر ہوتا ہو۔ آگے چل کر ممکن کیا یقیناً طور پر ڈرامے کے مغربی تصورات نے آدو ڈرامے پر اثر ڈالا لیکن اس  
ابتدائی دور میں یقیناً اس طرح کا کوئی اثر نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ واحد علی شاہ کو دہس سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور راہِ منزل والیوں کے علاوہ انھوں نے  
دہس کے اور بھی جلسے ترتیب دیے۔ ان سب کی تفصیل موجود ہے۔

دہان ساروہ منزل والیاں۔ پندرہ اسم۔ ۱۴۸۵ میں قائم ہوا۔ پر خاں منشی شاگرد واحد علی شاہ اور قلندر بخش رفاص شاگرد  
واحد علی شاہ جلسہ کے معلم تھے۔ پندرہ دہس والیاں واحد علی شاہ کی منوعات تھیں اور ان سب کو ملا کر آٹھ سو اٹھ روپے آٹھ آنے  
مابواں خواہ ملتی تھی۔

۲۰ بڑا جلسہ سلطان خانے والیاں۔ چوبیس اسم۔ ۱۴۸۴ میں قائم ہوا۔ ان کی تعلیم میں پہلے ہی بخش خان منشی شاگرد واحد علی شاہ  
اور ان کے بعد تاج خان منشی اور قلندر بخش رفاص اور شار علی خان کچلاوچی اور نعیم الدولہ مہاریشی شاعر اور خلاصہ اولہ بہادر منشی جملہ



شاہِ گروانِ واجد علی شاہ نے جھٹہ لیا۔ اس برس کے سلسلے میں واجد علی شاہ اپنے کمال فن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”گستاخانہ اور فی عرض خدمت ناظرین اور شائقین اور طالبین اور مشتاقان اور

استاوانِ فنِ تال اور صبیہ میں ہے کہ ایک دھیمے تالہ میں تین برس کے عرصے میں

باون طرح کی سنے تالہ میں غاں بکھاو جی کو مہر صاحبات جلسہ بتائی اور سب نے

باعانت راقم اور شاگردانِ راقم باد کیں مگر فرقہ نساً ایسا کج فہم اور ناقص العقول

ہے کہ سوائے خود آرائی اور خود پرستی کو یا کوئی کام دنیا کا پرور و گار نے ان کے

منتقل نہیں کیا۔ چوبیس اسموں میں تین چار اسم تو ان گھوڑوں پر قار و راقم پرے

ما بقی سوائے لے لے کے لے جو چلے دیئے وہ نہیں جانتیں۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ واجد علی شاہ برسوں میں بھی بڑا ریاض کرتے تھے اور اس کا مقصد محض تفریح، یا اندر بھائی طرح

کسی فرمائش کو پورا کرنا یا محض نشر و فطام اور مختلف راگوں کو جمع کر دینا نہ تھا۔

حسب دستور یہ چوبیس سلطان حملے والیاں بھی واجد علی شاہ کی ممنوعات تھیں اور ان سب کو ملا کر دو ہزار دوسو چوبیس

رہے آٹھ آنے ماہوار ملتے تھے۔

(۳) حضور والیاں یا خاص منزل والیاں۔ گیارہ اسم۔ عفا بیت غاں معنی خواجہ بخش مبلہ اور حیدر علی زفاں شاہ گروانِ واجد علی شاہ

مستلم تھے۔ ان کو چار سو پینسٹھ روپے ماہوار ملتے تھے۔

(۴) سرور منزل والیاں۔ یہ بقول واجد علی شاہ ”صاحبات سن رسیدہ بھی ہیں“ سولہ اسم۔ فی اسم میں روپیہ کی تنخواہ کل

تین سو میں روپے ماہوار۔ عرض اس طرح کے باقیں جلسوں کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ خاتمہ پرواجد علی شاہ لکھتے ہیں۔

”جاننا چاہیے کہ زیر تعلیم راقم ناخبر برپیتا لیس اسم ہیں اور سب جلسہ ملا کر دو سو

سولہ اسم گانے ناچنے والے اللہم زد۔ ماشاء اللہ چیم بدوڑ تاخیر کتاب ہذا راقم

کے پاس ہر وقت و ہر ساعت و ہر لمحہ موجود ہیں مگر ملاقات اور صحبت اور کلام

ہر روز انھیں سے ہوتی ہے جو پیتا لیس اسم زیر تعلیم حقیر ہیں۔ جملہ آٹھ ہزار پانچ

سوا آٹھ سو روپے مشاہرہ ہوئے۔“

اس حساب سے مختلف برسوں پر ملا کر سالانہ خرچ ایک لاکھ تین ہزار ایک سو چھ ہزار روپے تک جا پہنچتا ہے اور اس میں صرف

مختلف اسموں کی تنخواہ شامل ہے۔

پوشاک، زیورات، انعام و اکرام، معنی، کچھاو جی اور زفاصلوں کی تنخواہ اس میں شامل نہیں۔ اگر اسے بھی ملا لیں تو صرف

برس سے متعلق واجد علی شاہ کا خرچ کم و بیش ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ تک جا پہنچتا ہے اور یہ عالم اس وقت ہے جب واجد علی شاہ

معدیوں پر کہ مٹیا برج میں مقیم ہیں اور ایک مختصر سی پیش پر گزرتے ہیں جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ان جلسوں کی تیاری جیسی کہ نام سلطنت لکھتو میں بھی مٹیا برج میں نہ ہو سکی۔ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ اس مد میں کتنا خرچ کرتے ہوئے تھے۔

رہس والیوں کے علاوہ پندرہ مٹھی۔ ایک کھٹی والا۔ دو کچا و جی تینیس بلبلہ نواز چھپا میں سارنگی نواز۔ بائیس منجیر و نواز۔ ایک لے نواز۔ چھ رفاص۔ ایک شعبہ باز۔ دو ڈھولک نواز۔ ایک سرنگھار نواز اور انیس نفر لغار خانے اور چھ سرو و محفل ملازم تھے جن کی تحائف ہزار دو سو اکٹھ روپے ماہانہ یا اتالیس ہزار ایک سو تیس روپے سالانہ مقرر تھے۔ سرو و محفل ڈو غنیوں کا خطاب تھا اور ان کے سرو و ہا محفل کہلاتے تھے۔

واجد علی شاہ کے ہاں رہے ہیں اکثر کہا جاتا ہے کہ ناپچنے اور گانے والی عورتوں اور ان کے متعلقین جو ہر وقت بادشاہ کو گھیرے رہتے تھے انے انھیں خواب کیا اور ان کی صحبت میں امور سلطنت کی طرف سے بے تعلقی ہو کر بیت افعال اور بیت احوال کی طرف مائل ہو گئے۔ کسی قدر یہ بات درست ہے لیکن رہس کے سلسلہ میں واجد علی شاہ کا ایک بیان ایسا ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈوم ڈو حارڈیوں کے مزاج، عادات اور اطوار کی ناپسند کرتے تھے۔ خاص جلسے والیوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

مذہب رسال مقتضی ہوتا ہے کہ نجیف خدوان کی تعلیم دہی میں بدل و جان مصروف رہتا ہے۔ اب ما شا اللہ نے سر میں غریبی واقفیت ہوتی جاتی ہے۔ بچانا، گوانا، ارتھ بھاؤ بنانا، ٹکڑے پاؤں سے لوانا، گتیں پھانا سب مجھ سے متعلق ہے کسی سازندے، نوازندے، معنی، رفاص کو ذرہ دخل نہیں۔ بلکہ ان کے ہمراہ سوائے راقم اور کوئی نہیں ہوتا۔ جو کبھی ایسا ہی دل چاہا تو سازندوں کو ہمراہ بجا لیا۔ دوسرے تیسرے بیٹنے کے بعد چنگیوں پر دھڑ پر چترنگ، تروٹ، نزانہ، وصال، روپک، تیور، اچونا، و جمبہ تانہ، کبیر کی، چھب برہ، بھی، سولغا ختم، چھب تانہ، چاچر، غزل، ادھب، خیال، ٹھمری گاتیاں کن۔ جو اہر گچے کے چھوٹے ٹکڑے پاؤں سے نکالتیاں ہیں۔ دو تین سو چیزیں سب طرح کی آج تک بنا چکا ہوں اور تبا کے چلا جا رہا ہوں۔

نقلیں بھی مضحک کرتیاں ہیں۔ سجدہ ہو گیا ہیں صورت اس کی یہ ہوتی تو جیسے ترتب کے راہ واصل ہوں۔ وانیوں اور سلطان خانے والیوں پر ایسی ایسی محفلیں کیں کہ صبح کا کھانا شام کو شام کا صبح کو نصیب ہوا۔ مگر آخر کامان صاحبوں نے سبب تاثر صحبت شہانہ روزی ڈوم ڈو حارڈیوں کا سامراج پیدا کیا۔ مجھ اکیسے کا اثر نہ ہوا۔ تعلیم وہی ہی تھی تفرقہ پڑا۔ علم کی طرف توجہ بالکل نہ کی مرنے کی طرف رجوع ہو گئی۔ یہ حالات دیکھ کر راقم الحروف نہایت کبیر و خاطر اور پریشان رہتا تھا کہ یا خدا کیا تدبیر کروں بغیر سازندوں کے ایک کلمہ زبان سے نہ نکالتیاں تھیں۔ ایک دن شاہ زمانے نے مجھے رنجیدہ خاطر دیکھ کر کہا صاحب تم کیوں شہانہ روز چپ رہا کرتے ہو۔ میں نے قصہ گذشتہ نقل کیا۔ انھوں نے اصلاح دی

تہجو کیا کہ ہرچہ اوروں کو تعلیم دہی میں شریک کہنے ہو۔ میں نے جواب دیا سب جلسوں کی عادتیں خراب ہو گئیں وہ اب میرے زیرِ تعلیم نہیں آسکتیاں ہیں۔ انھوں نے ہنس کر جواب دیا ایک ورہندہ کر دیکھتے ہیں۔ گوریال چھو کر بیاں بولاتی ہوں، کچی کڑی کی طرح جدھر توڑو مر دڑو گئے بلا تکلف ٹوٹیں گی اور فوٹ بار کا محل صاحبہ، رامکار خاقان واروغہ اشفاق السلطان اور نواب شہزادہ محل صاحبہ یہ سب بھی ایسے ہی کلمات زبان پر لاتے، میں بھی راضی ہو گیا۔ الحق یہ صلاح یہاں تک مفید ہوئی کہ میں نے اب عمدہ دقت لیا کہ مدتِ اتم کسی ڈوم ڈھاڑی، میراثی، کلا دت، گوتیہ، دھر پیرے، تھیلے، قاضی کچھاوی کے حوالے ایک اکٹم بھی نہ کروں گا۔“

اس تحریر میں واجد علی شاہ نے علم اور مزے کو الگ الگ سمجھا ہے اور بلا پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم اور فن کے حصول اور اسی جذبہ کی تسکین کے لئے سب کچھ کرتے تھے یہ اور بات ہے کہ ایک والی سلطنت کو ان فنون سے اس درجہ وابستگی پیدا کرنا مناسب بھی ہے یا نہیں لیکن یہ سیم کرنا پڑتا ہے کہ جب واجد علی شاہ صحیح یا غلط اس طرف مائل ہوئے تو انھوں نے فنکاری کا حق وا کر دیا۔

آخر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے ان رسموں اور جلسوں کا اُردو ڈرامے کی تاریخ میں کیا درجہ ہے جنھیں ایجاد دی رسم جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے قصہ پن سے عاری ہیں۔ ان میں اداکاری نہیں، مکالمے نہیں، مناظر نہیں، پھر انھیں ڈرامے کی تعریف میں کیسے شامل کیا جائے۔ ان رسموں پر یہ اعتراض درست ہے۔ دراصل یہ صرف موسیقی اور رقص کا امتزاج ہیں۔ بلکہ ان میں موسیقی کم اور مختلف اعضاء کی حرکات و سکنات زیادہ ہیں لیکن انہی رسموں پر رادھا کنہیا رسم کی بنیاد ہے۔ رقص اور موسیقی ان رسموں میں بھی نمایاں عناصر ہیں لیکن ان میں ایک قصہ پن بھی ہے، مکالمے بھی ہیں، مناظر بھی ہیں، مختلف کردار بھی ہیں جن میں سفرے کا کردار بھی ہے۔ کنہیا رسم میں مناظر بار بار دہرتے ہیں مثلاً:-

(۱) (پہلا منظر) زعفران پری اور غوان پری کا جلسہ۔ دیو سامنے کھڑا ہے غربت، جوگن کے سامنے ورت بستہ استادہ ہے۔

- |                  |   |
|------------------|---|
| (۲) دوسرا منظر   | رادھا، کنہیا، رام جہیر ملازم، چار سکویاں۔                 |
| (۳) تیسرا منظر   | جوگن کا خادم غربت، مسافر کی صورت۔                         |
| (۴) چوتھا منظر   | غربت اور غفرینت کی ملاقات۔                                |
| (۵) پانچواں منظر | رادھا کنہیا کا رقص۔                                       |
| (۶) چھٹا منظر    | کنہیا کا مری کی تلاش میں روانہ ہونا۔ پنہا دیوں سے ملاقات۔ |
| (۷) ساتواں منظر  | مکھن وانیوں کی تلاش۔ ملاقات، مکھن چڑا کر لانے کا منظر۔    |
| (۸) آٹھواں منظر  | کنہیا مری بجاتے ہیں اور رادھا اگر ان سے پرٹ جاتی ہے۔      |

ان تفصیلات میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ مناظر کس طرح بدلے جاتے ہیں۔ پردوں کا استعمال غالباً نہیں ہوتا تھا ورنہ کہیں نہ کہیں ان کا

بہرہ ہونا۔ پہنچ کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی کیا شکل تھی۔ راجا گتیا رہیں یا رام لیا، دوسرے ہندو متوں میں ان کے راجوں پر ترتیب دیتے تھے عام طور پر کھلے میدانوں میں ادا ہوتے تھے اور سارے گرو اور مہادوا کرتے تھے۔ واجد علی شاہ کے رجب کے محلات میں ہوتے تھے معلوم ایسا ہونا ہے کہ کسی کشادہ جگہ پر سارے گرو اور انگ انگ بٹھا دئے جاتے تھے اور تمام مناظر سنا۔ راجا اور جاتے تھے۔ دیکھنے والوں کی اہل چوپی گانوں اور دھن تک محدود ہوتی تھی لیکن واجد علی شاہ کے رجب میں کئی ماہ قابل غور میں رکھنے میں ہیں۔ دیو پر باں موجود ہیں لیکن بنیادی گرو اور راجا۔ کنہیا سنگھیاں، ملازم، پٹنیاں، بکھن، سنا اور غیر ہیں۔ ان کی اداکاری فطری، سادہ اور دلچسپ ہے۔

جس زمانے میں واجد علی شاہ اپنے رجب تیار کرتے تھے قریب قریب اسی عہد میں امانت نے اندر سجا ترتیب دی۔ واجد علی شاہ کے رجب ان کے محلات تک محدود تھے۔ امانت نے اندر سجا عوام کی فرمائش پر عوام کے لئے لکھی۔ قدرتی طور پر اس میں فنی اور امانت پر اس قدر محنت نہیں کی گئی جس قدر واجد علی شاہ اپنے رجبوں پر کیا کرتے تھے۔ اس میں گانے زیادہ ہیں اور ان میں تنگ بند ہی معلوم ہوتی ہے لیکن عوام کے لئے یہ ایک نیا اور دلچسپ شغل تھا۔ چنانچہ اس قدر مقبول ہوا کہ امانت کی موت بعد ہی لال نے اور پھر ان کو دیکھ کر اور لوگوں نے اندر سجا میں اور دوسری سجا میں لکھیں۔ یہ سب ڈرامے کے جدید فن پر مبنی تھے لیکن آدھ ڈرامے کی پیشبرد و یقیناً یہی کہیں اور سجا میں ہیں۔

ہیں کے گانے۔

کنہیا راجا کے رجبوں میں بکثرت گانے ہیں جن سے واجد علی شاہ کی فنکاری کا اندازہ ہوتا ہے علاوہ سوال وجواب کے جو کالوں میں ہیں جنہیں گانے بھی اکثر ہیں۔ ان میں دوسرے، واسے، بھڑیاں اور ہولیاں شامل ہیں۔ یہ سب گانے عام بکھوام پسند ہیں۔ ان میں کچھ گانے نہیں ہیں اور نہ غزلیں ہیں۔ کچھ گانے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شادیدان کی فنی وقت اور حال کا ہی رہا ہے۔ فنی انداز کی عقل نہیں ہوتی تھی اور غزل اس لئے نہیں کہ غزل کی فنی عظمت ایسی تھی کہ واجد علی شاہ اس سے ناواقف گانے میں استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بہر حال وجوہات کچھ ہوں اس قسم کے گانے ان رجبوں میں نہیں ہیں۔

رہیں کے بعد کتاب کا پانچواں باب شروع ہوتا ہے جو بھنڈیتوں اور ضخک نغلوں کے بارے میں ہے واجد علی شاہ آقا زین لکھتے ہیں۔

”جاننا چاہیے کہ موجد بھنڈیتی اور جملہ حکایات اور لطائف اور نغلوں کے

امیر خسرو و لہری ہیں“

اس کے بعد مختلف علوم و فنون بالخصوص موسیقی میں امیر خسرو کے فنی کمالات کا ذکر تقریباً تین صفحوں میں کیا ہے اور اس میں امیر خسرو کی ایجادات کو تفصیلی سے بیان کیا ہے۔ ہمیں واجد علی شاہ کے اس بیان سے اختلاف ہے۔ امیر خسرو کی طبیعت ان کے مزاج کی افتاء و شعروادب میں ان کے رجحانات اور میلانات حضرت نظام الدین اولیاء سے ان کا عشق، و رباہوں اور ان کی عزت اور مرتبہ کے پیش نظر یہ بات قبول کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ امیر خسرو کبھی بھنڈیتی اور نقالی پر بھی آئے ہوتے ہیں۔

اسی طرح واجد علی شاہ کا یہ قول بھی درست نہیں کہ ”خانی باہی بھی ایک شہزادے کو بھلانے بھلانے موزوں کر دیں اور اکثر ان کے سامنے آستین چڑھا کر اور انارک اور گالی پھلا کر انعام لائے معمولی سے جو بھینڈتی ہیں بیان کروں گا۔ سخر این کر کے بھلانے بھلانے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ امیر خسرو خانی باہی کے مصنف نہیں ہیں اور یہ کتاب ان کے کسی سو سال بعد تصنیف ہوئی تھا اور ان بھانڈوں کے فرقے سے متعلق ایک عجیب بات واجد علی شاہ کے بیان سے معلوم ہوتی ہے کہتے ہیں۔

”اس فرقہ کو راقم نے پختہ خرد دیکھا کہ ایسے پابند صوم و صلوة ہوتے ہیں کہ سحان شہ ہزار روپے کی ٹھیلی سامنے دھروا اور فرماؤں کہ وہ نماز فوت ہونے دو۔ اگر نقل کئے جاؤ گے تو ہزار روپیہ یہ تمہارا ہے، کبھی قبول نہ کریں گے پر نماز وقت پڑ جائے گی“

انگریز درست ہر قول سے بھی اس وعدہ داری کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیے جو اس عمر کی تہذیب و معاشرت کا ایک معمول و نیاؤں جزو ہے اور یہ کہ ایسا طبقہ بھی جو بظاہر بہت بدنام نظر آتا ہے اخلاقی اعتبار سے بالکل دلیا لیں نہیں ہو چکا تھا۔ لیکن واجد علی شاہ کا یہ بیان بھی کچھ ٹھنڈا ہے۔

نقلوں کی تفصیل خاصی طویل ہے (ص ۱۲ تا ۲۹۳) اور تقریباً پونے دو سو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں اکثر نقلیں ایسی ہیں جنہیں مضحک کہنا مشکل ہے۔ ان میں ایسا جوڑ ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ عام جلسوں میں یہ نقلیں کس طرح ادا کی گئی ہوں گی۔ مثلاً گورندہ کی نقل جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

”ایک بی بی تعین انھوں نے پتھر کا حضور تاسلی آلود بنوایا تھا۔۔۔۔۔“

ان مضحک حکایتوں اور نقلوں کے پڑھنے سے واقعی عبرت ہوتی ہے اور اخلاقی اعتبار سے ایک دلیا الیہ معاشرت کی تصویر انکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اس کے لئے واجد علی شاہ کہنا تک ذمہ دار ہیں۔ قدرتی طور پر بار بار تفراری کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں واجد علی شاہ اپنے دور کی پیداوار ہیں۔ ان کے رہنوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجا کنہیا کمار جس ج انھوں نے سب سے پہلے تیار کیا ۱۷۷۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ امانت اس سے پہلے ۱۷۶۵ء میں اندر بھیجا گئے ہیں اور صیبا کہ امانت کے دیوان کے ویبا کے کی عبارت سے ظاہر ہے، دو متوں کے تعلق سے اور اصرار سے مجبور ہو کر لکھے ہیں۔ گویا وہ اس یا تلخ گمانے کا بذات صرف واجد علی شاہ کی وجہ سے نہیں پھیلا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ واجد علی شاہ خود اس کا شکار ہو گئے واجد علی شاہ کی فطرت ان میں جا بجا جھلکتی ہے چنانچہ خاص منزل والیوں کے سلسلہ میں انھوں نے علم اور مزے میں جو تمیز کی ہے اور جس طرح ڈوم ڈھاڈیوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا ہے۔ اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اس فصل کے خاتمہ پر واجد علی شاہ نے اپنی ایک غزل بھی لکھی ہے کہ بغا ہر اس غزل کا بیان کوئی عمل معلوم نہیں

ہوتا۔ غزل یہ ہے۔

نظارۂ ترخ احمد سے رنگ لالہ اوڑا  
کنان کی طرح ہوا چرخے چرخے دیکھ کے ترخ  
بہس چمک کے جو نکلا فنک پہ عارضہ  
تا میں کیا کہدات ہی میں ہکا پلٹا  
مجھے نصیب کیا آگے ان نگاہوں نے  
برائے چتر سریشام حسن محفل ہیں  
لکھی تھی اس میں جو تفریف اورچ بار بند  
جو دیکھے ہاڑی نیزہ تیرہری حسن

ہما کی طرح سرگوشن گل سے ہالا اوڑا  
مثالی کبک فلک سیر مد کا ہالا اوڑا  
یہی میں سمجھا کہ تیرے مکان کا ہالا اوڑا  
وہ گاؤں خور و ہے دفتر ترخ قبلا اوڑا  
مری تڑپ سے تو رنگ ترخ غزالہ اوڑا  
ہما کی طرح گلوتے پر ہی سے مالہ اوڑا  
فلک پہ بازوؤں سے جلا کے سالاد اوڑا  
کیت برقی کی مانند میرا بھلا اوڑا

یہ غزل اپنے انداز اور آہنگ کے اعتبار سے خالص لکھنوی ہے اور تغزل کی کیفیت سے کبیر محروم ہے۔  
لغات کے بعد ایک فصل میں چند پہیلیاں ہیں لکھنؤ کے اکثر شعرا اپنی شاعری کے آخری دور میں پہیلیوں اور چیتاں کو  
پر زاتے ہیں۔ امانت سے لے کر محسن کا کوئی تک کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ شعرا جو داخلی جذبات  
اور فنی کیفیات سے کم تر تعلق رکھتے تھے خارجی مضامین اور خیالی آرائی و مضمون آفرینی کو معراج کمال سمجھتے تھے۔ خیال آرائی ہی کی  
لیب انہماکی شکل پہلی ہوتی ہے اور یہ لوگ غالباً اسی منزل میں جا پہنچے تھے۔

اس کے بعد فصل شروع ہوتی ہے۔ اس میں محلات اور بیگمات کے خطابات ہیں۔ یہ حصہ تاریخ ادب کے لئے شاید اہم  
ہو۔ لکھنا۔ راجہ علی شاہ کی زندگی اور ان کی تاریخ کے سلسلہ میں اسی حصہ میں سب سے اہم معلومات ہیں۔ ان کی بیگمات محلات و ممنوعات  
کی تعداد، ان کے نام و خطابات اور مراتب کا اندازہ اسی فہرست سے ہوتا ہے۔

محلات کی تعداد ۴۴، اور بیگمات ۳۲ ہے اور یہ ملا کر ۷۶ ہوتی ہیں۔ ان میں وہ محلات اور بیگمات شامل نہیں ہیں جو اپنے  
بندہ نص و غنا اور ریس کے سلسلے میں لکھی جا چکی ہیں۔ ریس کے آخر میں ان کی تعداد جو ناچنے گانے میں حصہ لیتی تھیں ۲۱۶ بتائی  
ہے جس میں سے ۳۴ اہم ایسے ہیں جو براہ راست راجہ علی شاہ کے زیر تعظیم تھے۔ ان سب کو ملا کر یہ تعداد ۲۹۲ تک جا پہنچی ہے۔ ممنوعات  
میں سے راجہ علی شاہ نے صرف چار کے نام لکھے ہیں۔ معلیٰ پسند، اطاعت پسند، خیال پسند اور امیر النساء خانم۔ لیکن ممنوعات کی تعداد  
تقریباً اس سے زیادہ ہے کیونکہ بقول شہرہ راجہ علی شاہ ایسے مذہبی آدمی تھے کہ نامحرم عورت کا سامنے آنا گوارا نہ تھا اور محل کی خادما  
بھی ممنوعات میں شامل کر لی گئی تھیں اور نواب اب رساں اور نواب صفایم جیسے خطابات سے سرفراز تھیں۔ راجہ علی شاہ کی زندگی  
میں یہ ایسا ہے جس کی کوئی معذرت پیش نہیں کی جاسکتی۔

اس سلسلے میں ایک نکتہ نہایت دلچسپ ہے۔ راجہ علی شاہ کو خطابات تقسیم کرنے کا تو یہ مصرعی شوق معلوم ہوتا ہے بیگمات  
محلات اور ممنوعات کے علاوہ شہزادوں، شہزادوں، ہمایوں، دامادوں، مرشد زادوں اور مرشد زادوں کے خطابات اور میں  
اور جو راجہ علی شاہ نے لکھے۔ ان کے درباری صاحب اور حکام جو لفظ دولہ شلا ذوالفقار الدولہ، لطیف الدولہ سے ممتاز تھے تعداد میں

۴۲ ہیں۔ آٹھ وار و دوکان باغ ان کے علاوہ تھے۔ یہ سب ملاکر ایک خاصی بڑی تعداد ہوتی ہے اور اگر اس میں ان کے دیگر ملازمین و منصفین کو شامل کر لیں تو حیرت ہوتی ہے کہ واجد علی شاہ کے دم سے کتنے لوگ وابستہ تھے اور ان کی سلطنت کا اثر کتنے خانہ داریوں اور افراد پر پڑا ہوگا۔ واجد علی شاہ نے یہ کتاب طبایع میں سنہ ۱۰۱۷ھ میں لکھی جب ان کی نثر رباب مختصر سی پیش بردہ ہو رہی تھی لیکن یہاں یعنی منصفین کی تعداد کو کم نہ تھی اور پھر واجد علی شاہ اپنے ان منصفین کی بھی خبر گیری کرتے رہتے تھے حوالہ کے چلے آئے کے بعد لکھتے ہیں رہ گئے تھے۔ چنانچہ قواب منازعہ عمل صاحبہ ان کی والدہ کو بڑی پابندی سے روپیہ بھیجتے تھے جب ہم واجد علی شاہ کے عجب شمار کرنے میں تو یہیں کم از کم ان کی سیرت کا یہ روش پہلو بھی ذرا موش نہیں کرنا چاہیے۔

واجد علی شاہ کی طبیعت میں بے ایمانہ کام۔ انہما افسوس کہ اسے انہما کے لئے صحت مند میدان نہ ملا اس لئے ان کا انداز خطا ہائے کی فکر سے ہوتا ہے۔ محلات، کچھلات، درباری حکام وغیرہ کو خطاب دینے کا رواج عام رہا ہے لیکن واجد علی شاہ کا یہ سونی شاہ بدھن کی عادت تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ جانوروں کے لئے جو خطابات انھوں نے جو پرکھے اور جن کے متعلق ہے مثلاً۔۔۔

(۱) ہیل۔ ۴۶ خطابات۔ نو بولہل، آتش کے چپوں، عاشقوں، کلاب رنگ، خوش نوا، شاہد چن، ایل، بیل، وغیرہ۔

(۲) جل۔ ۱۷ خطابات۔ ولنگار، سحر بیان، بادل خواں، مطرب، مغنی وغیرہ۔

(۳) کستوری۔ ۲۲ خطابات۔ توند سرا، ناز پیرا، رشت الحدید، انارکلی وغیرہ۔

(۴) شاما۔ ۲ خطابات

(۵) مدہ۔ ۴ خطابات۔

(۶) ویڑ۔ ۳ خطابات۔

(۷) چنڈول۔ ۱ خطابات

(۸) آگن۔ آٹھ خطابات۔ کلاں، چشم چیر خطابات۔ ابلقہ دس خطابات۔ ہر نو خطابات۔ ملا گیر سات خطابات۔ پیکر آٹھ خطابات۔

اسی طرح دھونی، طوطی، کچھڑی، دوشے، مرغ، فرنگ، کاکا، گڑا، دینا، بنگلہ، بھوکٹہ، پیپیا، غوغائی، لالی، سورج، واران، لوار، اما، کپل، کنیری، ببا اور حکم کے خطابات ہیں جانوران اور ادنیٰ خاص کے خطابات مجیدہ ہیں خطابات ناری نماں، بک، انگریزی، خطابات گاؤں، خانہ، کوترخانہ، بینڈ خانہ، مچھلیوں، رنگ، پشت، گک، کو خطابات سے محروم نہیں رہ سکتے۔ ان کے بعد درختوں کے ۳۳ خطابات ہیں اور آخر میں کو کچھڑیوں، مٹلوں اور کمرؤں کے خطابات کی ایک طویل فہرست ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طویل فہرست واجد علی شاہ کی ایک خاص نفسیاتی کیفیت کی ترجمان ہے۔ واجد علی شاہ جو خود کو سلطان عالم سمجھتے تھے عملاً ایک مبہور اور نظر بند انسان تھے۔ بادشاہت کا خواب انھوں نے دیکھا تھا لیکن بادشاہت

سارے انھیں کبھی نصیب نہیں ہوئے۔ وہ شاہنشہ کی ٹھاٹ اور کاروبار پھیلانا چاہتے تھے لیکن اس کے لئے ضروری وساعی  
 سے محروم تھے۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سیاسی حالات ایسے تھے جو انھیں کچھ نہیں کرنے دیتے تھے۔ دوسرے وہ جو  
 دربار میں تھے وہ بھی جدوجہد کا نہ تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سید احمد شہید کی عریک جمادیا ۱۸۷۷ء کی سیاسی جدوجہد سے  
 ان کا سیاسی رکھتے تھے اور نہ اس میں حصہ لینے کے اہل تھے۔ قدرتی طور پر ایسا تھیں اپنے جذبات، تخیلات، تصورات اور  
 احساسات کی تکمیل کے لئے ایک تخیلی دنیا پیدا کرے گا اور اسی محروم و خجالی فضا میں پرواز کرنا اسے کا۔ واجد علی شاہ نے ایسی  
 عمارت کی بنی۔ اس میں ایک قسم کے فرا اور چپائی کی کیفیت یعنی پائی جاتی ہے اور کہیں ایسی جگہیں نہیں ملتی جس کے  
 لئے اسٹیشن کا مکان چنا۔ عمل اور حقیقت کی دنیا سے ہٹا کر واجد علی شاہ نے راگ اور قص میں پناہ ڈھونڈ لی۔ وہ جاگیر پر اور  
 دربار میں نہیں رہتے تھے اس لئے خطابات باغ کر ہی انھوں نے اپنے جذبہ کی تسکین کی۔ یہ سب کچھ وہ خود بخود نصیب کی  
 اور بدینہ اس وجہ کہ ہیں ایسے مبتلا رہے کہ ہر رنگ عبادت نہ ملے۔ ملت کی غلطی اور ستہ دہم میں نظر بندی اور قیام پر بیجا  
 و قیام سے واقعات تھے جو ان کی انھیں کھول سکتے تھے۔ اس دور میں ان کے کلام میں جن دروازوں کی اسٹارٹ ملے بھی ہیں  
 ان کی سیاسی یا سماجی شعور یا نفسیاتی کیفیت میں کسی تبدیلی کے ترجمان نہیں ہیں۔ واجد علی شاہ کو غلط اور حد کی غلطی  
 اور تہذیب و رواج کے راگ و رنگ کی محفل کا غم ہے۔ انھیں اپنی نیکیاں اور منوعات سے بچھڑنے کا الم ہے۔ انھیں اس کا رخ ہے  
 ان کے لئے اب وہ پہلا سا اہتمام نہیں کر سکتے۔ یہی سب اسباب ہیں جن کی بنا پر واجد علی شاہ کے کلام میں اس عظیم القدر  
 والی لوحہ زریعہ نہیں ملتا۔ یہ ساری نشا واجد علی شاہ کا ہی نہیں ان کے عہد کے دوسرے شعراء و فنکاروں کا بھی ہے۔ دلی کی  
 دلی برائے ظلم اور ستم میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ لکھنؤ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

کتاب میں دو دلچسپ نسلیں اور شامل ہیں۔ ایک کا عنوان "قانون اختری" ہے جس میں محل سے متعلق مرد و زن اور نیکیاں  
 اور منوعات پر بات دی گئی ہے۔ انھیں ایک طرح سے واجد علی شاہ کے ادب و عادات کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں جب ہم واجد علی شاہ  
 کی اس معلوم راگ اور قص کی مجلسوں، محلوں میں طرح طرح کی عورتوں کے ہجوم اور عیش و عشرت کی عام فضا کا حال دیکھتے  
 ہیں تو نہ تو یہ طور پر خیالی ہوتا ہے کہ یہ سارا ماحول اخلاقی اعتبار سے کس قدر رست ہو گا۔ لیکن ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ  
 رست کا مطالعہ رکھیں۔ واجد علی شاہ لکھتے ہیں۔

دفعہ پہلی۔ کسی غیر مرد و نا محرم کے منہ پر نظر نہ نہ سچو میں خواہ پیش مالک ہو خواہ بیٹھ  
 بیٹھی۔ دفعہ دوسری۔ غیر مرد و نا محرم سے بات نہ کرنے وقت اپنی نظر نہ سچو میں لکھیں خواہ  
 مالک کے لئے خواہ غریب ہیں۔ دفعہ تیسری۔ ہر شخص مالک کے روبرو بیٹھنا ہو  
 کسی ضرورت کے وقت اگر ان کے سامنے بھی بیٹھ جائے تو مضائقہ نہیں۔ سوائے  
 ویسے شخص لائق کے اور کسی نا محرم مرد کو قریب بٹھانے کی اجازت نہیں۔ دفعہ  
 چوتھی۔ کسی غیر نا محرم مرد کو کلوری پان کی دینے کی اجازت نہیں۔ دفعہ پانچویں



کسی نامحرم غیر مرد کو حقہ بولنے کی اجازت نہیں۔ دفعہ چھٹی کسی غیر مرد نامحرم کا نام نہ لے کر خواہ پیش مالک خواہ پس مالک بلکہ اس فرقے کے نام سے اسے پکار دیا یعنی کوئی آدمی ہے یا کوئی کبوتر باز یا جانور باز یا دار و نہریا یا غلبان یا مکاندار یا ماہی پرورد وغیرہ۔ یہ نہ کہہ کہ نام تو خواہ اب علی ہے پیار سے کہو تو یا غلبان یا بیگ یا غلبان اوہراؤ یا میر صاحب یا مرزا صاحب یا شیخ صاحب۔ دفعہ ساتویں۔ کسی نامحرم غیر مرد کے دست بردستی کوئی چیز نہ لو بلکہ لٹانے والا زمین یا اس جگہ پر بآرام و حفاظت دھڑے۔ بعد اس کے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر پینے والے اپنے مصرف میں لائیں۔ دفعہ آٹھویں۔ غیر مرد نامحرم جو در والوں سے فرش کو صاف کریں یا حرم عورتیں ان کو صفائی کی خواہ جگہ لے دیا کریں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کا ہاتھ ان کے اجسام سے صفائی کے وقت مس ہو تو باعث ناخوشی مالک و غضب خدا ہو۔ چاہیے کہ ان ہاتھوں پر ایٹون کو ہمہ وقت مد نظر رکھیں تا خداوند اور خداوند دونوں خوشنود رہیں اور دنیا کا کار بھی بند نہ رہے۔ اگر نہ سب کو ہرے میں بٹھا دیا جائے تو کسی قدر بھلائی خداوند کو البتہ بے چینی ہوگی اور عجب نہیں کہ اس بے چینی کی حجت سے تم لوگ اپنے خداوند کی ملاقات سے محروم ہو جاؤ اور اگر اس ہدایت پر چلو گے تو اپنے خداوند کے پہلو میں رہو گی بلکہ ہمہ وقت دل میں گھر گھر کا خدا تم عورتوں کا مادی ہے دس۔

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہدایت نامہ برائے ملازمین ہے جس میں چھ دفعات ہیں۔

دفعہ پہلی۔ اپنے مالک کی عورت پر نظر کاڑھنے نہ دیکھیں بلکہ جو کچھ کہنا ہو نیچی نظروں سے کہیں۔ دفعہ دوسری۔ اگر اپنے مالک کے رو برو بیٹھتے ہو تو کبھی وقت ضرورت اپنی مالک کے آگے بھی بیٹھو۔ دفعہ تیسری۔ غلامی اور حقہ نامحرم عورتوں سے نہ مانگو اور بسبب احترام اپنے مالک کے ان کے آگے بھی نہ کھاؤ۔ دفعہ چوتھی۔ کسی مالک کی عورت کا نام آؤہانہ لو اور حقار سے نہ لو۔ دفعہ پانچویں۔ کبھی نامحرم عورت کے دست بردستی کوئی چیز نہ لو بلکہ کہو کہ رکھ دیجئے میں اٹھا لوں گا۔ دفعہ چھٹی۔ فرش چھوڑ کر زنجبالی رہنے کہ لائقہ ان کے کسی عضو سے مس نہ ہو جائے کہ جو موجب طہیان اور کفر ہو۔ جب ان چھتروں پر نہ کھانا لائے کبھی دھوکہ نہ کھاؤ گے۔ اگر تمھارا مالک اپنی کل عورتوں کو پرے میں بٹھا لے تو کسی قدر اسے بے چینی بھی ہوگی اور تم زیارت سے محروم رہو گے۔

مزینہ بیچدیم شہ صغیر المظفر م ۱۲۹ھ

یہ ہدایات ملازمین اور خدمتگاردوں کے لئے تھیں۔ عملات اور بیگیاات کے لئے بھی آداب عیسیٰ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان ہدایات سے اور کچھ ثابت ہو یا نہ ہو واجد علی شاہ کی طبیعت نفاست و نزاکت و صفائی پسندی اور ضابطہ پرستی کا ضرور مظہر چلتا ہے۔ میں وفات پر مشتمل ان دلچسپ ہدایات میں سے جو خاص طور پر بیگیاات سلطان خانہ مبارک جواہر منزل

۱۔ من شاہی کے لئے نقوش۔ ملاحظہ ہوں۔

نعر پہلی۔ ہمیشہ اپنے کو خوشبو رکھیں۔ دفعہ دوسری۔ دھویا ہوا اور کپڑا جو کچھ سرکار سے ملتا ہے یا اپنی یاقت سے برافق جیسا بنایا ہو پہنا کر ہی۔ زہنا زہنا پہلی اور وجہ دار اور پچھی پوشاک خواہ یا عجمہ، خواہ دوپٹہ، خواہ چھوٹے کپڑے یا سب۔ ورنہ جی کے سپرد ہیں اور جہان کے اہتمام والے ہیں ان سے مواخذہ ہوگا اور وہ ہی داد و فہ لوگ اس کے جواہر ہوں گے۔ پاؤں اور تلوے ہمیشہ آئینے کی طرح صاف اور چمکتے رہیں کسی طرح کا میل اور خورد نہ ہوا کرے۔ باؤں میں نشو و افن اور آنکھوں میں کاجل یا سرمہ، کانٹھوں میں ہندی پنچوں تک ہمیشہ رکھا کرے جو کنوا ریاں ہیں وہ بغیر حکم از خود ہستی نہیں۔ کوئی بلان چھیدنے کا قصد نہ کرے ممانعت قطعی ہے۔ بلانے کے وقت حتی الوسع جلد حاضر ہوا کر ہی۔ میباک و عذائب سے بچا کر ہی وغیرہ۔

یہ تمام تفصیلات شاید آئی پڑھنے والوں کے دلوں پر بار بار غلط گزریں لیکن ان کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ واجد علی شاہ کی سلطنتیں جو سلطنت کے اختتام اور انصاف میں صرف ہو سکتی تھیں ایسی تاریک مٹی اور تاریک مٹی میں صرف ہو رہی تھیں۔ جن کا تعلق صرف ان کی ذات سے تھا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ اپنے سیاسی اقتدار کا تعلق صرف اس درجہ محروم ہو چکے تھے کہ انہوں نے اپنے لئے ایک خیالی سلطنت تعمیر کر لی تھی۔ سلطنت ان کے محلات تک محدود تھی جہاں ان کا ہی حکم چلتا تھا اور جہاں کا ذرہ ذرہ ان کے جرم و ابرو کے اشائب پر رقص کرتا تھا۔ ایران تمام تفصیلات سے محلوں کی زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مشرقی تمدن کے آخری نمونے کے جس مٹتے ہوئے نقوش میں ان کے نام بھرے کی کوشش کی ہے وہ نقوش یہاں بغیر کسی تنقید کے اپنی پوری آب و تاب سے نظر آتے ہیں۔ واجد علی شاہ کا راج اور اس عہد کا داستان نگار اس باب کو مشغل سے نظر انداز کر سکتا ہے۔

اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ واجد علی شاہ کی تمام تصانیف میں ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے یہ کتاب نہایت اہم ہے۔ اس میں ذاتی تفصیلات اور معلومات جس طرح فراہم کی گئی ہیں وہ قطعی اور یقینی ہیں اور کئی دوسرے ذرائع سے حاصل کی ہو سکتی ہیں۔ واجد علی شاہ کی شاعری ممکن ہے بعض لوگوں کو صرف لغائی یا رسمی معلوم ہو ممکن ہے بعض دوسروں کے نزدیک تاریخی علم کی ہر بات جو لوگ ہندوستان کے مسلمان فنکاروں بالخصوص موسیقی اور رقص کے ماہرین کے کارناموں سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس کتاب کی دریافت کو بڑا وزن دیں گے۔ اس کا انداز بیان صاف و سادہ اور دلکش ہے اس میں لکھنوی ادب اور شاعری کا ضرب مثل خلقت یا تصنع باطل نہیں پایا جاتا۔ اس میں بات سے بات پر اپنی کمی ہے۔ نہ محض خیال اور فانی یا تخیل کی بلند پروازی ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی یہ کچھ کم اہم نہیں۔ اردو میں فنون لطیفہ پر کتابیں ہیں اور واجد علی شاہ کے زمانے تک۔ تو یہ کمی اور بھی نمایاں نہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا وقتی کا آخری یادگار مشاہیر ابلیک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ واجد علی شاہ نے بھی ان انداز کی ایک مثال مشاعرے کی نقل کے عنوان سے لکھی ہے جس میں ایرانی، ہندی، فارسی اور اردو شعرا کو شامل کیا ہے ان کی تعداد ۵۲۵ ہے۔ پہلا نام میاں ناسخ کا اور آخری نام جرات کا ہے۔

بہادر شاہ ظفر تزیین میں آتیا جو جس جگہ پر نظر آتے ہیں اور ان کے برابر خود واجد علی شاہ ہیں۔ خواجہ بن زبیر نے  
 مختصری، صدر علی صدر، اور علی محمد و عظمیٰ عالم آرا، حکیم عالم شمال ہیں۔ تزیین نہ تو ریختی ہے نہ حروف تہجی کے اعتبار سے اور نہ  
 ہی شہ آ کے مراتب کے اعتبار سے۔ اور شعر او میں آتش، انشاء، شرف، اسیر، برقی، ہمدرد، سو دا، دنہ، میر وغیرہ بھی شامل ہیں  
 شعرا کا تعارف بھی بس ایک جملہ سے ہوتا ہے۔ یہ کون ہیں، یہ میاں ناسخ ہیں۔ یہ کون ہیں یہ آتش ہیں۔ جذبات کا تعارف ابتدا  
 عجیب انداز میں ہے اور اس سے اس عہد کی عام سہت مذاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ با آخر والی ریاست تختدار  
 و والی سلطنت کے بعد اسی امید پر قائم تھے کہ ایک نہ ایک وہ سلطنت بحال ہوگی۔ شہر بدقسم کے مذہبی آدمی تھے۔ آپ  
 مذہب کے بارے میں سن قد رشتہ بد تھے اس کی تا بدی شہادتیں و خود ہیں۔ ان کی تزیین کا بھی کچھ اثر ہوا ہو گا۔ لیکن انسانی  
 اور انسانی کا انصاف ایسا جرات کا تعارف اس طرح ہوتا ہے۔

اند سے جانتا نا نقل کہے کہ جو آت کو اب پہا ہونے میں۔ یہ کہہ کہ تا نہیں جیہ کر کہ اڑو چلے اور وہ ہوا تو جی ناگوں  
 کہ نیچے سے جہر ہوا نا کہے نہ اے باوا اسامے والا کہتے کہ بیٹا ایہ ہے وہ جواب دے کہ باا میں چنیں کیا۔ اسانے دانا کہ  
 کہ بیٹا بات ہو تو لیں آ۔ بس وہ فوراً اس گلے کے مانہر ٹانگوں کے سے سے مل آئے۔ پھر حرکت و افعال اپنی انگلیں دیکھو  
 کے مانند بنا کر کہتے کہ قربان جاؤں اندھوں کا شعر بھی اندھا ہوتا ہے۔ سائنہ والے کہیں کس طرح سے۔ اس وقت یہ مطلع میرا  
 عہد آت کا نابینا پرستھا جائے اور دونوں ہاتھوں سے پیاد طرف اندھوں کی طرح ٹٹولنا جائے مطلع ہدایت۔

سنا ہے یاد کی ہم نے کمر ہے۔ کہاں ہے کس طرف ہے اور کہہ رہے  
 مگر بغفل تا مہ شاعرے کے بعد ہو۔

جرات کی یہ نقل مشاعرے کے بعد رکھنے سے پڑھنے تو حاصل ہو جاتا ہے کہ شاعرے کی سنجیدگی میں فرق نہیں آتا۔  
 لیکن حقیقت مجموعی سہت مذاقی کا جو اثر پیدا ہے وہ مشاعرے کی سنجیدگی پر غالب آ جاتا ہے۔

اسیر کے بارے میں واجد علی شاہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی انہیں ذریعہ نہیں دیتا۔ لکھتے ہیں۔

”یہ شخص دس پندرہ برس کے سن میں راقم قلم پیاں اور ہم نوالہ رہا اور صحبت مشاعرہ کو فی ایسی نہ ہوتی تھی جس میں آں  
 کی اور میری ہم راہی نہ ہو۔ بلکہ یہ خطاب (تدبیر لہ دلہ۔۔۔) بہا و جنگ، فقیروی کا عنایت کیا ہوا ہے۔ دم محبت خیر تھا اور  
 خود کو عاشق بن میں گنتا تھا۔ ابابو جہاں اس کے نمک خوار میرے باپ و دادا کے دستے۔ میری و اسعدی میں عاشق اور میری  
 زمانہ سہل سہت میں مصاحب اور دار و غفل زندان خانہ سرکار اور ہمدرد خلاصہ نویس تمام کچھ ریاست سلطانی کا رٹا اور وہاں  
 نمک پیر سے مزاج میں دخل تھا کہ شبانہ روز حاضر خدمت رہتا تھا۔ ۶۵ برس کے سن میں عقد کیا زوجہ سے نہایت مالوس نہ  
 کرتا تھا جب او ضارغ نمک مہدی ہوئے یعنی امر انزع سہانت او ویر ہو، میں مایوس جانب کلک مہ جلد از لبکہ نہ وجہ  
 بتلا بہت تھا۔ جی نمک نمک ایک نظم فراموش کر کے شعر میں جا چھپا میں کلکتے میں داخل ہوا۔ میں برس سے تیر سے اس سے فراق  
 تھا۔ حریف یہ ہے کہ اب والی را مہور کو اپنا با و شاہ بنا کر یہ سیدی بی فاطمہ لی کر ان کا نمک کھانا دیا۔ یہ مطلع اسی شخص نمک  
 فراموش کا ہے۔“

اسی شاعر کے سلسلے میں واجد علی شاہ نے خود اپنا بھی مختصر سا نفاذ کر لیا ہے جو تمہید میں نقل ہوا۔ اس میں واجد علی شاہ نے ۳۰ قصائے کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض قصائے کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں جن سے یہ قصا و پراس سے اوپر ہو جاتی ہے اور یہ سب قابل ہے۔

(۱) اختر ملک (۲) افسانہ عشق (۳) ارشاد خاقانی (۴) ایمان (۵) الہدایت (۶) بحر الفت (۷) بھر مختلف (۸) ہجرت (۹) تاریک مہرب (۱۰) تاریک مناز (۱۱) تاریک خاص (۱۲) تاریک فراق (۱۳) تاریک مشعل (۱۴) غزالہ (۱۵) تاریک نور (۱۶) تاریک جمشیدی (۱۷) تاریک دہر (۱۸) تخی عشق (۱۹) جوہر عروض (۲۰) حزن اختر (۲۱) دریائے نقش (۲۲) غور و اجود (۲۳) فخر پلاویں (۲۴) دیوان مبارک (۲۵) دفتر پریشانی (۲۶) دھن (۲۷) سخن اشرف (۲۸) شبیدہ فیض (۲۹) صمیمہ لطافت (۳۰) سبکدوش (۳۱) عشق نامہ (۳۲) فہرست غزل (۳۳) کلیات اختر (۳۴) کلیات سوم (۳۵) غزلت (۳۶) استغاث (۳۷) سبکدوش (۳۸) ہامی نامہ (۳۹) مرقع درخ (۴۰) مہمانتہ بین عشق و عشق (۴۱) ناچو (۴۲) نظم نامہ (۴۳) حنا و اختر (۴۴) سبکدوش (۴۵) لغت ہندو زبان (۴۶) چار پائی کتابیں مراثی اور حساب لغت و شہدائے کربلا مہتموں کا حساب (۴۷) سبکدوش (۴۸) مجموعہ واجد بہ -

آخر میں لکھتے ہیں :-

یہ سب فقیر کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اور چونکہ ان کی سلطنت اور عمارت پر معاشاں

میں ناراض ہوئیں وہ خارج از حساب ہیں۔

اس کے بعد واجد علی شاہ گیارہ بارہ برس اور زندہ رہے۔ اس زمانہ میں جو کچھ لکھا وہ بھی اس میں شامل نہیں۔ ان قصائے

میں سے بیشتر اب ناپید ہیں۔ یہ سب موجود نہیں تو واجد علی شاہ کے کردار پر پیش پسندی اور عیاشی کے جو وجہ ہیں شاید وہ محل جلنے اور کارناموں کا مکمل جائزہ لے کر اس کا صحیح مقام متعین کیا جاسکتا۔

# ہماری داستانیں

## وقار عظیم

کوئی کہتا ہے داستان — تو یہ شعر پڑھنے کو ہی چاہتا ہے کہ

نباں پر بارِ حسن دایا یہ کس کا نام آیا  
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے بیٹے

اور دل کے اس احساس اور ارادہ میں کسی شاعری کو دخل نہیں — یہاں شاعری سے میری مراد محض مبالغہ آرائی سے ہے درندہ  
سیج پو پھٹے قحط داستان اور شاعری میں بڑا قریبی تعلق ہے۔ دونوں کی پرورش نخل اور قصو کی آغوش میں ہوتی ہے۔ اور دونوں احساسِ غم و اندوہ  
کا سر ہم ہیں میرے لیے اور ان سب کے لیے جو داستانوں کی گوناگوں لذتوں سے آشنا اور اس سے کٹھن کے رسیا ہیں داستان کے  
لفظ سے نہ جانے کتنے عجیب و غریب تصور وابستہ ہیں کہ جب یہ لفظ کان میں پڑتا ہے، تصویر یا تو بیتی ہوئی صحبتوں کی یگمیں یاد میں ڈوب  
جاتا ہے اور یا پھر ایسے جہانوں کی سیر کرتا ہے۔ جہاں غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں غم کی خلش سے آشنا ہیں — ہر چیز میں رقت  
کشادگی اور انوکھا پن۔

یہ داستانیں راقوں کی تنہائیوں میں چھپ چھپ کر بھی پڑھی جاتیں محض اور اس طرح مجبور کی شبِ فرقت اختر شکاری کے بیانیہ  
شغل کے بغیر پیدہ سحر کا منہ دیکھتی تھی اور گوشہ تنہائی سے الگ دوست احباب کی محفلوں میں بھی، جہاں دنیا والے دن بھر کی سختیوں سے  
خاک بار کر کسی ایسے جہان کی سیر کرنے کو یکجا ہوتے تھے جو ان پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر سکے۔ کسی کھیلے ہوئے میدان میں چاندنی  
کے فرش پر "یارانِ باصفا" کا ایک حلقہ جما ہوا ہے۔ اور ہر ایک کی توجہ کامرکز صرف ایک شخص ہے جو ان سب کے حلقہ میں گھرا ہوا  
لفظوں سے رزم و بزم کی گونگیاں گونگیاں تصویریں کھینچ رہا ہے اور دیکھتے والے ہر نفس کو حیرت سے دیکھتے، وجد میں آتے اور خود فراموشی  
میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ محفل روزِ تہی اور دو تین گھنٹے اور کبھی کہیں آدھی رات گئے تک جاری رہتی۔ سننے والے یہاں سے اٹھ کر جاتے ہیں۔  
اور خوابِ نوشیں میں بھی اس رزم و بزم کے وہی مرتفعہ دیکھتے ہیں جن سے ان کی زندگی محروم ہے۔

یہی محفل کہیں کہیں بزمِ آرائی کے سارے لوازم کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ فرش، فرش، چاندنی، قالین، گاؤنیکے، بھارناؤں  
عود، عین، نضا مصفا، مندر اور معطر ہے۔ اور داستان سننے والے امید و شوق کو جلو میں لئے، غم و اندوہ کی دنیا کو خیر باد کہہ کر سرود و انس  
کا سر مایہ جمع کرنے کے لیے، ایک ایک کر کے آتے ہیں اور آئے دن اسے وقت کے انتظار میں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ داستان

تر رہی ہوئی ہے، تخیل کی بلند پروازی نے نئے نئے مناظر سامنے لائے ہیں اور ہر منظر کی مرتع کشی میں رنگینی بیانی کے ذریعہ بھاتی ہے۔ رنگینی بڑھتی جاتی ہے اور محسوسات کے نعرے بلند ہوتے جاتے ہیں۔ داستانیں سننے والوں کے جذبہ شوق و جستجو کو بڑھاتی رہتی ہے اور اہل عمل انسانی نوع کے ساتھ نئے نئے فلسفات کی سیر کر کے وہ کچھ پالیتے ہیں جو انہیں زندگی میں میسر نہیں۔

ایک منظر وہ ہے جب کوئی مسرست ناز محو استراحت ہے۔ لیکن خیال اب بھی زندگی کی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا ہے اس کا لوگ ایسے دار و کی ضرورت ہے جس سے کسوٹی میسر آئے۔ کسی نے کسی داستان کا نغمہ دل نشیں چھیڑا، پلکیں بوجھل ہوئیں، ارتعاشوں اور پیچیدگیوں کی دنیا اس کے کیف میں ڈوب گئی۔

ادھر پھر جو بیاری علم کسی اور طبیب کے منحنی سے دور نہیں ہوتی، اس کی دلجوئی چارہ درویشوں کا قصہ بنا کر جاتی ہے۔ سارا حتم ہوتی تو مریمین کے غسل صحت کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔

غرض داستان کے تصور کے ساتھ، سارے تصور جیتے جاگتے ہیں کہ سامنے آتے ہیں جو مدیوں سے اس کے ساتھ وابستہ ہیں، ان آئی اس کا منصب اولیٰ ہے۔ وہ مریمین کے لیے دار و شہ نشا اور غم نصیبوں کے پیچھے سر بایہ سرور و شادمانی ہے۔ اسے سامان و علم خواہ بنانے والے بے خودی و خود فراموشی کی اغوش میں پرورش پائے اور ہر آن ناز و جفاوں کی سیر کرتے ہیں۔

بے خودی کی یہ دولت بنے پایاں اس دنیا کا مقصود ہے جسے داستانوں نے اپنا بنایا ہے۔ یہاں کے حقائق ہماری اپنی دنیا کے حقائق سے بالکل مختلف ہیں۔ اس میں جن، دیو اور پریاں آباد ہیں۔ یہ دنیا جادو گروں، نجومیوں، جوتشیوں، رماؤں کی دنیا ہے۔ اور یہ ساری مخلوق شاہوں، وزیروں، امیروں اور ناجروں کی زندگی میں دوستی یا دشمنی کے رشتہ سے منسلک ہے یہاں کے جڑ، دیووں اور پریوں کی طرف سے انسان بھی عجیب اختلاف ہیں۔ حد درجہ خوب و حد درجہ بد وضع، حد درجہ نیک، حد درجہ خیر کے کھیتے، شر کے پکیر، ہر چیز کی انتہا، ہر چیز کی معراج، باندی سے بلند اور اپنی سے پست۔ ان سارے انسانوں کو رزم و بزم کے ایسے حلقے پیش آتے ہیں جو اس لیے پہلے کسی انسان کے تصور میں بھی نہیں آتے تھے۔ یہ سارے معرکے ہوتے ہیں اور ان کا انجام ہمیشہ غم و آفتاب سبوتا ہے۔ یہاں غم عشق اور غم روزگار دونوں کا انداز جدا کا ہے۔ غم عشق صحت و دستوں کے لیے غم روزگار صحت و جسموں کے لیے اور اگر عشق کو کبھی غم روزگار سے سابقہ بھی پڑے تو عشق کا نصب العین، تاثیر علی سے، رہنمائی و نصرت سے، مشکل کشا کی دستگیری سے، اسع و اعظم سے، لوح سے، تعویذ سے، سحر و تسخیر سے یا اپنی بے مثال قوت بازو سے اسے بنانا اور شر کو روک دینا ہی کے سپرد کر کے خود سرخروئی اور کامرانی کا تاج سر پہرہ رکھتا ہے اور انجام کار یوں دار و پیش دینا ہے کہ جو ٹھنڈے، جو پڑھے، وہ غور و غیور ہی دیر کے لیے سہی، قبول جلدی کہ دنیا میں غم نہیں، تلخیوں ہی، اور نامزادیاں ہیں۔

داستانوں نے انسانوں کی دنیا کے سامنے اس عجیب و غریب دنیا کا تخیل پیش کر کے رنگینی، نور و غمی، کشادگی، ذوالانی، رحمت، عظمت کا مفہوم پیش کیا ہے۔ بے بسوں اور محروموں سے ان کی بے بسی اور عجز کی بھینٹ ہے کہ بے خودی اور خود فراموشی کے یہ بڑے افکار ہیں اور بے خودی کی دولت پر جتنا نصرت داستانوں کا ہے، کسی اور چیز کا نہیں۔ اگر کھانا و غذا سنگین نہیں، اسی پر ہر زمانہ میں اور ہر طبقہ میں داستانیں محبوب و مرغوب رہی ہیں۔ اور یہ دعوے کرتے وقت میرے سامنے اردو کی داستانوں کی ڈیڑھ، پونے دو سو برس کی تاریخ ہے۔

یہ قہر شاہ و گیلیے کے مولا ہے۔ بوستان خیال کے مصنف ۱۲۶۶ھ میں گجرات سے دہلی آئے اور شاہ شمس الملک تلمش دہلوی میں ممتاز رہے، اس زمانہ میں جس مکان میں مقیم تھے اس کے قریب ہی ایک تہہ خانہ تھا۔ یہاں ہر روز کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ ان میں ایک صاحب ایسے تھے جو داستان گوئی کے فن سے آشنا تھے۔ ان میں دوسروں کے ہزاروں قصے یاد تھے۔ لیکن ان سب کو اپنی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ قصوں میں اپنی طرف سے جس عقوڑا بہت اضافہ کر لیتا تھا۔ اس کے باوجود اپنی فن کاری پر مدد و جہازاں ملکر ضرور تھا۔ ایک دن کہنے لگے "انسان حسبِ قدر علم و فضل میں دستاویز پیدا کر سکتا ہے مگر فی قصہ گوئی اس وقت حق و فصل ہے کہ بغیر مناسبت طبیعت ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اہل صحبت نے بھی اس کے قول کی تصدیق کی۔"

ایک دن اس شخص نے کوئی ایسی داستان بیان کی جو اہل مجلس میں سے ایک صاحب کہیں اور بھی سُن چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ داستان انسان شخص کی ہے۔ مگر یہ محض سرور و جنتی ہیں اور وہ زبونی نہ کوئی قصہ گزر ہو تا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن محمد تقی خیالی نے ایک قصہ کی تمہید لکھ کر اس شخص میں رسائی کی۔ اس پر وہی کے داستان کو صاحب نے فرمایا کہ یہ تو فارسی میں عوامی لہجہ توجہ ہے کہ قصہ اور میں یہ۔ اسی وقت کے اور بہت سے اور بھی کہنے اور اس طرح مجلس میں دو دو فریق پیدا ہو گئے اور دونوں میں خاصا فساد ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ خیالی کی داستانوں کا شہرہ ہوا اور ان سے کہنا کیا کہ خیالی ہیہ تمزاجی و انسان ہائی جوانی ہے۔ وہاں تم بھی مسایا لکھ۔ انھوں نے تعمیل کی۔ پھر ان کی ساری ایک بار نکال ہوئی جو داستان سنے اور انھوں نے اس کے شے شنیں لکھے۔ یہاں سے نواب رشید الدین بہادر رنگ رسائی ہوئی۔ اور ان کی فرمائش پر بوستان خیالی کو بہتادہ طور پر لکھنا شروع کیا۔ وہ جہاں میں کہیں کہیں گئے۔ یہی سبھی حیدر شہر و راج کی مٹی کہ اُسراو کی وساطت سے بادشاہ کی خدمت میں پہنچے اور بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے کہیں کیا جائے مصنف کی فرمائش پر بار شہا سے ہاں کاتب زود نویس اور خوش خط اس کام پر مقرر کئے۔ ابھی درجہ بدین مکمل ہوئی تھیں کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا (۱۰۸۴ھ) اور محمد تقی بنگال پہنچ کر نواب میراج الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ اور انھیں کی فرمائش پر قصہ گو پندرہ جلدوں میں مکمل کیا۔

محمّد تقی خاں نے اپنے دینی کے قیام اور قوم و خانہ والی تفرغہ گوئی کی مجلس کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتے ہیں کہ داستان کھنہ اور داستان سنہ کا جیسکا لوگوں میں عام تھا اور اس شوق میں علوم اور خواص ازمیر، وزیر اور بادشاہ تک شامل تھے، داستانیں اردو اور فارسی میں لکھی جاتی تھیں، وہ نہ صرف لکھی جاتی تھیں بلکہ لکھی جاتی تھیں، قصہ گو اپنے ذہن اور تخیل سے بھی قصے تراشتے تھے اور دوسروں کے قصوں میں زہیم و افادہ کہہ کے بھی شانتے تھے، لیکن پسندیدگی اور قدر وانی صرف متبع زاد قصوں کو حاصل تھی۔

یہ زمانہ اب سے دوسو برس پہلے کا ہے۔ اردو کی اکثر داستانیں انیسویں صدی میں لکھی گئیں۔ منہج داستانوں کا یہاں ذکر نہیں لیکن شری پہلی داستان جو ہم تک پہنچی ہے تحسین کی نو طرز مرصع ہے جو ۱۷۷۷ء میں لکھی گئی۔ اس کے بعد وہ قصے جو فورٹ ولیم کالج کے اہتمام میں لکھے گئے۔ ان میں میرامن کی بارغ و بہار، حیدر بخش میرد کی کراٹھن محفل اور طوطا کہانی۔ خلیل علی خاں اشک کی داستان امیر حمزہ، سلیمان بنیسی اور بے نال پیلپی زیادہ مقبول ہوئے۔ ان قصوں کا زمانہ تصنیف ۱۸۲۵ء سے ۱۸۷۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران میں فورٹ ولیم کالج سے الگ بھی بعض نثری ایسے قصے لکھنے میں مصروف تھے جن کا انداز داستانوں سے ملتا ہے۔ ۱۸۷۵ء میں راجہ کی نو طرز مرصع (یا بارغ و بہار) لکھی گئی۔ ۱۸۷۸ء میں افشا نے رانی کی لکھی کی کہانی لکھی۔ ۱۸۸۰ء میں محبوب نے نورتن لکھی۔ یہ ایسے قصوں اور داستانوں کے نام ہیں جو تصنیف ہونے کے بعد بار بار چھپے اور مختلف حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے۔ فیاس کہتا ہے کہ اس عہد میں اور تھے بھی لکھے گئے ہوں گے۔ بہر حال اس کے بعد سے تشریف والوں نے داستان

بڑے مستحق صنعت ادب کی حیثیت سے اختیار کر لیا اور انیسویں صدی کے آخر تک اردو میں جتنی داستانیں لکھی اور چھاپی گئیں ان کی تعداد بیوی چھتیت سے اڑو سو کے دیوانوں سے زیادہ ہوگی۔ سترہ سو میں سرور کی فسادت عجائب اور اس کے بعد تھوڑے عرصے میں اس کے گیارہ سرور، شگوفہ محبت اور شریعت، الف لیلہ، بوستان خیال، طلسم ہوش ربا، کی آٹھ ضخیم جلدیں، داستان امیر حمزہ اور اس کے بعد اوقات، بقیہ طلسم ہوش ربا کی دو جلدیں، طلسم نور انشاں اور طلسم ہفت پیکر کی تین تین جلدیں، الف لیلہ، سرور و سخن، طلسم حیرت اداں کے علاوہ بے شمار مترجم اور جمع زادہ نئے اور داستانیں عوام اور خاص کے ذوق داستان خوانی اور داستان خوانی کی دلالت کرتے ہیں۔ اردو کے اکثر اچھے داستان گو غدر سے پہلے اور غدر کے بہت بعد تک دہلی، اودھ، امپور، بنارس اور راجپوتانہ کے درباروں اور امیروں سے وابستہ رہے ہیں۔ اور اس تعلق اور وابستگی کے علاوہ شہروں میں داستان گوئی کی مجلسوں اور سائروں سے ہیں جس میں داستان گو کہیں لکھ کر اور کہیں زبانی اپنی داستانیں سن کر سننے والوں کے دلوں کو سرور کرتے اور ان سے بدینہ تقدیر و سرور کرتے رہے ہیں۔ اور زبانی اور لکھنے کے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانہ میں بھی اپنی مجلسوں کو اس شمع نور سے رکھا ہے چنانچہ دہلی میں سترہ سو تک میر باقر علی داستان گو کی محفلیں مرجع غامض و عام تھیں۔ لیکن وہیں اب بھی عید کے دن داستان گو پرستار عیش باغ کے میدان میں مرزا علی کی داستانیں سننے جاتے ہیں۔ یہ حالت تو بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور خانوں کی تھی۔ اب ذرا ایک جھلک ایسے ایسوں کی دیکھیں جن کے ذوق کی نفارت اور لطافت ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے نشان اور نمونہ رہے گی۔

جمہور اشد کا دن ہے۔ شام کے ہنسنے ہیں۔ غالب کے بقی ماراں والے گھر میں بچوں اور بوڑھوں کی ایک محفل جی ہوئی ہے۔ ان پر بھی جاری ہے اور سب شوق سے سن رہے ہیں۔ غالب میر محفل ہیں۔ داستان سننے ہیں اور جہاں کہیں داستان گو مطالبہ و اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا، داستان کا سلسلہ اپنے ہاتھ میں لیتے اور مکمل کرتے ہیں اور خوش ہو ہو کر کہتے ہیں کہ دہلی کی زبان انہیں داستان کہنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔

داستان سے غالب کو جو نگہری و انسنگی تھی۔ اس کا اظہار اتالی تو گزرا سرور اور بوستان خیال کے دیباچوں سے ہوتا ہے اور دوسرے سرور یا غلط سے جو اٹھوں نے میر ہمدی مجروح کو لکھا تھا۔ بوستان خیال کے دیباچہ کے دو تین جملے سنئے:

”افسانہ دو داستان میں وہ کچھ سنو کہ کہیں کسی نے دیکھا نہ سنا“

”ہر چند خبر و مندر بہدا مغز تو ایریخ کی طرف باطلح مائل ہوں گے لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی دل سے قائل ہوں گے“

”داستان طرازی میں جملہ فنون سخن ہے۔ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے“

ارداب دیکھتے میر ہمدی مجروح والے خط کی عبارت، لکھتے ہیں:

”مرزا غالب علیہ الرحمۃ! ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کہ کتاب



امیر حمزہ کی داستان اور اسی قدر بگڑی ایک جلد بوستان خیالی کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی تو شک خانہ میں  
موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔  
کسے کیس مراد کش میسر بود!  
وگر چہ نہ باشد سکندر بود

مخفف یہ کہ عوام اور خاص دونوں میں داستانیں سننے اور داستانیں پڑھنے کا شوق کسی نہ کسی انداز سے اب سے تقریباً دو سو  
برس سے قائم ہے۔ پنج میں چند برس ایسے آئے تھے جب ناول اور مخفف افسانہ کے مٹے فن نے داستانوں کو مختلف مخفوں سے نکال کر  
اس کی مسند پر نصب کر لیا تھا لیکن اب پھر خواص ان داستانوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ انہیں پڑھنے کے لیے وقت نکالنا چاہیے،  
انہیں گفتگو اور تنقید کا موضوع بنایا جاتا ہے اور انہیں ایک نمونہ غیر مترقبہ کی طرح کتب خانوں میں محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی  
ہے۔ اور اب بھی بھارت جیسے دیار غیر میں طلسم ہوش ربا، داستان امیر حمزہ اور فسانہ آزاد کے سنئے ایڈیشن شائع کئے جاتے  
ہیں اور یہ سب کچھ قصہ کہانی کی ان بے شمار کتابوں اور ان ضخیم کتابوں کے خلاصوں سے الگ ہے جو ٹیڑی پر بیٹھنے والے کتب فروش  
صبح سے شام تک بیچتے ہیں۔ اب بھی ان کے رزق کا سب سے بڑا سہارا یہی داستانیں ہیں۔

داستانیں کہنے اور داستانیں لکھنے میں ہمیشہ سے بڑا گہرا ربط رہا ہے۔ اور ہر زمانہ میں لوگوں کو داستانیں سننے اور پڑھنے  
سے یکساں دلچسپی رہی ہے اور ہر زمانہ میں کہی اور لکھی جانے والی داستانوں میں تخیل کی کار فرمائی سب سے زیادہ رہی ہے۔ فرق صرف  
یہ ہے کہ داستان کہنے اور لکھنے والوں نے مقامی ماحول اور مقامی مذاق سے متاثر ہو کر داستانوں میں داستان کی ساری خصوصیات  
برقرار رکھ کر بھی ان کے معنوں اور انداز میں جزوی تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں سے بعض فرق ارادی ہیں اور بعض غیر ارادی طور پر پھر بریل  
میں داخل ہو گئے ہیں۔ فسانہ عجائب اس اثر کی بڑی نمایاں اور واضح مثال ہے۔ اس قصہ میں ایک طرف تو سرور کی شخصیت نے داستان  
کی تشکیل و ترتیب میں نئے نئے نقوش بنائے ہیں اور دوسری طرف لکھنوی معاشرت اور مذاق کے مخصوص انداز نے قصہ کی تفصیلات  
میں امتیازی رنگ پیدا کئے ہیں۔ یہی صورت ذرا کمتر طریق پر بارغ و بار، آرائش محفل اور بوستان خیالی میں بھی موجود ہے۔ لیکن دہلی اور لکھنؤ  
کی داستان گوئی، اور داستان نویسی میں مقامی مذاق نے جو امتیازی فرق پیدا کئے ہیں۔ داستانوں کے معنوں اور ان کی بیانی تفصیلات  
سے زیادہ انداز بیان میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جو داستان گو دہلی کے مذاق سے متاثر ہیں انہوں نے بیان میں سادگی، فصاحت اور سلاست  
کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن داستان گو یوں پر لکھنوی ماحول اور مذاق کا اثر ہے، فصاحت، رنگینی اور عبارت آرائی ان  
کے طرز کی نمایاں خصوصیت ہے۔ طرز بیان کی ان منفرد اور امتیازی خصوصیات کے اظہار کے لیے بڑی آسانی سے میراں کی بارغ و بار  
اور سرور کی فسانہ عجائب کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان دو کتابوں سے الگ بھی دہلی اور لکھنؤ کے داستان گو یوں کی لکھی ہوئی جتنی  
داستانیں ہماری نظر کے سامنے ہیں وہ بھی مذاق کے اس نمایاں فرق کی متلہ ہیں۔ طلسم حیرت اور سرور کش سخن جو میراں  
اور سرور کی حمایت میں لکھی گئی ہیں، اس فرق کے دو اور امتیازی نمونے ہیں۔ لیکن اس فرق کا جو عکس بوستان خیالی کے ترجموں  
میں ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ لیکن اس فرق کی وضاحت سے پہلے شاید بوستان خیالی کے ترجموں کی دلچسپ کہانی  
بیان کرنی ضروری ہے۔

یہ بات عام طور پر علم میں ہے کہ فارسی میں بوستان خیال کے ہاں تھے ہیں اور پہلے مترجم مرزا غالب کے ہتھیے خواجہ امان دہلوی ہیں۔  
 بعد میں سے سب سے پہلے بوستان خیال کی تیسری اور چوتھی جلد کا ترجمہ حدائقِ افکار کے نام سے کیا اور اسی پر مرزا غالب نے اپنا دیباچہ  
 لکھا جس کے بعد انھوں نے باقی جلدوں کا ترجمہ کیا۔ آخری حصہ کے ترجمہ میں مصروف تھے کہ دل میں درد ہوا۔ اٹھ کر لیٹ گئے اور اسی  
 دردمیں ان کا انتقال ہوا۔ ترجمہ کا باقی حصہ ان کے صاحبزادے خواجہ قمر الدین خان راقم نے مکمل کیا۔ بوستان خیال اتنی مقبول ہوئی  
 کہ بعض چھاپہ خانوں نے اسے چھاپنے کی اجازت طلب کی۔ خواجہ قمر الدین نے کسی وجہ سے اجازت نہیں دی۔ دوسرے چھاپہ خانوں  
 والے نوچ پھوٹ رہے لیکن خوشی نوکشور کو اس کے چھاپنے کی دھن لگی اور انھوں نے بوستان خیال کا ترجمہ اپنے ہتھام میں کر دیا کہ  
 اسے اپنے مطبع میں چھاپا۔ یوں دہلی اور لکھنؤ والوں میں بوستان خیال کے دو الگ الگ ترجمے ہوئے۔ ان کی مختلف جلدوں کے نام  
 بی اور لکھنؤ والوں نے الگ الگ رکھے لیکن سب نصوص کو ملا کر یہاں اور دہلی دونوں جگہ بوستان خیال ہی کہا گیا۔ خواجہ امان کی ترجمہ  
 کا پہلی دہلی جلد ۱۳۳۷ھ میں چھپی اور ان کا انتقال ۱۳۴۹ھ میں ہوا۔ خواجہ امان نے جس جلد کا ترجمہ نہیں کیا تھا۔ اس کا ترجمہ لکھنؤ  
 کے مزاحمہ عسکری (سوف چھوٹے آغا) نے کیا اور وہ ۱۳۵۸ھ میں نوکشور پریس میں چھپا، اور باقی حصے بھی ۱۳۵۹ھ تک مکمل ہوئے۔  
 اب بوستان خیال کے ان دو ترجموں کی عبارتوں کا مقابلہ کیجئے جن میں سے ایک کا ترجمہ ایک دہلی والے نے کیا ہے اور  
 دوسرے کا ایک لکھنوی نے، تو زبان و بیان میں دہلی اور لکھنؤ کے انداز کا وہ فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جس کا ذکر باغِ دہرا — اور  
 اندازِ عبارت کے سلسلہ میں بار بار آتا رہا ہے۔ لیکن عبارتوں کے مقابلہ سے پہلے خود ترجمہ کرنے والوں کی کیفیت مزاج کی ایک جھلک  
 دیکھ لیجئے جو ان کے ترجموں کے دیباچوں سے مترشح ہے۔

خواجہ امان اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

”جس تحریر یا تقریر میں آورد و مسامحتگی کا دخل ہوگا اور آورد و بھی وہ کہ کوئی لفظ تنگ سے خالی نہ ہو، بلا ریب  
 وہ زبان اہل زبان کے نزدیک زبانِ عوام ہے، اس طرح کی تنگ بندی اور زبان درازی انھیں افسانوں  
 کے واسطے لائقِ خوشنما ہے جن کی تہید ایسی ہوتی ہے کہ ایک نھا بدشاہ، ہمارا تہار اخدا بادشاہ —  
 نہ یہ قصہ سرو قز قصص۔ اگر اچاناً قصراً اس کے ترجمہ میں سوائے بیانِ مصنف کے کچھ بھی جو دستِ طبع کی  
 جاتی جس قصہ ہرگز باقی نہ رہتا۔ خاکسار نے ترصیح بیان و درازی زبان سے قطع کی اور اہل دہلی کے  
 روزمرہ کا مقلد ہوا۔ لیکن وہ روزمرہ کہ جو خاص عائد و اعزہ شہر کے بے تکلف و بلا قصص استعمال میں ہے۔“  
 مرزا محمد عسکری نے اپنے دیباچہ میں پہلے بوستان خیال کی اصل فارسی عبارت کی تعریف کی ہے اور پھر خواجہ امان کے اور اپنے  
 ترجمہ کے انداز کا مقابلہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”عبارت رنگین، متقی و مستحکم۔ فصاحت و بلاغت میں قلم توڑ دیئے ہیں۔ اشعار برجستہ اور حسبِ حال،  
 ایسی عمدہ طرز سے مرقع و محل پر لکھے ہیں کہ سمان اللہ..... اگرچہ خواجہ امان صاحب دہلوی نے بی نسبت  
 عمدہ ترجمہ فرمایا ہے..... مگر حسبِ اس ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں گے، فصاحت و بلاغت، لطیف زبان،  
 نازک خیالیوں میں جہر جہا بڑھا ہوا پائیں گے۔“

اب دونوں جگہ کے ترجموں کا ایک ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے :

خواجہ امان کی عبارت ہے: ”راوی کہتا ہے کہ اس روز مرقاۃ سلاق دیو پرودہ قاف کو گیا تھا۔ تا نفع ثواب اپنے بڑا دیو خور کے ہاں مہمان رہا۔ اس نا بکار نے جیو داتا قوی الجمنہ اور شراب غلیظ سے اکثر دیوان قاف کی دعوت کی مٹی۔ جب نصف شب گزری مرقاۃ دیو اپنے بھائی سے خواہاں اجازت ہوا، اور کہا میں اس وقت پردہ دنیا میں کسی کوہ پر عاؤں گا اور شراب کے نشہ میں اس آدم زاد کا نغمہ خوش سنوں گا۔ ہر چند اس دیو مہمان دار نے کہا کہ یہ کیا وقت جمانے کا ہے مرقاۃ دیو نے نہ مانا۔۔۔۔۔“

یہی عبارت لکھنؤ والے ترجمہ میں نہیں ہے :

”اب وہ کہنے لگوں کہ جس نے جانتے ہیں کہ جب وہ حرام زادہ پرنس یوینی مرقاۃ سلاق دیو قاف میں گیا، اخوان الشیاعین میں سے ایک کا مہمان ہوا۔ سارا دن اور آدھی رات تک سرے ہوئے ہاتھی، ریچھ، سٹور، بلیاں چرسے، گونسٹیں کھایا کیا۔ یا انگور، میوے جو پڑے آب۔۔۔۔۔ میں پڑے پڑے بغیر آتش بدش کھایا کئے تھے۔ جن میں تعقی سے مجھے اٹھتے تھے، ان کی شراب پیا کیا۔ نشہ میں یہ تو تک سوچھی کہ چلوں آدم زاد کا گانا سنوں۔ بھائی سے رخصت ہوا۔ ہوا کی طرح چلا۔۔۔۔۔“

جس طرح دہلی اور لکھنؤ کی تحریری داستانوں میں مقامی مذاق نے طرح طرح کے فرق پیدا کئے ہیں اور ایک اختصار اور دوسرا طول، ایک سادگی اور دوسرا نگینی، — ایک روانی اور دوسرا سنجیدگی کی طرف مائل ہے۔ اسی طرح کہی جانے والی داستانوں میں بھی یہ فرق نمایاں ہے۔ چنانچہ دلی کے آخری داستان گو میر باقر علی کی داستانوں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سلاست اور فصاحت اس کا جوہر ہے۔ لکھنؤ سے داستان گو یوں نے اپنے لیے الگ الگ رنگ مخصوص کر رکھے تھے۔ اور ہر ایک اپنے رنگ میں منفرد اور ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو میزم کے مرتعے چھینچے میں یدِ طلی حاصل تھا، کوئی رزم آرائی میں آپ اپنا جواب تھا، کوئی شعروں کی کثرت سے داستان کو پُر لطفت بناتا تھا اور کسی کی داستان ایک نہ عرفان زاد تھی کہ جو اسے سنتا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ غرض ہر ایک کا رنگ، نہ الّا تھا اور رنگوں کا یہ تنوع سنسنی دلوں کے مذاق کی رنگینی اور بولچھونی کی بنا پر تھا۔ لیکن یہ ساری رنگینی، ساری بولچھونی جیسے ایک خاص زمانہ کے لیے تھی۔ نئے زمانہ نے وہ ساری صفتیں و رسم برہم کر دیں۔ داستان گو یوں کے تندر دان اور قدر شناس نہ رہے تو داستان گو داستان طرازی میں خبریں جگہ گس کسے لیے کھپاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میزم کی برہمی کے ساتھ شمعیں بھی گل ہو گئیں۔ داستان سننے والے بھی کہنے اور نہانے والے بھی پڑھنے دینے بھی اور لکھنے والے بھی اور کچھ مہرہ کے لیے داستانوں کے سارے ضخیم و فخر طاقی نسبیاں کی تدر ہونے لگیں۔ زمانہ کو ان کی گوشہ نشینی اور گوشہ گیری بھی گراں گزری اور اس نے انہیں ان طاقتوں سے آوارہ کر کر بدلتا شروع کیا۔ گیدنے اور دلیجنے والوں نے ان دنوں کو راکھ کا ڈھیر سمجھ کر کر بیا تھا، لیکن راکھ کو اٹھا پلٹا تو اس میں سے بہت سی چکاریاں جھنڈا اور ستا جسے بن کر بھانگیں اور نظروں کو ان میں کشمکش نظر آئی، لیکن کچھ نظر ایسی بھی تھیں جنہوں نے ان چکاریوں میں تو کچھ نہ پایا اور راکھ کے ڈھیر کو سب کچھ سمجھ بیٹھے اور گئے گئے کہ اس میں عیب نہکاتے۔ — اور اس طرح جہاں تھوڑے بہت لوگ اب بھی ایسے باقی تھے جن کے نزدیک داستانیں ایک خاص زمانہ اور خاص مذاق کی بڑی دلکش تصویریں تھیں، ایسے لوگ بھی خاصی تعداد میں پیدا ہوئے





سے غلت بہت خواہاں کو سٹے کر کے کامرانی اور با مرادی کی منزلی مقصود کو پہنچتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں رفعت، عظمت، برکت، انسانیت، کرم، ایشاد، شہادت، نجات، حوامزوی اور بڑی سے بڑی مصیبت کے آگے سیدہ سپر ہونے اور بالآخر منظم و منصور ہونے کی جو صفات مجتمع ہیں ان میں انسان کا ایسے نواہوں کی تعبیر نظر آتی ہے جو اس کی انتہائی آرزو کے باوجود حقیقت نہیں بن سکتیں۔ — دارتالوں کا یہ غیہ معمولی اخلاقی پہلو ہی داستان کے فن کا ایک لازمی عنصر ہے اور داستان گو اس کے اظہار میں جس حد تک اعتدال و توازن قائم رکھے میں کامیاب ہو اور جس حد تک اپنی شخصیت کو دواخط اور مصلح غننے سے محفوظ رکھ کر داستان گو کی شخصیت میں مدغم کرے اس کے کردار پڑھنے والوں کے لیے زیادہ حقیقی بنیں گے، ان سے اسے حوائست اور لگاؤ پیدا ہوگا، اور اس طرح داستان کی چھوٹی سے چھوٹی چیز اس نے لیے کشش اور دلچسپی کا موجب ہوگی۔ — اور یہی کشش اور دلچسپی ہر کہانی اور ہر داستان کے فن کا آخری پہلو ہے۔ — آخری ہی درجہ کا بھی داستان کی ابتدا اور اس کی انتہا فن کے اسی اصول کی پابند ہے اور داستان اپنی طوالت، اپنی غیر موزونیت، اپنے عدم توازن یا اعتدالیٰ سینے پر فطری عناصر، اپنے کچھ رواں اور بے راہ رد و تحیل کے باوجود دلچسپ ضرور ہیں اور اس طرح فن ایک اہم، سب سے اہم، ایک بڑا، سب سے سارا اعضاء پر راکر قی ہیں۔

# مرزا رسوا کی تنقید نگاری

ڈاکٹر محمد حسن

اردو میں ادب کی ماہیت اور اس کی فلسفیانہ توجیہ کی طرف بہت کم نقادوں نے توجہ کی ہے عام طور پر ادب کو ایک سترہ حقیقت سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور اس طرز سے میں بھی اس پہلو پر زیادہ ذوق دیا گیا ہے کہ اس کے پشتے ادبی روایت سے ملنے جائیں۔ اس عام میدان کے پیش نظر ایک ایسے ادیب کے تنقیدی مراسلے چونکا و بچنے کی مدد تک محدود ہیں۔ جس کی ساری شہرت ناول نگاری کی بنا پر قائم ہے۔ مرزا احمد لدی رسوا کو ادبی دنیا "امرد جان" اور اس کے مصنف کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن وہ وحقیقت بُری جامع صفات کے انسان تھے۔ فلسفہ ہیئت، علم نجوم، ریاضی، سائنس، الہیات اور اخلاق سبھی پر ان کو غیر معمولی قدیمت حاصل تھی۔

اس مختصر مقالے میں ان کے چند تنقیدی مراسلات کا تعارف کرنا مقصود ہے۔ اس وقت اس قسم کے تین مراسلات میر سے پیش نظر ہیں۔ یہ مراسلہ اُسے مرزا نے رسالہ "میں" کے مختلف پرچوں میں شائع ہوئے تھے اور انہیں بہت عرصے بعد مرزا احمد لدی عزیز غصہ نے رسالہ "زمانہ" کا پندرہویں شمارے شائع کیا تھا۔

مرزا رسوا نے شعر و شاعری کے مسائل کو دوسرے تمام علوم سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ پہلے مراسلے کے پہلے پیرا گراف میں اپنے مقصد کی وضاحت اس طرح کئے ہیں :-

"میر سے اس خط اور دوسرے خطوں کا جو اس کے بعد لکھے جائیں گے یہ منشا ہو گا کہ علم شرعی ان غویوں کو جنہیں اردو زبان کی شاعری خصوصاً میر سے جتنی اہمیت بیان کر دوں۔ مگر یہ سخت مشکل ہے کہ ان امور کو سمجھنے کے لیے جنہیں میں ذکر کیا چاہتا ہوں۔ مبادی مسائل ہم نفس سے واقف ہونا بہت ضروری ہے اور اس علم کی کوئی کتاب بالفعل اردو میں نہیں ہے۔ شیخ بوعلی سینا کا ایک رسالہ فارسی زبان میں میر سے پاس تھا اور اس کا ترجمہ بھی میں نے اردو میں لکھا تھا اور تحقیقات جدید کے موافق ایسے حاشی تعلیقات اس پر زیادہ کر دیئے تھے وہ گم ہو گیا۔"

شعر کے بارے میں ایک واضح اور صاف بیان دوسرے مراسلے کی ابتدا میں ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا کی فکر پر اخلاق اور الہیات کا اثر غالب تھا۔ اور اسی کے پیش نظر انہوں نے مضامین کو "الغائی اور الہامی" قرار دیا ہے۔ اور اخلاق سے ان کا بلا واسطہ ربط ملحوظ رکھا ہے۔

” میں اور حیثیات سے قطع نظر کر کے صرف یہ کہتا ہوں کہ بعض اشعار اخلاق کے لیے مفید ہیں اور بعض مضر مثلاً وہ اشعار جن میں اخلاقی مضامین ہوں۔ وہ قسم جس میں داخل ہیں۔ اور جن میں نفس پرستی کے مضامین ہوں وہ بھی ہیں۔ لیکن ہمارے اور ہمارے بعض معاصروں کے بعض اشعار بلکہ ہمارے اکثر اشعار ان دونوں صفتوں سے معرئی ہیں۔ نہ ان میں کوئی صفت ہے نہ نتیجہ..... ایسے شعر لکنا ایک فعلِ جث ہے؟“

شاعری کا علم اکثر خدا و قرار دیا گیا ہے۔ حاکمی ملک نے اسے انسانی سے زیادہ دہی بتایا ہے۔ مرزا سوانے اس پاسے سے ایک دلی چسپ بات کہی ہے۔ مضامین کو الخاقی اور اہمائی کہتے ہوئے اور موزونیت کو خدا و صلاحیت تسلیم کرنے پر بھی وہ اس ... لکھ نائل میں کہ موزونیت کی اوسط استعداد عام طور پر سارے انسانوں میں پائی جاتی ہے۔

” فطرت نے ہر انسان کو اواسط استعداد عطا کیے ہیں۔ فطرت کے قواعد کلیہ میں اتفاقات و حوادث کو بہت کم دخل ہے۔ موصوف خاص سے زیادہ خواہرورت اور موصوف خاص سے زیادہ بد موصوفات کی شکل مل سکتے ہیں..... اگر فطرت نے کسی کو موزوں طبع نہیں پیدا کیا تو وہ شعر موزوں کرنا کیسا موزوں پڑھ نہیں سکتا۔ مگر ایسے ناموزوں طبیعت واسطے شکل سے میں لگے لہذا اوسط درجہ کے مبالغہ واسطے اکثر موزوں طبع بھی ہوا کرتے ہیں؟“

” مرزا و تنقید میں ذاتِ سلیم کی ایک منطقی بنیاد قائم کرنے کی یہ ایک ابتدائی کوشش ہے۔ مرزا سوانے اس کی توجیہ میں مکی ... ی اثرات کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اور جہاں فطرت کے خدا و وسیلے موزونیت کا ذکر کیا ہے۔ وہیں یہ بھی مراحت کر دی ہے کہ۔

”..... ملک، مزاج اور عادت کو بھی اس امر میں بہت کچھ لگا رہے۔ فطرت نے ہر ملک کے مناسب ایک صورت خاص اور ایک طبیعت مخصوص ہر باشندہ کو عنایت کی ہے؟“

مذاہبی سلیم کی ماہیت، اس کے نشوونما اور تاریخی ارتقاء پر مرزا سوانے تفصیلی بحث نہیں کی ہے۔ لیکن اوسط درجے کی موزونیت کو قومی مزاج کی خصوصیت قرار دے کر گریبا انہوں نے شاعر کو بغیر معمولی طور پر اور خدا و موزوں طبع قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں ساتھ ساتھ اس کے مزاج کا آئینہ دار بتایا ہے۔ اس طرح شاعر اور غیر شاعر میں مرزا سوانے کے نزدیک بنیادی فرق نہیں تھا۔ دونوں موزوں طبع ہوتے ہیں۔ ان ایک کی موزوں طبعی اوسط درجہ کی ہوتی ہے اور دوسرے کی زیادہ ترقی یافتہ۔

موزوں طبعی کی اس ترقی یافتہ شکل ملک پہنچنے کا سانسہ کیا ہے؟ مرزا سوانے اسے ”ابتدائی و دستی قرار دیا ہے۔ اور اس ... نے ان کا نظریہ تعلیم استاد و شاگردی کے ادارے ملک پہنچ سکا ہے۔ موسیقی کی مثال پیش کر کے کہتے ہیں۔

” اکثر استعدادات بہ سبب عدم مزاحمت کے ضائع ہو جاتے ہیں یا بہ سبب عدم علم کے ابتداء مرزا اب ہو کر دستی کے قتل نہیں رہتی۔ جو لوگ ابتداء میں کسی کامل استاد سے موسیقی حاصل نہیں کرتے۔ اور ابتداء ہی میں سر بورہ ٹھیک نہیں کر لیتے ان کو ہوا داد اور بے اصول گانے کی مشق ہو جاتی ہے لہذا





”بعض صاحبِ مہنی پسند شریک تھے ہیں۔ ایسے لوگ وہل میں بہت تھے۔ جن کے ہر شر کو سمجھنے کے لیے قوتِ فکر کو حدِ اعتدال سے زیادہ محنت کرنا ہوتی تھی۔ . . . . دماغ کے ہر دسے بہت ہی نازک ہیں۔ ان کی لذت کے لیے نازک خیالوں کی ضرورت ہے۔ نازک خیالی اور وقتِ معقول دورِ امرِ جداگانہ ہیں۔ ایک کے دعوے کے سے دوسرے کو اختیار کر لینا بڑی غلطی ہے۔“

نئی تشبیہوں کی تلاش کے لیے مرزا استوائے ادبیات اور مطالعہ کائنات سے پیدا ہونے والے دوسرے تمام علوم کا ربط کر لیا ہے۔ اور یہ ربط محض مادہ تشبیہوں کی تلاش کے لیے ضروری نہیں بلکہ اسی ربط کی بناء پر شعر کو دوسرے تمام علوم کے پہلو پہلو پر مابستہ ہے اور شعر کے اعلیٰ ترین درجے میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ مرزا استوائے عقیدہ کی اور کمالی شاعری پر سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔ یہ بات ہے جس کا پہلی کا مشورہ دیا ہے وہ ایک معنی میں حالی کی چرل نفاہری کے تصور سے بھی زیادہ جہتی ہے۔ اور شاعری کے معیار اور ہجے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”جس قسم کے اشعار آج کل ہمارے کلمتوں میں شائع ہوتے ہیں۔ کیا وہ شاعری جزوِ دیستِ ادبیہ غیرِ ”رے“ مصداق ہو سکتے ہیں۔“  
 ”واہ! ایسا بانیہں ہے اس کا ایک سبب کم علمی ہے۔ علم سے ہمیری مراد بہت سی کنیزیں پڑھ لینا، نامِ از کم سلسلہ غلط فہم کو کسی نہ کسی طور سے تمام کر لینا نہیں ہے۔ عقل اور فطرتِ تنقیدِ علم کے لیے کافی ہے مگر عقل سے کام لینا اور فطرت میں تصرف کرنا کسی تدبیرِ محنت چاہتا ہے اور اس کی ہمیں فرصت نہیں۔“

جس قدر مضامین پیش پا افتادہ تھے۔ ان کو اگلے کلمہ کہتے اب ہماری استادای صرف اس سے استنباط کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اور اگر اس کا سلیقہ بھی ہم کو نہیں تو ان کو اور خراب کہتے ہیں۔ ہماری شاعری سماجی اور کتابی ہے نہ فطری۔ ہم خود فطرت کا شاہدہ کیسے قرار دے کر کتاب فطرت سے مضامین پیدا کرنے کے حامی نہیں ہیں۔ انہوں نے مضامین کو اپنے لفظوں میں وہ ادیتا ہمارا خاص کام ہے اور اس پر ہمیں فخر ہے۔

اس نظیری روح اور استقامت اور استعداد خیال بندی پر مبنی نے بھی مقدمہ شعر و شاعری میں سمیت تنقید کی ہے۔ مگر اس کا حل انسانی شاعری اور نچری مضامین کی فراہمی تھا۔ مرزا سوانے اس سلسلہ کو چارے سے مٹی میں منہ میں پیش کیا ہے اور اسی سے ان کے نزدیک اخلاق کا تصور محدود نہیں تھا۔ اور شاعری کو وہ حسن جذباتی باہالی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے شعور کا ایک بڑا پتہ سمجھتے تھے۔ اس سے مراد ہے کہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

اولی مرتبہ پر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کو شاعرانہ کیفیات انجام دے سکتا ہے۔ قدرت سے دقیق مضامین کو اخذ کرنا اور اس کو عام فہم اور سادہ الفاظ میں کہ جانا اس شاعری کا کام ہے اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے زیادہ ترقی کر کے کہتا ہوں۔

کہ خالق اور معارف کو جس پیرائے سے شاعر ادا کرتا ہے فلسفی کی مجال نہیں کہ اسے بیان کر سکے۔ خیال کے آئینہ خانہ میں عالم جبروت کی جھلک نظر آتی ہے۔ پیادہ پیادہ صورتیں مجسم ہوتی ہیں اور صورت و حرف کے ذریعے سے ساتھ تک پہنچتی ہیں۔

شاعرانہ حکیم کو مرزاہ سوانے ایک ہی صفت میں لکھنا کہ دیا ہے۔ بلکہ شاعر کا مرتبہ حکیم اور فلسفی سے بہت کچھ زیادہ بتا رہے آگے چل کر لکھتے ہیں :-

”شاعری کی وسعت مثل سمیت عالم کے لا متناہی ہے۔ اس کی جولانگاہ فلسفہ کی حدود سائی سے کہیں آگے ہے۔ جن امور کو فلسفہ نے اب ثابت کیا ہے۔ شاعروں کی تحقیق کئی قرن پہلے ان کو پا چکی ہے۔ شاعر اعلیٰ و موزون حکمت کو اس طریقہ و انداز سے کہہ جاتے ہیں۔ کہ فلسفی کو ان کے بیان کرنے کے لیے بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔“

اس اقتباس سے مرزاہ سما کا نظریہ ادب اخلاقی یا فطرت پرستانہ سے کہیں زیادہ نفعیاتی معلوم ہوتا ہے۔ جو اس زمانے کے عام چلن کے پیش نظر کافی عجیب و غریب ہے۔ پہلے ہی مراسلے میں مرزاہ سوانے علم النفس کی عام اصطلاحوں سے بحث کی ہے اور نہ صرف ان کے معنی اور مفہوم کو احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کو تنقید شاعرانہ نظریہ ادب کے سلسلے میں استعمال کیا ہے :

”..... ایسی چیزوں کو جو بذریعہ کسی حاسہ کے معلوم ہوں، محسوس کہتے ہیں۔ ذہن کے اس فعل کو جس سے محسوس کا علم ہوتا ہے احساس کہتے ہیں۔ احساس کی تعریف یہ ہوتی، احساس مراد ہے۔ اس اثر کے شعور سے جو کہ نظام آتی یا کسی موثر کی تاثیر سے حادث ہوتا ہے۔“

..... احساس کے لیے شے محسوس کا حاضر ہونا شرط ہے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شے کی صرف ایک ہی صفت کا ہیں احساس ہوتا ہے اور سب صفتیں ہم کو یاد آ جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ بالفعل غائب ہوں..... یا ایک ہی حاسہ کے محسوس نے اسی حاسے کی دوسری ہی محسوس کو یاد دلایا..... رہا۔ ایک حاسے کے محسوس نے دوسرے حواس کے محسوس کو یاد دلایا۔“

اس کے بعد لزوم ذہنی کے قوانین سے بحث کرتے ہیں۔ ان ذوق و محاسن اور تعلق و مقارنت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کہ اثر یہ نہیں جو یا تو ایک دوسرے کے قائل ہونے کی وجہ سے یاد آتی ہیں۔ بلکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی ساتھ مشاہدہ میں آنے کی وجہ سے یاد آ جاتی ہیں۔ خواہ وہ متماثل ہوں یا نہ ہوں۔

پھر ہر احساس کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں :-

” (۱) شعور محض (۲) اس احساس سے خاص لذت یا ام کا حاصل ہونا جسے آگے چل کر مرزاہ سوانے نے وجدان کہا ہے (۳) وہ احساس کسی خاص تحریک کا باعث ہو اسے مرزاہ سوانے اداوت سے

تعبیر کیا ہے، مثلاً گلاب کے پھول کو دیکھنے سے ایک تو یہ علم ہوا کہ اس کا رنگ ایسا نکل  
ایسی اور خوشبو ایسی ہے۔ یہ شعور محض ہے۔ دوسری یہ کہ گلاب کا رنگ اور شکل کے دیکھنے سے  
یا خوشبو کے سونگھنے سے ہم کو مسرت حاصل ہوتی یا مثلاً اس کا کاٹنا جبہ جانے سے ہیں الم ہوا۔  
یا وہ لذت اس حد تک پہنچی کہ گلاب کے پھول کو توڑنے کا ہمیں شوق ہوا۔ چنانچہ ہم نے اسے  
توڑنے کا قصد کر کے اسے توڑ لیا۔ اور کانٹے کے جبہ جانے سے جو الم ہوا تھا اس لیے اس  
سے بچتے رہے۔

پھر کا تجربہ کئے ہوئے اس کو بھی مختلف مدارج میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے درجے کا نام ادراک قرار دیا ہے۔ اور اس کی  
ہے: یعنی کسی چیز کے مجموعہ صفات کے احساسات سے اس چیز کو شناخت کرنا: دوسرا درجہ تعظیم کا ہے یعنی چیزوں  
نہتوں کا قائم کرنا۔ صفت فرع اور مجلس کا قرار دینا مثلاً ایک خاص طرح کی شکل اور رنگ اور خوشبو کے اعتبار سے گلاب  
ہی بہت سی چیزیں کہ اگرچہ ان کی رنگت اور شکلوں میں اختلاف ہے مگر بعض اوضاع خاص کی وجہ سے ملتے جلتے ہوئے  
و پھول کہتے ہیں!

سے درجے کو استدلال بتایا ہے جزئیات سے کسی اور کلیات سے جزئی پر خاص حکم نکلانے کا کام ہے۔ اس استدلال  
ہے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً زید فانی ہے، عمر فانی ہے، بکر فانی ہے، خالد فانی ہے۔ لہذا انسان فانی ہے یا شواکل انسان  
ہے لہذا زید فانی ہے۔ پہلی صورت کو استقرا اور دوسری کو قیاس قرار دیا ہے چوتھے تخیل جو ایک قسم کے مجموعہ صفات  
تجزیہ کر لینے کا نام ہے اس تخیل کو بھی مرزا دستا نے دوسروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک یہ کہ جمہور میں کسی مفاد کے  
بن کے سامنے لانا دوسری نئی صورتیں جو عالم خارجی میں موجود ہی نہ ہوں ان کو ایجاد کرنا۔

ل و اصل فن کی بنیاد ٹھہرتی ہے۔ مرزا دستا نے ایک اصطلاح کے تفصیلی تذکرے کے بعد یہ صراحت کی ہے:

”بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ تخیل خواہ مخواہ ایک جدید اصطلاح ایجاد کی گئی ہے۔ حقیقتاً یہ  
وہی ہے جس کو تخیل کہتے ہیں اور محاکات اور اختراع اس کی دو قسمیں ہیں۔ لیکن غور کرنے  
سے معلوم ہوگا کہ تخیل ایک شرط ذہن کی ہے جس کا زور ابتداء کے نشروفا سے ہوتا ہے  
اور جس پر دو دو قانون تذکرہ اور تقابل کے قائم کئے گئے۔ جن کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے۔ اور  
تخیل کا ظہور ذہنی ترقی کا آخری درجہ ہے۔ جس سے اکثر اذہان بہت ہی کم بہرہ یاب  
ہوتے ہیں۔“

سے تنقیدی ادب میں تخیل کے لفظ کو کافی بے پرواہی سے استعمال کیا جاتا رہا ہے اچھتان میں (FANCY) اور  
(IMAGIN) کی توجیہ و تفریع میں کافی بھٹیں ہو چکی ہیں۔ اولیس، برگ، کوبرج کے مختلف تفسیلات نے ان دونوں  
الگ الگ کر کے پیش کیا ہے اور تخیل کو ایک ایسی تخلیقی قوت قرار دیا ہے جو صرف عالم خارجی میں موجود اشیاء پہلے حال  
نہ کی مہمون منت نہیں بلکہ خود اپنی کائنات کی تخلیق کر سکتی ہے۔ ہمارے ادب میں غالب مرزا دستا پہلے تنقید نگار ہیں۔

جنہوں نے تخلیق اور تخیل کے اس فرق کو نمایاں کیا ہے۔ اور اس طرح اس کی فلسفیانہ توجیہ کی ہے۔ آگے چل کر محاکات اور تخیل کے فرق کو بیان کر سکتے ہیں:

”اگر تخیل کے اور اس کی دونوں قسموں کے ساتھ ساتھ لفظ شاعرانہ استعمال کر کے ہم شاعرانہ تخلیق شاعرانہ محاکات اور شاعرانہ اختراع کہیں تو ہمارے مطلب کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ محاکات وہ حالت ذہن کی ہے۔ جب کہ وہ چیزیں جو کہیں عندالذہن حاضر تھیں ان کی صورت میں جو محاذ حفظ میں موجود ہیں۔ پھر ذہن کے سامنے آجائیں اس کو استرجاع کہتے ہیں۔ جس کو درود ورنہ نے EMOTION RECOLLECTED IN TRANQUILITY کہا ہے۔ م۔ج۔۱ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) غیر ارادی (۲) ارادی اور باقیدان کے مت تک ذہن کے سامنے منہ رہنے کے اختصار کہتے ہیں۔ اور یہی یا ارادی یا غیر ارادی۔ شاعرانہ محاکات کے لیے اختیار طریقہ چاہیے تاکہ الفاظ کے ذریعے سے لہجہ کا بیان کیا جائے تو وہ عندالسامع مقبول ہو یا موجب کسی قبض و بسط کا ہو۔“

یہاں قبض اور بسط کی تشریح طلب اصطلاحات کو بھی مرزا نے واضح کیا ہے۔ قبض ان کے نزدیک وہ حالت و بعدانی ہے جو عالم کے مشابہ ہے اور معترضات سے دور رہنے یا ان کو دفع کرنے کی آمادگی ذہن میں پیدا کرتی ہے۔ جس طرح آنکھیں کوئی ذرہ ہرٹسے کا شعرو ہو تو بیک بیک چمک چمک جاتی ہے اسی طرح قبض کی حالت میں انسان اپنے کو آخرین گوار صورت حال سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اور نفسیاتی طور پر پیش بندی کر لیتا ہے۔ بسط ان کے نزدیک ذات الہی کی حالت ہے اور لذات سے متعلق ہونے کے شوق کا باعث بنتی ہے۔ محاکات تخلیق اور تخیل کے اس نازک فرق کو سمجھنے اور بیان کرنے سے مرزا رسوا کے تنقیدی مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے لکھتے ہیں:-

”محاکات فعل واقعہ فیسی یا مودع کے لیے زیادہ مفید ہے۔ نہ کہ شاعر کے لیے اختراع صرف شاعر کا حقد ہے۔“

تخیل کو مرزا نے شعور و وجدان اور ارادہ کے اعتبار سے تین چیزوں سے پیش کیا ہے (۱) وہ جن کا تعلق شعور سے ہے (۲) جن کا تعلق وجدان سے ہے اور جب ان کے اجتماع کو عقل ایک فرد واحد میں پیش کرتی ہے تو اس سے ایک مشابہ کا ظہور ہوتا ہے جسے کمال کہتے ہیں۔ اس طرح مرزا رسوا نے حسن، انفا دیت اور حقیقت تینوں جزا کو ایک وحدت میں پروانے کی کشتی کی ہے اور اس طرح وہ تقریباً افلاطونی تصور تک پہنچتے ہیں۔ جس نے مغرب اور مشرق میں تنقید جمالی کے سادے نظریات کو متاثر کیا ہے لکھتے ہیں:-

”وہ ذات مقدس جس میں یہ صفات نمایاں پائے جاتے ہیں۔ حقیقی، جمیل، لازمی، غیر مطلق اور غایت الغایت ہے۔ مثالیہ اول یعنی حق موضوع فلسفۃ الوجود کا ہے۔ جمال موضوع علم و حیات کا ہے۔ غیر موضوع علم اخلاق کا اور تصور باری تعالیٰ عز اسمہ موضوع الہیات کا ہے حقیقت

فلسفہ لامرئی سے وہ مراد ہے۔ جس کی موجودگی کو قتل خارج میں بخیر ترقی ہے نہ صرف  
ذہن میں بھولتے اور ذہنی کے جن کا وجود صرف ذہن میں ہے خارج میں نہیں ہے؟  
... میں مرزا اسکا کے تصور جمال کے بارے میں چند اقتباسات پیش کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر نے جمالیات کی بنیاد  
PURPOSIVENESS WITHOUT PURPOSE (یعنی بغیر غرضی) افادیت کے کسی شے میں مقصد کے ہائے کو قرار دیا تھا اس پر  
... سے بھی غور رکھا ہے:

”بیکل سے مرعوب لذائذ مغرور ہے۔ مذہب جس کو ہم کسی غرض سے دوست رکھیں جس کے  
محکم کا وہ واسطہ شہرے بلکہ اس کا حصول میں مراد ہے؟  
جی بنیادی طور پر حسن اپنا مقصد آپ ہے۔ وہ کسی دوسرے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں ہے یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے  
... سے نفع حاصل ہوتے ہوں۔ لیکن وہ ممکن اور ثنائی ہوں گے۔ اصلی اور بنیادی نہ ہوں گے بقول مرزا دوسرا۔  
... ممکن ہے کہ امر بیکل نافع بھی ہو یعنی کسی غرض ادنیٰ یا اعلیٰ سے اس کا حصول مطلوب ہو مگر  
جس حقیقت سے کہ وہ واسطہ کسی غرض کا ہے۔ اس میں داخل نہیں مرعوب لذائذ کی ایک  
بہت عمدہ مثال بچوں کے کھیل سے لی سکتی ہے اس لیے کہ اس سے ان کی کوئی غرض غرض  
نوعی نہیں ہوتی کہ وہ کھیل کا شوق جو بچوں میں پایا جاتا ہے۔ ترقی کرتے کرتے اس حد تک پہنچ  
گیا ہے جس سے بہت نڈاشی، صورتی، طراچی، مویہتی، شعر ایسے ایسے فنون لطیفہ نکل آئے  
ہیں۔ بچوں کے کھیل اور کھلونے بہت ہی سیدھے سادے ہوتے ہیں اور بڑھوں نے  
اپنے کھیلوں میں طرح طرح کی پیچیدگیاں اور لطافتیں پیدا کر لی ہیں۔ چشم حقیقت میں کے  
نزدیک اصل دونوں کی ایک ہی ہے۔“

بیکل اور فن میں فلسفیانہ مماثلت کا تصور یورپ میں شلر کی تصانیف کے بعد عام ہوا ہے۔ ہمارے تنقیدی ادب میں اس تصور  
... اور پوری شرح و بسط کے ساتھ پیش بھی نہیں کیا گیا۔ گونائی نے مقدمہ شعروناغوی کے پہلے یا دوسرے صفحے پر اس شخص کو بھی  
... پر منہر بتایا ہے۔ جو ایک ایران پہاڑی پر بیٹھا اپنی وطن میں مست ہو کر بالری بجا رہا ہے۔ لیکن بعد میں خود وہ بھی افادیت  
... مذاق کی پابندی میں جبری طرح گھر گھر گئے۔ مرزا اسکا کا تصور ان سے ذرا مختلف ہے۔ گو وہ بھی اخلاق اور فطرت پرستی کے قائل  
... ان کا دائرہ زیادہ وسیع اور فلسفیانہ طور پر زیادہ مابعد الصیغاتی ہے۔ جمالیات کے سلسلے میں مرزا نے صاف طور پر لکھا ہے۔

”فنون لطیفہ کے مقابل وہ فن ہیں جن کو نافع کہنا چاہیے۔ مثلاً فن میکانیات (مکینکس) بنانے کا فن  
کے ذریعے سے وہ چیزیں بنائی گئی ہیں۔ جو انسان کی بقا اور ترقی شخصی اور عمومی کے لیے

مفید ہیں۔“

لیکن یہ تضاد مرزا کے نزدیک مکمل اور قطعی نہیں ہے۔ جمالیات اور افادیت میں کوئی ایسا بیز نہیں ہے کہ دونوں ایک شے  
... بلکہ یہ مسئلہ ضرور قابل حور ہے کہ ادبیات میں کسی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔ اور کس کو ثانوی۔ حسن اور نادینت یکساں

ہو سکتے ہیں۔ اودان کو ایک جاکنا ہی فن کی سب سے بڑی منزل ہے۔  
 "کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جمال اور لطف دونوں صفتیں ایک ہی شے میں جمع ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک عجبوت  
 جیسی نفیسی چیزیں عند الذوق و نیز عند العقل مقصود ہیں۔"

ہر صاحبِ فن کی عزت یہ ہوتی چاہیے کہ اس کی ایجاد میں دونوں صفتیں پائی جائیں  
 مگر ایسا نہ ہو کہ ایک کی رعایت سے دوسرا ناقص رہ جائے۔ ہر ایک صاحبِ فن کی مراعات لازم  
 ہے اگر اس سے دوسرا مطلب بھی نکل سکے تو بہتر المراد۔ مثلاً شاعر کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس کا  
 شعر اصول سے درست ہو۔ اس میں کوئی ذاتی غریبی ہو چھر اگر اس سے کوئی نصیحت بھی نکلتی ہے  
 تو بحال اللہ نہ نصیحت لری کو نامح شفق کے حوالے کرے اور خود بزمِ شعرا میں اپنی عزت  
 بچانے کے لیے شعر مدہ کہے۔

اس کے بعد مرزا نے فنونِ لطیفہ کی تقسیم ان کے ذرائعِ انبہار کے اعتبار سے کی ہے۔ بت تراشی۔ طراوی اور مصوری کو پہلی  
 قسم میں شمار کیا ہے۔ کہ ان کا تعلق دیکھنے سے ہے۔ اودان میں شکل اور رنگ سے کام لیا جاتا ہے۔ دوسری قسم میں موسیقی کو گنا ہے جس  
 کا تعلق سمن سمع سے ہے اور کے آواز اور شریکے کام لیا جاتا ہے۔ تیسری قسم فنونِ ادبیہ کی قرار دی ہے۔ جس کا تعلق نہ دیکھنے سے  
 ہے نہ سنانے سے بلکہ تخیل سے ہے اور جس کے انبہار کا ذریعہ الفاظ ہیں۔ مرزا نے فنونِ ادبیہ کے لیے شعر کی اصطلاح استعمال کرنے کا مشورہ دیا  
 "لیکن اسے کلام منظوم کے لیے ہوتے ہیں۔ لہذا غوثِ انبہار سے شعر کی بجائے فنونِ ادبیہ کی ہمہ گیر اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس طرح ان  
 کے نزدیک شعر کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعے شعور اور وجدان کو متاثر کرے اور قبض و بسط کا موجب ہو۔

بنیادی طور پر مرزا کا تقویدِ فنِ اخلاقی سے زیادہ نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔ وہ قبض و بسط کو ایسی ذہنی کیفیات کے معزوں میں  
 استعمال کرتے ہیں۔ جن سے غلط اور اخلاقی طور پر جو کچھ کاموں سے احتراز کا مادہ پیدا ہوا اور ذہنی کی صحیح نعمتوں سے لذت پائی کی صورت  
 حاصل ہو۔ اس لحاظ سے ادب ان کے نزدیک ترجیحات (PREFERENCES) کا ایک موزوں اور مناسب سلسلہ پیدا کرنے کی کوشش  
 ہے۔ انسان میں قدروں کی ایک ایسی ترتیب پیدا کرنے کی کوشش ہے جو اچھی چیزوں کی طرف راغب کرے اور بُری باتوں سے روکے  
 اور یہ کوشش بنیادی طور پر تہذیبی یا خارجی سے زیادہ نفسیاتی اور داخلی ہی ہو سکتی ہے۔

شعر کی یہ بنیادی تعریف کرنے کے بعد وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ فنونِ ادبیہ میں صنفا اور "افراضِ عمدہ" بھی شامل ہیں۔ مثلاً  
 "مکالمات، توجہ، استدلال، موعظت۔ اس صورت میں چاہیے کہ مصنف ترتیبِ مقدرات میں ایسی بات اور سبب کو صرف کرے جس سے اس  
 کی تصنیف ان دونوں غرضوں کے لیے ہر دو اہم و اہل مفید ہو۔ اس کی مثال انہوں نے تاریخ اور سائنس سے دی ہے اور بتایا ہے کہ فنونِ ادبیہ  
 میں جو قوتِ انبہار سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے علوم میں بھی کام دیتی ہے۔

• اگر کوئی مؤرخ کسی واقعہ تاریخی کو اس طرح بیان کرے جس سے سامع یا ناظر کی تخیل میں ہر بہو  
 تصویریں کھنچ جائیں یا کوئی حکیم کسی قانونِ فطرت کی توجہ اس صورت سے کرے کہ ہر مری میں ہیں  
 اس کے آثارِ نظر آجائیں تو کہا جائے گا کہ وہ بیان اور فقہیہ دونوں غرضوں میں غرض علمی اور

غرض شری کے لیے ہر جہاز اتم - اکل مفید ہے۔ وہ علم جو بہت ہی خشک خیال یکے جاتے ہیں مثلاً ریاضی (اور منطق ان کے بیان میں بھی اگر سلیقہ شری سے کام لیں۔ تو سامع اور ناظر اس سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ غرض ملی بھی بخوبی حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے ایک قسم کی مدد بھی ملتی ہے۔

یہاں سلیقہ شری کو اظہار بیان کا جو ہر قرار دیا گیا ہے اور اس سلیقہ شری میں تخیل کے مناسب استعمال اور الفاظ کے دلچسپی اور ان کی تصویر کشی دینے کو زیادہ ہی اہمیت دی گئی ہے لیکن مرزا نے ادبیات میں محاکات کے استعمال کو دوسرے فنون غنیہ کی محاکات سے الگ کیا ہے وہ شاعری اور مثنوی کے فرق کو بھی محظوظ رکھتے ہیں۔ اور ان کے ذرائع ابھار کے فرق کو بھی۔

" فنون ادبیہ جملہ احساسات بلکہ جمیع وجہ انہات و تعلیلات کے استعمال پر بشروطیکہ وہ بذریعہ لفظ و عبارت کے ادا ہو سکیں قادر ہیں اگرچہ ادیب مثنوی کی طرح کسی چیز کی رنگت اور شکل آنکھ سے نہیں دکھا سکتا نہ غرض آئندہ مرزا کوئی شک پہنچا سکتا ہے لیکن وہ الفاظ کے ذریعے سے ہر چیز کی صورت صفو تخیل پر کھینچ سکتا ہے نہ صرف ایک طرح سے بلکہ مختلف دھڑوں سے اور یہ ذہنی تصویر بہ نسبت جسمانی تصویر کے زیادہ تر پابدار ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تالیف سے نہ صرف نغمہ بلکہ تشریح بھی اصول موسیقی کا مزاج پیدا کر سکتا ہے اور لفظ یہ کہ ایسی حالت میں کسی اشکالی تکی یا مسئلہ حکمی کا ثبوت اور حل بھی دیا جائے گا۔ جو اس کی غرض خاص ہے؟

ارسطو نے تاریخ اور ادبیات کے فرق کی کافی الفاظ میں مباحث کی ہے۔ مرزا نے اس فرق کو ایک اور پہلو یعنی محاکات کے استعمال کو پیش کیا ہے اور جس طرح دونوں محاکات کو مختلف طریقے پر اور مختلف اقدار سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کو پیش نظر رکھا ہے۔ ایک لائق حقیقت کے ناظر ہے دوسرے کا مقصد اختراع ہے ایک تو کلام ہے اور دوسرا خالق۔

" اگرچہ شاعر بھی واقعات کی جو تصویریں کھینچے ہیں محاکات سے بہت کام لیتا ہے۔ لیکن اس کے صن کا تعلق خاص اختراع سے ہے بخلاف مودع کے جس کا تعلق محاکات سے ہے جب شاعر محاکات سے کام لیتا ہے اس وقت بھی اختراع سے باز نہیں رہتا اس لیے کہ شاعر کی نظر اکثر مغلوب لذتہ اور تخیل کی طرف رہتی ہے۔ لہذا اس کو انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ متعجب اسے کسی واقعے کی تفصیل بیان کرنا ہے تو وہ عدالت کے گواہوں کی طرح ہر جزئی ذکر کا پابند نہ رہے گا۔ بلکہ صرف ان امور کو انتخاب کرے گا جو اس کے مطلوب کے لیے مفید ہوں۔"

یہاں اس عملی تنقید کا ذکر بھی بے عمل نہ ہو گا۔ جو اس ضمن میں مرزا استوائے مختلف آؤد و اساتذہ کے اشارہ پر کی ہے ظاہر ہے کہ اس سے ان کا مقصد ان کے کام پر اجمالی تبصرہ کرنا نہیں ہے اور جو اشعار انہوں نے منتخب کیے ہیں وہ صرف زیر بحث موضوع پر اپنے خیالات کی وضاحت کرنے کے لیے جن لیے لکھے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے تنقیدی ذوق و فکر کی غازی عملی تنقید اسے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر محاکات کے ضمن میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شعر سے جو تصور قائم ہوا فضا تعمیر ہو وہ جمالیاتی طور پر خوش گوار آؤد آؤد کی بخش ہو اس



میں ناگوار سی اور کراہت کا پہلو پیدا نہ ہو۔ لہذا جب شاعر یا ادیب کسی واقعے یا مضمون کو بیان کرنے کے لیے اس کے نازدہ گوشے میں رہتا ہے اور چند مخصوص زاویوں سے اس کو پیش کرنا چاہتا ہے تو اس انتخاب میں خوش گو اور جمیل پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اسے تمام گوشوں کو ترک کرنا چاہیے جو قبول ان کے مضر یا غیر مفید ہیں اور بسط و قبض و وزن کے لیے مصادیق ثابت نہیں ہوتے اور انقباض کا باعث ہوتے ہیں۔ عملی تنقید میں وہ اس بات کو ایک کچلے کی حیثیت دے دیتے ہیں۔

”ہم اس موقع پر ایک بہت ہی سہل قانون اور کردہ سے احتراز کرنے کے لیے تحریر کیے دیتے ہیں۔ اگر اسے یاد رکھیں گے تو شعرا اپنے مقصود میں عمدہ ہوگا وہ قانون یہ ہے ہر ایک شعر کے حاصل پر خود کر کے دریافت کریں کہ اس سے کن قسم کی تصویر ذہن میں پیدا ہوتی ہے اگر اس تصویر کے اجزایا لوازمات قریب میں کوئی امر کردہ شامل ہے۔ تو اس کو فطری کر دینا چاہیے۔ اس کی مثال میں انہوں نے تین اشعار پیش کیے ہیں۔ جن میں سے دو غالب کے ہیں اور ایک ذوق کا۔ ذوق کا مشہور شعر ہے۔

واہ رے شورِ محبت خوب ہی چمکا نکم

اتھاں پیرے چاکس کس منزے سے کھائے ہے

اس شعر پر ان کو اعتراض یہ ہے کہ اس سے ایک تصویر ذہنی پیدا ہوتی ہے۔ جس میں ایک امر کردہ شامل ہے یعنی انسان کی ہڈیوں کا ٹکین ہونا اور ایک جائزہ کا اسے کھانا عمدہ ٹیکل نہیں ہے۔

ایک دوسرے شاعر کا شعر انہوں نے پیش کیا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی تصویر ذہنی کو بعد از قیاس مضحکہ اور مکروہ قرار دیا ہے۔ شعر یہ ہے۔

شغل اگر چاہتے ہو جی کے بھیننے کے لیے

دل میں آئیسو لکھجہ مرا مٹنے کے لیے

نکھتے ہیں :-

”دل میں ایک شخص کا آئینہ اور آئندہ بڑھا کر لکھجہ کو مٹا ایک پہلی سی بات ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے اس شعر میں مخاطب معشوق مجازی ہے۔ معشوق حقیقی اس سے منزہ ہے کہ کسی کے دل میں بیٹھ کر اس کے لکھجے کو مٹے۔“

غالب کے جو اشعار انہوں نے نقل کیے ہیں ان میں ایک ناہی کا ہے اور دوسرا اذہوکا ہے۔ ناہی شعر یہ ہے۔

واعظ ذسوز دل نہ فجل دادوم ذحسنق

بوسے کہ تن ذسوزنق استخوان دہر

”ہڈیوں کے جننے سے چرانہ کا پیدا ہونا جو شاعر کو خلق سے فجل دکھاتا ہے واقعی ایک مکروہ امر ہے۔“

غالب کے اے دو شعر یہ بھی انہیں یہی اعتراض ہے۔

داع دل گر منظر نہیں آنا تو بھی اے جامہ گر نہیں آتی

مریہ کا کہنا ہے۔

”دش دل کی بو میں چراندہ ضرور ہوگی صرف داغ دل کا ذکر کیا کم تھا کہ اس کے جلنے اور اس بیگنہ  
کے پیدا ہونے کا بیان مریح لیا گیا ہے۔ اس موقع پر مجھ کا استعمال اس امر کو کہ وہ پر دلاستہ شیخ  
ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ جو صرف مجازاً کہے گئے ہیں اس کی اصلیت کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تو  
اس کا جواب دیا جائے گا۔ کہ مجاز کا تصور یہی ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے ذریعے سے ذہن  
نہیں ہو کہ جو مجاز میں، کثرت و رنگی کو محسوسات کے ذریعے سے جو اقرب الی الغیم میں بیان  
کرتے ہیں۔ . . . . اگرچہ وہ مجازات جو اشعار مرقومہ بالا میں شامل ہیں اپنی مدہاں دست  
میں۔ لیکن ان کا تحلیل کر وہ ہے، اس سے اس کا نطفہ معدوم ہو جاتا ہے۔“

پہلے مرے کے آخر میں مریح اور انداز بیان کی بحث اٹھائی گئی ہے۔ غرضوں سے لے کر اہم ہوں تک ہر ایک کو زبان  
ان الفاظ کی محدود معانی کی شکایت رہی ہے اور یہ بات عام طور پر کہی جاتی رہی ہے کہ وقت مضمون یا اگر بے تحاشیہ خیال کا اظہار  
محتاج ہے۔ انداز میں نہیں ہو سکتا۔ مریح کی لہرائی اور وقت اظہار کی سلاست کو ختم کر دیتی ہے اور بیان کی شجاس اور روانی  
میں۔ بادش کی نظر رہا ہوتی ہے۔ مریح نے اس مسئلے کو اس انداز سے پیش کیا ہے۔

”شعر پر نظر کرنے کے دو گز ہیں ایک آزاد لفظ اور دوسرے آزاد معنی۔ جس زمانے  
میں الفاظ کی باریکیوں کی طرف زیادہ نظر کی جاتی ہے قوجہ اتنی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔  
مصنویت کا خیال جاتا رہتا ہے اور جب مصنویت کا خیال پیدا ہوتا ہے تو فطری باریکیاں بیک  
ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں میں نہایت کمی ہے۔ ایک کی افراط دوسرے کی تقیظ کا موجب ہوتی  
ہے۔ لکن ایسے شاعر جو مضمون عمدہ کہتے ہیں ان کے الفاظ میں وہ سلاست اور نزاکت نہیں  
ہوتی جو ان شاعروں کے کلام میں ہوتی ہے جن کو مضمون کی جدت اور ندرت کا چندان لحاظ  
نہیں ہوتا۔ وہ صرف لطیف زبان کے دل دادہ ہیں۔“

اسی بحث کا دوسرا حصہ مریح نے اس طرح پیش کیا ہے :

”..... ہم شاعر خالق مضمون ہیں ان کو طرز و اس کے مقصد میں بڑی وقت پڑتی ہے اس  
لیے کہ ہر ایک جدید خیال کے لیے ایک جدید لفظ چاہیے ان کو زبان مرقومہ میں مقرر فاسد  
کراہتے ہیں اور اس صورت میں ان کا کلام موافق روزمرہ عوام کے نہیں رہ سکتا۔ لہذا  
اگر شاعری جن کی نظریں سطحی ہیں ان کو ایک قسم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔“

اس کی مثال حیر کے دیوان کی پہلی غزل سے دیتے ہیں۔

ہنگامہ گرم کن جو دل نا صبور تھا

پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا

اور سمجھتے ہیں :-

”ذرا ہنگامہ گرم کن“ کو دیکھئے اور آمد و زبان کو مگر لاسنہ کیا؟ اس مضمون کو کسی اور طرح ادا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

لیکن اس بحث سے یہ قیصر مکان غلط ہو گا کہ مرزا دستا شناسی الفاظ اور خالص ادبی زبان کے استعمال کے قائل تھے وہ نصارت اور سلاست کے دوسے کا لحاظ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے مزاج کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ مثلاً غزل میں سلاست کا جو مہیا ہوتا ہے وہ قبیحہ کی سلاست کا نہیں ہو سکتا۔ اس فرق کو انہوں نے اس استدلال کے ساتھ بیان کیا ہے :-

”غزل میں زیادہ تر سلاست ہی مناسب ہے اس لیے کہ اس کا موضوع سنجیدہ نہیں ہوتا۔ قبیحہ اور مرثیہ وغیرہ میں خیالات ادا ان کے ساتھ ہی زبان کو وسعت دینا چاہیے۔“

اس بحث کا خلاصہ مرزا نے اس طرح کیا ہے کہ لفظی نزاع اور تکنیک کی بات کیوں سے نفس مضمون کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور جب بھی انداز زبان کے غیر ضروری اجزاء پر زور دیا جائے گا اس کا انجام یہ ہو گا کہ شاعری صرف صنعت گری ہو کر رہ جائے گی اور اس میں جذبہ کی گرمی اور احساس کا غوص اور شدت ختم ہو جائے گی۔

”وہ ان ادق قافیہ کی پابندی شاعر کے لیے کم نہ تھی کہ اس پر روایت بڑھائی گئی پھر اور لفظی جھگڑے نکالے گئے۔ بے چارہ حدیث مضمون کہاں سے پیدا کرے۔ لفظی جھگڑوں کے بڑھانے سے مضامین کا دائرہ تنگ ہوتا جا سکے گا۔“

اس دلیل کے ساتھ مرزا نے متوسطین اور منافذین کی شاعری کو متقدمین کے مقابلے میں پست اور سطحی قرار دیا ہے اور معذرت کی طرف رجحان کو مبارک بتایا ہے۔ ان کے پہلے مراسلے کے آخری حصے میں وہ واضح طور پر یہ مباحث کی گئی ہے :

”مہندوستان میں سو برس ادھر کی شاعری آج کی شاعری سے اچھی تھی۔ متوسطین نے جھگڑے کیے زیادہ بڑے عادی تھے۔ اس لیے مزاج تارڑ۔ اگر اس زمانے میں پھر رجوع معذرت کی طرف ہے اس لیے مجھے ان مراسلات کے کچھ کی جرأت ہوئی۔“

اس مختصر مقالے کا مقصد مرزا دستا کی تنقیدی نگارشات کا تعارف کرانا ہے۔ پہلے مراسلے کے ساتھ ہی یہ مقالہ بھی ختم ہوتا ہے اگر یہ نادرش منقول ہوئی تو مرزا کے دوسرے مراسلات بھی تعارفی حاشی کے ساتھ پیش کیے جائیں گے

اس مراسلے میں بھی جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان سے اندازہ ہو گا کہ تنقید نگار کی حیثیت سے مرزا دستا غیر معمولی استعداد کے ادیب تھے جس طرح ادب کے نفسیاتی حوال اور فلسفیانہ بنیادوں پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے وہ اردو ادب کے تنقیدی رویے میں نئے کی چیز ہے۔ ادب ان کے نزدیک صرف قدام کی پیروی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے رشتے موم انسانی کے دوسرے تمام ذخیروں سے ملے ہیں پھر یہ بات خاصی تعجب بخیز ہے کہ مرزا دستا کی تنقید میں مغرب سے غیر معمولی مرعوبیت کا اندازہ نہیں ملتا نہ وہ محاکاتی طرح اخلاق اور اصلاح کے تقویرات تک محدود رہتے ہیں اور نہ قدیم رنگ سخن کے پیروؤں کی طرح محض لفظی نزاع و سمیت زبان اور بیان کے فزونی مسائل میں الجھتے ہیں۔

ان مراسلات میں پہلی بار آمد و تنقید نگار نے ادب کے فلسفیانہ مباحث کو دوسرے تمام علوم سے منسلک کر کے پیش کیا ہے

نیا۔ جدید استعارے اور ادب کی تکنیک کو ہضم کیا اور نفسیاتی انداز سے پرکھنے اور ان کے اصول و مضامین قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے مہارت سے یہ بھی اندازہ ہو گا کہ شاعری اور ادب میں احساس صحیح، تجربہ کے خلوص (GENUINE EXPERIENCE) اور انداز کی برابری کی طرف جس حد مرزا دستو افسانے پہنچائی کی ہے۔ اس کی مثال ہمارے تنقیدی سرمائے میں بہت کم ملتی ہے۔ اپنے دور کے دیگر بزرگوں کے برعکس وہ شاعر یا ادیب کو صرف اپنی فائز میں گم ہو جانے والا انسان نہیں سمجھتے بلکہ اسے کائنات سے باہر اور تجربہ کے دائرہ سے باہر دو پہنچائی رکھنے والا منظر قرار دیتے ہیں۔ یہ چند ایسے مسائل ہیں جن کی تازگی آج بھی قائم ہے اور ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو یہ ان پر غور کرنے اور ان پر بحث کرنے سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

لیکن ہے مرزا دستو کے تمام تو تنقیدی نظریات سے آج اتفاق نہ کیا جاسکے۔ لیکن ان میں سے کوئی نظریہ بھی ایسا نہیں ہے جو خیال اور خیالی آفریں۔ جو اور تخلیق و تعمیر فن کے سلسلے میں کارآمد خیالات نہ بنے۔ مہذب نہ ہو۔ پھر اب سے اتنے عرصے پہلے لکھے ہوئے یہ حقائق عقیناً اپنے دماغ میں انقلابی حیثیت رکھتے ہوں گے اور اس دور میں اس قدر جدید اور بہت آگاہ ذہن سے ادبی مسائل پر سوچنا اور ان پر اہم حاصل ہے۔ یہ کارنامہ ناگہانی سبکدوشی و شاعری کے بعد ہمارے تنقیدی سرمائے میں سب سے اعلیٰ اور بلند مرتبہ کا مہتمم ہے۔

# آزاد کی سیاحت

(سیر ایران)

(آغا) محمد اشرف

غدر شہسوار کا ہنگامہ فرو ہونے کے پورے ۲۴ سال بعد (۱۳۸۵ھ) میں مولوی محمد حسین آزاد نے ایران کا سفر شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ادبی دنیا پر آپ حیات اور دوسری تصانیف کے ذریعے آزاد کا سکہ بیچ چکا تھا۔ چنانچہ خود کہتے ہیں کہ ”میں شہسوار میں پیش کی مقدار پوری گئی۔ دلی برسوں سے آزاد و مندر ہے کہ رخصت ہو کر جکر سے حرکت اور خدا سے برکت یعنی چاہئے“

سیاحت ایران کا محرک دو چیزوں کو کہا جاسکتا ہے۔ نایاب علمی اور ادبی کتابوں کی تلاش اور بعض فارسی کی کتابیں جو مورخ سے زبردست تصنیف تھیں۔ ان کی تکمیل۔ اس عہد میں معیاری کتابوں کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں :-

”ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور یونیورسٹی بھی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی۔ کیونکہ نہ اسے کسی سے مروت تھی نہ کسی قسم کی آمد۔ بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ بھی نہ ملتی تھی“

اسی سلسلے میں آگے چل کر فرماتے ہیں :-

”..... خدا سے التجا کی۔ کہ اگر مجھے وسعت ملے تو ایک کتب خانہ نظر کا خاص و عام میں آماستہ کروں۔ اور جس قدر ممکن ہو ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں۔ کہ کسی بددماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے“

شہسوار کی ایک تحریر کے مطابق اس وقت آزاد کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس قلیل رقم میں سے آزاد کتابوں کے لیے کس طرح روپیہ پس انداز کرتے تھے۔ اس کا حال انہی کی زبان سے سنئیے :-

”اس عالم میں میں نے انتظام یہ رکھا کہ جو کچھ خدا دینا سکھاس میں سے خرچ کرتا باقی جمع کرتا۔ خانہ برآمدوں کی طرح گزارہ کرتا تھا۔ اور اپنے مبارک اماورے سے خانہ ولی کو مدد ملنے کا تھا۔ اس انتظار میں

کوئی ایسی کتاب جو کم ہفتہ آئے۔ مل جاتی تو بے بیجا۔ کہ ایک دن کام آئے گی۔  
آزاد کو اپنی کم مانگی کا پورا احساس عقارہ دوسرے رشتہ طرہیزی سے منازل حیات طے کرتا جیسا جاتا تھا۔ اعلیٰ خیال آیا۔ جو کتابیں اس  
مستہ نایاب تھیں۔ وہ عرب اور ایران میں انراں نہیں ملیں گی۔ اس لیے سفر ایران کا ارادہ کیا۔  
اپنی تصانیف کی تکمیل کے سلسلے میں سخیان فارس اور فارسی کی ایک لغت کے مسودے ان کے سامنے تھے۔ سخیان فارس  
اور فارسی زبان کی لغت اصل میں ایک ہی پروگرام کی دو کڑیاں تھیں۔ سخیان فارس میں موضوع بحث غلامی تھا اور لغت کی ترتیب سے مفید فارسی  
روزیہ کے الفاظ کا ایک ذخیرہ جیتا کرنا تھا۔ جو پرانی لغات میں نہیں ملنے تھیں۔ سخیان فارس کا منصوبہ سیاحت ایران سے پورا ہو گیا۔ مگر  
غیر کہ لغت کے خیال کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ان کے انتقال کے بعد جو کتاب لغت آزاد کے نام سے منسوب ہوئی ہے۔ وہ بظاہر اس لغت کا  
پتہ پر معلوم ہوتی ہے۔ جس کا نقشہ آزاد کے ذہن نے قائم کیا تھا۔  
فند پارسی کا مسودہ بھی بنیاد تھا۔ مگر آزاد اس کی زبان کی صحت روزمرہ محاورے کے مطابق ایران جا کر کرنی چاہتے تھے۔ آموزگار  
یہی جن سورت سے بعد میں ترتیب دی گئی ہے۔ یہ یادداشتیں بھی اسی سفر کا نتیجہ تھیں۔

## سیاحت ایران کی ابتدائی منزلیں

روانگی سے نکل بہت سے مزدوری امور تھے کہ جن کا طے کرنا ضروری تھا۔ بقول آزاد و صحت کا مقدمہ سب سے زیادہ سنگین تھا۔  
انہما حکم تعلیمات کے ڈاکٹر کیڑ ڈاکٹر کیڑ جن سے آزاد کی نوک جھونک کچھ عرصے جاری تھی۔ ان کے سامنے میں سنگ گراں ثابت ہو رہے  
تھے۔ آخر یہ تمام مرسلے بھی طے پا گئے۔ اور ستمبر ۱۹۰۷ء میں خاص گورنمنٹ کی تحریر نے حصولِ خصمت سے آرام دلایا۔  
سفر کے اخراجات اور کتابوں کی خرید کے لیے ایک مدت سے آزاد روپیہ میں اندازہ کر رہے تھے چنانچہ بنک میں دس ہزار روپیہ  
لے لیا۔ اور بنک کو ہدایت کی کہ یہ رقم کلمہ جوڑی ششما کو لا جوڑے کے منور رئیس ادا آزاد کے دوست نواب نواز علی خاں قزلباش  
نے حیلے کر دے۔ نواب توصیف نے اس کے عوض میں سوداگران ایران کے نام خط تحریر کر دیے۔  
تیسری وقت ان کی اپنی صحت سے متعلق تھی۔ خود لکھتے ہیں :-

”اعین و فون تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے جن میں سے سخت صدمہ

ایک جوان بیٹی کی موت تھی۔ جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی۔ وہ میری

تصنیفات میں میرا دامن ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور تصنیفات

کا قلم میدان الٹ گیا۔ یہاں تک کہ اکثر ہوشمندوں کو حیران کا شبہ ہو گیا۔“

اس کے علاوہ چند ادبیاں بھی لاحق تھیں۔ چنانچہ خولیش و احباب نے معینی۔ سفر کی مصیبتوں اور دشواریوں کی بناء پر  
آزاد کا ارادہ ترک کرنا چاہا۔ آپس میں بحث مباحثے ہوئے۔ آزاد علی مزدور توں کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ احباب کہتے تھے آپ تنہا کیسے  
جائیں گے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا۔ کہ انھوں نے اپنے لڑکے آغا محمد ابراہیم کو جو اس وقت سروے میں ملازم تھے۔ نوکری چھڑا کر لا جوڑ  
لا لیا مگر و صحت ملنے میں دیر لگی۔ ادھر انہیں ایک اور ملازمت مل گئی۔ اس لیے چارونا چار تنہا سفر پر مکر باندھی۔ دو سو روپیہ مجاہد کہ

اس سے پہلے (مسلحہ) بھی تو وسط ایشیا کا تنہا سفر کیا تھا۔ اور وہ بھی کس بے سروسامانی میں کہ پانچ برس تک مفقود الخیر رہا تھا۔ اور سب سے بڑا آزاد کا وہی علمی امداد: بی ضرورتوں کا احساس تھا۔ فرماتے ہیں :-

”جن مزدوروں کے لیے میں جاتا ہوں، ملک اس کا محتاج ہے۔ اور قوم کو خیال نہیں۔

لیکن چونکہ ایک عرصے کے بعد اس سے بہتر ہے کہ میں ہی اس کام کو جاؤں خصوصاً فارسی کی

جامعہ اللغات کہ بغیر فارسی میں جانے کے اس کی تکمیل اور اعتبار ممکن نہیں۔“

ایک شخص نے تو ان کے منہ پر مہاں تک کہہ دیا۔ کہ لوگ کہتے ہیں آپ کو جہنم ہے۔ مبادا جھگڑ میں یا جہان پر اس کا غلبہ ہو۔ اس وقت کیا ہو گا لیکن آزاد کی جوانی بہت نے کسی بات کی پروا نہیں کی۔ اور خدا پر تو کل کے کسے ۳۴ جزوی مسلمان کو تیار رہا۔ اور کراچی روانہ ہو گئے۔ کراچی میں ایک پرانے شاگرد ملازم مولوی عمر الدین مہدی ماسٹر سندھ مدرسہ کے ان قیام کیا۔ چونکہ ایران جانے والا جہاز ایک دن پہلے روانہ ہو چکا تھا۔ اس لیے مجبوراً ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑا۔ اگرچہ طبیعت کے شوق کو یہ ایک ایک دن کئی کئی مہینے کے برابر تھا۔

فرکانہ مقصد چونکہ ادبی تھا۔ اس لیے ہر قدم پر کانٹے اٹھانا اور نئی آوازوں پر لگے ہوئے غمے۔ کراچی کے راستے میں سکھر سے کچھ لوگ گاڑی میں سوار ہوئے۔ جب انھوں نے بات چیت کی۔ تو آزاد کے کانوں کو محسوس ہوا کہ ان کی لڑائی میں بہت سے لفظ فارسی کے سٹے ہوئے ہیں۔ اشتیاق نے مجبور کیا کہ اس کی اصل دریافت کی جائے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ مکرانی ہیں۔ وہی مکرانی جن کا ذکر کتابوں میں آزاد نے پڑھا تھا۔ اور جس کے راستے کئی مرتبہ لشکر اسلام ہند میں آیا تھا۔

کراچی سے بوشر کو روانگی

۱۸ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو عربیہ ڈاک کے جہاز میں ۱۲۶ روپیہ کرایہ دے کر آزاد دوبارہ سفر تیسرے درجے میں کر رہے تھے۔ کیونکہ دس ہزار روپے ہیں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ کتابوں پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ دوران سفر میں ایک رفیق نے جو دوسرے درجے کے مسافر تھے۔ اپنا آرام دہ کمرہ اور اس کی آسائشیں دکھائیں۔ مگر آزاد نے یہ کہہ کر دل کو تسکین دے لی۔

”اتنے روپے جمع کر کے کتابیں لے کر ایک خانہ الماری کا آباد ہوتا ہے۔ اس لیے تکلیف

مجھے آرام معلوم ہوئی۔“

کراچی سے بوشر تک دس روز کا سفر تھا۔ آج کل کے تیز رفتار سیٹھ اسے مشکل سے تین دن میں طے کرتے ہیں۔ جہاز میں روانہ ہوا اور ہر طبیعت کی طرف سے بڑا اندیشہ تھا۔ کہ ان کا مزاج صغریٰ تھا۔ مگر شوق سفر کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک دفعہ دوران سفر میں خیال بھی آیا۔ کہ خلل ہائے مذکور کا اثر طبیعت پر ہے یا نہیں۔ لیکن غور کیا تو کچھ بھی نہ تھا۔

جہاز کو آواز جا سک کے سامنے سے گزرتا۔ ..... پہاڑی سلسلہ کو دائیں ہاتھ پر چھوڑتا۔ مسقط سے پرتا ہوا منزل مقصد کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ بندر عباس پر جہاز نے ٹکڑ ڈالا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں چند نوجوان لڑکے غلوڑے۔ ناشپائیاں اور انٹے بیچنے کے لئے آئے۔ آزاد کی توجہ ان اشیاء کی نسبت نیچے والوں کی زبان پر سخی زبان کے محقق نے فوراً پرکھا کہ سب کی زبان خالص فارسی تھی۔ اور اس

سے تاج اربابوں سے ملک ایران شروع ہوتی ہے۔ ہر سفر مسافروں کے بھی لفظ لفظ پر ان کا دھیان تھا۔ آغا عبدالمکریم ایک ایرانی رفیق سفر سے ملاقات ہوئی جو سویرے براہ کراچی کر بلا جا رہے تھے۔ فارسی شاعری کا اعلیٰ شوق تھا۔ عربی بھی بولتے مگر سواصل کی۔ انگریزی بھی بولتے۔ انہوں نے بسترہ دونوں کا یکجا ہوا۔ کہ دونوں ایک دوسرے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ آخر ۱۰ اکتوبر کو ان کا جہاز بوشہر کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔

## بوشہر سے شیراز تک

بوشہر پہنچنے کے بعد آزاد کا پہلا تاثر یہ تھا:۔

”یہاں سب سے نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے تھے۔ فارسی بولتے

تھے۔ جیسے ”ہزار داستان“

زبان کی تحقیق کرنے والے اور علم زبانی کے ماہر خوب جانتے ہیں کہ اس فن کا وسیع ہر قدم پر ایک نئی بات محسوس کرتا ہے۔ حتیٰ کوئی فرقہ سناتا ہے۔ اس کے کان اسی طرف لگ جاتے ہیں کہ اہل زبانی نے اس مطلب کو کیسے ہوا کیا۔ محاذ سے میں یہ بات کیسے لے آیا۔ آزاد کا ذہن اور ان کے کان اسی تمام کیفیتوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اور سفر کی منزلیں اس شوق میں آسان ہوتی چلی جاتی تھیں۔ آزاد کے مثنیٰ کے لحاظ سے بوشہر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہاں کی زبان سند ہو سکتی تھی۔ نہ اس شہر میں علمی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ نہ اس کے باوجود کاروان کے انتظار میں آٹھ روز بوشہر ٹھہرنا پڑا۔ آخر ۱۰ اکتوبر کو ایک ایرانی راہوار کو اسے پر لیا۔ اور شام کو شہر سے کاروان میں شامل ہو گئے۔ یہ آج کل کا سفر نہیں تھا۔ کہ نو برس دن رات سرخوں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔ آج سے ۶۰-۷۰ سال پہلے یہاں سے شہر شیراز تک ہی قزاقوں اور ڈکوتوں کا خطرہ دامن گیر ہو جاتا تھا۔ اس لیے بغیر تافلے کے ایک دم نہیں بڑھ سکتے تھے۔

بوشہر سے شیراز تک تقریباً ۵۰ میل کی مسافت ہے۔ اس سفر کو آزاد نے ۹ دن میں طے کیا۔

راستے میں ہر ہفتک پہاڑوں اور گہری گھاٹیوں کو عبور کرتا یہ مافلہ جوں کی سی رفتار سے حرکت کر رہا تھا۔ کبھی کاروان میدان میں رتب کی شدت سہتا تھا۔ اور کبھی برف و باران کا مقابلہ کرتا تھا۔ جہاں کہیں تافلے نے قیام کیا۔ آزاد خورد و نوش کا سامان ہتیا کر لے لیا۔ اور کتاؤں کی دھن میں گھر گھر اور مسجد مسجد تلاش کرتے پھرتے تھے۔ کھانے پینے کی طرف سے لاپرواہی کا یہ عالم تھا کہ رات کو جبکہ پلاؤ مل گیا اسے کھا لیا۔ جو باقی بچا اسے ایک پڑیا میں باندھ کر جیب میں رکھ لیا۔ کہ خدا جانے اگلی منزل پر کچھ کھانے ملے یا نہ ملے۔

کاروانی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ آزاد نے یہاں ایک جوان عمر فاضل کو ڈھونڈ لیا۔ ان کا نام شیخ محمد تھا۔ نجف سے تھیں علم کی مٹی۔ تین شخص سعدل ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ایک شخص کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ شیخ نے یہ کتاب آزاد کو دی۔ اور کہا پڑھو۔ حال آزاد سے سنئے:۔

”میں نے کھول کر ایک جگہ سے پڑھنا شروع کیا۔ ایک لفظ پر انھوں نے ٹوکا۔ میں نے

پوچھا کہ میں غلطی پر نہ تھا۔ پھر بھی میں سوچنے لگا۔ انھوں نے خود سوچ کر فرمایا۔ کہ شاد دست

خواندیدہ۔ بخوانید“



اس طرح دیر تک امتحان لینے رہے۔ آخر فرمایا: "شما زبان عربی ماحوب و درزیدہ اید"۔ مگر اس قصبے میں کوئی کام کی کتاب ملنے نہ ہوئی۔ ایک روز کی راہ پر داشتند اردن شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کی ٹھنڈی ہوا کا جس قدر شہرہ تھا۔ اس سے زیادہ سردی آزاد کو کئی گھبرا کر گھوڑے سے کود پڑے۔ کہ دوڑ کر گرمی پیدا کریں۔ ہزار تندی پر کی مگر گھٹنوں سے پاؤں تنگ کہیں جس نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ پاؤں میں بھی خون جم گیا تھا۔ آخر کوس بھر پیدل چل کر حواس درست ہوئے۔

۶ اکتوبر کی صبح کو شیراز میں وارد ہوئے اور ایک سرائے میں قیام کیا۔ مگر سفر کی صعوبت کے بعد یہاں بھی آرام کی صورت نظر نہ آئی۔ دل شکستہ ہو کر بہتر خاک پر بیٹھ گئے۔ آخر اپنے آپ کو سمجھایا۔ گھڑی کھولی۔ کپڑے نکھائے۔ چونکہ وہ اپنی کتابوں کے انبار ساتھ لے جانے کا ارادہ تھا۔ اسی لیے گھر سے بہت کم سامان لے کر نکلے تھے۔ حد یہ ہے کہ چغندر تک ساتھ نہیں لائے تھے۔ تنقار پہنا اور شیراز کی سیر کو نکلا۔ لیکن ابتداء اچھی نہیں ہوئی۔ پہلے ہی جن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ غالباً محکمہ تلکراف میں ملازم تھے۔ اور ان کے ڈائریکٹر طمران سے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہہ دیا۔ ہمیں فرصت نہیں ہے۔ جب کتب خانہ دیکھنے کی اجازت چاہی تو بے رخی سے کہا۔ تمہیں اس سے کیا فائدہ ہو گا۔

شیراز کے ایک رئیس نواب حیدر علی خاں کے پاس پہنچے۔ وہاں بھی دعا قبول نہیں ہوئی۔ اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ جب کام ہو گا تو آنا۔ ہم مدد کریں گے۔ اصل میں آزاد کا مشن اس قدر نرالا اور سفر کا مقصد ایسا اٹوکھا تھا کہ ایرانی رئیس اور امیر زادے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ لیکن آزادان کی سردھری سے آرزوہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ اب ان کی منزل مقصود ان کے سامنے تھی۔ نواب حیدر علی خاں ہی کے دروازے پر ایک دلال سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ انھیں ایک اور شخص کے گھر لے گیا اور کتابیں دکھائیں۔ کل ۳۳ جلدیں ۲۰ روپے کو خرید لیں۔ شیراز کی سرائے سے یہ تنگ آچکے تھے۔ اس لیے کسی اور ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ آخر نرالی اکبر کے ہاں ٹھکان ہوئے۔ اس غریب زادے کی فلاکت پر بہت رحم آیا۔ ۳ روز تک اس کے ہاں قیام کیا اور اس کے صلے میں اپنے خوسے سے بہت زیادہ رستم اسے دی۔ مگر اس کے بوڑھے باپ سے جو توبہ ر تھا۔ اور بندہ نہیں بناتا تھا۔ آزاد کا دم ناک میں آ گیا۔

## ایک ایرانی امیر کی علم پروری

شیراز کے آخری دو روز نواب مرزا علی خاں صدر کے ہاں گزارے۔ اور یہاں معلومات کا سامان آزاد کو کمال و فخر کے ساتھ ملا۔ نواب جس طرح مال و دولت اور جاد و منصب سے امیر تھے۔ ایسے ہی علم و فضل اور کتب خانے کے اعتبار سے بھی امیر تھے۔ اس صاحب کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

در باد جو و دستگاہ بارات اور پیرانہ سالی کے جب دیکھو گرد کتابیں چینی ہیں۔ ایک دو ملا پاس بیٹھے ہیں۔ بیچ میں آپ ملا علی میں مصروف ہیں۔ نصیح کرتے ہیں۔ حواشی لکھتے ہیں۔ ایک خوشنویس کا تباہ ناقص کتابوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ مصروف نقاشی کر رہا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا۔ وہیں پیلو میں دسترخوان بچھا۔ اٹھنے سے پہلے مسجد شکرانہ بجالائے۔ ایک روٹی کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا۔ پھر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ گویا یہ بھی ایک فرض تھا۔ کہ

اداکر لیا پھر کتابوں کے طبع میں جا بیٹھے۔

علم ادب کے ایک سربراہ کی اس سے بہتر تصویر کھینچی مشکل ہے۔ قلاب مدد کے ہاں پارسی نامے کے مصنف حاجی مرزا حسن سے بھی ملاقات ہوئی۔ آزاد کا ذکر سنی کر قلاب کے ہاں اس سے ملنے آئے۔ ان کی شیراز سے ردا لگی میں ایک شب باقی تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ یونینیاں پڑھ رہی تھیں۔ اور رات گھر لے کر اپنے گھر لے گئے۔ اور رات گھر اپنی کمر بستہ رہے۔ آزاد نے بہت سے نکتے ان سے سنی کہ اپنی کتاب میں لکھ کر لیے۔

ایرانی شرفناکی طرز دانش کے ذکر میں آزاد، لکھنے میں کہ مکان کے ساتھ ایک سروانہ تھوڑا سا تھا۔ جو حرم سرا سے زیادہ آراستہ رہا ہے۔ اکثر محافل طبع و دست جمع ملاقات کو آئے۔ اور ظہر کی نماز پڑھ کر رخصت ہوئے۔ زیارت کو وہیں رہے۔ اور صبح کو ناشترہ کر کے رخصت ہوئے۔ اور علی محمدیوں میں ادبی تاریخی اور علمی نکتے بیان کئے جلتے تھے۔ مگر زمانے کے ساتھ اب یہ صحبتیں بھی رخصت ہو گئیں۔

شیراز کے دور میں آزاد نے۔ حافظیہ سعدیہ اور شیراز کی مشہور مسجد شاہ چراغ کی زیارت کی۔ مگر اس زمانے میں شیراز کی رونق نہ تھی۔ بڑی بڑی وسیع اور قدیم مسجدیں اور کھنڈر سے گھرے پڑے تھے۔ ان میں رٹنے صرف۔ بخود بلاغت فقہ اصول کی کتابیں سلنے۔ جو بے درد کتاب کے مسائل کتابی پر بحث کرتے رہتے تھے۔ اور علما و کتب علمیہ کی تدریس سے پرانی پڑیوں پر آب حیات چھڑکتے تھے۔ دوسرے ملک کی طرح علماء فقرہ بہ فقرہ نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ استاد کے سامنے کتاب تھی۔ طلباء اپنی اپنی کتابیں کھولے خاموش بیٹھتے اور استاد اب نے مطالب کو نہایت توضیح اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتا جاتا تھا۔

مرحوم رضا شاہ پندوی کے عہد میں شیراز کو نئی زندگی ملی ہے۔ روز آزاد لکھنے میں کہ وہ عالیشان اور سیدھا بانا۔ اور بلند اور فراخ انداز خانہ نمائے سو برس پہلے بنائی ہے۔ اگر وہاں سے اٹھائیں تو اصل شیراز ایک معمولی قصہ رہ جاتا ہے۔

خواجہ حافظ کے مراد اور اس کے قریب چیل تن اور ہفت تن کی آزاد نے بہت شوق سے زیارت کی مزار کی ابواب کو نفل کیا۔ والد آباد خاک مٹھے اور آب کر دیا دیکھ میری۔ اور سعدیہ میں جا کر گلستان بوستان کے پرانے اسباق کی یاد تازہ کی۔ شیراز کی دلچسپ نصفا۔ دست و امن پڑا۔ لیکن چارٹے کامو حکم کوہ برف لیے سر پر چلا آتا تھا۔ بڑھاپے نے خوف کے لحاف میں دھب کر کہا۔ کہ شیراز تو دیکھ لیا۔ اصفہان کو دیکھو۔ وہ آگے بڑھو کہ تلاش کی منزل ابھی دور ہے۔ شیراز کے دوست بہت درکتے تھے۔ مگر پندرہ روز کے بعد آزاد ایک قافلے ساتھ شامل ہو کر۔ اور نو مہر کو اصفہان روانہ ہو گئے۔

## سفر کا نقشہ

سفر نامے میں شیراز تک کا ذکر آزاد نے بہت وضاحت سے کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ حصہ فی الحقیقت سفر نامے یا ڈائری کی اہمیت ہے۔ علمی محنتوں کے علاوہ شیراز کے تماموں۔ وورش خانوں اور ان علماء کا ذکر جو اس شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ خاصی تفصیل سے موجود اور تمام سفر نامہ خاصی تفصیل سے لکھا جاتا تو ایرانی کے حالات اور اس دور کی ایک مکمل تصویر ہمارے ہاتھ آجاتی۔ مگر افسوس کہ اس کے بعد باہر دنیا نے شاید اس تفصیل کی اہمیت نہیں دی۔ اور تاریخ دار بیان کی جگہ مختصر فیسی نے لے لی۔ بعض جگہ فارسی میں کچھ حال تحریر نہ کیا۔ صرف کسی کا نقل نقل کر دیا ہے۔ تاکہ یادداشت کے طور پر باقی رہے۔ آزاد کا ارادہ تھا کہ اس مختصر فیسی کو پھیل کر مستقل سفر نامے کی

فصل میں پیش کریں گے۔ مگر دوسرے ادبی کاموں نے مہلت نہیں دی۔ کہ اس تصنیف کو مکمل کر لے۔  
بقایا سفر نامے کی تاریخوں اور مقامات کا معائنہ کرنے سے سفر کا یہ نقشہ تیار ہوتا ہے۔ جس۔  
ہیں۔

شیراز سے روانگی	۱۰ نومبر ۱۸۸۵ء
اصفہان میں آمد	۲۵ نومبر
(اصفہان میں قیام	صرف پانچ روز)
اصفہان سے روانگی	۳۰ نومبر ۱۸۸۵ء
طہران میں آمد	۱۰ دسمبر
(طہران میں قیام	تقریباً ۳ مہینے)
طہران سے روانگی	یکم مارچ ۱۸۸۶ء
مشہد میں آمد	۲۹ اپریل
(مشہد میں قیام	۱۲ روز)
مشہد سے روانگی	۹ مئی

ہرات میں آمد کی تاریخ کا تعین نہیں ہو سکا۔ البتہ ہرات میں قیام ۲۸ روز رہا۔ ہرات سے قندہار  
قندہار میں قیام ۵ دن تک رہا۔ قندہار سے ۱۱ روز میں کوٹے پہنچے۔ اگرچہ یہ سفر صرف ۵ روز کا  
شروع ماہ جولائی ۱۸۸۶ء میں لاہور واپس ہوئے۔

## اصفہان اور طہران

شیراز سے اصفہان تک معلوم ہوتا ہے۔ کہ اونٹ کے ذریعے سفر کیا تھا۔ مروی شباب پر لکھی۔ مگر پھر  
علم و ادب کی جستجو جاری تھی۔ ہر جگہ جا کر پوچھتے۔ اور جو اہل علم ہوتا۔ اس سے ملاقات کرتے۔ آزاد کو یہ دیکھ کر جو  
آبادی میں بھی ایک دو عالم بلکہ کہیں کہیں صاحب اجتہاد مل جاتے تھے۔ ان کی حالت پر آزاد کو تعجب ہوتا تھا۔ مثلاً  
گھاس کندہ سے پرے آتے ہیں۔ یا نہر پر کپڑے دھو رہے ہیں۔ اور کاکھر کی دیوار چن رہا ہے جب فارغ ہوئے۔ تو اس  
سبق بڑھانے لگے۔ یہ علمی فضا تمام ایران میں اٹھوں نے پائی۔ جس کی وجہ شادان سلف کی علم و ادب کی ترویج تھی۔ با  
کہا کہ تم اپنے لڑکوں کو طہران یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیوں نہیں بھیجتے۔ آزاد ہندوستان میں علوم قدیمہ  
دیکھ چکے تھے۔ اور زمانے کی روش سے واقف تھے کہ آئندہ یہ گھر لکھنؤ کتب اور درس و تدریس کے ٹھکانے زندہ نہ  
ایرانی علماء سے زمانے کی ہوابد لئے کا ذکر کرتے تو وہ ہنس دیتے۔

دوبار سفر میں ان کے پاس کھانے پکانے کا سامان نہیں تھا۔ کسی گھر سے روٹی مول لیتے۔ کہیں سے از

نے کہیں بھی گراؤوں کا نظریہ نہ کیا۔ اس پہلے انہیں بہت سی باتوں کی تحقیق کا موقع بھی مل جاتا۔ چونکہ سفر کا یہ حصہ ماہِ محرم میں طے ہو رہا تھا۔ اس لیے چارہ اندھا سوار بھی اس میں شرکت کا موقع ملتا تھا۔ ان مجالس سے فیض روحانی حاصل کرنے کے علاوہ آزاد ایرانی شہزاد کی تہذیب و ادب اور راجی بہت قریب سے مطالعہ کر سکتے تھے۔

راستے میں ایک مسافر حاجی ای کا ہم سفر ہو گیا۔ جب موہر چاک گاؤں میں منڈی ہوئی۔ تو اس بے برکت ایرانی گاؤں میں یہ دونوں کچھ خریدنے کے لیے دستک دیتے پھرے۔ حاجی کو بھی مند ہو گئی۔ کہ جب تک روٹی نہیں ملے گی۔ کوئی گھر بغیر دروازہ کھٹکھٹا کر نہیں آئے گا۔ آگے وہ پیچھے آزاد حاجی کہتے تھے۔ صاحب خانہ روٹی ہے۔ مگر میں سے کوئی بچہ نکل کر کتنا۔ نہیں۔ آزاد مہنس کر سکتے! لکھو لکھو دیکھو کتنا۔ مرغ ہے آزاد آواز لگاتے "خدا نہ کرے" آخر ایک شخص کو پیسے دکھا کر روٹی بیچنے پر آمادہ کیا۔ اس نے سواری قیمت سے کچھ خشک روٹیاں دیں۔ وہ بے کھدا کا شکر کرتے سرائے واپس آئے۔

سفر میں اس قسم کے دلچسپ حادثوں سے طبیعت کی کوفت و محل جاتی ہے۔

اصفہان کو اہل ایران نے نصف جہاں کا خطاب دیا ہے۔ آزاد بھی اس تاریخی شہر کے خوبصورت خیابان۔ بچتے ہوئے بزرگوں۔ شاندار مسجدوں اور شاہی محلات کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ زندہ رود کے جل کی تعریف کی اور اس شہر کو سلطان صفوی کی تمثالوں کا عجیب خانہ قرار دیا۔ آزاد صبح سے شام تک شہر کی سیر کرتے تھے۔ اور شام کو ٹھک کر بستر پر آپڑتے تھے۔ ملا باقر مجلسی کی قبر پر نائزہ پڑھنے گئے۔ مسجد جامع کی زیارت کی۔ یہ جگہ مہینوں رہنے کی تھی۔ مگر جاڑے کے ڈرنے پانچ دن سے نیا۔ نہ رہنے دیا۔ اب طہران نائزہ ان کے سامنے تھی۔ اور آمادہ وہیں ڈیرے ڈالنے کا تھا۔

اصفہان سے طہران کے راستے میں کاشان کے محل باغوں کی مصنوعی اور چاکرستی کی داد دی۔ ملا حسن کاشانی کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ اور قلم میں حضرت امام علیؑ کی بیٹی کے مزار کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔

## طہران کی علمی فضا

سفر نامے کی عبارت اور تاریخوں سے طہران پینچنے کی تاریخ کا تعین ۱۰ دسمبر ہوتا ہے۔ طہران کی یونیورسٹی کتب خانوں سرکاری و خانہ علمی مجلسوں کا شوق آزاد کو راستے میں کہیں سالس لینے کی محنت نہیں دیتا تھا۔ دوسرے جن اغراض کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ پوری ہوتی تھیں۔ افسوس کہ اس شہر میں تین پینچنے کے قیام کا پورا حال دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ معلوم ہوتا کہ کہاں کہاں انہیں علم کی جستجوئے گئی۔ البتہ اپنے لکچر میں اتنا حوالہ ضرور دیا ہے کہ کتابوں کی تلاش اور جامع لغات فارسی کے بے سرمائے کی باتانندہ جستجو شروع کی۔ اور سب سے پہلے شہزادہ فرہاد مرزا کے حضور میں پہنچے۔ جو شاہ ایران کے چچا تھے۔ سلطنت کے پیچیدہ معاملات انہی کی صلاح سے طے پاتے تھے۔ کئی عالم سرکاریں کر رہے تھے۔ جو ہر وقت علمی ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ تحقیق انفاذ کے سلسلے میں ان کے صاحبزادے احتشام الملک بھی آزاد کی مدد کی۔ یہ یورپ کے علوم جدیدہ کی تحقیق کے بعد طہران آئے تھے۔ اور سب سے پہلے بوسہ دے تھے۔ ان کی مداخلت سے آزاد کی رہائی دوسرے علماء اور امرا تک ہوئی۔ جن امراء کا آزاد نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ سب مغربی علوم کے ماہر تھے۔ اور ان میں سے اکثر شاہزادے پیرس اور برلن سے ڈگریاں لائے تھے۔ اصل میں اس وقت ناصر الدین شاہ قاجار کی سیاحت

یورپ کی وجہ سے اہل اوقاف میں بھی مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اور ایرانی تہذیب پر مغربی کلچر اثر کر چکا تھا۔ بہت سے امیرزادوں نے آزاد کی تحقیق، الفاظ میں مدد کی۔ اور اپنی مروت، محبت اور محنت سے آزاد کو خیرید لیا۔

اس زمانے میں فارسی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کرنے کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس نے خود پہلوی عہد میں پہلا لنگہ آزادی کی تحریر سے جڑا ہے کہ اس خیال کے زبردست حامی مرزا رضا خاں افشار بگشا اس وقت بھی طهران میں موجود تھے۔ انہیں حکومت کی طرف سے دیرینہ دیر کا خطاب ملا تھا۔ اس کے علاوہ ٹکی اور فرخ مجو خوب بولتے تھے۔ مرزا رضا خاں کا خیال تھا کہ فارسی زبان سے فوری عربی لفظوں کو خارج کر دینا چاہئے۔ اور اس کی جگہ فارسی قدیم جاری کرنی چاہئے۔ آزاد کو ان کے مقصد سے ہمدردی تھی۔ لیکن طبعی کام سے اختلاف تھا۔ آزاد کہتے تھے کہ علماء و جمہور کا اثر تمام ایران پر اس وقت جما ہوا تھا۔ اس خیال کی مخالفت کریں گے۔ اور عوام چونکہ اس مطلب کو سمجھتے نہیں۔ اس لیے ان کی تائید بھی میسر نہیں آسکتی۔ اگر تمام تصانیف اور عام سرکاری کاروائی اس نئی زبان میں ہونے لگی تو ہیکل گھبرا جائے گی۔ کیونکہ صدیوں لفظ فارسی کے اب لوگ بھول چکے ہیں۔ اور ان کی جگہ عربی الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔ ہزاروں کے لیے لفظ عربی موجود ہیں۔ مگر مستعمل نہیں۔ اور بہ نام ممکن ہے کہ ان کے ادب کے لیے ہر شخص ڈکشنری سے مدد لے۔

آزاد نے رائے دی۔ کہ جہاں تک ہو سکے الفاظ عربی کی جگہ فارسی الفاظ رکھو۔ اور وہ دیکھو جو خاص و عام کے کافوں کو اب بھی فاضل ہیں۔ پس عربی لفظ کی جگہ اصل لفظ فارسی کا نہ لے۔ وہاں فی الحال عربی رہنے دو۔ یا مطلب کو کسی اور پہلو سے فارسی کے مانوس لفظوں میں ادا کرو۔ آزاد کی رائے تھی کہ ہمیں اس بارے میں اخبارات سے بھی مددینی چاہئے۔ اور شاہ ایران تک اس بات کو پہنچانا چاہئے۔ کیونکہ بغیر سرکاری امداد کے یہ کام ممکن نہیں تاکہ شاہی تصانیف میں اس بات کا خیال رہے۔

آزاد کو شکایت ہے کہ طهران میں کوئی شاعر با لا استقلال نہیں۔ اصل میں فارسی شاعری قافی پر ختم ہو چکی تھی۔ آزاد نے اس کی وجہ یہ کہی ہے کہ جس قدر تہذیب بڑھتی ہے شاعری گھٹتی ہے۔ دوسرے شاہ اور اہل دربار پر یورپ کا اتنا غلبہ چڑھا ہوا تھا کہ ہر شاعر کی نسبت علوم و فنون کے زیادہ خواہاں تھے۔ پھر اہل دربار کسی کی امیر پر شاعری سے نکاح کرتے۔ آزاد دو چار شاعروں سے طهران میں ضرور ملے۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ شاعروں کی ساری خوشحالی بعض امراء کی قدر دانی سے پہنچی جاتی ہیں۔ نہیں تو اللہ ہی اللہ ہے۔

طهران کی علمی صحبتوں میں سہ ماہیہ تک آزاد کا خوب جی لگا رہا۔ مگر شوق کی پیاس کسی طرح نہ بجھتی تھی۔ اور دل اس سرچشے سے سیر نہیں ہوتا تھا۔ سہ ماہیہ غرض خوب محنت اور مصروفیت میں گزری۔ طهران میں ٹھہرنے کا بہانہ سردی کا موسم بھی تھا۔ آخر جب مارچ کا مہینہ آیا۔ اور ہمارے ایران کی سرزمین پر شکمہ اُٹارا۔ تو آزاد بادلِ نخواستہ طہری سے رخصت ہوئے۔ اب ان کی چھٹی بھی ختم ہو چکی تھی۔ اور ہر روز تنخواہ جس سے پام روپے کٹ رہے تھے چنانچہ جب آخری بروٹ باری ختم ہوئی۔ تو یہ شوق کا زارِ راہ اور عقیدت کا کارواں باندھ کر مشهد مقدس روانہ ہوئے۔

## واپسی

سفر نامے کے مطابق طهران سے مراجعت کی تاریخ کا تعین تقریباً یکم مارچ کو ہوتا ہے۔ طهران میں سہ ماہیہ تک رہنے اور علمی مجالس میں منہمک رہنے کے بعد آزاد پھر فارسی زبان کا ایسا جادو چلی گیا تھا کہ ان تاریخوں میں سفر کی یادداشتیں انھوں نے فارسی زبان میں

مہمان سے شہد جانے کے لیے آزادانہ رہا۔ بلکہ صرف ضروری بارداشتوں کے خورے ہیں۔  
 مہمان سے شہد جانے کے لیے آزادانہ رہا۔ بلکہ صرف ضروری بارداشتوں کے خورے ہیں۔  
 مہمان سے شہد جانے کے لیے آزادانہ رہا۔ بلکہ صرف ضروری بارداشتوں کے خورے ہیں۔

اس ہمدی سفر کی یادداشتوں میں جا بجا مشہور مقامات کا ذکر ہے۔ ہر مقام پر جس میں بزرگ کا مزار ہے۔ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔  
 ہر مقام پر جس میں بزرگ کا مزار ہے۔ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔  
 ہر مقام پر جس میں بزرگ کا مزار ہے۔ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

سبزوادی کے بعد خشیالور کی مردم خیز سرزمین کا ذکر آزادانہ بہت محبت سے کیا ہے۔ اس وقت جو شہر فاس شہر میں آباد تھے ان  
 شہر میں ان کے نام اور خاندانی شجرے لکھے ہیں۔ شیخ فرید الدین عطاء کے مزار پر فاختہ پڑھی ہے۔ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں کے نام  
 جو رہا نہت کے ہیں۔ مگر اس کی عظمت کے مقابلے میں اس کی اس درجہ بڑی حالت اور کھنڈر دیکھ کر آزادانہ پڑے۔  
 حضرت بابا یزید بسطامی کے وطن بسطام کی محبت نے آزادانہ راستے سے ہٹ کر اپنی طرف کھینچا۔ لیکن اب وہاں فقط ایک گاؤں  
 آباد رہ گیا تھا۔ آزادانہ اسے بھی دیکھا۔ مگر سب سے زیادہ حیرت انہیں بالاجیا بانی کے ایک چبوترے کو دیکھ کر ہوئی۔ اس چبوترے پر ایک  
 بڑا ترانہ نصب تھا۔ اور پاس نادر کشور پڑے سوتے تھے۔

اگرچہ ہمارا کام موسم شروع ہو چکا تھا۔ مگر فرامان میں برفت باری جاری تھی۔ ایک جگہ پر تکلیف اٹھانی پڑی۔ برفت آباد ہو گیا۔ راستہ تمام سفید تھا۔ اور عالم گیر برفت برس رہی تھی۔ آخر مشہد مقدس کا قصبہ دور سے نظر آیا۔ اور آزاد کی عقیدت مند آنکھیں مامور کے حصہ میں غم ہو گئیں۔ فوراً گھوڑے سے اتر کر زمین چھوئی۔ آزاد کے والد کو نام خاص سے جو عقیدت تھی۔ اس کا ذکر آزاد نے کیا ہے اور کھد ہے کہ مولوی محمد باقر امام اکثر ایک قصبہ پڑھتے تھے۔ جس کے تیسرے شعر میں طرق کا ذکر ہے۔ جب آزاد طرق پہنچے۔ نوادہ شعر یاد آ گیا۔ اسی کی زبانی آزاد نے سنا تھا۔ کہ یہ نصیرہ حضرت کے روح مبارک کے ایک دروازے پر آویزاں ہے۔

یارب ایں ارض مقدس چہ مقام است و چہ جاست  
کہ زمین تابہ ملک عظمیٰ الخوار خدا است

مشہد مقدس کی زیارت سے سرفراز ہونے کے علاوہ روضہ مبارک سے ملحق کتب خانے کی فہرست بھی مہتیا کی۔ آزاد کے بیان کے مطابق یہ لائبریری کتب عجیب و غریب سے علوم و فنون کا خزانہ ہے کیونکہ سلاطین و امرا نے ملحق نے عمدہ عمدہ نایاب کتابیں جمع کر ذخیرہ آخرت جمع کیا ہے۔ مشہد کی تہذیبی حیثیت اس کے خصوصیات خیالوں اور آب و ہوا کی لطافت سے بھی آزاد بے خبر نہیں۔ ایک جگہ یاد میں انکو دکن کا خوشہ آویزاں دیکھا۔ ابھی انکو کام موسم شروع نہیں ہوا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ گزشتہ سال کے انکو میں گرجے سے مر جھا گئے تھے۔ مگر بعض ان میں سے صاف اور درست تھے۔ یہ مشہد کی آب و ہوا کی تاثیر تھی۔

ہارون رشید کی قبر و کیمی علماء میں شیخ بہاؤ الدین املی۔ شیخ حمزہ علی۔ شیخ طبری کے مزار پر گئے۔ اور کتبے نقل کئے۔ طبع بہائی کے مزار پر کئی مرتبہ حاضر ہوئے۔ شعرا میں فردوسی اور اسدی۔ طوسی کی قبروں پر گئے۔ اور اس مقدس مقام پر ۱۲ روز بھر کرم و ملی کی طواف قدم اٹھایا۔

مشہد سے ہندوستان آنے کے دو دستے ہیں۔ ایک کرمان جوتے ہوئے بندر عباس پہنچتا ہے۔ جہاں سے پھر مہاجرین ملے کر کوہ پیو آسکتے ہیں۔ اور دوسرا بہرات اور قندھار سے کوہ کی منزل پر ختم ہوتا ہے۔ غالباً اس وقت تک وہ راستہ دریافت نہیں ہوا تھا۔ جس پر آج کل کوہ سے مشہد تک ناٹروین سفر کرتے ہیں۔ آزاد نے بندر عباس کے راستے کو طوفانی سمجھا۔ وہ سب اس راہ پر جانے والا کوئی کاروان نہیں تھا۔ اور اب شخصیت ختم ہو جانے کی وجہ سے واپسی کی جلدی تھی۔ اس لیے مجبوراً بہرات اور قندھار کی راہ اختیار کی۔ کچھ لوگوں نے کہا بھی کہ راستے میں افغانوں کی طرف سے خطر ہے۔ اس لیے سودا گروں کو بندر عباس کے راستے آنے جاتے ہیں۔ مگر ایک گروہ نے رائے دی کہ اب امیر عبدالرحمن سے افغانستان کا بندہ بےست ایسا چست اور درست کیا ہے کہ آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ آزاد امیر عبدالرحمن کے عدل اور انتظام پر یقینی کر لے تو کوئی بخدا اس راستے سے مٹی کے پہلے پہنچتے ہیں روانہ ہو گئے۔

دوسری منزل خیبر پانی میں ایک فاضل ملا محمد علی کو دیکھا کہ اپنے لڑکے کو تشریف لے کر لاہور دے رہے ہیں۔ لڑکے کی عمر چار برس کی تھی۔ آزاد کو یہ دیکھ کر بہت لطف آیا کہ سبق پڑھ کر لڑکا کاٹھا۔ اور مختصر ڈیر بعد کھینے کے لیے گھر کی دیوار پر چڑھ گیا۔ علماء کی سادہ زندگی اور علماء کی بے تکلف زندگی کان کے دل پر بہت اثر پڑا۔

تیسری منزل سے روانہ ہوئے۔ تو بغول ان کے نیند نے شجوں مار دیا اور نٹ پر اونگھنے لگے۔ اور لڑکے کو سر کے بل زمین پر آن کرے۔ خدا کی قدرت سراپا بال بنگ گیا۔ زیادہ تر پشت اور سینے پر صدمہ پہنچا اور پسلی ٹوٹ گئی۔ سارا بچنے زمین پر سے اٹھا پھر لمحات میں

بیت کو دنٹ کی کمر باندھی سے جکڑ دیا۔ سب کو خیال تھا شاید مگر گئے صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر دستہ کھولا اور آواز دی تو انہیں ہوش آیا۔ انہیں دن عجیب حالت رہی۔ نہ کوئی صبح اور نہ عکیم۔ قدرت الہی نے جماعت کی ادھر سیلی آپ ہی جگہ کر ابھی ہو گئی۔ مگر اس کی گرجاتی رہ گئی یہ بانی مردم کے ساتھ رہی۔

اب شمس بہت کے ویرانے۔ سلاطین تیموری کے قدیم آثار اور مساجد کے کتبے دیکھتے آناؤ قافلے کے ساتھ قندھار کی دونوں حصے جا رہے تھے۔ ہرات کی ایک مسجد کے اندر نہایت عمدہ خط و ثلث میں کوئی فرمان لکھا دیکھا۔ کوشش کی کہ اس کو پڑھ کر نقل کر لیں۔ مسجد کے اندر چند خوشنویس اور فلاجھروں میں بیٹھے تھے۔ ان کے دیکھ کے مارے غور سے نہیں دیکھ سکے کہ کہیں کوئی چھانڈھوٹک دیں۔ درخت میں جان جائے کیونکہ ان کے نزدیک گائے اور آدمی کا کلا ٹاٹا برابر ہے۔ فقط اتنا کہ دینا کافی ہے کہ ”آدم پرنگی (فرنگی) بود کا پر (دغا) بود کہ میدان ذکر گشت است“

اسی فوارح میں مولانا جامی اور ان کے استاد مولانا محمد والدین۔ امام غفر اللہین رازی۔ اور محمد حسین واعظ کاشفی کے مزارات پر فاتح پڑھی۔ یہ وہی محمد حسین واعظ کاشفی ہیں جن کی انوار سہیلی آزاد بچپی میں پڑھ چکے تھے۔ یہاں بھی علماء کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ وجہ بزرگ سے اس کی علمی قابلیت اور فضیلت کا حال نوٹ کر لیا۔ جو قابل ذکر نہیں تھے۔ ان کے متعلق صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

”بانی علماء بسیارند مگر قابل شمار نیستند“

قریب ہی مولانا جامی کے استاد شیخ جام کے مزار پر عقیدت کے چول چڑھائے۔ اور سلطان سجر کے نامکمل مزار کو شاہ عباس صفوی کے عقول مکمل ہوتے دیکھا۔

کارنیر کے مقام پر ایک پیر مرد سے ملاقات ہوئی۔ اس کے پاس دو نایاب کتابیں تھیں۔ مگر وہ کسی قیمت پر کتابیں دینے کو تیار نہیں تھا۔ آزاد کے پاس ایک ہاتھی دانت کی ٹکڑے کافی تھی۔ اس پر پیر مرد کی مال ٹپک پڑی۔ آزاد سرے دانی کے بدلے کتابیں لے کر خوش خوش روانہ ہو گئے۔

سفر میں جب کبھی بارش ہوتی تھی۔ سب سے پہلے انہیں اپنی کتابوں کا خیال آتا تھا۔ ایک مقام پر اس دور کی بارش ہوئی کہ اٹ پھینے لگے۔ قافلے والوں کو مجبوراً پڑاؤ کرنا پڑا۔ سردی کے مارے دم بند ہوا جاتا تھا۔ دوسرے مسافر بارش سے بچنے کی تدبیر کر رہے تھے۔ مگر آزاد نے بوجھ آگے پیچھے ادھر سے لگا کر کتابوں کو محفوظ کیا۔ اور پانی سے بچاؤ کے لیے ان پر موٹے موٹے گدے ڈال دیے۔ اور خود تو مکمل بخدا بیٹھ گئے۔

آگے جبل کو چھ بارش ہوئی۔ اگرچہ سردی اور ہوا کی طرف سے جہانی تکلیف تھی۔ لیکن کتابوں کی طرف سے روحانی تکلیف کا احساس تھا۔ خدا خدا کر کے اگلی منزل پر پہنچے۔ اس موقع پر بھی آزاد کی افشا پردازی کا دور کم نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں :-

”در رفیقوں نے یہاں بھی کار سازی کے ادنٹ بٹھائے۔ اور ہاج گروی کی آنکھوں

میں ایسی خاک ڈالی کہ ادنٹ لاد پھانڈ کر ادھر ادھر پر فائسب کر دیا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی“

افغانستان کی سردیوں میں داخل ہوتے ہی پروانہ ماہداری کی شدت سے پڑنا شروع ہوئی۔ ہرات میں نائب کو تو ال انہیں



سپہ سالار کے سامنے لے گیا۔ آدھ دن وہ پروانہ دکھایا۔ جو مشہد میں افغانستان کی حکومت کے نمائندے سے انہوں نے حاصل کیا تھا۔ افغانی سپہ سالار غالباً ان پڑھ تھا۔ کسی اور سے پڑھ کر سنا۔ اگرچہ اس پر ہر لگی ہوئی تھی۔ لیکن سپہ سالار نے پوچھا۔ کہ کیا یہ مبراصلی ہے۔ آزادانہ نے برجستہ جواب دیا۔

”محضور کے سامنے سند اعلیٰ کو پیش کرتے ہوئے ہاتھ کاٹتے ہیں۔ جلی کاغذ کو ان پیش

کر سکتا ہے۔ اس جواب سے خوش ہو کر سپہ سالار نے کہا۔ بہت خوب نام روانہ ہو جاوے۔“

ارباب حکومت کی سختی کے علاوہ ہرات کے باشندوں کا سلوک بھی تکلیف دہ تھا۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک درسیا ہی سے لے کر بوڑھے عورت تک ہر شخص سوال کرتا تھا۔ اور پھر آنکھیں بدلتا تھا اور کہتا تھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ کیوں آئے ہو۔ کس رستے آئے ہو۔ کیا لائے ہو۔ کہاں کیوں لائے ہو اور اتنی کتابیں کیوں لائے ہو۔ انہیں کیا کر دے کہ یہ کیا کیا کتابیں ہیں۔ کس کس علم کی کتابیں ہیں۔ تم اس راستے کیوں آئے ہو۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ کس رستے جاؤ گے۔ اس رستے کیوں جاتے ہو؟

یہ سب سوالوں سے آزاد کا ناک میں دم لگ گیا تھا۔ غور ملک۔ اجنبی ماحول۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکتے تھے کہ کہیں اور آفت بر نہ پھنس جائیں۔ جاسوسی کا الزام نہ لگ جائے۔ کفر کا فتوے لگا کر گروں زونی نہ پھرائیں۔ دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا کر رہ جاتے۔ سناں ایک بکری بھاڑتی مگر قائد نہ ملنے کی وجہ سے ۴ روز گزر گئے۔ ہرات کی سخت گیر لوگوں سے تنگ۔ آکر آزاد کو ایرانیوں کی محبت اور ان کی مہمان نوازی یاد آگئی۔ کس خلوص سے لکھتے ہیں۔

”ہزار رحمت ہے ملک ایمان پر کہ مہینوں وہاں رہا۔ جا بجا پھرا۔ اور سب سے ملا جلا۔“

بر قسم کی بات پوچھتا تھا۔ اور لکھتا تھا وہ بتاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ کسی بات کا شہرہ دل میں نہ لاتے تھے۔“

## ہرات کے قندھار اور کوٹے کو روانگی

غالباً جون کے مہینے میں ہرات سے ہزار وقت آزاد روانہ ہوئے۔ ہرات سے قندھار ۲۰ ایام منزل کی مسافت تھی۔ اور یہی سمجھ کر آزاد اس راستے سے آئے تھے۔ مگر یہ سفر پورے ۲۶ دن کا تھا۔

یہ علاقہ تمام ایرانی ہے۔ باشندے صحرائی ہیں۔ جہاں پانی دیکھتے ہیں۔ کھلناں کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایران کے سبزہ زاروں اور پُر لطف باغات کے بعد اس صحرا کو دیکھ کر آزاد کا دل اور بھی اچاٹ ہوا ہو گا۔ آزاد کے قافلے میں ۴۰ نفر تھے۔ اس لیے قافلے میں جو ہر میدان اور آب و ہوا میں سفر کرتے تھے۔ راہ بھوڑ کر ادھر نکل جاتے تھے۔ اور خواہ مخوڑی سی مسافت طے کی ہو۔ ہری گھاس دیکھتے ہی منزل کر لیتے تھے۔ ہر مسافر نے اپنے ساتھ کھانے کا تو شہ بانڈھ لیا تھا۔ جہاں صحرائیں تھیں۔ ان سے آٹا۔ گھی اور گھوڑوں کے لئے سولے پلتے۔ اس علاقے میں۔ پہلے پہلے کا رواج نہیں۔ چرواہوں کا آپس میں مبادلہ ہوتا ہے۔ آزاد نے بھی اپنے ساتھ سواہل اگٹا نے۔ ٹنگیوں۔ سرور۔ کالی مرغیں۔ رزق و غیرہ خرید کر رکھ لی تھیں۔ انہی چیزوں کے بدلے میں روٹی، دودھ، پھل اور گھی وغیرہ مرل لے لیتے تھے۔ ان کے پاس پکانے کا سامان نہیں تھا۔ اس لئے بہت سی روٹیاں کپوا کر رکھ لی تھیں۔ یہ پانچویں دن سفر گزیرا۔

نہیں نکلیا۔ ایک جگہ کہ چاہانی میں بیٹھ گیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ جب کچھ اور نہ ملتا تھا۔ تو ۱۰-۱۵-۱۵ دن کی سوکھی روٹی پانی کے گھونٹ سے  
 کھاتا۔ کھانے کو کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔ کہ تا پاک ہو جائے گی۔ کئی لوگ پھر لے کر مارنے کو کھڑے ہو گئے۔ کہ کافر  
 ہے۔ لیکن اب یہ کسی کو دودھ، وہی وغیرہ کھانے کی چیزیں دیتے تو بے بیٹے اصل میں ان کی سختی کسی خاص سبب سے نہیں جانتے  
 تھے۔ ہندوستان کے لوگ مذہب کے واسطے ہیں انہیں جس طرح ہو سکے وہاں دبا کر۔ دیر لینا چاہئے اور بہانہ ہاتھ آجائے تو مارنے میں بھی دریغ  
 نہیں کرنا چاہئے۔

قندہار پہنچ کر بھی یہ مصیبتیں ختم نہیں ہوئیں۔ یہاں پانچ روز گزارنے مشکل ہو گئے۔ ہر رات کی طرح قندہار میں بھی راء چلتے لوگ  
 آتے اور کہتے۔ ”بیابیا.....“

ایک دن چل کر آزاد کو بازار میں حسب معمول ۲ آدمیوں نے روکا۔ اور وہی سوال کیا کہ کہاں سے آئے ہو۔ ان کا دل جلا ہوا تھا۔  
 انہوں نے جس طرح ان دونوں کو آڑھے ہاتھوں لیا۔ اس کا دلچسپ حال آزاد سے ہی سُنے۔  
 انہوں نے کہا: ”ازہند آمدہ ام، بازہند میروم“  
 ”چرا آمدی؟“

”تو بگو کہ چرا می پرسی؟“  
 ایک شخص نے بازو پکڑ کر کہا: ”نہیدانی مائی تو اینم تہا بکریم پیش امیر صاحب بریم۔ توہا سوس فرنگ ہستی“  
 آزاد بولے۔ ”خیلے خوب۔ ماگو نیم۔ امیر صاحب مسافر مستقیم، بلکہ شہا آدمیم۔ ننگ شہا سا خور و نیم۔ آرام  
 یا ققیم، دعا کی کنیم می رویم۔ اس ہا ہستند کہ حالہ بخیر خواہی شہا دم می زند۔ فوج فرنگ می آید۔ و در  
 روی روند نوکر می کنند۔ یک تخم مرغ بہ ہر یک ماکیاں بہ علی می فروشدند۔ بازو قلیک..... می آید۔  
 بکھر شہا فتویٰ می نویسند“

آزاد کی ان سچی باتوں کو سن کر دونوں افغان گھبرا گئے۔ اور ایک دوسرے سے کہا۔ ”مگم کنید؟ اور آزاد سے کہا۔  
 ”بروہ آزاد اپنی فتح کو اس آسانی سے ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ ایک چاکہ اور لگایا۔ پوچھا۔

”حالہ اینم بغرما ئید کہ اسم شریف شہا چیست؟“  
 ایک تیسرے شخص نے ان سے پوچھا۔ ”ایں چہ ہلاست؟“  
 انہوں نے تنگ آ کر کہا: ”ہماں خرس است کہ من میگندیم او منی گزاروہ“

قندہار سے کوٹے تک کا کراہیہ دس روپیہ تھا۔ آزاد قندہار سے عاجز آگئے تھے۔ اس لیے اس کی جگہ بارہ بیٹے  
 دے کر سواری کر لے پری۔ اور پانچ روز کا راستہ ۱۱ دن میں طے کیا۔ اور کوٹے پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس زمانے میں کوٹے  
 ننگ ریل کی لائن نہیں بنی تھی۔ اس لیے کوٹے سے راولپنڈی تک ابھی سفر باقی تھا۔ سفر کی یہ آخری منزل کس اہتمام سے طے کی  
 اس کا ذکر بھی آزاد ہی کے لفظوں میں سنئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہفت خوان رستم طے کر کے الف میل کے سیار کی طرح اپنے

محبوب کو ساتھ لیے منزل پر پہنچ رہے ہیں۔

”دوسرے دن ایک چھکڑا کر یہ پر کیا۔ اس میں کتابیں لادیں۔ اور آپ بچھونا بچھا کر

اور پر بیٹھا۔

## سفر نامے کے متعلق رائے

سیر ایران نام کی جو کتاب اس وقت بازار میں ملتی ہے، اس کے پہلے حصے میں آزاد کا ایک کچر ہے، جہاں انھوں نے ۲۵ جولائی ۱۸۷۸ء کو لاہور میں دیا تھا۔ غالباً یہ تقریر انھوں نے پہلے سے لکھ لی تھی۔ اسے اخبار رفیق ہند نے شائع کیا۔ کچر کتاب کے ۳۴ صفحات پر حاوی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ان کا سفر نامہ ہے جو ۱۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کچر میں بار بار آزاد نے سفر نامے کا حوالہ دیا ہے۔ اور اکثر مباحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیا ہے کہ ان کی تفصیل سفر نامے میں پیش کریں گے۔ موجودہ سفر نامہ جو سیر ایران پر چھپا ہے آزاد کی یادداشتوں اور ان تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو دوران سفر میں یہ لکھتے رہے۔ سفر کے ابتدائی حصے میں بہت سی باتوں کی تفصیل ہے۔ مثلاً لاہور سے کراچی کا سفر۔ کراچی میں ایک ہفتہ قیام۔ کراچی سے بوئٹہ تک جہاز کا سفر اور بوئٹہ سے شیراز تک کی سیاحت یہ تمام حال سفر نامے میں خاص تفصیل سے موجود ہے۔ لیکن جوں جوں سفر بڑھتا گیا۔ اور دوسری مصروفیات پیدا ہوتی گئیں۔ سفر نامے کی طرف سے آزاد کی توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ طہران کے شہروں اور مشہر مقامات پر پہنچنے کی تاریخیں بھی موجود ہیں۔ لیکن طہران میں ۳ مہینے کے قیام کے متعلق کوئی تفصیل بیان نہیں ملتا۔ ہندوستان سے پہلے تھے۔ تو تھسی اور قمری دونوں تاریخیں ڈالے جاتے تھے مگر بعد میں صرف قمری تاریخیں نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ ایران میں قمری تاریخوں کا رواج تھا اور سفر کی مصروفیت میں قمری تاریخوں کے ساتھ شمسی تاریخوں کا مہیا کرنا مشکل ہو گیا۔ طہران سے روانگی کے بعد مشہد پہنچنے تک کا حال بہت مختصر ہے۔ یہ سفر انھوں نے میرے حساب سے تقریباً دو مہینے میں طے کیا۔ حالانکہ طہران سے مشہد کی مسافت ۹۰ سے زیادہ نہیں۔ سفر نامے میں ۲۴ جمادی الاول (یکم مارچ) طہران سے شاہ عبدالعظیم جانے کی تاریخ لکھی ہے۔ ہم ۲ کو ابوان کی قشتلاق میں قیام کیا ہے۔ اور ۳ جمادی الاول کو ابوان کا نام نظر آتا ہے۔ اس کے بعد کسی شہر کا حال نہیں ملتا۔ البتہ چند شہروں کی مسافتیں درج ہیں۔ اگر یہ مسافتیں سفر کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ اصفہان کے راستے قزوین گئے۔ اور وہاں سے ہمدان کا سفر کیا۔ ہمدان سے سبزوار کس راستے گئے۔ اس کی کوئی خبر نہیں دی۔ کچر میں بھی حیرت ہے کہ ہمدان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن طہران کی روانگی سے مشہد پہنچنے تک ۲ مہینے کا طویل عرصہ اس بات کی کافی شہادت ہے کہ یہ ہمدان ضرور گئے تھے ورنہ یہ سفر اتنے دن میں طے نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مشہد سے روانگی کی تاریخ کا تعین بھی ممکن ہے۔ لیکن اس کے بعد کہیں تاریخ کا حوالہ نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی خوبصورت سرزمین سے افغانستان کی بے آب و گیاہ سرزمین پر داخل ہونے کے بعد ان کا مقصد صرف ہندوستان پہنچنا رہ گیا تھا۔ دوسرے قدم قدم پر تکالیف اور مشکلات کا سامنا تھا۔ اس لیے سفر نامے میں سوائے ان تشکایتوں کے یا چند ضروری یادداشتوں کے بے حد اختصار سے کام لیا ہے۔

کچھ کی زبان اور انداز ہی ہے۔ جو آزاد کی دوسری تحریروں کا طرز امتیاز ہے۔ اگرچہ دل ہی جانتا ہے کہ ایران کا ذکر اسی سلف اور ملت سے کیا جاتا۔ جو ہمیں مخدیان فارس کے دوسرے حصے میں ملتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ سفر کی کسل اور مکان ابھی دور نہیں رہی تھی۔ اور احباب کا تقاضا تھا۔ اس لیے جلدی میں یہ لکچر لکھ لیلو دوسرا قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر آزاد نے بغیر کسی تحریر ہی مدد کے کی تھی۔ اسرار نویسوں نے نوٹ لے کر اسے اخبار میں چھاپ دیا۔

سفر نامے کا ابتدائی حصہ حبیب کا اور پڑ کر کیا جا چکا ہے۔ تفصیل ہے اور اس کی زبان میں بھی بنے بکھنے کے ساتھ انشاء پر دازی کا رنگ موجود ہے۔ لیکن بعد میں جہاں مختصر نویسی نے مسخوں کا بیان چند فقروں میں ادا کیا ہے۔ وہاں انشا کی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ لیکن اس انداز ہوتا ہے کہ جو مطالب اس اختصار سے لکھے گئے ہیں۔ انہیں لکھنے والے نے اس خوبی سے لکھا ہے کہ بعد میں اس سے دفتر تیار ہوں گے۔

## سفر نامے کی تاریخی اہمیت

سیرا ایران کنی لحاظ سے ہماری زبان میں ایک دلچسپ اور قیمتی سرمایہ ہے۔ اول تو یہ پہلی اور آخری کتاب ہے کہ جس کی مدد سے ہمیں آزاد کی اپنی تحریر سے ان کی زندگی کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ مشکل سے ۹ جہینے کی خود نوشت سوانح ہے۔ لیکن آزاد کی زندگی کے متعلق داخلی شہادتیں اس قدر کم باب ہیں کہ اس بیش بہا مواد سے ہمیں بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ان کا علمی ادبی تجسس۔ تحقیق کا شوق۔ غالب علما نے زندگی۔ علماء اور فضلاء کی صحبتوں سے فیضان حاصل کرنے کا شوق یہ سب باتیں سیرا میں سے ہمیں پہلی مرتبہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ آزاد کے مذہبی اعتقادات۔ آل عباس سے والمانہ عقیدت اور بزرگان سلف سے محبت ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی خوب روشنی پڑتی ہے۔

آزاد نے سیاحت ایران جن مقاصد کے پیش نظر کی تھی۔ یہ اپنی جگہ ایسے بلند اور اعلیٰ مقاصد ہیں کہ انہیں ادبی سیاحتوں و تہمت میں بہت اوجھلے درجے کا استحقاق دیتے ہیں۔ ۵۵ برس کی عمر میں جب کہ صعب مزاج اور احباب انہیں آرام کی صلاح دے رہے تھے۔ ایک مشکل اور زبردست مہم پر مکر باندھ کر جو ان کی جیسی ہمت کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ وطن کی محبت اور اہل وطن کی بہنوی انہیں ہر وقت دھیان ہے۔ جب احباب ان کی دلیلوں سے فائل نہیں ہوتے تو یہ کہہ کر انہیں خاموش کرنا چاہتے ہیں۔ ”میں مزدوروں کے لیے میں جاتا ہوں۔ ملک ان کا محتاج ہے۔ اور قوم کو خیال نہیں۔ لیکن ہو گا۔ ایک عرصے کے بعد۔ اس سے بہتر ہے کہ میں ہی اس کام کو کر جاؤں“

یہ فقرے صرف ایک انشاء پر داز یا ادیب کے نہیں۔ بلکہ ایک غم خوار مصلح اور ماہر تعلیم کے ہیں۔ جو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے بہت مدت سے جو کچھ خدا دیتا۔ اس میں سے کم خرچ کرتا۔ خانہ برداروں کی طرح گزراں کرتا اور صرف اپنے مبارک ارٹے سے خائے دل روشن کرتا تھا۔ آزاد کی اصلاحی کوششیں جدید نظم اور نو کی بنیاد ڈالنے کے بعد سے تمام ملک پر روشن ہو چکی تھیں۔ تعلیم نسواں اور دوسری اصلاحی تحریکوں میں بھی آزاد پیش پیش تھے۔ مگر ان کی اصلاح صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہی۔ ایران کے دیہات میں جب مالوں اور فاضلوں کو گمنامی کی زندگی مہر کرتے دیکھتے۔ تو انہیں اپنی اولاد کو طہران یونیورسٹی میں تعلیم دلانے کا مشہدہ دیتے۔ آزاد

ہندوستان میں مغربی اثر کا بڑھنا ہوا اقتدا اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے۔ ان کے سامنے دہلی کی قدیم عمارتیں تھیں۔ اور ان کی جگہ پنجاب میں یونیورسٹی اور کالجوں کو قائم ہوتے انہوں نے خود دیکھا تھا۔ یہ زمانے کے تھے کہ ایران میں جی یہ فضا چند روز کی مہمان ہے۔ ان کی نکتہ رسنگا ہوں نے طہران کی بدلتی ہوئی آئندہ ایران میں بھی وہی ہونے والا ہے جس کا تجربہ یہ خود ہندوستان میں مشہر کے انقلابات کے بعد سیرایان انیسویں صدی کے آخری۔ پنج کے ایران کی دلچسپ داستان ہے۔

اس سفر میں ایک کمی نہیں نمایاں نظر آتی ہے کہ تمام سفر نامے میں عوام سے ملنے جلنے اور ان سے ملنا۔ لیکن آزاد محنت ایک مقصد کے لیے گئے تھے۔ اور یہ مقصد انہیں ایک خاص طبقے کے لوگوں سے تھا۔ انھوں نے اس بات کا کہی و حیا انہیں کیا تھا۔ کہ یہ ایران کی معاشی اور سیاسی تاریخ لکھنے جا رہے ہیں نظر انداز کر سکتے ہیں۔

# نذیر احمد کی انفرادیت

ڈاکٹر سید عبداللہ

یوں تو سرسید کے رفقا میں سے ہر ایک شخص غیر معمولی قابلیتوں کا مالک تھا۔ اور اپنے اپنے خاص شعبوں میں ان کے نام کی نفیر آج بھی موجود نہیں مگر مولوی نذیر احمد ————— جنہیں بعض لوگ "پتی نذیر احمد کہنا پسند کرتے ہیں ————— اپنے اپنے صنفِ نثر کی شخصیت اور جن کا رنگ تصنیف و مضمون سے منفرد تھا۔ یہ انفرادیت ان کے اکثر کاموں کی اس طرح ہے کہ انہوں نے سرسید کے بعد شاید سب سے زیادہ عام زندگی اور عام مسائل سے رابطہ رکھا۔ مثلاً ایک عالماہِ شان رکھنے والے شخص نے جسے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاسکتے تھے۔ ادب میں بھی ان کا مذاق ڈالو سوچو ادب نہ ہو تو عرض کروں کہ "بورڈ والی" ہی سا تھا۔ ان کا خیال، نفاست و لطافت، شرفائے ادب کے سے متاثر تھے۔ عزت کو بھلی میں ہوں یا نہ بہت گاہِ ندوہ میں ————— وہ ہر جگہ ایک اثراتی شان سے مزور ہوتے ہیں۔ مولانا حالی ————— خوش صنات حالی ————— ان کی طاسیت مزاج تو ہر جگہ مائی اور مصالحت ہی کی قائل تھی ————— وہ ایک نرم و ادیب تھے۔ نرم زبان اور شریفانہ لب و لہجہ، ان کا امتیاز خاص تھا۔ شرافت سے وہ گر چہ ان کی وضع تھی ————— سرسید اپنے اثراتی پلیٹ فارم سے آکر کو حوامی اہل ملک مزور آئے۔ ان کا جمہوری اثرافیت ہی کے دل وادہ تھے ————— ان میں سب سے زیادہ جس شخص کو ہم عام لوگوں کے قریب پاسے میں دیکھنا چاہتے تھے۔ جن کی اپنی زندگی حوام ہی کے ماحول سے ابھری تھی۔ اور ان تحریکات سے مالا مال تھی جن سے زندگی کی مصروفیت پاک نہیں آئے جمہور کی زندگی کو سزا دینے کے لیے ادب پیدا کیا جتنا اس دور کے کسی اور شخص نے پیدا نہ کیا۔

نذیر احمد کے ضمن میں میں نے حوامی، اثراتی، بورڈ والی و غیرہ کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ان سے کوئی منہ نہیں ہونی چاہیے۔ نذیر احمد کو تو ان اصطلاحوں کا ادراک ہی نہ ہوا۔ ————— مگر ان کی تصنیفی روح کا تجزیہ یہی کہنا ہے کہ وہ تھے حوام۔ سب مخلص۔ کیونکہ ان کی تصانیف کی غالب مدد اس جمہوری اور انگساری کے ہنر ہے۔ سے برہنہ ہے حوامین عام لوگوں کی زندگی لینے اور ان کے لیے مناسب دستور اہل تیار کرنے پر مجبور کرتی رہی ————— اور یہی نہیں برہنہ ہے بعد شاید وہی صنف تھے۔ جن کی زبان بھی عام لوگوں کی زبان کے قریب تھی ————— یہ صحیح ہے کہ اس میں ایک مخصوص حالانہ طبقاتی درد مزور پایا جاتا ہے۔ مگر نذیر احمد کی گفتگو کی عمومی سطح عام ہی ہے۔

نذیر احمد نے بچوں کے لیے بھی کتابیں لکھیں اور قانونی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔

گواہ کی تصانیف کے اہم موضوع دو ہیں۔ اول ان کی دینی تصانیف دوم ان کے قضاے۔ ان دونوں اصناف میں دو اپنے رفتار سے سفر فرماتے ہیں۔ یوں کہنے کو تو سرسید اور ان کے سارے رفتار پتھر کی کہلاتے تھے۔ اور اس لحاظ سے نذیر احمد بھی پتھر ہی سمجھے جاتے تھے۔ مگر نذیر احمد کی پتھر تین بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ وہ مذہب کے معاملے میں آزاد اور تحقیق پسند آدمی تھے۔ جس زمانے میں وہی کالج میں داخل ہوئے اس زمانے میں دینی حلقے اختلاف برائے دوروں پر تھا۔ اس میں بھی وہ آزاد اور فیضانِ مباحثہ سے رہے۔ بعد میں سرسید کی وفات میں جو دینی جھگڑے برپا ہوئے ان میں بھی ان کی راہ اپنی تھی۔ ————— وہ نہ تو سرسید کے افق متقدّم تھے نہ سرسید کے مخالفان کے پورے ہم نوا تھے۔ سرسید سے ان کا اشتراک صرف چند مسائل میں تھا۔ وہ سرسید کی طرح آزادی، اسے اور عقل کی اہمیت، پر خاص زور دیتے تھے۔ تقدیر، توکل، انیر و شر وغیرہ کے متعلق ان کا نظریہ وہی تھا جو سرسید کا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ سب میں نفوت ہے اور سائنس اور دین کا آپس میں کوئی تقاضا نہیں اور ترک دنیا کا خیال ایک غیر اسلامی خیال ہے۔ سلا لندیر میں محض وہ سرسید کے ہم نوا تھے۔ اور تعلیم جدید کے معاملات و مسائل میں بھی ان کے ہم آواز تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ سرسید کے پیادوں سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔

وہ عجزات کے اتحاد میں ان سے متفق نہ تھے وہ مغربی معاشرت کے معاملے میں سرسید کی سب باتوں کو صحیح نہ سمجھتے تھے اور بزرگانِ سلف کے اجتہادات سے متعلق ان کو وہ بڑی نہ متقی جو عام طور پر سرسید کی تصانیف سے مزین شیعہ ہوتی ہے۔ مطلقاً وہ مخالف نہیں انہوں نے ایک معتدل شریعہ کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی ہے جس میں زیادہ سے زیادہ یکساں اور سہولت پائی جاتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد کی یہ دینی تصانیف اپنی جگہ خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اردو کے مشہور ادیب مہدی لاناری نے ان کے تہذیب کو اس وجہ سے اہمیت دی تھی کہ فقہائے سرسید میں وہ سب سے زیادہ اپنی کو اس کا استحقاق دیتے تھے کہ وہ اردو میں ایک ناموس اسلامی تہذیب کو بنائے۔ اور حق یہ ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد اپنی ایل جی کو یہ فضیلت منور حاصل تھی کہ وہ اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی تدوین کی ذمہ داری لے سکتے۔ مگر نذیر احمد کا مزاج، ان کا ذہن، اور ان کی طرزِ انشاء یہ تھی کہ وہ ناموس کی علمی اور فنی شان کو برقرار رکھنے کی طبیعت صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ وہ تو ہر چیز کو ایک عوامی سطح اور عوامی نقطہ نظر سے دیکھنے پر مجبور تھے اور اسی سے انہوں نے ہر چیز کو دیکھا۔ ————— وہ تو قرآن مجید کے ترجمے میں بھی نامی یا عوامی زبان اقبال کے نام سے باز نہ سکے۔ (اردو یہ ایک واقعہ ہے کہ انہیں اپنی عوامیت کو غیباً وہ بھی جھگڑا تھا) تاہم نذیر احمد کے ذہنی تجربے انکار ناممکن ہے۔

نذیر احمد کی قابلیتیں دینی تصانیف سے زیادہ ناول میں ظاہر ہوئیں۔ انہوں نے دین کی خدمت میں ناولوں سے براہِ کام نہ کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی دینی تصانیف کو وہ درجہ نہ دلا سکے جو ان کے مکتبہ تصنیف کی علمی کتابوں کو حاصل ہوا۔ مگر انہوں نے عوام میں دین کی تبلیغ میں سے کہیں زیادہ کی اس سے ان کو بھی شہرت حاصل ہوئی۔ اور ان کی تصانیف کو بھی قبولِ عام نصیب ہوا۔ عوامی زبان، مزاج، لب و لہجہ، اندازِ فکر۔ ————— ان سب چیزوں میں نذیر احمد اپنے دوسرے رفتار سے الگ اور منفرّد شخص تھے۔ وہ اردوں سے الگ طرزِ پوسپتے تھے اور ان سے الگ حرفِ حق سے بات بھی کہ جانتے تھے۔

نذیر احمد نے بہت سے فقہائے کلمہ، مرقاة العروس، ابن الروف، فتاویٰ جملہ، تہذیب النصوص، ایامی، دیہانے صداقت

ان سب میں نذیر احمد بہت اچھے ناول نگار نہ تھے ایک منفرد مبلغ اور بعض جمہوری معاشرتی مشکلات و مسائل کے اچھے ترجمان اور جس طرح انہوں نے ثابت کر کے دیے۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کے متعلق عموماً یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ وہ فقیر فزیم سے زیادہ واقف تھے کیونکہ انہوں نے بہت عرصے سے دہندہ ری، خدا پرستی اور اصلاح معاشرت کا کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں فقیر فزیم نے فن پر عبور دیا تھا۔ ان کے پلاٹ کمزور ہوتے ہیں اور کہار کی تعمیر میں بھی انہیں کوئی چابک دستی حاصل نہیں۔ یہ سب درست ہے مگر نذیر احمد اردو کے زمین ناول نگار تھے جو واقف بھی تھے۔۔۔۔۔ اسی لیے انہیں فزیم یا حقیقتنا و اعطنا ول نگار یا ناول نگار واقف بھی کہا گیا ہے۔۔۔۔۔ مگر وہ فن کے پرستار نہ تھے نہ اس کا ہونا ان کے لیے کوئی بڑی کشش کی چیز تھی۔۔۔۔۔ وہ تو مصلح اور۔۔۔۔۔ مصلح ہونے میں ہی اپنی عزت سمجھتے تھے۔۔۔۔۔ اور اس اعزاز کے لیے انہوں نے وعظ اور ناول دونوں سے حائدہ اٹھایا۔ تقریباً۔۔۔۔۔ غریب و دونوں کے ذریعے انہوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ انہوں نے اپنی پڑھ و خطا بہت سے اپنے سامعین کو جس طرح گویا اسی طرح اپنے مطلق ناولوں سے اپنے قارئین کو ترپایا۔۔۔۔۔ دونوں میدانوں میں "شے ایک ہی کام کر رہی تھی۔۔۔۔۔ بات ایک تھی۔۔۔۔۔ نذیر احمد۔۔۔۔۔ بقول غالب۔۔۔۔۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکتہ گل ہے  
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا

بہر حال ان کو اگر کوئی ناول نگار نہیں کہتا نہ کہے مگر ناول کی کوئی تاریخ ان کے ذکر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ ان کے ناولوں کا ناول نہ کہتے فقیر فزیم کہتے کہانی کہہ دیجئے انہوں نے اپنے زمانے کے عام لوگوں کی دھن میں متوسط درجے کے لوگ بھی شامل ہیں زندگی سے اقلنا کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ناول کے اصول کے مطابق بات نہیں کر سکے۔۔۔۔۔ مگر ان سے انہیں ناول نگار ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے نزدیک وعظ اور ناول کے درمیانی فاصلے کچھ زیادہ زائغ تھے۔۔۔۔۔ مگر انہوں نے پریوں اور جہڑوں کی کہانیاں نہیں کہیں۔ انہوں نے انسانوں کی کہانیاں کہی ہیں۔ انہوں نے میرا تن کی طرح کوئی باغ، بہار بھی نہیں کہی نہ چاند و دریشوں کو سیر کرائی۔ وہ تو اپنے زمانے کے "دریشوں" کی سیر کا مطالعہ کرتے رہے۔ اور ان کی سیر کے موقعے بناتے رہے جن کے کچھ دعوات اور حقیقی زندگی صرف تفریح کے خیال سے نہیں صرفت و اصلاح کے خیال سے بھی داستانوں سے مزار درجے زیادہ دلچسپ اور دل کش تھی۔۔۔۔۔ نذیر احمد بات کرنے کے ذہن سے بے خبر بھی مگر باتیں ان کے اپنے ہی درد اور سوسائٹی کی بے بسی۔۔۔۔۔ ناول کی طرح بات کرنے یا بات بنانے یا کہانی گھڑنے کا فن تو بڑی مدت کے بعد بھی ہمارے ملک میں لوگوں کو نہیں کیا مثلاً شاعر کو کہتے وہ تو سامنے کی عام زندگی سے صاف بچ کر تاریخی ناول میں جان مار رہے۔۔۔۔۔ ان کے معاشرتی ناول بھی واقعتاً بہت کم کچھ کرتے رہے۔۔۔۔۔ اپنے زمانے کی باتیں کہنے کو انسان ہیں مگر کہنے کا سبیل بڑی ہمت و دھار ہوتی ہے۔ سرشار۔۔۔۔۔ نہ کچھ ہمت کی تو زندگی کے معرکہ ہونے پر بھی وہ گلازدی کے (CETHRU) کی طرح ہری کے کوپے میں چراغ لے کر صرٹ گھومتے گھومتے رہے۔ سرنگان دادی غفلت کو کوئی روشن راہ تو نہ دکھ سکے۔۔۔۔۔ ان نذیر احمد نے اسے کوپے میں قدم رکھا اور مردانہ وار دکھا اور ان کے (CETHRU) نے تو "چراغ عمر راہ" کی جگہ سے



لوگوں کو روشنی بھی دلوائی۔

ہمارے نقادوں نے نذیر احمد کے ناولوں کو موفقی کہہ کر فنی لحاظ سے ان کی تنقید کی ہے۔ اور خالص فن کے نقطہ نظر سے ان میں نقائص ہیں بھی۔ مگر میں اب تک اس نظر سے مانوس رہا ہوں کہ ادب میں اخلاق و مصلحت کا کوئی عنصر ہی نہیں سکتا۔ سوال تو صرف اتنا ہی ہے کہ ادب میں اخلاقی عنصر کا پیوند اس طرح نہیں لگاتا چاہیئے کہ کہانی کا "امکان" وقوع" برپا ہو جائے اور خلاف عمل دیکھا جاسکے۔ یہ عیب تو نذیر احمد کے ناولوں میں موجود ہیں۔ مگر اخلاقی عنصر کا وجود ہونا تو کوئی عیب نہیں۔

نذیر احمد کے ناول "دوروں کے آدھن" ناول تھے۔ اس لحاظ سے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی سب خصوصیات کی تلاش بے کار ہے۔ ان میں ہندوستانی سماج کے اہم دور کی معاشرت کی تصویریں ملتی ہیں۔ اس عہد کی ذہنیت، سماجی قصور، انصاف و غیر انصاف کے بہترین رشتے۔ جیسے نذیر احمد کے ناولوں میں ہیں اور کہاں دیکھا جاسکے۔ ان کی وہی قدر وقیہ ہے جو ۱۹ ویں صدی کے بعض انگریزی قصوں کی ہے۔ جن میں ڈیکنز، ٹیلر، اور ڈیوی کے اجتماعی قصے اور EVANGELICAL NOVELS شامل ہیں۔ جس طرح انگریزی ناول کا یہ سمت اپنے نقائص کے باوجود زندہ رہا ہے اور زندہ رہنے کے قابل ہے۔ اسی طرح نذیر احمد کے قصے بھی زندہ ہی رہیں گے۔

اب آئیے نذیر احمد کے اہم قصوں پر ایک ایک نظر ڈال لی جائے سب سے پہلے ابن الوقت کو لیجئے۔ بعض ممبروں کے خیال میں ابن الوقت نذیر احمد کی ناکام ترین تصنیف ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر قابل فزادہ بات تو یہ ہے کہ اس زمانے کے ہدیہ تعلیم یافتہ گروہ کی کھوکھلی معاشرت اور نقالی کو اس سے زیادہ کس ناول نگار نے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ فنی نقائص تو نذیر احمد کیا، اس دور کے ہر دوسرے ناول نگار کے ہر ناول میں بھی موجود ہیں۔ نذیر احمد کے ناول متغیر اور موفقی بھی ہیں اس سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ پھر ناول کا رکن انجم۔ جذبہ محبت۔ زمانے کے اس ناول میں ہے نہ کسی اور ناول میں۔ مگر ابن الوقت میں اس عہد کی ذہنیت کی جو مرقع نگاری کی ہے، اس کی مثالیں تو بعد کے ناول نگاروں کی کتابوں میں بھی کم ہی ملیں گے۔ ابن الوقت اس عہد داخل کے عام افکار اور شکوک و اہلام کا ایک پیلر مجسم ہے۔ ابن الوقت میں اس زمانے کی سیاسی فضا کے مناظر بھی اپنی پوری جرأت کے ساتھ معرض تحریر میں آگئے ہیں۔ انگریزوں کے خیالات، ادیبان کے احساسات، سیاست و مذہب کی آویزش و مصالحت۔ اس کے ذریعہ ہندوستانی سماج کے تمدنی تغیرات۔ یہ سب باتیں نذیر احمد کے ناول سے باہر اور کہاں ملیں گی؟

ابن الوقت ایک ایسے شریف زادے کی خیالی سرگذشت ہے جو پرانی معاشرت کو جھوٹا چھوڑ کر مغربی وضع اختیار کر رہا ہے۔ ادب انگریزوں کی تقلید میں انگریزی طور طریقوں کو اپنا لیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود انگریز حاکم حکمرانی کے غرور میں اس کے طرز عمل کو ناپسند ہی کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے اس تعلق میں مفرد حاکم کو برابری کا ادما نظر آتا ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جو اس زمانے کے انگریز کو کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ نتیجہ یہ کہ ابن الوقت پکاراؤں میں سودا مند و اڑاں سودا مند رہتا ہے۔ اس خیالی تصویر کا واقعاتی اور تاریخی رخ اگر دیکھنا ہو تو کیری کی کتاب (GOOD OLD DAYS OF JHON COMPANY)

میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

خیال کیا گیا ہے کہ ابن الوقت کے پاس میں نذیر احمد نے سرسید پر چوٹ کی ہے اور وجہ یہ بتائی ہے کہ نذیر احمد نے سرسید کے عروج اور قبول عام کے خلاف کسی پوشیدہ جذبہ رقابت سے مغلوب ہو کر یہ کتاب لکھی ہے۔ اور اس طرح دل کی جھڑاس نکالی ہے۔

مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سب قیاس ہی قیاس ہے اور وہ بھی خاصا دور انداز کا۔ یہ کتاب مروی شہی کی ہوتی انیم تعلیم بھی کہہ سکتے۔ کیونکہ شہی تو آخری دور میں صاف صاف سرسید کے خلاف غلو و تعریف کر دیتے تھے مگر فریب نذیر احمد پر تو یہ الزام محض تمام ہے۔ اس لیے کہ نذیر احمد تو آخری و ایک سرسید مرحوم کے مشن کے بیٹے تھے اور وہ افغان دور سے کرتے رہے۔ ایسی صورت میں ابن الوقت کو حوالہ خواہ سرسید کی تصویر قرار دینا خود سید صاحب کی ذات ستودہ صفات پر ناواقف ہے۔ ابن الوقت میں فواد اعلیٰ طور پر کہنی باتیں ایسی بھی بیان کی گئی ہیں جو سرسید میں موجود ہیں نہ تھیں۔ نذیر احمد تو درکنار شہی بھی سید صاحب کو انکار جو انہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کو انگریزوں کا خوشامدی سمجھتے ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ سرسید نے ملازمت کے باوجود بڑی فہم و دانہ بندی کی۔ مگر ابن الوقت تو وہ شخص تھا جو اعلیٰ قابلیت کے باوجود بعض اوقات بہت گرجاتا تھا۔ یہ بات سرسید میں کہاں تھی؟ اس کے علاوہ سید صاحب کا سادہ ترین ابن الوقت میں کہاں پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ابن الوقت سرسید کی تصویر نہیں بلکہ انیسویں صدی کے آخری نصف کے عام انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان کی تصویر ہے۔ جو انگریزوں کے وضع و امداد کی نقالی میں اپنے آپ کو اپنی تہذیب پر مستحکم کرتا تھا اور بعض اوقات اپنی فیرت و حیثیت کو بھی چھوڑ بیٹھتا تھا۔

اس سلسلے میں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ سرسید سے ان کے نقالی کش کش کے افسانے اس بے جا عقیدت کا نتیجہ ہیں جو عموماً کسی محبوب شخصیت سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جس کے ماتحت کسی کا معمولی اور دہانت دارانہ اختلاف بھی عقیدت مندوں کو گوارا نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید کے تہذیبی عقائد سے ان کے تقریباً ہر دقیقے نے جزوی اختلاف کیا۔ نواب حسن الملک سے زیادہ سرسید کا ہمدرد اور دوست کون ہو سکتا ہے؟ یہ وہی حسن الملک ہیں جن کو سرسید ملک طمی و ملک دمی و ملک انشروت میرا گوشت ہے اور تمہارا خون میرا خون ہے، کہا کرتے تھے۔ پھر کیا حسن الملک کے سرسید سے نظریاتی اختلافات کو ذاتی حسد و رقابت کا دھجہ دیا جاسکتا ہے۔ مولوی حاتی سے زیادہ شریف مزاج کون ہو گا۔ مگر انہوں نے بھی حیات سماج و بد میں کئی مسائل میں سید صاحب سے اختلاف کیا ہے۔ یہ سب دیانت دارانہ اختلافات تھے۔ اور نذیر احمد تو اس اختلاف میں بھی اور دل سے کچھ دیکھے ہی تھے۔ ابن الوقت سرسید پر چوٹ ہویا نہ ہو اس کو مکمل معاشرت پر یقیناً ایک لاری حملہ ہے جس کو قومی اور ملکی روایات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اور جس کا اختیار کرنا خود انگریز کی نظر میں ایک معصوم خیر ضل تھا۔ کیونکہ اس میں باوجود خوشامد کا رنگ غالب تھا۔ اور قاعدہ ہے کہ خوشامدی خود اپنے لئے مدد کی نظر میں ذلیل ہو جاتا کرتا ہے۔

نذیر احمد کی تصنیف ابن الوقت ایک لحاظ سے قبل از وقت تصنیف تھی۔ یہ وہ اصل ایک احتجاج تھا۔ اس برستی ہونی سبب زدگی کے خلاف جس کا بھرپور انہماک جب عظیم اول کے بعد کی تصانیف اور تحریکوں میں تھا۔ ابن الوقت نذیر احمد

کا ایک جیت جاگت کردار ہے۔ حقہ الاسلام جو نذیر احمد کا بیرونی ہے باتیں تو بسی لمبی کرتا ہے۔ مگر ہر جگہ اس وقت کا ہی بھاری دہتا ہے کیونکہ وہ قابل بھی ہے اور ذہین بھی!

یہ عجیب بات ہے کہ نذیر احمد کے بعض کردار ان کے محبوب کردار نہ ہونے کے باوجود ان کے بہترین کردار ہیں، مردانہ کرداروں میں ابن الوقت اور توبہ الفوج کا یکدم اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کرداروں کی تعبیر سے انہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں لائق صلاحیت بھی موجود تھی۔ اور اگر وہ چاہتے تو اپنے ناولوں کو اپنے زمانے کے معیار سے بھی بلند تر سطح پر لے جاسکتے تھے۔

یکدم ایک زندہ آبائی شخص ہے۔ مگر اس کے ساتھ بڑا مذاق اور فن پرست بھی ہے۔ یکدم دین و مذہب سے بیگانہ ہی مگر علم و فن سے بیگانہ نہیں۔ اس کے پاس ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہے۔ جس میں کثرت اور ادب کے گرافیا جو ہر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ الفوج کو ان انمول موتیوں سے محبت نہیں مگر اس کا "چشم و چراغ" اپنی چیزوں سے محبت رکھتا ہے۔ یکدم میں وہ خود نگری بھی پائی جاتی ہے جو اکثر اہل کمال میں پڑا کرتی ہے۔ وہ طبعا آزاد اور وسیع المشرب ہے۔ مگر میاں الفوج کے نزدیک یہ سب کچھ ایچ ہے۔ نذیر احمد نے یکدم کی تخلیق میں اپنی ہنر و دی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ بہر حال یکدم نذیر احمد کا لافانی کردار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک آزاد ادب کا ایک زندہ جیت والا نمائندہ درست ہے۔ اس کی ظاہر وادی اور سخن سازی اور مذہب و بہادری ہی ہر طرح سچائی اور حقیقت کے قریب ہے۔

مرآۃ العروس کی اسٹوری اکبر میں بھی نذیر احمد نے بڑی احتیاط اور وقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔ مگر ان دو ناولوں کے کرداروں میں سچائی نہیں پیدا ہو سکی۔ ————— سریتہ نے مرآۃ العروس کے متعلق یہ اعتراض کیا تھا کہ نذیر احمد نے مرآۃ العروس لکھ کر زمانہ سوسائٹی پر ایک انتہام باندھا ہے۔ ————— ممکن ہے یہ درست ہو اور سچی گنج نذیر احمد کے زمانے میں خواتین کی نشاں نگلی بلند معیار کی ہو۔ مگر مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرآۃ العروس کے مردانہ کردار زمانہ کرداروں سے زیادہ عجیب و غریب ہیں۔ عورتوں میں اور نہیں کم از کم اسٹوری لکھنے اور باشعور تو ہے۔ مردوں میں تو میاں کاہلی ہو یا میاں کا قتل یا کوئی اور سب بے شعور سے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مرآۃ العروس اور بنات العرش اپنے رنگ کی اوقیہیں دلچسپ کن ہوں کی حیثیت سے بہت مقبول ہوئیں۔ ————— مگر یہ کتابیں ابن الوقت، توبہ الفوج اور فساد بنگلہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

فساد بنگلہ نذیر احمد کا شاید کامیاب ترین قصہ ہے۔ اس کے تین لاجواب کردار جنگل، خیرت بیگم اور ہر پائی مصنف کی کردار نگاری کے کامیاب نمونوں کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ————— ناول تو یہ بھی مقصدی ہے۔ مگر فن کے سرور و موز سے جو واقفیت اس قصے میں نظر آتی ہے۔ ان کے کسی دوسرے ناول میں موجود نہیں۔ اس میں پلاٹ کی تعبیر مناسب، مربوط اور معقول ہے۔ اس میں کشمکشوں کا طول کم اور مکالموں کی حیثیت فطری ہے۔ اور مقصد فن کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ افراہم کی گنج نش بہت کم لکھی ہے۔

ایاتی اور دیباچے صادقہ بھی ان کے قصے ہیں، ایاتی میں آزاد ہی بیگم کے کردار میں خاصی سچائی ہے۔ اگرچہ اس قصے کے کردار بھی مکالموں میں باتوں کی بجائے لمبی تقریریں کرتے ہیں مگر ایاتی میں نذیر احمد نے نفسیاتی تجزیے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ دیباچے صادقہ میں دیانت داری، خدا پرستی، ادب و اطاعت کی تردید، تعلیم جدید کی خرابیاں اور ملی گٹھ کا لچ میں تعلیم و تربیت کا حال اور اس کے نقصان بیان کیے گئے ہیں مگر دیباچے صادقہ میں نذیر احمد کی واقفانہ حیثیت سب سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔

نذیر احمد کے فن پر طرح طرح کے اعتراض کیے گئے ہیں مگر بڑے اعتراض دو ہیں، اول ان کے ناولوں کا ادھانہ افغان اور ان کی ہیئت کے متعلق ہے شعوری۔ وہ فارم (ہیئت) سے زیادہ بیانات کو اہمیت دیتے ہیں۔ انہیں یہ اشتیاق رہتا ہے۔ کہ جو کچھ سب کچھ دساری جزئیات سمیت) فی العود کہہ دیا جائے۔ محل مقام کی پیشی کا خیال وہ بہت کم دھتے ہیں۔ پھر بھی یہ تو ماننا ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں اپنے نقطہ نظر کو زور سے (خلافتی اور بیجانی انداز میں) ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے رائے کی عقل پسندی کے بڑے نمائندے ہیں۔ مگر اس عقل پسندی کے باوجود ان کی تکنیک میں عقلیت اور منطقیت کم ہے۔ ان میں انزاس، معنویت، حد مناسب کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ سب چیزیں وہ ہیں جن میں نذیر احمد کی عقل پسندی دھت سی گئی ہے۔ انسانی خفا سے عقل پسندی۔ وہ نہ ہوں سراسر حیرت باقی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اور ناول میں مقصد سے عشق کا اگر کوئی نقصان ہے تو یہی ہے کہ اس میں ناول نگار اپنی معنویت کو فراموش کر دیتا ہے۔

گزشتہ مباحث سے یہ بات ابھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ نذیر احمد کی قلم کاری کا نصب العین محض چند مخصوص سماجی اور تاریخی فکروں کی اشاعت تھا۔ وہ شاید فقہ زبیری کا فن ان کا مقبائے مقصد تھا ہی نہیں، وہ سرسید کے ایک ہم کار اور رفیق اور اس دور کے ایک مذہبی اور مجلسی مصلح تھے۔ اور ان کے حق میں یہ کلمات ان کی شان اور ان کی اہمیت کی تقبص کے مقصد سے استعمال ہیں۔ سوائے محکم فی الحقیقت خود ان کا اپنا مقصد اور نصب العین بالادادہ بھی یہی تھا۔ اس لیے فن کی بحث کو چھوڑ کر اب ہم ان انکاد و تصورات کی اعلیٰ ذہنیت پیش کرنے ہیں۔ جن کی اشاعت کی خاطر نذیر احمد نے فقہ زبیری اختیار کیا۔

نذیر احمد کے رجحانات اور تصورات متروک رہتی تھیں۔ جو سرسید کے رفقا کے مخصوص افکار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا اصل مذہب عرب تھا۔ قوم کی اصلاح و ترقی کا خیال اور نئے حالات میں مجلسی و دینی افکار کی جدید تعبیر و توجہ۔ سرسید کے سبب رفقا کی طرح نذیر احمد کا مقصد بھی یہی تھا جس کو انہوں نے اپنی دینی کتابوں کے علاوہ اپنے تقوں میں بھی پیش نظر رکھا۔ جبکہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ انہوں نے مذہب کی طرح خود تقویٰ اور مجلسی امور میں عقل کی کار فرمائی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ سرسید کے رفقا میں اگر شبلی کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے اسلامی تاریخ کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر تاریخ کا ایک معقول مقصد رہا ہے۔ سوائے نذیر احمد اور فارما ہے کہ انہوں نے مجلسی زندگی کا ایک مثالی مگر معقول نمونہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ بہر حال معنویت ان کے تصورات کا بنیادی وصف ہے۔ اس میں نذیر احمد کی خاص خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ان معقولی صلاحیتوں کو گھروں کی آبادی اور خانگی زندگی میں خوشحالی اور مرتبت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اور یہ اس معنی میں بہت بڑا کارنامہ ہے کہ خانگی زندگی کو فنی ترقی میں بہت بڑی مذہبک حمد و سجادہ ہو سکتی ہے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے عورتوں کو منزلی زندگی کا سبب بنایا و قرار دیا۔ یہ نہ کہ اچھی عورتیں ہی کارکن مردوں کو کاروائے نمایاں انجام دینے کے قابل بنا سکتی ہیں۔ جن گھروں میں عورتیں مردوں کے لیے ذہنی حثیت اور پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں۔ وہاں کے مرد زندگی میں کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ ان کا سارا وقت اپنی عورتوں کے مسائل حل کرنے میں گزر جاتا ہے۔ نذیر احمد منزلی زندگی کے اس دائرے سے ابھی طرح باخبر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قومی ترقی کے لیے عورتوں کو تعلیم اور ذہنی تربیت کی بے حد ضرورت ہے۔ اس کے لیے انہوں نے امرتسی، صادقہ اور آزادسی بیگم کے مثالی کردار ہمارے

سامنے پیش کیے۔

نذیر احمد کے ان تصورات پر دو اعتراض کیے جاتے ہیں:۔ اول یہ کہ انہوں نے اپنے طبقے (موسط طبقے) کے بچے درجے کے لوگوں کے کردار پیش کیے ہیں اور حقہ نویسی سے مقصد بھی انہی کی اصلاح تھی۔ دوم یہ کہ ان کے سنوئی کردار جدید معاشرت میں زندہ رہنے کے مستحق نہیں۔ ————— ہمارے نزدیک یہ دونوں اعتراض بے جا ہیں۔ ————— نذیر احمد کے نقشے عام مسلمان معاشرت کے لیے آج بھی مفید اور نفع بخش ہیں۔ ان کے سنوئی کردار بلاشبہ جدید نہیں مگر ہماری معاشرت میں منزلی زندگی کو پُر امن بنانے کے لیے جدید سیرقہ سے زیادہ نذیر احمد کی مثالی صورتیں آج بھی زیادہ کامیاب ہو سکتی ہیں۔ ————— اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغربی تصورات میں پی ہوئی "بحر و مشغولہ" اور "خرد و فکر" خواتین مردوں کی مشکلات میں اس طرح تعاون نہیں کر سکتیں جس طرح وہ خواتین جن کے نقشے نذیر احمد نے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں ہماری سوسائٹی کو آج پھر عصری کی ضرورت ہے۔

نذیر احمد نے قوتہ النعوج میں کلیم کو ایک فن دوست اور نفع کو ایک فن دشمن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے نفع کی زبان سے فن اور ادب کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی بنا پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ نذیر احمد آدھ اور ادب کے مخالف تھے اور بعض "موسوی" تھے۔ وہ نہ چاہتے تھے کہ قوم کے تعلیم یافتہ لوگ آرٹ اور ادب میں دلچسپی لیں۔ مگر یہ نذیر احمد کے ساتھ زیادتی ہے۔ نذیر احمد آرٹ اور ادب کے مخالف نہ تھے۔ وہ ایک مقصدی دور کے دیب تھے اور ادب کی افادیت کے قائل تھے۔ ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ آرٹ اپنی ذات میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا جو آرٹ برائے آرٹ اور جو ادب برائے ادب ہے وہ بے بنیاد بلکہ معر ہے۔ آرٹ اور ادب کو زندگی کے لیے مفید ہونا چاہیے۔ ————— حلقہ اور ادب کے سوال پر بھی ان کا نقطہ نظر یہی ہے۔ فحاشی اور غریبی سرائیکیان میں ہو یا گلستان میں، ان کے نزدیک معر اور ملک ہے۔ ————— بس یہی نذیر احمد کے خیالات ہیں اور یہ وہ خیانات ہیں جن پر بعد کے افادیت پسندوں نے خصوصاً اقبال نے ————— جہر نقدی ثبت کر رکھی ہے۔ ————— نذیر احمد قومی تعمیر کے اولین دور کے رہنماؤں میں سے تھے اس لیے انہوں نے ادب اور خصوصاً ادبی الوقت یا روایتی ادب کے متعلق جس نظریے کا اظہار کیا وہ قابل اعتراض معلوم نہیں ہوتا۔ ————— اور اس سے ان کی کسی "مولویت" کا تشبیح نہیں ہوتا۔ ————— اور اگر اس کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد کو کوئی شخص مولوی نذیر احمد کہہ دے تو ان کی یہ مولویت بھی نہایت مستحسن مولویت ہے۔

نذیر احمد کا دین کیا ہے؟ اصلاح معاش اور فکر معاد ان کے نزدیک ایک مکمل دین وارہ ہے۔ ————— جو جتنے کو پی جائے، انتقام دے، جھوٹ نہ بولے۔ غیبت نہ کرے، حربیں و طامع نہ ہو، جابر اور سخت گیر نہ ہو۔ محکم اوپر کھیل نہ ہو معزور اور متکبر نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ ————— مرقع اس میں ایک اعلیٰ درجے کے انسان کی جملہ صفات موجود ہوں۔ اس ممکن انسان کی صحیح تصویر وہ ہے جو نذیر احمد نے حجتہ الاسلام کی زبان سے ابن الوقت میں کھینچی ہے۔

نذیر احمد کا دین داد کوئی تاؤ کب دنیا عابد و زاہد نہیں بلکہ دنیاوی فہم و فراست سے بھی آداستہ ہے۔ ————— وہ سخت کوشش بھی ہے اور نیک عمل بھی۔ ————— اس کی خدا پرستی اس کو دنیا داری سے نہیں روکتی۔ بلکہ ایک کامیاب دنیا دار بناتی ہے۔



نذیر احمد کی زبان بھی اسی قسم کی ہے۔ اس میں ایک طرف محاورات و کنایات ہیں جو قومی ذہنوں اور معاشقہ طائفہ کے آئینہ دار ہیں خصوصاً وہ جو گھروں میں استعمال ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ علمی محاورہ جو اس زمانے کے عام تعلیم یافتہ طبقے میں رائج عام لوگوں میں مانوس و مقبول تھا۔ ————— بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ نذیر احمد کی یہ دورنگی زبان دو مختلف مزاجوں کی نمائندگی کرتی ہے جن سے نذیر احمد کا اپنا مزاج مرکب تھا۔ ————— پہلے یہ بھی ہر اس دورنگی زبان میں نذیر احمد نے جو یکت پیدا کی ہے اس پر درملی کا داغ نہیں لگا۔ ————— عمومی لحاظ سے ان کی زبان خوش رنگ ہی رہتی ہے۔ عربی فارسی کے الفاظ اور اصطلاحات نذیر احمد کے لیے۔ دوسرے کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان ثقیل عناصر کو اپنی دواں عبارات میں اس مرتبے سے لکھ دیا ہے کہ ساری عبارتیں پر محض فقرہ بن گئی ہیں۔ ————— کیونکہ یہی تو وہ ڈالغضب العین ہے جو نذیر احمد کے لیے ایک زہنی غایت کا درجہ رکھتا ہے۔ ————— تند و تیز لہجہ اور پُر شور آہنگ ان کی اس خطابت کی یاد دلاتا ہے۔ جس کی گونج آج تک بھی کچھ بڑی عمر کے لوگوں کے سامعہ میں عروشن پیدا کر رہی ہے۔ ————— پھر کیا اس پر محض آہنگ کے لیے لفظوں اور ترکیبوں کے عروشن کی ضرورت نہ تھی؟ یقیناً تھی! ثقیل عروشن اور ثقیل و غریب الفاظ نذیر احمد کی تحریروں میں بڑی قیمت ہائے ہیں۔ ————— دیباچہ شائع کو دو کر دیتی ہے نذیر احمد اسی سے اپنی دکان بھرتے ہیں۔ ————— نذیر احمد نظم الفاظ کے مزیداد بولتے ہیں۔ ان کی انشا کی اصل سچ و سچ ثقیل اور کوخت الفاظ سے ہی بنتی ہے۔ —————

اور پھر یہ بھی ہے کہ نذیر احمد کی انشائیں اصل قوت بھی اسی ذلت پیدا ہوتی ہے جب ان کے علم میں علم و غفہ اور کجروہ کے جذبات مواج ہو رہے ہوں۔ ————— نذیر احمد کی پیادگی تحریروں میں شاید وہی ہوں گی جو سب سے ضعیف باتوں کی قائم مقامی کر رہی ہیں۔ ————— ان مضمونوں پر طنز و مغرین، شکوہ و احتجاج، فہر و عتاب، عربی کی ضرب الامثال، مصرعے اور مقولے، زمانہ اور طبقاتی محاورات مسلسل اور مفرور ایک سبب ایک ایسے آئینے سے منظم ہو کر ایسے خوبصورت پیرایہ بیان میں نکلی ہو جاتی ہیں کہ ان کا اثر قبول کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

نذیر احمد اپنے بیان میں جزئیات کو جس طرح پھیلتے آتے ہیں۔ اس سے ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ کی تشبیہ سمجھنی ہے، جس کی پلیٹ میں ہر چیز سما جاتی ہے کوئی چیز ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ سے باہر نہیں۔ ————— نذیر احمد کے بیان کی اسی وسعت علمی سے متاثر ہو کر جدید آفاقی نگار مکتے تھے کہ اس شخص کی وسعت مغز تو بہ صلاحیت رکھتی ہے کہ یہ اسلام کی قلموس کھے۔ ————— یہ تو دین بازوؤں والا ارباب اور عالم ہے۔ اور ایک لحاظ سے یہ توقع غلط بھی نہ تھی۔ اگرچہ قلموس کی سہ گیری تفصیل بیان کی نہیں اجماع بیان کی متقاضی ہوتی ہے۔ اور نذیر احمد کو اس ایکاذ بیان پر قدرت ہی نہیں تھی۔ ————— یہ روشنی کا خاصا تھا کہ وہ وسیع مضامین کو چند لفظوں میں ادا کر سکتے تھے۔ نذیر احمد اس میدان کے مرد نہ تھے وہ تو دال کا کام کے آدمی ثابت ہوتے تھے جہاں بازوؤں کے پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی تھی۔ ————— نذیر احمد قلموس کے لیے نہیں عوامی خطابت کے لیے موزوں تھے۔ ————— ان کی خطابت اور انشا کو قید نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ————— وہ قید بھی ہوئے تو شاید زہموں میں قید ہو سکے جہاں اصل کی پابندی قدم قدم پر انہیں کوئی جاتی تھی کہ دیکھئے صاحب زیادہ بازو نہ پھیلا دیکھئے گا۔ ————— اور یہاں بھی بے اوقات ایسا ہوا کہ نذیر احمد تھک کر اٹھ اٹھائیں لیکن تھکے اور کچھ پابندیاں جو دوسرے عائد کہ کبھی تھیں وہ خود ہی توڑ ڈالیں۔ ————— ان کے قانونی تراجم بلاشبہ زیادہ متبیہ اور پابند ہیں۔ کیونکہ ان

نہیں۔ میں مدوں میں چلے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ————— مگر باقی ہر عکہ پھیل دہی ان کی طبیعت کا رنگ اصل ہے۔  
 نذیر احمد ہی اردو کے وہ انشا پرداز ہیں جن کی باتیں زور دار ہوتی ہیں۔ ساقی کی آواز میں ہجرت کیکنوں جیسا، شہکی پکی مگر مختصر  
 لکھنے والے آواز دھیمے میٹھی رکھی ہوئی کہیں کہیں نہاں کہنے والے، ان میں نذیر احمد ہی وہ انشا پرداز ہے جو پورا زور، انداز میں  
 اتارے، صداقت رکھتے ہیں۔ ان کے لہجے میں بھی قوت، کڑھکی اور صلابت ہے اور ان کے الفاظ میں بھی دُوب اور طغیانی ہے  
 ————— نذیر احمد لمبے فقروں اور طویل پیرا گرافوں کے معلق العنان حاکم تھے۔ ————— سرسید بھی فقرے لمبے لکھتے  
 تھے، اچھا سرسید کے فقروں سے یقین کا عکس پیدا ہوتا ہے وہاں نذیر احمد کے طویل پیرا گرافوں سے خوف اور دہشت کی کیفیت  
 پیدا کی ہے۔ ————— لکھن گرج ————— کچھ جرسنی، میٹھی آبادی کی غم کی طرح۔ ————— بجلوں کی چمک مگر مد کی آواز۔ —————  
 ان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ————— مگر نذیر احمد کا مغز و اسلوب بیان دونوں پر اپنا سکہ جماتا چلا جاتا ہے۔ ————— یہ خاص  
 سائنس کے رہتے ہیں سے کسی کو حاصل نہ ہوا۔



# گل بکاؤلی

محمد عبداللہ قریشی

اردو کے قدیم نثری قصوں اور منظوم افسانوں میں قصہ گل بکاؤلی بہت مشہور ہے۔ جس میں تاج الملوک اور بکاؤلی کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اصل کہانی کی تاریخ کا علم تو خود تاریخ گو بھی نہیں۔ البتہ ہندوؤں کی بعض قدیم کہانوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس کے متعلق کوئی کتاب سنسکرت وغیرہ میں لکھی گئی ہوگی۔ مگر اس کا کوئی ثبوت آج تک نہیں مل سکا۔

فارسی زبان میں یہ قصہ پہلے پہل عزیز محمد بنگالی نے ۱۲۰۷ھ (۱۱۳۴ء) میں اپنے ایک دوست نذر محمد کی فرمائش پر لکھا اور اس دوست کی وفات کے بعد اس کی یادگار کے طور پر اسے شائع کیا۔

اس فارسی قصے کی مقبولیت دیکھ کر فرشتہ ولیم کالج کے مشہور پرنسپل ڈاکٹر جان گلکراٹھ نے لاہور ویزلی گورنمنٹ ہائی اسکول کے مہم میں نہالی چند لاہوری سے اسے اردو نثر میں ترجمہ کرایا۔ اس ترجمہ کا نام ”مذہب عشق“ ہے۔ کتاب کے آخر میں ہجری اور عیسوی تاریخیں اس طرح لکائی گئی ہیں۔

عزیز جس طرح سے کہا ان کو شاد	ہماری بھی دسے یا افغان مراد
یہ قصہ ہوا جب بخوبی سم	تو پھر فکر تاریخ مقلی صبح و شام
یلا یک سنی میں نے آواز غیب	کہ سچے مذہب عشق تاریخ و نام

۱۲۱۶ھ

ہوئی پھر یہ خواہش کہ گلکراٹھ	کریں عیسوی سال کو بھی جیاں
تو پھر آئینہ غیب نے دی ندا	کہ اس مذہب عشق میں کوئی آ
کہتے مشرب جام اگر اختیار	تو مار نہ نہاں اس پہ ہوا شکار

۵۸۶

یعنی مذہب عشق کے ۱۲۱۶-۱۷۱۶ء اور ۱۸۷۶ء کے درمیان سے ۱۸۸۶ء تک حاصل ہو جائیں گے۔  
لاہور نہالی ہند کے آقا و اجداد شاہ جہاں آباد دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد ترک وطن کر کے لاہور آئے

اس لیے کہ انہوں نے نہایت سچ، پامناورہ اور باقاعدہ زبان لکھی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ فقہہ مسکنہ اور  
دوبارہ اشاعت کے وقت میرٹھ میں انٹوس نے مقررانی کی۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں لکھی مرتبہ بیع ہوئی۔  
پھر شاہی سے چڑھا جاتا رہا۔ سربراہ اہم گریسن سننے لگو شک سروے آف انڈیا میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی فہرست دی  
ہے اور پبلک ٹول ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جی ایم۔ اے قوی نل صدر شعبہ اردو و جمہوریہ کالج ممبئی ہال سنہ اس فقہ کے مختلف نسخوں اور ترجموں کی  
فہرست دی ہے۔

تاسی۔ گل بکاؤلی از عزت اللہ بنگالی ۱۷۲۲ء (۱۱۳۳ھ)

شعری از فحست ائمہ دین صدی کے آخر میں۔

اردو۔ وکئی سنہ ۱۰۳۵ھ بارود خانہ اردو کے کتب خانے میں راپرنگ

شعری فقہ مجلس سلاطین۔ بقول تاسی یہ تاریخ نام ہے۔ اور اس سے ۹-۱۷۳۸ء (۱۱۵۱ھ) نکلتا ہے۔ لیکن  
در اصل ۶-۱۷۷۵ء نکلتا ہے۔ رام بابہ سکسینہ "فقہہ الجاس" نام دیتے ہیں۔ اور اس سے ۱۰۵۳ء بمآد  
کرتے ہیں۔

گلشن منظوم یا خیالین دیکان از دیکان الدین دیکان مکنوی ۱۲۱۱ھ راجن نرقی (اردو)

مذہب عشق از نہال چند سنہ ۱۲۱۴ھ عزت اللہ بنگالی کے فارسی فقہ کا ترجمہ۔

شعری گلزار نسیم از دیا شکر نسیم سنہ ۱۲۵۴ھ

گل بکاؤلی قلمی منظوم سنہ ۱۲۶۱ھ از محمد داؤد علی ۲۶ داستان اور پانچ بیٹے۔ مصنف حیدر آباد سے کلکتہ آیا۔ اور شیخ  
سلطان کے خاندان کی سرپرستی میں رہا (کتب خانہ مسعود حسن رمنوی)

ہندی۔ بکاؤسن از بیچ سنگھ و سا سنگھ سنہ ۱۸۷۵ھ مکنو۔ مذہب عشق کا ترجمہ۔

فرانسیسی۔ از گارسان دتاسی سنہ ۱۸۳۵ھ

انگریزی۔ از بی۔ بی۔ مینول۔ مذہب عشق کا ترجمہ۔

از لٹینٹ آر پی اینڈرسن سنہ ۱۸۵۱ھ دلی۔

کورنجن نے دتاسی اور مینول سے لے کر سنہ ۱۸۵۱ء میں "اے گروپ" (A GROUP)

(EASTERN ROMANCES) میں شامل کیا۔

از بادا جبر سنگھ سنہ ۱۹۰۳ھ۔

مذہب عشق کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ پورب کے کسی بادشاہ زین الملک کے چار بیٹے پہلے سے موجود ہیں، پانچواں

تاج الملوک پیدا ہوتا ہے جو بادشاہ کو بہت محبوب ہوتا ہے۔ مگر بھرمی اسے بادشاہ کے لیے خواہش آتا ہے اور قتل و ہتھیار سے اسے مار دیتے ہیں مگر ایک کہہ دیتے ہیں کہ اگر بادشاہ نے کسی اسے دیکھ لیا تو اندھا ہو جائے گا۔ زمین الملوک نے شیر خوار بچے کے لیے شہر سے باہر ایک بڑا میدان، مگر مقبرہ کے سامنے کیا چارہ۔ ایک۔ وہ بادشاہ شکا سے واپس آ رہا تھا کہ نو چہم پر نظر پڑی۔ اسی وقت آنکھوں کی مینائی ہو گئی۔ اس کے لیے ہزاروں تھپڑیں لگیں مگر ایک نہ چلی۔ آخر ایک بزرگ نے کہا کہ شفا صرف اس پھول سے ملے گی جسے جو بکاؤں پائی۔ چمن میں ہے۔ بادشاہ کے چاروں بڑے بیٹے اس گل نایاب کی تلاش میں نکلتے ہیں اور سفر کرتے کرتے ایک شہر پہنچتے ہیں جہاں ایک بیسلا اور نامی رہتی ہے۔ وہ بازاری عورت چور کھینچنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور ایک آبی اور چوبیس کی مدد سے ہمیشہ بازاری جیتا ہے۔ چاروں شہزادوں سے اس کے ہاں جاتے ہیں۔ اور اپنی تمام دولت بلکہ آزادی ملک بادشاہ کے غلام بن جاتے ہیں۔ وہ انہیں لیدار ہے۔ بالآخر پانچواں شہزادہ تاج الملوک اپنے بھائیوں کی تلاش میں وہاں پہنچتا ہے۔ اور اس مقام کے گرد و فربہ کو تازہ کر کے ایک نیر سے مدد سے اسے کھیل میں شکست دیتا۔ اسے اپنی فوجی جانا اور تمام شہزادوں کو اس کی غلامی اور قید سے نجات دلاتا ہے۔ پھر کئی قسم کی میسجیں بھیج کر گل بکاؤں کی تلاش میں باغ آدم کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ راہ میں ایک مہربان کاک ویر اسے قتل کر دیتے ہیں۔ شہزادہ کے اداکاران حصار ہو جاتے ہیں۔ دیر خوش ہوتا ہے کہ آج مدت کے بعد لذیذ شکار نصیب ہو رہا ہے۔ اسے میں دیر کر چند اداکار، آقا، مگر ادھر شکر و فخر سے لڑے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں۔ وہ فریاد مچاتا ہے۔ اداکاران سب کو اٹھا لیتا ہے۔ چونکہ باوجود زیادہ ہوتا ہے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ تاج الملوک موقع غیبت جان کر نہایت لذیذ مہوہ تیار کرتا ہے جو دیر کے حوض میں آسنے تک باطل تیار ہوتا ہے۔ دیر شیرازی کھا کر بہت خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ اسے آدمی نادر مانگ کیا مانگتا ہے۔ شہزادہ گل بکاؤں کی خواہش ظاہر کرتا ہے دیر وہاں کے بہت خوفناک مقام سے بیان کرنے کے بعد آخر اپنی بہن حاملہ دیوئی کے نام ایک خط دیتا ہے کہ اس آدمی زاد سے کی مدد کی جائے۔ حاملہ کے پاس ایک آدم زاد لڑکی محمودہ عرصہ سے مفید تھی۔ جسے وہ جان و دل سے عزیز رکھتی تھی۔ اس نے تاج الملوک کو محمودہ کے تعلقات میں ایسی مضبوط گرہ ڈال دی جسے جینے جی کوئی نہ توڑ سکا۔ محمودہ کی سفارش سے حاملہ نے بہت سے دیوؤں کو بہت بنا کر باغ بکاؤں تک ایک سر تک لکھا۔ تاج الملوک اس سر تک کی راہ اس حوض تک جا پہنچا۔ جس میں وہ پھول تھا۔ چوں اٹھا لیا۔ اور خواب گاہ بکاؤں میں جا کر اپنی انگشتری نشانی کے طور پر اس سے بدل لی۔ بکاؤں نے جب آنکھ کھولی اور وہ پھول وہاں نہ پایا تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بہت روتی۔ بہت پیٹی۔ کسی پر غصے ہوئی۔ کسی کو ڈرایا دھمکایا، کسی پر جبری کا اصرار لگایا۔ مگر جو اصل کھیں تھا۔ اس کا ہتہ نہ چلا۔

تاج الملوک وہ پھول سے کر و لبر میسرانے ملک میں پہنچا۔ تمام قیدیوں اور اپنے بھائیوں کو غلامی کا نشان لگا کر رہائی دینی۔ گرد آستے ہیں چاروں بھائیوں نے وہ پھول اس سے چھین لیا۔ اور باپ کے پاس سے گئے۔ جس سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اور بکاؤں کی گل کے فراق میں دیوانی سی ہو گئی۔ اسے پھول پرانے والے سے فاسقانہ عشق ہو گیا۔ وہ اپنے پھول اور دل کے چور کی تلاش میں نکل پڑی۔ مادی مادی پھرتی۔ ہی اور بے شمار تحفے اٹھانے کے بعد جب وہ زمین الملوک کے ملک میں پہنچی۔ تو اس نے بادشاہ کے اندھا ہونے اور اپنے پھول کی کرامت سے دوبارہ مینائی حاصل کرنے کا پورا جاسا۔ وہ فوراً ایک مہوہ آدمی کو روپ دھا کر بادشاہ کے دربار میں پہنچی۔ بادشاہ اس کی باتوں سے اتنا خوش ہوا کہ اسے اپنا وزیر بنا لیا۔

تاج الملوک نے اپنے دیس پہنچ کر حال دہلوی کا ایک ہال جو اس نے مشکل کے وقت کے لیے دیا تھا آگ پر رکھا۔ عمارت بڑی  
 بڑی تھی۔ اس نے پوچھا محمود کہاں ہے؟ کہا اس کے بے بخ کے لیے نہ مکان ہے۔ باغ نہ حوض۔ اس لیے ان سب چیزوں کی ضرورت ہے  
 بادشاہ کی مدد سے تاج الملوک اور محمود کی خاطر قلعہ بکاؤلی کے موزن پر ایک مائیکٹان محل کشن نگاریں تعمیر کرایا جس کی دھوم بادشاہ  
 نے اٹھارہ لاکھ پینچھی۔ بادشاہ اس سے ملنے کے لیے آیا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ بادشاہ کا وزیر فرخ۔ یعنی بکاؤلی بھی بڑا تھا۔ تاج الملوک  
 سے بالکل ہی باتوں میں بادشاہ سے پوچھا۔ آپ کتے صاحب زادے کتنے ہیں؟ بادشاہ نے چاروں بیٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کہ  
 اب میں تھا مگر اس کم بخت نے تو مجھے بھڑکا کر دیا۔ یہ چاروں شہزادے بکاؤلی کو پھول لانے جس سے مجھے پھر جینا فی تعیب ہوئی۔  
 ان جوانوں نے میواؤں پر لڑائی چاروں شہزادوں کے کتے سے آگاہ کیا۔ اور جان جو کھوں میں ڈول کر بکاؤلی کے پھول تک پہنچنے اور  
 ان کے ساتھ ساتھ تمام ماجرا کہہ سنایا۔ باپ نے بیٹے کو گلے لگایا اور فرط محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

بکاؤلی نے جب اپنے تمام ہونے کی کہانی سنی تو بے تاب ہو کر اپنے وطن گلزار ارم چلی گئی۔ وہاں سے تاج الملوک کو  
 پکارا۔ وہ یہ خط لکھا۔ اوسمن پوری کے ذریعے اپنے گھوڑے پاس ہی بجا دیا۔ بکاؤلی کی ماں کو جب بیٹی کی نگاہ بازوں اور لگاؤوں کا  
 حال معلوم ہوا تو اس نے تاج الملوک کو دیر کے علم میں ڈال کر اپنی کو قید کر دیا۔ تاج الملوک عجیب عجیب شکلیں اختیار کر رہا۔ آخر اسے ایک  
 درویشی و سفتاب ہوئی۔ جس کی مدد سے وہ جہاں جاتا پہنچ جاتا۔ اس طرح وہ ایک ایسے نئی فرق محل میں پہنچا جہاں دیوؤں اور پریوں  
 کی دولت تھی۔ وہاں روح افزا نام ایک پری نے جو بکاؤلی کی چچا زاد بہن تھی تاج الملوک کو اپنا گھر لے لیا کہ کس طرح یہاں کے دیو نے اسے  
 یہاں لے آئے۔ بعد کر کے قید کر رکھا ہے۔ عرض لالچی اور توپی کی مدد سے وہ وہاں سے آکر مدد روح افزا کے دھن میں جا پہنچے۔  
 روح افزا کے واپس آ جانے پر گھر گھر خوشیاں ہونے لگیں۔ یہ خبر سن کر جمیل بھی اپنی بیٹی بکاؤلی کے ہمراہ ایک سلامت کے لیے آئی۔  
 یہاں تاج الملوک اور بکاؤلی کی ملاقات بھی ہو گئی۔ روح افزا کی ماں حسن تمام اور خود روح افزا نے جمیل سے کہہ سن کر بکاؤلی اور تاج الملوک  
 کی نشان کرا دی۔ اور دونوں ہنسی خوشی باغ ارم میں رہنے لگے۔

شہزادہ کو جب وطن کی یاد آئی تو بکاؤلی کو ہمراہ لے کر کشن نگاریں میں آیا۔ غور سے دونوں کے بعد بکاؤلی کو راجہ خدو نے  
 دیکھا۔ تاج الملوک بھی یہی طرح تخت رواں کے ساتھ تھا۔ اور راجہ خدو کی عقل میں یہاں بکاؤلی ناچتی گاتی تھی۔ اس کے ساتھ رہتا تھا  
 بکاؤلی کی گاتی تھی کہ راجہ کو خبر ہو گئی تو دونوں کو جلا کر مار دے گا۔ مگر شہزادہ کی ضد سے جموہ یعنی جب راجہ بکاؤلی کے گانے سے خوش ہوا  
 اس نے کہا کہ آج ہم کو حواٹنا ہے۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ بکاؤلی نے تاج الملوک کو دیکھا کہ اس کی فرمائش کی۔ راجہ اندر ایک  
 آدمی کو اپنی عقل میں دیکھ کر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے بکاؤلی کو بد دعا دی جس سے اس کا نصف بدن پتھر کا ہو گیا جو بارہ برس تک رہا۔  
 شہزادہ بھی دربار میں رہا۔ جب منگھ پ میں آیا تو بکاؤلی کے نصف انسانی جسم سے دو فرقات کی باتیں کیں۔ اس آٹنا میں راجہ چتر سین  
 کے منگھ پ کی رتی چیزاوت شہزادے پر عاشق ہو گئی مگر وہ نہ مانا۔ آخر جب اس کو چوری کے الزام میں بے گناہ قید کر دیا گیا تو اس  
 سے شادی کا قرار کر لیا۔ شادی ہو گئی اور ایک عرصہ تک باہم رہتے رہے۔

بارہ برس گزرنے کے بعد جب بکاؤلی نے ایک کسان کے گھر نیا جنم لیا۔ تو تاج الملوک بھی اس رہبان زادی کے حسن کا شہرہ  
 سن کر وہاں پہنچا۔ چونکہ دل پہلے ہی سے ملے ہوئے تھے بغیر کسی تکلیف و تردد کے شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد دونوں چتراوت کے

مل میں آئے۔ اس کو ساتھ سے کرتاج الملک اپنے وطن گھٹن نا رہیں میں پہنچا جہاں دلبر اور محمود پہلے ہی سے بال بندھی اور  
تھیں۔ تاج الملک کا وزیر ہرام روح افزا پر عاشق ہو گیا اور آخر بکاؤلی کی سعی سے ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ غرض ۔

حاصل ہوئی ان گول کچے خار      بیر شب زلف صبح رخسار

جس طرح انہیں ہم ملایا      پھرے گئے سب ملیں خدایا

اس قصے کے اجزائے ترکیبی کچھ ایسے ہیں کہ اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ تاج الملک اور بکاؤلی کی  
شادی پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ سے قصہ ہمیں ختم ہو گیا ہے۔ وصل کی راہ میں جو مزاحمتیں تھیں وہ جوڑ کر لی گئی ہیں۔ تمام مشکلات اور  
مسئعے حل ہو چکے ہیں۔ ہمارے جذبہ استفہام کو کسی بات کا اتفاد نہیں رہتا یہاں تک قصے پر ناری رنگ ہے۔ اس کے بعد دوسرا جزو  
شروع ہوتا ہے اور بکاؤلی کے دوسرے جنم کے بعد اصلی حالت میں آئے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ خاص منہ دہشتی ہے۔ اس کے بعد  
کہانی کو آگے بڑھانے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ تیسرا حصہ بہت مختصر ہے۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن بھی بدل جاتے ہیں یہاں تاج الملک  
اور بکاؤلی کی بجائے ہرام و وزیر زادہ اور روح افزا و نغمہ پر آ جاتے ہیں۔ ایسا عجیب ہوتا ہے کہ معصیت سے قصے کو دوسرے  
حصے کے بعد اور بڑھانا چاہا مگر اس سے باسانی ممکن نہ تھا۔ کو بکاؤلی اور تاج الملک کر کے کہی کچھ اختراع کر سکے۔ اس لیے ہرام  
اور روح افزا کو قصے کے دو بیان لیا گیا۔ یہ حصہ ایک منہ کی کہانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اصل کتاب سے بالکل الگ تعلق معلوم  
ہوتا ہے۔

مزاکر بیان چند کا خیال ہے کہ اس قصے کے بعض حصے قدیم داستانوں سے ملنے جلتے ہیں۔ مثلاً دلبر میسرا، شہزادے  
کو بکاؤلی کی ہم سے روکنے کے لیے برہمن اور شیر کی حکایت سناتی ہے۔ یہ بھی تتر کے کوئی نسخے میں موجود ہے۔ شمالی ہند کے  
نحوں میں کچھ اختلاف سے ہے۔

تاج الملک اپنے بھائیوں کو دنداں سے دھا کر آتا ہے۔ لیکن وہ اس سے دغا کرتے ہیں۔ یہی الف یلہ میں شہزادہ و خداداد  
کی کہانی میں ہے۔

پھول یا کسی اور چیز کے آنکھوں سے چھو آنے سے مینائی کا عود کو آکا بھی یا خیال نہیں۔ اس کی ابتدا فی شمال حضرت یعقوب  
میراتلام کا قصہ ہے۔

دوبوں کے ذریعے عمل کیا دکرانا اردین چراغ عرب ہی میں نہیں ہندوستانی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔

گلی بکاؤلی میں ایک لڑکی دیو سے جس تبدیل کر کے مرد ہو جاتی ہے۔ یہ کہا بھارت کے ادیبوں پر دستے لیا گیا ہے سکھندی  
مورت سنی لیکن مروی طرح پر دوش کی گئی۔ شادی کے موقع پر وہ جھل میں گئی اور ایک کیش سے جنس بدل کر مرد ہو گئی۔ جسمی جھل کے  
ایک حصہ میں غلط لگا کرتاج الملک مورت ہو جاتا ہے۔ جس بدلنے کی مثالیں مینائی پکسی کی جو دعویں کہانی میں بھی ملتی ہیں۔ سنداد کی کہانی  
میں جنس بدلنے کے کوئیوں کا ذکر ہے۔ الف یلہ کی دوسری کہانیوں میں جیٹر کا پانی پینے سے یا پتھر میں غلط لگانے سے جنس بدلنے

نقوش پر چار حصے۔

نقد کل بکاؤلی میں جو علم ہے اس کی مثالیں داستان امیر حمزہ یا داستان خیال میں بھری پڑی ہیں۔  
مزید سچا ذکر سنسکرت ادب میں تعقیب سے ملتا ہے اور ہر شخص اس سے واقف ہے۔

چند داستان میں چھٹے وزیر کی کہانی میں ایک شخص چوپ کر پڑی کے ساتھ پرپوں کے ملک میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں  
سے واپس آ کر اپنے گھر میں تاج اعلیٰ کا ہندوستان میں پہنچا دینا کوئی مشکل نہ تھا۔

نقصے کے خاکے میں ہر اہم کو ملاحظہ بنا دیا جاتا ہے۔ کامرواب میں اس کا واقعہ کل بکاؤلی سے پہلے تھا۔

دوسری ٹہاوتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نقد کل بکاؤلی ہندوستان میں لکھا گیا۔ مگر تشریح دہانی، تعلیم دی کا نقد اور  
مذہب کا لکھنا ثبوت ہیں۔ وہ بیرونی کا ہر کھینا ہندوستانی بات ہے۔ بکاؤلی ایک سنی قید پر مبنی ہے۔ منہ کے اندر کے  
مذہب کی بات ہے۔ اس کے تیل سے گسان کی پوری کے تیل نکلتا ہے اور بکاؤلی نیا جہم لیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا  
ہے کہ ان کے آداب اور یعنی تاریخ پر عقیدہ رکھتا ہے۔ یہ نقشے کی ہندوستانی اصل کا قوی ثبوت ہے۔ نقشے کی مدد سے فارسی داستانوں کی  
تاریخ کا نام ہی ہے۔ نقشے کا مرکزی نام بکاؤلی بھی ہندی یا سنسکرت کا نہیں۔ اس کے علاوہ "یش" اور "صیاد" کی حمایت میں حضرت  
نور علی نے انہوں میں اضافہ کیا جاتا ہے یہی اسلامی روایت سے پائیدار ہوگا۔

"مذہب عشق" کے چھبیس باب ہیں اور چونکہ ساری کتاب میں ایک ہی موبل فقرہ ہے اور ہر باب میں اس کا ایک حصہ یا  
تکڑا بیان ہوتا ہے اس لیے ہر باب کو داستان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اکثر داستانیں کہتے ہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ اور دو  
تکڑوں میں ان کے بہت سے فارسی الفاظ باقی رکھے گئے ہیں اور نہایت کلام کے لیے جز گراہ لفظی ہوتی تھی اس کو بھی برقرار رکھا ہے  
اور اس سے بہت کم ہٹنے پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا طریق بیان ٹھیک اور دو ٹوٹی کتابوں کی طرح زیادہ سادہ اور سلیس نہیں ہے۔ جہاں  
نقصہ کا انداز لکھا گیا ہے وہاں اس کے ترجمہ میں آفاقی کو مصلح کام میں نہیں لایا گیا۔ ساری کتاب پر فارسی سے سادہ  
سندھ کی اندری کے الفاظ بھی ہیں۔ لیکن جس زمانے کی یہ کتاب ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ہی کم ہیں۔ ان کے مددگار میر  
نور علی اور ان کے ادب کا مطالعہ و قد و غیرہ کی کتابوں میں ہندی الفاظ کا استعمال جس کثرت سے ہوا ہے اس کے مقابلہ میں ان کی تقریر  
ان الفاظ سے بالکل خالی رکھنا چاہیئے۔ جہاں کا مؤلف دیکھے۔ جب بکاؤلی نیند سے جاگی اور اس نے گلاب کے حوض میں گل کو نہ دیکھا تو  
اس نے پورے تلاش میں لگی۔ دیکھنے لیا نقشہ کھینچا ہے۔

"جب بکاؤلی نے جادو بھری آنکھ کھولی اور خواب راحت سے جوگی و پشواں ناز  
سے بچنے لگئی سے بالوں کو سلوارا، وید پڑھ اور دھا، آہستہ آہستہ جھومتی آنکھیں بند ہے  
حوض کی طرف منہ کی۔ ہر قدم پر وہ گل اندام اپنے نقش قدم سے زمین کو پانی پاش  
بناتی تھی۔ اور اگر دریاہ سے چشم پل میں سر نہ لگتی تھی۔ جب حوض کے کنارے پہنچی  
دست نگاہیں سے گلاب اپنے رخسار پر ڈالنے لگی۔ اور چہرے کا رخسار کہ چشمہ  
کے مانند تھا۔ دھو دھو کر گلاب میں حوض کے اور حوض کو چاروں طرف چشمہ مست ناز

سے دیکھنے بھاگنے لگی۔ ناگاہ گل بکاؤلی کی جگہ پر منظر پیش آیا۔ ہر چند ہنر و تامل تھا۔  
کی کچھ اس کا نشان مغرورہ کیا۔

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

”کہتے ہیں کہ تاج الملوک فقیروں کے بھیس میں اپنے بھائیوں کے پیچھے چلا جاتا تھا  
کہ ان کا ارادہ کیا تھا دیانت کرے۔ الغرض وہ جہاں آتے ہوئے تھے۔ وہ بھی  
آگے پہنچا۔ اور ایک کونے میں بیٹھ کر ان کی سن زائیاں اور جولاہیاں جھوٹی جھوٹی  
سننے لگا۔ آخر وہ نہ سکا۔ سامنے آکر دھوکہ دے کہنے لگا، آپس میں یہ کیا بے ہودہ  
باتیں کر رہے ہو۔ اپنا منہ دیکھو، گل بکاؤلی میرے پاس ہے۔ اور اسی وقت اس کو  
کوسے کھول کر ان دغا بازوں کے سامنے دکھ دیا۔ شہزادے غصے میں آکر بوسے  
بھلا اس کو مان کر تیزی بات پہنچی نہ ہو تو ہم جرحاں ہیں تم کو سزا دیں۔ تاج الملوک نے  
کہا۔ سنا کچھ کو کیا آج۔ بہت بہتر؟

”جب تاج الملوک سے ان نامتو تاندیشوں نے گل بکاؤلی چھین لیا اور وہ بچا رہا  
دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ شل ہے کہ قرد و دیش بھان دو دیش۔ پھر کچھ فہمی  
کے پیچھے پیچھے بعد چند روز کے اپنے باپ کی سرحد میں آیا۔ ایک محل جو درخشن کا  
مسکن تھا اس میں جا پہنچا۔ اور چٹکانے سے آگ بھاتا کہ محالہ کے دے ہوئے بال کو  
اس پر رکھ دیا۔ چرمتائی بھی نہ جلا ہو گا کہ وہ اٹھارہ ہزار دیووں سمیت آہنچی اور  
”تاج الملوک کو فقیروں کے بھیس میں دیکھ کر آگ ہو ہو گئی کہ اسے شہزادے میری  
بیٹی کو کیا کیا اور تو نے اپنا حال کیا بنایا؟ تاج الملوک بولا کہ آپ کی توجہ سے  
سب غیریت ہے۔ لیکن ایک کام مجھے نہایت ضروری ہے۔ اے اور اس کی تدبیر مجھ  
سے نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے آپ کو تصدیق دی ہے۔ محالہ نے کہا کہ اسے عیار  
باتیں نہ بنا۔ وہ کوں ہے جلدی کہ تاج الملوک نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں  
ایک محل اور باغ کہ ہو ہو بکاؤلی کے قصر اور باغ کا سا ہو، بناؤں۔ تم جس طرح جانو  
جلد بنادو۔ وہ بولی اے بیٹا! یہ گنتی بڑی بات ہے مگر میں نے اس باغ اور عمارت  
کو نہیں دیکھا۔ مجھ میں دیکھنے مکان کا نقشہ کس طرح بناؤں اور بنادوں۔ تاج الملوک  
بولتا جس طرح میں کہوں اسی طرح بنادو۔ محالہ نے اسی وقت کئی سودیو بولے پر خشتانی  
کے لیے اور سیگڑوں میں یانی کے لیے اور بنادوں روپے اور جواہر میں قیمت  
کے واسطے ہر جہاد طرف بھیجے۔ دیووں نے تین روز کے عرصہ میں جواہر و دھیرہ

کے جا بجا تو دے لگا دیئے۔ پھر شہزادہ جس طرح بتانے لگا۔ اسی طرح وہ بندنے لگے۔ پہلے تو دو نیزے مٹی لکھ کر پھینک دی اور وہاں دو خالص مہر دیا۔ اور اس طرح قطعہ عدائی پر جزاؤں کا قتل کی بنا ڈالی۔ عرض مقوڑے دلائی میں دیسا ہی قمر اور اس طرح کا بانج جو اہر لگا۔ جزاؤں بہت سی دیناں سبت اور نہ بھر اور یا قوت کے دو دالان عالی شان سامنے آئے۔ یہی میں ان کے ایک عرض مرصع اسی قطعہ کا گھاس سے محمود بتایا۔ پھر ایک مکان میں عرض اسی رنگ کا بکھوایا۔ حاصل یہ کہ جتنا جو اہر سونا دھیرہ دہلائے تھے اس میں سے آدھا مکانات کے بنانے میں خرچ ہوا۔ چوتھائی کا رخانہ جات کی تیاری کو دے دیا۔ اور باقی خزانے میں داخل کیا۔

ان مثالوں سے آپ نے اندازہ لگایا ہو گا کہ زبان عام طور پر سمجھا رہی نہیں۔ دو تین سطریں سادہ وصاف ہوتی ہیں پھر ان میں شروع ہو جاتی ہیں۔ جن سے روایتی عروج ہوتی ہے اور تدم قدم پر محسوس لگنے کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ اخلاقی کیفیت سے مرثیہ میں اس قصے کا کوئی درجہ نہیں پھر بھی جوئے کی خرابیاں جیسی تاج الملوک کے جہانوں میں آئیں۔ غیر کہیں شادی یا محبت کے مصائب جو تاج الملوک اور بکاؤلی پر گزرتے۔ جاہلانہ ضد اور نامناسب جہے اعتبار کی آئیں جو ہمارے ہیرو کے ہاتھوں راجہ اندر کے حکم سے بکاؤلی کو سہنی پڑیں۔ بے اعتدالی اور حمید کو محسوس نہ رکھنے کا نتیجہ جس سے تاج الملوک نے بھول اپنے ہاتھ سے گزرا دیا جس کے لیے اتنی دودھ و سوپ کی اتنے لاکھ پاؤں مارے۔ اور اتنی سختیاں جیلی تھیں۔ سب ان کے علاوہ اور ایسی باتیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں جن کی تعمیل انسانی زندگی میں نہایت سبق آموز ہے۔ ایسا معلوم ہے کہ مصنف تاریخی گوروشی و عیب کو ہنر و ذہن کے پیلے کو شربت کا گلاس کہہ کر پیش کرنے کے آدھ سے ناواقف ہے۔ دی کے چہرے پر حسن و ذہنیت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا۔ بلکہ ہدی کی جب مصوری کرتا ہے تو لاکھ پکارتا کہ یہ بھی دینا ہے کہ یہ ہدی ہے اس کے قریب میں نہ آنا۔ دیکھئے جب بادشاہ کے چاروں شہزادے ایک بازاری عورت کے پھندے میں اس جانتے ہیں اور تاج الملوک انہیں چھڑاتا ہے تو مصنف کا قلم ان واقعات سے یہ نتائج نکالتا ہے۔

”اے عزیز! تو نے معلوم کیا کہ یہ میں نے کیا کہا؟ اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل عرش منزل تیرا جو رواق بخش تخت بادشاہی کا اور دیکھنے والا مادہ اور عجز کا تھا۔ جب اس کی آنکھ اس غیبت ناپاک پر پڑی۔ اس کی بصارت کو دھجک لگا اور دیدہ روشن تاریک ہو گیا۔ اب اٹھ اور سرمہ بینائی دعوئی یعنی لگی مراد کی تلاش میں کوشش کر۔ لیکن راہ میں دینا کے عیارہ کی بازی میں گرفتار قریب کا دھرا ہوا ہے مشغول نہ ہو جان۔ ببادا فاحشہ تجھ کو پہلے فریفتہ کر کے بتا دے اور بعد اس کے مکر کی آبی اور قریب کے چہرے کی دوسے اچھا پائس



اپنی حسرت مرضی پھینکے اور اجانب تیسے توکل کا سراپہ آخر ہو جائے۔ تب تک  
کو دائم الجس کر رکھے۔ اگر تو صبر کے نبوے کی اعانت سے اس منادہ کی بازی معلوم  
کو درجہ کم دے تو وہ فاش ہو جاوے شاہوں اور گروں کشوں کی ہم نشین ہے تیری  
فرماں بردار زندگی جو کہ جہاں ہے کہ تجھ کو اپنے حسن و جمال پر جھلکے۔ پھر اگر تو  
اس کے منہ پر امانت سے نگاہ نہ کرے تو یقین ہے کہ گل مراد کے دامن پر پیرا  
دسترس ہوگا

مولانا عبد الماجد دیوبادی نے ایک مقالہ میں فقہ کل بھلائی سے مسائل قصوف و حدیث و عہدہ ذکر کیا ہے جس میں  
تاج الملوک سفر کرتے کرتے رعد ملک بھلائی تک پہنچا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ قلعہ بھلائی جہاں وہ گل مراد  
پر شہر ہے اٹھارہ ہزار دیروں کی حفاظت میں ہے۔ اور سان سال جہر کی مسافت کے مقامات تک ان کی چوکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ وہاں  
حدودہ سے شمار پرمال ہر وقت نگہانی کرتی دیتی ہیں کہ کوئی پرندہ ہوا کے راستے بھی نہ پہنچ سکے۔ نیز چوروں کا بادشاہ سبھہ حد و حساب نیکو  
سیے زمین دور استروں کی باہانی کرتا رہتا ہے۔ تاج الملوک سنہ بہاں پہنچ کر ایک قوی بھلی مراد کو کسی طرح اپنے موافق بنایا اور اس کی  
بہن عمالہ کو جو سب دیروں کی سردار تھی طلب کیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی بدودہ ایک حسین لڑکی محمودہ کو اس کے نکاح میں دے دیا مصنف  
ان امراتہ معرفت کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے :

”اے عزیز! روشنی چشم ظاہر میں کی سات پردوں میں ہے اور غلی باری تعالیٰ کہ  
نور دیدہ اولیا ہے سرتر بڑا پردوں میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہے کہ وہ پرے دریاں  
سے اٹھیں تو پہلے اس پرے نگہبان کو نفوس کا جواب بھیجے اٹھا کر اس کو پس  
میں کر کہ وہ عین اپنی کچھ روی کو چھوڑ کر محمودہ کے مقام میں پہنچائے۔ لیکن یہ  
بات یاد رکھ کہ اگر دیو سے اٹھ لیجئے تو یہاں پر ہے :

تزکیہ نفس اور عرفان حق کی اس سے واضح تر تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے ؟ (معارف بھلائی ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۰)  
تاج الملوک مصائب و آفات کا شکار رہتا ہے۔ علمی لڑائی اور عصا انگ کہ کر سو جاتا ہے۔ سو کر اٹھنے کے بعد ایک عرصہ  
میں نہاتا ہے تو مرد سے عورت بن جاتا ہے عرج حرج کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد ایک اور عرصہ میں غوطہ لگا کر پھر اپنی اصل حالت پر آتا  
ہے۔ چھوٹائی کا زمانہ انسان نوپس کی زبان سے ایک عجیبہ حقارت و معارف بن جاتا ہے۔ وہ تاج الملوک کی حکمت سے بڑی پاکیزہ ہے  
”اسے یاد دہان و ہر احق تھا۔ طے نے بنی آدم کے سر پہ کراست کی تو پی پہنچا کہ اور  
خسرت کا عدا امتحان میں دے کر حکیم گاہ دنیا میں کہ مراد آخرت ہے عاقبت کی

مولانا کا یہ مقالہ پہلے پہل رسالہ ”معارف“ اعلیٰ گزشتہ ماہت جرنائی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہی معرکہ پھر تیس سال کے  
عزیزان سے معنائیں عبد الماجد دیوبادی میں صفحہ ۶۹ تا ۸۰ پر مجھ بڑا ہے۔

تخیل کے لیے بھیجا ہے۔ پس انسان کو چاہیے کہ کل اور خوار اور آب و سرباب خوب  
 پہچانے۔ ہر ایک باغ کے پھول کو نہ سونگھے۔ ہر ایک نہایت گھرانے بھرے کر یہیں  
 کانٹے گل سے رنگیں انفرادی شراب پر صورت آب و ہوا دھرے۔ اسے عزیز اور  
 گھر دنیا کے لیے جتن بھان میں غلام مارے لا مقرر اس کا کھڑا اور عصا لھو دے گا  
 یہ علم اس بات پر ہے کہ طالب دنیا موت ہے۔ و طالب ملامت و تیرا پیکر معانی  
 جو مانسہ مرد کا دل ہے یہ صورت نہ رمانا نقص عقل جو جلسے گا۔ پس اس وقت تعلیمی  
 کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہیے کہ دم بخود ہو کر بھروسہ پائے ذرا الٹی جس غوطہ مارے  
 اس کے بعد جو سراٹھائے گا تو وہی عصا اور وہی ٹوپی سر پر رکھے گا؟

”اس قسم کی تصانیح بہت پاکیزہ اثر رکھتی ہیں اور قفسے کو فیل کا رنگ عطا کرتی ہیں۔ فانی قریب کے بعد جب یہ بند آتے ہیں  
 ان کے معلم جتنا ہے کہ یہ قفسہ ایک فیل ہے۔ جس کی یہ تفسیر ہے۔ ان تصانیح سے قفسے کی فضا بند ہو گئی ہے۔ قفسے میں نہاک اور استغراق کے  
 اس طرح جو ناس پڑتے ہیں جس طرح کسی دنیا میں پھنسے ہوئے آدمی کو ایک ایک رحمت کا پیغام دیا جاسکے۔ اسے اس حالت سے خبردار  
 رہنے میں۔ اسے تباہا جاسکے۔ ان میں وہ عقل کی شکل نہیں۔ (ڈروو کی نثری داستانیں ص ۴۲۵)

مشہور فرانسیسی فاضل اور ادب آراء دو کے سرپرست و قدو شناس گارسن ڈی ماسی نے جو انگریزی مغلداری کی ابتدا میں مدت  
 ان کے داستان میں قلم ہے، اپنے بعض کمپوز پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی جس کے فرانسیسی نام کا ترجمہ تاج الملوک و بکاؤلی کے افسانہ عشق  
 نے اسکیا۔ مذہبی تناجج و نکالت ہے۔

تھوگر گل بکاؤلی ہی گوارڈیم کا قفسہ جو بہت دیرینہ لکھنوی نے ۱۸۶۷ء (۱۲۵۲ھ) میں تصنیف کی۔ اور اسی قفسے  
 سے رشتہ لکھنوی نے اپنے مشہور ناٹک اندر سجا کا پڑا کیا جس کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۸۶۰ء کے قریب ہے۔ انگریزی میں بھی  
 اس قفسے کا ترجمہ ہو چکا ہے بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس نام سے کتابیں لکھی ہیں۔ جن سے اس قفسے کی ہر اور پیروی اور مقبولیت کا پتہ  
 پتا ہے۔

”اگرچہ اس وقت نہال چند یا ان کی کتاب مذہب عشق کی کیا قدر نہیں کی جاتی۔ کیونکہ نہ تو نہال چند کے طرز بیان میں کوئی  
 ایسی خاص دلی کشی ہے کہ آردو بولنے والے ہمیشہ اس کے گرویدہ بنے رہیں اور نہ مذہب عشق ہی کو قفسہ اس زمانے میں لوگوں کی کیفیت  
 میں کچھ سامان بہم پہنچا سکتا ہے۔ اب آردو بولنے والے قفسے کے اتنے دراج طے کر لیے ہیں اور اس میں لٹریچر کا اتنا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے کہ  
 مذہب عشق اور اس کے ساتھ کی دیگر کتابوں سے لوگوں کا دلچسپی لینا ممکن نہیں مگر فنیٹ و لیم کا کی کے ادب کا تعلیم نے آردو نثر کی جوشاؤ اور  
 خدمات انجام دی ہیں اور آردو نثر و لیم کے ابتدائی اور دشوار گزار مراحل کو جن محنتوں سے طے کر کے آنے والوں کے لیے راستہ صاف کیا  
 ہے وہ ایسی نہیں کہ آردو بولنے والی نسلیں ان کو بھلا دیں۔ ہمارے ان پیشروان نثر میں نہال چند بھی ہیں اور اس لحاظ سے توجہ اور مطالعہ  
 کے مستحق ہیں۔ ان کی قدامت ہی ان کی زندگی کے کارنامے کو اہمیت دیتی ہے

یہ قلعہ یوں تو ایک قسم کا - ونڈر لینڈ ہے۔ لیکن اس کی نہر میں تاریخی حقیقت موجود ہے جس کی تشریح مولوی رفیع احمد دہری مرحوم نے اپنی بیش بہا کالیف فرنگیٹ آصفیہ میں کر دی ہے۔ فرنگیٹ آصفیہ کی اشاعت سے پہلے ہی بعض بزرگوں نے فرنگیٹ آبادلوہ امرکنٹک کے سرکاری دفتر سے اس کی تصدیق کی ہے۔ اور ٹیگمیل کنڈ کی ایک قدیم تاریخ میں قلعہ امرکنٹک کے حالات پڑھ کر جس کا کل بلحاظی سے خاص تعلق ہے اس کی بہت کچھ اصلیت معلوم ہو جاتی ہے۔ مہاجرات مندرجہ ذیل جبل پور - وغیرہ میں اب بھی ایک نمود زور پڑھا پایا جاتا ہے جو اکثر پانی کے کنارے اگتا ہے اور اس کے پھول کا عرق آنکھوں میں ڈالنے سے آشوب وغیرہ قسم کی کئی بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں اس کا نام بکاؤلی ہے۔ جس کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا بھی ہمیں سے خالی نہ ہوگا۔

آج سے نصف صدی قبل ایک جماعت قائم ہوئی تھی جس کا نام طلسم بکاؤلی ایکچوڈنگ ایسوسی ایشن تھا۔ اس نے بڑی تحقیق اور جہاں چین کے بعد یہ بات پائے ثبوت کو پہنچائی تھی کہ یہ قلعہ محض فرضی افسانہ نہیں بلکہ ایک پتہ واقعہ ہے۔ گو اس کے مصنف عزت اللہ بنگالی نے رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لے کر اس کو بعید از قیاس بنا دیا ہے۔ حالانکہ اس واقعہ کے نقش پانچ نامک موجود ہیں چنانچہ بارہ بکاؤلی جس کو قلعہ میں بارہ ایم لکھا ہے اب تک موجود ہے۔ طلسمی قلعہ بکاؤلی جہاں تک کوئی بشر پہنچ نہیں سکا۔ کوسوں لمبی اور چود گہری دلدل کے مین وسط میں اس وقت تک قائم ہے۔ بکاؤلی کا تالاب - مندر اور قوارہ - گو مردار یا م سے ٹکستے اور یہ پختہ حالت میں رہتے ہیں۔ مگر دہان حال سے اپنی قدامت اور اپنے دم و کا ثبوت دینے کے لیے باقی ہیں۔ ولبریسوا کے مکان کے کنڈراتے جنہیں کہاں کے باشندے کھاتے پیتے کامل کہتے ہیں۔ دہان حال سے بتا رہے ہیں کہ انہی حملوں میں ولبریسوا نے جو ریکمیل کرتاج الملوک کچا دوں جہازوں کو اپنا غلام بنایا تھا۔ یہ سب نشانات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ۔

ابھی اس راہ سے گزر رہے کوئی پتہ دیتی ہے شوخی نقش پاک

(گئیری بیگزین جنوری ۱۹۱۰ء صفحہ ۳۳)

امرکنٹک ہندوؤں کا ایک بہت بڑا تیر قلعہ ہے۔ یہاں سے دریائے ندو نکلتا ہے۔ اس سے ایک میل مشرق میں ضلع منڈلہ رکشتری ناگ پور ملک متوسط کا علاقہ اور جنوب میں سوہیل کے خالصے پر ضلع بلاس پور کا علاقہ ہے۔ مغرب اور شمال میں مہاسٹ دیواں کی حدیں ملتی ہیں۔ خاص موضع امرکنٹک میں جو غریب صورت قلعہ واقع ہے اس میں پانچ چھ سو نہت اور بھاری آباد ہیں۔ امرکنٹک دراصل ایک جنگل ہے جس کے نام پر یہ موضع مشہور ہے۔ اس موضع کے ایک گوشے میں ایک مندر واقعہ کن کے زمانہ کا اب تک موجود ہے جو سنہ ۱۶۵۵ء بمقام میں دیواں کا راجہ تھا۔ ایک دھرم سالہا راجہ اندو نے بنوائی ہے جو آج سے پچاس ساٹھ سال قبل راج پٹ چھوڑ بیٹھے تھے۔ اس سے مسافروں اور یاتریوں کو بہت آرام ملتا ہے۔

ندو کے دھان پر ایک پختہ تالاب ہے۔ جس کے ایک طرف ایک مندر بھی ہے۔ اس مندر کے چنے ایک ندرتی چشمہ جاری ہے جس سے تالاب بر وقت بھر رہتا ہے۔ تالاب کے مغرب کی طرف ایک اور عرض ہے جس میں پانی غورہ قطرہ ہو کر داخل ہوتا ہے ندو کی دھار سے جو عرض سے قریب چالیس گز کے فاصلہ پر گرتی ہے یہ گھاٹ قدرتی آبشار کا کام دیتی ہے اور نہایت دل فریب سماں پیدا کرتی ہے۔ اس گھاٹ میں قریب دو میل پہاڑ کی بندی سے پانی گرتا ہے اس کو کپل دھارا کہتے ہیں۔ اٹھان کر کے دسے یا تری اس کی دھار اپنے سر پہ پھینکتے ہیں۔ مگر بوڑھے اور کمزور آدمیوں کے لیے اس کی ممانعت ہے۔ تالاب کے چاروں طرف پیراگی اور بکھادی

ہیٹے رہتے ہیں۔ یہاں لاکھ، سچیت اور مانگو کے میزوں میں بیٹھتا ہے جو کئی ہفتے رہتا ہے۔ اس میں فقیروں اور محتاجوں کو کھانا  
میں لایا جاتا ہے۔

سون ندی دہلی کے قریب اکے دھانے سے دو میل مشرق کی جانب بھارت کے علاقے میں جا ملتی ہے۔ وہاں سے چکر  
واٹ کر پاکستان ویاں میں داخل ہوتی ہے اور پھر وہاں کے لنگا میں جا ملتی ہے۔ اسی سون وادی میں موزا کے قریب ایک بہت بڑا سرسبز  
دھارا ہے اور مختلف قسم کے خوشبودار پھولوں سے آباد ایک جگہ ہے اس جگہ کو بکاؤلی کا باغ کہتے ہیں۔ اسی جگہ میں ایک درخت ہے  
جس کے پھول بدی کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اسے بکاؤلی کا درخت کہتے ہیں۔ گل بکاؤلی زیادہی میں بطور چڑھاوا چڑھتا ہے۔ پتھڑوں  
کا دھارا ہے کہ گھوچر جسے پنجابی میں گھگ منکا کہتے ہیں) کے ساتھ گل بکاؤلی پس کر اگر آنکھوں میں لگایا جائے تو آنکھوں کا جالا دور  
ہو جاتا ہے۔

کتاب تختہ خان بہادر میں لکھا ہے اور فشی محمد اقرین فوق مرحوم مدبر اخبار کشمیری لاہور نے آج سے پچاس سال قبل اپنے سفر  
جس کھنڈ میں لوگوں کی ذہانی ساخت کا مادی سیدہ مد علی تحصیل اور ام غرور علاقہ دیوان جہان مک پہنچے کے انہوں نے اس علاقہ کی سیر و پیمائش  
کی مرقعہ اور خاردار چھاڑیوں کی وجہ سے وہ جگہ میں دور تک نہ جاسکے۔ اگرچہ امرکتک ان کی تحصیل میں تھا۔ ان کو آرام و آسائش،  
راہ داری اور واقفیت کے تمام ذرائع حاصل تھے۔ اس کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ پیمائش اور بکاؤلی کے  
کچھ پودے وہاں سے لے آئے جو امتحان لگائے گئے۔ پیمائش کے درخت تو کچھ عرصہ بعد خشک ہو گئے مگر بکاؤلی کے چند درخت  
مستحکم رہے۔ رام گل میں موجود تھے۔ شاید اب بھی ہوں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصلی بکاؤلی کے درخت نہیں بلکہ وہ درخت ہیں جو  
جہاں ہم نشیں کے اثر یعنی اصلی درخت کی خوشبو سے ایسے ہو گئے ہیں۔ جیسے ہمارے جہاں میں قصور کی مٹی بہت مشہور ہے جو اصلی تو  
بہت کم اور صرف ایک آدمہ کھیت ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کی خوشبو سے دوسری قسم کی مٹی کے کھیت بھی اسی طرح خوشبودار ہو جاتے  
ہیں۔ لیکن ہے بکاؤلی کے یہ درخت بھی ایسے ہی ہوں۔

خان بہادر مولوی رحمان علی وکیل دہلی دیوان مقیم ستانے فشی محمد اقرین صاحب فوقی کو بتایا تھا کہ سیدہ مد علی تحصیل اس نے  
بکاؤلی کے بین پھل پھول بطور تحفہ میرے پاس بھی بھیجے تھے جن کو میں نے دوستوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ پھول زردی مالہ اور خوشبودار  
تھے۔ تجربہ کیا گیا کہ جب کسی کی آنکھ آشوب کرتی تو اس پھول کا عرق ڈالنے سے آرام ہو جاتا۔

گل بکاؤلی کے حالات میں ایک کتاب تاریخ مسلم بکاؤلی بھی مشہور ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ امرکتک ایک جنگل کا نام ہے جو ایسا  
وسیع، پرخار، وحشت ناک اور اتنی دور ہے کہ وہاں کوئی جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ امرکتک دیوان سے بارہ منزل بیان کیا جاتا ہے اس  
جگہ کی آج تک پیمائش نہیں ہوئی۔ اس کی حدود و اضلاع سفیل، بلاس پور اور منڈل سے ملتی ہیں۔ یہ اضلاع جنگل سے بارہ بارہ اور زیور و منزلی  
کے فاصلے پر ہیں۔ اس جگہ میں بے شمار شہے، دھندے، گزندے، شیر، چیتے، بکچہ، بندہ اور دیگر آفتیں ہیں۔ اس لیے بارہ بکاؤلی تک  
تو لوگ ہر وقت پہنچ جاتے ہیں مگر قلعہ بکاؤلی تک کوئی نہیں جاسکتا۔ اور یہ ایک مسلم معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعہ سے ہر وقت دھواں  
اٹھتا رہتا ہے اور دن رات جہیمیت ناک آوازیں آتی ہیں۔

قلعہ بکاؤلی کس نے بنایا؟ کب بنا؟ اس کے متعلق لکھا ہے کہ سہ ۱۵۹۵ ہجری سے پہلے وہاں کے ایک راجہ نے اپنے پھولے

ہیشے بھوج سے نا اعلیٰ ہو کر اسے کوہستانی جنگل اور غیر آباد ملک دست کر تک کر دیا۔ جب راجہ کے گرو کو خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ یہ سخت نا انصافی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہیشے ہیشے شامتر ہو گا ملک ہرگز سرسبز نہ ہو گا اور چھوٹے کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

عرض راج بھوج تن بہ تقدیر اپنے حق ملک میں جو اس کی فتح کے لیے بھی کافی نہ تھا، آیا۔ جب اس جنگ میں پنچا تو اسے ہینے کے لیے کرنی موزوں مقام نہ مل سکا۔ آخر ایک دن وہ اپنے بوزیروں کے ساتھ جن میں اکثر پامنی دان اور بھری تھے۔ امرنگنگ میں پنچا۔ وہاں اسے ایک بہت بڑا لالاب شہر ملا جس کی وسعت اور گہرائی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بھوج نے یہ مقام پسند کیا۔ اس کے میٹروں نے اپنے شہر اور تہذیب کے گروہ سے لالاب کے وسط میں ایک قلعہ بنوایا۔ جن میں دانت کار لوگوں کے سوا کوئی جان نہ سکتا تھا۔ قلعہ کے علاوہ مکان اور علم آئین باغات بھی تیار کر لئے جو دنیا ہر انسانی طاقت سے بہت معلوم ہوتے تھے۔

بھوج راج کے گھر اسی قلعہ میں ایک بڑی پیدا ہوئی جو بہت حسین تھی۔ اور جس کی جنم پتری بنا کر بزمیوں نے اس کے ایک حشر جو نے کی بشارت دی تھی۔ اس بڑی کے دو نام رکھے گئے۔ ایک شائیب یعنی پدریش کی امانت اور دوسرا زیدال جس کے نام پر زید شہر ہے گریہ و روناں نام زید شہر رہا۔ ایک ہیرا گئی نے اس بڑی کا حسن و جمال دیکھ کر اس کا نام بکاؤلی رکھا جو آج تک مشہور ہے۔

معلوم نہیں تاج الملوک اور بکاؤلی کے عشق و محبت کی داستان فرضی ہے یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔ بہر حال بکاؤلی میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔

# نذیر احمد کا ذہنی تجزیہ

## ڈاکٹر اعجاز حسین

اردو ادب کی تاریخ پر اگر غور و خوض سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر انقلاب میں بڑے ادیب پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جب کہ ان کی نوکھلا سرغیر واقعات سے دوچار ہونا پڑا ہے تو اردو زبان نے بھی اپنا بہترین کارنامہ با خاص جوہر دنیا میں پیش کیا ہے۔ نذیر احمد کی زندگی اس ماحول کا نتیجہ ہو جو اسے ابتدائی زندگی میں ملتا تھا۔ چونکہ اس کی نشوونما اور ادبی حیثیت طویل اور ہلکا ہلکا کے درمیان ہوتی ہے اس لیے اس کو طوائف میں سکھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اپنی توانائی و توانائی کا مظاہرہ یہ زبان اس وقت ہمیشہ سے زیادہ بہتر انداز میں کرتی ہے۔ نیز ستودہ و حیدر ایسی ہی حالتوں کی علامتیں ہیں اور جب نذر کا زمانہ آیا وہ اس سے سارے ملک میں ایک بھلی پیدا ہوئی۔ ان واقعات میں ماضی کے نقاب ہیں روپوش ہونے لگیں اور نئی قدیں ایک سیلاب کی طرح نکلنا چھوئیں تو اردو نے بھی متعدد گرائفڈ۔ نذیر احمد کی سیلاب کے تھمتے ہی سرسید۔ نذیر احمد۔ محمد حسین آزاد۔ حالی اور گئی ایک اہل قلم زبردست دل و دماغ کے کھنڈر ادیب پارسیا گئے۔ حالانکہ ان بزرگوں کو قسمت سے وہ ماحول ملتا تھا جو صرف انتشار و پیدائش کی کا مرقع تھا۔ مگر ایسے ہی عالم میں جو کچھ ان لوگوں سے اپنی کارنامے پیش کیے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر اور اہم ثابت ہوئے۔ ان ہی ادبی مہاروں میں اپنی تعمیری صلاحیتوں کی بدولت نذیر احمد بھی ایک ممتاز جگہ پر کھڑے ہیں۔ جو ماضی اور حال کی تدوین میں ایک طرز گراہ امتزاج پیدا کرنے کی صحت مند فکریں کر رہے ہیں۔ نذیر احمد نے کیوں ایک خاص طریقہ سے سوچا اور ایک خاص طریقہ سے لکھا؟ جب ہم اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو پہلا سوال ان کے اس ماحول اور تعلیم کا آتا ہے جو ان کی ذہنی نشوونما میں کارفرما تھے۔ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی فکر اور تحریر ان کی ساخت میں کیا خاص عناصر، افراد، ادارہ، اشعوری یا غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات نہیں بھائی آتی ہے کہ مغلیہ عظمت اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کی حکومت پوری قوت کے ساتھ ہندوستان بھر میں اپنا اقتدار قائم کر چکی تھی۔ جس نے کچھ واسطہ کو یقین دلایا تھا کہ اب عہد ماضی واپس نہیں آسکتا۔ نئے دور میں نئے حالات سے دوچار ہونا جس کے لیے عمل کی ضرورت ہے۔ خواب دیکھنے اور تعبیروں کے انتظار میں بیٹھے رہنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ مگر باوجود اس احساس کے کوئی تعمیری پروگرام لوگوں کے ذہن میں نہ تھا۔ ماری ترقی کے لیے بھی لوگ مذہب سے چاروسازی کی امید رکھتے تھے۔ اسی میں تمام مسائل کا حل تلاش کرتے تھے۔ اور عہد ماضی کے خواب اور معتور میں ہی بھلا کر غور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے انگریز تمام ملک پر چھا گئے تھے کوئی ایک ایسی مرکزی طاقت نہ رہ گئی تھی کہ ان سے کوئی منوالیت مگر ذہنی طور

ہر لوگ ان کی حکومت، ان کی تہذیب و طرز معاشرت سے قنفر تھے۔ اپنے آپ کو اجداد کے طریق کار کو سراہتے تھے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کو باعث فخر خیال کرتے تھے۔ بڑے بڑے حالات میں بول جانے کے لیے تیار نہ تھے اور نہ ان میں حالات کو بدل دینے کی صلاحیت تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ سب ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے۔ چونکہ ذہن یہاں کوئی ایسا نہ تھی۔ اس لیے چار دوا چار وہی سب کچھ کر رہے تھے جو اس دور سے پہلے ہوتا آیا تھا۔ چنانچہ نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم بھی کتب ہی میں ہوئی اور ابتدائی نقوش ذہن پر اپنا ہی اثر ڈال رہے تھے جو ایسے کتبوں میں پیدا کرتے تھے۔

نذیر احمد ۱۳۳۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بخیر کا شہر کوئی خاص شہر نہ تھا۔ اور پھر وہاں کی تحصیل کی ذہنی فضا کا جو عالم اس وقت رہا ہوگا اسے سوچنے اور آخر میں اسی کے ساتھ یہ بھی تصور میں لائیے کہ اس تحصیل کا ایک گاؤں میرٹھ اس زمانہ میں کیسا خطہ رہا ہوگا جہاں نذیر احمد کی ولادت ہوئی تھی۔ ان کے والد سادات علی کا سلسلہ نسب ایک بڑے بلند پایہ مولوی گھرانے سے ملتا ہے۔ وہ شاہ عبدالغفور اعظم پوری کی اولاد میں سے تھے اور طرہ بھی ایک خاص طہیت و دہرولی کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ ان کا شمار اپنے وقت کے مشاہیر لوہا میں ہوتا تھا۔ طہیت اور مولویت اس خاندان میں دو طرف سے آئی تھی۔ وادیہاں کے علاوہ نذیر احمد کی تحصیل کا بھی یہی حال تھا۔ اس میں بھی لوگ بڑے ہایہ کے گھر سے تھے۔ شاہی دانا میں قاضی رہ چکے تھے۔ عرض کہ نذیر احمد کا خاندان دونوں طرف سے مولویوں کا خاندان تھا۔ گھر کی پوری فضا ذہنی تھی۔ اس ماحول میں جو بچہ پیدا ہوا ہو گا ہر بچے کو اس کی تعلیم و تربیت بھی ویسی ہی ہوتی ہوگی۔ جو وقت کا تقاضا نہیں بلکہ پرانے لوگوں کے ذہن کی کارفرمائی کا نتیجہ رہی ہوگی۔ معلوم نہیں کیا ایسے حالات ہوئے کہ نذیر احمد کے والد کو گاؤں سے شہر آنا پڑا۔ اس وقت نذیر احمد کی عمر صرف چار برس کی بتائی جاتی ہے۔ اس سن میں گاؤں کی تنگ و تنہا فضا سے نکال کر شہر کی فضا میں بچہ آجانا قدرتی امر اور کبھی ہاں ملتی ہے۔ جب تعلیم کا وقت آیا تو کسی قدر بڑے بڑے ماحول سے نذیر احمد کو ساتھ لے کر آیا۔ ابتدائی تعلیم کچھ کتب میں ہوئی اور کچھ ان کے والد کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ سلسلہ و برس کی عمر تک چلتا رہا۔ نذیر احمد فارسی عربی پڑھتے رہے اس کے بعد ایک ڈپٹی کلکٹر مولوی نصر اللہ خاں سے نحو، منطق، فلسفہ کا درس لیا۔ کئی سال تک اسی ڈپٹی کلکٹر سے پڑھنے کا سلسلہ قائم رہا۔ ظاہر ہے کہ نذیر احمد کے ذہن میں پڑھنے کے ساتھ ہی سرکاری ملازمت کے چاہ و قرار کا بھی اثر پڑا ہوگا۔ ڈپٹی صاحب کے دنیاوی اعزاز کا نقش جین شکاری طرز پوشاک کے دماغ پر ایک مستقل حیثیت سے بن گیا ہوگا۔ بغیر سوچے سمجھے یہ احساس ہوا ہوگا کہ لاش یہ منصب تمہ کو بھی نصیب ہو وہ پلنے گاؤں بلکہ شہر میں بھی کہاں ڈپٹی کلکٹروں سے بڑے عہدے داروں کو دیکھتے رہے ہوں گے۔ لامحالہ خیال ہوا ہوگا۔ کہ ایک ڈپٹی کلکٹر دنیا کا سب سے بڑا آدمی نہیں تو کافی بڑا افسر ہوتا ہے۔ چونکہ نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر سے ہاتھ سال تک فیض حاصل کرتے رہے جس میں علمی اکتساب بھی شامل تھا اس لیے استاد و شاگردی کے رشتہ کے اور بھی حقیقت بڑھادی ہوگی۔ ڈپٹی کلکٹر میں دینی و دنیوی دونوں احترام نظر آتے ہوں گے۔ اس لیے سرکاری ملازمت اور ڈپٹی کلکٹر بننے کا شوق غور و خیر پیدا ہو گیا ہوگا۔ اس وقت ہندوستانیوں کے لیے ڈپٹی کلکٹری سراج تھی۔ اس سے بڑا عہدہ انگریزوں کے ہاتھ سے ملنا دشوار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت کا نقطہ حرج اسی نوکری کو نذیر احمد نے سمجھا ہو تو وجہ نہیں۔ غالباً اس احساس دقت کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر نذیر احمد نے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی جگہ چھوڑ کر تحصیلدار بننے کو باعث فخر سمجھا۔ علم و تعلیم کا اثر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت و دماغ حکمران تعلیم ہی کی نذر کرتے لیکن اس حکم میں وہ گردہ اپنے ان جذبات کو کھل نہ کر سکتے جو نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر کی صحبت میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ جب ہم یہ دیکھتے

ہیں۔ اب عجب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے محنت کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تھی تو ایک احساس کسری بھی بچپن میں پیدا ہو گیا جوگا  
 بچوں میں سب کھینچنے ہی سادہ مزاج کیوں نہ رہے ہوں مگر کچھ نہ کچھ طعنان تو دینا اور کلکٹر کے دلہانے کے لیے کرنا ہی پڑتا رہا اور جہیز  
 کی ضرورت کی رقم مٹی دی ہوگی اس کی آواز نذیر احمد کے کان تک بھی پہنچتی رہی گی۔ اس کو سن کر وہ بھی سوچنے لگتے ہوں گے کہ اتنی بڑی تنخواہ  
 لینے کی ضرورت ہے۔ اپنی خوی کو دودھ کرنے کے لیے ملن ہے یہیں سے دولت مند ہونے کی خواہش کی بنیاد بھی چو لگی ہو ایک بات اور  
 قیاس میں آتی ہے۔ کہ بچپن میں نذیر احمد نے سچے باپ کو دنیاوی ترقی کے لیے موزہ بکھا ہو گا۔ بلکہ نواز خان کو ایسے اعزاز کا موقع  
 بخشا ہو گا۔ کیونکہ علم و خاندانی وقار کی وجہ سے ان کے باپ سعادت علی کی عزت ایک مخصوص طبقہ کرتا رہا ہو گا۔ لیکن یہ عزت  
 بانی کی آسائش سے بچنے والی تمام عمر ان کے والد نے عزت میں بسر کی۔ برصغیر اس کے ڈپٹی صاحب پڑھے لکھے آدمی ہوتے ہوئے  
 علی صاحبانہ زندگی کی فکروں سے مستغنی رہے ہوں گے۔ اس لیے نذیر احمد کو بھی خیال ہوا کہ علم دی اچھا ہے جو دین و دنیا دونوں  
 پر فاضل کا ساتھ دے مزہ دیا سب درگ بھی پوری برقی رہیں۔ کچھ پیسہ بھی پاس رہے اور لوگ تاملت سے متاثر بھی ہوتے رہیں۔ پیسہ ہی  
 دین کی سب سے بڑی بات لیکن قیاس بے بنیاد نہیں جب ہم نذیر احمد کے اسی مستقبل کا رشتہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ  
 وہ سن سے ۱۲ برس تک کا سن ایسا ہوتا ہے جب بچہ کی خواہشات ایک شکل اختیار کرنے کی فکر کرتی ہیں۔ اور شعور یا بغیر شعور کی طور  
 پر وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ نذیر احمد ۱۲ برس کے سن سے ۱۴ برس کی عمر تک بخیر دین رہے اور ۱۵ برس کے سن سے جب  
 برصغیر دست نواز خان سے سالانہ پڑا۔ ملن ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ ان کو دیکھتے رہے ہوں یا ان کے تذکرے سننے رہے ہوں  
 لیکن جو کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس لیے اس قیاس کو کہ وہ پہلے سے ذہنی طور پر ڈپٹی صاحب سے مرعوب تھے ہم منظر انداز  
 ہی کر دیں تو بھی پاکی سال کی محنت بچے کو متاثر کرنے کے لیے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اس لیے ان تمام باتوں کو دہم دھماکا سے  
 نہیں دیکھنا چاہیے۔

نذیر احمد کی راوی زندگی میں سب سے اہم موڑ تو وہ تھا جو ان کو دہلی میں ملا۔ چودہ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ نذیر احمد  
 دہلی پہلے آئے۔ ان کے باپ چونکہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل کا جو یا تھا۔ پشت اپشت سے گھر میں دولت علم  
 و ثروت کی طرح چلی آئی تھی۔ سب کچھ کھو کے بھی وہ علم سے اپنی اولاد کو عروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب وہ دہلی آئے تو غالباً  
 نہ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے بونہاد بچے کو علم سے آراستہ کر دیں۔ غالباً شاگ دستی کی وسوسہ سے انہوں نے نذیر احمد کو ایک ایسے  
 مدرسہ میں داخل کر دیا جو ادھر ادھر سے دو تہائی ناگہم کہ طالب علموں کا پریشاں ہونا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعادت علی کو اس سے  
 پہلے ہی حکم نذیر احمد کی تعلیم کے لیے نغز آئی۔ کیونکہ بہتر حالات کے لیے مالی امداد کی بھی ضرورت رہی ہوگی۔ جس کا انظام خیریت  
 ناپ نہ کر سکتا ہو گا۔ اس لیے چار و ناچار مولوی عبدالخالق کے سپرد کر کے چلے گئے۔ یہاں جس عام میں نذیر احمد نے اپنی طالب علمی  
 کے دن بسر کئے وہ خود نذیر احمد کی زبان سے سنئے۔

پڑھنے کے علاوہ میز کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوتی اور میں چھری لاتھ میں لے کر گھر گردیاں جمع کرنے نکلی کسی  
 نے رات کی بجلی ہوئی دال دے دی کسی نے جیسے کی گدی ہی رکھ دی۔ کسی نے دیتی سوکھی روٹیوں پر ٹرغایا۔ غرض رنگ بڑنگ  
 کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں ان کے یہاں میز پر قدم رکھنا مشکل تھا۔



اور میں نے قدم لکھا اور ان کی رُو کی نئے ٹائٹ کی۔ جو بے تک سیر و سیر معاملہ مجھ سے نہ سپرد یعنی نہ فہر سے نکلنے دیتی نہ روئے و غور دیتی۔ خدا جانے کہاں سے عمل بھر کا مصالحہ انتقالی۔ چیتے چیتے ماحول میں گئے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں سنے اقدار کا اور اس نے بڑا عجیبوں پر مارا۔ سزا جہان ہی نکلی جاتی تھی۔ . . . . بہر حال بار دھائی دو لڑواں جانا پڑتا اور وہ وہیں مصیبت پھیلنے پڑتی۔ اس وقت کو ذہن میں رکھیے اور دوسرا واقعہ اسی سے ملتا جلتا ہے اس پر بھی غور کر لیجئے تو نذیر احمد کی ایک تصویر ذہنیت کی سیاہ و درخت کا سراغ مل جاتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں نذیر احمد کو اپنے استاد و دوستی عبدالغنی کے گھر کا کام بھی گونا گونا پہاں ملک کہ ان کی خود رسالہ پڑنی کو کھانا بھی پڑتا۔ اس کو گو وہیں نے کہ شہان پھرانا بھی ان کے خزانہ منسی میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ ستم خیزی ہون قابل دید ہے کہ بعد میں اسی رُو کی سے نذیر احمد کی شادی ہو گئی۔

یہ اور اس ستم کے واقعات اور دو کے پہلے نازل لگا۔ کے لیے ادبی ماحول میں گئے۔ اس کی ذہنیت کے اجزائے ترکیبی کی طرح سر بھر کا زریا ہے۔ یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ نذیر احمد کو زمانے کے لڑکچہ اور عادات کا پسکا لگا۔ چہ پندرہ برس کے سن میں ان کا گھروں میں اس طرح جانا کہ معمولی نوکر کے خزانے انجام دینے پڑیں اظہار کرتا ہے کہ وہ عورتوں سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ کیوں کہ وہ لوگ بغیر کسی تکلف کے ان سے کام لیتی تھیں اور آپس میں جو گفتگو کرتی تھیں اس کو اس وقت کا قریب طالب علم اور مستقبل کا مولانا نذیر احمد سب تصانیف ذہن میں محفوظ رکھتا تھا۔ اور وقت اور بے تکلفی کا سلسلہ شادی کے بعد اور بھی بڑھ گیا تھا۔ علاوہ انہیں اس کے کہ نذیر احمد نے اچھی خاصی علمی قابلیت اس عمر میں حاصل کر لی تھی۔ وہ بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے۔ اور قوت حافظہ کے لیے بڑے مستعد تھے۔ اس وقت جب گفتگو مستورات کرتی تھیں ان کو یہ بغیر کسی ارادے کے ذہن میں محفوظ کر لیتے تھے۔ چنانچہ مزاج میں شوخی و شہرت بھی کافی تھی اس لیے عورتوں کے انداز بیان اور طوطہ و طریقت میں ایک لذت بھی ملتی ہوگی۔ بھروسے آکر پہاں کی زبان میں کافی فرق ملے گا۔ دلی کی ٹکالی زبان اور وہ بھی شریعت گراؤں کی شستہ اور با محاورہ زبان ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے سرمایہ نشاط بن گئی ہوگی۔ وہ رُو کی جوان سے مصالحہ پسنداتی تھی اور اگر ان کا ہاتھ ٹوک جاتا تھا تو بے سے انگلیاں پھل دیتی تھی ان کے ذہن میں ایک خاص کو ذرا بن کر ہمیشہ کے لیے رہ گئی۔ اس کی اس ستم خیزی اور بے رحمی پر غصہ بھی آتا رہا ہوگا۔ اور لذت کی ہر پہلی جذبات میں دوڑ جاتی رہی ہوں گی۔ سوچتے رہے ہوں گے کہ یہ کھاتے پیتے گھرانے کی رُوکیاں نزاکت و امارت کی دھڑ سے خود کام نہیں کرتیں اور جو کام کرتا ہے اس کے ساتھ اتنی بے رحمی کا سلوک کرتی ہیں کہ گویا وہ آدمی نہیں ہوتا۔ نذیر احمد کو محسوس ہوا ہوگا کہ یہ لوگ دولت و امارت کا بے جان تہہ اٹھاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عالم انسانیت سے دور ہو جاتی ہیں۔ خود تو انسان رہی نہیں دوسرے غریب لوگوں کو بھی انسان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی ہر بات کا کیا حکمانہ یہ اور اس ستم کے اور بہت سے خیالات ایک ہونہار اور ذہین طالب علم کے دماغ میں آنا ضروری ہیں۔ وہ اپنے حاصل کردہ علم و اخلاق سے لوگوں کو دلکھنا چاہتا ہے کہ دار کو اس میں منظر میں سوچتا ہے جو اس کو اپنے بزرگوں اور ماحول سے ملتا ہے۔ نذیر احمد کے گھر کا ماحول جو کچھ رہا ہوگا اس کی تفصیل تو کسی کو نہیں معلوم مگر قیاس کہتا ہے کہ جب خفیال دادی بہاں و دوزل پلٹ سے بزرگان و دین کی سرپرستی میں یہ گھرانہ پروان چڑھا تھا۔ اور نذیر احمد کے والد بھی خود درویش اور فطریع عالم تھے تو لازمی ہے کہ گھر میں انسانیت و تہذیب سب ایک مخصوص انداز کی رہی ہوں گی۔ اس طالب علم نے یہاں کی عورتوں کا اخلاق و کچھ کر لیا سوچا

میں نے اپنی شہ پرانہ نگاہ اس کا صحیح اندازہ تو حسب ہی ہو سکتا تھا کہ نذیر احمد کی کوئی خود داشت سوانح عمری ہوتی۔ اور وہ  
 یہ تصانیف قلم بند کر کے جوتے مگر اس کمی پر بھی آج ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک سرائف پڑھے لکھے نوجوان کے ذہن میں  
 یہ سوانح کے بارے میں اس وقت بھی کیا خیالات ہوتے ہوں گے کیا وہ یہ نہ سمجھ سکا ہو گا کہ اگر اس قسم کی زندگیاں یوں ہی  
 لکھ لکھ کر اسے اور بھی بے حد تباہ و موہا لیں گے اس لیے ضرورت ہے کہ ایسے افراد کی اصلاح کی جائے۔ نذیر احمد جو نیکو عریض  
 انسان تھے۔ اس لیے ان کو یہ بھی خیال تھا جو ان کا یہ فرق کہ ایک جگہ تو ان کے بھی زندگیاں کے کام کو لے کر ہیں۔ معاملہ پیستے  
 رہا۔ ان کے بعد آتے ہیں۔ اور دوسری جگہ زندگیاں شان امارت کا مجسمہ بن کر رہ گئی ہیں۔ زندگوں کی شہادت کی داغ بیل نہیں دیتیں۔ اور  
 ان کی بے گارگی کے لیے دیکھ کر ہنسنے سے بچل دیتی ہیں۔

شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی ان گھروں میں آنا جانا اور عورتوں سے دو چار رہنا نذیر احمد کے لیے ایک  
 عادی رسم بن گیا۔ جہاں پر شادی کی بھانے کے معاملہ و مشاہدہ کا درس دیا جاتا ہے۔ تصنیف کا مواد فراہم کیا جاتا ہے۔ قلم چلانے سے  
 وہ اپنی سببیت ایک خاص پہلو پر ہوتی ہے۔ اس مادہ میں جو ہر زمانہ پر چل رہا ہوتا ہے اور خیال کو کسی نتیجہ پر پہنچنے کا راستہ مل جاتا  
 ہے۔ نذیر احمد کے گلیوں۔ گھروں۔ مدرسوں کی خاک چھان کر اپنی تصنیفات کو قبول نام کا ثبوت دے دیا تھا۔ اس لیے ان کے پاس  
 تجارت نہ تھی۔ ان کی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا تھا اور داغ نے بہت کچھ سوچا تھا۔ تجلیل کی بنا و خداد میں نہ تھی بلکہ ایک  
 انھوں جنسیت پر قائم تھی جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ ان حالات میں نذیر احمد کو سی عبدالحق سے تحصیل علوم و  
 زبان کرنا پڑا۔ مگر وہی صاحب طالب علم کی پروردہ سی داشت اور سعادت مندی سے بے حد متاثر تھے یہاں تک کہ ان کے  
 ہمراہ اپنی پوتی سے اس پر ہمارا شکر و کا کج بھی کر دیا۔ یہ وہی زندگی تھی جس کو نذیر احمد کو وہیں کھلایا کرتے تھے۔ مگر کائنات  
 اور انسانی حلق کی بہت بھی شام و سی سعادت مندی کی نذر ہو گئی۔ نذیر احمد کی سوانح عمری میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انہوں نے  
 اس دربار اور علییت کے فرق کا لحاظ کر کے اس شادی کے عہد کوئی احتجاج کیا ہو بلکہ یہ وہ بڑا دور ہے جو دین ہر کا مقرر کیا گیا  
 اس پر بھی ماضی ہو گئے۔ حالانکہ ان کی حیثیت اس وقت تک گہرا و سو کی بھی نہ تھی۔ اس لیے نذیر احمد کے کردار کا ایک ایسا  
 یہ نظر آتا ہے جو جتنا سہم کہ ان کی طبیعت میں بغاوت کا مادہ نہ تھا اپنی حیثیت کو بلند کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ اور باتوں کو  
 نظر انداز کر جاتے۔ مگر وہی عبدالحق کا مرتبہ اس وقت معاشرہ میں کسی لحاظ سے بلند تھا اور نذیر احمد کے محسن و استاد بھی تھے  
 اس لیے اس رشتہ میں نذیر احمد کو فائدہ بھی زیادہ نظر آیا ہو گا نقصان کم۔ ان کی زندگی سے ہم کو اور ابھی شایس ابھی ملتی ہیں۔ جن  
 سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذاتی فائدہ سے و عروج کا ہر بات سے زیادہ خیال کرتے تھے اور اگر بغاوت کا عنصر محدود لے سکتے ان کے

یہ کہ کبھی غلط بھی آتا ہے تو اسی وقت جب ان کے ذاتی فائدہ سے اور واقعات و خیالات میں تضاد ہو۔  
 یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کی ابتدائی کامیابیوں میں ویرت کا زیادہ فائدہ رہا ہے۔ شادی سے جوان کا وقار کم ہو گیا  
 تو اس کا اندازہ نفس طور پر نہیں کیا جاسکتا لیکن اندر میں ایک سیم کی جان بچانے کے عوض میں جو سہل و وہ توانا بکھی واقعہ ہے اس  
 کے باوجود کہ جسے کسی کو شک نہ ہونا چاہیے۔ نذر کے بعد اس ندرت کو سرکار کے سرکار اور ان کو اپنی الیکٹرک و اس الہ آباد و مقررہ کہ  
 دیا گیا۔ اس واقعہ اور الہ آباد کے قیام نے نذیر احمد کے ذہن و ترقی کے لیے ایک نیا راستہ کھولا دیا مگر داشت کی شہدوں میں نذیر احمد کا جو

وقار ہوا وہ تو اپنی جگہ پر ہے مگر ذہنی طور پر وہ انگریزوں سے قریب ہو گئے۔ اس قرش کا ثبوت یہ ہے کہ الہ آباد میں انہوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ اور چونکہ فارسی و عربی زبانوں کی گرامر اور ان کے حسن و قبح سے پوری واقفیت تھی اس لیے انگریزی زبان سے بھی واقفیت بہت جلد حاصل ہو گئی۔ کیونکہ ایک زبان کے جملے والے کو دوسری زبان جان لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا چنانچہ نذیر احمد نے انگریزی میں بھی اچھی خاصی قابلیت حاصل کر لی۔ قابلیت سے زیادہ انگریزی زبان کی لذت نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ موقع برپا نہ ہو وہ لکھتے یا بولتے دھت انگریزی الفاظ اور زبان میں محسوس دیتے تھے۔ اپنے انگریزی پڑھنے کے سلسلہ میں ایک لکچر میں کہتے ہیں :-

” میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند جانا کہ میں انگریزی پڑھوں، والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار۔ صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مر جانا منظور اس کا بیک مالین قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں : باپ کا نذیر احمد بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے اس زبردست جذبہ کا بھی ان کو خیال تھا۔ چنانچہ والد کی زندگی میں انہوں نے انگریزی کی طرف رخ نہیں کیا۔ ان کے انتقال کے کئی سال بعد تک اس وضعداری کو نہا جتے رہے۔ ملازمت میں الہ آباد آنے کے بعد انگریزی پڑھنا شروع کی۔ باپ کی مخالفت ترک کر دی مگر یہ ظاہر اس اقدام میں ایک طرح کی بغاوت ہے لیکن یہاں بھی ذاتی فائیدے کا خیال پیش پیش ہے اور غالباً وہی فائدہ اس بغاوت کا سبب بھی تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ بغیر انگریزی جانے ہوئے انگریزوں کی حکومت میں ترقی کرنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ لہذا اس زبان کا بھی مطالعہ شروع کر دیا جو ان کے بڑے کام آیا۔ تعزیرات ہند کے ترجمہ سے غرض ہو کہ گورنمنٹ نے ان کو تحصیلدار کی عطا کی اور پھر صدر ہی ڈپٹی کلکٹر بنا دیا۔

علم ہیئت کی ایک کتاب کا ترجمہ ان کی مزید ترقی کا باعث ہوا وہ جید راجا و جلیسے گئے اور وہاں پہنچ کر رفتہ رفتہ پورٹو آف دیویو کے لکچر ہو گئے۔ سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہو گئی۔ ایک اور مثال ایسی ملتی ہے جس سے ہماری اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ ذاتی فائدے کے لیے مذہب سے بھی بغاوت کر سکتے تھے۔ سود لینا اسلام میں جرم قرار دیا گیا ہے مگر نذیر احمد اس کے جواز پر اٹھنا مصرحتے کہ براہ سود دیتے رہے اور شرح بھی مقرر کر لی تھی۔ ایک روپیہ سیکنڈ سود دلائیے جیتے تھے۔ اپنی تصنیف حقوق و فرائض میں سود کے جائز ہونے پر بحث کر کے مختلف دلائل و تاویلات سے اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ سب باتیں ان کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ نذیر احمد کے دل و دماغ پر عورتوں کے برتاؤ و طرز معاشرت کا غیر معمولی اثر پڑا تھا۔ ان کی صورت و سیرت نے دہلی کی ابتدائی تعلیم و نظام کے زمانے میں ذہن پر نقوش پیدا کیے تھے وہی سب سے پہلے ان کی تصنیفات کا مرکز بنے۔ چنانچہ مرآۃ العروس، نبات النعش سب سے پہلے وجود میں آئیں۔ ان کتابوں سے نذیر احمد کی تصنیفی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے سب متورات کے بارے میں عورتوں کی زبان ان کے لب و لہجہ میں نشست و برخاست کا مکمل نقشہ ان کی جبین جاگتی تصویر اگر دیکھنا ہو تو ان کتابوں میں سب کچھ مل جائے گا۔ اس کے پس پشت یہ ماز بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے محرمہ زندگی اور عورتوں کا غائر منظر سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی خوبی و خرابی کو ناقد کی طرح دیکھا اور مصلح کی طرح سوچا تھا۔ ان کو ان باتوں میں اتنی لذت ملی تھی کہ کتاب پر کتاب لکھے جاتے ہیں اور سیری نہیں ہوتی۔ اس انہماک کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کا مطالعہ گھروں اور گھر والوں کے بارے میں وسیع تھا۔ ان کی بول چال میں نذیر احمد کی ادبی پیاس سیلاب ہوتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ

دہلی کی زبان نکالی تھی۔ دہلی واسے ہی اہل زبان سمجھے جاتے تھے۔ تذریعہ دہلی کے ذہن اس لیے احساس کمتری تھا۔ وہ دہلی والوں کی صفت ہیں اگر اہل زبان میں شمار ہونے کا جذبہ حاوی ہو گیا تھا۔ اس لیے بھی وہ زیادہ سے زیادہ محاورات ضرب الامثال اور روزمرہ اپنی محاوروں میں پیش کرنے لگے۔ تاکہ یہ سب کا اندازہ ہو جائے کہ مجھے بھی دہلی کی زبان پر اتنا ہی عبور ہے جتنا کسی اور کو ہو ممکن ہے۔ اس احساس کو انہوں نے مزودت سے زیادہ اہمیت دی۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ زبان دیباہ کا سیلاب ان کے ذہن کو بہا لے لیے جاتا ہے۔ اور وہ بعض وقت عبور ہو کر اس میں بہے چلے جاتے ہیں۔ سنجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سنبھل نہیں سکتے ابتذال و رلاکت کام میں آجاتی ہے۔ مگر ان پر محاورات اور روزمرہ کا ایسا اثر سوار ہے کہ وہ بے خبر سے معلوم ہوتے ہیں محاورے صاحب قادیانی نے جو اس سلسلے میں مثالیں پیش کی ہیں وہ اس دور کی جتنی دلیل ہیں ان ہی کو ہم یہاں بطور نمونہ پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں مثلاً الاجہاد میں تذکرہ ہجرت میں لکھتے ہیں:-

”اب تم ان حالات حقہ صبر کو حاضر فی الدین رکھ کر خندے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب محبوب خدا دہلی رسالت کر کے کسی مفاد کی توقع کر سکتے تھے۔ اس دعوے سننے تو ان کی یہ گت جزائی تھی کہ:-

بھڑکی تو مدتوں سے مسادات ہو گئی  
لالی کعبہ نہ دی تھی سوا ب بات ہو گئی  
باقی ہے ما کھائی تو سن لو گے ایک دن  
اس کی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اس دعوے نے ان کو شہر بہرہ کرایا۔ والاجہاد ص ۳۳

امہات الامر میں اخلاق نبی کریم اور اسباب نجات کے تذکرے میں ہجرت کے مطلق لکھتے ہیں:-

”تقدیریت اور حمایت اور حفاظت نہ ہوتی تو رسالت کی بیل ایک ٹھری بھی منڈے چرھنے والی نہ تھی۔ مگر اہل بیت کے

بہرہ پر پیغمبر تیرہ برس دشمنوں کے زعمے میں پڑے جھاتی پر مزہاب دلایا کیے۔ یہاں تک کہ آخر کو پاسے ثبات ملک سے الٹ گیا اور بھاگ کر دیہے جا پناہ لی“

ان مثالوں کو دلچسپ کرکون کہہ سکتا ہے کہ متانت و سنجیدگی کا خون نہیں ہوا۔ چپکے سے شک لگتے ان کی یہ گت جزائی، جھاتی پر مزہاب دلایا کیے، پاسے ثبات الٹ گئے، بھاگ کر..... یہ فقرے یا محاورے اس عظیم المرتبت ہستی کی شان میں ہیں جن کا نظیر معصوم ہستی پر پیدا نہیں ہوا۔ یہ صرف عام مسلمانوں کا عقیدہ نہیں خود تذریعہ احمد بھی رسالت کا بت کا دل سے اتنا ہی احترام کرتے تھے۔ مگر زبان دانی کا فقرہ اور محاورات کا چسکا ساری ذہنیت پر ہجرت کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ نہ حفظ مراتب کا خیال اس کو رہا سکتا تھا اور نہ موقع شناسی اس کو اتار سکتی تھی یہ مزور ہے کہ ان کا دل دھڑکا ہو گا۔ احترام کے جذبے نے ظلم کو دکھا ہو گا کہ کس کی شان میں یہ الفاظ استعمال ہو رہے ہیں کس موقع پر ان فقروں اور محاوروں کا صرف ہو رہا ہے مگر زبان دانی کے جوش اور الفاظ کے استعمال

کرنے کا نشہ اس بے اعتدالی سے زدوکد رکھا اور اس جذبہک و ہوش گردیا کہ فشری عبارت ناکافی معلوم ہوئی۔ تو چار مصرعے بھی چسپاں کر دیئے۔ حالانکہ اس موقع کے لیے یہ شعرے نہایت نامناسب تھے۔ اسی سبب تکے بن کی وجہ سے اکثر ان کی طرف تخریر عروج ہو جاتی ہے۔ کلام میں ناجہوری پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ عکس ہوتا ہے کہ بات بلا وجہ بڑھائی جا رہی ہے۔ یہ سب اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو الفاظ سے عموماً کھیلنے کا ہوتا ہے۔ سب کچھ کہہ جانے پر بھی خیال ہوتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا گیا۔ اس لیے کہ مخصوص انداز بیان کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے اور موضوع ختم ہو جاتا ہے۔

نذیر احمد ایسے دور میں تھے جب انگریزی تمدن کے اثر سے نئی قدریں تشکیل ہو رہی تھیں۔ لوگوں کو ان پر اعتماد ہو چلا تھا۔ انگریز ادب پر اپ کی ترقی کے راز کو سمجھنے کی کوشش بندوبست میں ہو رہی تھی۔ ایک خاص طبقہ انگریزی تعبیر یا انگریزی انداز سے متاثر ہو کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سائنس کی نئی تحقیقات و معطیات کا مطالعہ کیا جائے ان سے پرانی ذہنیت کو بدلنا جسے مذہب کو عقل کی جنگ سے دیکھا جائے اور ہمت سے کنارہ کیا جائے۔ اور ایسی رسمیں جو مذہب کے نام پر جاری ہیں مگر حقیقتاً خیال خام کی پیداوار ہیں دو قوم و ملک کے لیے ذہریں ان سے اجتناب کیا جائے۔ انگریزوں کی ترقی کا ایک بڑا انداز عبارت میں مضمر سمجھا گیا۔ اصلاح کے لیے تقریریں اور تحریروں و دونوں سے کام لیا جانے لگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھنے کو نذیر احمد کا دور نئی تحقیقات و تحقیقات سے اثر ہے کہ اپنی قوم میں بھی ترقی کی روح بھونکنا چاہتا تھا۔ اسی کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے لیے یہ عملیات کا ذخیرہ مغرب کے خزانے سے لے کر حرام کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ عالی۔ مرتبہ۔ محمد صبیح آزاد اور ان کے متعدد ہم خیال ایسے ہی اصلاح کے علمبردار تھے۔ جس کو جو طبقہ مناسب معلوم ہوا اسی میں تبلیغ کرنے لگا۔ نذیر احمد نے پہلے پہل اس کام کے لیے طبقہ دانش کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ انہوں نے اس کا ذخیرہ کے لیے نئے آئینہ کا انتخاب کیا۔ ناول اور ادب کے لیے نئی چیز تھی اس کا پناہ بن بھی لایہ معلوم ہوا ہوگا۔ اور بیانات کی تازگی بھی چاہتی تھی کہ پرانے فقے کہانی کو چھوڑ کر نئی صنف میں ہاتھیں پیش کی جائیں اس لیے نذیر احمد کا یہ اقدام ناول میں اصلاحی مقصد کو پیش کرنے کا خیال برسی نکتہ دہی پر مبنی تھا۔ بہر حال انہوں نے اصلاحی فریضہ ناول سے شروع کیا۔ اور لوگوں کی طرح نذیر احمد کے پاس بھی کوئی معاشرتی پروگرام ایسا نہ تھا کہ ان کی تخلیق سے تعبیر کیا جائے۔ و حقیقتہً ان کا ذہنی سرمایہ مغربی تمدن کا پرتو تھا۔ جس میں تقلید زیادہ عقلی خدائی کم۔ بہر حال جو کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آئیں اس کو قوم کی بہبود میں صرف کرنا انہوں نے ضروری سمجھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس اقدام میں خلوص تھا وہ دل و جان سے چلتے تھے کہ مسلمان ترقی کریں مادی ترقی کے لیے ان کے نزدیک ضروری تھا کہ شعور میں بھی بندی آئے قدامت پرستی کے ٹکڑے سے نکل کر۔ نئے علوم سے متعارف و ماؤن ہوں تاکہ نئے راستے اور ان کی قدر و قیمت سمجھ میں آئے۔ غنیمت وجود سے نذیر احمد نے عورتوں کو زیادہ کمزور پایا اور مناسب سمجھا کہ ان کو پہلے مضبوط بنایا جائے۔ اس لیے ان کی ناولیں مرآۃ العروس اور بنات النعش وجود میں آئیں۔ ان میں علاوہ اور باتوں کے ذہن کی بالیدگی کے لیے سائنس کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ مثلاً بنات النعش میں زمین کی کشش و وزن مخصوص، ہوا کا داب کشش، انفعال، مقناطیس، زمین گول ہے۔ اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اور اس قسم کے اور بہت سے معجزات ملت ہیں۔ جن سے ہر ہے کہ ان مسائل کو اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ شعور میں عقلی مضمر غالب ہو جائے۔ مذہب کے کٹھن سے عقلی طور پر سمجھ میں آجائیں۔ مفروضات سے مہٹ کر عذریں حقیقت کی روشنی میں چلنے پھرنے لگیں۔ اور نئی عقل کی توانائی کے ساتھ

آگے بڑھے۔ نذیر احمد نے اپنی فہمیت پر ایک جگہ خود متعبر کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-  
 ”اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا جوتا تو میں بتاؤں کیا جوتا۔ مولوی ہوتا۔ تنگ خیال۔ متعصب۔ اگلی کھرا۔ اپنے نفس کے اعتبار سے مایوس۔ دوسروں کے حقوق کا تحسین، بدعنوانی، مسلمانوں کا نادان و درست۔ تعاف سے وقت کی طرف سے اندھا۔ ۱۰ مولوی خاندان کے تھے مگر سوادیت سے بے باک تھے۔ اسی لیے مولوی کو انہوں نے بہت بڑی تعریف دیکھا۔ حالت معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اقبال کی طرح سمجھ لیا کہ دین کی چیز ہے۔ قوموں کی امارت کیا ہے۔ اس کو کیا جانیں یہ بے جا رہے۔ رد رکعت کے امام ان کے نزدیک قوم کی مہتری کے لیے اب وہی شخص عروں ہو سکتا ہے جو ترقی یافتہ دنیا کے حالات و تغیرات سے بخوبی واقف ہو مذہب کا اصل فساد بھی جانتا ہو اپنے پر بھی تنقیدی نظر ڈال سکتا ہو۔ تعصب و تنگ مغری کا شکار نہ ہو۔ مختصر یہ کہ ایسے کردار کا مالک موجود نہ ملے گا اور مذہب کی اصل حقیقت سے واقف ہو انسان کو انسان سمجھتا ہو۔“

ان مختلف الفاظ میں نذیر احمد نے اپنے دور کے ممتاز لوگوں کی فہمیت کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ اتفاق سے اس وقت جو سربراہ دورہ لوگ قوم کی رہنمائی اور بنیاد دے رہے تھے۔ ان سب کے مزاج و مذاق کی تحریریں اصول کے آئینہ میں نظر آتی ہیں۔ سریتہ حانی، آزاد اور نذیر احمد سب اسی تعریف کے ساتھ ماہ تہارت میں گامزن تھے۔ کبھی کسی سے حزب برہمنی ہو تو اسے اتفاق پر غور کیا جاسکتا ہے۔ وہ نہ جوتا، ان بزرگوں کے سامنے مسلک تھا۔ نذیر احمد کو اصلاح کے سلسلہ میں اناشاف تھا کہ وہ سچ محی نامیج شفیق معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ناولوں میں کردار کی حرکات و سکنات بیان کرتے کیستے خود بخود میں بول اٹھتے ہیں۔ اور اس شہر و مد کے ساتھ ہوتے جاتے ہیں کہ پورا پھر دے ڈالتے ہیں نہ ناول کے تخلیک کے عروج ہونے کا خیال رہ جاتا ہے نہ ناول کے تباہ و تاراج کا خیال۔ اتنی بڑا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات سے ان کا دم ٹھٹ رہا ہے۔ انہیں یہ ہے کہ ان کی حالت فیر ہو جائے گی۔ لکھنؤ کی یہی رہا۔ اور یہی ہے کہ انہوں نے جو جانا۔ یہ اس وقت کے پس پشت ناسن و غوغائی کا ہڈ ہٹاؤں ہے۔ اور یہی جذبان کی تمام ادبی کاوش میں آئی پڑتا ہے۔ مہربان کا مثال و محاورات کی تہیز۔ اور انہوں نے ان کا بے مزدت و بے عملی استغناء بیان کیا کہ ان کی فہمیت کی عازری کرتا ہے جو ان کی کے ذوق پر محمول ہے۔

نذیر احمد کے ذہنی پس منظر میں سیاست کا زیادہ دخل نہیں مگر معاشرت اور سیاست میں جو دوری ہے۔ وہ کبھی الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے سیاسی مسائل پر بھی ان کے خیالات ملتے ہیں مگر وہ بے وجہ ہیں مگر ہیں مزدور۔ ان خیالات کی تہذیب میں اتنی معتدیت نہ خود داری ہے کہ حریت جوتی ہے نہ اس زمانہ میں لوگوں کا سیاسی شعور اتنا بلند تھا جتنا آج ہے۔ نہ آزادی و عفو و غفار آج کے ایسی حاصل تھی۔ مگر پھر بھی انہوں نے مختلف صورتوں سے حاکم و محکوم کے رشتہ پر جو مغز ڈالی ہے وہ اس وقت کے لحاظ سے قابل تہذیب ہے ایک جڑا بہن الوات کی زبان سے نذر کے بعد انگریزوں کے عجیب میں لکھواتے ہیں۔

انگریزی سلطنت، رعایا کے جذبات کے حق میں ایک سہیلی ہے۔ جس کو اس وقت تک اثر عوام الناس نہیں ہو جاسکتے تبدیلی سلطنت میں بھی کچھ آسان بات نہیں اور پھر ایسا بدل کر حاکم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں۔ نہ وطن ایک نہ زبان ایک نہ مذہب ایک۔ میں ہندوستانوں کے حق میں سلطنت کی تبدیلی گویا ساری مخالفی بدل گئی۔ اگلے تمام ذریعے مسئلہ ساری پیا قیاس بے کار۔ کی تدبیریں بے اثر۔ اب ہر ایک منصف مزاج آدمی خیال کر سکتا ہے کہ اس گروہ کو انگریزی ممداری سے ناخوش ہونے اور رہنے کی وجہ محض

کتنی یا نہیں۔

سین سمدنی ایک کڑی اور مددگار بہت انصاف میں ایک جگر بادشاہ اور رعایا کے تعلقات پر کچھ عہد قوں میں بحث ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے خرمی ہیں۔

"جتنے بادشاہ ہیں سب لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ سب دنیا میں بدست آدمی ہو گئے تو آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہونے لگا۔ . . . . . بقول بزرگ نمبر کی کہ آپس میں کسی شخص کو سردار بنالیں۔ سب اس کا حکم مانیں اور اس کی اطاعت کریں اور اس سردار کا کام یہ ہونا وہ لوگوں کے بھلائی کے لیے کر دیا کرے۔ رعایا کی جان و مال، آبرو کا تحفظ نہ رہے۔ اسی کا نام بادشاہ جو لوگوں کا کام ہے اس کی اطاعت کرنا۔ اور بادشاہ کا کام ہے، رعایا کو آرام دینا۔"

[illegible][illegible]

بن۔ سول کے بارے میں لکھتے تھے: الفاظ و محاورات کی جتنی تعداد اس دینے والے جو ان کو متانتاً غصب، سما دیا۔ لکھا۔ ایسے سب فقرے لکھ گئے جو ہر لحاظ سے قابل اعتراض تھے۔ ان کو پڑھ کر عام جلسے میں پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کے جذبات اذیت احمد کے خلاف مشتعل ہوئے کہ ان پر کفر کا فتویٰ دیا گیا۔ علماء کا اجتماع ہوا اور ان کی کتاب صحت امانت کا جتنا بھی ذخیرہ ملی سکا۔ سب کو ایک جاکر کئے گاوی گئی۔ اس واقعہ پر فقیر احمد پر بڑا سوت اڑ پڑا اس لیے کہ خزانہ سول اور انواع و اقسام سے بڑی عقیدت مندی رکھتے تھے۔ یہ کتا پڑا ان بزرگوں کے اخلاق و سیرت کی اشاعت پر کیا تھا۔ اور آج ان ہی کو ان بزرگوں کا حمایت سمجھا جا رہا تھا۔ ان کو اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے بعد نہ کچھ لکھ سکے نہ زیادہ دن تک جی سکے۔ یہ عادیۃ ۱۹۱۱ء میں۔ اور ان کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہوا۔

فقیر احمد کی ذہنیت کی تشکیل میں مذہب کا عنصر جزو غالب ہے وہ بغیر اس کے تصور نہیں رکھتے۔ براہدنی تعلیم میں سب شئی محدود ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب و اخلاق کا چوں و دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناواقفیت اور لاشی قوت ہے۔ نوئے الفصح کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں: نیل کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا نو کو تنہا لار کر آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا ناخن کو گوشت سے علیحدہ یا شفا کر کے گویا ان کے نزدیک مذہب الگ ہو کر نہ لگی اخلاق کے دیکھے میں نہیں رہ سکتی۔ دوسرے الفاظ میں یہ لکھا پڑتا ہے کہ ان کے خیال میں اخلاق کا شیرازہ بغیر مذہب قائم نہیں رہ سکتا۔ یہاں کوئی اور قانون اس کو راہ راست پر نہیں رکھ سکتا۔ ان کا ذہنی ارتقار۔ سوچ و فکر کا سہارا ایسے ہوئے ہے کہ وہ سمجھتے یا سنتے جیسے آئے ہیں اسی پر اپنی تحقیق کا عمل تعمیر کرتے ہیں۔ اس سے الگ یا آڑو ہو کر کوئی نیا نظریہ یا نقطہ نظر ان کے ذہن میں چٹا پھٹا فصح کہ جب حشر کے میدان میں سے جاتے ہیں اور وہاں کی۔ وادیاں رستے ہیں کر خدا کو بھیج دیتے اور اس کی حمد کا۔ درویشانی معمولی حد تک کا چرچا سمجھتے ہیں۔ خدا کے یہاں بھی عبادت و عبادت ہے۔ جو اس کے جیسے فروہرم تیار کرتے ہیں۔ گواہی عبادت و عبادت۔ سوال و جواب کا سلسلہ بہا کرتے ہیں۔ اور آخر میں عبادتی فیصلے کی طرح خدا بھی اپنا حکم عوام کو سناتا ہے۔ گویا خداوند ماحی کی جود کا رو دنیا ہی میں لگی جیسے یہاں پہلوں میں خراگتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حدت و حشر کا مادہ نہیں۔ البتہ مذہب کی راہ کو لحاظ دیا تھا۔ اور نہ کچھ سوچا یا سمجھا تھا۔ اس پر فحشی کے ساتھ کار بند تھے۔ اسی کو شمل ہدایت برا کہ نام دنیا کی مار یحیوں کو دود۔ کرسے کی فکر نام نہاں رہے۔

فقیر احمد کے اندر ایسی عاشقان پاک علیحدہ رہا



# ماضی کے ادبِ عالیہ سے متعلق

منناز حسین

ایک ایسے زمانے میں جب کہ طبقاتی جنگ بہت تیز ہو جاتی ہے تو جذباتی دفر یا نفرتی کمزوری کے باعث ادبی پرکھ میں غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تصور سیاسی تیز پسری کا نہیں ہے کیونکہ سیاست تو تیز ہوتی ہی ہے۔ بورژوا نظام کے تضاد جوں اُبھرتے جاتے ہیں گئے طبقاتی جنگ تائیز ہونا لازمی ہے تاہم تاریخ کا تقاضا تو انہیں تضاد کو زیادہ ابھارنے اور تیز کرنے ہی کا ہے۔ لیکن جب سماجی ارتقاء کے قوانین کا اطلاق بہت جلد سے اور میکانیکی طور سے ادب پر کیا جانے لگتا ہے تو نہ صرف ادب ہی کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ اخلاقی ترقی بھی کمزور ہوتی ہے۔ مارکسی تنقید میں اقتصادی بنیاد کی اولیت اور طبقاتی جنگ ادبی جانچ پڑتال کا بہترین آلہ ہے۔ لیکن جب اس آلے کو باقاعدہ تمام حالات اور علوم کا جائزہ دیکھنے والے کے طور سے استعمال کیا جاتا ہے تو یہی آلہ علم دشمنی اور جہالت کا حربہ بن جاتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے پہلے اور بعد میں نہ صرف روس ہی میں بلکہ اینگلو اور امریکہ کے زمانے میں بھی خود جرمی میں ایسے ناقدرین موجود تھے جو مارکسزم کو ایک میکانیکی علم بنا کر ماضی کے ادب کو جانچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر امریکہ اور اینگلو دونوں ہی نے اپنا قلم اٹھایا ہے۔ اسی طرح چین نے ہر ذہ کو محلوں کے خلاف نہ صرف بہت کچھ لکھا ہے بلکہ عملی تنقید کے ذریعے سماجی رہنمائی بھی کی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اپنے ماضی کے ادب کی کسوٹی بناتے وقت ان کی تعلیمات کو سامنے رکھیں۔ قبل اس کے کہ ایک اتنے بڑے مسئلے کو اٹھ دیا جائے میں تمہیداً صرف سماجی ترقی کے مفہوم اور کلاسیکی ادب کے چند بنیادی مسائل کو پیش کر دوں گا۔

جسے ہم سماجی ترقی کہتے ہیں اس کا تعلق ترقی کے مختلف سطحوں سے ہے۔ معاشی اور سیاسی ترقی کے ساتھ اگر مادی اور ادبی نقطہ نگاہ اور اپنی نوع انسان کی وحدت کا تصور نہ ابھر سکے تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ابھی سماجی ترقی نہ صرف ناممکن ہی ہے بلکہ اس میں کھوٹ بھی ہے کیونکہ سماجی شعور ایک خلاقانہ قوت ہے جو معاشی بنیادوں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ اگر سماجی شعور کی بنیادیں مستحکم نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمیں خود معاشی نظام کی طرف سے جائیں یا ٹوٹیں۔ یہی خطرہ ہمیں تصنیفات کے ذریعے اور سماجی کو دیکھنے تک محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے دیرپا اثرات کا مطالعہ بھی لازم کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کسی زمانے کی ادبی تصنیف ذریعہ اثر کے اعتبار سے کمزور ہو لیکن سماجی ترقی میں دیرپا اثرات کی حامل ہو۔ اس حقیقت کا ایک مخالف پہلو بھی ہے۔

بہات تو مسلم ہے کہ ادب اور تنقید کی ترقی طبقاتی سماج میں ہوتی چنانچہ طبقاتی اثرات کی چھاپ تو ادب اور تنقید دونوں

ی ہر ہے۔ لیکن جب ہم اس طرح سوچیں تو ہمیں سماجی ترقی کے مفہوم کو بھی اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے۔ فلاح کا دور استحالی نفع کو دہرا میں لانے کے خیال سے ایک بڑا زمانہ نفع پر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قبائلی نظام کے مقابلے میں اس دور میں انسان نے زیادہ ترقی کی ہے۔ اس لیے اس دور کا لچہ حسرت ترقی پسندی کا بھی دور رہا ہے۔ یونان کا تمام علم و ادب اسی دور میں بار آور ہوا۔ اس دور کے علم و ادب نے ترقی اور رجعت دونوں ہی قوتوں کی فائدہ کی جستجو کی۔ کئی بھی دور کی۔ سب چیزیں ترقی پسند نہیں ہوتی ہیں۔ اور نہ انہیں تاریخی تقاضوں کا نتیجہ ہی کہہ کر مانا جاسکتا ہے۔ ترقی اور رجعت کی۔ روایات پیہم ایک دوسرے کے ساتھ دست و گرباں رہی ہیں۔ مادی اور معنوی ترقی کی تعلیم روایات کو آگے بٹھا کر ایک نئی صورت میں تبدیل کرتا رہا ہے۔ وہ ناقص اور غیر سائنسی روایات کو فروغ بھی کرتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا ہے۔ اگر بنیادی انقلابات نہ دیکھا جائے تو یہ ترقی و انفعول میں سمت آتی ہے۔ حریق پیداوار کو بچھلنے اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینے اور انسانیت کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں جن قوتوں نے حسرت کیا ہے انہیں ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ یہ قوتیں مختلف ممالک میں ایک ہی وقت میں اپنے کئی ممالک کے تحت مختلف صورتوں میں کام کرتی رہی ہیں۔ ہم ایک ملک کی مثال کو دوسرے ملک پر یکساں طور پر لاگو نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کہ علم و ادب کا اثر معاشرتی بنیادوں کے ساتھ حقیقی نظام میں اتنا زیادہ راست نہیں رہا ہے جتنا کہ قبائلی نظام میں تھا۔ حقیقی نظام میں تو ان چیزوں کے اثر و ستر ایک بار حاشی بنیاد سے سمیت ہو کر اپنی ایک آزاد زندگی بھی اختیار کر لے رہے۔ انٹران کی یہ آزادی آئنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ اپنی ترقی کے انہوں قانون اور بنیادوں کو بھی بنا لیتے ہیں۔ یہیں فکری تحریکوں کو چاہتے وقت نہ صرف حقیقی جنگ۔ اسی کو دیکھتے ہیں۔ بلکہ ان کے تسلسل منطق اور قانون کا بھی پتہ چلنا ہے۔ چونکہ فکری تحریکیں ادب پر گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔ اس لیے ان کا معاہدہ معاہدہ ان کی منطق کے بہت نزدیک ہے۔ فکری تحریکیں اس لیے بھی اہم ہیں کہ وہ ایک مخصوص عہد کے ادبی نقطہ نگاہ اور ادب کی حقیقت کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ ان کی مدد سے ادب سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ادب کی تعریف لیجن نے نہ صرف اس طرح کی ہے کہ ادب خارجی حقیقت کا آئینہ ہے بلکہ اس طرح بھی کہ ادب اور ادب حقیقت میں بڑی مدد بھی کرتا ہے۔ انہیں محضوں میں ادب ہماری جہانی۔ ذہنی و جذباتی زندگی کا ایک ایسا ارتعاش ہے جس کی مدد سے کسی بھی زمانے کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ یہ تاریخ پورے سماج کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے جو حقیقت میں سنہ ادب پرانے کی جنگ کی تاریخ ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادیب کسی نہ کسی معنی میں نئے کے ساتھ جڑتا ہے۔ اس وقت یہ بھی غور کی نہیں ہے کہ وہ مکمل طور سے نئے کے ساتھ ہو کر جو کہ جس عہد کا ایک دور کی متغیر قدروں کی گنگناک تصویر عوام کے ذہنوں میں چھپتی ہے۔ ادب کا ذہن بھی گنگناک رہتا ہے۔ اسی لیے وہ اکثر متغیر باتیں بھی کرتا رہا ہے۔ دیکھا یہ ہے کہ وہ بنیادی اعتبار سے پرانے کے خلاف ہنگام کر کے کون سی نئی چیزیں لانا چاہتا ہے۔ اگر وہ صرف ماضی کی چیزیں واپس لانے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اہستہ رجعت پرست کہیں گے۔ خواہ وہ ایک مخصوص عہد کے پرانے پن کے خلاف ہی جنگ لیں کہ نہ کہ وہ۔ میں نے اس چیز کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ جب اصلاحی سکراں جبکہ اپنے کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو بہت سے نئے تعویذات کو بھی اپناتا ہے لیکن وہ ان تعویذات کو صرف اپنے طبقاتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کی یہ کوشش اصل میں قدیم کو زندہ رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال اسلامی تاریخ میں امام غزالی کا زمانہ ہے۔ اس وقت اسلام کی شرعی حکومت اختلاف کی مکمل صورت شریعتی۔ شرع اور فقہ پھاروں صرف سے جسے جو رہے تھے۔ دشمنان شرع یونانی علوم سے لیس تھے۔ بلاغرام غزالی کو بھی یونانی علم اسلام کو مستعار لینا پڑا۔ لیکن امام غزالی

نے اسے جن مقاصد کے لیے استعمال کیا وہ قطعی رحمت پسند تھے۔ اسے مادی ترقی کے بجائے روحانی استہراک کا ذریعہ بنایا۔ ہم ہیں ابعدا طبیعیات کے خلق کی۔ ہم انہیں کی کششوں سے کھلی ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی مثال عدم اقبال کی فکری کششیں ہیں۔ علامہ اقبال نے اسدھم کی۔ روحانی جمہوریت کو رہنمائی لانے کی کشش کی ہے۔ اس کشش میں انہوں نے ان ذرائع کو بھی استعمال کرنا چاہا ہے جن سے یہ رہنمائی میں ترقی ہوئی تھی۔ لیکن ایسے تمام ذرائع کو وہ اپنے مخصوص مقصد کا پابند ہی کو دیتے ہیں۔ اور یہی چیز ان کے کلام میں بھی تقاضا پیدا کر رہی ہے کیونکہ مادی ذرائع روحانی مقاصد کے ساتھ جتنا نہیں جوسکتے ہیں۔ اگر انسان غلام فطرت پر تعارف حاصل کرے گا تو اس کا مستند معرفت مادی ہوگا۔ یہی وہ سبب ہے کہ اقبال کے کلام کے ترقی پسند اجزاء خود اپنی حفاظت کرنے لگتے ہیں۔ ان کو علامہ اقبال کو ناسطہ خود ہی چاہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ شریعت میں نیابت الہی کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کی بغاوت کی حدود بھی متعین ہو جاتی ہیں۔ اس ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو شریعت کو ایک سیاں تصور بنا کر برائے نظام پر ضیق کر دیتے ہیں۔ شریعت کی نظریاتی بنیادیں بالکل نعتیں ہیں اور اس کے عمل کی تائید ایک جیسے چوتھے دور پر مبنی ہوئی ہے۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کے ایک بہت ہی مختصر سے وقت کو چھوڑ دیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ شریعت کو استعنائی طبقے نے استعمال کیا ہے اور جب تفسیریں لکھنے کا وقت آیا تو ہم ان تفسیروں نے ایسے ہی نکات پیش کیے جن سے حکمران طبقے کی پوزیشن مضبوط ہوئی۔ بالآخر خلافت دینی ریاست ایک ایسا ادارہ بن گیا جس کی حفاظت کو ایک مقدس ذریعہ بنایا گیا۔

شریعت کی حفاظت اسلامی تاریخ کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اس بغاوت کی ابتداء وحدت الوجودی صوفیوں نے کی جو یونان کے فلسفہ وحدت الوجود سے متاثر تھے۔ یہ فخر غلاموں کا نہیں تھا بلکہ چوتھیں کا تھا۔ جس نے غلاموں کی حیثیت اور دہیو قریطس کی مادیت کو ہم آئیز کرنے کی کشش کی تھی۔ بغاوت کی اس آواز کو ڈوڈوٹون مصری، ابائیہ بطلانی اور صلاح نے اٹھایا۔ اس کے پہلے یہ آواز اٹھانی ہی ممکن تھی۔ اگر یونانی وحدت الوجود کے فلسفے کو توجہ مطلق کے فلسفے پر برتری حاصل ہوئی۔ توحید مطلق کے فلسفے میں مادہ مخلوق ہے اور ایک عام زمانہ و مکان کا پابند ہے۔ اس کی ایک ابتدا اور انتہا ہے۔ وہ اپنی حرکت و صورت پذیری میں قادر مطلق نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مادہ اور خالق ایک دوری قوت ہے۔ جس طرح اس قوت نے قوانین فطرت وضع کیے ہیں۔ اسی طرح سماج (سلسلہ) سوسائٹی کے لیے بھی چند قوانین وضع کر دیئے ہیں۔

وحدت الوجود کے فلسفے میں مادہ روح کے ساتھ ہم وجود ہے۔ اور بھی روح کے ساتھ ساتھ الہی اور الہی ہے۔ مادے کا کوئی خالق نہیں ہے بلکہ مادہ اور روح ایک دوسرے کے لیے جزو لاینفک ہیں۔ اس طرح انسان کا عمل اور ارادہ مشیت الہی میں شامل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کسی چیز کی تخلیق یا تخریب کرتا ہے تو اس میں مشیت کو بھی دخل ہے۔ کیونکہ مشیت کا نظارہ مادے کے توسط سے انسانی عمل ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ وحدت الوجودی صوفیوں نے اسی منطق کی بنیاد پر اسلامی اعتدالات کو مڑا دیا جو اسے آزاد کر کے عمل میں منتقل کر دیا ہے۔ اور ان تمام مذہبی دیواروں کو گرانے کی کشش کی جو انسانوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ان اسباب کے ماتحت یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ صوفی حوام میں بہت متبہوں تھے۔ وہ درہا ہی زندگی سے گریز کرتے تھے اور انہوں نے اسلامی تائید میں دینی ریاست کے قائم ہونے کی مخالفت کی ہے۔ یہ تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ صوفیوں نے بظاہر کھن کر کسی عوامی فساد میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن عوامی تحریکوں کے ساتھ ان کی ہمدردی بالواسطہ شامل رہی ہے۔

جس تک تو بانی وحدت اور وفا لکھنے اور اپنی کج و ترسانے، وہ فلسفے کی روایات توحید حق کے نصیص کے ساتھ ہم آئیں۔ یوں نہیں، سو فیوں سے، غنوں پن میں بھی کزوری آتی تھی۔ اس فلسفے نے پہلی بہت امام غزالی سے، غنوں کی، و، دوسری بہت مجدد الف ثانی سریندی کے ہاتھ امام غزالی سے وحدت وجود کو اس کے، اس کی پڑوس سے باطل ہی آکر دیا۔ مسرات کے نصیصے، عاص و عدائی اور باطنی نصیص کی پڑتوں کو، وانی مشق و مہارت کی چیر بنایا۔ ہی کے ساتھ ساتھ انہوں نے شریعت اور عاقبت کو، ہم آئیں کر کے کی کشش کی۔ اسی ہی بہت مجدد الف ثانی سریندی نے عہد امت کو وحدت میں تبدیل کیا تو مادے کو باطل کی غنوں کی صورت دے دی۔ اس کے یہ سمجھنے نہیں کہ وحدت وجود کو بذات خود ہی فلسفہ جو مادے اور روح کو ہم آئیں کر دیا ہے۔ بہت سے معنوں میں محاکمات نہیں ہوا۔ ہر چند وحدت وجود کو اس کے واسطے اور، وانی کو ہم آئیں کر کے کی کام کو کشش کی۔ وہ عینیت سے چھٹے را حاصل نہ کر سکے۔ انہیں روح کو خاص و مادے کو مفعول بنانا ہی پڑا، ہی وہ سبب ہے کہ وہی فلسفے میں فکر کو ممل پر توحید دس گئی ہے۔ سو فیوں کی نہ کی ہی فکر پڑی، خاموشی اور، اختلاف انہیں تصورات کے ماتحت آ رہے۔ لیکن ان فلسفے کا ایک حسین بیو بھی تھا، صوفیان کو عالم اکبر تسلیم کرتے تھے اور، نو میں غنوں میں صرف انسان ہی کی محدود کوری پر اپنا بیان نہ لکھتے تھے۔ میرزا ایسا لکھا مارا انسان ہی، اس پر جسے واقف تھا۔

ہم آپ ہی کو اپنا تصور دہانتے ہیں      اپنے سولے کس کو محدود دہانتے ہیں  
اپنی ہی سیر کرنے تم جوہر جوہر کے تھے      اس دھڑک دیکھن محدود دہانتے ہیں

یہاں تو خدا کو بندے سے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ بہر و اختیار کا عنصر تو صرف اس وقت باقی رہتا ہے جب کہ ہم اس کے کو حقوق تصور نہ کریں یہ کش کش تو معرفت توحید حق کی ہی رہی ہوئی ہے۔ بعد از صوبی صدی کا اٹھالی تصور اس کی زد سے بھوکے کچھ لکھا تھا۔ اتنا ترغیر نہ بھی اپنی نو و غنوں کا اقرار نہ جانا دیا۔

اسی طرح صاحب فلسفہ بتا با صدی اٹھالی و وہ میں باطل ہی ختم ہو جاتا تھا۔ صرف غزالی اس کا لفظ یا درہ لکھا تھا، صاحب کے بتا با اس کے اصول۔ کے مطابق انسان و اس باری کی مخلوق صغانت میں ختم ہو کر تغیر اور تخلیق پر آمادہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی تصور کے ماتحت انسان کو خالق بھی بتایا ہے۔ غزالی اللہ کا وہ درجہ ہے جب کہ وہ اپنی تغیر کوئی تخلیق کے لیے فنا کویت ہے چوڑو بقا با اس میں انسان کے بند و رہنے کا تصور کمزور ہو جاتا ہے۔ اس ہے توحید حق کے ماننے والوں نے اس کو بڑی غنانت کی۔ اسے فکر کے برابر کر دانا لگا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سون سو فیوں کے زیادہ تر غزالی اللہ ہی کو رواج دیا۔ پھر کہ جاگیر دارانہ نظام کا کھلا اس خیال کو جو ادیسے میں اور بھی حد کا شایست ہوا رذلت کی میں کوئی بھی نئی تحقیق بغیر ادنی علوم کے ناکھن ہے۔ یہاں ابی شرع و ابی بھادریں ہی سنے۔ وی معلوم کو اور کہ حقیقت سے خارج کر دیا۔ ابی صفا تو مسرات سے پہلے ہی ہے۔ لیکن ابی شرع نے اس کی بھی مخالفت کی۔ ان تو پڑوسوں سے نیا وہ اہم بات تو یہ ہے کہ وحدت وجود ہی بنیادی طور پر اگر ایک مدت مظاہر غنوں کی وحدت کے تہی تھے تو دوسری مدت کائناتی تحقیق کے مظاہر کی عالمی حقیقت کو مانتے تھے۔ سماج کے بارے میں ان کا یہ تصور نہ تھا کہ فرد نے کسی معاہدے کی بنا پر اپنے اختیار سے سماج کو تغیر کیسے میں بلکہ یہ کہ انسانوں کا سماج اسی طرح ایک عالم ہے جیسے نباتات یا جمادات کی دنیا ہے۔ ان کا سماجی تصور (سلفہ منہ) نہیں بلکہ عالمی ہے۔ اسی وجہ سے بنی نوع انسان کی وحدت کا تصور

اس کی شاعری میں بہت قوی ہے۔ غالب کا شعر ہے ۔

نروندے کہ مردم شوند انجن شود تازہ پیوند جانہا بہ تن

اسی تصور کے ماتحت ان میں انسان دوستی کا جذبہ بھی بہت شدید تھا۔ لیکن چونکہ وہ ماوسے کے ارتقا اور اس کے بعد یانی ص سے واقف نہ تھے۔ اس لیے سماجی ارتقا کو مبتدائی کش مکش میں مزید کھینچے۔ یہ راز تو یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد ہی آشکارا ہوا۔ پھر ہم صوفیوں سے اس کی توقع نہ کر سکتے ہیں۔

بڑی صنعتی بات ہے۔ لیکن کہہ دینے میں برج ہی کیا ہے۔ یہ کہ پہل دفعہ گوشتے نے آفاقی ادب کا تصور دیا ہے اور اسے آفاقی ہی سمجھتے کہ گوشتے وحدت الوجودی بھی تھا۔ اس کو کہتے کے بارے میں ایلگزن نے لکھا ہے کہ ”گوشتے خدا کے ساتھ کچھ نہیں پاتا تھا اس لیے تو یہ لفظ ہی کسما ویتا تھا۔ وہ تو صرف انسان ہی کے ساتھ ماوس تھا۔ اس کی یہ انسان دوستی، ادب سے ذہب کو آنا اور کرہنے کی کوشش۔ گوشتے کا یہ سب سے بڑا کام تھا اس اعتبار سے نہ تو ماضی کے بڑے سے بڑے صنفین اور نہ سیکسپیئر ہی اس لازم قدم پر آئے۔ لیکن میں اسے آفاقی نہیں سمجھتا ہوں۔ کیونکہ فارسی اور اردو ادب میں تو صرف وحدت الوجودی صوفیوں ہی نے خدا کے تصور کو وسیع کیا ہے۔ میں فیضی اور غالب کے اشعار پیش کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ بلکہ میں مولانا روم کا ایک شعر پیش کر رہا ہوں۔ جن کی مدد سے آپ کو وحدت الوجود کا اندازہ بھی سمجھ لینا آجائے گا۔“

مئی گفت دریا باں رنبر دہل در پردہ

صوفی مدنا دار و اوسیت آفریدہ

یہاں مولانا نے صاف مغفوں میں وضاحت کر دی ہے کہ چونکہ ماوسے کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اس لیے انسان کا بھی کوئی نہیں ہے۔ یہی منطق صحاح کو انا الحق کی طرف لے گئی۔ اور اس منطق کے ماتحت کہتے صوفی شعراء عالمِ دہن کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں جاگیر دارانہ نظام کے زمانے تک انسانی عظمت کے گیت اسی فلسفے کے ماتحت آئے ہیں۔ وہ تمام صوفی شعراء جنہوں نے شریعت کے اقتدایت کر لی ہے، وہ بھی انسان کی عظمت کے ایک حد تک قائل ہیں لیکن اس سے آگے قدم اٹھانا نہیں چاہتے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ ایک درمیانی راستہ اصلاح کا اختیار کیا ہے۔ جس مذہب مدار اقبال صحاح کے فلسفے سے متاثر ہیں انسان کو صبر کرنا ہی لاکر کھڑا بھی کیا ہے لیکن جس مذہب وہ امام غزالی اور سرہندی کے تقوت سے متاثر ہیں۔ مادی نقطہ نگاہ سے انسانی عظمت کی نفی بھی کی ہے۔ تو حیدر صلیق اور وحدت الوجود کے متفاد دوسروں کے فلسفے ہی کی کوشش میں مدار اقبال نے خدا کے تعالیٰ کو لا محدود اور محدود دونوں ہی بتایا ہے۔ اور یہی کوشش اجتہاد اور تعقید کے تضاد کو بھی قائم رکھتی ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ اجتہاد ترقی کے زمانہ میں کرنا چاہا ہے اور تعقید انحطاط کے زمانے میں۔ جب بھی کوئی۔ مہا انسانوں کو مقامِ کبرا بتا کر اسے مخلوق کا نسب بھی دے دیتا ہے تو وہ اسے بندہ محکوم بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس پر مزید روشنی ڈالنے کے لیے میں یسین کی تخریر کا اقتباس پیش کر رہا ہوں۔ حقیقت میں یہ خدا کا تصور نہ تھا جس نے ہمیں نہ انفرادیت پرستی کو دیا ہے۔ یہ کام ابتدا کی اجتماعی زندگی نے کیا ہے۔ خدا کے تصور نے تو ہمیشہ سماجی جذبے کو کمزور کیا ہے۔ . . . . . خدا کے تصور نے کبھی بھی فرد اور سماج کے رشتے کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔ بلکہ معلوم ہوتے کو سماج کی زنجیروں میں اس عقیدت کے ماتحت جکڑے رکھا کہ حکمران ہوتے پر خدا کا سایہ دیتا ہے ؟

اس میں شبہ نہیں کہ یون نے جو کچھ لکھا ہے مغرب کی تاریخ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے لیکن یہ غلط بھی نہیں ہے۔ کہ اصل  
 سہانی ماضی۔ کہ ہمارے یہاں بھی کاہر بارہا ہے۔ اور یہ قصہ۔ توحید مطلق ہی کا جزو بن سکتا ہے۔ وحدت الوجود میں تو اس کی گنجائش ہی  
 نہیں۔ لیکن توحید مطلق کے فلسفے سے متاثر ہونے کے بعد تو صوفیوں کے یہاں بھی دلیوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا جو یا تو سیاست سے  
 کنارہ کش ہو گئے تھے یا پھر مطلق اندکی مراعات کے غمگین تھے۔ جہاں تک ادبی فلسفے کے نقطہ نگاہ سے دیکھنے کا تعلق ہے توحید مطلق  
 اور وحدت الوجود دونوں ہی عینی قصہ ہیں۔ لیکن جاگیر دارانہ نظام کی گزشتہ تاریخ میں توحید و حمدی نے سیاسی مطلق العنانی۔ قناری اکثرین  
 اور بہائی مطلق کے خلاف جگہ جگہ کی ہم اسے نظر انداز ہی نہیں کر سکتے۔ اس نے اس جنگ میں اور ایک حقیقت کے لیے محسوسات کی شرط ٹھہرائی  
 پنجم و گوش اور کام و دین کی لذت کو ابتدائی زیر کجھا اور شر و ادب میں محسوسات کی تمام رعایتوں کو دھپایا ہے۔ اس نے مصوری۔  
 بت تراشی۔ قصہ و شعر و غزل کسی بھی چیز کو ممنوع قرار نہ دیا یہ دوری بات ہے۔ کہ اس نے ہر چیز کو ایک پردہ بنایا لیکن حقیقت تو یہی ہے  
 کہ یہ پردے کو کسی آئینہ کا۔ کیونکہ انسانی دماغ مادے سے مادہ و صورتات کو فہم میں رہی نہیں سکتا ہے۔ اگر مطلق میں کچھ لوگ ماضی کے  
 دیوان کا مطالعہ حقیقت کے رنگ میں کرتے ہیں تو اس میں کس کا قصہ ہے اگر گھٹے اور گھٹے نے حافظ کو صرف جہاز ہی کے رنگ میں  
 دیکھا تو علامہ اقبال کو خوش ہونا چاہیے جسے خدا کو کم از کم دنیا کے ایک حصہ پر غلطی تو رسد کی رعایت کا رگ نہیں ہے لیکن وہ اس بات  
 سے بھی غصہ تھے۔ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ حافظ کا معاملہ صرف مذہبی رنگ میں کیا جائے تاکہ کرچین مغرب اور ایشیائی مسلمان اس کی اپانی  
 بنیاد کی مخالفت کرے۔ وہ کئی بے ثباتی دنیا کی بات تو اس کی مخالفت تو کوئی بھی ایسا شخص نہیں کر سکتا ہے جو مادے کو حقوق مجتہد ہے۔  
 لیکن اگر مادہ مطلق ہے تو اس کی ایک ابتدا ہے اور انتہا بھی۔ کم از کم اہل شریعہ کو تو بے ثباتی دنیا کا لگ کر ناجی نہیں چاہیے۔ مسلمان  
 صوفیوں میں تو یہ چیز توحید مطلق ہی کے فلسفے کے ماتحت آئی۔ وہ نہ وحدت الوجودی آواز نہ ہمیشہ یہی رہی ہے۔ ہم سے پہلے نہ تو ابد  
 ہے اور نہ ہمارے بعد ازل حلاج

پھر یہ چیز صرف صوفیوں ہی کے ساتھ کیوں خوب کر دی گئی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص کے قول کے مطابق وحدت الوجودی  
 بھی اس بات کو مانتے تھے کہ ہر چیز ہے اور نہیں ہے۔ یعنی ہر چیز ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔  
 ہر قطعہ پرچم کے خاک و تر سے نظر کو  
 مت بہل ہیں جانو پتہ ہے خاک میں  
 سب کہاں کچھ لہو و لعل میں نمایاں ہو گئیں  
 خاک میں کیا سوچیں ہوں گی کہ پہاں ہو گئیں

شاید اسی سبب سے بہت سے صوفیوں پر ملامت ہوئے کہ انہیں بھی لگایا گیا۔ لیکن ہر ایک شخص کے اس نکتے کو سامنے طور پر  
 سمجھنے کے لیے پھر لکھنؤ کی مزارت مٹی۔ جس سے ایشیا مدتوں تک محروم رہا۔ ناچار تغیر و حرکت کو خاک کے ساتھ ہم مٹی کو دیا گیا۔ یہ تو صحیح  
 ہے کہ ہر چیز فنا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ ایک نئی صورت میں بدلتی رہتی ہے۔ تسلسلہ زندگی کو بے فنا کو۔ یہ نکتہ قیامت اور زمان و مکان  
 کے ارضی و سماوی تقسیم نے بھلا دیا۔ صوفی شعرا بھی اس انحطاط کے شکار ہوئے۔ چنانچہ جبر اور قاضیہ دونوں ہی کے یہاں یہ طریق کار آتا ہوا  
 نظر آتا ہے۔ دونوں ہی بقا کے راز کو فراموش کر کے خاک کو مقدم کر دیتے ہیں۔

مری قبر میں غم ہے اُس عورت مرنے کی  
چرتی ہے۔ ہے ساتھ لگ منہا فنا  
بیوی بقی خرمین کا ہے خون گرم دھواں کا  
آج یہ وہاں سے ہم ہوئے، باوجود ہر جگہ  
مری مرد نے جو تو کیا یہ ابو خاک  
جو نقشب یا کی طرے پائیاں اپنا ہوں  
مرا ہے۔ فنا ہوں، جو خاک آٹھے چھڑا  
اس رام ہیں ابھی تو درپیش مرے ہیں

بہر حال اس قریب و غریب کا جو کچھ سبب جو اس قسم کے ہندوؤں کی فہم سے مراد کے لئے ہے وہی حال ہر ایک ہندو شاعر  
مناظر ہوا ہے۔ اس قسم کے خیالات کی جنسی مخالفت کی جائے کم ہے۔ لیکن جب ایک مخصوص خیال کو پردہ بنا کر صوفی شعراء کی انہی باتوں کی بھی  
مخالفت کی جاتی ہے تو حیران و حیرت کی مثال ملتی ہے۔ یہاں پہلے ذہنی و ایمانی کا تحفظ خیالات کے طور پر ملاحظہ کیا گیا ہے۔

ماہی: دینی تفسیریں و معرفت

۱. دوستان "تغصن" یا دشمنان "مراہ"۔

اس شعر کے بارے میں اگر کوئی شخص اس قسم کی رائے دے کہ جب محافظت یہ شعر کہنا تو ترقی پسند تھا لیکن اب بھت پسند ہے تو اس کے یہ منہ ہوں گے کہ اسے یا تو کھلی ادب کے جانچنے کی سائنس نہیں معلوم ہے یا سپردہ لوگوں کو کلاسیکل ادب سے متفرک کرنا چاہتا ہے۔ غلامی کے مہدے سے کہہ رہا ہے اور ان الفاظ میں عیناتی شعور کے مختلف منازل سے ہے۔ اگر آج کے دور کی عیناتی جنگ میں کاشمیر بہت ہی صاف تیز و تند ہے، ہم ندی کے مہدیا جاگیر والے اند مقام کے ادب کو جانچنے کی کوشش کریں گے۔ تو وہ ہیں یقیناً خیر معلوم ہوں گے۔ ایسی صورت میں ان کی معذرت افادیت کو، بھلا کہ ان کے جمالیاتی حلقہ کو دہانہ دراپنے ساتھ معم کرنے کے برابر ہے۔ کارل مارکس نے برٹان کے سائیکری ادب اور ٹیکسیر کو اس نظریے سے نہیں جانچا ہے۔ اور نہ یہ دنیا پر مبنی کے ادب ماہر کے بارے میں دوس ہی ہیں۔ آج جب اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ وکنس کے نادلوں میں انسان دوستی کا جذبہ عیناتی جنگ کے تضاد پر غالب آجاتا ہے۔ اب وکنس کو عیناتی تیز و تند باز کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے وکنس کی عظمت منتفی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کا ناول نگار تھا۔ اسے دنیا وہ سے سپردہ برتر انسان دوست کہا جاتا ہے۔ اس کا مہم یہ ہے کہ اس کی دوستی معلوم جیتے کے ساتھ بہت ہی واضح ہے، اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وکنس کے نادلوں میں جمالیاتی حلقہ نہیں ہے تو انسان دوستی ہی کے چیز ہے کہ مکتب سن و کنس روس میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ اب آپ ایک میں سن اور آرتھر ٹیکسیر کا کوئی بھی ایسا رد امر نہیں ہے جس میں اس نے اپنے ہیرو کو مندر کے ساتھ ہم فائدہ کیا ہو۔ بلکہ دیگر اس کا کوئی بھی ہیرو نقد پر کی تحسین میں غالب نظر نہیں آتا ہے۔ ٹیکسیر کے ہیرو سوویت روس کے ہیرو کے شعور کو بیاور نہیں کر سکتے ہیں۔ پھر بھی ٹیکسیر کے روس میں پڑھا جاتا ہے اور وکنس کے مقابلے میں زیادہ جمالیاتی حلقہ کے ساتھ۔ اب آپ ایک میٹریں اس سے بھی نیچے آتے ہیں۔ یونان کا کلاسیکی ادب جس کا کائناتی نقطہ نگاہ بالکل ہی مفید ہے۔ آج کی دنیا میں کیا افادیت رکھتا ہے لیکن کارل مارکس ہر سال پڑھتا تھا۔ اور اسے انسانیت کے زائد ضل کے محافظ کے نام سے یاد کرتا تھا۔ اسی ادب کے بارے میں کارل مارکس نے یہ کھلی جہ بھی لکھا ہے۔

یہ مجتہد مشکل نہیں ہے کہ یونان کے فنون وادب اور اس کے ادوار غنوس متمدن کے ساتھ ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان یہ سمجھنے میں یقیناً وقت ہوتا ہے کہ وہ آج بھی لیون جمہوریت خطہ کہہ سکتے ہیں۔ اور بعض معنوں میں ایک ایسا معیار قائم کیے ہوئے ہیں جس کو

ماہی کو بہت شمس سے : یونان کے کلاسیکی ادب کے بارے میں کامل مائیس نے اپنے خیارات کا احباب کئی جگہ لکھا ہے۔ ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ مائیس کے ادب عالیہ کے بارے میں کارل ڈرگس کا نقطہ نظر درست کی جھڑک اس کی حقیقت میں ثابت ہو گیا اور کو دوسرے دور کے حافظہ مند نہیں کرتی تھیں اور چونکہ وہ سماجی شعور کے لحاظ سے مائیس سے جو وقت تھی۔ اس لیے وہ جو بات حافظہ میں کرنے سے پرہیز بھی نہیں کرتا تھا اور ادب کا بھی تو ایک حسن ہے جسے مارکس نے ہی اس کے لکھا ہوا ہے۔ یہ اہم ہی حسن۔ تول حافظہ شخص مائیس نہیں کر پاتا ہے۔

خبر کہ چہرہ بڑا وضاحت و بری دانہ خبر کہ تسمیہ ساز و سکنہ ری دانہ

اگر ہمارے اس نظر سے بھی ہے تو یہ مان پڑے گا کہ حافظہ کا شعور صرف مائیس ہی میں ترقی پسند تھا بلکہ ان کی تاریخ میں ہی مائیس سے کہہ کر وہ مائیس کا سبب بنا ہوا ہے۔ اور جب ہم حافظہ کے اس شعور کو مائیس کے دور پر پیش کریں تو یہیں یہ نہ کہنا چاہیے کہ دیکھو اس کو سبب تو بہت ہند ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اگر یوں ہو گئے تو ہمیں ہوگا۔ مائیس یہ بات انہیں کے لئے تھی جسے جو مائیس ہی ترقی پسند روایات کے حامل رہے ہیں۔ وہ مائیس نے ہمارے کے خلاف جنگ کی ہے کیونکہ حسن ترقی کے ساتھ آمیز ہے۔

اب میں حافظہ کا ایک دوسرا شعر پیش کر رہا ہوں۔

ہرینڈ از معرب وے گو دلا و ہر مختار جو کس نشو و کشا پر بہ حکمت میں مقار

یہ واقعی بڑا۔ بہت پسند آن خیال ہے کہ جو معنی حکمت سے نہ کہل کے بعد اسے معرب ہو کر کھول سکتا ہے۔ غالباً یہی فلسفہ خیام بھی تھا۔ چہر بھی خیام نے اپنی ادب میں مادی اور حسی فلسفے کو جنم دیا۔ لیکن میں خیام کا سہارا ہی نہیں لوں۔

حافظہ کے اس رجحان پسندانہ فلسفے کے بارے میں میرا جو آج رد عمل ہے وہ سائنس اور مادی علوم کی پڑھتی ہوئی روشنی کے باعث ہے جب کہ وہ نہ ہونے پر مبنی تھے۔ جہاں ہے۔ کیا یہی بات حافظہ کے وقت کے لیے بھی تھی۔ اگر آپ حافظہ کے وقت کا جائزہ لیں اور یہ بات تیسویں صدی کی تھی کی ہے۔ جب کہ یہ۔ آپ میں بھی اندر میرا خیال۔ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ حافظہ کے زمانے میں مادی علوم کی تعلیم ہی نہیں مادی تھی۔ مائیس میں صرف معقولات اور مقولات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ مقولات کا دائرہ فلسفہ انبیاء تھا اور مقولات کا دائرہ اسرار و فلسفہ الہیات سے مادی علوم کو بالکل ہی خارج کر دیا گیا تھی۔ مادی علوم کے خلاف یہ جنگ تین سو سال پہلے سے مادی مادی تھی۔ اس کی ابتدا مغضہ اللہ کے پہلے سے ہوئی ہے جب کہ مائیس رحمت یہ ہے کہ اس وقت و مدت اور جو دیوں کو بھی مائیس میں شمار کیا جاتا تھا۔ تو تہ تیغ کر دیا اور تمام مادی علوم کی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی۔ اس وقت سے ایمان مادی علوم سے دور ہونا لگا۔ حافظہ کے وقت میں تو فلسفہ مادی تعلیم رہ گئی تھی۔ ایسے مائیس میں اگر حافظہ نے فتنی حکمت کی عزت کی تو کیا قصور کیا۔

.. یہاں جب حافظہ حکمت کے خلاف رد عمل کر کے معرب وے کی طرف رجعتا ہے تو اس کا اشارہ صرف محسوسات کی طرف ہے اور محسوسات علوم کے۔ وہیں پہنچے ہیں۔ انہیں معنوں میں خیام اور حافظہ نے حتیٰ نفس کو ایمانی ادب میں داخل کیا ہے۔ یہ ایمانی پلٹنے کی بازگشت تھی جو بالکل ایک مادی نقطہ نظر تھا۔

گرمی گوید کہ بہت غامض نیست رب رستمی

ادیت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے پہلے اپنے حواس کی قوتوں کو بدوئے کار لانا پڑتا ہے۔ مادی علوم انبیاء کی طرف



سے نہیں پیدا ہوتا ہے۔ یونان کا مادی فلسفہ یونان کی پہلیز سے پیدا ہوا۔ یہ وہی وہی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے زمانے میں منکر حقیقتوں اور عجولانے پھرزم سے بے تکان عینیت کا انبار کیا ہے۔ مادی زندگی کی سرسوں کو ہمارے بیزار بیت کا نظریہ محکم ہی نہیں ہوتا ہے۔ حافظ کے سامنے مادی موم نہ تھے۔ وہ خود نام غزالی کے ہاتھوں بیت کر چکے تھے۔ پھر بھی ان کی شاعری میں ایمانی ٹیکہ مستحیث حقیقت نگاری کے زہپ ہیں ابھر آیا ہے۔ مادی حقیقت نگاری حسیہ حقیقت نگاری کے بغیر وجود میں نہیں آتی ہے۔ حافظ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے الہیاتی مضامین کے منکاب طریق استدلال کے خلاف بغاوت کر کے حسیہ انہما حقیقت سے ایمانی ادب کا مالال کر دیا۔ کیا یہ شعر رحمت پندار ہے ؟

اس موقع پر میرے سامنے علامہ اقبال کے وہ اشعار بھی ہیں جو انہوں نے کبھی حافظ کے بارے میں کہے تھے۔ مجھے مومن کی اس تنقید سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں تک حافظ کے فدا مونی گوسفند ہونے کا تعلق ہے۔ ہر وہ شخص فدا مونی گوسفند ہے جو مادی کو خلق سمجھتا ہے۔ پھر یہ کون سمجھائے کہ حافظ ”صبا گڑ“ اور سونوار دھمی میں کیا فرق ہے۔ کیوں ایک سے شعرے کا انبار کیا جاتا ہے اور دوسرے کو امام بنایا جاتا ہے کیا اس خیال سے کہ حافظ زیادہ ایرانی اور چینی ہے۔ تیسری بات اور بھی پیچیدہ نظر آتی ہے۔ علامہ اقبال عرفی کی تتبع کے لیے ہر بیت کرتے ہیں اور عرفی حافظ کی شاعری پر اپنا ایمان دیتا ہے۔

گرداوردی ہوس داری در قہم سخن      زندگی حافظ شیرازی ہایست کرد      عرفی

ان تمام باتوں میں علامہ اقبال نے ایک بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ ہے حافظ کی جاوہ بیانی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں اس کا خاص کرنا شکل سے اس کی نعت طنز تک بھی ہے۔ وہ آئے والی سنوں کو سن نگاری سے روکتی ہے۔ انہیں باہر یاد دلاتی رہی ہے۔ کہ خیالات کو۔ رت نظم کو دینا ہی شاعری نہیں ہے۔ شہ ایک تعلیمی پیکر ہے جو صورت و معنی کے جدیداتی طریق سے ابھرتا ہے۔

پھر کیا عجب کہ کچھ لوگ حافظ سے اس بڑی طرح متعجب ہو جائیں کہ اثر غزالی کے اشعار پر بات کرنی ہو تو وہ حافظ کا تذکرہ کریں شاید اس لیے کہ ۔

خوشتر آں باشد کہ سز و پیران      نغمہ آید۔ حدیث دیگران

اب دیکھنا ہے کہ ان غلیوں کا بنیادی سبب کیا ہے جو ذاتی اغراض و مقاصد سے آزاد ہے۔ پہلی غلطی تو مختلف ممالک کے سماجی ارتقار کے سمجھنے میں ہوئی ہے۔ مغرب کا تاریخی ارتقا اور۔ وٹاں لا جبتاتی شمولیاتی کی ارتقا اور طبقاتی غرض سے گئے ہاں مغرب تاریخ کے شہرہ میکانیکی پرمشقیہ لاگو نہیں کر سکتے اور نہ آتم تاریخ کے مختلف ادوار کو اس طرح خاؤن میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ گویا ایک کا تسق دوسرے دوسرے تقابلی نہیں۔ اکثر اوقات ہم میکانیکی طور پر غلام تہذیب کی پیچ پر جائیداد ارتقا نظام اور اس کی پیچ پر سرمایہ دارانہ نظام کی اینٹ چنے چنے پھینکتے ہیں۔ اور ان تینوں دور کو ایک معنی میں ایک عہد (EPOCH) سمجھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ذرائع پیداوار اور تہذیب کے مادی وسائل کے ہنسنے کا دور ترقی کرنے کا تسق ہے ایک دور کو دوسرے پر برتری حاصل ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ غلام کے مشابہ میں ہیت۔ دور اور غلیت مزدور کے مقابلے میں مل مزدور کی آزادی نسبت آگے بڑھتی رہی ہے لیکن ذرائع پیداوار۔ پر ایک غلیوں جیتے کے تہذیب حاصل کر لینے سے غلامی کا دور ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ کہ وہ ہنسنے کی بنیادوں کو ختم نہ کر دے۔ یہی سبب ہے کہ مارکس نے ان تینوں ادوار کو ایک عہد (EPOCH) کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ پورا عہد غلامی کا عہد ہے۔ اس میں اتصال کی تسلیں

تو معزور بدلتی رہی ہیں لیکن اجتماع ختم نہیں ہوا ہے۔ انہیں مسنون میں اشتراک انقباض اپنے۔ سبق کے انقباض سے بہت ہی مختلف ہے یہ فرق ایک بنیادی تبدیلی کا ہے۔ اشتراک انقباض کی یہ بنیادی خصوصیت اس حقیقی شعور کا نتیجہ ہے جسے ہر فرد و انعام نے بہت ہی بڑا کر دیا ہے۔ آج ہر فرد و انعام کے حقیقی شعور میں جو تیزی اور تندی ہے اگر اس کی بنیاد پر آپ جائیداد و انعام کے حقیقی شعور کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو بڑی ناگہانی ہوگی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جائیداد و انعام میں حقیقی رنگ یا حقیقی شعور نہ تھا۔ اس سے مراد اتنا ہے کہ اس وقت حقیقی شعور اتنا آگے بڑھا ہوا نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ لیکن اس وقت تک ہونے والے اور ملنے جانے والے حقیقی کثافات و انقباض نہیں پایا تھا۔ جائیداد و انعام کے بہت سے وہ بے ہوش افراد و انعام نے انقباض و انعام کے بہت سے انعام کے دے ہوئے تھا تو اشتراک انعام نے انعام کے بے ہوش افراد و انعام کے بے ہوش افراد کی توجہ سے ایک مثال دینا چاہتا ہوں انگریزوں کے آٹے سے پیسے دیہات کی زمینوں پر کسٹوں کا قبضہ تھا۔ بعد ہر فرد و انعام پر نفرت انفرادی تھی۔ لیکن وہ اپنی محنت سے ہر فرد و انعام کو نہیں اٹھایا تھے تھے۔ کیونکہ پیداوار ایک تہائی یا چوتھائی حصہ وہ جائیداد کو بھی دیتے تھے۔ یہاں چونکہ ذرائع پیداوار پر براہ راست تصرف جائیداد کا نہ تھا۔ اس لیے جائیدادوں اور کسٹوں کا حقیقی تعلق۔ یہی آٹا شعور نہ تھا جتنا کہ انگریزی راج میں ہوا۔ انگریزوں کے آٹے سے یہاں کے حقیقی کثافات میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے دیہات کی جماعتی زندگی کو تباہ کر کے زمینیں حصول جمع کرنے والے طبقے یعنی زمینداروں کو دے دیں۔ اب زمینیں ذرائع پیداوار پر براہ راست تصرف زمینداروں کا ہے۔ کیونکہ وہ انہیں بے دخل بھی کر سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ان کی زندگی مگے بڑھی ہوئی ہے اور ان کا حقیقی شعور بہت بیدار ہے۔ آج کی ایسی شعوری آگہی جائیداد و انعام میں نہ تھی۔ لیکن حقیقی کشمکش کو حقیقی زندگی پر بات چیت سے نہیں اس کشمکش کا اظہار شاہی سیاست میں ہوتا ہے۔ اچھوتکتا ہے کہ تمام انقباضی عناصر جو جائیداد و انعام کی قبروں میں گھسے تھے وہ سب کے سب شاہی طاقت کی طرف راجع ہوتے تھے۔ اور آخر الذکر ان کی طرف راجع ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں جب ہم جائیداد و انعام کی سیاست اور حقیقی شعور کا پتہ چھاننے کی کوشش کریں تو ہمیں بادشاہوں کی سیاست کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ یہ راستہ کافی مشکل ہے یہاں سرکھانے کی ضرورت پڑتی ہے ہمیں جدید بازی میں کسی بھی اختصالی طبقے کے مفکر کی تنقید قبول نہ کرنی چاہیے کیونکہ وہ اپنے مخالف طبقے کی پس منظر میں تو بہت ہی کامیاب رہتا ہے۔ لیکن وہ حقیقت کی قبروں تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ اس کا اختصالی رجحان حقیقت تک پہنچنے میں ایک پر وہی ممانعت ہے۔ میری ایک ضمنی بات ہوئی وہ نہ تمام غریبی تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب کہ میرا وہ غالب کی شاعری میں کسانوں کی بناوت اور مہاسی کی جنگ کا تذکرہ نہیں ملتا ہے تو انہیں رجعت پر دست کہہ کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ مہاسی کی تھوڑی دوسری قسم کی خند خیموں میں جسد کر دیتا ہے کیسی کسی ہم اشتراک اور فیوض انعام کو دو قبروں میں رکھ کر مراد نہ کرنے لگتے ہیں اور جب فیوض کا پتہ چھان لیتا ہے تو پھر ماضی کی حسین روایات پر بھی حقارت کی نفرا ڈالنے لگتے ہیں۔

ماضی کی حسین روایات کو حقارت سے دیکھنے کا یہ ہندو اس میں تاریخ کو شائے کا جذبہ ہے۔ اور تاریخ کو وہی ممانعت ہے۔ جس میں کچھ احساس کمتری ہوتا ہے۔ وہ تمام اویب اور شعراء جو اپنے فن کو اس مذہب چکا نہیں سے ہیں کہ اپنے کام میں بھی ایک ادبی حسن پیدا کر سکیں۔ ماضی کی حسین روایات کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ادبی حسن کا وہاں ہی ختم ہو جائے۔ ہر تو ناظم کے لیے یہاں خالی وہ جاتا ہے۔

یہ ادبی سخن صرف یونان کے کلاسیکی ادب ہی کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ہر دور کی ہفتیوں ادبی تخلیقات کے میں بھی ہے۔ ہر دور کے ادب کا نہ صرف مواد ہی بدلتا ہوتا ہے۔ بلکہ حیثیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ پھر بھی اس کے باہمی امتزاج سے ہم ہر ادب کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ سب کو نصیب نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو ماننا پڑے گا۔ اور اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہمیں ادب۔ تخلیقات کا پتہ چلانا ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ ادب خصوصاً ندروں اور خیالات کی تخلیق کرتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تخلیق کا وقتی ہے یا دیر پا۔ وہ ہمارے ہر زمانہ اور خیالات کو متحرک کر کے ایک دیر پا اس کی تعبیر کرتا ہے۔ یا صرف وقتی جوش میں ڈاکر چھوڑ دیتا وہ ہمارے احساسات اور تعلیمات کی جو بنی صلاحیتوں کو چھوڑتا ہے کہ نہیں۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ ہمیں کہہ دے کہ ہماری تعلیمات اور غور و فکر میں نہ دو کر سکتے۔ اور ہماری تعلیمات کو کسی قدر سے ہم نے اس کے ایک نئی تعبیر بھی کر سکتے۔ اگر یہ قوت اور صلاحیت کسی شاعر کے کام میں نہیں ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ قصور۔ یعنی اس کی میں روایات کا نہیں ہے اس کا اپنا جو ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو ایسے زندہ اور متحرک ساکھوں میں تبدیل کرے کہ ہمارے اندر یہ بات کو پیدا ہو جائے۔ مثلاً ہر دور اور تجربے کی ہندوستانیوں نے لکھے ہیں اور تہذیب پر صراحت کی وادائیں۔ یہ وہ سب سے پہلے ہیں کہ ہر عوام کو سننے حیاں اور سننے شعر کے کی طرف آگیا کرتے ہیں۔ یہ اس کا سب سے اہم وقت ہے کہ ہر دور سے جب نر و شاعر کے مشاہدے اور خیالی کو ایسے ذاتی تجربے کی سطح پر لے آئے جس نے کہیں اور انہیں لفظوں اور تصویروں اور یہی محسوس نہ کریں جن سے ان کے حواس آشنا ہیں۔ یہاں ہمیں کوئی ادب اور دماغی کی۔ روایات سے بہت سے چیزیں مستعار ہوتی ہیں۔ یہ کام چھپنے اور چھٹا ہونے سے پیدا ہونے کا ہے۔ "تجربہ کا کام وقتی ہوتا ہے۔ لیکن ادبی شاعر کے کام کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔ وہ انسانی ذہن میں رہتی ہے۔ ہمیں یاد ہمارے اُس نے اور اپنا تجربہ خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے تغذیہ میں ایسی باتیں ہوتی ہیں جو کہ ان کا بھی متاثر کر سکتی ہے۔ یہ البتہ ادب پر چھائی ہے جو ہمارے لیے کوئی چیز ہے۔ یہ مرتبہ تھا حاصل نہیں ہوتا کرتا ہے۔ شعر و ادب کی تخلیق، اختراعات کی بار آدھی نہیں ہوتی۔ انہیں ہر تخلیق کرنے کا کام ہے اس پورے طریق کے مادہ میں جنہیں تفصیلات میں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ انہیں ان میں یہ مجوزہ بھی نہیں ہے۔ اس میں یہ کہہ سکتے ہیں۔ شاعر اور ادب کا یہ بعد بہت ہی بد کرتا ہے۔ کوئی کہ ادب فلاحی کے ادب سے بنیاد کی طور پر مختلف ہے تاہم اس نے نیا ہی سے نکلتا ہے۔ چاہے کسی جذباتی عزت و وس اور اندوگی کے ہر زمانہ میں ہی ہے۔ پھر بھی گوئی کو یہ کہنا پڑا کہ میں جب تہذیب سے فن سے اپنے ا مقایز کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نظم سے نہیں بلکہ اس سے مل رہا ہوں۔

یہ ابھی شاعری میں جو شعر و ادب کی تخلیق میں شاعر میں بننا لکھی ہیں۔ اور اگر انسان محنت کرتا ہے تو وہ اپنے فن کر رہا سکتا ہے۔ پھر بھی وہ صرف اس سے صحیح دلی تکیہ نہ کر سکتا ہے۔ اسے عوام کی زندگی سے سبق لینا پڑتا ہے اور جب وہ یہ کہ کسی انقلابی صورت پر انجام دیتا ہے تو اسے ماضی کی روایات کو بھی جکا کرتا ہے۔ وہ ماضی سے تجربہ نام اور ہوس سب قرعہ ا تاکہ وہ نئی تخلیق کو عوام کے محبوب محسوس میں پیش کرے۔ آج کا انقلابی شاعر جس حد تک اس حقیقت سے دور ہوتا ہے اسے عوام دور دور ہوتا ہے۔

اچھا شعر کہی خون جگر اگلنے کے برابر ہے اپنی ناکامی پر اور دنیا و محنت ان کی پائیے نہ کہ لوگوں کو اس کے جوار ہی سے برگشتہ کر دینے کی کوشش

## فراق کے خطوط

بنام محمد طفیل ایڈیٹر نقوش

(1)

۴۴ بنیک روو۔ آباد

۱۴ فروری ۱۹۵۲ء

برادر مفیس، ما حسب تسلیم۔

[illegible]

آپ نے ایک سانس میں کئی باتیں سمجھ دی ہیں۔ میں جس سانس کے لئے توجہ دیتی ہوں تو مجھے آپ کی ساری باتوں کا جواب ملتا ہے۔ ہر حال آپ سے کچھ کہے بغیر جان بھرتا نامی شکل ہے۔ اس لئے آج یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ مجھے شعر کہنے کے لئے

کسی خاص ماحول یا مروت کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں؟

بظاہر میری زندگی کا خاندانی ماحول دوسروں کی زندگی کے خارجی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں۔ میرا تعلق دہلی جیسے شہر اور دہلی جیسے ہی عام خصوصیتیں ہیں۔ زندگی میں بھی یا آہوں۔ اس جیسے کی ابھی بڑی مائیں خبریاں اور کمزوریاں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس کے باوجود اپنی ایک انفرادی شخصیت بھی رکھتا ہوں جس کے نمایاں جذبات ہیں اور جو فحش کو اپنے ہم چشموں سے تھما کر کرتی ہیں۔ بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بہنوں سے اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ مذہباتی تھا۔ اور عزت کا غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ مانوس چیزیں بھی مجھے حدود و جہانوس اور حدود و جہانوس ہوتی تھیں۔ اس طرف سے سے میں اتنا متاثر ہوتا تھا کہ میں ان میں کھو جاتا تھا۔ میرے بچپن کی دوستیاں بھی بہت شدید قسم کی ہوتی تھیں۔ بچپن کے کھیل کھیلوں سے بھی اتنی زبردست ملاوت محسوس کرتا تھا۔ کہ گھر والے تعجب کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی میرا مذاق اڑاتے تھے۔ میرا دائرہ کا کہنا ہے کہ وہ تین برس کی عمر ہی سے میں کسی بد صورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتا تھا۔ بلکہ یہاں تک مذکور تھا کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آئے ہائیں۔ اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی۔ اور کبھی کبھی اس کے بے رحمی پر ایا بھی جاتا تھا۔ اور اس کی عمر ہی سے جس لڑکی یا لڑکے، مرد یا عورت کو اپنے نزدیک میں خوبصورت سمجھتا تھا اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کم جسم بھری بڑیاں تک لکھیں گے۔ شوریٰ مود پر احساس کتنے سے برا لگھتے ہونے والی جنسیت میرے اندر سن جو غم سے پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھائی، غم و شرافت کی قدیں بھی مجھے بڑھتی مود پر متاثر کرتی تھیں۔ جن کو کہیں اور واقعات میں ان قدر دل کی جھلک دکھائی دے جاتی ان سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اگرچہ میرا گھر ایک سچا گھر تھا اور ٹوٹ کو سب سے ملتا تھا۔ پھر بھی بچپن ہی سے اپنے اندر ایک احساس تنہائی پاتا تھا۔ لگے لگے انھوں نے بھی بتا دیں کہ بچپن جو ابتدائی کن ہیں پڑھنے کو ملتی تھیں ان کے حسن اسلوب سے میں بہت متاثر ہوتا تھا۔ اور بدسلوکی سے بد مزہ ہوتا تھا۔ اس طرز از کے سترہ، اٹھارہ سال گزرت گئے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی سے شریک بن جاتا تھا لیکن جیسا پہلے کہ چاہوں کہ میری زندگی مذہبات سے بریز تھی کہ اس عمر میں مجھے اظہار مذہبات کے لیے الفاظ نہیں ملے تھے۔ اور شرارت کی خواہش گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھی۔ یہ گھٹن ہو لیے بسا اوقات صیبت بن جاتی تھی۔ ان دنوں اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری بیوی کی عورت شکل وہی تھی بلکہ اس میں کئی لڑکی جو ان لوگوں کی تھی جن کی گود میں جانے سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیتا تھا۔ اور زندگی کی دوسری صلاحیت بھی ان پر ہوا۔ ان دنوں سے میری بیوی میں کم تھیں۔ میری شادی نے میری زندگی کو ایک دائرہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے طراب جانے کے باوجود میں نے خود کشی نہیں کی نہ پاگل ہوا۔ اور نہ جرائم پیشہ بنا۔ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس سے شدہ یہ حسن پرستی نے باوجود زندگی کی شرافت کی جو قدیں مان چکا تھا۔ ان کا میں نے سہارا لیا۔ فرض شناسی نے مجھے براہ راست بچا لیا۔ یہ ضرور ہوا کہ میں مجبوراً مسلسل نیند نہیں آئی اور صحت متعلق مود پر براہ ہو گئی۔ پھر بھی چونکہ علم دوستی کا جو سر بھی تھا میں اس لیے لالچ اور بڑی درستی کے استغافوں میں بہت اونچی پوزیشن میں لاتا رہا۔ لی اسے کا نتیجہ لکھنے سے پہلے ہی میرے والد منشی برٹا دھرت گود لکھ پوری جو ستر کے سب سے بڑے دیکھنے والے انتہائی فرما گئے۔ اور ایک کچی گڑبستی کے نام سالی میرے سر پر آ گئے۔ سی۔ ایس اور آئی۔ سی۔ ایس دونوں کے لیے میرا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیکن بدولت اور سب سے دھاتی نے مجھے اتنا داس بنا دیا تھا۔ کہ

وزن سے مستغنی ہو گیا۔ ان تکلیف وہ اور کوب آگئیں حالات میں میں نے شاعری شروع کی اور بہت آہستہ آہستہ میں اپنی آواز کو پانے لگا۔ میرزا علی مراد اور خارجی ماحول کو پہنچ ہی میں بن گئے تھے۔ اب جب شاعری شروع کی تو میری کوشش ہوئی کہ اپنے ناکامیوں اور اپنے دینی غم سے کہیں اشعار کے ذریعے سے مرہم تیار کروں۔ میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی اتنے ہی چڑ سکون اور مہارت افزا اشعار کہتا جاتا تھا۔ بندہ لوگوں کو تمنی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔ عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھا۔ اور غزل رات دہے ختم ہوتی تھی۔ کبھی کسی نرالیسا ہوتا ہے اور پوچھتی اور اور غزل کا قافلہ ہوتا۔

مجھے آج سے کفن میں سحر شام منہ آتی

ایک تصویر ہوں میں رات کے کت جانے کی

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کی کیفیتیں اور رات کی حریت میں طرح طرح سے اشعار میں فضا بانڈھتی ہیں وہ چیز نہیں اور نہیں ملے گی۔ میرے کلام کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی بنا پر مجھے شاعر نہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ مزاج بالاشعر کہنے کے پچیس برس بعد میں نے یہ دہائی کہی۔

دن و شب گیا قبات کچھ اور بھی بہت

آگے اور پھل وارہات کچھ اور بھی ہے

خاموشی و تیرگی و غم کی کے سوا

میں نے انجم و ماہ رات کچھ اور بھی ہے

آدمی رات اور جھکیاں کے حیران سے میری دو نظریں رات کی ترجمانی اور معذوری کی مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ میرے بارہے کلام میں رات کے متعلق صدا اشعار اور دہائیاں بکھری ہوئی ملیں گی۔ یہ خط اپنے اس متعلق کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

فراق دیکھ شب غم کراؤ قلب بخوم

چھڑا ہوا ہے سکوت ابد کا افسانہ

کچھ اور اشعار یاد آگئے۔

تاریکیاں چمک گئیں آواز درد سے      میری غزل سے رات کی زلفیں سنو گئیں

چھڑنے ہی غزل بڑے چلے رات بھگئے      آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

جب بل غزل کو چھوٹا ہوں راتیں کو دینے لگتی ہیں      غلات کھینے میں ہم میں روز چرائیں کرتا ہوں

اب دور آسمان ہے نہ دور حیات ہے      اسے دور ہجر تو ہی بنا کتنی رات ہے

ابھاب رخصت چاہتا ہوں۔ لیکن رخصتی سے پہلے اتنا بد چھٹا چاہتا ہوں، کہ ایسا ایلی آپ کو میرے بچپن اور  
ذات سے اتنی دل چسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ اگر ان باتوں کا صاف صاف جواب دیجئے گا، تو میں بھی صاف گوئی پر آم  
آنہ آؤں گا۔

ایک بولتی ہوئی منزل حاضر ہے۔ اپنی رائے سے مزدور اور مہذب مطلع فرمائیے گا۔ اس لیے کہ شاعر ہر وقت داد کا  
بے اور مجھے تو میرے من نے باقی شعرا سے کچھ زیادہ ہی مہو کا بنا دیا ہے۔

آپ کا

فسراق

کوئی میری صحت اب کسی طرح سنبھل نہیں سکتی۔ اگر کچھ دن بیتا بھی رہا تو اسی فکر میں جینا ہو گا کہ اپنا مجموعہ کلام  
اور دیگر تصانیف کسی ایسے ناشر کو سونپ دوں جو میرے اس حاصل زندگی کو ضائع اور ناپید نہ ہونے سے

(۲)

پشیمانی روڈ۔ الہ آباد

۲۳ فروری ۱۹۵۳ء

میرا دلیم۔ قیلم

کبھی تو آپ بھی میری طرح ڈوب جاتے ہیں اور میں جواب کی راہ نکالتا رہتا ہوں۔ لیکن اب کے آپ نے بڑا  
جواب دیا۔ ہوں معلوم ہوتا ہے کہ مجھے پہلے ہی سے جواب لکھ رکھا تھا۔ غزل کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ! البتہ مجھے آپ  
بہت کھٹکی کہ ایک شعر وزن میں نہیں۔ علامہ آثر لکھنوی صاحب! اسے ایک بار پھر پڑھیے، نہ تو اس شعر کو کاٹیں گے گا اور نہ ہی نہ  
کیسے گا۔ مجھے وہ شعر لکھ بھیجئے۔ میں خود اس کی بغیر دیکھ لوں گا۔ آپ نے پہلے تو غزل کی بڑی تعریف کی۔ اور میں براؤٹس ہوا کہ  
کلام کو میری ہی طرح اور بھی عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن قطعاً یہی سخن گستاخات سے نہ سکے۔

آپ میرے حالات زندگی سے واقف ہونا چاہتے ہیں، تو میں بھی یہ کوشش کروں گا کہ آپ کی باتوں کا جواب لکھ  
اور اس طرح چار مہینوں کا سکوت اکٹھا توڑ دوں۔

میری زندگی کے داخل اور خارجی ماحول پر زیادہ نہ ہوں کچھ روشنی تو میرے پہلے خط سے پڑی ہوگی۔ اس خط  
کی کوشش کروں گا کہ کئی حرکات و متاع صد کے ذریعہ اثر میں شعر کہتا رہا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ ازدواجی زندگی کے مذاہب میں  
کیا میری کوئی مشیت زندگی بھی رہی ہے۔ اور اس کا میری شاعری پر کیا اثر رہا ہے۔ میں شاعری کا ایک مقصد یہ بھی سمجھتا  
زندگی کے خوش گوار اور ناخوش گوار حالات و تجربات کا ایک سچا جمالیاتی احساس حاصل کیا جائے۔ زندگی کا ایک وجدانی شعور

وہ آسودگی اور طمانیت عطا کرتا ہے جس کے بغیر زندگی کے ذلک و شکستہ دونوں ناممکن رہتے ہیں۔ یہی احساس میرے عرفات شعری رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قوم کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اور اس کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس کی اجتماعی زندگی کی کچھ حقائق ہیں ہوتی ہیں۔ پھر تمام انسانیت کی زندگی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ اور اس زندگی کی کچھ اتفاقی قدیم ہوتی ہیں۔ قومی زندگی اور عالم گیر زندگی کی ان قدروں اور ہندوستان کے پھر کے مزاج کو اپنی شاعری میں سمونا علی اور عالمی زندگی کے باکیزہ حرکات کو گویا عطا کرنا ہی میرا مقصد شاعری رہا ہے۔ اردو شاعری میں بہت سے محاسن کے باوجود بہت ہی چند چیزیں اردو قدروں کی کمی رہی ہے۔ دو مثالیں دیں گے۔ حاکمی اور اقبال کی حاکمی کا دل بہت نرم ہے۔ نیکی اور شرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لیکن گہرا مہندہ فکر یا فلسفیانہ دماغ ان کے یہاں نہیں ہے۔ یہ چیزیں اقبال کے یہاں درجہ اتم ملتی ہیں۔ لیکن نہ فیسی ہے۔ ایک خلجی کا جذبہ بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ اور حالت یا قوت نواہ کسی طرح کی بھی ہو اس کے لیے ایک اندھی پرتش بھی اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ جنگیں جیتنے، ملکوں کو فتح کرنے اور ان پر اسلامی حکومتیں قائم کر دینے کو اقبال بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک مثلیں کو خلجی مزاج کو۔ شرافت کا کام پڑھ کر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسلامی قوت کے تصور کی زنجیروں میں ان کی شاعری جکڑی ہوئی ہے۔ شاعری میں میری کوشش بہت دنوں تک تو سماجی یا سیاسی یا وطنی موضوعات سے الگ رہی اور کافی دنوں تک تو اپنی شاعری میں حسن و عشق ہی کے جادو جگاتا رہا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ جنسیت کو کمزور کیے بغیر اور اخلاقی محبت یا عشق حقیقی سے قطع نظر کر کے جنسیت کو زیادہ سے زیادہ چھوڑ دوں۔ اور اسے اس جس سے مالا مال کر دوں۔ عشق کے علم و نشاط اور حسن کے تصور کی تہذیب و تالیف شروع ہی سے میری کوشش تھی۔ عشق شاعری کو سلیبت تلمنی خلجی، خشونت، اغمازت اور چھوٹے پن سے بچانا۔ اور اس میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدیم سمونا جی میری کوشش رہی ہے۔ مغربی ادب خصوصاً درگوش سورمہ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر اکابر و مشاہیر کے کارنامے۔ سنکرت ادب کے کارنامے، نادرسی ادب کے کارنامے۔ مجھے براہِ متاثر کرتے رہے ہیں۔ میری اردو شاعری، جذبات و جذبات کے معاملے میں اور معیار شاعری کے معاملے میں ہنسی غیر اردو ادب سے متاثر رہی ہے۔ اتنا اردو شاعری سے متاثر نہیں رہی۔ البتہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ میں اردو شاعری کے مشاہیر سے اتنا دور کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اپنی اردو کو اپنے دھند کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہوں۔ اور اس کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ میرے اسلوب میں کتابوں کی زبان کے بدلے زندگی کی اور تاثرات زندگی کی زبان جیسی بالکل شکل میں اُبھا کر ہو پھر کسی کیفیت کو محض مکمل طور پر بیان کر دینا میرا مقصد نہیں رہا۔ قادر الکلامی ایک طرح کا جبر بیان ہے۔ کیونکہ ہر کیفیت یا ہر خیال کے محدود و مطلق پہلو کے علاوہ اس کا ایک وجودانی پہلو ہوتا ہے جس کے لیے صراحت کے ساتھ ساتھ اشاریت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اشاریت کو اپنے اشعار میں سمونا میرے خاص مقاصد شعری میں رہا ہے۔ اس طرف ہمارے اردو کے شعرا کی توجہ بہت کم رہی ہے۔

جب میں زندگی میں عمل کی حیثیت سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا نصب العین بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے میری متعدد منظوم، غزلوں اور دیباچوں میں یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ اشتراکیت کے فلسفہ میں عمل کے جو معنی ہیں وہ انسان کی گذشتہ تاریخ کے عمل کے فلسفوں سے بہت مختلف ہیں۔ اب میری کوشش ایسی منظوم میں ہونے لگی کہ مسائل کو عالمگیر انسانیت کے ارتقاء کی روشنی میں پیش کر دوں۔ محض تکلیف ہونا یا زندگی جیسی ہے اس سے متاثر ہونا، قومی پھر اور قومی مزاج کے



تقدیر پر دھڑکنا اسے اب میں نا لافنی سمجھنے لگا۔ اب دنیا اور زندگی پر دھڑکنے کے بدلے دنیا اور زندگی کو بدلنے کا تقدیر میرے اندر کارگر مہر بنے لگا۔ دنیا کو بدل دینے کے عالم گیر عمل اور عوامِ عالم کی متحدہ کوششوں کی مسوئیت، دور رس اور اُس کے دھندلے پہلو کو ادب میں چمکانے اور روشن کر کے کہیں بہت اہمیت دینے لگا۔ پھر بھی مجھے اُس کا اعتراف ہے کہ میری زندگی بہت کم جنسیت زدہ رہی ہے اور ہے۔ جنسیت سے بھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اُسے شعور سی اور دھندلے طور پر گہر بنانے کی کوشش کی ہے۔ میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جاسکتا کہ میرے کن کن سے تعلقات رہے ہیں۔ ان تعلقات کو میں نے اُس طرح منظم کیا ہے جنسیت کو کتنا لطیف بنا سکا ہوں، جنسی جذبات و تجربات کو کتنا لطیف اور رنگیں بنا سکا ہوں۔ اگر باتوں کا پتہ چلانا ہو تو میری غزلیں، رباعیوں اور عشقیہ نظموں میں ان سوالوں کا جواب دھندلانا چاہیئے۔

میرے زمانے میں مرد اور عورت آزادی سے بن نہیں سکتے تھے اور نہ عورت کر سکتے تھے۔ چوری چھپے کی بات او ہے۔ اب بھی تبدیلی حالات کے باوجود صورت حال بدلتی چلی رہی ہے۔ اس لیے مجھے کچھ عورتوں کے حسن سے متاثر ہونے کا موقع تو ملے ہیں لیکن ان سے عشق برتنے کے موقع نہیں ملے ہیں یا بہت کم سے ہیں۔

پائیز کی جنسی خلق سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس تعلق کو جدا کرنا یا قی صفات سے متصف کرنے کا نام ہے جو چیز اس عورت کو بلند کرتی ہے وہ وہی ہے جو معمولی جانوروں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے یا معمولی آدمیوں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے ایک حساس اور رچے ہوئے دل و دماغ والے انسان کی جنسی زندگی کو داخل طور پر محنت بنا ہے۔ جب جنسی جذبات کسی شخص کی پوری شخصیت میں مغل کر جائیں۔ اور اس کے منتقل کردار کا جزو بن جائیں۔ اور جب جذب خواہش کے مقابلے میں احساسِ جمال بہت زیادہ بڑھ جائے اور بہت زیادہ گہرا ہو جائے تب جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل لیتی ہے۔ کیا میرا عقیدہ کام آپ کو یہ احساس کرتا ہے کہ جنسیت اپنی تمام گشتوں سے پاک ہو کر میرے شعور اور کردار کا جزو بن گئی ہے؟

مسافت کرنا میں نے اس خط میں خواہ مخواہ "خلیہ باند رنگ" اختیار کر لیا۔ آپ تو بعض اوقات ایسی آئینہ سیر می بات کر دیتے ہیں جو ہم ناگہان مزاجوں پر گراں گذرتی ہیں۔ اگر آپ پر میرا یہ لکھنا گراں گذرا تو آپ سے معذرت چاہئے۔ بھی گھٹ آئے گا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے لاہور ملائیں اور میں نہ آؤں۔ البتہ جوش کا وعدہ میں نہیں کرتا۔ آپ ان سے براہِ رخِ خدا کتابت کریں۔ میں بھی لغتہ دسے دوں گا۔ اور آپ کس کس کو جلا رہے ہیں۔

آپ کا  
منشراق

(۳)

چینگ رڈ، الہ آباد

یوم مارچ ۱۹۵۳ء

برادریم - تسلیم۔

آپ کا طریق خط ملا، شکریہ کہ آپ دوسری اشادوں سے تونگے، یا تو قریبی ہو جائے یا کچھ، مجھ پر کیا بات ہوئی کہ صاحب ہیں آپ کی، مئی سیدھی باتوں پر ایمان لاسے کے لیے تیار نہیں، میری باتوں پر بے شک ایمان نہ لایسے، لیکن مجھے قائل کرنے کی کوشش نہ کیجئے، ورنہ میں آپ کے جوابوں میں الجھ جاؤں گا۔ اور بات آگے نہ بڑھ پائے گی۔ اور پھر آپ مجھے یہ طعنہ دینے بیٹھ جائیں گے کہ میں الفاظ کے جادو سے قائل نہ ہوتا ہوں۔ مگر انہیں جانتا ہوں کہ ایڈیٹروں کو تو خدا بھی قائل نہیں کر سکتا (خدا کا لفظ مجھ سے کہنے کے لیے لایا ہوں) اور میں تو ایک شاعر ہوں۔

اچھا ان باتوں کو چھوڑ دیتے اور یہ دیکھئے کہ مجھے کچھ غلطوں میں اپنے نفسیاتی تجزیہ کی دیانت دارانہ کوشش میں مہفت خواں ملے کرنا پڑا کہ نہیں۔ جنسیت شہوانی تہذیب عشق انسانی پر مبنی، اور ترقی، انسانیت کا صحیح نظریہ یا بلکہ کہنے کے عشقیہ دلچسپیوں کے ساتھ غیر جنسی اور غیر عشقیہ اہم امور و مسائل میں دلچسپی ان تمام چیزوں اور رجحانات یا محرکات کو اپنے کردار میں سمونا اور اسے مختلف اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی شخصیت کی ایک بڑی، کافی بنانا، ان مختلف اجزاء میں ہم آہنگی پیدا کرنا یہی کوشش رہی ہے، اس خط میں پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری علمی، فلسفیانہ، سماجی اور سیاسی دلچسپیوں نے میری عشقیہ شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ ۱۹۳۶ء کے قریب میرا رحمان اشراکیت کی طرف ہونا شروع ہوا۔ لیکن جیسا پہلے خط میں عرض کر چکا ہوں۔ (زکین بی سے صن پرستی کے ساتھ ساتھ اور اس سے ملی ہوئی میرے اندر کچھ اور صفاتیں بھی تھیں۔ یعنی زندگی کی اعلیٰ قدروں، نیکی، خلوص، ہمدردی، شرافت، انسانیت دوستی، علم پرستی، حقیقی عظمت پرستی اور بعد کو اشراکیت کا علم ہونے کے پہلے سے سچی وطن پرستی اور ہندوستان کی آزادی، ہندوستان کی عظمت کا احساس۔ تمام چیزیں میرے اندر کارفرما تھیں، اس لیے شروع ہی سے میری عشقیہ شاعری میں یہ تمام محرکات و اقدار اس طرح کارفرما ہوتے رہے کہ عشقیہ جذبات میں شرافت اور تربیت یافتہ انسانیت کے عناصر مل جاتے۔ جنسیت یا عشق اگر محض جنسیت یا عشق ہی۔ تو شعوری سی اچھی عشقیہ شاعری کو یہ جنم دے سکتے ہیں۔ لیکن بلند عشقیہ شاعری اس آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جو رزی جنسیت یا رزے عشق تک اپنی دلچسپیاں محدود رکھتا ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں ثقافت ثانیہ اور نئی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر بیدار مغز دانشور خیال ہندوستان کی زندگی محض الغزادی و دلچسپیوں کی حد تک توڑ رہی تھی۔ اور یہ عمل عشقیہ شاعری پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ قومی زندگی میں ایک بڑا پن آ رہا تھا۔ اس لیے ہماری عشقیہ شاعری میں بھی ایک بڑا پن آنے لگا تھا۔ واضح اور ایسا کا محاطی و دودھ مست رہا تھا۔ خود میری زندگی میں عشقیہ محرکات کے ساتھ ساتھ جو دوسرے اچھے محرکات تھے۔ اور قومی زندگی میں جو نئے اقدار پل رہے تھے۔ ان دونوں نے مل کر میری عشقیہ شاعری کو پروان چڑھایا۔ پھر ۱۹۳۶ء سے اشراکاتی فلسفہ نے میرے عشقیہ شعور اور میری عشقیہ شاعری کو نئی دیتیں اور نئی معنویت دی۔ یہ حقیقت دہرائی کی مزدت ہے کہ مرنہ جنسیت

زندگی اور عشق زندگی نہ جھپٹتے کو چکا سکتی ہے۔ عشق کو اور نہ عشقیہ شاعری کر۔ عشق اس وقت عشق بنتا ہے جب عاشق معشوقہ  
نہ ہو بلکہ کافی حد تک ایک مکمل انسان ہو۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میری عشقیہ شاعری میں اور اردو کی پچھلی چوتھائی صدی کی شاعری میں  
زندگی کی بیداری نئی توانائیاں اور نئے امکانات پیدا کرتی جا رہی ہے۔ لوگ ترقی پسندی کو بلند پایہ اور موثر عشقیہ شاعری کا دشمن  
سے کچھ بیٹھے تھے۔ اجازت دیجئے کہ میں یہاں اپنے کچھ عشقیہ اشعار پیش کروں۔

یہ نرم نرم ہوا جھلکا رہے ہیں چراغ  
ترے خیال کی خوشبو سے بس یہے ہیں دماغ  
جو چپ سے تاروں کی آنکھوں پاؤں دھرتا ہے  
اسی کے نقش کنبہ پاسے جل اُٹتے ہیں چراغ

فرش سے خانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ  
دیدنی ہے تری آہستہ روی اسے ساقی  
خاک میں چوٹ دہی تھی یہ نہ جانے کب کی  
رگ پیمانہ لبہ دینے لگی اسے ساقی

زندگی کو بھی منہ دکھانا ہے  
دو چلنے تیرے بغیر اہمیت

اس پستلش گرم پہ تو آنسو نکل پڑے  
کیا تو وہی غلوس سراپا ہے آج بھی

ہرگز دیش چشم آئینہ گردش دوراں  
ہر ایک ادا موج شراب طرب آگیاں  
آفاقہ تعارف ہی میں قربت پنہاں  
پہلی ہی نگاہوں جہاں الفت دیدیں  
موسیٰ نغمہ اذاز سے اُن آنکھوں کا اٹھنا  
ہیں صافحہ طوطہ تیرے ساعد سیمیں  
دو ہر نفس حسن میں خوشبو کے محبت  
وہ دھب گل افشانی لب لٹکے نگاہیں

عزیز خواتین سے میں اپنی عشقیہ جمالیاتی دماغیاں یا انہیں پیش نہ کروں گا۔ اور نہ عزیزوں سے زیادہ اشعار کی مثالیں  
مندرجہ بالا اشعار پر اگر آپ غور کریں گے تو حقیقتیں کھل جائیں گی۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی سماجی سیاسی یا کوئی عوامی  
انقلابی خیالات یا فضا مرئیں نہیں۔ یہ شہیث یا سونی صدی عشقیہ شاعری ہے۔ لیکن بغیر علمی اخلاقی سماجی اور سیاسی محرکات کے  
شاعری ممکن بھی نہیں۔ جنسی عشق، زندگی کی دوسری دل چاہیوں سے دست بردار ہونا یا گریبان پھاڑ کر جھگڑوں میں نکل جانے۔  
جنوں میں مبتلا ہو جانے کا یا نامرد ہو کر نہ جانے کا۔ ہمارے اردو شعراء جسمی لحاظ سے نامرد نہیں تھے۔ لیکن چونکہ زیادہ تر یہ شاعر  
دلچسپیاں نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی عشقیہ شاعری میں وہ قوت یا زندگی نہیں ہے، جو ان شعراء کی عشقیہ شاعری میں بہت  
دلچسپیاں ہیں۔ مثلاً میر، آتش، غالب۔

تو عشقیہ شاعری میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ ثرائف و صداقت جذبات کے ساتھ ساتھ شادیت کیفیت مہم

صنعت، تخلیق خدا اور زبان و بیان میں ایک عالمگیر لہجہ، انسان کے دل کی دھڑکیں اور ایک آفاقت پیدا کر سوں۔ نئی خامی اگر نہیں تو انہیں صفات اور مقاصد کو اجاگر کرنے اور چکانے کے لیے آئیں۔ دنیا بھر کا عشقہ ادب ہر مرتبے کا ہے۔ معمولی اور سطح درجے کا اور بلند مرتبہ، آخر کار آفاقی ادب سے استفادہ کرتا ہے۔ نیز مقصد یہ ہے اور اس طرح عشقہ شاعری کے ہجے میں زندگی بندی اور پاکیزگی پیدا کرنے میں مجھے کافی مدد ملی ہے۔ شخصیت اور شاعری صرف اپنے بڑے یا اپنے سہارے ہرگز بند نہیں ہو سکتیں۔ دونوں بلندیاں اُخذ کرتی ہیں۔ تہذیب انسانی سے۔ ہر شخص کی بلند شخصیت اور ہر شاعر کی بلند یا یہ شاعری دوسروں کی دین سے بات نہ کرتی ہے کہ ہر خاص و عام اس دین کو حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

میں نے اپنی عشقہ شاعری میں ایک اور قیمتی عنصر سمجھا ہے اور وہ ہے حیات و کائنات پر مکمل ایمان۔ میرے لیے اس کی بالکل مزودت نہیں تھی کہ خدا پر چلنے ایمان لا کر قدرت یا خلقت پر ایمان لاؤں۔ ہوں تو میری عشقہ شاعری میں دکھ، درد، غم، آسرو، اضطراب، ناگہمی، سب کچھ ہے۔ لیکن اثر اس شاعری کا حیات و کائنات سے بڑا ہی نہیں ہے۔ بلکہ حیات و کائنات پر ایمان کو تقویت پہناتا ہے۔ تعزوت کا سہارا ہے بغیر مہادی دنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا احساس کرنا میری عشقہ شاعری کا مقصد و غم ہے حقیقت جسے حقیقت کہتے ہیں، وہ میرے نزدیک اسی مجازی دنیا کا ارتعاز پذیر وجود ہے۔ البتہ اب سے میں بس پہلے تک عینیت اور تعزوت کا کچھ اثر مزور رہا ہے۔ لیکن عصری کائنات کی طہارت و پاکیزگی کا براہ راست احساس میرے اندر ہمیشہ رہا ہے

بہت اچھا جب لاہور آؤں گا، تو آپ مجھ سے باقی باتیں پوچھ لیجئے گا۔ یہ خطوں کا سلسلہ بڑا درد سر ہے۔ جوئی صاحب لکھنؤ کے شاعر ہیں آپ آئیں گے۔ تو میں بھی ان سے بات کروں گا۔ بات کیا کروں گا بلکہ بات چلی کروں گا۔ آپ نے انداز سے کے سلسلے میں جو رقم بھجوانا تھی، وہ اب تک نہیں پہنچی۔ براہ کرم اس کا بعد رخصت خیال رکھیں۔

آپ کا  
فراق

(۴)

۳۱ بیگ روڈ، الد آباد

۳۱ جولائی ۱۹۵۳ء

برادر دم۔ تبلیم۔

آپ نے اپنے خط میں یہ کیا لکھ دیا کہ میں نے عشقہ شاعری کے پردے میں بعض بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ اگر آپ کے خیال میں میں نے بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ تو آج مزور و داخل کہ باتیں سن لیں۔ تاکہ میری یہ بہکنا مجذوبانہ مد تک بے مثال بن جائے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ میں جنسی موضوعات پر آکر پھسل رہا ہوں۔ بلکہ میں بعض اہم شخصیتوں پر آواز دانا اُنہما بہ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

ایسا تو نیچے۔ آغاز شباب سے لمبی زندگی پانے والوں کی بھی عشقیہ یا جنسی زندگی زیادہ سے زیادہ ساتھ بترور ہم تک قائم رہ سکتی ہے۔ یعنی نہ یا تو اسے برس کی مزینک۔ اس دوران میں کسی شخص کے جتنے بھی محبوب و معشوق ہوں۔ ان سے زیادہ سے زیادہ جا۔ پانچ ہزار مل سکے گا۔ یعنی زیادہ سے زیادہ تین چار سو معشوقوں سے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جا زندگی کا عمل حصہ یعنی دوس دکنار، وصل و ہجر، شکر و شکایت، وفا جفا، افتخار، انار و پیام اور اسی قسم کی مٹی بھریا میں عشقیہ زندگی کے اخیر تک قائم رہتی ہیں، لیکن انہیں مٹی جبراقوں سے عشقیہ شاعری ایک ہی شخص کے ہاتھوں ہزار ہا عشقیہ اشعار کہلا لیتی ہے مجھے انگریزی شاعر کینس (CEATS) کے ایک خط کی یاد آگئی کہ جس طرح ایک کوڑی دیوار کے دو مین نقوشوں سے جلال غنا کرتی ہے اور ہزار ہا تار اور مٹے بنا لیتی ہے، اسی طرح شاعرانے گنے بھریوں کے سپارے ایک پورا دیوان عشق کھرا کر دیتا ہے یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے۔ کہ زیادہ تر حالتوں میں کسی عشق کے معشوقوں کی تعداد دو تین ہی زندگی بھر میں ہوتی ہے۔ اور ان سے دو چار بار ہی وہ زندگی بھر میں مل پاتا ہے اور ان دو چار سو ملاقاتوں میں وہی مٹی بھریا میں اپنے کو دہرائی رہتی ہیں۔ آ۔ دن نئی دار داتیں نہیں ہوتیں۔ اور دیوان تیار ہو جاتا ہے۔ ہزاروں اشعار کا۔ اگر یہ تجربے نثر میں لکھے جائیں اور افسانے کا بنایا جائے تو شاید پچاس صفحات میں سب باتیں بیان ہو جائیں گی۔ لیکن یہ شاعری کا جادو ہے کہ ایک ایک اور دار دات ہزار ہا بار بنایا جاتا رہتی ہے۔ یہ کمر اور تجدید جذبہ عشق کے استقلال سے پیدا ہوتی ہے۔ مہر دل لذت تخلیق کی مدد سے قریب قریب لامحدود و مخلوق نہ صلاحیت حاصل کر لیتی ہے۔ اب اگر سارا دیوان محض چرما جائی سے بھرا تو نانا پرے گا کہ شاعر کی زندگی و ذہنیت ناقابل اصلاح ہو کر لاری کی شکا رہیں۔ لیکن اگر واقعی کسی کا دیوان لطیف پاکیزہ پر معنی عشقیہ جذبات اور جمالیاتی احساسات سے مالا مال ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعر کی جنسیت عشق کا مرتبہ ما کر چکی ہے۔ وہ عشق بھی معنی شاعر کے کردار کا مستقل جزو نہیں بن گیا ہے۔ بلکہ شاعری کے ڈب میں رنگا رنگ انداز سے جوا ہے اور خلا قانہ خلوص ہی الیا کر سکتا ہے۔

تو ایک خطا مرے اشعار میں ہزار ہوا

اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھتے

اس خلاقی کا ماز کیا ہے؟ چند محدود تجربے اور باری ہزاروں نئے روپ کیسے دھار لیتی ہیں، یہ خدا پیچیدہ ہے۔ شاید بات یہ ہے کہ داخلی کیفیات یا کوئی داخلی کیفیت گھٹنے کی چر نہیں ہے جسے ہم ایک جذبہ کہتے ہیں۔ جب د یا اور اک اسے چھڑتا ہے یعنی جب جذبہ علم جذبہ ہوتا ہے تو اس کے بے شمار پہلو نظر آنے لگتے ہیں۔ اس طرح وحدت سے پیدا ہوتی ہے، ہر حقیقت ایک ہوتی ہوئی بھی کئی حقیقتیں بن جاتی ہے۔

ایک عاشق کی جنسی ذہنوں کو یا اس کے جنسی اعمال کو بے نہ اشخاص بدکاریوں اور غلط کاریوں سے تعبیر کر۔

زخے میں آیا عشق اعظم

ٹوٹ پڑے دنیا کے کینے

ادل کی صبح سے اس عشق کا نہ راز کھلا

جو شہر شہر ہے بدنام کو ب کو رسوا

یہ راز اگر کہیں کچھ کھتا ہے تو حقیقی عشق شاعری میں کھتا ہے یا عاشق کی زندگی کے ان پہلوؤں اور کارناموں میں کھتا ہے جن کا سرشت لوگ جنسی یا عشقی زندگی سے طمانیں پاتے۔

جنسیت کا خواہش یا حاجت روائی کی سطح سے ابھر کر ایک مستقل جذبے کی شکل اختیار کر لیا، اس میں اتنا کسے حیات انسانی کا کونسا مقصد پنہاں ہے؟ — بقائے نسل کے لیے تو جنسی خواہش یا ایک خواہش مردانہ کافی ہے۔ عشق کس مد میں آتا ہے مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ ایک عظیم تہذیب میں مل کی وسعتیں اور اس کے بے شمار پیوستہ عشقیہ جذبات کی دین ہیں۔

انسان کو محض کھاتے پیتے گذرے اس منزل سے وہ پاؤں آگے نہ دھرے

دستی کے عمل کی انتہا مہیہ و شکار اگر عشق نہ ہو مل ترقی نہ کرے

عشق کی صلاحیت محض شعرو شاعری، رقص و سرود، تاج محل اور جنتا یا دیگر فنون لطیفہ تک محدود نہیں۔ بلکہ تہذیب کا پورا کارنامہ اس جنسیت کی تخلیق ہے۔ جو عشق کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کارآمد عمل یا افادیت سے شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ کیا یہ فنون تانہ بکھ کے مقاصد کی تکمیل میں مدد دیتے ہیں۔ یا ان مقاصد سے الگ تھک چہرے؟ کیا وہ ان برائے وجدان ہوتا ہے یا برائے عمل؟

ظہر قیاس کا ہمیشہ رہتا ہے کہ فنون لطیفہ آپ اپنے شکار ہر گزہ جاتیں اور نغمہ حال و حال ہر گزہ جائیں۔ لیکن شاعر اور اس کے سماج کی پیدا رفتی اس شعرے سے شاعری کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اے شاعر خوشنوا تری ہے وہ ذات جو سوئی ہوئی جوت جگائے دن رات

اپنی ہی لذت بیاں میں نہ ہو گم دم بھر نہ جھٹے مصعب نفاذ حیات

حقیقی شاعر نہ وجدان محض کائنات کے وجود کے احساس سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس وجود کے سچے علم اور محسوس ہی طرح سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وجود کا سچا اور اک اس ماڈ کا انکشاف کرتا ہے کہ وجود کائنات برکات سے ایک متحرک اور تغیر پذیر وجود ہے۔ کائنات کی تخلیق ہو نہیں چکی بلکہ ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس مسلسل تخلیق کا ضامن آدمی کی ذات ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب سے سینکڑوں برس پہلے کی شاعری کے مشاہیر نے اپنے زمانے کی کائنات کو جس طرح سمجھا تھا وہ کائنات تو اب بدل چکی۔ اور وہ کائنات ہمیں واپس دی جائے تو ہم اسے کوڑیوں کے مول بھی نہ خریدیں۔ لیکن۔ دلیلیات برتر۔ درجہ۔ کالی وکس۔ فردوسی، حافظ، امسی داس اور ٹیکسیر کے کارنامے اب بھی سدا بہار بننے ہوئے ہیں۔ ان شاعروں کی دنیا سینے سے نہیں اٹکا رہے اور ان کے کارنامے کمروں سے بھی اٹکا رہے۔ یہ اس لیے کہ ماضی کے وہ پہلو ہوتے ہیں۔ ایک وہ پہلو جو حال و مستقبل میں اپنی ہیئت کو تبدیل کر کے قائم رہے گا۔ دوسرا وہ پہلو جو اب قائم نہیں ہے۔ شاعر ماضی کے وہ پہلو زندہ جاوید شکل میں پیش کر دیتا ہے۔ اور جس ماضی سے ہم ابھرتے ہیں اس کا زندہ شعور ہمارے اندر پیدا کر کے ہماری بدلتی ہوئی زندگیوں کا تسلسل بخونہ کر دیتا ہے، یعنی ماضی کی زندہ روایتوں کی روش کو محفوظ کر دیتا ہے ہم ماضی سے کر لیا کریں گے لیکن ہم ماضی کی معنیت سے اگر چشم پوشی

کر پس تو حال کو بھی لکھو بیٹھیں گے۔ ہمیں حال کو ماضی نہیں بنانا ہے۔ لیکن حال اور ماضی میں جو رشتہ ہے اُسے سمجھنا ازم ضروری ہے۔ ماضی کا ادب عالیہ سب کا سب فنا ہو جائے گا تو ہمیں حال و مستقبل کی تعمیر میں بہت سی رکاوٹیں پڑیں گی۔  
آپ کے معنون پر حتمی رہتا ہوں۔ تعریف اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں آپ اگستے نہ لگیں۔ اور یوں ہم اچھے مضامین سے محروم ہو جائیں۔

اور آخری بات یہ کہ حفا ہونا چھوڑ دیجئے۔ اتنے نقد آدمی ہوتے ہوئے۔ جب آپ ہجرت کی طرح روتے جانا چاہتے ہوں تو بڑا عجیب لگتا ہے۔ فرق بدوشین میں مقوڑا سا فرق تو ہے۔ بہر حال عزل حاضر ہے اور اسلامی ادب کے بارے میں بھی چند سطحوں پر ہیں۔ یہ آپ کے ڈاکٹر احسن خاوندی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو اچھے بھلے تھے۔ اب توان کی زیادتی علاج معلوم ہوتی ہے۔  
اچھے دنوں سخت بیمار رہا ہوں۔ اس لیے جلد جواب نہ دے سکا۔ مجبوری تھی۔

آپ کا  
ذائقہ

(۵)

پیشہ بنک رومہ اراکام

۱۱ جولائی ۱۹۵۳ء

ملازم - تسلیم

آج میں آپ کو بڑا معقول قسم کا خط لکھنا چاہتا ہوں۔ موضوع تو آپ کا ہے۔ لیکن لکھوں گا تو میں انہی دنوں کے اپنی طبیعت سلجھ رہا ہوں۔ اگر نظم بھی نبھیں گے چلا تو مجھے وہ لطف نہ آئے گا جو نظم کے چھلنے میں ہے۔ بہر حال مسئلہ بڑا نازک سا چھپرہ دار ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنی شاعری سے خوش ہی خوش ہوں یا کسی قدر نا آسودہ بھی ہوں۔ میں معقول و مناسب حد تک اپنے کام کے اس قدر نا آسودہ و مطمئن ہوں اچھے میں اچھا سمجھتا ہوں۔ لیکن اپنے کسی شعر، غزل، دہائی یا نظم کو صرف آخر نہیں سمجھتا۔ میرے غالب، آتش، ملک کے ہندو زمین کلام کو میں نا آسودہ شاعری کا حرف آخر نہیں تسلیم کرتا۔ اپنے کام کے جن حصوں کو میں مزہ جانے والا ہوں کہ ہندو کرنا ہوں اور بھی مختلف سطحوں میں مختلف قدریں اور مختلف رتبے۔ میرا برا اچھا شعر، نظم، غزل، شاعری نہیں ہے لیکن کس شاعر کا اچھا شعر، نظم، شاعری ہے؟ میں جیسی اچھی اور مہتمی اچھی شاعری کو سکا ہوں اس سے کہیں اچھی شاعری کا تصور کر سکتا ہوں۔

اگر مجھے اپنے پرے کلام پر مغرورانی کرنے کی فرصت ملے تو میں اس فرصت کو پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو میں بہت سے اشعار کو اور بھی چکا دینے کی امید رکھتا ہوں۔ خاص کر غزل کے اشعار اور اپنی بہت سی دہائیوں کو۔ انہیں پھر سے چھوڑ کر ضرورت ہے (THEY NEED RETOUCHING) ابھی میرے تحت اشعار میں سینکڑوں غزلیں اس طرح لگا ہوں کہ میں گنگناہٹ سن نہیں سکتا۔ صرف ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرے اندر ایک گنگناہٹ سی جو رہی ہے اور میں۔

انہی غلوں کے بارے میں میں یہ محسوس کرتا ہوں مجھ کو ملو پر آن میں کئی غزلیاں ہیں۔ لیکن جتنی اچھی نظمیں میں کہہ سکا ہوں

دس مئی تعداد یا مقدار میں نہیں کہنا چاہتا ہوں۔ میری دونوں ادبی اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت سراہی گئیں۔ اگرچہ یہ دونوں نہیں بڑے متقی ہیں۔ لیکن آپ کے حضرت بزرگوار اہادی ایسے سراپا غزل شاعر اور حضرت جوش ملیح آبادی جیسے سراپا نظم شاعر نے بار بار ان پر وجہ کیا اور جی کھول کر داد دی۔ اور اگرچہ ان غزلوں میں کوئی گھٹا و خلا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ صرف ستر نگاری اور تخلیقِ فضا ہے۔ پھر بھی علیٰ سوادِ حسری اور ان کے ہم نوا وہم عصر شعرا نے جی کھول کر ان کی داد دی۔ یہ دونوں ہیں: آدمی رات اور چوچھایاں۔ اکثر خیال آتا ہے کہ اس انداز میں کم از کم دس نہیں اور ہر آن۔ میری ایک اور نظم ہے: رقصِ شباب جسے میں بہت اچھی سمجھتا ہوں اور جو اردو کے تمام مشاہیر سے داد حاصل کر چکی ہے، وہ چار ایسی اور نہیں کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی رقی پسند فکروں میں داستانِ آدم اور کچھ دوسری نہیں مجھے پسند ہیں۔ میں ان سے بھی جند و انداز میں بچاؤں اور نہیں کہنا چاہتا ہوں۔

میں نہ تو انجاک، جوش، پختہ کی تقلید کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ ان کے حماسی کلام کا مجھے احترام ہے۔ نہ یہ وہی شعر کی سوئی صدی تقلید کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن پروفیسرِ علم الدین احمد کے اس بیان سے متفق ہوں کہ اردو کی تقییں بھی غزلیت زدہ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ درودِ سوز، گھٹس، شیلے، لورچ، جینی سن۔ میٹھو آندرا، سون برون و دیگر شعرا کے اسلوب اور تکنیک میں جو خدا ناک صلاحیتیں ملتی ہیں۔ ان گھٹاوت اور غلطی کے ساتھ جو سنجیدگی ملتی ہے اس نمونے کی کچھ تقییں کہ سکوں، کچھ ایسی تقییں کہ بھی چکا ہوں۔

ہمارے نئے شعرا غیر متقی نظم میں جو کوششیں کر رہے ہیں میں اُسے سراہتا ہوں لیکن متقی شاعری کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ انگلستان کی شاعری اردو شاعری سے بہت پرانی ہے۔ لیکن آج تک اس میں رنگارنگ متقی شاعری ہو رہی ہے۔ اگرچہ انگریزی شاعری کے جنم دن سے اس میں غیر متقی نظم (BLANK VERSE) داخل ہو چکی تھی۔ انگریزی کے مشہور ode ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہم اپنی متقی شاعری کے لیے نمونے بنا سکتے ہیں۔

اپنی شاعری کی خوبیوں اور اس میں جو کمی محسوس کرتا ہوں اُس کے بارے میں اظہارِ خیال کر چکا۔ اس دور کے شاعروں سے تذاویز کروں گا کہ وہ انیسویں صدی کی مغربی شاعری کا بغور مطالعہ کریں۔ اور قدیم مشاہیر اردو کے کلام کو بار بار پڑھتے رہیں۔ قدیم ادب سے استفادہ کچھ بغیر کام نہ بنے گا۔ لیکن قدیم ادب کا شکار ہو جانے سے بھی کوئی کام نہ بنے گا۔ محمدرے، روزمرہ، فصاحت، تلمسار اور وہ دیگر خاصاں شعری جن کے نمونے قدما پیش کر چکے ہیں۔ انہیں نظر انداز کر کے ہمارے نئے شاعر کہیں کے نہ ہیں گئے ہاں نئے اسلوب مزور پیدا کیے جائیں۔ دوایتوں کی ذخیریں مزور توڑی جائیں۔ لیکن جو نچے شاعری کو زوال بخشتے ہیں ان کا مزور لانا۔ کھا جائے۔ محض نئی بات کہہ دینے سے یا نئے الفاظ بیان سے یا چونکا دینے والی بات کہہ دینے سے شاعری زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری شاعری محض مختلف افراد کے دماغوں کی آمیج کہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ نئی شاعری بھی زندہ رہے گی جب وہ ہماری تہذیب اور ہمارے قدیم ادب کی دین ہو۔ ہمیں اپنی شاعری کو اپنے اور دنیا کے قدیم مستند ادب کا سہارا لے کر نیا بنانا ہے۔ ایک بات اور عرض کر دوں۔

انگریزی کے ایک بڑے ادیب کا مقولہ ہے کہ عظیم ادب شادابی ادبی ہوتا ہے (GREAT LITERATURE IS SELDOM LITRARY) جس شروع ہی سے ادب کو ادبی زبان دینے کے بدلے زندگی کی زبان دینے کی کوشش کرتا رہوں۔ زبانِ ادبی کا جتنی مفہوم ہے حیات۔

آپ کا

فراق

دانی و حیات شناسی۔ ۱



(۶)

چ بیگم، ڈو۔ الہ آباد

مارت ۱۹۵۳ء

دورم تسلیم

اس خود میں اس سلسلے پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ جو میرے پہلے خطوط میں ذیل طور پر ہے ہیں اور آپ کی ان باتوں میں نہ الجھوں گا، جن میں آپ نے اذیت لگائی۔ بس میری باتوں کو چپکے سے سنتے جلیے۔ جب آج سے پہلے ادب موجود نہ تھوڑے کا ایک اندہ جزو بن چکا ہے تو یہ امر لازمی ہو جاتا ہے کہ ہر ایک صال شاعر قدامت سے اپنے مزاج و صلاحیت کے مطابق استفادہ کرے۔ میں نے اردو اور دوسری زبانوں کی اچھی شاعری سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں کہ جس میز صاحب۔ نقیراگر آبادی، آتش، اقبال، جوش یا کسی بھی مشہور اردو شاعر کا طبع دوم بن کر وہ جاؤں۔ میرا یقین ہے کہ اگر میرے کلام سے تمام قطعے کاٹ دیئے جائیں اور دوسرے مشاہیر اردو کے نائندہ کلام سے ان کے قطعے کاٹ دیئے جائیں اور سب کو کر کے ایک پندہ بن دیا جائے تو اہل نظر حضرات اس بے نام و مقصد پندے میں سے میرا اور دوسرے شعراء میں ہر ایک کا کلام الگ کر لینے میں قریب قریب سو فی صدی کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ حاضر یا گذشتہ ادوار کے دوم اور سوم مرتبہ کے شعراء کا کلام حوت گذر کر دیا جائے اور لڑب جعفر علی خاں آفر کے مجموعہ بہار ماں کی غزلوں سے قطعے کاٹ کر اس دوئم اور سوم دوہے کی شاعر کے پندے میں ملا دی جائیں تو ان شعراء کے کلاموں کو ایک الگ کر کے میں کسی کو کامیابی نہ ہوگی۔ کمزور شاعری خواہ اسے کتنا ہی اور ستھارا جائے۔ خدو خال اور شخصیت سے محروم رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ میرے غالب سے کم نہ حیثیت کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ جرات اور ناصح، میر و غالب سے بہت کم تر ہیں۔ لیکن جرات و ناصح دونوں صاحب طرز ضرور ہیں۔ اب اگر کوئی شاعر سوم و درجہ کی شاعری کرنا چاہے اس کی شاعری کرنا ہے کہ اس کا کوئی اپنا رنگ نہ بن پائے اس کی شاعری میں نمایاں خدو خال نہ ہو۔ ایسے صفات نہ پیدا ہوں، جن میں اس شاعر کا کوئی شریک نہیں تو اس شاعری کو تو ہم جان تو سکتے ہیں لیکن اسے نہ ہم مان میں نہ پہچان سکتے ہیں۔

میں نے ارادہ کیا اس کی کوشش نہیں کی کہ اپنے طرز کلام کی وضاحت اینٹ کی مسبد الگ بناؤں۔ اگر میرے کلام کا ایک نمایاں مخصوص رنگ ہے اور ایک مخصوص طرز ہے تو یہ اقبالیات میری شاعرانہ شخصیت سے میرے کلام میں داخل طور پر پیدا ہوتے گئے۔ میری شاعری کے آغاز سے پانچ سات برس تک جسے دور تجربہ کہہ سکتے ہیں۔ میرے کلام میں تنقید کا عنصر قدرے زیادہ ہے۔ اور اپنی آواز ڈرا دلی دلی سی ہے۔

لیکن جیسا عرض کر چکا ہوں ایک مخصوص رنگ اور نمایاں خدو خال دوم و سوم و درجہ کی شاعری میں بھی پائے جاسکتے بلکہ تیرہ شاعری یا وہ شاعری جسے ہم ادبیات عالیہ کہتے ہیں۔ اس میں ایک منفرد شخصیت کے علاوہ فن اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا جوہر ہے حیات و کائنات کی عظمت، آفاقی وسعت، حیات و کائنات پر اہل ایمان اور حیات و کائنات سے بیکراں محبت۔ یہ جوہر تنقید شاعری اور دیگر موضوعات کی شاعری دونوں کو عظمت عطا کرتا ہے۔ آتش اور آتش کے شاگردوں کو لے لیجئے، آتش آدمی کا راز ان کی زبان دانی، طباطبائی، ذہانت، معصوم آفرین میں اس حد تک نہیں ہے جس حد تک آتش کے فکر کی آفاقیت

وہ راز پنہاں ہے۔ اور کلام آتش کی آفاقیت کے مزاج میں مطلق طور پر ممکن ہے کہ کئی موضوعات پر جو اور جس طرح آتش نے سوچا۔ اسی طرح رند و مہمانے بھی سوچا ہو لیکن وہ موضوعات آتش کے وجدان میں اس سے زیادہ دیر رس، موثر، پر عظمت اور پر کیفیت ان گنتے جتنا وہ رند و مہمان کے وجدان میں بن سکے تھے۔ بلند شاعری کی حقیقت جلدیائی عظمت کی تلاش ہے۔

جنسیت اور عشق کے بارے میں بھی پہلے کے خطوط میں کئی باتیں کہہ چکا ہوں۔ آج یہ کہنا ہے کہ بڑے عاشق کا عشق اپنی بڑا عشق نہیں ہوتا جتنا بڑے "السان" کا عشق بڑا ہوتا ہے۔ بلند برہنہیت محض جنسیت ہے۔ لیکن نیک پیڑ، کالی داس، حافظ، جیسے راسخے کی جنسیت عوام کی جنسیت سے بہت بلند و اونچا ہے۔ عشق صرف دل کا معاملہ نہیں ہے بلکہ دل سے زیادہ دماغ کا معاملہ ہے۔ چھوٹے دماغ کا آدمی بڑے سے بڑا عاشق ہو کر بھی کو راز یا بڑا عاشق ہوتا ہے۔ بڑا عاشق نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی اگر معشوق پر رست مٹ جائے، اپنے شدتِ غم سے وہ اپنے جسم کو چھلنی بھی کوڑا سے باجھوں میں نکل جائے یا معشوق کی خدمت کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے۔ پائل بھی ہو جائے، خود کشی بھی کرے یا جو کچھ کرے۔ بلند دل و دماغ والے عاشقوں کی برابری نہیں کر سکتا۔ خواہ آخر الزکوٰۃ کوئی ڈرامائی یا غیر معمولی حالت اپنی نہ بنائیں اور کچھ ہنس کھیل کر وارداتِ عشق کو برداشت کر لیں۔ دنا کے معجزے انہی بڑے عاشق کا کام نہیں ہے، دیوان کو قیرنے کا ہے۔

پر عشق کی لئے بت یہاں تک تری

نظر میں سبھوں کی خدا کو چلے

لیکن یہ پر عشق ورجانوں پر جس سائی یا روئے یا کڑاٹے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک داخلی عمل ہے۔ اس داخلی عمل سے حسن کے اقدار کی تخلیق ہوتی ہے۔ جنسیت بجائے بقائے نسل کی ضامن ہونے کے ارتقاء کے تہذیب کی ضامن بن جاتی ہے۔ کسی مخلوق کا بیان ہے کہ ایک تہذیب یافتہ کلام عاشق دیتا معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ جنسیت کو عشق سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ برہمچل جاتے ہیں۔ کہ ایسا عاشق ناکام ہو ہی نہیں سکتا۔ جب حسرت مولیٰ کہتے ہیں۔

دلکینا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا

شبودہ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

یہ اندھا طوطی عشق محض ایک برائے بیست چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اس دورے دیکھنے میں بھی جرماد و کار ہے۔ وہ

جنسیت ہی کا جادو ہے۔

یہی بات ہم افراد سے گذر کر قوموں اور تہذیبوں کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ وحشی یا نیم تہذیب قومیں اس کی مثالیں تو پیش کر سکتی ہیں۔ کہ ان کے کئی افراد ہر پر عشق کے تحت آگ میں کود پڑے۔ لیکن ایسی قوموں کا عشق ان مثالوں سے بڑا عشق نہیں بن جائے گا۔ البتہ قابلِ قدر عشق ضرور رہے گا۔ کیونکہ عشق کا مقصد معشوق سے دھمال و قرب کے علاوہ ہر پر عشق اور احساسِ ہمال کو طبع بنانا ہے اور آگے بڑھ کر تہذیب و تمدن کی تخلیق کرنا ہے۔ نیکسپیر کی شیعہ شاعری عکسِ آئینہ کے دانے کے غیر عشقیہ غم کا ناموں سے غیر متعلق ہے۔ نیکسپیر کی شاعری۔ بیکن کی تصنیفات، انٹی دینا کی دریافت، انگلستان کی نشاۃ ثانیہ، یہ سب ایک ہی تاریخِ عمل یا دورہ کی پیداوار ہیں۔ ہماری آدو و شاعری نے کسی بڑی قومی زندگی کے آغوش میں نہ جنم لیا تھا نہ پروان چڑھی۔ جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں خود میری شاعری میں اگر واقعی کچھ بڑی چیزیں ہیں تو وہ سب کی سب ایجاد بندہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس ہندوستان کی دین ہیں۔ جس کی نشاۃ ثانیہ راجہ رام موہن رائے کے وقت سے شروع

یا محض نفس طبع کا باعث نہ بنے گی۔ بلکہ دہقان و تفکر کی ایک بڑی پرانی ورثہ ہوگی۔ بڑی عشقیہ شاعری کی نگاہ میں جہاں ایک معشوق ہوتا ہے۔ وہاں دوسری طرف تو ہی زندگی اور اس کے امکانات ہوتے ہیں۔ ایک مسک پر بھی انہماک و خیال کرنا چاہتا ہوں، معشوق ذہنی اور اخلاقی طور پر کوئی فوق الانسان نہیں ہوتا۔ بلکہ معمولی انسان ہوتا ہے۔ تو کیا اس کا اس قدر گرویدہ ہو جانا کہ اس سے قیمتی انسان کا نقص و ربح بھی ناممکن ہو جائے، جھوٹ یا مبالغہ نہیں ہے؟

سو داجو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ

کیا جانیئے ترے آسے کس آن میں دیکھا

محبت کی مشہور داستانوں یا واقعوں کے معشوق اپنے زمانے کے حسین ترین انسان تھے۔ لیکن ناقابلِ برداشت کشش عاشق میں پیدا کر دیتے تھے۔ اور غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والے عاشقوں کے دلوں میں دنیا کے حسین ترین انسان تھے۔ عقلی طور پر تو یہ ایک مجرم ہے۔ لیکن اس مجرم میں ایک داند پوشیدہ ہے۔ اور وہ ماند بقاء کے نسل نہیں ہے۔ بلکہ اور آ ہے۔ بقاء کے تہذیب نہیں ہے بلکہ ارتقاء کے تہذیب ہے۔ معشوق کے جہاں کی یہ داخلی کشش مجموعی حیثیت سے بہتر نس اور بہتر تہذیب کی فاضل ہے، بنیادیت شدید جذبات کے سہارے بہتر نسل پیدا کرتی ہے۔ یہ مزدوری نہیں کہ اگر کسی عورت میں انتہائی عشق ہو تو اولاد بہت بلند تو پیدا ہوگی۔ لیکن امکان بہتر اولاد کے پیدا ہونے کا ضرور ہے۔ اولاد کی سب سے زیادہ حد ماں باپ کی باہمی محبت ہے۔ اگرچہ اولاد چیزوں کا بھی اس معاملے میں حصہ ہے۔ مگر بھی والدین کی یا بچے کی زندگی کو جنت بنا دیتی ہے۔ یعنی اسے ترقی کے بہترین امکان فراہم کر دیتی ہے۔

لیکن ہم جنسوں کی پر خلوص جنسی محبت سے اولاد تو نہیں پیدا ہوتی۔ مگر اس سے تہذیب کو کیا فائدہ ہوتا ہے عاشق و معشوق کی زندگیوں میں لغات پیدا ہو جانا اور دونوں کی شخصیتوں کی تالیف و تہذیب۔ دوسرے اگر عاشق کی شخص سے بڑی ہے تو معشوقی جمال ہم نشین و رس اثر کر کے مصداق بہت کچھ بن سکتا ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر چلا ہوں۔ ہم جنسوں سے محبت انہی گئے افراد تک محدود رہے تو اچھا ہے۔ مگر اگر ایسی محبت میں طرفین ہر فن کو۔ یا کسی دوسری کارآمد دل چسپیوں کا حامل ہے۔ تو یہ محبت اس کی ان دل چسپیوں کو پروان چڑھانے میں ہے۔ یہاں ہم کہتے ہیں کہ محبت کے لیے ہمیشہ کچھ اور میر کی اور وکھتری کو سطرط یا بہت سے گناہم بیکہ مشق و مشق کے اور وکھتری سے کوئی نسبت نہیں۔ مگر وہ پست فنا یا شہداء میں ہوا کرتا۔ اور نہ تہذیب اس کو ضیاع دے سکتا ہے۔ یہ بہت اچھا ہے۔

تہذیب ہمیشہ ان محلوں میں قائم رہتی ہے۔ اور اس کے لیے کوئی ایک راستہ اور میر کے سے زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ یہ حق واقعہ ہے کہ میں سے آج تک کسی سے بھی اتنی کھن کو اختیار ہے۔ کہ مجھے آپ کی برہات کی قبل میں ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اب مجھے اپنی زندگی پر کوئی ہماؤں۔ کافی غم ہو گئی ہے کہ تک شعریہ کہ رچی سوں گا۔ وہ اب مجھے امید بھی ہے کہ آپ بعد ایک ایسا معنوں کو ملیں گے۔ جس سے میری ہر وہ شخصیت سب کے سامنے پیش آئے گی۔

# نواب عماد الملک (مولوی حسین بلگرامی)

ڈاکٹر عبدالحق

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے سب سے پہلے برٹش گالی آئے اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی۔ لیکن ان کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ برٹش گالی ہندوستان میں دو مقصد سے آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے دوپیر کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول میں انھوں نے بڑے ظلم و جبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ لفظ اور کچھ ویسی عیسائی اور کچھ دوسلے مردوں کی باقی رہ گئے ہیں۔ ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کا کوئی قابل ذکر نشان باقی نہیں رہا۔ البتہ انگریزوں کے قدم یہاں ایسے جمے کہ وہ ان کا سبیل کی طرح سارے ملک پر چھپ گئے۔

ان سے قبل جتنے فاتح ہندوستان میں آئے وہ شمالی مغرب کی طرف سے داخل ہوئے مگر یہ یورپی قومیں سمندر کے راستے تجارت کے بھیس میں آئیں اور تجارت کی کوٹھیاں بناتے بناتے طے بنانے اور لشکر جمع کرنے لگیں۔ اور ملک زین عالمگیر کے بعد سلطنتِ دہلی میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ قسمت یہاں نکلتی پہنچی کہ بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ صوبے خود مختار ہو گئے۔ کبھی آپس میں لڑ مرنے، کبھی غیروں کی مدد سے ایک دوسرے پر حملے کرتے۔ کبھی مل کر غیروں سے جا بھر دینے اور کبھی عداوتی کر کے خود اپنی جڑ کاٹنے پر آمادہ ہو جانے۔ انگریزوں کی حالات کا ایک شاطر کی طرح مطالعہ کرتا رہا اور کبھی فتنے کو لاف سے جانے نہ دیا۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو گیا اور دوسرے کو شکست دی اور اس ملک کے معاوضے میں مصارفِ عام سے گداؤں قدر رقم لے لی اور کچھ حصہ ملک کا بھی ہتیا لیا۔ کبھی کسی کو بڑھتا ہوا دیکھ کر چھپر خانی شروع کر دی اور اس زمینوں سے مل کر اس کے علاقے پر چڑھائی کر دی اور بندر بانٹ کے قدیم اصول پر اچھا حصہ اپنے لئے رکھ لیا اور کے طور پر ایک ایک ملک اساتھیوں کے سامنے ڈال دیا۔ کبھی بادشاہ سے فرمان حاصل کر کے مفسوبہ علاقے کے خود قرار دے لیا۔ ہمارے اسلاف ان فرنگیوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ ان کا لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، عادات و عیادت، زبان، غرض ان کی ہر بات ان کی نظروں میں نہ آتا تھا اور ناشائستہ تھی۔ ہمارے ایک لغت نویس نے فرنگی کی عجیب و غریب ان الفاظ میں کی ہے :-

”یکے از جانورانِ مدیائی کہ گاہ بہ گاہ محلِ خود را می شود“

اس میں نگاہ بہ ساحل نمودار می شود۔ کاکلمہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ ہمارے بزرگ زیادہ سے زیادہ ان کی تعریف تھے کہ کارنگرا چھ ہیں، ہندوئی، توپ، گھٹری وغیرہ خوب بنانا جانتے ہیں۔ صاحبِ علم نہیں۔ وہ بھی مسلمانوں سے خوش نہ اپنا زوار خیال نہیں کرتے تھے بلکہ باغی سمجھتے تھے۔ ان کا ایسا سمجھنا کچھ بے جا نہ تھا اس لئے کہ سلطنت انھوں نے مسلمانوں سے اپنا تسلط بڑھایا اور خاص کر اسلامی حکومتوں سے جو معاندانہ برتاؤ کیا اس نے مسلمانوں کو اپنے اعلیٰ مقامات، تہذیب و روایات اور علم و فضل پر غرور کیا۔ وہ اس ملک کے فاتح اور حاکم رہے تھے۔ انھوں نے تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ملک کی کاہل دی اور لادجود والی عظمت کے انھوں نے اپنی افروخت کو قائم رکھ کے سامنے نہیں ہچکے۔ وہ اسے خیر اور بخش سمجھتے رہے۔

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا حیات میں سنبھلنے رہنے اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ہندو اس راز کو سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ملک میں ایسے کئی دور تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ انھوں نے اس کی پردہ اندہ کی اور بالآخر اس کا خمیازہ جھکنا پڑا۔ مسلمانوں کو چارہ بی خانہ ان ایسے تھے جنھوں نے اس کشمکش کے ابتدائی دور میں زمانے کے تیرہ بچا نے اور اپنی حیثیت اور وقار رکھنے کے لئے بڑھ اور زمانے کا ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین بکرامی کا خاندان تھا جو کارخ و بیکو کو انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا۔

مکرام اور وہ کا نہایت مردم خیز قصہ ہے۔ اس خاک سے ایسے جلیل القدر عالم و فاضل آئے جن کے نام اپنے علم و فضل کی وجہ سے ملکی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سید حسین کے والد سید کریم حسین کو انگریزی توسل حاصل ہوا اور وہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اور وہ ۱۲۴۳ - ۱۲۵۲ھ سرکارِ اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر لکھنے کے گورنر جنرل لارڈ ڈیونپور میں پہنچے۔ ان کی اولاد سید زین الدین حسین (والد سید حسین) اور سید اعظم الدین حسین نے وارن ہیسٹنگز کے بنا کر وہ، میں علومِ مشرقیہ کی تعلیم کی اور ایسے زمانے میں جبکہ انگریزی پڑھنا حرام سمجھا جاتا تھا انگریزی بھی سیکھی۔ یہ پہلے مسلمان تھے جو اس بدعت کے متکبر ہوئے اور باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

سید حسین کے چچا اعظم الدین حسین نے انگریزی حکومت میں بڑا اعزاز اور اعتماد حاصل کیا اور بڑی ذمہ دار پر مامور رہے۔ ابتدا میں لارڈ ڈیونپور کے اسے ڈی کان اور ترجمان رہے۔ اس کے بعد وہ سندھ میں حکومت کی طرف سفیر یا پرنسپل ایجنٹ امیران سندھ و انسرا علی جہاز رانی و ریاست سندھ متعین ہوئے۔ یہ عمدہ انگریزوں کے مگر امیران سندھ اپنے ملک میں انگریز کا اتنا پسند نہ کرتے تھے۔ سندھ میں سیدیوں اور بہروں کی بے حد تعظیم اس لئے لوگوں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ہاتھ چومتے اور زچہ لیتے۔ نواب عماد الملک فرماتے تھے کہ انگریزی کتاب نہ پڑھتے تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اکثر سندھ میں ان کی خدمت میں تعزید لینے کے لئے حاضر رہ

کبھی کوئی عربی شعر یا دآیات قرآنی تو وہ کافد پر گھر کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے جب لوگ نعرہ میاں گئے تھے وہ اب تواری میں سے نکال نکال کر دے دیا کرتے کچھ عرصے کے بعد کسی بغض نے یہ افواہ پھیلا دی کہ شخص دراصل انگریز ہے مسلمان بنا ہوا ہے۔ آری نئے گورے بچے لوگوں کو یقین آگیا اور شورش برپا ہو گئی۔ اس سے ان کو جان کا خطرہ ہو گیا اور وہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر نکل بھاگے۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کلکٹر و ناظم بندوبست بہار چرمیں پر گئے کہ نہ مت پر مامور ہوئے۔ دوبارہ جیل گھر کو نسل بنگالی کے مہر نامزد ہوئے حکومت نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا۔

سید اعظم الدین حسین کے دوسرے بھائی سید ندیم الدین حسین نے محکمہ مالی میں ملازمت اختیار کی سید احمد میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی جسرٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران میں انھیں ایک مدت تک اصطلاح بہار و بنگال میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ مولوی سید حسین کی ولادت بھی مہاتما برہم کی جنم بھومی ضلع گید کے قصبہ صاحب پٹی میں ہوئی۔ سید صاحب سید حسین نے کہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

مولوی سید حسین کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ابھی چھ سات برس کے تھے کہ ان کو عربی شروع کرانی تھی۔ وہ کتنے کچھ کیریئر تعلیم کی ابتدا عربی زبان سے ہوئی تھی کہ حساب اور قلبدیس بھی عربی میں پڑھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ فارسی عربی کی تحصیل سے فارغ ہو کر بھاکپور پہنچے اور بعد ازاں کلکتے کے انگریزی وائن وٹنیم پانٹر رہے۔ شش ماہ میں میٹرک ویشن کی سند حاصل کی۔ شش ماہ میں ویرہ اولیٰ بین آنرز کے ساتھ بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے اپنے اثر سے کسی محفولی سرکار میں ملازمت میں منسلک کر دیں۔ لیکن نوجوان سید نے جو کالج کے کمروں سے تازہ تازہ نکلا تھا اپنے علم و فن کی بات اس سرور سے کو پسند نہ کیا جو تمام سرکاری سرکاریوں میں کم حقیقت سمجھا جاتا ہے اور ایک صدی گزشتہ پرکھا۔ ایک مافد روانی کا شکا ہے۔ اس نے فوجی کیریئر پر توجہ دینا شروع کیا۔ کالج لکھنؤ میں عربی زمانہ ان کی تیسری ایون کر لی اور ان طرح انہیں لکھنؤ میں مستقل طور پر رہنے کا موقع مل گیا۔

اس دوران میں ان کو لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی تندیب و آداب و آشنائی اور مذہبی رجحانات دیکھنے کا اچھا موقع ملا اور وہاں کے علماء و اکابر کی صحبتوں سے مستفیہ ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ شعرو سخن اور خاص کر مرثیہ گوئی کا مرکز تھا۔ سنہ ۱۲۸۰ ہجری تا ایک قابل تعلیم یافتہ نوجوان پرائر ہونا ضروری تھا۔ پروفیسری کے زمانے میں انھیں لکھنؤ ٹائمز کی ایڈیٹری کے ذریعے بھی انجام دینے پڑے۔ یہ اخبار تعلقداران اور دھرم کے مفاد و اغراض کی حمایت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ نے نہر سرورہ نکالنی چاہی۔ اس سے تعلقداران اور دھرم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے تعلقدار اس نیر کے سخت مخالف تھے۔ اخبار پائیر نے جو نیم سرکاری اخبار سمجھا جاتا تھا اس نوجویر کی تابیدیں پور زور آرٹیکل لکھے۔ گورنمنٹ ٹائمز کے نوجوان ایڈیٹر نے ان مضامین کا جواب لکھا اور گورنمنٹ کی نوجویر پخت نکتہ جینی کی۔ ایسی نکتہ جینی اور وہ بھی تعلقداران اور دھرم کے اخبار میں حکومت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ پروفیسر سید حسین معرض عتاب میں آگئے اور انھیں ایڈیٹری سے دست بردار ہونا پڑا۔ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نو اب سر سالار جنگ بہار و لارڈ لارڈ برک کی ملاقات کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ آ رہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی معاونداری اسی شان سے کی جیسی خود مختار روس کے عظام کی کی جاتی تھی۔ کالی گورنر ان صوبہ ہند کو حکم پہنچ گیا تھا کہ ان کو اپنا عہدہ چھوڑیں۔ چنانچہ اسی غرض سے ریڈیڈنٹ وقت مسٹر سائڈرس ہم کا بپتھے تھے۔ نواب صاحب جنرل ایل بیر و چیف کنشنز کے ہاں فروکش ہوئے۔ جنرل بیر و نے تعلقہ داراں اودھ و دیگر امرائے شہرہ کرائی۔ منجملہ ای کے بر و فیسیر جیسن کا تعارف بھی نواب صاحب سے کرا دیا اور ان کی ملی وادنی قابلیت کی بہت کچھ تعریف نواب سر سالار جنگ بہادر جت موم شناس اور قدر دان تھے اور ان اصلاحات کے پیش نظر جو وہ حیدر آباد کی ریا میں کرنا چاہتے تھے ان کی یہ تمنا تھی کہ ہندوستان کے قابل اور تجربہ کار اشخاص کو اپنی ریاست میں کھینچ لائیں۔ ج سید حسین سے ملنے کے بعد ان کو ریاست کی ملازمت کی ترغیب دی اور فرمایا کہ میں جب حیدر آباد واپس پہنچوں تو آؤ اور مجھ سے ملو۔ لیکن وہ حیدر آباد نہ گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ فطرتاً ان کے مزاج میں استغنا تھا اور اس کا کچھ نہ کیا۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ریاست کی نوکری کو انگریزی ملازمت کے مقابلہ میں کم تر اور ناتواں سمجھتے تھے۔ نواب سر سالار جنگ کو اس کی بڑی شکایت تھی اور جب وہ اس قسم کی کوئی بات سنتے تھے تو انہیں تنہا کیونکر انھوں نے اپنی ریاست کو منظر اور باضابطہ بنانے میں بڑی حکمت اور تدبیر سے کام لیا تھا اور اس کام ایسی پیشگفتاوت سے مقابلہ کرنا پڑا جن کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آخر خود نواب صاحب ہی نے اسے بلوایا۔ اس کے بعد بھی اس پیش کر رہے اور آخر ۱۸۵۷ء میں حیدر آباد آئے اور اسے بھی تو یقین دہانے کے لیے کہ حیدر آباد پہنچے تو نواب سر سالار جنگ نے ان کے حال پر اس قدر شفقت اور غنا کیا کہ ان کو وہاں کے سب سے زیادہ قابل و قابل تھے۔

ابتداء میں نواب صاحب نے اپنا پرسنل سسٹم (مد وگا پسی) بنایا۔ یہ خدمت بڑے اعتماد کی تھی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ کسی انگریز کو ہمبر اجازت گورنمنٹ آف انڈیا ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اس حیدر آباد میں انگریزی معتمد (سیکرٹری) ایک انگریز مسٹر اولی فینٹ تھا۔ گورنر جنرل ڈلہوزی جو پرسی ریاستوں مخالف تھا اور کسی ریاستوں کو ہٹ کر چکا تھا۔ اس نے اس بنا پر کہ حیدر آباد گورنمنٹ کے مصارف کی رقم کئی سالوں سے نہیں ہوئی تھی ریاست کے ذخیرہ علاقہ برابر پر عارضی قبضہ کر لیا تھا۔ حیدر آباد کے امراء اور ان کے حیدر آباد کا بہت حد تک اودھ و انخ ایسا تھا جو دولت اصفیہ کے دل پر آخر دم تک ہمارا اور ہر چند اس داغ کے مشابہ کو شش کی گورنمنٹ مارے اور روئے نہ دے کامعا ملہ تھا کامیابی نہ ہوئی۔ سر سالار جنگ نے اس قسم کا آغاز کیا سب سے بڑی یہ اور تھی کہ یہ علاقہ انگریزی گورنمنٹ سے واپس لے لیا جائے۔ ان باتوں سے انگریزی گورنمنٹ تھی۔ نواب سالار جنگ نے قدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے پچانے میں جو بے نظیر و کی تھی وہ ایسا بڑا انگریزوں پر ماتھ ڈالتے ہوئے بھیجے تھے وہ نہ بھیجے تھے نہ نہ بھیجے تھے۔ بلکہ اور اس قسم کے دیگر اہم معاملات میں اس نسبت انگریزی میں ہوتی تھی اور سیکرٹری مسٹر اولی فینٹ انگریزی حکومت کو نر کی بزرگی جواب دیتے تھے ضعیف۔ ان پر برٹش گورنمنٹ کا خطاب نازل ہوا اور ان کو حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔ مولوی سید حسین ان کے

جائٹ سیکر ٹری) تھے گویا شریک جرم تھے۔ حیدر آباد میں جب یہ افواہ پھیلی کہ مولوی سید حسین بھی معرض عتاب میں ہیں اور چند روز کے بعد نکال دیئے جائیں گے تو نواب سالار جنگ نے یمن کو فرمایا کہ سید حسین کو نکالے جانے سے پہلے میں خود اپنے ہمد سے سے استغفار سے دوں گا۔ اس سے نواب صاحب کی کمال قدر وافی کا اظہار ہوا ہے۔ وہ مولوی سید حسین کی کثرت عزیز رکھتے تھے اور ان پر کمال اعتماد کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ کوئی انگریزی مراسلہ اس وقت تک جاری نہ کیا جائے جب تک مولوی سید حسین کی نظر سے نہ گزر جائے۔

مسئلہ میں نواب صاحب نے نواب کا سفر کیا تو مولوی سید حسین ان کے ہم رکاب تھے۔ واپس پر مولوی صاحب کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری اور متحدہ صوبہ متصرفات مقرریا جاس میں سر مشق تعلیم اور بعض چھوٹے موٹے محکمے شامل تھے۔ یکم ۱۳۵۸ء میں جب حضور نظام میر محبوب علی خان مسند نشین ہوئے اور میر لاہن علی و عماد مسطنت ہمد راہی پر سر فرما رہے تو ایک کونسل آف سٹیٹ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اہم معاملات حکومت میں مشورہ دینا تھا۔ اس مجلس کے معتمد (سیکرٹری) مولوی سید حسین قرار پائے۔ اس کونسل کے ممبر مجلس خود بنفس نفیس اعلیٰ حضرت (میر محبوب علی خان) تھے۔ اس سال حسین روز میں ان کو علی بارخان موہن جنگ کا خطاب عطا ہوا اور ۱۳۵۸ء میں بہ تقریب جیٹ نوروز عماد الدولہ اور ۱۳۵۸ء میں ساگر مہاراج کے موقع پر عماد الملک کے خطاب سے سر فرما رہے۔

کرل مارشل کی علیحدگی کے بعد ۱۸۸۹ء (۱۳۰۶ھ) میں مولوی صاحب علی حضرت کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے وراثت مبارک سے (اپنی زبان میں) ایک رقم مولوی صاحب کو لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں :-

”نواب عماد الملک بہادر۔ آپ کے واسطے خدمت خانگی پرائیویٹ سیکرٹری کی مقرر کیا ہوں جو اس خدمت کے واسطے کسی کو نہ سمجھا۔ ایسا قابل شخص انگریزی فارسی اردو اور بات کو غنی رکھنے والا۔ اور جو اس خدمت کی کارروائی ہوگی وہ آپ کے پاس لکھ کر بھجوا دوں گا یا خود آؤں گا۔ مگر آپ کل دس بجے صبح میں اگر نذر دینا۔“

(دستخط یا محبوب)

۱۰ جمادی الثانی ۱۳۰۰ھ روز دوشنبہ شب شنبہ

چند سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں دوسرے مناصب سے کنارہ کش ہو کر وہ صرف ناظم تعلیمات (ڈائریکٹر پبلک انشٹرکشن) منملک محروسہ سرکار عالی کے عہدے پر فائز ہوئے اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ یہ اگرچہ بعض اوقات اس سے بڑے مناصب پر سر فرما رکھے گئے لیکن انھوں نے تعلیمات کو کبھی نہ چھوڑا اور سر حال ہی اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں بالبطع تعلیم اور مذہب کے خاص لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عہدوں پر پہنچائی ہوئی تقریب بڑی ہیں اور اقتدار کے بھوکے سفارشوں اور سازشوں کی دوسرے ان کے حوصلے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اہمیت و نامہیت کوئی نہیں دیکھتا۔ تعلیمات ایک معمولی عہدہ ہے، تنخواہ بھی زیادہ نہیں اور قوت و اقتدار بھی واقعی و حقیقی



ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے یہ مجدد دور سے نوادہ سے بھی غروم ہے۔ باوجود اس کے نواب عمار الملک کا وہ  
 بوجہ علم و فضل اور علی سیرت کے ایسا تھا کہ ان کے اعلیٰ افسر اور بڑے بڑے امرا و وزرا ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ  
 ۳۲ سال تک دوسری خدمات کے ساتھ بلا وقفہ اس عہدے پر رہے۔ ریاست حیدرآباد میں باقاعدہ تعلیم کی بنیاد آپ  
 رکھی اور سریشہ تعلیم کی جدی تعلیم آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مدارس اور طلبہ میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ علاوہ اس فرض  
 کے ان کے اثر و رجحیت سے حیدرآباد میں علمی ذوق کو بہت فروغ ہوا صنعت و حرفت کے مدارس بھی ریاست میں آپ  
 قائم کئے۔ ویسی صنعت کے بڑے کارخانے۔

حیدرآباد میں ان کے علمی ذوق کی دو بڑی قابل یاد کاریں ایسی ہیں جن کی اغا و بیت اور اہمیت کچھ کم نہ ہوگی  
 کتب خانہ فار عالی اور دوسرا کتب خانہ اس کتب خانہ کے لئے مکتبہ کتب کے علاوہ نادر اور کتب نفی کتابیں  
 جن کی اس کا شمار اس بڑے عظیم کے بہترین کتب خانوں میں ہو گیا۔ یہ نادر و خطوط زیادہ تر عربی زبان کی ہیں۔ انچ  
 بعض ایسی ہیں کہ جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ نفی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص  
 نہیں ہوتی۔ یہ قدر وانی پرست۔ بعض وقت سودا کرنے میں ان کی کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پکھنا و اچھ  
 رہتا ہے۔ نواب عمار الملک کتاب کے بڑے قدر و ان تھے اور اس قدر وانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آ  
 لئے بعیرہ پھوڑنے اور منہ مانگی قیمت دینے۔ اس فیاضی کی بدولت کتاب فروش یا جن کے پاس کوئی اچھی یا نادر کتاب  
 ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جو لوگ کتاب کی قدر و قیمت سے واقف نہیں تھے وہ اس پر بہت بھجھکھٹا لیتے اور  
 امرات سے فسوس کرتے اور طعن کرتے کہ مولوی صاحب سرکاری روپیہ ان چیزوں پر ضائع کرنے ہیں۔ چنانچہ ایک  
 انھوں نے جارجیا کی کتابیں آئینہ ہزار روپیہ میں خریدیں اور جب رقم کی منظوری کے لئے مکتبہ دارالہمام سرکار  
 نواب وقار لارہ کی خدمت میں پہنچی تو ان کسی صاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ سرکار! مولوی سید حسین صاحب کی عا  
 ہے کہ وہ کتابیں خریدنے میں سرکاری روپیہ بیکاروی سے خرچ کرتے ہیں اور جو جتنی قیمت مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ نو  
 عمار الملک کو بھی اس کی سن گئی تھی۔ انھوں نے دارالہمام سے کہا کہ کتابیں واپس فرما دی جائیں۔ میں انھیں  
 لوں گا اور یورپ بھیج کر اس سے جا رگنی قیمت وصول کروں گا۔ دارالہمام نواب وقار لارہ نے جو بہت بامروت  
 اور سیریشہ امیر تھے بہت معذرت کی اور فرما دیا کہ اگر ملے گا حکم صادر فرمایا۔ ایک ایسا ہی واقعہ میرے سامنے پیش آیا  
 عمار الملک نے کچھ کتابیں خریدیں اور رقم کی منظوری کے لئے ہوم آفس کو لکھا۔ سر رشتہ اعلیٰات ہوم آفس کے ماتحت  
 اس وقت ہوم سیکرٹری افضل العلماء نواب حمید اللہ خان (فرزند مولوی مسیح اللہ خان) تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ بعض کتاب  
 مبلغ ذیل کشور سے چند روپیہ میں مل سکتی ہیں ان کی قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو سو روپیہ لکھی ہے تو انھیں تعجب ہو  
 لکھا کہ کتابیں ملاحظہ کئے لئے بھیج دی جائیں۔ نواب عمار الملک نے لکھا کہ کتابیں کسی کے پاس نہیں جائیں گی جسے وہ  
 بیان اگر دیکھیے۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے بے چون و چرا منظوری دے دی۔ نام کے افضل العلماء صاحب کیا جانیں کہ  
 کتاب جو بازار میں دو چار روپیہ میں مل جاتی ہے وہی کتاب اگر مصنف کے ہاتھ کی لکھی جوتی ہو یا اس کا کوئی قد

انہی کے لئے قرآن کی قدر و قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح ذرا بے محابا ملک نے ناباب کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ برقرار رکھ کر خزانہ میں جمع کر دیا۔

علمی لحاظ سے قراب صاحب کا دوسرا بڑا کام دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ اس کا مبیع بھی ہے۔ اس ادارے نے عربی کی بہت سے نادر کتابیں طبع و نشر کی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے نسخے ناباب تھے اور وہ ایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ ان کی قدر اور ثمرت خند و نشان سے زیادہ عرب ممالک اور بلا و یورپ میں ہوتی۔ اس ادارے کا قیام ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں ہوا۔ اس وقت پانچ سو روپے مالانہ اس کے مصارف کے لئے مقرر ہوئے۔ اس کے بعد قراب صاحب کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) میں اسے ایک لاکھ روپے اور ایک سال بعد بارہ لاکھ روپے عطا فرمائے۔ بھارت کے ناجائز قبضے کے بعد ریاست حیدر آباد پچو آفات نازل ہوئیں ان میں دو ایسی ہیں جن کا سدھ رکھی نہیں جھولی سکتے۔ ایک عثمانیہ بیوروکریسی کی تحریک اور دوسری دائرۃ المعارف کا خاتمہ۔ افسوس قراب صاحب ملک کی یہ بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے جو قابل قدر کام کیے ہیں وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور کبھی نہیں مٹ سکتا۔

قراب صاحب کو عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دائرۃ المعارف اسی محبت کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:-

”مجھے ایک مدت تک بالذات ان کی روزانہ مصحفیوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے۔ اور ان کے طالب علمانہ مشاغل میں شریک ہو کر میں نے ان کے علم و فضل سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے ان کی واقفیت عامہ، ان کے مذاق اور ان کے اسلوب زندگی کا اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے میں چند روز میں ان کے ساتھ شریک رہا اور نظر آیا کہ جبسی حقیقتاً نہ مبصرانہ نظر کا کام عرب پران کی پڑنی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے صحیح یہ ہے کہ میں نے انھیں ادب عربی میں کینا کے روزگار پایا۔ جاہلیت عرب کے سانے اور خالص عربی مذاق کے داماد وہ ہیں۔ شعرا کے جاہلیت کے کلام پر سر و سفتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل نہیں پسند کرتے۔“

حیدر آباد یونیورسٹی کانسٹریکشن کے خلیفہ صدارت میں آپ نے جامعہ عثمانیہ کے ذکر کے دوران میں عربی زبان کی تعلیم کی خاص طور پر تاکید کی تھی۔ فرماتے ہیں:-

”دوسرا امر جس کی طرف کار پر وازان جامعہ علیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان علمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں۔ اگر فقط اردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بحرِ ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری بیوروکریسی کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ بھی رہ جائیں گے اور آپ کی ساری محنت اکارت جائیگی۔ طلبہ کو وہ پایہ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو ادھر کم کو اور ان کی قوم کو ضرورت ہے۔“

نقد و رقم کی ضرورت ہے اعلان دو کہ اس کا انتظام کروایا جائے۔ وہ بھی ایسے خود دار اور شریف النفس تھے کہ جواب میں لکھا۔ یہاں حسبِ دل خواہ انتظام ہو گیا ہے۔ آپ زحمت نہ فرمائییں۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے کہ ایسا معلوم ہوا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کی نیم جیبوں کے دوسرے پرچہ جاری ہے۔ میں نے ہاٹاں فلاں فلاں مقام پر جا میں گے۔ یہ سننے کے بعد کسی سوچے بچے ان کے سفر خرچہ کے لئے بھیج دیے۔

نواب صاحب کا ادبی ذوق اعلیٰ دیکھنے کا تھا۔ فارسی اور عربی کے جید عالم تھے فرنگِ خوب جانتے تھے اور انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ وہ ایرانیوں سے فارسی میں اور عربوں سے عربی میں بلا تکلف گفتگو کرتے تھے۔ جب میرزا نادر ہندوستان آئے اور ان کے پروگرام میں علی گڑھ کالج کا معائنہ بھی تھا تو نواب حسن الملک نے امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے فارسی سپاس نامہ نواب عماد الملک بہادر سی سے لکھوایا تھا۔ عربی ادب کے ذوق کے تعلقِ شہر صاحب کی رائے لکھ چکا ہوں کہ وہ جاہلیت کے شعرا کے سادہ اور پر جوش کلام کے بہت مداح تھے اور مولدین کا کلام پسند نہیں کرتے تھے۔ فارسی میں وہ شیخ سعدی کے بہت قائل تھے اور شیخ کی عاشقانہ شاعری کو حافظ کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ اردو میں لکھنؤ کی شاعری بہت ناپسند تھی۔ انھیں لفظی عناصر سے جس پر لکھنؤی شاعری کا وار و دار تھا اور عامیانہ خیالات بہت چڑھتی۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری زبانوں دار دو فارسی و عربی میں نہ تھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری یا نیم شاعری تھی۔ حاکمی نے اردو کو تین شراط کی جو علمی اور ادبی مضامین اور آکرے کی قوت رکھتی ہے۔ میرانیس کی شاعری کے بہت مداح تھے اور ان کے کلام کے بعض اشعار انھیں وہ ان کا شکر سمجھتے تھے زبانی یاد تھے اور کبھی کبھی سناتے تھے لیکن کہتے تھے میر صاحب بھی بعض اوقات لفظی رعایت اور صنائعِ بدائع سے دامن نہ بچا سکے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ میں نے میر صاحب سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائعِ بدائع کو پسند کرتے ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا۔ نہیں! لیکن آخر لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ انگریزی زبان میں متعدد متغزلے اور مضامین اور نظمیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں لکھیں کتاب کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں۔ اس مجملہ میں ان کا وہ فاضلانہ مقالہ بھی ہے جو انھوں نے "اصطلاحاتِ علمیہ" پر تحریر فرمایا تھا۔ یہ آج سے تقریباً چوراسی پرانی برس پہلے لکھا گیا تھا مگر اب بھی پڑھنے کے قابل ہے اور اس میں جو نکات اصطلاحات کے وضع یا ترجمہ کرنے یا اپنے تسلیم الفاظ کو کام میں لانے کے متعلق بیان کئے ہیں اور انگریزی اصطلاحات کو بحسنہ اختیار کرنے کے خلاف جو بحث کی ہے اور اس مسئلہ کے متعلق بعض مختلف آراء پر جو تبقیہ فرمائی ہے اس کا مطالعہ اب بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب کی انگریزی انشاء پر وازی کے نہ صرف ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ بلکہ اہل زبان بھی معترف تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد آغا خان کی سرکردگی میں لارڈ فٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بہت اہم اور تاریخی وفد تھا جس میں ملک کے متعدد صاحبِ الرائے اور نام و نمود کے مسلمان شریک تھے۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بہت نازک تھا۔ مسیحِ تقسیمِ بنگال کے بعد مسلمانوں میں عام طور پر بالوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وفد کی تجویز نواب حسن الملک کے فکرِ رسا کا نتیجہ تھی جو اپنے وقت کے نہایت دور بین اور روشن خیال سیاست دان تھے۔ انہی نے آغا خان کو گھیرا اور نواب عماد الملک کو بلا کر وہ ایڈریس لکھوایا جو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔

سیاست میں وہ سرسید احمد خاں کے پیرو تھے۔ جب سرسید نے انڈین نیشنل کانگرس کی بعض وجوہ کی بنا پر مخالفت کی تو اس کی تائید میں ایک بہت بڑا زور پڑا۔ انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کی۔ وہ انگریزی حکومت کو ملک کے حق میں پابست خیر و برکت سمجھتے تھے۔ پڑانے لوگ اکثر اس خیال کے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی طوائف اخلاق اور ویسی حکومتوں کی بد نظمی، ابتری، نا انصافی، رشوت خواری، ظلم و جبر دیکھے تھے۔ انگریزوں نے یہیں جاری کیں، نارگھر، ڈاک خانے بنائے، عدالتیں قائم کیں، لوٹ مار اور ظلم و جبر کا افسار دیکھا، تعلیم پھیلانی اور مدرسے اور کالجز اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ مسٹر کی آسامیاں پیدا ہوئیں، انصاف ہونے لگا، امن و امان قائم ہو گیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ انگریزوں سے بہت خوش تھے اور ان کی عقل و دانش اور نظام و انصاف کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو ملک کے اقتصاد کی اور سیاسی حالات سے بے خبر بحث نہ تھی اور نہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو کیا جسٹس رانا ٹائٹل نے اپنے ایک خط میں انگریزوں کو تشبہت ایزوی اور ملک کے حق میں باعث خیر فرمایا تھا۔ ابتدا میں گھٹے اور گاندھی جی جی جی جی جی جی جی جی شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگرس کا بھی یہی خیال تھا۔ اس وقت کانگرس والے صرف اتنا چاہتے تھے کہ انہیں حکومت میں امداد داری کے عہدے ملیں اور حکومت کے نظم و نسق میں ان کا بھی دخل رہے۔ حالات کے مطابق اور اقتصاد کی اور سیاسی امور میں غور کرنے اور عملی تحریکوں میں پڑنے سے ان کا نقطہ نظر بدل گیا۔ ہمارے بزرگ جو زمیندار قسم کے تھے اپنے پڑنے خیال سے نہ بڑھے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جنہوں نے ملکی معاملات کو غور سے دیکھا ہو اور ان میں بصیرت حاصل کی ہو۔ مولوی قسم کے لوگ جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کے مسلمانوں کا بدخواہ سمجھتے تھے ان کی نفرت کچھ تو مذہبی تعصب پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کی حکومت اور وفادار کو ان سے نقصان پہنچا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ انگریز حکومت سے اصل نقصانات کیا پہنچے اور بعض اسے آخر تک نہ سمجھے۔ اس بارے میں نواب عہد الملک کا ذاتی خیال اس ایک جملے سے ظاہر ہو گا کہ جس زمانے میں وہ انڈین نیشنل کانگرس کے ممبر تھے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ہمیں حکومت میں جیتلیں کی ضرورت ہے۔ یہ ویسی پرانا خیال ہے جس کا اظہار ہمارے بزرگ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مقابلے کے امتحان میں ہارنے وغیرہ کا مایاب ہو کر آجائے ہیں اور ہم پر حاکم بنا دئے جاتے ہیں جو شریفانہ اطوار و آداب عاری ہونے ہیں۔ نواب عہد الملک کو خاندانی شرف کا بڑا خیال تھا اور اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ قصبہ قادی شرف اس معاملے میں بہت سخت ہونے لگا۔ گوانچیں ملکر ام میں رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا تاہم قصبہ قادی شرف کی توجہ ان میں موجود تھی۔ ایک دن اتفاق سے میں ان کے ہاں گیا تو وہ بھی ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلے گئے تو کہنے لگے کہ شرف شریف نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا اظہار ہوا ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ آدمی تعلیم یافتہ ہیں۔ کہنے لگے بعض الفاظ کا تلفظ غلط کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر کسی قدر تعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ شرف کی پرچ بھی عجیب ہے۔ ایک مریلا نا حالی تھے جو کہہ سکتے ہیں۔

کچھ اور آؤ جن کو تم اسے سب و مرزا  
نہیں پوچھنے یاں حسب اور نسب کچھ

میں نے مولانا سے پوچھا کچھ اور آؤ جن کو سے کیا مراد ہے۔ فرمایا "مردور" دونوں اثرات میں اور قصبہ قادی ہیں۔ ایک نہ

صرف وقت کے تقاضے کو بلکہ انسانیت کے تقاضے کو بھی سمجھنا تھا اور دوسرا قدیم رسم و راہ اور وضع کا پابند تھا۔ جہاں بخت  
وہیں رہا۔

امیرانہ شان سے رہتے تھے لیکن اس میں تسبیح نہ تھا۔ عالی شان کوٹھی تھی اور اسی مناسبت سے اس کا فرنیچر اور سامان تھا۔  
مزاج میں بہت انصاف تھی۔ صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ریاست میں ان کا کوئی بہت بڑا عہدہ نہ تھا۔ لیکن زمانہ ملازمت  
میں اور خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جن ان کی خودداری اور وقار ایسا تھا کہ تمام عہدہ دار اور امر و ذرا ان کا بہت اوپر  
احترام کرتے تھے اور اس طرح ملے تھے جیسے کوئی خور کسی بزرگ سے ملتا ہے۔

ان کی امیرانہ شان و معاشرت اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور دعوت و اب کو دیکھ کر لوگ ان کے پاس جانے بوجھے گھبراتے  
تھے لیکن وہ بہت صاف باطن بامروت اور نیکو مزاج تھے۔ خاص کر اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور بے تکلف  
عملی باتیں کرتے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی بڑا شخص آجاتا تو مینے سے صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ان کے فرزند  
نواب خلیل جنگ ان سے ملے آئے۔ اس وقت نواب صاحب کے پاس مولوی کاظم ندوی بیٹھے ہوئے تھے جو نواب صاحب کے  
کتب خانے کی ترتیب و نمبر و کام کرتے تھے۔ نواب خلیل جنگ نے شہادت کے کمرے میں آئے تو مولوی صاحب نے مخاطب ہو کر کہنے  
لگے: کیا نیچے آپ کا جھٹکا کھڑا ہے (جھٹکا وہ کہیں میں ایک ادنیٰ قسم کی سواری ہے)؟ یہ سنتے ہی نواب صاحب سخت برہم ہو  
اور کہنے لگے: تم اہل علم کی توہین کرنے ہو؟ تم بھول گئے تمہارا باپ ایک زمانے میں جو تیاں چٹا تا پھرتا تھا یہ غرض اس بڑی طرح  
ڈنکا کہ وہ پانی پانی ہو گئے خلیل جنگ کا منشا طعن کرنا نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا جھٹکا پورٹی کون ملیش میں بیٹھ جیو  
کے میں سلنے کھڑا تھا جس سے آنے جانے والوں اور دوسری سوادہوں کو زحمت ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ اس معاملہ میں نواب الملک  
بہت سخت تھے۔ وہ علم کی قدر کرتے تھے خواہ صاحب علم کیسا ہی خستہ حال اور پیٹھے پرانے کپڑوں میں ہو۔ وہ خود بھی طالب علم تھے  
اور باوجود اس مرتبہ پر پہنچنے کے ان کے مزاج میں طالب علمانہ سادگی موجود تھی اور ادبی علمی گفتگو میں ان کا انداز مخاطب بالکل ایسا  
ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم سے ہوتا ہے۔ اس وقت وہ فرقہ مراتب کا بالکل خیالی نہیں کرتے تھے۔

آر دو زبان و ادب سے انہیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ تہذیب و آباؤ آنے کے دوسرے ہی سال کشمیر میں ایک ماہانہ  
آر دو رسالہ "محزن الفوائد" جاری کیا۔ ہر سالہ دو سال تک جاری رہا۔ اس میں متعدد مضامین شائع ہوئے ان میں بے شمار  
بیئیں سرائسی موضوع پر تھے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات کے شعرا میں اب تک یہ بات داخل ہے کہ آپس میں انگریزی میں بات  
چیت کرتے ہیں اور انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ نواب عماد الملک ہمیشہ آر دو میں گفتگو کرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے  
جن کی زبان آر دو ہے یا جو آر دو زبان جانتے تھے، انگریزی میں بات چیت کرنے کو بدتمیزی اور جھوٹا تقاضا خیال کرتے تھے۔  
البتہ جب کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی ہو اور وہ نہیں جانتا تھا مثلاً ایرانی، عرب یا انگریز تو اس سے اس کی زبان میں  
باتیں کرتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب جو پیسے برٹش انڈیا میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھے اور بعد میں بھوپالی میں وزیر ہو گئے  
تھے نواب صاحب سے ملے آئے اور آتے ہی انگریزی میں گفتگو کرنی شروع کی۔ نواب صاحب نے فرمایا: میری زبان انگریزی نہیں  
اور نہ غالباً آپ کی ہے۔ کوئی انگریز آجاتا ہے تو میں اس سے ستر پڑا انگریزی میں بات چیت کر لیتا ہوں ورنہ میں انگریزی

ان میں بات چیت کرنا ناپسند کرتا ہوں۔ وہ صاحب بہت شرمندہ ہونے اور معذرت کرنی پڑی۔ وہ ہندوستان کے نظام تعلیم کو اس وجہ سے بھی ناپسند کرتے تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ صرف معمولی علم میں مانے سے بلکہ اس کا اخلاق پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے طرز تعلیم کے حامی تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ ان خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے خطبہ صدارت جیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس نعمتہ جیدر آباد وکن ۱۹۱۷ء میں کیا ہے جس کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

”ثانوی مدارس میں ابتدا سے انگریزی شروع کر دی جاتی ہے جو ہمارے لئے ایک اجنبی اور تمنا بت اوفق زبان ہے اور اس کے مہور کئے جلتے ہیں کہ تمام ابتدائی فنون مثل حساب جغرافیہ تاریخ وغیرہ کے اسی غیر مانوس زبان کے ذریعہ کجیں جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کم و بیش ناواقف رہ جاتے ہیں اور انگریزی بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ جیسے تعداد طلبہ کو دس دس بارہ سال اسکول ہی کی حدود کے اندر صرف کر کے پڑتے ہیں۔ اس عرصہ و مدت میں ان کو کیا حاصل ہوتا ہے..... انگریزی قدرے قلیل سیکھ لیتے ہیں۔ انگریزی میں حساب کے معمولی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں..... جغرافیہ جانتے ہیں، اقطار دنیا کے نام جانتے ہیں، خاص خاص ملکوں کے مشہور و معروف شہروں، ندیوں، پہاڑوں کے انگریزی نام بتا سکتے ہیں اور نقشے میں ان کا نشان دے سکتے ہیں، یورپ خصوصاً انگلستان کی تاریخ کسی قدر جانتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ سے بھی ایک حد تک واقف ہیں اور آپ کو بتا سکتے ہیں کہ جہانگیر ایک شہزادی سلطنت سے بے خبر اور اورنگ زیب ایک تخت منسوب اور ظالم بادشاہ تھا۔ اپنی زبان سے بالکل لاعلم نہیں کہ مشہور ولی فقیر ہیں مگر اپنی مذہبی زبان اور بزرگوں کے علوم اور حالات بالکل نا بلد ہیں۔ کلچ میں چار پانچ سال تعلیم پانے کے بعد ان کی حالت میں زیادہ تغیر نہیں ہوتا۔ بجز اس کے ہمد تن مغربی دنیا کے مفقہ بن جاتے ہیں۔ ہر امر میں مغربی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قومی اخلاق اور پاکیزہ تہذیب چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کر لیتے ہیں آپس میں گفت و شنید بات چیت سلام علیک سب انگریزی زبان میں کرنا ان کو بھانا ہے۔ کھانا پینا انگریزی قسم کا پسند کرنے میں۔ اپنے آٹھ کروڑ ہم زبان ہند کو مسلم دینا کہہ لیں گے نام سے شرف بخشتے ہیں۔ اپنی زبان میں تحریر و تقریر کرتے ہیں تو اس میں حتی الوسع انگریزی لغات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ بہتوں کو نماز نہیں آتی سو رے یاد نہیں۔ ایک صاحب کو میں نے تسبیح کلمہ تو جید تک معلوم نہ تھا کہ

کیا شے ہے اور کس کا نام ہے ؟  
 کالجوں میں انگریزی و عربی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں :  
 ” انگریزی طریقہ قائم رہا تو جاری آج بھی زبان یعنی آرو و ایک جاہلانہ زبان رہ جائیگی  
 اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علوم مغرب سے نا آشنا رہیں گے ۔۔۔۔۔  
 اگر اس مبادیہ تھائیہ پونیو سٹی یعنی جامعہ عثمانیہ کو جس میں خاص آرو و زبان واسطہ  
 تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے بحسب امید کامیابی ہوئی تو یہ عرب بڑ جائے گا  
 اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولتِ علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی ۔“

جب ۱۲۸۵ھ میں انجمن ترقی آرو و قائم ہوئے تھے تو انہوں نے صدارت کے لئے نواب صاحب کا نام پیش کیا۔ انجمن  
 کی مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر عقیدار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر نہیں انجمن کی صدارت کیلئے  
 نہیں مل سکتا تھا۔ انجمن کو ان سے علاوہ اور کوئی مشورے کے ہر قسم کی مدد ملی۔ مثلاً میں نے ایک دن عرض کیا کہ اگر سپ  
 ہانہ انیس آغا خان سے انجمن کی امداد کی ضرورت ہے تو امید ہے کہ معقول عطیہ مل جائے۔ کیونکہ وہ قومی اور علمی کاموں کی  
 امداد میں بہت فیاض ہیں۔ انھوں نے فوراً خاندانِ قلم سے کہہ دیا کہ زبان میں خط لکھ مارا۔ مگر آغا خان نے کوئی جواب نہ دیا اس  
 زمانے میں آغا خان یورپ میں تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی سید اس مسعود نے انگلستان کا قصد کیا۔ میں نے ان سے کہا آغا خان  
 جی آج کل وہیں تشریف رکھتے ہیں تو ان کو کھٹکھٹا کیے۔ حضرت نے نواب عماد الملک کے خط کا جواب نہ دیا یہ حسد  
 سفر سے واپس آئے تو کہا۔ آغا خان سے ملا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچنے والا ہوں وہاں ملے۔ چنانچہ اس  
 تاریخ کو میں اور سید صاحب بمبئی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ پونا تشریف لے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ پونے آکر ملے۔ میں نے سید صاحب  
 سے کہا۔ بس آپ تشریف لے جائیے۔ مجھے معاف رہئے۔ وہ گئے۔ ہزبانی مس آغا خان تپاک سے ملے۔ انجمن کا معروضہ سماعت  
 فرمایا۔ اپنے کارندہ خاص کو بلا یا۔ حکم دیا کہ انجمن کو ایک ہزار روپیہ مانگنے کے حساب سے دس ہزار کا عطیہ ہماری طرف سے دیا  
 جائے۔ اس نے فوراً یہ حکم اپنی دستخطی میں مانگ لیا۔ اس کے بعد کئی بار یاد دہانی کی گئی جواب نہ دار۔ بڑے آدمیوں کے وعدے  
 ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایسا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ میرے پاس ایسے بہت سے شاندار  
 وعدے موجود ہیں۔ اس دن میں تو ان کی کچھ پوچھ بچھ نہ ہوگی۔ ایک روز دوا و عشرے آگے پیش کرنے پڑیں گے۔

اسی طرح جب میں حیدر آباد سے وطن (شمال ہند) جانے لگا تو نواب صاحب نے عرض کی کہ اگر مناسب ہو تو انجمن  
 کی امداد کے سلسلے میں ایک خط نواب صاحب رام پور (نواب حامد علی خان) کے نام عنایت فرمایا جائے۔ آپ نے ایک خط  
 فرما کر دوائے ریاست رام پور کے نام لکھ کر دیا جس میں انجمن کے کارناموں کا مفصل ذکر تھا۔ میں نے یہ خط لے جا کر نواب صاحب  
 کی خدمت میں پیش کیا۔ چند سطریں پڑھ کر اپنے معتد خاص کے حوالہ کروایا میں نے چاہا کہ انجمن کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن انھوں  
 نے نواب عماد الملک کی توصیف و ثنا شروع کر دی۔ وہ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے اور ان کی باتوں سے صاف معلوم  
 ہوتا تھا کہ ان کو نواب عماد الملک سے خلوص ہے۔ وہ ملحقانہ لہجے میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ کسی طرح آپ انھیں یہاں

نہ سبھ بے حد مسرت ہوگی۔ میری بڑی قناعت ہے کہ وہ کچھ دن میرے پاس آکر رہیں۔ میں نے کہا ان کی ٹانگ کو جب سے صدمہ پہنچا ہے انہیں اٹھنے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے جب کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے تو اپنے خاص کمرے سے پیچھے وار کو بھیج دیتے ہیں۔ اسی حالت میں ان کا یہاں آنا عاں ہے۔ کہنے لگے آپ کسی طرح انہیں لیٹی ٹک لے آئیے پھر ہی جی جی کہ نہایت آسائش و آرام کے ساتھ یہاں لے آؤں گا۔ غرض میں وہاں تین چار روز رہا۔ بہت خوشی سے ملنے۔ بلکہ بعض اوقات دوڑ ہی سے دیکھ کر بڑے تپاک سے آئیے آئیے مولوی صاحب آئیے۔ کہتے اور دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے لیکن انہیں کا معاملہ کبھی بیچ میں نہ آئے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیر ضروری اور بے جا کاموں میں روزانہ ہزاروں روپے صرف کر دیتے ہیں۔

اورنگ آباد سے مجھے اکثر سرکاری کاموں یا محکمہ تعلیم بلا یونیورسٹی کی کمیٹیوں میں شرکت کے لئے حیدر آباد آنا پڑتا تھا۔ تمام حیدر آباد والے کہ ان ایام میں نواب صاحب سے ملنا دھندا تھا۔ ایک روز جو میں گیا تو چلتے وقت مجھ سے پوچھنے لگے کیا امپریل بینک کی قیام گاہ کے قریب ہے؟ میں نے کہا جی ہاں قریب ہی ہے۔ فرمایا یہ خط بینک میں بھجوا دیجئے گا۔ آخر زمانے میں وہ چلتے وقت کسی ایسے ملنے والے سے جو قابل اعتماد ہو اور جس سے تکلف نہ ہو نہ خدمت کے وقت یہ پوچھ لینے لگے کیا ڈاک خانہ اب سے قریب ہے؟ اور جو وہ کہتا کہ قریب ہے تو وہ اپنے خط و سے دیتے تھے کہ یہ ڈاک میں ڈال دو دیجئے گا میں نے مکان پر آکر خط بینک میں بھجوا دیا۔ دوسرے دن بینک مجھے اطلاع دی کہ نواب عطاء الملک نے دو ہزار روپے چیک انہیں کے نام پر بھیجا تھا تو ان کے حساب میں درج کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن جو میں ملنے گیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا اس کا اعلان نہ کرنا اور نہ کسی اخبار یا رپورٹ میں لکھنا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم انہیں کے حساب میں درج ہوگی تو سالانہ رپورٹ میں بھی ذکر ہوگا اور جیسے اور عطیات کا اعلان کیا جاتا ہے اس کا بھی کیا جملہ کے گا۔ آپ جو نسخہ فرماتے ہیں اس میں کیا مصلحت ہے۔ کنگ کو بھی اس طرف اشارہ کر کے فرمایا وہ کہے گا مجھے کیوں نہیں دیا۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں جو لوگ حضور نظام میر عثمان علی خاں کی عادات و خصائل سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے۔

رسالہ اردو کو بالالزام پڑھنے تھے۔ بعض اوقات بعض مضامین کے متعلق اسے یا مشورہ دیتے اور کبھی کبھی الفاظ کی صحت و غلطی کے متعلق رائے لکھ بھیجتے۔

جب نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث حمید مدار الملہامی پر سرفراز ہوئے تو اس خیال سے کہ یہ نوجوان ہیں اور نظم و سنن ریاست کا تجزیہ نہیں رکھتے نواب عطاء الملک ان کے مشیر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں آپ نے ایک گشتی مراسلہ جاری فرمایا جس میں محاکمہ محروسہ سرکار عالی کے تمام دفاتر کو ہدایت کی کہ اگر دو مراسلوں میں بلاوجہ انگریزی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔

انہیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی اور جھوٹے کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہمارے شرفاء و مروت میں اگر یا تابعی قلب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا ایسے کام کی چابی بھرتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا اس کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پستیابی ہوتا ہے۔ نواب عطاء الملک کا مسلک



بالکل صاف تھا۔ جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وسعت داری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ انھوں نے حیدر آباد آنے کے بعد جو عزم الفوائد رسالہ نکالا تھا اس میں ان کا ایک مضمون ”راستی و راست باقی“ شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر ان کی سیرت سامنے آجاتی ہے۔ وہ راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نے برصغیر تدریس کے لیے صاحبزادہ اور اعلیٰ ازگان ریاست سے جو اس وقت حاضر تھے پوچھا کہ لوگوں کا میری نسبت کیا خیال ہے۔ ان صاحبزادوں نے عرض کیا کہ دعا یا حضرت کی فیاضی، محمدی اقدردانی، سیاست و تدبیر کا ودانی اور عالی دماغی کی بے حد مدح ہے۔ غرض ہر ایک نے تعریف کے پل باندھ دیئے۔ نواب عہد الملک خاموش بیٹھ رہے۔ آخر اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے کچھ نہیں کہا۔ نواب صاحب نے کہا۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پئے پڑے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ سرکاری کارروائیاں کسی کئی جیسے پڑی رہتی ہیں۔ ریاست کا انتظام خراب ہو رہا ہے۔“ یہ سننا تھا کہ دربار میں ساٹا چھا گیا اعلیٰ حضرت فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ جن لوگوں نے ہمارے سابق بادشاہوں کے حالات پڑھے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ان کے حضور میں خفیہ سے اختلاف میں بھی جان کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی حال دولت آصفیہ کے فرمانرواؤں اور ان کے مشیر بادشاہوں کے درباروں کا تھا۔ ایسی جسارت تو کما حقہ سے خفیہ اختلاف کی بھی محال نہ تھی۔ اہل دربار مولوی صاحب کی یہ صفت بیانی سن کر دنگ رہ گئے اور دور رہے تھے کہ دیکھئے اعلیٰ حضرت قدر قدرت کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ دوسرے روز اعلیٰ حضرت نے نواب عہد الملک کو یاد فرمایا۔ جب حاضر ہوئے تو فرمایا۔ ”آپ کو سب کے سامنے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔“ نواب صاحب نے عرض کیا کہ ”حضور نے سب کے سامنے دریافت فرمایا تھا۔ اگر میں سب کے سامنے ایک بات کہتا اور خلوت میں دوسری تو یہ جھوٹ اور منافقت ہوتی۔“ اعلیٰ حضرت جب اندر سے باہر تشریف لائے تھے تو ان کی ایک مٹھی بند تھی۔ نواب صاحب کا جو اب سننے کے بعد اعلیٰ حضرت نے مٹھی کھولی اور الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔ نواب صاحب کے فرزند نواب محمدی یا جنگ نے مجھے وہ انگوٹھی دکھائی تھی۔

اب آپ اس تشریف النفس اور ہر دلعزیز فرماں روا کے فرزند اور عائشیں آصف جاہ سابق میر عثمان علی خان کا حال سنئے کہ اس نے نواب صاحب کی راست گوئی کا کیا صلہ عطا فرمایا کہ کئی راجہ دیہ مجھے یاد نہیں رہا کہ ہمارا چڑیا گاہ یا جہانگیر نا بھم یا کوئی اور ریاست کے مہمان تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کے اعزاز میں اپنے علی میں ایک بڑا ڈنر دیا۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں مسئلہ ازواج پر بحث چھڑ گئی۔ اس میں کہیں اعلیٰ حضرت نے یہ کہہ دیا کہ اسلام میں اس باب سے بہت سہولت اور کڑاوی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ٹوکا کہ یہ صحیح نہیں ہے، اسلام نے اس معاملہ میں ایسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ شاہ و کن کو اختلاف کی تاب کہاں۔ سخت برہم ہوئے اور طیش میں آکر فرمایا کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔ نواب صاحب فوراً اٹھ کر چلے آئے۔ دوسرے روز علی اصبح اعلیٰ حضرت کے محمد علی غیاث الدین (ظہر جنگ) نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ آپ ریاست حیدر آباد سے چلے جائیے اور آپ کو کونسل آف اسٹیٹ کی مہتمدی کی جو تنخواہ اب

تنبہ ملی رہی ہے وہ بھی واپس کر دیجئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ رقم بطور امانت بنک میں جمع ہے جس میں اس کا ایک حصہ بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا۔ وہ آج ہی واپس کر دی جائے گی۔ اور اس روز حیدر آباد کے احوال کو راجہ مکہ کے پرنس نے لکھے۔ یہ شخصی حکومت کے فرمانرواؤں کا اولیٰ نمونہ ہے۔ جتنا کہ نواب غضب، ہنگامہ، بے اصولی، گھڑی میں فرسستہ اور گھڑی میں شیطان۔ جو شخص انھیں یہ خط لکھتا ہے: "عماد الملک بہادر فرزند امیر و الافران۔ آپ کے سامنے ہم ملائی و ہم صافی نہ ہو کر ایک زمانہ گزر گیا ہے لہذا اگلے صبح دس بجے شریک بریک فاسٹ ہوں تو باعث مسرت ہے۔" ایک خط میں نواب صاحب کے اندیا کو تسلی سے منع فرماتے ہیں کہ یہ خط خودت سے وقفہ استغفار سے، یا تمام مسلمانان ہند کے لئے ایک بد قسمتی کا باعث ہے کیونکہ آپ جیسا مدبر صاحب رائے، تجربہ کار، واقف اسرار و پھر وہ شخص اس خدمت پر مقرر ہونا محالات سے معلوم ہوتا ہے۔ "یہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ اپنی ریاست کے بڑے سے بڑے امیر یا وزیر کو مخاطب نہیں کرتے وہی شخص ان کو (جو ان کے استاد بھی ہیں) دربار کے نکال دیتا ہے اور درباری سے نہیں حیدر آباد سے خارج البلد کر دیتا ہے۔

دوسرے روز جب صاحب ریڈیڈنٹ کو معلوم ہوا تو وہ اعلیٰ حضرت سے ملے اور بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نواب عماد الملک معمولی شخص نہیں مسلمانان ہند کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و وقعت ہے اور حکومت ہند بھی ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ جو نثار و ابرتاؤ ہوا ہے اس سے لوگوں میں آپ کی طرف سے بہت ناراضی اور بیگانہ پیدا ہو گئی۔ چنانچہ فوراً ان کو واپسی کا فرمان بھیجا گیا۔ وہ اس واقعہ سے بہت آزرہ خاطر ہوئے۔ مگر آزار آتا نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے فرزندوں اور احباب کے اصرار پر واپس آ گئے۔ جس روز حیدر آباد پہنچے تو اعلیٰ حضرت نے فوراً ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ نواب صاحب نے کھانا کھیا کہ میں نکلا ہوا ہوں اس وقت میں آ سکتا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے جب بہت اصرار کیا تو وہ کنگ کو بھی گئے۔ دوسری سے (بلند آواز میں جیسا کہ ان کا تہذیب ہے) مائی ٹیڈ، مائی ٹیڈ کہہ کر استقبال کیا۔

انجمن کی مسجد کی کے ابتدائی زمانے میں میں نے ایک عرضداشت بغرض امداد انجمن پیش گاہ اعلیٰ حضرت میں پیش کی تھی۔ بارہ سو سالانہ امداد منظور ہوئی۔ نواب صاحب کو اس کا علم ہوا تو بہت ناخوش ہوئے اور مجھے لکھا: "اسے قبول نہ کیجئے، انکار کر دیجئے۔" ریاست کے خزانہ پر صاحب بہادر کا قبضہ ہے۔ (اس وقت صدر المہام خاں سر راجا لڈ گلاسی تھے) میں نے اسے خلاف مصلحت خیالی کیا کیونکہ آئندہ بہت سی توقعات تھیں۔

حیدر آباد اس پر تعلیم کی سب سے بڑی اور باعزت ریاست تھی۔ اس کی تہذیب اور روایات خاص تھیں۔ لوگ خوش حال تھے۔ ہر سال جنگ کے زمانے سے اس کے نظم و نسق میں بندرج ترقی ہوتی گئی اور بیسویں صدی میں ہر اعتبار سے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ مطلقیت سازش کا گھر ہوتی ہیں۔ جہن میںاں خوب چھوٹی چھوٹی بھتی ہے۔ ہر سال جنگ بڑے ہر تہمتے۔ وہ ریاست کے ہر شعبے پر نظر رکھتے تھے اور ہر عہدہ دار سے اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام لیتے اور ہر ایک کے کردار اور کام پر ایسی نظر رکھتے تھے کہ کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی ہمت نہ ہوتی

تھی۔ ان کی وفات کے بعد چشم نگراں آٹھ گن اور سازشوں و دوازدہ کھل گیا۔ آپس کی کش مکش اور رقابت نے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں پر ابھارا اور حریف ایک دوسرے کو گرانے کے لئے کذب و افتراء بہتان اور اس سے بھی بدتر حربے استعمال کرنے سے نہ چکے تھے۔ سازشوں کا یہ حال اب بیا بیج و بیج تھا کہ ماحول کے اثر یا ذاتی تعلقات کی بنا پر اس میں بعض ایسے اشخاص بھی بھلس جاتے تھے جن کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نواب عماد الملک کو اس قسم کی بعض سازشوں میں الجھانے کی بہت کوششیں کی گئیں وہ اپنے اصول پر قائم رہے اور ان کا دامن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی اس آلائش سے پاک صاف رہا۔

پاک ہیں آلائشوں سے بندشوں میں بے لگاؤ  
رہتے ہیں دنیا میں سبکے درمیاں سب سے الگ

بھٹوں نے اپنے ذاتی رسوم اور اقتدار سے کبھی اقربا نوازی اور بادر فروشی کا کام نہیں لیا۔ ایک بار علی حضرت مرحوم کسی وجہ سے اپنے پیشی سیکرٹری نواب تبرا میں جنگ سے ناخوش ہو گئے اور نواب عماد الملک کو لکھا کہ میں اپنی جنگ کی جگہ آپ کے درندہ محرم شتم کو مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے لکھا کہ وہ اس کام کے اہل نہیں مناسب یہ ہوگا کہ سنو راہین جنگ ہی کو ان کی سابقہ خدمت پر بحال فرما دیں۔ مہتمم پیشی کی خدمت (جو بعد میں صدر الہامی پیشی ہو گئی) ایسے اعزاز اور اقتدار کی خدمت تھی کہ ریاست کا کوئی دوسرا عہدہ اس سے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر کسی ہاتھ سے نہ جلائے دیتا۔ ایک دو تہہ مہتمم پر حضور نظام نے لکھا کہ میں آپ کے فرزند عقیل جنگ کو کوئٹہ شہر کی خدمت پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں ہندوستان کی قوت و اقتدار کا مقابلہ کوئی عہدہ دار نہ کیا کوئی امیر یا مہمور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نواب صاحب نے یہ لکھ کر باوجود یہ کہ اس کام کے اہل نہیں، کسی دوسرے شخص کا انتخاب فرمایا جائے۔

ان کے سامنے اہل ان کے بی بہت سے بڑے بڑے اشخاص آئے اور چلے گئے لیکن نواب عماد الملک نہایت عزت و آبرو کے ساتھ آخر تک حیدر آباد میں رہے اور ہر دور میں ان کا اعزاز پچھلے سے زیادہ ہوتا رہا۔  
برٹش انڈیا اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ان کا ایسا ہی اعزاز تھا۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے جو یونیورسٹی کمیشن ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے حالات کی تحقیق اور اصلاح کے لئے بہ صدارت۔ ٹامس ہیلے مقرر کیا تھا اس کے ایک رکن نواب صاحب بھی منتخب کئے گئے تھے۔ اس سیشن میں پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ رکن میں یہ لارڈ کرزن امپیریل یونیورسٹی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ شہرہ میں لارڈ مارلے نے پہلی بار وزیر ہند کی کونسل کے لئے دو ہندوستانی ممبروں کا انتخاب کیا۔ ایک نواب عماد الملک تھے۔ محمد علی ایجوکیشن کا نفرس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ ایک بار ۱۹۰۵ء میں میرٹھ کے اجلاس میں بڑا مانہ سرسید اور دوسری بار جب شہرہ میں کانفرس کا اجلاس رام پور میں ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں مدراس یونیورسٹی کے کان و کمیشن اجلاس تقسیم سندھ میں خلیفہ صدارت پڑھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بعض اوقات تعجب ہوتا اور مزاحیہ آوازوں سے امت کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بزرگوں نے انگریزی معاشرت کی گروہ پیگی کا اظہار کیا تھا اور اپنے ہنر سے ہمیں بہت کچھ تبدیلی کرنی تھی وہ کھانا اپنا ہی کھاتے تھے۔ سرسید احمد خان نواب حسن الملک،

اسیہ عمار صاحب کے دسترخوانوں کا میں نے بھی رنگ دیکھا تھا ہر شے کے انگریزی آئینے ہر شے کے کھانوں میں وہ ڈانٹا اور چٹا رہا کھاں جو ہمارے کھانوں میں ہے وہ اب تو لوگ وہ کھانے کچھ بول گئے نام نہانک یا وہ نہیں نہ ان کے کھانے والے رہے اور نہ کھانے والوں کے قدروان اب جو کھانے ہم کھاتے ہیں وہ نہ انگریزی ہیں نہ محلی۔ ان کھانا سب ہی کھاتے ہیں۔ لیکن ان میں کسے ہیں جو کھانے کا ڈانٹا اور چٹا اور ان کے کھانے کوئی دیکھتے ہوں تو اب عمار صاحب بہت نفیس اور لذیذ کھانا کھاتے تھے۔ لیکن ان کے کھانے بہت دیر تک ہوتے تھے۔ اندام بانی نے یہ کھانے کسی طرح بچھ کر بیٹھے تھے جبکہ کسی قسم کی درستی کے بغیر عمار ہی نہ تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ دانا آباؤ کے گئے جہاں ان کا ایک اچھا سا باغ اور بنگلہ تھا۔ کھانا ان کے ساتھ کھانا پڑا۔ شریک کھانے پر وہ بار بار ٹوکنے لگے کہ کیسے جوان ہو رہے تو میں بدھا ہی اچھا ہوں تو سے کھانا کھاتا ہوں۔ ان کے اصرار پر بھی میں نے کھانا بہت احتیاط سے کھا یا۔ لیکن یہ دیر کھانا جس قدر بہت ہی نہیں مجھے اس نے آبا اور ذات جو بے چین رہی۔ بیچ ہوتے ہی میں نے وہاں سے نکل جگہ کی کھانی۔ مگر نواب صاحب نے بلے نہ کیا اور پھر نے پرسن قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا۔ کھانا میرے سامنے آنا تو میرے روگٹے کھڑے ہو جاتے۔ نواب صاحب سیر کر کے رہتے اور دھن کرتے تھے۔ انہیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا ہوتی ہے۔ تیسرے دن تو میں نے ایک ذہنی اور حیدر آباد جا کر رہا۔ نواب صاحب کھانا تو خیر اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور اس کی بارگاہیں کو حق خوب کھاتے تھے۔ بعض چیزیں تو بھی پکاتے تھے۔ خاص اور برقی والی جس میں کمرنگ کی لٹک دیتے تھے بہت نذیر ہوتی تھی۔ قدروان بھی ایسے ہی تھے۔ ایک روز جو ان کے ہاں گیا تو کیا دیکھنا ہوں کہ ایک صاحب ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہیں اور وہ ان سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں جس وقت میں چلتا تو نواب صاحب ان سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ بیٹھے جاؤں تو بے تکلف باتیں کر سکتے لیکن مندرجہ ذیل ایسی شکر گرم ہوتی ہے۔ اس نے کہا آپ نے صحیح فرمایا۔ اس وقت پرانی شکر نہ لی سکتی تھی استھان کرنی پڑی معلوم ہوا کہ یہ نصرت بگاڑ گئے۔ نواب صاحب ملقاتیوں میں دوچار ہی ایسے تھے جو ان کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرتے۔ کھانوں کی قدر نہ دینا ایسی چیز۔

ان کے خاص وہ بہت اور مانے والے بہت کرتے تھے۔ مگر جس سے رابطہ تھا وہ غلوں کے ساتھ تھا۔ وہ اہل علم سے ملی کر بات نوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ طبع تھا اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور ان کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کر کے کو تیار ہو جاتے تھے جس کا ذکر میں اپنے کچھ پاؤں۔

پرانے لوگ اس کا ایک بات یہ بھی مٹتی کہ جس پر ایک بار غائب کر لیا جس اس کے ہو گئے۔ ہزار کرنی اس کے غلظت کے وہ میں سنتے تھے۔ یہی کیفیت سر سید احمد خان کی تھی۔ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ان کے انگریز کلرک نے ایک لاکھ کا غبن کروایا۔ نواب صاحب کے دفتر میں ان کے ایک ملازم کا عہدہ ایڈجیکٹ صاحب تھے۔ میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا کہ اس شخص کی دیانت مشتبہ ہے اور جہاں تک معلوم ہوگا۔ یہ یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے جو ایسا کہتے ہیں وہ خود ایسے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد تب دفتر کے حسابات کی تصدیق ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سا مکاری رویہ اپنے تصرف میں لے آیا ہے اور غبن کے الزام میں حدیث سے بے طرف کروایا گیا۔ اس مذکور سے یہ مقصد یہ کہ ان کے متعلق ایسے ہی تھے بعض اشخاص جن پر ان کو اعتماد تھا اور حقیقت اپنی سیرت و کردار اور قابلیت کے اعتبار سے بہت

تقابل قدر تھے۔

مذہب یا شیعہ تھے۔ لیکن اہل تشیع کے بعض عقائد مثلاً تبرّے اور تقیّے کے سخت مخالفت تھے اور کہنے تھے کہ جاہلوں کے عقیدے ہیں۔ نواب رام پور مرحوم، عادل علی خاں، جیسا کہ میں اور کچھ چکا میں نواب عماد الملک بہادر کا بڑا حداد ہے احترام کرتے تھے۔ ایک ملاقات کے وقت جب ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات میں ہمیں ان سے اختلاف ہے اور کسی طرح وہ اس معاملے میں ہم سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختلافی معاملہ تقیّے کا تھا۔ عائدانہ ہم نے بعض شیعہ علماء اور نمایندگان اہل اور دشمن خیال اشخاص کو یہ کہنے سنا ہے ”الغنیۃ دینی و دین آبائی“ وہ نہایت بے نقاب شخص تھے کسی مذہب یا مذہبی فرقے سے صریح کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ ”موجودی شیعہ ثمانی مجری سے کہتے تھے کہ میں نے افکار و فکری کو شایع کیا تو اس کا ایک حد نصاب عماد الملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات پر فرمائیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ گذشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر ابن الخطاب ہے۔ لہذا ان کی لاکھ لکھ اسلام کی عزت تھی جو آپ نے اوائلی کاسرشتہ تعلیم بہت وسیع حکم ہے اور بیگزوں اور مہر کا نظروں کے ماتھے میں تھا لیکن انھوں نے کبھی مذہبی یا ساداری سے کام نہیں لیا۔ اس معاملہ میں بہت قریح دل تھے۔ بعض عیسائی مشنریوں اور دوسرے غیر اسلامی ادیبوں کی جو اشاعتیں تعلیم کا کام کرتے تھے وقتاً فوقتاً مدد دیتے تھے۔

آخر زمانے میں انہیں مذہب سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ کنگو بھی اکثر خاص اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروغ پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو نہ جب سمجھ رکھا ہے۔ کہتے تھے اصل اسلام اہل حدیث (دوایوں) کا ہے۔ یہ اثر ان پر زمانہ طفولیت سے تھا جبکہ وہ اپنے والد کے ساتھ بنگال کے مختلف اضلاع میں رہے۔ اس زمانے میں شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمہ کے بے لوث مہر و مروت والی اور واسطہ اشاعت اسلام کی خاطر بنگال کے اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان کے ہاں آکر مہمان رہتے اور ان کے والدین کی بہت خاطر مدارات کرتے۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ یہ دو گشتیوں میں سفر کرتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان بزرگوں نے گاؤں کے گاؤں سامان کر لے تھے۔ یہ تو مسلم بڑے مخلص اور پکے مسلمان تھے۔ جس وقت نماز کا وقت آتا فوراً سب دم چھو بیٹھا ذکر نماز کے۔ بٹے کھڑے ہو جاتے مثلاً گھیت میں کوئی مل جاتا۔ یا ہے تو ان سے سخت ہی بل جہاں تھا وہیں رہ جاتے گا یا کسی اور کام میں مصروف ہے تو کام میں نوبت پر پہنچتے ہیں چھوڑ دیا جاتا۔ یہ اپنے عقائد میں بہت راسخ تھے۔ مجال نہ تھی کہ کسی شخص قبر پر پھول پڑھا جائے یا اسی قسم کی کوئی اور بدعت کرے اس بات پر بہت افسوس کرتے تھے کہ ان مخلص مجاہدوں کے بعد جب پنجاب کے جاہل اور دنیا وادیروں نے انکا شروع کیا تو بیچارے بنگالی مختلف قسم کے توہمات اور بدعنوانیوں میں پھنس گئے۔ شاہ اسماعیل کے وفات کے تقویمے اور سچے اسلامی جویش کے بہت قائل تھے۔ اگر کہیں کا یہ اثر ان کے دل پر آخر عمر تک تازہ رہا۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے آخر زمانے میں اسلام کی حقانیت اور قرآن پاک کی تعلیم کی عظمت ان کا تکیہ خیالی ہو گئی ان چیزوں کو کہ وہ طرح طرح سے بیان کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرا ملا ناوارا محمد خان صاحب (فضیلت جنگ) صدر الصدور سے

ادب کی نصاحت کے بعض نکات بیان کر رہے تھے دوران گفتگو میں فرمایا کہ لوگوں نے انعام قرآن پاک کی محبت بہت اور کم کی عرف بہت کم توجہ کی ہے اور اسی ضمن میں کہا کہ آجہا انگریزی کے الفاظ میں ایسی حسن تزیین ہے کہ وہ یہاں تو پرادائے جوشہ ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کو بہت بڑی اسلامی خدمت سمجھتے تھے ماسی بنا پر وہ خواجہ کمال الدین کی بہت عزت کرتے تھے اور خواجہ صاحب اور ان کے رفقاء نے تبلیغ کا کام جو مختلف ممالک میں کیا اس کے بہت شواہد تھے۔ غالباً انہی کی تحریک پر انہ کا رہے خواجہ صاحب کو مالی امداد بھی دی گئی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان کا آئندہ سربراہ دیڈر ہندوہ کے نہیں ہیں اسے گا۔ کچھ مدت بعد جب قائد جی جی میدان سیاست میں جلوہ فرما ہوئے تو مجھے خواجہ صاحب کی پیشین گوئی یاد آئی۔ اس سے قبل انڈین نیشنل کانگریس کے سربراہی نظم یافتہ حضرات کے تصرف میں تھی۔ عوام سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گاندھی جی اپنی قوم کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے انہوں نے ایک لغت اپنی طرز زندگی اس طرح بدلی دی جیسے سانپ اپنی کینچی بدل دیتا ہے۔ وہ ننگے سر شنگے پاؤں رہتے۔ دشمنوں سے اور ایک عرفی سی بانہ چھینتے اور کندھے اور سینہ چھپانے کے لئے کھدکا ہوا بڑا سا دھواں یا چھوٹی سی چادر ڈال لیتے۔ اس کے بعد سے ان کی زندگی درویشانہ اور زاریانہ ہو گئی اور وہ دفعہ مومس داس کرم چند کا مذہبی سے عمامہ لگا دیا۔ ہر گز نہ۔ ہندو خلقت ان کی پرہیزگارنے لگی اور ان کے ایک ایک لفظ کو اللہ مودہی سمجھنے لگی۔ کانگریس کا دروازہ مسکے لئے کھل گیا۔ انگریزی کی جگہ ہندی، ہندوستانی اور دو میں تقریریں ہونے لگیں۔ ہندو ذہنوں کو مسلمانوں کی خلافت کے واسطے پرالیا لگایا کہ ان کے سرگروہ اور ملکا گاندھی جی کا دم بھرنے لگے۔ گاندھی جی نے مذہب کو سیاست میں ایسا سمویا کہ وہ ٹھوڑے ہی عرصے میں ہندوستان کے مادی اور روحانی پیشوا ہو گئے۔

ظہنوں کا جواب بالا التزام دیتے تھے اور اپنے فہم سے سمجھتے تھے۔ کبھی دوسرے سے نہیں لکھواتے تھے اور کبھی فوٹو نہیں پر استعمال نہ کیا۔ اپنی تمام تحریریں اردو اور انگریزی سب خود لکھیں اور اپنے قلم سے لکھیں۔ ایسے زمانے میں بھی جب وہ ضعیف ہو گئے تھے اور کسی قدر ضعف بھارت کا بھی حاضر تھا انہوں نے کبھی اپنے خط یا اپنی تحریریں کسی سے لکھوانی گوارا نہ کیں۔ یہاں تو لکھواتا گاندھی رنگ خود آدمی تھے۔ خضاب کرتے تھے، آخر زمانے میں ترک کر دیا۔ سفید دائرہ بھی معلوم ہوتی تھی۔ حقہ پیتے تھے۔ پتھر ان سامنے لگا رہتا تھا۔ سگریٹ سگار بہت ناپسند کرتے تھے۔ کہتے تھے جہاں کے سفر میں ایک بار سگریٹ سگار پینے کی کوشش کی۔ اس کی بد سے بہت تکلیف ہوئی اور حلق میں بھی غراش معلوم ہوئی۔ زبان میں ہلکی سی گھٹکت تھی۔ جامہ زیب تھے۔ ہمیشہ ہندوستانی یعنی جید رآبادی لباس پہنتے تھے جب بھلیٹھو کو نسل کے ممبر ہونے کو لباس میں تبدیلی کرنی پڑی کہیں یہ تبدیلی عارضی تھی۔ انڈیا کو نسل کے ممبر مقرر ہوئے اور لندن میں رہنا ہوا تو انگریزی لباس اختیار کرنا پڑا۔ ان کے قوی بہت اچھے تھے۔ صحت قابل رشک تھی۔ لندن میں ایک حادثے سے ٹانگ میں چوٹ آگئی۔ زخم اچھا ہو گیا مگر ہڈی کا جوڑ ٹھیک نہ بیٹھا۔ اس سے انہیں اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف رہتی تھی۔ اگر یہ صدمہ نہ ہوتا تو کئی سال اور زندہ رہتے۔ پھر بھی ۸۳ برس کی عمر پائی۔ کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ شطرنج بھی کھیل دیتے تھے۔ کسی زمانے میں ستار کا بھی شوق تھا۔ ان کی یادگار یہ چند تصانیف ہیں:-

۱۔ سہارنچ سہارنچ اور جنگ - یہ نواب سہارنچ کی مختصر سوانح عمری انگریزی زبان میں ہے۔ یہ کتاب سہارنچ کی وفات کا سال ہے۔ لکھی گئی۔

سہارنچ ان کے محسن تھے اور ان کا ذکر بہت خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ سہارنچ ان کی تمام نعمتیں اور فرائض اسی اور فرائض میں اور ان کی ایک ایک نعمت کوئی شخص ہوا ہے تو وہ سہارنچ کی نعمتوں کا نذرانہ اور وہیں جمع ہو گیا تھا۔

۲۔ DESCRIPTIVE SKETCHES OF THE NIZAM'S DOMINION - اس میں ریاست ہیدرآباد کو ان کے خزانے، انارنجی واقعات، انتظامی حالات، ریاست کی صنعت، وحرف و تجارت کا عجیب بیان ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں شہر و طبع و لٹ بھی شریک تھے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳۔ رسائل و خطبات - اس میں نواب صاحب کے وہ تمام خطبے، خطبات و مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو میں شائع ہوئے۔

۴۔ انگریزی خطبے - مقالات و خطبات، انگریزی نظموں کا مجموعہ۔

۵۔ قرآن پاک کا ترجمہ - یہ نواب صاحب کا سب سے اہم اور قابل قدر کام ہے۔ یہ ترجمہ اپنے نہایت عجیب و نادر اور محنت سے کیا تھا اور اس کے لئے خاص انتظام کیا تھا اور ایک بڑا ذخیرہ فقہاء، محدثین اور لغات اور لغات کے دانے کی تصانیف کا جمع کر لیا تھا۔ ان کی کوششوں کی مدد سے یہ کتاب کی تمام جگہوں میں جو کچھ لازم آتا تھا اس کی سادگی، شان اور قوت باقی رہے۔ مزاج میں بڑی احتیاط تھی۔ بہت غور و فکر کرتے اور ایک ایک لفظ کو جانچتے اور فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ لغتیں پابندی کا بھی خیال رکھتے۔ ان کے پیش نظر انگریزی کا ترجمہ بھی کر لیا تھا اور نظم و پروف کے چھپوا بھی لیا تھا۔ نظر ثانی کے وقت مولوی حمید الدین صاحب بھی مشورہ کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں اس کا ترجمہ ہو گیا اور ان کے فضل و کمال کا بہترین نمونہ بن گیا۔

نواب محمد علی شاہ کی شخصیت اس زمانے میں بعض اعتبار سے عجیب سی معلوم ہو گی۔ وہ سنی اور سنی تہذیب کے جامع تھے آدمی کو علم، دولت اور اس قدر محنت سے مل جاتا ہے۔ لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال، نہ زر سے اور نہ محنت سے صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آ جاتی ہے جو وہ اداری، اعتدال اور اطمینان قلب پیدا کر دیتی ہے اور باوجود تشیب و فرائض اور اوجھٹ گئیوں کے سبب حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ اس ذوق نواب محمد علی شاہ کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو میں پایا جاتا ہے۔ ان کی طرز معاشرت اور ظاہری شان ایسی تھی کہ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے چمکیا کرتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے جو ذوق علم اور ذوق تہذیب سے عاری ہوتے گویا وہی حیثیت سے ان کا پایہ کتنا ہی بلند ہوتا، ملنے سے ابا کرتے اور ایسے اصحاب ان کا بڑا خوشگوار آجٹا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن ان کی علم کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے۔ ان سے مکمل مل کے باقی کرتے۔

ملا قانون میں غالباً عامانہ ساوگی، خلوص اور ہمدردی باقی عانی تھی۔ وہ غریب سے غریب عالم باطنی علم کے خباثت میں بڑے سے سے حامل امیر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے علم و ادب کی اشاعت، اہل علم اور علمی اداروں کی آمد و سرپرستی میں ہمیشہ فرخندگی سے کام لیا اور اس سے ان کو سچی خوشی ہوتی تھی۔ وہ صادق القول، مامون اور پابن اصول تھے۔ ان میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم ملی ہوئی تھیں کہ اس امتزاج نے ان کی روش زندگی میں ایک نیا مکتبہ پیدا کر دیا تھا۔

ان کی صحبت و تعلیمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طب علمائے دونوں شناس نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے برائے حالات اپنے بزرگوں کی خودداری، ضیع داری اور شجاعت کے کارنامے اور ان کے ترہات، اسراف اور سبکی کے قصے سے مرعہ سے بیان کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صعبیوں میں ان کا طیب کام شناسنے اور کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالنے سے دلچسپی دیکھ کر ان کے ذہن کی داد دینی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلمبند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی۔ مولانا حاتی نے کسی جگہ ذکر کیا ہے کہ منظر حلی جابا سے اساتذہ کے کام سے مختلف اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام "خریطہ خواہر" تھا۔ اس کا وہی کی شاعری بہت بجا اثر پڑا۔ پرانے صاحب ذوق اور پختہ نگار حضرات اپنے ہاں ایک بیاض رکھتے تھے۔ یہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیالی یا کام کی بات نظر پڑی یا کوئی محراب نسخہ یا نظم یا گدھا جھٹ اپنی ساق میں لکھ لیتے تھے۔ غرض نواب عماد الملک کی صحبت میں بعض وقت اپنے علمی و ادبی نکات، مل جاتے تھے جو کہرے مطالعہ اور شکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے علمی ذوق و علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو نہیں لوگوں کو پیدا وہ ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار و درودورس تھا۔

وہ جس خدمت پر مدت و راز تک فائز رہے۔ اگرچہ اس میں ایک گونہ ترقی ہوتی لیکن جیسی ہوتی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس کا نہیں خود بھی اعتراف تھا۔ اس کی وجہ ہے۔ ان کاموں کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن سرپرست کے مصداق اور تجویز و کی منظوری کیلئے بہت سے ضمن کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی اپنے اعلیٰ افسروں سے مل کر اور ان کو خوش کر کے کام کمال لایا پڑتا ہے، کبھی دیکھ کر اور اپنے رسوم سے کام لیکر منظوریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ نواب عماد الملک اس قدر خود راہ اور غریب اور اپنے اعلیٰ افسروں سے اس قدر بلند مرتبہ تھے کہ اس قسم کی دہش اور دوا و دھوپ یا اپنے افسروں کی خوشنودی کی کوشش ان کے امکان سے باہر تھی۔

ان کے علم و فضل، وسیع معلومات، علمی و ادبی ذوق اور عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے گہرے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ان کا علمی کام اس توفیق سے کم ہے جو ان سے کی جاتی تھی۔ حیدر آباد کے انکے حالات اور ماحول کی آئے ان کی تعمیرات نے بزمی اور نئی طرز معاشرت کے فن آسانی پیدا کر دی تھی اور کام کا وہ ولولہ جو اب ان میں تھا بعد میں نہ رہا لیکن بے دریغ علمی سرپرستی، علمی فیض و فاضلہ استغناء، اعلیٰ سیرت اور بے لوث کردار کی وجہ سے وہ دل سے آصف حیدر آباد کن کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رہیں گے۔



نہا کہ وہ انھیں اپنے پرکھوں رکھا ہوا ہے کہ کسی دشمنے کا ماتھ و مان تک نہیں پہنچ سکتا۔

سید صاحب اس قدر عجیب تھے کہ مجھ کو اپنے والد ان کے سامنے بہت بولے اور مختصر معلوم ہونے لگے۔ وہ ان کا ایک اس سے پہلے میں ان کے بڑے کسی کو شرا آدمی نہ سمجھتا تھا۔

سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جلتے تھے اور کبھی بھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ میرے بڑے بھائی تو کسی پر بیٹھ گئے تھے مگر میں کھڑا رہا۔ کیونکہ سخت عریض فرصت تھا۔ میں سید صاحب کے پاس کھڑا ان کے لکھنے کی دوان کو بڑی محنت کے ساتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس دوان کا ڈھکنا کچھ بالکل شبیر کا معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل اسی صورت کا جس کی تصویر میری رہبر میں بنی ہوئی تھی۔ اس کی آکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمک رہی تھیں۔ میں اس خواب جھرتے اس وقت چونکا جب سید صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا کہ آدھو کی چوتھی ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری پڑھتا ہوں اور رائل ریڈ شروع کر رکھی ہے۔ اس سید سے سادے جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسنے لگے۔ وہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ علم فضل "باعت مسرت ہوا ہو۔"

یہ دونوں بڑے ایک باتیں بھی کرتے جلتے تھے اور مختصری طور پر دیر کے بعد فتنہ بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب کے کچھ کا خدات والد کو دیکھ جب وہ ان کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ مختصری دیر بعد سید صاحب نے لکھنے ختم کر دیا اور ایک چھوٹے سے کس کی طرف انہیں جھرا کر دیکھ کر کہا "بچا دو کہ" جس پر فریضہ کو کما فوراً رک گیا۔ سید صاحب نے کس میں سے ایک چرٹ نکالی کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چرٹ کے قریب لاسے تو مجھ کو ان کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھ معلوم ہوا کہ کس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ چرٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہونے ہی میں سید صاحب کے ڈرنے لگا اور یہ اس خوف کی ابتداء تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا سبوتا رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سید صاحب کے پاس ہٹھ کر جب والد اس کمرے میں گئے تو ہم دونوں بھائی بھی ان کے ساتھ آئے۔ اس کمرے میں جو عسلخانہ تھا اس کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کسی چیز کو ہر نہ کی جانت نہ ہوئی۔ کپڑے بدلنے کے کمرے میں چراغینہ دار خوبصورت میز تھی۔ اس پر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ مگر ان سب کو مجھ سے سخت دشمنی تھی۔ کیونکہ جہاں میں نے خوش ہو کر کسی چیز کو ہاتھ لگا دیا۔ اور وہ آپ سے آپ لوٹ کر گرہ پڑتی تھی۔

شام ہوئی تو سید صاحب کچلے سے باہر آئے۔ کوئی کے اساطے میں ایک طرف کو بارغ تھا اس کے سرے پر ایک خوبصورت تختہ۔ اس پر بہت سی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سید صاحب اور میرے والد بھی باتیں کرتے لگے۔ مختصری دیر بعد سید صاحب مجھے اپنے قریب بلا دیا اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا "مٹھ کھو" میں نے مٹھ کھولا تو کہنے لگے "اے اس لڑکے کے منہ سے تو خون نکل رہا ہے تو بہ۔ تو بہ۔ جی وائی سے چلا تھا تو زبان کھایا تھا۔ اس لئے وانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے مٹھ بند کر لیا اور سمجھ لیا کہ پاؤں کھانا بڑی بات ہے۔"

بہت کچھ بات ہو گئی تو آدھی گھنٹہ تک کھانا میز پر ہے۔ اس پر سب لوگ اُٹھتے اور کھانے کے کمرہ میں آتے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر چھنی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چھچھے۔ دھنسی و انت کے دستے کی چھیریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دوڑے سناٹا عجیب روشن تھے۔ پٹھا چل رہا تھا۔ اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا دسترخوان۔ برتن اور قندیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ و منتر خوان عیدہ آج بچھوایا کرتی تھیں۔ مگر وہ کاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی وار ہوتے تھے۔ چھنی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی عہدوار آئے تو برتن بدلتے تھے۔ شیشے کے گلاس صرف گرمیوں میں یا رمضان شریف ہی افطاری کے وقت نکالے جلتے تھے۔ مالامال آن کو باندھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھیریاں اور چاندی کے ہاتھ تو ہم نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا قندیل سوز اگرچہ روزمرہ معمولیایا جاتا تھا مگر اس کی صورت شکل اور ڈھانی جہاں روشنی مان لپھوں کی عمارت اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرنے اور ہنسنوں پر توجہ لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نئی چائے سفید پوش ملازم اور ایک بہت بڑی ٹی ڈی وار جس کا وہ بلا پتلا سوکھا کھربے حاجت و چالاک اور تیز خانساں طرح طرح کے کھانے سامنے لوتا تھا۔ اور سب لوگ چھوڑ کر سب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابیوں میں بڑھے خانسانا نے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقین ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نئی نمی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان بچوں کو ان کے پلنگوں پر لے کر سلا دو" صبح دہشتہ ہی چیزوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ یعنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں ان کی نسبت تیسویں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ والد آباد میں یہ سب چیزیں ہونگی یا نہیں؟ والد کبھی تو جواب بڑے جیتے فیتے کبھی ہنس کر چنپ ہو جانے لگتے۔

والد نے عملی گڑھ میں دو دن قیام کیا۔ پھر والد آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن شوبھ ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔ اسٹاپے آنکھ برس کی عمر میں سید صاحب کی طرز معاشرت پر میرا چھوٹا سادہ مانع نور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا تھا۔ ان کے بظنہ کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس جی ہوتی۔ اب یہ شوق پیدا ہوا کہ جہاں جی رہوں وہاں کی ہوا ایسی ہی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں۔ باغ ہو۔ باغوں میں پھولوں کے پھولے ہوں۔ گرو ویش کی سب چیزیں صاف ستھری۔ چمکتی ہوئی۔ ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ اور کوئی چیز میٹلی اور خراب نہ ہو۔ یہ ایسا خیال تھا جس کا بہت کچھ اثر طبیعت پر تمام عمر غالب رہا۔

(عطیہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

# نواب صدر یار جنگ بہادر

(مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی)

ماکرام

نواب صدر یار جنگ بہادر سے میری ملاقات محض حسن اتفاق کا نتیجہ تھی۔ وہ بالعموم علی گڑھ حبیب، گنج میں رہا کرتے تھے، میں دہلی سے آگے کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ ان کا حلقہ احباب مجھ ہیچ میر زادیمچداں سے بہت بلند تھا، اور کاجو فرق تھا وہ ظاہری ہے۔ پس عام حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے مل سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۳۷ء میں مجھے غائب کی کتاب ”سبد چین“ دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں مشکل سے چھ سات سو شعر ہوں گے۔ غائب نے اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی ۱۹۳۶ء میں شائع کیا تھا، لیکن چونکہ اس کے بعد نہ یہ انگ کہیں سے چھپا۔ نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا، اس لئے مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غائب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگار غائب میں اس کا ذکر موجود ہے، اور انہیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے ادھر ادھر بعض احباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لئے مستعار عنایت فرمائیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں لکھ کے پوچھو۔ ممکن ہے ان کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا۔ بااے ایک تیز نشانے پر بیٹھا۔ ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ ”سبد چین“ کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے، یہ غنی تقریب قمارت۔

یہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں ان ایام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے۔ میں اس کی نقل لے کر اسے برحفاظت واپس کر دوں گا۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ آپ کہاں اتنی زحمت کریں گے۔ میں یہیں سے اسے نقل کروا کے چند دن میں مجھ کو ادوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انہوں نے

پہلے بچے پیدا دی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، میں نے اس کی خوشی میں پانچ چھ بیٹے صرف کئے تھے اور تقریباً پانچ سو چودھ تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے خیال سے بہت کم جسم کی نکل، تاہم کچھ بھی ہو غالب کا کلام نسا اور اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحبان حضرات کے کتب خانے اس سے خالی تھے۔ اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لئے میں قندلہ بھی کرنا تھا۔ انھوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اب میں فیصلہ نہ کر پاؤں کہ آیا اصلی کتاب ہی اتنی غلط تھی؟ یا ادب صاحب کے کاتب نے دو انٹی، علما میں دی ہیں۔ ان میں سے کئی غلطیاں تو ایسی تھیں کہ میں نے خود ہی انگلی سے انہیں درست کر لیا پھر بھی کچھ ایسی روگئیں کہ ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ ایک آدھ جگہ غلطی لکھنے سے رہ گئے تھے۔ میں نے جب اس کا انکشاف ہی سے کیا تو جواب ملا کہ اگرچہ کاتب بہت محتاط آدمی ہے لیکن امکان ہے کہ اس سے غلطیاں ہو گئی ہوں۔ اس پر میں حوصلہ میں ملے کیا کہ جب وہی جانا ہوا، تو ایک دن کے لئے علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ اور اسی شخص سے اس کا مقابلہ کر کے دسٹی کروں گا۔ ادب صاحب مرحوم نے بھی مجھے دعوت دی کہ جب پہاڑ سے آؤں تو یہاں آئیے اور کتب خانہ دیکھ جائیے۔ یہ تو میں میری ہمتش تھی۔ میں نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے آنے کا وعدہ کر لیا۔

اس کے تھوڑے دن بعد میں وہی آیا۔ یہاں ایک مہینہ ادب صاحب رہا، میں کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ اس میں حکیم مرزا خان کے فارسی دیوان کا، کہ بڑھا، میں نے پھر ان کی خدمت میں لکھا کہ آپ نے ہاں جیب گف میں مرزا خان کا فارسی دیوان ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہاں۔ دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے، لیکن اب میں اسے آپ کو بھیجوں گا نہیں۔ اپنا وعدہ وفا کیجئے۔ یہاں آئیے اور جو چاہیے لے جائیے، میں خود کتنے دن سے وہاں جانے کے لئے پرتوں رہا تھا۔ لیکن مکر دہات اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسی جہں میں دو تین مہینے نکل گئے۔ آخر ایک سہ پہر کو میں نے ہڑ بڑا کے بستر باندھا اور بغیر اطلاع دے علی گڑھ پہنچ گیا۔ گاڑی وہاں مغرب کے بعد پہنچی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جب میں علی گڑھ کے سٹیشن پر اترا ہوں تو بزدلیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ اب میں نے شبیالی کیا کہ یوں بے اطلاع آنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتے تو پھر۔ لیکن یہ خدشہ ایک لمحے سے زیادہ میرے دماغ میں رہا نہیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ دل نے کہا اگر نہ ہوتے تو کوئی قیامت آجائے گی، رات کی گاڑی سنہ واپس چلے جانا۔ بہر حال میں نے سواری لی اور چند منٹ میں میرکس روڈ پران کی کوٹھی حیدر منزل میں جا پہنچا۔ وہ خود اس وقت مریض و نہیں تھے۔ ملازم مجھے اندر جناب عبدالوحید خاں صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے ادب صاحب کو عرض کیا اور اپنا تعارف کر کے خاموش ایک طرف بیٹھ گیا۔

نام آگیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں جناب عبدالوحید خاں صاحب کا تعارف کرادوں۔  
 ادب صاحب ریاض جنگ مرحوم نے اپنی عمر میں تین نکاح کئے۔ پہلی بیوی ان کے چچا حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب کی صاحبزادی تھیں، ادب صاحب مرحوم کے رہتیے بڑے صاحبزادے خاں بہادر حاجی مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب ملکہ اللہ تعالیٰ انہی بیگم کی اولاد ہیں۔ دوسری شادی بھی اپنے خاندان ہی میں ہوئی۔ یہ بیگم جناب محمد عبدالغنی خاں شیر والی دہس بیگم کوہک ہاشم تھیں۔  
 ادب صاحب کا تیسرا نکاح جناب مولانا عبدالغنی خاں صاحب ملکہ قائم گنج (نیل فرخ آباد) کی دختر نیک اختر جناب نیرب بیگم صاحب سے ہوا۔ مولانا عبدالغنی خاں مرحوم مشہور کتاب از خان آصفی کے مصنف ہیں۔ جس میں فارسی مصادر کے صلوٰۃ کی اسناد کلام سادہ

سے جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب ۱۰ ہجرتوں میں عجیب چکر ہے۔ اس کے علاوہ سوا اور عرب اور ایک تذکرہ شعر فارسی بھی ان سے باور گار ہے۔ مولانا عبدالحی خان نواب صاحب کے استا بھی تھے۔ انھوں نے فقہ اور حدیث اور تفسیر کی متعدد کتابیں ان سے پڑھی ہیں۔ یہی مولانا عبدالحی خان صاحب جناب عبدالوجید خان صاحب کے والد بزرگوار تھے اور جناب زینب بیگم صاحبہ ان کی سگی بہن تھیں۔ نفیس و حسن کے نام سے کسی کبھی نہیں ملے گا۔ دو تین سال ہوئے کہ انتقال فرمایا۔

ایک اور بات یاد آگئی۔ غالب نے ایک ناول میں اپنے تمام مشہور فارسی گو معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ قطعہ ہے۔

ہستہ را خوش نسا نند سخن در کہ بود ۱ بار در خلوت شان مشک نشان از زم شان

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ ۲ حسرتی، اشرف و آرزوہ بود عطیہ شان

غالب سوختہ جانی اگر چہ نیر زوہ بد شمار ۳ حسرت و در بزم سخن، ہم نفس و بزم شان

یہاں دوسرے شعر میں علوی سے مراد مولوی عبداللہ خان علوی ہیں۔ یہ علوی ہمارے مولانا عبدالحی صاحب کے تحقیقی ناموں تھے۔ مولوی محمد انیس شہید، مولوی کے شاگرد تھے اور سید احمد بریلوی سے بیعت تھے۔ طبابت میں بھی یرطونی حاصل تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ایشہ وطن ہی میں تپ محرقہ سے وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ صہبائی انہی کے شاگرد تھے۔ تاریخ وفات ہے: ”بنیاد سخن نفاذ“

بات سے بات یاد آتی ہے۔ غالب کے نانا مرزا غلام حسین خان، اگرہ کے رؤسا میں سے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ

جناب عزت النساء بیگم صاحبہ کا نام صرف ایک فارسی خط میں دیا ہے۔ جو انھوں نے اگرہ ہی کے ایک صاحب خدا داد خاں

اور ان کے بیٹے صاحبزادے ولی داد خاں کے نام لکھا ہے۔ اس خاندان کے غالب کی نانہیال سے لین دین کے تعلقات تھے

اور اسی سلسلے میں غالب نے یہ خط بھی لکھا ہے۔ اصلی خط کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ تو خیر، ان خدا داد خاں کے

ایک اور صاحبزادے کریم داد خاں بھی تھے، ان کریم داد خاں کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں، جو میں ان سب کے نام لکھنا

تو غیر ضروری ہے۔ البتہ ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام بیگم اللہ بیگم تھا۔ یہ مولانا عبدالحی خان سے منسوب تھیں اور جناب

عبدالوجید خان صاحب انہی بیگم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ گو یا یہ غالب کے مکتوب الہیہ جناب خدا داد خاں کی برقی کے بیٹے

ہوئے۔ غالب کے جس خط کا آپ ذکر ہوا، وہ انہی نے نواب صاحب معذور کو دیا تھا، جو ان کے خاندانی کاغذات میں

موجود تھا۔

یہ جذبہ معروضہ، بحر طویل میں چلا گیا۔ بہر حال جناب نواب صاحب نوبے کے قریب مکان پر تشریف لائے جو نہی پہنچے

انھیں میرے آسنے کی اطلاع ملی۔ فوراً اس کمرے میں آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ میں ایک طرف دلہا سے ٹپک لگا کر دوڑا تو بیٹھا

تھا۔ دروازہ کھلنے پر نظر اٹھا کے خود کھینچا ہوں تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میں نے

قیامت سے فوراً پہچان لیا۔ پہلے حلیہ پہنے۔

بہت لانا قدر، کوئی چھینٹ کے قریب، اکسرتی جسم۔ سرخ و سپید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی سونواں

ناک، خضاب لگی ہوئی بھرواں دارھی خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے، کیونکہ جڑوں سے سپیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے

پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے، اور ان کے پان کے شوق کے نماز تھے۔ جسم پر

نہایت دشمنی و نفرت اور نیچے غالباً اسی کپڑے کا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی، اور اس کے آؤ پر منڈ سے کی نسل میں سبب ساز اور بھٹے والے سے جو صورت اور جامہ زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بہت تپاک سے ملے اور آٹھا کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے فرمایا، آپ نے جھکوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں تک اسے میں تعلیف ہوئی ہوگی آپ کو؟ مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ اپنے آؤ پر تو میں کسی کو اسٹیشن پر بھیج دیتا۔ غرض اسی طرح نابڑ توڑا انہوں نے چار سوال کر دیے، لیکن بچے میں کسی طرح کی جبلت نہ ابھری تھی۔ بلکہ آؤ پر بہت نیچے تھی، اور ایک ایک لفظ انہوں نے الگ الگ کہا، کمرے میں پہنچے تو چھوٹے بی لایا، میں تو آپ کو زیادہ مہربانیاں کرتا تھا، آپ تو ماشاء اللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا، فیلہ جوانی کی بھی ایک ہی گئی، ساری عمر جس ماحول میں بسر ہوئی ہے، وہاں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ جوانی کس چیز کا نام ہے۔ ”غم عشق“ تو خبر نہیں ”علم و کمال“ تو ہے نہیں پریشان رکھا، اس لئے دل جوانی ہی میں بوشیا ہو گیا۔ کھنڈ لگے۔ میں تو آپ کے فارسی کے ذوق پر بہت متوجہ ہوں۔ ابھی ”سید جین“ کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا وہی ختم نہیں ہو پایا تھا کہ آپ نے مومن کے فارسی و پوران سے متعلق جو یہ بھیجا، پھر میری فارسی تعلیم کا حال پوچھا۔

فرمایا، میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا، ایک مدت سے میٹھوں ہے کہ جب یہاں علی گڑھ آتا ہوں تو اگر وہ یہاں موجود ہوں تو شام کا وقت ان کے ساتھ گزارتا ہوں، اور وہ اپنی بالعموم عبتا کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ آج معمول سے ذرا دیر ہو گئی۔ پھر ان کی تعریف اور علم و فضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد میری موضوع بدل گیا، فارسی اور اردو علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات گئے تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہوا تھا کہ خواہ مخواہ ان کے آؤ پر میں قفل ہو رہا ہوں، لیکن وہ اتنی محبت اور دل جبین سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ اس میری بے وقت کی ہرزہ مرائی سے بچے، اس میں ہی ہوتے تو انہوں نے قطعی کسی طرح اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدمی راستہ کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا، تو نہایت لطیف سے فرمایا۔ ارے آپ کی ڈسپ باؤزی سے مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں۔ تنگے مانرے ہوں گے، اچھا اب آپ آرام کیجئے۔ کل صبح انشاء اللہ جدید گنج چلیں گے۔ میں نے عرض کیا، یہ باتیں گفتگو کا کافی کا سفر ہی کو لے لیا، بسا سفر تھا کہ میں ٹھک جاتا۔ آپ کی تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہر حال ہم نے ایک دوسرے سے شب بخیر کہا، اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں باہر بارش زیادہ شدید لگی سے ہونے لگی تھی، اور ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ بد قسمتی سے میرے کمرے کے ایک روشن دان میں کچھ غرابی تھی۔ یہ پوری طرح بند نہیں ہو، تھا اور میرا سے اس کا پٹ کھٹکٹا ٹاٹا تھا۔ راستہ بھرا میں بے ہنگم آؤ پر کے باعث میں عجیب طرح سے نہیں سکا۔ خیر جرح کو آٹھا، حمام میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ نہایا دھوٹا ناخن کد بند ہم نواب صاحب کی موٹر پر جدید گنج کے لئے روانہ ہوئے۔ اگرچہ بارش ختم ہو چکی تھی، لیکن ہوا میں خاصی نمی تھی۔ اور سردی بھی خوب چمک گئی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ ہم تین آدمی تھے۔ نواب صاحب اور ان کے مصاحب ملا احمد اور میں۔ نواب صاحب اور میں پچھلی طرف بیٹھے اور ملا احمد صاحب ڈرائیور کے برابر میں آگے بیٹھے گئے۔ سڑک بہت خراب

تھی۔ اس کا اکثر حصہ پہلے ہی شکستہ سا تھا۔ رہی سہی کسرات کی بادش نے پوری کر دی۔ گرگھوں میں پانی بھر گیا تھا، اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کچھڑ جو رہی تھی۔

گھنے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم آفتاب خیزان حبیب گنگ پینچے۔ علی گڑھ سے ناشتہ کر کے چلے گئے اور دوپہر کے کھانے میں اعلیٰ بہت ویرانی تھی۔ اس نے جادو سے باس کافی وقت تھا۔ پہنچنے میں نواب صاحب نے کتب خانہ کھولنے کا حکم دیا۔ محترم صاحب آگئے۔ ملازموں نے کرسیوں کو بچا ڈال دیا اور ہم داخل ہوئے۔

اللہ نواب میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قریب سے الماریوں میں چنی رکھی تھیں۔ غائب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی پچھلے شاعر کے ہاں کوئی ایسا مضمون بندھ گیا ہے جو میرے جہاں بھی پایا جاتا ہے، تو اس سے یہ خیال نہ کرو کہ مجھے اس سے توار ہو گیا ہے، بلکہ یقین جاؤ کہ اس نے نہایت خفاہ ازل سے میرے مضمون کی چوری کر لی تھی۔ کچھ ایسا ہی سال میرا اس وقت ہوتا ہے، جب میں کسی جگہ کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے، جیسے غلطی سے میرے حصے کی چیز یہاں آگئی ہے۔ اور یہاں تو ایک دو نہیں ہزاروں کتابیں ابھرے ابھر کر دے رہی تھیں۔

زفر قنابل مستدم ہر جا کہ می نگرم  
کہ شمع وامین دل می کشد کہ جا بیتجا است

نواب صاحب کا عجیب عالم تھا، وہ ایک کتاب منگواتے، مجھے دکھانے اور پھر اس کی خصوصیات کو آنا شروع کرتے۔ یہ ملک الشعراء طالع کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالع کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس طرف میری توجہ علامہ شبلی مرحوم نے دلائی تھی۔ میں نے جب یہ دیوان خریدیا ہے تو محض قدامت اور کتابت کی خوبی کے باعث۔ لیکن انھوں نے اسے دیکھ کر لکھا کہ اس میں بہت سی غریب غریب خوبیات کے لائق ہیں۔ دیکھتے یہ سرخ روشنائی کی تحریر طالع کی ہے۔ یہ مثنوی کا ایک ذریعہ نسخہ ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا اس سے قدیم تر نسخہ جو میری کے شہر بیونج (صحیح تلفظ بیونج ہے) کے کتاب خانے میں ہے۔ جو اس سے صرف چھ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ میرا نسخہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے کتاب خانہ میں رہا ہے۔ یہ وہی آن کی تھری۔ صاف پڑھا جاتا ہے۔ ”محمد اورنگ زیب بادشاہ“۔

یہ شیخ سحر کی برستاں ہے۔ اس پر او دھ کے نین بادشاہوں کی تھری ہیں۔ نصیر الدین جیدر۔ امیر علی شاہ اور واجد علی شاہ۔

چند دن پہلے ایک تازہ فزح آئی تھی۔ ملا سعد الدین نقشا زانی کی مطول جہنم سے کہہ کے آئے منگوا یا۔ اس کے شروع میں پانچ چھ سطریں اس شان سے لکھی تھیں کہ ”آسی عبارت بہت قدیم اور مشہور تھی اور باقی آدمی تازہ لکھ میں معلوم ہوا کہ یہ حصہ خود نواب صاحب نے لکھا تھا، پاس ہی میز پر یکبر شیشہ پڑا تھا۔ اٹھا یا اور اسے میرے ہاتھ میں دے کے فرمانے لگے۔ دیکھتے تو یہ عبارت پڑھ سکتے ہیں۔ میں دیکھ کر کہ پڑھنے لگا۔ آخر میں ”نور الدین بن اکبر شاہ غازی“ کے الفاظ تھے۔ مگر یہ خود جہانگیر کے لائق کی تحریر تھی۔ اور اسی نے انھوں نے مجھے اس کے پڑھنے کے لئے کہا تھا۔

تاریخ کا مزہ کا دیوان اس سے تھوڑے دن پہلے شائع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چند ایسے صفحوں کے  
نکس و نلے گئے ہیں، جن پر غل باو شاہوں کی تحریریں یا دستخط ہیں۔ میں اسے دیکھ کر ہلکا ہوا۔ مطول کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد  
میں نے کہا کہ جانتیگر کا سوا خط بالکل وہی ہے جو کامران کے دیوان میں ہے۔ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے۔ اور کہا تو آپ نے  
کامران کا دیوان دیکھا ہے۔ پھر اسے بھی منگوا یا اور ہم دونوں اُسے دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔  
غرض ہم دیر تک اس جنت نگاہ کے نظارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکلائے اُسے دکھاتے اور اُس کی خصوصیات  
کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے اس کی کسی طرح کی اہمیت واضح ہوتی تھی تو خوشی کا  
ظہا فرماتے۔ وہ مجھے کتابیں اس طرح دکھا رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بڑا ہنسنے والا صاحبِ علم و فن ہوں۔ وہ ہر طرف سے  
بے پرواہ ہو کر ہوں کتاب پر کتاب نکلا رہے تھے، گر یا آج پہلے مرتبہ انہیں کوئی کتابوں کا قدر دان ملا ہو، اور میں اپنی  
بے مالگی اور ان کی ذرہ نوازی پر عرق عرق ہوا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ میر درد علی گڑھی کا شعر ہے۔

یادانی زہربانی دانند ہرچہ دانند

ماخوب فی شناسیم اے درد آچہ ناہیم

اصل بات یہ ہے کہ وہ بفضلِ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اساسی اور بنیادی طور پر علمی آدمی تھے۔ ان کی ترویج اور  
ذوق کی تسکین اگر ہوتی تھی تو کتابوں سے یا صاحبِ علم اصحاب کی صحبت میں۔ جہاں کہیں انھیں یہ دونوں چیزیں میسر آجائیں  
ان کا یہ ذوق ہر وہ جو مہر حال عارضی چیز تھی، بڑھ جاتا اور وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہو جاتے۔ میرے ساتھ بھی یہی  
مسئلہ پیش آیا۔ میں جب ان سے ملا، تو وہ بے لفاظ ہو گئے، بیچارے یا غلط، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا، کہ میں بھی پڑھنے  
لکھنے کا شوق رکھتا ہوں اور کتابوں کا قدر دان۔ اس صورت میں عمر، مرتبہ، علم کا تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اہم  
چیز یہ تھی کہ میں بھی ان کے خیال میں علم کا شوقین اور کتابوں کا رسیا تھا۔ یہی چیز ہم دونوں میں گو یا قدر مشترک تھی۔ اس کے بعد  
بھی یہ کیسے ممکن تھا، کہ وہ ایک ہم مشرب و ہم خیال شخص کے سامنے اپنا اندر و خند نہ رکھ دیتے۔ اس میں کسی حد تک جذبہ  
تفاخر بھی شامل تھا۔ آپ نے بار بار دیکھا ہوگا، کہ آپ کا بچہ، جب تک اپنا نیا کھلونا اپنے ہم چولیوں کو نہ دکھائے، اُسے جین  
نہیں آتا۔ اس کی تہہ میں بھی یہی بات ہے، یعنی کسی ہم خیال کے ساتھ کھلونے سے لطف اندوز نہ ہونا اور اپنی ملکیت کا غرور اور اس  
کی فائز کی خواہش۔

نواب صدر یار جنگ نے عمر بھر کی محنت سے یہ کتاب جمع کیا، قیمتی سے یہ ایسی جگہ تھا، کہ وہ ان تک پہنچا انسان نہیں تھا۔  
اس لئے بسا اوقات واقعی صاحبِ ذوق حضرات بھی وہاں جانے سے ہچکچاتے تھے۔ لیکن اگر کسی طرح نواب صاحب کو معلوم ہو جاتا  
تو وہ دھڑکتے دھڑکتے کہ انھیں بلاتے۔ اپنا مہمان رکھنے اور جب واقعی کوئی قدر دان مل جاتا، تو پھر اسے نہ سکتے۔

عربی کے مشہور شاعر منشی نے ایک شعر میں اپنی دو دل پسند چیزوں کا ذکر یوں کیا ہے۔

وخیر مقام فی الدنی سرچ ساج

وخیر جلیس فی الزمان کتاب



یعنی دنیا میں بہترین قسمت برحق دنیا رکھوٹے کی تری ہے اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے۔  
یہی دوسرا صریح کتب خانے کا طرز ہے۔ بڑی ایک تنگ فہم قمر میں یہ کن رہا تھا اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی اس پر یہ پھر نکائی جاتی تھی۔

آخر ہم اندر سے کل کر باہر کے برآمدے میں آئے میٹھے گئے۔ یہاں دیوار پر مختلف تصویریں نقشے، مرنے وغیرہ لگ  
رہے تھے۔ ہندوستان کا ایک پرانا اور دل کش قلمی نسخہ تھا جس میں ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی زرعی پیداوار اور حیوانات  
بھی تصاویر میں دکھائے گئے ہیں۔ ہمارا جو سرکش پرشاد و مرحوم کو آخری زمانے میں مسوری کا بھی شوق ہو رہا تھا۔ یہاں آں کی  
ہست کار میں کے بڑے چھوٹے دیکھے۔ تصویریں فی میل سے تو داہی ہی اسی تھیں۔ البتہ تبرکات و تصویفیں۔ شروع میں مال کے جس خط  
کا ذکر کر آیا ہوں وہ بھی موجود تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ تحریر سنہ ۱۰۸۵ھ لکھی ہے جو بدھ مت غلط ہے۔ دیر تک اس پر بحث  
ہوئی کہ چھک تار کیج کیا ہے۔ بہر حال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ اور میری جیسے سکتا تھا محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ ثبوت کیسے مہیا  
کیا جاسکتا تھا؟ ذکر غالب کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا عکس دیا ہے وہ میں نے یہیں سے لی تھی۔

اتنے میں غمراہ وقت ہو چلا تھا۔ فرمایا، اگر کھانے کے بعد ملا سچے کے لئے کوئی کتاب لینی چاہیں تو کھلو ایچھے، میں نے  
تو اب کش کی کمر بید چیں، "عام طور پر نسخہ دلائیے تاکہ جو نقل آپ نے مجھوائی ہے اس سے مقابلہ کر سکوں۔ نیز مومن کا فارسی دیوان  
آنا ہیں آئیں اور ہم باہر چلے آئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔

"سید چیں" کی پہلی شاعری والی اشاعت میں کثرت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، اور اس کے آخر میں غلط نام لگوا  
گیا تھا۔ سوہ القمان سے جذبات گنج والے نسخے سے یہ غلط نام ثابت تھا۔ اس لئے میں پوری تصحیح کر سکا۔ آخر میں سے یہ کام  
لاڑوگ لاہوری روٹی کے نسخے کو دیکھ کر کیا تھا۔ اس کے باوجود میرے شان کردہ ایڈیشن میں بعض غلطیاں رہ گئیں جن کا  
مجھے افسوس ہے۔

غورانی ویر بعد ملا احمد مجھے کھانے کے لئے بلانے آئے۔ دوسرے خزانہ کاڑی کا ایک نیچا ساخت تھا۔ اس پر سفید  
چادر تھی۔ تخت کے چاروں طرف گدے تھے۔ ہم لوگ ان پر آتے پالتی مار کے بیٹھے گئے۔ نواب صاحب نے غورانی ویر خزانہ کے ایک  
مرے پرستے۔ ان کے سیدھے ہاتھ پر ان کے خلف اکبر خان بہادر محمد عبید الرحمن خاں صاحب تھے۔ اور ان کے بعد ملا احمد میں  
نواب صاحب کے بائیں طرف تھا۔ میرے برابر میں ایک اور صاحب بیٹھے تھے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا بس یہیں بائیں کھانے  
پرستے۔

کھانے میں تو مرہ پاؤ تھا۔ مرغ کا سان تھا، شامی کباب تھے، ترکاری تھی۔ ملازم نے نواب صاحب کے سامنے ایک  
رکابی میں کوئی خاص چیز لائے رکھی۔ یاد نہیں رہا کہ کیا تھا۔ انھوں نے اس میں سے ایک اور رکابی میں ٹھوسا سانکالی کے مجھے  
عایت فرمایا۔ کھانے کے دوران میں بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد کچھ مٹھائی آئی جناب خان بہادر نے یہ کمر کے  
مجھے بیٹی کی کہ شوق فرمایا۔ بازار سے نہیں آئی، بلکہ خانہ ساز ہے۔

کھانے کے بعد نواب صاحب آرام کے لئے اندر تشریف لے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور مومن کا دیوان

لکھنا۔ ۱۔

چاندی کے ٹک جگ میں پھر بڑے مکے کی طرف گیا۔ نواب صاحب تلاوت سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے لئے رہے تھے۔ پھر بڑے پھاٹک کے باہر جہاں جماعت ہوتی تھی۔ آن کی واپسی پر ہم رات کے کھانے تک بیٹھے باہر گئے۔ رات دو سبائے میں ایک مرتبہ وہ غربت کی نماز کے لئے اٹھ گئے۔ لیکن نماز کے بعد سب سے وہیں واپس آئے جید راہاد کے زمانہ قیام اور انگریز ریڈیٹر سے اپنی جینٹلمن کے حالات سناتے رہے۔ ہمارا جبر سرکش پر شاوشنا و مرحوم کی وصعداری کا ایک قصہ قابل ذکر ہے۔ فرمایا، مجھے پان کی عادت ہے، لیکن تبا کو نہیں کھاتا۔ میں جب پہلی مرتبہ ہمارا جبر ہاد کے ہاں گیا تو وہ خاصہ دان میں پان رکھ کے لائے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پان لے لیا۔ واپس جا کے اب دوسری مرتبہ وہ زردہ کے آگئے۔ میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور غدر کیا کہ میں تبا کو نہیں کھاتا۔ میں جید راہاد میں بارہ برس رہا اور ہمارا ہمارے اکثر ملاقات بھی ہوتی تھی۔ جب ملٹی میں آن کے ہاں جانا۔ وہ پہلے پان کی گھوری لاتے جو میں نے لیتا۔ پھر تبا کو لاتے ہیں شکریہ کے ساتھ غدر کر دیتا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ میں تبا کو نہیں کھاتا۔ لیکن بھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے مجھے تبا کو پیش نہ کیا ہو۔

اس پہلی ملاقات کے موقع پر اپنے میری نوٹ باب میں مندرجہ ذیل عبارت رقم فرمائی۔

براہ دوستیما ہر کہ بے منت قدم ساید  
بہر گامیکہ بر زار و، از و پائے، ز من چشتے

کتبہ حبیب الرحمن

بغرائش مالک نام صاحب بوقت ورود ایشان در حبیب گنج، ایشوال المکرّم ۱۳۵۶ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء۔

انگلے دن میں واپس دہلی چلا آیا۔ چلتے وقت آپ نے اپنی تصنیفات کا مجموعہ میرے ساتھ گاڑی میں رکھوا دیا۔ یہاں آنے کے بعد ڈسے دن بعد میں نے پہلے "سبد چمن" اور پھر "ذکر غالب" شائع کیے۔ دونوں کے نسخے میں نے آن کی خدمت میں بھیجے جو صلہ انفرادی فرماتے ہوئے بہت تعریف کی۔

(۲)

اتفاق سے میں ۱۹۳۹ء میں ملک سے باہر چلا گیا۔ جنگ کا سارا زمانہ باہر ہی رہا، اور ۱۹۴۶ء کے آخر میں واپس وطن آیا۔ اس قیام دوران میں خط و کتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا۔ میں جب لوٹ کے آنے والا تھا، تو انھوں نے لکھا کہ جب واپس آؤ تو حبیب گنج ضرور آنا۔ چنانچہ میں تعمیل حکم میں فروری ۱۹۴۷ء میں ملی گڑھ گیا۔ میں نے جاتے سے ایک دن پہلے تار سے انھیں اپنے آنے کی اطلاع دی۔ میں صبح کی گاڑی سے گیا تھا۔ کوٹلی پر پہنچا تو اب کے پھر جناب عبدالحیدر خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے پہچانا نہیں جو اتنے دن کے وقفے کے بعد پھر ایسا غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ بہر حال ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب تبا حبیب گنج میں ہیں۔ میں فوراً وادوں جانے والی لاریوں کے اوٹے پر پہنچا۔ اب رستے کا سال کیا بیان کروں، یوں معلوم ہوا تھا، جیسے

پچھلے دس برس میں سرک کی مرمت تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اب اسے سرک کہنا ہی غلط تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دونوں طرف کھیت تھیں اور ان کے بیچ میں ایک خاص چوڑی روڑ تھی جس پر بہت بار ایک مٹی کی چھرا کی تہہ جمادی گئی تھی۔ موٹر کے پیچھے پیچھے گرے وہ غبار کا ایک طوفان چھایا ہوا تھا۔ اور اگر بدقسمتی سے کہیں سب سے بھی کوئی لاری یا موٹر آنکھ کی تھوپی پر خود ہی تصور کر لیجئے کہ مسافروں پر کیا گزر جاتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ میل کا ٹکڑا اسے پاتا ٹکڑے پر مل کر ناخفا۔ یہاں میں اڈے پر آتا اور ایک ٹانگے پر بستر رکھ کر لگے روانہ ہوا۔ لیکن یہ راستہ بھی اتنا خراب تھا کہ ہچکروں کے ماتھے میری طبیعت خراب ہونے لگی، لاچار دو تین فرلانگ کے بعد میں آنز کھڑا ہوا باقی مسافت میں نے پیدل لپری کی، اور سامان ٹانگے پر آیا۔

میں ڈھائی تین بجے کے قریب حبیب گنج پہنچا۔ نواب صاحب مرحوم باہر کے مغربی بلاد سے میں فریض پر بیٹھے حسبِ معمول تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ میں ملا احمد صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب تلاوتِ فارغ ہوئے تو میں نے جھک کے سلام عرض کیا۔ چونکہ اب اونچا سنسنے لگے تھے اس لئے سنا نہیں۔ ملا احمد صاحب نے کہا کہ ذرا اونچا کیجئے۔ چنانچہ میں نے منہ کان کے قریب جھک کر خاصی اونچی آواز سے وہ بارہ کہا آداب عرض کرنا ہوں۔ چند لمبے تک غور سے دیکھا، میں نے بھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ اللہ کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یک عنت پہچان کے سرور قد کھڑے ہو گئے اور لیٹا لیا۔ اللہ اکبر اس معانی کی گرم جوشی سے اب تک لذت اندوز ہو رہا ہوں معلوم ہوا کہ میرا تاراج نہیں ہو رہا۔ ہوا یہ کہ چونکہ تاراج میں نے علی گڑھ کے پتے سے بھیجا تھا۔ وہاں سے جناب عبدالعزیز خاں صاحب نے آگے کو سنی روانہ کر دیا۔ چنانچہ میرے پیچھے کے آدھ ہون گھنٹہ بعد ایک شخص ڈاک لے کے آیا ماسی میں تاراج تھا۔

نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا، وہ باقی کا ڈوا، صابون، ڈولیا وغیرہ لے آیا۔ جس نے ہاتھ منہ دھویا۔ اتنی دیر وہ میرے پاس کھڑے رہے۔ پھر چائے آئی۔ سب نے پی۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد عصر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے منہ دیا۔ مغرب کے بعد آپ کی پچھلی سات برس کی رام کہانی سنوں گا، کہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا بسرِ چشمِ شام کے کھانے کے بعد ہم لوگ بڑے کمرے میں آگئے۔ نواب صاحب اور ملا احمد اور میں۔ اگرچہ میں نے اس چھ سات برس میں شرق اور وسط و افق کے تمام اسلامی ممالک کی سیر کی تھی، لیکن زیادہ قیام مصر میں رہا تھا کہنے لگے، دیکھئے صاحب از رو میں گفتگو نہیں ہوگی آپ اتنے دن مصر میں رہے ہیں یقیناً عربی بہت اچھی بولتے ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ یوں کہنے کے تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے۔ لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص یہاں آئے جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو تو اگر وہ یہاں علم لوگوں سے بات چیت کرے، تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ وہ ان کی سمجھنے اور انہیں سمجھانے میں بہت دقت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام بول چال کی بولی و کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے اس حوامی زبان رواں چہ اس کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرائمر الگ ہے۔ اس کی لغات الگ ہے۔ اس کا لہجہ و لہجہ الگ ہے۔ غیر ملکی عاملوں کو تو چھوڑ دیجئے کہ ان عربوں نے سوائے کتابی عربی پڑھنے کے کسی کو کم بولتے سنا ہو گا جو عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری ایک عراقی کی بات سمجھنے میں مشکل محسوس کرتا ہے، حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آگیا۔ میرے ایک مصری دوست

ہیں۔ وہ کسی زمانے میں مارسیلز (فرانس) میں مصری قنصل تھے۔ مراکش کا علاقہ، فرانسیسی سلطنت کا حصہ ہے۔ ایک دن پھر مراکشی باشندے کسی کام سے آنے کے وقت نہیں آئے۔ اب خیال رہے کہ مصر اور مراکش دونوں مغربی کی زبان عربی ہے، فرہم نہ گئے۔ قنصل نے دیکھا، جو عربی آنے کی گفتگو کا ایک لفظ سمجھا ہوں، آخر ایک ترجمان بلا نا پڑا۔ جو عربی کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا، اور اس طرح سنانے لگا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں وہی الفاظ ہیں۔ یعنی دوسری زبانوں کے لفظ عربی ہیں ایسے دس دس گئے ہیں کہ لوگ انہیں بے تکلف بولتے ہیں، اور قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ انہیں یہ معلوم ہی ہے کہ یہ عربی کا نہیں کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تونس میں فرانسیسی اور ہسپانوی کے لفظ راہ پا گئے ہیں۔ مصر میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں فارسی اور ترکی۔ اور یہی حال دوسری جگہوں کا ہے۔ اگر اس پیر وئی آلائش سے کچھ غور کریں تو یہی ہے، ترجمان کی زبان، اگرچہ یہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ پھر یہ خرابی عوام میں تک محدود نہیں بلکہ تعظیم یافتہ اور عالم لوگ بھی جب آپس میں بات چیت کر رہے ہوں تو اسی وارج زبان میں۔ یوں کہنے کو ٹھیک لگتا ہے، کیونکہ کثرت زبان نہیں بدلی، لیکن بولنے کے یہی عام بولی۔

اسی صورت حال کو مد نظر رکھ کر کہ میں نے عربی کیلئے عربی میں بات چیت کرنے میں کوئی قدر نہیں دیکھیں بے اختیارانہ ہماری زبان پر وارج کلمات آجائیں گے جو اول تو آپ سمجھیں گے نہیں اور اگر سمجھ بھی گئے تو عربی کا ہے کہ، یہ اچھا خاصہ مذاق بن جائے گا۔ فرہم نہ گئے، پروا نہ لیجئے۔ چنانچہ ہم پہلے پندرہ میں مرث نگ عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے کوشش کی کہ حتیٰ الوسع ہماری زبان بخوبی اور صحیح ہو لیکن پھر بھی مشق نہ ہرنے کے سبب کہیں کہیں وارج لفظ آ گئے۔ موضوع سخن اسلامی ممالک کے حالات تھا۔ وہاں کے لوگوں کے دینی اور معاشری مسائل سے متعلق پوچھتے رہے جب میں نے بتایا کہ عوام بہت غریب ہیں اور دولت کی تقسیم بہت غلط طریقہ پر ہوئی ہے۔ ملک کا تمام سرمایہ چند خاندانوں میں جمع ہو کر رہ گیا ہے۔ زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کا حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں۔ مغربی سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی بلکہ خلاف اسلام تمدن و معاشرت ہر جگہ عام تو بہت افسوس کہتے رہے۔

اس کے بعد اردو زبان و ادب کا سلسلہ چلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خطوط قبہ خانے میں آن کے نام لکھے تھے، ان کا مجموعہ ”غبارِ خیال“ کے نام سے چند ماہ پیشتر شائع ہوا تھا۔ میرے پہنچنے سے غور سے دن پہلے ایک اور غرض کتاب ان کے ایک عزیز نے مرث کر کے کاروانِ خیال، کے عنوان سے چھاپی تھی۔ اس میں مولانا آزاد کے علاوہ ان کے اپنے خطوط بھی ہیں۔ ”غبارِ خاطر“ کا ایک بہت خوب صورت ایڈیشن لاہور سے نکلا تھا۔ اس کے آخر میں ایک خط بھی زیادہ ہے جس میں اسلامی ترقی سے متعلق بحث ہے۔ کاروانِ خیال، کے ساتھ اس خاص ایڈیشن کا ایک نسخہ میر پر پڑا تھا۔ وہ دونوں کتابوں کو اٹھایا اور ان پر دستخط کر کے مجھے عنایت فرمائیں۔ پھر مولانا آزاد کی تحریر و تقریر اور حافظہ اور ہمہ گیر شخصیت کی تعریف کرتے رہے۔ مجھے خیال تھا کہ ان کی زندگی کے کچھ حالات پوچھوں۔ چنانچہ میں نے ان کے خاندان، تعلیم اور حیدر آباد کی ملازمت سے متعلق کچھ سوال کئے۔ جواب دیتے رہے۔ پھر فرمایا، میرے ایک عزیز نے پچھلے دنوں علی گڑھ کے ریلوے صنعت میں میرے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں در آئی ہیں۔ بہر حال اس پر ایک نظر ڈال کے آپ کو سمجھ دینگا۔ چنانچہ حسب وعدہ پر پھر انہوں نے مجھے بھیجا تھا۔ اس میں بعض اصلاحیں خود ان کے قلم سے ہیں۔ بعض کسی اور کے۔

اکلی جمع ہو ناستے کے بعد کتب خانے میں پہنچے۔ میرے پاس دیوان غالب کا ایک نسخہ ہے جس کا پہلا اور آخری ورق فائب ہیں۔ اس نے مجھ پر معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کہاں سے اور کب شائع ہوا۔ قرآن سے البتہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میرزا کی زندگی میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں نیز رشتاں کی لکھی ہوئی تقریر ہے جس نے غلط فہم نکالا کہ یہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا۔ چنانچہ میں نے اسی طرح ”ذکر غالب“ کے پہلے ایڈیشن میں لکھ دیا۔ بعد میں اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ اب یہ بات زحمت ہو گئی کہ ۱۲۷۵ھ میں اردو دیوان کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایک نئی انجمن پیدا ہوئی کہ آخر میرے پاس نسخہ ہے یہ کہاں اور کس سال میں چھپا۔ میں احتیاطاً اسے اپنے ساتھ لیتا گیا تھا کہ اگر کتب خانہ حبیب گنج میں بھی اسی ایڈیشن کا کا اور نسخہ ہو تو منسلک سے بچتے حل ہو جائے۔ خوش قسمتی سے یہاں ایک مکمل نسخہ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مطبع احمدی شہرہ دہلی والا ۱۲۸۱ھ کا نسخہ ہے۔ اس میں بہت غلطیاں رہ گئی تھیں بعض شعر چھپنے سے رہ گئے، بعض دوبارہ چھپ گئے اور بہت کی غلطیوں کا تذکرہ ہی کیا۔ اسی لئے میرزا نے فوراً مطبع نظامی کانیپور میں نیا ایڈیشن چھاپنے کی اجازت سے دی تھی۔ ہمیں کتب خانہ میں آگے بیٹھے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ فرمایا، ایسے آپ سے متعلق ایک شعر ہو گیا ہے۔

اے مالک ملک و نائے باراں

دل رام تو مشہدِ نداشتِ صد جاں

میں اٹھ کے آداب بجالایا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے عرض کیا کہ اپنی کوئی تصویر ہو تو مرحمت فرمائیے۔ ورنہ تصویروں کے ذخیرے میں سے تلاش کرنے سے میری پرانی چیزیں بھٹیں۔ اور ان میں سے بھی کوئی اکیلی تصویر نہ نکلی۔ چونکہ میرا شام کو ایسی کاراواہ تھا۔ فرمانے لگے چلتے میں آگے ساتھ علی گڑھ تک چلتا ہوں، وہیں اکیٹھے نصیر اترواؤں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے زحمت کچھ بھی نہیں۔ میں کل نو جانے ہی والا تھا، آج چلا جاؤں گا۔ بول علی گڑھ تک اور ساتھ بھی رہے گا۔ غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھے کل کسی کام سے الہ آباد جانا ہے۔ لیکن ہمیں حبیب گنج سے روانہ ہونے ہونے دیر ہو گئی۔ جاڑوں کے دن، پانچ بجے ہی خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک ہم علی گڑھ پہنچے، روشنی اتنی کم ہو چکی تھی کہ نصیر اتروانے کا وقت نہیں باقی کہنے لگے کوئی بات نہیں، پھر کسی وقت اتروا کر بھیج دوں گا۔ اگرچہ یہ افسوس ضرور رہے گا کہ آپ اس میں نہیں ہوں گے۔ راستے میں گر و غبار کے طوفان کو دیکھ کے میں نے عرض کیا کہ اس دل بادل کو دیکھ کے فردوسی کے شعر کی حقیقت واضح ہو گئی۔

زمن گر و میداں کہ بر مشہد بہر دشت

زمین شمش شد و آسمان گشت ہشت

بہت مسرور ہوئے۔ پھر خود حافظہ پر زور دے کر شاہنشاہ کے اسی مقام کے اٹھ دس شعر سنائے ہیں ان کی یاد پر دنگ رہ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ کے پیٹے میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شاہنشاہ انھوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا کوئی ایک آدھ شعر کسی جگہ سے حسب موقع پڑھ دینا کوئی کمال نہیں۔ یہ بات ہر کوئی کہہ سکتا ہے۔ لیکن یوں اچانک ایک

وہ آئے بھیجے کے شعرا وینا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے تو عموماً خاموش رہتے یا کوئی اور ذکر چھیڑ دیتے۔ اس سفر میں بھی ایک اسی طرح کا تجربہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی کی سوانح عمری ”حیات شبلی“ کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی، اس کا پورا مسودہ نواب صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، اور انھوں نے اس پر جاننا اٹھانے کے بجائے کتاب کے ساتھ چپ کئے ہیں۔ اسی زمانے میں یاروں کے مشغلہ ہاتھ آیا اور انھوں نے مختلف رسالوں میں شبلی اور عطیہ بیگم کے موضوع پر سرائے کی ایک نادر باندھ دیا۔ بلکہ یاد پڑتا ہے کہ غالباً جہد راء اور پڑیو سے ایک تقریر بھی اس موضوع پر نشر ہوئی تھی جس میں وہ صاحب نے کے شعر چھپے تھے میرا ذہن ”شعر العجم کی طرف منتقل ہو گیا جس کے پچھلے حصے میں مولانا شبلی نے ان کی سوجھی میں شاہناہ پر سیر حاصل فرموا کر لیا ہے۔ شعر العجم اور شبلی سے مجھے شبلی اور عطیہ بیگم کا قصہ یاد آ گیا۔ اب مجھے عزت اور یحییٰ کی سوجھی جن اصحاب نے ”حیات شبلی“ پڑھی ہے، انہیں معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اس سے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا۔ حالانکہ یہ ایسی بات نہیں جسے بول فطرت انداز کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے تو اس کا بڑا اعتراف کر لینا چاہیے تھا۔ کہہ نہ کہ اس سے مولانا شبلی کی عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی، اور اگر یہ غلط ہے تو پھر اس کی مدافعت کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر آج یہ مسئلہ صاف نہ ہوا تو پھر قیامت تک نہیں ہوگا۔ اس وقت مولانا شبلی کے نانا اور احباب اور دوست یافتہ اصحاب ہمارے درمیان موجود ہیں، جو اس موضوع پر ذمہ دارانہ اور واقف کارانہ انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے زہر حال انھیں کے خوشہ چیں ہوں گے۔

ان ہی رعایتوں کے خیالی سے میں نے آج سے سوال کیا کہ کیا آپ نے ”حیات شبلی“ میں کوئی فرد گذشت محسوس نہیں کی۔ اچھا، کہوں آپ کا استاد کس طرف ہے میں نے کہا یہی عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں میں کر کے دیا ہے۔ اس سے معلوم ہونا تھا کہ وہ اس سے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ اور میں محض خطائے بزرگان گرفتار خطاست پر مل گیا۔ یہ کوئی تباہی نہیں تھا۔ عزت و نمانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے پھر کہا۔ مکاتیب شبلی میں آپ نے مولانا کے خط ہمدی انلوی کے نام نو صو در پڑھے ہوں گے، جو اب اثبات میں دیا۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے ہمدی آنادی کے خط کا مجموعہ بھی دیکھا ہے۔ فرمایا ہاں، ایک زمانہ ہوا دیکھا تھا۔ میں نے کہا آپ نے خطوط شبلی بھی ضرور دیکھی ہوں گی، جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے عطیہ بیگم اور ان کی بہن کے نام لکھے تھے، فرمایا ہاں، یہ بھی بہت مدت ہوئی دیکھے تھے۔ اب میں نے اتنی تہیدوں کے بعد سوال کیا کہ ہمدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا مجھ سے پرہیز نہیں تھا۔ آخر یہ اس بات کی تہذیب و ادب تھی۔ کہنے لگے، مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ اب شک و شبہ کا مجموعہ بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا اچھا، ہمدی۔ لیکن آپ اصحاب کی یہ کانٹا خوشی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کہیں کوئی بات نہیں کرنے۔ کہنے لگے ”فائدہ“ فائدہ یہ کہ اس سے قود و قود دھار و بانی کا پانی ہو جائے گا۔ کل کے موثر نمکے لئے روشنی جیتا ہو جائے گی، اور اس کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی“ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں نے

گستاخانہ جہازات سے کام لیتے ہوئے ایک اور حریستہ مال کیا۔ میں نے کہا قرآن کہتا ہے "لَا تَسْتَعْمِدُوا الشَّهَادَةَ" کسی سلسلے میں اگر تعین کچھ بات معلوم ہو تو اس کے اظہار سے دریغ نہ کرو اور اسے مت چھپاؤ، اور آپ حضرات میں کہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں۔ اور پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے۔ لیکن صاحب یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ جس کے مال گئے۔ اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔

میں شام کی گاڑی سے واپس دہلی چلا آیا۔ اس موقع پر اپنے میری نوٹ بک میں تحریر فرمایا تھا۔

اے آمدنت باعث آبادی ما

ذکر تو بود زمزمہ شادنی ما

بفرمائش مالک رام صاحب بوقت درود مکہ مقام حبیب گنج

فی البدایہ

اے مالک مالک و فائے یاراں

دلِ رام تو شد فدائت صد جاں

حبیب الرحمن صدر یا جنگ

حبیب گنج، ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء

یہ میری آن سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے جلد بعد ہی میں دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے خط و کتابت برابر جاری رہی۔ لیکن پھر بہت بے قاعدگی پیدا ہو گئی۔ بلکہ آخری سال میں تو بالکل بند ہو گئی تھی۔ لکھا کہ اب کچھ لکھتا ہوں تو انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی بار خاطر ہونا پسند نہ کیا۔ جناب عبدالوجید خاں صاحب سے ان کی خبر براہِ مہربانی رہتی تھی۔ آخر ایک دن ان کا خط ملا کہ وہ ۱۱ اگست ۱۹۵۶ء کو جمعہ کے دن جس کے ساتھ ساتھ بچے اپنے خانی حلیہ سے چلے آنا اللہ وان الیہ راجعون۔

(۳)

موت بنی آدم کی میراث ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ وہ طبعی عمر گزار کر دیاں گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر ۸۶ برس تھی۔ یعنی کتاب مقدس کی مقرر کردہ حد سے بھی ۴۴ برس زیادہ۔ تو اس پہلو سے کوئی افسوس نہیں۔ یہ مرحلہ طوائفِ ملی نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا۔ وہ رئیس بن رئیس تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی عمر رئیسوں کی لغویات میں نہ گزاری تھی۔ علم کو اس طرح حاصل کیا جس طرح اس کا حق ہے۔ پھر ملک کے علم و عمل کا شاہد رہی کوئی ایسا گوشہ ہو گا جو ان کی مادی یا معنوی اعانت سے شاد کام اور فیض یاب نہ ہو۔ یہ بھی قابلِ فخر بات ہے۔ لیکن افسوس ہے تو اس بات کہ اب ان سا انسان نہیں ملنے کا۔ جس دور کی وہ پیداوار تھے وہ دور ہی ختم ہو گیا۔ اب ان کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہونے۔ ایک آدمی اور صورت جو اس دور کی یادگار باقی ہے، وہ بھی جھلملاتی مٹھ ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گل، اس کے

بعد گھپ اذہیرا۔

ذمہ لے نے اپنا وزن اٹا دیا ہے۔ آج محبت اور خلوص، دوستی اور وفا، اخلاق اور فداکاری، علم اور فن، دین اور دنیا، عرض ہر چیز کا معنوم ہی بدل گیا ہے۔ مرحوم اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ پچھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ جسے ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو صنادیدی سے بہتر علم نہ ملے۔ صنادیدی، ایک قانون، ایک عناطے کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس طرح کسی شخص سے آج ملے ہیں، اسی طرح آج سے پچاس برس بعد بھی ملیں گے۔ زندگی کا جو اصول آپ نے بنا لیا ہے، اب کوئی طاقت آپ کو اس سے اوھر ڈھرنہ نہیں کر سکتی۔ آپ کی دوستی بھی کسی اصول پر مبنی ہوگی، اور مخالفت بھی۔ یہ نہیں کہ جبر کی ہوا ہوئی اسی طرف پھر گئے۔ اسے ہم وفاداری بشرط استراوی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ مرحوم اسی اصول کی حللی چیرتی تصویر تھے۔ اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئے گی۔ سمیر کا ایک شعر یاد آگیا۔ اسی پرچہ کرتا ہوں سے

باقی ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سببے لگا  
جب کہتے کسی کی سندے کا تو دیر تک سرد حنیے کا



# ابوالکلام آزاد

## علامہ رسول مہر

نوافل و سنت زادانہ بریشم عمرو

غزل بہ زمزمہ خواہم کہ پروہ ہا پست اند

۱۹۱۱ء کے موسم گرما کا آغاز تھا۔ میں ایف اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ چند دوست و منتظم کے لئے ایک فارم میرے پاس لائے اور بولے کہ ”حزب اللہ“ کے ممبر بن جاؤ۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا تھا، لیکن دوستوں پر اعتماد تھا اس لئے تذبذب کے بغیر دستخط کر دیئے۔ دیکھا کہ جیوٹا سا فارم ہے۔ اس پر نائپ میں تین چار سطریں چھپی ہوئی ہیں۔ اوپر علی حروف میں ”من انصارى الى الله“ مرقوم ہے۔ اس کے نیچے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور اس کے ساتھ اردو ترجمہ۔ پایا بن تحریر نام پیشے، عمر اور پتنے کی جگہ خالی چھپاؤ رکھی ہے۔ چند روز بعد میں اس فارم کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ ایف اے کا امتحان دے کر گھر جانے لگا تو دوستوں سے پوچھا کہ بھئی! کرنی دیکھتے تھے تیار ہو، جس سے نتیجہ امتحان کے انتظار کا وقت بخوبی گزر سکے۔ انھوں نے کہا کہ اخبار جاری کراؤ۔ اور ساتھ ہی دو اخباروں کے نام تجویز کرتے۔ ایک روزانہ ”زمیندار“ دوسرا ہفتہ وار ”اللال“۔ ”اللال“ کا چندہ اس زمانے میں آٹھ روپے سالانہ تھا اور اعلان ہر چکا تھا کہ جو لوگ ایک معین مدت میں خریداری کی دستاویز کر دیں گے ان کے چندے میں سے ساڑھے سات روپے ہلال احرار کو دیئے جائیں گے۔ میں نے ہم خرما و ہم ثواب کے پیش نظر فوراً درخواست بھیجی۔ لیکن نہ اس وقت تک ”اللال“ کی شکل دیکھی تھی نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کس قسم کا پرچہ ہے صرف اتنا جانتا تھا کہ ”حزب اللہ“ کا فارم ”اللال“ ہی کے دفتر سے آیا تھا۔

میں کچھ پہنچا تو چند روز بعد ”اللال“ کا وی۔ پی آگیا۔ پرچہ کھولا تو پورا نائپ میں چھپا ہوا تھا اور نائپ کے پڑھنے کا میں مادی نہ تھا۔ تکلف سے عبارت پڑھنی چاہی تو وہ عربی الفاظ و تراکیب سے بھرپور تھی اور جا بجا آیات و درج تھیں۔ کچھ وقت صرف کرنے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ممکن ہے ”ہلالی احرار“ میں چندہ دینے کا ”ثواب“ میرے نام نہ سماں میں اکٹھا جائے۔ لیکن ”خرما“ کی امید تو نقش بر آب ثابت ہوئی۔ پرچہ ویسے ہی رکھ دیا اور اس کے کسی حصے سے استفادہ کا سوال باقی نہ رہا۔ آٹھویں دن پرچہ آتا تھا۔ میں اسے کھولتا اور پڑھتا تھا۔ چٹا سا لٹراں پرچہ آیا تو اس میں ”حزب اللہ“ کے افراسی و مناصد کا ذکر تھا۔ میں چونکہ اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا اس لئے طبیعت پر جبر کہ کہ مضمون پڑھا کہ جس جماعت

ہے۔ اور ہر ماہ میں اس کے مقاصد سے آگاہی لازم ہے۔ فارغ ہواؤں پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ پھر تمام بچوں کو اس کے عجیب و غریب واقعات اور اس امر پر برابر افسوس کرتا رہا کہ پہلے وہی اس کا یا قاعدہ مطالعہ کیوں نہ شروع کر دیا۔

بے غم شہر تھوڑے جیت از عمر ہے کہ گزشت

پیش از بی کاشش گرفتار غمت می بودم  
 بن کاوی می رہنا تھا، جہاں ہفتے میں مہینہ مزیدہ ڈاک آتی تھی۔ الملائ کی آمد کے دن ڈاکے کی پیشوائی کے جوش  
 شہباز میں میل ڈیڑھ ڈیڑھ میل باہر نکل جاتا۔ جہاں دو ملتا وہیں سے پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا اور جو دوست یا  
 عزیز ہوتے تھے اُن سب کو ایک ایک مضمون سناتا۔ الملائ سے عشق و شفیقگی کی ابتدا تھی، اسی وقت سے مولانا ابوالکلام  
 آزاد نے ان کی عقیدت کا رشتہ استوار کیا۔ چالیس سال کی مدت میں کادوانِ حیات نے دلبستگی و انقطاع کی سیکڑوں منزلیں طے  
 کیں۔ لیکن یہ رشتہ استوار ہے استوار تر ہوتا رہا اور آج بھی جبکہ آخری منزل بہت قریب نظر آتی ہے، اس تعلق کو زندگی کی  
 ایک عزیز ترین قمار سمجھتا ہوں۔

اسی زمانے میں مولانا سے خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور میری درخواست پر انھوں نے اپنی ایک دستخطی تصویر بھیجی تھی۔ اگرچہ اس واقعے کو ایک عمر گزر چکی ہے، لیکن آج بھی تصویر پانے کی لذت اسی طرح محسوس کرتا ہوں، گو یا یہیمت اسی حاصل ہوئی ہے۔ مولانا سے ملاقات ۱۹۱۴ء میں ہوئی جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ راولپنڈی کا فرنس سے مراجعت پر واپس لوٹ رہے تھے۔ میں چند احباب کی معیت میں زیارت کے لئے گیا اور انہیں دیکھا تو اپنے ذہن میں جو تصویر قائم کر رکھا تھا اس سے وہ بالکل مختلف نکلے۔ میانہ قامت، جسم نہایت ویلا پیلا، رنگ سرخ و سفید، داڑھی موٹھو صاف، کبیل لودھی سے لپٹے تھے۔ صرف چند منٹ سرسری باتیں ہوئیں۔ میرا تعارف ہوا تو فرمایا کہ آج شام کے چار بجے طویل قرعہ وقت برپا ہو گا تو ان کے علم فیصل کا رعب دل پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ جذباتی عقیدت کو دل ہی دل میں موزوں الفاظ کا لباس پہنانے کے لئے ہر کوشش ناکام رہی، گو یا یہ نقشہ پیش تھا۔

آزادۂ زمین حال شب وصل چہ پرسی

نے دل خیرم داشت نہ از دل خیرم بود

موندانے پر حجامہ کہ بنی اسے پاس کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟ میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ اخبار جاری کر دوں گا، تاکہ ملک و ملت کی فہم خدمت بجا لاؤں۔ فرمایا: "مغفلہ اچھا ہے، لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ اس طرح منزلی مقصود کے قریب پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟ فرض کرو کہ اندائے کاری میں آرزو کے مطابق سامان میرا آجائے میں تو اخبار کے استغلال اور اس کی اور کچھ پڑائی کے لئے کم و بیش دو سال کا انتظار ضروری ہوگا۔ پھر دو سال اس پڑائی کے نتائج کا انتظار کرنا پڑے گا گو یا جس قریب خدمت سے کام لینے کا ارادہ کئے بیٹھے ہو، اس کے نتائج دیکھنے کے لئے کم از کم چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک حالات کی رفتار ایسی ہے کہ اس مدت کے ایک حصے کا بھی انتظار مشکل ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس اثنا میں کیا کچھ ہوتا ہے گا؟ میں دم بخود رہ گیا اور عرض کیا کہ آپ فرمائیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا کہ امتحان سے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔

۱۰۔ "السلال" بند ہو چکا تھا مولانا نے "البلاغ" نکالا تو اس کے ساتھ ہی ملکۃ میں "دارالارشاد" قائم کر دیا جس میں وہ منتخب نوجوانوں کو قرآن مجید کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ قومی اور دینی کارکنوں کی تعلیم و تربیت کا وہ مرکز تھا جس کے لئے مولانا سلاسل کے زمانے سے انتظامات کر رہے تھے۔ لیکن "دارالارشاد" کے قیام کو ابھی چند ہی عرصے گزرے تھے کہ حکومت بنگال نے انہیں بنگال کے حدود سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ وہ راجپوت چلے گئے تو وہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی "البلاغ" بھی بند ہو گیا اور "دارالارشاد" بھی۔ اس اثنا میں درس صرف اڑھائی تین پاؤں تک پہنچا تھا۔ میرے دل میں ان کی ذات بابائے کات سے استفادہ کی جو آرزوئیں موجزن تھیں وہ بھی خون ہو کر رہ گئیں۔

پہناں تھا دام سخت قریب آشیانے کے  
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۱۱۔ میں نظر بندی سے دلا ہوا ہوں تو ملک میں ترک موالاٹ کی تحریک جاری ہوئی اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وقف ہو گئے۔ میں اس زمانے میں زمیندار تھے وابستہ ہو چکا تھا۔ ان سے نیاز مندی کے رد البطلی تھا۔ ہوتی۔ اگرچہ سیاسی افکار میں بعض اوقات اختلاف کی صورت بھی پیش آتی رہی۔ لیکن رشتہ عقیدت بدستور قائم رہا اور ذاتی تعلقات میں بفضل اللہ کوئی خلل نہ آیا۔ ہمارے ہمہ کی عام حالت یہ ہے کہ حسن نیت کی بناء پر بھی کسی سے اختلاف ہونے سے ناقابل برداشت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولانا اپنے دوسرے اوصاف و صفات کی طرح اس وصف میں بھی نیکانہ حیثیت کے مالک ہیں کہ رائے کے اختلاف یا مسلک کے تفاوت کو انھوں نے ذاتی تعلقات پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

میں ان کے بے مثال علم فضل کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا جو نصف صدی سے اس وسیع سرزمین کے آسمان پر آفتاب جہاں تاب کی طرح تابندہ و درخشندہ ہے۔ وہ ان اصحاب میں سے ہیں جنہیں قدرت صدیوں کے بعد عالم انسانیت کو اپنی خاص نعمت کے طور پر عطا کرتی ہے۔ وہ تحریر و تقریر و فنون کی اعلیٰوں کے ناجدار ہیں۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اس زمانے میں بھی نشو و نما فرما کر دیاں علم فضل کے لئے بکسر حیرت انگیز تھیں۔ جب ان کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی تب ۱۹۰۹ء میں وہ پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو خواجہ الطاف حسین حالی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا و عبدالہ بن سلیم مرحوم مولانا کے لئے خواجہ صاحب مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو پوچھا کہ خواجہ صاحب اس لڑکے کی عمر کتنی ہوگی؟ انھوں نے فرمایا کہ چودہ پندرہ برس کے ہوں گے سلیم نے کہا یہ لسان الصدق کے ایڈیٹر ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان کے والد ایڈیٹر ہوں گے۔ جب معلوم ہوا کہ یہی ایڈیٹر ہیں تو متحیر رہ گئے اور بہت شفقت فرمائی۔ اس وقت سے مولانا کے ساتھ گہرے دو ایل پیدا ہو گئے۔ "السلال" کا ابتدائی دور تھا کہ مولانا ایجوکیشنل کانسفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ خواجہ حالی کے فرزند ارجمند خواجہ سجاد حسین بھی اس میں شریک تھے۔ ان کے ہاتھ خواجہ صاحب نے مولانا کو بہت بہت سلام کھلا بھیجا۔ نیز فرمایا کہ "السلال" آنا ہے تو چار چار پانچ پانچ دن اس کے سوا کوئی مشغولیت نہیں رہتی۔

اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ مولانا بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ "ارمغان فرخ" کے نام سے ایک گلہ سنہ نکلتا تھا جس کی مالکانہ طرحوں پر ملکۃ میں مشاعرے ہوتے تھے۔ اسی زمانے کی کہی ہوئی غزلیں اس گلہ سنہ میں شائع

ہوتی تھیں۔ مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خان شترجی رام پوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ مولانا جو سزائیں مشاعروں میں سناتے ہیں وہ انہی کی ہوتی ہیں۔ ایک روز مولانا مسجد سے نکل رہے تھے۔ نادر شاہ خان نے روک لیا اور کہا کہ ایک شاگرد نے جان غدا میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں اور وہ غزل کے لئے متقاضی ہے۔ چند شعرا سی وقت کہہ دو۔ انہوں نے زمین بتائی ”یاد نہ ہو“ ”شاد نہ ہو“ مولانا نے ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھ بیٹھے پھر شعر کہہ دیئے۔ نادر شاہ خان برسے کہ اشعار کی تعداد طاق ہوئی چاہیئے۔ مولانا نے بے توقف کہا۔

وہ نہ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات

میں تو بھولوں نہ کہیں، ان کی کہیں یاد نہ ہو

نادر شاہ خان نے کہا کہ صورت سے تو اس بارہ برس کے صا حیرا نے علوم ہونے ہو گئے خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔

شمس العلماء شبلی مرحوم سے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ان سے مولانا کی خط و کتابت تھی۔ شبلی شاہ میں بدی گئے تو اس زمانے میں مولانا وہیں مقیم تھے۔ ایک دوست کے ہمراہ ملاقات کے لئے پہنچے۔ دوست نے تعارف کرایا تو شبلی کو یقین نہ آیا کہ ابوالکلام آزاد یہی ہیں جب شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تو اس درجہ گرویدہ ہو گئے کہ ”الندوہ“ کی ایڈیٹری سونپ دی اور مولانا نے ۱۹۰۷ء کے اواخر سے ۱۹۱۰ء کے ادا کی تک یہ خدمت انجام دی۔

بہر حال جو دور و عمر کے ابتدائی مراحل میں وقت کے اکابر علم و فضل کے لئے باعث حیرت و استعجاب بن گیا تھا اس کی شان و عظمت کے متعلق میں کچھ زبان کیا کہہ سکتا ہوں۔ مولانا کو خدا نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا ہے۔ اس کی محسوس و مشہور مثالیں ”تذکرہ“ اور ”غبارِ خاطر“ کی شکل میں دستیاب کے سامنے موجود ہیں۔ ”تذکرہ“ راجہ کی نظر بندی کے زمانے میں لکھا گیا، جب مولانا کے پاس کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی ”غبارِ خاطر“ کے خطوط احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ اس وقت بھی وہ کتابوں سے بڑی حد تک محروم تھے۔ لیکن ان کتابوں کے مطالعے سے ہر شخص پر آشکارا ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے کتب خانوں میں بیٹھ کر بھی اس قسم کی چیزیں مرتب نہیں کی جاسکتیں۔ ”غبارِ خاطر“ پہلی مرتبہ ادھر میں چھپی تھی اور اس کی کاپیاں دیکھنے کا کام مجھے سونپا گیا تھا۔ ”ماثر الامراء“ کی ایک عبارت کے متعلق میرے دل میں شبہ پیدا ہوا مگر بعد کتاب میں عبارت وہی تھی جو مولانا نے ”غبارِ خاطر“ میں درج کی تھی میرا خیال ہے کہ کتاب ایڈٹ کرنے والے نے ایک لفظ کے سمجھنے میں غلطی کی۔ اس مخصوص باب کی بعض سے مولانا کو لکھا۔ فرمایا ”منقولہ عبارت درست ہے اور یہ ”ماثر الامراء“ کی غلط جلد کے غلط صفحے پر غلط طرف اور پر کی سطروں میں موجود ہے۔ میں نے قریب سالی پیشتر ”ماثر الامراء“ دیکھی تھی اور یہ الفاظ اسی طرح لایج حافظہ پر نقش ہیں۔“

مروءیت و استقامت مولانا کے اقدار طبع کے و خصال تربی جو ہر ہیں۔ انہوں نے جن اصول و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی، ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ چٹان کی طرح جے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی صحت کو نقصان پہنچا، کاروبار تباہ ہوا، ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسوے ضائع ہو گئے، انہوں نے علمی یا دانشوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انہیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے، وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے۔ لیکن ان کی شان و عزت

ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔

ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ایک نہایت دشوار و دل گداز مرحلہ امتحان اس وقت پیش آیا جب احمد نگر کی امیری کے زمانے میں ان کی اہلیہ عزیزہ سخت بیمار ہوئیں۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ اگر حکومت سے کچھ کٹنا ہو تو میں اسے فوراً ہمیں پہنچا دوں گا۔ طلب غالباً یہ تھا کہ اگر رفیقہ حیات کی شدید علالت کی بنا پر مشروط و دائمی کی درخواست کریں تو وہ حکومت کے ملاحظہ میں پیش کر دی جائے گی۔ لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ سپرنٹنڈنٹ نے پندرہ جواہر لال کی وساطت سے بھی مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ جو فیصلہ فرما چکے تھے، اس پر قائم رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

”جو فی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی . . . . . میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون رہ گیا ہے اور اسے قابل میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد و مانع کو نہیں گرجم کو تھکا دیتی ہے۔ اس زمانے میں میرے دل و مانع کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو لپور سے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔“

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

”میں نے تمام معمولات جاری رکھے لیکن . . . . . اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر و باطن و کھانے کا ایک پارٹ تھیں جس سے و مانع کا مفروضہ احساس کھینچا رہتا تھا، اور اس لئے کھینچنا تھا کہ کہیں اس کے وامن صبر و وقار بڑھ جائے اور پریشانی خاطر کی کا کوئی وجہ نہ لگ جائے۔“

اس کے باوجود مولانا نے حکومت سے کوئی درخواست نہ کی اور ان کی صاحبِ عزیمت رفیقہ حیات اس سنا میں و نیل سے رخصت ہوئیں جب وہ سینکڑوں میل دور اپنے اہم اصولی و مقاصد کی خاطر احمد نگر کے قلعے میں محبوس تھے۔ اصولی و مقاصد کی قربان گاہ پر عزم و تہمتوں کو وہی سہتیاں، جس طرح بھینٹ چڑھا سکتی ہیں جنہیں بخشندہ حیات سے عزیمت و انتقامت کی غیر معمولی صلاحیتیں ارزائی ہوئی ہوں۔

مبادا کسی کو خیالی ہو کہ مولانا اس افتاد و پرانتہائی اضطراب و پریشانی سے تو محفوظ نہ رہ سکے، جیسا کہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ یہ سچ ہے لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا۔ صبر کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان موجباتِ غم کی شدت و فراوانی کے باوجود اپنے احساساتِ عزت و پر قابو پالے اور انھیں مناسب حدود سے تجاوز کا موقع نہ دے۔ یہ نہیں کہ احساساتِ سرے سے باقی ہی نہ رہیں اور انسان کا دل پتھر بن جائے۔ ایک سلیم الفطرت انسان کی طرح مولانا بھی احساسات سے بدرجہ اتم بہرہ مند تھے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ رفیقہ حیات کی خطرناک علالت کا خط ملنے ہی ان کے دل پر کیا قیامت گزری ہوگی۔

حصہ سے اس حالت میں کہ وہ امیر فقہ اور پاس رو کر تیار واری بھی نہ کر سکتے تھے، جو اکثر انسانوں کے لئے فی الجملہ باعث  
 تکلیف و تعب ہوتی ہے۔ یقیناً انھیں بھی آرزو ہوگی کہ وہ اپنی طبیعت کا علاج کر لیں اور تباہ حذر مکان اس کا  
 کہہ مٹانے کی کوشش کریں۔ لیکن ان کے سامنے زندگی کے اہم بنیادی اصول و مقاصد بھی تھے۔ وہ کوئی ایسی صورت قبول  
 نہ کر سکتے تھے جو ان اصول و مقاصد کی آبر و پر اثر انداز ہوتی۔ انھوں نے جب اس راستے میں قدم رکھا تھا تو ان تمام  
 ترسیلات کا اہل ذمہ کر لیا تھا جو اس سفر کے لوازم میں شامل تھیں جب پے پے وہ قربانیاں طلب کی گئیں تو مولانا نے  
 ایک صاحب عزیمت انسان کی طرح انھیں پیش کرنے میں ناخن نہ کیا۔ ذاتی تعلقات کے سلسلے میں غالباً یہ سب سبڑی  
 ذہانی تھی جس کا ان سے مطالبہ ہوا۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھے خبر فرمایا تھا :-

” ہر وقت اسے پیش نظر رکھئے کہ استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی  
 نوکری قبول نہیں کرتا تو یہ کوئی جرم نہیں، لیکن اگر سپاہی بن کر میدان جنگ میں  
 آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔“

ہاں، رہ عشق ہست کج رفتن مدار و بازگشت

جرم را اینجا عقوبت ہست و استغفار نیست

وہ یہاں آرنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیے، لیکن جب آگئے تو مورچوں کا  
 شکوہ فضول ہے اور کبھی بھی شٹنا نہ جائے گا۔ ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں غوطہ  
 نہنگوں کا سامنا ہر جگہ لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے اسے نہنگوں کے وجود سے  
 بے خبر نہ ہونا چاہیئے۔“

مولانا کی ذات گرامی اس تعلیم ہی کا نہیں بلکہ ہر اس تعلیم کا اعلیٰ نمونہ رہی ہے جو ان کی زبان پر جاری ہوئی۔ بلاشبہ ان کے  
 نقاب پر بھی درجہ دالم کی تمام کیفیتیں پوری شدت سے طاری ہوئیں جو عورتوں و کشتوں سے انقطاع کا لازمہ ہیں لیکن انھوں نے  
 مقام صبر کے درجات جس شان عزیمت سے ادا کئے، ان کی مثالیں تاریخ میں بہت سی کم ملتی ہیں۔ مروجیاتِ نعم سے متاثر ہونا ہر انسانِ مسلم  
 کا خاصہ ہے لیکن احساسات پر قابو پالینا صرف صابرین و بشرین کا کام ہے۔

ان کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے۔ جب ہم قوموں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسلک سے اختلاف  
 کیا۔ میرے علم کے مطابق وہ اپنے لئے ۱۹۱۲ء میں جو راہ عمل طے کر چکے تھے، اس پر مدت العمر بے خوف و ہمت لائے قائم تھے۔ بیچ میں اکثر  
 ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے دعویدارانِ عزم و ہمت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ انھوں نے اپنا مسلک بدلنے کے لئے معقول دلائل  
 بھی فراہم کر لئے۔ لیکن مولانا کے نزدیک صحیح مفید اور بہترین راستہ وہی تھا جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انہیں  
 بے شمار قربانیاں کرنی پڑیں۔ کم و بیش دس سال قید و بند میں گزرے۔ ان کے نہایت اہم دینی و ملی مشاغل کی محنت نقصان پہنچا۔ وہ  
 دسائی سانس بھی بالکل تباہ ہو گئے جو انھوں نے اپنی طبیعت کے ذوق کے مطابق اختیار کر لئے تھے اور جن میں وہ سب بڑھ کر کامیاب

تھے۔ لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہا تر قربانی یہ تھی کہ ان کی ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم حل کر رکھ کا ڈھیر بن گئی۔  
وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر مغفوانِ شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ جس طرف نکلے تھے لوگ اپنی  
آنکھیں ان کے لئے بچھنے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے لئے مسلسل و متواتر عقیدت کی جن گرم چوبیسوں کا  
اظہار ہوتا رہا، وہ شاید مولانا محمد علی مرحوم کو مستثنیٰ کرنے کے بعد کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوئیں اور یہ غیر معمولی ہر دل عزیزی انہیں اس  
وقت حاصل تھی جب ان کی عمر بیس اور بیس کے درمیان تھی۔ خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ ان سے محبت و عقیدت کا ملا لے کر نہ  
غنی یعنی وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے جنہیں مختلف گروہوں نے صاحب اختیار و اقتدار دیکھ کر فتح باب مقاصد کا مرجع سمجھ لیا ہو، لیکن  
انہیں پیش نظر مقاصد کے لئے استقامت و عزیمت کی راہ میں ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم بھی قربان کرنی پڑی اور وہ جس شے کو حق سمجھتے  
تھے اس سے بال برابر بھی اوجھڑا و جھڑپ نہ ہوئے۔ یہ قربانیاں ذکر و بیان میں شاید بہت دل پسند معلوم ہوں۔ لیکن اس پر عمل سہل نہیں۔  
نظیری کیا تب کہہ گیا ہے۔

نیت آسان برصغیر آتش زدوں

می نماید گر چہ از پردانہ خوش

یہاں سوال مولانا کے افکار و آرا کی درستی یا تاویسی کا نہیں مقصود صرف یہ ہے کہ ان کی شانِ عرومیت و استقامت واضح

ہو جائے۔

مولانا کے عادات و خصائل کا باب بہت وسیع ہے اور اپنے علمی و ملی جوہروں کی طرح عادات و خصائل میں بھی وہ بالکل یگانہ  
حیثیت کے مالک ہیں مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے ان کی فطرتِ ثانیہ بنی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ آدل وقت اُٹھتے ہیں، گو یا نظیری  
کے اس شعر کی عملی تصویر ہیں۔

عبادست سحری را کن نظیری کم

کہ ہر چہ کرد و عا جائے صبح گاہی کرد

ایک مرتبہ سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں لاہور آئے۔ سرویوں کا موسم تھا۔ جس نے عرض کیا کہ "عادات کے لئے کوئی  
وقت بنائیے۔" فرمایا: "صبح کے چار بجے سے آٹھ بجے تک مل سکتے ہو؟" وہ آٹھ دس دن یہاں مقیم رہے اور میں زیادہ سے زیادہ پانچ  
بجے ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ نہیں گھنٹے اعلیٰان سے باتیں کرنے کے لئے مل جاتے تھے۔ پچھلے دنوں میں دلی گیا تو اس وقت بھی وہ  
اپنے انتظامی کاموں میں بہت مصروف تھے۔ دس دن ان کے پاس ٹھہرا رہا۔ یہی صبح کا وقت گفتگو کے لئے مقرر تھا۔ سیاسی مہنگاموں پر  
مرگزارنے کے باوجود انہیں غلوت و تنہائی بہت پسند ہے۔

تنہائی و غلوت طلب عشقِ نظیری

ایں خیل و خدم را بہ امیر حشمت بخش

وہ ایک زمانے میں بہت خوش پوش تھے۔ غالباً سلاطین کے کدھر پہننا شروع کیا اور اب تک اسی پر قائم ہیں۔ وہ ابتداً  
ہی سے ہلکی غذا کھانے کے عادی ہیں اور بہت کم کھاتے ہیں۔ آج کل تو غذا کی تعلیل غیر معمولی صورت اختیار کر چکی ہے، لطیف چینی

ہیں اور اس کے دکھش تذکرے، اخبارِ خاطر میں جا بجا موجود ہیں۔  
 ہم کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔ سچائی کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفہ، نیاز یا آسانی قبول  
 نقت و نوازش سے انھوں نے عزیزوں کا درجہ دیکھ لیا ہے۔ ایک مرتبہ انھیں حرقِ آفتاب کا عارضہ ہوا۔  
 نظامی مرحوم بھی میری طرح مولانا کے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ مولانا سے بیماری کے متحمل حالاً  
 اس قدر تیز کر دوں گا کہ بے عقلِ خدا یہ عارضہ دوبارہ نہ ہو گا۔ میں نے حالات منگوائے۔ حکیم صاحب مرحوم  
 خیر تجویز کر دیا اور یہاں سے دوا میں کلکتہ بھجوا دی گئی۔ ان سے خاتمہ ہوا حکیم صاحب کی رائے بھی کر دوں  
 ہیں۔ مولانا نے لکھا،

صاحب کی دواؤں کے استعمال میں ہرگز تاہی نہیں۔ اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہے کہ جو ہر شے  
 حال کر ناجائز ہے تو ضرور کہہ دینا کہ شرط یہ ہے کہ وہ دوا خانے کو حکم دے دیا کریں تاکہ  
 دوی۔ پی پارسل کے ذریعے پہنچے رہیں۔ اس صورت میں شکر گزار ہوں گا اور انشاءِ خاطر  
 چ کر دوں گا۔ ورنہ طبیعت ترک جاتی ہے کہ تحفہ ایک مرتبہ ہونا چاہیے نہ کہ مسلسل۔ اگر  
 حب یا آپ سے منظور نہ کریں گے تو فرارِ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کر دینا  
 دوا جو اس کی حالت گوارا ہو سکے گی۔

ہم دین نے مولانا کی تفسیرِ فاتحہ کے بعض حصوں پر ابرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا۔  
 ہاقتی مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی جھنڈائی بھی لکھا کہ کتاب اپنے نہیں دینی تو میں بھی دوں۔ فرمایا۔  
 ہنر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں۔

میں نے جن تین باتوں کا اہم کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو مناظرہ  
 ہمبر سے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دے گا نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو اودھ کرے گا۔  
 سدا نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک بغیر بے اصل تھیں۔ انھوں نے مجھے لکھا :-  
 بی طبیعت کا وہ اندازہ ہوتا جو اس وقت تھا جب اللہ لال "نکالتا تھا، تو یہاں سے مزین کذب  
 میں معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے کیسے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن  
 عالی و ہر ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں  
 بند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے مرقعوں پر اپنا نفس سامنے آ جاتا ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں کہ  
 کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں بڑا نہ کہوں؟

مکمل اسلام میں صدقِ مقال نہیں تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ ولیس و داد  
 من الایمان حقیۃ خرد دل



ایک مرتبہ وینک ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک حریفی میں شعلہ اعنہائی کا یہ شعر لکھ دیا۔  
 اُن بخت نہ اریں کہ ہم ہر دم تیرے ہاشیم  
 ماسر را تو آجے ونگا ہے  
 انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شعر کا بہانہ کیا موقع تھا،  
 "ایک حدیثِ قدسی ہے: من تعشّب الی شجر آتقربت الیہ ذراعاً  
 وج ایک بالشت میرے قریب آتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب جاتا ہوں،  
 عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تحقق سے محروم نہ رہوں۔ اب  
 بھی اس پر عامل ہوں اور عامل رہوں گا، ۷۰ ہزار بار بروصد ہزار بار بیات  
 مضمون بہت طویل ہو گیا۔ لیکن جو کچھ کہنا چاہتا تھا، نہ کہہ سکا۔ دوسری عرنی والی بات ہوئی کہ  
 زبان زنگنہ فروماند و راز من باقیست بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست  
 آخر میں مرانا کی تحریک ایک انتہا میں پیش کرنا ہوں جو ان کے ایک طویل مکتوب سے ماخوذ ہے۔ کچھ علمی بحثیں  
 رہے تھے کہ خلافِ عادت ان کے علم سے یہ الفاظ بے اعتناء نہ لگیں گئے۔ فرماتے ہیں:  
 "افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غائب کو قوصوف  
 اپنی ایک شاعری کا دونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قریب کیا کیا چیزیں جائیں گی۔  
 تار و بربار باز ابرجہاں جنس وفت رونق گشتم و از لحاظ و کال رفتم  
 بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و اہم کا ایک عجیب عالم عاری ہو جاتا ہے۔ درہبِ علوم  
 فنون، ادب، انشاء، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمارئی راہیں مبارکیا حق نے مجھے نامزد کیے  
 دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن، ہر لمحہ تجسسوں سے دامن مالا مان نہ ہوا ہو۔ تھک رہا ہوں  
 اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پہنچانا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ بھیاں پچھلی منزلوں کی جلد و طرازی کا  
 ماند کردیتی ہیں لیکن افسوس جس مانتوں نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گریبا کر کیا اس نے شاید سرسلائی کا  
 کے لحاظ سے نئی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا  
 مگر اس کے حوالے کروایا گیا"

یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے نہ سخن گسری ہے نہ تعلی بلکہ سراسر حقیقت ہے، کاش مجھے اندازہ شناسی میں رسانی کا درجہ نصیب نہ  
 اس کی زبان سے کہتا ہے

وعدہ باید کہ تا یک مروی پیدا شود  
 یا زید اندر خراسان یا اویس اندر رکن

# ہندی سن

## عبدالماجد دریا باوی

سنہ ۱۸۴۳ء میں ۱۸۴۳ء ہوا۔ وفات نومبر ۱۸۴۳ء میں ہوئی۔ عمر ۵۰ سال کے اندر ہی رہی۔  
 ہوش کی آنکھیں جب کھلیں تو اپنے وطن کو رکھپور میں رنگ پیدا ہوا ریاض خیر آبادی کا۔ ریاض کا وطن  
 اختیار علی گڑھ رکھپور تھا۔ وہیں شباب گزارا۔ وہیں سے ریاض اخبار فقہی میں دوبار رسد روزہ کی اصطلاح اس وقت تک نہیں ملی  
 تھی (مثلاً)۔ وہیں سے فقہ اور فطر فقہ کے شکر نے چھوڑتے رہے۔ اور وہیں سے انگریزی ناولوں کو اپناتے رہے۔ آج میرے سامنے فلم  
 اور حوالے فقہ طلب قیام ہیں۔ ان کی بعضی فنر بھی سننے چلتے۔ ریاض اخبار نام کا سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی ادبیت  
 اس کی سیاست پر کہیں غالب۔ ریاض اس میں نثر کی شاعری کرتے۔ اور لوگ بھی بھلے سیاسی معلومات لے کر زبان و انشادی کی  
 خاطر خریدتے۔ فقہ اس کا ایک بھلا متا صاحبہ جی تقی کا رنگین کاغذ پر نکلتا۔ اور لطیفوں چٹکوں سے ولی بھلا تا رہتا۔ فطر فقہ کی بات  
 اب خوب ذہن میں نہیں۔ اسی شان جمالی کا یہ پرچہ غالباً شعر و نظم کی بہار دکھاتا۔ بہر حال اتنا یاد ہے کہ یہ دونوں پرچے نام کے فقہ  
 قیامت کی شوجیاں دکھاتے رہتے۔ اور ریٹائلرز وغیرہ کے عام پسند انگریزی ناولوں کو ریاض اور وہیں اپناتے رہتے چنانچہ ریٹائلرز  
 کا (LOVES OF THE HAREM) حرم سرا کا نام پا کر اردو میں اپنا نام کر گیا۔ اردو کے محلی کے لطیف و شہسہ چلے گیا  
 سائیکس میں ڈھلے ہوئے۔ اور پھر ریاض اور ان کے دوست رسا رام پوری کے مزے دارا شعار۔ عطر میں بے ہوئے۔  
 بہ فضا غنی جس میں ہندی مرحوم نے آنکھیں کھولیں، اسی میں پیسے و رٹھے۔ سالہا سال بعد ریاض کو ایک خط میں لکھا،  
 ”جھگڑا آپ کے ساتھ جو خاص تعلق ہے، آپ کو معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس  
 وقت سے آپ کے لٹریچر کا داراؤہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم ہی میرے ذہن میں  
 نہیں تھا۔“ (ملکا تیب ہندی ص ۱۸)

دلگیر مرحوم ایڈیٹر ماہنامہ فتاویٰ (آگرہ) کے نام اس سے کہیں زیادہ کہل کر لکھا ہے۔  
 مرحوم ریاض (خدا سے توفیق ملے) مرحوم سن کا آشنائے ازلی ہے آپ لٹریچر  
 کی جی نزاکتوں پر مٹے ہوئے ہیں، وہ ریاض کے قلم کی آواز باز گشت ہے۔ آج  
 لٹریچر پر طبع آزمائی کے لئے بہترین اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن میں نے پہلے پہل یہ

۱  
لفظ ریاض الاخبار میں دیکھا۔ جب اس کے مفہوم سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا  
..... موجودہ لٹریچر ارتقائی حیثیت سے ریاض سے بے نیاز نہیں ہے۔ وہ  
جس طرح نظم کا مالک ہے۔ آئلے نثر بھی ہے۔ اور یہی اختیار نافع ہے جس کی بنا پر  
وہ انشا پر دانی کا تسلیم القوت پہر ہے۔ (مکاتیب ہندی ص ۱۵۹)

پیدائش علامہ بذاتِ پور، گورکھپور کے ایک کھاتے پتے شریف اور نندہی رنگ کے خاندان میں ہوئی۔ والد کورٹ اپیکٹر  
تھے۔ گھری کا ایک حصہ کتب کھانا تھا۔ وہیں میٹر کے سب دستروقت آرو فارسی پڑھی۔ ممکن ہے اردو کی بھی شہدہ حاصل کی ہو۔  
اور پھر کچھ روز علمی گوشہ جا کر اسکول کے دوجوں میں پڑھا۔ طبیعت بڑی اخلاقی تھی۔ مزاج میں نفاست و لطافت اور آروادب  
سے مناسبت، یہ چیزیں معلوم ہوتی ہیں فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لائے۔ کتنے بے انہیں کے سہارے بغیر کوئی ڈگری یا سند  
حاصل کئے کچھ ہی روز میں اتنا کر لیا اور ایسے جل نکلے کہ ابھی ڈگری والوں کو راستہ بتاتے، اور بڑے بڑے سند والے ان کا  
سامنا کرتے ہلکے تھے۔ بیگم ہندی کی روایت ہے کہ شروع میں گھر پر کسی انگریز سے بھی پڑھا تھا، اخلاقیات ہندی ص ۱۵۹، یہ روایت  
انہوں نے یقیناً مرحوم ہی سے سنی ہوگی۔

یہ بیگم دوسری جوی نہیں بڑی چینی اور صحیح معنی میں شریک زندگی۔ پہلی جوی کا انتقال مرحوم کی جوانی ہی میں ہو گیا تھا  
یہ عقد اس کے بعد ہوا۔ ————— معاشرت میں ”صاحبیت“ کا اثر ممکن ہے کہ انہیں ”صاحب“ کی معنی کا نتیجہ ہو۔  
شعوری طور پر بچپن میں علمی اثر سب سے زیادہ سرسبز کا پڑا۔ ان کے تہذیب اخلاق کی ایک جلد دیکھنے کو مل گئی تھی۔  
انہیں بیگم ہندی کی روایت ہے کہ

”وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ صرف اسی تہذیب اخلاق  
نے مجھے آدمی بنا دیا“ (خفاوات ص ۱۵۹)

مرحوم کا شمار مصنفین کے زمرہ میں تو مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے تصنیف یا تالیف ان کی ایک بھی نہیں۔ خوب کہا ہے  
ہمارے اردو کے نویس مصنفین مولانا سید سلیمان ندوی نے کہ:۔  
”مرحوم کوئی پیشہ و مصنف نہ تھے جو پھیلوں کی رحمت کے لئے اپنی تصنیفات کا  
ذخیرہ چھوڑ جاتے“ (مکاتیب ص ۱۶۱)

مضمون نگار بھی وہ کوئی پیشہ و راہ بڑے مشتاق نہ تھے ذخیرہ تحریر کل اہم مضمون میں چھوٹے اور بڑے سب ملا کر اور انہیں  
میں زمرہ تنقید بھی شامل ہیں۔ یہ ہفتہ واروں اور ماہناموں میں پچھلے چارے مضمون ۱۸۹۹ء تا ۱۹۱۹ء یعنی ۲۰ سال کی مدت میں شائع  
ہوئے۔ اس حساب سے اوسط ہر سال ڈیڑھ مضمون کا پڑتا ہے تاہم اوسط ہر دور نہ واقعہ یہ ہے کہ کم از کم سال میں دو ایک مضمون لکھتے وہ  
بھی جب طبیعت خوب حاضر ہوتی اور لکھنے کا کوئی داعیہ قوی موجود ہوتا۔ کسی کسی سال جب طبیعت میں موج آتی تو چار چار پانچ پانچ  
مضمون بھی لکھ ڈالتے اور درمیان میں مہینوں کیا برسوں کا سناٹا۔ تصنیف کے نام سے کل کائنات ہی مجموعہ مقالات ہے  
جو افادات ہندی کے نام سے وفات کے بعد شائع ہوا ہے۔ بیچارہ کو نظر ثانی و ترمیم وغیرہ کا کوئی موقع نہ مل سکا اور ہر صاحبِ قلم

رانا ہے کہ اس کے بعد تحریر کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ نامکون تھا کہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۱ء تک مدتی جس میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۰ء تک مدتی میں بھی کئی نام کے ساتھ "اقتصادی" نام سے لکھے گئے تھے۔ یہاں پر کسی تحریر کو دیکھتے تو اسے بے لائق لگنے لگتا تھا۔ یہاں پر ۲۶۵۲۰ قریب پر دو دروں کے کچھ نمونے دیباچہ وغیرہ کو نکالی کر دیے گئے تھے۔

اور ان اس سے کچھ کم خدمات کی ایک اور کتاب بھی ان کے تعلیم کی رچیں منت نکلی تھی۔ یہ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ کتاب مدتی کے نام سے ————— مرحوم بڑے اچھے، بڑے پاکیزہ خط نویس تھے۔ ظن تھا اگر ان کے ان انشائی کلمات کو ضائع ہونے دیا جاتا۔ کچھ قدر ان احباب و اعزہ نے انہیں بچا کر رکھ لیا تھا۔ یہ ادنیٰ جو اہر پارے اگر ضائع ہو جاتے تو اردو کا ایک بڑا سرمایہ گم ہو جاتا۔ پہلے کی ساری عمر سرکاری ملازمت میں گزری۔ وہ بھی کچھ ادبی کچھ نہیں۔ پہلے نائب تحصیلدار رہے پھر تحصیلدار ہو گئے۔ پھر ان میں اس زمانہ میں کچھ واجبی ہی سی ہوتی تھیں۔ یہ پھر شاہ غریب، مزاق کے شوقین، لغات جیسے۔ کھانا ہونے وغیرہ، کپڑے ہونے تو نفیس، مکان اور اس کا فرنیچر ہونے تو نفیس، ہر شے اچھا۔ ہاتھ ہر شے پکھلا ہوا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کدو دیر کس طرح کی چیمپی ہوئی کے گئے کپڑے کے جو حملہ و آرمائی کیسے پورے گئے۔ لوگوں کی تعلیم کے اخراجات کیونکر ادا کئے۔

کئی سال کا زمانہ تو خیر بنا رہی اور الہ آباد کی صدر تحصیلوں میں گزارا۔ باقی بیشتر حقیقت دیہات کی دور دور از تحصیلوں ہی میں بسر کیا، جہاں کتابوں کے کسی بڑے ذخیرہ کے وجود کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ تحصیلدار کی کئی عیالوں کیوں بھی کوئی مناسبت علمی اور تصنیفی مشغلوں سے نہیں ہے اور پھر جبکہ قیام بھی ایسی جگہ ہو۔ جہاں کو سون نہ کسی علمی صحبت کا پتہ۔ نہ کسی کتب خانہ کا نشان، تو ایسے کو رو بہید میں اور اتنے غیر علمی ماحول میں رہ کر جبکہ متعلقہ نگاری کر ڈالنا ایک ادبی کرامت ہی کا مرتبہ رکھتا ہے۔

نئی نئی ترکیبیں گڑھنے اور انگریزی سے لے کر اردو میں نئے نئے لفظ ایجاد و اختراع کرنے میں مرحوم کو ایک رنگ ملتا تھا، اور اگر کہیں علمی استعداد مولانا نذیر احمد دہلوی کی سی ہوتی یا لسانیات اور زبان و ادبیات سے مناسبت محمد حسین آزاد کی سی تو مدتی جس اس میدان میں سب سے بڑی لے جلتے اور اپنے معاصرین کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے۔ پھر بھی جتنا کچھ وہ کر گئے وہ بہت سے پیشہ ور محققین کے لئے بھی باعث رشک ہی ہو سکتا ہے۔

ماہر طب کے لئے "اختراع ناقصہ"، "ہنی مون" کے لئے "عذر زفاف"، "جوابنگ ٹائم کے لئے" "وقفہ سبکدوشی" "ایلیکٹ کے لئے" "حوادث صبیحہ"، اس قسم کے الفاظ خدا معلوم کتنے انھوں نے چلانے چاہئے، اور ان میں سے کوئی کوئی حل بھی کئے ————— غیر متناقص جنہیں "ب" آدھ گھنٹہ علامہ علی کے ساتھ "دماغی جھٹیں غیر فانیوں کے ساتھ" "پارے جواب" اس خیال کے بھی بہترے نقش انھوں نے انگریزی سے اپنائے۔ کچھ ان میں سے جم گئے اور کچھ اڑ گئے! ————— انگریزیت سے متاثر بہت زائد تھا (اور وہ زمانہ ہی خاص متاثر تھا اس لئے وہ اکیلے کیا، سب ہی متاثر تھے، اس لئے لفظی اختراعات میں بھی انگریزیت کی جھلک آگئی اور وہ لفظ اور فقرے اردو میں کھپ نہ سکے۔

اپنے مذہب ادب میں پورے اہل ہنر و الجماعت تھے۔ یعنی سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی، سب کے قاضی۔ اور دانت ہے کہ کبھی آزاد کی شخصیت کا کلمہ پڑھتے۔ کبھی نذیر احمد کی عظمت کا قلم چماتے۔ کبھی شبلی پر جان چھڑکتے۔ کبھی حالی کی اوّلوں پر داری جلتے۔ اور کبھی سرسید کو استادِ اکل کے رقبہ پر رکھتے۔ یہ سارے دعوے ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ اپنے اپنے سیاق میں اور مناسب موقع پر۔ یہ سب باہمی شک ہیں اور اتنی تفضیلیت کی گنجائش مذہبِ اہلِ سنت میں پوری طرح موجود ہے۔ بخوبی وہ اور علمی ادب اور دوسرے ان عناصرِ خمسہ کے علاوہ ادبِ خالص کے بھی استادوں کے پرستار و دوست تھے۔ ربیع کا نام اور پرگزہ چکا۔ ایک اور اسی دور کے بہت اچھے لکھنے والے، نیر محمدی صدی اور صلا کے عام کے ایڈیٹر منشی ناصر علی دہلوی تھے۔ دنیا تو اب ان کے نام ہی کو بھول چکی ہے۔ ادبِ لطیف کی اصطلاح پر بعد کو چند خاصوں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ ورنہ انشاء کی یہ شارح و اصل ناصر علی کا خاص حصہ تھی۔ اور محمدی ان کے نام پر بیٹے ہوئے تھے۔

خٹک نگاروں ان کے مذہب میں بہت زیادہ کھنچتی۔ "مولویت" اور "مدیریت" سے اسی لئے نیر اور ہتے۔ اور نواز خود مولانا سید سلیمان سے مددیں ان کی "مولویت" کی بنا پر مدین اور ان کے کمالات کے منکر رہے۔ مولانا شبلی کے انتقال کے رجحان کے لئے واقعہ پر مدلل تھا، معاً بعد ۲۰ ستمبر ۱۸۸۷ء کو مولوی عبدالحجید و ربیع دہلوی کے خط میں لکھتے ہیں:-

"سیرت نبوی کی تشکیل اب قیامت تک ہر چکی..... سکتا ہوں میان سلیمان اور  
پروفیسر حمید الدین ترتیب دیں گے۔ اس سے فائدہ ہونا اچھا تھا۔ یقیناً تنقیدی  
حصہ ہر جہت سے نہیں لکھا ہوگا، جسے وہ تاریخی حجت کے بعد شروع کرتے" (مکاتیب ۱۳)

بدگمانی بے محل ہی تھی کب تک قائم رہتی حقیقت کی پہلی نہیں سے چکنا چور ہو گئی۔ فروری ۱۸۸۷ء میں خود سید الطائف کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:-

"ہیں نہایت دلچسپی سے آپ کی ادبی فنونیات کو دیکھ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا تصنیف  
عہدِ علامہ شبلی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اس خیال کو میں نے ایک مستقل  
عنوان کے تحت میں پھیلا یا ہے۔ "آرود لٹریچر کا دم واپس" مختصر یہ آپ کی  
نظر سے گزرتا ہے گا جس میں میں نے دکھایا ہے کہ دارالمصنفین سے ایک نئے دور  
کا آغاز ہوتا ہے" (مکاتیب ۹)

پھر ستمبر ۱۸۸۷ء میں ارض القرآن کی رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میں عربیت سے زیادہ آپ کی ادبیت سے مرعوب ہو رہا ہوں۔ زبانِ نفس پر فروغ  
کے لحاظ سے قطعاً لائقِ شکایت نہیں۔ یعنی کہیں سے بے جوڑ نہیں۔ اور حسب

تناسب میں کہیں سے کو کسر نہیں۔ تو حسن کی جامعیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے" (ص ۱۰۰)

اور پھر:- "یہ کہنا بھول گیا کہ طنز یہ لٹریچر کی لطافت آپ کا حصہ ہے (ص ۱۰۱)

اور ایک بار اور معارف کے بعض چٹپٹے شذرات کی داد میں جو مسرور و جی نائیڈو کے سلسلہ میں تھے:-

”آپ نے شاعرہ و کمن پر جو بھلیاں گرائی ہیں اور اس سلسلہ میں محنوں و سوسائیاں چوس  
خو بصورتی سے لے لئے کچے، لکے، پیرے، وہ نازک خیالی کی آخری حد ہے۔ میں نے  
بار بار پڑھا اور لطف اٹھاتا رہا — جس زمانہ میں یہ پہلی دفعہ پیش پڑائی ہے اور  
اس کی زبان سے یہ شعر نکلا ہے۔

و رہ خنجر لیلے کہ خطر با سست ہے

شرط اول قدم آن سرت کہ مہنوں با سستی

خوب یاد ہے کہ بہتر سے کول تمام کہ بیٹھ گئے تھے۔ چڑھتی دو پہر سے ٹھہرتی چھاؤں یاؤ  
خوشگوار ہوتی ہے۔۔۔۔۔ مدت سے سوچ رہا تھا کہ اس کی بھکد اور سائیت کو  
اپنی چند سطروں کا تختہ مشق بناؤں لیکن آپ نے میرے لئے بالکل گھمناقتیں نہیں چھڑی  
اور ساتھ ہی میرے دل کا ارمان پورا کر دیا۔ جو خاکہ آپ نے کھینچا ہے اور جس پہلو  
سے چوٹ کی ہے، وہ تقلید کی چیز نہیں۔ غلاف ٹسکے میں اس طرح کوٹ کر  
نہر بھرا ہے کہ خود آپ سے داؤ لینے کو جی چاہتا ہے۔“ (ص ۱۷۱)

عام طور پر مزاج متوازن اور راجن چمنی تلی رکھتے تھے نہ مدت میں غلو نہ ہجوم میں مبالغہ۔ نہ افراط نہ تفریط۔ لیکن آخر بشر  
تھے جو ک ہی جلتے تھے۔ ان سطور کا راقم، آج کا بنا ہوا ”مولانا“، اس وقت بڑا کٹرا ”مسٹر“ تھا اور مرحوم سے سن میں کوئی ۱۶-۱۷  
سال چھوٹا۔ بس اُس پر اس طرح حیران ہوئے کہ کوئی حد ہی نہیں دیکھا تب کے ورق کے ورق اور نالوت کی سطروں پر سطر ہی سی  
خود لڑائی کی نذر۔ ————— حوصلہ افزائی کی بھی کوئی انتہا ہوتا تھی۔

مزاج کی نفاست اور طبیعت کی شرافت میں اپنی نظیر آپ نے بوں کیجئے کہ ان کی تخلیق میں جزو اعظم ہی دو عنصر تھے۔ کھنے  
وقت کا فذ نفیس ہو۔ نظم نفیس ہو۔ روشنائی نفیس ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موسم خوشگوار ہو۔ جب کہیں ان کا نظم حرکت میں آجئے۔  
مسوہ لکھتے وقت کیا مجال کہ کوئی داغ و حباب پڑ جائے یا کہیں کا شہریت کو راہ ملے۔ سرکاری ملازمت سے آزاد ہونے اور وقت  
تامنا پنا رکھتے، جب بھی انہی رعایتیں اور اتنے التزامات کے بعد کیونکہ ممکن تھا کہ کوئی بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑ جاتے؟  
بنا لکھ ڈالا ہی بہت نصیحت ہے۔

کتاب میں نہایت صاف ستھری رکھنے اور جلد اعلیٰ سے اعلیٰ بندھوا کر سیکنڈ ہینڈ یا استعمالی کتاب وہ ہاتھ میں لینا کیا  
جانیں۔ ”دوشیزہ کاغذی“ انھیں کہ زبان میں ”دست غیر سے مس ہو جانے کے بعد“ ان کے کس کام کی رہتی۔ کھانا نفیس کھانے،  
کپڑا نفیس پہننے۔ مکان، فخر پر ہر چیز میں صفائی، نفاست اور لطافت کا خیالی سبب و مقدم۔ کہا کہ تھے کہ سیکنڈ کلاس کوئی سی  
بھی شے ہو، مجھ سے بدواشتہ نہیں ہوتی۔ جو چیز بھی ہو ورنہ اول کی ہو۔

اور شرافت نفیس تو کچھ اس سے بھی بڑی ہوتی تھی۔ کسج کی دل آزاری کیا دشمنی بھی جانتے ہی نہ تھے اور تحریر میں

درشت و ناطق الفاظ لانے کو نکالی کسے برابر سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ ایسے بھدے تھقیل لفظ لانا مخزیر کا خون کرنا ہے۔ صوفیہ لیلیٰ اشاروں کنایوں کے جواز کے قائل تھے اور ملکی بھلی چوٹیں کر جانے کے بادشاہ تھے۔ اور خیر خود تو اس پر عامل تھے ہی، دوسروں کو اس روش سے ہشتے دیکھتے تو ٹوک دیتے۔ تذرات معارف کی ایک عبارت پر مولانا سید سلیمان کو لکھتے ہیں۔

”میری غرض یہ ہے کہ تھقیل الفاظ کی جگہ صرف لغوی کی غنی سے کام لیا جائے۔ یہ باتیں کوئی اور آپ کو نہیں لکھے گا لیکن مجھ کو جس حد تک خلوص ہے، اس کا اقتضاء ایسی یہ ہے کہ جن محفولی پر غایت غلو کی وجہ سے دوسروں کی نگاہ نہیں پہنچتی، ان کو آپ کی ترجمہ میں لاؤں“ (ص ۱۷۷)

میری قدر جاہلیت کی ایک کتاب ”فلسفہ اجتماع“ نام ہے، لفظ احوال کی حالت میں لکھی ہوئی۔ اس میں پیروں کا ذکر جاہل ہے بالکل دنیوی لیڈروں کی حیثیت سے ہے۔ اور ان کے کا ناموں پر تغیند و نبصرہ اسی انداز میں، جس میں قومی و ملکی لیڈروں پر ہوتا رہتا ہے۔ اپنے نزدیک اس وقت اس میں ہر جہاں ہی کیا تھا؟ اور اگر کوئی روکنا ڈکنا تو جواب میں اس کی مولویانہ تنگ نظری اور تعصب پرے سے دھری ہوئی تھی۔ ہمدی مرحوم میری مخزیر کے قدر وادوں میں نہیں، پرستاروں میں، عاشقوں میں تھے۔ اس کے باوجود کچھ ہوئی ان بعد جب کھڑے آئے تو مجھے ایک موقع پڑنا پا کر بولے، کہ:-

”فلسفہ اجتماع کا عاشق زار مجھ سے بڑھ کر کون ہوگا، لیکن سن میں مجھ سے چھوٹے ہو اس لئے ایک بات کان میں ڈالنے دیتا ہوں۔ پیروں خصوصاً پیغمبر اسلام، کا تذکرہ جس طرح آیا ہے، اس سے صاف استغناء نکلتا ہے۔ عقائد کی بحث سے قطع نظر یہ تنگ کسی سنجیدہ مصنف کی مناسبت مخزیر کے بھی تو منافی ہے جن شخصیتوں کا ادب و احترام کروڑوں انسان کر رہے ہوں، ان کے مزید کا لحاظ رکھنا تو لازمہ تہذیب و شائستگی ہے۔“

بات اتنے خلوص سے کہی گئی تھی کہ سیدھی دل میں آتے گئی۔ اور جوں سے منکر و مکذب تھا، وہ کم از کم زبان و قلم کی حد تک تو آدمی بن گیا۔ اور پھر دوبرس بعد جب اس کتاب پر حیدرآباد میں سخت لے دے شروع ہوئی تو اپنے اسی اخلاص و شرافت کے تقاضے سے مجھے لکھا:-

”میں نے آپ کے کلمہ میں نوکر کیا تھا کہ آپ نے گواہ حضرت کی تنقیص نہیں کی تاہم اظہار خیال کی بار ایک تہ میں ایک طرح کی تصحیک پائی جاتی ہے۔ اور میں عملانہ رنگ ہے، مستشرقانہ سنجیدگی نہیں، ایک آدھ لفظ کے ہیر پھیر سے برشکایت و دور ہو سکتی ہے اور مقصود پھر بھی ہاتھ سے نہیں جابجا کیا۔ یہیں آپ کیلئے کر سکتا ہوں آپ اجازت دیتے ہیں؟“ (مکاتیب ص ۱۵۵)

یہ تو آپ جتنی بھی باقی اسی طرح کی مثالیں کوئی گنانے پر آئے تو ان کی تحریروں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھی خاصی نکال سکتا ہے۔ خود بڑے ”آزاد خیال“ تھے اور بڑے ”رشد خیال“، ملائیت کے نام سے بیزار، مولویت کے سایہ سے پناہ مانگنے والے، لیکن ہر آزاد و مشرعی اور ہر روشن خیالی پر چھاپ تہذیب و شائستگی اور شرافت کی لگی ہوئی۔

مخزیر کا اصل جو ہر شوخی محض غرافت نہیں شریفی HUMOUR نہیں wit۔ تقصیر آفرینی نہیں بلکہ صرف ایک

انبساطی کیفیت جو بہت پہلی نوزائشوں پر کھرا ہٹ لے آئی اور بس۔ جو کہ قوی نہیں جو حرارت جسم کو امتزاج میں لے آئے، صرف مسکن جو مسرت کی بلکی ٹھنڈک جسم میں دوڑا دے۔۔۔ وصال نہیں صرف خیال وصل۔ بقول شخصہ ؎

خیالی ہی میں مرنے وصل دلربا کے لئے !

مناوے کا انتظار نہ گا۔ دوچار حاضر ہیں۔ موضوع علمی ہو، ادبی ہو، مذہبی ہو، قلم کی شوخیاں مساتحہ کیں بھی نہیں چھوڑیں۔ مولانا شبلی کی نیم فلسفیانہ نیم مکتبانہ کتاب الکلام فی نئی نکل ہے اس پر تبصرہ کر رہے ہیں۔

”ہم کو ان کلام کے ہونے کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات جہدِ باطل کلام کی ضرورت کا احسا  
رکھتے ہیں وہ دیکھیں گے کہ فاضل پر دینسرنے ایک طرف تو بڑے میاں یعنی مذہب کی جگہ ہی نہیں اتاری  
اور ساتھ ہی یورپ کے فوجیہ جہذوں یعنی فلسفہ و سائنس کے سامنے تیر سو برس کے بوڑھے سے  
اچھے نہیں جڑوائے، بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا۔ یہ معتدل روش جو اس علمی نزاع میں اختیار کی گئی  
وہ شہل ہی کا حصہ تھا“ (افادات ص ۱۳)

ایک اور جگہ اللہ وہ رمولانا پاشی کے ماہنامہ کا تعارف لکھا ہے اس کی قہید میں :-

”خائب زندہ ہوئے نوشہلی کو اوروں سے خاصہ کی داوطلبی جس نے ایک فوجی بازاری یعنی کل کی چھوڑی کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جو جنوں پر آئی ہوئی بھلی نہیں بیٹھ سکتی تھی مددوں شعر آسے گاڑھا اٹھا اور با۔ یہ فضلے سن بڑی طرح کھل کھیل لکھ پاؤں نکالے اور بہنیرے بنے بگاڑ دیئے۔ کیونکہ ایک زمانہ شدیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی بعض جگہ بے آبروی کے سامان جو ہو کر رہ گئے اور بالی بالی بھی۔“

آخر آخ میں ملک کے مغلہ یعنی ناول کو جس تو یہاں تک پہنچے پڑے کہ اس کی پروردہ داری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا کبھی کبھی وہی زبان سے اسے یہ کہتے ہوئے سنا۔ ————— ہادی اٹکھ جاؤ گی میں جوں ہے۔

لیکن دفعۃً اس کی حالت نے بدلتا کہا یا کثرتِ فراحت باعثِ تجدیدگی ہو گئی۔ اچھے دن اتنے ہیں نو کا بڈی ہو جاتی ہے۔ اب وہ مقدس عمارت کی کنیزوں میں داخل ہے لیکن سنایا گیا کہ خوش اوصاف بشری سے زیادہ ملاوس ہے اور قریب قریب انہیں کے تصرف میں رہتی ہے اللہ وہ اسی کا ایک فریش رس، ”انعامات ص ۱۰۸، ص ۱۰۹“

ایک وینڈر اہل قلم سے ان کی کوثر قلمی کی شکایت گرمیوں کے رمضان کے زمانے میں کرتے ہیں اور اپنے قلم کے بانگپن سے صحرائے خشک کو لالہ زار بنائے دیتے ہیں ۔

خیر فرمے؟ آپ کا بالکل پتہ نہیں۔ کیا آپ کے رمضان سے میرے مئی کے شہزاد کچھ کم ہیں جو ایک دم سے آپ ٹمب رہے ہیں؟ تحریری فافے زندہ مشرب دوستوں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں، سوزہ رکھیے



نہ کیجئے مگر مجھے یاد ضرور کیجئے۔ (ملکاتیب ص ۵۱)

ہیں ایک سال جید رآب اور ماہنامہ پرنسپل قائم ہو رہی تھی اور اس کا مقدمہ الجیش سررشتہ تالیف و ترجمہ ایک سال قبل ۱۹۱۶ء میں مکمل کیا تھا۔ میں اسی میں نصاب علم کی آڑ لے کر وکن کے اخبارات نے گولہ باری شروع کر دی۔ اور وقت قیام کے چند مہینے بڑے سخت موکروں میں گزرے۔ سال جبر بعد لکھنؤ واپس آیا ہوں، صابطہ سے صرف رخصت لے کر ویکن دل میں ہفتہ کی نیت مستحکم کر کے۔ حضرت ہمدی جیسے غلط کو سارا ماجرا لکھ کر بھیجا ہے۔ اب جواب ملاحظہ ہو۔

”جس طرح ایک بھوکا خوش ذائقہ کھانے پر گرتا ہے اور جب تک نعمت ترجمہ سے جلد جلتی ہے نیچے نہیں آتا لیتا اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ میں چھپانا نہیں چاہتا کہ آپ کے وحشیانہ عینیت ناموں کے ساتھ مجھے بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ اس میں میرے کنگلے جن کو اس قدر رنج نہیں جس قدر آپ کے بھلے کو۔ کہ یہ نعمت جلد جلد میرے حجتہ میں نہیں آتی۔ خوش ہزار افسوس کی تیلیاں ٹوٹیں اور پر شکستہ طائر کو چوتے وطن نصیب ہوئی۔ وطن بھی لائق رشک لکھنؤ جس کی فضلے بسط آپ کی مشیطہ و مافی کیلئے راضا و کافی ہے۔“

آپ لکھتے ہیں کہ ”اب وقت اپنا ہے، قلم اپنا ہے، دماغ اپنا ہے“ ایک صاحبزادی میں صاف کہوں نہیں کہتے کہ بیگم اپنی ہیں۔ یہ نکتہ رہ گیا تھا کہ پوری کئے دیتا ہوں۔ (ص ۱۵)

میری شادی کو تھوڑا ہی زمانہ ہوا ہے۔ بیوی اور سالیوں کے ساتھ لکھنؤ سے بانڈا رہی سنسراں، گیا ہوں ریل کا سفر خاصا دلچسپ رہا۔ حضرت ہمدی کو لکھ کر بھیجا۔ جواب میں آپ بھی شریک ہوں۔

”آپ کا پرستان سفری و دلچسپ تحت رواں (ریل) پر بہت ہی قابل رشک رہا۔ سچ یہ ہے کہ جنس لطیف اپنی پاکیزہ وحشی اور کافراواری کے ساتھ کائنات کے خوبصورت چہرہ کا غارتی نہیں ہے۔ ہمارے لئے شرط زندگی بھی ہے کہ بغیر اس کے دنیا میرے سے رہنے کے لائق نہیں تھی۔“ (ص ۱۵)

صاحب معارف کو معارف اور طبوعات دار المصنفین کی لوح کی سادگی (سادہ لوحی) نہیں، پر متوجہ کرنا چاہئے ہیں تو قلم کا بلبل یوں نغمہ سرا ہوتا ہے۔

”یہ غلط ہے کہ فلسفہ حق آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہے۔ محنت کتنی ہی حسین ہو، لیکن جبرگی کے بعد وہ بھی نہیں رہتا۔ ہیرا تراش کیل کے آئینہ ہی اس کی سچ و حق، تراش تراش سب میں فرق آجاتا ہے۔“ (ص ۱۶)

سارا ہمدی لٹریچر انجمنی خوشیوں کی تجلیات سے جھل جھل کر رہا ہے۔ شرمی کہیں کہیں بڑھ کر جھلنے کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ متانت کی آنکھیں اس منزل پر پہنچ کر نہیں ہونے لگتی ہیں اور پرہش کی بائیں زبان قلم پر پہلے پروہ ہو کر آنے لگتی ہیں۔

مثالیں ————— ایک آدھ ————— بیجئے۔ مخاطب مولانا سید سلیمان صاحب بہ اپنی متانت و تقدس ہیں۔

”میں خدا خدا کر کے ڈیڑھ سال کے بعد گیس سے چھوٹا یعنی تحصیلداری پر جس کا چنداں شائق نہیں ہوں متعلق ہو گیا

یہ اضافی تصریح اس لئے ہے کہ وطن آیا تو دار المصنفین میرے لئے گھر آگن ہو گا اور آپ بوسہ بہ پیام کی جگہ آپ محورت ہوتے تو کتا، لب بلب کی ٹھہر گی۔ آخری فقرہ سے آپ کے تقدس میں کچھ فرق تو نہیں آتا؟ (ص ۱۶)

انھیں تیار کیا ہے یہی بیوی کی وفات پر دوسرا عقد کیا ہے اور اتفاق سے اس وقت کچھ عیسیٰ تھے حضرت ہمدی کو ایک  
سعدی تھا اور ناگفتنی کس کس طرح ان کی زبان پر اگر گفتنی ہو گئی۔۔

میں سنا تھا مولوی غلام کے رنگیے ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کی روداد عروس جہاں تک معلوم ہوئی غیر حوصلہ افزا  
ہے۔ یہ کیا کہ مرعوب ہو کر صنعت فنی کی آبرو کھوئی۔ خیر گزری کہ علالت نے پردہ رکھ لیا لیکن دوستوں کو  
تلقین رہے گا کہ جسے بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں شکن بستر نکلا۔ عورت گفتنی ہی نازک اور  
لچکدار ہو۔ لیکن پیاس کی فطرت کا راز ہے کہ حریف متقابل کے نقل پر غالب رہتی ہے، یعنی ہار مانتے والی  
نہیں۔ یہ دلچسپ شگفتہ خدا کے صرف قبول بندوں کے حقد میں آتی ہے یہ تصورات آپ کے مذاق سے گفتنی  
ہی لگانے ہوں غیر سنجیدہ نہیں اور گو آپ کا بیوی موت (عقد زفاف) بستر علالت پر گزرا تاہم میں سنا  
چاہتا ہوں آپ کہاں تک اپنے فصر کی تلافی کر سکے اور آیا آپ خوش ہیں؟ دو آتشہ اچھی کھچی ہو تو نشاط  
مستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے، میں اس نقشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ (ص ۱۷۷، ص ۱۷۸)  
اب صاحب تو خیر اس زمانہ میں جوان تھے۔ ایک اور بزرگ مولوی مقبول احمد صاحب صدیقی تھے۔ میں نے انھیں جب دیکھا۔  
سعدی ہی پایا۔ حضرت ہمدی سے ان سے بھی ایسی ہی چوٹ کی ہوتی تھی۔

اس سے آگے بڑھیے تو سعدی کی بیوی کی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ہمدی مرحوم اس صنعت میں بھی بند نہ تھے اور نہ اس میدان  
پر کسی سے پیچھے رہنے والے۔ بلکہ ان کے ادب کی بھی یہی صنعت ایسی ہے جو انھیں آج کے "نوفی پسندوں" کی بزم میں "پریخان" بنائے  
دے۔۔۔۔۔ زیادہ مرنے اس صنعت کے نو پیش کرنے کی ہمت کہاں سے لاتی جاتے۔ دل پر حیر کر کے دو چار فقرے دہرائے  
خیر جاریہ نہیں۔۔

عورت چھستی ذرا مشکل سے ہے۔ لیکن جہاں محسوس اس سے چھٹکا راہ بند نہیں کرتی۔ اس کی اصلی فایہ زندگی  
دوسرے کی بچانے ہے۔۔۔۔۔ اس کی فطرت اس کا سراپا یہ نشاط میں جن سے اس کے دل کو راحت ملتی  
ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دستہ دار نہیں ہو سکتی۔ وہ وار کر کے بے گئی کیونکہ یا مر اس کی فطرت میں دخل  
ہے۔ شائد سے آچل خود نہ گرائے۔ لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ دہرائے کہ مرے  
آچل میں دراصل اسے سینہ کا ابھار غالب کرنا منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اور نظر چاکر دیکھے۔  
محم کا جائزہ نظر ہی ایک طرح کی داؤد حسن ہے جو ہزار پار سائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے بیکر رہیگی۔

اسی لئے جوانی کی آرافتوں میں دستانہ کی طرح چھپتی ہوئی چیز اسے دل سے پسند ہے جس میں یہ ان  
مرکتوں کو قید رکھتی ہے جنہیں عورت کے ارمان محسوس کیے۔ مے دو آتشہ وہ بھی شباب کی جب  
کچھ کھینچ کر قدرتی کنٹروں میں بھری ہو تو کوئی ہے جو ان کی کیفیت مستی اور بے خودی کے محبتوں کی پرتش  
کا دلدادہ نہ ہوگا۔ ترکیب عناصر ہی تو ہے۔ ذرا فطرت کی شوخی دیکھے گا، فتنہ قیامت زائیکہ گھٹائش  
نکالی بھی تو کہاں؟ تو کیا میں میا رحمن ہمیشہ مختلف رہا ہے اور آج بھی اختلاف مذاق کے لحاظ سے؟

حس کے لئے کوئی نصاب مشترک قائم نہ ہو سکا۔ تاہم ہر زمانہ میں محبت کا تعقیب انشباب رہا ہے۔ آج تک سننے میں نہیں آیا کہ اہل عین کی چھٹی ناک کی طرح سپاٹ سینہ بھی کہیں نہ رہا ہو۔  
(انوارات ص ۲۱۱، ۲۱۲)

بعض قصہ گوئیاں اس سے بھی زیادہ فائن و بے پردہ ہیں۔ اور شرف کی محفل میں بیرونی مٹھو آج سے ۴۰-۴۱ سال قبل ۱۹۱۳ء میں جب یہ مضمون اول بار شائع ہوا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت

ہندی ادیب و افشا پرداز ہی نہ تھے کچھ حکیم بھی تھے۔ اور خود لاکھ نہیں رہیں، کہتے رہے اور حالی کے رنگ کی کرکٹیں ہیں۔ اپنے تجربہ کی باتیں دوسروں کو بتاتے ہیں ان کی زندگی سنوارنا چاہتے ہیں۔ طرح خود ان کی نظر میں ہے۔ ایسے اعتقاد چاہتے ہیں کہ ان کے اس پاس والے بھی اس سے مستفید ہوں۔ ہندی خرافات نگاری کے شہدائوں میں تھے اور خود بھی کچھ درجہ اول کے مذہبی نہ تھے۔  
سے میری شبہ او یوں "پرٹو کتے ہیں" زمانہ پھر یاد کر لیجئے کہ میرے شباب الحاد کا ہے۔

گزشتہ تصنیفات کی نظر ثانی کے سلسلہ میں میں یہ دیکھتا ہوں کہ فلسفیت کے زور میں مذہب ربارک یا طرز ادا ایسا نہ ہو جس سے اس کی تحقیر و تخریب سے سی جے رنجی بھی باقی جاسکے۔ میں کرکٹیں کہ سنجیدگی تصنیف کا اقتضا یہی ہے۔ یہ ممکنہ ہم برس کے بعد سمجھ میں آئیگا۔ ایک ہیں آپ کو کم از کم ڈاکٹر لیسان کی طرح فیاض دیکھنا چاہتا ہوں۔ سو رہے کسی باقی مذہب کو دراصل میٹھی چھری زہر کی گھٹی "کا مصداق ہو گا۔ آدھ میں شبلی کے مصلح اعظم کو عمدہ نہ لکھیے تو مٹھو پر آپ کا شکر گزار ہو گا۔ (مکاتیب ص ۱۷۷)

باندے میں میرا چھوٹا اور ہیلہ پچھلے میں عالمگیر و باقی انفلوئنزہ کی فذر ہو گیا دو ایک روز بعد ہی آگیا ہوں حضرت ہندی تعزیت نامہ لکھتے ہیں۔

"نہایت افسوس ہوا کہ محبت کا اثر آدھیں ضائع ہوا۔ غالباً یہ عالمگیر بیمار کی عنایت ہو گی۔ ہمارے ایک زیادہ ان کے ساتھ ہے جن کی بھری گرد و فتنہ خالی ہو گئی اور جن کا آج کل یہ نقشہ ہمارا  
یہ سینہ میں تا زندگی رہے گا

نزا داغ دل میں نشانی رہے گا  
آپ تنہا نہ چھوڑتے تو اچھا تھا ساتھ رکھیے یا ساتھ دھیے۔ کہ نہی نئی چوٹ کے لئے مرہم نہ  
تافو بی فطرت کا یہی جتن کا پڑ بعض وقت بلا کے جلتے ہوئے ہے۔ مگر یہ انسان کی عام تقدیر

لے شیل کی سیریز الفی جلد اول کے مطالعہ کا یا اثر ہوا تھا کہ صاحب سیریز کی عظمت کا اس وجہ میں غافل نہ  
دکھنے لگا تھا۔ انکا محض کے مقابلہ میں یہ وجہ بھی غنیمت تھا۔ اور ہندی مرحوم میری اس نصیحت کے را

تین جید ماہیوں ہوں وہاں کے جوڑ توڑ اور آپس کی سازشیں ایک کھلا فراز تھیں۔ میں کس ونا تجربہ کار حضرت ہمدی، کباری، زرد کہ میں محسوس ہونے سے بچا رہوں، دیکھئے، یہ مشورہ بھی بائکین کی کن اوادوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

”جس جلیل القدر شخصیت کا آپ نے ذکر کیا ہے اپنے روابط اس سے قائم رکھیے“

اور ہم چٹنوں میں یعنی جس دائرہ میں آپ متبادلہ سے رکھے گئے ہیں ان میں سے کسی سے کامیابی تو خیر کبھی بعد از دل کا دکھیں نہ آئے۔ اسی طرح شب کے کھٹنے کا راز شمار صبح بھی : افشا کرنے پائے، آپ خود نفسیات کے عالم ہیں۔ لیکن جی نہیں مانا چھوٹا بھائی سمجھ کر حدود سے نکل جاتا ہوں۔

میں نے بہتر سے بہتر اشخاص کو بی دنیا میں کم ہیں پایا۔ دوسروں کے لطف قائم رکھنے کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم نسبت ان سے بہتر حالت میں ہوں۔ اس خاصہ جمیعت کو نفسیات کی کس شاخ کے تحت میں رکھیے گا؟ (صفحہ ۱۵۹، ص ۱۶۰)

اور پھر یہ خبر سن کر کہ میں جید آباد سے ایک معقول ملازمت چھوڑ کر چلا آیا ہوں اور واپسی کا قصد نہیں رکھتا، کس طرح بچے پھارتے ہیں۔

”کیا واقعی اب واپسی کا قصد نہیں؟ آپ تو فلسفی ہیں دنیا دیکھنے کے لئے ہے، برتنے کے لئے نہیں اور دنیا کی حماقت سے لطف اٹھانا بھی ایک عیش ہے“ (صفحہ ۶۲)

اپنے ایک عزیز قریب کے سامنے جو ساتھ ہی مجلس دوست بھی ہیں، اپنا دل کھول کر یوں دکھ دیتے ہیں۔

”سمجھو یا نہ سمجھو، میری وطنیت یعنی دنیائے احباب تم ہی دونوں تک محدود ہے۔ اونچی سے اونچی سوسائٹی میں اٹھا بیٹھا، بڑے بڑے جگہ گنتے نظارے دیکھے، عمر اس میں گزری لیکن قسم لے دو اگر انھیں خیر ہوئی ہوں کبھی کی ہوشربا روشنی میں بیٹھ کر بھی کبھی اپنے سادہ چرخوں سے بے نیاز نہ ہوا۔ اس سے زیادہ نمائشی دنیا میں ہم سے کیا جاتے ہو، اچھے اچھوں کو دیکھا آپ سے باہر، سبک سری کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتے ہیں“

ہمدی مرحوم کوئی بڑے مذہبی نہ تھے۔ لیکن مذہب، بیزار و مذہب دشمن بھی ہرگز نہ تھے۔ آزاد خیال سے تھے اور اپنی مذہب پر ہر جگہ اچھا لٹے رہتے تھے۔ مولویت کے نام سے چڑھنے اور ”مولوی“ پر خار کھلے بیٹھے رہتے تاہم مسلمان تھے، توحید کے قائل اور رسالت کی تصدیق کرنے والے۔ لباس مغربی زیب تن نہتا لیکن لباس کے اندر دل خالص مشرقی تھا۔ دماغ مغربیت کے اثر سے آپر کی لینے لگا لیکن یہ اسے گھوم پھیر کے پھر ایمان و اسلام کی طرف واپس لے ہی آئے۔

شفقت، ہمد روی، اور اخلاص کے پندے تھے۔ قلب رقیق تھا کسی کی تکلیف نہ دیکھ سکتے۔ اپنے بیگانہ سب کے ساتھ  
 حسنی سلوک کی فکر میں لگے رہتے۔ اور اپنی فیاضی کا دروازہ کسی پر بند نہ رکھتے۔ نماز پابندی سے نہ پڑھتے لیکن جب کبھی پڑھتے تو اکثر  
 غسل تازہ کے بعد ہی پڑھتے تو، اپنی حیات، ہمدی بیگم کا بیان ہے کہ شروع شروع کے ساتھ پڑھتے، اور وہ عام گننے وقت تو قصیدہ  
 جمرویت پڑھتے۔۔۔۔۔ زندگی کی قلمت کچھ روئے اور ملی جاتی تو مجھے اپنی جگہ یقین ہے کہ ان کی اسلامیت خوب بچتے اور  
 نمایاں ہو کر رہتی اور اپنی تخلیقات صرف لفظی کو نظر ثانی و اعفادہ کے بعد ہر طرح پاک و پاکیزہ بنا کر ایک بڑا ذخیرہ جمع معنی میں  
 "ادب اصیف" کا اپنی یادگار چھوڑ جاتے۔



کے عقلی و انکشافی علوم پر بلند پایہ جتھانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا لکھا کر اب معلوم ہوتا تھا بند لٹ گیا ہے۔ مشورے چند منزلیں اور طے کیں تو ان کے ایک عربی ماہر نے ”الیان“ پر آگاہی چھوٹی۔ یہ ماہر عہدِ عہدِ صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے سلسلہ میں غلام جسے وہ مشورہ نگ کا میاں سے چلاتے رہے۔ اسی وطن میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کبھی غلام جسے شخص نے جنھوں نے بیرون ہند کی صحافت سے ناظر جوڑا، اور مصر و یمن و یمن کے رسالوں اخباروں میں مضامین لکھے۔ ”الیان“ اسی لکھنؤ کے سہارے نکلا تھا۔ پھر جب ”الہلال“ نکلا تو کچھ دنوں بعد وکیل کی لوح سے ان کا نام نصرت ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ ابوالکلام صاحب نے عہدِ صاحب کو ”الہلال“ کی مسلک ادارت میں بندھ لیا ہے۔ ”الہلال“ سے ظفر علی خاں صاحب نے ان کو ”زمیندار“ میں کھینچا، اور دو تین برس کے وقفے کے بعد ان کا نام ظفر علی خاں صاحب کے عہدِ رسالے ”مسارہ جہ“ میں شریک مدیر کی حیثیت سے نمودار ہوا صحافت میں غالباً یہ ان کی آخری نمود تھی۔

یہ معرفت بہت بھاری بھر کم تھی، لیکن عہدِ صاحب کی علمی فضیلت کا ایک بے غور واقعہ و وعدہ اس وقت میرے سامنے آیا جب میں دارالترجمہ سے متعلق برکے جید راہدار ہوا تھا۔ طبق مشورہ کی غرض سے حکیم امین خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا حکیم صاحب نے فرمایا: وہاں ایک بڑے فاضل شخص عہدِ صاحب بھی ہیں۔ سفیرِ کابل ۱۹۰۹ء سے تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی فکر میں تھے، ایک دن سید صاحب نے مجھ سے کہا: حکیم صاحب! آپ کے ہندوستان میں ایک آدمی ایسا نہیں ملتا جو ابن خلدون کی تاریخ کا ترجمہ کرے۔ مجھے تین سال جو کر رہے ہوئے، مجھے یہ سن کر بڑی شرم آئی، سو چنا ہوا، مولوی عہدِ صاحب نے بڑے بھائی سے ”قانون“ پڑھا تھا، میں جانتا تھا کہ وہ عربی فادی میں بڑی درست گاہ دکتے ہیں، خط لکھ کے ان کو بلا یا اور انھوں نے یہ کام انجام دے دیا۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ بہترین ترجمہ کیا اور دو سال میں پوری کتاب کا ترجمہ کر دیا۔

یہ قسمت کی نیرنگی تھی کہ عہدِ صاحب جس شعبے کے رکن تھے اسی شعبے سے ایک وہ بھی منسلک ہوا جو ان کی پائنداز میں بیٹھنے کے قابل تھا۔

لیکن اس گہرے تاثر کے باوجود میرے دل میں شوقِ ملاقات نہ تھا۔ خیالی تھا کہ جب وہ ایسے ہی فضیلت پناہ ہیں تو اپنے متحد و ہم کاروں کی طرح اپنا سارا علم اپنی نکتہ چینی پر لاوے رہتے ہوں گے، لکھنؤ میں سخت تھری ہوگی، زمین پر اس طرح چلتے ہوئے

۱۔ وکیل ایک ڈپٹی صاحب کی مستقل تصانیف و مقالات ہیں ”حکمت“، ”علم الحدیث“، ”فلسفۃ القرآن“، ”فلسفۃ ابن عربی“، ”دعائۃ العرب“، ”تاریخ عرب قدیم“ اور تراجم بیہقی محمد عبیدہ کی مشہور کتاب ”الاسلام والاضواء“، ”لجزایران“ کے جواب میں لکھی ایضاً عبدالرزاق شامی کی ”الاسلام دین الفطرۃ“ اور امام راغب کی ”تفصیل التشریح و تحصیل السعادتین شائع ہوئیں۔ ۲۔ اہلبیان وہ ہیں جنھوں نے مشرق تھا، ایک حصے میں عرب ممالک کے لئے ہندوستان کی تاریخ و رجال اور حالات حاضر پر عربی میں مضامین ہونے لگے۔ دوسرے حصے میں عرب اہلِ قلم کے مضامین با ترجمہ و درج کیے جاتے تھے اور تیسرے حصے میں بلادِ اسلام کے حالات اور خبریں آر دو میں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے زیادہ مصر، شام و بیروت اور شمالی افریقہ، تونس و الجزائر و مراکش میں اس سلسلے کی مانگ ہوئی۔

مگر توڑی کھڑوں پر چل رہے ہیں، اور باقی انھیں بند کر کے اس طرح کٹے ہوئے جیسے بہت دور کسی سیارے میں بیٹھے اپنے اپنے پر وچ نازل فرما رہے ہیں۔ ————— مگر جب ان کو دیکھا، تو پہلی نظر میں وہیں پران کی شخصیت کا پہلا عکس یہ پڑا کہ شخص اپنے تئیں کوئی غیر معمولی و ولایت الٰہی نہیں سمجھتا، جس انسان، لاکھوں کھڑوں انسانوں کی طرح کا ایک انسان! اور اس سے زیادہ کچھ ہونے یا مٹنے کی کوئی شے بھی نہیں کرے گا۔ اور میں بھول گیا کہ وہ کوئی بڑے جنادری فضیلت پناہ ہیں، اور میں سطوت و ریاست بہت قدر کھڑا ایک نامادان لڑکا ہوں۔ چہرے پر شرافت کی ملامت، خند و خال میں علم کا رچاؤ۔ آنکھوں میں گہرے باقی کا وقار۔

اسلاف عالی گوہر تھے، علم صدیوں سے متواتر تھا، جامہ و منصب بھی دیا بسا۔ نیک نہاد و لادنے جوہر و اہل بزرگوں کی تسبیح میراث پر رہے جن سے محفوظ رکھی اور ایک نسل نے دوسری نسل کو پہنچا دی رہا یہ لوگ صدیقی تھے، صدیقیت ان کے علمی شرف کے انھان کے اوضاع و اطوار میں نمایاں رہی۔

شیخ عہد نام ایک صاحب فضل و کمال اس خاندان کے مورث تھے وہ آٹھویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستان آئے۔ اس زمانے میں علم کے خافوں کی آخری منزل پر وہیں تھا۔ شیخ عہد بھی یہیں پہنچے اور جون پور میں خود وہ اور ان کے گھرانے کے لوگ تادم علوم میں مشغول ہو گئے۔ ابراہیم شرقی کے زمانے میں اس گھرانے کے درس علوم کا شہرہ زبان زد عام تھا۔ اس نے بارہ گاؤں میں حاصل کیا۔ دسے وان لڑکوں نے انہی دیہات کو اپنی درس گاہ بنا لیا۔

مسلمان بادشاہوں کی یہ جاگیر بخش یاں ایک مستقل فکر کی حامل تھیں۔ جاگیروں کا مدعا تہذیبی اداروں کے لئے آزاد و اختیار رہا یہ ہمارا ہوتا تھا۔ ہر درس گاہ قرب و جوار کے طلبہ کی اتانتی درس گاہ ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر طلبہ نئے کے کپڑوں سے گھر سے لٹے اور میں درس گاہ میں پہنچتے، فراغت حاصل کرنے تک ان کے تمام مصارف کی وہی درس گاہ کفیل ہوتی۔ یہ دیہاتی درس گاہیں صحت مند عظیم و تربیت کے علاوہ تبلیغ کا بالواسطہ وسیلہ تھیں۔

عمادی خاندان نے پورب کی بستیر میں تقریباً ساڑھے چار سو برس تعلیم و تحقیق کی تمجید روشن رکھیں۔ آخر زمانے میں وہ پورب میں۔ شیخ عبدالنقاد و عمادی کی درس گاہ مرجع علم تھی، جس میں بیک وقت دو دو سو طلبہ متفرق رہتے تھے۔ بادشاہی و قہر کی جاگیر و دھول کی فواری کے ابتدائی دور میں ضبط ہو چکی تھی، لیکن چشمہ نور جاگیر پر یہ تعلیم خود ان کی ذات تھی۔ بزرگوں کا زرخیز "امر نور" بسا ہوا تھا، اس کی آمدنی سے طلبہ کی مدد کرتے اور دوزن وقت کا کھانا ان کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھاتے۔ عمادی صاحب پر واداشتے تھے۔

اس تعلیمی اور تہذیبی خدمت گزاری میں جو ترقی بھی اپنے دائرہ عمل میں مرووں کے ساتھ شریک تھیں، اور یہ ہمارے معاشرہ میں نیکو لوگوں پر اس پرانا دستور تھا، اسی سے خاندانی اوصاف چلا پاتے تھے، تہذیب و دانش کی برومند ہوتی تھی اور معاشرے کا بڑا بڑا بندھا رہتا تھا۔

عمادی صاحب نے علمی شیفتگی کے اس ماحول میں آنکھ کھولی۔ خاندان میں اب تک بول چال کی زبان عربی تھی صرف و نحو اسی سے پڑھی۔ اور گیارہ برس کی عمر میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ خود "الف لیلہ" پڑھ لیتے اور اس کے مشکل مقامات لغت کی مدد



مل کہہ جیتے۔ اسی کتاب نے عربی انشا کا شوق پیدا کیا۔ علوم و ادب اپنے والد اور واو اسے پڑھے، و وفون بزرگ صاحب فضل تھے۔ ادب کی و میروں آخر علم کتاب میں چھوڑ کے قرآن اور حدیث کے درس میں بہترین ادب مایہ میں پڑھا و یا۔ اس طریق تعلیم سے طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو گئی کہ جاحظ و ابن قتیبہ کی ادبی مصنفوں اور کلام عرب کے مجرموں سے خود استفادہ کرے۔ یہ زندگی سے ہنسنے بولنے، کھڑے اور سادہ، لطیف اور منطقی، کانٹے کی تول تھے ادب کی تعلیم تھی۔ مثنوی اور عربی اس کے آگے پانی تھے یعنی اور منطقی علم میں ملا نظام الدین کے اصول پر ہر فن کی ایک ایک دو دو جامع و مستند کتابیں پڑھائیں، فقہ میں امام نصاب کے خلافت امام محمد شیبانی کی جامع صغیر و جامع کبیر پر گفتگو کی، اور آخر میں امام رازی کی شرح اشارات پڑھائی۔ یہ دس نظامی پڑھاؤ تھا اس کے بعد خیر آبادی و ریاست سے فکر و نظر کی وسعت حاصل کرنے کے لئے مولوی ہدایت اللہ خان رام پوری کے دروس میں داخل کر دیا۔

ہزاروں مکتبیں ہوں ان بزرگوں پر جنہوں نے فقہ میں سلاست مولوی کا قانون و زمین نشین کیا، اور غیاوی تعلیم میں آزاد و فکر کا سبق پڑھا یا۔ اگر خدا نخواستہ عماری صاحب قدوری شریف اور مولانا کتہ الدقائق کی آلی اولاد کے چکر میں پڑھاؤ اور جو کچھ بھی پڑھنے لیکن بلند نگاہ اور وسیع القلب عماری صاحب نہ پڑھنے، چھوٹی چھوٹی باتوں میں ٹکٹے، ”صورت معنی“ اور ”معنی صورت“ کے کانٹوں میں آٹھنے، دوسروں کے لئے بھی مصیبت بنے رہتے اور خود اپنے لئے بھی۔ قرینے کی ہٹھی میں ہٹھی سٹھا ڈاڑھی کو ایک ہشت و دو انگشت بنا کر پڑنا۔ ٹخنے ٹھک پانا کما نہ نہیں سکتے، اور یہیں اتنی گری تڑپاؤنے کہ مونچھوں کے وجود کا اطلاق ہی نہ ہو سکتا۔ شرح اشارات رازی کا سبق حقیقت میں آزاد و فکر کا سبق تھا۔ امام رازی بڑے بہت شکستہ انداز نے فتنہ نشین کے طاقتور سے بڑے بڑے بڑی کر گرایا ہے اور بڑے بڑے سے ان کا منکر کیا ہے۔ اور اس بہت شکستہ کے بعد بہت بڑا احسان یہ فرمایا کہ خود اپنا بہت کسی طاقت سے نہیں بچایا۔

درسیات سے فراغت کے بعد حکیم عبد المجید خان صاحب سے ”ولی“ جگہ کے طب کی مشہور کتاب ”القانون“ پڑھا

مولوی ہدایت اللہ خان رام پوری، مولوی فضل حق خیر آبادی کے جگہ دو رنگا رشاگردوں میں تھے۔ چند سال رام پوری میں دیا، پھر شملہ میں جون پور آئے اور مدرسہ امام بخش کو دولتی بخشی مولوی حبیب الرحمن خاں بیروانی ان کی کبیم انفسی کا ایکٹ اذ بڑے مزے سے کر بیا کرنا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ اساتذہ العلماء مولانا لطف اللہ مدرسہ عالیہ کے امتحان کے سے ہیں رام پور تشریف لے گئے سخت گرمیوں کا موسم تھا، امتحان سے فراغت پائی تو بارہ بج چکے تھے۔ اساتذہ العلماء کی عادت تھی دوپہر کے وقت باہر نکلنے تو سر پیرا وروال بلیٹے، چاؤ ووال کے مدرسہ سے پیادہ یا اساتذہ العلماء مولوی ہدایت اللہ خان رام پوری کے مکان پر پہنچے مولوی صاحب فیلو کہنے زمان خانے میں جا چکے تھے، اطلاع پاتے ہی باہر تشریف لے گئے اور شان سے ہمارے عزیزی کی چیرائی کی جو انہی بزرگوں کا حصہ تھا۔ اپنے بھتیجے کو بھیج کر کنویں سے تازہ پانی منگوا یا اور غرض اپنے ہاں سے اپنے ہمارے کے پاؤں دھوئے۔ سپاس گزاری یہ بھی کہ ”مولوی لطف اللہ صاحب نے و محبوب ہیں کہ فرمایا کہ اپنے ہر لوگوں کے ساتھ ان بزرگوں کے یہ آداب تھے۔

دعوتِ اسلام اور ادب عربی و عربیہ سے فنونِ ادب کا فیض حاصل کیا۔ اور طبیب صاحب نے کتب سے مکتب نوازی کی مسند پر بیٹھا۔

اس زمانے کی کچھ دنیا میں مولوی بیدار علی آسی ایک مشہور و مقبول شخصیت تھے۔ وہ مولوی عبدالجبار قرنی محل کے ممتاز شاگرد تھے۔ اور دام پور کے مدرسہ عالیہ میں مدرس رہ چکے تھے۔ مدرسہ چورگر لکھنؤ میں "اصح المطالع" کے نام سے تصنیف قائم کیا۔ جس میں حدیث و فقہ، خصوصاً عربی کی درسی کتابیں تصریح و تنہیب کے ساتھ چھاپتے تھے۔ آسی صاحب کو اپنے شاگردوں کا یہ کہنے سے ایسے لوگوں کی صحبت و ہم آہنگی تھی جو ادب اور مختلف علوم میں دستِ گاہ رکھتے ہوں اور غلط نسخوں کی تصحیح میں ان کی مدد لیں۔ وہ اپنے کسی کام سے دام پور آئے، عرب صاحب نے ان کے مطالب کے موزوں ترین آدمی سے ان کو متعارف کیا، مولوی صاحب کتب سے مطبع کی زمینت بن گئے۔ یہاں قلمی اور مطبعہ شے تھے اور عمادی صاحب اول سے آخر تک اپنے ضبط ایک ایک کتاب پڑھتے اور نقل و کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ آسی صاحب کو کاپیاں اور پروف دیکھنے میں بڑی حساسیت تھی۔ جیسے بچوں کو بچوں کے ساتھ قرآن پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کاپیاں اور پروف پڑھتے تھے۔ یہ کام انہوں نے اپنے وقتے دکھا۔ کام کا دائرہ وسیع کر دیا اور حدیث و فقہ کے علاوہ معقولات کی بہت سی کتابیں اور روایات کی تصحیح تمام کتابیں شائع کیں۔ "اصح المطالع" کا نام درسی حلقوں میں صحتِ طباعت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ عمادی صاحب نے اپنے وقتے کہ اس کام سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا، غلطیوں کی تصحیح اور پرکھنے کی استعداد پیدا کر دی، اور بخیر پڑھنے اور جو سے مباحثہ و بحثیں ہو گئے اور پوری کتابیں پڑھنے سے تفصیل اس کے مباحثہ سامنے آ گئے۔

تصحیح کا بارجب بلکا ہوا آسی صاحب نے پہلے "الریاض" نام ایک عربی ماہنامہ جاری کیا۔ پھر عماد الوالی صاحب نے "ہمامت" البیان" جاری ہوا۔ یہ دونوں رسالے عمادی صاحب کی مدارات میں نکلے تھے جب ناخن نرم تھے اس وقت سے عربی انسان کا وقت پرورش پا رہا تھا۔ تصحیح کے کام سے جب فرصت پانے عربی جو اُن کو مضامین بھیجتے رہتے تھے۔ آسی صاحب نے ان سب سمجھا کہ یہ اب کرم جو باہر پرستنا ہے گھڑی میں کیوں نہ برسے۔

عرب محمد طیب نوادرِ عالم سے ایک نادرہ تھے، علوم کا ہندو دیا، وطن مگر تھا، نہ جانے ہندوستان کس طرح آنکلی، مولوی منٹو خاں خیر آبادی دکن میں ملتا ہے معقولات میں کمال حاصل کیا، فنی علوم میں صاحب دست گاہ تھے، کتاب سے بے نیاز، ان کا علم ان کے سینے میں تھا۔ ادب میں اپنا جواب دہ رکھتے تھے، کلام جاہلیت پر اس قدر عبور تھا کہ گفتگوں قصبہ پر قصبہ مسلسل سے ماسیہ پڑھنے کے انداز سے شعری تصویروں کی ہو گا کسی کو دیتے اور لہجے سے شعری بیانیہ کر دیتے۔ نکات سخن بیان کرتے دروازے دینے۔ محاشی یا منتہائی شعرستانے کی لہر آجائے تو گفتگوں جہرنگ و ہم معنی شعر سے جاییے جس مجلس میں بیٹھ جاتے ہی فاجرانہ نہ جھٹکتے۔ نواب ملک علی خاں کی مجلس کے بلبل ہزار داستان تھے، جد و ہزل میں طاق، نواب ان کی بہت ناز و نیاز کرتے۔ مذہب میں پانی تھے جس رنگ کے کلاس میں چاہو ڈال دو، مگر رہتے تھے، اسلام کے دائرے کے اندر۔ ہندوؤں کے علاوہ عالمیہ کے صدر و متمم ہے اور غلبہ کے وظیفے بڑی فراخ جو صلی سے بھم کئے۔ خلا کی گھنٹی ہوں اس مرد آزاد و بے باک پر۔

عمادوی صاحب کے فضل و کمال سے سبک آموز میں دارالترجمے اور جید رآباد کے دوسرے علمی اداروں کو استفادے کا شرف حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے (خدا ان کی اپنی حفظ و امان میں رکھے) اس قدر شناسی کے ساتھ تقرر فرمایا تھا کہ ایسے علم و فضل والے علماء خال خال نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ مشرقی شعبے میں اس پایہ کے فاضل شخص کا موجود ہونا مشرقی شعبے کا بڑا شرف ہوگا۔ دارالترجمے کو یہ بڑا شرف "تقریباً بائیس سال حاصل رہا۔ اس مدت میں وہ سبھی کچھ سہہ۔ مترجم، ناظر مذہبی علمی مہتر، واضع اصطلاحات۔ عمادوی صاحب کو عربی فارسی کی قدیم و جدید لغات و مصطلحات پر بڑا عبور تھا۔ اس لئے وہ ہر شعبے کی مجلس مصطلحات کے مستقل رکن تھے، اور ان کو ارکان مجلس میں بڑا امتیاز و احترام حاصل تھا۔ باایں سب وہ علمی بینہانی سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اصطلاح وضع کرنے میں مدد دیتے اور اس بات سے غرض نہ رکھتے کہ ان کی مدد اور رہنمائی قبول کی گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا بوجھ نہ دے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

داثرۃ المعارف اور کتاب خانہ اصفیہ حیدرآباد کے دو عظیم ترین بین الاقوامی شہرت کے ادارے ہیں۔ جمادی الثانی ۱۳۸۱ھ کے زلزلے کے رکن رکین تھے۔ داثرۃ المعارف نے تاریخ اور فلسفے کے علاوہ ہیئت و ہندسہ وغیرہ علوم کی متعدد کتابیں یورپی شرق مشناسوں کے اشتراک سے ایڈٹ کی ہیں۔ اس قسم کی تمام کتابوں کی تصحیح و تہذیب کے نگران اعلیٰ عمادی صاحب مقرّر کے جانے نہ تھے۔ کتاب خانہ اصفیہ کی مجلس خطوط میں وہ قلمی نسخوں کے مستنصر مقرر تھے۔ کتاب کسی موضوع و مضمون کی ہو اس کی علمی قدر جانچنے میں ان کی نگاہ بہت تیز تھی۔ لیکن مادی تمیزت کیا جو اس میں وہ کر رہے تھے اور اس سے سروکاری نہ رکھتے۔ جس نے زندگی بھر بازارا جاکے کوئی چیز خریدی ہی نہ ہو، وہ قیمت جانچنے میں نیز نگے ہی لگاتا۔ ایک درگیری اور حکم گیری ان کی شخصیت کی ایک بنیادنی ایڈٹ تھی۔

۱۔ مترجم کی حیثیت سے عوامی صاحب کے قلم سے حسبِ اہل کتاب بن گلیں :-

۱، مؤرخ مسعودی کی "تنبیہ و اشرف" اور "مرج الذهب" ۲، مؤرخ طبری کی تاریخ اوسل و الملک کی آخری دو جلدیں۔  
۳، طبقات ابن سعد کی بارہ جلدیں۔ ۴، ابن حزم کی اہل و اهل — یہ آخر الذکر کتاب تفسیر و حدیث علم کلام و  
فلسفہ اور مذاہب کی معلومات کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔

۷۲ پانچویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی طبعی و ریاضیاتی مصنف ابن النہیم کے حسب ذیل رسائل :-

(١) رسالة الضموم

(٣) رسالة المراهبة المحرقة، بالدراسة (٤٣) رسالة المكان

(۵) رسالت مشکل بنی موسیٰ

(۶) مساحت

(۴) سائتھنوں دا قمر۔

محدث ابن حجرزی کی مشہور تالیف یعنی اورسیرت عالوں کا دوسرا منظر نامہ، صدر بخ و غیرہ

حیدر آباد سے عادی صاحب کے تعارف کا ذریعہ ظفر علی خاں صاحب تھے۔۔۔۔۔ یہاں حیدر آباد سے میری  
 راجہ حیدر آباد کی روح ہے، روح کا مظہر جس سے حیدر آباد و حیدر آباد تھا۔۔۔۔۔ اور اپنے رفیق و برہنہ کی کچھ اس  
 سادہ سے تقریب کی کہ پیش نماہ سے تار کے ذریعے طلبی ہوئی، درباری لباس برطرف کر دیا، پہنچتے ہی باریاب کیا اور ستر  
 تھے لوگوں کی رکنیت کا شرف بخشا۔ پہلی ملاقات میں ہنزوات کا نقش اٹھا کر اپنا کہ عادی صاحب خاص امتیازوں کے  
 دروہ بن گئے، ایسے امتیاز جن میں وہ یکسر منفرد تھے۔ بارگاہ میں جو نادر قلمی کتابیں سلسلہ و انعام کی غرض سے پیش کی جاتیں، اور  
 شاعرانہ صنف اپنی جو کتابیں فوارشس و سرپرستی کی غرض سے پیش کرنے ان کی قدر و قیمت نہ جاننے کے لئے ایک ہی معتد  
 ۴۔۔۔۔۔ عادی صاحب ایہ بھی معاملت تھی، براہ راست "ہمارے قلموس" اور "ہمارے جاحظ" مخاطب کئے جانے۔  
 ایہ عادی کتاب خانے اور آصف صاحبی بنیاد آفس کے دروازے ان پر کھول دیئے اور اس نادر تاریخی مواد سے  
 تیسرے، چھپے کا اتفاق عادی صاحب کے سوا کسی کو نہیں ہوا، خود اپنے لئے ہندو و کن کی سیاسی تاریخ لکھوائی اور سب کے  
 ۱۰۔۔۔۔۔ کہ اپنے اطمینان اور اپنی قلوب میں اس قدر افسانے کے لئے قرآن کے نامی گرامی ترجموں کی نسبت توفیق چاہی کہ دیکھ  
 ۱۱۔۔۔۔۔ ان میں کوئی نسخہ مستند ہے اور اگر اس میں غلطیاں ہوں تو حاشیے پر اصلاح کرو، کس قدر جذباتی بنا ڈالنے والا  
 عادی نسبت کو یہ امتیاز اور منفرد امتیاز، لیکن عادی صاحب کا جو ہرزوات اس قدر اعلیٰ اور گراں مایہ تھا کہ یہ سارے  
 امتیازات ہمیشہ تک میں بارش کی ایک بوند تھے !  
 عادی صاحب کے بطور تحدیث نعمت "مجی ان باتوں کے ذکر سے اپنی زبان کبھی آلودہ نہیں کی۔ وہ جو آرو کی ایک کہلو  
 ۱۲۔۔۔۔۔ آئی کہ کنوں میں ڈال، بالکل اسی طرح انھوں نے یہ سارے کام کئے اور ان کے ذکر کا رخاموشی کے کنوئیں میں ڈال دیئے۔  
 ۱۳۔۔۔۔۔ سے زیادہ نلوہ کاری اور کیا ہوگی۔ کہ وہ بھی ان کاموں سے بے خبر رہے جو ان سے قریب تر تھے۔

۱۔۔۔۔۔ ظفر علی صاحب کو اعلیٰ حضرت آصف سابق اپنے زمانہ شہزادگی سے جانتے تھے اور اسی جانتے کی وجہ سے ملک بدر کئے گئے تھے۔  
 ۲۔۔۔۔۔ یہ بھی کہ اعلیٰ حضرت آصف سادس و میر محبوب علی خاں کے حکم سے تمام سیکرٹری شہزادہ ولی محمد کو ملکیت کا کام سکھانے جاتے  
 تھے، ظفر علی خاں صاحب اس زمانے میں ہوم سیکرٹری عزیز مرزا صاحب کے اسسٹنٹ اور پیش کار تھے، کافذات پیش کرنے  
 ۳۔۔۔۔۔ میں بھی ان کے ساتھ جاتے، عزیز مرزا صاحب تمام سیکرٹریوں میں سب سے زیادہ لائق فائق، اسبابی اور کام میں رعد و  
 ۴۔۔۔۔۔ ان تھے، ولی محمد کی نگاہ میں بہت عزیز ہو گئے، دوسرے سیکرٹریوں کو ان کی فوقیت گراں گزری، ان لوگوں سے یہ سازش  
 ۵۔۔۔۔۔ تھی کہ عزیز مرزا ولی محمد کو برسرِ اقتدار لانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس باواش میں عزیز مرزا صاحب اور  
 ۶۔۔۔۔۔ ان کے دو یقظ ظفر علی خاں صاحب ملک بدر کر دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت آصف سابق نے یہ بات یاد رکھی، اور جب  
 ۷۔۔۔۔۔ ظفر علی خاں صاحب کرم آباد کی قید محض سے نکلے اور اسی کے لگ بھگ زمانے میں عثمانیہ بونیورسٹی کی انصافی کتابوں  
 ۸۔۔۔۔۔ کے لئے سر مشتبہ تالیف و ترجمہ قائم ہوا، تو ظفر علی خاں صاحب کو حیدر آباد بلا یا اور اپنے خاص چہان سے مغربی  
 ۹۔۔۔۔۔ سب سے کارکن مغرور فرما دیا۔

یہ ان کے کھربے علم کا گھمبیر انا تھا۔ انا احساس ذات ہے، یہ احساس جس قدر واضح اور مستقیم اور علم و نظر سے متاثر ہوتا ہے اسی قدر گھمبیر ہوتا ہے، اور جس قدر گھمبیر ہوتا ہے اسی قدر ہوش مند شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ لیکن ایسا جس نفسی کیفیت کا اظہار ہے، وہ مستقیم اور متوازن احساس ذات نہیں! انا کی بدستی ہے۔ عوامی صاحب کو احساس تھا کہ وہ علم و نظر سے بہرہ مند ہیں، ان میں ایک خاص گمان اور خاص بصیرت ہے۔ اس احساس اور فطرت و مشرب ہزارگوں کے فیض تربیت نے ان کی ہوش مند اور جیس شخصیت کو جنم دیا۔

ان کی شخصیت میں اس قدر اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں جو آج ڈھونڈنے بھی کہیں نظر نہیں آ سکتیں، نہ منافقا ہوں  
میں نہ مدرسوں اور مکتبوں میں، نہ مسجدوں میں، نہ کسی بڑے سے بڑے ادعائی مرکز میں؛ شائبے کا تو ذکر ہی کیا، نخوت اور  
تجترگی پر چھا میں بھی ان میں نہ ملتی۔ اپنے ہر طے کرنے والے کی بے حد بزرگداشت کرتے، اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس طرح  
پیش آنے کو باوجود ہر حیثیت میں ان سے چھوٹے ہیں۔ اپنی کسی بات اور کسی طریقے سے ایک جاہل ہم نشین کو اس بات کا  
ضعیف سا بھی احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ نیکی اور دست گیری کا جو سلسلہ ایک دفعہ شروع  
کر دیا مرتے دم تک قائم رکھا۔ ان کی خواہشیں دست گیری کی ایک مستقل مدد فی معمولی نہیں جیسے سو مسرو پے کی  
مستقل معاونان کا اپنا حصہ کھانا کپڑے، در او پری مصروف سمیت پانچ فی صد تھا اور دست گیری کامیابی میں فی صد!  
دست گیری اس شان سے کرنے کہ اونچا اونچا بیچارہ تنہا اور نیچا اونچا اونچا۔ جسے مرید یا اخلاص اپنے پیرو مرشد کو اور  
سعادۂ مندر شاگرد اپنے استاد کو نذر پیش کرتا ہے۔ عیدین کے موقع پر وفز کے چراسیوں کا گروہ عید کے سلام کو آنا  
قرآن کریم و ماں کا عام دستور یہ تھا کہ چار سیویں کا سلام دیکھ لیا اور انعام دلوا دیا۔ لیکن عمادی صاحب ان سب معاف کرتے، بزرگ  
داشت سے ان کو بلاتے، خود ہر ایک کو عطایاں پیش کرنے اور عید کا انعام ٹھیک اسی طرح پیش کرنے جن طرح وہاں اعلیٰ حضرت کو  
نذر پیش کی جاتی تھی۔ عید اور عید گروی میرے لعنت و رسم سے خارج رہی ہے، لیکن عمادی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا مقدم تھا۔  
ادن کی بلندیاں دیکھ کر میری پسندیاں پانی پانی ہو جاتی تھیں۔ سادہ رنگ پر چھتے تو اپنی سپن کا یہ احساس انہی کی بلند ناسائیت کا ادنیٰ فیض تھا۔  
تمرح میں ایک - نہر میں نے اس طریقے پر حیرت سے کچھ کہا، فرمائے گئے : جب عمادی اعلیٰ حضرت کی جناب میں اس طرح عید کی نذر

قندری طرین کا تھنہ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ خضر رومی ہندوستان لائے پر وینہ سال تھے۔ صاحب فضل اور پختہ کام میں صاحب کامان تھے۔ "بروکش ایک گنا ہے" ان کا طرین کا تھا۔ خواجہ قطب الدین گنجیاراوشی طے، مفتی کیا اور مفتی ہوئے۔ وہ خود دو وجدان کی اس تازہ نظر سے ان علاقوں کو بہرہ مند کرنے واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے۔ لیکن یہاں بھی ان سے ایک منتقل طرین نقلہ شائع ہوا، قطب میناؤں اس کے رعلقہ تھے اور طریقہ حشر تیبہ میں بھی اس طرہ نقلہ کا پیوند رکھا۔ چیز پر کا مٹی تمام اصحاب طرین مفتی ہوئے۔ عماموی صاحب کے بزرگ شیخ قطب میناؤں کے رعلقہ سے منتقل تھے شرب قندری کا خلاصہ دو لفظوں میں حیثیت نفس ہے: "قطب نظر کی ہاکی و بے باکی خوش دلی خوش اندیشی شیخ غا نے" اخفاء الامنیاء میں خضر رومی کا مختصر ترجمہ لکھا ہے۔

ہیں کہ ہے، تو یہ لوگ بد بخت وانی اس کے سزاوار ہیں۔ عمارت کی نگاہ میں سب اس سے اعلیٰ اور اس کے قدر میں اور وہ سب کا وانی ترین نعم ہے۔ ان کے لیے میں کھر پور انسانیت کا خلوص اور گداز تھا۔ اس وقت بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں۔ وہ دھیمی اور گہری آواز میرے دل میں چیر پست ہوئی جا رہی ہے۔

لوگوں کے ساتھ براہ انداز نہ تھا۔ نوک صرف دوستوں، لیکن ان کا سا لکھراں کہ دسترخوان میں بزرگ کا حصہ و اہمیت، غلاموں کے مہمان بھی جو خود کھاتے وہی ان کو کھلاتے۔ لذت کا دم و دھن سے زیادہ ان کو دسترخوان کی صحت محبوب تھی۔ نوک و بیماری میں ان کی بیکر بھالی علاج معالجہ کرنے اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے۔

عزیزوں کے ساتھ بہت آغوش تھی۔ وطن جب جلتے عزیزوں کو سنوں کے لئے سو غائبی لے جاتے، بچوں کو نندہ دی دیتے۔ ہندوستان کے متعدد بچوں کو ان کے دھماکے کے مطابق پڑھوایا۔ ایکسٹینجیو اورب کا اور ان کے ساتھ ہر اسے کو سائنس کا شوق تھا۔ دونوں کو ان میں ایک ساتھ ملی گڑھ میں پڑھوایا۔

جیدہ آباد کی جاہ نما معاشرت کا ان پر اتنا بھی اثر نہ تھا جتنی کھٹے پراؤس ہوتی ہے۔ نمونے کی غالب علامت ساوگی، تو ہمیشہ ان کا شعار تھی۔ حالات کے نغمے اس میں سرگودھی نہ آیا۔ ان کے ایک بہت پرانے ہم وطن دوست لکھتے تھے کہ میں نے وطن میں زندگی کی جو کوشش دیکھی تھی وہی آج اس مرکز جاہ و نمائش میں دیکھ رہا ہوں نہ مزاج میں کوئی فرق ہے، نہ لباس اور بود و باش میں۔

اور اسی سلسلے میں عمارت صاحب کی تحصیل علم کے واقعات سنائے۔ انفرادیت لکھتے یا وضع داری، جو کچھ بھی تھی ان کی ٹوپی میں تھی۔ بچپن سے آزاد امانی بارڈ کی نرم تر کی ٹوپی۔ دلچسپی و حالی کھنڈوں سے بالشت بھرے کچھ زیادہ نیچے شیر وانی۔ دل بڑھنے پانچے، ٹخنوں سے اڈپنے نہیں، انھیں سیکہ کہ ایڈیوں سے ملے رہتے۔ یہ چیز خاص خاص قسم کے لوگوں کو بہت گراں گذرتی تھی عجا اور علم سے کہیں گراں جسم نہ ہوئے جو لباس عمو لا پٹنے لگتے۔ کوئی مجلس ہو اسی جاں میں جاتے۔ جلوہ فرمائی کا جدا لباس کیش و آئین نہ تھا۔

لباس کی طرح تعلقات میں بھی بڑے وضع داری تھے۔ جس سے جو تعلق تھا حاضر و غائب یکساں تھا، جو وضع پر کئی زندگی بھر کا ہنر و ان گنی۔ تو میں جاہ کسی کی جو کسی قسم کی جو، اس سے انھیں سخت اذیت جوتی تھی۔ بدگوئی، دل آزاری، طنز و سہنہ، اپنی ذات کے متعلق آزاد کاران کے مذہب میں گتہ تھے۔ آپ بیتی گفتگو میں اسی حد تک آتی جتنی کہ مفید اور سبق آموز ہوتی جو صلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی جس میں ذرا بھی کوئی استغناء پاتے۔ اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے۔ کم ہند لوگوں کے کام کو اپنے مقام سے نہیں ان کے مقام سے دیکھتے اور وصلہ پڑھتے۔ رد و کد و بحث و تکرار سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن بطور غرض کوئی ان کو کبھی ملی بات چھیڑ کے ذہنی درزش نہ دے دیتے اور لطف اندوز کرتے۔ شواذ اور لواؤ مسائل، اور لٹرائٹ و ظرائف ان کے شکوک میں بہت تھے۔ انسان خواہ کسی وجہ سے کاموں ان کی باتوں سے محفوظ ہوتا تھا جس سے گفتگو کرتے کمال خوبیاں نظر آتیں۔ عوامی فاری اور تہذیبوں زبانوں کے ہزاروں شمر، جد و جہاں ہر قسم کے ان کے خزانہ و مانع میں محفوظ تھے، مسئلے اور نکتہ سنجی کرتے۔ مسئلے کے تنوع نے ان کی طبیعت کو لا دراز بنا دیا تھا۔ ادبی تاہی اور فنی طیفوں کی بھل بھڑیاں چھوڑنے، خوش وقت کرتے اور خوش وقت ہوتے۔ منہ بند کر کے اس صدمہ ہنسنے کہ سارا جسم مل جاتا۔ شاید مقامی محاوروں کی طرح ہنسنے کا محاورہ بھی مقامی چیز ہے۔ ہنسنے کی بالکل بھی وضع مرحوم مولوی

ابوکر شہید کی بھی غبی، دونوں جون پوری تھے۔ ممکن ہے ہنسنے کا یہ سا بچا جون پور کی قدیم شائستگی نے ڈھال دیا ہو۔  
 "نروید کے انداز میں نروید نہ کرنا، غلطی کی اصلاح، غلط ہے" کہہ کے نہ کرنا ان کی مستقل عادت تھی۔ اور یہ بھی مستقل  
 عادت تھی کہ جو لوگ ہنسنے کے فتویٰ تھے، ہوتے بڑی عکثہ آفرینی سے ان کی تسکین خاطر کرتے۔ ایک صاحب کو علامہ ہنسنے کا سودا ہوا،  
 خوب مدارات کی، وہ حضرت علامہ بن کئے اور اس سند پر کہ عمامی صاحب کے علامہ مکہ دیا ہے، علامہ بن کو اپنا قانونی  
 حق سمجھ لیا اور عمامی صاحب نے طرح داری سے مکہ دیا کہ جامع العلوم کتاب کو مفت کھاتے ہیں اور جامع العلوم شخص کو علامہ بیگ  
 دوست بلاشبہ علامہ ہیں اور بیسے علامہ کم ہوتے ہیں۔ تقریر کے لئے شے لطیف ضروری ہے اور بیسے لطیف کا کرشمہ تھا تھڑولے  
 عالم لوگ جھٹکے، عمامی صاحب نے کہا: میرا با آپ کا اس میں ہرج کیا ہوا، وہ غریب علامہ ہنسنے کی کوشش میں کچھ بن ہی  
 جاتے گا، جگر شے کا تو نہیں۔ میرا تو یہ مسلک ہے۔

ہمیں تو شیخ و برہن سبھی کی سن لینی  
 یہ کہیں وہ کہ اس نہ توڑیں بکالنے والے

کسی بات کو وہ غلط جانتے ہوں، مگر اس کی مدارات ہیں بھی درینہ تھا۔ کیا خوب اس طرح کہتے کہ یہ اپنی جگہ مطمئن وہ اپنی  
 جگہ خوش۔

اور یہی مدارات تھی کہ قانون کے مترجم مسعود علی صاحب عجمی نے عربی ادب پڑھنے کی خواہش کی اور استاد صاحب  
 شاگرد کو اس کے کمرے میں جا کے پڑھانے لگے۔ عجمی صاحب علی گڑھ کے پڑانے فارغ التحصیل اور علامہ مشعلی کے شاگرد تھے عربی  
 میں نمایاں استعداد کا علامہ مشعلی نے ان کو وثیقہ دیا تھا، سشن بیچ رہ چکے تھے، جوش عمامی خیال کیا کہ شاید وہ سابقہ  
 سشن عجمی کے غرتے کی وجہ سے خود پڑھتے نہیں آتے، اور عمامی صاحب کو جھنجھوڑ ڈالا۔ خوب برے، خوب برے، جتنے یہ برے  
 اتنے ہی وہ نہالی ہوئے، جھڑپی غمی تو بڑے پھڑے ہوتے جے میں بولے۔ ان کے آنے سے مجھے کچھ ترک نہیں لگ جائے گا۔  
 یہ بات تو قابل قدر ہے کہ انھیں اس عمر میں بھی پڑھنے کا شوق ہے آپ پڑھئے عمامی آپ کی جناب میں بھی حاضر ہوگا، انہی  
 عجمی صاحب کے بار ضیافت میں غفر علی صاحب نے بیان کیا تھا ریہ سلسلہ یا سلسلہ کی بات ہے، کہ پھر سے ڈاکٹر اقبال  
 نے نوکر کیا کہ میں ابن عربی کا فلسفہ سمجھنا چاہتا ہوں، کوئی ایسا آدمی بتاؤ جو مجھے ابن عربی کی فصیح اور فتوحات کے مباحث  
 اور فلسفہ بھجھا دے۔ میں نے اپنے علامہ کو تجویز کیا اور یہ حضرت خود جا کے پڑھانے لگے۔ عجمی صاحب نے فریاد کیا: کہ رسم  
 پابندی اوقات چلی جاتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ تاربخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کا قصہ پوچھا، بہت سادگی سے اتنا کہا: جو بزرگ یہ کام خوش سلیبی  
 سے انجام دے سکتے تھے وہ روزے ہو چکے تھے، مولوی شبلی سید صاحب کے زیر ہدایت وقت کے ضروری مباحث پر لکھنے اور تحقیق و  
 مطالعے میں مشغول تھے۔ اور قصہ کو باقی تمام کر دیا۔

مولوی سید سلیمان صاحب کو بہت ملائی تھا کہ "ان کے مضامین ابوالکلام کے نام سے شائع ہو گئے" ایک و ن  
 دار مصنفین کی کسی کتاب کے سلسلے میں عمامی صاحب کے پاس دفتر تشریف لائے۔ یہ قصہ لازم گفتگو سے تھا، فرمایا: یاد ہو گا مولانا

آپ کو، وہ بیوا کاں پور کی مسجد والی مضمون اور ابوالکلام صاحب کا برہمی کا خط! اسی مضمون سے شہرت ملی اور اسی مضمون پر لکھنے والے کو غیظ و غضب سے نوازا۔ اور مولانا! آپ نے دیکھا، آپ کے وہ مضامین بھی اپنی مملوکانہ اور فی میں شامل کر لئے جرات یہ وہاں چھوڑ آئے تھے۔ اور ان مضامین کی خوب ستائش فرمائی جمادی صاحب نے کہا: چھوڑیے جناب مولانا یہ جمادی صاحب کا خاص انداز تھا، ان باتوں کو، اب وہ مضامین نہ مولانا ابوالکلام ہی کے لئے کوئی حیثیت رکھتے ہیں نہ آپ کے لئے۔ یاد کے قابل تو وہ صحبتیں ہیں جو مولانا ابوالکلام کے ساتھ گذر گئیں۔ پھر وہ لطف و محبت حاصل نہ ہوا! مسلمان صاحب کو یہ بات خوش نہ آئی۔ بڑی دن گرفتگی سے جمادی صاحب کی صورت ٹکنے لگے۔ میرے لئے یہ بہت دل چسپ مطالعہ تھا۔

ان کا، اپنی کلینہ عقلی تھا، اور وجدان الفاظ کا زبانی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے افکار و معتقدات میں بے حد راسخ تھے اور دوسرے کو اپنے معتقدات و رسوم کی پوری آزادی دیتے اور تصادم سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے لئے والوں میں غالی شیعہ بھی تھے، راسخ اسماعیلی بھی، اور ایسے بے فکرے بھی جو، انگریزوں کی زبان میں گفتگو کیا کرتے، اور یہ سب ان کی صحبت سے یکساں فرحت و انبساط حاصل کرتے۔ ایک غالی شیعہ دوست نے پوچھا: مولانا! اسلام کے موسیقی کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟ بولے: آپ جس کو موسیقی سمجھتے ہیں اس کی سرپرستی اسلام نے اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ طبعی اور سارنگی پیدا کرنے نہیں چاہتا۔ غیر شگن جہاد کو پیدا کرنا چاہتا ہے، کفران کے نزدیک لغت اور اصطلاح دونوں لحاظ سے، عقل سے بغاوت ہے اور استدلال ایمان کی مستحکم بنیاد فراہم کرنا ہے۔ مولوی معنوی نے استدلال کو پائے چوبیس کہا ہے، وہ پائے آہنیں کہتے ہیں۔ مولوی کے شعر کو انھوں نے یوں بدلا ہے:

پائے استدلالیاں روئیں بود      پائے روئیں باہر سبیں بود  
بسکہ استدلال کاروبن ماست      غریزی راز و داروبن ماست

اور یہ استدلالی طریق، دینی امور اور علمی امور میں، ان کا اصول کار تھا۔

وہ اپنی تسکین خاطر کے لئے جب کسی مسئلے کی تحقیق کے درپے ہو جاتے، تو دن رات اسی دھن میں لگے رہتے اور تحقیق کے پھل سے خواہ ان کی خواہش کے مطابق ہو یا خلاف، شاد و شاد ہوتے۔ ان کا مدعا صرف تحقیق ہونا تھا، وہ اپنی خواہش اور نقطہ نظر کو محور نہیں بناتے تھے۔

تاریخی مطالعے میں ان کا طریقہ عام روش سے جدا تھا۔ وہ واقعاتی تاریخوں سے صرف زمین کا کام لیتے تھے اور عمارت گری کے لئے تذکرہ و تراجم رقعات و محاضرات (کثکولی کتابوں) اور دوسرے مآخذ سے واقعات کو رونما کرنے والے ریشوں کا کھوج لگاتے۔ اس کے لئے وہ قصصوں اور کہانیوں اور قصیدوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں انھوں نے شاہی فرمانوں، جاگیریں و شیعوں اور پرائے وقت ناموں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ مقامات اور دوسری علمی سرکاری مدوں و دو حائی ہزار سالانہ کی جو آمدنی ہوتی وہ قلمی کتابوں اور ایسے ہی ذخیروں کے لئے وقف کر دی تھی۔

بدنام واقعی سے ان کو بہت ہمدردی تھی، کہتے تھے کہ وہ بہت بڑا مصنف ہے۔ اس نے تاریخ اور افسانے کو سیکر



ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ اس کے دن سے سائنس کی اکثریت پر زمانے میں بڑے فوق شوق سے مستفہد ہوئی۔ وہ مورخ کی بجائے ایک با معصہ نقاش ہے اور اس کی نقاشی اس ماحول کا واقف اور آراستہ و رنگ آمیز کیا گئی ہے۔ میدان کے تاریخی مطالعے کا انداز نظر ہے۔

ابن خلدون کے دونوں نظریوں اصولوں کی ہر دیت کے نظریے اور علوم و آداب میں عربوں کی تہی و تنہی کے نظریہ سے سخت اخلاف تھا۔ کتنے قلم کے مشترکین نے زیادہ تر ان دونوں نظریوں کی وجہ سے ابن خلدون کی ستائش کی ہے۔ ان کی محققانہ رائے یہ ہے کہ ابن خلدون کے یہ دونوں نظریے سب سے اہل ہیں تاریخ عرب قدیم اور عاصیہ العرب ابن خلدون کے نظریہ ہر دیت کی ترویجی تحریک میں نہیں ان کو اپنی محتاج و روش کے مطابق ترویج کے عنوان سے پیش نہیں کیا۔

مقالہ جو لا ترجمہ، بروا شتر قلم لکھتے اور کسی پیرا گراف یا صفحہ میں شاذ و نادر کوئی لفظ قلم زد ہوتا۔ مدت خود لکھا چھوڑ دیا تھا، ترجمہ لکھتے تھے ترجمہ لکھنے کا ہنگام اکثر و بیشتر یہ ہوتا: ٹپکتے رہتے، کتاب ایک نظر دیکھتے اور فقرے رو افی سے دلی دہکتے۔ خوبی یہ ہوتی کہ ترجمہ لکھتی ہوتا۔ سب عباراتوں کے لفظی ترجمے کی یہ نشان تھی،

والقصور الباهر والکواکب المذاہر	قسم ہے ماہ تاباں کی، نجم درخشاں کی، ابر باران کی، مرغان
والغمام الماطر وما بالحق من طائر وما	فغانے آسمان کی قسم ہے اس پہاڑی ٹیلے کی جس سے دہرہ
احتدی بعلم مسافر من موجد وغائر	کو راہ سے فراز پسند ہوں یا نشیب گیر سب کو پناہ ملے کہ
لقد سبق هاشم امیة الى المآثر اول	خوبیوں میں ہاشم امیہ سے بڑھ کے ہے، آگے پیچھے ہر حال
منه و آخر ابو صمحة بذالک خابو	میں بڑھ چڑھ کے ہے، ابو صمہ اس کا خیر رساں ہے اور
نقصن لها شتم بغلبة	بھی اس کا بیان ہے۔ اس بیان کے ساتھ ہاشم کے غالب
آنے کا فیصلہ کیا۔	

لوگوں کی خدمت طرح طرح سے کرتے، ایک صاحب کے پاس قدیم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا چاہتے تھے کہ آصفیہ کتاب خانے میں اچھے داموں لگ جائے۔ ان سے کہا: قدرت ہمارے ہر کتاب پر مختصر سا تعارف لکھیے کہ اس کی قدر قیمت کا اندازہ ہو۔ تعارف لکھنے کا کام ان کے بس کا نہ تھا، یہ کام اپنے دوسرے لے لیا، اور بار احسان سے یہ کہہ کے ان کو سبکدوش کر دیا کہ مجھ بڑھنے کو اچھی کتابیں مل جائیں گی۔ وہ ہر پختہ دس یا بیس کتابیں لاتے اور تعارفی نوشتوں کے ساتھ اپنی کتابیں لے جاتے۔ جیلون پر سلسلہ جاری رہا۔ اتنی کھلی کون کسی کے لئے اٹھاتا ہے۔ چند فریادوں سے تعارف کی فنی خصوصیتوں کا اور ادبی شان کا اندازہ ہو گا:

کیا ہے اسلام: اللہ تعالیٰ نے کائنات کی نگہ بن کیوں کی، نبات و معدن و جماد میں قدر مشترک کیا ہے نقص خلقت کی کتنی گنجائش ہے۔ سالمات کتنے ہیں اور ناقصات کس قدر ہیں، جو ہر و عرض کی کیا نسبت ہے، جن اجسام کو بقا و تہمت اور محسوس محسوس کیا جاتا ہے کیا حقیقت میں ان کے اندر عقل نہیں ہے کہ اعمال تصعید و تشریل و تحلیل و ترکیب سے وہی جس سائل مرتبہ عالی میں پہنچ سکے اور صنعت گری کے فیض سب کو لے کر ہیرے میں تبدیل کر لیا جائے؟

کھینچنے اسلام کا یہی موضوع ہے جو تمام تر حقائق اشیا کے علم حق اور عمل صدق پر مبنی ہے۔  
اسلام سے پیشتر کھانی و مصری و یونانی قومیں مہوسی میں مبتلا تھیں مسلمان ہی ابتداء اسی طبع میں گرفتار ہوئے خلافت  
سے محمدی کے بعد خالد بن ولید اور ان کے رفیق کار جابر بن حیان انہی تجربوں میں پڑے رہے جو طغرائی کی تحقیق میں  
من سے فعلی نہیں رکھتے، ایک شخص زمین کی تضییع میں نہ گرفتار ہے، تو یوں میں اٹھا کر رکھتا ہے، یا اس ہمد کو شمشیر بنے بغیر  
بہتی ہے، اس لئے کہ نباتات و معاون و جمادات کے تحقیقی علم سے ملنا آشنا نہیں۔  
مسلمانوں نے یہ کمزوری محسوس کی، ہوسکتے تھے کہ پرچہ لکھ کے کھینچ کے پام حکمت پر چڑھ گئے۔  
یہ کتاب انہی حقائق پر حاوی ہے۔

طغرائی نے اپنے تمام مہر پر دوں سے الگ ہو کے ابو بکر رازی کو اپنا مدار علیہ مانا ہے کہ اس علمی خلافت  
کے۔۔۔۔۔ فی زعمہ۔۔۔۔۔ وہی بانی بلا فصل تھے۔

رسالہ تحریر، فلاسفہ اسلام کے سب سے بڑے پیشوا شیخ بو علی سینا کی یہ کتاب عربی زبان میں تھی جس کا یہ فارسی ترجمہ  
مدرسہ سلاجقہ کی یادگار ہے۔ اسی حمد کی زبان سے اور وہی انداز بیان ہے، کائنات کس طرح وجود میں آئی، نیستی سے  
پستی کیسے ہوئی، معدوم سے موجود کی کیا سبیل نکلی، کوئی شے اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کے لئے کوئی  
علت، سبب موجود ہو، بقولت اس شے پر مقدم ہوتی ہے، وجود عدم سے نکلا تو کیونکر نکلا، علت وجود کو وجود سے  
پہلے موجود ہونا چاہیئے حال آنکہ وجود سے پہلے آپ عدم کے ناکل ہیں۔ یہ مباحث نو نہ کتاب ہیں۔ ان میں غور کرنے والے  
پڑھیں، اوہرین کے مذہب کا فساد و بخود واضح ہو جائے گا۔ اور ماننا پڑے گا کہ عدم اور وجود سے پہلے ایکے الگ وجود  
ہی ہے، تعالیٰ شانہ کہ وہی کائنات کا سبب بھی ہے اور مسبب بھی۔

رسالہ طبر: یہ بھی شیخ کی عربی تالیف کا فارسی ترجمہ ہے جو سچو قبول کے حمد میں ہوا تھا۔ اس میں انسان کی تخلیق  
سے بحث کی ہے کہ ایک نوع کے ہونے میں گونا گوں اختلاف کیوں ہے؟ اختلاف کی نہایت نازک علمی  
تحقیق کر کے دکھایا ہے کہ ہر انسان میں ترقی کی استعداد موجود ہے، یہ استعداد بالقوہ ہے، ہمارے اس کو اس کو عمل  
میں لایا جائے تو کون سے مدارج ارتقا میں جن پر انسان قادر نہیں ہو سکتا۔

تحفۃ الجیب: اصغیان کے خوش بیان سخنور و سخن سنج میرزا غفری کی یہ کتاب زبان اوری کی دنیا میں پرواز  
خیال کا ایک عجیب مرقع ہے۔ مثلاً سمجھائی نے، کہ ملاحت کلام میں شور انگیزی پہلے پہل انہی کے حصے میں آئی، ایک غزل  
نفسی، خسرو، بھی اسی زمین کو شاداب کرنے میں اور معاملہ بندی میں جسے آن دنوں وقوعہ کوئی کہتے تھے، ایک نئی  
نشان دکھاتے ہیں۔ حسن، اس کو روانی و سلاست کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ سلمان ساوجی، خواجہ کرمانی، ہمدانغیہ  
کی شکر خانی اور حلاوت انگیز طبع آزمائی سے بھی زمین سخن شکرستان بن جاتی ہے۔ پھر صاف آ علی بن اور خدا داو  
نہی خاطر سے اسی زمین کو آسمان کے ہمدوش بنا دیتے ہیں۔ پھر وحشی، ہلی دکائی و نزاری و جامی اپنے اپنے طرز میں  
داؤ سخن دیتے ہیں۔

ایک ایک زمین میں مشابیر شعرا کی طبع آزمائی کا یہ حرب نیز نگار خانہ معنی اہل نظر کے ذہنی شگفتگی کا انبار و زائبا سامان رکھتا ہے جس سے ادب فارسی میں محمد عبد حسن خاں و لطف ذوق و عروج فکر کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے کہ فارسی کی حد تک ایران و ہندوستان آرتھک اس سے نا آشنا ہے۔

اسی سلسلے میں دو معنیوں کے انقباس، ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کی شان دکھانے ہیں۔  
 دہا ساقی صدی ہجری کے آخری ایام میں، بغداد و کاغذ سیداب تاتار کی نذر ہو چکا ہے، ہولناکی کا فاشیہ ابا قاسم برائے سطوت ہے۔ تیریز، جو زبیدہ خاتون کی یادگار تھا، آج اس میں تاتاری لشکر کی چھاؤنی ہے، روم و عراق و ایران و توران و ماوراء النہر جتنے اسلامی ممالک تھے سب کفر کے ترے میں آچکے ہیں۔ مصر و شام کی ایک بھی بچاؤ اسلامی سلطنت رہ گئی ہے جہاں جا کر خلافت نہ پناہ لی ہے، گلاب اس پر بھی چڑھائی کے سامان ہوئے ہیں اسی ضرورت سے خود ابا قاسم، تیریز، میں لشکر زدہ ہے۔ اور صاحب دیوان روزیر اعظم خواجہ شمس الدین محمد پرنال کبیر مورخ ہے کہ مغولستان سے لے کر ایران تک کی تمام فوجیں یک جا کر فی جا میں پوری قوت کے ساتھ جامع نقطہ طائے کناروں پر حملہ ہو سکے۔

(۲) ہجرت نبوی کا چھاسٹھواں سال ہے، سیدنا حسین بن علی علیہما السلام دشت کربلا میں شہید ہو چکے ہیں، ہوش انتقام نے عراق کو ایک نعل جو الہ بنا رکھا ہے، بید و آن بید پر عام ہزاری مزید ہے، فو آہیں کا تو خانہ ہو چکا ہے مگر توبہ نلا اب بھی برپا ہے۔ اسی حالت میں قبیلہ ثقیف کا ایک جوان مرد آؤٹھا ہے اور سب کو بٹھا دیا ہے۔ اس کی کنیت ابو اسحاق ہے، پہلے خارجی رہ چکا ہے، اس میں کامیابی ہو ہو م نظر آئی قراب نمرہ طرف داران اہل بیت میں اپنے تئیں منسلک کرنا چاہتا ہے، بااں پر شیعہ اس سے کھٹکتے رہتے ہیں کہ سیدنا حسن مجتبیٰ کے عہد میں اس کی کاٹ چھانٹ دیکھ چکے ہیں، اب نہ جانے ب کانا کیا لی کھلائے، یہ فتنہ کیا قیامت ڈھائے۔

اُردو میں شعر کم کہتے تھے، عہد شباب کی ایک نثری ہے :-

چشم پر فن کا ہے گردش میں نظام اے ساقی	گردش ساغر و مینا کو سلام اے ساقی
سطوت جام کی جاتی رہی عالم بیری	اب کمانی و لولہ شرب مدام اے ساقی
شیشہ ہے منظر جلوہ خود شید ازل	مجھ کو درکار نہیں ماہ تمام اے ساقی
کعبہ دل میں بتوں کو ہے خدائی کا خدور	لب تک آتے ہے پھر اللہ کا نام اے ساقی
پر تو صبح بنا گوش سے ہوگی کافور	گیسو ہند بگر خوار کی شام اے ساقی
تین ابرو سے آفتاب کیوں ڈرتے ہیں	دم شمشیر ہے رندوں کا مقام اے ساقی

نئے گل و رنگ شہادت کا چلے بزم میں دور

آچلی ساعتِ افطار صیام اے ساقی

فارسی میں یوں داؤخن دیتے ہیں :-

جبین زہد ز افنا دگی نشد روشن      ہزار سجدہ کند نور بر جبین زرد

حرمان تو ز بہت کوتاہ ہیں قسمت      ہرگز دو کریم بکافرنہ بستہ اند

اہل سبزش بہرہ آتش دوزخ بہ امان      ہر کہ در غلہ در آید نہ برندش بجم

عجب آں نیست کہ اعجاز مسجاری      عجب این ست کہ سیارہ قویا در زست

فریب رنگ و نمود لے گشت ناس مخور      حباب دار نموداری گم بخشند  
عجب مدارا گم مرغ حسن نہ پرور را      نداده ہمت پرواز بال و پر بخشند  
جہاں کشت کہ جہاں نہ و گر پدید آید      یکلیم فقر ریا بند و تاج زر بخشند

عالم اور علامہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات انسان ہونا ہے عوامی صاحب بخنے بڑے عالم اور علامہ  
تھے اس سے زیادہ اعلیٰ قسم کے انسان بننے۔ بلند نگاہ اور کریم انفس و قلندر صفت اور قلندر سیرت۔ ان کی زندگی شرافت  
انفس کے امتزاج کی نمود تھی۔

# ظفر علی خان

## شورشِ کاشمیری

جہ پیر پور کے لئے ظفر علی خان ایک بھری سبزی کھائی ہیں۔ آج سے پچیس برس پہلے ان کا طوطی بولتا تھا۔ وہ ہندوستان کے پنجابی رہنماؤں میں سرفہرست، مجموعہٴ اعتدال اور جامع صفات تھے۔۔۔ اب تو بھر گورکنا مسیحیں لیکن جب جوان تھے، آگ تھے۔ ایک زندگی میں کئی زندگیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ادیب، خطیب، صحافی، شاعر اور سیاست۔۔۔ آج بظاہر وہ ایک کم شدہ وزن میں اور سیل و نہار کی بہت سی گردشوں نے ان کے آفتاب کو گھٹا دیا ہے، لیکن ایک زمانہ نہیں ان کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ حتیٰ کہ ان کا وجود ہی جدوجہد کی ایک تاریخ بنا گیا۔ ہر چند اس تاریخ میں ایک عجیب سا تضاد ملتا ہے اور ظفر علی خان اس تضاد کا ایک شدید مظہر ہیں۔ لیکن اس تضاد میں بھی اتنی دلکشی ہے کہ زمانے کے سوال و خدو سے ملازرائے کشمیت کو بھیجیں تو اس میں نہ صرف ادب کی فرزانگی اور سیاست کی دیوانگی نظر آتی ہے، بلکہ وہ ایک عجیب و غریب پیکر دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ ان کا ادب ان کی زندگی سے متاثر ہے اور ان کی زندگی ان کی سیاست کا عکس اور ان دونوں کے امتزاج سے جو صورت بنتی ہے، اس سے ایک ایسا وجود ابھرتا ہے جس میں صدوری تھوڑی سنگتراشی زیادہ ہے۔۔۔ ظفر علی خان ترنا پائے نام تھے اور ظاہر ہے کہ ہر کام میں حکایتیں شاد اور شکایتیں دافرو جوتی ہیں۔ ظفر علی خان کی شخصیت سے ہم غصوں اور ان کے جانشینوں سے جو آغافل بننا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظفر علی خان نے گروہ کی پیش کی حمایت میں ڈھلنے میں زبان اور قلم کو ہمیشہ گداز ہر شکن بنائے رکھا۔ نتیجہٴ معلوم کہ۔۔۔ آج وہ ماضی کی تمام ہامی کے باوجود وہ ویرانہ محض نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی ادبی یا سیاسی نقشہ ایسا نہیں جس میں ان کا خطر نہ ہو۔۔۔ اور پھر محض خط ہی نہیں رنگ بھی ہیں۔ کہیں مدح، کہیں شونہ۔ انہیں ان خطوں اور رنگوں سے علیحدہ کر کے پرکھنا زیادتی ہے وہ جو کچھ بھی ہیں اپنے ماحول کی صدا ہیں۔۔۔ اور اسی سے ان کی سیرت عبارت ہے۔۔۔ وہ ایک ایسی تصویر ہیں جس میں بونگونی ہی بونگونی ہے۔

اب آج چالیس پچاس برس پہلے پنجاب سپاہیوں کی کھلی منڈی تھا۔ صدیوں ناشکر یوں کی گزر گاہ رہا۔ برطانوی نے پنجاب کو حیطہٴ اختیار میں لایا تو یہ ہیبت اور بچتہ ہو گئی۔۔۔ حتیٰ کہ تمام صوبہ برطانوی متناہد کی جلا نگاہ بن گیا۔۔۔ اس سارے عرصہ میں صوبے کی اصل پیداوار سپاہی ہی رہے یا پھر ظفر علی خان کی مخصوص سیاسی اصطلاح میں کاسہٴ لبیان ہر مدی۔

ان کا طفر علی اختیار کیا۔ غاداری بشرط استواری تھا۔ ادھر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سیاسی شعور کی کرنیں پھوٹ چکی تھیں۔ انہیں پنجاب کا مطلع پرستو تار یک تھا۔ بعض سمتوں میں چند گونجدار آوازیں سنائی جاتی تھیں لیکن ان کا دائرہ نہایت مختصر تھا۔ ایک ایجن مٹی اور اس میں چند چراغ۔۔۔۔۔ بالفاظ دیگر ایک طبقاتی مدافعی پیدا ہو رہا تھا جس سے عامندا الناس بہمہ درجہ میں نہ تھے۔ طفر علی خان نے ایک ایسی ہی موجود میں نعرہ دست نیز بلند کیا۔ ادھر لاہور میں کئی ادبی محفلیں جم چکی تھیں۔ ان کے بانی محمد حسین آزاد تھے۔ عید نقاد نے محزن کمال تو ایک نرم آراستہ ہو گئی۔ ادھر صحافت میں دو چار اخبار پیش رو تھے لیکن طفر علی خان خوشنویس، دلی، راج، حسن الملک اور اس عہد کے دوسرے اکابر کی محفلوں سے فیض یاب ہو چکے اور جدید آباء کی خوشگوار ادبی فضا میں رہ چکے تھے۔ اب خاندان کے کرائے۔۔۔۔۔ وہ کسی دلایت کے ناسخ نہیں تھے لیکن انہوں نے نرم کو نرم میں ڈھالنا نہ چاہا۔ جو ان کے ان کی امانت تھا، اس کی ہمت بدل ڈالی۔ وزیر آباد سے لاہور منتقل ہو گئے اور یہیں سے زمیندار، نکالنا شروع کیا۔ ان کا دل نہ بہت فہم چکا تھا۔ علی گڑھ کی تعلیم، حیدر آباد کی صحبتیں، ہر سید، شہنشاہی اور عالی کا تلفظ۔۔۔۔۔ ان سے ایک منفرد طفر علی خان نکلا۔۔۔۔۔ اور دو جنگل پنجاب کے چند گھرانوں میں راہ پیدا کر سکی تھی، اب عوام کے سراج میں نہیں ہونے لگی۔ پڑھے لکھنے والے اب چند ان حقیر ہی تھا۔۔۔۔۔ لیکن فاریں کی قلت نے سامعین کی کثرت پیدا کر دی اور دیکھتی آنکھوں اس سے بڑے سے بڑے تک طفر علی کا نام ہو گیا جس کا مطلب تھا کہ طفر علی تمام کے رشتہات فخر نوک زبان ہوتے گئے۔۔۔۔۔ اتفاقاً ہی تھیں۔ ادھر طفر علی خان نے زمیندار کی ادارت سنبھالی، ادھر بلقان میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ پہلا سیاسی موڑ تھا جو مسلمانوں کو شہرہ کے بعد مانا پڑا اور ان میں اپنے پاؤں پر اٹھنے کی قدرے ہمت پیدا ہوئی۔۔۔۔۔ طفر علی خان ادبی اعتبار سے سونا بنے ہی تھے، اس سیاسی اتفاق نے سہاگ کا کام کیا اور چند ہی دنوں میں ایک نیا دلولہ پیدا ہو گیا۔

یہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہو چکا، بعض روایتوں کے مطابق ہو رہا تھا۔ اپنے زمیں کے ان کی صحبتیں، اس وقت خیار آلود ہوتی ہیں۔ لیکن پڑیوں کا خیال ہے کہ اس دور کے اسلامی جذبات کی مظہر چار شخصیتیں ہیں۔ ابو الکلام، اقبال، محمد علی و طفر علی خان۔ ان چاروں میں ہمت ہی خصوصیتیں مشترک اور بیشتر ہیں۔ لیکن ان کے اشتراک اور تضاد دونوں میں حیات ملی کی روح کا رفرما تھی۔ ابو الکلام علم و عمل کا مرقع تھے لیکن وہ جس مقام سے پکارتے رہے، وہاں انہیں بھی حساس رہا کہ وہ اپنی ہی قوم میں ایک اجنبی آواز اور اپنے ہی ملک میں ایک غریب آواز ہیں۔ اقبال کی فکر میں ان کا مخلص تھا۔ محمد علی ایک نصب العین تھے جس کا اختیار تھا۔۔۔۔۔ کہے کہ کشتہ دشمن از قبیلہ مانیت۔۔۔۔۔ اور طفر علی غلام۔۔۔۔۔ من از سر لعلوہ دہم دار و رسد را کی حدائے بازگشت۔۔۔۔۔

اس وقت مولانا کی عمر چالیس برس سے کچھ اوپر ہے اور میں پیدائش شدہ غلط سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہر میں پیدا ہوا۔ ذہن پر تابش اسکول میں داخلہ دیا پٹیار سے میٹرک کیا اور علی گڑھ سے ۱۹۱۷ء میں ایف اے کی سند لی۔ والد کشمیر میں ڈاک اور تار کے نسل میں تھے۔ ان کے بلاوے پر سرری نگر چلے گئے اور اسی محکمہ میں ملازمت کر لی۔ وہاں اپنے ایک افسر سے مجھ پڑے، ان کی جو کچھ ملازمت سے دست کش ہو کر میں تعلیم کے لئے علی گڑھ لوٹ گئے۔ فرسٹ ڈویژن میں بی اے کیا۔ نواب حسن الملک کو خواجہ غلام انبلیں کے سفادینے کی وجہ سے پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ آپ نے، اخبار میں اشتہار دیکھا، درخواست گزاری۔۔۔۔۔ اور خواجہ صاحب

کی جگہ لازم ہو گئے۔ وہاں تھوڑا عرصہ قیام کیا، پھر عسکری ملک سے سفارتی خط لے کر حیدر آباد چلے گئے۔ نواب افسر جنگ سے ملے انھوں نے فوج میں ملازم رکھ لیا۔ وہاں کسی نہ کسی طریت فوج سے واپس آکر وہاں چلے گئے۔ چند ہی دنوں میں اسٹیشن جیٹا رہ گئے۔ میر عثمان علی خان کے اتالیق بنے۔ سوز و گداز ہوم سیکرٹری تھے، ان کی فوج سے اسٹیشن ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے۔ ان کا تباہ و برباد ہونا تو نواب سر بلند جنگ کی جگہ ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ وہ فوج سے رخصت ہو کر واپس چلے گئے۔ مولانا کی ہوت طبع کو دشمنوں ہاتھ آ گیا۔ محمد رفیع سودا نہیں تھے کہ غنیمت سے کہنے قلند ان لاؤ۔ قلم اٹھایا اور جو کچھ ماری۔ سر بلند جنگ کو بھی خبر ہو گئی۔ مولانا جتنی لے کر میر محمد علی بدایونی کے ہاں پر رہ چلے گئے۔ آج وہ بھی ملازمت سے بیزار تھے، وہ دنوں نے جی بی میں امپورٹ آئیپورٹ کا دفتر کھولنے کی کھانی اور اسٹیشن سے کر رخصت ہو گئے۔ وہاں مکان کر ایہ پر لے کر اوٹیل کمرشل ایجنسی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا۔ جاپان سے لیشم اور افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان درآمد کیا، مگر یہ منڈر سے نہ چڑھیں۔ وہ دنوں ادیب تھے اور یہ کاروبار خاصہ پر موزون اور دل لگستہ ہو کر ہواؤں چلے گئے لیکن اپنے وکن۔ پر تیز نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اچھی سوچ ہی رہے تھے کہ سوز و گداز دوبارہ ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ انھوں نے تار سے ہوا ایسا، جی بی سے حیدر آباد پہنچے اور سیلینڈر اسمبل کے جیٹا اور مقرر ہو گئے۔ یہاں آپ نے لاڈ کر دن کی تالیف خیابان ناری کا اردو میں ترجمہ کیا اور شہرت پائی۔ پنجاب یونیورسٹی نے پانچ سو پچھلے انعام میں دے جو ایک پنجابی نژاد کو کسی اردو ترجمے پر پہلا انعام تھا خود انعام نے ازراہ خوشنودی تین ہزار روپے مرحمت فرمائے۔ ————— واریع، میر محبوب علی خان نے استاد اور جمع امرائے۔ انھوں نے تقریظ لکھی جس میں محبت زبان کی بے حد تعریف کی۔ ————— احسن فارہروی راوی ہیں کہ واریع کے قلم سے نثر کا ہر سب سے بڑا ٹکڑا نکلا۔ وہ یہی تقریظ ہے۔ ————— اس سے پہلے مولانا سیر خطرات و فساد لندن اور سنہری گھونگا کا ترجمہ کر چکے تھے۔ مولانا اب الکلام آزاد کا اٹنا ہے کہ نظری علی خان فساد لندن کے بجائے کسی علمی کتاب کا ترجمہ کر سکتے تو ان کی خدمات علمی میں شمار ہوتا۔ معرکہ مذہب و سائنس کے متعلق ان کی رائے ہے کہ ایک مفید دینی خدمت ہے۔ غرضیکہ ان نراجم سے مولانا کی ادبی قابلیت کا شہرہ ہو گیا۔ انہی دنوں مولوی ندی میں طبعی بیہوشی تھی جس نے تمام ریاست کو ہلا ڈالا اور مشاعرہ لوگوں کی امداد کے لئے تحریک چلی تھی۔ مولانا نے اس پر جو طویل نظم لکھی، اس سے ابی و شعری حلقوں میں ان کا نام اور تھہ ہو گیا۔ اس نظم کو موضوع کے اعتبار سے اولیت کا درجہ ملا۔ اسی اثنا میں وکن ریویو جاری کیا۔ جنگ روس و جاپان کے نام سے ایک مضمون شرمہ لکھا۔ گو اس کی فنی حیثیت شیخ کی نہیں، لیکن ادبی اعتبار سے قادیان لکھائی کا نمونہ ہے۔ —————

ایک روز نواب افسر جنگ فوج کے جوائنوں کی نیزہ بازی دیکھ رہے تھے۔ آپ قریب ہی کھڑے تھے۔ ————— جی جلاز

نواب افسر جنگ سے عرض کی ہے

تو دستگیر شوالے خنجر پہ خستہ کہ میں

پیادہ می دوم و مسلمان سوار اند

افسر جنگ مکرانے۔ نیزہ موجود تھا، گھر: طلب کیا۔ ————— فرمایا:

ہمیں میدان وہیں گئے است

مولانا تامل کئے بغیر گھر سے کی پیٹھ پر بیٹھ گئے اور آگن واحد میں میخ اکھاڑ لائے۔ ————— ایک دن واریع کے ہاں شریک مجلس تھے

کر جیسے میں شور ہوا۔ کوئی بچہ کنوئیں میں گر گیا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤہ نگوٹ باندھ گئوئیں میں اتر گئے اور بچے کو نکال باہر کیا۔  
 حیدر آباد میں کسی درپہر میں قیصر ٹول کمپنی نے ڈرامہ کیا۔ جس میں تیم برہنہ عورتوں کا قصہ ہی تھا۔ ریاست کی طرف سے کمپنی  
 فاش کر دیا اور کسے کے لئے آئے تھے تو اظہار تبریک کے بجائے اظہار مذمت کر ڈالا۔ ریڈیو ٹکٹ کو ناگوار گنڈا، اول میں گرے باندھ دی اور  
 آخر حیدر آباد سے علنا پڑا۔۔۔۔۔ والد حیات تھے۔ بہائی آگندہ حیدر میں شریک ہو گئے لیکن ایک آدھ برس ہی میں دوبارہ ملٹی  
 ہوئی۔ سربراہین ڈو اور حیدر آباد میں ریڈیو ٹکٹ رہ چکے اور اب پنجاب میں گورنر تھے، ان کے اشارہ پر جو حسن نظامی نے چلی  
 تھی اور حیدر آباد سے دوبارہ نکلے گئے۔ حتیٰ کہ پیش بھی ضبط ہو گئی۔ الزام یہ تھا کہ نظام حیدر آباد کو پان اسلامزم کی راہ پر  
 ماننے اور انگلیزوں کے خلاف اکسٹنہ ہیں۔ لاہور پہنچے تو والد ہنس مرگ پر تھے یا غالم آقا کو پیاسے ہو چکے تھے۔ نہ حیدر کو  
 نہ حیدر آباد سے اٹھایا اور لاہور چلے آئے۔ بلقان کی جنگ نے ہمیز کا کام کیا۔ اخبار رکھیں سے کہیں پہنچ گیا۔ سربراہین لکھات  
 میں تھا۔ ۲

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے  
 زمیندار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور مولانا کرم آباد میں نظر بند کئے گئے۔ وہاں سے ستارہ صبح نکلا لیکن تابہ کے؟ بالآخر اس کی شہرگ  
 بھی کٹ گئی۔ جن لوگوں کے سپرد احتساب کام تھا، وہ ادبی استغاروں اور شہری کٹاپوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔  
 ایک زمانہ میں زمیندار کو شخص اس لئے ایک بڑی رقم کی ضلعی سے دوچار ہونا پڑا کہ اس میں کسی مقابلہ کا سر عنوان یہ شعر تھا۔  
 گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ فر بھی  
 اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اچھڑ بھی

الہ آباد کے ایک سرکاری قبیضے نے عمری کی اور زمیندار موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اب جو مضبوطی و قوتوں اور بندشوں کا سلسلہ  
 چلا تو سبلا ب تھا نہیں۔۔۔۔۔ تحریک خلافت میں یہ خطیاتی اور تیز ہو گئی حتیٰ کہ حضور کی ایک تقریر میں ماحوذ ہو کر پانچ سال  
 کے لئے قید ہو گئے اور پھر ۱۹۳۶ء تک بھی رہائی، کبھی اسیری۔ آپ کی مجموعی قید جو آپ نے مختلف وقتوں میں کاٹی، تقریباً بارہ  
 برس جتنی ہے۔ ہر تحریک میں حصہ لیا اور ہمیشہ پیش پیش رہے لیکن ہر تنظیم میں شامل ہو کر اس سے الگ ہی رہے۔۔۔۔۔ کانگرس  
 میں گئے تو برہنہ تھوار، اس سے نکلے تو دو الفقار۔۔۔۔۔ مجلس خلافت کی روح و رواں تھے لیکن کنارہ کشی اختیار کی تو اپنے ہی ہمسو  
 سے دو دو ہاتھ کئے۔ احرار کی عداوت اٹھائی لیکن شہید گئی کی کدال سے گرا بھی دی۔ انما دولت کی بنیاد رکھی لیکن جلد ہی ڈھادی  
 بیگ میں نکل مار کر شریک ہو گئے اور اس کو گوشہ عافیت سمجھا۔ مگر طبیعت کا انداز جوں کا توں رہا۔ مولانا ابوالکلام نے  
 اب دفعہ آپ کی انہی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

” ایک جس کی تحریک کو ہمنوں کے بجائے ہمنوں میں چلانا چاہو، تو ظفر علی خان  
 اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بسرعت تمام یہ قلعہ بنا ڈالیں گے، لیکن جب  
 قلعہ ہی جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو، کیونکہ وہ پھر اسی قلعے کو ڈھادیں گے۔“

الغرض ظفر علی خان انہی حادثوں کی مخلوق اور یہ حادثے ان کے سراپا کو محیط ہیں۔ بغاہر یہ ان کی زندگی کا سیاسی پہلو



ہے دیکھی حقیقتاً ادبی ہے کیونکہ ان کا ادب ان کی سیاست کی تلقین نہیں۔ ان کی سیاست ان کے ادب کی پیداوار ہے۔ اور سیاسی زندگی میں جو چمک ہے، وہ ان کے ادب کی وجہ سے ہے۔ ظفر علی خان میں سے ادب کو حذف کر دیں تو ایک فرد اور شخصیت اوجھل ہو جاتی ہے۔ بعض نقاد لوگوں کی رائے ہے کہ ظفر علی خان کا ادب ان کی سیاست کے ہاتھوں پٹ گیا۔ سیاست کے بہتے نہ چرختے تو ادبی اعتبار سے اقبال اور ابوالکلام کی صفیں ہوتے اور ہنگامی ادب کی جگہ تخلیقی ادب پیدا اس کے برعکس دوسرا خیال یہ ہے کہ یوں ہونا اور دونوں ہونا کی بحث سرے سے غلط ہے۔ ظفر علی خان پیکر ہی اس امتزاج بنا ہے۔ اگر ادب کا کوئی مقصد ہے تو ظفر علی خان کے ادب نے جو جوہر اس مقصد کو پورا کیا ہے۔ بلکہ ان سے زیادہ مقصد کی خدمت کی ہے جن کے ہاں ادب محض ایک سماجی نظام کی اکھاڑ بھینک کے لئے آلہ تخریب ہے۔ بیضیوار کے الفاظ میں ادب، تنقید حیات، تفسیر حیات اور تعمیر حیات ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود حیات کیا ہے؟ اس کا جواب کیا ہے؟ اور اس موقف تک پہنچنے کے لئے وہ کون سے اصول ہیں جن پر زندگی کا انظم قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی ایک فرض ہے اور اس فرض کے کچھ مقاصد ہیں۔ ان مقاصد کے بارے میں جہاں تک احوال و ظروف کا تعلق ہے، ہمیشہ رہا ہے۔ ہر دائرہ انسانی میں حرکت و عمل کے خطوط ایک دوسرے سے منحنی بن جاتے ہیں۔ ظفر علی خان نے جس ماحول میں قدم رکھا، مسلمانوں کے لئے حد درجہ اجنبی تھا۔ تمام عالم اسلامی کے مسلمان صنعتی دور کے ہاتھوں پٹ رہے تھے۔ ابھی ایسے نو زندہ تھے جنہوں نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے جوہر بجا لائے، اس لئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا جن کے لئے یہ غم نامہ اور ملک میں قومی تحریک نے بال و پر پیدا کر لئے اور حریت کا احساس کروٹیں لینے لگا تھا۔ ظفر علی خان نے ایک مرد کا راز راہ اختیار کی۔ اب تک راز دہانہ اور استعارہ و تشبیہ میں بائیں کئی جاتی تھیں۔ چنانچہ غالب اس مقام پر ایک آہ نغمہ کرتے ہیں۔ ان کے خوشہ چینیوں میں حاتی نے نالہ درو بلند کیا۔ شبلی صف ماتم میں شریک تو رہے لیکن آخر تاریکی کی راہ پر نکل آکر نے تنقید اور ظہیر کو اختیار کیا۔ ان کے ہاں آسودوں اور مفتوں کا امتزاج ہے۔ اقبال ایشیائی کارل مارکس کی حیثیت آگے بڑھے اور وہ قومی سے زیادہ بین الاقوامی نظر آتے ہیں لیکن ان کے مخاطب مسلمان ہی تھے۔

ظفر علی خان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ادب کو عوام کے لئے ڈھالا اور اس کی عزت بھی قائم رکھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے جذبات کا سفیر بنالیا۔ جو باتیں اب تک شعراء سے کہی جاتی تھیں وہ کھل کر سلنے آگئیں۔ ظاہری رکھ رکھاؤ سے مبرا اٹھالیا۔ مرحلہ یہ تھا کہ جن غیر ملکیوں کے قبضے میں ہندوستان ہے، ان کے خوف اور خیر کو ذہنوں سے کیا جائے۔ اور یہ کسی قومی تحریک کا ابتدائی شبوہ ہوتا ہے۔ ظفر علی خان نے غیر ملکی حکومت پر ناز توڑ دیا۔ جو قومی تحریک چھپتی گئی، توں توں ان کا نظم تیز ہوتا گیا۔ انہوں نے برطانوی نظم و نسق اور اس کے کل پرزوں ہی کو ہدف تنقید بنایا بلکہ ان کے ہندوستانی معاونوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے اس حملے کی پیٹیٹیں بھی آگئے۔ افراد و مجالس نظریات، تحریکیں اور اپنے پرانے۔ ان کی مدارات کے لئے ایسی اصطلاحیں اور ترکیبیں وضع کیں کہ سبھی داد دے ان میں نمایاں بھی تھیں اور کچھ کے بھی، لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ عوام ہمیشہ جذبات پر اکتھے ہوتے ہیں۔ شاعری بجا جذبات کی پیداوار ہے اور صحافت کی بنیاد بھی جمہور پر ہے۔ اور قومی تحریک میں جذبات کا بلورن نفرت اور محبت سے ہوتا ہے۔

جذبات ہی کبلی پر نفرت کرتے اور جذبات ہی کے ذریعہ محبت کرتے ہیں۔ اسی تمام محرکات نے ظفر علی خان کے قلم کا اسلوب متعین کیا اور قلم و شعر کے میدان میں یکے تا دیگر گئے۔ پھر ان حوالے سے صحافتی شاعری پیدا ہوئی جس میں قصیدہ تھا یا ہجو — اور ظفر علی خان کا سارا کردار اس میں جھلکتا ہے۔ ان کے ممدوحین کی فہرست مختصر لیکن متنوع ہیں کی فہرست طویل ہے۔ جن ہستیوں اور عقیدوں کا انھوں نے خراج ادا کیا ای میں حمد لاری قسلا اور نعمت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو مستغلا ہیں۔ اس باب میں انھوں نے سنگدلانہ سے نکلنا ز زمینیں غیب کیوں اور شگفتہ سے شگفتہ شعر نکالے۔ ان کے لفظیہ کلام کی مبادی بھی صمیمیت پر ہے وہ دوسرے شعرا کی طرح غلو سے کلم نہیں دیتے بلکہ حضور کی سیرت کا نقشہ اور ان کے عاقل کی تصویر اس کمال سے کھینچتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے سیرت النبی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ آپ کے قلمی چہرے میں لکھا تھا کہ قیامت کے روز اپنی انھوں کے باعث مجھے جایش گے۔ خود ظفر علی خان اپنے اس کلام کو توبہ اُخترت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں اسلام اور تاریخ اسلام سے والہانہ عقیدت ہے۔ بعض مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں انھوں نے بہت کچھ لکھا اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی مسلمانوں کو تلقین کی ہے۔ مثلاً صلاح الدین ایبکی، محمود غزنوی، اورنگ زیب اور اس زمانہ میں ابن سعود، امان اللہ خان، مصطفیٰ کمالی ان کے ممدوحین تھے بعض تحریکوں کی تائید و اعانت کے لئے جذبات کی شمشیل کے ساتھ قلم اُٹھایا مثلاً کانگریس، خلافت، حسدار، اکالی رگوردار، تحریک مسلم لیگ، اتحاد ملت وغیرہ۔ اسی طرح بیشتر ہم سفر رہنماؤں اور ہم نوا عزیزوں کو بھی ہر یہ سپاس پیش کیا۔ لیکن ان رہنماؤں، عزیزوں اور تحریکوں کے معاملہ میں ان کے ہاں دونوں طرح کے جذبات عام ہیں جس کی تعریف کی اس کی ہوجو بھی لکھی، اور جس کی ہوجو بھی اس کی سنائش میں کی۔ مولانا کے قیوں مجموعے ”ہمارا ستان“ ”نگارستان“ اور ”چمنستان“ اس سے لبریز ہیں۔ بلکہ ان واقعات کی دستاویز — حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا کلام پوری نصف صدی کے سیاسی واقعات کی منظر نامہ تاریخ ہے۔ ایک مورخ اس میں واقعات اور حالات کی بہت سی گمشدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا کے تین مجموعے اور نئے۔ پہلا ”روح معانی“ — یہ اصلاً گورکھپور خلافت کانفرنس کا خطبہ تھا۔ اسی کے اخیر میں چند نظمیں درج تھیں جن میں ہمارا ستان میں شامل کر لیا گیا۔ دوسرا ”جسیت“ — یہ مولانا کے زندانی کلام کا مجموعہ ہے جو آپ کے پانچ سالہ قید کے دوران میں حکمرانی سترلی جیل میں سپرد قلم کیا۔ تیسرا ”ارمغانِ قادیان“ جس میں مقالات کے علاوہ نظمیں بھی جو آپ نے قادیانی فرقہ پر لکھیں اور اب ان کے دوسرے مجموعوں میں ملتی ہیں۔

جہاں تک متنوعی کا سوال ہے، ان کا کوئی معاصر اور جماعت ان کے قلم سے نہیں بچی۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال، قائد اعظم، ابراہیم آزاد، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال نہرو بھی ان کے قلم کی زد میں آچکے ہیں۔ اور جماعتوں کا تذکرہ ہی کیا۔ یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طنز بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انھوں نے اچھے اچھوں کی دستاویز فضیلت کے پچ کھولے اور بڑے بڑوں کو چاروں شانے چت کیا ہے۔

مولانا سے پہلے ہجو کا انداز شخصی یا ذاتی تھا۔ جس کی بہترین مثالیں سوزا، انشا اور مصحفی کے ہاں ملتی ہیں۔ یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد و خاتم اکبر الہ آبادی ہیں ظفر علی خان نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی بنا قومی و ملکی مقاصد پر لکھی

گو ان میں ذاتیات کا ذہریغیت ہے اور یہ ایک بشری تقاضا ہے۔ لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود اس میں جو جذبہ بکار فرما ہے، وہ اجتماعی ہے۔ ان تجروں میں جن کا اصل نشانہ برطانوی ڈیپوٹسی، ہندو بقیہ، قنویانی نبوت اور اپنوں کی کاسہ لسی ہے کہیں کہیں دشنام بھی ہے۔ لیکن رٹنائی کے باوجود بعض اچھوتی تشبیہیں، دلچسپ استعارے، عمدہ ترکیبیں، اور دلآویز کنایے بھی ملتے ہیں۔ گویا ایک قاری ان کی رشتی کو محسوس کرتا ہے اور بعض ناک بھری بھی چڑھانے میں۔ لیکن بیشتر ان اشعار پر سرودھننے اور صا کر نے ہیں۔

اس قدر تہ کلام پر مولانا نے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ زمینداران کے آیام صحت تک ایک ادارہ رملے ————— کئی آئے اور کئی گئے۔ ————— عبداللہ العماوی، وحید الدین سیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول تھر، عبدالحجید سالک پیراجن حسرت، مرتضیٰ احمد کین اور نصر اللہ خان بونہر، یہ سب اپنے اپنے وقت پر زمیندار کی دجاہنت کے ستون تھے۔ بعض نے مجاہدگی اختیار کی تو شعر و سخن اور تصحیک و طعن کا ڈول ڈالا، لیکن مولانا کے شباب کا زمانہ تھا، جو سادہ آیات کھا گیا۔ —————

مجیب زمانہ تھا، مسلمان رہنما تحریک خلافت کے نتیجوں سے منتشر ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے تھے۔ مولانا محمد علی، مولانا خضر علی خان اور خواجہ حسن نظامی میں بڑے بڑے قلمی معرکے ہو چکے تھے۔ دوز نامہ انقلاب، کرم جو ان معرکوں کی دلآویز فصل تھا۔ ————— مولانا نے انقلاب پر چوٹ کی۔ —————

مجموعہ انقلاب کا اقبال و لون ہیں

انھیں شبہ تھا کہ انقلاب کے احرار میں علامہ اقبال اور ملک فیروز خان لون کا ہاتھ ہے۔ ————— پس اس پر ایک معرکہ گرم ہو گیا۔ ————— انقلاب کے ہم نواؤں میں نیاز مندین لاہور یعنی ————— تھر و سالک کے علاوہ تاثیر، تبسم، حنیف، پطرس اور ان کے ساتھی ————— ادھر نثار ظفر علی خان ————— ادھر افکار و حوادث ادھر نکات ————— دہان کئی لکھنے والے کوئی نظم لکھ رہا ہے، کوئی افتاد حیر اور کوئی انکار و حوادث کے محل سے پھر رہا ہے اور مولانا ہیں کہ چو کھی لڑ رہے ہیں۔ ————— ایسے معرکے میں مولانا کا ادبی نام نقاش ہوتا۔ ————— پھر ایک نام نہیں کئی نام۔ ————— ادھر افتاد حیر لکھا، ادھر نکات اور پھر سنگلاخ سے سنگلاخ زمین، نئے نئے قوائی، نئی نئی روئیں اور بولی ہوئی نظم۔ ————— کما ہے ماہے حسرت بھی ہاتھ پاتا اور ایک آدھ دفعہ اختر شیرانی نے بھی ملک اس کے نام سے چند نظمیں کہیں۔ ————— مگر ظفر علی خان بلا کے شہسوار تھے۔ ————— لڑائی تیز ہو گئی، اعلان کیا۔ —————

زمیندار ایک، آپ اتنے عداوت و مصافحت پر  
یہ اک کل دھڑے گا آپ کی ساری بیگنوں سے

اب فقرے بازی شروع ہے، شعر چل رہے ہیں، مصرعے ہو رہے ہیں، ادھر سے طعن توڑا جا رہا ہے، ادھر سے جواب آن غزل آ رہا ہے کہیں طنز مرگیم نوا ہے کہیں بھین آتش فشار۔ ————— اور پھر ایک ادھو دن کی بات نہیں۔ ————— ہفتوں یہ جدوا۔ ————— حریفان بدلتے، حریفان دشنام ہر گئے تو بات مجلس سے منقطع پانگنی۔ ————— غنیم چورنگ ہے اور مولانا فارغ۔ —————

ہم تھے حریف بادل، وہ دشنام کے حریف  
ایک دوسرے کی آنکھیں تھیں کہ عاذ میر گرم ہو گیا۔ مولانا نے لکھا —

انقلابات ہیں زمانے کے  
تھر دسا لکت کے انقلاب کو دیکھ

اب جو سرور اٹھایا تو مشاعرہ ہو گیا — یک غزل، دو غزل، سہ غزل — نظم و نثر کی فراوانی — انقلاب کے بھی ساتھی اور مولانا  
نے تمام دین سیاسی — سا لکت نے لکھا "خلافت کی بلیاں ہمارا کھبا نو چنے پر آمادہ ہیں" مولانا نے جواب دیا: "کیوں حضرت!  
مولانا کے اہل سر پر مابین مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق کیا ارشاد ہے —

اور پھر یہ معرکے محض تھر دسا لکت تک ہی محدود نہ تھے — ان کا وارہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا یعنی جواو  
وفاق پر ایسے ایسے حربہ شعر کے ہیں کہ ان کا جواب نہیں شنوارہوں کی بغاوت متعلق زمیندار میں اقتتاجیہ لکھا تو سرور خان لکھا ہے

جنگ کا کب ہے سینہ کسی شنواری میں

کوئی معشوق ہے اس پر وہ زنگاری میں

میں نے سر جناب سے بھڑکنے — نظم اٹھایا، اور یہ لکھا اور عنوان میں یہ شعر —

کیونکر اس کی نگہ ناز سے جبینا ہوگا

زہر دے اس پر یہ تاکید کہ مینا ہوگا

ایک زمانہ میں می برادران سے گاڑھی چھتی تھی اب جو اختلاف کی ہوا چلی تو عمارت ہی بیچہ گئی ہے

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلام میں بھڑک  
ہے صلہ دوستی سے علی بیائیوں کو ضد

منڈلا رہے ہیں آج خلافت کی لاش پر  
دہلی کے اور بمبئی کے موٹے موٹے گد

اور پھر ایسے ایسے فلسفے نکالے کہ مضمون سے قطع نظر بے اختیار دوا دینے کو جی چاہتا ہے — علامہ اقبال سے عمر بھر دوستانہ تعلقات

ہے ایک زمانہ میں حضرت علامہ نے دو زمانہ احسان کے نظم علی خان نمبر کو پیغام بھیجے کہ کہا تھا کہ — مولانا کا نظم مصطفیٰ اکمل

ہو گیا ہے — لیکن سامن کمیشن کی آمد پر مولانا ان کی تواضع بھی کر چکے تھے —

مانگ کر اجاب سے رحمت پسندی کی کدال  
تیرا آزادی کی کھووی کس نے ہر اقبال نے

کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے  
آبر و ملت کی کھووی کس نے ہر اقبال نے

تو ان کے ہر کاب تھے — توان کے قصیدے لکھے مثلاً —

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس  
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

ان کو نے تو پھر مٹنے نہیں — زاویر نظری بدل گیا —

بھارت میں بلائیں عدمی تو ہیں اک سا درکار گاندھی ہے  
اک بھڑک کا چلتا بھڑک ہے اک مگر کی اتنی اندھی ہے

— انھوں نے مولانا کا تمام کلام ان شعری ساخت سے بھرا ہوا ہے — ایک عام آدمی کے لئے یہ تضادات بظاہر حیرت انگیز ہیں

لیکن مولانا نے جو کچھ لکھا وہ اسلاف ہماری ریاحین سالہ سیاست کے داخلی اختلافات کا رنگارنگ مرقع ہے۔ ان کے جذبات ہیں، مدح اور قدح۔۔۔۔۔ وہ میں ہنکھڑے جو تصور رکھتے ہیں، اسی کو کہتے ہیں۔ ان کے ہاں مجمع شعر کی کمی نہیں۔ بہت سی مثبت نقیصے اور بیکاروں غریب شعرا کے ہیں۔ لیکن کمی یہ ہے کہ ان کا انتخاب نہیں ہو سکا۔ مولانا نے زندگی لکھے، وہ دس بارہ ہزار سے کیا کم ہوں گے؟ اور جو کچھ ان کے قلم سے نثر میں نکلا ہے اس سے کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ کلام کے لئے فرصت اور محنت کی ضرورت ہے۔ خود مولانا بول رہے ہو گئے اور زمانہ کا مذاق سخن بدل چکا ہے۔

ایک خوجی جس نے مولانا کو ہندوستان میں نامور کیا وہ ان کی بدیہ گوئی ہے۔ ان کا تمام کلام ارتحال کی یاد دہانی ہے۔ بدیہ گوئی کے اسی معرکوں کو سمجھوں دیکھا ہے۔ کسی نے فرماؤش کی اور شعر ہو گئے۔ جلسہ میں گئے، حاضرین نے اصرار کیا طبیعت کی آماجگاہ کا یہ عالم رہا کہ ایک ایک نشست میں دس دس نقیصے موزوں ہو گئیں۔۔۔۔۔ اور کابلجیٹ فوجوؤں کا حاضر ہوا، موصی کیا۔۔۔۔۔ مولانا شعر۔۔۔۔۔ فرمایا بلحاظ شعر کہاں۔۔۔۔۔ ہر وقت طبیعت حاضر نہیں ہوتی۔ انھیں چپ ہو گئے، حقے کا کٹ کھینچا اور کہا۔۔۔۔۔ اچھا کھو۔۔۔۔۔ اب فی کس ایک شعر لکھو لے جا رہے ہیں اور اس میں شعر کہہ ڈالے۔

”حقے کی نئے منہ میں آئی، انگوٹھا انگشت شہادت پر پہنچا۔۔۔۔۔ پیشانی پر پل پڑے اور بالفاظ حسرت کہ سامنے آگیا۔ اب بندش پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل کا بنا ہوا شعر ہے ہاتھ کا بنا ہوا ہی نہیں۔“

جب تک تو اس بجائے مولانا شعر خیال تھے۔۔۔۔۔ ہر کوئی میں قدم رکھا اور ہنسنے کہیں نہیں۔

کلم دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت تھے اور چل نکلے۔

ہاتھ کے سخی، دل کے سادے۔۔۔۔۔ کنز فوجان ان سے رویہ بڑھتے رہے۔ جس ادا سے کمانے اسی ادا کرتے تھے۔۔۔۔۔ دفتر میں ہونے تو گما گھی رہتی۔ سفر میں ہونے تو ملازم اور حقہ ساتھ رکھتے۔

زندگانی کے لطف دہی تو ہیں صبح کی چائے شام کا حقہ

انھیں زمیندار کی زبان اور کتابت کا بڑا خیال رہتا۔ ایک دفعہ اپنے خواہر زادے ہمدی علی خاں اور دوسرے افسلے کو زخمی کی ایک چھوٹی سی لغزش کے باعث دفتر سے الگ کر دیا۔ اور صفحہ اول پر ایک لکھی۔ ہر کاتب کے دست خط کا جائزہ لیتے۔ دائرے اور نقطے خاص طور پر دیکھتے۔ کسی کے کلام پر بہت کسی کی نظم پسند آتی تو اس میں ایک آدھ جگہ نظم لگا دیتے جس سے مصرعوں کا حسن سوا ہو جاتا۔

ایک دفعہ راقم نے عرض کیا۔۔۔۔۔ مولانا آپ کی زندگی تو محض سفر ہے۔ فرمایا:

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایک حصہ زندان میں بسر ہو گیا، ایک سیاسی سفروں کی محنت پر چڑھ گیا۔ قلم و دوات کی صحبتیں تو شادی میسر آئی ہیں۔ جی چاہتا ہے زمیندار انگلستان کے اخباروں کی طرف نہ دیکھتے لیکن رویہ۔۔۔۔۔“

اور رویہ زندگی بھر ان کے لئے ایک پراہم رہا۔

جب کبھی ادارہ یہ کہتے تو اس کا پروف بھی خود ہی دیکھتے۔ اس کی کھائی کے لئے کاتب بھی خرید کرتے۔ ایک دفعہ راقم نے  
 پیردوب بڑھا تو سستی نہ ہوئی خود پڑھا آخر ایک غلطی کی گئی، مگر خوش ہے کہ اور انعام میں بہارستان کا ایک شعر عنایت فرمایا۔  
 ہندوستان کا کرنی گوشہ ایسا نہیں جہاں بھولانا نہیں پہنچے۔ وہ رنگوں سے خیر باد و مالا بار سے سری مگر تک گئے۔ اپنے  
 زمانہ میں وہ ایک صاف گو مقرر تھے۔ یعنی الفاظ کی نوک پلک درست، برجستہ فقرے، خوبصورت بندشیں، صحت مند استعارے،  
 جس سے سن میں روانی ملے طبعانی، ہر موضوع پر تقریر کرتے لیکن اپنا موضوع کہیں بھی نہ چھوڑتے۔ ان کی تقریر بہبوط آدم سے شروع  
 ہوتی اور بے غلط خلافت پر ختم ہو جاتی۔ تمام دنیا کے مسائل زیر بحث آ جلتے۔ ان کا دل اس سے ہمیشہ دکھی رہا کہ مسلمان  
 اپنی یہ وہ حد ملے۔ روایات کو گلاستہ طاق نسیان بنا چکے ہیں۔ ان کے قوی میں ضلالت اور احصاب میں اختلال آ گیا ہے۔  
 ان کی تقریریت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے اور ان کی داستانِ مصائب جنابِ معلم الملوکوت کے رودہ و احشا کے مانند دراز ہے۔  
 اور یہ بھولانا کا مخصوص انداز تھا۔ وہ خطابت کے میدان میں ابوالکلام آزاد یا محمدا اللہ شاہ بخاری نہ تھے۔  
 بیان بہت کچھ تھے۔

ان کی بے شمار آرزوئیں تھیں اور انہی کے تصور میں انہوں نے عمر کے چوداسی سال بناوئے مگر ایک ہی آرزو پروان  
 چڑھی۔ اور وہ ہے ملک کی آزادی۔ اور غالباً یہ آرزو سب سے بڑی آرزو ہے۔ اب وہ ہڈیوں کا ایک ڈھیر  
 ہیں۔ جو اس کا احتجاج۔ اور سچ تو یہ ہے بڑھا پا بجائے خود جو ان کی ہے۔ یہ تصرف اونٹنے سے  
 اویسباند آئے، صدا کہ چلے  
 میان خوش رہو، ہم دعا کہ چلے

# جگر صاحب

رشید احمد صدیقی

بالکل یاد نہیں؟ آنا جگر صاحب سے پہلے پہل کب کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی۔ ممکن ہے الہ آباد میں ہوئی صاحب مرحوم ہندوستانی الیڈمی (لو۔ پی۔ بی) میں صیغہ آردو کے مشیر ادبی تھے۔ کسی کام سے الہ آباد جانا ہونا تو میراثیا کے ہاں ہوتا۔ یہ زمانہ اور اس کے بعد کا کافی زمانہ ایسا تھا جب جگر صاحب پر شراب کا بڑا تسلط تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے ہو گئی کہ جگر صاحب بس کبھی علی گڑھ تشریف لائے تھے تو میرے ہاں ٹھہرنے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بڑے دوست بن گئے۔

الہ آباد میں آصف صاحب کے سامنے جگر صاحب اس طرح خاموش، مودب اور آنکھیں نیچی کئے ہوئے بیٹھنے کو گفتگو بھی کی جاتی تو صرف "ہاں" نہیں، میں شکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا بیٹھتے۔ آصف صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے ہاں پختہ جاتا تو وہ ایسے خوش ہونے جیسے ان کا رُواں رُواں مسکانے لگا ہو ان کے اس طرح خوش ہونے سے مجھ پر اتنا ایسی کیفیت طاری ہوتی جیسے میں ان مقام لوگوں کا تصور رِضا ف کرنے لگا جنھوں نے میرے ساتھ ظلم و زیادتی کی تھی۔ کبھی کبھی وہیں جگر صاحب مل جاتے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود نہ آئے ہوں، بلکہ کسی نے پہنچ اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی تم پر چلے جائیں۔ ان کے مواجہ میں آصف صاحب مجھ سے تفصیل سے گفتگو نہ کرتے ذکر نہ پھیلاتا۔ ہم دونوں بیٹھتے ہوتے تو جگر صاحب اٹھ کر چلے جاتے۔

آصف صاحب، جگر صاحب کو زیادہ خاموش یا اگنا یا ہوا دیکھتے تو کبھی کبھی مسکرا کر یہ فقرہ ان کو سننا دیتے "چلا لوٹ کر یہیں آنا پڑے گا" اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر ہنسنا بولنا شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا "آصف صاحب آنا پڑے گا، بیچارے تو جلتے ہیں"۔ آصف صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی آنکھیں ان سے زیادہ مسکراتی تھیں۔ "ابھی کہاں آئے ہیں، ابھی تو لائے جاتے ہیں" ایک دفعہ الہ آباد پہنچا تو آصف صاحب کے ہاں جگر صاحب پھر اسی حال کا وقت آیا تو میں اور آصف صاحب کھانے کے کمرہ کی طرف چلے۔ جگر صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا۔ آصف صاحب دن کچھ بد خط سے معلوم ہوتے تھے۔ چلتے چلتے ٹھہرے ہو گئے اور جگر صاحب کو مخاطب کر کے بولے "یہ سب تمہارے شعر گوشت کھاتے ہیں؟" آصف صاحب کی آزدگی پر کسی قدر برہم کی گادنگ چھلانے لگا تھا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھانے کے کمرہ میں داخل ہوا۔ اصغر صاحب کھانے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا "صغر صاحب! لکھنوی شاعری کے تشبیہ استعاروں کے کبھی شیدائی نہ تھے۔ یہ گوشت کا کیا قصہ ہے؟" کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ کچھ غلغلہ مچا دیا۔ لیکن وہ جلد ہی لہجہ میں بولے "رشد صاحب آپ کو کیا معلوم یہاں ایسے بے رحم لوگ بھی ہیں جہاں کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ بیٹھے ہیں اور یہ جہاں ہوتی ہے تھلا وہ بلا بلا کر ان سے شعر سنتے ہیں اور جب یہ ادھر موئے ہو جاتے ہیں تو کچھ پر لاؤ پھاند کر یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اصغر صاحب بے کیف ہو گئے ہیں اور کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔"

میں نے پوچھا "اصغر صاحب آپ نماز تو پڑھتے ہیں؟" بولے "ہاں؟ میں نے کہا "..... صاحب تو آپ کو صاحب کا صاحب کا نام بھی بتاتے ہیں؟" بولے "جی تو کچھ؟" میں نے عرض کیا "..... صاحب نے آپ کا ایک شعر سنکر آپ کو مستجاب اللہ بتا دیا اور دیا تھا؟" بولے "آپ بھی تو کچھ کہیے؟" میں نے کہا "آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ جگر صاحب کا گوشت کھلے والے جیسے ہو جو باقیں؟" اصغر صاحب ہنس پڑے اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانا کھلانے پر جو ملازم مامور تھا اس سے بولنے چلے گئے یہ کھانا یا وہ کھانا جگر صاحب کے لئے رکھ دیا ہے یا نہیں۔ اس سے اطمینان نہ ہوتا تھا تو ڈونگے اور پلیٹ سے کھانا کر علیحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کہتے "یہ سب جگر صاحب کے لئے ہے۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باہر نہ جانے دینا؟" میرے گھر کا ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ دیوبند میں جی جگر صاحب محبوب و مقبول تھے۔ اس بار میں بھی شریاب کا بڑا دور تھا۔ اکثر فاضل اور بدست شہر سے لاتے جاتے۔ دیوبند میں اس کے اندر کوئی نہ کوئی طالب علم مل جاتا جو ان کو میرے ہاں لانا میں گھر پر نہ موجود ہوتا تو وہ کمرہ میں پہنچا کر دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔

یہ طالب علم جگر صاحب کی نرسنگ اس طور پر کرتے جیسے کوئی اپنے باپ یا بھائی کی خدمت کر رہا ہو یا کوئی نرس مسلم میں مبتلا رہنے کی نرسنگ کرتی ہو۔ اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جب جگر صاحب اور یہ طالب علم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان بالکون کے کمرے بن کے فحشہ تادیبوں اور داستانوں میں ہم پڑھتے آئے ہیں۔

میں آجاتا تو طالب علم چلے جاتے اور معلوم نہیں کیوں اور کیسے جگر صاحب خاموش اور مودب ہو جاتے۔ لیکن ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رگہ سمندر کی نہ سے کوئی طاقتور مروج ابل کر باہر آنے والی ہو لیکن سطح کے قریب پہنچ کر بیک بیک زور ختم کر کے واپس چلی جاتی ہو۔

یہ باتیں میں اس لئے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے، میری یہ نیت ہوتی تو میں اتنا بیوقوف نہیں ہوتا۔ ان بھونڈے طریقے سے اس کی نمائش کرنا۔ جگر صاحب مجھے بھی تو شکایت ہے کہ وہ میرے سلسلے مودب کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت گارڈ آف آنرز دیتا رہے اور اس سے بھی کچھ کم رفت اس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مزاجیت کی کوشش کرتا ہے!

جگر صاحب اپنے حلقہ کے لوگوں میں بیٹھے ہوتے ہیں تو بہت خوش اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ ایسے میں جگر صاحب کے پاس جانے سے بد مزہ کرنا ہوتا۔ لیکن اتفاق یا ضرورت کہ پہنچ جاؤں تو وہ اس طرح خاموش اور سنجیدہ ہو جاتے ہیں گے جیسے مکتب گئے چوتھے بچے ہوں۔ بل یا ادھر مجھ سے ہمدردی اور فحشہ مولوی صاحب نمودار ہو جاتے!



جگر صاحب یقیناً مجھ سے بہتر انسان ہیں۔ وہ مجھ سے مساوات برقی، مہری عیادت کریں، مجھ سے خدمت میں سے جھگڑیں یا مذاق کریں یہ ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن وہ مجھے عربی شریعتیں قسم کا مریوی یا کسی اردو اخبار کا آبرو یا خیر سے جھگڑیں ہند کا تختہ سید رکھیں۔ یہ سیرے لئے ذوق مرنے کی بات تو ہے ہی خود جگر صاحب کے لئے کوئی غزلی بات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے ہاں میرا تو رکھ رکھاؤ ہے، وہ غالباً اس قفل سے ہے جو مجھے اصغر صاحب یا اصغر صاحب مجھ سے تھا۔ اس طرح کی باتوں کا جگر صاحب بڑا لمانہ کہتے ہیں۔ واعداری شریعتوں کی پرانی کمزوری ہے۔ ایک دفعہ خیرائی کہ جگر صاحب شراب سے تائب ہو گئے۔ یقین نہ آیا کہ ایسا ہوا ہو گا۔ سمجھنا تھا کہ آج نہیں کل یہ خبر کہ پھر سے شروع کر دی۔ بری عادتیں اس آسانی سے نہیں چھوڑتیں جس آسانی سے اچھی عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ سو خیال تھا میں اپنی معمولی بری عادتیں چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں تو جگر صاحب نررب کیسے چھوڑ دیں گے جس میں وہ اس طرح ڈوبے ہوئے جس طرح شاید جوش گریہ میں غالب کا دل ڈوبی ہوئی اسامی تھا!

جگر صاحب شراب سے کہیں نہ کیسے تائب ہوئے اس کا مجھے علم نہیں۔ اس بارہ میں اسی سے کبھی ذکر نہ آیا۔ اتنا جانتا ہوں کہ ان پر شراب کا کتنا ہی غلبہ کیوں نہ ہوتا، ان سے کوئی ایسی حرکت نہ ہوتی جسے متبذل کہہ سکیں۔ ان کی زبان نجف کلمات نہیں نکلتے تھے۔ وہ کبھی لٹنے پڑنے دیکھنے نہیں پائے گئے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا جیسے کیفیت و سرخوشی کے بجائے شراب ان کو انتہائی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہو۔ ان پر پھوڑی شراب بھی بہت اثر کرتی تھی۔

لیکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے اعصاب بڑے ذکی محسوس ہیں اور پھوڑی سی ٹھریک بھی بہت ہو جا شاعری میں بھی ان کا یہی حال ہے جیسے خیال یا جذبہ برقی دونوں کر ان کے جسم و جان کو سمجھنا دیتا ہو۔ پھر دونوں سے آ کلام میں یہ بات بظاہر کم ہو گئی ہے لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے اس میں تاثرات کی شدت ہے ان کی پیش کیا گیا ہے زیادہ مدح و آواز اور انداز میں۔

جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اصلاً وہ دوری و دوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعر رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعروں وصال کے نہیں۔ ان کا جھریب رش انداز CENTRIFUGAL درکنز کہہ سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جگر صاحب کی شاعری میں مجرب کی محبت میں کہیں کوئی غفل نہیں آتا اور ان کا کلام اس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آج کل نظر آتی ہے۔ کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعر ذہن و فکر کے اعتبار سے مجرب سے قریب سے قریب اور جسم و جان کے اعتبار سے دور دور ہو، وہ اس شاعر سے بالعموم ہندو برتر ہو گا جس کی پوزیشن اس کے بالکل برعکس ہو۔ جگر کے نقاد کو یہ نکتہ تو نظر رکھنا شراب چھوڑنے کے بعد جگر صاحب طرح طرح کی عیبتوں میں مبتلا ہو گئے۔ یہ زمانہ ان پر بڑا سخت گزرا، صحت و

لے اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میرا مطلب شراب کی فضیلت بتانا ہے۔ یہاں شراب کے چھوڑنے اور عیبتوں کے آگے اور متبہ کا رشتہ نہیں ہے۔ (رشدید صدیقی)

ہر نئی طرح طرح کی نوواردیوں نے آگھیرا، مالی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ جگر صاحب نے جس پامردی سے ان مصیبتوں کو جھیل دیا جگر صاحب کا رزمیہ ہے۔ کہتے اور کیسے کیسے "روز ابر و شب ماہتاب" آئے ہوں گے اور جگر صاحب پر سے گزرتے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جگر صاحب بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ مذہبی لوگوں کے بارہ میں میراج پور یہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں۔ یہ لوگ خدا کو اس من مطلق سے قائل کرتے رہتے ہیں "میں تعین شادیاں کرتا ہوں، طلاق دیتا ہوں انہی ہی زائد کتب نماز کی بھی نو پڑھ لیتا ہوں" وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈال رہی وصول کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کر رہا ہے۔

مذہب بڑی سخت اور بڑی قابل قدر آزمائش ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا مذہب جس طرح کے مذہبی لوگ میسر ہیں نفا میں، وہ اس درجہ بے وقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اوپر دیکھ کر معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیونکر دھوکہ دہی گئے جس کی صفات کا ان کو علم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ عدائے اپنے سارے اعتقادات ان مندوں کو ہمیشہ کے لئے منتقل کر دے ہیں جن کا وہ حق مار رہے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو پڑھے بغیر عدالتِ حجاز کو واپس کر دیتا ہے۔

ان میں بعض ایسے معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی ان فرشتوں ہی کو دھوکہ دے کر کاروباری کر لیں جو ان کا اعمالنا مرثب کرنے کے لئے کاندھوں پر بٹھا دیئے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے !

جگر صاحب ان معصوم میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ رسول اور انسان کے حقوق پہچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس کا جو حق ہو، اسے پہنچا دیتے۔ وہ نفع کے ضرر اور ضرر کے نفع کو جانتے ہیں۔ ان میں حیا ہے، وہ پرانی چیز کو اپنانے کے ورے نہیں ہونے ان میں غیرت اور محبت ہے۔ ظلم اور زیادتی اپنے پر ہو تو جمیل جائیں گے دوسرے پر ہو تو اس کی حمایت میں اپنے کو خطرہ میں ڈال دیں گے۔ ان کے یہ جو تہذیب ملک کی ہلاکتوں میں کہتے ! تفصیل میں طوالت ہے۔

جگر صاحب عالم فاضل نہیں ہیں۔ مذہب ہو، سیاست ہو، شعر و ادب ہو، ان پر ان کی گفتگو منطقیانہ یا فاسدیانہ نہ ہوگی۔ ان کا احسان جتنا سرچ اور شدید ہے، اتنا ان کا مطالعہ کبھی نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارہ میں تفصیل سے گفتگو نہیں کر پاتے۔ وہ اپنی شاعری سے باہر نکل کر کسی اور کی شاعری پر غور کرنا نہیں چاہتے۔ شاید غور کر بھی نہیں سکتے۔ جس کے جذبات تند و تیز ہوں، وہ غور کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جگر صاحب اقبال کی شاعری کے کچھ ایسے قائل نہیں ہیں۔ قائل بھی نہ تھے۔ دونوں کا یہ کہنا ہے کہ شاعری میں فکر و فلسفہ کیسا بہ حالاکہ و دلون بالخصوص جگر صاحب جب جنت و جہاں سے بلند ہوتے ہیں، اقبال کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جگر صاحب شعر و شاعر کے بارہ میں جو کچھ کہتے ہیں وسعت اور وزن سے قطع نظر اس میں خلوص کی پاکیزگی اور یقین کی عکاسی ملتی ہے۔

میں نے جگر صاحب کو تقریر باہر حال اور محبت میں دیکھا ہے۔ خوبصورت نوجوان آزاد منش عورتوں میں، ماں

بہن بیٹیوں میں، عمامہ اور اکابر کی موجودگی میں، طلباء اساتذہ اور دوسرے سنجیدہ اور نضرہ حلقوں میں۔ گفتار و کردار کے اعتبار سے جس نے ان کو کہیں قابلِ گرفت نہ پایا۔ عورتوں کی موجودگی میں جگر صاحب عقیق و شفیق نظر آئیں گے۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلے گی اور نہ کچھ کہے۔ بے باک اور بے عمامہ ہو گی۔ عورتوں کی موجودگی سے قطع نظر بے تکلف دوستوں میں جس نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ جگر صاحب نے بے خیالی میں یا نضرہ بچا کوئی ایسا جملہ کہا ہو جس میں عورتوں سے تفریح یا عورتوں کی تشبیہ کا پہلو نکلتا ہو۔ کم سے کم پری جان پہچان کا کوئی آرد و شاعر ایسا نہیں ہے سوا فانی مرحوم کے جو اس بارہ خاص میں جگر صاحب کا مقابلہ کر سکے۔

دوسرا اور اہم اس کے سلسلے میں جگر صاحب حتی الوسع اپنا اور ان کا دونوں کا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی معجزاتی میں جگر صاحب کی طرف سے میں ہمیشہ متروک رہا۔ اس لئے کہ معمولی آدمیوں کی بدتمیزی وہ بالعموم نفسِ آزادانہ کو دیتے ہیں۔ لیکن کسی بڑے آدمی سے ذرا بھی کوئی ناواقف حرکت مرنے دہر جائے تو جگر صاحب بغیر کچھ کہے باکے نہ رہیں گے۔ چاہے اس کا انجام کچھ ہی ہو۔ بھوپال کے لوہا بڑا زور شدیدا نظر صاحب زمانہ طالب علمی سے جگر صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے جگر صاحب کا خطیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اور کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں فائدہ کی تھی کہ وہ کیا کریں یا کہاں رہیں۔ اس زمانہ میں والیان ریاست میں سے اکثر یہ چاہتے تھے کہ جگر صاحب ان سے وابستہ ہو جائیں۔

ان میں سے ایک جو برت بڑی ریاست کے چشم و چراغ تھے اس کے درپے ہوئے کہ جگر صاحب جن معاوضہ اور شرط چاہیں ان کے متوسلین میں شامل ہو جائیں۔ طرح طرح سے دوسرے ڈالے گئے جگر صاحب کی مالی حالت خراب تھی۔ بھوپال کے خطیفہ سے بس بسراوقات ہوجاتی تھی۔ جگر صاحب اس آفر کو خوش اسلوبی سے ٹالتے رہے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ رئیس نے جگر صاحب سے بر ملا اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جگر صاحب نے بات ٹالنی چاہی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اصرار بڑھا اور اصرار میں کچھ رنگ ادا کرنا بھی چھوڑا۔ جگر صاحب بے تاب ہو گئے۔ بولے۔ ”جناب آپ مجھے داموں خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو رشیدا نظر خان کے ہاتھوں بک چکا ہوں اس حاضرین سنا لے میں آگے اور جگر صاحب گھر آگئے۔“

جگر صاحب میں مروت اور صنع داری بہت ہے۔ جس سے رسم و راہ ہو جائے اس کے لئے وہ تمام آداب بستے ہیں جو شریفوں میں قدیم سے چلے آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اٹھائے۔ جگر صاحب کا شمار کھانے پینے لوگوں میں نہیں ہے۔ مدتوں بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوئی ہے اب بھی غریب آمدنی سے بہت زیادہ ہے لیکن انھوں نے اپنی تنگ دستی کا اظہار کسی سے نہیں کیا۔ مہمان کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں جیسے ان کے گھر خیر و برکت کا نزول ہو رہا ہو۔ تکریم و تواضع میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ کپڑے اچھے پہنتے ہیں۔ سامان قیمتی رکھتے ہیں جس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا ہے یا چرالیتا ہے ورنہ خود کہیں کھواتے ہیں۔

جگر صاحب جب کہیں میرے ہاں آتے ہیں نے یہ سوال کیا کہ جگر صاحب سفر میں کیا کھواتے؟ اور ترقیباً

ہمیشہ ہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں چھوڑ گئے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں جو کچھ ملا تھا اسے جیب میں رکھ لیا تھا۔ جی کے ہاں بھڑکے تھے انھوں نے جگہ صاحب کی دیکھ بھال کے لئے اپنے کسی عزیز کو مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے جگہ صاحب کی بڑی خدمت کی، ہر وقت موجود رہتے اور اظہار عقیدت کرتے۔ جگہ صاحب کو غافل سمجھ کر انھوں نے سالے روپے عانی لئے۔ جگہ صاحب کہتے تھے کہ وہ یہ سب دیکھ رہے تھے، نیکی چپ رہے۔ میں نے پوچھا یہ کیوں بولے یہ واقعہ ایسے وقت ہوا جب میں جائے قیام سے رخصت ہو کر سٹیشن آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ اچھا نہ معلوم ہوا کہ ان اس جوڑی کا اعلان کروں اور کسی شریف آدمی کو رسوا کروں؟

جگہ صاحب جس کے ہمان ہوتے ہیں اس پر بہت کچھ اپنا ہی صرف کر دیتے ہیں۔ میں نے نصیحتیں ان کو آپس سے باہر دینے نہ دیکھا۔ حکم جلائے نہ پایا۔ اپنی بڑائی کسی ان کی زبان پر نہ آئی دوسروں کے عیب انھوں نے کبھی نہیں ڈھونڈھے۔ نہ کسی ان کی تشہیر کی۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لئے ایسا نہ کرتے ہوں! جگہ صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام شعر آ کی مانند اس تاک میں نہیں رہتے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اپنے اشعار سننا کر اسے اڑھوا کر دیں!

جگہ صاحب کو معصوم بچوں سے کھیلنے ہوئے کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ بالخصوص ایسے حال میں کہ جگہ صاحب کو نہ معلوم ہو کہ انھیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ بچے سے کہیں زیادہ معصوم وہ خود نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے خوش اور شگفتہ معلوم ہوں گے جیسے ان کے سر پر آسمان نہ ہو۔ جگہ صاحب کا چہرہ بشرہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بچہ ان کے سامنے بے تکلف ہو سکے۔ اس کی کمی جگہ صاحب طرح طرح سے پوری کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بچہ کا کھلونا بنا دیتے ہیں۔ ایسا کھلونا جس کو بچہ نہ کھیلے تو کھلونا تو کھیلنے لگے۔ وہ بچوں سے مصافحہ، معافہ یا چوڑا جاتی نہیں کرتے۔ نہ وعائیں دیتے ہیں نہ تلقین کرتے ہیں۔ نہ اسے فلک ملت کی خدمت یا خواری کے لئے نیا کر دیتے ہیں۔ وہ اس کے سامنے اپنی شاعری بھول جاتے ہیں، اپنی عمر، صحت، تعب، زہر، حالی سب فراموش کر دیتے ہیں۔ بس طرح طرح سے خوش ہوتے ہیں اور بچہ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ بچے خدا کا صمد طرح ہوتے ہیں جن پر خدا طرح طرح سے طبع آزمائی کرتا ہے!

میں نے بعض مشہور مستند اور عرصہ رسد شعرا کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعر کی بڑائی بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعرہ میں شاعر اپنا کلام مستار رہا ہے اور یہ ٹیٹھے اس پر بازاری فقرے چسٹ کر رہے ہیں اور اس پاس کے نالائقوں سے اپنی اس خفیف الحکمت کی داد لینے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی بے ہودگی کسی اور میں ہوتو ہو، شاعر میں ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ اس طرح کی حرکت شاعر ہی نہیں کرتے، وہ لوگ بھی کرنے ہیں جو شعر و ادب کے پارکھ سمجھ جاتے ہیں اور جنھوں نے مر کا بیشتر تھوڑے شعر و ادب کی خدمت میں گزارا ہے۔ بس یہ گوارا نہیں کہ ان کے ہونے دوسرا کہوں!

بعض شعرا، بعض اشعار اور بعض مواقع ضرور ایسے ہوتے ہیں جب پھبتی یا فقرے سمجھا ختیار زبان پر آ جاتے ہیں۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ فقرے اور پھبتی کبھی کبھی وہ مزادے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار میں دکھ پاتے، لیکن اس طرح کے فقرے اور پھبتی کہنے کا حق مشاعرہ میں سامعین کو حاصل ہے خود شعرا کو نہیں۔

مشاعروں میں اب یہ بات عام ہو گئی ہے بالخصوص دہلی کے پبلک مشاعروں میں۔ آج کل شاید ہی کوئی اور تقریب ایسی ہوتی ہو جہاں بے ہودگی اور آبروریزی کے ایسے مناظر دیکھے جانے ہوں جیسے وائی کے اس طرح کے مشاعروں میں۔ عام مجمع میں جہاں شراب خواتین، ذمہ دار حکام، پیشوا یا بی ملک و قوم، غیر محاذک کے اکابر، نا بھگڑ کے لوکیاں موجود ہوں وہاں شعر کا جو قوم کا ناموس ہونے میں، فخریہ اور علانیہ شراب پی پی کر اس طرح کی نالائقی دکھانا بڑے رنج اور شرم کی بات ہے۔

مجھے تو کبھی کبھی اس کا اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ دن بھی دور نہیں جب وائی کا کوئی مچھلا سراہہ دار مشاعروں کی کوئی سرکس کھنی بنائے اور امریکین فری اسٹائل میں ان کے کرتب اور کر قوت شہر شہر دکھانا پھرے ! خلوت ہو یا جلوت جگہ صاحب کو میں نے ساتھی شعرا کے کلام پر کبھی حاشیہ آرائی کرنے نہیں پایا یا مشاعرہ میں ان کی طرے سنجیدہ اور خاموش بیٹھنے والا شاعر شاید ہی کوئی اور ہو۔ ان کی زبان سے کوئی فقرہ کبھی نکلے گا بھی تو تحقیر اور ہمت افزائی کا۔ یہاں مجھے ثاقب اور جمعی مرحومیں بے اختیار یاد آتے ہیں۔ لکھنؤ کے یہ بالکمال شعرا مشاعرہ میں جس ادب و احترام سے بیٹھتے اور ہر سب موافق پر تحقیر کے کلمات جس شریفانہ انداز سے کہتے وہ اب کہیں نہیں نظر آتا۔

یہ مشاعرہ میں شروع سے آخر تک دوزار نیچی فطرت کے ہونے بیٹھے رہتے، خواہ مشاعرہ کتنے ہی دیر میں کیوں نہ ختم ہوتا۔ کبھی چائے، پانی یا پانی کی فرمائش نہ کرتے۔ کوئی پیش کر دیتا تو بڑی فروتنی سے قبول کر لیتے یا مذر کر دیتے۔ ان لوگوں نے ایسے مشاعروں میں بھی شرکت کی جہاں مخالف کدپ کے شعرا اور ان کے حمایتی موجود ہوتے اور اس کا اندیشہ رہتا کہ کہیں کوئی ناظم فقرہ نہ کہہ دے لیکن آج تک کوئی ناگواری پیش نہ آئی۔ مخالفین کا کلام یہ دونوں بڑے شوق اور شائستگی سے سنتے اور داد دیتے تھے۔

ثاقب صاحب کو ملی گڑھ سے بڑی آلفت تھی۔ کوئی بڑی ہی محبوبی ہوتی تو خیر، ورنہ یہاں کے مشاعروں میں ضرور شرکت کرنے۔ میری طالب علی کا زمانہ تھا، ثاقب صاحب کی باز کہ ایک کمرہ میں بٹھڑے ہوئے تھے۔ وہ بھر کا سفر کر کے آئے تھے۔ طبیعت قد سا زلفی، رات کو مشاعرہ تھا۔ میں نے عرض کیا آپ آرام فرمائیں، وقت آنے پر میں حاضر ہو جاؤں گا اور آپ کو لے چلوں گا۔ فرمایا: "میاں نہیں، یہ آداب مشاعرہ کے خلاف ہے کہ جب جس کا جی چاہے آجائے اور جب ہی چاہے چلا جائے میں آپ کے ساتھ بھی چلتا ہوں۔"

اس مشاعرہ میں ثاقب صاحب کے دو اشعار ملی گڑھ میں بہت مقبول ہوئے۔ جیسے: "اجل رات کو سینا ہوا اور صبح اس کے مقبول فلمی گانے یا دھنیں پتھر پتھر کی زبان پر آگئیں۔" اس زمانے میں ملی گڑھ کے مشاعروں کا یہی حال تھا، اچھے اشعار ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر رواں ہو جاتے تھے، ثاقب صاحب کے وہ دو اشعار یہ تھے۔

باغبان نے آگ دی جب آتشیا نہ کو مرے      جن پہ نگہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے !

ہے روشنی قفس میں مگر سو جہت ما نہیں      ابر سیاہ جانب کسٹار و کبیر کر !

جگر صاحب میرے ہاں نشریت لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔

اولیٰ یہ کہ جگر صاحب کی صحت اچھی نہ ہوگی۔ اس لئے اپنے عزیز ترین ڈاکٹروں کو بلوانا ہوں جو ان کا مکمل معائنہ کر رہے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے، یہ سہیزبا بھی گئے اور دوسرے بشورے دیں گے۔ میں ان سب پر جگر صاحب سے عمل کراؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگر صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں کا اور کتنے دنوں کا چکر لگاتے ہوئے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے پرچہ چادر، غلاف، ٹولے کا انبا ہوتا ہے۔ دھو بی بکوا کر یہ کہڑے اس کے حوالہ کروں گا۔  
تیسرے یہ کہ جگر صاحب کا خط بڑھا ہو گا۔ اس کے لئے فائی بڑاؤں گا تاکہ وہ جگر صاحب کو رک پلک سے دینٹ کر دے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگر صاحب کے عشاق ان کو ملی گڑھ میں گھسیٹتے نہ پھر رہے۔ اور میرے ہاں نہ اپنا کلام ان کو سنائیں نہ ان کا کلام خود سنیں۔

پانچویں یہ کہ جگر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کر لیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپے اس طرح نہ خرچ کریں جس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔

چھٹے یہ کہ جگر صاحب رخصت ہونے لگتے ہیں تو میں خدا حافظ کہنے کے لئے نہیں موجود ہوتا اس لئے کہ جگر صاحب کچھ اس گداؤں کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں جیسے نہ ان کی میری زندگی کا بھر دسہ ہے نہ اپنی زندگی کا اور اس طرح سے رخصت ہونا یا رخصت کرنا میرے بس کی بات نہیں!

# ذاکر صاحب

## ڈاکٹر عابد حسین

طیفیل صاحب کی فرمائش پہنچی کہ ذاکر صاحب کی شخصیت پر ایک مضمون "نعرش" کے لئے لکھو۔ پہلے میں نے حضرت کی دو وجوہ سے۔ ایک تو سست سوجھنے اور سست لکھنے کی عادت کے کارن میں ہوں بھی رسالوں کے لئے مقررہ وقت کے اندر مضمون نہیں لکھ سکتا اور پھر اس زمانے میں شدید مصروفیت کی وجہ سے اور بھی مشکل ہے۔ دوسرے ذاکر صاحب جیسی صدر رنگ و یک رنگ شخصیت کا نقشہ ایک مضمون کی چھوٹی سی لوح پر اتارنا قلم کا نہیں بلکہ موفلم کا کام ہے جس میں مجھے دستگاہ حاصل تھیں۔ مگر یہی مشکل طیفیل صاحب نے مجھے کچھ اور مہلت دے کر حل کر دی اور دوسری خود میں نے یہ سورج کر حل کر لی کہ اگر اس وقت ایسا مضمون لکھنا ممکن نہیں جس سے میں مطمئن ہوں تو ایسا ہی سہی جس سے میں غیر مطمئن رہوں۔ شاید یہ بے اطمینانی کسی دن اس موضوع پر ایک سیر حاصل مضمون اور (شاید ایک پوری کتاب) لکھوا دے۔

شخصیت کیا ہے؟ اس مفصل بحث کرنے کا اس وقت موقع نہیں۔ محفل طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ شخصیت ان جہانی اور اخلاقی صفات کا ایک ہم آہنگ مجموعہ ہے جن کی بدولت کوئی شخص عام لوگوں سے امتیاز حاصل کرتا ہے اور لہذا پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم شخصیت کے مالک یعنی اس انسان کو بھی جو غیر معمولی جہانی اور اخلاقی صفات رکھتا ہے شخصیت کہہ دیتے ہیں۔ اس مضمون میں شخصیت کا لفظ ضرورت کے مطابق دونوں معنوں میں استعمال ہو گا۔

یہ بات تو شخصیت کی تعریف ہی میں داخل ہے کہ وہ اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے۔ البتہ اس بارے میں بہت کچھ اختلاف ہے کہ اس کے اثر کی کیا حدود ہیں۔ اکبر نے کہا ہے :  
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اور ماقبال نے تو شخصیت کو جسے وہ خودی کہتے ہیں (خدا کی حد کے قریب قریب پہنچا دیا۔ ہے مگر ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک شخصیت سراسر اپنے زمانے یا ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔ عام طور پر تصوریت IDEALISM کے مظہر واداس کے قابل ہیں کہ شخصیت اپنے ماحول پر غیر محدود اثر ڈال سکتی ہے اور بہت بڑی شخصیتیں واقعی قوموں کی زندگی اور زمانے کے دھارے کو بدل سکتی ہیں۔ مگر حقیقت POSITIVISM کے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا

انہی بہت محدود ہوتا ہے۔ بلکہ خود شخصیت اپنے طبی، سماجی اور رعبی زیادہ معاشی ماحول کے سانچے میں ڈھل جا کر رہتی ہے۔ فلسفیانہ کی افراط و تفریط سے بچ کر تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کرنے والا جاننا ہے کہ شخصیت اس انجن کی طرح ہے جس سے بڑی سے بڑی اصلاحی یا انقلابی تحریک کی گاڑی کھینچی جاسکتی ہے۔ لیکن خود یہ انجن جس طاقت سے چلتا ہے وہ اسے بدلنے یا ماحول سے ملتی ہے۔ ایسی شخصیتیں جن میں اصلاح یا انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی صلاحیت کا قوت سے فعل میں آنا اس پر موقوف ہے کہ ان کے زمانے کے حالات اور زمانے کے لوگ ان کا ساتھ دیں۔ میں نے اپنے زمانے یعنی بیسویں صدی کے نصف اول میں جن مسلمانوں کو روحِ تاریخ پر نمودار ہوتے دیکھا تھا ان میں کھری شخصیتیں بھی تھیں اور طبع کی بھی تھیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر طبع کا مال اکھڑے ان سے کہیں زیادہ مقبول ہوا۔ اس لئے کہ اس میں ظاہری چمک جس پر مسلمان جان دیتے ہیں زیادہ تھی۔ ذکر صاحب ان کھری شخصیتوں میں سے ہیں جن کی مقبولیت کا دائرہ اب تک بہت محدود ہے، لیکن طبع کی عارضی چمک ماند پڑتی شروع ہو گئی ہے اور کھڑے سونے کی پائندارویک ہر ستر و چوہے ممکن ہے اب ہندوستان کے مسلمان ذکر صاحب کی شخصیت کو پرکھ سکیں۔ ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

ادرا ان کی مدد کے لئے ذکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما اور موجودہ آپ ورنگ پر بخیر ڈی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

ذکر حسین ۱۹۰۹ء میں حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے ان کے والد فدا حسین خان صاحب ضلع فرخ آباد (دہلی) کے شہر نصیب قائم گنج کے رہنے والے تھے اور حیدر آباد میں وکالت کرنے تھے، قائم گنج کے پٹان صدیوں سے سپہ گری کا پیشہ رکھتے تھے چنانچہ ذکر حسین کے خاندان کے بھی بہت سے لوگ فوج میں ملازم تھے۔ ان کے والد کا مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم پانا اور وقت کا بہت احتیاط کرنا قائم گنج والوں کے نزدیک بہت سے کم نہ تھا۔

ذکر حسین کا چچا حیدر آباد میں گذرا لیکن وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں پلے اور پڑھے اور ریاست کی جاگیر دارانہ آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں سب سے گہرا اثر ان کی سمیرت پر اپنے چچا حسین شاہ صاحب کا پڑا جی کے وہ بہت کم عمری میں مر رہے ہو گئے تھے۔ یہ بزرگ ذکر حسین کے عزیزوں میں سے تھے اور حضرت شاہ غالب حسین فرخ آبادی سے واردات رکھتے تھے جس شاہ صاحب پر ایک داروات ایسی گذری تھی جس سے ان کی روحانی زندگی کی کاپیالیٹ گئی ابتدا میں وہ ہندوؤں سے تعصب رکھتے تھے اور شاید انہیں برا بھلا بھی کہتے تھے جب ان کے مرشد حضرت شاہ غالب حسین کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ان کی تادیب اور تہذیب کے لئے یہ حکم دیا کہ تم چوٹی رکھو اور پٹا ورتک پہنلو اور وہاں آؤ اس تادیب نے حسن شاہ صاحب کو آزاد روی اور صلح کل سکھانے کے علاوہ جانیابی جہاں گشت بنا دیا اور ان کا پیشہ چار ہو گیا کہ ایک گھڑی کھڑی اور گناہوں کی ساتھ لئے، پیدل دنیا بھر میں پھرا کرتے۔ جب بھی حیدر آباد کے کچھ دن رہتے تو ذکر حسین کی بہنو اور بہن کا کام زیادہ تر ان دو طریقوں سے انجام دیتے، ایک تو وہ کس مریض سے علم دین یا سلوک و معرفت کی کسی کتاب کی نقل کرنے، دوسرے اسے دیر دیتے اور پھر حاجت مندوں کو اس کے پیچھے لگا دیتے کہ خیرات و حسنت کی مشق سے اس کا دل بھر کھل



جلئے اور باقی تھی۔

۱۹۱۵ء میں ذاکر حسین تعلیم کے لئے اٹا دہ کے اسلامیہ لائی اسکول میں مجبوراً بیٹے گئے جسے سید احمد خان کے ایک دور کے رفیق مولوی بشیر الدین سے ملا کر لیا تھا۔ ان بزرگ کی نسبت نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انھیں ایک ہی دھرم تھی اور اپنی دھرم کے پکے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین ان بچے معلموں میں سے تھے جو اس راز سے واقف ہوئے ہیں :

ورس ادب اگر بود زمزمہ محبتش

جمعہ بہ کتب اور طفل گریہ پائے را

ذاکر حسین کے حساس دل پر مولوی صاحب کی ایک عظمت اور سید صاحب کی بہت سی صفات کا بڑا گہرا نقش بیٹھا جو کبھی مٹ نہ سکا۔

۱۹۱۵ء میں ذاکر حسین ایم۔ اے۔ اور کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ انٹر میڈیٹ انھوں نے سائنس میں پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے میں بھی کامیاب ہوئے۔ اسی سال کالج میں داخل ہوئے تاکہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکیں۔ لیکن شدید مہلات کی وجہ سے اس ارادہ کو ترک کر کے پھر علی گڑھ واپس آنا پڑا۔ اس طرح ان کا ایک سال بیکار گیا۔ اس بار انھوں نے آرٹس کا کورس لیا۔ ۱۹۱۷ء میں بی۔ اے اور ۱۹۱۹ء میں اقتصادیات کے مضمون میں ایم۔ اے پر ویس پاس کیا۔ ایم۔ اے کی تہاری کے ساتھ ساتھ ذاکر حسین اقتصادیات کے شعبے میں جو نیر لکچرار کے فرائض انجام دے رہے تھے کالج علی گڑھ میں ترک ہو کر لاہور آئے جہاں سے سید احمد خان کا ایم۔ اے۔ اور کالج زیرو زبر ہو کر ڈاکٹر ضیاء الدین کی مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ کچھ لوگوں نے گتہ مونی حمایت سے نکل کر ایک جیمز کی بستی میں پناہ لی اور اس کا نام جامعہ قلیہ اسلامیہ رکھا ان پناہ گزینوں میں ذاکر حسین بھی تھے جو اب ذاکر صاحب کہلانے لگے تھے۔ علی گڑھ کالج کی تعلیم کے دوران میں ذاکر حسین یونین کے اور عام طور پر طالب علموں کی جماعتی زندگی کے دوحہ والے تھے۔ انھوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن خود سب سے گہرا اثر ڈاکٹر ضیاء الدین کا قبول کیا۔ گو وہ مثبت نہیں منفی اثر تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی ذات ان سب صفات کا مجموعہ تھی جن سے ہر کارِ برطانیہ کا تقرب اور صنادید قوم میں مقبولیت حاصل ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈاکٹر ضیاء الدین کی پیروی معکوس کو اپنی زندگی کا اصول بنا لیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طلبہ کو ترک مہلات کی دعوت دی تھی اور مولانا محمد علی نے شیخ الہند مولانا محمد ولس مرحوم کے دست مبارک سے جامعہ قلیہ کا افتتاح کرایا تھا تو ذاکر صاحب کے لئے ایم۔ اے۔ اور کالج کو چھوڑ کر جامعہ قلیہ میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا نہایت دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ کئی روز شدید کشمکش میں مبتلا رہے مگر ایک دن جب ڈاکٹر ضیاء الدین نے انھیں بلا کر بڑی محبت سے زندگی کے نشیب و فراز بھلے اور رفیقین و لایاکر ایم۔ اے۔ اور کالج میں رہ کر تم کو ایک ہی سال کے اندر ڈیڑھ لکھ ٹری مل جائے گی تو ذاکر صاحب کی مشکل آسان ہو گئی۔ وہ فرما ایم۔ اے۔ اور کالج کو خیر باد کہہ کر جامعہ قلیہ پہنچ گئے۔

دو سال تک جامعہ قلیہ کی تعمیر میں مولانا محمد علی کا ہاتھ بٹانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے برلن پہنچے جیری ملاقات ان سے ایک مرتبہ علی گڑھ میں ہو چکی تھی۔ لیکن اب سواتین برس تک میرا ان کا

دست کا نظریہ تھا۔ یہی نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا اور ہر رنگ میں چڑھایا یا سب سے زیادہ مجھ پر اس بات کا سکہ بیٹھا کہ اگر صاحبِ اربابِ عام جوانی جیسا کہ افتد وانی کی واوی پرخار سے بڑی پامردی سے گزرتے۔ گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں لڑائی میں اچھے نہیں بلکہ اوسانِ قائم رکھے وامن بچائے قدم بڑھائے چلے گئے۔ برلن میں ڈاکٹر صاحب کے استادوں میں پروفیسر زورنرٹ اور دوسرے بڑے پائے کے عالم تھے جن سے انھوں نے بہت فیض اٹھایا مگر فیضان اگر تھوڑا بہت کسی سے پایا جاتا ہے۔ اس لئے استادانِ شیراز سے جو خبر کے ساتھ ساتھ نظر بھی رکھتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر صاحب جو برلن سے ڈاکٹر ڈاکٹر حسین بن کر لوٹے تو ملک کی کیفیت دیکھی کہ ترک حرکات اور خلافت کی تحریکیں تھک رہی تھیں اور لوگوں پر خصوصاً مسلمانوں پر ایک عالمِ افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

گلشن میں کہیں برے دمساز نہیں آتی

اللہ رے ستانا آواز نہیں آتی

مگر ایک آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور وہ خود ان کے دل کی آواز تھی :

بے گانہ ہوئی دنیا رسمِ درو افیس

اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

بہت جانِ طبیعت باز نہیں آتی اس نے جامعہ قلیہ کی سوکھتی ہوئی بیل کو خون جگر سے سیجا اور پردان چڑھایا۔ ۱۹۲۶ء کے آخر میں اہل خانہ کے انتقال کے بعد جامعہ قلیہ کا چلنا قریب قریب ناممکن نظر آتا تھا۔ جن لوگوں نے ان دنوں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کیا وہ جانتے ہیں کہ وسائی کے فقدان، اپنوں کی مخالفت، بغوروں کی شہادت، حکومت کے غائب کے باوجود جامعہ قلیہ کو چلانا ہر ایک کا ہم نہیں تھا۔ یہ وہی کہہ سکتا تھا جسے خدا پر افسان پر اور خاص کر اپنے آپ پر سچا پورا اور گہرا بھروسہ ہو۔ جو آثار ڈاکٹر صاحب کے جامعہ قلیہ سے لئے یا اس میں تھے، وہ ان کی قربانی قرب کو نظر آتی مگر ایک قربانی جو حوصلہ مند طبیعتوں کے لئے ان سے مشکل ہے بہت کم لوگوں نے دیکھا وہ یہ ہے کہ ملک ایڈر می کے موفقیہ جن کے لئے ڈاکٹر صاحب کے ہم چشم ہزاروں جن کرتے تھے ان کو بے مانگے لے رہے تھے مگر انھوں نے بے تامل سمجھوڑوئے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا کام یوں بھی کیجیو چاہتا ہے اور ان دنوں جامعہ قلیہ کی جوئے شیر لانے کے لئے اس طور پر بیٹھے آپ کو پوری طرح کھپانے اور تہہ مار کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں ڈاکٹر صاحب کو قریب قریب سبھی قومی اور ملی ایڈروں سے سابقہ رہا لیکن ان کی شخصیت پر ناپاکی ڈکڑا اثر صرف نام کا حامی اور جیکیم اہل خانہ کا پڑا گاندھی جی کی حق بینی، حق شناسی، حق کوئی اور ہمہ گیر انسانیت کی آواز نے آگے کچے سونے کو کندن بنایا اور اہل خانہ کے حق و مروت، صبر اور حلم نے اس پر حلا کر دی۔

جرمگان قوم میں سے سوا ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سب اس بے ولی کی فضا میں جو خلافت اور سوراخ کی تاریکی کا نام ہونے کے بعد جھاگتی تھی، اس ادارے کی کشتی کو حکومت کی مدد کے بغیر بار لگانے سے بہت دیر چکے تھے ڈاکٹر ڈاکٹر حسین نے وہ کام کر دیا جو انگریزی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کے شوق سے ہمارے استادوں میں سے ان لوگوں کو ساتھ لے کر جنھوں نے بیس سال پرانے نام معاوضے پر جامعہ قلیہ کی خدمت کا عہد کیا، جنھیں تعلیم

کی جٹاؤانی۔ اس انجمن نے جامعہ تعلیم کو اپنے ماتھے میں لے لیا اور چلا یا۔ ارباب حکومت روٹے اٹکاتے رہے۔ بزرگان قوم والا زمانہ تھا۔ دور سے قاتلا دیکھتے رہے۔ انہی دور دارانِ قوم واکر صاحب کی سرکردگی میں روکھی سرکھی کھا کر مرنا چھوٹا بہن کر ایک امراد تعلیم گاہ کی تعمیر کھتے رہے۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۷ء تک کا زمانہ واکر صاحب کے لئے بڑی سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ یوں تو ہندوستان کے نون میں نیک آراؤنی نے شانہ سے یہ جان پیدا کر رکھا تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں حکومت خود اختیاری ملنے کے بعد ہندوستان اہل غرض کی انوکھے کے اندام سے فرقہ داری نہ ہر اس شدت سے پھیلنے لگا تھا کہ یہاں سون نے زہر باد کی صورت اختیار کر لی۔ واکر صاحب اور ان کا چاہ قلم اس زمانہ میں دو گونہ رنج و غلاب میں مبتلا تھی۔ فرقہ پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو نفرت کی آگ میں لپیٹ لیں یا جلا کر خاک کر دیں۔ قوم پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو محبت کی زنجیروں سے سیاست کی جنگ میں گھسٹ لیں۔ واکر صاحب کو پورا احساس تھا کہ اس وقت جب ملک کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا سیاست سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ لیکن ملک زوت جہاد کی زوت نہ بن سکی۔ دشمنوں کی عداوت اور دوسروں کی محبت دونوں ان کو عملی سیاست میں کھینچنے میں ناکام رہے۔ البتہ واکر صاحب نے اپنی سوشلسٹ کی کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں صلحت کر لے اور ملک کی تقسیم کر دینے میں گاندھی جی کا ہاتھ بٹا دیں اور انہیں آؤ تک یہ آس۔ ان کے اس کوشش میں کامیابی ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جب مختبر ذریعوں سے معلوم ہوا کہ واکر صاحب کو پہلی قومی کانفرنس میں رکھنے کی تجویز ہے تو انہوں نے اس امید پر کہ ایک دن کانگریس اور لیگ کی مشترک کا بیہ متحد ہندوستان کا اصول مان کر بنے گی۔ اس وقت وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ وہی کر سکتا تھا جو اقبال کی اصطلاح میں مروت فیر ہو۔ مگر ظاہر ہے ساحل پر رہ کر طوفان کو روکنے کی سعی کیا کامیاب ہوئی۔ فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی۔ ہندوستان کو تقسیم کرنا ہی پڑا جس کے ساتھ ہندوؤں کے مسلمانوں کے جسم و روح تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ ————— بھارت، مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان۔ واکر صاحب کے جگر پرکے چل گئے۔ ان کی آنکھوں میں دنیا تار یک ہو گئی۔ مگر اس اندھیرے میں انہیں اپنے فرض کی راہ صاف نظر آتی رہی۔ انہوں نے پاکستان کو وعائے خیر دی اور اپنے آپ کو تن من سے ہندوستان و بھارت کے حوالے کر دیا۔

۱۹۳۷ء کے بعد کے تین سال واکر صاحب کے لئے سخت روحانی کرب اور شریر چھائی اور روحانی محنت کے تھے۔ اس میں انہیں وہی کے مسلمانوں کی تباہی، اضطراب مالیسی، ہراس، دہلی میں آگے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کی بے ہودہ ساقی، مصیبت اور دنگ بلیش کے جگر خراش منظر دیکھنے پڑے اور ان سب کی یکساں خدمت کرنے والے سردوں اور عورتوں کے ساتھ ان نیک کام کرنا پڑا۔ گاندھی جی کی شہادت کا جانکاہ صدمہ اٹھانا پڑا، جامعہ تعلیم کو اپنے معتمد سانیوں کے سپرد کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اندر اور باہر کے بے شمار خطروں سے بچانے کی جدوجہد کرنی پڑی اور اسی زمانے میں یونیورسٹی کمیشن کے ساتھ سارے ملک کی خاک چھانی پڑی۔ روح و دماغ اور جسم تینوں مسلسل بوجھ پڑنا رہے تو انسان کمان تک سہہ سکتا ہے۔ آخر جسم کی قوت برداشت نے جواب دے دی۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں شدید قلبی مرض (THROMBOSIS) کا حملہ ہوا جس سے جان کے لئے پڑ گئے۔ مگر خدا کو واکر صاحب سے کچھ اور کام دینا تھا۔ اس لئے چار پانچ مہینے صاحب فرات رو کر اچھے ہو گئے۔

۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء میں واکر صاحب نے اپنا سارا وقت اور فوج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں صرف کی اور جہاں

ہم اس سے ہر وقت تھانا امید میں امید، بے ولی میں دلورہ، بد نظمی میں نظم پیدا کر کے علی گڑھ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بڑی اونچی جگہ پہنچا دیا۔

۱۹۵۲ء سے ان کی مصروفیتوں کا دائرہ بڑھ گیا ہے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوان بالا، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اور اس طرح کی بے شمار عارضی اور مستقل مجلسوں کی رکنیت، انجمن ترقی اردو، ہندستان اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تنظیم و کمیٹی کی صدارت ان کے لئے قابل فخر ہیں۔ ان کے لئے ان کو مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں مانتہ ثنائے کے لئے بدلی کے ایجوکیشنل سروس کے نائب، بین انٹرنیشنل فور انڈیا صاحب کو بلا کر پرووائس چانسلر بنانا پڑا ہے۔ مگر اب بھی ان کی توجہ اور سعی کامرکز علی گڑھ ہے۔ اس لئے ان کو غور کرنے اور سدھارنے میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما کا ایک سرسری سا خاکہ کھینچنے کے بعد اب ہم اس میں کچھ غور و اسرار نگ بھرتے ہیں تاکہ ان کی تصویر کے نقص کسی حد تک اُبھر آئیں۔

میرے عزیزم استاد، پروفیسر اشیر انگری نے انسانی شخصیتوں کی چھ بنیادی شعبیں قرار دی ہیں۔ مذہبی، سماجی، علمی، جمالی، سیاسی، معاشی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت ان میں سے دوسری قسم سے اعلیٰ دکھتی ہے یعنی گواہی میں مذہب و نصرت، فکر و فطرت اور دونوں جہان کا خاصا گراؤنگ ہے اور اقتصاد و سیاست کا کچھ ہلکا سا رنگ موجود ہے۔ لیکن ساری زمین انسان دوستی سے زجی ہوئی ہے، ان کے لئے انسان سے خواہ فزیکل شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کرنا نہ کوئی مذہبی و اخلاقی فرض ہے، جس کے لئے شعوری عقیدے اور ارادے کی، نہ کوئی علمی اصول ہے جس کے لئے فکر کی، اور نہ کوئی سیاسی مذہب ہے جس کے لئے مذہبی ضرورت ہو بلکہ وہ توان کی فطرت کا قافی ہے جو بلا شعور، بلا ارادہ کام کرتا ہے۔ ہم سنا کرتے ہیں کہ فلاں شخص سے دو منوں عزیزوں یا عام طور پر بندگان خدا کی خدمت کا بیڑا اٹھا یا ہے۔ فلاں نے قوم و ملت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔ دنیا کو بیخ و برباد کیا ہے، قربانی کی ہے۔ ذاکر صاحب کو میں نے پچھلے ۳۲ سال میں ہمیشہ افراد اور جماعتوں کی جلدائی کی کوشش میں محو دیکھا ہے۔ لیکن میرے علم و یقین میں نہ انھیں کبھی خدمت کا بیڑا اٹھانے کا احساس ہوا، نہ اپنے آپ کو وقف کرنے کا، نہ تیگ کا، نہ ایثار و قربانی کا۔ احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود بہتے چلتے، بے رکاوٹ ایک سمت بہہ رہا ہے اور انھوں نے کہا اچھا ہے بہنے دو سماجی یا انسان دوست ٹائپ کی ایک اور بڑی پہچان ہے اور وہ بھی اگر صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان میں ”خودی“ اور ”بے خودی“ اس طرح گھل مل کر شیر و شکر ہو گئی ہے کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خواہ وہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کے ہوں انھیں احساس کمتری اور اظہار برتری کی کشش سے گزرتا، خود فروشی اور خود غلامی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑتا۔ نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے ہیں جیسے برسوں کا دوست ہو، وہ انسان کو کتاب سمجھ کر اس کی تنقید و تکیلی اور تجویز نہیں کرتے کہ کسی جزو کو زہ اور کسی کو قبول کریں، بلکہ جیسا ہے سارے کا سارا لے لیتے ہیں اور اپنے کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اخلاقی رہنما ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور ہمارے زمانے میں گاندھی جی تھے اس پر بہت زور دیا ہے کہ بڑے آدمی اور اس کی بڑائی میں فرق نہ ہو، اس طرح جیسے بیمار اور بیماری

میں کرتے ہو۔ بڑائی کو ضرور بڑا کہو اور رونے کرنے کی کوشش کرو۔ گمان انسان کو جس کے اندر بڑائی نظر آئے بڑائی کی طرح ہمدردی کے قابل و علاج کا محتاج و محبت کا سزاوارتھ ہو۔ اس اصول پر اپنی طبیعت کے تقاضے سے عملی کرتے ہوئے میں نے کسی کو دیکھا ہے نہ ڈاکر صاحب کو۔ بڑے اعمال کی وجہ سے کسی کو بڑا سمجھنا تو درکنار ڈاکر صاحب کی اتھاہ موت اکثر انسان کے جوہر انسانیّت کی آفتاب اس کے نور سے اعمال کو قبول نہیں تو گوارا ضرور کر لیتی ہے۔ کسی کے دل کو ہاتھ میں لینا ان کی طریقت میں رنج اگر ہے اور کسی کے دل کو توڑنا گناہ کبیرہ کفر ہے۔ ان کی طبیعت حوصلہ مند ہے اور قومی اعزاز، اجتماعی منصفیہ مانگنے والے قومی کا دل قبول کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس میں کسی عریض کا مقابلہ کر کے اس کو شکست دینا ہو کسی انسان کو رو نہ کر آگے بڑھنا ہو تو وہ عموماً پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ جب ڈاکر صاحب تعلیم کے لئے برمنگھم کے ہندوستانیوں کی قومی انجمن ہندوستان ایسوسی ایشن کے صدر و اداروں کا انتخاب و پیش کیا۔ ڈاکر صاحب کی شخصیت نے چند ہی روز میں اتنا گرا اثر ڈالی ویا تھا کہ بہت بڑی اکثریت ان کو صدر منتخب کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ڈاکر صاحب اپنے عریض کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ دوسرے سال جب لوگ انھیں اچھی طرح جان گئے تھے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ وہ ان کا عریض بنے، بلا مقابلہ وہ صدر منتخب ہوئے۔

انسان دوستی کے بعد سب سے گہرا رنگ ڈاکر صاحب کی شخصیت میں خدا پرستی کا ہے۔ ان کی دینداری و دنیا داری کے پرزے ہیں سے یوں بھی غور و باری بہت جھلکتی رہتی ہے۔ لیکن اچھی طرح چمکتی اس وقت ہے جب آس پاس کی فضا میں مایوسی کا اندھیرا اچھا جاتا ہے۔ ان کے ایمان کی ثابت قدمی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اچھے اچھوں کے ایمان ڈالوں ڈالوں ہول مچاتے ہیں۔ اس کی سب سے روشن مثال وہ ہے جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں ریلی میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا، جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی جالی ہر دفت خطے میں ملتی اس کے بہت سے پیچھے ہمدرد و جواہر لال نہر سمجھے جاتے تھے اصرار کرتے تھے کہ کچھ دن کے لئے وہی چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ لیکن ڈاکر صاحب کے قدم جیسے آواران کی وجہ سے ہزاروں اکھڑے ہوئے قدم بھر جگمگاتے تھے اور روحانی ہلاکت کے سیلاب میں ڈاکر صاحب نے ہنسنے پینے لنگر سنبھالے رکھا بلکہ بہت سے ڈوبنے والوں کو یہاں تک کہ ان لوگوں کو جو خروان کو ڈوبا چاہتے تھے، ہمارا دم کو کٹا کر پرہیز کیا دیا۔ اسی دن ڈاکر صاحب نے ایک دوست کو لکھا تھا کہ مجھے انسان کی انسانیت پر بھروسہ ہے۔ جنوں کی یہ لہر دیکھتے دیکھتے گزر جائے گی ظاہر ہے انسان کی انسانیت پر ایسا بھروسہ وہی کر سکتا ہے جو خدا کی خدائی پر اہل ایمان رکھتا ہو۔

فطرت ذوق اور لطافت احساس وہ صفات ہیں جو ڈاکر صاحب کی شخصیت کی گہرائی سے ناسازگار ماحول کے باوجود ابھر کر رہیں۔ مولوی بشیر الدین کے اٹاؤ سے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے عملی گڑھ میں رہ کر شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کا ذوق رکھنا و دوزخ کی زندگی میں، رہیں سن اور اخلاق و آداب میں۔ بیرونی صفائی اور خیراتی اندرونی پاکیزگی اور حسن و تناسیب کا لحاظ رکھنا بہت دشوار تھا۔ مگر ڈاکر صاحب نے کر دکھا یا۔

جامعہ ملیہ کے دورِ تنگ کوئی ہی میں ڈاکر صاحب نے اپنے گھر اور اپنے ادارے کو ساؤگی اور سلیقے کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اب عملی گڑھ میں ہماری انھیں مقابلتہ فراغت حاصل ہے، ان کی ذاتی نوجہ اور اہتمام کی بدولت وائس چانسلر کے کچلے لے کر یونیورسٹی کی آخری حدود تک ساری سنی گھراؤ نظر آتی ہے۔ سڑکوں، ٹالپوں، چیمپوں کی صفائی سے صحت جسم و صحت

دارالعلوم کی سطح اور پہنچ ہو گئی ہے۔ علی گڑھ کی بے ہنگم اور بد نما عمارتیں ڈاکٹر صاحب کی ہتکھٹوں میں طالب علمی کرنے والے کے لئے تھیں۔ گریڈا پرستے انھیں ایک دم سے گرا کر بدل نہیں سکتے۔ اب جہاں تک وسائل مہیا کرتے ہیں نئی عمارتیں اپنے مذاق کے مطابق تیار ہے ہیں۔

موسیقی اور مسوری میں ڈاکٹر صاحب خاصا وسیع ذوق رکھتے ہیں اور مشرقی اور مغربی فنکاروں کے کمال سے کیا انھیں اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے پاس منتخب تصویروں اور ریکارڈوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جس میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ خطاطی کا فن بھی ان کا پسندیدہ فن ہے اور ایک زمانے میں ان کے پاس کتبوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا جس کا راجہ جتوہ نے جو کیا۔ شعر میں ان کی دلچسپی کا دائرہ اردو، فارسی، انگریزی، جرمن شاعری کی محیط کئے ہوئے ہے۔ مگر سب سے زیادہ فارسی شاعری سے خصوصاً اقبال کے فارسی کلام سے اٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہ جھوم جھوم کر دلکش محو میں اقبال کے شعر پڑھتے سنتے تو آپ کو یاد آ جائے گا کہ اقبال مفکر، معلم، مصلح ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔

علمی منشغل میں ڈاکٹر صاحب کو سب سے زیادہ پڑھنا اس سے کم پڑھانا اور اس سے کم لکھنا مرغوب ہے۔ کتب میں ان کو اتنا گہرا اور سچا شوق ہے کہ انتہائی مصروفیت، پریشانی، بیماریاں تک کہ علالت کی حالت میں بھی اس کا نفوٹا بہت سہولت سے جلتا رہتا ہے۔ باقاعدہ تحصیل انھوں نے علم معاشیات کی کی تھی اور آگے چل کر فن تعلیم کو اپنا فن بنایا۔ شعبہ کی کامیابی ان دونوں کے علاوہ اور دنیا بھر کے موضوعات پر بھی حاوی ہے۔ البتہ فقے کہانیاں جی کا شوق ان پر اسے میں لوگوں کو خط کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کم پڑھتے ہیں، درس و تدریس کا کام جب تک انھوں نے کیا، خاصی دلچسپی سے کیا لیکن باقاعدہ درس سے زیادہ ان کو اس کی لگن تھی اور اب بھی ہے کہ طلبہ کے دل میں عام لگنے کا، اپنی اپنی چیز سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق پیدا کریں۔ علی گڑھ ہی پر موقوف نہیں کسی یونیورسٹی کا کوئی نوجوان طالب علم اس کا جو روم و منصب کی طلب اور پارٹی بازی کی بات سے محفوظ رہ کر خلوص سے علمی کام کرنا چاہتا ہے، ڈاکٹر صاحب کو دل سے بہ ہوتا ہے اور وہ اس کی اپنے امکان بھر پوری مدد کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اردو داگمہ بڑی تھریو و تحریروں پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر سادگی اور پیکاری میں ان کی طبیعت کی بولتی ہوئی تصویر اور ان کی تحریر اگر کیسوی سے لکھی ہوئی ہو بے ساختہ پن، جوش اور خلوص میں ان کی سیرت واضح ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی علمی اور تعلیمی دنیا کو ڈاکٹر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ بہت کم بولتے اور لکھتے ہیں۔ تقریر سے بچنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قلب کی بیماری کا دورہ پڑنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو زیادہ غور کرنے سے منع کر دیا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اس میں دل کی طاقت بہت کھپاتے ہیں۔ اب یہی خبر سوا اس لئے آج کل تو انھیں جتنی فرصت چاہیے، وہ نصیب نہیں، لیکن دراصل یہ ان کی جراثیمی کمزوری ہے کہ لکھنے کے کام کو بڑھاتا رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ یا تو وہ بالکل ہی ٹکی جاتا ہے یا عین وقت پر رات بھر جاگ کر پورا کیا جاتا ہے۔

لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا کہ مابین صدی کی دوسری چوتھی میں ہندوستان میں زندگی گزارنے والے جامعہ تعلیم یافتہ یونیورسٹی جیسی قومی اور ملی تعلیم گاہوں کے وائس چانسلر رہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب میاں ست سے بالکل بے تعلقی



لیفٹاننٹ، سرب، ریسر و دراج اگر الگ الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔  
 کہ ان میں سے کچھ ایسے ایسے ہوتے ہیں، اگر آوے گا تو وہی بگڑا ہوا ہو تو معلم اور مرشد کی ساری سعی  
 انہیں عانی ہے جب تک کوئی مصلح اور مجاہد اجتماعی سائچوں کو نہ سدھارے یا ان کو توڑ کر نئے سائچے نہ بنائے اور جو  
 انہیں ہی نقص میں معلم اور مرشد کے ساتھ مصلح اور مجاہد یعنی مجموعی طور پر تجد و کی شان پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا!  
 شاید اگر صاحب جیسے صوفی غرض کو یہ توڑ پھوڑ قانون وحدت اور ایمین محبت کے خلاف نظر آئے لیکن اس  
 مثال کو اس مردِ معارف نے حل کر دیا ہے جس نے کہتا ہے ۔

نقشِ حق را ہم ز امرِ حق شکن!

بیز عباچ دوست سنگ و دست آن

یہ دہل نے ثابت کر دیا کہ پرانے سائچے خواہ سنگ خار کے بنے ہوئے ہوں بنے فیثہ و گرز محض تنگ بالحق صرف  
 بنے ہوئے سے توڑے جاسکتے ہیں ۔



# مرزا عظیم بیگ چغتائی

شہاد احمد دہلوی

اللہ بخشے مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی عجیب خوبوں کے آدمی تھے۔ سدا کے مریجوڑے۔ پیدا ہوئے تو اسنے نجف و کمزور کہ  
 مدنی کے پہلوں پر رکھے گئے۔ بڑے ہوئے تو روگی مرعوب۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ دو حبال بھی جائیداد تھی اور انجیاں بھی  
 سادھی۔ ان کے والد عظیم بیگ چغتائی پورہ میں ڈپٹی ملکہ تھے۔ باقی وطن آگہ تھا۔ بیس ان کی جدی جائیداد بھی تھی۔ مرزا عظیم بیگ  
 چغتائی کے نانا منشی امراؤ علی تھے جو اسے لکھنؤ کے صدری پھنسے کے مشہور ناول نگار تھے۔ ان کی نصابت رزم بازم اور البرت بل  
 ایک زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ مرزا صاحب کے والد بڑے ثقات کے آدمی تھے۔ سرسید کی انکمیں دیکھے ہوئے علی گڑھ کے  
 ابتدائی گز بکریس میں سے تھے۔ اپنے زمانے کے اچھے کلاڈیوں میں شمار ہونے لگے۔ ورزش کا بھی شوق تھا۔ سواری کے لئے موزن۔  
 سے منہ زور گھر لے آیا۔ کر کے رکھتے تھے۔ بڑے طاقتور آدمی تھے۔ ایک بلی نے گھر والوں کو بہت عاجز کیا رکھا تھا ایک دن  
 وہ ان کے ہاتھ آگئی۔ ہاتھ اس کی کمر پر پڑا۔ چاہتے تھے کہ اسے گھر سے باہر اچھال دیں مگر وہ کم بخت کلائی میں پٹ گئی۔ انہیں  
 بھی تاؤ آگیا۔ اس نے اپنے بھجوں اور دانتوں سے ان کی کلائی اور جھڑی مگر انھوں نے بھی اپنے پھسے کی گرفت اتنی سخت کی کہ  
 اس کی ہڈی ہلکی ایک ہو گئی اور اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا دم نہ نکل گیا۔ ویسے وہ بڑے خوش مزاج آدمی تھے  
 اور چھوٹے بڑے سب اچھی طرح پیش آتے تھے۔

چغتائی صاحب چونکہ پیدائشی کمزور ہوئے تھے اس لئے ان بچوں کے مقابلے میں ان کی طرف والدین کی توجہ زیادہ رہتی  
 تھی۔ لاڈ پیار میں پلے۔ کچھ گھر پر پڑھا، کچھ ٹیوٹر کے سکول میں۔ اس کے بعد علی گڑھ سے بی۔ اے اور ایل ایل۔ بی کے امتحانات  
 پاس کئے۔ کالج ہی کے زمانے میں نواب مزل اللہ خان کے ہاں ملازمت بھی کر لی تھی۔ کیونکہ شادی ہو گئی تھی اور اخراجات پر سے  
 نہ ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں صفوں نگاری بھی شروع کر دی تھی، بکنڈیوں کی کہانی "نقصہ صحرا" کا پہلا حصہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے  
 ہی لکھ چکے تھے۔ اس کے باقی دو حصے بعد میں لکھے۔ جھٹکی اور دوہیں بہت تھے۔ جہانی کمزوری کی تلافی و ماضی قوت سے ہو گئی تھی۔ کالی  
 کے زمانے میں اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مذہب کا مطالعہ بھی کر ڈالا اور حدیث اور فقہ سب چاٹ گئے۔ علی گڑھ والوں کی خواہش  
 یہ بھی آرزو خیالی اور مغربیت کے دلدادہ تھے۔ قدامت پسندوں اور مذہبی خیال والوں سے ان کے مباحثے ہونے لگے۔ انھیں  
 اس میں بھی مزہ آتا تھا کہ مفسروں کو پھیریں، ستائیں، جلایں۔ حدیثی اذہب تھیں مستند کتابوں کے حوالے یا دتے۔ بڑے دھڑکتے

سے قائل کر دیتے تھے۔ اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ شرط لگا کر بحث کرتے تھے۔ مثلاً کسی مولانا قسم کے آدمی سے وارسی نہ کھنے نہ دیکھنے پر بحث تھلتی تو شرط لگاتے کہ ”اگر تم جیت گئے تو ہم وارسی رکھ لیں گے اور اگر ہم جیت گئے تو تمہاری وارسی مونڈ لیں گے۔“  
 امت سے تو شرط کی نوعیت ہی سے گھبرا کر بھاگ جاتے اور اگر کوئی ہمت کر کے جم گیا تو سمجھو کہ اس کی شامت آگئی سب لوگوں کو  
 خبر تارے دیا جاتا۔ شام کو ایک جو غصہ کی موجودگی میں بحث شروع ہوتی۔ کتابیں گھولی جاتیں، دلیل کی تصدیق یا تردید کی جاتی۔  
 ”مڑی نہ جلسہ کیا ہوتا کہ چیتا کی ہی ہمیشہ جیت جاتے۔ پھر کسی منچلے کے ہاں سے شیو کا سامان منٹایا جاتا اور نہایت احتیاط سے  
 وارسی مونڈ کر محفوظ کر لی جاتی۔ اس طرح انھوں نے کئی وارسیاں جیتی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جیتی ہوئی وارسی بچا دی جاتی تھی۔  
 وہ اس طرح کہ دوسرے ہوتے مولانا سے اس کی کوئی مناسب قیمت لے لی جاتی اور ان کو وارسی بخش دی جاتی۔ اس ”خصاص“ سے  
 لوگ ٹھکانے منگلتے اور سب کو شیرینی تقسیم کی جاتی۔ ایسے ہی ایک مباحثے میں چغتائی صاحب ایک دفعہ مار گئے۔ انھیں وارسی  
 بھی نہ دی۔ اس وقت کی ایک تصویر بھی تھی جسے میں نے ”کامران“ کے سرورق پر چھاپا تھا۔ خدا جانے پھر کیا کفارہ ادا کر کے  
 اس سے نجات پائی۔

چغتائی صاحب کی شادی رامپور کے ایک پٹھان گھرانے میں ہوئی تھی جو مذہب کا بڑی سختی سے پابند تھا۔ چغتائی صاحب  
 نے شادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کا برقعہ اتروا دیا اور انھیں کھلے بندوں لانا لے جانا شروع کر دیا۔ اسی وضع سے انھیں  
 اپنی سسرال رامپور بھی لے کر پہنچے تو وہ لوگ بہت بگڑے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کی اور سسرال والوں کی ٹاننی ہو گئی۔  
 مصیبت بھاری بیگم چغتائی کی! باپ بھائیوں کو یہ رسم کہ ہماری لڑکی بھلا ہمارے گھنے سے باہر کیسے ہو سکتی ہے۔ (وہ مول بگڑے  
 مڑا کہ چاہے جان چلی جائے آن نہ جائے پائے۔) اڑ گئے کہ صاحب وہی ہو گا جو ہم کہتے ہیں۔ ہم بھرے پٹھانوں نے کہا۔ ایسا  
 ہرگز ہو ہی نہیں سکتا۔ کفنے براوری کے سب بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ صلوات ہوئی کہ لڑکی کو گھر بٹھالیا جائے اور داماد  
 صاحب کو بیک بینی و دو گوش روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ مرزا صاحب کہہ دیا گیا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے چھتے پھرتے نظر آجئے مرزا  
 کسول گئے مگر کیا کرتے، بولے ”میری بیوی سے اور پوچھ لیجئے۔“ اگر وہ بھی یہاں رہنا چاہتی ہیں تو خوشی سے رہیں۔ میں جلد جاؤ  
 اور اگر وہ میرے ساتھ چلنا چاہتی ہیں تو آپ تو آپ دنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی۔ بات معقول تھی۔ سمجھ میں آگئی۔  
 لڑکی سے پوچھا تو وہ نیک بخت چادرا دھڑک کر کھڑی ہو گئی۔ اس غریب کو تو مرنا بھرنا تھا۔ ماں باپ کے پکھوڑے سے لگی کب  
 تک بیٹھی رہی تھی؟ گھر والوں نے کہا ”بی بی! ہماری بات نیکی کر کے جاری ہو تو پھر کبھی اس ویلیز بندہ آنا۔ آج ستم ہمارے  
 سے اور ہم تمہارے لئے مر گئے۔“ وہ بھاری دھاروں روئی مہیاں کے ساتھ مولی، اردنوں میکے نہ گئی۔

تفہیم سے فارغ ہونے کے بعد چغتائی صاحب نے کتاب ”فرائین اور پردہ“ لکھی۔ پھر چند سال بعد حدیث اور پردہ“  
 اور اس کے پھر عرصہ بعد ”قص و سرود“۔ اسی عرصے میں کچھ لوگوں کے بھاننے اور کچھ اپنے تلخ تجربات کی وجہ سے انھوں نے مذہب  
 کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ادب کی طرف کر لی اور ۱۹۲۷ء سے ان کے ادبی مضامین اور افسانے شائع ہونے لگے۔

جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں ان کا افسانہ ”انگوٹھی کی مصیبت“ نیزنگ خیال کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے چھپنے  
 ہی ہمارے ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا آگیا جس کو دیکھو اس کی زبان پر اسی کا ذکر۔ بعد میں چغتائی صاحب نے وہ بلے شمار

خطر طبعی دکھائے جو اس افسانے کے بارے میں ان کے پاس آئے تھے۔ بیشتر خطوط تو صیغی تھے لیکن بعض خطوط میں نفسیت کیفیت کی روشنی میں افسانے کے بعض مقامات کی توضیح چاہی گئی تھی۔ بعض میں شعور اور لاشعور کی بحث کی گئی تھی۔ ایک خالوق پرچھا کہ پیر وجہ بیرون سے پوچھتا ہے "بھرو لوگی تو نہیں..... بھرو لوگی تو نہیں..... بھرو لوگی تو نہیں....."

اس میں جو وقفہ یوں کیا آپ بنا میں گئے یہ لذتِ الغشام سے مغلوب ہونے کے ہیں؟ چیخائی صاحب بولے یہ ہمیں آج کا دور بھی نہیں معلوم کہ لذتِ الغشام کیا ہوتی ہے "چنانچہ ہم دونوں ملے لذت میں اس کے معنی دیکھے۔ اور چیخائی صاحب ہنسے میرے تو وہم میں ہی یہ بات نہ آتی تھی۔ لوگ بھی کسی کسی کو ضعیفین کر لیتے ہیں!

اس افسانے کے بعد جیتاٹی صاحب کے چند اور افسانے دوسرے رسالوں میں چھپے مگر وہ اس طرز کے نہیں تھے اس سال اس سے بہتہ اور کوئی افسانہ چھپا ہی نہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں بڑے بڑے افسانہ نگار تقریباً سبھی زندہ اور لکھ رہے تھے۔ اس کے کوئی ایک سال بعد میرے پاس ایک خط علی گڑھ سے آیا۔ اس میں جیتاٹی صاحب کا خط اور دو نئے خط میں بڑا خلوص تھا اور کس نفسی بھی۔ ساقی دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ ان کا خط پا کر بے حد خوشی ہوئی اور اسی وقت ان سے ملنے کو جی چاہنے لگا۔ یہ افسانے تھے ”ٹکٹ پتیکہ“ اور ”کوئٹار“۔ دوسرا افسانہ بہت مشہور ہوا اور جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہم نے منصوبہ بنایا کہ ”کوئٹار“ کا پورا قاول کیسے مرتب کیا جائے۔

مرزا صاحب کا پہلا بیٹا ملنے کے بعد ان سے دس سال تک خط و کتابت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ شاید ہی کوئی ہفتہ نافرہ ہوتا ہو۔ ان خطوں میں دنیا زمانے کی باتیں ہوتی تھیں۔ اور تب خطوں سے جی نہ بھرتا تو وہ دلی چلے آتے یا مجھے ان کے پاس جانا پڑتا۔

پہلا خط بھیجنے کے وقتیں ہی جیسے بعد ان کا خط آیا کہ میں دہلی آ رہا ہوں اور رات کی فلاں گاڑی سے، بیوی بھی ساتھ ہوں گی۔ مرزا صاحب کی تصویر ہم سب دیکھ چکے تھے۔ رات کو میں، انصاری، ناصر علی اور فضل حق قریشی انھیں لینے اسٹیشن پہنچے۔ ریل آئی، ایک ایک ڈوبے چہان مارا۔ چغتائی صاحب کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب گاڑی بالکل خالی ہو گئی تو ہم اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ سا۔ منے سڑک پر سے ایک ٹانگہ گزرا۔ اس میں ایک سائفرن اور ایک صاحب دکھائی دے۔ فضل حق نے کہا: ”وہ چغتائی ہیں چغتائی صاحب! میں نے اور انصاری نے چونک کر انھیں دیکھا۔ کوئی بڑھا بچہ مرایا سا آدمی تھا۔ موٹی سی جینک لگائے، پھر ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ اگلے دن صبح میں گھر ہی میں تھا کہ اطلاع پہنچی: ”چغتائی صاحب مرانے میں آئے بیٹھے ہیں“ میں لپک کر پہنچا تو دیکھا کہ بیٹھک میں وہی ٹانگے والا بڑھا بیٹھا ہے۔ فوراً دیکھا تو اسے تصویر پر سے کچھ متاثر پایا۔ اس نے کہا: ”آپ ہی شاید صاحب؟“ میں نے کہا: ”جی ہاں“ اور وہ مجھ سے چمٹ گئے۔ بولے: ”اماں میں تو سمجھا تھا کہ کوئی خوفناک شکل کا مولوی ہو گا۔ مولوی سنا ہوا احمد، تم تو اچھے خاصے آدمی ہو“ پھر خوب ہنسنے تو میں نے دیکھا کہ نیچے کے چادروانت غائب۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے کونوں پر بے شمار جھریاں، کٹے پچکے ہوئے۔ ہونٹوں کے دونوں طرف قریب۔ لبوں پر لاکھا سا جما ہوا۔ چھوٹی چھوٹی کتری ہوئی مونچھیں، داڑھی صاف، دہلا نیلا سا شخص عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے مجھے مچھانک رہا ہے۔ میں نے کہا: ”مرزا صاحب! آپ اپنی تصویر سے بالکل نہیں ملتے۔ کئی رات کو آپ کو ٹانگے میں جانے دیکھا مگر ہم نے

آپ کو نہ پہچانا۔ کہاں بٹھرے؟ بھابی کہاں ہیں؟ میرے گھر کا پتہ تو آپ کو معلوم ہی تھا۔ یہاں سیدھے کیوں نہ چلے گئے؟“ بولے۔  
 ”میں نے بھی قصیں اسٹیشن پر دیکھا تھا مگر تعین جاننا نہ تھا۔ طبیعت کا جی میں میری ایک بہن ہیں، ان کے یہاں چلا گیا۔ اب تمہارا گھر دیکھ لیا،  
 شام کو آ جاؤں گا بیوی کو ملے گا۔“ اس کے بعد ان سے رسالوں اور مضمون نگاروں اور مضمون نویس کی باتیں ہوتی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ  
 مرزا صاحب کی قوت گویا اب بھی بہت مضبوطی ہوئی ہے۔ دوسرے کو ملائی ہوں سے آگے بڑھنے کی زحمت نہیں دیتے۔ مگر باتیں اتنی  
 دلچسپ کہ گھنٹوں سناؤ، رچی نہ بھرے۔

شام کو مرزا صاحب حسبِ وعدہ معِ بیگم کے آگئے۔ رات کو صبح احباب جمع ہوئے اور خوب گفتگو چھی رہے۔ رات  
 گئے احباب رخصت ہوئے تو ہم سونے کے لئے لیٹے، مرزا صاحب، میں اور میرے مخلص بھائی۔ مرزا صاحب بولتے رہے میں سنتا  
 رہا۔ وہ بولتے رہے، میں سو گیا۔ صبح اذانوں کے وقت انھوں نے آپ ہی آپ پھر بولنا شروع کر دیا۔ دیکھا کہ ہوں ہاں بھی غائب  
 ہے تو میرا نشانہ ہلا کر بولے۔ ”ارے بھی تو بڑا انصوح کا پوتا آخر تک خواب دیکھتا رہے گا؟“ ناچار جاگ کر ان کی باتیں  
 سننے لگا۔ بولے ”سنئے ہو، میں ابھی بیت الخلاء گیا تو ایک افسانے کا پلاٹ سمجھ میں آ گیا۔ آج جانے سے پہلے تجھیں ہم وہ افسانہ  
 لکھ کر دے جائیں گے۔ تو میں اب آٹھ بیٹھو۔ منہ ہاتھ دھو ڈالو۔“

اتنے ہیں کہ تیار ہوں اور ناشہ آئے چغتائی صاحب نے آدھا افسانہ لکھ ڈالا۔ ناشہ کے بعد کوئی صاحب ان سے  
 ملنے آگئے۔ میں ٹل گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد آیا تو ان کے پاس افسانہ مکمل تھا اور وہ میرے مخلص بھائی سے بیٹھے باتیں کر رہے  
 تھے۔ وہ پولیس کے آدمی، ادب کے جھیلوں سے اللہ نے انھیں محفوظ رکھا تھا۔ بولے ”تو میاں سنھا لو انھیں۔ خوب آدمی  
 ہیں تمہارے چغتائی صاحب بھی۔ میان غضب خدا کا، ساری رات باتیں کرتے رہے تم دونوں! وہ جب سوئے تھے تو ہم  
 باتیں کر رہے تھے، جب جاگے تو ہم باتیں کر رہے تھے۔ سمجھو کہ ہم ساری رات ہی باتیں کرتے رہے۔ مرزا صاحب اس لطیفے سے  
 بہت محفوظ ہوئے۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے افسانے کی شان نزول بتائی کہ ”کل جو غم سے مجھے اسٹیشن پر نہیں پہچانا تو غامی پریشانی ہوئی مگر واقعی  
 میری تصویر مجھ سے نہیں ملتی۔ اور مجھی وہ تصویر کس کام کی جو اصل سے مل جائے؟ یہ افسانہ اپنی تصویر پر لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے ”یہ کس  
 کی تصویر ہے؟“ اس کے بعد انھوں نے افسانہ سنایا۔ جیرانی ہوئی کہ قلم برداشتہ ایسا شگفتنا افسانہ! اور اس کے بعد تو میں نے ان کی یہ  
 کیفیت دیکھی کہ باتیں بھی کتنے عار سے ہیں اور افسانہ بھی لکھ رہے ہیں۔ عدالت میں مقدمہ بھی پیش کر رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھا جا رہا ہے  
 اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس افسانے کے کچھ ورق تو گھر آگئے اور کچھ مزم کی مسل میں لگ کر عدالت کے فائل میں چلے گئے۔

ایک دفعہ اپنی وکالت کے زمانے میں مجھے جو چھوڑ ملا با۔ مل نے لکھا ”گلے تھے آؤں گا۔ کچھ دلی سے مکانا ہر تو لکھیے۔“  
 خط آیا یہ اور کچھ لاؤ یا نہ لاؤ، پائے ضرور لانا۔ مدتیں ہو گئیں کھائے ہوئے۔ ”دلی سے جو چھوڑ کوئی چھوڑ گھٹنے کا راستہ تھا میں نے  
 سوچا کہ پائے لے جاؤں گا، جارے کے دن میں، خراب نہیں ہوں گے۔“ اتفاق سے ایک عزیز بے پور کے آئے ہوئے تھے۔  
 انھوں نے کہا ”اسٹیشن ہی پر دھرائے جاؤ گے۔“ بے پور، جو وہ پور کسی ہندو یا ست میں لگے نہیں ہوتی۔ اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔  
 اس لئے ارادہ ملتوی کر دیا۔ مگر جو چھوڑ پہنچے ہی مرزا صاحب نے پہلا سوال ہی کیا ”پائے لائے ہمارے لئے؟“ میں نے نہ لانے کی وجہ

بتائی تو بڑے ارے بھی ہو چکی ہیں، اگر تم کھڑے مہاتے نہ تم نہیں جہا نہ دے کو پھر الٹے دے بھی جہا نہ دے ایک موکل کی کار کی ٹکر ایک گھوڑا مانا سے ہو گئی تھی۔ ان محترمہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ عدالت نے بارہ روپے جہا نہ کیا۔ میں نے کہا: ”آپ کی وکالت یہاں کچھ چل بھی رہی ہے؟“ کہنے لگے: ”کسی نہیں، ہمارا جیڑو کیونکہ یہ کہہ کر اپنا جیڑو نکال کر دکھانے لگے۔ کسی سے پیشی پانچ اکسی سے دس وصول ہوئے تھے۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ باقی میں ڈال رکھے تھے۔ بہت چمک کر بولے: ”پچھلے بیٹے چالیس روپے کی آدنی ہوئی، پھر سو لہنا یا میں ہیں۔“ میں نے کہا: ”ماشا، نہ خوب چس رہی ہے۔“ بولے: ”میاں تم یافت کو دیکھتے ہو، بھائی کو دیکھو۔ ہزاروں پہ فوت ہے، ہزاروں پر۔“ کوئی موکل آگیا تو جو دھڑی مٹی کو ملا کر کہا: ”اس سے کہہ دو کہ وکیل صاحب کے پاس کام بہت ہے۔ کل کچھری میں ملے۔ اسے تم بھیجے نہیں ہمارے دوست ولی سے آئے ہوئے ہیں۔ موکل تو اور بھی آجائے گا۔ یہ کب کب بانہڑا آئے ہیں۔“ اور پھر مرزا صاحب کی وکیل پانچ شرور ہو جاتیں اور باتیں تم ہونے نہ باتیں کہ دو اپنے کسی ناول کا مسودہ سننا شروع کر بیٹے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا ناول ”دیپا تر“ لکھا تھا۔ بولے: ”میں پڑھتا ہوں، تم اس کی زبان ٹھیک کرتے جاؤ۔“ میں نے کہا: ”آپ کی زبان ایسی نہیں ہوتی کہ میرے ٹھیک کروں۔“ کہنے لگے: ”یہیں مجھے اپنی کمزوری معلوم ہے۔ میں زبان کا بالکل خیال نہیں رکھتا، بس لکھنے چلا جاتا ہوں۔“ میں نے کہا: ”تو آپ یہ مسودہ مجھے دے دیجئے، میں اس کی نظر ثانی کر دوں گا۔“ کہنے لگے: ”ابھا شش زور۔ ابھی کل کہاں ہوا ہے۔ پلاٹ اگر ایک جگہ اڑ گیا ہے۔ آگے نہیں چلا۔ پھر دو گھنٹے تک وہ سنانے رہے اور مسودہ ختم ہو گیا۔ پوچھنے لگے: ”بناؤ اب اسے ختم کیسے کریں؟“ میں نے کچھ بتایا، ان کی سمجھ میں آگیا، بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: ”بس بھی کل کی روانگی ملتری کر دو، ہم ایسا یہ ناول مکمل کر کے تمہیں دے دیں گے۔ اس قدر لبا جت سے رد کرتے تھے کہ مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی۔“ انھیں نیند بہت کم آتی تھی۔ رات کو بارہ ایک تک جاگتے تھے۔ اس لئے میں صبح سات آٹھ بجے تک اٹھتا تھا۔ پھر دوپہر کو ضرور سوتا تھا۔ غرض میں تو سوتا ہی رہا اور انھوں نے ”دیپا تر“ مکمل کر دیا اور دو ایک افسانے بھی لکھ کر تمہا دئے۔

چھٹائی صاحب کے اور سب عزیزوں کو دیکھ کر گھبرا کر کہہ دیا کہ ”اب غنا نہ تمام آفتاب است۔“ بڑے بھائی ملے خوب نندہ سنت و تودانا معلوم ہوا کہ آپ بھی تھک ڈکلاس وکیل ہیں۔ نیچے کے چار وادانت غائب۔ مرزا صاحب سے چھوٹے بھائی ملے۔ قوی العبتہ، مزاجاً صوفی نیچے کے چار وادانت غائب۔ ان سے چھوٹے بھائی بالکل چھٹائی صاحب کی شکل کے مگر اچھی صحت۔ آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا: ”رہتا ہوں؟“ نیچے کے چار وادانت غائب۔ سب سے چھوٹے بھائی قد میں سب سے بڑے، ماشاء اللہ، دیو زار، یہ لمبا ترنگا جوان معلوم ہوا کہ آپ کو وق سے۔ نیچے کے چار وادانت غائب۔ مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے مرزا صاحب پر چھا۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ سب کے چار چار وادانت غائب؟ کہنے لگے: ”ایک وادانتوں کے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ انہی چار وادانتوں سے پائو ریا ہوتا ہے۔ بس سب لکھ ڈالو۔“ جب عصمت چھٹائی ملیں تو سب سے پہلے میں نے بھی دیکھا کہ کہیں ان کے بھی چار وادانت تو غائب نہیں؟ مجھ اشدان کے سارے دانت برقرار تھے۔

ایک دفعہ پھر خط لکھا کہ ”ملے کو بہت جی چاہتا ہے۔ آجاؤ۔ کسی کے نوکر تھوڑی ہو۔ تم آؤ گے تو تم سے ڈس کس کر کے کئی افسانے لکھیں گے۔“ میں ہنپا۔ صحت پہلے سے بدتر تھی۔ کھانسی زیادہ تھی۔ میں نے کہا: ”آپ اپنی صحت کی طرف سے غفلت کر رہے ہیں۔“ کہنے لگے: ”ڈاکٹر کہتے ہیں تمہیں وق ہے۔ میں کہتا ہوں مجھے وق نہیں دہم ہے۔“ ان کی حندی طبیعت نے ڈاکٹروں کی رائے ماننے

ہے بھی انکار کر دیا تھا۔ من مانی ودا میں کھاتے رہتے تھے۔ گھرواں میں سے بھی کسی کی نہ سنتے تھے۔ بلکہ جو کچھ کوئی کہتا اور بد آکر اس کے خلاف کرنے اور تکلیف اٹھاتے۔ بجائی میں ان کی ضد سے پریشان ہوتی تھیں گھران کی ایک بھی پیش نہ جاتی تھی۔ بچاری حاشوش سے مارے گھر کا کام بھی کرتیں، بچوں کی نگرانی اور پرورش بھی اور شوہر کی خدمت بھی۔ اور کیا مجال جو کبھی پیشانی پر شکن تک آجائے۔

دوہیں افسانے تو جتنا ہی صاحب میرے لئے پہلے ہی سے کھڑے تھے۔ کچھ افسانوں کے انھوں نے پلاٹ رٹانے سب اچھے، ایک سے ایک عمدہ۔ ایک مارواڑ کا رومان مثالیہ۔ سوانہ کی درجیں۔ پیر سب زیادہ مجھے پسند آیا۔ کہنے لگے۔

”لولو پہلے اسی کو کھڑا لیں، اور کاغذ قلم لے کر کھنا شروع کر دیا۔ میں بیٹھا واقعی کھیاں پازا دیا کیونکہ اس سال وہاں ساری دنیا کی کھیاں انکی تھیں۔ ایک گھنٹہ میں انھوں نے کسی صفحے کھڑا لے، پھر دوسرے۔ میاں پٹہ کھیل چکے۔ لودرا اب قلم قلم لودیرا لودیرا تنگ کیا۔ میں نے قلم سنبھالا۔ وہ بے تحاشہ بدلتے رہے میں لکھنا رہا۔ دو تین صفحے کھڑے کر میں نے کہا۔ ”بس جی میں تو لکھ چکا۔ مجھے نوینہ لڑی ہے۔ مرقوں کھالے کھاتے ہو تو سونے بھی دو“ کہنے لگے۔ ”اچھا تو مجھروانی لگا کر سو دو۔ عصر کے وقت انھوں نے جگایا۔ کیا آج پائے نہیں پوچھ گئے؟“ اٹھنا پڑا، بولے۔ ”افسانہ ختم پر آ رہا ہے۔ شام تک ختم ہو جائے گا۔“ میں تو جا رہی کر کسی کے ساتھ تھل گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے کھتے رہے۔ چران جلے گھر والیں ہینچا تو بڑے خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ ”لو بھی یہ افسانہ۔“ امد کوئی چالیس فی اسکیپ کا پلندہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کہا۔ ”شابش ہے مرزا صاحب آپ کی مہمت کو۔ بس کل صبح کی گاڑی سے میں چلا جاؤں گا۔“ جانے کے نام سے ان کا منہ اُتر گیا۔ کہنے لگے۔ ”نہ جانے کیا بات ہے تم آج اپنے ہو تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پورا نہیں ہوں۔ کل نہ جاؤ، تم تمہیں دو افسانے اور لکھ دوں گے۔“ انھوں نے یہ بات کچھ ایسے اندوہ ناک لہجے میں کہی کہ میرا دل بھرا آیا۔ میں نے کہا۔ ”اچھا میں برسوں چلا جاؤں گا۔“ بچوں کی طرح خوش ہونے لگے۔ مجھے حضور دیویر بعد خیال آیا کہ میرے پاس جتنا فی صاحب کے تقریباً سو صفحے کے مضامین تو ہو ہی جائیں گے۔ اگر سو صفحے کے اور ہو جائیں تو ”جنتا فی نمبر“ ہی کہوں نہ تھا سب دیا جائے۔ اتنے بڑے مضمون نگار اور ایسے پیارے دوست کی ایک آہیں یاد گار ہی قائم ہو جائے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ ”مرزا صاحب! تو میرا آپ یوں کیجئے کہ کل تو آپ مجھے جو کچھ لکھ کر دے سکیں دے دیں، اس کے بعد پندرہ بیس دن میں مجھے چند مضامین اور لکھ دیجئے۔ میں ”جنتا فی نمبر“ پھیلے دیتا ہوں۔“ یہ تجویز انہیں پسند آگئی۔ پوچھا ”پک بھی جائے گا؟“ میں نے کہا۔ ”نہ بچنے کی کوئی وجہ نہیں۔“ کہنے لگے۔ ”ایک صفحے میں تمہیں سب مضامین پہنچ جائیں گے۔“ میں نے چند تجویزیں انھیں بتائیں کہ اس طرح کے مضامین ضرور لکھیے مثلاً ایک آدھ غناک افسانہ، دو ایک مکالمے یا ڈرامے اور ایک مضمون یہ کہ ”میں مضمون کیسے لکھتا ہوں۔“ کہا۔ یہ سب ہو جائے گا۔“

لگے دن دو مضمون تو انھوں نے لکھ کر دے دئے اور بیسویں پلاٹ رٹائے۔ پھر کہنے لگے۔ ”لکھنے لکھنے میرا ہاتھ تنگ جاتا ہے۔ اگر کوئی شارٹ سینڈ میں لکھنے والا مل جائے تو میں کی ناول بول دوں۔“

اگلے دن صبح سویرے میں اٹھ بیٹھا۔ بستر بیٹھے کا اراوہ کر رہا تھا کہ مرزا صاحب آگئے۔ افسردہ لگا چہرے سے ظاہر تھی کہنے لگے۔ ”ارے بھئی سنئے ہو، آج اور نہ منہر جاؤ، سارے مضامین ساتھ ہی نہ لیتے جاؤ؟“ دل کٹ گیا ان کے اس غلوں کو دیکھ کر میں نے کہا۔ ”اگسا آپ کو میرے منہر جانے سے خوش ہو گی تو میں ضرور منہر جاؤں گا، مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ آپ میرے لئے مرنے دیں۔“

بند رہ وں میں تو یہ مضامین لکھے جا رہے تھے جو میرے پاس ہیں۔ باقی آپ پھر بیٹھتے رہیں گے۔ بولے: ”اے یعنی تم نہیں جانتے کہ تمہارے یہاں جو نے سے میری کیا کیفیت ہے۔“ سچ کہنا ہوں میں بالکل تندرست ہو گیا ہوں۔ جو کہ کتنے لگی، خوراک تو لگی ہو گئی۔ جی چاہتا ہے کہ کھول اور کھتا ہوں۔ میں اس وقت سے ڈر رہا ہوں کہ تم چلے جاؤ گے تو مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا جائے گا اور پھر ہماری مجھ و بولچے لے گی۔“ میں نے ان کو بہلانے لکھ لکھ کر کہا: ”اب تو آپ پہلے سے بہت اچھے ہیں۔ میں دلی جا کر چند یونانی مرکبات آپ کو کھجوں گا ان سے رہی سہی کمزوری بھی جاتی رہے گی۔“ مگر وہ لچکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئے اور بولے: ”بس تو آج تم نہیں جا رہے؟“ میں نے کہا: ”نہیں! جلدی جلدی بھابی سے جا کر کہا: ”شاید صاحب آج نہیں جا رہے۔“ آج انہیں جو صوبہ کی سیر کرائی جائے گی۔ ذرا نرا ناشتہ کراؤ آج۔“ ناشتے کے بعد کسی دوست کی کامنگوائی، شہر کا ایک چکر اس میں لگایا۔ پھر ایک پُرانا قلعہ دکھایا۔ ایک نیا عمل تیار ہو رہا تھا، وہ دکھایا۔ ایک عرب بڑے تھے، ان سے طویا۔ دوپہر کو گھر آئے۔ کھانا کھایا۔ باتیں کرتے کرتے میں تو سو گیا اور انہوں نے اتنی درمیں دو چھوٹے چھوٹے مضمون لکھ لئے۔ کہنے لگے: ”آج رات کو تمہیں کھانا بھی سنوایا جائے گا۔“ میں نے کہا: ”آپ کو تو اس سے نفرت ہے۔“ بولے: ”تمہیں تو نہیں ہے۔ ایک ہندو پکا کانا لگاتا ہے، اسے بدلا رہے۔“ وقت اچھا گذرا۔ صبح ناشتہ پر پھر کچھ روکنے کی تمہید اٹھائی تھی کہ بھابی نے کہا: ”کیوں آپ انہیں پریشان کرتے ہیں۔ گھر والے پریشان ہوں گے کہ تین دن کر کہہ کر گئے تھے، آج چھوٹے ہو گئے۔“ کہنے لگے: ”اے صاحب یہ کسی کے ذکر تو میں نہیں کہ ان کی حاضری ضروری ہو۔ ہم یہاں سے ان کے گھر تارٹے دیتے ہیں۔“ انہیں آخر کس بات کا فکر ہے؟ بھابی شاید کچھ اور کہتیں مگر میں مرزا صاحب کا چھ سال کا بچہ بخوبی بڑا تھا۔ اقاں یہ دلی میں کیا کرتے ہیں؟ بھابی نے کہا: ”کچھ بھی نہیں۔“ بچے نے کہا: ”تو پھر یہ کھاتے کہاں سے ہیں؟“ ہم سب ہنس پڑے اور وہ بات بھی آڑ گئی۔ چلتے وقت مرزا صاحب نے کہا: ”وہ کہہ کر پھر جلدی آؤ گے۔“ میں نے کہا: ”جب آپ یاد فرمائیں گے حاضر ہوجاؤں گا۔“

نواب صاحب جاوڑہ خبر نہیں کب۔ سے چنتائی صاحب کی قدردانی پر مائل تھے۔ کچھ عرصے بعد سنا کہ نواب صاحب نے انہیں جاوڑہ بلا کر چیف رنج بنا دیا۔ مرزا صاحب نے جاوڑہ بلوایا۔ میں وہاں بھی گیا۔ نہایت حالیشان کوٹھی انہیں ملی ہوئی تھی۔ چنتائی صاحب بہت بڑے عمدہ دار لکھے اور نواب صاحب کے مزاج پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہا کہ: ”نواب صاحب سے کب ملے گے؟“ میں اتنے بڑے آدمیوں سے نہیں ملتا جن سے مل کر مجھے ذلت محسوس ہو۔ مرزا صاحب نے کہا: ”اے یعنی تمہارے دادا کے فور پڑے تدریان میں یہ نواب۔“ میں نے یہاں لوگوں سے سنا ہے کہ نواب صاحب ایک دفعہ ایسے بیمار پڑے کہ ان کے جینے کی اس نہ رہی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ کہہ رہے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن شائع کرو۔ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ انہوں نے تمہارے والد سے اجازت منگوائی اور دو جلدوں میں صرف ترجمہ اپنے چھاپہ خانہ سے شائع کیا اور واقعی اچھے ہو گئے۔ تو وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔“ میں نے کہا: ”اور کچھ خیرات بھی مجھے دیں گے۔“ مرزا صاحب نے کہا: ”تو پھر کیا ہوا؟“ میں نے کہا: ”مجھے معاف فرمائیے، میں تو صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ میرے تو نواب یا بادشاہ جو کچھ ہیں آپ ہیں۔“ مگر مرزا صاحب نے میری اس بات کو کچھ پسند نہیں کیا اور دل میں شاید کچھ ناراض بھی ہوئے۔

جاوڑہ میں مرزا صاحب کی صحت اور بھی زیادہ خراب رہنے لگی۔ وہاں کی مرطب آب و ہوا سے ان کی سانس

کی شہادت اور برہمگئی اور صحت گرتی ہی چلی گئی۔ شاید شکل سے دو سال جا ورہ ہیں رہے ہوں گے، اُن کمزوروں نے مشورہ دیا کہ آپ جو دھپور واپس چلے جائیں ورنہ آپ یہاں بہت بدمر جا رہے گے۔ مرزا صاحب ہمدانی کا ہندو کر کے جو دھپور چلے آئے اور یہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ وکالت کا کام پھر شروع کیا مگر بدن میں جان نہ ہونے کی وجہ سے وکالت ٹھس ہی رہی۔ اس لئے اپنی کتابیں پھیلنے کا کام خود شروع کر دیا تھا۔

اب سے کوئی پچاس سال پہلے مولوی نذیر احمد صاحب نے ایک کتاب ”امت الائمہ“ لکھی تھی۔ یہ کتاب ایک دریدہ دہن پاوری کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس نے آنحضرت صلعم پر بعض بڑے بے ہودہ اعتراضات کئے تھے جن میں خاص طور پر ازواج مطہرات کے سسلے میں ناگفتہ بہ باتیں کی تھیں۔ اس کتاب کا ایک جواب سر سید احمد خاں نے لکھا تھا اور ایک مولوی نذیر احمد نے۔ یوں تو یہ کتاب شروع سے آخر تک ایک علمی اور تاریخی کتاب ہے اور اپنے مواد کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر بھی۔ لیکن مولوی صاحب نے احترام کے الفاظ کسی نام کے ساتھ اس میں نہیں لگائے ہیں۔ اور بعض جگہ فقرے بھی ایسے لکھے گئے ہیں جو زمان کے اعتبار سے پہلے کتنے ہی نگسائی کیوں نہ ہوں، رسول مقبول و اہل بیت کے ادب و احترام کے لحاظ سے قابلِ اعتراض سمجھے گئے۔ مولوی صاحب اس پیرایہ بیان کا جواز یوں پیش کرتے تھے کہ چونکہ ایک عیسائی پاوری اس ساری کتاب کا مخاطب ہے، اس لئے ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہ تو صریح صریح ہو یا غلط یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارے علمائے اس کتاب کو سختی اور موذی صاحب کو کافر قرار دیا۔ مسلمانوں کے ایک بڑے ذمہ دار لیڈر نے رفع شر کے لئے اس کتاب کے سارے نسخے مولوی صاحب سے اپنی تحویل میں لے لئے۔ اور مولوی صاحب کی بغیر اجازت انہیں علماء کے جلسے میں لے جا کر جلو اویا۔ قصہ مختصر اس ناگوار واقعہ کے بعد مولوی صاحب تین چار سال زندہ رہے مگر انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ شامت اعمال اس کتاب کا نسخہ کہیں سے میرے ہاتھ لگ گیا اور میں نے یہ سوچ کر کہ ایک اچھی کتاب سے مسلمان کیوں محروم رہیں، اسے جوں کا توں چھاپ دیا۔ اس کا چھپنا تھا کہ پھر ہمارے علمائے اس کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ حکومت پر زور ڈالا کہ کتاب ضبط کر لی جائے۔ حکومت کو بھلا کیا غرض پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اسل جھگڑے میں بیٹے، جب آدھر سے کامیابی نہ ہوتی تو مجھ پر زور گوں سے دباؤ ڈلوا یا گیا۔ یہ بھی ناکام رہا تو قسطنطنیہ کی دیکھائی دی گئیں اور ہر شہر میں اور دلی میں اس کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ بیعتنامی صاحب نے مجھ کو دھپور سے لکھا کہ ساری کتاب مجھے بھیج دو اور اعلان کر دو کہ کتاب میرے پاس ہے۔ جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے۔ میں نے انہیں دو سو جلدیں بھیج دیں کہ محفوظ ہو جائیں۔ اور کتاب کی اشاعت روک دینے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں نے مجھ نہ صرف معاف کر دیا بلکہ خوش بھی ہوئے کہ چلو غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ کتاب کی اشاعت بند کر کے اس نے اپنا مالی نقصان کر لیا۔ آدھڑ مرزا صاحب کی ضدی طبیعت نے زور مارا اور انھوں نے ایک مراسلہ ”انقلاب“ لاہور میں چھپوا دیا کہ ”امت الائمہ“ شاعر احمد کے پاس اب نہیں ہے، میرے پاس ہے۔ جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے، بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ مجھ کاٹ کر ہرا لیاؤ لیکائیں اور ملاؤں کی کھلا دیں۔ اس کے چھپتے ہی بس آگ ہی نہ لگ گئی۔ پندرہ دن بعد مرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جو دھپور کے مسلمانوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا اور زبردستی ان سے ساری کتابیں لے گئے۔ اس کے بعد وہ پکھری



جادو ہے تھے تو دو چار بدبھاشوں نے اسی پر لا جھپٹی سے حملہ کیا اور ان کے ایک ہاتھ میں سخت ضرب آئی۔ مرزا صاحب نے کھانا کھائی بڑی رسوائی ہوئی۔ نوبت پہاڑ تک پہنچی کہ باؤں مسلمانوں کے جلسہ عام میں نہ بکرہ واد اور اقرار اسلام کر دینے کا فرہور اور قتل کر دینے جاؤ گے۔ سارے گھر میں انگلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ لاکھ میں سب سے کہتا ہوں کہ کتاب میں لکھے نہیں تھے، ورنہ اسے نذیر احمد نے لکھ دیا مگر سب یہی کہتے کہ نہیں تم نے لکھی ہے اور اس میں تم نے سب کو گالیاں دی ہیں۔ چنانچہ مصلحت اسی میں سمجھی کہ اپنے آپ کو یہاں کے عوام کے حوالے کر دوں۔ علمائے ایک بڑے جلسے میں لے گئے۔ مجھ سے سب کے سامنے توبہ کرانی، مجھے کلہ پڑھوایا اور دوبارہ مجھے شرف بہ اسلام کیا۔ تب کہیں جان بچی۔ خبر مجھے اس تکلیف اور رسوائی کا بھی اتنا افسوس نہیں، مگر بے حد رنج ہوا اور شرم آئی یہ دیکھ کر کہ وہ دو سو جلدیں جو تم نے مجھے بھیجیں تھیں اور مجھ سے مولوی زبردستی چھین لائے تھے، اس سلسلے میں جلائی گئیں۔ افسوس کہ انیس تیس سال میں لکھاؤں نے کوئی ذہنی ترقی نہیں کی۔

ایک دفعہ مرزا صاحب کا سخت اصرار ہوا کہ خود بھی آؤ اور بھائی کو بھی لے کر آؤ۔ فقیر ارشد کی کئی سب کے چوتھیں وکھٹا تو بڑا دکھ ہوا۔ ان کے پاؤں رہ گئے تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بخار ہر وقت رہتا تھا۔ کھانسی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ سو کہ کتنا ہی پر گئے تھے۔ مگر دماغ اسی طرح روشن اور مزاج اسی طرح بشاش تھا۔ خوش تو ہمیشہ ہی ہوتے تھے۔ اب کے بہت خوش ہوئے۔ بولے: ”دیکھو! ابھی تم آگے جاؤ اور ابھی ہماری بیماری جاتی رہی۔“ مرزے مرزے کی باتیں کرتے رہتے رہتے رہے، ہنساتے رہے۔ ایک ناول ”شراب“ لکھنا شروع کیا تھا مگر چند باب ہی لکھ سکے تھے۔ اس کے کچھ حصے سناتے اور چھاپنے کے لئے بھیج دیتے۔ رات کو جب دسترخوان بچھا کر کھدک کر سنا تو بڑھ گئے۔ بھائی وپیر سے چیمیں کہ آپ کچھ نہ کیا لیجئے کہنے لگے۔ ”کھائیں گے تو ہم ضرور اب ہم بالکل اچھے ہیں، کوئی بیمار تھوڑی ہیں۔“ مجھ سے کہتے جاتے تھے۔ ”ارے بھئی یہ میں جی دو۔“ بھائی جلائی تھیں مگر وہ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ کھانا تو خیر ان سے کیا جاتا تھا تو تھوڑا سا سب کچھ لیا۔ بارہ ایک بجے تک باتیں کرتے رہے۔ صبح جب مرزا صاحب کو دیکھ کر ان کی حالت غیر تھی۔ معلوم ہوا کہ سخت بدھمی ہوئی۔ رات بھر اوتے اور ڈھلتے رہے۔ چیمیں نکل گیا۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ دو دن میں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ ہم باؤں سے کھم بچ کر آئے تو ان کے سہارے پاگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے: ”لو یہ افسانہ تمہارے لئے لکھا ہے۔“ پڑھ کر سنا یا۔ عنوان تھا ”برتنہ کنٹرول“ میں نہیں رہا تھا، مرزا صاحب بھی ہنستے جاتے تھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ان کا آخری افسانہ ہے اور میرے لئے ان کی یہ نہیں بھی آخری! اگلے دن صبح واپس جانا تھا۔ رات کو باتیں کرنے کرتے میری بیوی سے بولے: ”آپ کا آنا ایسے وقت میں ہوا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ پھر ایک اپنا چھپا ہوا ایڈیٹر نام لکالا اور اس پر کچھ لکھ کر انھیں دیا کہ اسے قبول کر لیجئے۔ ”انھوں نے بڑھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ مرزا صاحب نے کتاب کو تیار“ کا حق تصنیف ان کے نام منتقل کر دیا تھا۔ میں نے کہا: ”یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کے بچوں کی حق تلفی ہے۔“ کہنے لگے: ”تم خاموش رہو جی۔“ چیمیں تھوڑی دیر رہے ہیں۔ نہیں مانے اور زبردستی وہ کاغذ میری بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

مرزا صاحب کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ ان کے خطن سے ان کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد ایسے خط آنے شروع ہوئے جو ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ پھر ایک دن ان کا خط ملا کہ آخری بار ان کا دل جاؤ کچھ پڑھا۔

بیتے آنا میں نے رہا انکی کا تار دیا اور رات ہی کی گاڑی سے چل پڑا۔ اسٹیشن پر ان کے چھوٹے بھائی آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔  
 چنتائی صاحب کا کیا حال ہے؟ بولے تو وہی ہے! سمجھ میں نہ آیا کہ وہی ہے کا کیا مطلب ہے۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان  
 کے بھائی کے کمرے میں سناٹا نہ تھا جی نہ سچے۔ ایک کمرے میں ٹینگ پر لحاف اوڑھے چنتائی صاحب پڑے تھے۔ پاس کوئی  
 نہیں تھا۔ میں نے آواز دی اور سلام کیا تو منہ پر سے لحاف ہٹایا۔ مجھ پر کھلی گہ پڑی۔ مرزا صاحب کے بدلے ایک سیکر دکھائی دیا  
 کہ بڑی اثری موٹھیں اور بڑے ہونے سر کے بالوں پر ایک رومال بندھا ہوا۔ پیلا چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں لحاف ہاتھوں میں سے  
 نکال کر باہر جھکا آیا۔ بالوں کے نیچے پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے مگر ٹینگ پر نہ تھے کے چہرے پہلے سے تھے۔ میں رونے لگا  
 وہم آہ دیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی؟ بولے: جس اب ختم سمجھو! پھر ایک دم سے مسکرائے اور کراہتے ہوئے  
 بولے: ارے ارے آپ کو دیکھئے! اور لحاف جس سے ایک چوڑا چنگی میں پکڑ کر نیچے پھینکا۔ مرنے سے پہلے ہی اپنا حصہ لینے  
 سے آئے! مرنے میں اندر کے رنج کا ایک دروازہ کھلا اور ان کی والدہ اندر آئیں۔ بولیں: مرنے کی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟  
 مرزا صاحب نے کہا: یہ شاہد صاحب آئے ہیں، انھیں پیسے چائے پلائیے۔ آماں چلی گئیں تو ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اب  
 صرف آماں ہی ان کا خیال رکھتی ہیں۔ ماشاء اللہ بھرا بڑا گھر تھا مگر کوئی ان کے پاس نہ آتا تھا۔ جس نے کہا: بھائی اور بچے کہاں ہیں؟  
 بولے: رام پور؟ میں نے کہا: وہ کیوں؟ کھنڈے گئے۔ بیوی کو میری خدمت کرنے کے لئے خود رون ہو گئی۔ میں نے ان سے بار بار کہا  
 کہ یہاں سے چل جاؤ ورنہ تم بھی مر جاؤ گی۔ مگر وہ نہ مانیں۔ جب میں نے دیکھا کہ میں تو مری رہا ہوں اور اگر یہ نہ چلی گئیں تو  
 یہ بھی مر جائیں گی تو میں نے ان سے کہا، اگر تم یوں نہیں جاؤ گی تو ہم تعین طلاق دے دیں گے۔ وہ پھر بھی نہ گئیں۔ میں نے ان سے  
 کہہ دیا کہ آپ کو ہم نے طلاق دے دی، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے، تو انھوں نے کہا آپ کے طلاق دینے سے کیا ہوتا  
 ہے۔ ہم نے طلاق نہیں لی۔ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آخر میں نے تنگ کر ان کے میکے والوں کو خط لکھا کہ اپنی لڑکی کو  
 اگر بے جاؤ، میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ خط کے پہنچتے ہی ان کا بھائی آدھ کا اور زبردستی اپنی بہن کو یہاں سے لے گیا۔  
 میں نے کہا: یہ آپ نے اچھا نہ کیا۔ ساری عمر کی خدمت کا آپ نے یہ صلہ دیا انھیں! کھنڈے گئے: بھائی اگر وہ یہاں رہتیں تو نقص  
 دے جاتیں۔ ان کے بچانے کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی، اور ماں ستوں، اصل میں طلاق ہوئی نہیں ہے۔ مگر ان کے گھر والوں کو میں  
 مانا تھا کہ ایک خط میں ہی اکٹھے جائیں گے۔ بیوی نے بہت کہا مگر یہ طلاق نہیں ہے مگر ان کے بھائی نے کہا: جب انھوں نے  
 نہیں لکھ کر ہی بھیج دیا تو اگر نہیں ہوئی تب بھی ہو گئی؟

اس کے بعد ان کی ماں اور بھائیوں اور صحت چنتائی سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ بیمار ہی نے مرزا صاحب کے  
 علاج پر سب طرح کا اثر ڈالا ہے کہ انھیں وہ سروں کو تکلیف پہنچا کر لطف آتا ہے۔ مثلاً بھائیوں بھائیوں کو لڑوا دیں گے کسی  
 کو لڑا دیں گے۔ طبیعت سے گھر کو کوئی ایسی بات کریں گے کہ وہ آدمی الجھ جائیں۔ ہم سب نے تنگ آکر ان  
 کی خدمت جانا ہی چھوڑ دیا۔ بس ماں کی ہی ماضی ہے جو برداشت کر رہی ہے! میں نے کہا: مگر اب تو ان کا بھڑی وقت ہے۔  
 نے ان میں سے چارے! مگر سارے بھائی بہن بھی کھنڈے گئے کہ یہ نہیں مریں گے۔ کتنی ہی دفعہ ہر چکا ہے کہ مرنے بھائی مرے  
 ہیں۔ نہ بھائی۔ رہے ہیں۔ سب بھائی بھائی گئے اور وہ نہ مرے نہ ورے۔ میرا بچہ غلے ہو گئے! اس گھر میں تین دو

رہنا مجھے اتیرا ہو گیا۔ عجیب بے بسی کی زندگی تھی۔ گرم گرم بخار چڑھنے، پنڈا جھلستا رہتا۔ ہڈیاں تک سوکھ گئی تھیں۔ کھانسی کے مارے بیٹھے ہیں سانس نہ سکا تا تھا۔ پاؤں بالکل سبے کا ہو چکے تھے۔ مگر دماغ روشن تھا۔ کوئی تیار دار نہیں۔ پیسہ کوڑی پاس نہیں۔ نہ جانے کس وقت دم کل جائے۔ گھر والے زلمی ہیں کہ یہ مرنے ہی کے نہیں! میں نے جی میں کہا: اللہ تیری شان ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کو ہنسایا اور مرنے کے بعد بھی ہنسنا نہ ہے۔ اور اس عذاب میں مبتلا! تو ہی اپنی مصلحتوں کو خوب جانا ہے۔ جب میں ان سے نصیحت ہونے لگا تو ہنسا بڑھا یا اور میرا لقمہ اپنے ماتھے میں لے لیا۔ میں رو رہا تھا۔ وہ بھی رو رہے تھے میں نے کہا: یہ رو پہ رکھ لیجئے۔ پوچھنے لگے: کتنے ہیں؟ میں نے کہا: دو سو ہیں۔ اگر زبا وہ کی ضرورت ہو تو میں دیتی پہنچ کر اور مجھروں کا: ”بسے“ بہت ہیں۔ تنکے کے نیچے رکھ دو“ خدا حافظ کہہ کر میں آنسو پونچھتا باہر نکل آیا۔ پھر ان کی صورت ابھنی نصیب نہیں ہوئی۔ شاید دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ ان کے انتقال کی خبر ملی۔ میں نے کہا: ”وہ بھی وہ مر گیا جو مرنا نہ تھا“

اِنَّ اللّٰہَ وَاَنَا الْبَیْسَارُ اَجْعُوْنَ“

# منٹو ماموں کی موت

حامد جلال

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ منٹو ماموں بیانی صاحب کبترستان سے اٹھ کر گھر چلے آئے تھے تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیات و ثانی کے مجوزے کو نظر انداز کر کے ان سے صرف انا کہوں گا۔ منٹو ماموں! آپ نے آج تک جتنی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکت آپ کی موت ہے۔

بہاول پور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا ٹیسٹ میچ ہو رہا تھا اور میں ڈنگ سٹیڈیم میں بیٹھا طبع بار خاں کرکٹ کا چشم دید حال نشہ کرنے میں مدد دے رہا تھا کہ لاہور سے بیرے نام ایک ٹرنک کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں فوراً غم سے بے قابو نہیں ہو گیا بلکہ مجھ میں شدید براؤننگ پیدا ہو گئی۔ مجھے منٹو ماموں پر اتنا ہی شدید غم نہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ ملک کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور جب میں بولا تو میری آواز سے غیر معمولی تشویش نکلائی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کہاں انتقال ہوا؟ جواب ملا کہ گھر پر! اس جواب سے مجھے بڑا اطمینان ہوا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اچانک گھر سے باہر کسی اور مقام پر موت سے ہم آغوش نہ ہو گئے ہوں۔ میں ممکن تھا کہ کسی تانگے پر کسی رستوران میں کسی پبلشر کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے یا کسی فلم سٹوڈیو میں انھیں اچانک موت آگئی ہو۔۔۔۔۔

جب میں اپنی جگہ پر واپس گیا تو کچھ کا اچھوں دیکھا حال بیان کرنے والے ساتھیوں نے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات تھی میں نے ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ دیا: امپائر نے سعادت حسن منٹو کو آخر آؤٹ دے ہی دیا۔ آج صبح ان کا انتقال ہو گیا۔

منٹو ماموں کو آؤٹ دینے کے لیے امپائر سے کئی بار باتیں کی جا چکی تھیں لیکن ہر بار اپیل مسترد کر دی گئی تھی۔ اب ان کی بے حد ڈرنا ڈول، ہلکے ختم ہو گئی تھی۔ وہ کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی حریف ٹیم کی طرح ہوشیار اور ناقابل غلطی نہیں بن سکتے تھے جسے وہ لاہور کے تیسرے ٹیسٹ میچ میں کھیلتے ہوئے دیکھنے کے لیے حشر تاق تھے۔ اس کا علم مجھے ان کی موت نے جو میں کھٹے بعد گھر پہنچ کر ہوا۔ وہ حقیقت ان کی زندگی کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ تھی۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے انھوں نے ایک رستوران میں اپنے دوستوں سے کہا تھا: حامد جلال کو واپس آ جانے دو۔ میں اسی کے ساتھ ٹیسٹ میچ میں حریف کا ٹیلر دیکھنے جاؤں گا۔

ان کی دوسری خواہش اس بے حد دردگار حرکت کی موت پر افسانہ لکھنے کی تھی جس کی برہنہ وائس ریکارڈ میں سحر کے کنارے

پانی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس صورت اور اس کی فحش سی بجی کو بس کے اڈے سے اغوا کیا گیا اور نصف درجن کے قریب ہوس پرستوں نے اپنی ہیمانہ خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کوکڑاٹی سروری میں ان کے جھگڑنے سے بھاگ کر بھاگیں تو اس کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹی نے منہ کر دینے والی سروری میں دم توڑ دیا۔ اس المیہ سے فٹو ماسٹریں بعد متاثر ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو گھرات سے کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے اور انھوں نے حادثہ کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں ضرور اشتغال اور پیمان پیدا ہوا ہو گا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد فٹو ماسٹریں نے معمول سے نیا وہ شراب پی لی ہوگی جو ان کے لیے مملکت ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزرنے کے بعد گھر واپس آئے۔ فحش ٹری ویر بعد انھیں خون کی قے ہوئی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جو ان کے قریب ہی کھڑا تھا، ان کی دھاریوں کی طرف انھیں متوجہ کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یہ تو پان کی بیگ ہے۔ انھوں نے اسے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس کے بعد انھوں نے حسب معمول کھانا کھایا اور سو گئے۔ گھر بھر میں کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات خلاف معمول ہوئی ہے کیونکہ میرے لڑکے نے فٹو ماسٹریں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ لیکن بے خود فٹو ماسٹریں کو بھی اس کے متعلق کوئی تشویش نہ ہوئی تھی۔ یوں بھی وہ گھر والوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کا بچھو پہ تھا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اٹھا کر بنایا کہ وہ شدید دردموس کر رہے ہیں اور اب تک بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا بکسر پچٹ گیا ہے۔ ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورت حال کا تنہا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انھوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو جگایا اور انھیں صحت کے منہ سے نکالنے کی جلد و جہد شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کئی شدید علالتوں کے بعد وہ شغاب ہو چکے تھے اس لیے کسی کو یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ صحت چند گھنٹوں کے مہمان ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ انھیں آؤٹ دینے کے لیے اسپتار کی انگلی اسی وقت سے فصا میں بند ہوئی شروع ہو گئی تھی جب فٹو ماسٹریں کو خون کی پہلی قے آئی تھی۔ فٹو ماسٹریں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے میں بھی اندازہ لگا سکا ہوں کہ کافی دیر تک انھیں خود بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آگیا ہے۔ ڈاکٹر کے انجکشن وغیرہ لگانے کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد تک وہ مایوس نہیں ہوئے تھے لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی صحت خلاف معمول نہیں سمجھی۔ ان کی بعض برابر ڈوبی گئی اور درمیں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ خون کی بھی بند نہیں ہوئی۔ صبح کو ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ فٹو ماسٹریں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

اس وقت فٹو ماسٹریں کے ہوش و حواس بالکل بجا تھے اور ہسپتال کا نام سننے ہی وہ بول اٹھے ”اب بہت دیر ہو چکی مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور یہیں مکوں سے پڑا رہنے دو۔“

گھر کی خورقوں کے لیے منظر نا قابل برداشت تھا۔ انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر فٹو ماسٹریں فوراً مشتعل ہو گئے اور انھوں نے غضب ناک آوازیں کہا ”خبردار جو کوئی رو یا۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنا منہ رضائی سے بند کر لیا۔

فٹو کا یہ اصلی روپ تھا۔ جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اسے مریا ہوا دیکھیں۔ فٹو ماسٹریں جسم خفیہ و غضب بنے ہوئے تھے معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے ناراض تھے یا شراب سے

یہاں کی قبیل از وقت موت کی ذمہ داری۔

ایجووٹس آنے سے پہلے صرف ایک یادوار انھوں نے اپنے منہ سے خفا ٹیٹھاٹی انھوں نے کہا: ”مجھے بڑی سہو کی لگ رہی ہے۔ اتنی سہو شدہ قبریں بھی نہیں لگے گی۔ میرے اوپر اور خفا ٹیٹھا ڈال دو۔“ کچھ دیر کو نف کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی نلک نمودار ہوئی، انھوں نے آخرتہ سے کہا: ”میرے کو ٹشکی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر غور ٹیٹھی کر لی جاتا۔“

شراب کے پیے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی نستی کے لیے ایک پڑا منگایا گیا۔ انھوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور

منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت بھی اپنے لیے رحم کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا وقت اسپنچا ہے، لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے اپنے اوپر جذباتیت نہیں طاری ہونے دی۔ انھوں نے اپنے بچوں یا کسی اور کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ نگاہِ آبِ حیات کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان جمعیۃ شخصیتوں کے لیے زندگی اور موت کے درمیان حتمی فصل بہت ہی ہم آہنگ و سواخ ہوتی ہے اور یہی ہونا چاہئے کیونکہ ان کی زندگی اور روح تو پیڑھے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں محفل ہو چکی رہتی ہے۔۔۔۔۔ وہاں پہنچ کر انھیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے وہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ ہستے ہوئے رہتے ہیں، عمت کرتے رہتے ہیں۔

بستر مرگ پر فٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انھیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی حافی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا ہم سفر سمجھنے لگے تھے جس پر جہاننی فتنی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ جس طرح موت کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے۔ اسی طرح فٹو ماموں شراب کے سامنے باطل بے بس ہوتے تھے۔ لیکن ان کی فطرت جو ٹھیکہ ہمیشہ سے باغیانہ تھی اس لیے انھیں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔ انھیں شکست سے بھی سخت نفرت تھی خواہ وہ موت کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہوا اور یہی وجہ تھی کہ وہ موت سے تنہائی میں انھیں چار کرنا چاہتے تھے جہاں کوئی انھیں ترانہ دیکھ سکے جہاں کوئی ان کی شکست کا انکار نہ کر سکے۔

ان سے کم درجے کا آدمی شاید ایک ڈرامائی موت کا اہتمام کرتا کہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا چرچا کریں، اس پر خصا میں لکھے جائیں اور اس کے اعزاء و احباب کہہ سکیں کہ اس کی زندگی ضرور ایسی تھی جسے ہم پسند نہیں کرتے لیکن مرنے سے بیسے وہ نفع مل گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا لیکن غلاموں پر کیا کار نہیں تھے۔ انہوں نے اس عوامی شہسختی سے مقابلہ کیا۔ ان کی موت کے وقت صحت ایک پلو ڈرامائی تھا یعنی شراب طلب کرنے کا منظر لیکن اس کا ناٹھ بلجی مرکزی کردار کہ پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کا انجیغہ صرف وہی تھو سکتا تھا۔

میں اس وقت موجود تھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ایک حد تک میرے سامنے بے نقاب کر دیتے اور یہ کچھ شکل بھی نہیں تھا کیونکہ انھیں صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی۔ سانپ اور انسان کی کہانی نہ سمجھنا۔ میں اپنے سر کو اثبات میں پیش دیتا اور غائب کا آخری جام انھیں پیئے کو دے دیتا۔ صرف یہی ایک جملہ ہر بات واضح کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔ سانپ اور انسان کی کہانی

صرف اتنی کھانسی کہ ایک آدمی نے اپنے دوستوں کے منع کرنے کے باوجود ایک زہریلا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن مر  
 سلا اور اس کے جسم میں آنا دیا، تو اس نے جی سانپ کو کھڑا کیا اور اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا۔  
 ایمر بنس حبیبی درود: زہر پر آکر کھڑی ہوئی، انھوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چھپرہ سبکی ان کے منہ  
 گئی، لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق سے نیچے اتر سکا ہوگا۔ باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر خشی طاری ہو  
 یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے ہوش و حواس کھوئے تھے۔ انھیں ایسی حالت میں ایمر بنس میں لٹا دیا گیا۔  
 ایمر بنس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انھیں دیکھنے کے لیے اندر گئے تو مٹو ماموں مرچکے تھے۔ دو بارہ ہوش میں آ  
 ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

# میرا دوست، میرا دشمن

## صحت چغتائی

اولیٰ جمعی کی چوٹی بیٹھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی، جیسے کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا جی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملتے گھبراہٹ ہو کر تھی تھی، لیکن یہاں تو وہ ”نیا آدمی“ منٹو تھا جس سے میں اپنی بارہٹنے جا رہی تھی۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا: ”چلو واپس چلیں شاید منٹو گھر پر نہ ہو“ مگر شاہد نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

”وہ شام کو گھوٹی پر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔“

یہ لیٹنے مے پر سوؤرے ایک نو فٹ اور وہ لمبی پتیا ہوا منٹو۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا۔ ایسا لمبی کیا، مجھے کھا تو نہیں جاتے گا۔ مجھے خود جی اس کی زبان کی نوک پر ٹونک ہے۔ میں مجبلاً تو ہوں نہیں جو پھر نوک ماری تو بیٹھ جاؤں گی۔ چرچاتی گرد آلود میٹریسیاں ملے کر کسے عہد و سری منزل پر پہنچے غلیٹ کا دروازہ نیم اٹھا۔ ڈرائنگ روم نما کرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک جٹا سا سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملتی ہوئی ایک لہری پھندی بڑی سی بینک کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک محوڑے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ ”آئے آئے!“ بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا، لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھنچ کر اس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں ریٹنگ کر کہ کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زبردیا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر لکھڑا کاغذ کا جامہ اور چوہر کا کٹ صدری تھی۔

”ارے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کالی دہلی ٹوکی مرلی می ہوں گی۔“ اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

”اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت دہنگ قسم کے گھمیر چٹکھاڑتے ہوئے پنجابی ہوں گے۔“ میں نے سوچا رسیدیتے چلو کہیں یہ

ایک دم نہ پا پٹے پر لے لے۔

اور دوسرے لمحہ ہم دونوں لہدی تن دی سے جٹ کو محبت کرنے لگے کہ جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہے ہم نے بڑا گھٹا اٹھایا ہوا درازے پر اکڑنا ہو۔ دو تین بار بات اُلجھ گئی لیکن ذرا سا تلفظ باقی تھا لہذا دوسری ملاقات کے لیے انتظار بھی کئی گھنٹے ہمارے جبرٹے شیئروں کی طرح مختلف موضوعات پر جھلے کرتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو لمبی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سمجھنے سے پہلے ہی بول اٹھتا ہے اور جو دوسرا مہلت تلفظ تھا وہ لمبی غائب ہو گیا۔ باتوں سے بحث اور بحث سے بات ماند ٹوٹ جھنک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان بچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادنیٰ قسم کے غفلتوں



ہیں احمق، بھکی اور کج بخت کہ ڈالا۔

گھمسان کے بیچ میں میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلی زلی  
آنکھیں جنہیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر باد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا۔ مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں  
کو دیکھا۔ مجھے مور کے پر باد آ گئے۔ ناپید عورت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی۔ ان آنکھوں  
کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انہیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ہفتہ لگاتے ہفتہ لگاتے سنجیدگی سے مسکراتے  
ظن کے نشہ پر مالتے اور پھر نزع کے عالم میں پھراتے! وہی نازک نازک ہاتھ پیر سر پر ٹوکرا بھر بال چمکے زرد زرد گال اور کچھ بے نیگے سے  
دانت۔ پتہ پتے اچانک نہ تو کوٹھیر لگا اور وہ کھانسنے لگا میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی نوبانی پھانی سی تھی۔ اسے تو میں نے بچپن سے سنا تھا۔  
مجھے کوفت ہوئے گل نہ جانے کس بات پر میں نے کہا:-

”یہ بالکل غلط“ اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

”آپ کج سمجھی کر رہے ہیں۔“

”حماقت ہے۔“

”روحانہ ملی ہے۔ عصمت نہں!“

”آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں؟“ میں نے چڑھ کر کہا۔

”بس یونہی۔ عموماً میں عورتوں کو بہن کہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا۔“

”تو پھر مجھے بڑا لے کو کہہ رہے ہیں؟“

”نہیں تو وہ کیسے جانا آپ نے؟“

”اس سے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے چلاتے اور مالتے پیٹتے رہے یا پھر کہ پڑاوتے رہے۔“ نظر زور سے ہنسا۔

”تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا۔“

”تو اتنا یاد رکھئے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا

علاج کیوں نہیں کرتے؟“

”علاج؟ ڈاکٹر گھر سے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے تمہیں ٹی۔ بی ہے۔ صاف ظاہر

ہے کہ میں نے مرکز ان کی مشین کوئی کوسجھا ثابت نہ ہونے دیا اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں۔ ان سے تو صبریزم اور جادو

کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔“

”یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔“

”کیون بزرگ؟“

”میرے بھائی عظیم بیگ، انوسن ٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔“

نقوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آتے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے۔

غائبہ جرنالی بھڑکیں الگ تھلک بیٹھے دیکھ رہے تھے بھوک سے تنگ آچکے تھے۔ مٹا دینے پہنچنے پہنچنے ایک بج چلے گا لہذا کھانا کھا ہی جا جائے۔ مٹو نے کھانے سے الماری سے پلٹیں اور چھپے نکالنے کو کہا اور خود ٹول سے روٹی لینے چلا گیا۔

مٹو اس برقی سے اچار نکال لیجئے۔ مٹو نے تیزی سے مینر کھانا لگا یا ادر کسی پر مٹو دیکھ گیا۔ وہی میز پر دم بھر پہلے ایک کارکناریوں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے پہلے آپ کے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے بیچ میں گرما گرم مباحثہ چلتا رہا۔ گھوم پھر کر مٹو محاف کے بخیرہ اوچھڑنے لگا جو ان دنوں میری دلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مٹو نے مٹو لانا چاہا مٹو وہ ڈھٹائی سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا۔ اسے بڑا دھکا لگا یہ سن کر کہ مجھے محاف لگنے پڑوس ہے۔ خوب مٹی کٹی مٹو ڈھٹائی اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔ میں محاف کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور مٹو نے محاف سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت کھل کر اور مجھے تعجب ہوا کہ مٹو گندی سے گندی و ہنودہ سے ہنودہ بات دھڑے اس مقبولیت اور بھولپن سے کہہ جاتا ہے کہ زما جھاک محسوس نہیں ہوتی۔ یادہ ملت دیتا ہی نہیں۔ اس کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے گھن ہو غصہ نہیں آتا۔

چلتے وقت اس نے پھر مصفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور مٹو کو مصفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔

مصفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔

مصفیہ بہت عمدہ سالن بچاتی ہے۔

آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔

بہت یاد آ رہی ہے تو اسے بلا کیوں نہیں لیتے۔ میں نے کہا۔

اورے..... کیا گھنٹی جو اس کے بغیر نہیں سکتا۔ وہ اپنی اہمیت پر اترنے لگا۔

نہیں تو مٹو پر بھی آجاتی ہے۔ میں نے بات مٹائی اور وہ ہنس پڑا۔

آپ کو مصفیہ سے بہت محبت ہے؟ میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔

محبت! وہ بیچ پڑا جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔ مجھے اس سے قطعی محبت نہیں۔ اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی

پتلیاں کھائیں۔ میں محبت کا قائل نہیں۔

سارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟ میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

نہیں۔

آپ کے کبھی گھسٹے بھی نکلے۔ خسرو بھی نہیں ہوئی مگر کالی کھانسی تو ضرور ہوئی ہوگی۔ وہ ہنس پڑا۔

محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے بہن اور بیٹی سے بھی

..... بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے چلوں اور بوٹ بڑھتے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کو اپنی کتابت سے محبت ہے،

اس نے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔ وہ بیٹے کے خیال پر اچک کر کرسی پر اونچا ہو گیا۔ خدا کی قسم آنا سا پیروں چلتا تھا۔ بڑا شریعتا گھٹنوں

چلتا تھا تو فرس کی دواڑوں میں سے ٹٹی ٹال کر کھایا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا ماننا تھا۔ عام بابوں کی طرح منٹو نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

”آپ یقین کیجئے جو سنا۔ دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سٹلانے لگا۔ میں اسے خود تیل مل کر نہلا ناخن دھینا کالھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا کر رہنے لگا تھا۔ بس سنجیدہ کونچہ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی۔ مات کو ذوبس پٹری سوئی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلا دیتا۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچہ کو دودھ پلانے سے پہلے دیڑھی لیٹن با اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہئے نہیں تو بچے کے منہ میں دانے ہر جاتے ہیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور جیہا حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مردوا ہے جو بچے پاس سے جیہا شام ہے۔

”مگر وہ بڑ گیا۔ منٹو نے مسنوجی مسرت چہرہ پر لا کر کہا۔“ اچھا ہوا جی وہ مر گیا۔ مجھے تو اس نے آیا بنا ٹٹا لایا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اس کے پوتے سے دھوٹا ہوتا۔ لکھا ہو کر رہ جاتا مجھ سے کوئی کام نہ توڑی ہوتا۔ کچھ جھجھکتا ہوتا۔ مجھے اس سے عشق تھا۔ چلتے چلتے اس نے پھر کہا کہ صفحہ نے والی ہے بس جی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے مل کر۔“ اور واقعی صفتیہ سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔ منٹو میں ہماری اتنی گھٹ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں جو صورت میں ہی کہتی ہیں عورتیں ہی سنتی ہیں جو مردوں کے کانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفتیہ کو یوں سر جوڑے کھسکے پھر کر تے دیکھ کر غوطہ مل گیا اور طعنہ دینے لگا۔ اس نے پچھلے کمرے کی چوٹی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سن لی تھیں۔ وہ شہرینچوں کی طرح بولا۔

”قربہ قربہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی گئی باتیں کرتی ہیں۔“ صفتیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔

”اور آپ سے جو محبت ہیں مجھے قطعی امید نہ تھی کہ یوں محفل کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کر رہی گی۔ کب شادی ہوئی؟ شادی کی رات کیسی گذری؟ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا؟ قربہ ہے۔“ وہ چڑانے لگا۔

میں نے فوراً نکام لگائی۔ ”معد ہے منتر صاحب میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ اسے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندی کیا ہے۔ بچہ کی پیدائش دنیا کا حسین ترین حادثہ ہے اور یہ کانا پھوس ہی تو ہمارا اثر دنیا کا سکول ہے کیا سمجھتے ہیں آپ کیا کالج میں مجھے بچے دینا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے بوڑھے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھروسہ کر چھو کر قربہ قربہ کہتے رہے محفل کی عورتوں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔“

”یہ صفیہ سخت جاہل ہے۔ ادب و ادب کچھ نہیں سمجھتی ہر بات پر تھوٹھو کرتی ہے۔ آپ کی تحریروں سے سخت خفا ہے آپ کا جی نہیں گھبراتا اس سے گھٹنوں باتیں کر کے کہ قورے میں کتنی ہلدی، آرد کی دال کے دی بڑے۔“

”اسے منتر صاحب قورے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے۔“ صفتیہ نے ہیبت زدہ ہو کر کہا۔

ہو منٹو پڑا۔ وہ بھند تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہئے اور جہ نہیں پڑتی تو یہ میرا منظر علم اور نا انصافی ہے۔ ”میرا ایک راجپوت دوست تھا وہ بھی اور ہلدی بی کر جاڑوں میں کسوت کیا کرتا تھا۔ پورا پہاڑ ان تھا۔ اور ہم مصر تھے کہ آپ کا دوست بھی اور ہلدی



کیسا کیسا غمِ ثبوت و تہذیب نہ کہ وہ فطرت میں نہیں، وہ اسی وقت دنیا چھوڑ سکتا ہے صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آکر مجھے شرط لگانا پڑی اور غمِ شرط ڈال گیا۔ میں عیت گئی۔ مگر کیا؟ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب غم کو بہت چڑھائی اور وہ شرط لگانے پر آمادہ ہوا تو اس نے شرط لگانے کے غمِ خلاصی نظر نہ آتی تو ہار کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

غمِ خود ستائی کی بناء تھی مگر غمِ نامیرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا اور اس وقت میرے اور اپنے سرانیا میں کسی کو ادیب نہ ماننا۔ خاص طور پر کرشن چندر اور۔ فیض مستی دہلی کے خلاف ہو جانا۔ اگر ان کی تعریف کرو تو شکِ احتیاط میں گنتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مافی جہاں اور وہ تنقید نگاروں کو جل بھی سانسے لگے۔ ایک سرے سے ان کے وجود کو ہی سہم قائل سمجھنا خاص طور پر آپ کے لیے۔

”ابو اس کرتے ہیں یہ لوگ۔“ وہ جل کر کہتا ”جو یہ کہتے جاتیں بس اس کا اٹل کرتے جاؤ یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنے کے بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نام و ہر کا اول قول ہے۔ وہ کبھی اتنا بیڑا نہ بنا کہ میں اسے تسلیم دینے کو کہتی ہوں کہ یہ اول قول لکھتے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں اگر تنقید سے آپ کو بد نہیں ملتی تو نہ مجھے مگر اسے عام کر دو مطعون نہ کیجئے مگر وہ بھننا نہ رہتا۔ ایک دن بڑی تنبیہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

”مقدمہ وار کریں گے۔“

”ہاں، کہا، کون؟“

کہنے لگے۔ ہم، یعنی میں اور آپ۔ اس مرد و دیر میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں لکھ کر چھاپی ہے کہ فحش ہے ایسے ادب سے ملک کو بچانا چاہئے۔ اب اس کم بخت سے پوچھو کہ کیسی اعلیٰ بات کر رہا ہے۔ ایک تو اسے کتاب میں چھاپ کر شہر کر رہا ہے دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے۔ اس نے جاری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں اسے نوٹس دلو اور ہار کر ہر جان دے۔ پھر نہ جانے بھول بھال گئے۔

منٹراچی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شہنی لکھا کرتا تھا۔ رفیق غازی سے کچھ عجب قسم کی محبت تھی جو میری سمجھ میں نہ آتی۔ جب اس کا تذکرہ کیا بھی کہتا ”بڑا بد معاش لفظ لگا ہے۔ ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رڈ ٹیسی نہیں جس کی اس نے اپنے چوڑے پرناک نہ گھسوالی ہو۔“

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے کچھ بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلاً سے سنایا کرتا ایک دن مجھے اس سے ملنے کو کہا۔ میں نے کہا ”کیا کروں گی مل کر؟ آپ تو کہتے ہیں لفظ لگا ہے وہ۔“ کہنے لگے۔ ”ارے جب ہی تو ملارہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفظ لگا اور بد معاش بڑا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے۔“

میں نے کہا ”منٹو صاحب! لفظ لگا، شریف، بد معاش یہ آخر کیسا آدمی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے بتنا تو میں ادب کر جاؤں۔“

کہتے ہیں شہید و سیا نہیں۔“

”آپ بنتی ہیں۔ منٹو نے بڑا مایوس کر کہا۔“ جسے تو میں آپ کو فقیہ سے ملانا چاہتا ہوں۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے کوئی عورت غیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔“

”میں بھی تو محبت ہوں۔ میں نے فکر مند بن کر کہا اور وہ کھسکا نا ہو گیا۔“

”میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔“

”مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے۔“

منٹو نے فحشہ لگایا۔ ”ہو سکتی ہے۔ یہ خوب کہا۔“ مگر منٹو کو ضد ہو گئی۔ ”آپ کو اس سے ملنا پڑے گا۔ دیکھئے تو سہی۔“

”میں اسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کم بخت پر عاشق ہی

نہ ہوا پڑے۔“

اور فقیہ سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دنیا کے ساتوں عجیب کرنے کے فقیہ ہیں۔

وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک جذباتی انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدعاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف

بھی۔ یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ یہ منٹو کا میدان ہے وہ دنیا کی ٹھکانی کوڑے پر پھینکی ہوئی غلامت میں سے نکل کر

نکل لانا ہے۔ کوڑا کرید لے گا اسے شوق ہے کیونکہ دنیا کے ستارے والوں پر اسے بھروسہ نہیں۔ ان کی عقل اور فیصلہ پر بھروسہ نہیں۔

وہ ان کی شریف اور پاکیزہ بیویوں کے دل کے چور پڑھتا ہے اور کوڑے میں رہنے والی زندگی کے دل کے نقد سے اس کا موازنہ کرتا ہے۔

سطح پر ڈوبی ہوئی معیشت پسند لوگوں سے میل اور پسینے میں بڑتی ہوئی گھائیں نیاہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔ ”کوڑے“ میں حالانکہ جسم ہی جسم ہے۔

فقر سے دیکھئے تو جسم کے اندر روح بھی ہے۔ معیشت پرست طبقے کی پچھے پڑے ہوئے دھکی طرح پھٹکیوں دار روح اور کچلے ہوئے طبقے کی

نصیحت سے دور مصلحت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں

کے درمیان خیال تھا اور وہ اس محبت کو جس کی دنیا کو جاکر سنے نہیں پر پٹختے ہیں۔ بڑی ہمدردی محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بدعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ منسا یا کرتا۔ ایک دن میں نے جملانے کو کہہ دیا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔

اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے ان کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی ہمدردی کی اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا

کہ یہ لوگ واقعی بدعاشیاں کہتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

”سب جھوٹ۔ میں وہ اندلی کرنے لگی۔“

”ارے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ باز میں جو چاہے جاسکتا ہے۔“

درمغرائی لوگوں کی اتنی ہمت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جاسکیں۔ بہت کرتے ہوں گے گانگن کر چلے آتے ہوں گے۔“

”مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر۔“

”گانگن سننے۔“ میں نے پڑایا۔

”جی نہیں، اپنے دام وصول کرنے اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے۔ پھر بھی میں نے کہا۔“

”میں نہیں یقین کرتی۔“

”وہ کیوں؟“ وہ اٹھ کر بائبل میں سے سلسلے خالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

”بس میری مرضی۔ آپ جیسے اوپر موجب ڈالنا چاہتے ہیں۔“

”بھئی خدا کی قسم میں کہتا ہوں میں کیا ہوں۔“

”خدا پر آپ کو یقین نہیں بیگا، اسے نہ گھسیٹئے۔“

”اچھے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک بار نہیں بلکہ.....“

”مرحوم بچے کو اب آپ بھڑکی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟“

اور منڈا وہ ہر پھسکوا مار کر بیٹھ گیا کہ آج تو منہ کر رہوں گا کہ میں زندگی باز ہوں مصفیہ کی گواہی دلوائی۔ میں نے وہ منڈا چمت کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ زندگی کے یہاں جا رہے ہیں اور اگر گئے بھی ہوں تو سلام کر کے چلے آئے ہوں۔  
مصفیہ چپ سی ہو گئی۔ ”اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آگئے یا.....“ وہ موجب گو محو میں رہ گئی۔

فتوے جو ش میں کچھ زیادہ قیزی سے پی ڈالی اور مٹی طرح ٹٹے لگا کہ یہ تو آج منہ کر چھوڑوں گا کہ میں پتا زندگی باز ہوا کہہ دیا آج ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں مان کے دوں گی نہیں۔

ایک تو فشدہ دوسرے فٹو کے مزاج کی جہل مٹی اگر بس چلتا تو میرا منہ فشدہ لیتا۔

مصفیہ نے مسرور کر کہا۔ بہن مان جاؤ۔ شاہد نے کہا بس اب کچھ چلو مگر فٹو نے شاہد کی ٹانگ لینا شروع کی اور کہہ دیا کہ ہوتے جلنے نہیں دوں گا۔ خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سنجیدگی سے فٹو نے شاہد سے کہا چلو زندگی کے یہاں ابھی اسی وقت آج میں قائل نہ کروں تو میں نے مان کا دھوکا دو دھپایا۔ ”مگر میں نے اور بڑھایا۔“

”آپ جانتی وائیں گے نہیں یونہی بانٹنا برج پر گھوم کر آجائیں گے اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ؟“

اب تو فٹو کے سر میں لگی قواٹری میں جا کر شاید ہی کبھی ہو خستہ ضبط کر کے پوچھا۔

”پھر کیسے یقین دلایا جائے؟“

میں نے کہا۔ ”بہن یعنی مجھے اور مصفیہ کو بھی ساتھ لے چلئے۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“ مصفیہ گڑبی۔ ”تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے تم ہی جاؤ۔“

”جلنے لگی کیسے نہیں۔“ فٹو غرا یا۔

”چلو چلو.....“ مصفیہ کو کم نے تاکھ ماری اور چاروں چلے۔ دروازے سے ہم دونوں تو نکل آئے، فٹو کو کہے تاہم میں کیا۔ دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو فٹو نے خوب قہقہے لگائے اور پھر چپکے سے کہا۔ ”مگر اب تو مان جاؤ میں نے کیا قطع نہیں۔“

مجھے نہیں معلوم فٹو کو تجربہ تھا یا جو کچھ اس نے زندگی کے بارے میں کھا ہے وہ اس کے اپنے ہر باب ہے کیونکہ اگر وہ زندگی کے کوئلے پر گیا بھی ہوگا تو وہاں زندگی سے زیادہ اس نے ایک حوت کامل دیکھا ہوگا جو با

ہماری زندگی کی خدمتوں کو پیار کرتی ہے۔ اچھے اور بُرے کو ناپنے کے جویمانے عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انھیں خود بھیج دے اور ان کو اپنی جگہ سے اُن کا انداز لگاتا تھا۔ خوشیاں جیسے دلچسپ اور نکلنے انسان کی رگ و جھیت بھی پھڑک سکتی ہے۔ رگ و جھیت جیسا کہ انسان بھی دلیوتاؤں پر بازی لے جاسکتا ہے۔ بلند و فغان دینا بھی مرگن ہو سکتے ہیں۔ قوی رضا کار بدکار بھی ہو سکتے ہیں اور لاش سے زندہ کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی میرا اور فکر کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ دو روز ٹیٹس ملہم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انت میں کر لیا۔

”آپ محرومت میں ورنہ ایسی بات کہنا کہ دانت کھٹے ہو جاتے۔“

”مول کا ارمان نکال لیجئے مروت کی ضرورت نہیں۔“ میں نے پڑاپا۔

”اب سہانے بھی دیکھے کوئی مرد ہوتا تو بتاتے۔“

”بہا جی متبھی ایسے کئی کون سے نیر زکشتیں باقی رہ گئے ہیں نکال لیجئے۔“

”آپ مجھ پر جانتیں گی۔“

”قسم خدا کی نہیں جھینٹیوں گی۔“

در تیارپ عورت نہیں۔

”دیکھو! کیا عورت کے لیے جھینپنا اشد ضروری ہے؟ چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے؟ بڑا افسوس ہے مگر صاحب! آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ اصول بناتے ہیں۔ میں بھی سچی آپ کا عام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں۔“ میں نے مسکے لگایا۔

”قطعی نہیں..... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔“

”تو پھر کہئے نہ وہ بھینسیا دینے والی بات۔“

”نہیں۔ اب فقہہ اُتر گیا۔ وہ منس کر بولا۔

”اچھا دوستی ہی میں سہ بتا شیے وہ کون سی خطرناک بات تھی۔“

”کچھ نہیں..... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ شاید کوئی ٹوٹی ٹوٹی گالی دے دیتا۔“

”بس؟“ میں نے نا اُمید ہو کر کہا۔

ماشاہد کس کے بھائی پڑھاتا۔ "نادم ہو کر لولا۔

”یہ پرکھ لی اثنے ہوتا میں نے ایسی ایٹیم کالیاں سنی ہیں کہ نہ نہیں اور میرے پتھر طبی خالصے زور کے پڑ چکے ہیں سڑا پسلی دھن  
آپ نے صورت کچھ زرا عایت کی۔ میرے بھائی تو نگاہ چکے ہی کئی بار۔“ اور کھانا ملا پھر گیا۔

حسبِ اَحْلَاءِ اَنْصَارِ جاکر دیکھا تو صفیہؓ نہ پہلا تھے لیکن یہ بڑا افسوس ہے کہ انہوں نے سوا ماہِ فطر کے بعد آرام کروں پہر واپس لا دی تھیں۔ یہاں



ناک پر کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

”یہ کیا کر رہے ہیں۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”یہ کیسے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے! صفیہ! صفیہ! آؤ آؤ۔“

”کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

مردوں کا کام میں بھی جوڑو دے سکتا ہوں۔ میں نے بہت روکا تو اور لڑے، کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے۔۔۔ صفیہ نے بسور کر کیا۔

منڈ سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے بن کر کھانا شروع کیا۔ صبح ہی صبح منڈی کے بھنگی نے صحن صاف کرنے کے بہانے وصول حلق میں جھرنکی، اب آپ ارمان نکال لیجئے۔ مگر مئی کے مارے جان نکل رہی ہے۔

جلدی ہی سے جھاڑو چھڑو منڈی سے برف لائے چلا گیا۔ صفیہ ہنڈیا بگھارنے چلی گئی۔ برف لاکر منڈی نے تولیہ دیا اور مارا کر توڑی اور پیٹ میں بھر کر سامنے رکھ دی اور اکڑوا بیٹھ گیا۔

”اور منڈی ہے۔“ اس نے حسب عادت کہا۔ ڈانڈی کے گھار سے مجھے زور سے ابکائی آتی۔

”افوہ! یہ صفیہ کیا کر رہا ہے۔“ میں نے ناک بند کر کے کہا۔ منڈی نے چونک کر مجھے دیکھا سر سے پیر تک بڑی بڑی تیلیاں لکھائیں اور چھلانگ مار کر جھٹکا باوچی خانے میں صفیہ کی سختی رہی اور اس نے بھر لڑا پانی تیلی میں جھونک دیا۔

واپس آکر وہ سما سما رساں سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر منس دیا۔

میں بیوقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑا قاتی آتی تو اسے زور سے ڈانڈا پھر بڑے شرمیلے انداز سے بولا۔

”آپ کے پیٹ میں بچہ ہے؟“ جیسے بچہ میرے نہیں خود اس کے پیٹ میں ہو۔“ میں نے فوراً تاڑ لیا۔ جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اسے بھی گھار سے ابکائی آتی تھی۔

”منڈ صاحب! خدا کے لیے دائیں جیسی باتیں نہ کرو۔“ میں نے چڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”ارے واہ۔ اس میں کیا بڑائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں بھی کیریاں لاتا ہوں۔ وہ لپک کر نیچے گیا اور کڑے لکڑی کے بیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔“ میرے منہ کے بیچے جھاڑو کھڑے ہوئے۔

”اسے بروقت ان کا بیر بھاری ہے۔“ اس نے صفیقہ کی کمریں ہاتھ ڈال کر کہا۔  
 دھمکنائی کی انتہا ہے بھی تو آپ کو لوگ غش نگار کہتے ہیں۔“ میرے اس بگڑنے پر غصہ خوب خوب چکا اور بڑی بڑھڑکی  
 سے دینے لگا۔

”پیش پرزیتوں کے تیل کی مائش سے گھر و گھر نہیں پڑیں گے۔“  
 ”نہار نہ صیغ کا مرتبہ کھانے سے الجھائیاں نہیں آئیں۔“  
 ”کھر پرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا۔“  
 ”جاسپیں برت نہ جانیے گا۔“ نئے صبح جاتے ہیں۔ کیوں صفیقہ؟  
 ”ہٹو غصہ صاب کیسی باتیں کہتے ہو۔“ صفیقہ کھسکا کر رہ گئی۔

اور جب سہا پیدا ہوئی تو صفیقہ میرے پاس میٹھی کانٹنی رہی مگر بچی کو یکسر غصہ کراپنا بیٹا بہت یاد آیا وہ دیر تک مجھے اس  
 کی چھٹی شہزادہ بناتا رہا۔ صفیقہ کا دل کھل گیا اور سال کے اندر اندر غصہ کی بڑی میٹھی نکلت پیدا ہو گئی۔ پونہ سے آنے کے بعد مجھے  
 معلوم ہوا میں فوراً گئی تو غصہ نے مکان بدل لیا تھا۔ دھڑ دھڑ کاٹھ کر نئے مکان پہنچی تو دیکھا ڈرائنگ روم میں لگنی پر پڑے جو پڑے جو  
 حیران رہے ہیں۔ نیا مکان بہت چمک رہا اور بغیر ہوا کا تھا۔ غصہ نے اس لیے بدل لیا کہ اس کا فرش گندہ تھا بچی گھٹنوں چلتی تو پچاس لگ  
 سانی دھڑکی چاٹ سجاتی۔ یہاں تک کہ مزے سے فرش پر کھیل سکے گی۔ حالانکہ تکلیف دہ ہفتوں کی تھی۔

مجھے بچے سخت ناپسند ہیں۔“ صفیقہ غصہ کی سے کہتا۔ زبان کو چمٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لیے ڈر لگتا ہے کہ وقت  
 نہیں کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ وہ دو درہ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا۔ میری بیٹی جیو اسے بڑی پیاری تھی گھٹنوں اس کے  
 ساتھ لڑائی اور ہند غصہ کی باتیں کیا کرتا۔ فرائش پر کھڑکی سے بائیں ڈال کر اس کے لیے المیایں تو لکھ کر نیچے سے کڑنے کے دامن میں  
 میٹ لانا سہا کو پاٹ پر بٹھا کر روشنی شہزادہ اور بچوں کا بہت شاک کی تھا کیونکہ وہ ان کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم عدا میں رہتے تھے رات کے کوئی ساڑھے بارہ ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی معلوم ہوا  
 صفیقہ سانس پھولی ہوئی کسی کھڑکی پر۔ میں نے پرچھا کیا ہوا۔ بولی ”میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا سہا تیرے گھر وہ  
 کہاں گئے ہیں۔“ فقوش مع نہ اچھی اور خوشیہ انور کے اندر آ گئے۔

”یہ صفیقہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی۔“ کاغذ میں لٹل اور گلاس لینے بیٹوں در آئے۔ شاید نے پارٹی کو لبیک کہا۔ طے  
 ہوا کہ جس کے میں ہڈی سب بند ہو چکے ہیں ریل کا وقت گزر گیا، کچھ مل جاسے تو خود پکا کر کھا لیں۔ بس آنا وال دسے دو خود باورچی کا  
 بن کر پکا لیں گے۔

صفیقہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطع نہ بھایا مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانے پر چڑھائی کر دی۔ غصہ آنا گوندھنے لگے نہ تکی  
 فیٹھی پڑے اور خود شہزادہ اور کوڑا لہو چھیننے کو دے دیے گئے جو وہ چھیننے سے زیادہ کچے کھانے پر ٹھہرتے اور پھر بول بھی  
 اور جی نہ لگتی۔ لوگ پھسکا مار کر وہ ہیں بیٹھے گئے اور کچے کچے پرانے پکانے گئے گئے بیٹوں نے آنا بہت اچھا گوندھا  
 بڑے سیتے سے روٹی پکانی اور پھر جھٹ سے پورے پنکھی چٹنی میں ڈالی۔ کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی نہ

نکب رنگ سبب جاتا۔

یہ زندگی تھی جو غم و غصہ سے بھری ہوئی تھی۔ معلوم ہوتی تھی۔ مقبول آمدنی ہو، پینا پلانا ہو، قحطی ہو اور بے فکریاں۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانہ میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو برآئی۔ لاہور میں بھی لطف آگیا خوب دعوئیں اڑائیں۔ اسی بہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری کے جوڑے خریدنے میں ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے یہ بہت نازک اور سرفہر گئے جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوڑے بہت بیچنے لگے۔

”میرے پیر بڑے بھتے ہیں۔ میں نہیں خرید دوں گی اتنے خوبصورت جوڑے۔“ میں نے کہا۔

”اور یہ ہے۔ اتنے زمانے میں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔“

منٹو ہم دونوں نے کئی جوڑے خریدے۔

”آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں۔“ میں نے کہا۔

”نہو اس میں میرے پیر لاشیہ بدل لیں۔“

”بدلتا ہی ہے تو لاشیہ نہ بدل لیں۔“ میں نے راستے دی۔

”بھلا! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ منٹو نے چہک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر گفتنی ہی جھڑپیں ہوتیں تو کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

”محبت کیا ہوتی ہے؟ مجھے اپنے زری کے جوڑے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچویں بیوی سے محبت ہے۔“

”میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دو تیزو سے ہرجاتا ہے۔“

”ہاں..... میں سمجھ گیا۔“ منٹو نے دو رمانی کے دھند لکوں میں کچھ ٹھٹھا کر سوچتے ہوئے خود سے کہا: ”کشمیر میں ایک چرواہا تھی۔“

”پھر؟“ میں نے دوستانہ سننے والوں کی طرح ہنسا کر دیا۔

”پھر کچھ نہیں۔“ وہ ایک دم بچاؤ کے لیے تن گیا۔

”آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بنا دیتے ہیں اور آج آپ شرمناک رہے ہیں۔“

”کون گدھا شرمناک رہا ہے؟“ منٹو نے واقعی شرمناک کر کہا..... بڑی مشکل سے اس نے بتایا۔

”بس جب وہ مویشی دکان کے لیے اپنی لکڑی اور پر اٹھاتی تھی تو اس کی سفید کمٹی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بیمار تھا۔“

ایک کبل لے کر پہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا اور سانس روکے اس لمبے کا انتظار کیا کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین سرک

جاتا۔ میں نے اس کی سفید کمٹی دکھائی دے جلتی۔“

”گنتی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... میں نے سوئے گنتی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ٹوہالے کی طرح پہنے رہتی تھی۔ اس

کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں گنتی کی جھلک دیکھنے کے لیے لپکتی تھیں۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر ایک دن میں کبھی پریشان تھا، وہ مجھ سے تقریباً دو سال گزر چکا تھا۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا مجھے  
رکتہ تو شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا اور بولی کچھ لمبی نہیں۔ میں نے مجھے خند ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔  
وہ راسی ہوئی کمر میں لمبی خند پر اڑ گیا اور آخر کو بڑی رد و کد کے بعد اس نے منحنی کھول کر تعجبی میرے سامنے کر دی اور خود شرم سے  
نفس میں منہ دے دیا۔“

”کیا تھا اس کی تعجبی یہ؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”مصری کی ڈلی! اس کی گلابی تعجبی پر برف کے ٹکڑے کی طرح بڑی بھلدار ہی تھی۔“

”پھر آپ نے کیا کیا؟“

”میں دیکھنا رہ گیا۔“ وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

”پھر؟“

”پھر وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔ تقریباً دو سال سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ  
مصری کی ڈلی بہت دفن تک میری قمیص کی جیب میں پڑی رہی۔ پھر میں نے اسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد حزن نیاں کھا گئیں۔“

”اور لڑکی؟“

”کون سی لڑکی؟“ وہ چونکا۔

”وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تمہاری۔“

”اسے میں نے پہچان نہیں دیکھا۔“

”لکس قدر نہیں پچھا ہے آپ کا عشق!“ میں نے ناامیدی سے چڑ کر کہا۔ ”مجھے تو بڑے کسی شعلہ بداماں قسم کے عشق

کی امید تھی۔“

”قطعاً پچس پچسا نہیں۔“ غصہ بڑھا۔

”بالکل ردی..... غصہ بڑھ رہا۔ مصری کی ڈلی نے کر چلے آئے۔ بڑا تیر مارا۔“

”تو اور کیا کرتا؟ اس کے ساتھ سو جانا؟ ایک حرا می پلا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی بادیوں اپنی مرنائی کی ڈینگیں مانا۔“ وہ بگڑا

”ٹھیک کہتے ہیں آپ مصری کی ڈلی کو کڑا کر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چوسنے کی چیز ہے۔“

”یہ وہی غصہ تھا۔ عشق نگار۔ گلدہ دہن!“

”جس نے“ بڑے لکھی تھی۔

”جس نے“ شعلہ اگر شست“ کھا تھا۔

لیکن مرزا غالب، میں جو دعویٰ بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہر یا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا مگر غصہ کے جہان کی لڑکی ضرور  
ہے جسے وہ اتنے نہیں مگانا چاہتا۔ جس کی گلابی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تضاد جو منظر کی مختلف کمانوں

میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ "نیا قانون" لکھتا ہے اور دوسری طرف "..... دونوں میں وہ خود کو نہ لکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک قسم کی گھبراہٹ ہوتا ہے اور واضح شکار کو وہ نہیں جانتے ہیں۔ قصہ آیا سہواً..... ایک ہی بات ہے۔

ملک میں فساد شروع ہوئے۔ شہر کے بعد اس کو ملٹی کے وہاں اس کو ملٹی میں کیے جانے لگے۔ غصہ اس وقت میں قریب قریب منتقل ہوا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مداح نہ اٹھائی جو اس کی زندگی کا سہارا بنی اسے ملتی تھی کہ اس کی ختم "آٹھ دن" کا ہوتا۔ نہ جانے کیوں وہ فطرتاً ہی ہجو کر اشوک کار کے ساتھ بیٹھی تاکہیں چلا گیا۔ اسے اشوک کار بہت پسند تھا۔ بھرتی نے نہ جاکر کیا کیا۔ دیا تھا کہ وہ ایک دم اس کے خلاف ہو گیا۔

"بھو اس ہے بھرتی۔ فراڈ ہے بچا۔ وہ ملٹی سے کہتا۔

بھرتی تاکہ میں جا کر اس نے مجھے بھی کہیں میں ایک سال کے لیے سیڑی لڑی پارٹنر میں کام دلوا دیا اور بہت ہی غم "اب ہم وہ نوں مل کر کہانی لکھیں گے۔ تنگدست ہو جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی" اشوک کار بہت دلسپہ ہو کر بیٹھ گیا۔

ایک کہانی غصہ کے زیرِ غور ملٹی، اشوک کار کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اسے بھرتی کی کہانی پسند تھی پھر دل سے اڑ گئی۔ کہانی پسند آئی۔ میرے آنے سے بعد اسے میری کہانی "عندی" پسند آگئی۔ خیر فطرتاً کو ناگواری نہ کرنا۔ اب اشوک کار نے مجھ سے غصہ پر کام کرنے کو کہا اور غصہ کو میری کہانی پر اختیار کیا کہ غصہ مجھ سے اور میں غصہ سے شاکہ بننے لگے۔ "اُدھر کہاں امر وہی" محل کی کہا آگئے اور اشوک کار کو وہ پسند آگئی اور ہم دونوں کی کہانی لکھانی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات ملتی۔ وہاں ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطاری میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو۔ خواہ ملتی رہے گی کیونکہ ہر جگہ ہے لیکن کہانی جاری نہیں بنے گی لہذا میری اور شاکہ کی پوری کوششیں اپنی کہانی "عندی" کو نرانے کی طرف لگ گئیں اور دنیا کے دوسرے درجہ کی تصویر بروں کی نظر میں "عندی" بنائی جانے لگی۔

مٹو مٹو کی کہانی رہ گئی۔ مٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی ادھیڑ میں کیا کرتا کبھی انجام کو آفا زبنا کر لکھتا کبھی آفا زبنا کر کبھی وسط سے شروع کر کے آفا زبنا کر لکھتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنز کے کہانی کی کوئی کل اشوک کار نہ آئی۔ مٹو مٹو ہی کہتا۔

"آپ گنگولی کو نہیں سمجھتے، میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں حذر رکھ کر رہے گا۔"

"آپ کی کہانی میں اس کا رول روٹینٹک نہیں باپ کا ہے وہ کبھی نہیں کرے گا۔ اور مٹو سے پھر ملٹی ہونے لگا۔

دبی زبان سے۔۔۔ یہاں اپنی فکر بڑی ملتی اور وہی ہوا کہ "عندی" اور "محل" بن گئیں۔ مٹو کی کہانی رہ گئی۔ مٹو کو اس کی امید نہ ملتی اور ذلت محسوس ہوتی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اُدھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے اسے پاکستان بلانے لگے۔ مٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کڑھ ہاں ہم ہی ہم ہیں گے، بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر مٹو مجھ سے واقعی بد دل ہو گیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے ہونے لگوں کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوتی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا منٹو کتنا بزدل ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جاں بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وہ جاکے جوڑے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لکھتے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت ہی ہو گئی۔  
اور ایک دن وہ بعیر اطلاع کیسے اور طے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہینک محسوس ہوئی۔

پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشتادہ اور بیو بصورتِ وقیعن سامان سے آراستہ۔ اس نے پھر بنایا تھا۔ صدی ختم ہو گئی تھی اور ہم نے آرزو شروع کر دی تھی۔ جس سے وقت آتے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے بارہ مہ آئے۔ اس نے بلایا تھا، ایک سینما اٹاٹ کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا مگر اب تو یہ بھی مان جانا پڑا۔ میں نے اس کے خط پھاڑ دیے اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی تہہ کیوں نہیں کرتا۔ میں نے تو اسے جس سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سنا منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا منٹو دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ منٹو کا ایک خط آیا "کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلالو"۔

پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ ہاتھ پر ڈاکو رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا ذوق تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جیسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں نہ ریزولیشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں بارہ دست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر محترمی سے کہہ کر بھی بلالو تو بہت اچھا ہو۔ اس کے بعد عرصہ تک کوئی خبر خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر ٹنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اب منٹو کی نعروں سے ڈرنا لگتا تھا۔ پوچھنے کی بہت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو منٹو پاگل خانے سے آگے جو قدم چڑھنا ہے وہ بٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبر نہیں کہ جی اوب گیا۔ بے طرح پیسے لگے ہیں۔ اپنے پرانے بیکس سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھوا لے لیں۔ میٹنگ پیسہ رو تو سب کھا جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اوپر لکھنے کو کہا تھا اور بے ساختہ میری محسوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو میرے لیے بہتر مضمون لکھوں گی۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو میری نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مرچکا تھا۔ آج صحت ایک کسک زندہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مرچکا ہو جس زندہ ہوا؟ یا یہ ہے کہ میں نے پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے؟ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا یہی ناکہ اس نے مجھے بس کہا تھا۔ لکھ نہیں تو کھری بھائیوں کو دم توڑتا تو کھیتی ہیں اور کچھ نہیں کرتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں جو نہ دکھتا ہے نہ رستا ہے۔

خاموش سٹکنا رہتا ہے۔

آج مجھے صغیر بے طرح یاد آرہی ہے۔ جی چاہتا ہے ایک بار سر جوہر کریم ویسے ہی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ہوئے۔  
 اٹھ بجے چیر میں کیا کرتے تھے۔ وہ تھیں سو گت رات وہ پوچھنے کے۔ بچے کی باتیں، یہ ہیں موت کی باتیں۔ اسی لیے ڈرتی ہوں اور میرا نظم  
 ہو جاتا ہے۔ نہ جانے ان چند برسوں میں اس پر کیا گزری ہے کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی  
 تمہاری محبت اس طوفانی سماں کا سہارا چٹا رہی رہی یا تمہارا پیار تھک کر نہ محال ہو چکا تھا۔ کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھینچال نصیب بھیجے  
 پست کر گیا یا تم اب تو اپنے منہ صاحب کی صغیر ہیں؟ پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اس کی بد روی پر ناک بھوں چمھانے  
 تھے تو تم کیا کرتی تھیں؟ ان خاموش گیسوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جسے مروتی اور لاپرواہی سے تمہارے ارد گرد منڈلایا کرتی  
 تھیں، دم تو نہ ٹھٹھٹ جاتا تھا؟ کیا اس نے تمہاری پیار بھری گود میں دم توڑ آیا وہ تمہارے خاندان میں اکیلا ہی سدھارا؟ کیا پہاں  
 ۱۔ پتے باپ کو پاگئے غلس شہزادی سمجھتی تھیں؟ اس نے تمہیں نگہ ستی اور نہ است کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا؟ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم تھے  
 کہیں اس کی خبر ہو رہی تھی اپنی زندگی کا دھندلا سا جی غس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا۔ اس نے انہیں عجیب  
 کی طرح چھپایا۔ اسے غرہ تھا کہ چاہے تو وہ دم بھریں لاکھوں لگا کر بھدیک دے۔ جی بھی تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ مانتے بھی کر سکتا  
 اور اس کا قلم بے کسی سے کچھ ٹٹا رہتا ہے۔

تم عاجز تو نہیں آگئیں ادیبوں سے؟ یونہی خود گھسٹتے ہیں اور اپنی کمر دل میں گھسیٹتے ہیں!..... اور پھر ایک دن اکیلا  
 چھوڑ چلے جیتے ہیں، تو میں یہ ادیبوں ہی کی عادت نہیں ہمارے پیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی  
 کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ادیب ہوں یا کلرک! ان کی بھی زندگی ہے اور کم و بیش ہی انجام۔ جو زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ پاگل ہو جاتے  
 ہیں اور دھوڑھٹ سستے رہتے ہیں۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس حواں مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے پھینٹے  
 ہیں جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے۔ وہ دنیا جس نے اسے مرنے دیا میری ہی تو دنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل دینہی مجھے بھی جانے  
 کی اجازت ہو گئی اور پھر لوگ مانگ کریں گے۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جلیے کریں گے، چننے سے جمع کریں گے  
 اور ان جلسوں میں مدیم انفر صنی کی وجہ سے کوئی نہ آ سکے گا۔ وقت گزر جائے گا سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ  
 سب کچھ بھول جائیں گے۔

# منستو میرا دشمن

اوپنڈر ناتھ انکیت

منٹو، میرا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ ہم میں خاصی چغچغش برپا تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت تک ہم اکٹھے رہے ہم نے بددعویٰ کو سخت چوٹیں پہنچائیں۔ کتب پبلشر لمبئی سے شائع ہونے والے نئے ادب کے معیار کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا جو ریکارڈ کرشن چندر نے لکھا اس میں اس چغچغش کا ذکر بھی کر دیا اور ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا ہے کہ اگر میں نے منٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا۔ لیکن آج جب منٹو اس دنیا میں نہیں ہے، میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم واقعی دشمن تھے؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو پتا ناہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدا اچھی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

منٹو کی اور میری افتاد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ لڑکپن ہی سے دینریا فضلہ کھارکی، وکافوں کے اوپر چاروں میں جیسے والی تجربے کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور رات کو خواب لمبی تاش ہی کے دیکھتا تھا اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا وہ زندگی بھر اور میں نے شراب تو دور رہی مگر میٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا جب میں تیس برس کا تھا۔ اس نے کڑھ گھونیاں ہو یا میرا منڈی ہو یا نارس روٹ، اس بازار کی خوب میر کی لقمی ماور میں نے اُدھر جھاگ کر بھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ماں نے بچپن ہی سے ان تینوں کے اعتدال سخت نفرت میر سے دل میں بھر دی تھی۔ والد محترم نے ان تینوں میدانوں میں جو کاروائے نمایاں سرانجام دیے، میرا خیال ہے نہ تھا۔ سے خاندان کی آئندہ دو سلیس اس سلسلے میں کچھ بھی کیے بغیر ان پر خیر سے سر بلند کر سکتی ہیں۔ ان کے انہی کارناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہو گئی اور ہم نے جس حسرت میں بچپن کے دن کاٹے اس نے خون کو کچھ ایسا مجھ گروہ یا کہ آج جب میں مگر میٹ یا شراب کر دیا میرا یہ نہیں سمجھتا، کبھی کھل کھیلنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پتا جی، جب ایک آدھ پیگ چڑھا لیتے تھے عموماً غرہ نکاتے تھے۔ کڑی لکھن کے لیے! وہ حال ہی میں جیتے تھے اور انھوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ ردِ عمل کے طور پر میں نے لڑکپن ہی میں زندگی کا سا خاک تیار کر لیا تھا۔ او منٹو کو میر سے اس زہرِ حسامیت، پلاننگ، کھانا بت شکاری اور لٹھراؤ سے سخت نفرت تھی اپنی اس نفرت کا انہماک اس نے کئی بار محنت ترین الفاظ میں کیا۔

..... مجھے منٹو نے فطرت میں کام کرنے کے لیے مٹی بلایا تھا۔ میرے مٹی پہنچنے کے دوسرے پتھر سے دو۔



جیم کو کٹوریہ میں آئے، سٹو نے پیٹھے گرانٹ روڈ کو جا رہے تھے۔ سٹو نے تھوڑی سی پی رکی تھی۔ اچانک اس نے انگریزی میں کہا۔  
 "I LIKE YOU THOUGH - I HATE YOU."

..... ڈیڑھ سال بعد ہم فلستان کی کنٹینر میں بیٹھے تھے۔ لچ کا وقت تھا۔ مٹوکی میز پر حسب دستور اجہدی علی خاں دا چاہ وغیرہ دوا ایک دوست تھے۔ میں براہری میز پر اپنی پینٹ نے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا نہ جانے کیسے ہندوؤں کے واقعہ پیش کیا اور کہا کہ یہاں کربا یعنی مردہ کی کھوپڑی کو توڑنے کی رسم کا ذکر چلا مٹو نے دانت پس کر کہا ۔۔۔ شکست جب مرے کانتر اصر کی کپال کربا میں کروں گا۔

..... میں کہے۔ ای۔ ایم ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے وق کا قتلے دے دیا تھا۔ راجہ مندی علی خاں مجھ سے ملنے آیا اور اس نے کہا کہ سالہا اس طرح پیسہ نہ جوڑتا تو بیمار نہ پڑتا۔

جب گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے منٹرو نے محمد سے کہا تھا، میں تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔ یہ تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لیے جواب دیا تھا ورنہ منٹرو سے مجھے دراصل کوئی نفرت نہیں تھی۔ رخصت تو اس نفرت کے باوجود جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا میں ابھی طرح جانتا ہوں۔ ہمدردیوں گہرے دوست ہونے اگر میں نے اپنے پچھلے پسنے میں منٹرو کو بنا دیکھے بنا جانے، بنا پڑھے اس کے خلاف ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاہ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۹ء کے آس پاس کی ہے۔ شوکی ایک کہانی خوشیا، ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں اور اجے سنگھ پٹیل اس زمانے میں ساتھ ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ وہ کہانی لکھتے تو مجھے انکڑا سا نہ لگھو لیتے اور میں لکھتا تو انھیں جائنا سا نہ دونوں مل کر عرصہ کے افسانوں پر تبادلہ خیالات کرتے اور جیسا کہ نوجوانی میں ہوتا ہے، ہمارے خاص تیز اور ٹھکی ہوئیں۔ بی بی کے لئے خوشیا کے بارے میں میری رائے پوچھی۔

میں نے اس وقت تک ٹٹو کی کوئی چیز نہ چھیٹی تھی نہ اسے دیکھا تھا۔ نہ نہشت امیر کے نام سے سہیو کو کا ایک ترجمہ تھوڑے کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے لنگل میں دبائے کسی ناشر کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے یہ میں نہیں جانتا۔ بہر حال خوشیا کی اشاعت سے پہلے ٹٹو کے بارے میں بھی دو ایک باتیں میں جانتا تھا اور چونکہ لکھنا میں نے کوشش منو اور بیسی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، عمر میں بھی میں نینوں سے بڑا ہوں اور اس وقت تک اسے کچھ مشہور افسانے، ڈرامے، کونسل، قصص وغیرہ لکھے جا چکے تھے اور ترجمہ کو میں طبعاً دیکھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا، اس لیے یہی نظر آیا کہ ٹٹو کی کوئی خاص وقت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ خوشیا پڑھتے وقت بھی میں پہلے ہی مصنف کے خلاف تھا۔ خوشیا مجھے بہت اچھا بھی نہیں لگا حالانکہ ٹٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا دورِ جاہل ہے اور زیادہ خیال کو ٹٹو نے بہت اچھی طرح نبھایا ہے تو بھی مجھے یہ اعتراض تھا کہ خوشیا حقیقی کردار نہیں بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اس زمانے میں باقاعدہ اس جلی کی سیر کرتے تھے اور ان کی وساطت سے مجھے اس کے آداب و قواعد سے مناسی واقفیت تھی۔ پچھلے طبقے کی طوائفوں کے جیسی کہ خوشیا کی کہانیاں،

رات جو ماؤں سے پہلے ہی بھائی طور پر متعارف ہو جائے ہیں۔ یہ بات میں یقینی طور پر جانتا تھا۔ اسی لیے یہ خیال تھا کہ خوشیا کا کردار جتنی بھی بڑی بی بی نے جب خوشیا کے بارے میں میری رائے پوچھی تو اس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے دماغ میں تھیں۔ یوں ہی چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ کسی چیز پر آئی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ ملتی۔ جو مہذب آیا یا باگ دیتے تھے۔ اسی لیے میں نے کہا ”دو کوڑی لاکھ کی بات ہے۔“

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا لیکن بی بی نہیں بھولا اور جب کچھ عرصے بعد بیدی واپس آیا اور وہاں مٹو نے جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو میں آگیا تھا، اپنی عادت کے مطابق اسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں بیدی نے خوشیا کے بارے میں یہ بی بی رائے کا ذکر کر دیا۔

وہی سے واپس آکر بہت سی باتوں نے منہ سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے شکر تک تمہاری بات پہنچا دی ہے۔ دیکھو مجھے بھی یہ خیال بھی نہ تھا کہ مٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا رامنڈ کاٹیں گے اس لیے میں نے اس اطلاع کو سنا آنا سنا کر دیا لیکن سنا آنا نہیں جب کرشن چندر کے ملاوے پر میں وکی ریڈیو پیش کیا اور وہاں جانے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ یہ اوہ ریڈیو کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دو سٹونز نے میری ملازمت پر اس لیے خوشی کا اظہار کیا کہ اب مٹو کو اپنا بدل ملے گا یعنی اگرچہ میں اور مٹو کبھی آسنے سامنے نہ ہوئے تھے لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا۔

وہی میں اپنی فوکری ہونے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتہ چل گیا اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کشش بھری زندگی سے محبت پا کر آیا تھا اس لیے اس خیال سے میری روح کا بپ گئی کہ مجھے پھر کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں بوقت ملنے ہی مٹو کو سمجھاؤں گا کہ لوگ محض تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم کیوں تماشہ نہیں لیکن ایک قویہ کہ ریڈیو میں اس وقت مٹو کا نمٹا ہوا تھا۔ دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے بچا دکھانے کے لیے اُدھار کھائے بیٹھا تھا اس لیے میری کوششیں بار آور نہ ہوئیں۔ ریڈیو کا فرائیڈول میں پورے ایک بڑی کوٹھی میں تھا۔ بڑے کمرے میں ڈائریکٹر پروگرام ڈائریکٹر اور میوزک ڈیپارٹمنٹ کے پاس تھے۔ تیسرے کمرے میں سے (جو شاید کوٹھی کے ساتھ روم رہے ہوں گے) ایک میں رائنڈ دوسرے میں کرشن اور تیسرے میں مٹو بیٹھے تھے۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں کرشن کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کرشن مٹو ریڈیو میں (جو سڑک کی دوسری طرف ایک کوٹھی میں تھا) گیا ہوا تھا اور میں کوئی خیال نہ کر رہا تھا کہ مٹو ٹھنڈا ہوا آیا اور ادھر ادھر کی بات کر کے اس نے خوشیا کی بات چھیڑی۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں میری کہانی خوشیا پسند نہیں آتی۔“ وہ بولا۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن مٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ”تمہیں اس میں کیا پسند نہیں آیا؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ میں یہاں ہندی صلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں، میرا تھا راکوئی مقابلہ نہیں، تم میرے سے کام

لے دو۔ ”مٹو نے دو فیصلے کے تحت ہاتھ میں ہت پڑو۔ لوگ تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں، ہم کیوں تماشہ نہیں۔“

”مجھے بات نہیں سمجھنے دی۔ اس نے ہاتھ کی جنبش سے جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے وہی سوال دہرایا اور

”کیوں جتنی نہیں؟“

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا، تعصیب ایک خیال ہو چکا اور تم نے اپنے آپ کو دلال کے دوپ میں لکھ کر ویسی صورت میں اپنے عمل کو تبلیغ کر دیا۔ حقیقی دنیا میں خوشیاؤں کا لال ہونا کتنا اس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ اسے وہیں دبیچ لیتا۔  
— تم نے جو کچھ لکھا وہ ایک شرعاً کھانا سمجھ سکتا ہے، ان پٹھرو دلال نہیں۔

کچھ اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی۔ منٹو نے بھر کوجھپ رہا، پھر تھلا کر بولا، "یاں ٹاں! میں وہ دلال ہوں منٹو وہ دلال ہے۔ تمہیں افسانہ نویس کا علم بھی ہے؟ تم خود کیا لکھتے ہو؟"

لیکن اس وقت کرشن چندر آگیا یا اچھے آدمی (پیشوا ٹریڈیوٹ) نے بلایا یا جانے لیا ہوا بہر حال وہ قطعہ وہیں ختم ہو گیا۔  
..... لیکن وہ قطعہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ آئی میں جو پیش اس کے بعد ہی سورہی، منو میرے اس اعتراض کو کبھی نہ قبول سکتا۔  
گزشتہ سال گفتگو کے کسی خاص نمبر میں اردو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہوا تھا اس وقت جب اردو میں کوئی نیا افسانہ لکھے  
ہوئے (ادھر میرے جہا افسانے اردو میں چھپے بھی وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہوئے ہیں) مجھے آٹھ برس پہلے کوکے میں اور  
میرے احباب اور اردو کے ناظر تک مجھے الجھنی کہے ہیں، انٹو کو میں باور با خوشیا کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب  
کا ذکر کرنا وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں جھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی کہ مٹھ سے میری سچک نہ چڑھے، مگر اپنی میزبانی اٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی نیچے اترتا، دوستوں میں بنانا، مٹھ، سخت حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا۔

ان دفین کی بیسی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے۔ مٹو ریڈیو کے بیسے ڈرامے کھنے پر مامور تھا، گوش چنڈوڑاے کا انچارج تھا، میں ہندی سلیج کار تھا اور چونکہ اس نظام میں ہندی کو اہم زبان سمجھا جاتا تھا اس لیے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرسٹ کے وقت میں ایک آدھ ڈرامہ بھی کھنے پا کر نہ تھا۔

مٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اُردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا "لوکھی، کس موضوع پر ٹورار لکھا جائیگا" مریض سننے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک سوزہ کرشن کو دے دیتا۔ مٹو کو اس بات کا زعم تھا اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہے ٹورار لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ٹورار اڈسٹ۔ غلام محمد، سندھیلو، جواب فلم، ایکٹرمیں آج مجھ وغیرہ اسے عمر گنا گھبرے رہتے تھے۔ مٹو لکھتے لکھتے انھیں ڈرامہ سنایا بھی کرتا تھا اور وہ مٹن کو، مٹو صاحب، آپ ٹورار کے بارے میں کہتے ہوئے مٹو کے خرمی پر چندے اڑایا کرتے تھے۔ جاوید اور حسرت صاحب سے مٹو کا پینے پلانے کا رشتہ تھا اور اداوانی اس سے اس لیے دبشے تھے کہ مٹو کے کوئی رشتے دار محکمہ اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ کے سیکرٹری تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر بہ وقت مٹو صاحب، مٹو صاحب، ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں مٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ مٹو خوشامدیوں، یاد و ستوں میں گھرا ہوتا۔ لٹچ کے وقت کبھی اس کے ادھر بھی کرشن کے کمرے میں محفل جیتی۔ میں بھی کبھی کبھی اکٹھا ہوتا۔ مٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تنقید آمیز ریاکار ضد و پاسبان کرتا اور اگرچہ میرے معاملے میں لوگ اس کا ساتھ نہ دیتے، مٹو مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا: دیکھو بھائی! تم غنمو کو سجدو۔ وہ مجھے غواہ خواہ تنگ کرتا ہے۔ میں طرح

”جانتا ہوں۔“

”تم جی، اسے تنگ کر دینا کرشن نے کہا۔ میرے بھانے سے وہ کیا سمجھے گا؟“

اور اس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کر لیا کہ آج میں منٹو کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اس کی کہانی ”دھواں ستان“ ہوئی تھی۔ کہانی مجھے بے حد پسند تھی۔ منٹو نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور نفاست سے افسانہ لکھا تھا۔ لیکن میں تو شرارت پر تلا ہوا تھا۔ درجنوں میں اس دوران میں منٹو کی انانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لیے میں نے اپنا طرز عمل طے کر لیا۔ دفتر پہنچ کر میں منٹو کے کمرے پر گیا۔ وہ ابھی اُٹ کر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا — ”میں نے تمہاری کہانی ”دھواں“ پڑھی۔“

”کیسی لگی؟“

”اچھی ہے اب تم چپٹی پر لکھو۔“

منٹو کھنکھن کر چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باز نکالتے ہوئے کہا: ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دہرائی۔ پس اب تم چپٹی پر لکھو!“

اس وقت حصمت نے لحاظ نہ لکھا تھا۔ منٹو چڑ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو، لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا اس لیے اس نے کہا: ”تم کیا جھک مارتے ہو؟ میں نے تمہارے ڈسے پڑھے ہیں۔“

اس وقت میرا محبوبہ پانی، چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ منٹو نے کافن مجھے خوب آتا ہے اس لیے طرح دے کر میں نے کہا: ”میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں، اس لیے میرے ڈراموں کی بات چھوڑ دو لیکن تم جو ڈراموں کے بارگاہِ اعلیٰ لکھتے ہو جیسی جھک مارتے ہو، وہ میں ابھی طرح جانتا ہوں۔ کروٹ“ میں تم نے ماتم کے افسانہ ”ربین“ کے کہانی چڑالی ہے۔“

”یوں کا نامک“ پورے کا پورا ترجمہ کر دیا ہے اس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا، اور حوالہ تک نہیں دیا۔ میں اچھا لکھتا نہیں لکھتا لیکن منٹو اور منٹو لکھتا ہوں۔ میری ابھی بڑی چیز میری اپنی ہے، کسی دوسرے کی چڑائی تو نہیں۔“

منٹو جھٹا اٹھا لیکن میں وہاں نہیں ڈکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ منٹو ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا لیکن ڈرامہ لکھنا تو دور رہا۔

میں نے اپنے لیے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اس نے پھر مجھ سے افسانہ کے بارے میں کربات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر طرح دے کر ٹھک گیا اور منٹو ڈیوڑھی پہن گیا۔ منٹو نے ستر پر میں میرا بیچا کیا۔ لیکن میں چیر مار گیا۔

اسی شام دشوار مزاج آدمی اپنے دوست اور بہنوئی مسٹر مرن موہن بھٹہ کے ساتھ منٹو سے ملے گیا۔ اس نے اگر نیا یا کنٹر نے انھیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں کہ اشک سالہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا۔ ہے؟ اس کو افسانے کے فن کی ایک کالجی علم نہیں۔ ادب لطیف، میں اس نے افسانہ کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا ہو اس ہے وغیرہ وغیرہ۔“

تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا وہ سب سناتا رہا، کیونکہ قاشانی بڑے خوش تھے اور منٹو کیا کہتا ہے، وہ مجھے رائی رتی بنانا نہ بھوتے تھے لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا

ہی ہوا اور افسانہ میں کتنا بڑا کرنا اور خواستہ مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑا ہے جس کی دہشتوں کو توقع تھی۔

میں منٹو کے افسانے پسند کرتا تھا۔ خوشیا کے بعد میں نے منٹو کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے۔ نیا قانون، منتر، منور، بڑا لوک، سو سو کی شہادت، ہنگام، منٹو بڑی کوسٹا، مجھے بہت پسند آئے تھے۔ لیکن جب تک میں دلی میں رہا میں نے کبھی منٹو کے سامنے اس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چونکہ منٹو کی نظر کافی تیز تھی اس لیے خوشامد کرنے پر وہ اگرچہ جتنی طور پر خوش ہوتا تھا لیکن خوشامدی سے کہیں اس کے دل میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھ کو دلی بلا کر منٹو کے مقابل لاکھڑا کیا، لیکن جب بھی ہم جگڑا ہوا اس نے ہمیشہ منٹو کی طرف داری کی۔ منٹو اس طرف داری کا فائدہ اٹھا لیا لیکن کرشن کے لیے اس کے دل میں عزت نہ تھی۔ وہ اسے بھی نکال دیا دینا تھا۔ چونکہ ان دونوں منٹو کو ہر وقت خوشامدی لوگ گھیرے رہتے تھے اس لیے میری اس حقیقی تعریف کو بھی منٹو خوشامد پر معمول کر لیتے یہ میری اپنا کو منظر نہ تھا۔ میں وہ سہ ماہی منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑنا چاہتا تھا اور اس کے کمزور افسانوں کی تنقید نہ کرنا چاہتا تھا۔

ان دنوں عویاں نگاری کو زنی پسند ہی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی مصمت اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن کھٹ کر نہ کھیلتے تھے۔ لیکن انھوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولہ بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان، انجیری اور ترقی پسندانہ طنز میں منٹو کی سی عویاں نگاری ملادیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی مصمت، فرہنگی اور آریزیز کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو انسانی اہم ہیں لیکن نہ جانے کیوں اس وقت ترقی پسندوں کو عویاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طنز و تشبیہ کے چاروں میں تعلیم یافتہ فوجیوں کا مارے مارے بھڑبھڑا ہی واحد موضوع سمجھنا تھا۔ سب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ یہ سب لکھ نہیں سکتے اس لیے انھیں منٹو اور مصمت (ان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے خند ہوتا ہے۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی بڑبڑائی تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا میں نے اپنے آپ لکھا لیکن ہم دونوں نے ایک ہی موضوع۔۔۔ یعنی لوگوں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی۔۔۔ پر افسانے لکھے۔ منٹو نے ”بلاؤز“ اور میں نے ”اہال“ دونوں افسانے ساتھی دہلی کے ایک ہی نمبر میں (خالد گامی سالانہ میں) چھپے۔ اہال کو دہشتوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اس سے اس وقت تک کہ میرے افسانوں میں اتنی مانتا۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو وہ بھی کافی پسند کیا گیا۔ بلاؤز اور اہال اس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عویاں دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا اثر۔ دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جہاں بلاؤز کے انجام کی حقیقت کو ہی حقیقت ہے وہاں اہال کے انجام میں نوکر کی ٹریجیڈی کے ساتھ سماجی ٹریجیڈی بھی نہیں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت (SOCIAL REALISM) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو حقیقت جیسی بھی ہے اس کا خاکہ کیسے بننے تک ہی اپنے فکرم کو محدود رکھنا چاہیے یا اس حقیقت کے پس منظر میں صلیب کا بھی جائزہ لینا چاہیے، یہ بحث طویل اور فرہار ہے فن اور فن برائے زندگی کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہے ہیں گئے۔ بہر حال منٹو کے ساتھ ہونے والی چٹک میں میں نے بھی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اس کی بڑی تعریف ہوئی لیکن پھر میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے میں کہہ کر ویسا افسانے لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

بارتی صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے پھوپھو قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو عیدیا کہ میں نے دیکھا میرا نہیں۔ ہے کہ بارتی صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کرفار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو جن حالات میں چائیکس بکس منٹو دہلی سے فاشب ہو گیا تقریباً انہی حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے براجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود دہلی اس فرار کا باعث تھا کیونکہ دہلی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا، خوش رہتا تھا اور صحت مند رہتا تھا۔ اسی کے حلوں کو اس پر آزماتے تھے تو وہ یہاں چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بمبئی سے بھاگنے کے بارے میں مذہبِ ہاجیری کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے۔

”میں نے بہت غور کیا، کچھ مجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا: منٹو بھائی! آگل راستہ نہیں ملے گا۔ کارٹر روک لو۔ دوسرا جو کی گلی سے چلے جاؤ۔ اور میں ہاجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔“

دہلی سے چائیکس منٹو فاشب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا حالانکہ یہ افواہ اڑی تھی کہ اسے فلم میں نوکری مل گئی ہے لیکن دو سال بعد اس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا۔ ہاجو کی گلی سے آگل راستہ نہ ملنے پر۔ بالکل ایسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بمبئی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر بڑے بڑے نوکری نہ رکھ کفن کے لیے، کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نعرہ لگایا کرتے تھے وہ تھا۔ ”پانہ نکال رام“۔ اور وہ اپنے لڑکوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا منہ بکا صوبے میں لڑا ہوگا اس لیے وہ سب کو بڑے کے طریقے بتایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی پٹ سہ سہت دی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پیشے سے پٹنا مشکل ہے۔ پٹو اور پیشے والے کو نہ چھوڑو۔ میری صحت تڑپ لیکن ہی سے خواب تھی۔ شہدائیا بھائیوں کی طرح تو میں کیا پٹنا، لیکن یہ بات ضرور زمین نشین ہو گئی اور کشمکش حیات میں جہاں جہاں بھی میرے پٹا ہے میں نے اسے آڑے پیشے والے کو پیٹ دیا ہے۔

منٹو سے میرا وہ بار سابقہ پڑا۔ ایک بار دہلی میں اور وہ سری بار بمبئی میں۔ دہلی میں میں نے اسے ڈک مے دی۔ لیکن بمبئی میں خود جزر برابر ہی۔

”دھواں کے سلسلے میں ہم میں جو چٹنک ہوئی اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ منٹو زور دے گا کہ میں اگرچہ مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن ہر بار منٹو کے لیے بے حال بن جاتا تھا اس لیے میرا اور اوچھا پڑتا تھا لیکن اس دوران میں اپنے منٹو راستہ سے بھی بگاڑ بیٹھا۔ راشد آزاد نظم کے بلنی مجھے جاتے تھے اور منٹو کو آزاد نظم سے چڑھائی۔ انہی دنوں راشد کی نظموں کا نام یاد رکھتا ہوں اسے شائق ہوا جس پر کرشن چندر نے ریبا جھ لکھا۔ منٹو نے دونوں کا مذاق اڑایا۔ اس نے نیلی لکھی، کے عنوان کے آدھ رام بھی لکھا جس میں راشد کی نظم سے الفاظ لے کر ان کا مذاق اڑایا۔ رام آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ دو مکالمے دیکھتے۔“

سعدی اشاعرہ۔ کرشن اتم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے لہو اپنے ہاتھوں میں دبا رکھے ہیں؟  
سکوشن :- ٹھنڈے ہاتھ.....؟

مسجد مسجد، مجھے ایسا فقرہ درست کر لینے دو۔۔۔۔۔ اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں  
زیر رہائش ہیں۔۔۔۔۔ ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خشک ہوں۔۔۔۔۔ کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمہاری زندگی میں گہرا  
داخل ہو جیسے رات کے منہاں اندھیرے میں کوئی جگنو ٹھٹکا آئے۔

صکروشن اذواق کے طور پر، اپنی دُوم سے لاشیں باندھے۔۔۔۔۔ چاند کی ٹوٹی چوستا ہوا ادھر آئے تھیں آج ہو گیا  
گیانے مسجد۔ یہ ٹھنڈی رات عورت تمہاری زندگی میں کب داخل ہوئی؟  
کچھ دن مٹاؤ، ادا شاعری کا، راشد کی ناور شبیہوں کا، اجنبی عورت کا، زمستان کی رات کا مذاق اڑاتا رہا، پھر اس نے کوئی دوسرا مضمون  
طرح دیا اور بات آتی گئی ہو گئی لیکن راشد اسے نہیں بھولے۔  
اس کے بعد ایک دن فطرت نے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لیے دیا۔ راشد ٹاپ شدہ مسودہ اپنے کسے ہے  
لے گئے اور کچھ در بعد واپس آ کر انھوں نے مسودہ واپس کیا۔

ٹھیکسا ہے، فطرت نے پوچھا۔

”بہایت اچھا ٹاپ ہو رہے، راشد نے اس اسٹنڈ آؤ بنز سکراہٹ کے ساتھ کہا جو ان کی اپنی چیز تھی۔  
اور فطرت بغور کباب، ہو گیا۔ اس کے بعد فطرت ہفتوں راشد اور ان کی نظموں کو کو تار بٹا۔ اپنے کسی وہ مت سے  
اس نے راشد کی نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

ہندی صلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ فطرت اور راشد میں چلنے لگی تھی، راشد میرے  
پڑوسی بھی تھے اس لیے فطرت مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا تاہم مجھے پریشان کرنے میں فطرت نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر غالباً ۱۹۴۲ء کے اوائل میں ۱۹۴۲ء کے شروع میں (ٹھیک سن مجھے یاد نہیں) اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے  
پروگرام ڈائریکٹر (پروگرام ایڈیٹر) ہو گئے۔ راشد نے سچائی سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیہ حاضری میں اس کا تبادلہ لکھنؤ کر دیا۔  
بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام اسسٹنٹوں میں کرشن سب سے قابل تھا اور باقی جتنے پروگرام اسسٹنٹ  
تھے وہ اپنا شہید دل سنانے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس کا کہنا مانتے تھے۔ پروگرام ڈائریکٹر ٹھیک سیس میں باقیوں کا  
کرشن سے مدد لیتے تھے اس لیے اس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے اور بہت سی باتیں کرشن پر اور راست ڈائریکٹر سے منظر کر لیتے تھا  
راشد کی فطرت میں آمریت کو کافی دخل ہے۔ انھیں یہ منظر دیکھتا تھا کہ کرشن ان کو نظر انداز کر جاتے۔ اس لیے انھوں نے اس کو لکھنؤ بھجوا  
دیا لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی (راشد نے ان کی غیہ حاضری میں ان کے خلاف کچھ الزامات لگائے اور چونکہ بھاری صاحب  
نمک راشد کی براہ راست رسائی تھی اس لیے فوراً تہا دلہ کر دیا) اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس افسوس کا  
اظہار بھی کیا۔ راشد امید کرتے تھے کہ میں ان کی تائید کروں گا لیکن جب میں نے کرشن کی طرف داری کی تو باوجود اس کے کہ ہم برابر کے  
گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بیکم راشد میں بہت اچھے تعلقات تھے، روز کا ملنا جیٹھا تھا، راشد مجھ سے بدظن ہو گئے۔

راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو فطرت نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام ڈائریکٹر (دوسرے ڈیوٹی) کو لکھنؤ  
اس کے ہم دن فطرت نے ایک جرحیا سوٹ اسے پرزنت کیا اور یوں اسے اپنی طرف مبٹل کیا۔ کوئی چوں کہ مجھ سے خوش تھے اس نے

انھوں نے مجھے نئے پروگرام اسٹنٹ کے آٹھ نمک کرشن کی جگہ منبھائے کے لیے کہا۔ منٹو کا ڈرامہ شیدائیل پر تھا۔ میں نے پروگرام اسٹنٹ بھی کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منٹو اس کی ریہرسلوں میں منٹو ڈیوٹی کرتا رہا۔ حالانکہ وہ شاد ہی اپنے ڈراموں میں دلچسپی لیتا تھا۔

اس دوران میں لکھنؤ سے ہندی کا ایک پروگرام اسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا۔ نہایت بد صورت، لمبا ڈنگا، چمچاٹا بال والا نوجوان تھا۔ اڈوانی نے صبح اسے اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام لے سکے۔ کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اس دن کا منٹو نے لگا لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اس لکھنوی پی۔ اے (پروگرام اسٹنٹ) کو سمجھایا کہ وہ پروگرام اسٹنٹ ہے اور اسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہئے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت کچھ تھا۔ کام لینے کی بات بھی اسے اچھی نہ لگی تھی۔ اس نے راشد سے کہا کہ اڈوانی نے بھی اس سے یہی کہا کہ ڈرامہ ڈیپارٹمنٹ کی سب ذمہ داری تمہاری ہے۔ اسکا قرآٹسٹ ہے۔ کوئی بھی خرابی ہو تو جواب وہ پروگرام اسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر مزے سے میٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ آیا۔ میرا دھیان سو دے میں لگا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ آپ کی کرسی ہے۔ ساتھ ہی اس نے میرے سامنے چڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: آپ ادھر آجائیے۔

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ پی۔ اے کی آنکھوں میں تنگم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں ناتحانہ چمک۔ مجھے معاملہ سمجھے میں دیرینگی نہ بنے کہا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں جانا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آجائیے گا۔

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے عقدہ کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی۔ اے ان سے مل چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں ان کے پروگرام اسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل انھیں بات پسند نہ آئی تھی کہ اڈوانی نے بغیر ان سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا۔ میں اس کا شائق بھی نہ تھا کیونکہ ایک بار جب کل صاحب نے مجھے پی۔ اے کی جگہ آؤ کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے اس کی انجینٹ پر مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ انھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا لیکن پھر سوچا کہ اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی آنکھوں کی ناتحانہ چمک میرے دل میں دو رنگ گھاؤ کرتی چلی گئی۔ اسی وقت میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ آصفی دے دوں، پھر خود ہی اس پر ہنسی آگئی جھلایا ہوا اوپر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ منٹو کی آنکھوں کی وہی چمک پھر ہانسنے آگئی۔ خدا گواہ ہے اگر منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں سب نہ کرنا جو میں نے کیا اور منٹو کو وہی نہ چھوڑتی پڑتی۔

اس وقت کمرے میں جا کر بیٹھا تو کام کرنا میرے لیے بیکار ہو گیا۔ بار بار اپنی تنگ کا خیال آنے لگا۔ راشد پر عقدہ آنا۔ اس لکھنوی پی۔ اے پر عقدہ آنا لیکن سب سے زیادہ عقدہ آنا منٹو پر! اس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اس سے پتہ چل گیا تھا کہ میری تنگ کرنے کا وہ پی۔ اے ہے نہ راشد۔ عقدہ ہے اور میں نے طے کر لیا کہ منٹو کو اس سازش کا مزہ چکھاؤں گا۔ میرے عقدے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا اس میں منٹو ہی کا ڈرامہ پروڈیوس کیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میں اس میں



ایک دفعہ ان کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا پروڈیوس ہو۔ کچھ پہلے کاغذی اور کچھ تازہ رنگ کا گھاؤ کام و ام چھوڑ کر میں بسر پر لٹوٹی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے احمد اس سے کسی نے مہرشی جھانکے کے آئینہ میں تسلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خاندان ان سے والدین ختم سے اس مہرشی کے کارنامے میں شریک نہیں بنے۔ یہی کی طرح سوچا سیکھ لیا تھا۔ بہر حال ہمیشہ جب مجھ پر وہ صدمہ کی قویں اور مٹی بڑی سے کام کرنے لگیں اور توہین کرنے والے کو اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اونچا معادلت نہیں کیا اور یہ بات کتنی بھی بڑی کہیں نہ ہو اس سے غور و استفادہ لیا اور نہ صرف ہر نصیبت سے ٹکرا ہوا آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پر مجھے محسوس ہوا کہ یہ لکھنوی پروگرام اسٹینٹ نہایت احمق آدمی ہے۔ یہ ٹیکسٹ ہے کہ غلط لیکن جو غلط ہے کہنے میں آگیا اس کی حماقت میں کیا شک ہے۔ اس وقت بھی ہندی میں میرا کافی نام تھا اس نے یہ بات نہیں۔ وہ مجھ سے ہوتا تو مجھے الگ لے جا کر بات کر لیتا اور یہی حکم نہ لے لے جاتا۔ سوچا کہ اس جانے اور کچھ زبردستی نہ لے گیا۔ لکھنوی بی۔ اے سینہ تانے چھٹی ناک چڑھائے تھے لکھنوی کے اپنے کیسے چپ صاحب (جو اس وقت لکھنوی کے شیش ڈاکٹر تھے) اسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اس نے وہاں کا دیکھا ہے اور غلط (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاپ پاؤں کر رہی پر رکھے لکھنے بانہوں میں رہا ہے ہرگز نہیں رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی تو دور ہی تھی نہیں کہ بیٹھا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھا یا۔ کچھ دیر کے کاچر اسی بلکے گیا تو میں نے ان لکھنوی حضرت سے کہا۔ ”مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں۔ ایک پروگرام اسٹینٹ کی بڑی ضرورت تھی۔“ اور میں نے اسے شام نو گھر پر جانے کے لیے دعو کر دیا۔

میں ان دونوں تیس ہزاری میں رہتا تھا۔ وہاں ایک بی ایک چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ جا چے پلاک میں اس لکھنوی احمق کو برج پر لے گیا۔ بادل گھر سے ہوئے تھے اور بڑی بگ بھڑا رہی تھی۔ وہ لکھا تا رہی تو اس نے ڈرامے لکھے کس طرح چپ صاحب نے کہا کہ وہ لکھنوی (SCRIPT) ہندی میں کوئی نہیں لکھتا اور اس کی صفا کش کر کے اسے پروگرام اسٹینٹ بنا دیا۔ میں نے بھی اسے خوب چنگ پر چڑھا یا۔ اس کی شخصیت سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اس نے اپنا سکہ جما دیا تو سب اس سے خوف کھائیں گے، انہیں آرٹسٹ نواز چھ سے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ بی۔ اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈ کاسٹ ہوں انہیں اچھی (VET) کرے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک بھی چیز پڑھے اور ویٹ کیے بغیر براڈ کاسٹ نہ ہونے دے گا۔ ہیں اور ہندی جانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ تو نہیں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لیے ہندی رسم الخط ہی میں لکھ دی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے مل کر ویٹ کیا کیجئے اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈ کاسٹ کیجئے کیونکہ ان کو اب ڈرامہ دانی آپ کی ہوگی اور میڈنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی۔ اس پر اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔

اب شیطانیوں تو تین جیسے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرتش بنا کر گیا تھا۔ میں جیسے دوسرے جیسے ڈرامہ لکھتا تھا اور منٹو کے تو تین ڈرامے ہی نہیں ہوتے تھے۔ اگلا ڈرامہ منٹو کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک کر مجھے یاد ہے) "آوارہ" اگلاٹ وغیرہ مجھے سب بھول گیا ہے۔ انا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی منٹو کے ان دنوں لکھے بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا جاتا تھا۔ دوسرے ہی دن اس لکھنی پی۔ اے نے اس کا مسودہ نکالا۔ اے مجھے بلایا۔ میں اسے منٹو پر اس لیے گیا اور وہاں جا کر اسے سناتے لگا۔ اس کو زبان وغیرہ یا ڈرامہ وغیرہ کی خاک کچھ نہ تھی۔ ڈرامہ سناتے سناتے میں کہتا: "کیوں صاحب اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا رہے؟" اور وہ کہتا: "ہاں ہاں! یہ بہتر ہے۔" اسی طرح میں لال نپل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا۔ وہ چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیے۔ میں نے ان حضرت کے کہہ کر رائے صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جان گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا۔ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام ذمہ داری ان کی ہو جائے گی۔ ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اس کی جگہ میں اختتام بخیر کر دیے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ اس لکھنی پی۔ اے نے رائے پر بڑا عجب ڈالا کہ اس نے منٹو کا ڈرامہ پڑھا ہے۔ ڈرامہ ہے۔ اس نے بڑی محنت سے ویٹ کیا ہے۔ رائے مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو پڑھا کما سٹ ہو۔ رائے تو منٹو سے پہلے ہی سے بیٹھے تھے، ان کو اپنا پڑانا بدلتا نہ نکالنے کا موقعہ نہ تھا آیا اور انھوں نے وہ چند الفاظ بھی جن پر میں نے لال نپل سے گول دائرے بنائیے تھے بدل دیے۔

جب منٹو کو معلوم ہوا کہ اس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈرامہ ٹیکر کے کمرے میں گیا اور اس سے رائے اور اس لکھنی پی۔ اے کو بے لفظ سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ ہو گا تو بنائے ایک لفظ کٹے ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔ میں اوپر ترقی کلارک (انگریزی ڈاؤنسر) کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اڈوانی کے کمرے کا روشندان میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ نیچے اڈوانی کے کمرے میں منٹو کھڑے تھے، وہ سے چلا رہا تھا کہ میں اٹھ کر روشندان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا نظارہ کر کے لگا۔ رائے کہہ رہے تھے کہ انھوں نے خود ڈرامہ پڑھا ہے اور ہو گا تو انہی تبدیلیوں کے ساتھ ہو گا ورنہ نہیں ہو گا اور ڈیوی ایشن (DEVIATION) یعنی جدول کے انحراف کی ذمہ داری ان کی نہیں ہو گی۔ جب ہم باہر والوں کی چیزیں ویٹ کر سکتے ہیں تو اپنے انکسٹن کی کیوں نہیں کر سکتے اور منٹو پھر سے میں بند شیر کی طرح تھلا رہا تھا اور تقریباً دو گھنٹے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہو گا تو اسی کوپ میں بدلتا ورنہ نہیں ہو گا۔

مجھے منٹو کی اس تھلاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوئی۔ منٹو نے مجھے جتنی گالیاں دی تھیں، میری ترقی کے رستے پر وہ وہیں ڈالی تھیں، اور وہ کلاٹاپ رائٹر میرے ہاتھ نیچتے ہوئے جو چالیں روپے جھوٹ بول کر زیادہ لے لیے تھے اور اوپر سے مجھے بنانا تھا اور جتنا بھی مجھے مستلایا تھا اس سب کا صلہ ان چند لمحوں کی اس کی تھلاہٹ میں مجھے مل گیا۔ سارے دی ٹھک ٹھک بول رہی تھیں۔ میں نے منی ہی منی میں پنجابی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف پھرا۔

مجھے یاد نہیں، اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انھوں نے رائے پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈیوی ایشن کے کام میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے معور میں واپس آکر کرسی پر بیٹھ گیا اور لٹا نکلیں میز پر

پھیلا کر اطمینان کی ماسٹری۔

لیکن اس سہرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اُرداسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہو گیا۔  
 آنکھوں کے سامنے غٹر کی تلاء ہرٹ، اس کے خوبصورت ماتھے پر چڑی ہوئی شکنیں، اس کی باہر کوٹھی ہوئی آنکھیں۔۔۔ سب کچھ گھوم  
 گیا۔۔۔ اور اس غمگین ہٹ کا باعث میں تھا۔۔۔ میں جو درحقیقت اسے چاہتا تھا، اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اس کے  
 افسانوں کا اس کے نام نہاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ مداح تھا۔۔۔ میں جس نے دو ایک مہینہ پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا  
 مجموعہ چر وا ہے، اس کے نام معنون کیا تھا۔

چر وا ہے، اکا ایک نسخہ میرے پاس پڑا ہے۔ مٹو کے نام کیا ہوا انتساب میرے سامنے ہے۔

### مٹو کے نام

جو کبھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا

میرے اس وقت کے جذبات کی کتنی عجیب تصویر یہ انتساب پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامہ کا قصہ پیش ہوا۔ لکھنوی بی۔ اے نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی تقریری تنقید پیش کی۔  
 آل انڈیا ریڈیو دہلی کی زندگی میں یہ پہلا تجربہ تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگ میں ہو لیکن چونکہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا۔ اگر وہ  
 ڈرامہ نہ ہو تو اس کی جگہ دوسرا ڈرامہ پیش کی بات تھی اس لیے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اٹھائی۔ لکھنوی بی۔ اے نے پہلے ہی  
 وہ تنقید تیار کر رکھی تھی اس نے پڑھ دی۔ بہر حال مٹو کی تنقید ہوا روہی بھی بھری میٹنگ میں یہ کبھی نہ ہوا تھا۔ مٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا  
 عادی نہیں تھا۔ لکھنوی بی۔ اے کی سمجھ کے بارے میں اس نے دو تین تیز باتیں کہیں اور تیز باتیں کہتے وقت مٹو کچھ سوچتا نہ تھا۔ مجھے پھر قصہ  
 آگیا اور میں نے کہا کہ یہ ڈرامہ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل طعنت تنقید کی ہے۔ اور چونکہ سب قطع و برید میں نے  
 کی تھی اس لیے میں نے بڑی صفائی سے اس ڈرامے کی کمزوریاں آجاکر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں، مٹو نے کیا کہا لیکن حقیقت میں اس نے میری قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ  
 تکنیک کے ضمن میں میں کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر کھ کر دکھا سکتے ہو؟  
 میں نے اور بھی تیز لہجہ میں کہا کہ میں تمہیں دس برس تک ڈرامہ لکھنا سکھا سکتا ہوں۔ تم اور میرے کمرے میں آؤ تمہیں  
 بتاؤں، ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈرامہ بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی لیکن شورشیں کر اڈو آئی صاحب اپنے کمرے سے آگئے۔ طے ہوا کہ ڈرامہ نصیح شدہ حالت میں ہوگا اور  
 چوتھا اپنے آرٹسٹ کا سوال ہے اس لیے جدول سے انحراف نہیں ہوگا۔

فٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رکا۔ اس نے ٹائپ رائٹر اٹھا لیا اور چلا گیا دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دو  
 کو خود شید صاحب دسکر ٹیڈ انٹرمیشن ایڈیٹر کا مٹنگ، کا فون آیا کہ فٹو کا ڈرامہ اگر براڈ کا سٹ کرنا مقصود ہو تو مٹو کے کھمبے پر  
 مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

دھیک دھیک مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ڈرامہ خود شید صاحب نے منگایا تھا اور پھر انھوں نے یہ بیخام بھیجا تھا۔

آج چوتھے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ قبیح شدہ حالت میں کریں گے اس لیے فٹو نے فٹو پٹا کے ریلوے کینسل کرایا تھا۔  
تیسرے دن پٹی منڈو فٹو میں نہیں آیا۔ ڈرامہ اس نے منکالیا۔ چوتھے پٹا پانچویں یا غلابا ساتویں دن تھا کہ وہ بمعہ چلو گیا ہے اور اسے فلم کینی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے فٹو نے بتایا کہ نوکری و نوکری اسے کچھ نہیں ملی اور بیٹی اسے حاضری تکلیف ہوئی۔ بیوی کو وہ دہلی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں فلستان میں اسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غلابا اس کا دوست بن گیا اور اس کی ٹیلی کو بجتی لے آیا۔

”وہ تمہارا لال کیا ہوا مسترد اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔“ اچانک فٹو نے کہا۔ یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر خصلہ تھا نہ اس کی بیوی۔ اسے پرکھ کر فٹو پر خصلہ تھا اسی طرح فٹو کو بھی ان دونوں کے بھائے بھی پر خصلہ تھا۔ اس کا ڈرامہ میں نے کاما ہے؟ بات وہ جان گیا تھا۔

”اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
فٹو چپ رہا۔

مرد بکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر ہمیں اسی طرح رہنا ہے تو مجھے فلستان کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو پاتا ہوں آراکم ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور پچھتر بج رہی تو کیا فائدہ؟“  
”نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا۔“ اور اس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

اس دن گھر واپس آکر میں نے صفیہ بھابی سے کہا: ”دیکھئے، فٹو نے مجھے یہی بتلایا ہے میں انہیں دے رہا تھا۔ دو ہزار تار بجے پہنچا آیا ہوں۔ فٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ آوارہ کا مسودہ سنبھالے ہوئے ہے اور دہلی کے اس واقعہ کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لیے قاتل بنے ہیں۔ اب اس نے مجھے یہی بتلایا ہے تو آپ اسے بھجائیجئے کہ مجھے یہاں تک نہ کرے، کیونکہ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔“

فٹو اور صفیہ بھابی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہوگی اور میں نے اگرچہ کانگریٹ پر دستخط کیے لیکن ہاں ردی لیکن جب بعد میں میں نے سوچا تو میں نے طے کیا کہ میں جی جی الامکان اس بات کا مرتعہ ہی نہ آنے دوں گا کہ فٹو سے میری لڑائی ہووے۔ جی میں جتنے میرے واقف کار تھے ان سے مل کر میں نے فلستان، اس کے کتا دھڑنا شدہ مگر جی اور وہاں کے طریقہ کار کے بارے میں تحقیق حاصل کی۔ میں خاص طور پر ان لوگوں سے ملا جو فٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے۔ مجھے تین چار ہم باتوں کا پتہ چلا۔

۱۔ فلستان کا پاس حکمرانی زمانہ قدیم کے سادیت پسندان داروغہ جیسا ہے جو فلاسوں کو کوڑے مارا کرتا ان سے کام لیتے تھے۔

- ۲۔ - فلستان میں منٹو کا ایک بھتر راج ہے۔  
 ۳۔ - جب سال بھر پہلے شاہ لطیف نے میر انام تجویز کیا تھا تو منٹو نے فلستان میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے۔  
 ۴۔ - فلستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نہیں لکھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے بڑھاتے ہیں اور سب کو روکر کے خود لکھتے ہیں۔  
 ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے شاہد لطیف اور رفعت خٹک کو فلستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا، جبکہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلستان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک دہائی پہلے منٹو مجھے نظر ناک سمجھا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ خود اس نے ہی مجھے بلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب منٹو نے مجھے فلستان میں کام کرنے کے لیے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ انٹرویو کو آؤ اور بیکٹو کلاس کا کراہی مینیوسے گی تو چنگو کو تشکیلاتی ٹریننگ لینے بمبئی جاؤ، پھر ممبئی میں ملے گا میں لکھی نیا ہو گیا۔ خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی تو بمبئی کی سیر ہی ہو جائے گی لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ آخر منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اس میں مجھے بمبئی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر غور ہی سی ترسیم کرنی پڑی۔ لیکن اس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا۔ چونکہ اس قسم کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے اور خاصا دلچسپ ہے اس لیے میں اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جدید ماک میں نے پہلے کہا، مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لیے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو پہلی آنے سے پہلے منٹو سے ملائی نہ تھا اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ گورا چٹا رنگ، پتلہ چہرہ، براجم، فراخ پیشانی، سنوٹاں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پر استہزا آمیز مسکراہٹ۔ منٹو کی یہ پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں میں منتظر، نیا قانون، اور شاید منٹو کی کوسٹا، پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بے اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک منہ جہم کے بجائے ایک ذہن افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنائی تھی۔ لیکن دہلی میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لیے جو پارٹ طویل گئے تھے ان سے نجات نہیں ملی۔ ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کرشن لکھنؤ تبدیل ہو گیا تھا، اختر الایان کو راشد نے جلا دیا تھا۔ چٹھا، میراجی اور راجہ مہدی علی خاں، راشد کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور راشٹ چونکہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لیے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گزرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی جھپٹ ہو جاتی، خاصی چپقلش بھی ہوتی تھی، لیکن اچھے سے اچھا لکھنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا۔ منٹو کے بمبئی جانے کے بعد اس کی اور اس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے اوپر زبردستی حقیقت لکھ رکھی تھی اسے ڈھیلا کر دیا۔ منٹو کے بمبئی جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد۔ ٹھیک سن مجھے یاد نہیں، اس کا افسانہ بڑا شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہونے ہی اس کے خلاف ایک شور مچا رہا ہو گیا۔ چودھری نذیر احمد نے

میر میری بھی رائے مانگی۔ میں نے بڑے "کی خوب تعریف کی۔ مجھے بڑے "کے کنٹنٹ سے خرض نہ تھی، میں اس افسانے کی تعریف نہ تھا۔ ایک بڑی نازک سی تعلیم کو منظر سے چاہکتی تھی "بڑے" میں سمجھا ہے، وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میرا افسانہ اپنے کئی دوستوں کو مسنا چکا ہوں جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار شیشال بھی شامل ہیں اور شیشال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہندی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لیے وہ "بڑے" ضرور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے حامل ہے اس کے جوڑ کا افسانہ بیدار کی "لا جوتی" ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ اردو ادب میں اس کی جگہ کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ جوتی میں ہیئت ہی نہیں کنٹنٹ کا بھی کمال ہے۔

بہرحال مجھے خیال ہوتا ہے کہ "بڑے" کے بارے میں جو خط میں نے چورھری نذیر احمد کو لکھا اس نے منظر سے اس کا تذکرہ کیا اس کا خلاصہ انھیں بھیج دیا کیونکہ جب میں لکھی گیا تھا تو منظر نے اس کا ذکر کیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد میرے بارے میں بڑے کا رخ کچھ ڈھیلہ ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ جب ڈائریکٹر متن بوس فلستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے ملازمین کو رکھنے کی بات چلی تو منظر ہی نے میرا نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق لمبئی میں ہوئی۔ منظر اگر شراب نہ پیئے ہوتا اور وہی کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے "آوارہ" کے اس مسودے کا ذکر نہ کرتا جسے میں نے کانٹ چھانٹ دیا تھا تو میں اسی خوش حالی میں مبتلا رہتا کہ میری طرف سے منظر کے دل میں جو کہ ورت تھی وہ مدھل گئی ہے۔ منظر ڈھیلہ پڑ گیا تھا لیکن وہ اس واقعہ کو فراموش نہ کر سکا۔ چار سال پہلے فلستان میں اس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی۔ اس وقت میں وہاں جانا تو اگر میرا اور شاہد کلیمیر اور سنوٹی کا گٹ بن جانا منظر کو لطیف ہوتی۔ اس لیے اس نے میری مخالفت کی۔ جس وقت اس نے مجھے بلایا اس وقت شاہد لطیف اور سنوٹی فلستان چھوڑ چکے تھے۔ اسے اندھنوں کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ منظر تمہارے حکاموں کے پرچھے اڑا دے گا۔ تم خواہ ضرور تمہارے اپنے لیکن تمہاری جان صبر میں آجائے گی اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اس کے ڈرامے کی جو دھجیاں اڑائی تھیں اس کا انتقام لینے کی نگرانی اس نے یوں نکالی تھی اور چونکہ میں "ہاں" کر چکا تھا اور وہی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے فلم کی تو گری کر لی ہے اس لیے میں واپس کو نہ گیا لیکن میں نے فلستان میں اپنا لائٹ محل طے کر لیا۔

میں نے اس وقت تک کنٹرول پر دستخط نہ کیے جب تک فلستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ بزم نہ مل گئی ہو۔ میں احتیاط تھی کہ منظر میں اور مجھ میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے، اور یہ طے نہیں ہو گیا کہ صرف میں ہی متن بوس کے لیے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی ڈائریکٹر کی پیش کروں گا۔

میرا پہلا فلم "مزدور" تھا اور دوسرا "سفر" جسے برترانے ڈائریکٹ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی بہت میں نے لکھے اور یوں فلستان کا ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منظر کو اس بات کا قلق ضرور رہا کہ میں نے اس کی چال ہٹ دنی لیکن میں نے اپنی عادت کو جانتے ہوئے نت جھگڑنے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منظر نے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا فلم "مزدور" خواہ باکس آفس پر

کامیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۳۵ء کے بہترین ڈائلاگ سمجھے جاتے تھے اور مجھے ایک سسٹم بھی ملی تھی۔ میرا ہاکیس ہنس پر بھی کامیاب رہا اور ظاہر ہے کہ میرا کڈٹ بھی بڑھ گیا تب اشوک کمار نے اپنا الگ فلم پروڈیوس کرنے کی بات کہی۔ میں نے ان کو دو سال لینے کے باوجود کامیاب رہا۔ ”دو دو سال لینے کے باوجود کامیاب رہا۔“ اور ”شکاری“ اور ”نوجوان“ میں جمل جمل سے ”نوجوان“ اور ”شکاری“ میں نے ان کو دو سال لینے کے باوجود کامیاب رہا۔ ”دو دو سال لینے کے باوجود کامیاب رہا۔“

میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے ان کو دو سال لینے کے باوجود کامیاب رہا۔ ”دو دو سال لینے کے باوجود کامیاب رہا۔“

اشوک نے ایک پسند کر دیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ ڈالوں لیکن میں نے کہا کہ لکھنے سے پہلے ایک شہرہ جوں کی تو میری کہانی لکھنے کا وہ ہزار روپیہ پیشگی لوں گا۔ میں اس وقت پرے سات سو کے ذریعہ تنخواہ پارہا تھا۔ کہیں مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم ہوں کہانی نویس کی حیثیت سے نہیں۔ کہانی لکھوں گا تو اس کا وہ ہزار روپیہ لوں گا وہ کے کھاتے لکھوں گا۔ اگرچہ اشوک کمار بھرتی کا سالانہ لیکن ان دنوں سالے ہفتوں کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ انہوں نے آپ کو جی سے کہیں ”لیکن“ مجھ سے خوش نہ تھے۔ میں نے انکار کر دیا تب اشوک نے کہا کہ میں سیدھی لالہ بات کہہ بیٹھتا ہوں، لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالیے۔

خاکہ کو یہ خبر ملی کہ اشوک میرے پاس پہنچا اور میں دو ہزار روپیہ مانگا رہا ہوں تو اس نے واپس کو ساتھ کر اپنے غلیٹ پر لے گئے۔ شراب و آسپا کے دن اعلیٰ قسم کی ہفتی تھی۔ اشوک کو انھوں نے اس وقت تک نہ آنے دیا۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ میں اس کا جواب دے دوں گا۔

چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور صورت ہو گیا تھا اس لیے ”آٹھ دن“ کے نکالنے کے سلسلے میں کیا کیا دقتیں ایک الگ ہی کہانی ہے لیکن چونکہ غلطی یہ جانتے ہوئے کہ میں نے الگ سے معاوضہ مانگا تھا، نیز معاوضہ لینے کر لیا یہ اور بات ہے کہ جب آدھی فلم بن گئی تو اس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مدین بھی کچھ معاوضہ لے لیا، کہہ کے میرا پتہ کاٹ دیا اس لیے مجھے بہت برا لگا۔ خصوصاً اس وقت جب میں افسانہ کا خاکہ لکھ کر اشوک کے کنارے صورت ہو گیا۔ بھرتی مجھ سے خوش نہ تھے اس لیے میرا اس کے کہ میں نہ ہر گھنٹہ پی کر رہ جانا اور لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے غصے بدلے لینے کی ترکیب نکال لی۔ آٹھ دن کا ڈائریکٹر گلستان کا ایڈیٹر دنا رام پانی پڑا کر کش تو اشوک ہی کرتا تھا لیکن چونکہ پانی پڑا قابل ایڈیٹر تھا اس لیے اس کی مدد تھی۔ میں نے پانی کو ساتھ لایا اور پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا۔ جب کہانی شروع ہوئی تھی تو یہ دو ایک مناظر کا رول تھا لیکن میں اپنا پارٹ کیا اور بغیر ری ٹیک (RETAKE) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اس نے طے کیا کہ یہ رول فلم میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ پنڈت طوطا رام چونکہ ہندی بولتا تھا اس لیے پنڈت کے سب ڈائلاگ ایک لائن لکھنا تو چاہ کر دینا، مگر ایک سب لکھنا تو میں اس کے دو بنا دیتا۔ مجھے شیخ ایفنگ تو پسند ہے لیکن فلم کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن مگر پریشان کرنے کے لیے وہ مٹھکے خیر رول میں کرتا رہا اور غصا بنا پریشا صیڈ پڑا تھا پانی تک کی فوبت آگئی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ گلستان سے الگ ہوئے اور اگرچہ اشوک اور دنا رام چاند کے دور

اس کے ساتھ بستی ملا کر چلا گیا جسے اشوک نے مکرچی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا، لیکن غزوہ ماں ایک لمبی کہانی نہ دے سکا۔ جب ہمیں پہنچ گئی ہے اور آتا ہے تو ہر شے اشوک سے ملادیں گے۔ پھر وہاں نے پوچھا کہ منٹو کیسے پہلا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے کہانی لکھی تھی لیکن ہم نے کمال امر وہی کہانی "عمل" لینے کا فیصلہ کر لیا۔ منٹو کچھ کہے بغیر چلا گیا، حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ اس کے بعد تمہارا جو کمالی کہانی بنائیں گے لیکن اس نے نہیں سنا۔

درحقیقت ساوڑی بیکار ٹوسٹ و آچا (جو غزوہ کا دوست تھا) اور مٹی ٹاکیز کے مالک و آچا میں فرق تھا اور انہوں نے ایسے آدمیوں میں لکھ لیا جنہیں بھی اس نے غلستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ اگلے راستہ بند ہے، کاروڑ نہیں چلے گی تو وہ امر وہی سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چٹیاں اشوک اور رو آچا کو ملی تھیں، لیکن سٹوڈنٹ کو انک ٹھکانا اور خود بیکار ہر جانا آسان نہیں۔ اس کا اثر نہ شاید طیف نے لیڈنا ناہیرا جمیری نے منٹو کے بدلے سنے کی جیسی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیرا جمیری کی چچی گئی اور دوسری کہانی کمال امر وہی کی۔ جس دن کمال امر وہی کی کہانی کا ہفتہ چلا، منٹو نے بھی پھر ٹوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن منٹو کی اس رن چھوڑت اور باری صاحب کی رن چھوڑت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی پچھڑت میں غامی بزدلی کا عنصر تھا جبکہ منٹو کی پچھڑت اس کی زبردست انانیت کے باعث تھی اور اس کی اسی انانیت میں اس کی عظمت کا راز سم ہے۔ منٹو کو نوحہ کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرچی کے پاس بیٹھ کر ان کی خوشنودی کے لیے منٹو غالب کے اشتہار سنانے میں نہ دیکھا ہے۔ حالانکہ میں سمجھا ہوں، مکرچی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا ہمیں کس کے آگے ہیں بجانا ہے۔ اس سے مکرچی کی عظمت کم نہیں ہوتی، اپنے فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں، لیکن غالب کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں اور پھر منٹو کی ہر بات کے سنا تے نکالنے کا پھوٹے سے چھوٹا شاعر ان کے نزدیک غالب سے بڑا ہے، اشوک اور آچا کی محفل میں بیٹھ کر سو قیادہ لطیفے سنانے دیکھا ہے۔ ان پر صاحب پڑوں اور میرزاک ڈار پڑوں کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے بکواس کرتے سنا ہے جسے منٹو بکواس اور دوسرے بڑے لکھی کا نام دیتے تھے، لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں اس کی انا کو تھیں نہیں پہنچی، کیونکہ اول تو یہ کہ وہ ان کو اپنے سے کہیں کم تر سمجھتا رہا اور دوسرے یہ سب لوگ خواہ منٹو کو سننے لگتے ہوں، منٹو ہی سمجھتے ہوں لیکن اول درجے کا ڈراما لکھ رہا تھا۔ منٹو کی اس بینگ میں جہاں راشد نے، میں نے اور اس لکھنوی بی۔ اے نے اس کے ڈرامے کی تنقید کی اور منٹو ٹاکیز کے سٹوڈنٹوں نے ان اشوک اور آچا اس کے جگہ دی دوستوں نے اس کی کہانی کے مقابلے میں نذیرا جمیری اور کمال امر وہی کی کہانیاں لے لیں، منٹو کی انانیت کو زبردست تھیں پہنچی اور جب اس کی انانیت کو تھیں لگی تو پھر وہ اس کے لیے پھر منٹو کی کہانیاں لے لیں، منٹو کی انانیت صرف ہوتا تو ہر تک برداشت کرتا ہوا لمبی دواں جا رہتا لیکن منٹو کی انانیت کے لیے وہ تنگ ناقابل برداشت تھی اور پھر ہر شے کر بیٹھ دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا اس لیے دونوں باری میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اسے سخت تکلیف ہوئی دوسری بار اس کی جان پیاجی، لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو تھیں لگنے دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پارٹی ہو، میٹنگ ہو (مارل یا انفارمل) منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی



لوگوں کی فوج اپنی طرف بذول کر لے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کوتاہی کے کھسک جاتا تھا۔ یوں تو پاکستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں جب میں نے کانٹریکٹ پر دستخط نہ کیے تھے اور میری شرطیں مکرجی نے ابھی منظور نہ کی تھیں اور میں مکرجی کو فائبر کے بجائے مواد دی ورنہ کے گیت سے سنایا کرتا تھا، میں نے منٹو کی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا لیکن ایک خاص واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں سکا۔

۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ تھیک مہینہ مجھے یاد نہیں، بلکہ میں امریکہ کا دیا انگلستان کا یہ مجھے یاد ہیں۔ ایک مشورہ ایکوٹ آیا تھا۔ میں نے اس ایکوٹ کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ موٹر سائیکل ریس میں شامل ہوتا ہے اور اسی حرکتیں کرتا ہے کہ دیکھنے والے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ بہر حال میں وہ ایک دوستوں میں گیا۔ رائے بہادر چٹنی لال نے اسے پاکستان میں بھی مدھو کیا۔ شام کو پاکستان کی کینٹین میں جو کھانے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی، میز پر لگا دی گئیں اور شندھ مکرجی، گیان مکرجی، اشوک، واجا، چنگر، برن، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چونکہ اس ایکوٹ کو مارے ہاں آنے سے پہلے فلم پروڈیوسر کی ایسوسی ایشن میں جانا تھا اس لیے اسے دیر ہو گئی۔ بڑے مکرجی اٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے کپ شپ کرتے رہے۔ منٹو حسب معمول باسنر (BOSSER) کے ساتھ بیٹھا بقول شتیام اپنی بڑی سہیلی ان پر ضائع کرتا رہا۔ میں نیپالی، برن وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آخر ایکٹر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔ لمبوتراسامند۔۔۔ جیسے کسی نے دونوں جہڑوں کو ٹھنکے میں کس کر چپا کر دیا ہو، بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا۔ ان کی بیوی بڑی حسین تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ اور نام کی کشش نے اس عورت کو اس لنگور کے پہلو میں لٹھا ہوا تھا۔ بہر حال اس کے آگے آگے رائے بہادر چٹنی لال اور مکرجی آئے کینٹین میں ایک بڑی میز بچھی تھی اور اس کے ساتھ چھٹی چھوٹی میز پر لگی تھیں۔ بڑی میز ہمانوں اور کمپنی کے باسنر کے لیے تھی اور چھوٹی میزوں پر وہ سرے کوٹ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا لیکن منٹو، اشوک کے ساتھ بڑی میز پر بیٹھا رہا۔ لیکن ایک تو اس ایکوٹ کے ساتھ آنے والے لوگ زیادہ تھے وہ سب رائے بہادر کے ساتھ بھی چند ہمان تھے۔ اشوک اور گیان مکرجی بالکون میں سے لٹھے مکرجی نے واجا اور منٹو کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ واجا اٹھ کر چھوٹی میز پر چنگر کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے منٹو کو بھی پاس بٹھانا چاہا لیکن منٹو نہیں بیٹھا۔ اس اخراجی میں جب ہمان بیٹھ رہے تھے منٹو چپ چاپ کھسک گیا۔ میں یہ سب ناشرہ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا۔۔۔

”کیوں؟“

”چلو چلیں۔“

”کیوں؟“

”سب بکواس ہے۔“

”بیٹھو“ میں نے کہا۔ ”جہاں اس کو اس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آؤ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لیتے ہیں۔“ لیکن منٹو نہیں رکا، خاموشی سے کینٹین سے نکل گیا۔

”گئے فرشتے“ میں منٹو نے شتیام پر جو سیکھ لکھا ہے اس میں اس کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے۔ لاہور

ن کوٹنے والے اتنے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی انا کو بار بار باٹھیں لگتی ہے۔

”شیام نے مجھ سے کہا۔۔۔ میرے ساتھ رہو، لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے محنت پر اگندہ کر دیا۔ اس سے وعدہ کر کے کہ رات کو میں اس سے فلیٹی ہوٹل میں ملوں گا، چلا گیا“

جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے، منٹو کے چلے جانے کی وجہ (باوجود اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے ساتھ رہے) اور کچھ نہ ملنے، اس کی انا ملتی۔ اس کی اس الجھن اور گھٹن کو میں نے اس امر کی (یا انگریزی) ایکٹو کی آمد بی نے جب منٹو کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ یک لخت اُداس ہو گیا اور پھر وہاں بیٹھنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔۔۔ نے فلیٹی ملے گی، لیکن اس ملاقات کا حشر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منٹو اور بھی چرچہ کر واپس آ گیا۔ یعنی میں جب تو عمرنا شیام نہیں، منٹو لوگوں کی توجہ کا مرکز بننا تھا، کیونکہ ایکٹروں، ہٹائریکیٹروں میں وہ اپنی قابلیت لطیفہ گوئی اور زلہ سنجی وجہ کو اپنی طرف، لگاتے رکھتا تھا لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں، جسے والے آرٹسٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے، جن ب جانتے تھے اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ بھی ہنگامی طور پر بھول گئے تھے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا، کتنی کوفت ہوئی ہوگی۔

میں طرح پیتنا جانتا تھا لیکن پٹن نہیں، پدانا جانتا تھا لیکن پدنا نہیں، اسی طرح مذاق کرنا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے تھی۔ وہ بہت ذکی الحس تھا (اپنے مضامین میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے) لیکن دوسرے ملے ذکی الحس ہو بھی ہاں تہہ جھٹکتی ہے اسے وہ اونچے درجہ کا افسانہ نگار اور ناہر نقیبات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے آتا تھا لیکن انسان کی یہ عام خامی ہے مٹا سٹائی کئی بار نفیس سے اندھے ہوئے لیکن اپنے افسانوں اور ناولوں میں غلات کھلا۔ بالذات نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے لیکن اپنی ہی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انھیں روپیہ بے دریغ اور پیکانی چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہیے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہئیں اور چاہئے۔۔۔ سمفوز ٹراس پر زندگی کی دہلی چھٹی حقیقتوں کو عظیم فن کار کی چابکدستی سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر کا اور بے حد پریشان رہا۔ آج میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن ان دنوں حقیقت ٹکار ہونے کا دعوے کرنے کے بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا۔

دہلی دہلی کیا، منٹو کی ایک کہانی کا بڑا چرچا تھا۔۔۔ اس کا نام تھا ”ترقی پسند“۔۔۔ چرچا اس کا یوں تھا کہ منٹو اور مبدی پر بھی ملتی۔ چونکہ مبدی میرے بہت نزدیک تھا اس لیے پہلی فرصت میں میں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ مبدی مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ ملتی کہ لوگ گیت لکھتے لکھتے ستیا رتی ایک دم غلے لکھنے اشام کو اپنے افسانے با شمر سنانے کا مرض ہوتا ہے ستیا رتی کو بھی تھا، ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت

کچھ زیادہ ہو۔ بہر حال وہ اپنے کفایتیت راجد ر سنگھ بیدی کے ہاں جہاں پر گئے اور صبح شام اُسے افسانے سناتے گئے۔ بیدی اس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اس کے پاس تھے، بلکہ زیادہ نہیں تھی، پھر تنہا رہتی کی ہر جگہ میں خلوت کا مہرہ آئیوں میں مشکل۔ بیدی شام کو کھانا کھا کر آتا تو تنہا رہتی ایک افسانہ سناتے کے لیے تیار رہتے۔ جس کو نہ صرف ملنے جیسے بلکہ نصیج چاہتے۔ اسی سبب رات کو وہ سو جاتی۔ صبح اٹھتا تو اسے نصیج شدہ افسانہ سننا پڑتا۔ مہینہ بھر تنہا رہتی وہاں رہے اور بیدی اپنے دیوی بچوں سے بات کرنے کو ریس کیا۔ تنہا کی کمی ”ترقی پسند“ کا پلاٹ بھی ہے۔ صرف اخیر میں منٹو نے ذرا افسانوی لکھ دیا ہے کہ پرماتھی (ترقی پسند میں تنہا رہتی کا بدل) اپنے عزیزان سے کچھ ایسا چٹتا ہے اور اس کے وقت کا ہر لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ ”نوبہ اپنی جیوی سے پیار کرنے کے لیے بھی مٹھانہ ہی بہتر جگہ نہال کرتا ہے۔“

کہانی ابھی ہے۔ اس میں شکارہ بھی ہے لیکن فٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مجھے کہانی پڑھنے پر دلچسپ لگی، لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ ابیدی کے منہ سے سنا ہوا، فٹو نے قلمبند کر دیا، اس لیے مجھے بُرا لگا۔ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حتی بیدی کو تھا، یا پھر فٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہئے تھا کہ دیکھو یار، میں اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں تبھی لکھنا ہ تو میں نہ کہوں ورنہ میرے نہیں بچوڑ سکتا، لیکن فٹو نے افسانہ نگار کو اتنا صبر کہاں۔ خیال آیا تو اسے قلمبند کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعہ کو لکھنے سے دو دوتوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دباؤ نہ کھڑی ہوئی بلکہ انھوں نے غلطی کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا اور جس طرح غلطی نے اپنی کہانی میں بیدی اور ستیا لکھی کے عادات و اطوار شکل و شبہ است اور ذاتی زندگی کا مذاق اڑایا تھا، اسی طرح ان دونوں نے نعل کر ایک افسانہ لکھ کر غلطی کی ذاتی زندگی اور اس کی خاموشی کو اجاگر کر دیا۔ کہانی ستیا لکھی کے نام سے شائع ہوئی۔ انھوں نے ہی کبھی بھی غلطی۔ بیدی نے اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے پتے لکھے کہ کہانی جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے بے حد اچھی اُترتی۔ نام ہے۔۔۔ ”نئے دینا“

”اتنی بھی کیا خوشی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اتن تو فاقہ مست حسن (نئے دریا میں سعادت حسن کادبل) پہلے بھی کمالینا ہوگا۔ ٹیڑھ سو روپے کے لیے اس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باخیا نہ طبیعت کا آدمی مشہر ہے اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ بھیرہ نوکر سی اس نے کیسے کر لی۔ غریبوں پر غلام خانے جاتے ہیں، زندگی کی تنگ کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکمل کی طرح برابر اپنا جالا بٹھا جا رہا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اس جاے میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ ان خیالات کا مالک آج خود بھی کی طرح اس جاے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں پار و متوں کو دعوت دے رہا ہے.....“

اور یوں شروع کر کے "نئے دلیقما" کے لکھنے والوں نے نفاست حسن (یعنی سعادت حسن کی حکمت و سکنت، عادات و اطوار، سفلیں، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت اور سنگ، پردوش، جنس نگاری اور "سہری کمروں" کی کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اڑایا کہ مڑبھلا اٹھا (بعد میں جیسا کہ اس کی عادت تھی) اس نے خود اپنی سنگ اور سفلیں کی شہیر شروع کر دی۔  
 لے جو گیشی کالج کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے مڑنے لگا۔ "البتہ جب میں میٹھا بیٹھا پانا یا خریدی ہر قسمی پن نکالتا ہوں تو مجھ پانا میٹھا پن بہت دہشت  
 معلوم ہوتا ہے۔" (لڈتو سنگ)

”شے جو کھا“ کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دہلی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ چونکہ غٹو اپنے اچھے سے اچھے دوست کسی بھی وقت اُن کا رکھ دیتا تھا اور اپنے سامنے بھی کسی کو کچھ نہ بچھتا تھا اس لیے یار دوستوں کو اچھا موقعہ ملتا تھا۔ دوست صاحب جب اکٹھے ہوتے، کسی نہ کسی زمانے اس کہانی کا، یا سنیار لکھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اسے چھیڑتے۔ غٹو اس کہانی کا ذکر کرتے ہی کرپٹن چڑھتا۔ دنیا جہاں کا مذاق اڑاتے ہوئے مذاق کیے جانے پر کس طرح سخی پا ہو جاتا اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

لچ کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں آ اکٹھے ہوئے تھے۔ غٹو ہر ہی تہی۔ کرشن اپنی کسی پرستار کے ساتھ صبح کی صبح رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر غٹو پاؤں اوپر کیے گھٹنوں کو باہر میں دہاتے آٹھوں بیٹھا تھا۔ آٹھ قدموں اور دو تینے روگرام اسٹنٹ غٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ (اختر الایمان اور بیلا جی شاید اس وقت ریڈیو میں نہیں تھے، یاد ہے مجھے یاد نہیں) حقیقت جاوید نیچے دری پر دیوار سے بیٹھ لگاٹے گھٹنے پٹانگ رکھے اُدھ لیٹے، اُدھ بیٹھے خاموشی سے سب لکھتے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ کمرے میں جگہ نہ تھی اس لیے کونے میں پڑے ریکارڈوں کے اونچے چھٹ پر لیجیں بیچ کر دکاٹے بیٹھ گیا تھا۔ یہی جانے کس نے اور جانے کیسے سنیار لکھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ لکھا ہے۔ دوسرے نے کہا۔ ”لیکن شے دیتا“ تو اس نے خوب کہانی لکھی ہے۔“

”واہ!“ کرشن نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اسی وقت اس کی نگاہیں غٹو سے چارہمیں ہوتا تھی۔ ”اٹھ اٹھ سنیار لکھی کا اٹھا ہوا لکھی لکھی اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔“

اور تب کسی نے غٹو کو بتاتے ہوئے کہا۔ ”ار سے یار! سنیار لکھی کیا کھا کر دیا افسانہ لکھے گا وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔“

”بیدی کا تو نہیں۔“ تیسرے نے کہا۔ ”لکھا تو سنیار لکھی ہی کا ہے، بیدی نے اس میں پتے لکھے ہیں اور کہانی روا آتش لکھی ہے۔“

”ہم نے سنیار لکھی کا لکھا ہے۔“

اور اس وقت غٹو نے پاؤں نیچے کیے اور سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی کرختگی میں ڈبوئے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے اٹھوں سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”بیدی اور حقیق کیا، اس میں سنیار لکھی کا لکھا ہے، سنیار لکھی کا لکھا ہے، سنیار لکھی کا لکھا ہے۔“

تب مجھے نہ جانے کیا سوچا، متو کو بات ختم کرنے کا موقعہ دینے نہیں ملے کہا۔ ”اپنے بارے میں یا سب کو غلط فہمی ہوتی ہے وہ شام لال کچر دھانا، گورو گھنٹال کا لکھی، وہ بھی اپنے آپ کو لکھی ٹیوشن سمجھتا تھا۔“

میں نے شام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا یا قہقہہ خیز ہوتا غٹو جھجکا کر اٹھا اور اس نے غٹو سے پاگل ہو کر دو تین غٹو کا میں کے ڈھیلے میری طرف چھینک دیے۔

کئی دوسرا موقع ہوتا، غٹو مجھ گالی دیتا تو میں کھینچ کر ایک ٹیوشن اس کے منہ پر جمادیتا۔ لیکن لکھی کی طرح مذاق کرنے کا لکھی ایک نئی ہے۔ مذاق مذاق میں جو چڑھتا ہے گالی دیتا ہے یا لکھا اٹھاتا ہے دراصل وہی پٹ جانا ہے۔ غٹو نے گالیاں میں تو لوگ اور بھی زور سے ہنس دیے۔ کرشن نہیں ہنسا۔ اس نے غٹو کا لکھا تھا متے ہوئے کہا۔ ”کیا کرتے ہو؟“ اور دوسرے لکھی غٹو نے اپنے اپنے

قابو پایا۔ بڑھ کر یہ ادا تھا ماما اور دھیرے سے انگریزی میں کہا: ”ڈونٹ مائنڈ اٹ (DO NOT MIND IT)“

اس وقت جا رہے تھے اور دو کالیاں بھی دے لیتا تو شاید میں بالآخر نہ اٹھاتا لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے غصے نے گالی دی اور میں اٹھ اٹھا لے کر نیا رہ گیا۔ اگر وہ ذرا لمبی منہ کھولتا تو سر پھٹول ہو جاتی۔

فستان کے زمانے کی بات ہے ”آٹھ دن“ کی شوٹنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیلا لے لیا تھا۔ چوتھو دن کو سنو ٹیوڈیو نے لے لے اور اسٹوڈیو کے ریسٹوئرنگ کے لیے ”آٹھ دن“ کی مشترکہ شوٹنگ رات کو ہوئی۔ منظر رات کو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا۔ اس کے اشتغال دوسرے تھے لیکن جب سے میں نے ٹھوس لکچر آکر آٹھ دن میں رول لے لیا تھا اور منظر کے کچھ مکالموں میں رد و بدل کرنے لگا تھا تو منظر رات کو لمبی سیٹ پر آنے لگا تھا۔ رات کو وہ پیلا پلا کر ناٹھا اور سیٹ پر آنا اسے بے حد شاق گزارتا تھا لیکن میں اس کے مکالموں کو ”صبح“ نہ کر دوں، اس بات کا اسے ڈر تھا اسٹوڈیو کی کہانی اسے سسٹم میں میرے ساتھ اس نے زیادتی کی تھی، اس سے میں بے حد بڑھا ہوا تھا اور اس کو تنگ کرنے کے درپے تھا لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شادی غلطی اپنے سر لیتا ہوں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسرے کے سر رہے۔ اس موقع پر بھی میں نے منظر کو اتنا چڑا دیا کہ وہ بے اختیار ہر کر گالی دے بیٹھا، لیکن منظر نے واہن کو غلطی اسی کی معلوم ہوئی۔

”آٹھ دن“ کی شوٹنگ کے بعد میں بیمار ہو کر بیچ گئی چلا گیا تھا اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس لیے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں آتا یا وہ ہے کہ رات کی شوٹنگ تھی، شادی کا سیٹ تھا۔ مجھے پنڈت کی حیثیت سے ہیرو کی شادی کرنا تھی اور میں کر میں دھوئی کئے خشک بدن پر چنیدہ پہنے، رام نامی دوپٹہ گلے میں ڈالے سر پر پینڈو ٹوپی پکڑی سجائے دیدی پر بیٹھا تھا اور ہمیں دکی ماں سے ایہ پارٹ دیکھا کہ رہی نہیں، میرا جھکڑا ہوا ہاتھ تھا۔ اس میں کہیں فقرہ آگیا۔ ”تو کیا میں جھک مار رہا ہوں۔“ یا شاید یہ فقرہ تھا۔ ”میں ہرگز یہ جھک نہیں مار سکتا۔“ بہر حال جھک مارنے کا محاورہ منظر نے استعمال کیا تھا۔ اسٹوڈیو ہدایات دے رہے تھے۔ منظر پستے ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا سین شوٹ ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے شرارت مڑجی اور میں نے سنجیدگی سے کہا: ”میں بڑا اٹل لگ نہیں بول سکتا۔“

”کیوں؟“ اسٹوڈیو نے پوچھا

”جھک مارنا ہنسنا بھرا شہ ہے۔ دیدی پر بیٹھا ہوا، دیدوں کا دکھنا، دھرم پرائن برہمن ایسا دیکھ بھی نہیں بول سکتا۔“

”لیکن یہ تو محاورہ ہے۔“ منظر ٹھاک کر اٹھا۔

”بہت سے ایسے محاورے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں لیکن شریف لوگ نہیں بولتے، اسی طرح دیدی پر بیٹھا ہوا پنڈت ہے

ہنسنا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا۔“ میں بولا۔

”لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھرا نہیں۔“

”جھک کیا ہے، پچھلی۔ جھک مارنا، پچھلی مارنا۔ مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہو، لیکن کئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا۔“

”بنگلہ کے پنڈت پچھلی مار تے ہی نہیں کھاتے بھی ہیں۔“

”لیکن پنڈت طوطا رام بنگالی نہیں، نہ یہ کہانی بنگالیوں کی ہے۔“

”تم بھروسہ کرتے ہو۔ منٹو جھوٹا اٹھا۔ تمہیں یہی خبر ہو رہی ہوگا۔“

”میں نہیں بول سکتا۔ میں دیدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں۔“

”میں بھی برہمن ہوں۔“ منٹو گرجا۔

”برہمن تمہارے اجداد ہوں گے اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو۔“

اور منٹو نے بے اختیار ہرگز زور سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوجھتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ درحقیقت دل میں مجھے اس وقت لمبی ہنسی آ رہی تھی لیکن اوپر سے میں بے حد سنجیدہ بنا ہوا تھا۔ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرانیں پڑت ویدی پر بیٹھ کر ایسا کاؤ نہیں کر سکتا۔ اعتراض نہایت چمکاتھا لیکن جو گنگائی دیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے پھر اعتراض وہاں سٹیٹوں پر شب و روز ہوتے ہیں، جانتا ہوں کہ اعتراض پھر ہے لیکن برہمن بول سکتا ہے یا نہیں، اس سوال نے اسے ایک دم وزن عطا کر دیا۔ غلطی دنیا والے نہایت کر ایک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا انسانک وہاں ہورت کرتا ہے (حالانکہ ان جہورنوں کے باوجود آٹھ دن حادثے ہوتے ہیں، غلط میں ہوتے ہیں اور خاصہ خسارہ اٹھاتے ہیں) میری بات اشوک اور واپسا کو ٹھیک لگی۔ منٹو نے گالی دی تو میرا تپہ اور لمبی بھاری ہو گیا اور چونکہ میں مافیہ زور تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لیے میں نے کہا: ”دیکھو منٹو! میں پہلوان نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم لمبی پہلوان نہیں ہو اور تم نے جب بھی کمرے تو میں تمہیں اٹھا کر سٹوڈیو کے باہر پھینک دوں گا۔“

معاذے نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ اشوک گھر گئے۔ شوٹنگ مرگ گئی۔ انھیں فکر ہوئی کہ ہم دونوں اڑے رہے تو شوٹنگ نہ ہو گئی اور چار چھ ہزار کی ڈر ڈر چلائے گی۔ وہ منٹو کو باہر لے گئے (یا شاید مجھے لے گئے) یہ مجھے یاد نہیں) لیکن کچھ دیر بعد جب ہم صیٹ پر آئے تو منٹو نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دباتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا، گھر چلا گیا۔ پھر کبھی وہ رات کو صیٹ پر نہیں آیا میں نے مکالمے ہی نہیں مناظر تک بدل ڈالے لیکن پھر اس نے یہ بہانہ استعمال نہیں کیا۔

منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غیظہ گالی دے سکا۔ والے نوکتابی رہا تھا لیکن کرشن بھی ایسا موقع نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا۔ دو مضمون کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اس نے اور مجھے گالی دی۔ ان دنوں تو میں ناؤ سینڈنگ تھا۔ دھوکہ جی نے اشوک اور منٹو وغیرہ کو ترک کر دینے کے لیے سنسنو شی کو پھر بلا لیا تھا اور آٹھ دن کے جیسے اس کا ایک گیت منظور کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی لیکن منٹو سنسنو شی کا وہاں آنا پسند نہ کرتا تھا اس لیے وہ ایک گیت مجھ سے لکھوا رہا تھا، ہم بزرگ روم سے دفتر باہر آ رہے تھے کہ بیڑھیان چڑھتے ہوئے منٹو نے اچانک مجھے باتوں باتوں میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی نے مجھے نہیں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والد محترم انت ہی گالیاں تصنیف کرتے ہیں بکتا تھے یوں بھی جائزہ گالی خیر خطہ ہے۔ دوست سب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھر کم کامیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں بے بیٹھم لاہور کے دفتر نہ کام کرتا تھا اور اپنے سینئر ایڈیٹر جناب کے گرجہ کو رکھ کے ساتھ (جربعد میں روزنامہ پر تپ کے مزاجیہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور تھے) لکھنؤ اب اکل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں گنگائی کی زندگی بسر کر رہے ہیں (ریڈیو رے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا لکچرنگ کا دوست کلونت سنگھ آ رہا دکھائی دیا۔

دو ہی سے اس نے ایک موٹی تنگالی سے میرا حال پچال پوچھا اور میں اس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اس سے متغیر ہو گیا۔ آج یہ بات کچھ تیاراب کی ہی معلوم ہوتی ہے اور حالانکہ میری بیوی اب بھی مجھے خاصا غیر مذہب سمجھتی ہے لیکن جالندھر سے لاہور آنے والے اشکات اور لالہ زاد کے اشکات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گو رکھا صاحب بیران و شمشدر کھڑے دیکھتے رہے۔ بعد میں میں نے انھیں گھمایا کہ وہ میرا لکھنویا تھا اور جالندھر کے لکھوٹے یاروں میں غیر خدم کی بیڑ پائی رقم ہے۔ ..... کاش منٹوں اور مجھ میں ایسا یار نہ ہوتا اور ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالی دے سکتے۔ لیکن دفتر کی بیڑ میںوں پر چڑھتے ہوئے اس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی اس میں بے تکلفی و بھلی یاد نہ تھا۔ میری کاغذیہم ساجدہ بنتھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خاموشی سے سن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے ہشت میں گالی دے نہ سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا: ”کھیر منٹو! تم امت سر کے ہر قومیں جالندھر کا ہوں میں گالیاں دوں گا تو تمھاری طبیعت صاف چلنے کی دوبارہ رقم مجھے کبھی گالی مت دینا۔“

اور منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی۔ اس کی بے پناہ جھجھکاہٹ میری کپال کی بات کرنے کی خواہش میں منہ ظاہر ہوتی لیکن گالی وہ مجھ نہ دے سکا۔

منٹو جب گالی دینے پر معافی مانگ دیتا تھا، اتنا مادہ اس میں تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں برابر کشیدگی رہی اور ہم اڑتے رہے میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے متقابل رکھ دیا گیا ہے اور ہم اڑنے پر مجبور رہے۔ اگر کہیں برابر مل کے بیٹھتے بھی تو ایک دوسرے سے ہزار آزما، ایک دوسرے کے منٹو کے کوکاش کرکشت دینے والے ہروں کی طرح۔

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہوا یہی بات نہیں لیکن ہماری دانا یا احتیاط کھل کر ہمارے ملنے کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی ہیں۔ ملنے کی کوشش کی تو منٹو تار مار، منٹو نے ملنے کی کوشش کی تو میں تار مار، شکایت سن یا وہ نہیں لیکن کرشن کھنڈو کا چلنا و تشدد بڑا کام ڈار کی طرح کی کرسی پر جا برا ہے۔ تھے چوڑا صاحب کو ابھی منٹو نے پھانسا نہیں تھا، منٹو کو خفا تھا کہ علقہ اپنے گرد تنگ ہوتا تھا۔ منٹو دیتا تھا شام کو وقت تھا تو بے جل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈرامہ یا کہانی کھڑا تھا۔ کوئٹہ اندر باورچی خانے میں کھانے پکانے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر مٹرک پر سے سخت اور کھچی آواز آئی۔ ”اشک!“

”منٹو!“ ————— مجھے خیال آیا۔ اور بیرادل دھک سے روک گیا کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھروں حسن بڑھکھو، کشمیری گیش میں تین چار بار گیا تھا، لیکن وہ گزشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا حالانکہ میں تیس ہزاری میں بھیرو کے مندر کے سامنے رہتا تھا اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ میرے ہاں تو در و در ہا، وہ کبھی کرشن چندر کے ہاں بھی نہ آیا تھا جو میرے نزدیک ہی رہتے تھے (میرے آنے سے پہلے آیا ہو تو میں نہیں جانتا)۔

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا۔ نہ اٹھ کر دروازہ کھولا، کیونکہ آواز اگرچہ منٹو کی معلوم ہوتی لیکن یقین نہ آیا کہ منٹو ہے۔

”اشک! تو ہی کرخت، کھچی قادر سے چڑچڑی آواز۔“

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ منٹو، صغیر بھائی اور ان کے ساتھ ایک گوراجا، بڑی خوبصورت آنکھوں اور نیکیے ناک نقشہ، فوجان ————— تینوں اندر آئے۔

منٹو نے تعارف کرایا۔ یہ سود پر دینے ہے (میرا بھتیجا یا میرا دوست، منٹو نے کیا کہا مجھے یاد نہیں)۔ تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے

ہی، جیو ظالمیں۔“

سیر سے پاس اس وقت وہ چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ مغرب لال بھارگو نیل کشتہ دلی شالہ دھانی کے عیسے غریب لوگوں کے لیے بارکوں جیسے ۲۰ کو اوڑھنا رکھے تھے جس وقت کا ذکر ہے، راستہ ایک فرس میں تین فرس اور کشتہ باریک فرس کو اوڑھیں دہشتہ تھے۔ ایک کمرہ سے لگا اور ایک بیٹھنے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں نے ایک کمری میز کام کرنے کے لیے رکھ دی اور بیٹھنے کے لیے ایک دوی اور جامع فرش پر بچا رکھی تھی۔۔۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا "بیٹھ بیٹھو" اور کوٹلیا کو آواز دی کہ وہ کچھ مشا و صفیہ بھائی آئے ہیں مٹھا اور پرویز بیٹھ گئے، صفیہ بھائی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اس وقت تک بات چیلانے کو کوشش کرتا رہا جب تک صفیہ کو ٹلیا کے ساتھ بیٹھ چکی نہیں آئیں۔

مجھے ہنس میٹنگ کی کوئی بات یاد نہیں، سو اس کے کہ سمجھو، پرویز کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں، اس کا ناک نقشہ عجیب و غریب تھا اور میں نے ہی باہر دزد پہنکا ہوں۔ سسے اس کی طرف دیکھا اور میرا خیال تھا کہ واقعی علمی دنیا میں ہیہر کی حیثیت سے مشہور ہوگا شاید وہ اس وقت کسی فلم کیس میں ڈکڑھایا جانے کی کوشش کر رہا تھا، منظر اور آواز کی بڑی اچھری بانیں کتنا راؤ میں تناجھار رہا بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا، پرویز کے پاس پوچھا کہ اس سنگھان کی میری چیز پڑھی ہے، وہ کہہ بی آیا ہے کیا کر رہا ہے کب تک ہے گا، بات چیت کو میں نے خواتی چل نہیں دیا، غور کو باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا، بلکہ جب کو شکایا آئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا نامک کرتا رہا۔

ہیں نے بسا کیوں کیا جب میں اس کے پاس سے میں سوچتا ہوں تو یہاں ہوں کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا۔  
 یہودیہ نے مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور میرے شام کے شعلے میں فروشی کو چھوڑ کر اسے مجھ سے ملنے چلا آیا تھا۔ صفیہ لہجائی کو شلیا سے ملنا چاہتی ہوں گی  
 یہاں میری بھویں اس کی ملتی۔ صفیہ کو شلیا کو چاہتی تھیں اور کو شلیا بھی صفیہ اور دھڑو دونوں کی عزت کرتی تھی لیکن منٹوں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور  
 میرے دل آئے گا جو ہمارے اس نے بنایا اس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پھر منٹوں کے اس طرح آئے ہیں اس کے اس طرح آواز دینے میں میرے دل  
 نیچے اور ہاتھیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے دل اگر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکوہ گزار رہا تھا چاہتے تھا۔ باتوں  
 میں اس نے جتنا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کرشن کے گھر بھی گئی نہیں آیا اور مجھے اس کا یہ انداز کھل گیا تھا۔

منٹو کی بات میں نہیں جانتا، لیکن اس ملاقات کی کئی کیفی باتوں میں سے داغ پر حاوی رہی۔ میں پچھتر آدمی ہوں، منٹو لمبی اُقل اور بے کا چتر ہے لیکن ایک وہ سرسکی اور جگمگ جانے والی امانیت کے کن تاروں کو چھیڑ دینی تھی کہ وہ بے ساختہ تن جاتے تھے۔ مجھے بھی طرح مارے کہ جب میں کمری پر بیٹھا تھکے کا جھنڈ کر رہا تھا اور پاس ہی درزی پر بیٹھے منٹو اور سودا صغیہ بھابی اور کوکوشیا باتیں کر رہی تھیں میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا، جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ نہ کرنا چاہئے اور نہ کوئی منٹو کے آنے کا صحیح مقصد جانتا تھا جسے اس نے احسان برتری کے زیر اثر دبا رکھا تھا، اس لیے میں کھل نہیں سکا۔ بلکہ سارے کام جذبہ منٹو کو اپنی جگہ دیوں سے دیرانیچے اُترنے کے دیکھ کر میرے دل میں ضرور پیدا ہوا لیکن ان بد نظیروں سے اسے اتار لانے کی کامیابی پر مجھ جانی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوئی۔

فٹو کچر کے گھر بھی نہ کیا۔۔۔ دہلی میں بھی نہیں، بمبئی میں بھی نہیں، اور اس نے دہلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ پیچھے



# منٹو صاحبؒ

محمد طفیل

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ منٹو صاحب کی زندگی میں اور دوسرا حصہ ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔

(۱)

اس وقت سر میں شدہ بد دور ہے، نہ جانے یہ جی کیوں چاہتا ہے کہ در و بڑھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس چاہتا ہوں سڑتا ہوں کہ در و کی نوعیت نہ بدل جائے۔ اس لیے کہ میں نے منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے عموماً سر کی محسوس کیا ہے۔ میرے علاوہ اور بھی کئی ایک اسی اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ بعضوں کے دل میں ان کے انداز بیان سے درد ہوتا ہے۔ جبراً شمار کن ہیں ہے؟ یہ آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس لیے کہ میں اس وقت منٹو کے فن کی بجائے عرصن کرنا چاہتا ہوں۔ منٹو کے فن پر لکھنے کا حق ہمیشہ کی طرح نقادانِ کرم کو سونپنا ہوں۔ ورنہ وہ محاورہ صادق آئے بڑی بات۔

ایک دن انارکلی میں ایک صاحب کو افسانوی انداز میں پیدل چلتے دیکھا تو ذہن میں آیا کہ اسے منٹو سے اس لیے بھی ذہن میں آسکتا تھا کہ منٹو صاحب بیدئی سے لاہور آچکے تھے۔ چند دنوں بعد ایک صاحب ہمارے دفتر سائیکل پر گزرے، سائیکل بالکل نئی تھی۔ صاحب سائیکل نے ہمارے دفتر کے اندر کچھ اس نئے انداز سے دیکھا کہ ذہن منٹو گیا۔

ابھی بخوڑی ہی دب بوٹی تھی کہ بلدرم احمد ندیم قاسمی آئے اور انھوں نے بتایا میں آپ کے پاس ٹھیک لیکن راستے میں منٹو صاحب مل گئے تھے۔ اس لیے آدھ گھنٹہ ان سے باتوں میں گزر گیا۔

کچھ دنوں بعد جب پیر ندیم صاحب آئے تو ان کے ہمراہ ایک اور صاحب بھی تھے۔ وہی جن کو میں نے دفتر کے سامنے سائیکل پر گزرتے دیکھا تھا۔

ندیم صاحب نے تعارف کرایا: ”آپ سعادت حسن منٹو ہیں۔“ اور میری طرف اشارہ کر کے یہ آپ طفیل صاحب

منٹو صاحب میں سوخو بیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ موجود ہوں، تو وہ دوسرا لاکھ کو شش کو لے، وہ کسی کو بولنے نہیں دیں گے۔  
 اتنی ہی دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔

وہ میرے پاس پہلے مرتبہ آئے تھے، اور کہتے ہی انھوں نے باتیں شروع کر دی تھیں اس لیے مجھے موقع ہی نہ مل سکا کہ بانی دانی کے بیٹے کو چھٹا۔ پھر بھی میں نے ان کے مسلسل باتیں یہ بات چھوڑ دی۔  
 منٹو صاحب چائے پیئیں گے؟

منٹو صاحب اس وقت نان اسٹاپ موڈ میں تھے۔ اس لیے انھیں میری مروت بھی ناگوار گذری، اور جھٹ بولے ”ہٹا ڈیارہ“  
 وقت چائے سے زیادہ گرم باتیں چوری رہی ہیں۔

باتوں کا تسلسل تو ٹوٹ ہی چکا تھا۔ اس لیے کسی اور طرف چلے گئے اور ندیم صاحب سے کہا: ”مجید آباد دکن میں کئی ایک کو  
 دیکھتی تھی، اور ہے کہ میری شادی عصمت سے ہوئی چاہئے تھی۔ نہ جانے یہ لوگ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں جب یہ بات میری بیوی نے سنی  
 تو یہ نہاب ہو گئی۔ اس لیے کہ دونوں کی آپس میں بڑی دوستی ہے۔ پھر حقیقت یہ بھی آگئی کہ میری بیوی نے اس کا کباب ہونا برحق تھا۔“  
 پھر: ”اسے یا مجھے کا کیا پوچھتے ہو۔ ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ اسے اسے“۔ بڑے ٹھاٹ سے دن گزارے ہیں۔ ڈیڑھ  
 دو تار کا آمدنی تھی۔ بڑی قدر تھی۔ ہر کوئی منٹو منٹو کرتا تھا۔ مملکت خداداد میں آئے تو پبلشرز کے پاس خود جانا پڑا کہ بھیجی ہماری کتاب  
 چھپو۔ لکھی بار بھی چاہا کہ بیچ کر مرگ کھڑا ہو کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاؤں، پھر سوچتا ہوں کہ لوگ مجھے پاگل کہیں گے۔“

اس تذکرے پر منٹو صاحب ذرا افسردہ ہو گئے اور شاید افسردگی ہی دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنا خوبصورت سگریٹ کیس  
 نکال دیا، ایک سگریٹ ندیم صاحب کو دیا ایک خود اپنے بائیک بائیک لیوں پر لٹکایا، جیب سے ماچس نکالی ہی رہے تھے کہ ایک دم میری  
 وجہ دینی کا خیال آیا اور بولے ”مجھے معاف کرنا“ اور سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیا۔  
 ندیم صاحب نے مشکل کشائی کی اور کہا کہ یہ نہیں پیتے۔ منٹو صاحب پیئیں گے لفظ کو لے اُسے ”ہائے کجعت تو نے بی بی ہی  
 نہیں دیکھتے پینا کیا ہوتا ہے۔ پینا تو وہ ہوتا ہے۔“

پھر ندیم صاحب سے پوچھا ”قاسمی صاحب آپ نے میرا مضمون ”سورجے جو کل آنکھ میری کھلی“ پڑھا ہے؟“ ندیم صاحب نے  
 حسب عادت ”جی ہاں، کما“ ”چھڈا بارادہ مضمون کہہ اسے، بکو اس اسے۔“  
 منٹو صاحب کی تعادلت ہے کہ اگر ان کی کسی چیز کی تعریف کی جائے تو وہ عموماً بھی جواب دیتے ہیں، یا صرف اتنا کہ دیں گے  
 ”اس شے سے پھر خریدی اسی مضمون کی تعریف شروع کر دیں گے اور وہ بھی جو اسے دے دے کر مثلاً اس میں وہ فقرہ  
 لڑا اچھا تھا کہ

”صبح کا وقت تھا، مجھ بہار تھی اور مجھ سیر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند  
 تھیں۔ ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں۔ بجلی کا  
 پنکھا چل رہا ہے۔ لیکن اس کا مزد دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا۔  
 ”یہ اُسے رُخ کا پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟“ اُس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا

”دیکھتے نہیں ہو“ ————— میں نے دیکھا ————— پکے کا رخ تانہ اعظم محمد علی جناح کی تصویر کی جانب تھا۔“

چراغیں کوئی دوسرا پیراگراف یاد آگیا تو وہ یہ سنا دیا :  
 ”ایک دم شور برپا ہو گیا کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے ہنڈل لیے چلتا رہے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے ہیں آئیں۔ اخبار تک رہے تھے۔ تازہ تازہ اور گرامر کم خبریں۔ دہلی میں جوتا میل گیلہ لکھنؤ میں فلاں کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا۔ پاکستان کے ایک بخجری کی پیش گوئی کثیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔“

اس وقت انھوں نے یہ فقرے بغیر کسی رابطہ کے سنائے تھے۔ یہاں ان کی کتاب سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد بھی رُکے کہاں۔ کہنے لگے آج کل عجیب ٹوٹے۔ ہے۔ افسانہ لکھنا چاہتا ہوں تو مضمون ہو جاتا ہے اگر مضمون لکھنا چاہوں گا تو ڈرامہ ہو جائے گا نہ جانے اس وقت مجھے بیٹھے بھٹکے کیا ہو گیا اور پیٹ سے بول پڑا۔  
 ”اگر آپ نے ایک وقت ڈرامہ، افسانہ اور مضمون لکھنا چاہا تو آپ سوالیہ نشان بن کر رہ جائیں گے۔“  
 اس فقرے پر غصہ صاحب محفلہ ہوئے اور کہا ”اپنا ہے، اچھا ہے“ چونکہ انھیں اپنے پیہ کوئی چپکتی ہوئی بات گوارا نہ ہوتی، اس لیے ذرا سوج کر بولی ہی پڑے ”بات تو آپ نے اچھی کہی ہے، بڑھتی سے میری اور آپ کی بے تکلفی نہیں ہے اس لیے جواب ارسال کرنے سے معذور ہوں۔“

لہذا صاحب سمجھ گئے کہ یہ اس وقت کس قسم کا جواب دے سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے مسکرا کر کہا ”آپ انھیں کوئی جواب نہ دیں۔ یہ ذرا اور قسم کے آدمی ہیں“ اور قسم سے اس وقت نہ جانے ان کی مراد کیا تھی۔ لیکن غصہ صاحب کی باتوں کا رخ قصوں کی طرف چل نکلا اور کہا ”آپ نے میرا مضمون ناک کی قسمیں پڑھا ہو گا۔ وہ، وہ، ہاں وہی آئی جو ان کی ناک تو آتی چلی گئی

ہیں نے اس مضمون میں ناک کی قسمیں گنوائی ہیں۔ اس مضمون میں ایک شعر بھی کوٹ کیا ہے جو مجھے ناک کی مناسبت سے بڑا پسند ہے۔ وہ کیا ہے تنکا بھی وہ تنکا۔ ہاں !

ناک میں نیم کا فقط تنکا شوخی چالاک اقصا اس کا

اس کے بعد انھوں نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے، موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے دیکھ کر ندیم صاحب سے پوچھا ”آپ یہاں بیٹھیں گے؟“

ندیم صاحب نے اپنا تکیہ کلام دہرایا۔ ”جی ہاں!“ تو آپ کھڑے ہو گئے اور کہا ”اچھا بھی میں چلتا ہوں۔“ پھر تو ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ قریب قریب روز۔ عموماً ان کی ملاقاتوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مسلسل ملاقاتیں بخشیں گے کبھی کبھی اچانک ناپید ہو جائیں گے۔ بات صرف اتنی ہو گی کہ ملاقاتوں کا رخ کسی اور کی طرف مڑ جائے گا۔ ان کا یوں روپوش نہ ہونا

دن کا یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہو گا۔ نانگے سے اتار تے ہی دودھ سے اسلام علیکم کے ساتھ ملا تات پھینک دیں گے۔ پھر کہیں گے۔  
 ”اس دن پہلے یا پندرہ روپے دوائی کے لیے دینا۔“ جو دینے پڑتے ہیں۔ لوگ دوائی اس لیے پیتے ہیں کہ صحت یاب ہوں۔ لیکن یہ دوائی  
 اس لیے پیتے ہیں کہ صحت اور خراب ہو۔ ان کی دوائی کا نام شراب ہے۔ پہلے یہ دوائی کو پیتے ہوں گے۔ اب دوائی انہیں پی چکی ہے  
 اور کسی دن بیٹھے بٹھائے ہم برس نہیں گئے کہ منٹو صاحب کا انتقال ہو گیا۔

یہ سب جانتے ہیں کہ منٹو اردو کا ممتاز افسانہ نگار ہے، جو ان کی اس حیثیت سے منکر ہیں، مجھے ان کی رائے سے اتفاق  
 نہیں۔ لیکن ایک بار ایسا بھی ہوا کہ منٹو صاحب نے ایک افسانہ مجھے نقوش کے لیے دیا جس کا نام ”نقطہ“ تھا، میں نے وہ افسانہ پڑھا  
 تو مجھے پسند نہ آیا۔ ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار ان سے کیا۔

منٹو صاحب نے بڑا نہانا بلکہ ایک اور افسانہ لکھ دیا۔ میری نظر میں وہ بھی پہلے جیسا ہی تھا جب منٹو صاحب کو دوسرے  
 افسانہ کے متعلق بھی میری رائے کا علم ہوا، تو انھوں نے کہا کہ کل ایک اور افسانہ لکھ دوں گا اور اس وقت تک لکھنا رہوں گا جب  
 تک کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ افسانہ مجھے پسند ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے ایک ایک دن کے وقفے سے دو افسانے دینے دو نوں مجھے بے حد پسند آئے۔ ایک  
 ”نام مودیل“ تھا اور دوسرے کا نام ”سڑک کے کنارے“۔

مندرجہ بالا واقعہ کے اظہار کا میرے نزدیک سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ اتنا بڑا لکھنے والا اتنے بڑے دل  
 گزرنے کا بھی مالک ہے۔ ہر فن کار کو اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریر بھی بڑی عزیز ہوتی ہے اور وہ اس کی شان میں ایک حرف بھی سننے کے لیے  
 تیار نہیں ہوتا اور پھر منٹو ایسا فن کار، جو فن کار بھی ہے اور منہ پوٹ بھی۔ اس وقت انھوں نے نہ مجھے یہ طعنہ دیا کہ میں بہت بڑا لکھنا  
 چاہتا ہوں نہ ہی یہ ثابت ہو۔ نہ دیا کہ نہ بیٹھ بھی ہوں۔

دوسرے ایوان کے آگے کوئی غنڈ نہیں سمجھی کھی پی کر آ جا میں گئے اور کہہ گئے۔ ”کجا، اب رہے خانا۔“ صاحب کے سامنے  
 کیا کہ اس کی صفی، میری جان! میرے اور اس کے تعلقات اور قسم کے ہیں۔ معاف کرنا۔ وہ بھی عوام زادہ، پر آپ کو کیا پڑی حتیٰ کہ وہی  
 بات آپ اس سے بھی کہہ دیں، جو میں نے آپ سے چھپا کر کہی تھی۔ ویسے میں ڈرتا نہیں ہوں، وہ میرا کیا کرے گا، میری جان! آپ  
 مجھے عیب آدمی ہیں۔ معاف کرنا آپ کو پتہ نہیں کہ آپ نے بڑی کینہ حرکت کی جب میں نے سنا تو کہاب ہو گیا۔ میری...“

میں ایسے مزاح پر شاموش ہوتا ہوں، یا ہر وقت مسکادیا کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اس وقت ان کی باتوں کا کوئی سر پر نہیں ہوتا  
 اور اس وقت منٹو کی بجائے شراب بول رہی ہوتی ہے۔

بعض اوقات جب منٹو اور شراب مل کر بولتے ہیں تو اس وقت منٹو پر بھی پیارا آتا ہے اور اس کی باتوں پر بھی۔ لیکن ایسے  
 واقعے ان پر ہی آتے ہیں۔ عموماً وہ پی کا وہ پتہ نہیں ہی سکتے ہیں۔ وہ اپنی اپنی باتوں کی بدولت دوبارہ پاگل خانے جا چکے ہیں۔

پہلی مرتبہ منٹو صاحب کا صفی خوشی خوشی سے منٹو صاحب کی طرف سے بہت سی باتیں کہیں ان کے گھر والوں نے جھجھکی کی دوبارہ واپسی  
 پر نہ ان سے پوچھا تھا کہ منٹو صاحب آپ کس خوشی میں مبتلی یا سپین براتے اور آتے ہیں۔

کے گئے کہ صفی پہلی مرتبہ تو خود بڑے چاڑھے گیا تھا کہ وہاں جا کر دوا شراب پھر آؤں۔ سنا تھا کہ وہاں اس انداز سے علاج

کیا جاتا ہے کہ آدمی آسانی کے ساتھ شراب ترک کر دیتا ہے۔ لیکن وہاں جا کر جو طبیعت صاف ہوئی۔ وہ بیانی نہیں کر سکتا۔ دوسری مرتبہ گھر والوں نے زہر دستی بھجوا دیا۔ حالانکہ میں نے ان کی بڑی منت سماجت کی۔ لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ میرا ذہنی معائنہ کرایا جائے اس لیے کہ میں اسکل خلیف ہوں۔ لیکن ڈاکٹروں نے بھی ایک نہ سنی۔ کل میرے ایک دوست مجھے ملے ہوئے تھے، تو میں ان کے ساتھ چلا آیا۔ وہ مجھے دھونڈتے ہوئے گئے، ڈھونڈھا کریں۔ پاگل کہیں کے۔

منٹو صاحب کا سزا اس وقت آتا ہے جب ان سے عربی یا فحاشی کے موضوع پر گفتگو کی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے بڑی حیرت ہے کہ لوگوں نے میرے وہ بے شمار افسانے نظر انداز کر دیئے۔ جن میں جنس کا تذکرہ تک نہیں۔ میں نے جنسی افسانے تو شاید چند ایک ہی لکھے ہیں۔ باقی تو بس افسانے ہیں۔ جن حضرات کو میرے افسانوں میں فحاشی نظر آتی ہے، وہی دکان دکان پھرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ منٹو کی کوئی نئی کتاب آئی۔ ان کا خیال ہے کہ میری تحریریں یا تو وہ حضرات پڑھتے ہیں جنہیں میرے فن سے بیا رہے یا وہ اعتراضات پڑھتے ہیں تاکہ مجھے برا بھلا کہہ سکیں۔ میں بھی وقت آنے پر ہر ایک کا قرضہ چکا دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی ایک کتاب کا حساب بول کر کیا تھا۔

”ایڈیٹر دن و دنیا کے نام، جن نے مجھے سب سے زیادہ گالیاں دیں۔“

اب جی چاہتا ہے کہ قبل مولانا عبدالمعتمد صاحب دہلوی کے نام بھی ایک کتاب معنون کر دوں۔ اس لیے کہ موصوف نے سب خلاف لکھ لکھ کر میرے افسانوں کی قدر کی ہے۔ اگر میں اپنی زندگی میں ایسا نہ کر سکا، تو بہت ممکن ہے کہ حشر کے دن مولانا موصوف ہوں اور سب سے پہلے۔

بھئی ان عزم آستینوں کا تذکرہ بھجواؤں میرے دوست قاسمی صاحب نے بھی میرے نام ایک کھلی جھٹی لکھ دی۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی بند لفاظ لکھ کر چھپوا دوں۔ لیکن قاسمی صاحب کا شرافت اڑے آگئی۔ عسکری نے سیاہ حاشیے پر دیا چھ لکھ دیا تو بار لوگوں نے اڑا دیا کہ مچھیرا لکھ کر چھپوا دیا۔ حالانکہ وہ خود اتنا سیدھا سارا اور بھلا ہے کہ اپنے اوپر تو چڑا نہیں سکا۔ مجھے پرکھ جانا۔

پسے ترقی پسند میری تحریروں کو اچھے نہیں سمجھتے اور فخر کرتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ منٹو ہم میں سے نہیں ہے۔ مجھے نہ ان کی پہلی بات پر یقین تھا، نہ موجودہ پر ہے۔ پہلے ترقی پسند کہتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ میں کتنا تھا اٹھک ہے۔ اب مجھے حلقہ اربابے وق والوں نے اپنا ممبر بنا لیا ہے۔ میں کتنا ہوں ٹھیک ہے۔

مجھ سے کوئی پوچھے کہ منٹو تم کس جماعت میں سے ہو تو میں عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہوں، ہر معاملے میں اکیلا ہوں جس دن میں کوئی ثانی پیدا ہو گیا میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔ ویسے کوئی جماعت میرے نام کو اپنی جماعت کی فہرست میں شامل کر کے فخر کر سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اب منٹو صاحب میں یہ کمزوری راہ پا گئی ہے کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ کل فلاں صاحب ملے تھے اور انھوں نے میرے فلاں افسانے کی بڑی تحریف کی۔

پرسوں کو اچھی سے ایک صاحب آئے تھے نہ جانے ان کا نام کیا تھا۔ انھوں نے منٹو صاحب میں نہ آپ کی ساری کتابیں چھو ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں آپ کو اردو کا سب سے برا افسانہ نگار مانا ہوں۔

کل فلاں صاحب نے شیخ بہرہ سے دو کھنڈہ لکھے اس لیے بھجوا دیئے کہ وہ مجھے بڑا اثر رکھتے ہیں۔

میں نے مال روڈ پر ایک دکاندار کو اپنی دو تصویریں فریم کے لیے دی تھیں۔ کوئی صاحب محبت کے اعتبار سے کے طے پر وہاں سے دو کے لیے دے کر میری دونوں تصویریں لے گئے۔

میرا یہ سنگرمیٹ کیس گم ہو گیا تھا۔ اس کے دو سوسے دن ایک صاحب اسے لیے ہوئے آئیچے اور کہا منٹو صاحب! سلام! کیا یہ سب بے یس رکھتے۔ مجھے فلاں جگہ پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے اُن سے کہا تھا۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں یہاں رہتا ہوں، وہ کہنے لگے۔

اُدھر ممتاز شیریں میرے فنی پر کتاب لکھ رہی ہیں۔ ادھر میرے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ چھپ رہا ہے۔ ایک دن ایک صاحب نے کشمکش میں انہوں کو کالی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے تے کر اسے کے لیے کوئی دوا تجویز کی۔ اس نے دوائی پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں مرنا چاہتا ہوں۔ شور مچا تو میں بھی پہنچا، میں نے کہا۔ بھئی دوا کھا لو۔ اس نے کہا۔ تم ہوں تو میرے کما میں منٹو ہوں۔ اُس نے اسی حالت میں کہا۔ بڑا اچھا ہوا کہ میں نے آپ کو مرنے سے پہلے دیکھ لیا میں آپ کو بہت بُرا کرتا تھا ہوں۔ چنانچہ میں نے اسے حکم دیا کہ تمہیں دوائی پینا ہوگی۔ چنانچہ اس نے دوائی لی۔

ایک دن میں انا کلہاڑی اور مالی روڈ کے درمیان بیہوش ہو گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ میں اتنا یاد ہے کہ کچھ ایسے معلوم ہوا کہ میں نے میری گھر دن پر کلہاڑا مارا ہے اور میں بیہوش، کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک سائیکلوں کی دکان میں بوسے کی سی برچھٹا ہوں۔ ایک ہجوم میرے ارد گرد، سب منٹو منٹو کر رہے ہیں۔

میں نے کہا ”ما بھرا کیا ہے؟“

انہوں نے جواب دیا ”آپ کو چوڑے تو نہیں لگی؟“

”بڑے کیڑے کیوں گیلے ہیں؟“

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

میں نے پشیمانی کہا ”کیا کہو اس کو رہے جو؟ تم لوگوں نے میرا جلوس کس سلسلے میں نکالا ہے؟“

بعد میں معلوم ہوا کہ میں بیہوش ہو گیا تھا۔ اس لیے لوگوں نے پانی کے پھینٹے مار مار کے، مجھے ہوش میں لانا چاہا مگر بے نتیجہ

دیر ہوئی کہ بعض لوگوں کا خیال تھا، مجھے مرگ کا دورہ پڑا ہے، اس لیے مجھے خوب خوب جوتیاں ”سو لگھائی“ گئیں۔

جب میں نے یہ بات سنی تو مجھے خطرہ پیدا ہوا۔ ناک کو باغی لگا کے دیکھا کہ جھوٹی سی جوتی اس کے اندر نہ نہیں رہ گئی۔ یہی وجہ تھی

کہ اب دم گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں سے کہا۔ ”میں گھر جانا چاہتا ہوں، تاکہ منگو ادا“

”تاکہ منگو ادا کیا۔ اب سب مقرر کہ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے۔ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے چنانچہ میں

ان لوگوں میں سے تین صاحبان کو ساتھ لے کر گھر کی طرف تاکتے پر چل دیا۔ اُن میں سے ایک صاحب نے کہا۔ منٹو صاحب میری خوش قسمتی ہے

کہ آج آپ سے اس ڈرامائی انداز میں ملاقات ہو گئی۔ میں آپ کو دنیا کا بہترین افسانہ نگار ماننا ہوں۔ میں نے فلاں فلاں مغربی افسانہ نگاروں

کو پڑھ ہے۔ لیکن آپ کے سلسلے سب بھی ہیں۔

میں نے اُن صاحب سے کہا کہ میں کیا ہوں، بس افسانہ نگار ہوں۔ اب تو میں افسانہ نگار بھی نہیں ہوں۔ افسانہ نگار اس وقت

ہوتا ہوں جب میرے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے۔ جب میرے ہاتھ میں قلم نہیں ہوتا، اس وقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ اب افسانے کہاں ہیں جنہیں لکھوں۔ افسانے اُدھر رہ گئے۔ جو افسانے اُدھر تھے، انہیں بھی مار بھگایا اُدھر یا ان کے ساتھ کچھ اور کر لیا گیا۔ وہاں ایک سڑک پر کئی افسانے ملتے تھے۔ یہاں کئی سڑکوں پر ایک افسانہ نہیں ملتا۔ اب یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ سعادت حسن منٹو مال روڈ کے قریب بیہوش ہو گیا اور لوگوں نے اس کی پانی کے جھینڈے اور تھوڑی سی توامع کی۔ میری جانی! یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ —

ایک بار کسی صاحب نے ان کے افسانے موزیل کی بات چھیڑ دی۔ منٹو صاحب گویا ہوئے۔ وہ افسانہ میں نے تھوڑا ہی لکھا ہے۔ وہ تو موزیل نے لکھ دیا تھا۔ بھی مجھے افسانہ لکھنے وقت کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھے کیا لکھنا ہے۔ قلم دوات سنبھالنا ہوں تو کاغذ کے آؤ پر ۷۶ لکھ دیتا ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے۔ کیا لکھوں، کیا لکھوں، کیا لکھوں۔ معاً ایک بات سمجھیں آتی ہے، مثلاً وہ درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ پھر قلم رکھ دیتا ہوں، سگریٹ پیتا ہوں، یا پیشاب کرنے چلا جاتا ہوں، یا پانی کھانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ واپس آکر ”وہ“ سے پوچھتا ہوں کہ بتا اب تو کیا کہتی ہے۔ وہ جو کچھ مجھ سے کہتی جاتی ہے۔ میں لکھنا جاتا ہوں۔ وہ جدھر جاتی ہے میں اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں، البتہ میں اسے لکھیں سے دیکھنا جاتا ہوں۔ کہ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے کہی ہے۔ اس میں قابل غور کہوں کو کسی باتیں ہیں۔ اُس کے سینے کا اُبھار کیسا ہے۔ وہ جب ہنستی ہے تو اس کے کانوں میں گڑھے پڑتے ہیں یا نہیں۔ وہ جب چلتی ہے تو اُس کا انداز کیا ہوتا ہے۔ جب وہ مسکراتی ہے تو کہیں دل ٹوٹ کے تو نہیں لے جاتی۔ یہ مرحلہ میرے لیے نازک ہوتا ہے کہ جب وہ دل ٹوٹنے پر آتی ہے تو خود کئی بھی ہے یا نہیں۔ بس اس کا علم مجھے نہیں ہوتا۔ جب افسانے کا آخری حصہ آتا ہے تو ان تمام کرداروں سے پوچھتا ہوں کہ بھئی اب بتاؤ تمہاری کیا کیا مرضی ہے؟ تم میں سے کس کس کو مار دیا جائے یا تم میں سے کس کو کیا کر دیا جائے۔ بعض کردار مرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جاؤ تمہیں زندگی بخشی۔ پھر دوسرے کردار سے مشورہ کرتا ہوں وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر صاف کر دیتا ہوں۔ ان میں سے جو کوئی مرنے کے لیے راضی ہوتا ہے اُسے مار دیتا ہوں یا وہ سالانہ رسائی جو کچھ بھی کرنا چاہے، میں اُسے مطلق نہیں روکتا۔ البتہ آخری فقرہ منٹو سوچتا ہے اور افسانہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً موزیل کا پہلا فقرہ ”تو لوچ نے پہلی مرتبہ“ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا۔“ میرا ہے اور پھر آخری فقرہ ”مے جاؤ اپنے اس مذہب کو“ میرا ہے۔ باقی سب کچھ موزیل کا ہے۔

پھر موزیل کے وجود پر بحث ہوگی۔ ”مبئی میں ایک یہودن تھی۔ بڑی بڑی رانوں والی، دھڑلے کی عورت، وہ اسکرٹ کے نیچے کچھ نہیں پہنتی تھی۔ افسانہ لکھنے وقت وہ دماغ میں اُبھری۔ اس کا نام بھول گیا تھا تو میں نے سوچا کہ ہمارے فلیٹ کے سامنے بھی تو ایک یہودن رہتی تھی اور اس کا نام موزیل تھا۔ اُدھر بڑی بڑی رانوں کا تصور ذہن میں اُبھرا۔ اُدھر موزیل کا نام، تو بس افسانہ ہو گیا۔ بلز اس میں کوئی کمال ہے۔ اگر کوئی کمال ہے تو موزیل کا ہے۔“

دیے اس سلسلے میں منٹو صاحب نے جو کچھ تحریری طور پر فرمایا ہے۔ وہ بھی سنی لیجئے، مزے کی باتیں ہیں :

”اب آپ کو کیا تاؤں کہ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ یہ بڑی اُنھیں کی بات ہے۔

اگر میں کس طرح، کو پیش نظر رکھوں تو یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اپنے کمرے میں صوفے

پر بیٹھ جاتا ہوں۔ کاغذ قلم کھینچتا ہوں اور رسم اللہ کر کے افسانہ لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔

میری تین بچیوں کو خود بچا رہی ہوتی ہیں، میں ان سے باتیں بھی کرتا ہوں، ان کی تمام باہم ملائیوں کا فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ اپنے لیے ’سلوا‘ بھی تیار کرتا ہوں۔ کوئی ملنے والا آجائے تو اس کی خاطر ماری بھی کرتا ہوں۔ مگر افسانہ لکھ جاتا ہوں۔ میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے یا میں نے غسل نہیں کیا۔۔۔ میں افسانہ نہیں لکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ یوں تو میں نے بیس سے اوپر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ یہ کون ہے جو نے اس قدر لمبے افسانے لکھے ہیں، جس پر آٹے دن مقدسے چلتے رہتے ہیں۔ جب قلم میرے ہاتھ میں نہ ہو تو میں صرف سعادت حسن ہوتا ہوں، جیسے نہ اردو آتی ہے نہ فارسی، نہ انگریزی، نہ فرانسیسی۔۔۔ بعض اوقات میں جو ہی کے کتنے پر قلم بائیس لکھتا ہوں اور لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ دماغ بالکل خالی ہوتا ہے۔ لیکن جیب بھری ہوتی ہے۔ خود بخود کوئی افسانہ اچھل کے باہر آجاتا ہے۔ میں خود کو اس لحاظ سے افسانہ نگار نہیں جیب گنرا سمجھتا ہوں جو اپنی جیب خود ہی کاٹتا ہے اور آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔۔۔ مجھ ایسا بیوقوف دنیا میں کوئی اور ہو گا؟“

ایک مرتبہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔ اس کا حال آپ نے منٹو صاحب کی رہائی سنا ہو گا۔ میرے اور ان کے بیان نہ بہت فرق ہے ہو گا کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور میرا لکھنے والوں میں شمار ہی نہیں۔ الحمد للہ کہ میرا لکھنے والوں میں شمار نہیں۔ میں بھی بعض اوقات ان کے ہم درجہ ہوا ہوں۔ ”کی طرح کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ ہر ادیب کے متعلق یہی کہتا کہ فلاں کیا لکھتا ہے۔ فلاں کی زبان ٹھیک نہیں۔ فلاں کا مشاہدہ ناقص ہے، فلاں جاہل ہے۔“

ایسے اساتذہ کی موجودگی میں کون کسی کے منہ لگے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔ میرا سمجھلا بھائی سخت بیمار تھا۔ میں اس کی دواؤں کے سلسلے میں ڈاکٹر کے پاس آیا ہوا تھا اور اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا، ان کے پیغام ملا کہ ہاجرہ بھی آئی ہیں اور آپ کو بلا رہی ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایک خاتون دفتر میں بیٹھی نہ رہے۔ چل کر پہلے ان کی بات سن لوں۔ پھر دواؤں لے جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ابھی آیا۔ میں اپنے بھائی کی بیماری سے سخت پریشان تھا۔ پھر بھی برنبائے تکلف ہی سے ہنس ہنس کر آیا۔ میں اصرار کر رہا تھا کہ میں آپ کو چائے پلاؤں گا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ ہرگز ہرگز نہ پیوں گی اور طفیل کی چائے تو کسی نہ پلاؤں گی کہ اتنے میں منٹو صاحب قشر لیتے آئے۔ وہ تانگے میں سوار تھے۔ انھوں نے میری طرف اشارہ کر کے آواز دی ”دراودھر کنا“



میں ڈراؤ دھر، منٹو صاحب ڈراؤ دھر آئے اور ہمارا آتنا سامنا دفتر اور مرٹک کے درمیان درمیان ہٹا۔ منٹو صاحب نے کہا کہ درمیان سے گزرا اور میری خدمت سے دور میں اپنے چند دوستوں کے پاس گیا تھا۔ اُن میں سے کوئی نہیں ملا۔ اس وقت میرے لیے یہ فیصلہ مشکل تھا کہ یہ اس وقت یہاں مجھے اپنا دوست سمجھ کر آئے ہیں یا دشمن سمجھ کر (ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ کل پانچ ہزار روپے کی ضمانت ہے۔

میں نے یہ غور کیا کہ میں تو گھر سے جاؤی کی دوا لینے کے لیے آیا ہوں۔ اس لیے آپ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ میری پانچ ہزار کی ضمانت بھی منظور نہ کی جائے۔

اس پر منٹو صاحب نے کہا کہ آپ آدھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے اور ساتھ ہی کئی سوال چڑھ دیئے۔ ”آپ کا ذاتی مکان ہے؟ آپ کا بینک بیلنس تو اتنا ہو گا؟“ جب میں نے نفی میں جواب دیا تو کہنے لگے ”آج آدھ ہو جائے گی ضمانت، آخر اتنے بڑے ادارے کا مالک پانچ ہزار کی بھی ضمانت نہیں دے سکتا۔“

باہر وہ مہینے بھی غور کیا، چلنے جانے ناظر ہر جہاں ہی کیا ہے؟ چنانچہ دھڑکتے دل کے ساتھ اور ذہن میں گھر بلو پریشاںیاں لیے منٹو صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے میں نصیر انور اور حنیف رامے موجود تھے۔ اب تانگہ انا رکھی سے نسبت روڈ پہنچا اور راستہ میں باتیں ہو رہی ہیں۔ ”کل جو تھا نندرا میرے وارنٹ لے کر آیا تھا، بڑا تربیت آدمی تھا، میں نے اس سے کہا کہ کل صبح خود تھکانے میں اپنے ایک ضمانتی سمیت حاضر ہو جاؤں گا۔ اب آپ جائیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔ چنانچہ انھوں نے میری بات مان لی اور میں رات بھر آرام کرتا رہا۔“ کبھی نصیر انور کہتے ”منٹو صاحب آپ ایسے انسانے کیوں لکھتے ہیں جن پر مقدمے کی فوبت آئے۔ کبھی میں کہتا کہ منٹو صاحب اگر آپ کو وقت مقررہ پر حاضر عدالت ہونا ہے تو مجھ سے ضمانت دلو! اپنے وہ نہ مجھے پریشان نہ کیجئے گا۔“

جب وقت ہم نسبت روڈ سے میکمل روڈ پر پہنچے تو منٹو صاحب نے کہا: ”اگر اس وقت ٹینل صاحب نہ ملنے تو بڑی مشکل ہوتی۔“ اس پر نصیر انور نے کہا: ”آپ کی مشکل تو حل ہو گئی۔ اب آپ ٹینل صاحب کے لیے مشکل پیدا کر رہے ہیں۔“

اس پر منٹو صاحب ہنسے اور کہا ”ہنسی نہیں، ہرگز نہیں۔ آخر مجھے ایک بار تو کراچی جانا ہی ہے تاکہ یہ ٹنڈا ختم ہو جائے۔ تانگہ میکمل روڈ سے قلعہ گوجر سنگھ کی طرف مڑا۔ بالآخر تانگہ ڈسٹرکٹ پولیس کے سامنے جا کر رکا۔ ہم سے دفتر میں جا کر اپنی آمد کی غرض بتائی۔ وہاں میرے بھی ایک ملنے والے مل گئے۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ میں ایک ضمانت کے سلسلے میں آیا ہوں تو انھوں نے کوشش کی کہ ضمانت جلد سے جلد ہو جائے۔ حالانکہ اس وقت میرا دل یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ ایسا میرے بھیہ کرے کہ تھا نندرا صاحب میری ضمانت ہی قبول نہ کریں۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ میں یہاں محسن مروت کی بنا پر آگیا۔ اس لیے کہ مجھ سے ایک بڑے لکھنے والے کی دلاندری نہیں دیکھی جاتی تھی۔

چنانچہ صاحب ضمانت ہو گئی۔ دوسرے لمحے منٹو صاحب نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ میں کراچی نہ جا سکوں گا اس لیے کہ محنت خراب ہے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ مجھ اداں گا۔ اُن کے منہ سے اس وقت یہ فقرہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس لیے کہ وہ کراچی نہیں جا رہے تھے۔ میرا فیصلہ اس لیے بھی ہوئی کہ میں نے اُن کی محنت اُس دن سے اچھی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس وقت مجھے منٹو صاحب پر بڑا غصہ آیا۔ حالانکہ غصہ مجھے اپنے اوپر آنا چاہئے تھا، یہ فرض محال اگر اس وقت مجھے اپنے آپ پر اتنا تو کی جھٹکا۔ بالآخر تانگے پر چڑھ کر سو رہا ہوں اور تانگے کا رخ بھارے دفتر کی طرف کر دیا گیا۔ راستے میں پاکستان ٹائمز اور امریکا کے اخبارات کو مانگ کر دیا گیا۔ اوپر پہنچے جس کسی نے سنا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی ہے تو سب نے ہی کہا کہ منٹو صاحب وقت مقررہ پر نہ آئے، عدالت نہ ہوں گے۔ منٹو صاحب ان ریڈارکس پر بیٹھے رہے اور کہتے رہے: ”نہیں یار! کہوں نہ جاؤں گا۔ حالانکہ وہ اس سے بچے۔ بچے۔ چکے گئے کہ نہیں جاؤں گا۔“

بالآخر ایک بارٹ میرے ذہن میں آئی اور میں نے منٹو صاحب سے کہا: ”اگر میں کل صبح کے بجائے دوپہر میں ٹک کر دوں، تو کیا آپ اور اصرار کرنا چاہیں گے؟“ منٹو صاحب نے میری اس پیشکش کو قدرے تکلف کے ساتھ قبول کر دیا۔ بعد ازاں منٹو صاحب نے شرمیلی نگاہ سے کہا کہ آپ گھر قنبریف سے جائیں۔ جین سیٹیں ٹک کر لانے کا بندوبست کرنا ہوں۔

چنانچہ پاکستان ٹائمز کے دفتر سے اپنے دفتر تک پہنچ گیا۔ اپنی سائیکل سنبھالی، سائیکل پر سوار ہوا تو بھائی کی بیگاری اور اس کی بدچلانی۔ سائیکل کے پیچھے کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی گھومتا لگا۔

سیدیں ٹک کر لانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ ریڈر ویشن آفس سے معلوم ہوا کہ چار دن تک کوئی سیٹ خالی نہیں۔ راجہ وقت پر حتیٰ کہ منٹو صاحب کی دوسرے دن عدالت میں حاضری تھی۔ چنانچہ شوکت علی کوئی صاحب کے پاس ریڈر ویشن مہینہ انھوں نے پہلے تو خوب سخت کوشش کی۔ لیکن پھر یہ انتظام کر دیا کہ اگر ہم لوگ کل صبح سات بجے اسٹیشن پر پہنچ جائیں تو سیٹوں کا انتظام ہو جائے گا۔

میر نے اس کی اطلاع منٹو صاحب کو دے دی اور ان کی سبکدوشی اور ہمشیرہ سے بھی کہا کہ انھیں صبح تک تیار کر دیجئے گا۔ ان کے ذہن میں وہی ختم ہو۔

رات کو جب گھر پہنچا تو گھر والوں نے شکایت کی کہ بھائی اتنا بیمار ہے اور تمہیں دو انک پہنچانے کی فرصت نہیں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ پر آج کیا بیٹی ہے۔ رات بھر کبھی بھائی کی بیگاری کا خیال آتا رہا۔ کبھی منٹو صاحب کی کمر فرمائوں کا۔ یہ امر عجیب بات ہے کہ میں ایسے مواقع پر بھائی کے ختم شمار کی کہ زخم شناری کرتا ہوں۔ چنانچہ رات بھر یہ شغل جاری رہا۔ صبح ۵ بجے گھر سے چل نکلا۔ گھر والے میری شب بیداری سے ہی کافی پریشان تھے۔ جب علی الصبح گھر سے نکلا تو وہ اور پریشان ہو گئے۔ اس لیے کہ ان سببوں میں رات کے گیارہ بجے سے پہلے سونے کا اور صبح ۹ بجے سے پہلے اٹھنے کا عادی نہ تھا۔

اُن کے استفسار پر میں نے صرف اتنا کہا کہ میرا ایک دوست کراچی جا رہا ہے اسے اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ میں آج صبح کا اور بھائی کی دوا بھی لاؤں گا۔ جب بھائی دروازے کے باہر پہنچا تو سوچا کہ تانگے میں بیٹھ کر منٹو صاحب کے ہاں پہنچوں۔ چنانچہ ایسا ہی بہت سویرے جا رہا ہوں، جلدی پہنچ گیا تو منٹو صاحب کو تکلیف ہو گئی، دُعا بھی دے دیا، اگر میں نے جلدی پہنچنے میں کسی غلطی کی تو منٹو صاحب گھر سے بھاگ جائیں گے، پیدل ہی چل نکلا۔ اپنے بھائی کے ان کی تکلیف کا زیادہ خیال رہا۔

راستے میں گزرتے ہی سڑک بھونک کر استقبال کیا۔ سوچتے ہوں گے کہ اس شکل و صورت کا انسان آج! کہیں ایک اور جگہ جھکی نے بھی سڑک صاف کرتے ہوئے کہا: ”ہٹ جاؤ باوجودی“ اس وقت بڑا جی چاہا کہ خراس کے پاس رُکوں، اس کی غیریت اور

اس کے بازو پھول کا احوال پوچھوں۔ پھر مدعا نے بہت کیوں نہ ہوئی، اس کے بعد وجود صاحب کے مکان پر پہنچا ہوا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی بیگم سے دروازہ کھولا، منٹو صاحب کو جگایا تو منٹو صاحب آنکھیں ملنے ہوئے آئے اور اسلا کیا۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک بڑی سی گرم چادر لپیٹی ہوئی تھی، جیسے مغل پر دیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نصیر انور بھی آگیا، ان کی بیگم اور بیٹیوں نے یہیں دواغ کیا اور غربت سے واپسی کی دعا مانگی۔

ایشن پرسیدٹوں کا انتظام ہو چکا تھا۔ جیب سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تو منٹو صاحب نے شراب کی بوتلوں جگہ رکھ دیا، جہاں ہر آتے جانے کی نظر پڑتی تھی۔ میں نے منٹو صاحب سے کہا: ایسا نہ کیجئے۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ چھوٹی سی سبز رنگ کی کاچی نکال کر دکھائی کہ میرے پاس شراب کا یہ مٹ ہے۔ یہ بات ان کے منہ ہی میں تھی کہ گاڑی چلا دوسرے دن اخبار میں آیا کہ منٹو صاحب عدالت میں حاضر ہو گئے تو جان میں جان آئی۔

ایک وقت منٹو صاحب پر یہ بھی آیا کہ جب وہ ایک دم بیٹھے بھاٹے کھنے لگے۔ ”ارے بھئی سنو تنان تنان“ (پتہ نہیں کیا الہام) جو صاحب منٹو صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ وہ بریتان کہ ایک دم انھیں کیا ہو گیا۔ رادھر سے استف منٹو صاحب کہیں گے ریڈیو، ارے بھئی کہاں ہے؟ جواب ملے گا: رادھر آؤ اور میرے کانوں کے ساتھ اپنے کان لگا آواز۔ واہ وا کیا گان پایا ہے کبھ نے پیراقتہ کے انشادوں سے سر کے انارچرے گاؤں کا ساتھ دیں گے۔ کبھی کبھی اٹھ بیٹھیں کھڑے کھڑے بیٹھ جائیں گے۔ ساتھ ہی تبصرہ بھی ”ہائے ظالم نے مار ڈالا۔ یا بدظالمی“ نے مار ڈالا۔ واہ وا، شاہاں اس وقت شہزادہ سے کسی نے کہہ دیا کہ منٹو صاحب جو کچھ آپ سن رہے ہیں وہ ہمیں سنائی نہیں دیتا۔ اس لیے ہمیں گانہ جانیے تو وہ کاغذ اور قلم سنبھالتے ہوئے پریشورہ بھی دیں گے کہ کانوں میں تیل ڈالا کرو اور سر کی مالش کرایا کرو۔ اور ساتھ ہی کہہ دیں گے۔ پہلے دو تین پنجابی گیت لکھیں گے، پھر کہیں گے ”اب اردو کے گانے سینے“ وہ بھی نہیں چار لکھ ڈالیں گے۔ جیسے تک منٹو صاحب کے کانوں میں بجاتا رہا۔ جسے صرف ان کی ایکلی جان سن سکتی رہی اور لوگوں کو یہ لکھ کر یا خود سننا کر سناتے رہے۔ کیوں ان کے کان کے ریڈیو کے دواغ خراب ہو گئے اور ریڈیو بجا بند ہو گیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کے قریب ان کے گھر گیا تو باہر سے دیکھا کہ منٹو صاحب گارہے ہیں۔ کچھ تک رہے مگر وہ ہیں اور کبھی سر کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو بچا رہے ہیں۔ میں باہر کھڑا کافی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر تار آواز دی۔ ان کا نوکر باہر آیا تو میں نے کہا: ”ذرا منٹو صاحب کو بلا دیجئے“ اس نے جا کر منٹو صاحب سے کہا کہ کوئی صاحب ہے۔ منٹو صاحب نے جواب دیا ان سے جا کر کہہ دو، اس وقت منٹو صاحب نہیں آ سکتے، گانا گارہے ہیں۔“

پھر خود ہی چلے آئے اور دروازہ کے قریب۔ اگرچہ ایک کو ٹیک کر تے ہوئے کہا ”کون ہے؟“ اچھا آپ پر میں اس وقت گارہا تھا۔ آؤ تم بھی گانا سنو“ میں نے پوچھا ”اور کون کون ہے؟“ کہنے لگے ”کوئی نہیں ہے۔ گھر کے ک“

آؤ۔ آؤ۔“

مقدموں کی بھرمار نے اب انھیں سنبھلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب ان سے افسانے دھڑے کہ انھوں نے اس عرصے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بحیثیت مجموعی ان کی ناکام تحریریں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانہ بہ

میرے میں جانا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ لکھنا دکھنا پھوڑ دوں اور پاکستان اور ہندوستان سے دور کہیں چلا جاؤں۔ وہاں  
جی ٹیو کے افسانے لکھوں اشاعت کے لیے انھیں یہاں بھیج دوں تاکہ سارے پبلشرز انڈیا کو جان چھوڑے۔  
میں اس کو سفید کرنے پر مجبور ہوں۔ حکم ہوتا ہے کہ نہیں سفید کو سیاہ کو سیاہ کو سفید کو۔ اگر سیاہ اور سفید دونوں نظر آ رہے ہوں تو  
لکھنا کہ سب رہو۔ گچھلڈ ہوا سیسہ نکل لویا شو کہ کشتی کو رو۔ پھر مجھے جو سزائیں ملتی ہیں وہ بھی انگریز بہادر کے زمانے کی۔ میں تو ایک  
ہی نسل کی سزائیں جھلک جھلک کے پور ہو چکا ہوں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ مملکت پاکستان میں مجھے اسلامی سزائیں ملتیں، تاکہ درامٹی ہی کی وجہ  
سے اس کو نہ عار نہ ہوتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ وہی ہے کہ جو خدا انگریز بڑی سیانی قوم ہے۔ وہ یہاں سے اپنا جسم بچا کر لے گئی ہے لیکن  
یہاں تو یہ تو کئی ہے۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ ایک ہسپتال (یہ اُن کا خاص لفظ ہے) قسم کا افسانہ لکھوں جس میں علاج  
اور مکت کے تمام ناسوروں کو ایک ساتھ چھیڑ دوں۔ خوب خوب فطرت زنی کروں۔ اس کے بعد بھر پور رنگ پاشی کروں۔ انجام کار اپنے  
اب کو لونی مار دوں اور یہ سمجھ لوں کہ مقصد ادا ہو گیا۔

منٹو صاحب پنجابی بولنے میں بڑی آسانی محسوس کرتے ہیں۔ جب انھیں شہ ہو جائے کہ مخاطب تو اہل زبان ہے، تو ان  
بے تشویش کر دیں گے۔

آپ پنجابی سمجھتے ہیں نا؟ ظاہر ہے کہ مخاطب نہ سمجھتے ہوئے بھی انہیں انہی میں سر ملائے گا اور اردو میں جواب دے گا کہ بول  
نیپا پتا سمجھ تو دیا ہوں۔

ان پر منٹو صاحب کہیں گے ”معاف کیجئے گا جب میں اردو بولتا ہوں۔ تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا منہ پک گیا  
ہے یا پک رہا ہے۔ اردو بولتے ہوئے میرے جڑے دکھنے لگتے ہیں۔ تاہم اردو زبان کے نیچے جو جگہ ہے وہ مجھے چٹاپ چٹاپ کئی معلوم  
ہوتا ہے۔ ایسے میرے بجائی معاف کرنا، میں پنجابی ہی میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے اردو کو کوئی پیر ہے۔ سوچتا ہوں کہ  
جب لکھنا اردو میں ہوں تو پنجابی میں باتیں کروں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اردو میں بھی باتیں کر کے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہوں۔  
منٹو صاحب عموماً گھر میں ملتے ہیں یا تانگے میں ہوتے ہیں۔ کسی تانگے کی پھولی سیٹ پر دوڑے کوئی بیمار لیٹا ہوا نظر آئے۔  
بولنے لگا کہ لیٹا ہو، تو فوراً کوئی رائے قائم نہ کیجیے گا۔ تانگے کے قریب آنے کا انتظار کر لیجیے گا۔ بہت ممکن ہے وہ  
منٹو صاحب ہوں۔ اگر ان کے دو ایک ہم بوتل دھم گلاس ساغہ ہوں تو وہ اگلی سیٹ پر بیٹھیں گے اور اپنے اُن قدر دائروں سے کہتے  
مانیں گے کہ میں ایک بہت بڑا افسانہ لکھنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ مقدمہ چل جائے گا۔ اگر مقدمہ نہ چلا تو مجھے دکھ ہوگا۔ اس پہلے  
دیسے رہیں میں خواہ مخواہ آئے گا کہ اپنی حکومت تو فریق منضی سے بھی بیگانہ ہو گئی۔ یا مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ افسانہ  
میری قلم کا کلاس ہے ورنہ حکومت ضرور ایکٹیویتی۔

منٹو صاحب میں ذاتی طور پر بڑی خوبیاں ہیں۔ لیکن شراب نے اُن میں کئی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ پہلے مجھے اُن پر غصہ آتا  
تھا۔ اب ترس آتا ہے۔ میں تو اُن کے فن پر اُن کی تمام کمزوریوں کو نشا کر سکتا ہوں۔ کسی اور کا حال خدا جانے۔

(۲)

عمر کے آخری دنوں میں مرحوم یہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی ہی میں ان پر کوئی اچھا دسالہ نمبر چھاپ دے۔ اس سلسلے میں اردو

کے پاس جی گئے ہوں گے میرے پاس بھی آئے، اور جو میری دواں کی اس بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ وہ مندرجہ ذیل ہے۔  
 ”دیار نشہ نمبر نکالو۔“

”جی!“

”میں کہتا ہوں نقوش کا منٹو نمبر نکالو۔“

”آج یہ آپ کیسی باتیں۔“

”تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نشہ میں ہوں اور بکواس کر رہا ہوں۔“

”تمہارا ہی جلد ہی کیا ہے۔ چھپ جائے گا۔“

”میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ پہلے مر کے دکھاؤں۔ پھر نمبر چھپے۔“

”مرنے کا نام نہ لیجئے۔ ابھی آپ کی بڑی۔“

”اب جی کر رہی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرے پر راضی ہو گیا ہوں۔“

”اچھا! یہ بتائیے، اس نمبر کیا کیا ہو گا؟“

”اب تک مجھے جتنی گالیاں ملی ہیں، وہ سب سے پہلے چھپیں گی اور جتنے ہی تو فوں نے میری تعریف آفریں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اس کے ہوں گے بہر حال انھیں زیادہ فکر کرنے کی تھیں میں مرتب کر دوں گا۔“

”اگر آپ مرتب کر دیں گے تو میں کیا کروں گا؟“

”نظم جھٹک مارا۔“

”اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتب کر لیں اور اسے کتابی صورت میں چھاپ لیں۔“

”میں چاہتا ہوں، نقوش کا منٹو نمبر نکالے۔“

”تو پھر آپ کا اس نمبر کی ترتیب دندوں سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ میں کسی کی رائے تک برداشت نہیں کر سکتا۔“

”تو اپنے آپ کو سمجھنا کیسا ہے۔ کیا تو مجھ سے زیادہ قابل ہے۔“

”قابلیت کو چھوڑیے۔ یہ معاملہ فہم داری کا ہے۔“

”فہم داری کو چھوڑو۔ یہ معاملہ قابلیت کا ہے۔“

”اس معاملہ میں مجھے آپ کی قابلیت سے انکار ہے۔“

”اچھا تو تم پھر جیسی میری درگت بنانی چاہتے ہو میری زندگی ہی میں بنا ڈالو۔“

”منٹو کے انتقال کو ادیبوں نے ایک ادبی حادثہ قرار دیا۔ یہ بات ہے بھی ٹھیک، اس لیے کہ اُس نے

اتنا کچھ دیا ہے کہ اُسے کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ نہ اب نہ جب۔“

میں نے بھی دوسرے رسالوں کی طرح نقوش کا منٹو نمبر نکالا۔ جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے دیگر رسالے

میں ہر قسم کی سب تو غیر مطبوعہ کہانیاں تھیں دس فائدہ افسانوں کا انتخاب بھی مرحوم کا اپنا تھا۔ فن پر لکھنے والوں میں ممتاز شیریں، ممتاز رحیم،  
محمد شمس، حامد علی عابد، البرالینت صدیقی، عبادت بریلوی اور ممتاز حسینی تھے۔  
تخصیصت لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ، شک، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، ابو سعید قریشی، حامد جلال،  
ہارم سہیل اور اتم احمد تھے۔

منٹو نثر پر تبصرہ کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ لیکن ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔  
جب میں نے منٹو نثر کے لیے مضمنا میں فراہم کرنے شروع کیے تو قدرت اللہ شہاب کو بھی دعوت دی۔ جسے انھوں نے  
مستعدانہ انداز میں دیا۔ وہ نے یہ لکھا کہ ان مضمون جلد بھجودوں گا اور وہ ایک خط کی صورت میں ہر گاہ جو منٹو کو عالم بالا سے لکھیں گے یہ خیال مجھے بہت  
پروردگار سے ہے کہ اس میں منٹو کی پوری شخصیت آسکتی تھی۔ اور وہ تمام مسائل بھی آسکتے تھے، جو منٹو سے متعلق ہو سکتے تھے۔  
اب شہاب صاحب اپنی معروفیات کی بنا پر وقت نہ نکال سکے، تو میں نے اسی انداز میں جو کچھ لکھا۔ اُسے یہاں پیش کرتا  
ہوں۔ منٹو کا ایک خط "کے نام سے منٹو نثر میں چھپ چکا ہے۔ اس خط میں میں نے کو مشن کی حقی کہ منٹو کا اسلوب بھی آسکے۔  
کیا بی نند معلوم :

برادرم، السلام علیکم

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ  
یہ ساری یہ بے نیا تھا۔ ہر حال اس ماحول سے یقیناً بستر ہے۔ جس میں میں نے ۲۴ برس تک جھک ماری تھی۔ وہاں جب تک  
اس کوئی یہ لکھا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں، نہ معیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی حکمت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے، ورنہ  
آتش بولتا تھا۔ اب فلاں چیز لا دو، فلاں چیز لا دو۔ تمہیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی پیچوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی فرمائش  
کی کہ کوئی بنا پر پوری نہیں کر پاتا تھا۔ تو خون کے آنسو رو دیا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض محض سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی  
سائیکل تھی اور حبيب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھ ایسے انسان کش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے  
فرد سے سوائے اختیار کر لیے تھے کہ آپ کے جہنم دار سے نکلنے میں کیا پیاب ہو گیا۔

میں حبيب تک دواں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھٹنا رہا۔ نہ صرف گھٹنا رہا بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔  
یہاں ہر وقت یہی دعا کیا کرتا ہوں کہ یہ زندگی میرے تمام محض افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر میں نے  
ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔ وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی۔ جب مجھی کو وہاں سے آنا پڑا تو نہ جانے وہ کیوں گئے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں، جو لاہور میں موجود ہیں۔ ان سے زبانی کہہ دیں۔ جو لاہور سے باہر ہیں۔ انہیں  
فرد جہنم مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچوں سمیت میرے پاس آجائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں۔  
اس لیے کسی کو تکلیف نہ ہوگی۔

زمانے نے نہ سیری تدرک کی اور نہ دوسرے اہل قلم کی۔ تمہیں علم ہے اگر ہم لوگ ہی تمہارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علمِ لاسیما اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی سنیگا سنا ہے۔ مزے میں ہے۔ اکثر قلم کاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح بھوسے بیٹھیں ہیں۔ نے تو تمہارے نمائش آباد کی نشان میں ایسی ایسی جو بات سپرد قلم کی ہیں کہ جب تک کلبہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ ختم لیا جائے سب ہی نہیں جاسکتیں۔ اگر وہ چھپ گئیں تو تمہارے ہاں کے بعض سر بھیے سر باز دے بیٹھیں گے۔

بہر حال، جو بات کا وہ مجبورہ جب بھی شائع ہوا تمہیں اس کا ایک نسخہ مندر بھیجوں گا۔ نقوش میں اُس پر تبصرہ کر دینا۔ تمہارے ہاں کے ادیب اور تمہارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قمر کی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں۔ وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف بہن خوش فہمی ہی تھنے سو رہی ہے۔

تمہارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی دذیر ہے۔ نول جیل میں ہے۔ اگر کوئی جندوں پہلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدارِ وطن بھی، تو آنا فائدہ دیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جانتا، میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمہیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف نمائش کے جرم میں چلے گئے۔ حالانکہ میں نے کوئی غش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے۔ کبھی وارنٹ نکلتے، کبھی گرفتار ہوا۔ کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا غور لگا یا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور دواں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا کہ مجھ پر نئی ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیئے جاتے۔ جہاں ناکرہ گناہوں کی سزا ملتی ہو وہاں کون مسخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے کچھ جانبیں تو فائدہ بھی نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے دو بھٹا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دُور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں تو تنقید میں علامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا سہرا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتا ہوں تو اچھو، ہستلی چیزیں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن ادیب حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ نہ سنیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے ان بے تم شاکھ پڑھوں سے بچنا۔ ایسا نہ ہو کہ دیر سے تو بد مذہب ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم نیز کہیں ادیب کے فنی کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب بھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کہے، اُس کا اُٹا کیا جائے۔ نقادوں کا نشان بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اُس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی شخصیت میں لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھ لیجئے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ ہیں۔ اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہو گا اور نہ واضحیت۔

میں نے اس کا دل کے ساتھ فغاوا بھی دل دھڑکے گا تو پھر کچھ لکھا جائے گا اس پر ایمان لانا پڑے گا۔  
 یہاں شراب مہور عام ہے۔ پانی نہ پیئے شراب مہور نوش کر لیجئے۔ تمہارے ہاں تو بڑی غرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی مٹی اور  
 اس جگہ شراب کے لیے بھی لکھا گیا ہے کہ نہیں کرتے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لیے ذیل لکھ ہوا۔ دوستوں میں میری  
 حالت نہ ہی۔ جدمہ جاتا تھا، احباب من موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مدد بھی ہو جاتی تو وہ میرے  
 بارے میں کوئی نہیں لکھا کرتا تھا کہ میری جیب میں دھیلہ لنگ نہیں ہے حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس جیب میں دھیلہ چھوڑا ہے وہ پہلے ہی کہہ  
 دیتا تھا۔ غار غراب کی کئی باتیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں شراب کو خانہ خراب اس لیے کہتا ہوں کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا  
 ہوئی تھی

ایک بڑی خطرناک مگر ماز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ پڑ گئے۔ یہاں جنی لوٹکیاں ہیں، وہ سب ہزاروں  
 برس پرانی ہیں۔ لیکن بن کھنڈوں کا جسم اور بائیں تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعاً حماقت ہے۔ اس لیے کہ تم اس مسئلے  
 سے نہ بچو۔ توجہ ہو۔ تمہاری چندینیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پروقار کشش اور سپردگی  
 ہو پائی تھی ہے کہ تمہارے ہاں کی لوٹکیاں ان کے سامنے بالکل بکواس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اس کعبت کے بے ہوش ہونے  
 سے غافل ہو جائے گا۔ بہت نکم ہے۔ جان ہی نہ ہو سکے۔

میں سادی عرادی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ میرے مقابلے ہی کا کوئی  
 تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا چبتی باز ہے۔ دیکھنے لگا۔ "تو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تو نے اپنے افسانوں  
 کے نمونے چنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سوچے تو میرے شعروں کو دھرو گڑا اور محسن کشی ایسی کہ میرے بارے میں جو نئی کہانی لکھی،  
 کہ میں بجائے میری شکر گزاری کے اظہار کے میری کسی غوی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ اٹی میری کمر دیاں گنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا وہ تھا،  
 رہا بار تھا، جو اکیڈ تھا اور اس کی یاد میں جیل تک ہو گئی تھی" وغیرہ وغیرہ۔

تخلیق علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو تو مانا تھا۔ جب اس نے مجھے مجھ سے ایسی باتیں کہیں تو میں نے  
 ان پر کراہت اور سعادۂ حسن منو تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا ذہن دل قسم کا انسان۔ میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھپتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ بیٹے ہیں اور پیٹے  
 ہیں۔ جب ہم مختلف آشنا ہو جاتے ہیں اور ہمدای انا بیدار ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے "میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے  
 اسے اصول چیر سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا" اور میں اس سے کہتا ہوں "شعر کہنا کونسا کمال ہے عرصہ صاحب، میری تو شہرہ بہرہ سطر میں  
 ہے۔ شعر ہیوں نہ۔" ان کی غزل پنہاں ہوتی ہے۔ "بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اُسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔  
 پنچا سام کا دبدبہ تو تمہارے ہاں دن دونی رات چو گئی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو۔

شاعرانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کی جو خیالات ہیں، مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترمیم  
 کرنے کا حق بھی نہیں۔



میٹوں کی عزت منور کر دینی چاہیے۔ لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں کہ تم اپنی نفسی سی جان بھی خطرے میں ڈال دینا۔ شہر بد بھی سنی ہے کہ اب تو تھارے ہاں کا سارا کام وہی کہتے ہیں اور سب آقوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دیکھ کر اندھیرے کے قتل آسانی اچھی نہیں دہن چھٹا دینگے۔ سچی کہ تم لوگوں نے اپنی خود داری تک کو قتل گاہ کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

معیشت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُن سے اپنی حدود میں رہنے کا منور کرتا دعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس حیدر سے بند آجائیں تاکہ تھاری جان چھوٹے ہیں ان سے ٹٹ ہی نوٹنگا۔ فرد کو فرادہ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں تمہارے ہاں میرا بڑا سوگ منا یا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا اس بیٹے کو جب تک میں وہاں ہوں۔ سب سے مل کر مجھے اپنے ہاں سے دور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ لگیا ہوں تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گندگی کے اعلانات کیوں کئے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں جو مجھے اپنے ہاں گاہیت تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے درپوش ہونے پر خصوصی ماتم کر رہے ہیں۔ ان کا بھی میرے ساتھ یوسف ایسا سنوٹ تھا۔۔۔ ان حالات میں تم سب کو اپنے اس منافقانہ رویہ پر نرم آنی چاہیے۔

یہاں میرے کچھ قدر دان پیدا ہو گئے ہیں اور پچھلے دلوں انہوں نے میرے قدر یہ کام کیا تھا کہ میں یہاں کے سرمایہ رپورٹ پیش کر دوں، یہ فریضہ میرے سپرد اس لیے ہوا تھا کہ ان کے خیالی کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کو میں نے بھی اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ بڑی ہپ ٹلمہ رپورٹ ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈر بھی کی ہے۔ اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا، اُس کا بھی کچا چٹا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو اندھ صی نہ منڈوانے کا دستور ہے، وہ بعض مستعین قہ گزرتا ہے۔ اس لیے اس کی اجازت ہونی چاہیے کہ جس کا دل چاہے وہ اُسی رکھے جس کا دل چاہے نہ رکھے۔ اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، خالص جی کا گھر نہ تھا، تھارے ہاں خدا سے وزیر اعظم کے سامنے کہہ دینا تو میری زبان گدڑی سے نکلوا دی جاتی۔

اعلاماً عرض ہے۔ یہاں میری کتاب لکھنے فرشتے، کافی پسند کی گئی ہے۔ جو سکے تو میری بیوی بچوں کا خیال

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء

وقار عظیم

ان اچھے، بُرے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے جن تک فطرت کی نظر پہنچی ہے۔۔۔ کلرک، مزدور، طوائف، ریڈیو، زہاد، پاکباز، مسکین، دہلی، لاہور، فلیٹ، سٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چاند خانے، کنبچے، لڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی گنجینیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گونا گوں مظاہر فطرت کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض نٹو کو زیادہ عزیز ہیں مثلاً کچھ سائیکسٹک گراس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری ٹنگھوں پر نظر نہیں آتی۔ بعض افراد کا ذکر وہ جس ازائے خاص سے کرتا ہے مثلاً کچھ سائیکسٹک گراس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری باتیں کہنے اور بعض رموز آشکارا کر نہیں اسے جو مزا آتا ہے وہ دوسری باتیں کہنے اور کرتے ہیں مثلاً کچھ سائیکسٹک گراس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری باتیں کہنے اور کرتے ہیں۔ جہاں تک ان گونا گوں موضوعات

کا متعلق ہے اسی کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سی کھول آزاری کی ہے بہت سوں کی مراثی مولا علی ہے اور بہت سوں کی گالیاں مٹی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں نے انہی گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مزید کا اندازہ لگائے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر وہی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لیے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جن کا منٹو نے پوری فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطہ نظر کو بھی اہمیت ہے جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے، لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو غلط بنایا جس چیز نے اسے وہ بڑا ٹی وی میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں وہ اس کا فن ہے اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ لکھا جائے اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے اور اس اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا حدیں ہیں مثلاً یہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطہ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منطقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے تکنیک کے وہ مبادیات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنعت اور دوسری صنعت میں مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان، ناول، نگار ڈرامیٹسٹ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈراما یا افسانہ لکھنے وقت ان اصولی قواعد کی پابندی کو اپنا فرض اولیں جانتا ہے۔ ایک خاص صنعت ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے اس کے خلوص اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ اس صنعت ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انہیں پوری طرح سمجھے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنعت کی تکنیک اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جانتا سمجھتا اور ان کا صدق دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا اس لیے کسی فن کار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو ان اصول و قوانین کو اس کی روایت کو کس حد تک جانا، سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں بنانا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کار نے فن کی روایات کی پابندی کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کیے ہیں۔ ان مختلف وسائل کے استعمال میں فن کار کے تخیل، فکر اور ذہنی کاوش اور انہماک و توجہ کو خاص دخل ہوتا ہے اس لیے جو فن کار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے اسی حد تک اس کی توجہ، انہماک اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار اور ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔ اظہار اور ابلاغ کی یہی منزل ہے جہاں صنعت کا تخیل اور فکر حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر میں اظہار اور ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے یہی رنگ صنعت کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا مظہر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے جس میں فنی روایات

باطنِ دلِ طالع کے دوسرے مسائل شامل ہیں۔

فنی جائزہ لیتے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فن کار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند ادبائیں بھی ایسی ہیں جو پیش نظر نہ آتی ہیں۔ فنی جائزہ ادھر اور رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں جو شے سے پہلو پیدا کرتا ہے اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے ان پہلوؤں کا بھی جائزہ اس رنگ کی شرمی میں قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے اس عصب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس انہماک اور کاوش کے اہل نہیں رہتے جس سے انتشار کے وسائل کو بیاہن اور مبنی بنتی ہے اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے اور رنگ بھی بھیکا ہوئے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظر انداز نہیں کر سکتا اس لیے کہ ان خالق کیش نظر کے تعمیر کردہ فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں ان عناصر کا پیدا ہونا بھی ہے۔ پس فن کھڑے کے ساتھ ایک خاص مدت تک تسلسل رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ درپہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوب اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتا ہے جو اس کے فن کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ظاہر ہونے کے بجائے صفت کبھی بھی ابھرتے اور اندھیرے میں چمک دکھا کر فانی ہو جاتے ہیں۔

مثلاً کے افانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

افسانہ ناول، ڈراما، داستان، کہانی — ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ اس قصے سے تعلق رکھتا ہے۔ کردار، واقعہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ تک اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص انداز فکر و نظر، یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی ساوگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں، اس کہانی میں بھی جو بڑی بڑی جگہاں انت کی خاموشی میں بچوں کو سنا جاتی ہیں۔ اس افسانے ناول اور ڈرامہ میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن ان کی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک نہ ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے۔ غایت سے دوسرا صنف سے منفرد کرتی ہے۔ داستان میں قہقہے اور تصویر کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کشمکش، ناول میں زندگی کی وسعت اور مافیاء اور افسانہ میں موضوع کی اگائی یہ امتیازی اور انفرادی خصوصیات ہیں۔ افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے الگ لحاظ سے منفرد اور خاص ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے — ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو ایک، ہو۔ عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غلبہ برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا تاثر قائم نہیں کر سکتے جو کہ افسانہ نگار کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کی بھی جذبات کی رہ میں بہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے فطرت نے اپنی پوری فنی زندگی میں

کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ انھیں اپنے افسانہ نگار کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے خاص تاثر قائم کرتا ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے بے شمار چیزیں آتی ہیں۔ یعنی مثلاً کہ ہم گہرے مشاہدہ میں ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے اس کے بارے میں سے بارے میں اپنے افسانہ نگار کا پس منظر بناتا ہے۔ واقعہ اور کردار کے ذکر میں غٹو بہت کم اس جرم کے متکبر ہوتے ہیں کہ وہ واقعہ تفصیلات پر عبور حاصل کیے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحول یا کردار کی صورتی کو اپنی افسانہ نگاری کا مقصد نہ علم عمداً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے نیچے ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصد ہے۔ مثلاً ان کے افسانے نے اوڑنیہا سال پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے شاہد ہے اس کے فحش فکر اور تجزیہ حیات کی بدولت بے شمار چیزوں کا سامنے آئے۔ اس کرتا ہے لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت افسانہ پڑھنے والے کے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی آن گنت تصویریں اسکی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہے۔ حسب موقع پڑھنے والا لطف و حفا محسوس کرتا رہتا ہے لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے صورتی قلم کے بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہونے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں قانون، نحو، سبب، لغو اور نیا سال کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعات کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس جذباتی کیفیت کے ترجمان ہیں جس میں ایک خاص فرد مثلاً میر اور اس کا انتقام اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہے ہیں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی مزہ ہے لیکن افسانہ پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے نمایاں اثر قبول کرتا ہے وہ صرف ایک واقعہ صورت میں واقعہ کی ہلکی ہلکی ہنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاج کا ایک طعناں تاثر پڑھنے والا دوسری چیز کے مقابل میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔ اسی طرح ہنسا ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا گونا گوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر ہنسا کی ہیروئن سوگندی کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے جو افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جہ کی مدد سے واضح ہونا پہل جل کر سوگندی کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم سوگندی کے علاوہ باقی سب چیزوں کو باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ گہرہ اگر اس طرح چھپا جاتی ہے کہ ہمارے لیے سرائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ صرف سوگندی کو یاد رکھیں جیسے ہم اسے برسوں سے جلتے پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل مٹو کی افسانہ نگاری غن کی مختلف منزلوں سے گزری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور

ہیں سے ہر منزل میں منٹوں نے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعہ صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے عمل میں آسانی اور جاکزیر کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف ہی وسیعے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یعنی وسیلے اگر پروری و زہرداری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جہاں تاثر بھی ناگزیر حاصل بھی ناگھن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور انبیائی خصوصیت ہے۔ افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعہ قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش ڈالے گا۔ اپنے افسانہ کا ایک ڈھانچہ بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح شروع ہوگا، کس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہوگا۔ اچھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرف یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکے تو پڑھنے والے کے ذہن کو تاثرات کے نشاں پر تازہ کر دے اور دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضائیاتی بریکے پڑھنے والے کے ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔ فضائیاتی اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا عمل ہم یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطہ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں جنہیں ہم افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے قدم کا ابتدا اگر پوری طرح قدم چما کر ہمواری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جائے گا اور بے تڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم مل کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ ہر سفر وہ قاری ہیں جو افسانے کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی ہے کہ اچھے افسانہ نگار بھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں رہتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جائے گا جو سب افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے خیر آجاتا ہے۔ منٹوں نے ایک - یا نہت و وار اور خلوص فن کا یہی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی میں جانی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔ منٹوں نے اچھے اور بڑے جتنے افسانے بھی لکھے ہیں ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والوں کو متفق یا نہ ہو لیکن افسانہ کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور کر پاتا ہے۔

منٹوں نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف مقصود پر مختلف کام لیے ہیں لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا ہو قاری کے ذہن پر ابتدا ہی کا ایک نہر نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ منٹوں کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگائیے کہ تمہید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے اسے کن کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

”نیاتاقون“ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

دوستگو کو چوان اپنے اٹے میں بہت عطف آدھی سمجھا جاتا تھا۔ گواس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا مزہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اٹے کے وہ تمام کو چوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کتنی

کیا ہو رہے، اسنادِ ننگ کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

اسی طرح بلاؤز کی تمہید یہ ہے۔

”کچھ دنوں سے تو میں بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجہ کیا پھر؟ اس میں کیا تھا؟ کم کے نئے وقت باتیں کرتے جیسے تھی کہ سچے پرچی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔“

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی اور اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر اگسائی اور مجبور کرتی دو تمہیدیں اور دیکھئے :-

”گھر میں بڑی چولہا بھلی تھی۔ تمام کمرے لٹکے لٹکیوں میں بچے، بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان چڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دو دو پینے کے لیے بلبلارہے ہیں تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بڑھو لگی لیے بے ٹھری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ نال کی خبر ہے نہ ٹکے، بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے پوڑھی سے لے کر بالائی منزل تک مکان مکانوں سے کچا کچھ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو، ایک مکان میں دو بیاہ رہے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاندی دھنیں بیاہ کر لائے تھے۔“

”میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے ابو بکر پر ہوتی۔ شام کا وقت تھا سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور واز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بیچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے سولے گھنٹے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے اس ٹر پلانیچہ چوڑے پر ایک آدمی عجیب والے سے اپنے سر کی مالش کر رہا تھا، دوسرے بیچ پوڑھا بیٹھا تھا اور حد نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور، بہت دور جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا گہرے رنگ کا قالین ہے جسے اُدھر سے اُدھر بیٹھا جا رہا ہے۔“

پہلی تمہید ”شوشو“ کی ہے اور دوسری ”بانجھ“ کی۔ دونوں تمہیدوں میں افسانہ نگار نے آنے والے واقعات فصاحت و فصاحت کی ہے اور اس فصاحت میں دونوں توفیقوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے بڑھتا ہے۔

”پچا با“ کی تمہید صرف ایک جملہ ہے لیکن اس جملے سے افسانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا

نگرپال کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے اوسانِ لمبی نفور سے بہت ضرور خطا ہو جائے گی۔ وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ یہی افسانہ نگار کی جیت ہے۔ اس نے ایک معمولی سی خبر کو قاری کے دل میں اتار دیا۔

ایک اور افسانے کی تمہید دیکھیے۔

”ایک نہایت ہی تھوڑا سا گلاس ہوٹل میں ویسی و سکی کی بڑی ختم کرنے کے بعد ملے ہوا کہ باہر گھومنا جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور و سکی کے پیدا کردہ نکتہ کو دور کر سکے۔“

یہ تمہید پہچان کی ہے۔ اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے نہ کوئی تضاد یا حل بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے نہ کوئی جھگڑا ہے نہ کوئی خبر سنائی گئی ہے بلکہ بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے نشانی سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ، اگر تم لمبی ان شرابیوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔ اور معصوم قاری فوراً یہ خبر قبول کر لیتا ہے۔

اور سنئے۔

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتویں منزل میں اس کے کانڈھول پر دھڑکی گئی ہیں۔“

یہ نعرہ کی تمہید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کی شوال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی کہے گا کہ افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ کیٹھولال کے اس شدید احساس کے نتیجے میں ایک کام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی خلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

”دن بھر کی بھڑکی مانی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر بیٹھی تھی اور بیٹھے ہی سو گئی تھی۔ میری پیل کٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی بڑیاں پھیلانے کے لیے شرباب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات کو ہمیں ٹھہر جاتا، مگر اسے اپنی دھرم تہنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔“

یہ تمہید ”ہنک“ کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں، اس لیے افسانہ میں آگے چل کر جو گھمان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سیدھے سادے انداز میں کہنے کے بجائے درجہ تکبر کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان نیکیے تیروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تنگسہ مار کر سر جاتے تو ابھی بیوی کا محبوب داروغہ صفائی آگے چل کر کیا کھلاتے ہیں، افسانہ کے منہ جاد میں کود پڑتا ہے۔

مگر نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہنر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے



انہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تمہید ہے جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے کہ دراکر متعارف کرنے کا، ایک خاص فضا یا ماحول بنانے کا، ایک پھر کتنی جیتی جڑ بنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مصوری کوئے کا، اپنے والے واقعات کے لیے زمین ہوا کرنے کا اور کبھی کبھی یہ ایک وقت کئی طے محلے مقصد پر رسے کرنے کا، لیکن ان گوناگوں کاموں کے علاوہ جو کام غٹھو کے افسانہ کی ہر تمہید نے اپنے ذمے لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کرے، اس کے دل میں گدگدی پیدا کرے یا اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کرے افسانہ پڑھنے کے لیے یہ آمادہ کر دے۔ غٹھو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لیے اس نے غماز پر رسے سوچ بچار سے دم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی پہلی منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعہ پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جاتا اور اسے افسانہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کرتا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں ہیں جن میں طرح طرح کی مصوحتیں مسافر کی راہ میں حاصل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے کاٹتے ہیں جو اس کے تلووں میں چھپنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے والا ان مصوحتوں کو افسانہ بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے افسانہ نگار کی رہنمائی اور ہدایت کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر افسانہ نگار کی رہنمائی اسے منزل مقصود تک پہنچاتی ہے جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کشمکشیں منزلیں طے کرنے اور چھپنے والے کانٹوں کی خدش کو گوارا اور آسان بنا لینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے سکون و راحت کا سرمایہ ہم پہنچ سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہوا اور پڑھنے والے کے لیے قابل قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی نگاہ میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ کے خانہ پر افسانہ نگار کی ذرا سی مستحق ذرا سی تن آسانی ذرا سی سہل انگاری اور باطل معمولی سی غفلت اور غفلت اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کوئی وقت اور غلطی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

منظر نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کر کے حرم اپنا فنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کر دیا۔

ان کا افسانہ "نیا قانون" اس طرح ختم ہوتا ہے:-

"استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے میں اور تھانے

کے اندر وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ مٹتی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا ایک رہے ہو۔ قانون وہی ہے چرانا"

اور اس کو حالات میں بند کر دیا گیا۔"

"پچھا" کا انجام یہ ہے:-

"نرمل پڑے انہماک سے پچھا متاثر رہی تھی۔ اس کی تیلی تیلی انگلیاں قہقی سے بڑھیں کام

لے رہی تھیں۔ بچا کا ٹٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا سر ہم نکال کر اس پر پھیلایا اور  
 ان جھٹکا کر اپنے کمرے کے بٹن کھولے۔ سینے کے واسطی طرف چھوٹا سا ابھار تھا ایسا  
 معلوم ہوتا تھا کہ تنگی پر صابن کا چھوٹا سا مکمل جھلا لٹکا ہوا ہے۔  
 زلزلے پہا ہے پر لچرنگ ماری اور اس منہ سے ابھار پر بجا دیا۔

”شہ لستین“ کے آخری الفاظ یہ ہیں :-

”وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے  
 بڑے دھیمے دھیمے لہجے میں کہا: ”مجھے زندہ رہنا ہو گا۔“  
 اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس تنگی ہوئی جوانی کو اٹھتھی ہوئی چاندنی  
 میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔“

”ہینک“ کی ہیروشن سوئندی ہم سے اس طرح نصحت ہوتی ہے :-

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچا  
 کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے غار شش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور نسا گوان کے  
 چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔“

”..... اس کے سلق سے ایک نعرہ..... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ،  
 پچھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا۔ بہت تیری.....!  
 جتنے کبوتر ہول کی ہڈیروں پر اونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھر پھڑانے لگے۔ نعرہ  
 مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور واپس مڑا  
 تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہول کی عمارت اڑا اڑا دھم نیچے گر گئی ہے  
 اور یہ نعرہ من کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور مچا کر ڈر گئی تھی کہا: ”بھلا ہے۔“

(نعرہ)

”..... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی صبر معاملہ صاف  
 ہو گیا۔ سیداجی میری غیر حاضری میں اپنی جمالیہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپا مار  
 گئے تھے۔“  
 (میرا اور اس کا انتقام)

”اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں میرے ذہن میں سوئیاں می پھٹنے لگتی ہیں۔ — بے نامکمل دوسرے ہمیشہ میرے ہونٹوں پر اٹکا رہے گا۔“  
(نامکمل خیر)

”جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک ڈاکٹر نے مجھے بلایا اور کہا ”ڈاکٹر صاحب! اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔“ میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ تو ہے کے دو گلاب تھے۔ اس کی بیگی کی یاد تازہ!

”ان گزشتہ سال نہیں یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔“ میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور رول میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت ایسے دفتر چلا گیا۔“

(بیگی)

"وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا گرکڑا تا کہ روح کو دیا جیسے وہ اس مسجد سے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ سر جھکا کر اور کانڈھے بڑھیلے کر کے اس نے تکی پر آواز میں کہا "اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے....."

(سجدہ)

منہج کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ والے کو اپنے ذہنی انتشار کے متبع کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تا جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہتا تھا، دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس طرح کی بنا کر جو کہانی کی تہید سے شروع ہو کر برابر زیادہ منظم رفتار رکھتا، افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی فطونے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جو پڑنے اور انھیں مضبوطی اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

”یہ قانون کے خاتمہ میں استوار ملکوں کا اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد ردِ عمل ہے جس سے پڑ  
دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ ”پہلا“ کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجربہ کا بڑا امیدوار اور ایک ایسا خبا  
جہ ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔ ”شہ نشین“ پر ”کا انجام جذباتی کھچاؤ، تسکین اور  
سادہ لیکن فن کارانہ حل کی تصویر ہے۔ ”ہنک“ کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے فنیہ

اب سے دیکھتے ہوئے ماسور کو بظاہر ایک معمولی سواغہ کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ ناشر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک نئی صورت اختیار کر گئی ہے۔ سواغہ پڑھنے والا سو گندی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم ڈال ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو گندی کے نزدیک تہذیب کے تہذیبی تہذیب ہے۔ "نعرہ" کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کی شلال کی جذباتی شدت اور اعلیٰ کشش کو بظاہر سے غفلت میں بیان کر کے افسانہ کو جس جیل پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فضا کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی طریقہ کار کو ظاہر کر دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی تلخی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا فطرت کے افسانوں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ "سجود" کا انجام فطرت کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ فطرت اپنے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گزاردیتے ہیں جو افسانے میں سے چپے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ یہ معمولی سی غیر اہم بات گزرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ "میرا اور اس کا انتقام" میں آخری جملے میں گھبی ہوئی جلی سی ایسا تیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آمینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کیا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور صریح نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ "نامکمل تحریر" میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے رومانی واقعہ کو ایک ناقابل فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔ "سجود" کا انجام فطرت کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کو فی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے قصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

فطرت کی مختلف کہانیوں کے ان خاتموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ فن کے غور و نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی ناشر کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن سے اس صورت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرتی زبان اور اس کے انداز فکر کی ندرت اور شرمیلی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے کبھی محض سادگی میں اس سے کبھی تضاد سے کبھی تنگدلی سے کبھی مزاح کی شرمیلی سے کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ و فکر اور خیال کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لینا ہے اور پڑھنے والا ہر جگہ اس سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانہ کے خاتمہ کا بیان از پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے خاتمہ کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، لطافت اور شرمیلی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں، افسانہ نگار چرچاؤ کے مختلف مرحلوں سے گزر کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ ٹھنکی کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر جگہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم عنان و ہم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام ————— ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے جلی غفلت یا بے نیازی برتنے کو افسانہ کے مجموعی ناشر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے فطرت

فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لیے ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن اس سے وہ متاثر اور مسرور ضرور ہوتا۔ شروع ہونے پر ہی یہی لیکن یہی مثل خیال سے بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور محوِ جوں آگے بڑھتا والے کے دل و دماغ پر اس کا خصلہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دھیمی اونچی نئی رفتار سے افسانہ انجام کو پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا تازی سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی برکت ہے۔ اسے یوں لگتا ہے کہ اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ یہ احساس میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔ — ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ملے نہیں آجاتی۔ اس میں لکھنے سے پہلے بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا۔ کے لیے زیادہ موزوں ہو کوئی کڑی اگر ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدا آخری سرے میں جو مہوار رابطہ ہے اس میں جھٹکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کے لیے اس ربط میں ایک خوشگوار جھٹکار کا جو نقص وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ چارے کم افانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھٹکار کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جن سے انھوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔ غلطی کے فن کا یہ اور اختیار ہے کہ اس نے اس کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت سمجھی نہ بھلائے ہوئے ہمیشہ ہر افسانے کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیان ساخت، ترتیب، رفتار اور انارچر چھانڈ کو پوری فنی ذمہ داری کے ساتھ بنانا ہے۔ غلطی کے نزدیک فن کے ان مراحل کی جلا اس کا اندازہ غلطی کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجئے۔

’نیا قانون‘ کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے کی خبر سن کر خوشی سے پھیر لائیں سنانا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہونے کے بعد بھی اسے ایک گورے کے جرم میں حالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس آغاز اور انجام کے درمیان محضوں کو اس طرح چکرنا کہ افسانے کا والے کے لیے ہر درجہ کرب انگیز بن جائے، غلطی کے فنی احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب تنظیم کا مظہر ہے۔ نیا قانون نا خبر سن کر منگو خاں کو جو خوشی ہوتی تھی اس کے لیے نئے قانون کے نافذ ہونے کی تاریخ تک غلطی نے کئی ایسے موقع پیدا کی حالت دیکھ کر قاری برابر یہ اندازہ لگاتا رہتا ہے کہ اس کی مسرت آہستہ آہستہ وارنگی اور دیوانگی کا درجہ اختیار کر رہا ہے اور وہ سب سے زیادہ سب سے زیادہ اس کی مسرت وارنگی اور دیوانگی شوقی آزادی کو محسوس دیکھنے کے لیے بیتاب ہے اور عین اس وقت جب اس وارنگی شوق کو نظر ہر اپنی تکمیل کا موقع مل جاتا ہے اسے حالات میں داخل ہونا پڑا اور اس طرح منگو خاں نے جذبات و احساسات کے جو متعدد ذرا رک مرحلے طے کیے تھے ان کا یہ غیر متوقع انجام دیکھ کر ہوتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک ایسی ٹریجڈی کا نقش مرتب ہو جاتا ہے جو اپنی انتہائی سادگی کے باوجود والی ہے۔

’نیا قانون‘ غلطی کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے اس لیے اس میں آغاز اور انجام کے درمیان و

بازرچہ جادو، یہ نازک اور بچہ اور ایک شدید قسم کا نقطہ شروع شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طرف مائل کرے کہ منظر اس طرح کے مرحلے پر آئے۔ ایسے افسانوں میں ملے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں مگر خود سے دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منظر فن کے نقطہ نظر سے اپنے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں امتیاز برتنے کا قائل نہیں۔ فن کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں یکساں توجہ اور انہماک کے ساتھ پورے ہونے چاہئیں۔ اس انداز سے کے لیے نقطہ کی چند اور کہانیوں پر ایک سرسری ہی نظر ڈالئے۔

دفترا اور زمیر اور اس کا انتقام، موضوع کے اعتبار سے دو بالکل سیدھی سادی اور غیر اہم سی کہانیاں ہیں جن کا مقصد دوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ پڑھنے والا انہیں پڑھ کر عیسوس کرے کہ اس نے ایک اچھی چٹکی تفریحی چیز پڑھی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا مجموعی تاثر کسی طرح کے فادری پر بھی اس تفریحی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن منظر نے ان دونوں کی ترتیب میں بھی پورے فنی انہماک سے کام لیا ہے۔ دونوں افسانوں کا آغاز، دونوں کا انجام اور دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی منزلیں پورے فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ طے ہوتی ہیں۔

”پھانسا“، ”بلاؤز“ اور ”کالی شلوار“ ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جنہیں منظر کے محبوب موضوع کہا جاسکتا ہے اور جن پر موضوعات کے قوی تعلق نے منظر کو اردو کتب سے بدنام افسانہ نگار بنایا۔ ”پھانسا“ اور ”بلاؤز“ میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ان بچے والے اور معصوم جنسی احساسات کی مصوری ہے جو شباب کی صبر آزما اور کٹھن منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں ابھرتے عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو بڑے سیدھے سادے انداز میں شروع کرنے اور اسی سیدھے سادے انداز میں ختم کرنے کے علاوہ آغاز اور انجام کو گہری معنویت دینے کے لیے افسانہ نگار نے بہت سے چھپے چھپے غیر اہم افسانے کو جو کہ ایسی نفسیات کی ہے جو پوری توجہ اور پورے انہماک کے بغیر ظور میں نہیں آسکتی۔ افسانہ نگار کے اسی فنی انہماک اور غور و فکر نے دوسرے سادے افسانوں کو ایک اچھی حیثیت دے دی ہے لیکن کمال یہ ہے کہ افسانے نے نفسیاتی نقطہ نظر سے دو اہم مطالعے ہونے کے باوجود فن کے ان محدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کہانی کہانی نہیں رہتی۔

یہی صورت ”کالی شلوار“ کے ساتھ ہے۔ کالی شلوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق لکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات میں ایسا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے عجیب و غریب ماحول سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ کالی شلوار طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لیے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری بول چال ہے

انسانی وجود میں یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایسا ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی محنت سے محنت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کہانی کے مختلف ٹکڑوں میں یہ بھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آکھانوں نازم و طر دم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں شیر و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں منظر

کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانہ میں ریاکم از کم اکثر افسانوں میں موجود نظر آئے گی منٹو نے اپنی اس ہی ذریعہ بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

(۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو وہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مجموعی رہ تشکیل اور تعبیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تمہید اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا اتار چڑھاؤ، ان واقعات کی اس اتار چڑھاؤ کی پراگھٹاؤ کے بعد افسانہ کا نقطہ شروع اور اس کا خاتمہ، ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھاس کی ساخت سے ہے اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے سب سے اہم چیزیں ہیں۔ منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور علامتی پہلو کو افسانے کے مختلف اجزاء و عناصر کو جو اس سے ہیں یہ اندازہ لگاتے اور نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منٹو ایک فن کار کی حیثیت سے فن پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے ہر ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے یقینی وسائل ہیں گویا فن کار کا مقصود، یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کر جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لیے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یہ ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد میں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اس میں تاثر انگیزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لیے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور اس سے طریقے برتنے اور استعمال کیسے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی اف مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک نہیں کیا لیکن ان سے بھی خاص حیثیت اظہار اور ابلاغ کے ان طریقوں کو حاصل ہے جنہیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند اپنی اپنی مذاق کے مطابق برتنا ہے۔ ایک سیدھی سادی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا انداز کیا ہو اس کے لیے کسی خاص فقرے، اشارے، کنایے، تشبیہ، استعارے، تضاد یا انکار میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہو گا یہ بات ہر مصنف کے مطابق سوچنا اور انہی صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لیے موزوں اور مؤثر سمجھ کرنا ہے، فقرے، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور منفرد انداز ایک مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطہ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کر سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔ فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی، فقرہ کے برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی اور ہر

نہایت اس طرح ادا کر دینے کی قدرت کہ جیسے وہ بات نہ اہم ہے نہ حقیق فٹو کے اندازہ اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔  
بعض ٹکڑے دیکھ کر ان کے اسلوب کی انی خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کیجئے۔

سب سے پہلی مثل مینا قانون کی ہے۔ استاد ٹکڑے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لیے  
بیقرار ہے اتنے میں غور کیا اڑے پر آنا ہے رنگ بلند آواز سے اس سے کہتا ہے:

”بالفلا دھرا ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس بچی کھوپری پر بال آگ آہیں۔“

”پہچان“ میں بازار حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ ”یہ رنگ بنگی عورتیں مکافوں میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند  
لٹکی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں۔“

”پہچان“ ہی میں ایک لڑکی کا ذکر یوں آیا ہے۔ ”شہر وڑیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا  
معلوم ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔“

”پہچان“ میں ایک اور بازار کی عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلاری لیتی جیسے مکار و کھانڈا  
کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پوری تول نہیں تولے گی۔“

”شوشو“ میں ایک جگہ کہا گیا ہے۔ ”شوشو..... شوشو..... ارے یہ کیا؟ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا  
تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پرمٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔“

”شوشو“ ہی میں سونے سے پہلے کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے۔ ”میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں  
دھنکی ہوئی روتی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔“

”خوشیا“ میں کائنات کا منگ جھم جھم کے پٹلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پھل پھل کر اس کے اندر  
جار رہا تھا۔“

”پاپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں بانجھ ہیں۔ (بانجھ)  
..... محبت کا اسقاط بھی چوسکتا ہے۔ (بانجھ)

”اند ر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرے کو بھنبایا تھا کہ وقت پر کام آئے۔ (غیر)  
”جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو زمین کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر بڑے کچی غبار سے پھٹ گئے ہیں۔ (بلقذرا)  
”منہو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں  
گھس کر چھنے لگی ہیں۔“ (اس کا پتی)

”کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت اچھی لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا میں  
ہوا ہی ہوا ہے اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزادیتا ہے۔“ (رتنگ)

”انسان میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری نیا دہا ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ  
جالتے ہیں جیسے آبی کپڑے۔“ (دھواں)



۱۵۔ میں نے انھیں سس کے بالوں میں لٹکی کرنا شروع کر دی۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اٹکے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انھیں سے ٹوٹا رہا ہوں۔

۱۶۔ "اسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس۔ دوسروں کی بہت پردہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا تھا۔ (ذیاسلم)

۱۷۔ "محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لے کر مائٹھنٹا تک سب محبت کرتے آئے ہیں۔" (قبض)

۱۸۔ "زندگی کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک آؤنی جواب ہے جس کے دھانگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں ہے

دیا گیا ہے۔ ہم اس جواب کو اوجھڑتے رہتے ہیں۔ جب اوجھڑتے کو میٹر نے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آ جاتے گا تو ظلم سے زندگی کہا جاتا ہے، ٹوٹ جائے گا۔" (مصری کی ٹولی)

منٹو کے افسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے انداز بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثال فرماؤں میں نے سبب یہ بات بھی کہ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن یہ بظاہر معمولی معلوم ہونے والی بات منٹو کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منٹو نے منٹو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور کچھ تنقیدی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منٹو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منٹو کی جذباتی شدت کے انظار کے لیے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے ایک چلتے ہوئے غیر بخیہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال نمبر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آتی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے نشے پن کا احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ "آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گر سکتے ہیں" تو پوری تشبیہ پڑھنے والے کو منٹو کا منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے اس لیے کہ یہ جملہ جو خیال یا بیان کے اعتبار سے بالکل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے۔ بازاری عورت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا اقتیاز لگتی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں شاہجہ کی تو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرز فکر کی ایک خصوصیت ہے لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ مڑپیاں نیچے کر رہی تھیں اس کے لیے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لیے اکثر گھسنے والوں کو جو فکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جھلنے کیسے کیسے گہرا آبدار ٹکڑا لے کر منٹو کی فکر ہوتی۔ لیکن منٹو کے پاس سے شدید جذبہ کے انظار کے لیے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دینا کہ جیسے کی ظاہری حیثیت تو سادہ و خیر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کی گنا زیادہ ہو جائے منٹو کی قدرت بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ادنیٰ اس لیے کہ یہ کوشش کبھی کبھی نہیں ہمیشہ طور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت مثال نمبر ۴ کی ہے جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک قابل نفرت ہے لیکن نفرت اگر ایسے لفظوں کے ذریعہ ظاہر کی جائے جو بدیہی طور پر جذبہ نفرت کے مظہر ہوں تو بیان میں عموماً آجائے۔ منٹو نے اپنے انداز کو ہمیشہ عموماً سے بچایا اور سادگی بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثال نمبر ۵ تا ۸ اچھی ری کی خصوصیت کے لحاظ سے اوپر کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہاں ہر ایک کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لیے بھی شورش کے نام میں وہی لذت پیدا کر دی ہے جس کے افسانہ نگار کا دل پر ہر ایک آتا ہے۔

چھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے انداز بیان کی ندرت اور قدرت کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو نے اپنی مثالوں کے لکھنے سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف اسے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کیجیے ہیں کہ وہ نہ صرف تاثر اور ایک اور لطیف جذبہ قائم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک غیر مرنی اور غیر ملوی جس ایک شخص اور مرنی صورت کی نظر کے سامنے آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کیے ہیں۔ بانجھ اور مسقاط کا ایک واضح لغوی مفہم ہمارے ذہن میں نہ ہو سکتا ہے اس لیے جب منٹو محبت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہو سکتی ہے یا اس کا اسقاط ہو سکتا ہے تو ہمارا ذہن اس کا اثر قبول کرتا ہے اس میں الجھن اور تکتہ کی ایک نئی جگہ کی کیفیت ہوتی ہے لیکن جب آہستہ آہستہ وہ نئے شوق و ہوا میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ منٹو نے ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے اظہار کے لیے دو بے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور فکر کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھے لیکن منٹو کی چابک دستی کی بدولت یہ دو لفظوں اور جملوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انھوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار کر دیا جس سے کہ وہاں اس کی حیثیت سے اہل نہیں تھے بلکہ پڑھنے والے کے لیے سوچ بچار کے دروازے بھی کھول دیے منٹو کے اسلوب کی بدولت پسند ہی کے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔

دہریں سے لے کر پندرہویں مثال تک ہر جگہ منٹو نے بہت فرق کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو بھی بالکل سادہ جملوں سے سمجھی ایسی تشبیہوں اور تشبیہوں سے دوہرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے محل معلوم ہوتی جہاں منٹو نے انھیں کامیابی سے بڑا ہے اور کبھی بہت سی تشبیہیں اور تشبیہوں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کو محسوس نہیں کر سکتا ہے۔ دل کی بات ایک زندہ اور ذہنی حقیقت بن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ میں یہ ہیں مجھے اچھی طرح پہچان لو اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کو بے لفظی میں ماحق ہے۔

دہریں مثال میں منٹو کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر نہ ملے اور نہ ہی اس سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ مخصوص کیفیت جس کا بیان منٹو نے آئینہ کی طرح روشن اور صاف کی طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

نیز دہریں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے ہمیں ایک خبر یہ کہ کرنا ہے کہ

ایک عام چہرہ ہے اور اس نہر کی وضاحت کہے لیے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور طنز کی ایک بات معلوم ہونے کے منطقی ہے کہ کوئی شخص والا اسے جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ منٹو کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی مٹا بھی سادگی بیان اور اچھ ترین بات کو حد درجہ معمولی سمجھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت بابر کا رفاہی ہے۔

تہجری مثال میں بھی منٹو کے نگار اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور امتزاج ہے جہاں گہرے خیال اور عبارت اور معمولی سی تشبیہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سمجھنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور نقطہ واضح کرنے کا بہترین اور تیز ترین انداز وہ ہے جسے منٹو نے اپنایا ہے۔

منٹو نے اپنے افکاروں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جلوں سے ایسی مثالوں اور تشبیہ کی نظر میں بالکل حقیقہ اور بے حقیقت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے جن میں سنجیدگی و نہانت کا شائبہ تک سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور منٹو سے منٹو بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عمویت کو قصور آ اور خیال اور ذوق بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جہاں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دو اور متخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لیے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اور کہیں ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی نظر ہے۔ منٹو کے پورے اس اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا یہ تو نہیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے ترکش فن کے ترے — ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگائیے کہ اور ہمہ صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس کس طرح کا رہتا ہے۔

استاد منٹو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو قصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ کس قدر محروہ اور گہرا

”ان کے لال جھرمپن بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم

پر سے اوپر کی تھکتی کل کل کر جھڑپ رہی ہو۔“ (نیا قانون)

منٹو کے دل میں ایسا منٹو کے کسی کردار کے دل میں کسی چیز، کسی واقعہ یا شخص کا جو قصور ہے اسے دو ایک جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ، فقرے اور جلوں کی کمی نہیں۔ اسی طرح ان کا ذہن ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کرتا ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن متعلق بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جلوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں، اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے — اور اکثر بالکل معمولی

— وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جیتا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں انار دینے میں کامیاب

اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے۔ استاد منٹو کی زبان سے مارواڑیوں کو غریبوں کی گلیاں میں گلیاں

کھلانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرنے میں کہ ”نیا قانون ان کے لیے کھولنا ہوا پانی ہو گا۔“ منٹو کے فن کی بڑی

بہت دنگ کی نگاہیں گور کے کی آنکھوں سے چار ہونٹیں تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ ایک وقت آٹھنے سٹھنے کی بند وقوں کی  
تاریخ پر تھیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں گولہ بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔ بند وقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں  
ہوتی۔ صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مٹی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں بولوں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف توجہ نہیں کر سکتیں۔ لیکن منٹو کا دور رس تصور ہمیشہ نو  
پن کے زوال پر مشابہت تلاش کر کے اسے بڑی چمکی سے صرف کرتا۔ تھا اور ایک معمولی اور بظاہر بے حقیقت سی تشبیہ  
کی تازگی حاصل اور ایک گہرے توجہ کی عکاس بن جاتی ہے۔ بند وقوں سے نکلی ہوئی گولیوں جیسی اور بہت سی سیدھی سادگی کی  
مثالیں ماضی کے اہم تشبیہیں منٹو کے ہر افسانہ میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:-

”وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا سنکچہ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لمبوں  
پھوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے۔“ (پہچان)

”اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوتے تھے۔“  
(شو شو)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگتا ہے کہ کانتا پر مہنہ اس کے سانس آکر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت  
کو لڑکھائی کہ ”کیا ہرج ہے“ اپنا خوشیابی تو ہے۔ یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے روپ بھر کر اسے سناقتی  
ہو گئی ہے۔ ان سب سے شمار روپوں میں سے ایک یہ ہے:-

”خوشیا نے ہر سال وہ پلا ہو گیا ۱۲، کے بہتر پر ہر وقت اوگھٹتا رہتا ہے۔“  
(خوشیا)

بالآخر میں ایک منظر کا قصہ منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:-

”کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ڈرائی کی آواز بلند ہوتی اور میں معلوم  
ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران کسی نے زور سے ہنس لگی ہے۔“

یہ سب محض ممانہ سہی لیکن اس تک منٹو کے ہر کسی اور کے ذہن کی نارسائی اسے غیر معمولی بھی بنا دیتی ہے اور منٹو کی عظمت  
وہی رہتی ہے۔

”لکھی ————— یوں سمجھئے کہ کالوں کے رات بھر گھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس  
کے محل میں اتر گیا۔“

”بابا پردو گایاں جو سیدھ نے باہل پائی تو باب کے مانند اپنے منہ سے گل دی  
تھیں اس کے کالوں کے پاس نہری بھڑوں کی طرح پھنسانا شروع کر دتی تھیں۔“

(ضرر)

”دو گالیاں جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دکھل نکال کر پھینک دیے  
ہیں۔“ (نعرہ)

دو گالیاں۔۔۔ اس کے پی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر وہ نظر ڈال کر وہ ان دو  
پتھروں کو جو کچی جیلے لگتے ہی زتے باہر نکال لے۔ (نعرہ)

ایک گالی بادو گالیاں۔۔۔ میرے اور آپ کے بیچے دو ٹی سٹائی بے حقیقت باتیں ہیں جنہیں آد  
ہر ایک کے مزے سے ٹھٹھکتا ہے لیکن کشیولال کے دل پر ان کامیوں نے جو اثر کیا ہے اس کی شدت اور ڈپ کو  
ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہیں۔ اوپر کی چاروں تشبیہوں میں کوئی نیا پنا نہیں لیکن ان فرمودہ تشبیہوں سے منٹو۔  
اس سے عمریت میں خصوصیت پیدا ہوئی ہے سطحیت میں گہرائی آتی ہے۔  
منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچنے اور فضا قائم کرنے کی جو خدمت لی اس  
پہلی رونق پر یہ دھواں کی ہیں۔۔۔

”موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ریز کے جڑے پن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔“  
(دھواں)

”ایک کمر نرا اور ایک کمر تری پاس پاس پر بٹھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا  
کہ دونوں دم پخت کی ہوئی منہ با کی طرح گرم ہیں۔“ (دھواں)

”وہ کچھ اس طرح مٹی جیسے کسی نے بندی سے مٹی کپڑے کا تان کھول کر نیچے پھینک  
دیا۔“ (مصری کی ڈلی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دو کیچے اور اندازہ لگائیے کہ فٹ پوجیوں کو کیسے کیسے گوشوں میں سے  
پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنائے میں مدد دیتا ہے۔۔۔

”یہ انوکھا کاروبار ہی عجیب چیز ہے پردے پر شبنم کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کاروبار  
بہتر ہے۔“ (جمہ)

”اپنے آپ کو چھپانے کی بزدلی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان طیف بن کے  
رد کیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں مٹا یا گیا ہو۔“ (جمہ)

”وہ کرسی پر اس انداز سے بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہر امرہ بسا طے سے بہت بڑا  
پڑا ہے۔“ (جمہ)

”اس کی شہارت اب تو مٹی گھڑی میں گر رہی تھی۔“ (مجہد)

”نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے  
نئے مقابل کی طرف نحوٹھٹھاک کر بڑھتا ہے۔“ (نیاسال)

یہ تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک ہمدے کر اسے ایک ایسی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں جس  
میں تخیل اور نقش واضح ہے۔ مٹو کی تشبیہوں کا یہ اقتباس ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی سبب اور تیزی سے خالی نہیں۔ ہر تشبیہ کے  
پشت میں اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے مٹو کی فنی چابک دستی اس طرح بھل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا تاثر  
لے لے کر اپنی ذہنی اور جذباتی تالیخ اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہیں۔ مٹو کا اسلوب اظہار جس میں الفاظ، فقرہ اور تشبیہ  
کا استعمال ہے۔ مکمل تاثر کی تخلیق کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے  
وہ میانی حاصل نہ ہوتی ہو۔ اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو بھی دخل ہے۔ اور وہ ہے تکرار۔

اظہار مشرقی اسلوب اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے شاعر سے زیادہ نظم میں برتنا گیا ہے لیکن اردو اور فارسی میں عموماً تکرار  
تالیخ سنت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے لکھنے والوں نے عموماً مٹو کی ترمز اور تاثر انگیزی کا کام لیا ہے۔ گو  
لیتھائز محض مٹی ترمز و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ مٹو میں مٹو کی اسالیب کے اثر سے لفظوں  
تالیخ تکرار خاص عام ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی مثالیں ملتی ہیں لیکن کسی افسانہ نگار نے  
اسے وسیلہ کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا جیسے مٹو نے۔ مٹو کے مشہور افسانوں میں سے خوشیا، نغمہ، بلاؤز، ہنسک، نیا ناؤنا  
، آمروٹ افسانوں میں مٹو کا پٹھا اور قہن اس فن کے بڑے کامیاب مظہر ہیں۔

دو تین افسانوں پر نظر ڈال کر دیکھئے کہ اس تکرار سے مٹو نے کیا کیا کام لیے ہیں۔

”نغمہ“ میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالا خانے سے نیچے اترتا تو افسانہ نگار کے لفظوں میں :-

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس نگین عمارت کی ساتویں منزل میں اس کے کانہ صوں پر  
دھڑکی گئی ہیں۔“

چند دھڑکیں کا کرنا اور نہ کرنے کی مزا میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں اور وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سما جاتی جارہی  
تھیں۔ گالیوں کے کیشو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ مٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں ان  
دو جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل مٹو کی زبانی سنئے :-

”..... مالک مکان نے عرصے میں آکر اسے گالی دی۔ گالی..... یوں بگنے

کہ کانوں کے راستے پچھلا ہوا سیدہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا اور

اس کے سینے کے اندر جو مٹک گیا اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا.....“

”اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی متکبر محفل چکا تھا، سیٹھ کے بھائی کے چہرے پر قے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اس کا غرور تو باہر نٹ پاتھ پر پڑا ہے.....“

”سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی جتنی اس کی چڑی بھری گردن تھی۔ اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرٹ بھینک دیا ہے.....“

”ایک نہیں دو گالیاں — بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس نہ پہنچ سکیں بلکہ اس کی طرح بھنبھنا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔“

”چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکڑ ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کھل دیا گیا ہے چاقوں کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے..... گالی..... گالی..... گالی بھینک اسی طرح اس سے اُلجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھڑپیری کے کانٹوں میں کوئی پڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو سمجھانے کی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ زخمی ہوتی جا رہی تھی۔“

”سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا۔ دوسری گالی دی تو لمبی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو۔ پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلنے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے سوریوں سے باہر نکلے ہوں۔“

”جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں لگھلگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔“

”گالیاں — گالیاں — کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے بھنے کے اندر دھڑا ل کر وہ ان دو تھوکوں کو جو کسی جیلے لگتے ہی نہ تھے باہر نکال لے اور کچل

”بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے۔“

[illegible]

نعرہ میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے فطرت نے آہستہ آہستہ کمبیشو لال کئے ہنی اور جذباتی مہمان کو واضح کرنے میں مدد لی ہے اور اس تکرار اور بڑھنے ہوئے مہمان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی و فنی دوا پیدا کیا ہے جس میں کیشو لال نے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سٹ کر وہ نعرہ بن گیا جس سے کمبیشو لال کے دل کو مزہ و تسکین مل گئی لیکن سنسنے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ ”پگھلا ہے“۔ فطرت اپنے فن میں افسانہ کی تمہید اس کی اٹھان اس کے اعظم مروج اور اس کے انجام کو جو اجمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خلوص اور ہنماک سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں وہ نعرہ ان گالیوں کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔ تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے، تکرار ہی نے افسانہ کو آہستہ آہستہ اٹھان کی طرف لے جا کر ایک سوچے بچے انجام تک پہنچایا ہے اور تکرار نے اس تائثر کی تکمیل کی ہے جو قاری کے نقطہ نظر سے اس کا مقصود ہے۔

بلوڑ، شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے توحین کی اس جنسی بیداری کی کہانی ہے جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی مینوع کی کہانی منٹو نے چند نشانات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پر و کر تصورات کی لڑکی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک دن زمین کو:

”شکیلہ کی سفید بغل میں کالے کالے بادن کا ایک گچھا نظر آگیا۔۔۔ یہ گچھا اسے بہت

بجلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب

خوابِ ہنس اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بالی اس کی منجھیں بن جائیں۔

مومن کے دل میں اس کے بعد دھندلے دھندلے خیال پیدا ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر

ایک دفعہ جب اس نے اپنا ٹرنک کھول کر اپنے عید کے لیے بنے ہوئے نئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو.....

”رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا چھند آ گیا اور چھند نافذ آ ہی ان



کھڑے کھڑے کچھ میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکید کی نسل میں دیکھا تھا۔

اور پھر کہہ صاف کہنے ہوئے اس نے سائن کی جھکیلی کترنہ اپنی جیب میں رکھیں اور اٹکے دن یوں ہی الگ بچے کے دھانگے الگ کرتے شروع کر دیے.....

حق کی رو سے جسے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک کچھسا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ باتا رہا۔ مسطورہ۔ لیکن اس کے تصور میں شکیہ کی وہی بغل لٹی جس میں اس نے کانے کانے بالوں کا ایک چھوٹا سا کچھسا رکھا تھا۔۔۔۔۔

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤں کو دیکھتا تو.....  
 اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا اور اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے ہفتے۔  
 اور بالآخر ایک رات کو.....

..... جب وہ سو رہا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ ٹرپٹی صاحب نے پتھر کے کوٹلوں کا ایک بڑا ڈبہ اس سے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوٹہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی کھاٹ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولانا ہوا تھا۔ پھر یہ گے گے کالے رنگ کے غبار سے بن کر ہوا میں اڑنے شروع ہوئے۔ ہلست ہلست جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آدھی آگنی اور مومن کی رونق لپٹی کا جھنڈا کہیں غائب ہو گیا۔ پھندے کی تلاش میں نکلا۔ دلچسپی اور آن دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا۔ آیات کالی ساٹن کے بلاؤں پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی وحشت کی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہر پڑا کے اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب اس کے اٹھان، اس کے رقصاء اس کے فتنہ اور اس کے انجام اور پھر سرب باہمی ربط اور توازن میں فٹولے ایک خاص قصور کی حکمران کو فنی کی بنیاد بنایا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے چوہ طے کیے ہیں ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے لیکن نمٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ قصور ان کی جس نگار کو ایک خاص تاثیر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا کی حیثیت سے نمٹو نے اپنے لیے یہ امتیاز مخصوص کیا ہے کہ جب کسی خاص محل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثیر پیدا کرنے کو شمش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس محل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔ غور اور بلاؤز کی مثالوں سے نمٹو کے فو حکمران کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے چمک خوشیاں اگلو کا پٹھا اور قبض جیسے افسانہ

میں نے یہ کھائی دیتی ہے۔

منٹو نے تنقید کی طرح رقصاً و کولمبی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے  
 خیالوں میں برتا ہے۔۔۔ ہماری سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قہروں کا جو حیرت انگیز رقصا ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے  
 پختہ اور آہستہ پیش کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس رقصا کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماج کے مختلف  
 طبقوں اور طبقہ بندیوں اور معاشرتی شکلیں زندگی کے مختلف، مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد،  
 ایک دوسرے کے ظاہر اور باطن میں بددیہی فرق اس رقصا کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔ منٹو اس رقصا کو اور اس کے علاوہ زندگی کے  
 مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے یہ ایسے رقصا کو جو انسان کو قریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و مسرت کی برپائی کا باعث  
 بنتا ہے، ایسے محبوب، واسعے جس میں لفظ، فقرے اور افسانے کے مختلف اجزاء مل جل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں  
 یہ خوب کہا ہے۔

تصانیف کی مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

”اس گھر کا اندھا صیب کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے  
 نچے سر کے اوپر سکارا ہوا تھا کئی بار اس کے ہینڈ لکے کپڑے ان کھنٹیوں پر  
 ٹپک کر پھر اس کے بدن سے چمٹ گئے جو دیوار میں کڑی چمٹ ہی تھیں۔“  
 اسی لحاظ فی تضاد کی ایک شکل بلاؤ، میں اس طرح دکھائی دیتی ہے۔

... نوکروں کے متعلق کون غور کرنا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں بیدل طے کر جاتے ہیں اور اس پام کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔  
دو کو دار ایک ہی صورت حال کو اپنے اپنے جذبات اور قصورات کی روشنی میں کس کس نگاہ میں دیکھتے ہیں، اس کا اندازہ مناسب نہیں کیا جاسکتا اور سب کو جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا لیا ہے۔ ان کئی تصویروں میں سے ایک یہ ہے:-

”ایک ہفتہ سے سوگندی نے گھڑی واسے کی تصویر اتاری اور دوسرا اٹھاس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو بڑھا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا جیسے ہاتھوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کی سمیت سوگندی کے ہاتھ میں تھا۔

نور کا قہقہہ لگا کہ اس نے ”اونہ“ کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دونوں سے جب فریم زمین پر گرے اور بج ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے جیسی شکل سے اس نے جنس کر اٹا کہا۔ اچھا کیا۔ — مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔

آخری جگہ میں ملاحظہ فرمائیے کہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک پرفورم جھوٹی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھیے :-  
..... ماحول ڈر گیا۔ وہ گری ہوئی ٹوٹی اٹھانے کے لیے جھکا تو سگندی کی گرج  
نسائی دی۔ خبردار۔ چڑی نہنے وے وہیں۔ تو جانتیرے پوچھا پچھتے ہی میں  
اس کو مٹی آڑ کر دوں گا :-

سگندی کے اس تلخ طنز پر سے جھلے میں کئی تضاد ایک جگہ آکر جمع ہو گئے ہیں۔ ایک تضاد تو وہ ہے جو سگندی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز پر ہے جس میں سگندی کا ایک ایک لفظ ڈوبا ہوا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس غوم سے ظاہر ہے جو گزرے ہوئے واقعات اور موجودہ صورت حال میں تضاد میں کر رہا ہوا ہے۔

”ہنگ اگا خانہ جنباتی کشمش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فن کارانہ تصویر ہے :-

”ہمت رنگ وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل  
پہچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے غارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور گون  
کے پوڑے پتنگ پر اسے پیو میں ٹکا کر سو گئی :-

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر مٹھ کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے فنکارانہ میں یہ تضاد بعض دوسری معنوی صورتوں میں بھی رونما ہوتا ہے۔ ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اب ایک جوہرست کی مثالیں پیش کی گئیں ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ چمکنے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً فقرہ کے پورے افسانے میں انہیں اور انجام کا تضاد و مطبوع کی زندگی کے انداز کا تضاد اور دو آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو متضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح ظاہر ہے اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں مٹھ کی کئی مٹی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے ماسٹر شائیکہ پر انسان نے محبت کی ہے۔

مٹھ کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے ہے جنہیں ہم تکنیک کے بہت اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال اس کے تاثرات و صورتوں دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ سچ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص صحت و ریات کے مطابق ان میں سے تیزوں جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔ ہمارے اچھے افسانہ نگاران مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عمدہ برآ ہوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی خصوصیت اور منفرد انداز فکر کی بنا پر جزئیات نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے چنانچہ اس خاص نقطہ نظر سے مٹھ کا ایک اپنا رنگ ہے جو کہ دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔ مٹھ نے ہمیشہ کسی واقعہ یا کردار کے تاثرات و نفوس کی وضاحت کے لیے ایسی جزئیات

اہمیت دی ہے جسے دوسرے غوراً غور اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ مختصر جس طرح بیان و اظہار خیال کے معاملہ میں اور اپنے قصودات کی وضاحت کے لیے تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی قدرت اور زکرائی پیدا کرتے ہیں اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انھوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی پہلو کو اہم اور غیر معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ وہ واضح کی ہو یا کردار کی انھیں معمولی رنگوں سے شغوغ اور رنگیا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں دیکھئے :-

”مار واپڑوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو صلوانی کی دوکان پر آدھر سیدھی کی تسمی بی کر ایک بڑی ڈکارتی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چومتے ہوئے ایسے ہی بلند آوازیں کہا: ”ہت تیری ایسی کی تیری۔“

یہ استاد گنگوہی نیا قانون میں — اسی افسانے میں انہی کی دو تصویریں اور ملاحظہ ہوں :-

”چھاؤنی بچھ کر گنگوہی نے سواری کو اس کی منزلی مقصود پر اتار دیا اور حبیب سے بکریٹ کھال کہا میں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر منگایا اور اگلی نشست کے لئے پر بیٹھ گیا۔“

گھوڑے کی بائیں گھٹنجی کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور کچلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا :-

”صاحب بہادر! کہاں جانا مانگتا ہے؟“

اس سوال میں بلا کا طنز یہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کتنے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا اور پاس ہی کال کے اس طرف جو دم سمی لکھیناک کے نکتے سے ٹھوڑی کے بلانی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔

انہی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہمیں استاد گنگوہی کی پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملا ہے۔ ”چھاؤ“ میں گوپال کے پتا جی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے :-

”اس کو اپنے پتا جی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی..... اس کے پتا جی لالہ پتھم داس تھا۔ وہ ڈانٹ گھوٹ باند سے ل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی ڈانڈ بٹھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔“

”پچھائی“ میں کچھ شب زندہ دابوں نے جن کمروں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر فوٹو نے یوں بنائی ہے :-

”کوئی نے میں ایک بہت بڑا پٹنگ تھا جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر سیلی سی چادر

بھئی ہونی تھی بلکہ یہ بھی بڑا تھا جس پر نہ بن رہا تھا کہ کسے کسول کرے جو تھے تھے پلنگ  
کے ساتھ والی دیوار کی کانس پر تیل کی ایک میل بونل اور لکڑی کی کٹھلی پڑی تھی۔ اس کے  
دائیں میں ایک کھانسی اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ڈٹا ہوا  
تھا جس پر ایک کالی گرگانی رکھی تھی۔

پھر اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن سید نہیں تھے۔ کوٹ کی استینوں کے  
آخری حصے کثرت اشغال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوٹے نکل آئے تھے  
کا کر کھلا تھا اور قیص بس ایک اور دھلائی مٹی مارتی تھی۔ (بائچھ)

”باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹے وقت جب لوہے سے لوہا کڑا اور دھکوں سے  
چھت میں ایک گونج مچی۔ اور جاتی تو برہمن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت جلد معلوم ہوتی۔  
(بلاؤز)

”وہ ساکون کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوڑھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں  
جو کاندھوں تک نکلی تھیں پلنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اس کی کانپ  
بانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ وہیں بازو کی بھل مٹی کی آلود  
گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار ہونڈنے کے باعث نیل رنگت اختیار کر گیا تھا  
جیسے بچی ہونی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا ہوا رکھ دیا گیا ہے۔“  
(پلنگ)

یہ نثر کی جزئیات نگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور جن کی اتنی باریکی خصوصیت یہ ہے کہ مٹھو نے کسی واقعہ کی مصوری کی ہے  
کسی ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بنانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں کبھی  
چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو بڑا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ مٹھو فن کار تھا اور فن کار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی  
— دوسروں کو معمولی اور حقیر نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں بشرطیکہ فن کار انھیں صحیح انداز سے اور  
بر عمل برتنے پر قادر ہو اور یہ قدرت مٹھو میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انھیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظروں میں مٹھو بھی  
جزئیات کی قدر دیکھ چکے انھیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے مٹھو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔  
مٹھو کے فن کے مختلف پہلو جن میں افسانہ کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوب نگارش کی ساری خصوصیتیں

نہل ہیں یہی تیشیں، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقروں کی بھرپور اور ان کے استعمال میں تضاد کا صرف اس کی شخصیت مزاج اور اندازِ نظر سے متاثر ہوئے ہیں۔ غٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے اسے بغیر جھک، غوف اور اندیشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں اس کے جذبات پسند مزاج اور توانا شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

غٹو کی نظر میں گہرائی بھی ہے اور گہرائی بھی سیاست، معاشرت، دین، اخلاق۔۔۔ معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی بائبل میں اور تختہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی بُرائی اور حبیب و مبغض کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی شخصیت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح حبیب و مبغض پر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا منہ سے غمزہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو بڑھو کے میں رکھتی ہیں۔ کن سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کن سے انسانی زندگی اس سکوی و مسرت سے محروم ہوتی ہے جو فطرت کا مقصود ہے۔ فطرت و انسانی زندگی کو اس کے سب اجتماعی دار و کار کی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں فطرت کے بنائے ہوئے راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پڑی طرح مردان پرستے دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت نا انصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ نا انصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون نا انصافی کر رہا ہے۔ دیکھیں کس طرح کر رہا ہے۔ غٹو نے اس نا انصافی کو مٹانے، اس کا پردہ ناکش کرنے اور اس کا ظلم توڑنے کو اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بے حد اہم کام کا بیڑا اٹھانا بجا ہے خود ایک اہم ہے لیکن اس سے سخت تر اہم ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔ غٹو کی مخصوص نظر نے انھیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساس و روش نے انھیں جس کام کو بہت قابل کیا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔۔۔ ہر نا انصافی کرنے والا سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے دار و کار ہیں۔ اجارہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رخ سے غریب اور ظلم کے پر سے اٹھ کر اس کی حقیقت کے گناؤں سے کھنکھار کر رہا ہے۔ اس لیے اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا بڑا اتنا بے خوف اور جری ہونا چاہیے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لیے سیدہ سیدہ رہے۔ غٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے خوفی، یہ جرأت اور یہ مردانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر وار کو دلیبی سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شکستہ طبع سے جھیل لے۔ غٹو کے فن پران کی اس بے خوفی نے بڑا اثر ڈالا ہے۔۔۔ اچھا لکھی اور بُرا لکھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی خرابیاں ہر جہہ کر کے انھیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے کہ چوٹ کھانے والا ہلکا کر دے۔ انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور بڑا اس طرح کہ حیاتِ انسانی کے بعض مستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی وزیدہ نگاہی سے بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے ناموروں کی ناٹش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔۔۔ اور کبھی کبھی حقیقت جہی اور حقیقت نگاری سہ دنیا والوں کو صرف عریانی سکھاتی ہے۔ یوں اس بڑے پہلو کا ایک اچھا پہلو یہی ہے اور اس کی تاویل یہی کہ کد کا کی جاسکتی ہے کہ۔ سب کچھ بڑا مزاج تھا، اس کی شخصیت تھی اور غٹو فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن میں اپنے آپ

کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں جنہوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور منفردیت کے پہلو نمایاں کیے ہیں سیاسی ماحول معاشرتی انتشار و مدہوشی کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ منٹو نے اپنی زبردست قوت ارادی سے ہر طرح کے انتشار کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کر دینے والے حالات کا مقابلہ بڑی دیوری اور جوا فردی سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو غلوب کر کے اپنے جیسے فتح کی راہ نکالی اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے لیکن دیکھنے والوں نے بڑے درد و غم سے ساتھ حالات کے طوفان انتشار اور کشمکش کی ٹھکرا اور ریٹے سے اس کے پیروں کو ڈنگا گئے بھی دیکھا ہے زندگی کے دشوار گزار سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض منزلوں میں اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آمادہ پایا ہے شکست کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر عجز اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لیے کسی آب زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشمکش اور عارضی ماحول اور بیرونی زندگی کے اس تصادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب نہ آتی ہے اور منٹو کی شخصیت کی عظمت اور بلندی نمایاں ہوتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور پائپانے کا پیش خمیر بنی ہے۔ منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ ہوں تو اس کی حیات فن کے ہر دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے توازن کی جھلک نمایاں ہے کبھی ایسا ہوا ہے کہ منٹو نے مدتوں کچھ نہیں لکھا کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن ایک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح توازن اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا مثلاً منٹو کے مجموعے "تھنڈا گوشت" کے سب افسانے (سوائے تھنڈا گوشت کے) ۲۳ اور ۳۱ جولائی ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے، بادشاہت کا خاتمہ (مجموعہ) کے سب افسانے یکم جنوری ۱۹۵۰ء اور ۲۳ جولائی ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح یزید (مجموعہ) کے سب افسانے ۱۴ اکتوبر اور ۱۵ نومبر ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ منٹو کے فنی دور کے بعض اور مجموعے جو زیر ترتیب اور زیر اشاعت میں منٹو کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان افسانوں کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ لہجوں اور رنگین باتیں جو سب سے زیادہ ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے منٹو کے کم تر درجے کے افسانے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن انحطاط کی منزلوں سے گزر رہا ہے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی بعض مجموعی حیثیت سے ان کی کیا اچھا انداز نہیں کہہ سکتے مہاجم عشق کی ذمات، ان کی جدت پسندی، ان کی شوقی طبع، ان کی گہری طنز اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ منٹو کی فادرا کلانی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں اس دور میں بھی اسی ناز کی اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے۔۔۔ بہت اچھے اور بڑے سب افسانے۔۔۔ دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جن خصوصیت

یہ سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔ یہ تو کو فطرت نے ایک قسم کو بنا کر بھیجا تھا اس نے جب اساتذہ شری شری کی جب بھی اس میں فطرت کی ہی جوتی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی اور جب اس نے مجبور اور سیر کرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو احساس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے عمارت کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کئی چڑکی باتیں معلوم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ اس کے خطابی میلان اور فن کے ساتھ  
اس سے باباں لگاؤ نے اس میں ان گڑکی باتوں سے پوری طرح غائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہندوم  
بہت کمائی ہے، مگر انسان اور بہر واقعہ خواہ وہ کننا ہی کم حیثیت اور کم پای محسوس کیوں نہ ہو کمائی کا بڑا سروسز اور دلچسپ موضوع ہے  
مگر اس کے یہاں ایک شرط ہے اور بظاہر بہت کمائی معلوم ہونے کے باوجود یہ شرط قصہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے اور ضرور طریقہ ہے  
کہ قصہ والا ایک ایسا انداز اختیار کرنا جتنا ہو کہ کمائی شروع بخیرتی اس میں اوکھاٹی ٹھنڈیا پر صحت والے ہیں انتہائی نجات اور بے تکلفی کا شستہ  
قد و دانے چھنے یا ٹھنڈے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصہ گو اسے اپنا ہمراز سمجھ کر اسے اپنے مولیٰ کی بڑی سے بڑی بات بتائیں گی نام نہیں لے گا وہ  
اپنی ذاتی اور غم میں اسے پوری طرح شریک نہ کرے گا۔ کمائی ٹھنڈے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جہان وہ غالباً ہرگز اس سے  
محسوس نہ کرے گا۔ اس بات بھی اس طرح کننا کہ جیسے وہ بے حد اہم ہے کمائی کہنے والے کی بڑی حیثیت ہے۔ منٹو قصہ گوئی کے میدان میں یہ حیثیت حاصل کرنے  
کو بہ زیادہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح بتائیں کہ اسے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا کہ دوسرے اس کے عجوبے کو اس کے  
دماغ میں کو اس وقت کی خوشی میں پہلے ہوئے عجیب و غریب تصور کو صحیح سمجھ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے۔ حقے معمولی سی بے کیفیت  
بات اس طرح کمائی بن سکتی ہے اس کی مثال منٹو کا افسانہ "جرے وان" ہے۔ کمائی میں کس طرح باتوں کا مزاجیدار کے اپنے اور بڑھنے والے کے احساسات  
پر متاع طاعت پیدا کی جا سکتی ہے اس کا اندازہ "پیچھے مس ٹین والا" میرزا نام ملو جائے تو نوٹنگ آواز میں علامہ کا پورا رحمت خداوندی کے پھول ٹھوٹ  
اطلاقیں لاکتا پھر اتنی اور والد صاحب جیسے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کس طرح عجیب و غریب اور ناقابل اعتبار خیال افسانوں میں کیا گیا  
اور مثالی باب رستمی کے علافہ نگارش بن کر پڑھنے والوں کا دل بردھکتے ہیں یہ پرن، صاحب کرامات، بادشاہت کا خاتمہ کہنے کی دعا اور موت کے لینے  
یہ افسانے پڑھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے منٹو اپنے مغربی ماحول میں سے اتنی آسانی سے کوئی کمائی پیدا کر دیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو  
انداز بہرہ و فساد کے لیے استعمال کر سکتا تھا یہ بات اور بھی زیادہ حیرت انگیز تھی لیکن یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ منٹو کمائی کرنا جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی فنی کمزوریوں  
کا اعتراف اپنے انوی دو خطاطوں میں بھی وہ کمائی کرنا مجبوراً نہیں تھا اسی لیے اس انحطاط کے زمانہ میں منٹو کے افسانے شرق سے چرمے جاتے تھے۔

ہی ساری باتیں ہیں جو کل محل کر خٹوٹے فتن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور اذیت اور عظمت بھی دیکھیں نہیں اگر اس مسئلہ کو افانوں کا موضوع  
مستطاب و دی نہ سوتی پڑھنے والوں میں کبھی بھی ایک ہنگامہ اور گرما گرمی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگرچہ نکاو دینے والی باتیں کہنے اور رکھنے پر حاضر ہار نہ کرتا  
اور طنز کو اصولوں کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہر میں بھجے ہوئے تیروں کی طرح برستے ہوئے سردوں کو کچلنے  
کے نام پر بغلت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی تجویز کو نفسیات کی نازک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچ و بازار میں برسا کرنے سے  
بچھڑا سکتا اور غلط فہمیاں اس سے بھی بڑا فتن کار بنتا جیسا کہ وہ اب تھا۔ اس لیے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ اس چند کردار



کے باوجود بہت بڑا فن ہو رہا تھا۔ اس کے شاہدہ، تخیل، تصور، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا بڑا انگرزنگ ہے اور تنصیف  
 نو انسانی۔ — دی قوت و کونائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے اور آنے والے پردہ میں ہر طرح کے حوادث کے علاوہ  
 فن کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی۔ — منور گب — لیکن اس کا فن اس قدر نہیں درے گا۔

---

## غالب

(۱)

بنی مچوہری عبدالغفور صاحب سرود

صاحب چودھری صاحب

ہیں تو خدمت بجا لیا۔ مگر اس کے سلسلے میں نہیں باتیں چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آرو میں مولوی سید فرزند احمد کے مکان کا پتہ مجھے  
 کچھ بھیجتا کہ میں ان کو تنہا لیتے مگھوں۔ دوسرے یہ کہ تیار اس خط کو واپس بھیجتا ہوں۔ حضرت صاحب کی دشمنی بدلت کو حرفت، محرف  
 صاحب کے ترو تروں میں کون ہے جس نے غالب کے خطوط پر شے ہوں اور وہ چودھری عبدالغفور سرود سے ناواقف ہوں۔ چودھری صاحب، بڑا ہرہ خلق  
 بنے۔ دہا میں تھے۔ وہ دن کا خاندان کی صدیوں سے وہاں آباد ہے، غالب کے عزیز ترین دوستوں میں تھے اور ان کا شمار ان کے ایہ نماز شاگردوں میں ہے  
 ان کے دو دووں و بالوں میں سر رکھتے تھے اور غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ اشعار اب بہت کم لکھتے ہیں۔ غالب کا یہ نادر قدر اہم نے ان کے خاندان کے  
 ہونے میں اس پناہ سے رخصتا لایا ہے احمد۔ مگر سرود نے ۳۴ سطروں کا ایک اردو قصیدہ اور ۹ قطعات مروج کے لیے میرزا کے پاس بھیجے تھے۔ یہ قصیدہ کاغذ میں پر  
 اس ہائے فقر سے شام لکھے ہیں۔ وہ جو غالب کی اصلاح سے مزین ہیں اتفاق سے میرے ذمہ آگیا۔ قصیدے کے گیارہ اشعار پر غالب کی اصلاح ہے جس قطعات  
 میں سے نام لیا ہے۔ ایک قطعہ انہیں پسند آیا تو میرا ترغیبات مار وہ لکھ کر اسے قلم زد کر دیا ہے۔ خدمت سے مراد انہی شعروں کی اصلاح ہے۔ مگر صیفیر بلگرامی (۱۲۲۹ء)  
 نے جو اب کام کے لڑے اور میرزا تارکے شاگرد۔ ان دونوں کے تعلقات کی داستان دیکھنی ہو تو احوال غالب ملاحظہ فرمائیے۔ مگر صیفیر بلگرامی کے گھر میں ۱۲۸۳ء  
 ایک فیاض صاحب نے لکھا ہے اسی نسخے میں تنہا کے قطعات لکھے ہیں اور اب غالب مگر کو ہمارا کاؤ کا خط لکھا چلا ہے ہیں۔ اسی لیے ان کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔  
 بہت ناگوار ہے تنہا تنہا کا خط ضرور لکھا ہوگا لیکن یہ خط بھی ان کے عزیزوں غلوں کی طرح اب تک ماحول میں ہے۔ یہ صاحب داد سے ماں باپ ترو احمد ہیں  
 ان میں راستہ ہے۔ ان کا ذکر یہ قیص صحت و تذکرہ شاگردان صیفیر اور تذکرہ یا لادیشی میں موجود ہے مگر لکھ کر میں ان کی تصویر بھی بھیج رہے ہوں تو اس نے  
 ان اشعار کی تعداد بڑھ کر ساتہ ہزار آج کل وہی دسمبر ۱۹۱۱ء میں شائع کر دی ہے۔ وہ مراد صاحب عالم مار ہر دی ۱۲۱۱ء - ۱۲۸۸ء میں کے خطوط سے  
 ان اشعار کا پتہ ہی کران سے پتہ نہیں بدلتے۔ سرور ہی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

میرزا ان کے ایک لفظ ہی، مگر پڑھایا ہو تو وید سے بھی نہیں ایمان نصیب نہ ہو وہ غلط پتہ تو یہ آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ حرفت بہت

ان کی نقل کے پھر مجھے پتہ کیجئے تاکہ جو اب لکھنے میں سعادت حاصل کروں (رخصتا لایا ہے احمد)

اپنے ہاتھ سے ٹکھو اور مجھ کو بھیجنا کہ میں ان کو ہفتیت میں خود ٹکھوں۔ واللہ ہرگز مجھ سے فرمائیں گیا۔ تشریف دینا میں ہوں  
 کو کیا کروں۔ قلم بوجھ مجھ پر سے اٹھا لو۔ قیسری ہاست یہ کہ یہ معاملہ حضرت صاحب پر ظاہر نہ ہو اور میرے اس خط کا جواب  
 جلد آئے۔  
 غالب - ۲۵ - دسمبر ۱۸۶۶ء

۲

۲۴ مارچ ۱۸۶۶ء

اے میری جان!

کس وقت مجھ سے غزل مانگی کہ میرے واسطے نیکرین کے جواب دینے کا زمانہ قریب آگیا۔ میرا دل اب جس اور بات  
 رہا ہو وہ اہل علم سے دریافت کرے۔ تمہاری خاطر عزیز ہے۔ ٹھوکی۔ بارے نفس ناطقہ نے بڑی بھلی طرح مدد دی ہے  
 پہنچتے ہیں۔ لیکن نہ شاعرانہ نہ عارفانہ۔

## غزل

میں دشتِ فم میں آہوئے حیات و پردہ ہوں	ملک نہیں کہ بھول کے بھی آرمیہ ہوں
گزانہ کشیدہ کہ اشکِ سب چکھو ہوں	ہوں در و مند، بہر ہو یا اختسبیار جو
از بسکہ تلخی غم جبرائیل چشیدہ ہوں	جاں لب پر آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
میں معرعتِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں	نہ شجرت سے علاقہ نہ ساحل سے نہ اطل
نہ داغِ فنا وہ ہوں نہ دامِ چسیدہ ہوں	ہوں خاکسار پر کسی سے ہے مجھ کو لاگ
میں بوسفِ بقیعتِ ادا خستہ ہوں	جو چاہیے نہیں وہ مری قد و منزلت
ہوں میں کلامِ لغز، و نئے ناشیدہ ہوں	ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
پر عاصیوں کے فرقتے میں میں برگزیدہ ہوں	اہل و رع کے حلقہ میں مرچند ہوں ذلیل

پانی سے ساگ گزیدہ ذریعے جس طرف آمد  
 گزتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(۳)

نام جناب ذکی دہوی مرحوم

بندہ پرور!

آپ کا منایت نامہ پہنچا۔ آپ اندرون شرافت نبی و لیاقت جس آفتاب و ماہ تاب ہیں۔ آپ کا کیا کہنا ہے۔  
 نے یہ خط فرمایا امین الدین احمد خان بہادر الی فرار کے نام۔ بھلا اس کے شروع میں درج ہے اس خط میں اگر وہی جو غزل ہے۔ وہ شائع شدہ ہے خود سے  
 ہو گیا کہ غزل کب بھی گئی تھی۔ وہ ایک نام

در میں علم و فضل ہیں وہ پایہ بلند حاصل کیا ہے کہ دوسرے کو یہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔ غرضی کے اشعار میں نے دیکھے اور پسند کیے۔ ہرگز سہل منتفع کہے ہیں۔ آمد و فضیحت، بہارت سلیم، الفاظ نہایت بخیدہ و تہین، احواف، حرث شستہ و رفتہ جو خوبیاں نظم میں پائی ہیں وہ سب موجود و قریبی درج میں اتنا مبالغہ کیوں کیا۔ میں تو اعلیٰ سخن کا گہرائے خاک نشین ہوں۔ شہنشاہ کہاں سے ہو گیا۔ خیر آپ کی اداوت میرے لیے موجب سعادت ہے۔ جو مصائب شر میں خود ستائی کو بڑھا جاتے ہیں کیا انہوں نے بخیر و شاعرانہ کجوزلیغہ نہیں سنا ہے یا اساتذہ مستند ائمہ الٰہی کا غریب کلام ان کی مغرے نہیں گزرا؟ ————— اللہ اعلم الامر خاص میں کیا کیا بلند پروازی اور اسے غلام کی کیسے کیسے درج طرازی کی ہے۔ نیکو مالگیری کہتا ہے۔

چیت داسے ہادہ نگاہیں مصفا جو ہرے

حسن را پروردگارے عشق ما پیغمبرے

تین شعر میں تین شاعروں کے سبیل نمونہ یہاں لکھا ہوں باقی فائدہ کلام اہل سخن پر حوالے کرتا ہوں ایک شاعر کہتا ہے۔

پر اعلیٰ سخنے رسول ایمن

سنائی و نژدوسی از آستان علم

دوسرا اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہے۔

پر ملک سخن آں عدلئے قدیم

کہ معنی یکے باشد از بند کا علم

تیسرا کہ اور ہی رائے لگاتا ہے۔

حومن کوثر کہ مشرب الودعت

ناوردانے نہار گئے منت

ناوردان یعنی سواری اور پادگین اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں مغلچ اور حمام وغیرہ کا پانی جمع ہوتا ہے۔ غرض بالذکر من شطیبت الشعراء۔ میر جانا بے بدت اڑھا ہو گیا ہوں اس پر امراض متعارفہ مرصعہ میں گرفتار قوی بالکل مضلل اٹھا بیٹھا لکھا پڑھا سب مشکل اچھا تا اگر تکریم جواب میں تاخیر ہو جائے معاف رہوں۔ والسلام مع الوفا الاحترام! فقط!

دعائے خیر کا غالب فقیر غالب ۱۸۶۸ء

روز چارہ شبنہ

(۴)

نواب امین الدین احمد خاں

بھائی سے دوسرا ال ہیں ایک قویہ کہ مجموعہ نثر کے خاتمے کو کیا کروں۔ وہ مبنی تھا اس حقیقت پر کہ نول کشودہ نواب مینا مال دین خاں نواب امین الدین احمد خاں، نواب احمد بخش خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد وارثوں کے درمیان تقسیم ہو گئے۔ ۱۸۶۸ء سے اپنی وفات تک

سے واسطے افطاح کے لے گیا۔ جب یہ واقعہ ہوا تو اب اس کو نکال کر اول اور اس کی جو کئی تخریج ہو ہیں وہ لکھ دوں۔  
اور اتنی اشعار جو زین العابدین خاں متعلق ہیں۔ اس واسطے کہ تم اپنے ان کے مجموعے کی تصحیح اس سے کرو۔ پھر یہ مرقع ہوا  
یا مرنے والا ہے۔  
تو محمد ابو الفداء کی جلد اس پر پہنچی ہے۔

جواب کا غالب :- غالب

(۵)

بنام عزیز اللہ شاہ عزیز صنی پوری

خان صاحب عنایت منظر سلامت !

آپ کا مرواتی نامہ آیا۔ اور اب پنج دفعہ منظر فرزند ہونی خوشامد فقیر کا شیدہ نہیں۔ نگارش تمہاری پہنچ رہے تھے سابق کی تحریر سے لفظ اور  
معنا بڑھ کر ہے۔ اس میں یہ معانی نادرک اور الفاظ آب دار کہاں؟ اگر ایک اس سے تمہیں آگاہ کرنا ہوں کہ یہ نثر فہوری کی نہیں

بقیہ حاشیہ :- ۱۸۶۹ء تک لڑو کی جاگیر کا انتظام انہی کے ہاتھ رہا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیز درختاں ان کے بھائی تھے اور جاہلاد میں  
شریک لیکن انہیں امور ریاست سے کچھ تعلق نہ تھا۔ امین الدین کے انتقال کے بعد نواب علاؤ الدین احمد خاں علاقائی ان کے جانشین ہوئے۔ ان سب  
لوگوں سے غالب کے گہرے تعلقات تھے۔ اس وقت پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں۔ لیکن قریب بہ یقین۔ ہے کہ مرزا نے یہ دفعہ نواب امین الدین  
احمد خاں کو لکھا ہے اس پر تاریخ درج نہیں۔ راقم کے خیال میں اس کا زمانہ تحریر ۱۷۸۰ء (مطابق ۱۸۶۳-۱۸۶۴ء) عتقاد الدین احمد) تک ۱۲۸۰ء میں  
مشی نول کشور دہلی آئے اور مرزا سے ملے انہوں نے کجاست نثر چھاپنے کی خواہش ہی ہر کی مرزا نے نواب ضیاء الدین خاں سے متوجہ لے کر مشی  
صاحب کے حوالے کیا۔ چھپنے میں تقریباً پوری قمر مرزا مایوس ہوئے اور انہوں نے یہ دفعہ لکھا۔ بالآخر کلیات چار سال کے بعد ۱۲۸۴ء میں مطبع نول کشور  
سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن اب بہت کمیاب ہے۔

۱۔ زین العابدین خاں طاعت، مرزا کی سال کے بیٹے انہیں غالب اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ پہلے شاہ فقیر کے شاگرد ہوئے پھر مرزا سے اصلاط  
لیختے گئے۔ دیوان اردو کے کئی نسخے ہندوستان میں موجود ہیں۔ لکھ غالباً تاریخ عالم معارف الفخا کا وہ ترجمہ مراد ہے جو مولوی کوکم الدین دہلوی نے کیا تھا۔  
اور مطبع العلوم دہلی سے ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا تھا (عتقاد الدین احمد) تک عزیز صنی پوری ۱۸۶۴ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے وہیں عربی و فارسی کی تعلیم  
خود کے ہنگامے ہوئے تو لکھنؤ چھوڑ کر صنی پور (انارڈ) اپنی خیمال چلے گئے اور وہیں انہوں نے اپنی پوری عمر گزار دی۔

تصانیف کی تعداد چالیس سے کم نہیں جن میں دیوان اردو، لڑو لالت، نظم نکل، کلام نظم فارسی، اور مقامات، پیش کش تہ جہانی، پنج دفعہ  
ترجمہ سناڑ مجاہد و منظوم اور فتویٰ فتح حسین و درج اب شاہ نامہ قابل ذکر ہیں عزیز کا انتقال ۲ جولائی ۱۹۲۸ء کو ہوا۔

یہ دونوں دفعہ غالب کے وفات کے کسی مجرمے میں اب تک شائع نہیں ہوئے (عتقاد الدین احمد)

لکھ شاہ صاحب کی فارسی نثر کا مختصر مجموعہ جو چھپ بھی گیا ہے۔

ہے۔ ارادت خاں متخلص و دامغ عالم گیری سرودوں میں سے ایک شخص تھا۔ دینا باز اور بیچ و قدر اس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ کوئی گستاخ  
کی طرز ایجاد کی ہوئی اس کی ہے۔ موجد سے متعلق بہتر نکلا۔ یعنی تم نے خوب لکھا ہے۔

نقاش نقشب ثانی بہر کشد اول

جہاں آپ نے فخر کا مطلق لکھا ہے وہاں آپ بہ حرف میرے صفت ہوئے ہیں۔ متوقع ہوں کہ یا شعر نکال ڈالو یا صفت کی  
جگہ متخلص لکھ دو۔

نجات کا طالب، غالب

(۶)

نور الدین شاہ عزیز صنی پردی

معنی شناس نہ مشفق، خطا میں جا ست۔ یہ جو کہ یا میرا شعر نکال ڈالو یا صفت کی جگہ متخلص لکھ دو موجب ملل خاطر کیوں ہوتا اور اس  
سے یہ نتیجہ کیوں کہ پیدا ہوا کہ میں تمہارے کلام کو اصلاح نہ دوں گا۔ تمہیں عذر کہو کہ شعر کو عذر متخلص سے ہے یا نام سے .....  
صفت سے۔ میں نے تو اصلاح دی تم نے بڑا مانا۔ زمین تمہارا موعج ہے اکثر لکھی کی طرف جاتا ہے تمہاری اس نثر میں حک و اصلاح کی  
گنجائش نہیں۔ پہنچ و قدر سابق سے نفاد و منہا تمہاری عبارت بہتر ہے۔ اس قول کو بار نہ کرو گے تو خفا اس کا وہی اور حاج طبع ہوگا  
مع سو وطن۔

نجات دہندہ :- غالب

(۷)

بہر صاحب

بقدر جو دہا

آج میں نے وہ انگریزی معنی دوا کر دی اور صبح کو آپ کا کما رسودہ اور میرے معنی کا رقعہ آپ کے نام کا منجھ کو دے گیا۔ اس  
وقت کی شکر میں کیا خدمت بھالانا ہمارے ایک ہوائی بھیجتا ہوں اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اٹھا کر راجہ صاحب کی خدمت  
میں بھیج دیکھئے۔

نجات دہندہ :- بہر صاحب، نور الدین شاہ عزیز صنی پردی اور بیچ و قدر اس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ کوئی گستاخ  
کی طرز ایجاد کی ہوئی اس کی ہے۔ موجد سے متعلق بہتر نکلا۔ یعنی تم نے خوب لکھا ہے۔

جہاں آپ نے فخر کا مطلق لکھا ہے وہاں آپ بہ حرف میرے صفت ہوئے ہیں۔ متوقع ہوں کہ یا شعر نکال ڈالو یا صفت کی  
جگہ متخلص لکھ دو۔

نجات کا طالب، غالب (ابکر علی خاں رام پور)

امید بہ تشددِ یمیم، تخفیفِ یمیم و دونوں طرح متعلیٰ ہے ایسا نہ ہو کہ جناب مودع اس کو زحمت سمجھیں۔ پہلے اور دوسرے مودع  
میں بتخفیفِ یمیم ہے اور دوسرے مصرع کا یمیم مشدد ہے۔

غالب!

(۸)

بنامِ جناب علاء الدین خاں مدنی

جانِ غالب!

دو شاعر تیار سے ممتا تو پہنچے۔ مگر کئی مرغا ہیں سے ہے۔ بیشتر اوس کے کلام میں مضامین حقیقت آگئیں ہیں۔ لیکن دامنِ گداز دو  
گربانِ گداز اور اس زمین میں اس کی عزال ہیں نے نہیں دیکھی۔ حاجی عمر مہاں قدسی کی عزال اس زمین میں ہے۔

در بزمِ وصال تر بہ گامِ تماشا

نظارہ زنجیدنِ مژگاہاں گداز اور

یہ ایک شعر اس کا ہے یا ہے۔ بھائی مہاراجا پدگان ہے یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے یہ اسلام کہہ اور یہ شعر میر بڑھناؤ۔

گمانِ زبیت بود بر منتِ زبے دو حے

بدستِ مرگ و لے بد تراز گمان تو نیست

مجھے کا ذکر و گمن کے فکر پڑ رہے ہیں۔ وہ تم کو شعر و سخن کا طالب ہی زندہ ہوتا تو دیں کیوں زچہ آنا۔ مجھ پر سے یہ تکلیف اٹھو!

اور تم اسی زمین میں شعر کہہ کر بھیج دو میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ حصائے پیر بھائے پیر والد میرا کلام ہندی یا فارسی کچھ  
میر سے پاس نہیں ہے آگے جو کچھ حافظہ میں موجود تھا وہ لکھ بھیجا اب کچھ یاد آگیا وہ لکھتا ہوں۔

باسن کہ ماستقم سخن از ننگ و نامِ چیت

در امرِ خاص محبت دستور عامِ چیت

بستمِ ذوقِ دل کہ دو چشمِ ازاں پڑ است

بادِ دستِ ہر کہ بادہ بہ خلوتِ خود و مدام

ماستہ عظیم و بود سے دوا کے ما

از کاسہ کرام نصیب است خال را

مژگنِ مجذوبِ شراب و نہ بینی بجامِ چیت

دانہ کہ خورد و کورڈ داد اسلامِ چیت

ماستہ گمانِ مدیشہ حلال و حرامِ چیت

تا از فلک نصیبہ کاس کرامِ چیت

غالب اگر نہ طرہ و صحف بہم فروخت

وہ سد چرا کہ زرخ مئے لعلِ نامِ چیت

۱۔ شعر زیادہ آئے، یاد آگئے، نیر گلشنے کو یہ بھی کافی دیکھتی ہیں۔

دل برد و حق آنت کہ دہ نترال گفت	بیدار توں دہ و ستم گر نترال گفت
درد ز گلشن لہجہ و خیر نترال برد	درد ز گلشن بادہ و ساغر نترال گفت
رخشدگی سادہ و گردن نترال جست	زہدگی بادہ و پردہ گر نترال گفت
ہیرتہ دہ بادہ و ساقی نترال خواند	ہموارہ تراشد بت و آذر نترال گفت
در گرم دہ کے سایہ و سرچشمہ بخویم	ہما سخن از طوطی جے و گور نترال گفت
ہنگامہ سر آمد چہ ذلے دم و نظم	گر خود سخی رفت کبشر نترال گفت
آں باز کہ در سیمہ نہارت نہ و عطاست	بردار توں گفت و بہ نترال گفت

کاشے عجب افتاد ہیں شیفہ مارا

موسن ہرود غالب و کافر نترال گفت

کوئی امید بر نہیں آتی	کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہنچی	اب کسی بات پر نہیں آتی
موت کا اکسوں معین ہے	نیز کیوں ملت بھر نہیں آتی
واغ دل گر نظر نہیں آتا	جو بھی لے چاہے گر نہیں آتی
جانتا ہوں تو بے عت نہ	یہ طبیعت اور نہیں آتی
ہم دہاں ہیں جہاں ہم کو بھی	کچھ ہماری خبر نہیں آتی
کہہ کس منہ سے جان لگے غائب	شرم تم کو مگر نہیں آتی

نکتہ پس ہے عظم دل اس کو سنائے نہ بنے	کیا جسے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں جانا تو ہوں اس کو مگر لے جذبہ دل	اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

۲۔ یہ خط پہلے چھپ چکا ہے مگر نامکمل، پہلا خط اس مصرع پر ختم ہو جاتا ہے۔

بدستہ چرا کہ زرخ سے لعل خام بیت (لاحظہ ہو مکاتیب غالب مرتبہ مرتضیٰ دوم)

خط کی باقی عبارت اس میں نہیں آئی لیکن اصل خط میں موجود ہے جو غالب کسی وجہ سے ابتدا ہی میں حذف ہو گئی میرزا نے اپنی ایک درد آرد و غزلیں بھی اس خط کے ساتھ بھی تھیں جو مضمون خط سے واضح ہے۔ لہذا اس سے ایسی غزلوں کی نقل کرنا، آئی تھی جنہیں لگانے دیا جاسکے۔



اس ذاکت کا جزا ہودہ بچلے ہیں تو کیا  
 دھو دھو سر سے گڑھے لٹھلٹھائے نہ گئے  
 جبر پر تاج ہے لیے بدن سے خط کو کر اگر  
 کوئی پوچھے کہ یہ کیسے تو چھانے نہ بنے  
 عشق پر دور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب  
 کر ٹٹائے نہ گئے اور بھٹائے نہ بنے

## سیر سید

(۱)

بنام ذاب تہ علی حسن صاحب رحم

جناب والا مناقب مخدوم و محرم جناب مولوی محمد علی حسن خان بہادر دام حیاتیکم  
 آپ کا ذوالش نامہ مورد تیسری دیکھ انسانی مشاعرہ صحت طبعہ کرشی لٹ تہمدادی پائندہ روپیہ پہنچا۔ ہامشہ افتخار و ذوالعہ ہزارہی  
 اعزاز ہوا۔ گو علیہ کو میں سب سے بہتر کہتا ہوں مگر اس فیاضانہ مرحمت کو مدستہ معلوم کے اور قوم کے لیے خالی نیک جانا ہوں۔  
 کچھ شبہ نہیں کہ مدستہ معلوم اور میری کوشش فلاح قومی دنیاوی اور دینی سے متعلق ہے۔ بلکہ اگر نیت نیک اور تمام کام جتنا اللہ میں تو  
 خدائے اہد ہے کہ جزائے اعلیٰ الامال بالانیت سے جو بخ ایمان ہے عہد و دم نہ لگے گا۔

آپ باور کریں یا نہ کریں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ اس اسلامی اخوت اور ہمدردی قومی کی جزائے غیر ضرور خدائے تعالیٰ  
 آپ کو عطا فرما دے گا۔ یہ ترجمہ کو یقین کامل ہے جب کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس وظیفہ سے کسی طرح کی شہرت و یادگار آپ  
 کو منظور نہیں ہے اور بلاشبہ طیرات مخفی ہزارہ و جہ خیرات ملی سے بہتر ہے۔ مگر نیک نیتی اور بے ہوائی کو تسلیم کر کے دوسرے پہلو پر  
 بھی غور فرمائی ضرور ہے کہ اعلان اس قسم کی خیرات کا جو قومی بھلائی سے نہ شخصی مراعات سے متعلق ہے اور قوم کو اس قسم کی خیرات  
 کی شدہ ضرورت ہے۔ ذریعہ ہوگا اور دل کی توجیب کا اور خیرات دینے والا اجر اللہ علی اللہ کرنا علیہ میں ضرور داخل ہوگا۔ پس  
 علاج کے کاموں میں باعلان خیرات کرنا اگر نیت نیک ہو تو در چند اجر کا مستحق کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس اعلان سے قومی عظمت اور  
 اسلامی شوکت ثابت ہوتی ہے جو ہماری حقین قننا اور آرزو کے ولی ہے۔ آپ نے مدستہ معلوم کو عطا نہیں فرمایا اور جس سے  
 نہ دیکھا جو اس کے خیال میں آتی نہیں سکتا کہ وہ کیسا ہوگا۔ اس کی عمارت جس شان و شوکت سے بنائی قرار دی گئی اور جس نور  
 کہ اس وقت بن چکی ہے۔ قومی عظمت اور اسلامی شوکت کو ثابت کرتی ہے۔ ایک انگریز نے کہا کہ یہ خیال کہ مسلمانوں میں قومی جوش  
 اور ان میں سے قومی عظمت جاتی رہی۔ ملی گڑھ میں جا کر اور مدستہ معلوم کی عمارت دیکھ کہ بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ  
 جب کہ غیر قوم کے لوگ اس کی دیر اوروں پر جا بجا مسلمانوں کے نام کثرت سے کندہ دیکھتے ہیں تو اندہ بھی زیادہ قومی عظمت اور اسلامی  
 شوکت کا اثر ان کے دل میں میٹتا ہے پس ان وجہ سے آپ مجھ کو مجاہد بنے دیں کہ اس روپیہ کو ایک مناسب فخر میں داخل کر لیں

اور اس کے ساتھ آپ کے نام نامی کی بقید ولایت نشانی تہم رکھوں۔  
دوست معلوم کی درمیان کی عادت جو سترل مالی سے موسوم ہے بہت بڑی عادت ہے سات ہزار روپیہ اس کی طاقت کا ٹیگنڈ ہوا ہے  
معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ طاقت آویسے کی۔ اس میں نہایت عیش اسلوبی سے ایک سو بیس ہتر لکھتے گئے ہیں  
جس بزرگ نے پانسو روپیہ عیا ہے وہ روپیہ اس کی تعمیر کے فنڈ میں جمع کیا گیا ہے۔ اور ان پتھروں میں سے ایک پتھر پر اس کا نام  
کنڈہ کر دیا ہے۔ جس کا نام کنڈہ ہو چکے ہیں۔ نیز قوم کے لوگ جب آن کر دیکھتے ہیں تو قومی عظمت کا بے انتہا اثر ان کے دل پر  
ہوتا ہے اور مسلمانوں کے دل بھی ایک قسم کی فرحت اپنے میں پاتے ہیں۔ پس یہ ارادہ ہے کہ آپ کے در عطیہ کو بھی اسی فنڈ  
میں داخل کر دیں۔ اللہ آپ کا نام بقید ولایت کنڈہ کر دوں جب کہ آپ نے یہ روپیہ عنایت کیا اور مجھ کو متولی کیا کہ اس کو کسی کا بغیر  
میں صرف کر دیں تو اس کاپ کو اس میں مداخلت مزود نہیں ہے۔ آپ ثواب میں داخل ہو گئے تب جو گناہ ثواب کا میری زندگی پر  
ہے۔ اگر میری نیت بخیر سے تو خدا سے امید ہے کہ مجھ کو بھی میری نیت کے موافق جزا دے گا۔ اس تحریر کا میں آپ سے جواب  
نہیں چاہتا میں کہوں گا وہی اللہ چاہے گا۔

محمد بن یحییٰ کاشانی کا جنس اب کے سال الہ آباد میں ہو گا۔ ۱۲۸۰ء اور ۱۲۹۰ء اور ۱۳۰۰ء ہجری قمریہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ پہلے  
اجلاس میں وہ امر متبعی پادری کے جو بحث کے لیے پیش ہوں گے۔ مگر تمام بخشیں تعلیم مسلمانوں سے متعلق ہوں گی۔ غالب محسن الملک  
مولوی سید محمد علی خان خانقاہی اسباب تہذیبی مسلمانوں پر لکھ دیں گے۔ ہمارے کالج کے ایک نہایت نیک اللہ عالم پروفیسر انگریز  
مشیر آف فزیشن اور جارجیا میں اسلام کی ترقی اور دلائل کے مسلمانوں کی حالت پر لکھ دیں گے وہ یہ ثابت کریں گے کہ بغیر کسی مذہبی حکومت  
کے مسلمان اسلام پیلا ہے۔ اس وقت انہی دو مصاحفوں کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر خانقاہی مولوی سید علی بلگرامی جو مجدد آباد سے گئے  
داسے ہیں وہ بھی کوئی لکچر دیں گے۔ مگر نیک تمام علم میں ان سے مسلمان آئے مسلمان اس کے سوا کچھ نہ ہو گا۔  
گزشتہ سال کی اجلاس و پورٹ بلور نذرانہ آپ کے ملاحظہ کیے ہو چکا ہوں، انھوں نے فرمائی جاوے اور آپ مجھ کو  
ہمیشہ اپنا نیا زمانہ ایک عاجز نیا زمانہ مقصود فرمادیں، آپ کی خدمت میں نیاز و نجات ارسال کیے بغیر عادت میرے فکر کا ہو گا۔ والسلام  
بیکم و بختہ اللہ و برکاتہ !

خانقاہی سید احمد علی گڑھ ۲۰ نومبر ۱۸۹۰ء

(۲)

اب سید علی من مرموم

جناب مولوی صاحب مخدوم رکن مہتمم من اہل انصاف مولوی سید محمد علی من خاں بہادر  
غوازش نامہ عالی عمرہ ۱۸۹۰ء و ۱۸۹۱ء ہجری قمریہ میں کیا۔ جو کہ آپ نے دیکھنے کے بعد مسلمانوں کے حق میں سرکار عالیہ سے  
سی فرمائی۔ اور خدمت معلوم اور اس ناہی کے حق میں گناہ الخیر فرمائے اس کی نسبت بخیر اس کے کہ اگر کمال علی اللہ اور کیا کہہ سکتا ہوں  
لکھ کر عالیہ کو تائید درست معلوم میں مافی ہو گا۔ حضور شاہی وجہ سے کوئی بغیر سے بہت کچھ غلو باتیں نسبت خدمت معلوم کے مشورہ

کر رکھی ہیں۔ علاوہ اس کے ایک عام خیال نہایت حساسات و غیرت اور مہارت کے عہد وہ ہو گیا ہے۔ اس خیال کو کوڑنا اور یہ بات دل میں ڈالنی کہ درحقیقت جس امر کی مسلمانوں کو عزت دہشت ہے اور جس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی مذہب پر ذلت ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے اس میں تاہید کرنا اور اس ذلت سے مسلمانوں کو نکالنا سب سے بڑی حساسات میں شامل ہیں۔ ..... اور ظاہر ہے کہ دین میں یا شکیلیں کچھ کام آنے والی نہیں ہے مگر انگریزی نہ جاننے کے سبب روز بروز مسلمان ہندوستان ذلت و خواہی میں پڑتے جاتے ہیں۔ عہدہ مانے سرکاری سے روز بروز خارج ہوتے جاتے ہیں اصلی مہرے ان کے ہاتھ سے نچتے جاتے ہیں۔ ہندو بنگالی روز بروز قریاں پاتے جاتے ہیں اور مسلمان ہر امر میں ان کے مغلوب و دست نگر ہونے جاتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو ہندوؤں و بنگالیوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے یا ان سے مغلوب نہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دینا درحقیقت ہندوؤں اور بنگالیوں پر ان کو فتح مندرکنا ہے اور اس زمانہ میں جو حال مسلمانوں کا ہے درحقیقت ان کی تعلیم انگریزی میں اور ان کو اپنی حساسات میں داخل ہے مگر سرکار عالیہ کو یا عوام مسلمانوں کو اس خیال کی طرف ..... خیالات سے ہے۔

مدرسۃ العلوم میں مسجد کی قیہ شکل نہ ہونے سے درحقیقت طالب علموں کو ناذ کی تکلیف ہے۔ نواب سر آسان جہانے جس قدر روپیہ دیا تھا اس سے مسجد کو کسی تعمیر ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی پر ایک چھپر ڈال دیا ہے جس میں ناذ ہوتی ہے۔ وہ سو طالب علموں کے قریب پاکی وقت ناذ پڑتے ہیں۔ ان کے دھڑکے سے پانی کا اہتمام بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس کے سیرے کنواں بھی بن رہا ہے، مسجد کے صحن میں دھڑکے سے پانی بھی بن رہا ہے۔ اگر سرکار عالیہ مسجد ہی کے لیے تاہید فرمائیں گی تو بہتر ہے اسی کی کسی قدر تکمیل ہو جاوے گی۔ میں کل یہاں سے علی گڑھ جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر کوئی تاہید روٹنگی مسجد پال مقرر کر کے آپ کو اور وزیر صاحب کو اطلاع دوں گا۔ ہمارے سب کام تو کثرت علی اند ہوتے ہیں، جو خدا کو منظور ہو گا ہو گا۔

کار ساز ما بھیکر کار ماست

نیکر مادر کار ما آزار ماست

جو خدا کو منظور ہے وہ ہو گا۔ مگر آپ نے جو سنی دلکشش کی اس کا شکر ہم پر واجب اور اجر دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ والسلام علیکم!

خالکد

سید احمد۔ الہ آباد، راسٹ ۱۸۹۱ء

(۳)

بنام نواب سید علی حسن صاحب

جناب عذوقی و مکرہی!

بجواب عنایت نامہ مٹس ہوں کہ جو آپ کی غرضی ہے اس کی تعمیل میں ہم سب کو اختیار ہو گا۔ تعمیل اور شاہد ہو گی۔ بعد ازاں مغرب ہم سب حاضر دولت خانہ ہوں گے اور وہاں سے کیا ناکارائیتیں چلے جاویں گے۔

خاندان بادشاہ دولت زیادہ والسلام !

خانہ سید احمد ۲۲ ستمبر ۱۸۹۱ء

(۴)

برادر صاحب گل حسن مرحوم

مخدوم کرم بندہ جناب ابوالنضر قاب سید علی حسن خان بہادر

بہ سلام سنون التماس یہ ہے کہ بلحاظ اس شفقت اور عنایت کے جو آپ کو میرے حال پر ہے اور بلحاظ اس قسمی  
بہر دی کے جو مسلمانوں کی ترقی اور بہبودی کی آپ کے دل میں ہے۔ مجھے جرات ہوتی ہے کہ آپ کی خدمت عالی میں ایک  
مرزوی التماس کروں۔

آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دفتر درست العلوم کے ہیڈ کوارٹر نے بذریعہ جعلی چٹوں کے ایک اور خط لکھا تھا۔ درست العلوم میں  
جو باب ہیں جن میں غلطیوں کی تصحیح کے سبب سے نقصان کثیر ذرا امانت درست معلوم ہو گیا۔ اگر وہ جن و تصرف صرف ذات  
ای میں ہونا تو صبر کیا جاتا۔ مگر اس جن و تصرف کے سبب پچاس ہزار روپیہ ایک کا مدرسہ پر فاضل ہو گیا اور اگر ذرا فاضل کی ادائیگی  
جلد تندرہ ہونے کی جاوے تو اس کا سود اس قدر بڑھ جاوے گا جس کا ادراک ناممکن ہوگا۔ اس لیے یہ تجویز ہوئی ہے کہ اس زراعت  
کو چند ماہی سے جس قدر حد ممکن ہو ادائیجاوے۔ چنانچہ اس کے لیے چند لکھ لایا ہے اور اجاب دہ زراعت لکھی سے قریب  
دس ہزار روپیہ کے چند دینے کا وعدہ کیا ہے اور اگر لوگوں نے بھی اس میں چند دیا ہے۔ اس لیے میں آپ سے بین امریکی  
درخواست کرتا ہوں اور امید ہے کہ آپ اس پر توجہ فرمائیں گے۔

اقل یہ کہ آپ بھی اپنی ذات خاص سے اس نقصان کو روک دے کہ اگر ممکن ہو تو چند جناب بیگم صاحبہ سے بھی اس باب میں عرض و معروض کریں۔ اگر جناب  
ممدتہ بھی کچھ عانت فرمادیں گی تو اس وقت میں نہایت مدد پہنچے گی۔  
اگرچہ میرا ارادہ تھا کہ چند جناب بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھی کوئی عرض لکھوں۔ مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اگر آپ سے  
اس باب میں کچھ ممکن ہو تو عرض معروض کیجئے۔

تیسری درخواست یہ ہے کہ علاوہ اپنی ذات خاص اور چند جناب بیگم صاحبہ کے اور لوگوں سے بھی اگر ممکن ہو تو اس  
اد کے لیے کچھ چند وصول کیجئے۔ آپ کی کوشش اور سعی سے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ وصول ہو جائے گا۔ والسلام بیگم۔

خانہ

سید احمد - علی گڑھ

۲۲ جون ۱۸۹۱ء

(۵)

بنام نواب سید علی حسن مرحوم

جناب مخدوم رکوم معظم من ابوالنضر نواب سید محمد علی حسن خانی بسااور  
 محمد یحیٰی صاحب احکام تھارہ روپکارہ جناب کا خدمت و خدمت ستمبر ۱۸۹۶ء سے نصف قطعہ نوشتہ سے تعاونی ایک ہزار  
 روپیہ جو آپ نے ادا فرمایا اسی شفقت و درگاہ نہایتی انصاف و کالی عنایت فرمایا ہے میرے پاس پہنچا۔ میں آپ کی عنایت و شفقت  
 کا دل سے شکر ادا کرتا ہوں اور شکر ادا کرتا رہوں گا۔ اور یہ حریفہ نیاز و لہور و سید نصف قطعہ ثانی وٹ نہ کر و خدمت عالی میں برسل ہے  
 و التیام مع التیام!

خالک

سید احمد علی گزہ - ۸ ستمبر ۱۸۹۶ء

محمد حسین آزاد

(۱)

بنام محمد نوح دمنوی ضلی شہری

آپ کے حسب الرحمن کا خیال قابل جزاء تعریف کے ہیں اور یہ عنایت خاص جو بندہ آزاد کے حال بہ  
 مہول ہوئی ہے اس کا شکر یہ ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں اپنی طبیعت کا حال کیا بیان کروں۔ آپ تصویر منظر کے ہیں میری یہ حال  
 ہے کہ کئی برس ہوئے آئینہ و کھینا چھوڑ دیا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ کبھی آئینہ سامنے آجاتا ہے تو اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا۔ جو  
 شخص غرو اپنی صورت دیکھ کر شرماتے اسے فوڈ گراف اتروانا اور تصویر کو اس عالم شیر کرنا کب گوانا ہوگا۔

دو برس ہوئے ایک دوست رستے میں سے ہمارے گھر کے مجھے لے گئے اور میری تصویر اتروائی۔ اگرچہ رنج ہوا۔ مگر پھر  
 شکر خدا کیا کہ الحمد للہ اسے صبح الاحضا سلیم احمد و قیادہ پیدا کیا ہے اور دلکھا ہے۔ حقیقت اب میں اپنا حال کیا عرض کروں۔ قیادہ  
 جینے کے بعد آج استاد احمد بنانے کا ارادہ ہے۔ اگر خدا پر را کرے۔ کیا کروں فرصت نہیں ہوتی اور جو وقت بچتا ہے کہتا ہوں  
 کہ چار سطری لکھوں گا۔ بنانے کو پھر دیکھ لیا جائے گا۔ آج کل دیوار الہی کھڑی ہوئی۔ اس میں اکثر کے اسلئے دریاہ کا حال آپ  
 اسی طرح پڑھیں گے جس طرح آپ سیاست میں شراکتے آدوولا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ برائیکہ میرے حال کے بعد اس کی تصویر  
 بھی ہو۔ چند تصویریں ہم پہنچانی ہیں۔ مگر بعض اب تک نہیں ملے ہیں۔ اگر آپ کے ذریعے سے ممکن ہو تو مزید مطلع فرمائیں۔

محمد حسین ضلی وٹ - فروری ۱۸۹۶ء

(۲)

بنام میر حسن چہر آباد

جناب میں اہوام اقبالکم وصلی اللہ العالیہ!

تسلیم۔ آپ کا رحمت نامہ تو پہنچا مگر اس نے رنج کو دودھا کر دیا۔ کیونکہ نہایت دل شکستگی پائی جاتی تھی۔ بے دل ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ مگر اللہ العالیٰ موجود ہیں۔ اللہ اللہ پہلے سے اچھا ہو گا۔ میں نے انہیں احتیاطی کچر نہیں لکھی۔ آپ کو بھیجے گا کہ رجوع قلب سے عرض کرتے ہیں۔ سب مشکلیں آسان ہوں گی۔

تجھے پھر کون سی مشکل ہے لے تیر  
اگر تیرا علی مشکل کشت ہے

میں گزرا رو سیاہ کس منہ سے کہوں کہ دعا کرتا ہوں۔ غیر جو کچھ ہے خدا قبول کرے۔ دنیا کے اعتبار سے اتنا ہوا کہ جہاں جہاں ہو سکا خیالات کو بدل دیا، جہاں جہاں ہو سکا کلمہ کو رسائی دی ہے۔ جو کچھ خدمت میں پہنچا ہے لا خد فرمایا ہے گا۔ میرے پاس بحیثیت احوال کے پہنچنے کا کوئی رستہ نہیں، آپ ہی کوئی تسلی نامہ لکھیں تو لکھیں اگرچہ غیروں کو اس بات کا یقین نہ آئے لیکن غالباً آپ کے دل پر اس فقرہ کا اثر ہو گا کہ مجھے شاید ہی کچھ آپ سے کم رنج ہو۔ میں دعیا اور میں نے میرے میاں نے اس مرحوم کی عازریت پر بھی۔ مجھے امید نہیں کہ ان کے بیٹوں نے پڑھی ہو گی۔ حضرت آپ ہم لوگوں کو نہیں جانتے آپ کے بد جہانئے ہیں۔ ہم کچھ لوگ لوگ ہیں۔ اللہ ان کے صدقے سے، ان کی خاک آستان کے صدقے سے، ان کے گزرنے کے صدقے سے خیر و برکت شامل حال رکھے۔ او۔ فی الحال تو میری عرض ہے کہ خدا آپ کی بات کو بنا دے۔

لفظ و الدعاء بالتماس الدعاء!

آؤدہ ۱۵ فروری ۱۳۴۶ء

## امیر میانی

(۱)

پیش کشی خیر سلسلہ کی تکریم قریبی میر آبادی

نو چشم من۔ کل قطعات تاریخ بھیج چکا ہوں۔ ایک قطعہ تاریخی اپنی طرف سے بڑھادیا ہے، اس کے بعد خیال آیا کہ نام سے تاریخ پیدا کی جائے۔ اس وقت ایک صورت سے موزوں ہوئی اس کو ملے بھیجتا ہوں۔ اگر یہ قطعہ پسند ہے تو خیر۔

حفت کہ بانو بخاک و کتہہ شد سبز چاک  
سال مرگ از نام آن مرحوم پیدا کرد امیر

۱۲۹۹ = ۱۵۳ + ۱۱۴۶

چاہیے کہ رسید و وزن تاریخوں کی اور کیفیت پسند اور ناپسند سب عزیزان و ایمان انہیں کے لکھ بھیجے اور میں تاریخ کا کندہ ہونا قرار پائے اس سے بھی اطلاع دیکھئے میرے ایک شفیق سفیر و شیرازی میرے پاس تقریر لکھتے تھے انہوں نے اس تاریخ

کو چند کہ کے دو مصرعے نقل کے اس طرح موزوں کیے ۔

اغریہ قائم مرا تا دیدہ چشم روزگار

قائم زنیسان کو از دور بخم آمد کنوں

قائم آئم امیر احمد از نام پور

۱۲ جنوری ۱۸۸۳ء

(۲)

بنام مرزا داغ دہلوی

مصدر لفظ اقم۔ قدیمی کرم سلاست۔ سلام منون اخلاص مقرون۔ مدت کے بعد فراخ نامہ آیا۔ منون یا مامدی فرمایا۔ ہندو نواز مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب ظلم انداز کیا ہو۔ یہ میرے مقدر کی نارسائی کہ خط نہ پہنچا ہو۔ بہر کیف جرم ناکوہ کاغذ خواہ ہوں۔ اخبار گو کہ پور میں قیام نے آپ کا خطاب استاد السلطان ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا چھاپا یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا۔ مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ مسرور نہ ہو سکتا تھا۔ عزت افزائی جو سرکار دولت دار نے قلم سے فرمائی وہ میرے سرور اور آئندہ ترقیوں کی امیدوں کو ٹھکانہ ہے۔ یہ خدا جلد فرمادے گا۔

شکایت جو آپ نے "صمیم خانہ عشق" دیوان دوم کے نہ پہنچنے کی لکھی ہے وہ دیوان چھاپا کہاں؟ درہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا۔ تاویفات کہہ کر حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پہنچا معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ نے شک و حسد سے نہ گزرا میں افسوس کہ اتنی مدت تک یکجائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں۔ میاں بڑے ہو گئے ہو یہ شبوہ چھوڑ دو کہ زہدتی رکاوٹ کے لیے ایک بات قرار دی ہے۔

آؤں تو میں خطاب لینے ہی کے پہلی اپنی تاجیت کو نہیں سمجھتا اور پھر درخواست دے کہ خطاب مانگنا یہ تو بالکل پسند نہیں۔ میاں اب تو وہ وقت آگیا کہ مجرم و مغرور کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے ملنا ہو کوئی اور حوصلہ نہیں ہے۔

آپ کا تازہ کلام دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ میں کہتا کیا ہوں جو یہ محسوس آجی انورہ دہنا ہے۔ کبھی کسی گلدستے والے کے اصرار سے کچھ لکھا ہوں تو وہ چھپ چکا ہے۔ یہ زرافیں چشم بدور، آپ کے واسطے ہیں کہ شعر کے سوا کوئی فکر نہیں۔ خدا جمعیت خاطر فرمائے۔

۱۸۹۱ء میں نظام دکن میر محبوب علی خاں نے مرزا داغ کو رشتہ السلطان کا خطاب دیا۔ اخباروں میں اس کا تذکرہ چھپا۔ امیر میانی نے بھی دیکھا۔ انہی دنوں میں مرزا داغ کا خط امیر کے پاس آیا۔ لیکن انہوں نے اپنے خطاب و اعزاز کا ذکر نہ لکھا تھا۔ اس خط کے جواب میں امیر صاحب نے یہ خط لکھا۔

مخبر یعنی مرزا داغ کے خط میں۔

مرزا داغ نے اپنے خط میں امیر صاحب کے خطاب کے متعلق اعتناء کیا ہو گا اس کا جواب ہے۔

ارشہ یار آستان سلطان ہونے کی شنائی تو نا-یا تمنا و یا استاد برسوں کہا گیا ہے اب جو وہ وقت آیا تو  
استاد کی شیرینی نثار دے۔ امید ہے کہ کسی کسی رسم رسل و سما کی رہے۔ میں ابتداء سے تمنا دوست اور خیر خواہ ہوں۔ میری طرف  
سے گمان غاصد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا کھدوں۔

۱۳ مارچ سنہ ۱۳۱۲ھ آئبر فقیر

## داغ

(۱)

باب صاحب حسن علی خان امیر جاگیر دار

نواب صاحب شغل شہار سلمہ اللہ تعالیٰ

میں دن سے خدا کا فطر ہوں احباب نثار دے۔ لفظ بی جو شرکار کے واسطے ہے اس پر خفا ہوں میں سنہ خوب بھاڑا ہے۔ پانچ  
ہاویہ بڑی سے لائیں پچاس بدیاں سے گئے دس آپ سے مانگتی ہیں ورا ان کو بھاڑیے گا۔ میں نے جو ان کو خدا لکھا ہے۔ وہ  
انہ کے خدا میں ہے اس کو اتار سے لے کر آپ پہنچائیں تو بڑی عنایت۔ ایک مظلوف اور بھگتا ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ پہلی سب  
تو ہیں مہینہ میں صاف چڑھ گئیں کہا بھی کوئی آتی ہیں۔ یہاں خیریت ہے۔ گرمی کی شدت ہے۔ بچوں کو دعا تیں۔ لفظ  
ضیغ الملک داغ دہلوی یکم جون ۱۹۰۳ء مطابق ۵ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ

(۲)

باب صاحب حسن علی خان امیر جاگیر دار

نواب صاحب سلام!

میں غیر کا طالب ہوں، عرصہ کا منظور نہیں۔ مرمت کی کیا صورت ہوئی اس بارش میں مشکل ہے۔ بی عجاب کل سے وارد ہیں۔  
اند آپ کی شنائی۔ ان کا مکان گرا، جان بچ گئی۔ اس کی مرمت جو رہی ہے۔ یہاں تو ٹھکانا نہیں۔ زیادہ نیاز!

ضیغ الملک داغ دہلوی

یکم اگست ۱۹۰۳ء مطابق ۱۵ جمادی الاول ۱۳۲۱ھ بروز یک شنبہ

سے بے تکلفی اور غرض کا کیا کہنا!



## ڈپٹی نذیر احمد

(۱)

جناب سید علی حسن خان بہادر

جناب عالی!

کرامت نامہ پہنچا۔ میں نے حقیقت واقعی جے کم دکلاست بالمشافہ عرض کر دی تھی۔ اب کامیابی ہو تو اور ناکامی ہو تو دونوں صورتوں میں جناب کا احسان میرے ذمہ ثابت ہو چکا اور میں دت و نعمت مند رہوں گا۔ اگر کسی سے مقابلے کے لیے سہارنہ نہیں کی گئی تو ناکامی کا احتمال ضعیف ہے۔ لیکن آپ کے خط میں اس کی کچھ ملاحظت نہیں فرمائی۔ یہی حکام انگریزی کی سفارشوں کا حال یہ ہے کہ بیس برس سے میں سرکار انگریزی سے بے تعلق محض ہوں۔ دس برس کے قریب جید آباد و راولپنڈی کے بعد سے خانہ نشین ہوں۔ اب کو خدمت کی جستجو نہ تھی۔ طبیعت نے بے فائدہ خوشامد اور درد بار داری کر گواہ کیا۔ لیکن جس وقت تک میں سرکار انگریزی میں تھا۔ یہ فیض گوارہ و نیک کے سرٹیفکیٹ کتاب میں آپ نے ہضم کیے ہوں گے۔ بڑی خدمت کے لیے بڑے عہدیداروں کی سفارش و مدد کا رہتہ اور یوں ملنے کے ڈپٹی کمشنر اور کمشنر محمد کو جانتے پہچانتے ہیں ان لوگوں نے میرے علم سے ہیں اور مزد و میری نسبت اچھا خیال رکھتے ہیں اور پوچھا جائے تو اچھا ہی ظاہر کریں گے۔ لیکن میں ان کی کوتاہیوں پر ان کے سلام کو بھی نہیں گیا۔

چونکہ آپ نے ایک طرح کا تعلق اسی معاملہ سے پیدا کر دیا ہے۔ وقتاً فوقتاً مجھ کو اطلاع ہوتی رہے تو مزید عنایت

خالسار نذیر احمد ۳۰ دسمبر ۱۸۹۶ء

(۲)

جناب سید علی حسن خان بہادر

جناب عالی!

اسلام و عیسائیت آپ کو شاید معلوم ہے کہ میں نے بڑی محنت سے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ مجھ کو اس کے لیے تین برس محنت شافہ اٹھانی پڑی ہے اور تراجم موجودہ اور تفاسیر و احادیث سے مطابقت کرنے کے لیے موریوں کا اسراف رکھنا پڑا ہے تب کہیں جا کر یہ ترجمہ میرے نزدیک باعادہ سلیس و مستند اور تراجم موجودہ سے بہت بہتر ہوا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ اشعار بھی لکھ دیئے گئے ہیں اور غلطی یہ ہے کہ ان اشعار میں بھی طرح افلاک کر دیا جائے کہ قرآن مجید کا یہ ترجمہ مل سکتا ہے۔ پہلے آپ دیکھ دیجھا کر اچھی طرح اطمینان حاصل کر لیجئے کہ آیا واقعی میں یہ ترجمہ تراجم موجودہ سے بہتر ہے یا نہیں اور اگر آپ کے نزدیک بہتر ثابت ہو تو آپ اس کی سرپرستی کیجئے کہ نیکو اس کی اشاعت میں مدد دینا گویا احرام رسالت کی تکمیل کرنا ہے بلکہ اگر

آپ کہیں جو اسی ترجمہ کی کیفیت کو سراہ کر کے گوشتِ گند کر دیں اور ان سے سر پہنتی کی تحریک فرمائیں۔ ترجمہ کے حجم اور مواد خدا اور  
جہاں سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت جو قرارداد کی گئی ہے اس میں کوئی خالی مقام و مضمر نہیں وہ نہ میں اگر اپنی محنت اور زور و باریں  
کی تنخواہ ملتا تو عہدہ فی جلد ہکت پڑتی۔ مگر میں نے یہ کام اتنا کیا ہے۔ ان امری اعلیٰ اللہ  
میر نے میں آپ سے تفصیل طاقات نہ ہونے کا انکس باقی رہ گیا۔ ترجمہ تو پورے آپ کی خدمت میں نہاؤں کیا گیا ہے۔ اور  
صرف خرچہ کا..... کیا گیا ہے براہ مہربانی..... کو ایلیجے گا۔ خدا !

خاکسار۔ تہذیب احمد سرحدی ۱۸۹۶ء

(۳)

پیشانیہ جادو اور شیر العزیز احمد رائوہ

(جواب خطِ تعلیم دسمبر ۱۹۰۳ء)

اسلام علیکم۔ سب سے پہلے میں آپ کو مرگ عزیز پر جس کی مرگ کا حال آپ نے اخبار میں بھی چھاپا ہے۔ تعلیق صبر کرنا ہوں۔ اگرچہ  
آپ محتاجِ تعلیق نہیں ہیں۔ محال شریف کی جلد بندی کے دام لٹھ ہمارے پیچھے ہیں آپ طلب فرماتے ہیں اس کی بابت استفسار  
طلب بات یہ ہے کہ کمیشن جو آپ منظور کرتے ہیں اس کی تعداد کیا ہے۔ مجھے یاد نہیں اور نہ میرے پاس کوئی اس کی یادداشت ہے  
کانفرنس کی شرکت موقوف ہے۔ اعتدال مزاج پتال ہوتا ہے۔ وہ وجہ سے، اول ددنی سفر دوسرے دہاں کے لوگ آمد و کم  
تجھے ہیں اور اکثر نہیں سمجھتے البتہ آپ کا اور آپ جیسے لوگوں کا شریک کانفرنس ہونا نہایت ضروری ہے۔ وہ نہ میں تو سننے ہی کام کا ہوں  
کہ فرسودہ مسئلہ پیش پا افتادہ باتوں کا کھرے ہو کر مادہ کر دیا۔

اخبار کی نسبت مجھ کو یہ کہنا ہے کہ مرئی کا اہتمام جیسا چاہیے نہیں۔ مذہبی مضامین بھی بعض جڑے ہوتے ہیں۔ جیسے کسی شخص  
نے آپ کے اخبار میں لکھا ہمارا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے پابندی مذہب ضروری نہیں۔ ابھی شاید کچھلے پرچے میں کسی صاحب نے  
دعوتِ عالم ہمارے دہانوں سے ریل کی پیش گوئی استنباط کی۔ لغو ہے اصل اسے جوڑے ضرورت، ایسی باتوں سے قرآن کے ظاہر الفاظ سے  
اخبار اٹھا جاتا ہے اس قسم کے مضامین آپ کے اور آپ کے اخبار کے شایانِ شان نہیں اور میرے نزدیک ایسی باتوں سے  
اسلام کو نقصان پہنچتا ہے۔

ہاں ————— حمایتیں جو عجلہ جائیں گی ان کی جلد قسم اول ہوگی بعض نے اسے قسم ادنیٰ پڑھا۔

خاکسار۔ تہذیب احمد۔ ہر دسمبر ۱۹۰۳ء

## مولانا حاکمی

(۱)

بنام عن الملک

جناب مولوی صاحب محترم و مکرم و معلم دوام محمد ہم  
بعد تسلیم وینا ان کے التماس یہ ہے کہ دو جلدیں کتاب 'حیات سعدی' کی اور دو جلدیں 'سوس ہدیہ اسلام' کی خدمت  
میں ارسال کرنا ہوں ان سے روساوی جلدیں آپ کے ملاحظہ کے لیے اور دوسری دو جلدیں جن پر روپلی ٹیپ کیا ہوا ہے حضرت  
نواب صاحب بہادر دام اقبال ہم کی نذر کے لیے ہیں۔ پہلی کتاب میں نیاز مند نے شیخ سعدی کی لائف اور ان کی تمام تصانیف  
پر یو یو کسی قدر جدت کے ساتھ لکھا ہے جس پر فاضل محمد ذکار اللہ صاحب کا دیوبند علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ مورخہ ۱۲ راج میں  
چھاپا ہے اللہ جس کو پنجاب اور اضلاع شمال و مغرب کے معتبر اشخاص عموماً پسند کرتے ہیں۔

دوسری کتاب یعنی سوس ہدیہ اسلام کے آخر میں ایک نیا نمبر ۱۶۰ بند کا اکثر اکابر و اجاب کی تحریک سے سے اعاد  
کیا ہے جس کی بہت ابھی میں نہیں کہہ سکتا کہ پہلے کی کیا رائے ہوگی۔

خانہ جناب کو کثرتِ مہمت مرحومہ کے سبب یاد نہ ہو گا لیکن نیاز مند کو غریب یاد ہے کہ ان دونوں کتابوں کی قیمت  
جب کہ ان کی ترتیب و تدوین ختم نہ ہوئی تھی۔ ملازمان سامی کی طرف سے مختلف ادوات میں اعانت و غریباری کی امید  
دلائی گئی تھی اور زیادہ تر اسی امید کے مجروح سے پران دونوں کتابوں کے ایک ساتھ چھپوانے کی جرات کی گئی ہے التماس  
یہ ہے کہ اگر ان کتابوں کی اشاعت اس ملک میں ممکن بھی جیسے تو ازراہ فراڈش و کم دونوں نسخے جو حضور نواب صاحب  
کی نذر کے لیے ارسال خدمت والا کیے جاتے ہیں، مع عرضداشت مسئلہ نیاز نامہ پیش گاہ جناب فاضلہ امیر  
گزاران کر جس قسم کی اعانت یا مہمت ممکن ہو اس کے لیے سفارش فرمائیں۔

جو محنت اور ذریعہ ہادی محمد کو برداشت کرنی پڑی ہے اس کا تدارک خاطر خواہ ہو جائے گا۔ اگر یہ ہندوستان  
میں مصنف کی وقعت ایک بسیلہ سے زیادہ نہیں ہے اور نہ میرا کوئی حق آپ پر ایسا ہے جس کے سبب سے میں آپ  
کو ایسی تلخیاں دینے کا مجاز سمجھوں لیکن سچ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ہم لوگوں کو ایک حسنِ عنان اس قسم کا ہے کہ جس امر کی  
تخریب کو کوئی ہوس سے زیادہ گڑبچکے ہیں آج ملک اس سے قطعی مایوسی نہیں ہوئی۔ خیر کامیابی تو بہت مشکل ہے۔ اگر یہ امید  
بھی قائم رہے تو قیمت ہے زیادہ نیاز

نیاز نامہ خاکسار الطاف حسین حالی از دہلی کو چھپنداشت ۲۶ راج ۱۲۸۹

لے خانیہ خط موصول ہے نواب عن الملک کا اور اسی مسئلہ میں ان دونوں کتابوں کی جلدیں جید و باادب میں طبع کی گئیں جگہ سالہ کی فعل اور عبد الرحیم خاں کے  
موسر خط کی فعل موجود ہے۔ اصل خط میرے پاس محفوظ ہے (تخلین کاغذی)

(۳)

از حسن خاں صاحب رئیس محکم پور

جناب میں !

مذائقہ میں جا بجا اسے غلو ہے۔ لیکن بات اور بات کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے۔ قافیہ کی ضرورت ایسی اسی خفیف لذتوں کو جان کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کہتی اور کہتی کی جگہ کہتو اور کہتو کو فریضیج سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے آدو دیوان میں پیسے کی جگہ کہتو اور کہتو بندھا ہوا ہے۔ میں بھی ہمیشہ مذائقہ کو اسے غلو کے ساتھ لکھتا ہوں۔ مگر قافیہ میں بات باندھنا جائز سمجھتا ہوں۔

نیا زمند

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت محلہ انصاریاں ۷ فروری ۱۸۹۰ء

(۳)

از حسن خاں صاحب رئیس محکم پور

مخدومی !

ان ناخواندہ عزیز تر از مہمان خواندہ پنچا باوجود کہ آج کل ضیق فرصت کے سبب مطلوبات جدیدہ کے مطالعے کے لیے اہل وقت نہیں ہے۔ اسی حالت میں قریب نصف کے رسالے ملے سلف کو دیکھا گیا۔ انہیں ہنس کر مجھے اس عمرہ تصنیف پر صل دیارک کرنے کی فرصت نہیں ہے مگر غمخیز ہے کہ اس رسالے نے میرے دل میں آپ کی محبت اور خدمت نسبت بن کے انصاف مضاعف کر دی ہے۔ مسلمانوں کے لڑکچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے شاید کوئی ناواقف آدمی یہ کہے یا مسلمانوں نے فن رجال میں ایسی صدائے کان میں نہیں کہیں مگر ایسا سوال کرنا سخت فعلی کی بات ہے۔ آپ نے درحقیقت وہ م کیا ہے جو انگلستان کے شہر مصنف مشہور سمجھے گئے سلف پہلے کے کہنے میں کیا ہے اس نے بھی ہزاروں ہائیر گریڈیاں پچھ ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس سے بہتر آج تک کوئی کتاب انگریزی میں اس طرز کی نہیں لکھی گئی۔ مسلمان علماء کے حالات نہ ادوات ہے اور تمام ہائیر گریڈیوں کو دیکھ کر چند عزمان بخیر کر سنے اور ہر عزمان کے مناسب اس دفتر مایوں الفیض سے مایین انتخاب کرنے اور ان کو جدا جدا عزمانوں کے تحت میں درج کرنا نہایت محنت اور بیاقوت اور عزا و فکر کا کام ہے پہ کی تصنیف میں اور مشہور کی کتاب میں صرف یہ فرق ہے کہ اس نے سلف پہلے میں کتاب کا موضوع صرف علماء و محدوینوں دکھا بلکہ اس میں تمام دنیا پر امداد و موجد و مخترع اور شیعہ مین ادبہ سالار و جزہ و غیرہ شامل ہیں اور اس رسالے ن صرف علماء سلف کے حالات سے بحث کی گئی ہے اگر آپ اس کے دائرے کو زیادہ وسیع کر دیتے تو یہ بالکل اسی م کی کتاب ہو جاتی جیسی سلف پہلے ہے۔ اس کتاب میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ مگر میں نے صرف ایک خوبی کا کہ تمام تصنیف کی جان ہے ذکر کرنا کافی سمجھا ہے

میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ انگلش لڑکچر سے واقف نہ ہوتے تو ایسی تصنیف کا خیال ہرگز آپ کے دل میں نہ کرتا

پس کا و تحقیق مذکورہ العلما انگریزی تعلیم کی مزدورت پر ذوق نہ دے گی اس کی چیخ و پکار سے کوئی مستبد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہوگا  
اسی کے ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے کہ انگریزی تعلیم جب تک کہ اس میں شرعی تعلیم کی چاشنی مذہبی جانے لگی ہوگا مفید آدمی  
پیدا نہیں کر سکتی۔ مجھے ایک انگریزی تعلیم یافتہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جو مسلمان علماء کے حالات پر ایک ایسی کتاب لکھ لے جیسی  
کہ آپ نے لکھی ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی ایک ایک دودھ دہلیز ہر مدرسہ اسلامیہ میں رہنی چاہیے  
بلکہ محض ان کا لڑکے طلباء بھی اس سے مستفید ہوں تو بہت مناسب ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کتاب آپ نے اپنے خرچ سے چھپوائی  
ہے یا تذکرۃ العلما نے اس کو چھپوایا ہے۔ مسلمان اودھ عام کر کے اپنے خیالات کے مسلمان ایسی کتابیں کے خرچ سے میں بہت  
تمسک ہیں۔ اس لیے مدارس اسلامیہ میں اس کو محض تعلیم کو ناجایا جیئے۔ آخر میں میری یہ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ سے ہمارے عام  
زیادوں اور رئیس زادوں کو اسی طرح ذہیر و علم و لیاقت و حسن اخلاق سے آراستہ کرے جیسا کہ اس نے شرفانی و مجید میں آپ کو  
ذہیر و علم و فضل و اخلاق سے آراستہ کیا ہے اور آپ کو جملہ کمالات و کمالات سے محفوظ رکھ کر صدوسی سال تک ذوق و سلامت سے

زیادہ تیار

خانکار الطاف حسین حالی عمی صفا لکھنؤ پتہ ۱۰ ستمبر ۱۸۹۱ء

## نواب محسن الملک

(۱)

بنام فشی ذکار اللہ صفا۔ پ

محترم و مکرم ہندو فشی علما فشی ذکار اللہ صاحب زاد لطف

مولوی سید احمد مصنف فرسنگ آصفیہ میں اکی چار سو گنا میں سرکار نے فرید فرمائی ہیں یہاں آئے اور جناب نواب دارالہمام برادر  
عالی کی عازمت حاصل کی۔ نواب انتقاد چکٹ بہادر اور بندہ نے بھی ان کے مشکلات جو کتاب کے چھاپہ کے ختم ہونے میں  
پیش ہیں نہیں اور سرکار میں عرض کیا کہ کسی طرح اس کتاب کا نام ہو جانا چاہیئے تاکہ جس عرض سے سرکار نے چار سو جلدیں خریدی ہیں  
وہ حاصل ہو اور اس پر یہ امر قرار پایا ہے کہ یہ معاملہ آپ کے سپرد کیا جاوے اس لیے میں آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ  
مہربانی کر کے اتنی محنت اپنے آپ پر لگوا دے فرمائیے کہ جو معاملہ ان کا سا ہو گا وہ سے ہے کہ وہ طور پر ہو سکتا ہے اور وہ اس وقت  
اس کے بچے سے بجات حاصل کر سکتے ہیں اور سرکار کی کیا مدد اس کام میں مطلوب ہے اور آئندہ باقی ماہرہ کتاب کے چھاپے  
کے لیے یہ بہتر ہو گا کہ سرکاری مطبع حیدرآباد میں چھپوائی جاوے اور مولوی سید احمد صاحب اس کی تصحیح بیان آگے یاد دل رہے کہ  
کہ کیا کریں۔ آپ سے بہتر اس کام کے واسطے دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے آخری تصحیف اس کا آپ کی دیکھنے والی پروردہ

لے نواب وقار الملک۔

طوبہ پر ہر کے کا - دیا وہ نیا ز!

محسن الملک الامام اسی اللہ فی ۱۳۰۶ھ (۲۷ فروری ۱۸۹۰ء)

(۲)

نام پید علی حسن

جناب مخدوم کرم ہندہ ذاب علی حسن خان بہادر

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کھنوں میں تشریف رکھتے ہیں اور امین الدین کے ذریعہ سے آپ کا پتہ بھی دریافت کیا تاکہ خط کھنوں کے پتہ معلوم نہ ہوا۔ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے عنایت نامہ بھیج کر دیا فرمایا۔ آپ نے جو حواش فرمائی ہے وہ تمام قوم کی نمونی کا باعث ہے۔ آپ کو قومی بہرہ دہی تو ہمیشہ سے ہے اب وہ آتش اور نشتل ہو گئی ہے۔ یہ قوم کی خوش نصیبی ہے۔ اگرچہ آپ کا سہو پال سے تشریف لانا دشمنوں کو ہند ہوا جو قوم کے لیے مفید ہو۔

مرد شود سبب خیر کہ خدا خواہد

غیر پایہ دوکان شیشہ گر سنگست

قوم کی پہلی خدمت تویہ ہے کہ آپ تعلیمی معاملات پر ذمہ داریاں کچھ مضمون لکھ کر علی گڑھ انٹی ٹرٹ گزٹ میں بھیج دیا جائے۔ دوسری یہ ہے کہ اپنے دوستوں اور علاقائیوں کو قومی کاموں پر متوجہ کیجئے اور عمدہ مشورہ اور صلاحیں ہم کو دیا کیجئے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ تعداد فریڈل کی زیادہ کی جائے۔ اس وقت جتنی جگہ ہیں وہ سب معمور ہیں۔ اگر یہ تجویز منظور ہوئی تو فریڈل کی فہرست میں آپ کا معزز نام بھی جلد نظر آدے گا اگر خوشی ہو نا اور نہ ہونا اور بات ہے۔ آپ کی شان اس سے ارفع اور اعلیٰ ہے ادا آپ سے ہر طرح کی مدد ملنے کی امید ہے۔

میں ایک درخواست جو نہایت چھوٹی ہے کرتا ہوں، یقین ہے کہ آپ اس کو منظور فرمادیں گے یعنی علی گڑھ انٹی ٹرٹ گزٹ کو آپ کو مزید اگر جس کی سالانہ قیمت وہ ہے اور اگر معاذ میں میں آپ داخل ہونا چاہیں تو طے یا دے آپ دے کہ ان کو مدد دے سکتے ہیں۔ کچھ اجارہ بطور نمونہ آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔

محسن الملک: از علی گڑھ یکم اگست ۱۹۰۲ء

(۳)

نام موری بشیر الدین

مخدومی مولوی بشیر الدین صاحب!

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور کیونکر آپ کے ساتھ کام کروں۔ ایک نئی عادت آپ میں ہے جو مجھی سے کہ آپ

خصلوں کا جواب نہیں دیتے۔ اگر دوسط میں جواب بھی دے دیا کرو تو اس قدر۔ تو معلوم ہو کہ تم ذمہ دار اور مرے نہیں  
میں نے تم کو تین خط لکھے مگر ایک کا بھی جواب نہیں کیا تاہم دنیا میں ہا سال کی طرح پھر میری ذلت اور رسوائی ہوگی۔ اگر  
ذلت پر کام نہ ہو۔ آپ نے اس وقت تک رد و روشن بھیجے نہ چنہ کی فہرست اور میں اس وقت تک ان سب کشتوں کے  
جھروں کر کے۔ عدوت نہیں دے سکا جو مختلف کاموں کے لیے مقرر ہوئے ہیں۔ آج کا اخبار بھی پہنچا اس میں بھی سب کچھ ہے  
سولے کاغذ اس کے نہ اس کی کچھ کیفیت ہے رد و روشن۔ اگر ہے تو پریڈنٹ کو سختی کے ساتھ پڑا بھلا کہا گیا ہے۔ وہ  
یہی جس سختی سے آپ تحریر کرتے ہیں مجھ کو تو پند نہیں ہے۔ آپ ہی شاید اس کو پسند کرتے ہوں۔ اسے ظاہر کرنے کے لیے  
نہ دے رہی نہیں ہے کہ سختی سے کام لیا جائے۔ بلکہ خوبی اسی میں ہے کہ اپنا مطلب ذمہ فطوں میں ظاہر کیا جائے۔ انسانیت  
اور اخلاق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ لیکن مجھ کو اس سے کچھ غلب نہیں۔ نہ میں آپ کا ناصح ہوں نہ آپ کسی کی سننے والے  
ہیں۔ ہاں مجھے اندوس اس بات کا ہے کہ آپ مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں اور ذلت پر میرے خصلوں کا نہ جواب دیتے ہیں  
نہ کام کرتے ہیں۔ آپ رد و روشن اور فہرست چنہ کی بھیج دیکھئے یا جواب دیکھئے ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کروں گا۔ مجھے  
ہا سال کے سے آثار مفرغ آئے ہیں کہ باتوں میں دن گذر جاویں گے اور رد و روشن ذلت پر تیار نہ ہوگی۔ لیکن میں آپ سے رشتہ  
کھنکے دیتا ہوں کہ میں اب اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر آپ دہرٹ نہ لکھ سکیں تو جن لوگوں نے نوٹ لکھے ہیں ان کو بہت  
پاس بھیج دیکھئے تاکہ میں خود اپنا سرمایہ اور آپ کو آئندہ تکلیف نہ دوں۔

یہ کیا طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے کہ اول آپ اخبار میں شائع کر کے کالج کو جنام اور ضیعت کر دیتے ہیں پھر لے  
توجہ دلاتے ہیں۔ کالج کے طالب علموں پر مشن کا کیا جال چلا اور کیا ہوا۔ جس پر آپ میری توجہ چاہتے ہیں۔ اور در صورت توجہ  
جہونے کے آپ بذریعہ اخبار کالج کی ضیعت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجھے اس وقت تک کچھ معلوم نہیں کہ کیا جڑا بھلائے اخبار میں  
لکھنے کے اول مجھے تو اطلاع دی جوتی۔ یہ کوئی دوستی نہیں ہے نہ کالج کی خیر خواہی کہ آپ ایسی باتیں کہ جس سے مسلمانوں کو آگ  
کے خلاف جوش پیدا ہو اخبار میں لکھ دیں اور مجھ کو خبر تک نہ کریں اور پھر بھی گول گول طعین جس سے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کیا آت  
آئی۔ کیا تین ست ہوا ہوئی۔ خیر اگر اسی کا نام آزادی اور خیر خواہی ہے تو یہ آپ کو مبارک رہے اور جو آپ کا دل چاہے کر لیا  
انصار احمد اور علی محمد کہاں ہیں۔

محسن الملک ۱۵ جنوری ۱۹۰۴ء

## نواب وقار الملک

(۱)

بنام سر سید احمد خاں

جناب قبلہ و کعبہ ام سلامت

تسلیم آپ کا ارشاد تو بہتر و حکم کے ہے جس کے بعد سکوت کے سوا اس قسم کے معاملات میں کچھ جاریہ ہی نہیں ہے

بہن جو وجود ارشاد جوئی ہیں اور ان کی نسبت اس قدر عرض کرنے کی اجازت جانتا ہوں کہ خبروں میں سے بھی بہت سے ہوں۔ گے جہان مضامین کو جن کو وہ سن چکے شاید وہ بارہ پڑھنے کی تکلیف نہ کریں اور میں ہزاروں غیر خبروں نے غلط روایت پڑھی ہے۔ ان کو تو مضبوط رہدہ سے بہت ہی کم تعلق رہے گا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ پاپو نیز اخبار کے تحریر پڑھنے والوں کے لیے تو اردو مضبوط رہدہ سے کچھ تعلق نہیں اور اس طرح ہزار ہائے غیدہ لوگوں کا خیال اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کسی پر خوف مسلمان نے اس بات کی بھی کافر نس میں دانتے دی کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ وہ اپنے موجودہ مسلمان ماحضروں کے ذریعہ سے مذہبی تعلیم بھی کرا دے۔

گو میں آؤ پر عرض کر چکا کہ اگر آپ کی رائے سو سٹی کے اخبار میں جو اردو انگریزی دونوں کا اخبار ہے اصلاح کی نہیں ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ اس حالت میں اپنے آپ کو آزاد سمجھوں گا کہ اگر کوئی مرقع مجھے لے کر میں اپنے آؤ پر سے اس وجہ سے مٹانے کی کوئی ناسب کارروائی کر سکوں اور اسی کے ساتھ وہ دوسری اصلاح ہوگی کہ یہ جس قسمی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ ایسا ہی کر دوں گا۔ مگر شاید کہیں کوں۔ والسلام

خاکسار۔ مشرقی حسین۔ اردو بہار ۵ مارچ ۱۸۹۳ء

(۲)

آداب تعلیمی حسن صاحب

جناب آداب صاحب مخدومی و مخضی آداب حمام الملک بہار سلامت

اسلام و علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! محمد کو اگرچہ جناب سے شرف قدم برسی حاصل نہیں تھا۔ لیکن فکر غیر اکثر اوقات سنتا رہا ہوں اور صبر و صبر میں مولوی منافذ سید احمد رضا خان صاحب سے بہت کچھ جناب کے متعلق سنا ہے اور شکر کیا ہے کہ تم میں ابھی ایسے افراد موجود ہیں۔ میں گزشتہ چند مہینہ میں علیل تھا۔ اور اس لیے جن کاغذات کو مجھے دو بیٹے پہلے پڑھا اور دیکھنا چاہیے تھا ان کی نسبت اب آئی ہے اور آج شام ابھی میں نے جناب کا مضمون عرب کی تصنیفات اور یورپ کی فیاضی پر گزشتہ مئی کے مسافر میں پڑھا ہے جو کچھ کہ جناب نے اس مضمون میں علی گڑھ کی کوششوں کے متعلق ظاہر فرمایا ہے میں اسے ذاتی تجربہ کی بنا پر جو وہاں زیادہ عرصہ تک مقیم رہنے کی حالت میں مجھ کو حاصل ہوا ہے عرض کر سکتا ہوں کہ وہ بالکل صحیح ہے اور اس کی وجہ صروت یہ تھی کہ مذہبی تعلیم کی نسبت جو کچھ وہاں سے صدائے غلطی تھی وہ محض راستے پر ہی تھی۔ فی نفسہ کہیں یہ ارادہ نہیں کیا گیا تھا کہ عبادت دینی و دنیاوی تعلیم کی ترکیب کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی یکے کے طریقے سے حاصل کریں اور اسلامی اخلاق ان میں پیدا ہوں۔ لیکن خیر وہ زمانہ گزرا ہے اور اب دیکھنا ہے کہ صاحبان علی و محمد زمانہ موجودہ و آئندہ اس میں کیا تغیر پیدا کرتے ہیں۔ اس وقت تک تو اب بھی وہاں جو کچھ کہا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے وہ صرف چند الفاظ سے اور کچھ زیادہ نہیں ہے۔ وقل اللہ یحکم و یحکم اللہ بعد ذلک اہل عدل کے اس مضمون میں جو کچھ کہ حضرت نے تحریر فرمایا ہے اس میں جان نوح ہے کہ قوم اور ملکہ میں بہر نسبت تعلق قائم ہوا اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ مطلب فی زمانہ ذوق اصلاح کے گروہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ محمد احمد علی صاحب کو فرقہ کے

آداب و قدار الملک نے کافر نس کے اجلاس ۹۲ء میں تعلیم و فیات پر جو پیش کیا تھا اس کے سلسلے میں یہ خود گناہت ہے۔



ناہم صاحب اور نائب ناہم صاحب اور چند مشیر علماء ندوہ نے جبرانی سے امر وہہ کو اپنی تشریف آوری سے عزت بخشی تھی۔ اس وقت میں نے ان حضرات سے دریافت کیا تھا۔ کہ کیا بھوپال میں بھی ندوہ کی طرف سے کوئی تحریک ہوئی ہے تو اس کے جواب سے میں اسی قدر تعجب نہ لال سا کہ کوئی عورت تحریک نہیں ہوئی اور اب جناب کے ان تانہ نظار خیالات کے لحاظ سے میرے نزدیک مناسب ہے کہ آئندہ جلسہ ندوہ کا بھوپال میں ہو۔ بشرطیکہ اوقات مناسبہ اور نواب دارالہمام صاحب باغبار اس کو پسند فرمائیں اور پھر حضور عالیہ متعالیہ دست تھما اس کو منظور فرمائیں اور جس وقت کہ یہ ارادہ ہو اور منظوری ہو جائے تب جلسہ کے زمانہ اور اوقات کا تصفیہ ضرور جناب اور نواب دارالہمام صاحب کی مرضی اور موافقہ پہ پیش کر دوں گا اور حضرات ندوہ یعنی کمال نظر و اقدار سے اس کو قبول کریں گے۔ اور پھر یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ ندوہ کا جلسہ بھوپال میں وہ پیدا ہوا جس کی نسبت یہ صحیح طور پہ کہا جاسکے گا کہ ندوہ اسٹیم ایک جم تھا اور اس جلسہ نے اس میں جان ڈال دی ہے اور اس جم بے جان میں جان کا پڑنا ان کڑیوں کو پھر درست اور مسلسل کر دے گا جن کے کمزور ہو کر ٹوٹ جانے سے نرم کا سلسلہ ملازم کے ساتھ مرگ برائے نام باقی رہ گیا ہے اور حضور عالیہ دست اقبالہ اسی زمانہ میں ندوہ کی درخواست پر ندوہ کا ولی موز منظور فرمائیں جو گویا تمام ہندوستان کے علماء کی اور قوم کی مرئی کر رہی ہو گی اور بھانڈا ان کی نظر اور خدا و علی قاطبیتوں اور شامہ مرآم اور نوازشات کے جو حضور محمد و محمد کی ذات بابرکت کے ساتھ شخص میں اندوہ کے پیرن کا جہدہ حضور محمد کے واسطے ہے وہ حضور کو سمجھا جاوے گا۔

حضور علیہ السلام قیصر ہند کے دائرہ فرائی ہندوستان میں حضور عالیہ متعالیہ ہی اس کی متقی ہیں کہ وہ مذہبی حیثیت سے مسلمانان ہند کی مادر شفقت و منظر تسلیم کی جاویں۔ حضرت کے نام نامی کے ساتھ جو انگریزی تعلیمات کا انتظام دیکھ کر جس انتظام سے کہ اس عہدہ کو اختیار حاصل ہوتا ہے۔ آج کی ڈاک سے چند کلمات اردو انگریزی جناب کے ملاحظہ کی عرض سے سمجھتا ہوں اور یہ نتیجہ ہے جو میں نے چار سال کی متواتر کوشش میں اپنے صوبہات متحدہ ملک مغربی و شمالی و اودھ کے واسطے حاصل کیا ہے اور جس کے ذریعہ سے اب یہ بات خود اہل ملک کے ماتھے میں آگئی ہے کہ وہ انگریزی سرکاری مدارس میں دینیات کی تعلیم کا انتظام کریں اور جو اس پر بھی دیکھیں تو پھر ان کو خدا کیسے۔

ندوہ کے جلسہ بھوپال کی نسبت ایک احتیاطی کارروائی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر پیش کیا تھا مگر تاہم اس قدر اس کے متعلق بھی عرض کر دینا کافی ہے کہ اگر دارالہمام اس کو پسند فرمائیں تو قبل اس کے کہ اس پسندیدگی کا کوئی انہار کیا جاوے صاحب یہ بحث گورنر جنرل سے کسی عاقبت کے موقع پر اس کامرت دانی نہ کر کہ کنایت کرے گا اور اچھی دیر کی طرف سے یہ مرث میرے ہی خیال کا انہار ہے۔ حضرات ندوہ پر میں بھی اس کے بعد ہی پیش گوئی کروں گا۔ والسلام

حالیہ

مشائق صبیحہ از امر وہہ - ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ

لے نواب سید علی حسن رضوی والدہ حام الملک نواب صبیحہ حسن خاں کے فرزند صفر تھے۔ مدت تک علم تعلیمات کے انچارج رہے پھر کلکتہ میں آگیا اختیار کوئی دین و فطانت پائی۔

(۳)

برادر عزیز احباب

جناب غزوئی!

آپ غنا ہوتے ہوں گے کہ آپ کے خطوں اور مصروفیات میں کاجواب وقت پر نہ ملے۔ اصل یہ ہے کہ میں نے  
نہر سے لڑتے وقت آباد کے مقام سے ایک ہفتہ کی خدمت سرکار سے علاوہ عید کی تعطیل کے لیے بی تھی۔ پرسوں شام  
وہیں آیا ہوں مگر صحت خراب ہے۔ آپ کا ایک خط، ۲۰ جولائی کا دو خط ۳۰ اگست کے لیے۔ جواب آئندہ کے خط میں دروں گا  
راجہ ہزار پرشکے متعلق آپ کا خط محمد کوہاں سے چلنے کے دن شملہ میں ملے تھا۔ پہلی ہی منزل میں سرکار نے تار پر روپیہ بھیجے کا حکم  
نیدرہا بھیج دیا تھا۔ خیال ہے کہ اس وقت روپیہ پہنچ گیا ہوگا۔ مہجر رابرش صاحب کا قزو در حقیقت اس قسم کی پالیسی ہے  
جن کو میں ہمیشہ عزیز رکھتا ہوں۔ بدلت و شلو ناتھ کو جب میں نے پناہ دگا ر معتدہ ملت جہا راجہ صاحب کے وقت میں بنایا تھا  
تو وہ بھی پاسی تھے یعنی کہ اپنی صفائی اور راست بازی کا پاس کیا۔ جواب میں اس لیے دیر ہوئی کہ .... بلیہ ..... اور اس  
کے بغیر سردی صاحب کو جواب دینا مناسب نہ تھا۔ آپ کے مکان پر سب خیریت ہے خدا کے لیے اب تو بعد آؤ جی اکتا  
گیا۔ میں منصف آئندہ کہوں گا۔ والسلام و التسلیم!

خاکسار

ششاق حسین۔ عید روہاؤ و کنیہ ہارگست و شنبہ جمع

## شبلی نعمانی

(۱)

ششاق حسین اور محل خاں شروانی

مبارک باد۔ ریویو پڑھا اور بار بار پڑھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ تعین نہیں بلکہ حمد کے قابل ہیں اور  
نکاح ہے کہ اگر آپ کسی کپہ میٹھ کے موہ پر آئیں تو مجھ میں اسی کم بخت فیلڈ کا ظہور ہوگا۔ یہ ریویو اخبار تک محدود رہ کر  
مڈ پڑ جائے گا اس کو الگ رسالے کی صورت میں چھپنا اور شائع ہونا چاہیئے۔ اس سے اسے اور عمدہ نمونے قائم ہوں گے۔ اور

نہ مکتوب قابل ذاب حسن الملک کے نام ہے جب وہ معدنیات کے مقدمے کی پیروی کے لیے دولت آصفیہ کی طرف سے  
نہ لکھے ہوئے تھے۔

نہ مہارت برحق نہیں گئی۔

میرے منہ سے قائم ہوں گے۔ اور شاید رفتہ رفتہ حیاتِ ہمدرد کا کل خونِ جگر ان نشروں سے نکل جائے۔ والسلام  
شبلی۔ ۲۴ فروری ۱۹۰۲ء۔ حیدرآباد

(۲)

بنام مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

مکرمی!

میرے دل میں تادمہ ہے کہ جب کوئی علمی رسالہ نکالنا چاہتے ہیں تو قریباً سال مہر کے لیے معائنہ کیا کر لیتے ہیں تب لکھتے ہیں  
الفردے کے لیے جس پر ہونا چاہیے اور چونکہ بڑی وقت چھپنے کی ہے اس لیے میری تیرہ رسالے ہیں کہ دو میں پہلے کاغذ  
اس طرح چھپوایا جائے کہ مرثیہ نمائندہ اور علمی جدول کے اندازہ کر دینے کے بعد دس سال تک جائے۔ میں نے ایک چھوٹا سا  
مضمون عربی تفسیر پر ایک دیوبند مکتب پر جس میں بونا فی منطقہ کی غلطیاں بتائی ہیں۔ ایک فرقہ عالم کے ایک مضمون کا جو اسلام پر  
ہے زبرد کر لیا ہے۔ شہنشاہ مولوی روم پر تقریباً ایک وسیع سلسلہ شروع کیا ہے۔ آپ بھی اسی طرح جتنے جتنے مضامین لکھ چکے ہیں  
کے حقوق سے شروع کیجئے اور جو خیالات آتا جائے ان پر بتائیے تصحیح کیا ہو۔ کیا اور دوسرے معنی کے برابر؟ لیکن خدا اس سے  
جلی ہونا چاہیے اور بڑا ترجمہ عربی میں کیا ہو۔ دیر سے اچھا کوئی لفظ نہیں ملا۔ لوح پہ ادب و شرف کا نام لکھتا ہوں گا۔ میں اس کو بھی  
اڑا دیتا۔ لیکن اولیٰ تو سرکاری احکام سے اس کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ نہ تو کوئی میں ندوسے کی ہوا اس قدر اٹھ چلی  
ہے کہ مجھ ندوسے کے نام سے اس حلقے میں اس کی کچھ دلچسپی نہ ہوگی ان دس سال کے صفات کس قدر ہوں۔ میں تو دو  
جزو کا فی کھتا ہوں۔ والسلام

شبلی۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۳ء

(۳)

بنام نواب علی حسن

جناب نواب علی حسن خاں صاحب بالغاہم!

نثارِ لبیبی کن ہر مستراح کہنہ و نورا  
فغان از گرمیِ سخن و نوا  
طرازِ منہ جیشید و فرساج خسرو را  
بہم آمیزند جزا زلتِ معارضِ خلوت و منور را

مولانا شبلی کی یہ غزل کھات کے حقہ دستہ گل میں شائع ہو چکی ہے۔ صفی الدولہ حرم الملک نواب علی حسن خاں بہادر کے نام کے ملا تیب بھی  
ملا تیب شبلی میں چھپ چکے ہیں۔ لیکن یہ مکتوب کہیں شائع نہیں ہوا۔ اگرچہ اس میں غزل کے سوا کچھ نہیں لکھا۔  
مگر یہ شعر خوبانِ ذر و شتی سے متعلق ہے اور نہ تو تیری یعنی باریعہ کا مینا ہی حیدر ہے کہ دنیا میں موت تو تیری کار فرما ہیں۔ ایک ہندوستانی دوسری امریکی اسی کو نورِ خلعت  
سے بھی تہہ کر سکتے ہیں اور اسی کا نام دھرت کے مندرجے میں تحریر ہے۔ خرابانِ ذر و شتی نے زلفِ عارض سے خلعت و نور کو باہم ملا دیا۔

ہر سوائے مجھ دلیلیں خوش بے پروا  
گوشن از سرہ مشکلی افتاد است بہر و را  
برہ ساقی سے ہائی کہو جنت بخوای یافت  
کنار آب چہ پائی و گلشت اپاں لورا  
بیابانی بہ یاد پنچہ گیر اسے مزگانش  
وگرہ ہارہ گرداں اپن جلے نہر جد تورا  
شبلی۔ از بیتی لکیر دو۔ جنگہ دھن کاسنت پرست آتش ہائی کلا  
۶۔ ستمبر ۱۹۰۶ء

## اکبر الہ آبادی

(۱)

بنام شفی محمد الہدین فوق

الہ آباد۔ کرمی سطر اللہ تعالیٰ

عمری گزریں آپ سے مواصلت نہیں ہوئی۔ میں کیا کہوں ایک مدت سے کس مصیبت میں ہوں۔ مرث میل ہی نہیں ہوں۔  
اس کے سوا اور بہت کچھ ہوں۔ تفصیل کی عرض کروں گا  
پڑ گئے گھیر گئے ادا م تہاں کے چھندے  
پا پہ ڈنچیر ہے اکبر کا قلم آج کے دن  
بہر حال دعا ہے کہ خدا عاقبت بہ نیر کرے۔

رسالہ طریقت ماہ دسمبر ۱۹۰۵ء کو دل خوش ہو گیا۔ ذوالخدا و قسطنطنیہ، خود آرائیوں، خود فرشتیوں سے پاک۔ سچے دسمانی  
منید صناعین سے الال۔ جزاک اللہ۔ من کو دیکھ کی تقریر سبحان اللہ نزل علی نور۔ ہا صاحب کے خیالات بھی خوب۔ کیا اچھا ہوتا  
اگر یہ پرچہ انگریزی زبان میں شائع ہوتا۔ کچھ مزو نہیں کہ اعلیٰ درجہ کا انگریزی دیکر پھر ہو۔ کام سے کام طلب۔ سے طلب۔ کاشش  
گورنمنٹ اسی طریق کی حامی اور مددگار ہو۔ ایئر ٹیکہ دنیا پرستی کا دھوکہ کہہ کر گایا اپنا ہی گریڈ اسٹے کی بیباک قائم کرتا ہے اپنی خیریت  
نکھنے۔ دعا لیجئے، دعا دیجئے۔

اکبر

۲۶ دسمبر ۱۹۱۵ء

(۲)

بنام مولانا شمس الدین صاحب مرحوم ایڈیٹر البشیر

جناب ایڈیٹر صاحب۔ جناب مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی نے قلم کا جو با محاورہ اردو ترجمہ

لے چھ پائی اور بالو بیتی کی مشہور و بہت گاہیں ہیں۔

شائع کیا ہے۔ وہ درحقیقت نہایت عمدہ بلکہ لاجواب ہے۔ اس سے بہتر خدمت اسلام کی اس دمانے میں ذہن میں نہیں آسکتی۔

اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو جزائے غیر مطلقا فرمائے کہ ان کے علم و قابلیت سے قوم کو بہت فائدہ پہنچا۔ اور بہت فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔

بعض مقامات پر مجھ کو شبہ پیدا ہوا ہے یا تو میرا شبہ بے جا ہے اور ایسا ہونا کچھ بعید نہیں کیونکہ بغیر علم کی روشنی کے بعض عقل و قیاس کو اس منزل میں کہاں تک رسائی ہو سکتی ہے اور یا فی الواقع ترجمہ میں کچھ غلطی ہو گئی۔ ایسا ہونا بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ مولوی صاحب کے دو گارہ اور بڑی داری بھی تھے۔ شاید کسی نے غلطی کی اور نقل ثانی میں اس پر نگاہ نہ ڈالی۔ اتنے بڑے عظیم الشان قانون قدرت کے ترجمے میں اگر کہیں دو چار غلطیوں پر نظر نہ پڑی تو کچھ تعجب نہیں۔ اب میں ایک شبہ بیان کرتا ہوں سودہ والتین کے ترجمہ پر صفحہ ۹۵۱ لغتہ خلقنا الانسان فی احسن تقویم مشد سہو سہو اسفل اسفلین کا ترجمہ سب ذیل نیایا ہے۔ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا۔ پھر ہم اس کو رپڑھا کر کے کمتر سے کمتر مخلوق کے درجے میں لوٹا لائے۔

یہ کث میں جو الفاظ توضیح کے لیے بڑھائے گئے ہیں اس کی صحت میں مجھ کو شبہ ہے۔ درحقیقت ترجمہ غلط نہیں ہے معنی میں شاید غلطی ہوئی تیرا خیال تھا اور ہے کہ یہاں جانی اور بڑھا پا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی روحانی اور اخلاقی حالت کا بیان ہے ترک دنیا کن دیگر۔

دوسری آیت اَلَّذِیْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالٰتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَیْرُ مَصْنُوعٍ اس خیال کی تائید کرتی ہے اگر میرا خیال صحیح تسلیم کیا جائے تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح چاہیے اگر میرا خیال صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔ تو یہ بات زیر بحث ہوگی

تیداگر حسین ازالہ آباد

مولانا عبدالحکیم شترہ  
(۱)

ہمام مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب مٹروانی

جناب مومن - اسلام و ملک

آپ نے اپنے والدانائے مروضہ مریدی الحجہ ۱۳۱۹ھ میں جناب حکیم سعید الدین صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کی حسرت ناک وفات کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے بجا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکیم صاحب مرحوم کی زندگی کا بہت زیادہ حصہ آپ ہی لوگوں میں گزرا۔ اور جس طرح آپ نے ان لوگوں کو اپنا نانا تھا۔ اسی طرح ان کو بھی مرستے دم تک آپ ہی کے ساتھ تعلق رہا جس

نہیں کے گھر انتقال ہوا وہ بھی آپ کے ایک معزز عزیز ہیں اور اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ جس دن انتقال ہوا ہے میں ہستی تاریخ جناب نبیل القرضاوی صاحب کے گھر کے لوگوں کا علاج کرنے کو جانے والے تھے۔ میں آپ کا بہت ہی شکر گزار ہوں۔ اور اسی طرح حکیم صاحب مرحوم کے تمام متعلقین آپ کے منوں میں کہ ایسی تم فائدہ کی حالت میں آپ نے دل دہی اور تسلی دینے کی کوشش فرمائی۔ حکیم صاحب مرحوم کے جن اوصاف کا آپ نے تذکرہ فرمایا۔ وہ اوصاف بے شک ایسے ہیں کہ اسی طبقے کے بزرگوں کے ساتھ ختم ہوتے جاتے ہیں۔ جس سے خردمان مرحوم کو تعلق تھا۔ مگر محدودی میں کہنا ہوں کہ آپ پھر بھی اس عقیم صدمے کو محسوس نہ کر سکیں گے جو اس نیک ذات کے اٹھ جانے سے ہم لوگوں کو ہوا ہے۔ درحقیقت خاندان ہی بگڑ گیا۔ آپ کو شاید نہ معلوم ہوگا کہ جس خاندان کی یادگار حکیم صاحب مرحوم تھے۔ اس کی پچھلی یادگار اکیلے وہی تھے۔ اور اس کا لائی نتیجہ تھا کہ ضعیفہ اور پیرہ عورتوں کی ایک بڑی جماعت کی خبر گیری وہی کرتے تھے۔ اب ان لوگوں کی بے کسی کی حالت ایسی نازک ہے کہ خیال کرنے سے بھی دل کانپ جاتا ہے۔ اگرچہ مرحوم کے بعد قدرۃ ان تمام ہاڑن کا ذمہ دار میں ہوں۔ مگر ایسی فیاض و نیک ذات کی جانشینی کے لیے بہت سی یاتقیں چاہیئے ہیں۔ جو مجھ سے ناکارہ شخص میں بالکل نہیں۔ اصل یہ ہے کہ میرے دھم جگر پر مرہم دکھا جاسکتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے دلوں کو دھار میں بندھانا اسکان سے باہر اور خدا ہی کے اختیار میں نظر آتا ہے جس کو اب مرحوم کے بعد زندگی کے باقی ماندہ ایام بسر کرنا دشوار بلکہ غیر قابل برداشت مصیبت نظر آتا ہے۔ حکیم صاحب مرحوم کو آپ کے خاندان بھر میں آپ کے والد ماجد سے بہت زیادہ تعلق تھا ان کو ہمیشہ یاد کرتے تھے اور ان کے نیک اخلاق اور ان کی کریم انفسی کے بردقت معترف رہا کرتے تھے۔ یقیناً ان کو بھی بہت بڑا صدمہ ہوا ہوگا۔ آپ کی طرف سے میں نے جناب حکیم صاحب مرحوم کے گھر میں لوگوں کو بہت کچھ تسلی و تشفی دی۔ اور وہ سب آپ کے شکر گزار ہیں۔ میں ان دنوں مکھنوں سے باہر تھا اور اسی وجہ سے والد اسے کے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مجھے مذمت ہے کہ مکھنوں میں بھی ایک اتفاقی اور فوری بیماری کی وجہ سے مجھے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ والسلام

میں ہوں آپ کا خادم محمد عبدالحکیم شرر از مکھنوں

۲۲ اپریل ۱۸۹۹ء

(۲)

ازاب سید علی حسن

بجائے دنا وائے من۔

ازاب و نیاز اور اسلام و ملک کے بعد بعد ادب عرض ہے کہ گرامی نامہ مورخہ ۴ جولائی ۱۳۸۶ء وصول ہو کر باعث سرگرمی ہوا۔ میں وعدہ کر گیا تھا اس کو بھولا نہیں۔ آتے ہی مولوی سید عبد المجید صاحب سے اس بارے میں گفتگو ہوئی اور معلوم ہوا کہ اس بارے میں جناب نے ان سے بھی طرست فرمائی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں اس معاملہ میں غور کرتا رہا جن خاندانی تعلقات کا جناب نے تذکرہ فرمایا ہے۔ ان کا پتہ لگا دشوار ہے اس لیے کہ جن دنوں کا یہ واقعہ ہے اس زمانہ میں یہاں

وفا تو کی ایسی اہمیت تھی کہ کسی اگلے خاندان کا اب چر لگانا قریب قریب غیر ممکن کے ہے۔ اور بالفرض پتر لگے بھی تو حاصل کیا۔ اس لیے کہ ان کے ثبوت سے کوئی خاص حق حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

دلیہ امر کہ جناب یہاں تو وطن اختیار فرما چکے ہیں۔ اس کے لیے کسی اجازت کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص آزادی کے ساتھ یہاں آ کے رہ سکتا اور مہاراجہ وغیرہ ملتا ہے۔ اور توطن اختیار کرنے کے چند ہی روز بعد سے اسے جملہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔ بجز اس کے کہ لازمت کے لیے بارہ سال تک یہاں مقیم رہنا شرط ہے۔ مگر یہاں کا جاننے والا مکان مزید لینے کے بعد اگر درخواست کی جائے تو یقیناً یہ بارہ سال کی شرط بھی اڑ سکتی ہے۔ الفرض آپ کے لیے کوئی امر مانع توطن حیدر آباد نہیں ہے۔

لیکن یہ بات کہ آپ کے تشریف لانے سے پیشتر حضور سے کوئی اجازت حاصل ہو تو بقول بید عبد المجید صاحب کے ایسی درخواست کو اعلیٰ حضرت مشتبہ مفروض سے دیکھیں گے۔ اور خیال ہو گا کہ اجازت توطن کے پر دے میں کوئی اور حق حاصل کرنا مقصود ہے اور اپنے شہر کا پیدا ہونا اچھا نہیں۔ میرے خیال میں اگر جناب کو یہاں رہنے کا شوق ہے تو عمرہ کو بھی یہاں مزید لینے اور اس میں آ کے رہنا شروع کر دیکھئے۔ اور یہ بھی کے قیام کے زمانہ میں وہ کوششیں عمل میں لائیے جن کو جناب یہاں آنے سے پہلے کر رہے ہیں۔ آجائے اور مکان مزید لینے کے بعد سب باتیں ہر آسانی بلکہ خود بخود پوری ہو جائیں گی۔

میں یہاں حضور کی سیرۃ لکھنے کے لیے بلا ہائی تھا۔ اور میرا سابق کا وظیفہ ملا کے پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ قرار پائی تھی۔ یہاں آنے کے بعد اس کام کے لیے تین سو تین سو تین ماہوار کا مل ملا۔ اور مواد جمع کرنے کی کوشش شروع ہو گئی اور دفتر کا نام دفتر شوکت عثمانیہ قرار پایا۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت کے ایک فرمان سے حکم ہوا کہ مجھ ہی سے ایک مکمل تاریخ اسلام تصنیف کرائی جائے اور اس کی بابت مہاراجہ ماہوار دی جائے۔ اس حکم کے مطابق میرے لیے علاوہ ماہوار سابق کے دوسری ماہوار پانچ سو روپیہ اور تین سو چھتر روپیہ ماہوار کا عہدہ معتدی سے منظور کر کے بارگاہ خسروی میں پیش ہوا ہے۔ شاید آج ہی کل میں منظور ہو کے آجائے مگر ان سب جملہ امدادوں پر اٹھان میں ہیں سے نامزد ہو گئے ہیں۔ بہر حال شک ہے، میں حضور میں واسطہ عرض پیش کر سکتا ہوں اور جو ملتا ہوں اس کا فوڈا جواب ملتا ہے۔ میرے حال پر منتظرانیت بھی غیر معمولی ہے۔ مگر انہیابی کا موقع ابھی ایک آہی بار ملا ہے۔ لیکن صاحب اور شاہی مزاج کی نزاکت کی یہ حالت ہے کہ اپنے امور متعلقہ کے سوا اور کسی بات کے عرض کرنے کی مجھ کی کسی اور کو جرأت نہیں ہو سکتی۔ گنہگار اگر دیکھو کہ صحبت ہوئی جس کے چار پانچ ماہ بعد قطعی امید ہے اس وقت شاید کسی اور ملک کے عرض کر کے لا توقع بھی ہو سکے۔ والسلام

۲۵ جولائی ۱۹۱۸ء

خاندان محمد عبد العظیم قراری

پیارے سے صاحب۔ سب اوروں کی خدمت میں۔

خاندان محمد عبد العظیم قراری

دشمن۔ شہر۔ پورہ۔ جامع ہاشمہ دہکاد دکن

لوگوں میں گورا۔ اور میں طرح آپ نے ان لوگوں کو پناہ پ۔

# ریاض خیر آبادی

(۱)

بنام احسن مادر ہر دی

نکوحی !

کار و طا۔ ریاض، لاخوار کی بابت عرض کردہ قیمت قبول فرمائیے۔ شکریہ۔ سب سے پہلے تلاش کر کے آج یا کئی غائبہ روانہ کر دوں گا۔ ٹرڈیو۔ تے کا۔ ناگوار نہ ہو میری صاف روش جرأت دلاتی ہے۔ ورنہ بقول میرے۔

میں جانتا ہوں درختی کو کمال عیب

دینا درخت ہے مرے دست سوال کا

اگر میرا فعل کچھ بھی گراں ہو تو بے تحلف واپس کر دیجئے گا میں تاوان کو مزد فقور سمجھ کر پھر وہی پرچہ دست روانہ کر دوں گا۔ یہ امر کہ انعام زیادہ ہے لوگ پسند نہ کریں گے۔ میں نے صرف اسے کا اظہار کیا تھا۔

میرے مصطفیٰ غوثی نکوحی داؤد

آپ کو مزد محمد سے ولی امن ہے۔ اس قدر متاثر ہوں کہ بے تحلف آرزو کے یکساں جانی کر بیٹھا۔ آپ میرا خیال صحیح سمجھیں بات یہ ہے کہ میں نہ اس پریشان ہوا ہوں۔ اول تو بالکل تھی کیسے خود و باہر اور فراہم کی ہر وقت فکر دوسرے صحت تہلیل سے تجار کی کام تنہا جب ہی چاہے سچے ہیں کہ انسان فارغ الہال ہو مہینہ ملازمت دیتے ہو۔ معافی

نگلی تھوڑا اور میں لاغر

کیا پٹھانے گی کیا ہنسے گی

یک جانی کا کوئی مناسب طریقہ ممکن ہوتا تو آپ کی ذاتی مالی اعنایت سے ایک مرتبہ زمین مرید اور غنایہ کی کوشش کی جاتی۔ مگر بہ حسن اتفاق کہاں ممکن۔ ہاں مزد غنایہ کیجئے صرف گد سڑکے کیجئے۔ تجار کی چھپائی یا اخبار نکالنے کو مار بڑا بہت ہی چھوٹا مقام ہے۔ ہر حال کچھ کرتے رہیں۔ خصوصاً نام آوری کے کام۔ طرح میں غزل تو دن کر بہت ہی اچھا خاصہ چاہتا ہوں یہاں پر کام ہے۔ ریاض خیل کے درینہ پہلے کے دور میں طرح پہاڑے بچہ نمایاں کیجئے۔ آپ و نور اخلاق سے یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر آؤ بھگت کے ساتھ کچھ بچے بوجھش الغافل میں خیر مقدم کیجئے۔ تصویر پھودنی سے لے دی ہوئی شائع کیجئے۔ یہاں تک کریں کہ دنیا میں میرا کوئی ثانی نظر نہ آئے۔ مگر جب کام پر نظر پڑے گی تو سب سرت اندس۔ سے ہن جائے گی۔ آنکھ میں آنسو آ جائیں گے۔ کام اس قابل ہوتا تو نذر کا مفاکد نہ تھا۔ نہیں حضرت نہیں۔ واللہ عجل کو آپ غنایہ سادگی کے ساتھ معمولی درجہ کے شکاری آخری حالت میں لیجئے۔ یہ باتیں ذرا کی تھیں۔ میں غزل مزد بھیجوں گا۔ میرے نام کے ساتھ دائرہ الفاظ نہ ہوں گے۔ صرف ریاض کا کافی ہوگا۔ دوسرے تو اس ثبات سے کہ رہا ہوں کہ غزل بھیجوں گا۔ اور قصد ہی ہے۔ مگر غزل بھی تو ہر جائے۔



آج آپ نے محبت جتنا کر میرا بہت ہی وقت لیا خدا آپ کا بھلا کرے۔ بالوں میں چند سنت دل طوب بہلا۔ اب نہ وہ ہم نہ سہارے ہی حالت انکو دینا کھا گئی۔ کچھ روز سے اور عالم ہو گیا۔

بادلوں کی تجھے گلشن کی بہاریں مل چیں

پنکھڑی ٹوٹتی تو شہر عمارتِ دل ہوتا

پیشہ ورانہ نیماقتی ۱۹۹۹ء

(12)

بنام چو وحر بنی نوح و صاحب بیفتہ بنی طے

عالی جناب چودھری فتح محمد صاحب ہالقاہ !

ہندوستان میں دھرم ہے کس کے کلام کی

وہ کون ہے یہ یاقین کو جو جانتا نہیں

عنوان تو شاعرانہ نقلی ہے مگر کم از کم دماغ حقیقت اتنی ہے کہ ریاض الاخبار جھٹنے میں دو بار "تقنتہ" منبتہ وارہ "تار بیل" رودادہ "عطرتہ" منبتہ وارہ "گل چیں" نامانہ "صح کل" وہ زانہ۔ یہ سب میری انڈیشی اور ملکیت میں برسوں شائع ہوئے رہے اس زمانے میں اخبار کم تھے کہ لارڈ سپنالی لاہور سے "ادوہ اخبار" روزانہ لکھنؤ سندھ لارنس گزٹ منبتہ وارہ میر پٹھ سے شائع ہوتے تھے میرے نام اور شخص کی شہرت کا یہی سبب تھے۔ یعنی وہ پہلے چھ جنہیں میں نکالتا تھا، سر عبدالقادر صاحب قریب قریب اسی زمانے کے بزرگ ہیں۔ یقیناً خط و کتابت کے ذریعے سے میرے ساتھ اس بھی، نیز ان کی تحقیق و تدریق و ذکاوت و ذہانت اور عالمانہ ذہین معلومات کا مدت سے معترف ہوں۔ سر اقبال شاعرانہ حیثیت سے مجھے جانتے ہیں اور اخبارات صحافت سے بھی۔ مجھے اس وقت مرحوم گرامی کی یاد بے اختیار آئی۔ وہ مجھ سے چودہاویں اس وقت ملے تھے جب میں سر بہار اہرہ کشن پرشاد شاہ کا مہمان تھا۔ میں ان کی فارسی شاعری کا بہت احترام کرتا ہوں۔ اس سے میری یہ غرض نہیں کہ سر اقبال کی "رودادہ" شاعری کا احترام ان کے بلند خیالات کو دیکھتے ہوئے میرے دل میں فرق کے ساتھ ہے۔ میں سمجھتا ہوں سر اقبال کے بلند خیالات نے ان کے ہر مصرع کا سہارا لیا کی بلند چوٹی کا مہمان ذریعہ بنایا ہے۔

بچاس سال جوئے سرسید مرحوم نے مذہ و لان پنجاب کا فقرہ کلمہ کہ پنجاب کو اور صوبوں سے افتداری حالت میں ظاہر کیا تھا چنانچہ اس وقت کی تعلیمی رپسپاں لاہور کو گل سرسید بنائے ہوں گے دیکھتے ہی دیکھتے تمام اصناف میں پنجاب نے اپنی مذہ و لی سے تابو حاصل کر لیا۔ بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ یہاں

## ترقی امتحان ترقی کرے قیامت کی

تہا شباب بڑھے عمر جاوداں کی طرح

مجھ بہت دباورہ حیرت زبان کی ترقی پر ہے۔ پنجاب کے شہری افراد ہوں یا اہل تصنیف و تالیف، دو زبان، مہذبہ وارہ

بہارے ہوں یا مہوار شائع ہونے والے سالے، قریب قریب کیسی پاکیزہ اور ساختہ و سبے ساختہ زبان میں اہتمام کرتے ہیں جناب نگار کی اردو میں بھی وہی دلکش و کھنڈ سے قریب قریب یکسانیت حاصل کر لیتا۔ مگر نگار کی زبان تو برجہ اپنے خاص مرکزوں سے رخصت ہو رہی ہے۔ پھر بھی بالیسی میں امید کی جھلک اس اعتبار سے نظر آ رہی ہے کہ زندہ دلاں پنجاب اگر نگار کی زبان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تو ضرور اس پر بھی قابو حاصل کر لیں گے۔ وہ نگار کی زبان جو غائب و اہتمام کا حصہ بھی جاتی ہے اور زمانہ سرسید سے اب تک خان بہادر میر نامہ علی مرحوم مدبر صلائے عام کا جرحہ ہو گئی تھی۔ جزو نگار کی اردو کی نظم کو امیر دانش و آتش، جلال نے چار چاند لگا گئے۔ زندہ دلاں پنجاب کا شاعر بھی توجہ دے لیں۔ جو زبان اسکولوں اور کالجوں میں درجہ اولیٰ کا تیسب میں داخل درس ہو چکی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ خاص توجہ سے نگار کی زبان ہو سکتی ہے۔ ورنہ تاریخی رد و دیوار کچ کی مصداق جیسی اب بے آئندہ بھی رہے گی۔

میں آپ کو کیا لکھنا چاہتا تھا اور کیا کہہ گیا کسی اجنبی کے لیے بہ امید معاوضہ کاغذ سیاہ کر دیا ہوں۔ مجھے جناب کو بنا نامہ لکھنے کا اتفاق اس بنا پر ہوا کہ میں نے فقہا صاحب کو ایک خط اس عرض سے لکھا کہ میرے دیوان کے طبع کا پرچا تو پنجاب و غیرہ میں زیادہ عرصہ سے ہے مگر تاخیر نے ہر طرف نا اہمیدی کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اس لیے فقہا اور دیگر احباب کو میں یقین دہانا چاہتا تھا کہ دیوان کی طاعت و اشاعت کا ذمہ اب قریب ہے اور اعتبار دلائے کو میں نے ملک کے سرمایہ ناز سر سلیمان صاحب چیف جسٹس الہ آباد کی چٹی جو اسی دن میرے نام آئی تھی بصورت نقل اسی خط میں غفوت کر دی تھی۔ فقہا صاحب نے اس چٹی سے تاثر ہو کر یہ چاہا تھا کہ دیوان ریاض کے متعلق اپنے صوبے کے سرمایہ ناز حضرات یعنی سر عبدالقادر صاحب بالظاہر، سراجیال صاحب بالظاہر، ملک سر فیروز خان فزون ایم اے وزیر تعلیم پنجاب سے ایسی ہی چٹیاں یا نوٹ حاصل کیے جائیں۔ کہ دیوان ریاض کو ان کے ذریعے سے بھی روشناس عالم ہونے کا موقع حاصل ہو سکے۔ فقہا صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک "بنا نامہ" جناب کو بھیجوں۔ آپ محاسن اور مختلف خوبیوں کا مجموعہ عجیب ہیں۔ مجھ پر آپ کی تائید کا بخیر صیت تخلص یعنی کبیل ہیں کہ تائید علی بدوس است یہ اثر ہوا کہ میں آپ کو خط بھیجنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

مجھے اس کی بھی خواہش نہیں ہے کہ آپ جواب لکھنے کی تکلیف گوارا کریں یا میری اس بے سرو پا طولانی تحریر کے پڑھنے میں وقت ضائع کر لیں۔ میں جس اونٹنے پوزیشن میں ہوں میں جانتا ہوں۔ مالی حالت نے بہ لحاظ کثیر ادلاء ہونے اور صرف للہو ماہوار پڑھنے ہونے کے مجھ پر ضرور دینا تنگ کر دی ہے۔ مگر دیوان کی اشاعت انشاء اللہ ضرور میرے لیے اطمینان پیدا کر دے گی۔ بقول میر کے۔

آس اک چیز ہے دنیا میں اگر ٹوٹ نہ جائے

سرداب قاضی عزیز الدین وزیر دینا میرے واسطے بہترین ذریعہ تھے کہ میں لکھنؤ میں اعلیٰ حضرت نظام دکن سے حوں۔ مگر میری قسمت نے مجھے نوک دیا۔

بلکہ ملک سر عبدالقادر صاحب، سراجیال صاحب، ملک فیروز خان صاحب فزون ایسی بند پائے شخصیتیں ہیں کہ وہ میرے

دیوان کے متعلق اظہار خیال فرمائیں تو مدد و معین کی یہ قدر شناسی ملک کی شکر گزاری کا باعث ہوگی۔ مگر میں محدود بین سے ایسی مدد کا کہنا اس حوالہ دیدہ بزرگ کے ادب اور شان کے خلاف سمجھتا ہوں جس نے مجھ سے بے بغضامت کم مایہ شخص کی شاعری کو اس مرتبہ پر پہنچایا کہ انگریزی تعلیم یافتہ ہندو ہند حضرت جن کی قابلیت نے دور جدید کی شاعری کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ میر سے لیے کہ نہیں مگر میر سے اشعار کے لیے اچھے الفاظ سے بھل نہیں فرماتے یہ کہتا تھا کئی دہوں سے دیا من شکستہ حال مجھ کو نہ دیکھئے مرے اشعار دیکھئے

میرا خیال یہ ہے جو حضرات میر سے دیوان کے لیے خام فرمائی فرمائیں گے وہ اپنے لیے میر کے دیوان میں اپنی منتقل یا دلگہ تمام کر دیں گے۔

امستہ لماند سید برہنہ

لفظ صاحب نے اپنی امیدیں ہواپ کے دامن سے دالبتہ کی ہیں۔ ان کا لحاظ فرماتے ہوئے آپ حضرات مدد و معین کو کفایت دینا جائز اور مزید اعتبار کے لیے ان کی ضرورت معلوم ہو تو آپ سید خان صاحب چیف جسٹس کی چھٹی نقل شدہ جو ملفوظ بھیجتا ہوں آپ پر ایک تہہ و صودت میں یا یہی ان کی خدمت میں بھیج دیں یا خود کسی وقت دکھا دیں گے۔ میں وہ غزل بھی ملفوظ بھیجتا ہوں جس کے لیے اچھے الفاظ خان بہادر نذیر الہی صاحب اسٹنٹ ڈائریکٹر ریشہ تعلیم پنجاب نے اپنی چھٹی موصولہ حال میں تجھ کو لکھے ہیں یہ قدر دان گوہر سخن کے دیا من منہ مرا موتیوں سے بھرتے ہیں

سید ریاض احمد راقی خیر آباد راولپنڈی

۱۹۳۳ء

## حبیب الرحمن شروانی

(۱)

ہمام سید عذرم عالم صاحب

مفردی۔ وسیع السلام ورحمۃ اللہ

الطاف نامے کا پاس گزار ہوں۔ آپ بے لاد کی شکایت کرتے ہیں۔ اور مجھے بالادہ بننے کی تدبیر میں مشورے کے خواستگار ہیں مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ ایسا شخص کیوں کر بیکار ہو سکتا ہے جس کے قبضے میں شباب، علمی استعداد، روشنی خیال، خاندانی خلعت معاش و غیرہ سب قوت ہوں۔ مسافری میں کام کرنے کے اتنے میدان کھلے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی کام کا شائق ہو تو کچھ کمزور اس دل می کشد کہ بجا انجاست۔ کامغنون ہوتا ہے۔ ابھی آج کی کافورس میں جو پائیدہ نشانی پائیں مشراہیں نے دیا اس میں کائن

کا ماضی و ماضی اقدس میں پہاڑے میں گھلایا ہے وہ رول پر تان دیا ہے گا کام نہ دے نہ بھنکا جائے کہ دلی مرچے ہر ایک مسلمان (جو ارادہ کرے) اس اقداس کو دُور کرنے اور قومی تہذیب میں اصلاح کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ کس طرح ایہ تجویز ہے۔

سینے۔ مسلمانوں میں جو مرض ساری ہے وہ بے فکر کا ہے۔ باقی کئی غریبوں میں اس مرض کے مراض ہیں۔ اس مرض کا علاج کیا جائے یعنی مسلمان اپنی حالت پر غور کر کے اس کا اندازہ حقیقی طور پر کریں تو ابھی کا یہ ملتی ہے۔ آپ خالق ہیں، مسجد میں عربی مدارس میں، کانفرنسوں میں، کالوں میں، گھروں میں، بازاروں میں، اجانب کی مجلسوں میں، غرض مسلمانوں کے چہرے میں جا کر دیکھئے ہے دلی اور کم حوصلی کا نشانہ ہر جگہ آپ محسوس کریں گے۔ اور یہ رنگ آپ نہیں دیکھیں گے کہ ایک یا دو مسلمان حوالہ مردانہ کسی کام کے کرنے میں جان بڑا رہے ہیں۔ اور ان کی ساری حرکات و سکنات سے حوصلے کی گئی تپک نہ رہی ہے۔ جو دیکھنے والوں کے دل میں کچھ نہ کچھ برقی اثر دوڑا دیتا ہے۔ کیا اس سے پہلے اور پاکیزہ کام کسی مسلمان کے واسطے ہو سکتا ہے کہ وہ اس بد دلی کے دُور کرنے اور حوصلے کی گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ حقیقتاً یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے ایک اعتبار سے خوش فہمی کا زمانہ ہے اور یہ یوں کہ جو وقت مسلمانوں پر مسلح کن کر پڑا ہے وہ تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اور جو موقع قومی خدمت کا ہم کو حاصل ہے وہ بہت کم نصیب ہوا ہو گا۔ اگر کوئی حوالہ مردانہ دلی کے ساتھ اس خدمت میں جان دے دے تو شہادت کے مراتب پانے کی امید کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کی بے فکری کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ عجیب وہ کسی کام کے کرنے کا خواب دیکھتے ہیں تو باروں و داموں کے دربار کے سوا انہیں کچھ نظریں آتا یعنی وہ یہ مضروبے بانہ دیتے ہیں کہ جب بغداد کا دربار آباد ہو اور ہم شان و شوکت کے ساتھ اس میں جا کر رہا کرے تو اب یہ تقریب میں کھڑے ہوں تو اس وقت ملے گا کہ میں یونیورسٹی کے واسطے ایسا وقف حاصل کریں جس کی آمدنی کیمبرج اور آکسفورڈ کو ان واحد میں گروہ کر دے لیکن آہ بغداد کا دربار انہیں ہم میں برکی عروج کا کچھ شائبہ نہیں پھر ہم قومی خدمت کیا کر سکتے ہیں۔ جب اس خواب سے آگے کھلتی ہے تو وہ اپنے دماغ کی طسروح خستہ اور مضطرب پاتے ہیں جس نے ابھی کسی دماغی دورے سے نجات پائی ہو۔ اور اس خواب کا سلسلہ اس کے کچھ تجربہ نہیں ہوتا کہ وہ چند روز تک خواب دیکھنے کے لائق ہی نہیں رہتے۔ جب وہ ایسا خواب دیکھنے لگتے ہیں تو اس کا خیال نہیں کرتے۔ کہ بغداد کا دربار وہ بارہا دلی کے عروج نے نہیں سمجھا تھا بلکہ وہ ان پاک دل کا دربار یوں کی محنت کا ثمرہ تھا۔ جو راہ خدا میں لڑا کرتے تھے۔ اگر ہم بھی پاک دلی سے قومی خدمت کے لیے مزدور نہیں تو ہمپر عظمت قومی اور شوکت ملی کا دار سج جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم مزدور کی کون سے کہاں جائیں۔ جواب یہ ہے کہ جہاں ہم ہیں وہیں مزدوری شروع کر دیں۔ قومی عبادت کا سلسلہ اس کی ہی سے ہماری تہ تک بلکہ دنیا کے ہر حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ہر جگہ مزدور نہ ملنے سے کام بند ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ بیعتہ آدم بر مطلب سب سے آگے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم تو قومی عمارت کے ایک جز ہیں۔ ہذا ہمیں سے کام شروع کر دیں۔ رشکے

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن شروانی مرحوم امارت کے علاوہ علم و فضل میں بھی بلند مرتبہ شخصیت کے مالک تھے۔ اور جو کتب خانہ انہوں نے فراہم کیا تھا۔ وہ دور حاضر کے نواور ہیں سے تھا۔ وقت کے تمام اکابر علم سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کٹھن ان کے بعض ملائیم محمد کاہر دان خیالی میں شائع ہو چکے ہیں۔

ہم تو تحصیل علم کریں۔ تحصیل کے لیے مزدور نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں جانے کی وسعت نہیں تو گھر پر چھین۔ کتب خانہ  
 تو بھاگ دوڑ کر خرید لے لی جائے اس سے سبق میں کوئی ڈٹے تو بیٹے سے حساب کے گڑھی بیکیں۔ اگر ایسے کرے  
 میں ہیں جہاں کوئی پڑھا لکھا نہیں تو جہاں قوتوں میں ہوتے ہوں ان کو بیکیں۔ بل جڑیں۔ ہمارا کام کریں۔ ہماری حاصل کریں  
 غرض کچھ کریں۔ یہ کہنا اس سے ہر جہاں ہر ہے کہ ہم اس حسرت میں وقت نہ دوں کہ ہم کو وظیفہ دار اور کالج میں جاکر پڑھتے۔ ان  
 ہم جہاں ہیں۔ گھر میں بروی۔ پنکھے۔ بڑی بوڑھی ماں ہیں۔ رہنے کو ملاں ہے۔ تھوڑی سی مصافحہ بھی ہے۔ جہاں ہم رہتے ہیں۔  
 شریف مسلمانوں کی سب سے جو گزشتہ تاریخ بھی رکھی ہے، ہمارا بھائی بھی ہے۔ دوست احباب بھی ہیں ہم کچھ نکلے پڑھے  
 بھی ہیں۔ صمیمت کی بدولت مشکلاؤں کی ضرورتوں اور دوسری قوتوں کی حالتوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اب تو بے انتہا  
 کام ہم کو کرنا ہے۔ جس سے مادی عمر فرصت نہیں ہو سکتی۔ ہم کو اول ناک اولیٰ اور وسعت خیالی اور عمل کی عادت اپنے  
 نفس میں پیدا کرنا چاہیے۔ اس کے ذریعے سے ہم ان لوگوں سے جن سے ہم کو سابقہ پڑھے عبت و ہمدردی کے ساتھ  
 لی بیکیں گے۔ کفایت شعاری سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ ہمدردی و عبت طے والوں کو ہمارا دردہ کر دے گی کفایت شعاری  
 ایمان قلب پیدا کرے گی

اب ہم گھر میں جاتے ہیں تو بروی کو علم کا شوق دلاتے ہیں۔ مزدور ہوتا اس کو لکھنا پڑھنا بتاتے ہیں۔ رسوم بے جا کی برائی  
 ذہن نشین کرتے ہیں۔ احکام دین کی پابندی کی تعلیم کرتے ہیں۔ جو نفع نفع عورتوں کی بے بیعت ثانیہ بن گئے ہیں ان کے مقابلے  
 زمری سے جہاد کرتے ہیں۔ لڑکی کی تعلیم کی فکر کرتے ہیں یعنی اس کو کم سے کم جو ممکن ہے لکھاتے پڑھاتے ہیں۔ سینا و دونا  
 سیکھنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ بوڑھی ماں سے یہ کشادہ پیشانی پیش کرتے ہیں۔ سعادت مذات بات چیت کرتے ہیں۔ جو  
 خدمت قابل سراپا انجام ہو رہا انجام دیتے ہیں۔ مکان کی صفائی کا اہتمام رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ دیکھئے اس تھوڑی سی دیر میں کتنی  
 خدمتیں انجام دیں۔ تعلیم نسوان۔ مادی ترقی۔ حفظ صحت وغیرہ بہت سے کام کیے۔ دوست احباب سے ملنے ہیں تو ان سے  
 ان کا دکھ درد سنتے ہیں۔ ان کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں ان کے دکھ سے معصوم۔ مگر یاد رہے منافقانہ نہیں غصا نہ پھر دیکھتے  
 ہیں کہ ان کو کس خدمت کی ضرورت ہے اس خدمت کو بخوش اسلوبی اور کرتے ہیں۔ غرض لکھتے ہمارا دوست خوش حالی ہے  
 مگر روکے کی تعلیم ہے بے فکر ہے۔ اس کو اس طرف توجہ دلائیں گے یاد رہے جا بھڑکتا ہے۔ اس کو اس کی معزیتیں سوجھائیں  
 گے، فذل فرج ہے تو کفایت شعاری کی ترغیب دیں گے۔ فیاض ہے تو دہیہ مینہ کاموں میں صرف کرنا کا شوق دلائیں گے  
 دقت ملے بنا۔ اس کے ساتھ ہی یہ توجہ نہ کریں گے کہ ایک ماری فرانس و جناتش ہمارا اور ہوگی۔ نہ اس سے غولی ہوں گے۔ کہ  
 دوست نے ہماری نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ غرض کچھ بھائی ہمارا دوست خنوک ہے۔ اس کی بے لاری و فح کرنے کی کوشش کریں۔  
 کچھ نہ کچھ ہو سکے تو اپنے ہمدردانہ ہوتا ڈاڈا رکام سے اس کی مصیبت کے ہلکے کرنے کی کوشش کریں یہ بھی تھوڑی ہمدردی  
 نہیں۔ بھائی سے برادرانہ شفقت کا بتاؤ رکھیں۔ اس کی نافرمانی کریں اپنے اور اس کے حقوق کو برا بھلیں۔ تنگ دلی  
 سے کام نہ لیں۔ اس طرح دوسروں کے لیے عمدہ نظیر قائم کریں۔ فرصت کا وقت معاملہ وغیرہ علی مشاغل میں صرف کریں۔ شادی  
 وغیرہ تقریبات میں شریک ہوں تو سب سے اول ایسا سنگتہ مزاج قائم رکھیں کہ صاحب تقریر کے ہماری جہان داری میں وقت

ویش نہ آئے۔ بلکہ ہماری آسائش کی نظر نہ کرے تو بھی ہم نہ جھڑکیں اور اس طرح دل میں گنجائش پیدا کر کے کچھ مناسب حال الفاظ اس کے کان میں ڈال دیں جتنا کہ اس تقریب میں کام نہ آئے تو آئندہ آئیں گے۔ یہ بھی نہ سہی تو ہمارا ہوتا تو دوسروں کے لیے نفیر ہو گا۔ نفیر بھی نہ ہوا تو ہم اپنے فرض سے ادا ہوں گے۔ نیز ایک پریشان حال بندہ خدا (صاحب تقریب) کی مصیبت نہ بڑھائیں گے۔ ہمارے محلے میں جو مسلمان دکاندار ہیں ان کو ہم صفائی معاف کی تقریب اس طرح دلاتے ہیں کہ جو ہمارا معاف اس سے ہر اس میں صفائی رکھیں اور ان کے ساتھ سہولت کا ہوتا تو کریں۔ موقع موقع سے ہمت استقلال کے متعلق دو چار لفظ بھی ان کے کان میں ڈالتے رہیں۔ اپنی بہت ہی گزشتہ تاریخ کے مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے عہد سبق تحریر یا تو تقریباً اہلنا سے زمانہ کو سنا تے ہیں۔ بڑیوں کی علمی یا دیگر دل کو جو ہماری دسترس کے اندر ہوں تاہم دھندلے رکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور اس سب کچھ کرنے کے بعد جب رہا فرض، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو کوشش ہم نے کی وہ بالکل بار آور نہیں ہوئی۔ بلکہ سب جگہ اکارت گئی۔ تو پھر ہم یہ خیال کر کے مطمئن رہتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا اور یہ اطمینان ہم کو کوشش میں بنا ہر معرفت رکھتا ہے۔ میرے محذوم اگر ہم نے اپنی زندگی اس طرح بسر کی تو کیا ہم بے کار رہے اور کیا باکاری اس کا نام ہے کہ ہم تو کڑی کے پابند ہو کر بے کار ہو جائیں؟ اور اذاتگی معاف فرمائیں۔ والسلام بالاکرام۔

خاکسار حبیب الرحمن

حبیب گنج ہر جنوری ۱۹۰۲ء

## علامہ اقبال

(۱)

امام مولانا عرفان صاحب

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۲۵ (بصیرت ناٹ)

جناب مولانا!

السلام وعلیکم۔ مولانا شرکت علی تو اس وقت مقدمہ کی تیاری میں مصروف ہوئے گئے۔ آپ ان سے دریافت حالات کر کے اس خط کا جواب دیں۔ کچھ روز ہوئے میں نے ان کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک ہندو بزرگ مشرقت کا خط میرے پاس آیا تھا اس کا معنیوں یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے اسکیم کو جو تم نے ایک کی صداقتی ایڈریس میں پیش کی تھی تسلیم کر لیں۔ پندت مالوی سے بھی مشورہ کرنے کے لیے جا رہا ہوں وہ بھی ہندو مسلمانوں کی صلح کی خاطر اس کو تسلیم کر لیں گے۔ گو اس وقت ملازمہ طور پر اس اسکیم کو تسلیم کر لینا مصیبت نہیں ہے۔ یہ خط بصیرت ناٹ تھا اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے مولانا شرکت علی صاحب سے بھی گفتگو کی ہے۔ وہ بھی صلح پر آمادہ ہیں۔ اسکیم جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے یعنی شمالی ہندوستان کے مسلمان صوبوں کا ایک ہو جانا۔

اس خد کے موصول ہونے پر میں نے مولانا شوکت علی کو لکھا اور انہوں نے اس بات کی تصدیق کی شرکت ان سے ملے۔ میں نے شرکت موصوت کو دو خط اس کے جواب میں لکھے تھے مگر یہ خط قریباً ایک ماہ ڈیڑھ آفس کے ذریعہ سے میرے پاس آگئے ہیں۔ پہلے مجھ کو شبہ تھا کہ اس میں کوئی چال اور حیا دہی نہ ہو مگر اب خطوں کے واپس آجانے سے یہ شذوذ رفع ہوا۔ شرکت اب معلوم نہیں کہ کہاں ہیں۔ اور مذکورہ بالا خط لکھنے سے ان کا کیا مقصد تھا۔ ممکن ہے۔ مولانا شوکت علی اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔ لیکن لوگ مشرورہ دے رہے ہیں کہ میرے خطوط کے واپس آجانے کے بعد شرکت کے خط کو شائع کر دینا چاہیئے۔ اگر ممکن ہو تو حالات دریافت کرنے کے بعد مجھ کو مطلع فرمائیے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

انٹوس کہ بیٹی کے فسادات ختم ہونے میں نہیں آتے۔

فخلص محمد اقبال

## مولانا محمد علی جوہر

(۱)

پچھنہ وارڈ - ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

براہر واجب الاحترام!

اسلام علیکم۔ ہر اپریل کے محبت نامہ کا جواب آج دیتا ہوں اور محبوب ہوں کہ اس تاخیر کا باعث سوائے اس کے کچھ نہیں بیان کر سکتا کہ اس عرصہ میں ہمارے قلم و قلم کا شکار رہا۔ میں جو برسے برسے معاملات میں بھی آج کے عارضی فیصلوں کا قائل نہیں اور ان تمام ہنگاموں کو "مزارعین" سے زیادہ نہیں سمجھتا، ہر اپریل کے فیصلہ پر کیا۔ بندہ دام فریب ہوں مگر دوستوں کی موت اس زمانہ میں بھی جب کہ موت کا بازار گرم ہے دوچار آتش بھڑکے مزارع کے وصول کر ہی لیتی ہے۔ اور ہر اپریل کو میرے چند عزیز ترین دوست نذر اہل ہو گئے اس لیے میرا غم و غصہ بے جا نہیں۔ مگر موت جسمانی نہیں، اس لیے کہ میں تو اس کا قائل ہی نہیں ہوں۔ ہر دم سے مردوں کو جن کی قبروں تک کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ علی احیاء میں شامل کرتا ہوں مگر ان جیتی جاگتی کشتہ پیکر کو جو حسی شیک پر پناہی جاتی ہیں اور پناہی جاد ہی ہیں مردوں سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ موت ان کے جسموں کو نہیں آتی بلکہ ان کی دوحوں کو۔ تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو کہ یہ

محروم ہوں، محبوب ہوں، بے تاب و توان ہوں

مخصوص ترے قلم کا مزامیرے لیے ہر

پھر جس چیز کا صحیح معنوں میں اجارہ تم کو اس دربار سے مل گیا ہو اس میں شرکت کے دعویٰ کی مجھ سے جرات نہیں ہو

ہو سکتی۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ میں بھی کسی قدر محروم و محجور ہوں۔ اس پر بھی میں نے انصاری صاحب کو راہ راست پر  
 استقامت کی۔ جس طرح مجھ سے ہوسکا، ترقیب دی اور امید کی کہ میری اس دعا کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ ”ربنا لا تزغ قلوبنا  
 بعد از ہدینا“ میرا خط و جہان کو بھیجا گیا تھا، کوئی تحریر معمولی نہ تھی۔ اس میں میرے نگار دل کے متعدد ٹکڑے منسلک تھے مگر  
 براہم انکشاف ہی معلوم ہوا کہ جس دنیا میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ اس دنیا سے بہت مختلف ہے جہاں یہ ہمارے جہیز پس  
 رہے ہیں۔ ہمارے تمام خیالات، تمام اغاڑے، تمام تحفے، فضول اور غیر متعلق ہیں۔ میں نے غالب کے ایک مصرع پر جو غزل لکھی  
 تھی اس میں ایک شعر تھا۔

تقصے کے بعد خوف کہاں مژن پھر کہاں

عالم ہی اک جدا ہے وہ کچھ دامن کہاں

تقصے کا دوسری کرتے بھی ڈر لگتی ہے اور یہ سب جھوٹا فخر ہوگا۔ اگر میں کہوں کہ میں متقی اور خدا ترس ہوں۔ مگر باوجود  
 ہار بار انقباء اور کم از کم چھوٹی موٹی تکلیفوں کے اب تک اس وعدہ الہی کو سچا جان رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ بھی پورا  
 ہو رہا ہے کہ ”سلفی فی غلوب اللہین کفر و الرعب“ اس لیے باوجود ناست و فاجر اور بندہ حرص و ہوا ہونے کے اپنے کو  
 اپنے دیرینہ احباب کی دنیا سے ایک الگ دنیا میں پاتا ہوں اور گو اس دنیا کو اس پرانی دنیا سے بدرجہا بہتر مگر پاتا ہوں اور  
 خوش ہوں کہ اس کی سرحد میں داخل ہو رہا ہوں۔ تاہم پرانے تعلقات دامن گیر ہوتے ہیں اور گو خود ہیچا چھڑا لیتا ہوں۔ تاہم  
 دامن کے ٹکڑے اس خاندان لگتار منزل میں جٹے رہ جاتے ہیں۔ جن کے لیے آسروں کا ایک چھوٹا موٹا قافلہ روالا ہو  
 جاتا ہے افسوس کہ احوال سے زیادہ بہت واسطے نہ نکلے۔ اب اپنی کی نہیں بلکہ خود حریت کی چلک ہنسائی ہو رہی  
 ہے مگر اس کا زیادہ رنج نہیں۔ کچھ پرانے دوستوں و دوستوں کی رفاقت چھوڑنے کا ہے۔ غالب نے سچ لکھا تھا کہ

دھکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

مگر اچھا ہوا یہ جھوٹا سہارا بھی گیا۔ اب ایک سہارا باقی ہے اور وہ ہمیشہ کافی تھا اور اب بھی ہے۔ غالب کی غزل کا  
 ایک شعر بھیجے کئی برسوں سے دل میں کھب چکا ہے۔

چاک مت کہ جیب کو بے فضل گل

کچھ اور مرا بھی اشرا چاہیئے

اس پر ایک نامکمل غزل قافیہ کو محدود کر کے میں نے بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر ہے۔

ایک ہی درد کا بھکاری ہوں مجھے

اک فقط تیرا سہارا چاہیئے



گو کہنے کو تو لکھ گیا۔ خود اب جا کر کہیں اس کا مفہوم سمجھا ہوں اور پھر سورہ یوسف پڑھتا ہوں تو اس کا یہ کریم کا مطلب اب سمجھ میں آتا ہے جن میں مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون کے جام بردار سے اس کی رہائی کے وقت کہا تھا۔ کہ بھیج ہمارا بھی ذکر اپنے آقا سے کر دینا کہ محنت ظلم ہوتا ہے اور وہ بھول گیا اور اس طرح چند سال اور حضرت یوسفؑ مبتلا رہے۔ ان دنوں رہے۔ جب ایسے بزرگ و بزرگ پرستار کے لیے بھی فرعونوں کی یاد دہانی داخل شرک نہیں تو کم از کم مذموم کبھی گئی۔ اور اس دھندلے شریک کو اس میں بھی استعانت چیز اللہ کا شکر معلوم ہوا تو پھر ہمارے تمام تعلقات تو شرک جلی ٹھہرے۔ اقامت صلوٰۃ میرا ایمان، اجماع امت پر میرا اعتقاد، تاہم بعض اوقات اس تنگ و تنگ ایک بت کردہ میں عبادت اپنی بھات کے سیکھنا زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے جہاں ایک وقت میں ایک ہی عبادت کرنے والا اپنے معبود کے حضور میں کھڑا ہو کر اپنی بندگی کا اظہار کر سکتا ہے۔ خوف ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مذہب کی وسیع فرائض مساجد میں ناز کے ساتھی اور خود امام بھی مجھے کفر و شرک کی طرف نہ گھسیٹ لے جائیں اور دوسروں کی اصلاح تو گئی خود اپنی بھات سے مایوس ہونا پڑے۔ سب کچھ ہو جو اگر اب یہی وہ گیا ہے کہ اپنی جان بچانے کی کوشش کر دوں اور مدرسہ کو چھوڑ کر پھر خانقاہ میں احتکات کر لوں۔ بھائی دعا کر دو کہ اگر اپنی بھات کے متعلق خوف و ہراس میں کمی ہو تو کم از کم دوسروں کے متعلق یہ بے اعتباری باقی نہ رہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کہیں کا نہ رہا۔ البتہ جب تمہارا خیال آتا ہے اور تم سے بھی دنیا وہ بہن کا رجحان صرف تمہارے ناموس کو بلکہ ہم سب کے ناموس کو اس طرح بہت و جرات کے ساتھ منہ مٹانے میں اور صامت و ساکت نہیں بلکہ کلمہ حق کو باقی توڑنے میں سب کو سارہی ہیں تو یہ بے اعتباری دُور ہوتی ہے۔ اور جس طرح خدا سے میں مایوس نہیں اسی طرح اس کے بندوں سے مایوسی بھی قرین کھنسر معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ قومی ایجنسی کی کٹھ پتلیاں نہیں ہیں۔ وہی غریب اور کمزور لوگ ہیں جن سے اسلام کی ابتدا ہوئی تھی۔ رہے یہ حضرات قرآن کے متعلق تو بدگمانی بہت پہلے سے تھی۔ چنانچہ میں نے متعدد دیباچہ ان "آزادوں" کے صفحوں کو غزلوں میں بانٹ دیا۔ مثلاً :-

تمہ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے، دلے  
میرا لہو بھی خوب ہے، تیری حنا کے بعد

یا سہ

ہیں اتنے لاف شوق پہ مرعوب حسن بھی  
یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دُور  
ہے بعد کہ بلا سے بھی، قریب یزید بھی  
اور چاہتے یہ ہیں کہ نہ ہوں، بھٹک سے دور

یا سہ

دشمنوں سے جب تلطف ہے تو کچھ  
دوستوں سے بھی داد چاہیئے

حافظ طحطائی کو دوستوں کے لیے اور حاداد کو دشمنوں کے لیے لازمی گردانتے تھے۔ ہم دوستوں کے لیے ملے (۱) یہ سب کچھ لکھ کر دیا ہے اور آج بھی اس طرح لکھ رہا ہوں کہ گویا ہم ہی انبلا اللہ اور اجباء اللہ ہیں۔ مگر ہر آدمی! ان حیرت انگیز اختلاؤں کو دیکھ کر خوف ہوتا ہے کہ کہیں پڑا بول آگے نہ آئے۔ بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد آیا ہے جس کا قرآن کریم میں مذکور ہے: "قَوْرًا اَلْقَلِيْلًا سَمِيْعًا" خود مسلمانوں نے بعض اوقات اس خیر القرون میں بھی سنت بنی اسرائیل کی تقلید کی تھی۔ چنانچہ مصنفین ائمہ سے کہا گیا تھا کہ "وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمْنُوْنَ الْوَلُوْءَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقُوْلُوْا وَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ" دعا کرو کہ یہ حال اپنا بھی نہ ہو بلکہ آخر تک ایمان اور صالح عمل پر قائم رہیں۔ تمہاری دعا منور و مقبول ہوگی۔ اس لیے کہ آزل قرآنی رسولی پھر تقلید سنت پرستی سے مشرب ہو چکے ہو۔ اب جو قوم نے مجھے بھی اپنے منہ میں بھی جو ایمان اور اجباء کا ہے شامل کر لیا ہے اور خود لکھ چکے ہو کہ

خوش اسی حال میں جو ہر بھی ہے آزاد بھی ہے

غیر یہ تو ہوا۔ ہم نے لکھا تھا کہ تم پیش گوئی کرتے ہو کہ جمہور کی خواہش کے خلاف احمایان استبداد ایک ذلیل و نیکو قائم کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اسے بھائی اس میں پیش گوئی ہی کیا ہے۔ تم تو ان کے قبیح ہر جو خواہش کی صحیح تعبیریں بیان فرمایا کرتے تھے اور اس طرح مجلس سے نکل کر سخت تک پہنچ گئے۔ میں کہ اس مقام سے بدست و درہوں یہ تو میں بھی جانتا تھا اور سال گذشتہ ہی میں سب کو جتلا چکا تھا کہ مزاج من مد مدہ یونی و مدنی کا نہیں ہے بلکہ قوم کی شکل اور تمہاری خواہش و غزالی کا، اور یہی یونی و مدنی تو سن لو کہ اسے ہم بنائیں گے ہم۔ تمہارے قوم قروش اور کالج قروش۔ کیونکہ ہم سے کسی نے حتمی وعدہ کر لیا ہے اور وہ وعدہ کا سب سے پکا بھی ہے کہ "وَلَا تَحْضُوا دِلَّائِحُمْ وَلَا تُؤْثِرُوا عَلَیْهِمْ اِنَّ كَثَمَ مَوْمِنُوْنَ" اگر خوف ہے تو اس شرط کا کہ "اِنَّ كَثَمَ مَوْمِنُوْنَ" سو خدا سے دعا ہے کہ ہم کو ایمان پر قائم رکھے اور ان بزدلوں کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے جو کے متعلق اللہ فرماتا ہے کہ "فَمَا وَهَنُوا لَمَّا اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوا اللّٰهُ یَحِبُّ الْعَبْرُوْنَ" اگر ہم ایمان پر قائم رہے تو پھر سنت اللہ میں تو تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارا انعام کہیں نہیں لیا ہے۔ وہاں تو طے ہی لگا، مگر بیعت پر میں مل جائے گا کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ

"فَاتَمَّ اللّٰهُ ثَرَابَ الدِّیْنِ وَحَسَنَ ثَرَابَ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ یَحِبُّ الْمُحْسِنِ"

اس پر میں نے لکھا ہے کہ

انعام کا حقیقی کے تو کیا پوچھنا لیکن

دنیا میں بھی ایمان کا صلہ میرے لیے ہے

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ تمہارے دونوں دیوان پڑھ چکا اور بنایت عذر سے پڑھے اور ہمارے پڑھے۔ ارتقاے

سخن ہی ہر ہے اب الگ لکھا ہوں کہ

اللہ کرنے زورِ قلم اور زیادہ

لے یہاں کچھ بابت پڑھی نہیں گئی۔

کہ اس کے مرتبہ صحنی یہ ہوئے کہ جو تختیاں الہ آباد اجماعی، پتہ تاب گڑھو اور فیض آباد میں جھیلنا پڑیں۔ ان سے زیادہ کامدہ می ہوں۔ مگر یہ بھی ہو تو جانتا ہوں کہ تم زیادہ کے بھی تحمل ہو گے۔ اس لیے کہ وہ خود کسی نفس پر اس کی سکت سے زیادہ تکلیف کا بوجھ نہیں ڈالتا اور جس کے رتبے میں سوا ان کو سوا دیتا ہے۔ علم و اندوہ کے لیے کھائی گئے تم میرا عزیز بیٹا مگر اسے ہوا چھوڑ دوں گا۔ مگر سچائی تم شاعریت میں شاعر نہ تھا۔ البتہ عنایت اور وی نے تمہیں تین دیر افوں والا دیا تو اس قسم کی عنایت نے مجھ سے بھی تین چار عزلیں کھوا دیں۔ پہلے بھی تک ہندی کر لیتا تھا۔ مگر کامز کے پھولوں میں نہ نہیں ہوتی۔ اب کچھ گجواس آنے لگی ہے اس وقتوں تہارے کا۔ تو سے تم کو نہ دے کیونکر دعا دل۔ اس وقت صرف غریبوں کی پہلی عزلیں لکھے بیٹا ہوں۔ بہن کو کل خط لکھوں گا۔ تم میری از روٹی کا ذکر کر کے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ ورنہ ناراض ہی رہیں گی کہ جواب لکھوں نہ دیا۔

تمہارا مرید با محبت : محمد علی

## راشد الخیری

(۱)

بنام شمس العلماء مولوی سید قاسم علی

مکرمی دستخطی !

اسلام علیکم۔ گرامی نامہ کا ممنون ہوں۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ میرے متعلق جو اعتراض تھا اس کی تردید کروں، بلکہ صحت کے معنوں سے آپ کو میری طرف سے بدگمانی نہ ہو اور اب کہ چل چلاؤ کا وقت ہے کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔ آپ عزت نہیں۔ خیال فرماتے تو جانے دیجئے۔

حاجیہ تاج بیگم صاحبہ کے معاملہ میں جس قدر میں نے کوفت امتحانی وہ تھوڑی بہت آپ کے علم میں ہی ہے۔ آپ اس سے ناخبر ہیں۔ اب یہ آپ ہی فرمائیے کہ دعائی کے بعد اگر ان کے شوہر نے سنگدل امتحانات میں وہلی سے سید شریف صاحب کی خدمت میں کیونکر لے جاتا۔ میرے ساتھ اب وہ نہیں رہے، اکثر بیمار رہتا ہوں۔ ایک آٹھ کروڑ لگی ہے، ایک نامک میں بروقت و درجہ ہے۔

کاش وہ سات روپیہ اس سے پہلے یاد آجاتے اس کے بعد دتوں صاحب دتا۔ کبھی کے حسب ہو چکے ہوتے اگر یاد فرمائی پر بھی قابل کرنا تو بد معاملگی کہی جاسکتی تھی۔ مجھے جہاں تک یاد ہے۔ پہلی مرتبہ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ حالاً اس کے بعد دتہ داتا تک سینکڑوں روپیہ کا حساب دتا۔ میاں امتیاز نے جو روپیہ مجھے تھے۔ اس کا حساب آپ دیکھ لیں۔ ۱۰ مجھے جہاں تک بھی یاد ہے وہ میں نے مضامین کے واسطے ۱۰۰۰۰ اور شاید ایک آدمہ معنوں دعا نہ بھی کیا تھا۔ مجھے اس معلوم ہوا کہ معنوں کی ضرورت نہیں ہے۔

میں حسرت۔ سے اپنا نام عیدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وسط مکتوب میں دہلی جاؤں گا۔ مہربانی فرما کر آپ پر توفیق  
مسئلہ سے فرما دیجئے کہ وہ وسط آئندہ میں ایک کارڈ حساب کا کلمہ کر مجھے دہلی روانہ کر دیں۔ میں تمام حساب عافیت کر دیتی گا۔  
کتاب کے متعلق اگر تغیر و تبدل کی ضرورت ہو اور دوبارہ محنت کرنے پر درست ہو کچھ ہر قومی حاضر ہوں۔ اگر  
نہیں تو میں الشاہدہ کسی اور کو دلا دوں گا۔ اور جس وقت اب کوئی درخواست کتاب لکھنے کی آتی تو آپ سے منظر الوں  
میاں امتیاز مسئلہ کر دیا

نیا زمند ارشد الخیری - ۱۲ جمادی الثانی ۱۹۲۱ء

## غشی دیا نرائن تلکم (۱)

بنام احسن مارہروی

ضایت فرماندہ۔ تسلیم!

نوازش نامہ باعث مشکوری ہوا۔ تصویر کی نسبت معترضین کا اعتراض ہے کہ اس کا ایک گراؤ نہ قلم معلوم ہے۔  
جو اس وقت موجود نہ تھا۔ اور خاندان کے آخری دور کی عمارتوں میں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تصویر اکبر اعظم کی نہیں بلکہ  
اکبر ثانی کی ہے۔ مروجہ تصویروں سے اس کی شبہیت بھی مختلف ہے۔ اس میں چہرہ کسی قدر لمبا ہے۔ عام تصویروں میں بالکل  
گول ہے۔ چہرے سے بڑھا پے کے آثار نمودار ہیں۔ اکبر بڑھا پے میں سلطان عالم پناہ سے مماثل ہو گئے تھے اور نوازش کا  
بالکل صفایا کر دیا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے مگر یہ باتیں بھی قابل لحاظ ہیں۔ اس ایک نورتیں کا گروپ  
پچھوٹا نامہ تھا ہوں۔ آپ کے پاس ہوا یا نہیں سے دستیاب ہو سکے تو ضرور عنایت فرمائیں۔ بلاک جھٹنے کے بعد میں امتیاز کے  
ساتھ اصل تصویر کی واپسی کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے یسین کرناہیت خوشی ہوئی کہ اسلئے انجن ترقی آرو کے آپ بیکروڑی ضرور ہونے  
میں اس انتخاب پر آپ کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ انجن ترقی آرو نے اب تک کوئی کارنامہ یا نہیں کیا ہے۔ خدا  
کرے آپ کے زمانے میں یہ ایک مردہ انجن کی حالت میں نہ رہے۔ زمانے میں علمی خبروں اور نوٹس کا ایک متیہ مسئلہ  
شائع ہوتا رہا ہے اور اب بھی بالکل بد نہیں ہو گیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس مسئلے کا ایک حصہ انجن ترقی آرو کے  
یہ وقت ہے۔ جس میں آپ اس انجن کے بیکروڑی کی حیثیت سے لکھتے رہیں۔ اسی طرح سے زمانہ انجن آرو کا ایک  
باقاعدہ آرگن ہو جائے گا۔ جس کی حزب ادبی جبران انجن کے لیے ضروری ہونی چاہیئے۔ محض اسی حصے کی عیدہ کا بیان بھی شائع  
ہو سکتی ہیں۔ انجن کا ایک باقاعدہ رسالہ جس میں اس کے متعلق کل ضروری امور و کارروائی سے پہلے کہ اطلاع ملتی رہے  
ہونا ضروری ہے۔ میں زمانے کے لیے خواہ مخواہ اصرار نہیں کرتا ہوں۔ مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ انجن موصوف ایک  
کارزار انجن ہو جائے۔ مضامین خاص کے لیے پیشتر سے تکلف دے رہا ہوں۔ واجہ لندن لالی لکھی کی سوانح عمری جزوی

کے پرچے میں جو اول ہفتہ فردی میں شائع ہو گا ہدیہ ناطقین ہوگی۔ اب مارچ یا اپریل کے رسالے کے لیے کوئی جوتی کا مضمون  
منیت فرمائیے۔

زیادہ نیاز

بندہ دیارائن عظم کا بندہ

۲۶ جنوری ۱۹۰۶ء

## نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی

(۱)

بنام پر و نصیر محمد مسلم عظیم آبادی

عزیز کرم۔ سلام شوق۔

۲۸۔ کہ آپ کی محبت کی وہ بارگاہِ راسخ عظیم آبادی مطبوعہ الناطقین، علیہ معنون ہوا۔ مضمون دل لگا کر پڑھا۔ حق یہ ہے  
کہ آپ نے آمدود پر مذاق بیچ پر ابھر اپنے صوبہ و شہر پر احسان کیا ہے۔ میں آپ سے متعلق ہوں کہ راسخ کا وہ جو میر سے کم  
نہیں۔ بلکہ بعض اعتبار سے کہ بڑھا ہوا ہے اور اس ضمن میں آپ نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ ہرگز طرفت داری و مبالغہ  
نہیں ہے۔

تہیہ میں جو کچھ آپ کے جے دل سے نکلا اسے بھی ایک صندک جائز سمجھتا ہوں۔ لیکن آزاد یا کسی اور کے متعلق آپ کے  
سے اہل علم کے قلم کا اتنا بے قابو ہو جانا درست نہیں۔ بلا شک آزاد نے سہل انگاری سے کام لیا اور اس پر ایراد مزدور بخنی  
مگر آپ و محانت کریں (مزدور سے زیادہ دوڑ گئے ہیں۔ پھر جس چشمہ سے اپنی سیرابی بیان کرتے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ خود اس  
میں کیا دھرا ہے۔ . . . . .)

راسخ کے ذکر میں نوازے وطن میں "شعری کشش عشق کا سعادت ملی خاں کے نام سے معنون ہونا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ  
شعری اصناف اللہ کو نذر کر دی گئی۔ و زب و زبیر کی تعریف میں اس شعر کو یاد کیجئے۔

فقط ہے یہ تیرا ہی یقین قدم  
ہوا مکتد جس سے رشک ارم

لے ہر اشارہ اپنے ملاتی ماموں مولانا سید علی محمد شاہ عظیم آبادی کی ایک تالیف "نوازے وطن" کی طرف ہے۔ اب جب کہ دونوں ماموں بجا بنے  
دار فنا میں جا ملے۔ یہ امر کوئی دانا باقی نہ رہا کہ دونوں ایک دوسرے سے صاف نہ تھے۔ یہ ایک خانہ دانی عامرہ اللہ و ساقیہ تھا۔ جس سے ادبی  
دنیا کو کوئی دلچسپی نہیں ہر سکتی۔ دونوں اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ ایک غزوہ دہلی کا شاعر۔ دوسرا صاحب مرثیہ نثر نگار، عالم و دونوں کو مغفرت  
کرے۔

ذاتی گفتگو بھی اس خط سے مذمت کر دی گئی ہے۔ (مسلم)

کون نہیں جانتا کہ یہ آصف الدولہ ہی تھے جہاں اور بی بی سے رنجیدہ ہو کر فیض آباد سے لکھنؤ آ رہے تھے۔ پھر نیچے  
عمامات کی تعریف میں :-

عمامات عالی کا جو وصف کیا      نہیں اپنا اوداک اتنا دیرسا  
زہر خونی قلع ان کی بیاں      ورق ہے مرقع کا اک اک مکان  
نفر کیجئے جس کا سرو تصویر ہے      مجب رنگ سے طرز تعمیر ہے

کیا یہ اس کے بعد بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ عمامات کی بنا شروع آصف الدولہ سے منسوب ہے، انہ کہ سعادت  
علی خاں سے۔ اب صاف دیکھئے :-

تو اسے آصف الدولہ عالی جناب      رہے تاقیم جہاں کا سیاب  
نہیں تجھ سا حاجت روا خلق کا      بہت غرض ہے تجھ سے خدا خلق کا

آپ سے بہتر اسے کون جانتا ہے کہ تذکروں کی ایسی غلطیاں ناقابل معافی ہیں۔ ذرا سے وطن میں اس ذکر کمزور پڑھ کر  
رائج کی سنی غراب ہوتی ہے۔ لوگ اسے مستند سمجھ کر غنوی کشش عشق کو سعادت علی خاں کے زمانے کی چیز سمجھتے ہوں گے۔  
حالانکہ وہ آصف الدولہ کے وقت کی ہے۔ یعنی جب کہ غنوی میر حسن علی۔ عزیز کبچے مصنف کی تحقیق نے غریب رائج کو کتنا  
بیمچھہ مٹا دیا۔

پھر اسی طرح غنوی حسن و عشق کے ذکر میں تو اسے وطن کی عبارت ملاحظہ ہو :- غازی الدین حیدر کے زمانہ میں پھر  
لکھنؤ آئے۔ ایک غنوی سستی بہ حسن و عشق ان کے نام سے موزوں کی۔ مگر اب شریعت نے رنگ ہی بدل دیا تھا۔ اس نے  
بھی کام نہ کیا۔ وار خالی گیا :- یہ دوسری تاریخی غلطی ہے لکھنؤ میں شریعت نے محمد علی شاہ کے وقت میں رنگ بدلا نہ کہ غازی الدین  
حیدر کے زمانے میں۔ اسی عہد میں ”فسانہ عجائب تالیف ہوئی۔ اور فیض نے اپنی مشہور ”غنوی“ نثر و نثر (تصوف میں)  
تصنیف کی۔ پھر شریعت نے وہ کون سا رنگ بدل دیا تھا کہ فسانہ عجائب و غنوی فیض تو عام ہو جائیں، مگر رائج کی غنوی  
مقبول نہ ہو؟

کلکتہ میں مرآۃ الجلال لکھی گئی۔ اس میں غراب جان ایک کسی کے حسن و جمال کا ذکر ہے۔ رنٹے وطن اس ذکر سے بھی  
خالی ہے۔ حکیم آباد میں گنجینہ عشق تصنیف ہوئی جس میں ایک کسی بہ اپنے عاشق ہونے کا نہایت صفائی و دلیری سے حال  
لکھا اور اس کی تعریف و توصیف کی ہے :-

ہمت اس شہر میں بھی خود بر و پر      نہیں ہے دلبر اپنا کوئی دلبر  
دل اپنا اس صنم کا ہے فقط رام      کہ شرف جس کا ہے نام خدا نام  
اُسی گل کی ہوا ہے دل میں اپنے      یہی آتش ہے آب و گل میں اپنے

دنیا کے شاید ہی کسی شاعر نے اپنے عشق کو اس طرح بیان کیا ہو۔ یہاں تو ”گفتہ آید در مدیثہ دیان“ میں سب کچھ لکھا جاتا ہے  
اور رائج کا یہی وہ رنگ ہے جسے آپ اس کا امتیازی طرہ کہتے ہیں.....

زمانے وطن میں راسخ کی وفات کی تاریخ ۱۲۳۸ھ دی گئی ہے۔ مگر گٹھن بخارا اور تاسی میں ۱۲۴۰ھ ہے اور دہلی کے راسخ کو تو نہیں مگر شیفتہ کو حیران کے بھروسہ کچھ دنوں بعد کے ہیں دیکھا تھا۔

راسخ کے ذکر میں ہمارا یا عظیم آباد کی زبان دشاہری کی تحقیق تکلف سے خالی نہیں۔ راسخ صاحب مہابت جنگ کے زمانہ یعنی ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۳ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کی عمر اگر پندرہ برس کے سن سے شمار کی جائے تو ۵۹ء اور ہوگا۔ یعنی پچاسی کے دو دس بعد۔ اور ان کی زبان بنارہے کی کہ مرث چند سال کی مشق کا یہ نتیجہ نہیں۔ بلکہ پشتوں اگر نہیں تو ایک پشت کی ریاضت و صفائی کا نتیجہ ضرور ہے۔ اور اس ایک پشت کا زمانہ کم از کم پچاسی سال مقرر کیا جائے گا۔ یعنی مستند سے کبھی اور مرکی یہ زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ فرض کر لیا جائے جس کا فرض کیا جانا قیاساً نا درست نہیں۔ تو وہ زمانہ عالمگیر کا ثابت ہوگا۔ جو ۷۰ء اور میں فوت ہوا۔ اس لیے عالمگیری بعد ازاں اس سے بہت قبل اردو ہی نہیں بلکہ شاہجہانی یعنی ٹکسائی اردو کا عام رواج آپ کے صوبے میں تھا۔ اور اس وقت لکھنؤ تو لکھنؤ فیض آباد میں بھی ٹکسائی اردو عام ذمہ فیض آباد و محدثہ یا زیادہ سے زیادہ فرخ سیر (۱۶۹۷ء) کے وقت میں آباد ہونا شروع ہوا۔ اس لیے عظیم آباد کی زبان اردو اور دکن سے بھی قدیم اور مستند ہے۔

اشرف علی خاں کو کہ فغانی، دلی سے عظیم آباد و راجہ شتاب رائے کے زمانے میں آئے۔ اور ۸۶ء اور میں وہیں مرے راسخ کی عمر اس وقت ۲۴ سال سے کم نہ تھی اور اس وقت ان کی شاعری بھی جوانی پر ہوگی۔

فرخ سیر عظیم آباد امیر الامرا نواب حسین علی خاں کے ساتھ ۱۱۳ء اور میں دلی گیا ہے۔ اس وقت عظیم آباد اور دلی دہلی کی جاگیر بنا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے دلی ٹکسائی اردو کا بازار گرم تھا۔ انیسویں اور میں سے نواب سید ہدایت علی خاں اسد جنگ المتخلص برصنیر صاحب سیر المتاخرین کے باپ، بھی تھے جو فرخ سیر کے آخری عہدے سے لے کر شاہ عالم ثانی کے وقت تک دلی و عظیم آباد میں رہے۔ نواب اسد جنگ عمر یوں، بولی اور دہرے خوب کہتے تھے۔ اردو میں بھی ان کی غزلیں ہیں۔ نواب مرزا ملک انجام وزیر محمد شاہ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ نواب صاحب کی جاگیر میں پرگنہ چیلہ رہا حسین آباد تھا۔ لیکن زیادہ تر وہ اپنے محلہ اور شاگرد پیشہ سمیت جو دلی کے تھے، عظیم آباد میں رہتے تھے۔ ..... حاجی گنج، پورب دروازہ اور نون گور اور رائے دلی کا مسکن رہا ہے۔ ..... شاہ ارزاں خواجہ کلان رحمن کے نام سے گھاٹ ہے) اور شاہ صادق (جی کے نام سے غالباً صادق پور ہے) ان سب کو دلی سے قسمل تھا۔ اور یہ سب عہدہ شہرائے اردو میں سے تھے۔ آپ کے خاندان صادق پور میں بھی زبان کا خاص ذوق و شغری رہا۔ جسے علم و فضل اور فراغت ہمیشہ جلا دیجی رہی۔

فرض راسخ کے ذکر میں عظیم آباد کی زبان کا ذکر بھی ضرور ہے اور جب اس پر غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ آپ کے گھر میں جس وقت اردو عام و واضح تھی، لکھنؤ اس وقت شیخوں اور کبیر ہل کا قصبہ دکن تھا اور سعادت علی خان کے وقت ملک دلی کی زبان دہی تھی۔ جو کالوری اموان، ہراکے اور محمود آباد میں رائج ہے۔ عہدہ الکی مکتب کا اثر فیض آباد پر پڑا۔ اس لیے کہ انجام کے بعد صفہ جنگی دسالا دہلی اردو کے اصول اور دفتر کو راجہ دوستی عہدہ الملک، فیض آباد اور اٹھالائے شاہ حاتم

دیگر وہ کی ہیں عمدۃ الملک کے خادم اور آگے دوسرے دفتر میں کلرک تھے۔ ان پر زبان کا اثر چھڑا اور اس وجہ سے ان کے شاگردوں کی زبان بھی درست ہوئی۔ اس دفتر کے لوگوں میں تبرہ صاحب اور آتش کے چچا اور اس میں مسند و جیسر کے ساتھ فیض آباد آئے اور روکا دفتر اب وہاں قائم ہو گیا۔ پھر جس صاحب شہزی نے اسی دفتر اور زبان فیض آباد کے محلوں میں پرورش پائی۔ تبرہ غلیق وہیں چلے۔ تبرہ انیس کی غار عیدیں سلیم زبان بہرہ یک صاحب کی مصاحب نہیں اور تبرہ انیس اسی محل میں بڑھے ہوئے۔ اتنے آثار پر شاہ کے بعد انیس کی زبان ایسی ہوئی ہے۔ اور اسے ٹوٹ کر پہنچے کہ انیس کے قبل تک کھنڈ کی زبان وہی تھی جو نسخہ و دیر کے ہاں مستعمل ہے۔ یہ انیس کے گھر اور عمدۃ الملک اس کی کامدہ تھا کہ کھنڈ کی زبان اس پانچ کر پہنچ گئی۔

غلیق آباد پر کھنڈ کی زبان کا کوئی مستند بہ اثر کسی نہیں پڑا۔ وہاں کے بعض شعرا متعین کے: بلند شاہ و ہرے اور آپ کے ہاں کے اکثر شعرا نے اپنے شاگردوں کو نتائج دیگر کے متنبہ کیے بنا دیا اور وہاں بھیجا ہے یعنی اس وقت تک کھنڈ کی قلمی و قلمی حیم آباد میں نے یہ سند تھی۔ غلہ سانی اور برت وغیرہ اغا و شاہ عالم ثانی کے وقت تک موت تھے، وہی کھنڈ پہنچے اور اسی سے عظیم آباد آئے۔ دلی میں پنجابی اور آگرہ وغیرہ کے اثر سے وہ ذکر ہو گئے کہ کھنڈ اور عظیم آباد میں یہاں اثر قائم رہا.....

خیال

مارچی ۱۹۱۹ء

## سید سلیمان ندوی

(۱)

بنام ذاب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم

مخدوم محترم دام عمدۃ السامی! السلام علیکم

آپ سے رخصت ہو کر اعظم گڑھ پہنچا۔ یہاں بھی چند روز مرادت اور پھوڑے کی تکلیف رہی۔ غم آج اچھا ہوں۔ پھر سے بھی دیم نکل گئی ہے اور اب صاف ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب بھی اسی دن صبح کو الہ آباد سے آئے وہ سخت طبع ہر گئے تھے۔ غمزدہ کا خطرہ تھا۔ الہ آباد میں بروقت علاج ہوا۔ اور اب اچھے ہیں۔

جب سے آیا ہوں ندوہ کا تعلق قائم ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ ندوہ میں کوئی ذمہ دارانہ عہدہ لینے پر کسی طرح راضی نہیں اور مستقل قیام کھنڈ میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے لیے ہاٹل کا نوہ ہیں کہ سال میں چند مہینے وہ وہاں اقامت کریں تو تعلیم و تعبیر میں اور فراہمی چندہ میں مدد دیں اور اس کے لیے وہ بہت جلد کارروائی شروع کریں گے مولوی عبد السلام صاحب مقرب جائیں گے کہ ایک دو مہینہ وہ آخری سال کے طلباء کو ادبی علوم میں مدد دیں اور بچوں کی تعلیمی نگرانی کریں۔ مولوی مسعود صاحب نے طلباء کے قدیم کو خطوط لکھے ہیں۔ اور ان کا جلسہ جلسے والے ہیں۔ میری حالت یہ ہے کہ میں تعلیمی نگرانی کے لیے تیار ہوں۔ مستند دارالعلوم بن قریبے۔ سال میں متعدد دیر سے کروں۔ ندوہ کی تعلیمت کا ہمارا اثر



تو ایس گئے تو قبر آجہر آبرداشت کر دیں گا۔ مولوی حبیب الرحمن خاں غوثی کا خط آیا ہے۔ مشورہ پر چلا ہے۔  
مولوی غوثی صاحب کا خط آیا ہے کہ بھرپال میں جس حد تک کوشش کرنی تھی سو چکی ادب آپ کے اہلست  
جدد کا دیا جا۔ تے ہیں۔ عبدالعلی صاحب کے بلیکریہ کوشش کی اور مجھے لکھا بلکہ تم جنرل صاحب کو لکھو کہ اس کا ذہنیہ ہو جائے  
چنانچہ میں لکھوں گا اور امید ہے جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ ان کو مل جائے گا۔ اس طرح ان کی تعینم کا بندوبست ہو جائے گا  
مولوی مرتضیٰ صاحب جو پہلے کتب خانہ میں تھے میرے پاس آئے تھے کہ ان کو کتب خانہ میں کر دیا جائے۔ میں  
نے کہا کہ اگر کتب خانہ میں آپ کے کام کا ریکارڈ چھاپے تو مجھے اخلاقیات نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نواب صاحب خود علاج  
تھے، اگر آپ نے ان کے کام کو پسند کیا ہے تو ضرور ان کو کتب خانہ میں جگہ دے دیجئے، کتب خانہ کی حفاظت ضروری  
اور لازمی ہے۔ اس کا بند رکھنا کنوں کو نقصان پہنچا ہے۔

آپ اچھے اور جاری ضرور دیکھئے۔ اور نظامت کی تجویز بھی درج کر دیجئے۔ اگر عاقبت میرا نام بھی لکھ دیجئے تو برج نہیں۔  
مستقل بقیہ میری نظر میں ہے۔ انشاء اللہ۔

مولوی عبدالرزاق اور مولوی عبدالرحمن صاحب نگرانی کو خط لکھے گئے ہیں۔ والسلام  
۱۰ مارچ ۱۹۳۳ء یثرب سلیمان۔ اعظم گڑھ

(۲)

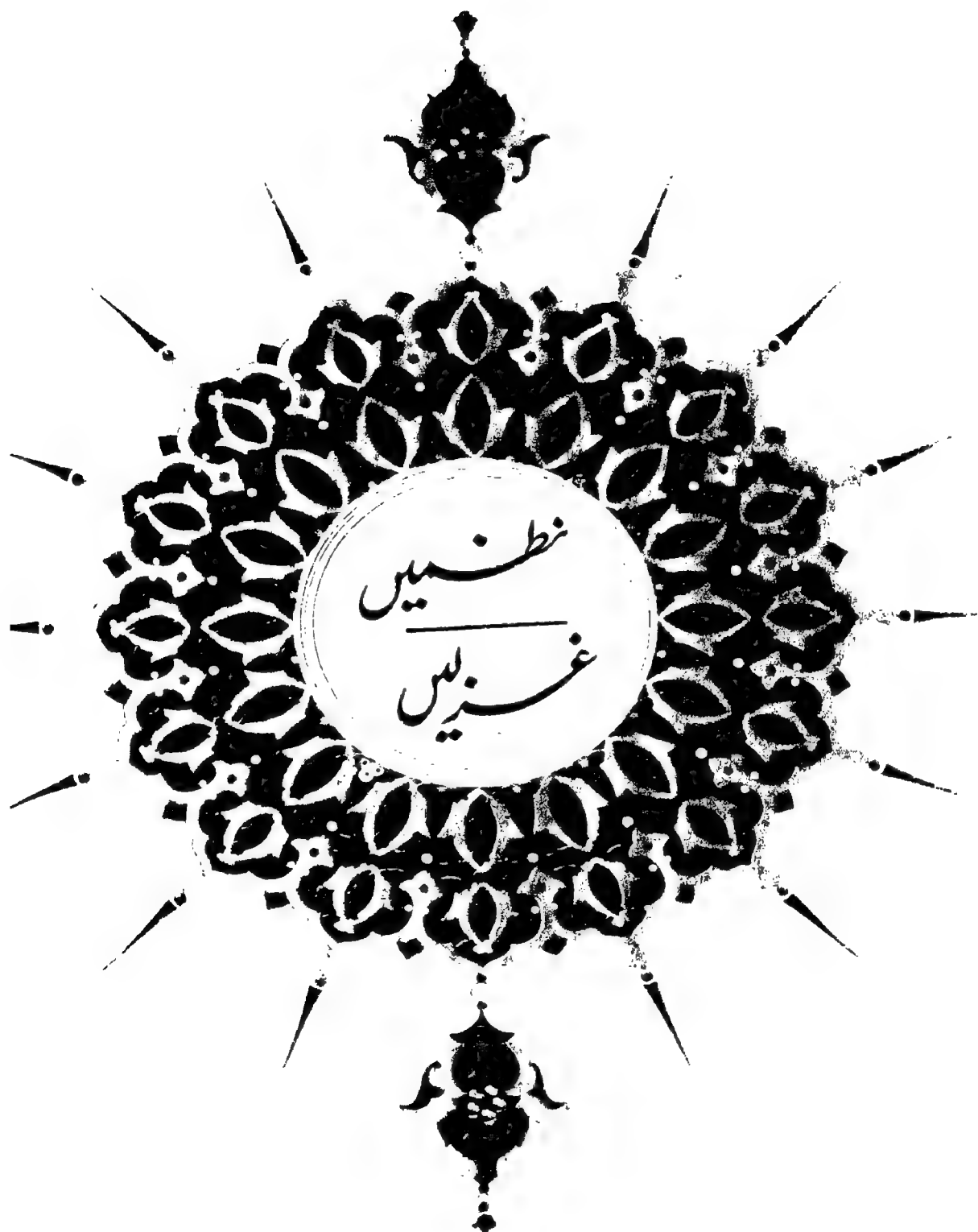
ہنام مولانا عزان صاحب

۳۳-۳۴۔ انڈین اسٹریٹ مدراس۔

مقدم محترم خادم کو ملے۔ اسلام علیکم۔ آپ کے اخیر تاریخ نے مجھے بے چین کر دیا۔ کئی دفعہ تار لکھوایا، اور پھر کٹوایا۔  
یقین جانیے کہ رات بھر سون سے نیند نہیں آئی، کوئی بھی دماغ کی خفگی اور معدہ کی تبخیر کے باعث تین بیٹے ہو گئے کہ نیند کی  
اصل لذت سے محروم ہوں، مگر آج کی شب تو صرف کوڑھ ہی بدلتے بدلتے گزری اور زبان پر یہ مصرع تھا۔ "وے ادد دل ان  
کو جو نہ دے بعد کو زبان اور گرو میں اپنے پہلے خط میں اپنی معذرت کے اسباب پر دی طرح لکھ چکا ہوں، مگر آپ نے شاید پوچھ  
نہیں کیا۔ اس لیے میں دوبارہ اپنا طریقہ بیان پیش کرتا ہوں اور یہ اس لیے کہ مجھے آپ کے ساتھ جو محبت ہے اس کی وجہ  
سے یہ خیال کر کے دلی میں تکلیف محسوس کرتا ہوں کہ آپ میرے عذرات کو عرض بہانہ سمجھ کر سہتے ہیں۔

۱۔ میں یہاں چند ہفتوں کے لیے مسافرانہ آیا۔ اسباب و سامان جو ایسے بڑے سفر یعنی حجاز کے لیے درکار ہے وہ  
سارا ساتھ نہیں۔ پاسپورٹ میرے پاس نہیں، پچھلا پاسپورٹ کہیں، غلط گڈھ میں پڑا ہے۔ پاسپورٹ مدراس میں نہیں مل سکتا  
بھئی میں نہیں مل سکتا۔ پھر کیونکر اگر بایں ہر بے مردمانی چل کھڑا ہوں تو ۲۰ روپے کو لڑائی یا ۱۵ روپے کو بھئی پی او سے روانہ ہو سکتا ہوں  
خود فرما دیجئے۔

۲۔ ہر شخص جو کچھ بھی اپنے پیچھے تعلقات رکھتا ہے۔ وہ کسی بڑے سفر سے پہلے کچھ اختلافات کرتا ہے۔ میں پڑنے کے







یہ سب تو درد دو۔ کی یعنی آفتش مجبوریاں تھیں۔ اب میں آخر اپنا جسم آپ کو دکھاتا ہوں، اور آپ سے یہ بیماری سنے کر آیا کر لکھائے کے رو گھٹنے بعد ہلکے سے کر گڑھ ملک رو جوتا ہے۔ علاق سے دب جاتا۔ ہے اور ہر جو جاتا ہے۔ اس کے سینے یہ مزدوری ہو گیا ہے کہ خاص طریق سے رہا جائے۔ آپ اپنی ہر بانی سے ہر قسم کا انعام دیتے سر لینے کو تیار ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں عرب کو دلجو چکا ہوں اور آپ مرث سن کر فرماتے ہیں، کچھ دفعہ عرب کے سفر نے پھر مرث کو پیدا کر دیا۔ اور ایک نئے مرض میں مبتلا کر دیا۔ عرب میں گوشت عموماً دہنے کا ہوتا ہے جو میرے سینے ذہر، ردی باز اوروں میں شیر کی کچی ہے۔ نہایت نفیس، سبزیاں اور ترکاریاں جو میں لکھاتا ہوں وہاں نہیں ملتی، چھٹی دفعہ ہڈی تانی ہادی دکھائی۔ مگر گشت اور ردی کی قسم کو وہ کیا کرتا، وہاں اور شروع ہو گیا۔ تو وہ ابھی مشکل میں آئی۔ اینٹ کر آگ میں گرم کر کے اس سے جگر، پیٹ اور گودہ کو یک کر علاج کرتا تھا اور شکیں حاصل کرتا تھا۔ پاخانہ لاواں کسٹم ایسا ہے۔ جو ایک دائم المرض کے لیے سواں درد ہے، کہ نہیں سکتا کہ ایک جینے میں اس کی کیا تکلیف دیاں اٹھاتی ہے۔ اس سے مرض نہایت سخت لایا ہوں کہ دونوں سر میں کے بیچ میں کوئی رگ یا پٹھا یا بڑی ہے۔ اس میں درد ہو جاتا ہے۔ اُسٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ اس حالت میں موڑ کی سواری پر بھی حرکت ہوتی ہے تو جان نکل جاتی ہے ایسی حالت میں رہنے سے مگر مغلہ تک کئی دن اونٹ یا شہد کی سواری میرے لیے ناقابل تحمل ہے دماغ کا یہ حال ہو گیا ہے کہ دواسی فکر یا کسی خیال کی آمد سے غیب جاتی رہتی ہے تین جینے سے یہ حال ہے۔ قلب پر یہ اثر ہے کہ بالکل اندر دل اور ہڈی مرو کی آگئی ہے۔ ذرا سا ہون ہوں تو تنک جاتا ہوں اور سینہ میں درد ہو جاتا ہے یہاں آیا تھا کہ کام کے ساتھ کچھ تعزیک اور تبدیلی آب و ہوا ہو جائے گی یہاں ایک مرض جو جاتا رہا تھا عود کر آیا یعنی قاروہ دیں سوزش اور ایک مرض ترقی کر گیا یعنی سوزش اور درد و تنک کے ساتھ دو تین دفعہ دست۔ ڈاکٹری علاج یہاں کوئی فائدہ نہ ہوا آخر ایک مہفہ کے لیے بھگور گیا تھا۔ وہاں حکیم صاحب قبیلہ کے ایک شاگرد مستعد حکیم ہیں انہوں نے دیکھا اور دو تین یونانی فرس، مسجون اور شربت تجویز کیا ہے جو روزانہ استعمال میں ہے اور اس سے کئی قدر تخفیف ہے۔

میں نے اپنا دل نکال کر آپ سے سامنے رکھ دیا ہے اور خدا جانتا ہے کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ حرفِ کرب سچ ہے، اماؤ غفرہ اور ہمارا کار عادت نہیں اور نہ طبع دنیا میں گرفتار ہوں۔ میری حالت آٹھ برس کی طاقت آپ سے ہے۔ آپ جینے پر آدمیوں کی تہذیب کے دعوے سے یہ کہ فی حیرت یا نتر چھپانہ ہو لا۔ خدا جانتا ہے کہ آپ کی خواہش کو ہادی کر کے کا کس درجہ احموس۔ ہے۔ میں گماہ گاہوں اور اپنی گناہ گاری کی سزا آپ کے ہاتھ سے برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ کیا کسی طرح اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟

میں وہ چار روز میں یعنی یکم زویر کو افعہ گڑھ روانہ ہو جاؤں گا۔ والسلام

۱۲۱۲ھ ۲۵ دسمبر

یہودیہ

## خواجہ حسن نظامی

(۱)

بنام بہاراجہ سرکش پرشاد

دین بسیرا۔ درگاہ حضرت نعام الدین اولیاء محبوب الہی دہلی۔۔۔ تارک لاہور خواجہ دہلی  
نہاری شاہ صاحب۔ اسلام علیکم۔ خط ۱۲ مورخہ ۱۲ دسمبر وصول ہوا۔ درویش کے معنوں میں جماعت ملی شاہ  
صاحب ہی کے واقعہ کا اشارہ تھا۔ آپ مجھ سے پہلے اس فقرہ کو ذرا پکے ہیں۔

اگرچہ آپ کا خیال مجاہد پرورست ہے کہ جماعت ملی شاہ صاحب جیسے لوگ ان حرکات سے قائل نہیں  
ہوں گے جہاں اور مذکر کے ملک میں ان کے علاوہ بھی ایک جماعت کثیر الہی ہے جو اس قسم کے معنوں میں شائع ہونے  
سے بدگنیوں اور غفلتوں افزا ہوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے میں نے وہ معنوں شائع کرنا ضروری سمجھا اور مناسب  
معلوم ہوا تو آپ کا یہ خط بھی خالی الفاظ قلم نہ کر کے بعد شائع کر دیا جائے گا۔ کہ اس خبر میں نہایت مفاد نہ بھی مقرر  
ہے۔ اگر خط شائع ہوا تو جماعت ملی شاہ کا فقرہ درج نہ ہوگا۔

میں کل ایک خط آپ کو لکھ چکا ہوں اور دو تار بھی آپ کو دیئے ہیں۔ امید ہے کہ وصول ہوئے ہوں گے۔ میں  
خود آٹھ سا۔ مئے ملنا اور بات چیت۔ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ خدا کے فضل سے حور بانو کو بھی اب آرام ہے۔ یعنی قابل  
فکرمات نہیں ہے۔ شادی اگر مقرر ہوگئی تو فوراً چلا آؤں گا۔ در نہ پندرہ دن کے بعد ارادہ ہے۔ محض آپ ہی سے طاقات  
کرتی چاہتا ہوں کہ مریدوں کی ہمیر کھاؤں سے بچ کر کہیں بٹھروں۔ خواجہ بابا اور بچوں کو دنا۔  
۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء دہلی۔ حسن نظامی

(۲)

بنام مولانا وحید احمد

جناب مجید صاحب مولوی لاہور

کسی برائے کو آواز نہ کیجئے کہ وہ دنیا کا مسافر ناستہ مال تھا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ ۱۳ اپریل کا خط آج ۱۵ کو ملے۔ جب آپ یہ خط لکھ رہے تھے میں اپنے گھر سے دس میل دور  
انکم ٹیکس آفیسر سے ملنے جا رہا تھا۔ لاکھوں حورک مرومناشان کو کے گھروں میں واپس جا رہے تھے۔ قدم قدم پر اندیشہ ہوتا تھا

میں نے بھرتے کے متعلق گزارش کی تھی کہ ایک ہوٹل میرے یہاں ہے اس میں قیام فرمائیے اور اس کا نام HOTEL de HEART ہے۔

کو کسی سے ٹکر ہو جائے گی۔

مجھے معلوم تھا کہ میاں کی کیا چیز ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا چرچا پنجاب میں زیادہ ہے۔ اب پنجاب کے پانچویں دریا  
اہلی کے کونے میں بند ہیں۔ انکم ٹیکس آفیسر محب الفقرا مند ہیں۔ مجھے دیکھ کر کہ آج نیا سال ہے۔ شگون بہت اچھا ہے  
ماس نے سونے کی گھڑی لکائی نہ ہانڈھی اور خدا نے آپ کو ٹھہر بیٹھے بھیج دیا۔

یہ سن کر کہ میاں صاحب کا نیا سال ہے۔ مجھے ان سینے دل نور معلوم ہوا کہ میں بھی اپنے انکم ٹیکس کا حساب سمجھنے  
سمجھا نے لگی تھا

پھر کل صبح درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں گیا۔ مالانہ عرس میں شریک ہوا۔ سینکڑوں نازنین کو چھین مار کر دوتے  
ہونے لگیا اور سنا۔ مزارات کو شکستہ پایا۔ درگاہ کے دروازے پر محافظ وراں کی قبر تھی جس پر لکھا تھا کہ ۔

مردہ ویراں یہ بھی خاکتہ پڑھتے جانا

ان سے کہہ دو جو ہیں اس سے گزرنے والے

دیکھا تو یہ کتبہ ویراں تھا۔ شاعر نے ۔ یہ انکم ٹیکس دیکھ کر شگون کی تھی۔ میں نے آج سے چالیس برس پہلے ایک کارٹون بنایا  
تھا کہ اسکو ماسٹر مین ٹوکی نہ ایمان شاگرد کہ پڑھ رہے تھے۔ لکھو جو پڑھنا "شاگرد جواب دیتا ہے ماسٹر دادوس  
نے بتایا تھا کہ لفظ ویراں ہے۔ ایران نہیں۔

مجھے آپ کے ہنوں سے نام پڑھ کر ایسی خوشی ہوئی۔ گویا ہوش دی مارٹ میں ٹھہر گیا ہوں۔ اور میری نواسی لگی دنا آپ  
کی نواسی کے ساتھ باتیں بنا رہی ہے۔

یہ بتانا کہ مسافر ہوئی دی مارٹ میں کب آئے گا۔ دشوار ہے کیونکہ یہ مارٹوں نے اتنا زور لگا رہا ہے کہ کل دوپہر  
سے آج رات تک کچھ نہیں کھا۔ اور پانچ چھوڑے ہوئے سات دن سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ خیال آیا اگر لکھنؤ مارٹوں کا اور مانی  
لکھنؤ کے پان کی گوری جی ہیں لی تو کیونکر نکلا۔ کروں گا۔

قطب عالم سے اگڑا ہوا بھی جائے کہ موسیٰ کی طرح انجان میں وہوں گا یا خضر کی طرح قطب عالم کو انجان پاؤں گا۔ یہ  
توفیق ذات اور تحقیقات کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی حکمتیں ہیں ورنہ آدم نہ بود و من ہم حقا نہ بود و من ہم۔ اور خود نہ بود و من  
ہم من عاشق و یارین ام۔

آج شام کو ایک فرسٹ صاب کے آرمز میں مجھے بھی ان کے ساتھ کھانا کھا ہے ان کا ہم لوری ہے۔ وہ بیز شریک ہیں  
اور میرے پرانے دوستوں میں ہیں۔ بیاور کے رہنے والے ہیں۔ اگر آج رات کو ان سے ملوں اور کہوں کہ آپ دی پبلک کو  
مانتے ہیں یا نہیں۔ اور وہ جواب دیں (آہم فوری) تو میں کہوں گا جس مقام پر آپ رہتے ہیں اس کا نام بھی نواسی ہندی سے  
مرکب ہے۔ پہلا لفظ بیا دوسرا لفظ و۔ بیا و۔ اور و۔ ہندی میں طاقت دار اور غالب کو کہتے ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ۱۴ شعبان تک اگر میں اپنے جسم سے باہر نہ چلا گیا تو اس کے بعد رمضان میں آؤں گا۔ تاکہ  
روزہ نہ رکھنے کا بہانہ ملے آجائے۔ دھوم دھواؤں کی بحث میں نے اس لیے پسند کی کہ ساری عمر عام فہم و جودی دہوں اور سولانا

سید فہرہ احمد وحشی شاہجہاںپوری نے میری شان میں ایک فارسی غزل لکھی تھی جس میں میر سے وجودی عقائد کو بہت شاعرانہ انداز سے ظاہر کیا تھا۔ وجود، وجود، وجود، وجود، وجود، وجود سے قرانی تھے۔

حضرت ابتر فرما کر تھے تھے آئے والے انقلاب کے سیلاب میں سب بہہ جاتیں گے فقط صوفی باقی رہیں گے آپ کی کتاب فقہوت کو جب پڑھتا ہوں ابراہیم آتے ہیں۔ آپ کے کچھ مسودات قرن اول کے کہیں ہوں تو میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کی زندگی کے ارتقائی درجوں کو سمجھ سکوں۔ نہ آپ کے جیسے نہ اپنے جیسے، نہ قوم کے جیسے، نہ ملک کے جیسے بلکہ ہر نسل کی تاریخ کے جیسے۔

دشمن کے برقی دادالسرود میں ٹھہرا ہوا تھا کہ غالب پاشا گوردیشام لٹنے آئے ہیں نے کہا آپ ملک عرب کے گوردیش ہیں۔ آپ کا قرآن عربی میں، حدیث عربی میں۔ پھر آپ عرب بچوں کی ابتدائی تعلیم میں سری کو داخل کیوں نہیں کرتے؟ جواب دیا۔ میں نے مرکزی حکومت کو لکھا ہے۔ کل وہ بات یاد آئی جب بتا رہا تھا کہ اب کتاب آئی۔ جس میں جو اہل لال کا ایک مسنونہ اردو کی حمایت میں شائع ہوا ہے۔ میں نے خیال کیا غالب پاشا باوجود غالب نام کے منسوب تھے احمد اہل لال باوجود بڑے حاکم کے حرام کے محکوم ہیں۔

آپ شعر بھی کہتے ہیں؟ اور اگر کہتے ہیں تو کس زبان میں۔ اور جب آپ غراب دیکھتے ہیں تو سننے والوں سے بات کس زبان میں کرتے ہیں۔

میر سے بچوں کے ناموں کی فہرست یہ ہے۔ بڑا بڑا حسین و دوسرے علی انیس سے زید پاشا ان کے بعد حسن، ابو طالب پھر محمد علی۔ بڑی بڑی محو بانو مرگئی۔ دوسری بڑی روح بانو تیسری کوڑا حسین کے چار لڑکے سلمان، لہان، امان، دامن، ایک بڑی قدیم علی کے دو لڑکے ولی اور وحی اور دو لڑکیاں طاہرہ قرۃ العین اور فریدہ۔ روح کے ہائے لڑکے، دم دوسرے زعم۔ ایک بڑی گل رعنا۔

میری بیانی بہت کمزور ہے۔ وائیں آنکھ سے کچھ تنویر آتا ہے۔ بایں سے کچھ تقریبیں آتا۔ ہر وقت ہلا ہلا بخار دہتا ہے۔ گروہ، معدہ، مجر غراب ہے۔ آنتیں بھی غراب ہیں۔ پیٹ بھی کم آتی ہے۔ گروہ زیادہ آتا ہے اور یہ قرآن کی تہائی ہوئی زمین کی نشان نہیں ہے۔ باقی سب صفات، حسن میر سے اخذ ہیں۔ ایک کوتاہی میر سے ذہن اور دماغ میں پیدا ہو گئی ہے کہ میں چاروں طرف دیکھ کر کہتا ہوں کہ لوگ کام کر رہے ہیں۔ مگر ان کو کام کرنا نہیں آتا۔ مجھے کام کرنا آتا ہے لیکن کام لینا نہیں آتا۔ اس واسطے میر سے کسی کام میں ترتیب اور موثریت باقی نہیں رہی ہے۔ اور اس کی وجہ سے دماغی اور ذہنی اذیت میں ہر وقت مبتلا رہتا ہوں۔

گڈ بائی گڈ بائی مائی ڈیر انکل

حسن نظامی

۱۹۵۰ء



## نشتی پریم چند

بنام سید الیہ ناز علی تاج

مشفق من الیہم !

نفاذ ملا، مشہور ہوں، اتنی جون کے پر پتے خوب پڑھے۔ اور نہ اٹھایا۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ ایسا دلچسپ سالہ اس وقت آدھ زبان میں نہیں ہے۔ پہلے اگر نقد نہ کرے تو مجبوری سے بالخصوص ارتقا اور اصل الفاظ پر جو مضمون قبلہ سے ممتاز علی صاحب کے کا یہ فرمایا ہے وہ بالکل جان ہے۔ ان بیسویں صدی کے پر ایسا صاف اور روشن مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ مجھے اب تک نہ معلوم تھا کہ حضرت مولانا کو ملی مغربیوں کی دہائی دہائی ہے۔ . . . کچھ زیادہ دلچسپ نہیں لیکن شغف کی رنگا رنگ بات بہت اچھا ہے۔ آگاہی کے آگاہی میں کوئی بیحد متعین نہیں تھی۔ اس لحاظ سے دیگر تنقید کی خوبی کے اعتبار سے آپ کا رسالہ اول ہے۔ اور دوسرے آگاہی پر یہ اچھی چہرہ کی ہے۔ انا نیکو کسی قدر غیر متعین ہے۔ عالم خواب مجھے بہت پسند آیا ہے۔ علاج بے دوا خوب ہے۔ معلوم نہیں بلکہ ادا ہے یا کچھ اور جہدِ نغمہ جس دیگر رسالوں سے کہیں بلند تر ہے۔ میں تعریف کر کے کامیابی نہیں ہوں۔ حق کا انبار کر دیا ہوں۔ گناہ صاحب، تو پڑے کھانا معلوم ہوتے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب لکھتے ہیں۔ پیرہن پیرہنی حصہ دوم کی سوجھیں آپ کے یہاں بھواری ہیں۔ پریم تنبیہی حصہ اول چھپ چکی ہے۔ غالباً وہ جیسے ہیں تیار ہو جائے گی۔ کیا تنبیہی کا حصہ دوم آپ اپنے اہتمام سے نیاں شائع کر سکتے؟ باز احسن تو ابھی معلوم نہیں کہ کب نیاں اسی شائع میں اگر جیسی حصہ دوم آپ شائع کر سکیں تو خوب ہو۔ کچھ قہقہے آپ ہی کے دونوں پرچوں میں نیکو میں بقیہ دس میں دس روں گا۔ کوئی دس ہزار کی کتاب ہوگی۔ آپ کے بے ایک قہقہہ لکھ دیا ہوں۔ سخن جگر تو بہت حدت کر دیا ہوں پر معلوم نہیں کچھ رنگ بھی آئے گا یا نہیں۔ خون ہی نہیں ہے تو رنگ نیا خاک پیدا ہو۔ اور کیا اتماس کروں اپنے والد صاحب آبد کی خدمت میں میرا دست بستر سلام کہئے گا۔ آپ کے خطوط سے ایسا غصہ چلتا ہے کہ بے اختیار رشتے کو جی چاہتا ہے پر غصائی کی قید اور سفر کی دوازی بہت کر دیتی ہے۔ والسلام

نیا زمند - رنجیت رائے - گوردھپور - ۱۱ اگست ۱۹۱۹ء

## رباعیات

جوشِ ملیح آبادی

زلفیں باندھیں مگر بکھرتی ہی رہیں  
گھڑیاں روکیں مگر گذرتی ہی رہیں  
امید کا رخسار میں بہرتے رہے رنگ  
اور یاس کی جھڑیاں ابھرتی ہی رہیں

دوڑو کہ سب کو ٹٹ رہا ہے یارو  
نمانِ پین تچوت رہا ہے یارو  
یادوں کے جواب کو بچاؤں کس طرح  
نسبِ ان مجھے لوٹ رہا ہے یارو

سو ہا ر مری دھوپ کو سنو لایا ہے  
خود میرے ہنر سے مجھے شریا ہے  
آیا ہے مری راکھ پہ سجدے کرنے  
وہ جس نے مری آگ کو ٹھکرایا ہے

# جھومتی برسات

جوش ملیح آبادی

۳  
کیا جوش میں ہیں جھاگ اڑاتے ہوئے تالے  
بادل کے خزانوں کے ہیں ٹوٹے ہوئے تالے  
بکریوں کے یہ کھانچے ہیں کہ پھلکے ہوئے تھالے  
دبے ہوئے پھجوتوں کے تلے خونچنے والے  
ٹاپو میں کہیں راہ، کہیں راہ میں ٹاپو  
اسے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑاتان، مستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۴  
کس ناز سے وہ دیکھ کھٹ اباغ میں لوٹی  
نوعِ منسا جھوم گئی کھوں کے چوٹی  
برکھا سے لکری ہو گئی جو چیسر غنی کھوئی  
جنش میں اُدھر مبزہ، اُدھر سیر بہوئی  
ہر باغ میں ہر باغ میں، ہر راہ میں، ہر سو  
اسے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑاتان، مستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۱  
ہاں، دیکھ، ذرا دیکھ، مرے سرو لب جو  
گنگھور گھٹاؤں کا یہ عیلت ہوا جا دو  
زرتار ڈپٹوں کے یہ اڑتے ہوئے پلو  
یہ کنج میں زندانِ سید مست کی یا ہوا  
اسے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑاتان، مستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۲  
ساحل پہ یہ اڑتے ہوئے جنت کے نظارے  
افلاک پہ یہ مَرخ دوشالوں کے کنارے  
بجلی کی لپک میں یہ حینوں کے اشارے  
اُڑے ہوئے دریا کے اُبھتے ہوئے دھارے  
دھاروں میں گھری ناؤ کے مڑتے ہوئے چٹو  
اسے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑاتان، مستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۵

پتی کوئی کالی ہے، تو جوتا کوئی گورا،  
لبریز ہے ہر نخل کے پھل کے کاٹورا  
ہر زرخس شہلا میں نئی عسمر کا ڈورا  
لو کو نڈا ہر اک گل ہے، تو ہر خار ہے گھڑ  
اسے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۷

شاخوں میں جھا جھم ہے فضاؤں میں روانی  
بہتی ہوئی چھکار، نچلتا ہوا پانی  
بھورے ہیں کہ اڑتی ہے کہانی پہ کہانی  
اک خیمہ ہے، ادھر خیمہ رنگین جوانی  
بھیکے ہوئے پودوں کی یہ چھتی ہوئی خوش بو  
اسے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۶

خود سوچ دو اس نے ہوں نہ کس طور سے لمحات  
جب ناز سے ابھرے ہوئے کو لے پڑھے ہا  
دن کو ہر فرد مشندہ و قصندہ جواں رات  
کہا بات ہے برسات ہے برسات ہے برسات  
لہراؤں ساوات پہ، چل جائے جو متابو  
اسے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۸

ہر مسرت صدا، خواب زلیخا کی ہے تعبیر  
ہر زمر مرہوش ربا، حسن کی تفسیر  
تصویریں آواز ہے، آواز میں تصویر  
اک کیسٹ کی پازیب ہے اک شے کی زنجیر  
باخوں میں، گنتی چھاؤں میں، کوئل کی یہ کوکو  
اسے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۹

ہر لحظہ رواں اتند عثمان ابر کا تو سن  
ہر آن مسکتا ہوا املاک کا دامن  
ہر وقت نئے رنگ کی اٹھتی ہوئی چلین  
ہر لمحہ پردار میں پردار کی سن سن  
ہر ساعت سرشار میں نازِ زم زم آہو  
اسے دولت پہلو  
ہاں تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۱۰

شیشوں پر یہ در مار چھب لگتی ہوئی بوندیں  
شاخوں سے یہ مے ریز چسکتی ہوئی بوندیں  
یہ دُوب کے ریشوں سے ڈھلکتی ہوئی بوندیں  
یہ اُم کے پتوں پر کھسکتی ہوئی بوندیں  
بوندوں کے مجیروں میں یہ بجکتے ہوئے گنگرو  
اسے دولت پہلو  
ہاں تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۱۱

یہ سر پہ کڑکتی ہوئی ساون کی کمانیں  
کھلتی ہوئی بچ میں یہ جواہر کی دکانیں  
موجوں میں یہ آنکھیں یہ ہواؤں کی زبانیں  
بھیکے ہوئے لمحوں کی یہ ڈوبی ہوئی تانیں  
ہنسی ہوئی راتوں کے یہ بھیکے ہوئے جگنو  
اسے دولت پہلو  
ہاں تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۱۲

گنگھور گھٹائیں میں یہ خوابوں کے فسانے  
بوچھار میں ماروں کے یہ ٹوٹے ہوئے دانے  
پڑ والی کی سن سن میں یہ شاخوں کے ترانے  
بہتے ہوئے یہ سُر یہ برستے ہوئے گانے  
یہ مور کی جھنکار، پیپے کی یہ پی سہو  
اسے دولت پہلو  
ہاں تان اڑا تان، ستر پارہ و گل رو  
اسے دولت پہلو

۱۳

اک نکتِ معنی جنوں خیر و خروشنے  
اک نکتِ نکت لار و شے، عتوہ فروشنے  
اک نکت سرود و سخن و سوز کے گوشے  
اک ماسے میں صہبا کے ہکتے ہوئے خوشے  
اک سچ پر ہر ہا کے دہکتے ہوئے آنسو  
اے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گل رو  
اے دولت پہلو

۱۴

یہ پستی، یہ گندی، یہ سرمئی بادل  
یہ فاختی، یہ روی، یہ وزی، یہ محفل  
یہ نقری، یہ کھٹی، یہ آگہی، یہ پھل  
اور فاسی طشت میں یہ چمپسی، یہ بوتل  
بدل میں ہست کرتا ہوا یہ شعلہ وارو  
اے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گل رو  
اے دولت پہلو

۱۵

ہر سجدہ صد دانہ ہے اک زلفِ تہ دام  
ہر سجدہ شکرانہ ہے اک جت سونے جہم  
ہر گد و کشش پیمانہ ہے اک رقصِ خوش انجام  
ہر نعرہ زندانہ ہے اک نغمہ المسم  
ہر لغزشش منانہ ہے اک قوتِ بازو  
اے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گل رو  
اے دولت پہلو

۱۶

اس رمت میں خرابات کی پوشاک ہے دھانی  
اور جوش کے ساغر میں خرابات کی رانی  
اس شیخ سے کہہ دے کہ ارے دشمن جانی  
خاموش کہ اس وقت ہے موسم کی جوانی  
خشنہ بہر کوچہ در قصندہ بہر کوہ  
اے دولت پہلو  
ہاں، تان اڑا تان، مستر پارہ و گل رو  
اے دولت پہلو  
اے زمینت پہلو  
اے جنت پہلو  
اے آفت پہلو



## جگر مراد آبادی

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے      تو پھر یہ کیسے کئے زندگی کہاں گزرے  
جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گزرے      کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گزرے  
مجھے یہ وہم رہا مدتوں کہ جو است شوق      کہیں نہ حنا طرِ مصوم پر گراں گزرے  
خطا معاف! زمانے سے بدگماں ہو کر      تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گزرے  
مری نظر سے تری جستجو کے صدقے میں      یہ اک جہاں ہی نہیں سینکڑوں جہاں گزرے  
اسی کو کہتے ہیں جنت! اسی کو دوزخ بھی      وہ زندگی جو حسینوں کے درمیاں گزرے  
مجھے تھا شکوہ، عسراں کہ یہ ہوا محسوس      مرے قریب سے ہو کر وہ ناگماں گزرے  
بہت حسین سہی صحبتیں ٹکوں کی مگر۔      وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے  
کبھی کبھی تو اسی ایک مشت خاک کے گرد      طوائف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

بہت عزیز ہے مجھ کو، انہیں کی یاد جگر۔

وہ حادثاتِ محبت جو ناگماں گزرے



## جگر مراد آبادی

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آنہ سکے  
مری تباہی دل پر تو جسم کھانہ سکے  
وہ سبزہ ننگ چمن ہے جو ہلہا نہ سکے  
یہ آدمی ہے وہ پروانہ شمع و شمس کا  
انھیں سعادت منزل رسی نصیب ہو گیا  
نہ جانے آہ کہ اُن آنسوؤں پہ کیا کذری  
کریں گے مر کے بقائے دوہم کیا حاصل  
زہے خلوص محبت کہ حادثاتِ جہاں  
مری نظر سے گریزاں بہت رہے لیکن  
یہ مہر و ماہ مرے ہمسفر رہے برسوں  
مری نظر نے شبِ غم انھیں بھی دیکھ لیا  
گھٹے اگر تو بس اک مشبہ خاک ہے انسان

کہ غنچے کھل تو سکے، کھل کے مسکرا نہ سکے  
مگر کبھی وہ نظر سے نظر ملا نہ سکے  
وہ گل ہے زخمِ ہبساں جو مسکرا نہ سکے  
جو روشنی میں رہے روشنی کو پا نہ سکے  
وہ پاؤں راہِ طلب میں جو دم گمانہ سکے  
جو دل سے آنکھ تک آنے لڑتے نہ سکے  
جو زندہ رہ کے منہم حیات پا نہ سکے  
مجھے تو کیا؟ مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے  
مرے حدودِ محبت سے بچ کے جانہ سکے  
پھر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے  
وہ بے شمار ستارے کہ جگمگا نہ سکے  
بڑھے تو وسعت کوین میں سہما نہ سکے

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے  
نئی زمین، نیا آسمان بنا نہ سکے





## فراق گور کھپوری

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے  
وہ چوٹ جو کیا جانے کہاں سے ابھرائے  
آنکھوں کو پھر اک شاہدِ رعنا نظر آنے  
اک برقِ ادا، شعلہ قبا، پسیرِ رنگیں  
کوندا ہو گا از۔ اُٹھت یہ تبسم کی گھلاوٹ  
وہ مستی قامت کہ گھٹا جھوم کے اُٹھے  
نس نس میں کوئی جیسے دبی چستیاں بھرتے  
دوشیزہ جوانی کی اُدھر ٹوٹتی انگڑائی  
وہ شوخیِ محتاط کے نیچتے ہوئے انداز  
یہ کم نگہی چشمِ فسوں ساز کی کیسی

ہر دل کو لگے چوٹ سی، ہر آنکھ بھر آئے  
وہ دردِ فرشتوں کو جو انسان بنائے  
زریں مکرے کچ کلے، تنگ قبائے  
دلہائے مہ و مہر کو پسلو میں دباے  
لمبے کی کھنک۔ لُج جو ستاروں سے چرائے  
وہ جیتی ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے  
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے  
تصویر اُدھر قوسِ قزح کھینچتی جائے  
دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے  
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے

کچھ ایسی بھی گزری ہیں تیرے سحر میں راتیں  
دل درد سے خالی ہو مگر میند نہ آئے

# جگنو

فراق گو رکھپوری

یہ مست گشتا، یہ بھری بھری برسات  
تمام۔۔۔ حد نظر تک — گھدوٹوں کا سماں  
فضائے شام میں ڈوبے سے پٹے جاتے ہیں  
جدھر نگاہ کریں کچھ دھواں سا اٹھتا ہے  
وہ اک اٹھتا ہے طرارت کی آنچ سے آکاش  
زفرش تاغلات انگڑائیوں کا عالم ہے  
یہ مد بھری ہوئی پُر دایاں سنکتی ہوئی  
بھنبھوڑتی ہے ہری ڈالیوں کو سرد ہوا  
یہ شاخسار کے جھولوں میں بیتک پڑتے ہوئے  
یہ لاکھوں پتیوں کا ناچنا یہ رقصِ نبات  
یہ بخودنی مسرت یہ والہانہ رقص  
یہ تالِ سم، یہ چھپا چھم کد کان بختے ہیں؟  
ہوا کے دوش پہ کچھ مادی اودی شعلوں کی  
نشتے میں چورسی پر چھائیاں بھتکتی ہوئی  
افق پہ ڈوبتے دن کی چھلکتی ہیں آنکھیں  
غموں سوز دروں سے سلگ رہی ہے یہ شام

مرے مکان کے آگے ہے ایک صحن وسیع  
کبھی وہ ہنستی نظر آتی ہے کبھی وہ اُداس  
اسی کے بیچ میں ہے ایک پیڑ پھیل کا  
سناس میں نے بزرگوں سے یہ کہہ کر اس کی  
جو کچھ نہ ہو گی تو ہو گی قریب چھیا نوے سال  
چھڑی تھی ہند میں جب پہلی جنگِ آزادی  
جسے دبانے کے بعد اس کو غدر کہنے لگے  
یہ اہل ہند بھی سوتے ہیں کس قدر معصوم  
وہ دار و گیر وہ آزادی وطن کی جنگ  
وطن سے تھی کہ غنیم وطن سے غداری  
پھر گئے تھے ہمارے وطن کے پیڑ جوں  
دیباہ ہند میں زن پڑ گیا تھا چار طرف  
اسی زمانے میں کہتے ہیں میرے دادا نے  
جب ارض ہند پہنچی خان سے سپوتوں کے  
میان صحن دکایا تھا لا کے اکٹ۔ پودا

جو آب و آتش و خاک و ہوا سے پلتا ہوا  
خود اپنے قہ سے جو شش نمونکتا ہوا  
فسون روح نباتی رگوں میں چلتا ہوا  
نگاہ شوق کے رانچوں میں روز و رات چلتا ہوا  
سنا سے راویوں سے دیدنی تھی اسکی اٹھان  
ہر اک کے دیکھتے ہی دیکھتے چڑھا پر و ان  
وہی ہے آج یہ جیت سنا رپڑ پیل کا  
وہ ٹینیوں کے منڈل لیے جٹا دھاری  
زمانہ دیکھے ہوئے ہے یہ پڑ بچپن سے  
رہی ہے اس کے لیے داخلی کشش مجھ میں  
رہا ہوں دیکھتا چپ چاپ دیر تک اس کو  
میں تو کیا ہوں کئی بار اس دنیا سے میں  
وہ اس کی گہری جڑیں غنیں کہ زندگی کی جڑیں  
پس سکون شجر کوئی دل دھڑکتا تھا  
میں دیکھتا تھا بھی اُس میں زندگی کا ابھار  
میں دیکھتا تھا اُسے ہستی بشر کی طرح  
کبھی اُداس کبھی شادماں کبھی گھبر

فضا کا سر مئی رنگ اور ہر چہلا گہرا  
کھلا کھلا سا ناک سے دھواں دھواں سی ہے شام  
ہے جھٹٹا کہ کوئی اڑ رہا ہے مائل خواب  
سکوت شام میں دراندگی کا عالم ہے  
ڑکی ڑکی سی کسی سوچ میں ہے مروج صبا  
ڑکی ڑکی سی صفیں مل بھی گھٹا دُن کی۔  
آنا پر ہے سر صحن رقص پیل کا  
وہ کچھ نہیں ہے اب اک جنبش خفی تھے سوا  
خود اپنی کیفیت نیلگوں میں ہر لوندہ  
یہ شام ڈوبتی جاتی ہے جمپتی جاتی ہے  
حجاب وقت سر سے سے ہے جس حرکت  
ڑکی ڑکی دل فطرت کی دھڑکنیں بکثرت  
یہ رنگ شام کہ گردش ہی آسمان میں نہیں

ہیں ایک وقفہ تاریک . سرسبز تار یک  
سایاں غمبشیں سہمی کچھ ہوئی — فوراً  
نئی کھٹا کے تلے جھلکے بھٹکے پتوں سے  
چری چری کئی چنگاریاں سی پھوٹ پڑیں  
کہ جیسے کھلتی پھلتی ہوں بے شمار نکھیں  
عجب یہ آنکھ چوٹی تھی نور و خلعت کی  
سہمی نرمیوں دیتے آن گزشتہ بگنو  
کھنی سیاہ لختک پتیوں کے جھڑٹ نہ  
مثالی حب اور شب تاب بگاڑنے لگے  
کہ تھر تھراتے ہوئے آنسوؤں سے ساغ شام  
چھلک چھلک پیسے جیسے بغیر بان گمان  
بطوان شام میں ان زندہ قلموں کی دما  
کسی کی سونی ہوئی یاد کو جگاتی تھی —  
وہ بے پناہ کھٹا وہ بھری بھری برسات  
وہ سین دیکھ کے آنکھیں مری بھراتی تھیں

مری حیات نے دیکھی ہیں میں برساتیں  
مے جھڑی کے دن مٹی تھی ماں میری  
وہ ماں رُاشک بھی جس ماں کی میں نہ دیکھ سکا  
جو آنکھ بھر کے مجھے دیکھ بھی سکی نہ وہ ماں  
میں وہ پسر ہوں جو کچھ نہیں کہ ماں کی ہے  
مجھے کھلائوں اور دایوں نے پال تھا  
وہ مجھ سے کہتی تھیں جب کچھ کے آتی تھی رستا  
جب آسمان میں ہر سب کھٹا میں چھاتی تھیں  
بوقت شام جب اُڑتے تھے یہ طرے جگنو  
دینے دکھاتے ہیں یہ بھولی بھٹکی روحوں کو  
مڑہ بھی آتا تھا مجھ کو کچھ ان کی باتوں میں  
میں ان کی باتوں میں رہ رہ کے کھو بھی جاتا تھا  
پراس کے ساتھ ہی دل میں کسک سی سوتی تھی  
کبھی کبھی یہ کسک جُوک بن کے اُٹھتی تھی  
یتیم دل کو مرے یہ خیال ہوتا تھا  
یہ شام مجھ کو بنا دیتی کاش ایک جگنو  
قواں کی لٹھکی سوتی روح کو دکھاتا راہ  
کہاں کہاں وہ بھاری بھٹک ہی ہوگی

کہاں کہاں مری خاطر بٹک رہی ہوگی  
یہ سوچ کر مری حالت عجیب ہو جاتی  
پلک کی اوٹ میں جگنو چمکنے لگتے تھے  
کبھی کبھی تو مری ہچکیاں سی بندھ جاتیں  
کہ ماں کے پاس کسی طرح میں پہنچ جاؤں  
اور اس کو راہ دکھاتا ہوا میں گھر لاؤں  
دکھاؤں اپنے کھلونے دکھاؤں اپنی کتاب  
کہوں کہ پڑھ کے سنا تو مری کتاب مجھے  
پھر اس کے بعد دکھاؤں اُسے میں وہ کاپی  
کہ ڈیرھی بیڑھی لکیریں بنی تھیں کچھ جس میں  
یہ جوت تھے جنہیں میں نے لکھا تھا پہلے پہل  
دکھاؤں پھر اُسے آنکھیں میں وہ گلاب کی سیل  
سُنا ہے جس کو اُسی نے کبھی دکھایا تھا  
یہ جب کی بات سے جب میری عمر ہی کیا تھی  
نظر سے گزری تھیں کل چار پانچ برسائیں

گزر رہے تھے مرد و سال۔ اور موسم بہار  
ہمارے شہر میں آتی تھی گھر کے جب برسات  
جب آسمان میں اُڑتے تھے ہر طرف جگنو  
ہوا کی موج رواں پردہ نیچے جلاکے ہوئے  
فضا میں رات گئے جب درخت پھل کا  
ہزاروں جگنوؤں سے کوہ طور بنتا تھا  
ہزاروں وادی ایمن تھیں جس کی شاخوں میں  
یہ دیکھ کر مرے دل میں یہ ہو کہ اُٹھتی تھی  
کہ میں بھی ہوتا انہیں جگنوؤں میں اک جگنو  
تو ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ  
وہ ماں میں جس کی محبت کے پھول چُن نہ سکا  
وہ ماں میں جس سے محبت کے بول سن نہ سکا  
وہ ماں کہ بیچنے کے جس کو کبھی میں سو نہ سکا  
میں جس کے آنچلوں میں منہ پھپکا کے روز نہ سکا  
وہ ماں کہ گھٹاؤں سے جس کے کبھی پیٹ نہ سکا  
وہ ماں کہ سینے سے جس کے کبھی چمٹ نہ سکا  
ہمک کے گود میں جس کی کبھی میں چہرہ نہ سکا  
میں زیر سایہ اُمید جس کے بڑھ نہ سکا  
وہ ماں میں جس سے شرارت کی داد پانہ سکا  
میں جس کے ہاتھوں محبت کی مار کھا نہ سکا  
سنوارا جس نے نہ میرے جھنڈوے بالوں کو  
بسا سکی نہ جو ہونٹوں سے سوئے گالوں کو  
جو میری آنکھوں میں آنکھیں کبھی ڈال سکی  
نہ اپنے ہاتھوں سے مجھ کو کبھی اچھال سکی  
وہ ماں جو کوئی کمائی مجھے سُنا نہ سکی  
مجھے سُنانے کو جو لڑکیاں بھی گانہ سکی

وہ ماں جو وہ دھبھی اپنا مجھے پلا نہ سکی  
وہ ماں جو ہاتھ سے اپنے مجھے کھانا نہ سکی  
وہ ماں گلے سے مجھے جو کبھی لگا نہ سکی  
وہ ماں جو دیکھتے ہی مجھ کو مسکرا نہ سکی  
کبھی جو مجھ سے لٹھالی پھپکا کے رکھ نہ سکی  
کبھی جو مجھ سے وہی بھی بچا کے رکھ نہ سکی  
میں جس کے ہاتھ میں کچھ دیکھ کر ڈبک نہ سکا  
شک شک کے کبھی پاؤں میں ٹٹک نہ سکا  
تھیں نہ کھینچا شرارت سے جس کا آچل بھی  
رچا سکی مری آنکھوں میں جو نہ کا جل بھی  
وہ ماں جو میرے لیے تیلیاں پکڑ نہ سکی  
جو بھگتے ہوئے باز و مرے جکڑ نہ سکی  
بڑھایا پیار کبھی کر کے پیار میں نہ کی  
جو منہ بنا کے کسی دن نہ بھرے روٹ نہ سکی  
جو یہ بھی کہ نہ سکی جانہ ہوں گی تجھ سے  
جو ایک بار خفا بھی نہ ہو سکی مجھ سے  
وہ جس کو جوٹھا دگا منہ کبھی دکھ نہ سکا  
گٹھنوں پہ مری جس کو پیار آنہ سکا  
جو موتی کھانے پہ مجھ کو کبھی نہ پیٹ سکی  
نہ ہاتھ تھام کے مجھ کو کبھی گھسیٹ سکی  
وہ ماں جو گفتگو کی رو میں سن کے میری بڑ  
کبھی جو پیار سے مجھ کو نہ کہہ سکی کھامڑ  
شرارتوں سے مری جو کبھی اُلجھ نہ سکی  
حافظوں کا مری فلسفہ سمجھ نہ سکی  
وہ ماں کبھی جسے چونکانے کو میں ٹک نہ سکا  
میں راہ چھینکنے کو جس کے آگے رُک نہ سکا  
جو اپنے ہاتھ سے ہر وہ پیرے بھر نہ سکی  
جو اپنی آنکھوں کو آئینہ میرا کہ نہ سکی

گلے میں ڈالی نہ بانہوں کی پھول مالا بھی  
نہ دل میں لوح جبین سے کیا انس لالہ بھی  
وہ ماں کبھی جو مجھے بہ حیاں پنہا نہ سکی  
کبھی مجھے نئے کپڑوں سے جو سما نہ سکی  
وہ ماں نہ جس سے لڑکیوں کے جھوٹ بول سکا  
نہ جس کے دل کے در ان گنجیوں سے کھول سکا  
وہ ماں میں پیسے بھی جس کے کبھی چرا نہ سکا  
سزا سے بچنے کو جھوٹی قسم بھی کھانہ سکا  
وہ ماں کہ آیت رحمت ہے جس کی جبین جبین  
وہ ماں کہ ہاں سے ہوئی ہے بڑھ کے جس کی نہیں  
دم عتاب جو ممتی فرشتہ رحمت کا  
جو راک چھڑتی جھنجھلا کے بھی محنت کا  
وہ ماں کہ گھر مکیاں بھی جس کی گیت بن جائیں  
وہ ماں کہ جھڑکیاں بھی جسکی بھول برسا بنیں  
وہ ماں ہم اس سے جو دم بھر کو دشمنی کر لیں  
تو یہ نہ کہہ سکی اب آؤ دوستی کر لیں  
کبھی جو سن نہ سکی میسر ہی تو نلی باتیں  
نہ مے سکی جو کبھی تھپڑوں کی سوغاتیں  
وہ ماں بہت سے کھلونے جو مجھ کو مے نہ سکی  
خراج سرخوشی مسرمدی جو لے نہ سکی  
وہ ماں میں جس سے لڑائی کبھی نہ ٹھان سکا  
وہ ماں میں جس پہ کبھی ٹھیکان نہ تان سکا  
وہ میری ماں میں کبھی جس کی پیٹیر نہ جوتھا  
وہ میری ماں کبھی کچھ جس کے کان میں نہ کہا  
وہ ماں کبھی جو مجھے گردھنی پنہا نہ سکی  
جو تال ہاتھ سے لے کر مجھے پنہا نہ سکی  
وہ ماں نہ دیکھ سکا نہ زندگی میں جس کی چاہ  
اسی کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ

یہ سوچ سوچ کے آنکھیں مری بھڑاتی تھیں  
تو جا کے سوئے بچھونے پر لیٹ رہتا تھا  
کسی سے گھر میں نہ راز اپنے دل کے گستاخا  
یتیم تھی مری ذیسا یتیم میری بیات  
یتیم شام و بھر تھی یتیم تھے شب و روز  
یتیم میری پریشانی تھی میرے کھیل یتیم  
یتیم گیری مسرت تھی میرا غم بھی یتیم  
یتیم آنسوؤں سے نکیہ بھیاک جاتا تھا  
کسی سے گھر میں نہ کہتا تھا اپنے دل کا عید  
ہر اک سے دور اکیلا اس رہتا تھا  
کسی شاہان نادیدہ کو میں تکست تھا  
میں ایک وحشت بے نام سے بڑھتا تھا

ہمارے شہر میں آتی ہیں اب بھی برساتیں  
ہمارے شہر پر اب بھی گشتائیں چھپاتی ہیں  
ہنوز بھیگی ہوئی سردی فضاؤں میں  
خطوط نور بناتی ہیں جگنوؤں کی میضیں  
فضائے تیرہ میں اڑتی ہوئی یہ قناریلیں  
مگر میں جان چکا ہوں اسے بڑا ہو کر  
کسی کی روح کو جگنو نہیں دکھاتے راہ  
کہا کیا تھا جو بچپن میں مجھ سے جھوٹ تھا

نما کہ بھی کہیں حسرت سے دل میں کہتا ہوں  
یہ جانتے ہوئے جگنو نہیں دکھاتے چراغ  
کسی کی بھنگی ہوئی روح کو — مگر بھر بھی  
وہ جھوٹ ہی سہی کہتنا حسین جھوٹ تھا وہ  
جو مجھ سے چھین لیا عمر کے تقاضے نے

گذر رہتے تھے مہ و سال اور موسم پر  
اسی طرح کئی رسائیں آئیں اور گئیں  
میں رفتہ رفتہ پہنچنے لگا بہ سن شعور  
تو جگنوؤں کی حقیقت سمجھ میں آنے لگی  
اب ان کھلائیوں اور دایوں کی باتوں پر  
مرا یقین نہ رہا، مجھ پہ ہو گیا ظاہر  
کہ بھنگی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ  
وہ من گھڑت سی کہانی تھی اک فسانہ تھا  
وہ بے پڑھی لکھی کچھ عورتوں کی تھی بکواس  
بھنگی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ  
یہ کھل گیا مرے بدلانے کو جتیں یہ باتیں  
مرا یقین نہ رہا ان فضول قصوں پر۔

میں کیسا بتاؤں وہ کتنی حسین دُنیا تھی  
جو بڑھتی عمر کے ہاتھوں نے چھین لی مجھ سے  
بجھ سکے کوئی اسے کاش عجب طفل کو  
جہان دیکھنا مٹی کے ایک ریزے میں  
نمود لالہ خود رو میں دیکھنا جنت  
کو سے نظارہ کوئین اک گھر وندے میں  
اٹھا کے رکھ لے حنائی کو جو سبھیلی پر  
کرے دوام کو جو قید ایک لمحے میں  
سنا؟ وہ قادرِ مطلق ہے ایک تھی سی جان  
خدا بھی سجدے میں جھجک جائے سامنے اس کے

سکوت رات کا جس وقت چھڑتا ہے تہ  
کبھی کبھی تری پائل کی آتی ہے جھنکا  
تو میری آنکھوں سے موتی برسے لگتے ہیں  
اندھیری رات کے پرچھاویں ٹسنے لگتے ہیں  
میں جگنو بن کے تو تجھ تک پہنچ نہیں سکتا  
جو تجھ سے ہو سکے اسے مان تو وہ طریقہ بنا  
تو جس کو پالے وہ کاغذ اچھال دے کیسے  
یہ نظم میں ترے قدموں میں ڈال دوں کیسے

یہ عقل و فہم بڑی چسپہ ہیں مجھے قیلم  
مگر دکا نہیں سکتے ہم اس کا اندازہ  
کہ آدمی کو یہ پڑتی ہیں کس قدر ہنگامی  
اک ایک کر کے وہ طفل کے بہ خیال کی موت  
بلوغ سن میں وہ عدد سے نئے خیالوں کے  
نئے خیال کا دھچکا نئے خیال کی فیس  
نئے تصوروں کا کرب الاماں، کہ حیات  
تمام زخم نہاں ہے تمام نشتر ہے  
یہ چوٹ کھا کے سنبھلنا محال ہوتا ہے

نوائے درو سے کچھ جی تو ہو گیا بڑکا  
مگر جب آتی ہے برسات کیا کروں اس کو  
جب آسمان میں اڑتے ہیں ہر طرف جگنو  
شراب فوریے سبز آنکھوں میں  
کنول جلاتے ہوئے ظلمتوں کے سینوں میں  
جب ان کی تابش بے ساختہ سے پیل کا  
درخت سرو چراغاں کو مات لگاتا ہے  
نہ جانے کس لیے آنکھیں مری بھراتی ہیں



# بات سمجھنے والا

حفیظ جالندھری

روزِ روشن کو ہوں میں رات سمجھنے والا  
دورِ بالغ نظراں اور ہے۔ یہ دورِ نہیں  
جلوہ صبحِ قیامت کے لیے ہے بیدار  
فقط ہے کہ ہو مغرب سے طلوعِ خورشید  
تو سمجھتا ہے جسے رنگِ بہارِ گلزار  
آج کل تو بھی نشے میں ہے تو مجھ سے الجھ  
میرے بگڑے ہوئے تو بھی سمجھ لے اے کاش  
دیرِ زنداں پر ہے اک طرہ غضبناک ہجوم  
شانِ زندانِ خرابا بات سمجھنے والا  
ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا  
ہم بزرگوں کے مقامات سمجھنے والا  
چاند تاروں کے اشارات سمجھنے والا  
اپنے اللہ کی آیات سمجھنے والا  
میں اسے خون کی برسات سمجھنے والا  
میں ہوں کم ظرف کی اوقات سمجھنے والا  
میرے بگڑے ہوئے حالات سمجھنے والا  
شانِ زندانِ خرابا بات سمجھنے والا

اس نئے دورِ سخن سے ہے پریشان حفیظ

شعر کو حرف و حکایات سمجھنے والا



## آرزو لکھنوی

زندگی مجسوریوں کا راز ہو کر رہ گئی	سانس اک فریاد بے آواز ہو کر رہ گئی
دل کی دھڑکن غمناکے راز ہو کر رہ گئی	جو محبت سوز تھی وہ ساز ہو کر رہ گئی
کی شکل آہ اور پھر دسے گئی طاقت جواب	غم کی لمبی داستان آغاز ہو کر رہ گئی
بات کیلئے خود نہیں سمجھے تو سمجھانے کسے	وہ جو الجھن دل میں معنی اک راز ہو کر رہ گئی
ہر نفس اک نالہ دل اور دل پابندِ غم	زندگی زنجیر کی آواز ہو کر رہ گئی
اب کہاں قربانگر الفت میں ہم سا جاں نثار	چار دن مشق ادا کو ناز ہو کر رہ گئی
اول اول جھوٹے غمخواروں کی یاد آئی بہت	آخر آخر بے کسی دم ساز ہو کر رہ گئی
جس کے بل پر پھر پھڑا کر ہم نے توڑا تھا نفس	اب وہ حسرت حسرت پر واز ہو کر رہ گئی

ناتواں دل کی فغانِ آخری اسے آرزو

کان میں گونجی ہوئی آواز ہو کر رہ گئی



### فیض احمد فیض

یاد غزال چشماں ، ذکرِ سمنِ عذاراں	جب چاہا کر لیا ہے کینچِ قفسِ بہاراں
آنکھوں میں ردِ مندی ہونٹوں پہ عذرِ خواہی	جانانہ دار آئی شامِ سنہِ اقیاراں
ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ	آساں نہ تھی کچھ ایسی راہ و ناسعاراں
بجورم ہو خواہ کوئی ، رہتا ہے ناسمحوں کا	رُوئے سخن ہمیشہ سوئے جگرِ فکاراں
ہے اب بھی وقتِ زاہدِ تریمِ زہدِ کرلے	سوئے حرم چلا ہے ابنوہِ بادِ خواراں
شاید قریب پہنچی صبحِ وصالِ مہمدم	موجِ صبا ایسے ہے خوشبوئے خوش کناراں
ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس نقیب سے	آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرو باراں

آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر  
تسینم سے فروشانِ پیغامِ نئے گساراں

# آگ میں پھول

فیض احمد فیض

شمار میں تیری ٹیکوں پر اسے وطن، کہ جہاں  
 چلی سے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے  
 جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے  
 نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے  
 ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بہت دکشاد  
 کہ سنگ و شستِ مہم میں اور سنگ آزاد  
 بہت بہت ظلم کے درست بہانہ جو گے لیے  
 جو چند اہلِ حب وں تیرے نام لیا ہیں  
 بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی نصف بھی  
 کسے دیکھیں کہیں کس سے نصفی چاہیں  
 مگر گزارنے والوں کے دن گذرتے ہیں  
 ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں  
 بجھا جو روزِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے  
 کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

چمک اٹھے ہیں سلاسلِ توہم نے جانا ہے  
 کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہو گئی  
 غرض قصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں  
 گرفتِ سایہ دیوار و در میں جیتے ہیں  
 یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق  
 نہ اُن کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی  
 یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول  
 نہ اُن کی لار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی  
 اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے  
 ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے  
 گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل ہم ہوں گے  
 یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں  
 گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیسا  
 یہ چار دن کی حسدائی تو کوئی بات نہیں  
 جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں  
 علاجِ گردشِ یل و نسا رکھتے ہیں



## سیما ب اکبر آبادی

جو در پردہ اُنھیں بسلوہ نمائی کی نہ ہو ہوتی  
منازع ضبط وقت واپس کی راگیاں میں نے  
مسافر اپنے پہلو ہی میں مل جاتی تھے منزل  
حدیث طور و موسیٰ اور وہ بھی چار لفظوں میں  
غلط ہے عشق پر الزام آوارہ نگاہی کا  
دل اک قطرہ تھا۔ زویدہ چکیدہ سیل غم دیدہ  
میں برقِ جن کو روکے ہوئے ہوں دل پر ایسے مینا  
وہ ذوق و شوقِ موسیٰ اور وہ اک کم سے کم جلوہ  
میں بچ کتنا ہوں دنیا آرزو ہی آرزو ہوتی  
نگاہِ جن میں ایک اشک کی کیا آرزو ہوتی  
اگر منزل سے پہلے تجھ کو اپنی جستجو ہوتی  
ہوئی تھی گفتگو اُن سے تو کھل کر گفتگو ہوتی  
جو ہوتا جن یک سو تو نظر کیوں چار سو ہوتی  
ذرا سی بوند پھر کیا اشک بنتی کیا لہو ہوتی  
اگر یہ کووند کر گرتی تو میں ہوتا نہ تو ہوتی  
جزائے آرزو یارب، بقدر آرزو ہوتی

دل لے سیما ب خالی آرزو سے وہ نہ سکتا تھا  
نہ ہوتی آرزو، تو آرزو کی آرزو ہوتی



## عبدالمجید سالک

مرے جی میں ہے کہ پوچھوں کبھی مرشدِ مغان سے  
 کہ ملا جمالِ ساقی کو یہ طسطنہ کہاں سے  
 وہ یہ کہہ رہے ہیں ہم کو ترے حال کی خبر کیا  
 تو اٹھا سکا نکا پس نہ بتا سکا نہ باں سے  
 جو انہیں وفا کی سوجھی تو نہ زیست نے وفا کی  
 ابھی آکے وہ نہ سمیٹھے کہ ہم اٹھ گئے جہاں سے  
 میں عدم کے لالہ زاروں میں فدا کر ازل بھت  
 مجھے کھینچ لائی طنِ اُلم تری آرزو کہاں سے  
 مری سرفروشت میں تھا وہی داغِ نامِ رادی  
 جو ملا مری جبین کو ترے سنگِ آستان سے  
 بچے بھلیوں کی زد سے وہی طائرِ انِ دانا  
 جو کڑک چمک سے پہلے نکل آئے آستیاں سے  
 یہ ہے سرگزشتِ وحشت کہ ملا سراغِ محفل  
 نہ درائے کارواں سے نہ غبارِ کارواں سے  
 شبِ غم جو آئی سالک مٹے عارضی اندھیرے  
 مرادِ دل ہوا منور تب و تابِ جاوداں سے

## ○ تائیس

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں  
 کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں  
 مزاج ایک نظر ایک دل بھی ایک ہی  
 معاملات من و تو نکل ہی آتے ہیں  
 ہزار ہسم معنی ہو ہزار ہسم نظری  
 مقام جنبش ابرو نکل ہی آتے ہیں  
 خانے ناخن پا سو کہ حلقہ سر زلف  
 چھپاؤ بھی تو یہ حب دو نکل ہی آتے ہیں  
 جناب شیخ، وضو کے لیے سہی لیکن  
 کسی بہانے لب جو نکل ہی آتے ہیں  
 متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے  
 زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں





### چراغِ حسنِ حسرت

دل بلا سے نثار ہو جائے  
آپ کو اعتبار ہو جائے

قمر تو بار بار ہوتا ہے  
لطف بھی ایک بار ہو جائے

زندگی چارہ سازِ عزم نہ تھی  
موت ہی غم گسار ہو جائے

یا خزاں جائے اور بہار آئے  
یا خزاں ہی بہار ہو جائے

دل پہ مانا کہ اختیار نہیں  
اور اگر اختیار ہو جائے



### اختر شیرانی

اٹھا یا غم، کہ دنیا درپے آزار ہے ساقی  
 مشیت ہو کہ قسمت، بر سر پرکار ہے ساقی  
 غمب ہے یہ جوانی اور ہم اس طبع سے کامیں  
 کہ اک اک سانس اک چلتی ہوئی تلوار ہے ساقی  
 محبت کر۔ غم دنیا ستائے تو محبت کر  
 محبت اس جہاں میں اک حسیں آزار ہے ساقی  
 خریدی جا نہیں سکتی خوشی دنیا کے غمگین میں  
 مگر تیرے کرم سے یہ بھی کیا دشوار ہے ساقی  
 محبت میں مزے لے لے کے مرنا تو مقدور ہے  
 مگر اس کے لیے کچھ زندگی درکار ہے ساقی  
 پریشاں کر دے تو بھی زلفِ مشکیں دوش رنگیں پر  
 کہ صحنِ باغ میں اودی گھٹا گلکار ہے ساقی  
 عجب کیسے کیا فرات آنکھوں ہی میں کٹ جائے  
 ادھر بے خواب ہے اختر ادھر بیدار ہے ساقی



### وحشت کلکتہ

کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریب اُمید کھا رہا ہوں  
ہزار ہا نقش آرزو کے بنا رہا ہوں مٹ رہا ہوں  
وفا میری معتبر ہے کتنی جفا وہ کر سکتے ہیں کہاں تک  
جو وہ مجھے آزما رہے ہیں تو میں انھیں آزما رہا ہوں  
کسی کی محفل کا نغمہ نے محرکِ نالہ و فغاں ہے  
فسانہ عیش سن رہا ہوں فسانہ غم سن رہا ہوں  
زمانہ بھی مجھ سے نا موافق میں آپ بھی دشمنِ سلامت  
تعجب اس کا ہے جو مجھ کیونکر میں زندگی کا اٹھارہا ہوں  
نہو مجھے جتنوئے منزل مگر ہے منزلِ مری طلب میں  
کوئی تو مجھ کو بلارہا ہے کسی طرف کو تو جبارہا ہوں  
یہی تو ہے نفع کو ششوں کا کہ کام سارے بکڑ رہے ہیں  
یہی تو ہے فائدہ ہوس نا کہ اشکِ حسرت بہا رہا ہوں  
خدا ہی جانے یہ سادہ لوحی دکھائے گی کیا نتیجہ وحشت  
وہ جتنی الفت کھٹا رہے ہیں اُسی قدر میں بڑھا رہا ہوں

## ○ اثر لکھنوی

جلد جاں بازید کا پار ہے ہیں  
 نظرتے ہم گئے جا رہے ہیں  
 ہو یاد نظر پھر دل دکھانا  
 توجہ پھر ادھر فرما رہے ہیں  
 جو آئے تھے مجھے تسکین دینے  
 تماشا ہے کہ خود گھبرا رہے ہیں  
 گل تر کا ہوا جاتا ہے دھوکا  
 وہ اس انداز سے شرما رہے ہیں  
 تغافل کشتگان بے نیازی  
 تری باتوں سے دل بہلا رہے ہیں  
 چلی کیسی ہوا گلشن میں یارب  
 خزاں سے پہلے گل مرجھا رہے ہیں  
 اثر اب شکرتے میں جفا پر  
 محبت کی حدوں میں آ رہے ہیں



احمد ندیم قاسمی

کیا بھروسہ ہو کسی بہم کا  
چاند الجہر اترے حیرا چمکا  
صبح کو راہ دکھانے کے لئے  
دست گل میں ہے دیا شبنم کا  
وقت سستا کے بٹھے گا پھر سے  
غم مفت در تو نہیں آدم کا  
مجھ کو ابرو، تجھے محراب پسند  
سارا جھگڑا اسی نازک خم کا  
حسن کی جستجوئے پیسم میں  
ایک لمحہ بھی نہیں ماتم کا  
ہوئے اس دور میں فتوے جاری  
کہ غزالوں کو جنوں ہے دم کا  
مجھ سے مر کر بھی نہ توڑا جائے  
ہائے یشہ زریں کے غم کا  
اب سیو چاک گر بیان حیات  
کہ نقاضا ہے یہی موسم کا

# غینچہ پھر لگا کھلنے !

احمد ندیم قاسمی

یہ شب ہے یا مرے دل کا سکوت بے پایاں  
کچھ ایسے ٹوٹ رہی ہیں رگیں تختہ کی  
ہوا چلی کہ مشیت کو دل لگی سو جھی

یہ دل ہے یا مرے مرقد پہ چل رہا ہے چراغ  
کہ جیسے تندی سے سے چمچ رہا ہو ایاغ  
سمند روں سے نہ پڑھو کبھی صدف کا سراغ

ہر ایک چیز میں گہرائی ہے، تیر ہے  
یہاں تو گل بھی مرے ہم نصیب ہی نکلے  
اندھیری شام سے محسوس ہو رہا ہے مجھے

ہوا کے ہمیں ہیں اُڈے سکوت کے ڈھانے  
کہ تیرگی میں گھلے جا رہے ہیں بے چارے  
کہ جیسے بھیل کی تہ تک اُتر گئے تارے

تمام ریگتے کہے، تمام سناٹے  
کہ جیسے شیر ہرن کو زنگل کے لب چاٹے  
بڑے وقار سے اجداد نے سفر کاٹے

نیشپ شام سے بخم سحر کی چوٹی تک  
ٹھکے ٹھکے ہیں کچھ اس طرح وقت کے تودے  
سنا ہے ایسی ہی شہنائے تار تھیں، جن میں

مگر جس کی صدا تھی کہ راست بھر نہ تھی  
مجھے یہ وہم کہ آغوشیں گل میں برف جھی  
بجھا گئی وہ دینیے دامن صبا کی نمی

مری نگاہ سے اوجھل ہے کاروانِ سحر  
مجھے تھے اوس کے موتی قبائے گلشن پر  
جو آنسوؤں نے سرِ بامِ دل جلائے تھے

افتی لہز نے لگا، رات کے قدم اکھر طے  
ستارہ سحری نے مجھے نہ پہچانا  
یہ اور بات مجھے تاب غبط ہے کہ نہیں  
قدم اٹھا تو چھٹکنے لگی ہیں زنجیریں  
کسی کے دوش پہ ہل تھا، کسی کے ہاتھیں پھل  
دہک رہا تھا وہ پنداران کے چہروں پر  
بگڑ بجا کہ عروس سحر ہوئی بیدار  
امٹی افق سے وہ مجھ پر شگفتہ مزاج  
زمین سے تابہ فلک رنگ لہلہا نے لگے  
میں سوچتا ہوں، سحر نے مجھے شعور دیا  
مچل رہی ہیں شعاعیں اُبل رہا ہے لہو  
چمک تو خوب تھی لیکن مجلس گمے ہیں بدن  
سحر کی ایک ہی تفسیر ہے — طلوع سحر  
نہ مسکرائے گا غنچہ ہزار آنے تک  
وہ لاکھ نوک سناں سے کلی کا دل چیریں  
مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں

کچھ اور نام ہے اس کا، یہ فصل گل تو نہیں  
کہ جوئے گل کے لیے دھل رہی ہیں زنجیریں



## نہم راشد

تم سے کرم سے خدائی میں یوں تو کیسا نہ ملا  
 مگر جو تو نہ ملا۔ زیست کا مزانہ ملا  
 حیاتِ شوق کی یہ گرمیاں کہاں ہوتیں  
 خدا کا شکر ہمیں نالہ رسا نہ ملا  
 ازل سے فطرتِ آزاد ہی تھی آوارہ  
 یہ کیوں کہیں کہ ہمیں کوئی رہنما نہ ملا  
 یہ کائنات کسی کا غبارِ راہ سہی  
 وہیلِ راہ جو بنتا وہ نقشِ پا نہ ملا  
 یہ دل شہیدِ فریب زگاہ نہ سکا  
 وہ لاکھ ہم سے باندا نہ محسوس نہ ملا  
 کنارِ موج میں مرنا تو ہم کو آتا ہے  
 نشانِ ساحلِ الفتِ ملا، ملا نہ ملا  
 تری تلاش ہی تھی مایہِ بقائے وجود  
 بلا سے ہم کو سر منزلِ بقا نہ ملا



# انقلابی

ن - م راشد

موزخ ، مزاروں کے بستر کا بارگداں  
عروس اُس کی نارس تمناؤں کے سوخ سے  
جداٹی کی دہلیز پر زلف و رخاک ، فوج کتاں !  
یہ ہنگام تھا ، جب ترے دل نے اس غمزہ سے  
کہا ، ہوا ، اب لاؤ ، در یوزہ غمزہ جانتاں !

مگر خواہشیں افسوس با و پیا نہیں ،  
جو ہوں بھی تو کیا  
کہ جولا نگہ وقت میں کس نے پایا ہے  
کس کا نشان

یہ تارنخ کے ساتھ چشمک کا ہنگام تھا ؟  
یہ مانا تجھے یہ گوارا نہ تھا ،  
کہ تارنخ داؤں کے دام محبت میں پھنس کر  
اندھیروں کی روح رواں کو اجالا کریں  
مگر پھر بھی تارنخ کے ساتھ  
چشمک کا یہ کون ہنگام تھا ؟

جو آنکھوں میں اُس وقت آنسو نہ ہوسکتے ،  
تو یہ مضطرب جاں ،

یہ ہر تازہ و نو بہار رنگ کی دلربا  
تری اس پذیرائی چشم و لب سے  
وفا کے سنہری جزیروں کی شہزاد ہوتی  
ترے ساتھ منزل منزل روان و دواں !

اے اپنے ہی زلف و گیسو کے دامِ ازل سے  
رہائی تو ملتی ،

مگر تو نے دیکھا بھی تھا

دیوتا تار کا حجرہ تار

جسم کی طرقت تو اُسے کر رہا تھا اشارے ،

جہاں بامِ دیوار میں کوئی روزن نہیں

جہاں چار سونو بانو طوفاں کے مارے ہوئے راگمیں  
کی بے انتہا استخوانیں پڑی ہیں ؟  
ابد تک نہ آنکھوں میں آنسو نہ لب پر فغاں !



### حقیقت ہو شیا پوری

کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی  
 دل ستم زدہ کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں  
 وہ ایک جلوہ صد رنگ، اک ہجوم بہار  
 نظر کہ تشنہ دیدار تھی رہی محسوس  
 نگاہ شوق کی محرومیوں سے ناواقف  
 اب اُن کے حسن میں حُسنِ نظر بھی شامل ہے  
 کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن مٹی  
 نصیبِ اہلِ وفا یہ سکونِ دل تو نہ تھا  
 اٹھا پھر آج مرے دل میں رشک کا طوفان  
 کہ دل کو عینِ ستم کا سزاوارہ کر گیا کوئی  
 خود اپنے حُسن سے یوں بے خبر گیا کوئی  
 بھانے کھن تھا جانے کہ دھڑ گیا کوئی  
 نظر اٹھائی تو دل میں اڑ گیا کوئی  
 نگاہِ شوق پہ الزام دھڑ گیا کوئی  
 کچھ اور میری نظر سے نکھڑ گیا کوئی  
 ہزار بار اٹھا سونے ور گیا کوئی  
 ضرور نالہٴ دل بے اثر گیا کوئی  
 پھر اُن کی ماہ سے با چشمِ تر گیا کوئی

یہ کہہ کے یاد کریں گے حقیقت دوست مجھے

وفا کی رسم کو پائندہ کر گیا کوئی

## ○ احسانِ دانش

بزمِ میں جب وہ وفا نا آشتِ نا بھی آئے گا  
 وار و زناں کے پرستار و یونہی ہنستے رہو  
 تہ نشیں ہو موجہ و طوفان کا دامن چھوڑ کر  
 روحِ گلشنِ خاک کے فزوں میں لے لی کر دیں  
 پہلے اپنے دستِ دواز و پر تو کر لے اعتماد  
 آپ کے جلوے سلامت آپ کے ہوتے ہوئے  
 گھر میں بیٹھے گھر ہی کا شکوہ بے جا نہ کر  
 ہو گئے جرمِ جنوں میں جتنے دیوانے اسیر  
 عشق کی مظلوم خاموشی نہ خالی جائے گی  
 ہر قدم اب قافلے کو ہے یقین گسری  
 جو دعا نکلے گی دل سے کیوں نہ ہوگی مستجاب

زندگی میں یہ جنازوں کی پرستش تبار کے  
 ایک دورِ احسانِ حسبِ دعا بھی آئے گا

# تقابل

معین حسن جذبی

کیا یہی انقلاب ہے قلبِ اودھر جگر اودھر	نالا ہے قرار اودھر شورِ شبنم تر اودھر
اُفتدویٰ میاں ستہمیں رنگ کو بو سے سودِ دین	کو رہے زگیں وطنی فور اودھر نطن اودھر
ایک تبسمِ فرنگ ہر دوافق ہو ترنگ	نفس بدوش نالہ رنگ شام اودھر صحر اودھر
اے وہ عقاب جس سے قہقہہ و دمن کی آبرو	ابج اسی عقاب کے ہال اودھر میں پر اودھر
کام و دہن کی تلخیاں کوئی مثالے اب کہا	وائے بہ حالِ تشنگاں شیر اودھر شکر اودھر
قلبتِ صلح کل یہاں، قلبتِ صلح کل وہاں	کثرتِ فتنہ گرا اودھر، کثرتِ فتنہ گرا اودھر
اہل ہنر کے واسطے اخاک بسر کے واسطے	جو روجھا کا گھر اودھر، قہر و بلا کا گھر اودھر
برگ سے بڑے پوچھے، لعل و بجر سے پوچھے	کون ہے بار و بار اودھر، کون ہے باثر اودھر
ایک مریضِ نیم جاں ایک مریضِ خستہ جاں	کون ہے چارہ مجاہد اودھر، کون ہے چارہ گرا اودھر
اہلِ فراق کچھ تباؤ، اہلِ مذاق کچھ بستلو	کون سی شے ہے خوب اودھر، کون سی خوب اودھر

بھر کی رات ہے طویل وصل کی صبح دور ہے

جذب الہی ہے ناتمام، خام ابھی شعور ہے

# قطعات

جانِ نشا و اختر

حسن کا عطر، جسم کا حسن دل  
مارضوں کے گلاب، زلفت کا خود  
بعض اوقات سوچتا ہوں میں  
ایک لوحِ شوہے صرف، تیرا وجود

یا دماغی میں یوں خیال ترا  
توال دیتا ہے دل میں اک ہل چل  
دھڑکتے میں کسی حسینہ کا،  
جیسے آجائے پاؤں میں اپنچل

میری راتوں کی تیسہ گی جب بھی  
روح پر یاس بن کے چھاتی ہے  
میری انجم تری جس میں صورت  
شع کی نور ہو مسکاتی ہے

## احترامِ نصاریٰ

خزاں میں آگ لگاؤ، بہار کے دن ہیں  
 بھدو غلوں و حقیقت خزاں کی تربست پر  
 اُنٹ دو تھنہ خزاں کی تبساہ کاری کا  
 گداسے ہم نے جہاں اشکِ غن ویاں اہل  
 عذارِ گل کی دہک سے جلا کے کانٹوں کو  
 مارا دیتے ہیں جس سے گل مراد وہ پھول  
 بلا کے قطرہ مشیم میں رنگ و نکست گل  
 جھڑے کوڑے چمن لکے یہ درس دیتے ہیں  
 چھتتی کلیوں کے جا دو ہرے ترنم کو  
 وہ عند لیب نے دل دوز راگنی چھیری  
 اب احتسابِ پندی سے سچی نامشکو  
 امچال دو گل و لالہ کو ماہ و انجم تک  
 چمن سے بلکہ جہاں سے بھی کر کے قطعِ نعل  
 شزارِ گل سے زمانے میں شعلے بھڑکا دو  
 زمیں زمیں نہ رہے اور فلک فلک نہ رہے  
 جنوں شوق کی بے اعتدالیوں کے خلاف  
 نشاط و مستی و رعنائی و علالت کو  
 خزاں رسیدہ انگوں کے پھیکے رنگوں میں  
 تصورِ راست ہیں، انکار میں رحمتِ ابد میں  
 فروغِ رنگ و ہجومِ ضیاء کی مہبتی میں  
 پرانی شمعیں بجھا دیں جہاں کے جھونکوں نے  
 گراں گزرتی ہے دل پر فوٹے سندِ سودہ  
 فضلے و شفت کو ویرانے کو بیاباں کو  
 لچک رہی ہے دفنِ ثمر سے شاخِ حیات  
 جنابِ اختر جہاں دادہ زرخ گل کو

نئے شکوے کھلاؤ، بہار کے دن ہیں  
 گلوں کی بھینٹ چڑھاؤ، بہار کے دن ہیں  
 بساطِ عیشِ شب ویاں، بہار کے دن ہیں  
 عیشی کے پھول گراؤ، بہار کے دن ہیں  
 مکی دلوں کی بجھاؤ، بہار کے دن ہیں  
 کہیں سے فونڈ کے لاؤ، بہار کے دن ہیں  
 کوئی شراب بناؤ، بہار کے دن ہیں  
 پھلکے جامِ سنڈھاؤ، بہار کے دن ہیں  
 بہشتِ خوش بناؤ، بہار کے دن ہیں  
 رباب تم بھی اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں  
 متاعِ ضبط لٹاؤ، بہار کے دن ہیں  
 زالی دھو میں مچاؤ، بہار کے دن ہیں  
 فلک کو سر پہ اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں  
 حسینِ فتنے جگاؤ، بہار کے دن ہیں  
 انوکھے حشر اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں  
 کوئی دلیل نہ لاؤ، بہار کے دن ہیں  
 دماغ و دل میں بجاؤ، بہار کے دن ہیں  
 دھبک کے رنگ ملاؤ، بہار کے دن ہیں  
 چمن کی روح بھلاؤ، بہار کے دن ہیں  
 دل و جگر کو تپاؤ، بہار کے دن ہیں  
 نئے چراغ جلاؤ، بہار کے دن ہیں  
 اچھوتے غمزے گاؤ، بہار کے دن ہیں  
 چمن فروغِ بساؤ، بہار کے دن ہیں  
 یہ بارش کے اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں  
 اہم وقت بناؤ، بہار کے دن ہیں



## فہرست آئندہ نرائن مکتبہ

بسنحال ساقی محفل اب اپنے پیانے  
 ہر انقلاب کی مٹرنی انیس کے افسانے  
 فصیل باغ سے یہ آندھیاں رکیں گی کہیں  
 خدائے ہر دو جہاں خوب ہے تری تعظیم  
 ابھی تمام نہیں داستان محفل شب  
 خیال یار! شبِ غم کی محفلوں کی قسم  
 گزر گئی جو ستاروں کے دل پہ آخر شب  
 انگ انگ سے افق پر ہیں چھوٹے چھوٹے خبار  
 یہ جبرِ زیست محبت پہ کب تلک آخر  
 یہ جن و عشق کی محفل بھی ہے عجب محفل  
 ہماری جا بھی کہیں ہے خدائے دیر و حرم  
 نہ پوچھ دوہرِ حقیقت کی سختیوں کو نہ پوچھ  
 کہ آگئے صعب زنداں میں آج دیوانے  
 حیات و ہر کا حاصل ہیں چند دیوانے  
 چمن کی سمت بڑھے آپسے ہیں ویرانے  
 زمیں پہ دیر و حرم اور فلک پہ میخانے  
 چراغ کشتہ کے باقی ہیں چند پروانے  
 ترے بغیر کبھی پرہوئے نہ پیمانے  
 شعاع خندہ زن آفتاب کیا جانے  
 یہ کارواں کو مرے کیا ہوا خدا جانے  
 کہ دل سلام کریں اور نظر نہ پہچانے  
 یہاں شراب کھسی کی کسی کے پیانے  
 حرم میں غیر ہیں اور بتکدے میں بیگانے  
 جس گئے لبِ افسانہ گو کو افسانے

کہوں تو کس سے کہوں میں حدیثِ دل مکتبہ

بیاورید گریں جا بود سخن دستانے



## فصل احمد کریم رضی اللہ عنہ

کچھ تو مجھے محبوب تر اعم بھی بہت ہے  
 انکوں سے بھی کھلتا ہے وہ دل جو ہے گرفتہ  
 ہم خود بھی نہیں چاہتے مینا دے بچپن  
 ہے رشتہ وز دیدہ نگاہی بھی عجب شے  
 ہاں نیم نگاہی سے یوں ہی کام لیے جا  
 اب طرف کی یہ بات ہے جو بھی جسے دل بجائے  
 دھلائے دل نازک پر بہت اس نے تم بھی  
 یہ طرفہ تماشا ہے کیا قستل میں مجھ کو  
 کچھ بانگ بل سکے بھی یہاں کان ہیں حاوی  
 کچھ تیری توجہ کی نظر کم بھی بہت ہے  
 کیوں کے لیے طرہ شبنم بھی بہت ہے  
 سازش نگہ دل کی منتظم بھی بہت ہے  
 قائم یہ ہوا پر بھی ہے محکم بھی بہت ہے  
 یہ تیری عنایت کی نظر کم بھی بہت ہے  
 دنیا میں خوشی بھی ہے بہت غم بھی بہت ہے  
 پھر لطف یہ ہے مجھ پر وہ برہم بھی بہت ہے  
 اور پھر مرے مرنے کا انھیں غم بھی بہت ہے  
 کچھ لے مرے شاعر کی مدح بھی بہت ہے

پڑتے ہیں ستمگر کے ذرا مار بھی اوچھے

اور فضلی بسل میں فدا دم بھی بہت ہے

## ○ میکش اکبر آبادی

وضع کا پاس کہاں تک کرتے ہم تو پھر دیوانے تھے  
 اُن سے بھی یاں بندہ نہ سکی جو مائل تھے فرزانے تھے  
 آپ یہ طے کرتے رہتے کچھ تھا کہ نہ تھا کچھ ہے کہ نہیں  
 کٹ ہی گئی اپنی تو ان میں خواب تھے یا افسانے تھے  
 ستانا سا محفل میں ہنگامہ سا برپا دل میں  
 کیا کہتے کیا چُپ رہتے کچھ جانے کچھ اُجھانے تھے  
 حسن کی فطرت ہر جانی اور دل کو ذوق رسوائی  
 مسجد میں تھے مے خانے اور کعبے میں بُت خانے تھے  
 موج صبا سے اُس نے چھیڑا بوئے گل سے یاد کیا  
 ہم بد قسمت پھر بھی نہ سمجھے کہنے کو فرزانے تھے  
 اگلی پھلی باتوں کا کیا ذکر ہے اب جانے دیجیے  
 آپ کے در پر آہی پرشے ہم تھے متک بیگانے تھے  
 مغروروں کو دیکھ کے ہم نے یہ سیکھا ہے اے میکش  
 جس سے طے اس طے جیسے جانے بچانے تھے



### عندلیب شادانی

کوئی ادا شناسِ محبت ہمیں بتائے  
کس کی مجالِ معنی کہ حجابِ نظر اٹھائے  
اک دل نشین نگاہ میں، اللہ یہ خاشع  
کچھ ہم سے بے خودی میں ہوئیں بے جابیاں  
آزردگی نہیں کہ یہ فطرت ہے حُسن کی  
ناداں سہی پر استنہ بھی ناداں نہیں ہیں ہم  
وہ جانِ آرزو کہ ہے سرمایہ نشاط  
کہتے تھے تم سے جھوٹ کے کیونکر میں گے ہم  
ماریسوں میں دل کا وہ عالم دم و دماغ  
تم تو ہمیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کیا ہوا

جو ہم کو بھول جائے، وہ کیوں ہم کو یاد آئے  
وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے  
نشر کی نوک جیسے کلجے میں ٹوٹ جائے  
چشمک زنی ستاروں نے کی بھول مسکرائے  
بس دل یہ چاہتا ہے کہ کوئی ہمیں منائے  
خود ہم نے جانِ جان کے کتنے فریب کھائے  
کیوں اُس کی یادِ غم کی گھٹابن کے دل پہ چھائے  
جیتے ہیں تم سے جھوٹ کے تقدیر جو دکھائے  
بجھتے ہوئے چراغ کی کو جیسے تھر تھرائے  
دیکھو کنول کے بھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

اک ناقامِ خواب، مکمل نہ ہو سکا  
اُسے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے



## عشری رامپوری

ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا  
جنوں کے ساتھ حقوڑی سی فضائے لامکاں بھی دے  
ہے مر جانا کلیدِ فتح، سمجھایا تھا رندوں نے  
زہے قسمت! اگر حضرت خود اپنا جائزہ بھی لیں  
اگر ہمدرد بنتے ہو، تو زنجیریں ذرا کھولو  
در پیرِ مغان چھوڑیں یہ ہم سے ہو نہیں سکتا  
جسے دیکھو وہ ہے سرمست مہبائے خود یکسر  
نہیں قلب و جگر میں غن کا قطرہ کوئی باقی

نہیں جب ہوش میں ہم جلوہ فرمانے سے کیا ہوگا  
مری وحشت کو اس دُنیا کے دیرانے کیا ہوگا  
مگر ناصح یہ کہتا ہے کہ مر جانے سے کیا ہوگا  
ہماری زندگی پر تیرا سانسے کیا ہوگا  
مری پابستگی پر یونہی غم کھانے سے کیا ہوگا  
کوئی واعظ سے کہہ دو تیرے بہکانے سے کیا ہوگا  
خداوند! یہاں اک تیرے دیوانے سے کیا ہوگا  
عزیز و! اب ہمارے ہوش میں آنے سے کیا ہوگا

دکھوں کو کھو نہیں سکتے اگر اہلِ خود ہمتِ شرعی  
تو خالی سیٹھ افلاک برمانے سے کیا ہوگا



### اشک راہپوری

اک دن وہ دل گئے تھے سہرہ بگڑ گئیں  
 پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر پھر کہیں  
 بگڑی کا ساتھ خوب دیا ہمدون نے آہ  
 دل سے بنا بنا کے ادھر کی ادھر کہیں  
 بیٹھے رہو گے دید کا وعدہ لیے ہوئے  
 بیمار غم نے آنکھ نہ کھولی اگر کہیں  
 سن راز داں یہ سب ترے کہنے کی بات ہے  
 گوش و زباں بھی رکھتے ہیں دیوار و در کہیں  
 اہل وطن کے دل میں نہیں گھر تو کیسا ہوا  
 عمر رواں گزرتی ہے دنیا میں مس کہیں  
 اندازِ محرابِ محبت تو دیکھئے !  
 میری نظر کہیں ہے تو اُن کی نظر کہیں  
 اُس نکتہ چیں کو عشق جتانے چلے تو اشک  
 اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

# پس منظر

اختر الایمان

کس کی یاد چمک اٹھی ہے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر  
یونہی چند پرانی قبریں کھود رہا ہوں چپکا بیٹھا  
کہیں کسی کا نام نہ پڑی، کہیں کسی کا روپ نہ چھایا  
کچھ کتبوں پر دھندلے دھندلے نام کدرے ہیں۔ میں جیون بھر  
ان کتبوں، ان قبروں ہی کو اپنے من کا بھید بنا کر  
مستقبل اور حال کو چھوڑے دھندلے سب میں بیٹھ کر  
ماضی کی کھنکھوٹ میں چپکا بیٹھا سوچ رہا ہوں  
کس کی یاد چمک اٹھی ہے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر؟

بیٹھا قبریں کھود رہا ہوں۔ سوکھی بن کر ایک اک مورت  
درد سا بن کر ایک اک سایا، جاگ رہے ہیں۔ دور کہیں سے  
آوازیں می کچھ آتی ہیں، گزرے غمے اک بار ہیں سے  
حیرت بن کر دیکھ رہی ہے ہر جانی پہچانی صورت  
گویا جھوٹ ہیں یہ آوازیں کوئی میل نہ تھا ان سب سے  
جن کا پیار کسی کے دل میں اپنے گھاؤ چھوڑ گیا ہے  
جن کا پیار کسی کے دل سے سارے رستے توڑ گیا ہے  
اور وہ پاگل ان رشتوں کو بیٹھا جوڑ رہا ہے کب سے

میری نس نس ٹوٹ رہی ہے بوجھ سے لیے ورثے۔ جس کو  
اپنی روح بھگ کر اب تک لیے لیے پھرتا ہوتا ہر سو  
نیکیں آج اڑی جاتی ہے اس مٹی کی سوندھی خوشبو  
جس میں آفتابوں نے تھے میں نے بیٹھا سوچ رہا ہوں جو ہر  
ان کتبوں کو ان قبروں میں دفن کر دیں اور آٹکھ بچا لوں  
اس منظر کی تاریکی سے جو رہ جائے وہ اپنا لوں



عدم

زبان پر آپ کا نام آ رہا تھا  
 غم ہستی کو آرام آ رہا تھا  
 خیانت کر کے موسیٰ کو ملا کیسا  
 ہماری رحمت پر پیغام آ رہا تھا  
 خدا کا شکریہ تیری زلف بکھری  
 بٹی گئی کا ہر سنگام آ رہا تھا  
 ستارے سو گئے اگلڑائی سے کر  
 کہ افسانے کا انجام آ رہا تھا  
 تڑپ کر میں نے قوبہ توڑ ڈالی  
 تری رحمت پہ الزام آ رہا تھا  
 عدم دل کھو کے آسودہ نہیں ہوسم  
 بُرا تھا یا صبا! کام آ رہا تھا!

# افسانہ آک شے

جگن ناتھ آزاد

اک رات کی بات کہہ رہا ہوں آزاد  
شعلوں کی ندی میں بہ رہا ہوں آزاد  
جس کو کبھی غصہ فطرت میں لانا سکوں  
دل پر وہ عذاب سہہ رہا ہوں آزاد

پہلا رخ

جب موج ہوا تھی موج سے وقت، بسو  
جس طرح شراب میں شہ پہول میں رو

یہی ہے وہ اک جوش تلاطم ہے ہے  
وہ رات کا خاموش ترنم ہے ہے

اڑتے ہوئے طغات ہیں کس کے بس میں  
دنیا ترسے دن رات ہیں کس کے بس میں

دہمار ہواؤں کے تھے منہ زور اسے دوست  
ہم تم تھے پسینے میں شرابور اسے دوست

تھا ہوش کی قید میں نہ میں ابد نہ تو  
وہ تیرے بدن کی بھینی بھینی خوشبو

ہر بات گلی کی طرح ہسکی ہسکی  
اسے دوست آخری نظر وہ ہسکی ہسکی

وہ رات کہ جب غلبہ بریں تھا پہلو  
وہ رات تصور میں بیسی ہے ایسے

چہرے پر وہ سیلاب بستم ہے ہے  
گاہوں میں مرے گونج رہا ہے اب تک

افسان کے حالات ہیں کس کے بس میں  
اک رات ملی تھی افسانہ قافور نہ

گروں پر گھٹا آبی تھی گھنگھور اسے دوست  
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں کہیں

کل شب کہ فضا تھی مست بے جام و سبو  
۱۲ اڑ کے عظیم روح تک جاتی تھی

وہ کامل دل فواز ہسکی ہسکی  
ہنگام سحر بھی دل میں ہے رقص گناں



## دوسرا رُخ

اُن جو سفر نہیں ہے جاگو جاگو  
 آنکھوں کو طو، نظر اٹھاؤ، کہ یہ رات  
 امکان ملاقات کے پھر کم ہوں گے  
 جب صبح آفت پر جلوہ مستدام ہوگی  
 اس سے پہلے کہ صبح سوٹے اسے دوست  
 اڑتے ہوئے لمحات کو یوں اپنا لیں  
 بزمِ طرب و نشاط برہم نہ کرو  
 اُسے صبح کی ترنگار کو فو، وک جلاؤ  
 ساعت ہے فراق کی پھر آنے والی  
 لمحے یہ گواں بہا میں اسے دوست کہ پھر  
 اب رات کے خاتمے کا ہے وقت قلیل  
 جی بھر کے اغیوں دیکھ، کہ کچھ جائے گی  
 ذوقِ نظر اک مقام پر رہ نہ سکے  
 اور نطق اگر بیان کرنا چاہے  
 یہ خنکی ماہتاب میں دل کی حبس  
 یہ نیند کے وقت گشتِ گمانوں میں  
 فردوس کا باب ہے یہ رات لے ساقی  
 اس رات کو لمحات کا بسکہ نہ سمجھ  
 فریاد کہ راست ہاتھ میں آکے گئی  
 ماحول کی تیسہ گی میں فسا حنائہ،  
 پھر وقتِ سحر قریں ہے جاگو جاگو  
 سونے کے لیے نہیں ہے جاگو جاگو  
 بکٹے ہوئے لمحات یہ برہم ہوں گے  
 کیا علم، کہاں تم اور کہاں ہم ہوں گے  
 بجلی کی طرح وہ ہم پر ٹوٹے اسے دوست  
 اک لمحہ بھی ماحول سے نہ چھوٹے لے دوست  
 یہ مغل انبساط برہم نہ کرو  
 خود بزم کے مری بساط برہم نہ کرو  
 ہے کوئی گھڑی میں رات جانے والی  
 ہے صبح آفت پر جسگ گانے والی،  
 ہونے کو ہے یہ سماں سحر میں تبدیل  
 اس بزمِ طرب کی خود بخود ہر تبدیلی  
 جلووں کا یہ طوفان کہ دل سہہ نہ سکے  
 اس وقت کی کیفیت کبھی کہ نہ سکے  
 سینے کی یہ خاموشی شب میں دھڑکن  
 میلے سے یہ اک مکاں میں غوثِ شب سے بدن  
 اڑتا ہوا خواب ہے یہ رات لے ساقی  
 پی لے کہ شراب ہے یہ رات لے ساقی  
 اک لطفِ عظیم ہم پر منہ رکھے گئی  
 فریاد کہ رات اور برسا کے گئی

اسے میرا کبھی ترا اشارہ نہ ملے  
میں رات کے طوفان میں بھٹکتا ہی رہوں  
اسے تو زبا کبھی ترا سہارا نہ ملے  
اسے صبح کبھی ترا کنسارا نہ ملے

### تیسرا رُخ

آخر سحر آکے دل کو تڑپا ہی گئی  
خود ریز جو دل میں بھٹیں مہنگیں آزاد  
یہ تیرگی آکے نور پر چھپا ہی گئی  
کالا کفن اُن کو آکے پہنا ہی گئی  
رات اپنا جمال کھو رہی ہے سو جاؤ  
قوتے ہوئے مجھ پر ذرا جسم کرو  
پھرہ شبنم سے دھو رہی ہے سو جاؤ  
اب صبح طلوع ہو رہی ہے سو جاؤ

جو نیند میں ہو نیند میں رہ جاتا ہے  
اک نور کا دریا کہ سحر سے پہلے  
بیدار سے رازِ زیست کہہ جاتا ہے  
ظلمات کی وادیوں میں بہ جاتا ہے  
انسان کے ہر نفس میں شامل ہو جائے  
یہ رات - یہ شام سے سحر تک کا سماں  
پھیلے جو تو زندگی کا حاصل ہو جائے

بچوں کی طرح نفس لہک جاتے ہیں  
شاخوں کی طرح بدن پک جاتے ہیں  
مل جاتے ہیں بھٹکے ہوئے دودل جو کہیں  
وہ رات کی ظلمت میں چمک جاتے ہیں

## ○ قتیل شفائی

غرد کے نام جنوں کا پیام لے کے چلے  
 ہم اپنے ساتھ ہی اپنا مقام لے کے چلے  
 سکوتِ شام کا مطلب کوئی سمجھ نہ سکا  
 بس اک ہمیں تری محفل میں جام لے کے چلے  
 بٹھا دئے ہیں کسی نے بہار پر پھرے  
 صبا چلے بھی تو اذنِ حسد رام لے کے چلے  
 خدا کے نام سے واقف ہر ایک راہ نہ ملتی  
 کبھی کبھی تو ہم اپنا بھی نام لے کے چلے  
 فریب کھا ہی گئے اہلِ جہنم و آسمان  
 چراغِ دھونڈنے آئے تھے شام لے کے چلے  
 بنامِ ساقی صحرا نظر ملے ہیں سراب  
 اب ایک دور ہمارا بھی نام لے کے چلے  
 قتیل جن سے پریشان ہیں طائرانِ حسم  
 وہ پھر سے وائے ہزن گم نام لے کے چلے



### ظہیر کاشمیری

جب کبھی تذکرہ شعلہ رخاں ہوتا ہے  
 دامنِ دل پہ سلکنے کا لگاں ہوتا ہے  
 ہم سمن پوشوں میں اس طرح رہے آشفقت  
 جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے  
 دل بیاباں میں اداؤ کی طرح جلتے ہیں  
 نیمہ زن قافلہ گشتہ سراں ہوتا ہے  
 اس کی ہر تابی سے ملتا ہے ستاروں کو گداز  
 عشق کہتے ہیں جسے نغمہ جاں ہوتا ہے  
 دل مرحومِ تمنا پہ دھمکتے ہوئے داغ  
 جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے  
 دعوتِ جلوہ شب تاب پہ سرور نہ ہو  
 یہ بھی اک وعدہِ ذریں کراں ہوتا ہے  
 حق کا عکس بھی تسکینِ دل و جاں ہے ظہیر  
 حق پر سایہ صاحبِ نظراں ہوتا ہے

# ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

مجید امجد

تنگ پگڈنڈی ————— سر کساد بل کھاتی ہوئی  
 نیچے، دونوں سمت، گہرے غار، منہ کھولے ہوئے  
 آگے ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ — اور اس جگہ  
 اک فرشتے کی طرح نوانی پر قولے ہوئے  
 مجھک پڑا ہے آگے رستے پر کوئی نخل بلند  
 تمام کر جس کو گزر جاتے ہیں، آسانی کے ساتھ  
 موڑ پر سے، ڈگمگاتے سروؤں کے قافلے  
 ایک بوسیدہ خمیدہ پیڈ کا کسزور ہاتھ  
 سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں،  
 آہ ان گردن مند ازان جہاں کی زندگی،  
 اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جھپٹیں حاصل نہیں



## عبد المجید حیرت

کسی کے دم سے راحت بھی ہوئی ہے      مگر برپا قیامت بھی ہوئی ہے  
 کوئی پوچھے کسی کا دل دکھا کر      کسی کو کچھ ندامت بھی ہوئی ہے  
 روا ان کی عنایت کی بدولت      کسی کی کوئی حاجت بھی ہوئی ہے  
 یہ ہے عقل سے ہم نے بہت کام      یہی ہم سے حماقت بھی ہوئی ہے  
 اگر تکلیف پہنچی ہے تو کیا غم      بہت ہم پر عنایت بھی ہوئی ہے  
 کسی کے سامنے مجبور ہو کر      بیاں غم کی حکایت بھی ہوئی ہے  
 علاجوں سے مریض خستہ جاں کی      بہت کچھ سلب طاقت بھی ہوئی ہے  
 جگر پر جب کوئی صدمہ پڑا ہے      دگرگوں دل کی حالت بھی ہوئی ہے  
 مشقت کا کبھی پھل بھی ملا ہے      کبھی محنت کا ثمر بھی ہوئی ہے  
 اٹھایا ہے تجھوں نے بار کلفت      میسران کو راحت بھی ہوئی ہے

کسی کا جو رجب حد سے بڑھا ہے  
 تو اُسے حیرتِ شکایت بھی ہوئی ہے

### شعری بھوپالی

غضب ہے مجھ کوئے دل کا یہ انجام ہو جائے  
 کہ منزلی دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے  
 ہر اک جذبہ ہر اک ذوق طلب نام کام ہو جائے  
 محبت ہی محبت کا اگر انجام ہو جائے  
 وہی نالہ وہی نغمہ بس اک تفریق لفظی ہے  
 فتن کوشتہ کرو دشمن نام ہو جائے  
 تصدق عصمت کو نین اُس مجذوب العنت پر  
 جو اُن کا غم چھپائے اور خود بدنام ہو جائے  
 یہ عالم ہو تو اُن کو بے حجابی کی ضرورت کیا  
 نقاب اٹھنے نہ پائے اور جلوہ عام ہو جائے  
 یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے  
 میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا نام ہو جائے  
 ابھی تو دل میں ہلکی سی خاش محسوس ہوتی ہے  
 بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے  
 جو میرا دل ہو شعری حریت اُن کی ٹنگا ہوں کا  
 تو دنیا بھر میں برپا انقلاب علم ہو جائے

# دولت کی خدائی

پر و فیسر شود

انکھڑیوں کی مستیاں دوشیزہ رخساروں کی آگ  
میری مٹتی ہیں سہے حنِ معصومہ کا سہاگ  
عفتوں کے خون سے شاداب میری وادیاں،  
رقصِ منسہر ہیں میرے سازوں پہ مریم زادیاں  
عصمتیں اکثر گھل جاتی ہیں میری آگ میں  
ایسی نہ بھیریں بھی گل جاتی ہیں میری آگ میں  
میر و سلطان و وزیر و بچکلاہ و شاہدار  
میرے فتراکوں کے آہو میرے تیروں کے شکا  
فر جاگیر و دراشت قصر و ایوان کا وفستار  
میری لٹوڑ کے خونت میری شرابوں کا خمار  
پتھر جم ادنگ پر ویزی، قیاسے بخت یار  
میری صبحوں کے دھندلے میرے رستوں کے غبار  
نخوتیں میری دراشت، عشرتیں میری بدست  
ساعز و میسنار کی جھیں عارض و گیسو کی رشت  
نمزمے میرے اُجائے، قہقہے میرے چراغ  
نخونِ آدم زاد سے دہکے ہوئے میرے امان  
یسم و زر میرے بنی، بعل و گھر میرے رسول  
میرا اعجازِ خلافت کھیتوں کا عرفِ طول



میریم حج و زیارت، زخم دیسار و درم  
 میرے ناموروں کے چھلنی سینہ مقرر و مجسم  
 میرے ناخن سے کلیناؤں کے سینوں پر خراش  
 مسجد و پیکل کی فوجانی جب سینوں پر خراش  
 راہب و صوفی مرے گم کردہ سنڈل لٹاہ گیر  
 میری عمر ایوں میں دل میرے ہی طاقتوں میں ضمیر!  
 جتہ و دستار کو میری غلامی کا شرف

ہر عزائے میں بے گور و گھنی میرے شہید  
 ہر حقیق آباد میں میرے تراشیدہ یزید  
 میرے بوجھلوں کی زد پر ہر تعمیر کا دستار  
 کھیلنے ہیں میرے زناری خداؤں کا شکار  
 جرم و جہل و کذب عصیاں میرے ہی نقشے میں چڑ  
 میرے کس بل پر زوالت کو شرافت کا غرور  
 مجھ سے نیلیں سرگراں مجھ سے بجابت کا چشم  
 مجھ سے چہرے متعبر مجھ سے ضمیروں کے مجسم  
 مفلسی سب سے بڑا میری شریعت میں گناہ

زہر میرا ہر تبسم طرز میری ہر نگاہ!!  
 خود فروشی میری فطرت پر وہ پوشی میسر اکام  
 مجھ سے چھپ جاتا ہے نسل و آدمیت کا جندام  
 میری راتیں میکے دلی میرے شبستان میرے خواب  
 چھین لوں میں جس سے چاہوں ہاتھ اب آفتاب  
 طاعت و تقدیر میں غرماؤں اور میری قسمت او  
 اپنے سر اپنی جہنیں میرے قدموں پر جھکاؤ  
 کوئی دوکان پر دیر و حسرت نہیں

یا خدا کھتا نہیں ہے یا صنم بکتے نہیں  
 یا خدا کھتا نہیں ہے یا صنم بکتے نہیں



### سیف الدین سیف

کیا منزلِ عنم سمٹ گئی ہے  
اک آہ میں راہ کٹ گئی ہے

پھر سامنے ہے پاڑ سی رات  
پھر شام سے نیند اُچٹ گئی ہے

پہلو میں یہ کیسا درد اٹھا ہے  
یہ کونسی راہ کٹ گئی ہے

آپ آئے نہیں تو موت کجخت  
آ آ کے پلٹ پلٹ گئی ہے

اٹھ اٹھ کے مریم غم نے پوچھا  
کیا ہجر کی رات کٹ گئی ہے

پھر سیمت ہوا نے یاد رفتہ  
ہر غم کی نقاب الٹ گئی ہے

## غلام ربانی تاباں

چمن میں کس نے کسی بے فوا کا ساتھ دیا      وہ بوئے گل بھی کہ جس نے صبا کا ساتھ دیا  
 دیا جو ساتھ تو پھر کس بلا کا ساتھ دیا      فلک سے غم نے ہر اک مدعا کا ساتھ دیا  
 فروغ باد نے رنگِ سیا کا ساتھ دیا      غرض اُسی بتِ کافرا کا ساتھ دیا  
 خیالِ یار ترا شکریہ رہِ منم میں      بس ایک تو نے دلِ مبتلا کا ساتھ دیا  
 نگاہِ شوق کے یہ حوصلے کوئی دیکھے      کہ ہر نظر اُردہ صبرِ آزا کا ساتھ دیا  
 میں کس طرح سے کروں کم نگاہیوں کا ٹکڑ      تری جفاؤں نے ذوقِ وفا کا ساتھ دیا  
 تجھے خبر بھی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن نے      کہاں کہاں تری آوازِ پا کا ساتھ دیا  
 دلِ خراب کی یہ سادہ لوحیاں تو بہ      جفا کے بعد بھی اہل وفا کا ساتھ دیا

اب اس سے آگے وہ مسجدِ میکہ تاباں

یہاں تلک تو کسی پار کا ساتھ دیا

# یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں

ابنِ نسا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں  
تم انشا جی کا نام نہ تو، کیا انشا جی سودا کی ہیں  
ہیں لاکھوں روگ نہانے میں کیوں عشق ہے دوا بیچارا  
ہیں اور بھی وہ جہنم و حشت کی انسان کو کھینچ دیکھا را  
ہاں بیکل بیکل رہتا ہے ہو بیت میں جس نے جی ہارا  
پر شام سے لے کر صبح تک یوں کون پھرے گا افلا  
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں  
تم انشا جی کا نام نہ تو، کیا انشا جی سودا کی ہیں

یہ بات عجیب سناتے ہو وہ دُنیا سے بے اس ہوئے  
اک نام سُنا اور غش کھایا، اک ذکر پہ آپ قلم نہ ہوئے  
وہ عقل میں اطلالوں سے وہ شعر میں تلسی داس ہوئے  
وہ تیس برس کو پہنچے ہیں وہ بی اے ایم اے پاس ہوئے  
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں  
تم انشا جی کا نام نہ تو، کیا انشا جی سودا کی ہیں

مگر عشق کیلئے تب کیا ہے جھوٹی شاد نہیں آباؤ نہیں  
 یہ بات تو تم بھی مانو گے وہ قیس نہیں منہ نہ نہیں  
 جو جان لئے کن تل نہ سکے یہ ایسی جی فست و نہیں  
 کیا بجر کا مار و حلقا ہے کیا وصل کے نسخہ یاد نہیں  
 یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں  
 تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سوداگی ہیں

وہ لڑکی بھی لڑکی ہے تم نام نہ لو ہم جان گئے  
 وہ جس کے لاسنے کیسو ہیں لپہاں گئے لپہاں گئے  
 ہاں ساتھ سارے انشا جی اس گھر میں رکھے ہمارے  
 پر اس سے تو کچھ بات نہ کی، انجان رہے انجان گئے  
 یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں  
 تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سوداگی ہیں

جو عورت کہو ہم کرتے ہیں کیا انشا کو سمجھانا ہے؟  
 اس لڑکی سے بھی کہیں گئے، گو اب کچھ اور زمانا ہے  
 یا چھوٹے یا تکمیل کرے یہ عشق ہے یا افسانا ہے؟  
 یہ کیا کچھ رکھ دھندا ہے، یہ کیسا تانا بانا ہے  
 یہ باتیں کیسی باتیں ہیں جو لوگوں نے پھیلائی ہیں  
 تم انشا جی کا نام نہ لو، کیا انشا جی سوداگی ہیں

## ○ آوا جھڑی بدایونی

کن نگاہ کی بے لگتی تو کیا ہوگا  
 فریب ہوش فریب حیات سے بچ کر  
 یہی نگاہ کہ آوارہ ہے خلاؤں میں  
 گلوں کے رنگ میں خون جگر کا رنگ سی  
 اندھیری رات کو چھوٹے قدم ہی سی  
 یہی حیات کہ ہے واقعہ رموز حیات  
 لگاں بھی کر نہ سکے تھے سحر کے متوالے  
 تری نگاہ سے روشن ہیں داغ دل کے کنول  
 خلوص شوق پہ آنچ آگئی تو کیا ہوگا  
 فریب اہل وفا کھا گئی تو کیا ہوگا  
 جب آفتاب سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا  
 بھری بہار بھی کترا گئی تو کیا ہوگا  
 حیات نوکی سحر آگئی تو کیا ہوگا  
 جنوں کا راز کبھی پا گئی تو کیا ہوگا  
 سحر فریب ضیا کھا گئی تو کیا ہوگا  
 تری نگاہ بھی ترا گئی تو کیا ہوگا

شعور غم بھی فینمت ہے زندگی میں آقا  
 غموں کی دھوپ بھی کجلا گئی تو کیا ہوگا

## شاد عارفی

کھری باتیں یہ اندازِ سخن کہدوں تو کیا ہوگا  
 ٹہبان وطن کو راہ زن کہدوں تو کیا ہوگا  
 طریقی کے لیتے لے گئی تاحسہ عربانی  
 اندھیرے کو اندھیرا ہی کہیں گے دیکھنے والے  
 جو مستقبل کے رخ پر روشنی ڈالوں تو کیا دوگے  
 غلط باتوں پہ دنیا کب توجہ صرف کرتی ہے  
 کہیں فطرت بدل سکتی ہے ناموں کے بدلنے سے  
 عروسیم و زرسہ ہے مستلائے نازِ خود بینی  
 قد و گیسو کو تم ششاد و سنبل کہہ کے کیا لوگے  
 ستارے توڑتی ہے جبکہ ذروں کی توانائی  
 حد و سٹے جان و تن کو جان من کہدوں تو کیا ہوگا  
 کسی بھی بد چلن کو بد چلن کہدوں تو کیا ہوگا  
 جو میں اُن عصمتوں کو سیم تن کہدوں تو کیا ہوگا  
 سواو شام کو صبح وطن کہہ دوں تو کیا ہوگا  
 چین کی تاک میں بقی چین کہدوں تو کیا ہوگا  
 بہتوں کو بے زبان و بے دہن کہدوں تو کیا ہوگا  
 جناب شیخ کو میں برہن کہدوں تو کیا ہوگا  
 وہ خود بینی جسے دیوانہ پن کہدوں تو کیا ہوگا  
 قد و گیسو کو میں دار و رس کہدوں تو کیا ہوگا  
 ستاروں کو تھاری انجمن کہدوں تو کیا ہوگا

بتوں نے بے سبب اے شاد جب لٹوا دیا مجھ کو

جو ان کی شان میں کوئی بھجن کہدوں تو کیا ہوگا

# میراث

یوسف ظفر

دی شیخ با چراغ ہی گشت گر دشر  
کز دم و دو ملو لم و انس اتم از زو ستر (رومی)

ابن آدم! — ابن آدم! — یہ تری میراث ہے

ایک جہرا — یہ درستی کے سے دانت

ایک دل — آتش فشاں

آنکھیں — بلائے ناگہاں

عافیت دشمن — چراغ خانہ سوز

ابن آدم! — تیرے ہاتھوں میں تمام اختیار

اور پیچھے اپنے مرکب کے لہو سے ترتر

(۱)

شفق اپنی بانگی سیلی سے ملنے چلی

چمکتی جیہیں پرستاروں کی دھول

لبوں پر بستم کے نوخیز پھول

دوپٹے پہ زکار نغموں کا جال

نظر میں کوئی شاعرانہ خیال

کھلے رنگ آپس میں نیلے سے پیدا، حسانی سے لال

کہیں سبز سے لاجوردی ملا، پھول کھلنے لگے

ہواؤں کے باغات، ہلنے لگے

دھڑکنے لگے ابر پاروں کے دل

شفق شام سے جا ملی

شام سے  
اپنی بانگی، سجیلی، روشن سی سیلی سے جمل جا ملی  
جیسے اُس گئے لئے ان پہاڑوں میں چھپ کر گڑا تھا دن  
جا ملی — ساتھ لے کر خدا جانے کن او یوں میں مست کی تائیں  
اڑانے لگی  
کیا سنانے لگی! — راست چپ چاپ چھانے لگی

(۲)

دیر کے شب زندگی کے کھلے ماہ و نجم نے دیکھا، بستم کی

گزر گاہ رستی پر منزل کے مارے چلے پا بجواں

پہاڑوں کی ہیبت، فضاؤں کی وسعت سے ترسنا

فحاشت ہواؤں کے تیروں سے لڑاں —

زمینوں کے سینوں میں نفرت کا لاوا

زمینوں کے ناسوروں میں مارے پچاں

کہیں پھوؤں کے شبتاں

یہ کوہ و بیا باں کہ جن میں درندوں کے پتھر چل سکیں ہیں گودہ خون آنا

یہاں قوتِ نامہ سے پتے ہیں شمارِ مٹیاں

وہ چودے کہ پتوں پر ہے جن کے مرکب خراں

کہ پھولوں پر ہے جن کے مرکب خراں



(۴)

انہوں کی تافوں سے بیٹوں کے غم و مل گئے  
مساجد کے در کھل گئے  
جھکے ہوئے مسجود کے سامنے زندگی کے امیں  
ہر دنیا دیں

لبوں پر دعا ہے۔ الہی گناہوں کو تو بخش دے  
لوٹ لگا ہوں کو تو بخش دے  
عطا کر رہ راست جو تو نے دی  
عبادت گزاروں کو۔ توفیق دے  
کہیں جائیں ہم بیک بندے تیرے  
ہمیں کام کرنے کی توفیق دے  
الہی میں عاجز گنہگار ہوں  
مگر میں خدا ہی نمک حار ہوں۔

یہ الفاظ اخالی — نہیں جن میں سوز

یہ الفاظ رشتے ہوئے روز روز

زماں ایک عادت سے مجبور ہے۔ یہ عبادت نہیں

دعا میں لبوں پر۔ مگر دل میں طوفانِ اُمید و بیم

لگا ہوں میں تصورِ مالِ قیمہ

خیالوں میں بیوہ کا رنگیں شباب

تصور میں رشوت کی دولت کے خواب

زباں پر دعا — اور خواہش یہی

کہ حاصل ہوا جیس کی زرگری

نوحِ عجز پر پارسائی کا نور

مگر دل تنور

لیکتے ہوئے جس کے شعلوں کے سانپ

مگر ابنِ آدم! — نہیں منہ نہ دھانپ

ہواؤں کی پاکیزگی میں محنت کے موسمِ اخلاقی پریشان و یکساں  
ہواؤں کے عالمی میں کاف کی ہوائیں  
زمینوں کے بیٹوں کے پروردہ قاتل زمینوں کے اوپر  
زمینوں کے بیٹوں میں بھونکوں کے دہستے ہیں خونی عناصر  
یہی وہ فضا ہے جہاں پرورش تو نے پائی۔

یہ کہو رہے تیری انسانیت کا

ہیں سہلے تھے جو بلا ہے یہی تیرا سولہ یہی تیرا مسکن،  
یہی تیرا وطن،

یہی تیری میراث ہے ابنِ آدم! یہی تیری میراث ہے۔ ابنِ آدم!

(۳)

پناہوں کی عظمت میں فوجیہ کیوں کا جو بن لگا

درستی چلی

سسکتی رہی سرد و کھن ہوا

روزِ رات ہر تار سے کا مصوم نسا دیا

درستی چلی —

بھجھوڑا ہونے گرا ذیلِ پیروں کو — جاگو! اٹھو

مرے صاحبو!

سین و نشیں چاند تاروں کی کرون کا خون ہو گیا

داناں کچ میں دیکھ لو! — صاحبو! — صاحبو!!

مردِ پرواز

گرا تے رہے اپنے تپوں کی شمشیر، سایوں کے خار

قدم دو قدم جل کے خمد دیکھنے کی مسکت کس میں تھی

درستی چلی —

ستاروں کے سایوں میں فوجیہ کیوں کا جو بن لگا

درستی چلی — ابنِ آدم! یہی تیری میراث ہے دیکھ لے

درستی چلی

یہ تیری میراث ہے دیکھ لے  
مہانتی چلے

(۵)

سحر آگئی

دیکھتے ہوئے کندی رنگ پر  
حنائی نعرہ ساز ہاتھوں میں بگروں کی سیس کھنک  
نگاہوں میں خوابوں کے گیتوں کا رس  
ادافل میں دل کی لڑائی امنگس  
مسلل معطر حسیں شمیم کیسوں میں گلابی سے پھل  
سحر آگئی —

پرندوں کے نعروں نے آواز دی  
چمکنے لگی زندگی —

پرندے — یہ نعروں کے پرنے اڑے  
اڑے اور صباحت کو بھی لے اڑے  
دھوپ ہے دھوپ ہی دھوپ ہے دیکھ لے  
درانتی چلے —

(۶)

یہ چرواہا، گلے لگائے بھینسوں کا انسایت بہت دور  
پھر بھی سہو رہے  
لو کہیں سے محروم ہے اس کی دنیا، یہی سہو زار ادیبی گاؤں میں  
یہی اس کے غمیش

نہ اس کو مقام بشر کی خبر ہے نہ درد بشر  
اسے کیا خبر یہ بھی اک جزو اعظم ہے تعمیر کل کا  
ورق ہے یہ شیرازہ سخن گل کا  
اسے کیا خبر کیا ہے یہ کائنات جہاں و جلال  
وہ تصویر بامضیٰ — یہ تنظیم حال —

اسے کیا خبر کیا ہے تقدیر معلول و رازہ عل  
اسے آج ہے آج اور کل ہے کل

یہ راہی ہے منزل وہی ہے فنا — اس کا ہونا ہے کیا  
چارہ گاؤں میں

لگے — اس کی ہنسی کی آوازہ تان  
ہوا میں سندیے لٹاتی ہے خواب سکون کے  
فضائیں پری ہی کے صوت طرب کی بے جا رہی ہے  
یہ ہنسی کی آواز — جیسے سنہری روپلی جبین تلیوں کی قطار  
جو نا دیدہ، انجانی دنیا کی جانب چلی جا رہی ہے  
یہی ماضی ترنم ہے اس کی دلیل حیات  
یہی ہے یہی اس کی کل کائنات

نہیں تو یہ چرواہا خود اپنی بھینسوں سے بہتر نہیں ہے  
وہی بے شعوری، وہی کم نگاہی  
نہ جاوہ نہ منزل نہ احساں جاوہ، نہ احساں منزل  
جئے جا رہا ہے —

درد ہے درد پر وہ آدمیت لگے اس کو اس کی خبر کچھ نہیں  
یہ نادان حیوان معصوم و مظلوم بے ذوق بہتی ہے مجبور بہستی  
سحرے شیر دل سادہ صورت گڈ ریلے تجھے کچھ خبر ہے  
تری ہنسی کی لڑائی ہوئی تان کیوں لٹتی ہے فضاؤں کے دل کو  
ہواؤں کے دل کو  
بتاؤں تجھے! — پر تجھے کیا بتاؤں — بچے ہنسی وقت کتنا ہے  
یہی تیری میراث ہے ان آدم — یہی تیری میراث ہے، دیکھ لے  
بچے ہنسی یا درانتی چلے —

(۷)

سکون نام فطرت بڑی بھولی بھالی، بڑی سادہ سادہ  
ہزار اس کے عشوے میں غمزنے ہزار

جاں اس کا پھول ہے تاکہ خار  
رگ و پھوس ہے اس کے بق پیاں  
کہ جیسے پوریک رواں پھر ازل وداں  
گر اس کے چہرے پر نقش مجسم سر و وسکوں  
یہ مصومیت ایک پیغمبرانہ فجعت کی وجوہ  
سرت کا، انسانیت کا، سکوں آفونی کو ایک نبوت۔

یہ ہے، یہ مصومیت کے شکستے، یہ منظوم خواب  
مستانِ فطرت کی پیکیں و نایاب و تازہ مہراب  
یہ آوازاں کی تاروں کی جھل سے ملتی ہوئی  
یہ عارض مجسم بہار چمن  
یہ باتیں — یہ نعشوں کے پھولوں کے بار  
یہ آنکھیں۔ یہ گیتوں کی خاموش جھیلیں شفق در کنار۔  
اسی جن محسوس کے ساز میں گونیں لے رہے ہیں جالستے راک  
اسی سینہ پاک میں جاگنے کو ہے وہ زرخ کی آگ  
ایک دستبازک کی شاخ ہاریں سے پھوٹیں گے خار  
جستہ اس تھکے گل سے پیٹے ہوئے ہیں تباہی کے خونخوار  
یہی تھکے کو سینہ سینہ ملا ہے یہی تیری میراث ہے۔  
ابن آدم!

(۸)  
شب تار میں ٹھونڈتی ہیں نگاہیں کہیں جا رہے ہیں جھپٹانے والے  
تجسس کی آنکھوں میں غیب کا سر ہے لیکن یقین بشارت  
نہیں ہے  
تجسس کے ہاتھوں میں ہے غصے کا عصا، لیکن اس کا  
سہارا یقینی نہیں ہے  
تجسس شب تیرہ و تار میں وقت کی ٹھوکریں ملنے کے بھی نادر ہے  
ہوس جھونکتی ہے۔ مگر اس کا چہرہ ہے انسان کا چہرہ  
ہوس کا لٹی ہے۔ مگر اس کا جڑ ہے انسان کا جڑ  
بے وقوف شہزادوں کی عمارتوں کی چٹکھار انسان کی آواز سے چھوٹی ہے  
شب تار میں پایا۔ پایا کی صداؤں سے ارض ہلکا پڑتی ہے  
گر کیا ملے ہے۔ فقط راز یک ذرہ کائنات  
کہ جس سے فنا کا ظلم دوا می ہوا پختہ تر۔  
شب تار میں آدمی کو ابھی تک وہی قلب تارہ نظر آ رہا ہے  
کہ جس سے جدا باختر سے ہے خاد۔  
کہ جس سے سفید اور سیر کی ہے صورت نمایاں  
کہاں ہے وہ تہذیب مذہب کہ جس کی حقیقت پر ہیں  
علم و ادراک نازاں  
کہاں ہے۔ کہاں ہے۔ وہ انسان! — وہ انسان!!



## انجسم رومانی

دن ہو کہ رات ، کچھ قفس ہو کہ صحن باغ  
آلام روزگار سے حاصل نہیں سداغ

رجبت کہے کہ بچے معیش و طرب کا نام  
فرصت کہاں کہ کیجئے صہبائے پڑیاغ

ویرانہ حیات میں آسودہ غلہ سدی  
کس کو ملا اس آہوئے رم خوردہ کا سرف

آثار کوٹھے دوست ہیں اور پاشکشی  
خوشبوئے زلف یار ہے اور ہم سے بے داغ

کس کی جبین پہ ہیں یہ ستارے عرق عرق  
کس کے لہو سے چاند کا دھن ہے داغ داغ

کہتے ہیں کسب فور اسی تیرگی سے ہم  
انجم ہیں دل کے داغ گہرائے شب چراغ

# یہ بھول ستیوم نظم

ہر طرف بکھرے ہوئے تارے، یہ بھول  
تیرگی کے بل پر رقصاں جگمگاتے قہقہے  
حسن کی رحنائیوں میں گم خوشی کے چہچہے  
ماہ سے بڑھ کر یہ مہ پارے، یہ بھول  
ان میں لہراتی سوئی خوشبو کی شیرینی بھی ہے  
آرزو کی سادگی گلشن کی رنگینی بھی ہے

دور افق تک پھیلے نظارے، یہ بھول  
اس بلندی پر مگر اتنے قریب آئے ہوئے  
آسماں کی رفعتوں کو خاک پر ملائے ہوئے

بھلائی رات کے پیارے، یہ بھول  
ان کی جلتی محفلوں میں اک عجب بے چارگی  
خود قریب آشفگی بے ہمتیاری آوارگی

سرگراں، سلسلے، تھکے مارے، یہ بھول  
جانے کیا کیا روپ و چارے مسکراتی شام نے  
سیم و زر کی دلکشی نے نکستِ آیام نے

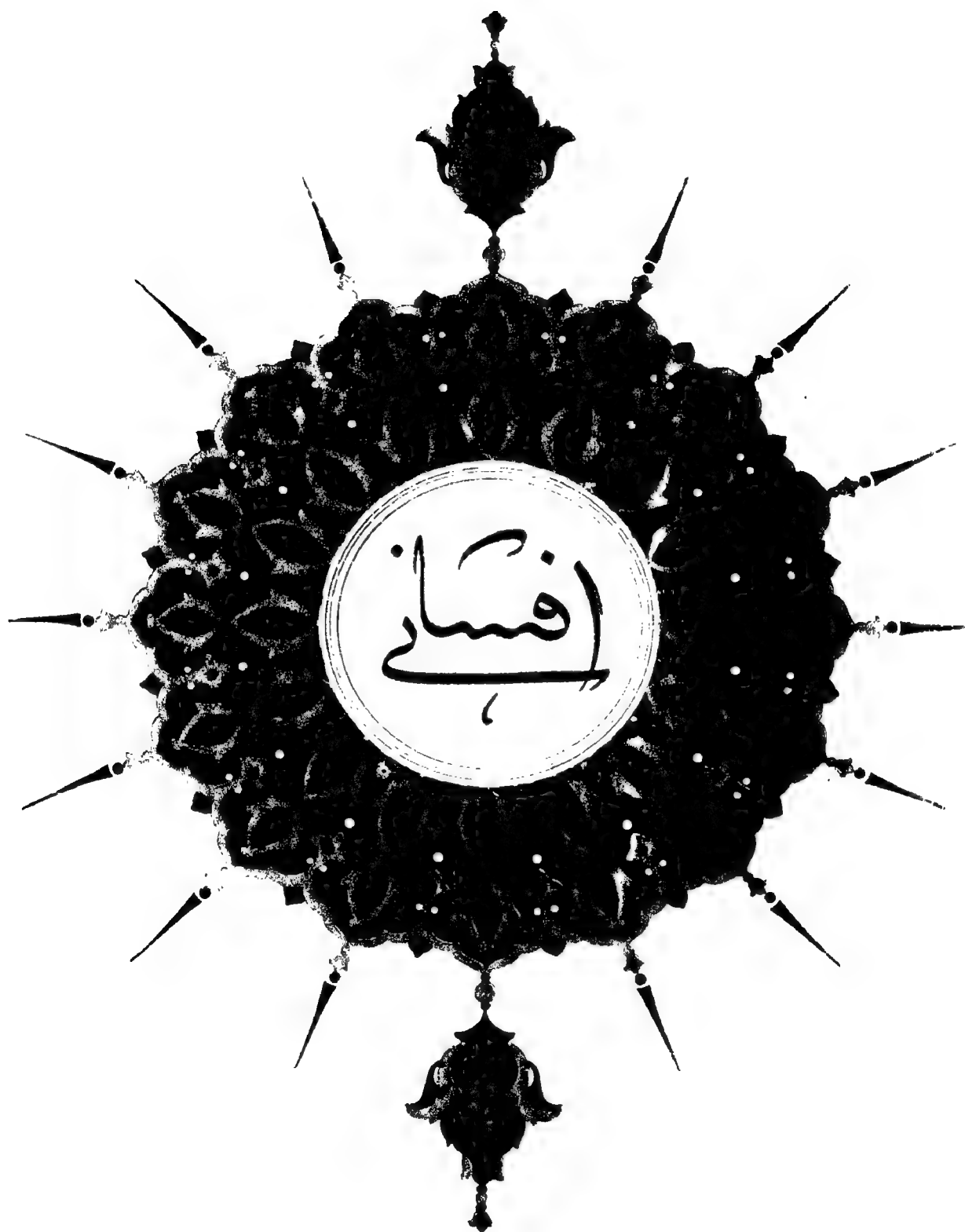
دم بخود ہیں ورد کے مارے، یہ بھول  
ان کی دنیا میں دلی آویزی کی دولت کہاں  
منظرِ عالم پہ پھر سننے کی جرات اب کہاں

اب کہاں یہ بچتے انگارے، یہ بھول  
زندگی کی ماہ سے کٹ کر غم و اندوہ  
دن کے ویرانے میں کھو جانے کو ہیں نئے دیے

## ○ ناصر کاظمی

وا ہوا پھر درمیں اٹھ نکل	پھر صبا لاتی ہے میانہ نکل
نمزمہ ریز ہوئے اہل چین	پھر چراغاں ہوا کاشانہ نکل
رقص کرتی ہوتی شبنم کی پری	لے کے پھرتی ہے نذرانہ نکل
پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے	میرا دیوانہ ہے دیوانہ نکل
پھر کسی گل کا اشارہ پا کر	چاند بکلا سر میں اٹھ نکل
پھر سرشام کوئی شعلہ نوا	سو گیا پھیر کے افسانہ نکل
آج غربت میں بہت یاد آیا	اے وطن تیرا صنم خانہ نکل
آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں	ہم سے متی رونق کاشانہ نکل
ہم پر گزرے ہیں ان کے صدمے	ہم سے پوچھے کوئی افسانہ نکل

ہم ہی گمشدہ ہیں میں ناصر  
ہم سے کوئی نہیں بیگانہ نکل







# دور کا نشانہ

پہلو حری محمد علی ردو لوی

لاؤ نہیں دھرتی نے لڑا انت کے لئے اور وہ بھی کشور میں جو نہیں ہیں اور انہی ذات نہیں سمجھ جاتی ہے۔ مگر اپنے انداز شرافت  
 یہیں بقیل، ٹوڈیل، بھارگر، سب کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ گھر کے اندر چھڑ کر بول جاتا کرتے تھے ہوں مگر باہر آزاد خیال۔  
 وہ نہ تھوڑے تھے۔ آج کل کی آزادہ روی نہیں کہ باتیں کرنے میں بد تمیزی قلم خود داری سمجھا جائے۔ اور کلم کلم ہر چیز کھانا پینا  
 روشنی کی پہچان ٹھہرے۔ جتنی خیالی سے حسن پرست بھی واقع ہوئے تھے۔ اس لئے گھٹور کے چوک اور شہر کے بھی حصے سے جہاں  
 گھر کے فلم لہو انو امین رہتے ہیں نہ یادہ واقع تھے۔ کچھ پیڑی مشہور تھے، گھر میں سماجی، عدالت و لوانی سے حسد پیری جتنی  
 رادی سب ہی کچھ تھا مگر صحبت کے لہیا یقیناً ایسے تھے کہ باوجود مصروفیت کے ان جلسوں کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔  
 بھر کی خبر رکھتے تھے۔ جہاں کہیں جلسہ ہوا یا پرائیویٹ مجرا ہوا وہاں پہنچ ہی جاتے تھے اور رکھ رکھا ایسا تھا کہ ان جلسوں  
 اشیائیں ہو کر نہیں بٹھتے تھے بلکہ مندر کا کونہ و باکر بیٹھنے والوں میں شمار ہوتا تھا۔ جہاں کہیں ادب و فن کا سوال  
 بتا تھا وہاں ان کی رائے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی۔ اور ایسے اہم معاملات میں جو خوش قسمت ان کا مشورہ حاصل کر سکتا وہ  
 ہو جاتا تھا کہ صورت، وزن، بدن اور فن کے لحاظ سے اب کوئی گھر نہیں رہ گئی۔ آدمی منکسر مزاج اور خدمت کرنے کا جذبہ  
 تھے، مگر جہاں سے ولی کے معاملات شروع ہونے لگے وہاں سے ان کی خود داری ان کو اعزازت نہیں دیتی تھی کہ کسی  
 بے کے معاملات سے واسطہ رکھیں۔ بجز بے نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جتنا بڑا دوست ہو یا کتنا ہی دوست و قند و ملاقاتی ہو،  
 پرائیویٹ معاملات میں یہ کسی کی مدد کریں گے تو ذلیل ہو جائیں گے۔ میرے پڑھنے والے لکھتے ہیں گے کہ لکھنے والا شبہا  
 نہ معلوم کہاں کی وقیاری جہاں غلام قبول اور بدتمیز ہیں کہ پیش کر رہا ہے اور یہ بھی خیال نہیں کرتا کہ نوجوان لوگ پٹھان  
 ہو جائیں گے۔ چوک اور چوک بازا میں کاؤز کا فوٹا نمودار ہو جاتا چاہیے۔ میں عرض کروں گا کہ کہیں ایسا کیجئے گا بھی نہیں،  
 نہ معلوم کتنے ریٹرو ان، کتنے مٹرل، کتنے کافی باؤسیر، بلکہ انیس پرنٹل چلے جائیں گے اور نوجوانوں کو جو سبق فطرت  
 ملی ہے وہ تو بھولنے سے ہے لیکن زیب انسا کی طرح چلا نہیں سکتا کہ ہے

پاک زئی من باعث گناہ من است

جس فلسفہ کی میں باتیں کرتا ہوں اس وقت عید اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر انصاف سے نہیں برتی جاتیں تھیں

بچے، بوڑھے، جوان سب باضابطہ شریک ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہر ایک نے اپنی قدر و قیمت کو بتا دیا تھا۔ کوئی خالی ہاتھ نہ رہا تھا۔ کوئی کہہ دیتا تھا۔ کوئی کہہ دیتا تھا۔ کوئی خالی دوا نہ کرنا اپنا منصب سمجھتا تھا، کوئی موسیقی کے نکات بیان نہ کر دیتا تھا اور بزرگ عقل خالی شگفتہ مزاجی چہرے سے سنا ہر کرتا تھا اور ان ہی مواقع پر بعض فوجیوں کی نگاہوں کا جائزہ لیتے ہوئے زبانِ حال سے کہتا تھا

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسان عقل

لیکن کبھی کبھی استغناء بھی چھوڑ دے

لالہ فیضی دھر کے لیے وگ آرٹسٹ سے تہذیب کے ساتھ باتیں کر کے اس کا دل بھی بڑھاتے تھے۔

یہ بچے صاحب، سارا رنگ پر لہرا شروع ہوا۔ بینا بچ کی تصویریں کرتے جاتے ہیں کہ سری کرشن کی لہلا ہے۔ سری کرشن جی بھی جو گیند کھیل رہے تھے گیند سمندر میں جا گرا۔ ناگ دوپٹے منہ میں لے لیا۔ سری کرشن جی نے اس کو بھانسنے لیا ہے۔ سمندر میں جا کر اس کے منہ سے گیند نکل رہی ہے۔ ناچنے والی نے بایں ہاتھ کا ندھے کی سیدھ پر پرالانا کیا۔ دوسرا ہاتھ بھی کا ندھے کی سیدھ پر رہا۔ مگر کہیں سے غم ہو کر غم بیٹھ کے سامنے آ گیا۔ بایں ہاتھ کے پنجے نے سانپ کا پھنساں ثابت کیا ہے۔ واہنے ہاتھ کی انگلیوں نے ٹھکیوں دے کر یہ ظاہر کیا کہ جب سانپ پھنس گیا تو سری کرشن جی نے یوں ٹھکیاں تباہیں۔ ناچنے والی میٹھن دیر میں چال سے تیار ہی ہے کہ سانپ کی گنڈیوں پر چڑھ کر سری کرشن جی کی گیند سمندر سے لائے تھے۔ ہاتھ کا پنجا مانگنے کے سامنے آ گیا۔ کلائی ماتھے سے چھو گئی۔ انگلیاں اوپر کواٹھی رہیں۔ تنہا عقل کی طرف رہی۔ پر کرشن جی کا محنت ہو گیا۔

اب ہمارا دلچسپ کا ناچ شروع ہوا۔ تیزی سے گھوم گھوم کر چاروں ہاتھوں سے دنیا بنارہے ہیں۔ لالہ فیضی دھر اس طرح ارتھ تلاتے ہیں کہ ہر ترشے، ہر پٹے کے معنی آئینہ ہونے جاتے تھے۔ اسے لیجئے، پارہتی کے ناز و انداز شروع ہوتے۔ ہر پہلے اپنے کو بچاتی ہیں۔

وہ کیسا کہہ کہ محبت کا مقصد ہی ہے یہی

وگرنہ فائدہ اس کو مرے ستانے سے

سے کی نزاکتوں، پرن کی مشکل جگہوں کی وادائیں دیتے چلے جاتے ہیں کہ منہ والوں کا حلف دوگنا ہوتا جانتے۔ یہی صاحب، اس کے بعد بھادو شروع ہوئے، وہ جانی ناخوں، ہر ٹھکی کی سرخی اور آنکھوں کے لال ٹھکروں کی طرف اشارہ کرتی ہے یہ مجبور کے خونیں دل کا پتہ دیتے ہیں کہ خوشی کی خبریں بھی یوں راج میں لوہے کے آنسو لاتی ہیں۔

اپنی بستی میں کاسے کھوں

قرے کارن جو دکھ پاوا

کے معنی اب آئینہ ہو گئے۔ اس نے انگوٹھے کی آرسی دیگی، زرو ڈوٹے کا پٹل ہاتھ پر لیا۔ کہ رنگ ایسا ہو گیا ہے۔ کلائی سے نیچے کو ادھر ادھر آٹے پٹے دے کر رات کو ٹھپیں جڑھتے کٹی ہے۔ پچھتاوے کے انداز سے واہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر چمکتی جہانی۔ اس ہاتھ کی ہتھیلی کٹی کے نیچے رکھ کر خیال زانو قائم کیا۔ انہوں نے انترے کے معنی ہو پیدا کر دیے کہ کہہ پیا قری کتا دھلا، تاپی مرہا کیا ہووے آگے آوا۔ یوں ثابت کرتے ہیں خیال کو ادھر کھا بنانے کے لئے مرقق کا شعر بھی پڑھ دیا۔

دل آغاؤ تو نظر آداس کہدہ ہر اس قصدا  
یہ شک سب یہ چیم تر، یہ کیا نصیب بیکمال!

یہ قصہ قلم نہیں دھڑکا ہوا۔ اسی طرح جسے چھوٹے صدور نشین، سانس بے نشین، صفتِ تعالیٰ واسلے سبب لی کر چڑھا  
سیاڑ نصیب کرتے ہیں، یہ نہیں کہ ہر موقعِ دولتِ پردہ دری سے اور بے پروائیِ خلوت و جلوت کا فرق ملنا دے یہ تو باضابطہ صفتیں  
کمال ہوا۔ اب تو وہی دھڑکی پرائیویٹ تفریحوں کا حال سنئے، دن کوڑا چوکر زمرہ تقدیر میں پہنچ رہے تھے۔ شام کو جب سیر  
کے لئے نکلتے تھے تو انہیں میں کہہ لے کاہرا انگلی میں اضافہ ہوتا تھا۔ گلے میں سونے کی دو ٹوٹی موٹی لٹریں ہوتی تھیں۔ عطر کے معاملہ  
میں وہی محسوس کا قہقہہ طرہ کرتے تھے جس کی خوشبو سے نافک مزاجوں کو بھیٹکیں آنے لگتی تھیں۔ اتنی تیزواری ضرورتی  
نہیں کا عطر صرف گرمیوں ہی میں لگاتے تھے۔ مگر اس کے آگے نفاست کا لحاظ کم رہ جاتا تھا۔ مثلاً کیوڑے کا عطر جو صرف آبدار  
خانہ اور بھٹائی خانہ میں کام آتا ہے سر کے نیل میں ڈال بیٹھتے تھے۔ زمانہ و اندہ عطر میں فرق نہیں کرتے تھے۔ چھوڑوں کے  
بچے عطر جیسے چلیں جاڑوں میں ہی لگا لیتے تھے۔ جاڑوں کے عطریات مصالحہ واملے جیسے حاشا مذا البغیر گرمیوں میں استعمال کر جاتے  
تھے۔ عمر جوانی کی نزاکتوں کا غیر کون کر کہ جنہیں مختلف عطر میں کا خیال ہو اور پھر بھی تیز نہ ہو سکے کہ بھینی بھینی ہلکی ہلکی خوشبو جنت  
سے آئی یا اسی دنیا میں پیدا ہوئی۔ جب بے فصل کی پھٹیں آتی تھیں تو قہیں مزاج کہہ اٹھتے تھے کہ ”وئے پوری می آیدہ ہاجان  
آدی تھے اس لئے دل کے معاملات میں بھی حدود کے باہر پاؤں نہیں پڑتا تھا۔ ایک دن بے تکلفی میں کہنے لگے کہ سال میں ہم سب  
سے پہلے تو وہ پرچی نکالی لیتے ہیں جو کار و بار میں لگائی تھی۔ اس کے بعد خانہ داری کے اخراجات الگ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد  
منافع میں سے جس قدر مناسب ہوا پرچی میں اضافہ کرتے ہیں۔ سب کے بعد کچھ روپیہ اپنے دل کی خوشی کے لئے علیحدہ کر لیتے  
ہیں۔ یہ روپیہ ہم بے دھڑک صرف کرتے ہیں اگر کوئی کوئی کہہ دے کہ ہمارے ساتھ روپیہ پانی میں پھینکے اور یہ کھیل  
ہم کو پسند آجائے تو ہم اس میں بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب دل کی خوشی والا مال ختم ہو جائے گا تو ہم آٹھ کھٹے ہونگے  
بھروں اور دل کے افکار کو خدا حافظ۔

ایک داد راز نے دل ایک سے لاگے بھانوں دھڑاؤں کھڑے ”لا لہ آدمی وسیع الاخلاق ہے اس لئے گو منظرِ فطرس  
ایک ہی رہتی تھی۔ گھر میں صلا سب کی پوچھ آتے ہیں۔ شام سے لے کر دس بجے تک۔ ”رات ہی بھر گور ہے لیکن گلوں میں ہم آہستہ  
کا آواز بلند کیا کرتے تھے۔ کسی سے تکلف اور تہذیب کی ملاقات ہوتی تھی۔ کسی سے خلوص اور بے تکلفی تھی۔ بعض سے مذاق اور کراہی  
کی چوٹی چلتی تھی۔ لیکن ہمیں ایک آدمی بھی ہوتی تھی جہاں غالب مرحوم یاد آ جاتے تھے۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شبیرہ نہیں ہم ہی کر بیٹھتے تھے غالب پیش دستی ایک دن  
لادہ بی بی و حیرت توڑے سے فلاسفی بھی تھے۔ جب دوستانہ ناصح ان کے پاؤں کے سینچا آنا دے رہے تھے تو کہتے تھے کہ ایک  
درگاہِ حکم گیر ”خود کر پانی سے پتلا ہوا سے ہکا نہ کریں اور ہر جگہ کی حاضر باشی سے باز آجیے تو یہ جواب دیتے تھے کہ جس نے تقاضے  
الک بیز ہی اور محض نادک سے ہم کلامی اور ہم نشینی کی خواہش دوسری چیز ہے۔ لیکن جس مالک میں مردہ رہے وہی ہے  
نہیں کر سکتا کہ کسی قدم و تقاضا آدمی میں پہلی بات کا ہے اور کس قدر دوسری بات کا۔ اور اس سال طبعی سے دوسرے قدم سے













میں کی شخصیت سے بے شکشا آنسو بہہ پڑتے تھے مگر یہ جوتی میں اندھنس رہی تھی۔ پتی برس پہلے مہاک کے آبشار شاد پر بس جاتے تھے۔ جب غور۔ دن جب سناٹائی کی دبیاس کیا کر آنسو پہلے پگھلتے ہوئے اپنے اس دھن پر پڑتے تھے..... (اندھنس) جس ترس کی لپک اس کی ہنس دلی دلی تھی۔ بابری کے خیال سے وہ بھی ادنیٰ آواز میں نہ ہنستی تھی جیسے کھکھہ ہٹ کئی تگا ہی ہے۔ نہ سوتا رو پڑا۔ وہ دلی ہنس ایک گھوٹ گھٹ۔ پھر دن نے اندھ کا ایک نیلی رت بنایا اور اس سے عیسویں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے ایک تنگ نہ کیا تھا..... وہ پہرائی دنیا میں لٹا بس جس ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہلے سے آواز دی۔ اندھ اور پھر چپ ہو گیا۔ اس اور پھر میں وہ بورائی مستی نہ آیا اس سے بلی پٹ گئی۔ ایک گھوٹ گھٹ آئی لپک مانتہ ہی یوں تھا جیسے شادی کی رات دانی پڑوسی سوٹ کی گھنٹیں بند کھاس پھکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے گلی کے عالم میں اٹھا۔ پھر رستی کی طرف دیکھتے مڑ کر کھاتے دینی جگہاں لے کر لیٹ گیا۔ سو گیا۔

دن جیسے کانوں کو کئی سندیر دے کر سویا تھا۔ جب اندھ کی چوڑیاں بستر کی سولہیں سیدی کسنے کے لیے کھنک اٹھیں۔ زوہ جی ہر شکر اٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جا گئے میں جنت کا جذبہ اور لمبی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی گردنوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور لپکا کی اٹھے نہ محبت دم توڑ رہی ہے۔ دن کا سا ماہی اندھ کی آگ سے پھنک رہا تھا اور ہی اس کے خیمے کا کارن بن گیا جب اس نے کچھ روکھا۔ شے ہوتے اندھ نہیں کہا۔

”سو۔ تم آگئیں؟“

”ہاں!“

”تمنی۔ سو گئی؟“

اندھ جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ”اے رام!“ اس نے ناک پر انگلی رکھتے دانتے ہوئے کہا۔ ”کیا کہہ رہے ہو....“

”مے کیوں بے چاری، ماں باپ کی ایک ہی بیٹی۔“

”ہاں۔“ دن نے کہا۔ ”بھائی کی ایک ہی نند۔“ اور پھر ایک دم ٹھکانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ وہ منہ ست لگاؤ اس چٹیل کو۔“

”کیوں اس میں کیا باپ ہے؟“

”یہی باپ ہے۔“ دن نے اور پڑتے ہوئے کہا۔ ”وہ بچا ہی نہیں چھوڑتی تھا۔“ جب دیکھو جو ناک کی طرح چٹتی ہوئی ہے۔

”فان ہی نہیں ہوتی۔“

”ا۔“ اندھ نے دن کی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بہنوں اور بیٹیوں کیوں تو شکرا نہ نہیں چاہئے۔ بے چاری وہ دن کی ممان۔ آج نہیں تو کل کل نہیں تو پھر سوں ایک دن چل ہی دے گی۔“ اس کے بعد اندھ کچھ کتا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کی کھنک کے سامنے اپنی ماں، باپ بھائی ہیں اچھا یا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلائی تھی جو یکجہٹ جھپکتے ہی بنیادی ہو گئی اور پھر دن مات اس کے کھانے پانے کی باتیں ہوتے تھیں جیسے گھر میں کوئی بیٹی ہی باقی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ پوچھ کر پھنگوئی نہیں مانتی گھر کے لوگ، آرام کی عین سو نہیں سکتے۔ دور دور سے پکھلنے والے، تنہا کرنے والے، دانت پھوٹنے والے ماندی ٹھکانے



میں نے تو تجی سے چار سوٹ اندر کھینچ رکھا ہے جس میں کے لئے اندر دے گا اور یہ دن کے کوئی جواب نہیں دے گا۔  
 سہو نہتہ سے تیری۔ تم کیوں پیش ہی ہوتے ہو۔ یاد نہیں اپنا چوں کہ تہہ پہننے تک لے دے چکے ہو۔  
 "ہیں؟" میں نے چہکتے چہکتے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا لیکن اب کے جب اس نے اندر دے گا اپنے ساتھ چلا کر وہاں ایک  
 مہربانی سن رہا تھا اس کا ایک ڈونگ بھی شامل ہو گیا تھا۔

میں کے پیشانہ و درون ہی نمودار تھی۔ اندر کے جسم بھی تھا لیکن وہ جیسے کسی نہ کسی وجہ سے من کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔  
 ایک پروتھا خواب کے تاروں سے پٹا ہوا، آجوں کے جھوٹ سے رنگین مکتوں کی زرتاری سے چکا چوند جو ہر وقت اندر کو ڈھانچے جتا  
 من کی نگاہوں اور اس کے افسوں کے روشناس صدیوں سے اس درویدی کا جو ہر کہتے آئے تھے جو کہ صرف عام میں پیری کہلاتی ہے  
 جس کے پیدا سے اس کا من سے تھانوں کے گزیراں نگاہیں ڈھانچنے کے لیے طے کیا تھا۔ وہ شاسن خشک اور کسے یہاں وہاں گئے  
 بڑے نئے لیکن درویدی وہیں کھڑی تھی سوت اور اپنی گزیراں کی سفید ساری میں لبوس وہ درویدی گنگ رہی تھی اور۔

من کے کہتے ہوئے تھے اندر خالت کے پسینے سے تر ہوتے جیسے شگھانے کے لیے وہ انھیں اوپر ہوا میں اٹھا دیتا اور پھر اندر کے  
 تاروں کو روکے حور پر پھیلتا ہوا، ایک تھی کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھینکی پھینکی جوتی تکیوں کے سامنے دکھ دیتا اور پھر انھیں کے بیچ میں سے جھانکتا  
 اندر کو کامر میں جو خوش رنگ اور گماز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، ابتداء کے لیے دور۔۔۔۔۔ کبھی جب اندر کی نگہبندی  
 ہر جاتی تو اس قسم کے فترے ہوتے۔

"اسے سچی لگہ میں چھوٹے بڑے سچی ہیں، وہ کیا کہیں گے؟"  
 من کہتا۔ "چھوٹے کچھ نہیں۔ بڑے انجان ہی جاتے ہیں۔"

اسی دور میں بابو دینی رام کی تبدیلی سہا زبور ہو گئی۔ وہاں وہ ریڑھے میل سرہوس میں سلیکشن کر ڈک کے ہیلو کرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کو اثر  
 ملا کہ اس میں آٹھ کپے رہ سکتے تھے لیکن بابو دینی رام اس میں اس کیلئے ہی پٹا لگیں بھیسے بڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیحدہ نہیں ہوئے  
 تھے۔ محنت گھر پر قسم کے آدمی، آخری زندگی میں اس تھائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی لیکن مجبوری تھی، بچے سب دینی میں من اور اندر  
 کے پاس تھے اور وہیں انھوں میں پڑھتے تھے، مسئل کے خاتمے سے پہلے انھیں ہی میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ بابو جی  
 ان کے دور سے پڑھنے لگے۔

بارہ سگری کی چٹیاں ہر شیں اور ان کے بار بار کھنے پر من نے اندر کو کندہ پاشی اور ولاری کے ساتھ سہا زبور کی جیل۔ دینی رام  
 کی دنیا بیک الٹی۔ کہاں انھیں دفتر کے کام کے بعد محنت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے بچوں کی طرح، جہاں کپڑے لٹاتے  
 وہیں پڑھتے دیتے اندر بابو جی انھیں سیکھتے پڑھتے۔ اپنے من سے دور اس کی مٹی رتی، اندر تو اپنے ہاتھ سے ایک سے فاصلہ رہتی تھی۔

سورج کی روشنی کی بجائے گلاب کی دھند میں گھسے، باہر کی طرف نہ اٹھا اٹھا کر اپنے ٹامک کو ٹھونڈا کرتی ہے۔ کام دام کرنے کے بعد وہ بھی اندر  
وہاں پر ہی بیٹھ جاتی ہے۔ باہر کے ڈالے کے پاس اور بھی کام کے بیٹھتے جو آگاہی میں گھر پر ہی بیٹھیں ہزاروں دلوں کو تھامے ہوئے ہیں۔

مکمل ہوا میں ڈھلے گلاب۔ آگاہی میں سے باہر کا دور پر کھٹا تو گھبراہٹ، نئی جیاتی ہوتی اور کیا ہی رنگت بڑھاتے ہوئے گاہیں۔ چھوٹا  
کھٹے ڈالے سے اسیوں اور پھر گیت کے بدل کے مطابق دو جھونپٹیں اور دو جھونپٹیں اور کمیں چار دل جاتیں تو بھول بھولیاں جو جاتیں سادہ و سادہ  
کی ہر طرح کی خدمتیں ایک طرف کھڑی ٹھکرتیں۔ اندر کو معلوم ہوتا جیسے وہ ملی ان میں شامل ہو گئی ہے۔ جی وہ منہ پیرتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوتی سر  
جاتی۔ بالائی پاس سے گزرتے تو اسے جگہ کے اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرنے بلکہ محض ہر اس کی شلوار کو جو بہرہ حق سے بدل آتی اور اس  
وہ پیشانی سے اسے پڑانے صندل کے صندل پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر رکھا دیتے۔ ایسے میں انہیں سب سے نظریں بچانا پڑتی ہیں۔  
ایک شلوار کو پھینک کر جتنے ہی تھپے کسے میں نگاہ ہو کر کے عزم پر جا پڑتی۔ تب ان کی بہت جواب دے جاتی اور دلوں کی تسلی کر کے سے مل جاتے  
جیسے سانپ کا پھل سے باہر آگئی ہو۔ پھر برآمد سے میں اسی کی آواز سنائی دینے لگتی۔ اوم نو بھکرے تھو اسو دریا۔

اڑوس چروس کی عورتوں نے بابو کی ہونے کو بھروسہ کی وراستہ میں دور دور تک پہنچا دی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو کی کے  
سائے ہو کر پیار سے پی اور سٹول ہم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے بھول جاتے اور کہتے: ہم تو دھندلیہ ہو گئے، اچی چند کی اس بات کو ہے ہمارے  
گھر میں بھی کوئی محنت والا جیسا آیا۔ اور یہ کہتے ہوئے ان کی گاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں جہاں دق کے مارنے لگے اورانی کی پیشیاں اچھلی کی بیڑیوں  
پر جیڑیوں کے بل، ٹھکانہ قریب آتی تو انہیں موٹے موٹے گدراہے ہوئے جسم والے کئی بچے ہنسی میں جانا گھر پر، گورن پر چڑھتے آتے تھے جسے عروس  
ہونے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور اسے ہی۔ پلو پر لٹی ہوئی ہونے کی گزرتی کے ساتھ اور کھلے چھت کے ساتھ گلاب رہے ہی اور وہ خنجر  
سنگ جتنی جاری ہے اور ان بچوں کی عروس کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا سے نہ چھوٹا، سبھی ایک سے۔ جہاں تمام..... اوم نو بھکرے تھو۔  
آس پاس کے لوگ سب جان گئے تھے اور بابو کی کی چھٹی ہو رہے۔ چنانچہ دو دو چار چھ کے لکھے یعنی رام کے گھر آنے  
گئے اور پھر ایک دم سلام دین کو جرنے فرمائش کر دی۔ اندر سے کہا: بی بی امیرا بیٹا آر۔ ایہ۔ ایس میں تھی رکھو ادو، اللہ تم کو اجر دے گا۔ اندر  
کے اشارے کی دیر لگی کہ سلام دین کا بیٹا ذکر ہو گیا، وہ ملی سارٹر، جو نہ ہو سکا اس کی قسمت آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہرے کے کھلنے پینے اور اس کی محنت کا بابو کی خاص خیال رکھتے تھے۔ دو دو پینے سے اندر کو کر چٹھتی۔ وہ رات کے وقت  
خود دو دو کھاتی ہیں لیٹت گلاس میں ڈال، ہو کر چلانے کے لیے اس کی کھٹیا کے پاس آ جاتے۔ اندر اپنے آپ کو سمجھتے ہوئے اٹھتی اور کہتی  
"نہیں بابو کی مجھ سے نہیں دیا جاتا۔"

"نیرا تو سسر ملے پیے گا۔" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ بی بی جیے نا۔" اندر ہنستی ہنستی جواب دیتی اور بابو کی ایک صغریٰ نعل سے برس پڑتے یہ تو چاہتی ہے بھروسہ تیری ملی۔  
"راست بہرہ تیری ساس کی ہوتی؟"

"ہیں۔ ہیں۔" اندر لاڈ سے دوشے لگتی۔ آخر کہیں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھے تھیں سائے والا کوئی نہ ہو  
میں اس تو سائے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندر بابو کی کے ہاتھ سے گلاس نہیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس مہانے  
کے لیے رکھ دیتے۔ اور اسے یہ پڑا ہے۔ تیری مرضی سہلی نہیں مرضی تو نہتی۔ کھٹے ہوئے پل دیتے۔

اچھے دوست پر بھی کر دینی تمام وہ ملا ہی سکے ساتھ کیٹے گئے۔ وہ بھی باجی کے ننگے پٹے کے ساتھ پتہ اگساٹے اور بیت پر  
مذکر کے رہے۔ اس کی عادت تھی۔ آج جب باجی اور بی بی کیل رستے تھے جنس ہنس رہے تھے تو بی بی نے باجی کی طرف دیکھ کر ہنس  
کہا۔ "دور دور تو گھر اب ہر جگہ کا رہی۔" باجی تو بی بی نہیں۔  
"ہنسی مگر وہ بھی گئی تھی۔" باجی نے وہ دھڑلے لڑکے سے پاشی کر لیا۔ ہنسے کہ "موتیں گھر کی کسی چیز کو خواب جوتے  
نہیں دیکھ سکتیں۔"

ایسی یہ فقرہ باجی کے منہ میں جڑا کہ ایک حرف سے ہٹل۔ "ہے قسم کھانی کی آواز آنے لگی۔ پتہ جتنا ہو تو کو بھاگ رہی ہے  
اور پھر کوئی غٹ غٹ ہی سنائی دیتی اور سب جا رہے تھے۔" باجی نے دور دھڑلے لڑکے کے بعد کندن باجی کے پاس آنا اور کہنا  
"باجی۔" باجی رو رہی ہے۔"

"انہی؟" باجی کہتے اور پھر انہی کے اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے بعد پھر وہ کی جا پائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے  
کے بعد وہ پھر بیٹھ جانے اور کچھ کہتے ہوئے کندن سے کہتے جا۔ "تو مر جا۔" وہ بھی سو جانے لگی اسنے آپ۔  
اور پھر سے بیٹھے ہوئے باجی و بی بی رام آسمان پر کھٹے ہوئے پرانا کھڑا کر دیکھنے لگتے اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے  
"ہانہ کی کے ان کہتے بند جوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟" اور پھر پورا آسمان انھیں دور کا ایک دیبا دکھائی دینے لگا  
اور کافوں میں ایک مسلسل آواز سنائی دیتی ہے کہتے ہوئے وہ کہتے "جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!۔" اور  
وہ روتے روتے سو جاتے۔

اندھ کے جانے کے میں پچیس روز ہی میں دن نے اور عیا شروع کر دیا۔ اس نے لکھا۔ میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے  
تنگ آگیا ہوں۔ مجھے فیض ہو گئی ہے اگر وہ کا دور شروع ہو گیا ہے۔ پھر بیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا شریکیت بیچ رہے  
میں دن نے باجی کے ایک دوست سے قصداً کی چٹھی لکھا۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈاکٹر تار۔ جوالی۔  
جوالی تار کے پیسے مارے گئے لیکن جاسے۔ اندھ اور بچے لوٹ آئے تھے۔ دن نے اندھ سے دو دن سیدھے نہ بات ہی نہ  
کی۔ یہ تو بھی اندھ ہی کا تھا۔ ایک دن میں کو اکیلے میں پا کر وہ پوچھ "بھئی اور بولی۔" آنا منہ پھلانے بیٹھے ہوئے میں نے کیا کیا ہے؟  
میں نے سنے آپ کو پھر دیتے ہوئے کہا۔ "چھوڑ۔" دور ہو جا میری آنکھوں سے۔ کیہنی۔  
"یہی کہنے کے لیے آئی دور سے ملوایا ہے؟"

"ہاں!"

"پشاپ۔"

"خبردار۔" سب تمہاری کیا دھرا ہے۔ تم جو آنا جانتیں تو کیا باجی روک بیٹھے؟

اندھ نے بے بسی سے کہا۔ "ہے جی۔" تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بعد انھیں کیسے کہہ سکتی تھی وہ تو بچہ تو رہے تھے

”اگر وہی ہو تو کیا ہے۔“

”یہی مطلب؟“

”مطلب یہ نہیں۔۔۔۔۔ اس کا جو ہست تھا وہاں تھا بلکہ نہیں۔“

”اور میری؟“

”تھاراجی! تو تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔ اندو نے ثمرات سے کہا اور کچھ اس طرح سے مدد کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے ہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو کچھ کراہنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ ”باہوی کہہ بہت خوش تھے؟“

”ہاں! اندو بولی۔ ایک دن میں جاگی تو دیکھا سر ہانے کھڑے تھے دیکھ رہے ہیں۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”اپنی قسم!۔“

”اپنی قسم نہیں۔۔۔۔۔ میری قسم کھاؤ۔“

”تھاراجی قسم تو میں نہیں کھاتی۔۔۔۔۔ کوئی کچھ بھی دے۔“

”ہاں! مدد نے سوچتے ہوئے کہا: ”کنا ہوں میں اسے پکس کھتے ہیں۔“

”سیکس! اندو نے پوچھا: وہ کیا ہوتا ہے؟“

”وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔“

”ہائے رام! اندو نے ایک دم نیچے ہٹے ہوئے کہا: ”گندے کہیں کے۔۔۔۔۔ شرم نہیں آتی باہوی کے بارے میں“

ایسا سوچتے ہوئے؟

”تو باہوی کتنی نرم نائی تھی یوں دیکھتے ہوئے؟“

”کہیں؟“ اندو نے باہوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”وہ اپنی ہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔“

”دیکھیں نہیں۔ جب ہوں تم ایسی ہو۔“

”تھارام! گندہ ہے۔ اندو نے نفرت سے کہا: ”اسی لیے تھاراکا دوبارہ بھی گندہ سے برہم ہے۔ تھاراجی کنا ہیں سب گندگی سے“

”جبری پڑی ہیں۔ تمہیں اور تھاراجی کنا ہوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے تو صوب میں بڑی ہو گئی تھی تو میرے پتائی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا وہ بھی..... وہ تھا غور!۔۔۔۔۔ جس کا تم اپنی نام لے رہے تھے۔ اور پھر زندہ ہوئی۔ باہوی کو یہاں بلاؤ۔ اسی کا وہاں“

”جی جی نہیں لگتا۔ وہ دیکھی ہوں گے تو کیا تم دیکھی نہیں ہو گے؟“

”مدد اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر میں ماں کی موت نے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اشدکری پر کیا تھا۔“

”اس کے طرح سے یاد تھا۔ ماں کے تیار رہنے کے باعث صوب بھی اس کی موت کا خیال مدد کے دل میں ڈالنا خود آنکھیں ملنے لگا تھا۔“

”اس کے بعد وہ فریاد کرتے دے سو رہا۔ ادم فریاد..... اب وہ نہیں جانتا تھا اب کی حیرت مہلا بھی اس سے آگے پاس کے خاص طور“

یہ ہے جس کا کہنا ہے کہ اگر کوئی جان نہیں دیا، اس نے غیر تین ہی اندر سے صوف اٹا کر اٹا لیا۔ اچھی بات ہے دو بار ہی کہہ دیا کہ کبھی یہ دونوں  
آبی بار آدھی کے ساتھ مل سکے۔

قیس سے چوستے روئے بارہوی کا انصاف میں غویا ہما خط آیا میر سے پیار سے دلی کے تھا عجب میں میر سے پیار سے کے انصاف شہر پانچل  
میں داخل تھے۔ تھے۔ کھا تھا۔ ہو گئے یہاں ہونے پر میر سے تو وہ ہی پرانے دن عورت آئے تھے۔ تھکادی میں کے دن، عجب ہادی نئی نئی شادی  
ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی افسردہ تھی۔ ایسے ہی آثار کے ہوتے کپڑے (اور اور ہر ایک دیتی اور پتا بھی سمجھتے پھرتے۔ وہی مسئلہ کا مسئلہ وہی وہی بیسیوں  
خلنگیں میں بانہار جا رہیوں آ رہیوں کچھ نہیں تو وہی بڑے پارٹری لارہ ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ مگر جہاں مسئلہ کا مسئلہ پڑا تھا انصاف  
..... اور پھر ایک آدمہ سطر اوہ داخل تھی تھی۔ آخر میں کھا تھا۔ دفتر سے لوٹتے سے یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوئے  
ہوئے میر سے کسی میں ایک ہول سا اٹھتا ہے..... اور پھر..... ہو گا خیال رکھنا! اسے کسی ایسی ویسی راہ کے حوالے مت کرنا۔

اندو نے دو دھڑوں انھوں سے چٹھی کچلی، سانس کھینچی۔ آنکھیں پھیل گئیں، شرم سے پانی پانی ہرق ہرق ہوئی۔ میں مر گئی۔ بابو بھی  
 کر کیسے پتہ چل گیا؟

میں نے جتنی چیز اُتارے ہوئے کھا۔" بابو جی کیا کہے ہیں؟ — دنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔"

”ہاں مگر“ اندوہ میں۔ ابھی دن ہی کئے ہوئے ہیں۔“

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھانجی شرمیلا نہیں کیا تھا اور پھر جیسے بابو جی پاکوئی اور دیکھ رہا ہے اس نے سامی کا ہاتھ اس پر کیسے لیا اور کچھ سوچنے لگی یہ بھی ایک جھک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی: "تواری سسرالی سے شہین آئے گی۔"

”میری شہزادی! — اداں!“ میں نے راستہ پاتے ہوئے کہا: ”کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھوٹا بیٹا ہی شادی کر رہا ہے۔“

”خدا آیا جیسا تم لوگ کہتے ہو؟“

”نہیں۔ یہ مسکرتھا رہا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہیں ایسی ہیں :-

مذمتیں پسند نہیں؟

”ایک دم نہیں۔“

یکسوں کو

”چار ملاں تو مرنے سے جیتے زندگی کے۔“

”کیا یہ جنگی کام نہیں؟“ اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا۔ سرد عورت شادی کس لیے کرتی ہیں؟ جنگجوئی نے بن مانگے شہ پانا؟ یہ عورتیں سہرا کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں؟ دیر میں خیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سادھیوں، عبادوں، چوٹیاں، اندھنی، شرمیلیا کوچ کر دیوئوں کے کنارے لگی ہوئی کھڑے کھڑے کٹھنوں میں سناں جاتی۔

”یہاں! یہاں! میں بلا تم نے کہاں ہی شروع کر دیا۔ اداوار کے لیے تو میری عمر بڑی تھی۔“

”جیسا کہ قرآن مجید نے مردِ نفل کے انداز میں اعلیٰ اٹھاتے ہوئے کہا: ”غیب تم اسے داخل ہی مت لگنا۔“ وہ تھا رانہیں پروردگار کا نہیں  
 جس کی وحدت میں اس کے داد کو بہت ہے یہ میں جانتی ہوں۔“

اور پھر اگرچہ محلِ کچھ صدرِ مزدوم ہو کر اندر سے اپنا منہ دروازوں کا تقویٰ میں چھپا لیا۔ وہ سر پہ تھی پیٹ میں اس بھی سی جانی کر بائینے کے سلسلے میں  
 اس جانی کا دستِ سرِ آفریدی بہت۔ بددی نو کر سے ٹھہری لیکن مدد چپ چپ چپ شیار لہا۔ ایک لفظ ہی اس نے منہ سے نہ نکالا۔ اندر سے چہرے پر سے  
 اٹھا کر مدد کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوئی کے خاص انداز میں بولی: ”وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب سچ ہے۔ ہر کچھ پہلے تو میں دیکھوں گی ہی  
 نہیں..... لکھ چکی ہوں ہی کے وہم سے اس بات کا۔“

مدد ہی بیسے خائف ہو گئی۔ یہ خوبصورت ”جینز“ جو حالِ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے، سر جھانے لگی اس نے  
 پیشِ طرف سے اندر کو تمام دیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازو دھریں لے آئی اور بولا: ”جے کچھ نہ ہوگا اندر..... میں تو موت کے منہ سے سر پہلی گئی  
 نے آتش لگائی۔“ اب ساؤتری کی نہیں ہستی جان کی باری ہے۔  
 مدد سے پیٹ کر اندر بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دھوکہ ہے.....

اس کے بعد باہر جی نے کچھ نہ کہا البتہ سہارنپور سے ایک سارٹ کیا جس نے مدد آنا بتایا کہ باہر جی کو پھر سے دور سے پڑنے  
 لگے ہیں۔ ایک دور سے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدد ڈر گیا ”اندر درونے لگی“ سارٹ کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدد  
 نے آنکھیں بند لیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا۔ اوم نرہنگرتے.....

دوسرے ہی روز مدد نے باپ کو کھینچ لکھی۔ ”باہر جی اچھے آؤ.....“ سچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہرہ ملی۔  
 لیکن آخر تو کئی تھی۔ اپنے بس کی بات تو مٹی تھی۔ جیسی نام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے..... ان کے بارے میں مدد  
 مدد کا احساسِ جرم بڑھنے لگا: ”اگر میں اندر کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑ جاتا۔“

دوسرے دن سے ایک رات پہلے مدد اضطراب کے عالم میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمد ہوئے ہیں مثلِ راجا کساند سے بچے  
 کے رونے کی آواز آئی اور وہ چمک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم ماہر باہر آئی اور بولی: ”مبارک ہو باہر جی۔“ لڑکا ہوا ہے۔  
 ”لو لڑکا“ مدد نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا: ”بی بی کیسی ہے؟“

بیگم بولی: ”خیر بہتر ہے۔“ میں نے ابھی تک اسے کوئی پتائی ہے..... ”وہ چہ زیادہ خوش ہو رہا ہے تو اس کی آنکھیں نہیں لگتی نا؟“  
 ”او.....“ مدد نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے  
 دیکھ کر دھڑک دیا اور کہنے لگی: ”تھارا اندر کیا کام؟“ اور پھر کیا ایک ردِ انداز لکھ کر اندر چلا گئی۔

مدد کی آنکھیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں۔ تسلی سے یا شاید اس لیے کہ ہمیشہ کوئی اس دنیا میں  
 تھا۔ یہ تو گرو کے لوگوں کی ہی حالت ہوتی ہے۔ مدد نے غصے سے کہا: ”مبارک ہو“ تو گھر کے دروازے پر نہ لگے ہی گویا  
 ”مبارک ہو“ کہہ کر گئی۔ گویا کہہ کے گا۔ مدد نے غصے سے کہا: ”مبارک ہو“ کہہ کر گئی۔





دن بھی کے نہیں دنیا بھر کے گناہگاروں کے گناہ معاف کر دیے ہیں اور اب دیوی بن کر دیا اور کرونا کے پر سادہ بانٹ رہی ہے۔۔۔۔۔ اندو کے سزاوہ طرف دیکھا اور سوچنے لگا۔۔۔۔۔ اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دہلی پر کر اندو اور بیجا بھی گئے گی ہے۔۔۔۔۔ ابھی کیا ابھی اندو نے دونوں انفرادی چھاتیں پر رکھ لیے۔

”کیا ہوا؟“ اندو نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ اندو تو اسراٹھنے کی کوشش کر کے برقی۔۔۔۔۔ اسے بھوک لگی ہے۔۔۔۔۔ اور اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

”اے؟۔۔۔۔۔ بھوک؟۔۔۔۔۔“ دن نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تھیں کب سے پیٹھا؟“

”ابھی کچھ نہیں؟“ اندو بچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے برقی۔ ”سب گھٹا ہو گیا ہے۔“

دن نے غور سے اندو کے ڈھیلے ڈھالے دگلے کی طرف دیکھا۔ ”جھجھک دو جھجھک دو۔۔۔۔۔ اندو اور ایک خاص قسم کی کڑواہی تھی۔ پھر۔۔۔۔۔

بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے مجھے دے دو۔“

دن نے لڑکھنڈے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ بہت سے کام ہوتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اٹھایا جیسے دو

کوفی مراہواچ باجو۔۔۔۔۔ آخر اس نے بچے کو اندو کی گود میں دبے دیا۔ اندو دن کی طرف دیکھتے ہوئے برقی۔ ”تم جاؤ۔۔۔۔۔ ماہر۔۔۔۔۔

انکلیں؟۔۔۔۔۔ باہر کسوں جاؤں؟“ دن نے پوچھا۔

”بھاؤ نا۔۔۔۔۔“ اندو نے کچھ مچھتے کچھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے سامنے ہیں دو دروازے ہیں پلاٹوں کی۔“

”اے؟“ دن چرت سے بولا۔ ”میرے سامنے؟۔۔۔۔۔ نہیں پلاسٹک کی؟ اور پھر نا کچھ کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باج

کی طرف متوجہ ہوا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر ٹپٹے ہوئے اس نے اندو پر ایک نگاہ ڈالی۔۔۔۔۔ تھی خوبصورت اندو آج تک نہیں ملی تھی۔

باجو مدنی ’’مچھتی پڑھوئے تو وہ پہلے سے آدمی دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو نے پلاٹوں کی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ اور کے پیٹ کے اندر کوئی پھر ٹھکانا تھا۔ جرج میں کھینچے انھیں مولی پھٹکے۔“ اگر تانہ ہرنا تو باجو کی اس سے دس گنا بڑی حالت ہوئی۔

کئی علاج۔ کچھ بچے باجو کی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھتی کے برابر بند رہیں گولیاں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن انھیں نہ

دیکھنے آیا کہ دن میں تین نہیں چار بار باجو کی سے بدلتے پڑے۔ ہر بار مدنی پیڑے آنا کر باجو کی میں پھڑپھڑتا۔ صرف بیسٹین ہی سے باجو کی ایک چوتھائی ہو گئی

تھی۔ رات انھیں مٹی کی محسوس ہونے لگی اور انھوں نے پکارا۔۔۔۔۔ ”ہو! اور ادا تو دنیا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔“ ہو بھائی ہوئی گئی۔

داتن لے آئی۔ باجو کی اٹھ کر اتنی جابجی رہے تھے کہ ایک ایک کی آبی ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیسٹین نے واپس مہربانی کی طرف اشارہ

ان کی پتلیوں پر کچھ انھیں اور کرنی ہر دم میں وہ اوپر آسمان کے گھڑاویں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا۔۔۔۔۔

مئے کو یہ ابوئے کل میں کسی روز ہوئے تھے۔ اندو نے سہلہ کز سر اور پھانی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر دیا۔ دن کے سامنے دی

منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چڑیاں توڑنے کی بجائے انار کے کھڑی انھیں۔ سر پر اندو

ہیں لڑائی لڑی تھیں زمیں پر سے مٹی لگ جائے اور ہاتھوں کے بھر ہلنے سے چہرہ بچا کسم ہو گیا تھا۔ ”گوگو! میں ٹٹ گئی“ کی جگہ اس نے ایک دھندلا

زوار میں ہوتا شروع کر دیا تھا یہ لوگ بڑھ گئے :

گھر بار کا کتنا بوجھ دن پر پڑا تھا۔ اس کا اعلیٰ من کو پوری طرح سے اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منہ میں لگی۔ وہ شاید کتا نہ لگا کر کے باہر بد رو کے کنارے سیل چڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر اپنے دل کو شکستے پر نہ قاتا..... دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچے کو کھانا دیا تھا۔ چھوٹے بچے کو نہ دلا رہی تھی اور پاشی میں چلا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکستے کے گلے پر چڑیا کے بوٹ چوچس لٹا تھا کہیں کہیں کہتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی پروں کے نیچے سیٹھی ملتی تو اندر.....

نالی کے کنارے پڑے پڑے دن نے سوھا اب تو یہ دنیا میرے لیے غم ہو گئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ وہ اٹھا اور اٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔

ریڑھ میں کے نیچے نچھٹا نہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کوڑ بند کسے ہوئے دن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا۔ عیسیٰ کبھی ہنس بھی سکوں گا؟..... اور وہ کھٹکھٹ کر ہنس رہا تھا مالا کھڑا اس کے باپ کی لاش اعلیٰ پاس ہی جھٹک میں پڑی تھی۔

باپ کو لگ کے حوالے کرنے سے پہلے دن، اعلیٰ پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈھٹوٹ کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے من و مانا کو آخری پر نام تھا۔ بس پر بھی وہ روز نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتے دار جتنے والے سن سے ہ کئے۔ پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے دن کو پتا چلائی بڑی۔ ملحق ہوئی گھر پڑی میں کپال کریا کی لالھی مائل پڑی۔ عورتیں باہری سے ششمان کے کوئی نہیں پر نہ کر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب دن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے گھر مڑی ویر کے لیے جوتھا ہے چٹے کوئی ملتی رات کے گھر آنے پر پھر سے ہول میں ڈھل گئی..... اسے کوئی کھانا چاہیے تھا کسی ایسے جذبے کا سہارا جو رات نے مل گیا۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی جگت دلا رہی اندوٹے کسی گھر سے جس سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا..... اس رات اگر اندوٹا چاہا آپ یوں دن پر نہ کر دیتی تو آنا بڑا ڈکھ دن کو لے ٹھوٹا۔

وہ ہی جیسے ٹکے اندر راند راند کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بوری کو اس دوزخ کی آگ میں دھکیل کر دن خود اپنا نوکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے سوال آتا کہ میں شادی کے بعد باہری کے پاس گئی ہوتی اندو کو نہ بلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے انسان کے کوپرا کر سنے میں لگ جاتا..... کاروبار جو پہلے بے قوتھی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا..... مجبوراً چل نکلا۔

ان دنوں بڑے بچے کو دن کے پاس پھر ڈکھ پھر ڈکھ کو چھاتی سے لٹائے اندو کے چل گئی تھی۔ تھپتھپتا طرح کی خد کو نہ تھا جو کبھی آتی جاتی تھی اور کبھی نہیں ملی۔..... بچے سے اندو کا خط آیا..... بچے بیان اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آرہی ہے اسے کوئی مارتا تو نہیں؟..... دن کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جہل میں ان پر سو حور ت..... ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟..... پھر اس نے اپنے آپ سے کہا..... کیا یہی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے.....؟

حاصل گند گئے۔ جیسے کبھی اتنے نہ آئے کہ اس سے کچھ عیش ہو سکے لیکن گذارے کے مطابق آمل ضرور رہ جاتی تھی۔ وقت اس وقت ہوا جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا..... کندہ کا داندو دینا ہے تو لاری میں کاٹنگن بھجوانا ہے۔ اس وقت دن نے منہ دکھا کر بیٹھ جاتا اور پھر لڑو

”کہیں سے بھی آئے..... تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے؟“

”تم جیائے اپنا کام چلاؤ۔“

ایسے ہی کندہ بھی بنا لگیا۔ ان شاویروں میں اندوہی ”تھمبھرا“ کرتی تھی اور ماں کی جگہ کٹری ہو جاتی۔ آسمان سے باجرجی اور ملن دیکھا کہنے اور پھر بل رساتے جو کسی کو نظر نہ آنے پہر ایسا ہوا، اوپر ماں جی اور باجرجی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے باجرجی سے کہا ”تم تو سہو کے مالک کی پتی کھا آئے ہو اس کا شک بھی دیکھا ہے پر فیصلیوں علی گھر بھی نہیں دیکھا۔ اور یہ جھگڑا دشمن ہمیش اور شو تک پہنچا۔ انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا۔ اور یوں ان مات لوگ میں اگر بھیر کی کو کم میں پڑی۔ اور اندوہ کے ادا ایک بیٹی پیدا ہوئی.....

پھر اندو ایسی دیوئی لمبی نہ تھی جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو نند دیو تو کیا خود مدن سے لمبی لڑ پڑتی — مدن راستبازی کی اس بڑی کوششا ہو کر ہر پیش چنڈو کی بھی ہمارا گنا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں اُلجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے اس لیے مدن اور کنبے کے باقی مسب لوگوں کی انتہیں اندو کے سامنے بھی ہی رہتی تھیں۔ جبکہ کتا لمبی جڑو مہاتے مدن اپنے شوہر کی رحمتیں کتنا بھی اندو کی بات کو رد کرنے لیں آخر سبھی تر حکم کا ہے ہوئے اندو ہی کی شرمن ہیں اتنے تھے اور اسی سے بچا مگلتے تھے۔

نئی بھابی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اندوا یک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں اس کے آٹھ چھوٹے بھائی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جسے بی چا چاک کی معرفت جاندا و تقسیم ہوئی مہس میں ماں باپ کی جائیداد تو ایک ستر اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں ملے تقسیم کی زمین انگٹیں اور اندو کیچھ موس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر ملی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں مل سکے تھے وہاں اندر کا نیا گھر زون ہی میں جھک جھک کرنے لگا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچی ہر وقت اندو کی چھاتریں سے چٹکی رہتی تھی۔ جہاں بھی گوشت کے اس لقمے پر غور فرما کر تے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کیچے سے لگاٹے پھرتی لیکن کبھی خود بھی پریشاں نہ رہا تھی اور بچی کو سلسلے میں جھلنگ میں پھینکے ہوئے

اس مٹی تو مجھے بھی جینے دے سنگل — اس —۔  
اور یہی چوہا ہوا کہ جس نے لگتی۔

دن اندو سے کھٹے لگا۔ شادی سے بے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ کہنے لگا اور دن نے بہت سارے دیوانہ و سہ بالہ بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔  
گھبرا پڑوسی سبیل کی بھینس پھر مہی کے منہ کے پاس بھینکا رہنے لگی بلکہ بار بار بھینکا رہنے لگی۔ شادی کی رات والی بھینس نے ایک بچی لگی تھی اس کا نامک زندہ تھا۔ دن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سائے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے تھے۔ بچہ پر کبھی نہ جھپٹتا تھا۔ بچی ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چمک رہا کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی معلوم ہوتا ہے نعل سے یہ جانہ مٹھا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منہ پوری طرح سے ڈھانپ دیا اور کوئی سانس کے لیے نہ پڑنے لگا۔  
وہ بچی جو کورنر ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آکر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آہ پار چلا گیا جیسے ہاتھ نہیں نہ تھا۔ نیچے کوئی گٹا۔ دس لگا اور پٹیل نے اس کی ہڈی ڈوب دی۔

دن کو اس کے قصور کے خدو خال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آٹسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا یا ہنسی کی آواز نہ رہے۔ سے زیادہ بلند تھی اور دن بے داغ صنایع اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا۔

سبیل نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے دن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے سبیل کے سامنے پیش کیا۔ پیش کیا گیا بلکہ منہ پر مارا۔ اس کو اٹھا کر سبیل نے پتھر کے منہ پر دے مارا۔ معلوم ہوتا تھا کسی خرمیں نے بڑبڑکا گواہ ہے جس کے رگ و ریشہ بیگم کو آگ اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں۔ گروڈر وڈکا کی ہمتی ہوئی بیگم نے مانتے کی ڈگری میں سے گودا اور بیچ اٹھائے اور اند کے مانتے انہرے صحن میں بکھیر دیے۔

ایک اندو کی مجلس سے دو اندو ہو گئیں۔ ایک تراندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آتا تھا۔

دن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر۔ ..... نہاد صوملہ اچھے کپڑے پہن نکلتی کی ایک جوڑی جس میں خوشبو دار قوام لگا ہوا۔ منہ میں لکڑی کر ..... لیکن اس دن جو دن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی۔ اس نے چہرے پر پوڑہ تعویذ رکھا تھا۔ کانوں پر روج لگا رکھی تھی۔ لب اسٹک اندر سے پر ہرنٹ مانتے کی بندی سے رنگ لیے تھے۔ اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ دن کی نظریں ان پر نہ لگے گئیں۔  
”کیا بات ہے آج؟“ دن نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کچھ نہیں“ اندو نے دن سے نظریں ہچاتے ہوئے کہا۔ ”آج فرصت ملی ہے۔“

شادی کے چندہ برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ چہرے پر چھائیاں چلی آئی تھیں۔  
تاک پر ایک سیاہ سی کالٹی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کرپڑ چلی کی دو تین تھیں سی دکھائی دیتے تھے لگی تھیں ..... کچھ اندو نے





# پرتو

## کرشن چندر

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر آیا تو اس کے چلنے کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ طرح میں ملازم رہ چکا ہے۔ اس کی شخصیت بڑی پُر وقار قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا، دنگ سرخ و سپید، براتی نرمانی داڑھی۔ اس نے کالی سرچ کے رنگ کا کوئی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور ڈبے کے درمیان روشنی میں اس کی پگڑی کی تہوں میں سے ابرق کے ٹکڑے جو اہر دینوں کی طرح چمک اٹھتے تھے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا متوازن قدم اٹھاتا ہوا، میرے قریب آکر دکا۔ چمک کر اس نے قریب کی سیٹ کا لمبر پڑھا اور اطمینان کی سانس لے کر سیٹ پر دروازہ مولا۔ سیٹ اس کے وزن سے پیچھے کو ہر گئی۔ اس نے مزید اطمینان کی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر بولا "یہ پیچھے کو ہٹنے والی کھال شیشیں بہت عمدہ ہیں انہیں نے اپنا جتنا ہوا سکریت جسے میں نے ابھی ابھی سلگایا تھا جلدی سے خاک دھن میں بکھا دیا۔ بوڑھا سکر میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس نے کہا، شکریہ! مجھے تباہی کا دھواں واقعی بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اس کے دانت جب وہ مسکرایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔ جید سپید اور مضبوط دانت جڑے جڑے اور ہم سطح آس بڑے فوجی سکے کی عمر ستر برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا تجسس پابلیا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی بُر نہیں کہ جوانی میں تو وہ بے حد حسین اور ولادیر شخصیت کا مالک رہا ہوگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر مجھے جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے وائیں ہائیں اس کے رخساروں پر تین چار لائے لائے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ وائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی اور بائیں رخسار پر یہ زخم انگریزی میں دی "و" کا سا نشان بناتے تھے اور جب اس نے اپنی ٹائی ٹیک کر کے پیسے لات اوپر کیے تو میں نے دیکھا کہ اس کی مچھلیوں کی پشت پر بھی کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے میسوں نشان ہیں جیسے کسی نے تیز دھار کے چاقو سے ان لائن کا قیر ہانسنے کی کوشش ہو۔

چمک! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ جانے پہل چمک عظیم کے اعزاز پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو شیریت۔ ہی کہ خصوصیت اور وجہ انسان کی باندہ یا مالک نہیں گئی ورنہ کتنا بڑا معلوم ہوتا یہ آدمی! مجھے اس معاملہ پر زبان حذر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر کر دیتو ران کا سرکیر سے نے آکر کہا کہ اب آپ لوگ اس کے کھانا کھا لیں ہم لوگ دس بجے دیتو ران بند کر دیتے ہیں۔



میں آٹھ گھر بنوا۔ وہ پورے سال کے میرے ساتھ آٹھ گیا۔

"ملا کر میں آٹھ بجے گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا مگر اس وقت میرا بھوک محسوس کر رہا ہوں۔ پورے سال کے ہنس کر مجھے نہ تھا۔ میں نے جواب دیا۔

میں دوڑوں اور کھانا کھا کر میں جاکر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ صرف ایک کونے کی نیز پر ایک نوجوان بیڑا بیٹھا رہا تھا اور کھڑکی سے باہر لٹک کر کپڑوں کی ماسی کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ مڑ گئے آٹھ میں تھا۔ جسے وہ مٹھوڑے مٹھوڑے بالوں کے بعد رہا تھا۔ ہاتھ کے رہنے میں لڑکی کے چہرے پر ایک گھٹا مسکراہٹ کھلی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے لڑکے کے ہاتھ میں کوئی سوچ (SWITCH) ہے کہ جسے بار بار دہانے سے یہ مسکراہٹ کھلی کے مٹھنے کی طرح روشن ہو اٹھتی۔ لڑکی کے بال خوش نما مڑے ہوئے تھے اور وہ بڑی دل رہا کرتی تھی، موہنی آوازوں والی لڑکی تھی اور شکل و صورت سے ایک ایسی ہندوستانی لڑکی محسوس ہوتی تھی جس پر پتی خون کا بھی دخل رہا ہو۔ لڑکا خاص ہندوستانی تھا۔ سانسوں کے ساتھ ساتھ چھوٹا لیکن مضبوط اور گھٹا ہوا لکھنے جیسے ہاتھ اور چہرے کے چہرے جڑوں پر لگے ہوئے شہر کی نیلاہٹ تھی۔ اس کے سر کی جھامت بھی بالکل تازہ تھی معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال تراشا گیا ہے۔ اس کے کپڑے بے حد صاف ستھرے تھے اور اس کے رویوں وہ ہیں جسے زندگی کی صحت مند آرزو میں پھرتے رہی تھیں۔ لڑکی کا ایک ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور بار بار وہ اسے اس طرح دبا رہا تھا جس طرح گویا وہ اس میں رہتی ہو۔ میرے لیے اس کی خوشامیہ کر رہا ہو۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس کی نپلی ساڑھی کا پلو ہارے کے چارے دبا رہا تھا اور اس کی بے حد سہاہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اس طرح دیکھتی تھیں جیسے وہ لڑکی نہ ہو جس کی ایک ہیٹ ہر محبت میں صحت کو کس قدر دخل ہے۔ میں نے اپنے زور و زبانی کو آہستہ سے چھپھپھاتے ہوئے کہا۔

جواب میں پورے سکون کے ساتھ نہ کہا۔ کیونکہ اب کھانا ہم دوڑوں کے سامنے تھا اور وہ کھانا کھانے سے کھانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ چارے کھانے کے دوران میں ہی وہ جڑا کافی پی کر اور لی ادا کر کے چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ گھٹا مسکراہٹ پر لڑکی کے لبوں پر لکائی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کی وہ گھٹا مسکراہٹ اس کے ہاتھ کی اداسی سے حد پہنچا آئی۔ جب وہ لڑکے کی طرف دیکھتی تھی کتنی چاہت اور سہولت تھی اس کی۔ اس کی کبھی کبھی تو وہ ایک نگاہ میں سب کچھ دیکھتی تھی۔ ہے اور پھر ایک خالی برتن کی طرح محسوس کھڑی کی کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ اس وقت وہ سب سے پیاری بھی معلوم ہوتی ہے۔ مسکرائے کے بعد کچھ اس طرح کی نگاہ سے اس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا اور پھر غصہ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور نوجوان اس کی کمر میں ات ڈال کر اسے دیتی بول میں لے گیا تھا اور ان کے جانے کے بعد لیٹورا گیا۔ اور وہی سوئی سوئی سی دکھائی دینے لگی اور کھڑکی میں لٹکا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا گویا صرف انہیں کے لیے لٹکایا گیا تھا۔ میں نے بات بڑھا کر لڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

پورے سال کے میری حرکت پر مسکرایا۔ مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد پورے سال کے کافی تنگائی اور میں ساری شہینے

کے لیے باہر دیتی بول میں آگیا۔ دیتی بول کے ایک کونے میں وہ نوجوان اس لڑکی کو چوم رہا تھا اور چاند لڑکی کے چہرے پر تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

لڑکے نے جیڑن ہو کر پوچھا۔ یہ آنسو کیسے ؟

کچھ نہیں رہی! لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی اور پھر کھٹکھٹا کر تنہا چلی اور اس کے چہرے پر وہ دلاؤ بڑھ گیا۔  
محبت میں ڈوبا ہوا۔ مگر تہمت! لڑکے نے پھر اسے ایک بار چوما۔

لڑکی کے شانے کا سچے اس نے پھٹ کر کہا۔ چلو اور تگ اندھ چلیں یہاں سرور ہے۔ اس نے خاموشی سے اپنی نگاہیں میری طرف اٹھا رکھی۔ میں جو دوسری کھڑکی میں کھڑا ہوا ہر دو دیکھا کے چاند کو دیکھ رہا تھا لڑکے نے میری طرف اس طرف دیکھا گویا مجھے ایسی چہرہ بھونک دے گا۔ پھر اس نے آہستہ سے گھوم کر لڑکی کی کمر میں ات قیلا اور اسے ویٹی پرل سے نکال کر اندر ڈبے میں سے لیا۔  
خوڑی دوسرے کے بعد بڑھا سکہ بھی کافی پی کر سیتوان کا، سے نکلا میں نے بھی اتنے میں اپنا سگریٹ ختم کر لیا تھا۔ ہم دونوں واپس اپنے ڈبے میں آکر اپنی سیٹوں پر دواڑ ہو گئے۔

خوڑی دیر کے بعد گاڑ ڈبے میں آیا۔ اس نے سب بتایا کچھ وہیں لیکن ڈبے کے باہر چاندنی مکمل طور پر مکمل اٹھی تھی اور اس کی سیدھ دم دھڑکی میں لاری کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے خاموش اور کتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔  
میں نے کہا۔ مجھے اس چاندنی میں غم نہیں آتی۔ کھڑکی کا پردہ سرکاروں؟

دراختہ ہو کر اسے سکھ نے بہت ہی دیر میں بے حد پر سوز آواز میں کہا۔ یہ پونم کی رات بہت ہی بہت ہے۔ بہت خوبصورت بھی ہے مجھے اس سے ڈر تھا ہے مگر میں اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ کچھ دیر اور اس چاند کو دیکھ لوں؟ چاند کو تو جو جان لوگ دیکھتے ہیں۔ ہمارے تہارے دیکھنے کی یہ چیز نہیں۔ میں نے آنسوؤں کے سہم کے ساتھ کہا۔ بڑھا سکہ مسکرایا اس کا دایاں رخسار چاندنی میں تھا اور بے عیب نشان بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں رخسار کی وی (۶) تاریکی میں گم تھی۔

میں نے کہا۔ تمہارے رخساروں کے یہ زخم کیا تم نے جنگ میں حاصل کیے ہیں؟ جنگ؟ جنگ؟ بڑھے سرور اس نے میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

ہاں! جنگ ہی تو تھی۔ وہ ڈک کر آہستہ سے بولا۔

کون سی جنگ؟ اپنی جنگ عظیم یا اس سے پہلے کی کوئی جنگ؟ میں نے پوچھا۔

میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا پر اسے سکھ نے آہستہ سے کہا۔ میرا قیاس بلے بنا و ثابت ہوا اس لیے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا۔  
چہرہ زخم کیسے؟

بڑھے سکھ نے ادھر ادھر دیکھ کر چاند اپنی جگہ تھا۔ کھڑکی اپنی جگہ تھی۔ مسافر ڈبے میں خالی خالی ہی تھے مگر جہاں تھے وہیں کے وہی اپنی آرام کرسیوں پر دواڑ سو رہے تھے۔ ہمارے آگے پانچ چھ سیٹیں چھوڑ کر آخر میں تا ایک کونے میں وہ ڈکلا اور لڑکی اپنی اپنی کرسیوں پر دیکھ بکھنے تھے۔ لڑکی کا سر لڑکے کے شانے پر تھا اور لڑکے کا بازو لڑکی کے شانے پر تکیوں کی دونوں کی ہڈیوں پر۔  
بڑھے سکھ نے مجھ سے پوچھا۔ یہ قدر ضرور سنو گے؟ اگر تمہیں چند ذرا ہی بوسنا دو۔

خیر تو مجھے اس چاندنی میں کبھی نہیں آنے کی! بڑھے سرور نے بڑے گہرا لہجے میں کہا۔ پھر اس نے اس طرح سے کہا جیسے وہ وقت سننے کے لیے تیار ہو چکا ہو۔ اس نے ایک لمبی سانس لیٹھ کر کہا۔ اچھا تو سن لو۔ تم میرے لیے مکمل جیبری ہو اس لیے تمہیں بنا لیتے ہیں کہ کوئی ہرجائی نہیں

وہاں لڑائیوں میں مدد دینے کے لیے تھے۔ جن کی وجہ سے گاڑی کی چمک چند بڑے بیٹھے بیٹھے دم خروگی سے بھر پور تھی اور  
 ہر گھنٹہ ہر گھنٹہ دور دور گاڑی کے دور دور پہنچل ہوئی سفید چاندنی میں سیاہ دھندلتی اپنی شاخوں کو کیٹھتے ہوئے اور جھلکاتے ہوئے گناہگار عروصوں  
 کی سانس لے رہے تھے۔

مردانہ کونے میں سوتے ہوئے سر اٹھے زحمان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جوانی میں میں بھی اسی طرح تھا بے نظر اور بلا ہوا  
 اور اب یہاں گنبد رنگہ موصیٰ حاصل کا بنر و تھا اور اس کے علاوہ چاک لبر ۳۲ بھی پورے کا پورا ہماری ایکسٹ میں تھا۔ گھر میں کھانے  
 پینے کوئی کمی نہ تھی۔ گواہاب نے مجھے بی اے پاس کرایا تھا لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ تعلیم کی بجائے میرے  
 ہاتھ زمین چلانے میں مشاق تھے۔ جانتے ہی نہ تھے بی اے کیسے کر لیا۔ پھر سے ہاپ کی آواز تھی کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ کرنل بنوں  
 اور کچھ عیسائیوں کی زندگی ہی پسند تھی۔ سموری بھوری مٹی کی سونہری جہک، شبنم میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے چوں کا بوٹ، دور دھراں  
 کے نیچے پانی بھرتی ہوئی تاریدوں کی قطار اور میری سنہری گھوڑی کی ڈھکی چال، اچھے، انگوٹوں پر ہلکی ہلکی دھن دھن جلاتی ہوئی۔ آہ۔  
 میں نے کہا تم اپنے شباب میں بے حد چین رہے ہو گے۔ عزتیں تم پر بہت مرتی ہوں گی۔  
 بوڑھے سکھ نے حریف مسکراہٹ سے کہا ایسا تو مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی نے مجھ سے محبت کی ہو۔ ان میں سے ضرور ایک لڑکی سے

محبت کی تھی

کون تھی وہ؟

میری بیوی تھی

بیوی؟

جب میں بی اے پاس کر کے گاؤں واپس آیا تو میرے ہاپ نے چاک جھراں کے بنر واری لڑکی پر تیرے میرا بیاہ کر دیا۔ پر تیرے  
 بڑی عرصہ تک لڑکی تھی لاہری اور دہلی گوری اور سنہری ہلکی اور نرم جیسے کواد گندل گر میں تو اس کی آنکھوں پر مڑتا تھا۔  
 کیوں ان آنکھوں میں کیا بات تھی؟ میں نے پوچھا۔

بچا ہر تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی تھیں اور کالی سیاہ! مگر ایسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں، پھر بات کیا تھی؟  
 کہ نہیں سنا۔ ان آنکھوں کا رنگ، انہیں نہیں رنگ نہیں، ان آنکھوں کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔  
 وہ آنکھیں بولتی تھیں؟

بولتی تو نہیں تھیں۔ لیکن بولنا جانتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کہہ لیں گی۔ مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہیں۔ ہر وقت پسینے  
 سے دھنکتی۔ نہیں، انہیں ایسی آنکھیں تھیں تم نے دیکھی ہیں جو ہمیشہ پینا سا دکھایا کریں۔

جوانی میں بھی آنکھیں پسینے دھنکتی ہیں میں نے کہا،

ان میں پسینے بڑا ایک کے ایک الگ ہوتے ہیں۔

مجھ سے آہستہ سے کہا۔ میں تو اپنی پر تیرے پر مڑتا تھا کہ مجھے تو کہو یہ اسی لیے ہر اک میری زندگی میں اس سے پہلے کوئی نہ آئی تھی  
 اس سے پہلے نہ اس کے بعد.....

ہر یقیناً نے نہیں دیکھی۔ درندوں نے کہنے وہ تو ایسی صورت تھی جس سے اس کے جری ہونے کے بعد بھی اس سے مشتق ہوا  
 ہاں اسکا تھا اور پھر یوں ہی ہوا۔ جب میں گاؤں پہنچا اور میں نے فوج میں بھرتی ہونے سے کان بٹنے کو ترجیح دی تو میرے باپ نے زور  
 میل بیاہ کر دیا۔ دو مجھے کھیتوں پر کام کرنے کو لگا دیا۔ حالانکہ اسے اس بات میں ہڈی ماری ہوتی ہوگی۔ مگر میں تو بہت خوش تھا۔ تم جانتے ہو کہ  
 میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پریتو سے محبت کر سکتا تھا۔ اب تک تو فرنگیوں کی کسی زکسی زکائی میں بھی میں فرائض میں یا میٹھی یا مادہ خیر میں  
 کہیں نہ کہیں ان لوگوں نے میری جان لے لی ہوتی حالانکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا یا بُرا ہوا۔  
 ایک دم وہ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔

بہت دنوں کے بعد وہ بولا۔ قصہ غفر یہ کہ میں اپنی پریتو کو بہت چاہتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی اور ہم کبھی ایک دن  
 کے لیے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے تھے لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میرا سر سر پہنے گاؤں میں سخت بیمار پڑا اور  
 پریتو کو اپنے بیکے جانا پڑا اس کا باپ بنا تھا۔ اس لیے میں بھی اسے کیسے روک سکتا تھا چنانچہ پریتو چلی گئی۔ لیکن اس کے جانے کے بعد  
 میرا دل اپنے گھر میں کھیتوں میں اپنی گز سوا رہی میں کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ تین دن تو میں نے جیسے تیسے کر کے لائے لیکن چوتھے دن میں  
 نے اپنی گھڑی پر نہیں کسی اور سر پہن کر لیا۔ اپنی سرسرا کے گھر۔ چک جھراں ہمارے گاؤں سے تیس کوس پہ واقع ہے لیکن میری گھڑی بڑی  
 تیز رفتار ہے۔ میں شام ہونے پر تک چک جھراں پہنچ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ میرے سرسرا کی حالت چلتے سے بہت بہتر ہے بلکہ میں نے  
 اسے خاصا جاشا بٹاش پایا۔ سانس اور سرسراؤں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہاں اپنے سرسرا کی صحت بچنے  
 چلا آیا ہے۔ تو وہ میری سعادت۔ ندی بہت خوش ہوئے۔ دن بھر میں کس کام کر کے سے میں بہت تھک گیا تھا اس لیے کچھ ہی کھانا کھا کے میں رو  
 گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جو سونل کا تو پھر سوجی اٹھوں گا میں نے پریتو سے کہا مجھے صبح ضرور اٹھنا دینا۔ میں گھڑی پر سوار ہوا کہ صبح میرے کھانوں کا  
 کہیں ایسا نہ ہو کہ دن چڑھے تک سوتا ہی رہوں۔

لیکن ہوا یہ کہ اس رات تیسرے پری میں میری آنکھ کھل گئی اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری جوی میرے پر نہیں ہے  
 وہ کمرے کے آخری سرے پہ دروازے کے ہنگے سے کھلنے لگا رہا ہونے کی آواز آئی اور ایک سایہ سا دروازے سے نکلتا ہوا معلوم  
 ہوا۔ میں آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا۔ واگور وہ کیا ماجرا ہے؟ سوچ سوچ کر میں آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا۔ کہ پاؤں کو تیکے کے نیچے سے  
 نکال کر پہنا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہوا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ بڑی خوبصورت طشموں والی چاندنی رات تھی۔ سرسرا اٹھ بیٹھم کی شانوں میں چھپے ہوئے گھونٹوں  
 میں کبھی کبھی چڑیاں غونڈی میں چڑی چڑی کرتیں۔ گراں کے چرے وہ اپنی عضوہ چوکی سے ٹھونک کر انہیں اپنی گود میں دبا لیتے میرے پاؤں  
 شبنم میں بیگم چکے تھے اور میرے چادروں طرف سرسوں کی ہری ہری کوئلیں ہرا رہی تھیں اور کھیتوں میں گزرتا ہوا اپنی پریتو کے تعاقب میں چلا تھا  
 پھٹے میں نے سوچا وہ کھیتوں میں مزدوری حواچی سے فارغ ہونے جا رہی ہے۔ لیکن جب اس نے ایک کیفیت کو یاد کر لیا۔  
 دوسرے کیفیت کو یاد کر لیا۔ تیسرے کیفیت کی دھواں سے گھوم نیچے کے خشک نالے کو یاد کر کے ٹیوں کے پیچھے غائب ہو گئی تو مجھے کچھ شب  
 طرح کی تشویش۔ حیرت اور کوفت سی ہونے لگی۔ دل کو دھچکا سا لگا اور اب میں ہولے ہولے بہت ہی احتیاط سے اس کے تعاقب میں چلنے لگا

پہلے کو کوئی اس کے تعاقب میں ہے تیسرے کجیت کی دھماکا سے اتر کر نالے کو ہار گیا۔ پھر قیاد سے قیلوں کے  
پتھ سے خوں کر میں نے آگے کو سفر دوڑائی۔

ساتھ پھر برسوں کے کجیت تھے۔ کھیتوں کے بیج میں ایک کناں تھا۔ کونیں کے قویب بیروں کا ایک ماسے دار جھاڑ تھا  
جہاں کے نزدیک ایک پٹنگ تھا۔ پٹنگ کے قریب ایک نا پختہ گھر تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور پیری پیری اس پٹنگ پر ایک جاٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ پیری پیری جو اس سے بہت زیادہ کہہ رہی تھی وہ  
پیری کی آنکھیں جو مٹی اور اس کے دروازہ اور کتنی شدت تھی اس پیار میں۔ پیری آنکھوں میں خون آنے لگا۔ پیری کے جھٹکے  
پتھ کے قریب ان کو پیار کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ان ان اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

کچھ عرصے کے بعد جاٹ نے پیری پیری سے کہا۔ پرتو! مجھے پیاس لگی ہے اندر سے پانی لا دے:

پرتو نے اپنا سر اس کے سینے سے ہٹا لیا اور بولی پکھنے: تیری پیاس کیا ابھی تک نہیں لگتی؟

پتھ جواب میں صرف سکرا دیا اس نے پیری پیری کے ہوت پر دم لیا۔ پرتو آہستہ سے پٹنگ سے اٹھی اور آدھ کھلے دروازے  
سے باہر نکل گیا۔ پتھ اندر سے مزید لٹ کر بڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ پیری پیری بالکل مٹی تھی۔

یہ ایک میں نے کہاں نکالی اور اس سے اپنے دو وزن ہاتھوں میں لے کر سر کو اوپر اٹھایا اور پھر اپنی پوری طاقت سے پکھنے پر وار کیا  
پتھ کے سر سے حاکم کی ایک مٹی سی آواز نکلی۔ دوسرے لمحے میں اس کا سر قلم ہو گیا۔ پھر میں بیروں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب  
ہو گیا۔ پتھ کے پیچھے سے نالے کو جھڑک کے سرسوں کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے چند لمحوں کے لیے رک کر اپنی کہاں کو منی سے  
پس منصات کیا اور جب وہ بالکل صاف شدت ہو کر نینے کی طرح چمکنے لگی تو اسے میان میں مل کر گھر کے اندر آ گیا اور کمرے کے اندر آ کر پھر  
اپنے اپنے پر سو گیا۔

کوئی آدھ پون گھنٹے کے بعد پرتو میرے گھر میں دیر سے داخل ہوئی، میں جاگ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔  
اور جبے جسے سانس لینے لگا۔ پرتو نے دروازہ کھول کر پتھ کو پتھ کے پیچھے سے برے پتھ کے پیچھے سے کہاں نکالی  
اور اسے خون کر دیکھا۔ اور جب اسے بالکل صاف پایا تو گویا اس کے دل کا شہرہ رو ہو گیا اور وہ پیری پیری بالکل مٹی میں آ کر لیت گئی چپ چاپ پتھر کی  
میں دروازہ کھلے چپ ہو گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا۔

پتھ نہیں پتا؟ اس کا باپ چونکر صحت یاب ہو چکا تھا۔ اس لیے میں پرتو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا اور ہم  
دونوں اپنی خوشی اکتے رہنے لگے۔

دن بیتے۔ جیسے بیتے، سال بیتے۔ میں نے کبھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا نہ پرتو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ ظاہر ہونے لیا  
اُسے کسی بات کا جس شہر جڑا تھا یا اسے کسی بات کا کوئی غم تھا۔ ان ایک بات میں نے ضرور دیکھی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ پھر کبھی اپنے بیکے  
میں کس میرے کہنے پر یا اپنے باپ کے امرا پر بھی نہیں لگتی۔ ہوتے ہوتے میں بھی اس واقعہ کو بھول سا گیا۔ کیونکہ اب میرے بچے ہو گئے تھے  
میرے اور پرتو کے بچے، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑے خوبصورت بچے تھے۔ ہمارے ہر تاپ اور دھپ اور ہر نرم کوہ بڑھتے بڑھتے بچے بھی

جیسے ہو گئے اور سکول جانے لگے۔ سکول سے کالج جانے لگے تو ہمارے ان تیسرا لڑکا پیدا ہوا۔ ہر مہینہ گھر میں شادی ہوا۔  
مررت مٹی۔ آرام دسکون خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور محبت جیسا کہ گھروں کی مثال بتی ہے۔  
ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آئے گھر کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ پتا پ اور دیپ کالج سے واپس آ گئے تھے  
گرمی کی چھبیاں گزارنے کے لیے، ہر نام ایک کونے میں کٹیدہ کاٹھ دی تھی۔ بیڑا سات سال کا مریض کڑی کے گھر سے کو چھانے کی ہتھکنڈ  
کرنا تھا۔ پرتو گھر کے نیچے ایک کونے میں چرے میں کٹی کی روٹیاں بیک دی تھی، ہندی میں برسوں کا سا اُبل رہا تھا۔ اور اس کی کھٹ  
خوشبو میری سحر اور بھی ہے، میں کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کو پاں کھول کر آگ دیکھ دی اور بات مہ دھو کر پرتو کے سامنے منڈیا بچا کر  
بیٹہ گیا اور بالکل بچوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا۔

پرتو جلدی سے کھانا دے دے۔

پرتو نے سب سے پہلے میرے لیے کھانا پڑھا۔ پھر پتا پ کے لیے، پھر دیپ کے لیے، پھر ہر نام کو دے کے لیے، اس سے  
چھوٹا ہر مہینہ بچل کر کہا: میں تو ان کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔

میں نے پرتو سے کہا تو بھی بیٹہ جا اب۔

میں بیٹہ جاؤں گی، تمہیں کھانا کون کھلائے گا؟ پرتو نے زانا کی میکر کر کہا۔

اس وقت چرے کی روشنی میں اس کے رخسار اُٹھ اُٹھتے تھے اور آنکھیں ہوئی ڈلف مانگے ہوئے تھیں۔ مجھے وہ اس وقت بہت  
ابھی تک رہی تھی۔

ماں! مجھے برسوں کا ساگ اور دے دے، دیپ نے اپنی تھالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

پرتو نے ہندی میں سے ساگ کی تڑھی بھر کر اسے دیپ کی تھالی میں اُتار دیا۔

میں نے کہا ہر مہینہ کی ماں! اُٹھو، ساگ اُچھا کر اس وقت کہیں سے مل جائے تو کھانے کا مڑا دونا ہو جائے۔

اچھا تو اندر کوٹھری میں ہے، پرتو نے ڈک ڈک کر کہا۔

کر کہا ہوا اندر سے جا کے لا دے۔

پرتو سہم کر بولی اکیلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اذیت ہے مجھے ڈو لگتا ہے۔

ڈرگت ہے، یہ کیا یک میرے منہ سے ہے اُٹھا، نکلا۔ اس وقت سب کے سامنے اندر جاتے ہوئے ڈرگت ہے لیکن اس نے

کو کھیتوں کو ہار کرے اکیلی جانے میں ڈر نہیں تھا، یہ کیا؟ میں نے ٹک کر کہا جانے کیسے کہہ دیا اتنے سالوں تک جس بات کو کہیں نہ کہتا

کیسے وہ بات میں معنی میں کر اتنے سالوں کے بعد میرے ہونٹوں پر آگئی۔

پرتو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا، دو سرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کو پاں سے میرے ہاتھ

کھڑی ہے پھر ایک بجلی سی تڑپی اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ اُڑا دیا تھا۔

ایک بار، دوبارہ، تین بار کو پاں میرے رخساروں کا کشتی ہوئی میں گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ہاتھوں سے اسے

روکنا چاہا۔ اور چلا یا۔ پرتو، پرتو! ڈک جا۔ مگر پرتو ایک سحر کی شہرٹی کی عزت کو پڑا، وہ کتنی رہی۔ آخر صفحہ میں بھر میں نے ایک جھٹکے میں کو پاں

اُس کے ہاتھ سے چھین لی اور دونوں ہاتھوں سے زبان کو اٹھا کر اور اپنے جسم اور رگوں کی پوری طاقت سے پرتوی گروں پر  
 سرور دار کر دیا۔ پرتوی گروں کٹ کر ہرنس کے گھوڑے کے قدموں میں جا گئی اور دھال سے ٹھٹھک کر میری تھالی میں اوندھی ہو گئی اور  
 اس کے پہاڑ کھل کر میرے سامنے بھر گئے۔  
 بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔ کھڑکی میں چاند بھی ایک محبت ناک بھرت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی کے مسافروں کے چہرے سپید اور  
 بے رونے تھے۔ جیسے وہ چہرے نہ ہوں۔ بہرہ یوں کے خول ہوں۔ گاڑی کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی معلوم منزل کی طرف بڑھتی ہوئی چلی جا  
 رہی تھی۔ اور چاند مجبور اور بے کس نہتا اور اکیلا کھڑکی میں کھڑا تھا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بوڑھے سکھ نے دلگیر لہجے میں کہا۔  
 عورت کبھی نہیں بھولتی، وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسے ایک ٹوٹی میں سوار کر کے، ایک چمک پٹن کو  
 بے ہنگم پیرا کر کے اس کے دل پہ سنا اُس سے چھین سکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے۔  
 عورت کبھی نہیں بھولتی!

بوڑھا سکھ خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے ہنسا کی صلیب پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ  
 سبب موت گبری اُس کے دل کے اندر گوب چکی ہے۔

گاڑی میں اس قدر سناٹا تھا کہ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی میں نے منہ کھول دیا میں بے بسے سانس اندر کو لیے پھر  
 باہر کی نظر کرنے میں سوکے ہوئے جوڑے پوڑی، رز کی کاٹھ اچھی تک رٹنے کے ہاتھ میں تھا اور اس کے کا بازو اچھی تک رٹکی کے  
 آگے بڑھا اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں سو رہے تھے۔ بیک ایک رز کی نے رٹکے کے شانے سے سر اٹھایا۔ آہستہ سے اپنا ہات  
 رٹکے کے پیچھے سے نکالا اور رٹکے کی طرف دیکھا اور جب اس سے اطمینان ہو گیا کہ رز کا گہری نیند سو رہا ہے تو رز کی نے نوجوان کا بازو اپنے  
 منہ سے اٹک لیا اور اس سے منہ پھیر کر چاند کی طرف دیکھا۔ پھر ایسی حسرت آمیز نگاہ سے دیکھا جو اس کی گھٹنا رسلاہٹ کی ہر قدم پر تکذیب  
 لی گئی تھی۔ اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ بیک ایک میرے ذہن میں ایک زبان سی لہلہاتی محسوس ہوئی اور میں نے ڈر کر آنکھیں پٹی کر لیں۔  
 وہ میرے لمحے جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو رز کی نے اپنی کھڑکی پر پردہ گرا لیا تھا اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گو میں اس کا  
 چہرہ دیکھ نہ سکتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

# منہجی کی نمانی

عصمت چغتائی

نہی کی نالی کا نام باپ کا نام تو اللہ جل نہ کیا تھا۔ لوگوں نے کہیں انہیں اس نام سے یاد نہ کیا۔ جب چھوٹی سی بچیوں میں ناک نہ پڑی چہرہ  
عین تو بغام کی کوئی یاد کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دن ”بشیرے کی بہو“ کہلائیں پھر ”بسم اللہ کی ماں“ کے لقب سے یاد کی جانے لگیں۔ اور جب  
بسم اللہ چاہے کے اندر ہی نہی کو چھڑ کر چل بسی تو وہ ”نہی کی نانی“ کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں انہی کی تانی نے اختیار نہ کیا جو کٹر اگلاں پکڑنے کی عمر سے وہ تیرے ہی سے گھوڑے دوست اور پیارے نیکروں کے عوض اُدھے کام پر مدد کی گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے۔ یہ کچھ کہیں کوڑنے کی عمر سے کام پر جوت دینے والے ہی جاتے ہیں۔ ننھے بند کے آگے جھجھنا بھانے کی غیر دلچسپ دیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کے سر کی فائش تک اوپر کے کام کی نہایت میں آجاتی ہے۔

زندگی کی دوڑ جاگ میں کچھ بھینٹنا جھلن بھی آگیا۔ اور زندگی کے کچھ سال مانا گیری میں بیت گئے۔ پر جب دال میں جھپکی لگا زدی اور دوٹیوں میں مکھیاں پر وئے لگیں تو بھیرا ریز ٹاڑ ہونا پڑا۔ اس کے بعد تو نعلی کی تانی بس لگائی بھائی کو سنے ادھر کی ادھر پہنچانے کے سوا۔ کسی کرم کی نہ رہیں۔ بہ لگائی بھائی کا پیشہ ہی خانہ سنانع بن جاتا ہوتا ہے۔ محلاتیں کھٹ پٹ جلتی رہتی ہے۔ مخالف کیمپ میں جا کر اگر ہوشیاری سے مخبری کی جانتے تو خوب خراب خاطر و ارات ہوتی ہے۔ لیکن یہ پیشہ کئے دن چلتا، نانی لٹری مکمل نہ لگس اور دال لگتی نہ پا کر تانی نے آخری اور مفید ترین پیشہ یعنی مہذب طریقہ یہ جبکہ مانگنا شروع کر دی۔

”اے بہوی عیالِ دُعا کی ہیں گوش میں۔ رہے تعلق سے پرہیزیں۔  
 کھانے کے وقت نانی تاک چھید کر سوختیں کہ کس گھر میں کیا پاک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈوسر پہن کر وہ گھریں ان بیٹیتیں۔“

”نہیں بواگھیر نکوڑی آج کل گلیں کہاں ہیں۔ آلودہ ہے۔“

”اے سبحان اللہ۔ کیا خوشبو ہے۔ اللہ رکھے جسم اللہ کے بادا کو آموں سے عشق تھا۔ روزِ نبی کو لبِ لبان کی ماں آلودہ گوش  
جب دیکھو آلودہ گوش۔ اب تو مینوں گز جہادیں آلودہ گوش جو آنکھوں سے بھی دکھ جاوے..... اے پوری کو تیرے چہرہ زیا  
نہ ایک دم نکل نہ ہو جاتی ہیں۔

”نہیں، ہوا کو تغیر نہ کرو سب مار گیا تو اسے کات کیا ہی میں روٹ گیا۔“



ہے بہتر کو تعمیر کے جملہ کو گوش کیا فلک مزہ دے گا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے۔  
 سے نہیں مانی حکیم جی کے ہونے نے کل شبنم میاں کی بھنگ میں کھلی لگا دی۔ اس پر میں نے کہا خبر دلا جو تب مجھے پر قدم رکھا۔ تو...  
 میں نے کچھ تانے ہم سے تھوڑی باتوں کی؟ ادنیٰ ترقی سنبھال سلیپر پر سنبھاتی حکیم جی کے یہاں جا پہنچیں۔ دھوپ کھانے کے پہلے  
 سپان منڈیر تک پہنچ جاتیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سو گئے کے بدلے چکی میں سلتیں۔ حکیم جی کی بہو کی آنکھ پچی اور مارا تانی نے  
 صبراً لڑنے کے بعد ظاہر ہے دو نو اسے کی مختار ہو ہی جاتیں۔

جے اٹھ کی معافی کے لیے سارے محلہ میں شور مچیں۔ کھانے پیئے کی چیز دیکھی اور نقد مار گئیں۔ پیچے کے دودھ کی پتلی شہنہ  
 فٹ یے۔ شکر کی چکی ماری۔ گڑ کی ڈبل تالو سے چپکالی مزے سے دھوپ میں بیٹھی چوس رہی ہیں۔ ڈلی اٹھانی نیچے میں اڑس  
 میں اور آدھی نیچے کے ادھر آدھی ادھر اوپر سے موٹا گڑا آہستہ آہستہ حساب مہولی کر ابھی کو نکلتی جھسک گئیں۔ سب جانتے  
 ہوتے۔ کھوٹے کی ہمت نہ تھی کیونکہ نانی کے بوڑھے ہاتھوں میں بھنی کی سی شہرت تھی اور بے چہلے نکل جانے میں وہ کوئی  
 شہرت نہیں۔ دوسرے ذرا سے شہرے پر ہی وہ فیل چلانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں۔ خزان اٹھانے کی دھمکیاں دیتی  
 تھیں۔ ان سے جھوٹا قرآن اٹھوا کر اپنی قبر میں بھی ڈھپے پڑوائے۔

تری پر چور اور چکر باز ہونے کے علاوہ نانی پر لے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقعہ تھا جو ہر  
 سو اور پتہ تھا۔ کبھی اس برقعہ میں نقاب بھی پر جوئیوں جوئیوں محلہ کے بڑے بوڑھے چل بے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے  
 ہاتھ دیا۔ مگر گوروں وار فیشن۔ بڑے برقعہ کی ٹوپی ان کی کھوپڑی پر چبکی رہتی۔ آگے چاہے مہین کرتے کے نیچے بنیان نہ ہو پر پیچھے  
 بڑے بڑے بول کی جھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقعہ صرف نستر ڈھانکنے کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی  
 سے کیا جاتا تھا۔ اوڑھنے پھانے اور گڑی مڑی کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اُسے تولیہ کے طور پر استعمال  
 کرتیں۔ برقعہ نماز کے لیے جاتا تھا اور جب محلہ کے کتے دانت کھوسیں تو ان سے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی ڈھال۔ کاپیٹڈ کی پر لپکا اور  
 نانی نے برقعہ کا گھیر اس کے منہ پر پھینکا۔ نانی کو برقعہ بہت پیارا تھا۔ فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اس کے بڑے بڑے پر بسوا کرتیں جیسا  
 کہ چھوٹی لڑکی اور اعلیٰ طاہر پوند چکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی لڑا تھی تھیں جب یہ برقعہ بھی چل بسے گا۔ آٹھ گڑھا کفن کو  
 زنجار سے لپی بست جاتا۔

نانی کا کوئی مستقل ہیڈ کو اڈر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے آج اس کے دالان میں تو گل اس کی صحنی میں جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال دیا،  
 جب دھکا پڑی کچھ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقعہ اوڑھاؤ دھا بچھایا لپی تان لی۔

مگر برقعہ سے بھی زیادہ وہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ بھتی ان کی اکھوتی فواہی تھی۔ کڑک مرغی کی طرح نانی پر پھیلے اُسے ہونے  
 تے رہے رہتیں۔ کیا عجیبی جو نظر سے اوچل پر جاسے۔ مگر جب ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا اور محلہ والے چپکے ہو گئے۔ ان کی جوتیوں کی  
 آواز سن کر ہی جہاں چرند ہو کر موہ پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی اُسے نانی کے اشارے کا یہ سے مانگے کو شٹا ان شٹا کر جاتے۔ تو نانی کو  
 اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ نخی کو اس کے آباؤی پیٹھے یعنی اوپر کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انھوں نے اُسے ڈپٹی صاحب  
 نے یہاں لدی کپڑا اور ڈپٹی صاحب نے یہاں میدنہ پر چھوڑ دی دیا۔ پردہ ہر دم سارے کی طرح لگی رہتیں۔ نخی نظر سے ہوجھل ہوئی اور وہ بلبلائیں پر نصیب

عصمت چغتائی

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں شخص کی نانی نے اختیار نہ کیا ہو۔ کس کس کا کس پر کرنے کی عمر سے وہ تیرے میرے گھر میں دودھ دقت کی روٹی اور پالنے پکڑنے کے عوض آپ کے کام پر دھڑلی گھسیں۔ یہ اور پر کا کام کتنا ہیچا چڑھا ہے۔ یہ کچھ کھینچ پکڑنے کی عمر سے کام پر جوت میرے جانے والے ہی جانتے ہیں۔ شے منہ کے آگے جھیننا، جانے کی غیر دلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کے سر کی نالائش تک اور پر کے کام کی فہرست میں آجاتی ہے۔

کھانے کے وقت نانی تاک پھیلا کر سو گھنٹیں کر کر گھر میں کیا پاک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈوس چیک کر وہ گھڑیاں آن بیٹھیں۔  
 ”اے بیوی جیسے ڈالی ہیں گوش میں“ وہ بے تعلقی سے پوچھتیں۔

”نہیں ہوا گھبراؤ، آج کل گلے کہاں ہیں۔“ تو اسے یہ۔  
 ”اے سمان اللہ! کیا خوشبو ہے۔“ اللہ رکھے بسم اللہ کے باد کو آنسوؤں سے عشق تھا۔ روز ہی کہ بسم اللہ کی ماں آنو گو مشش۔  
 جب دیکھو آنو گوش۔ اب تو میدانوں گز جا دیں آنو گوش جو آنکھوں سے بھی دکھا جاوے..... اُسے بیوی کو تعمیر چھڑ دیا!  
 وہ ایک دم غکوند ہو جاتی ہیں۔

”سنیں، بڑا کو قہر لگ رہا ہے، سب ماما گیا، مونسے کا کتا کیاری میں لوٹ گیا۔“

ہے بھر کو تیرے جلاؤ گویا خاک مرہ وے گا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے۔

مے نہیں تانی حکیم جی کے نوڈے نے کل شبنم میاں کی جنگ میں کھلی لگا دی۔ اس پر میں نے کہا خبر ملے جو مجھے پر قدم رکھا۔ تو... مے میں کوئی تانے نام سے قہوڑی مانگوں گی۔ اور تانے برقع سنبھال سلیریں بیٹھانی حکیم جی کے یہاں جا پہنچتیں۔ دھوپ کھانے کے بہانے فیسٹیو کھینچ کر دی کے پاس منڈیر تک پہنچ جاتیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سونگھنے کے بہانے چکی میں سلستیں۔ حکیم جی کی ہوک آنکھوں بھی اور مار تانی نے کھسک پڑا۔ کو حقیر مہیا کرنے کے بعد غلا ہرے دو فوڑے کی ہمدرد ہو ہی جاتیں۔

نانی اپنے اٹھ کی صفائی کے لیے سارے محلہ میں مشورہ خیز کھانے پینے کی چیز دیکھتی اور رقم مار گزرتی۔ بچے کے دودھ کی پتیلی منہ سے دکانی دو گھونٹ غٹ لیتے۔ شکر کی چھٹی ماری۔ گڑ کی ڈبلی تانوسے چپکانی نرے سے دھوپ میں بھی جوس ری ہیں۔ ڈلی اٹھائی نیچے میں اڑس۔ چھانیاں میں اور آدمی نیچے کے ادھر آدمی اور ادھر آدمی سے موٹا کر تا آہستہ آہستہ حسب معمول کراہتی کو نکلتی کھسک گئیں۔ سب جانتے ہیں۔ ہر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ نانی کے بوٹے باغوں میں بھلی کی سی مٹھرت تھی اور بے چارے بگل جانے میں وہ کوئی شب نہ سمجھتی تھیں۔ دوسرے دن سارے شہر پر ہی وہ فیل چمانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں۔ قرآن اٹھانے کی دھمکیاں دیتی تھیں۔ اب کون ان سے جھوٹا قرآن اٹھو اگر اپنی قبر میں بھی کیڑے پڑ جائے۔

نڑی پر چور اور چمکے باز چورنے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقع تھا جو ہر سال ان کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقع میں نقاب بھی تھی پر جوڑوں تو اس محلہ کے بڑے بوٹے چل بے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے صاحب کو خیر باد کہہ دیا۔ مگر گنگوڑوں وار فیشن ایل برقعہ کی ٹوپی ان کی کھوپڑی پر چکی رہتی۔ آگے چاہے مہین کرتے کے نیچے بنیان نہ ہو پر پیچھے برقعہ بادشاہوں کی جھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقعہ صرف ستر ڈھانکنے کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے کیا جاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے اور گڑی مڑی کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اُسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ برقعہ زمانہ کے لیے جاننا اور جب محلہ کے کتے دانت نکوسیں تو ان سے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی ڈھال۔ کتابیڈی پر لپکا اور نانی کے برقعہ کا گھبراؤس کے منہ پر پھنکا دیا۔ نانی کو برقعہ بہت پیارا تھا۔ فرست میں بیٹھ کر حسرت سے اُس کے بڑے پاپے پر بسوڑا کرتیں جہاں کوئی جند نہ کتر ملی اور احتیاطاً ہوند چکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی رزاضتی تھیں جب یہ برقعہ بھی چل بے لگا۔ آٹھ گڑ لٹا کھن کو بڑھانے سے بھی ہمت نہ جاتا۔

نانی کا کوئی مستقل مہر کوادر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے آج اس کے دالان میں توکل اُس کی صفائی میں جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال دیا، جب۔ دھنکار پڑی کوچ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقعہ اوڑھاؤا کھچا یا لمبی تان لی۔

مگر برقعہ سے بھی زیادہ وہ جس کی ٹکڑی گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکوئی فوای نہ تھی۔ کوک مرغی کی طرح نانی پر پھیلے اُسے بوٹے سے دسے رہتیں۔ کیا عجیب اور غریب اور اہل ہو جاتے۔ مگر جب باغیروں نے جواب دے دیا اور محلہ والے چمکتے ہو گئے۔ ان کی جوتیوں کی آواز سن کر ہی جاتی چہرہ بند ہو کر مدح پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی اُسے نانی کے اشارے کنایہ سے مانگنے کو کھٹا آن سنا کر جاتے۔ تو نانی کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ تھی کو اُس کے آباؤی پیٹھے یعنی اوپر کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انھوں نے اُسے ڈپٹی صاحب کے یہاں مدنی کپڑا اوڑھ بیٹھ کر مدیہ میدہ پر چھوڑ ہی دیا۔ پردہ ہر دم سارے کی طرح لگی رہتیں۔ ننھی نظر سے اوجھل ہوئی اور وہ بلبلائیں۔ پر صیب

کا مکمل گھبراہٹ سے ہٹ کر وہ دوسرے طرف ہٹ گیا۔ ڈپٹی نے اپنے بھائی کے گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی تھیں۔ وہ پھر کا وقت تھا۔  
تانی مندر پر جا کر بیٹے کی چھان بین کی۔ ڈپٹی نے تو اپنے ناموں کے ہاں بیٹے کی بات لے کر گئی ہوئی تھیں۔ سرکلر خاص خانے میں  
قبول فرما رہے تھے۔ نئی پٹری کی دھڑکی تھی۔ اوگھ رہی تھی۔ چلکا لڑک گیا اور سرکار کی لینڈ ٹوٹ گئی۔ شیطانی جہاں اٹھا اور نئی کی آست  
سو گئی۔

کتنے ہیں بڑھاپے کے سبب سے بچنے کے لیے مختلف ادبیات اور طلاؤں کے ساتھ حکم میں جو زندگی کی نئی جی جی فرماتے  
ہیں۔ نو برس کی نئی چوڑی ہی تو تھی۔

مگر جب نئی کی تانی کی آنکھ کھلی تو نئی غائب۔ محلہ جہاں ہلا کوئی سرخ رنگ ملا مگر رات کو جب تانی حلی باندی کی نظری کوئی تو کوئی نہ ہوا  
سے کئی ہوئی نئی زخمی چڑیا کی طوطا پئی پھیل چکی آنکھوں سے گھر رہی تھی۔ تانی کی لٹکی بندھ گئی اور اپنی کمرہ کی کچھ پانے کے لیے وہ اسی گایاں میں  
گئی۔ یہ اتنا ہی اچھا چکا۔ یہاں کان کمری ہے۔ دھونڈتے دھونڈتے پنڈیاں سوچ گئیں۔ غم تو جامہ کا سسے کی جار چوٹ کی مار لگوانی ہوتی  
مگر نئی کی چوٹ زیادہ دیر نہ چھپ سکی۔ تانی سر پر دو ہتر مار مار کر چلکا ڈسنے لگی۔ پڑوس نے سنا تو سر پر کڑ کوہ گئیں۔ اگر صاحب  
کی لغزش ہوئی تو شاید کچھ ڈانٹ ڈپرٹ ہو جاتی۔ مگر ڈپٹی صاحب ..... محنت کے مکھیاتی تو سوں کے تانا بوجھ نہ تھی۔ اسی  
پچھلے دنوں مسجد میں چٹائیاں اور لٹے رکھوئے۔ مزے سے چھوٹنے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی تانی نے تانسوہ کی کرنخی کی کمر سینکلی آئے گئے کا حلو اکللا اور اپنی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہی۔ دھچار  
دن لوٹ بیٹ کر نئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور چند دنوں میں سب کچھ بھول جال گئی۔  
مگر بعد کی شریف زاد ہاں نہ بھولیں۔ چھپ چھپ کر نئی کو بلاتیں۔  
”نہیں..... تانی مارے گی“ نئی طاقی۔

”یہ چوڑیاں ہیں۔ تانی کو کیا خبر ہوگی.....“ بیویاں بے قرار ہو کر پھسلاتیں.....

دلایا ہوا..... کیسے ہوا..... بلکی تھیں پوچھی جاتی۔ نئی کچی کچی معصوم تفصیلیں دیتی۔ بیویاں ناگوں پر  
دوبہٹے رکھ کر کھٹکھٹاتیں۔

نئی بھول گئی..... مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچی کھی قبل از وقت توڑ کر کھلانے سے بچھڑیاں جھڑماتی ہیں..... غلط  
رہ جاتا ہے۔ نئی کے چہرے پر سے بھی نہ جانے کتنی معصوم پنکھڑیاں جھڑ گئیں۔ چہرے پر پھٹکا مارا اور روٹا پین۔ نئی بھی سے لڑکی نہیں ملے۔  
چھلانگ مار کر ایک دم عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنوادی بھر پور عورت نہیں۔ بلکہ بیڑوسی میڑوسی عورت جس پر کسی  
دیہلے دوڑ لہا پاؤں رکھ دیا ہو۔ شگفتگی۔ موٹی۔ کچھ راسی جیسے کچی مٹی کا کھلنا کھار کے گھٹنے سے دب گیا ہو۔

میلی صافی سے کوئی ناک پوچھے جا رہے کوٹے، اکون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اُس کے چکیاں جھرتے۔ مٹھائی کے دوئے  
کچھ اتنے۔ نئی کی آنکھوں میں شیطان متحرک اٹھا..... مگر اب تانی بجائے اُسے حملے مانڈے ٹھسانے کے اُس کا دھوبی گھاٹ کرتی  
مگر میلی صافی کی دھول میں نہ جھرتی۔ جاؤں درج کی گینڈ، پٹا کھایا ادا اچھل گئی۔

چند سال ہی میں نئی کی چھٹکی سے عکس لڑا اٹھا۔ سنا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ تین گئی۔ پھر سنا مسجد کے مندرج

روا کر مارنے یا تنے مارنے چھوڑا۔ پھر سنا صدیق پہلوان کا ہمارے مستحق ہو گیا۔

اُسے دن نخی کی تاک کھٹے کھٹے بجتی اور گلیوں میں لٹ پڑ گیا ہوتا۔

اور پھر نخی کے تلوے جلنے لگے۔ پیر و صر نے کی رتی بھر جگر نہ رہی۔ صدیق پہلوان کے ہمارے کی پہلوانی اور نخی کی جوانی نے تلوے کا نا طعہ بند کر دیا۔ سننے ہیں رتی، بیٹی میں اس مال کی تھوک میں کھیت ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن نخی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہوا۔ وہیں دن سے گھوڑی چپ چپ سی نخی۔ نانی سے بد زبان بھی نہ تھی۔ چپ چاپ آپ ہی آپ میٹھی بھائی میں گھر راکھتی۔

”اے نخی روٹی کھالے“ نانی کہتی۔

”نانی بی بھوک نہیں!“

”اے نخی اب دیر ہو گئی سو جا“

”نانی بی میں نہیں آتی۔“

رات کو نانی کے پیر و بانے لگی۔

”نانی بی..... اے نانی بی“ ”سبحانک اللہ“ ”سن لو باد ہے کہ نہیں۔ نانی نے سنا فرز یاد!“

”جانی اب سو جا“ نانی نے کروٹ لے لی۔

”اے نانی کیوں نہیں؟“ نانی نے غور سے دیر بعد اُسے صحن میں کھٹ پھٹ کرتے سن کر کہا۔ کبھی خاکی نے اب انگوٹھی بلبید کرنا

شروع کیا۔ کون حرامی ہے جسے آج گھر میں گھسلائی ہے۔

پرمی میں گھوڑ گھوڑ کر دیکھنے پر نانی سمجھ کر رہ گئی۔ نخی عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ اور صبح نخی غائب ہو گئی۔

کبھی کوئی دور دبیس سے آتا ہے تو خبر آجاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے نخی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے۔ ٹھٹھ

بے ہوشوں سونا ہے بگیوں کی طرح رہتی ہے۔

کوئی کہتا ہے ہیرا منڈی میں دیکھا تھا۔

کوئی کہتا ہے فارس پہلے پراور کسی نے اُسے سونا گاجی میں دیکھا۔

مگر نانی کہتی ہے نخی کو یہ فتنہ ہوا تھا۔ چار گھڑی ٹوٹ چوٹ کر گر گئی۔

نخی کا سوگ منانے کے بعد نانی کچھ خبیث بھی ہو گئیں۔ لوگ راہ چلتے پھیر غانی کرتے۔

”اے نانی نکاح کر لو۔“ ”جانی جان چیر تیں۔“

”کس سے نکاح؟“ لا اپنے ختم سے کرا دے۔ ”نانی بکڑ تیں۔“

”اے نانی قادیان سے کرو۔ اور قسم تم پر جان دیتے ہیں“ اور نانی کی مخالفت شروع ہو جاتی۔ وہ وہ پیرے گایوں میں نکالتیں کہ

لوں جو چلے رہے جاتے۔

”مل تو جائے بھڑوا..... ڈار مٹی نہ کھیر لوں تو کہنا“ ”مگر جب علاج کبھی مل جاتے تو نانی سچے شرما سی جاتیں۔“

علامہ عہد کے لڑکوں یاوں کے نانی کے ازلی دشمن تو مرنے لگے بڑے بندر سے جو پڑھیوں سے اسی محلے میں پڑھتے بڑھتے آئے تھے۔ جو ہر فرد کا کچا کھٹا ہانستے تھے۔ مرد و عورتیں ہر ذات کے اور بچے ہر ذات کے عورتیں تو صرف ڈر ہو کر جھپتی ہیں۔ بڑھائی بھی انھیں بندوں میں چل کر بڑھائی تھیں۔ انھوں نے بندوں کو ڈرانے کے لیے کسی بچے کی خلیل بھتیالی تھی۔ اور سر پر برقعہ کا پکڑ بانڈھ کر وہ خلیل تان کر جب اپنی بھتیالی تو بندر تھوڑی دیر کو شہر درہ جاتے اور پھر بے توجہی سے چلے گئے۔

اور بندوں سے ان کی آئے دن باسی ٹکڑوں پر پڑھ چلتی رہتی۔ عہد میں جہاں کہیں شادی بیاہ چلا جائے سو ان ہوتا نانی جو بڑے ٹکڑوں کا ٹھیکہ لے لیتیں۔ لنگر خیرات مثنی تو بھی چار چار مرتبہ چمکے۔ دے کر حصہ لیتیں۔ سواں کھانا بٹور لانے کے بعد وہ اُسے مسرت سے بھکتیں اکاش ان کے پیٹ میں بھی اندھا پاک نے کچھ اونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا تو کتنے مزے دیتے۔ مزے سے بہاروں کی غور اک حصہ میں بھر لیتیں جیسی ہوتی۔ مگر اندھا پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹا نہ کیا۔ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے کا تصور ٹھکانا نہیں۔ اس لیے نانی مات کے بیروں پر جو بڑے ٹکڑے پھیل کر سکھائیں۔ تیس پھر انھیں ٹکڑوں میں بھر لیتیں۔ جب بھوک لگی ذرا سے سوکھے ٹکڑے چمکے پانی کا چھینٹا دیا چھٹی پھر دھو کر مرغ بڑا کا اور لہندہ ملو بہ تیار۔ لیکن گرمیوں اور برسات کے دنوں میں بار بار یہ نسخہ اُن پر سیفہ طاری کر چکا تھا۔ چنانچہ بٹور جانے پر طوعاً و کرہً اُن ٹکڑوں کو اُدسنے پونے بیچ ڈالتیں تاکہ لوگ اپنے کتوں اور بکریوں وغیرہ کو کھلا دیں۔ مگر عموماً کتوں اور بکریوں کے منہ سے نانی کے ڈھپٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ مول تو کیا تحفہ بھی ان فوگات کو قبول نہ کرتے۔ وہی عزیزانہ جان جو بڑے ٹکڑے جنھیں بڑے کے لیے نانی کو ہزاروں معلوماتیں اور ٹوکریں سہنا پڑتیں اور جنھیں دھوپ میں سکھانے کے لیے انھیں پوری بندر جاتی سے جہاد مول لینا پڑتا۔ جہاں ٹکڑے پھیلے گئے اور بند روں کے قبیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی۔ اب کیا بے غول درغول دیواروں پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کچھ یوں پر دم مار کر کڑی چال رہے ہیں۔ چھپر کھسٹ رہے ہیں اور آتے جاتے پر خوشیاں رہے ہیں۔ نانی بھی اس وقت مرد میدان بنی سر پر برقعہ کا ڈھاننا بانڈھ سے آخر میں خلیل لیے مورچہ پر ڈٹ جاتیں۔ سارا دن "لگے۔ لگے" کر کے شام کو بچا کچا کوڑا بٹور بندروں کی جان کو کھسی نانی اپنی کوٹری میں ٹھک کر سو رہتیں۔

بندوں کو اُن سے کچھ ذاتی قسم کی پرغاش ہو گئی تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیوں جہاں بھر کی نصحتوں کو چھوڑ کر صرف نانی کے ٹکڑوں پر ہی حملہ آور ہوتے۔ اور کیوں ہر ذات لال بچھائے والا ان ہی کا عزیز ازجان ٹیکہ لے بھاگتا۔ وہ ٹیکہ جو خفی کے بعد نانی کا اور عزیز اور پیارا دنیا میں رہ گیا تھا۔ وہ ٹیکہ جو برقعہ کے ساتھ اُن کی جان پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیونوں کو وہ ہر وقت پکا ٹھکانہ مارتی رہتی تھیں۔ بار بار نانی کسی کو نے کھد رے میں میٹھی ٹیکہ سے ایسے کھید کرتیں جیسے وہ ننھی سی بچی ہوں اور وہ ٹیکہ اُن کی گریباں وہ اپنے سارے دکھ اُس ٹیکے ہی سے کہہ کر جی ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انھیں ٹیکہ پر لاڈ آتا وہ اس کے ٹٹکے پکے کرتی جاتیں۔

نصرت کے کھیل دیکھتے نانی منڈیر سے لگی برقعہ کی آڑ میں خیفہ سے جو میں چن رہی تھیں کہ بندر دم سے کودا اور ٹیکہ لے یہ جا رہا جا۔ ایسا معلوم ہوا کوئی نانی کا کلچر نوچ کر لے گیا۔ وہ دھاڑیں رہ چلائی کہ سارا عہد اکٹھا ہو گیا۔ بندروں کا قاعدہ ہے کہ آٹھ پچی اور کوڑا گلاس لے بھاگے اور بچے پر بیٹھے دو لون دو لون ہاتھوں سے کوڑا

اور کس دے ہیں۔ کوئسے کا مالک نیچے کھڑا چکا رہا جسے پیاز دے دوٹی سے جب بندریاں کا پیٹ بھر گیا کوٹرا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی سے علی بھر خوشہ لٹا دینے پر حرامی بندر نے نیکر نہ چھوڑا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کئے گئے مگر اس کا جی نہ کھلا۔ اور اس نے مزے سے نیکر کے ٹٹا پیاز سے جھلون کی طرح تار نے شروع کئے۔ وہی نلات جنہیں نانی نے چند سی آنکھوں سے گھور گھور کر پکے ٹانگوں سے گونٹا تھا۔ جوں جوں غلات اترتے جاتے تانی کی بدحواسی اور بیدارگی میں زیادتی ہوتی جاتی۔ اور آخری غلات بھی اتر گیا۔ اور بندر نے ایک ایک کر کے چھجور پر سے ٹپکا مارا۔ دوٹی کے گلے نہیں بلکہ شبن کی فتویٰ۔ جو سٹے کا انگو چھا..... حسینہ بی کی انگلیا..... منی بی کی گڑیا کا سطرارہ۔ رحمت کی اور منی اور غیراتی کا کھننا.....

خیر ان کے لونڈے کا طعنے..... غشی جی کا مغل اور ابراہیم کی قمیص کی آنتیں معد کھٹ! صدیق کی تھمہ کا کلڑا۔ آمنہ بی کی مرمرہ دانی اور بغاٹن کی کھوٹی۔ سیکند بی کی افنان کی ڈبیر۔ علی جی کی تسبیح کا امام اور باقریوں کی سحر گاہ۔ بسم اللہ کا سوکھا ہونا اور کلاوہ میں بندھی ہوئی خفی کی پہلی سا لگرہ کی بلدی کی گانٹھ دوپ اور چاندی کا چھلا۔ اور بشیر خاں کا کلا فاسد جو اسے جنگ سے زندہ لوٹ آئے نہ پر سرکار عالیہ سے ملا تھا۔

مگر کسی نے ان چیزوں کو نہ دیکھا۔ بس دیکھا تو اس چوری کے مال کو جسے سا لہا سال کی چھاپہ ماری کے بعد نانی نے کھدوٹ

خوار کیا۔

”چور۔۔۔۔۔ بے ایمان..... کمینی“

”کھا تو بڑھیا کو محلے سے“

”پولیس میں مے دو“

”ارے اس کی تو شک بھی کھو لو اس میں نہ جانے کیا کیا ہو گا؟ غرض جو جس کے مز میں آیا کہہ گیا۔

نانی کی چھین ایک دم رگ گئیں۔ آنسو خشک۔ سر نیچا۔ اور زبان گنگا کا تو تو خون نہیں۔ رات بھی جوں کی توں دونوں گھٹنے ٹیٹوں ہیں دابے ہل بل کر سوکھی سوکھی چکیاں لیتی رہیں۔ کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کر کے کبھی بسم اللہ اور خفی کو پکار کر کہیں کرتیں..... دم چھ کو اڈنگھ جاتی پھر جیسے پرانے ناموروں میں چپوٹے چٹکنے لگتے اور وہ بلبلا کر چونک اٹھتیں۔ کبھی جبکی پہلی باتیں کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا اٹھتیں اور پھر تاریکی میں سے کوئی پرانی یاد کا بھلا کھینچ مارتا اور وہ بیمار کتے کی طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلے کو چونکا دیتیں۔ وہ دن اسی حال میں بیت گئے۔ محلہ والوں کو آہستہ آہستہ احساس ندامت ہونا شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو ان چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کاروبار پیٹ کر بھڑی چکے تھے وہ بچائے خود کو نہ بچتی تھے۔ تنکے کا بوجھ بھی ایسے موقع پر انسان کو خستہ کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے بغیر زندہ تھے۔ شبن کی فتویٰ اب سردیوں سے دھبکا مٹی کرنے کے قابل کہاں تھی، وہ اس کے ٹٹنے کے انتظار میں اپنی بڑھوار غٹوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ بی نے انگلیا چولی کی آہستہ کو تیار کچھ کر اسے خیر باد کہہ یا تھا۔ منی کی گڑیا کا سطرارہ کس مصرت کا وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گزر کر ہنڈ کھینوں کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ محلہ والوں کو نانی کی جان لینا غٹوڑی منظور تھی۔

پرانے زمانہ میں ایک دیو تھا۔ اس دیو کی جانی تھی ایک بھورے میں رات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا۔ اس صندوق

میں ایک اور صندوق اور اس صندوق میں ایک ڈیرہ مٹی میں ایک بھونڑا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا..... اور اس نے پہلے بھونڈے کی ایک ٹانگ توڑ دی، اور دیکھو کی ایک ٹانگ جادو کے زور سے ٹوٹ گئی پھر اس نے دوسری ٹانگ توڑ دی اور دیکھو کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی پھر اس نے بونڈے کو سسل ڈالا اور دیو مر گیا۔

نانی لی جان بھی تکیہ میں تھی۔ اور بندہ نے وہ جادو کا تکیہ دانتوں سے چیر ڈالا۔ اور نانی کے کلبے میں گرم سلاخ اتر گئی۔ دنیا کا کوئی دکھ کوئی ذلت کوئی بدنامی ایسی نہ تھی جو نصیب نے نانی کو نہ بخشی ہو۔ جب سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گر اٹھا تو بھی یقین اب کوئی دن کی جان ہیں، پر جب بسم اللہ کو کفن پہنانے لگیں تو یقین ہو گیا کہ ادنٹ کی پیٹ پر یہ آخری تنکا ہے۔ اور جب نفی منہ پر کا لکھ لگا گئی تو نانی جھپٹیں بس یہ آخری گھاؤ ہے۔

زمانہ بھر کی بیمار باں پیدائش کے وقت۔ سے جھیلیں سات بار تو چھپک نے ان کی صورت پر جھانڈ پھیری۔ ہر سال تیج تہوار کے موقع پر ہیضہ کا تملہ ہوتا۔

تہہ ایزہ اگر موت دھوتے دھوتے انگلیوں کے پورے بڑے بڑے برتن مانگتے مانگتے ہتھیلیاں چھانی ہو گئیں۔ ہر سال اندھیرے اُجالے اور پکی نیچے میٹرھیوں سے لٹھک پڑتیں۔ دو چار دن تو پٹ کر پھر گھسٹے گھسٹے۔ پچھلے جنم میں نانی ضرور کتے کی بلی رہی ہوں گی۔ جی تو اتنی سخت جان تھیں۔ موت کا کیا واسطہ جو ان کے قریب پہنچ جاتے۔ لمبی نال لگائے پھریں گی مگر مردہ کا کپڑا اتنی سے نہ چھو جائے، کیم مرنے والا سلوٹوں میں موت نہ چھپا گیا ہو جو نازوں کی پالی نانی کو آن دلوچے اگلیوں عاقبت بندروں کے ہاتھوں سے لگی، اس کی کتے خبر تھی۔ صبح سویرے ہشتی مرٹک ڈالنے گیا تو دیکھا نانی کھیر لی کی میٹرھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہیں، منہ کھلا ہے۔ یکھیاں نیم دا اکھسوں کے کوڑوں میں گھس رہی ہیں۔ یوں نانی کو سوتا دیکھ کر وہ گ انہیں مردہ سمجھ کر ڈر جائا کرتے تھے۔ مگر نانی ہمیشہ بڑا کر طعم تھوکتی جاگ پڑتی تھیں اور ہونسنے والے کو ہزار اعلو انیس سنا ڈالتی تھیں۔

مگر اس دن میٹرھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی نانی دنیا کو ایک مستقل گالی دے کر چل بسیں، زندگی میں کوئی گل سیدھی نہ تھی۔ کر وٹ کر وٹ کانٹے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں لٹائی گئیں۔ ہزار کھیل تان پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔



# الحمد لله

## احمد ندیم قاسمی

شادی سے پہلے مولوی اہل کے بڑے شاعر تھے۔ کھدر یا سبھی کی زندگی جگہ محنتی رنگ کی سبز دھاریوں والی ریختی خوشامی تھی، دگر زبوسکی کی لیس جس کی آسمنوں کی چٹوٹوں کا شمار سیکڑوں تک پہنچتا تھا۔ اودے رنگ کی محل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا اور دوسری جیب میں نسواری کی نقری ڈبیا ہوتی تھی۔ سر پر بادامی رنگ کی مشدیدی رنگی جس میں سے کلاہ کی مٹلا چوٹی چمکتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں حصا جس پر جگہ جگہ ٹھٹ کے بند اور پٹیل کے کوکے جوڑے تھے۔ بالوں میں کوئی بڑا کا فریل سبکی خوشبو کیوں میں تھکتی رہ جاتی تھی۔ ندے سے اوپر اٹھتی ہوئی لکڑیوں والی آنکھوں کے پوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں میں حاجیوں کے لاسے ہوئے بڑے بڑے انگلیوں والی چاندی کی انگشتریاں جو دمنو سے پہلے دن میں چار پانچ بار اترتی تھیں مگر ان کی ترتیب میں کبھی کوئی فرق نہ دیکھا گیا۔ اور پھر مولوی اہل کی آواز! کمرے اندر آتے لے کی بجٹی ہوئی یہ نصحت کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوتی وہ نہ اگر مولوی اہل مابے کی کلی الاپ دیتا تو گاؤں بھر کی دگر کی کسبیاں اٹھ اٹھ جاتا۔ ہر عید پر خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع کئے ہوئے ڈیڑھ سو روپوں کی پوٹکی چھین سے آگرتی تو وہیں نمازیوں کے سامنے چالیس پچاس روپے گاؤں کے مسکینوں، محتاجوں میں بانٹ دیتا اور ان سے کہتا دیکھو دعا میں نہ دو، اس اللہ جل شانہ کو یاد کرو جو پھر میں کیرا پیدا کرتا ہے تو وہیں سے اسے خوراک بھی پہنچاتا ہے مجھے دعا میں نہ دو، مجھے اس نے کیا نہیں دیا۔ صحت، اطمینان اے ندری، مجھے تو اس کی رحمتوں کے غزلانے سے اور کچھ نہیں چاہئے۔“

لیکن شادی کے بعد اللہ جل شانہ کی رحمتوں نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔ مولوی اہل کے ہاں اولاد کا کچھ ایسا تانا بندا تھا۔ سب ایک سال اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ سیدھا حکیم کے ہاں دوڑا گیا۔ اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہو اتو زیر النساء کے نظام تخفیف میں کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ زیر النساء کے ہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جانے پر بھی سورج طلوع نہ ہو۔ اور جب اگلے سال سورج طلوع ہوا تو مولوی اہل کی جان میں جان آئی۔ یقیناً اولاد کی افراط خدائے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھی۔ مگر مشکل یہ آئی پڑی کہ ریشمی خوشامی رنگی صافی بن کر رو گئی تھی۔ بوسکی کی قیس برسوں پہلے پوٹوں کے روپ اختیار کر چکی غائب ہو چکی تھی۔ اودا سب اس کی جگہ گاڑھے کے چوے نے لے لی تھی جو کئی بار دھلنے کے باوجود بوس میلہ میلہ سا لگتا تھا جیسے اسے جھٹکے وقت جلا ہے نے سوت کے تانے بانے میں ٹھوڑی سی غلاظت بھی بن ڈالی ہے۔ مٹلا کلاہ کی داڑھی تو بچیں لکڑی تھیں۔ انگشتر یوں کی چاندی اور حصا کا لکڑی لکڑیوں کے بندوں جھکوں کی ندر ہر چکا تھا۔ سرخ سرخ پوٹوں والی

ہندوؤں میں پتلیاں لگے اس طرح جنت میں پہنچے کہ مولوی اہل برہمنیت نزع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا تاہم توڑ بہت سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی تاہم توڑ تھیلیاں ہو رہی تھیں مولوی اہل نے اپنی پہلوئی کی بیٹی مہرا النساء کے لیے جو ہوتا ایک ایسے میں خرید تھا ایسا ہی ہوتا مری نے اس کی سب سے چھوٹی بیٹی عذرا النساء کے لیے چھ روپے میں تیار کیا تھا۔ اور جب مولوی اہل نے شکوہ کیا تو مری کو لاہ میں سے تو مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اور ہوتا تو چھ چھوڑ دے ماریتہا چڑھنے کو آگ لگ گئی ہے۔ تمہیں یوں ایک دم تڑن سے اور پڑھو گئی ہیں کہ لگتا ہے دنیا بھر کی گائیں بھینسیں کہیں کوہ خات پر بھیج دی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت سے ایک چوٹی کھا رہا ہوں، پچھلے آپ چوٹی کو بھی جانے دیجئے۔ اس میں ذرا سا بھی جھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں۔ جنازہ تک نصیب نہ ہو۔“

اگر خداؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریات زندگی کا اتنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی اہل خدا سے اپنی عمر کے لیے جوتے مانگتا۔ رات کو زیب النساء سے مشورہ کیا۔ اور جب اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے لحاظ کا ایک کوٹا ٹھاکر مولوی اہل کو عذرا النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایک دم رو دیا۔ اور دوسرے روز صبح کی نماز اور دعاؤں کے بعد پونے چھ روپے مری کی نذر کر آیا۔ اور مری کی دکان سے اٹھ کر کئی میں آیا تو اللہ جل شانہ کو صلف و غطرہ مان کر کھراستہ تو بہ کر لی۔

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریات زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی۔ اور اولاد کے ساتھ مولوی اہل کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ادھر مہرا النساء نے چودھویں سال میں دم رکھا اور مولوی اہل کی یہ حالت ہو گئی کہ رکوع میں گیا ہے تو اُسٹے کا نام نہیں لے رہا۔ سجدے میں پڑا ہے تو بس پڑا ہے۔ ہوشیہ مقتدیوں کو وقت پر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی اہل ایک ہی سجدے میں ظہر کو عصر سے ملا دیتا۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کی سعادت حسب دستور اسی کے سپرد ہوتی، مگر وہ مولوی ابوالبرکات جو آیات یا الفاظ کی غلطی تو کیا کبھی نہ نہ نہ کی غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوا تھا۔ البقرہ سے النساء میں جانا نکلا۔ اور سورہ رحمن پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی میں لے دیا۔ پڑھ ڈالا۔ چودھری فتح داد کو سی نشین و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نے جب اسے اس استغراق پر سرزنش کی تو ایک بار تو مولوی اہل کے جی میں آئی کہ پکار اُسٹے مدد آپ کے ہاں تو نو نڈوں کی کھپ ہے نا چودھری صاحب۔ آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہو گئی ہوتی تو میں آپ کو سمجھانا کہ ایک سورت کو دوبارہ کیسے پڑھ لیا جاتا ہے۔ لیکن چودھری فتح داد کی یہ سرزنش زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی۔ روزنہ بھی چودھری جی تو تھا جو برسوں سے مولوی اہل کے گھر میں ہر شام کو گھسی گئی ایک روٹی اور والی شربے کا ایک سیکور اس التزام سے بھجواتا تھا کہ جیسے ایک وقت ناعد ہو گیا تو سورج سوائیر سے پر اتر آئے گا۔ اور حدیث تھی کہ جس روز روٹی یا دال سان بھجولے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چودھری فتح داد بنفس نفیس مولوی اہل سے معافی مانگنے آتا مگر آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہو گا قبل ازیں اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں۔ چودھرائی ذرا بیمار تھی اور کھانا نائے تیار کیا۔ وہ حرامزادی یہ بھول گئی کہ آپ کو یہاں سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کھارہ ادا کرنا ہو گا۔“

یہ مدو نظیفے مختلف نوعیت کے تھے۔ اور معبرات کو تو مولوی اہل کے ہاں نہ آتا گذشتہ تھا اور نہ ہنڈیا چڑھتی تھی۔

مولوی اہل کے عقیدت مندوں کے ہاں سے ایک درجن کے قریب بڑی جاندار روٹیاں بجاتی تھیں۔ اور حبیب النساء نے گھر میں لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھانے کا سلسلہ بیاہ کے تین مہینے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ جمعرات کو ہر لڑکی چھوٹے چھوٹے سے "مطیفوں" پہن کر ڈانسی شکر رکھ کر رات کو حبیب النساء کو دو چنگیریں ان کے لیے لگ رکھ دینا پڑتیں۔ اس روز دونوں وقت سب تہہ بہہ ہو کر کھاتے۔ جو دلیف باقی بچتے تھیں۔ صبح میں سکھایا جاتا اور مہینے میں چار بار اہل گھر کے شربت میں اُبال کر پیٹھے ٹھٹھے تیار کئے جاتے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ انسان کو ہیٹ جیسے کسے پیسے روٹی کے علاوہ پیٹ ڈھانکنے کے لیے کچرا بھی تو چاہیے، چودھری فتح داہرہ بڑی فصل پر مولوی اہل کو ایک پوشاک بھی پیش کرتا تھا۔ لیکن جب یہ پوشاک گھر میں آئی۔ ایک اہل دھڑی کی دوکان سے آئی۔ حبیب النساء، مہرن اور زہرا اور سمس کو پاس بٹھا کر لٹچے کے ترسندہ دھڑی پر لٹا کر رکھ دیں اور بڑی آنکھوں کے بہت سے چرے نکل آتے۔ عمل کی پٹری سے بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا اور بڑی چند مہینوں کے بعد مولوی اہل کی اولاد بالکل نکل گئی ہونے سے پہنچ جاتی۔ اس دوران میں اگر کسی کی نکاح خوانی کے سلسلے میں یا ناز جنازہ پڑھانے کے ضمن میں درج دیے آسکتے تو وہ مہر النساء کے جہیز کی خاطر مین کے ایک ڈبے میں رکھ دیتے تھے۔ بچوں کے پیٹ بڑھ رہے تھے اور باقی خوراک بڑھ رہی تھی۔ حبیب النساء کے کنگن جو کبھی اس کی سافلی کلائیوں میں گڑے بہتے تھے۔ اب ذرا سے جھٹکے سے پیچھے پر آ جاتے تھے اور اس کی نانی لالچی پٹکوں کے نیچے جو اتنی کا بھر بھل مہر راہ بن چکا تھا۔ اور جب وہ پٹکوں جھٹکتی تھی تو اس کے چہرے پر ہیرا لکھا ڈرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خود مولوی اہل زندگی کے ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان بالکل پچی ہو کر رہ گیا تھا۔ انہی دنوں اسے مولوی ابوالبرکت کی بجائے مولوی اہل کہا جانے لگا تھا۔ کنفیٹیوں کے بال تو بالکل سفید ہو چکے تھے اور دانٹوں پر سوڑوں کی گڑت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ملاوٹ والے وقت کئی بار انہی کی ریجن میں سیٹیاں بچ اٹھتی تھیں۔ مگر ادا نہ کھاٹا۔ یہی تھا۔ صبح بھر سے نکلے ہوئے عورتوں کیوں سمجھتے تھے جیسے مہل کی تھالی پر بلور کی گولیاں گر رہی ہوں۔ البتہ اس پر دوا میں لرزش سی ضرور آگئی تھی۔ جو پرانے عازلیوں کو بہت اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جو بھری فتح داہرہ اس کے ان تماشوں کا سبب معلوم تھا کہ بڑے مولوی اہل اس سے مہر النساء کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کے سلسلے میں بات کر چکا تھا۔ چودھری نے اس مقصد کے لیے سارے گاؤں پر نظریں دوڑائی تھیں۔ بات کو بہتر پر لیت کہ ایک ایک گھر میں جھانک رہا تھا۔ اور کئی نوجوان اسے بچے بھی تھے مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی اہل کو سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مہر النساء کے سر کے ٹکڑوں پر ہی ہے، اور سر کے ٹکڑوں پر پل ہوتی جوانی میں خون کم ہوتا ہے اور آئینہ زیادہ۔ اور پھر یہ بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اب مولوی اہل کو عیدین پر نہیں بھیجیں۔ روپے ملتے جن سے مہر النساء کا جہیز تو خیر کیا بنا ہو گا۔ دوسرے نو بچوں کے لیے جو تان تو پی تھی سنا یہی مہیا ہو سکے ہوں۔ ایک دو جگہ چودھری نے بات بھی کی مگر مخاطب کچھ یوں نیوہرا کر پیچھے رہے جیسے چول کی بیٹیوں میں سے ایک ایک بچہ نکل آئی ہو۔

لیکن مولوی اہل اور حبیب النساء کی دعائیں رائیگاں نہ گئیں۔ انہی دنوں سابقہ خدایا راجہ حال شمیم احمد شہر سے گاؤں آئے تباہ اور یہاں کپڑے کی چھوٹی سی دوکان کھولی۔ خدا یا را ایک حافظ قرآن کا اکوٹا بیٹا متحد والد کے مرنے کے بعد مولوی اہل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب میں بھیجے گئیں تو بڑھی ماں کو سہیں گاؤں میں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ہیڈ کلرک کے ہاں ملازم ہو گیا ہے، اسی ہیڈ کلرک نے کچھ عرصے کے بعد اسے ایک دکان کے سلسلے کو بھر جگہ لے دی جہاں وہ کٹ پیس بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بلا لیا۔ پھر جب اس نے تجارت میں کافی مہارت حاصل کر لی تو خدایا را کی

بہلے شمیم احمد کا نام اختیار کر کے گاؤں لگیا۔ اس نے بڑی منت خوشامد سے مولوی اہل کو مجبور کیا کہ وہی اس کی دوکان سے بوہنی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور نقد سود اچلتا ہے۔

اس روز اہل نے اپنے شاگرد اور اس کی بوڑھی ماں کا دل رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا شاید سب سے بڑا فیصلہ کیا۔  
 قریب النساء کے پاس گیا جو عارف کی ماں شمیم احمد کتا ہے کہ وہ میری بی بوہنی سے کاروبار شروع کرے گا تو تم کو تو مہرن کے لیے ایک سوٹ کا کپڑا ملے گا جو میرے لیے ضرورت تو ہے ہی، ویسے سانسے گاؤں والوں کے ہمارے بوہنی کی رقم ادا ہوگی اس لیے ذرا سار عیب بھی بیٹھ جائے گا، پھر شمیم احمد کا دل رکھنا تو میرا فرض ہے۔ ایک تو پرانا شاگرد ہے۔ دوسرے حافظ عبد الرحیم مرحوم و معذور کا نوکر نظر ہے، تبصرے۔ مولوی اہل نے رُک کر دھر دھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا ”عارف کی ماں۔ اللہ جل شانہ کی قسم، مجھے تو کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے اللہ جل شانہ نے اسے مہرن ہی کے لیے آسمان پر سے اتارا ہے۔“

اس بات پر قریب النساء کی آنکھوں کی راکھ ایک لمحے کے لیے تو بھو بھل میں بدل گئی ”وہ تمہارے منہ میں کچی شکو“ وہ بولی اور گھٹے میں لپکتی ہوئی چابی قسیص کے اندر لٹکا ڈال کر نکالی۔ صندوق کھولا اور مین کا ڈیر نکال کر مولوی اہل کے سامنے رکھ دیا ”خدا تیری زبان مبارک کرے۔ میں تو جب بھی مہرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے پراٹھا تو ہے پر دیر تک پڑے چلنے لگتا ہے۔“ وہ دوسنے لگی، ساتھ ہی مسکراتی بھی رہی۔ اور جب مہر النساء کسی کام سے اندرائی تو فوراً بول اٹھی ”بیٹی! باہر دھوپ میں ٹکڑے سوکھ رہے ہیں نا۔ وہاں ہنڈیا الٹ کر رکھ دو، ورنہ سب ٹکڑے کوڑیوں میں بٹ جائیں گے۔ جاؤ میری بیٹی۔“ اور مہر النساء کے گاؤں کی لالی نے جواب دیا کہ میں سب سمجھتی ہوں اماں شمیم احمد کی دوکان پر باہیاں میزری بوہنی کرنے چلے ہیں۔

مہر النساء باہر چلی گئی تو مولوی اہل نے بے کی کل متاع بلیغ تیغالیس روپے نکال کر جیب میں رکھے اور اٹھتے ہوئے بولا ”وہاں کرنا مہرن کی کہیں شادی لگ جائے تو میں پانچ سات برس کے لیے تو بچوں کی طرح ہلکا پھلکا ہوں جاؤں۔“

قریب النساء آنسو پونچھتی اور مسکراتی رہی اور مولوی اہل شمیم احمد کی دوکان چل دیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو ناگوں اور چوڑیوں پر انگلیاں رکھے یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی نظر پر رنگ رنگ کے کپڑوں کے ساتھ سل کر رہ گئی ہوں۔ مولوی اہل دوکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدموں میں پکڑ پکڑ گیا۔ اور جب مولوی اہل نے اپنی خوبصورت آواز میں قرآن شریعت کی چند آیات کی تلاوت کی تو ایک سماں بندھ گیا۔ تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر نیلے پھولوں میں جبکہ ہلکے زرد رنگ کے نقشے تھے۔ ”ایک زمانہ سوٹ کا کپڑا اکاٹ دو۔“ مولوی اہل نے معمول سے ذرا بلند آواز میں کہا اور ایک نظر ہجوم کو بھی دیکھ لیا شمیم احمد نے گڑاٹھا کہ رسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا اور سات گز کپڑا تاپا۔ یعنی اٹھا کر ایک بار۔۔۔ پھر رسم اللہ پڑھی اور کپڑا اکاٹا۔ تم کیا اور آخری بار رسم اللہ پڑھ کر مولوی اہل کے سامنے یوں رکھ دیا جیسے مفت میں۔۔۔ محض تحفہ پیش کر رہا ہے۔

”دقیقت؟“ مولوی اہل نے اب کے حاضرین کی طرف نہیں دیکھا صرف اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔  
 شمیم احمد مارے احترام کے سمٹنے لگا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا۔ کھلا کھلا اور بولا ”پھر روپے گز کے حساب سے پراپیس روپے ہوئے قبلہ!“

دوکان میں سچے ہوئے سب تھان جیسے مولوی اہل کے دماغ پر دھب دھب کرنے لگے۔ جو کھلا کر اس نے جیب سے

دراپیک وہ پیر واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم شمیم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اٹھ کر ناک پر اور ناک سے زبردستی جیسے جھرمک رہ گئیں۔ مولوی اہل نے پکڑا بغل میں لیا تو شمیم احمد بولا کہ "مہلے نے بوہنی فروٹی ہے۔ س لیے میں نے نرنگے میں کوئی رعایت کی۔ میرا پکا پیرانا خادم ہوں، پھر ملتی کر دوں گا، افتاء اللہ تعالیٰ"۔

مولوی اہل کپڑے کو بغل میں لے کر اٹھا تو اس کا جی چاہا کہ شمیم احمد سے کہے کہ "اللہ جل شانہ ہی تلمانی کرے گا ورنہ شمیم احمد اس لیے کہ تم نے کپڑا بیچا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے" لیکن یہ تو ایک دم سے جیب کے خالی ہونے کا بغیر ارتقاء، میرا بھٹے ہی اٹھتے اس نے قابو پا لیا اور وہ بولا کہ "یہ تو تمہارا حق تھا شمیم احمد، یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی، اللہ جل شانہ تمہیں اور تمہارے کاروبار میں برکت دے"۔

"آمین" شمیم احمد نے ہاتھ ملنے ہوئے کہا۔

"آمین" زیب النساء نے کپڑے کی نرمی اور بھکاری اور عین کو دیکھ کر مولوی اہل کے ان الفاظ کے جواب میں کہا کہ "اللہ کے ان کپڑے میں ہمدانی مہر کا مہاگ ہنکے"۔

چند ہی روز بعد ایک شام کو مولوی اہل کے دروازے کی زنجیر بجی، اس وقت آنے والے کو ماچا دل یا حملہ دیکھ کر بغیر ہانسنے قہقہے سے زنجیر کی آواز سنتے ہی چھوٹے بچے ڈیڑھ کی طرف پکے۔ لیکن جانے مولوی اہل کو کیا سوچھی۔ خلافت رسول کو کد کر بولا "خود بچے رنگ گئے، سب کے چہرے ہلک گئے، عذرا النساء فوراً بھی دی، مگر مولوی اہل ان کو دلا سر دیئے بغیر بڑی بے پروائی سے گئے۔" جو بچی ڈیڑھ کا دوازہ کھولا تو شہزادہ کا ایک خوارہ سا لٹا اور ساتھ ہی، آواز آئی "السلام علیکم قبلہ"۔

یہ شمیم احمد تھا۔ مصافحہ کے لیے بڑھا تو ٹھٹھے کا نیا تہ بند ٹین کی طرح بج اٹھا۔ اور جب اس نے رنگ روک کر کہا کہ آپ کی خدمت میں ایک درخواست ہے کہ آیا ہوں قبلہ۔ اسی لیے آپ کو بے وقت زحمت دی "تو مولوی اہل کو شمیم احمد کی پوشاک سے اتنی ہی ہلک کچھ لگتا تھا محسوس ہوتی۔ یہ درخواست یہاں ڈیڑھ میں ہی سنی جا سکتی تھی، لیکن مولوی اہل گروں کو ہونڈ پکارا "یہاں بھی کہا عار کی بات" اور پھر شمیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی سے مسجد کی طرف چلا کہ شمیم احمد کو نہ تہ بند کا شور و غوغا نہ کہنے کیلئے اسے دوسرے ہاتھ سے گھٹنوں تک اٹھا دینا پڑا۔

دونوں ایک جگہ پہنچے تو وہاں چند مازی آگ جلنے لگا، ان ارشید کے انصاف کی کہانیاں سن سنا لیے تھے، دوسرے جگہ میں اندر اٹھ رہا تھا، اور یہ اکتائیس اکتائیس دنوں کی مسلسل چلہ کشی کے لیے مخصوص تھا شمیم احمد کو وہیں چھوڑ کر مولوی اہل پہلے جگہ سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھا لیا اور اندر پہلے جگہ کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ ڈیڑھ پر کڑو سے تیل کا چراغ جلا اٹھا۔ اس نے واپس جا کر لکڑی کو لاڈ میں پھینکا اور لپک کے شمیم احمد کے پاس لایا۔ شمیم احمد نے ان چند روز میں واٹھی مین مینڈوئی تھی۔ گالوں اللہ گلے پر نہایت سلیقے سے خط بنے تھے اور واٹھی کے خوشنہی بالوں پر عطر خا دیئے کی روشنی میں چمکنے لگا تھا۔

"کو" مولوی اہل کچھ اس انداز سے بولا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے تھماں کے لیے ایک ایوان کی آرائش وزیناٹش سے

فارغ ہوا ہے۔

شمیم احمد کی آنکھیں جھک گئیں اور ہونٹ ذرا سا کھل کر کانپنے لگے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر چراغ کی طرف دیکھا جس کی کو

بے پناہ دھواں چھوڑ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے تنکے سے چراغ کی بتی کو کم کیا اور بولا ”آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں“  
 ”کہو۔ کہو“ مولوی اہل نے شمیم احمد کے کندھے کو تھپکا اور پھر چپک کر اس کے دوسرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا شمیم احمد کے  
 کندھے کی ہڈی پر گوشت کی اتنی بڑی گیندیں سی دکھی تھیں! ”کہو نا۔ بزم“

شمیم احمد نے اپنے ہاتھ ملنا شروع کئے، ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کوئی چیز بڑی مشکل سے نکلی اور بولا ”اصل میں  
 یہ کام تو بیری اماں کا تھا۔ انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے تھا مگر پچھلے چند برسوں سے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ بات  
 بات پر درد دیتی ہیں اور برا بھلا کہنے لگتی ہیں، سو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی حاضر ہو جاؤں“  
 ”تم نے بہت اچھا کیا“ مولوی اہل نے بڑی شفقت سے کہا۔

”میں آپ کا پرانا خادم ہوں“ شمیم احمد نے سمجھتے، پھلتے اور پھرتے ہوئے کہا ”میری دیرِ خواست یہ ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ  
 کے لیے ————— اس نے ایک بار پھر چراغ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر اپنی آستین پر سے کوئی خیالی دھبہ اڑا دیا۔ حضور مجھے ہمیشہ  
 کے لیے اپنی غلامی میں لے لیں“ شمیم احمد نے نزع کے سنے عالم میں کہا۔

مولوی اہل کا جی چاہا کہ چپکی بچائے، رسماً ذرا ہنسنے ہوئے بولا ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا شمیم احمد“  
 شمیم احمد نے بڑی حیرت اور دکھ سے مولوی اہل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص سے قرآن مجید  
 کے کئی دشوار مضامین اور فقہ کے بے شمار مشکل مسائل کو ان کی آن میں صاف اور سلیس انداز میں سلجھا دیا وہ ”غلامی“ کا مطلب نہیں سمجھتا۔ دینی  
 دنی آواز میں جیسے اس نے نزع کی آخری چپکی لی۔ ”جی میرا مطلب ہے کہ حضور ————— حضور مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمائیں“

اور جیسے اس وضاحت سے مولوی اہل کی تسلی ہو گئی! اس نے مزید تشریح طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ شمیم احمد کچھ دیر  
 تک نظریں جھکائے کھڑا ہوا تھا اور سر ہلاتا رہا، اور جب مولوی اہل ایک لفظ تک نہ بولا تو اس نے اپنی نظروں کو جیسے دونوں ہاتھوں  
 سے بصد مشکل اٹھا کر بے انتہا جھجک سے اوپر دیکھا۔ مولوی اہل کی دائرہ میں برائے سوؤں کے قطرے ٹوک گئے تھے، شمیم احمد کی دائرہ میں  
 برعکس جھجک رہا تھا اور مولوی اہل کی دائرہ میں آئسو جھگڑا اور خرقہ اڑ رہے تھے اور چراغ کی کو پھر ڈھیروں دھواں اگلنے لگی تھی، مگر اب  
 کے شمیم احمد کو بتی کم کر دینے کا خیالی نہ آیا۔ وہ پھر ہنسنے کے لیے بے تاب ہو گیا مگر صرف ہونٹوں کو کھول کر رہ گیا، مولوی اہل نے ایک آنکھ  
 جیسے کچھ سوچ کر پگڑی کے پتے سے آنکھیں پونچھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”لو کی تیری کتنی مسکینیں مخلوق ہے اور جل شانہ! —  
 کتنی مسکینیں!“ اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ایک ساتھ نکلے اور دائرہ میں کے بالوں نے انھیں پر دیا۔ ”دینے کا مال ہے شمیم احمد!  
 دوں گا۔ کیوں نہیں دوں گا؟ دینا ہی پڑے گی۔ اور پھر تم تو میرے اپنے عزیز ہو، بھائی حافظ عبد الرحیم مرحوم و مغفور کا بیٹا میرا اپنا بیٹا ہے۔  
 آؤ! ادھر آؤ“ اور مولوی اہل نے شمیم احمد کو اپنے سینے سے لگایا۔

جب وہ واپس گھر میں آیا تو زینب النساء نے چند قدم کے فاصلے پر سے ہی کہہ دیا کہ کہاں سے آ رہے ہو؟ عطر کی پٹلیں آنے

لگی ہیں؟

”ہر النساء تو سے پر آخری روٹی ڈالنے بیٹھی تھی، بولی“ ”پر اب بچی، سارا گھر ملک اٹھا ہے“  
 ”کیا بات ہے؟“ زینب النساء نے پوچھا۔

مولوی اہل نے بڑی آسودہ خاطر سے بچوں کی تقاریر کی طرف دیکھا۔ دجلالی ہاتھ گھڑیں کیا تھا اس لیے سب کے منہ کھٹکے گئے تھے سب کو ایک ساتھ پیار کرنا مشکل تھا اس لیے بولا ”آج میرے سب بچوں کو روٹی کے ساتھ گڑ کا ایک ایک ٹکڑا بھی ملے گا“ اگلے ہفتے چہرے سنبھل اور سنور گئے اور ہر النساء کی نظریں تیرے پر گر گئیں۔

”بات معنوعارف کی ماں“ مولوی اہل باہر جلتے ہوئے بولا۔

”زیب النساء نے سب حالات سن کر کہا ”میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو“

مولوی اہل چہکا ”اللہ جل شانہ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔ اب تو اپنے سر کی قسم دیتی ہے تو نعوذ باللہ کیا تو جمل شانہ سے بڑی بے ہوش عورت کی عقل یہاں کہیں کھو چڑی کے آس پاس ہوتی؟“ اور اس نے مسکرا کر زیب النساء کے تالو پر ایک چپت جڑ دی۔

زیب النساء بچوں کی طرح رونے لگی، وہ ان آئسوڈوں کا مطلب سمجھتا تھا وہ بھی تو ابھی کچھ دیر پہلے ایسے ہی آئسوڈ گرا چکا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ آگے بڑھا اور زیب النساء کے پیچھے پیچھے لگاؤں پر اپنی بیگنی بیگنی دائرہ می رکھ دی۔

”دعا میں یوں قبول ہوتی ہیں عارف کی ماں“ مولوی اہل پر سوں کی عبادت و ریاضت کا جلال چہرے پر لا کر بولا ”الحمد للہ! یوں سنتا ہے سنتے والا یوں دیتا ہے پھر پھاڑ کے سنتی ہو زمین“ آج مولوی اہل نے مہماگ رات کے بعد شاید پہلی بار زیب النساء کو عارف کی ماں کے جانے زمین کہہ کر پکارا تھا۔

زیب النساء آنکھیں پونچھتے تھے بولی ”جب نفیم خدایا رتھا جب وہ لڑکا تھا اور تمہارے پاس بڑھتا تھا تو یوں چھیڑ چھاؤں لگا ہوں دیکھنا تمہارا من کو جیسے کبھی کبھی تم مجھے دیکھ لیتے ہو“ اللہ قسم

اور ابھی میاں پیو آئسوڈوں کو ابھی طرح خفک بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک بار پھر دروازے کی زنجیر بجی، بچے ڈیوڑھی کی طرف دوڑے۔

”عقرو“ اب کے مولوی اہل کی آواز میں ڈانٹ نہیں تھی ”میں خود جاؤں گا“ پھر بچوں کے پاس آ کر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا ”نذیرہ! بہت بڑا جوتا ہے۔ سمجھے؟ ہر آنے والا صلہ اور چادل دینے نہیں آتا۔ کئی لوگ دوسرے کاموں کے لیے بھی آسکتے ہیں۔“

بچے باہر دوڑا بلند آواز میں بولا ”اٹھیں باہر سردی میں نہ نکلنے دو مہرن بیٹی۔ یہی پنکھے تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں“ وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو گرم چادر میں لپٹے ہوئے چودھری فتح داد نے ہاتھ بڑھا کر مولوی اہل کو باہر لگی میں گھسیٹ لیا اور چھاتی سے لگا کر بولا ”مبارک ہو قبلہ! ہزار بار مبارک ہو، آخر میری کوششیں بیکار نہیں گئیں“

اس وقت مولوی اہل کی بغل میں چودھری فتح داد کے فرشتہ بننے میں بس پروں کی کمی رہ گئی تھی ”اللہ جل شانہ کا شکر اور آپ کا“ ان سے ”اس نے چودھری سے بڑے پچھلے ہوئے ستیال لہجے میں کہا۔

فخدا نے مجھے آپ کے سامنے سرخرو فرما دیا“ چودھری فتح داد بولا ”اب جلدی سے شادی کی تاریخ بھی ملے کر مجھے شہیم احمد بھائی کا ہے، پرانا خوجان لڑکا ہے اور پھر دوکاندار ہے۔ دن میں بیسیوں حورتیں اس کی دوکان پر آتی ہیں، اور آپ جانتے ہی ہیں کہ بڑا بڑا زمانہ آگیا ہے، لڑکے لڑکیاں بارود کے گولے ہو رہے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب پڑے پڑے بیک سے ہو جائیں شہیم احمد میں سے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اس کی ماں آپ کے گھر میں آتی مگر بڑھیا سٹھیا سی گئی ہے، کوئی بات

اس کی مرضی کے خلاف ہر توسل و پیشین گوئی ٹالتی ہے کھنت۔ ابھی ابھی شمیم نے آکر بتایا کہ آپ نے حامی بھر لی ہے، میں نے اسے جلدی بنا کر لینے پر زور دیا تو بولا کہ آپ ہی قبلہ مولوی صاحب سے تاریخ کا فیصلہ کرادیجئے، سو میں اسی لیے حاضر ہوا تھا۔ آپ کل تک سوچ لیجئے امید یہ ————— ”چودھری فتح داد نے گرم چادر کے نیچے سے ایک پوٹلی سونگالی ————— ”یہ میری بیٹی کو دے دیجئے گا“

مولوی اہل نے خاموشی سے پوٹلی لے لی تو چودھری نے آہستہ سے کہا ”اللہ قبول فرمائے“

”آمین“ مولوی اہل کے منہ سے عادتاً یہ لفظ نکل گیا۔

مردی اہل نے اندازہ کر لیا کہ وہی تو ایک بڑے سے ریشمی درمل میں سو کے ایک فوٹ پر سونے کے دو جھکے لٹے تھے۔ جی کی بڑے سے بڑے جتنی کٹڑیوں میں جانے لگیئے جڑے تھے یا مینا کاری کا کام تھا!

زیب النساء کسی اور چیز کی امید میں رومال کو جھاڑ کر چمکی دوں، تو سیم احمد نے بھیجے ہیں؟

اور ابھی مولوی اُٹل جواب نہیں دینے پایا تھا کہ ہر انسان بھاگ سکو۔ باہر نکل گئی۔

اے! موعویٰ اُجکل نے حیرت سے زیب النفس کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ایک مسخد بے اختیار ہنس پڑے!

”سمجھ گئی!“ زیب النساء باہر دیکھتے ہوئے انگشتِ شہادت کو ناک کی گھیل پر رکھ کر بولی۔

”تم نے بھی تو منہ پھر کر کہہ دیا۔“ دشیم احمد نے جیسے ہیں! ”مولوی اُبل نے زیندگی میں شاید پہلی بار عداوت کی

آواز اور انداز کی نقل اتاری اور بچے جو ابھی تک محض حیرت زدہ تھے، غصہ ظاہر کر زور زور سے ہنسنے لگے، عمدۃ النساء ڈرتے ڈرتے جھلکوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”چودھری فتح داد دے گیا ہے۔ مہرلی کے لیے،“ مولوی اُنکل نے ہڑی بے پروائی اور رولواری میں رازناش کیا۔

۱۱۔ اللہ تعالیٰ فرمائیے ”زینب النساء جیسے اپنی قبر میں سے بولی جس پر دنیا نیا غلاف چڑھایا گیا تھا۔“

چند ہی روز میں ہر انسان مایوں بٹھادی گئی۔ اس کے لاشوں بیرون پر ہندی صوبہ دی گئی۔ ڈھولک تو خیر نہ بجی کیونکہ شہر

لاکھ سہیہ آخر مولوی ابوالبرکات لاکھ تھا جس نے حضور پر نور صلعم کی مدینہ میں تشریف آمدی پر مدینے کی لڑکیوں کے وہیں بچا ہوا

گناہ کے متعلق تو رُخا تھا مگر ڈھونڈ کا جواز کہیں موجود نہ تھا۔ اور خیاب آستانہ منصب تھا کہ یہاں اس کتاب و فن کا رواج ہی تھا۔

حلیے مانتھا، رن ہو تو وہ اور بھاؤ اور گلاؤ۔ تم ڈھونڈ لائیں تو میں اسے اٹھا کر چھت پر بھینک دوں گا۔ مولوی اہل نے یہ سنا

کے جوہر سے ٹانٹ کر کہا تھا۔ آخر گاؤں کی دوکان مہ النساء کو اپنے دائرے میں لے کر بیٹھ گئیں اور ڈھولک کے فخر ہی ایسی نرئی

اللہ سے رات بھر اس کے گرد محنت اور دوستی، پھولوں اور پھواروں، ملاقاتوں اور جدائیوں کے جلسات منعقد رہیں۔

لکھ، اٹھ اچ، کو ڈھ، اٹھنا، کچھ انے اور گولے کھڑنے سے کو، روکتا، رات ایسی، حق سے کو، اور بولی ایل

وہ منہ مار کر مغللوں سے لڑتا تھا۔ اس کے سوا کسی اور شخص نے ان کے گھر دندے کی غنا دوں پر رٹ نہیں ہے۔

[illegible]

یہ دھوکہ دھڑکا دیکھ کر رات ہی رات کو وہی اہل اور درویش اہلسائے مکان کے ایات کو کے ہیں چند سرگوشیاں

ماریشس کے دیہاتوں میں بسوں کے لئے اور جہازوں کے لئے اور ایسی میسی نہیں ہیں اور کربیب دوسرے دن کو بھیج دیا۔



مولوی اہل کے پاس دست خیم کا تعویذ ہے۔ کسی نے رائے دی۔  
ایک بڑھیا نے ٹھوڑی کی ٹھکرتی ہوئی جھٹی میں انگلی ڈبو کر کہا: ”پکڑوں کے کئی چوڑے تو ان گندگار آنکھوں نے پہچان لئے۔ کچھ تو بے پناہی مرنے والیوں کے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو بی بی زیب النساء کو اپنی شادی پر ملے تھے۔ سبکدوش ہے اس لئے اوفے نے رکھ چھوڑے۔ یہ کلنگن اور یہ ناک کی کیل۔ یہ سب لچھری بی بی کا ہے۔ یہ یہ جھٹکے؟“ اور اس نے اپنی انگلی کو ٹھوڑی کی جھٹی میں سے نکال کر آسمان کی طرف بلند کر دیا۔

مرزا النساء کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو آنکھوں اور چہرہ ہاروں کی ایک لہری اس پر سے پھار چھو گئی۔ گاؤں کے بچے ان پر چھپے ہوئے مولوی اہل کے بچے جو ڈیوڑھی میں ماں باپ کی دیکھا دیکھی رو رہے تھے۔ ایک دم اپنی جگہ سے یوں اچھلے جیسے ان کے قدموں تلے ٹھیک دار گامبالا اچھڑائی ہیں۔ ”مولوی اہل گرجا گاہ کا بنیاں دھرتی پر اتر گئیں۔ سیکے جہاں تھے وہیں ختم گئے۔ صرف عادت ایک کئی کو اپنے بچے تلے بٹھائے کھڑا رہا۔ اور برات کے چلے جانے کے بعد ہی اس کا یہ اثاثہ اس کے پاؤں سے ہاتھ تک کی مسافت طے کر سکا۔ مولوی اہل کچھ دور تک ڈولی کے ساتھ ساتھ گیا۔ اس کی ناک اور آنکھیں سرخ تھیں مگر ان کے ساتھ چہرے کی زردی مری قحی اور مولوی اہل بالکل گلاب ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکھ اور اطمینان نے چہرے کی سرزمین کو اپنے اپنے مظاہرہ سے سب سے ہٹ لیا ہے، ایک ٹھوڑی پر جا کر وہ رک گیا اور دو دو تک ڈولی پر پڑے ہوئے نشیمن پر شے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی گہری سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر چٹھیا اور پٹ کر گھر کو جانے لگا۔

گلی میں گاؤں کے بچے اب تک اکٹیاں اور چھوڑے ڈھونڈ رہے تھے۔ ڈیوڑھی کے دو واڑے پر کھڑے ہوئے عارف اور دوسرے بچوں نے اپنے آبا کو دیکھا تو ایک آن میں بھوتوں کی طرح غائب ہو گئے۔ مولوی اہل کے ہونٹوں میں دیر سے جو سوزش اور غم چھپ رہی تھی وہ مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں تک مسکراتی چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو اسے دیوار سے لگی ہوئی ایک کچی چٹکتی کھائی دی۔ لیکن وہ بڑی بے پروائی سے اس کے بڑھ گیا۔ زیب النساء شاید کو اڑھی سے لگی کھڑی غمی مولوی اہل کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرف زور زور سے لگی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جب آگن میں آئی تو دونوں ہاتھوں سے بڑے سے واڑے بنا کر بولی ”ہمارے بچے لو اس یہ قبرستان کا سامنا کتا چھوڑ گئی ہماری مہرن“

”تمہارا تو معاذ جیل گیا ہے“ مولوی اہل نے اپنی مسکراہٹ کو ادھر پھیلایا۔ ”مہرن چلی گئی تو کیا زبدہ کو بھی لے گئی؟“ اور کیا تمہیں بھی اس نے ساتھ چلی گئی؟“ پھر زبازد کو بولا ”عارف میاں زبدہ کیا کر رہی ہے؟“

”جی اور ہی ہے“ عارف دیوار سے لگے ہوئے بچوں کی نظار میں سے نکل کر بولا۔  
”کہاں؟“ مولوی اہل نے پوچھا۔

”یہی جہاں مہرن آیا بالوں بیٹھی رہیں“ عارف بولا۔

”زبدہ“ مولوی اہل پکارا۔ زیب النساء مسلسل روئے جا رہی تھی۔

زبدہ وہ واڑے پر نمودار ہوئی، نیا گلابی دوپٹہ آنسوؤں کی غمی کے سبب جگہ جگہ سے سیاہی مائل سرخ پڑ گیا تھا۔ اور زبدہ نے اپنے بوسندہ ہاتھوں کو صبح اندک لٹکی ہے چکایا تھا ان پر جگہ جگہ مٹی چم رہی تھی اور بالوں کی مینڈھیاں ابڑھ رہی تھیں اور —————

مگر مولوی اہل تو زبدہ کو دیکھتے ہی سناٹے میں آگیا تھا۔ مسکراہٹ بونٹوں میں بحث کر یوں پھڑپھڑانے لگی تھی جیسے دم توڑ رہی ہے۔ چہرے پر مذہبی کھنڈ گئی تھی۔ زبدۃ النساء چند قدم پر آکر رک گئی اور سسکیوں میں رونے لگی۔

اور پھر مولوی اہل نے زیب النساء کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور اسے بے ڈھنگے پن سے کچھن کر انگلیں کے ایک گٹھے میں لے جا کر یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع دینے والے ہیں۔ ”عارف کی ماں! سنو، یہ زبدہ تو جو ان ہو گئی ہے!“

اور زیب النساء آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبدہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اب تک والدین کی بے خبری میں مہربان کے عقب میں بیٹھی بیتی بڑھتی رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مولوی اہل نے بغیر مروت کے گلا صاف کیا اور دم بخود زیب النساء کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”مگر نہ کرو یہی اللہ جل شانہ کی رحمتوں سے مایوس ہو نا کفر ہے۔“

زبیب النساء نے مولوی اہل کا ہاتھ کسی قدر سختی سے اپنے کندھے پر گر کر دیا۔ ”نرم کرو۔ پہلے میرا ہاتھ پکڑے چلے گئے، اب کندھا سہلا ہے۔ ہو جو ان جہان بیٹیاں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے۔“ زیب النساء نے فقرہ پورا کر کے کی بجائے اپنا وہی کندھا اچکا دیا۔

مولوی اہل کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ پکارا ”شمس!“

شمس النساء قطار میں سے نکلی ہی تھی کہ مولوی اہل نے جیسے سہارا لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹھٹھلنے کے لیے ہاتھ بلایا اور کوئی سہارا نہ پا کر ٹوٹی فتاح کی طرح تجھوم سا گیا۔ چلتے ہوئے شمس النساء کے پاؤں کے تلوے ایک دم جیسے چھپے زمین پر نہیں لگ جاتے تھے بلکہ اس کے جسم کی طرح اس کے پاؤں میں بھی لہراؤ سا تھا۔ سب سے پہلے اڑی زمین کو چھوتی تھی۔ پھر تلوے کا خم جھکنا تھا اور اس کے بعد پیچے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری باری جیسے لپک لپک کر دھرتی کو چھوتی تھیں۔ تب جا کر دوسرا قدم اٹھنا تھا۔ کچھ نہیں بیٹھی۔ کچھ نہیں بھاؤ۔ ”مولوی اہل تیزی سے دیوار کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

شمس النساء حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

اور زیب النساء زار زار روتی دیں۔ ”حیر ہو گئی، زبدہ اور شمس اس کی طرف لپکیں۔“

مولوی اہل نے باہر جا کر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور پھر دیوار کے قریب سے چپکتی ہوئی اکئی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

گھر میں کل درہی کس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکھے ٹکڑے رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں تھن اور عمدہ کی گڑیاں اور دوسرے تھنوں کی بلور کی گولیاں پڑی رہتی تھیں۔ گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول بھی کھل گیا تھا۔ اس لئے اب کلام پاک کا درس لینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور اسی لیے سوکھے ٹکڑے اب ہفتے کی بجائے ہر روز کے بعد ابالے جانے لگے تھے۔ نمازیوں کو بھی زمانے کی ہوا لگ گئی تھی۔ بعض وقت تو مولوی اہل اذان مے کر رہی مٹھ جانا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے انتظار میں نماز قضا ہو رہی ہے تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اٹھ کر اندر مسجد میں آتا جیسے کوئی بڑا ناگوار مرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ کی نماز پر جب چند کسان جمع ہو جاتے تو وہ بڑی رقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور علمائے دین

کے برکات کا تذکرہ کرتا اور کہتا: تمہیں یاد ہو گا کہ کون سے جی زلزلہ آیا تھا، کیوں آیا تھا، ترکی میں بھونچال آیا تو کتنے ہی گاؤں کو  
 برباد کیا، کیوں لنگ گئی؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں، کیوں ہو رہے ہیں؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اور بھلا  
 کون سا مذہب، تمہیں تو گندم کے خمار نے دیں سے بریکانہ کر رکھا ہے۔ یہ غماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔  
 یہ سب تو سنو۔ یہ آثار قیامت ہیں۔ سمجھو؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اتار دو گے؟ بتاؤ! بتاؤ! — اس قسم  
 کے جوابی خطبوں کے بعد مقتدیوں میں ذرا سا اضافہ ہوتا اور ایک دو روز تک گھمی گئے وظیفے آنے لگتے۔ مگر پھر وہی سناٹا مود کرنا  
 اور زمین کی آنکھیں پھٹتیں، شمس کا جسم پچکنا، مٹین کے خالی کبسون میں سوکھے کھڑے اور بچوں کے بلوری بنے بجتے اور زانا یاں بجاتے۔  
 دھڑکن کی گزریاں نکلی ہو ہو کر ایک دوسرے میں گھسی پڑتی ہیں۔

مولوی اہل کے صرف دو ایسے سہائے سطرے جو کبھی نہ ٹوٹے۔ المذہل شانہ اور چودھری فتح داد۔ المذہل شانہ کا یہی  
 پورا نام خاکسروی اہل اور زبیب النساء اب تک زندہ تھے اور اب تک ان کی ساری اولاد زندہ تھی، اور المذہل شانہ کا بیٹا اس  
 شانہ سے ہو اٹھا کہ زندہ اور شمس کے لیے رشتے کے پیاموں کا سلسلہ توڑتے ہی میں نہ آتا تھا۔ نیکے مولوی اہل جس شدت سے  
 النساء سے برکی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ اسی شدت سے وہ زبیدۃ النساء اور شمس النساء کے لیے آنے والے پیاموں سے  
 نہ تھا۔ یہی تو کل کی بچیاں ہیں بھئی۔ ابھی تو گیلیوں سے کھیلتی ہیں۔ شمس نے تو ابھی تک قرآن مجید بھی ختم نہیں کیا۔ میں خدا ندراسی پونی  
 ان بچیوں کو کس دل سے اٹھا کر پرانے گھر میں پڑھ آؤں؟ زبان و بان نہیں دوں گا۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔  
 ”دیکھا جائے گا“ وہ زبیب النساء سے زندہ اور شمس پر سبے تجا شا آئی ہوئی جوانی کی اطلاعیں پا کر کہتا: ”المذہل شانہ  
 کا بیٹا ہے گا۔ توکل بڑی چیز ہے عادت کی ماں! کسان جب دھرتی میں بیج بوتا ہے تو المذہل شانہ پر توکل کرتا ہے۔ توکل نہ کرے  
 تو بیج بونہی میں مٹی ہو کر رہ جائے۔ یہی توکل بیج کو چٹھنا ہے اور دھرتی کو چیر کر پودا نکالتا ہے، اور مرنے والوں کی کوکھ میں بالیوں اور  
 بلیوں کو پتہ ان چڑھانا ہے، مجھیں عادت کی ماں؟“

”کسان بیج تو بوتا ہے نا!“ زبیب النساء بحث کرتی ”تم نے کیا کیا ہے؟“  
 ”اعوذ باللہ“ مولوی اہل کہتا ”میں نے بہت کچھ کیا ہے، میں نے ہر نماز کے بعد دعائیں مانگی ہیں!“  
 اور زبیب النساء لاجواب ہو جاتی۔

دعائیں کے بعد مولوی اہل کا ذہن چودھری فتح داد کی طرف منتقل ہو جاتا۔ آج کتنے برسوں سے اس خدا ترس انسان نے اس  
 کے دھرم پرشام کو غلط سمجھوایا تھا۔ اور کتنی پابندی سے ہر فصل پر مولوی اہل کو پوشاک پہنانی تھی، اور لطف کی بات یہ ہے کہ دوسروں  
 کو اس نے غلط نہیں بیٹھا تھا۔ لیکن اب چند روز سے چودھری فتح داد بیمار رہنے لگا تھا۔ ایک بوڑھے عاٹ نے جو عرصے سے جراحی کا کام کرتا  
 تھا چودھری کی بڑبڑکی بڑی کے چھوڑے کے آس پاس کچھ ایسی خوشتر زنی کی کریم لپوڑا شام تک سوچ کر پھیر پڑا اور بے سہنے لگا۔ ساتھ ہی  
 پودوں کو زے کے بخارنے آ لیا اور علاقے کے حکیموں کا تانا بانہہ لگا۔ ان دنوں مولوی اہل کے گھر بدنی سی چھائی رہتی۔ ایک تو  
 بے سہنے سے اس کی ساس کا بڑا دوسرا سواہن روح تھا۔ اس پر چودھری فتح داد کی علالت اپنے کسی وقت شور مچاتے تو مولوی اہل پرچہ بھٹتا  
 ”جیب۔ ہونا مرادو! اور چودھری فتح داد بیمار پڑا ہے اور ادھر تم بیٹس کھیل رہے ہو، ناشکوہ اور چودھری نہ ہوتا تو آج تک ہم میں سے

آدھے آدمی تو خاتون سے سرگئے ہوتے۔ اللہ جل شانہ کے حضور میں اس کی صحت کی دعا کرو بد بختو! ”

مولوی اہل ان دنوں ہر روز صبح و شام چودھری فتح داد کے ہاں مزاج پرسی کو جاتا۔ لیکن وہاں عبادت کرنے والوں کے ہجوم میں کبھی کوئی گھر کی بات نہ ہو سکی۔ جس اتنا ہوتا کہ مولوی اہل کو دیکھ کر چودھری تعظیماً اٹھنے کی کوشش کرتا اور پھر گراہ کر اسی طرح مرنے کے بل گرجاتا ”دعا فرمائیے قبلہ“، آہستہ سے کہتا اور مولوی اہل آنسو لاکر آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور کہتا ”وہی شافی مطلق آپ کو صحت کلی عطا فرمائے گا۔“ لیکن ایک روز جب مولوی اہل چودھری کے ہاں گیا تو وہاں سوائے اس کے ایک بیٹے کے اور کوئی نہ تھا۔ چودھری کی طبیعت بھی خلاف معمول سنبھلی ہوئی تھی۔ آج وہ حسبِ عادت تعظیماً کچھ اٹھا لیکن کراہا نہیں نہ لڑکے کو اشارہ کر کے باہر بھیج دیا اور بولا ”بیٹیوں کیسی ہیں قبلہ؟“

”اللہ لائے۔ اچھی ہیں۔ دعا گو ہیں؟“ مولوی اہل نے جواب دیا۔

”سننا ہے بہت پیغام آرہے ہیں؟“ چودھری نے پوچھا۔

مولوی اہل اچھی نگاہ سے کچھ بیٹھا تھا کہ لڑکیوں کے پیغامِ طرین کے درمیان سر بہ راز و دی کی حیثیت رکھتے ہیں سوہ بر نہیں جاتا تھا کہ جوانی کا دھماکا پڑتا ہے تو کوئی راز راز نہیں رہتا۔ چونکہ کر بولا ”مجھے ہاں بہت آرہے ہیں۔“

”پھر؟“ کوئی فیصلہ فرمایا آپ نے؟“ چودھری مسلسل مولوی اہل کو دیکھے جا رہا تھا۔

مولوی اہل کھبرا سا گیا۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر محسوس کیا کہ اچانک نالہ و زبان اور حلق خشک ہو گئے ہیں۔ کچھ ٹھک کر بولا ”جی فیصلہ میں کیا کروں۔ یہ تو اللہ جل شانہ کرے گا۔ جس خالی ڈھنڈا گھر میں غلام کے لیے لکھا تھا نہ ملے وہاں بیٹیوں کے رشتے کو نہ ملے کرتا پھرے۔“

”تو بتد کیا میں مر گیا ہوں؟“ چودھری فتح داد کی آواز میں شکایت کی بھرپور ہٹ تھی۔

”آپ کے دشمن مریں؟“ مولوی اہل فوراً بول اٹھا ”آپ اللہ جل شانہ کے فضل سے تندرست ہو جائیں تو پھر دو لڑکی بیٹے کو ملے کریں گے۔“

”جی ہاں“ چودھری نے ہمدردانہ انداز میں کہا ”فوراً ملے ہو نا چاہئے۔ گھر میں جو لڑکی بیٹی ہو تو ایک ایک دن ایک ایک صدی بن جائے مگر اللہ تعالیٰ سب سامان کرے گا۔“ وظیفہ تو باقاعدہ پہنچ رہا ہے نا؟“

”جی ہاں“ مولوی اہل نے جواب دیا ”ما تاعدہ“

”اللہ قبول فرمائے“ چودھری فتح داد نے آہستہ سے دعا کی۔

”آمین“ مولوی اہل نے جلدی اس دعا کی تائید کی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، چودھری ذرا سا کراہا۔ پھر بولا ”سننا ہے بیٹی مر لائے اور شمیم احمد کی تو خوب بھدھی ہے پر اس اس کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی۔“

”بیٹی ہاں مولوی اہل نے بڑے دکھ سے کہا ”لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ بیٹی بیاہ دی جائے تو پرانی ہو جاتی ہے۔“

”پر اس سے کیوں نہیں بنتی؟“

”مس دی غریبہ غنیمت کے طے، تو لنگی ہے، تو سو کے گڑوں پر پڑی ہے، تیرے کپڑوں سے لٹن کی بو آتی ہے، تو اپنے ساتھ خاک  
دنی ہے؟ وہی غور تو کی باتیں“

”ہوں“ چودھری کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا ”بیٹی پرانی نہیں ہو جاتی تہا، بیاہ کے بعد تو اس کے حقوق بڑھ جاتے ہیں۔  
اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اسے ان معنوں کا موقع ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی ہر انسان کو لنگی کہتی ہے، اب ہماری  
جہن کے بچہ ہو گا تو اس کے لیے آپ ریشم کے کپڑے اور طلائی ٹوپیاں اور سونے کے گھنگھڑوں والے لنگن بھیج دیجئے اور پھر دیکھئے کس  
طرح بیٹی کا مان ہی بڑھے گا اور بڑھیا کی پلید زبان بھی گٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا قبلہ؟“

ٹھیک ہے، مولوی اہل نے سوچا۔ بہت حد تک ٹھیک ہے مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا  
ہاں ہے؟ اور کیا عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا؟ اب مولوی اہل کا  
دباں دیر تک پھلا بیٹھے رہنا مشکل تھا۔ تو کیا سچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے؟ اس نے تو زیب النساء سے کہی پوچھا ہی  
تھا اور زیب النساء نے بھی حیا کے مانے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولوی اہل بیٹیوں کے بیٹیوں کو ٹوٹتے پھرنے  
کے سخت خلاف ہے۔

مولوی اہل ڈیوڑھی ہی اسے پکانا ”عارف کی ماں؟“  
”زیب النساء جانی آئی وہ خدا نیر کرے، کیا ہوا؟ چودھری کیسا ہے؟“  
”اللہ جل شانہ برحق فرمائے گا“ مولوی اہل بولا ”عارف کی ماں! سنو، مہرن بیٹی کی ہے؟“  
”زیب النساء سچ کہی، تمہیں کس نے بتایا؟“  
”کب تک ہو گا؟“ مولوی اہل تو آج آپس سے باہر ہو رہا تھا۔  
”بس اللہ چاہے گا آج کل میں“ ”زیب النساء“ ”عینپ کر بولی“ ”پہنیں کس نے بتایا؟“  
مولوی اہل تقریر کے سے انداز میں بولا ”بس یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو اس کی ساس کے معنوں تشنوں سے چھٹکارا دلا سکتے  
ہیں۔ ہم اپنے نواسے کو اس کے لیے بہت سارے“

”اللہ کرے نواسہ ہو“ ”زیب النساء نے مولوی اہل کی بات کاٹ دی۔  
”جو کچھ بھی ہو“ مولوی اہل نے ٹوٹے تار کو جوڑا ”ہم بچے کے لیے بہت سارا سامان بھیج کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھائیں گے اور اس  
پر بخت بڑھیا کی پلید زبان بھی گھنٹے میں گے ہمیشہ کے لیے۔ ٹھیک ہے نا؟“  
”کتنا تو بڑا آسان ہے پر کدو گے کہاں سے؟“ ”زیب النساء نے پوچھا۔  
”تو کل عارف کی ماں تو لگی“ مولوی اہل کے ذہن میں چودھری فتح داد کا بیٹھا بیٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا۔ ”اللہ جل شانہ پرتیکہ  
نور خود مولوی اہل کو اس وقت چودھری پرتیکہ تھا۔

شام ہوتے ہی زیب النساء نے برقعہ اوڑھا۔ عارف کو ساتھ لیا اور مہرن النساء کے ہاں چلی گئی۔ رات گئے ماں ہی آئی۔ برقعہ کو  
ایک طرف رکھ کر آہستہ سے مولوی ”جہاں گئے ہو عارف کے آبا؟“

”ہاں عادت کی بات۔ کیوں؟ مولوی اہل نے سماعت میں سے ستر نکالا۔  
”بڑی کیفیت میں ہے مرنے بیٹی۔ نسیم احمد رو رہا تھا بے چارہ۔ شاید کل تک ہو جائے گا“ زریب النساء نے بڑی کھنکھاتی ہنسی آواز میں  
سہرگوشی کی۔

”سچ اماں؟“ زبدہ توپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

”اے! مولوی اہل اور زریب اندھا جیران رہ گئے، اور پھر اس موضوع پر مزید ملاحظہ اور رائے کے بغیر ہی سو گئے۔  
دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی جب بیٹی مائے درد کے چپٹی ہے اور ماں باپ مائے غم کی پھولے نہیں سنا تے۔  
اور پھر آدھی رات کو ایک ناخن نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا مولوی اہل نے لپک کر زنجیر کھولی۔ مہرن کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ سارا  
گھر جاگ اٹھا اور جب کافی دیر کے بعد سب اپنی اپنی مسکراہٹیں سمیٹ کر اونگھنے لگے تو مولوی اہل زریب النساء کے پاس آیا ”اب کیا ہو گا؟“  
”چودھری کیسا ہے؟“ زریب النساء نے پوچھا۔

”اللہ جل شانہ ہی رحم فرمائے،“ مولوی اہل ہنسنے لگا۔

زریب النساء اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی ”علائی ٹوپوں اور سونے کے ٹکٹوں کو تو بھونک بھونک میں۔ میں تو کتنی ہوں اگر ریشم کا  
ایک ایک چوڑا چپتی ہی بوائیس تو ناک رہ جائے۔ کوئی سبیل ہے؟“

”سبیل؟“ مولوی اہل سوچتی میں پڑ گیا اور جب بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا ”تمہاری عقل بھی تو ایڑیوں میں ہے۔ اور جانے  
وہاں بھی ہے کہ منیں رسات بیٹیاں ہیں اور بیٹی ہی بیٹی کے بیاہ پر کپڑے لٹے اور کتنے پاتے یہاں تک کہ آنکھوں کے چھلے بھی جینز میں دے  
ڈالے۔ آخر ایک بھوکے مرحلے امام مسجد کی بیٹی کا بیاہ تھا۔ وہ کوئی نواب ناداری تو تھی نہیں کہ کوئی، ٹھکی دھرتا۔ اب ہاتھ بھر لوٹا پیدا ہوا ہے تو  
اس کے لیے وہ ہاتھ کپڑا جو نہیں اور پوچھتی ہے کوئی سبیل ہے؟۔۔۔ نہیں ہے کوئی سبیل، کفن بھی تو نہیں کہ اٹھا کر نو لے کر پھینا دیتا۔“  
”کتنے کیوں لگے؟“ زریب النساء بھی غصے میں بولی ”کفن نہیں اس کے دشمن۔ اللہ وہ سہرے باندھے۔ اب یہ تو بھوکے سے نہیں ہو گا کہ خانی  
ہاتھ لٹکانی مہرن کے پاس جاؤں اس کی کبیری ساس کے سامنے، اور زبانی زبانی صاف قے قربان ہو کر داپس آجاؤں بھنٹوں کی گھڑی اٹھا کر۔ مجھ سے تو یہ  
نہیں ہو گا جینا جیران ہو جائے گا میری بیٹی کا۔ ساس ناک میں دم کر دے گی۔ آنکھیں نہیں اٹھ سکیں گی کسی کے سامنے۔ زبدہ اور نسیم کو بھی کوئی  
نہیں پوچھے گا۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تھا وہ ایک دم اگل بیٹھے اور اب وہی سوکھے ٹکڑے توڑتے پھرتے ہیں۔ ساری عمر کنواریاں  
بیٹھی رہیں گی۔“

”بیٹھی رہیں؟ مولوی اہل پیش میں آگیا۔“ اب کہہ تو میرے پھر ڈالوں اپنا۔ کہہ جو دیا کہ میرے پاس کفن تک نہیں اور تو ریشم کا کپڑا لٹکتی ہے،  
کچھ نہیں میرے پاس، کھچیں؟ میرے پاس کچھ نہیں.....“ مولوی اہل باہر نکل گیا۔

زریب النساء کچھ دیر تک اس خیال سے چپ چاپ بیٹھی رہی کہ وہ آنگن میں کچھ دیر بٹھل کر اندر آجائے گا مگر جب ڈیوڑھی کے دروازے  
کی زنجیر کھلنے کی آواز آئی تو وہ بٹھلا کر رودی۔ اور زبدہ النساء اور نسیم النساء تریپ کر بستر میں سے نکلیں اور لٹکتی ہوئی اپنی ماں سے پمٹ گئیں۔  
مولوی اہل سیدھا سجدہ میں گیا۔ نہ نوکر کے دیر تک تہجد پڑھا نہ پھر صبح کی اذان مے کر کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ چند نمازی کئے  
تو جماعت کرائی اور سوچے طلوع ہونے پر گھر آیا تو زریب النساء اسی جگہ بیٹھی اپنی سوچی سوچی آنکھوں سے دیوار کو گھومے جا رہی تھی۔ اور زبدہ اور

خس اس کے پاس گھڑیاں بچا ہوتی پڑی سو رہی تھیں۔ وہ مجرموں کی طرح چپکے سے اپنی چار پائی ٹنگ دیا اور یوں بے خس و حرکت بیچ گیا جیسے اسے تصور یہ اتنا دانا ہے۔

زیب النساء کی نظریں دیوار سے اتر کر زمین پر جم گئیں۔ مولوی اہل کی نقادوں سے ان کا تعاقب کیا مگر مدھیر منہ ہو سکی، پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے زور کی ایک آہ بھری۔ اب زیب النساء سے نہ ہو گیا۔ فوراً اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مولوی اہل کے ہونٹوں پر مری مری مسکراؤ نہ اور ہوتی اور اس کی آنکھوں نے کہا ”ادھر آؤ۔“

زیب النساء اٹھ کر اس کے پاس گئی۔ اب تک مولوی اہل موم ہو چکا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے؟“ زیب النساء نے بڑی پیاد بھری شکایت کی۔

”مسجد میں“ مولوی اہل نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

”کیوں گئے تھے؟“

”کیوں جاتے ہیں؟“

”کچھ سوچا؟“

”ہاں“

”کیا سوچا؟“

”یہی کہ صبح ہو گئی ہے۔ نہیں تو ماں ہونے کے سبب رات ہی کو مرن گئے ہوں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ رات کو نہ جاسکیں تو اب اس دقت تو تمہارا جانا بہت ضروری ہے۔“

”مذخالی ہاتھ؟“

”نہیں“

”پھر“

”یہی تو سوچ رہا ہوں۔ تم نے کیا سوچا؟“

”یہی“

”کچھ دیر تک دو دینی خاموش بیٹھے رہے۔“

”سنو“ زیب النساء بولی ”کہیں سے دس روپے تک قرضہ مل جائے گا۔“

مولوی اہل نے بھریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھنا وہ گیا۔ پھر ہونٹوں کو سیکڑ کر زمین کو گھورا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر لوں آہستہ آہستہ اٹھ اٹھ جیسے کھڑکی ہوئی ہے، تھکے ہوئے لمبے میں بولا ”ابو الکرکات کو کون عقل کا اندھا قرضہ دے گا عادت کی ماں۔ مجھے سب لوگ بہت اچھا طرح جانتے ہیں۔ دیکھے ٹھیک میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ سوچتا ہوں آج فراسے کے بے دو گز کپڑا نہ بیچ سکا تو پھر اس گاؤں میں کیا ہے کو رہوں گا۔“

زیب النساء بڑی عمارت سے اڑے ہوئے آنسو پی لگی۔ بولی ”بچو دھری کیسا ہے؟“

”موہیں جانا ہوں،“ مولوی اہل نے جوابی لے کر کہا۔ ذرا راجھی اچھا ہوا تو عمر کا ضرور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے اللہ جل شانہ کوئی سبیل پیدا کر دے۔“

مولوی اہل کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ زریب النساء نے برقعے کو جھاڑ کر لگتی پر ڈال دیا اور عارف کو منہ ہاتھ دھونے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ زبیدہ اور شمس نے منہ کی کہ وہ بھی اپنے بھائی کو دیکھنے جا ئیں گی۔ ”ابھی ٹھنڈی بیٹی“ زریب النساء یوں آہستہ سے بولی جیسے اس وقت ذرا سی بھی بلند آواز سے کوئی چیز نہیں سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

انتظار —————

انتظار —————

ماں کے نیور دیکھ کر بچے بھی سسے بیٹھے تھے اور ماں چڑیا کے اڑنے تک سے چونک کر ڈبوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ اور چہرہ ڈبوڑھی کے کواڑ دھڑک سے بچ کر کھلے، اور مولوی اہل زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا اور بانپتا ہوا اندر آیا اور چلتا یا، عارف کی ماں اسے عارف کی ماں“ زریب النساء باہر لپکی۔ اور اس کے نیچے زبیدہ، شمس، عارف، نمرن، عمدہ اور دوسرے سب بچے یوں نکلے جیسے کمرے میں کسی گولے نے انہیں اٹھا کر باہر کھینچ دیا ہے۔

اور مولوی اہل اسی بجتے ہوئے لہجے میں چلتا یا ”مبارک ہو عارف کی ماں! تم نولے کے چولے کو رو رہی تھیں۔ اللہ جل شانہ نے چولے چتی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا۔ جناشے پر کچھ نہیں تو بیس روپے ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اٹھے گا۔“ چودھری فتح داود مر گیا ہے نا۔“

زریب النساء نے اس زور سے اپنی چھاتی پر درد ہنتر مارا کہ بچے تک دہل کر رو دیئے۔ اور پھر ایک دم جیسے کسی نے دلوئی اہل کو گردن سے دبوچ لیا، اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتیلیں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی اہل جو سرد کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلافِ شریع قرار دیتا تھا، چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پیختا ہوا ڈبوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر لگی میں بھاگ گیا۔



# موزیل

## سعادت جن منو

ترتوچن نے پہلی مرتبہ — چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبراہٹی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی چیمبرز کے پیڑس پر چلا آیا تھا۔ آسمانی بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تلو کی طرح ساری بیچی پرینا ہوا تھا۔ حد تک جگہ جگہ بنیاں روشن تھیں۔ ترتوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سے ستارے جھڑک رہے تلوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹھ گئے ہیں، اور جگنوؤں کی طرح ٹٹھا رہے ہیں۔

ترتوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی۔ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک پہنچے فلیٹ میں قید رہا تھا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی تھی۔ ترتوچن ٹیکھے کی میکا کی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سانسے وجود کو جوھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا جیسے رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، تروتازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن اُدھے گھٹنے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا، اسی حد تک گھٹنا ہو گیا تھا۔ اب وہ صاف طور پر سواہا سکتا تھا۔

کریال کوہ اور اس کا سا راخانہ — بڑے مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانات کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلعت ہو چکی تھیں۔ ترتوچن ان سب کو دے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کر فیونا فذ ہو چکا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا۔ غالباً آٹھائیس گھنٹوں کا۔ اور ترتوچن لازماً مضطرب تھا اس پاس سب مسلمان تھے بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پختاب سے دھڑوہ دھڑوہ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہا ہے۔ کئی بھی ہاتھ — مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم دناڑک کریال کوہ کی گھٹی پکڑ کر موت کے گمبزیں کی طرف لے جاسکتا تھا۔

کریال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مغرور بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیوالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ لیے ہوئے ٹیکھے کی دیکھ بھال کر رہا تھی۔

ترتوچن کو کریال کے بھائی نے بھی بہت فحشہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا۔ فسادات کی تیزی دندہ کی

متعلق ہفتہ بھر بیٹے آگاہ کر دیا تھا اور صاف نفوس میں کہہ دیا تھا ”نرجن! یہ ٹھیکہ دیکھتے ہی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا گھر پر رہنا بہت ضروری ہے۔ اولاً، یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاگ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیتا ہے۔“ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی ٹھنی منہجوں میں مسکرا دیا۔ دیکھو! تم خواہ مخواہ ٹکڑے کرتے ہو۔ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امر قسم بالادہ ہو رہی ہے۔ بے بے، تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔ بارہ برس سے“

جہان نے نرجن بیٹی کو کیا سمجھنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس میں اگر فسادات برپا بھی ہوں تو لعلی کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے پاس کوئی چھوٹتر ہے۔ یادہ کہانیوں کا کوئی ایسا طعن ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔ مگر نرجن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ————— محلہ قطعی محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کراچی اور اس کے مای باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کراچی اور اس کے غلوچ باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ مرحلتے اور کراچی کو درپیش جاتی تو نرجن کے لیے اچھا تھا۔ وہاں دیوالی میں اس کا بھائی نرجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا تاکہ نرجن کے لیے میدانی صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنکھڑ تھا۔ چنانچہ جب کبھی کراچی اور اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرجن سنگھ کی بجائے کھنکھڑ سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بد رہی تھی۔ نرجن کا کیسوں سے بے نیاز سر ہڈی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائے ہوئے تھے۔ کراچی کو نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو پہلے کھنکھڑ سنگھ کی بہن تھی۔ مگر بہت ہی نرم و نازک اور دلچسپی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گریباں سر دبا دی گئیں تھیں، مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھڑی، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے، جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتی تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کوسے لٹھے کی طرح، اور بدن چمکنا تھا جس طرح مری رائے ڈیڑھ کی سطح ہوتی ہے۔ اور وہ بے حد شرمیلی تھی۔

نرجن اس کے گاؤں کا تھا مگر وہ زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ————— لائسنس اور مرتبہ اپنے گاؤں گیا۔ مگر اس نے کراچی کو اس کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد اپس شہر پہنچے۔ کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیریس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا۔ اور یہ فاصلہ نرجن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پر تھا۔ برما، سنگاپور، بانکا، کانگ، پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔ ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی جو بڑی لمبیں تھیں۔ ————— خاکستری رنگ کے نقوش کی

چھت میں ہزار ہا دینے دوشی تھے۔ اور ہوا اٹھڑی اور ہلکی لھلکی تھی۔

کرپال کو رکھ کر سوچے سوچے، وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو ادنیٰ جمیز میں رہتی تھی۔ اس سے تروچن کو گودے گودے، عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی بی بیٹیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے ادنیٰ جمیز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے ماسے پر غیث کیا۔ اسی دن اس کی بڑی بھینٹ موزیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کچھ چھوٹے بھونے والے اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لب اسٹیک یوں جی جی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹنی ہوئی تھی۔ ڈھیلڈا حالاً لمبا سفید چنہ پہنے تھی، جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی پٹھی پھانیاں تھیں جو پٹائی کے قریب نظر آرہی تھیں۔ بائیں جو کہ تنگی تھیں مبین مبین بالوں سے آئی ہوئی تھیں جیسے وہ بھی اسی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی نفی تھی ہوا تھیں ان پر ہم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے ہونٹے نہیں تھے، مگر گہرے عنابی رنگ کی لب اسٹیک کچھ اس انداز سے اٹھائی گئی تھی کہ وہ ہونٹے اور بھینٹ کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

تروچن کا فلیٹ، اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ یہ ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ جب تروچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو موزیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ تروچن ان کی آواز سن کر رگ گیا۔ موزیل نے اپنے پریشان بالوں کی پتوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے تروچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔ تروچن بوکھلا گیا۔ جب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موزیل کی ایک کھڑاؤں سینٹ کے چکنے فرش پر پھیلی اور وہ اس کے اوپر آ رہی۔

جب تروچن سمجھا تو موزیل اس کے اوپر ملتی کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چنہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دونوں بڑی ٹانگیں اس کے اوپر اُدھر تھیں اور..... جب تروچن نے اٹھے کی کوشش کی تو وہ بوکھلا ہٹ میں کچھ اس طرح موزیل سے۔ ساری موزیل سے اٹھا، جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سائے بدن پر پھیر گیا ہے۔

تروچن نے ہانپتے ہوئے مناسب دوزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موزیل نے اپنا بارہ ٹھیک کیا اور سکوادی دیکھ کر اڑھل ایکدم کندم چیر ہے۔ اور وہ اتنی ہونٹ کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اس کے ساتھ والی انگلی پھنساتی کوری ڈور سے باہر چلی گئی۔

تروچن کا خیال تھا کہ موزیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو، لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود مر تھی۔ وہ تروچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی، بی بیٹھی تھی، اس کے ساتھ بیٹھا جاتی تھی، سارا سارا دن اس کے ساتھ جو ہو پر نہاتی تھی، لیکن جب وہ ہانوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تھا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھڑکتی کہ اس کے سارے دوسرے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

تروچن کو پہلے کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برامیں، سنگاپور میں، وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بی بیٹھی ہے وہ ایک نہایت اچھا قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں لگوڑے لگوڑے، جنس جاتے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے انتہائی برتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سچ بن کر بیٹھا نہ جانے کے لیے تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھنے تو اُدھر اُدھر نکلیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا

کو زور سے ہاتھ ہلاتی اور تروچن سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھی۔  
 جو ٹکی میں بیٹھے ہیں۔ تروچن نے خاص طور پر موزیل کے لیے پُر تکلف کھانے منگوائے ہیں۔ مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا  
 ہے اور وہ نواہ بھڑک کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور تروچن کے سینے پر موہک دل رہی ہے۔

تروچن بعض اوقات بھٹتا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔  
 اور کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سرور کا بہانہ، کبھی پیٹ کی سحرابی کا، جس کے متعلق تروچن کو ابھی طرح معلوم تھا کہ وہ فولاد کی  
 طرح مضبوط ہے اور کبھی خواب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی ”تم سکھ ہو۔۔۔۔۔۔ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں“  
 تروچن چل بٹھ جاتا اور پوچھتا ”کوئی نازک باتیں۔۔۔۔۔۔ تمہارے پرانے یاروں کی؟“  
 موزیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چمکے کوہلوں پر رکھ کر اپنی نکلڑی مانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی ”یہ نظم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو۔۔۔۔۔۔  
 ان وہ میرے یار ہیں۔۔۔۔۔۔ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جتنے ہو تو جتنے رہو۔“

تروچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا ”اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟“  
 موزیل زور کا تقہر لگاتی ”تم پانچ سکھ ہو۔۔۔۔۔۔ ایڈیٹ۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ بٹھاؤ۔۔۔۔۔۔ اگر بٹھانے کی  
 بات ہے تو جاؤ! اپنے وطن میں کسی سکھ سے شادی کو لو۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔“

تروچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موزیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔  
 اس میں کوئی شک نہیں کہ موزیل کی وجہ سے اس کی اکثر توجہیں ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کر شان کو توندوں کے سلسلے جن کی کوئی حقیقت ہی  
 نہیں تھی، اسے خفیت ہوتا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر تو وہیں اور ہنگ کار دیو سمل انتقام ہوتا ہے، مگر تروچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ  
 کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روٹی ٹھیکہ فسی لی تھی۔ اس کو موزیل پسند تھی۔۔۔۔۔۔ پسند ہی نہیں، جیسا کہ وہ اکثر  
 اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا ”گوڈے گوڈے“ اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے  
 جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح غوار میں رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جبکہ موزیل مروج میں تھی،۔۔۔۔۔۔ تروچن نے  
 اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا ”موزیل۔۔۔۔۔۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟“

موزیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فرائک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی ہڈی آنکھیں  
 اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا ”میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔“

تروچن نے ایسا محسوس کیا کہ گہری کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دکتی ہوئی چٹکائیاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن  
 میں اگ اگ لگی۔۔۔۔۔۔ موزیل تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو۔۔۔۔۔۔ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔“

موزیل اٹھی۔ اس نے اپنے بھروسے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔ دم شیکو کر اٹھا اور اپنے سر کے بال

کھلے چھوڑ دو۔ تو میں شرط لگا تی ہوں، کئی لوٹے نہیں آئیں گے۔ تم خود جھوٹے ہو۔  
 ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موزیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی  
 بوتلوں میں اپنے موزیل بھرے ہوئے پیوست کر دیئے۔  
 موزیل نے ایک دم چپوں چپوں کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی ”میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں۔  
 تم تکلیف نہ کرو۔“

ترلوچن چلا یا ”موزیل!“  
 موزیل دبئی بیگ سے غصا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جن پر لگی ہوئی گاڑھی لب اسٹیک پر خراشیں آگئی  
 تھیں ”خدا کی قسم۔ تم اپنی داڑھی اور موزیلوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا بیوی برسرکٹ  
 بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔ پس غصہ اس پر دل لگانے کی ضرورت ہوگی۔“  
 ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موزیل بھی آگئی اور  
 اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی۔ اس میں جونپن لگی تھیں، وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں سے  
 دبائیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی موزیل نہیں آگئی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر حیرت  
 کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کی مانند اپنے  
 اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرمانبردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام  
 تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے، جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔  
 جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لگنے لگی تو اس نے موزیل سے پوچھا ”میرے تم کیا کر رہی ہو؟“  
 دانتوں میں نہیں دبائے ہوئے وہ مسکرائی ”تمہارے بال بہت ملائم ہیں۔ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا  
 بیوی برسرکٹ صاف ہو سکے گا۔“ ترلوچن۔ تم میرے دوسرے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے بیلے ایک فرسٹ کلاس  
 ٹو بناؤں گی۔“

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب ہوا ”میں نے آج تک تمہارے مذہب  
 مذاق نہیں آڑا یا۔ تم کیوں اڑاتی ہو۔“ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا،  
 یہ تو اس لیے کرتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں؟“  
 موزیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا ”مجھے معلوم ہے؟“

”دیکھ“ ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تھکے اور موزیل کے دانتوں سے پٹیں نکالیں ”میں اچھی طرح  
 جانتی ہوں کہ میری محبت کبھی اس نہیں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“  
 ”مجھے معلوم ہے“ بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے ٹکلی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔

میں قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔  
”تو چون اچھل پڑا“ سچ؟“

”موزیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکماہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لیے چمکے  
”ہاں!“

”تو چون نے اپنی نصیحت لپیٹی ہوئی دائرہ ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ پھینک لیا۔ تو..... تو کب؟“  
”موزیل الگ ہٹ گئی۔ جب — تم اپنے یہ بال کٹا دو گے!“

”تو چون اس وقت جو ہوسو ہو، بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا۔“ میں کل ہی کٹا دوں گا۔“

”موزیل فریٹ پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔ تم بھو اس کو تے ہو تو روج — تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔“

”اس نے تو چون کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سے خیال کو نکال باہر پھینکا۔ موزیل دیکھ لو گی۔“

”دیکھ لوں گی۔“ اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ تو چون کی سرخوئوں کو چومنا اور ”پھوئوں“ پھونکنا اس کی ہر حرکت پر ہر نکل گئی۔

”تو چون نے رات بھر کیا سوچا۔ وہ کن کن افیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز

اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹا دینے اور دائرہ ہی میں منہ وادی — یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا

معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر مہلکی کی حبس سے حسین لڑکی بھی کچھ

دیہ کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔

”تو چون دی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا جو سیلوں سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی اور دیر تک اس کو چھیڑتی اور

گدگداتی رہی تھی۔ اس نے ٹیریس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا جہاں ٹینکیوں اور نمروں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا

بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بغیر نہ رہا۔

”بال کٹا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز صبح موزیل کو چٹ بھیجی کہ

اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آجلے۔ موزیل آئی، تو چون کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھنکی،

پھر ”مائی ڈارلنگ تو روج“ کہہ کر اس کے ساتھ لیٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

”اس نے تو چون کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے انگریزی ریش کے کٹے ہوئے بالوں میں

اپنی انگلیوں سے کھسکی کی۔ اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔ موزیل

نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سرکٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پوچھنا شروع کر دیا۔ تو چون شرما گیا۔ اس نے سرکٹ نیچے کی اور سر زنجیر

کے طور پر اس سے کہا ”جیسے کچھ ہیں تو لیا کرو۔“

”موزیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگر جگر سے اگھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صورت اڑنا کہا۔“

”بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ایسے ہی چلتا ہے۔“

”تو چون کو وہ پہلا دی یاد آ گیا جب وہ اور موزیل دونوں ملکر اگے گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڑبڑ ہو گئے تھے۔“

”کہ اگر اس نے موزیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگایا عشاوی کی ہوگی؟“

”مندرہ“ موزیل نے تروچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

”مندرہ“ موزیل نے تروچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔ اس لیے ان کو پندرہ دن کا فوس و بنا تھا۔ عدالتی کا ردائی حتی اس لیے مناسب ہی خیال کیا گیا کہ پوز ہنتر ہے۔ پاس ہے اور تروچن کے دہان کٹی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پوز ہنتر ہونا تھا۔

موزیل فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلڈ گرل مٹی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹنکیسی اسٹینڈ تھا۔ میں یہیں موزیل نے اس کو منع کرنے کے لیے کہا تھا۔ تروچن مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیوالی جلی گئی اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہاں رہے گی۔

تروچن پر کیا گزری؟ — یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کر کہا اور موزیل کو بھول گیا۔ اتنے میں اس کی ملاقات کربال گور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ اور ٹھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موزیل بہت وابہیات دیکھتی تھی جس کے دل کے ساتھ پڑ گئے ہوئے تھے اور جو چڑوں کی مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھٹتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ نسکیسی ہوئی تھی کہ وہ موزیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی موزیل کی یاد ایک چمکی کی مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کہہ دیتے لگتی تھیں۔ وہ بے حیا تھی، بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ تروچن کو پسند تھی۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیوالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ رہنے نے نئی نئی کار خریدی تھی، یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگا حالانکہ اس کو موزیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے، اور نہ موزیل منگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی نسلی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ تروچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی کان میں موزیل جھوٹے، بھڑکیلے اور بہت سستے آدیزوں پر مرمی، اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر تروچن سے فیتس کرنے لگی کہ وہ غیر غریب ہے۔

تروچن اب تک نہ سمجھ سکا تھا کہ موزیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹتی رہتی تھی۔ اس کو چھوٹے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارے کاسارامناہن کی مانند اس کے جسم پر پھر جانا تھا کہ وہ اس کو اس سے لگے ایک پناہ دے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چھوٹے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی ”تم سکھ ہو۔“ مجھے تم سے نفرت ہے!“

تروچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موزیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رہتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس اس کی محبت میں نہ گزارتی۔ وہ ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈو بیٹراس کو ناپسند تھے، اس لیے کہ

ان سے اس کو اچھی ہوتی تھی۔ تروچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا۔ مگر اس نے بہ چیز کبھی نہ پہنی۔

تروچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑھ جاتی تھی۔ وہ یہ جیاد یا کبوتر اس ہے۔ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیا کرو۔ تم مجھے یہ بتاؤ، کون سا لباس ہے جس میں آدمی رنگا نہیں ہو سکتا۔ یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ مجھ سے ایسی کو اس نہ کیا کرو۔ تم سکھ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تیلون کے نیچے ایک سلی سا انڈروئٹر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا ہے۔ یہ بھی تمہاری دائرہ اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے۔ شرم آتی چاہئے مہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈروئٹر میں چھپا بیٹھا ہے! تروچن کو شرم شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر فحشہ آیا تھا، مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی رٹھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موزیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور دائرہ کی تصویا کر دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ بیکار اتنے دلوں بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھر جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر تروچن رگ گیا۔ موزیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔ کربال کو رد ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی۔ وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے۔ اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن معیشت یہ تھی کہ وہاں ایڑنا لیس گھنٹے کا کریو تھا۔ مگر کریو کی کون پر واکرنا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کربال کو رد اس کی مان، اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صدایا کر سکتے تھے۔

تروچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے تل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی دائرہ نیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ نورٹ میں ایک بار بر تھا۔ وہ اس صفائی سے اسے تراشنا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک مرد آہ بھری۔ اُٹھنے کا ارادہ ہی کہ رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کراخت آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ بلوٹنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو۔ ب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں۔ آواز قریب آئی تھی۔ ایک لخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موزیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص وضع کا ڈھیلہ ڈھالا لباس کرتا پسینے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی۔ اس نے اندر کی کہ تروچن کو محسوس ہوا کہ اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

تروچن پانی کے تل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا یہ ایک ایسی کہاں سے نمودار ہو گئی۔ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟

موزیل نے ایک اور انگڑائی لی۔ اب تروچن کی ہڈیاں چٹختے لگیں۔

ڈھیلے ڈھلے کرتے ہیں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں۔ تروچن کی آنکھوں کے سامنے کچی گولی گولی اوپھٹے چپٹے



بیل اُٹھرا آئے۔ وہ زور سے کھانستا۔ موزیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِ عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑا ڈل گشتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی تھپی تھی مار ڈھی دیکھنے لگی ”تم پھر سکھ بن گئے تر لوچ؟“  
 دھس کے بال تر لوچ کو چھٹے گئے۔

موزیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت لگائی اور سکا لکھا ”ادب یہ بُرش اس قابل ہے کہ میری بیوی بلو سکرٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو دیں دیوالی میں رہ گئی ہے۔“  
 تر لوچ خاموش رہا۔

موزیل نے اس کے بازو کی چپکی لی ”بوسنے کیوں سرور صاحب؟“  
 تر لوچ اپنی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا، تاہم اس نے صبح کے طلکے اندھیرے میں موزیل کے چہرے کو نور سے دیکھنا ————— کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ تر لوچ نے اس سے پوچھا ”مبار رہی ہو؟“

”نہیں“ موزیل نے اپنے تراشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔  
 ”پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟“  
 ”میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں“ موزیل پانی کے موئے تل پر بیٹھ گئی اور کھڑا ڈل فرش کے ساتھ بجانے لگی ”تم گویا کہ ————— اب پھر ————— نے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔“

تر لوچ نے کسی قدر ڈھٹائی سے جواب دیا ”ہاں“  
 ”مبارک ہو“ موزیل نے ایک کھڑا ڈل پر سے اتار لی اور پانی کے تل پر بجانے لگی ”کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟“  
 تر لوچ نے آہستہ سے کہا ”ہاں“  
 ”مبارک ہو ————— اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟“  
 ”نہیں“

”یہ بہت بڑی بات ہے“ موزیل کھڑا ڈل اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی ”ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے“  
 تر لوچ خاموش رہا۔ موزیل نے اٹھ کر اس کی مار ڈھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا ”کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟“

”نہیں“  
 تر لوچ بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا، جیسے لنگھا کرتے کرتے اس کی مار ڈھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے ”نہیں“ کہا تو اس کے لیے میں نیکھاپی تھا۔

موزیل کے ہونٹوں پر لب اسٹک بامی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو تر لوچ نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گلاؤں میں جھٹکے کی دکان پر تھائی نے پھری سے موٹی لک کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔



اس نے تروچن کا بازو پکڑ لیا۔۔۔۔۔ تروچن نے گجراہٹ میں اس سے پوچھا ”کہاں ہے؟“  
 ”وہیں ہے، جہاں وہ ہے۔۔۔۔۔ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کھجانتی ہوں۔۔۔۔۔ چلو آؤ میرے ساتھ“  
 ”مگر سنار تو۔۔۔۔۔ کرفیو ہے“  
 ”موزیل کے لیے نہیں۔۔۔۔۔ چلو آؤ“

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کہیں بھی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ ٹک لگئی اور ترلوچن کی دائیں کی طرف دیکھنے لگی۔

مردم کے لئے کہا ”یہ تمہاری داڑھی ہے۔ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔۔۔ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم ننگے ہو۔“

”ننگے سر!“ تروچن نے کسی قدر بدکھلا کر کہا ”میں ننگے سر نہیں جاؤں گا“

موزیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا ”کیوں؟“

تربوین نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی مذمت سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں گڑبڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔  
”میکوں ٹھیک نہیں۔“

متم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔“

مذہب نے نور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دلیز پر ماری مقم واقعی اول درجے کے ایڈریٹ ہو۔ گدھے کہیں کے۔ اسکی جلیں کا سوال ہے۔ کیا نام ہے، تمہاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو؟  
 تریلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ”مذہب، وہ بڑی مذہبی قسم کی لوکی ہے۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی“

موزیل جی پگھی ”اودہ تمہاری محبت بی ڈیڈ“ میں پوچھتی ہوں کہ سائے سکھ تمہاری طرح کے یقوت ہوتے ہیں۔ اسکی جان کا خطرہ ہے ادر تم کہتے ہو کہ گیکری ضرور پہنوں گے۔۔۔۔۔ اور شاید وہ اپنا اندر ویٹر بھی“  
 ترلوچن نے کہا ”وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں“

”بہت اچھا کرتے ہو۔ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس عملے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔ تم گیلری پس کر گئے تو وہیں فرج کر دیئے جاؤ گے“

تو لڑجی نے مختصر سا جواب دیا مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو گریڈی پہن کر جاؤں گا۔  
جس اپنی محبت خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔“

موزیل جھنجھلا گئی۔ اس نے اس سے پہچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑبھڑا گئیں۔ نگدھے — تہدی

محبت ہی کہاں رہے گی جب تم نہ رہو گے۔ تمہاری وہ — کیا نام ہے اس بھڑوی کا — جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا نام ان تک نہ ہے گا۔ تم سکھ ہو۔ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو۔“

تیرے بچے بولنا لگا "بکواس نہ کرو"

موزیل زور سے ہنسی۔ میں مسیحاؤں کے غبار سے آٹی ہوئی ہاتھیں اس نے تروچ کے گلے میں ڈال دیں اور مٹھوڑا سا عجول کر کہا۔ ”فائلنگ چلو، جیسے تھکادی مرضی۔ جاؤ گڈ بڑی ہیں آؤ۔ میں نیچے بازو میں کھڑی ہوں۔“  
یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ تروچ نے اسے روکا۔ ”تم کیڑے نہیں پہنڈی گی؟“  
موزیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ ”نہیں۔۔۔ چلے گا اسی طرح۔“

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ تروچن پختی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوٹی آواز سناتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سینے اور نیچے اتر کر اپنے غلیٹ میں جلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے ابھی طرح سر پہ جمایا اور غلیٹ کا دروازہ منتقل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی ننگی ٹانگیں چوڑی کمرے کے سکرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جو بڑے بوجھ اس کے قریب پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ بوجھ نے غصے میں کہا: ”متم بہت فوٹیل ہو“

موذیل مسکرائی ”یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اس سے پہلے اور کئی عجیبے ذیل کمر چکے ہیں“ پھر اس نے بوجھ کی گپڑی کی طرف دیکھا ”یہ گپڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے کیس ہیں“

بازارِ باکل انسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بدلتا دھرتی دھرتی جیسے کہ قبوسے خوف زدہ ہے۔ بنیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹرائیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گھبراہٹ ہوئی تھی پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مرکز پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزے گا۔

موزیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹے کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور مچتی۔ تروچن دل ہی دل میں موزیل کو بڑا جھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں ۵۰ اور کچھ سنیں تو اپنی جا ہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز بھی سنبھال سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موزیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی، اس لیے خاموش رہا۔

تمروچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتہ کھڑکتا تھا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر وہیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔

سنگڑٹ کا دھواں اڑا تھا، جیسے وہ بڑی بے فکر سی جیل بندی کر رہی ہے۔

جہک میں پہنچے تو پولیس میں کی آواز گونجی ”اے — کدھر جا رہا ہے؟“  
 ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس میں کے پاس پہنچ گئی اور بابوں کو ایک خفیف سا جھٹکا مے کر کہا ”اے،  
 تم — ہم کو پہچانا نہیں تم نے — موذیل....“ پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا ”اُدھر اس باجو — جا رہی رہتا  
 ہے اس کی طبیعت خراب ہے — ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے....“

سپاہی اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی فوجیا نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر اس کو دیا۔ ”لو، پیو۔“

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ ”موذیل نے اپنے منہ سے سُٹکا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا ”ہیئر از لاسٹ!“

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ ”موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرت چل دی جس میں سے گزر کر انہیں ————— ملتے جاتا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کو فوج کی غلات و دوزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔ خطوں سے کیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوتہ پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی چیل تن لہروں سے ٹکراتی، پھرتی وہ دوز تک نکل جاتی تھی۔ اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تھی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا، مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈرڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی پھری مار غزو دار نہ ہو جائے۔ ”موذیل ٹوک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا ”ترلوچن ڈیر۔۔۔۔۔ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں۔۔۔۔۔ تم ڈر و گئے تو کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔۔۔۔۔“

جبری آزمائی ہوئی بات ہے۔

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی جس میں کربال کو درہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم ٹوک گئی۔ کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک جلدواری کی دکان ٹوٹی جا رہی تھی۔ ایک لٹلے کے لیے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا ”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ چلے آؤ۔“

دونوں چلنے لگے۔ ایک آدمی سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا، ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی اس آدمی نے فوراً سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے نیٹے میں ہاتھ ڈالا۔ کہ موذیل آگئی۔ لڑکھاتی ہوئی، جیسے نٹے میں چڑ رہے۔ اس نے اس آدمی کو دھکا دیا اور غور لے کر کہا ”اسے کیا کرتا ہے؟“ اپنے بھائی کو مارتا ہے۔ ہم اس سے شادی کرنے کو مانگتا ہے۔“ پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی ”وہ کبیم!۔۔۔۔۔ اٹھاؤ یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔“

اس آدمی نے نیٹے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا۔ ”عیش کر سالی۔۔۔۔۔ عیش کر۔“ پھر اس نے پرات اٹھا لی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا ”کیسی ذلیل حرکت کی سے حرام زادے لے!“

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا کہ کوئی ذلیل حرکت نہیں۔۔۔۔۔ سب چل رہا ہے۔۔۔۔۔ ”اؤ۔“

اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ لکھی طے کر کے ”دو توں اس خطے میں پہنچ گئے جہاں کریال کور رستی تھی۔ موزیل سنے پوچھا ”کس لکھی میں جانا ہے؟“  
 نروجن نے آہستہ سے کہا ”تیسری لکھی میں۔“ ————— ”تکڑا دالی بلو رنگ؟“

نمودیل نے اس حرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی۔ مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی۔ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنائے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنائے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھر اٹھو نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی بھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موزیل ٹھنک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔ ”ترلوچ ڈیر۔۔۔۔۔ یہ لکڑی تار دوا“

تو لوچہا نے جواب دیا کہ میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا! "

نویز و غلغلہ گویا تہنہاڑی مرغی — لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہورہا ہے ؟

ساتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر لوہیاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ کاٹھی کاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دو لوگوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پہ پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے تڑپ کر کہا ”دیکھو، ایسا کرد۔۔۔ میں بھاگ کر نگرہ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں۔ تم میرے پیچھے آنا۔ بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو سمجھے۔“ نگریہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہوئے۔

موسو ذیل سے ترلوچن کے جواب کا انتقاد نہ کیا اور نکر والی بلڈنگ کی طرف ٹھکراؤں ٹھٹھکساتی بڑی تیزی سے عمارتی ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر گئے۔ میسر میسوں کے پاس، ترلوچن، مانپ رہا تھا مگر موسو ذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا، ”کون سا علاقہ؟“

”مردم کو جن نے اپنے خشتک ہو نیتوں پر زبان پھیری ”دوسرا“  
”جلیلم“

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ میڑھیاں چڑھنے لگی۔ تو بچہ اس کے پیچھے ہو گیا۔ زمینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے ماٹے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر تڑپوچن نے ہوئے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ مؤذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

تہ لہجہ نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی "منگنا سنگھ جی! منگنا سنگھ جی!" اندر سے ہمیں سی آواز آئی "کوئی؟"

دروازہ دھیرے سے کھلا۔ ترلوچن نے موزیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ موزیل نے اپنی منسل میں ایک ڈبلی تکی لڑکی کو دیکھا۔ جو بے حد سسیمی، دٹی تھی۔ موزیل نے اس کو ایک لمبے کے لیے فور سے دیکھا۔ پتلے ستلے تخت تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موزیل نے اس کو چوڑے پچکلے سینے کے ساتھ لگایا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے روتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پر بھیجی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موفق بنے کہ پال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا ”ڈرو نہیں، تر لوچ نہیں لینے آیا ہے“  
 کہ پال کور نے تر لوچ کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موزیل کے بسم سے الگ ہو گئی۔  
 تر لوچ نے اس سے کہا ”سرور صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں۔“ اور اپنی ماناجی سے بھی — ”میکن جلدی کرو۔“  
 اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور وحید کا شقی ہو رہی ہے۔  
 کہ پال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی ”اسے پکڑ لیا انھوں نے!“  
 تر لوچ نے یو جھا ”کسے؟“

کر پالی کو راجا اب دیتے ہی والی مٹی کو مہذبیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں بے گئی مد پکڑ لیا تو اچھا

گربال کو باہمی کچھ سوچنے نہ پائی تھی کہ موزیل نے انا فانا اس کی قمیض اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ گریال کو رنے اپنی بانہوں میں اپنے نکلے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ تروچو نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موزیل نے اپنا ڈھیلہ ڈھالا کر نانا اتارا اور اس کو پناہ دیہ۔ خود وہ تنگ و چراگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے گریال کو رکازا رہنہ ڈھیلہ کیا اور اس کی شکلاتا کر تروچو سے کہنے لگی ”جاری، اسے لے جاؤ۔۔۔ لیکن غصہ نہ“

یہ کہہ کر اس نے کراپال کو رکے بال کھول دیئے اور اس سے کہا ”جھاؤ“۔ جلدی نکل جاؤ۔“  
 تو لہجہ نے اس سے کہا ”آؤ“، مگر فوراً ہی ٹک گیا۔ پلٹ کر اس نے موزیل کی طرف دیکھا جو دھوئے ویسے کی طرح ننگی  
 ٹکڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔  
 ”تم جانتے کیوں نہیں ہو؟“ موزیل کے لہجے میں چڑچڑاہٹ تھی۔  
 تو لہجہ نے آہستہ سے کہا ”اس کے ماں باپ بھی تو ہیں“  
 ”جہنم میں جاؤں گے“۔ تم اس سے لے جاؤ۔“  
 ”اور تم؟“

ایکدم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑیچے اترنے لگے۔ ددوانے کے پاس آکر انہوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کربال کو رک کی اندھی مٹی اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔  
 موزیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا تو اس نے تروچن سے کہا ”سنو! اب صرف ایک ہی ترکیب میری  
 سمجھ میں آتی ہے۔ میں دروازہ کھولتی ہوں.....“  
 کربال کو رک کے خشک حلقے سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی ”دروازہ“

موزیل، تروچن سے مخاطب رہی ”میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں۔ تم میرے پیچھے بھاگنا۔ میں اوپر چڑھ  
 جاؤں گی۔ تم بھی اوپر چلے آنا۔ یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے۔“  
 تروچن نے پوچھا ”پھر؟“

موزیل نے کہا ”یہ تمہاری۔ کیا نام ہے اس کا۔“ موزیلا کو نکل جائے۔ اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔  
 تروچن نے جلدی جلدی کربال کو کوساری بات سمجھادی۔ موزیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔  
 سب بوکھلا گئے ساتھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ تروچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موزیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی۔ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے  
 تھے۔ سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موزیل کا پاؤں پھسلا۔ اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ پتھر پڑنے کے ساتھ ٹکراتی،  
 لوہے کے جھنگے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آ رہی۔ پتھر پڑے فرش پر۔

تروچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے  
 بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اور گرد و جمع ہو گئے کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موزیل  
 کے ننگے اور گوتے جسم کو دیکھ رہے تھے جس پر جا بجا خاشبیں پڑی تھیں۔

تروچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی ”موزیل۔ موزیل“

موزیل نے اپنی بڑی بڑی بیوی کی آنکھیں کھولیں جبرال ہوٹی ہوئی تھیں اور مسکرائی۔

تروچن نے اپنی پگڑی اتار دی اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موزیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے تروچن سے منہ میں غصے  
 کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا ”جاؤ، دیکھو۔ میرا اندر ویڑواں ہے کہ نہیں۔“ میرا مطلب ہے وہ.....“

تروچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موزیل نے غصے سے کہا ”میں سچ کہہ رہی ہوں..... جاؤ دیکھ کر آؤ۔“

تروچن اٹھ کر کربال کو کسے غلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موزیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے اس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا ”میرا میاں بھائی  
 ہے..... لیکن بہت دادا قسم کا..... میں اسے سمجھ کر کرتی ہوں۔“

تروچن واپس آگیا۔ اس نے آنکھوں کی آنکھوں میں موزیل کو تباہ کیا کہ کربال کو رہا چکی ہے..... موزیل نے طمیان کا سانس لیا مگر ایسا  
 کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا ”اوہ ڈیم! ہٹ.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنی مہیبی مہیبی بالوں سے آٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور  
 تروچن سے مخاطب ہوئی ”آل رائٹ ڈارلنگ۔ بانی بانی“

تروچن نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ اس کے حلق میں الجھ گئے۔

موزیل نے اپنے بدن پر سے تروچن کی پگڑی ہٹائی اس نے حادثہ کو دیکھا۔ اس نے اس کا بازو مارا، مگر مضبوط ہاتھ۔ اسے روک کر کہہ دیا۔



# سایہ

## علامہ عباس

دن بھر جیسے جیسے سائے گھٹتے بڑھتے رہتے، سڑکوں کی دکان بھی جگہیں بدلتی رہتی۔ سڑک کو ابھی سورج نہ نکلا ہوتا کہ وہ اپنا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اس کنارے لاکھڑا کرتا۔ اس طرف کوئی عمارت نہیں تھی۔ زمینی بھونچیل کی طرح تھی اور بخود ہی سی ڈھلوان کے بعد ایک میدان آتا تھا جس میں چیل کا ایک پہانا بیٹھا تھا۔ جب سورج وکیل صاحب کے چومنزے مکان کے پیچھے سے اُبھرتا اور دھوپ دھیرے دھیرے چیل کی چوٹی سے اترتی شروع ہوتی اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں میدان کا احاطہ کر کے، ڈھلوان پہ چڑھ کے سڑک کے کنارے تک پہنچ جاتی، تو وہ اپنا ٹھیلہ سڑک کے اس کنارے وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کے برابر کھڑا کر دیتا۔ ادویوں اس اوچے مکان کا سایہ دو تین گھنٹے تک اور اسے دھوپ سے بچائے رکھتا۔ لیکن جب سورج میں سر پہ آجاتا تو ناجار اسے اپنا ٹھیلہ ڈھلوان پر سے وکیل کر میدان میں چیل تلے لے جاتا پڑتا جہاں وہ دو تین بجے تک ڈیرا جمائے رہتا۔ اس کے بعد جب سورج ڈھلوان شروع ہوتا تو چیل کے سائے کے ساتھ ساتھ اس کی دکان بھی آگے کو سرکئی شروع ہو جاتی۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے وہ پھر وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اسی کنارے پہنچ جاتا جہاں زمین بھونچیل کی طرح تھی اور جہاں اس نے علی الصبح ٹھیلے کو کھڑا کیا تھا۔ خاص طور پر گرمیوں گرمیوں اس کی دکان یوں ہی جگہیں بدلتی رہتی تھی۔ وکیل صاحب کا مکان اسے دھوپ ہی سے پناہ نہیں دیتا تھا بلکہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی تھا۔ وکیل صاحب ایک وسیع گنبے کے سر پرست تھے۔ ان کا شمار شہر کے مشہور مد کیوں میں ہوتا تھا۔ بڑے با اخلاق، مفسر اور مہماں نواز تھے جب تک گھر پر رہتے ملنے والوں کا تانا بانا لگا رہتا۔ کچری جاتے تو پیچھے بیگم صاحبہ ان کی ہر دلچسپی کو برقرار رکھتیں۔ ان کی اپنی بیٹے والیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، اس پر وکیل صاحب کے منکلوں کی بی بیوں کی خاطر واریاں کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ دی بھر سبھان کے ٹھیلے سے سو ڈالیمیں کی بوتلوں، برف، پان، اسکریٹ وغیرہ کی فحاک بندھی رہتی۔

یہ علاقہ شہر کے آخری سرے پر تھا جہاں شہر کی حد ختم ہو جاتی تھی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس جگہ مکانی خلل خال ہی تھے اور کوئی دکان قریب نہ تھی۔ جہلا وہ ایک گھروں کے آسیرے پر کون ایک مستقل مکان کا متحمل ہو سکتا۔ رہا سبھان تو اس کی بات دو سری تھی۔ اول تو اس کے ٹھیلے کا خرچ ہی کیا تھا۔ نہ کرایہ دینا پڑتا تھا نہ بجلی کا بل۔ پھر دنیا میں کوئی رشتہ دار تھا نہ عزیز۔ گھر تھا نہ در۔ اس کی ضروریات زندگی اس قدر مختصر تھیں کہ صرف وکیل صاحب کے مکان کی آمدنی ہی سے بھری ہو جاتی

تھیں۔ اور وہ شہر کے چوکوں کے ٹیلے والوں اور دوسرے دوکانداروں کی باہمی چٹکنوں سے الگ تھلک اس سلسلہ میں گرفتاری کی جگہ میں خوش تھا۔

دکیل صاحب نے جب نئی نئی وکالت شروع کی تھی تو انھیں مجبوراً شہر کے ایک بارون کی بازار میں رہنا پڑا تھا۔ چھوٹا سا مکان کرایہ حد سے بڑھا ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ جب کام چل نکلا۔ اور لوگ ان کو جاننے لگے تو انھوں نے اس نواح میں ایک موٹیل کی زمین سستے داموں خرید لی۔ کئی برس تک یہ زمین یونہی پڑی رہی۔ یہاں تک کہ انھوں نے تعمیر کے لیے خاصار و پیر جمع کر لیا۔ آخر جب ان کے حسب منشا مکان بن گیا تو وہ اپنے وسیع کنبے کو لے کر اس میں اٹھ آئے۔ ان کے دم قدم سے ٹھوڑے سی بوتلوں میں اس علاقے میں زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے۔ دور دور سے ٹانگے والے ان کے موٹلوں کو لے کر یہاں پہنچنے لگے۔ چونکہ وہیں صاحب خود بھی ٹانگے ہی میں بیٹھ کر کچری چایا کرتے تھے۔ اس لیے وہ ایک ٹانگے صبح شام ان کے مکان کے آس پاس کھڑے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی کوئی موٹر بھی ٹھوڑی دیر کے لیے ان کے مکان کے نیچے رُک کر اس نواح کی رونق بڑھا جاتی۔

دکیل صاحب کے گھر کے علاوہ سبحان کی آمدنی کا ذریعہ یوں تو وہ اکاؤنٹ کاراہ گیر بھی تھے جو شہر سے دیہات یا دیہات سے شہر جانے ہوئے اس سے دو ایک پیسے کی بیڑیاں، گڑ کی ریوڑیاں یا بٹھنے ہوئے چنے خریدنے بٹھرتے۔ مگر ان سے یافت کم اور کوفت زیادہ ہوتی۔ خصوصاً اس وقت جب دیہاتیں دہپے کو سراور ٹھوڑی پر بل دیئے، ناک اور منہ چھپائے، اپنی بھڑکی جوتیاں گھسٹ گھسٹ کر چلتیں تو سرک پر گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا اور سبحان کو سوسٹے کی بوتلوں پر سے گہرے صاف کرنے کے لیے پانی کا ایک اور جینٹا دینا پڑتا۔

ان راہ گروں سے کہیں زیادہ اس کی بکری ٹانگے والوں سے ہوتی تھی جو یوں کر کے نیچے سے پھٹا ہوا خاک یا جامہ پہنے ہوتے تھے مگر قہقی سے کم درجے کا سکرٹ پینا ان کی طبع کو پسند نہ تھا۔ اور جب پیاس لگتی تو پانی کے بجائے برت میں لگے ہوئے لیم کے اٹھے سے ان کی تسکین ہوتی تھی۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ جب سبحان دوپہر کی چمپلاقی دھوپ میں لاوارث ساندوں، کتوں اور فقیر لڑکوں کی معیت میں پیل کے سائے تلے پناہ لے رہا ہوتا اور بکری سے بے نیاز اسٹیل پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تو ایسے میں کوئی دیہاتی برات دو لٹاؤں سمیت، پیسے میں شراورد ملگے مانتھے اور کلاٹیوں پر سستے بریشی کپڑوں کا رنگ لگا ہوا، پیاس سے زبانیں ٹھکی ہوئیں، اس پیل تلے سستانے اور پڑاؤ کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اور سبحان کی کئی دلوں کی کسرا ایک دن میں نکل جاتی۔ سبحان کو اس علاقے میں ٹھیلہ لگانے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہی ایک ایسا کام تھا جو اس نے ایک جگہ جم کر اتنے عرصے تک کیا تھا ورنہ اس کی ساری عمر گھوڑے پھرنے میں گزر گئی تھی۔ ابھی وہ دس برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ فکر معاش نے اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بچپن اور جوانی میں بیسیدوں ہی دھندے کئے تھے۔ آج اس شہر میں ہے تو کل اس شہر میں کبھی گھر میں ادھر کے کام پر ملازم ہے تو کبھی کسی دفتر میں چیرا سی ہے۔ کبھی دیکوے شاپ میں تو کبھی چھاپے خانے میں۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکوت رہا۔ آزاد مزدوری کو ہر کام پر ترجیح دی۔ مگر جب جوانی گزر گئی۔ اور بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تو طبیعت محنت مشقت سے خود بخود کتراتے لگی۔ آخر اس نے اتنی رقم جمع کر لی کہ ایک ٹھیلہ

غریب تھے۔ پہلے پہل اس نے پھل اور سبزیاں بھیلے پید کھ کو شہر کا چکر لگانا شروع کیا مگر غور سے ہی دلوں میں اس کام سے بد دل ہو گیا۔ آدلی نو منڈی کے بھاؤ کو سمجھنا اور موافقہ کرنا اس کی فہم سے باہر تھا۔ وہ مال کو پر گھنے میں بہت جلد و دو کا کھا جاتا تھا۔ پھر مال نہ بکے تو گل سٹر کر یا باسی ہو کر خراب ہو جاتا۔ اور پھر یہ کہ دوسرے ٹھیلے والوں سے خواہ مخواہ کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دلی بھر پولیس والوں کی گھر کیاں اور چھڑکیاں سہنی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس نے زیادہ منافع کے خیال کو چھوڑا اور پان سکرپٹ کی دکان پر اکتفا کی۔ ادھر شہر کا ایک ایسا الگ قلعہ گوشہ تلاش کر لیا کہ جہاں کسی تعدد میں سے زندہ گی کے دی پوسے کر سکے۔

ادھر وکیل صاحب یہ دیکھ کر کہ یہ دکان محض ان کے گھر کے آسروے ہی پر لگائی گئی ہے، اس کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ماما اور نوکروں کو تاکیدی مٹی کہ سب اسی سے سودا خریدیں اور اگر کچھ شکایت ہو یا چیزیں منگی معلوم ہوں تو ان کو اطلاع دیں، وہ خود اس کا بندوبست کر دیں گے مگر سبھی کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہ آنے دیتا تھا۔ وہ نوکروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اور ایک آدھ پان یا بڑی مفت کھلا پلائے میٹلہ انھیں خوش رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

یوں ہی وہ ہنس مکھ، اعلیٰ گو اور ہمدرد انسان تھا۔ لگائی بھائی کی عادت نہ تھی۔ اس لیے سب سے خوب بنتی تھی۔ جھڈ لگانے کے ساتھ ہی اس نے داڑھی رکھ لی تھی، لمبے کمر و اسٹے لگا تھا۔ تحقیقی بال، ایک تنکوں کی بنی ہوئی مخروطی وضع کی ہلکی ہلکی ٹوپی ہر وقت سر پر رکھتی۔ چار خانہ تھمد، گاڑے کا کرتا، اس پر چاکری زین کا کوٹ، اپنی اس وضع سے وہ خاصا دیندار معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ سوہم و صلوات سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ان پانچ برس میں جو اس نے وکیل صاحب کے سائے میں گزارے تھے، وہ ان کے خاندان کے بہت سے حالات سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اسے ایک ایک فرد کی عادات و اطوار کا علم تھا۔ یہاں تک کہ پرشے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ، ان کی سیرت اور سچاؤ بھی اس سے چھپا ہوا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے سائے نیچے ایک ہی چھاتی کا دو دو چنی کر پلے میں کدو نکھ دوسری چھاتی پر دو چھاتی لڑتا۔ وہ جانتا تھا کہ منجھلی صاحبہ کی سب بہن بھائیوں سے زیادہ فحشیل ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وکیل صاحب کے والد ماجد میر صاحب بر مقصاب تھے مگر بیٹے کے کہنے پر وہ چنہ چھوڑ دیا تھا غرض کئی اور ایسی باتیں جن کا وکیل صاحب کے بہت سے شے والوں کو سناں گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اسے مکان کے ایک ایک حصے اور اس کی آرائش کا حال بھی معلوم تھا۔ حالانکہ گھر نو گھر اس نے کبھی سیر حیدر میں بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس کمرے میں کون رہتا ہے۔ وکیل صاحب کا دیوان خانہ کہاں ہے۔ بیگم صاحبہ ملنے والیوں سے کہاں ملاقات کرتی ہیں۔ بڑی صاحبہ ادا یاں اور صاحبہ زادے رات کو کہاں سوتے ہیں۔ ہارونیم کون بجاتا ہے۔ وہ پرانا بڑا کلاب جس کا گھنٹہ کبھی کبھی رات کو پھلے پھلے پر کے سناتے ہیں سنائی دیا کرتا ہے کس کمرے میں ہے۔ باورچی خانہ کس منزل پر ہے اور بوڑھے میر صاحب اور نوکر چاکر کس طرح رہتے ہیں۔

یہ باتیں اسے کچھ تو بچوں کے بھولے پن سے، کچھ نوکروں کی بے احتیاطی سے اور کچھ خود اپنی ٹوہ لگانے کی عادت سے معلوم ہو گئی تھیں۔ لیکن انھیں معلوم کرنے میں اس کی کسی بُری نیت کو دخل نہ تھا۔ بس اسے انسانی ہمدردی کہہ لیجئے، یہ بدل ہلا دے کی ایک صورت۔ آخر زندگی میں کچھ تو لگاؤ و مہونا ہی چاہئے تھا ورنہ اس دیر لانے میں ایک ایسے شخص کا، جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، زندگی گزارنا اجیرن ہو جاتا۔

اس پانچ سال کے عرصے میں سہان کے ماسٹرنے وکیل صاحب کے خاندان میں دو نئے رکنوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ایک صاحبزادہ ایک صاحبزادی۔ ان سے پہلے جو صاحبزادے کئی گودوں میں رہتے تھے وہ اب بہن کی انگلی پکڑے سہان کی دکان سے اپنی مٹھائی کی گولیاں بیٹے خود اگلے لگے تھے۔ ان کے لیے ابھی پاجامہ پہننا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔

ان بہن بھائیوں سے بڑے دو صاحبزادے علی الصبار سب سے پہلے مکان سے نکلتے۔ ایک کی عمر نو برس، دوسرے کی گیارہ برس۔ ایک ہی طرح کے کوٹ۔ ایک ہی طرح کی ٹوپیاں، ایک ہی طرح کے بستے۔ اسکول روانہ ہونے سے پہلے وہ سہان سے دو درپیسے کی چوسنے والی سنگترے کی چاکلیں خریدتے۔ سہان سب سے پہلے ان ہی کی جوہنی کیا کرتا۔ جس دن انھیں آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ سمجھ جاتا کہ آج اسکول میں چھٹی ہے۔ وہ ان کے لیے ہمیشہ بڑھیا سے بڑھیا سنگترے کی چاکلیں اور دوسری انگریزی مٹھائیاں خرید کے لایا کرتا۔ اور نفع کا خیال نہ کر کے ہمیشہ گنتی سے زیادہ دیا کرتا۔

کبھی کبھی وہ چھوٹے بھائی سے کہتا:۔

”افضل میاں اسکول سے دیر ہو گئی نا، دیکھنا آج کیسے کان انٹیس گئے ماسٹر صاحب!“  
اور افضل یہاں اس کے سانوسنگ کو گھر کر کہتے:۔

”محبوب رہو تم کالا آدمی۔ تم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا“ اور وہ دونوں ہنستے ہوئے وہاں سے چل دیتے۔  
ایک دن صبح کو بڑا بھائی آیا لیکن چھوٹا نہ آیا۔ جب اس نے چاکلیں خریدنے کے لیے جیب سے پیسے نکالے تو سہان نے پوچھا:۔

”افضل میاں کہاں ہیں؟“

”وہ ماموں کے ساتھ گاڑی گیا ہے“ لڑکے نے جواب دیا اور وہ اکیلا ہی اسکول روانہ ہو گیا۔

جب چار پانچ روز تک سہان نے افضل کی صورت نہ دیکھی تو اسے بے چینی ہو نے لگی۔ آخر چھٹے روز جب دونوں بھائی پہلے کی طرح اسکول جاتے ہوئے اس کی دکان پر آئے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز کھو گئی تھی جواب مل گیا جیسے ان لڑکوں کے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد ایک غامبی تانگہ مکان کے نیچے آکر رُکا اور کوچاں گھنٹی بجانا۔ سہان سمجھ جاتا کہ اب صاحبزادوں کے اسکول جانے کی باری ہے۔ جب انھیں آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو کوچاں بے صبری سے پے درپے گھنٹی بجانا شروع کر دیتا۔ اس پر پہلی منزل کے بھادرپے میں سے بوڑھی ماما جی کو سر کا کر اپنا سر باہر نکالتی اور تانگے والے سے کہتی:۔

”مدم لومیاں دم لو۔ آتے ہیں ابھی آتے ہیں“

یہ سن کر تانگے والا بڑھتا ہوا تانگے سے اتر کر سہان کے ٹھیلے کے پاس جاتا اور اس سے پیچنی کے دو سگریٹ خریدتا۔ یا سو فٹ طعنی مارا پان بڑا کر کھاتا۔ آخر وکیل صاحب کی تینوں بڑی صاحبزادیاں ماما کے ہمراہ سیڑھیوں سے اتریں۔ بڑی کی عمر اٹھارہ نو برس، اس سے چھوٹی کی سولہ برس اور اس سے چھوٹی کی تیرہ برس۔ تینوں کے مٹھری وضع کے برقعے، ایک کتھن رنگ کا، ایک سیاہ رنگ کا اور ایک سلیٹی رنگ کا۔ تینوں کے پاؤں میں سینڈل۔ دو بڑی بہنیں تانگے کی پھیلی سیڈ پر بیٹھیں۔ اور چھٹی بہن اور ماما

انگلی سیٹ پر۔ اور تانگے والا ایک بڑی سی سفید چادر تانگے کے آگے پیچھے تان دیتا۔ ملا سیر پیر برت کا چورا کر داکے غرقس بوتل میں بھر دیتی۔ وہ اپنے بیٹے سہلان سے ایک برابر کا پاں بھی ہڑاتی۔ جس میں وہ بہت سا کالا تبا کو ڈلوایا کرتی۔ کبھی کبھی منجلی صاحبزادی کو بد بھمی کی شکایت ہوتی تو وہ کھائے پانی کا ایک ادھاما سے منگو کے پیار کرتی اور تانگہ چل دیتا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مختار اور شمشاد وکیل صاحب کے دونوں بڑے صاحبزائے موسم گما کے ہلکے پھلکے سوٹ پہنے، اپنی اپنی سائیکل کند۔ مہر پر اسٹارٹ سیر ہیروں سے اترتے دکھائی دیتے۔ وہ مڑک کو پار کر کے سہلان کے کھیلے کے پاس آکھڑے ہوتے۔ سہلان انہیں سلام کرتا جس کا وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ مگر وہ دونوں ہر وقت ایسی گرم بحث میں الجھے رہتے کہ سہلان باوجود کوشش کے ان سے کوئی بات نہ کر پاتا۔ پھر ان کی باتیں بھی گھوما ایسی ہوتیں کہ سہلان کے کچھ بھی پتے نہ پڑتا۔ ان کے جوش و خروش تیز رہے اور آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ وہ کسی بہت ہی اہم اور دقیق مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ گفتگو کا جتنا حصہ سہلان کی سمجھ میں آتا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا۔

”شمی۔ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے بھلا افلاطون.....“

”لیکن بھائی جان آپ بھی تو ذرا غور فرمائیے کہ اسطو.....“

”شمی میں کتنا ہوں تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ مانا کہ.....“

”وہ تو صحیح ہے لیکن بھائی جان ان دلائل کی روشنی میں.....“

”یہ سراسر سٹ ہے تمہاری شمی.....“

”بھائی جان لیکن پروفیسر صاحب.....“

”شمی.....“

”بھائی جان.....“

”شمی.....“

”بھائی جان.....“

غرض کالج کو جاتے۔ کالج سے آتے۔ ہاکی کھیلے جاتے۔ ہاکی کھیل کر آتے۔ سب کبھی دونوں بھائی ساتھ ساتھ ہوتے، یہ بحث یوں ہی جاری رہتی۔ کبھی کبھی وہ انگریزی میں بھی گفتگو کرنے لگتے۔ پھر ان کا جوش و خروش اور بھی بڑھ جاتا۔ ایسے موقعوں پر سہلان نظریں نیچی کر کے مسکرایا کرتا۔

مختار بائیس سالہ فوجوان تھا۔ محنت و توانائی کا مجسمہ۔ بھرا بھرا جسم۔ سرخ و سفید چہرہ۔ شریں رنگ کی آنکھیں۔ بھروسے گفتگو کرنے والے۔ شمشاد اس سے دو سال چھوٹا تھا مگر اس کے باوجود اس کا قدرے بڑے بھائی سے نکلتا تھا۔ ظاہری جمال میں وہ مختار کے برابر تھا۔ البتہ اپنی آنکھوں کی غیر معمولی چمک سے وہ اس سے کہیں زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اور سہلان سے بدایہ محسوس کیا کہ مختار بحث میں اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ چھوٹے بھائی کو ڈانٹتا ڈپٹتا ہے اور یہ شمشاد کی مسعودندی ہے کہ وہ ہمیشہ بڑے بھائی کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔

سبحان ان کے لیے حسب معمول دو کرائے دیسی پان جن کر نکالتا اور اٹنی پوچھنا کم اور کھانا زیادہ لگا کے انھیں پہننے کے لیے رکھ دیتا۔ وہ اپنی بھرت کے دوران میں اس سے بھاڑاٹن مانگتے۔ اور بائیسکلوں کو بھی جھانٹتے پوچھتے جانتے اور ساتھ ساتھ بھرت بھی کرتے رہتے۔ کبھی کسی پیٹے میں ہوا کم ہوتی تو وہیں سے ملازم لڑکے شعیب کو آواز دے کے پپ منگوایا جاتا اور پیٹے میں ہوا بھری جاتی۔ گھما ب بھی کیا مجال کہ بھرت لمحہ بھر کے لیے بھی روکنے پائے۔ سبحان پانوں کے علاوہ سگریٹ کی دو ڈبیوں میں یعنی کے پانچ پانچ سگریٹ پہلے ہی ڈال رکھتا۔ اور وہ اپنا اپنا پان منہ میں رکھ، سگریٹ سٹکا، بائیسکلوں پر سوار ہو، تیز تیز پیر مارتے ہوئے کالج روانہ ہو جاتے مگر بھرت بدستور جاری رہتی۔

کئی دس سبھ کے قریب ایک اور خالی ناگہ مکان کے نیچے آکر رکتا۔ اور سبحان کو معلوم ہو جاتا کہ وکیل صاحب کے پھری جانے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت اس کا عقیدہ وکیل صاحب کے مکان کی سیزر جیوں کے برابر میں کھڑا ہونا۔ وہ پہلے ہی سے ایک اچھا سا پان چھانٹ کر لگا رکھتا۔ آخر سیزر جیوں میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی اور وکیل صاحب سیاہ شیر دانی پہنے، سر پر مشدیدی پگڑی باندھے، پھڑکی جلتے ہوئے سیزر جیوں سے اترتے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ بھاری بھر کم آدمی تھے مگر چاق و چونند، فرانسیسی تراش کی داڑھی جس میں اب کچھ دنوں سے سفید بال زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ چہرے سے قناعت اور بردباری ٹپکتی تھی۔ کثرت اولاد کی وجہ سے ہر ایک کو شفقت کی نفروں سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سبحان کے سلام کے جواب میں ایک آدھ بات کرنا خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو، اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔

”بھئی سبحان آج کل خبر بوزے بڑے پھیکے آ رہے ہیں“

”تم بھی تو کھٹے ہیں سرکار“

”سچ کہتے ہو“ یہ کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھ جاتے۔ اور سبحان معمول کے مطابق پان، تلپنی کی ڈبیا، دیا مسلائی کا بکس اور ایک کاغذ کے ٹکڑے پر رختوڑا سا چونا رکھ کر، کہ وہ زیادہ چونا کھانے کے عادی تھے، تانگے کے پاس جا کر یہ چیزیں انھیں دے دیتا۔ کبھی کبھی ان کا مختار بھی فائیلین لیے ان کے ہمراہ ہوتا اور سبحان کو اس کے لیے پان میں بہت سی سوغت ڈالنی پڑتی۔

وہ وکیل صاحب اور ان کی بیگم کے بہت سے ملنے والوں کو بھی جانتے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بدھ کے روز تیسرے پھر حاجی صاحب کے ہاں سے زنانہ سواریاں آیا کرتی ہیں۔ چونا پتھر جیسے ہی ان کا تانگہ آکے رکتا وہ لائٹ جوس، دس بھری وغیرہ کی بوتلیں پہلے ہی سے دھو دھا کر نکال رکھتا۔ ان سواریوں کے ساتھ جو بچے آتے ان کی دل پسند مٹھائیوں کا بھی اسے پتہ تھا۔ انوار کے روز کھانا ڈاکٹر عظیم الدین یا خیر المہ جیٹا واسے کے خاندان آیا کرتے۔ موغرا لڑکے وکیل صاحب کے دور کے قربات داروں میں سے تھے اور ان کی طرح کثیر الاولاد۔ قریب کے رشتہ داروں میں جو کبھی کبھی ملنے آ جاتے۔ اور جن کو سبحان اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک تو بیگم صاحبہ کا چھوڑا جاتی تھا جس کی بربازی کی دکان تھی۔ جب کبھی وہ آتا تو کپڑے کا ایک آدھ تھان اس کی بغل میں ہوتا یہ تھان کبھی تو وکیل صاحب کے ہاں ہی رہ جاتا۔ اور کبھی وہ اسے واپس اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور دوسرے وکیل صاحب کے تایا۔ جو بے حد منعیت تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کے دوسرے گھر پر رہا کرتے تھے۔ جب کبھی یہ باپ بیٹے ملنے آتے تو دن بھر ان کے گھر ہی پر رہتے اور رات کو بڑی دیر میں کھانا کھا کر جاتے۔

سبحان، بخار اور شمشاد کے بعض درختوں کو بھی جانتا تھا جو ان سے ملے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً ریاض کو۔ شام کو جب وہ باکی کھیل کر واپس آتے تو اکثر ریاض میں بھی سائیکل پر ان کے ہمراہ ہوتا۔ وہ شمشاد کا ہم عمر اور کالج میں اس کا ہم سبق تھا۔ مختار سے اس کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ وہ چونکہ شمشاد کا بڑا بھائی تھا اس لیے ریاض میں اس کا ادب کیا کرتا تھا۔ ریاض ان دونوں بھائیوں سے قد میں چھوٹا تھا اور رنگت بھی ان کی جیسی سرخ و سفید نہ تھی، تاہم اس کی ملاحظت میں ایک خاص بات نکلیں تھا۔ جیسٹم چہرہ، زندگی کی مسرتوں سے بھرپور اور لکڑوں سے آزاد شمشاد کو اس سے اور اس کو شمشاد سے گہری وابستگی تھی۔

سبحان کے بھیلے کے قریب جو اس وقت وکیل صاحب کے مکان کے عین بالمقابل میٹرک کے دوسرے کتا سے ہوتا، یہ قیسوں نور جوان اپنی اپنی بائیکل تھلے، رخصت سے پہلے کچھ دیر باتیں ضرور کرتے۔ جب کبھی ریاض ان بھائیوں کی بحث میں شامل ہو جاتا پھر تو بحث طویل ہی کھینچتی چلی جاتی۔ سبحان سے بار بار پانی اور سگریٹ لیے جاتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا مگر رخصت نہ ہو پانا غرض گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی باتوں میں گزر جاتا۔ اس دوران میں وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی کا کمرہ تھا، بار بار ایک رنگین سایہ چغولی کے نیچے حرکت کرتا رہتا، جسے سبحان کی کن آنکھوں کے سوا اور کوئی آنکھ نہ دیکھ سکتی۔

وکیل صاحب کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے رشتے کے سلسلے میں جو لوگ آیا کرتے، سبحان ان کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی بکری ایک دم بڑھ جاتی اور گھر کے ملازموں اور بوڑھی ماما کے علاوہ وکیل صاحب کے چھوٹے دھکے اور لڑکیاں بھی دوڑ دوڑ کر سبحان کی دکان پر سودا لینے آیا کرتے۔ ان لوگوں کے جانے کے غصڑی ہی دیر بعد سبحان ٹوہ لگا لیتا کہ کہیں بات پکی ہوئی یا نہیں۔

وہ شبیر سے ہنس کر کہتا:۔۔

”پانچویں گھی میں ہوں گی اور سر کرٹھاٹی میں“

شبیر خیر ان ہو کر پوچھتا:۔

”کیا کا تم نے؟“

”زیادہ بڑ نہیں ہم سے، سب خبر ہے ہمیں“

شبیر اب بھی لاعلمی غاہر کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کو واقعی خبر نہیں۔ اور پھر وہ ماما کی طرف رجوع کرتا جس سے اسے اکثر باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ بڑی بی وکیل صاحب کی سب سے پرانی ملازمہ تھیں۔ ان کے سائے نیچے ان ہی کی گود میں پے تھے۔ اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ نہ کوئی رشتہ دار ہی تھا۔ ان بچوں سے انھیں دلی محبت تھی۔ اس کی بنا پر وہ ان کے مستقبل کے بارے میں بڑے زنی کرنا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ چنانچہ محبت اور سادگی میں ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا:۔

”نور جوان لوگوں میں رشتہ ہو۔ مجھے تو یہ لوگ ایک آنکھ نہیں جاتے“ پھر ذرا تامل کر کے کہتی: ”گھبراؤ نہیں۔ وہ دن

میں آجائے گا۔ چاند سی بیٹیاں ہیں میری۔“

اور سبحان سمجھ جاتا کہ ان لوگوں سے بات نہیں ٹھہری۔ ایسے ہی کسی موقع پر وہ افضل میاں سے کہتا:۔

”شہ بالا بنے گا میرا میاں۔ ہم کو بھی گھوڑی پر چڑھا دے گا نا!“

اگر اس قسم کی کوئی بات گھر میں ہوتی ہوتی تو افضل بیاں بڑا کر چل دیتے۔ یا معلوم نہ ہوتا تو کہتے :-  
”چپ رہو تم کا آؤمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا“

ایک دن ایسے ہی موقع پر جبکہ کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں، بڑی بی بی پانی لینے آئیں۔ ان کا سامنے پھولا ہوا تھا مگر وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ سبحان نے ان کی طرف مستفسر انداز نظر سے دیکھا ہی تھا کہ وہ پھوٹ پڑیں :-  
”کسی سے ذکر و ذکر کچھ خبردار۔ بڑی صاحبزادی کی بات ٹھہر گئی“

”کب؟“

”ابھی ابھی“

”کون لوگ ہیں؟“

”شہر کے نامور ڈاکٹر ہیں۔ لڑکا بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ پر خبردار کسی سے ذکر نہ کر بیٹھیو۔ سو دشمن ہیں سو دوست ہیں، میں نے گھر کا آدمی سمجھ کے تم سے کہہ دیا ہے۔ تم کسی سے نہ کہنا۔ بچوں سے بھی نہیں۔ لڑکوں سے بھی نہیں۔۔۔۔۔“

اس کے دو تہی ہی دن بعد سبحان نے کئی اور ذریعوں سے بڑی بی بی کی بات کی تصدیق کر لی۔ سیدھیوں میں سب جوں بڑھنے لگا۔ عورتیں تو آتی جاتی ہی رہتی تھیں۔ ایک بار لڑکے کے والد ڈاکٹر صاحب بھی اپنی موٹر میں بیٹھ کے وکیل صاحب سے ملنے آئے۔ اور دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ دوسری مرتبہ ضیافت پر آئے۔ اس موقع پر ان کا صاحبزادہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ خاصا قبول صورت تھا مگر کسی قدر لاغر معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بی بی نے کہا ”امتحان کی فکر ہے بچائے کو“ سبحان کو نام بھی معلوم ہو گیا۔ صغیر احمد۔ تو ادیر پایا کہ جب لڑکا امتحان دے لے گا تو اس کی شادی کر دی جائے گی۔

بڑی صاحبزادی کے حمیز کے لیے بڑی شہرت کے ساتھ جو زیورات و ملبوسات وغیرہ تیار کر آئے جا رہے تھے، سبحان کو ان کی ایک ایک تفصیل کا علم تھا۔ اس دوران میں شمشاد میاں کے دوست ریاض بھی کئی مرتبہ ان کے بعد ان دونوں بھائیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے آئے۔ اور سبحان نے دیکھا کہ دوسری منزل میں چیتوں کے پیچھے وہ رنگین سیارہ اب بھی حرکت کرتا ہے۔

اور ایک دن اچانک سبحان کے ذہن میں ایک بات آئی۔ گئیں ایسا تو نہیں کہ صاحبزادی کو یہ رشتہ منظور نہ ہو یا یہ بات اسے کسی نے نہیں سمجھا یا مٹی۔ اور سمجھانا بھی تو کون۔ کیونکہ وکیل صاحب یہ گند کے کسی اور آدمی کو اس کا گمان نہ تھا۔ اس نے مختلف زبانوں سے اس کے بائے میں مواد حاصل کر کے خود ہی یہ نتیجہ نکالا تھا۔ آخر اس نے بھی ایک عمر گزاری مٹی۔ زمانے کا سرد گرم دیکھا تھا۔ دو تہی مرتبہ بڑی بی بی اور بچوں سے اسے معلوم ہوا تھا۔ کہ صاحبزادی کی طبیعت نا ساز ہے۔ ایک دن دیکھا کہ ناگے میں سوار ہونے ہوئے وہ بڑی بے دلی سے قدم اٹھا رہی ہے۔ ایک دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اسکول نہیں گئی۔ بلکہ دوسری وجہ سے گھر ہی میں رہی۔ مگر اسی شام کو جب شمشاد اور شمشاد کے ساتھ ریاض میاں سبحان کی دکان پر آئے۔ اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو اس نے دوسری منزل میں چیتوں کے پیچھے سائے کو پہلے سے ہی کہیں زیادہ بے چین دیکھا۔

شادی کی تیاریاں اب اور بھی زور شور سے ہونے لگی تھیں۔ وکیل صاحب کے گھر میں ہر وقت ایک شور و غل مچا رہتا تھا۔ مگر اسی طرح کی اجناس تانگوں میں لہر لہر کے آرہی تھیں۔ طرح طرح کا فرنیچر، سنگھار، میز، پینک، کوبیاں، تپائیاں، تانبے اور پیتل کے



برقی جھپٹن نعلی گرنے چاندی کا بنا دیا تھا۔ علاوہ انہیں مہالوں کی وہ دیل دیل نعلی کہ سبحان کو دکا ند اوی سے لمحہ بھر کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہ تھا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا جاتا تھا اس کی انفرادی زندگی بڑھتی جاتی تھی۔ اور اسے ایک نامعلوم ہول سا ہونے لگا تھا۔ کیل صاحب اب اس سے اور بھی زیادہ لطف و مہربانی سے پیش آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ اس سے کہنے لگے :-  
”سبحان ہم تمہارے بیٹے بھی ایک سچڑا سلوا میں تھے۔ برات کے روز پہننا۔ دیکھنا انکار نہ کرنا۔ ہمسائے کا رشتہ سوزیدوں سے کم نہیں ہونا“

سبحان نے وکیل صاحب کے بچوں کو دعائیں دیں۔ مگر یہ مزدہ بھی اس کی انفرادی زندگی کو درد نہ کر سکا۔ ایک دن علی الصبح سبحان نے ابھی ٹھیکہ ترک کے کھاسے لاسے کھڑکیا ہی تھا کہ دیکھا شمشاد کندھے پر بائیسکل اٹھائے جلد بلد بیڑھیوں سے اتر رہا ہے۔ اس نے صرخت بنیان اور ٹیکہ پس رکھا تھا۔ ابھی داڑھی بھی نہیں مونڈھی تھی۔  
”کئے شمشاد میاں صبح صبح کو صحر کی تیاری ہے؟“ سبحان نے پوچھا۔  
”کیں نہیں، ذرا ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہوں“ شمشاد نے جواب دیا۔  
”غیر تو ہے؟“ سبحان نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں خیر ہی ہے“ یہ کہہ کر شمشاد بائیسکل پر تیز تیز پاؤں مارنا ہوا چل دیا۔  
سبحان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ بے تابی کے ساتھ گھر کے اور لوگوں کی راہ دیکھنے لگا تا کہ معلوم کرے کون بیمار ہے۔ جب تکیل صاحب کے دونوں چھوٹے صاحبزائے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے تو ان سے معلوم ہوا کہ رات بڑی باجی کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی۔  
تھوڑی دیر بعد ایک موٹر وکیل صاحب کے مکان کے نیچے رکی اور ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لیے اوپر گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ نیچے نرا سبحان اپنا خلیل چھوڑ کر اس کے پاس آگیا تھا مگر اس سے کچھ پوچھنے کی اسے جرأت نہ ہو سکی۔ اور وہ اور بھی زیادہ بینائی کے ساتھ بڑی بی یا شبیر کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ ناگہ آ یا جس میں بیچہ کر لڑکیاں اسکول جایا کرتی تھیں مگر بڑی بی نے اسے اوپر ہی سے ”آج نہیں چاہئے“ کہہ کر ٹوٹا دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شبیر بہت بیٹھے آیا تو اس سے سبحان کو معلوم ہوا کہ بڑی صاحبزادی کو سرسام ہو گیا ہے۔ مگر زیادہ فکر کی بات نہیں۔ ڈاکٹر وہ گھنٹے بعد پھر آئے گا۔

دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر پھر آیا اور جب وہ جانے لگا تو سبحان پھر اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس کے لب ہلے مگر سوال کرنے کی اب کبھی اسے جرأت نہ ہوئی اس دفعہ بڑی بی پان بیٹھے آئیں تو ان سے معلوم ہوا کہ حالت میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ڈاکٹر شام کو پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔  
اس روز تکیل صاحب پھر بھی نہیں گئے۔ تیسرے پیر لڑکی کا ہونے والا سسر جو خود بھی ڈاکٹر تھا اسے دیکھنے آیا۔ ایک گھنٹہ تک اس باں رہا۔ اور لوگ جو بچی کی خبر کو آئے انھیں جلد ہی نصرت کر دیا گیا۔ دن بھر مکان پر ایک مقبرے کی سی خاموشی طاری رہی۔

شمشاد اور مختار کالج سے جلد ہی واپس آگئے تھے۔ شام کو وہ ہاکی کھیلنے نہیں گئے مگر شمشاد سے ملنے آیا۔ سبحان کے شیلے کے قریب جب شمشاد اس سے اپنی بہن کا حال بیان کر رہا تھا تو سبحان نے سنا کہ اس کے مرض میں ابھی آفاقہ نہیں ہوا۔ دونوں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر آج رات خبر بہت سے گزرتی تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔

سبحان کی نظریہ اختیار دوسری منزل پر حقیقت کی طرف اٹھ گئی لکڑے میں روشنی ہو رہی تھی اس کے سوا وہ کچھ اور نہ دیکھ سکا۔  
تقریباً دیوہیں ریاض رخصت ہو گیا۔

شمشا نے گھر جاتے ہوئے سبحان سے کہا:-

”بروت اور لا رکھنا شاید رات کو ضرورت پڑ جائے“

”نکڑ نہ کیجئے۔ میں نے من بھر بروت پہلے ہی سے منگو رکھی ہے“

سبحان رات کو عموماً نو بجے دکائی بڑھادیا کرتا تھا مگر اس رات اس نے گیارہ بجے تک مکان جہائے رکھی۔ اس دوران میں وہ ملازمت

سے راجپوتی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ اس کی حالت اگر سدھری نہیں تھی تو زیادہ بڑی بھی نہیں ہونے پائی تھی۔

آدھی رات کے قریب وہ ٹھیلے کو بند کر کے صاحب معمول اس کے قریب ہی سڑک کے کنارے چارپائی ڈال کر لیٹ رہا مگر آنکھوں

میں نیند غائب تھی۔ کان دکیل صاحب کے مکان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ صبح کو تین بجے کے قریب جب وہ ذرا اٹھ کھٹنے لگا تھا تو اچانک

ایک طرف سے کتے کے جھونکنے کی آواز آئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اوروکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ مگر گھر میں

خاموشی تھی۔

اس نے اینٹ پھینک کر کتے کو بھگا دیا۔

# سہارے کی تلاش

## حیات اللہ انصاری

دیاست مئی پور کے راج محل کے شاندار باغ میں ہمارا جد کی سائفرہ منائی جا رہی تھی اور دیاست کے چوٹی کے عہدیدار، اعلیٰ افسر، جنیور اور معززین اکٹھے تھے۔ سالگرہ کی رسوم ادا ہو چکی تھیں، ایٹ ہوم بھی ختم ہو چکا تھا، اور اب ہمارے گھوم پھر کر ایک دوسرے سے مل رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

مسٹر جان فاسٹر جو دیاست کا نیا انگریز وزیر داخلہ تھا ہمارا جد کو مبارکباد دینے کے بعد صدر میں لگے ہوئے زبردستی شامیانے سے نکل کر ایک جاگیردار مسٹر جوشی سے باتیں کرنے لگا۔ وزیر داخلہ کو دیکھ کر فیکٹر جنرل پولیس اور چند اور معززین اکٹھے ہو گئے۔ فارسٹر باتیں تو اب لوگوں سے کر رہا تھا لیکن اس کے کان اس کھوج میں تھے کہ محنت اور محنت کے تذکرے کس کس طرف ہو رہے ہیں۔ اتنے میں اسے ذرا دور پر ایک زنانی آواز جوش میں بھری ہوئی سنائی دی۔

”جس دہیں میں اس کی بیٹیوں کی لالچ محفوظ نہ ہو وہ مٹ جائے تو اچھا ہے“

پھر ایک مردانی آواز سنائی دی۔

”اتنا مبالغہ نہیں کرتے مالتی؟“

مردانی آواز میں ایسا لہجہ بھی تھی کہ ایسی باتیں کم سے کم یہاں تو نہ کرو۔

مالتی نے جواب دیا۔

”میں اتنا جانتی ہوں چاچا جی کہ ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے“

شاید کسی نے چپکے سے کہا کہ مسٹر فارسٹر پاس ہی کھڑے ہیں۔

مالتی نے چمک کر جواب دیا۔

”جس کا جی چاہے سن لے میں سچ بات کہنے سے نہیں رُک سکتی“

مسٹر فارسٹر ہندوستانی اچھی طرح سمجھ لیتے تھے، یہ سب باتیں سمجھ گئے اور جوشی سے کہنے لگے۔

”آج کل محنت و محنت کی باتیں بہت ہو رہی ہیں“

”کچھ نہ پوچھئے۔ ہر طرف اسی کا جہ چاہے“

فارط کے لمحے میں تلخ غمہ موجود تھا جو دیا جانے پر بھی چھٹک آیا تھا۔ اب تو فارط کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب بھی محنت کا تذکرہ  
 سنا تھا تو یہ محسوس کرتا تھا کہ سوامی کامرن برت ہمیں بدل کر مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔ ایسے محطے برداشت کرتے کرتے وہ اپنے سینے میں  
 ایک ڈائنامیٹ محسوس کرنے لگا تھا۔

دوسری جنگ عالمگیر جاری تھی اور ہندوستان میں رنگرٹ بھرتی کر کے چند ہفتوں کی تربیت دے کر محاذ پر بھیجے جا رہے تھے۔  
 اس زمانے میں ایک فوجی ماہر نے یہ دریافت کیا کہ ریاست منی پور کے پہاڑ اور جنگل ایک خاص قسم کی جنگی تربیت کے لیے بہت موزوں  
 ہیں حکومت ہند نے ہمارے لیے فوج پرکشی اجازت لی اور چند ہفتوں کے اندر اندر ضروری انتظامات کر کے وہاں تربیتی کیمپ کھول  
 دیا گیا۔

تربیتی کیمپ اپنے ساتھ فارط کو بھی بھجیت ریاست کے وزیر داخلہ کے لے آیا۔ فارط کو انگلستان سے آئے صرف  
 ۵ سال گزرے تھے لیکن اس نے اپنے کو اس تربیت سے سو سے بھی زیادہ بہت کامیاب سوچیں کر دکھایا تھا۔ اس نے سلسلہ کے ہنگاموں  
 کو فرو کرنے میں ایسی ہوشیاری دکھائی تھی کہ حکومت اس کی انتظامی قابلیت کی قائل ہو گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ فارط ایسے  
 ہندوستانیوں کے مزاج دان انگریز ہندوستان میں بہت کم ہیں اس لیے حکومت کو بھروسہ تھا کہ مسٹر فارط ریاست میں کوئی بات ایسی  
 نہ ہونے دے گا جس سے کیمپ کے کاموں میں رکاوٹ پڑے۔

منی پور کی جس وادی میں کیمپ کھولا گیا تھا اس سے دو دو تین تین میل کے فاصلے پر تین چار گاؤں واقع تھے۔ کیمپ کے کھلنے کے  
 چند ہی روز کے بعد مسٹر فارط کو معلوم ہوا کہ رانوں کو فوجی ان گاؤں میں اچانک ٹھکس جاتے ہیں اور وہاں کی عورتوں کو اغلاے جاتے ہیں۔  
 مسٹر فارط نے یہ شکایت فوجی ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی تبھی سے دن وہاں سے رسمی جواب آیا کہ ”ضروری کارروائی کی جائے“

اس واقعہ کے دو مہینے بعد دس پندرہ فوجیوں نے ایک گاؤں پر چھاپہ مارا اور وہاں سے چند عورتوں کو اغلاے گئے۔ صبح  
 یہ عورتیں بہت بُری حالت میں جنگل میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان بچا دیوں کو ان کے عزیز اغلاے گئے۔ اسی دن شام کو ان میں سے ایک عورت  
 نے جس کا نام سیتا تھا موقع پاکر بغیرت کے مارے خودکشی کر لی۔ اس خودکشی سے گاؤں والے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے ریاست  
 کے اعلیٰ افسروں کے سامنے رور دکر فریاد کی۔ جواب میں ان سے کہہ دیا گیا کہ وزیر داخلہ نے فوجی ہیڈ کوارٹر کو لکھا ہے کہ ایسی حرکتوں  
 کا سدباب کیا جائے اور ہیڈ کوارٹر نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ وعدہ جلد پورا ہو گا۔ یہ جواب سن کر گاؤں والے واپس  
 چلے گئے اور بغاوت ختم ہو گئی۔

لیکن دو ہفتوں کے گزر جانے کے بعد ایک سوامی نے درخواست دی کہ فورم فوجیوں پر جلد سے جلد مقدمہ چلایا جائے اور  
 اس سلسلے میں انھوں نے مسٹر فارط سے ملاقات کی خواہش کی۔ فارط نے سوچا کہ وہ فوجی جنھوں نے ایسی حرکت کی تھی اپنے دستے کے  
 ساتھ ریاست سے جا چکے ہیں اور اب تک وہ برمایا افریقہ یا یورپ کے محاذ پر بھیجے جا چکے ہوں گے۔ ایک معمولی سے سوامی کی ہٹ  
 پوری کرنے کے لیے یہ تو ہونے سے رہا کہ محاذ پر لڑتی ہوئی ایک پوری فوج کو بلا لیا جائے اور اس طرح لاکھوں روپیوں کا خرچ  
 اور فوجیوں کی عام بددلی مول لی جائے۔ فوجیوں کی بددلی اور ایسے زمانے میں جبکہ ان میں جنگ سے اتنا ہٹ پھیل رہی تھی اور انکی  
 دل دہی کی حد سے زیادہ مزور تھی! ظاہر ہے کہ یہ آئی ہوئی بات تھی۔ فارط نے یہ سمجھ کر سوامی سے ملنے سے انکار کر دیا۔

صلایا گیا تو میں مرن ہمت رکھوں گا۔

یہ خط پڑھ کر مسٹر فارمستر نے کہا۔

مذکورہ سمجھنا ہے کہ اس طرح مجھے بلکہ میں کہنے میں کامیاب ہو جائے گا؛ مگر گاندھی نے ابھی جو اکیس دن کا برت رکھا تھا اس کے نتیجے میں ایک طاقت ختم کیونکہ ہندوستان کے کروڑوں باشندے اسے ہاتھ دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں۔ لیکن ایک ادنیٰ سوامی جیسے ۳۱ دیاست ہی کے بہت غٹوڑے سے لوگ جانتے ہوں، وہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ وہ زندہ رہے یا مر جائے، اس کا لا کر کے کہیں نقل جائے یا پھاڑے لگ کر خیر و کشتی کرے۔ یہ جگہ پر اس کی ان بنی باتوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اور حکومت اس سے کیوں بے گامی و سوامی یا تو سستی ثمر حاصل کرنا چاہتا ہے یا بالکل ہے۔“

۱۱۔ فارم سے سوامی نے عودت کی لاج کے نام پر اپیل کی تھی اور ماسی کی رکھوالی کے لیے وہ جان دینا چاہتا تھا۔ عورت کی لاج !! جس دنیا میں ہر طرف آوارگی اور بد چلتی ہو، جہاں پاک و ناموسی نام پر صرف نادرستی اور سماج کے خوف کا، جہاں پاکیزہ مرد ایسے نوجوانوں پر جہاں بدنامی کا اندیشہ نہ ہو کبھی نہ جوگنا ہو جہاں وفا و ادبیات دل کی تلواروں میں آزاد ی سے بغیر مردوں سے ہم بستری ہو جاتی ہو، وہاں ایک ادنیٰ لڑکی کی عصمت کے لیے اتنا اودھم !! یہ حرکت صرف احمقانہ اور بے نتیجہ آدرش پرستی ہے۔۔۔ سینہ نے خود کوئی کر لی محافقت کی اگر وہ سبھی تو اس کا مستقبل ماضی سے بگڑا تو نہ رہتا۔ ایک مرد اسے مسترد کر دیتا تو دوسرا بد نہ کر لیتا۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے۔۔۔

سوالی نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا۔ یعنی دو دن کے بعد مرگ برت شروع کر دیا۔ غار سترنے جنگ کے زمانے کے اختیار سے کام لے کر اخباروں کو برت کی خبریں چھاپنے کی ممانعت کر دی، اور اس سلسلے میں ہر قسم کے جلسے اور جلوس خلافت قانون قرار دے دیے اور پھر اس واقعہ کو اس نے اپنے ذہن سے نکال دیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر گیا تھا کہ ایک جم سے سینا ہر بر گھر میں عصمت کی دیوی بن کر نمودار ہو گئی۔ شاعروں نے اس کی شان میں نظمیں اور کہلوں نے کویتاں لکھیں۔ گویوں نے دھکائیں اور اخباروں میں چھپیں۔ اخباروں میں عصمت پر بحثیں نکلے گئے۔ کسی مصور نے سینا کی ایک فرضی تصویر بنا دی جو ہزاروں کی تعداد میں بکنے لگی۔ ہر بر گھر ہر بر صحبت اور ہر بر آفس میں یہ بخش ہونے لگیں کہ عصمت بہت مزدور چیز ہے۔ اس کے بغیر دنیا کا کام نہیں چل سکتا۔ یہ نہ رہے گی تو ساج کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر ہر بیویوں پر بھروسہ کیسے کریں گے؟ کنواری لڑکیوں کے جو بچے ہوں گے ان کو پائے گا کون؟ اس طرح کے درجنوں سوالات اٹھ کھڑے ہوئے جو گھوم پھر کر کسی نہ کسی راستے سے جواب کی تلاش میں فارسٹر کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ وہ دل کی آواز میں ہندوستانیوں کی احمقانہ آواز پرستی پر ہنسنا اور ان سوالوں کے جواب موقع اور عمل کا لحاظ کر کے کوئی چھتا ہوا فقرہ اس دیتا تھا۔ لیکن جب ان سوالوں کا اور عصمت کی عظمت پر بحثوں کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تو فارسٹر کو کچھ پرانیانی ہونے لگی کہ سوامی کے لئے اسے اس خفیہ جگہ کو کیسے روکا جائے۔

چوتھے ہفتے فارسٹر کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہر خاموش ہونٹ اور ہر چار ہونے والی آنکھیں اسی مسئلے پر اس سے بحث کرتی ہیں اور اس سے متعلق سوالوں کو اس سے پوچھتی ہیں۔ رفتہ رفتہ فارسٹر کی یہ حالت بدتر ہو گئی کہ اگر کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ مصیبت

کے منے کا معاملہ دے دیتا تو فارستر اندر ہی اندر کھل جاتا۔ اور غصے کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔

آج سوالی کے برت کو پانچ ہفتے اندر چکے تھے۔

مسٹر جان فارستر کا رینڈرک اور مسٹر جوشی کا جواب سن کر انیسٹر عزیزل پرمیس نے کہا۔

”میر جگہ نبی باتیں ہو رہی ہیں۔ بازار، کلب، اسکول، کالج، باؤنڈریکس پر جگہ نبی مسئلہ زیر غور ہے، شاہدوں اور غائبوں میں بھی باتیں

ہو رہی ہیں“

فارستر: ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کے سب کام رُسکے ہوئے ہیں اور جب تک عصمت کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا ہے زندگی کی گاڑی

ایک دم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

فارستر کے اس فقرے پر ایک باتیںز قہقہہ لگا۔

فارستر: (درا اوپنی آواز میں) میں جانتا ہوں کہ عصمت بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن بعض چیزیں اہمیت میں اس سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ آج

مذہب مکھڑوں میں دفاع پر ہر ہر چیز قربان کی جا رہی ہے۔

انگریز مہمانوں کے لیے ایک میز انگ لگا دی گئی تھی جس پر شراہیں اور سوؤ کے گوشت کے کباب اور انگریزوں کے پسند

کی دوسری چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ فارستر گفتگو ختم کر کے اُدھر گیا اور روسکی کا ایک بڑا سا پگٹے کر اس نے ایک گھونٹ پیا۔ اتنے میں

پاس سے آواز آئی۔

”مسٹر فارستر! کیا آپ سوامی کے برت کا مقابلہ اسی طرح کرتے رہیں گے خواہ وہ مر جائے؟“

اس سوال کے پوچھنے والی پس لمب عقی جو ریاست کے ایک سابق انگریز دیوان مسٹر جیس لمب کی اکلونی بیٹی تھی۔

فارستر: مس لمب اگر کوئی شخص مرنا چاہتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟“

پلمیس: جس طرح آپ اس برت کا اور اس کے پس منظر میں ہندوستانیوں کے جو دنیاؤسی اقدار ہیں ان کا مقابلہ کر رہے ہیں، اسکی

تعریف نہیں کر سکتی۔ دتھوئل۔

فارستر: ٹینک یو۔

پلمیس: آپ نے مجھے ایک بہت بڑی چیز بتا دی۔ وہ یہ کہ مغرب کی مٹوس حقیقت پسندی اور دنیاوی سوچ بوجھ کیسی ہوتی ہیں۔ اور وہ

ہندوستان کے دنیاؤسی اقدار کا مقابلہ کس خوبصورتی سے کر سکتی ہیں اور ان کو اپنی جگہ نقل و حرکت سے کس طرح پاش پاش

کر سکتی ہیں۔

مس لمب جس حسین کسی پہلو سے نہ تھی۔ بہت معمولی صورت تھی اس کی، بال بخوشی ہی لہروں کے ساتھ کندھوں پر ریشم کے پھوٹی کی طرح

جھول رہے تھے۔ آنکھوں میں ساکن تال کی نیلا ہٹ تھی۔ بوٹ پتلے پتلے تھے جو اس وقت جوش اور ضبط سے کانپ رہے تھے۔ لگاتوں پر

میامی کا سایہ تھا۔ چہرے پر کچھ ایسا بھولاہن اور تاجرہ کاری تھی کہ وہ باوجود ۲۵، ۲۶ سال کی ہونے کے بیس سال کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

مس لمب کا باپ چندرہ سال ریاست کا دیوان رہ کر مر گیا تھا۔ ہمارا چرنے اس کی خدمات کے جلسے میں اس کے خاندان کو ایک جاگپنے

دی تھی لیکن یہ شرط لگا دی تھی کہ یہ جاگیر اس وقت تک اس خاندان کے پاس رہے گی جب تک کہ وہ ریاست میں مستقل سکونت رکھے۔ کچھ



کولامٹی چارچ سے منتشر کرنا پڑا تھا۔ ایک بار تو انھوں نے سینڈا ڈے رنڈا کو خلافت قانون جیلوس نکال دیا تھا جسے منتشر کرنے کے لیے ایسا سخت دھمکی چارچ کر پڑا کہ چھ آدمی مر گئے اور سو سے اوپر زخمی، سپتال پہنچائے گئے۔ آخری ہفتے کے اندر اس جیلوٹے سے شہر میں تیس سہندوؤں کو گرفتار کر کے بلا مقدر چلائے جیل میں ڈال دینا پڑا تھا۔

فارمہ سوامی کے برت کے چوتھے ہفتے کے بعد ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ عصمت اس کی صف میں انتشار مچا رہی ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی صف کے لوگوں کے جذبات بھی سوامی کی صف میں شامل ہو رہے ہیں اور اس کی حکومت صرف ان کے ہاتھ پاؤں پر رہ گئی ہے۔ سینڈا ڈے کے موقع پر شہر لوگوں نے دن بھر کا برت رکھا تھا۔ اس دن رات کو فارمہ کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ بڑے بڑے سرکاری افسروں کی بیویوں اور بیٹیوں نے بھی اس دن خرابی صحت کی بنا پر دن بھر کا فاقہ کیا تھا۔

قلعہ اوپر سے تو بالکل ویسا ہی مضبوط تھا جیسا اول دن تھا، لیکن اس کے اندر ایک طوفان اٹھ رہا تھا جس کا زور روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔ جب وہ لوگوں کو اس جرم پر سزا دیتا تھا کہ وہ عصمت کی ضرورت سے زیادہ حمایت کرنے کی وجہ سے بغاوت کے مرتکب ہو گئے ہیں، یا نشتہ مجمع پر دھمکی چاہے کرنا تھا تو اسے اپنے آپ کو اس سخت کام کے لیے پہلے سے زیادہ مضبوط کرنا پڑتا تھا۔ اور کام ختم کرنے کے بعد دیر تک اپنے آپ سے بحث کرنا پڑتی تھی کہ میں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ اور آخر کار اسے دھکی کی آڑ میں چھپ کر اس بحث سے جان چھپانا پڑتی تھی۔ دن بدن بے نیاری اور یہ بحث اور یہ آڑ لے کر چھپنا، یہ سب کام مشکل سے مشکل تر ہوتے جاتے تھے۔

ایک دن فارمہ کو یہ رپورٹ ملی کہ ایک ادنیٰ سی منڈی نے یہ کہہ کر سینڈا فٹڈ میں چندہ دیا ہے کہ اگرچہ میں خود عصمت کی دوکاندار ہوں، لیکن خوب جانتی ہوں کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے اور اس کی رکھشا کتنی ضروری ہے۔ یہ رپورٹ پا کر فارمہ نے اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ واقعی یہ چیز جس کا نام عصمت ہے، ایسی ہی ضروری ہے کہ لوگ اس کے اتنے دیوانے ہو جائیں؟ لیکن اس سوال نے اس کے دماغ کو خیالات کے ایسے گورکھ دھندے میں الجھا دیا جس کا اسے کوئی اور سرا نہ ملا۔

ایک رات فارمہ نے پوچھنے کے دو افسروں کو سادے کپڑوں میں ساتھ لیا اور معمولی شہریوں کی طرح سوامی سے ملنے پہنچ گیا۔ وہاں وہ خود کچھ نہیں بولا۔ پوچھنے کے افسر باتیں کرتے رہے۔ سوامی نے اپنے برت کا مقصد سمجھایا اور پھر کہنے لگا۔  
”یہ سمجھنا کہ یہ برت کسی شخص کی مخالفت میں ہے، بہت سخت غلطی ہے۔ عصمت کی رکھشا کرنا حکومت پر فرض ہے، اور وہ اس فرض سے کسی وقت پہلو تہی کر سکتی ہے جب حق اور انصاف کا اثر سماج پر کم ہو جائے۔ میں اپنے برت سے حق اور انصاف کو جگانا چاہتا ہوں۔ وہ اگر جاگ اٹھے تو دل بدل جائیں گے۔ بڑے اچھے ہو جائیں گے، اور جو اچھے نہ ہوں گے۔ سماج ان کی رائے کو ماننے کا ہی نہیں؟“

پھر سوامی کہنے لگا ”جو لوگ میری مخالفت کرتے ہیں وہ بھی عورت کی لالچ کی قیمت جانتے ہیں۔ پھر میں ناحق پر یکے ہو سکتا ہوں؟“

فارمہ نے سوامی کے الفاظ سے زیادہ اس کے دل کو محسوس کیا۔ وہاں واقعی اس کے خلاف یا کسی اور کے خلاف ذرا بھی نفرت نہیں تھی۔



اس ملاقات نے نابھہ کو اور کمزور کر دیا جو شخص تم سے نفرت کرتا ہو یا تم سے ڈرتا ہو یا تم کو غصہ دلاتا ہو اس کے سینے پر نشانہ باندھنا اور ٹولی مارنا آسانی ہے لیکن جو شخص نہ نفرت کرتا ہو، نہ ڈرتا ہو، نہ غصہ دلاتا ہو، بلکہ اٹا سپنے طریقے سے تمہارا بھلا چاہتا ہو اس پر نشانہ باندھنا یا گولی مارنا آسانو کا وہ نہیں مشکل اور بہت مشکل ہے۔

سوامی مرگیا اور مر کر ایک سخت سڑک چھوڑ گیا وہ یہ کہ سب شہر اسے مل کر اس کی ارضی امانت چاہتے ہیں، اس بات کی ادنیٰ کو اجازت دی جائے یا نہ دی جائے ملکی انتظام کی زبان میں یہ سوال یوں اٹھتا تھا کہ عوام کو پہلے ڈھیل دی جائے اور پھر ان کے گلے میں پھندا کسا جائے۔ یا شروع ہی سے پھندا کس دیا جائے؟

دعائی کے مرنے سے عصمت کا معاملہ اور سنگین ہو گیا تھا۔ ریاست کے عوام کی حالت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ نیدر دی بلی کی طرح ان کی عورتوں کی گھات میں بیٹھا ہو رہا ہے۔ اس لیے عوام قدرتی طور پر اپنی عورتوں کی عصمت کی حفاظت کے لیے سرکھٹ میں۔ غم و غصہ کا ایک آتش نشان ملک رہا تھا اور کچھ انداز میں ہوتا تھا کہ اس کے پیٹ میں گتنا لاوا بھرا ہے۔

فارسٹر تذبذب یا سناٹا کیا کر دے۔ عوام کو شروع ہی سے دباؤں یا پٹے ڈھیل دے دوں پھر دباؤں میں کی انگریزی غلب میں ایک بات ایسی ہو گئی جس نے فارسٹر کو سہارا دے دیا اور اس سہارے سے اس نے اپنا تذبذب ختم کر دیا۔ غلب میں ریاست بھر کے انگریز موجود تھے اور سب کے سب جلوس کے نام سے بہت خوفزدہ تھے سب ایک لڑنے تھے۔ وہ یہ کہ ہم کو گاندھی والوں کے عدم تشدد پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے کیا معلوم وہ کس وقت تشدد پر اُتر آئیں؟ ایک میم نے کہا،

”فرض کرو جس وقت جلوس نکل رہا ہو اس وقت گاندھی والوں کا افسر اپنے آدمیوں کو ہزن کا حکم دیدے اور ایک دم ناکھ دو ناکھ فوٹے ہم پر ٹوٹ پڑیں، تب فارسٹر سترم کیا کر دے؟“

”کبتان ڈر جٹ جو اپنی چھٹیاں گزارنے حال ہی میں اپنے ایک دوست کے پاس مئی پور آیا تھا، کہنے لگا،

”فسٹر فارسٹر! آپ کو ہم لوگوں کی جانوں پر تجربہ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے“

پس لمبے نال میں نظر آنے والے آسمان کے رنگ کی آنکھوں سے فارسٹر کی طرف دیکھا اور بولی۔

”آپ مذہب کیوں ہیں؟ کیا ہندوستانیوں کے وقتاؤسی اقدار نے آپ کو بھی توڑ ڈالا؟“

فارسٹر کا انگریزی طرز و رد و کر آیا۔

”میں ٹوٹے کا نہیں مس لمب“

فارسٹر نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ جلوس نہیں نکلا گا۔ بس صرب۔ ۵۰ آدمیوں کو ارضی کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائیگی۔

(۳۱)

جلوس کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن شہر والوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور خلافت قانون دس ہزار آدمی بلو تھی سے کر اس بات سے روانہ ہوئے کہ شہر کے خاص بازار سے ہو کر شہر ان جائیں گے۔ فارسٹر نے خلافت قانون جلوس کو منتشر کرنے کا پہلے سے انتظام

کر لیا تھا۔ بازار کے دوسرے سوسے پر مسلح پولیس کھڑی کر دی تھی اور خود بھی موقع پر موجود تھا۔  
 بازار سے گزر کر جلسہ سب نگہ پر پہنچا تو پولیس نے اس کا راستہ روک دیا۔  
 ارغی کے آگے سوامی کے کچھ چلیے تھے، ان کے بعد ریاست کے سیاسی کارکن تھے جن کے ہاتھوں میں ترنگا جھنڈا تھا۔  
 اس کے پیچھے آدھوں کا سمندر تھا جس میں ایک طرف عورتوں اور بچوں کا غول بھی تھا۔ لوگوں کے ہاتھ میں ایک چھڑی تک نہ تھی۔  
 پولیس نے لٹاؤ اسپیکر سے اعلان کیا کہ اگر مجمع کھڑے آگے بڑھا تو اس پر فائرنگ کر دی جائے گی۔ لیکن مجمع نے اس اعلان  
 کی کوئی پروا نہ کی اور آگے بڑھتا رہا۔ جیسے وہ بازار کی حد سے نکلا فائر سٹر نے حکم دیا۔  
 'سٹار'

فون، فون، فون، فون، ووراؤنڈ چلے۔ آگے کی قطار۔ ڈھیر ہو گئی، ارغی لگے پڑی اور لوگ بدحواسی سے بھاگنے لگے۔  
 ان میں کچھ تو درہمٹ کر پھٹ گئے، کچھ دوکانوں پر چڑھ گئے اور کچھ ایسے بھاگے کہ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جب مجمع منتشر ہو گیا تو فائر سٹر نے حکم  
 دیا کہ ارغی پر قبضہ کرو۔ پولیس آگے بڑھی سائیکائی ایک نوجوانی پانگوں کی طرح بھڑے نکل آیا اور زمین پر پڑے ہوئے جھنڈے کو اٹھا کر اس نے  
 نعرہ لگایا۔

"انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد"

بھاگنے والوں میں ایک لہر دوڑ گئی اور ان کے قدم ٹھم گئے اور وہ پھر اکٹھے ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ فائر سٹر نے نوجوان کے ہاتھ  
 پر اپنے پستول سے ایک ڈیر کیا۔ وہ مع جھنڈے کے گر پڑا۔ لیکن پھر وہ فوراً ہی ٹپ کر اٹھا اور دوسرے ہاتھ میں جھنڈا اٹھام کر نعرہ لگایا۔  
 "انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد"

فائر سٹر نے دوسرا ڈیر کیا اور نوجوان پھر اس طرح ڈھیر ہو گیا کہ لوگ سمجھے وہ مر گیا، لیکن ایک منٹ کے بعد اس نے پھر کھڑے ہو کر پلٹ کر  
 پاس پڑے ہوئے جھنڈے کو دانتوں میں دبا کر لے کر اٹھا اور اٹھتے بھٹتے نعرہ لگایا۔

"انقلاب —"

فائر سٹر کہ اس کی مندر پر غصہ آ گیا اور اس نے پورا پستول اس زخمی پر خالی کر دیا۔ نوجوان جہاں تھا وہیں غول میں نہا کر فائر سے کی طرح ڈھیر ہو گیا۔  
 لیکن اس بات پر مجمع چھٹنے کی بجائے اکٹھا ہو کر نعرے لگانا ہوا آگے بڑھا۔

"انقلاب زندہ باد"

"سوامی جی زندہ باد"

"محنت و محنت زندہ باد"

فائر سٹر نے پھر فائرنگ کا حکم دیا۔ اب کی چھ راؤنڈ چلے تب جا کر مجمع منتشر ہوا۔ بھاگنے والے نوجوان کی لاش تو اٹھالے گئے،  
 لیکن سوامی کی ارغی تک نہ پہنچ سکے۔ پولیس نے ارغی پر قبضہ کر لیا اور شمسان لے جا کر پھونک دیا۔

(۴)

فائر سٹر کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی ٹرک بک زندگی دھسکی تھی جو جلدوت و خلوت،

خوفی و غم ہر موقع پر وفاداری سے اس کا ساتھ دیتی تھی۔ فارستر جب سوانی کی لاش پھینکا کر واپس آیا تو اس نے بہت بدستواری سے اپنی شریک زندگی کو یاد کیا۔ لیکن آج وہ کسی طرح بھی فارستر کے دل کی بیابان نہ سمجھا سکی۔ اس کے سینے میں ایک نغمہ پرست تھا جو کسی طرح نکالے نہیں نکلتا تھا۔ اس نغمہ کی نوک دانتوں میں جھنڈاؤں سے لہلاہٹا تھا۔ اٹلانو جو ان تھا۔ چل سوا ہی اور سینا۔ یہ سب گھسے ہوئے اس کے گلیے کا قہر بنا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے سینے میں جسے میں نے کئی زہروں سے چھپا رکھا تھا، اس نغمہ نے کیسے راستہ بنا لیا۔ اس نازک وقت میں اس خیال سے بھی کچھ سہارا نہیں مل رہا تھا کہ میں کمزور انگریزوں کا محافظ ہوں۔ کیوں نہ نہتے مجمع کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس بات پر یقین کرنا کہ یہ کسی لوٹ مار بھی کر سکتا ہے حال یہ چکا تھا۔

فارستر سوچنے لگا کہ کاش کوئی نسوانی آواز ہوتی جو پیار و پریم میں ڈوبی ہوئی میرے دل پر ملائم ملائم ہاتھ پھیرتی اور کہتی "ڈارلنگ جان" "تم نے جو کچھ کیا ہے وہ درست ہے۔ تم غلط پر نہیں ہو، غلطی پر تھا وہ سوامی جو اپنی حماقت میں مر گیا، اور غلطی پر تھا وہ نوجوان جس نے پاگل پن میں اپنی جان دے دی۔" لیکن ایسی نسوانی آواز ہے کہاں؟

ایک دم سے دہلی پہلی مس بیس میب فارستر کے دل میں ردنا ہو گئی۔ فارستر کی نگاہوں سے پردے سے اٹھنے لگے اور اسے محسوس ہونے لگا کہ ڈیڑھ مہینے سے، جب سے کہ میں برت سے لڑا ہوں وہ میرے لیے جزمی رہی ہے اور لوری بھی جب مجھے جنگ پر جانا تھا تو وہ خیالوں کے تاروں پر قوس کرتی ہوئی آتی ہے اور اس نے مجھے گدگد کر گدگد کر جگایا ہے اور اپنی جھیروں سے میری ہمت بندھائی ہے۔ میر جب میں نکلا ہوا واپس آیا ہوں تو وہ مسکراتی ہوئی تصور میں آئی ہے اور اس نے خود اعتمادی کے چھاتے لگا کر میرے زحمت مند دل کٹے ہیں۔ فارستر نے پلٹ کر اپنے سے کہا جان تم بیوقوف ہو جو جمعی تک تم نے یہ نہیں محسوس کیا کہ تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ وہ لڑکی تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر تم انجن ہو تو وہ بھاپ ہے۔ اگر تم ہوائی جہاز ہو تو وہ پٹرول ہے۔ تم کو اسے اپنا بنالینا چاہئے۔

فارستر میں کی تلاش میں کلب گیا۔ لیکن وہاں وہ نہیں ملی حالانکہ وہ بہت پابندی سے آیا کرتی تھی۔ فارستر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بیاد تو نہیں ہو گئی۔ لیکن اسے ایک اندیشہ اور بھی ہوا۔ جس سے وہ بہت پریشان ہو گیا۔ وہ یہ کہ کپتان ڈرجٹ اس کے پیچھے لگا رہتا تھا اور وہ اسے ہر ایک قسم کا عورت کا شکار ہی تھا جو کسی نہ کسی چال سے عورت کو اپنے اوپر ترس دلا کر اس کے مادرانہ جذبہ کو کھولا دیتے ہیں اور پھر اس حالت سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ فارستر نے طے کیا کہ مجھے فوراً آپس کے یہاں جانا چاہئے۔

فارستر ایسا شخص تھا جس کے سینے میں طاقت اور اختیارات حاصل کرنے کی انگلیوں کا طوفان امٹا کرتا تھا۔ اور جو اپنی منزل کے لیے بلا جھجک خون کا دریا بھی پار کر سکتا تھا۔ لیکن آج کل یہ انگلیں ایسے نامعلوم بھاری بوجھ کے نیچے دب ہوئی تھیں جن کے نیچے سے ان کے جزمیہ گیت آہن بن کر نکلتے تھے اس لیے اس کو خارجی سہائے کی ضرورت تھی اور فوری ضرورت۔

فارستر بہت بیتیانی سے آپس کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اس کا گھر ایسی پہاڑی پر تھا جہاں کافی دوز تک پیدل جانا پڑتا تھا۔ یہ راستہ کامٹاس کے لیے دو بھر ہو گیا۔

پیس نے فارستر کو آتے دیکھ لیا، وہ خوشی سے چلا کر اس کی طرف دوڑی۔

فارستر فارستر — میں اس وقت آپ سے ملنے کے لیے کتنی بے چین تھی!! لیکن اس بات کا تو سان گمان بھی نہ تھا کہ میں اتنی

خوش نصیب ہوں۔ کہ آپ یہاں آجائیں گے۔ آئیے مسٹر فارمٹر۔“

مسٹر فارمٹر کو بیس سٹ ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کہا۔

میں آپ کو ایک خبر سنانے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ یہ بات ایسی ہے جسے میں دنیا میں صرف آپ سے کہہ سکتی ہوں اور صرف آپ ہی اس کی عظمت محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ میرے بگڑی دوست بھی ہیں اور دگر و بھری اور ساتھ ساتھ مطربی اقدار کی آپ نہ انصاف: ہیں۔ وہ خبر ہے کہ آج مجھے اپنی مادر وطن کی ایک خدمت کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ — جمی ہاں مجھ پر لڑکی نے مادر وطن کی خدمت کی۔ جس نے ایک تھکے ماندے فوجی کو نازنی ہمت دے کر محاذ پر بھیج دیا۔ — ایک بچی ماڈرن انگریز لڑکی کی طرح —

فائبر کے سینے پر ایک نامعلوم گھولنے لگا۔

فائز ستر: کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھا۔

پیس : (مہنس کر) آپ خیال بھی نہیں کر سکتے ہیں کہ میں نے کیا کیا ہو گا۔ کپتان ڈرجہ کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں لیکن وہ لڑائی سے اتنا اکتا یا ہوا تھا کہ کہتا تھا کہ میں محاذ پر جانے کی بجائے سامنے کے پہاڑوں میں بھاگ جاؤں گا اور وہاں مارا مارا پھروں گا۔ جب اس کی سکت نہیں رہے گی تو اپنے کو کسی چوٹی پر سے گرا دوں گا۔ وہ کہتا تھا کہ مار ڈالنا وہ کاروبار ہے جس کے لیے انسانی دل کو ایک خاص قسم کے راسخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہے چاہت، نرم و نازک انسانی لمس اور مجھے یہ ملا نہیں ہے۔ دو سال بیت گئے اس کے بغیر۔ جب وہ بیر بانلی مجھ سے کیا کرتا تھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈباتی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں نہ ہوتی تو وہ پلوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر اسے بدل سے پوچھا کہ علی کی ایک ماڈرن لڑکی جو ہندوستان کے قدیم لومسی اقدار کی نہیں بلکہ یورپ کے حقیقت پسند اقدار کی یعنی ان اقدار کی جن کا مجسمہ آپنی فائرسٹر ہے، بھاری ہے اسے کیا کرنا چاہئے؟ وہ کہوں نہ اس ننگے ماندے سہا جی کو اس کا مطلب راسخ سے ہے؟ آخر بہت غور و فکر کے بعد میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔“

فارسٹر: (اپنے بے چینی کو بہت سخت کوشش سے چھپا کر) ”کیا کیا؟“

**پیمیں :** جس چیز کا وہ بھوکا تھا وہ اسے مے دی۔ ہم دونوں نے ایک دوا دی میں جا کر خوب دوا دی عیش دی۔ اہل باہم ستر فارستر میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے ڈر بحث اس وقت ہوئی جہاز پر نہیں جا رہا ہے بلکہ میں لے اپنے بازوؤں پر اٹھاؤں معاذ کی طرف لیے جا رہی ہوں۔ اور جب وہ ہمارے دیر وطن کے بیٹے دشمن سے لڑنے گاتو اس وقت وہ اپنے بازوؤں سے نہیں (اپنے) ہاتھوں کو اونچا کر کے) بلکہ ان کو زور ہاتھوں سے لڑنے گا“

فارسٹر : کیا اس نے تم سے شادی کا وعدہ کر لیا ہے؟

پیس : منادی کا وعدہ !! اس کی بیوی لندن میں موجود ہے۔

فارسٹر: پس کیا تم اتنی ہی احمق ہو؟

پیس : کیا مطلب ؟

فارس سطر: تم نے اپنے کو ایک بد معاش کی خواہشوں کا شکار بنا دیا اور سمجھتی ہو کہ مادرِ وطن کی خدمت کی — کیا داغ تھی تم سے اتنی

بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے؟

پیس : اتنی بڑی غلطی! جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سب واقعہ ہے۔ لیکن اس میں غلطی کیا ہے؟ آدمی کا انتخاب غلط تھا، یا فعل غلط؟  
فارسٹر : (مجھلا کر) کیا تم اتنی بھولی ہو نہیں؟ تم میں عملی سوچ جو بالکل نہیں ہے۔ جو بات چھوٹی سے چھوٹی لڑکی کہہ سکتی ہے تم وہ بھی نہیں سمجھ رہی ہو۔

پیس : میں سمجھی۔ تم کو میرے مستقبل کی فکر ہے۔ مئی کو اگر معلوم ہو جائے تو ان کو بھی یہی فکر ہوگی۔ لیکن مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ہوسکا تو میں مغرب کو چلی جاؤں گی۔ اور یہ نہ ممکن ہو تو بھی کوئی ہرج نہیں میری سب سے بڑی فضا علی کہیں نورالیا یا اپنے وطن کی کوئی خدمت کر سکوں سو وہ پوری ہو گئی اب جو بھی ہو، سب جھگٹ لوں گی۔

فارسٹر : یہ بناؤ تم ڈرجٹ کی محبت میں تو نہیں گرفتار ہو گئی تھیں؟ یا ایسا تو نہیں ہو کہ اس کے رونے کی وجہ سے بہت زیادہ کچھ لگیں؟  
پیس : میں اتنی جذباتی تو نہیں ہوں۔ اتنا تو تم محسوس کر ہی سکتے ہو۔

فارسٹر : پھر کیا تم کو اس میں جنسی کشش نظر آئی؟  
پیس : نظر تو آئی۔ لیکن پہلے نہیں۔ جب میں نے فیصلہ کر لیا ہے اس کے بعد۔  
فارسٹر : تو سن لو۔ تم عصمت باختہ عورت ہو۔

یہ سن کر پیس پر بھلی گر پڑی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہی۔ پھر اپنے کوتاہوں میں کر کے کہنے لگی۔

پیس : عصمت باختہ! اقم اس لڑکی کو عصمت باختہ کہتے ہو جس نے تمہارے خیالات پر عمل کیا؟  
فارسٹر : خیالات، خیالات، خیالات کا کیا؟ آدمی سینکڑوں باتیں روز کہتا رہا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے ان پر عمل کیا جائے؟

پیس : لیکن تم کہتے تھے کہ تمہارے خیالات ہندوستانی آدمیوں کی طرح ناقابل عمل نہیں۔ بلکہ وہ روزمرہ کی زندگی کی چیزیں ہیں سب میں سمجھی۔ میں نے واقعی دھوکا کھایا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں نے ڈرجٹ کے ہاتھ سے دھوکا کھایا، نہیں، میں نے تم سے دھوکا کھایا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے جو کچھ کیا وہ کسی فوری جذبے سے کیا؟ میں اس قربانی کے لیے اپنے کو ڈرجٹ کے آنے کے ایک مہینہ پہلے سے، جب سے کہ میں نے اپنے کو تمہارا چملا بنایا ہے، تیار کرتی رہی ہوں، تاکہ موقع پڑنے پر اس طرح خدمت کر سکوں جو میرا دل اس کے خلاف فریاد کرتا تھا تو میں اس کو سمجھاتی تھی کہ تجھ پر آورش پرستی کا سایہ ہے اس لیے تو ابھی باتیں کرتا ہے عصمت کے حامیوں کے خلاف جنگ نے میری ہمت بندھائی اور میں نے اپنے دل کا گلا گھونٹ گھونٹ کر اسے خاموش کر دیا۔ لیکن افسوس رانا اب کھلا کہ میں نے جس آواز کو مار ڈالا وہی سچی تھی۔ میں نے اپنے کو پوری طرح برباد کر ڈالا۔ لے پیس یہ ہے تعبیر تیرے ادب کے خوابوں کی؟ پیس چوٹ چوٹ کر رونے لگی۔

فارسٹر غم و غصہ اور کوفت سے نیم پاگل ہو رہا تھا۔ لیکن چند منٹ میں اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

”دیکھو پیس۔ مجھے الزام دو، میں نے جو کچھ کیا تھا وہ سوائی کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ٹھکانا تھا۔ یہ تمہارے اس پر عمل کر کے بہت غلطی کی۔ میں پھر کراہ کر کھڑی ہوئی۔“

موس کیسے، اپنی قیمتی باتوں کو اپنے ہی ٹمکے بنے دیکھتے — اچھا خدا حافظ.....“

فارسٹر : تم کو اس حالت میں چھوڑ دوں؟

پلیس : میں آپ کی صورت نہیں دیکھ سکتی ہوں، جلیٹے — ابھی جاٹے۔

پلیس رنج و غم سے گری پڑ رہی تھی۔ لیکن اس پر بھی وہ فارسٹر کے غیبر نے کی روادار نہیں ہوئی اور اسے نکال دیا۔

فارسٹر کو گھرا کر یہ خبر ملی کہ سوامی کی خاک سندھ اڑتی ہے دوسرا حتم نے لیا ہے یعنی فہرہ والے کلوشمید نوجوان، کی اڑتی پڑی دھوم دھام سے نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فارسٹر کی حالت اس کہ سان ایسی تھی جس کا کھلیاں اسی کے ہاتھوں چل کر اچھی زندگی گزارنے کی تمام امیدوں کو نیکر خاک ہو گیا ہو۔ اور خوشخوار فرزند خواہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو — اختیارات کی بھوک، عزت و ترقی کی خواہشیں، اس قسم کی سب انگلیں نہ جانے کس طرح خاک ہو چکی تھیں۔ صرف اس بات کا احساس تھا کہ جیسے بنے رکھ قتل و غارت کا روبرو کرنا ہے۔

فارسٹر خود اعتمادی کی بھبک مانگتے پھر و حسکی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ صبح جب وہ فائرنگ کرانے جا رہا تھا تو اس کے جسم میں ارادے کی جگہ نشہ کام کر رہا تھا۔

دیدی

اسے حاصل تھا۔ اس سے زیادہ زندگی میں کوئی کس چیز کی امید کر سکتا ہے، مگر حجب وہ اپنی بیوی کی زبان سے یہ دو حرفی لفظ ”جی“ سنا.....  
 بلا کے غم، بے رنگ، تھکے ہوئے انداز میں..... تو اس کی خوشی اور خوش قسمتی دونوں پر لٹک اور شبہ اور ایک عین  
 مایوسی کے بادل چھا جاتے۔

”جی!“

کب سے یہ لفظ اس کی زندگی میں گونج رہا تھا۔

نیرہ برس ہوئے وہ پہلی بار مسوری میں ملے تھے۔ سدھیر مہینہ بھر پہلے ہی انگلستان سے آیا تھا اور تقرر ہونے سے پہلے  
 چند ہفتے چھٹی منانے آیا ہوا تھا۔ مسوری کھاتے پیتے گھراؤں کی ذرا بصورت، خوش پوشاک اور دلچسپ لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ٹائبریری کے  
 سلسلے ہر شام کو لہراتی ہوئی رنگین سڑکیوں، چٹت قمیصوں، ریشمی شلواریوں اور گلیے میں جھولتے ہوئے دوپٹوں کی نمائش ہوتی تھی۔ اونچی  
 ایڑی کے جوتوں پر اچھلتی ہوئی چال، بے باک نگاہیں، شوخ جوانیاں، بانگی جینز، ولیمین سینٹ میں ڈوبے ہوئے ہوا کے جھونکے، گلاب  
 لب، موچنے سے باریک کیٹے میزے کمان جیسے ابرو، غار سے مہکتے ہوئے بال، کٹے ہوئے اور پرم ”کٹے ہوئے گیسو، نوجوان  
 کے شوق نگارہ کو دعوت عام تھی۔ مگر نہ جالے کیوں سدھیر کو سامنے مسوری میں صورت پسند آئی تو صرف ایک ”بلا“ جس سے پہلی بار اس کی  
 ملاقات ”ہریک میسر“ ہوئی۔ ہریک میسر کو ”تی ڈانس“ کے دوران میں ہوئی تھی۔

”ہیلو سدھیر!“ اس کے ہنسنے کے دوست ماسٹر نے اسے ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنی میز کی طرف بلاتے ہوئے کہا تھا ”یہاں، اختیار  
 اور ان سے ملو۔ آپ ہیں مس بلا میسر جی۔ ہیں بنگالی مگر لکھنؤ میں پلی ہیں۔“

سدھیر نے دیکھا کہ بغیر پاؤں کے گورے چہرے پر دو بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ جن کی گہرائی میں کوئی غم ڈوبا ہوا ہے اور ان کے گرد سیاہ  
 حلقے ہیں اور لمبی، نیکی، تھیں سی پلکیں ہیں جو راتوں کو جاگے ہوئے پوچھوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں۔  
 وہ ماسٹر کے اصرار کا انتظار کے بغیر ہی بلا کے قریب کی کسی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اس کے لیے اس کچا کچھ بھرے ہوئے بال بدم  
 میں بلا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

بارہ برس کے بعد بھی ان کی وہ سب سے پہلی لکھنؤ آج تک اس کی یاد میں تازہ تھی۔

”تو آپ آئی، ٹی کالج میں پڑھتی ہوں گی؟“

”جی!“

”جی، اسے میں؟“

”جی!“

”اگلے سال نیشنل کا امتحان دیں گی؟“

”جی!“

دو برس تک انگریز عورتوں کی کراخت، مردانہ آوازوں کو سننے اور دو ہفتے مسوری کے شور و غل میں گزارنے کے بعد کتنا سکون  
 تھا بلکہ کی کم کوئی ہیں۔ جیسے آندھی اور طوفان اور کڑک چمک کے بعد بارش تھم گئی ہو اور گلاب کی پتیوں پر سے چند ننھی ننھی بوندیں گھاس پر



”ہیک رہی ہوں۔ کتنی بندہ ستائیت مٹی اس ”جی! میں۔ کتنی ملائمت اور محتاس! کتنی مصومیت اور جبار!“  
 ”آپ ڈانس کرتی ہیں؟“  
 ”جی نہیں“

ان کے دوست ناچنے والوں کی جھڑپیں کھوٹے ٹخنے اور اب وہ دولوں اپنی میز پر اکیلے تھے۔ سدھیر نے سوچا آخر کار میری تلاش آج ختم ہوگئی۔ بلا سے بہتر بیوی مجھے نہیں مل سکتی۔ وہ صبی ہے مگر شوخ تکی نہیں جو ایک چول سے دوسرے چول پر جھکتی پھرے۔ پڑھی لکھی ہے مگر خورائے اذہان دراز نہیں، کھاتے پیتے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ گدائی امیر بھی نہیں کہ ایک مائی، بی، ایس کی درخواست ٹھکرا دے۔ اس سے شادی کر کے انسان واقعی سکھ اور سکون کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اور اس نے کہا ”تو آپ کے تیار.....؟“

”وہ ٹکھنڈ میں رہتے ہیں۔ آرٹ سکول میں پڑھتے ہیں!“

”اوہ! آپ آرٹسٹ میزجی کی بیٹی ہیں۔ ان کی تصویروں کی نمائش تو ہمارے پینڈ میں بھی ہو چکی ہے“ اور پھر اس نے صفائی سے تھوٹ بولا ”مجھے ان کی تصویریں بہت پسند آتی تھیں“ حالانکہ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ نہ جانے ای ٹیڑھی میٹھی لکیریوں اور نیلے پیلے رنگ کے دھبوں میں کیا دھڑا ہے۔ جو لوگ ان کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ مگر اسی لمحے اسے ان تصویروں میں سے ایک خاص تصویر یاد آگئی۔ ایک گیارہ بارہ سالہ شوخ و شمر بچہ کی تصویر جو صابن گھلے ہوئے پانی کے رنگین پیلے بنا کر اڑا رہی تھی۔ تصویر کا نام تھا ”پیلے“  
 ”وہ تصویر پیلے، آپ کی ہی مٹی نا؟“

”جی!“

”اس میں آپ بہت شریر معلوم ہوتی تھیں۔ اب تو آپ کتنی سیریس ہو گئی ہیں“

صرف اس بار اس نے ”جی“ کہہ کر جواب نہیں دیا۔ ایک عجیب سی، خشک ہوئی، بکھی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ جوابی ”پیلے“

کی زندگی ہی کتنی ہوتی ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور بلبلہ ٹوٹ گیا۔ بس ختم!“

جب تک وہ مسوری راج اس کا بیشتر وقت بلا کی رفاقت میں گذرا۔ اکٹھے وہ چندال چوٹی تک چڑھے، کیملا بیگ روڈ کے گرد گھومتے، نیپیشی خالی پینک کے بیسے کئے۔

اس تمام عرصے میں بلا نے مشکل سے ایک درجن جیلے اس سے کھے ہوں گے۔ سدھیر کی باتوں کو وہ بڑی خاموشی اور توجہ سے

سنتی۔ جب تک وہ براہ راست سوال نہ کرتا۔ وہ کسی بات پر بھی اپنی رائے کا اظہار نہ کرتی۔ مگر سدھیر کو بلا کی کم گوئی سے کوئی شکایت

نہ تھی۔ باتوں کی دنیا میں جو ہر مسئلے پر رائے رکھتی ہیں۔ اور اس کا اظہار ضروری سمجھتی ہیں اسے بالکل پسند نہ تھیں۔ اسے تو یہی اچھا لگتا

تھا کہ وہ بولتا جائے اور بلا بیٹھی سنتی رہے اور ”جی! جی!“ کرتی رہے۔ جب سدھیر کو یقین ہو گیا کہ وہ بلا کو بہت پسند کرنے لگا ہے

بلکہ شاید محبت بھی کرنے لگا ہے۔ تو ایک دن تنہائی میں موزن پیکر اس نے ”پہ درپوز“ کہہ ہی ڈالا۔

”بلا! تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں“

”جی!“

”تمہارے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

”جی!“ اس ”جی“ میں سوال بھی تھا اور جواب بھی۔

نٹھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”دیکھئے میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اس لیے میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔“

”کیا تم کسی اور سے محبت کرتی ہو؟“

بلا کی زبان سے ”جی نہیں“ شاذ و نادر ہی نکلتا تھا مگر اس بار اس نے کہا ”جی نہیں“ اور پھر ایک پل کی خاموشی کے بعد جس میں گہری ٹھنڈی سانس کا شائبہ تھا، کہا ”ایسا کوئی نہیں ہے۔“

سید حیر کو اطمینان ہو گیا۔ اس نے کہا ”تو پھر کوئی حرج نہیں۔ میں تمہیں اپنے سے محبت کرنا سکھا دوں گا۔“ اس دی جولائی سلسلہ کی چودہ تاریخ ختمی۔

نوکرنے ڈاک کا پلندہ ناشتے کی میز پر سید حیر کے سامنے لا کر رکھا۔ سب سے پہلی ہی خط جو اس نے کھولنے کے لیے اٹھایا تو اس کی نظر ڈاک خانے کی مہر پر پڑی ”نمائش گنج۔“ چودہ جولائی ۱۹۵۷ء۔ دفعتاً سید حیر کی یاد میں پورے بارہ برس پہلے کا وہ دن چمک کر بیدار ہو گیا۔ غفلت کو چھڑی سے چاک کرتے ہوئے سید حیر نے بلا سے پوچھا ”جانتی ہو آج کیا تاریخ ہے؟“

”جی!“ اور اس کی نظر سسٹن کی دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف گئی۔

”بارہ برس پہلے کا وہ دن یاد ہے مسوری میں۔ جب میں نے تمہیں پرہیز کیا تھا؟“

”جی!“ مگر اس ”جی“ میں صرف اقرار تھا۔ کوئی گرجو جی نہ تھی۔ سید حیر بارہ سال پہلے کی جس رات کو کریدنا چاہتا تھا وہ بالکل ٹھنڈی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس میں کبھی بھی کوئی چنگاری نہ تھی۔

مگر سید حیر نے بلا کے چہرے پر ایک رنگ جلتے اور دوسرا آتے نہیں دیکھا۔ وہ خط کھول کر پڑھ رہا تھا جو اس کے کالج کے پرانے اور بے تکلف دوست مانتھر کے پاس سے آیا تھا۔ جواب پٹنہ میں دکالت کرتا تھا۔ خط پر نظر ڈالتے ہی سید حیر مسکرایا۔ کیونکہ مانتھر نے لکھا تھا ”یار تم کتنے خوش قسمت ہو۔ بلا جیسی بیوی پاٹی ہے۔ جیسا ہمیں دعائیں دو کہ اس دن ہمیک منہ میں تمہاری ملاقات اس سے کرائی۔ مگر اس دنیا میں کون کسی کا احسان ماننا ہے۔“

”سنا تم نے، مانتھر نے کیا لکھا ہے؟“

”جی!“

سید حیر نے بلا کے بارے میں جو جملے مانتھر نے لکھے تھے وہ پڑھ کر سنائے اور پھر دوسرے خطوں کو کھول کر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس نے یہ نہیں دیکھا کہ مانتھر کے دوستانہ مذاق کو کتنی مسکراہٹ کی آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی۔ صرف ہونٹوں پر ایک تلخی مسکراہٹ کا غم پیدا ہوا اور پھر بیکار ایک غائب ہو گیا۔

دوسرا خط جو سید حیر نے کھولا وہ کلب کابل تھا۔ وہ اس نے بلا کی طرف بڑھا دیا۔ کیونکہ بھوں کی ادائیگی وہی کرتی تھی۔ تیسرا خط

آئی۔ سی۔ ایس ایسوسی ایشن کی طرف سے آیا تھا۔ سالانہ جلسے اور انتخابات کے بارے میں۔

”سنا بلا تم نے؟ اس سال بلدیہ اور احسان وغیرہ سیکرٹری کے لیے میرا نام پر پوز کرنا چاہتے ہیں“  
”جی!“

چوتھا خط — گھر پر اس کے نام نہیں بلکہ نام تھا ایک موٹا مگر پیلا سا پرانا لٹافہ جس پر کتنی ہی مہر لگی ہوئی تھیں اور کئی بار پنے میں کانٹ چھانٹ کی ہوئی تھی۔ اور یہ کیا؟ مس بلکہ میری؟ یہ کون بدلتا ہے جو مسز بلکہ سکینز کو شادی کے بارہ برس بعد بھی مس لکھتا ہے؟ ..... سدھیر نے ایک نظر بلکہ کی طرف دیکھا جو اس وقت نوکر کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دیتے ہیں مصروف تھی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ بلکہ نے اپنا خط نہیں پہچانا۔ سدھیر نے چائے کی ماسے رکھ کر لٹافہ جاک کیا۔ شادی کے بعد کئی برس تک اس نے بلکہ کے نام آئے ہوئے کتنے ہی خط چکے چکے کھول کر پڑھے تھے۔ مگر سو اٹھ کالج کی سہیلیوں یا رشتے کی بہنوں وغیرہ کے کوئی شہید نہ ملا تھا۔ نہ جانے کیوں اس خط کے لٹافہ ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کوئی پڑا نا عبید منور ہے۔ شاید آج اسے معلوم ہو سکے کہ اس ”جی“ کی اکٹا ہٹ اور بے دلی کے پیچھے کون سا راز چھپا ہوا ہے۔

لٹافہ میں سے کئی درقوں کا طویل خط نکلا مگر اس کی پہلی چند سطریں ہی سدھیر کے سکون کو ہمیشہ کے لیے پاش پاش کرنے کو کافی تھیں۔ لکھا تھا:۔

”جان سے پیاری بلکہ!“

تم سے ملے دو مہینے ہو چکے ہیں اور میرے لیے یہ دو مہینے دو برس سے بھی زیادہ طویل ہیں۔ کیا ہم ہمیشہ اسی طرح چھپ چھپ کر ہی مل سکیں گے؟ یہ دیوار جو ہمارے درمیان کھڑی ہے۔ کیا یہ کبھی ڈھائی ٹن جاسکے گی؟ .....“  
”خفے اور نفرت کے جوش سے سدھیر کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس سے آگے اس سے یہ خط پڑھنا نہ جاسکا۔ ..... یہ خط جو اس کی بیوی کی آواز لگی اور بد چلی کا اعلان نامہ تھا۔ جلدی جلدی ورق اُٹھ کر اس نے آخری صفحے پر نظر ڈالی۔ خط کے اختتام پر لکھا تھا ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارا نیل!“

”انیل!“ اس کے دماغ میں یہ آن جانا نام ہم کے گولے کی طرح پھٹا۔

”بلکہ!“ وہ چلا یا اور بلکہ جو اس وقت کمرے کے باہر جلسہ الی مٹی ٹھٹک کر دروازے کے پاس ڈک گئی۔

”جی!“

جی! جی!! جی!!! وہی ملائم، ٹھنڈا، پھیکا ”جی“ اور اس وقت سدھیر کو ایسا لگا جیسے یہ دو حرفی لفظ ایک طعنہ ہو۔ ایک گندی مٹی ہو۔ ایک طمانچہ ہو جو اس کی بیوی نے اس کے منہ پر دے مارا ہو۔

”ادھر آؤ“ وہ پھر جلد یا اور بلکہ خاموشی سے میز کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور اس کے چہرے پر حیرت بکھیر پکار کر کہہ رہی تھی جی؟  
”انیل کون ہے؟“

سدھیر نے یہ سوال اتنا اچانک کیا کہ چند لمحوں تک بلکہ جو ٹکی کھڑی رہی جیسے کبھی ہی نہ ہو کہ اس سے کیا پوچھا گیا ہے۔ ..... یا یقین نہ آتا ہو کہ یکایک اس کے شوہر کو یہ عجیب کیسے معلوم ہو گیا۔ ..... مگر پھر جیسے دھیرے دھیرے سونے پر

بادل بٹ جاتے ہیں اور برسات کی خم آلود صوب زمین پر پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دمبھی، مٹی، نرم مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھل گئی۔  
 ”ایس؟“ اس نے بڑی ملائمت سے نام دہرایا..... جیسے ماں بچے کا نام لیتی ہے، جیسے پیسوی بنگلان کا نامہ لیتا ہے۔  
 جیسے شاہزادہ اپنا محبوب شہر لکھنا تا ہے..... اور اس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمک اٹھیں..... وہ روشنی جو بارہ برس تک سدھیر نے  
 کبھی اپنی بیوی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی.....

”ہاں! ہاں! ایس! کون ہے وہ؟“ بللا کی آنکھوں میں، اس نئی روشنی کو دیکھ کر سدھیر آپے سے باہر ہو رہا تھا۔  
 مگر بللا کسی دوسری ہی دنیا میں تھی۔ اس کی آنکھیں دور — بہت دور..... نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ کوئی بہت خوبصورت  
 منظر؟ کوئی دلکش یاد؟ امید کی کوئی کرنی؟

”وہ سب کچھ ہے.....“ اس کے مسکرتے ہونٹوں نے سدھیر سے نہیں بلکہ خود سے سرگوشی کی..... پھر ان ہونٹوں کی مسکراہٹ  
 جھٹکی۔ اندام کے خم میں ایک کڑواہٹ اُبھر آیا۔ اور اب وہ کچھ بھی نہیں ہے..... ”پھر کسی نامعلوم خم کے بوجھ سے اس کی گردن جھک گئی۔  
 ”پیدیاں مت بوجھاؤ“ سدھیر چلا یا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ میز کوارٹ دے۔ تمام چینی کے برتنوں کو چکنا چور کر دے پچائے دان  
 کو اٹھا کر بلا کے سر پرٹے مارے معنیج بیج بناؤ۔ کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟“

”جھکی ہوئی گردن پھر اٹھ گئی۔ آنکھوں کے ڈبڈباتے ہوئے آنسوؤں میں سے پھر وہ عجیب روشنی چمکنے لگی۔ چمکے اور بے رنگ  
 انداز میں صرف ”جی“ کہنے والی بللا نے غریب انداز سے سراٹھا کر سدھیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”جی ہاں۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔“  
 اور اس لمحے سدھیر کی دنیا تہہ وبالا ہو گئی۔ اسے ایسا لگا کہ بللا نے اس کی عزت پر، اس کی آئی۔ سی۔ ایس کی شای پر، اس کی مردانگی  
 پر ہمیشہ کے لیے کالک پوت دی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ بللا نے اسے ایک ایسی غلیظ گالی دی ہے جو عمر بھر اس کے کانوں میں  
 گونجتی رہے گی۔ اس وقت تعلیم اور تمدنی تہذیب اور اخلاق کے سب پھٹکے اس پر سے اتر گئے۔ اب وہ لندن کا پڑھا ہوا بیڑ نہیں تھا۔  
 آئی۔ سی۔ ایس ایسوسی ایشن کا ہونے والا سیکرٹری نہیں تھا۔ کلب کا ممتاز ممبر نہیں تھا۔ نرائن گج ضلع کا ڈپٹی کمشنر نہیں تھا جس کی معنی میں ایک لاکھ  
 سے زائد انسانوں کی قسمت تھی۔ اس وقت وہ صرف ایک ننکا وحشی تھا۔ غصہ کے جوش میں بھرا ہوا ایک مرد جس کی محبت نے اسے دھوکا دیا تھا۔

”جتنی چلایا“ نکل جاؤ اس گھر سے، اسی وقت، اسی دم“

بللا کے چہرے پر نہ غصے کے آثار پیدا ہوئے نہ خم کے۔ وہ اب بھی کسی دوسری ہی دنیا میں تھی۔ اس نے سدھیر کی چیخ کو ایسے دُنا  
 جیسے بہت دور سے کوئی دمبھی سی آواز آئی ہو..... اور اب بارہ پھر اس کے ہونٹ ایک محسوس مسکراہٹ سے کھل گئے..... جیسے کھوئے  
 ہوئے مسافر کو بڑی تلاش کے بعد راستہ مل جائے۔ جیسے وہ مدت سے بارہ برس سے — اسی گھڑی کا انتظار کر رہی تھی اور آخر کار وہ  
 مہانگ سافٹ آن ہی پہنچی ہو۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ایک نظر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اس نظر میں شکایت نہیں تھی۔ شکوہ نہیں تھا، رحم تھا،  
 معافی تھی، جیسے اس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں ”اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے“ پھر وہ اپنے بیڈ روم میں گئی اور وہاں سے  
 اپنی چھٹی پچی کو گود میں لے کر برآمدے میں سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے قدموں کی آواز دودھ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ باہر سڑک کے شور میں  
 ہمیشہ کے لیے کھو گئی۔

سجدہ کا خیال تھا کہ وہ روئے گی، گو گلزار اٹے گی، اپنی مہنائی پیش کرے گی، ایسے لکناہ کی معافی مانگے گی، آئندہ اپنے اعمال کو درست کرنے کا وہ کہے گی۔ مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا کہ بھلائی کے گھر جوڑ کر چلی جائے گی۔ اس خاموش طمانچے سے اس کی ساری ہستی بھنبلا اٹھی۔ بھنبوٹا کی طرح اس کے دل پر ایک ہی جوتہ پڑتی رہی۔ ”انیل، انیل، انیل، انیل“ یہ انیل کوئی سپہ ہے؟ جس کا پتہ لگا کر چھوڑوں گا۔ اس پر ایک بیابستا عورت کو اُخرا کرنے کا دعویٰ کر دوں گا۔ اسے جیل بھجواؤں گا۔ اسے جہان سے مار دوں گا۔.....“

بالکون کی طرح دوڑتا ہوا وہ بلدا کے کمرے میں پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنی داڑی، وب کے ایک خنہ میں بلدا اپنے خط وغیرہ رکھتی ہے۔ بالائیوں کا لکچھا سانس پٹنگ پر چڑھا تھا۔ جاتے جاتے وہ چٹنگ لگتی تھی۔ سدا جیسے وارڈ روم کھولی۔ خنہ کو چابی لگا کر باہر کھینچا۔ اس میں کھٹے ہوئے خطوں کے پندوں اور کائنات کو ٹوٹا۔ سب سے نیچے کی تہہ میں سُرخ ریشمی بیٹے سے بندھے ہوئے چند خط رکھے تھے۔ مزدور برائیل کے خط جوں گئے۔ اس کا خیال صحیح ٹکڑے پر خط میں اعلانِ محبت ”بلدا میری جان“۔ ”میری اپنی بلدا“۔ ”میری اچھی بلدا“۔ ”تمہارا اور صرف تمہارا انیل“۔ ”اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں تمہارا تمہارا تھا۔.....“ ”میرے ذہن کو دفتر کی طرح اس کے دل میں کچھ کے لگانا رہا۔ ایک ایک دے وہ خفا فرش پر گرے تھے۔ رہے۔ مگر یہ کیا؟..... خطوں کے پیچ میں تنہا کیا ہوا اختیار کا ایک تراشہ..... کھولنے پر دیکھا کہ ایک نوجوان لیٹھویر۔ گہری چمکتی ہوئی آنکھیں۔ اونچا ماتھا۔ مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ اس کے نیچے یہ شیر چڑی ہوئی تھی۔

## نوجوان شاعر کی موت

بہیں یہ اطلال دیتے ہوئے دلی صدمہ ہے کہ لکھنؤ کے نوجوان ترقی پسند ادیب اور انقلابی شاعر انیل کمار انیل کا انتقال ہو گیا ہے۔ لکھنؤ کی ستیہ گرو تحریک میں وہ جیل گئے تھے اور وہیں انہیں وطن کا محسوس عارضہ ہو گیا تھا.....

سجدہ بادی خبر نہ پڑ سکا۔ اس لیے کہ ترلے پر اخبار کی اشاعت کی تاریخ دی ہوئی تھی۔ ۱۸ جون ۱۹۹۷ء۔ اس کے ہاتھ سے باقی خط اور تراشہ فرش پر گر پڑے۔ اس کی کچھ کچھ میں نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ انیل، انیل، انیل، انیل!! کیا کوئی مرکز ہی زندہ ہو سکتا ہے؟

”ہٹے ہوئے مسافر، بلکے ہوئے جواری کی طرح وہ کھانے کے کمرے میں واپس آیا۔ میز پر انیل کا خط اور لٹاؤں پر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے لٹاؤں اٹھا کر ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ درجنوں گولی ہروں کے درمیان میں ایک چوکور مہر لگی ہوئی تھی۔ جس پر انگریزی کے تین حروف نیچے ہوئے تھے۔ ۵۰ مل، ۵۰ ڈی، ۵۰ یل۔ او۔ ڈیڈ میٹر آفس۔

# مست!

## اختر اور نیوی

"اللہ! اودھن لاوے کی ہم اٹھائی پر ان کاٹلی دھوکے پہاڑیں بن  
اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اودھاتے ہوئے ایڑی اٹکا کر گاؤں کی ہم راز عورتوں سے کہا۔ گویا وہ منشی جی کی نگلی واقعی لگتی  
پوچھا ہی ہو۔ اس کا تیار لڑکی چہرہ قہقہا ہوا تھا۔ اس کے دھیان میں چھوٹے رگڑے منشی جی کی سبز چادر خانہ دار نگلی بسی ہوئی تھی۔  
ان دنوں اس پر وہ نگلی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ بڑھتی بڑھتی کو آٹھ سال ہو گئے تھے۔ یہ دن اس نے سینے پر پتھر کا سل رکھ کر  
جتانے تھے لیکن اس کے قدم ڈگے نہ تھے۔ اس کے ایک بڑی تھی جو اب دس سال کی ہوئی تھی۔ یہی ایک دو سال کی بچی چھوڑ کر اس کا چوڑا چھلا  
کاشتت میاں مٹی میں بیٹھا تھا۔ نوٹا باطل اپنے باپ پر تھی۔ چوڑی چلی، مٹھی، اناموش، ابھی کوڑا ابھری بھی نہ تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوانی  
اس کی لمحات میں چھپی ہوئی ہے، اب ٹوٹ پڑی کہ تب ٹوٹ پڑی۔  
کو کو پانی بر رہی تھی۔ اس کے کس بلی کو دیکھ کر نا بھڑکی آنکھوں کے سامنے اس کے سر نے واسے شہر کی تصویر پھر جاتی تھی وہ  
سب سے پہلے براہمنی تھی۔ رات رات بھر تاجو کو نمید نہیں آتی تھی۔ وہ لڑکوں پر کو نہیں دیتی۔ ٹھنڈی سائیں بھرتی۔ اس کے ق من میں آگ سی لگ  
جائی وہ ٹھنڈی تھی۔ زینون اور حاتو کے آباد ہندوں کی گرمی کو سوچ سوچ کہ وہ انکار مل پر ٹوٹتی رہتی تھی۔  
زینون اور حاتو سے وہ جیسر چھڑ کر بڑی بڑی باتیں پوچھتی۔ گاؤں کی لکیوں میں چلتے پھرتے مردوں کو جھانکتی۔ عورتوں کی ٹوہیوں  
میں جھینگر کر پھڑکتی۔ گایوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پیتی۔ مگر اس کی تشنگی دور نہ ہو پاتی۔  
"مست لگی ہے زینون کہتی۔  
"نک لگی ہے حاتو بولتی۔  
اور گاؤں کی دوسری عورتیں فقہ کہتیں۔  
"جسناوے ہے! چرچا کرے سے! نہ نکل جائی!۔  
"بستی کا نام لٹواوے کی! باب دادا کا نام آدھن کرے گی!۔  
خود نہ لڑتی تو کیا کرتی۔ آٹھ سال پہلے ایک عورت اس کے دل کی چٹانے اندر کستی ہوئی تھی اور اب آٹھ سال کے بعد چٹائی راکھ سے  
دھلک کی عورت وہ عورت پھر جی اٹھی تھی۔ پھر راکھ میں آگ کے شعلے سے پلک اٹھتے تھے۔

[illegible]

منشی جی گاؤں میں نئے نئے آئے تھے۔ چھوٹے سرکار کے دربار میں، دندوڑے تھے، اور ابھی کام نہ کھاتے۔ ان کی خاندانی روایتیں  
میں بہت افزائیں منشی جی کے ایک بھائی نے اس سے قبل گاؤں میں بڑی پتھری کی پکیٹیں شروع کی تھیں اور رہتے، پہنتے، سوئی کی پروردہ ایک  
باندی سے جو ان سے عمر میں بڑی تھی، وابستہ ہو گئے تھے۔ منشی جی پر بھی معنی سمجھتیوں کی مغرب تھیں، لیکن تاجو کو تو منشی جی سے گرویدار تھی۔ عالم لڑائی  
میں تاجو بدل گئی تھی۔ اب وہ لگی لگی تاک جھانک نہیں کرتی تھی۔ غرض مذاق سے بھی بچتی تھی۔ وہ ہم باز عورتوں سے اپنے دل کی بات کہتی —  
”اب میرا دل درود ہو گا، میں امیرا دل کہے ہے کی منشی جی میرے گھر کو بھیجیں، بڑے اچھے ہیں منشی جی!“

”کھاک اچھے ہیں! تم محمود راہے!“

زیتون بول اٹھتی۔

”ناہن ہمرے بڑے اچھے لگے ہیں۔ جی چاہے ہے کی آن کی صورتیاہ دم دیکھتے رہیں۔“

ناجو جواب دیتی۔

دور بہ الاچھے مکی میں انٹرنیٹ سٹریمنگ کے آگے پیچھے توڑتے رہے ہیں۔ سٹریمنگ سروسز

[illegible]

کرتے۔ نوجوان کی ٹانگوں کے درپے تھی۔ آخر شمش جی نے دوسرے قصبے میں ایک تیرہ سالہ لڑکی سے نکاح کر لیا۔ یہ خبر مرنی ہوئی ناجر کے گھر پہنچی مرنے والی جی اپنی قدر و قیمت گھٹانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود نہ کھلے کہ ماجرا کیا ہے۔ رفتہ رفتہ سولے ناجر کے سب کچھ حقیقت معلوم ہو گئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ شمش جی اپنے بھائی کی پیروی کر کے اس گاؤں کے جانے والے نہیں بلکہ ناجر کو اس بات کو ماننے والی تھی وہ تو شمش جی کو اپنا چلی تھی، اپنے گھر بیاہ چلی تھی، اپنی بھیا سنا چلی تھی۔

کچھ بھی بڑی بڑی چیز ہے، تلخ اور نیکی، اندر گھسنے والی، باہر سے جاک کھانے والی، سچ، خود بھی ننگا اور دوسرے کو بھی ننگا کرنے والا ہوا۔ ناجر کی عقل میں کچھ گھس پڑا۔ مگر اس کے سامنے گبرے اندھا دھڑے میں جو اندھی حرکت مٹی ہوئی تھی اس کے دیر سے نہ کھول سکا دونوں میں پہلے بھاڑتی بڑی بڑی اور ناجر کو شیریا کے دورے پڑنے لگے۔ وہ دوسرے کے رقت بڑی بے مہاشی سے شمش جی سے بھاڑ دھاتی اور دھل محبوب کے باب میں ٹھنڈوں کی کھال آدھی تھی۔ اور اس خواب دنیا کا اثر یہ ہوا کہ ناجر کے بھائی نے ایک روز اس کی خوب گندی کر دی۔ اور رہنا اس کی گندی ہوئی رہی۔ مگر وہ شمش جی کی گھٹی بھری گھٹ میں اتار کر دھونے اور کھانے پر مصروف رہی۔ بیٹیاں بھی گنتی اور سوکھتی رہیں اور ناجر کا بھر کس ہٹا رہا۔ آخر شمش جی نے ناجر کے بھائی سے ایک "ہٹائی" قسم کے آدمی سے ناجر کو بیاہ کر دیا۔ ناجر دوسرے گاؤں چلی گئی۔ سال بھر کے بعد وہ اسی کو کھ میں پھرے کر واپس آئی اور سیکے میں ہی کچھ پیدا ہوا۔

ان ہی دن شمش جی ایک ماہ کی بچی لے کر گھر چلے گئے جب واپس ہوئے تو بڑے شاداب تھے۔ لوگوں نے تان لیا کہ شادی بھاگے آئے ہیں۔ لیکن اب بھی شمش جی اپنے مزے سے کچھ نہ بچو گئے۔ اب وہ جلد جلد شمش جی کے گھر جاتے رہے۔ لیکن کب تک جھوٹے سرکار نے دوک نوک شروع کی۔ سال بھر کے بعد وہ اپنی نئی نوبی کو ساتھ لے آئے۔ اور حویلی سے قریب ہی ایک چھوٹے سے اٹھارہ مکان کو دست کر کے اس میں اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگے۔

لوگوں حویلی میں کام کرتی تھی اور کام کرنے پر مجبور تھی۔ یہ وہاں کی شادی کے بعد بھی گھر کی حالت نہیں بدلتی۔ مہلوں کے ٹکڑوں پر پیٹے بھی پڑی تھی اور بعد بھی پڑی رہی۔ اب یہ نوجوان کو کھٹو مہیاں ملا۔ جو خود بھی کبھی کبھی سسواں ہی آرتا تھا اور کھانے والا ایک مزہ اور پیدا ہو گیا۔ جب تک وہ دھوپتا ہے تو خیریت ہے۔ وہ لوگوں کے منہ کا لقمہ چمن جاسے گا۔ لوگوں کی ماں، ناجر نے اسے مستقل حویلی میں رکھوا دیا اور کھانا کے لیے۔ مگر اس آدھار کی فہرست لافتا ہی تھی۔ لوگوں بڑے مہرے یہ ماہ ملے کرتی رہی۔ کوئی نہ ہی تھا اسے۔

لوگوں فہرست کے اوقات شمش جی کی بیوی کے کام کاغذ بھی کر دیتی تھی۔ ان کے کام بڑی جاہ سے کرتی تھی، وہ انہیں اپنی بھول سمجھنے لگی تھی۔ نئی دین کا بھی لوگوں سے مل جاتا تھا۔ وہ لوگوں کو چھٹے پڑنے کپڑے دے دیا کرتی تھیں وہ شمش جی اس سے مذاق کر رہا کرتے تھے۔ دونوں بانیوں دل کش تھیں۔

جاڑے کا موسم آیا۔ لوگوں کو گرمی تھی۔ دن تو خیر، رات بڑی ظالم ہوتی تھی۔ رات گئے تک وہ حویلی میں کڑکتے جاڑے کی برچیاں ہتی ہوئی کام کرتی رہتی تھی۔ چھپ چاپ ایک دن وہ شمش جی کے گھر گئی۔ وہ حویلی سے رات کو واپس ہو رہی تھی، جی میں آئی وہ شمش جی کے ماں جھانک لیں۔ دونوں میاں بیوی ایک حالت میں ملوث ابھی بیٹھے ہائیں کر رہے تھے۔ لوگوں کو شمش جی کی چرٹ پر ہجک اور شمشک کو شرم، حسرت اور اخلاص کا جسمہ بنی کھڑی ہو گئی۔

آؤ لوگوں کو ہارک لاہے گئی، اندر آجا شمش جی کی بیوی نے اپنی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔



تیرے جاڑا نہیں۔ گلے ہے کوکو؟ جو ان پر رہی ہے نا؟  
 منشی جی نے اس کے جواب سے پوچھنے لگے اور ہمارے ہاں سے آٹھ پٹ  
 کرتے ہوئے کہا۔

کوکو کی کافی پتلیاں لائین کی پہلی پہلی روشنی میں اچھپنے لگیں۔ وہ خاموش رہی۔ اندر آگئی۔ مگر گول گول پتلیاں تھرکتی رہیں  
 اس نے اپنے پٹے پٹے کپڑوں کو ذرا سیٹ لیا۔

”دیکھو! کوکو کیسا کانپ رہی ہے! کوکو کو سردی سے نہیں کانپ رہی تھی۔ وہ ابھانے پیچیدہ و تندہیات سے کانپ  
 رہی تھی۔ کون جانے اس کی حیات کے کتنے تار راز اٹھتے تھے! تم اسے اپنا مار پیٹے والا ہمارا گرم شلوکہ کیوں نہیں دے دیتیں؟  
 منشی جی نے بیوی سے کہا۔

”مے گی کوکو؟ بیوی نے دم کھاتے ہوئے پوچھا۔  
 کوکو خاموش کھڑی رہی۔ اس کی گہری سیاہ پتلیاں چمک اٹھیں، جیسے ادھر سے بڑے بڑے کٹے سے چٹکادی نکل پڑی

منشی جی کی بیوی نے مین کے پیچے سے مار پیٹے کا شلوکہ نکال کر کوکو کو دیا۔ اور منشی جی نے اسے مار پیٹے کے شلوکہ  
 پہننے پر مجبور کیا۔ کوکو نے اپنے پٹے پٹے کرتے کے اوپر واسٹ کی طرح شلوکہ پہن لیا۔ وہ منشی جی کا شلوکہ اسے آٹھ لگا۔

”اکیں؟ منشی جی نے لطف سے چونکے۔ ”اب منشی جی نے اپنے گھر سے بیٹے پر اچھتی ہوئی تڑپھی نگاہ ڈالی اور پھر  
 کوکو کو اسلڑاتی ہوئی گھورنے لگیں۔ کوکو شلوکہ کے بھادوں کو اڑھنی سے چھپانے لگی۔ خاموشی اور غور و خفا دی کے ساتھ بہت ہی خفیف  
 تناسل بہت اس کے بندھوں کے ایک گوشے میں لہرا کر غائب ہو گئی۔ کوکو اپنے گھر چلی گئی۔

”کون دیکھ رہا ہے شلوکہ؟ کوکو کی ماں ناخبر ہو کر پوچھا۔

”منشی جی کی دہن دیکھ رہی ہیں! کوکو نے جواب دیا۔

ناخو اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ کوکو کے اندر مچھڑ مچھڑ کی آواز اچانک دھک گئی۔ ناخو اٹھ کر شیرنی کی طرح کوکو پر  
 بھٹی۔ اور ان کی آن میں اس نے گرم مار پیٹے کا شلوکہ چھین لیا اور چھین کر خود پہن لیا۔ وہ شلوکہ اسے آٹھ پہنیں دانتھا۔ سانس روک  
 رک کر اس نے اٹھایا۔ بہت مشکل سے دو دھینے بیٹوں کو کٹس کر اسے دھک دیا۔ سب کے منوں کے درمیانی صفحہ تن گئے  
 کسی تو میں بن بن گئیں۔ ان کی ملی تو میں کی ڈبیر سے بھی بھرے بھرے سینے ڈوبے اور ڈبیر کے حلقوں سے جھانکتے رہے  
 دباؤ سے دودھ ابل پڑا اور گرم شلوکہ پر دو بڑے بڑے نم دھبے پڑ گئے

ناخو نے یہ حرکت سوجھ بوجھ کر نہیں کی۔ یہ سب کچھ بڑی بے شعوری سے ہوا، بڑی بے دردی سے ناخو پر ایک حق سوار  
 ہو گیا اور دبا۔ کوکو حیرت زدہ رہ گئی اور اپنے آنسو کی کر لگتی ہوئی سو رہی۔

دوسرے ہی روز گاؤں کی عورتوں میں شلوکہ کی کہانی منشی جی اور ان کی بیوی کی دہانی پھیل گئی۔ ناخو ہر وقت اس شلوکہ  
 کو پہنے دیتی تھی۔ کوکو سے اس کی تصدیق کرائی گئی اور طعنے طعنے کا بازار گرم ہوا۔

”بھی! لوگوں سے چھین کر دے شوکہ میں بس۔ بے شرم بدھی عورت! حاکم نے فتر لگایا۔  
 ”کیسی عمارت لگی ہے چروہ صدی میں! اور سائے صلا ز شان سے کہا۔  
 غشی جی کی بندی جی جل کر تاج پر ہوا کرتیں۔ عورت بھی کتنی سمجھ دار ہوتی ہے! وہ تیر کی باتیں جان لیتی ہے۔ وہ گھر سے  
 بھیڈ پا جاتی ہے۔  
 غشی جی اس جوا پہ سے انداز شوکہ کے قصور سے لطف لیتے رہے جس کے پاؤں میں تین جڑے پینے  
 منوعم ہوئے۔  
 ”ہائے گنج! تیری عمارت لگتی تھی نا جو؟ زمین نے پوچھا۔  
 ”تو سب بھی تو صبر کرے۔ آسمان لیے جانے! ان پوچھ نہات! اسے ہم تو اپنا دودھ گرم رکھے لا شوکہ یا رہے۔ غنڈہ  
 بھرے لڑکا کو دست بہ دست۔ تختہ اٹھنا دودھ پیتے پیتے منت منت پڑتے۔ ہائے ہائے کا دل! ہم صد کے جائیں اپنے  
 دونوں لالہ سے! نا جو نے جواب دیا۔“

# جل پری

علی عباس حسینی

— اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لیے ہاتھ بڑھالیا۔

میں ڈاک بنگلے میں بالکل اکیلا تھا۔ میرا اردنی بہاری قریب کے ایک گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہر گیا تھا۔ سرکاری خانہ اماں جو چوکیدار کے فرائض بھی ادا کرتا تھا۔ مجھے کھانا کھلا کر کچھ دیر کے لیے قصبہ چلا گیا تھا۔ قصبہ ڈاک بنگلے سے تقریباً ایک میل دور تھا۔ انگریز کالے آدمیوں میں مل جل کر رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ محکمہ نمر کے انگریز انجینئرز نے اسی لیے یہ بنگلہ آبادی سے خاصے پر بنایا تھا۔ بنگلے کے تین طرف اسی دریا کے بہت تھے جو جتنی طرف نہر تھی۔ نہر کے اس پار ایک فرلانگ کے خاصے پر ڈھاک اور جھاڑ کا جنگل تھا۔ یہاں لومڑوں، گندڑوں، لکڑچکوں اور بھیر پوں نے جٹ تھے۔ نہریچ میں نہ ہوتی تو شاید یہ بنگلہ ان کا رہنم بن جاتا۔

رات بچپنے سے نکل کر جو انی میں قدم رکھ رہی تھی۔ دھندلے کی جھلکاہٹوں پر گہری تاریکی کی متانت غالب آتی جا رہی تھی۔ بنگلے پر ایک سانا سا چھایا تھا۔ ارد گرد کی فضا پر بھی وہ سکوت طاری تھا جو دس بجے شب کے قریب دیہاتوں، جنگلوں اور غیر آباد مقامات کو بھیا نک بنا دیتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ خاموشی کے پردے کو کبھی کبھی لکڑچکوں کی تھنہ نما جھجک چاک کر دیتی تھی۔ یا کبھی کبھی کسی اٹو کی آواز۔

میں نووارد تھا۔ ضلع کی خصوصیات سے ناواقف۔ میرے بے ماحول میں نیا تھا اور مقام بھی۔ نہر کے ماتحت انجینئر کی حیثیت سے میں مل کے دورے سے پلٹا تھا۔ یکسر کی سرداری نے رپخت اور نیم پختہ مٹھروں کے، بچکوں نے چور پڑ کر دیا تھا۔ جسمانی تھکاوٹ کا تقاضا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاؤں۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ نیند کی دیوی آتی تو مڑو مگر خراشاں، اور دل دو مارے میں اپنا شیش رنلے کی جگہ صرف پلکوں کو چھوڑ کر چلی جاتی۔ میں اعلیٰ لکڑ کا صوفیا جاگتا، درون الرشید بن گیا تھا۔ سو رام چند جی کی طرح رعایا کا دکھ سکھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے راتوں کو جھیس بدل بدل کر نکلتا تھا۔ اور جس کی باتیں بہت چھوٹی اور دل بہت بڑے ہوتے تھے۔ اور میرے دل میں بھی ہارون الرشید جیسا ڈر ہی تھا۔ اس لیے کہ جس طرح وہ اپنے معمولی لباس کے نیچے کمر میں مرصع تلوار رکھ لیتا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی اپنی پیٹھی سے دو نالی بندوق لگا رکھی تھی۔ اسے انسانوں کا خوف مسلط رکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ میرے دل میں جانوروں کا ڈر تھا۔ اور جس کے بعض اصلاخ میں لکڑچکوں اور بھیر پوں نے ان ذول آفت چار کھلی تھی۔ نہ جانے کتنی جانیں ان کی بدولت تلف ہو چکی تھیں۔ ایسے میں بسندوق پاس ہوتے ہوئے قریب نہ کھنا یا بوتلی ہی تو ہوتی۔

میں نے بستر کے قریب چھوٹی میز پر رکھے ہوئے لپ کی روشنی تیر کی اور اپنی کتابیں اٹھا لیں۔ اس دورے میں تین کتابیں سلف

لایا تھا پریم چند کی پرمپچیس، سمرست، مہ کی اینڈرس ایچ اور اناطول فرانس کی پنگوئن ٹیلنڈس۔ یہ کتابیں بار بار کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن مجھے پریم چند کی جرات، غیرت، جہمت، شرافت اور محبت کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ ان کے کردار بہت تھے۔ ان سے سیرتیں درست ہوتی تھیں۔ ان سے طبیعتوں میں توازن و استقلال پیدا ہوتا تھا۔ وہ آج کل کی کہانیوں کی طرح بے نتیجہ نہ تھیں۔ اناطول فرانس کی ساری تصنیفوں میں مجھے اس کی پینٹیلی ناول حد درجہ پسند تھی۔ طنز کا یہ شاہکار موجودہ تہذیب کے ارتقاء کی مکمل تاریخ ہے۔ حال ہی میں پریذیڈنٹ ٹرومین نے جو مجھٹ کے سنت میں کانگریس کو سفارشا کی ہیں۔ اور جس طرح اکیسے امریکہ کے بجٹ کو سارے عالم کا بجٹ بنا دیا ہے۔ اس کا اثر اسی ناول کے آخری ابواب میں بڑی خوبی سے موجود ہے۔ میں بار بار اس سے کہہ رہا تھا تھا۔ اور اس ادیب کی حیرت انگیز سیاسی سوچ پر انگشت ہندان رہ جاتا تھا۔ اینڈرس ایچ میں ہیرو کا استغناء عجیب و غریب ہے۔ وہ نہ صرف دولت و ثروت کی جانب سے بے پروا ہے، بلکہ وہ جن جنس کے معاملے میں بھی مستفی ہے۔ محبوب اگر ایثار سے کام لے کر اس سے شادی کر سکتی ہے تو وہ خوش، اگر وہ دولت کے حرم میں کسی اور شے کی تلاش میں غرق ہو جاتی ہے تو اسے کوئی شکایت نہیں۔ سزا یافتہ سچو اور بد معاش اس کی ہمدردی کے مستحق، اور جانی بوجھی بد کردار عورتیں اس کے تحفظ کی حقدار۔ اگر ان میں سے کوئی اس کے احسان کا بدلہ نہ جہان لذتوں کے ذریعے چکانا چاہتی ہے تو اسے معاوضہ کے قبول کرنے میں عذر نہیں۔ اگر خود ہی اصرار کرنے کے بعد وعدہ فراموشی سے کام لیتی ہے تو وہ اس سے ناخوش نہیں ہوتا۔

میں اینڈرس ایچ کی جلد پر ہاتھ رکھے مام کے عجیب کردار پر اور اس کی انوکھی ٹیکنک پر غور کر رہا تھا اس نے اس سرائی ناول میں اختیار کی ہے کہ دفعتاً مجھے شاد و غمیر آبادی کا مشہور شعر یاد آگیا:۔

سنی حکایت، سنی تو درمیاں سے سنی

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اور دماغ جسم و روح کے مابعد الطبیعی مسائل میں الجھ گیا۔ یہ تیس "کون سی چیز ہے؟ گوشت و پوست کا مجموعہ یا کچھ اور؟ روح محض حرارت جمی ہے یا اس سے الگ کوئی دوسری چیز؟ اگر محض حرارت ہے تو انسانی دماغ اس کے پیدا کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتا؟ اگر جسم سے علیحدہ کوئی شے ہے تو اسے نفسِ مصری میں کون بند کر لے، کون نکال لیتا ہے؟ پھر یہ پیدائش سے پہلے کہاں تھی، مرنے کے بعد کہاں جاتی ہے؟ کیا روحانی کا ادعا ہے کہ وہ روح کو بلا سکتے ہیں، ان سے گفتگو کر سکتے ہیں؟ — اور مجھے کچھ تصوف کی باتیں یاد آئیں۔ کچھ دیونیت کی، کچھ متیسیقی کی، کچھ سائنس کی — اور میں نے الجھ کر لپ کی روشنی کم کی، آنکھیں بند کیں اور نیند لانے کے لیے شاد و مصرعہ دہرانے لگا۔

ع، نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — دفعتاً گھر کے دروازے سے ایک شخص نے جھانکا۔ بڑے بڑے الجھے الجھے بال لمبی کچھڑی وارھی اور دھنسی دھنسی چمکتی آنکھیں۔

میں نے ڈر کو دل میں چھپاتے ہوئے کہا "کون؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کمرے میں چلا آیا۔ بھیاک چہرہ، چھٹی قیصر، پٹٹا پانجامر، ننگے پاؤں، سارے جسم اور کپڑوں پر گرد کی ایک تہرجی ہوئی، اس پر اس قدر لاغر کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے یا کوئی مصری مومیائی، میرا دل بیوں اچھلنے لگا اور مجھے پسینہ چھوٹنے لگا۔ میں نے بھی افسرانہ لب و لہجہ میں پوچھا:

"تو کون ہے؟ بوتا کیوں نہیں؟"

”پانچ پیسے“ وہ پہلی بار بولا۔

بھیک مانگنے والے میری چڑھیں۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے دست سوال پھیلاتا انسانیت کی سخت ترین قہر ہے اور بے تباہی اور بے عزتی کی آخری حد۔

میں نے اسی بے جھجک کر کہا۔ ”تواند کہیں گھنسا آرہے ہو؟ دروازے پر کھڑا ہو کر صدارت لگا“ اس کی آنکھوں کی چمک اور جی بڑھ گئی۔ جیسے دیکھتے ہوئے کو لوں پر سے چوٹ نکال کر خاک اڑا دی گئی ہو۔ مگر وہ عاجزی سے بولا ”جی جے اسنے کام بھی تو کر لیا ہے“

فقیر کی زبان پر کام کا لفظ۔ میں بھونچکا سا ہو گیا۔

”کیسا کام؟“ میں نے گہرا کر پوچھا۔

”جی پانچ پیسے کے عوض کام“ اس نے کہا۔

”یہاں کوئی کام نہیں ہے“ میں نے ترش روئی سے جواب دیا۔

وہ اطمینان کے ساتھ میری بے سہری کی پٹی کے پاس فرش پر بیٹھ کر بولا ”جی“ آپ بہت تھک گئے ہوں گے۔ لائے میں آپ کے پاؤں دباؤں۔ اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لیے اپنا سکہ ہاتھ بڑھایا۔

میرے دماغ میں ایک سوچوں، چوروں، ڈاکوؤں کی سادی کہاں کیا غم کی بدلتی تصویروں کی طرح جلدی جلدی ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ میں نے جلدی سے ٹانگیں سمیٹ لیں۔ اس کے پھرے پر وہ مسکراہٹ دوڑ گئی جو نکلا کر وہ چوہے سے پیسے دنت بتی کے پھرے پر دکھائی دیتی ہے۔ اس نے کہا ”دیر سے نہیں باجی، میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں! میں۔۔۔ میں ایک والی ملک کا بھائی ہوں! اس کی آواز میں غرور کی جھلک پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے کہا ”تم!“ اور میں نے ساتھ زور سے ہنس پڑا۔ یہ صورت، یہ حالت، پانچ پیسے کا سوال، پاؤں دبانے کی مزدوری اور والی ملک کا بھائی! مختلف جذبات کے روتے ملنے اس ہنسی کو ایک دیر پا مقدمہ میں تبدیل کر دیا۔ دونوں طرف آنکھوں سے آنسو نکلے میرے ہاں ہنسی کی افراط کی درجہ سے اور اس کے ہاں جھٹلنے جانے کے غم و غصہ سے۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پہلے جلتی شمعیں لہرائیں، پھر دو آہستہ آہستہ خشک چوبے کی خاک دھونے ہوئے فرش پر گرے۔ اس کی تکلیف کی شدت کے احساس نے میرے قہقہے کی آواز اس طرح کا ایک بولک دی جس طرح ”پیارو“ کا رخانے کا شور بجلی کا سوپرچ دبانے سے دفعتاً ڈگ جاتا ہے۔ اور مجھے اس طرح کا ایک جھلکا لگا جیسا تیز چلتے ہوئے موٹر میں اچانک بریک لگانے سے محسوس ہوتا ہے۔

میں نے کہا ”میرا یہ طلب نہیں کہ میں آپ کی بات پر خشک کرتا ہوں“

اس نے آستین سے آنسو رو پختے ہوئے کہا ”نہیں نہیں، آپ کی ہنسی بجا تھی۔ میری صورت ٹھیک، میری حالت دیکھ کر ہر شخص کو ہنسی آتی ہی ہے۔ کوئی مجھے دیوانہ کہتا ہے، کوئی مجھ سے، لیکن میں نے آج تک کسی کو نہ تو یہ بتایا کہ میں کون ہوں، ادا نہ کسی کو اپنا قصہ سنا۔ ایک عجیب داستان ہے۔۔۔

میں نے اس کے لب و لہجہ اور انداز گفتگو سے محسوس کیا کہ وہ ایک پڑھا لکھا شریف خادہ ضرور ہے۔ اور میں نے دل دی کہ تے جوئے

کہا "نہیں نہیں، میں آپ کو جو ٹانہیں بکھتہ کرے۔ مگر۔۔۔ اچھا آپ مجھے اپنی کمائی سناؤ" اور میں مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے نظر جھکا کر کہا "میں نے کہا کہ میں ایک والی ریاست کا بھائی ہوں۔ ریاست کا نام اگر نہ بتاؤں تو آپ برا نہ مانیں گے۔ ریاست بہت بڑی نہیں مگر اس کے نواب کو اپنے حدود کے اندر بڑی سے بڑی سزا دینے کا حق ہے۔ اور اس کے اٹھارے ہر اب بھی ریاست کا بڑے سے بڑا آدمی موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹا وزیر اعظم تک کا عہدہ پاتا ہے۔ وال مرحوم نے ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت پر لاکھوں روپے خرچ کیے۔ ہم عربی، فارسی، انگلہ بڑی، فریخ ہی نہ پڑھاٹے گئے بلکہ ہمیں نشانہ لگانا، سواری کرنا اور جملہ سپاہیانہ فنون سکھائے گئے۔ بھائی صاحب کو اس پورٹس کا زیادہ مشوق تھا اور مجھے مطالعہ کا۔۔۔ میری فرائض پر اسٹیٹ لائبریری میں ہزار ہائی کتابوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ میری خاص پسند کا موضوع فلسفہ تھا۔ میں شروع ہی سے مابعد الطبیعات کی یارکیوں میں الجھنے میں ایک خاص لذت پاتا تھا۔ میرا محبوب ترین مشغلیہ تھا کہ میں اپنے استادوں میں سے کسی ایک سے کسی فلسفیانہ موضوع پر بحث کرتا رہوں یا پھر کسی شعر یا کسی نظم کی انوکھی تشریحیں کیا کروں۔۔۔ مجھے زیبائش و آرائش، رقص و سرود سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ میں نے بدھ کی زندگی اور اس کا فلسفہ بڑے طور سے پڑھا تھا اور میں اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ میں نے اس نیم پختگی ہی کی حالت میں یہ طے کر لیا تھا کہ میں دوسرا بدھ بن کر رہوں گا۔ انھوں نے کچھ دنوں تو تامل کی زندگی بسر کی، میں وہ بھی نہ کروں گا۔ میں عیسائی کی طرح بن گیا یا رہوں گا۔ اسی لیے جب حضور نے میری شادی کی بات چیت چھیڑی تو میں نے ان کے پاس کھلا بھیجا کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ ان کے لیے جن کی کمی مسویویاں تھیں، یہ بات بالکل عجیب تھی۔ ڈاکٹر حکیم، وید بھیجے گئے۔ سرکاری حکم تھا۔ معاذ اللہ کرنا پڑا۔ سب نے با اتفاق فیصلہ کر لیا، کوئی بیماری نہیں۔ ایک خزانہ نے منجانب ہوا منجانب کیا۔ میری خدمت کے لیے مرد ملازمہ کی جگہ کینز بی رکھ دی گئیں۔ ایک سے ایک ہوش رہا، ایک سے ایک شراب، میں نے ان کے افعال و حرکات، جذبات کا بغور مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اور پورے محل کو جنسیات کی ایک تجربہ گاہ میں تبدیل کر دیا۔ جب مہینوں کی روزانہ رپورٹوں میں انھیں "میرے رویت میں کوئی فرق نہ معلوم ہوا تو وہ بھی ہار بیٹھے اور انھوں نے حکم دے دیا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے جتنا چاہو میرے سب کچھ لے جانا۔ بہنوں کی شادی ہو گئی مگر میں اپنے مشاغل میں لگا رہا۔

ایک دن صبح کے کوئی سات بجے تھے، میں نماز سے فراغت پا کر پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ روش کی دھولوں جانب گلاب کھلے ہوئے تھے۔ سُرُخ، زرد، سیاہ، سفید اور ان پر بند وستانی جمل اور مختلف چھوٹی چھوٹی گل داڑھیاں گر رہی تھیں۔ شہد کی مکھیاں اور مچھرنے بھی اپنے اپنے طور پر طواف میں لگے تھے۔ میں دور سے اس حسین منظر کو دیکھ رہا تھا اور غائب کا یہ مطلب میرے دماغ میں گونج رہا تھا:۔۔۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پہلاں ہو گئیں

اور اس پر غور کر رہا تھا کہ کیا واقعی تنازع صحیح ہے۔ کیا ہم جو لے بدل بدل کرتے رہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پیدا ہی کیوں ہوئے؟ مرتے کیوں ہیں؟ بار بار پیدا ہونے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے۔ پھر وقتاً دماغ اس طرف مڑ گیا کہ ہمارے بوس نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں کی طرح نباتات میں بھی جان ہوتی ہے۔ وہ خوشی بھی محسوس کرتے ہیں، درد و تکلیف بھی۔ پھر جس تحقیق تک سائنس اتنی دیر میں اتنی جھوٹ کے بعد پہنچی۔ شاہو کی تحقیق نے اسے کیونکر اتنی مدت پہلے، محض سمجھتی مشاہدے کے ذریعہ معلوم کر لیا تھا۔ کیا ایک بڑے شاہو کو اللہ مہربان ہے؟ کیا وجودہ سائنس کی نظر میں اللہ بھی کوئی چیز ہے۔

بھونوں کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ بکے جھونکی گزرتی جاتی۔ اور میرے خیالات ایک جگہ جمنے کی بجائے نئی نئی پہاڑیاں بدستے جاگتے جیسے جلتے اور لائیں سواکات کا ایک ہار گوندھے جلتے تھے۔ دفعتاً گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بھائی، حضور ملی عہد بہادر، اپنے مشکلی پر سوار چلے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے رہا نہیں میرے عجب نفور کی مقام پکڑے لارہا ہے۔ میں نے سلام کیا تو بڑے "اوسے" ریاں راہب" انھوں نے مجھے راہب کا خطاب دے دکھا تھا۔ "آؤ چلیں تقریر کر آئیں"۔

مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا بہت شوق تھا۔ ایک مہینہ سے زمانہ ہوا تھا کہ محل کی چار دیواری کے باہر تدم نہ رکھا تھا۔ آج جو اپنا "تھوڑا دکھائی دیا تو دل بے ساختہ چرا پا کہ چپک کر اس کی پیٹ پر بیٹھ جاؤں۔ پھر بھی میں اس وقت صرف کرتا پانچاگرہ پہنے تھا۔ اپنے محل کے اندر تو اس لباس میں محوم سکنا تھا، باہر اس طرح جاسے کے خلاف احکام تھے۔ ریاست کے وال کے لیے تو ہر موقع محل کے لیے مناسب لباس ضروری ہے۔ میں نے بھائی صاحب سے اجازت لے کر جلدی جلدی لباس بدل لایا اور اپنے عجب پر سوار محل سے نکل گیا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا، برسات ختم ہو چکی تھی۔ زمیں نے ہر جگہ اپنے سینے میں چھپے ہوئے محل و جزائر سندھ سے اور ہریالی کی صورت میں اگل دیئے تھے۔ ہوا میں بہت ہی دلی پذیر خلی تھی۔ طائر و درختوں پر چھپا رہے تھے، جنگلی اور فقہاء دیڑ اور عرب، سیاہی و سپیدی، ایک دوسرے کو نگہبوں سے دیکھتے فرائے بھرتے چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں کچھ سبھاہوں کے نیچے دکھائی دیئے۔ چھوٹی چھوٹی چھوڑا دیوں میں پور پورا خانہ دانی۔ ان کے کالے کالے ٹونڈے در در سے ہیں، پیچ رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔ ان کی عورتیں ملی ملی میٹھی شادیاں، ساریاں، پانچاگرے اور شکر کے پینے بل کر دست آنے ہوئے کوئی تپتی ہاتھ دہی ہے، کوئی چوٹے میں آگ روشنی کر رہی ہے۔ کوئی کھڑی دونوں ہاتھوں سے جوئیں پڑے بالی کھجا رہی ہے۔ مرد یا تو بیٹھے حقارتی رہے ہیں، یا اپنے چھوٹے چھوٹے ٹونڈے میں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نظیر کا مصرعہ نکل گیا: ع

سب عطا پڑا رہ جائے کا عجب لاد چلے کا بھارا

بھائی صاحب نے کہا "جلدی نکل چلو، یہ شہر نے کی جانیں"۔

ہم نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی اور چند منٹ میں اپنی شہر جمیل "رام ساگر" کے کنارے پہنچ گئے۔ کوسوں لمبی جمیل پر ریاست نے لاکھوں روپے صرف کر کے اسے قابل دید بنا دیا ہے۔ اس میں گھاٹ ہیں، رنگ برنگ درنگ برنگی کے کنارے ہیں۔ اس میں جھیل میں بنے دلچسپ شہر کے مناظر ہیں۔ پھاڑوں میں مل کھاتی ہوئی ندیوں کے مناظر ہیں۔ اس کے کنارے پر سنگ مرمر کی بنی ہوئی گشتی گاہیں ہیں۔ اس میں تیرنے کے وہ تمام سامان ہیں جو اس ورزش کا جو افس کو حریص رہا سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کا پانی صاف ہے۔ شیریں ہے اور اس میں کسی قسم کی گندگی کی آمیزش کی اجازت نہیں۔

جم جمیل کی اس عمارت کی طرٹ مڑے جو شاہی خاندان کے غسل کے لیے مخصوص تھی اور جہاں کسی دوسرے کو نہانے کی اجازت نہ تھی۔ "ہم نے دیکھا۔ ہم نے دیکھا۔"

جنگاری شہزادے نے بے تکلف چھپٹ کر میرے سر ہانے سے سنگریٹ اور دیاسلاٹی اٹھائی اور ایک سنگریٹ جلا کر کٹی لیے لیے کش لیے۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ اسے یہ دنیا وی من و سلونی مدنوں کے بعد ملا ہے۔ لیکن وہ اس سے لذت یاب ہونے کو بجائے اسے کسی دعا کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر اور اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کر کے بیان کرے۔ اس نے آدھی جلی ہوئی سنگریٹ زمین پر گر کر کھجا دی اور مجھے جوئے ٹکڑے کوکان کے پیچھے ٹھونس لیا۔ پھر وہ اسے کان سے نکالی کر چٹکیوں سے مٹا ہوا بولا:

وہ شہزادوں کے گھاٹ پر پہنچی مادر زاد کھڑی تھی۔ اس کے ہلکے رنگ پر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں قلع چڑھاری تھیں۔ اس کے لیے کاسے ہلاں ہوا میں اڑتے اور لہراتے سانپ کی طرح بل کتے تھے۔ وہ خود چوہوں سے لدی ہوئی شنی کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ ایک چمکتے ہوئے جٹان کی طرح اس کا چہرہ ایک بار پھر روشن ہوا۔ ایک چھپا کے کی آواز آئی اور وہ پانی میں غوطہ کھا گئی۔ میں بے ساختہ گھوڑے سے کود کر ادھر دھڑکا۔ مجھے نہ ولی حمد بنادور کا خیال تھا۔ نہ اپنی شہزادی کا، نہ ماحول کا خیال تھا۔ نہ حالات و واقعات کا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے آج جل پری اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور وہ نظروں سے غائب ہو چکا ہے۔ میرا دل پکا رہا تھا کہ اس عجوبہ روزگار کی اگر پھر جھلک دیکھنی ہے تو جلدی کرو۔ بجائی حضور مجھے آواز دے رہے تھے "کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کچھ نہ سنا۔ میں دوڑ کر کن رہے پر پہنچ گیا۔ جھک کر بہادوں طوفانِ ناز و آبی۔ جھیل کی سطح سے بابوں میں چھپا ہوا ایک۔ آفتابی چہرہ اجڑا ایسپر گس جیسے نازک اور سفید ہاتھوں نے ان کو جھٹک کر نیچے پھینک دیا۔ اور ایک آن واحد کے بیٹے دو۔ حضور آنکھوں سے میری آنکھیں لڑیں اور اس نے ایک ہلکی چیخ کے ساتھ پھر غوطہ کھا دیا۔

بجائی صاحب نے اتنی دیر میں غارت کی گئی ان ملاحوں کو آواز دے دی تھی۔ ان میں سے دو تین دور تھی ہوئی سامان نکلتے تھیں۔ بجائی حضور نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے جو کھلے کی کوشش کی۔ میرے منہ سے بار بار اسی میں نکلا "جل پری" وہ ہنس دیتے "ابھی آئی ہے تمہاری پری گرفتار ہو کے" انھوں نے کہا اور ملاحوں کو اشارہ کر دیا۔ ان میں سے دو فوراً تجلیں میں بھاڑ پڑیں معلوم ہوا دو گر گچھ ایک رو ہوئے تعاقب میں چلے۔

بجائی حضور میرا ہاتھ پکڑ کر ادھر لائے جہاں ہمارے گھیرٹ کھڑے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں بالکل انھیں کے سہارے چل رہا ہوں۔ مجھ سے فوت عمل بالکل سلب کر لی گئی ہے۔ میں رہ رہ کر کانپتا تھا جیسے میں کسی بھیانک خواب سے چونکنا تھا ہوں۔ میری اب کچھ میں آنا ہے کہ یہ رزش وہ فطری جھٹکے تھے جو ان بندھنوں کے ٹوٹنے سے ہو رہے تھے، جو میں نے اپنی جنسی میلانات کے گرد باوجود رکھے تھے۔ میں نے اپنے دہب کی زین سے پیچھ لگائی اور کھڑے کھڑے سرگرمیت جلائی۔ جلدی جلدی دو تین کش لگائے جب جاکر میری یہ کیفیت کم ہوئی۔

ملاحین اسے پکڑ کر لائیں۔ جیسے جسم پر میلی خاک سدی، کمر سے نیچے بابوں سے پانی ٹپکتا ہوا۔ ان دونوں کے درمیان ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے مشک کے دو نافوں کے درمیان کاغذ کی ایک ڈلی۔

بجائی حضور نے کوک کر پوچھا "کون ہے ری تو؟"

اس نے ندی سے جواب دیا "شہزادی"

وہ مسکرائیٹے "اچھا، جب ہی آپ شہزادیوں کے گھاٹ پر نہا رہی تھیں!"

ملاحوں میں سے ایک بولی "مرکار یہ بھارن بڑی نٹ کھٹ پاجی ہے، نہ جانے کیسے گھس آئی سرکادی گھاٹ میں۔"

بجائی حضور نے کہا "اچھا! اسے شام کے دربار میں پیش کرنا"

اتنی دیر میں کئی سرکادی ملاح بھی آگئے تھے۔ سب نے سلام کیا اور "شہزادی" کو گھیرے ہوئے گھاٹ کی عمارت کی طرف لے گئے۔

میں خاموش تھا۔ بجائی حضور ولی حمد تھے۔ مرکار کے بعد انھیں کاساری ریاست میں حکم چلتا تھا۔ میں اگر کچھ کہتا تو نہ جانے ملاح اور ملاحین مانستے بھی یا نہیں۔ لیکن دل میں پٹکنے لگے۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اور منہ کا ذائقہ کڑوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کئی دن سے بخار کا مریض ہوں۔



جہاں محسنوں نے گھونٹے پر بیٹھتے ہوئے جنس کرکے "کوتمنداری جل پری تو بخارن نکلی" میں نے کہا "آپ نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا ہوتا۔ دربار میں پیش کو سے کیا ضرورت تھی؟" وہ بولے "شاہی گھاٹ پر نہانے کا جرم چھوٹا نہیں، اس کی سزاسات برس کی قید سے لے کر موت تک ہے۔ اس لیے سرکار ہی بے سلسلہ فرمائیں گے؟"

میں نے کہا "مکو۔۔۔ مکو۔۔۔"

ان کے چہرے پر دفعتاً وہ سختی اور بے رحمی چھلکنے لگی جو مطلق العنان ڈایوں کے چہرے پر نادری احکامات صادر کرتے وقت دکھائی دیتی ہے۔ وہی جوان ہوا نشان کی جگہ درندوں سے شاہ بہنما دیتی ہے۔ اور وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گئے۔ میرا فقرہ خوب بھی خود بخود سنا نہ ہوا۔ جیسے وہ بھی تنگی کے قدم بقدم چلنے میں اپنی غلط سمجھتا ہو۔

محل میں واپسی پر میں اپنے بستر پر جا کر گر پڑا۔ لیٹ کر میرے حوصلے امد پڑے۔ مارنے والے نہیں تو میں نے جو تک دیا۔ جب وہ واپس آئے گئے تو میں نے ایک کونڑک ہانے کا اشارہ کیا۔ اس کا سن سترہ برس سے زیادہ نہ تھا اور وہ سب میں حسین تھی۔ وہ اس وقت کچھ سہمی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا سرور کے اعضاء میں وہی تناسب ہوتا ہے جو "شہزادی" کے نیم عریاں لباس سے چھلکتا تھا۔ کینز قہوڑی اور ہر آنکھ سے مست بستر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اشارہ سے اور قریب بلایا۔ وہ آئی مگر ڈرتی ہوئی، غم سے ہوتا تھا کہ وہ میرے اچانک انکسار سے گھبرا رہا ہے۔

میں نے کہا "ڈرو نہیں، میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں" میرے لب و لہجہ سے وہ ذرا مطمئن ہوئی۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

میں نے پوچھا "تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہے؟" اس نے سر جھکا کر کہا "آپ کی خدمت کے لیے"

"کس طرح کی خدمت؟"

اس نے کہا "بہر طرح کی!"

میں نے کہا "میرے سامنے تنگی ہو کر ناپوگی؟"

اس نے کہا "کینز ہوں، جیسا حکم ہو!"

مجھے غصہ آگیا "منیں چاہئے مجھے تمہاری کینزری۔۔۔ پسینوں پر پکینے والا جسم! پہلی جاؤ میرے سامنے سے، دور ہو جاؤ! میں چھپا کر وہ ایک پسینے ہوئے کتے کی طرح کرے سے چلی گئی۔

میں پلانک سے اٹھ کر کونٹے لگاؤ وہ دو دو تین تیر برس یا بار بار میری آنکھوں میں پھرتی تھیں، غوطہ لگاتی ہوئی جل پری اور ملاحوں کے درمیان گھلے لیگی۔۔۔ مجھ سے عاقبت اندیشی کی صلاحیت دفعتاً سلب ہو گئی۔ میں جھپٹتا ہوا کرے سے باہر نکلا۔ پھر "شیر دل" پر بیٹھا اور سر پٹ جھگٹا ہوا جھین لے لیا۔ شہزادیوں کے گھاٹ پر پہنچا۔ ملاحقین اب کے باقاعدہ پہرہ دیتی ہوئی تھیں۔ انہوں نے شہزادی کو ایک کمرہ میں بند کر رکھا تھا۔ وہ اس کے دروازے پر پیٹ پیٹ کرانی کو کوس رہی تھی۔

میں دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوا تو اس کی ساری کماؤں پر ایشیا تھا۔ اور اس کے بال کترنگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں طعنے سے سرخ اور اس کے گال بالکل لال ہو رہے تھے۔ یہ میری تصویر پہلی دو تصویروں سے بھی زیادہ دلربا تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں پھسے ہوئے پلانگ پر بٹھا دیا۔ وہ مجھے تعجب سے دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے یوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

”آپ مجھے شہزادے ہیں؟“ اس نے سرگوشی کے لہجہ میں پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر حامی جواب دیا۔ اور مجھے دفعتاً یاد آیا کہ میں ایک شہزادہ ہوں۔ میں ایک سرکاری مجرم سے گھٹکو کر رہا ہوں۔ حضور عالی کے احکام بڑے سخت ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بن کملی کی ہی نہ ہمیشہ کے لیے مر جھا جائے۔ بلکہ مجھے بھی نظر بندی یا قید تنہائی کی سزا جھگٹنا پڑے گی جس جلدی سے پلانگ پر بیٹھ گیا۔ شہزادی میرے قریب کھسک آئی۔ اتنی ہی دیر میں اس کی نسوانی فطرت نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کا داماد و شیدا، اس کا غلام ہی چکا ہوں۔ وہ مجھے موم کی طرح جذبہ حبیب سے موڑ سکتی ہے۔ اس نے دفعتاً میرے کندھے سے سر ہٹا کر کہا:

”میرے شہزادے! مجھے چھوڑ دیجئے“

میں حضور عالی کی غلطی کے خیال ہی سے کانپ اٹھا۔ اس نے پلانگ سے اتار کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر کہا: ”میں آپ کے کنگے ہاتھ جوڑتی ہوں، چھوڑ دیجئے!“

”میں بے بس ہوں شہزادی، مجھے چھوڑنے کا اختیار نہیں!“

وہ طعنے سے ہنسی: ”اچھے شہزادے ہیں! ایک مجرم بھی چھوڑ نہیں سکتے!“

میں نے کہا: ”اگر چھوڑ دیں تو، تو بھی تجھے پھر پکڑ دیں گے، شام کے انداز میں عاضی ضرور ہی ہے۔“

وہ بولی: ”ہونہ! بس اس گھاٹ سے نکل جائے دیجئے۔ پھر دیکھوں گی کون کون کڑھتا ہے۔“

میں نے کہا: ”اچھا چلی جا! مگر — مگر — میں کیسے —“

اس نے جھک کر تیرپاؤں جھوڑے: ”میں نے آؤں گی شہزادے!“ اور وہ کمرے سے نکل گئی۔ ملاحضوں نے روکنا چاہا۔ میں نے کہا: ”جہانے دو!“ اور وہ تیز بجائی ہوئی اس طرف چلی گئی۔ جدھر بخاروں کا قافلہ پڑا تھا۔

خام کے دربار میں وہ تو نہیں پیش ہوئی۔ البتہ سارے دربار سے بندھے کھڑے تھے۔ لیکن حضور عالی کے بار بار پوچھنے پر بھی کسی نے یہ نہ بتایا کہ وہ کہاں گئی۔ دھمکیاں دی گئیں، چٹا گیا لیکن کوئی بھی اس کے سوانہ چھوٹا کہ وہ بھاگ گئی۔ پھر پر بھی کتاب شاہی نازل ہوا۔ تاؤن جنکین کیوں کی گئی۔ مجرم کو خزا میں مدد کیوں دی گئی۔ میں خاموش سر جھکائے سب سنتا رہا۔ حضور عالی نے ڈانٹا۔ بھائی حضور نے مذاق اڑایا۔ وزراء نے صیحت کی مگر میرا سکوت نہ توڑا۔ بالآخر حضور عالی نے جھلا کر ایک مہینہ محل میں نظر بند رہنے کا حکم سنایا۔ میں اسی طرح چپ سا دھڑا اپنے حصہ میں چلا آیا۔ اور پلانگ پر لیٹ کر اس پر غور کرنے لگا کہ آخو شہزادی کہاں گئی۔ اور میں اسے پھر کیسے دیکھوں گا۔ پھر یہ بھی اٹھی کہ میں اس بخاروں کے پیچھے کیوں دلیانہ ہوتا ہوں۔ والی ملک کا بیٹا اور بیٹہ ذات کی صورت کا عشق۔ لوگ کیا کہیں گے؟ بھائی حضور نے تو آج بھرے دربار میں رسوا کیا، کل سارے ملک میں تشہیر ہوگی۔ حضور عالی کے قصہ کا پارہ کس ڈگری پر پہنچے گا۔ سرکار عالیہ کے سامنے اگر پیشی ہوئی تو ان کو کیا نہ دکھاؤں گا۔ مگر — مگر — کیا اسی کو عشق کہتے ہیں؟ میں تو اس سے کوئی بھی غرض نہیں رکھتا۔ میں تو شہزادی کو صرف خوش، چلیں کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ پھر اس قدر فکر کیوں؟ ممکن ہے کہ اس کا بھی کوئی بخارہ ہو۔ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم مجرم کسی نے ایک ساتھ بہت سی سوئیاں چھو دیں۔ میں

بڑا بکرانہ کھڑا ہوا۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا! ہرگز نہیں! وہ میرے ہی ساتھ رہے گی۔ میں اسے سب کچھ کہہ کر حیرتوں لگا گا! میں نے شہزادہ شہزادہ کبار پورے کمرے کی سیکنڈوں بار پیمائش کر ڈالی، فرش کچن ڈالا۔ لیکن لہجی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ میری خود کج میں نہ آتا تھا کہ یہ ہے کیا کہ کبھی سارے جسم میں چنگاریاں سی جھوٹے لگتی ہیں، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رگوں میں برف اتاری جا رہی ہے۔ میں نے کمرے کے باہر روش پر ٹھنڈا شہر در کیا۔ مختلف طرح کے ہندوستانی اور انگریزی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوائی کی خوشبو سے معطر تھی۔ لیکن مجھے سوائے اس کے کسی بات کا احساس نہ تھا کہ میرے دماغ میں کوئی کیل سی ٹھونکتا جا رہا تھا۔ کھٹ! کھٹ! کھٹ!

اور اس نے دفعتاً اپنی لمبی انگلیاں بڑھا کر اپنی کھوپڑی پر اس طرح ماریں کہ معلوم ہوتا تھا واقعی ہتھوڑی سے کبلا کھٹکی جا رہی ہے۔ یہ محسوس کرنا تھا کہ قصہ بیان کرتے کرتے اس کی وحشت بڑھتی جاتی ہے۔ اور کہانی کی ابتدا میں جو رحم اور ہمدردی کا جذبہ مجھ میں پیدا ہوا تھا۔ اس پر ایک لمبی گھبراہٹ، ایک حقیقت کی سرسری لگی غالب آتی جاتی ہے۔ رات کا سا سا تازہ تازہ لگی، دور دور تک ہمارے سوا کسی انسان کا موجود نہ ہونا۔ ان جہروں نے پھر محنت اشعور میں دبا ہوا خوف اُبھلا نا شروع کیا تھا۔ اور اُس کے اجبار نے کا سبب قصہ کا موضوع نہ تھا۔ وہ تو کافی شیریں ہو چسپ اور لیزیر تھا، بلکہ جھلکے کا پورا ماحول تھا اور قصہ گو کا انداز اور اس کا صلیب۔

میں نے اسی جیسے قصہ کوتاہ کرنے کی غرض سے سوال کیا ”تو شہزادی سے آپ کی ملاقات ہوئی یا نہیں؟“ وہ بولا ”نہ ہوتی تو آج یہ گت کیوں بنتی؟ اسی رات ہوئی۔ تقریباً بارہ بجے جب میں اپنے کمرے میں پڑاؤ کو بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے خیالی کیا نگاہ کا دھوکا ہے۔ آنکھیں مل ڈالیں۔ وہ اتنی دیر میں اچک کر اندر آ چکی تھی۔ میں نے کہا ”تم؟ تم؟“

وہ میرے سر کے بالوں میں انگلیاں دوڑا کر بولی ”میں نے وعدہ کیا تھا شہزادے!“ میں نے شروع دآئیں سب کو پیراپشت ڈال کر اسے اپنی گود میں سمیٹنا چاہا۔ اس نے مجھے دکنے ہوئے کہا ”میں اس جیسے نہیں آتی شہزادے!“

”پھر تمہیں آئیں؟“ وہ بولی ”مجھے آپ کی مدد کی اب بھی ضرورت ہے۔ مجھے ایک تیز اور مضبوط گھوڑا چاہیے تاکہ میں آج ہی رات ریاست کی سرحد سے نکل جاؤں۔“

میں نے کہا ”اور میں؟“ وہ بولی ”آپ شہزادے ہیں، آپ میرے جیسی عورت کو بیوی نہیں بنا سکتے۔“ مگر میں تو بغیر تمہارے زندہ ہی نہیں رہ سکتا!“ ”تو پھر آپ کو سبھا رہہ بننا پڑے گا!“ میں نے کہا ”منظور!“

اور ہم اسی رات اپنے فقرہ اور مشک پر سوار ہو کر سرحد سے نکل گئے اور میں چھ ماہ تک اس کے ساتھ بنجاروں کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ہمارے سر پر کبھی ایک کسل کا سا ثبان ہوتا، کبھی وہ بھی نہیں۔ مگر ہر لمحہ صحتی ہوتا۔ شہزادی کے ہر فعل میں ایک خاص ادا ہوتی۔ و نظریب،

دلہنہ پر فرحت انگیز اور یہ اجنبی چاہتا ہوا اسے دیکھتا ہوا۔ چلتے پھرتے، جنت سے کام کرتے، اسٹے، اسٹے، بیٹھتے، ادب میں جی بھر کر دیکھتا پھر بھی دل میر نہ ہوتا۔ طبیعت نہ مہر تھی۔ میں کبھی بھی سوچتا، کیا جنت میں اس سے زیادہ خوشی ممکن ہے اور ہماری اس جنت میں ایک دن ایک سانپ آجی گیا۔

میر ہی مذہبی اور کم شہ کی کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ اشتہارات دیکھتے دیکھتے حلیہ شائع کیا گیا تھا۔ انعامات کا اعلان ہوا تھا۔ آدمی چھوٹے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کجخت اتفاقاً بخاروں کے ہر خانے کو دیکھتا، تو وہ جیتا ہوا نکال پھینچا گیا۔ وہ مجھ سے ملا۔ حضور عالی کی بیماری کی اطلاع دی۔ سرکار عالیہ کے سسر بڑے بہر ہونے کی خبر سنائی۔ میں نے کہا مدد سوائے شہزادی کے اب میرا کوئی نہیں، اس وقت تو وہ مایوس ہو کر چلا گیا مگر شب میں جب ہم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے، دس بارہ آدمیوں نے ہمیں اچانک گھیر لیا اور شہزادی کو سیوں سے باندھ کر ایک نیٹس میں ڈال دیا۔ مجھ سے کہا گیا ”گھوڑا سنا ہے، آپ کا جی چاہے تو ساتھ چلے، ورنہ ہم اسے یہ جارہے ہیں“ چارہ کار ہی کیا تھا ہم دو دن سفر کر کے دربار میں حاضر کیے گئے۔ حضور عالی نے حکم دیا اس باجی عورت کو سپاہیوں میں سے کسی ایک کو دے دو کہ اپنا گھر لے جائے اور صاحبزادے کو غسل کر کے کپڑے بدل کر میرے سامنے حاضر کر دے۔ میں اس ذات کا تحمل نہ ہو سکا۔ میں نے جبر سے دربار میں کمر دیا کہ شہزادی میری بیوی ہے۔ اگر کسی سپاہی نے ہاتھ لگایا تو میں اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر چیل کوٹوں کو کھلاؤں گا۔

حضور عالی نے طنز سے پوچھا ”بیوی ہے؟ کس نے نکاح پڑھا تھا؟“

میں نے کہا ”میں نے خود!“

وہ جانتے تھے، مذہب میں ایسا کر سکتا ہوں۔ اس لیے ان کے لیے جواب تو ساکت نہ رہا تھا مگر اس سے ان کا غصہ بھرک اٹھا۔ ہنوں نے حکم دیا ”ان دونوں کو جیل میں ڈال دو، مگر الگ الگ کمروں میں!“

ہم دونوں قید کیے گئے مگر اتفاق کی بات کہ اسی شب میں حضور عالی کو قلبی دورہ پڑا اور صبح ہوتے ہوئے وہ اپنے سے بھی زیادہ سخت مگر عادل فی کس عدالت میں طلب کر لیے گئے۔ آٹھ بجے دن کو جب میں قیدیوں کا لباس پہنے اپنی تاریک کوٹری میں بیٹھا تھا یہ خبر ملی۔ مجھے اس حادثہ پر کوئی رنج نہ ہوا۔ اس لیے کہ میں انھیں باپ کی جگہ اپنی شہزادی پر ظلم کرنے والا سمجھتا تھا۔ اس لیے نہ میں نے ان کا شمار افسوس کیا اور نہ ہی میں نے افسوس بھرا۔ ہاں اس کی خوشی ضرور تھی کہ بھائی حضور کو سخت ملا۔ وہ نسبتاً یقینی رحم دل تھے۔ چنانچہ پھر توڑی دی دیر میں اس کا ثبوت ملکہ و زہرا بڑا عظم خود میری رہائی کا پردانے کو قید خانہ آئے۔ میں نے کہا ”میں بغیر شہزادی کے نہ جاؤں گا“ اس کی رہائی کا بھی حکم لگایا اور ہم دونوں بندوڑ میں بٹھا کر محفل میں پہنچائے گئے۔

میں نے اپنے خاص محل میں جا کر نہادھو کر کپڑے بدلے اور شہزادی کے بارے میں خاصوں کو ہدایت دے کر میں بھائی حضور کی خدمت میں نذر گزارنے حاضر ہوا۔ انھوں نے لگے لگایا۔ دلہنہ کی اور حضور عالی کے دفن و کفن کے سارے فرائض میرے سپرد کیے۔ میں نے انھیں بخیر و خوبی انجام دیا اور میں براہ طبعان اپنے محل میں رہنے لگا۔

شہزادی کو سارے ممکن آرام دیا تھا۔ ماما، دانیاں، خواص میں کینز پر وقت خدمت میں لگی رہتیں۔ میں اب بھی مجوزے کی طرح اس کے گرو پھر کرتا۔ تفریح کے لیے موڑیں تھیں، خرچ کے لیے روپے تھے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ سب سے بڑے تھے۔ اس پر محل میں قیام کا وہی اثر ہوا جو ایک آواز چڑیا پر ایک سونے کے پتھر سے میں بند کر دیے جانے کا ہوتا ہے۔ اس کے شہابی رنگ پر مگر مٹاؤں رنگ غالب نہ لگا۔ اس کی

یہاں پر بہت سی جنتی برکت کی انجنادیت اختیار کرنا شروع کی۔ میرے خوشی کے چین میں فکر کی کاسٹے دار عمارتیں نکلتے لگیں۔ میں اس کو خوش رکھنے کی صورتوں پر غور کر رہی رہا تھا کہ ایک شب کو جب میں بارہ بجے کے بعد دربار سے پٹا توہیں نے محل کو اس سے نکالی پایا۔ مگر کا کو نہ کو نہ ڈھونڈو ڈالادہ کہیں نہ ملتی تھیں۔ میں بدحواس پڑ گیا تو کچھ کے نیچے ایک پرندہ ملا "شہزادے" میں باقی ہوں دیکھتے تم سے بے انتہا محبت ہے لیکن بجاووں کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ باتیں نے اس شب میں پہلی دفعہ شراب پی اور اتنی پی کر میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

صبح کی بعض اشکونی اور دوسرے بچے پہلی دفعہ اپنی ظاہری حالت کی طرف توجہ کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے دیکھا کرتے کے گلے کے دوسرے بند کھٹے ہیں۔ دامن اور آستین پر بدبو دار دھبے ہیں اور کمرے کی ہر چیز پر ترقیبی سے پڑی ہے۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے شب میں شراب پی اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری شہزادی اور خجالت کی کوئی آئینہ نہ ہو۔ یہ نکاح دفعہ تھا کہ جیسے میں نے رات بھر خاک پھا کی ہے۔ پھر توجہ کچھ کر دیا تو اس قدر روبرو چمکے۔ حلق میں کاسٹے سے پڑے تھے۔ میں نے ذکر کرتا ہوا انتہا اور حمام میں گھس گیا اور محل میں نے پہلے دن ابدار خانے کے سرسبز گلدس کی جگہ چائپ کا پانی چٹو لگا کر پیا۔ پھر تبدیلی بھری کپڑے اتار کر نیم گرم پانی سے خوب نہایا۔ جب میں توہیں پیسے باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ دروازہ میرے بستر کی چادری بدل رہی ہے۔ درخود بخود اس کی طرح مسکرا رہی ہے جس نے ستوری و برقیل گھر کا پاناؤ سفید چڑھا تھا والا ہو۔ اس کے پھٹکے ہوئے پیکے بالی اس کے شاہد تھے کہ وہ جس اچھی فعل کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نیم سپردگی، نیم آواز نہ ہلکا۔ مٹی۔ مجھے یقین آگیا کہ رات کی مدبوشتی میں نے اسے شہزادی کی جگہ دے دی۔ اور مجھے خود اپنے سے نفرت ہو گئی۔ میں ڈاکو تھا، بے زبانون اور کمزوروں کی پوچھی ہوئی ٹوٹے والا ڈاکو! میں نے ایک کینز کو اپنا لیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، بلکہ اس لیے کہ اس کا جسم میرے لیے خرید لیا گیا تھا۔ میں نے اس سے اس کی پسند کا حق زبردستی چھین لیا تھا۔ پھر میں بے وفا بھی تھا۔ میں نے اسے اپنی ملکیت پر دوسرے کو قبضہ کر لینے کا موقع دیا۔ میں نے چند گھنٹوں میں اپنی تمام روایات کو بھادیا جو دامن و مجذوں و فریادوں میرے اپنا سب کچھ کھو کر محبت کرنے والوں کے لیے چھوڑ دی تھیں۔

میں اسی بیچ دن اب میں گرفتار تھا کہ بھائی حضور کا حکم نامہ آیا "دوسرے کار عالیہ نے یاد فرمایا ہے، فوراً حاضر ہو" مجھے یقین ہو گیا کہ مجبوروں نے ساوے واقعات کی خبر پہنچا دی ورنہ میں یوں نہ یاد کیا جاتا۔ سرکار عالیہ نے جس دن سے شہزادی کے متعلق یہ معلوم پایا تھا کہ وہ بھادون ہے، مجھے عاقبت کر دیا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ جب تک یہ ناگوار اور ذلیل تعلق قائم رہے گا، وہ میرا منہ نہ دیکھیں گی۔ اب اس راہرونگی سے پہلے اس طرح کا حکم میرے لیے موت کے برابر ہوتا۔ اس لیے میں ان سے بے انتہا محبت کرتا تھا اور مجھے اپنی اولاد میں سب سے زیادہ چاہتی تھیں۔ لیکن شہزادی کی محبت نے میرے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کیا تھا کہ میں اس کے علاوہ نہ کچھ سوچ سکتا تھا اور نہ مجھے کسی اور کی دنیا میں پرواہ رہ گئی تھی۔ اس لیے مجھ پر نہ تو حضور عالی کی تنگی اور موت کا کوئی اثر تھا نہ میرا سایہ کی ناراضگی کا۔ میں نے دنیا اسی کے پیچھے بچھ دی تھی۔

اس دن جبکہ میری محبت نفرت میں تبدیل ہو رہی تھی مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی کس حد کا خود غرض، کینہہ خائل اور ذلیل ہوتے ہوئے ہوں۔ میں نے ایک بنیاد ان کی محبت میں باپ کی شفقتوں کو ادرماں کی محبتوں کو بھلا دیا۔ مجھ میں نہ تو خداوندی کا غیظ و پاس نہ دیا تھا اور نہ اس کا احساس کہ میں ریاست بھر میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہوں۔ دنیا مجھے کیا کہتی ہوگی۔ اور میرے فعل سے ریاست اور اس کے والی کی کتنی سبکی ہوتی ہوگی۔

میں نادیم و ہراساں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کے لیے جھکا ہی تھا کہ ان کے اشاروں پر کینڑوں، مغلائیوں نے صدمہ اٹا کر انہیں روک دیا۔ خلیہ، کپڑا، روپیہ میں نے اجازت لے کر بیٹھنا چاہا اور انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے چماتی سے نکالیا اور مانتا سے بے چین ہو کر روئے گئیں، میری آنکھوں سے جی ندامت کے آنسو گرے۔ ایک لفظ شکایت یا نصیحت کا زبان پہ نہ لائیں۔ میں بار بار چہرہ دیکھتی اور باغ باغ ہو جاتی۔ میں دل میں کشتار، ہلکا کر ایسی چاہنے والی مل کے ساتھ میں نے اس طرح کا سلوک کیا۔ انہیں اس حد کی اذیت پہنچائی۔ غرض وہاں سے دل میں طے کر کے اٹھا کہ شہزادی کا خیال دل سے نکال کر رہوں گا اور اب اسی طرح کی زندگی بسر کروں گا جو ایک والی ریاست کے بھائی کے شایان شان ہے۔

ان سے رخصت ہو کر نکلا ہی تھا کہ اطلاع ملی، بجائی حضور منتظر ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے خوب خوب لہتے لیے۔ ان کو بھی اس کا وہ تھا کہ میں نے کبھی ایسی عورت کا اپنے لیے انتخاب نہیں کیا جو ان کے ہم تہہ ہوتی۔ جس سے وہ بہنوں کا سا سلوک کرتی تھیں۔ میں نے ہنس کر کہہ دیا "میر تو آپ بزرگوں کا کام ہے، آپ نے کیوں تلاش نہ کی؟" وہ خوش ہو گئیں، بولیں "آج ہی لو، میں سرکار عالیہ کا عند پرے لوں، پھر دیکھیں اس کی جگہ ایک چاند سی دمن نہ لے آئی تو تم ہی کہنا" انہوں نے اسی دن سے کچھ اس طرح کی جوڑوڑ لگائی کہ جیسے ریاست کے والی کی صاحبزادی سے جس کا بقل مشابہ "ایک لال چاند تھا تو ایک گال سورج" ایک ہی ہفتہ کے اندر رشتہ طے پا گیا۔ اور یہ بھی طے ہو گیا کہ سرکار عالی کا سوگ اترتے ہی یہ پہنچ کر شہزادی میری دمن بنادی جائے گی۔ میں نے اس دوران میں اپنے کو اس قدر مشغول بنا رکھا تھا کہ مجھے اپنی شہزادی کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ صبح کو میں غسل کرنے کے بعد فوجی بارکوں میں چلا جاتا۔ وہاں ایک گھنٹہ تک سمائندہ کرتا۔ پھر مقدمات سنتا۔ بارہ بجے کے قریب واپس آ آکھانا کھاتا اور فوراً لائبریری میں چلا جاتا۔ وہاں مطالعہ کرتا یا لکھتا۔ چار بجے کے قریب چائے پی کر گھوڑے پر سوار ہو کر تفریح کو نکلتا جاتا اور اسی سلسلہ میں فوجی بارکوں سے ہوتا ہوا آٹھ بجے شرب کو پیتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بجائی حضور کے پاس بیٹھتا۔ اکثر ان کے ساتھ کھانا کھاتا۔ کبھی ان ہی کے ساتھ سے نوشی میں مشغول ہو جاتا، کبھی گھر آجاتا اور دہرہ ساتی کے فرائض ادا کرتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب تک میں اپنے حواس میں رہتا میں اپنے کو اور دہرہ کو حد درجہ تنفر کی نگاہ سے دیکھتا۔ لیکن جہاں مدہوش ہوتا تو پھر جسم کی پکار دل کی پکار پر غالب آجاتی۔

اسی طرح تقریباً دو سال گزر گئے اور وہ دن بھی آگیا جب میں نئی دمن کو رخصت کر کے گھر گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بلا کی آندھی آئی تھی۔ ہر طرف سے بادل اٹھے چلے آ رہے تھے۔ زہرہ و مشتیزی تو کہیں ایک خنار سا تارا بھی کہاں نظر نہ آتا تھا۔ پھر اس پر وہ گرج کر الامان۔ ہر جاندار اپنی اپنی جگہ پر سمٹا خافت بیٹھا تھا مگر ہمارے ہاں محل میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ چنانچہ پرشہنائی نچ رہی تھی۔ میں بجلی کے رنگین لمبوں اور چکر کاٹتے ہوئے قمریادوں سے قوس قزح کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ ریاست کے سامنے امراء اور وٹسا و عورتیں کھانے میں مصروف تھیں اور میں دولہا کی مصنوعی متانت سے اپنے ہمسوں کے مجمع میں کچھ شغل کر رہا تھا کہ اندر سے حکم آیا، میں بلا یا جا رہا ہوں۔

میں کچھ جھومتا کچھ جھجکتا اس مقام پر پہنچا جو: بنابھی صاحبہ سیلیوں کے جھگٹ میں ایک کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں "کیا آج کی مات بھی اس موٹی شراب کی مدد کی ضرورت تھی؟" اور قبل اس کے کہ میں اپنی خجالت مٹانے کے لیے کوئی جواب دوں انہوں نے دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا اور قہقہوں

کے پیوں بھرائی ملی گئیں۔

جن ذاتی کو صنعت گری و فنکاری جس قدر دلآویز و دیدہ زیب بنا سکتی ہے اس کا نامزد اعلیٰ و حریر میں اپنا پیوں سے ڈھکی ہوئی مسہری پر ساکت و ساکن پڑا تھا۔ مستی و مدہوشی پیدا کرنے والے بخود ات فضائل و عطریں ہی کر رہے تھے۔ کمرے کی ہر شے قیمتی اور ہی ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ گاہرٹ سے آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اور چنانچہ پر بختی ہوئی سرٹلی آنسری کی ہلکی ہلکی سوز سن آواز پاؤں کو ایک خاص نال دم پر اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نم: آنکھیں مسہری پر جمائے، کچھ جھومتا کچھ لٹکھڑاتا دارنگی اور سرخوشی کی حالت میں وہ دوہیں میں ایک خاص طرح کا ذائقہ محسوس کرتا چلا جا رہا تھا۔ بڑھتا جا رہا تھا دفعتاً کمرے کی ساری روشنیاں گل ہو گئیں۔ میں تھک کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زم زم ریشمی دھوا کا جو مجھے مسہری کی جانب کھینچ رہا تھا۔ دفعتاً ٹوٹ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کسی نے میرے خاص طور پر اس کمرے کی روشنیاں گل کر کے مجھے اندھیرے میں اپنی منزل اور اپنا مرکز کشش ٹیٹھنے کے لیے مجبور کیا ہے۔ مگر حق ڈی دیہ میں پورے محل کے شور و غوغا نے بتا دیا کہ یہ تاریکی عام ہے۔ میں نے مسہری پر ایک سرسراہٹ محسوس کی۔ دروازے کی طرف پیشے پلٹنے اور ہر پلٹا۔ غالباً نئی ولسن ٹیٹھ گھونگھٹ سے میرا رخسار دیکھ رہی تھی اور اب اندھیرے نے مجھے ایک تاریک تر سایہ بنا کر اس کی نظروں سے پوش پڑا کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ حرکت منزل تک پہنچنے کے لیے میرا سہارا بن جاتی لیکن دفعتاً ایک جانا پہچانا زم زم ہاتھ مجھے کھڑکی کی جانب کھینچے لگا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا ”شہزادی؟“

کان کے قریب منہ لاکر جواب دیا گیا ”وہاں! باہر چلئے“ — اور میں خاموش ساتھ ساتھ ہولیا۔ کان پر دو گھوٹے لگا کر کھڑے تھے، بھائی محصور کا منٹکی اور میرا فقرہ۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور چور دروازے سے ہو کر حواں آج کے ہنگامے میں کوئی پہرہ نہ تھا، نعل کے باہر نکل گئے۔ میں نے شکایتوں کا باب جب کبھی لا تو شہزادی کے جواب نے مجھ میں باز پرس کا یا ر باقی نہ رکھا۔ وہ اپنے غصوں اور اس سے سر کو جھٹکا دے کر بولی ”میں نہیں چاہتی تھی کہ ہمارا معصوم پہلی سائنس ہلی فضائی جگہ گئیں اور رے“

اب حرف و حکایت تھی تو اس کی کہ وہ کیسا ہے، کہاں ہے، کہاں پیدا ہوا اور اس وقت اس کی دیکھ بھال کوئی کر رہا ہے؟ اس حدیث نے بی کو اس نے دروازے دراز کر کے بیان کیا۔ اور میرا دل ہی نہ بھرتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس افسانہ کی جلدیں بڑھتی ہی چلی جائیں۔ ہم ساری رات چلتے رہے، کبھی تیز کبھی آہستہ، مگر اس پورے طویل سفر میں مجھے ایک سیکنڈ کے لیے نہ تو بھائی حضور کے غم و غصہ کا خیال آیا اور نہ وہ غائب تر چہرہ ولسن یاد آئی جو میرے اس طرح غائب ہونے سے مختلف طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنی ہوگی۔ دو سال سے چھوٹی ہوئی شہزادی میرے ساتھ تھی، مجھے کسی اور سے کیا مطلب؟

صبح کے قریب ہم ریاست کے حدود سے باہر بنجاروں کے ایک ڈیرے میں پہنچے۔ وہاں پہلی دفعہ اپنے نور نظر کو شمع جلا کر دکھلا دے۔ نے تھوٹے سے پائے میں سوراخا تھا۔ پہلی نظر میں وہ بھولی صورت میرے دل میں اتر گئی۔ ہو ہو شہزادی کی تصویر تھی۔ وہی ناک نقشہ، وہی رنگ، وہی غلافی آنکھیں، اور سونے میں وہی ہلکی مسکراہٹ جو میں نے بارہا شہزادی کے چہرے پر دیکھی تھی اور جس نے اکثر اڑوں میں مجھ سے میری نیکیاں لین لیتی تھی۔ ہم دونوں اس پر جھک پڑے۔ کبھی جگر پارے کو دیکھتے، کبھی ایک دوسرے کو شہزادی کی نظر میں غور، افتخار تھا، تجتر تھا۔ وہ سب کچھ تھا جو اپنے بہترین شاہکار کو دکھانے وقت ایک کامل صنم کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ وہ کتنی تعین، و کتنی تم نے میری تخلیق؟

جھلایہ پھول قمیص شیش محل میں دیان نصیب ہوتا ہے تو بہاروں کا چڑھتا ہے۔ کھل ہوا، آواز اٹھتا اور شہزادیاں، بچیاں، لالہ و گلاب، سنبل و بنفشہ کی آمیزش و فیر و ہل کمال نصیب ہے۔ میری آنکھیں بار بار اس تھوڑی سی منگھٹ میں گم ہوتی ہیں کہ ان دونوں میں دلربائی کس میں زیادہ ہے۔ بلال میں یا بدر میں، غنچہ و نازگشتہ میں یا گلاب تازہ میں۔

بچے نے ماں کی خوشبو پاٹی، سوتے میں کھلایا، اس نے پنکھ یوں جیسے لب کھلے اور اس نے "اچی اچی!" کہہ کر ادھر کود لی۔ جدھر شہزادی کا چہرہ تھا۔ اور میں نے شہزادی کی چہرے کی تصویر دیکھی جو پیشتر کی تینوں تصویروں سے بھی زیادہ دلکش تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سنہری لہر دوڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک برقی سی کوندی۔ اس کی کندھ کی سبز رنگیں سنبلیں اور پھلپھلیں۔ اور اس نے جھک کر بچے کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان دونوں کے گود ایک سفید باد میں گیا۔

اس نے پھر مگر سنگریٹ کیس کی طرف ہاتھ پڑھایا۔ میں نے جلدی سے سنگریٹ پیش کی۔ وہ دو تین لمبے لمبے کھل نکال کر بولا "میں نے بہت دنوں سے کوئی اچھی سنگریٹ نہیں پی تھی۔ آج آپ نے پلائی تو شہزادگی کے دن یاد آگئے۔" پھر اس نے سنگریٹ کو فرش پر ڈکڑ ڈکڑ کر چھڑ کر دیا۔ جیسے وہ اپنی ان ساری یادوں کو خاک میں ملا رہا ہے۔ جو شہزادی سے ملاقات کے قبل۔ والی زندگی سے متعلق تھیں۔ اس نے ایک لٹنٹائی سا فٹس بھی اور کہا۔

مجم نے دو برس عجیب طبع کی خوشی میں گزارے کبھی ہم جو تیریاویں میں سوئے کبھی اپنی چوٹی سی راوٹی میں، کبھی ہم نے درختوں کے نیچے بستر بنایا، کبھی ہم نے جھکوں میں شاخوں پر بسیرا کیا۔ مگر ہر لمحہ مسرت سے ہرگز تھا۔ ہر وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہا ہوں جس کے لیے بری تخلیق ہوئی تھی۔ مجھے کبھی بھی بھانوں کے مجمع میں بیٹھ کر احبیت نہیں محسوس ہوئی۔ میں نے کبھی ان کی سادہ و عفا کس زندگی میں کوئی غیریت نہیں پائی۔ انھوں نے مجھ کو اپنا لیا تھا اور میں نے ان کو۔

جب ریاست کا کوئی جاسوس یا پولیس کا کوئی سپاہی نہیں ڈھونڈتا ہوا ان کی جانب آنکھتا تو ہمیں بہت پہلے سے اطلاع ہو جاتی اور ہم کسی قریب کے جھک میں کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جاتے۔ پھر ہم نے کبھی ایک ٹوٹی کے ساتھ ایک ماہ سے زیادہ بستر بنایا۔ ہم ان خانہ بدوشوں کے جس گروہ میں پہنچ جاتے۔ شہزادی ان کی لڑکی ہوتی اور میں داماد۔ ہر ایک۔ ہماری آؤ بگٹ کرتا اور دل و جان سے ہماری خدمت پر مستعد دکھائی دیتا۔ ہم نے ان کے ساتھ ہندوستان کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ لیکن شہروں کے قریب پہنچتے ہی ہم ہمیشہ ان میزبانوں کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ ہم جانتے تھے شہروں میں پولیس کے اڈے ہیں اور ان کے پاس ہمارے جیسے۔ پہلے ایک ریاست کو میری گرفتاری کی فکر تھی اب دو ریاستیں میری تلاش میں ہیں۔ اس لیے آزادی کی زندگی دینا توں میں نئی ہوا ٹوٹی میر تھی۔ شہزادی اور میں نے فرار کے وقت اتنا کچھ ساتھ رکھ لیا تھا کہ وہ ہماری عمر بھر کے لیے بہت کافی تھا۔

وہ رگ، کچھ سوچتا رہا۔ اس کی نظریں فضا میں نہ جانے کیا کیا دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے لمبی سانس لے کر کہا "ہماری کی وادی میں میری پہلی بار منو سے ملاقات ہوئی۔ منو اپنی ٹوٹی کا سردار تھا۔ چھوٹا سا، گورا چہرہ، خاصہ وجہ، اس کی آنکھیں سے زائد نہ تھا۔ کالے کالے پٹوں پر اس کی چھوٹی گلابی بگڑی اور اس کے کانوں میں سونے کے موٹے گول جینے بڑے اچھے لگتے تھے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی مگر آنکھوں میں کجلائی ہوئی آگ بھی تھی۔ اس کا انداز بھی کچھ اکھڑا اکھڑا تھا۔ وہ خلوص اور وہ تپاک جو عام طور پر میرے بھائیوں میں ہر ایک نے ظاہر کیا تھا اس کی بھی منو کے ہاں کی محسوس ہوئی۔ وہ بے موقع ہنس پڑتا تھا اور باتیں کرتے کرتے دفعتاً چپ ہو جاتا تھا اور





میں بھی تیزی سے ٹیلے پر چڑھ گیا مگر ٹیلے کے دوسری جانب پہ کوئی نہ دکھائی دیا۔ راستے میں اب بھی کئی چھوٹی بڑی چٹانیں تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کے پیچھے چھب کر دم لے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے قریب ترین چٹان کی طرف رخ کر کے پھر فیہ کر دیا اور ٹیلے سے اتر کر اس طرف بڑھا۔ جلد ہی اور تاریکی میں چھوٹا پار پڑا اور میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ چوٹ زیادہ نہ آئی۔ لیکن دم پھیل گیا اور میں کئی منٹ تک ٹانگ پر اڑا اپنی سانس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا اور میں نے سنا: کوئی مجھے پکار رہا ہے ”شہزادوے“! شہزادوے! اور ساتھ ہی تیز دھڑکنے ہوئے گھوڑے کے ٹانگوں کی آواز سنائی دی۔

میں چیخا ”یہاں! یہاں!“ اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ کے بعد شہزادی اپنے مشکلی پر سوار وہاں آ پہنچی۔ اس نے پوچھا ”کیا ہوا؟ کس پر خبر کیا؟“ میں نے کہا ”گھر پہلو، پھر تباہی کا!“ اور ہم دونوں ایک ہی گھوڑے کی پیچھے پیچھے تھمتھماتے آئے۔ راستے میں میں نے شہزادی کے ہزار پر اسے سارا واقعہ سنا دیا۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ مگر جب میں گھوڑے سے اترتا تو وہ اسی طرح اس پر مٹی رہی۔ میں نے سمجھا وہ گھوڑوں کے لئے کھاس اور دانے کا اشتہام کر کے آئے گی۔ میں نیچے میں چلا آیا۔ مجھے تھکن محسوس ہوئی جیسے میں بڑی منزل مار کر آ رہا ہوں، جیسے میں کئی راتوں سے نہیں سویا ہوں۔ میں نے بنا کر کپڑے بدلے اور خودی دیکھ کے میرے اسی طرح سوزی بنگ پر اتر گیا۔ لیکن مجھے غینہ نہیں آ رہی تھی۔ ابانغ اسی ادھیر میں لگا تھا کہ میرے تیرے بارے میں اس جگہ میں آبادیوں سے دور لوگوں دشمن پیدا ہو گیا۔ کیا معافیٰ حضور کے جاسوس ہیں یا میری سسٹل کے آدمی یہاں پہنچ گئے! مگر انہیں میری گرفتاری کی فکر ہوتی نہ کہ تفریق کی۔

میں اسی طرح الجھ رہا تھا کہ دفعتاً انہوں میں ایک شور مچا ہوا جیسے بہت سے لوگ جوش میں باتیں کر رہے ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا نہ رہا۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

سارے غیموں کی لائینیں ایک دائرے میں بانس ٹوٹا ٹوٹا کر لکھا دی گئیں تھیں۔ لکڑی کے ایک بڑے ڈھیر کا اناؤ سلگ رہا تھا اور اس کا بھلائے اس روشن تمام پر بن رہا تھا۔ میں نے کچھ پوڑے نمونے کے ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شہزادی پھری گھڑی تھی۔ وہ منہ ملی طرانت اشارہ کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں ادھر بھاگا۔ میں نے سنا۔

”ہاں میں نے اس کی جگہ شہزادے سے شادی کی، میں اپنا ذکر سنتے ہی ایک درخت کے تنے سے جہاں اندھیرا تھا لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہزادی آج اپنے پیروں کے سونے کوئی منہ نہ پیش کر رہی ہے۔ میں بھی چاہتا تھا کہ دیکھوں شہزادی کو اس نوم دلمے کیا سمجھتے ہیں۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ وہ غصہ سے ہونٹ جبار رہی تھی۔ اس کی بوٹی بوٹی میں ایک بھلی سی کوند رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صاف عقہ بن کر کسی نہ کسی پر گرتے گی۔ اور اسے خاکستر بنا دے گی۔ وہ کہہ رہی تھی ”آپ ہی سے انصاف جانتی ہوں“ اس کا اور شہزادہ کا کوئی مقابلہ ہے؟ سورت میں، لشکر میں، ذات میں، بہانت میں، عزت میں، ہنرمیں، علم میں، یہ کس چیز میں ان کی برابری کر سکتا ہے؟“

مجھ میں سے ایک بولا ”جو شہزادے ہیں، ہزاروں برس پہلے بادشاہت کی ہے!“

شہزادی پلٹ پڑی ”مگر آج تو ہم اچکے ہیں، چور ہیں، بد معاش ہیں، شہروں میں جاتے ہیں تو پولیس ہماری نگرانی کرتی ہے۔ نہ ہمارے مکان ہیں، نہ ایک بالشت زمین، ہر جگہ سے لگائے پھرتے ہیں اور غریب سے غریب آدمی بھی اپنے کو ہم سے اچھا سمجھتا ہے!“

ایک نوجوان نغا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ”اگر کوئی ہمیں ذلیل سمجھتا ہے تو وہ خود ذلیل ہے۔ ہم جنگلوں کے بادشاہ ہیں، ہم کسی کا دیا نہیں کھاتے، ہم اپنا قانون خود بناتے ہیں۔“

ایک بوڑھے نے کھڑے ہو کر ڈھٹا، مٹا، مٹھ بیٹھا جاؤ مٹھتے، شہزادی نے ہمارے منہ سے مقررہ وار کیا ہے۔ وہ کہتی ہے: "موتے آج ہمارے ہمارے شہزادہ بڑے تیر ہلاک۔ وہ اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ہم کیا فیصلہ دیں گے۔" "اے موتے، تم کو کون سا کام دیکھنے لگے۔ وہ نصف منٹ تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجمع پر نظر ڈالی۔ اور بولا:۔

"شہزادی کا الزام صحیح ہے۔ میں نے تیر مارا، اور مجھے بڑا تعجب ہے کہ وہ کیونکر بچ گیا۔ تم جانے ہو میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔" "میں تم لوگوں کا سردار ہوں۔ میں تمہارے فیصلے سے فیصلے اپنا فیصلہ دینا چاہتا ہوں۔" "میں شہزادی کے چہیتے سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ تلوار سے، نیزے سے، چاقو سے۔" "جو ہتھیار اس کو پسند ہو اس سے" "مجھ میں ایک لہری دوڑ گئی، ایک شور مچا ہوا "ہم سب کو منظور! منظور! منظور!" "شہزادی بھیٹ کر سلسلے آگئی" "مجھے ہرگز منظور نہیں۔" وہ شہزادہ ہے، وہ پستول، ہنار دق چلانا جانتا ہے۔ وہ چاقو اور نیزہ جانتے ہوئے مقابلہ میں کھڑے ہو گئی! میں!

"مجھ پر تو شہزادے کو اپنے کھا کرے میں!" ایک نوجوان نے طعن کیا۔ "مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں ایک کرشمہ کو چرتا، لاؤ کے پاس پہنچ گیا۔ ہر ایک مجھے حیرت سے دیکھنے لگا میں ساری تعلیم، سارا فلسفہ، ساری تہذیب، ساری ثقافت بالکل بھول گیا۔ میں اس وقت بالکل وحشی تھا۔ میں نے کہا:۔" "بھائیو! موتے نے مجھ پر چھپ کر حملہ کیا، میں بچ گیا۔ میں اس کا کوئی قصاص نہیں چاہتا۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔" اور تو چپ رہے مگر ایک بوڑھا بیل اٹھا "بھئی بڑے کی بڑی بات!" میں نے اسے ہتھوڑے سے اشارے سے روکا۔ میں نے کہا: "موتے نے ابھی مجھ سے مقابلہ کرنا ہر کی ہے، میں اسے قبول کرتا ہوں۔ چھڑے سے، تلوار سے یا پستول سے، ان میں سے جس کو مانے میں رہا۔ اپنے کو مار کر مچھتا ہوں، میں مقابلے کے لیے تیار ہوں!" "شہزادی چیخیں "نہیں! نہیں!"

میں نے اسے ڈانٹا "تم چپ رہو، عورتوں کے مجمع میں جا کر بیٹھو؟" جب وہ گردن جھکائے عورتوں کے مجمع کی طرف چلی تو میں نے موتے پر ڈک کر کہا "بتاؤ کس حیرے سے لڑو گے؟" "موتے مسکرا کر کہا "چاقو"، اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس نے ایک سگریٹ جلائی۔ شہزادی کہنے سے ایک ہی جھنجھٹ کر گئی۔ ایک بوڑھے نے اٹھ کر کہا "نہیں! نہیں! شہزادہ چاقو سے لڑنا کیا جانتے؟"

ایک نوجوان غصے سے بولا۔ "شہزادی بیمار ہے، وہ اسے جیتنا چاہتا ہے تو ہمارے ہی جوبوں سے لڑنا چاہے گا!" "نہیں، نہیں، اور ہاں، ہاں،" کا شور مچا۔ میں جانتا تھا کہ موتے اس فن کا ماہر ہے۔ سارے مجمع کا انداز بتاتا تھا کہ اسے موتے جیت اور میری بار کا یقین ہے۔ مگر مجھے مطلقاً ثبوت نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یچین میں ہر حربے کا استعمالی سکھایا گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں مجھے کھیل کود، جنگ و جدل سے زیادہ مطالعہ اور کتب بینی کا شوق تھا۔ میں نے سو، لے پستول کے کسی دوسرے حربے کے استعمال میں ہمارے نہیں حاصل کی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ جیتوں گا میں ہی۔ موتے کے ایک گوشے میں سگریٹ

دبانے سکڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی پیشانی پر پسینہ جھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی زردی دوڑ گئی تھی اور اس کے نکتے پھیلنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ غالباً اس کی یہ گھبراہٹ ہی میری خود اعتمادی کو مضبوط و مستحکم بنا رہی تھی۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوکے طرف رخسار و جہان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:-

”میرے دوست نے جو کچھ کہا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے شہزادی کے بے اسی حربے سے رٹنا پڑے گا جو آپ کا قومی حربہ ہے۔“ معاذ اللہ! کیا کہہ کر نوکے گھبراہٹ میں کیوں نہ افساد کر دیا جائے۔ سیب میں پڑے ہوئے سپتول کو میری انگلیاں بار بار چھو رہی تھیں۔ خود بینی نے بھی مجھے اپنی ہمارت کی نمائش کی طرف اگسایا۔ میں نے جیب سے سپتول نکال لیا اور نوک کی طرف مڑ کر کہا ”میری پسند کا حربہ تو یہ ہے۔“ اور ساتھ ہی ایک خیر کر دیا۔ نوک کے منہ میں ٹھکی ہوئی سگریٹ آدھی کٹ کر اڑ گئی اور پورا مجمع چیخ اٹھا ”ارے مار ڈالا،“ ”نوک کھڑا کر گزرنے لگا۔ میں نے مسک کر کہا ”ڈر و نہیں، نو،“ میں نے سگریٹ کو نشانہ بنایا تھا، تمہیں نہیں،“ وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی سگریٹ لبوں سے نکال کر دیکھی۔ پھر اسے زمین پر پھینک دیا اور اس کا دہناباقتہ تیزی سے کمزور ہو گیا اور اس نے وہیں سے چاٹو نکال کر میری طرف پھینکا۔ میں اپنی حرکت کے رد عمل کے لیے تیار تھا۔ میں نے جلدی سے پتھر ابد لا کر میرے قریب ہی بغل سے ایک دوسرا چاٹو س سے گھرا۔ ہوا میں دو ٹوٹ چاٹو لکھرائے اور دونوں زمین پر گر گئے۔ میں نے بڑ کر دیکھا تو شہزادی کمر پر دو ٹوٹا ہاتھ رکھے نوک کو غصے سے ہانپتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ وہ دانت پیس کر بولی ”شہزادے کے منہ میں کہاں سگریٹ چلی گئی کہ تم نے نشانہ لگایا تھا، نو؟“

مجم کو ان جلد جلد ہونے والے واقعات کی سرعت نے بولنے کا موقع نہ دیا تھا۔ اب شہزادی کے سوال پر پھر ایک شہزادہ اٹھا۔ ”شہزادے نے بھی اس پر فیر کیا تھا۔“ ”شہزادے نے اس پر منہیں سگریٹ پر فیر کیا تھا۔“ ”جھوٹ ہے۔“ ”سچ ہے۔“ میں نے خاموشی کیلئے پھر ہاتھ اٹھایا۔ ۵۰ چپ ہوئے تو میں نے پہلے شہزادی کو ڈانٹا۔ ”یہ موقعوں پر مردوں کے بیچ میں عورتوں کا دخل دینا میں اچھا نہیں سمجھتا۔ تم بیٹھاؤ۔“ اس کا منہ تھمتا اٹھا۔ مگر وہ بیٹھ گئی۔ میں نے مجمع سے کہا ”آپ نوکوں کو میرے نشانے پر شک ہے اچھا تو میرے سینے سے تین موم بتیاں لے آئیے۔“ ایک ان میں سے دوڑ کر تین موم بتیاں لے آیا۔ میں نے نوک کو اس جگہ سے ہٹوا کر ایک بتیاں لکھوا دی۔ اور تینوں موم بتیاں جلوا دیں۔ پھر ہر ایک کو اس جانب سے ہٹا کر میں نے اپنے مقام سے کھڑے کھڑے تین موم بتیاں فیر کیے۔ جب تینوں موم بتیاں بجھ گئیں تو میں نے کہا ”اب تینوں کو دیکھیے، کوئی نیکی یا ٹوٹی قوم نہیں“ شہزادی سب سے پہلے ہنسی ہوئی دوڑی۔ اس نے تینوں بتیاں اٹھا کر دکھائیں۔ سوائے فیتند کے کوئی حصہ نہ دکھانہ لڑتا تھا۔ مجمع واہ واہ کرنے لگا۔

میں نے کہا ”آؤ، نو، اب ہمارا تمہارا بھاروں کے حربے میں مقابلہ ہو جائے۔“ اور میں نے کوٹ اتار ڈالا۔ قمیض اتار ڈالی، صرف شلو اور پیمے رہا۔ مونے اپنا کرتہ اتارنا اتہم کھول کر پھینک دی۔ وہ پہلے ہی سے ہیئت جاگھیا پیمے تیار تھا۔ دو بورتھوں نے اپنی اپنی کمر سے دو چھڑے نکالے۔ ان کے دونوں اور قدوں کا مقابلہ کیا۔ دونوں یکساں تھے۔ ایک چاٹو انھوں نے مجھے دے دیا اور ایک نوک کو ہر دو ہاتھ گرو حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ عورتیں اور بچے پیچھے کر دیئے گئے۔ سبست جلیغے میں انور واد حسن کا مونہ تھا۔ اس کے ہاں تناسب اعجاز کا تھا اور چہرے کی گرفت یہ بتاتی تھی کہ وہ اس کے استعمال میں قدرت کا طرہ رکھتا ہے۔ سچ عرض کرتا ہوں، میرے دل میں پہلی دفعہ ڈر پیدا ہو گیا۔ میں چھڑے کے استعمال سے یوں بھی گھبراہٹا تھا جیسے شمشیر چھوٹی ہوئی تھی۔ بس اتنی امید تھی کہ میں ”جو جھڑے“ سے واقف ہوں، مجھے کوئی آسانی سے زخمی نہیں کر سکتا۔ اس وقت نوک کا کمرنی پھر تیل جسم دیکھ کر مجھے اس مقابلہ کے نتیجہ کی طرف سے کھٹکا پیدا ہو گیا۔ ممکن تھا

کمر بند پر بڑھتا مگر نمونے بڑھ کر وار کر دیا اور میں نے پتہ پڑا بدن کر اسے خالی دیا۔ وہ نہ ٹکھڑا نہ کمر سنبھلا اور ہم دونوں وار کر کے اپنے اپنے جگہ پر چلے گئے۔ میں نے چند ہی منٹ میں محسوس کیا کہ فوج جس چمڑی سے وار کرنا ہے یا جھکا دیتا ہے وہ میرے ہاں مغفوب ہے۔ اگر ہلکے چھاپے گئی تو چھپا رہے ہوں گے پار ہو گا۔ معاً مجھے استاد کا قول بھی یاد آگیا۔ ”دست بدست ڈالنی میں دشمن کے جسم کی حرکت نہ دیکھو، صرف آنکھوں کو دیکھتے رہو، وہیں سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس کا کیا قصد ہے۔“ اسی لیے میں نوکی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے تھا اور اس کے ہر وار کو روکنے یا خالی دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ مجھے خود وار کرنے کا اب تک موقع ہی نہ ملا تھا۔ ایک امرالبتہ میرے لیے باعث مسرت تھا کہ میرا جسم خشک تھا، میری سانس نہ پہلی مٹی اور نہ پیسے میں نہا گیا تھا اور وہ تنگے جوئے پیسے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ غالباً نوے سالہ بھی اس فرقہ کو محسوس کیا۔ اس لیے کوہ وار کرنے کے لیے ایک دم پیچھے ہٹا اور بچا ہے اس کے کہ وہ پتہ پڑا بدل کر میرے وار سے بچے۔ اس نے اچھل کر پوری قوت سے میرے پیسے پر لانت ماری۔ میرے ہاتھ سے پھرا جھوٹ گیا اور میں زمین پر چپٹ گر پڑا۔ وہ اچھل کر میرے پیسے پر سوار ہو گیا اور اس نے پھر پورا ہاتھ مارنے کے لیے چمڑا تانا۔ میں تنہا دیر سے اسی موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح اس کا جسم میرے جسم سے مس ہو جائے اور میرا ہاتھ اس کی کھال تک پہنچ جائے۔ تو نے وہ موقع مجھے اپنی محنت سے دے دیا۔ اس کا چمڑا میرے پیسے میں پیوست ہونے لگا۔ یہ حمد اور سانس کی طرح تیزی کے ساتھ چلا۔ میں نے بائیں ہاتھ بڑھا کر اس کی کھال پر ہلکی دی۔ چمڑا تو بھنی سے جاکر دوڑ کر ادریں جو جھڑکا پڑا کہ اسے نوکی پیٹ پر پڑا اور اس کی دونوں کھالیاں میرے ایک ہاتھ پر پھنس گئیں۔

جی تو چاہتا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹ کر میں نوکیو بولہ کے لیے ٹوٹا کر دوں مگر میں نے غصہ کو ضبط کیا۔ جاہل تھا، وحشی تھا، میری فوج اس کو ذلیل کرنے میں ہی ممتی۔ میں نے اسی لیے وہیں سے پیسے پیٹے پڑھوں۔ سے کہا۔ اس نمونے بھگے دو بار مار ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ آخری حملا بھی اسی نیت سے تھا میں بدلہ لے سکتا ہوں۔ اک دھماکی حرکت میں اس کے دونوں ہاتھوں کو بائیں ٹوٹ جانے کی۔ لیکن میں اپنے کو اسی کی سطح پر نہیں لانا چاہتا۔ میں اس کی پھجواں بخشنی کرتا ہوں۔ میں نے اٹھ کر ٹھہر کر پھنی، کوٹ کندھے پر ڈالا۔ نوکیو اس کے دو ساتھیوں نے منہ جال کر اٹھایا۔ وہ اس کا منہ دھلا کر پانی پلانے کے لیے ایک طرف لے گئے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور مجمع پر نظر ڈال کر کہا، ”میں نے بھارہ بھنے کی کوشش کی، آپ نوکیوں نے بھنے نہ دیا۔ شہزادی یقیناً آپ کی ہے وہ میری نہیں ہو سکتی۔ ایک بار وہ مجھے چوڑ کر چلی آئی تھی، آج میں اسے چھوڑ کر جاتا ہوں۔“

شہزادی چیخ کر دوڑی۔ میں نے اسے ڈالنا ”تم صحن نام کی شہزادی ہو، تم ان بھاروں کی کھو ہو، میری نہیں! میں نے اپنے کو بہت گرایا اب اس سے زیادہ نیچے نہیں گر سکتا۔“

اور میں نے جلدی اپنے فقرہ پڑھ کر کسی اور اس پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ شہزادی خوشامدیں کرتی رہی، بھائے بھار میں نہ کہیں رہیں مگر میں نے ایک نہ سنی۔ شاید کئی پشتوں کی وجہ سے اپنے غور، تکنت، جلال و جبروت کے ساتھ میرے دل و دماغ پر اس دست تسلط پھیں۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ میں حد درجہ رسوا ہوا۔ میری بے انتہا ذلت کی گئی تھی۔ اس ذلت شہزادی سے ملے مٹی، اس کے بھان سے پیدا ہونے والے بچے سے نفرت تھی اور اس پوری زندگی سے نفرت تھی۔ جو میں نے اس کے عشق میں کافی مٹی اور میری دماغی حالت ایسی تھی کہ اگر کوئی اس وقت میرا تعاقب کرتا تو شاید میں اسے مار ڈالتا۔

میں رات دن مسات روز سفر گزارا۔ بس کچھ گھنٹوں کے لیے کسی چستے، کسی دریا یا کسی کنوئیں کے کنارے یا کن ہرے جڑے پہاڑی میں سو رہتا۔ میں نے اس دوران میں کیا کھایا، مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ دو ایک دن تو جنگلی میوہں پر بسر ہوئی۔ ایک دن پستول سے ایک تیرتر فشکار کیا تھا۔ اسے آگ پر پھینک کر بغیر ٹک کے کھایا۔ ایک دن ایک پھلی چستے میں پانی پیتے وقت بہت آسانی سے ہاتھ آگئی، وہ پھل میں بھرن کر کھائی۔ ایک دن ایک دیہاتی مسجد میں شب بسر کی، وہاں نمازیوں نے اپنے گھروں سے لاکچھ کھانا پلایا تھا۔ مگر اتنا ضرور یاد رہے کہ میں نے اتنی مدت تک شکم میں کچھ نہ کھایا اور نہ میں نیند بھر سکی۔

آٹھویں دن میں ریاست کے حدود میں داخل ہوا اور اسی شام کو اپنے محل میں۔۔۔ میں نے تمام کیا، کپڑے بدلے اور بھائی محسن ر کے سلام کو منظر ہوا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ فرمائیں، میں نے دست بستہ عرض کی ”میراجو فی دور“ ہو گیا۔ میں سزا کے لیے حاضر ہوں، اپنی کی غصہ بھری نگاہیں محبت بھری نگاہوں میں بدل گئیں اور انھوں نے مجھے سیز سے نکال دیا اور مجھے ساتھ لیے ہوئے اندر آئے۔ وہاں جا بھی صاحب سے بھی میں نے معافی مانگی اور سرکار عافیہ سے بھی ت

اس نے ٹک کر نہر میری سگریٹ کو لپٹائی جوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے جلدی سے ڈیریا بڑھا دی۔ اس نے حسب معمول ایک سگریٹ جلا کر چن لیے اپنے کشمیرے اور ٹر اعلیٰ کر میں پر پھیلات دیا۔ پھر وہ بولا:-

”میں نے تقریباً ایک سال اپنی پچھلی زندگی بسر کی۔ اب کے مموات میں دو فرق ہوئے۔ ایک تو یہ کہ زہرہ کی جگہ اس دلس نے لی تھی جو دوسرے سے انتظام میں بیٹھی تھی۔ اس کا حسن یقینی چاند کو شرماتا تھا لیکن اس کی محبت چاندنی کی طرح ہلکی اور ٹھنڈی بھی تھی۔ اس شہزادی جیسی گرمی نہ تھی نہ تڑپ تھی نہ مدہوشی، اسی لیے پھر بھی شراب نوشی شروع ہو گئی تھی۔ سر خوشی اور بے خودی کے لیے کچھ تو بہانہ چاہئے تھا۔ دوسری بات جو اس شراب کی بالکل ضد تھی اس کی بھی میں نے عادت ڈال لی تھی۔ یعنی میں نے روزانہ خنوڑی سی ورزش کرنا اپنے اوپر فرض کی طرح عائد کر لیا تھا اس سے فارغ ہوتے ہی میں تقریباً ایک گھنٹہ چاقو کی لڑائی میں مصروف کرنا تھا۔ میں نے ریاست کے سب سے بڑے بانک اور ہنوٹ جانے والے کو ملازم رکھ لیا تھا اور اس کی نذر بدایت قدیم ہندوستانی حربوں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لیا تھا۔ اس ورزش سے یہی تحت حمی درست رہی اور مجھ پر بے لوثی کا زیادہ برا اثر نہ پڑا۔ غرض زندگی ایک ڈھرسے پر لگ گئی تھی اور ظاہر ہیں نظریں اس کا یقین کرنے لگی تھیں کہ میں شہزادی کو بھول چکا ہوں اور اس بے کیف ہوا اور طرز حیات کا عادی ہو چلا ہوں کہ دفعتاً ایک شب میں جب میں گیارہ بجے قلعہ معنی سے اپنے محل واپس آیا تھا۔ ایک شخص میری موٹر کی روشنی میں دونوں ہاتھ پھیلائے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیو ر نے موٹر روک کر پوچھا ”کون ہے؟“

وہ بولا ”منو!“

میں نے ہند کی روشنی جلا کر جب دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ نو کے دونوں ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہیں اور اس کے چہرے

سے وحشت ٹپک رہی ہے۔

میں نے گھبرا کر پوچھا ”کیا بات ہے منو؟ کیسے آئے؟“

وہ ہانپتا ہوا بولا ”سرکار، شہزادی یہاں سے بیس میل پر مر رہی ہے۔ اس نے بلایا ہے!“

میں نے نو کو اندر کھینچ لیا اور ڈرائیو ر سے کہا ”موٹر پھاٹک تک لے چلو“

دواں پنہنے ہی میں نے سفری سے اس کی بدوق اور کارتوس کی پیٹی لی اور ڈرامیٹر کو موٹر ہلکانے کا حکم دیا۔  
جب ہم شہر کے حدود سے باہر نکل گئے تو میں نے منہ سے پوچھا:-  
”لو کیا بیارہقی شہزادی؟“

وہ عجیب طرح ہنسا: ”بیاری۔۔۔ بیاری! آپ کی نبت۔۔۔! پھر وہ رُک کر بولا: ”اے کل جیڑیے نے کاٹ لیا ہے۔ وہ مرد ہی ہے!“

میں نے جھلا کر منہ کو کھنکھنایا۔ اس پاجامی کے لیے شہزادی کی موت جیسی بات ہے۔

پھر میں نے ڈرامائی طور سے کہا:۔

لے اور تیز چلاؤ !

ہم کچی سڑکوں اور گھبڑوں سے ہوتے ہوئے نصف گھنٹہ میں وہاں پہنچ گئے جہاں شہزادی پڑی تھی۔ اس کے جسم پر سفید جادو ڈال دی گئی تھی۔ صرف اس کا چہرہ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کو جس کی تو امیر ورتی کا مقابلہ وہ نصیب پر بھی نہیں کر سکتی تھیں جو نوکار کے دلوں کو جھالیات کا شہر بناتی ہیں، اس وقت بھڑپٹے کے پنجوں نے بھانک بنایا تھا۔ ایک آنکھ جھوٹ گئی تھی۔ ایک گالی اس طرح کھایا تھا کہ جیڑے کی بیڑیاں دھانی دیتی تھیں۔ نیچے کا ہونٹ تقریباً نثار دھا۔ گردی کے پاس کا گوشت بچا ہوا تھا اور جیمہ کا کوئی حصہ ابسانہ تھا جو موجود نہ رہا۔ نہ جانے کیونکر وہ اب تک زندہ تھی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ ڈوبی پڑی رہتی پھر بھی جب آنکھ کھلی تو ”شہزادہ“ شہزادہ!“ کی رٹ لگائی۔ میں نے کیونکر اپنے کو پتہ لگانا کہ اس تک پہنچایا۔ اس سے باتیں کیں، مجھے معلوم نہیں میری آنکھ سے اب آنسو بھی نہ نکلا۔ بس انسان ضرور محسوس ہوتا تھا کہ اگلا ترک فی میرے جسم میں چھپے۔ مازنا چلا جا رہا ہے میرا گوشت کھڑک کھڑک کر کاٹ رہا ہے اور میں بار بار کانپتا، بار بار سٹھپاں کس لیتا، بار بار دانت بیچھنیغ لیتا اور شہزادی پر جھکا ہوا اس کی دلکھ بھری کہاں سننا۔ وہ زنگ زنگ کر کھ رہی تھی۔۔۔

”تم آگے شہزادے! میں نے تمہیں دیکھ لیا، میں تمہیں ہر دوسرے تیسرے روز عمل کی جھاڑی کے نیچے آدمی آدمی رات تک دیکھنے کے لیے بیٹھی رہتی تھی۔ تم بھول سکتے تھے شہزادی کو! وہ اپنے شہزادے کو نہیں بھول سکتی تھی! کل میں جاوید کو بھی لے جا رہی تھی۔ وہ ”ڈیڈی! ڈیڈی!“ کی بہت دھنوں سے رٹ لگائے تھا۔ میں نے کہا، اس کا منہ دھلا دوں، اچھے کپڑے پہنا دوں، تب لے چلوں۔ اسی لیے پاس والے جنگل میں چستے پر لے گئی۔ بھڑیا نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا تھا جھاڑی میں۔ اس نے جاوید کو منہ میں دبا کر بھاگنا چاہا! میں لپٹ گئی، اس نے مجھ کو خوب خوب کاٹا، نواگیا اور اس نے مجھے بچالیا مگر میرا۔۔۔ میرا جاوید!“

وہ ایک بار چینی دھڑے میرالال! کہاں ہے میرا چاند؟“ اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ایک بڑھی تجاری نے خون سے رنگین ایک قہیلا بڑھا دیا۔ مجھے پکڑ سا لگیا اور میں وہیں بے جان ہو کر گر پڑا۔“

اس نے پھر ایک سگر بیٹ پی اور سسلی۔ وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھا جھوم گیا۔ پھر وہ بولا:-

”میں اسی دن سے ان دونوں کی قبر کی مجادری کرتا ہوں اور پانچ پیسے روزانہ روشنی اور ہر پر صرف کرتا ہوں۔ پانچ پیسے سے زیادہ نہیں! لائیٹ بلبو جی آپ کے پاؤں مبارک!“

اور اس نے اپنے سوتلے سوکھے لاکھ میری اینڈلیوں پر کھڑکھڑایا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے برت کی قاشیں زور زور سے

میری پندھیوں میں ملی جانے لگیں اور میں چمچ کر جاگا اور میں نے بے ساختہ اپنے ہاتھ لگیں زور سے جھٹک دیں۔ ایک سانپ پلنگ سے ملی ہوئی ٹھڑکی پر گرا اور تیزی سے نیچے اتر کر کھیت میں جا گئے لگا۔ میں نے جھپٹ کر بندھن، ٹھانی اور دو فیر کیے مگر وہ اکیچہ کئے پتوں میں غائب ہو گیا۔

ہنگلے کا چوکیدار دوڑا ہوا آیا کہ کیا ہوا بابو جی! کیا ہوا؟

میں نے کہا ”کچھ نہیں جی، سانپ تھا!“

وہ بولا ”ارے صاحب وہی ناگ بابا ہوں گے جو اس کمرے میں رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں یہاں کسی کی قبر تھی۔ انہیں نے سانپ

کا روپ دھاریں کیا ہے!“

وہ قہرات کی ایک چوری داستان سنانے کو تیار تھا مگر میں حیات و موت، خیال و خواب کے سلسلہ لاغنا ہی پر غور کرنے لگا اور

میری زبان پر شاد کا یہ شعرا ہی گیا۔

سنی حکایت سستی تو درمیان سے سنی      نہ ابتداء کی خبر سے نہ انتہا معلوم



# صنم تراش کا خواب

ل۔ احمد

کون نہ کہے گا کہ قدیم یونانیوں کی نزاکت ذہنی اور طوے خیال ان کی مضامین پرستی کا نتیجہ تھی۔ یونان قدیم کے ذہن و دل کا بہترین شہر اور فائز ان کی دیوتا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کا ایک ایک کردار یونانی فکر و فراست کی زرخیزی پر دلیل ہے۔ دیوتا کے علاوہ ان کا سب سے بھی ایسی کہانیوں سے ڈالا مال ہے جو دلہری کے گونا گوں پہلوؤں کو روشن کرتی اور ایک فلسفیانہ نتیجہ نکالتی ہیں۔ یہ کہانیاں بجائے خود ایک دیوتا کا صیغہ تو مانی ہی جائیں گی۔ ان میں سے بعض کہانیوں کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور ان میں سے ایک صنم تراش کی کہانی بھی ہے۔ جس کو اپنے ہی بنائے ہوئے بہت سے مشتق ہو گیا تھا۔ اور جس کی محبت یا قوت خیال نے اس مروجہ پیکر میں جاری و ساری دی گئی۔

مغربی ملکوں کے ادب میں جتنا لطف اور متل پایا جاتا ہے۔ یونانی ادب ہی کا فیض ہے۔ میرے خیال میں یہ حکایت ایک نازک اور عمدہ دلیل ہے۔ اور کوئی صاحب ذوق اس سے خاص اثر جیسے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ حکایت جس پر وادہ سے پیش کی جا رہی ہے شاید ان میں کوئی تردید نظر آئے!

چلچلیاں ایک صنم تراش تھا اور بہت دن سے ایک ایسی صورت گھڑ لینے کی آرزو کر رہا تھا جو اس کی تمام پہلی مرئیوں سے بہت عالی و اشرف ہو۔ چنانچہ اس نے ایک پیکر مکمل کر لیا۔ اور آخری جھل جھل کر کے جب اسے چھپی ہوئی ہتھوڑی لگی تو قدرتی طور پر اس نے جہان سے کی نظر ڈالی۔ ایک دفعہ اوپر سے نیچے تک نظر گئی تو وہ بے اختیار مسکرایا۔ ایک بوجھ پہل و منع پر رہی دنیا کو پا کر جتنا خوش ہو سکتا ہے۔ چلچلیاں کی یہ مسکراہٹ شاید وہی ہی اختراعی مسرت کا نتیجہ تھی۔

بدشعبہ وہ ایک بڑی سندر اور روپ مورتی تھی۔ ایسی مکمل کہ اس سے بہتر تصور نہیں کی جاسکتی تھی، کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں بت تراش دیوی دیوتا کی مورتی بنا کر پہلے خود پر جا کیا کرتے تھے۔ چلچلیاں ہی اپنے بنائے ہوئے اس اصنافی پیکر کے سامنے سلسلے احترام و پیشکش کے تہے تہذبات پیش کر سکتا۔ اور اس کے سامنے ماتھا ٹیک سکتا تھا!

پہلیاں سے مکان کا وہ کمرہ جہاں وہ محرم کرتا تھا۔ یکساں مہمانوں نے وہاں پہنچ کر چوکیوں پر فرش پر اٹھادیوں اور طاقتوں پر ہر طرف سے ہر جگہ سرسری حقوق آباد تھے کسی کا انداز غصہ، غضب کا تھا تو کسی کا نشان و دشنامی کا تھا تو کسی کا رنج و ملکہ کا، کوئی سنت پیش کرتا تو کوئی گیان و دھین میں ڈوبا ہوا تھا۔ فرض آذر مند سناج کی جوانی پتھر کے اندر جھٹنے خواب دیکھ سکتی تھی یہ صندستان ان خوابوں سے معمور تھا اس کا یہ نگار خانہ پتھر کی ایک کان پٹی جو زندہ تھی۔ زندگی سے معمور تھی، شاید اس کا جذبہ خلائی — یحییٰ قبادرانہ ہے — اس بات کا زور دار ہو نہ کسی اور کو اس کمرے میں داخل نہ ہونے دیتا تھا۔ کوئی اگر اس پر کمرستان کو دیکھ پاتا تو وہ یا تو پشیمانی سے لگتا یا کھنڈہ پیمانی اور گلیان یہ دونوں باتیں ہر داشت نہ کر سکتا تھا اس کمرے کے اندر تو اس کی روح بوجہ پڑی تھی؛

قمر سے ہوئے اور انکھڑ سینہ پتھر کے ٹول اور سیلے۔ کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ کوئی طیارہ کی قربت اور کسی کا بس ڈول نکلا ہوا۔ ہر طرف پھری ہوئی تھیں یا کہنے کے مہم اور بے ربط خیالات کا ہجوم تھا۔ ایک سل میں بیٹھی ہوئی صورت، پہلو اور۔ کوٹھے کا صرٹ عم ہی گھڑا گیا تھا۔ دوسری میں صرٹ سینے کا اچھا رہی نکل پایا تھا۔ خود گلیان اگر دیو کی طاقت و گرفت میں چپس جانا اور اس وقت اس کی پیشانی پر ٹکلیں پڑیں، ایک مجھے کی پیشانی پر دیسی ہی ٹکلیں نمودار تھیں۔ ایک سل پر ابھی صرٹ گہری دروازہ ہی پڑی تھی۔ جس سے خیال ہوتا تھا کہ گلیان نے اس پتھر کے اندر زندگی کا اٹھانہ پیدا کر دینے کے پلنے زور کے ہتھوڑے چلائے ہیں۔ مختصر یہ کہ جھین ہتھوڑے کے پہلے دن کے کام سے سنے کر مکمل صورت چھٹے تک، ہر وجہ کے غور سے موجود تھے۔ اور گلیان کے ہتھوڑے و احساس کی جھانکی کا محض انہماک معلوم ہوتے تھے؛

ایک ہی کل کی سنناں، ایک ہی خاندان کی نسلیں، یہ تمام سمجھتے، یہ اصنامی مخلوق، ایک ہی جذبہ اور شرق کے رشتے میں بندھی تھی۔ اور ان کے اندر اچھوتی گھاس کا جھتہ بے مثال تھا؛ گھاس کے ایک بات میں آئینہ ہے اور اس کا پھول کی کل سا پہرہ اس آئینے پر چھلکا ہوا ہے۔ وہ اپنی بگڑی اور "کی" لاکھ بناؤگوں کو دیکھنے میں لگوئی ہے۔ گلیان کی جانب دستی سے شاید گھاس کو سالکی کی تحلیل نہ انکوں کا حال سنا دیا تھا؛ گھاس کے نازک و دبک پاؤں، پاؤں جو فرستوں کے پڑھوس ہوتے تھے۔ اس کی بانہوں کا گمانہ ایک دعوت تھی کہ ان کے چھندے ہیں پڑ کر جان سے دینا ہی معراجِ ذلیست ہے؛

یقین و صرٹ کی آفری نقرہ مال کر سکا بہت مضبوط نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسی حالت میں گلیان نے اپنے ذاتوں کو دیکھا۔ سینہ گرد کی ایک تہہ جم گئی تھی۔ لیکن گلیان کا یقین لامرانی اس صرٹ سے بدل گیا کہ یہ نہیں ذاتوں سے پتھر میں جان ڈال دی ہے؛ اب اسے اتلہ تھا کہ انسانی محنت اور دست کاری دہناؤں سے حسن کا۔ انہیں سے لے سکتی ہے؛

جس ساعت میں گلیان کے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ اس کا بنا ہوا مجسمہ مکمل ہے۔ ایک شہ کار ہے۔ بت تراشی کا اجماز ہے تو وہ ساعت کچھ ایک الہامی ساعت تھی؛ اس نے اپنے نفس کو دھوکا نہیں دیا بلکہ اس کا وہ یقین الہامی تھا۔ گلیان کو وہ مہر تھے بھی یا آئے۔ جب وہ کوئی پیر مکمل کر کے اس کے اندر اپنے احساس و خیال کو دم توڑتے دیکھتا تھا۔ جب وہ اپنی آرزوؤں کو جان کنی کی حالت میں دیکھتا تھا جب کسی گلیان اپنے جانتے ہوئے مجسمے کو اپنے خیال و تصور سے باطل متنازع دیکھتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ ناامی کا احساس غصے میں بدل جاتا اور ایک وہ محبت شکن دیوانگی میں مبتلا ہو جاتا تھا؛

مرمرستان کی دھوپ اور اچھوتی آبادی کے اس ہجوم پر شام کی اداس مٹھا چھانے لگی۔ لیکن منم آباد کی مرمریت و صند کے سے مغرب

تو ہانا چاہتی نہ تھی۔ اصرار کی سفید روئی پھیلے ہوئے دھندلے سے منہ کر کے ہوتی تھی۔ اور جب دیواروں پر شام کا رنگ چھڑکا فرش پر اجاڑی نظر آتا تھا۔ تو اس دھندلے میں سفید پیکروں کی عروانی نیا وہ شاندار اور دل کش محسوس ہونے لگی تھی۔

ان وقت گلیان اپنے منہ کو سے کی مرمریں بیتیں میں ایک ایسی دھڑکنی زندگی محسوس کر رہا تھا۔ یہی پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اور بستہ سوچ کی غصا سے اصرار کی بڑوں کے اعضا کو شباب کے چمکے رنگ میں رنگ رہا تھا۔ اور آخری کون ان کے ہر تڑپ اور سینے کے بوسے پر گریہ مٹاتی محسوس ہوتی تھی۔

گلیان کے اس نگاہ میں ان کے سمندر کا کن ما نہادہ دھندلے سے سمندر جہاں نام نہادہ پیرہہ اچھوتا پس۔ اس کی عیاں صفت مکران سے۔ اس مکان سے قریب تھا۔ اور اس وجہ سے سمندر کی ہواؤں کے ساتھ ایک خوش آمد و گرامہ قسم کی لاپی مکان کے اندر داخل ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ بغیر شام یعنی ہوا کے جلور سے ایک جذبہ کی تحریک تھی۔ فضا کی یہ جار و گری گلیان کے احساس حسرت پر اس طرح چھا گئی۔ کہ اس نے اصرار کی حالت میں گلیان کے برہنہ قدموں کو چوم لیا۔ اور اندر سے دھڑکتے ہوئے اس کے محسوس اور ٹھنڈے زانو پر دھک دیا اور پھر اجانک، جیسے کی چوکی پر کھڑا ہو کر اس اصرار کی پیکر سے چوٹ لیا۔ اس کے خوش ہر تڑپ کے ہتے پینے لگا۔ محبت کے پہلے شمار ہوتے!

پھر جب رد عمل ہوا تو خود سے بھی شرمایا۔ لیکن اس کی شرم سے چھٹی ہوئی آنکھوں نے کیا کچھ دیکھا کہ وہ حیرت سے چوٹ کر رہ گئیں؟ وہ کانپنے لگا۔ اس پیکر میں تو جان بڑھ گئی تھی! وہ جیسے تو متحرک محسوس ہوتا تھا! اس کے سفید کاروں میں سرخی کی جھلک تھی! اور فضا کی ہل کی مانند چہرے سے بے گہاؤں کے ناشنوں تک میں زندگی کی ایک دھڑکنی محسوس ہوتی تھی! جس طرح موسیقی کے انداز بار بار بانس ٹوٹتی ہے۔ بالکل اسی طرح گلیان کے سینے میں زندگی کا جھکا ہوا موج تھا! اور جاتی ہوئی کون کی مدھم روشنی میں گلیان کی بالکی چلیں چھپنے لگیں کسی خوف سے کانپ گئیں۔ شاید زندگی کے ڈر سے!

گلیان یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے دل میں تنگ کا سا تیر بھی نہ تھا! اب وہ گلیان کے جسم کو، جسم کے ہر جتنے کو، ایسے جکے ذات سے چھو رہا تھا جیسے مالی کا ذات کسی نازک پھول یا پودے کو سینٹے میں نرم چومتا ہے! اب گلیان کے جسم میں نہ ہتھوڑی سختی تھی۔ اور نہ اس میں وزن محسوس ہوتا تھا! مرمر میں بہنے ہوئے بال ایسے سیاہ ہو گئے تھے جیسے ات نے آکر لیرا لیا ہوا آنکھوں کے اندر ایسی چمک تھی۔ جیسے سمندر کے اندر سورج چمکتا ہے! لیکن گلیان ابھی تک چپ تھی اکو!

اس سوال کو ابھی گلیان اپنے ذہن میں پوری طرح قائم کر نے نہ پایا تھا کہ گلیان کی ایک سکرا دی۔ اور مسکرا نے سے اس کے چہرے پر جبرانی کا سا دھوپ چھا گیا۔ معمولانہ انداز سے اس کا ذات پڑھا۔ اور گلیان کے ہاؤں سے کھیلنے لگا۔ کافوری علم ایسی اچھلی سے اس نے گلیان کی ایک نکالی اور ہنس پڑی۔ ایک بچی ہوئی سی ہنس جس کی تشبیہ ممال ہے!

گلیان نے نہ جانے اس سے کیا کہہ دیا کہ اس کو سمجھنے کے لیے گلیان کی جوہر پیشانی پر ایک ال سا پڑ گیا۔ زندگی کی پہلی نادر کا احساس! اور پھر ایک نازک سی کاجی، ایک طینت کی تکان میں جتا دکھائی دی۔ ادنی سکون میں پڑے رہنے کے مقابلے میں زندگی ہی تھا رہنے والی چیز!

جب پہلی با۔ گلیان نے اپنی صراحت کے شہکار میں جان پڑتی دیکھی تھی تو کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی عمر بھر کی کمائی

پھینکنا۔ یہی مٹی۔ اور اس سے اس کی حالت بذاتی تو نہیں مگر اسی قسم کی ہو گئی تھی۔ گلابیہ کے گلاب بدن کو راحت اندوزی کے انداز میں پتلا دیکھ کر اسے ایک نوع کی حیرت تھی۔ گلابیہ کے دونوں ہاتھ چھپا کی شکل بنے سینے پر رکھے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا مدھمکا تھا اور گلابیہ کے اندر بیٹے کی یہ نشانیاں اس کو ایک دہری کے برے گوشت پرست کا ایک انسان بتا رہی تھیں۔ جو محبت کی تلاش میں، اوسس ہو گیا ہوا!

مقدسات کی یہ پیش بینی تھی کہ گلابیہ کی فانی تخلیق معمولی مٹی سے نہیں بلکہ اچھوٹے اور پاکیزہ مرمے سے ہوئی! اور تخلیق کائنات کے وقت جو صورت و حالت وہی ہوگی۔ اس دولت پگیلیان اپنے اندر کچھ ویسی ہی الوہیت محسوس کر رہا تھا۔ اسے یہ فخر آمیز احساس تھا کہ اس مٹی اور وہ بات کو خود اس نے تخلیق کیا ہے، اس کا خالق وہ خود ہے!

گلابیہ ابھی تک جیتی جاگتی تصویر تو تھی مگر حقیقی برہمنی صورت نہ تھی۔ ہر بات سے بے خبر اور ہر چیز سے نا آشنا! اسے تربیت درکار تھی، اور پگیلیان کے سوا اور اس سے بہتر معتم و آدابین کون ہو سکتا تھا؟ چنانچہ جب اس نے یہ ذمہ داری اٹھائی تو پگیلیان اپنے جذبات کو صاف طور پر سمجھ نہ سکا۔ لیکن وہ اپنے اس نئے مشغلے سے بہت خوش تھا۔ اسی میں سرشار رہتا تھا! وہ اس مرمے پر بیٹھ کر احساس و جذبات کو تو نہیں سمجھ سکتا لیکن اب اس کی سمادیت میں انسانی اچھا بہت جھلکنے لگی تھی!

وقت گزرنے کے ساتھ گلابیہ کو اب اپنے خالق کے نگار خانے میں مرمے کی سوں اور قووں کے درمیان ہمارے رہنے سے انہیں ہونے لگی۔ ہنید پھر کی چوکی پر بیٹے رہنا دو بھر معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب اصنامی چوکی پر بیٹتی تو جسم اور مرمے مل جاتے معلوم ہونے لگے اور شاید گلابیہ کو ابھی دھندلی سی یاد تھی کہ مرمے اس کا عنصر اصلی ہے! مرمے میں مفت اور اچھوٹے جن کے اندر سے بیدار ہونے کا اقبال دکھائی دے رہا تھا۔ پگیلیان کی حیرت میں اضافہ کرتی رہتی تھی کہ ایک خواب کے عزم ہو جانے کا معجزہ کیونکر رونما ہوتا ہے! اس نے کھڑی ہوئی گلابیہ مجبورۃً جمال بن کر پگیلیان کے سارے جذبات پر کش و پستاری کا مرکز بن جاتی، اور پگیلیان کی مدوح اس کے ہونٹوں پر رنڈنے لگتی اور جب گلابیہ کی سونہ میں پڑ جاتی تو اس کے چہرے کی صہارت پر بادلوں کے سائے پڑتے اور اس کے خیالات معلوم کر لینے کی آمد وہیں پگیلیان کا دم کھٹکنے لگتا!

اس بیکر کے بنانے سے پہلے پگیلیان نے جتنے مجھے بنائے اور کھڑے تھے، ان سب کو محنت و ایگان سمجھتا رہا۔ لیکن اس مروت کو گھر لینے کے بعد سے اسے ایک نامعلوم خدا کی قائم مقامی کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ وہ خود خالق ہے اور گوشت پرست کی مخلوق پیدا کر سکتا ہے! کسی وقت وہ اپنی پہلی اور پرانی حالت و کیفیت یاد کرنے لگتا تھا۔ کبھی نازل نہ ہونے والے ابہام کی آمد وہیں نہیں آتا تھا، واران کو ناقابل تجزیہ انھیں رہنا، سام رہا میں رہنے والے کی آمد اس تنہائی اور سرد و عروج صبح کی تسوہ نسکھی۔ پگیلیان اپنی اس تمام ابہمی عورت کو سزا و عقوبت سمجھتا تھا، لیکن آج وہ پرانی مائیں اور کیفیتیں اس کے خیال میں سزا و عقوبت نہیں رہی تھیں۔ اس لیے کہ ایک عزم کا نام رہنے کے بعد باقہ خالقین کو سنانا، اپنے دست و بازو میں قدرت پانا اور خدا بن جانا اس کے خیال میں مفت نہیں مل سکتا تھا۔

لیکن جب بھی پگیلیان ان خیالات میں کھوجتا تھا۔ اس کے رخساروں پر آشوبوں کے نشان نمودار ہو جاتے اور چہرے پر اتھا کی وہ کیفیت سمجھا دیا جو حقیقی تھی جسے مذہبی زبان میں دوائت کہا جاتا ہے۔ اس وقت بھی اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور لکھنوں

نہیں جھک کر اس سے گلا تھا کی بھری بھری دافوں سے اپنی بانہیں پیست ہیں۔ اور محسوس کیا کہ گھٹیا کی جہتی سے ایک ہنس۔ ایک ہنسائی،  
 ایک ہنسائی زبردستی اس کے آگے اس طرح چھائی جا رہی ہے۔ جیسے نثر چھانے لگا ہے۔ اچھا یہاں سوچنے لگا۔  
 ”ہیں نے اس کے ہرے لیے ابھی بھر کے ہرے بیٹے اربہ اور کیا چاہتا ہوں؟  
 ہماری فطرت، دو گانہ فطرت پر قابو پا بیٹھے اور منصرف ہو رہے کی یہاں غور و خوض  
 جس کا دوسرا نام دوانہ کزدی ہے۔ ہماری پاکیزہ ترین ماحول میں بھی ہم سے  
 الگ نہیں ہوئی، چھی۔ سنی ہے؟“

ایک دن شام کا وقت تھا اور جذبات کو اکسا دیئے والے کیفیات کا اثر چھایا ہوا تھا۔ گھٹیا کی تپان پھیل گئیں اور اسے  
 انسانی جذبات کی حریت خیزی اور اس کی لذتوں کا احساس چھایا ہوا محبت کے سیٹے میں بہہ جانے والی جہتی، عورت کی ساخت میں اس  
 کھلم کھلا کی بناوٹ میں کوئی اضافہ نہ تھا۔ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اندر قبضہ و فقرت کی یہ دیوانگی، اس کی آہیں اور آواز، داخل کی کالانہ فطرتیں  
 اور فطرتیں اور دل پسند مکان و خوشی۔ یہ سب کچھ اس کے ساتھ کیا اس کے جسم کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمام کیفیتیں اس کی جہتی کا جزو ہیں!  
 ہمیں اور محبت کے یہ دو دیوانے سمندر کی ہر گھڑی بہنے والے مناظر سے دوچار، بچوں کی کن تلاوت میں اظہار جذبات  
 اور تڑپتے، استے، تھکتے، محبت کرنے والوں کے دھڑکنے والے دھڑکنے اور فطرتیں جو ہر صبح میں ابجا دھوتی۔ سنی ہیں، دوہرائی جاتی تھیں۔ شاید اس  
 زمانہ محبت کی کم عمری جانا پنا پنداری کے خیال کو محروم فراموش کرنا چاہتے تھے۔ سمندر کی جہتی وقت ہے بین موعیں زندگی کی حقیقت سمجھتی  
 رہتی ہیں۔ لیکن محبت میں نصیحت پر کس نے کام دیا ہے؟ وہ زندگی کی قیاس مدت پر دھیان دیتے تھے۔ نہ اپنی محبت کی اہمیت پر  
 غور کیا کرتے تھے!

لیکن اس کے باوجود دلچسپی اپنی دل کی اندیشہ مند محبت کو، اپنے احسان خوف کو گھٹیا پر ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے  
 دل میں دوسروں نے کھربنا لیا تھا۔ اور وہ سوچتا رہتا تھا۔

”اے خداوند! تو ہر چند پاکیزہ طریق سے پیدا ہوئی۔ تیری اصل طبیعت و نفس ہے، لیکن اس انسانی جسم میں گھسے  
 گھسے دوام نہیں۔ تو بھی بن گئی ہے۔ اور ایک دن کیڑے کوڑوں کی غذا بن جانے والی ہے، ہر چند میرے سارے خواب ابدیت  
 کے عرصے میں گھسے گھسے سوچوں میں گھٹیا میں تیری جہتی میں بھی بھول جاتا ہوں کی میری بنائی ہوئی چیز پر دوسرے کے بنا کے ہوئے قانون کا نفاذ  
 ہے۔ سو خدا کی تدبیر ثابت کرنے کے لیے وہ گھٹیا جو میری جہتی ہے۔ موت کے قانون کی پابندیوں بنا دی جائے؟ اور اگر قانون بدل  
 نہیں جاسکتا تو گھٹیا میں چاہتا ہوں کہ قدرت اپنے ہی قانون میں بس اتنی تبدیلی کر دے کہ وہ دو سال کا اثر تیرے اوپر نہ پڑے۔ اس کے مجھے  
 میں مجھے ان ہی خاکوں میں جاتے آؤ، مگر گھٹیا جہتی تو میری ہے۔ میں نے تجھ محبت کرنا کیوں سکھایا؟

محبت کی غریبوں کے پرگت جاتے ہیں۔ زمانہ تیزی سے گزرنا لگا اور وہ وقت آ پہنچا جب دو انسانی انسانوں کی محبت جہتی  
 سے انسانی نقطہ تک پہنچ کر اپنے پردوں کو سمیٹ لیتی اور اس جہتی سے اترتی نہیں، اگر پڑتی ہے۔

وہ وقت بھی آیا کہ ایک دن گلیلیان نے شدید صدمہ و الم کے ساتھ محسوس کیا۔ شہر و گلاب کا جسمہ گھٹیا، غربانی کا انداز گلابی مرعہ پہلی ہے! گلیلیان نے اس کی آنکھوں کے گوشوں پر ملنے والی جھڑپاں پڑتی دیکھیں! لیکن انسانی حضرات اہم کر حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور گلیلیان نے وہ صفت ایک انسان تھا۔ بلکہ وہی گرفتہ محبت بھی تھا! اس نے خود فریبی کا سہارا لیا۔ جو دیکھا تھا اسے ان دیکھا سمجھا اور گھٹیا جو وہ دیکھنے کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنی محبت کی عمر کو چندے طویل کر لیا! لیکن وہ انسان اور عاشق ہونے کے ساتھ ایک صنّاع بھی تھا۔ اور ایسی نظر رکھتا تھا۔ جو پتھر کی چٹان کے اندر سا دسی صحن و جمال کو دیکھ لیتی تھی۔ کیونکہ ممکن تھا کہ وہ اپنے آپ کو ذرا وہ درجہ تک دھوکے میں رکھ سکے؟ انہم سے زیادہ مدت تک منظرہ چرا سکتا تھا۔ اس کے خوابستان صحت میں صنّاعی کھردرا پن نظر آنے لگا۔ گلابیہ کے سوتے سروپ پر جب اس کی نظر پڑتی جب وہ اس کے جمال خوابیدہ کو دیکھتا۔ تو زندگی کے پورے جھلکے کے آثار صاف دکھائی دیتے اور اس منظر کو دیکھ کر گلیلیان مایوسی کے سمندر میں گروب جاتا تھا!

لیکن گھٹیا خود اس حقیقت سے بے خبر اور بالکل بے پرواہ تھی۔ اس کی موتی اب بھی بڑیوں کا تقاضا کرتی تھی وہ اب بھی ایک سوئے ہوئے بچے کی طرح پیاری اور دلی نشیں ہستی تھی! ہر چند اس کی جوانی کا مدھ اپنی خواہش اور دعا کو آسٹھن تک اُدھانچا کر دینے کا اشارہ کرتا محسوس نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ تھکان جو ہر شے کو افسردہ کر دیتی ہے، اپنا اعلان کرتی نظر آتی تھی!

ذوال صحن اور انجام ہستی کا خوف اک احساس گلیلیان کو مایوسی کے تار ایک گڑھے میں دھکیلتا جاتا تھا وہ اپنے سمنہ خانے کے کونوں میں منہ چھپا کر آنسو بہاتا، اور ہر وقت سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ اور جب طاقت منہ جواب دے دیتی تو دل ہی دل میں باتیں سننے لگتا "گلابیہ، تو نے مجھے سب کچھ دیا، وہ مستیزیں اور وہ اذیتیں دیں جن کی یہ دہی آدمی کو سرشارہ دکھ سکتی ہے! مگر جس طرح رنج و غم انسان کو افسردہ و مضمحل کر دیتا ہے۔ اسی طرح خوشی و مسرت بھی تھکا دیتی ہے!

"گلابیہ، مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ خواب جسم اختیار کر کے خیرا۔ بد جاتے ہیں، پسینے جھون پائے مگر اب ہو جاتے ہیں! ان میں نے میری تخلیق کی۔ مگر تجھے بتا کر میں نے جو حقیقت تو تم کی وہ اونٹنے تھی۔ فانی حسن ہے۔ ادنیٰ حقیقت، احسن کہ تو ابھی ہونا چاہیے۔ سروپ کو تو امر ہونا چاہیے!"

"گلابیہ، آج میں تجھ سے محبت بھی کر رہا ہوں اور غلبہ بھی ہوں۔ پریم کرنے کے ساتھ دیکھی بھی ہوں، اور اس طرح دوسرے مذاہب میں جتنا ہوں۔ ایک انہونی بات اور ایک انسانی خواہش کی کشاکش کے ٹکڑے میں پھنس گیا ہوں۔ انہونی یہ کہ میری جان محبت ایک دوزخ زندہ نہ ہوئی! اور خواہش اس کی کہ تو اپنی تمام جمال آریوں اور حشیں سامانیوں کے ساتھ لافانی بن جائے۔ وہ میں اس کے اندر مسرور ہوں!"

ایک دن گلیلیان دور تھا اور بات پیچھے ہوتے تھے۔ وہ خالق کو کلمات پہیلانے دعا مانگ رہا تھا اور سمندر نے ایک آواز آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ صدا مضمون و منتخب دل و دماغ کے لیے محبت کے نغموں کا مفہوم رکھتی ہے! گلیلیان کے بدن میں ایک پھر ہی آئی اور اس کے ذہن میں سننے اور پرانے تصورات پیدا ہونے لگے۔ اب وہ نئی ٹھیکیں تراشنے کی آرزو کر رہا تھا! لیکن اس کی یہ نئی حالت چند روز تک رہی اور پھر وہ شوق تھنڈا پڑ گیا۔ جوش اور دوسے کی جا۔ پھر تھکن اور افسردگی نے لے لی!

رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آگیا کہ پگلیاں فن و مصاحبت کو بھی مکر و فریب سمجھنے لگیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ مصاحبت قریب محض ہے۔ نیز مکہ وہ محبت کے جذبے کو فنا کر دیتی ہے۔ محبت کی جگہ خود چھین لیتی ہے۔ مصاحبت اب اس کی نظریں ذہن کی غلامی اور لغت و انداز معلوم ہونے لگی۔ ایسی داہم پرستی نظرائی جو صرف غلام فطرت انسان کے لیے ہی مناسب ہو سکتی ہے!

فن و مصاحبت سے اس طرح بیزاد ہو کر پگلیاں باطن اپنے جذبات کے قانون میں کھانا بن گیا۔ صنم سازی سے بات اٹھا کر اور خورشید آرزو کے نئے نئے مجسمے بنانے لگا۔ کسی وقت اگر محبت جی کی آغلیں میل کی نظرائیں تو پگلیاں دل سوزی کے جذبے سے تڑپنے لگیں۔ مگر کھانا اس کی حالت کو بالکل نہیں سمجھتی تھی۔ پگلیاں کے احساس کی نزاکت اور جذبے کی گہرائی کا سمجھنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ عورت و مرد کی تخلیق ہوئی اسی عنوان پر ہے!

پگلیاں جب اس سے باتیں کرتا تو ایسی نرمی اور ملاحظت سے مخاطب کرتا جیسے بچوں کے خواب کا تانا بانا جاہلی اور نادک ہوتا ہے۔ سمجھانے کے لیے اس سے کہتا۔

"پیاری گلشنیا، تجھے معلوم ہے کہ پتھر کی سورتیاں گھڑنا میری زندگی کا شغل رہا ہے۔ لیکن جذبہ و احساس سے مجھے تو نے متعارف کرایا۔ جہنم کے معنی مجھے تو نے سکھائے۔ اس لیے جب میں تجھے عجیدہ و طول دیکھتا ہوں تو جہنم سے بیزاد ہوجاتا ہوں! اس لیے گلشنیا اس نوروت کا طب لا نہ بنا، خاکی نژاد ہونے کے باوجود جسے آسمان سے الہام ہوتا ہے، جو فانی ہو کر بھی قدرت کے اشارے دیکھ سکتا ہے۔" میرے من موہن پسنے، پیاری گلشنیا، اگرچہ ہواؤں کے ساتھ اُڑ جاتے ہیں۔ لیکن میرے دوسرے اہدیت کی ساتھی ہیں!

نہ اپنے اہلی گلشنیا تو اگر چاہے تو میری اس دیوانہ آرزو کو، اہدیت کے اس لمحے کو بچا سکتی ہے!

"گلشنیا، انسان پر غلبہ انسان کی فطرت کو ایک مختصر جزو، ایک بے حقیقت حصہ یعنی اس کی محبت کی ابدی نشانی، زندہ و باقی رہتی ہے! انسانی محبت کا لمحہ فنا نہیں ہوتا! اس طرح ہم نے محبت کے لیے اپنی ہستیوں سے سارے عالم کو سمیرا بجا کائنات کو سمیرا کر دیا ہے! میری پیاری گلشنیا، مجھے بتا۔ کیا تو میرے علم کا راز، میرے دُکھ کا عجیدہ سمجھتی ہے؟

مگر گلشنیا اس زبان کو سمجھنے کے قابل نہ تھی۔ اس کی یہ لامٹی اپنی جگہ ایک مشن تھی، اس کی بہتے خبری اپنے مقام پر شہر و نہ نہ تھی اور پگلیاں کا مطلب و مقصد تو نہیں سمجھ سکی۔ لیکن اس کے پیچھے کے غلوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ ہی! لیکن پگلیاں کی آرزو نشانی رہی۔ اس کے سوال کا جواب نہیں ملا!

وہ دن بھی یاد خیر آ رہا تھا۔ جب گلشنیا کی آنکھوں کی روشنی، آنکھوں کی حیرت جو میرے کی طرح کو دیتی تھیں، دم دم پڑنے لگی اس نے تیلے پہ مہر کا رنگ پھینکا پڑ چلا، اس کے پہلوؤں کے غم و غم سے غالی و کھالی دینے لگے، گلشنیا کا لبیں و گداز سراپا اس طرح بے رنگ و بیخود بن گیا جیسے مقدس کا مجسمہ بے نور و بے رنگ ہوتا ہے!

جوں جوں دن بیت رہے تھے، گلشنیا کا شباب و اس پر ہوتا تھا۔ مگر زری ہوئی شان و آفرین و تابناک گھڑیوں کی یادیں محبت کے تازہ انوار ہوتے اور صورت ناک برسوں کا تہ و نہ ہوتا تھا۔ شاید گلشنیا کی ممتی نیرانی اور اُجڑا دوپ پگلیاں کے اندر پہ تیش کے جذبے کو پر ہمارے لیے۔ لیکن فطرت انسان کمی بدلی بھی ہے۔

پگلیاں، وہ مطلقاً سن و سناں میں اپنے تئیں کی آرزو تھی۔ گھلتا کو اپنے سے خراب سنا کر بھڑکتا رہتا تھا۔ اور گھلتا، وہ پیکر حسن و شباب زندگی میں پر غائب آپکے تھی۔ پرانی آوازوں سے پگلیاں کو پھسلاتی رہتی تھی۔ لیکن ان دونوں کی خواہش و آرزو کے باوجود پرانی کا وقت قریب آ رہا تھا، آدھی بڑھنے لگی تھی، کیونکہ جذبات دھماکتے جا رہے تھے۔

صنعت کی مرضی غرق سے جب گھلتا اپنا منہ بدلتی تو اس رشک میں مبتلا ہو جاتی کہ یہ جیسے استاد وقت سے متاثر ہونا چاہتی تھی۔ نہیں۔ نہ انہیں کوئی غم ہے نہ فکر اور وہ اس آرزو پر محو ہو جاتی جو دیوی دیوتاؤں ہی کو نریب دیتی ہے۔ یعنی وہ جلدی موت آنے کی فکر کرنے لگی۔

————— لیکن اپنی مرضی سے مڑنا کون ہے؟

بالآخر پگلیاں کو ایک دن صبح کے وقت گھلتا کی شکل بڑی سی نظر آئی۔ اس نے ایک خیال قائم کر لیا اور بے پہنی سے رات ہونے کا خطرہ لگا دیا۔ گھلتا جب اپنے بستر پر جا سوئی تو پگلیاں نے ہتھوڑی اٹھا کر سوئی ہوئی گھلتا کے سینے پر ایک ضرب لگائی اور ضرب کے ساتھ سناں کا دائمی فکریں نہ لے دیا۔ فنا آداس ہو گئی۔ ایسی آداس جس کے اندر شاخوں کے خواب باگ پڑتے ہیں۔ پگلیاں کا دل دھچک دھچک سے دھیم تھا وہ بے تاب ہو کر بیٹھنے لگا۔

۴۱۔ سے جمال و رعنائی کا ش میں جانتا ہوتا کہ تو آتا ہے رحم بھی ہو سکتا ہے اکاش میں اس وقت اندھا ہو گیا ہوتا، کیونکہ ہر خواب کی تعبیر ایک لاش تھی اور ہر پہنے کا نتیجہ ایک اذیت ہوتی ہے؟

پگلیاں نے پھر ڈرتے ڈرتے اس کے بدن کو چھوا۔ بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ پگلیاں کے خیال نے وضع پٹا کھایا، اس نے محسوس کیا کہ ایک دوسرا معجزہ رونما ہو رہا ہے۔ تو وہ کانپ لپٹا، گھلتا پھر تھوڑی مودتی بن گئی تھی، اس کا بدن سر کی طرح سخت اور چمک ہو گیا، اور وہ پھر دسی پائیزہ و سادہ ہستی بن گئی، جیسی جان پٹنے سے پہلے تھی۔ مگر اس کے دماغ پر آنسو کی ایک بوند بھی جم کر رہ گئی تھی، یہ منہ آنسو اس محبت پر ایک اضافہ تھا۔

وہ چونکہ ایک صفا تھا۔ اس لیے پگلیاں کی حیرانی انداز سے باہر ہے۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا خود اس کی روح کی تیز رفتاری تھی، موت یا معجزے کا مذہب تھا، اسے دیکھان آیا کہ خون و گوشت کے پیکر میں جو فساد ہی مادہ ہے۔ اس کو اپنی صناعت کی قوت سے دودھ کر دے۔ چنانچہ اس نے اندھیرے میں اپنی چھینی ہتھوڑی ڈھونڈ نکالی اور رات بھر کام میں لگا رہا، رات کی حیرت اور غوشی میں ہتھوڑی کی ضربیں کسی طاقتور سینے کی دھڑکن کی طرح سنائی دیتی تھیں۔

اس دنیا میں قدم نہ کہ انسان ایک چادر اور ڈھنپتا ہے۔ اور وہ علم کی چادر ہوتی ہے! اور انسانی فطرت جب علم پر غلبہ حاصل کرتی ہے تو وہ کامیابی ہی اتنی ہوتی ہے۔ بدنامی چھینی ہتھوڑی چونکہ پگلیاں کا مایہ تھا، اور اس کا مایہ کی اہمیت علم کی ناقابل فتح مندوں کے مقابلے میں ہی بھری غوشی کے برابر ہے!

ایسی سوگوار ہی جس میں اس وقت پگلیاں مبتلا تھا۔ ایک غیر فانی تخلیق کے مناسب حال اور دوامی صناعت کے بیٹے موانی شے ہے۔ پگلیاں نے اپنے ہاتھوں پر ہاتھوں کی سی لپکا ہتھوڑی کی۔ ایسی نرم اور ہلکی لپکا ہتھوڑی جو محالہ اختلاف میں اس کو گھٹیا کے سینے پر محسوس ہوتا کرتی تھی! پگلیاں ابھی تک ایک جوش و شوق سے مودہ مودت سے اتنا قرب محسوس کر رہا تھا کہ اس کو گھٹیا کے مرمیوں کا زندگی اور محبت کی گرمی سے خالی اور عاری ہونے کا حق الیقین نہ تھا۔ اس احساس یعنی محبت کی فانی آرزو نے پگلیاں کی چھینی ہتھوڑی کے اندر



اسی جذبے کو دوڑا دیا تھا! استغوری پڑنے کی آواز غفر مندی کا نعرہ اور خوشی کا غلغلہ بن گیا تھا۔ جس کی آواز تال بکرتی تھی۔ گویا مری کی اس حرکت کے اندر زندگی تازہ ہو جانے کی آواز اپنا کام کر رہی ہے!

پگلیاں نے پھر جو نظروں سے محسوس ہوا کہ وہ بیکر اس کی مناعت و دوستی کا نتیجہ نہیں تھا، وہ گھڑیا دیکھ کر اس کا مجسمہ قلم نہ تھا۔ اس کے ہونٹوں سے کڑی کان کا منہ غائب تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں انسان کی غم فیسبی کا بیان بن گئی تھیں۔ جذبہ آمیت پینے پر جم کر رہ گیا تھا۔ رازوں کا گداز ہر سی طرح زخمی تھا، اور رمنائی و دل رمانی کا یہ بیکر مادہ ارض کی بغل میں سو جانا چاہتا تھا! چنانچہ پگلیاں اب ایک ایسا جادو طرز کی جگہ راز غم کے مجسمے کو کھینچ رہا تھا! اس کے ماتر، دغا اور آنکھیں قریب دے رہی تھیں! پگلیاں غم نہ وہ تھا اور اس شخص کے غم سے بڑا غم کس کا ہوگا۔ جو خود خالق ہو کر یہ دیکھے کہ کل کا دن ہو کا عام ہوگا، ایک ایسا عالم جہاں نہ الہام آفریں سبزہ و سایہ ہوں گے۔ اور نہ کوئی چشمہ و چمن نہاد!

انسان کو جہاں غم نصیب بنایا گیا ہے۔ وہاں اس پر ایک احسان بھی کیا گیا ہے اس کو دل کا سمجھانا سکھا دیا گیا ہے! لیکن جب دل کو سمجھانے کے لیے بھی ہونا کہ مستقبل ہی ہو تو وہ ایک۔ ایسی گھڑی ہوتی ہے، جب آدمی ہر چیز اور ہر بات پر موت ہی کو ترجیح دیتا ہے! اور جو شخص فنا سے اس طرح قریب ہو اس سے کسی لافانی مناعت یا مدہ تخلیق کرنے کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے! پگلیاں کی حالت اس وقت لڑکچہ تھی تو بس یہ کہ وہ خالق ہو کر ناقص مخلوق سے محبت کرنے کی سزا پا رہا تھا! اور اس کی مثال ایسے شخص سے دی جاسکتی ہے جو ایک مرد نے کو ریکھ کر دودھا ہوا

# اُولی اللہ

## مناہ منفی

اگر شیخ اجل حسین کو بے ستم شاہ بننے کی عادت نہ ہوتی۔ اگر خدا بخش کو صدو کہا بیٹے کے ہاتھ کے بننے ہوئے کہا ب کھانے کی لت نہ پڑتی۔ اگر اسلم کو س رنگی کی محبت کا مار نہ اور مجھے چستانی خطوط کا جڑن نہ ہوتا تو یہ آپ بیٹی کبھی مرض و جہر میں نہ آتی۔ اگر شیخ اجل حسین کو بے ستم شاہ بننے کی عادت نہ ہوتی اور وہ اپنے بڑے بیٹے جمیل کے اس جواب پر کہ اندر عورت میں بیٹھی ہیں جی، مجھے وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے اس قدر شدت سے نہ جیتے اور حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال نہ ہوتا اور جملہ متعاقبن ان کی وفات کے بعد بے یار و مددگار نہ رہ جاتے۔ تو اس صورت میں جمیل ۱۸ مارڈنگ روڈ کی کوٹھی چھوڑ کر ایورڈ لاج میں ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ اگر خدا بخش کو صدو کہا بیٹے کے کہا ب کھانے کی لت نہ پڑتی تو وہ ایڈورڈ ہوٹل کو نہ چھوڑتا۔ ایورڈ لاج میں آنے سے پہلے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ صدو کہا بیٹے کی دوکان کے بندوں میں رہ سکے۔

اگر اسلم کو س رنگی سے عشق نہ ہوتا اور وہ دن رات رنگی کے بالی روم کے چکر نہ لگاتا اور یہ خبر لاہور سے چل کر ان کے کاؤں و اج کوٹ تک نہ پہنچتی اور اس کے والد توفیق کی نزاکت کو غصے کر کے اس کا عقد اس کی بنت ام زینب سے کر دیتے تو اسلم کے سسر سید حبیب اللہ نئے محلے میں وہ مکان ہمارے لیے خالی نہ کروا دیتے اور ایورڈ لاج کی بنیاد ہی نہ پڑتی۔

اگر میں چستانی خطوط سے متاثر ہو کر دنیا کے مشہور نقوش سے چند نیم پر بند نمونے اپنے کیوبیل کی دیواروں پر نہ سجاتا اور سپر فٹنٹ میرے خلاف پرنسپل سے شکایت نہ کرتے تو میں بورڈنگ سے مزاکے طور پر نہ نکلا جاتا۔ اس صورت میں ایورڈ لاج لاج بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا۔ اس واقعے کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔

اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے کے لیے شیخ اجل حسین کو ہفتے ہفتے جام اجل پینا پڑا۔ اور توراتی طور پر جہل کی ساخت ایسی بنائی گئی کہ وہ عورت سے دلچسپی کا اظہار نہ کر سکے۔

اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے کے لیے اسلم اور س رنگی کے عشق پر دائمی بندش قائم کی گئی۔ خدا بخش کو کہا ب کھانے پر کسب کیا اور صدو کو ایسے کہا ب کھانے کے بعد اسے نئے محلے میں کہا ب کی دوکان کھولنے پر مجبور کیا گیا۔

اس واقعہ کو عمل میں لانے کے لیے فطرت کو کیا کیا کرنا پڑا۔ اور پھر جمیل، اسلم، خدا بخش اور میرے علاوہ وہ بڑی کٹیا کی طرح چھٹی ہوئی بڑھیا اور اس کی پوتی مینا جسے فطرت نے چستانی کے کسی عمل سے متاثر ہو کر بنایا تھا اور بلا ضرر ہمارا لاکر بوجہ برکت

بہت ہوتا تھا۔

اور ان سارے واقعات کو جمع کرنے کے لیے مجھے ہر سال سے نکالے جانے کا حادوث رونما ہوا۔ جب میرے پرنٹنگ ہاؤس نے ان نیم پورٹریٹوں کے پیش نظر جو میں نے اپنے کیوبکس میں مانگ رکھی تھیں۔ پرنٹس سے شکایت کر دی۔ شام کو جب ہم نئے برتنے تو اسلم مرانا کے حکم کے متعلق سو کر غصے سے بل کھانے لگا اور انہیں گایاں دینے لگا۔

پھر ٹیکر سے جیٹا "مذاکحش" نے سنجیدگی سے کہا: "مرانا کو گرا بھلا کہہ کر دل تختہ اندر لے دینا بھی ہو سکتا ہے۔ اب یہ سوچ کر کرنا

ہا ہے۔"

اسلم نے سر جھکا کر کہا: "ہا ایک مکان تو مل سکتا ہے۔ رات کے سسر سے یہ فائدہ بھی نہ اٹھایا تو۔"

"تو بھنت ہے تم پر؟" مذاکحش نے بند جھاڑتے ہوئے بولا۔

"کہاں ہے وہ مکان؟" جمیل نے مسکرا کر پوچھا۔

"نئے محلے میں۔"

"بھئی واہ! مذاکحش بولا: "اپنے صدویں دوکان کے پاس ہونا درست میں بھی تمہارا ساتھی ہوں۔"

اور جمیل بھی تو کو کھی چھوڑ رہا ہے اس کی والدہ جا چکی ہیں نا؟ اسلم نے کہا اور اس طرح ایورگرین لاج کی بنیاد پڑی۔

لیکن ممکن ہے کہ ایورگرین لاج بننے کے بعد یہ واقعہ ظہور پذیر نہ ہوتا۔ حقیقت میں تمام تر قصور ہمارے نوکر بدھو کا تھا۔

آپ جانتے ہیں آج کل نوکر کا من کس قدر مشکل ہے۔ ہم نے بورڈنگ کے باورچیوں سے بات کی تھی۔ بعضی کوئی نوکر منگوا دو

مادہ می۔ نے یہ سن کر ہاتھ کاچھو ونگی کے ڈھکنے پر رکھ دیا تھا اور نوکر: "کہہ کر یوں سوچ ہیں پڑ گیا تھا جیسے آستے کوہ نڈا کی خبرنا سنے

کوئی لیا کر۔ احمد حسین بولا علیہ تو میڈیکل کالج میں گم گیا ہے اور گاما کلکٹر و نٹروالے صاحب کے ہاں چلا گیا ہے اور وہ ہندوستانی، اسے

کسی بھرتے پندی بلا یا ہے۔

— اچھا بابو جی میں دیکھوں گا۔

ایورگرین میں چار ایک دن تک زہم نوکر کے بغیر ہی رہے پھر ایک روز جب مذاکحش صدو گیا۔ بیٹے کی دوکان سے واپس

آکر تو اس کے پیچھے پیچھے بدھو تھا جیسے کوئی پالتو کتا ہو۔

"وجاہ" مذاکحش نے سر پھیل کو تاؤ دیتے ہوئے کہا: "یہ دیکھ لو آپ کو، آپ بدھو ہیں خالص بدھو۔"

"جی ہاں جی ہاں۔ بدھو کی لمبوتری پھوٹ کھلی۔"

"اب آیا یقین: مذاکحش نے خلیبانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

جی ہاں جی ہاں۔ بدھو کا منہ کھلا اور اس میں سے تنقو کے لمبوترے پھینٹے دور دور تک اڑے۔

اس کے بعد بدھو جب بھی کام کاج سے فارغ ہوتا تو چپکے سے کوٹھے پر جا بیٹھا۔ بلکہ چھوٹے موٹے کام بھی وہ وہیں پر

بیٹھ کر کیا کرتا۔ اس پر بھی اسے ڈانٹتے۔

"ارے بدھو! اسلم چیختا: تو صباگ کر کوٹھے پر کیوں چڑھ جاتا ہے؟"

جی ماں بالو جی : اس کی باجھیں یوں کھل جاتیں جیسے اس کی تعریف کی گئی ہو۔

”ابے بدھو : خدا بخش ہنستا، کوٹھے پر کیا دھرا۔ ہے ؟ دھرا ہے کچھ ؟“

”جی ماں بالو جی : کچھ بھی نہیں دھرا جی ماں بالو جی :“

بدھو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چاہے اس کی تعریف کرو۔ چاہے اس پر : عجب جمانے کی کوشش کر دیا ہے ہاتھ اٹھانے کی ہر صورت میں اس کی باجھیں کھل جاتیں۔ سنہ روزن کی طرح یہاں سے وہاں تک کھل جاتا۔ محو ک کے قطرے ہوا میں اڑتے اور وہ خوش ہو کر مپٹتا۔ جی ماں بالو جی ماں جی بالو جی ۔

اگر بدھو کو کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھنے کی عادت نہ ہوتی تو یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا۔ کیوں کہ اس صورت میں ہمیں کوٹھے کے جملہ اسرار کا علم ہی نہ ہوتا۔

بدھو کی دھوپ کھانے کی عادت کو چھوڑ بیٹے۔ اگر وہ بڑھیا عمارت کے طور پر بڑی گڑھیا کی طرح نہ چنچتی تو ہماری توجہ پڑوس کے مکان کی طرف مبذول نہ ہوتی۔

”اے ہے لڑکی سر پر ویڑے“ لڑکی گڑیا چنچتی اور ہمارے کان کمرے ہو جاتے اور ہمیں شدت سے احساس ہوتا کہ کہیں پاس ہی ایک لڑکی موجود ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس کے سر سے ریشمی آنکلی پھسل پھسل جاتا ہے۔

”اے ہے مینا نہ سنبھل کے بیٹھ تجھے اپنا برش بھی ہے : اور ہمیں احساس ہوتا کہ لڑکی عمر کے اس صحت سے گزردہ ہی ہے جہاں اپنا برش بھی نہیں ہوتا اور جہاں سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ لڑکی گڑیا چنچتی اور جمیل خواہ مخواہ شرمائے جاتا اور اسلم کے دل میں مس رنگی کی یاد، زہ جو جاتی اور وہ وہ دھون لگنے لگا تھا جس نے مس رنگی سے سکی تھی ”فاناک ان کر الین“ اور خدا بخش نہ بندھو کہ کہنتہ یا لڑکے گرم مصالحے ڈالنے لگا ہے۔ صد و کہا بوں میں گرمی ہو گئی ہے کچھ کچھ۔ اور میرے دل میں مینا بدوش کامل ابھرتا اور ٹکے دھلے دھلے رنگ دھاریاں باتے اور خطوط ڈھلکنے اور سیاہ آنکھیں دو تیں۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے کوٹھے کا راز جمیل پر کھلا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی ٹوٹا لے کر کوٹھے پر چلا جایا کرتا تھا۔ اور پھر وہاں تک نہ جانے وہاں کیا کرتا رہتا اور جب دایس آتا تو اس قدر چلے پاؤں زیبے سے اترتا کہ چاہے تک سناٹی نہ دیتی۔ زینہ اترتے ہوئے وہ آپ ہی آپ شرمانا اور مسکانا، اشرمائے جاتا اور سکا کے چلا جاتا۔

میں اس زمانے میں اس حقیقت سے واقف نہ تھا کہ جمینپ چھینپ کو بھی انتفاع رعیت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس یہ سمجھا کرتا تھا کہ چھینپنا اور نیچی نگاہوں سے مسکرانا انسانی خصوصیات ہیں اور عورتوں کے دل میں اٹا نفرت پیدا کرتی ہیں۔

ان دنوں مجھے زندگی کا تجربہ نہ تھا۔ اور میرا علم چند سستی کنابوں کے اوراق تک محدود تھا جیسے ہر کالج کے لڑکے کا ہوا کرتا ہے اس لیے میں نے جمیل کے شرمائے کو کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ عورت کی بات پر جمیل کا چھینپنا اس بات کا شاہد ہے کہ عورت سے قطعی طور پر دل چسپی نہیں۔

جمیل ایک اونچے لمبے غذا اور درمیانہ جسم کا لڑکا تھا۔ اس کی جلد کا رنگ سنہری تھا۔ اس کی آنکھیں شریقی تھیں جو چھینپنے کے علاوہ زیادہ

دستی تھیں۔۔۔ اس کے منہ پر ہاں سے ادا انداز میں پریشان رہتے تھے۔ اس کے ہاں ہر بات کا ایک ہی جواب تھا بلی دلی سکراہٹ اور جی جی جی کی نظر جیسے سادوں میں پھوٹا پڑ رہی ہو۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ غارت نے اس کے کلم کے بیشتر حصے کو اس کی نظر اور سکراہٹ میں مرکوز کر دیا تھا۔ اور اس سکراہٹ اور جی جی جی کی نظر سے وہ دل کے بڑے بڑے پیچیدہ جذبات کا خدا کر کے کی قدرت دکھاتا تھا۔ ان دونوں مجھے جی جی کی نظر اور دلی سکراہٹ کے مختلف اہمیت و درجوں کا احساس نہیں تھا۔ اور نہ ہی میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ وہ کلم جو نگاہ اور ہر نفس کی لطیف جذباتوں سے پیدا کرتا ہے۔ اپنا اپنا مفہوم دود و درنگ نشر کر سکتا ہے۔

جیل کے بعد کہ مجھے کے اسرار کا ماز آسم پر کھلا۔ اس روز جب وہ نیچے آیا تو خیرات معمولی کسی ٹہرے خیالی میں کھویا ہوا تھا اور ان جہانے میں "فانک" ان لوگوں میں لگتا تھا۔ لیکن اس کے گیت کی دھن برسرِ بدلی ہوئی تھی۔ بول تو انگریزی تھے۔ لیکن دھن میں لوک گیت کا رنگ نمایاں تھا۔ سب سے پہلے خدا بخش نے اس بدلی ہوئی دھن کو محسوس کیا۔ حالانکہ خدا بخش کو علمِ ادب اور راگ رنگ کی باریکیوں کا احساں نہ تھا۔ وہ بھی کبھی کبھار وہ دھن کا انداز میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا کہ میں سمجھنے مڑا آجاتا۔ بولا: "یا داسلم آج مس رنگی کو میرا روپ دے دے ہے تو تم۔" تیریت تو ہے۔

اسلم نے ایک لمبی آہ بھری اور بولا: "مغربی رقص میں مجھے ایک ہی چیز کھنتی ہے اور وہ ہے اس کی تشنگی۔ اگر ناگوں میں مغربی رقص ہو اور رنگا ہوں میں مشرقی چھکاؤ تو مڑا آجائے۔"

"ہی ہی ہی خدا بخش ہنسنا: تو بھی مس رنگی کے جسم کا اوپر کا حصہ تو مناسب بنا کیوں بدھو؟

"جی ہاں بابو جی؟ بدھو کی باچھیں کھلیں۔"

جیل کے منہ پر رنگ پڑا دو جیسے تیز نے لگے اور آنکھوں میں بوند باندی ہونے لگی۔

اسی شام اسلم حرقہ چغٹائی کی دھن کو دانی کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا: "یار کا لے چکی جھلی آنکھ بھی کیا چیز ہے؟

لیکن مس رنگی کی تو کٹورہ سی کھلی رہتی ہیں خدا بخش ہنسنا۔

"ارے یار اس کا مزہ اور ہی کچھ ہے" اسلم نے ایک آہ بھری۔

"جی ہاں جی ہاں بابو جی" بدھو نے سمجھا کہ اسے مخاطب کیا جا رہا ہے۔

"نیم وا" جیل سکرایا اور پھر آنکھیں جھکالیں۔

"نیم دا جو یا کٹورہ سی" خدا بخش نے تہ بند جھڑپے ہوئے کہا: سب ایک ہیں وقت تمہنے پر کٹ ماسی نیم دا ہو جاتی ہیں۔ اور نیم دا کٹورہ سی کھل جاتی ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے۔"

"جی ہاں بابو جی، بدھو کے پچھے ہوئے مزے چھینٹے آڑے اور دو خالی کٹورے یہیں گھورنے لگے۔

سب سے آخر میں ان نیم وا آنکھوں کی بات خدا بخش تک پہنچی۔ اور اس روز وہ دبا دبا ہوا دوان منظرِ عام پر آگیا۔ خدا بخش نے کس بے دردی سے ان ڈولتی کشتیوں کا بھانڈا صحن میں پھونک دیا۔

"ارے یار وہ کوٹھے سے ہی چلایا۔ کالے، اسلم، جیل، یہی یہاں تو مس رنگی کا پاکستانی ایڈیشن کھلا پڑا ہے، بھاگ کے

آغا بھگت کے :

اور ہم سب یوں کر تھے کہ بھاگے جیسے ہیں اس پاکستانی ایڈیشن کے متعلق کوئی علم ہی نہ ہو۔ سب سے آگے اسلم تھا۔ اس کے پیچھے میں اور سب سے پیچھے جیل ایک عجیب انداز سے سکراتا ہوا آ رہا تھا

اس روز کے بعد کوشش کے اسرار کی حقیقت ایک کھلے راز بن گئی۔ اور سب نے مل کر کوشش پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب لوگ کوشش کے اسرار سے کما حقہ واقف ہو چکے تھے۔ اگرچہ ہر کوئی اس راز کو یوں پسینے سے لگائے بیٹھا تھا جیسے وہ اس کا اپنا راز ہو۔ ہر کوئی اس راز کو اپنے آپ کی دھن میں شدت سے مصروف تھا۔ کاش یہ بات مجھے ان دنوں معلوم ہوتی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے یوں کر دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ اس وقت اتفاق سے میں کالج سے جلدی آ گیا۔ گھر پہنچا تو بھوکے سوا دماغ کی نہ تھا۔ بلکہ صوفیوں نے مجھے کہا تھا کہ آج تو آپ سب سے پہلے آگئے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اتفاق سے میں بیڑیوں میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیڑیوں کے بالائی حصے میں کھڑا مسکولے جا رہا ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ میان جیل و بیرون سے گھر کے مسکولے کیوں جاتے ہیں مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے غصہ کا اور پھر محمول کے خلاف اونچی آواز میں کہنے لگا: آؤ۔ آؤ۔ آؤ۔ کیوں گئے؟ اُدھر جا کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن وہاں بیڑیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور وہ اسی طرح کھڑا مسکولے جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور اس نے مسکراتا پھوٹ کر لہنا شروع کر دیا اور پھر جلد ہی ٹوٹا اٹھا کر پیچھے آ کر آیا۔

کچھ دیر تک میں بے معرفت ٹھٹھا رہا۔ اب وہ دیرین مروت ایک منزل مکان تھا۔ اس کے ایک طرف گلی تھی۔ دو جانب تین منزلہ مکانات کی اونچی لمبی دیواریں کھڑی تھیں۔ اور ایک طرف پرانی ساخت کی تھمک چندی اینٹوں کی ایک منزلہ دیوار تھی۔ جس میں ایک بند کھڑکی تھی جس کے اندر درجالی دار اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن پرلی جانب سے جالیوں کے سوراخ پستری سے بند کیے ہوئے تھے۔

جب میں اکتے کر پیچھے اترنے لگا تو دفعتاً ایک حرکت سی ہوئی اور جالی کے سوراخ شیخ کے ستاروں کی طرح روشن ہو گئے۔ جیسے کسی نے ان کی پشت کا پستری توڑ کر صاف کر دیا ہو۔ میں رگ گیا اور غور سے ان سوراخوں کی طرف دیکھنے لگا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ان سوراخوں میں دھندلے رنگ دار رجتے سے دکھائی دینے لگے۔

دو سوراخوں میں سرزد ہوتے چمکنے لگے۔ ایک سیاہ دھبہ واضح ہونے لگا اور دو تین سنہری دھبے جھلکائے۔ سنہری دھبوں میں جنبش سی ہوئی۔ ایک دھندلی سی مسکراہٹ اور گھنی سرگاہ کا ایک چمکڑے لگا۔

دفعتاً بڑکی گڑیا بھاری آواز میں جھین جھین کرنے لگی۔

”اے ہے رومی تو پھر وہاں کھڑکی کھول کر بیٹھ گئی، ہزار بار کہا ہے کہ برف کتب سے کہ نہ بیٹھ جایا کر“

”اوی اللہ! کہیں بیٹھنے بھی دیں گی آپ“ ایک رنگین آواز گونجی۔

”اے وہ اوی اللہ! سارے جہاں کا حسن، رنگین، اکتاہٹ، فراغت اور زندگی سمٹ کر اس اوی اللہ میں سا گئی تھی۔

میرادل بیٹھ گیا۔

کھٹ سے کوئی دروازہ بند ہوا اور جالی کے سوراخوں پر پھر سے غفلت چھا گئی۔ جیسے اندر سے کسی نے پستری کے انہیں

بند کر دیا ہو۔

میں مہرست کھڑا تھا۔ دونوں ایک جہاں نگاہ کام کوئی حق چھپتا، اندریوں اور دیوانوں کا ایک اجڑا ہوا انبار لگا تھا۔ میں  
سندر کا ایک سبز اکس شام کی ٹھانی روشنی میں چمک رہا تھا۔ جس پر چند ایکس جلیں سی خاموشی سے اڑ رہی تھیں۔ اس ہی ایک سبز سبید جادو اور  
سندے میں گری ہوئی تھی۔ آسمان پر ٹھانی بدلیاں یوں چمک رہی تھیں جیسے اس آؤنی اللہ کی تمام تر نگینی انہوں نے جذب کر لی۔

پھر وہ مجھے آہستہ آہستہ پھر پرستہ ہوتے گئے۔ میرے ارداک، میرے خیالات، میرے جذبات پر عادی ہوتے گئے۔ اب  
بڑھتے بڑھتے دفعتاً چھپے ہوئے حروف میں ایک جنبش ہوتی اور جرات میں کچھ سوراخ کھل جاتے اور پھر نگین، ایسا اور نہری مجھے ناپختے  
اور گھنے بالوں کا ایک چتر گزرتا اور چمک مارا یہ کشتی سی ڈوبتی۔ حتیٰ کہ میں کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اور ان جگہوں میں کھٹے پر جا چڑھتا  
اور میرے حیل کے ٹپاے اندر میرے میں کھڑا اشتغال کرتا کہ کب سوراخوں کا پلستر کھڑے اور وہ مجھے غمزدادہ ہوں اور اس سبز سبید سندر میں  
ناقص ہے۔ آؤنی اللہ میں کدھر جاؤں اور اس آؤنی اللہ کی نگینی بادلوں میں منکس ہو۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ گرین لوج میں میرے علاوہ اور بھی ایسے تھے جن کی کتابوں میں سوراخ کھل جاتے تھے۔ اور نگاہوں  
نے نگین دیکھتے تھے۔ لیکن ان دنوں زمانے کیوں اس بات سے قطعی واقف نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان وجوہ کی حقیقت بھی تک  
حد وہ ہے۔ وہ نگین امریکہ صحرانہ ہی دیانت ہے۔

مجھے اس بات کا اندازہ بھی کیسے ہوتا جب کبھی چھٹی کے دن ہم سب کھٹے پر دھوپ میں بیٹھے ہوتے تو ہم میں سے  
کئی بھی ان جالیوں سے دلچسپی کا اظہار نہ کرتا تھا۔ کوئی نگاہ بھر کر ادھر دیکھتا بھی نہ تھا۔ میں تو خیر اس بات کو خیرہ ماذیں کھنے کے لیے  
ادھر نہ دیکھنے پر مجبور تھا۔ میری بات چھوڑ دیتے۔

اسلم عام طور پر اپنے محبوب، سال لائف کی ورق گردانی کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی ناگ ان لگین لگانے لگتا اور لگاتار  
ذات سرسری طور پر ادھر دیکھ بھی لیتا۔ لیکن یہ تو معمولی بات تھی۔ جیسے تو ہمیشہ ادھر بیٹھ کر کے بیٹھتا تھا۔ اگرچہ وہ کھسٹ کر اپنی گڑھی امتیاز  
سے اس مقام پر کر لیا کرتا تھا۔ جہاں سے وہ جالیوں میں سے بجز بی نظیر اسکے یہ بات قابلِ ذکر نہ تھی کیوں کہ دلچسپی تو دیکھنے سے ظاہر ہوتی  
ہے اپنا آپ دکھانے سے نہیں اور خدا بخش تو زیادہ تر اوپر بیٹھتا ہی نہ تھا۔ چند ایک منٹوں کے لیے کھٹے پر ادھر سے ادھر اور ادھر  
سے ادھر گھومنا شروع کر دیتا۔ نہ بند تھا تو۔ بدن کھاتا اور آپ ہی آپ لگتا۔ بہت ہی مصالحتی ڈالنے شروع کر دیتے ہیں مہرست  
گرمی ہوئی ہے کچھ کچھ۔

البتہ جب کبھی اس سندر میں آؤنی اللہ کا ناقوس بجاتا تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے اسلم کے اہم سے بچہ چھوٹ جاتا  
تیسرا کا رنگ نہ جانے کیوں زرد پڑ جاتا۔ آنکھوں میں بونڈا ہانڈی ہونے لگتی۔ گردہ چمپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اور خدا بخش گرمی سے بے حال ہو کر  
نہ بند تھا تو اور صدو کا بیسے کو گالیاں دیتا۔ پھر دفعتاً وہ ہمیں ہمیں کرنے والی دڑ کی گڑیا پھینکتی اور دھوپ سے دروازہ بند کرنے کی آواز  
اتی اور ان جالیوں پر غمت چھا جاتی۔ اور پھر۔۔۔ پھر مجھے لوگوں کی طرف دیکھتے کہ ہوش نہ رہتا اور میری نگاہ میں ملاؤں، اندریوں  
اور دیوانوں کا وہ انبار کاغذ اور سند کا کس جھلکا، جلیں سندر تیں اور بادل رنگ جھلکاتے۔ اور دڑ کی گڑیا چھینے چلی جاتی۔

ان حالات میں کیسے شک کر سکتا تھا کہ ان نگین سندر کے جہوں کا راز ان پر آشکار ہے اور اگر آشکار بھی تھا تو وہ اس میں  
پڑی پڑی تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے، میں اس راز کے خفہ کے خیال سے ان جالیوں میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہ کیا کرتا تھا لیکن پھر

دل مٹک دھاک بھنا دیتا اور میری کیفیت ایسی ہوتی جیسے کوئی سہمہ تن گوش ہو۔ پھر عجب بھی موقع ملتا میں دسے پاؤں کو تھکے پر چڑھ جاتا اور سیر حیدروں کے اختتام پر سائے میں کھڑا ہو کر سگریٹ سلاگتا۔

سائے میں کھڑے ہونے سے میرا مقصد اپنے آپ کو اس نقشب چغتائی سے نہیں، بلکہ اس شخصیت ہونی بڑھیا سے چھپانا ہوتا تھا۔ جو میل کی طرح اس منہرے کس پر چھائی رہتی تھی۔ اس کی حفاظت کے لیے چوکس رہتی تھی۔ دو ایک بار میں نے دعوپ میں کھڑے ہونے کی جرات بھی لی، مگر اس کے فوراً بعد ہی دعوپ سے عقبی دروازہ بند ہو جاتا۔ اور جالی کی دھانچیں بے نور ہو کر رہ جاتیں۔ ظاہر ہے کہ مینا یہ پسند نہ کرتی تھی کہ میں روشنی میں کھڑا ہو کر اس منہرے منہ کے سینس واؤں، اس لیے میں سیر حیدروں کے اندھیرے ہی میں کھڑا رہتا اور اسے اپنی دھندلی موجودگی کا احساس دینے کے لیے سگریٹ سلاگتا اور سگریٹ سگلتے ہی جالیاں روشن ہو جاتیں اور وہ تھکاپنا منظر خاص پر آ جاتا۔ اور پھر میں اس تعویذ کے ٹوکے ہوئے ٹوکے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا۔ اب تو وہ ٹوکے بے حد روشن اور رنگیں ہو چکے تھے یا میری نظر مشائی ہو چکی تھی۔ ہر حال میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی روز دیوار کی وہ بند کھڑکی کھلے اور مینا چند ساعت کے لیے وہاں آکھڑی ہو۔ وہ کھنی مرغان جھکیں، اور آنکھوں کے سیاہ کونوں میں چمک لہرائے، بازو ہوں۔ لمبی لمبی انگلیاں ایک شان بے نیازی سے کاشنا پر چھائی ہوں۔ اور وہ پرائیوٹ کی ٹھوسٹی بل کھاتی میجرس کا نہانت کو اپنے آغوش میں لے لیں۔

ایر ڈیرین والوں کو تعظیم ملے، پر معلوم نہ تھا کہ میں کسی حسین مادے سے واقف ہوں یا ان گھومتی فوسے بیکروں کی پیٹ میں آگیا ہوں بلکہ وہ تو کہا کرتے تھے: کالے! تیرا کوئی چانس نہیں۔ میان پنجاب کی رٹکی افریقی رنگ اور نقدش پسند نہیں کرتی اور وہ ہنستے۔

وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ رٹکیاں سانولے رنگ کو پسند نہیں کرتیں۔ بہر تو فوں کو معلوم نہ تھا کہ رنگوں کا تضاد سب سے زیادہ کشش کا باعث ہوتا ہے۔ کشش کھیا کی ہی مثال لیجئے۔ ان کا رنگ سانولا پیش کیا جاتا ہے اور پھر گویا بار بار انہیں سانولے کھیا کیوں کہتی تھیں۔ لیکن میرے ساختی ان باتوں کو کیا جانتے تھے یہ سچا ہے۔ کشش مہاراج کی بات چھوڑیے میں نے اپنے کئی ایک دوستوں سے اس بارے میں تحقیق کی تھی۔ مثلاً رفعت حسین کو ہی لے لیجئے۔ کتنا گرا چٹا رنگ ہے اس کا، سارے کا سارا خاندان ہی کوئی نیس پاؤڑ سے لت پت ہو رہا ہے لیکن جب اس کے آبانے ایک بڑی چچی حیدر سے اس کا رشتہ کرنے کی کوشش کی تو وہ میرے پاس آکر رو دیا۔ یا رتیاہ ہو گیا میں، سفید چمک، رنگ ہے اس کا۔ اتنا چمک اور سرخ منہ جیسے چاند ہو۔ اور بالآخر اس نے ایک کالی کوئی چھوڑی سے محبت لگا لی تھی جو عشق کے درجے تک جا پہنچی تھی۔

لیکن ایر ڈیرین کے ساتھیوں کی یہ غلط فہمی میرے حق میں بڑی مفید تھی۔ لہذا میں نے اس موضوع پر ان سے کبھی بحث نہ کی تھی، بحث کرنا تو ایک دھمکتا ہے تھی کہ ان کے پاس بیٹھنا بھی میرے لیے دوسرا ہوتا جا رہا تھا۔ جی چاہتا کہ تنہا کی میسر ہو۔ اور میں سگریٹ سلاگ کر سیر حیدروں میں کھڑا ہوجاؤں۔ اب تو مینا میری موجودگی محسوس کر کے بار بار سلاگاتی اور ہانے بھانے ایسی باتیں کر جاتی کہ میں دل محسوس کے رہ جاتا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن پنیا سے کھیتی، باتیں کرتی اسے چھپرتی اور ذرا خاموش نہ ہوتی جب تک کہ وہ آفت کی پرکار بڑھیا خفا سے غارت کرے۔ جیسے جیسے شروع نہ کر دیتی اور وہ بیٹھیا، تو رہے جب بات کرنے پر آ جاتی تو گویا گھر میں زلزلہ آ جاتا۔ جیسے بڑا ہڑا پڑ پڑ زلزلہ میں گر رہا ہو۔ اسے لڑکے کسی کا خیال نہیں لگتی کا لٹاؤ نہیں۔ اس پر مینا سلاگ کر دم آواز میں کہتی، اونی اللہ اتنا خیال تو ہے، مردم نکا دیتا ہے۔ اور پھر میری طرف معنی خیز انداز سے دیکھتی اور وہ بڑھیا اور بھی لڑتی تو بہ کتنی باتیں بنائی آگئی ہیں۔ اور پھر منہ کا



کاش سنے، انداز سے چمکتا اور وہ چیل اس کے ارد گرد چکر لگاتی اور میرا دل قیوں اچھلتا، اچھلے جاتا۔  
 پھر وہ واقعہ جس نے ہمدردی محبت کو ہیٹھ کے نیلے استوار کر دیا اور اس کی تابانی کو دوا م بخش دیا۔  
 ایک روز جب ہم سب کو کھٹے پر بیٹھے تھے تو ہوا زوروں پر تھی اور چالیس کے سواغ منور تھے تو نہ جانے کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑتا  
 ہوا آیا۔ اور میں نے تھوڑا سا اسے دلوں لیا۔ وہ دسائے کا ایک ورق تھا۔ میں نے بغیر کسی مقصد کے اس کاغذ کو اس بند کھڑکی کے نیچے دیوار  
 کے آئینہ پر جو کھٹے پر لکھ کر اس پر ایک اینٹ لکھی۔ ایسا کرنے سے میرا کوئی خاص مقصد نہ تھا اور نہ ہی مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ  
 یہ میری سی تفصیل ہمارے زمان میں اتنی بڑی حیثیت اختیار کرے گی۔

اگلے روز جب میں کھٹے پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کاغذ اپنی جگہ سے غائب ہے۔ خبر میں نے اس بات کو قطعی اہمیت  
 نہ دی بلکہ جب میں نے میز میوں کے اختتام پر کھڑے ہو کر حسب معمول سگریٹ جلیا اندر دے جایا۔ بقعہ لڑ مونی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرا  
 وہ کاغذ کھائے ہوئے بیٹھی تھی اور کاغذ کی طرف اشارے کے منور اسی تھی۔

پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ وہ بند کھڑکی کھل سکتی ہے، کھلتی ہے اور میں نے اسے کھول کر وہ کاغذ اٹھا ہا ہے اور —  
 کاغذ اسی مرتبہ سے مینا کے پاس پہنچائے جاسکتے ہیں۔ یہ سوچنے ہی میں پیچھے آگیا اور اندر سے کمرہ بند کر کے مینا کو خط لکھنے میں مشغول ہو گیا  
 یہ خیال تھا کہ میں چند ایک سطریں لکھ کر خط ختم کر دوں گا۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا مجھے نہ جانے کہاں سے جذبات اڑنے چلے آئے کہ اندر میں درق  
 پر وہی یہ کرا چلا گیا۔ خط ختم کرنے کے بعد مجھے اپنے جذبات کی شدت کا احساس ہوا۔ ایک تھوڑی کھیل ایک دل لگی میرے لیے کس قدر اہمیت  
 رکھتی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ میں اپنے جذبات کی حقیقت اور شدت سے واقف ہوا۔

میز میوں کے سامنے میں کمرے ہو کر سگریٹ کے سلگنے انگارے کی روشنی میں مینا کو وہ خط دکھایا اور پھر شام کے چھپنے میں  
 اسے اسی اینٹ کے نیچے چھپا دیا جو بند کھڑکی کے نیچے ہے۔ اگلے روز صبح سویرے میں کھٹے پر چڑھا۔ اینٹ اٹھانی خط  
 منتخب تھا میرے دل میں انبساط کی ہر سی دھڑکی تھی۔

میرے لیے وہ دن گزارنا مشکل ہو گیا، وہ رہ کر خیال آتا، کیا مینا جواب دے گی۔ اگر اس نے جواب نہ دیا تو، اگر وہ ناراض ہو  
 گئی تو، اگر اس نے قطعی دروازہ کھولا بند کر دیا تو۔ سارا دن مجھے اسی قسم کے خیال رناتے رہے۔ رات بھر غمگینہ آئی اور میں نے کمر میں بدل بدل کر  
 آتے آتی اور پھر صبح سویرے ہی میں کمرے کو اوپر بھاگا۔ اینٹ کے نیچے کاغذ کا ایک ٹکڑا دیکھ کر میرے اٹھ ہا اٹھ بھول گئے۔  
 کمرے میں واپس پہنچ کر دروازہ بند کر کے میں نے وہ کاغذ کھولا۔ کاغذ پر صرف ایک لائن لکھی ہوئی تھی: اُدنی اللہ اگر یہ کسی اور  
 کے کاغذ پڑ جاتا تو؟

اس کے بعد اس کے خط آہستہ آہستہ طویل ہوتے گئے اور ایک جھینے کی خط و کتابت کے بعد تو وہ دیرے دیرے الفاظ میں  
 ہر نسبت بھی کرنے لگی۔ لیکن ہمارے خطوں میں نہ تو عنوان ہوتا تھا اور نہ ہم ایک دوسرے کا نام لکھا کرتے تاکہ اگر وہ کسی کے کاغذ پڑ جائے تو بھی اسے  
 معلوم نہ ہو کہ وہ خط ہے۔

ہم باری باری خط لکھتے تھے۔ ایک۔ دو۔ وہ لکھ کر اینٹ کے نیچے رکھ دیتی اور اگلے روز میں اس کا جواب لکھ کر وہیں چھپا دیتا  
 جسے وہ رات کے وقت کھڑکی کھول کر اٹھا لیتی تھی۔ کیسے پیارے دن تھے، ان رنگدار دھبوں نے اس جھکی جھکی آنکھ نے اس نغمہ دین کوئی اللہ کے

اور ان اشعارات بھرے خطوط نے زندگی کے سادہ ورق کو سنہری بنا دیا تھا۔ یہ کیفیت مروت مینا کے خطوط کا نتیجہ نہ تھی۔ بھرے اپنے جذبات بھرے لیے ان کے انوکھے اور نپکینت معلوم ہوتے۔ حسب میں اسے خط لکھتا تو میرے دل سے نئے نئے انوکھے غلوں بھرے جذبات ابھرتے اور میں ان کی جمیدگی اور غلوں پر حیران ہوتا، ایسے جذبات جن کے جوڑ کا مجھے خود علم نہ تھا جو نہ جاننے دل کی کن گہرائیوں سے ابھرتے تھے ان ہی جذبات کی وجہ سے باز نہ جانے کیوں اس دور کے تعلقی سے جو محض وقت کٹی اور تفریح کے لیے پیدا ہو گیا تھا۔ ایک بے نام سنجیدگی اور پاکیزگی پیدا ہوئی۔ نہ جانے کیا وجہ تھی۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ایردگین کے تمام زرافراذہ عیدہ سوچے تھے۔ جمیل نے تو کامیابی چپ سادہ کھن تھی۔ اگرچہ وہ طبعی طور پر خاموش رکھا تھا اور اس کا بڑے سے بڑا اظہار بھی ایک خاموش سکواٹ تھا۔ یا ایک گرم سرگوشی کے محدود ہوتا تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں بوند پاندی سی ہونے لگتی تھی۔ لیکن اب تو وہ بالکل ہی خاموش ہو چکا تھا۔

وہ صبح سویرے بیدار ہوتا اور ہمارے جاگنے سے پہلے ہی تمام مزدوریات سے فارغ ہو کر بیٹھ جاتا۔ کالج سے واپسی کے بعد وہ چپ چاپ میز پر بیٹھ کر مطالعے میں مصروف رہتا۔ اکھٹے کرکٹ کھیلنے کی نئی مصروفیات پیدا کر لیں اور نہ ہارہ تو وقت اسی میں بہ کرتا تھا۔ خدا بخش معمول یا تو صدور کی دوکان پر چلا جاتا اور یا بدھو سے تباہی کرنے میں مشغول رہتا اور ادنیٰ اندلی آواز سن نہ ہر تھا۔ نہ ہار کتا اور کتا میاں بدھو کچھ شاخا بے اور بدھو کی چھوٹ چھوٹ سے کھل جاتی اور چھینٹوں کا ذراہ چلتا۔ جی ہاں جی ہاں جی ہاں جی ہاں جی ہاں خدا بخش کھجائے ہرے جواب دیتا۔ یہ تو پیر گھنے کا بھجڑا ہے اور ہم بھڑے آم چوسنے والے اور بدھو بے سوچے سمجھے ہنستا اور بڑکی گڑیا چھتی اور میری نگاہوں میں سنہرے کلس پہ چلیں منڈ لائیں۔

پھر وہ منحوس وان طلوع ہوتا۔

اس روز جب میں کالج سے واپس آ رہا تھا تو گلی میں مینا کے مکان کے صدر دروازے پر وہ بڑھیا بڑھتے پہننے کھڑی تھی۔ وہی تھی۔ وہی ذرا خیال رکھنا پڑا کہ باہر نہ جانے دینا میں شام تک روٹ آؤں گی۔ بڑھیا کو باہر جیسے دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ مطلع صاف ہے اور بھاگ کر بیدھا کرٹھے پر جا چڑھا اور بیڑھیل کے دھڑکنے میں کھڑا ہونے کے بجائے باہر دوپ میں جا کھڑا ہوا جانی کے سوراخ روشن تھے اور مینا حسب معمول کرسی پر بیٹھی پینا سے کھیل رہی تھی۔ اس کے بال تلخ تھے۔ حسب معمول گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی اور نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا اور میں پہلی مرتبہ دیوی کرسیس کو آنے کے لیے جھک گیا۔

کھٹ باغی مدد خانہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اور میں چڑھا۔ جالیوں پر غفلت طاری تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو میں حیران کھڑا رہا۔ چپ چاپ نیچے چلا آیا۔

پھر بیٹھے بھٹائے دفعتاً مجھے خیال آیا شاید بڑھیا کے علاوہ گھر میں کوئی بزرگ موجود ہو شاید کوئی دھان آیا مڑا ہو جس کے سامنے تشہیر گوانا ہو۔ اس خیال سے مجھے تسلی سی ہوئی۔ پلک کر کھٹے پر گیا۔ لیکن میرے سر پرٹ سگانے کے باوجود وہاں روشن نہ ہوئیں۔ اس روز میں کوئی ایک مرتبہ کوٹھے پر گیا لیکن بے سود۔

میرا جی چاہتا تھا کہ کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں سے اسے ایک خط لکھوں لیکن اس روز مینا کی ہادی تھی، اگلے روز مجھے اس کا

خط ملا تھا۔

دجائے اگلی صبح میں نے دینا کا خط ایسٹ ٹے سے نکال کر منشی میں کیوں دیا لیا۔ مجھے ایک معلوم سا ڈر محسوس ہوا تھا۔  
ایک شخص سی ٹی جو میری رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا، میں نے بند کر کے اس سے کہو، خیر از معمول مرث چند ایک خیر سے لکھے  
مرث سے لکھے۔

”آپ کا یہ کالا کھوٹا دوست کون ہے۔ خواہ مخواہ مجھے اشارہ  
کر رہا ہے۔ کل اس نے مجھے سلام میں کیا؟ اسے منع کر دیجئے؟“

میری نگاہوں نے دھندلکا چھا گیا اور دل قندب گیا۔  
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ کون کالا کھوٹا ہے۔ وہ سلام تو میں نے کیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔  
اس گشتی کو سلجھانے کے لیے میں باہر نکل گیا اور دیکھا کہ آدراہ پھر تارہا۔ حتیٰ کہ میں خود اس میں الجھ کر لکھ گیا۔  
آہستہ آہستہ میرے شکوک تقویت پکڑنے لگے۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ خود محبت کے  
ذرات سے دیکھتے ہوئے خطوط نہیں۔ انہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر وہ کالا کھوٹا۔ وہ خوش نصیب گورا کھن ہو سکتا ہے۔ کون ہو سکتا  
ہے۔ وہ۔ کون۔ مزوڑوہ کوٹھے پر جاتا ہوگا۔ مزوڑ۔

اس ماڈر جہان کے لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک دن چھپ کر کرکٹ پر بیٹھا رہوں۔ وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ تو تھا ہی  
جسٹائی پڑا تھا اور جہاں چھپ کر میں دنوں سے سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزار دی۔ پھر تین بجے کے قریب چلنے سے کھٹے پر چڑھ کر میں اس کمرے میں جا بیٹھا۔ اور شروع  
آؤں سب کا انتظار کرنے لگا، سات بجے کے قریب پینچے سے آوازیں سنائی دیں۔ کوئی جاگ چکا تھا۔ وہ میں پر کس ہو کر دوڑانے سے گاہ کہ پیش  
گیا۔ کونٹے پر دیرانی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس مقام سے قطعی طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ کہ آیا مینا کے کمرے کا قطعی دروازہ کھلا ہے اور جالی کے  
سورماخ روشن ہیں یا نہیں۔

پھر وہ بے پاؤں کسی کے سیریاں چڑھنے کی آواز آئی۔ سیریاں میں ایک دھندلی سی شکل دکھائی دی۔ کوئی اوپر آ رہا تھا۔ سیریاں  
کے باہر تھے میں رگ گیا۔ مین اسی جگہ جہاں میں کھڑا ہوا کرتا تھا۔

اس نے سگریٹ سلگایا۔ دیا سلوائی کی روشنی میں جیل کی دہی دہی مسکراہٹ واضح ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں وہی بوند باندی مہدی  
تھی۔ پھر وہ کھڑا ہو کر مسکرائے گا۔

انگاہ میری نظریاں اس کی طرف تھیں، ایک سوراخ سے ایک تہی نمی گلابی اٹلی باہر نکل ہوئی تھی ادویوں ہرادی تھی جیسے پاس  
ہو رہی ہو۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیوں گرد و پیش پر ایک دھندلکا سا چھا گیا۔ چادریوں طرف سے ایک منہ لے مجھے گھیر لیا۔ اور پھر بوند بوند بن کر دل میں  
وڑی ایک جھیل سیلتی گئی۔

تو میں ہی وہ کالا کھوٹا ہوں۔ یہ خیال آئے ہی کیلچے پر ساپ لٹ گیا۔ لیکن پھر وہ خط کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اور ابھی جاتا تو کیا  
ہوتا۔ اب زندگی ہی میں کوئی دل چسپی نہ رہی تھی۔ چادریوں طرف ایک دیراز پھیلا ہوا تھا جس میں نہ تو امید کی کرن تھی اور نہ آرزو کی حرکت۔

ان حالات میں لاہور دہانہ لاد تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چند دنوں کے لیے گھر چلا جاؤں۔ لیکن جانے سے پہلے جیل سے

تھم واقعہ بیان کر دے۔

جیل سے مختصر عرصہ پر تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد میں نے کہا: "جیل میں اتنا ہی ہے میری نہیں۔ مجھے اندس ہے کہ غلامی کی وجہ سے میں نے اسے تم سے چھیننے کی کوشش کی۔ یہ کہہ کر میں نے اس کے سامنے مینا کے تمام خطوط رکھ دیئے۔ جیل جیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بوڑھا باندی نے کوئی اور جی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جیسے بونڈیں بڑی ہو گئی ہوں۔ اور ان کا تواتر ٹوٹنا جا رہا ہے اور ان میں دکھ کی جھلک پیدا ہو گئی ہو۔ رفتہ رفتہ ایک بونڈ اس کے گال پر آگئی اور اس نے منہ موڑ لیا اور میں وہ خطوط دیکھ کر باہر چلا آیا اور سوٹ کیس اٹھا کر بس کے اڑنے کی طرف چل دیا۔

بس جا رہی تھی۔ دیرانے میں درخت سر جھکائے پیچھے سرکتے جا رہے تھے۔ زرد کھیتوں میں پودوں نے سر جھکا رکھے تھے خوشن کی ٹری ہوئی انھیں اٹا سے کہہ ہی نہیں۔ جاؤ، چلے جاؤ۔ دوڑ۔ اور گئے آسمان پر ایک اداس دھند لگا چھایا ہوا تھا۔ گاؤں میں درختوں کی چھاؤں میں چادپائی پر پڑے پڑے میری نگاہ پتوں کی طرف منعطف ہو جاتی۔ سبز پتوں میں سوراخ سے روشن ہو جاتے، آؤ، آؤ، کوئی پرانے چلتا۔ اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اور اندر گھر میں جا کر ننھے سے کھیلنے کی کوشش کرنے لگتا۔ رفتہ رفتہ باہر دادی آتاں چلائی۔ اے بے درگیز۔ ابھی ہنڈیا نہیں چڑھائی تم نے۔ اور مجھے محسوس ہوتا کہ بڑی گڑباز بیچ رہی ہے۔ پھر نگاہوں کے سامنے زمین دھبے ناچنے لگتے اور میں گھبرا کر باہر نکل آتا۔

ابھی گاؤں آئے جاؤں ہونے تھے کہ ایک تار معمول ہوا۔ کھول کر دیکھا تو جیل کا تار تھا۔ لکھا تھا: "ڈراؤ ضروری ہے"۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر جیل کو مجھے بلانے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ وہ جالیوں والا واقعہ تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں کتاب بات کرنا بھی بے کار تھا۔ وہ بات تو ہماری نہ سکتی تھی۔ نہ جانے پھر کیا وجہ تھی۔ بہر حال میں نے سوچا جانا ضرور چاہیے۔ ورنہ جیل کیا کہے گا۔ اور جیل کا قصور بھی تو کوئی نہیں۔ اگر مینا جیل سے محبت کرتی ہے تو اس میں جیل کا کیا قصور۔ جب میں ایرو۔ کرین پہنچا۔ تو گھر میں بدھو کے سوا کوئی نہ تھا۔ بدھو نے میری طرف دیکھا اور وہ پھوٹ کھلی "ہی ہی ہی بالو جی آ گئے۔" میں نے پوچھا: "بدھو گھر میں کوئی نہیں؟"

"جی ہاں جی کوئی بھی نہیں۔" وہ بولا۔

اتفاق سے میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ دوازے میں جیل گھرا سکا رہا تھا۔

"اے بدھو! جیل صاحب تیریہ ہے۔"

"جی ہاں۔" بدھو ہنسنے لگا۔ "جیل صاحب نہیں ہیں۔"

"کیونکر خیریت تو ہے؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جیل سے پوچھا۔

"ہاں" جیل نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ ساتھ ہی اس نے بدھو کو آواز دی: "بدھو جا کر مینا نگاہ آؤ۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"اتانے چلا ہے۔"

"کب آؤ گے؟"

”معلوم نہیں۔ جب وہاں اجازت ملے گی؟ اور کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھ رہے۔  
”آخر کیا بات ہے جس کے لیے مجھے بدیا ہے؟“

”بہت مزوری بات ہے، ابے عذر دے دو سکرے گا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں سادوں نہیں بھاریوں کا سا عالم تھا۔  
”تباؤ نا؟ پھر میں نے سبکداری سے پوچھا۔“

”ذرا تھوڑے دو بولا۔ پڑا اچھا کما تم آگئے۔ بہت اچھا کیا۔ مجھے معلوم تھا تم میری بات نہ ٹالو گے؟  
اس کی آواز عجیب سی سائی دے رہی تھی۔ جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو۔ اور اس کی مسکراہٹ میں عیوری کی واضح  
نکبت تھی۔“

”ٹانگا آگیا ہالو جی۔ بدسو چلتا یا

جیل نے سوٹ کیس اٹھایا۔

”لیکن وہ بات؟ میں نے بے تابانہ پوچھا۔“

”میرے ساتھ آؤ؟ اس نے چاروں طرف حیرت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اجازت۔“

”آگئے ہیں بیٹھ کر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ یہ تو اس میں سب کچھ مکر رہا ہے۔ اور پھر آخری بار مسکرانے کی شدید  
کوشش کی۔“

”مانگے کے روانہ ہونے کے بعد میں لاچ کی طرف بھاگا۔ اور ایک کمرے میں داخل ہوا اور اسے کڑی بند کر کے لپیٹتے ہوئے  
آنکھوں سے ہاتھ کھولا اور جیل کا وہ مختصر خط پڑھنے لگا۔“

”میں تباؤ رہی ہے، میری نہیں۔ اسے تباؤ ہے جذبات سے عشق ہے، عشق ضرورت

کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ میں نے تباؤ سے جانے کے بعد صرف ایک خط اسے

لکھا تھا۔ اس کا جواب مفوف ہے پڑھ لو۔“

میں نے جلدی سے مفوف خط نکالا۔ لکھا تھا۔

”آپ اس کا لے لو گے کہ منع کیوں نہیں کرتے۔ یہ دیکھو آج

اس نے مجھے خط لکھنے کی جسارت کی ہے۔ اس کی اتنی ہمت

ایسا خط لکھتے ہوئے اسے شرم نہیں آئی۔ جیسا اس کا رنگ ہے

ویسے ہی اس کے خیالات ہیں۔ آپ اسے منع کر دیجئے ورنہ۔“

میں نے پھر سے جیل کا خط پڑھنا شروع کیا۔

میں تباؤ رہی ہے۔ میری نہیں۔ میں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے ہمیشہ

کے لیے عین کے سب وہ خطوط جو تم مجھے دے گئے تھے مفوف

میں۔ خدا حافظ۔“

”میں میری جسم نے مجھے یقین نہ آتا تھا۔ وہ ایک کالے کوٹے کی کیسے ہو سکتی ہے انہیں، وہ میری نہیں۔ ان خیالات کے باوجود میں کرتھے پر چڑھتا گیا۔ اور میریوں کے بالائی حصے سے اندھیرے میں پہنچ کر رک کر جانیں کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسے ایسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ دروغ تھا۔ منہ مٹا ہوا، بال پریشان تھے اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے اور دیکھ رہی تھی جیسے کسی کے انظار میں تباہ حال ہو۔

نہ جانے شدتِ شوق سے یا آذمانے کے لیے میں میریوں کے اندھیرے سے نکل کر باہر صوب میں جا کھڑا ہوا۔ دفعہ شکر کے چہرے پر فحشے اور نفرت کے آئینہ بکلی کی طرح چمکے اور وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

یہ دیکھ کر میں پھر سے میریوں کے اندھیرے میں جا کھڑا ہوا۔ اور سوچنے لگا۔ وہ میری نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں۔ میرے ارد گرد چھتروں، دیواروں اور سکانوں کا وہی دیرانہ پھیلنے لگا۔ وہی لباس وہی مردنی، کتنا بد نصیب تھا میں! میں نے سنی کھیل میں اپنی زندگی تباہ کر لی تھی۔ لیکن اس دنیا میں آخر کون ہے جو تباہ نہیں ہوا۔

جھیل، میں اور اولد۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔ ایک نیا خیال۔ میرے ذہن میں تصویر کا ایک نیا رخ ابھرنے لگا۔ وہ یہ کہ ہم دونوں سے زیادہ تباہ حال مینا ہے۔ جسے ایک شخص کی شکل و صورت اور دوسرے کے جذبات سے محبت ہے اور جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دو الگ الگ اشخاص ہیں۔

میری نگاہ بال کی طرف منتقل ہو گئی۔ مینا پھر آ کر وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ عقبی دروازے کے پاس اسی طرح تباہ حال پائینا مشالیں جھکی ہوئی نکلیں، کھوئی ہوئی جیسے مینا خالی ہو چکی ہو۔ اسے ڈکی تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ دفعہ بڑی گویا بیٹھنے لگی: نہ جانے کیا کرتی رہتی ہے؟

”آؤ فی اللہ میں کیا کروں؟ مندر کا ناقوس یوں بجھا جیسے وہ ٹوٹ چکا ہو۔“

# یہ حادثے

## حجاب انتہا زعلی

حادثے کا نام سب کو میرا ذہن ہمیشہ انساں کی ناقصہ تباہی کی طرف متقل جو رہتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انساں کی تشنہ تباہی دنیا میں حادثات کی سرزدنا ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں اتفاقات کا قیصر سمجھتے ہیں مگر تجربات و مشاہدات نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ انساں حادثے کی تیاری خفیہ اور بالکل انجانہ طریقوں سے یہ سو کرتا رہتا ہے تب کہیں یہ کوئی تباہی ایک حادثہ رونما ہوتا ہے۔

اگر آپ کو میری رائے سے اختلاف ہے تو ذیل کا واقعہ سنئے:-

یہ گزشتہ خزاؤں کا ذکر ہے جب میں ایک اعصابی مرض سے نئی نئی صحت یاب ہوئی تھی اور ہنگاموں سے دور آرام و سکون کی خاطر چند دنوں کے لیے ہڈیوں سے ڈاکٹر لار کے پاس شہر نیل کے چھینکے سامعوں پر آئی ہوئی تھی۔

رات بھیا نک اور شدید طوفانی تھی۔ سمندر میں سخت تلاطم گیا تھا۔ موجیں اٹھ اڑ کر آسمان کا منہ چوم رہی تھیں اور درخت مارے خوف نے ہلکے جھک کر مار کیتی کے سینے سے چٹ گئے تھے۔

میں افسردہ اور کسمی ہوئی تھی۔ ایک اعصابی ٹیکہ پانی میں گھول کر پی لی تھی اور اپنے سیاسی بے کسو گود میں بے چارے چپ آتش دان کے بائیں بیچی ہوئی ہوائی کسکیوں کو مجبوراً سن رہی تھی۔

ڈاکٹر لار اپنی فسواری و مہیا پر ہلکے بجاتے ہوئے سبب محول مجھے جلانے کے لیے اپنی طبی تجربات سے معمول زندگی کے واقعات

بادی تھا۔

موسم کے سلسلے میں میری افسردگی دیکھ کر کہنے لگا ”پیٹی روتی، باہر کے طوفان کو بھول جاؤ۔ مینو ڈی ویو کی بات ہے، ابھی فہم ہلے گا۔“

تو اس جری دانت نکل آئے گی۔ ان تو میں کیا کہہ رہا تھا تم سے؟ مریضوں کے حالات۔۔۔ امیں مریض اور ان کے مرض میں عجیب ہونے ہیں۔ میرا ایک

مریض نے کہا کہ میں مبتلا تھا کہ جہاں میری استے کوئی خاتون نظر آتی اس کی ایک آنکھ خود بخود بند ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔

”نہیں۔۔۔۔۔؟ میں نے حیران ہو کر کہا ”اور دوسری آنکھ ڈاکٹر؟“

”وہ کھلی کی کھلی رہتی“

یہ سن کر میں زور سے ہنس پڑی۔

مگر کچھ محنت ڈاکٹر لار کا چہرہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ وہ خود سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر بولا ”یہ کیا قصاروحی؟“

میں اکتا کر بولی ”کچھ نہیں۔ سرشام ہی سے حواس میں قہیں قہیں کرنے لگی تھیں۔ انہیں کی آواز ہوگی۔ طوفانِ نوح کی آمد آمد ہے ڈاکٹر۔“  
”مگر یہ حواسوں کی آواز تو نہیں معلوم ہوتی“ اس نے پھر کچھ سننے کی کوشش کی۔  
”پھر کس کی آواز ہے؟“ میں تو حش ہو کر پوچھنے لگی۔

درستیکے دروازے بند تھے۔ باہر مسائل پر طوفانی ہوائیں خوفناک سیٹیاں بجا رہی تھیں اور پوری کائنات پر جہنم کی آواز کی جھانکی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر کا درستیکے کی طرف گیا۔ اس کے تیشوں میں سے جھانک کر باہر دیکھنے لگا پھر بولا ”کچھ نظر نہیں آتا۔“  
میں نے اپنے سیاسی بچے کو اپنے سے چٹا لیا اور سراپیمہ ہو کر بولی ”اُٹ۔ مجھے مانیخو لیا ہو جائے گا۔ عجیب رات ہے۔“  
سے گذرتی معلوم نہیں ہوتی۔ آج سرشام ہی آسمان گہرے کاسنی رنگ کا ہو گیا تھا اور میرا مانتھا مشکاب گیا تھا کہ آج کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے گا۔“  
”کس قسم کا؟“ وہ آگ کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

میں سوچ کر بولی ”کوئی منحوس سا واقعہ۔۔۔ مثلاً کوئی بہارِ سمندر میں ڈوب جائے گا۔۔۔ یا روشنی کا دینار ہواؤں میں گھوم گھوم کر یکھفت پاش پاش ہو جائے گا۔ دنیا میں جتنے بھی خوفناک اور ٹہرا سرا واقعات رونما ہوتے ہیں وہ برسات کی کالی طوفانی راتوں ہی میں ہوتے ہیں۔“

ڈاکٹر گاہنہس پڑا۔ ایک موٹا سا اطالوی سگدار ہونٹوں میں دبا کر بولا ”تم بڑی دہی ہو روجی۔“  
میں نے کہا ”ہزار ہماری تربیت سائنس، عقل اور منطق کی فضاؤں میں ہوئی ہے مگر انسان داخلی طور پر دہی ہے۔“  
آج سے صدیوں پہلے زمانہ جاہلیت میں تھا۔ وہ فطرتِ انسانی اور طلسم پرست و ہنیت کا ہونا ہے۔ اُٹ۔۔۔ یہ کیا ہے ڈاکٹر۔ انسانی پیچ؟“

”نہیں روجی۔ طوفانِ کاشور ہے۔ سنسان ساحلوں پر نڈاؤں کی ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔“  
”کاش ایسا ہی ہو؟“ میں منظر ہو کر بولی ”کچھ دیر ہوئی مجھے بجلی کی تیز چمک میں یوں معلوم ہوا کہ دُورِ پل پر کچھ لوگ دہشتِ ناز طرین پر تڑپتے چڑھتے اور چیختے چلاتے ہیں۔ نہ جانے دہاں کیا حادثہ پیش آیا ہے۔“  
ڈاکٹر کا کہنے لگا ”میں ممکن ہے کہ فطر کا دھوکا ہو، درجوں کے تیشوں پر ٹہنیوں کا عکس متعیش ہو۔ وحشی ہوائیں ہیراؤں کو اٹھانے لگی ہیں۔“

”بہاں ممکن ہے فطر کا دھوکا ہو، مگر۔۔۔ اُمس۔۔۔ درجہ ہجوم کا شور کیسا ہے۔۔۔ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ آج کی رات خیریت سے نہیں گزرے گی، یہ جیچ و پکار تو قریب ہو تی جا رہی ہے۔“

اور یکھفت کسی نے بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور ساتھ ہی ٹوکوں کے بولنے کر کہنے اور رونے کی مختلف آوازیں نے طوفانی رات کو اور بھی بھیا تک بنا دیا۔

ڈاکٹر کا دروازے کی طرف لپکا۔ دروازے کے کھلتے ہی پانی اور ہوا کے ایک زبردست تغیر نے مجھے پیچھے کی طرف دھکی



جو کچھ میں نے وہاں دیکھا اسے سامنے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ طوفانی راتوں میں خوشاک آفات نازل ہوا کرتی ہیں۔ چار آدمی ایک لاش کو چارپائی پر ڈالے، اندر کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان جو بغاوت پر جوش و خروش کھڑا تھا۔ پہلی پٹی آنکھوں سے اور دوسری دیکھتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ اس کے چہرے پر گہری خرابی اور کھینچ کر کسے دارغ تھے۔ ڈاکٹر گارن لوگوں سے کچھ دیواریات چریت کرنے کے بعد میری طرف آیا اور جلدی جلدی کہنے لگا ”مرد بڑا ایک حادثہ ہو گیا ہے راجی، مرد بڑا ہی پر سے وادی میں اٹھ گئی تھی۔ ہاں بہت سخت حادثہ ہے۔ یہ لوگ فوری امداد کے لیے میرے پاس آئے ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ چارپائی کی طرف گیا اور جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

ساتھی نوجوان نے بے ساختگی سے پوچھا ”زندہ ہے نا؟“  
ڈاکٹر گارن نے غصہ سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”فسادہ ہے میں بولا ”دوست ہیں آپ کے؟“  
”کیا ختم ہو گئے؟“ وہ پھر چلایا۔

”ابھی نہیں“ ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا ”ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔ میں اہل شہر کے ہسپتال میں لے جا رہا ہوں۔ شاید پچ جائیں۔“

”ڈاکٹر!۔“ نوجوان نے التجا کی ”آپ کو انہیں بچانا ہو گا۔ میرے بڑے بھائی ہیں۔ اگر یہ ختم ہو گئے تو میں خودکشی کروں گا۔“  
”جی ہاں۔“ اس نے بے پایاں محبت سے — ہائے میں نے اپنے بھائی کو مارا ہے۔ میں اس حادثے کا ذمہ دار ہوں۔ گاڑی میں چلا رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے کرتار باگ میں سے اس کی ایک نہ سنی۔ ایسی طوفانی رات میں اس کے بارہا منع کرنے کے باوجود میں گاڑی سے کوئی پل پر چڑھ گیا۔ بارش کی ریت سے زمین پر پڑ چکا ہوں ہی تھی۔ وہ دو گنا رہا۔ التجا میں کرتار باگ۔ ہاتھیں کر کے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی مگر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ گاڑی سے گر آئے۔ گھر بڑھتا ہی چلا گیا۔ دراصل میں اسے نصرت شب تک منزل پر پہنچا دینا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ اس لیے اس کا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ وہ میرے ہاتھوں اس حادثے کا شکار ہو جائے گا۔“

ادریہ کہتے کہتے وہ یکسوخت زمین پر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر گارن نے اس کی ٹائی کھول کر چیک دی۔ اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا ”وقت کم ہے۔ مجروح کو فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔ یہ آدمی جلدی جوش میں آجائے گا۔ اسے تو فوراً ہی دمچکا گا ہے۔ خوف کی وجہ سے بیہوش ہو گیا۔ میں مجروح کو لے کر ہسپتال لے جا رہا ہوں۔ اس کی زندگی کی امید کم ہے۔“  
یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر گارن نے جلدی سے اپنا بارانی کوٹ پہنا اور لوگوں کی مدد سے مجروح کو گاڑی میں ڈکوا کر رات کے اندھیرے اور طوفان کے مسلسل شور میں ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بیہوش ریف کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اپنے سیاہ رو سیاہی تلے کو ادنیٰ شمال میں لیٹ کر اور اس کے سر کے نیچے ٹیپ کس کر آئینہ ان کے پاس ایک غمگین نرم کرسی پر بٹھا دیا اور خود ڈاکٹر گارن کی ہدایات کے مطابق ٹریس کے سر پر لیٹ بیٹھا اس کے سر میں اسے آسنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ اسے دوا پلاؤں۔

کچھ دیر بعد مجھے نیند سی آنے لگی۔ میں ایک کشش کے سہارے نیم دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں مگر اجاناب کراہنے کی آواز سے بڑی توجہ سے اٹھ بیٹھی۔

”میں نے اس کی جان لی ہے۔ میں نے اسے مارا ہے۔ میں گناہگار ہوں۔“ میں  
وہ پوری طرح ہوش میں نہ آیا تھا۔ اس کی زبان سے عجیب عجیب نامکمل فقرے نکل رہے تھے۔ یوں معلوم ہوا تھا کہ اسے بیہوش دیکھ کر  
مدفون جذبات اپنی پرائی قبروں سے سر باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس کا چہرہ تلاش کی طرح زرد اور اس کا جسم برص کی طرح سرخ تھا۔  
میں نے اس پر جھک کر آہستہ سے کہا ”دوا پی لو“  
میری آواز سن کر وہ چٹکی چٹکی آنکھوں سے جھجھکیں لگا۔ پھر بولا ”مہرو؟“ اور ناراضگی کے انداز میں سر پھیر لیا۔  
میں نے ملائمت سے کہا ”دوا پی لو“

وہ یکدم چپٹ پڑا ”ہاں نہیں اب تک مجھ سے محبت ہے مہرو؟ مجھ گناہگار سے؟ مجھے تنہا چھوڑ دو اور اپنی جاؤ۔  
میں پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ کیا کروں، پھر بولی ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مہرو نہیں ہوں۔ دوا پی لو“  
”مہرو نہیں ہو تو اور کون ہو؟ میں تمہارے قابل نہیں پھر کیوں دوا چلا رہی ہو؟ دھوکا دیتی ہو مجھے؟“  
میں ذرا انصاف سے بولی ”مجھے کیا معلوم کہ مہرو کون ہے؟ میں تو تم کو بھی نہیں جانتی۔ تم کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو گئے  
اور یہاں لائے گئے تھے۔ مہرو کون ہے؟“

”میری بھانج ہے!“  
”اور تمہیں اس سے دلچسپی ہے؟“ میں نے دوا پلاتے ہوئے پوچھا۔  
”اسے بھی مجھ سے دلچسپی تھی“ اب اسے ہوش آ گیا تھا۔ بات کرتے کرتے ڈک گیا اور پوچھا ”اور میرا بھائی؟ وہ کہاں  
ہے؟ کیا مر گیا؟“

میں نے کہا ”اس کی بڑھ چکی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ فوری آپریشن کے لیے، ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ فکر نہ کرو وہ بچ جائے گا۔“  
اس نے گردن پھیری اور بھرائی ہوئی آوازیں بولا ”نہیں۔۔۔ وہ نہیں بچے گا۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔“  
”وہ ابھی زندہ ہے“ میں نے اسے تسلی دی۔

”مگر کارڈ پل پر سے الٹ گئی تھی اور وہ ایک کھڑ میں جا گیا تھا۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتا، اس کی آنکھیں بھرائیں۔  
”تم نہیں چاہتے کہ وہ زندہ رہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔  
”اگر وہ مر گیا تو میں بھی خودکشی کر لوں گا۔ مجھے اپنے بھائی سے محبت ہے۔ میں تمام عمر اس سے محبت کرتا رہا مگر قسمت کو  
یہی منظور تھا کہ وہ میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔“

”قسمت کو تو نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی منظور ہے کہ وہ موت کے گھاٹ اترے۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے مگر  
تم بے خیالی میں اس کے متعلق یوں باتیں کر رہے ہو جیسے وہ مر چکا ہے۔ میرے یقین دلانے کے باوجود کہ ابھی وہ زندہ ہے تمہیں اس کی  
زندگی کا یقین نہیں آتا۔ اس پر بھی تم اپنے بھائی کی محبت کے دعویدار ہو؟“  
”کیا تمہیں میری محبت میں شبہ ہے؟“ اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

”میرا اس سے کیا تعلق؟“ میں نے بے پردائی سے کہا ”البرہہ تمہیں اپنی محبت کے متعلق شہادت پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم اس کے متعلق یوں بات نہ کرتے کہ وہ چکا ہے۔“

وہ چونک سا پڑا، ذرا دم جم لیجے میں بولا میں بھول گیا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

”انسانی حافظہ اپنے چاہنے والوں کے متعلق خوشگوار باتیں سوچنے کا عادی ہوتا ہے“ میں نے دلی زبان سے کہا۔

اسے غصہ آگیا ”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو شبہ ہے کہ میں اپنے بھائی کا دشمن ہوں؟ میں حنفیہ کہتا ہوں کہ آج کا واقعہ محض ایک اتفاقی حادثہ ہے کہ میں بچ گیا اور وہ زخمی ہو گیا۔ مجھے اپنے بھائی سے بڑی گہری محبت ہے۔ میری زندگی کا ایک ایک واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ مجھ اس سے کتنی محبت ہے، کسی کو کیا علم کہ میں نے اپنے بھائی کے لیے ایسی سی سی عظیم قربانیاں کی ہیں اور کبھی اُن تک نہیں کی؟“

”جس محبت میں قربانیاں ہوں اور اُن کرنے کی مدت بھی نہ ملے ایسی محبت پہنچتی نہیں۔ کسی دن اچانک باوے کٹنے کی طرح ہم بڑھاکر اپنے محبوب کو کاٹ کھاتی ہے“ میں نے افسردہ ہو کر کہا۔

معلوم ہوتا ہے تمہیں اب تک اس بات کا یقین نہیں آیا کہ مجھے اپنے بھائی سے گہری محبت ہے۔ پتھر کا بھی کلیجہ ہوتا تو باؤں کر رہ جاتے۔ میں نے اپنے بھائی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ اپنی زندگی، اپنی روح، اپنا بچپن، اپنی جوانی حتیٰ کہ اپنے حسن و عشق کی کائنات اس پر قربان کر ڈالی۔ اور پھر بھی دنیا کو شبہ ہے کہ میں اپنے بھائی سے محبت نہیں کرتا۔ خدا کے لیے میری داستانِ سنوار اور انصاف کرو کہ میں نے اس سے کیا کیا اور اس نے مجھ سے کیا کیا؟ شاید اس کی اور میری زندگی کی شب و تاریک کی سمجھ نہ ہو سکے اس لیے میں اپنی داستانِ بیان کر کے دل کا بوجھ ہی ہلکا کر دوں گا۔ اس کی جفاؤں اور میری وفاؤں کی داستان طویل ہے۔ اس کی محبت نے میری زبان کو بند اور میرے جذبات کو مفلوج کر دیا تھا اس لیے میں اس کی جفاؤں کا جواب دے دے سکا۔

میں بولی ”مگر میرا خیال ہے کہ محبت مثل اور زندگی کا نام ہے۔ موت کا نام نہیں۔ وہ کسی کو مفلوج کر دے تو پھر وہ محبت نہیں رہتی۔“

اور وہ کلمے جا رہا تھا ”میری داستانِ سنو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ میں نے کیا کچھ اس کی محبت میں برداشت کیا ہے۔ حد ہو گئی۔ ایک مرد سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی مسکرا کر بہا سکتا ہے۔ مگر اپنی محبوبہ کو اپنی آغوشِ تنہا سے زبردستی فوج کر کسی قیمت پر تہی دوسرے مرد کی زینتِ آغوش نہیں بنا سکتا۔ مگر یہ کام میں نے کیا۔ اپنے بڑے بھائی کی محبت کی خاطر اپنی محبت کا کلا گھونٹا جی جاتا تھا کہ اس کا اور اپنا کلا بھی ساتھ ہی گھونٹ دوں مگر نہیں وہ میرا بھائی تھا۔

۱۰ ہمیشہ سے میرا تیر مقابل بنا رہا۔ بچپن سے نے کر جوانی تک زندگی کے ہر شعبے میں ایک نامعلوم طریق پر اس کا اور میرا مقابلہ ہوتا رہا۔ جیسے زندگی کے اکھاڑے میں دو پہلوان ڈر رہے ہوں۔ ایک کمزور۔ ایک طاقتور! گا۔ اس خفیہ لڑائی کا ہم دونوں سے کسی ایک کو بھی علم نہ ہونے پایا۔ وہ دجیہہ اور خوبصورت تھا، میں نحیف اور قبولِ صورت۔ وہ ذہین اور عسار تھا، میں ٹریدار اور کم۔ اس کے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا، میرا دنیا میں کوئی بھی دوست نہ تھا سوائے میری ماں کے اور وہ بھی اکثر متوجہوں پر اپنے بڑے بیٹے کی کوٹھ پر تر جم دینے تک باقی تھی۔ وہ لیلیوں اور ورزشی نمائشوں میں پیش پیش رہتا تھا، میں نہ تو تپند اور سلاکھ کتب خانہ میں تھا ظاہر ہے کہ اس قسم کے کردار محفلوں کی جان ہو کر تے ہیں۔ چنانچہ وہ دوستوں کی آنکھ کا تار اور رشتہ داروں کا پیارا تھا۔ کئی

دفعہ بے حسد پیدا ہوا۔ مگر پھر محبت نے مجھ پر صحتِ سلامت کی بوجھاؤ شروع کر دی۔ کئی دفعہ مجھے اس پر غصہ آیا مگر میں نے ضبط کر لیا۔ آخر وہ میرا بھائی ہے، کوئی غیر نہیں۔

یہ تو حیران کن اور دلچسپ کا زمانہ تھا۔ پھر جب جانی کی پڑھنا شروع کیا تو وہ بن کر اعلیٰ اور حسن و عشق کے سادہ بھادوں پر سانس لگے تو وہ پھر نئے انداز سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

کالچ میں تیراکی کا مقابلہ تھا۔ میرے ہزار انگارے نے پھر بھی دوستوں نے اور خود اس نے نہ مانا۔ میرا اور اس کا مقابلہ ہوا۔ حکم یہ ہے کہ ہر ہمیشہ میری ہی قسمت میں تھی چنانچہ میں ہار گیا۔ اور سخت دل شکستہ ہو گیا۔ میرا بھائی مجھے منانے اور تسلی دلا سے دینے لگا۔ باتوں باتوں میں اور مذاق مذاق میں اس نے مجھے پانی میں دھکا دے دیا۔ انتھاق کی بات کہ میں پانی میں سنبھل کر تیر نہ سکا اور غوطے کھانے لگا۔ پانی چھین پڑا۔ پہنچ گیا اور مجھے مونیہ ہو گیا۔

نہیں، میٹھے میں، ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار پڑا۔

اس بیماری کے دوران میں مجھے یوں شبہ ہونے لگا کہ شاید میری زندگی کی شب تاریک میں ایک نورانی سحر جھلک رہی ہے۔ بات یہ تھی کہ ایک خوبصورت نرس میری خدمت کے لیے مقرر ہوئی۔ جب وہ دوا پانے کے لیے مجھ پر جھکتی تو مجھے شبہ ہوتا کہ اس کی آنکھیں محبت کے نور سے جھلک رہی ہیں۔ معنی وقت مجھے یقین نہ آتا۔ اسے میں دبا ہوا سمجھتا۔ اپنے دل کو سمجھانا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی مجھ سے محبت کرے۔ مگر ایک رات تیز بخار غنودگی بن کر میرے ہوش و حواس پر چھا رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ یہ لڑکی جھک کر میرے بانوں کو چوم رہی ہے۔ میری سرور اور تاریک زندگی میں تپش محبت کی اس پہلی کرن نے ہلکی ہلکی چاندنی کر دی۔

جب میری حالت کچھ سنبھلی تو میں نے دوسرے مریضوں سے بھی یہی سنا کہ مرنے بڑی جافش فی سے میری تیمارداری کی ہے۔ رشتہ رشتہ مجھے اس کی محبت کا یقین آتا گیا۔ مگر ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کی محبت کو سمجھ گئے ہیں۔

میں گھنٹوں بستر پر لیٹا ہوا مٹی قلعے بنایا کرتا کہ جو نہی طبیعت سنبھل گئی میں مہر و سے اظہار محبت کر دوں گا۔ کئی دفعہ کوشش کی آج اندھا تھا کہ ہی دوں مگر عین وقت پر نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا تھا کہ شدت جذبات سے زبان گنگ ہو کر رہ جاتی تھی۔ میں داخلی المزاج انسان تھا۔ ”جس کی محبت اور نفرت دونوں داخلی ہوتی ہیں۔“ بڑی دیر کے بعد میں نے کچھ کہا پھر اس کی داستان سننے لگی۔

اس نے میرا فقرہ سنا نہیں، ایک ردائی کے عالم میں کہتا رہا ”کئی دفعہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مہر و اس بات کی منتظر ہے کہ جو آگ دل میں سلگ رہی ہے اس کے شعلے زبان تک پہنچیں۔ ہم ایک دوسرے کی محبت سے واقف ہو جائیں۔ ابھی میں اظہارِ قناعت کا موقع نہ ملتا تھا کہ ایک شام میرا بھائی مجھے دیکھنے آگیا۔ مہر و جب تک کمرے میں رہی نہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا جب وہ باہر چلی گئی تو اس نے آہستہ سے کہا ”مگر کتنی خوبصورت لڑکی ہے شادیت سے ہیں جس قسم کے حسن کا تصور کرتا رہا ہوں یہ اس کی ہو بہو تصویر ہے۔“ افسر وہ افسر وہ نظریں معصوم سی ادا تیں اور بات چالیں میں نے باتوں باتوں میں اس ذکر کو ٹال دیا مگر وہ دوسرے دن پھر آکر موجود ہوا اور کہنے لگا ”دفتر میں کبھی اسے نظر پڑ کر دیکھا ہے؟ اس میں

ایک خاموش ساجد و بھرا ہوا ہے۔ اگر والدین احترام نہ کریں تو میں اس سے شادی کر لوں!“

میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، میری زبان بند ہو گئی، میری نظریں جھک گئیں۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ تمام رات کروٹیں لیتا اور آہیں بھرتا رہا۔ کبھی اپنے آپ کو اور کبھی اپنے بھائی کو کوستا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے نزل پر پہنچنے کی تیاریاں بھی کرنے لگا اور میں ابھی تک کم کر رہا ہی تھا۔

چند ہی دنوں میں مجھے مہرہ کے انداز میں نمایاں فرق کا احساس ہونے لگا۔ اب وہ راتوں کے سانسے میں میرے سر پہنے میوٹر کے انساؤں کو معطر اور رنگین نہیں بنایا کرتی تھی۔ اس کے اس روئیے نے میرا دل توڑ دیا۔ میں تنہائی میں پہرہ لیتا اور تار بٹھاتا تھا۔ کبھی مہرہ کو بے وفا سمجھتا۔ کبھی مجھے بھائی پر غصہ آتا۔ کبھی اپنے آپ پر جھجھلا اٹھتا۔

دنوں اور ہفتوں کے بعد مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ خطا میری اپنی تھی۔ اگر میں مہرہ سے اظہارِ قدرتا فوراً ہی کر دیتا اور اسے اس پشت نہ ڈالتا تو آج یہ حادثہ میری قسمت میں نہ لکھا ہوتا۔ میرا بھائی بے تصور تھا۔ اسے میری محبت کا علم نہ تھا۔ یہ خطا میری تھی۔

پھر ان دنوں کی شادی ہو گئی اور میں نے ہمیشہ بھائی کے لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دینا۔ اب تمہیں یقین آگیا ہو گا کہ میں نے اپنے بھائی کی محبت میں اپنے پر کیسے کیسے غلامِ درار کے ٹکے مگرھے کبھی اس پر غصہ آنا تو درکنار اس سے شکایت تک پیدا نہیں ہوئی۔ ”پھر یکھت رہ چکے پڑا۔“ ہاں مجھے یاد آیا اس ساری طویل زندگی میں صرف ایک موقع ایسا آیا کہ جب مجھے اس پر شدید غصہ آیا مگر وہ بھی لمحہ بھر کے لیے رہ چپ ہو گیا۔

”وہ کو نہا موقع تھا؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

وہ مہم اور مفردہ لمحے میں ہوا۔ دیکھیں گا زمانہ تھا۔ میں مشکل پانچ پچھ سال کا ہوا تھا۔ وہ ادوم میں بارگ کی ادبھی دیوار پر چڑھے ہوئے انگور توڑ رہے تھے۔ جب بھی میں انگور کا کوئی گچھا توڑتا وہ شونخ سے چھین کر کھا جاتا۔ جب کھا کھا کر تنگ کیا تو دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے اچھین ہو گیا کہ اب وہ مجھے نہیں ستائے گا۔ چنانچہ میں نے انگوروں کا ایک بہت بڑا گچھا اپنے لیے توڑا۔ مگر وہ لپک کر میرے پاس پہنچا، اور اسے میرے ہاتھ نے چھین کر نیچے وادی میں پھینک دیا اور تھپتھپے لگانے لگا۔ اس کی اس حرکت پر میں دانت پیس کر رہ گیا۔ میرا سانس بھول گیا۔ بے اختیار میرا دل جابا کہ اسے بھی انگور کا کوئی گچھا نیچے پھینک دوں۔ ایک جنون کی سی کیفیت میں میرے ہاتھ اس کے کندھے پر پہنچ گئے اور ایک تشبیح کی سی ناکت میں میرے پیچھے اس کو تالو میں کرنے لگے۔ پھر یکھت مجھے خیال آیا کہ اگر میں اسے نیچے گرا دوں گا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی...

چھینا پھینکا ہو جانے لگی اور وہ ختم ہو جانے لگا۔ اس خیال کے آنے ہی میرے دل میں اپنے بھائی کے لیے رحم و محبت کا ایک دریا ابلنے لگا اور میں اسے اٹھکا دے کر نیچے گرائے کی بجائے اس سے چھٹ گیا۔ اس بات کو آج بیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ”وہ اپنی داستانِ غم کو چھپاتا تھا۔“

میں چپک پڑی اور بولی ”اور آج بیس سال بعد یہ حادثہ قم سے سرزد ہوا ہے!“

حادثے کا نام سن کر میرا ذہن ہمیشہ انسان کی ناقص تشادوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فتنہ نشانیوں دنیا میں حادثات ہی کو رونما ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں اتفاقات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مگر تجربات و مشاہدات نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسان حادثے کی تساری تغیر اور بالکل انجانے طریقوں سے برسوں کو تار بٹھاتا ہے۔ تب کہیں جاکر دنیا میں ایک حادثہ رونما ہوتا ہے۔ انہیں حادثے نہ سمجھتے۔ یہ ہماری اپنی دھکی چھی تنہائی ہیں۔

# لندن لیٹر

## قرۃ العین حیدر

دیباچہ :- معزز ناظرین! لندن لیٹر کی بہت سی اقسام ہیں۔ پہلی وہ قسم ہے جو ایک زمانے میں ہمارے ملک کے زمانہ رسالوں میں چھپا کرتی تھی۔ عزیزہ سعیدہ بانو سلیمان اپنی باجی جان کو لکھتی تھیں۔ آپا بیگم میں خیریت سے ہوں۔ بیٹی سے دلسن بھائی نے جو آم کا چارہ میرے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ یہاں ہندوستانی طعام خانوں میں بیچ اور سالہ بہت کم کا ملتا ہے۔ ایک شنگ کی ایک پڑیا دھینے کی سمجھ لیجئے۔ گرم پانی کے پاؤں کے ذریعے میرا گرم رہتا ہے (پھر کچھ لینڈ لیدی کا ذکر نہیں ہونا تھا) یہاں آپا بھائی زمین دوزریلیں چلتی ہیں (لندن ٹرانسپورٹ کا مفصل بیان) میں نے کل یہاں ملاؤ تیار کیا جو بہت پسند کیا گیا (ہندوستانی اور انگریزی کھانوں کا موازنہ اور آپا بیگم کے لیے انگریزی کھانوں کی چند آسان ترکیبیں) آپ کا کام اسب کیا ہے۔ اگلے خط میں میں براہمن اور ہلیک پول کا حال لکھوں گی۔ آپ کی پیاری دور افتادہ بہن ”سعیدہ“

جب پیاری سعیدہ بانو واپس جاتی تھیں تو دور نزدیک سے رشتے دار عزیز دوست اور محلے والے ان سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ وہ ایک خاص دیکھنے اور سننے کی چیز خیال کی جاتی تھیں۔ اور اپنی باقی عمر وہ وطن کے کسی گمنام مدرسے میں ہیڈ ماسٹر یا پھر اسکول انسپکٹر بن کر گزار دیتی تھیں۔ اور قسم ختم ہو جاتا تھا۔

حضرات! اب میں لندن لیٹر کی دوسری اقسام کا بیان عرض کر دوں گی۔ ایک آغاز شربت کا مٹی بی سی سے آداب عرض تھا کہ کس طرح انگریز نائقی بھاری کا ہمدردی سے متاثر ہو کر رہے ہیں۔ اور فتح افشاہ امتدادیوں کی ہوگی۔

اتحادیوں کی فتح کے بعد سے جو لندن لیٹر اسٹریٹڈ ویلک آف انڈیا میں چھپتا ہے وہ اس طرح ہوتا ہے۔ کل ہارس آف لارڈز میں جب بحث چلی اور جب فلاں ہائی کشر سے میں ملا۔ اور دیگر یہ کہ میرے باغ میں آج کل گنہیا خوب پھولی رہا ہے اور فوڈ منسٹری نے انڈوں کا کوٹاکم کر دیا ہے۔ آئندہ اگلے بیٹھے۔

لندن لیٹر کی آخری قسم وہ ہے جب کہ ”تمنا شانی“ اور ”آئینے“ کا نام نہ لگا کر خصوصی حسین و جمیل رسالوں کے کاموں میں یوں نظر آواز ہوتا ہے ”پچھلے اتوار کو میں نے بیگم فلاں کو لیڈی فلاں کی گارڈن پارٹی میں اس حسین نیلی ساری میں ملیوں دیکھا جو انھوں نے مجھے بتایا کہ جمینا میں خریدی ہے۔ کمانڈر فلاں بھی پارٹی میں موجود تھے۔ جنہیں میں نے بریگیڈیر فلاں کی دلکش بیوی کو ایک لطیفہ سناتے پایا۔ کمانڈر فلاں کل ایسکٹ میں بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اتفاق سے ان کو برکسٹن کی ایک گمنام دوکان میں ایک بہت ہی عمدہ کیمبرہ دستیاب ہو گیا۔ مس فلاں جو ہمارا راجہ صاحب فلاں نگر کی بے حد خوش خوش صاحبزادی ہیں۔ کمانڈر صاحب کے اس کیمبرہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کر

ہی تھیں۔ ان کو بھی فوٹو گرافی کا بہت شوق ہے۔ اس مرتبہ ASCOT میں ————— وغیرہ وغیرہ وغیرہ اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر چھپنے کی گوسپ ہوتی ہے۔ یہی خبریں یہی لوگ۔

ان میں الا تو امی طیارہ گا ہوں ان گلبوں اور دھیس کو رسوں کی رہتی دیکھئے۔ پتہ اردن کی تعداد میں یہ لوگ روزانہ زاد ہر اور ہر آج رہے ہیں۔ بغداد۔ بیروت۔ استانبول۔ روم۔ پیرس۔ جینوا۔ نیویارک۔ کیا کھا گئی ہے۔ کیا کھا نہیں اور گھر وں پادشیاں ہیں۔ اللہ اکبر۔ آئے۔ کیوں نہ ملے۔ نیشنل کے ایک اور نامہ نگار یعنی اس خاکسار کے ہمراہ اس منظر کو ذرا قریب سے دیکھئے۔

ملاحظہ فرمائیے۔ ہارون الرشید کا ماقہ جہاں چاروں طرف سیکرانا ریگستان ہیں اور مجلس ہوتی زندگی ہے۔ کہیں کوئی پائپ لائن دور سے نکل آجاتی ہے یا کوئی بدو پتھر پر بیٹھا سر جکائے آہستہ آہستہ اپنی راہ چلا جاتا ہے۔ ایک بھی مٹھک کر آسمان کو دیکھ لینا ہے جس پر آڑن قطعہ پرواز کر رہے ہیں۔ کیا وقت آن لگا ہے کیا کبھی وہ سوچنا ہے کہ اس کے گھر وں واؤں نے اسی ریگستان سے نکل کر بحر طلمات میں کیا سر پٹ گھوڑے دوڑائے تھے!! مشرق وسطیٰ کے شہروں میں اب آپ کو صرف اعلان تک پار کے رہنے والے گھومنے نظر آئیں گے بدو اسی طرح باہر راستے کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہے۔

اس ریسٹوران میں ایک اور خاصا بین الاقوامی مجمع موجود ہے۔ دیواروں پر کوکو کو لاکے اشتہار لگے ہیں۔ ایک آدھ عراقی ماد موزیل اونچی ایڑیوں کی سینڈل پہنے سرعت سے گیلری میں سے نکل جاتی ہے۔ کس قدر گرمی ہے۔ اعلان تک پار والے پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے ہیں۔ جہاں نے انہیں میاں بولوں کو تہذیب و تمدن سکھانے بھیجا ہے۔ یہ دور افتادہ قصبوں اور کچی مٹی کی بستوں میں جا کر دو انہیں تقسیم کرتے ہیں اور اپنے کیمروں سے تصویریں انکارتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے مشرق وسطیٰ کی زمین نے ان سفید فام قوموں کے وجود کو اپنے اوپر اسی طرح صبر اور قناعت سے سہا ہے۔ جو انگریز یا ڈچ یا فرانسیسی اس وقت جیب پر جا رہا ہے جس کے پیچھے پیچھے عرب بدو ٹاؤن بھی ہے۔ تصویر اونٹ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ کیا دمانک پس منظر ہے! اس کے نگار دادا پٹرڈ شیر دل کے ساتھ ساتھ بیڈیائی بھی ہر جانتے تو انہیں کا ہے کویر بڑے دن دیکھنے پڑتے۔ اب بہر حال یہ انٹرویو بلڈ ماک ہیں اور یہ عالمگیر مہم دی اور جانی جائے کا زمانہ ہے۔ اور اس امیر حسن پیر تین ٹیلیٹ اور توحید گویا خدا کے سارے ماننے والے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔

توحید کا پجاری ایک عرب۔ ریسٹوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی معری رسالے کی درق گردانی کر رہا ہے جس میں وہی ایکٹروں کی تعدادیں ہیں۔ (مصری فلم انڈسٹری نے اتنی ترقی کر لی ہے ماد موزیل آم ویٹائی اور شرتے وٹز میں ذرا بھی کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ اور ماد موزیل آم ویٹائی۔ بلکہ ان کے ساتھ خود ہمدادی اپنی نرگس اور شرتیا اور مدھو بالا اپنے اسٹریم لائنڈ آف وی شولڈر شام کے لباس میں سب ایک لائن انڈر ڈائز کے ساتھ فرنسے سر اونچا کر کے کھڑی ہو سکتی ہیں) بہر کیف، تو یہ بوڑھا عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہا ہے۔ اس عرب کو بیکو کو میرے دل میں محبت اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ میرے رسول اور میرے امام کی قوم کا ایک فرد ہے۔ وہ لوگ بھی اسی شکل و صورت کے رہے ہوں گے۔ یہی لباس پہنتے ہوں گے۔ در پیچھے کے باہر فرات بہ رہا ہے جہاں پر میرے امام مظلوم کو پیسا مارا گیا تھا۔ میرے اد پر کافی جذباتیت کی موڈ طاری ہو رہی ہے۔ عرب نے کوڈ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں اٹھایا ہے۔ میں اس سے نسا جاتی ہوں میرے پیارے عرب بھائی ————— کوکو کو لایو تویاد کرو پیاس حسین کی۔

وقت اپنی جگہ پر طہر گیا ہے۔ اگر کھڑا نہ رہے، بجائے شروع کر دیئے ہیں!! عرب بڑے سے شہدی عدال سے اپنی پیشانی

صاف کر رہا ہے۔ میرے پیارے بوڑھے محبوب۔ تم جو ایک چوری تاریخ کے، ایک بہت بڑے عظیم قدوں اور روایت کے بہت ہیچائے مانتے ہو اور تمہارے ہاتھوں میں یہ موزیک کا رسالہ ہے اور تمہاری آنکھیں زندگی کی مدھنی سے عاری ہیں، تمہارے پڑکھوں نے تو مولائی اور جناب عباس اور جعفر طیار کا ساتھ دیا ہو گا۔ تم جو صدیوں کا بہت اذیت ناک اور عبرت انگیز سفر طے کرتے اس لمحے تک پہنچے ہو کہ تمہارے رشتہ زدہ ہاتھوں میں کو کو کو لا کا نکلا س ہے۔ اب تم کدھر جانے والے ہو۔ میرے بھائی! میرے پیارے ساربان! —

یہ میرا است ہے۔ یہ ایک ترک میرے سامنے بیٹھا ہے۔ مذہبی اور قومی جذباتیت کا ایک اور مسل، کیا شاندار ترک ہے۔ پرتہ اور آرتھ اور سائونیا سب ایک جھنکار کے ساتھ کانٹوں میں گونج گئے۔ وہ کو ریاسے لوٹ رہا ہے اور وہ بھی یو۔ این کا ایک اہم رکن ہے۔ کو ریاسے کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس نے ترک بریگیڈ کا ذکر کیا اور ترکی جمہوریت کا۔ میں نے جنرل فخری پاشا کا قصہ اُسے سنایا جو میرے آبا کے بہت پیارے دوست تھے، اور جنرل انور پاشا اور کمالی انارک وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ساری خلافت تحریک کی داستان میں نے اس کے گوش گزار کر دی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرے بھائی چارے اور اسلامی دوستی کے جذبے پر کچھ ٹھنڈا پانی سا پڑ گیا۔ وہ اطمینان سے صاف یو۔ این۔ او میں اپنے کام کا تذکرہ کرتا رہا۔ پھر اس نے قدرے جذباتیت سے اپنی بوڑھی ماں کا ذکر کیا جو بیمار تھی اور جس سانس کی روانگی کے وقت کہا تھا کہ میرے بیٹے میں تم کو آزادی اور سچائی کی فتح کی خاطر کر دیا جھوڑی ہوں۔ کامران ٹوٹا۔ — بابلیوں کو رٹاٹیوں پر بیٹھا ترک ماڈلی کی اچھی خاصی ہوئی اور عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ میں سانس کی ماں کی خیریت دریافت کی۔

اور دو دروازوں کی شے ہیں۔ ہم نماں نڈوں کو سبق سکھا دیں گے۔ وہ آپس میں کہہ رہے ہیں۔ تذکرہ غالباً تین کا ہے۔

سڑک پر جنگلے کے سہارے ایک بہت کم سن بیٹا بیٹھا ہے۔ ہندو کا لڑکا کدھر سے۔ جانے وہ یہاں کدھر سے آ نکلا۔ وہ انگریزی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ اردو بھی مطلبی نہیں بول سکتا۔ میں نے مارے پانچ سال کے بائبل عرصے کے بعد ڈیو میٹک کو رکے افراد کے علاوہ پہلی بار آج ایک عام ہندو کو دیکھا ہے۔ حق نسائیگی اور کرنے کے لیے میں اس سے بات کرتی ہوں۔ وہ ٹھیکہ بیٹا بولتا ہے جو میرے لیے نہیں بڑتی۔ مجھے بے حد تعجب ہوتا ہے جب میں کوشش کر کے زندگی میں پہلی دفعہ بیٹا میں باتیں کرتی ہوں۔ — تو می یا ملکی یگانگت کا عجیب و غریب احساس! ترک اور انگریز اور فرانسیسی دور، جنگلے کی دوسری طرف کھڑے رہ گئے ہیں۔

سبز پہاڑیوں کی ڈھلوان پر پھیلا ہوا اور سمندر کے کنارے کنارے کھرا ہوا پر دست، دھوپ میں جگمگا رہا ہے سمندر۔ نیلا میڈی ٹیرین، نیلے میڈی ٹیرین، اور لبنان، خدائے دولوں کو اپنی حفاظت امان میں رکھے! لبنان! — اخیل جبران کے ملک، تم بہت پیارے ملک ہو۔ یہ سب بہت پیارے لوگ ہیں۔ یہ سارے انسان جو خلیل جبران کی کہانیوں کے کردار ہیں۔

لبنان کی کمیونٹک لوکیوں کا ایک گروہ سمندر کے کنارے والی سڑک پر سے شلتا میری سمت آ رہا ہے۔ غالباً وہ لوگ بری ساری کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ دھوپ میں ان کے سنہری اور چاکلیٹ بال بھلا رہے ہیں۔ خوبصورت چہروں والی کمیونٹک لوکیاں عربی میں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہیں۔ تذکرہ ساری کا ہے۔ تم انگریزی یا فرینچ بولتی ہو؟ میں ان سے پوچھتی ہوں۔

فرینچ دیریں گد۔ انگلیس نو۔ پھر وہ خاموشی سے کھٹکھٹا کر ہنستی ہیں۔ ان کی راہ بہرہ جو خود بہت کم عمر اور خوبصورت ہے،



سکون سے سکونانی ہے۔

ایمان دور دورہ انجیر اور زیتونی کے درخت ہیں جن کے جھنڈوں میں صدیوں پرانی پختہ مک خائفانہ ہیں چھپتی ہوئی ہیں۔ جن کی سمت جانے والے ساید و غرابہ راستوں پر سے کبھی کبھی کوئی بیکار ڈیا جیپ تیزی سے اس الوہی سکون کو منتشر کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

بھر سائپرٹس ہے۔ سارا ترک پھیلا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں چٹیل میدان، گیموں کے کھیت، فہوہ خانے، بحیرہ اسود، اسطورس، استانبول، پریوں کا شہر، روشنیوں، خوشبوؤں، رنگوں کا دارالسلطنت۔ کوئی چیز نئی نہیں، وہی گلیاں ہیں، وہی مسجدیں اور پل اور۔۔۔ جب میں بہت نیچے میں ان جگہوں پر آئی تھی اس وقت کی یادوں کو کوشش سے اکٹھا کر کے میں نے اس زمانے سے ان کا موازنہ کیا ہے۔ کوئی فرق نہیں۔؟؟

اجی تبد بہت فرق ہے۔ پیادہ گاہیں اور بن گئی ہیں۔ فوجی چھانیاں ٹریکریز تک کھیتوں کی زراعت کے لیے منگوائے جا رہے ہیں۔ مذہب کو دوبارہ زندہ کیا جا رہا ہے۔

نامق کمال کا ترکی۔ آنا ترک کا ترکی۔

میرے پیارے بابا، سجاد حیدر یلدرم کا ترکی۔

اور اب باسفورس پر سورج غروب ہو رہا ہے۔ سارے میں شفق پھیل گئی ہے۔ اس شفق میں ابا مونیہ کے مینار نظروں سے نہیں ہونے جا رہے ہیں۔ مارمورہ کے پانیوں پر روشنیاں ناچتے تلپتے شگ گئی ہیں۔

اور اس شفق کے دھندلکے میں مارا مشرقی یورپ ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن نظروں کے سامنے ہے۔

الپس۔ جرمنی۔

الماتیہ! آہ الماتیہ!! (واہ الماتیہ!!!)

بون۔ کوٹون۔ فرینک فرٹ۔

ان ناموں میں کتنا سحر ہے اے معرزا ناظرین۔ لوہے کا جگمگا ناخنہ فرینک فرٹ۔

ڈاؤ لین کیا چاہئے۔ ایک ویٹر ٹیک کر پوچھتا ہے۔

فرامین کے پیارے بھائی فریڈرک۔ تم تو میٹر پوچھتے تھے نا؟ اب میں تم سے کیا بتاؤں مجھے کیا چاہئے۔ بڑا کنفیوژن ہے۔

جانی بڑا کنفیوژن ہے۔

بجیم۔ کیا خوبصورتی ہے، کیا نفاست ہے، برتسنز۔ برتسنز۔ گر جاؤں میں شام کی عبادت کے لیے گھنٹے بج رہے ہیں۔ ان کی رات شام کے کمر کو دس مندروں پر پھیلی جا رہی ہے۔

حضرات میر سے پاس وہ کیمبرہ نہیں ہے جو کہ میں نے برستل میں خریدا ہوتا تو کم از کم فلاں کے ساتھ میں اس کے متعلق نہالہ خیالات کرتی۔ اول تو مجھے نوٹوگرافی اچھی طرح سے نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ اگر اس سے میں تصویریں اتارتی بھی تو وہ کسی کام کی نہ ہوتیں۔ کیونکہ میر سے پاس وہ ٹورسٹ روپہ نہیں جس کے ساتھ یہ تصویریں کھینچ کر گھر خطوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

لہذا ناظرین، اب میں باسم سبحانہ لندن بیٹریے تصویر کا آغاز کرتی ہوں۔ دیباچہ ختم ہوا۔

## ۷۸۶

حضرات! اس پش رہا، دیو زاد پری پیکر عدوس البلاد سے ہمارا کتنا صدیوں کا پرانا قلبی و روحانی تعلق ہے۔ دہریہ آمر تیل جان کپنی کا خیال کیجئے کہ جب سٹی آف لندن کے تاجر مدراس اور بنگالے کے لیے یہاں ٹنگر اٹھاتے تھے۔ یا جب ادکسفرڈ اور کیمبرج کے ہونہار فرزندوں کو سرسراج الدولہ اور شجاع الدولہ کے پاس ذرا کام سے بھیجا جاتا تھا۔ کیا کیا معرکے ہوئے ہیں، کیا کیا توپیں دفی ہیں۔ الٹرا کیمبر چپے چپے سے یہاں کے کیسی کیسی داستانیں وابستہ ہیں۔ چارلس ڈکنز کے ناولوں کے علاوہ روڈیا رڈ کپلنگ اور ونسن چرچل کے ادراک ان کلی کوچوں میں کھجے ہوئے ہیں۔

یوں اندازہ لگایے کہ پچھلے اتنی سال سے ہمارے نوجوان یہاں ادب، قانون اور طب سیکھنے کے لیے آتے رہے ہیں۔ یہاں ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر انھوں نے شعلہ باز تقریریں کی ہیں۔ لندن مجلس اور تھوہ خانوں اور ایمپنک منٹ میں میٹنگ کر آزادی کے خواب دیکھے ہیں۔ وائٹ ہال کے دروازوں پر پہنچ کر جہد و جد کی ہے۔ ہمارے نیناؤں نے گول میز کے گرد بیٹھ کر برطانیہ کی طاقت سے ٹکراتے ہیں اور اب خداوند تعالیٰ کی عنایت دیکھئے کہ بالآخر ہم آزاد ہوئے۔ سچ ہے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بڑا میٹھا۔

ہماری آزادی کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کے کانڈھوں سے گویا ایک بار اتر گیا۔ اب ہم یہاں ایک جگہ پھٹے صبر کے ساتھ آتے ہیں۔ ہمارے نیناؤں نے لڑائی لڑنے کے لیے نہیں بلکہ کنگم پلیس کی کارڈن پارٹی میں شریک ہونے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ اب اگر کوئی لینڈ میڈی ہمارے کلمے رنگ پر اعتراض کرتی ہے تو ہم مطلق اس کا فوش نہیں دیتے بلکہ جی بھر کے اس کے کموں کو گندہ کرتے ہیں، اس کے دالی پیپر پر سیاہی کے چھینٹے گراتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد اس کے پردوں سے اکثر نظر بچا کر انگلیاں بھی پونچھ لیتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ ہم آزاد ہیں۔ جہلا ہم میں اندر مثلاً۔ مثلاً۔ کسی اور آزاد قوم میں کیا فرق ہے؟

اے مومنین! اس وقت اس ملک میں، کفر کی اس آماجگاہ میں چالیس ہزار کلہ گورہتا ہے۔ کئی مسجدیں ہیں۔ ایک آدھ فرزند کلب بھی لگے ہیں۔ لگا ہے اسلام قبول کر لیتا ہے۔ ہمارے مذاہن جو مختلف ہندو گاہوں میں رہتے ہیں۔ مزدوریوں جو شمال کے منارے صنعتی مرکزوں میں موجود ہیں۔ صرف شہر لندن میں تو سے ہندوستانی اور پاکستانی رستہ توران ہیں۔ ہمارے ان گنت لڑکے اور لڑکیاں یہاں کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ پھر ہماری بیگمات ہیں، جب کوئی خاتون زرتار "غراہ" پہنے مٹرک پر سے گزر جاتی ہیں تو اللہ دیکھنے والوں کی طبیعت کلیڈ ہو جاتی ہے۔

ہیں نے موش کیا تھا نا۔ بڑی گناہی ہے۔

ہندوستان والوں کا بھی یہی احوال ہے۔ انڈیا ہاؤس کی عظیم الشان عمارت میں جہاں ہمارے فادر تعلیمی فنسے، مغل تصویریں اور سارے مذہبی خزانے محفوظ ہیں جس کی دیواروں پر سے میرے گورو اہل اہم سین کے بنائے ہوئے فریسکوز کی تصویریں خاموشی سے نیچے جھانکتی ہیں۔ ہمارا فی جھانسی کی جھانٹیں، نئے بھارت کی سرنگ، ہلاٹیں اپنے ویش کی سفارت کے فراغتیں انجام دیتی ہیں۔ ملکیت جیتی منائی جاتی ہے۔

بھی ہاں۔ یہ بالکل ایک نئی دنیا ہے۔

سوینڈ کے اُدھر بیٹے والوں کی اس نئی دنیا کی جھلک جب انگریز اپنے ملک میں دیکھتا ہے تو اسے بڑا اچھا ہوتا ہے۔ ساریوں اور ہندوستانی آرٹ کی تعریف کرتے کرتے اب اس کا حلق خشک ہو چکا ہے۔ میرے پاکستانی پڑھنے والے مجھے معاف فرمائیں جب میں اس ضمن میں ہندوستانی آرٹ کا ذکر کروں گی۔ کیونکہ جب یہ لوگ لفظ پاکستان سے ہی زیادہ واقف نہیں تو پاکستانی آرٹ وغیرہ کا تذکرہ تو بہت دور کی بات ہے۔ ہندوستانی رقاصوں کے ایک ڈانس پروگرام سے اس ملک کی جتنی پستی یہاں ایک شام میں ہو جاتی ہے اس کا تذکرہ یا متقابلہ ہمارے ایک ہزار پیفٹ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم کتنا ہی ان کے اپنے ریفریجی پروہم، اپنے کشیر کے کبسن، اور اپنی ترقی یافتہ کمپنوں کے متعلق بتائیں لیکن پڑھے لکھے طبقے کے ایک مخصوص حصے کے علاوہ ایک عام برطانوی مرد یا عورت کو یہ جاننے کی مطلق ضرورت نہیں کہ ہمارا سکھر چراغ کیا شے ہے۔ یا ہم کتنی جوڑ ملز قائم کرنے والے ہیں۔ جبکہ شیریں وجیہ دار کے بیٹے یا مٹی اور میت کا رک کی فلم آن، کو دیکھنے کے لیے لندن کا ایک عام شہری گھنٹوں طیر اسکو اثر میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے کیوں لگائے مبرور۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ حال، یہ بالکل ایک دوسری بحث ہے۔

لندن کی پھول زندگی میں آرٹ کی ٹائٹشوں، ٹھیکر، اوپرا، بیٹے اور کوزش کے ساتھ ساتھ ہندوستانی رقص کے مناظر بھی ایک اہم حقیقت اختیار کر چکے ہیں۔ اور اب غالباً آن، کی کامیابی کے بعد سے ہندوستانی فلموں کو بھی وہی مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔ جیسی دس دس سال پہلے یہاں آئی ہوئی تھی اسے یہاں کے پریس نے کافی پسلی دی اور برطانوی اور امریکن پروڈیوسروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ دیا۔ مٹی کے ذکر پر یہاں آیا کہ انگریز کی نفسیات کے متعلق کچھ عرض کروں۔

”آن“ انتہائی بکواس فلم ہے جس میں تازہ ترین دہلی کی کیدی لیک کاریں اور تلواریں ساتھ ساتھ چلی ہیں۔ ڈویل رٹے جاتے ہیں اور ان سب اغویات کا اعلیٰ پیمانے پر میکینی کلر مظاہرہ ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں صرف مچوڑنی والوں کو بہت پسند آ سکتا ہے۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے چوٹی والے طبقے کی افسانہ دہلی ساری دنیا میں تقریباً ایک سی ہے۔ ہالی وڈ کی جی ٹی وی تصویریں اسی حالگیر طبقے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آن کے مقابلے میں ”ہم لوگ“ یا ”دھرتی کے لال“ یہاں ایک دوزخی نہ چل پاتی۔ ہندوستان نے تخلیق جو تصویر یہاں پر صدیوں سے موجود ہے۔ یعنی ہمارا جوڑ کے باقی گھوڑے اور تلواریں کی دھاتیاں اور سونے کے عملات وغیرہ وغیرہ، وہ سب اس فلم میں بغیر خوبی پیش کیا گیا ہے۔ لہذا انائٹس برج میں کام کرنے والی ٹائیسٹ لڑکی اور سٹی آن لندن کا بینک کارکن خوش خوش گھر لوٹے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان یعنی مشرق کے کلیمر کی ایک جھلک دیکھ لی۔ مجھ سے یہاں کے ایک بہت بڑے

انگریزوں پر مشہور فلم کرٹیک نے کہا کہ عالمگیر فلمیں کے لیے فلم بنانے سے پہلے آپ کے ڈائریکٹر محبوب کو اطلاع دیں کہ ”سائیکل کاچور“ دیکھیں۔ یہی فلمی یاد دہانہ سب سے پہلی فلمیں ہیں، میں نے عرض کی کہ پہلے ڈلی ووڈ کے ان سارے ڈائریکٹروں کو بھی ”سائیکل کاچور“ دکھائیے جو ”قسمت“ اور ”کلاچور“ اور ”سیلو گرل“ اور ”بغداد“ جیسی تصویروں بناتے رہے ہیں۔ یا جن حضرات نے ”مرگم“ تیار کی ہے۔ محض مشر محبوب کی دینی نرس کے آپ کیوں اتنے خواہاں ہیں۔

انگریزوں کی اس مخصوص نفسیات کا سب سے بڑا کھاس ان کا پریس ہے۔ SENSATIONALISM ان کی محبوبہ ذہنی غذا ہے۔ صحت بہت زیادہ بڑھا کر رکھا جاتا ہے۔ انگریزوں کی پریس پر چھاپے ہوئے اخبار لکھتے ہیں جن میں قتل، مار پیٹ، اغوا، ڈکیتی اور اسکاٹڈ کا ذکر ہوتا ہے۔ اسکو کر سبی اب یہاں آنکھیں سانس لے رہی ہے لیکن اب بھی عوام کو یہ خبر پڑھ کر سب حد اچھا معلوم رہتا ہے کہ لارڈ فلان کے بیٹے آرنسٹ فلان نے کل رات سے فیئر میں اپنی پارٹی میں غصہ کی اتنی پونٹیں پیرس سے منگوائیں اور اسپتال کی ٹھانہ بدش روٹھاؤں کو بذریعہ ہوائی جہاز چھٹکنے کے لیے میڈیٹسے بولا۔ پارٹی صبح کے پانچ بجے تک جاری رہی۔ یا یہ کہ کاؤٹس فلان اتنے ایک کوٹ لے کر اطلاع دی۔ پوری انٹریٹ لے گئی ہیں۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ عوام کو یہ بات کہ بعض تعصبات سے جان بوجھ کر لاعلم رکھا جاتا ہے۔ خودیر طبقہ گھوڑ دوڑ، کتوں کی دوڑ اور فٹ بال ٹول بورڈ کرکٹ کا اس قدر شدید شوق ہے کہ اس کے مقابلے میں بین الاقوامی صورت حال کی اسے زیادہ فکر نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانوی عوام سیاست سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ لیکن ڈائری اے کے لیے بہر حال یہیں سے زیادہ دلچسپ ہے۔ ویسے ملایا کی دوسری بات ہے۔

تقریر و تقریر کی آزادی یہاں ایک حد تک مزور مروج دیکھیں۔ پچھلے دنوں یہاں ”نڈس“ فلم ”زوال برلن“ دکھایا جا رہا تھا۔ فلم شروع ہونے سے پہلے یہ الفاظ سامنے آتے تھے، ”برطانیہ ایک آزاد ملک ہے۔ اور ہم اس کے باشندے، اس چیز میں یقین رکھتے ہیں کہ جہاں سے علاوہ دوسرے شخص کو بھی اس کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ اور اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کرے۔ ہمیں اس فلم میں پیش کی ہوئی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں۔ اور روسیوں کو فتح ان کی بے مثال ساداری کے علاوہ برطانوی اور امریکن اسلحہ جات کی وجہ سے بھی ہوئی تھی۔ برلن یہ ایک بہت عظیم فلم ہے۔“ وغیرہ۔

یہ فلم اس طرح کے تعارض کے ساتھ امریکہ میں تقطی بڑھایا جاسکے گا۔

آزادی تقریر کا دوسرا مشہور معروف مرکز ہائیڈ پارک ہے جہاں ہر کسی کے بولوں پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کے سیاست دان اپنی بیٹریز، مصنف اور ادیب ہر زمانے میں گلا بھارتیہ کر سکتے ہیں۔ ایک طرف کوئی صاحب کیونٹس پارٹی کا دستر لگانے جراحی جنگ کے متعلق کچھ کہہ رہے ہوں گے۔ ان سے دو قدم بہت کر دین آت کنٹری کے مفادات چلا کر کچھ ارشاد کیا جا رہا ہوگا۔ دوسری طرف سوشلسٹ پارٹی کے نمائندے اپنا بیان دیتے ہوں گے۔ ایک سمت خداوند تعالیٰ کو سخت و سست کہا جاتا ہوگا۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے اسٹینڈ پور سوسائٹس کا پیغام پیش کیا جاتا ہوگا۔ ایک روز ایک فاسلم انگریز اور ایک پاکستانی مولوی صاحب بھی خوش خوش سے کچھ فرما رہے تھے اور مجمع تھکے لگا رہا تھا۔

مقرر اور سامعین کے مابین ٹکرا رہی ہو جاتی ہے۔ مجمع ہر ایک کی سند ہے اور اسی طرح تھکے لگتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

آزادی تقریر محض ہائیڈ پارک تک ہی محدود ہے۔

پہلے دلوں چند اخبار فروخت کرنے والوں نے ملے کیا کہ وہ ڈبلی وارکر بیچیں گے۔ ٹائمز نے اس پر بڑا زور دار نوٹ لکھا کہ یہ دبیہ غلط ہے۔ اگر وہ ڈبلی وارکر بیچیں گے تو ہم ان کو ٹائمز بھی بیچنے کے لیے دیاں گے۔ کیونکہ یہ رویہ جمہوریت کے اصولوں کے منافی ہے۔ کل ٹائمز یا کسی اور اخبار کے لیے بھی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ انڈیائی تحریک پر اسٹند بہادر۔ چنانچہ اخبار بیچنے والوں کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ یہ برطانوی اصول پرستی کی ایک مثال تھی۔ فقیر برہادو سرا سنہ ۱۹۰۷ء کے باوجود پہلے کی طرح اب بھی یہ اخبار ہرنیوز اسٹینڈ پر آپ لو دستیاب نہیں ہو سکتا۔ ایسٹ انڈیا کے چوراہوں پر کوئی نویب لڑکی اسے فروخت کرتی آپ کو مل جائے گی۔

ایسٹ اینڈ۔ ایکٹیوٹی سے ٹیوب میں بیٹھ کر آپ دائیں چمپل یا آئینی گریس اتریں۔ بینک بچیس منٹ کے اندر اندر آپ بالکل ایک دوسری دنیا میں موجود ہوں گے جہاں بیماری سے تباہ شدہ نکلے ہیں اور دھومیں سے جلے ہوئے مکانات اور تاریک گلیاں۔ یہاں کی سڑکوں پر آپ رات گئے تنہا گزربینے تو آپ کی جیب ضرور تراش لی جائے گی۔ ناٹسیوں نے اپنی بیماری کا نشانہ خاص طور پر اس عداوت کو بنایا تھا جنہاں لندن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی گنجائش آبادی واقع ہے۔ یہاں کوئی کنوفشن نہیں ہے۔ ہر شخص بے حد دوستی کی موڈ میں رہتا ہے۔ انلاس اور گندگی کے معاملے میں یہ علاقے ہمارے اپنے محلوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہاں ان سنت ہندوستانی، پاکستانی اور لنکا کے مزدور رہتے ہیں۔ برصغیر سے رہنے آئے ہیں اور اس آبادی میں مدغم ہو گئے ہیں۔ ان کے لباس بھی اتنے ہی بد نما اور شکستہ ہیں جتنے ان کے مفید خام ہمسایوں کے۔ چھوٹے چھوٹے نیم تاریک بندوستانی طعام خانے ہیں جہاں اتوار کے روز دن بھر جاز کی موسیقی بجتی ہے اور اس کے ساتھ نیگرو لوک کے اچلتے رہتے ہیں۔ ایک چارخانے میں ایک روز جم لوگ لٹے۔ اس میں دیوار پر پراانا مسلم رنگ۔ کانیلنڈر رکھا رہا تھا جس پر قائد اعظم اور بیماری کیبنت کے افراد کی تصویریں تھیں۔ بے رنگ کریسل اور جلدی میز پر تھیں۔ ایک کونے میں ایک انلاس زود انگریز والی بات کھانے میں مصروف تھا۔ کاؤٹر پر سیاہ فام، غائب اسلمت کا رہنے والا ڈیرہ چلایا "نون ٹی، ون دول" — عین مین کراچی کی سند روڈ کا کوئی ریٹووان معلوم نہ تھا۔ ڈور چیمبر کلیننگ۔ بے فیئر؟ — جی ہاں۔ ان الٹ بیلوی جگاؤ کے علاوہ جن کے اندر داخل ہو کر لوگوں کی عقل پکڑیں آجاتی ہے اور آنکھیں جھپک جاتیں ہیں۔ ان کے علاوہ یہ جارحانہ بھی موجود ہے۔ انگلستان بھن دو ایسے ٹیمر کا مغربی کنارہ ہی نہیں ہے۔

اتوار کے روز ایسٹ اینڈ کی مشہور ریڈیو کوٹ بس میں ہاٹ لگتی ہے۔ وہی ٹیبلٹ والوں کی بھانت بھانت کی صدائیں

پھر یہ نگلیاں ہیں جن کی دونوں طرف شکستہ مکانات کے سلسلے ہیں جن کے دروازوں پر عورتیں بیٹھی دھوپ سینکتی ہیں اور سامنے بچے کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر، بٹے کے انبار، غریب یہودیوں کے عبادت خانے، یہاں سے تو کوئی بیکار ڈیڑھ سال تک بھوتے سے بھی نہیں گذرتی۔

یہ منظر آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ شمال کے صنعتی مرکزوں میں شیفلڈ میں، گلاسگو میں، ویلز کی آبادیوں میں، ساسے آئرلینڈ میں

اور پھر جیتل محمود کرنے کے بعد اٹلی، اسپین اور یونان میں یہ سارا کچھ ہے جس پر کمرہ چھایا ہوا ہے۔ کمرہ جو کچھ کم کے سمندر میں سے اٹھتا ہے۔ نیچے نیلا میڈی ٹرمینیٹی جگہ گارہ ہے۔ جس کی موجوں پر کاؤٹنس آف ٹیڈل ڈم کی یاٹ تیرتی ہے۔ حسین کاؤٹنس آف ٹیڈل ڈم جو مارکوش آف ٹوڈل ڈو کے ساتھ، پندرہ منٹ کوٹے کے کراٹاوی ریربرا اشریت لے گئی ہیں۔

میری پیاری دوست خایا نے مجھ سے کہا۔ اس انٹرنیشنل مسلم سینڈ سے کم از کم ہم اپنے یہودیوں کو نکال کر اسرائیل لے گئے ہیں۔ ہمارے COLLECTIVE نام دیکھو۔ ہماری نئی موسیقی، ہماری کچھ، ہمارا جذبہ۔ ہمارے سامنے وہی مسائل اور وقتیں ہیں جو تمہیں پیش ہیں۔ نیا ملک ہے۔ نئی اجتماعی طاقت جو پرانی تاریکی کی طاقتوں سے ٹکرائے۔ یہی ہے لیکن پھر بھی ہم اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ بتاؤ ہم میں اور تم میں، یا ہم اور عربوں میں کیا فرق ہے۔ وہ خاموش ہو گئی۔  
— ہم نے کئی بار کوشش کی کہ عربوں کے ساتھ مصالحت کر لیں لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا۔ تاکہ مشرن رجلی میں عربوں اور یہودیوں میں باہمی مفاہمت، سمجھوتہ اور امن نہ پیدا ہو جائے۔  
وہی ہندو مسلم مسئلہ تھا۔ خایا نے پھر کہا۔

اب وہ چپ چاپ بیٹھی ہے۔ خایا دوسری نژاد ہے۔ یوکرین میں پیدا ہوئی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے اس نے فلسطین کی انڈر گراؤنڈ تحریک میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے ڈبئی سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ لیا ہے۔ خایا بے حد خوبصورت لڑکی ہے۔ ایک تو یہودی ویسے ہی بہت دلکش اور ذہین ہوتے ہیں۔ اس لیے خایا کو کیمبرج میں عام طور پر بہت پسند کیا جاتا ہے۔ خایا یعنی حیات، یعنی حیات، عبرانی میں خایا زندگی کو کہتے ہیں۔

لیکن میں بنی اسرائیل کی نئی زندگی کے اس سبل سے ہر وقت الجھی رہتی ہوں۔ علاوہ حایز میں میرے ملک نے خایا کو سرکاری یا اخلاقی طور پر تسلیم نہیں کیا ہے۔ میں خایا کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہنے کی گنت عربوں کی جان لی ہو گئی۔ یہ سوچ کر مجھے اس کے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ اطمینان سے بیٹھی پیا فور چیکو و سکی بھاتی رہتی ہے۔ جب وہ جذباتی ہو جاتی ہے تو دوسری گانے لاپسے شروع کر دیتی ہے۔ روسی اس کی مادری زبان ہے۔ عبرانی مذہبی اور سیاسی، انگریزی، ادبی، اور فرنگی اس کی کچھل زبان ہے۔ وہ بڑی کٹر، بیٹی برٹش عورت ہے۔ فلسطین کی جنگ کے زمانے میں کئی دفعہ برطانوی فوج نے اسے جیل میں بند رکھا اور برطانوی پولیس نے اس کی پٹائی بھی کی۔ سیاسی طور پر وہ اشتراکی ہے۔ اس کا باپ اسرائیلی حکومت کا ایک اہم رکن ہے۔ فقہ مختصر یہ کہ ان سردمزاں انگریزوں کو وہ بحیثیت مجبوری کا پیڑا سرار اور پیکر کشش نظر آتی ہے۔ پائندہ باو خایا یعنی حیات۔

اس وقت خایا ڈاکٹر اٹل ٹرے ایڈیٹ کے معاملے میں الجھ رہی ہے۔ ڈاکٹر اٹل ٹرے برگ کا انٹیکوٹیل ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ غصے کا گناہ ہے اور دکھاری، کہہ کر لپکا تلبے کیونکہ سندسکرت اور کالی داس کا وہ بہت عالم فاضل ہے۔ سات سال تک وہ شرتی ملازمینوں سے لڑتا رہا۔ دوس میں نظر بندی کے زمانے میں اس نے پہلی بار ”جرم و سزا“ کو پڑھا۔ اب وہ ہمبرگ میں ادب کا



پران گنٹ PUNTS تیر رہی ہیں۔ ابھی قریب سے جو پنٹ گزری ہے اس کے سر پر کھڑی ہوئی خیانت نے جوش میں آکر زور زور سے کوئی جبرانی لوک گیت شروع کر دیا ہے جو اسرائیل کے کھیتوں میں لڑکیاں گاتی ہیں۔ ڈاکٹر اسٹ مارا ہستہ آہستہ ایک جرم نغمہ الاپ رہا ہے۔ ڈاکٹر نینسی کارمن نیگرور دھانی گیت، گلگانے لگتی ہے۔ انٹرنیشنل سمفنی شروع ہو جاتی ہے۔

”تم بھی کوئی بندوستانی، میرا مطلب ہے پاکستانی گانا گاؤ۔“ رونلڈ ڈرافٹنگی سے مجھ سے کہتا ہے۔ نینسی آنکھیں نیم داکے اپنے وطن، جنوب کے ————— PLANTATIONS کے گیت گاد رہی ہے۔

ڈاکٹر نینسی کارمن۔ یہ میری دوسری پیاری دوست ہے۔ اس کی داوی بعضی سلیڈ گول حتی جسے نیو اور لینز میں فروخت کیا گیا تھا۔ اس کا باپ ورجینیا میں باوری ہے۔ نینسی کو ورجینیا کے کسی کالج میں اسے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لہذا اس نے شمال کی کسی یونیورسٹی میں جا کر پڑھا۔ اور امریکن ناول میں نگہ پادری کے کردار پر متاثر ہو کر اس نے کو لمبیایے ڈاکٹر ٹیٹ لیا۔ اسے وہ جنوب کی کسی بہت بڑی نیگرہ یونیورسٹی میں ادبیات کی پروفیسر ہے۔ نینسی بے حد پیاری لڑکی ہے۔ ہر وقت بشاش رہتی ہے اور بات بات پر زور زور سے قہقہے لگاتی ہے۔

”دیکھو۔۔۔ تم لوگ ہمیشہ اپنی مفلو میت پر سو رہے ہو اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہو۔ لیکن نینسی کو دیکھو۔ اس کی قوم نے کتنے ظلم سہے ہیں اور یہ کس طرح ہر سہے بندتی اور دوسروں کو ہنسائی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی اپنی سیاسیات اور اپنے کلر پرولم کے بارے میں تمہاری طرح ہی حساس ہے۔ بلکہ اس نے تم سے زیادہ دکھ سہے ہیں۔“ رونلڈ مجھ سے کہتا ہے۔

نینسی واقعی بہت عظیم ہے۔ ہمارے ساتھ تین چار امریکن اور ہیں جو سب کے سب کسی نہ کسی مشہور یونیورسٹی کے ڈاکٹر ٹ کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔ سب بڑے ذہین پرست ہیں۔ مثلاً یہ لڑکا رسل فریزر جو نیویارک کے ایک مشہور ادبی رسالے کا جوائنٹ ایڈیٹر ہے اور امریکہ کے نئے باندہ پائے نقادوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن ہم کبھی ایک دوسرے سے سیاست کی بات نہیں کرتے۔ صرف ایڈر پانڈنڈ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ نینسی ان سب کی دوست ہے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی امریکن ہے اور بڑی کچی امریکن ہے۔ لیکن ان سب سے مختلف ہے ایک بات آپ کو اور بتا دوں۔ نینسی، غایا یا رونلڈ کی طرح اشتراکی خیالات کی حامی نہیں ہے۔ امریکی طرز جمہوریت کی پرستار ہے۔ پھر بھی اس سے کتنی کھیر تا اور کتنے دکھ سے وہ ”نیگرور دھانی نغمہ“ الاپ رہی ہے۔

نینسی کارمن بہت عظیم عورت ہے۔

کل ایک انگریز لڑکی نے برکفاسٹ کی میز پر اس سے بہت بشاشت سے کہہ دیا ”ہو ٹو ٹیسی۔۔۔“

نینسی نے اس سے کہا ”دیکھو ڈارلنگ، مجھے معلوم ہے کہ تم نے کسی بڑی نیت سے نہیں بلکہ محض خوش دلی سے ٹوٹی کہہ کر بکا رہا ہے۔ لیکن آئندہ کسی نیگرہ کو اس نام سے مخاطب نہ کرنا۔“

”اوہ۔۔۔ آئی ایم سوسوری ڈیر۔“ انگریز لڑکی نے جواب دیا اور خاموشی سے پارچ میں مصروف ہو گئی۔

”متم نے دیکھا۔“ بعد میں نینسی نے مجھ سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا۔ ”یہ بالکل اسی طرح ہے جب یہ لوگ نیگرہ عورتوں کو ٹوٹی یا نیگرہ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو نا۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“





ہیم تانا دھی ری تانا تانا دھی ری تانا دھیم — سب مل کر لاپٹے لگتے ہیں۔  
 شیر نکل —! درتسل فریزر جیلا کر خوشی سے کہتا ہے۔  
 ان سفید قوموں کا کہ کسٹر اب بندر ابن کا گیت بجا رہا ہے۔ یہ دھنیں انھوں نے آج تک نہ سنی تھیں۔ سب کے سب بچوں کی  
 طرح اکساٹیتے ہیں۔

ادہ ہوائے —! اینٹنی پلا کر کہتی ہے۔  
 کیا کچھ بول دہرمنی پیدا ہوئی ہے واسطہ —! میں سوچتی ہوں۔

شام کو ای ایم فارستہ مجھ سے کہتے ہیں۔ میں ہندوستان کو جھلاکس طرح جہل سکتا ہوں؟ — کبھی نہیں۔!  
 میں سر۔ میں کہتی ہوں۔  
 خصوصاً تمہارا لکھنؤ۔

میں سر۔  
 تمہاری تہذیب۔  
 میں سر۔  
 تمہاری سادی جلد و جلد۔  
 میں سر — ٹوٹھیز فار ڈیو کو بیٹے  
 فارستہ بھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

سارے ایسٹ انگلیا پر، جنوبی انگلستان پر، موسم گرما کے خوشگوار بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پھر دھوپ نکلتی ہے۔ سیزن اپنے  
 عروج پر ہے۔ ویسٹ اینڈ میں پیٹر اسٹونٹ، ایڈمز ایوانسز اور میری مارٹی کے کھیل بے پناہ ہجوم اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ  
 نے نئے ٹینس ایجاد کیے ہیں۔ کورٹ آف سینٹ جیمز سے ذرا پر سے اندر ریزنگ کی عبوری میڈل عمارت ہے جس میں بورڈس آئی ایس  
 اور نوآبادیات کے سابق گورنروں پر چپ چاپ بیٹھے دھسکی پیتے اور ٹائمز پڑھتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی اخبار پر سے سر اٹھا کر گندا دل سے پڑ  
 رینڈیٹسی یا ڈیر اولڈ چیمبر منزل کلب کا تذکرہ کر لیتے ہیں۔ جہاں مسئلہ میں مل مسئلہ میں کتنی دلچسپ برج پارٹیاں ہوتی تھیں۔  
 ایک دوز ایک پارٹی کے دوران میں میں نے ایک بہت بڑے انگریز کو فوس کیا جو سب سے اگلی تھلگ خاموش بیٹھا چارہ پی  
 رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دھنڑلہ تھا۔ میں نے پیالی اسے اٹھا کر دی۔

انڈیا —! اس نے دوستی کے انداز میں سوال کیا۔  
 پاکستان —! میں نے اسی بنناشت سے جواب دیا۔  
 اوہ — ونڈرفل — ونڈرفل۔  
 آپ کبھی برصغیر جا چکے ہیں —! میں نے پوچھا۔  
 ہاں! جا چکا ہوں — جا چکا ہوں — اس نے پیرالی کا پتے اعلیٰ سے سنبھال کر اٹھائی۔  
 کسی خاص جگہ —؟  
 بمبئی!

اچھا — کسی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں۔ یا، ایسے ہی۔ یہ میں نے اخلاقیات کا لہجہ جاری رکھنے کی غرض سے دوبارہ بات کی۔  
 نہیں۔ ملازمت کے سلسلے میں نہیں۔  
 اوہ —! آرمی —؟  
 نہیں، آرمی نہیں۔

تو کافی عرصہ رہے آپ ہندوستان؟  
 ہاں۔ ہاں۔ کئی سال — کئی سال۔  
 کیا کرتے رہے اتنے دنوں آپ وہاں — میرا مطلب ہے، بمبئی میں۔؟  
 ار — میں بمبئی پریذیڈنسی کا گورنر تھا۔  
 اوہ —

ان انگریزوں کی تنہائی اب قابلِ رحم ہے۔ ان کے دوسرے ہم مرتبہ ساتھیوں پر بھی ذوالِ آچکا ہے۔ بڑے بڑے لارڈز اور کاؤنٹس  
 لیے چڑے خطابات، طویل و عریض ریاستیں اور عظیم الشان محلات اور قلعے تھے، اب نوکریاں کر رہے ہیں یا اپنے جواہرات  
 نہ کتب خانے فروخت کر رہے ہیں۔ بہت سوں نے اپنے محلوں کی مناشیں شروع کر دی ہیں جن پر کلکٹ لگا کر وہ مناشیوں کو  
 لسنے، اپنے نفیس بیڈروم اور ڈرائنگ روم ایک مستعد گائیڈ کی طرح دکھلاتے پھرتے ہیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اس  
 بچ میں مدد لیتے ہیں۔ ”موت کے حصول“ نے اس سٹوکرسی کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دیا ہے۔  
 انگلستان کے لارڈز اور بیڈریز کا زمانہ ختم ہوا۔

لہذا اسے مومنو! لازم آیا تم پر کہ عبرت پکڑو اور درد سے کبھی غافل نہ ہو۔ پڑھو درد!



سلسلے سے اعلان تک پارہائے سپاہیوں کا ایک غول گزر جاتا ہے۔  
میں اور فیروز سیدنا کے اندر جا کر لادندہ دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔  
لادندہ — زندگی کا میری گورنہ انڈہ — ۱۱۹

تو بھائی فیروز یہ سلسلے ہیں۔ رات کو میں آگ کے سامنے اعلیٰ دنیا سے بیٹھ کر فیروز سے کہتی ہوں۔ یہ بھائی پارہا انا لطیف ہے۔ یونیورسٹی  
میں پڑھنے پڑھنے کے تو شام کو ہوسٹل کی ڈائٹنگ ٹیبل پر دو بھر کے سارے ضروری واقعات یونیورسٹی پالیٹکس اور اسکندرا ایک  
سال میں گوش گزار کرنے کے لیے بعد میں فیروز سے کہتی تھی: تو یہ سلسلے ہیں بھائی صاحب۔ ۱۱۹  
فیروز کا ناپاکانے میں مصروف ہے۔ اسٹوڈیو کے چاروں طرف ٹیبلیم کتا ہیں بکھری ہوئی ہیں۔ اس نے لکھنؤ سے اردو میں ایم اے  
لیا تھا۔ اب وہ جرنلزم کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور انڈیا ہاؤس میں کام کرتی ہے۔ فیروز جیسے ہندوستانی لڑکی ہے۔ ہندوستانی طالب علموں کی  
دینی سرگرمیوں میں بہت دلچسپی سے حصہ لیتی ہے۔ جدوجہد بخاری روایت ہے اور اس روایت کو ہم کبھی نہ بھولیں گے۔  
برادرو۔۔۔۔۔ میں جلاتی ہوں۔  
فیروز اور اس کے ہندوستانی ساتھی ذرا تکلفاً برامان کر چپ ہو جاتے ہیں۔

اور یہ کہتا ہے۔ میری بچپن کی رفیق کلا جپال جس کا ذکر آپ نے اس ناچیز خاکسار کے افسانوں میں اکثر پڑھا ہو گا یہ صاحب  
ہندوستان کی خان سردس کی ایک بڑی ذمہ دار کن ہے، پر اب تک لگتا ہے کہ ابھی ابھی اپنی کلاس کا کوئی پیریڈنگولی کر کے کالج سے  
جائی چلی آ رہی ہے۔ اس کا نمبر چلتی میں ہے۔ لہذا آرٹ وارث کا چکر اس کے یہاں بہت رہتا ہے۔  
کینیڈا کا انٹیکوٹیل تاریخ اور پولیٹیکل سائنس کا ماہر اتنی ٹیبلیم برگ جاتی رائے کی ایک تصویر کو بے دھبائی سے امیٹ  
ہے۔ اترتی آج کل بیک وقت دو کتابیں لکھنے میں مصروف ہے۔ ایک کینیڈا کی اقتصادی تاریخ ہے اور دوسری کچھ اور اسی قسم  
کی چیز ہے۔ اوقوں کتابیں بڑے پورے گریسو نظریے سے لکھی جا رہی ہیں۔ اپنی کم عمری کو چھپانے کے لیے ہر وقت بے جا۔ سنجیدہ رہنے  
کی باتیں کرتا ہے۔

پروگریسو۔۔۔۔۔ آف وہ۔۔۔۔۔ انیسویں برسے کہ تم تو پچھم کے زوال پرست انٹیکوٹیل بھی نہیں ہو۔ کوئیل انٹیکوٹیل ہو۔۔۔۔۔ میں  
سے جلدی کے لیے کہتی ہوں۔

دراصل مجھے اس لفظ انٹیکوٹیل ہی سے وحشت ہوتی ہے اور پھر کینیڈا کی یہ مخلوق۔۔۔۔۔ آف وہ۔۔۔۔۔ یہ کوئیل ڈگ بھلا کیا کھا  
را انٹیکوٹیل نہیں کے۔ بھائی جو تمہارے باپ کے چہن اسٹوڈیو ہیں، انہیں میں مگر رہو (راتی جب اپنی بے تحاشا طویل دعو بعض امر میں کار میں سرگول  
بست گورہ ہے۔ خصوصاً کٹری سائیڈ کے تصویب کی پتلی پتی سرگول پر سے، تو را گریڈر ڈگ کر کار کو غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔ امریکن کاریں انٹیکوٹیل  
بہت کم نظر آتی ہیں۔ انٹیکوٹیل کاریں جہاں کے سامنے بالکل کھوٹا ایسی دکھلائی دیتی ہیں، اترتی کی کا دی وجہ سے ڈگ جاتی ہیں کیونکہ اس کی



گذاوردند ہم —

کر شتائیں دینا نہ ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ اپنی کشتی رہے اٹھیا دوس میں انہوں نے اپنی رہائش کے لیے ایک کمرہ رکھا تھا جس میں ایک طرف چادر ہانے کا سامان رکھا تھا اور باقی سارے کمرے میں کتابوں اور اخباروں کے انبار کچھ بے رہتے تھے۔ دن بھر اور آگے تک وہ خود چادر بنا کر پیتے جاتے تھے اور لگاتار کام کرتے تھے۔ کام میں مصروف، ہنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔

اب آپ بنا کچھ کئے کیسے رہ پائیں گے؟ میں نے ان سے پوچھا۔

میں کچھ نہ کچھ ضرور کیا کروں گا۔ انہوں نے کہا۔

اب آپ کتابیں لکھ دیجئے۔ میں نے غفلندی سے ان کو مشورہ دیا۔

غالباً وہ انگلستان میں مستقل رہیں گے جس طرح ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں۔ محمد علی خاں علی آبادی کی طرح وہ بھی اس سرزمین کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اس وقت تو وہ اتنی کوچسے وہ کینیڈین پیش میں آتے ہیں، پر اسے کھلا رہے ہیں اور وہ سالوں میں سرچوں کی زیادتی کی وجہ سے سون سوں کر رہا ہے۔

اور اب رات ہو رہی ہے۔ سڑک کے کنارے کنارے گھومنے والی لڑکیاں اور وہ بوڑھے بھکاری مصروفِ فٹ پاتھ پر رنگین چاکلی سے مصروف ہیں۔ ایک طرف، دیوار کے سہارے دن دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور ہر راگبیر کو دھندلی، پورا امید آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا چکے ہیں۔ فٹ پاتھ کی ان تصویروں کے نیچے لکھا ہوا ہے:۔ یہ میں نے جمیل اور چاندنی رات کی تصویر لی ہے۔ لیکن چونکہ چاکلی سے سڑکے رنگ اٹھا کر نہیں ہو سکتے اور کاغذ یا کینوس کے بجائے میرے پاس صرف یہ فٹ پاتھ کی زمین ہے۔ اس لیے تصویر ایسی نہیں ہو سکی۔ جیسی میں چاہتا تھا۔ اگر آپ کچھ دیتے جائیں تو میں رات کو کھانا کھا کر سو سکوں گا۔ گو میرے پاس رات کے لیے کوئی پلنگ نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

سڑکیں سنسان چو چلی ہیں۔ زمین دوزریلیں اپنی آخری مسافتیں طے کر رہی ہیں۔ متوسط طبقے کے باور بہت اور چھتر یوں والے گھر اپنا اپنے گھروں میں قلعہ بند ہو چکے ہیں۔

کوئی ٹورسٹ اپنے دوست سے کہہ رہا ہے۔ کیا جو بد مذاق شہر ہے جہاں اتنی جلدی رات ہو جاتی ہے۔ اسی لیے میں کل مجاہد ہوا ہوں۔ شب بخیر لندن۔

لندن سو رہا ہے۔ لندن جاگ رہا ہے۔ کھر کھوں کے پردے گرا دیے گئے ہیں۔ باہر خشک ہوا چلی رہی ہے۔ گل ہڑی

ہوگی۔ نیچے سرک پر شام کا اخبار بیچنے والے آخری بچے کچے پرچے سمیٹ رہے ہیں جن کی سرخیاں تادیبی میں مدغم ہوتی جا رہی ہیں۔ ابھرا مرگئی۔ شاہ فاروق کو باہر نکال باہر کیا گیا۔ مصدق رونے لگے۔ روسیوں نے ایک اور گولڈ میڈل جیت لیا۔

اب سب سو رہیں گے۔ میں اور فیروز اور کتلا اور خلیا اور بنیسی۔ اور ان کے علاوہ روزنڈ اور اسٹیلر اور ارانی اور جم سب جاٹیں گے۔ کیونکہ یہ آج کا دن بھر ختم ہوا۔  
کل کیا ہو گا۔ یہی سوال مسئلہ میں بھی سب کے سامنے تھا۔

لیکن سامنے دیکھو۔ اب دیوار پر کیا لکھا ہے۔ دیکھو۔

اب تمہاری خاطر کوئی ڈسٹینش فیصلے کے لیے نہ آئے گا۔



# بھاگ بھری

ہاجرہ مسرور

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نئی نئی پریکٹس شروع کی تھی۔۔۔۔۔  
میڈیکل کالج کے زمانے میں اپنے آپ پر روپوں کی کبھی کبھی بارش نہ دیکھی تھی۔ اپنے بڑے بڑے برادریوں کی لمبی لمبی  
ریجنرل آدمی اور سوچ بھی کیا سکتا ہے۔ مگر جب ڈگری لے کر اس بازار میں آئی تو معلوم ہوا کہ گلی کے اندر حقیر سے کمرے پر نور ڈنگا کر بیٹھے سے  
ان درخت واپس آنا مشکل ہے جو یہ وہ ماں کے زیورات بک بک کر تیسوں اور کتاہوں پر خرچ ہوئی۔ آگے چل کر میں نے کیا خرچ  
نہ کیا۔ یہ ایک الگ قصہ ہے جس کا ذکر کرنا اس موقع پر ضروری نہیں۔

ان دنوں وہ دنوں جب پہلی بار مجھے دو روزہ کے ایک گاؤں میں ڈپٹی کا ایک کس کر نے کی دعوت ملی تو میں کافی خوش ہوئی۔ بھابھی  
میں نے بنایا اور اپنے بے شمار رفیقوں کی پریشانی کا ذکر کیا۔ لیکن جب سیدھے سامنے پھیل بیٹھا مرنے میرا ہماؤ ایک دم بڑھا دیا تو میں فوراً نیا ہو گئی۔  
۔۔۔ دوسروں کے کم نہیں ہوتے۔ میں جیڑان وہ گئی کہ شہر کی دوسری جلی ہوئی ڈاکٹر نیوں سے بچ کر یہ میرے پٹے کیسے پڑ گیا۔  
میں نے جلدی سے اندر جا کر والدہ سے ذکر کیا لیکن وہ خوش ہونے کے بجائے کچھ پریشان ہو گئیں کہ ہٹاؤ دور کی بات ہے،  
ان کو ادھی لڑکی، لاکھ ڈاکٹر تو پھر بھی۔۔۔ والدہ کی اس ”پیرھی“ سے میں بھی ذرا پریشان ہوئی۔ لیکن پھر ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی، جس نے  
میں نے بھائی سے کہا کہ وہ دوڑ کر سائیکل پر جانے اور کالج میں کم از کم چھ دن کی چھٹی کی درخواست دے آئے اور ساتھ ہی میں نے گھر کی  
پانی ملازمہ مانی کہ سفید شلواریں کہتا پہنوا کر بطور نرس ساتھ چلنے پر آمادہ کر دیا۔۔۔ جب میں واپس اپنے مطلب کے جڑے کرے میں گئی تو یہ بات  
جیڑا نے ہو گئی کہ نرس کو دس روپے روز میں ملے۔

پھر میں نے پوچھا کہ ”وہاں ٹری بیس کس وقت جائے گی؟“

فادر ساتھ لایا ہوں۔ جواب ملا۔

اور میں یہ سوچ کر پریشان ہوئی کہ دیہات سے شہر تک پہنچنے پہنچنے کا رکش اتنی بے کار نہ ہوگی سو کر اسے میں پریشانی اٹھاتا پڑے۔  
لیکن جب میں اپنے دو موٹوں کے ساتھ والدہ کو دعائیں پڑھتے چھوڑ کر نکلی اور گلی طے کر کے سڑک پر آئی تو تازہ تازہ کپٹی لک  
دیکھ کر میرے چہرے کا رنگ ضرور بدل گیا ہوگا۔۔۔ میں بھتیائی کہ میں نے فیس اور زیادہ کیوں نہ مانگی۔  
ماتھے میں میرے چھوٹے بھائی نے کرید کرید کر کہا کہ ہم ضلع سرگودھا کے ایک جاگیردار کے ہاں جا رہے ہیں۔ جاگیردارانی

معرضت کو ولایت لاہور سے ڈاکٹر ٹی پچ جلنے آئے۔ بڑے اساتذوں کی پہلی زوجگی تھی۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لاہور سے بالکل مختلف مینا میں وارد ہوئے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بڑی سی حویلی ہمارا منزل تھی۔

بڑی سی بیٹک کے دروازے پر پہلی پڑتی دھوپ میں ایک درجن شکاری کتوں کو شام کا راتب تقسیم ہو رہا تھا، اور دس بارہ آدمی اور کتوں کی زنجیروں سے پٹے ہوئے تھے۔ ہماری آمد پر وہ چوکے لیکن پھر کتوں کی زنجیروں پر جھٹ گئے۔ اسی پہلی دھوپ میں گدے دار کرسی پر، میرے دوسرے روز کے دانہ، ملک گل نواز آتھی پالٹی مار سے بیٹھے تھے۔ سفید سلک کی تھم اور تیلی سلک کی قمیص، سر پر بیچر کلاہ کی بھاری پگڑی۔ اور کلائی پر باز۔ باز، ملک کے ہاتھ پر رکھی ہوئی تازہ تازہ فاختہ کے پر بھیر بھیر کر گوشت نرچ رہا تھا۔ یہ وقت باز کے راتب کا بھی تھا۔

کیڑی ملک کے اس مالک کا تصور میں خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر پھر بھی اس ماحول سے میں کافی مرعوب ہو گئی۔ ڈاکٹر ٹی صاحب بڑی تکلف اٹھائی آپ نے، میں آپ کو خوش کر دوں گا؟ ملک نے گہری نظروں اور بھاری آواز سے بیک وقت کہا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ملک صاحب کی صورت اس بادشاہ سے ملتی ہے جس کی تصویر میں نے اسکول کے زمانے کی کسی کتاب میں دیکھی تھی۔ مانتے تک پیچ در پیچ بڑی سی پگڑی، بڑی کھنٹی سر نہیں، کرسی پر آتھی پالٹی مار سے اور ہاتھ پر باز بٹلے۔ بس مانگ کیا مانگتا ہے کہنے کی کسر تھی۔

زنان خانے کا ماحول لباس اور سجاوٹ کی تبدیلیوں کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا محو ہمارے پرانے عمارت کے بڑے گھر دار میں ہوتا ہے۔ صحن میں رنگین پتیلیوں پر کافی سے زیادہ خوردہ رنگین تھم اور موٹی رہنمی کنارے والی چادریں پیسے منٹھکے شکلیں بنائے بیٹھی تھیں اور ایک کھیس سے ڈھکے ہوئے پلنگ پر ایک بوڑھی عورت فکر مند سی بیٹھی تھم اور سر ٹک رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گھر کا بڑی بوڑھی ہوں گی حقیقتاً ہی ملک کی والدہ بڑی ملکنی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ وہ اٹھ کر میرا استقبال کریں گی۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی میں متحسنتی ہوئی پلنگ کے قریب رُک گئی۔

بوڑھی ملکنی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے دو نشانے کا پلو سر کا کر گروں سے لے کر ناک تک ڈال لیا اور اب میں صرف اس کی تیز آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھی جو مجھے سختی سے گھور رہی تھیں مجھے اتنا غصہ آیا، اتنا کہ میں نے جی میں دعا کی کاش ان سب غور توں کے در پردہ ہونے لگے۔

”مرعین کہاں ہے؟“ میں نے اٹھ اٹھ کر پوچھا۔ سب عورتیں جنگلی ہرنیوں کی طرح گردنیں اٹھا اٹھا کر مجھے حیرت کھڑے کر رہی تھیں۔

”بیمار کہاں ہے؟“ اب کے میری مائی نے انتہائی کڑخت زبان میں سوال کیا۔

”اند کا نام لو، بیمار یہاں کہاں؟“ ایک عورت نے دونوں طرف چھدی ہوئی ناک کی ٹاپس نکالیں چوکا کر بڑی ہی کڑخت آواز میں جواب دیا۔ سب کی معائنات نظر نہ بھی پڑتیں۔

میں نے سمجھا میں دیر میں پہنچی ہوں، اسی لیے سب کی نفرت کا نشانہ ہوں۔ شاید بے چاری ختم ہو چکی۔ اور

انہوں میں ڈوبی ہوئی دوبارہ ملک کی صوفیوں سے ٹھنسی ہوئی بیٹھک میں پہنچ گئی۔  
 ”مجھے افسوس ہے ملک صاحب میں مریضہ کو نہیں دیکھ سکی۔“ اور میں نے دیکھا کہ اس قہرے سے بھائی کے چہرے کا رنگ یوں  
 اڑ گیا جیسے اسے شدید صدمہ پہنچا ہو۔ طاہرہ سے بھائی کو تعلیم کے لیے ٹیس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔  
 مگر ملک صاحب کے پٹے ہوئے چہرے پر کوئی غمناکیاں نہ ہوئیں۔ ”خوہ! ڈاکٹر ٹی صاحب میں نے ابھی تک والدہ سے ذکر  
 نہیں کیا کہ لاہور سے ڈاکٹر ٹی بلائی ہے۔“ یہ کہہ کر ملک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔  
 ”مگر ملک صاحب اب اندر جاتے سے کیا فائدہ؟“ میں نے گردن جھکا کر کہا۔  
 ”ڈاکٹر ٹی صاحب آپ بڑا نہ مائیں جی، دراصل میری والدہ رحمہ ورجہ کے خلاف جانا پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے میں نے  
 ان سے پہلے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

لیکن گھر کے اندر پہنچ کر ملک اور بڑی ملکنی کی جھک جھک شہزادہ ہو گئی۔ وہ بار بار میری طرف اشارہ کر کے منہ بنا بنا کر  
 چنبٹنے سے کہتی۔ ”بیچارہ کہاں ہے؟ بیچارہ۔۔۔“ ہنہ بھارا!  
 یہ قصہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بعد میں ملک نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھ کر دھیرے سے بتایا کہ بڑی  
 ملکنی تو آپ کی یہ بات ناگوار گزری ہے کہ آپ نے پہلے پہل کی زچہ کو بیچارہ کہہ دیا۔ زچہ کی آپ جانتی ہیں بڑی مبارک چیز ہے۔  
 ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

”وہ سائنس محل میں ہے!“ ملک نے ایک کمرے کے دروازے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے گوہر مقصود کا پتہ دے  
 رہے ہوں۔ اور میں بچائے ہونے کے کھسیا کر رہ گئی۔

میں نے سے ایک دروازے اور بغیر کھڑکی اور دروازے کے پڑانے طرز والے کمرے میں ہونے والی زچہ بھتی۔ وہاں بھی  
 مانی خواتین تھیں، اور ایک سٹری ہوئی عورت اس کا پیٹ پکڑے بیٹھی تھی۔ ساتھ کئی عورتیں اس کا سر باغہ پاؤں دبا رہی تھیں۔ زچہ  
 ہچک ایک تار ایک کونے میں تھا اور اس کے علاوہ کئی اور ہلنگ بھی کھیسوں سے سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر قسم قسم کے خوبصورت  
 پتوں، اور آئینوں سے آرائش اس حد تک تھی کہ دیوار ہر شکل نظر آتی تھی۔ یہ محل تھا۔

زچہ تیس بیٹیتیں بہانہ عورت تھی اور اپنے علاقے کے تمام زیورات سے مزین تھیں۔ اگر اس کے دروازہ پر ہونا تو کافی  
 بھی معلوم ہو سکتی تھی۔

میں نے مانی سے مخاطب ہو کر کہا کہ مریضہ کو فوراً اس ٹھنڈے اور گھٹے ہوئے کمرے سے کسی اور جگہ منتقل کیا جائے۔  
 مانی نے عورتوں کے سامنے تجویز رکھی اور بلڈ ساج کیا۔ انگلیاں ناگوں اور دانتوں پر پہنچ گئیں۔ اور اس ہلڈ  
 ڈیو ملکی ہانپتی ہوئی آگئیں۔

میری تجویز ایوان کی متفقہ رائے سے مسترد ہو گئی، کیونکہ اس قسم کا کمرہ ہر گھر کا محل کہلاتا ہے اور ضروری ہے کہ گھر کی بہو  
 جگہ اپنے بچے کو جنم دے۔

”عورتیں کمرہ خالی کر دیں۔“ یہ میری دوسری تجویز منظور ہو جاتی تھی۔ لہذا میں نے مانی سے کہا کہ وہ زچہ کے پانچ ٹیکس

کی ادب کے کھڑی ہو جائے تاکہ میں مریضہ کا معائنہ کر سکوں۔

پہلے لڑکھائی تھی۔ سر رینے نے بتایا کہ بڑی غنوں مرادوں کے بعد یہ دن پوسے پوسے ہیں۔ ورنہ پہلے تو کبھی نو چھینے پورے ہی نہ آتے۔ ایک فقیر فی کستی تھی، ایک جان رسبگی، ماں یا بچہ۔ میم صاحب و ووفی کو بچاؤ بڑا، غلام دیں گے، خوش کر دیں گے۔ "مریضہ در واد وادو" سے سفید ہو رہی تھی۔ جس نے اسے نسل دی اور کہا کہ سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہ سن کر غمنوئیت سے مریضہ کے آنسو نکل آئے۔ "ناک سے رطوبت بہہ آئی۔ دو مال سے اس کے آنسو پونچھ چکنے کے بعد ناک پر پونچھنے میں بڑی دقت ہوئی کیونکہ ہم نے کی بڑی بڑی کیلور سے دو ذراں تھپتھپے دھکے ہوئے تھے۔

میں نے دینے کو تستی دے دی مگر یہ فقرہ سن کر خود پہ پشیمان ہو گئی۔۔۔۔۔ کبھی عمر کی اولاد ذرا مشکل سے ہوتی ہے اور بچر زچر کو دور بھی پڑے بنے ٹکے تھے۔۔۔ اور بچے کے قلب کی حرکت مست۔ میں نے اللہ میاں سے دعا کی کہ عزت رکھ لینا۔۔۔ ورنہ ماپیس کے لیے کبھی تک نہ کیا خاک نہ ملے گی۔

دات آگئی اور عورتیں بدستور آپس میں بولتی رہیں۔ اور باری باری مریضہ کا جسم دباتی رہیں۔ رات نے ایک دفعہ پتکیے سے کہا کہ میں بھی مریضہ کا پیٹ پکڑ لوں کیونکہ عورتیں کشتی ہیں، یہ ڈاکٹر فی محنت عورتی ہے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔ میں نے مانی کے حکم کی تعمیل کی۔

جب مریم نے زور سے کہا ہے اور ہونٹ کاٹنے لگی تو میں نے صوب عورتوں سے باہر نکل جانے کو کہا۔ لیکن کئی عورتیں نپکیں اور پانگکے پاس دو اینٹیں رکھ دیں اور سب مل کر زچہ کو اٹھانے لگیں تاکہ وہ اینٹوں پر اکڑوں بیچہ ہائے۔

”بسم اللہ، خیر اللہ“ مریم نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی تھی اور میں یہ صورت حال دیکھ کر خوف سے بیچ پڑی۔

”سب مجبور ہو، بھاگ جاؤ یہاں سے، تم لوگ اسے مار ڈالو گے۔“ مورتیں اس مداخلت پر پھر ہر نہانے لگیں۔ مائی نے نہ بچہ کو بازوؤں سے پکڑ کر لٹا دیا۔ اور مجبور کسی بغیر کسی اور لٹ کے کچھ سب کے سامنے ایک کمزور سی آواز میں روسنے لگا۔

مبارک سلامت کا شورا تھا اور باہر سے جتنی عورتیں اندر آ سکتی تھیں انہیں باقی دروازے میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس وقت زچہ کی حالت نازک ہے۔ میں نے بلیدنگ کم کرنے کے لیے اسے انجکشن گنٹیوں کے ٹھیکر کے درمیان دیا۔ سوئی دیکھ کر کئی عورتیں دروازے کراہ اٹھیں، زچہ کو غش آ گیا تھا۔

اچانک باہر بند دروازوں کے فائزر ہونے لگے اور پھر ڈھول نفیر پیاں بجنے لگیں۔ اس کے بعد رسموں اور گنگوٹوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی بار میری توجہ زچہ و بچہ کی طرف سے ہٹ ہٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے یہ ساری چیزیں دلچسپ تھیں، مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس گھر کے تمام حاضرین کا رویہ ابھی تک میرے لیے دوستانہ نہیں تھا، حالانکہ میں نے کئی برسوں میں دوسری عورتوں کی دیکھا دیکھی روپے بھی دیے۔ لیکن مجھ تک مجھے قدم قدم پر زچہ و بچہ کی زندگی کی خاطر ان سے ٹھیکڑا نہ بھی پڑتا تھا اس لیے میری دلجوئی بھی ادھر ہی اوپر نہ گئی۔

رات بھر ڈھول بجا، کرچہ کو پوری نیند لینا چاہیے مگر یہ کہ اسے بخار تھا۔ مگر وہ خود اس ہنگامے میں اتنی دلچسپی محسوس کر رہی تھی کہ میں بے بس ہو کر سونے کی کوشش کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتی۔

صبح جب ہم ناشتے کے لیے، ملک صاحب کے بلاوے پر پہنچ گئی تو میرے جانی نے بتایا کہ باہر بھی رات آتش بازی پھوٹ رہی ہے اور ملک کے سینکڑوں مزارعوں نے ناچ گاکر میچ کی، اور ملک صاحب کو بچے کی پیدائش کے سلسلے میں بڑی نذرین ملیں — میں اس نذرین والی رسم پر کافی حیران ہوئی۔

لیکن دوسرے دن میری حیرانی شدید خوف میں تبدیل ہو گئی جب کہ وہ واقعہ ہوا۔

ایک تو سردی کا زمانہ اس پر سے سو پر سے ہی سے ہادی آنا شروع ہو گئے — میں نہانا جا ہتی تھی کیونکہ مجھے اپنے جسم پر غلط پٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی — یہ تو میں نے بالکل بے فکرانہ تھا کہ اس گھر میں میری سب سے زنائی ہے اس لیے میں نے نہانے سے بے گرم پانی کسی سے طلب نہ کیا — سات بج کر چھ کی بجائی کے بعد بخار کی شدت میں مغزڑی سی فینڈ لینے کے بعد جب زچہ نے میری طبیعت کو دیکھی اور اس کی آنکھیں پیروں کی کیلوں کے ساتھ چمکیں تو میں نے اس سے کہا کہ کیا نہانے کے لیے گرم پانی مل جائے گا۔ ”جسم اللہ ضرور نہاؤ گی“ اور پھر اس نے مسکرا کر بچے کو گھیرے بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے ایک سے کہا کہ بھاگ بھری سے گرم صابن کے لیے پانی گرم کر دے۔

زچہ کو ہلکے دینے کے بعد میں نے مائی سے کہا کہ سنوٹ کیس سے میرے کپڑے نکالے۔

دیکھنے تو جی نہیں میم صاحب ہم انعام میں دیں گے؟ زچہ نے میٹھی ادا سے مسکرا کر کہا۔

اور مجھے بہت بُرا لگا، خدا جانے یہ گنوار ملنی مجھے کوئی دائمی خدمتگار سمجھتی ہے جو بیٹا جھنے کی خوشی میں جوڑا دے گی۔

”ہم ڈاکٹر ہیں ملنی، اپنی مفردہ فیس لیتے ہیں جوڑے نہیں“ میں نے غرور سے منہ جاکر جواب دیا اور وہ حیرت سے

بے دیکھنے لگی۔

”میم صاحب تم نے ہماری خدمت کی ہے، پھر ہم تو سبھی کو کچھ نہ کچھ دیں گے — اور تم نے یہ دن دکھایا ہے“

”اچھا اچھا میری مائی کو دے دینا میں تو —“

اسنے میں ایک دس بارہ سال کی لڑکی ابدر بھدر بھاگتی اندر آ گئی۔ خوب ندرست، چھٹی سارنگ، ماتھے پر مہین گندھی

روٹی بینڈ جیوں کی عراب، کاتوں میں چاندی کے بندے — یہ بھاگ بھری تھی۔

”ہم اسے بھی جوڑا دیں گے، جیسا جوڑا ہے؟ زچہ مجھے اپنی بات کا قائل کرنے پر تپتی ہوئی تھی۔

اور بھاگ بھری مجھے دیکھ کر ایک دم شرمانے لگی۔

”پانی رکھ دیا بھاگ بھری، میم صاحب کو غسل لینے سے جاؤ؟“ زچہ نے اس سے کہا۔ اور میں نہانے چلی گئی۔

نہاتے ہوئے میں جھلا جھلا کر سوچتی رہی کہ کیسے لوگ ہیں، کسی کی ہزنشین تک کو نہیں مانتے — جوڑا دے گی

مجھے، ہنڈ!

جب میں نہا کر سر پر تو میرے پیٹے ٹکلی تو میرے بال سکھانے کے لیے صحن میں بیٹھ کر آتی باقی دھوپ میں سسپانے لگی۔

بھاگ بھری نے گھر کے کسی کونے سے مجھے دیکھا اور دوڑ کر مٹی کے کنگڑوں والی انجیلی لاکر میرے پاس رکھ گئی۔ اس وقت

بھاگ بھری میرے دل کو بھاگ گئی۔

گھر میں بڑی پہل پہل تھی۔ چوتھوں پر چوڑی اُڑی چلی آرہی تھیں، اس وقت پھر گانے بجانے کا پردگرم تھا۔  
 اچانک ملک صاحب کھانستے کھنکھارتے زنان خانے کی طرف آئے۔ سب بھگے گری گری نظروں سے دیکھا۔ زچہ و پیر کے  
 بارے میں وہ ایک باتیں دریافت کیں اور پھر بڑی ملکی کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ باہر چلے گئے۔  
 ”بھاگ بھڑیے، بھاگ بھڑیے ملک جی نہاں گئے، تو میرا بھر سٹھانے میں رکھا۔“ بڑی ملکی نے حکم دیا۔  
 اور بھاگ بھڑی اسی طراری سے بعد کو بعد بھاگتی مردانے سٹھانے کی طرف چندی۔

گاسنے بھانے کی تیاریوں کو دیکھ کر میں یور ہونے لگی۔ میں اطمینان سے سو جانا چاہتی تھی۔ میرے خیال میں  
 زچہ کو بھی سکون سے سو جانا چاہیے تھا، لیکن کوئی بس نہ چلا۔ میں نے اس وقت سوچا کہ کسی مغربی مصنف کا قول ہے کہ  
 دیہات صحت بخش قریبی ہیں، مگر میرے امیثیر قریبی کتنی پریشور ہیں، کتنی خدائی، بیٹھی لاشیں ہیں۔ کتنی یکساہیت ہے۔ میں تو  
 ہوں ہی شہر کا کٹڑا، مگر شرط بد کہ دوں کہ شہر کے مرغی یا کتنے تک کو یہاں نے آؤ تو، مراقبہ میں جا کر جان دے دیں۔ میں نہایت تنہی  
 سے سوچتی رہی، سوچتی رہی، مجھے اپنے روز کے دوسو روپوں کا خیال تک نہ آیا۔ اور پھر جیسے موت کے مراقبہ میں جھونک کھائی۔  
 درحقیقت مجھے سخت مینڈ آرہی تھی۔

اچانک بھاگ بھڑی روتی، گھسٹتی میرے پاس سے گزری، اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ دفعتاً وہ ڈنگائی اور زمین پر گر گئی۔  
 اس کا نیلا تھمد خون کے دھبوں سے لال ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر اسے اٹھانے لگی۔ کانیں کانیں شروع ہو گئی اور پھر ایک دم  
 باورچی خانے سے ایک عورت دوڑتی ہوئی آکر میں میں ملی آواز میں رونے میں کرنے لگی۔ یہ بھاگ بھڑی کی ماں تھی۔  
 بھاگ بھڑی نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

”مٹے، ملک جی! ملک جی! بھاگ بھڑی نے ماں کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ماں پھر زور زور سے  
 بین کرنے لگی۔

ظاہر ہے کیا ہو چکا تھا۔ میں ابک کنواری لڑکی بن کر دہشت سے کانپ رہی تھی۔ تمام عورتیں اکٹھی ہو گئیں۔ مائی  
 مجھے پک پکاتا دیکھ کر سہارے سے زچہ والے کمرے میں سے آئی۔ اچانک صحن سے بڑی ملکی کی دہنگ آواز شور کرنے لگی۔  
 مائی دوبارہ ٹوہ بیٹے باہر چلی گئی۔ میں سن سی بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ذرا سی خاموشی طاری ہو گئی۔ زچہ اب تک آنکھیں پھاڑے باہر کی آوازوں پر کان لگائے ہوئے  
 تھی۔

جب مائی باہر سے آئی تو اس نے چپکے چپکے مجھے قہر مختر کر کے سنایا کہ بڑی ملکی بھاگ بھڑی کی ماں کو روک رہی  
 تھی کہ بچے والے گھر میں رونا مت ڈالو۔ لیکن جب وہ اپنی بچی کی حالت کے میں ہی کرتی گئی تو بڑی ملکی آپے سے باہر  
 ہو گئیں کہ تیری لڑکی خود ہستاٹی ہوئی ہے، تو غیر رکھ کر وہاں لڑکی کون؟ مرد ہے کیا کرے۔ اور یہ بھی کہا کہ بڑی بیٹی کی عزت  
 کی دہائی دیسے والی آئی، وہ دن بھولی گئی جب تیرا خاوند کھیتوں پر ہوتا اور تو ملک جی کی بیٹھا میں۔ اس پر بھاگ بھڑی نے  
 رو رو کر اپنی ہم چشموں سے فریاد کی، تو بڑی ملکی اور بھی صلی گئیں کہ دیکھیں کون ہیں مریم بیٹیاں، جنہیں تو پکار رہی ہے۔ اب اس پر



چپ چاپ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں صاحب اس کا بھی علاج کر دوں گا۔“ زچہ نے میری طرف لمبا جھٹ سے دیکھ کر کہا۔ اور میں اس دیہاتی جاگیردار کی غلطی کے سامنے سناٹے میں آ گئی۔

بھاگ بھری کی تکلیف کا جو بھی مداوا ممکن تھا وہ میں نے کیا۔ بھاگ بھری اس وقت کتنی بے جس ہو رہی تھی۔

ایک دن اور گزر گیا۔ دو دو چار آنے کی وجہ سے زچہ کا بخار بہت زیادہ تیز ہو گیا، وہ بار بار غافل سی ہو جاتی۔ ایک اسی دن میں واپس چل دی۔ شاید میں زچہ کی حالت دیکھ کر ایک دن اور ٹوک جاتی، لیکن اسی دن بھاگ لینے میں میری مائی کا شدید اصرار شامل تھا۔

تصدیروں ہو، اکہیں صبح صبح اپنے جانی کے ساتھ قیمتی صوفوں سے تھنے ہوئے دیوان خانے میں مرغ اور پرائیڈوں کا ناشہ کر رہی تھی اور ملک صاحب بھر سے زچہ بچہ کی غیر میت پوچھ چکے تھے۔ بعد باہر دھوپ میں اپنے سرخوٹ پوز میں دھوپ لے سہے تھے، اور ان کے سکاڑے کنوئیں کو صبح کا راتب تقسیم ہو رہا تھا۔ قریب ہی کہیں ڈھول نفیری بج رہی تھیں، اور اس لمحے میں نے طے کیا کہ دو ایک دن اور زچہ چاہئے، پیسے ہیں رہے ہیں۔

اس لمحے کے بعد قریب کے ایک مکان کی ادٹ سے نکل کر بھاگ بھری کی ماں آتی نظر پڑی۔ جاڑے کی دھوپ میں اس کا سیاہ فام سرخ لمبا کرتہ اور گہری زرد چادر چمک رہی تھی۔ وہ ڈھبی چال سے چل رہی تھی۔ اس کے سر پہ ایک بڑا خال تھا جو گوتا لگے سرخ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے اور بھی کئی عورتیں تھیں، وہ بھی کچھ نہ کچھ سر پہ اٹھائے ہوئے تھیں اور مرد بھی تھے۔ بعض ناچ رہے تھے اور بعض ڈھول نفیریاں بجا رہے تھے۔ بھاگ بھری کی ماں کی تباہت میں یہ جلوس بالکل قریب آ گیا۔ سب پر جھکوتے ہوئے کتے بھونکنے لگے۔ ڈھول کی دھم دھم اور اچھٹ پھانڈتے مردوں کی ہڈیوں سے ملک صاحب کے ہاتھ پر چٹھا ہوا بانہ ایک دم اڑا اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ اور سب کے بعد اکوڑتے برستے گھوڑے کی لگام ایک شخص کی طرف اچھال کر تھا نیندار ملک صاحب کی طرف بڑھا۔

جوبلی کی ڈیوڑھی سے عورتیں میلاب کی طرح باہر آ گئیں۔ بہت سی ریشمی کپڑوں والیاں دیوان خانے میں بھی گھس پڑیں۔ میرا بھائی گھبرا کر باہر نکل گیا اور میں نے عورتوں کے جھوم میں دھنکے کھانے ہوئے دیکھا کہ بھاگ بھری کی ماں نے غافل اتار کر ملک صاحب کے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

”بچے کے کپڑے آئے ہیں،“ کا شور اندر سے باہر تک برپا تھا۔ میں ایک دم اندر مائی کو ڈھونڈنے بھاگی۔ آنگن خالی تھا۔ زچہ خالے میں زچہ پٹنگ پر بیٹھ ہوئی تھی اور بھاگ بھری کی مینڈھیاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اور اس کا چہرہ بالکل ویسا ہی ہو رہا تھا جیسے وہ دروازہ میں مبتلا ہو۔ مجھے دیکھ کر وہ چمک پڑی۔

”بذمیر نے پانی بستر پر گرا دیا۔“ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور اس کا چہرہ ایک دم یوں پُر سکون اور مسودہ ہو گیا جیسے وہ ابھی ابھی بچہ جن کر فارغ ہوئی ہو۔ بھاگ بھری کے دونوں گالوں پر آنکلیوں کے سفید نشان ابھرے ہوئے تھے اور بستر کا کوسہ پانی کا نام تک نہ تھا۔



میں نے جلدی سے مائی کو ڈھونڈ کر اس سے گھس پھس کی، وہ تھکتے سے میری ہم مذا ہوئی اور ہم فوراً چلے کوئی راہ ہو گئے۔  
..... مجھے ان لمحات میں یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایسے گھر میں ہوں، ایسے گھر میں جس کی دیواریں گر چکی ہوں۔

گھر بچ کر تین دن کے پھر سمورے پہلے والد کو ملے، ہاتھ پر رکھتے ہی برائے زور کی بھونٹ شمر مچ ہوئی، صبح یا غلط، مطلب یہ کہ  
میں نے فوراً چپے اُسے جس تماقت کی یا تہیں۔ والد کو کتنیں بالکل ٹھیک کیا۔ بھائی اُسٹا خواہ مخواہ گھبرا کر بھاگ گئے۔  
اس سے پہلے کہ اس کا کوئی فیصلہ ہو، میں یہ بات بتا دوں کہ گھر نہ ٹوپی کے جس جالوس کی قیادت بھاگ بھری کی ماں کر رہی تھی،  
تختیار صاحب کے گھر سے آیا تھا۔

# آندھی میں چراغ

## مست از شیریں

کوئی اندوازہ کھٹکٹا رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے پوچھا: ”کون؟“ اور اپنے بچے کی آواز سن کر اس نے چٹنی کھیل دی جو اندر آگیا اور اس کے دل میں ایک ہرک سی اٹھی۔ کتنا بھلا ہوا تھا وہ۔ اس کے پیسے میں تر بالوں کے بچے سے بن رہے تھے۔ جتنا جلدی اس کے نکلے ہوئے برقع، بھاری پاؤں اور پھولا ہوا بیٹ اسے لے جاسکتے تھے وہ اندر گئی اور گھر سے بیس سے پانی نکالی۔ وہ پانی ڈالنی جا رہی تھی اور وہ لا غور منہ دھو رہا تھا۔ پیسے میں ڈوبے ہوئے گرم چہرے پر پانی کی ٹھنک انتہائی ایسی بھلی لگ رہی تھی کہ وہ چلو میں پانی بھر بھر کر نہ پر اچھالنے لگا۔ ٹھنڈے پانی کے لمس سے اسے فرحت محسوس ہوتی اور وہ محبت اور شکر کی نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے چار پائی پر جا بیٹھا اور وہ اسے کھانا پینے کے لئے تجنہ بچانے لگی۔

رہنے دو نیلا میں کچھ دیر بچہ کھاؤں گا۔ یہاں بیٹھو۔ کچھ دیر۔“

”نہیں، پہلے کھاؤ، بعد میں باتیں ہوں گی۔“ اس نے کچھ شرماتے ہوئے جواب دیا۔ وہ تجنہ پر بیٹھ گیا۔ کھانا پر اس کو وہ پھر رسوا ہی ہو گئی، اچانک اس کے پیٹ کے پچھلے حصے میں ایک تڑپا دینے والی ٹپس اٹھی۔ اس کی آنکھوں سے اندھیرا اچھا گیا۔ پیٹ پاٹ کر بیٹھ گئی۔ درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ انت نے اسے دیکھ لیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر اور جلدی سے ہاتھ دھو کر رسوا کی طرف بھاگا۔ کیا ہوا نیلا، نیلا کیا ہوا تجھیں؟ وہ اس پر جھک گیا۔

”نہیں تو، کچھ بھی نہیں، بولنی چکرا گیا تھا۔ ایسے نوٹوں چکسا ہی جا یا کرتا ہے۔ کوئی بات نہیں،“ لیکن انت نے اس کے چہرے کو دیکھ کر جان لیا کہ وہ بھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی تسلی کے لئے وہ کہہ رہی تھی یہ کوئی بات نہیں تم جا کر کھانا کھاؤ۔“

”مجھے بھوک نہیں نیلا،“ وہ بھی جھوٹ بول رہا تھا۔

نیلا کے بھرورہ ڈاکھا۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں گھٹنوں میں چھپا لیا تاکہ انت اس کے چہرے پر مرکب نہ ہو سکے۔ لیکن انت نے نیلا کو نہایت احتیاط اور نرمی سے بازوؤں پر اٹھالیا۔ اور اندر چار پائی پر لٹا دیا۔ پاس کی

نہی کی کہ بچے کے ہٹ بند کر کے اس نے بوسیدہ کپڑے نہایت احتیاط اور نرمی سے اڑھا دیا۔ نیلا نے پھر کہا: ..... اب مجھے

..... فرماؤ کھا نا کھا لو۔  
مجھے بھوک نہیں ہے نیلا۔ وہ نیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ وہ اپنی بیوی کو نکلے جا رہا تھا۔ پریشان

نہی بھی نظروں سے۔ نیلا بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں پریشانی تھی اور محبت تھی۔  
ان کے چہرے میں کوئی کشش نہ تھی۔ انہیں کاسو کھانا جسم ایک ایسا ہی تھی۔ وہ نیلی ڈھالی قیص اور صحتی میں چھپا ہوا تھا۔

..... نیلا کا پیٹ ہمیشہ بھولا رہتا تھا۔ وہ موٹی موٹی میل خور سے، لگوں کی ساریاں پہنے ہوئے، کہہ چکے کے پاس کام کرنے سے بڑی ہی بیگناہ  
..... دکھائی دے وہ کنگھی چوٹی کے بغیر وہی جبر کام میں مصروف رہتی تھی۔ وہ تو بصورت نہ تھی۔ فوجی میں جو کچھ دیا

..... میں نہیں بھی ان میں تھی۔ وہ بھی غصی نے چھین لی تھی۔ انہیں کاسو کھانا جسم ایک ایسا ہی تھی۔ اس کے کال اندر دھنس گئے تھے۔ نیلا کا  
..... ہاتھ ہلکی کی طرح زبرد پر گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد کانے کانے حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی ہر حرف ستائش سال تھی لیکن وہ

..... نہ جانے وہ کیا چیز بھی جس نے ان کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا تھا۔ کیشش ظاہری حسن اور  
..... انہیں شش سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

..... ماں باپ اور نہ سب سے ایک دن ان کا سمجھ کر دیا اور وہ ایک دوسرے کے ہر گھٹے نیلا جانتی تھی۔ نیلی کی پریشانی چھپا  
..... اس کی خدمت کرنی چاہیے اور وہ اس کی پریشانی کرنے لگی، خدمت کرنے لگی۔ انہیں جانتا تھا کہ ایک کمزور سی چیز اس کے سپرد کی گئی

..... ہے اس کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کرے۔ اس کا ہر طرح خیال رکھے اس کے لئے کماؤ، اسے سہارا دے، اور اسے چاہے۔  
..... ہر دور میں ہی جو ساری زندگی اس کا ساتھ دے گی، اس کا کھڑے ہو جائے گی، اس کے بچوں کی ماں ہوگی، اس طرح ان کے دل مل گئے

..... ایک دوسرے کے چاہنے لگے تھے۔ اور بوسوں کی نفایت نے ان کی محبت کو گہرا کر دیا تھا۔ بوسوں کے ساتھ رہنے اور ان کے لئے کچھ بچوں  
..... کے لئے زمینوں، لوں کے اس طلب کو مضبوط کر دیا تھا۔

..... نیچے جو اب تک باہر کھیل رہے تھے، ناچنے کو مارتے اندر آ گئے۔ ماں بھوک لگ رہی ہے، اے! اس نے اٹھنا چاہا۔ انہیں  
..... اسے۔ ہر دوپٹی لٹا دیا۔ نہیں نرم سو جاؤ، میں ان سب کو لٹا دے لوں گا۔ بچوں کو حیرتیں لگا ہوی سے کھانے کو تکتے اور بڑے بڑے

..... سے بڑا کر لیتے دیکھ کر اور انہیں کو بے ڈھنگے بن سے پرہیز دیکھ کر اسے ہنسی آگئی۔ لیکن وہ زور سے نہ ہنس سکی۔ اس کے پیٹ  
..... پیٹ تھے میں حیران چاہتا ہوں وہی دروازہ رہا تھا۔ اس نے منہ موڑ لیا۔ لیکن انہیں نے اس کی آنکھوں کا کوب دیکھ لیا تھا۔ وہ بچوں کو کھجور کے

..... کے پاس آگئی۔  
..... نیلا کی تکلیف سے نہیں؟ اس نے بے قرار لہجے میں پوچھا۔  
..... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ..... کہ مجھے..... مجھے درد و شہد ہوئے ہیں اس نے رک رک کر جواب دیا۔

..... نیلا تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تمہیں.....  
..... میں، ابھی اٹھواں مہینہ ہی تو ہے، جانے کیوں ابھی سے.....

..... میں نہیں ہسپتال لے جاؤں گا۔ نیلا۔ وہ اپنا بوسیدہ کوٹ پہن کر ٹانگہ لٹے چلا گیا۔ بچوں نے بھی ماں کو پریشان دیکھ کر

جلدی جلدی کھانا کھا لیا اور سب چار پائی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ "تھالا جی اچھا نہیں ماں؟ کیوں چھوٹی ہوماں؟ کچھال ہے ولدہ درد ہے۔" کہاں؟ میں چوم لوں تو اچھا ہو جائے گا نا؟" اور سب سے چھوٹا بچہ اسے چومنے لگا۔ اس کے پیٹ کو اس کے امد بازوؤں کو اس کے پیروں کو اس کے سینے میں مسرت جاگ اٹھی۔ کتنا پیار کرنے میں اسے۔ اس نے ننھے کو اٹھا کر خوب چوم پھلویں لٹالیا۔ آخر اس نے زندگی میں کیا سکھ پایا تھا مغسی بھوک، مصیبتیں، لڑ بھرجیں آرام نصیب نہیں۔ لیکن بچوں کی یہ عزت کی یہ رفاقت، یہی تو اس کی زندگی کا سہرا بن گیا تھا۔

ٹانگہ آگیا تھا۔ انت پچوں کو ہمارا کمرہ ہمسائی کے ہاں چھوڑ آیا۔ "دیکھو میں کل صبح تمہیں سے جاؤں گا۔ اور تم اپنے گڈا دیکھو گے۔" تھا راتھا بھائی۔ گڈے کا سا "اس نے نیلا کر اپنے بازوؤں پر اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ خود تیزی سے "ٹانگہ میں جا بیٹھی۔

میٹری وارڈس اوپر تھے اور میٹر جہاں بہت اونچائی تک چلی گئی تھیں۔ نیلا کے قدم ڈمک گئے۔ "میرا سہارا نیلا" انت نے کہا۔ پھر خود ہی اسے اپنے بازو سے تمام کر آہستہ آہستہ میٹر جہاں چڑھنا شروع کیں۔ چار میٹر جہاں ملے کرنے کے بعد پھر وہی تڑپا دینے والی ٹیس اٹھی، اور اس نے اپنے سر کے کا کب چھپانے کے لئے اپنا سر انت کے سر پر ڈال دیا۔

وہ لیبر وارڈ میں بڑی انتظار کرتی رہی۔ اب دو دوشوں کے دفعے سے دروازہ کھلا تھا۔ پریت میں۔ در بھر کی ہڈی نہ رہیں تھیں کو لہوں میں۔ اور ہر دفعہ یہ درد شدید تر ہوتا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیٹی پڑتی تھیں۔ وہ اپنے پچلے ہونٹ کو زور سے کاٹ لیتی۔ بچوں اور کمرہوں کو روکنے کے لئے وہ نہیں چاہتی تھی کہ انت اس کی بچوں کو سنے وہ جان لے گا کہ اسے بے انتہا تکلیف ہو رہی ہے اور۔۔۔۔۔۔

اور انت بند دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس پر ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ وہ بے تاب ہو کر ٹپٹنے لگا پھر بچہ پیرا کر بیٹھ جاتا اور بھیٹی بھیٹی آنکھوں سے خلا میں گھوڑنا پھر غور سے سننے لگتا۔ اسے اندر سے تو کوئی آواز بھی نہیں آرہی۔ لیبر وارڈ تو ہمیشہ بچوں سے گونجتا رہتا ہے۔ کہیں۔۔۔۔۔۔ اتنی کمزور تھی وہ۔ کیا اس سخت آزمائش سے بچ نکلے گی؟ اور ایک ناقابلِ بیان درد اس کے دل کو حکم لیا پھر جھکا کر اس نے اپنے دل کی گھڑائیوں سے ایک چھوٹی سی وعاما لگی پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اگر نیلا اس دفعہ نکل جائے تو وہ کبھی اسے بچہ نہ ہونے دے گا۔ اس نے پھر دروازے سے کان لگا کر سننا۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔۔۔۔۔۔ لیکن نیلا ہمیشہ لہوئی سہرے اس زندگی اور موت کی کش مکش کو طے کر جاتی ہے۔ کسی بچے کے وقت اس نے کبھی اس کی چھین نہ سنی تھیں۔ یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی اور وہ بچہ پر جا بیٹھا اور پھر وہی انتظار اذیت ناک انتظار۔ جیسے وقت بھٹہ گیا ہو۔ ان چند لمحوں کی اذیت میں زندگی بھر کی تکلیفوں کا بخیر ٹھکانا تھا۔ اور اس کی بے قرار نگاہیں دروازے کی طرف اٹھاٹھ جاتی تھیں۔ اب کھلے گا۔ اب کھلے گا۔۔۔۔۔۔

اور اندہ نیلا بے ہوش پڑی تھی۔ بچہ بہت چھوٹا تھا۔ اس نے جلدی پیدائش ہو گئی۔ اس کے نحیف سینے میں رتی بھر ہوائی باقی تھی۔ آواز کا شے ہی میں وہ بچی لے کر خاموش ہو گیا۔ نیلا کو اب ہوش آگیا تھا۔ اس نے بچے کے منہ کی پوچھا بھی نہیں۔

ن کی کسی بھی جہتی جس نے بہ جای لیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ یہ بھی نہیں پوچھ دیکھ ہے یا پھر۔ نرس نے اُسے آہستہ سے تباہ پیر  
جھانپے اور اسے تسلی دی۔ ”اگرچہ جینے کے سبب کبھی زندہ نہیں رہتے اگر اب نہیں تو بعد میں مری جاتا۔ نیلا نے کوئی جواب نہیں  
دیا اور نرس نے نیچے کو آٹھا کر دکھایا تو ایک نظر دیکھا۔ نازک نقش زرد چہرہ لکڑی کی طرح سوکھا جہم۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں۔  
دراستہ اس کی آنکھوں سے نکل کر دہر کی تثلیث پر ڈھلک گئے۔ دوحبت اور دافنائی وہ گرم گرم دھارہ جو تیرے سرے سے  
آٹھ نرس کے سینے میں بہہ آئی تھی۔ سرد ہو کر ٹھہر گئی۔

دروازہ کھلا۔ نرس باہر آئی۔ اُنت آٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح نرس کو گھورنے لگا۔ اس سے کچھ پوچھا بھی نہیں  
جانتا تھا۔ اس نے تباہ پیر پر چلے گئے۔ پیر کا خیال اسے بالکل نہیں آیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ہی خیال پھریٹ چلا  
تھا۔ کافی نیلا نکلی گئی ہوا درائی پاگلوں کے سے انداز میں اس نے نرس سے پوچھا۔ ”اور میری بیوی؟“ نرس نے شاید یہ نہیں  
سنا۔ وہ کہہ رہی تھی ”اگرچہ جینے کے سبب کبھی نہیں جیتے۔“ اب نہیں تو کبھی نہ بھی مری جاتا۔ اس کی اتنی فکر نہ کرو۔ ”اور  
وہ اتنی باگ ہو گیا۔ وہ نرس کو جھوٹا کر دیا۔ ”اور میری بیوی؟“ اور جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے میں گھسے لگا۔ نرس نے  
سے ڈانٹا۔ کہاں جا رہے ہو تم ابھی اندر نہیں جا سکتے۔ کافی لے آؤ۔ اپنی بیوی کے لئے۔“ بیوی کے لئے کافی آخر طرست سے  
سر تکیج کر نکلی پھر اسے گرد و پیش کا خیال آیا۔ وہ جلدی باہر نکل آیا اور قریب کے موٹل سے کافی۔ بے آیا۔

وہ نڈھال پڑی تھی۔ اس نے کافی اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا ”نیلا کیسی ہے طبیعت تمھاری؟“  
”اچھی ہوں۔ صرف کمزوری ہے۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے۔ ایسا ہواڑی کرتا ہے۔ لیکن اس دفعہ کمزوری کی وجہ سے  
طبیعت برباد ہے۔“

دوسری صبح کو بھی نیلا پونسی نڈھال پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی چھوٹ تھی۔ جیسے اس کے جسم سے سارا خون  
جڑوں سے لیا گیا ہو۔ اس نے اس پر جھک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کتنا سرد تھا وہ ہاتھ۔ اس نے آہستہ سے پکارا ”نیلا!“  
نیلا نے آنکھیں کھلیں اور ہلکی سی سر ہٹا۔ اسی لمحے نرس اور لیڈی ڈاکٹر وارد ہوئیں آگئیں وہ نیلا کا ہاتھ چھو کر ڈاکٹر  
کا کھڑا ہوا۔ نرس نے نیلا کے انگوٹھے میں سوئی چھو کر خون نکالا بہت دبانے پر خون کا ایک ننھا سا قطرہ ہلکی نکل آیا اور  
اس سے اس قطرے کو کاغذ پر چپکا کر نال و حار لپوں والے کاغذ کے ساتھ لگا کر دیکھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا کتنا؟ ”پندرہ فی صدی“  
نرس نے جواب دیا۔

”پندرہ فی صدی؟“ ڈاکٹر کے منہ سے چیخ نکلی گئی۔ اس نے اُنت کو باہر بلایا ”تم جانتے ہو تمھاری بیوی کی کیا حالت ہے؟  
میں کہہ جس میں قطرہ بھر بھی خون نہیں جانتے ہو اس کے خون میں کتنا میوگلوں ہے۔ پندرہ فی صدی! تم مرد و عورتوں مرد و عورتوں  
میں اس پر کیا کر رہی ہے۔ تمھیں اپنی پڑی رہتی ہے ہمیشہ۔ شادی کر لیتا اور پھر ہر سال ایک بچہ دے دیا میں بھی معلوم ہے تم لوگوں کو۔  
جس پر بیوی کا بھی خیال کیا؟ حمل کے دنوں میں اسے دودھ اور پھل دتے ہوئے۔ ٹانگ پلائے ہوئے۔ اور پھر ٹیکٹ انجکشن دلائے  
لئے۔ ستر گھنٹہ فی صدی میوگلوں میں ہو تو اس حالت میں عورتیں ٹانگ پتی ہیں، انجکشن لیتی ہیں زچہ اور خون ہو پندرہ فی صدی میو  
گلوں! اور پھر اس نے دانستہ میں کر کہا۔ اور تم لوگ صرف یہ خوب جانتے ہو کہ جب وہ موت کے منہ میں پہنچ جائے تو اسے

ہسپتالی میں لاکر ٹیک دیا جائے۔ وہ نیلا کو نہیں چاہتا، نیلا کا خیال نہیں رکھتا ڈاکٹر کا ہر جملہ مہموٹے کی ضرب بن کر اس کے دل پر پڑ رہا تھا۔۔۔۔۔ پھل اور دودھ اور ٹانگ۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو کیا وہ ای چیزوں کا ڈھیر نہ لگا دیتا۔ نیلا کے لئے اور اب نیلا کے جسم میں قطرہ برابر خون نہیں، نیلا موت کے منہ میں ہے۔۔۔۔۔ پھر ڈاکٹر کی آواز کچھ دھیمی پڑ گئی۔ سنوٹ سے بہت سے فوریکسٹر ٹیکٹ انجکشن دینے پڑیں گے اور ہر انجکشن کی قیمت اڑھائی سے تین روپے ہے۔ کیا تم ادا کر سکو گے ان کی قیمت؟ اس سے اس کا جی چاہا کہ ڈاکٹر کے پاؤں کپڑے اور کئے۔ میں کسی طرح ادا کروں گا ڈاکٹر! بس تم میری بیوی کو بچا لو۔

اور ہسپتال کا بل چکانے کے لئے اس نے قرض لیا۔ دفتر کو بس میں جانا چھوڑ دیا۔ سینے سے مگر ٹیک بھی چپے ترک کر دئے۔ ان چند گھنٹوں سے وہ نیلا کے لئے پھل خرید لے جانا۔ نازنگیاں اور سیب، بائیں چھوٹے سے چھوٹا سیب بھی چار آئے ہیں آنا تھا۔۔۔۔۔ اور نیلا کو دن میں تین چار بار انجکشن دے جانے۔

لیکن وہ ذہنی مدحال پڑی رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید سے سفید تر ہوتا جا رہا تھا خون کی کمی کی وجہ اس کے ماتھے پاؤں اتنے سرد ہو گئے تھے کہ ان میں گرمی قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ ربر کے ساکس سے چرٹھائے جاتے اور گرم پانی کی ٹھیلیاں اس کے پاؤں کے نیچے رکھی رہتیں اور وہ اس کے ہانگ کے قریب بیٹھا گھنٹوں اُسے لگا کر تا اور نیلا کی نگاہوں کا کرب اس کی آنکھوں میں منتقل ہو جاتا۔ لیکن وہ اس کرب کو نیلا پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا: تم اچھی ہو جاؤ گی۔ نیلا ضرور ادریں تجھے تمہی ٹانگ لادو نگا۔ اور پھل اور دودھ، تم تندرست ہو جاؤ گی، نیلا میں سوچے جمع کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ نیلا مسکرا ہٹ سے اسے ننگ دہی غنی اور اچانک معلوم ہو جاتا کہ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک بھی کی جھڑکی ہے۔ اُو اس مسکراہٹ صرف اس کی تسلی کے لئے ہے۔ اور اس کا دل خون ہو جانا۔ جب کبھی وہ بچوں کو لے آتا اور وہ ماں کے پیٹ کے گرد کھڑے اسے حیران نگاہوں سے دیکھا کرتے تو وہ بچوں کو عجیب سے انداز سے نشتی۔ جیسے انھیں چھوڑ کر کہیں جا رہی ہو۔

اور ایک رات وہ مسلسل کراہتی رہی۔ اس کا بدن چھوٹے کی طرح دکھ رہا تھا۔ رگوں میں شے ہو گئے ان میسینوں غلجین کا اور کمزوری کی وجہ سے شدید ہو رہا تھا۔ وہ ماتھے پاؤں ہلاتی تو درو کے مارے بلبلات مٹھتی۔ اور انتہے زسوں کی منت کی کہ آج رات اسے یہیں سو جانے کی اجازت مل جائے۔ وہ یہیں کہیں کو نہ جی پڑا رہے گا۔ لیکن آنکھوں نے بھڑک کر اسے نکال دیا رات کے فوٹے کے بعد کوئی بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ لیکن نیلا نے دیکھا تھا کہ بازو کے پیش واد ڈوالی لڑکی کا شوہر رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ تک اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اور یہی ترسین خاموشی سے بند و راز سے کاٹھل کھولی دیتی تھیں اور جب وہ لڑکی بھی اس کے شوہر کو در تک پہنچا کر خوشی سے جھومتی ہوئی واپس آتی۔ تو ترسین اسے اندر چھوڑنے کے لئے دروازہ پرکے پاس ہی، جو نیلا کے کمرے کے سامنے تھا، کھڑی رہتیں اور ہنس ہنس کر اسے چھیڑتی۔ بڑی محبت سے ہم دونوں ہیں۔۔۔۔۔ غریبوں کی محبت کو تو کوئی نہیں پہچانتا۔ پہچانے بھی تو پروا نہیں کرتا۔ اس نے ایک آہ پھر کر کرٹ لی اور وروس سے تڑپ کر کہہ کر دی۔ وہ رات بھر کراہتی رہی۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا کبھی بھی چڑچڑائی ہوئی نہ اس کے پاس سے کہنی اتنے زور سے

کراہتی ہے۔ دوسرے مریضوں کی فینڈ خراب نہیں ہوتی؟ اور وہ اسے فینڈ کا انجکشن دے کر چلی جاتی اس رات اسے فینڈ کے کئی انجکشن دے گئے۔ لیکن اسے فینڈ نہ آئی۔۔۔۔۔

صبح کو وہ بالکل خاموش تھی۔ اب اس میں کراہنے کی بھی سکت نہ تھی۔ انت آیتا تو اسے خاموش دیکھ کر سمجھا اب اسے تکلیف نہیں ہے۔ لیکن شام کو یڈی ڈاکٹر نے تیکہ کا معائنہ کر کے مایوسی سے سر ہلایا۔ اور انت کو باہر بلا کر کہتا اب ایک ہی امید ہے۔

وہ کیا ہے؟ وہ بالکوں کی طرح چلا یا۔

[illegible]

انسانی خون بہ لیکن کون دے گا اور میری طرف سے کسی دوسرے کو.....  
 انت نے ایک ٹھہری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: اب جو انکسٹن نہیں دیا گیا ہے وہ انسانی خون ہی کا تھا.....  
 لیکن، لیکن، کون..... اور پھر وہ جان گئی اور اس نے محبت بھری نگاہوں سے جی میں اب جھجک بھی آگئی تھی،  
 اپنے شوہر کو دیکھا۔ پھر ان نگاہوں میں گلہ پیدا ہو رہا اور وہ کہنے لگی..... لیکن وہ مجھ نہ کہہ سکی۔ اس کے جوش پھڑپھڑا کر رہ گئے۔  
 اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ چہرہ نیلا پڑنا لگا۔ انت اس پر جھجک گیا۔ نیلا، نیلا..... وہ چلا یا۔۔۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن  
 آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے کان قریب لا کر سنا دیا کہ وہ یہی مٹی۔ نیچے، پیچھے، میں نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ سر پٹ  
 بھاگا اور بچوں کو لے آیا۔ نیلا نے سب بچوں پر بادی بادی نگاہیں جما کر دیکھا، چھوٹے کو اٹھانا چاہا۔ لیکن اٹھ کر بوسے لاکھڑے ہی  
 سے گر گئے۔ اس نے بڑی رفت سے کچھ دیر اپنی نظروں کو انت پر جمائے رکھا۔ لبوں پر پھر وہی آواز اس سے لپٹ کر نمودار ہوئی اور  
 اس کی گردن ڈھلک گئی۔ انت پلنگ کی جی پیر پیر پلنگ کر چلائے گا۔ نیلا، نیلا..... نیچے جیرانی سے ہال کو تک پہنچے  
 یہ چھوٹے بچوں کو سمیٹ کر کرسی پر گر پڑا۔ بڑے نیچے بھی باپ کی کمرسی کے پاس کھڑے چھٹی چھٹی آنکھوں سے دیکھتے تھے، موت  
 آواز ان کی کچھ سے باہر تھا۔ زمین اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کے کے اس پر سفید چارہ ڈال رہی تھیں سفید چارہ اور اتنا ہی

سفید چہرہ، کلمے بھرے ہوئے بال۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا گھومتا رہا۔ لیٹی ڈاکٹر لولی۔ "تم اس کی ارنی کا انتظام کر کے کل صبح اسے لے جا سکتے ہو۔ اس وقت تک نعش نیچے ایک کمرے میں رکھی جائے گی۔۔۔۔۔ اور بل بھی تم کل چکا سکتے ہو۔ مجھے افسوس ہے تمہاری بیوی۔۔۔۔۔" لیکن وہ کچھ لمبی نہیں سن رہا تھا، جیسے اس کے تمام حواس شل ہو گئے تھے۔ لیکن جینا اور نیرا آوازوں سے اسے چونکا دیا۔ نعش لے جانے والی نیچی ذات کی حوریں سڑ بچر لے جا رہی تھیں۔ "جب تک ہمیں پہلے ہی ایک ایک دو پرینہ دے دیا جائے ہم نہیں لے جائیں گے۔" اور نرسوں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ "ہم خود لے جا سکتے تھے۔ لیکن تو بہ! اس کا چہرہ کتنا سفید ہے، آنکھ تو ڈر لگتا ہے۔" وہ نیلا کی بیڑی میں برداشت نہ کر سکا۔ غصے کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا: "شکر ہے میں اپنی ذات کا ہندو نہیں ہوں۔" وہ نیلا کی طرف بڑھا۔ نرس نے جلدی سے سڑ بچر بڑھا دیا۔ اس نے اپنا ہرٹس کاٹ کر کہا: "میں اس کی ضرورت نہیں، صرف مجھے وہ نیچے والا کمرہ بنا دو تو مہربانی ہوگی۔"

اور اس نے اپنے بازوؤں پر نیلا کی نعش کو اٹھالیا۔ اور وہ نیلا کو لئے اسی زینے پر سے اتر رہا تھا، جن پر سات دن پہلے اسے سہارا دے کر اوپر پہنچایا تھا، اس جسم کو لئے جسے موت نے سخت اور بھاری کر دیا تھا۔ اس جسم کو جو اسے محبوب تھا، جو کبھی اس کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ جس نے بارہ سال تک اس کا ساتھ دیا تھا اور اس کے قریب رہا تھا۔ اور اب اس کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھوں سے اوچھل ہو جائے گا۔ اس کی زندگی سے الگ ہو جائے گا۔ اس جسم کو اس نے کئی بار اسی طرح اپنے بازوؤں پر اٹھالیا تھا جب نیلا بچھڑی کی طرح ہلکی تھی۔ جب وہ کسی لڑکی نئی تھی، بیابھی آئی تھی اور اس کی ماں اس سے دن بھر کام لیتی تھی اور جب وہ ماں کی نظریں بچا کر دھڑلے کرے میں ملنے تو وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر کھانا اور پیٹنگ پڈال دیتا اور پھر جب وہ بیمار بیمار کمزور رہا کرتی تھی تو وہ اسی طرح اسے اٹھا کر پیٹنگ پر لٹا با کرتا تھا۔

اور اب وہ آخری بار اس مجرب جسم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ نیچے، نیچے اور نیچے۔



# دادا

## خدیجہ دستور

اُسی رات کا بھانک سنا تب جیسے سرگوشیوں میں قتل کی سازشیں کر رہا تھا اور دادا پختہ مرگ کے بچوں بیچ اس اطمینان سے چل رہی تھی کہ لگتا یہ پوری مرگ صرف اس کی خاطر بنائی گئی ہے۔ کہیں قریب ہی سے پہرے دار سپاہیوں کی سیٹیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ عجیب سناٹے میں عجیب سا خوف و ہراس پھینکا جا رہا تھا۔ دادا بھانک سناٹے اور سیٹیوں کی آوازوں سے بالکل بے خبر ہی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تھی ہوئی موٹی سی لاثمی کے سرے پر لگا ہوا ہار مرگ کوٹ رہا تھا اور اس کے بھاری بھاری مردانہ چوڑے شور جھادر رہے تھے۔ اس کے چہرے سے سخت بیزاری ٹپک رہی تھی۔ وہ بار بار لمبی لمبی سانسیں لیتی اور پھر اپنی چوڑاٹھوں سے بولیں آسمان کی طرف دیکھتی جیسے وہاں بھی کوئی موٹا سا تالہ لٹک رہا ہو۔ وہ جھلنے کیا سمجھ رہا ہی تھی۔ پتہ نہیں گالیاں بک رہی تھی یا ڈھانگ رہی تھی۔ گشتی سپاہی اب اس کے قریب آنے جا رہے تھے لیکن وہ اسی سکون سے متوازن قدم ڈالتی چلی جا رہی تھی۔

”کون ہے تو؟“ — آواز اتنے قریب سے آئی کہ اب اسے کھڑا ہو جانا پڑا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بیزاری اور دکھ تھا۔ شاید وہ کھڑا نہ ہونا چاہتی تھی۔ سپاہی مارے حیرانی کے اسے جھانک جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اتنی لمبی ترانگی عورت، ہاتھ میں ڈنڈا، مردانہ چوڑے، ڈھیلے ڈھالے لہبا گتے، بڑے بڑے پانچوں کی ششوار اور دوپٹہ غائب — دادا ایک لمبے تک چپ چاپ کھڑی تاک جھانک کرنے والے سپاہی کو کچھ اس طرح دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو کہ بھائی۔ آج مجھے خوب چلنے دو، آج میں بہت بیزار ہوں۔ آج میں زندگی سے اُگنا چکی ہوں۔ مجھے چلنے دو۔ سپاہی نے پیچھے مرگ کر زور سے بیٹھی بھائی۔ ٹھوڑی دور پر دوسرے گشتی سپاہیوں کے جوتوں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

”کون ہے تو؟“ — گونگی ہے جو بولتی نہیں۔ سپاہی زور سے پکارا اور اس کی آواز سناٹے میں دور دور تک پھیل گئی۔

”کیوں سناتا ہے بابا، تو اپنا کام کر“ دادا نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”اپنا کام کرنے کی ہمتی، بول تو کون ہے“ سپاہی اس کی طرف بھپٹا۔

”تیرا باپ ہمیں حرام زائے“ دادا جیسے چوٹکی اور اس نے اپنی لاثمی زمین پر دھسے ہوئے۔ اس کے چہرے پر عجیب ساری

دنیا کی کرختی پیشکار بن کر رہنے لگی۔۔۔۔۔ سپاہی نے پھر کر موٹی سی گالی کی "چل تھانے۔۔۔۔۔ دو دو نچے ٹھیرے کر آوارہ گھر مٹی ہے سالی"

"تھانے لے چلے گا۔۔۔۔۔ وہ سپاہی کی طرف پل پڑی۔۔۔۔۔ تھانے لے جانے کا، تیری ایسی کی تھی۔۔۔۔۔" وادانے اپنا ڈنڈا سپاہی کی ٹانگ پر بھجھا ڈر دیا اور جب سپاہی نے گھبرا کر اپنی لاشی اٹھانی چاہی تو وادانے اس کے دوسرے ہاتھ سپاہی کا سر بچھٹ گیا۔ لاشی میں لگا ہوا دوا اس کے دماغ تک بکھیر گیا تھا۔ وہ زیر لب جھٹکے کیا بد راہی تھی اور یہی کی بھکی چاندنی میں ہوتا ہوا جیتا جیتا خون سیاہ نظر آ رہا تھا۔ دوسرے سپاہی کے قدموں کی چاپ بالکل قریب آچکی تھی۔

وادانے دو کھلا کر خون دیکھا اور پھر جیسے سر پٹ بھاگنے کے لئے اس کے قدم اٹھے۔ ابھی وہ چند ہی قدم بھاگی تھی کہ چھ سپاہیوں نے اس کا ڈنڈا زمین پر ہٹا دیا۔۔۔۔۔ دو سپاہیوں کو لاش کے پاس چھوڑ کر باقی چار سپاہی اسے پیچ میں لیکر قریب کے حوالات کی طرف چلے گئے۔ سپاہی اپنے مروجہ ساتھی کے متعلق باتیں کر کر کے وادانے کو گالیاں دے رہے تھے۔ مگر وہ خاموشی سے چلتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی اور رات سپاہیوں کی طرح جیسے غصے میں بھٹکا رہی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

وادانے کو تین دن تک حوالات میں رکھا گیا۔ اس کے متعلق زیادہ کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ کسی بارہ جیل جا چکی تھی، اس کی ساری ہسٹری موجود تھی۔ جس صرف یہ معلوم کرنے کے لئے اسے کئی دن تک سزا میں دی گئیں کہ مروجہ سپاہی سے اس کی کون سی دشمنی تھی، اور اس کے عاشق کا کیا پتہ ہے۔ وادانے لاکھ بھجایا کہ اب اس کا کوئی عاشق نہیں، وہ اب کسی کو نہیں جانتی، پھر بھی کسی نے اس وقت تک یقین نہ کیا جب تک کہ سپاہی حوالات نے اس کی اچھی طرح مرمت نہ کر دی۔

پونے دو دن اسے ایک بند گاڑی میں بٹھا کر جیل پہنچا دیا گیا جہاں وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اس وقت تک کے لئے بند کر دی گئی۔ جب تک کہ اس کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔

وادانے کو جب اس اکیلی کوٹھری میں بند کرنے کے لئے لایا گیا تو وہ ہمیشہ کی طرح ہنس نہ رہی تھی، جیل کی کوٹھری کو بڑا اچھا گھر نہ کہہ رہی تھی، سپاہیوں سے ہنسی مذاق اور چھیر چھپاؤ نہ کر رہی تھی۔ بلکہ وہ بالکل چپ تھی اور جب اس کی کوٹھری کا آہنی دروازہ بند کر دیا گیا تو وہ مٹی کے اس لمبے سے چوڑے پر چٹائی بچھا کر لیٹ گئی جس کے سر کے لئے ذرا زیادہ مٹی بھوپ کر تکیہ بنا دیا گیا تھا۔ سارا دن یوں ہی چپ چاپ چھپتے ٹکٹے ٹکٹے گزر گیا، المیہ جو بڑے سے پیالے میں پڑی ہوئی چنے کی بتلی پتی والی اور دو دوٹی موٹی روٹیاں اس کی بھوک کو لچا پتی رہیں۔ رات آئی تو کھانا اسے زبردستی کھلایا گیا لیکن اس کی اس کیفیت میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی۔ آہنی دروازے کے باہر پہرہ ہوتا تھا۔ پہلی پہلی لائینوں کی چمک ادھر سے ادھر گھومتی رہی۔ بارک نمبر ایک، بارک نمبر دو۔۔۔۔۔ سب اچھا۔۔۔۔۔

سب اچھا۔۔۔۔۔ پہرے والوں کی آوازیں ایک دوسرے کو جواب دیتی رہیں۔ وادانے ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہی شاید آج اس کی وہ زندگی اسے بڑی طرح سناتے پر زنی گئی تھی جو ایک چھوٹے سے گھرانے میں شروع ہوئی تھی۔ شاید یہ اسی کی یاد تھی جو وہ یوں غم پڑی اندھیرے میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

وہ دن جب اس کا آقا قریب کی کوٹھی میں بیرے کا کام کرنا تھا اور اس کی اماں سارے مینے پندرہ روپوں کا حساب کر کے کرٹھا کرتی تھی اور ان دنوں اس کا نام وادانے کے بجائے کبیر تھا۔ پندرہ روپے اور چھ جانیں۔ کبھی اسے پیٹ بھر دوٹی نصیب نہ ہوتی

اسی لئے وہ جھگڑا طبیعت کی ہر گئی تھی۔ اپنا پیٹ بھرنے کی غرض سے وہ اپنی چاروں بیویوں کا حصہ چھین کر ذرا بھی شرمندہ نہ ہوتی۔ اعلیٰ اس کی دوسری بیویوں کے صبر و شکر کی مثال لئے کہ اسے بھجواتی لیکن کھانے کے وقت وہ چھوٹے سے باورچی خانے میں بند روں کی طرح دوسری بیویوں کا حصہ چھیٹتے ہوئے ساری قصبتیں بھجواتی جاتی۔ اٹاں اس کی ان حرکتوں پر دوسری اولادوں کو پیار کرتی، اسے کوستی اور ہر وقت برا بھلا کہتی رہتی۔ دوسری بیویوں کو پیار کرتے دیکھ کر وہ روتی اور غمزدی رہنے کے لئے پیٹ بھجواتی لیکن پھر جب باورچی خانے میں جاتی تو پھل بھانڈا شروع کر دیتی۔ چھینا چھٹی میں کسی مار چھوٹے بڑے مٹی کے برتن بھی توڑے اور اٹاں نے اپنا سبز کشتہ ہونے سے میلانے کی کٹھڑیوں سے مارا بھی۔ اس کی ان حرکتوں پر آس پاس کی عورتیں اسے نام دھرتیں تو ماں بیڑے ارمائی سے کہتی کہ بڑی ہو کر بے شک ہر جائے گی لیکن اس کی عادی بن خراب ہی ہوتی گئیں۔ بارہ تیرہ سال کی ہو کر اپنے پیٹھے مگر عادتوں میں رہتی برابر فرق نہ آیا اور نہ ہی اس کے آبا کی تحفہ ہڑھی۔۔۔۔۔ اپنا وہ اور بھی نئی نئی باتیں سیکھ رہی تھی۔ زیادہ وقت کو اڑنے کے دروازے میں گر وٹنے لے کھڑی رہتی اور جب کو ٹھیکوں کی عورتیں ہی ٹھن کہ باہر نکلتیں تو وہ تالیاں پیٹ پیٹ کر چیخے لگتی۔

”پلاؤ زردہ کھانے والے اللہ کرے مر جائیں“

”پلاؤ زروہ کھانے والے اللہ کرے مر جائیں“

” اچھا اچھا کپڑا پہننے والے اُمید کرے ہر جائیں۔۔۔۔۔ عیٹھے چنے اور کپڑے پیچنے والوں کو خواہ مخواہ بلا لیتی اور حسبِ بغیر کچھ غریب سے اندر بھاگتی تو وہ گالیاں دیتے چلے جاتے اور ایک دن تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ اپنے باپ کی مالکن کو گالی دے دی کہ وہ اتنا ہی تنخواہ کہوں نہیں ٹرھاتی۔ اس دن باپ کی نوکری پرہن گئی۔ کو اٹر سے نکل جانے کا حکم مل گیا بڑی مشکل سے پاؤں پڑ کر اور مابھی کی بات کہہ کر نوکری بچائی گئی۔ باپ اسی وقت گھر آیا اور موٹی سی لکڑی لیکر اسے اتنا مارا کہ کسی دن تک کھاٹے سے اُٹھ نہ سکی۔ اس واقعے کے بعد دروازے میں ہر وقت تالہ پڑنے لگا۔

پندرہ سولہ سال کی چوٹی تو اماں نے اسے ٹھیک کرنے کے لئے شادی طے کر دی۔ شادی کے نام پر صاحب سے بیس پے  
فرض مانگے گئے اور دو جا پانی کیلے کے جوڑے بنا کر اسے مانگے بشا دیا گیا۔ مانگے کے زون میں وہ روٹی کے لئے ذرا بھی نہ لڑی۔  
آدھا پیٹ کھا کر بھی اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی۔ اس نے اپنی نئی نو بی شادی شدہ سہیلیوں سے سن رکھا تھا کہ شادی  
کے بعد روٹی اور اچھے اچھے کپڑوں کے علاوہ میاں کی ایسی محبت ملنی ہے جو اور کوئی نہیں دے سکتا۔

رخصت ہرگز کسرا ل گئی تو چھ سات دن بعد ہی کچھ بڑھ کر بھول گئی۔ مہاں کی بھرپور محبت علی اور ساس کی ایسی شفقت کہ بہر گو مددوں وقت اپنے ماتھے سے کھانا کھلاتی۔ مگر جب اس نے گھوٹکھٹک اٹ کر اپنا گھر دیکھنا چاہا تو وہ صرف بڑے نام گھر کی مالک بنی حکم بڑے بڑے دانستوں والی ساس کا جلیقا۔ اس کے شوہر کی بیس بیٹے تنخواہ بھی اسی کے ماتھے آتی۔ وہ اپنا گھر سنبھالنے کے لئے جلد ہی دلہنا پے کو خیر باد کہہ گئی۔ اس کی ساس نے جب یہ دیکھا تو وہ چڑیلوں کی طرح خوفناک ہو گئی۔ نہ تو اس نے بہو کو اس کو کھڑی میں قدم دھرنے دیا جہاں مٹن کے تین بڑے بڑے صندوق دکھائے تھے وہ باورچی خانے میں چھانکنے کی اجازت دی اور نہ ہی تنخواہ میں سے ایک وجیلا چھوٹے دیا اور تو اور ساس نے ان مرنے والی چیزوں سے بھی اسے محروم رکھا جو اس کا شوہر اپنے مالک کے باورچی خانے سے اڑا کر لایا کرتا۔ اسے جن کے بھی تعلق ہوئی دینے لگی چاہے پیریت بھرے یا نہ بھرے۔ آخر ایک دن اس نے بڑی محبت سے مہاں کے کان بھرنا چاہے مگر اس کی نیند ہی بدل پڑ گئی۔

”اے اے! کس لئے ایک لفظ بھی کہنا تو مجھ سے بڑا کرتی نہ ہوگا، میری ماں نے جتنی باتیں کہیں کہیں پالا ہے، اس گھر کی ہر چیز انھیں کی ہے۔“ اس نے بہت جالام کہ بیان کو اپنا کہ ساس کو نظروں سے گراٹے لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اب شوہر بھی اس سے دور بھاگنے لگا۔ آج گھر میں ہر وقت کی لڑائیاں تھیں کہیں وہ ساس کو چھپتی، ساس اسے سارا لٹکا لیاں دیتی، روٹی اور چینی سائے ملے والوں کی ہمدردی بٹور کر بھی اسے چھین نہ آتا۔ اب وہ جلن کے مارے ملے انہی روٹی دیتی کہ اس کے پیٹ کی ایک کو رہی نہ بھرنی۔ وہ زبردستی باورچی خانے میں گھس کر کھاتی اور ساس کی گالیاں بڑی خوفناک ہونے لگتیں۔ اس کا شوہر روز کی کٹ کٹ سے تنگ ہو کر اسے مارنا اور وہ ساس سے بدلہ چکا تی۔ باپ کی موت کے باوجود وہ اپنے گھر بیٹھ جانے کی دھمکی دیتی اور ساس اس دھمکی سے خوش ہو کر کہتی کہ تو بھلا کیا جائے گی چڑیل۔ اور واقعی اس کی دھمکی صرف دھمکی ہی رہتی۔

پھر کچھ دن کے لئے لڑائیاں رک گئیں کیونکہ اس کی گود بھرنے والی غمی۔ ایک مہینہ کھٹیا کھیل کر جب وہ اپنے بچے کو گود میں لئے اٹھی تو ساس نے یہ بھی برداشت نہ کیا کہ وہ اس کے اکڑنے بیٹھنے کے بچے کو گود میں لے کر اپنا حتی جتاے اور اس کا بیٹا اولاد کی وجہ سے بیوی کے بس ہیں آجائے۔ یہ چیز ایسی تھی کہ وہ ایک دم شیریں ہو گئی۔ ذرا طاقنت آئی تو اس نے اپنی ساس کے جھوٹے پردے کو اچھی طرح مٹ کر دی اور پھر اسی دن اس کے شوہر اور ساس نے دو، چار پتے بچے کو اس کی گود سے چھین کر گھر سے نکال دیا۔

دوسرا شہر تھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں جلتے، کس کے پاس پناہ لے۔ برقعہ میں اٹھتی چلی جا رہی تھی کہ راستے میں اسے اپنے محلے کے نانگے والے کی بیوی مل گئی۔ وہ اکثر اس کے ہاں آیا کرتی اور سڑی گالیوں کے ساتھ سائے محلے کی خبریں سننا جاتی۔ نانگے والی اسے اپنے گھر لے گئی اور بڑی ہمدردی کی مگر اس کے آنسو نہ رکے۔ وہ مہینہ کوٹ کوٹ کر روٹی رہی اور قیص کے اوپر سے بہتے ہوئے دودھ کے قطرے دکھا دکھا کر فریاد کرتی رہی۔ اسی رات جب نانگے والے نے اپنا گھوڑا کھولا تو اس کے عجیب عجیب سے دوست بے دھڑک گھر میں آکر چپکے چپکے بائیں کھٹکے۔ اس کے بعد گھر کے دروازے بند کر کے چوڑے اور چرس سے شوق کیا گیا۔ نانگے والی نے بھی زمین پر بیٹھ کر چرس بھری سگریٹ پی اور پھر اسے بھی زبردستی پوری سگریٹ پلا دی۔ چرس کا پہلا پہلا لٹھہ بھا۔ وہ بالکل چکر لگئی اور کھری کھاٹ پر گر کر ساری رات اپنے پتے، اپنے لال کو آوازیں دیتی رہی۔

دو تین دن کے بعد بھی جب اس کے آنسو نہ خشے تو نانگے والی نے اسے بتایا کہ اس کے آدمی کا ایک دوست اس پر عشق ہو گیا ہے۔ رونے دھونے سے کام نہ چلے گا، بیش کرنا ہو تو اس کے ساتھ بھاگ جائے، ساری زندگی عیش کرانے کا وعدہ کرتا ہے۔ پھر نانگے والی نے بتایا کہ وہ خود بھی بھاگ کر آئی تھی۔ نہ شادی کی نہ بیاہ ورنے سے ششاکرتی ہے میاؤں کی حکومت

سے بھی بال بال پی ہوئی ہے۔ ————— وہ ان باتوں پر راضی نہ ہوئی۔ برابر ہی رٹے لگی کہ اس کی ساس اور شہر سے میل کر اعد۔ اب وہ سب کچھ برداشت کرے گی۔ بھوکی مرے گی مگر آف نہ کرے گی۔ اس کا بچہ اس کی گود میں نہ دیا جائے گا تو کبھی ہاتھ نہ پھیلے گی۔ اگر اس سے کہا جائے گا کہ بچے کو نہ دیکھے تو اپنی آنکھیں پھوٹے گی لیکن اس طرف نظر بھی نہ اٹھائے گی۔ صرف اسے اپنے بچے کے قریب رہنے دیا جائے۔ ————— آخر نانگے والا اس کے شوہر کے پاس گیا تاکہ صلح معافی ہو جائے مگر جب وہ واپس آیا تو ساتھ ہی طلاق نامہ تھا، وہ پاگلوں کی طرح بال بال تو جیتی، بوٹیاں کاٹتی اور چیخ چیخ کر روٹی رہی۔ اس کے نئے عاشق نے اسے جی جان سے تسلی دی، نانگے والی نے بڑی شفقت سے گالیاں بک بک کر دم دلا دیں لیکن اس کی سمجھ میں

کچھ بھی نہ آتا۔ ساری ساری رات اپنے بچے کو بلاتی، اس سے باتیں کرتی، رنجی اور پھر جس کے دم لگاتی۔  
دو ہفتے اسی طرح گزر گئے آخر ایک دن نانگے والی نے اس سے صاف کہہ دیا کہ وہ زیادہ دن نہ کھلا سکے گی، بچہ ابلا  
چاہئے والا لگ گیا ہے اب اپنا گھر بنائے اور آخر وہ اس شرط پر اپنے عاشق کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی کہ جانے سے پہلے  
ایک بار اس کا لالہ دیکھا دیا جائے۔

جانے سے پہلے اس کو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر اور ساس کسی دوسرے شہر جا چکے ہیں۔ اس خبر کے بعد وہ روٹی پڑی  
بس اس طرح چپ ہو گئی جیسے پنجر میں بند ہو گئی ہو۔ دوسرے دن اس کا جہت کرنے والا اسے شہر کی بڑی تاریک اور پر اسرار  
گلیوں کے ایک مکان میں لے گیا جہاں اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کا ساتھی چوری کر کے بیٹھ بھر تلے۔ اس نے کسی قسم کا  
اعتراض نہ کیا۔ وہ ہاتھ کی صفائی سے جو کچھ کھانا اس کی گود میں ڈال دیتا۔ مارے پیار کے کچھا جاتا لیکن وہ اس سے ہنس کر  
بولتا نہ جانتی ہی نہ تھی۔ بات بات پر گالیاں کہتی، ڈھیر ڈھیر میسر میسر مینتی اور سارا دن پلنگ پر پڑی بان توڑا کرتی۔ مگر چور اچکے  
کو تو بس عورت چاہیے اور عورت اس غریب کو بڑی مدت کے بعد مل گئی تھی وہ اسے ایک لفظ نہ کہتا۔ بہت سے گویاں ہی  
گزرنے چلے گئے۔

پلنگ پر پڑے پڑے اس نے غصے کی ساری دایروں سے علاج بھی کر لیا لیکن آخر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ نہ چنگی کے  
وقت اس کی ساس نے مارے جلنے کے دانی کو نہیں بلایا تھا اسی لئے یہ خرابی ہوئی۔ کہ اب وہ اولاد پیدا کرنے کے لائق نہیں ہے۔  
اس انکشاف کے بعد تو وہ اور بھی عجیب و غریب ہو گئی۔ وہ سارا دن پڑی اپنا سینہ کوٹ کوٹ کر دیتی، گالیاں کہتی، چرس پیتی  
اور پھر اتنا کھاتی اتنا کہ اس کے باطن میں گڑبڑ ہو جاتی۔

ایک سال بعد اس نے اپنے آدمی سے ضد کی کہ اب وہ بھی اس کے کام میں ہاتھ بٹائے گی۔ اس اظہار سے وہ بہت  
خوش ہوا اور جلد ہی پوری کے موٹے موٹے گرتے بنا دیئے۔ احتیاطاً تاملہ توڑنا بھی سکھا دیا۔ کچھ ہی دن بعد وہ برقع اتار نوکری کی  
تلاش میں گھڑناڑنے لگی اور اس کے آدمی کو ہاتھ صاف کرتے ہیں آسانی ہو گئی۔ اب دونوں کے بڑے مزے تھے۔ وہ رونے  
دھونے کے بجائے سیر سیر پھر دو دھڑی کر خوب ہنستی اور پہلے کی طرح اپنے چاہنے والے سے بے اعتنائی بھی نہ کرتی، اسی دن  
استہ جانے لگا سوچا کہ ایک گھر میں نوکری کر کے مالی پر ہاتھ صاف کرنے کے بجائے وہ مالک کے دو دھڑے پچے کو لے بھاگی مگر  
دقت پر وہ نہ پچے کہ بے تماشہ جوتی ہوئی پڑی گئی۔ اسے اور اس کے آدمی کو پورے سات سات مہینے کی قید با مشقت ہو گئی جیل  
سے جھٹ کر وہ دونوں پھر ملے اور پراسرار گلیوں میں چوپ کر دوبارہ کام شروع کر دیا مگر اب کی اس کے ساتھی نے اسے  
بچی طرح سمجھا یا کہ ایسی نادانی کی حرکت پھر کی تو مفت میں مرنا ہوگا۔ سچا دادا بننا ہے تو ساری زندگی پالیں گے ہاتھ نہ آؤ۔  
اور جب اس نے دادا کے مطلب پر چھ تو معلوم ہوا کہ بیبی میں دادا بدعاش کو کہتے ہیں اور وہ بیبی میں کافی عرصے تک داداؤں کے  
ہاتھ رہ چکا ہے۔

دو تین دن رہی اس نے مطالبہ کیا آج سے اس کا نام دادا پکارا جائے، اگر کثیر کما تو وہ اپنا اور اس کا سر پھوڑ  
لے گی۔ اس کے چاہنے والے نے بہت سمجھایا کہ یہ نام عورتوں کا نہیں دیتا مگر اس نے اپنے عورت ہونے سے ہی انکار

کر دیا۔۔۔۔۔ یہ نام رکھنے کے بعد اس نے بڑی پھرتی سے گھر تاکنے شروع کر دیے اور ایک بار بغیر صلاح کے بڑھ گئے  
پن سے چوری کر مٹی۔ اس دفعہ اسے چھ مہینے کی جیل ہوئی اور اس کا ساتھی بھی معذرت میں چھ مہینے کی قید چھینے پر مجبور ہو گیا۔ اب  
کی بار جب جیل سے چھٹا کر دونوں ملے تو دادا کے ڈھنگ نزلے تھے۔ وہ اس قدر عجیب سی ہر گئی تھی کہ اس کا ساتھی  
بھی اسے نہ پہچان سکا۔ وہ اب دن دھاڑے لائے کر گلیوں میں گھومتی۔ اس کا عاشق اور اس کے دوسرے چار ساتھی  
اسے سمجھاتے کہ اس طرح گھونٹا تو سب کو پکڑوا دے گی۔ لیکن اس کے کان پر جوں ہی نہ سگیتی۔ یا تو وہ باہر گھومتی یا پھر  
چرس پی کر پینگ پر ڈھیر رہتی۔ بہت سمجھانے کے بعد بھی جب وہ باز نہ آئی تو آخر ایک دن اس کا ساتھی بھی اسے چھوڑ گیا۔  
اس دن وہ بڑی دینک بھوک پیاسی بڑی ٹکر ٹکر آسمان نکلتی رہی۔ اسی رات اس نے بڑے دھڑکنے سے ایک مکان کا کالا  
نور ڈا اور پھر چھ مہینے کے لئے جیل پہنچ گئی۔

چھ مہینے کے بعد جب وہ باہر نکلی تو سارا دن بھوک پیاسی اس گلی میں چپ چاپ بیٹھی رہی جہاں وہ اپنے چاہنے  
والے کے ساتھ رہتی تھی۔ جب رات ہونے لگی تو وہ ٹھکی ٹھکی سی آٹھ کر اپنے ایک جاننے والے کے گھر چلی گئی جو مدت ہوئی  
چو۔ ی سے قریب کر چکا تھا۔ اس کے وہاں مانگ کر کھانا کھایا اور پھر چھ مہینے چلائے ڈیڑھ سی میں کھڑی ہوئی لائے چسکا کر  
باہر نکل آئی۔

رات کا اندھیرا بھیا تک ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ پختہ سر تک پر لائے جاتی، جانے کیا سوچتی آہستہ آہستہ چل رہی  
تھی اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ ٹوکنے والے گشتی سپاہی کے سامنے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو، بھائی آج  
مجھے خوب چلنے دو۔۔۔۔۔ آج میں بہت بیزار ہوں۔ آج مجھے زندگی بہت آداس لگ رہی ہے، مجھے چلنے دو۔۔۔۔۔  
جیل کی ایک رات اور ایک دن اسی خاموشی میں گزر گیا۔ دوسرے دن جب وہ لوہے کے جالے سے بیلیں کی طرح باہر  
سمجھا گئے لگی تو اس کے چہرے پر غم و اندوہ کی ایک ذرا سی برجھاہٹ بھی نہ تھی۔ جب اس کی کوٹھڑی کے سامنے سے پرے وار  
گزرتی تو وہ اسے پکارنے لگتی۔

”اوتے، کوئی بات دات کر، مشین کی طرح چلے ہاٹی ہے۔“ پرے وار اسے گھورتی اگے چلی جاتی اور دادا ایک  
مروانہ وار اسے گالی دے کر ہنستی۔

نیرنگہ دادا اس بار ایکسی کوٹھڑی میں بند کی گئی تھی اس لئے اسے چرس کی سخت تکلیف تھی۔ اس سے پہلے جب  
جیل میں آئی تو چرس کی کوئی کمی نہ ہوئی۔ نشہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا دماغی توازن ساتھ نہ بڑے رہا تھا جسم اس بڑی  
طرح ٹوٹا کہ وہ دوسرے ہی دن بیمار پڑ گئی۔ جیل کی ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور پھر ایسی کڑوی دوا میں پینے کو دی کہیں کلاس  
نے شیش توڑ ڈالی اور کوٹھڑی میں ایسی ایسی پھاندی کہ ڈاکٹر اسے دیکھتے ہوئے گھبرانے لگی۔ آخر دادا نے  
ایک دن کھانا مانگنے والی فیروار سے خوشامد کی۔

”کہیں سے چرس مل جائے گی میری جان“

”نہیں؟۔۔۔۔۔ فیروار نے رحم کھا کر اسے دو بیڑیاں پکڑا دیں۔“

”اگر تم جیسے لادو تو میں تم کو دو روپے انعام دوں گی“ دادا نے ان دو روپوں کی تلاش دی جو وہ تلاشوں کے باوجود صاف بچا لائی تھی۔

”نا بابا، میں تم سے نہیں لاسکتی۔ اگر کسی افسر کو تہہ پہل جائے تو میری معافی کٹ جائے گی۔ مجھے جلدی سے گھر جانا ہے، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں“ نمبردار قیدی عورت کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ اس کے بعد دادا نے پھر کبھی عرس کی خدمت کی بلکہ اب وہ جیل کے دوسرے کام کرنے والیوں کو منانے لگی تھی۔ اور جب ہر طرف سے ”نہیں ملے گی“ جواب ملتا تو دادا کی گالیاں بڑی خوفناک ہو جاتیں۔

ایک مہینے بعد آج دادا عدالت میں اپنے مقدمے کا فیصلہ سننے گئی تھی۔ وہ جری خاموشی سے عدالت کی ساری کارروائی سنتی رہی لیکن جب اسے عمر قید کا فیصلہ سننا یا گیا تو وہ ہنکریاں بجا بجا کر چیخنے لگی۔

”میں نہیں چاہتیے چودہ سال کی سزا، اگر ہم اس کے بعد بھی جینے رہے تو کیا جج صاحب ہمیں اپنے گھر ڈالیں گے؟“ سپاہی عورتیں اسے کھینچ کر لے جانے لگیں تو وہ زور زور سے گالیاں بھینے لگی۔

”اوجھڑے، اوجھڑے، بس چودہ سال کی قید دیتا ہے۔“ سپاہی عورتوں نے اسے کھینچ کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ لیکن وہ راستے بھر گالیاں بکرتی رہی۔

جب وہ جیل پہنچی تو اودھادی گز چکا تھا۔ اب اسے جیل کے کپڑے اور کپڑے کر بارک نمبر دو میں چھوڑ دیا گیا جس وقت وہ بارک میں داخل ہوئی تو ساری قیدی عورتیں مشتق کرنے لگی ہوئی تھیں۔ ان کے سیاہ کمبلوں میں پٹے ہوئے بستراور المیز کے بڑے بڑے کٹڑے لائن سے رکھے ہوئے تھے۔ دادا نے کپڑے تبدیل کر کے بارک میں تیزی سے ٹھنڈا شروع کر دیا وہ اب بھی زیر لب گالیاں بک رہی تھی۔ اور جس کی شدت سے گھبرا ہوا چہرہ اس وقت بڑا ہی مکروہ لگ رہا تھا۔ وہ دیرینہ اسی طرح شلتی رہی اور جب مشتق والیں آکر کھانے کے سلسلے میں دھما چو کر ٹی پیانے لگیں تو وہ غصے میں جیسے پھسکانے لگی۔

”میں حرام زناؤں پر چپ رہوں، ورنہ ایک سوئوں کر کے چودہ سال اور بڑھا لوں گی۔“

”بڑی آئی لاٹ صاحب کی بچی“ ایک عورت نے تڑا ق سے جواب دیا۔ دادا نے استیغاب چڑھالیں اور دوسری عورتوں نے بڑی مشکل سے بچ بچاؤ کیا۔ اس کے بعد بھی سونے سونے دادا کی کئی عورتوں سے ملتی۔ رات بھر بہرہ ہونا رہا اور دادا اپنے بسترا پر بڑی بے چینی سے کہہ رہیں بدلا کی۔

صبح جب ناشتے میں ٹھنڈے چنے بٹنے لگے تو مشتاقش بشاش لائن میں سب کے گے کھڑی تھی۔

”میں اور دو ساتنے جنوں میں تیریت کی ایک کو بھی نہ بھرے گی“ چنے بانٹنے والی نے شاید اس کے بلے ترنگے جسم پر رحم کھا کر ٹھوڑے چنے اور دے دئے۔

”میں بھی دو نمبر دوہیں“ دادا کے پیچھے والی عورت بڑی اتجا سے منمائی۔

”حرام زناؤں کو عیش سوچتا تھا تو اپنے گھر بیٹھیں چین سے“ چنے بانٹنے والی نے اپنی بالٹی اٹھالی۔

”گالیاں دیں نا کسی کو بھی تو مڑ توڑ دوں گی“ دادا نے غصے سے کہا اور پھر جنوں کی بالٹی کی طرف جھپٹی۔ چنے تو خیر وہ





کہ یہ مفت میں پینے والی واوا سب عورتوں کے لئے تو لعلت تھی ہی مگر شہزاد کے لئے آسمانی بلا سے کہ نہ تھی۔ جب دوسری عورتوں سے ملاقات کے لئے اس کے عزیز آتے اور چوری چھپے روپے دے جاتے تو شہزاد کی بڑی سبیلہ سے ہوجھتی۔

”واوا تیرا کوئی نہیں ہے، کوئی یا دوست بھی نہیں تیرا۔“

”تو جو ہے۔ پلانے گی نا۔“ واوا اس کے نیچے کی طرف ہاتھ بڑھاتی اور وہ بدک کر انگ کھڑی ہوجاتی۔

مفت کی جرس کے علاوہ واوا عورتوں کی ان کھانچے پینے کی پیڑوں میں بھی زبردستی حصہ لیتی تھی جو ان کے عزیز ملاقات کے وقت سے جایا کرتے۔ اس سے بھی خوب ڈرائی ہوتی۔ جب واوا کو یوں لوٹھکڑا کر چیز نہ ملتی تو وہ راتوں کو بڑی ہوسیار سے عورتوں کی کھڑکیوں کے لکڑی کی چیزیں چوری کرتی اور پھر ان عورتوں کو بھی چیکے چیکے ہاتھی جن کے پاس کوئی اسنے والا نہ تھا۔

کھانے کی چیزوں کو غائب دیکھ کر عورتیں سینہ کوٹ کوٹ کر روئیں اور واوا سے لڑتیں، اس کی شکایتیں کرتیں مگر کیا مجال جو واوا کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔ کئی بار اسے مارنے اور تباہی و تہمت لپٹنے کی سزائیں دی جا چکی تھیں۔ تاکہ کھانے اور دھوکے کے باوجود جب جیل کی ڈاکٹر عورتوں کو دیکھنے آتی تو واوا بڑی مکاری سے لیٹ کر کہہ دیتے تھے۔

”بہت کمزوری ہو گئی ہے ڈاکٹر فی صاحب، رونی کی ایک کور بھی نہیں کھاتی جاتی، دو دو ہندو اور بجھے، عورتیں فوراً

واوا کی لاٹ کرتیں۔“

”ڈاکٹر فی صاحب یہ تو دوسروں کا بھی پیرا کھا جاتی ہے، کیا مجال جو رونی کی ایک کور بھی نیچے اس سے۔“ ڈاکٹر مسکاتی اور واوا

کو دیکھے بغیر یہی جلی جاتی۔ دوسری بے حد کمزور عورتوں کا بھی کبھی دو دو ہندو اور یا جانا۔ ڈاکٹر کے جلنے کے بعد واوا شکایت کرنے والی عورتوں کو بڑی سڑن گالیاں دیتی۔ آخر ایک ڈاکٹر اسے ہنستے ہوئے واوا کے سے ایک ہفتے کا دو ہندو اور یا جانا۔ اس دن اس نے عورتوں کو بڑی فاختانہ نظروں سے دیکھا۔

”اور کرو شکایتیں، ہم تو آرام سے دو دو ہندو نہیں گے۔“ وہ عورتوں کو جلانے کے لئے خوب زور زور سے سنبی۔

ویسے تو واوا کی عام طور سے یہی حالت رہتی کہ اس سے لڑا، اس سے جھگڑا، کسی کی کوئی چیز چرائی تو کسی کے جھوٹے پکڑ کر

مادیہ بیٹ شروع کر دی۔ لیکن کسی کی دن وہ بالکل چپ ہو جاتی وہ بھی اس طرح کہ اگر کوئی اسے ایک گالی دے جلے تو آف نہ کرے کبھی کسی منہ چھپا کر چپکے چپکے روتی بھی اور پھر آنسو لہ پکھڑا کر شہزاد کے کھمبیاں دے کر ڈھیر سی چرس ہوتی۔

دن گزرتے جا رہے تھے، واوا کی بارگ سے کئی عورتیں رہا ہوئیں، کئی داخل ہوئیں۔ مگر اب شہزاد کے علاوہ ہی پرانی سبھی

عورتیں اس سے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ دراصل واوا ان سے کھانے پینے کے سلسلے میں نڈرائی لیکن اگر جیل کی طرف سے عورتوں کو سختی کے

طور پر کوئی مزا دی جاتی تو وہ ان کی حمایت کرتی۔ یہاں تک کہ ایک بار سپرنٹنڈنٹ سے اس بات پر لڑ پڑی کہ اس نے ایک عورت کو

گستاخی کرنے کے سلسلے میں چاروں کے لئے تنہائی کی قید دے دی تھی۔ اور سب عورتوں کے سامنے اس کی اچھی طرح مرمت کرائی تھی۔

کرنے کے سلسلے میں واوا کے وس بیدار لگاتے گئے اور کچھ عرصے کے لئے جیل کی ساری رعایتیں چھین لی گئیں۔ عورتیں اب اس

اپنا دکھ درد بھی کہنے لگی تھیں اور راتوں کو جب وہ اپنے گھروں اور بچوں کی یاد میں ہلک ہلک کر روتیں تو واوا بڑی شفقت گالیاں دے

دے انھیں چپ کرائی، ان کے آنسو پچھتی اور خود بھی رنجیدہ ہو کر چپ بیٹھ جاتی۔

آج شام دادا کی بارک میں ایک بڑی کسین دھان پانی سے عورت لائی گئی تھی کی گود میں شکل سے دیکھنے کا بہ ہو گیا۔ عورت نے  
 رہی زمین پر بیٹھ گئی اور بچے کے منہ میں دودھ دے کر زار زار رونے لگی۔ عورتیں اس کے گرد جمع ہو گئیں اور اس سے پوچھنے لگیں کہ وہ کیا  
 کیوں آئی ہے، اس کے ہر کون سا جوہم ہے۔ عورت نے دیر تک کسی بات کا جواب نہ دیا۔ بس بولنے چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی  
 ہچکیاں بند ہو گئیں۔ عورتیں اسے پانی پلانے اور چپ کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اس ایک دانا بھی جو بالکل ایک ٹھنک بیٹی سے نکھر رہی  
 تھی۔ بچے والی عورت جب رونے رونے ٹھنک کر چپ ہو گئی تو دادا اس کے قریب سرک آئی۔

”واہ، جوہم کیلے روتی ہو، ایسا ہی پڑیا جیسا دل تھا تو اپنے گھر بیٹھیں ٹھکانے۔ سے۔“  
 ”میں نے کون سا جوہم کیا ہے۔“ عورت چھر چڑک کر روتے لگی۔ ”میرے سر زبردستی جوہم لگا دیا ہے۔“  
 ”زبردستی کیسے؟“ دادا نے ذرا اٹنیان سے پوچھا۔

”میرا میاں شادی کے ایک سال بعد دوسری عورت کو لایا۔“ بچے والی عورت اپنا قصہ سناتے لگی۔ ”میں  
 بہت روتی دھوئی گھر چھوڑ کر لیا کہ اپنے بچے کو باپ سے محروم نہ کروں، گھر میں نوکرانیوں کی طرح رہنے لگی۔ اس پر بھی میرے میاں کو صبر  
 آیا۔ روز رکتا کہ میرا اور اپنی سوت کا بسنے خورا کا باکر۔“ بیٹھے پر پتھر رکھ کر یہ کام بھی کر دیتی۔ عورت آہ بھر کر آنسو پونچھنے  
 لگی۔ ”اس کے بعد بھی سوت کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی اور ایک دن وہ لیٹ کر چھینے لگی کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ سارا حمل جمع ہو گیا  
 ڈاکٹر کو بلا کر دکھا یا تو معلوم ہوا کہ ذرا زیادہ افیون کھالی ہے۔ اس کے بعد پولیس آگئی اور سوت نے پولیس کو بیان دیا کہ میں نے اسے  
 زہر دیا ہے۔ گھر کی اور میری تلاشی لی گئی تو افیون میرے دوپٹے کے پٹوں میں بندھی ملی۔ مجھے تیرہ مہینے نہ چلا کہ میری سوت نے  
 پتوں میں کب باندھ دی تھی۔ پولیس مجھے حالات سے گئی اور پھر وہاں سے جیل لے آئی۔ ایک مہینے سے دوسری بارک میں ہوئی۔  
 میرا باپ مغرور محبت رہا تھا مگر جانے کیسے مار گیا اور آج میں عدالت سے سزا سن کر آرہی ہوں۔ چھ مہینے کی سزا دی تھی پر اس بچے کی  
 وجہ سے آدھی معاف ہو گئی۔ شریف عورت ہوں اب باہر نکل کر کیا منہ دکھاؤں گی۔ میرے آبا کی عزت خاک میں مل گئی۔ عورت  
 پھر بلب بلب کر رونے لگی۔

”ہوں اگر گد حیات تو اپنے ضم کے گھر نو کروں کی طرح کیوں رہی، ایک ہی دن میں گھر سے باہر نکل کر دوسرا بارک لیتی تو  
 آج یہ حالت ہوتی تیری۔“ دادا نے جوش سے کہا۔ اور پھر سونے ہوئے بچے کی ٹانگہ کھینچ کر بلکاری۔ ”لے چلی آرہی  
 ہے اس گتے کے پتے کو، وہیں پھینک آئی منہ پر کرے پال۔“ لاڈ لہجے سے لے لے کر وہیں۔ دادا نے بڑی شہمت  
 سے بچے کو گود میں لے لیا۔ ”اگلے تو یہی۔“ اس نے آدھی جلی سگڑ اس کی طرف بڑھا دی۔

”میں نہیں ہوتی، اور دکھیو جی میرے بچے کو تم اب کچھ نہ کہنا، میں اسی کی خاطر زندہ ہوں ورنہ کہٹھے سے کو دیکھا جانے دیتی۔“  
 ”میرا بچہ، بڑی آئی بچے والی لے لے۔“ دادا نے بچے کو چہرے کی طرح اٹھا کر ماں کی گود میں دھر دیا اور پھر دیر تک  
 چپکے چپکے گلاباں بکتی رہی۔

اس رات دادا کوٹ بدل بدل کر بچے کو دکھائی اور جانے کیا بڑ بڑاتی رہی۔ ورنہ اس کا منہ یہ حال تھا کہ ساری رات کبیل کی  
 ہڈوں کے کاٹنے کی ہر داکے بغیر ٹھاٹ سے خراٹے یعنی دیتی۔

وآؤ اسنے اچانک پھر در، روپ بدل لیا نقاب سے وہ ابھی اسی جہاں میں آئی ہے۔ جب دیکھ کر ایک لڑکی پڑتی ہے۔  
ہر ایک کو اٹھٹھٹھ رہی ہے اور سرسری سرسری کالیاں یک دوسری ہے۔ نیچے داتا عورت سے لواتے جیسے دشمنی ہو گئی تھی۔ زبردستی  
اس کے نیچے کہ گود میں لیتی اور پھر در اسی ویر بعد اسے مال کی گود میں بیچ دیتی۔

”میرا بچہ، بڑی آئی نیچے والی“  
وآؤ بڑ بڑاتی اور عورت سے تیرائی سے دیکھ کر اپنے سینے سے لگا لیتی اور دھر  
ایسے دھڑکے سے روتی کہ ساری عورتیں و آؤ کو برا بھلا کہنے لگتیں۔ رات جب بچہ سوئے سوئے جاگ کر دوتا تو و آؤ خواہ مخواہ پھر نکلتی۔  
”چپ کر اس کتھ کتھ پلے کو لے کے آگئی، غبت کے لئے ترس گئے۔“

”دیکھ و آؤ تو خواہ مخواہ لڑتی ہے، نیچے کس کے نہیں دوتے، کوئی عورت و آؤ کو سمجھانا چاہتی۔“

”رو میں مگر ہمارے بنید کیوں خواب کریں، ذرا لاڈ لو اپنے نیچے کی و آؤ و آؤ کر رکھے نا۔“

”نھاری و آؤ و آؤ داب روئی“ نیچے کی مار بھٹتے سے کانپ کر جواب دیتی اور پھر بڑی بے بسی سے روتی نکلتی۔

”بائے بائے میری آماں“ و آؤ چپ تو ہو جاتی مگر اب اس کی راتوں کی غنیدیں حرام ہو چکی تھیں جبکہ ساری عورتیں مرے  
سے سوئی ہوئی تھیں تو و آؤ کہیں بدل بدل کر صبح کر دیتی۔

ایک دن نیچے کو ہلکا سا بخار ہو گیا۔ ماں نے در در کر برا حال کر لیا اور و آؤ نے بڑی شفقت اور غمتوں سے نیچے کو  
اپنی گود میں لے لیا۔ ڈاکٹر دیکھنے آئی تو اس نے پہلا حکم یہ دیا کہ نیچے ماں کی گود میں دیا جائے اور وہی اس کا حال بتائے۔ و آؤ  
نے نیچے کو فٹ دیا مگر اس کے تیور بگڑنے لگے۔ ماں در در کر نیچے کا حال بتانے لگی۔

”ڈاکٹر ٹی صاحبہ، میرا بچہ بہت بیمار ہے، رات بھر ہوش نہیں رہا، آنکھ نہیں کھولتی میرے لال نے، آگ کی طرح پٹنڈا  
پھٹنا رہا ہے۔“

”کوئی بخار و خار نہیں ڈاکٹر ٹی صاحبہ“ و آؤ نظر سے ہٹنے لگی۔ ”ساری رات گلا بھاڑ بھاڑ کر

رو رہا ہے، کہتی ہے کہ آنکھ نہیں کھولتی۔“ ڈاکٹر و آؤ کو چپ رہنے کا اشارہ کر کے نیچے کو غور سے دیکھنے لگی پھر سر نہ کھڑ کر  
فوراً اپنے سات نیچے کو دوا پلائی۔

”آج نیچے والی عورت کا باپ اس سے ملے آیا تو نیچے کے لئے چھوٹے چھوٹے کھلونے اور نئی قمیصیں دے گیا تھا اس لئے وہ  
بہت خوش نظر آ رہی تھی۔“

”میرے آبا کہتے تھے کہ فوراً اس آدمی سے طلاق لے لیں گے اور پھر میرے چچا زاد بھائی سے شادی کریں گے میری۔“

عورت خوش ہو کر بتانے لگی۔ ”میرا چچا زاد بھائی مجھ سے بہت پہلے سے محبت کرتا تھا، میرے غم میں اس نے اپنی شادی نہ کی  
اور تو اور وہ میرے نیچے کو بھی بہت چاہتا ہے، اب میرے گھر آنا تو اسے سینے سے لگا لیتا، اس نے نیچے کو سینے سے لگا لیا۔“

”اچھا تو تیرا بھائی ہے۔“ و آؤ زبردستی نیچے میں بول آئی۔ ”اسے یہ باری داری چاروں کی ہوتی ہے زیادہ

باتیں نہ بنا۔“

”نہ وہ باری، میرا بچہ تو ہے اس کے سہارے زندگی گزارو لگی۔ تو کیوں بولتی ہے میرے بچ میں۔“ عورت بد مزہ سی ہو کر

چُپ ہو گئی۔

کل سچ نیچے والی عورت کچھ دبا ہونے کا دن تھا۔ آج دادا نیچے کو زبردستی گود میں لینے کے سلسلے میں کھٹی ہی بار اس سے لڑ چکی تھی۔ لیکن عورت نے ایک بار بھی دادا کو ہاتھ نہ لگانے دیا اور نہ اس کی لڑائی کا جواب دیا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ مالے خوشی کے رات اسے نیند نہ آرہی تھی۔ وہ لوریاں گا گا کر اپنے نیچے کو پیاد کر رہی تھی اور دادا کے چہرے پر جیسے ساری دنیا کی لعنت برس رہی تھی۔

”چُپ ہو کر سو جا لعنت پرستی“ دادا بار بار چپٹی مگر عورت دادا کی بدوا کے بغیر آدھی رات پہلے نہ سوئی۔

جب عورت گری نیند سو گئی۔ بار کہیں سناٹا اچھا گیا تو دادا اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چوروں جیسی آنکھوں سے اپنے ارد گرد کو بکھ رہی تھی۔ بہت بلندی پر لگا ہوا مدھم سا بجلی کا ققمند جیسے دادا کو گھور رہا تھا۔ — بارک نہر ایک بارک نہر دو — سب اچھا ہے — سب اچھا ہے — باہر پیرے والیوں کی آوازیں ایک دوسرے کو جواب دے رہی تھیں۔ دادا آہستہ سے نیچے والی عورت کے بستر کے قریب رہینگ گئی۔

سچ تڑکے جب دادا کے اوپر سے کبیل سر کا یا گیا تو بارک میں کرام ہو گیا۔ جیل کی افسر جمع ہو گئیں اور نیچے کی ماں سینہ پیٹ پیٹ کر چیخ رہی تھی۔ اپنے منہ پر پتھر مار رہی تھی اور کھڑے قدم سے بار بار زمین پر گر رہی تھی۔ — دادا کے گلے میں اس کی قمیص کس کر بندھی ہوئی تھی اور اس کے ننگے سینے پر لیٹے ہوئے تچے کھنہ میں اس کی منگ چھاتی تھی۔ دادا اور نیچے دونوں کی آنکھیں غلغلوں سے آبی ہوئی تھیں اور دونوں کے جسم سرو ہو کر اکڑ چکے تھے۔

کالی تبتزی چسری ورجی بو لے  
تے اڈ دی نوں باج پے گیا

بڑے مزے میں مولانا نے چلم میں خبا کو اور اس کے اوپر سٹگے ہوئے اُپلے کے دو ٹکڑے جھاویئے اور پھر مارے  
مہروی کے دانت لکٹانا اور چار پائی پر پڑھ دیا ناگوئی پر وحسہ ڈالی مگن ہو گئی۔  
روٹی کھانے کے بعد اسے حقے کی غت طلب ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے آنکھیں موند کر دو چاکسٹ ہی لئے ہوئے  
کہہ دیا اے پردستک کی آواز سنائی دی۔ یہ دستک اسے بڑی ناگوار گزری۔ اس نے کڑخت لہجہ میں پوچھا۔  
"کون ہے؟"

پیر داٹھکھا۔۔۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ عین اس کے سرے پر بڑا کچّا مکان تھا جہاں وہ اپنی بوڑھی ماں اور ایک بیوہ ہی سمیت رہتا تھا۔ گاؤں میں گھنٹے وقت چونکہ اس کا مکان سامنے پڑتا تھا۔ اس لئے راہ گیر اسی سے کسی کے مکان کا پتہ یا کسی اگلے گاؤں کا راستہ دریافت کرنے کے لئے دروازہ آن کھٹکتا نہ تھے۔ لیکن اس وقت آدھی رات ہونے کو تھی اور پھر سردیوں کے موسم میں تو سرد شام ہی گاؤں پر خاموشی کا تسلط ہو جاتا تھا۔ نہ جانے بے وقت کون آن وجر کا تھا جب نو لاکو یقین ہو گیا کہ اسے اُٹھنا پڑے گا تو اس نے حقّ کی فئے ایک جانب کو ہٹائی اور دھستے کی سمت نکلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

نوٹ :- اس کہانی کا پس منظر وہ سنہرا عالمِ پنجاب ہے جس میں ہندو، مسلمان اور سکھ ڈاکوئل جمل کر اپنے بھائی بندوں کے مکانات میں نقب لگا پا کر تھے تھے۔

دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر تاریکی میں میاں نے قد کا ایک سچہ کھڑا ہے۔ گپٹی اس کے سر پر موٹے رستے کی طرح لیٹ ہوئی تھی۔ اور اس کے ایک ہرے سے اس نے اپنے چہرے کا، آنکھوں کے سوا، نیلا حصہ چھپا رکھا تھا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا۔ سینوں موٹی گھنی اور لمبی تھیں۔ آنکھیں نیزاد و مقبوس۔ اسی کی ناک کی جڑ کے قریب آنکھوں کے نیچے باریک اور گہری لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا۔۔۔۔۔

مولانا بدکلامی کرنے کو تے رک گیا۔ اس نے بھاری اور خشک جیسے میں پوچھا :-  
”تم کون ہو؟“

اجنبی نے غم بھر اس کی طرف چھٹی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر غصے سے بولا:-  
”میں مجنبوڑی گاؤں سے آ رہا ہوں“

”بھلیوڑی؟ وہ تو یہاں سے بیس کوں کی دوری پر ہے لیکن تم کیوں بات کرنے ہو جیسے پڑوس کے گاؤں سے آ رہے ہو۔۔۔۔۔“

اجنبی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا:-

”میں ڈاچی پر آیا ہوں“

مولانا اس کے لڑنے کا ڈھنگ پسند نہیں آیا۔ اس نے بے پردہ اپی سے کہا ”خیر مجھ اس سے کیا غرض؟ سوال تو یہ ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

”مجھے لگا سنگم مجنبوڑی والے نے بھیجا ہے“

یہ سنگم مولانا چرکتا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نوادار کا بازو تھام لیا اور جلدی سے وہی آواز میں بولا:-  
”..... تو یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اندر چلے آؤ نا؟“

اجنبی بیک جست اندر آ گیا وہ بڑا مضبوط شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بدن پر موٹا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔

مولانا نے ڈیڑھ میں سے جھانک کر اندر کی جانب دیکھا اور اس امر کا اطمینان کر لیا کہ اس کی بہن اور ماں

سب سے پیچھے والے کمرے میں لحافوں میں گھسی پڑی ہیں تو اس نے صحن والا دروازہ بند کر لیا۔ اور اجنبی سے مخاطب ہو کر بولا:-

”میں نے دروازہ بند کر دیا ہے تاکہ ہماری باتوں کی آوازیں اندر تک نہ پہنچیں“

اجنبی کچھ نہیں بولا مولانا نے تیزی سے باہر والے دروازے میں سے جھانک کر اوپر ادھر نگاہ دوڑائی۔ پھکی

چاندنی میں دوڑ جو ہڑکا پانی پچکلے ہوئے سیسے کی ٹنگی کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا ساکن تھی۔ پیڑ اور در در درونک بھلی

ہوئی جھاڑیاں بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر مولانا نے اپنے دانستہ میں انگلی ہوئی حلقے کی تے کو ہونٹوں میں ڈبو

کر بڑے اطمینان سے گڑ گڑ کی صدا بلند کی اور پھر دروازہ بند کر کے لوٹا نوادار ڈیڑھ کی اندر ہی ہوئی کھڑی سے

ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

” بھوک لگی ہو تو تیار کھانے ماننے کا کچھ بندوبست کروں “  
 ” نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں، قریب کے گاؤں سے..... بس اب کلمہ پڑھنا چاہیے “  
 ” کیوں اتنی جلدی بھی کیلئے ہے؟ “  
 ” مجھے پھر وہ ٹوٹنا ہو گا “  
 ” کیوں “  
 ” مجھے نے ہی کہا تھا۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں کسی نے دیکھ لیا تو سب ہو گا۔ کھاہ کھاہ “  
 ” ڈاچی کہاں ہے؟ “  
 ” ڈاچی ساتھ دوائے گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آیا ہوں “  
 ” اور بندہ کدھ؟ (بندوق) “  
 ” بندہ کدھ میرے پاس ہے “  
 ” مولہ کو تعجب ہوا کہ اتنی بڑی بندوق اس نے کہاں چھپا رکھی ہے۔  
 اس پر اجلی نے قدرے جھنجھلا کر کہیں کے نیچے۔ سے دھنالی بندوق دکھائی جس کی دونوں نالیاں الگ ایکے اس نے  
 بٹ BUTT سمیت انگوچھے میں پیٹ رکھی تھیں اور پھر ان پر ایک رسی کس کر باندھ دی تھی۔  
 اب مولہ سمجھا۔ سر ہلا کر بولا۔  
 ” اچھا توڑ کر باندھ رکھی ہے “  
 ” ہاں وہ۔ ایسے چھپ کر نہیں سکتی تھی “  
 ” ٹھیک “  
 ” اب جلدی کرو “  
 ” اور کا توں؟ “  
 ” اجلی کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ بگڑ کر کہنے لگا۔  
 ” دیکھو میں ہل گئی تیار ہو کر آیا ہوں..... بس اب مجھے نوک کے پر لے چلو “  
 ” اچھی بات “ یہ کہہ کر مولہ نے جتنے کے دو تین خوب گھرے گھرے کش لئے پھر وحشت سے کو بدن پر خوب اچھی طرح پیٹا  
 اور نگو کر بولا۔  
 ” استاد تمہیں میرے گھر کا پتہ کیسے چلا؟ کسی سے پوچھا تھا؟ “  
 ” میں ایسا کچا نہیں ہوں کہ کسی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھتا پھرؤں۔ اس طرح تو تم پر شبہ کیا جاسکتا تھا۔ گئے نے  
 مکان کا ٹھیک ٹھیک پتہ اور تمہارا اعلیٰ بنا دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ تمہاری راہ دیکھتا ہو گا “  
 ” ہاں ہاں کیوں نہیں “ مولہ ہنس کر بولا ” جو اس کام کو کسی مانوی آدمی کے سپرد نہیں کر سکتا تھا۔ اچھا تو لو میں

چلا ————— ابھی دو تین اور آدمیوں کو بھی بلانا ہے :

” بولا تو . . . . . یہ ہیں ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا “

” بے شک بے شک جبروت بھی کیا ہے “

یہ کہہ کر مولا چلنے لگا تو اجنبی بولا ” سٹکا بیٹے جاؤ “

” کیوں ؟ “

” سٹکا کر گزرتے چلو گے سک نہیں ہو گا دیکھنے والوں کو “

” یہ تو واضح کھری بات کہی تم نے “

مولانا نے حقہ اٹھایا، اُسے دانٹوں میں دبائی اور چلم سے بندھی ہوئی چٹی جھلانا اور تہ بند لہراتا ڈبوڑھی سے باہر نکل گیا۔

اجنبی نے اس کے رخصت ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا اور سرکنڈوں کا بنا ہوا بالشت بھرا اونچا مونڈا گسیٹ کر  
سٹکے ہوئے آپلوں سے بھری ہوئی مٹی کی انگلیوں، دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ کر بیٹھ گیا۔

مولانا کپڑوں کی طرح ال کھاتی ہوئی سنسان اور رنگ گلیوں میں سے گزرتا ہوا بالآخر ایک بوسیدہ کچے مکان کے آگے  
کھڑا ہو کر آواز بے ڈینے لگا : ” سدا گرا ! اوئے سدا گرا ! “

کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے پھر ٹانگ لگائی ۔

” اوئے سدا گرا ! سدا گرا ہوئے ! “

پھر وہ اطمینان سے حقہ کر گزرتے لگا۔ دماغ میں جو طراوت پہنچی تو وہ لی اجنبی کو دعائیں دینے لگا جس نے کہ حقہ اس کے  
بمراہ بھجوا دیا تھا۔

مکان کا دروازہ کھلا اندر سے کھنکھنے اور کالے بالوں والا ایک نوجوان باہر نکلا اس نے پہلے تو مولا کی جانب خواہناک  
ہانکھوں سے دیکھی لیکن جب پہچانا تو اس کی آنکھیں پورے عور سے کھل گئیں ۔

مولانا نے زرد زرد دانٹوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا ” واجیں شے شے کر میرا تو گلہ بھی بیٹھ گیا کہاں گھسا پڑا اتھالاں  
کے موڑے “

اس پر دونوں ہنسنے لگے ۔

” سدا گرنے پوچھا ” ہاں بے تبا “

جواب میں مولانا چپ چاپ حقہ کر گزرتا رہا۔ پھر اس نے تشرارت اور پر معنی انداز سے ابرو اُڈاپاٹا کہ ایک ناکھ اس طرح

ماری جیسے ڈھیلہ کھینچ کر مار دیا ہو۔

” سدا گرجھ گیا۔ “

” چلو ” مولانا نے کہا۔

” ٹھہرو، میں اوڑھنے کے لئے تو کچھ لے آؤں اندر سے “



وہ بھاگا بھاگا اندر گیا اور کالے رنگ کی ایک لونی بدن پر لپیٹا ہوا خورا دامن آگیا۔  
دوڑوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ گاؤں پر ہو کا عالم طاری ہوا کہیں کہیں کوئی کھلی ماری گتیا دانت دکھاتی ہوئی دکان  
کے ایک کتے سے نکل کر دوسرے کتے تکے دباک جاتی۔ یا گارے کے ہنسنے مکاؤں کی دیواروں نے چھو ندری سماں چھپاتی  
پھرتی تھیں۔

وہ بے وجہ بچے میں باقی کرنے ہوئے وہ دونوں بڑھتے چلے گئے۔ انھوں نے مہلا سنگھ کو اس کے مکان سے اور  
بھو کویشیوں کے طریقے سے بلا کر اپنے ہمراہ لیا اور واپس مولہ کے مکان پر پہنچ گئے۔  
اندر سے اجنبی نے دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ اب گڑبڑی کے شے میں چھپا ہوا تھا۔ رد اگر بھو اور مہلا سنگھ  
ابھی نوجوان تھے ان کاموں میں شے شے داخل ہوئے تھے۔ اجنبی کا نقاب کے پیچھے چھپا ہوا چہرہ اور جتن کے مانند گھنی بھنوں  
نے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ان کے فوجیز جسموں میں سنسنی کی نعریں دوڑ گئیں۔  
اجنبی نے جلدی سے ان کی صورتوں کا جائزہ لیا۔ چہرہ اس نے کھیس میں سے ہاتھ نکالی کر اشارہ کیا کہ اب  
دیکھ بات کی ہے۔

اس کا ہاتھ بھی کالا تھا اس پر موٹے موٹے بال آگے ہوئے تھے۔

مولہ نے جواب دیا۔

”دیکھ کسی بھی بات کی نہیں“

”تو اب چلیں“

”ضرور“

مولہ نے آگے قدم بڑھایا اور باقی سب اس کے پیچھے پیچھے ہوئے۔ اجنبی کے قدم بڑی پھرتی سے اٹھ رہے  
تھے اور اس کی پتلیاں دم بھر کو بھی ایک جگہ نہیں رکتی تھیں۔ نیس کے دانوں کی طرح کھٹا کھٹ گھومتی تھیں۔

دور سے بھی گھبراہٹ دار کے وقعتہ جھلا اٹھنے کی آواز یوں سنائی دے جاتی جیسے وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ کر  
ہڑاڑا اٹھا ہو۔ اس آواز اور اپنے درمیان کافی فاصلہ رکھتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

گاؤں سے نکل کر تقریباً پون میں کی قدری پر واقع پیراں داسے رہٹ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ مولہ کے اشارے  
پر تہہ اگر نہ رہٹ کے قریب والے بارے میں گھس کر ایک مرلی میل کو باہر نکالا اور پھر وہ اسے مانگتے ہوئے ذرا پسے  
ئے اور گاؤں کے ایک بڑے سووخور کے کعبہ میں اسے چھوڑ دیا۔ اوردہ خود ببول کے پیر کی چھدری چھاؤں سے  
جا کھڑے ہوئے۔

پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔

اجنبی سنگھ نے پھرتی سے اپنی اگل میں سے بندوق کا انجربنجر نکالا۔ نالیوں کو بیٹ سے کرک کیا اور نیچے کی جانب  
چوٹی کھینچی جاتی اور تنہیل کی ایک ہی ضرب سے سے اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

پھر اس نے دونوں ٹالیوں میں ٹھوس گولیاں BULLETS والے کارتوس بھرے۔ اور ایک نظر مل بیل کی جانب دیکھا جو سرد ہو امین کان پھر پھڑپھڑاتا اور ہلکی اور کمزور دم کو نقاہت سے ہلاتا گھاس پر مٹہ مار رہا تھا۔ پھر اس نے شست باندھ کر لپٹی دبائی۔ گولی کھانے ہی بیل بغیر کسی جدوجہد کے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ گولی تو شیر کو ٹھنڈا کر دینے کے لئے کافی تھی لیکن اجنبی نے احتیاط کے طور پر دوسری گولی بھی اس کی گردن پر چپکادی۔

بیل کا کام تمام ہوتے ہی اجنبی نے اپنی اور لمبی تیزی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مولا اور اس کے ساتھیوں کی جانب دیکھا پھر بھاری آواز میں بولا۔

”اچھا اب مجھے چلنا چاہیئے۔ صبح سے پیسے واپس پہنچنا ضروری ہے۔“

مولانے ہاتھ بڑھا کر کہا ”اچھی بات“

اجنبی نے چاروں سے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک بار پھر بھاری آواز میں کہا :-

”ساب سلامت“

”ساب سلامت“

اجنبی نے پھر اپنی بندون کو توڑنا کر اس پر کپڑا لپیٹ دیا۔ اور پھر فی سہ قدم اٹھاتا ہوا قدم پھینکی چاندنی میں غائب ہو گیا۔

وہ چاروں کچھ دیر تک اسے جلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر وہ بیل کی جانب بڑھے اور دیکھا کہ وہ قطعاً مر چکا ہے۔

اب وہ جلد جلد گاؤں کی جانب بڑھے اور گاؤں کے قریب پہنچ کر آنکھوں نے دفعۃً پکڑ دیکر ڈاکا شور مچا دیا۔ لوگوں کو ڈاکوؤں کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ بہت بڑی تعداد میں لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تب انھیں پتہ چلا کہ بچا رے مولا کا بیل گولی سے مار دیا گیا ہے۔

مولا دیر تک گولی مارنے والے کی ماں اور بہنوں سے اپنا رشتہ کا منتہا بنا اور جب اس کا گلا بیٹھ گیا تو سورج نکلنے سے پہلے پہلے وہ چچہ کو س پرے کھانے میں اس امر کی رپٹ درج کر دیا کہ گاؤں لوٹ آیا۔

(۲)

”پیراٹھہ“ گاؤں چھوٹا تھا لیکن یہاں کا سب سے امیر گھرانہ ”ماہنہ“ دور دور تک شہور تھا۔ ارد گرد دہشتا میں ان کی اسامیاں موجود تھیں۔ اب ماہنوں کا دبیر کچھ کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہر یکے ٹھٹھے اور ارد گرد کے دیگر گاؤں کے بدعاشوں نے مل جل کر خواہ مخواہ مقدمہ بازی میں بھینسا کر انھیں کم کھلا بنا دیا تھا۔ اور اوجھران کے لئے مولانے ایک مئی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

سورجوں کا شور کچھ زیادہ بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ علاقے کے کھانے سے ایک لمبا بڑنگا مسلح تھا نیرا

سے پرچیا اور دو سائیکل سوار سپاہی ساتھ لے کر پیر کے ٹھٹھے میں آن ہوا۔  
گاؤں کے باہر ایک بڑے اور بڑگ پیل کے پیرٹے پہنکر تھانیدار گھوڑے پر سے اترا۔ نہر سکلاہ پر پہنچ جوتی  
خاک کی رنگ کی کلفت گل پگڑی کے لہانے پر سے شملے دُور ہی سے دکھائی دینے لگے۔ چنانچہ گاؤں بھر کے چمادوں  
وں اور کسانوں کے بچے اور کتے گاؤں میں گھٹتے ہی اس کے پیچھے ہوئے اور اب وہ ایک بڑا سا حلقہ بنائے  
ہے تھے۔

پیل کے پیچھے بلا کی گردوغلیں جس میں سوکھے پتے اور پھوسے لکے تنکے ملے ہوئے تھے۔  
گھوڑے کی لگام سیکھ سپاہی کے ہاتھ میں تھا کہ تھانیدار نے دونوں طرف سے وردی کو کھینچ کر اپنے سڈول بن  
ا، اس کا آدھا تھکلاہ دار پگڑی کے باعث اور لمبی آدھنچا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دھکی ہوئی پیشانی خوب کشادہ تھی اور اس  
جبر میں سے ایک دم آدھنچا گھٹتی تھی۔ اپنی شاندار آؤچی ناک کی وجہ سے وہ بڑا باقار اور بارعب انسان نظر آتا تھا۔  
نوجوانی کی ناخبرے کاری اس کے چہرے سے جھلکتی تھی لیکن وہ ذہین ضرور تھا۔ اس کی سبز رنگ کی پٹلیوں کی وجہ سے وہ  
دیہاتیوں کے انگریج، جان پڑتا تھا۔

پیلے اس نے کھلی ہوا میں شل شل کر دوغلیں گھرے سانس لئے اور پھر جیب ٹٹول کر ایک خاکی رنگ کا کاغذ باہر  
اور اس پر بغور نظر دوڑانے لگا۔

اسی اثنا میں گاؤں کے لوگ بھی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ادھر سپاہی نے گھوڑے کی لگام پیل کی جڑ سے  
مردی۔

کہیں سے نہروار کو خبر ملی تو وہ بچا را سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ جب وہاں پہنچا تو حال یہ کہ دم پھولا ہوا، اور  
ہٹا لوگوں میں الجھی ہوئی۔

تھانیدار نے ٹانگیں اکڑا کر لڑا کر نظر آؤ پڑا تھا اور حلقے میں کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک کو قریب آنے  
بارہ کیا۔

وہ بچا را گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

تھانیدار نے ٹھکانہ انداز سے کہا "میں تمہیں کو بلا رہا ہوں"

"جی مجھ کو؟" اس آدمی نے اپنے سینے پر ہاتھی جھانپنے ہوئے پوچھا اور اثبات میں جواب پلنے پر اس نے مضحکہ خیز  
ز سے آنکھوں کی پٹلیاں دائیں بائیں گھما کر ادھر ادھر مرد کیا اور پھر پگڑی سنبھالتا ہوا تھانیدار کی جانب بڑھا۔

"تم مولا کا گھر جانتے ہو؟"

"آؤ جی..... آؤ....."

"جاؤ اسے بلا کر لاؤ"

وہ آدمی سر پٹ بھاگا۔ لیکن مولا حقہ ہاتھ میں لئے پیٹے ہی سے تھنبدار اٹا چلا رہا تھا۔

تھانیدار سے انکبیں چار ہونے ہی اس نے دُور ہی سے حقّہ زمین پر رکھ دیا اور بڑے غلو سے جھک کر فرشی سلام کیا۔ اور پھر اگے بٹھا۔

”موتیاں والیر! میں نے دُور ہی سے آپ کو دیکھ لیا تھا۔ بس حقّہ تازہ کرنے میں دیر ہو گئی۔“

یہ کہہ کر مولّا نے بڑے خوشامدانہ انداز سے حقّہ کی نئے اس کے نعتوں سے بھڑادی۔

غبردار آتے ہی چار پائی کا انتظام کرنے کے لئے اٹھ پاؤں لوٹ گیا۔ بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہ پا کر تھانیدار ایک گھدہ پر بیٹھنے لگا تو مولّا نے بڑھ کر اپنا کھیس پکھا دیا اس پر۔ اور پھر لاکھ لکھا ”اوسے مبادیو! بچے کے میرے گھر سے چار پائی اور بستر لے آؤ۔“

اس کی بات سنتے ہی دو تین آدمی بھاگ نکلے۔

تھانیدار نے پہلے تو چپ چاپ حقّہ کے خوب گھرے گھرے کش لئے اور پھر مولّا کی جانب مخاطب ہوتے ہوئے شکر اکر بولا ”سنا اوسے بھوتی پیسز! بات کیا ہے آج چروں کے گھر موڑ پڑ گئے؟“

”قوبر امیری قوبر! آگئے کتنے مولّا وہیں اس کے قدموں میں پھیر گیا۔ جبر جنتو! جی تو کہتے ہیں کہ بد اچھا بد نام پڑا۔“  
”ہاں خوب یاد آیا،“ تھانیدار نے سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”اوسے عجیب سینہ! جاجرا رام محل ماننے سے اور دے لڑکے کو تو بلا کے لیا۔“

پہلے ہی سے مدح لئے ہوئے سدا گرنے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ دئے اور مسکین آواز میں بولا ”کھان صاحب! بڑا ازغہ ہو گیا ہے جی۔ پچائے مولّا کی ناں کمر ہی ٹٹ گئی۔ کسان کو بیل کا بڑا سہارا ہوتا ہے۔“  
مولّا نے ٹھنڈی سانس بھر کر منہ نیچے کر لٹکا دیا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ رام محل سفید دھوئی اور اس پر سفید کتہ پہنے آ پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کا نرم نازک عین سالہ لڑکا بہرا محل بھی تھا جو ہنکون پہنے تھا۔

تھانیدار نے باپ بیٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا، باپ بچارا اوجیر طرک کا سنجیدہ انسان تھا لیکن تھانیدار کو لڑکے کے کھڑے ہونے کے انداز سے بغاوت کی بو آئی۔ تاہم اس نے کافی تحمل سے بوجھا۔

”ابے لونڈے اپنا نام بتاؤ۔“

اس پر پڑھے لکھے لڑکے کو کچھ گرمی آگئی برہم ہو کر انگریزی زبان میں بولا۔

”YOU SHOULD NOT BE SO RUDE!“

تھانیدار کو انگریزی میں داہمی آتی تھی۔ اس لئے نہ ٹھکانے میں بولا۔ دیکھ اوسے منڈیا! ہم سے زیادہ گٹ پٹ نہیں کرنا۔۔۔ جو کہنا ہو سو اپنی بولی میں کہو۔ تاکہ سب لوگ تمہارا بیان سمجھ سکیں۔“

تو جوان ذرا تیز مزاج تھا بولا ”آپ افسر ہی آپ کو ذرا تمیز سے بات کرنی چاہیے۔“

یہ غیر متوقع جواب سن کر تھانیدار نے سر اُپر اٹھایا اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے اشارے

سے سپاہی کو قریب بلایا اور مونٹ کاٹ کر بولا "بجیرت پینا! ایس منڈے کو تھوڑی تیز دکھاؤ"۔  
 عجیب سنگھ کے دو تین جھانپڑ کھا کر نوجوان کے دواخت ہل گئے۔ اس کے ٹخنوں میں سے خون بہنے لگا۔ تھاں بیدار نے  
 اس کے پچنے بالوں کے گچھے کو ہاتھ میں دبوچ کر کہا: "جینا! میں تمہارے ایسے شریف پر عاشقوں کو بیدارے راستے پر لانا خوب جانتا ہوں!"  
 پھر حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے "دیکھو جی ایک غریب کہ ان کا بیل گولی سے مارا گیا اور اوپر سے دھونس جاتے ہیں۔ قانون ہمارے  
 ہاتھ میں ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانا ہمارا کام ہے۔"

حاضرین میں سے بیشتر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تھاں بیدار نے کہا "اے مولیٰ! اوکے مولیا!"  
 "جی موتیاں والیو!"

مولیٰ بھلی ہی میں سے نکل کر ہاتھ باندھ تھاں بیدار کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

"بیل کہاں پر رہا ہے؟"

"سہنشاہ جی وہ تو مانتوں کے کعبیت ہی میں پڑا ہے۔ بچا راقسمت کا مارا بارے میں سے نکل ان کے کعبیتوں میں جا نکلا۔  
 بس اٹھا کے گولی داغ دی انہوں نے۔ بھلا دو ڈنڈے مار کر نکال دیتے سارے کو۔ غریب کا بیل تو بچ جاتا۔ یہ کہتے کہتے مولیٰ نے  
 ردی صورت بنائی۔"

ماتھا بہ الزام سن کر شیشا گیا۔ لیکن بیٹے کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اس نے سر پ جوڑا۔

"ہم مرا ہوا بیل موقعہ پر دیکھیں گے"

"چلو موتیاں والیو!"

اب آگے آگے موتیاں والا۔ ساتھ ساتھ مولیٰ، سداگر، بھو وغیرہ۔ ان کے پیچھے ملے۔ اور سب کے آخر میں ناک سڑ سڑتے  
 نیچے اور وہیں ہلانے ہوئے گئے۔

پیش کر کعبیت پر کعبیت پھلانگتا ہوا جب ماتھوں کے کعبیت میں پہنچا تو دیکھا کہ سروی سے اکڑا ہوا بیل کعبیت میں ٹانگیں  
 پسارے پڑا ہے۔۔۔۔۔ مولیٰ نے احتیاطاً ایک لوندے کو دایں بٹھا دیا تھا تاکہ گدھ اور کتے مردار کے قریب نہ آئیں۔

خاں صاحب (تھاں بیدار) نے بیل کی اگلی ٹانگیں کے نیچے اور گردن میں لگی ہوئی گولہوں کے نشانات کو بغور دیکھا۔  
 گاؤں کے تین چار آدمیوں کو بھی دیکھنے کا حکم دیا۔ پھر گاؤں واپس آکر بیل کی چھاؤں تلے بھی ہوئی چار پائی پر بیٹھ گئے۔۔۔۔۔ اس  
 وقت ان کے لئے کھن اورستی کا کٹورا طیار تھا۔

کھن کا گولہ نکل کر اور اوپر سے سسی چڑھا کر خاں صاحب نے باچھیں جھاڑیں نما رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا "ہاں بے  
 مولیٰ! اب بتا سارا قصہ۔ تیرا بیان کھا جائے گا اب۔"

مولیٰ نے کھانسی کر گلا صاف کرتے ہوئے بتانا شروع کیا کہ کیسے بھی رات کو وہ اپنے باڑے تک یہ دیکھنے کے لئے گیا کہ  
 وہ لوندہ جو دایں موشیوں کی رکھوالی کے لئے مقرر تھا دایں موجود بھی تھا یا نہیں۔ کیونکہ اس کعبت کا ایک چھاروں سے یارا نہ تھا۔ موقعہ  
 پا کر راڈی کو دھڑکی کھک جایا کرتا تھا۔



اس کا سرکہ سرکہ تھا اور منہ کدھر کہہ

رام لال مقدسے بازی سے تنگ آچکا تھا مانہ جوڑ کر بول: خان صاحب! ابھی لڑکا ہی تو ہے شاید..... میں بیل کی قیمت دینے کو طیار ہوں۔  
 ”بیل کی قیمت؟ مولانا نے چلا کر کہا ”گریکے بیل کی جنون ایسی سنی نہیں ہوتی کہ جب جی چاہا مار دیا اور پھر پیسے کی منہ جمانے لگے۔“

خان صاحب بولے ”چھپ رہی تھم۔ بھلا اس بند کہہ۔“  
 ”نہیں بادشاہو! میری کیا مجال ہے؟“ مولانا نے جوڑ کر انگ کھڑا ہو گیا۔  
 ”اچھا لالہ! اپنی بندوق تو منگو آؤ خدا“  
 بندوق حاضر کی گئی۔

ہیرا بولا ”دیکھئے بندوق کی نالی میں گر بڑا لگا کر میں نے انگ دکھ چھوڑی تھی“  
 خان صاحب نے ہیرا کی طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے سر ہلا کر بولے ”سب سمجھتا ہوں یہ گر بڑا تو آج ہی کی گئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔“

گھوڑی و بزنک بندوق کا معائنہ کیا گیا۔ پھر انھوں نے سپاہی سے کہا۔  
 ”جیسے سینہ کا گندلاؤ تو بندوق کی رسید لکھ دوں“  
 اس کے بعد سب کے بیانات مکمل کئے گئے۔ اور پھر تھانیدار نے کہا ”بندوق تھانے میں داخل ہوگی۔ بیٹا! ہیرا جلد تھانے۔ پھر دیکھو میں ہیرا کا بیڑا کیسے بناتا ہوں۔“

رام لال بیٹے کے لئے سخت پریشانی تھا۔ مانہ مانہ کدھر کدھر بولا۔  
 ”خان صاحب دیا کیجئے جی بیل کی قیمت اور جرمانہ دینے کو طیار ہوں۔“  
 ”یہ تو بے لک باتیں ہیں..... معلوم ہوتا ہے کہ تھادی جیب میں تپے آجیں رہے ہیں لالہ!“  
 رام لال نے مشکل غوک نکلتے ہوئے پوچھا ”کیا ضمانت نہیں ہو سکتی؟“  
 ”یہ سب تھانے پہنچ کر طے ہوگا۔“

یہ کہہ کر خان صاحب گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ جب وہ ہیرا کو لے کر چلنے لگے تو رام لال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکے نے جو شہنشاہی کی ہے۔ اس لئے اس کی خیر نہیں۔ کچھ سوچ کر آگے بڑھا اور مانہ جوڑ کر بولا۔  
 ”خان صاحب ایک بات عرض کروں۔“  
 خان صاحب نے گھوڑا روک لیا۔

”بات یہ ہے کہ ہر لڑکے بیل کو گولی میں نے ماری تھی۔“  
 خان صاحب نے ہنس کر گھوڑے کو ایڑی اور بولے ”لالہ! لڑکے کو بچانے کی خاطر جھوٹ بولی رہے ہو۔ نہ لگاؤ ہوں

سے تو رہ چھو۔ ہم تو قانون کے بندے ہیں۔“

جب تھا نیا صاحب ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بدعقلمی اپنے ساتھ لے گئے تو ملانے اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں بٹن کر پیلے آسمان کی طرف، بجھا اور پھر بھاری آواز میں بولا ”یا مولانا! اس کے بعد سداگر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا ”دیکھ بے سداگر! تو گھوڑی پر سوار ہو کر سیدھا بھنبوڑی چلا جا اور بگا سنگھ سے کہہ دے کہ وہاں دھابیں دھابیں لینے والی چڑیا بھر سہیں بند ہوئی ہے۔“

(۳)

ابھی سورج دھل ہی رہا تھا کہ دفعۃً اس نذر زور کی آندھی آملی کہ زمین سے آسمان تک دھبے اڑ دھا رہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ زمین کا سینہ بھٹ گیا ہے اور گرد کے بادل و بادل فلک بوس پہاڑوں کے مانند جھوم جھوم کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ارد گرد کا ہر سمندر خس و خاشاک کر اڑانا، اندنا چلا آرہا ہے۔ سورج دفعۃً روپوش ہو گیا۔ ہر چار جانب دھندلا ہٹ اور پھر تازہ لگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور گولے آسمان میں آنے والی آندھی کی خبر دینے والے چیلوں کے جھنڈ بھی اس بے پناہ دھندلاہٹ میں غلط ملط ہو گئے۔

کھڑکی کے بنے ہوئے بھاری بھاری چکر ڈولنے والے رست کے اوپر چھانے ہوئے پتلا لہ کے پیڑوں کے جھنڈ میں کپور سنگھ ٹپٹے دانہ ایک آتشیں تھوڑی والی سترنا پاسبان مضبوط گھوڑی پر سوار باہر نکلا۔ اس نے پہلے پہر کے ٹپٹے کی جانب دیکھا اور پھر دور دور تک کچھ ہوئے کھینٹوں پر نگاہ دوڑائی۔ لیکن اس کی نظر دور تک نہیں جاسکی۔ کیونکہ آندھی دم بدم بڑھتی رہی تھی۔ کھینٹوں کی فصیل گر دالو ہو کر آندھ سے ایک بڑے تالاب کے جیسے گردے پانی کی طرح لہریں لینے دکھائی دے رہی تھیں۔

کپور سنگھ نے والا، جسے عام طور سے کالائیز کہتے تھے، اپنے گلوں سے نکال دیا گیا تھا۔ کئی برس سے اس نے گاؤں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن ہفتہ بھر پہلے وہ چھدی چھپے اپنی بہن کو ملنے کے لئے گیا صرف ایک رات رہ کر اور یہ معلوم کر کے کہ سسرال سے لائے ہوئے زیورات وہ کہاں پر دکھتی ہے، وہ چپ چاپ لوٹ آیا تھا۔ آج ان زیورات اور اس کے ساتھ اڑوس پڑوس والوں پر بڑا غصہ صاف کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ ہنس جیم انسان تھا، کالا بھنگ۔ حرامی پن میں رہا ہوا تھا۔ اس کا دل بھری اور جذبات کُند ہرچکے تھے۔ ابھی وہ دور دور تک نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ کھینٹوں میں چند سائے دکھائی دیئے جو پرچھا بھوں کی طرح اس کی جانب آئے۔

آندھی کا زور بڑھنے لگا۔

گاؤں کے چاروں طرف پھیلی ہوئی گرو پر پہلے تو سب وصول کی چادر میں لہلہائیں پھر بھاری گونہ ورنہ اور پرکو اٹھنے لگی اور جو ہڑکے پانی کی سرسراتے ہوئے ساپوں کی طرح نفی نفی لہریں بل کھا کھا کر گردیں لینے لگیں۔ طوٹے، کٹے و



دیگر گھریلو چٹا پھیل اور دھڑک کے پیڑوں میں پناہ گزین ہو گئیں۔  
 کھیت کھیت چلتے ہوئے آدمی جب قریب پہنچے تو کھاد سے نے انہیں پہچان لیا۔ اگے اگے بولتا تھا اور اس کے  
 پیچھے پیچھے سدا کر، بھو، اور میلا سنگھ۔  
 انہیں دیکھتے ہی کھدرا کر خست لبیں بولتا۔

”کیونکہ بڑا لڑا۔“ اچھا اب میں چلنا ہوں۔“

”ابھی باقی لوگ تو نہیں آئے ہوں گے۔“

”اے گئے ہوں گے۔ چل کر دیکھتا ہوں۔ تم لوگوں کو تلاش کرنے میں میرا وقت خراب ہوا“

”ہم تمہیں دیکھتے رہے۔ تم کہیں دکھائی نہیں دیتے۔“

”رہٹ پر ملنے کا وعدہ تھا۔ میں سیدھا اسی جگہ پہنچ گیا تھا۔“

”پہلے ہم بھی رہٹ پر گئے تھے۔ پھر وہ کھیتوں میں چلے گئے۔“

کیوں؟

”ہم نے سوچا کہ کہیں ریٹ پر کوئی ہمیں ساتھ ساتھ دیکھ نہ لے“

”یہ اچھی حرکت کی رقم تھی۔ اس قسم کی حرکتیں کرو گے تو خود بھینسو گے اور ہمیں بھی پھینساؤ گے۔ اگر مجھ کوئی اس

جگہ دیجیے لیتا تو ۹

مولانا بلا۔ اچھا جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ہم اپنی جگہ سے تمہیں دیکھنے کی کوشش کرنے رہے لیکن آندھی کی وجہ

تم دکھائی نہیں دیتے ..... بسعفی! آگے کو خیالی رکھیں گے۔ ایسی گنتی نہیں ہوگی۔“

اس پر کچھ ماحوش ہو گیا۔ بولا۔

” دیکھو تم اگر پہلے اسی جگہ رکیں گے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ہمیں خبر کر دینا “

” اچھی بات “

”مولانا! تمہارا گھر تو بالکل سامنے پڑتا ہے۔“

” تو پھر ذرا نظر رکھنا۔ تاکہ جب ہم یہاں پہنچیں تو تم جس سے ایک شخص یہاں آئے ہو سکتے ہو۔“

”لیکن آدمی بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب تک اس کا جوڑ رہے۔ ٹھوڑی دیر میں ہاتھ لگ کر ہاتھ تک سچائی نہیں

مے گا۔ تم لوگ اپنی دُور سے کیسے دکھائی دے سکتے ہو۔

کہوڑے نے قدرے تاقل کیا۔ پھر لولا یہ بھی جھٹک ہے۔ لیکن اب کہیں کیا؟

”نہ یہ بتاؤ کہ سب کو لے کر کب تک لوڑ گئے؟“

کچھ دیر نے قدرے غور کرنے کے بعد جواب دیا: "بھئی پٹیل نے اور جینٹلنگ سے جواں آ رہے ہیں۔ اگر سب

پہنچ گئے تو یہم ایک گھنٹہ تک لوٹ آہیں گے۔“

”اچھی بات“

”اور کیا۔ اب رات بھیگنے کا انتظار تو رہ گئے نہیں ہم۔ آندھی سے تو اس قدر اندھیرا چھا رہا ہے گا کہ بس طبیعت

کھٹش ہو جائے گی۔“

”کیسے“

”لہجہ اب بھی چلا“  
 یہ کہہ کر کپورے نے گھوڑی کو اتر دی اور گرجے کی سی تیزی کے ساتھ، مہم دم دھندلاتی ہوئی جھاڑیوں میں  
 گم ہو گیا۔

(۴)

ایک گھنٹہ گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ پیر کے شے پر ایسی کمری تار بچی چھا گئی کہ پہلے کبھی دیکھے میں نہیں آئی تھی۔  
 کپورہ اور اس کے ساتھی گھوڑوں اور سانڈھنیوں پر سوار اندھا دھند چلے آ رہے تھے۔ تیز و تند ہوا گویا  
 ان کے کپڑے فوج کو ان کے بدن سے الگ پھینک دینا چاہتی تھی۔ ان کی واڈھیاں اور مونچھیں گیس سے اٹ گئی تھیں انھوں  
 کی ہلکیں ایک دوسری میں پروست ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر کپورہ ان کی رہنمائی نہ کرتا تو وہ بھی راستہ تلاش نہ کر پاتے۔  
 ان میں ہندو مسلمان اور سکھ سبھی ملے جلے لوگ شامل تھے۔ ان کے پاس دوپٹے، راکھلیں، خلیں، جن کی نالیوں  
 کے دھانے انھوں نے کپڑے کی ڈالوں سے بند کر رکھے تھے تاکہ گردانہ نہ جانے پائے۔ لاری کے اسٹیرنگ کی نالی والی  
 ایک بندوق بھی تھی۔ ان کے علاوہ وہ کرپانوں، پھولوں، لالٹھیوں اور صفا جنگوں سے مسلح تھے۔  
 اس وقت دُور سے پیر کا ٹھہرے ہوئے جھینے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔

گاؤں سے ہٹ کر سنت و نارسنگھ جی کی ٹوٹی ہوئی سماڑھ کی ادبھی، پواریں الگ تھلگ کھڑے ہوئے دیو کے مانند  
 دکھائی دے رہی تھی۔ بوسیدہ دیوار کے قریب سرے ہرے پانی کی ایک کھائی تھی جس کی سطح پر مسرنگ کی کائی جمی ہوئی تھی  
 اور دیوار کی دراڑوں سے جنگلی بیلین ٹنک آئیں تھیں اور ان کی پتیاں پانی کی سطح کو چوما کرتی تھیں۔  
 مولا نے سداگر کو حسب وعدہ موقعہ پر بھجوا دیا تھا۔ سداگر ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں سر اور کانوں کو دھسے  
 ہیں لیٹے بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لئے اس نے آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا سداگر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسی تار بچی میں کیا  
 دکھائی دے سکتا تھا۔ نظر نے تو کچھ کام نہیں کیا البتہ کانوں میں گھوڑوں کے سٹوں کی پٹاپٹ اور سانڈھنیوں کے بھلانے کی  
 آوازیں آئیں تو اس نے چونکا ہوا کہہ کر گدی اوپر اٹھائی لیکن ڈاکو چشم زدن میں اس کے سر پر تھے۔ اس تار بچی میں چھوڑوں کی جھج  
 جھج چمک اور بھی زیادہ خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔  
 اندھ کی شور میں آواز نہ گونجی۔

”کون؟“  
 ”سداگر، سداگر نے جلدی سے جواب دیا مبادا جواب دینے میں تاخیر ہو اور اس کا سر چھوڑے کی ایک ہی وار  
 کٹ کر الگ جا کرے۔“

”سداگر کون؟“  
 اب سداگر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے چلا کر بولا: ”وہ میں..... میں سداگر ٹھٹے والا۔ کپورہ کہتے آئے“

”میں دقت پر کپڑے کی گھوڑی چلی کر تگے برسی۔ سدا گر۔“  
”ماؤ کپوریا۔“

”اوتے اپنا ہی منڈا اے۔“ کپورے نے سانپوں سے کہا۔ پھر سدا گر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔  
”مولا بھی ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ گھر رہے۔“

”باکی سب ٹھیک ہے؟“

”سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“

اس اشنا میں گرد آؤدو ہوا فراتے بھرتی رہی۔ گھوڑے اور سانڈ ٹھنڈیاں بے چینی سے دفنماں تھیں۔  
نور اور ڈاکوؤں نے چندے آپس میں نباولہ خیالات کیا۔ اور پھر کپور سدا گر سے بولا۔  
”سدا گر بچو اب ہمیں رہٹ کی طرف لے چلو۔“

سدا گر کچھ کھے بغیر آٹھا اور رہٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سب اس کے پیچھے پیچھے ہوئے۔  
کپورے نے رہٹ کے قریب پہنچ کر دریافت کیا۔ ”سدا گرا! طویلہ تو کھالی ہے نا۔“  
”ماؤ بالکل کھالی ہے۔“

”ایسا نہ ہو کہ کوئی باہر کا آدمی گھسا ہو۔“

”ارے نہیں۔“

رہٹ پر پہنچ کر وہ گھوڑی اور سانڈ ٹھنڈیوں سے نیچے اترے۔ جانوروں کو طویلے میں بند کر کے سدا گر کو  
دکھالی کے لئے مقرر کیا اور خود سارے ساز و سامان سمیت گاؤں کی طرف بڑے۔

مولا کے مکان کا دروازہ نیم وا تھا اس نے دروازے میں بیٹھیں پھنسا کر تختوں کو ایک جگہ جما دیا تھا۔ اور وہ خود  
بھوکے ساتھ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ مینلا سنگھ الگ بیٹھا دائرہ کی بد رہا تھا۔

انھوں نے دروازے میں سے ڈاکوؤں کے گردہ کو پہچان لیا جب وہ قریب آگئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان میں  
سب کے سب بڑے مضبوط اور زرخیز ننگے آدمی شامل تھے۔

مولا تہ بند جما کر کھڑا ہوا۔ اور بولا۔ ”ساب سلامت!“

”ساب سلامت لے جی۔“ وہی وہی علی صلی آواز بنی سنائی دیں۔

مولا بڑھ کر وہیں تک گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دروازے کے آگے بھانت بھانت کی صورتیں کھڑی ہیں۔

انھوں نے پگڑیوں کے شٹے کھا کر چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ سوا آنکھوں کے ان کے چہروں کا اور کوئی حصہ دکھائی نہیں  
دیتا تھا۔ بدن سے وہ ننگے تھے۔ ان کے جسم سرسوں کے تیل کی وجہ سے نہ صرف چمک رہے تھے بلکہ تیل کی ہلکی ہلکی بو بھی  
پھیل رہی تھی۔

مولانے گری ہوئی لمبی مونچھوں پر چار انگلیاں پھیرنے ہوئے کہا۔  
 "آج ناں اللہ وا بڑا پھیل ہے جی۔"

"ہاؤ۔"

مولانے کپورے کی نیکی پیچھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آجھا: پانی کا بجی پی دسارے۔"  
 کپورے نے جٹا جھاڑ ناریل کے مانند اپنے سر کو نکار کے طور پر بلانے ہوئے کہا۔  
 "نیش جھو! بخت گھٹ لے۔ پانی کا بجی کی بات چھو۔"

مولانے ادھر ادھر دیکھا۔

"جارو! سواری بنا آگئے او۔"

"نیش گھوڑے ڈاچیاں طیلے میں چھوڑ آئے ہیں۔"

"پر بھا! گھوڑے کچھ ٹیک رکھو۔ بھاگتے وقت جلد مت پڑے گی۔۔۔۔۔ اور پھر کپوریا! تجھیں کسی نے پچھان لیا تو اچھت آ جائے گی۔ تو اپنی گھوڑی بہت بچک رکھنا۔۔۔۔۔"  
 کپورے کو مولائی بات پسند آئی اس نے جھک کر ایک ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ اور وہ "ہاؤ" کہہ کر طویل کی جانب روانہ ہو گیا۔

کپورے نے مولانے سے کہا۔

"مولیا! اب دیر مت کرو۔ بس چلو ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔"  
 "بوت، بچھا۔"

مولانے چوٹک مار کر دیا بچھا یا تو اس کی لمبی لمبی مونچھیں پھڑکیں۔

اب وہ ایک لمبی قطار کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے بڑھنے لگے۔ گوبر کے ڈھیروں، جوہڑ، اور اردوڑوں کے قریب سے ہوتے ہوئے وہ گلی میں گھس گئے۔

آندھی کی دیر سے بے پناہ شور پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے موقع پر گنتے بھی تنوروں میں دیکے ہوئے تھے۔ ایک آدھ دیہی سی بھوں کی آواز نکالی جی تو وہ آندھی کے شور میں دب کر رہ گئی۔

ان کی رائیلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان سب کے ہتھیار بالکل طیار تھے۔ ہر اہم موٹر پر کپورا ایک آدمی کھڑا کر دیتا۔  
 مولائی ابھی تک لگا سنگھ سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بگاکم کو انسان تھا۔ مولائی اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ بچکے کے دوش بدوش چلا جا رہا تھا۔ بگاکم کی طرح لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں لیکن ان میں وحشی جانور کی آنکھوں کی سی چمک اور شہت تھا۔ وہی ان سب کا سردار تھا۔  
 ڈاکو طویل کنگھوڑے کی طرح دیواروں سے لگے لگے بڑھ رہے تھے۔  
 بگاکم نے مولانے سے دریافت کیا۔

”سکان ہے کہاں؟“

”گاؤں کے بچوں بیچ“

یہ سن کر گئے کے ابرو پر بل پڑ گیا۔ بگڑنے والی زبان میں کہا۔

”اگر لوگ باگ جاگ بڑے تو اس تاریکی اور اندھی میں گاؤں سے باہر نکلنے کے لئے بہت احتیاط اور ہوشیاری

کی ضرورت ہے“

مولانا نے قدر سے بے پرواہی سے کہا۔

”اوسے مجھ آدم لوگوں کے سامنے کوئی ٹکارہ سکے گا۔ چاہے سو آدمیوں سے بھی مقابلہ کیوں نہ ہو جلتے“

جتنے پر مولانا کی اس بڑا کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ گاؤں والوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن

وہ ایک گرگ جانا نہ بد تھا۔ اس وقت سوالی مقابلہ کر سکتے یا نہ کر سکتے کا نہیں تھا بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ گروہ کا ہر آدمی نکل کر

نکلنا چاہیے ورنہ ایک آدمی بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو سارے گروہ کی آفت آ جائے گی۔ اس قدر اندھی تاریکی اور شور

میں یہ سارا کام بخیر و خوبی انجام پا جائے اس قدر آسان نہیں تھا جتنا کہ مولانا کو محسوس ہوتا تھا۔

معاذ اللہ ایک دم رک گیا اور اس کے پیچھے رہنے میں ڈاکو رک گئے۔

تاریکی میں سامنے سے انھیں ایک تاریک نر سایہ دکھائی دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آدمی جلد جلد قدم اٹھانا بڑھا

چلا آ رہا ہے۔

وہ سب چپم زون میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ آدمی بدن پر کالی چادریٹے تیزی سے بڑھتا آ رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ وہ ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔

ڈاکو دم سادھے کھڑے تھے۔ اتفاق سے اس دیوار پر ایک چھوٹا بڑھا ہوا تھا اس لئے وہ مکمل تاریکی میں کھڑے

تھے۔ یوں سمجھ سے قریب کھڑا ہوا آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ تو محض بگڑے کی محسوس آنکھوں نے ہی اجنبی کر لئے دیکھ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ اجنبی اور کے قریب سے گزرنے لگا۔ اس غریب کو اس امر کا مطلقاً احساس نہیں تھا کہ وہ چھپا ہوا

ڈاکوؤں کی چھوٹیوں کے سامنے تلے سے گزر رہا ہے۔ اگر کہیں اس کے منہ سے چوں کی آواز نکل جاتی تو اس کا سر تن سے جدا ہوتا۔

ڈاکوؤں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی وہ اس منہ سے آدمی کے سامنے کو اپنے قریب سے گزرنے دیکھ رہے

تھے۔ خدا خدا کر کے وہ ان کی قطار سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سب نے اطمینان کی سانس لی۔ کیونکہ وہ اس

وقت خون خرابہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر کہیں اس کی بہت تیز چوچ نکل جاتی۔ اور اس چوچ کو سن کر گاؤں میں شور مچ جاتا تو انھیں

خالی ہاتھ واپس بھاگنا پڑتا۔

گاؤں کے اندر والے چور اپنے پرہیز تو دیکھا کہ اونچے چوتھے والے بڑے کنویں کی منڈیر پر پانی نکالنے کی

آدھی آدھی چکر کھڑیاں سر جھکائے غناگ انداز میں کھڑی ہیں۔ اور ان چکر کھڑیوں کے قدموں میں ناہموار پینڈوں والے لڑکے

کے ڈوبے ہوئے کے زور سے پل بل کر ڈنگ کا شور بلند کر رہے ہیں۔ اور چوتھے کے قریب کھڑے سوڑیوں کے پیر گویا

انہیں خشکیں نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”دوب فوراً پیڑوں کے تھنڈے چلے گئے۔ تاکہ آپس میں شوق نہ کر لیں۔

کیونکہ اس نے تجھ کو سب کی تعداد معلوم کی ہے اور اس نے کہا۔

”اس جگہ کم سے کم تین جوان کھڑے رہنے چاہئیں۔“

(۲)

”وہ کیوں؟“ ان میں سے ایک نے جلد جہانے کے علاوہ کا ذرا اٹھ تھپٹ جوان تھا، اعتراض کیا۔

”کیونکہ اس کا یہ اعتراض پسند نہیں آیا۔ اس نے ابرو پر ہلکے سے ہل ڈالی کہ اس کی جانب دیکھا اور پھر گہری

دافس دیکھا اس نے اپنے غصے کو دبا دیا اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرنے لگا۔

”اس جگہ سے صرف ایک تنگ گلی آگے کو جاتی ہے۔ جو مکالموں کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے جگہ نکلنے

کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔“

”اے آپاں نوں پڑا نہیں ہے۔ آپاں نالی کو مکالمہ کر سکتا ہے۔“ فوجوان نے بازو ہرماں لہرا کر بے پرواہی سے بلند

آواز میں کہا۔

اب فکیر سے کاجی چاہا کہ اس کی گردن مروڑ کر رکھ دے۔ اس کے بہ تیور دیکھ کر فوجوان بھی پھرنے لگا فوجوان مضبوط

اور جوشیلا ہی سہی نیکی کیونکہ اس کے مقابلے میں کھڑا ہونا تو ہر امر حماقت تھی اس کی۔

شاید ان کے دو دو ہاتھ چرخ جلتے لیکن جگے بنے فوجوان کو اٹکھ دیکھا تو زور دے لگا پڑا۔ پھر بھاگتا پھرتا ہے

غما طلب ہو کر لولا۔

”ان تو کیا کہہ رہے تھے تم؟“

”اور جو تنگ گلی ختم دیکھ رہے ہو اسی کے اندر میں جان رہے۔ وہ مکانات جن پر ہماری نظر ہے قلعے کے مانند ہیں ہر

آفت سے بچھ ہوئے ہیں۔ اول تو وہاں پہنچنے کا کسی ڈاکو کو حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ ہماری پہلی کوشش ہے۔ اگر ہم وہیں کہیں گھر گئے۔

تو عجب مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہماری خبریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے سب کے سب صحیح سلامت نکل جائیں۔۔۔۔۔

صرف یہی ایک کھلی جگہ ہے خطرے کے موقع پر ہمارا ایک آدمی فوراً گلی کے اندر آ کر ہمیں خبر کر سکتا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی

چاہیے کہ اول تو ہمیں قنا بلکہ کرنا ہی نہ پڑے۔ لیکن ایسا ہو بھی تو یہاں کھلی جگہ میں ہو۔“

جنگلے اثبات میں ہر بلا۔

کیونکہ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

”یہ آدمی ہماری مدد بھی کر سکتی ہے اور ہمارا انگلسن بھی کر سکتی ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو اس ہلڑ بازی آدمی اور اندھیر

میں ہم اپنے ساتھیوں کی گفتنی بھی نہیں کر پائیں گے۔“

جنگا کو حرف بحرف اس سے اتفاق تھا۔

چنانچہ تین آدمی وہاں پر چھوڑ کر وہ لوگ آگے بڑھے۔

تنگ لگی ہیں ہنچ کر انہیں ہیں محسوس ہوا جیسے وہ قبر میں ہوں۔ آندھی اور ہوا کا نغمہ کم تھا البتہ قیامت کا شورہ کازوں پر دے پھاڑے ڈالتا تھا۔  
دفعۃً بگا ایک دم رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب کے قدم رک گئے۔ اور وہ اپنی نقوشیاں اس کے قریب لے آئے تاکہ اس کی بات سن سکیں۔

گئے تھے سانس کی طرف دیکھ کر پوچھا:  
” بانس نہیں لائے؟“

” اوہ تو بھول گئے۔“

” واہ اوئے بھٹو..... تو کیا اب..... کے سہارے سے چڑھو گے چھت پر۔“

” بانس کون دے رہے۔ مولا کے گھری سے تو لے لیا ہے۔ مبلہ جارا تو بھاگ کے جا اور مولا کی ڈیوڑھی کے اندر من کے

کونے میں ایک لمبا بانس دھرا ہو گا..... بس اٹھا کر پھوڑی بانس آنا.....“

مبلہ نے نقوشی گھائی اور ناک کی سہارا میں بیٹھنے لگا بھرتا ہوا چل دیا۔

وہ سب پھر آگے بڑھے۔ کچھ دُور جا کر لگی بانس مانف کو گھوم گئی غلی۔ مڑ سے چند قدم آگے دلہنے ہاتھ کو ایک اُردو اٹھا تھا جس کی بنیادیں بھرنے کے بعد نہ جانے اسے کیوں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب وہاں بڑے بڑے خشک جھارے اور ٹھنڈی دیکاس کی چھڑیاں کے انبار لگے مکان کی دیوار کے ساتھ سے ہوئے تھے۔ جب کسی گھٹیا کو سچے جھننے موتے تو وہ چیختی کہ اتنی ہیں ان کر پناہ یعنی ایک کونے میں بھڑ بھوٹے کا پوٹھا تھا جس میں اس وقت دینت بھری تھی۔

دلوں رک کر انہوں نے اس مکان کے کچھ اڑے کا جائزہ لیا جس کے اندر انہیں سب سے پہلے داخل ہونا تھا۔

چھت سے بڑے بجلی چمک چمک کر انہیں دکھا رہی تھی ٹھنڈے گھٹا میں سیاہ دامن لراتی بے پناہ دل کی طرح آسمان کی دستخون میں پھیلنے لگیں۔ آندھی کے زور میں کمی تو نہ آتی تھی البتہ ہوا میں پہلی سی گرد باقی نہ رہی تھی۔

پہرے کے اشارے پر وہ پھر رُک گئے۔ ان کی وارڈھیاں پھر ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس نے کہا۔

” سب لوگ یہیں پر رُکیں ہیں گئے کولے کر مکازوں کو اگلی طرف سے دیکھ دوں جرا“

وہ دونوں چند ہی قدم پہنچ کر ان سب کی نظروں سے اوچھل ہو گئے۔

سانس نے مکان کی جانب دیکھا اور پھر دل ہی دل میں اندازہ لگانے لگا کہ اس پر بانس کی مدد سے چڑھنا ممکن

بھی ہے یا نہیں۔ ان میں ایک بولا۔

” بھٹو! مکان جرا اُد بچا مالم جرتا ہے۔“

” ہاں ہے تو۔“

” اگر تم بانس کے زور سے پھلانگ کر اس پر نہ چڑھ سکے تو اُدھرا دھر سے اُوپر جانے کا کوئی راستہ یا سہارا بھی دکھائی

نہیں دیتا..... پھر تو آگے والے دور واجے سے جانا پڑے گا۔“



ساہنسی چپ چاپ دانتوں سے مونچھ کا ایک سر چھپاتا رہا۔ پھر یہی بولا جیسے اپنے آپ ہی کو مخاطب ہو کر کہہ رہا ہو۔  
 ”ہیں آگے بڑھ کر دیوار کے نیچے سے ٹھیک انداز میں لگا سکتا ہوں۔“  
 یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور دیوار کے قریب پہنچ گئی۔ ایک انبار کے عقب میں گم ہو گیا۔ تاریکی کی وجہ سے اندازہ لگانا مشکل سا ہو رہا تھا۔

چند منٹ کے بعد لگا اور کپور ابھی واپس آگئے لگا بولا۔  
 ”پہلے تو کپور سے کی بہن بہرہ تصرفات کرنا ہوگا۔ اس کے بعد پندرہ کے چند گھر بھی اچھے ہیں ان بھی جلدی سے ہاتھ بھر دیا جائے۔۔۔۔۔ اپنا ساہنسی یاد رکھ گیا۔“  
 ”وہ دیوار کی طرف گیا ہے آنا ہی ہوگا۔ اندھیرے میں اسے بھی کچھ سوجھ نہیں رہا۔“  
 چند ثانیوں کے بعد ساہنسی آگیا۔  
 اسے دیکھتے ہی لگے تے کہا۔  
 ”مکان تو اونچا ہے بھنو۔“

”ہاں بھائی“ ساہنسی نے پھر ایک مکان کی جانب نظر ڈالی۔ اور پھر قدم بے چینی سے ہاتھ لٹکے۔ شبید اس کے ہاتھ بانس پکڑنے کے لئے بے قرار ہو رہے تھے۔  
 ”پھر آگے تے سوال کیا۔“  
 ساہنسی نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟  
 جگہ کس کے جواب سے اطمینان نہیں ہوا لیکن سردست اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی تو نہ تھا۔  
 اتنے میں تکیہ ہاتھ میں لیا بانس نے یوں داروہو جیسے بڑے موذی کو کندھے پر لاوے لارہا ہو۔ ساہنسی نے تکیہ کو بانس نکال دیا۔ پہلے آگے بڑھا پکڑا کر اس کی مضبوطی کا سناڑہ لیا اور راستہ ٹھول ٹھول کر آگے بڑھا اور پھر اس نے مکان کی چھت کی جانب غردہ ڈالی۔ ٹھیلے سمان پر کالے یاوے گدے دھتوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔  
 اب ساہنسی نے اپنی کمر کے گرد ملبا رتہ پیٹا اور زمین پر ہاتھ مار کر دوڑ چیلے کر بند میں ٹھونس لئے اور سر کھٹک رہی واز میں ساتھیوں سے کہا۔

”اچھا اب میں کوشش کرتا ہوں۔ چھت بہ صبح و سلاطین پہنچ گیا تو یہ دوڑ چیلے تمہاری طرف پھینکوں گا۔“  
 بعد ازاں اس نے لے لے بانس کو سنبھالا، اسے دونوں ہاتھوں میں ٹولا اور پھر دوپہا مار پاؤں کے ہتھوں پر ناز کر بڑی سے ہماگ نکلا۔۔۔۔۔ معاً اس کے قدموں کی آواز بند ہو گئی۔  
 سب نے سے پر ہچکچہٹ ہوتے ہوئے چمکا در کی طرح ہوا میں اٹھنے دیکھا، قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھت پہنچ گیا ہے۔

اگر بجلی چمک جاتی تو اسے دیکھ ہی لیتے۔ وہ نہ..... تڑاق سے دو دھبے ان کے قریب گئے ایک تو میلو کی ٹانگ پر لگا۔  
 وہ اسے مبادیہ آدھ ٹانگ پر لگا کر بھینچ گیا۔ دیکھی سوٹ بالکل معمولی تھی ڈھیلہ کچی مٹی کا تھا۔  
 اب جگے نے چند آخری ہڈیات دیتے ہوئے کہا۔

دیکھو! اب ہمیں یہ سارا کام جلد سے جلد کھتم کرنا ہے۔ اس گاؤں میں چند ماچھے لڑکا حیران رہتے ہیں جو جان کی بھی  
 لگا سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چپ چاپ اور پھرتی سے اپنا اُتو سیدھا کر کے زرا در دو گیا رہ ہر جان ہے۔ کچھ؟  
 وہ ہاؤ جھوٹا "سب سے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔

کپور سے نے میلو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھبی آواز میں ہدایت دی کہ وہ سب جانوں کو اس کے مکان کے  
 دروازے پر پہنچ جائے۔

وہ لوگ اُدھر چلے گئے تو کپور اگتے کو ساتھ لے پھوڑا اڑے والی دیوار کے قریب پہنچا۔ ابھی ان کے قدم رکے بھی نہ  
 پائے تھے کہ چھت پر سے رستہ طے ناگ کی طرح پھینکنا مارا اور لہراتا ہوا نیچے کو جھوٹنے لگا۔  
 باری باری دونوں رستے کی دوسری چھت پر پہنچ گئے۔

چھت کی مندریں شکل چار چھ آنگلی اُدبھی ہو گئی۔ نیز وندرا سیدی کے زور میں انھیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے پاؤں  
 اکھڑ جائیں گے اور وہ چشمِ ندان میں اُڑ کر گاؤں کے باہر جا گریں گے۔ اس لئے وہ جھکے جھکے محسن سے آنے والی سیر بھی پرہیزی ہوئی  
 مٹی کی جانب بڑھے۔ یہ اور خوشی کی بات تھی کہ مٹی کا دروازہ اعلیٰ کھلا تھا ورنہ انھیں کوڑ بھانڈ کر نیچے جانا پڑتا۔ اس سے بیظاہر  
 ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ابھی سونے کا کوئی وقت بھی نہیں تھا۔

کپور سے کے ہاتھ میں داخل تھی، مگر اس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھوٹی اور ساہنسی حسب معمول لمبا سا پھراٹھلے تھا۔  
 انھوں نے ایک بار پھر اپنے اپنے چہروں کو مگر پاؤں کے شکلوں میں چھپا یا صرف آنکھوں اور ابروؤں کو نہ کاچھوڑا۔  
 اور پھر چونک چھوٹک کر قدم رکھتے ہوئے سیر جہاں اترے گئے۔

وہ کافی نیچے جا چکے تھے کہ دفعتاً مور سے ٹھٹھاتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ کوئی شخص ہاتھ میں لالٹریں  
 یا چراغ لئے سیر طبعوں پر چڑھنا چلا آ رہا ہے..... وہ ٹھٹھاک کر رک گئے۔ روشنی پھیلنے جا رہی تھی۔

ابھی وہ کچھ طے بھی نہ کر پائے تھے کہ چراغ کے پیچھے دو زنانہ پاؤں دکھائی دیئے اور ان کی آنکھیں ایک تیرہ چودہ سالہ  
 لڑکی کی آنکھوں سے طبع جو چراغ کو اپنے دونوں ہاتھ کے حلقے میں لئے ہوئے تھی تاکہ وہ بھگدڑ نہ لگے۔

انھیں دیکھتے ہی لڑکی کا رنگ تپ پڑ گیا۔ اس نے یہ بڑی زبان باہر نکال کر حلق سے ایک دلدہیز چرچ نکالنے کی کوشش  
 کی لیکن مارے خوف کے اس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی۔ مٹی کا چراغ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

جگے نے پھرتی سے اُگے بڑھ کر اسے تمام لیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ انھوں نے اس کے منہ میں اسی کی چند ری کہ  
 ٹھونس ٹھانس کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر وہیں کرنے میں ڈال دیا۔

محسن میں پہنچے تو دیکھا ایک جانب ڈیڑھ سیڑھی ہے۔ اور دوسری جانب مکان کا پسار۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس دروازے سے

لڑکی کی آنکھیں اس کا کندھا اس نے باہر سے چڑھا دیا تھا، تاکہ ہوا کی تیزی کے باعث دروازہ نہ کھلے۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور مردانوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بچہ ادب سا ہنسی دروازے کے دونوں جانب اپنے اپنے ہتھکڑیاں پہنائی رکھ کر بیٹھا۔ اور کپڑا باقی ساتھیوں کیلئے کا دروازہ کھولنے کو ڈیڑھ سی کی جانب بڑھا۔ ڈیڑھ سی میں موٹی بندھ گئے۔ ایک بیل تر سے اتنا پسند آیا کہ بے اختیار جی ہلکا سے بھی وہ اپنے ہمراہ لیتا جائے۔ لیکن اس رات یہ قطعاً ناممکن تھا۔

ڈیڑھ سی کا دروازہ کھول کر اس نے کلی جس جھانکا تو کچھ نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس نے بیل لائیکس کے انداز میں ٹوٹو ٹوٹو کر کے نین آوازیں نکالیں تو متعدد سائے اس کی جانب بڑھے جیسے کافی دیواروں نے انھیں جھمکے دیا ہو۔

کچھ سے نے ایک جوان کو بندرت سمیت گھر کے کچھواٹے غصے کے انباروں کے پاس کھڑے رہنے کے لئے بھیجا یا اتنی لوگوں کو اندر لے آیا۔

دو کھڑی بعد وہ سب لوگ دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ بگڑے چھوٹی بڑھائی اور دروازے کے کندھے میں اس کے وجود پر لڑکھائی آواز سے کھل کر گرا اور زلزلہ مچنے لگا۔ دروازے کے دونوں تکتے زور زور سے پکھلنے لگے۔

گھر کے لوگ سمجھے کہ لڑکی مٹی کا دروازہ بند کر کے لوٹی ہے۔ وہ کچھ دیر تک اس کے اندر رہنے کا انتظار کرتے رہے لیکن کوئی صورت دکھائی نہیں دی تو ایک مرد جلدی سے باہر نکل آیا۔ پہلے وہ دروازے کے دونوں جانب کھڑے ہوئے بگڑے سا ہنسی کو نہیں دیکھ پایا۔ جب اس نے لڑکی کو صحن میں نہ پا کر گردن کھائی تو بگڑا اور سا ہنسی کی صورتیں دکھائی دیں اس نے گھبرا پھا۔

”آپ کو ہیں۔“

اسی اثناء میں باقی آدمی بھی ڈیڑھ سی میں گھس آئے اور دروازہ زلزلے میں سے ان کی خبیث صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ وہ چپ چاپ کھڑے رہے۔ پیچھے سے کچھ سے نے اس کی گدی پر لٹے ہاتھ کا ایسا دھچکا دیا کہ وہ لڑکھائی میں برگر بڑا۔ یہ سب کچھ چند ثانیوں میں ہو گیا۔ وہ سب فوراً مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ لائیکس کی روشنی میں ان کے ہتھکڑیاں جھلک رہی تھیں۔

کپڑا فدا چھپا چھپا ہی رہا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ لے۔ وہ گئے گئے کو اندر والے کمرے میں لے گیا اور ان کی پرچی اشارہ کیا۔ دم کے دم میں سب کچھ سمیٹ لیا گیا۔ پھر وہ سب صحن میں آ گئے۔ بگڑے ایک نظر میں ساتھیوں کی تعداد جانچ لی وہ دو چھتوں میں بٹ کر بڑوس کے مکانوں کی جانب بڑھے جن کے صحن ایک دوسرے کے ساتھ سے ہوئے تھے۔

انہیں میں باہر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ان کے قدم رک گئے۔ کان کھڑے ہو گئے۔ پھر دھڑا دھڑا دو گولیاں آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ آندھی کے شور میں مردوں کے لٹکانے کی صدا میں بلند ہوئیں۔

موقعہ کی نزاکت سمجھتے ہوئے وہ باہر کی جانب بھاگے۔

جس نوخیز نشانہ باز جوان کی کچھ سے نے بنا روق سمیت مکان کے کچھواٹے ڈیڑھ سی لگائی تھی، اس نے برسرِ اہمیت

میں یہ گولیاں چلا دی تھیں۔ ہوا یہ کہ آندھی کے زور سے مچھٹی اور جھاڑ کے انبار حرکت میں آگئے اور لڑکتے ہوئے اس کی جانب بڑھے اور اُس نے گھرا ہٹ میں نہ جانے کیا سمجھ کر بچے درپے بچے گولیاں چلا دیں۔

اسی اثناء میں گاؤں کے مختلف حصوں سے خطرے کی صدا میں بلند ہوئیں۔ چرکھڑیوں والے کنویں کی جانب سے 'ایلی ایلی' کی آوازیں آنے لگیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کے سانحی انجین خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔

اب انھوں نے مینو کو آگے دگایا اور سرپٹ بھاگے۔

چرکھڑیوں والے کنویں تک پہنچے تو وہاں اندھا دھند لالٹیاں جلی ہی تھیں۔ گاؤں کے مچلے بھی جلدی میں جیسا ہتھیار ملے کہ مقابلہ پر اُن ڈٹے تھے لیکن تاریکی اور آندھی نے انجین بچھڑانے نہ دیا۔

ادھر تک کہ سدھاسم ہوئے سانحی گاؤں والوں کے کندھوں سے کندھے بھڑاتے ہوئے نہایت صفائی سے اُدھر اُدھر منتشر ہو کر صحیح سلامت گاؤں سے نکل گئے۔

اتنے میں کپورے کو اپنی کالی گھوڑی دکھائی دی وہ فوراً پھلانگ کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ جب وہ اپنی منہ زد گھوڑی کہ ایڑے سے گاؤں کے ہجوم کو کافی کی طرح چیرتی ہوئی نکل جائیگی لیکن میں اس وقت بھی جی تو گاؤں والوں میں سے بعض نے اسے پہچان لیا اور آندھی کے بھیاں گ شور میں کلاتر کلاتر کی دھنیلہ آواز میں گھل گئیں۔

ایڑے پیٹے جانے پر گھوڑی بوٹ کر جو اچھن تو گاؤں کے ایک مچلے جوان نے اس کی لگام پر چھپٹا مارا۔ اس پر گھوڑی ہلنا کر پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ اس کی انکھڑیاں پھٹ گئیں، کان پھڑپھڑائے اور بال بال لہرائے۔ سوار نے ہونٹ کاٹ کر اپنی بے دستے دانی کھانڈی اوپر اٹھائی لیکن گھوڑی کے اگلے پاؤں زمین پر گئے بھی نہ پائے تھے کہ ایک چھوٹی چکی اور کپڑے کے پیٹ کی آئینیں ادھیر جاتی ہوئی انجین پیٹ سے باہر لے آئی۔

وہ بڑے گھر گھر کی طرح بل کھا کر اندر سے منہ زمین پر گرا۔ پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹا اور لمحہ بھر میں زمین اس کے گائے خون سے سرخ ہو گئی۔

پھر بادش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

# ریلوے جنکشن

## قدت اللہ شہاب

"کتنی چمکی پوائے ہو؟" تارا نے پھونسنے ہی بغیر کسی ہلکے ہلکے کے پوچھا۔  
 "پندرہ دن کی" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔ چلو اس بار تمہیں لاہور کی ذہن دوڑ مال گاڑیاں دکھائیں گے" تارا نے فیصلہ صادر کیا۔  
 "میں بہر کروں گا۔ وہ کچھ دیر سوچ کر۔" مشفقانہ انداز سے کہتا ہے۔ "تم کمائیاں کھنا؟"

یہ لاکھ عمل ہم دونوں کے حسبِ مشابہت چنانچہ شام ہوئے ہی تارا مجھے مال روڈ پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے لان میں ہم نزل بے حیائی کے ساتھ ایک ایسی میز پر جاؤ گے۔ یہاں پہلے سے دو ایک ایڈیٹر، چند نامہ نگار۔ کچھ ریڈیو آرٹسٹ، کچھ ادیب اور چند لوگ بارڈر ویدہ صورت کے سیاسی حضرات پر اجماع تھے۔ چائے کا دو دو چل رہا ہے۔ ایک صاحب کو لڈائی لڑائی ہمارا فرما رہے ہیں۔ یہ کو لڈائی اس گرم چائے سے مختلف ہے۔ جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اور جسے معمولی ذہانت کے انسان پیا کرتے ہیں۔ یہ مشروبِ خاص لاہور کی ایجاد ہے۔ اور دستور کے مطابق اس ایجاد کی ماں بھی مزدورت ہے۔ وہ ضرورت جو پریہمیشن کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ انداز میں کی طرح لاتی ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس عقل پر پوسٹ مارٹم کے لمبے کی فضا بڑی شدت سے چھائی ہوئی ہے۔ قوم کی لاش سناٹے میں پڑھ رہی ہے۔ اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی حصہ ہاتھ میں لیے بڑی چابکدستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہمک ہے۔ روحانی، جسمانی، ایمانی اور سیاسی احوال سے لے کر خود کشی کے نفسیاتی اسباب تک بڑی تنہا سے تشخیص ہو رہے ہیں۔ علاج تجویز ہوتے ہیں۔ نسخوں پر گرم مارم خست ہو رہی ہے۔ میز پر کتے پڑتے ہیں۔ گڑیاں اُٹتے اُٹتے بچتی ہیں۔ لیکن اس وقت قوم کی ساری ہادیوں کا واحد علاج صرف اس چائے دانی میں ہے۔ جس میں کو لڈائی بڑی اعتیاد سے محض ہے۔ کو لڈائی والے صاحب پیالی منہ سے لگائے مزے مزے کی جھپکیاں لے رہے ہیں۔ اور اپنے ادوار کو راحت دردہن میخانوں کے خوفانہ برقیزی کے باوجود بڑی لائقانی سے رات کی ایک عشقِ غزل لگاتے رہے ہیں۔

"آج سینما کا پروگرام ہے؟" کو لڈائی صاحب تارا سے پوچھتے ہیں۔

"جی نہیں۔ آج دوسرے پروگرام ہیں" تارا میری طرف اشارہ کر کے دوسرے کے لفظ پر خاص زور دیتا ہے۔



اس خاموش کو لڑوار کے بعد موضوع سخن بدل جاتا ہے تاکہ وہ لا گھوڑے کو غصہ کر کے جہیں بڑی ٹائیں اور بیچ دار لاپرواہی سے نکال رہے ہیں جگہ جگہ کی تعریف کرتا ہے جو مزودت کے وقت اس پر کئی لمبی جڑا وہ یہ ایک خرچہ کو کسے سے بھی پہنچ نہیں کرتے اور کو لڑنی صاحب پاکستان کے حیدر افسروں کی کیننگی انا لائق اور بد ہانتی پر جی طول کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ یوں بھی رفتہ رفتہ کو لڑنی بنا رنگ دکھا رہی ہے اور جب تاکنے والا گھوڑے کی وساطت سے ہیں چند اور دائمی ٹاپین تکریر مندی میں ڈگرے کی قبر کے پاس اتار دیتا ہے تو کو لڑنی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے لٹکھڑا رہے ہوتے ہیں اور وہ "س" کو "ش" میں بدل کر بڑی خوش سگالی سے چوک ہیں کھڑے ہر کے پسینے کا ٹیبل کو غصہ کرتے ہیں شوپاہی جی شام۔ بیٹے دھو۔

سہا ہی تھکنے چید کر کو لڑنی کے منہ کو فریب سے زور لگا کر نہ لٹھکتا ہے۔ اچھا آج بھی خوب بڑھا دکھی ہے صاحب پرست کہاں ہے؟

کو لڑنی صاحب نفع مند مرغ کی طرح چھاتی نکالی کر اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ ناجائز وہ مجھے پرست کے طور پر سہا ہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں سلین میں نظریا کر کھسک جاتا ہوں اور نوڑنے کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہوں۔ مجھے خبر موجود پا کر کو لڑنی صاحب کی چھاتی کا تھوڑا حیدر بن جاتا ہے۔ اور وہ اپنی پیش ٹرٹ کی جیبیں نکال کر پانی دھپے کاؤٹ کا ٹیبل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کا ٹیبل اس پرست سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ شاد اور کو لڑنی صاحب کی گرمی گفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے درمیان دات کا مسئلہ زیرِ مود ہے۔ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں اور پھر غصے سے ایک طرف کو ہل کھڑے ہو گئے ہیں۔

ڈگرے کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ وہی پرست والا سہا ہی اب مشتبہ ٹکا ہوں سے بار بار میرا ہالہ لے رہا ہے۔ میں اپنی دھن کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جہاں شاد اور کو لڑنی صاحب اور پرست والے کا ٹیبل سے میرا سامنا نہ ہو۔ اس تلاش میں میں بڑا مندی کی بے شمار بیچ و بچہ کلیوں کے تانے بانے میں الجھ جاتا ہوں۔ اس محم میں سب لنگے ہیں۔ ٹھیکوں اور شرکوں پر مشرکیت کرتے ہوئے شائقینِ قدم پر چلن کی طرح پھٹتے ہوئے دھل اور واڈوں اور دھچکوں میں گزریوں کی طرح بھی بولن ہو رہے ہیں۔ اپنے رنگ رنگ طبعات کے باوجود یہ ساری مخلوق الف نکل ہے۔ اور ان کے جسم اور اذان ایک ہی آواز سر پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ فضا میں کچے گوشت کی بسانہ چھی ہوئی ہے۔ اور بڑی بڑی پاد کے نقول کا اجتماعی نود ٹھیکوں اور شرکوں پر دھس کے دافوں کی طرح پھیل جاتا ہے۔ مجھے وہ کہہ کر خیال آتا ہے کہ یہ عورتیں جو درواڑوں اور کھڑکیوں میں گردنیں نکالتے بیٹھی ہیں۔ یکایک پھر سے اڑ جائیں گی۔ اور ابا بیوں کی طرح اپنی چوچوں میں لٹکیاں اٹھا کر ساری دنیا کو اپنے زینے میں لے لیں گی۔ لیکن عمل طور پر لٹکیوں کی جگہ میری گردن پر چھپا کر سے غم کا ایک بڑا سا غلفہ آگرتا ہے۔ جو ایک آدمی کوئی سی عورت دیکھ کر بیٹھی بڑے اطمینان سے کھٹکا کھٹکا کر دیکھنے متو کر رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اس غلاطت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں۔ تو خدا کی خاص رحمت میری دستگیری فرماتی ہے۔ اور ایک لگی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے۔ جس کے ایک دروازے پر کالی بیبا ہی سے "یا اللہ" اور دوسرے دروازے پر پناہ لکھا ہوا ہے۔ یہ جھوٹی سی مسجد دو بلند ہالا عمارتوں کے درمیان بڑی بے کسی سے جگہ بے جگہ ہے۔ اندر پیشاب اور پاخانے کا تسنق ہے۔ ایک طرف نالی ہیں۔ بریکر کی چند خالی اور شکستہ زمیں اندر ہی پٹی ہیں۔ دھنوں کے لیے ایک پرانا

حرام ہے۔ جس کا پانی باسی لعاب دہن کی طرح کثیف ہے۔ اور بڑے زوروں سے بہا کرتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے ذہن میں ریل کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے جو نیز دفتاری سے چتا چلتا اچانک پٹری سے اتر گیا ہو۔

ہیرامندی سے جھٹکتا جھٹکتا آعر میں شاہی مسجد آہنچا ہرنی اور خدا کی کھل صفائیں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی مسجد کے آس پاس کئی شاہکار گادیں کھڑی ہیں۔ اور ان کے ڈرائیور ادھر ادھر بیٹھے ہلے دلی سے آگے رہے ہیں۔ یہ شرفار کی مرثیہ ہیں۔ جو اپنی بیگمات سے اجازت لے کر شاہی مسجد میں آؤ نیم شبی یا اقبال کے مزاد پر ہر نئے عقیدت پسند کے لئے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا ہاڈن پھسل جاتا ہے اور وہ لڑھکتے لڑھکتے بے اعتقاد ہیرامندی کے نہاں خانوں میں جاگتے ہیں۔ اگر اقبال دندہ ہوتا تو وہ مسئلہ جبر و تقدیر کی ایک نئی تفسیر معلوم کر سکتا تھا!

شاہی مسجد کے مین مقابل پرانے قلعے کی آدھی بھٹی ہوئی عمارت ہے جس کے دروازے پر پاکستان کا جھنڈا کھلندی سے لہرا رہا ہے۔ اقبال کے مزاد میں ایک چھوٹا سا بلب روشن ہے۔ جو اب کچھ عرصہ ہٹا کر چمکی ہو گیا تھا۔ لایون میں بجلی کے نئے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کی مانگ تیسرا منڈی میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اقبال کے مزاد کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی تمامت شعار دینا چاہیئے۔ مزاد کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے۔ تاکہ عقیدت مند اندر گھس کر سوچا ہو نہ چلا سکیں۔ باہر ان میں ہیرامندی کے اکا دکا دلال بھولے بھٹکے راہیوں کے لیے خضر راہ کا کام دینے کے لیے منفر بیٹھے ہیں۔ ایک منگے والا دو دو آنہ میں دانا کے دربار پہنچانے کا اعلان کرتا ہے۔ میں اچانک کہ اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تانچے میں منفع جہلم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دن بھر مقدموں اور کھمبولیوں کی زحمت کے بعد وہ کھڑی دو گھڑی دل بھلانے کے لیے ہیرامندی آگئے تھے۔ ادب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں کہ تا تو سب کچھ اللہ ہی ہے! ایک مقدمہ باز اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے: لیکن بزرگوں کا سہارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے! دوسرا مقدمہ باز بھی اس تنفر بیٹے کی تائید کرتا ہے اور اس روحانی گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگرمیوں میں ہیرامندی کے ذاتی تجارت پر تبادلوں خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جمعرات کی درجہ سے دانا کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ جھوم ہے۔ کھوسے سے کھرا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں تیار راہ کو لڑائی صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چت کھڑے ہیں۔ جھوم کے ہر دھڑکے کے ساتھ حسد و خاشاک کی طرح بھٹتے ہوئے اندر چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واپس آکر صدر دروازے کے مین بیچ اپنی جگہ بحال بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر ادھر ادھر ہو جاؤں۔ لیکن تیار مجھے دیکھ لیتا ہے اور نہ بڑکتی کھینچ کر اپنے پاس کھنکھاتا ہے۔ کو لڑائی صاحب بھی میری پھللی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور دانا کے دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدت مندی کے جملہ فوائد پر دانا دوشی ڈالتے ہیں۔ اپنے پردہ گرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزگ کے آگے پہنچ گئے اور وہاں سے زمین و زمان کاڑیوں کی دوسری منزل شروع ہو گئی۔ لایون دانا دھند ویرن ریلوے کا بہت بڑا جکشن ہے۔ یہاں کی زمین دوڑا مال گاڑیاں ہر طرف لہرائی، ہر کپے میں جلتی ہیں۔ جگہ جگہ سرخ دیو کے نشان ٹھکتے ہیں۔ لیکن ان تیروں کے باوجود کئی گاڑیاں کانا بڑھتے بڑھتے چوک جاتی ہیں اور اکثر تصادم کے حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی نیز دفتاری انجن چلتے چلتے پٹری سے اتر جائے تو اسے پھینک نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کی پیشانی پر کالی سیاہی سے اللہ اور رسول کا نام لکھ کر اسے مسجد کے کام پر لگایا جاتا ہے۔ .....



# چارہ گر

## تسلیم سلیم چٹاری

کنوڑ صاحب جب کبھی اپنے قبیلوں بچوں کو ایک جگہ دیکھتے تو یہ بات کہے بغیر ان کا جی نہیں مانتا تھا کہ ”بگم و ولایت کی آیت مبرا بھی آٹا اثر مبرا۔ جو بچے ہندوستان کی پیداوار ہیں، ذرا آٹا کا بھی رنگ روپ کچھ اور اپنی متیرہ کو دیکھو۔“ — تشریف لائیں لندن میں اور نکل باقی خلاص ....

بگم پران باؤں کا رد عمل مختلف حالات میں مختلف طور پر ہوتا۔ کبھی ہنسی خوشی میں ہوتی تو کہتیں: ”واہ جی! تم نے میری بچی کی صورت دیکھی ہے، اس کا نصیب تو نہیں دیکھا۔ تمہیں کیا خبر۔ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔۔۔۔۔ اللہ نے چاہا تو اس بچی پر فخر کرو گے۔۔۔۔۔ کبھی مذاق کا موڈ ہو کر دیا کہ ”نورج میری بچی کیا ان مرنے فرنگوں پر جاتی۔۔۔۔۔ بلا سے ولایت میں ہوئی تو کیا ہے۔ اکل اپنے باپ پر گئی ہے۔۔۔۔۔ آئینہ دیکھو اور اسے دیکھو۔“

اور جو کبھی جلی جاتی تو کہہ کر کہہ دیتیں کہ ”کبھی بھی سہی۔۔۔۔۔ میرے لئے تو سب ہی برابر ہیں۔۔۔۔۔ کوئی بسدرہ دو کھ کر ہوتا نہیں۔۔۔۔۔ جو قسمت میں لکھا ہے آگے آئے گا۔ تم کیوں کیڑے ڈالتے ہو۔۔۔۔۔!“

ویسے ایمان کی بات یہ ہے کہ میرا سب سے اچھی بچی تھی، اور سب سے بڑھ کر ماں باپ کو پیاری تھی، کیسی سمجھدار اور چپ چاپ بچی تھی کہ بڑوں کسی کو ہتھ نہ چلا کہ وہ گم گم مٹاواست اور مزاج لے کر نہیں آئی بلکہ بڑے بہن بھائی نے زبردستی ہر دم کے طعنے دے کر سے برا احساس کمتری پیدا کر دیا ہے۔۔۔۔۔ کنوڑانی کی گود میں وہ مرجھائی ہوئی کلی کی طرح پڑی رہتی اور جب ان کے طعنے جلتے ایساں آئینے تو کھسک کر اپنی آبا کے گھٹنے سے جا لگتی، ناصحہ اور دیکھ آ سے مڑا چڑھی کھتے اور الگ تھلک بیٹھے دیکھ کر وہ میرا چراتی بھائی جان ملاحظہ ہو۔۔۔۔۔ صورت چڑیلوں کی اور مزاج پھیلوں کے۔۔۔۔۔ اور وہ بے چاری دل کی بھڑاس کھانے کو بھی دھرا دھرم نہ سمجھ پاتی پھرتی۔ حالانکہ خدا نہ کرے اندھی کافی نہیں تھی۔ میں رنگ سا لواتھا اور نقشہ بھی اوروں سے بچتا۔۔۔۔۔ مادے کپڑوں میں ابھی خاصی لگتی اور گوٹے مصلحہ کے کپڑوں کو تو اس نے کبھی بچپن ہی سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جوش شہناختے ہی اس نے اپنے سر پر کبھی کبھی کہ یہ کہنے سنا کہ ”میرہ کی شکل سارے گھر سے علیحدہ ہے۔۔۔۔۔“ میرہ کنوڑ صاحب کی بیٹی نہیں لگتی اور میرہ؟ وہ تو ہر ہوا اپنی ماں پر تھی۔ کنوڑانی آج بھی تیس تیس سال کی ہو کر اور تین بچوں کی ماں بن کر بھی ایسی معلوم ہوتی کہ چینی کی ل ہوئی مورتی ہیں۔ جسے گذر زمانہ اتھ نہیں لگا سکتا۔۔۔۔۔ ویسی ہی جوان شگفتہ اور پرکشش۔۔۔۔۔ جیسی وہ ڈولے سے

اتنی غصہ، اور کنور صاحب کے گھر والوں نے وہی کا گھر ٹھٹھاٹھا کر کے کہا تھا کہ یہ اندسورہ کی جوڑی ملی گئی ہے! کنور صاحب خود ہزاروں میں ایک تھے۔۔۔۔۔ اب تو جسم کچھ بہت بھاری ہو گیا اور رنگت بھی ماند پڑ گئی تھی دیر دنوں میں جیوی میں گھٹنوں ہی مقابلہ ہوتا کہ رنگت کس کی زیادہ اچھی ہے اور نقشہ کس کا زیادہ پیارا ہے۔۔۔۔۔ پھر تو ہی ہر سچے کس پر ہوتے، پہلے تو ناصر باب کا بچپن لے کر آئے، پھر ماں کا نو نہ بن کے و سجدہ ہوئی۔۔۔۔۔ دونوں میں جیوی بہت خوش تھے کہ اب ہماری جوانی دائم ہو گئی — جب ہم بڑے ہوں گے تو یہ دونوں جوان ہو کر ہماری آنگوں کو سہا لیں گے۔ دیکھئے اس قدر بچوں کے حسن کی تعریف کرتے تو ان باب پھولے نہ سمانے کیوں کہ یہ تعریف بالواسطہ انہیں کی تھی۔

جب ناصر آٹھ نو سال کے ہو گئے تو کنور صاحب نے ان کو خنی تالی لے جا کر شیر و ڈاسکول میں داخل کر دیا اور بیک صاحب کے اصرار پر وہیں کو نوٹس میں پانچ چھ سال کی وسیع طبی پہنچا دی گئی۔ گھر سے بچے گئے تو ان باب کا دل بڑھلانے لگا۔۔۔۔۔ کنور صاحب کو جب سے ان کے والد کا انتقال ہوا، ہر سال ولایت کی سیر کا ارادہ کیا کرتے تھے۔ اور ادھر کچھ دوسرے کنورانی کو شکایت تھی کہ بہا کی لیڈی ڈاکٹر یا سب اونڈے سید سے مرض تشخیص کر کے دینا بھر کے علاج بتائیں مگر اصل مرض کو کوئی نہ پہچانتی تھی۔ اور ادھر کنور صاحب دیکھ رہے تھے کہ ان کی چکنی تیل کچھ پتوں کی جدائی ہے اور کچھ اس انجانے موزی مرض میں جنس کر بالکل نڈھال مرنے جا رہی ہے۔ انہوں نے فوراً ہی جیوی کو لے کر ولایت کا رخ کیا۔۔۔۔۔ سیر اور علاج کا علاج۔۔۔۔۔ دوران سفر میں کنورانی صاحبہ کی طبیعت اور طبی مکتدر ہوئی اور لڈن پہنچ کر کنور صاحب کو پہل ملاقات ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر سے کرنی پڑی جس سے کنور صاحب نے بہت ہی غمگین لہجے میں کہا: ہندوستان کے بعض ڈاکٹروں کو یہ بھی شبہ ہے کہ ان کے پیٹ میں پتھری ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ بعض نقلی بتاتے ہیں اور بعض زمانہ امراض میں سے کوئی مرض۔۔۔۔۔

لیڈی ڈاکٹر نے مکمل معائنہ کرنے کے بعد کنور صاحب کی اتھری بات کو تسلیم کر لیا: "شک کہتے ہیں۔۔۔۔۔ بالکل زمانہ مرض ہے!"

کنورانی اور کنور صاحب دونوں ہی اچھل پڑے: "کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ — میرا مطلب ہی نہیں بلکہ واقعہ بھی یہی ہے۔ اور میں جیوان ہوں کہ اب تک آپ کو اس سلسلے میں لاعلمی کیوں ہے۔ جب کہ بچہ بالکل نارمل ہے۔ اور کوئی حوالی نہیں معلوم ہوئی۔ صرف سسر میں خون کی کمی ہے اور وٹامن ڈی کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔"

کنورانی کو خود بھی کبھی ایسا ہی شبہ ہوتا مگر ان کو تو کجنت وایتوں اور ڈاکٹر ٹیموں نے ہولا دیا تھا۔ اب اس لیڈی ڈاکٹر کی صاف صاف بات سن کر انہیں اطمینان ہو گیا۔ البتہ کنور صاحب کی پریشانی کسی طرح رفع نہ ہوتی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستان کے سارے ڈاکٹر کیا گھاس کھوتے ہیں جو بچے کا قصیدہ بنا لیتے ہیں۔ اور آپریشن کی رائے دیتے ہیں۔۔۔۔۔ خیر یہ بات کہاں تک معتد رہتی۔ کوئین میری ہسپتال کی ایک سفید رنگت اور سفید لباس والی خود نے انہیں جیوی کی خوش خبری سنائی۔ اور انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ قیصری ادلاؤ تھی اور کسی تیسرے پر ہی گئی تھی! جب کنور صاحب کو یہ سن آئے اور سفید بازوؤں میں سفید چادر سے لپیٹی ہوئی گڑیا دیکھی تو چونک پڑے۔۔۔۔۔ شاید انگریز نرس کی گود میں بھی سانولی لگ رہی ہے۔۔۔۔۔ انہوں نے احتیاط

سے اس نازک برج کو سنبھالا اور کنورانی کی گود میں لٹا رہا۔ کنورانی قراچ اس گودی میں سے بھی زیادہ سفید ہو رہی تھیں۔ اور بچی ایسی لگی جیسے چاند میں دانہ لگ گیا ہو۔۔۔۔۔ کنو صاحب کا مقصد آڑ گیا۔۔۔۔۔ وہ تو اٹھ ناک کے حساب سے بھی اس ماں کی گود میں نہیں بھتی تھی!

اول اول تو میاں بیوی اس بات کو آپس میں کہتے بھی کچھ جھجک محسوس کرنے کو بچی کی شکل اچھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ میاں نے دلے دلے مجھے میں اٹھا بیٹا لیا اور بیوی نے جسے سے دل سے مانا کہ ماں اور وں سے کچھ دیتی ہوئی ہے۔ بچی تین ماہ کی ہو گئی تو دونوں گھر بیٹے، پیٹے تو ولایت میں ہی کنورانی جہاں گئیں اور جس سے بلیں، دیکھنے والوں کی نظر نے آتے سے اپنے تعجب کا اظہار کیا کہ یہ بچی کیا واقعی آپ دونوں کی اولاد ہے؟ اور ایک آدھ کم بخت تو اس شہر کا اظہار بھی کر دیا کہ شاید یہ بچی تیس کھا کر کسی قیم خانے سے گود لی ہوگی! اگر ولایت کے قیم خانوں میں اس صورت شکل کا بچہ کہاں؟ تو پھر کیا آپ یہ چھوٹا سا بچہ بھی ہندوستان سے ہی ساتھ لائی ہیں۔ کنورانی کو ایسی باتیں مارنے ڈال رہی تھیں۔۔۔۔۔ یہ بچی اپنی پیدائش سے قبل ہی مرض بھی گئی تھی اور پیدائش کے بعد بھی دو گن گئی۔ کبھی کبھی ماں باپ سے چکارتے تو وہ فوراً ہی مسکرا دیتی۔ پھر دونوں یہ معمول مانتے کہ انہیں بچی کے حسین نہ ہونے کا غم ہے۔ اس کا اخلاق ہی اس کا حسن تھا۔ یہ ہر دم مسکراتی بچی کبھی بھول کر بھی منہ سمورنا نہیں جانتی تھی۔ بھوکے ہتھ تو اور پیٹ بھرا ہتھ تو، بس جہاں ماں باپ نظر آتے وہیں لیا اور اس کے مصحوم چہرے پر مسکراہٹ کھینچی۔

کنور صاحب کے ولایت سے لوٹنے کی خبر ہندوستان پہنچی تو جو دوست احباب اسی کو وقت بخت خبر خوشی سے داپسی کی اور کنورانی کو صحت یابی کی دعا میں دیتے، مہربانی تک پہنچتے تھے، وہ اب زندہ سلامت بیٹ سمیت لوٹنے کی مبارکباد دینے بھی جمع ہو گئے۔ انہیں میں کنورانی کی ماں مانتا کی ماری دلی سے چل کر پہنچی آگئیں اور خود کنور صاحب کی ایک بھی جو اپنے خاوند کے ساتھ پراناں رہتی تھیں، بھائی کے خوش آمدید کہنے بیٹھی پہنچ گئیں۔

کنورانی چار پانچ بہنوں میں ایک تھیں اور کئی بھائیوں میں ای کے بھائی محمود میاں سچے تھے۔ ماں کو دونوں بچوں سے بڑا نہ عشق تھا اور پر وازہ دارنار تھیں۔ انہیں اپنے بچوں کے حسن و لیاقت پر بھی بڑا ناز تھا۔۔۔۔۔ کتنی تھیں کہ میں پوسٹ کے خاندان سے ہوں۔۔۔۔۔ میری اولاد کو دیکھو۔۔۔۔۔ نشاط اعمال کہ محمود میاں کی ولہیں کسی بے ایمان مشاطہ کی باتوں میں پھنس کر چلیں تو وہ بس لپٹ ہی آدھی کا بچہ تھی! ظاہر ہے کہ محمود میاں کے ہر سال ہونے والے نیچے کسی عنوان خود کو پوسٹ کا وارث کہلانے کے ال نہ ہونے اور دادی کو اس کا بڑا ہی صدمہ تھا۔ یہی چوٹ کھا کر انھوں نے اپنی لاٹھی زبیدہ کے لئے کنور صاحب جیسا تو بھرت و دھما ڈھونڈا اور کچھ نچ ناصر اور وسیع نے اپنی نانی کا جی بھی خوش کر دیا تھا۔

جب ولایت سے یہ مشرہ جانے لگے کہ وہی تاہم پنچا کہ اللہ پاک نے کنورانی کو بیٹی سے نواز ہے تو راتوں کو سہوے میں پڑ کر بیٹی کی سلامتی مانگنے والی ماں شا دئی مرگ سے بالی بالی بچی۔ وہ ہمارے ہی قراچ میں مٹائی بلٹھے اور زچہ گیریاں گوانے سے مر نہ ہوئی۔ پھر وہ اسکلن ملا تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ ناؤ محمود میاں کی دلہن کے پیچھے بڑھ گئیں جو غیر سے آج کل اپنے قریب نیچے کو دوڑ رہی تھیں۔ ایمان کی بات ہے کہ بچہ صورت کا بڑا نہ تھا مگر داوی کی خاندانی روایات کو تو بہر حال ٹھیک سمجھتی تھی اور انہیں اپنی



نہا۔ ساتھ آیا تھا اور ————— چھوٹے بچے کی طرح ہر دم ماں سے چٹا رہتا تھا۔۔۔۔۔ وہ سیرنگی سے کہنے لگیں تو کنوڑ صاحب نے کہا: ”آپ ابھی ان بچوں کا آپ نے دیکھا کیا ہے سزا اس قابل تو رہنے دیں۔ یہ بڑھکھ نہیں، جوان ہوجائیں تو آپ کی عزت کی توجہ کو سہ جائیے گا۔۔۔۔۔“

گھر جھیلہ بی کہ تو ساس بننے کا ارمان مانے: ”اقتا تھا۔ کہے لگیں: ”یوں نہیں پکا معاملہ کروں گی۔۔۔۔۔ میں سات اشرفی سے لڑکی کا ہاتھ روک کر شہر بھی بانٹے دیتی ہوں“

اب کنوڑانی کو بڑے بغیر چارہ نہ تھا۔۔۔۔۔ آخر وہ سیدہ ان کے پرٹ سے ہوتی تھی۔ ان کو بھی ماں ناکامی تھا۔ ساجد کی صورت شکل تو بے عیب تھی مگر اس کی حرکتیں کنوڑانی کو ایک ”انگھ“ نہ بھائی تھیں۔۔۔۔۔ ماں کے حبابے جا پانے اس کو بڑا صدمہ دیا اور چڑھا بنا دیا تھا اور یہ بات ان کے منہ سے نکل ہی گئی کہ: ”ہیں پکا معاملہ کس طرح کر لیں۔۔۔۔۔ یہ کوئی گڑبگڑ ہے۔۔۔۔۔“

پہلے آپ اپنے لاٹے کے ڈھنگ نہ سمجھا لیجئے۔۔۔۔۔ وہ تو اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لانا اور میری بچی کا جسم ہی نہیں دل بھی بہت نازک ہے۔۔۔۔۔“

کنوڑ صاحب بھی اس جواب پر سٹپٹ گئے اور جھیلہ بیگم کے زور جیسے کسی نے منہ پر جوتا کھینچ مارا ہو۔۔۔۔۔ انھیں بھابھ سے اس جواب کی توقع نہ تھی۔۔۔۔۔ پھر کبھی وہ بھول کر رشتے کی بات زبان پر نہیں لائیں۔

آج کئی برس بعد بھتیجی کی شکل دیکھ کر ان کا دل خوش ہو گیا کہ اللہ نے ولہن بھابی کے سرور کا بدلہ دیا۔ بچی کے ہاتھ کے روپے گن کر انھوں نے بھابھ کے آگے رکھے اور مسکرا کر بولیں: ”اللہ بظہر بد سے بچائے۔۔۔۔۔“

بے چارے کنوڑ صاحب کھلے دل کے آدمی، بہن کے طنز کو کیا سمجھتے! وہ بچی کی پیدائش کے دلچسپ واقعات سننے لگے: ”خیر! آپاشکل تو جیسی ہے سو ہے بیگم اس کی پیدائش کسی معجزے سے کم نہیں! اللہ کی شان ہے کہ اس نے کس طرح پریشانی کو خوشی سے بدل دیا۔ جب لہڈی ڈاکٹر نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو میرا دل کسی طرح باور نہ کرنا تھا۔ مجھے تو آخر تک شبہ ہی رہا مگر جب ایسی آنکھوں سے بچی کو جا کے ہسپتال میں دیکھا تو یقین کرنا ہی پڑا کہ۔۔۔۔۔“

جھیلہ بیگم مسکرائیں: ”تو بچی کو دیکھ کر آپ کو اختیار آگیا بلکہ اور شبہ بڑھ گیا! بھتیجی ہسپتال کا معاملہ تھا اور لاکھوں عورتیں اسی غرض سے آئی ہوں گی۔۔۔۔۔ کیا پتہ کسی نرس کی فعلی سے۔۔۔۔۔“

بہن کی بات ختم ہونے سے قبل ہی کنوڑ صاحب نے زوردار قہقہہ لگایا اور کنوڑانی نند کی اس چوٹ پر تزلزلہ کر مومنے سے آٹھ کے دوسرے کمرے میں چلی گئیں جہاں ان کی والدہ پلنگ پر کچھ حیران پوشیاں سی بیٹھی تھیں۔۔۔۔۔ بے چاری بڑی بی! ای کا خیال تھا کوئی کومبلی سے وہلی لے جائیں گی اور دو ایک ماہ اپنے پاس رکھیں گی۔ کالے کوسوں سے خیر کے ساتھ بھری گود لے کر لٹی ہے۔ سیدھی کھنڈ کس طرح جانے دیں گی۔۔۔۔۔ ابھی تو بچی کا حقیقہ ہی نہ ہوا تھا۔۔۔۔۔ اور اب وہ بچی کو دیکھ کر اور سب کچھ بھول کر دوسری فکر میں پڑ گئیں۔۔۔۔۔ عمو کی دلہن کیا کہے گی!!! اس کے دوسرے وعانوں پانی پڑ جائے گا۔۔۔۔۔ جیسی بھی باتیں بنائے کم ہے۔۔۔۔۔ عجمی کھنڈ کو کیا پڑی تھی کہ بلا دیکھے بھالے اتنی شینی کر گئی۔۔۔۔۔ اللہ قسم ایمان کی پوچھو تو زبیدہ کی لڑکی سے تو عمو وہ کا نوڈا ہی کچھ کھلے رنگ کا ہے۔۔۔۔۔!!

معصوم شیرہ! نکلیں پھا ڈیپاڑ کے ہرئی صورت کو کھیتی اور شاید ان چہرہ پر کھے ہوئے جذبات بھی سمجھ رہی تھی جو اس

نے منہ بسور کر دیا مگر یہ کہ ..... پھر یہ احساس کمتری اور غیر شعوری جھجک اس کی قسمت بن گئی! یہ بات کچھ بڑوں پر ہی منحصر نہ تھی کہ انھوں نے بچوں کی صورت میں عیب ثواب نکلے ہوں۔ حد ہے کہ باڑوں کی چھپا کر شروع ہوئی اور کنور صاحب بیٹی تالی ہمارے ناصر اور وسیمہ کو لائے تو دونوں بچوں کو پورا یقین کہ اتنی نے خالق میں ہماری بہن کو چھپا کر کسی اور کا بچہ دکھایا ہے ..... ناصر و ثقیل کے ساتھ کہہ کر میں ایسا بے وقوف ہوں جو اپنی بہن کو نہ پہچانوں ..... یہ تو جانے کس کی لڑکی ہے!! اور وسیمہ بڑی مصومیت سے ماں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر پوچھنے لگی: "اتنی کیا لندن کی ڈاکٹر بنی اپنے ہنگ میں اسی بچی کو ڈال کر لائی تھی!"

جوں جوں منیرہ ہوش سنبھالتی گئی، دیکھنے والوں کی نظر پہنچانسی رہی ..... بہن بھائی سال بھر میں ایک بار بیٹن ماہ کی چھٹیوں میں آنے اور جب دونوں کو اپنے کھیل سے فرصت ملتی تو چھوٹی بہن کی چڑھانے لگتے ..... ایک دفعہ نو ماہ اور وسیمہ نے لی کر چار پارک برس کی جان کا گھنٹوں خون کیا کہ کچھ تراشی نے پانچ سیرنگیوں کے بدلے ایک چماری سے خرید لیا۔ اور رونے رونے سے غریب کی دونوں آنکھیں انکارہ ہو گئیں۔ ماں نہیں کھاتی، بڑے بچوں کو ڈانٹتی تھیں اس کی آنکھوں کے آنسو کسی طرح نہ ٹھٹھتے تھے۔ یہ بات اس کے جی کو لگ گئی اور پھر وہ بچی کبھی کھلے دل سے نہ سنسی ..... جب ناصر اور وسیمہ اسکول چلے جانے تو گھر ایسا سوتا ہوا رہا جیسے منیرہ کا تو وجود ہی نہیں۔ وہ تو ماں کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہتی یا پھر کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی آپا سے پردوں اور شاہزادوں کی کہانیاں سنتی رہتی۔ شاید یہی وہ دنیا تھی جہاں پہنچ کر اس کا ذہن و دماغ کچھ دیر کو آزاد ہر جانا تھا۔

وہ بڑی سعادت مند اور سمجھدار تھی۔ باب کی سگریٹوں کا ڈبہ اور ماں کا پانڈا ریڑھے سلینے سے اٹھ لاتی اور ان کے سارے حکم بلا چون و چرا مانگتی ..... دونوں کا دل چاہتا کہ وہ اون بچوں کی طرح کھیلے اور شور مچائے، چیزیں توڑے، کھلے فون کی فرمائش کرے ..... مگر منیرہ تو جیسے خود کو اس اعزاز کے قابل نہ سمجھتی تھی۔ اس کی زبان ہی نہیں کھلتی تھی۔ کنور صاحب نے اس کا سبب اس کی تنہائی سمجھ کر یہ علاج سوچا کہ اسے بھی وسیمہ کے ساتھ اسکول بھیج دیا جائے۔ منیرہ جانے لگی تو کنورانی نے وسیمہ کو اپنی جان کی قسمیں دیں اور خدا کا واسطہ دیا کہ اس بے چاری کو اسکول میں تنگ مت کرنا۔ وسیمہ اب بہت ناواں نہ تھی۔ اور جو بہن نہ گڑبائی چھینے نہ کھلے فون پر لڑے اس سے بلاوجہ دشمنی بھی کیا ہوتی۔ اس نے ماں سے سچا وعدہ کر لیا اور پیادہ سے منیرہ کو لے گئی۔ ایک بے چاری وسیمہ کیا کر لیتی ..... منیرہ کو اپنے بچپن کی سب سے بڑی ذہنی شکست اس وقت ہوئی جب وسیمہ کی سہیلیوں نے منیرہ کو دیکھ کر کہا۔ چل جھوٹی، یہ تیری بہن نہیں ہے۔ جانے کس کی بھی بیٹہ لائی ہے! اور اس کی تکلیف وہ "خوش آمدید" کے بعد جب وہ غریب سینگٹوں لڑکیوں سے الگ تھلک ہرگز نہیں ہے تو وسیمہ کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ لازمی تقریبات کے علاوہ کبھی کسی سے گفتگو نہیں کرتی۔

پچھلے سال ہی اسکول کی طرف سے جو کنور صاحب کو منیرہ کی رپورٹ گئی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے، وہ بہت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور وسیمہ کی طرح منیرہ سے اسکول والوں کو کام میں لا رہا وہی کی شکایت نہ تھی۔ اسکول کی زندگی منیرہ کو شور و غلب کا شوقین نہ کر سکی ————— ماں وہ نسبتاً پرسکون ضرورت تھی ..... اسکول میں

اسی طرح کی لڑکیاں تھیں۔ ہندوستانی اور انگریز کے علاوہ چینی، جاپانی اور برمی لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ بچیاں حبش ماں باپ کا سر بائیں جانب تھیں۔۔۔۔۔ اور اگر منبرہ کو خاص طور پر وسیعہ کی بہن بنا کے نہ دیکھا جائے تو ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے اس کی دل شکنی کا امکان ہو۔ وہ وسیعہ سے بچاؤ کی صلح چوڑی کی حق جو آستانوں میں بہت مقبول ہو گئی۔

اسکول سے بچوں کی رپورٹ آتی۔۔۔۔۔ نامہ کی رفتار دیرینہ تھی۔ ایک مرتبہ فیل ہوتے تو دوسری مرتبہ ساری کلاس میں اول آئے۔ ان دنوں بہنوں میں جہاں وسیعہ کی بے شکا شکایتیں ہوتیں، وہیں منبرہ کی مسامتہ بھی ذرا بھی فی نہ تھیں۔ اس لیے کہ بڑھاپی کا کچھ ایسا شوق نہ تھا۔ وہ بھیل کو وہیں اچھی تھی اور جو بھی گئی نہ ہوتا تو شاید اسکول میں نہ رہ پاتی۔ اور منبرہ پر اگر کبھی کسی لڑکے کو اعتراض ہوتا تو اس میں زندگی کی بولانی نہیں۔۔۔۔۔ اگر بڑھاپی کے علاوہ اس نے اپنے شوق سے کسی چیز پر توجہ نہ دینی تھی تو وہ محض گانے کی کلاس تھی۔ وہ پانچویں سیکڑی تھی اور آواز کے لحاظ سے سارے اسکول کی جدید اکیڈم میں ایک نئی بیان تک کہ آواز کے دن گر جا میں حمد گانے والی لڑکیوں کے گروہ میں اس کو بھی شامل کر دیا گیا۔

دن گزرتے رہے۔

ماں کا حسین فلسفہ وسیعہ اب کنورانی کی پرسکون بینہوں میں خلل انداز ہونے لگی۔ سولہ سترہ برس کی عمر ایسی تو نہیں ہوتی کہ شادی کے سوا چارہ نہ ہو، مگر یہ اب کنورانی کو اچھا نہ لگتا کہ ان کی ہانک فٹ چھانکے ہی صاحبزادی بلاور اور اسکرٹ پہن کر تھکے بغیر بھرتی رہے۔۔۔۔۔ خود وسیعہ کو اس لباس سے بڑھتی۔ یوں تو وہ اسکول کی حد سے باہر ہیڈ ہی شلوار قمیض پہنتی مگر جس زمانے میں گرمیاں گزرنے لگیں ماں باپ دونوں نمبی تالی ہلتے اور سینیر کی شام کو بچوں سے ملنے اسکول پہنچتے تو وسیعہ کا علیہ دیکھ کر ماں کا دل بوکھلائے لگتا۔۔۔۔۔ کہاں تو ان کے گھر نے ہی جوان بٹیاں باپ کے آگے سر سے دو پر نہیں گرائی تھیں اور کہاں یہ کہ وسیعہ کے لباس میں دو بڑے کاؤنٹل ایک طرف اکٹھنوں تک ٹانگیں بھی اپنی بے مالگی کا شہدہ کرتی تھیں۔ لہذا کچھ دنوں کی بھی بھی باقی نہ تھی اور کچھ وسیعہ خود بھی کو نوٹ کی پابندوں سے عاصی آگئی تھی۔۔۔۔۔ طرفہ یہ ہوا کہ وہ جزیہ کچھہ میں فیل ہو گئی۔ کنور صاحب نے لاکھ بھجایا مگر وہ اب اسکول جاتے پر آمادہ نہ تھیں اور گھر پر تیاری کر کے وہیں لکھنؤ سے دوسرے کا امتحان دینا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ منبرہ کو اس مرتبہ تنہا ہی جانا پڑا۔

وسیعہ گھر آگئی تو ساتھ ہی شادی کے بیخامات بھی برسے لگے۔ وہ کنورانی کے ساتھ نانی کے ہاں وہلی گئی تو محمود ماموں کے وہیلے بیک وقت اس سے شادی پر تیار ہو گئے۔۔۔۔۔ چوں کہ دونوں نے اشائے کنایوں میں پھر بھی پاپنی نیات جتا دی تھی۔ لہذا ایک بھی تالی قبول نہ قرارہ پاسکا۔۔۔۔۔ خود کنورانی کی ماں نے ان سے کہا کہ وسیعہ کے حق میں محمود میاں کی داس کیسی اچھی ماس ثابت نہیں ہوں گی۔ وہ اپنی لڑکیوں کی بد صورتی کے سبب ہمیشہ وسیعہ کے حسن سے جلتی رہی تھیں اور اب ماس میں کنول کی بھڑاس نکالیں گی۔ مجبوراً کنورانی کو بھیجیوں کا خیال ترک کرنا پڑا۔۔۔۔۔ اب اسے خود کنور صاحب کے بھانجے اور جیلہ ہی کے لاٹے ساجد میاں، آواز انھوں نے ایسی حماقت کی کہ کنورانی نے وسیعہ کو ان سے نہ بیاہنے کی ہانک تم کھالی۔

جی لے کے امتحان سے نہٹ کر وہ ماموں کے بلاوے پر لکھنؤ آئے۔۔۔۔۔ یہ وہی زمانہ تھا کہ وسیعہ بی بی کی تیاریوں

میں مصروف تھیں اور دونوں نے برہنہا میں کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا تھا ساجد میاں بے چارے پہلی نظر کا شکار ہو گئے انھوں نے بھی اسکا دیکھا نہ پہچانا اور وہیں مردانہ کرہے میں بیٹھ کر اپنی شادی کا پیام و سیدہ کے نام تمام دیکھے ہوئے فلون، پڑھے ہوئے ناولوں اور سننے ہوئے واقعات کے خلاصے سمیت لکھ بھیجا..... مزید یہ لکھا کہ تم بالغ اور تعلیم یافتہ ہو۔ اس میں صرف تمھاری رضا و کار ہے۔ ماں باپ کی مرضی کو دخل نہیں ہے۔

شامت اعمال کی یہ شاہکار سہاسے میٹی کے ماں کے ہاتھ پڑا اور کنور رانی کی ایڑی لگی آگ چوٹی تک پہنچ۔  
ظاہر ہے کہ بذریعہ ربلی نو ساجد اور بذریعہ ڈاک ان کا پیام شادی! دونوں جمیلہ نگیم کی خدمت عالیہ میں اس پیہرہ کے ساتھ پہنچے کہ جو آئندہ ایسا جوتا تر.....!!

وسیم نے میٹرک پاس کیا اور وہیں انٹر میڈیٹ میں داخلے لیا..... ناصر سینیئر کیمبرج کر کے آئے تو کیمبرج کی کچھ کی ایسی لگی لگی کہ اس مرض کا علاج پاسپورٹ کے علاوہ کچھ نہ ہو سکا..... فلک بوس چوٹیوں اور انتھام گہرائیوں والے بنی تلال کے سینٹ میری کو فوٹ میں منیرہ چپ چاپ پڑھتی رہی!

ناصر میاں کیمبرج کے وچپ نفعے اپنے طویل خطوط میں لکھنے، وسیم کے نیلے رنگ کی بیروں میں گہری نیلی جارجٹ کے پرشے نفعے، جن دونوں کا لالچ جاتیں اور بقی تالی سے منیرہ کی بابت آنے والی شاندار رپورٹیں کنور رانی سینٹ سینٹ کر رکھتیں،  
دوسالی اور پینتھ گئے.....

یہ اس رات کی بات ہے جب وسیم ایف۔ اے پاس کرنے کی خوشی میں اپنی دوستیوں کے ساتھ ایک انگلش فلم دیکھ کر لوٹ رہی تھیں اور سڑک پر خامدہ ہجوم تھا..... بشکورت ڈرائیور اپنی طوطی و عریض بیروں کو بڑے سلیکے سے پہا بچا کر درمیان سے نکال رہا تھا۔ دفعہ آگے جلتے ہوئے رکشا والے نے اس پاس کی سواریوں سے بوکھلا کر کچھ اس طرح اپنی رکشا بیروں کے سامنے کر دی کہ اگر شکورت لے بھر کر بیروں نہ لگائے تو خدا کا علم کیا جوتا۔ ایک نو آنسی تیزی سے بیروں لگانے کے سبب موڑنے پیچھے کو جھٹکا کھایا۔ دوسرے برابر کی رفتار سے آتی ہوئی پیچھے والی جیب اپنی پوری طاقت سے بیروں کے ساتھ ٹکرائی.....

جب ٹینوں لوکیوں کی چیخیں بدلت تھیں تو وسیم نے شکرت کر یہ کہنے لگا کہ ”صاحب آپ نے تو ہمارا ٹیگا ٹھہرا ہی توڑ ڈالا.....“  
وسیم کو اس موڑ سے بہت پیار تھا۔ یعنی تالی سے لگا کر اس نے اس موڑ کو اپنی پسند سے غرہا تھا..... ادکالچ کی چار دیواری میں داخل ہونے والی پرستے جین کا مٹی..... ٹیگا ٹھہرا کچھنے کی بات نے اسے بڑی طرح مشتعل کر دیا اور پیک کدو موڑ سے کو پڑی..... جیب کی ایڑی جنگ و میل پر دونوں ہاتھ رکھے بڑے اطمینان سے ایک صاحب کہہ رہے تھے۔

اور جناب آپ کی حماقت سے جو میری گاڑی کے ہیڈ لمپ کا چوراہا ہو گیا وہ.....  
وسیم نے بگڑا لگا تیزی میں بڑی تیزی سے کہا یہ مجھے افسوس ہے کہ آپ کا سر کیوں لگی گیا۔ ہنس سنبھال کر ڈرائیور نہیں کرتے..... ایسی عمدہ موٹر کا تاس کر دیا۔

موٹر ٹکرائنے کا حادثہ اس نوجوان کو بالکل بدحواس نہ کر سکا تھا۔ گلاس ایڈم نے اسے سچ سچ دہلا دیا..... اس نے کسی قدر ہلکا کر انگریزی میں جواب دیا ”مجھے افسوس ہے محترمہ..... تاہم میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر میری خطا کیا تھی؟“



میرے لئے شعلہ باد لگا ہوں سے دیکھا۔ عجب..... تو کہہ کر آپ نے اٹھ کر دھند کا ڈیڑھ لڑکے ہمارے ساتھ گھر نہیں  
 تو اب کر رہے اس نقصان کا ذمہ دار ہوں آپ تو نہیں ہیں!

وہ کچھ دیر خاموش دسمیرہ کو دیکھتا رہا اور پھر وہی سی مسکراہٹ اس کے ہنسنے پر چلی۔ اور میرا بھی تو بہت نقصان ہو گیا  
 ہے۔ آپ بتائیں، اس کی ذمہ داری لیں گی آپ؟ اس نے اٹھ کر وہیں آگئیں والی کرپو جیا۔ دسمیرہ کی ہلکی جھک گئی۔ سرک پر  
 ناشائی جمع ہو گئے تھے، پچھلے سوار ہاں رک رہی تھیں اور وہ اسے صنگ و جیل پر چھوڑی تھیں کہ آتے ہیں، طبعان سے دیکھ رہا تھا۔  
 دسمیرہ چہرہ لگتی..... وہ اب ڈرنے کے بجائے دسمیرہ پر آنا دہ تھا۔ کہاں ہے آپ کا ڈرائیونگ لائسنس؟ وہ کھلے جھک کر!!  
 میں کل ہی آپ کی رپورٹ کروں گی۔ بڑے ڈرائیونر بننے ہیں!! پاؤں پٹنی دسمیرہ ہو کر ہیں، پٹنی تو شکوہ کرنے کا ڈیڑھ تھا.....  
 ولایت سے ناصر کا خط آیا تھا اور وہ کنور رانی کو پتہ کر رہا تھا، یہی تھی تو کنور صاحبہ نے ان میں ایک کاغذ لے کر لے  
 ہیں داخل ہوئے اور دسمیرہ سے پوچھا۔ بیٹی۔ تم نے ظفر میاں سے ان کا ڈرائیونگ لائسنس مانگا تھا؟  
 دسمیرہ اچھل پڑی۔ جی کس سے؟

ظفر میاں سے..... خان بہادر ریاض احمد خاں کا بیٹا لڑکھے نا؟ وہ یہ لائسنس لایا ہے..... کہتا ہے کہ آپ  
 کی صاحبزادی دیکھنا چاہتی ہیں..... تم نے مانگا ہوگا.....  
 دسمیرہ کو ٹھنڈا پسینہ آگیا۔ آبا میں تو اسے جانتی ہی نہیں..... رات البتہ ایک قصہ پڑھا تھا! شکوہ نے آپ کو  
 اطلاع کر دی ہوگی.....

ہم لوگ سینا سے آ رہے تھے تو ایک جیب گاڑی ہماری ٹوڑے سے ٹکرائی..... مجھے کیا پتہ کون چلا رہا ہے.....  
 میں نے کہا اپنا لائسنس دکھاؤ ورنہ میں رپورٹ کروں گی! کنور صاحبہ ہنسنے لگی..... لا حول ولاقوة..... وہ بے چارہ  
 بہت ہی پریشان معلوم ہوتا ہے..... تم نے بھی حد کر دی، ان کے والد سے تو میرے بڑے تعلقات ہیں..... بلکہ تم  
 تو ان کی گھر والوں سے جی کئی بار ملی ہو۔ پچھلے سال ایک مین میں خان بہادر نے میری بڑی مدد کی تھی..... وہ غریب لڑکا ڈرائیونگ  
 میں بیٹھا ہے۔ اسے یہ لائسنس واپس کر دو..... اور کہہ دینا کہ تم نے اسے پچا نا نہیں تھا!

کنور صاحبہ ہی کے پاس بٹیر کنواٹر کا خط پڑھنے لگی۔ اور دسمیرہ ظفر کا ڈرائیونگ لائسنس مانگنے میں لے کر کھینکتی ہوئی،  
 شرمندہ سی ڈرائیونگ روم کی طرف بڑھی۔ ظفر اسے دیکھ کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور مسکرا کر بڑے ادب سے سلام کیا.....  
 دسمیرہ نے بغیر سلام کا جواب دینے، کاغذ میز پر ڈال دیا اور رک رک کر بولی۔ یہ معاف کیجئے گا رات میں نے آپ کو پچا نا نہیں تھا!  
 ظفر مسکراتا رہا۔ اور اب وہ اب تو پہچان لیا آپ نے مجھے؟

دسمیرہ پلٹ کر چل دی تو ظفر نے کہا۔ سنئے گا..... میں نے دیکھا ہے کہ آپ کا ڈرائیونر تو میرا بڑا بڑا دوست  
 کر لایا، میرے نقصان کی تلافی کس طرح ہوگی.....؟ غریب آدمی ہوں! دسمیرہ کے ہونٹ مسکراہٹ نہ روک پاسے دھڑکی  
 سے بھاگ آئی۔ کیسا شرمناک ہے، تو یہ!

اس کے دو چاروں بعد ہی خان بہادر ریاض احمد خاں کے یہاں سے کنور صاحبہ کو معذور رانی اور دسمیرہ کے دعوت

کار قہر آیا۔ کنور رانی اپنے میاں کے حلقہ احباب میں ولایت کی واپسی کے بعد سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور نہ خان بہلو کے یہاں  
بہسے کی پابندی تھی۔ کھانا ایک ہی جگہ کھایا گیا۔۔۔۔۔ اس دوران میں ظفر نے وسیمہ سے کوئی بات نہ کی۔ البتہ اس کا چھوٹا  
بھائی رفیع جو انجینئرنگ کالج میں پڑھتا تھا، ادھر آدھر کی باتیں کرتا رہا۔

کھانے کے بعد وسیمہ شست گاہ میں گئے ہوئے ایک سنگ مرمر کے حصے دیکھ رہی تھی، جب ظفر صعدان لیکر  
آیا تو وسیمہ کے چہرے پر نرن رنگ ظفر نے لگا:

وسیمہ نے شکر یہ کہہ کر پانے لیا تو ظفر نے آہستہ سے کہا: آپ نے میرے لئے بھی کچھ سوچا۔۔۔۔۔ یا میں خود  
ہی کنور صاحبہ عرض کروں؟

”جی! وسیمہ نے گھبرا کر اس کا منہ دیکھا۔

وسیمہ کی وحشت پردہ زور سے ہنس پڑا: میری گاڑی کی ابھی تک مرمت نہیں ہو پائی۔۔۔۔۔ میں تو اس دن سے  
لاچار ہو رہی ہوں۔“

کسی قابل انجینئر کو کھلیجے: وسیمہ نے شوخی سے کہا: ایک اپنی برابر کے کمرے سے آتے ہوئے رفیع نے کہا: میں  
ہوں قابل انجینئر! اور بات کا رخ پلٹ گیا۔

دوسرے دن کنور رانی نے وسیمہ کو بتایا کہ خان بہاؤ نے قمار ار شتہ ظفر کے لئے مانگا ہے۔۔۔۔۔ تمہاری کیا  
مرضی ہے؟

وسیمہ کی مرضی کنور رانی کو معلوم تھی۔۔۔۔۔ اور جب یہ بات طے ہو گئی تو وسیمہ نے ظفر سے پردہ شروع کر دیا، ظفر اکثر  
ان کے یہاں آتا اور ایک دن تو اس نے باقاعدہ پرچہ لکھ کر بذریعہ ڈاک وسیمہ کو بھیج دیا کہ جس دن سے آپ نے میری گاڑی کا میٹیمپ  
توڑا ہے، میں اندجیرے میں جھٹک رہا ہوں۔ اس سے قبل کہ میں بطور انتقام آپ کی ٹھکانے کا سٹیشن توڑ دوں۔۔۔۔۔ میری  
فکر کیجئے!

وسیمہ کی شادی میں ایک ہی ہفتہ باقی تھا کہ منیرہ منیر کو کمرچ کا امتحان دے کر رکھوا گئی۔ اس نے ظفر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔  
وسیمہ نے اسے ظفر کی دو تین تصویریں دکھائیں جو غالباً ظفر کے ہی انشاء پر رفیع اس کو دے گیا تھا۔۔۔۔۔ منیرہ نے ایک ڈو کو غور  
سے دیکھ کر کہا: اچان سے آپا یہ تو بڑی خوبصورت ہیں۔ مونچھیں البتہ کچھ زیادہ نہ لگی ہیں۔۔۔۔۔ آپ ذرا کم کر دیجئے گا۔۔۔۔۔  
چہرے سے بہت خوش مزاج لگتے ہیں۔“

وسیمہ نے اس تنقید کا لطف لیتے ہوئے کہا: ادنیٰ ان کی مونچھیں کاٹنا کچھ آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔ بہت تیز ہیں۔ اب  
تو دیکھنا تیرا ناظر ہی بند نہ کر دیں تو شرط ہے۔

منیرہ کے دل میں خوشی کی لہریں اٹھنے لگیں۔۔۔۔۔ ہنس کھڑو لہا بھائی کا تصور بڑا ہی دلچسپ تھا۔۔۔۔۔ اس نے آٹھ  
ایک کسی سے مذاق نہ کیا تھا۔ ناصر نے اس کو چھوٹے چھوٹے کہ بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ اس کے لئے بھائی سے کچھ زیادہ بے تکلف نہ ہوتی  
تھی۔۔۔۔۔ اور کوئی ایسا رشتہ نہ تھا جس سے وہ بھی ہنسی مذاق کرتی۔۔۔۔۔ کچھ تو اس کی حیثیت ہی سب سے الگ تھلک تھی۔

پھر اس بھوکوں کی زندگی جس میں ہر لمحہ ہنسی کی آواز ہمیشہ بے تکان اور ہمیشہ معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔۔ منیرہ کا دل ابھی سے  
چپنے کر چاہتا تھا۔۔۔۔۔ اس نے تصور ہی میں اپنے ناخن کاٹنے کی فیسی اٹھا کر دیکھا تھا۔۔۔۔۔ وہ بھائی کی ہونٹوں کا صفا یا کر دیا۔۔۔۔۔  
اور پھر ان کے دونوں کانوں کی نوک بھی کتر ڈالیں! اس نے سوچا کہ دو بھائی کو پاؤں میں ہستی ضرور رکھلاؤں گی۔ اور ان کے بالوں میں  
افشاں بھی ضرور لگاؤں گی۔ جو کئی دن تک تھکتی رہے!

دل میں آن گشت ارمان سے کروہ بہن کا جینز بھلنے لگی۔۔۔۔۔ بہن کو گھر جانے دیکھ کر منیرہ کے دل میں اس کیلئے  
اتحاد محبت آبل پڑی تھی۔۔۔۔۔ وہ ہر جھوٹی دیر بعد کسی ضروری کام کو چھوڑ کر دسمیرہ کے کمرے میں دوڑی جاتی اور کہتی  
اس کا آبل سے مہکتا چہرہ دیکھ کر مسکراتے لگتی اور کہتی اس کے زرد و پٹ کے دامن میں منہ چھپا کر رو دیتی۔

بارت آگئی۔۔۔۔۔ منیرہ نے ہتھالی کی چھت پر سے دو لہا کو دیکھا اور خوشی کے مائے اس کا دل اچھل کے حل ہی  
آنے لگا۔۔۔۔۔ وہ دوڑی ہوئی دسمیرہ کے کمرے میں گئی۔۔۔۔۔ وہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے  
موقع نکال کے دسمیرہ کے کان میں کہا۔۔۔۔۔ آ پاؤ لہا بھائی بڑے خوبصورت ہیں اور بہت شاندار لنگ بے ہیں۔۔۔۔۔ پھر وہ  
بھاگ کر نکلی اور ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے دو لہا کو سب کے ساتھ مل کر جھانکنے لگی۔

شاوی کے ہنگامے میں دسمیرہ کی نیز طراز سیلیوں نے منیرہ کو ذرا بھی دو لہا سے بات کرنے کا موقع نہ دیا۔ وہ سب کی  
سب منت منتہ ذرا ق کر رہی تھیں اور ایک کھٹے کو پیچھ رہی تھیں۔ کوئی اس سے عجیب و غریب سوال کرتی تو کوئی اس کی  
صورت کو ”چڑھی کا غلام“ بتاتی۔۔۔۔۔ ایک دفعہ بڑی ہمت سے وہ یون میں مچیں ڈال کر لڑائی بھی تو بدقسمتی سے ظفر  
تک پہنچ سکا اور پہلے ہی رافع چھپ کر کھڑا گیا!

دسمیرہ رخصت ہونے لگی تو بہت روئی اور منیرہ کا تو یہ حال تھا کہ اس کی ہچکیاں کسی طرح ناہو میں نہ آتی تھیں۔ اس نے  
آواز روکنے کے لئے دانتوں سے اپنی انگلی لہو لہان کر لی مگر اسے نہ سمجھے کہ آئے ہی آئے تھے۔

منیرہ کی خواہش تھی کہ وہ بھی دسمیرہ کے ساتھ اس کی سسرال میں جائے۔ مگر یہاں کے بکیرے بھی اس کو میٹھنے تھے بلکہ  
کچرا سارے گھر میں بول ہی بھیل پڑا تھا۔ کمرہ رانی نے اس کو روکا کہ اس وقت تو رہنے دو۔ کل صبح تم ہی جا کر دسمیرہ کو سسرال  
سے لانا۔ ناصر بے چارہ تو سمندر نور پڑا ہے اور وہیں کو لینے کوں جلتے گا۔۔۔۔۔

دسمیرہ کے بننے سے سارا گھر سونا ہو گیا تھا اور بے چاری منیرہ نے کمرے میں بدل کر یہ اونگتی رات بسر کی، صبح ہوئی  
تو منیرہ کی بے تابی ناقابل برداشت تھی۔ دسمیرہ کے لئے بہت سی مٹھائیاں اور کپڑے، دو لہا بھائی کے لئے سستی بڑی ہوئی پاؤں  
کی گلو رباں اور افشاں نے کروہ خان بہادر ریاض احمد کی شاندار کوکھٹی میں پہنچ گئی!

ظفر کی بہن اس کو ساتھ لے کر دسمیرہ کے پاس گئی۔ دسمیرہ زیور اور پچھلے سے لدی ہوئی کار چوبی کے سبز کپڑوں میں  
ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ ظفر ابھی تک اٹھ کر منظر دوستوں کے پاس نہ جاسکا تھا اور وہیں قالین پر لیٹا ہوا خاصداں میں  
سے چھالی کے سفید دانے چن چن کر کھاتے جا رہا تھا۔

منیرہ کو دیکھ کر دسمیرہ اٹھی تو اس کی پاؤں کا ایک ایک گھونگر و بول اٹھا اور یہ وہ دونوں گھٹے ملیں تو ظفر کی

موجود کی نظر انداز کر کے ایک دوسرے کے افسوسوں سے بھیکے ہوئے منہ جو منہ لگیں.....  
کچھ دیر بعد دونوں کو ظفر کا خیال ہوا تو وسیع چھینپ کر بیٹھ گئی اور منیرہ نے اسے سلام کیا۔ اس سے قبل کہ ظفر کچھ  
کے رفیع آگیا اور منیرہ کو دیکھ کر چہنچا "بھائی صاحبہ کون ہیں یہ؟" فرما مجھے ان کا نام تو بتائیے..... ہیں انہیں خوب پہچا  
ہوں۔ انہی حضرت نے پرسوں شام مجھے مرحوں والا پان کھلا دیا تھا.....

وسیمہ نے سیرت کہنا: "ارے تم منیرہ کو نہیں پہانتے؟ میری بہن کو! ظفر اور رفیع دونوں نے گھبرا کر منیرہ کو دیکھا۔ وہ بیچا  
شرا کر مٹی جا رہی تھی..... رفیع نے کہا: "جی؟ آپ کی بہن؟" وسیع بولی: "ہاں بھی میری بہن منیرہ۔ تم نے بار بار اس کا ذکر مجھ سے  
سنا ہے..... ابھی تک صورت نہیں دیکھی تھی؟" رفیع سر کھجا کر دولا: "جی میں نے شادی کے دوران میں انہیں دیکھا تو کئی بار  
مگر یہ خیال نہیں تھا کہ یہی منیرہ ہیں..... یہ تو قطعی آپ کی بہن نہیں لگتیں....."

"ارے کیوں؟" رفیع کی چھوٹی بہن نے بھونپی ہے سے پوچھا۔

"ابن!؟" رفیع گھبرا گیا، اس بات کی تشریح اس سے ممکن نہ تھی!

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ" لیدی "ابن نہیں لگتیں....." تم بھی تو میری بہن نہیں لگتی ہو!"

سب ہنسنے لگے، منیرہ کے چہرے پر بدلی بدل کے تیرج اور زرد رنگ آ رہے تھے..... اس نے بھی سبک  
ساتھ ہنسنا چاہا مگر وہ نہ ہنس سکی..... اسے ڈر ہوا کہ اس کو سنش میں آس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل پڑیں گے رفیع جس کیلئے  
کا جواب نہ دے سکا، اس کے سبب سے وہ اچھی طرح واقف تھی..... اپنا کر ناک چہرہ چھپانے کو اس نے جھٹک کر وسیعہ کی  
سازشی پریشاں ہوا ایک ستارہ نورج لیا اور منیرہ راوی طور پر اسے دانتوں سے چسایا..... اس کے باشعور جذبات پر یہ پہلی  
ضرب تھی! کھنڈر اکہ منیرہ کی زندگی میں ایک ہیجان آمیز تبدیلی ہوئی تھی۔ یہاں کا ماحول "سینٹ میری کو نوٹ" سے بالکل جدا  
تھا۔ یہاں اس کا لباس، اس کا کمرہ اور اس کا رہن سہن سب اس کی اپنی مرضی پر تھا..... کلب اور سینما گھر تھے۔ شاندار میک  
اور سہارا سہولتیں انہیں! پھر ناصرا اور وسیعہ کے نہ ہونے سے وہی سارے گھر کی روح مردوں اور سارے مہمانوں کی مہربانی تھی مگر  
تھا کہ یہ ساری تبدیلیاں اور مصروفیتیں اس کی فطرت کو بھی ایک نیا جہم دیتیں..... اس کا نوجوان پیداوار اس کے شکست  
خوردہ بچپن کو بھلا دیتا..... مگر..... خان بہادر ریاض احمد خاں کی کوٹھی کے اس خوبصورت خالینوں اور قمعوں سے  
بچے ہوئے کمرے میں ایک نوجوان نے، شاید نادانستہ طور پر اسے پرکھ کر کھوٹا کر دیا اور بے سوچے سمجھے اس شایخ کو نوٹ  
ڈالاجس پر ممکن تھا کہ اس کا آئینہ نہ بن جاتا۔

جب شام کو وسیعہ اور ظفر کمرے کردہ اپنے ہاں واپس آئی تو مٹی پڑے پانوں کی گھوریاں اسی طرح سے بیک ہیں  
پڑی مٹی مڑھا رہی تھیں اور افغان کی ڈبیا بھی کس میر سی کی حالت میں ایک طرف پڑی تھی..... اس کی بہت اس کی شراکت  
اور اس کی انگلیں بائیک ہی جھیکے سے کھڑکیں..... آج وہ پہلے سے زیادہ بے بس ہو گئی تھی.....

ایک ال اور چلا گیا..... بہت سے نئے پھول کھلے اور پڑنے لگاؤ بھر گئے..... وسیعہ ماں بن گئی اور  
ناصر نے فائنل میں ناکامی کا غم بھلانے کے لئے وہیں ایک آئرش روکی سے سول میرن کر کے، ن باپ سے روپیہ اور معافی کی



کہ علاوہ کوئی نہ تھا..... ڈاکٹر صاحب اپنی حیرت کا اظہار کر رہی بیٹھے۔ انھوں نے کہا ”منیرہ، تمہیں نہیں معلوم کہ تم کسی خطرہ  
حالت میں ایک دن ایک رات پڑی رہیں۔ تمہارے گھر والے کیسے پریشان تھے..... اور میں..... یہاں اسی کہ سی پوٹھا  
..... تمہیں تک رہا تھا..... مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں نکلا اور رات کب آئی..... مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اس مرض کو  
وئی..... مگر تم..... ایسا لگتا ہے کہ تمہیں اپنی صحت پر نہ حیرت ہوئی نہ مسرت..... کیا تمہیں اپنی زندگی بچا  
منیرہ نے سر اٹھا کر بھر ڈاکٹر کا چہرہ نور سے دکھایا..... پھر تمہیں جھکا لیں اور ہستہ سے کہا: ڈاکٹر صاحب  
میں کیا ہے جس سے بیمار ہو..... میرا مطلب اپنی زندگی سے ہے“

بڑے ڈاکٹر نے پوچھا کہ بغیر ایک چمکائے نعجب سے اس نوجوان لڑکی کو دکھایا..... جسے آرام دہ گھراؤ شفیق  
ہاں نصیب تھے جس نے اچھی تعلیم پائی تھی اور جس کے آگے طویل زندگی کی آن گت سیڑھیاں چڑھنے کو تھیں..... زندگی میں بہ  
ہے جو تمہاری زندگی میں نہیں؟

منیرہ کے لئے اس بات کا جواب دینا کچھ بہت آسان نہ تھا، اس شخصیت میں آدھڑاں بھلی کے فتنے کو دکھایا اور دھڑک  
تھی کہ کتنی مایہ ناز کے چوں شمار کرنے لگی۔

ڈاکٹر نے منیرہ کے تہرے پر جذبات کی کشمکش دیکھی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے کو پیار سے فہر کا۔ منیرہ میں چھٹا  
بیماروں کا عالم کرنا ہوں..... بہت سے زخم بہت سے نامور میرے انھوں اچھے ہو گئے۔ بہت سے مریضوں کو درد اور تک  
لی حالت میں میرے ہاتھوں میں سکون پہنچا..... مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر کے علاوہ میری انسانیت کی بھی کوئی وقعت ہے یا نہیں  
..... مگر تم سمجھ سکتی ہو..... اور تم ہی بتا سکو گی کہ کیا میں تمہاری مدد کرنے کا اہل ہوں یا نہیں..... تم اپنی زندگی  
بیزار کیوں ہو.....

ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ کے نیچے منیرہ کے شانے میں کپکپاہٹ محسوس کی اور دیکھتے ہی دیکھتے منیرہ کے زرد رخساروں  
آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی..... ڈاکٹر بے مقصد زندگی کی بھی کوئی قیمت ہو سکتی ہے..... آپ کی زندگی کا نصب العین بہ  
بلند ہے، آپ ایک بے مصروف زندگی کی بے کیفی کا اندازہ نہیں لگا سکتے.....

ڈاکٹر غصہ کے بڑے چہرے پر مطمئن مسکراہٹ بھلی۔ میں یہی بات ہے کہ تم نے اپنی خوش نصیبی کا بھی احساس کیا کہ  
اپنی زندگی کی قدر ہے اور اس کی تصنیف پر تمہیں درج ہونا ہے۔ تم کچھ کرنا چاہتی ہو اور اپنی بے کاری پہلے زور ہو..... جب تمہیں  
مرض معلوم ہے تو علاج کیوں نہیں کرتیں اس کی دوا بھی تمہارے پاس ہے“

منیرہ نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا اور چہرے پر امید و ہرج کی لہری لپکیں۔ ڈاکٹر نے کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر نہ  
جہاں ہیں جیسے نیلے آسمان پر منیرہ کا مستقبل لکھا ہوا دھڑکے ہوئے لہجے میں کہنے لگے: ”تم ایک نوجوان عورت ہو..... ایک بھی  
کہ فرائض ادا کرتی ہو اور اب..... جب کہ فطرتاً تمہارے مطالبات بڑھ رہے ہیں تو تم ایک کامیاب بہری اور قابل خیرات ہو  
ہو۔ تم اپنا گھر اپنے ہاتھوں سنوار دو گی اور یقیناً وہی شخص تمہارا ساتھی ہو گا جسے تمہارے دل نے پکارا ہو..... اور.....  
منیرہ کے چہرے پر زردیاں کھڑنے لگیں، اس نے گلو گھبراواں کہا: ”بس ڈاکٹر.....“

ڈاکٹر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور اگر تھا تو سنو! تم اس سے بھی بڑھ کر ہیں تمھاری سہمت اس سے بھی زیادہ ہے۔ تم اپنی ذمہ داریاں لا محدود چاہتی ہو..... تو تم ڈاکٹر کیوں نہیں بنیں..... لیڈی ڈاکٹر.....

”لیڈی ڈاکٹر؟ منیرہ کے منہ سے چیخ کی طرح نکلا۔

”ہاں ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا: بشرطیکہ تم اپنی زندگی سے اپنا اور اپنوں کا سب کچھ نکال لو..... نکھلے دن اور تمھاری رائے بھر آرام وہ گھراور خوش باش گھروالوں کی نہیں بلکہ روئے بکٹے مزہبوں اور تباہوں کی ہوں گی..... اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اپنے فرائض کا احساس رہا تو تمھاری زندگی کا ہر لمحہ انمول ہوسکے گا.....“

شدت جذبات سے اس کا سانس چڑھنے لگا۔ ”مجھے ایسی ہی زندگی کی قضا ہے ڈاکٹر..... میں اپنی زندگی میں انکار کرتی ہوں“ نہیں چاہتی..... ”پھر دفعہ وہ چوکی۔ مگر ڈاکٹر ہر نے تو کبھی جو سائیں نہیں لی..... میں نے تو سینئر کیمبرج میں آرٹ اور ہسٹری لی تھی.....“

ڈاکٹر حفیظ ہنسنے لگے۔ ”تم نے جو کچھ نہیں سیکھا وہ اب سیکھ لوگی..... پانچ سات برس ابھی تمھارے لئے اہم نہیں اور منیرہ ایک سمجھ دار ڈاکٹر سے ایک خدمت شعار نرس کی طرح کم نہیں ہوتی..... تم بڑی اچھی نرس بن سکتی ہو۔ اگر تم چاہو تو میڈیکل کالج میں پڑھنے کے علاوہ شام کو چھ بجے سے آٹھ بجے تک نرسنگ ہوم میں آیا کرو۔ ایک گھنٹے تک اسٹاف نرس کی مدد کرنا اور ایک گھنٹے تک میری کلاس میں سیکھ لینا..... تمہیں اس سے بڑی مدد ملے گی..... بولو نیار جو؟“

”بالکل نیا رہوں“ منیرہ نے جھڑائی ہوئی آواز میں کہا: ”اگر میں ڈاکٹر بن سکی تو کم از کم آپ کے نرسنگ ہوم کی نرس بن جاؤں گی“

اور منیرہ ڈاکٹر حفیظ کے نرسنگ ہوم کی نرس بن گئی! وہ لیڈی ڈاکٹر نہیں بن سکی۔ اس نے کبھی سائنس نہیں پڑھی تھی۔ اکیبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے لئے کچھ نہیں پاسکے گی۔ تو آسمانوں کے لئے وقف کرنا ہوگا..... اسے میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں مل سکا مگر ڈاکٹر حفیظ کے نرسنگ ہوم کے دروازے کھلے ہوئے تھے منیرہ نے ہلکے ہلکے رنگ کی ”ہوک“ سے گھرے نیلی چارجٹ کے پر سے فوراً چھٹکے اور لشکر رڈ پر جوڑے ہوئے چلا ناسکھنے لگی..... وہ روز صبح کو نرسنگ ہوم میں اسٹاف نرس کے ساتھ زخمیوں اور مریضوں کی نگہ رانی کرتی اور شام کو ڈاکٹر حفیظ کے لیچر سننے..... کنوڑا کی کو اس باسٹ پر ناگواری بھی تھی اور پریشانی بھی..... ان کے بے حد خواہش تھی کہ جلد سے جلد منیرہ کی شادی سے فارغ ہو جائیں اور کسی طرح اپنے اس نامعلوم عوت سے نجات پالیں جو منیرہ کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں پیدا ہوا تھا اور جس کا وہ اصل منیرہ کی شادی تھا..... وہ اس پر بھی آمادہ نہیں کہ اگر ان کے بھائی محمود میاں اپنے اس بیٹے کا رشتہ بھیجیں جو منیرہ سے چند ماہ بڑا تھا، تو فوراً ہی منظور کر لیں گی۔ اور اگر منظر کا چھٹا بھائی رفیع جو اب انجینئر ہو گیا تھا، جو بٹے کو جس رشتہ چاہے تو نواسی کا بھی انتظار نہ کریں گی۔ مگر..... محمود میاں کی دلہن نے چھوٹے بیٹے کا رشتہ بھی اپنے میکے میں ملے کر لیا تھا۔ اور رفیع آج کل کسی ایٹکوارٹر جیسے کے فراق میں دیوانے ہو رہے تھے! کنوڑا کی بلک جھک کے خاموش ہو گئیں اور منیرہ اطمینان سے موٹر ڈرائیو کے نرسنگ ہوم جانے لگی.....

کنز صاحب بھی بچوں کی طرف سے عجیب قیمت لائے تھے۔ ایک ہی بیٹا اور وہ بھی ہاتھ سے نکلا سمجھتے۔ ناصر بابر  
 آؤں گا کہ بکریٹ ہونے کا ارادہ ترک کر کے ہندوستان آگئے تھے اور مسز ایڈنا ناصر بھی ہمراہ تھیں! وہ بیوی کو لے کر گھنوا گئے اور  
 مکین تھا کہ اعلیٰ کو سانس سسہ گھر کی رونق سمجھتے۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ مسز ایڈنا ناصر ہندوستانی لباس پہننے کی نسبت اپنے  
 عاشق زار کو تر پنا چھوڑ کر ولایت لوٹ جانا بہتر سمجھتی تھی۔ اور کنز رانی سے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ عزت و زور اور دست و پا  
 میں ایسی ہوساں تھلے کو نکلیں جو وسیمہ کی دوسالہ بیٹی نعیمہ کی طرح ایک مختصر نیلے اور لٹکا قمیض ہی اپنے لئے کافی سمجھتی ہو۔ او  
 کہ لے ہیں کفایت کے لئے نہ صرف دوپٹہ اور پاجامے سے نالای ہو جائے بلکہ آنسو ویشٹ ایسے فراک پیٹھ جو نہ صرف استینود  
 بلکہ شانوں سے بھی عاری ہوں۔ کنز رانی تو ڈوبی جا رہی تھیں اور خدا لئے بڑا ففس کیا کہ ناصر میاں کو وہی میں فوراً ہی اچھی خانہ  
 ملازمت مل گئی اور وہ دولہا کو لے کر چلے گئے ورنہ اور رنگیں جنگ مچتی۔

وسیمہ کی طرف سے یوں تو ماں باپ کو اطمینان تھا کہ وہ اپنے گھر خوش ہے، میاں قدر دان ہے، مگر وسیمہ کی صورت  
 گھر والوں کے دل ڈبا دیئے تھے۔ وہ شروع سے وہاں جان سی کمزور لڑکی تھی اور آگے والی کے بچہ خانوں سے اس کا تعلق اور  
 گیا تھا۔ ہر سال وسیمہ کا ہینڈ ایسا تھا کہ کسی کی آئی ٹل جائے مگر وسیمہ کا بچہ نہ ٹٹے۔ ..... ایک کی زبان نہیں کھلی۔ دوسرے۔  
 پاؤں اٹھانا نہیں سمجھا اور تیسرا خبر سے گھر میں آ گیا۔ بے چاری لڑکی انیمیا میں مبتلا تھی اور اکثر اختلاج قلب کی شکایت دہتی  
 ..... بیٹی کی یہ کیفیت دیکھ کر کنز رانی کو فواسہ تو اسی بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ اب یہی منبرہ تو اگر وہ شریف گھر کی لڑکی  
 کی طرح دولہائی پڑھ کر اپنا گھر بساتی تو شاید ماں باپ کے سر سے کوئی بار ٹل جاتا۔ مگر اس نے تو ڈھنگ ہی دوسرا بنا لیا تھا  
 اس کا ارادہ شادی بیاہ کا نہیں تھا۔۔۔۔۔ کنز رانی اکیلے میں میاں سے کہیں کہ میری زندگی تو اول ہی عذاب تھی مگر  
 اس کنز رانی بیٹی کو اس طرح بے بارود دکھا دیکھو ڈھری تو قبر میں بھی چین نہ ملے گا۔ خدا کے لئے منبرہ تو سمجھاؤ کہ بیشر لیب ٹیڈوں کا  
 طرفی نہیں! ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے یہ کام نہیں کیا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ جن بچوں کو چھینک بھی آتی تو ہم نے  
 بیسیوں حکیم ڈاکٹر جمع کر لئے، اب وہی بچے دوسروں کی اچھی بری بیماریوں میں مانجھ ڈالیں۔ دنیا بھر کا ناک ٹھوک صاف کر دیں اور  
 پھنسی چھوڑوں کو چھوڑیں۔ کیا ہماری مرثی اولاد کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی؟

کنز صاحب منبرہ کے لئے کرکٹ اور راستہ سمجھتے تو اس کو بھی سمجھاتے۔ اس رستے پر اگر منبرہ یہ بھول گئی تھی کہ کبھی اس  
 نے خوکو پابند بھی محسوس کیا تھا۔۔۔۔۔ حالانکہ اس کی ہنر کی کوئی نہ فنی مگر سفر کی گھاگھی میں اس نے پیچھے دیکھنا اور اس کے پیچھا چھوڑنا  
 جرم و بیزان کے مکتف گھر میں جپ پہا پ رہنے والی لڑکی اب ڈاکٹر حفیظ کے بیماروں اور کراہٹوں سے بھرے ترسنگہ تو  
 ہیں ہمیشہ مسراتی رہتی۔ یہاں وہ کنز صاحب کی بیٹی اور وسیمہ کی بہن نہیں تھی۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ تنہا کی طرف سے سوشل  
 پیچھے ان کا خاندان پوسٹ سے جا ملتا تھا اور گھر والے شاکسٹے تھے کہ اس نے خود کو اس وراثت کا اہل کیوں نہیں قرار دیا۔  
 مگر۔۔۔۔۔ یہاں اس کی اپنی ذاتی شخصیت تھی۔۔۔۔۔ ذاتی وقار تھا اور اس کی اپنی محصور اور مہربان مسکراہٹ تھی۔  
 منبرہ کی وہ جوانی بھی اپنی تھی جو مٹی نالی کے اونچے پہاڑوں میں جنم لے کر گھر کی عجوبہ فضا میں اٹھتی رہی اور اب اس نے ماحول میں  
 چونک کر منبرہ کے گروپٹ گئی تھی۔



پربہارچھی میں جس کی کو آپ نے نظر انداز کر دیا، وہ ضروری نہیں کہ گریبان کے کلاچ میں سج کر بھی آپ کو بے رنگ و نگاہ معلوم ہو۔۔۔۔۔ سنید لباس میں پروفاؤر انداز اور عربیوں سے لڑنے کے ساتھ قہر کی ہوتی منیرہ خدا جانے کتنوں کے دکھ محض اپنی آمد سے مٹا دیتی تھی۔ چھوٹے بچوں میں وہ خاص طور سے مقبول تھی۔ پریشان مائیں اپنے بچوں کو ہنسنا کھیلتا دیکھنے کے لئے منیرہ کی ڈوبی کا انتظار کرتیں اور بہت سے مریض کڑوی دواؤں کو اس کی چھٹی نسل کے ساتھ خوشی سے پی جاتے۔۔۔۔۔

اب منیرہ کو اپنے خواہ مخواہ دنیا میں آنے کا رنج نہ تھا اور نہ مگر کے بے مصرف گزرنے کا غم، ڈاکٹر سیفیٹ نے اس کے بیمار جسم کے ساتھ ہی اس کے ماؤف و مانع کا بھی مداوا ڈھونڈ لیا تھا۔۔۔۔۔ اور یہ جب کی بات تھی کہ دل کا معائنہ زیر بحث نہ آنے پایا تھا۔۔۔۔۔ وہ بیمار تو سما ہوا کسی کو نے میں پڑا کرتا تھا۔۔۔۔۔ اس میں دھڑکنے اور گنگنا نے کی سکوت کہاں تھی۔۔۔۔۔

نہ منیرہ نے کبھی یہ سوچنے کی جرات کی کہ اس کی دنیا اتنی پراسرار اور رنگین بھی ہو سکتی ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ بات کسی بھی دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر دماغ کی رسائیوں میں نہ گونجی۔ اگر افسردہ کا ہاتھ اٹا جا رہا ہو تو اور انجانی مشیت کی جیسے جیسے کی شان کی نہ ہوتی۔۔۔۔۔

وہ ایک خنک رات تھی جب اندھیرا چھلانے ہی کمرے کے باؤں اور صحر اُور بھٹنے لگے تھے اور سڑکوں پر ٹھانے والے تقفون کی زرد روشنی دو دو حیا لمبیٹ میں اور زیادہ جھپکی اور محدود ہوتی تھی۔۔۔۔۔ منیرہ زنگ ہوم سے گھر آ رہی تھی۔۔۔۔۔ بیچے کی سیٹ پر شکوہ اور گھر دیا تھا اور وہ خود گاڑی چلا رہی تھی۔۔۔۔۔ یہ وہی گلے بنے رنگ کی بوک تھی جس نے کٹرے نیلے پردے منیرہ نے انارڈالے تھے اور جسے گذشتہ دو سال سے وہ ڈرائیو کر کے اپنے گھر سے زنگ ہوم جایا کوئی تھی۔۔۔۔۔ یہ وہی بوک تھی جسے آج سے سات آٹھ سال پہلے کنور صاحب نے بسیمہ کی پسند پر خریدا تھا۔ اور اب ایک رات سینما سے واپسی پر ملکارڈ ٹوٹنے کے جرم میں نافر کو بسیمہ کے حضور جواب دہ ہونا پڑا تھا۔۔۔۔۔ اسی موڑ نے ایک خنک اور دھندلی رات میں منیرہ کی راہ میں بھی کسی کو لا ڈالا۔

آج رات جب منبرہ رونے سے کہیں کہیں کہہ لے ایک منہسی کا قی محفل سے لوٹ رہی تھی تو اس کا دل ہمیشہ سے کہیں زیادہ دیر لای اور پڑھ رہا تھا۔ آج جب کہ وہ ایک اساتذہ نرس جو لیا کی شادی میں شرکت کہے آ رہی تھی، تو یہی تھی کہ اس نے دیکھ کر اس کی رگوں میں شتر جھوڑے تھے اور اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ کاٹھڑی کا کہہ سکتے تھے۔

پچھلے دو سال سے جب شام کو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے وہ لٹکی ہاری گھر لڑتی تو اس کے دل میں ایک خود غمازی اور عزت نفس کا احساس ہوتا، اسے اپنے وجود پر پیاؤ آتا کہ آج اس نے کتنے بھونے چہروں کے آنسو پونچھے کتنے رستے زخموں پر مرہم لگائے اور کتنے شکریہ گزار نظریں اپنے چہرے پر مرکوز رکھیں..... اس کے بعد اسے بے سوجھ بھمی شرم آتی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے..... بایں ہو سکتا ہے..... مگر اس رات.....

ڈاکٹر خلیفہ نے جو لیا کہ رخصتی دعوت دی تھی۔ وہ شادی کر کے اپنے خاوند کے ساتھ جا رہی ہے۔۔۔۔۔ یہ وہی راس تھی جسے دو سال پہلے ڈاکٹر نے منیرہ کا ہاتھ بٹھایا تھا۔ اور کہا تھا: جو لیا۔ یہ لڑکی زندگی کی جو لیا ہے۔ اور جو لیا منیرہ کا ہاتھ بٹھایا تھا۔

کے دو سائے تنگ اوروں کے غم میں اس کے لئے مسکراہٹ چھٹی رہی اور منبرہ کو ایسا لگتا تھا کہ اب وہ اور جولا اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ اس شاہراہ کے کانٹے چھٹے چھٹے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گی اور آخری دم ان کے دل کو یہ سکون ہو گا کہ انھوں نے ان گنت تلواروں سے چھلنی ہرنے سے بچائے ..... مگر جولا کی راہیں مختلف نکلیں ..... اس کی منزل اور نئی اور ساتھی بھی اور مل گیا!

ڈاکٹر حفیظ نے نرسنگ ہوسپتال میں جولا کو اداسی و موت دی ..... منبرہ بھی موجود تھی، سب ہنس بول رہے تھے۔ گارسے تھے اور منبرہ کے دل میں یہ احساس چنگیاں لے رہا تھا کہ زندگی طویل ہے اور وہیں ان گنت ہیں ..... ساتھی بھی مل جائے اور بعض تڑپ تڑپ کر تنہا بھی مر جائے ہیں ..... زندگی مسکراہٹ بھی ہے اور آنسو بھی ..... جس کے نصیب میں جو بھی آجائے!

پھر اس کے نصیب نے ایک حلا ..... بے نیکی اور تنہائی کا جہنم اس کے سامنے کھول دیا اور اس ہنسیتی بولتی مخل سے لڑتے ہوئے اس کا دل ہمیشہ سے کہیں زیادہ دیرانی تھا اور بے بستہ انگلیاں ایڑھ جگ و جیل پر بے جا ہنسنے کی طرح کسی ہونی نہیں ..... مہرہ ہنسیتی کے کمر و لب کمرے کے دھند گھمبے میں اور بھی سسک رہے تھے اور ہستان سڑک کو نکلتے تکتے خشک کر منبرہ کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ یہ دو چار میل کا رستہ جو روز بیک بھجے کر جاتا تھا، آج پلکوں کو جھپکاتے دینا تھا تاہم وہ مشکور کی طرح اونگھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں اور اسیر ہنگ و جیل پر ہاتھوں کی گرفت بھی مضبوط تھی۔ پھر کیا ہوا ..... منبرہ کو معلوم نہیں ..... سڑک پر کوئی راہ گیر نہ تھا۔ مہرہ کی سرخ لاسٹ کے ساتھ دوڑتی ہوئی لگا ہوں نے کسی متغیر کو نہیں دیکھا اور پھر بھی ..... سیمنٹ کی چمکی سڑک پر پھلتی ہوئی پیرک نے جھٹکا کھایا اور رضائیں ایک دلدور انسانی پیچ گو بھی!!

”کیا ہوا؟“ شکر اپنی غموں کی سے چونکا۔

منبرہ نے پوری طاقت سے بریک مارنے ہوئے کہا: ”اللہ جانے۔“

لڑنے ہاتھوں سے مشکل پٹ کھولا اور ڈاکٹر لڑنے قدموں سے پیچھے دوڑی جہاں چند گز کے فاصلے پر انسانی کراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کلبی نے ہونے بیاہ و حشر پر جھک کے منبرہ نے فرط خوف سے، دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ بیہوش کی کھلائی روشنی میں اس نے ایک دروچرے کے علاوہ سڑک پر مل کھائی ہوئی خون کی پتلی سی دھار بھی دیکھی۔

”یا اللہ یہ کیا ہو گیا!“ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

شکر نے جھک کر اسے ٹھٹھا: ”بی بی۔ یہ تو مر گیا ہے چارہ“

”تڑپ کر منبرہ سڑک پر دوڑا تو ہو گئی اور کانچتے ہاتھوں سے اس کی کلاٹیاں نکالیں ..... اس کے بعد مذنی اودھ کوٹ میں اس کے دل کی دھڑکنیں ڈھونڈنا چاہیں ..... وہ یکبارگی چیخا۔“ افرہ ..... ہٹے ہٹے ..... چھوڑ دو“

منیرہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی " اسے لے چلو شکور..... جلدی کرو۔"

شکور لپک کر گیا اور موٹر کو پیچھے نہ کر لایا..... منیرہ کے جسم میں سر سے پتہ تک سنسنی مچ رہی تھی اور دل بڑھنے اور  
سے دھڑک رہا تھا..... شکور کی مدد سے اس نے زخمی کو اٹھانا چاہا تو وہ پھر چیخا " ہائے چھوڑو۔ خدا کے لئے.....  
مجھ پر ہتھیو۔ منیرہ کے ہاتھ سے وہ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ برقت دونوں نے اسے پیچھے کی سیٹ پر ڈالا اور منیرہ بھی اس کے  
ساتھ ہی پھیلے جھتے میں پائیدار پریٹھ گئی۔ اس نے شکور سے کہا " واپس جلدی نہ کرو۔"

شکور نے گاڑی گھائی اور منیرہ نے اندر کی روشنی کھول کر اسے دیکھا..... ڈرنے ڈرنے دیکھ..... وہ ہوش  
میں تھا اور کوٹ کی لمبی آستین میں سے خوں کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ "آپ اچھے ہو جائیں گے۔ منیرہ نے اس کی  
وناک نظروں کی زد سے بچتے ہوئے کہا۔ وہ بولنا نہیں۔ کراہتا رہا اور منیرہ کو دیکھتا رہا، منیرہ نے پھر کہا "مجھے بڑا افسوس  
ہے..... مگر آپ اچھے ہو جائیں گے۔ آپ بہت جلدی اچھے ہو جائیں گے..... میں آپ کو ہسپتال لئے جاتی ہوں۔"  
"ہسپتال؟ وہ کراہتا رہا۔ پوری شدت کے ساتھ۔

"ہاں ہسپتال..... کہوں آپ کہیں اور جانا چاہتے ہیں؟"

"میں اس میں کہاں جاؤں گا..... میرا کون ہے....." منیرہ کو ایسا لگا کہ جیسے اس کی آنکھوں میں آنسو  
بھرائے ہیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں منیرہ کو چکر سا آ رہا تھا..... دل آچھل آچھل کر حلق میں اٹکنا رہا اور نرجس کلاتیاں  
چھوڑے دے رہی تھیں..... وہ سچ بچ رو دیا تھا..... اس کی بند پلکوں سے آنسوؤں کی بارش نہ روک سکی اور منیرہ کا  
دل چاہا کہ وہ بھی بھوٹ بھوٹ کر روئے۔

"نیرہ میں نے کیا غضب کر دیا" اس نے اپنی ہتھیلیاں ملتے ہوئے دل سے پوچھا اور پھر دفعتاً شکور کا کندھا پکڑ  
کر جھوڑتے ہوئے بولی "نرسنگ ہوم جانا ہے کار ہے شکور۔ ڈاکٹر صاحب جا چکے ہیں..... گھر چلو..... پھر جا کے  
ڈاکٹر صاحب کو بلالانا " شکور نے موٹر کو دوبارہ موڑا اور منیرہ نے پلیٹ کر اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹا۔ وہ  
اب بچہ ہوش ہو چکا تھا..... آستین سے خوں کے قطرے ٹپک رہے تھے اور زرد زخموں پر آنسوؤں کی بوندیں کانپ  
رہی تھیں..... منیرہ رونے لگی۔

منیرہ اپنے ساتھ اچھی خاصی قیامت گھر لے آئی تھی۔ اس کی ماں پریشان بھی تھیں اور ناتواں بھی..... وہ ہمیشہ  
منیرہ کو موٹر چلائے سے منع کرتی تھیں اور کندھ صاحب اپنا پاپ سدا کا کہہ کر اسے ہنس چپ چاپ ٹھہر رہے تھے۔  
ڈاکٹر حنیف دوڑے ہوئے آئے۔ منیرہ نے قہقہے لے کر وہیز اور کوٹ کو گلے گلے کر کے اُتار ڈالا تھا اور اپنے  
بے ہوش ہمان کے سر پر جمی ہوئی اس کا کچلا ہوا بازو دیکھ کر کہ اپنی آنکھیاں مروڑ رہی تھیں۔ موٹر کا پیٹہ سیدھے ہانکے ہڈی  
کا چڑسا کر گیا تھا.....

ڈاکٹر صاحب نے آنے ہی کہا "بھئی منیرہ بیٹی۔ تم نے تو سارے کتے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ اچھا کہیں تم نے یہ بھی  
سننا ہے کہ نرسیں....." منیرہ کی رونے کی شکل دیکھ کر ڈاکٹر حنیف نے مذاق کا ارادہ ملتوی کر دیا اور مرض کا معائنہ کرنے لگے۔ "شکور

کمر صوف کئی پر سے ہڈی لڑی ہے اور باقی محض گشت پھٹ گلیہ ہے۔ ہم صبح آپریشن کر کے ہڈی جوڑ دیں گے..... فی الحال زخم صاف کر کے خون روک دیا جائے..... کیوں منیرہ؟

”جی ہاں..... مگر بے ہوش کیوں ہو گیا ہے ڈاکٹر؟“ منیرہ نے بغیر ارادہ کئے سوال کر ڈالا۔  
ڈاکٹر حنیف نے تعجب سے منیرہ کو دیکھا۔ شاید دو ماہ بعد آپ کو جنرل ہسپتال جا کر زنگ کا امتحان دینا ہے منیرہ بڑی حیرت ہے کہ مرنس گیا..... بڑا جاننا رہے جس نے تمہاری ٹیم ٹیم ہو کر مقابلہ کیا اور محض ایک باؤ پر بیٹھی..... اگر آپ کا پتہ اس کی گردن سے گند جانا؟

ڈاکٹر حنیف کے ذرا ق کا منیرہ ذرا بھی لطف نہ لے سکی۔ یوں ہی آنکلیاں جھٹکتے ہوئے اس نے پھر پوچھا: یہ آپ ہو جائے گا نا؟

ڈاکٹر حنیف نے کہا: ”اپن سول سے پوچھو..... تم نے کیسے کیسے زخمیوں کی تیمارداری کی ہے؟“  
منیرہ کا دل آج پہلی بار اس کے اظہار میں نہ تھا..... نہ وہ اس شدت سے کبھی وحشت کا تھا اور نہ منیرہ نے دماغ کو دل سے آج کی طرح ہار مانتے پایا تھا..... وہ خاموشی سے ڈاکٹر حنیف کے ساتھ اس بے ہوش زخمی کی مرہم پٹی کرتی رہی اور بار بار آئینہ دیکھنے والے آنسوؤں کو دھو پٹہ میں جذب کرتی گئی..... خون بند ہو گیا مگر بہت سا خون نقصان ہو چکا تھا اور مرنس کا جوان اور بھرا ہوا چہرہ لاش کی طرح سفید نظر آ رہا تھا..... منیرہ نے ڈاکٹر کی نظر پالکے دونوں طرف اس کے ماتھے پر بکھرے ہرے بالوں کو مٹایا..... ڈاکٹر کی نظر پالکے..... جانے کیوں..... حالانکہ زنگ ہوم میں اس نے بہت سے کمزوروں اور زخمیوں کے آنچھے ہرے بالوں کو سمجھا یا تھا..... مگر آج اسے یہی بات ”محض فرض“ سے کچھ مختلف لگ رہی تھی۔

جب تک نیاز کو ہوش نہیں آیا، ڈاکٹر حنیف وہیں کمرے میں بیٹھے منیرہ سے باتیں کرتے رہے، ایک دفعہ انھوں نے منیرہ سے کہا: ”مجھے خوب یاد ہے کہ آج کی طرت تم اس دل بھی ہراساں اور مدحراں نہ تھیں جب تم منیرہ ہو گیا تھا.....“  
منیرہ بولی: ڈاکٹر صاحب جان دینا جان لینے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے..... اگر اسے کچھ ہو گیا تو میرا بھرا بھر مجھے ملامت کرتا رہے گا..... یہ کبھی آپ کے زنگ ہوم میں قدم نہ رکھوں گی۔“  
ڈاکٹر حنیف نے بڑا عظیم الشان فتنہ لگایا..... نیاز نے پت سے آنکھیں کھول دیں۔ اور اضطراب آمیز تعجب سے ڈاکٹر حنیف اور منیرہ کو دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کرسی پلنگ کے نزدیک کھینچ کر اس کی منہ پر آنکلیاں رکھیں اور بولے: میں ڈاکٹر ہوں..... یہ لڑکی فرس ہے..... اور ابھی یہ لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اگر تم اچھے نہ ہوئے تو عمر بھر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہے گا اور وہ پھر کبھی میرے زنگ ہوم میں کام نہیں کرے گی! لہذا میں تم سے اپنی کروں گا کہ جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔“  
نیاز نے گردن گھما کے سر ہانے کھڑی ہوئی منیرہ کو دیکھا جو پٹا کے اپنا ہونٹ چبا رہی تھی۔  
”مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ نیاز نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

تھیں تو ذرا کچھ نہیں ہوا۔ بولیا کی شادی میں شرکت کر کے ڈاکٹر کا مہراج بہت شگفتہ ہوئی تھا۔ بولے: البتہ ایک انٹرویو ڈاکٹر نے تمہارا بازو پکڑ دیا ہے۔۔۔۔۔ تم بھٹک ہو رہا تو پھر اس انٹرویو پر غور و فکر کرنا۔۔۔۔۔  
 نیاز نے دوبارہ گردن پھیر کر دیکھا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے منبرہ کی آنکھوں سے آنسو برسے گئے۔  
 وہ پلک بھپکا کر بڑے غور اور تعجب سے منبرہ کو دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔

ڈاکٹر جیٹو مصنوعی غصے کے ساتھ کرسی سے اُٹھے۔ اسے لڑکی نور کو دھمکانا ہے کہ پیارہ نکلتی  
 ہٹ کر رہے۔ انھوں نے منبرہ کا سر پکڑ کر بلایا، نیاز کو ایک خواب آور مسکچر بلا دیا اور جلد سے وقت منبرہ سے پوچھا کسی  
 نرس کو بھیجوں؟

منبرہ نے کہا: کیا میں نرس نہیں ہوں ڈاکٹر؟  
 ڈاکٹر صاحب بولے: تو پھر یاد رکھو، نرس کا کام آندو مہانا نہیں بلکہ رونے والے کو مسکانے کا موقع دینا ہے  
 نیاز کا ڈیڑھ بج کر دیکھ کر اُسے سونے کی ہدایت کرتے ہوئے ڈاکٹر جیٹو صبح آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔۔۔۔۔ نیاز فوراً  
 سو گیا۔۔۔۔۔ صبح تک سوتا رہا۔۔۔۔۔ منبرہ پلنگ کے برابر کرسی پر بیٹھی، آنکھیں پھاڑے اس کا تحمل چہرہ نکلتی رہی۔۔۔۔۔  
 اور وقت گزرتا گیا۔

منبرہ کی زندگی میں یہ رات بڑی عجیب اور سحر آمیز تھی۔ یوں تو اسے کچھ دن ہوئے نرسوں کی کمی کے سبب ڈاکٹر  
 جیٹو کی نوازش پر ان کے نرسنگ ہوم میں رات کی ڈیوٹی بھی یعنی بڑی سختی اور اس نے کئی راتیں طویل و طویل وارڈ میں گھوم  
 کر گزاریں تھیں۔۔۔۔۔ اور ان دنوں وہ اپنی ساتھی نرس سے کہتی رہی کہ ”بھئی! شد کیسے جاگ لیتی ہو تم لوگ؟“ اور ہر ٹیوڑی  
 دیر بعد اپنا ٹھیرا س کھول کر ایک پیالہ تلخ کافی کاپی یعنی تھقی اور اس ڈرسے کرسی پر نہ بیٹھتی تھی نہ بیٹھتے ہی مینہ نہ آجائے۔۔۔۔۔  
 آج رات جب کہ وہ بالکل تنہا تھی، نرسنگ ہوم کے ماحول کی طرح یہاں کوئی آواز نہ تھی اور کراہٹ کی نہ تھی، اس کا مرض  
 لکچر کے اثر سے سو رہا تھا، یا بہت سا خون بہہ جانے کے باعث خافض تھا۔۔۔۔۔ وہ بہر حال منبرہ کے پلنگ پر لکچر  
 بند کیے بغیر جس وحشت لپٹا تھا۔ اس کا زخمی بازو پیٹیوں سے جکڑا ہوا پیڈوں میں پڑا تھا اور دوسرے ہاتھ کو اس نے سینے پر اس  
 طرح رکھا تھا کہ منبرہ کرسی پر نیم دراز ہو کے محض ہاتھ کی خفیف جنبش سے اس کے سانس کی آمد و رفت شمار کر رہی تھی۔۔۔۔۔  
 کسوڑا فی سونے کو چینی گئی تھیں۔۔۔۔۔ کنوڑ صاحب نے مشعل ان کو بھیجا تھا۔۔۔۔۔ انھوں نے کہا۔۔۔۔۔

منبرہ سے غلطی ہوئی ہے، اسے خباہتہ جھگڑنا چاہیے۔۔۔۔۔ اور بہر حال وہ نرسنگ سیکھتی ہے، کسی بھی مریض کی دیکھ بھال اس کا  
 فرض ہے۔ کنوڑا فی چلی گئیں تو کنوڑ صاحب منبرہ کو سمجھانے رہے کہ موڑ جائے وقت ڈاکٹر نے فرائض کیا ہوتے ہیں اور کن  
 اور کا خیال! شد ضروری ہے۔۔۔۔۔ منبرہ سنتی رہی۔۔۔۔۔ پھر کنوڑ صاحب بھی یہ کہہ کر چلے گئے کہ ”ضرورت ہو  
 تو مجھے فوراً جگا لینا۔۔۔۔۔“

منبرہ نے اٹھ کر اس قیمت اور کوٹ کو دیکھا جو بہت عمدہ اور قیمتی تھا۔ اور جس کے چند گھنٹے قبل وہ بڑی  
 بے دردی سے چلتی پھرتے کر چکی تھی۔۔۔۔۔ خون آلود اسٹین اس نے سیلائچی میں ڈال دی اور فانی جسے کڑنلاشی لینے لگی۔۔۔۔۔

ایک جیب میں سے چاندی کا سگریٹ کیس اور لائٹر نکلا۔۔۔۔۔ دوسری جیب میں پارکر قلم، رومال اور دو سوپ کا چمڑا تھا جس کا ایک شیشہ اس حادثے کی نذر ہو چکا تھا۔ اندر کی جیب میں پھر لے کا پرس تھا جس میں چند نوٹ تھے۔ کچھ ربڑ کاری نئی، ایک ساس کا اپنا نوٹ تھا اور ایک رسید تھی جس پر اس کا نام لکھا تھا "نیا زا احمد خاں"۔

"نیا زا احمد" منیر نے آہستہ سے کہا اور اس کی جیبوں سے نکلا ہوا سامان پلنگ کے سر ہانے میں بڑھکھوپا۔ کچھ ربڑ کاری، خواہ مخواہ کمرے میں پھینک دی۔ پھر کرسی کھسکا کر پلنگ سے ملا دی۔ پائنٹی سے اپنی رضا فی آٹھا کر کبل کے اوپر آہستہ سے پھیلانی اور سبز رنگ کے بلب والا میپ روٹ کر کئے بجلی گئی۔۔۔۔۔ کمرے میں سکون ریز سبز روشنی پھیل گئی۔

دھیرے سے ہاتھ بٹھا کر منیر نے اس کی پیشانی کو چھوا۔۔۔۔۔ جسم سرد تھا۔۔۔۔۔ پلڑا کا شکریہ کہ بھاری نہیں ہوا ورنہ سیپنگ کا ڈر تھا۔۔۔۔۔ ہونٹ خشک ہوئے تھے۔ جبکہ کپانی دینا تو غلط ہے۔۔۔۔۔ ٹکا کھٹے تو آٹھا کر دوا پلانے کو بھی منع کر دیا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے بڑی ہی رہنے دو۔۔۔۔۔ چہرہ اور گردن کو سردی تو نہیں لگ رہی ہوگی۔۔۔۔۔ کہیں کمبخت ٹھنڈا ورنہ ہرجائے منیر نے اپنی گردن سے شمال آٹا کر بڑی احتیاط سے اس کا سر گردن اور شانے ڈھک بیٹھے۔ امارتی سے گرم چادر نکال کر اپنے گرد لپیٹی اور کرسی پر نیم دراز ہو کر اس کو دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ کون ہے یہ؟ کون ہے بے چارہ؟ کون ہے یہ فوجان۔۔۔۔۔ میرے راتھے میں کیسے آگیا۔۔۔۔۔

مٹی اچھ نیاز لے سکھ کھولی۔۔۔۔۔ زخمی باز آٹھا تا چاٹا اور چیخ ماری۔۔۔۔۔ منیر تو اسے بیدار ہونے دیکھ کر گلاس میں اس کے لئے دوا انڈیل رہی تھی۔۔۔۔۔ دوڑ کر آئی۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟

مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا۔۔۔۔۔ ہائے ہائے! وہ چھوٹے بچوں کی طرح چل رہا تھا۔۔۔۔۔ منیر گھبرا گئی۔۔۔۔۔ یہ تجربہ اس کے لئے نیا نہ تھا۔ اکثر ریاض شوروچا کر سارا دار ڈسریاٹھا بیٹھے تھے، تاہم اس سوال کا جواب دینا منیر کے بس کی بات نہ تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ غالباً رات ڈاکٹر نے جو کچھ اسے بتایا وہ بھول گیا تھا۔۔۔۔۔ تم کون ہو؟ اس نے منیر سے پوچھا۔

"نرس" منیر نے آہستہ سے کہا اور باتیں شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھنے کی کوشش سے باز رکھنا چاہا۔

"نرس" پھر اس نے منیر کو جانی پہچانی نظروں سے دیکھا اور لیٹ کر مصیبت سے پوچھا: میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا؟

"موٹر سے کھل گیا۔۔۔۔۔" منیر نے بھد شکل ہو کر زبان پھیر کر یہ الفاظ کہے۔ "گھبراہٹ نہیں آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

"ہائے موٹر سے کھل گیا! وہ دوبارہ شور مچانے پر آمادہ تھا۔ کیسے کھل گیا، اس کی موٹر سے کھل گیا؟"

"میری موٹر سے۔۔۔۔۔" منیر نے جبر مانہ انداز سے سر جھکا کر کہا۔ مجھے صاف کر لیجئے۔۔۔۔۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔"

اور ضبط کے باوجود پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جنہیں وہ چھپانہ سکی۔

"اسے آپ تو روتی ہیں۔۔۔۔۔ خدا کے لئے آنسو پونچھئے۔۔۔۔۔ آپ تو کہتی ہیں کہ میں اچھا ہو جاؤں گا۔" وہ ڈر کر

اپنا ڈکھ بھول گیا۔ منیر نے ایک ہاتھ سے اس کے سر کو سہارا دیا اور دوسرے ہاتھ سے دوا کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔۔۔۔۔

دوبائی کہ اس نے ہڈا منہ بنا لیا ہے ہانی لاؤں کئی کے لئے؟ الائی کھائی گے آپ؟  
”نہیں“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سگریٹ پیروں گا؟“

”سگریٹ؟“ منیرہ بول کھلائی۔ ..... ”زیادہ گرم ہے تو آکر ہی اجازت کے بغیر بیٹوں کو سگریٹ دینا ممنوع تھا۔“ ڈاکٹر صاحب کو اس نے ہیکے۔ ”ان سے پوچھ لوں؟“

”میری معاف تو آپ ہیں؟“ اس نے غصی سے کہا۔ ”ہیں آپ سے پوچھنا ہوں؟“  
منیرہ خاموشی سے اٹھی۔ ..... ”میز سے سگریٹ کیوں اٹھا کر کھولا اور ایک سگریٹ نکالی کہ اس کے لبوں میں کپڑا دی پھر لا کر کھولا اور سگریٹ روکشن کیا۔ ..... اب وہ سر جھکا کر کرسی پر بیٹھی تھی اور وہ سگریٹ پیٹتے ہوئے غور سے اس کا چہرہ نگاہ رہا تھا۔

ڈاکٹر حفیظ اپنے ساتھ اپنا کپڑا ڈنڈر اور ایک نرس بھی لاتے۔ ..... آتے ہی آخر میں منیرہ سے رات کی کیفیت پوچھی اور کہا کہ اب جب آپ پریشین کر دیں گام ہاؤس جاؤ۔ .....“

منیرہ نے اجازت چاہی کہ کیا وہ آپریشن کے دوران ہیں کرے میں ٹھہر سکتی ہے؟ ڈاکٹر نے اجازت دے دی۔  
کچھ دیر بعد آپریشن شروع ہوا۔ ..... ”کہا ڈنڈر نے اس سے بے ہوش کیا اور ڈاکٹر حفیظ نے جراحی کی۔ ..... دوسری نرس ان کا ہاتھ بنا رہی تھی اور منیرہ کئی گز کے فاصلے پر آکھیں بچھاڑے کھڑی تھی اور دل کھد رہا تھا۔ ”اللہ میری لاف رکھ لےجیو۔“  
جب آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر حفیظ منیرہ کے پاس سے چلتے اور نرس پٹیاں بانڈھنے لگی تو منیرہ نے ڈاکٹر حفیظ کے ہاتھوں سے ہونے نثر دیکھا۔ ”بچہ ہیں پوچھا؟“ ڈاکٹر صاحب یہ بڑی ہشیک ہو جائے گی؟

ڈاکٹر نے غصی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ میں ایک کامیاب تجربہ کار ڈاکٹر ہوں۔ ..... کیا تمہیں شک ہے؟“  
منیرہ جھینپ گئی۔ ”میں یوں ہی بدحواس ہوں ڈاکٹر صاحب؟“

ڈاکٹر حفیظ اس کا ہاتھ پکڑ کر کنور رانی کے کمرے کی طرف لے گئے۔ ”کنور رانی صاحبہ۔ ..... منیرہ کو منید کی ضرورت ہے۔ ..... اسے اپنے کمرے میں سونے دیجئے۔ .....“  
”بہناشتہ کر کے سو جائے اور جب تک میں شام کو واپس نہ آ جاؤں، اسے آپ مزاج کے پاس نہ جانے دیں؟“

پھر انہوں نے منیرہ کو بتایا کہ مریض کے ہوش میں آنے تک کپڑا ڈنڈر یہاں رہے گا اور پھر شام تک نرس بھی ٹھہرے گی۔  
کنور رانی کے حکم سے منیرہ نے بلا خواہش جہانے بی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ ..... ”نہیں کسی طرح نہ آئی تھی اور کنور رانی بڑا دے میں بیٹھی مغلانی کو اپنے غراؤں کا صحیح ناپ سمجھا رہی تھیں۔ ..... کرے سے نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ خشک کر سو گئی۔ .....“  
”کئی گھنٹے بعد کھانسی، کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ مگر کنور رانی خوان سہانے بھی نہیں، منیرہ کو کھانا پڑا پھر اس نے ایک ماما سے کہا میرے کمرے میں جو نرس ہے، اس کو بلا لاؤ۔“ نرس آئی تو چھوڑتے ہی منیرہ سے نیاز کی شکایت کرنے لگی۔

”بڑا جنگلی پلا ہے۔ اچھے نوکھانے کو دوڑتا ہے، جبکہ ہوش آیا ہے اور دم چار رہا ہے۔ ..... کہتا ہے رات والی نرس کہاں گئی؟“

”ہاں.....؟ منیرہ نے بناوٹی بے اعتنائی سے پھر پوچھا۔

”ہاں بھی اور کیا..... میرے ہاتھ سے تو دوا بھی نہیں پیتا۔“

اب منیرہ کا دل چاہا کہ دوڑ کر جائے اور اسے دوا فرما دے مگر ڈاکٹر کے آنے میں دیر تھی اس واپس چلی گئی اور منیرہ کھڑے پاس بکھڑے ہو کر ڈاکٹر کی راہ نگاہی۔

ڈاکٹر حفظہ بلاشبہ کامیاب تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ شام کو جب وہ منیرہ کے ساتھ نباز کے پاس پہنچے تو نیاز نے مسکرا کر دروہی کی کاکٹراف کیا۔

ڈاکٹر حفظہ نے کہا کہ پندرہ دن ہیں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اور منیرہ کو اجازت دی کہ وہ پندرہ دن تک زنگٹ کے بجائے گھر پر ڈیوٹی دے۔.....

نیاز نے پھر شور نہیں مچایا۔ رات کو اس کے پاس کسی نرس کی ضرورت نہیں تھی۔ کنوڑ صاحب کا ایک نوکر رات کو آگے کمرے میں سو جاتا اور منیرہ یہ ہدایت کر کے برابر کے کمرے میں سوتے چلی جاتی کہ یہ جاگیں تو مجھے بھی آگھا لینا..... وہ اللہ کا بے نوکر تو گھوٹے بیج کر سوتا تھا مگر منیرہ کو اکثر رات میں نیند نہ آتی اور وہ بار بار اس کے نیاز کو جھانک لیتی تھی۔ ایک رات اس نے دیکھا کہ وہ جاگ رہا ہے اور منہ لٹکھٹکھٹا کر جھانکیاں لے رہا ہے..... منیرہ ڈرائسنگ گون پہن کر آئی۔ ”کیسے کیا حال؟“ آپ کی عتابت ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”جاگ کیوں گئے؟“ کسی چیز کی ضرورت ہے؟

”پہلے آپ بتائیے..... آپ کیسے جاگیں؟“ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”میری بات چھوڑ دیجئے..... میں تو آپ کی نرس ہوں۔“ منیرہ گھبرائی۔

”اور میں کیا آپ ہی کا زخمی نہیں ہوں؟“ اس نے شرارت سے پوچھا۔۔۔۔۔ منیرہ سے وہاں ٹھہرنے نہ بنی.....

وہ چھینا ہی رہا ”سگریٹ چاہیئے..... ایک سگریٹ چاہیئے۔“ منیرہ وہاں سے بھاگ آئی۔ وہ سو نہ سکی اور صبح تک ہنگ پر بیٹھی بے سہمی سے انگلیاں چٹھانی رہی۔ نیاز کی آنکھوں میں کیا ہے..... باتوں میں کیسے ہے..... دل میں کیا ہے..... ۱۹۶۰

نیاز کا مبدعہ ہاتھ تو خیر بے کار ہی تھا، مگر وہ اپنا دوسرا ہاتھ دانستہ استعمال میں نہ لانا اور ہڑے اٹھانے سے منیرہ پر حکم چلانا نہ ہوتا۔ منیرہ! ذرا سگریٹ دینا۔“ اسے سگریٹ دینے کا ہو کا تھا..... منیرہ سگریٹ لاتی تو وہ ہاتھ بڑھانے کے بجائے منہ بچاڑ دیتا..... ہر دمنٹ بعد اس کی سگریٹ بچھ جاتی اور منیرہ کو لاسٹر لے کر دوڑنا پڑتا۔

دن میں دس منیرہ وہ اپنے بال سنوارنے کی فرمائش کرتا..... منیرہ ہر گھنٹے ہو کر اس کے بال سنواراتی۔ ”مانگ ٹیڑھی ہے۔“ وہ اعتراض کرتا..... منیرہ کو وہ بارہ مانگ بنانی پڑتی..... ”ارے! آج تیل تو ڈالا ہی نہیں۔“ آخر کار اسے یہ بھی یاد آ جاتا اور منیرہ سے بارہ اس کے بالوں میں الجھ جاتی۔ ”متہ دھلتا تو آنکھوں میں صابن گھس جاتا..... پانی پیتا تو آدھا گلاس اس کے گریبان میں آٹ جاتا..... وہ خوب اوندھی سیدھی حرکتیں کرتا اور رذرات کو شب بخیر سے پہلے کتا۔“

”میری باتوں سے آپ کو غصہ تو نہیں آتا؟“





اور اس شہزادے کی باتیں ہوشکار کو گویا تھا اور زخمی ہرن کی تلاش میں اس کنوین تک پہنچ گیا، جہاں ایک دیوہٹا باقیمت شاہزادی کو بند کر رکھا تھا۔ ..... شاہزادہ جان پھیل کر شاہزادی کو نکالتا ہے اور بڑی شان و شوکت سے دہلی لے جاتا ہے۔

مینبرہ کے ہونٹوں پر نئے نئے گیت بھی تھرکتے رہتے تھے۔ اسے ان پندرہ دنوں میں بال سوارنے کا سبق دیا میں رنگوں کا تا سب بھی آگیا تھا۔ ..... مگر ..... پندرہ دن گزر گئے۔ اور نیا زکمرہ لایا تھا۔ آج ڈاکٹر نے پٹی کھنڈ تو کل چلا جاؤں گا۔

”کہاں؟ مینبرہ نے اس کے بال کھجورے چھوڑ دیئے اور سر ہانے سے گھوم کر سنے لگی۔ کہاں چلے جاؤ گے؟“  
”ہوٹل میں ..... جہاں سے میرا سامان اپنے لنگر لایا تھا۔“  
”ہوٹل جانا چاہتے ہو؟ یہاں تکلیف ہے کوئی؟“  
”تکلیف؟ ان پندرہ دن کی راحت البتہ تکلیف دہ یا دین جائے گی۔“  
”تو پھر جانے کا خیال کیوں آیا؟“ مینبرہ نے ہنسلی سے پوچھا۔  
”ارے بھئی ڈاکٹر نے پٹی کھول دی تو پھر جانا ہی پڑے گا۔“

مینبرہ خفا ہو گئی۔ جناب بہ مہکاری شفا خانہ نہیں۔ مجھ غریب کا گھر ہے۔ ..... اور جب تک آپ گھر جانے کے قابل نہ ہو جائیں آپ یہاں سے نہیں مل سکتے۔ ..... ہاں جب آپ یہی اتنی طاقت آجائے کہ آپ گھر جاسکے تو چلے جائیے گا۔ ..... گھر جانے سے آپ کو یہ نہیں روک سکوں گی۔ .....“  
گھر ..... میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ ..... اگر سے میں میرے باپ کا گھر ضرور ہے۔ ..... وہ لوگ اولیٰ باتوں سے ناخوش تھے، اب میری دیوانگی سے اور نالوں ہر جا میں گئے۔ .....“  
”دیوانگی؟“ مینبرہ نے تعجب سے وہرایا۔ دیوانگی؟

”ہاں مینبرہ۔ ..... میں نے آج تک کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔ ..... اور میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ ..... یہ سے جا کر میرے ہال ہمیشہ ہی اُسجھ رہا کریں گے۔ ..... میں سگریٹ پینا چھوڑ دوں گا۔ ..... اور میں بالکل دیوانہ ہو جاؤں گا اور اس نے شاید مستقبل کی دیوانگی ثابت کرنے کے لئے سگریٹ کو خاکنہ دان میں مسل دیا اور سر کو جھٹک کر بال ماتھے پر بچھو۔ ..... مینبرہ کی آنکھوں میں حیرت اسرت اور دور کی ملی جلی کیفیات تھیں۔ ..... وہ نیا زکمرہ دیکھتی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر کے ماتھے پر بکھرے ہرے ہال سمیٹ ڈالے۔ ..... وہ عندی چوں کی طرح پلنگ پر پھیل گیا اور اڑیاں رگڑنے لگا۔ میں بہ سے نہیں جانا چاہتا۔ ..... میں پٹی نہیں کھلاؤں گا۔ ..... تم نے مجھے اپنے پاس سے علیحدہ کیا تو میں دوبارہ تمہاری مڑ سامنے آکر جان ڈے دوں گا۔ .....“

ڈاکٹر حنیف نے آکر بیٹیاں کھولیں۔ ..... ہڈی جڑ چکی تھی۔ گرامی زخم بھرنے باقی تھے۔ ..... ڈاکٹر نے کہا، علاج جاری رہے گا۔ اور کنور صاحب نے نیا دستہ خواہش کی کہ جب تک ڈاکٹر صاحب یہ نہ کہہ دیں کہ وہ بدستور سانی

ہے، وہ یہاں سے نہ جلتے۔

جب شام کو منیر نے پلنگ کے پاس بیٹھ کر اس کا کھانا کھا تو اس نے یہ کہہ کر کھانے سے خود ری کی کہ اُسے ہانڈ سے نہیں کھایا جاتا، حالانکہ جب سے اُسے کھانے کی اجازت ملی تھی، وہ برابر اُسے ہانڈ سے کھانے کی مشق کرتا رہا تھا۔

”مجوری ہے“ منیر نے سرد آہ بھری۔ پھر تو آپ کو بھوکا رہنا پڑیگا۔“

”ہو ہمد“ وہ مڑ آیا۔ آپ جب میری چارہ گر ہیں تو۔۔۔“

”جی اب نہیں! پیٹ کھل گئی آپ کی۔۔۔“

”اچھا یہ بات ہے“ اس نے جھکی سے منہ پھلایا۔ اب تو آپ ذرا پھر اپنی موٹر سے کو نکلتے۔۔۔۔۔ سہرہ وستان

سلامت۔۔۔۔“

”نا بابا! منیر نے کان پکڑنے ہوئے کہا۔“ میں باز آئی موٹر چلانے سے۔۔۔ سب مجھے الزام دھرتے ہیں اور میں

آج تک نہیں سمجھ پائی کہ یہ ہوا کیسے۔۔۔۔۔ آخر آپ تھے کہاں۔۔۔۔۔ سامنے تو ہرگز نہیں تھے؟

”نیاز ہنسنے لگا۔۔۔۔۔ ایمان کی بوجھ تو خطا میری تھی۔۔۔۔۔ اٹھا را واقعی اس میں تصور نہیں۔۔۔۔۔ میں نے خدا جی

کیوں دفعہ“ سڑک پار کرنا چاہا۔ مجھے یاد پڑنا ہے کہ میں نے موٹر کی آواز سننی اور سڑک پر روشنی پڑتی دیکھی۔۔۔۔۔ جس لمپ پوسٹ

کے اس طرف کھڑا غالباً سگریٹ سدا گانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔ بس ایک سانچہ میں نے سوچا کہ موٹر گدہ دہنے سے قبل

سڑک کے دوسری طرف پہنچ جاؤں۔۔۔۔۔“

”یہ آپ کو سوچھی کیا؟“ منیر نے جبر سے کہا۔

”بس حماقت کہو۔۔۔۔۔ ہوش میں تو تھا نہیں۔۔۔۔۔ اس تھپی لی تھی کہ موٹر پہنچنا دو بھر ہوتا تھا۔“

”جی؟“ منیر نے سمجھ کر کہا: آپ نے۔۔۔۔۔ آپ نے۔۔۔۔۔ شواب۔۔۔۔۔ پی لی تھی!“

”ہاں“ نیاز نے دیکھا کہ منیر گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔۔۔۔۔ پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ پھر کرسی

پر بٹھ گئی اور اپنا سر پکڑ لیا۔

”منیر! منیر! نیاز کا چہرہ سفید ہو گیا۔ نہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ نہیں“ منیر نے ماپسی سے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی نگاہوں میں کرب تھا۔

”نہیں نہیں“ میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو گئی ہو۔۔۔۔۔ تمہیں مجھ سے نفرت ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ نہیں نہیں منیر

خدا کے لئے۔۔۔۔۔ مجھ سے نفرت نہ کرو! مجھ سے خفا نہ ہو جانا۔۔۔۔۔ میں تمہاری جنگی برداشت نہیں کر سکوں گا۔۔۔۔۔

میں جان دے دوں گا۔“ اس نے کانپتا ہوا سیدھا بازو اٹھایا اور منیر کا ہانڈ پکڑ لیا۔

اس کمزور اور زخمی ہانڈ میں انگاروں کی نیش تھی، منیر پھر گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ نیاز نے عاجزی سے

کہا: ”میرے خون آلودہ جسم سے تمہیں گھن نہیں آئی۔ مگر میری داغدار فطرت نے تمہیں متغیر کر دیا۔۔۔۔۔ میں کچھ کہتا ہوں

منیر! میرے ہر حرف کا علاج تمہارے پاس ہے۔۔۔۔۔ تم جا ہو گئی تو میں بہت اچھا انسان بن جاؤں گا۔۔۔۔۔ تم ہی کو

جسے کسی کی محبت نصیب نہ ہو، وہ اپنے ہوش میں رہے تو کیا کرے۔  
منیرہ بیچھ گئی اور رکابی میں کھانا اتارنے لگی..... نیاز چھوٹے بچوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر اس کے  
سے کھانا کھا رہا تھا!

منیرہ کو نیاز کے ساتھ جو خلوص تھا، وہ تیمارداری سے کچھ سوا ہی تھا۔ یہ بات زیادہ دن تک گھر والوں  
نہ چھپ سکی..... دفعۃً کنوڑ صاحب نے نیاز سے اس کے گھر اور گھر والوں کا پتہ پوچھنا شروع کر دیا اور کنوڑ  
سے کچھ ایسی بات چیت ہونے لگی۔ ”خاندان اچھا ہے..... اکلوتا بیٹا ہے۔ شہری جائیداد ہے..... پڑھا لکھا ہے  
صورت اچھی ہے، عمر زیادہ نہیں، نوکر ہر جائے گا۔“

ایسی بہت سی باتیں برآمدے کی چٹ، کمرے کے پردوں اور کورڈوں کی درازوں کے علاوہ وسیع کی زبانی ہم  
منیرہ کو معلوم ہوتی رہیں اور وہ راتوں کی تاریکی میں اجالوں کے خواب دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ اپنے زخمی ہاتھ سے نیاز چاہتا  
منیرہ کی گردن توڑ دیتا۔ مگر ابھی تک نہ اس سے لاسر جلا کر سگریٹ سٹگائی جاتی اور نہ اپنے بال سنورتے..... منیرہ کو  
سارے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینے پڑتے تھے۔

ایک روز جب وہ نیاز کے لئے چائے بنا رہی تھی تو اس نے کہا: ”کل سے اپنا کام سمجھ لگا۔ مجھے زندگی  
جانا ہے۔“

”خیریت“ وہ چونکا۔

”جناب مجھے ہمینہ بھر کے بعد زندگی کا امتحان دینا ہے..... خیراب تو میں کیا خاک پاس ہوں گی۔۔۔  
ایک ہمینہ جھک مارا ہے۔“

”اچھا جی! جھک مارا ہے آپ نے..... اور مجھے جو مار ڈالا تو..... اس کا کچھ بھی تذکرہ نہیں۔۔۔“

منیرہ گجرائی: ”ارے بھئی بخشو..... میں امتحان کی کمرہ ہی تھی.....“  
”گو لی مارو امتحان کو.....“ وہ گلگتا ہا۔

”ابھی شش کے امتحان اور بھی ہیں۔“

منیرہ اٹھ کر چل دی۔

”سنو منیرہ..... کیا سچ کل سے زندگی ہر دم چلی جاؤ گی۔“

”اور کیا..... جانا ہی پڑے گا..... ڈاکٹر حفیظ کا قلعی حکم ہے، وہاں زندگی ہر دم میں ایک چھ  
سی لڑکی ”رقیبہ“ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ میرے لئے بہت رونی ہے..... کھانا پینا چھوڑ  
ہے۔“

”اور میں بے چارہ چھوٹا سا لڑکا جو یہاں روٹی کا تو.....“ وہ اٹھلایا۔ ”میں بھی تو کھانا پینا چھوڑ دوں گا۔“

”چھوٹ مات! منیرہ جھینپی۔“

” اسے لڑکی میں بھوٹ نہیں بولتا۔۔۔۔۔ تمھاری بے اقتدار طبیعت کی قسم — تمھارے زسنگ ہوم کے مریضوں کو اور زسنگ ٹیگٹ لیں گی مگر میری دوا تمھارے اور صرف تمھارے ہاتھ ہے۔“

ایک دن نیاز نے منیرہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں آگے جا کر اپنے والدین کو گھیر لانا ہوں۔۔۔۔۔ وہ میری وابستگی کے بعد ہمیشہ مجھ سے ناخوش رہے مگر اب میں اچھا لڑکا بن کر دکھاؤں گا۔ شرط یہی ہے کہ وہ تمھارے حصول میں میری مدد کرے۔۔۔۔۔

کنور صاحب اور کنور رانی بھی اسی قسم کا اقدام چاہتے تھے جو نیاز کے والدین کی طرف سے ہو۔

بند کرے میں پڑے پڑے نیاز کو بہت دن ہو گئے تھے، ڈاکٹر کی ہدایت پر منیرہ آسے لے کر موٹر میں سیر کرنے

چلی۔۔۔۔۔

”جیسی بات نیاز نے یہ کہی کہ اب آپ کو قطعی حق نہیں ہے کہ میرے علاوہ کسی کو مشق ستم کے لئے بخیر یز کریں۔ اگر دل چاہے تو مجھے حکم دیجئے گا میں لیٹ جاؤں گا لڑک پر۔۔۔۔۔“

”بکو اس بند کرو“ منیرہ نے گاڑی اسٹارٹ کی۔۔۔۔۔ ”عجائب خانہ دیکھو گے“

”اگ نیا سلسلہ بنا ہے تو اسے دو نہیں ہیں۔“ اس کی آواز بالکل بے مٹری تھی۔

”خدا کے واسطے نیاز لڑک والے کیا کہیں گے“

”تیرا دلوانہ رہوں۔ سب سے بڑگان رہوں“ اسے عجیب و غریب گانے یاد تھے۔

دونوں نے عجائب خانے کے ایک ایک گھیر اور ایک ایک بخیرے کو دیکھا۔۔۔۔۔ بندروں کو چنے کھاتے۔۔۔۔۔ مچھلیوں کو مرے ڈالے۔۔۔۔۔ تشریح پر کنکر پھینکے۔ اور لکڑیاں ڈال کر بھاؤں کو متایا۔۔۔۔۔ منیرہ نے اپنی عمر میں پہلی بار شرارتیں کیں اور اپنی حرکتوں کا اطف آٹھایا۔ اور جی بھر کے ہنسی۔۔۔۔۔

واپسی میں جب وہ بہن آباؤ سے گزرے تو ایک موٹر پر ریف سے مقابلہ ہوا۔۔۔۔۔ وہ موٹر سائیکل پر اڑ رہا تھا۔۔۔۔۔ منیرہ کو اس نے ہاتھ آٹھا کر سلام کیا اور تعجب سے نیاز کو دیکھا۔ موٹر آگے نکل گئی تو نیاز نے پوچھا ”منیرہ تم اس لڑکے کو جانتی ہو؟“

”ہاں جی تو آیا گا دلور ریف ہے۔“

”اوہو! اس سے تو میں بھی مل چکا ہوں۔“

”کہاں۔۔۔۔۔؟“ منیرہ نے پوچھا۔

”کیٹھیں۔“ اسی رات کا قصہ ہے جب تم نے میرا مزاج درست کیا تھا۔۔۔۔۔ کیٹھیں میں یہ بھی تھا۔۔۔۔۔

ہم سب نے مل کر غلیش کھیلنا اور۔۔۔۔۔ اس نے بھی بہت شراب پی تھی۔۔۔۔۔ بلکہ اسی کم بخت کی وجہ سے بن بہت پی گیا۔۔۔۔۔

منیرہ کا چہرہ بے رونق ہونے لگا۔۔۔۔۔ نیاز نے محسوس کر لیا۔

”منیرہ..... منیرہ خدا را اب اسے بھول جاؤ..... تمہارے پاس آکر تو مجھے ایک دن بھی شراب کا  
وصیان نہیں آیا..... مجھ سے اس زمانے کا حساب نہ لوجب تم میری زندگی میں نہ تھیں..... ادراہ..... میں اپنی پہلی اور  
آخری محبت کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تم اسے حرام کہہ دو گی تو یہ مجھ پر حرام ہو جائے گی..... منیرہ!!“

منیرہ نے اس کی طرف دیکھا اور سسکرائی.....  
اسی دن شام کو جب نیاز تنگ کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تھا اور منیرہ ڈرائنگ روم میں ایک کرسی پر سکوڑی  
ہوئی بیٹھی تھی، تاکہ وسیمہ کو ماں باپ سے یہ کہتے ہوئے سن لے کہ نیاز اپنے گھر والوں کو بلانے کے لئے کل اگرے جانا چاہتا  
ہے..... تو باہر رفیع کی موٹر سائیکل بھٹ بھٹائی..... وہ مہینوں بعد یہاں آیا تھا.....  
ادھر ادھر کی باتیں کہ کے اس نے منیرہ سے پوچھا: آج دوپہر جو حضرت تمہارے ساتھ موٹر میں تھے کیا یہی ہیں  
جنہیں سنا ہے تمہاری موٹر سے چوٹ لگی تھی؟

”ہاں یہی ہیں“ وسیمہ نے بتایا۔

”کیا خیالی ہے تمہارا؟ کنوڑ صاحب نے برسپیل تذکرہ پوچھا۔

رفیع مسکرایا۔ میں ان سے اتنا واقف نہیں کہ ان کی بابت کوئی رائے قائم کر لوں..... میں نے اس سے قبل  
ایک ہی مرتبہ ان کو دیکھا۔ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ بغیر غلے سے خارج تھے؟  
”کیوں؟ کیوں؟“ کنوڑ صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ”کیا مطلب؟“

”واقعہ یوں ہے“ رفیع مزے لے کر سنانے لگا۔ ”میں ایک دوست کے ساتھ کیفے میں چائے پیئے گیا تھا.....  
وہاں کئی لفٹوں کے ساتھ ایک میز پر یہ صاحب بھی جڑا کھیل رہے تھے..... اور انہوں نے اس قدر شراب پی لی تھی  
کہ گانا گانے لگے۔ گالیاں بکتے تھے اور بے رشتہ پر آمادہ تھے۔“

ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا!

گھبرائی آواز میں کچھ دیر بعد وسیمہ نے کہا: ”سچ کہتے ہو رفیع؟“

”ارے بھابی مجھے جھوٹ بولی کہ کیا نفع ہوگا؟“

پھر طوبی خاموشی!

لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالتی منیرہ اٹھی اور دروازے کی طرف چلی۔ کہاں جا رہی ہو منیرہ؟ کنوڑ رانی نے ٹھکانہ لے لیا  
میں کہا: ”بیٹھ جاؤ۔“

منیرہ واپس آکر دھم سے بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد کنوڑ صاحب آٹھے اور کھٹکار کے بولے: ”وسیمہ نیاز سے کہہ دو کہ وہ کل اپنے گھر چلا جائے۔ یا پہلا

بھی جائے..... مگر اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے..... یہی ہمارا جواب ہے۔“

کنوڑ رانی نے پھر منیرہ کو نیاز کے کمرے کی طرف نہیں جانے دیا۔ نیاز رات بھر اس کا منتظر رہا اور وہ رات بھر

وسیر کے گلے سے لپٹی ہوئی ٹبک ٹبک کر کھتی رہی۔ آپا بند لکے واسطے میری مدد کرو۔۔۔ ابا اور اچی سے کہہ دو کہ میری قسمت پر بھروسہ کریں۔۔۔ میں اُسے سنبھالی لوں گی۔۔۔۔۔ اس کا دل برا نہیں ہے۔۔۔ میں جانی ہوں وہ مجھے دھوکہ نہیں دینگا۔۔۔ ابا اور اچی سے کہہ دو کہ مجھے میری تقدیر کے حوالے کر دیں۔۔۔۔۔“

صبح ہو گئی۔۔۔۔۔ پڑا نا سورت ٹٹی تھا۔ تہ کے ساتھ نکلا اور شاخ سے ٹوٹے ہوئے چھوٹی مڑھ جائے۔۔۔۔۔  
وسیر نے کنوڑ رانی سے کچھ کہنا چاہا تو وہ تیسرے کی طرح بھڑک اٹھی۔ وسیر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر۔۔۔۔۔ تو بھی ماشاء اللہ بیٹی والی ہے۔۔۔۔۔ آنکھوں دیکھتے کھی کون نکلتا ہے۔۔۔۔۔ کیا میں نے میں بائیس ساٹھ تک اسی لئے منیرہ کو پالنا تھا کہ اپنے ہاتھوں بھاڑ میں جھونک دوں۔۔۔۔۔ کیا میرے نصیب میں ہیں تھا کہ اکلوتا بیٹا تو فرنگ کرے اور بیٹی جان بوجھ کر جاری شرفائی کے پتے بندھ جائے۔“

وسیر باپ کے پاس گئی تو انھوں نے جواب دیا: بیٹیا تم خود ابھی جذباتی لڑکی ہو۔۔۔۔۔ اس معاملے کو پہلے سے زاویہ نظر سے دیکھو! بول بھڑو کہ نسب تمھارا کس پتھر آگ کے پگھتے ہوئے شعلے کو پکڑنا چاہتا ہے تو اس وقت تم اس کے دل کا لفظ کتنی جو یا اپنے دماغ پر چلتی ہو۔۔۔۔۔ منیرہ سے کھوفیل سے کام لے۔۔۔۔۔

نیا زحار ہے۔۔۔۔۔ نیا چلا گیا۔۔۔۔۔ اس نے پروے کے پاس منیرہ کا لہزنا جسم دیکھا۔۔۔۔۔ وہ دُکا نہیں۔۔۔۔۔ وہ کچھ کہہ بھی نہ سکا۔۔۔۔۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا مگر روح کھلی ہوئی تھی اور اس کا کوئی چارہ گرد نہ تھا۔۔۔۔۔ کوئی درد مند نہ تھا۔

جب ڈاکٹر حفیظ آئے تو ابھی تک منیرہ اپنے اس پینگ پر بے حس و حرکت پڑی تھی جس پر ایک رات اس نے بے ہوش نیا زکولہ ڈالا تھا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور زمین پر ہوتی آواز میں کہا: میں نے سنی لیسنے منیرہ۔۔۔۔۔ وہ چلا گیا ہے۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ زبادت ہوئی ہے۔۔۔۔۔ تمھارے ہاتھ بھی۔۔۔۔۔ ہم اس فیصلے کو تسلیم نہیں کریں گے۔۔۔۔۔ میں اُسے ڈھونڈ لادوں گا۔۔۔۔۔“

نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ آپ اُسے کبھی بھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔۔۔۔۔ آپ کی کوئی پکار اس کے کانوں میں نہیں جا سکے گی۔“

ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش کھڑے ہوئے منیرہ کو نگتے رہے پھر انھیں ایک لم کچھ یاد آگیا: ”منیرہ بیٹی تمھیں تو وہ بیکار ضرور سنائی دے گی جو تمھارے لئے ہے۔۔۔۔۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری زندگی تمھاری اپنی نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ تمھارا کام اپنے غم میں آنسو بہانا نہیں ہے اور دل کے دکھ دھونا ہے۔۔۔۔۔ زرننگ ہوم میں تمھاری ضرورت ہے، وہ اپنی بیٹی رقیہ جسے تم دو سال سے پالی رہی تھیں، تمھارے بغیر دور دور کر اپنا خون کرتی ہے۔ وہ پریٹ بھر کر روٹی نہیں کھاتی۔ دو ماہ میں اس کا وزن بہت زیادہ گھٹ گیا ہے۔۔۔۔۔ تمھیں اس پر رحم نہیں آتا۔“

ڈاکٹر حفیظ منیرہ کو اپنے ساتھ زرننگ ہوم لے آئے۔ اُسے بازو کا سہارا دیتے ہوئے وہ لمبے برآمدوں میں سے گزرتے چاروں طرف منیرہ کی جانی پہچانی زرننگ ہوم میں دیکھ کر منیرہ کو آتے دیکھ کر ہمیشہ مسکراتی تھیں۔۔۔۔۔ آج ان کے چہرے اس طرح

خاموش اور اداس تھے کہ جس طرح انہوں نے ابھی نزع کے عالم میں فسی مریض کو دیکھا ہو.....  
 وہ بغیر کہیں نہ کے طویل وارڈز میں مریضوں کے دو دو بیستر کی قطاروں کے بیچ میں سے گزرتے رہے اور ڈسپنری آؤ  
 فیئر اور مردہ گھر سب پیچھے رہ گئے..... یہ نرسنگ ہوم کا آخری حصہ ہے "نرسری" ڈاکٹر صاحب نے یہاں سے اس کا شانہ چمکا:  
 آفس جا رہا ہوں منیرہ..... نہ اپنا فرض بخوبی پہچانتی ہو۔"  
 ڈاکٹر جنٹل چلے گئے۔۔۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ نرسری میں داخل ہوئی..... کچھ بچے کھیل رہے تھے..... کچھ دوڑ۔  
 تھے..... رقیہ اپنے پانگ پر خاموش بیٹھی تھی..... منیرہ کو دیکھ کر اس نے خوشی سے تیغ ماری اور ہاتھ پھیلا دیئے.....  
 بے تابانہ اس کی طرف دوڑی اور اس کے ننھے بازوؤں میں منہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔  
 بالآخر ننھی رقیہ نے ایک ننھی سی بات پوچھی۔ "آپا۔ آپ اتنے دن کہاں رہیں؟"



ابو الفضل بن عیسیٰ

اور مزدور مزدور بھی اور سب کچھ بھول بھلا کر گزرتا دیکھتا کہ وہ کس سے چوڑا ہے۔ "دلی واسے" جنہوں نے محمد قزاقی کو بیچ میدان بھگایا، اچھے چند کر نیست دنا بدو کیا۔ آلبا اول ملکوں سے بیر پائے پھر دویل گھنڈی چوڑا، اسیافزجی رماٹا رحمت خاں کے سیدھے باندہ اجن کے بل پر روہیلے فرنگی اور شاہ اور دھ "ایک" ٹوانٹے دلی پر پڑھ دوڑے۔

اور اس سنی منائی کو محفوظ کیے تھا کہ گزرتا دیکھتا کہ اب تو بیس سال سے اسی "دھل" میں تیرے میرے کھیتوں کے اندر دفنانے روز کی مزدوری کو لے رہے تھے۔ جہاں اب سے چالیس سال پیشتر ان کے باپ دادا کی دھاک میٹھی ہوئی تھی۔ اور ان کے بہادر پرکھے پر ب

کر منہ کر دیتے تو پروانی دم سادہ جاتی اور بچیم کو نگاہ اٹھا دیتے تو چڑھی آندھیاں کٹ کر نکل جاتیں۔ اور ان کے زمانہ کی آنکھیں مہینے جیسے دو چار بڑے اب بھی دیہات میں باقی تھے جو گوردھن سنگھ کو کھیت کیست دودا آنہ کی مزدوری کرتے دیکھ کر اس کے مامی کے حالات بتاتے اور اپنی اولاد کو عبرت دلاتے۔

باپ کی زمینداری، سیر و کاشت، اثاثہ البیست، دولت سب کچھ باپ کی زندگی ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ ایک بہن تھی۔ جس کو وہ اچھے گھر بیاہ گئے تھے۔

اور انہوں نے اپنی شھراکت کے بھاری بھرے گوردھن سنگھ کو بھی اچھے گھر بیاہا تھا۔ اور گوردھن سنگھ کے سسرال داؤں نے بہتیز چا کر وہ گھر بھائی بن کر رہیں۔ مگر انہیں پرانی مثل با دمی کہ ساس گھر بھائی سوکتا اور قہر جھڑکی ہڑا اور بیلہ کی کیا بیاہ کے بعد گونے دوسے کی جھوت ہی نہ آ پائی اور بعد ایسے گھر میں کوئی کھاتے پیتے گھرانے کی راجپوتی کیسے گڑ کر سکتی تھی، کمریوں جلی، اور اصرار بھی کرتے تو گوردھن سنگھ کس برتے پر۔ ان کے پاس کیا تھا۔ ایک کھرپی، اور وہ بیج تڑکے دھوئی کے بیج میں کھرپی لگا کر لٹختے۔ خیر کھرپی اور زمین کا بھی اذلی رشتہ چلا آتا ہے۔ مگر راجپوت اور زمین کا بھی اذلی رشتہ ہے اور جب ساری دھرتی پر کہیں کوئی سر بھڑ بن کے مائے نہ تھے تو گوردھن سنگھ کا ہے کے راجپوت تھے۔ آپ اپنے منہ میاں مشہور بنا کر بن کر دنیا انہیں راجپوت کیسے تسلیم کر سیتی۔ جتنے کہ سگی جود دیکھنے نے تسلیم نہ کیا۔

اور گوردھن سنگھ جہاں گڑھ میں نہ گئے۔ تو دودو چار چار کوس چاروں طرف دیہات میں کسی ذیل کار مزدوری کاشت کار کے کھیت پر مزدوری کرتے اور مزدور چاروں اور دودھوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں کام پر جتے دکھائی دیتے۔ مگر یہاں بھی اپنی شھراکت کو اٹھ سے نہ جانے دیتے۔ چاروں اور دودھوں سے ڈیوڑھا کام کر کے دکھاتے۔ اور ناک کو ان کو توکنے کی بجائے لائی توامی اور قرینٹ کرنی پڑتی، وہ باہر پلم پلاتا جاتا۔ یہاں پر انہیں امان داری کا خیال کم رہتا بلکہ وہ اپنی شھراکت کی حاج کو دوتے کہ کہیں ان کے بیٹے بیچے مائے نہ کہے کہ چوڑھا کر ہیں۔ بے چارہ کا وقت بگڑ گیا ہے جو کچھ کر ہی کر ہی۔ اور خیال ان کے مانا ہیں یہ کیا کہ میرے ساتھی مزدور سب چھار دوسرے نیچے قوم کے ہیں اور اگر یہ مجھ سے زیادہ یا میرے بھائی بھی کام کر دکھائیں تو میری شھراکت کا ہے کی سوتی۔ اور شام کو دودا آنہ پا کر گوردھن سنگھ کتنے معلق کس قدر خوش نظر آتے؟ شاہد ان کے دادا بیج قرینٹ اپنی پردی تمیل لگان کر کے اتنے خوش نظر نہ آتے ہوں گے۔ اور ان کی بہن جنگا اپنے شہر سے فصل کے فصل ہزاروں روپیہ کی پرٹ ہاتھ میں لے کر انہی معلق نہ ہوتی ہوگی۔

اور جنگا کا شوہر ایک متوسط خوشحال زمیندار تھا۔ جس سے وہاں بھی کچھ تھا، اور سارے کی حالت سے کچھ بچہ واقف بھی تھا۔ اور اس کی کچھ خاندانی روایات تو آج تک زبان زوخاص عام تھیں۔ ہمیشہ شکایت کیا کرتا کہ وہاں ریشے کھائی، سنے کسی جہاد اٹھ نہ بٹا یا، اگر فصل کی بیماری کے ہی وقت آکر سیر کے کھیتوں پر پندرہ دن کھر سے بر جایا کریں تو سال بھر میں مزدور لوگوں کی جوری سے ہم کو اتنا کچھ دلا کرے کہ دو تین برس میں نہ کھا جائیں۔ اور جنگا کو کبھی کبھی بھائی کی حالت اور کچھ روایات کا اندازہ کر کے اپنا جیش اور دولت بے کیست معلوم ہوتی شوہر کے باہر اصرار پر ایک مرتبہ جنگا نے گوردھن سنگھ سے اپنے یہاں حلق عود پر چڑھے آنے کی ترغیب بھی کی۔ خیر بھائی کی بات تو ہمیشہ گوردھن سنگھ نے ہنس کر نالی مگر جنگا کی ترغیب پر بڑی لالچیل آنکھیں دکھائیں۔ ہوں نادان کو مٹا دیا، اپنے باپ دادا کی ناک اپنے ہاتھ سے کاٹی ہے

شرم نہیں آتی تھو کو۔ بہن گھر بھائی سوکتا۔ پر سنے پدکے کہہ رہے ہیں، تو کیا تیرا بھائی کتا جو بچے مجھے تو دوسرا بنا اچھا ہے۔ بہن کے در پہ جا کے دھننے سے؟

گر جب کسی حکمت کی بات سنیں طعنہ درہنیں کہ بڑی غلطی ہوئی ہو۔۔۔ بھتیائے شمع کی مزدوری کرتے پھرتے ہیں۔ تو جتنا اڑ کر جواب دیتی، مزدوری ہی تو کرتے ہیں بھیک تو نہیں مانگتے، ڈیکیتی تو نہیں مارتے اور تہاڑے دروازہ پر کس دن مزدوری کسے آئے ہیں۔ اور یہ کہ کہ جتنا اپنے آپ کو فتح منہ محسوس کرتی جیسے اس کے بھائی کی حیثیت اس کے شہر سے ذرا بھی کم نہیں ہے۔

(۲)

اور اپنے بھوڑے کے دروازہ پر ادھر کی گڑبوں کی مٹی چڑھا کر منہ اندھیرے کا نکلا گورہن سنگھ سرنام پٹنا اور اپنی دونوں آنت کی روٹی خود پکاتا، اور صبح کو دات کی رکھی ہوئی ہاندھ کر ساتھ لے جاتا۔ اور سب مزدوروں کی روٹی ان کی عزتیں دہر کر پکا کر لاتیں اور اپنی دات کی پٹی برائی روٹی کی پٹی کھول کر دہر کے وقفہ میں گورہن سنگھ کھاتا۔ دہر سے پہلے کام والا بجنے برسے بچنے کا چہینا تقسیم کرتا جو وہ آئے دہر کے علاوہ مزدوری ہی کا جزو بنتا۔ گڑبوں میں رات کا پکا جڑا کھانا دہر تک خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے جڑوں جڑوں تو گورہن سنگھ باسی کھانا کھا لیتے اور گڑبوں کے موسم میں اسی پھینے پر انگٹا کر کے دن کاٹ دیتے۔ تمام دن گورہن سنگھ کا بھوڑا سرنام پٹنا رہتا۔ شام کو کبھی کبھی جی جی جولا ہے، رات کی بجلی، جلدی مراد، بے رام گڑیہ آیشٹے الاؤ کے گرد آدمی رات تک گپ ہوتی۔ چلوں کا دور چلتا اور ہنسی تہائی پن اور انداس کے اعتبار سے گورہن سنگھ کا بھوڑا سبستی پھریں اپنی قومیت کا ایک تھا۔ گڑسال میں ایک دن ایسا بھی آتا۔ جس روز ان کا تاریک دیران جو پڑا چمک کر چھپا اٹھا اور منسوب نازک کے بھر کی جل زبک گو کھتی سانی دیتی جب بھتی دیوچ پر جگا پکا کھانے اور مٹھائی سے منہ بھرنے سال کے سال آتی۔ اور بھتی دیوچ کا محبت اور خصوص سے پڑنوار میں روز بہن بھائی کے نکال ٹھانی ہے۔ منہ مٹھائی سے بھرتی ہے اور پھر اپنے بھائی کے اوپر سال بھر میں آنے والی سب جلدیں ساری مہینوں میں ہاریاں اپنے لیے مانگتی ہے۔ اور پھر اپنی فرد تنہا دستی اپنے بھائی کو مل جانے کی دعا مانگتی ہے اور یہ ساری دعائیں شیریں گیت کی آوازوں میں مانگی جاتی ہیں، بھائی بہن کو اپنی حیثیت کے مطابق دان دیتا ہے۔ مٹھائی کے برسے میں مٹھائی یا اس کی قیمت دیتا ہے۔ کپڑے دیتا ہے اور آنے جانے کا کاپڑ دیتا ہے اور دو تین روزہ مقبرہ کر دھوت کرتا ہے۔

بھتی دیوچ کے دن بالعموم جولاں گھر چھوڑ چھوڑ کر شیکے چلی جاتی ہیں اور گھر گھر دیوچوں کے بھائے بہنوں کا انعام ہوتا ہے اور برہنہ کی آج کے دن بھری نہیں ہوتی مرث بہن ہوتی ہے۔

جنگا کا گاؤں، مشہور گڑبان گڑھ سے چامیں میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور دیوچے آیشٹن سے کوس بھر کے فاصلہ پر آباد تھا۔ بھتی دیوچ کے دن صبح ترے کی گاڑی سے جنگا روانہ ہوتی، مشہور گڑھ سے آیشٹن تک دھن میں کوس بھر کا فاصلہ طے کرتی۔ اور پھر سیکٹر کس کا کٹ لیتیں۔ ایک مشہور لاندہ اور ایک مشہور بھری اور ایک کہا۔ تین آدمی ساتھ ہونے، دیوچے آیشٹن سے چران گڑھ میں کوس تھا۔ لاندہ تو حسب معمول دیہات کے مطابق اسی ترین سے شہر چلا جاتا اور جنگا بھری اور کہا۔ کو آیشٹن پر ہی چھوڑتی اور ایک گھنٹا سی سوتی ساڑھی ہاندھتی اور چیل چران گڑھ روانہ ہو جاتی اور تین کوس کا فاصلہ پیدل اس لیے طے کرتی کہ سفر میں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم ہندا ہندا سا بھتا ماسٹہ میں چران گڑھ کے لوگ آتے جاتے اور اور گڑھ کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ جنہیں وہ دفعہ میں بہن اور بیٹی دلسے انداز

میں سلام کرنی چلتی۔

جنگا جھوٹی سی مٹائی کی پوٹلی ہاتھ میں لٹکائے بیٹیا کے گھر پہنچی، اور آج گوربدھن سنگھ اسٹن کے لیے مدقوں کا رکھا ہوا غصہ جوڑ نکالتے۔ کافی کنارہ کی دھوٹی دھو بیچ لٹکا کر خوب ٹٹک چڑھا کر اندر کس کر باندھتے آؤ پر سے اچھی سفید چھنٹیں پہنتے اور سر پر بڑا۔ پٹک باندھتے، راجپوتی انداز میں خوب ٹونٹیں چڑھا کر بیٹھتے، تو بچے ترچھے، ہمدادی بھر کم ہتے، اگرچہ ان کی کھدج اور ہر وہاں میں راجہ انداز ہوتے مگر تیرہوں میں آندا اور مزدور۔ واسے دم خم جھانکتے، اور عجیب شان استغنا نظر آتی۔ بہن کو، کچھ کر کھل اٹھتے اور جنگا راج مطابق ٹٹک لٹاتی اور منہ میں مٹھائی کی ڈولی دیتی اور پھر اس کی بھائیں لے کر ساری بیادیاں اور مصیبتیں اپنی جانب آجائے کی پراہتھنا کا جس کی تان اپنی مردانہ سستی اپنے بھائی کو مل جانے پر ٹوٹتی۔

پھر بڑے مخصوص انداز میں گوربدھن سنگھ اٹھتے، اپنی کشادگی کو کڑی کموں پر اندر گھس جاتے۔ گھسی میرہ آٹو نکالتے، چا بھری کشادہ میں سے ایک وقت کے قابل نکال، ہے ہیں۔ اور جنگا بڑے انتہام سے پوری کچھ دیاں، آٹو طیارہ کوٹی۔ اور ان کے سدا پر دستھی اور انہیں کھلانے کے بعد خود لٹھاتی اور رخصت، ہونے لگتی، رخصت کے وقت راجپوتی گھر کے آئینہ سے چھان کر مٹھ آئینہ تک کاغذ دھوس کا کراہہ بتاتی اور کہتی کہ میں ایل آئی ہوں، اس کی مٹھائی بتاتی، کراٹھک کا چندن سینہ دے، یہ رقم تین چار رو بلتی، پھر جسم پر موٹی دو ڈریسہ روپیہ والی ساڑھی باندھتے ہوتی اور ویسی ہی ساڑھی کے دام مانگتی اور سب حساب ہاتھ چھ روپیہ کا اور گوربدھن سنگھ یہ رقم ہاتھ پر رکھتے جسے پا کر جنگا ایسی خوش ہوئی جیسے اس کے بھائی نے منہ انٹیم کی دولت اس کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ انھوں نے ہاتھ کاغذ بخشا بڑا دان دولت۔ کے ہاتھوں میں پہنچ کر تیرے کی طرح چمکتا اور اس میں بہن کے وقت تمام دیکھی تجاہل عارفانہ برتے جاتے۔

اور سہ پہر کے بعد جنگا آئینہ پہنچی، اتنی دیر میں اس کا منہ بڑا مدہ شہر سے ٹٹک چکا ہوتا دیشیم بڑے ساڑھی جہزی کہا کہ مرنے اور اپنے باپ، اچھے کپڑے اور مٹھائی کا ٹوکریاں بوسے جنگا اپنی موٹی ساڑھی اتار کر نئی لیشیں ساڑھی بدلنے لگی۔ کا مدہ بھری اپنے اپنے کپڑے پہنتے اور بھی بنی سسران پہنچی۔ ساس ندیم دیکھتیں۔ شہر دیکھا کہ کتنے مدہ کی بھینا دیوچ کرتا ہے گوربدھن سنگھ بالعموم باری ساڑھی دیکھ کر شہر بول پڑا۔

”دو پھانے آن والے نکال کر ہیں۔ کچھ نہ مانگ رہیں کو بیٹے دینے وقت بیس بن جاتے ہیں؟ بھلا دیکھو تو یہ ساڑھی اس کی ساس لقمہ دیتی۔ پھانچو بان گھر ہے۔ بات پر بیٹھنے واسے چوڑا اور کوئی نڈکیتی“ اور مٹھائی تو دیکھو اچھوٹی تو کر بھری۔“ ہوں یہی تو میں کہتا ہوں، دیکھو تو اتنا غلغلہ ان کی بھی ہے دانت پر میل نہیں اور بہن کے بیٹے یہ مٹھات سامان، م کہا کہ سب کی پہناؤنی کرتے ہیں۔ منشی ہی کو غلغلہ کن۔ کی دھوٹی اور بوسکی کی قیص دی ہے۔ مٹھات سے پہنے بیٹھے ہیں۔ باہر چو پا کے چہرہ پہ۔“

اور جنگا بڑے ہیں سے نکال کر دیکھو یہ کے ستر کے اکیاون روپیہ دھاتی“ اور اکیاون روپیہ۔“

”ہمت والے لوگ ہیں، ہما دد بیردھن سب ختم ہو گیا پر آن وہی ہے؟“

ادی چھو کہی چھو کہ دم کیا جانو ہم جانتے ہیں ان چوڑاؤں کو۔ ہمت کے لوگ ہیں اور لینا دینا ہمت کے ہاتھ ہا۔

اور گوبردھن کے پاس تو باپ دادا کے زمانہ کا دہا دہایا پڑا ہے۔ یہ مرد ہیں نہ دیکھو۔ گڑھے ہوئے کھدوے ہیں۔ جی دار تھا کہ پتہ ہے جان جائے نہ جائے۔ کوئی بڑا بکھرا جیت نہیں تھا کہ اس سے اٹھ اور کیا کرے گا۔ ساس بہتی اور جگا خوشی کے مارے مہولی نہ ساتی جیسے یہ سب کچھ کھی اس کے بھائی نے دیا ہے۔ ہوں تو ساس ندوں کا گھر تھا۔ مگر جگا جیسے اس سامان سے سال بڑیک سب گھر برآمدی ہو جاتی۔ جیسے برابر کے تھا کہ گھر کی بیٹی۔

(۳)

اور بھیا دیوچ کا ڈیڑھ مہینہ باقی تھا۔ ساڑھے دس مہینہ کے چہرہ دس سے پس انداز کیے ہوئے پانچ روپیہ کے تاجے کے پیسے گوبردھن سنگھ کے پاس تھے اور ڈیڑھ ماہ میں انہیں دو ڈھائی روپیہ اور چھ کڑے تھے اور وہ تمام دن مزدوری کرتے اور شام کو کسی مکان کے یہاں سے موٹہ کے ٹھکے اٹھلاتے اور آدھی رات تک اپنے اکیلے مکان میں پانی لگا لگا کر انہیں کوڑتے کہیں سے پڑے اسے من کے پرے سے آتے اور انہیں توڑ توڑ کر سن بچھ کر تے اور علاوہ کا نہ بٹتے اور دوسرے تیسرے دن باندھوں کے وزن کے برابر مٹھا سا مٹی مل جاتا اور اس طرح رات کے چند گھنٹہ کے کام میں چار روپیہ روز کے سر جو ملتا ہے اور اس طرح انہیں بھیا دیوچ کے مخصوص دن کے اخراجات کی فراہمی میں سخت کٹے پڑے دن ٹوٹتے تھے اور اب وہ مطمئن تھے کہ اجہرا ماہ میں فاسے کر کے پس انداز نہ کرنا پڑے گا۔ جیسے سال بھر میں بارہ مہینہ ہر دن تو مزدوری ہی تھی نہ مٹی لیکن اور مزدور ہوں کی طرح جس دن مزدوری نہ ملتی وہ گھر نہ بیٹھتے۔ گھر کی سڑک جری جری داب پر چھل پڑتے اور تمام تک دو آنہ کی نہیں تو پانچ سو پیسہ کی گھاس چھیل کر بیچ لیے اور جب بارش کی وجہ سے کچھ بھی نہ کر سکتے تو اطمینان کے ساتھ فاتہ کر لیتے۔ مگر بھیا دیوچ کے فیز کو پورا کرتے نہ رہتے۔ ان کا دائرہ بہت چھوٹا تھا۔ گھر دائرہ کے اندر رہنے کا بہتر بہت وسیع۔ روز کا کھانا کھدوے سے اور روز کا پانی پییتے۔ انہیں زندگی کے پچیس سال کئے تھے۔ اسی پچیس سال میں کسی کے سامنے فاتح نہ پیدا تھا۔ کسی نے جن سے ان کا تعلق باقی نہ تھا اور ان کے باپ دادا کا جانشین بننا نہ دیندا۔ انہیں جانتا بھی نہ تھا۔ مگر وہ اسے خود بے جا سنتے تھے۔ کیونکہ انہی کے قریب میں ان کی آبادی نہ میداری نیلام ہو کر اسے پہنچی تھی۔ جیسے اس کے بھاری کھوں اور موٹی ٹونہ سمیٹا اندر۔ دو در سو کی دھونکی سے ٹھکرات کی روح پھٹک گئی تھی۔ جیسے گھوڑا کھاس کھا لیا کہ اس کے اوپر یہ گوشت چڑھا ہے۔ اور ایک دو آنہ پور میہ کھانے والے مزدور کی نگاہیں اس پر انہیں جذبات کے ساتھ پڑتیں۔ اور حلقہ کا مہاجن تو ان لوگوں سے واقف تھا۔ جن کے پاس اُسٹ ٹیٹ اور لین دین کے کچھ ماوی سامان تھے۔ اور گوبردھن سنگھ کے پاس نہ دامن تھا اور نہ غار سے اٹھنا تھا۔ البتہ اس کا بھیا دیوچ کا حقیر دان ایسے ایسے نہ معلوم کتنے سامانوں پر بھاری تھا۔ جو اس کی بہن کا زندہ اور ملازموں کی سازش سے گھر جا کر دکھایا کرتی تھی۔

اور آج صبح گوبردھن سنگھ یہ سوچ کر گھر سے نکلے کہ نہ میڈا بھینہ گواہ ہے۔ روزانہ کی موٹی اور سن کی کنٹی میں تو ڈی منٹ بھی پڑتی ہے اور بہت تھوڑا ہاتھ آتا ہے۔ اگر دات کا کام بھرتہ پر مل جائے تو بھینہ ہی بھر کے اندر بھیا دیوچ کے خرچ کے قابل رقم جمع ہو جائے۔ لہذا دریافت حال کے لیے جی جولا ہے کے گھر میں گئے وہاں اور ہی رنگ دیکھا۔ جی جولا ہے ایک بقر قصاب کے ساتھ کھڑے تھے اور جی جولا ہے کی اوپر گھر کے دروازہ کے قریب زمین پر سے پسری ہوئی تھی۔ اور بقر قصاب دستی پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ اور بچھے سے جی جولا ہے خرچ کر کے اٹھا رہے تھے مگر اور کسی صورت میں نہ چھوڑتی تھی اور زیادہ خرچ نہ کرنے

ہر گز دل نہ جلا کر گھسیا جانے سے انکار کرتی تھی۔

گوہر دھن سنگھ پہلی ہی نظر میں سبھ گئے اور آہستہ سے جتنی جو لاپسے کے کان کے قریب منہ لاکر بوسے کیوں چاہا ایسی اچھ کی بھیا کیوں کٹائے دیت ہو۔

جتنی جو لاپسے محراب سے ہو گئے اور گردن جھکا کر ذریعہ بوسے بیٹھا اپنے من کٹائے دیت ہوں، لالہ جی رنہ ہندار لگان ٹوٹ رہا۔ یہ فعلی رنہ فعلی کا نوش دیا ہے۔

”تو پھر کٹائے سے کیا نتیجہ لالہ جی سے کہو کسے میں اپنے مطالبہ میں“ گوہر دھن سنگھ نے کہا۔

اسے بیٹا بہتیری کہی، اسٹیا ما بھیا ہے۔ کھائے پئے بڑی سکر گائے بنے گی۔ پرنا میں مانا کہت ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ کٹے نہیں چھے ہمارا لگان دیوہ ہیں گاؤں کا باڑا بنانا ہے کہ جیندار دی (رنہ ہندار دی) کرنا ہے۔

”نہ کتے میں کٹائے دیت ہے چاہا“ گوہر دھن سنگھ نے وقت کے ساتھ کہا۔

اور اس سے زیادہ وقت کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر جتنی جو لاپسے بوسے پائی روپتیا میں بیٹا۔ اور ایک مسلمان کو آنکھوں میں اپنی کٹے لے کر پر مجبوری کے آنسو دیکھ کر شاکر کے خون میں جوش آگیا اور گوہر دھن سنگھ بوسے ”پھر تم کہی نا کٹے اس بنے رنہ ہندار سے کہ کسائی (رھائی) سہنے گو؟

اں بیٹا سب کچھ کہی پر اس نے وہی اپنے مطلب کی کہی کہ تم جانو۔ مت دیو کسائی کو پاؤ دو دو دھکا دھکا ہمارا مطالبہ ہمارا گوہر دھن سنگھ دانت کھاتا کر بوسے بیٹا سالا۔ ویش بنت ہے (ویش بنتا ہے) اور ٹھکرات کرتا ہے، کسائی ہے کسا؟ بھگوان نے حکومت زمیندار دی دے دی اس کے ماتھ میں! اسے نلف تیری بھلا! اور بڑھاتے ہوئے گوہر دھن سنگھ نے چلتے اٹھانہ بتایا۔ ایک نظر والی تو اور سر نہ بھیا کی آنکھوں سے آنکھیں چاہ ہوئیں۔ مجبورہ نگاہوں کی شفا میں ملتی آنکھوں سے جا میں، اور سا ہی ملتی سے آواز اور سر نہ گائے سے زیادہ کچھ آدمی سے ملتی ملتی نکالی اور آنکھوں کی رہی بھی باقی ادب کچھ اس کی آواز میں کہہ دی اور آواز پر جیسے ایک ذہنی ترنگ کے ساتھ گوہر دھن سنگھ نے اچھل کر پھر اور سر کی جانب دیکھا، اور انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ گائے کی معصوم خوبصورت ہرئی جیسی آنکھوں کی کرسٹ راجپوت کی بہادر آنکھوں سے مل گئیں اور جیسے دو ڈانٹوں کی ہرئی ایک دوسرے سے مسلہ ملائے لگیں۔ جیسے ان کے شہر میں ہزاروں سال پہلے کی کہانی دوہرا دی۔ وہ بے غم ہو گئے۔ اور ان کے جذبات کا دستہ ماضی و مستقبل دونوں سے منقطع ہو گیا اور جیسے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے اور بلڈ ایک نظر آگے اٹھائے سارے دس مہینے کا بھیا دیوچ کا اندازہ فضائی کے حوالہ کیا اور رستی اٹھتیں پڑیں اور اور تو جیسے نظر بیٹھی تھی۔ گوہر دھن سنگھ کے دیتی پڑتے ہی اچھل کر کمری ہو گئی اور بیا تو جی جو لاپسے کے گھر کے دروازے پر دیوچ کا گز رہی چلی ہوئی تھی یا گوہر دھن سنگھ کو گھسیتی ان کے گھر کی جانب دلی بھائی چلی جا رہی تھی اور ان کے گھر کا کھڑی ہوئی۔

گوہر دھن سنگھ کے بچے اب دیکھا زندگی کے میدان میں کسی صنف نازک داخل نہ ہوئی تھی۔ بچپن کی ماں کی آغوش فراموش کر چکے تھے۔ جوانی بیوی کی خوشبو سے آشنا نہ ہوئی تھی، سال کے سال بہن صبح کے ستارے کی طرح چمک کر سماں بھر کے لیے غائب ہو جاتی اور ایک سرور سا گوہر دھن سنگھ کی آنکھوں میں چھوڑ جاتی جس کے سہارے ان کے اندر جمایاتی احساس کی جھلک لوٹ بھیا دیوچ تک باقی رہتی اور بھیا دیوچ کی لپٹا رہی ہیں انہیں سال کے بارہوں جینے کا ہر دن گزرتا۔ اور ان پر مستقل سرور سا رہتا۔ آج بھی زندگی میں گائے داخل

ہوئی تھی۔ اور گائے بھی نوجوان۔ دوسرا وہ پھر شیا ما ایک زائے بے دارغ چلتا ہوا سیاہ۔ ایک دو غٹے پر ایسی چمک جیسے گئی ہے۔  
 ہے۔ غصہ غصہ قدرتی بدوش اور نوجوان کے ساچرے میں جھلکا ہوا۔ کھڑے سے زائے سیاہ ایک ہر چہرہ پر بایکٹی سی اچھلتی ہوئی۔ ایک ایک  
 بدوش کی کے ساتھ بہتے ہوئے گائے تھی کہ ہندو بن سے خاص تنہا بنی کے کھلی ہوئی دھڑکی۔ دو دو غٹے کی ہنوں کا غرا نہ اپنے  
 اندر چھپائے ہوئے اور بڑے جیسے چوڑے۔ قبوں کی کاشت کے جانور کا کافہ ہی ہوئی۔ گڑھا ہی دیر بعد بہ نشہ شمار بن گیا اور آج  
 سے چاہیں ورنہ بعد بھیا دیوچ کا دن ان کے سامنے کھڑا تھا۔ چون چوں دن گذرے۔ شیا ما انہیں تیرنی سی نظر آئے گی۔ ان کی ساری روایت  
 سائنس پشت لیا کھڑپ کرتی معلوم ہوئی۔ اور اور گائے سے تو بڑی بڑی امہدیں وابستہ ہوا کرتی ہیں۔ اور آج شیا ما تو ان کے جیسے  
 کرم دودھ بن گئی تھی۔ اور بھیا دیوچ کا ایک۔ ایک۔ دن کم ہو رہا تھا۔ وہ دو۔ دو۔ فرامی زائے تکیں نشہ آتی تھیں۔ گوہر دھن شگہ کی رات کی  
 بہترین آدمی، دن کا سکون گیا۔ لائیں تو کہاں سے لائیں اور مانگیں بھی تو کس پر نہ پے اور کس سے۔ اور اس طرح میں دن گذرے، اور  
 میں دن کی بدوش میں شیا ما رنگ پر آگئی اور کھلی دہی۔ سی خوش نصیب کے تھان پر شیا ما اور گائے بنی جیسے کوئی دوسرا ہوتا تو خوشی  
 کے مارے پھوڑا نہ سنا کر گوہر دھن شگہ پر دھنا شیا ما کے ایک ٹوکس گل رہے تھے۔ تقدیر دیکھنے جی بولا ہے اسے خالی کچھ کر کھائی سے  
 نثار ہے تھے۔ نہ ہندو نہ بے کار پھینا خیال کر کے لگان میں یعنی ہندو کی تھی۔ اور گوہر دھن شگہ کے تھان پر میں دن میں ہی گائے کھل گئی۔  
 تو — کان جیتا ہے تو زلف کے سر جوئے تک — دودھ دے گی کھی دے گی پھر دے دے گی۔ گرجب تک گوہر دھن  
 سہل کی چھپس سال کی بنی بنائی کر کوئی موچکی ہوئی۔ بھیا دیوچ پر ان کی ہن بٹے گی اور وہ خانی ہاتھ ہوں گے اور ان کا دم گھٹے لگا۔ رات  
 گذر کر کھو اور آگئے گی۔ تو ہری ہری ہلی دھب۔ ہر چہرہ کھشیا ما جیسے ایک دم پہاڑ کی پہاڑ گائے بن گئی یہ بڑا ہیٹ، بھرے ہوئے شگہ  
 سے تھن۔ اور بدن میں جیتی اور تن دہی، چال میں نشہ سا اور کھلی کھی گوہر دھن شگہ لائیں گائے کو دلچھ کہ سہ چھتے کھسا پاپ بچا ایکسی اچھی  
 شیا ما گوہر دھن، نقالی کی پھری سے کھٹے کھٹے پھی۔ گرا تنے بڑے پٹن کے احساس سے بھی وہ اپنے دل کو نہ سمجھ سکے۔ وہ تو بھیا دیوچ  
 غراہ۔ سانپ کی طرح بہتا رہا تھا اور جس تو شیا ما دن دگنی رات چر گئی ہوئی اتنے ہی گوہر دھن شگہ گئے اور گئے اور ایک شام گوہر دھن  
 شگہ بھل سے ہکا کر شیا ما کو لا رہے تھے بستی کے قریب حلقہ کا سا ہوا کا گڈوں سے واپس جا رہا تھا۔ گوہر دھن شگہ کی گائے کو دلچھ کہ سا ہوا کا  
 سے اپنا یہ روک گیا۔ سانپوں کے ہمارے کے بعد سا ہوا کا گڈوں نے کہا: "تھا تو بڑی اچھی شیا ما پانی ہے۔"

اں سا ہوا پانی کیا ہے۔ سر پر چر گئی ہے۔ جی بولا ہے کہ لگان کے لینے پانچ روپہ کی ضرورت تھی۔ سو وہ کٹائے دیت تھے  
 میرے پاس پانچ روپہ کا ڈوکی دھرو۔ دیکھی کی امانت کے رکھے تھے میں نے اٹھائے کے دے دیئے۔ تو اب تو بے گام میں ڈاب گئی ہے؟  
 ہوں پانچ روپہ دے کے پچاس گام مال بھی تو نے مار لیا، ایسی اور اور پھر شیا ما کسی تقدیر دے کے لاتھ گئی ہے۔ مگر بھر دینے کی گھر آدھے  
 فائدہ سے اوپر نکل گئی۔ بس اب لیے دن چار مہینہ بعد۔

اور چار مہینہ "کالو گوہر دھن شگہ کو چار لوک سنائی دیا، آج سے بڑا زائے پھر سا دھجی چا۔ مہینہ کسے لے میں گئے جس کی  
 درد ہے وہ تو آن نکلتا ہے۔ میرے لیے تو اس کی کھربواری مصیبت بن گئی؟

ارے تھا تو دیکھی بائیں کرتے ہو۔ یہ تو دودھ گائے ہے۔ مثل میں کہی جاتی ہے پھر شیا ما اس کا دودھ امرت، اس کا مٹی اہمیت  
 تاکہ ہے شیا ما کھی دودھ، ہر وہیں دوں۔ کتنے چھپیں پھر صاف بات ہے کہ پوسے بات کھی دودھ میں کھاؤں گا۔ اور بھلا آج

مٹے کوں نما۔ بولو کتے روپے۔

مگر ساجی مثل تو ہے بھی ہے کہ گاہیں گائے کس نے دیکھی؟

اسے جس نے دیکھی اور یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور برسے کتنے روپے دفن؟

اور اب نکلا۔ گھرنا دودھ بھری تھالی میں لات مارنا تھا۔ سات روپے لگو برہمن شکو کے منق سے اٹھتی ہوئی آواز نکلی اور نہ سے دس روپہ جیب سے نکالے اور کہا: یہ تو تھا کہ پھر تمہیں ہماری خرچ معلوم ہے اور منی روپیہ ہمارا سو روپے گا۔ اور بھانڈا ہانڈا پینا اور سیراؤن پر چڑھے گا۔ اور گلو کا معاملہ ہے میں زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا اس کو کھانا پینا ہی پائے ہے۔  
مثل مشہور ہے مہو کے کا کیا بھاؤ شرت سود اور کھی دودھ نرٹ کو گر برہمن شکو اچھی طرح سنا بھی نہیں۔ رہہ میں بیٹھے ہی رہی کھانے لکھوں کہ سا ہوا۔ نے اندراج کیا۔ اور روپیہ انہی میں لگا کر خوش خوش گر برہمن شکو ٹھہرے، انیا اپنی برکت ساتھ لائی تھی۔ اور روز گر برہمن شکو چہن کی میند سوسے۔

(۴)

اور بھیا دیوچ کا معتدل ازرو میں دن آپہنچا۔ جب آسان برسات پھر لا۔ دھلا دھلا شفاٹ نیلگوں ہوتا ہے۔ جب صبح شام نکلی ہوتی ہے اور دوپہر کو لگائی سونی مراد ت ہوتی ہے۔ جب ظریف کی نصیبیں لگوا۔ کے سودج کی تیز دگنیں پھانکتی ہیں اور سردی کا لہجہ نہیں پا چکا ہوتا۔ دیوانی کی تاریک ترین انداس کی رات کے بعد پہلی دیوچ پڑے یہ پرخوص تیرا منایا جاتا ہے اور جگہ دیشہ کی طرہ میکے پنہیں اور گھر میں گھستے ہیں پہلی نگاہ میں تھان پر شیا دیکھی۔ اور دیکھ کر ایسی بار بار ہمیں کہ شوہر کے دروازہ پر کبھی ہاتھی دیکھ کر یہ خوشی نہ ہوتی تھی۔ حسب معمول رسم ادا ہوئی۔ بہن نے ٹیکا کیا۔ گیت گایا۔ پڑھنا کی اور پکوان ہم یا بھائی کو پر سا اور خود کو لیا اور سب وقت بار بار شیا کا تذکرہ خوش ہو کر کرتی رہیں۔

اور دوسری بھیا دیوچ پر جگہ پنہیں تو خوشی کے مارے بھولی نہ سائیں۔ ایک فرہ دھوڑا کچھڑا اور شیا کا دودھ سے مٹکا سا "این" نکلتا ہوا، شیا تھی کہ نعمت کی پرت اور ایک مرتبہ برہمتا دیوچ سے زیادہ کھانے پینے کا سامان ہوا اور دن میں کچھ گھر شکو نے جرحانا چاٹا مگر جگہ نہایت خوبصورتی سے مال گئی اور مفردہ۔ قم آئے ز بڑھنے دی اور جگہ بھیا کے دروازہ پر ایک گھاسا پھوڑا دیچہ کر خوشی کے مارے آپلے سے باہر نکلے۔ بڑی ہنس کے ساتھ گرت گایا اور سسرال پہنچ کر بڑی تفصیل اور خوشی کے ساتھ اور اس کے پھر سے اور دودھ کا تذکرہ ساس اور شوہر سے کیا۔ آپ تو بھیا کے تھان پر شیا ما بندھی ہے بڑی دودھار ٹھہریں دو کی دیلی ہیں سبے خوب زور کی دعوت کھائی ہوگی؟

"طبیعت اچھی ہے خوب دان پین کر تے ہیں پھر کیوں ناہیں مٹے گا۔" ساس بولی۔ شیا کا گائے بندھی ہے؟  
"اچھا شیا ہے۔ بھیا کے تھان پر باشوہر نے کہا۔ شیا کے کیا کہنے کسی تقدیر والے کو ملتی ہے۔ دودھ لگی مٹھا ہر ت کی ہوند۔"

"اور پھر بھاگ مان ایسی کر گھر بھر دے۔" ساس نے کہا۔

اور اعلیٰ بھیا دیوچ پر جب جگہ پنہیں تو دھڑکھڑت دیکھے۔ میرے بھیا کا گھر بھر ہائے گا۔ ہانڈا ہانا بڑھے گا۔ اب تو فوراً



کما۔ اور ساتھ ہی ساتھ جگتا نئے بھائی کے چہرہ پر اطمینان اور فراغت کی چمک دیکھی جسم پر کپڑے بھی نقد سے بہتر تھے۔ بڑی محنت آئی اور بڑے مشق کے ساتھ سسرال پہنچ کر دینا تک تذکرہ کر لی۔ یہی۔

اور شیا ماکو تو برص شگہ کے تھان پر تیسرا سال تھا جبکہ بیوہ کی بیحادثین سال ہوئی تھے۔ نذر کے دھبے پر سا بڑا بڑتین سال پرانا حساب چاق کر تے ہیں اور اس دھبہ پر حساب لازمی تھا۔ اور سا بڑی کے بھی کھانا میں تو دودھ کی بوند بوند گھی کا تھوڑا تھوڑا لکھا تھا۔ اور ہر قیمت پر اٹھوڑے کے بھاد پر پیر کے اوپر اور میرا بڑی سا نئے درج تھی اور ہر بھاد دیوچ کے مزج کا پیسہ سید مع شرح سودا ہوا درج تھا۔ دیے تو حساب کتاب باطل صاف تھا مگر سا بڑی کو تحصیل کے ساتھ سمجھنا پڑا۔ تین سال بھر چکے تھے۔ صفائی لازمی تھی۔ پہلی بھیا دیوچ برص کا بھین دوسرا کائے کی کھات تھی دوسری پر ایک بھیا بھی اسی ذمہ آیا اور تیسری پر دوسرا بھیا بھی لٹ پرت میں پھٹ گیا۔ کائن کے پہنچا جس ہوتے بہتر اٹھینڈ بڑھیا۔ بھڑوں کی قیمت بڑھا پڑا کہ ظانی۔ مگر حساب جس مزج کے میزان میں دودھ بھڑے سا بڑی کی جانب گئے اور آدمی گائے۔ اور آئندہ اس شرط پر گائے کو برص شگہ کے حوالہ کی گئی کہ بقد ایک جہاد مگھی دودھ ان کا اور بھڑے آدمی آدھے، اور نصف گائے حکیت میں لگا کر اور پچھلے سے دام دام چاق ہو کر گزیر جن شگہ گائے لے کر پٹ آئے اور تیسرے سال تو دام طور پر لگائیں سال مرد جاتی ہیں اور ایک سال بچہ نہیں دبا کر نہیں۔ اور اس مرتبہ شیا ماکو معلوم ہو رہی تھی اور دھبے کے بعد دیوالی ۱۰۔ دیوالی نے مین بعد بھیا دیوچ کا تو بڑا بڑا ہے۔ مگر گزیر جن شگہ طلعت تھے۔ کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی وہ سا بڑی سے لے کر حسب معمول بھیا دیوچ کا مزج پڑا کر دیں گے۔ اور جب دیوالی سے پیشتر وہ سا بڑی کے پاس گئے تو سا بڑی سے صاف انکار کر دیا پہلے تو آدمی گائے اور وہ بھی سوکھی کاسبے پر وہ اپنی رقم بھنسا بیٹھے۔

اور خلافت امید انکار گزیر جن شگہ کو توپ کے گزے کی صورت لگا۔ کئی ہوئی چٹک کی مزج وہ اٹھا، بد آیا۔ اور بھیا دیوچ کے تو آج سے سات ہی دن باقی تھے۔ اگر سات دن میں وہ سات جنم لے کر سات مرتبہ کٹا تو بھی رات ۱۰۔ یہ جمع نہ کر سکتا تھا۔ کچھ سوچا اور سوچ کر چہرہ بولکا۔ کہے پاس پہنچا۔ اور کہا: سا بڑی تو پھر آدمی گائے آپ کی رہی اور آدمی بھری۔ اس کی قیمت بھینڈ کر لے لیز اور آدمی جمع بھری ہاتھ دھرو اور گائے تم سے بڑے؟

وہ تھا کہ جی واہ! یعنی کیا ہم سوکھی گائیں پالتے پھرتے ہیں، تم پاؤ۔ اس کے بچے تو حاد۔ گئی دودھ کر دے مگر میرا کام بغیر سات آٹھ دھبہ کے نہیں بن سکتا، آج کے دن بھیا دیوچ ہے، اور جگتا آتی ہوں گی؟ لیکن تھا کہ وہ کچھ ہو۔ بھیا دیوچ یا دیوالی سوکھی گائے اور آدمی، اور آدمی دھبہ کے سوا اور بڑے بھاد پر سات دھبہ کیسے پٹ جائیں گے۔ جتنی چادر ہوئے اتنے پاؤں پیلا لے آدمی۔

”تو پھر مجھے تو اپنے حقد کی گائے رکھنا نہیں ہے اب؟“

”نہیں پانا ہے تو بیچ لو جہاں بچے اور ہاڑے آدمی دام ہاڑے ذمہ دھرو؟“

”مگر آج کل اسے لے گا کون۔ پہلے تو کا مین نہیں ہے اور کا مین میں نکلی تو دودھ پیا لے گی چھ سات مہینہ بعد؟“

”کوئی نہ لے گا تو پاؤ۔ روڈ لگا کر دھو۔ چار پیسہ ہیں بھی کائے کے دیسے آپ بھی مٹھ بوند کھا پڑو گے؟“

”تو پھر اس بھیا دیوچ کا مزج پڑا کر دیو؟“

”مٹھائش نہیں ہے مٹھا کر اور تہا رہا اس نہ چنے تو غم کر دے بیچ ڈالو، مگر ہم تو میں گئے نہیں؟  
 ”تو کوئی گاؤں والا کسان تو ایسے میں سے گا نہیں مٹھائی کاٹے گا؟ گریہ دھن سنگھ نے کھانا ہر کر کہا۔  
 ”کچھ ہر تم جانو، ہم کب کچھ میں کہ تم خالی کاٹے نہیں تمہیں تو بیچتے ہو؟  
 اور گریہ دھن سنگھ ناؤ میں مہرے چنے آئے۔

(۵)

بھتیہ، ابرج کے مقدس اور پر خلوص تیرہ میں دو دن باقی تھے اور گریہ دھن سنگھ کی جیب خالی تھی۔ اس کا دل سینہ میں دھک دھک کر رہا تھا۔ اور اس کا دم گھٹنے لگتا، اور جب اس کی بہن دو دن بعد آئے گی تو خالی ہاتھ جائے گی۔ اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے تو لعیب نہیں۔ اور پھر اس کے پاس تو اس کے ایک وقت کے کھانے کے قابل بیدہ گھی اور آلو بھی نہیں اور بھتیہ ابرج کی مٹھائی کی ڈلی کے لیے راہ گزرنہ نہ کھوئے گا۔ اس کے سینہ میں کبوتر سے پھر پھڑا اُٹھتے۔

مہر مہر کا مٹھا ڈالا مٹھا کر اپنے بھو پڑے کے سامنے صحن میں بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سر پر رکھے، جیسے پڑی ایک مدھنت کا مالک جس کا بھتہ نہیں جو رہا ہو۔ اور اس کے جدنا دار کی صدیوں کی بی بی ہوئی ساکھ اور عزت مٹی میں مل رہی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور تمام دھما کو پرتالا۔ برسات کے برے لگے پھونس کا بھو پڑا جس کے اندر ایک جاہ پائی پر کچھ پیٹھڑے لکڑے پڑے ایک لمبا بک کچھ اندر سے بھروسہ مٹی پیش کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ اور اندر کو کھانہ کی کھڑکی کا دروازہ۔ مہر مہر جاہی پناہ خالی۔ باہر سے ایسی چٹنی چھڑی جیسے نہ معلوم اس پر کتنی جنس مہر ہے اور کھوکھے کھوکھے جذبات سے ادھر سے منہ پھیر لیا۔ اور سامنے شیا کا کھڑی دم ہلا رہی تھی۔ اور گریہ دھن سنگھ سو گیا۔ اور راجپوت جاگ اٹھا۔ اور کھلی کی بڑی اس کے دماغ سے چل کر دگ دگ جھنجھٹائی مٹی چلی گئی۔ اور جیسے وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے اور کھڑے کمان کے تیر کی طرح مہاجن کا منہ چراتے جی ہونا ہے کے گھر میں پہنچے۔ جی جولا ہے الاؤ کے پاس تہا بیٹھے ہوئے تھے جاتے ہی گریہ دھن سنگھ بے دھڑک برے چا چا ہمارے لگے بیچ دیو؟

اب بیٹا تہا رہی لگے! دو تو آج کل ٹھنڈے ہے کون لینے لگا؟

”جو کوئی لینے“ انہوں نے قدرے آزادی سے کہا۔

”ناہیں بیٹا، کون پڑیگا، کوئی کسان تو سیلے گا نہیں؟“

”پھر جو کوئی لینے“

اور جی جولا ہے نے غائر نگاہ سے ان کا چہرہ دیکھا اور مضبوط ارادے والے راجپوت کے انداز میں بات کر رہے تھے اور پھر بولے ”تو تم سا جو بھی کو کیوں نہ لگائے دیو۔ آدھے دام تم لے لیجو؟“

سا جو بھی ناہیں ریت کہتے ہیں پاؤ اور نہیں تو جہاں چاہے بیچ ڈالو ہمارے ادیب! میں دے دوں

”ہر تم پاؤ؟ جی جولا ہے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ یو راہ چتا رہے۔ اب کے تیرے سال دو پچھڑے اور پوری لگائے انہیں بیچ

ہو جائے۔ اور تین برس لگی دو وہ نفع میں کھائیں — سالہا جہاں ہے مہاجن اٹا اور جی جولا ہے کو شیا اسکے ساتھ لگا ڈھنڈا۔ پھر برے برے دانت لگتا کہ کہا ”کسانی ہے رقصانی، کسانی، دیکھو تو۔ بے ایمان لوگوں نے دیت ہے سود کے لالچ میں؟“

”اور پاسوں بھینا دیوچ ہے تم جانت ہو“

”ہن سمجھ گیا بیٹا۔ پھر تم اچھی طرح سمجھو برہم بیٹو“

اور عبور تھا کر بچہ کی گردن ندرت شرم اور روایات کے بار سے تھک گئی۔ اس کے شہر سے جسم پر۔ وہاہ کا پوتین آگیا۔  
شام کو قصبہ سے جی جولا ہے بقر قصاب کو بلائے۔ بقر قصاب نے اوپر سے نیچے تک باؤں میں باندھ کر آگڑا کر شیا ما کو  
پڑناں، ہر سر بندر دلیما۔ اوپر سے بغور معائنہ کیا۔ خپتے تھک تھک کر دیکھا۔ پھر آہستہ سے دم لپٹنی اور ہڑٹایا۔ دوسن مال ہے۔ وہاچ  
دپر بی، سمیت۔ بسن دوسن۔۔۔۔۔

اور تھا کر کے کان میں جس کے تین سال کے ٹھی دووہ کی آواز کا وزن سا ہو جی کے ہی کھا تر سے حساب ہو کر گیا تھا۔ آج اسی  
کے گوشت کا تہینہ کیا جا رہا تھا۔ جی جولہ ہے نے سودا چکا اور چوہہ۔ وہیہ ییزان گئی۔ شیا ما کی سی بقر قصاب نے پکڑی اور چوہہ روپیہ  
گوہر دھن سنگھ کو پکڑنے لگے۔ گوہر دھن سنگھ نے وہیہ نا تھین یہیہ جیسے بھروسہ نہ لایا۔ بغیر گئے جی تھ لہنے کی جانب ہڑٹائے اور دگتی تھی  
آواز میں بولے ”چا چا تم سات روپیا اس جہا جن کو دے آؤ اور سات اپنے پاس دھر یونکل وہ پر جنگ آئیں تو پہنچا دیکھو۔“  
”تو پھر تہیں دھر یونکل جتنے کہا۔۔۔ اور گوہر دھن سنگھ کو ایسا سانی پڑا جیسے کہ رہے ہیں“ ایک من گوشت تم نے بچا  
ہے اس کے سات روپیہ بھی تم اپنے پاس رکھو“

”ناہیں چا تہیں دھر یونکل اپنے پاس اور سات اسے دے آؤ جہا جن کو گوہر دھن سنگھ نے جلتے بھرتے کہا اور جیسے ایک من  
گوشت کا ٹوکرا سر پر دھرے گھر کی جانب پٹے۔ انہیں خوب یاد تھا۔ کہ بچپن میں کہا یوں میں سنا تھا کہ عمر غری نے جب دوسری مرتبہ دلی پتہ  
محو کیا تو اپنی فوج کے آگے گاؤں کا بہت بڑا گھہ کر دیا تھا۔ اور بڑھتے چلتے آئے تھے اور ان کے آگے ہونے کے سبب چوہاں اپنی تلواریں  
بند کیے بیچے بھرتے رہے تھے اور عمر غری کی فوج بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گھوڑوں کی موہال کی آڑ میں دلی فوج کو لی تھی اور  
چوہاں گھوڑوں کو کات کر ترکوں تک نہ پہنچ سکے تھے اور بغیر رائے دلی فوج ہو گئی تھی۔

اور اس کی تلواریں گائے کی حفاظت کے لیے بنی ہے۔ اور آج اپنے ماتحتوں کو گائے کو چھری تلے دے کر مارا ہے۔ وہ  
اپنے سنان گھر میں پہنچا۔ شیا ما کے تھان پر گوہر دستور بکرا ہوا تھا۔ اور سانی کی ناند میں چارے کے پس خوردہ پر کھیاں بھیننا رہی تھیں  
اور اس نے ایک گہری سانس لی اور زمین پر آگڑوں بیٹھ گیا۔۔۔۔۔

اور بھینا دیوچ کے دن حسب معمول چٹکا ایشین پڑا تھی، اور کاوندہ ہر سال دلا مقررہ سامان طریقے سے شہر چلا گیا۔ گاڑی شام  
کو چایا کرتی تھی۔ اور چٹکا ہمیشہ ایشین پر کاوندہ کو غنڈھائی تھی۔ مگر آج واپس نہ پہنچی تو جو مہری کہاں وہاں موجود تھے۔ ان کے حوالے پکڑے  
اور مٹھائی کا ٹوکرا کیا اور کہہ دیا کہ گھر کہہ دینا کہ بھوجی اور مٹھی جی کو بھینا نے مٹھرا لیا ہے اور وہ کل آئیں گے۔

صبح ہی چٹکا بھائی کے دروازہ کے قریب پہنچی تو کچھ عجیب اور کچھ آواز میں جی کو مٹھا مٹکا جب آگے بڑھی تو جتنے سنا تے تھے۔  
”اچھے خاصے تھے کل دن مندرے“

”ارے ہمارے پاس بیٹھے پلم ہیٹ رہے۔“

اور کل دن مندرے سات روپیہ بھینا دیوچ کے میرے پاس دھر در زانست دھر۔۔۔

اور اسے میں شہر ہوا کہ آئے گئیں۔ آئے گئیں جکا آئے گئیں۔ اور جکا چیرتی بھارتی اندر پہنچی تو گروہن سنگھ کے جنازہ پر جا کھڑی ہوئی۔ طری ملہ پد بہن کی چیخ نکل گئی تمام جسم ہیٹ کر بھینک دیا۔ سب موت پر چوہے لگائے ہوئے تھے۔ اور انہوں کی کاشت تو تمام گاؤں میں عام تھی۔ اور سال دو سال قہقہے ایک دو تھتے ایسے ہو ہی جاتے تھے مگر سب کا پتہ نہ تھا۔ جب جکا روئے پٹھنے سے ڈرا جوش میں آئی اور اس نے وہ مخصوص گیت میں کے لہجہ میں گایا جو بھتیہ دیوچ پر گایا کرتی تھی۔ اور جی جولا ہے نے گروہن سنگھ کی امانت انہی سے نکال کر دے دی تو جکا نے گروہن کے جنازہ پر کھڑے ہو کر ٹیکا کیا اور پھر مٹھائی کی ڈلی بند ہونٹوں کی جانب بڑھا کر بین کیے مگر گروہن سنگھ تو آج کی بھتیہ دیوچ کے دان کا راز اپنے ہند ہونٹوں میں چھپائے اس قدر خاموش تھے کہ ہونٹ بھی نہ کھولے۔

اور جب لاہار ٹی جنازہ کھٹی بنا کر اور کفن پہنا کر جکا نے گاؤں کے بچوں کے حوالہ کیا تو دروازہ پر شیاما کو ایسے تھائی کھڑا تھا جو آہستہ آہستہ جتی جولا ہے سے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر نے پاس نہیں کی۔ گائے کا بھن نکل۔ سارے کو دور دوپیر دیتا رہا نہیں مانا۔ آج کی دوکان کا بھی ماری گئی — اور جکا شیاما کو پہچان کر قریب آگئی۔ اور سب حال معلوم کر کے بھتیہ دیوچ کے دان والے سات روپیہ اور ساہوکار والے سات روپیہ علیحدہ علیحدہ نکال کر حوالہ کیے اور کا دندہ سے آہستہ سے ایک جانب بے جا کر کہا۔

فشی جی اب کی مرزہ بھتیہ دیوچ کے دان میں بھتیہ۔ نے شیاما گائے دان کی ہے سمجھ گئے۔

# پرداز کے زخم

کشمیری لال ذاکر

میں ابھی ابھی اس کے گھر سے لوٹ کر آیا ہوں اور اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پی رہا ہوں۔ پردوں کے کارن کرے کا ماحول کچھ عجیب سا ہے اور اس میں سگریٹ کے دھوئیں کی محنت کی لکیریں جھیل جھلکی ہیں۔ اسے تپائی پر رکھی اینٹیں ٹرے میں ایک اودھ جلا سگریٹ ابھی تک سلگ رہا ہے۔ میں سگریٹ کو مسل کر اس کی ہستی نہیں دھاتا، اسے لندہ دہنے دیتا ہوں اور اس کے آخری حصے پر میرے ہونٹوں کے نشان سوئے رہتے ہیں اور اس میں سے ہلکا سا لڑتا ہوا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔ میں اسے سلگنے دیتا ہوں جب تک وہ خود نہیں بجھ جاتا۔

مجھے ایک دم بچہ جانے سے سلگ سلگ کر تڑپ تڑپ کر دھک دھک کر رہا ہے۔ اس طرح اور تعداد کی سب چیزیں ملے ہوتی ہیں۔ درمیانی منزلیں ملے کیے بغیر آخری منزل پر پہنچ جاتا تو ایسے ہے جس طرح کوئی پرندہ پہاڑ کی چوٹی سے اڑ کر ایک لمبے آسمان کی بلندی کو چھو لینا چاہے اور اگر اس کے کمرے ٹوٹ جائیں تو اسے زمین کی پستیاں بھی قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ایسا ہی کچھ تازہ میرے ذہن میں ابھرا ہے آج بیناں کو دیکھ کر۔

بیناں کو میں شکرانہ دے رہا تھا ہوں جب بوائے کے بعد میں اس شہر میں آیا تھا۔ ان دنوں وہ دوسری جماعت میں پڑھتی تھی اب بی۔ اے کر چکی ہے۔

ان دنوں وہ سبز سبز تپوں میں چھپی ہوئی کلی تھی اب پورے کے عین ادھر کھلا ہوا بھول ہے۔ غالباً نومبر کا مہینہ تھا۔ ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ شروع تھے۔ میں دن بھر کرکٹ کھیل کر اور آخر میں پٹ کر گھر لوٹا تھا۔ ہمارے قلعہ کا قلعہ اس وقت میں کانٹے کی طرح چھو رہا تھا اور جسم میں ٹھکن کے کارن دد ہونے لگا تھا میں گھر پہنچتے ہی بستر پر گر گیا اور آنکھیں بند کر کے دن بھر کے کھیل کے متعلق سوچنے لگا۔

”بھائی جان کھیل آئے میچ؟“ شاردہ اچھے بھائی جان ہی کہہ کر پکارتی ہے۔ بھیا نہیں کھتی، اسے یہ انداز پسند ہے۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔ شاردہ میرے سر ہانے بیٹھ گئی۔

”دار گئے؟“ اس نے مجھ سے اس آغاز سے پوچھا جیسے اسے پہلے ہی یقین ہو کہ میں ہار جاؤں گا۔ آج وہ میری ہی ہے۔ وہ

انتی ہے اس کا بھائی کسی بھی کھیل میں کبھی نہیں جیتا۔

”ہاں!“

”تو شرط قائم ہے۔“ شاردانے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا اور میں نے اس کی پتی پتی انگلیوں کی ہریاں ٹھنڈک کو محسوس سمجھ کر کھول دیں۔ وہ مسکادی۔ میں حجب ہارتا ہوں وہ مسکراتی ہے اور اس کی اس معصوم اور بے لوث مسکراہٹ سے شکست کی چھٹی ایک دم مہم ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”چلے ہے!“ میں نے پوچھا۔

”چلے تیار کھی ہے میرے کمرے میں۔ وہیں چلے میری ایک سہیلی بھی ہے، اس سے ملے۔“ شاردانے جواب دیا۔

”لیکن میں نے تو منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا۔“

”لو کونسا میریج بیورو میں جا رہے ہیں آپ۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ ”کسی وقت تو حد کر دیتے ہیں آپ! دن بھر آئینہ بھی نہ دیکھیں لیکن۔“

”چلو جھٹی۔“ میں نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ میں جانتا تھا وہ کیا کہے گی۔

کمرے کا پردہ اٹھا کر اس نے اندر قدم رکھا اور اس کے پیچھے میں داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر چونکی جیسے کوئی ہرنی اپنے قریب آہٹ پا کر ڈر جائے۔

”نیناں!“

”بھائی جان۔“

نیناں نے لمحہ بھر کے لیے پکیں اور پراٹھائیں جیسے جھیل کے گہرے نرمل پانی پر بھور کا ہلکا سا نیم اندھیرا، اپنی بھرپور جاذبہ چھا گیا ہو اور پھر فوراً ہی اس نے پکیں جھکائیں جیسے کوئی صبح کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہو اور جھیل کا پانی سا کھن ہو گیا ہو اور اس کی سطح پر کے سامنے ہر آنے لگے ہوں۔

کمرے میں دو کرسیاں تھیں۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ شارد کا پلنگ تھا جس پر سفید سلک کی چادر چھپی تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھ کر کرسی لے لی۔ میں اور نیناں آگے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں تپائی تھی۔

”نیناں بڑی اچھی کہانیاں لکھتی ہے بھائی جان۔“ شارد، پیالہ میں چائے کا پانی ڈال رہی تھی۔

”تو آپ ہماری برادری کی ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی!“ نیناں کی پلکوں میں غصیف سی لرزش ہوئی وہ ذرا سا ادب پر اٹھیں جیسے جھیل کے پانی پر دونوں وقت لگے مل رہے صبح شام کے بادلوں میں گھل کر مسکادی ہو۔

”جب بھی اس وادی میں کوئی قدم رکھتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔“

میرے چارے قدم کہاں رکھ رہی ہے۔“ شارد نے میری بات ٹوک دی۔

”راستے پر چل پڑنا ہی قافلے میں شامل ہو جانا ہے۔“ کسی نہ کسی موڑ پر تو دوسرے مسافر مل ہی جاتے ہیں۔ جیسے کہ

مل گیا ہوں۔“

میری بات سن کر نیناں کی آنکھیں ایک بار پوری طرح کھل گئیں جیسے ساگوان کے گھنے جنگلوں میں سوئی شبنم کے سینے پر کھلی  
 ڈھیر چلنے لگی ہو اور اپنی نرم نرم کمر سے اسے گدگداتے لگی ہو اور ساری ساری بیدگی، سارا کسل، ساری میند بھڑٹنے لگی ہو اور ہر چاہک جانے  
 لیا ہو اگر تمام جنگل پر اندھیرا بھانسنے لگا اور دھوپ ٹٹنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گھٹنا اندھیرا بھر گیا۔ نیناں کی آنکھوں میں بے پناہ  
 غم بھانک اٹھا میں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں چائے کی پیالیوں پر گاڑ دیں۔ شادو پیالیوں میں دودھ ڈال رہی تھی اور بھول گئی تھی کہ میرے اور اس کے  
 درمیان کوئی گفتگو چل رہی تھی۔

”بھائی جان آپ یہ پیالی لے لیں“ اس نے نیناں کے آگے بڑھی ہوئی پیالی میری طرف سرکادی اور میری پیالی اس کے آگے کر دی۔  
 ”یہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”نیناں کو بالائی پسند نہیں۔ یہ تو چائے میں دودھ چھان کر ڈالتی ہے۔“ اس کی پیالی میں بالائی کے چھوٹے چھوٹے تیر رہے تھے۔  
 ”اچھا!“

”ہاں! گھر میں اس کا اکثر اس بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے“ شادو نے کہا۔  
 ”بڑا آرسٹو کرٹسک نظر یہ ہے“ میں نے اپنی پیالی میں گھج گھانا شروع کر دیا۔ شادو انہماں کی پیالی میں شکر گھول رہی تھی۔  
 ”چائے میں شکر بھی خود نہیں گھولتی کم بخت، ہر کام اسے کیا کرایا چاہئے۔ شادو نے پیار سے اس کے کھال کو چھو لیا اور نیناں  
 ایک دم جیسے جاگ گئی ہو۔

”مسو رہی تھیں آپ؟“ میں ہنسا۔

”جی نہیں!“ وہ ذرا سا مسکرائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار دانت چمک اٹھے پراس مسکراہٹ میں ایک کسک سی تھی،  
 شبیہ دود کی ایک ہلکی سی لہر اس کی نگوں میں پھیل گئی ہو۔ اس کے چہرے پر لودھی سی ابھرا آئی تھی اور آنکھوں کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا  
 جیسے وہ کسی وادی میں کھڑی کوئی پہاڑ کی چوٹی ہو جس کی ایک طرف تو سورج کے ڈھلنے سے چمک اٹھے، دوسری طرف اندھیرا پھیل گیا ہو۔  
 کچھ دیر تک مینوں خاموش بیٹھے چائے پیتے رہے اور اس کا چہرہ دھیرے دھیرے اپنی نارمل حالت پر آگیا۔

”کون سے مضمون لے رکھے ہیں آپ نے؟“ میں نے پوچھا۔

”سائنس اور فل میتھیمٹکس“

”بڑا مشکل کیمینٹیشن ہے، ڈاکٹری کرنے کا ارادہ ہے کیا؟“

”خیال تو ہے!“

”آپ بھی تو ڈاکٹری بننا چاہتے تھے نا بھائی جان؟“

”ہاں!“

”اور بن گئے انسانہ نگار، شاید سبھی لکھنے والے پہلے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔“ شادو ابڑے غلوں سے مجھ پر جھوٹ کر رہی تھی۔  
 صبر سے خیال میں ڈاکٹر ایک بہترین ادیب بن سکتا ہے۔ انسانی جسم اور ذہن کی ایک ساتھ واقفیت تو انسان کو زندگی کا مکمل نیا سن  
 بناتی ہے۔ ادیب بھی ایک طرح کا ڈاکٹر ہے جو تھکے ہوئے بیمار ذہنوں کو تازگی اور صحت دیتا ہے۔ شکستہ اور نا امید لوگوں تک کو زندہ رہنے کا

پیغام پہنچا تا ہے۔“

نیناں نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور میری طرف دیکھنے لگی جیسے وہ خود بھی یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ کی شکل واضح نہ تھی اور وہ اس لیے خاموش تھی اور بولتی نہ تھی۔ میں نے جیسے اس کے من کی بات کہہ دی تھی۔ اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتار دیا تھا چہرے پر ایک دم ایک پیاری سی زماہٹ چھا گئی۔ ایک لطیف سی آسودگی۔

”تم ڈاکٹر بڑی یا لیکچر؟“ شارہ اس سے پوچھا۔

”جو زندگی بنا دے گی۔“ یہ شاید پہلا مکمل جواب تھا جو نیناں نے دیا تھا۔

اتنی چھوٹی عمر میں ہی اس نے شاید حالات کے بندھنوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ زندگی نے اس اوجھل کھلی کھلی کی ٹیکسٹ بکوں سے شاید کانٹوں کا گھیر ڈال دیا تھا یا وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ کچھ کلیاں بھول بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور کچھ بھول کھل کر بھی شاخ پزیر۔ اس کے ذہن کی عجیب ملی جلی سی کیفیت تھی جیسے دھوپ اور چھاؤں پر دراز اور ٹھنکی، تصویر کا ایکسج ہو گیا ہو مگر مکمل تصویر نہ ہو۔ اور تصویر مکمل ہونے میں غماص وقت لگا۔ بہت دنوں تک تو میرے سامنے وہ ایک ہی پڑا ہوا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

نیناں کے چنا ہواں کے ایک بہت بڑے وکیل ہیں اکثر قتل کے مقدمے ہی لیتے ہیں۔ سول کیسز سے انھیں کم دلچسپی ہے۔ قتل ہار جانا سول کے دس مقدمے جیتنے سے بہتر ہے، کچھ اس طرح کا خیال ہے انہیں وکالت کے بارے میں۔ کوئی دو ہزار کے قریب ان کی پریکٹس یہ ضلع کافی پسماندہ ہے اور لوگ اپنا بہت سادہ سا ڈرائیو بھگڑاؤں میں ہی بناتے ہیں۔ پانچ ہزار سو چار سو تیس میں رہتے ہیں وکیل صاحب کے بھگت ہیں۔ ان کی کوٹھی شہر سے باہر اجیر جانے والی سڑک کے کنارے ہے معلوم ہوتا ہے یہ جگہ انھوں نے کسی مقدمے میں ہی حاصل کرنا تھے وسیع احاطے میں تو ایک محل بن سکتا ہے لیکن انھوں نے ایک مختصر سی کوٹھی بنانے پر ہی اکتفا کی ہے اور جو راج اور مزدور اس کرتے رہے ہیں شاید وہ بھی کسی مقدمے میں ہی پھنسے ہوئے تھے۔ وہ دن جنھوں نے پوری ہجرت لے کر کام کرنا ہوا وہ اس بے دردی سے یہ پہلی بار جب صبح کو سیر جاتے ہوئے میں ان کی کوٹھی کے قریب سے گذرنا تو وکیل صاحب کا بورڈ پر چڑھ کر رک گیا۔ تو یہ نیناں کا کھر جوا چھا ہوا لگ رہا تھا مختصر کوٹھی تو یوں لگ رہی تھی جیسے کسی بڑی سی گھر سال میں سا بیسویں کے کچھ کو اڑھار ہوں اور کوٹھی کے آگے کھلا احاطہ کو سدھانے کے کام آتا ہو۔ کچھ آدمی پہلی پہلی سی رشتائیاں اوڑھے پھاٹک سے باہر نکل رہے تھے۔ شاید یہ وہی میلو لوگ تھے جن کے وکیل صاحب کی پریکٹس چل رہی تھی۔ وہ صبح صبح رفع حاجت کے لیے باہر جا رہے تھے۔ رات انھوں نے یہیں گزار دی تھی۔ شاید آج عدالت میں بیٹھی ہو۔ میں آگے قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ کوٹھی سے ایک صاحب باہر نکلے خوب بڑھی ہوئی توند، سر بالکل منڈا ہوا اور کے ذرا نیچے تک چڑھی ہوئی دھوٹی۔ میرا ذہن یہ گواہانہ کر سکا کہ میں انھیں وکیل صاحب سمجھوں، پر تھے وہ وکیل صاحب ہی جن سے میرا تعارف ہوا جب میں اور شارہ اینڈیاں کے ہاں چائے پر گئے تھے۔

”تمہاری سہیلی کی کوٹھی کیسی ہے شارہ؟“ میں نے کوٹھی کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

نیناں کے پتا پرانے خیالوں کے آدمی ہیں۔ وہ اس طرف کم ہی دھیان دیتے ہیں۔ شارہ اس نے جواب دیا۔

”انتہا بڑا احاطہ گھیرنے کا فائدہ؟ اس میں تو ایک ریفریجری کیپ کھل سکتا ہے۔“

”آپ ہمیشہ اٹنی باتیں ہی سوچیں گے۔“



اگر فاقی جائدا کو اس بری طرح ہی استعمال میں لانا ہوتا تو اسے قومی ملکیت قرار دے دینا چاہئے۔ میں نے تاک پر دو مال کھنے کی ضرورت محسوس کی۔ ایک طرف بندھی ہوئی گوبر میں لت پت جھینسوں نے اچھا خاصہ گھمسان مچا رکھا تھا۔

اس وقت نیناں اندر سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے پاؤں سے احاطے میں دھول کے باہل اٹھ کھڑے ہوئے۔

”نستے جانی صاحب!“ اور پھر اس نے اشارہ کرنا کو اپنے ساتھ جوتا لیا اور دونوں ہنسنے لگیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور دھول میرے سوٹ پر جم رہی تھی۔ کم بخت کو آج ہی ڈرائیو کھلی کرنا پڑا تھا۔

نیناں بھی ایک بڑے سے بال نا کرے میں سے کڑا لے ہوئے ایک چھوٹے سے کرے میں لے گئی۔ بال کرے میں سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ ان کا ڈرائنگ روم آگے اور اس میں شام کا سمر میز بجالا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر غالباً ایک ری بھی تھی اور دیواریں بہت اونچی اور خالی تھیں ان پر کہیں کوئی پرانا کیلنڈر بھی نہ تھا جس جھوٹے سے کرتے میں ہم آئے وہ خاصا اچھا تھا۔

دو یہ نیناں کا کرہ ہے جانی جان!“ اشارہ دے کر مجھے مخاطب کیا۔

”کرہ نہیں یہ میری پناہ گاہ ہے۔“ نیناں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ کچھ روز پہلے جوہر نی میری آہٹ پا کر چونکی تھی وہ واقعی زخمی تھی اور اس کے سینے میں کوئی گہرا گھاؤ تھا۔

”مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی نخلستان ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور یہ اگر ایک صحرا جب لگوں کا طوفان اٹھتا ہے تو اس سے بچنے کے لیے یہی سہارا میرے کام آتا ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی اور پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے کرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک دیوار کے سہارے اس کا پینک تھا اور اس کے ساتھ ہی تپائی تھی جس پر ایک خوبصورت ٹھیل ٹھیل رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ کتا بون کی بڑی سی الماری رکھی تھی جس کے باہر چھوٹا سا قفل لگا تھا۔ شمالی دیوار کے ساتھ ایک آرام کر رہی تھی جہاں میٹرک الماری کی ایک ایک کتاب پر نظر پڑ سکتی تھی۔ اس دیوار میں ایک کھر کی تھی جو پھلے کھلے امدلے کی طرف کھلتی تھی کھر کی پر پلکے آسمانی رنگ کا پردہ تھا جو شاید اٹھایا کم ہی جاتا تھا۔ جنوبی دیوار میں کرے کا دروازہ تھا جس میں پردے کی جگہ چتر پڑی تھی۔ فرش پر ایک نفیس کارپٹ تھا اور ایک کونے میں پیبل کے گیسے میں بڑگس کے پھول تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کتا بون کی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اشارہ دے دیکھ رہی تھی۔ اشارہ امیری غادلوں سے واقف ہے، بیکار میں نہیں ٹوکا کرتی۔ اس وقت ٹوکتی ہے جب اس کے خیال میں میں حدت گزر جاؤں۔ الماری کے ایک خانے میں کتا بوں کی قطار کے اوپر فریم میں لگی نیناں کی تصویر رکھی تھی۔ میں اسے دیکھنے لگا۔

عذیرہ کتا ہیں دیکھی جا رہی ہیں یا تصویر؟“ اشارہ دہلی۔

”کتا ہیں بھی اچھی ہیں اور تصویر بھی۔“ میں نے جواب دیا اور کتا بوں کو زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

ہندی سا ہندیہ کی ڈانڈہ کتا ہیں موجود تھیں۔ انگلش اور فرنچ لٹریچر کی بہت سی اچھی اچھی کتا ہیں تھیں اور اردو ادب، نظم اور نثر دونوں کی تخلیقات موجود تھیں۔ کتا بوں کو دیکھ چکنے کے بعد پھر تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک جوان سی لڑکی جس کا ماحول اتنا خشک اور غیر ادبی ہو ذہنی طور پر اتنی اچھی طرح کیسے نکھر سکتی ہے۔ اس کی شخصیت کو ابھارنے میں ضرور کسی دوسرے شخص کا ہاتھ ہے۔ میں ایک نئی آکھن میں بیٹھ گیا اتنے میں نیناں کمرے میں داخل ہو گئی۔

پر پیغام پہنچا تیسرے

نیناں نے بیانی تپائی پر رکھ دی اور میری طرف دیکھنے لگی جیسے وہ خود بھی یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ کی شکل واضح اور مکمل نہ تھی اور وہ اس لیے خاموش تھی اور بولتی نہ تھی۔ میں نے جیسے اس کے من کی بات کہہ دی تھی۔ اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتار دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ایک پیاری سی نرمی بٹھ چھا گئی۔ ایک لطیفیت سی آسودگی۔

”تم ڈاکٹر بنو گی یا لیکچر؟“ اشارہ اس سے پوچھا۔

”جو زندگی بنا دے گی“ یہ شاید پہلا مکمل جواب تھا جو نیناں نے دیا تھا۔

انہی چھوٹی عمر میں ہی اس نے شاید حالات کے بندھنوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ زندگی نے اس اوجھ کھلی کلی کی پیکٹر یوں کے ارد گرد بھی شاید کانٹوں کا گھیر ڈال دیا تھا یا وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ کچھ کلیاں پھول بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور کچھ پھول گل کر بھی شاخ پر ہی ٹوٹ جاتے ہیں اس کے ذہن کی عجیب ملی جلی سی کیفیت تھی جیسے دھوپ اور بھگڑاؤ پر راز اور تشنگی، تصویر کا ایکج ہو مگر مکمل تصویر نہ ہو۔ اور تصویر مکمل ہونے میں غامض وقت لگا۔ بہت دنوں تک تو میرے سامنے وہ ایکج ہی پڑا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

نیناں کے چنا ہاں کے ایک بہت بڑے وکیل ہیں اکثر قتل کے مقدمے ہی جیتے ہیں۔ سول کیسز سے انھیں کم دلچسپی ہے۔ قتل کا مقدمہ ہمارا ناسول کے دس مقدمے جیتنے سے بہتر ہے، کچھ اس طرح کا خیال ہے انہیں وکالت کے بارے میں کوئی دو ہزار کے قریب ان کی پریکٹس ہے۔ یہ ضلع کافی پسماندہ ہے اور لوگ اپنا بہت سا وقت لڑائی جھگڑوں میں ہی بناتے ہیں۔ بایج ہزار میو جیویات میں رہتے ہیں وکیل صاحب کے خاص بھگتے ہیں۔ ان کی کوٹھی شہر سے باہر اجیر جانے والی سڑک کے کنارے ہے معلوم ہوتا ہے یہ جگہ انھوں نے کسی مقدمے میں ہی حاصل کی ہے، درنہ اتنے وسیع احاطے میں تو ایک محل بن سکتا ہے لیکن انھوں نے ایک مختصر سی کوٹھی بنانے پر ہی اکتفا کی ہے اور جو راج اور مزور اس پر کام کرتے رہے ہیں شاید وہ بھی کسی مقدمے میں ہی پھنسے ہوئے تھے۔ درنہ جنھوں نے پوری ہجرت لے کر کام کرنا ہو وہ اس بے دردی سے نہیں کرتے پہلی بار جب صبح کو سیر جلتے ہوئے میں ان کی کوٹھی کے قریب سے گزرا تو دوکیل صاحب کا بورڈ پڑھ کر روک گیا۔ تو یہ نناناں کا گھر جو اچھا خاصہ مہبط لگ رہا تھا مختصر کوٹھی تو یوں لگ رہی تھی جیسے کسی بڑی سی گھر سال میں سا بیسوں کے کچھ کو اڈر زہوں اور کوٹھی کے آگے کھلا احاطہ جیسے گھوڑوں کو سدھانے کے کام آتا ہو۔ کچھ آونی سٹی پہلی سی رشتائیاں اوڑھے پھاٹک سے باہر نکل رہے تھے۔ شاید یہ وہی میو لوگ تھے جن کے سہائے وکیل صاحب کی پریکٹس چل رہی تھی۔ وہ صبح صبح رفع حاجت کے لیے باہر جا رہے تھے۔ رات انھوں نے یہیں گزاری تھی۔ شاید آج ان کی عدالت میں بیٹھی ہو۔ اس کے قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ کوٹھی سے ایک صاحب باہر نکلے۔ خوب بڑھی ہوئی توند، سر بالکل منڈا ہوا اور گھٹنوں کے ذریعے تک چڑھی ہوئی دھوٹی۔ میرا ذہن یہ گواہ نہ کر سکا کہ میں انہیں وکیل صاحب سمجھوں، پر تھے وہ وکیل صاحب ہی، جن سے میرا اس دن تعارف ہوا جب میں اور شادہ انبیاں کے ہاں چائے پرائے گئے تھے۔

”تمہاری سہیلی کی کوٹھی کیسی ہے شادہ؟“ میں نے کوٹھی کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”نیناں کے پتا پرانے خیالوں کے آدمی ہیں۔ وہ اس طرف کم ہی دھیان دیتے ہیں“ شادہ نے جواب دیا۔

”آخرا بڑا احاطہ گھیرنے کا فائدہ؟ اس میں تو ایک ریاضی کی پکھل کھل سکتا ہے؟“

”آپ ہمیشہ انٹی باتیں ہی سوچیں گے“

مادر فاتی جائداد کو اس بڑی طرہ ہی استعمال میں لانا ہو تو اسے قومی ملکیت قرار دے دین چاہئے۔ میں نے ناک پر دو مال رکھنے کا ضرورت محسوس کی۔ ایک طرف بندھی ہوئی گوبریں لت پت چھینسوں نے اچھا خاصا گرگھسان بنیا رکھا تھا۔

اس وقت نینال اندر سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے پاؤں سے احاطے میں وصول کئے بادل اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”نستے بھائی صاحب!“ اور پھر اس نے اشارہ کرنا کہ اپنے ساتھ چٹا لیا اور دونوں بیٹے لگیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور وصول میرے سوتے پر جم رہی تھی۔ کم بخت کو آج ہی ڈرائی کلین کر کے پہنا تھا۔

نینال بھی ایک بڑے سے ہال بنا کرے میں سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ ہال کمرے میں سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ ان کا ڈرائنگ روم اور اس میں شام کا سائرمی تھا جانا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور کچھ کرسیاں بڑی تھیں۔ فرش پر غالباً ایک درو بھی تھی اور دیواریں بہت اونچی اور سفید تھیں ان پر کبیں کوئی پرانا کیلنڈر بھی تھا جس چھوٹے سے کمرے میں جم آئے وہ خاصا اچھا تھا۔  
”دیر نینال کا کمرہ ہے بھائی بھان!“ اشارہ کرنے مجھے مخاطب کیا۔

”کمرہ نہیں یہ میری پناہ گاہ ہے۔“ نینال نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ کچھ روز پہلے جو ہرنی میری آہٹ پا کر چوٹا تھی وہ واقعی زخمی تھی اور اس کے سینے میں کوئی گہرا گھاؤ تھا۔

”مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی نخلستان ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور میرا گھر ایک صحرا۔ جب بگلوں کا طوفان اٹھتا ہے تو اس سے بچنے کے لیے یہی سارا ایسے کام آتا ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی اور پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا ایک دیوار کے سہارے اس کا پتلا تھا اور اس کے ساتھ ہی تپائی تھی جس پر ایک خوبصورت طویل ٹیپ رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ کتابوں کی بڑی سی الماری رکھی تھی جس کے باہر چھوٹا قفل لگا تھا شمالی دیوار کے ساتھ ایک آرام کر رہی تھی جہاں بیٹھ کر الماری کی ایک ایک کتاب پر نظر پڑ سکتی تھی۔ اس دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو کچھ کھلے اجڑے کی طرف کھلتی تھی کھڑکی پر ہلکے آسمانی رنگ کا پردہ تھا جو شاید اٹھایا کم ہی جاتا تھا۔ جنوبی دیوار میں کمرے کا دروازہ تھا جس میں پر کی جگہ جتنی بڑی تھی۔ فرش پر ایک نفیس کارپٹ تھا اور ایک کونے میں بیٹی کے گیلے میں زرگس کے پھول تھے میں نے سگریٹ سلگایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کتابوں کی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا اشارہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید امیری خادموں سے واقف ہے، بیکار میں بنیر ٹوکا کرتی۔ اس وقت ٹوکتی ہے جب اس کے خیال میں میں حد سے گزر جاؤں۔ الماری کے ایک خانے میں کتابوں کی قطار کے اوپر فریم میں لگی نینال کی تصویر رکھی تھی۔ میں اسے دیکھنے لگا۔

”دیر کتا میں دیکھی جا رہی ہیں یا تصویر؟“ اشارہ دیا بولی۔

”کھانا میں بھی اچھی ہیں اور تصویر بھی!“ میں نے جواب دیا اور کتابوں کو زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

ہندی سا ہندیہ کی نمائندہ کتابیں موجود تھیں۔ انگلش اور فرنچ لٹریچر کی بہت سی اچھی اچھی کتابیں تھیں اور اردو ادب، نظم اور نثر دونوں کی تخلیقات موجود تھیں۔ کتابوں کو دیکھ چکے کے بعد پھر تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک جوان سی لڑکی جس کا ماحول تنا خشک اور غیر ادبی ہو ذہنی طور پر اتنی اچھی طرح کیسے نکھر سکتی ہے۔ اس کی شخصیت کو ابھارنے میں ضرور کسی دوسرے شخص کا ہاتھ ہے۔ میں ایک نئی آنکھ میں محسوس کیا اتنے میں نینال کمرے میں داخل ہو گئی۔

مچاٹے آرہی ہے، اسے آپ میری کتابیں دیکھ رہے ہیں!“

”ہاں بغیر تمہاری اجازت کے“ میں نے جواب دیا۔

مجھے لوگوں میں یہ اجیون گزار رہا ہے وہ اجازت لینے کے قائل نہیں۔ وہ تو میرے خط تک اٹھا کر پڑھ لیتے ہیں اور محسوس نہیں کرتے کہ یہ رویہ غلط ہے؟

اس کی آنکھوں میں پھر ایک دم ایک درد سا لہرا گیا۔ کتنی بیزار تھی اپنے ماحول سے وہ۔ اس نے الماری کی چابی مجھے دی اور میں الماری کھول کر کتابیں دیکھنے لگا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا:

”نیناں یہ سب کتابیں تم نے خریدی ہیں؟“

”جی نہیں۔ بہت سی کتابیں میرے بھائی صاحب بھیجنے رہتے ہیں۔“

”کہاں ہیں تمہارے بھائی صاحب؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا انہیں؟“ شاردہ نے پوچھا۔

”کوئی برسوں سے الہ آباد میں وکالت کر رہے ہیں بہت دنوں وہ اس ماحول میں گڑھتے رہے اور آخر اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہیں رہتے ہیں کبیں سال ڈیڑھ سال میں وہ ایک دن کے لیے یہاں آتے ہیں۔“

”کبھی آئیں تو مجھے ملانا۔“ شاردہ نے کہا۔

”ہو سکے تو مجھے بھی۔“ میں نے کہا۔

”مجھے تو جملی ہوتی ہے شاردہ کو دیکھ کر جسے آپ جیسا بھائی ملا ہے اور جو زندگی کا ہر لمحہ اس کے ساتھ گزارا سکتی ہے۔“

”شاردہ! تو مجھے ہر وقت کوستی ہے۔“

”بہنیں کو سانسین کرتیں دعائیں دیا کرتی ہیں بھائی صاحب! اور جب ان کے پاس دعائیں ختم ہو جاتی ہیں تو دو آنسو بھیٹ

بھی کر دیتی ہیں۔“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسوؤں کی لمبی انہرائی تھی۔ یہ لمبی گواہ تھی اس محبت اور عقیدت کی

جو اسے اپنے بھائی سے تھی۔

اس کا بھائی بھی اس دھول بھرے احاطے میں گھسٹتا رہا اور جب ان بگولوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہار گیا تو بھاگ گیا۔ اس نے گرم گرم چائے کا ایک گھونٹ پیا اور پھر کہنے لگی:

”دیکھو بھی انہی کا ہے۔ جاتے ہوئے مجھے نے گئے تھے۔ جب یہاں آتے ہیں تو اسی کمرے میں رہتے ہیں۔ رات دن ہم دونوں یہاں اس کمرے میں پڑے رہتے ہیں۔ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے علاوہ کوئی اور دنیا بھی ہے۔ دنیا سے اس طرح کٹ مہانے میں کتنا آندہ ہے۔“

شاردہ کے ہونٹوں سے ایک طویل آہ نکل گئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر لمبی سی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے دھند بھری گھائیٹوں میں سورج کا پہلا اجالا پھلنے لگے۔

شاردہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کھلے اور پُر اسرار انداز میں اس نے کبھی باتیں نہ کی تھیں۔

مضمون میں آپ کو بھائی صاحب کی تصویر دکھاتی ہوں۔  
وہ کمرے سے اٹھی اور الماری میں کتابوں کے اوپر رکھی اپنی تصویر کو اٹھلائی اس کے خیر کو کھولی کہ اس نے اپنی تصویر کے نیچے سے  
ایک تصویر نکالی۔

”دیکھئے یہ ہے ان کی تصویر۔“ اس نے تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایک خوبصورت نوجوان نیکیے نیکیے نقوش کھلا تھا اور کمرے  
آنکھیں۔ ایسی ہی آنکھیں نیناں کی تھیں۔ آنکھوں کی یہ گہرائی ہو! ان دونوں میں مشترک تھی۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر وہ دونوں کھڑے تھے۔ نیناں اور  
اس کا بھائی۔ میں نے تصویر شادو کی طرف بڑھائی اور پھر نیناں کو توڑ سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیاں کئی پراسرار تھیں اور مجھے یوں لگا جیسے نیناں  
نے اپنی تصویر کے نیچے اپنے بھائی کی تصویر رکھ کر غیر ارادی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے بھائی کی شخصیت ہی اس کی دھار کا باعث ہے۔  
اتنے میں جتنی اٹھا کر کوئی داخل ہوا۔

”نستے پناجی!“ شاردہ اکرسی سے اٹھی۔ وہ انہیں جانتی تھی۔  
”نستے!“ مجھے بھی کرسی سے اٹھنا پڑا۔

نیناں شاید اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھیں۔ وہ اٹھنے لگی تو پاسے کی پیالی تپائی سے خوش ہو کر گر گئی۔  
”تم بھی اتنی ہی بے اعتیاد ہو بیٹی؟“ انھوں نے شاردہ کو مخاطب کیا اور پھر مجھے کچھ کہنے سے بغیر جتنی اٹھا کر باہر نکل گئے۔  
”نیناں در بات سننا“ ان کی آواز آئی اور نیناں خاموشی سے باہر نکل گئی۔

کچھ لمحوں کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں درد کی آگنی تھنی دھند بھر گئی تھی کہ وہ ابھی  
طرح کھل بھی نہ رہی تھیں۔

میں لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ اس کے بھائی نے اپنی تمام خیریت اور اخلاص کے ساتھ نیناں پر پہلے حد  
ظلم کیا تھا اس نے اپنے ماحول سے انتقام لینے کے لیے اپنی ہی کو چڑھا تھا۔

اس نے اس کے گرد تخیل، تصور اور ادب کا طعنی جال ہی دیا تھا اور وہ سحر ہو کر ادنگھر رہی تھی۔ اب وہ ناول کے کرداروں  
کی طرح جیتی تھی۔ نظموں کی تشبیہوں کی طرح حرکت کرتی تھی اور کہانیوں کے ہیرو کی طرح اپنے جیون کے خاکے بناتی تھی۔ عملی طور پر وہ  
اپنا بیچ بنتی جا رہی تھی۔ وہ اس جھوٹے سے کمرے کے پراسرار ماحول میں رہ کر بھول جاتی تھی کہ اس کے باہر ایک اجازت اور سنسن  
دنیا ہے۔ اس کے گھر کا ماحول نہایت کھردرا اور اکھڑ ہے۔ وہ کونے میں اگلے زنگس کے چھوٹوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنے سے انکار کر  
رہی تھی کہ اس کے جیون کے گرد تیز کانٹوں کی ایک ادھنی باڑ ہے اور اس نے جب بھی اڑنے کی کوشش کی وہ پھیلے کانٹے اٹھے ہوئے  
بھالوں کی طرح اس کا راستہ روکیں گے۔ اس سب کا ذمہ دار اس کا بھائی تھا جس کی تصویر کو اس نے اپنی تصویر کے نیچے رکھ کر اپنی  
شخصیت کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر ڈالا تھا۔

میری سوچ کا مسدہ اچانک ٹوٹ گیا۔

”معاف کیجئے گا بھائی صاحب!“ نیناں اٹھ جوڑ کر معافی مانگ رہی تھی اور میں بہ نہ سمجھا تھا کہ وہ کس تصویر کی معافی مانگ رہی  
تھی۔ لے کس بات کا افسوس تھا۔

”کس لیے؟“ میں نے پوچھا اور ایک بار اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھا جو بڑی طرح کپکپا رہے تھے۔  
”آپ بھی نہیں سمجھیں!“ اور اس کی آنکھوں میں سلگتے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے اور آنسوؤں کی اس روشنی میں سب کچھ نظر آگیا۔ میں نے سب کچھ جان لیا۔ شادوانے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے میری نگاہ کو چند لمحوں کے لیے روشنی مدھم ہو گئی۔

”بے بس ہو کر جینا سب سے بڑا پاپ ہے شادوا!“ اس نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک بار کتابوں سے بھری ہوئی بڑی سی الماری کی طرف دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ ایک دن یہ الماری اپنے پورے وزن کے ساتھ بیناں کے اوپر گر پڑے گی اور اسے سدا کے لیے پانیچ کڑا لے گی۔  
جب میں اور شادوا اس کے گھر سے واپس آئے تو ہم دونوں ادا اس تھے۔ بہت دیر خاموش چلتے رہے جیسے دونوں کے دلوں پر بہت بڑا بوجھ پڑا ہو۔

اس کے بعد میں کبھی بیناں کے گھر نہیں گیا۔ اس نے مجھے کبھی بلایا بھی نہیں۔  
شادوا کیلی ہی جاتی تھی۔ خود وہ ہفتے میں ایک آدھ بار ہمارے گھر آ جاتا کرتی تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنی کمائی بھی لے آتی۔ کمائی سناتے سناتے وہ اس میں اس قدر کھو جاتی کہ کئی دفعہ اسے ہماری موجودگی کا بھی احساس نہ رہتا۔ میں جب کبھی سیر کے لیے جاتا تو اس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے محسوس کرتا جیسے صحرائے گولے اس گھر کی صوبوں سے اُچھڑ کر انہیں جھلس ڈالتے ہوں۔ اس کے پتا کبھی کبھار دکھائی پڑ جاتے تھے کہ وہ مجھے پہچانتے ہی نہیں تھے۔ لمحہ بھر کی ملاقات پہچانتے کے لیے کافی بھی نہ تھی۔ میری ذاتیت بیناں سے بڑھ کر اس کے گھر والوں تک نہ پہنچ سکتی۔ البتہ بیناں کو میں زیادہ سے زیادہ پہچانتا گیا۔ اس کی شخصیت اپنی ساری برائیوں کے ساتھ میری سمجھ میں آنے لگی۔

اس کی اکثر کہانیوں میں ایک ادھورے پن کا سا احساس ہوتا تھا جیسے وہ کمائی کو انگلی پکڑے ہوئے کسی بازار میں سے گزر رہی ہو اور بھڑکے ریلے میں اچانک اس کا ہاتھ چھوٹ گیا ہو اور کہانی کہیں گم ہو گئی ہو اور وہ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود اسے نہ پاسکی ہو اور اس کے انداز میں ایک جھٹلاہٹ، افسردگی اور شکستگی سی بھر گئی ہو۔ بول لگتا تھا جیسے کمائی کو لکھتے لکھتے وہ اسے اچانک کسی جگہ چھوڑ دی ہے۔ ایک عجیب سی حسرت اور ترشہ لبی رہ جاتی تھی اس کی کہانیوں میں اس کے کردار عام زندگی کے کردار نہ ہوتے تھے۔ وہ ان کا انتخاب دھرتی سے نہیں آکاش سے کرتی تھی۔ آدھری اس کے سامنے سب سے پہلی چیز تھی۔ وہ تخلیق کے پنکھوں پر اُٹتے ہوئے دھرتی سے بہت دور دنیا میں پرواز کرنے کی کوشش کرتی تھی اس لیے اس کی کہانیوں کے کردار اپنے بھرپور خلوص کے ساتھ بھی بے جان ہوتے تھے۔ ان میں جو کت آمیز زندگی نہ ہوتی تھی۔ ایک ٹھٹھرن اور مجھدم کی کیفیت تھی۔ گرمی اور چلت پھرت نہ تھی۔ ایک بے دلی اور اکٹا ہٹ سی تھی۔ میں نے اسے کئی بار کہا بھی کہ فن کار کو اپنی ذات سے باہر نکل کر اپنے ارد گرد کے ماحول کو گہری نظروں سے مٹھ لانا چاہئے۔ جو کردار اسے وہاں سے ملے گے وہ زیادہ جاندار اور زندگی آمیز ہوں گے۔ پر یوں نظر آتا تھا جیسے وہ مجبوری ہو گئی تھی۔ اس کا ایک زاویہ نگاہ بن چکا تھا اور اس کا جہان اس سے سبکدوڑ میں دوڑ رہے ہوئے بھی اس ناویہ نگاہ کو بچھڑنے سے جاتا تھا۔ کاش اس کے نزدیک کوئی ایسا شخص ہوتا جو اسے اپنے ماحول کے کھر دے پس سے پنچنے کے لیے پھیلنے کی بھول بھلیاں

یہ بھکنے کی بجائے حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں پر کھڑا کر دینا جہاں ہواؤں کے تیز تیز رسیے اس سے ٹکراتے اور ٹیڑھی ٹیڑھی مندوش پگڈنڈیاں سے اپنی حفاظت خود کرنے پر مجبور کرتیں۔

پہر ایسا نہ ہوا اور وہ اپنی ہی ماہ پر چلتی رہی اور اس کی کمانیوں میں حسرت اور افسردگی بڑھتی گئی اور اس کی آنکھوں کی گہرائیاں زیادہ پراسرار اور خاموش ہوتی گئیں۔ اس کے ہونٹوں کا مسکراہٹ میں معصومیت کی جگہ زہر خند نمایاں ہونے لگا۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ جہاں اسے محبت اور خلوص کی شمع کی ضرورت تھی۔ ایک بھائی کی نہیں ایک محبوب کی محبت۔ ایک ایسے شخص کی محبت جس کی آنکھوں میں اس کی شخصیت کا ہر فیلا پہلو گھیل جائے۔ اس کے ہونٹوں کے یا قوت و کم سکیں اور رخساروں کے پھول ایک اٹھیں اور اس کے ماحول میں ایسی کوئی ہستی نہ ملے۔ اس کے گھر کے باہر ایک ادبچی دیوار تھی جسے کوئی نہ پھلانگ سکتا تھا۔ اس کا تخیل اسے جس چیزوں میں بے جانا چاہتا تھا وہ بہت دور سے اور ان کے ارد گرد بہت گہرا پانی تھا جس میں اتنا اس کے بس میں نہ تھا۔

جذیرے زیادہ خوبصورت ہوتے گئے۔

ان کے گرد پھیلا ہوا پانی زیادہ گہرا ہوتا گیا۔

اس کی الماری میں کتابوں کی تعداد بڑھتی گئی۔

اور اس کا تخیل کمشتاں کی تلاش کرتا رہا۔

ایک دن شادوانے مجھے بتایا کہ مینا کے بیاہ کی بات ہو رہی ہے اور پھر چاہتا ہے کہ اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔

تمام دن اپنے کمرے میں پڑی جانے لگا کرتی رہتی ہے۔

مینا کے پناشادی بیاہ کے معاملے میں مدد سے زیادہ کرتے۔ وہ راجپوت بنے اور راجپوتوں کے بھی ایک خاص طبقے سے تعلق رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب لڑکی کی ڈولی اٹھ جائے تو پھر سسرال کی حویلی سے اس کی ادھی بچی نکلتی چاہئے۔ جیسے جی واپس آنا اس کے ماں باپ کی توہین ہے۔ مینا کا بھائی اس سے متفق نہ تھا اور اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ وہاں شکست کھا کر ان کی خود داری زخمی ہو گئی تھی اور اب پورے جوش کے ساتھ وہ اس نئے محاذ پر ڈٹ گئے تھے۔ مینا کی شادی انھوں نے اگرہ کے ایک گاؤں میں طے کی تھی۔ لڑکا فوج میں حوالدار تھا اور اب ریٹائر ہو کر واپس آ گیا تھا۔ ان کی بہت کافی زمین تھی اور وہ اس کا اکیلا مالک تھا۔ اس کا باپ بوڑھا تھا اور سن چودہ کی جگہ میں اپنا ایک بازو گنوا چکا تھا۔ ان کی ایک بہت بڑی پرائی حویلی تھی۔ مینا کا گھر تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہ رکھتا تھا۔ حویلی کے گرد ایک بہت اونچی فصیل تھی۔ کسی زمانے میں وہ ایک قلعہ تھا، بعد میں وہ ایک حویلی میں منتقل ہو گیا۔ ان کے پاس دس بھینسیں تھیں، اگرچہ دو بھینسوں سے بھی کام چل سکتا تھا۔ اُدھا گاؤں جو ان کے مزارعوں پر مشتمل تھا ان کے گھر سے چھوچھو جاتا تھا۔ بیویوں کی کئی جوڑیاں تھیں اور دو بھلیاں تھیں انہی خوبصورت لڑکیاں بھی ان کے آگے بھیج دیں۔

مینا کے پتانے اپنے لڑکے سے اس معاملے میں کوئی مشورہ نہ کیا تھا۔ مینا نے جو حالات اسے ماں سے معلوم ہو سکے اپنے بھائی کو کلمہ دیئے۔ اس کے بھائی نے جب پتا کے فیصلے کی مخالفت کی تو دیل صاحب نے اسے ایسے الفاظ کھکھے کہ اس نے اٹھ سسکا کے لیے تمنعات توڑ لیے۔ اس نے مینا کو عین منہ ہار میں چھوڑ دیا۔ جس مہائے پر اسے اب تک ناز تھا وہ اس سے چھین گیا۔ وہ

ماں باپ کے فیصلے کے خلاف ایک لفظ نہ کہہ سکی اور اس کو نہ سمجھے کے عاروں سے بچنے کے لیے اپنی پناہ گاہ میں دھک لگئی اور یوں ہے جس ہو گئی جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اس کی شادی کرکس کے دلوں میں ہوئی۔ میں ان دلوں ایجوکیشن ٹور کے سلسلے میں جنوبی ہندوستان گیا ہوا تھا۔ جب میں واپس آیا تو وہ سسرال جا چکی تھی۔ شادوانے مجھے بتایا کہ جس روز نیناں کی برات آئی اسے کئی بار بے ہوشی کے دور سے پڑے اور اب سسرال میں اسے ایسے ہی دور سے پڑتے تھے۔

”بیاباہ کے دن اس نے کئی بار آپ کا پوچھا“

”کیوں؟“

”کتنی مٹی میرا بھائی بیاباہ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اسے بھائی جانی ہوتے تو مجھے مزدور ڈھارس ملتی“

”کاش میں یہاں ہوتا!“ میں نے کہا۔

دو روز سے نیناں سسرال سے آئی ہوئی ہے۔ اس کا خاندان بھی ساتھ ہے۔ میں اسے شادی پر کچھ بھی بھیجتا نہیں کر سکا۔ شادوانے کہا کہ بھائی مجھے مزدور کوئی تحفہ دینا چاہئے۔ بہت سوچنے کے بعد مجھے خیال آیا ”مرقع چغتائی“ اس کی الماری میں نہیں۔ یہ کتاب اس کے بھائی نے اسے بھیجتا نہیں کی، میں ہی کر دوں۔ میں نے اپنی کتابوں میں سے اسے نکالا۔ یہ کتاب مجھے بے حد عزیز تھی اسے کبھی کبھار ہی الماری سے نکال کر پڑھتا تھا۔ سوچا ہی نیناں کو دے دوں وہ مزدور پسند کرے گی۔ میں اور شادوا ”مرقع چغتائی“ لے کر اس کے گھر گئے۔ میں باہر کھڑا رہا اس کے ساتھ اندر نہیں گیا۔

اس نے نیناں کو میرے آنے کی اطلاع دی پر وہ اس روز کی طرح جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا اپنے وصول ہونے کے لمحے میں گرد اڑاتی ہوئی نہیں آئی۔ در در اکہڑے میں کھڑی رہی اور شادوا ہی مجھے میسنے آئی۔

آج وہ ہمیں اپنے کمرے میں نہیں لے گئی۔ اس بڑے سے ڈرائنگ روم میں ہی بٹھایا جو ڈرائنگ روم سے زیادہ ایک کورٹ روم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب گہرائیوں کی جگہ وحشت بھر گئی تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ٹھوس اور بے حس ہو گیا تھا اس کے ہونٹ ایک دوسرے پر سختی سے جم گئے تھے جیسے مدتوں سے ان پر مسکاپٹ نہ کھلی ہو۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں احساس ہوا جیسے میں نیناں سے نہیں مل رہا، ایک جرم کو دیکھ رہا ہوں جو کچھری میں اپنے کسی ناکرہ جرم کی سزا کا فیصلہ سننے کھڑے ہیں کھڑا ہو۔ جس کے دماغوں میں ہنگامی اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں۔

”بہت دلوں میں آئے آپ بھائی صاحب؟“ اس کی آوازیں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کوئی شکایت نہ اُکھانا نہ پیار۔ خالی آواز تھی۔

ہر جذبے سے محروم۔

میں یہاں نہیں تھا نیناں۔ تمہاری شادی میں شریک نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔ میری بات سن کر اس کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے کسی دیوانے کو کسی راہ چلتے ہوئے نے پھیر دیا ہو۔ اس نے کہا کچھ نہیں خاموش رہی۔ صرف ایک بار میری طرف دیکھا۔ اس نظر میں آن گنت شعلوں کی تپش تھی۔



”میں ہی لائی ہوں جناب کو۔ نہیں تو یہ آج بھی نہ آتے۔“ شاردانے مسکراتے ہوئے کہا کہ نصاب چھائی سجدہ کی چٹ جاتے، پر گھٹا بہت گھسی مٹی جیٹی نہیں بلکہ اور تپتے جھک گئی۔

”بھائی صاحب میں نے اپنا کمرہ بند کر دیا ہے۔“

”دیکھو؟“

”اور اپنی تمام کتابوں کو پھاڑ کر مٹا دیا ہے۔“ اس نے میرے سوال کی طرف دھمکان ہی نہ دیا اور اپنی بات کھتی گئی۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“ میں نے پوچھا مگر اس نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

”اپنے ماحول سے انتقام لینے کا میرے پاس ہی ایک طریقہ تھا۔ میں دلیپ سنگھ نہیں مٹی کہ یہاں سے بھاگ جاتی۔“

دلیپ سنگھ اس کے بھائی کا نام تھا۔ وہ دلیپ سنگھ کی بھادری کا اعتراف کر رہی تھی یا اس کی بزدلی پر طنز میں نہ سمجھ پایا۔

اور اس وقت پچیس پچیس برس کا ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ نیناں اسی طرح بیٹھ رہی جیسے اسے اس کے کمرے کی خیمہ ہی نہ ہو۔

”نشتہ جیاجی؟“ شاردان اپنی جگہ سے اٹھی۔

”میرے بھائی جان۔“

اس نے آگے بڑھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر صوفے کی طرف لپکا جہاں نیناں بیٹھی تھی۔

وہ اس کے پہلو میں بیٹھا ہی تھا کہ نیناں کی آنکھیں اس پر گر گئیں جیسے مجرم پوری توجہ سے اپنے فیصلے کی عبادت سن رہا ہو اور اس کی نظریں بچ پر جم گئی ہوں اور پھر اس نے آنکھیں تیزی سے جھپکنی شروع کر دیں اور اس کا سر ایک دم صوفے کی پشت پر ٹک گیا۔

اسے پھر غشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کتور چھپالی سنگھ، اس کا خاندان گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا اور چند ہی لمحوں میں نیناں کی ماں پانی کا گلاس لئے آئی۔ نیناں بڑبڑا رہی تھی۔

”بھائی صاحب میں نے انتقام لے لیا ہے۔ میں نے انتقام.....“

ماں نے اس کے منہ میں پانی ڈالا۔ شاردانے اٹھ کر اسے سہارا دیا اور کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آ گیا۔ وہ بچوں لگ رہی تھی جیسے چھائی کے تختے پر کھڑی ہو اور چھائی کا رستہ اس کی نظروں کے سامنے جھول رہا ہو۔ شاردان صوفے میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اسے اپنے بازو میں لے رہی تھی۔ ماں خالی گلاس لے کر چلی گئی۔ میں نے اپنی جھولی میں پڑے مرقع چھائی، کو ٹٹولا۔ وہ وہیں تھا۔ غائب نہیں ہوا تھا لیکن نیناں کے کمرے میں اب ایک بھی کتاب باقی نہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کتابوں کی اتنی بڑی الماری نیناں کے اوپر گر گئی تھی اور نیناں سدا کے لیے اپنا بچ ہو گئی تھی اور اس کی تصویر کا فریم ٹوٹ گیا تھا اور اس کی تصویر کی جگہ اب دلیپ سنگھ کی تصویر تھی اور اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

”تو اب چلیں شاردان؟“

شاردانے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اپنی کتاب تو بھینٹ کر دو۔

لیکن میں نے آنکھیں جھکا لیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا مرقع چھائی، میری بغل میں تھام لیا۔ نیناں اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ بولی تک نہیں۔

چپ چاپ کھڑی ہو گئی اور پھر ہمارے ساتھ برآمدے میں آگئی اور وہاں ایک دم رگ گئی۔ شاردہ اور میں احاطے میں وصول  
اڑتے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے ٹھوہر کے لیے میں نے بیناں کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی اور اس کی  
آنکھیں جانے کس نے پرگڑ پھینکی تھیں۔

میں شاردہ کو بازو سے پکڑ کر جلدی جلدی سڑک پر لے آیا۔ اس نے مجھ سے منیں پر چاکر میں نے ”مرقع چغتائی“ بیناں کو  
بھینٹ کیوں نہیں کیا۔ پر مجھے اس کی عادت کا پتہ ہے وہ پوچھے گی ضرور۔

میں نے جانے کتنے ہی سگرٹ پھونک ڈالے ہیں۔ میرے ارد گرد گناہمواں پھیلا ہوا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر شاردہ  
نے مجھ سے یہ بات پوچھ لی تو کیا جواب دوی گا؟

# ماتی پستان

## میرزا ادیب

اس دن سارا شہر شیخ خیر الدین مرحوم کا پہلا جنم دن منا رہا تھا۔  
یہ دن منانے کے لئے کئی ہفتوں سے بڑی مشرور و مد کے ساتھ تہواریاں ہو رہی تھیں چنانچہ اخبارات کے خاص نمبر  
شائع ہو رہے تھے، رسائی و جرائد میں مرحوم کی تعادیر چھاپی جا رہی تھیں اور انوار کی شام کو کارپوریشن کے میئر کی زیر صدارت  
عاموں میں ایک عظیم الشان عام جلسہ بھی ہو رہا تھا۔ اس جلسے میں شہر کی کئی مشہور و ممتاز ہستیاں مرحوم و مظلوم کی زندگی کے  
واقعات پر روشنی ڈالی رہی تھیں۔ اور مجھے بھی اسی سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے مرحوم سے ذاتی واقفیت تھی اس کے  
علاوہ اخبارات و رسائی میں چھپے ہوئے مضامین کے مطالعے کے بعد میرے پاس اتنا مواد جمع ہو گیا تھا کہ ان کے بارے میں  
ایک تقریر کیا کم سے کم دس لمبی چوڑی تقریریں تیار کر سکتا تھا مگر میں چاہتا تھا کہ جو کچھ لکھوں وہ مرحوم کی زندگی کے صرف  
ایک سرے سے متعلق ہو اور اس کے لئے میں نے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ تھا شیخ خیر الدین مرحوم کے احسانات عام  
لوگوں پر۔ مواد لکھوں کے سامنے بکھرا پڑا تھا اور میرا قلم بڑی تیزی سے اسے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک  
نہیں کہ شیخ صاحب مرحوم شہر کے مشہور رئیسوں میں سے تھے، آبائی وراثت میں آپ کو کافی جائداد ملی تھی اس کے علاوہ اپنی ذاتی  
کوششوں سے بھی آپ نے دولت میں کافی اضافہ کر لیا تھا مگر دیکھتے والی حیات ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی دولت کو کمال تک خرچ  
کیا اور مرحوم کے نزدیک اپنے سرمائے کا حقیقی مصرف کیا تھا۔ شیخ صاحب بے نواؤں کا امرا اور غنیوں کا ملجا تھے۔ ساری عمر  
خلق خدا کی خدمت کرتے رہے آپ نے اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ لوگوں کی بہتری کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ استاد ذوق کا  
ایک شعر ہے۔

”نام منظور ہے توفیق کے اسباب بنا

پہل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا“

اور مرحوم اس شعر کی زندہ تعبیر تھے۔ آج خیر الدین ہسپتال کا نام کوئی نہیں جانتا؟ اس ہسپتال میں روزانہ میسرین رضی اللہ عنہما  
ہم ملے آہ را اکثر رضیوں کو دوا بالکل مفت دی جاتی ہے۔ مرحوم نے صرف یہ ہسپتال ہی نہیں یہی جیب خاص سے ایک مختل  
مرفعت کے ایک تعمیر خانہ بھی تعمیر کروایا تھا اور آج بھی اس تعمیر خانے میں قوم کے کئی بے نوا اور بے امرا بچے پرورش پا رہے

ہیں۔ بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا۔  
”باؤبی! ایک خط لکھ دو گے۔“

میرا قلم چلتے چلتے ٹک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر سامنے دیکھتا ہوں مہراں گراہی اپنے میسے ہاتھوں میں خالی لفافہ پکڑا  
درمیز پر کھڑی ہے۔

”خط لکھ دونا“ پھر سست نہیں ہے؟

جاننا ہوں کہ اگر اس وقت تمام خیالات کو سمیٹ نہ لیا تو پھر عبارت کا ربط و تسلسل ٹوٹ جائے گا اور  
میں وہ آسانی باقی نہیں رہے گی جو اس وقت حاصل ہے مگر کیا کیا جائے انکار کہنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مہراں گزشتہ دس  
سال سے بغیر یانی ملائے دو وہ ہتیا کر رہی ہے اور یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ انکار احسان مندی کے خلاف ہوگا  
چنانچہ میں سر کے اشارے سے اسے اندر آنے کے لئے کہتا ہوں۔ مہراں اندر آتی ہے اور فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی  
ہے۔

”باؤبی! کلیف تو ہوگی۔ میری بھی کو کھنا ہے جو راہ پینڈی میں رہتی ہے۔ تحصیل۔“

”بھئی پہلے بناؤ کھنا کیا ہے۔ پتہ بعد میں لکھا جاتا ہے۔ ذرا ٹھہرو۔ کاغذ لے لوں۔ ہاں اب بولو۔“  
”بس یہ کھنا ہے، جھیراٹ کی شام کو مائی پھاناں مر گئی ہے۔“

یہ کہنے ہی کے اس کا لہجہ سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ فاطمہ کو مائی پھاناں کے مرنے کا بڑا دکھ ہوگا۔ مائی پھاناں کو اس کا  
بڑا خیال رہتا تھا۔ جب فاطمہ کنواری تھی تو ایک دفعہ اس کا پاؤں ذرا جل گیا تھا۔ پھاناں ساوا دن گھومتی رہی اور اللہ جانے کہاں سے  
موم لے کر آئی۔ اس دن اللہ ماری بڑا نالی تھی ساوے شہر میں۔

”مائی پھاناں وہی تھی نا۔ دھوبی۔“ میں پوچھتا ہوں۔

”گلی کے آخری مکان میں تو رہتی تھی۔ آپ بکے کپڑے دھوتی ہوگی۔ سارے جتنے کے کپڑے دھوتی تھی وہ تو۔“

”یہ بات ہے بد سوں اس گھر کے سامنے چند آدمی بیٹھے تھے۔ تو مائی پھاناں مر گئی ہے۔“

”کیا کموں کتنی بہت دالی تھی وہ کام کر کے ٹھکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی ذرا بہت تھی کہ لوہے کی بنا کی ہوئی مشین“  
مہراں تعریف لے کر کہتی ہے۔

”اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ بڑی لڑا کا تھی بہت لڑتی رہتی تھی محلے کے لوگ اس سے پندہ مانگتے  
تھے۔“ میں پھاناں کی وہ خصوصیت بتانا ہوں جس کا مشہور عام ہے اور جس کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔

”لڑتی تو وہ ضرور تھی اور شور بھی بہت مچاتی تھی پورا اپنے خشم سے لڑتی تھی۔ لوگوں نے اللہ جانے بدنام  
بھی کر دیا تھا۔ میں بتاؤں تم کو کس قسم کی عورت تھی وہ تھی۔ بڑی اچھی۔ مائے آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔  
کیوں بانیں کروں۔“

میں تقریر والے کاغذ پر نظر ڈالتا ہوں۔ ”بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا۔“



وہ اپنے گھر کے حالات بتانے لگی ————— اس دن مجھے پتہ لگا کہ پھانساں دل کی بڑی نہیں ————— باؤجی وہ کچھ بڑی ہو سکتی تھی اس کا ختم ایک مراثی سے یا راز نہ کر رہا تھا پر پھر بھی جب وہ زنجی ہوتا ہے تو وہ ساری ساری رات جاگ کر اس کی خدمت کرتی ہے اور اپنی ٹولی ساکس کی تو وہ اس دن سے خدمت کر رہی ہے جس دن اس کا بیاہ ہوا تھا۔ میرا شک شبہ جاتا رہا اور میں اس کے گھر آنے جانے لگی ————— بیماری میں مولانا بخش نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ مراثی کے گھر نہیں جائے گا مگر جیسے ہی وہ خشک ہوا وہ پھانساں کی سونے کی چوڑیاں چڑھا کر فوراً اوسر بھاگا اور مراثی کو وہ چوڑیاں دے آیا۔ پھانساں کے رشتہ داروں نے کہا کہ وہ مولانا بخش کو کچھ دے پردہ اس بات پر راضی نہ ہوئی۔ میکے چلی گئی اور ایک بیٹے کے بعد پھر آگئی ————— اللہ جانے اسے کیوں اپنے ایسے بڑے ختم کا خیال نہ تھا۔ میں ہوتی اس کی جگہ تو پتہ ہے کیا کرتی تھی ادھر کا رُخ نہ کرتی کتنی کتنی ہوں، اچھا تو ایک دن کاؤ کہہ بیٹھیں کی کھڑکی میں بیٹھی روٹی کھا رہی تھی کہ ایک عورت آئی۔ کوٹنے کی طرح کالا سیاہ رنگ، قندھاری انار کی طرح ترخ آنکھیں اور گلے میں زنجیوں کی کالا۔ میں نے کہا یا اللہ! کون ہے اور کیوں یہاں آئی ہے وہ عورت کو لٹھے ملکا تھی ہوتی آئی اور میرے پاس موڑنے پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا ہنس تو کہہ رہی تھی ہے اور کیا کام ہے۔ اس پردہ بولی میرا نظم داراں ہے۔ بھری شاہ میں رہتی ہوں۔ ذرا مولانا بخش کو بلا دو۔

میں بولی کہ مائے تو تو وہی ہے مراثی ہے نا ————— نہ بابا! میں تو اس کام میں نہیں آؤں گی۔ اگر پھانساں نے سن لیا کہ تو یہاں ہے تو وہ اللہ جانے کیا کرے۔ بڑی سخت عورت ہے۔ سارا حملہ اس سے ڈرتا ہے۔ بیٹے کو وہ بولی: بہن! اب میں کہاں جاؤں گھر والوں نے مجھے نکال دیا ہے کہتے ہیں تو! داگدار ہو گئی ہے۔ مولانا بخش کو ذرا بلاؤ نا۔ اس سے پوچھوں اب داگدار کر کے مجھے کس کے حوالے کرتا ہے بد معاش کہیں گا۔ میں نے کہا: یہ تو میں نہیں جانتی کہ اب تم کہاں جاؤ پر میں اس کام میں نہیں آؤں گی کبھی۔ تو نے پھانساں کو دیکھا نہیں۔ اس نے اگر تجھے دیکھ لیا یہاں تو تیری ہڈیاں تک میں ڈالے گی ہاں اللہ جلنے بڑی سخت عورت ہے چپ چاپ یہاں سے چلی جا۔ اسی میں تیری خیریت ہے۔

وہ بولی: میں تو ضرور اس سے ملوں گی۔ کتنی دن سے وہاں نہیں گیا۔ اللہ سے کسی کی آئے کیوں آیا تھا میرے گھر اگر میں! تو مولانا بخش کو نہیں بلاتی تو میں خود اس کے گھر چلی جاؤں۔ ————— باؤجی! وہ تو پھانساں کے گھر جانے کے لئے تیار تھی پر جب میں نے خوب ڈرایا تو کہنے لگی اچھا! اپنی چلی جاتی ہوں ہاں مہرا مہرا رہتا ہے۔ اور وہ باہر نکل گئی ————— مٹی میں اوسر بھاگا میں اسے جانتے ہوئے دیکھ نہ سکی۔ سمجھ لیا اب تو اس قدر ڈر گئی ہے کہ بیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھے گی۔

صبح میں پھانساں کے گھر گئی تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ بڑا ہی عجیب تھا۔ پھانساں کیڑوں پر ستری کر رہی تھی اور وہ ————— بھلا کون ————— وہ مراثی، پھانساں کی سونے ————— موندھے پر بیٹھی وہی کے ساتھ رات کی بچی ہوئی روٹی کھا رہی تھی میں حیران ————— گئی۔ پھانساں کہنے لگی: مہراں! اجانی ہو یہ کون ہے؟ میں نے کہا: نہیں! ————— جھوٹ ٹوٹ کہہ دانا۔

تھنے لگی یہ وہی زوجی ہے واراں مراثی۔

”تو یہ یہاں۔۔۔۔۔“

”ہاں ہوا کہتی ہے مجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے۔ میرا کوئی امرا نہیں اور میں ”واگزار“ ہو گئی ہوں۔ میں نے کہا اچھا تجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے تو آجا یہاں اشد جو میں روکھی سوکھی وتبا ہے تو بھی کھا لیا کرے اور واراں بھانائی کے گھر میں رہنے لگی۔

بھانائی کے رشتہ داروں کو جب پتہ لگا کہ واراں مراثی اس کے گھر میں آگئی ہے تو وہ ہوں تو ملکا اٹھے جیسے بیٹروں کے چتے کو کسی نے چھڑو دیا ہو۔ سب نے کہا اسے فوراً گھر سے نکالی دو وگڑ بھانائی بولی ہیں اسے سہارا دے چکی ہوں اب تم سے نہیں نکالو گی۔ کہاں کہاں ماری پھرے گی یہاں سے جا کر۔۔۔۔۔ باؤ بھی ایک کموں بھانائیں کے رشتہ داروں نے بہت سختی کی۔ بھانائی کے چچا نے تو یہاں تک کہ یا اگر یہ مراثی یہاں رہے گی تو میں کبھی تمھارے گھر میں نہیں آؤں گا۔۔۔۔۔ بھانائی نے سب کچھ سنا پر اس اشد کی بندی نے واراں کو گھر سے جانے کے لئے بالکل نہ کہا۔

بھانائی پینے کی طرح ہی گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ واراں زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی اس کا پیشہ گانا بجانا تھا بھلا وہ استری کر سکتی تھی ابھی جھونک سکتی تھی۔۔۔۔۔ اچھا تو دن گذرنے گئے۔ بھانائی کے سب رشتہ داروں نے اس کا ”بیائی کاٹ“ کر دیا۔ باپ نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر واراں کہنے لگی ”بھن ابس اب زیادہ نہیں۔۔۔۔۔ میں جی جاتی ہوں اور وہ جلتے لگی۔ بھانائی نے اس کی چوٹی پکڑ لی اور گھسیٹ کر اسے اندر لے آئی۔۔۔۔۔ آس کے بعد واراں نے جانے کا نام نہ لیا۔ پانچ چھ مہینے کے بعد واراں کے یہاں بچی پیدا ہوئی۔ بڑی کمزور بچی تھی میں تو اسے دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ بچے کی نہیں پر جسے اشد رکھے اسے کون بچھے۔ بچی سہمیل گئی اور ماں کی حالت خراب ہو گئی۔ بھانائی نے اس پر کافی رقم صرف کر دی لیڈی ڈاکٹر کو بلا دیا۔ مگر وہ نہ سکی۔ اس وقت عیاشاں رہا کشتہ دوا اٹھائی جینے کی تھی!

ماں مر گئی تو بچی کی کوئی پرورش کرے۔ واراں نے مرنے وقت بھی بھانائی کے حوالے کی تھی پس بھانائی نے اسے بھانائی سے لگا لیا اور اپنی جی جان کر بانے لگی۔ اشد جانے بھانائی کو بچی سے کیوں اتنا پیار ہو گیا تھا کہ وہ اسے گود سے اتارنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی؟

مہراں کو پھر اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے میرا کافی وقت ضائع کر دیا ہے چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس خالی لفافے کو دیکھنے لگتی ہے جسے وہ ساتھ لائی تھی اور جواب چار بائی پر میرے کاغذوں کے انبار کے اوپر پڑا تھا۔

”یہ بچی زندہ رہی۔۔۔۔۔“ میں سوالی کرنا ہوں۔

مہراں کے گھٹنے پھر پڑ جاتے اور وہ جلدی سے کہتی ہے۔

”جی ہاں زندہ رہی پر بھانائی کے لئے تو ایک نصیبت بن گئی۔ تم تو چھوٹے کس طرح۔۔۔۔۔ دو اس طرح کہ جب تک

مراثی زندہ رہی لوگ بھانائی سے کہتے رہے یہ نہ ختم ہوتا ہے اسے فوراً گھر سے نکال دو اور جب وہ مر گئی تو وہ بولے۔ یہ بچی

اللہ جانے مولا نجس کی ہے بھی یا نہیں اسے اس کی نانی کے گھر چھوڑ دو۔ سنا یاد جی مطلب یہ کہ بچی کے بارے میں ان کو شک شبہ تھا۔ تو ایک دن بچا تان کے گھر بڑا دروازے کے سب لوگ جمع ہوئے اور کہنے لگے۔ دیکھو بچا تان ہم اسے تک تھا رامنہ دیکھتے رہے ہیں اب خبر یہ اسی میں ہے کہ اسے اس کی نانی کے یہاں چھوڑ دو۔ اسی وقت درنہ ہم سے بڑا کوئی نہ ہوگا۔۔۔۔۔ اس وقت بچا تان نے پتہ چھ کیا کیا۔ وہ بیٹہ تان کو بولی۔ میں اس صوم (محبوب) کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔

”اگر تم نہیں چھوڑو گی تو ہم تمہارا بی بی کاٹ کر دیں گے“ انہوں نے کہا۔

”جروں میں آئے کرو۔ میں تو اسے چھاتی سے لگا چکی ہوں اب موت ہی اسے مجھ سے جدا کرے گی۔“

مراں کے لب و لہجہ میں جوش میرا ہو گیا ہے اور وہ اس طرح بولی رہی ہے جیسے بیٹج پر بچا تان کا پارٹ کر رہی ہے۔

نور بادری نے بھانپناں کا بائیکاٹ کر دیا ہو گا۔  
 جی ہاں۔۔۔۔۔ مولائش بھی بیوی کے خلاف ہو گیا۔ بھانپناں کے دونوں لڑکے پہلے ہی مراسم کے بہت خلاف تھے وہ ماموں کے گھر چلے گئے تھے وہیں کام کاج کرتے تھے۔ میں نے سب دیکھا کہ بھانپناں اپنی ضد سے بڑا انسان (فقیر) اٹھا رہے تھے تو ایک دن اس سے بولی بھانپناں! اس بھی کو بوجھ ہی دو۔ کیا فائدہ اسے گھر میں رکھنے کا سب لوگ تمہارے خلاف ہو گئے ہیں۔  
 پرسنک وہ کہنے لگی۔

نہیں ہوا ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے اس کی ماں سے کہا تھا کہ اسے سینے سے لگا کر دکھوں گی کیوں بھجوں اسے۔ لوگ خلاف ہو گئے ہیں تو بیشک جو جا میں جب کسی کو سہارا دیا ہے تو لوگوں سے کیوں ڈریں؟ میں نے کہا: ”تمہارے بچے لڑکے ہیں تو خلاف ہو گئے ہیں؟“

بچانوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ سی گئیں۔

لوگ کہتے ہیں لڑکا ماں باپ کا بازو دھرتا ہے پر میرے لڑکے تو اللہ کی ماں پر۔ اچھا جو جا میں کہ میں ان سے ڈر نہیں جاؤں گی اللہ ہمت دے سب کام کر دیا کروں گی۔“

اور پچھاننا سب کام کرنے لگی۔ عیشاں بڑی ہونے لگی۔ پچھاننا نے رات دن محنت کر کے اس کا جہیز بنایا اپنی ساری پونجی اس پر صرف کر دی۔ جب عیشاں کا بیاہ ہوا تو پچھاننا بڑی خوش فہمی کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے پر بازو اٹھی! اگر اللہ مہربان ہو یہ بات منظور نہیں فہمی۔ عیشاں کی شادی گجرات میں ہوئی تھی۔ وہاں کسی نے عیشاں کے سسر کو بتا دیا کہ عیشاں ایک مراثی کی بیٹی ہے۔ میں بھر کیا تھا سسرال والوں نے عیشاں کو مار پیٹ کر پچھاننا کے گھر بھجوا دیا اور بعد میں کاغذ بھی بھیج دیا۔ ادھر عیشاں طلاق لے کر گھر آئی اور مرنے کی خوش خوار بن گئی۔ پچھاننا پر وہ ہراسہ مہم پڑا۔ کوئی اور ہوتا تو پاگل ہو جانا پچھاننا نے بہت مذہاری۔ لولی سانس کی بھی برابر خدمت کرتی رہی جسم کی بیماری پر بھی خرچ کیا اور لوگوں کے کپڑے بھی دھوتی رہی۔ تاہی پچھاننا کا رشتہ میں بھائی کا بیٹا تھا۔ بڑا آدمہ مگر نہ تھا۔ پچھاننا نے اسے گھر میں رکھ لیا۔ یہ



رط کا کام کارج میں مدد دینے لگا۔ وجہ یہ تھا کہ آجی ٹھیکہ ہو گیا ہے تو اس کی شادی عیشاں سے کرویں خدا خدا کر کے  
 بچانوں کے سر سے یہ بوجھ بھی اُترے۔ اب سفوف ملا بخش دو ماں تک بچا رہا اور پھر مر گیا۔ دو عیار دلی بعد بچانوں کی  
 لونی ساس بھی چل بسی۔ بچانوں کی شادی کے بعد در سے بیس برس زندہ رہی تھی یہ۔۔۔۔۔ پورے بیس برس اتنے  
 سال بچانوں نے اس کی خدمت کی تھی۔ ایک دن بچانوں کی پٹروں پر استری کر رہی تھی کہ استری سے اللہ جانے کس  
 طرف کو کئے نکل گئیں کس کے کپڑوں پر گرے اور بیماری کے گھٹے چل گئے اور وہ صحت تک پہنچ نہیں پڑی رہی۔ جمع عیشاں نے  
 نیچے اُتر کر دیکھا تو اپنا سر بیٹھ لیا۔ ہم سب مل کر اسے جا رہی پوچھا اور حکیم کو بلایا اور وہ جون میں آگئی پر اب وہ پہلی بیسی  
 نہیں تھی جا رہی تھی تو ہٹھ رہی نہیں سکی تھی بے چاری۔ نکل گئی۔ اتنا کا کہتے بچانوں نیچے سو رہی تھی اور عیشاں، آجی اور  
 ان کا بچہ اوپر بچپت پر سو رہے تھے۔ آدھی رات کو بچہ رونے لگا۔ اللہ جانے یہ تکلیف تھی اُسے۔ عیشاں کی جوانی کی طبیعت بالکل  
 بے خبر سوئی نہ رہی۔ بچانوں سے نہ دُعا گیا جسے تو اس نے آواز میں دیں پھر بھی بچہ روتا رہا تو آدھ پڑ گئی۔ اللہ جانے کس طرح ادھر پڑ گئی  
 اہ پڑا کہ اس نے بچہ گود میں اٹھالیا اور عیشاں کو کھادیا عیشاں بڑی نراغ و ناراض ہوئی۔

اور یہ بات سمجھ ہی نہ سکی۔ بچانوں کو ہوا لگ گئی اور وہ چھرات کی شام کو مر گئی۔۔۔۔۔ پچاس سال لوگوں کی خدمت کرنے کے بعد مری گئی۔

ہسٹل کی آواز بھرا جاتی ہے۔ اس کی بنکھیں فغاں ہو جاتی ہیں اور وہ دوپٹے سے منہ لپیٹ کر پوچھتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیرتی ہے۔

میں کاغذ ٹکاتا ہوں اور لکھنے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔ مہراں آنکھیں بند کر کے دوائیں ہاتھ کی آنکھوں سے ابھین دیتی رہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈی نم آلود ہو جاتی ہے۔ مہراں آنکھ ٹٹے اور انگوٹھے کی سانہ والی انگلی سے اس کی کہ خشک کرتی ہے اور ایک لمبی آہ بھر کر پوچھتی ہے۔

”کھل لیا ہے خط“

”ہاں۔ پتہ لولا“

میں خط مکمل کر کے اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ وہ اکٹھا بیٹھتی ہے اور جانے لگتی ہے۔ وہاں سے قریب پہنچ کر  
تک جاتی ہے۔

” آج شہر میں جھنڈیاں کیل لٹائی جا رہی ہیں؟ مہراں پوچھتی ہے۔

” انھیں معلوم نہیں کہ شیخ خیر الدین مرحوم کا جنم دن منایا جا رہا ہے۔“

اچھا۔ شیخ خیر الدین ————— جو نے انھیں دیکھا تھا۔ بہت بڑے آدمی تھے۔ پچاننا ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی یہ  
مہراں جی جاتی ہے۔ میں تقریر مکمل کرنے کے لئے کاغذ پر ہلکتا ہوں۔ ————— مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا۔

میری آنکھیں کے سامنے پچاننا کا بڑا چہرہ ابھرنے لگتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس چہرے پر صدیوں کی محنت، صدیوں  
کی بے لوث خدمت کا قیام چھایا ہو رہا ہے۔ اس خیال میں اس کی خاموش نظریں مجھ سے ایک سوالیہ پوچھ رہی ہیں اور میرے ذہن  
میں مہراں کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ————— خیر الدین بہت بڑے آدمی تھے پچاننا ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی۔“

# گٹاری کے اندے

دیوند رستیا ریتی

منہ میں کوئی کیر یا کوئی نغما طوڑا یا نہ تھا سے گٹاری اپنے گھونسنے میں گھس جاتی۔ گھونسنے کا درد واڑہ ایک معمولی سوراخ ہی تھا۔ اُدھ کی منزل میں نکلے والے مسل خانہ کی محبت پر جہاں ٹہن کی چادر کا برا کار یگانے باہر کو بڑھا رکھا تھا۔ بس وہیں اس ٹہن کے نیچے دیوار سے آٹھری سرے میں یہ سوراخ تھا جو گٹاری کے گھونسنے کا درد واڑہ تھا۔ نیچے، سوئی کے درد واڑے پر کھڑے کھڑے بدھ سنگھ گٹاری کو اپنے گھونسنے میں داخل ہوتے دیکھتا اور سوچتا کہ ماں کی محبت دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے۔ اور دنیا کی کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جب گٹاری کی ماں آیا پر وائٹ توپٹ کرتی کہ آج اس نے گٹاری کو دقت پر لکھا ناکیرں نہیں کھدایا، بدھ سنگھ کی نگاہ میں گٹاری کی شخصیت ابھر کر اُدھ کی آٹھ جاتی۔ جب کوئی خوف ناکہ بات ہوتی گٹاری کا جوتہ رسوئی کے بغل والے پیڑ پر بیٹھ کر ایسی ایسی آوازیں نکالتا کہ بدھ سنگھ بڑی جھکی سے ادھر ادھر دیکھتا۔ وہ کہتا: گٹاری سے بڑا انسان کا درد سرا دوست نہیں ہو سکتا۔ سانپ کو دیکھ کر سب سے پہلے گٹاری ہی شور مچاتی ہے۔

اس مکان میں ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھار سانپ نظر آ جاتا تھا۔ گٹاری کی چیخ پکار ہی سانپ کی موجودگی کا پتہ دیتی۔ اس دقت پر بدھ سنگھ ہاتھ میں لٹخا اٹھائے سانپ کی تلاش میں نکل پڑتا۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا، چنار کے نیچے تین چار سانپ مار چکا تھا۔ بدھ سنگھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔ بات کرتے وقت یوں سامنے آتا جیسے داری کے سامنے موجود، سامنے والے شخص کا جائزہ لینا اور پھر نیچے تلے انداز میں اپنا فلسفہ بچھارنے لگتا۔ ہاتھوں سے دی ہوئی لائٹیں انسان کو منہ سے کھولنی پڑتی ہیں ہمارے گورنمنٹ راج کا کہنا ہے۔ کہ سوچ کر لو۔ سوچ کر کام کرو۔ گھر والے اس سے خوش تھے۔ کیونکہ اپنے کام کے علاوہ وہ دوسروں کا کام بھی بخوشی کر دیتا۔ فریڈ پر بھری کتابوں کو تھیک کر دیتا۔ سانپ کا ذکر آنے پر تو وہ فضا میں آ جاتا۔ کہتا تھا میں اس پر چھٹ پڑوں گا، ایک ہی ڈنڈے سے اس کی سری توڑ دوں گا۔ اس کی آواز میں اتنی گنجوشی تھی کہ اس کی بات پر یقین نہ آتا۔ ضروری اور غیر ضروری بات میں وہ بہت فرق نہیں کر سکتا تھا۔ وہی گرم جوشی، وہی ٹہل پیدا کرنے والی آواز، جب وہ بات کرتا تو اس کے اکھر سے جوے گاؤں کی بڑیاں ابھرتی نظر آتیں۔ اس وقت اُدھ پر کھڑکی کے درد واڑے پر بیٹھا گٹاری کا جوتہ اتیکھی سی آواز میں بولنے لگا۔ بدھ سنگھ سوچتا کہ گٹاری اس کی داد دے رہی ہے۔

کوئی بدھ سنگھ سے بات کرے نہ کرے کبھی کبھی وہ دوسری کے برائے میں آدھنی آواز میں خود ہی باتیں کرتا رہتا۔ ابھی گھر کی کسی بات پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔ ابھی ریڈیو پر سنی ہوئی کسی خبر کو لے کر ناک مرچ لگایا جا رہا ہے۔ بات کرتے وقت وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا۔ اسے اس بات کا سب سے بڑا اطمینان تھا کہ گھر میں اس کا استقبال نہ ہو اور وہ اپنا کام ایمان داری سے کرتا ہے۔ جتنے جہان آتے ان کے ساتھ بدھ سنگھ کا سلوک ہمیشہ خوش گو اور ہنسنا چکوں سے اُسے بے حد محبت تھی۔ کئی کئی ماں اُس پر اس لیے بھی خوش تھی کہ کئی کا خدنا خیال وہ رکھتا ہے۔ ابھی نہیں دیکھتی۔ جیسا کہ شمس پر بیٹہ کو گائری اپنی زبان میں کچھ کہنے لگتی تو بدھ سنگھ پاس کھڑے ہو کر اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ گائری کہہ رہی ہے — بدھ سنگھ! میں جانتی ہوں کہ تم ایک تین آدمیوں کا کام کرتے ہو اور وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ بڑی مصروفیت سے وہ گائری کی طرف دیکھتا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو — میں تو تہا را بھی اتنا ہی دیکھتا ہوں۔ گائری جتنا لگی کی ماں کا!

بجلی کے تار پر چلتا ہوا ابھی بدھ سنگھ کو عانتا ہے۔ کم سے کم بدھ سنگھ کا یہی خیال تھا۔ کوٹے کی کابینس کا میں سے بدھ سنگھ کو پتہ چل جاتا کہ کتا بھوک سے چھوڑ رہا ہے یا خوشی کا سر جبر رہا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوٹہ عقدہ میں ہوتا۔ اُس وقت چنار کے پیر پر بیٹھی گائری چوڑا کر بدھ سنگھ سے سلامت کرتی۔ بدھ سنگھ واقعی گھبرا کر کوٹے کو آتا دیتا۔ کیونکہ بدھ سنگھ کو معلوم تھا۔ کہ گائری اور کوٹے کو یہ پرانا یہ جیلا آتا ہے اور کوٹے کی موجودگی میں گائری کو یہ محسوس نہیں ہو سکتا کہ اس کا گھوسٹ سلامت ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کوٹے اور گائری کا یہ رشتہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ کوٹے اور گائری کی فرور ہوئی میں وہ اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے اسی موصوفی پر سوچنے لگتا۔ اور پھر دیکھتے کہ کتنی دیو آدموں کو سانسے کے لیے آدھنی آواز میں کہنے لگتا۔ گائری تو بہت معصوم تھی ہے۔ وہ بے پاری تو کوٹے کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ گائری ابھی اُس کے بچوں کا دشمن ہے۔ کم بخت۔ کو کسی کا گھوسٹ اجاڑنے میں نہ جانے کیا کرتا ہے! اپنے آپ کو گائری کی خدمت کے قابل بنانے کے لیے وہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔ ساتھ ہی اُس کی یہ خواہش نہ تھی کہ گائری اُس کا شکلہ ادا کرے۔ کوٹے پر اسے عقدہ آئے لگتا۔ شیعان کو گائری پر ذرا رحم نہیں آتا۔ آخر گائری اس کا کیا بگاڑتی ہے؟

صبح کو جاگنے پر بدھ سنگھ کی نگاہ گائری کے گھوڑے پر پڑتی۔ گائری کو گھوڑے کے قریب بیٹھنے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا اس کی سب سے بڑی دل چاہی تھی کہ گائری کو مسکراتے اور چل چل کر باغیچہ کی دوش پر اُچھلتے کودتے دیکھتا۔ کئی کئی دن کے منہ سے ایک آدھ تعریف کا بول سن لیتا، یا پھر کسی جہان کے منہ سے زمانے کے حالات پر ہلکا بھلکا سا تبصرہ سن کر اُس کے بارے میں رائے قائم کرنا۔ لیکن اس سے آڑک اگر اس کی کوئی دل چاہی تھی تو وہ تھا گائری کا گھوسٹ۔ جب بھی گائری انہ سے ملتی تھی بدھ سنگھ سوچتا کہ گائری کی نئی نسل شروع ہونے والی ہے انہوں سے بچے نکلتے گا اسے ہے مدد انتظار رہتا۔ ان دنوں وہ خاص طور پر گائری کے گھوڑے کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے آدھ پر لے لیتا اُس کی نگاہ بیدھی گائری کے گھوڑے پر پہنچتی۔ حالانکہ زمین پر کھڑے کھڑے یہ نا ممکن تھا کہ کوٹھی کی آدھ پر کی منزل میں گھوڑے غلطی نہ کی چھت پر زمین کی چادر کے بڑے بڑے بچے دیوار کے آخری سرے کے گول سوراخ کے اندر کی دنیا کے بارے میں کوئی بات دریافت کی جا سکے۔ گھر کی پریشانی گائری کی آواز میں چل اور لوری کی آواز میں دیکھ کر بدھ سنگھ اندازہ لگا لیتا کہ گائری کے انہوں سے بچے نکلتے لگی آسٹیں گائری انسان کی سب سے بڑی دوست ہے! — بدھ سنگھ کا تکیہ کلام تھا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ ایسا سے بات کرتے وقت وہ عورت کو گائری سے تشبیہ دیتا۔ لیکن اس کے باوجود عورت کا صحیح تصور وہ بدھ سنگھ کے ذہن کو کبھی نہ گدگداتا۔ اسی لیے اُس

سنے کبھی بھول کر بھی بیاہ کی بات نہ سوچی تھی۔ اس دن کے ہاتھ کام کرنے کے لئے بہت کھڑے ہو گئے تھے۔ چوٹی ہوئی تو انہیں اس کے ہاتھوں پر نیکل ہی چسڑ دیا کرتی۔ لیکن اس نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ بیاہ کے جھگڑے میں نہ پڑے گا۔ بیوی کی غیر موجودگی کا تصور اسے کبھی نہ نہ کرتا۔ ایسا کہ جو بڑے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اکثر سوچتا کہ بھگیا اپنے بیٹوں کی سعادت مندی حاصل نہ کر سکی۔ روز اس عمر میں اسے کیا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے ایسے باپ بھی دیکھے تھے جن کے بیٹے ان پر جھگڑے کے بچکوں کی طرت بھینٹتے تھے۔ ایسی ماں بھی دیکھی تھیں جن کے بیٹے جو بھوکے کے غلام ہو کر اپنی ماؤں کو ایسی جی کٹی سناڑا سٹے تھے کہ شے واسے کو مہر میں نکل دیا کر دے جانا پڑتا تھا ایسے بیٹے پیدا کرنے سے کیا حاصل۔ اس یی سوچ کر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ الیڈا بنے گا۔ دم کا دم، نہ دھوکا نہ غم۔ میں اس کا فلسفہ تھا پھر بھی گن دی کے پیسے اس کی محنت اُمڈی پڑتی تھی۔

بڑھ سنگھ کا چہرہ کبھی اور اس نہ ہوتا۔ اس کی آواز میں بھی نہیں کا گمان نہ ہوتا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ دوسرے لوگوں سے کتنا مختلف ہے، ایک طرح سے وہ چرمیں بیٹھنے کا نوکر تھا۔ نوکری میں تانے کا توڑ، ال ہی نہ آتھ سکتا تھا۔ گلی کی ماں کو کبھی اس پر جبراً نہ کرنے کی دہت نہ آتی تھی۔ بلکہ وہ تو اس بات کے اتفاق میں رہتی کہ کبھی تو بڑھ سنگھ بھی بھٹی مانگے۔ کبھی تو جیسی بھی منانی جا بیٹھے گلی کی ماں اس سے کہا کرتی جینے میں ایک بھی جیٹی نہ مانے۔ تو انسان کی زندگی میں گھٹن گاب جائے یا نہیں بڑھ سنگھ بتا کہ اسے گھٹن کا ڈر نہ تھا۔

گلی کی ماں کی ساس بھی تو اسی کو بھٹی میں رہتی تھی۔ جیسی منوں دن بڑھ سنگھ گلی کی ماں کی ساس کو نوکر تھا۔ جنہیں بڑھ سنگھ سے بھابھو جی کہہ کر پکارتا۔ بھابھو جی پر تو بڑھ سنگھ جان بٹا تھا۔ جب بھابھو جی کبھی بیمار پڑتیں تو بڑھ سنگھ آدھی رات کو اٹھ کر پوچھتا: بھابھو جی! کچھ چاہیے تو منیج! بھابھو جی آتے۔ بیٹے سے بڑھ کر سمجھتی تھیں۔ اس لیے کبھی بڑھ سنگھ کسی بات سے بھجھو کہ خود ان کا من بھی بھابھو جی کو تھا۔ بڑھ سنگھ نے مانے کا خیال تھا کہ بڑھ سنگھ دل کا سچا ہے۔ اس کی بات حیرت کا کھروار ان بھابھو جی کو ڈرا بھی تو نہ اٹھتا۔ کیونکہ بڑھ سنگھ نے اپنے من سے یہ جی تو نہ لٹا تھا کہ اس کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔ گلی کی ماں بڑھ سنگھ پر اس لیے بھی خوش تھی کہ جہاں وہ بھابھو جی کا پورا خیال رکھتا ہے وہاں ضرورت پڑنے پر خاص خاص معاملوں کے آنے پر وہ سب چیزیں تیار کر دیتا ہے۔ جن پر کشمیری دسویئے کا لٹا خیاں نہیں جتا بھابھو جی ذرا پڑانے خیالات کی تھیں۔ اس لیے وہ گلی کی ماں کے کون سے ایک اپنی رسوائی بڑا کرتی تھیں۔ بڑھ سنگھ ان کا رسوینا بھی تھا۔ اور پرائیویٹ سسٹنٹ بھی۔ کیونکہ وہ ہر کام میں بڑھ سنگھ کی صلاح لیتیں۔ گلی کی ماں کے بارے میں ان کی رائے بہت اچھی تھی۔ اکثر وہ یہ کہا کرتی تھیں کہ اگر کوئی ان کی سٹی بیٹی بھی ہوتی تو شاید ان کی اتنی سبوتا نہ کرتی۔ بھابھو جی بھابھو جی کہتے گلی کی ماں کی زبان سٹوکتی تھی۔ بھابھو جی کو سب سے بڑی حیرت تو اس بات پر تھی کہ گلی کی ماں کا جنم اس قوم میں ہوا جس کی اس دیں پر حکومت نہ ہی۔ لیکن کس طرح ان کے بیٹے کے ساتھ انگلینڈ سے یہاں آنے پر اس نے اپنی طبیعت کو اس دیں کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ کس طرح وہ یہاں کے تمدن میں رہنا سکھ گئی تھی، یہ بات کچھ بہت بڑی تھی۔ اس دیں میں آنے کے بعد بھابھو جی کے ہو جیسے کو کچھ کم کش کش کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ لیکن کیا جمال کہ بھابھو جی نے اپنی بہو کے ماتھے پر تیرہری دیکھی ہو۔ خیر اب تو ان کی زندگی ایک ڈھب پر آگئی تھی۔ گلی کی ماں فرطیکوں کے کالج میں پرائیویٹ تھی۔ اور گلی کے پتاجی پھر سے وہ میگزین نکالنے جا رہے تھے۔ جس کے ذریعے انہوں نے انگلینڈ سے دہننے پر اس دیں کی بہت بڑی خدمات سر انجام دی تھیں اور جسے اقتصاد دی وجہ سے کے باعث بند کر دینا پڑا تھا۔ بڑھ سنگھ پر گلی کے پتاجی بھی بہت خوش تھے اور بھابھو جی کے کمرے میں بیٹھ کر وہ اکثر کہا کرتے: دیکھ بڑھ سنگھ! تیری بڑی بڑی دیادی ہے کہ بھابھو جی کا سارا کام سچ

زمرے رکھا ہے۔ اور بھابھی کہتیں: بیا! جیسے تم میرے بیٹے بودیابی بدھ سنگھ بیٹا ہے۔ میری بس ایک ہی اچھا ہے کہ بدھ سنگھ بیاہ کرے۔ اس کی بھی ایک بیٹی ہو گئی جیسی باگھی کے پتاجی کہتے: وہ بھابھی۔ ڈگری کر ابدھ سنگھ کی دعائی ہزار کی۔ اتنا تو بے چارے نے جوڑا بھی نہ ہو گا۔ بدھ سنگھ یہ سنتا تو کچن کی طرف چلا جاتا۔ اور اس وقت اگر لڑائی کھڑی سے ہوئی اٹھتی تو اسے عیسوی ہوتا کہ لڑائی پوچھ رہی ہے۔ تم کب بیاہ کر لو گے، بدھ سنگھ؟ وہ کچن سے باغیچہ کی طرف چلا جاتا۔ جیسے بیاہ کی بات کو ان سنا کرنے کے لیے وہ بڑی سے بڑی ہمدردی کر سکتا ہو۔

وہ کئی بار دات کو دسے پاؤں بھابھی کے کمرے میں جاتا اور سوتے میں ان کا گیمبر چرو دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوتی دے پاؤں وہ اس کمرے سے چلا آتا۔ بھابھی کا زہب دیکھ اس کی آنکھوں میں تیزا رہتا۔ ان کی گری ہو رہی اور ہمدردی آواز جیسے اس وقت اس کے کان میں بیاہ کو گونج رہی ہو۔ اسے خیال آتا کہ سوتے سے ایک لمحہ کے لیے جاگ کر بھابھی اس سے یہی کہیں گی: بدھ سنگھ! اب تو تمہیں بیاہ کرانے میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ وہ جواب کے لیے تیار رہتا۔ نہیں بھابھی! یہ نہیں ہو سکتا۔ جس نے ہمیشہ کی غلامی کا طوق لگے میں ڈانا ہو وہ بیاہ کرانے میں تو آزاد ہوں؟

کچن کے ہانڈے میں ٹھوٹے ٹھوٹے کبھی کبھی بدھ سنگھ اپنے دل سے باتیں کرتے کرتے آدھنی آواز میں کہنے لگتا: لڑائی دو اڈے جیتی ہے ایک ساتھ، دو ہانڈے میں کبھی دن ان اندوں کو سینا ہوتا ہے۔ آدھے دن لڑائی جیتی ہے، آدھے دن ٹا رہتا ہے۔ لیکن عورت اور مرد کبھی اپنے کام ہانڈ ہانڈ کر نہیں کرتے، اسی لیے تو بیاہ مصیبت بن جاتا ہے۔ نہیں بھابھی نہیں۔ بدھ سنگھ بیاہ نہیں کرانے گا۔ بدھ سنگھ اتنا بدھ نہیں ہے کہ اپنے پیروں میں ایک زنجیر ڈالے۔ بھابھی! پھر بدھ سنگھ آپ کی سیدھا بھی نہیں کیسے گا۔ بدھ سنگھ۔ اسے بیاہ کرانے کو نہ کہنا بھابھی!

لڑائی کی زد و چوخی بدھ سنگھ کو بہت بیاہی گئی تھی۔ لڑائی کے پیر بھی تو نہ دوتھے۔ ان کے بارے میں بدھ سنگھ مرے سے لے کر وہ قعدہ چھڑ دیتا۔ لڑائی کے پیر اپنے نہیں ہیں۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے جب لڑائی کے پیر اپنے ہوتے تھے۔ وہ مور کے سامنے پانچنے لگی۔ مور نے خوش ہو کر کہا: ہانڈ لے لڑائی جو تیری اچھا ہو۔ لڑائی نے مور سے کہا: تم میرے ساتھ اپنے پیر بدل لو۔ مور نے سوچا کچن دیا ہے تو پڑا کرنا چاہیے۔ بس جی مور نے اپنے پیر لڑائی کو دے دیئے اور لڑائی کے پیر خود لیے۔ آج تک مور کو اس بات کا انوس ہے یہ سو دا ہرا خاں دے کا رہا۔ لڑائی تو مور کے پیر لے کر پہلے سے کہیں زیادہ سندر ہو گئی اور مور اب تک دوتا ہے۔ جب بھی مور ناپتا ہے اسے پیروں کو دیکھے بنا نہیں رہ سکتا۔ کہتا ہے۔ میں اتنا سندر ہوں لیکن میرے پیر کتنے بھونڈے ہیں؟ اور اگر اسے آدھ کھڑکی پر بیٹھی ہوئی لڑائی نظر آ جاتی تو وہ پکار کر کہتا: تو بڑی چاناک نکل۔ تو نے مور کے پیر انا لیے بات بات میں۔ وہ لڑائی میری چٹکی لڑائی! وہ لڑائی چٹان! لڑائی کے ہر سیاہ مال مجھ سے نہ ہوتے تو نہ وہ چوخی اور نہ وہ پیر اتنے خوب صورت نہ لگتے، یہ سوچ کہ بدھ سنگھ ٹھٹھکی ہانڈ سے لڑائی کی مسرت دیکھتا رہتا۔

بھابھی اکثر بدھ سنگھ کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سنتیں اور سمجھتیں: اس طرح تو تیرا داغ چر جائے گا بدھ سنگھ! تو اپنے آپ سے باتیں نہ کیا کر! لیکن بدھ سنگھ کہتا: میرے گود و جہازاج کا کہنا ہے بھابھی، کہ اچھا جینا ایسے ہی ہے جیسے کیرے کا کھانا۔ جیسے کیرے کو ایک سرے سے بھونڈا سا کاٹ کر اور اس ٹکڑے کو باقی کیرے پر اسی جگہ جہاز سے وہ کاٹا گیا ہے گھسا کر کیرے کا لکڑا پانی نکال دیا جاتا

ہے۔ ایسے ہی آدمی کو ایک نیت میں اپنے من سے باتیں کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ ایسا کرنے سے جیسے کاکڑیاں پانی انہنگات دہر نکال دیا جاسکتا ہے۔ بھابھو جی سنس سنس کوٹ کوٹ پوٹ پوٹ جاتیں۔ بدھ سنگھ یہ نہ سمجھ سکتا کہ بھابھو جی کیوں سنس رہی ہیں۔ بخوڑی دیو رہا۔ بھابھو جی دودھ سے بدھ سنگھ کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سنیں۔ ”گورہ بھابھو جی کا کہنا ہے کہ کئی باتوں میں انسان سے بدھ سے اچھے ہیں۔ اور کئی باتوں میں وہ انسان میں بھی وہی نہ ہو سکتی ہوئی ہے جو انسانوں میں۔ اب کوئی لڑکوں سے پوچھے کہ وہ گائے دیوں کے پیچھے کیوں پڑے بستے ہیں۔ تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ لڑکوں اور گائے دیوں کی دوستی ہو جائے۔ یہ دوستی کیسے ہو۔ اس کا آپاٹے گورہ دھندلے کے پاس ضرور ہو جائے۔“

گلی کی ماں چائے کی میز پر اپنے خاوند سے بحث میں الجھ لڑ کم اور مانی باجرب ایسے وقتوں پر گلی کے چٹا جی کسی بات پر جھنجھلا اٹھنے تو بدھ سنگھ بھابھو جی سے بات کرتے ہوئے کہتا: ”گورہ بھابھو جی کا کہنا ہے کہ بھابھو جی کو کھارے کو نہیں ہیں پانی بھی میٹھا نہیں ہو سکتا چائے کو میں میں من بھر کھا کر ڈالی میں بھابھو جی کہتیں: ”تو کہنا کیا چاہتا ہے بدھ سنگھ؟ وہ بات کو مٹاتے ہوئے کہتا: ”بھابھو جی میں بوجھتا ہوں۔ کیا گائے دی اور گائے دیں بھی ان میں دھرتی ہوگی؟“ بھابھو جی سنس کو کتنیں ”تو پاگل ہو جائے گا، بدھ سنگھ! جب دیکھو گلی کی بات، گائے دی تیرے دماغ پر بیٹھ گئی ہے“ اچھے کیا ہو گیا ہے؟ اس کے جواب میں انٹی بیدھی اٹھتے ہوئے وہ کہتا: ”بھابھو جی! انسان نے بچے کبھی انسان کے دوست نہیں ہو سکتے چاہئے انہیں من بھر دودھ پلایا جائے، بھابھو جی پیرت سے بدھ سنگھ کی طرف دیکھتیں۔ بدھ سنگھ کی آواز دھیمی کی طرح گونجتی۔ بھابھو جی سوچتیں کہ بدھ سنگھ میں ایک ہی کمی رہ گئی۔ وہ بدھ کھا جوتا تو بدھ بڑوں کے کان کرتا۔“

جب سے بھابھو جی نے چار پانچ مرتبہ بدھ سنگھ کو گائے دی کا ذکر کرنے سے ڈک دیا تھا وہ ان کے سامنے گائے دی کا ذکر کرتے جھنجھنے لگا تھا۔ وہ آد پر کھڑکی پر بیٹھی ہوئی گلی کی میز سے ہکا بکا کہنا چاہتا کہ اب اسے کہیں دوسری جگہ گھوسلا بنا لینا چاہیے۔ جب کوئی کسی کو دیکھتا تھا گورہ دھندلے تو اس شخص کو چاہیے۔ کہ اس گھر سے الگ ہو جائے۔ پس گائے دی کو بھی اپنا گھوسلا بدل لینا چاہیے۔

نہیں گلی کی اپنا گھوسلا بدلنے کو تیار نہ ہوئی۔ گائے دی کی آواز اسے پیاری نہ تھی۔ بدھ سنگھ اس کے لیے بھی اپنے دل کو سمجھنے لگا۔ جب بھابھو جی ناراض ہوتی ہیں تو انہیں ناراض کرنے سے کیا حاصل۔ گائے دی کی آواز میں کون سے لڑو دیکھے ہیں؟ آخر کسی پزندے کی آواز انسان کے دماغ پر کیوں چھا جائے؟ ویسے تو انسان اور پزندے بھائی بھائی ہیں۔ دونوں پر ایک ہی سوج چمکتا ہے۔ لیکن بھابھو جی کی بات بھی قید ہے۔ ہر وقت ایک ہی بات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں انسان پاگل پن کو دعوت دیتا ہے۔ ہر وقت گلی کی غلبیں آواز کو دماغ پر رشک دینے کی اجازت کہیں دی جائے؟ انسان کا دماغ جتنا دکھتا ہے اتنا ہی فائدہ مند ہے۔ بدھ سنگھ نے فیصلہ کر لیا کہ بھابھو جی کے کہنے کے مطابق پہلے وہ اپنے دماغ کو ہر خطرے سے بچا کر رکھے۔

اب گائے دی آد پر کھڑکی پر بیٹھی رہتی۔ بدھ سنگھ بخوڑی کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتا۔ گائے دی کی آواز سے اب اسے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ اب وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت بھی کم کر رہا تھا کیونکہ بھابھو جی کی صاف اور واضح رائے یہی تھی کہ ایسا کرتے رہنے سے بدھ سنگھ پاگل ہو جائے گا۔ وہ پاگل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

صبح کی چائے کی میز پر بیٹھے بیٹھے گلی کی ماں گھاس پر بیٹھی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گلی سے کہتی: ”وہ رہی گلی کی تیری بہن“  
گلی گلی کی میز پر بیٹھے بھاگتی ادا اسے پڑنے کی کوشش کرتی۔ گلی کی ہاتھ نہ آتی۔ لیکن وہ بار بار چائے کی میز کے قریب آکر بیٹھتی

جہد سنگھ زور سے ہنستا۔ لیکن وہ آگے بڑھ کر بھی کی مدد نہ کرتا۔ ٹھل ٹھلاری کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اچھلتی کودتی۔ تئاری ہاتھ نہ  
 آتی۔ جہد سنگھ کچن کی طرف چلا جاتا۔ ٹھل کی ماں آیا کو جا کر کہتی: ٹھل کی مدد کر دیا؟  
 "ہم کی مدد کرنے سکتے، بی بی جی؟" آیا سنس کو کہتی۔

باجھ سنگھ مالک کا تکرر نہائی سکا۔ دو گنا، ی کو پڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ نین گھاری اُس کے ہاتھ نہ آئی۔ لگی کے پتا جی ہنس ہنس کر اسے بڑھادو بیٹے کہتے۔ ہکوڑو کو رو دئی گئی۔

”اس میں بحث کی ضرورت نہیں“

”گٹاری کو تنگ کرنے سے یہ معاملہ؟“

"تو یہ کیا ہے؟"

”یہ تو دوستی کی جادہ ہی ہے۔“

دھڑ سٹنگھ نہاک کر: بس کا زینہ اٹھالیا اور اُسے اُدھر پر کی منزل کے کوئٹہ والے غسل خانہ کی دیوار سے لٹکا کر اوپر چڑھنے لگا۔ مچلی کی ماں نے چلا کر کہا: پہلے میرے پاس آؤ! دھڑ سٹنگھ!

بدھ سنگھ نے اپنے سے اتر کر ٹھل کی ماں کے پاس کھڑا ہو گیا۔

گگ کی ماں نے آواز دی : کیا !

آیا دوشہ کو آئی۔ بھئی کی ماں نے کہا: بھئی کو اندر سے جاؤ۔



فعلی نے تاج محل کی گود سے کیا کئے پاس جس سے انکو روک دیا۔ سننے میں تھا یوں باہر آئیں۔ سو مسرودہ گھبراہٹی جھپ۔ یوں

”جسٹرز! کچھ نہیں بجاو جی! اٹھی کر ماں نے اپنے خیال کی تائید جانتے ہوئے کہا: بدو سنگھ ”تاری“ کا بچہ نہ نہ جا رہا ہے۔ میں اپنی ہون ”تاری“ کا راضی ہو جیسے گی۔“

انہاں یہ توجہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے لئے کئی ہی ترما راض ہو گئی تھی۔ جیسا کہ اس نے پہلے ہی دیکھا تھا۔  
 بدھ سنگھ خاموش کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا حکم ماننے، جیسا کہ اس نے کہا تھا، اور اس کی ماں کا کیا بھی کہتا ہے۔ اس نے تو  
 کئی ہی دنوں تک اس کا جھوٹا دکھا تھا اور تین چار روز سے اس کا کھڑکی میں بیٹھی بیٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی کوشش نہ کر سکتی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ بالکل  
 اور عورت نہیں رہتا تھا۔ وہ سیدھی اور مستحضر زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ وہ کسی طرح کی الجھن میں نہیں پڑتا تھا۔ عورت کے لیے  
 اس کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی تو یہ غمزدگی کہ اس کی جہاد مرنے لگی تھی۔ جیسا کہ اس نے پہلے بتا دیا تھا۔ وہ کئی ہی سے آسانی نہ پڑھتا تھا۔ اب تو  
 اسے لگتا ہی کہ اس کے اندر میں اس کی طرح کی غمزدگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اب اس کی ہی صورت اس کے منتظر اور سہولت کی امید نہ رکھتی تھی  
 اس کے یوں کی پھر پھر اس کے پسندوں کو چھوڑ دے تھی۔ اور یہی تو ہندو تھے۔ اس کی ہی تھی۔ اس نے کئی ہی دنوں سے اس کا  
 یہ کہہ ہی تھا کہ اس کے نزدیک اس میں پسندوں کی طرف سے ہمارے سے پہلے سری گورو کے باغوں میں چلنے کے لیے آ جاتا تھا۔ جس کی مہم بہت لمبی  
 اور طویل مدت ہوتی ہے۔ ایسے ہی اور بھی بہت سے ہندو تھے۔ اب اس کی ہی تو نہ تھی۔

کچھ لمحوں کے لیے چائے کی میز پر خاموشی رہی۔ گلی نے پتاجی سے لڑک لڑا: درمستک بات۔ ہم نہیں کر سکتے تو مجھے دوسرا  
انتظام کرنا پڑے گا۔

”جی صاحب! بدھ سنگھ جو تانگے ڈیپنے کی طرف بڑھا۔  
گلی کی ماں خاموش تھی۔ سب بدھ جی کچھ نہ بولیں۔ بدھ سنگھ ڈیپنے پر چڑھ گئی۔ کچھ عموں کے بعد اس نے واپس آکر کہا۔ جی صاحب! میں نے ابھی حشر دیکھ لیا۔ میرا پہلے بھی یہی خیال تھا۔ گاڑی کو اندر سے دیتے ہیں دن ہی جو سٹے ہیں، ابھی پانچ دن اور لگیں گے ابھر جا کر آٹھ دن سے دو تھے مرنے پہنچے ہمارے بھائی گے۔“

”اچھا تو ہندو دن اور اشعار کرتے ہیں۔ گلی کے تاجی نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ہمارے گلی اچھی بڑی ہے۔ وہ اناری کے بچے سے مزدور دوستی کرے گی۔“

مجاہد جی کے چہرے پر اہمیان کی جھلک نظر آئی۔ مٹی کی ماں نے بھی سکھ کا سانس دیا۔ لگی کے پتا جی نے آن کی طرف دیکھا۔ اور جنس کو کہا: ہم بدستی کرنے کے قابل نہیں۔ پانچ دن بعد گاڑی کے اندر سے دو بچے باہر نکلیں گے۔ جب وہ دس روز کے ہو جائیں گے ہم گاڑی کے بچے سے لگی کی ملاقات کریں گے۔

”بہت اچھی بات ہے! بھابھو جی نے شکار لگائی۔“

”مجھے بھی اعتراض نہیں ہے۔ تمہاری ماں نے کالج میں پڑھنے والی کسی لڑکی کی درخواست قبول کرنے کے اعداد میں کہا۔“

میں نے اپنے تیاہی کی لود سے آتر کر کیا کی طرف بھاگ گئی۔

بدر شگہ نے پرانی عادت سے بے قابو ہو کر کہا: "جی صاحب! میرا حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ گناری ہمیشہ وہی انداز سے دیتی ہے۔ سال میں ایک بار۔ پورے پچیس دن وہ اپنے انداز سے سیتی ہے۔ آدھا وقت گناری سیتی ہے اور آدھا وقت گناری نہیں کرتی۔" اکیل گناری پر ہی سدا بوجھ خراب رہا جاتا ہے۔

"ماں! اس انداز شگہ! انداز حساب کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ گلی کے پناہی نے مذاق کرتے ہوئے کہا: "اس جھگڑے میں چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اب یہ چائے نہیں سیتی ہے، پھر سے لاؤ۔ ایک دم گرم؟"

دوبارہ چائے آئی تو گلی کی ماں بولی: "گناری نے کتنی اونچی جگہ گھونٹا بنایا ہے؟"

"اب ذرا گناری کو پیچ میں نہ لاؤ۔ گلی کے پناہی برسے روز چائے پھر ٹھنڈی ہو جائے گی؟"

گلی کی ماں نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ تیار کر کے اپنے شوہر کے ہاتھ میں بٹھایا۔ پھر اس نے اپنا کپ ہونٹوں سے دھو کر لے لیا۔ جس کمرے میں میں لڑکیوں کے کالج میں انگریزی پڑھاتی ہوں وہاں روشن دان میں گناری نے اپنا گھونٹا بنایا تھا۔ پچھلے سال۔ ایک دن میں لڑکیوں کو پڑھا رہی تھی۔ اپنا کپ آدھرتے دو دن اندر سے ایک لڑکی کے سر پر گئے اور نوٹ گئے۔ رطوت سے بے چاری لڑکی کا چہرہ خراب ہو گیا۔ سب لڑکیاں ہلکھلک کر ہنس پڑیں۔ میری طبیعت پر بہت زبردست دھچکا لگا۔ میں اس دن پیڑوں سے لے سکی۔ اس لڑکی نے غسل خانہ میں جا کر اپنا چہرہ صاف کر لیا تھا۔ اور باقی لڑکیاں سنبیدہ ہو کر پڑھنے کیسے تھیں۔ لیکن میرے دل پر جیسے ہمارے نوٹ پڑا تھا۔

"تم بہت حساس ہو! یہ مجھے معلوم ہے؟"

"وہ واقعہ مجھے اب تک غمگین بنائے ہوئے ہے؟"

"اب تو یہ غلط بات ہے کہ ایک برس پہلے کے واقعہ پر آنسو بہائے جا رہی ہیں؟"

"اندھے لڑکوں کو نوٹ گئے تو گناری کا ہونٹا لکڑے میں دیوانہ وار دھونڈانے لگا تھا۔ ان کی بیخ و بچا رکھی دن تک سناٹا دیتی رہی تھی جیسے ان کے اندر سے توڑنے کا کئی ہیم سے مرزد ہوا ہو؟"

جیسے ان کے اندر سے توڑنے کا کئی ہیم سے مرزد ہوا ہو؟

"اب اس غم کو وقتاً دینا ہی شکیک ہو گا؟"

"اس غم کا دھماکا سا ہوتا ہے میرے سامنے میں اس وقت میں بے چین ہو جاتی ہوں؟"

یہ تو وہی بات جو فی جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے؟

کچھ لمحوں کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ بدر شگہ بھی بوجی کے پناہی کے قریب کھڑا اسی جیسی ہی لگا ہوں سے چائے کے میز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کاش وہ گلی کی ماں کو دھماکے کو کہہ سکتا کہ پچھلے غم بھولی جاؤ آئے وہ اسے غم کی فکر کر دے۔ وہ میراں تھا کہ بھانجی کیوں چپ بیٹھی ہیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ جب انسان بھی اپنی زندگی کا مالک نہیں رہا۔ ہندو نے اپنی زندگی کے مالک بننے کی اہلیت کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی ہے تو ایک نہ ایک غم لگا رہے گا۔ ایک نرلک ظلم، ایک نرلکا نا انصافی، زندگی پیسے کی میں نہیں ہے نہ جاوے گا بھیکو لا۔ زندگی ایک بھوک ہے جس پر پیوں چلنا ہوتا ہے جیسا کہ گورو جہا راج نے کہا ہے۔ زندگی کا مطلب ہے جینے کا نام گاڑی۔ اور گورو جہا راج کا یہ بھی تو کہنا ہے۔ سوائے لاک کر میں سب بدیتی۔ انسان نے کوئی چیز کم کر دی ہے وہ چیز ہے انسانیت۔ گورو جہا راج کا کہنا ہے کہ انسانیت بہت زیادہ دیر کم نہیں رہ سکتی۔ انسان صداقت کو جو حوصلہ دے رہا ہے، الفاظ کو آواز دے رہا ہے۔ صداقت کسی دوسرے کی جیب کا سکر نہیں ہے۔



اس کے بارے میں تو دو رائیں نہیں ہو سکتیں: ملاقاتی نے ہنس کر کہا۔  
 گناہوں کا جوڑا چھوڑا تھا۔ جیسے اُن پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ بدھ سنگھ پرے سے لٹھ اٹھائے آیا۔ بولنے لگا: "یوں کا  
 بدلا میں لے لے آیا۔ آخر گو دھبہ راج کے آئینہ بارے میں سنے سانپ کی سری توڑ ڈالی ہے۔ گو دھبہ راج کا کہنا ہے کہ جب سانپ سویرے  
 جاگتا ہے وہ لبتا ہے کہ ہے بھگوان مجھے ایسے انسان کی شکل دکھا جو مجھ پر لٹھ اٹھائے تو میری سری مزدور توڑ ڈالے تاکہ مجھے زخمی ہو کر ادھر  
 آدھرنہ بھٹکنا پڑے۔ سری ٹوٹنے سے سر نے پر سانپ دوسرے جنم میں انسان بنتا ہے۔"  
 "اسی لیے شاید کچھ انسان سانپوں کے بجائے ہوتے ہیں: ملاقاتی نے طنز کی۔  
 "پر سانپ گناہوں کے گھونسلے میں ٹھس کر اُن کے اندر سے کھا گیا: بدھ سنگھ بولا: "تاریاں جوتی، وہ لگیں، چلتے وہ بھی نہ

بچ سکا۔"

گلی کی ماں کا لچ سے آئی تو گناہوں کی بے بسی کی کہانی سن کر افسوس سے ماتھو مٹی رہ گئی۔ گناہوں کے دو اندر سے پچھلے سال  
 دیکھیں کے کالج میں انٹرمیڈی کے پیرز میں روشن دان سے گرا کر ٹوٹ گئے تھے، دو اندر سے یہ تھے جنہیں آج سانپ کھا گیا تھا۔ ہمارے  
 گو دھبہ راج کا کہنا ہے کہ گناہی پہلے مروت ہوتی تھی: بدھ سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں کہنا شروع کیا: "گناہی کی مصیبت اب بھی کچھ کم  
 نہیں، وہ لاکھ گڑن بند کرے۔ لاکھ چکنے کا جنن کرے، زندگی کا غم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس پر بھی گناہی اندر سے میٹھے سے باز نہیں آتی؟"

五

ابو سعید قرنیؓ

اس کا بھوپتر وادی کے وٹنے پر واقع تھا، جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں، صرف اس کی باتیں سنی تھیں۔ رات کو جب وادی دو دھوا دھند لکڑی میں تھوپ جاتی تو اس کا باپ حق سدا کا کر بیٹھ جاتا۔ پرجہان کی لو پر نظری کاڑھے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ اس کی جھوٹیں میں لپٹی باتیں سن کر احساس ہوتا کہ شاید اس کا حقہ میں گمراہ ہے۔

تیری ماں راوی کی سب سے حسین و شیریں ممتی۔ بالکل تجھ جیسی۔ میں اسے ہمیں بیاہ کر لیا تھا۔ اسی جھوٹے میں۔ شہر  
 بھیاں اسے کبھی ڈنک نہیں مارتی تھیں۔ بالکل تیری طرح۔ اور اس کے ہاتھوں میں بھی ایسی ہی برکت تھی تیری اس گوری گائے  
 ماں جو گواہوں کو پاس نہیں بٹھانے دیا کرتی تھی۔ بکری ہی قربان جاتی تھی۔ پتہ نہیں کیا کنگنائی تھی اس کے کان میں۔ جب چاہو وہ  
 — مرغیاں بٹھیں تو وہ جیسے کڑک مٹھنا ہی نہیں آتا۔ ٹوکری بھری بہتی تھی اندوں سے۔ اور نینے اندے بٹھاؤ اتنے ہی چورے  
 لے لے لے تیری چینیاں بھی تو ویسی ہی ہیں۔ — اور انگوڑ، سیب، اناروٹ، نیو بانی، توبہ، حل، خد، کمرندی میں  
 کہ کبھی بائیسے کو بیچ رہتا تھا۔ ... وہ جب کثیدہ لے کر بیعتی تھی تو تنیاں بھول پڑتی تھیں کہ کچھ رچ کسے بھول ہیں۔ —  
 ے ہاتھوں میں بھی وہی بات ہے۔ — مگر سوچنا ہوں کہ جب ان ہاتھوں میں دھڑری لگے گی، بیاہ ہوگا تیرا اور تو یہی جاہلیگی  
 نادر کے گھر، جس طرح تیری ماں اس گھر میں آئی تھی، تو تیرے باپ کا کیا بنے گا؟

”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی اب!“  
 ”تو نہیں جانتی گلی کہ ایک کانگر سونا جو کہہ رہی دوسرے کانگر آباد ہو رہا ہے، اور تیرے بیاہ کی تیاریاں تو تیری ماں نے  
 بے پیدا ہونے سے پہلے ہی شروع کر دی تھیں۔۔۔۔۔ مجھ تو لڑکی چاہیے۔۔۔۔۔ سات لڑکیاں چاہئیں۔۔۔۔۔ تین  
 سرائی میں ہوں تو چار میکے میں۔۔۔۔۔ وہ اصرار میں تو یہ اذھر چلی جائیں اور ان کے بچے دن بھر کھینچے شور مچاتے  
 رہیں۔“

”مجھ کو بھی ایک مثال دو گے، یا؟“ زیتو اپنے باپ کی بات کا مٹی سے بڑھے چٹاروں، چھنڈتکے جاتیاں کے مٹے سا، روناتوڑا تاہی نہیں اس کو اتنا پیار ہے کہ بس: ”اور وہ اپنے باپ کی وارثی میں انگلیوں سے نکشی کرنے لگتی“۔ لا دو گے

— 516 —

”منازا دووں تجھے؟ — جی تو کہتا ہوں کہ لاش تیری چھہیں اور ہوتیں، یا پھر بجائی ہوتے — تو میں بھل ہو گئی ہے  
 لڑکی۔ اتنی بڑی ہو گئی ہر عقل نہ آئی۔ اب میں کیسے بھگاؤں تجھے۔ لاش تیری ماں.....“

ایسے میں کہیں دوسرے چنگ کی آواز آتی یا جاکوہ کا نغمہ گونجتا۔ شاہ بلوط کی شاخوں میں مٹھاپنی سارنگی بجانے لگتا اور زنبور کھول جاتی کہ جی اسی اس نے اپنے باپ سے کیا فرمائش کی تھی۔ وہ پتکے سے اُٹھتی اور دروازہ کھول کر رات کے منظر کا جزو بن جاتی۔ دو دو صبا چاندنی میں چوروں کے پر اچھڑے خواہوں کا پیروں ہیں ہلکتے، ادھر کہیں دیوار کے پردوں کے پیچھے سے چنگ کی جھن جھن آن رہی ہے دیکھنے ناچوں کی گشت بن جاتی۔۔۔۔۔ یہی جلی کی گھمر گھمراہٹ کا نشو و نما، رازِ عفران کے کبوتروں کی ملک اور سبزے کے پراسرار اندھیرے میں جھنجھنوؤں کی جگکاہٹ جیسے جانیاں کا ناتنا آئینوں میں چمکتا تھا۔۔۔۔۔ زنبور اس قصر بر کو بست سے دیکھتی۔ بہان تک کہ چیزوں کے چوں میں ہوا لگانے لگتی اور زنبور کے بالوں کی ٹیف اس کے کالوں پر لہرائے لگتی۔

”پگلی ہو گئی ہے یہ لوکی! اس کا باپ حقے کا لیا کنش نکاتہ ہو کے اسے آواز دیتا ہے بند کر دے اب دودھ اڑھ، وارنہ ہوا ملک جلے گی، اور تُو تیرا اب اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ میں تیری تیمار داری بھی نہیں کر سکتا۔“

زینب عیسیٰ کی کالی کانیا بھری آنکھوں سے جو نیک کے باعث اور بھی کالی نظر آتی تھیں، اپنے باپ کی طرف دیکھتی، جیسے کہہ رہی ہے کہ مجھے یہاں سے نہ ہٹاؤ۔

” بالکل اپنی ماں پر ۔۔۔ بڑے کامر اس نے بارہا دہرائے ہر نئے جیلے کی پھر تائید کرتا ” رات بہت بیت گئی تریو۔  
اب سے جا بیٹھا“

نیز کے ہونٹوں پر وہی پرانہ اوسکر اسٹ فلیم ہوتی جو اس کی ماں کے ہونٹوں پر نظر آیا کرتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ بہ پانچ  
 پرچہ یہ جنگ اور سڑیلوں کا غمہ نیند میں مجھے کہاں ملے گا۔۔۔۔۔ مگر اس کا باپ چپکے سے اٹھتا اور اسے شاؤن سے پکڑ کر  
 بستر پر لٹا۔ اس کی پیشانی کو اپنے ہونٹوں سے ٹھونکتا اور اسے لعاف اور حاتمہ میرے دل ہی دل میں کہتا۔ کاش آج اس کی ماں  
 زندہ ہوتی۔

[illegible]

گھما ایک روزہ کلیوں، پھولوں، بھونڑوں اور تینوں کے موسم میں جب وادی سرکے ہوئے سازی طرح اپنا ازلی نعمہ الاپ رہی تھی بجایک دن عرس ہو رہے تھے ہوں اور ان پر کسی نے اُٹاں بدھا گئے تھے پھر تا شروع کر دیا ہر۔ نتیجہ اس روزہ پاڑ کے دامن میں خود درگلاب کے گئے گندھاری تھی اس آواز سے وہ چنگ پڑی۔ کوئی چنگ تو نہیں گس گیا تھا؟ — نہیں، یہ چنگ نہیں

حق، پتھروں پر پردوں کے انتشار کا شور بھی نہیں تھا، ادوی کے مشکوں میں بلندی کی آواز ملی تھیں، پھر خلی گھر کو بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔  
 اس نے آبی پر نگاہ دوڑائی اور دُور آسمان پر سیاہی کا وحشیہ نظر آیا۔ سیاہی کا یہ تھیلی برائے نشان قریب آنا اور بھٹکتا گیا  
 اس کے ساتھ ہی وہ خوفناک آواز بڑھتی گئی۔ پہاڑوں کے پتھر لرزنے لگے۔ زیرِ خور سے بت بنی دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا بنا ہے؟ ایک  
 مرتبہ سے ٹڈی دل دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، لیکن اتنی بڑی بڑی ٹڈیاں ہی کے پر اس کے جھونپڑے کی چھت سے بھی بڑے تھے، وہ دم دگ  
 ہیں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ نہیں مٹدیاں نہیں ہو سکتی تھیں! ایک بڑے سیدھے۔ نہ جو ادوی سے لرزے وقت ان کے یہاں ٹھہرا تھا،  
 جیشوں کے وطن کا محلِ مسئلہ وقت بتایا تھا کہ وہاں اتنے بڑے بڑے گدے نہ ہر طبقہ میں کہ غزالوں کو اپنے بچوں میں اٹھا کر لے جاتے  
 ہیں۔۔۔۔۔ اس قصور سے وہ سمجھ گئی اور سورج گہی کے پل دوں میں ایک بچہ سے پٹ گئی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے  
 لگا۔ بچہ میں جب وہ کوئی خوفناک کہانی سننے لگی تو لحاف سے منہ ڈھانپ کر اپنے باپ سے مہذبت جاننا کرتی تھی اور اس کا خوف دُور  
 جی جاتا تھا۔

”زیرِ آگدوں کے شور کو چھپتی ہوئی اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔ تم کہاں ہو زیزو؟“  
 لیکن نہ بڑی آواز حق میں سو گھر گئی۔ اس نے اٹھ کر بھاگ بھاگ چلا اور سورج گہی کی کپڑوں میں جھانک دیا، وہ جھپی ہوئی تھی  
 گدوں کے پردوں کے ساتھ تیرے تھے۔ پتھر کے گرد اس کی بازوؤں کا مستند اور تلک ہو گیا۔  
 اپنی آواز کا جواب نہ پا کر زیزو کے باپ نے اپنی بیٹی کی ہرنی کے بچے کو جسے پھولوں کی کپڑوں کو بچانے کے لئے  
 ہمیں بھی باندھ دیا جاتا تھا، کھول دیا۔ آہو بھاگا اور اس کے گھر گھر دُن کی آواز نہ زیزو کا باپ سورج گہی کے گھر میں پہنچ گیا۔  
 ”زیزو۔۔۔۔۔ زیزو بیٹی! یہ تیری بانوں کو کیا ہو گیا ہے؟“ ڈر گئی گلی۔ ”اٹھ وہ چلے گئے۔“  
 زیزو اب ادوی کی دوسری جانب پرواز کر رہے تھے۔ سیٹیاں بچانے، خوش لگاتے جیسے شکار کا جائزہ لے رہے ہوں۔  
 ”مجھے ڈر لگتا ہے اب کہ یہ گدے مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔“ زیزو کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

”ڈر مت میری بیٹی۔ کوئی ہوا انہیں ادھر لے آئی ہے۔ اس سے پہلے ہی ہوا ٹڈی دل کو لائی تھی اور ہم نے ٹڈیوں کو  
 مار بھاگایا تھا۔ ٹڈیاں تیرے دادا کے کھیت میں آئی تھیں مگر اس نے اپنے کھیتوں میں آگ لگا کر دوسرے کھیتوں کو بچا لیا تھا۔“  
 اس نے اپنا قصہ ابھی تک نہیں کیا تھا کہ کھڈوں، غاروں، وادیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے ایک اور قسم کا شور ہوا چاروں  
 طب سے کسان اور گڈیے ڈھول پیٹتے، شور مچاتے اس جانب بڑھے جہاں گدے منڈلا رہے تھے۔

”دیکھا تیرے؟“ زیزو کے باپ نے کہا۔ اس وادی کے لوگ تیرے دادا کا آسمان نہیں بھول سکتے۔ تیرے گھر کے دروازے ہمیشہ  
 کھلے رہتے ہیں، کبھی مال نہیں ڈالا توٹے۔ لیکن ہمارا کبھی ایک تنکا بھی کم ہوا؟  
 زیزو نے سر ہلا کر کہا نہیں۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ وہ اب تک سہمی ہوئی تھی۔  
 ”تیرے بلوغ سے سب کا ایک دانہ یا انگور کا ایک خوشہ بھی کسی نے توڑا؟“  
 ”نہیں!“ زیزو کے جوتے آہستہ سے ہلے۔  
 ”تیری غزالہ تیری مرغیاں اور بھینس۔۔۔۔۔ وہ بھر ادھر ادھر گھومتی رہتی ہیں، کبھی کسی کا گتا بھی ان پر بھونکا؟“

”کبھی نہیں!“ زینت نے جواب دیا۔  
 ”یا پھر تو جو اندھیرے سویرے جنگلوں میں یا چشموں کے کنارے گھومتی رہتی ہے، کبھی کسی نے تجھے اکیلا پا کر جھپٹ مارا  
 ہی سے ڈرایا ہو؟“  
 ”قطعاً نہیں!“ زینت نے کہا۔

”یہ سب تیرے دوا کی بدولت ہے۔ یہاں کے لوگوں پر اس کے اُن گنت احسان ہیں، اور تو دیکھے گی کہ یہ ان نگہوں کو ایسی طرح اڑادیں گے جس طرح تیرے دوا کے وقت میں مٹی کی ٹریخ آمد سی یہاں سے اُٹھ گئی تھی۔“

”اور میرے بچپن کی بات ہے جب برف کا طوفان آیا تھا اور ہماری پھیل تک جم گئی تھی۔ ہم برف کچلا کر پانی چیتے تھے طوفان تھا تو پہاڑوں سے ریگھوئیں کی لیندا ہوتی۔ سفید عور کے رفاغی رہ گھوئیں کو جب پہاڑوں پر کچر کھانے کو نہیں ملا تھا تو وادی پر ٹوٹ پڑے تھے اور پھر وہ جنگ شروع ہوئی تھی جس کی یاد سے میرا جسم آج بھی کانپ جاتا ہے۔ آدمیوں اور درندوں کی چیونٹوں سے پرندے اپنے استیازوں کو چھوڑ کر ولوانہ دار اُڑ رہے تھے اور چٹانوں سے اپنا سر جھوڑ رہے تھے۔ تیرے دادا نے دیکھوؤں کے راستے میں جگہ جگہ اللہ روشن کروادئے تھے اور لاتھروں میں شعلیں، لالٹیاں اور کلکائیاں لٹے دوگ دست بدست رکھیں سے لڑ رہے تھے۔۔۔ اتنے ایک عورت کی چیخ بلند ہوئی۔ ایک ریگھو کھیں پیچھے سے ہوتا ہوا ایک جھونپڑے میں، گھس آیا تھا جو اس درخت سے صرف چند ہی قدم کے فاصلے پر واقع تھا جس کی شاخوں میں چھپا ہوا میں یہ خوش کہ منظر دیکھ رہا تھا جیسے اگلے وقتوں کے بادشاہ جھوکوں میں بیٹھے آدمیوں اور درندوں کو آپس میں لڑا دیا کرتے تھے۔“

مگر اس دیکھ کا کیا ہوا آبا؟ یہ نہیں ہے اپنے باپ کی بات کاٹی۔ اسے معلوم تھا اگر باؤں شاہوں کا قصہ جھڑ گیا تو بچہ کی گانی ادا ہو رہی رہ جائے گی۔

”ہاں تو وہ بچہ مجھ پر پڑے میں گھس گیا اور ایک عورت کو لے لیا تھا۔۔۔۔۔ بڑا موزی جانور ہے یہ بچہ۔۔۔۔۔“

”تکونے چاٹ لیتا ہے عورتوں کے۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ اب میں تجھے کیسے بناؤں بیٹی۔ بہت بے شرم ہوتا ہے بچوں سمجھ لو۔ آدمی کی طرح۔ پر میں کیسے بناؤں تجھے! کاش تیری ماں زندہ ہوتی اس وقت! اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ ریت پر جانی تھی کہ جب وہ اس طرح سانس لیتا ہے تو بعض اوقات ایسی چپ سا دھنسا ہے کہ پیروں بیت جاتے ہیں۔ مگر وہاں دیکھ کر کمانی اوجھڑی رہی جا رہی تھی۔

” تو بچہ اس عورت کو اٹھا کر لے گیا، اور اس کے بعد کیا ہوا آتا ہے ؟  
 ” ماں — مر جینا نام تھا اس کا۔ اس کی چیخ مجھ اپنے گرد مکند کی طرح بیٹھی ہوئی محسوس ہوتی، اور اگر میں نے سخت  
 کی شاخوں کو نہ ختم لیا ہوتا تو زمین پر آ رہتا۔ خیر، مر جینا کی چیخ سن کر ایک آدمی جس کے ایک ہاتھ میں شعلہ تھی اور دوسرے میں درخت  
 اڑنے ہوئے انگارے کی طرح لپکا اور اپنی درختی دیکھ کر بیٹھ گیا۔ یہ شخص تیرا دادا تھا بیٹی — زخمی  
 بچہ مر جینا کو چھوڑ کر تیرے دادا پر چھٹا — تیرے دادا کو روزش کا بہت شوق تھا، اور یہ اس کی جرات کا زمانہ تھا۔ بڑے



”نئے تیرا کوں کا ہماری جھیل کے آدھ ہی میں سانس ٹوٹ جاتا تھا۔ بس تیرے دادا نے اسے کئی بار پار کیا ہوگا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس پر ضرور خواجہ خضر کا سایہ ہے ورنہ یہ جھیل تو ایک سانس میں تنگ سے لہجی پار نہیں ہو سکتی۔“

”تو یہ بچہ نے مرعینا کو چھوڑ دیا اور دادا بابا پر چھپا۔“ زینو نے کہا۔

”ہاں تو تیرا دادا جانا تھا کہ زخمی رکچہ سے بچنا محال ہو تا ہے اور جب آدمی زندگی اور موت کا فرق مشا دے تو بعض اوقات موت ہی زندگی بن جاتی ہے۔ اس نے یہ بچہ کو بانہوں میں پیٹ کر بھینچا جو شروع کیا تو درندے کی آنکھیں اٹل پڑیں منہ کھل گیا، ہانڈو جیلے پڑ گئے، حتیٰ کہ وہ بے سوج ہو کر گر پڑا۔ بعد میں وہ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ جنگ میں پہلا وار ہی آخری وار ہوتا ہے۔ اگر میں اس وقت سرخسارہ جانا تو میرا وہی حشر ہوتا جو رکچہ کا ہوا تھا۔“

دفعۃً گدوں کا ایک اور غول بیٹیاں بھاتا ہوا گذرا۔

”اور یہ کس پرندے؟“ زینو کے باپ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا ”میرا گریا زینو۔۔۔۔۔ میرا گریا!“

لیکن زینو جس کا خوف پھر ہو کر آیا تھا، اپنے باپ کے گرد محنت پیچاں کی سیل کی طرح پیٹ گئی۔ اس کا دل اس کمزوری کی طرح دھک دھک کر رہا تھا جس کے سر پر بازو منڈلا رہا ہو۔

”اور دھڑک دھڑک کر کھڑی ہو جا بیٹی! یہ غلیظ پرندے شاید یہ نہیں جانتے کہ میں اپنی جوانی میں جنگی سوڈوں کے سرنگی جینا ہوں۔“

اور وہ پتھر اٹھا اٹھا کر دیوانہ وار ہوا میں پھینکنے لگا لیکن گد بدستو بیٹیاں بھانے لگد رتے پھس گئے اور بوڑھے کے پتھر اس کے گرد بولیں گرتے رہے جیسے مردوں میں اولے۔

”جانے دو آبا! تم تنگ جاؤ گے! یہ موڑی بہت اونچے اڑ رہے ہیں۔“ زینو نے اپنے باپ کا ہاتھ دھکتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا! بڑھے نے مانیتے ہوئے جواب دیا یہ شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ لیکن

میں ای ان ان ٹڈیوں سے ہار نہیں مان سکتا۔ آدمی تو جنات سے لڑ جاتا ہے۔“

اس کے منہ سے جنات کا لفظ نکلا ہی تھا کہ ایک گولا بلند ہوا اور سارے علاقہ میں پھیل گیا۔ غبار کم ہوا تو زینو اور اس کا باپ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک دیو کھڑا ہے۔ دیر نے زینو کے باپ کو جھک کر سلام کیا اور اس کی جانب گھٹنے کا ہار پھینکتے ہوئے بولا:

”تھیں مبارک ہو بڑے میاں! نھاری بیٹی کا نصیب جاگ اٹھا۔“

زینو کے باپ نے گیندے کے ہار کو، جو کہتہ کی طرح سیدھا اس کی گردن میں آکے گرا تھا، توڑ کر جن کے منہ پر ڈالا۔

”اے جاؤ اپنے یلے مرگی کے پھولی، اور میری زعفران کی گیارہوں سے اس طرف ہو کر بات کرو۔ تمھارے سانس کے نفع سے ان کی خوشبو جاتی رہے گی۔“

ملے بڑی بوڑھیاں کہنا کرتی تھیں کہ گیندے کے پھولوں سے مرگی ہو جاتی ہے۔ - مصنف:

دیو کی ایک آنکھ جو اس کے ماتھے کے درمیان تھی، سگنے لگی۔ اس کے بال ساہی کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور وانت مرنے کے انداز میں فردا رہ گئے۔ لیکن وہ اپنا قصہ ہی گیا اور اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لانے ہوئے بولا۔

”نیری بیٹی کا نصیبہ جاگ اٹھا ہے بڑے میاں۔ ہمارے باؤشاہ نے اسے اپنے حرم کے لئے منتخب فرمایا ہے۔“

”میں نہ کہتا تھا بیٹی کہ تو جو ہر وقت پھوڑوں کے گھنے گھرے پہنے پھرتی ہے اور اندھیرے سہرے چٹھوں کے کھائے گھومتی ہے، اچھا نہیں۔ نیری ماں جوتی تو بھاتی ناچھے اس کا مطلب کہ کنواری بچیوں کو خوشبو سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔“ نیری کے باپ نے اپنی بیٹی کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا۔ اور بے بڑا علم تو نے یہ کیا کہ وہ تعویذ تار دیا جو نیری ماں نے تیرے بازو سے باندھا تھا۔ لیکن رو نہیں بیٹی۔ میرے جیتے ہی۔۔۔۔۔“

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پاتا تھا کہ آسمان سے نوبت و ناقوس کی آواز آئی۔ شہ جنات کا پیامی منہ کے بل گر پڑا اور ایک تخت زمین پر اتر آیا۔

”ہم میں اتنی تاب نہیں تھی بڑے میاں کہ ہم تمھارے جواب کا انتظار کرتے اس لئے ہم خود چلے آئے۔“

”تم؟“ نیری کے باپ نے کہا۔

”ہاں، تمھاری بیٹی کے حسن کا شہرہ ہم نے اپنے دربار میں سنا تھا اور ایک روح جب تم لوگ اپنا فائدہ تقسیم کر رہے تھے، ہمارا بھی ادھر سے گذر رہا اور ہم نے دیکھا کہ نلیم ندی کے پانیوں میں ایک سفید شعلہ تیر رہا ہے۔“ نیری بیٹی کا جسم ہلکی چاندی۔

”چپ ہو جاوے فیرت حضرت!“ نیری کا باپ نصیحت سے کانپ اٹھا۔

”اپنی بیٹی کی تعریف بھی نہیں سن سکتے بڑے میاں۔ بہت پیار ہے تمہیں اس سے، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ شہ جنات کے پہلو میں بیٹھ گئی اور دنیا کی کوئی نعمت اس کے لئے ناقابل رسا نہیں ہوگی۔“

”لیکن وہ تمھارے لئے ضرور ناقابل رسا ہے۔“ نیری کے باپ نے کہا۔ ”تم نادری ہو۔“

”تم نے اپنے اطباء سے نہیں سنا کہ تم میں بھی آگ موجود ہے۔ تم اگر ٹھنڈے ہو جاؤ تو دیر جاؤ۔“

”کل تو تم یہ کہو گے کہ نور اور نادر دونوں میں روشنی ہے اس لئے ہم نادری ہیں۔“

”تمہیں منطق میں ضرور پید ملوئی حاصل ہے بڑے میاں۔ لیکن شاید تم طاقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

سودا گیل کی ایک دلیل۔

”مگر طاقت سے تم روح کو زہ نہیں کر سکتے، اور جسم بغیر روح کے بالکل ویسا ہی ہے جیسے۔ جیسے۔“

اس نے رکتے ہوئے مناسب تشبیہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ ”جیسے یہ وادی بغیر ہمارے۔“ سو نیری طاقت کی مجھ اتنی بھی پہچان نہیں تھی اس پنچر کی۔ لیکن نیری بد نظری، جسارت اور دھمکی کے باوجود میں تیری درخواست پر غور کرنے کو تیار ہوں، مگر ایک شرط ہے۔“

”مجھے ہر شرط منظور ہے۔“ جی نے جواب دیا۔



”تو میری تیرا مقابلہ کروں گا“ زینو کے باپ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔  
 ”گمراہ جہات کو نہیں دیکھا تو نے۔۔۔۔۔ یہ دیر، یہ گور، یہ جھٹنے۔۔۔۔۔ یہ سب میرے غلام ہیں۔“ عفریت نے کہا۔  
 ”اور ان کو بھی دیکھ لو۔“ زینو کے باپ نے داوی کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ میرے بھائی ہیں، اور ان پہاڑوں کے آدھر میرے اور بھی بھائی ہیں۔ تیرا مقابلہ کیا جلتے گا۔“  
 عفریت چنگھاڑا اور زینو کی طرف بڑھا۔

اور پھر آدمیوں اور عفریتوں کے درمیان وہ جنگ شروع ہوئی جس کا شور سن کر اڑوس پڑوس کی وادیوں سے زینو کے باپ کے دوسرے بھائی جی اپنی آبائی تلواریں لے کر آہٹنے جو ایک مدت سے ان کے صند و فوج میں بند تھیں۔  
 لوگ لڑھکیاں، کھانڈے، درانیاں، چپو اور بھاڑے لے کر عفریتوں کے لشکر پر پل پڑے اور ہر سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ شہر جہات گھبرا گیا۔ گائے باڑوں، کسانوں اور ملاحقوں نے اس کا تخت توڑ ڈالا۔ اس کے سامنے دم دبا کر بھاگ گئے اور وہ خود ایک گدی کی دم سے شک کر بڑی شکل سے ہان پھاڑا۔  
 لیکن عفریت کے فرار ہونے کے کچھ ہی دیر بعد داوی کے، مانے کی طرف ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور پہاڑ ٹھٹھ گیا اور آسمان کا ایک ایسا ٹکڑا آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا جسے داوی کے لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

زینو لڑنے لگی اور جیسے اس کے پیٹ میں بادل لڑھک رہے تھے، بلبلیاں کروٹیں لے رہی تھیں داوی کے نشیب و فراز سے گشت کی گرج آہٹی۔ پیڑوں کی پڑیاں، بھونپڑوں کے کبوتر، چٹانوں کی بابلیں بے تابانہ ہوا میں اٹھ لگیں فضا میں شہر کی کھجور کے پھل پھلنے لگے، جیسے ان کے چھتے پر کسی نے پتھر چھینک دیا تھا۔ جیڑ بکریاں میا میں، زینو کی گائے بلبلا آہٹی۔ اس کی مرغیوں نے گویا بلا دیکھ لیا، جھیل کی جانب سے ڈری ہوئی مرغابیاں بغیر تھار کے اڑتی نظر آئیں۔ عرکوش اپنے بھٹ چھوڑ کر نکل آئے اور دیکھنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، درختوں کی شاخوں میں کلر بانی چک چک پر چھنے لگیں کہ یہ کیسی گڑا ہٹ ہے جس نے ہمیں وہ خنوں کے تنوں میں بھی آرام نہیں دیا۔ تیلیوں کے پڑے بن کر پھولوں کے کٹوروں میں گر پڑے اور پھولوں کی پتیاں ایک ایک کر کے خاک میں مل گئیں۔ سبب، ناست پانی اور شہنائی کی شاخوں سے کچے پھل آفسوؤں کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگے اور جھیل کے شفاف پانیوں کی سنہری مچھلیاں کناروں پر تر پٹی دکھائی دیں۔  
 ”بھونپال! زینو کے باپ نے کہا۔ لیکن پہاڑ کا وہ شکاف بند کیوں ہوا جا رہا تھا۔“

”اڑو ہے؟ کسی نے کہا۔“

”جیتے؟ کوئی پکارا۔“

”سینوں کی آنکھوں میں اڑو ہے؟“

”اڑو ہوں کے جسم واسے جیتے؟“

”گینڈے؟“

”گینڈے اور مٹی؟“

” چار چار سو نڈوں والے ہاتھی؟“

” آگ نکلتی ہے سو نڈوں سے؟“

” سو نڈ؟“

” لمبے لمبے دانتوں والے جنگلی سو نڈ؟“

” طلسمات؟“

” طلسمات؟“

” طلسمات؟“

” ٹوٹ جائے گا یہ طلسم! زینو کا باپ بکا را! اپنی زمین کی مٹی اپنے ہاتھوں سے لی لو، مومن ہو جاؤ گے تم اس عمر سے

یہ سونے نعلاری حقیقت کا امتحان ہے۔“

زینو کا باپ اور اس کے ساتھی نعرے لگاتے ایک بار پھر سارا گرد و پر ٹوٹ پڑے۔ اڑوے آگ اٹھنے لگے۔ ان کے  
سندھوں سے دھڑکیں کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ سو نڈوں نے دانتوں سے چنگا ریاں جھرنے لگیں اور ان کے ہونٹوں سے لادہ اُہل نکلا۔  
زینو کے باپ کے ساتھی کٹ رہے تھے، اگر وہ تھے، مگر وہ تھے۔ لیکن ان کا ہر قدم آگے ہی کو بڑھتا تھا۔ ان کی دیراٹھی نے بولو  
کی گرد و ہری گردی اور جنت کی لوح پھر اسی شکات کی طرف لپٹا ہوتی نظر آئی جدھر سے وہ داخل ہوئی تھی۔ مگر عین ایسے ہی جب  
کہ ان کی شکست یعنی ہوجی غنی آسمان یکایک تار یک ہو گیا۔ سو نڈوں کے گردوں کے پردوں کے پیچھے چھپ گیا۔

” آہ! زینو پکار اٹھی۔ یہ گرد نہیں اُتر رہے ہیں جنہوں نے سرد باد کے جہاز کو پتھر اور سے غرق کر دیا تھا۔“

” رُخوں کے پسے واوی کے غلات علاقوں پر پھیل گئے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتے زمین سے شعلے بھڑک اُٹھتے اور لوٹ  
آگ کے بیج آگ کے بیج اُپکار تھے۔ پسے گھروں کی آگ بجھانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوتے۔ لیکن زینو کے باپ کے ساتھیوں میں  
پھر بھی ایسے لوگ موجود رہے جن کے سینوں میں زینو کے دادا کے ہسمانات ملگے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے جلتے ہوئے جھونپڑوں سے  
مندھ مڑ لیا اور ناموس کے نعرے لگاتے ہوئے پھر سارا گرد و پر اٹھنے کی طرف بڑھے۔

گھاتے ہیں رُخوں کے پرے یکایک کہیں غائب ہو گئے اور ان جانب سے جہاں پہاڑ بیٹھا تھا، سادوں کے بادلوں کی طرح کالی  
کوئٹوں کا جھنڈا اُٹا دکھائی دیا۔ ان کی چوخیوں میں کچھ چمک رہا تھا۔ جب وہ زینو کے باپ کے لشکر کے اوپر نہیں تو انہوں نے اپنی چوخیوں کو  
دیں اور لشکر پر اثر فوسل کی بارش ہرنے لگی۔ لوگ اثر نیاں دھٹنے کے لئے لپکے اور آپس میں اُلجھ گئے۔

زینو اور اس کا باپ اکیلے رہ گئے اور جنت نے انہیں اپنے پیچوں میں جکڑ لیا۔

نصائیں ایک فتنہ بلند ہوا۔

” اب بناؤ! آسمان سے شجرات کی آواز سنائی دی۔“ لیکن ہماری پیشکش بدستور موجود رہے۔ یہ لڑکی اگلاب بھی ہماری

ہو جلتے تو بہت اعلیٰ کی جگہ کھلائے گی۔“

” چپ ہو جا مردو! زینو کے باپ کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ لیکن اس کے بازو جکڑے رہے۔ نہ اس کا بدن اپنی

جیل کے کنارے بید مجنوں کی شاخوں کی طرح کاٹنے لگا۔

”لیکن تو بڑھا ہو گیا ہے شاید، اور اپنی بڑائی بھلائی کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم تیری بیٹی سے بات کریں گے۔“ کوئی بے شہ جنات نے تانی بھائی: ”وہ تاج کہاں ہے؟ ہماری ملک کا تاج ہے، جسے ہمارے دربار کی کنواری پریوں نے ہماری ولیم کے لئے تیار کیا ہے۔“ دیکھ لاک! ادھر دیکھ! اس میرے کو دیکھ، ملک و سب کے تاج میں بھی ایسا گھینٹہ نہیں ملے گا۔“ اور یہ نیکم دیکھ رہی ہے تو! سا قوس آسمان کی نیلا ہٹ اس کے آگے ماند ہے اور یہ زمر و زارہ نے ارض کا سبزہ اس سے اپنا رنگ ادھا مانگتا ہے۔ یہ جل پریوں کا تحفہ ہے تیرے تاج کے لئے۔ اور تو نے کہا نیوں میں لعل پریشان کا نام سنا ہو گا! ان لعلوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے پریشان کے سوداگر اپنا ایمان نیلام کرتے ہیں۔ اس میں اس آگ کی سرخی بند ہے جتنیں ہماری بھاریں کبھی بھنے نہیں دیتیں۔ خواجہ سگ برست کو اگر ان لعلوں کی آب کا حال معلوم ہو جائے تو اپنے کتنے کا بڑا آنا کر اپنے گھر میں ڈال لے۔ لیکن تیری ایک ماں پر یہ تاج تیرا ہے۔“

”تیرا تاج میری دادی کے خود رو گلاب کے تاج سے بہتر ہے؟ اور تیرے زیورات جن کا تو مجھے لالچ لے رہا ہے ان گھروں سے اچھے ہیں جو یاسمین کی شاخیں میرے لئے ہر روز گوند دیتی ہیں؟“ ذہین نے پوچھا۔

”سن لیا تو نے؟“ زینو کے باپ نے کہا۔ ”اور اب کہ وہ آخری بار نہ کہہ چکی ہے، اگر تیری آگ میں غیرت کی کوئی بھی موٹی چنگاری بھی موجود ہے تو تیرا واسنہ وہ ہے جدھر سے تو آیا ہے۔“ رہے ہم اور ہمارے جسے ہر کے جھوٹے بھینٹوں، کھلیاؤں میں ہمارے فرقے، اور ہمارے باغوں میں مجھے ہرے پھول اور کلیاں۔ سو ہم بھی گے کہ یہ ہماری شامت اعمال بنتی۔ جا۔ اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔“

”جذباتی بڑھا!“ عفریت نے زیر لب کہتے ہوئے کہا۔

”طلعون نادی!“ زینو کا باپ بھڑک اٹھا۔ ”تو ہمارے جذبات کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ ہماری بیوائیں، ہمارے قیم، ہمارے آبرو کیا رہا۔۔۔۔۔ اور سب بڑھ کر ہماری عزت جو تیری شیطانی فوج کے ہاتھوں برباد ہوئی۔“ تجھ ان جذبات کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ ہوس کا عفریت! سجاد و ہویاں سے، ورنہ ایک ایک لاش بھڑک اٹھے گی اور بھڑکے۔“ تجھ ناری کو بھی اس حدت سے پناہ نہ ملے گی۔ سمندروں کا پانی، ساون کی گھٹائیں، پہاڑوں کی برف اور کمرہ کرہریر کی ہوائیں بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکیں گی۔ جب۔ جہنم کی خلوق قدر ہو جاہاں سے؟

”کپڑا ٹھونس دو اس بد لگام بڑے کے منہ میں اور اس کی مغرور بیٹی کو اندھے فار میں ڈال دو! لیکن ٹھنڈا۔ باب بی ایک دوسرے کے قریب رہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم رحم و کرم کے جذبات سے عاری تھے۔“

اور بھولے جیسے سیاحوں کا بیان ہے کہ زینو کی دادی میں اب زعفران کے کھیتوں سے لاشوں کا قطن پھوٹا ہے، ٹکٹاؤں کی رنگیں نوکھ گئی ہیں، عشق پیموں کو امریل کھا گئی ہے، تمھارے کانٹوں سے زنگ کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں، چشموں کا پانی پہاڑوں کے پیچھے میں ہر گیا ہے، جھیلوں میں نہری پھیلیں کے بچلے جو کھیں رنگتیں ہیں، کنول کے پھول کچھ دلوں کی طسلیں

سیاہ پوش ہیں، سیدب کی شاخوں سے پتھر ٹپکتے ہیں، جگنو اپنی چمک بھول جیتے ہیں، کوہ میں کئے مرغ زریں پر کتے کا لٹکان گزرتا ہے اور کوہ گرداں خواب کی برفوں کے نیچے نیلم کی رنگیں کو طہ بن گئی ہیں، شہد کی ٹھیکڑی زنبوروں کی مارح ڈستی ہیں اور ان کے پھنٹوں میں لمبوں کا بوسہ ہے، گلابوں کے تھنوں سے چیر پڑ گئے ہیں..... اور ان فضاؤں میں پہاڑی آدمی تلپوں کے پر چھٹکا۔ نئے نئے اب جگکا وڑ مروہ چرموں کی بو پھیلانے ہیں..... گزریوں کے چٹک گنگ ہیں اور پچھلی سے کئی کئے سترے آٹے کی معائشے لپکتے ہیں

اور

افسے فاری گمراہوں سے کبھی کبھی مجھے پھاؤ! بے پھاؤ! بانی آواز آتی ہے: درغار کے باہر ایک پوٹھاجس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہے، پاؤں میں زنجیریں ہیں اور ہاتھ سلوں کے نیچے دبے ہیں، اپنا سر تھمروں سے پٹیتا ہے، لیکن اس سے لہو کا ایک قطرہ نہیں نکلتا۔  
 ————— خیالی ہے کہ بے بسی کے احساس نے اس کا سارا خون خشک کر دیا ہے۔

# جونکیں

مہند نانا

آشنا جب بستر سے اٹھی۔ تو اس کے سارے جسم میں درد کی ٹیمیں اٹھ رہی تھیں۔ نہ جانے یہ درد کی لہر کہاں سے آئی تھیں۔ جہاں کے دل و دماغ پر جادوی ہرگئی تھیں۔ کئی دنوں سے اسے صدمہ ایک ہی خیال ساز تھا کہ آئندہ لاخکیوں نہیں آئیگی وہ آج بکلیا نہیں، گھر کا مالک اسے کاٹنے کو روکتا تھا۔ زندگی میں سب کچھ ہرنے کے باوجود اپنے آپ کو بالکل بے بس ہی محسوس کر رہی تھی۔ گھر میں سب کی نگاہیں آشنا پر تھیں کہونکہ زندگی کی ضروریات آشنا ہی پوری کر رہی تھی۔ اگر آشنا نے اپنی زندگی کے ساتھ ہونی نہ کیجی ہوتی تو یہ سارا کفر کب کا مٹ چکا ہوتا۔ لیکن آشنا کی ایک سو کی بات یہ کہ آج تک وہ وقت کا کھانا کھا رہا تھا۔ ہر سہ بجائی نے شادی کر کے ایک مکان لے لیا تھا۔ چھوٹے بھائی نے پان کی دوکان کھولی تھی اور ساتھ ہی شادی کوئی تھی۔ اور اس کی زندگی پان کی دوکان اور ایک مدریدی اور ایک مدر و بر صودت بچکے کے گرد طواف کر رہی تھی۔ بڑی بہن ایک علاوہ مزاج عورت تھی جس نے اپنی ساری زندگی آوارگی اور عیاشی کے سپرد کر دی تھی۔ اس نے بھی اپنی منزل تلاش کر لی تھی۔ اس نے چلے جس جہاں اس کے گرد منڈ لانا تھا۔ جب شباب کا سلا سونا پھل جانا ہے۔ اور جسم میں دھیر دھیر سا آ جاتا ہے۔ جب کپڑوں کے آس پاس بال سفید ہونے لگتے ہیں جب ٹھوڑی کے نیچے موگشت اپنی جگہ چھوڑنے لگتا ہے۔ تو سمجھ لو بڑھا پا آپ کا تعاقب کو رہا ہے۔ موت کی دھمک آہستہ آہستہ سنائی دیتی ہے۔ اس وقت پر بھگوان نے بہن کی دعائیں قبول کر لیں۔ پر اسے گناہ معاف کر دیے۔ اور پر مانتا ہے اسے ایک شخص کے قریب لاکھڑا کر دیا۔ جو اسے دو وقت کھانا۔ ایک مدر کھولی اور ساتھ ہی اسے والی زندگی دی جس میں بھوک اور پیاس اپنے ذراؤں نے جبر سے کھو لیے تو مار رہی تھی۔ ان سب ہیبت ناک چیزوں کو ایک لمحے کے لیے دھڑ بھڑک دیا تھا۔

لیکن آشنا ابھی تک ایسی تھی۔ اس نے گھر کے ہر فرد کے لیے سب کچھ کیا تھا اپنے جسم کی بازی تک عادی تھی۔ اپنی آشاؤں اور تئناؤں کا خون کیا تھا۔ اپنے جسم اور جرات کو بیچا تھا۔ لیکن نتیجہ ایک ایک کر کے سب لوگ اس سے الگ ہوتے گئے۔ ہر شخص اپنے محوس کے گرد گھوم رہا تھا اور آشنا آج زندگی کی دیز پر بالکل ایسی کھڑی تھی۔

وہ بستر سے اٹھی۔ آئیٹھ میں اپنی صورت دیکھی۔ صبح کے وقت اسے اپنی صورت کبھی ابھی نہ لگی۔ نہایت دہلا سا چہرہ۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گٹھنے۔ چہرے کی رنگت زرد ہالوں کی زمی اور ان کی جگہ آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے کپڑے جو آج سے چھ مہینے پہلے اسے پہنس کر آجاتے تھے۔ آج بہت ہی کھلے کھلے سے تھے۔ ہر چہ مہینوں کے بعد وہ اپنے کپڑوں کو دوبارہ بیٹی۔ کبھی کاٹی، کبھی بڑھاتی کبھی کر کے قریب اپنی تھیں کے ٹیر سے کو کم کرتی۔ کبھی بلاؤں کو دوبارہ بیٹی اور سینے کے پھیو کو دوبارہ لپاتی۔ یہ تہذیبیاں جو اس کے جسم میں



ہو رہی تھیں اس کے متعلق آتش کو احساس تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو دیکھ کر جھجھکا ہوا تھا۔

اُس کا بھی ایک زمانہ تھا جب وہ پہلی بار ایک دلہن کی طرح اس شہر میں آئی تھی۔ پہنچی گئی، ہراتی ملی کھاتی مٹی اس شہر میں وارد ہوئی تھی۔ ہر شخص نے اس کے قناسب جسم، اس کی متہم آنکھوں، اس کی بٹی کمر اس کے کونھوں اور اس کے پیسے تدکی تعریف کی تھی جس شخص نے اس کو دیکھا ایک لمحے کے لیے وہ مہوت سا ہو کر رہ گیا۔ ایک سا اہٹ لینے ہوئے تجھیلی پر دل چلیک بکٹ بیسب میں ڈالے ہوئے متقبل میں امیدوں اور فنان کا چراغ روشن کیے ہوئے اپنی جان قناسبنا کے لیے بے قرار نظر آتا۔ اس کی اداس باتوں میں گری پیدا کرنے کے لیے اُس کی روح میں بہتے نورانی کے لمحات کو احساس کرنے کے لیے ہر لمحہ والا ٹوٹی گرم جوشی سے ممتا۔

لیکن آتش کی روح ان لوگوں سے میرا ب نہ ہوئی۔ نہ کہنے والے مردوں کوئی نہ کوئی کسی رو جاتی، اگر وہ پہنچے تھے تو صورت شکل کی طرح منظر تھی۔ اگر صورت بھی تھی تو بکٹ بیسب نہ ارد۔ اگر آنے والا قبل صورت اور بکٹ بیسب کی تلاش کر دیتا تو بچا ہوا سر سے پاؤں تک رے کو راج داتا اور اگر اسے میوں چیزیں، میز، بیسب تو سیرت نہایت ہی پرانگندہ باتیں کو توڑتے آجائے اور قی جمال دار درجہ پایائی جس صغریات کرنے کے بعد معلوم ہوتا، شاہرہ بیسب بکری کا گلاب آگیا تھا۔

آشائے ان نرم مردوں کو دیکھا۔ اپنی غلی غریب اور گھر میں ان جھٹنے ہوئے انسانوں کو دیکھا جو اس کی روح کی دلیز پر سرسک سے تھے۔ وہ پہنچے تھے۔ گو یہ سب لوگ اس سے گھر میں بسے تھے۔ بہت کچھ کہہ سکتے تھے لیکن نہ جانے کیوں نہ کہ پاتے تھے کیوں حسرت بھری نگاہوں سے اس کی فرقت دو وقت نہ کھانے کے لیے تھکے جتے۔ یا اس بھری نگاہیں۔ لیے ہوئے اور دے ہوئے تھے۔ وہ کہنے میں پڑے رہتے۔ جیسے اس شہر ہی ان کی زندگی کا مرکز تھی۔ جیسے ہی ان کا پانچ سالہ بچہ اپنی مٹی کو تم کچھ کر دے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم سب بیکار ہیں۔۔۔ جہاں ہی طاقت لگائی جیٹ گئی ہے۔ ہمیں اپنے آپ پر یقین نہیں رہا۔ ہم کچھ نہیں ہیں۔ کچھ نہیں ہیں۔

انہی سکتی ہوئی صورتوں کو دیکھ کر آتش کے دل میں ایک عالم پیدا ہو جاتا۔ یہ نگاہیں جو مردانہ، برص، ہر سیکڑ، اسے اپنی زندگی پہنچنے کے لیے مجبور کوئی رہتیں۔

اور شاہرہ آتش نے سوچ یا تھا کہ جھگولان نے اسے تمام لوگوں کو پاتے کے لیے پیدا کیا تھا۔ شاید ان تمام کو پیدا کر کے اس نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ اب آتش کی بازی تھی کہ ان سب کی کشتی کو منزل مقصود پر نہ جائے۔ ایک ناخدا کی طرح۔

اور آتش نے ان دس سالوں میں یہی کچھ کیا۔ انہیں کی حرف دیکھ کر۔ انہیں کی مطلق اور غریب کا اندازہ کر کے۔ انہیں کی بھوک سے متاثر ہو کر انہیں کے مستقبل کو نہانے کے لیے اس نے اپنی بھائی کا پیغام کر دیا۔ لیکن یہ پیغام جو اس وقت کچھ کر گیا۔ ناک ٹک کر دیکھ دیکھ کر بیجیل بیجیل کر گیا۔ یہ لمحات جریج میں آتے رہتے ان لمحات نے اس کی روح کو بھی پرانندہ نہ کیا۔ کیونکہ اس کی اپنی روح اس پیغام میں شامی نہ تھی اس کی اپنی منزل یہ نہ تھی۔ اسے خود ڈوبیوں سے حجت نہ تھی۔ اسے یوں زندہ رہنا مقصود تھا۔ یہ سب کچھ اس نے اپنے کہنے کے لیے کیا۔ ان دس سالوں میں چار پانچ عشق بھی کیے۔ ایک دوسرے کچھ کہ ایک دو عہدوں کے تحت، کچھ بھائیوں کو دیکھا کہ کچھ ان کی فرقت نگاہ ڈال کر مہربانہت پر کارواں اپنے تھکانے گئے تھے۔ اور پھر وہ اپنی زندگی شروع کر گئی۔ لیکن یہ کارواں تو بڑھتا ہوا رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کے کٹاں ایک لڑکی ہو گئی تھی۔ بڑے بھائی کے ہاں پانچ بچے تھے۔ وہ بچے آتش کے پاس چلے رہے تھے اور تین بچوں کے ہجہ کو خود بڑا بھائی بیجیل رہا تھا سب سے زیادہ بچے ترا سے اس بات کا تھا کہ کوئی شخص اس کی عزت نہ کرے۔ اس کی ماں بھی تو یہی کہتی تو نہ دیتی ہے، نہ دیتی؟

اُسے یہ لفظ کہتے ہوئے ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ جس لاکھائیں اسی کو لایاں دیں۔ اُسے ماں میں تیری جانی ہمن، تیرے ہی خون کی فوند ہوں۔ تیری رگیں اور نیس میری دل و جگر ہیں۔ میں تم سے الگ تو نہیں، اے بھائی۔ اے میری بھابیو۔ شرم نہیں آتی تم مجھے دیکھ کر ہنسی کیوں ہو۔ اپنے من ہی من میں خوش کیوں ہوتی ہو۔ کب تم نے میرا خون نہیں دیا۔ یہ گھر میں کسے لپٹے تھیں ایک ایک ہنسی یعنی جب کبھی آند آتا ہے۔ اور میں اپنے آپ کو سزا دے مٹی ہوں، اپنے بلی دھوتی ہوں۔ انہیں سکھاتی ہوں، اپنے لبوں پر لب شک لگاتی ہوں۔ اور اس کے اعتقاد میں ایک خوبصورت نیلی ساڑھی پہنتی ہوں۔ یہی ساڑھی تو انہیں پسند ہے نا۔ تو تم جل بھن کر خاک ہو جاتی ہو محلے والوں سے جا کر کہتی ہو "اے جی وہ آج آنے والے ہیں نا۔ تم بھی خوش نہیں ہوتیں جس دن سے وہ آتا ہے یا اسے آنا ہوتا ہے تم کیوں مجھ سے لڑنا جھگڑنا شروع کرتی ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے۔ تم میں سے ہر شخص کو معلوم ہے کہ میں کہا کرتی ہوں۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ تم میری کمائی پر زندہ ہو۔ مجھے تو آند سے محبت ہے۔ میں آج کل دن رات اس کا انتظار کرتی ہوں۔ دن رات اس کی مالا پہنتی ہوں اُس کا نام لے کر زندہ ہوں۔ جب اُس کی یاد آتی ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

ماں دیکھو تو مجھے یہ ہر گز۔ میں تو ہنسی ہی نہیں۔ چہرے پر وہ شگفتگی نہیں رہی۔ وہ رونق نہیں ہے آواز میں وہ نغمہ نہیں۔ ملک دن ڈوبی جاتی رہی ہوں۔ ان دس سالوں میں میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ پھر بھی تمہیں رحم نہیں آتا۔ شاید میں رحم و دردم کے قابل ہی نہیں۔ میں تو مٹی ہوں ماں۔ جو مٹی کی کمائی کھاتے ہیں انہیں کس نام سے پکارا جائے۔ چھوڑو آسا۔ ماں کو مرگ گئی وہ۔ ان بھائیوں کو مت کو سونو نا کچھ ہیں نا۔

آج آسمان بڑا خوب صورت تھا دھوپ میں ایک نشہ سا تھا۔ سامنے کے مکان پر کمرہ تول کا ایک جھوٹا، ایک دھڑلے سے ہمارا کمرہ تھا۔ ادیل کے درخت اس خشک ہوا میں جھوم رہے تھے۔ دو دو ایک جہاز سفر کے لیے اپنے پوتول داتا تھا۔ آج آند لگا کر آنا چاہیے۔ کیا وہ آج صبح آئے گا۔ وہ آج سے گا تو وہ اپنے دل کی ساری کہودت کو اُس کے سامنے دکھ دے گی۔ وہ ہر چیز کو میری ہر شکایت کو میری ہر التجا پر بڑے عزم سے سنتا ہے اور حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کم بہت بہت دود دتا ہے۔ انہیں چینیے کچھ بعد صبح ایک دن یا ایک رات کے لیے آنا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اپنا تاجدار ہماں کیوں نہیں کرا لیتا۔ اتنی دود دے جتنے سے کیا فائدہ خط بھی نہیں لکھتا۔ جب آتا ہے تو محض ایک تا بھیج دے گا۔ اور میں اُس کے انتظار میں تڑپتی رہتی ہوں۔ اُس پر دود یہ کہ جس دن وہ ہماں آئے۔ نکلے ہوتا ہے گھر میں ہمارا ضرور ہو گا۔

اُسی دن قریم خوش ہوتی ہوں۔ وہ دن تو میرا بڑا ہے۔ ہاکی سب اُن کے ہوتے ہیں۔ باقی سب شاید۔ راتیں اُن کی ہوتی ہیں۔ اُن سے کوئی کیا کہے کہ اُسے گھروالہ۔ کیا تم مجھے ایک سہانی صبح نہ دو گے۔ کیا میری زندگی کی ایک گرم رات تمہاری نگاہوں میں کھسکتی ہے۔ اتنے ہی خود دار ہو تو کچھ سے نکل جاؤ۔ آند بھی کہتا ہے کہ اب اُن کو گھر میں کیوں لکھا ہے تم نے۔ تم نے ان سب کو ذرا کی کے قابل بنادیا۔ شاید ان تک لڑاویں۔ لیکن پھر بھی یہ سارا بوجھ تمہارے کندھوں پر۔ ہر کب تک۔

لیکن آند کو کیا تاؤں کہ یہ جیٹیں ہیں آند۔ جیٹیں۔ جو لوگوں کو خون پینے کی عادت ہوتی ہے نا۔ وہ ساری ہر کسی نہ کسی کا خون پیتی ہیں۔ اور مجھے خون دینے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ جب تک کوئی مجھے گالی نہیں دیتا مجھے سکون نہیں ملتا۔ جب تک اُن مجھے

مذہب نہیں کہہ سکتی مجھے غیظ نہیں آتی۔ جب تک بھائی یہ نہیں کہہ دیتے کہ تم کیا کچھ کر سکتی تھیں اور ہمارے لیے کچھ نہ کر سکیں مجھے بہت نصیب نہیں ہوتی۔ میری قربانیوں کا یہی صلہ ہے نا؟ اور کیا کر سکتی۔ آئندہ۔ اب تو آجاؤ۔ آئندہ۔ یہ صبح بڑی بیداری ہے آسمان۔ بے حد نیلا ہے۔ دھوپ میں ہنس کے پروں کی نرمی اور لکڑی ہے مجھے اتنا نہ آیاؤ۔

دن کے بارہ بج گئے۔ اور نہ کہہ آیا۔ اور ساتھ میں ایک۔ نا۔ آٹا نے کاپتے ہوئے اٹھوں سے تار کھنکھنایا تھا۔ لکھا تھا شام کو آ رہا ہوں۔ تمہارا آئندہ

آتش خوشی اور حیرت سے جھوم گئی اور تار کو جھم لیا۔ اور پھر اور جھم دیکھا۔ آٹا نے کی جا رہا تھا یہ اس کی ماں یعنی ہوئی تھی۔ سوئی میں اس کی بھائی کھا پکا رہی تھی۔ صوفے پر بھائیوں کے کچے کپتے ہوئے تھے۔ اور نیچے فرش پر اس کا بھائی ٹرے سے دھاغہ سامان اور دھڑلہ پڑا تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ آٹے وہ آئیں گے تو کیا کہیں گے کہ کچا کبھی نہیں دکھایا تھیں انہوں نے گھر ایسے ہوئے ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے ہر طرف انتشار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب لوگ کوئی کی تیاری کر رہے ہیں۔ آٹا نے ہر چیز کو دیکھتے ہی دیکھ کر شروع کیا۔ صوفہ اپنی جگہ پر رکھا۔ جھاڑو سے اس سے صاف کیا۔ اور پھر ہر چیز کو فریٹے سے دیکھا۔ تصویروں کو پڑے سے صاف کیا۔ اپنی جوانی کی تصویر کو۔ آٹے آتش تو کتنی خوب صورت تھی۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تصویر صاف کر کے ہوتے ایک تصویر پیچھے کر پڑی۔ اور بڑگ پر سوئی ہوئی ماں۔ جاگ اٹھی۔ کیا شاہ پچا رکھا ہے۔ آٹا تم نے۔ سوئے بھی نہیں دیتی۔ یہ سوئے کا وقت ہے ماں۔ بارہ بج چکے ہیں بارہ اور چلائی۔

”بڑھیا ہوں۔ غیظ زیادہ آئی ہے نا۔ جب تم بڑھیا ہو جاؤ گی تو ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکو گی۔ دن بھر سوئی ہو گی۔“  
فرش پر بھائی نے اٹھ لی۔ اور وہ چلتا۔ راست پالی کر کے آیا ہوں۔ لیکن اس گھر میں سوت کے پیسے کوئی جگہ نہیں۔ اور اس نے پھر کروشے کر آٹھیں بند کر لیں۔

کیا وہ اپنی ماں کو بتا دے کہ آند آج شام کو یہاں آئے والا ہے۔ اگر اس نے بتایا۔ تو وہ بڑا شرم کرے گی۔ پہلے تو گھر کو صاف کرے۔ چیزوں کو بھالے۔ فرش کو دھوئے۔ موری کو تیزاب سے صاف کرے۔ تاکہ گند کی کا احساس نہ رہے۔ کپڑوں کو اچھی طرح تالک دے۔ ہمارے صاف کرے۔ برتن سجا کر دے۔ یہ سب کچھ کرے۔ آئین۔ ان اکلیں۔ اس کام میں تمہارا کوئی سا اٹھ نہ دے گا۔

اس نے اپنی چھوٹی بھائی کو ایک کونے میں بلا لیا۔ دیکھو ہانا۔ ہمارا ایک مرغ ہے آؤ۔ دو سیر قریب وہ دن کے چاول اسے ان پالیٹ کی مچھلی۔ وہ مچھلی بڑی خوشی سے کھاتے ہیں۔ کچھ ملاؤ۔ بنا لے۔ ایک آدمی بیٹھی چیر۔ میری یاد رہی بھائی۔ اس نے بھائی کے کاسے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ سر پر پڑ تو رکھو۔ ادی بچوں کو تو ہندو دے۔ اچھے سے کپڑے پہناؤ اور تھو سے کہہ کہ وہ آٹھ کر منہ ماتہ دھوئے۔ شام کو وہ ..... وہ شرا لگی۔ لجا سی گئی اور دھو لیتے ہوئے پتھر کو سر پر رکھ لیا۔ بڑی سہاگن بنی چھتی ہے۔ بھائی۔ سب کچھ سمجھ گئی اور سوئی کی طرف گئی اور بڑا آنے لگی۔ بتے ہر شرم کہیں کی۔ کہتے ہر شرم نہیں آتی۔ آج وہ آ رہے ہیں مذہبی کہیں کی شادی نہیں کر سکتی۔ کتنے مرد کھا چکی ہے۔ ابھی تک جی نہیں بھرا۔ ملے بھر میں تاک کر رکھا ہے۔ ہمارا۔ لوگ آنکھیں بھاڑ بھاڑ کر دیکھتے



نہدان کے ساتھ شادی کر کے گھر بسا لیا تھا۔ لیکن تو ساری عمر کنواری رہے گی۔ ساری عمر بیزختم کئے رہے گی۔ کیسے لکھے گی ہاڑسی جوانی جب میں مرجاؤں گی۔ تب تو میری باتیں یاد کرے گی۔ اب نہیں۔ ادی یہ بھابیہل تھا۔ ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ نہیں کھا جائیں گی۔ تیار سے بھائی ایک پیسہ نہیں دیں گے تبیں۔ میری بات یاد رکھ۔ اسے شو کی ان۔ جابا تار سے بھلی اور مرغ طریقہ لا۔ والی تو میں بگھارتی ہوں میں۔ اب گھر میں مہمان آئے گا کچھ تو کھانا پڑے گا۔ اسے موئے سنڈلے۔ شہدے، غنڈے کر ماں بستر سے گالیاں دیتی ہوئی اٹھی اور بھائی کو پاکی کا ٹوٹ دیا۔ تے آبانار سے جا کر نہ بے آ۔ یہ دونوں نکاحیں گے۔ سب جا کر ان کا جی پہلے گا۔ گھر میں بھونے کو دمی نہیں۔ گھو کی سلوں کی نفیس نہیں دی۔ چار جیسے کا کڑا ہلک تو دیا نہیں لیکن آج مرغ مزدور سے گا۔ ادی کھڑی کھڑی کیا ملک دی ہے۔ باہر جا کر مرنے کیوں نہیں۔ مذہبی چھوڑ گشتی کہیں کی۔ جاتی کیوں نہیں مرام حور۔

یوں اکثر ہوتا تھا۔ یہ تو آتش کے لیے دوزخہ کی بات تھی۔ یہ گالیاں۔ ہر غصہ، چہرے پر خود فریب کی لکیریں۔ ان سب سے مشتاقی۔ آستان گالیوں کو سننے کی عادی ہو چلی تھی اور ماں کو ان گالیوں کو سننے کی عادت تھی۔ گھر کے ماحول میں یہ تلخی یہ تندی یہ گھبراہٹ۔ یہ دہشت، یہ زمانہ سازی یہ زمانہ بازی یہ سب کچھ اس گھر میں ازل سے ہوتا تھا۔ گھر کے تمام فزاسی پیکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ آستان نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن نکلنا آسان نہ تھا۔ اسی لیے آستان نے ان گالیوں کو زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیا تھا۔ جیسے زندگی اس کی زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ اس پر انگڑی کا دوا اس کے پاس نہ تھا۔ اس سے نکال کر وہ زندگی کے کچھ لمحات اپنی خوشی کے لیے رکھنا چاہتی تھی۔ آستان چاہتی تھی۔ جیسے اس نے اپنی زندگی کو ان کی خوشی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسی طرح گھر کے باقی افراد

بغیر کسی تنقید کے اس کی خوشی میں شریک ہوں گے۔ اور اسے خوشی کے زوال لمحات عطا کرنے میں فزاح دی سے کام لیں گے۔ لیکن یہاں فزاح دلی کہاں۔ یہاں تو گھٹن اور سزا تھی۔ یہاں تو خود غرضی تھی۔ صرت اپنے آپ کو خوش رکھنے کی توانائی۔ جہیں تو آستان پر ان گالیوں کا خاص اثر نہیں پڑا۔ وہ اپنے کام میں منہمک رہی۔ چھوٹے بھائی کو صوفے پر ان کے فرش کو دھویا۔ ہندی بچھائی۔ کمرے کی ہر چیز کو قرینے سے دکھا۔ خود نائی۔ ہالوں کو دھوپ میں سکھایا۔ — نئے کپڑے پہنے۔ آنکھوں میں کاجل۔ لبوں پر لب اسٹک اور ہالوں میں تیل اور سینٹ، بالٹوں میں چڑیاں۔ کاند میں سونے کی بالیاں۔ اور گلے میں دودھ گڑھا کا دھوپن لیا۔ اور پھر آند کے انفراد میں بیٹھ گئی۔ گھر کا ہر فرد کن آنکھوں سے آتش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بھابیاں کھسک پھسک رہی تھیں وہ تو بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک خاندان تھا۔ ہاں صرت ایک، اما تھے پر ایک ٹیکا۔ ہالک میں صرت ایک ہی آتھ کا سیندور۔ نگاہوں میں ایک ہی چمک تھی۔ ایک ہی کی صورت تھی۔ ایک ہی مرد سے آستانی تھی۔ ایک ہی کا انتظار تھا۔

آتش کے سلسلے میں کتنے آئے اور چلے گئے۔ کتنی بار ہالک بھری گئی اور پھر اڑی۔ کتنی بار وہ ہنسی اور پھر روتی۔ کتنی بار یہ گھر بنا اور اڑا۔ اسے، کتنے آدمی آئے اور چلے گئے اور آستان نے تمیں کھائیں کہ اب وہ کسی اور سے محبت نہ کرے گی۔ لیکن چھ بیٹے، پانچ سال کے بعد پیر دی پک، ہر شخص نے اس گھر کی بدلتی ہوئی زندگی کو دیکھا تھا۔ لیکن ہر بار گالیوں کی بوجھاؤ آتش کو سنا پڑیں یہ جانتے ہوئے اس گھر کے افراد خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھے۔ اگر قابل ہوتے تو کب کب وہاں سے چلے جاتے لیکن کہاں جاتے کون بھانٹا انہیں بھانٹنے والی صرت آستان تھی اور گالیاں کھانے والی بھی آستان!

بھابیوں کے دل میں حسد کی آگ بجھ گئی۔ سالی خود پیش کرتی ہے اور ہم صرف ایک مرد پر قناعت کریں۔ یہ مرد کتنے بھدے گزے اور نامرد تھے۔ خود کچھ نہ کھاتے تھے۔ بہن کی کمائی پر زندہ تھے۔ اجڑا گنوار۔ چپ رہنے والے ماں اور بہن کی گایاں سننے والے، ہانڈوں میں ہست ہوتی تو ایک گھر نہ بناتے۔ اُن کے ذہنوں میں کتنی بار لغات نے جنم لیا۔ لیکن کہاں جاتیں۔۔۔ کون اپنا سے گا نہیں۔ اب تو اسی گھر میں زندگی لاشی پڑے گی۔ یہیں سے جنازہ نکلے گا۔ لیکن آٹ تو پیش کرتی ہے۔ ہر چہ بیٹھنے کے بعد نیا مرد۔ کبھی گودا چٹا۔ کبھی گول مثل کبھی سوٹ پہن کر آتا ہے۔ کبھی بیٹ لگا کر، کبھی کاد میں بیٹھ کر۔ کبھی ٹکسی میں۔ کبھی سینہ مارے جاتا ہے کبھی کپڑے طرید کر دے جاتا ہے۔ یہ مراد پیش کرتی ہے اور ہم۔ بس صرف ایک مرد، والے کورٹے، ڈبے پتے، جاہل شوکے، سرے محض نامرد۔ اسی سے انہیں اچھا نہ لگتا تھا۔ کسی کا اس گھر میں آنا۔ ان کردوں کو صحت کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ کمرے تو ازل سے گزے ہیں اس صفائی سے کیا فائدہ جس میں اُن کا کوئی حصہ نہیں۔ محض کام کرتے جاؤ اور دو وقت کھانا کھاؤ اور جاہل مردوں کو اپنا ہاتھی سمجھو۔ جیسی تو ناک سکوڑے سبھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ آج مہمان نہیں آنے والا تھا۔ بلکہ اُن کی جاگی ہوئی خواہشوں اور امشوں کا جنازہ نکلنے والا تھا۔

ہر صبح کے بعد شام آتی ہے۔ جب آفتاب اپنی تمام دفعتی سمندر میں غرق کر دے گا۔ اور آسمان پر شفق پھیل جائے گی۔ تو کچھ عرصے کے بعد بادلوں کے کنارے اور غزائی ہو جائیں گے تو ایک نیا چاند ابھڑ آئے گا۔ جیسی یہ کمرے سبھانے گئے ہیں آٹا کوک وہیں بن کر میٹھی ہے۔ نابکار و نڈی۔ مردوں کو کھانے والی، گھر کی عزت نہ بچھنے والی، بے حیرت، خاندان کی عزت کو خاک میں ملائے والی لاش آئندہ نہ آئے۔ دن بھر بھابیاں یہی سوچتیں۔ یہ کھانا بچا بچا بارہ جاسے گا، یہ صفائی، یہ دیکھ لکھاؤ۔ یہ اجلا اجلا سا فرش۔ یہ ہاؤسنگ۔ یہ ٹکراہٹ اس نڈی کی دھری کی دھری رہ جائے۔ یہ دسے اور دود زور سے دوسے۔ اپنے بال نہ چھے۔ دیواروں سے ٹکریں مارے، اس کی ماں دوسے۔ اس کے ہر صورت بھائی روتیں۔ یہ کپڑے بھاڑ کر بازار میں بیچ کر ناچے۔ یہ پاگل ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ طریش ہوں گی اور مہربان کے منہ میں جا کر ہر سادہ چھاتیں گی۔

یوں اندھیرا چھٹا جا رہا تھا۔ آٹا کے دل میں انتظار کی کیاں۔ سارے گلشن کا جربن لیے ہوئے جہک رہی تھیں۔ اب آئندہ کی گاڑی اس اسٹیشن پر ہوگی، اب پوری والی کے قریب، اب گولے گاؤں۔ اب اندھیری۔

”مرا مسئلہ اب آتا ہی ہوگا۔ کھڑکی میں نہ بیٹھ۔ تیرا یاد آجائے گا۔ ماں نے کراہتے ہوئے کہا۔

بادرہ جی خا۔ نہ سے ڈیرہ دون کے چادلوں کی سونہری سوڈھی خوشبو آ رہی تھی۔ پلاڈیٹا رہ رہ رہا تھا۔ چپتیاں کپ۔ یہی تھیں۔ براتی ایک ایک کر کے گھر سے جا رہے تھے۔ جب وہ آتا ہے تو ہر دون کو گھر سے جانا پڑتا ہے۔ صرف ماں رہ جاتی ہے۔ بھابیاں ایک کونے میں دھک جاتی ہیں، ایک کمرے میں۔ جن کے ایک کونے سے ہنسی، مذاق، مسکرائیں، کبھی کبھی دلی دبی سی سکلیاں، کبھی آہیں، بے قرار سی۔ دھڑے، متنبیں کھڑکڑاہٹ اور کبھی کبھا دہ پیٹ، کسی کا ہاروں کا کھینچا جانا۔ آٹا کا آدنی کر کے رہ جانا، اسے کیا کرتے ہو۔ آہستہ سے بال کھینچو۔ یہ سب کچھ بھابیاں دیکھتی، سنتی اور اپنے مردوں کو گایاں دے کر رہ جاتیں اور جب کبھی وہ آنے والا ہوتا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے معافرتیں۔ لاش وہ آج نہ آئے۔ آج وہ نہ آئے۔ اسے سائیں بابا۔ اے۔ بھگوان۔ اے۔ وہ جہاں کے مالک، اسے بے لاشی دالے لاش وہ آج نہ آئے۔

وقت گز رہا تھا۔ وقت گز رہا تھا۔ تاہم یہی بڑھتی جا رہی تھی۔ گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے آسمان

ہر ساروں کی کہکشاں لڑ رہی تھیں۔ چاند نظروں سے اوجھل تھا۔ کمرۂ بقیع زور بنا رہا تھا۔ ہر چیز قریب سے رکھی ہوئی تھی اور آتش کی آفتاب میں جھپٹی ہوئی تھی۔ ان بستر پر وصال دہی۔ ہر شخص کسی کی آہٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ بگسی آئے گی۔ کوئی اترے گا اور آتش کی مرگٹ کا وارث اس دنیا میں وارد ہوگا۔ ہر سانس میں کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ آتش تو خوش تھی اسے کسی کا خیال نہ تھا۔ یہ محنت اس کے پیٹھے خود کے تخلیق کردہ تھی۔ دنیا کے ہر شخص نے اس سے بے رحمی برتی تھی۔ ماں سے لے کر بھائیوں تک، دوستوں سے لے کر دشمنوں تک اس کا اپنا بچہ نہ تھا۔ جس کو وہ پیٹنے سے مل کر زندگی کے باقی دن کاٹ دیتی۔ جیسی تو اس سنہ، ان لمحات کو پرالگ انداز کے ہوتے ہوئے اس زندگی کو سولی پر چڑھا کر موت سے ٹکڑے کر رہنے کو شہت کہہ کر نام کر کے خون کے لالہ میں نہا کر خوشی کے چند لمحات اپنے لیے تخلیق کر لیے تھے۔ یہ سوچ کر کہ دنیا تو ہمیشہ کچھ دیکھ لیتی رہے گی۔

اسی سوچ بھار میں انتظار کا وقت کٹا گیا۔ شام کی تاریکی نے اندھیری رات کی جاود اور ڈھلی۔ ستاروں کی جگہ گھاٹ میں اور اصفاد ہو گیا۔ مغرب سے غمزدہ ہوا نہیں جاگیں۔ اور سارے آسمان پر ایک کہکشاں لرزنے لگی۔ چاند نے اپنی دلفریب مگر آہٹ سارے آسمان کو منور کر دیا۔ مگر یہ چاندنی، یہ ستاروں بھری رات، یہ جمیل کے پھولوں کی ہلک۔ یہ ناریل کے رخت۔ یہ لہریں اور یہ دلی دلی سی تھکن۔ اور آئندہ تو کب آئے گا۔

کھانا کھنا اور دھنا۔ کھانے کی سونڈھی سونڈھی خوشبو آہٹ آہٹ کم ہوتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا تھا۔ اس کی بھابھیاں خوش ہو رہی تھیں اور آتش کے دل میں درد کی شعلوں کا اصفاد ہو رہا تھا۔ ان۔ آج کوئی نام نہیں بھرے گا۔ آج اس کی اجڑی ہوئی زندگی میں ہمارے نہیں آئے گی۔ آنے والا کبھی بھی آسکتا ہے جس نے آنا ہے وہ ضرور آئے گا۔

وقت بیت رہا ہے، بیت جائے گا۔ لیکن ان لمحات کی کون قدر کرے گا۔ وہ کمر کی میٹھی دھبی۔ حامد و ساکت، ساتھ مکان کے ایک ٹیکسی وکی۔ سب کے کان کمرے ہو گئے۔ خرگوش کی طرح۔ یہ مہر و سکون کا دیتا تھا۔ صدیوں سے اس کی روح بے قرار اور پیاسی تھی۔

نہیں۔ نہیں۔ یہ خوشی، مسرت اور نور کا سیلاب تھا۔ ٹیکسی وکیں روک گئی۔ اور نہیں آئی۔ پھر سیدھیوں پر آہٹ آئی۔ ایک قدم پھر دو قدم۔ تیسرا قدم، کسی نے دوا لہ کھٹکھٹایا۔ آتش کے ہوں پر سانس اکر ڈک سا گیا۔

”آگیا مستعدا، سالم مرضی کھانے والا۔ آگ لگے اس کے پیٹ کو۔ ماں نے بڑبڑانے ہوئے کہا۔ تو مرجاتی تو اچھا تھا۔ میں اپنی آنکھوں کے ساتھ تیزی سے حالت کو دیکھتی۔

بھابیوں نے قہر آ کر دنگا ہوں سے دوا لہ کے کی طرف دیکھا۔

”آگیا۔ ملک الموت ان کی خوشیوں کو فنا کرنے والا۔ ان کی راحتوں کا جنازہ نکالنے والا۔ بھڑیا۔ آگیا“

آتش کے سوا۔ وہی ہوں گے۔ وہی ہو سکتے ہیں۔ میرا آئندہ میری راحتوں اور خوشیوں کا کھولا، اسے جان بہاؤ۔

اس وقت معلوم ہوتا تھا۔ جیسے میٹروں بھاریں عورتوں میں۔ دردناک کھلا۔ سانسے مارا والا کھڑا تھا۔ ایک غما کی ردی پہنے ہوئے، موت نگاہوں کے سامنے ناچنے لگا۔ اس نے غما کھولا۔ شاید کوئی شخص چیز ہو..... یہ کبھی خرابی تھی۔ جس نے بہاروں کی سادی دھجی لٹائی تھی۔

”کھانا تھا“

آج نہیں — پھر کسی دن آؤں گا۔

”آؤں“

نامہ پڑھنے ہی آشا کے سادے جسم میں ایک سکڑے سا طاری ہو گیا۔

آشا تار کو اپنی انگلیوں میں پھینچتی ہوئی، چمک پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بھابیوں خوش تھیں، ماں کے چہرے پر

ایک نرگس سا درس رہا تھا۔

---



تشکید اختر

اور وہ نگاہیں جیسے اس کی گردن میں اتری چلی جاتی تھیں۔ وہ گھبرا جاتی۔ اس کا دل زود زود سے دھڑکنے لگا اور ہنروری کی سردی میں بھی اس کی پیشانی پر پسینہ چمک اٹھتا۔۔۔۔۔ احم کے ہاتھوں تلے اس کی روح پس چلی تھی اور اب اتنی بڑی وسیع دنیا میں اس کا کوئی بھی اہل نہ رہا تھا۔ کسی کے لیے اب اس کے دل میں فکر نہ تھی اور کوئی دل اس کے لیے مضطرب نہ تھا۔ سارا اضطراب ساڑا دور اور سارا غم ایسے ہلکا ہو گیا کہ اس کی زندگی پر آیا اور آکر چھا گیا کہ اب یاس و حسرت کی کوئی انتہا باقی نہ رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ وہ اس کے بعد یہ دو چھینے روز عشرت سے بھی زیادہ طویل ہو کر اس کی سسکتی ہوئی روح پر سے آہستہ آہستہ ریگ رہے تھے۔ گزری ہوئی زندگی کے نقش و نگار اس کی نگاہوں سے بہت جلد مٹ چکے تھے۔ مگر اس کے دل و دماغ اور آنکھوں میں بھانک موت کا اندھا بھڑا سیلاب ابھی تک چھا رہا تھا۔۔۔۔۔ خوراک ناک موت کی گرج۔۔۔۔۔ بے بس زندگی کی آخری کش مکش، اور اس کی سسکیاں اور پٹیلیاں اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔۔۔۔۔ وہ ایک قیامت سے ہو کر گذری تھی۔۔۔۔۔ اسرائیل کے صوبے سے بھی کہیں زیادہ شہر مزہ۔۔۔۔۔ خون کی ندیاں بہیں۔۔۔۔۔ آگ کے سعلے بلند ہوئے۔۔۔۔۔ یزیدوں کے جہنم میں جھینس گھس گئیں۔۔۔۔۔ اور گنڈا سے اچھا لے اور بچھڑیوں میں لچپی ہوئی زندگی ممتی چلی گئی۔ وہ کسی بھی لچپی بدحواس مردوں کے ساتھ زندگیوں اور مردوں کو زندگی ہوئی بھانکتی رہی مگر کنوئیں کی منڈیر پر آکر اب کے پاؤں ایک لمحہ کے لیے ساکت ہو گئے۔ جیسے جہات۔۔۔۔۔ نے ان کے قدموں کو تمام لیا تھا۔ خون کے بہتے ہوئے پراناں میں۔۔۔۔۔ سے گذرتے ہوئے ان کے پاؤں بھی بال سرخ ہو رہے تھے۔ اپنے عزیز دل چھیتوں اور پیاروں کا گرم گرم خون، اجواب ان کے کپڑوں اور پیروں میں امر و کی جلی کی طرح جتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ جب سے کاروں کی آوازیں ان سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ قیامت کا شور مچ رہا تھا۔ ان کے دلوں کی دھڑکیں بھی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں۔۔۔۔۔ کنوئیں کی منڈیر پر آکر وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لیے جھٹک لگی تھیں۔۔۔۔۔ مگر ان کے بیٹے، ان کی ماہیں، ان کے باپ اور ان کے سائے رشتہ دار عزیز اور عزیز تر لوگ بیدار دی سے مارے جا رہے تھے۔ شہر شیر کشور بڑھتا جا رہا تھا اور چھین بند ہو کر ممتی جا رہی تھیں۔ وہ منزل سے بڑھ چلا ہو گیا، اب ان کے دلوں سے اضطراب مٹ چکا تھا اور وہ بڑے استقلال سے کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گئیں۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد اس کو کچھ بھی یاد نہ رہا۔۔۔۔۔ سردی سے ان کے دانت کھٹک رہے تھے۔ اور وہ اسی آواز سے جاگ اٹھی تھی۔۔۔۔۔ کچھ عورتیں اور لڑکیاں اسی کی طرح کنوئیں کے اندر اس کی بھینگی ہوئی دیوار سے آوی ہوئی ٹھنڈ سے لپکا رہی تھیں۔ ان کے قدموں کے نیچے کنوئیں کا پانی بہا ہلکا رہا تھا۔ اور اس پر کئی پھول ہوئی تھیں ایک ایک ایک ایک ٹھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مل کر پھر سے دیکھا۔ وہ ابھی تک زندہ تھی۔

وہ پہلے تاب ہو کر کنوئیں کے اندر ماسنس لیتی ہوئی صوفیوں کو حریصانہ طور پر دیکھنے لگی۔ "اماں، آپا، بھابی اور پیاسے سے بھائی بہن؟ غروڈاں کوئی نہ تھا۔ بھرا بھرا گھڑا سا گھر؟۔ کیا ہو گیا؟۔ وہ سب کے سب اس کو ایکلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ اندر وہ کنوئیں کے اندر چھپاتی ہوئی دیوار سے اڑی ہوئی سرودی سے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سبھی آہستہ آہستہ سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ ایک کی گردن میں تین سال کا بچہ تھا۔ اس کا سارا جسم سرودی سے تھر تھرا رہا تھا۔ اور وہ بار بار اسی طرح کپکپاتے ہوئے رٹ رہا تھا۔ اماں گل گل۔ گل گل چلو اماں۔ ماں بار بار اپنے گیلے اکچل سے اس کو لپیٹ لیتی۔ چپ رہو بیٹا۔ چپ رہو دشمن خدا کی آواز سن۔ لے گا بیٹا۔ مگر کچھ کنوئیں کے اندر بیٹھ رہا تھا۔ ہم کو جالا لگ رہا ہے اماں گلے چلو۔ گلے چلو۔ ماں: بچہ جیسے ہی چپ ہوا تھا کہ کنوئیں کے اندر پھر کی ایک بڑی سی سل اکڑ پانی میں لڑی۔ ایک خیف چیخ بند ہوئی۔ کنوئیں کا پانی زور سے اچھلا۔ پھولی ہوئی لاشیں ڈوبنے لگیں۔ خوف و دہشت سے سب کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنی آنکھ کھولی تو کچھ خون سے شرابور اپنی ماں کی گردن سے چٹا ہوا تھا۔ اور اس کا بیٹھا پانی پر تیر رہا تھا۔ بس اس نے اتنا ہی دیکھا۔ اور اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال کے چٹک پر پٹیوں سے جڑی ہوئی کڑا رہی تھی۔ اس کی گردن، پیٹ اور ماتحتوں پر برچھے کے گڑے دھم گئے تھے۔ چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح اس کو بھی دشمنوں نے کنوئیں کے اندر بھجوا دیا اور جھالوں سے گھونپ گھونپ کر ڈھکی کر دیا تھا۔ دوسرے دن مٹری والوں نے کنوئیں میں سے کئی لاشوں کے ساتھ اس کو بھی نکالا۔ ڈیڑھ مہینہ وہ اسپتال میں پڑی رہی۔ ذہریلے دھم کے ساتھ اس کو نوٹیر بھی ہو گیا تھا۔ ادب عالیہ ہسپتال سے اس پر طیف کیسپ میں پہنچا دی گئی تھی۔ کپڑوں اور کپڑوں سے لڑی ہوئی لڑکیں کئی بار یہاں آکر آکر خانی ہوتی رہیں۔ مگر ہمیشہ مٹنے والوں کا بڑا مجمع رہتا۔ ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ۔ ہتھیار، صدائیں، اور لوٹ کھسوٹ کو دیکھ کر اس کو بڑی کراہیت ملتی رہی تھی۔ اور وہ ایسے موقع پر ہمیشہ دواں سے کترا کر نکل جاتی۔ جب وہ ہسپتال میں تھی تو کئی رضا کار بہنوں نے ملتی ہوئی مریضوں کو ان کے چنگلوں کے پاس جا کر ایک ایک جڑا کپڑا دیا تھا۔ اس کو بھی ایک جڑا کپڑا ملا۔ پہلے پہل ان کپڑوں کو لیتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں آنسو چلنے لگے تھے۔ اور اسی دن اس کو اپنے عزیزوں کی موت پر رشک آیا جو شہید ہو کر جنت میں آرام سے تھے اور اچھے اچھے کپڑے دوسروں کو دینے والی یا سبھن کے بیمار ماتحتوں میں ہر اسے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کا ایک جڑا کانپ رہا تھا۔ اور ابھی تک اس کے پاس ہو درجہ بے کپڑے تھے۔ ایک اس کے اپنے گھر کا آخری جڑا اور دوسرا جھ پتال میں ملا تھا۔ بس یہی اس کی ساری کائنات تھی۔ ٹھنڈی زمین پر سوتے ہوئے اس کو اپنا گھر یاد آ جاتا۔ سماج یا ہڈا گھر۔ زم اور شغاف سے بہتر، میز، کرسیاں، لٹاؤں سے بھری ہوئی ٹیبلٹ کی اڈکھی اڈکھی، اماں کا محبت سے دکھا ہوا چہرہ، آبا جی کی شفیق نگاہیں، بھائی جان، بھابی جان اور چھوٹے چھوٹے پیارے بھائی بہن۔ جاتے کی راتوں میں جب بڑھی آتا چر مدلی اور بھوتوں کے ٹھہرے ان پھل کو منانے لگتی تھی تو وہ اپنی رضایوں میں خوف سے کیسے دبا جاتے تھے۔ اور اب کتنی بے مددی سے وہ سب کے سب ذبح کر کے جلا دے گئے اور زندہ جلا جلا کر ذبح کیے گئے تھے۔ اس کی آنکھیں دوتے دوتے اب ٹھک گئی تھیں۔ اور اکثر جب اس کا جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر رو سکے تو اس کی آنکھوں سے بہت مشکوں سے چند آنسو بہ جاتے، اور اس کے بعد سب سے زیادہ اس کو اپنے آپ پر انفس آسنے لگتا تھا۔ اس کے سبب پیاسا جیسے اپنے گھر میں تھے۔ اسی طرح ایک ساتھ جنت میں بھی خوش ہوں گے۔ مگر وہ کتنی بد نصیب تھی۔ اس کو اپنے آپ پر غصہ آ جاتا وہ کوئی نہ کی طرف بھاگ کر اب تک کیوں نہ دی تھی؟ پیلے پیلے بہت سے لوگوں کے ساتھ اچھ کی منزل میں کمرے کا ایک کونہ اس کو بھی مل گیا تھا۔



ہوئے تھے۔ وہ بھروسے لبوں پر کھلی ہوئی حسرتیں دم توڑ رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں ابھی تک سونے کی ابریک پڑی ہوئی تھی اور دہانے فاقہ کی چھلکی میں انگریزی دوا اس کی ایک سادہ سی انگوٹھی بھی تھی۔

اتنے دنوں کے بعد آج پہلے پہل اس کی نگاہوں میں یاسمین نے اپنے بے سہارے اور پاکیزہ منور کا جذبہ دیکھا۔ اس کا دل مہر آیا۔ دنیا میں اب اس کا اپنا کوئی بھی نہ تھا۔ پھر وہ لگا جس کی روح کی گہرائیوں میں کیوں نہ تھی جی جا رہی تھیں۔؟ لیکن وہ یاسمین سے کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔ اس کے قدم بڑی آہستگی سے اٹھ رہے تھے۔ جیسے اس کے دل کا ساما بوجھ انہی قدموں پر آگیا ہو۔۔۔ وہ اس کو ہاتھ جوڑے دیکھتی رہی۔ سلیٹی رنگ کے پینٹ اور اسی رنگ کے پٹی اور نیس اس کا دوا قد اور بھی نمایاں لگ رہا تھا۔ ابھی اس کو اس کو کتنے قریب سے دیکھتی رہی تھی۔ اس کی تسلی تسلی آنکھیں، اس کے اداس سے لب، اور اس کا مہربان چہرہ۔ اس کی وہ ٹھیکٹیں لگا ہیں ابھی اس سے کتنی قریب تر تھیں۔ کبھی وہ یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کوئی اس طرح بلا جھک اس کے آنا قریب آئے گا۔۔۔ چیز اور ہی مورد پر اس کی نظر اپنی انگوٹھی پر پڑی گئی تھی۔ اسی انگوٹھی نے کیسا کیسا انظار اس کی آنکھوں میں مہر دیا تھا اور وہ بے تابی سے آنے والے دنوں کی فضا تھی۔ اس کی شادی کو صرف پندرہ دن باقی رہ گئے تھے۔ گھر میں شادی کی ہوا بھی بچ رہی تھی کہ پروفٹ سائے رہیں گے۔ اور پھر ایک قیامت ان پر سے گزر گئی۔ جہاں وہ بیاد کر جا رہی تھی۔ وہ سستی بھی جدا کر خاکستر کی جا چکی ہے اور اتنے بڑے گاؤں میں سے صرف ایک چودہ برس کا لڑکا دھان کے کھیت میں چھپ کر بچ سکا تھا۔ لادواں کا لادواں جا چکا تھا اور ایک وہی بلنصیب تھی کہ بھٹاک کر رہ گئی تھی۔ ایک بیک اس کی روح میں اک اہال سا اٹھا۔ کیسے کیسے تصور اس کے دل و دماغ میں جا لے جلتے رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی ایسی ہی ہوں گی۔ اس کے بال بھی غرن میں تھوڑے جانے سے قبل ایسے ہی چھلکے ہوں گے نا؟۔ اور اس کے لب؟۔۔۔ وہ ہمیشہ اس کے لبوں کو سوچتے ہوئے شرماتی تھی۔ اس وقت بھی پہلے کی طرح اس کے لبوں کو یاد کر کے ہوئے وہ جھٹک گئی۔ اور اس کے لب؟ موت کی خاموشی سے پہلے بھی وہ ایسے ہی اداس ہوں گے۔ اچانک اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کسی لطیف درد کو نہیں اپنے مستقبل کے اسی روشن آفتاب کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں اسی کی تھیں وہ انہی لبوں کو یاد کر کے شرماتی رہی تھی۔ اس کی تسلی تسلی لگا ہوں میں محبت تھی، رحم تھا اور سہارے تھے۔ بے اختیار اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ دودھ لگا کر اس کے قدموں سے لپٹ جائے۔

رات بھر ٹھنڈی زمین اور بھی سخت ہو کر اس کی میٹھ میں گڑتی رہی۔ وہ دبا بھی نہ سوسکی۔ دوسرے دن نہ جانے کیوں، اس کی آنکھوں میں انظار بھاگ رہا تھا۔ اپنی غم ناک یادوں سے وہ ابھی تک لپٹی ہوئی تھی۔ مگر اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ بھانک موت اور دوا چھین اور غن کی بہتی ہوئی مریاں۔ اور اسی طور پر دو جینے سے اس کی زندگی محروم رہی تھی، چکا رہی تھی۔ اس نے اتنے دنوں سے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ دنیا اس قیامت کے بعد ویسے ہی تھی یا کوئی دوسری دنیا بن گئی تھی۔ اور کل پہلی بار جیسے اس کی پے ہوش نگاہیں ہوش میں آئی تھیں۔ اچانک اس کو اپنے آپ سے مشغول آنے لگی۔ اس نے اسے بس ایک فیکٹری ہی سمجھا ہو گا نا؟۔ اس بے چارے کو کیا خبر کہ اپنے سچے ہونے خوب صورت کردوں میں وہ گفتگو ایسی ہی آنکھوں، ایسے ہی لبوں اور ایسی ہی محبت سے بھری ہوئی نگاہوں کا کبھی تصور نہ کرتی رہی تھی جب وہ یاسمین تھی۔۔۔ چنبیلی کا نازک سا پھول۔۔۔ اور اب؟ اب وہ کون تھی؟ اس کا اپنا دل بھی اپنے کو یقین کرنے کو نہ چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ اپنی اگلی میں سے انگوٹھی اتار کر پھینک دے۔ وہ ہاگل ہوئی جا رہی تھی۔ دنیا میں اب اس کا کوئی بھی نہ تھا۔۔۔۔۔ پھر یہ کس کی تمنائیں اب اس کے دل میں جاگ رہی تھیں؟ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور پھر۔۔۔ اسی مورد پر اس کی زندگی گردش کرنے

گئی۔ اس کے میروں میں پھنا ہوا چل تھا اور اپنی مٹی سی پھٹی ہوئی سادی کے آچکل میں وہ سمٹ گئی۔ اس کو اپنے سے شدید ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ بڑے پیار سے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو دیکھتی رہی۔ کاش یہ زندہ نہ رہتیں۔ موت اگر وہ ایک دم گانپ گئی۔ کنوئیں کے اندر پھونکی ہوئی لاشیں اس کو یاد آگئیں۔ اور پھر کنوئیں کی سردی اس کی ہڈیوں تک آؤ گئی۔ وہ کتھڑے پا بھکی آسمان کو نکلنے لگی۔ اس کو آسمان کا نیلا رنگ بہت اچھا لگا۔ بہت دنوں کے بعد آج اس کو اپنے دل کے اندر ایک نئی زندگی کا احساس ہوا۔ اٹھا۔ ہاں۔۔۔ اس کے دل کے اندر یہی تو۔۔۔ اس کا جسم تو ابھی تک سرد رہا تھا۔ گندے نعلین میں پٹی ہوئی ایک مٹری ہوئی لاش ہی تھی دو۔۔۔ ابراہم کے میں بردوز کی طرح جہنم سا شونہ بنی۔ اٹھا۔ کئی بچے دور سے تھے۔ اس نے ہٹ کر پیچھے دیکھا۔۔۔ اور جیسے اس کی نگاہیں تھر تھرا گئیں۔ وہ اپنی اور اس قدموں سے اس کی طرف پھاڑا تھا۔

— نہ طیف کیٹی کے میگزین سے کہہ کر آپ کے لیے کچھ پڑے اور ایک بستر لایا ہوں — آپ کو نام کیا ہے؟ —  
وہ اپنی لاپٹی پر کچھ لکھتے ہوئے بولا۔ ایک حساس سی خاموشی صدوزی دیر کے لیے دامن پر چھا گئی۔ یاسمین نے اپنی جھیلی ہوائی بوجھل پلکوں کو آدھ پر اٹھایا۔

—پامپین—

۱۲۰

'ہا میں؟' اس کی آنکھوں میں حسرت سی بھر گئی۔ 'وہ آپ کا مکان کہاں تھا؟' ہم کی موجودگی میں یہ کہیں کی روح چھوٹے کھانے لگی۔ بس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ 'تھا تو۔۔۔ گاؤں پر چلتے چلتے اس کا قلعہ ٹک گیا۔' تمباڑا؟ — وہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا۔ پھر آپ کیسے زندہ رہ گئیں؟

ایک بے بس سی آہ اس کے اہوں پر تعتر کر رہ گئی۔ "بہت خشکوں سے..... انگریز میں کود کر — گرد بجھئے نا! کنوئیں کے اندر بھی ہندوؤں نے برنجیوں اور جالوں سے گھونپ گھونپ کر مجھے زخمی کر دیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں زمینوں کے داغ دکھاتی ہوئی۔" یہ سٹاک ہو گئے تھے۔ ٹریڈر حبیبہ ہسپتال میں رہی اور اس کے بعد یہاں بھیج دی گئی۔ مگر کہاں سے ہسپتال اچھا تھا۔ وہ جو بے بھرے پن سے بولی۔

ہمارے پارٹی بھی تباہ اور بچنے لگی تھی۔۔۔ وہاں سارے مکان جلے ہوئے ہیں۔ مسجدوں میں ابھی تک خون کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔۔۔ اسی جگہ کوئی ہوئی بہت سی چوڑیاں تھیں، اور بے چاری عورتوں کے سر کے بال، بچے بچے بال بھی۔۔۔ میں نے سنا ہے۔ کہ چارہ دوز کے مقابلہ کے بعد جب مسلمانوں کے پاس ایک بھی کارڈس نہ رہا، اور بھوکے پیاسے بچے چارہ مسلمان میں ہیں ہزار کے جتنوں سے مقابلہ کرتے کرتے تھک گئے آخری بار مایوسی میں وہ اس خیال سے مسجدوں میں جمع ہو گئے تھے کہ شاید ہم خدا کے گھر میں کچھ حمایتیں۔۔۔ مگر وہ یہاں بھی نہ بچ سکے۔ مری اور پولیس والوں نے بلایوں کے ساتھ قتل کے سارے مسلمانوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا اور دشمنوں نے قتل کرنے سے پہلے بے چاری عورتوں کے بالوں پر اپنی کپڑوں کی تیزی آزمائی تھی۔۔۔ اذہ۔۔۔ دنیا کی کوئی تاپ کچا اتنی بزدل اور بھیانک خلیہ بندی پیش نہیں کر سکتی۔ ہٹلر نے بھی اتنے ہیبت ناک خراب کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ اس کی آواز نہ کاہ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک جلی سی نمی آگئی تھی۔۔۔ مگر یا سمن چپ چاپ اس کو سمجھ رہی۔ جیسے اس کا سارا اضطراب غم مہو گیا تھا۔ وہاں تالاب کے

پاس ایک بہت اُدھنسا سفید مکان بھی آپ کے دیکھا تھا۔؟

”مکانوں کی صحیح صورت تو اب وہاں کوئی بھی نہیں۔“

”اور وہ وہاں کے کنوئیں؟ آپ نے کچھ اور آدمیوں کو ان میں سے نہیں نکالا؟ وہ اپنے گھر کی باتیں اتنی محبت سے پوچھ رہی تھی جیسے اپنے سسرال میں وہ میٹھے کی ایک باتیں چھیڑ چھیڑ کر بڑے پیار اور محبت سے دریافت کر رہی ہو۔“

”ڈشمنوں نے سارے کنوئیں ہار کر کے لندوں اور مردوں کا مدفن بنا دیا ہے۔ آپ کسمت سے بچ گئیں۔“

”دم بھر کے لیے ایک تھکی ہوئی بھڑی سی سنہری یاسمین کے سبل پڑائی: آپ پنجاب سے آ رہے ہیں نا؟“

”ہر آپ نے کیسے جانا؟ اس کی آنکھیں بھی پھلک اٹھیں۔“

”یہی آپ کے لیے اور باتوں سے، ابھی آپ نے جو کسمت ”کہا تھا نا؟ میں یہ پہلے ہی سے جانتی تھی کہ آپ ”گت“ نہیں

بول سکتے: وہ ایک مصوم بچے کی طرح بولی۔

”وہ ہنس پڑا: تو آپ یہی خود کر رہی تھیں؟“

”اور یہ بھی تو کہ آپ ہم پر نصیب کے لیے کتنی دُور سے آئے ہیں۔“ غصہ اور محبت سے یاسمین کی آنکھیں جھلک اٹھیں۔

ایک دم چپ ہو گئی۔ جیسے اس کو اپنا خیال آ گیا ہو۔ وہ ایک اُدھنھے گھرانے کی شریفیت گزار رہی تھی۔ جس کے خیال میں بھی کوئی جبر مرد نہیں

آ سکتا تھا۔ اور اب، وہ کتنی بے گنجائی سے اس سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ بے نادری کی لہریں اس کی دھج میں کود اٹھیں۔ اب وہ یاسمین نہ

تھی۔ سچکڑوں مرد اور عورتوں کے درمیان دبنے والی کوئی دوسری بن چکی تھی۔ غم کے بار سے اب اس کا جی ٹھک کر بے نادر ہو گیا تھا۔ مسلسل

دو مہینوں سے وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں سو گدا رہتی۔ گرا اب اپنا نام اس کی ذہنی زندگی ایک نئی کوٹ لینا چاہ رہی تھی۔ جیسے وہ

اپنے حلوں سے گریز کر رہی ہو۔ اب تک جو نگاہیں اور لب و لہجہ اس کے خیال میں چھائے رہے تھے۔ ان ہی کی یاد میں اب وہ اس کی

آنکھوں میں گھس گئی تھی جو اس کے غم اور دکھوں میں شریک ہونے کو اتنی دُور سے آیا تھا۔

”تکھاڑا کی مسجد سے ہم لوگوں نے منظم شہیدوں کی یادگار، خون سے مٹا ہوا لہروں کے کچھ ٹوٹے، ٹوٹی ہوئی چوڑیاں۔ اور

کتنے ہوئے تھوڑے سے بال دکھ لیے ہیں۔ ہم ان چیزوں کو اپنی زندگی سے بھی دیا دہ عزیز رکھیں گے۔ مصوم شہیدوں کی آخری یادگار ہیں۔“

”تو پھر۔۔۔ میری چوڑی۔۔۔ اور میرے سر کے بال بھی ہونے آپ کے پاس؟۔۔۔ میں کیوں بھاگی تھی بچنے کو۔۔۔ وہ

بے اختیار بول اٹھی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے تھپک پڑے۔ وہ دوسرے کمرے سے نکلتے ہوئے تھا، اس کی منہم

نگاہیں یاسمین کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اسی وقت یاسمین نے اس کو دیکھا وہ کتنا دل کش نظر آ رہا تھا۔

دو دن کسی نہ کسی بہانے وہ اس کے پاس ضرور آتا۔ یاسمین کی نگاہوں نے جب سے اس کو دیکھا تھا جیسے اک گونہ سکون اس

کو مل گیا تھا۔ وہ ایک دم بے سہارا نہ تھی۔ کسی کا دل اس کے لیے پڑا ہوا تھا۔ اس کی جگہ اب بدل دی گئی تھی۔ گھری میں ایک صاف ستھری

جگہ دیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ”آپ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں پنجاب۔“ تو وہ ہنس پڑی تھی۔ ایک عزیزوں اور دل دوزی

ہنسی اور اسی ہنسی کے ساتھ اس کا دل کانپ اٹھا تھا۔ ”کسی کے ساتھ چلے جانا، کتنی بڑی سی بات تھی؟“ مگر پھر بھی اس کا دل چاہتا تھا

کہ وہ اکیلے رہے۔ کیونکہ اس کے اندر اتنے شور اور ہنگاموں سے اس کی طبیعت پریشان ہو جاتی تھی۔ اور ایک عجیب سی غصہ، اختلاف بن

اس کی روح پڑھ جاتی۔ جب کسی اس کے آنے میں دیر ہونے لگتی تو وہ اس طرح بے کل ہو جاتی۔ جیسے اس کی زندگی بھر کا سرمایہ ہیشہ کے لیے ٹھٹھا ہو۔ کبھی ادھر دیکھتی، کبھی ادھر نکلتی۔ چھی چھی نکلا ہوں سے ہر طرف اُسے ڈھونڈتی۔ بہانے کر کر کے نیچے جھانکتی۔ مگر تب بھی وہ اتنی بُری نہ ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ بنگا بپلی جاتی۔ اس کے دل و دماغ میں عجیب عجیب سے جوار بھاٹے اٹھتے، اود اس کی روح میں بغاوت کا ایک طوفان سا چھینے لگتا۔ وہ خدا۔ اود اس کی دنیا و دوزخ سے باہمی ہو جانا چاہتی تھی۔ اتنی مختصر سی زندگی میں اس نے کیا کیا تھا؟ جس کی وہ مرزا اور تھی؟ اپنی بے کسی کو دیکھتے ہوئے اس کو اپنے عزیز دل پر غصہ آ جانا۔ جو اس کے خیال میں شہید ہو کر آرام سے جنت میں بیٹھتے تھے۔ اور اکیلی وہ بے چاری حوادثِ زندگی کے سمندر میں بچکولے لگا رہی تھی۔ طوفانی تھیرے اسے زندگی اور موت کے درمیان بھیانک ہنگامیں دے رہے تھے۔ کاش وہ دوبارہ ہی جاتی۔ موت سے بھی زیادہ ٹھنڈے اود تائیک دلدل میں سے احمد کے ہاتھوں نے اُسے نکالا تھا۔ جب وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھتی۔ تو اس کا جی بے اختیار چاہتا کہ احمد کے ہاتھوں کو حوام لے، پہنچے وقت احمد کی آنکھوں کا ہلکا بھورا رنگ لگتا چمک اٹھتا تھا۔ اس کے بون کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا جیسے ہر ٹھری ان پر کوئی نامکمل انسان چل رہا ہے۔ اود اس کے لب پر آگ بھڑکی ہوئی ہلکی سیاسی ناولی خرویش سے کٹی ہوئی وہ کانٹوں کی بانڈ۔ یاسمین کو سب سے زیادہ پسند تھی، جیسے دوزخ سے کسی مٹی کی گلاب کی حفاظت کر رہی ہو۔ اور کبھی کسی تو اس کا جی بے اختیار چاہتا کہ وہ قریب سے اُس گلاب کی خوشبو سونگھ لے، یہ سوچتے ہوئے وہ شرا جاتی، اس کی بھائی نے ایسی بہت سی باتیں اس سے سرگوشی میں کہی تھیں اندھ جن نکلا ہوں کا انفراد کر کے کہتے وہ تھک گئی تھی۔ اب وہ اچانک احمد کی آنکھوں میں جھلک رہی تھیں۔ اس کے رخسار دیکھنے میں دیشم کی طرح نرم لگتے تھے جن کو دیکھتے ہی اس کو اپنا وہ ساشن کا کلیہ یاد آ جاتا جسے اپنے رخساروں کے نیچے رکھ کر سونے ہوئے اس کو بہت اچھا لگتا تھا۔

اود پھیلری میں چھوٹے چھوٹے درختوں پر بیٹھے ہوئے جب وہ نیچے دیکھتے تو بڑے مان میں اتنے بکھڑے ہوئے پناہ لایزوں کو دیکھ کر بعض دفعہ انہیں یقینی نہیں ہوتا کہ یہ بھی انسان ہیں، سارے لوگ اس دلیلیت و رک کو جانتے تھے اود اس نے سب سے یہ کہہ دیا تھا کہ یاسمین اس سنٹر میں خود توں اود بچوں کی انچارج بنائی جانے والی ہے۔ اسی لیے وہ یاسمین کو اس کے کام سمجھایا کرتا ہے۔ اود کبھی اس نے یاسمین کو یہاں کا انچارج ہزار دیا تھا۔ احمد کے ساتھ کئی بار دلیلیت و رک خواتین اود خود عورتوں کی بڑے مسر اسحاق یاسمین سے ملنے اود اس کے حالات پوچھنے کو آچکی تھیں۔ ان سبھوں نے یاسمین کو کسی پرائیویٹ مکان میں بے جانا جانا۔ مگر وہ نہیں گئی۔ اس کو اس گندے کیمپ کے ایک ایک حصے سے محبت ہو گئی تھی۔ یہاں ہر جگہ اس کی محبت نے نقدش اُجاگر تھے۔ اود وہ ان سہاروں کو چھوڑ کر کہاں چلی جاتی؟

احمد نے ایک دن یاسمین سے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ اس کو کبھی نہ بھولے گا۔ بہار کی سب سے گہری یاد اسی کی تھی اود ویسے بھی بہار کی گزری ہوئی گھڑیاں اس کو ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔ اس کا جی بھی کچھ کہنے کو چاہتا رہا۔ مگر اس کے لب جیسے ساکت ہو گئے تھے دوسرے دن وہ انفراد کر کے کہتے تھک گئی۔ مگر سارا دن گزرا گیا۔ اود وہ نہ آیا۔ رات کو اچانک وہ ایک خوبصورت سائرم کپل لیے اس کے پاس ٹھہر گیا۔

”میں واپس جانا ہوں، یاسمین دیکھو یہ تار یا یہ ہے میری ماں کو دل کے دوسرے پڑ ہے میں۔ اود اتنی دلدل ہو رہی ہے مجھے جو یہی میں؟ اس کی آواز کا نپ رہی تھی۔ ہر روز تمہیں سردی لگتی ہے نا؟ اپنا کپل تمہارے لیے لیتا آیا ہوں۔“ اس کے الفاظ

رکھ کر آئے جا رہے تھے ————— اپنے کاموں کا چارچ دینا تھا اسی میں سارا دن گزر گیا۔ کہیں تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گئیں؟ وہ بڑے پیار سے بولا۔ تمہیں یاد ہوگا۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ اگر اپنے عزیزوں کے ساتھ تم بھی شہید ہو جاتیں تو تمہاری چوڑیوں کے ٹکڑے اور تمہارے بالوں کی تہ بھی یادگار کے طور پر میرے پاس ہوتے نا؟ ————— تو اپنی صوف ایک چوڑی اور سلپے بالوں کی ایک لٹ لٹ کر مجھے دے دو۔ ————— یہ تین کر دیں اس کو اپنی زندگی کا سب سے گراں قیمت سرمایہ سمجھ کر اپنے پاس رکھوں گا۔

یاسمین حیرت زدہ اس کی طرف نکلتی۔ ہی۔ وہ جا رہا ہے؟ ہمیشہ کے لیے؟ پھر کبھی نہ آنے کو؟ جیسے اس کا دل اس بات کو یقین کرنا نہ جانتا ہو۔ ————— دردِ دہم کی ساری انتہا کیا دیگی اس کی دھڑکن میں تپ اٹھی۔ بڑی حسرت اور بے چارگی کے عالم میں اس نے اپنے ہاتھ سے ایک چوڑی نکال کر اس کو دے دی۔ اور احمد نے خود ہی اس کے منتشر بالوں کی لٹل میں سے ایک لٹ بیڈ سے کاٹ لی۔ ————— وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنی نگاہیں چھپا رہے تھے۔ اس نے کبیل یا سمین کی ٹوہنیں ڈال دیا۔ اور بے اختیار اس کے ہاتھوں کو حتم کر وہ ان پر جھک گیا۔ لطیف لائٹوں کی بات اس کے ہاتھ پر سرسراتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور اس کی دھڑکن میں ایک ساتھ ہزاروں سوئیاں سی پھینے لگیں۔ کندیش کے اندر کی سرحدی جیسے اس کی ٹڈیوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی اور کندیش کا تنگ و تنگ دہانہ اور بھی زیادہ تنگ ہو کر اس کو پیٹا جا رہا تھا۔ ————— آخری بار ————— بے سہارا اور ہمیشہ کے لیے یاسمین کو کراہتیں نے اس کے ہاتھوں کو زور سے پکڑ لیا۔ بہت زور سے پکڑ لیا۔ بہت زور سے ————— یاسمین کی ٹوہنیں باقی ہوئی آنکھوں کو اپنی جھلکی ہوئی آنکھوں سے نکلتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس کے ٹھنڈے ہاتھوں پر جھک گیا۔ "خدا حافظ یاسمین۔" مجھ کو کبھی بھولو گی تو نہیں؟

مگر یاسمین بھر بھی چپ رہی۔ وہ اس کو جاتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکی۔ وہ اپنے سے ڈر رہی تھی۔ اگر وہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جانتے ہوئے دیکھ لیتی تو پھر اس کی جینیں بے اختیار ہوجاتیں۔ —————

اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ————— وہ برآمدے میں نکل کر کٹھن سے گلے تاروں سے جھلکتے ہوئے آسمان کو بے بسی سے تنکھ لگی۔ ————— اماں میری اماں! میری بھابی۔ پیارے آبا۔ ذریں۔ فرحت۔ خفاہ دیو۔ ————— تم سب کے صوب کہاں ہو؟ اتنے دنوں کے بعد اچانک اس کا سارا غم تازہ ہو گیا تھا۔ جیسے اس کے زخموں کے سارے ٹانگے ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے ہوں۔ ————— اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ ڈوبتے ڈوبتے اس نے ایک آنسو کا سہارا لیا تھا۔ —————

مگر تنکا۔ صوف ایک تنکا ہی تھا نا؟ اس کو اپنا گھریا دیا۔ جہاں وہ اب تک کتنی معصوم اور خوشیوں کی زندگی گزارتی رہی تھی۔ اماں کی محبت بھابی کی شوقیاں اور چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کے معصوم سے پیار۔ ————— اس کا اکیلا کراہ اور تجلی کے رنگین جالے۔ وہ چونک پڑی اس کو پھر احمد کی آنکھیں، اس کی حسرت بھری نگاہیں، اس کے دیشم جیسے رخسار، خوب صورت چھلتے ہوئے بال اور پھر اس کے ہونٹوں کی تھر تھراہٹیں یاد آگئیں۔ کل اب اسے کس کا انتظار رہے گا۔ —————؟ اب وہ کبھی شریقی رنگ کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو کبھی نہ دیکھ سکے گی؟ گھٹتی ہوئی چمکیوں کے ساتھ وہ اندر وہ لٹی ہوئی گیلیری میں واپس آ کر اپنے ذہن کے بستر پر لیٹ رہی۔ اس نے احمد کے دیشم ہوئے کبیل کو کھولا۔ اور اپنے چاروں طرف پریٹ لیا۔ کبیل میں سے احمد کی خوشبو بھوت رہی تھی۔ وہی خوشبو جو یاسمین اس کے چلے جانے کے بعد فضاؤں میں سے سونگھتی رہی تھی۔ احساسِ غم سے ایک بار اس کا سارا جسم کانپا۔ اور وہ پہلے



ہم سب کے کہیں سے اور بھی زیادہ پٹ گئی۔ اتنی بڑی وسیع دنیا میں صرف یہی ایک کہیل بنی تو سب اس کا آخری مہارہ گیا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے نکلتی ہوئی جو سچ تو مشکل سے روکا — میرے محبوب۔ میرے احمدؔ وہ کہیل کو جہم کر اس سے دیوانہ وار پستی ہوئی سسک سسک کر رونے لگی۔ اداسی وقت رات کے مسلمان انگریزوں میں پنجاب میں تیزی سے بہاؤ کو چھوڑتی ہوئی آگے بڑھی جا رہی تھی ۶

---

# زرد گلاب

کونسی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے  
عشق بلاخیز کا، قافلہ سخت جاں

(اقبال)

اے حمید

شروع نمبر کی ایک ابرہہ آلود شام،  
تعبہ ہری ناگ میں بارش ہو رہی ہے۔ ہلکی ہلکی، سرد، دیران اور اداس بارش میں قصبے کی اونچی نیچی تنگ دتاریک پتھر ٹی گلیاں  
سناٹا دکھائی دے رہی ہیں۔ ان گلیوں کے کوڑوں پر جلتے والے پڑا ہوا لیمپ کچھ بجھ گئے ہیں، اور کچھ جلتے ہوئے ٹھٹھرتی ہوا میں کانپ  
رہے ہیں۔ بڑے بازار کی تمام دکانیں بند ہیں۔ انداؤں کے جھکے ہوئے زنگ آلود سا تھان جگہ جگہ سے ٹپک رہے ہیں۔ منڈی کا صحن بارش  
اور کچھڑ میں دلدل بنا ہوا ہے۔ صحن کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی کچی کوٹھڑیوں میں کہیں دن بھر کے تنکے مانگے مزدور بٹے ہوئے کھڑے  
کسیل اوڑھے سو رہے ہیں اور کہیں گیس کی روشنی میں نندو چہروں والے بیوپاری تجوروں کے سامنے کھاتہ کھولے حساب کتاب میں  
مغروٹ ہیں۔ نیچی چھت والی پرانی غلام گردش میں ایک خستہ جان گھوڑی، دو میل لحد ایک جینس بندھی ہے، اسی کے پاس ہی اذیتور  
کا چوکیدار آگ جلائے بیٹھا سرخ کٹالی میں آٹا گوندھ رہا ہے۔ تیز بھا میں چیر کی مرطوب کھیاں مروت کڑوا حوال دے رہی ہیں۔  
چوکیدار کی ناک سردی میں ٹھٹھرتی رہی ہے۔ اور اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ مٹی والے نیم کے پیڑتے  
ایک ریڑا اپنے دونوں بازوؤں پر اٹھائے نومبر کی بارش میں بھیگ رہا ہے۔ مٹی کے جنوب میں حلیہ حمد کی یادگار آجڑی ہوئی،  
پرانی خستہ حال حویلیوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے۔ کچھ حویلیاں ڈھے چکی ہیں اور بٹے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جو باقی  
بچی ہیں ان کے گھٹے ہوئے بدبودار تاریک دیوان خانوں میں ضلع ریٹک اور ریاست اور کے مساجد میں آباد ہیں۔ حویلیوں کی رسیلی  
رسی کی زور چھتیں جگہ جگہ سے ٹپک رہی ہیں اور ضلع ریٹک اور ریاست اور کے مساجد میں اپنی گدڑیاں اٹھائے کھیں یہاں بیٹھ رہے  
ہیں اور کھسی دباں اٹھ رہے ہیں، ان کے کالے کالے بچے روٹی کی پیٹی ہوئی صدیوں میں زور زور سے رو رہے ہیں اور ان  
کی زرد آنکھوں والی مائیں انھیں مار پیٹ رہی ہیں۔ اور ان کے وہلی تپتی ٹانگوں والے غارندائیں گالیاں دے رہے ہیں اور کبریاں۔

میساری ہیں اور کہیں کانشی کی دیشیاڑھنگ کر نیچے گر پڑی ہے اور کہیں گرم گرم ندے میں سوئی سختی رو کیا پر پھر بارش کا پانی چکنے لگا ہے۔ اور وہ روتی ہوئی ماں کو پکار رہی ہے۔ اور کونے میں بیٹھا ہوا ایک بڑیوں کا ڈھچھا وارنٹ یہ سب کچھ دیکھ لے، سُن رہا ہے اور بڑے اطمینان سے جگالی کر رہا ہے۔

والی حویلیوں سے پڑے خوار کے کھیتوں کے پار، نرس کے سنسان پل پر میٹیاں بجاتی ٹھنڈی ہوا نیشہ کی جھکی ہوئی ٹھیلوں کو جھولا جھلا رہی ہیں۔ نرس لبالب بھری ہوئی ہے اور اُس کا گہر دسے رنگ کا پانی کناروں سے اُچھل کر باہر آ رہا ہے، آسمان گہرے سرستی بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ نرس کی پرانی جانب توتی چھوٹی پرانی چار دیواری کے اندر آم کے درختوں میں گھری ہوئی ایک بارہ دری ہے۔ اس بارہ دری میں مغل دیوار کی کوئی گنگام کینزدنی ہے۔ بارہ دری میں چاروں طرف سے سینہ کی چھوڑا اندر آ رہی ہے۔ آسمان کی چھلکی ہوئی ٹھیلوں بارہ دری کے ستونوں سے ایسا آپ بھار ڈھری ہیں۔ قبر کے پتھروں پر کافی بزم رہی ہے۔ اور کہیں گھاس اُگ آئی ہے ابھی ابھی جھکی جھکی تھی۔ اور اس کی نیل روشنی میں ہری ناگ کے تعصباتی سیشی کو جانے والی کچھڑے سے بھری ہوئی دلدلی سڑک دو رنگ روشن ہو گئی تھی۔ یہاں سے سببش سات کو س کے فاصلے پر ہے۔ ہری ناگ سیشی کے اُکھرے اُکھرے فرش والے چپے پلیٹ فارم پر دن میں صرف دو ریل گاڑیاں رکتی ہیں۔ یہاں کا سیشی ماسٹر ٹکٹ چیک بھی کرتا ہے اور بانٹتا بھی ہے۔ وہ صرف گاڑی کے وقت پلیٹ فارم پر نیلی ٹوپی پہنے موجود ہوتا ہے۔ باقی سارا وقت وہ اپنے نوادر میں بیوی کی ران پر سر رکھے غمی گاؤں کے پلاٹ بڑھتا رہتا ہے اور مدھو بالاکو یاد کرتے ہوئے اپنی بیوی کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے۔ اور پلیٹ فارم کے دھندلے بسپ تمام رات ٹٹاتے رہتے ہیں۔

تعبہ ہری ناگ بڑی بڑی بستی ہے۔ کتے ہیں مغل شہنشاہوں کا شاہی قافلہ کشمیر جاتے ہوئے یہیں سے گذر کر جاتا تھا۔ جموں کی طرف جانے والی اس پرانی سڑک کے آثار آج بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ ہری ناگ کے مشرق میں پرانے کھال پر جھکا ہوا نیچے چھت والا بوسیدہ میل، ذرا آگے جا کر نانک شاہی اینٹوں والا پرانا کھانا اور آدھا گرا ہوا مینار، اور دو رنگ سڑک کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی ٹوٹی چھوٹی دیوار، اور ادھر ادھر کھیتوں میں پھیلے ہوئے اگلے وقتوں کے عوامی کھنڈرات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کبھی یہاں سے بھی وہ رنگ اور خوشبو اڑاتے فاطمہ گذر کرتے تھے، جن میں شہزادے آسام کے دیو پیکر ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے اور لمبی آنکھوں اور پتے ہوئوں والی شہزادیوں کے ابریشمی عمل چھٹے ہوئے سیاہ پاؤں والے حبشیوں نے اٹھا رکھے ہوتے تھے۔ آج اس سڑک پر سوائے کھنڈرات اور دیوان حویلیوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ لیکن اس سڑک سے ہٹ کر یہ شاہی فاسفے اُسی طرح رواں دواں ہیں۔ شہزادے دیو پیکر ہاتھیوں پر سوار گلاب کے پھولوں کو بار بار سونگھ رہے ہیں۔ اور سیاہ خام ننگے حبشی برستی چاکوں میں نازک انعام شہزادیوں کے حمل اٹھائے پتھر علی شاہراہوں پر دوڑے چلے جا رہے ہیں، ہانپتے چلے جا رہے ہیں۔ صرف سڑکیں بدل ہیں۔ صرف راستے تبدیل ہوئے ہیں۔ باقی وہی ہے۔ سب کچھ وہی ہے۔ ہر روز ایک انارکلی زندہ دفن کی جاتی ہے اور ہر رات شاہی محلوں میں جشن ہوتا ہے، اور ہر صبح ایک مسیح آسنوی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

بادلوں میں دھیمی دھیمی گرجنا پیدا ہوئی ہے۔

بارش کچھ تیز ہو گئی ہے۔ جموں کی پہاڑیوں کے دامن میں بونے کی وجہ سے ہری ناگ میں بار نہیں بہت ہوتی ہیں اور سردی بھی بہت پہلے آجاتی ہے۔ حالانکہ یہاں کوئی پہاڑ نہیں۔ صرف میدان ہیں۔ بے رنگ، چھپے میدان اور کھیت، کچی سڑکیں،

یہ وہی ڈیڑھی ایک ڈنڈاں گھنٹہ سے پرشکوہی سبز جوہروں میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے وسیعہ چھوٹے مکان، کائی زدہ گنبدوں اور میناروں والی مد ایک پرانی مسجد، تھیمے سے باہر ٹھیکے پاس نہر کنارے کی پین پکی، چھوٹی سی منڈی، ایک بازار، کچھ اونچی نیچی پتھر کی علیاں، چند ایک مزار گرے ہوئے جیسے والا چوٹھی کا دفتر پرانے بچوں اور دیکھ لگی میز کرسی والا خانہ اور فعل ساز کی دکان اور پڑانی بارہ دری کے پاس پرانی طرز کا چاد خانہ اور دھوپ، بارش، سردی اور نس۔ قصبہ ہری ناگ میں گھومتے ہوئے آدمی کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ انیسویں صدی کے کسی مغربی گاؤں میں آگیا ہے۔ یہاں کشمیریوں کے کئی ایک گھرانے آباد ہیں۔ یہ لوگ کہیں پندرہویں سو لھویں صدی میں کشمیر کی دلدیوں سے ہجرت کر کے قصبہ ہری ناگ میں آباد ہو گئے تھے۔ اور تب سے اسی جگہ ہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ لوگ رنوگری، شال بانی، زردوزی شامل کی رنگائی اور پٹیشنے کی خرید و فروخت کا دھندا کرتے تھے اور سال میں چھ ماہ گھر سے باہر بنگال، بنارس اور لکھنؤ میں گزارتے تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد ان کا کاروبار بالکل تباہ ہو گیا۔ چنانچہ کسی نے کوئی چکی الاٹ کروالی۔ کسی نے ڈپو کھول لیا۔ کسی نے شہر میں کٹہرپیس کی دکان کھولی اور کوئی محض پرانے دنوں کی یادیں آہیں بھرنے کے لیے گھر میں بیٹھ گیا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی روایات اور وضع جاری ہاتھ سے نہ چھوڑی تھی۔ ان کے گھروں میں آج بھی رات کو چاندل اُبلتے تھے اور صبح کو ٹمکین چائے پیتی تھی۔ اور چولے میں سدا دلی آگ جلتی رہتی تھی۔ تھواروں پر اُسی طرح پکوان پکتے تھے۔ اور سردیوں میں ہر میسرے روز شب دیگ چڑھتی تھی اور رش مالو کا دن منایا جاتا تھا۔ ان کے گھروں میں آنے والے مہمان کے سامنے آج بھی سبز چائے کا سماوار، باقر خائیاں اور شیر مال اسی طرح رکھا جاتا اور میزبان خود میں مہمان کو بار بار کہتے ہیں۔ ہٹے اپنی کھاؤ نا یہ بھی نو، وہ بھی ذرا چکھو نا!

گھر بہ باتیں بیشتر کشمیری گھرانوں میں ختم ہوئی جا رہی تھیں۔ اور پہاڑ کی چوٹی پر سے لڑھکے ہوئے پتھر کی طرح ہر ٹھوکر کے ساتھ روایات کی کہیں ہوا میں اڑتی جا رہی تھیں۔ اس کے باوجود کچھ گھرانے ان روایات کو بحال رکھنا مذہبی فرض سمجھتے تھے، اور وہ ہر قیمت پر اپنی وضع جاری بناتے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ صرف اپنے کچھ کے لیے زندہ ہیں اور اپنے کچھ کے لیے مر جائیں گے۔ ان ہی میں ایک گھرانہ میر غلام حسن شاہ بائی کوڑی کا بھی تھا۔ اس خاندان کو بائی کوڑی اس لیے کہتے تھے کہ میر غلام حسن شاہ کا پر دادا کلکتہ ہائی کورٹ کا سب جج رہ چکا تھا۔ وہ اپنے سوداگر باپ کے ساتھ بنگال کا دوبارہ سیکھنے گیا تھا کہ اس نے قانونی پڑھنا شروع کر دیا اور وہیں پریکٹس شروع کر دی اور اپنی طبع زاد ذہانت اور خدا داد صلاحیت کے باعث ترقی کرتے کرتے سب جج کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلا لیکن بیرٹری سے لگے نہ پہنچ سکا۔ اب یہ خاندان پٹیشنے کی سوداگری چھوڑ قانون پر مبنی لگا۔ میر غلام حسن شاہ کے والد و کالت میں بری طرح ناکام رہے اور آپ نے پھر وہی پرانا دھندا شروع کر دیا۔ میر غلام حسن کلکتہ میں پڑھا کرتے تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد آپ نے ایل۔ ایل۔ بی کیا اور باپ کی طرح آپ بھی کالت میں ناکام رہے لیکن ناکامی کے بعد آپ نے کاروبار میں چند گوارا نہ کیا اور آئی سی ایس کے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی۔ آپ نے اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور آپ کو لیکل ری میجرپس میں ایک شایان شان عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ آپ نے اپنی ملازمت کا پورا عرصہ کلکتہ، کان پور، الہ آباد، کھنڈوا اور مدنا میں گزارا اور ریٹائر ہو کر قصبہ ہری ناگ پہنچے ہی تھے کہ ملک میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑ لیا اور ایک سال بعد فسادات شروع ہو گئے اور پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ اب پیشی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہر سو مذمت فتنہ کا جھگڑا چار سال تک چلتا رہا۔ اور پرانے خاندان کے رکن رکھاؤ میں فرق آگیا تھا۔ دونوں بڑی لڑکیاں سعیدہ اور بیبیہ

بی۔ سے کرنے کے بعد گھر کو بھیجی تھیں۔ چھوٹی لڑکی جینہ کو ایف۔ اسے کے دوسرے سال میں ہی تعمیر کا سلسلہ منقطع کرنا پڑ گیا تھا۔ میٹر کے باپ کے دو چھوٹے بیٹے فوت ہو گئے تھے۔ اور دو حواں بیٹوں کی شادی کی تھیں تھا۔ بنگ میں جو جمع پونجی ختم ہو رہی تھی۔ تب سے کی ہو سنبلی کی خانی خولی صدارت ملی توٹی تھی۔ کپڑے کے ایک کارخانے میں معمولی سا حصہ بھی تھا۔ لیکن سکوت رہنے سے کارخانہ بنگ دی چلتا تھا اور تین دان بند ہوتا تھا۔ اور کچھ میر غلام حس شاہ ہانی کو رٹی دیتے تھے۔ انہوں کو اپنی آن بان دکھانا چاہتے تھے۔ پر پورٹنٹ فنڈ کا دیر دور کی بات تھی۔ آپ نے اپنی بیگم کو پہانا قدیمی مکان گردی رکھنے کا مشورہ دیا۔ پرانی طرز کی نجیب لکھنوی کشمیری عورت نے مکان گردی رکھنے سے منع کیا۔ لیکن میر صاحب ماضی نہ ہوئے۔ مکان گردی رکھ کر کاغذات پر دستخط کر کے آپ گھر لوٹے ہی تھے کہ پریوینٹ فنڈ کے پاکستانی مینجمنٹ کی چھٹی آگئی۔ بیگم نے کہا۔

مکان چھڑا لیتے، میر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

مرد چھڑا لائی گے۔ میں کل ہی شہر جاؤں گا،

لیکن رات نے کچھ ایسے خواب دکھائے کہ مکان چھڑانے کا پر دگام منوی کر دیا گیا۔ چنانچہ ذہن کے یہ جھپکے ہوئے ٹھنڈے وہ دن تھے جب میر غلام حس شاہ ہانی کو رٹی کے قصبہ بیری ناگ واسے پرانے حلی نما گھر میں زبیدہ اور سعیدہ کے سیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اور آسمان کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور بوندیں پڑ رہی تھیں۔

یہ پُرانا حلی نما مکان آبادی سے ہٹ کر واقع تھا۔

اس کے سامنے سے چھوٹی سی ندی گذرتی تھی اور عقب میں رنگ آلود دیواروں پر عشق بیجاں اور نگاہ پاک کی جنگلی بلیں جھکی ہوئی تھیں۔ اندریوں کا ایک پرانا باغ تھا۔ مکان کے صدر دروازے کی دہلیز گھاس میں چھپ گئی تھی اور دوسری منزل کے تمام کمرے بند تھے۔ میان پر اسرار بند کمروں میں دیواروں اور روشنیوں پر گرد کی تہیں جم رہی تھیں۔ قد آدم آئینوں پر چالی دار پردے لٹک رہے تھے۔ اٹھارویں صدی کا کرم خوردہ فرنیچر بھروسے رنگ کی موٹی چادروں میں ڈھکا ہوا تھا۔

کوئی میں ڈھیر لکڑی کے بوجھل صندوق اطمینان سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے اوپر جالا لٹک رہا تھا۔ ایسے چڑے گرد آلود لنگوں پر خاندان کے بڑے بڑوں کی تصاویر اندھے سنہ پڑی تھیں اور ان کے نیچے ٹڈیوں نے انڈے دندے دے رکھے تھے۔ اندھیری راقص کو جب تیز زمستانی ہوا کے جھونکے روشن فاقوں اور بند کھڑکیوں کی درزوں میں سے اندھ داخل ہوتے تو دیواروں پر گرے ہوئے پٹے آہستہ سے پھرتے پھرتے اور محسوس ہوتا گویا ان دیوانہ کمرہ میں عہد پارنیم کی گم شدہ روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ یہ کمرے مدتوں سے بند پڑے تھے اور ان میں کبھی کوئی داخل نہ ہوا تھا۔ وقت کا سیلاب ان گناہ تریوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ پہلی منزل کی ادبئی چھتوں بھدی دیواروں اور موٹے گرم قالینوں سے ڈھکے ہوئے فرشوں والے کمرہ میں زندگی اور صفائی اور روشنی تھی۔ یہ کمرے صاف ستھرے، قیمتی اور بوجھل سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں درازوں پر گہرے قرمزی رنگ کے بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ اور ان کے پٹ کھلتے وقت کوئی آواز نہ دیتے تھے۔ وہ دیوں نرمی سے کھل جاتے جیسے آنے والے کو خاموشی سے اندد داخل ہونے کا مشورہ دے رہے ہوں۔ یہاں کی فضا میں خواب ایسی پُر اسرار تن آسانی پرچی ہوئی تھی اور ان کمرہ میں

داخل ہو کر آدمی کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ برفباری کی رات میں گرم گرم خوشبودار تھوڑے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ ٹھٹھکی ریخ بستہ تیز ہواؤں میں سے گزر رہا ہو اور تسی نے اسے نیم گرم ٹی کوڑی میں چھپا لیا ہو۔ جیسے وہ سمارا میں داخل ہو گیا ہو۔ اس پر اُس نے حویلی نما مکان کا ہر کمرہ سمارا کی طرح پُر سنوں، نیم گرم اور معتدل تھا۔ اور ایسی فضا میں پرورش پائے سے گھر کے ہر فرد میں جذبات کا احتلال اور آہنگ پھیل جاتا تھا۔ یہاں کبھی کوئی آپس میں رشتہ داریوں کے موضوع پر نہ نہیں جھگڑا تھا۔ یہاں کبھی کسی نے غصہ میں مڑخ ہو کر دوسرے پر کٹنگیم یا جھگڑتی ہوئی لکڑی سے تلمہ نہیں کیا تھا۔ یہاں کبھی کسی سینگے کے ایک دم تیز تیز رو پڑنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ یہاں کے کہیں ہر شام کھانا کھا کر اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے اور لیمپ بجھا دیتے جاتے۔ تھکے مروت مکان کی پشت پر باورچی خانے کا میپ حملہ آور ہوتا تھا۔ جہاں بوڑھی خادمہ اپنی بیٹی لاتی کی مدد سے برتن صاف کر رہی ہوتی تھی۔ پوچھتے جب بستی کی طرف سے مڑوں کے ادانیں بیٹے کی صدائیں آتیں تو اس حویلی نما مکان کے ویران آنگن سے کوئی مڑخ جواب میں اذان نہ دیتا۔ بند کھڑکیوں کے اندر اور باہر ٹوٹتی رات کے آخری سائے چپ چاپ مدغم ہوتے رہتے اور لیمپوں کے باغ میں پیڑوں کی ٹنڈیوں پر سے شبنم چپکتی رہتی اور پھر باورچی خانے کی محبت سے لپٹے ہوئے میپ کو دیا سدا فی دکھائی جاتی۔ تسل کے میپ کی دھیمی دھیمی نرم روشنی میں خادمہ کی بیٹی لاتی آگ جلاتی۔ چار کے لیے بانہ رکھتی اور انداری میں سچائی کے برتنوں کو نکال کر صاف کرنا شروع کر دیتی۔ بستی کی مسجدوں کے میناروں پر دن کی روشنی کا پیکھا اچھلا جھلکا تو بوڑھی خدیوہ سجدہ میر، زبیدہ میر اور رضیہ میر کے کمروں میں جا کر خاص بڑی نرمی اور پیار سے بادی بادی جگلاتی۔

”اُٹھئے آئی۔ صبح ہو گئی۔“

سب کے آخر میں وہ گھر کی مالکہ بڑی آپو کی خواب گاہ کا دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹاتی۔

”آپو جی! اذان ہو گئی!“

چالیس پچاس سال کی ادیبہ عورت پر رخ پر پیدائش کے وقت سے ایسا سارا بیوں ایسا بوجھل بوجھلے بستی، نرم اور گرم محاف میں سے باہر نکلتی۔ نسل خاندان میں وہ بے گھر ہوئی۔ دن کو گھر سے بعد وہ نماز پڑھتی اور نماز کے بعد وہیں مصلے پر تلاوت قرآن پاک میں مصروف ہو جاتی۔ تلاوت کے وقت ان کے چوڑے اور بارعب چہرے پر طلوع صبح ایسی مقدس روشنی پھیل جاتی۔ ان کے سیاہ و سپید بال پشانی تک سفید نشانی میں ڈھکے ہوئے امدان کے لب بند ہوتے اور جسم بے معلوم انداز میں جھول رہا ہوتا تھا۔ تہی دیر میں میر غلام حسن شاہ بھی نماز سے فارغ ہو جاتے اور لمبا گرم کوٹ پہن، سرخ ترکہ ٹوپی سر پر رکھ، چٹائی باغ میں لے سیر کے بیٹے باہر نکل جاتے۔

سب سے بڑی بہن زبیدہ نماز سے فارغ ہو کر اپنی ماں کے پیٹھ میں پیچ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتی۔ لیکن سجدہ بار بار جگناتے پر بھی نہ اُٹھتی۔ اس کے سرخ و سپید خواب آلود چہرے پر بالوں کی لٹ بھری ہوتی اور وہ ایک ٹانگہ محاف سے باہر نکلتے پریشی کیسے کو پیٹ کے ساتھ کھینچے آید۔ آدھ بار کچھ بڑبڑاتی اور ٹانگہ محاف کے اندر لے جا کر پھر سو جاتی۔

جب بادل غورائے اُسے اٹھنا ہی پڑتا تو وہ بنگ پر پاؤں اٹھائے بیٹھ جاتی اور محاف میں سے گرم شمال کھینچتے ہوئے بار بار جمائیاں لینے لگتی۔ وہاں سے اٹھ کر اٹھ کھڑا تے، بے ربط قدم اٹھاتی سگ دان کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی اور کھینچے پر جھک کر چہرے پر پھیلے ہوئے مواسوں اور کیلوں کا جائزہ لینا شروع کر دیتی۔ وہ ہر رات بے شمار کریمیں لگا کر سوتی تھی اور ہر صبح گالوں پر کوئی

کوئی نیا کیل نکلا ہوتا تھا۔ اسے اپنے اچھے محلے چہرے کی اس بدذاتی کا شدید احساس تھا اور وہ بہت کم آئینے کے سامنے جھڑکتی تھی۔

بورجی خادمر جب رضیہ کے کمرے میں داخل ہو کر اس پر آہستہ سے جھک کر سرگوشی ایسی آوار میں کرتی۔  
”چھوٹی آئی! اٹھو بیٹی.....“

تو رضیہ اپنی نیند بھری بھیگی بھیگی سیاہ آنکھیں کھول دیتی۔ جیسے وہ پینے ہی سے جاگ رہی ہو۔ اور وہ سوچتی کیا وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی؟ کبھی کبھی خادمر کے جھگانے پر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پہلے ہی سے جاگ رہی ہو۔ جب سے پیدا ہوئی ہو تب سے جاگ رہی ہو اور کبھی نہ سوئی ہو۔ بورجی خادمر۔ لحاظ اچھی طرح سمجھ کر تہہ کرنے ہوئے کہتی۔

”میرے بچے رضیہ تو سوتی ہی نہیں“

لیکن رضیہ ضرور سوتی تھی۔ دن کے وقت سوتی تھی۔ جاگتے ہوئے باتیں کرنے، اٹھانے، سوچتے بچاؤ پڑھنے، کتاب پڑھتے اور کھلی کھڑکی میں سے باہر بارش میں دیکھتے ہوئے سوتی تھی۔ ہمیشہ سوئی رہتی تھی۔ اُسے کبھی کبھی شبہ ہونے لگتا کہ وہ کبھی جاگی بھی ہو۔ بچپن ہی سے اس کا جسم کمزور و ڈبلا اور نازک تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہمیشہ بیمار رہی تھی۔ اور ڈاکٹروں کی کڑوی دوائیاں پتی رہی تھی مسلسل بخار میں مبتلا رہنے سے اسے موت سے ڈرانے لگا تھا اور زندگی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ خواب کے عالم میں رہنے لگی تھی۔ وہ قدرتی طور پر تنہائی پسند تھی اور اسکول میں اپنی جم عمر سہیلیوں سے بہت کم ملتی تھی۔ اُسے سرسبز صحت مند خوبصورت اپنے سے زیادہ خوش قسمت معلوم ہوتی تھی اور وہ کسی سے گل مل نہ سکتی تھی۔ اس نے خیال ہی خیال میں اپنی چند ایک سہیلیاں بنا رکھی تھیں، جن سے وہ تنہائی میں باتیں کیا کرتی۔ اسکول سے گھر آ کر وہ اپنے کمرے میں جا کر چپ چاپ کھڑکی کے پاس کورس کی کتاب کھول کر پڑھ جاتی اور خواب دیکھنے شروع کر دیتا۔ پھر الیکا ایکلی وہ چوک کر نیل ہو جانے کے ڈرتے کتاب پڑھنے لگتی۔ رات کو ان کی پرانی خادمر اسے باورچی خانے میں لمپ کی دھیمی روشنی میں پڑیوں اور بھوتوں کی کہانیاں سنایا کرتی۔ اپنے کمرے میں بستر پر بیٹھتے ہی رضیہ کو کافی لی پڑیوں کا خیال بھول جاتا۔ اور وہ بھوتوں کے خوفناک ٹھوڑے سے ڈرنے لگتی اور جلدی سے لحاف منہ کے اوپر کر لیتی۔ پھر اُسے اپنے پرانے حبشی نادرکان کے گرد و آلود ویران کمروں کا خیال آتا اور وہ دیکھتی کہ ان کمروں میں ایسی بد صورت چہروں والی کبڑی عورتیں چکر لگا رہی ہیں جن کے چہروں پر مکڑیوں نے جالے بن رکھے ہیں اور اس کا جسم خوف سے ٹھنڈا ہو جاتا۔ وہ بھاگ کر اپنی خیالی سہیلیوں کے پاس پہنچ جاتی اور ان کی باتوں میں غرق و غرق ہوتا جاتی۔ بچپن ہی سے رضیہ ذہنی طور پر الجھی ہوئی تھی۔ دن بھر وہ اسکول اور گھر میں خود فراموشی کے عالم میں وقت گزارتی۔ وہ بات کرتے کرتے فقہ بھول جاتی اور غسل خانے میں ٹوٹی کھول کر نمنا بھول جاتی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کی یہ تمام ذہنی الجھنیں ترقی کرتی گئیں اور گھر کی خاموشی، جامد اور پراسرار فضا نے ان الجھنوں کی زیادہ سے زیادہ پرورش کی اب وہ کالج میں آگئی اور یہاں بھی مجنوں، سہمی ہوئی ویران تنہائی اس کے ساتھ آئی۔ پڑھائی تم کے کہے وہ سیدھا ہوٹل کے کمرے میں؟

جانی اور دروازہ بند کر کے کتابوں میں کھو جاتی۔ اس کا ادب کا مطالعہ بہت کتابیں پڑھتے رہنے سے کافی وسیع ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں اُسے ایڈگریٹین جو بہت پسند تھا۔ لیکن بہت جلد وہ اس کی کتابوں سے خوف کھانے لگی اور اُسے تو کے نام کے ساتھ ہی اُس کی کتابی کا خیال آجاتا جس کی لاش آتش دان میں دفن ہو۔ پہلے پہل اُسے نادلوں کی انگریزی پڑھتے ہوئے بڑی وقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہر دوسری سطر پر اسے دشمنی کو لٹا پڑتی۔ مگر اس نے بہت نہ ہاری۔ کتابوں نے اُسے بڑی تسکین دی تھی چنانچہ اس نے

بڑی محنت سے ادب انگریزی پر لسانی عبور حاصل کر لیا اور ایف ٹی میں ہی وہ ایم اے کی ڈگریوں کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس نے انگریزی ادب کے دو کٹر ترین عہد کے تمام ناول پڑھ ڈالے۔ ان ناولوں کی پُر سکون، پُر امن ادگری تھی آسان نفاذ کے گویا رشتہ کے کھولتے تھے وہیں پر ٹھنڈا پھا مار رکھا دیا۔

یہاں سے گزرتے ہوئے اس نے تاریخ کی طرٹ ڈیج کیا۔ تاریخ میں اس نے قبل از تاریخ کے دور کو چھوڑ کر مصر، دور ہند سے مطالعہ شروع کیا اور یونان اور روم سے ہو کر سپانیہ میں آکر ٹوک لگی۔ مغراطہ کے آخری مور شہنشاہ کے زوال کے ساتھ ہی اس نے تاریخ کی کتاب بند کر دی اور اپنے آپ کو قدیم ایجنس، فلسفہ، روم اور مغراطہ کا شہری سمجھنا شروع کر دیا۔ یورپ کی پندھویں، سولہویں اور سترھویں صدی میں اُسے سوائے درباری سازشوں اور خانہ جنگیوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ اُسے قدیم یورپ کے کسی شہر میں زیٹون کے سایوں میں بیٹھ کر ادب اور فلسفہ اور موسیقی پر گفتگو کرنے والے رومی اور یونانی فلسفی دکھائی نہ دیے۔ رومی ادب میں سے اس نے تو رنگیت اور جھوٹ کو چھنی لیا۔ طاشانی کی متضاد باتیں اور عظیم اظہار بیان اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ گورکی، اسے خشک لگا اور دسترس کی دو کتابیں پڑھنے کے بعد اُسے اس خوفناک معصفت سے ڈرانے لگا۔ اس کی کتابیں رشتہ کے ذہن میں اُن تمام اُچھنوں کو بیدار کر دیتی تھیں اس نے قدیم یونانی کھنڈروں کے عظیم الشان ستونوں میں دفن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک عرصہ تک وہ جبرآن سے بھی متاثر رہی۔ لیکن پھر اس سے اُگنا لگی۔ اُس کے ذہن کو سب سے زیادہ تسکین فرمائیسی ادب نے دی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ ایک دم درختوں کی گھنی گھنی، گہری گہری، سوٹی سوٹی پھاؤں میں کسی ساکن پانی والے پُراسرار چشے کے کنارے آنکھی ہو اور ہر طرف سے نیلے بھول اور بھگی بھگی پُراسرار دھندھیلی ہوئی ہو۔ اپنے ملک کے اُسے تمام ایسے ادیب پسند تھے جن کی کہانیوں اور ناولوں میں پُراسرار دھندھ اور خفوں کی خواب آلود پھاؤں موجود تھی۔ مذہب پر اس نے پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کا عقیدہ متزلزل ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے فوراً کتاب پھینکی اور موسمِ باری جلا کر خدا سے دُعا مانگنا شروع کر دی کہ وہ اسے گمراہ ہونے سے بچائے رکھے۔ مذہب میں بھی اُسے ایک خاص قسم کی کلاسیکی رومانیت سے پیار تھا۔ نماز پڑھنے کی بجائے وہ پیغمبروں کو نیلی نیلی دھند میں ماتھا اٹھانے پہاڑیوں پر کھڑے ہو کر عبادت کی تلقین کرتے دیکھنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ تصور ہی تصور میں ان مقدس نورانی چہرے والوں کو فرشتوں کے جھرمٹ میں سنہری ستاروں کے درمیان دیکھتی اداس کے ہونٹ و نور جذبات سے کانپنے لگتے۔

پنگ پر نیم دراز کتاب پڑھتے پڑھتے جب رشتہ تھک جاتی تو اپنی روز کی ڈائری لکھنا شروع کر دیتی۔ وہ بڑی گرمجوش سے سارے دن کی بے رنگ کاروائی دور کر دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ڈائری کبھی کوئی نہ پڑھے گا۔ بلکہ وہ بیشتر خود بھی کبھی نہ پڑھتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ہر رات اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی۔ اور اب تک وہ کئی کاپیاں سیاہ کر چکی تھی۔ رات کا کھانا دوسری ڈگریوں کے ساتھ خاموشی سے کھانے کے بعد وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی آتی اور سونے سے پہلے بستر پر دوڑا نو ہو کر بیٹھ جاتی اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی۔ رشتہ کو اُس چھپی ہوئی مہربان، سخی سے بڑی محبت تھی جو ہمیشہ سے بائیں پھیل کر اپنی پُراسرار محبت کی آغوش میں لے لیتی تھی اور جو اس کی ہر خطا خندہ پیشانی سے معاف کر دیتی تھی۔ کبھی کبھی اُسے عجیب عجیب غم کے ٹکڑے د



جہالت گھیر رہے۔ کتابوں میں پڑھی ہوئی سنگدل، بے رحم باتیں کتابوں سے نکل کر نینروں اور برہمنوں سے اس کے عقیدہ کی دھن پر حملہ آور ہوئیں اور وہ سہم کر سکڑ جاتی اور غیر شعوری طور پر قرآن کی کوئی آیت پڑھنا شروع کر دیتی اور وہ یہ دھوکہ دیتا رہ جاتی کہ ایک ٹھیکے میں ہر طرف روشنی اور گرامن طاری ہے اور کتابوں سے نکلی ہوئی بے رحم قوت کے خو غوار سپاہی نائب ہر ٹھیکے ہیں۔ عامانگنے کے بعد وہ پہلے معدہ صاف کرنے والی دوائی پییتی۔ پانچ منٹ بعد سارے بدن کی خواب آور گولی پانی سے نگاتی اور بتی بھنا کر میند کی راہ دیکھنے لگتی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب میند نہ آتی تو وہ ایک گولی اور نگل لیتی۔

کالج چھوڑنے کے بعد رشتہ اپنے قبیلہ والے قدیم مکان میں آگئی تھی اور اس نے اپنے آپ کو باقی دنیا سے الگ کر کے تاریخ ادب فلسفہ اور موسیقی کی ضخیم کتابوں کی جبار دیواری میں بند کر لیا تھا۔ اسے اپنے پرانے مکان اور اپنی بارعب، شفیق آنکھوں والی ماں اور باپ سے محبت تھی۔ اسے سیدہ امہ زبیدہ سے بھی پیار تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں سے بہت کم بولتی تھی اور اپنے ہی خیالات میں گم رہتی تھی۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ ان اجنبی چیزوں کے تغویرات میں گم ہوتی جہاں اس کے خیال میں توجہ تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اسے اپنی دوسری بہنوں کی طرح نہ تو اچھے اچھے کماؤں کا شوق تھا اور نہ قسم قسم کے بیش قیمت کپڑے پہننے کی ہوس تھی۔ اسے صرف ایک ہی شوق تھا۔ پڑھنا اور خواب دیکھنا، پھر پڑھنا اور پھر خواب دیکھنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوفو کلیس کے کسی المیہ ڈرامے کا کوئی کردار ہے جو اپنے گرم غورہ مسوے سے باہر آگیا ہے اور پھر وہاں جانے کو بے قرار ہے۔

رات زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ بارش بدستور ہو رہی ہے۔ آسمان اور زمین کو ایک تاریک بادل نے ڈھانپ رکھا ہے جیگی ہوئی سڑاکی تیز ہوا اسی طرح چل رہی ہے۔ تھبے کی گلیاں سنسان ہیں اور مکانات کے پرناؤں سے بارش کا پانی مسلسل شور کے ساتھ بہ رہا ہے۔ پرانے حویلی نما مکان کی پہلی منزل کے تمام لمپ بھر چکے ہیں۔ باورچی خانے کی لکڑی بند ہے۔ اور روشندان پہاڑیہ صاف صاف صاف کے کمرے کا لمپ چل رہا ہے۔ اور اس کے روشندان میں سے ہلکی بارش کا عکس باہر بارش ٹپکتے ہوئے لمپوں کے پرانے حوضوں پر پڑ رہا ہے۔ اندر کی طرف گہرے قرمزی رنگ کا بھاری پردہ گرہا ہے اور اس کے ساتھ ہی رشتہ سبباہ آؤسی میز پر چلی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اس کا لباس ہلکے زرد اور ناخانی رنگ کا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی ہلکا زردی مائل سفید ہے۔ جسم ڈبلا اور کھلی کتاب کی ایک طرف سمٹی ہوئی انگلیاں نازک اور لمبی لمبی ہیں۔ لمبے سیاہ بال درپٹے میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ دوپٹہ کچھ اس طرح اڑھا گیا ہے کہ کشادہ پیشانی کا نصف حصہ بھی چھپ گیا ہے۔ کانوں میں سنہری رنگ کی دو چھٹی چھوٹی بالیاں ہیں۔ بڑی بڑی سوگوار آنکھیں کتاب پر ہلکی ہوئی ہیں اور مختصر، باریک، سیدھی کشمیری ٹاک کے ملائم بہاؤ میں ایک عجیب قسم کا کلاسیکی اسلوب ہے۔ ڈبے چہرے پر زرد گلاب کی افسردگی اور بیت چڑکی دھوپ کی طویل چمک ہے۔ یہ چہرہ ایک ایسی ویران جھیل سے مشابہ ہے۔ جس کی سطح پر کہیں کہیں زرد پتے بکھرے ہوئے ہوں، اور جس کی تہ میں گھنی جھاڑیوں کی اٹھی ہوئی بوجیدہ ٹہنیاں صاف دکھائی دے رہی ہوں۔ میز کی ایک جانب کتابوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگی ہے اور کچھ کاپیاں بڑی ہیں اور دوسری جانب اخروٹ کی

لکڑی کے بنے ہوئے چنار کے ایک چوڑے پتے میں سارے دن کی کچھ گولیاں رکھی ہیں۔ کانسی کے ایک بیڑے لکڑی میں گلاب کی بیل کے دو تین پھول مرجھا رہے ہیں۔ پاس ہی تپائی پر چھوٹی چھوٹی نیلی پتیوں والی جینی کی ایک خوبصورت چادر آئی اور اسی طرز کا ایک پیالہ رکھا ہوا ہے۔ ذرا پرے گھرے سرخ قالین پر سعادہ اور زبیدہ دو دونوں ہنسی بیٹھ لاتی کے ساتھ مل کر اپنے خود سی جوڑوں پر سجاوٹی ستارے ٹانگے ہو ہیں۔ بھرے بھرے جسم والی گورنی چیٹھی سعادہ پاس رکھی پیٹ میں سے مرتبہ لگے بسکٹ کھا رہی ہے۔ کام بھی کر رہی ہے۔ ادب باتیں بھی کر رہی ہے۔ زبیدہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے اور صرف ہوں یا ہاں میں سعادہ کی باتوں کا جواب دے رہی ہے۔

”یعنی باجی یہ کیا ہوا؟ تم کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟“

زبیدہ ہونٹوں پر انگلی رکھے اسے آہستہ سے کہہ رہی ہے۔

”رضیہ پڑھ رہی ہے۔“

اور سعادہ بڑبڑانے لگتی ہے۔

”وہ تو ہر وقت پڑھتی رہتی ہے۔“

اور کالی کالی پتی ایسی آنکھوں والی لاتی دبے دبے ہنس رہی ہے۔ رضیہ کے گولی کندھوں پر سے سرمئی رنگ کی گرم شال نیچے کھسک آئی ہے۔ وہ اسے اوپر کھینچ رہی ہے اور سعادہ پچلے ہونٹ پر سے مرتبہ پو پختے ہوئے کہتی ہے۔

”رضیہ! ابھی ذرا ہمارا ہاتھ بھی بٹاؤ نا۔“

رضیہ اپنی بڑی ہنس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ زبیدہ جلدی سے بول اٹھتی ہے۔

سعادہ تم چپ بھی ہو گئی یا نہیں؟

سعادہ فوراً کہتی ہے ”نہیں۔“

اور بسکٹ چبانے لگتی ہے اور بائیں بجل ایک بار پھر چمکتی ہے اور بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج سنائی دیتی ہے اور رضیہ

O' SHANGHNESSY کی یہ سطریں پڑھ رہی ہوتی ہے۔

WE ARE THE MUSIC - MAKERS

AND WE ARE THE DREAMERS OF DREAMS,

WANDERING BY LONE SEA - BREAKERS,

AND SITTING BY DESOLATE STREAMS.

WORLD - LOSERS AND WORLD FORSAKERS.

زبیدہ اور سعادہ کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ دونوں شادیاں ایک ہی روز ہوئیں اور لاہور سے دونوں کی بارہا تیں ایک ہی وقت میں آئیں۔ قصبے کے شیش سے بائی کوڑیوں کے حویلی بنا پرانے مکان تک کچی سڑک پر کاروں کی قطار بندھ گئی۔ میر نغلام حسن شاہ ہائی کوڑی نے جی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ اور یوں ثابت کر دیا کہ ہائی کھڈیوں کا خاندان لاہور کے کسی بڑے کشمیری خاندان

سے بچے نہیں ہے۔ دونوں بہنوں کو جیہ میں اس قدر سلام ملا کہ اُسے کب کرتے ہوئے طرحہ ریشیشن مارٹر کو تین یا، غسل ستانا پڑی اور  
تھکے کے گھروں میں کئی روز تک اس کے چہرے رہے۔ اسی رات بوسیدہ حویلیوں کی گھٹی ہوئی چھت کے نیچے جمع رہنک کے پناہ گیر گولے  
کے چاند میں لیٹی ہوئی اُس کی بیوی نے اپنے خاوند سے پٹے ہوئے کہا۔

”مکھو ارے! ہماری صادق ایسی نائیں ہوئی رہے؟“

اور کھواا سے پرے دھکیلے ہوئے بدلا۔

”گھاس چرگمٹی۔ جے کیا پناہ“

قدیم کشمیری روایات کے مطابق ذہنوں کو نو پٹھنے سے پہلے جھمت کر، مانگیا۔ رات بھر، بیوی بوجڑے غلنی ایسے مکان کی  
بانی منزل میں دبی دبی ڈھولک دھکتی رہی۔ لیمپوں، موم، تیل، اور شمعندوں کی بجھاپہ چھائی روشنی میں کراچی، پشتاور، لاہور اور ہندی سے  
آئی ہوئی رشتہ دار عورتوں، بھڑکیے کپڑوں، والی بچیوں اور بے باک چہروں اور مضبوطیوں والی جوان لڑکیوں نے، اندازوں میں کشمیری پشتو، بھجانی  
اور غلنی گیت گائے اور جی بھر کر شور مچایا۔ دھنس کیا۔ باتیں کہیں اور لکھایا اور بھر مانگیں، کیسا کہ سو گئیں اور خواتین بھرنے لگیں۔ جب رات  
ڑھل رہی تھی۔ اندر ستاروں کا نور ٹھٹھٹکی رات کی تنہائیوں میں زور بخار میں کراہا جا رہا تھا تو سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت نے  
کا پیٹے ہونٹوں سے ڈھولک کی بے ریط نال پر ایک پراں کشمیری گیت گایا۔ جس میں بچیوں کے گتہ، دونوں کا سوگ منایا گیا تھا اور جب وہ  
اس بند پر پہنچی تو اس کی عمر سیدہ بیکوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ہم تو جنگل میں زعفران چنے رکھتی تھیں،  
کر راستہ بھول گئیں،

جہاں سے سروں پر سفید برت ہے

اور برت میں چول دفن ہیں،

سارے بھول دفن ہیں،

یہ بوڑھی عورت دوسری عورتوں کے ساتھ آتش دان کے پاس ٹالین پر بیٹھی تھی۔ گیت ختم ہو گیا۔ کسی عورت نے کوئی  
ہانت نہ کی۔ سب چپ ہو گئیں اور پرانی یادوں میں کھو گئیں۔ دو جوان لڑکیاں ریشمی کپڑوں پر ایک وہ سری سے لمبی سدر ہی  
تھیں۔ کہنے والے پنگ پر سر تکیے پر رکھے۔ آنکھیں بند کئے رضیہ نے اس بوڑھی عورت کا پورا گیت سنا تھا جو جنگل میں زعفران چنے  
رکھی تھی اور راستہ بھول گئی تھی۔ اس گیت نے۔ جیت پر بڑا اثر کیا تھا۔ اس کی گرم بیکوں میں جی آنسوؤں کی ٹپکیاں پائے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ  
انڈ کر اس بوڑھی عورت کے پاس جا کر بیٹھ جائے اور اُس کا بھر پور بھرا لے اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے پوچھے، بڑی آپو! مجھے  
بھی اس جنگل کی راہ بتاؤ جہاں زعفران لگتی ہے۔ اور جہاں بیٹھ کر گنایاں گھر کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ لیکن وہ گرم لحاظ میں چپ چاپ بیٹھی  
رہی اور زور گیت کی زعفرانی مہک، نے اُسے اپنے خشک پتوں میں سمیٹ لیا۔ ساتھ لے کرے میں اس کی دہری بہنیں دھنیں بنی  
بیٹھیں تھیں اور اُسے ان کی سہیلوں کی منسی، قہقہوں اور باتوں کی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک انکی رضیہ کے ذہن میں ایک عجیب سا  
خیال پیدا ہوا۔ کیا ایک روز اُسے بھی اسی طرح دلہن بنا کر سمایا جائے گا اور وہ بھی کسی اجنبی کے ساتھ روانہ کر دی جائے گی؟ رضیہ کو یقین

نہیں، بارہا خاک ایک وقت آئے گا جب وہ اپنی ساری انفرادیت کو گاتوں کے پڑانے جڑوں میں بند کر کے رکھ دے گی۔ اور کسی دوسرے نے  
نعتیں قدم پر چلنا شروع کر دے گی۔ اُس نے اپنی شادی کے بارے میں کبھی اتنی سنجیدگی سے غور نہ کیا تھا۔ وہ جو کتنی سی ہو گئی۔ یہ شادی تو اس  
کی موت ہو گئی۔ لیکن اس گھر میں رہتے ہوئے وہ اس موت سے نہیں بچ سکتے گی۔ پھر کیا ہو؟ کیا وہ چپ چاپ مر جائے؟ رشتہ کے جسم میں شادی  
کے خیال سے ناامیدی کے باوجود ایک کیف اور لکچری سی دوز گئی۔ اس نے سوچا کہیں اس کے اندر عورت نہ نوٹھیں گی؟ لیکن اسے بعض  
تھا کہ یہ عورت زندہ ہے۔ کبھی کبھی غسل نہانے میں نہاتے ہوئے وہ اپنے ڈبے میں سڈول اور کنواں سے بدن کے خم و پوچھ کو بڑی دلچسپی سے  
دیکھا کرتی تھی۔ اس کے جسم کے خطوط میں بڑا بہاد اور مسائل تھا۔ گول شانوں پر سے نیچے کو پھسلتی ہوئی تو سیں مکر پر آکر مل گئی تھیں اور  
یہاں سے پھر دو نصف اثرے کو لمبوں پر سے اُٹھرتے ہوئے پنڈلیوں تک چلے گئے تھے۔ وہ اپنے جسم پر یونانی شہزادیوں کی طرح  
بڑے وقار سے آہستہ آہستہ ہاتھ پیرتی اور جب اس کا ہاتھ اپنی چھوٹی چھوٹی کپے تاروں ایسی چھاتیوں پر پہنچتا تو اس کے سارے بدن میں  
سنسنی سی پھیل جاتی اور وہ کانپنے لگتی اور جیسے کپے اتار بھی اپنی نازک ٹہنیوں پر کا پھینے لگتے۔ اس لمحے رشتہ کا دل گری، غمناقی اور  
لطیف مسرت سے لبریز ہو جاتا اور اُسے یقین ہو جاتا کہ ابھی اس کے اندر وہ نئے زندہ ہے، جس کے کمر جلنے سے اس کا سارا  
علم، سامان آٹ اور سارا فلسفہ راکھ کی کبھی ہوئی ڈھیری بن کر رہ جائے گا۔ وہ اپنے جسم کے معبد میں اس آگ کو ہمیشہ جلائے رکھنا  
چاہتی تھی۔ لیکن وہ اس آگ میں اپنی گاتوں کا ایک دھن جلتے دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ کسی وقت رات کو، میمپ کی روشنی میں ٹہمتے ہوئے  
یوں لگتا جیسے کوئی بڑا ہی خوبصورت چمکیلی آنکھوں والا بچہ کرسی کا سہارا لیے کھڑا ہے۔ اور اپنے ننھے ہاتھ سے اس کی مثال  
کھینچ رہا ہے۔ وہ چونک کر دائیں بائیں دیکھتی اور وہ خوبصورت بچہ غائب ہو جاتا، لیکن ایسے لمحات بہت کم آتے تھے۔ اسے ہر  
کتاب سے اپنے بچوں ایسی محبت تھی اور قدیم یونان کا ہر دلہن جو بچہ اس کا خوب تھا۔ جس کے ساتھ رختہ میں سوار ہو کر اس نے  
فرات کی دادی کو کٹی بارہو رکھا تھا اور ہائل کے شاہی مندروں میں دیوتاؤں کے قدموں پر اپنے خون کے چھینٹے پھینکے تھے اور ہشتی غلاموں  
کے کندھوں پر رکھی ہوئی زرد نشان عماری میں میچ کر مینڈا کے زندگی خیز بازاروں کی سیر کی تھی۔ چنانچہ آج بھی اپنی شادی اور بچوں  
کے تصور سے اُسے سنسنی آگئی۔ نلا میر کی طرح اس نے بھی آرٹ کے ساتھ بیاہ رچا رکھا تھا اور جس کی شادی ہو چکی ہو، اُسے  
شادی کی کیا ضرورت؟ رشتہ نے آنکھیں کھول کر کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ آتش، ان میں آگ مدھم پڑ گئی تھی اور بوڑھی عورتیں سما دار  
میں سے نکلیں چائے پیالیوں میں انڈیل رہی تھیں۔

شادی بیاہ کا ہنگامہ ختم ہو گیا اور پرانے گھر کو ایک بار پھر پُر اسرار خاموشی اور سرد تنہائیوں نے گھیر لیا۔ رشتہ ایک  
بار پھر اپنے خیالی اجنبی جزیروں میں نکل گئی۔ لیکن اب اس مکان کی مسلسل متانت اور خاموشیوں میں فرق آگیا تھا۔ زبیدہ کا خاندان ہر  
ہفتہ کی شام کو اپنی کار میں میچ کر قصبے میں آدھمکتا اور ہفتہ کی رات اور اتوار کا پورا دن اپنی بیگم کے ساتھ وہیں بسر کرتا۔ رشتہ کی  
تنہائی مجروح ہو رہی تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ کم سن اور گھر پر کھڑا کی پابند زبیدہ کا موٹا، جعدا ہٹا کٹا خاندان لاہور کے  
بڑے ہسپتال میں نائب سرجن تھا اور سوائے اپنے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ پھیٹی ہوئی بلند آواز میں بات کرتا، وحشیوں کی طرح  
کھانا اور کھاتے کھاتے پاگلوں کی مانند پورے جبرے کھول کر قصبے لگاتا اور آنکھیں پونچھتا ہوا پھر کھانے پر ٹوٹ پڑتا۔ اُس کے

سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے سیاہ گنگھریاے بالوں کا ایک جھلکا ہوا تھا۔ وہ بے تحاشا سنگدلت مہیا تھا۔ اُس کے گھسنے پر مائے اور جدی ناک پر سرور و قہر مسند آیا رہتا۔ جسے وہ بائیں ہاتھ سے پونچھ کر دوسری طرف چھڑک دیا کرتا۔ محفل میں بیٹھے اُسے صوف اپنا خیال دیتا۔ چنانچہ کئی بار اُس نے بڑی آہ اور میر صاحب کی موجودگی میں ہی اپنے پرہیزگار کے قیام کی شراب اور آوارہ عورتوں کے نقشے سنانے شروع کر دیئے اور زبیدہ نے ہر بار انتہائی دوراندیشی سے باتوں ہی باتوں میں موضوع بدل دیا۔

رضیہ کو زبیدہ کا ڈاکٹر خاوند انتہائی ناپسند تھا۔ لیکن وہ اپنی بڑی بہن کی خاطر اس کی ہر بات تحمل سے سنی اور خندہ پیشانی سے اُس کا جواب دیتی۔

بات بات پر بھڑک اٹھنے والی ہمزاج کی گرم اور طبعیت کی تیز سعیدہ کا خاوند لاہور کے ایک مشہور کالج میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر تھا۔ وہ لمبے چوڑے مگر پتلے دھڑلے جسم کا ایک شرمیلہ نوجوان تھا۔ جو بہت کم بات کرتا تھا اور بات کرتے ہوئے نوزی ہو کر کیوں کی طرح شرماتا تھا۔ جب وہ چپ ہوتا تو معلوم ہوتا اس کے سینے میں ہڈیات کا ایک سمندر سوراہا ہے۔ لیکن جب بات کرتا تو اس کا سچا اس قدر پرجوش اور پُر خلوص ہوتا کہ محسوس ہوتا اس کے دل میں سوائے اس بات کے اور کچھ نہیں تھا۔ رضیہ نے اُسے عقیدہ لگا کر ہنستے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کسی وقت وہ صحت پتلے ہونٹ کھول کر مسکرا دیتا تھا اور یہ مسکراہٹ آفتاب کی طرح اس کے چہرے سے گر کر ہر شے کو اپنی پلیٹ میں لپیٹ بیٹھتی ہوئی ہوتی تھی۔ اس کے گندمی چہرے کے نقوش باریک تھے۔ دراز میں دل کو گرم رکھنے والی بڑی ٹیگ سی ادا سی رچی ہوئی تھی۔ اس ادا سی میں چٹانوں سے ٹکراتی سمندری موجوں کا ہیبت ناک شور بھی تھا اور پُر سکون اچھیل کی تہ میں سسٹے ہوئے زرد پتھر کی آسودگی بھی تھی۔ اس کے جسم کا سب سے زیادہ پُرکشش حصہ اس کی آنکھیں تھیں۔ شہریتی رنگ کی دو پڑمردہ سی آنکھیں، جن میں ہر وقت کسی شے کا خمار سلگتا رہتا تھا۔ وہ ان آنکھوں کو ذرا سیڑی کر باتیں کرنے کا عادی تھا اور رضیہ کو ہر بار بات کرتے ہوئے اپنے چہرے پر طلوع ہوتے سورج کی پہلی نیم گرم کرنوں کی حدت محسوس ہوتی۔ اُس کے پاس میٹھ کر باتیں سنتے ہوئے رضیہ کو محسوس ہوتا جیسے گلوں اس کے سامنے بیٹھا اپنی کتاب ”ڈیڈ سونڈر“ کا کوئی حصہ پڑھ کر سنا رہا ہو۔ رضیہ کا دل کانوں کے پاس آ کر دھڑک رہا ہوتا اور وہ افسردہ آنکھوں والے پروفیسر کی دھیمی پُر سکون آواز میں ڈوب جاتی۔ لیکن اسے بہت کم قصبے والے پرانے مکان میں آنے کا اتفاق ہوتا۔ سینے میں دو ایک بار کسی شام اچانک اس کی چھوٹی سی نسواری کار پرانے مکان کے بڑے دروازے میں داخل ہو کر لمبوں کے پیرتے رک جاتی۔ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوتی رضیہ کا دل دھڑکنے لگتا۔ وہ جلدی سے بھاگ کر نیچے آتی اور سعیدہ سے پیٹ کر ملتی اور دیکھتی کہ پروفیسر زرد سوٹ میں ملبوس اس کی طرف شرمیلیں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے ہوں۔ رضیہ کو یوں لگا تو گویا خزان کے پتوں پر کہانیاں لکھنے والا بیخوف اپنے دیہاتی مکان سے اٹھ کر اُسے ملنے آیا ہو۔ جیسے اس کے خوابی جزیرہ کا سیراس کے سامنے کھڑا ہو۔ اور جیسے اُس کے شہنشاہ میں رکھی ہوئی سادی گناہوں میں زندگی کا گرم خون دوڑ گیا ہو اور وہ زرد سوٹ پہنی کر اُسے ملنے آئی ہو۔ وہ اُسے آداب کرتی اور پروفیسر اُس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کہہ دیتا۔

”اچھی ہو بی بی!“

رضیہ صرف شرم کر نظریں جھکا لیتی۔ پروفیسر کی دونوں کپٹیوں پر پتھڑے کو گئی ہوئی سفید بالوں کی لمٹوں کا خیال کر کے رضیہ کو

محسوس ہوتا کہ وہ محض بے بی ہے۔ ناگہجی ہے۔ اور اتنا کچھ پڑھنے اور سوچنے کے باوجود اس کا ذہن ابھی نابالغ ہے، غیر پختہ ہے۔ رضیہ کی اسی اور آباؤں کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کرتے اور صدیوں کے افسرہ مکان میں خوشی اور زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ شادی کے بعد سعیدہ کا رنگ زیادہ نکھر گیا تھا۔ اور اس کی طبیعت میں شوخی اور شگفتگی زیادہ آگئی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے خاوند سے ایک دم بگڑ جاتی۔ لیکن وہ کچھ اس طرح مسکرا کہ اس کی طرف دیکھنا کہ سعیدہ ایک دم ٹھنڈی پڑ جاتی۔

شام کی چاء پر وفیسر ہمیشہ رضیہ کے کمرے میں پتیا۔ کبھی سعیدہ اور اس کی بڑی آپو بھی اس کے ساتھ ہوتیں اور کبھی وہ دونوں بالکل تنہا ہوتے۔ ایسے لمحوں میں رضیہ بے حد خوش ہوتی اور پروفیسر کے بے بڑے اشتیاق سے چاء بناتی۔ پروفیسر سگریٹ بت کر سلگاتا اور پرانے پردوں اور تالیفوں واسے بھرپور دیکھتی کمرے میں پتھر کی منبر کی جھک اور بچہ کی خوشبو سے جھلگیر پڑ جاتی اور لمبی کی ملائم روشنی میں پروفیسر کے چہرے پر کسی انجانی گہری مسرت کی چمک سی پھیل جاتی۔ رضیہ نیلی قمیروں والی پیالی ہاتھ میں لیے ہنسنے کی کوشش ہو جاتی اور پروفیسر آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیتا۔ باتیں — پرانے اور نئے ادب کی باتیں۔ ملاٹائی کے مدار ایندھن پس کی باتیں، ٹھیکری کے دینی فیئر، کی باتیں، ہنری امیل کے 'جرنل' اور 'رد لائل' کے، 'دیاں کو مستوت' اور گول کی دیہاتی کہانیوں اور رومی کی مثنوی اور آملڈ کی نظم 'لاٹ آف ایفیا' کی باتیں..... اور پھر کنول کے پھول ایسی کنواری دیوہادی نے دنیا پر ایک گیت گایا۔

SO SIGH WE, PASSING OVER THE SILVER STRINGS,  
WE ARE THE VOICES OF THE WANDRING WINDS:  
WANDER THOU, TOO, O PRINCE, THEY REST TO FIND,  
LEAVE LOVE FOR LOVE OF LOVERS, FOR WOE'S SAKE  
QUIT STATE FOR SORROW, AND DELIVERANCE MAKE.

رنیہ پر عجیب خود فراموشی کا عالم طاری ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو کنول کے چول ایسی کنواری دیوہادی کے روپ میں دیکھتی۔ اس کی سببہ زلفیں سانپ کی طرح اس کے نکلے خوشبودار شالوں پر بکھری ہوئی ہیں اور ماتھے پر چندن کی کوکانپ رہی ہے اور انگلیوں پر منا کی سُرخی ہے۔ اور وہ گوتم کی مرمری خواب گاہ میں تالین پر میٹھی و جیتر دنیا پر ہندی شہزادے کو جدائی کا پیغام سن رہی ہے۔ پروفیسر کے گہرے پُرسکون اور اس چہرے پر وہ گوتم کے عظیم حکم کا عکس دیکھتی اور پیالی بڑے آہستگی سے بیز پر رکھ کر وہ ایک گہرا سانس لیتی اور اپنا تو بصر ت پیشانی والا سر کمرے کی پشت سے لگا دیتی۔ پروفیسر خاموش ہو جاتا اور بچا ہوا سگریٹ سلگانے لگتا۔

اور جب سردی کی روشن دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوتی اور گلاب کی سیلوں میں چڑیاں شور مچا رہی ہوتیں تو وہ دونوں مکان کے عقبی باغ میں بیچوں کے پیڑوں تلے بیٹھ کر چاء پیٹتے۔ رضیہ لمبوں کی سفید کلیاں چن کر لاتی اور انھیں سعیدہ کے بالوں میں بٹھاتا

نہروں کی دیتی اور پردہ پر دیکھ کر میٹ پینے ہوئے ان دونوں کو سہار کی روشنی میں سرور دیکھ کر خوشی کے شدید احساس میں ڈوب جاتا۔ کسی وقت پر دیکھ کر گلاب کی جھاڑوں میں چھپی ہوئی کوئی چڑیا کیڑا لٹا۔ سب مل کر اس کے ہم پر سرخ اور سبز پتے پر سنا رنگ بھرنے لیسے دامن کی طرح سجا کر تھیلی کھول دیتے۔ چڑیا کا نفا سدا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ بیخوش دم سادے پڑی رہتی۔ جیسے مر گئی ہو۔ پھر غمی سی تھک کے کونے سے جی نکالتی سے دیکھتی اور میدانِ مراد پاکر پھر سے اڑ جاتی اور سنبھلا، رضیہ اور پردہ دیکھ کر تالیاں بجاتے ہوئے اسے رحمت کرتے۔ ایسے مدتن اور خوشیوں جہ سے دن بڑی جلدی گزر جاتے۔ سنبھلا اور اس کا خاونا واپس شہر چلتے جاتے اور رضیہ پھر اپنے ویران کمرے کی تنہا جیوں میں کتابوں کے زرد اور اوراق کھول کر بیٹھ جاتی۔ پھر بیٹھ جاتی کسی سردرات کو جب باہر کمرے اندھیرے میں ہو گلاب اور لیموں کی شاخوں میں محبت کا سحر بھونک رہی ہوتی، لمبات میں پھٹی ہوئی رضیہ کا انگ انگ دیکھنے لگتا اور اس کے سینے میں سڑتی ہوتی، دبی ہوئی، کھوئی ہوئی عورت ناگن کی طرح پڑو اسکے پیسے جھونک بہ ایک مٹی بھونک لے ساتھ بیدار ہو جاتی اور رضیہ کی گرم چھائیوں پر سے پھسلتی ہوئی نیچے اترتی اور غسل خانے میں جا کر آٹے کے سامنے برہنہ ہو جاتی اور اپنا کپکپاتا ہوا لافڑ چھتے جیسے، پکے ہوئے، دھکے ہوئے، سخت اور ٹھنڈے جسم پر چھیرے لگتی۔ پھر آدھی اور بارش کا ایک مسبب طوفان اٹھتا۔ دریاؤں میں جھگ اڑاتے، غصیلے، کھٹکے، دوسیلاب اُٹھ آتے اور ان کی پھرتی ہوئی موجیں جٹانی پہنروں کے سنگین بند اڑا کر لے جاتیں اور کھوکھلی جڑوں والے تن آوار، تنومند وخت اکھڑا کھڑ کر گرنے لگتے، اور رضیہ ایک چیخ مار کر جاگ اٹھتی اور دیکھتی کہ طوفان گزر چکا ہے۔ اور پانی کی چسکوں سے پرور خنوں کی ٹہنیاں اور کشیتوں کے تختے تیر رہے ہیں۔ اس کے پھرے پر خوف اور ہشت اور اذیت کے نشان ہوتے۔ جیسے ات بھر کوئی اسے دھکیوں کی طرح چابکوں سے مارتا رہا ہو۔ اس سے پیسے اس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اسے ایسے کرب، انگریز خواب نہ آئے تھے۔ اب اس کیوں ہونے لگا تھا؟ رضیہ بستر پر ہی خدا کے حضور میں گر پڑتی اور روتی ہوئی آسمانوں سے اس کے ہونٹوں سے اپنے لٹا ہوں کا اعتراف کرتی اور گناہگاروں کی معافی مانگتی۔ پھر دن نکل آتا اور وہ نہاد دھوکے بڑے مٹھن چہرے کے ساتھ بڑھی خدامہ کے ساتھ مل کر اپنی آپو کے لیے پانی گرم کرتی۔ اپنے اتاجی کے کپڑے نکالتی۔ ان کے لیے دلیا خود پکاتی اور ان کاموں سے اسے اس ندرتیں ہوتی کہ وہ اپنے سارے دکھ بھول جاتی۔ اس کا ذہن بادلوں سے یوں چھٹ کر عات ہو جاتا جیسے وہ کسی غریب کسان کی بیٹی ہو۔

مگر رات نے خیالوں کا پراسرار اندھیرا اور نئی انگنوں کے سرخ بھول لے کر آتی اور رضیہ کو اندھیرے میں اپنے گوسے بدن پر جا بجا مٹوں کے سرخ دھبے ہی دھبے دکھائی دیتے۔ وہ نہ شی میل پر سے بھینک کر اٹھتی۔ روشندانوں میں سے اند داخل ہوتی ہوتی ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں سنگار دان کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے جسم پر خوشبو پھرتی۔ میز پر بیٹھ کر لمپ جلاتی، اور سنبھلا حاشیے والا بیڈنگال کر اپنے محبوب کے نام دیکھتی ہوئی آتشیں محبت میں ڈوبے ہوئے طویل خط لکھنے بیٹھ جاتی۔ کئی خطوط پھاٹنے کے بعد وہ ایک خط کو بڑے پیار سے افسانے میں بند کرتی۔ لٹافے پر اپنے محبوب کا نام لکھ کر اسے جڑھتی۔ اس کے بعد اسے دراز میں بند کرتی اور لمپ بچا کر سو جاتی۔

صبح اٹھ کر جب وہ بے خیالی میں دراز کھولتی تو بند لٹافے پر لکھا ہوا کسی مرد کا نام دیکھ کر جبران رہ جاتی۔ لٹافہ کھول کر

جب خط پڑھتی تو شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ اُسے کسی طرح یقین نہ آتا کہ وہ خط اُسی نے لکھا ہو۔ وہ جلدی سے اس خط کو لفافے سمیت پھاڑ کر آتشہالی میں پھینک کر جلا ڈالتی۔

[illegible]

”تو پھر باقی یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟“

زبیدہ نے رضیہ کو آہستہ سے اپنے ساتھ لگایا۔

مذکورہ حالت خراب نہیں۔ وعدہ کر دیکسی سے کوئی بات نہ کر دگی۔

دونوں بہنوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور زہرہ جہروں پر مسکات ہست غنی اور دونوں نے ایک دوسری سے مدد کر لیا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہیں گی۔ سب کچھ سمجھیں گی اور خاموش رہیں گی۔

سہ ہر کوڑا کٹر مایوب بھی، ہسپتال سے آگئے۔ انہوں نے مہاتماؤں کو دیکھ کر کچھ کی طرح بازو ہلاتے ہوئے پروفیسر سے مصافحہ کیا اور سعیۃ اور رضیۃ کو دہاں دیکھ کر خوشی سے عید منائے گئے۔

”میں تو آج ناراض ہی تھا۔ فون کر دیا ہوتا۔ چلو اچھا ہوا۔ زبیدہ! انہیں کچھ کھنٹا پلایا بھی ہے یا نہیں؟ مگر تو اتھا پائس کہاں بلائے گی۔ تو تو پوری بدترام ہے۔“

زبدیدہ نظریں جھکائے مسکراتی رہی اور اس کی ساس بھی ہنستی رہی اور اس کی ننیں اپنے بھائی کی جیب سے چاکلیٹ نکال کر کھانے لگیں اور رضیہ بویہ بات واضح ہو گئی کہ زبدیدہ کی صحت کیوں خراب ہے۔ چادر ڈاکٹر نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر رضیہ نے اسے کوئی لفٹ نہ دی۔ اسے ڈاکٹر کی وہ نظریں سخت ناپسند تھیں جس سے وہ اسے گھبرا کر تکتا تھا۔ یہ نظریں مگر وہ



چھٹکیوں کی طرح اسے اپنے کپڑوں کے اندر لپکتی محسوس ہوتی تھیں۔ چار کے بعد رضیہ، سعیدہ اور پردیسہ کمال ٹیک اپنٹے کھڑے آگئے۔ اگلے روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور برسات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔۔۔۔۔ سعیدہ کے خاوند نے رضیہ کو ساتھ لیا اور سعیدہ سے یہ کہہ کر کہ وہ دریا کھوئے جا رہے ہیں، شیراز میں آگئے۔ بادل گھر سے ہو گئے تھے اور مانی پر اندھیرا سا ہورہا تھا۔ شیراز میں بنیاں جلا دی گئی تھیں۔ وہ دونوں گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ رضیہ پر پردیسہ کے ساتھ: ایسے پر سکون ماحول میں بیٹھی بے حد خوش تھی اور اس کے زردی مائل گندمی چہرے پر مسرت کا بھرپور احساس تھا۔ پردیسہ نے چار کے ساتھ بہت کچھ منگوا دیا۔ رضیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مگر بھائی جان یہ اتنی ساری چیزیں کھائے گا کون؟“  
”بھم کھا جائے گا۔“

اور اتنا کہ کر اس نے ایک کریم لپٹ خود اٹھایا اور دوسرا رضیہ کے منہ میں ڈال دیا۔ دونوں ہنس پڑے اور باہر ایک دم مہذبہ برسرِ افروغ ہو گیا۔ رضیہ کو اپنے گھر والے کمرے کا خیالی آگیا۔ کیا خبر وہاں بھی بارش ہو۔ جی ہو؟ رضیہ کو اپنے پرانے گھر اور اس کمرے سے کچھ ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ وہ قریب رہ کر اسی سے بھانپتی تھی اور دُور جا کر اسے بہت یاد کیا کرتی تھی۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ اسے اپنی پرانی اور حالیہ زندگی کا خیال آ گیا۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ کہاں جاتے گی؟ وہ زندگی سے کیا چاہتی ہے؟ اسے کیا ملے گا؟ خدا جانے وہ کیا کھوئے، کیا پائے، کیا چاہے اور اُسے کیلے۔۔۔۔۔

پردیسہ نے سگریٹ سلاگا کر رضیہ کو غور سے دیکھا۔  
”چپ کیوں ہو گئیں؟“  
”کچھ نہیں۔“

پردیسہ نے اسی طرح منہ بنا کر کہا ”کچھ نہیں۔“  
دونوں ہنسنے لگے۔ رضیہ نے چار کی پیالی میز پر رکھ کر باہر کھڑکی میں سے نظر آنے والی بارش کی جھار کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
”بھائی جان ایک بات بتائیں گے؟“  
”کیا؟“

”آپ شادی کر کے خوش ہیں؟“  
پردیسہ خاموش ہو گیا۔ اس کے دُبلے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے شگفتگی ہو کر پھر وہ آنکھیں مسکیر کر رضیہ کو دیکھا اور خشک سی آواز میں بولا:-  
”مشادی کر کے ہم لوگ نہ شکھی ہوتے ہیں نہ دکھی، صرف شادی شدہ ہوتے ہیں۔“  
”نہیں مجھے سوچ بچ بتائیے۔“  
رضیہ بچوں ایسی مند کرنے لگی اور پردیسہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔  
”ہاں ہاں بھئی، میں خوش ہوں، بہت خوش۔“

رضیہ خاموش ہو گئی۔ پردیسر بھی خاموش ہو گیا۔ باہر بارش ہلکی ہو گئی۔  
پردیسر نے کہا:-

”تم بھی شادی کر لو رضیہ! تمہارا علم اور بختہ ہو جائے گا۔“  
رضیہ شرما گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔

”میں چاہتا ہوں تمہاری شادی خود کرواؤں۔ سب کچھ اپنے ہاتھوں کروں، تم، جو اتنی پیاری، اتنی ذہنی، اتنی قیمتی لڑکی ہو۔ تمہیں بیابان سے کسی شہزادے کو آنا چاہئے۔ سوچتا ہوں کسی روز چیکے سے ہسپانیہ کے سبزہ زاروں میں نکل جاؤں اور سرد کے جھنڈوں سے سونے ہوئے کسی انڈسی شہزادے پر جھک کر کموں، میرے ساتھ آؤ میں نے تمہارے لیے شہزادی ڈھنڈلی ہے، اور پھر میں اسے لے کر تمہارے پاس آ جاؤں اور بڑی دھوم دھام سے تم دونوں کا بیاہ رچاؤں اور.....“

پردیسر نے چونک کر رضیہ کو دیکھا۔ وہ ہتھیلیوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس کا مکڑور جسم کانپ اٹھا۔ ادب سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ ہرگز نہ بھڑکیا۔ اس نے بغیر سہجے سمجھے رضیہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

”آئسو روک لو انڈسی شہزادی! تیرا شہزادہ برقی رفتار گھوڑے پر آڑا چلا آ رہا ہے۔ آئسو پو پچھو.....“

انڈسی شہزادہ ابھی کافی دور تھا۔ لیکن سعیدہ شہزاد کی گیلاری میں ضرور پہنچ گئی تھی۔ پردیسر نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور بناوٹی سکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولا

”پاگل لڑکی! یونہی رونے لگ پڑی۔ کہنے لگی گھریا دار ہے۔“

سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا اس کا چہرہ کبھی زرد ہو رہا تھا اور کبھی سرخ۔ بدگمانیوں کی غین بڑی کچی ہوتی ہے۔ وہ انڈسی اہلبیت پر چونک اٹھتی ہے۔ سعیدہ کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ رضیہ آئسو پو پچھ رہی تھی۔ وہ اس کا بھی دھڑک رہا تھا۔ لیکن وہ طبعاً ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بلند لڑکی تھی۔ اُس نے سعیدہ سے کوئی بات نہ کی۔ سعیدہ نے اپنی کایاں گلاسن پینے کے بعد اپنے خاوند کو بتایا کہ وہ کچھ سامان خریدنے آئی تھی اور یونہی شیراز میں آئی کہ شاید اس کا خاوند یہاں ہو۔ اس کے بعد یہ لوگ وہاں سے اُٹھے اور گھر آ گئے۔ سعیدہ نے راہ میں رضیہ سے کوئی بات نہ کی۔ گھر پہنچ کر بھی کوئی بات نہ کی۔ وہ جیسے گم گم سی ہو گئی۔ بھڑکیلی طبیعت رکھنے کے باوجود اُسے کچھ ایسا دکھایا کہ وہ ایک دم بھڑسی گئی۔ رضیہ کو یہی حالت میں وہاں رہنا پڑا۔ ناگوار لگا۔ اُس نے سعیدہ کے خاوند سے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔ سعیدہ کا خاوند رضیہ کو بائیل نہ روک سکا۔ اُس نے رضیہ کو کال میں بٹھلایا۔ بوڑھا ملازم ساتھ لیا اور سٹیشن پر آ گیا۔ ریل کی روانگی میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ وہ دونوں ریفریشنٹ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ پردیسر نے کولڈ ڈرنکس منگوائیں۔ اور وہ انھیں خاموشی سے پینے لگے۔ دونوں کے غزوہ دل اس تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں نظر نہ آنے والے آنسو تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے اور کہہ نہ سکتے تھے۔ آخر پردیسر نے اپنے شخص میں لہجے میں کتنا شروع کیا۔

”سوچ کچھ تو اسے مجھے اس کا بہت دکھ ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں صدمہ پہنچا ہے۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر ایک بات بھی نہیں کہہ سکتا۔ اور شاید کہی نہ کہہ سکوں۔“

تم ذہین اور پرمی لکھی ہوئی ہو، میری کیفیت کو ابھی طرح پہنچ سکتی ہو سوچتے ہوں اس گھڑی دو گھڑی کی دوستی میں ہم نے کیا پایا ہے۔ تم اپنے گھر جا رہی ہو۔ میں پھر کراچ کی پرانی لکیر میٹوں گا۔ شاید اسی میں ہم دونوں کی جھڑپ ہو۔ دونوں خاندانوں کی جھڑپ ہو۔ تم بیٹے خاندان کے لیے زندہ۔ جو اور میں اپنی بیوی کے لیے۔ ہم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بیٹے زندہ نہیں ہے۔ ہم یہاں اپنے لیے زندہ نہیں رہ سکتے ہیں اپنے لیے ضرور سیکھتے ہیں۔ اُداس نہ ہونا۔ اُردو نہ ہونا۔ شاید ہم کسی دوسرے گھر میں، کسی نئے روپ میں ملیں۔

رضیہ پر موت ایسی خاموشی طاری تھی۔ وہ صرف سُن رہی تھی۔ وہ ہمیشہ صرف سنا سنا چاہتی تھی۔ اسے ہوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کے زخموں پر ٹھنڈے مرہم کے چھاسے رکھ رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر گاڑی کے انجن اور ڈبوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

گاڑی آگئی ہے۔ چلو چلو۔

رضیہ آہستہ سے اُٹھی اور پرو فیسر کے ساتھ باہر پلیٹ فارم پر آگئی۔ پرو فیسر نے اسے سیکھنے کے لئے اس کے زائد ڈبے میں سوار کروا کر ملازم کو ساتھ والے ڈبے میں بٹھلا دیا۔ ریل کے انجن نے آخری سیٹی دی۔ پرو فیسر نے رضیہ کو دیکھا۔ وہ گھڑی کے ساتھ سرگٹ اُداس لگا ہوں سب پلیٹ فارم کے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کھسکے لگی تو رضیہ نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ دھواں، شور، گرد، دھند، آوازیں۔۔۔۔۔ تیز، بلند سچوں سے ملتی جلتی آوازیں، روک روک، گاڑی روک روک، رضیہ کا سر گھڑی کی چڑھت سے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور گاڑی بڑی تیزی سے شور مچاتی ہری ناگ کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔

.....

قیصر سے بی روز سعیدہ نے شیراز میں پیش آئے ہوئے حادثے اور اس سے پہلے کے کئی ایک واقعات کی پوری تفصیل بڑی آچوک لکھ چکی۔ رضیہ کی والدہ سُن کر وہ کہیں۔ ایک لمحہ کے لیے انہیں کچھ سمجھائی نہ دیا خط کے آخر میں سعیدہ نے لکھا تھا کہ اگر اب رضیہ کو اس کے گھر آنے کی اجازت دی گئی تو اس کے گھری پیاروں دیواریں گر پڑیں گی۔ بڑی آپر نے خطاب بند کر کے بڑی انماری کے پچھلے دراز میں قفل کر دیا۔ انہوں نے رضیہ کے والد کو اس حادثے سے آگاہ کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ دین دن گزار جاتے رہے، انہوں نے رضیہ کو بلایا اور بڑی تدبیر اور دانشمندی کے ساتھ اسے پیار کرتے ہوئے سمجھانے لگیں۔

اگر سعیدہ کے سسرال والے نہیں اچھا نہیں سمجھتے میری بیٹی، تو پھر اُن کے ہاں جانے کا ناخوشی نہیں جب اپنے گھروں میں جاہیں تو وہ دور کی رشتہ دار بھی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں ہم جی ہاں کے ہاں کئی عقیں اور تمہارا گھر انہوں نے کوئی اچھا سبک نہیں کیا۔ لیکن خیر تمہارے ایسی پرمی لکھی ہوئی کو ایسی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہئے۔ بہتر یہی ہے کہ ادھر کا راستہ معمولی جاؤ۔ اب جاؤ اور خاندان سے کہو کہ میرے لیے دنیا اور سبز جاؤ تیار کر کے آئے۔

رضیہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی ذقت نہ تھی کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کا علم بڑی آچوک کو بھی ہو جائے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سعیدہ نے اچھی کو خط لکھا ہے۔ اُسے اپنی اس قدر بے عزتی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے گھر سے جا کر پلٹ پرگ بڑی اور کیمون میں رہنے کر جی بھر کر روئی، اُن دنوں کو بھی روئی جو اس پر میت چکے تھے۔ اُن دنوں پر بھی روئی۔ انہیں وہ اٹھارہ ہی تھی اور اُن پر بھی روئی جو اُسے اٹھانے تھے۔ تین دن تک کمرے میں بند رہنے اور کسی کے بلائے پر بھی باہر نہ نکلنے کے بعد اُس نے چوتھے روز شام کو اٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ سر پر اپنے مخصوص انداز میں دوپٹہ اوڑھا، میپ جلایا اور دیاں کرستوف، کھول۔ میڈ گئی۔ جوں جوں وہ اسے بڑھ

یہی تھی۔ اس کے اندر طاقت، ہمت، دلیری اور توانائی کا شدید احساس بھر رہا تھا۔  
کھلی کھڑکی میں سے باغ کی طرف سے میوں کے پھولوں کی خوشبو اندر داخل ہو رہی تھی اور بدلائ کہہ رہا تھا۔

“O, LIFE, I SOUGHT THEE IN MYSELF, IN MY OWN  
EMPTY SHUT-IN-SOUL. MY SOUL IS BROKEN.  
THE SWEET AIR POURS IN THROUGH THE WINDOWS  
OF MY WOUNDS. I BREATHE AGAIN. I HAVE  
FOUND THEE ONCE MORE. O, LIFE! HOLD THY  
PEACE, AND LISTEN.....”

انگلت کی آخری تاریخیں نہیں گذر بیدہ اپنے خلوند کے ساتھ ہری ناگ آگئی۔ وہ پورے دنوں سے تھی۔ اور پرانی روایات کے مطابق اپنے پہلے بچے کو ماں باپ کے گھر جنم دینا چاہتی تھی۔ اس کا خاوند پورے ساز و سامان کے ساتھ لیس ہو کر آیا تھا۔ زبیدہ آتے ہی بستر پر پڑ گئی۔ وہ بڑی کمزور ہو گئی تھی۔ پہلے سے بے حدود ملی اور خفیف دکھائی دے رہی تھی۔ پانچویں دن، ماں کے کسی لیے بیکر رضیہ اپنے کمرے میں افسردہ گال تکنے پر رکھے سو رہی تھی، زبیدہ کے ہاں پھول سی لڑکی پیدا ہوئی۔ رضیہ کو صبح خبر ملی۔ اس نے بچی کو اٹھا کر بڑا پیار کیا۔ بچی کا باپ بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ بھی بچی پر جھک کر اُسے پیار کرنے لگا اور رضیہ کو اس قسم کی بوجھوس ہوئی جیسے وہ ناگھوں کے اڈے پر بہت سے گھڈوں کے درمیان کھڑی ہو۔ اور اس نے جلدی سے یونی مسکراتے ہوئے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔

ڈاکٹر ایک ماہ کی رخصت لے کر وہاں آیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے گھر پر ہی رہتا تھا۔ صرف صبح شام سیر کو جانا اور کئی کئی میل کا چکر لگا کر سپیس میں تر بتر ڈانچنا کاپتا بیڑے کمرے میں داخل ہوتا اور ٹوٹ کھول کر صوفے پر اوندھے منہ لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیتا۔ وہ سعیدہ کے کمرے میں سوتا تھا۔ اور سعیدہ کا کمرہ رضیہ کے کمرے سے ملتی تھا۔ رات بھر ڈاکٹر کے بے ہنگم خراتے رضیہ کو بے آرام رکھتے۔ دن میں وہ کسی بھی وقت رضیہ کے کمرے میں آن دھکتا اور کبھی میز پر رکھی ہوئی کتوں کو اُسٹے پلٹنے لگتا اور کبھی صوفے میں دھنس کر سگریٹ پر سگریٹ پیے جاتا۔ اور ادھر ادھر کی بے مقصد باتیں شروع کر دیتا۔ رضیہ کو بے جا مداخلت بڑی ناگوار گذرتی لیکن اپنی بڑی بہن کے منہ کو چپ ہو کر رہ جاتی۔ وہ جانتی تھی، کہ زبیدہ کی زندگی سسرال میں پہلے ہی کوئی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ایک دو بار اُس نے دروازہ اندر سے بند کر کے بھی دیکھ لیا۔ اس طرح اور قیامت برپا ہو جاتی۔ دروازہ باہر سے زور زور سے بجایا جاتا۔ اور رضیہ کو مجھوڑا چٹھنی کھول دینی پڑتی، اندر آتے ہی ڈاکٹر بڑے تعجب سے ادھر ادھر دیکھتا اور کہتا۔

”بھئی دروازہ تو کھول رکھا کرو۔ اور نہیں تو کم از کم نازہ ہو تو اندر آتی رہے۔ تمہاری صحت پہلے ہی کمزور ہے۔“

رضیہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر بات ٹال دیتی۔ پھر وہ رضیہ کے پاس آکر میز پر جھک کر پوچھتا۔

”کھکیں میں تمہارے مطاھے میں مغل تو نہیں ہوتا؟“

”جی نہیں جانی جان! بالکل نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اور تمہیں اتنا پڑھنا بھی نہیں چاہیے۔ تمہاری آئی سائٹ بالکل خراب ہو کر رہ گئی ہے۔“

رضیہ کتاب پر نظر ہی جماتے سوچتی رہتی کہ وہ کیا کرے؟ کتاب بند کر دے یا پڑھتی رہے؟ اگر وہ پڑھتی ہے تو ایک دفنا بھی نہ پڑھ سکے گی اور اگر کتاب بند کر دے تو اس بھڑے ریچھ سے بات کیا کرے؟ وہ اسی گونگو کے عالم میں مبتلا رہتی اور ڈاکٹر باتیں کرتا، سگریٹ پہ سگریٹ دیتا مومنہ میں دھندلتا مابین پڑا لگیں پیاسے اونٹن لگتا۔ اُسے اونٹننا دیکھ کر رضیہ فوراً کتاب بند کرتی اور دبے پاؤں دروازے سے نکل زبیدہ کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور اس کی پیچی سے کھینچ لگتی۔ اسی وہ آواز کو بھیجی جاتی کہ زور سے ہونسنے کی آواز آتی اور ڈاکٹر اندر داخل ہوتے ہی ہوں، ہوں، ہوں، کرتا، پیچی کو بے تحاشہ چومنا شروع کر دیتا۔

رضیہ زندگی میں کبھی کسی شے سے اتنی عاجز نہ آئی تھی۔ وہ کبھی اس قسم کی گھٹیا ذہنی الجھن میں گرفتار نہ ہوتی تھی، جس قسم کی الجھن میں وہ دن و نزل گرفتار رہتی۔ وہ سمجھ نہیں سکتی تھی کہ ایسی باتوں سے ڈاکٹر کا مطلب کیا ہے۔ لیکن ایک دن یہ مطلب اُس کی سمجھ میں آ گیا۔

ایک رات پڑھنے کے بعد اس نے کاپی نکال کر اپنی ڈائری لکھنا شروع کر دی۔ بڑی دیر سے اس نے ڈائری کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اور اس دوران میں حادثات کا ایک بھوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ لکھنے بیٹھی تو نکستی ہی چلی گئی۔ دس، گیارہ، بارہ، رات کے ساڑھے بارہ بج گئے اور رضیہ کا نیز قلم اسی طرح چل رہا تھا۔ میپ میں تیل ختم ہونا شروع ہو گیا۔ وہ پیسے ٹمٹانے اور پیر کا پینے لگا۔ رضیہ نے قلم رکھ کر دوا میں سے دو بڑی موم بتیاں نکالیں، انہیں جلا کر لکڑی کے تیل سے چنار کے پتے میں جمایا اور میپ بھادیا۔ میپ بھا کر ابھی اس نے موم بتی کی نرم روشنی میں لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ اُسے اپنے عقب میں تانبے پر کسی کے بوجھل قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر کھڑا تھا۔ سگریٹ اس کے منہ میں سلگ رہا تھا اور اس کی نیند اٹکھیں سرخ تھیں۔ رضیہ غیر شعوری طور پر چوکنی ہو گئی اور اس کا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا۔ لیکن اس نے اپنا اضطراب بڑی مشکل سے دبانے ہوئے نادرمل انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

”آپ اس وقت بھاٹی جان؟ نیند نہیں آتی ہوگی۔ ساڑھوں دوں؟“

لیکن ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ ادھر ادھر دیکھا اور رضیہ پر جھک کر ہستہ سے جولا۔

”کوئی نہیں ہے۔ سب سو گئے ہیں۔ سب سو رہے ہیں۔“

اور اس کے ساتھ ہی رضیہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رضیہ کے لیے یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ اب سب بہ روپ بیکار تھے۔ وہ جلدی سے

کر سی چوڑا اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈاکٹر کا بھڑا ہاتھ پر سے جھٹک دیا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

ڈاکٹر نے لمپائی ہوئی ہوسناک نگاہوں سے رضیہ کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورا اور پاگلوں کی طرح جھپٹ کر اسے اپنے ساتھ پٹیا لیا۔ پیسے تو رضیہ ایک دم ٹپ ہو کر رہ گئی اور ڈاکٹر کی بانہوں میں مڑوہ لاش کی مانند لٹ گئی۔ مگر زور اُسی جیسے اس کے اندر ایک شعلہ پیر کا جس نے اس کے سارے جسم میں آگ لگا دی۔ اس کے ہونٹوں، کانوں اور اعضاء کے سب سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ اُس نے ایک ہاتھ باہر نکال کر ڈاکٹر کے منہ پر اس قدر بھر پور مطابچہ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جاگرا اور شمشیر ہو کر رہ گیا۔

”نکل جاؤ۔ نکل جاؤ۔“ دگر نہ میں شور مچا دوں گی۔“

رضیہ کی آواز لہر نہ رہی تھی اور اس کے خشک ہونٹوں پر جھاگ اڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک گہری ضرب آؤڑنگا سے دیکھا۔

اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ رضیہ نے جلدی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی اور اپنے آپ کو مشکل سنبھالے دروازے کے ساتھ ٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سارا جسم ہنڈا اڑ گیا تھا۔ اور ٹانگیں اب پہلے سے زیادہ کانپ رہی تھیں۔ اس نے پینٹ تک جانا چاہا۔ لیکن دو قدم اٹھانے پر ہی اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ گہری اور قالین پر اپنا چہرہ رلاتے ہوئے بچوں کی مانند چوٹ پڑی۔ اس شرمناک گھناؤنے منظر کا تصور اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اُسے گندے بدر کے دلدل میں گرا دیا ہو۔ جس سے نکلنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مار رہی ہو مگر باہر آنے کی بجائے اور نیچے چلی جا رہی ہو۔ ساری رات وہ قالین پر پڑی روتی رہی۔ پچھلے وقت کہیں روتے روتے اُسے نیند آگئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ سنہری دھوپ کھڑکی میں سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ وہ قالین پر اونٹھ سے منہ پڑی ہے اور اُس کے کمال کے نیچے قالین کا بؤرہ مندار ہو رہا ہے۔ اُس کا ساما بدن دکھ رہا تھا۔ کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو کر اُس نے باہر باغ میں پھیلی ہوئی روشن دھوپ میں چڑیوں کی چمکا رہیں سنیں اور رات کے واقعات پر غور کرنے لگی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے رات اُس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

دو پہر تک رضیہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ بوڑھے بنادھرنے اُسے کھانا بھی دیں لاکر دیا جو اس نے غصہ ڈار سا کھا کر ڈھیسے ہی چھوڑ دیا۔ آخر اس کی پیاری امی اور زبیدہ خدیجہ خواس کے کمرے میں آئیں۔

”کیا بات ہے میری بیٹی؟ آج ہمارے پاس نہ آؤ گی؟“  
 کہیں انہیں سب کچھ معلوم تو نہیں ہو گیا؟ رضیہ کا دل شرم اور ندامت سے ڈھبے لگا۔  
 زبیدہ نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔  
 ”چلو رضیہ باہر بیٹھتے ہیں، آؤ نا؟“

رضیہ کو محالوں محسوس ہوا جیسے اس کے گلے میں ڈاکٹر نے اپنی جلدی سی بائیں ڈال رکھی ہوں۔ وہ سہم سی گئی۔  
 ”آئی ہوں باجی، ابھی آئی ہوں آپو جی، یونہی دروازے پر ہنسنے بیٹھ گئی تھی۔“  
 ”اتنا مت پڑھا کرو میری بیٹی۔ پہلے ہی بڑی کمزور ہو۔“  
 رضیہ نے مسکرا کر کہا۔

”اب نہیں پڑھو گی آپو جی، اب نہیں پڑھوں گی۔“  
 زبیدہ نے پوچھا۔

”کیوں؟“

اور رضیہ نے چونک کر کہا۔

”ادہاں — ساری کتابیں ختم ہو گئی ہیں۔“

زبیدہ اور امی باہر چلی گئیں۔ رضیہ تنہا وہ گئی۔ وہ باہر جاتے ہوئے گھبراتی تھی۔ وہ مزید باہر کھڑا ہو گا۔ وہ اُس کا انتظار کر

بڑا ہو گا۔ جانے باہر کیا ہو جائے تبسیر سے پردہ نہ بیدہ کے کمرے میں لٹی۔ ڈاکٹر وہیں بیٹھا تھا دو لوگوں میں سے کسی نے ایک دوسرے نو دیکھنے کی جرات نہ کی۔ رشتہ بچی سے کہتی رہی اور ڈاکٹر نہ بیدہ سے باتیں کرتا رہا۔

.....

دوسری صبح رضیہ نے بستر پر سے اٹھتے ہی سنا کہ ڈاکٹر اپنی بچی اور زبیرہ کو لے کر وہیں چلا گیا۔ اسے یوں لگا کہ کسی نے اس پر سے بہت بڑا بوجھ اٹھا لیا ہو۔ اس نے امی سے زبیدہ باجی کے ایک درجے ہانے کی وجہ پوچھی۔  
 "میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک اچکی تیار ہو گئے تھے اور چلے گئے۔"  
 رضیہ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور غسل خانے میں نہانے کے بے چل دی۔

موسم سرما شروع ہوا تھا کہ ہرنی ناک میں ہائی کوڑیوں کے پُراے۔ بہت پرانے بوسیدہ حویلی نما مکان کی خستہ دیواروں کے نیچے کھوکھلی زمین میں سونے ہوئے سرد لادے میں کہیں سے ایک چنگاری پھوٹی اور دیکھتے دیکھتے لاٹھ پکھلتی، کھوئی، ہسکا رتی سیان آگ بن کر بھر بنیادوں سے مگرانے لگی۔ اوپر ایک زلزلہ سا آگیا۔ اور بوڑھی، بھریوں بھری دیواریں کانپنے لگیں۔ یہ وہ زلزلہ تھا جو ہر اس پُراے گھرانے کی دیواروں کو بلے کا ڈھیر بناتا ہوا گزر جاتا ہے۔ جو صدیوں سے ایک ہی جگہ آباد زمین سے زندگی کا سونچ کھینچ رہا ہو۔ آخر زمین کا سینہ خشک ہو جاتا ہے۔ اور درختوں کی جڑیں سڑکھ جاتی ہیں۔ وہ بظاہر تین آواز اور تیز سند ہوتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر ان کا سارا گودا ایک زدہ ہوتا ہے اور وہ طوفان کے پیٹے ہی جملے میں رٹکھڑا کر گر پڑتے ہیں۔ پھر اس حادثے کو آسمانی طاقتوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ان کے جسم کھ کھلے اور بنیادیں خستہ ہو چکی ہیں۔

میر غلام حسن شاہ بڑے وضعدار بزرگ تھے۔ انھیں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خاندان۔ کے ان افراد کی عزت کا حیاں رہنا تھا جو مر کھپ گئے تھے۔ اور جنہوں نے اپنے وقتوں میں آئندہ نسل کا خیال کیے بغیر بے نیازی اور تن آسانی میں اچھی زندگی گزاری تھی۔ آپ اپنے خاندان کی تعریف سننے کے لیے دوسرے اعلیٰ خاندانوں کی تعریف میں۔ طب اللسان رہتے تھے۔ اپنے رکھ رکھاؤ کے لیے دوسروں کے رکھ رکھاؤ کا 4/4 تراش کرتے تھے۔ چنانچہ آپ قدر تا بڑا تھو۔ کے کھلے تھے۔ جہاں ایک روپیہ سے کام نکل سکتا وہاں بلا درینہ پانچ روپے خرچ کر دیتے اور انھیں اس خیال سے بڑی تسکین ہوتی کہ لوگ ان کی درباروں کی کوہائی کو رتی خاندان کا طرہ امتیاز سمجھ کر تعریف کر رہے ہوں گے۔ جو کوئی ان کے پاس سوال لے کر آنا خالی ہاتھ واپس نہ جاتا۔ کئی بار جب میر غلام حسن شاہ سے کسی نے قرض کا سوال کیا تو آپ نے کسی دوسرے سے قرض لے کر اس کا سوال وعدہ کے مطابق پورا کر دیا۔ انھیں دوسرے کی غرض سے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ صرف اپنا وقار اور خاندان کی وضع داری نبھا رہے تھے۔ کیٹی کے تمام ممبر آپ کے مقروض تھے اور آپ نے کبھی قرض کی واپسی کا قصہ نہ کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بھی مقروض ہو گئے۔ بنک میں جو ٹھکانا بہت روپیہ جمع تھا اس کی سادھ پر دو گنا نکلوا یا جا چکا تھا۔ کپڑے کے ایک کارخانے کا حصہ خرید لیا لیکن مدت نہ ملنے سے کارخانہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا۔ پراویڈنٹ فنڈ کا وہ میر پرانا خاندانی مکان رہیں رکھ کر حاصل کی گئی رقم کے ساتھ ہی دو لوگوں بیٹیوں کی شادی پر خرچ ہو گیا تھا۔ اب۔ خوب گاہ

کی تجویز میں رکھے ہوئے چند سوروہوں اور زیورات کے سہو اور کچھ نقد قمار زیورات بھی ڈیڑھ ایک ہزار سے زیادہ کی مالیت کے نہ تھے۔ کچھ آپ کے والد گردی رکھ کر بھگم کر گئے تھے۔ اور کچھ سعیدہ اور زبیدہ کو پہنا دیا گیا تھا۔ اس وقت مٹی گورٹی خاندان ————— پرانے اعلیٰ کشمیری خاندان پر پچیس ہزار کے قریب قرض چڑھا ہوا تھا اور سلتانی دیواروں، بجاری پردوں اور موٹے افغانی قالینوں والے تاریخی مکان میں سوائے چند سوروہوں کے اور کچھ نہ تھا۔ میر صاحب نے یہ تاریک رانا اپنی رفیقہ حیات پر بھی ملک شفت نہ کیا تھا۔ اس خوفناک راز کو وہ اپنے ہی سینے میں چھپائے۔ قرض خواہوں کی نگاہوں سے بچتے پھرتے تھے۔ کسی قرض خواہ کا ان سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا میر صاحب کے نزدیک نہ صرف ان کی بلکہ سارے خاندان کی موت تھی۔ چنانچہ وہ زیادہ وقت گھر پر اپنے کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ مسلسل غم نگر اور پریشانی کی وجہ سے انھیں بلڈ پریشر کی شکایت دہنے لگی تھی۔ جوں جوں بینک میں روپے کا حساب دیے اور رہن شدہ مکان کی آخری تاریخیں قریب آرہی تھیں۔ آپ کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا اور بال سعیدہ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کری پر نیم دراز آنکھوں کے سامنے اس صدیوں پرانے مکان کو دیکھ کر زمین پر گرتے اور خاندان کے اعلیٰ افراد کو گلیوں میں دیدار پھرتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی سے کچھ نہ مانگ سکتے تھے۔ وہ کسی کے سامنے اپنا باغیرت ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے۔ ان خاندان کے باقی لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چپ چاپ مر سکتے تھے۔ یہ عظیم خود غرضی ایک عظیم خاندان کے شایان شان ہی ہو سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو عظیم وقت اور عظیم بد نصیبی کے دن قریب آرہے تھے اور میر صاحب ان کے مقابلے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ چھپ جانے کی فکر میں تھے۔ میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ ایک صبح جب کافی دیر تک ان کی خواہگاہ کا دروازہ بند رہا تو خادمہ نے اندر جا کر دیکھا۔ میر صاحب اپنے بستر پر مردہ پڑے تھے۔ خادمہ بدحواس ہو کر بڑی آہوں کی خواہگاہ کی طرف بھاگی اور ان کو خبر سنتے ہی غش آگیا۔ بوڑھی خادمہ نے روتے ہوئے انھیں سنبھالا اور لگائی چیختی چلاتی چھوٹی آہی کے کمرے کی طرف دوڑی۔ رقتیہ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ بغیر دوپٹے کے کھلے بالوں سمیت اپنی امی کی طرف بھاگی۔ دیکھتے دیکھتے وہاں ایک کمرہ چمک گیا۔ پنڈی، لاہور، کراچی، پشاور، ہر طرف تاریں دوڑ گئیں۔ دوسرے ہی روز قصبہ ہری ناگ کا پھانا حویلی ناما مکان قائم کدہ بنا ہوا تھا۔ رقتیہ کو بار بار غش آرہا تھا۔ بڑی آہو خورتوں کے درمیان بیٹھی رومال چیرے پر رکھے مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ سعیدہ اور زبیدہ کی آنکھیں رونے سے بڑی طرح سوج رہی تھیں۔ زبیدہ کا خاوند قبرستان میں گورکنوں کے سر پر کھڑا قبر کھد رہا تھا۔ اور سعیدہ کا خاوند باہر برآمدے میں کرسی پر چپ چاپ بیٹھا کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ موت کیسے اور کیوں مکر واقع ہوئی۔ میر صاحب مات کو اچھے بچلے سوئے تھے۔ اور اس رات انھوں نے غلاب معوی رقتیہ کو اپنے کمرے میں بلا کر بڑا پیار کیا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ موت ہارٹ نیل ہو جانے سے ہوئی ہے اور ڈاکٹروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی۔ لاش کے جسم پر کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف اوپر کے دانتوں میں ایک جگہ ذرا سا خون نکل کر وہیں جم گیا تھا۔ شاید وہ مرنے سے پہلے کہیں گر پڑے ہوئے اور پھر پلنگ پر دراز ہو گئے ہوئے اور موت نے ان کے ذہن سے تمام اٹھنوں اور پریشانیوں کو سمیٹ کر واپس لے لیا ہو اور ان کی زندگی پر محمود کی سرد مہر لگا دی ہو۔

اور بد نصیب رقتیہ اور اس کی سفید بالوں والی شفیق ماں !

تم لوگوں کو موت کب آئے گی ؟



سرد شام کے وقت کے جس جگہ قصبے کے کھلے کھیتوں پر چند چھاری تھی۔ میر غلام حسن شاہ کو ان کے بااثر قبرستان میں دفنادیا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے سب رشتہ دار بھٹکتے گئے۔ تیسرے ہی روز پرانے گھر میں سترے سعیدہ اور بیدہ اور پروغیر کے اور کوئی نہ تھا۔ ان کے بھی لاہور ہجرت کیا تھا۔ اس اعلیٰ خاندان کے باقی ماندہ بد نصیب اور ادھر پر اس جگہ کا اب انکشاف ہوا تھا کہ ان پر مجلس ہزار روپے کا قرضہ ہے اور بڑا مکان بھی شہر کی ایک کمپنی کے پاس گروی پڑا ہے۔ ان لوگوں کے رہے سے ہوش بھی اڑ گئے۔ اب کیا ہوگا؟ اب تو سر چھپانے کو بھی کوئی جگہ نہ رہے گی۔ بڑی آپوسے سعیدہ اور بیدہ اور پروغیر سے منورہ کیا۔ مجلس ہزار کی رقم کو فی معمولی رقم نہ تھی۔ سعیدہ کے پاس بنگلہ میں صرف اڑھائی ہزار روپہ پر جمع تھا۔ اور بیدہ بڑا قرضہ چڑھا ہوا تھا۔ بیدہ بیجاوی کی قرض خیر گھر میں اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ وہ کسی سے قرض مانگ سکے۔ سعیدہ کا خاوند سب سے زیادہ پریشان تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی شریف خاندان کو محض ایک فرد کی کٹھکھی و چند ادبوں کی قربان کا یہ جھینٹ چھٹتے دیکھ رہا تھا اور اسے کسی طرح بھی نہ بچا سکتا تھا۔ آئندہ بڑی آپوسے تجویز پیش کی کہ وہ سعیدہ کے بیٹے قاضی اصغر علی صغریٰ کٹر کیٹر کا رشتہ منظور کر لیا جائے۔ یہ رشتہ پہلے سعیدہ کے لیے آیا تھا۔ لیکن محض اس لیے منظور کر دیا گیا تھا کہ قاضی اصغر علی کی عمر زیادہ تھی اور اس کی دو بیویاں فوت ہو چکی تھیں۔ قاضی اصغر علی مالدار آدمی ہے۔ اگر وہ رضیہ کا رشتہ منظور کر لے تو یہ خاندان تباہی کے غار میں گرنے سے بچ سکتا ہے۔ اس تجویز کی سب سے زیادہ مخالفت پروغیر نے کی۔

”خدا کے لیے آپرچی ایسا نہ کریں۔ اس سے تو بہتر ہوگا کہ آپ اپنے ہاتھوں رضیہ کو کوئٹہ میں دھکا دے دیں۔“

سعیدہ فوراً بول اٹھی۔

”آپ تو اس کی طرف ہی کریں گے ہی۔ ہمارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بچ جائے آپ کی جگہ سے۔ آپ تو رضیہ کو بچانے

کی فکر میں رہتے ہیں۔“

دوبھی جھینٹ کا سوگ پسند پروغیر خاموش ہو گیا۔

زبیدہ نے بھی باور دلخواستہ اس تجویز کی حمایت کی۔ اسی وقت قاضی اصغر علی کے نام بڑی آپ کی طرف سے ایک خط لکھ کر آدمی شہر کی طرف دوڑایا گیا۔ دوسرے روز اس کا جواب آ گیا۔ قاضی اصغر علی کو معلوم ہو چکا تھا کہ لڑکی کو رتی خاندان بری طرح قرضے میں چنسا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے بعض باتوں کا بھانہ بنا کر رشتہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قلعہ سب پر اس پرکٹی۔ انہیں اس بات کا خیال ہی نہ رہا تھا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کا سودا کر رہے ہیں تو دوسرا بھی مال دیکھ قیمت ڈالتا ہے۔ بھلا ایسی دلی کو کون اپنے گھر بسائے گا جس کے پیچھے مجلس ہزار قرض خواہوں کی ایک طویل قطار کھڑی ہو۔ دوسرے دن سعیدہ اور زبیدہ بھی یہ فہم کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیں کہ وہ فی الحال آرام سے رہیں اگر کوئی غیر خوشگوار بات ہوتی تو انہیں فوراً اطلاع کر دی جائے۔ گھر پہلے سے زیادہ خالی اور سفید دکھائی دینے لگا۔ رضیہ اپنا کبل سے کر اپنی امی کے پاس گئی اور اس کے کندھوں پر سر رکھ کر دینک۔ دوتی رہی۔

”یہ کیا ہو گیا ہے آپرچی! اب اتنی نہیں اس طرح کیوں چھوڑ گئے ہیں؟“

اور بزرگی نہ تیرماں آنکھوں میں آنے ہوئے آنسو پی کر مٹی کو تھلہ دینے لگی۔

”ہماری یہی تقدیر تھی میری بیٹی! آؤ خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے گناہ معاف کر دے۔“

خدا نے ان کے سوارے گناہ معاف کر دیئے تھے۔ بلکہ خدا کو تو ان کے گناہ یاد بھی نہیں تھے۔ ہاں دنیا میں رہنے والوں نے ان کی چھوٹی سے چھوٹی خطا بھی معاف نہ کی تھی۔ چنانچہ گھر کے مالک کو فوت ہونے بمشکل تین ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ شہر کے بینک، جائیداد گروہی رکھنے والی کمپنی اور کپڑے کے کارخانے کی جانب سے اپنی اپنی رقم کی واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے۔ کپڑے کے کارخانے کا حصہ میٹر صاحب اپنی زندگی میں ہی فروخت کر چکے تھے۔ بلکہ اٹلا کارخانے والوں سے چار ہزار روپے لے رکھا تھا۔ مکان سترہ ہزار میں گروی پڑا تھا اور بینک کا مطالبہ کٹ کٹا کر چھ ہزار روپے کا تھا۔ آہستہ آہستہ تقاضے شدید ہوتے گئے۔ بینک کی طرف سے ہر تیسرے روز ایک آدھ یا دو دہائی خط آ جاتا۔ وہی کمپنی نے جائیداد خالی کر دیئے کا سرکاری نوٹس دلوادیا کا رخانے والوں کا ایک آدمی ہر روز آکر مکان کے بڑے دروازے کے باہر بیٹھ جاتا۔

رضیہ کی والدہ نے صورت حال سے زبیدہ اور سعیدہ کو آگاہ کر دیا تھا۔ پہلا خط پروفیسر نے لکھا اور دوسرا زبیدہ کی طرف سے آیا۔ انھوں نے رضیہ اور بڑی آپکو کو ٹھوڑا بہت ضروری اور قیمتی سامان ساتھ لے کر اپنے اپنے ہاں آ جانے کی دعوت دی بڑی آپو نے زبیدہ کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا اور ضروری سامان کی پیکنگ شروع ہو گئی۔ رضیہ کے لیے اپنا قدیمی گھر چھوڑنا اور پھر ایسی مجبوری اور بے بسی کی حالت میں چھوڑنا ایک عظیم صدمہ تھا جسے وہ دوسرے صدموں کے ساتھ اپنے سینے میں چھپائے تھی۔

بوڑھی خادمہ اور اس کی بیٹی لائی کے ساتھ مل کر چمڑے کے بڑے صندوقوں میں ریشمی اور گرم کپڑے تھم کر کے رکھ رہی تھی۔ بوڑھی خادمہ سے بھی اس گھر کی تباہی نہ دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور آدھی رات کے وقت قابینوں، پردوں اور آئینوں فرنیچر سے سجے ہوئے اس پرانے مکان صدفوں کے بوڑھے امن کے سفید بال پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ رات کے تین بجے تمام قیمتی اور ساتھ لے جانے والا سامان صندوقوں میں بند ہو کر تیار ہو گیا۔ تین بڑے صندوق، دو سوٹ کیس اور دو بستر تیار کئے گئے تھے۔ بڑی آپو آئندہ ان کے پاس سرمئی گرم شمال اپنے جھکے ہوئے بوڑھے کندھوں پر پھیلا چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ انھیں وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ پہلے روز اس گھر میں دلہن کی حیثیت سے آئی تھیں۔ کتنے روشن، پُر امن اور عمدہ دن تھے۔ وہ بنا رسی کا مدار عوامی جوڑے میں ملبوس بڑے کمرے کے وسط میں گہری سرخ سوزنی پر شہزادیوں کی طرح بیٹھی تھیں اور انھیں خوبصورت آنکھوں اور سرخ پہرے والی لڑکیوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ کس طرح ان پردہوازہ دار خدا ہو رہی تھیں! آج ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سب خوبصورت آنکھوں والی سبیلیاں کہاں چلی گئی تھیں؟ دکھ اور مصیبت کی اس بھیانک گھڑی میں انھیں اپنے خاندان کا خیال آ گیا جو آج کے دن سے بچنے کے لیے ان لوگوں کو اس دن کے مقابلے کے لیے تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ گیا تھا۔ بڑی آپو نے سفید رومال والا کمزور بوڑھا ہاتھ شمال سے نکالا اور اُسے آنکھوں پر رکھ کر آہستہ آہستہ رونے لگیں۔

رضیہ اپنے کمرے میں ایک طرف ہو کر کھڑی دیواروں، الماریوں، میزوں، صوفوں اور پلنگ اور سنگار دان اور قابینوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایسے اپنا کمرہ سانس لینا محسوس ہو رہا تھا اور اس کے در و دیوار گویا اس کے دل کی دھکی دھکی کے ساتھ ساتھ دھڑک رہے تھے۔ کمرے کی الماریاں اور شیلیف کتابوں سے خالی تھیں۔ میزوں کے درازوں میں کوئی ضروری کاغذ نہ تھا۔ پلنگ پر صرف موٹا کتا پڑا تھا۔ کارنس پر چینی کی دو لمبی منقش صراحیاں پڑی تھیں اور ان کے اوپر بڑا سا کالا ٹیمپ کی دھندلی روشنی میں

رات سنے سواتین بجارہا تھا۔ کھڑکی بند تھی اور اس کے آنکے قمر مزی پر وہ چٹنا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر شے پر نشان اور بیان دکھائی دے رہی تھی۔ رضیہ کو کبھی خیال نہ آیا تھا کہ محض مینز پر سے کتا میں اتحاد بنے اور پلنگ پر سے بسراٹھ دستے سے کمرہ اچھڑ جائے گا۔ ۲۱۰ کمرے نے رضیہ کو ہر رنگ، ہر مودہ، ہر حالت میں دیکھا تھا۔ اس کی دیواریں اور پردے اس کے ہر ناز اور غم تھے۔ انھوں نے رضیہ کو دوستی، آپ ہی سکھاتے بائیں کرتے چپ ہوتے، نمکین اور اس ہوتے دیکھا تھا۔ انھوں نے جسے پیرا سر۔ ان کی نیلی حاموشیوں میں اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جسم پر عطر چھڑکنے اور سنسن کا غدیہ آن دیکھے جنہیں محبوبوں کو محبت بھرے خطوط لکھ کر دروازے میں سنبھالتے اور صبح آں خطوں کو ندامت سے پھاڑتے دیکھا تھا۔ رضیہ نے پردہ ایک طرف کر کے نیمید، دھما کر دیا اور کھڑکی کھول دی۔

باہر سردیوں کے گہرے نیلے آسمان پر نکھرت ہوئے ستاروں کی ٹوس جھڑک رہی تھیں۔ باغ میں سردی اور اندھیرا تھا۔ اور گہری خاموشی میں نیموں کے پیڑوں سے شبنم کے پٹنے کی بڑاسہ اور آواز آ رہی تھی۔ باغ کے اوپر درختوں پر تاروں کی جیمی دھبی دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تازہ اور سرد ہوا رضیہ کی پیشانی کو چھو کر اندر داخل ہونے لگی۔ رضیہ نے کمرہ پر جسم نے بھر بھر سی لی اور اس نے گرم شال دانت کرتے ہوئے کھڑکی بند کر کے چٹنی تہہ ہادی۔ الوداع! لمبوں کے پرانے باغ اور اس کی شاخوں پر سے ٹپکتی ہوئی شبنم! شاید تمہیں دیکھنا پھر کبھی نصیب نہ ہو۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے رضیہ نے سوچا۔ جانے اس کھڑکی کو اب کون کھونے گا۔ رات کی خاموشی میں پرانی وفادار خادمہ کے بیٹے بیٹے نے سارا سامان اپنے جھکڑے پر لا دیا۔ اور شیش کی طرت روانہ ہو گیا۔ پہلی منزل کے تمام کمرے مقفل کر دیئے گئے۔ دوسری منزل کے کمرے پہلے ہی بند تھے اور اندر توٹا بھوٹا بوسیدہ سامان گروہ غبار کی دبیز تھوں میں اٹا ہوا تھا۔ اور اب بجلی منزل کی بارہ تھی۔ اب اس منزل میں مکڑیاں جالے نہیں گی۔ مڈیاں اٹکے دیں گی۔ اور جو بے تالیفوں پر دوڑیں گے اور بجلی کھلے روشن دان میں سے بڑی الماری اور بڑی الماری پر سے مینز پر کوڈر ان کے شکار کو آیا کرے گی۔ اب دیواروں کا چونا گرنا شروع ہو جائے گا۔ اور دلمیزوں، چوکھٹوں، دروازوں اور کرسیوں کو دیکھ گئے کی اور رہتی گم لموں داسے پلنگوں میں پھپکیاں آباد ہوں گی۔ بند کمروں کی کھٹی ہوئی فضا میں ایک نئی فضا پیدا ہوگی اور اس کی فضا کے کپڑے کوڑے پیدا ہوں گے۔ اب یہ پرانا مکان کبھی آباد نہ ہوگا۔ اس میں جو بھی رہے گا۔ اسے ایک بند ایک دن، رات کے اندھیرے میں سامان باندھ کر چوروں کی طرح جھاگ جانا پڑے گا۔ اس لیے کہ اس مکان کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، بنیادوں کو دیکھ چاٹ چکی ہے۔ اور اس کے نیچے کھولنا ہوا آئینیں لاوا گر دہش کر رہا ہے۔ ایسا پرانا مکان جہاں کہیں ہوگا آخر ویران ہوگا اور اس پر آسب اپنا قبضہ جما میں گئے۔ نکل جاؤ، نکل جاؤ، ایسے تمام بوسیدہ مکانوں کی چھتوں سے نکل جاؤ۔ یہ لڑکھڑا کر گرنے کو ہیں۔ ان کے تلے زمین کے بجز سینے میں پھرتا لاوا دھک رہا ہے۔ یہ بھڑکنے کو ہے اور پھر بھیا نک۔ آواز کے ساتھ زلزلہ آئیگا۔ اور ان حیرت انگیز فنا کرم خوردہ مکانوں کے سستوں تنکوں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئیں گے۔ جھاگ جھاگ جھاگ جھاگ۔ اسے پہلی منزل والو! اور دوسری منزل والو.....

اور اب میٹر گھرانے کے یہ آخری دو بد نصیب افراد اپنے آبائی مکان سے بے دخل ہو رہے ہیں۔ دونوں ماں بیٹیاں گرم کپڑوں، گرم چادروں اور آؤنی شالوں میں اپنا آپ چھپائے، مہر جھکائے مکان کے پہلے دروازے میں سے نکل کر سرد دروازوں

ڈیڑھ ماہ بعد بھری ناگ و اسے پرانے مکان کا سارا سامان نیلام کر دیا گیا۔ یہ بہار کے آغاز کا موسم تھا۔ نہر کنائے  
الیکٹرک کے درختوں پر بسنت پھولی آ رہی تھی اور یہاں اُن کا زرد اور نارنگی رنگ بھری ناگ کے پانی اور پکڑ بھڑی پر گر رہا تھا۔ پُرانے مکان

کے غضب میں غصہ مائل عراب پر چڑھی، وہی نقش بچاں اور گلاس کی بیوں میں ننھی ننھی کلیاں آنکھیں کھولے بچوں کے جھونکوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ لیون کے پیڑ بھی سفید پھولوں سے لگ گئے تھے امدان پر شہد کی نکلیاں پکڑ لگا رہی تھیں۔ دوسری طرف، مکان کے صدد وواز سے کے  
 لیون کے پیڑ بھی سفید پھولوں سے لگ گئے تھے امدان پر شہد کی نکلیاں پکڑ لگا رہی تھیں۔ دوسری طرف، مکان کے صدد وواز سے کے  
 لیون کے پیڑ بھی سفید پھولوں سے لگ گئے تھے امدان پر شہد کی نکلیاں پکڑ لگا رہی تھیں۔ دوسری طرف، مکان کے صدد وواز سے کے

سیاہ لہجے کوٹ والا آدمی جیوت سے پرکھ، چھٹی اٹھائے نیچا، بول رہا تھا۔ سامنے تھپے کے زمینداروں جاگیرداروں اور  
 امیر بیادلوں کے کارندے کھڑے مال کا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی دوسرے وہ لوگ خور نہیں آئے تھے۔ لیون انھوں نے اپنے کارندے  
 بیچ بیچتے تھے۔ اس مجمع میں تھپے کا ایک بھی دوکاندار، گاڑیاں، حجام، نعل ساز، کوچی الی اور علوانی موجود نہ تھا۔ وہ لوگ ایک بھر کے  
 خیر پاؤں راج الٹا دیکھ کر گھروں میں بیٹھے افسوسناک انداز میں اس پر تبصرہ کر رہے تھے اور خدا سے دعا مانگ رہے تھے کہ وہ ہر گھر کی  
 لالچ رکھے۔ دوسرا ہی پرانی ہادیوں میں طبرس سالان کی ڈھیر یوں کے درمیان اسیل مٹوں کی طرح گردن اکڑاٹے پھر رہے تھے اور یہاں  
 وہاں کسی دھنسی میز، مسند، الماری یا چنگ کو ڈنڈے سے بھا کر دیکھ لیتے تھے۔

نیلام بڑی تیزی سے شروع تھا، سو کا مال دس روپوں میں اور دس روپے کی شے ایک روپے میں اٹھ رہی تھی۔ مقررہ  
 فوراً جیوتوں میں اندراج کرتے جانے لگے اور دوسرے بک کے ادھیڑ غرناٹے کے پاس میز پر جمع ہوتا جا رہا تھا ڈاکٹر سگریٹ  
 سے سگریٹ سلگوا رہا تھا اور نیلام کرنے والی کمپنی کے ایک افسر سے کہہ رہا تھا۔  
 لندن میں نیلام کر دانے والوں کو کمیشن کے ساتھ آنے جانے کا لاؤنس اور دو وقت کا کھانا بھی ملتا ہے اور  
 یہاں.....

کمپنی کا گھنٹا بج رہا تھا گوڈنٹیک کے سگریٹ کو بنگلے کے سگریٹ کی مانند پیٹتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائے جا  
 رہا تھا اور لہجے سیاہ کوٹ والا ڈبلا پتلا چارنی سا آدمی کانسٹی کا پھول کی جی ایسا ہڑا اور منقش نقال ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔  
 مہجور نے حضرت اس کے لیے۔ اس ماسٹر پیس انگلیک کے لیے۔ ہاں.....  
 مجمع میں ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”ادے غلام علی! اسے گھجے جاؤ اوٹے، اماں پاں لگائے گی۔“  
 اور مجمع میں لوگ تھپے لگا کر ہنس پڑے۔ ڈاکٹر بھی دیکھ کر طرح پہنے لگا۔ گھجے مائندے نے ڈاکٹر کی طرف جھک کر کہا۔  
 ”دیے بہ نقال پاں سگریٹ کی دکان ہی کا ہے۔“

جب سیاہ رنگ کے ایک خوبصورت آنسو رانگ ٹیبل کی نیلامی ہونے لگی تو پریڈیسیس اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 اتنے بڑے مجمع میں صرف وہی جانتا تھا کہ اس میز پر جھک کر رضیہ ————— وہ یونانی المیہ کی ہیروئن اپنی انٹری لکھا کرتی تھی۔ اور  
 ترجمان، ٹالک شاپ، ٹریڈر، کھسکے، نقاد، اور ہیرو کو پڑھا کرتی تھی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”آپ کہاں چلے؟“

”میں یہ میز خریدنا چاہتا ہوں۔“

نیلامی بولنے والے نے آہستہ سی میز کو چھڑی سے بجاتے ہوئے کہا۔

”اور اب اس کالے میز کے لیے — ساتواں اس کے سیاہ رنگ پر نہ جائیں۔ اس کے گن دیکھیں۔ دیکھئے اس کے چھ دروازے اور اس کا ایک ڈھکنا بھی ہے۔ موٹر گاڑی کی طرح بارش ہو تو ڈھکنا چڑھایا جاسکتا ہے۔ اب بروئے اس کالے مگر دل کے گولے میز کے لیے.....“

ایک طرف سے آواز آئی۔

”پانچ روپے۔“

پرونیس نے فوراً بیس روپے کہہ دیئے۔ سب لوگ اُسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ نیلامی بولنے والا کتنی دیر بیس روپے ایک، بیس روپے دو چلتا رہا لیکن جمع میں کوئی نہ بولا۔ آخر اس نے ”بیس روپے تین“ کہہ کر چھڑی میز پر ماری اور میز پر وٹیر کے محلے کر دی گئی۔ پرونیس نے روپے دیئے اور بوڑھی خادمہ کی مدد سے میز پر آکر اسے میں ایک طرف کر کے کھڑی کر دی۔ پرونیس نے لائی کے سر پر ہاتھ پھرتے پھرتے پوچھا۔

”اچھی ہو بیٹی۔“

لائی نے سر جھکا لیا۔ اس کی ماں نے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیسا راج آٹھ لیا بڑے بابو؟“

پرونیس نے ایک گہرا سانس بھرا اور خاموش رہا۔

.....

رضیہ کو اپنی امی کے ساتھ زینبہ باجی کے ہاں رہتے ہوئے تیسرا مہینہ گزر رہا ہے۔ زینبہ کے سب سال والوں کی یہ کوٹھی اولڈ کلب روڈ پر واقع ہے۔ یہ کوٹھی کافی لمبی چوڑی ہے۔ اس کے لان میں کٹائے کٹائے نصف دائرے کی صورت میں پوکھلیس کے اوپنے اوپنے درخت ستونوں کی طرح کھڑے ہیں۔ برآمدے کی عمارتوں میں کاتے دار گھاس کے روشنی گٹھ تک رہے ہیں۔ اس کے دور دراز سے ہیں۔ پورٹیکو سے الگ دروازوں کی طرف جاتی ہوئی کمان ایسی کچی سڑک پر چٹائی رنگ کی بھری گئی ہوئی ہے۔ جب کوئی کار اندر داخل ہوتی ہے تو اس کے پچھلے پیوں کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی گرد آڑا کرتی ہے۔ سڑک کی جانب جہاز یوں کی دس گیارہ فٹ اونچی دیوار کھڑی ہے۔ اس دیوار کے ساتھ لان میں لالہ اور سورج مکھی کے سڑخ اور زرد پھول مارچ کی دھوپ میں مسکرایا کرتے ہیں۔ رضیہ اور اس کی امی کو اس کوٹھی کے دو مختصر سے کمرے دیئے گئے ہیں۔ ایک کمرے میں سلمان اور دو پلنگ نیچے ہیں اور دوسرے کمرے میں دو تہی کرسیاں، ایک میز اور کارنس پر چینی کا تختہ رابرت سامان پڑا ہے۔ اس کمرے کی ایک چھوٹی سی کھڑکی لان کی طرف کھلتی ہے۔ اس وقت رضیہ اس کھڑکی کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ اس کا چہرہ اس قدر ڈھل گیا ہے کہ وہ عمر رسیدہ عورت معلوم ہو رہی ہے چہرے کا رنگ بھوسلا چھوڑا ہے اور ہاتھوں پر سبز رنگیں ابھرا آئی ہیں۔ بھروسے حلقوں میں آنکھیں جب کسی شے کو غور سے

نہیں جی تو سچہر کی معلوم ہوتی ہیں نالوں پر ایک بے رنگ سی مروئی چھا رہی ہے وہ کتنی دیر سے یہاں کھڑی باہر ان میں ایک طرف دھستے اور سج کی نارنجی دھوپ میں اپنی بوڑھی اتنی کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی اتنی جھاڑیوں کے بیولوں کے پاس سبز کرسی پر بیٹھی کاپیتے انھوں میں پیٹ تناسے کچھ سے ولیدہ کھا رہی ہے۔ اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے ہیں اور بھاری بسمد ڈھلک کر نہ دھو گیا ہے۔ گالوں کی بٹیاں گھبراہٹی ہیں اور چہرے پر گزرتی تلک جھریوں اور لکیروں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ اس کے پاس ہی زبیدہ کی سوخ و شنگ نندہ میں ٹینس کھیل رہی ہیں۔ انھوں نے رنگین دوپٹے کمر کے ساتھ نرس کرنا مذہر رکھے ہیں اور وہ اچھل اچھل کر کھیل رہی ہیں اور شور عار ہی میں اور ان کے کٹے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ تیری نندا کا کہیں نندا کا نیلی بکرہ پہنے رضیہ کی والدہ کے پاس جا کر اسے جھک کر سورا سے دیکھتا ہے اور پھر ٹینس کھیلتی ہوئی اتنی سے پوچھتا ہے۔

”مقامی..... وادی.....“ کیا تھا رہی ہے؟“

رضیہ پر سب کچھ پھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور جیسے اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ ساتھ والی کوٹھی میں کوئی ریڈیو پڑھنا مانی جا رہی ہے۔ شہنائی کی ٹپو، دو آواز میں ایک زخمی فریاد اور ایک ہے۔ جیسے کوئی کھویا ہوا اچھ خواب میں جھک کر اپنی ماں کی گود میں جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ رضیہ کے لیے یہ سنگین افسردگی کوئی نئی شے نہیں تھی۔ وہ سب سے اس گھر میں آئی تھی اسی طرح تھی۔ اس نے کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔ وہ سارا دن اپنے مختصر سے کمرے میں جھپٹی پڑھتی رہتی، لکھتی رہتی اور اپنی غم نصیب بوڑھی امی کے پاؤں دباتی رہتی۔ اس سے اپنی امی کی روز بروز گرتی ہوئی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کی نظر بے حد کمزور ہو گئی تھی اور سوراخ کی روشنی میں بھی انھیں دو تین گز کے فاصلے پر سداٹے دھند کے اندر کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ نکلیں چائے دن میں کئی بار پیالہ کرتی تھیں ایک ہیال، انھیں یہ کشمیری پھاو صرف دن میں ایک بار صبح کو ملتی تھی۔ کبھی کبھی زبیدہ سب کی نظرس بچا کر اُن کے لیے سبز چائے کا پیالہ بنا کر لے آتی تھی۔ وہ چھوٹی چچے انھیں اور بھی بہت کچھ لا دیا کرتی تھی۔ لیکن اپنے تخت سے گری ہوئی شکست خوردہ بوڑھی آجوانے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔ بلکہ وہ زبیدہ کو بھی وہاں زیادہ دیر بیٹھنے سے منع کیا کرتی تھیں۔ سبیلہ شروع شروع میں تقریباً روزانہ ان سے ملنے آ کر فی منہ کچھ دین گزرتے پھر اس نے بھی اناکم کو دیا۔ کسی نے اس سے گلہ نہ کیا کہ وہ اب ملنے کیوں نہیں آتی۔ پروغیسر نے اپنی بیوی سے چھپکے بڑی آجوان کو ہر ماہ اپنی سخاوت کا کچھ حصہ پیش کرنا چاہا جسے بغیر عورت نے قبول نہ کیا۔ بلکہ پروغیسر کے ساتھ کچھ ایسی سڑوہری سے پیش آئی کہ وہ چھپکے سے اٹھ کر چلا گیا اور پھر کبھی نہ آیا۔

آئی کہ وہ چپکے سے اٹھ کر چلا گیا اور پھر بھی نہ آیا۔  
 ہری ناگ سے جو چند سو روپے بچا کر لائے گئے تھے وہ ختم ہو چکے تھے، زیور۔۔۔ پرانے خانمانی زیورات فروخت کرنا بڑی آچوٹے گوارا نہ کیا تھا، علاوہ انہیں ان کا خیال تھا کہ یہ زیور وہ روضیہ کو دیں گی۔ روضیہ کے سینے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ہاں! روضیہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ تو خالی دامن ہی رہ گئی تھی۔ اس کی بھلہ باری میں تو بہار میں بھی درختوں کے زرو پتے ہٹا کر رہے تھے۔ آج اس کی محبت، امسکی جوانی، اس کی زندگی سلسلہ در سلسلہ تباہ حال کھنڈوں میں برہنہ مہ کھڑی تھی اور اُس کی ہر اُنک، ہر آرزو کا سر نیزے میں بر دیا ہوا اس کی نعش پر فوجہ کناں تھا۔ وہ لاشعور کے تاریک جنگلوں میں بھٹکتی بھڑ بھڑاتی تھی اور اُس کی سنگین یادوں کے تمام گیت وقت کی خاک اڑانی، دیران محرابوں میں مسجدہ ریز تھے۔ ہائے روضیہ! تیرے سارے بیچ گرم بیت میں بونے گئے تھے۔ تو بھول کماں سے چنتی! تیرے سارے بگنڈوں کو اندھوں نے اپنی گدڑیوں میں تید کر رکھا ہے سبھے روشنی کماں سے

آئے گی! پرانی امیوں کی ہیر و منی! اپنے کھوئے ہوئے ایتھنز، ملٹی سین اور غرناطہ کی تلاش میں نکل جا! شاید تیرا محبوب تجھے شام اور فرات کے تھلتاؤں میں کسی چٹپٹے پر مل جائے اور تجھے شمالی افریقہ کے ساحل سے ہوتا ہوا ہسپانیہ کی اُن پتھریلے سڑکوں پر لے جائے جو زیتونی اور انجیر کے باغوں کو جھاڑی ہوں۔ اور جہاں انگور کی دیہیوں تلے مرا قشی قالینوں پر تھوہیسی کینزیں رقص کر رہی ہوں اور انڈسی ٹکڑے یورپی تہذیب کا خاکہ مرتب کر رہے ہوں۔

لیکن رضیہ جس طرف جاتی رہتے رہتے کاخاوند اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا اور وہ بے بس ہو جاتی۔ اب تو بالکل ہی بے بسی تھی۔ یہاں اس کی آہ و زاری سننے والا کون تھا۔ ایک امی تھیں۔ سوان کی حالت رضیہ سے زیادہ قابلِ رحم تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو ڈاکٹر کے شیطانی حملوں سے بچائے رکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر بالکل نہ نکلتی تھی۔ وہ بھرکڑیوں میں کھوٹی رہتی اور رات کو دوبارہ اندر سے بند کر کے امی کے پاس سوتی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی طرح اپنی شادی کر لے اور اپوچی کو اپنے ساتھ ہی لے جائے۔ مگر وہ اکیلی کیسے اور کیونکر شادی کرے؟ بونہی اسے کون گھر میں گھسنے دے گا اور اگر وہ کسی گھر میں آباد بھی ہو گئی تو وہاں اس کی کوئی بھی عزت نہ ہو گی۔ وہ بڑے باعزت طریق سے اپنے سسرال جانا چاہتی تھی۔ جہاں کا ہر فرد اس کا اور اس کی امی کا احترام کرے۔ لیکن وہ ہر بار ایسا سوچ کر ہی رہ جاتی پھر اُسے یقین ہو جاتا کہ اُس کا بیاہ کبھی نہیں ہو گا اور کسی ہسپانوی پہاڑ سے نکل کر کوئی انڈسی شہزادہ اسے لینے نہیں آئے گا، کوئی سفوفلیس اُسے اپنے ڈراموں کی ہیر و منی بنانا لگا، اُنہ کرے گا اور فرات کی وادی میں کوئی محبوب چٹپٹے پر اس کا انتظار نہ کرے گا، اور وہ یونہی مر جائیگی، اس لمحے اُسے موت بڑی خوفناک دکھائی دیتی۔ مگر جب وہ اپنے نیلے راستوں پر ڈاکٹر کے بالوں پر بھرتے جسم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتی تو جین مار کے جاگ اٹھتی اور خدا سے موت کی دعا مانگتی۔ موت۔ تاہم ایک اندھیروں کا اندھیرا، مستانوں کا ستارا، تنہائیوں کی تنہائی اور راتوں کی رات!

ایک بار اس نے اپنی امی کے پاؤں دبانے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”میرا یہاں دل گھبراتا ہے اپوچی! بہت گھبراتا ہے۔ کیوں نہ ہم ایک آدھ ماہ باجی سعیدہ کے ہاں رہ آئیں۔

رضیہ کا خیال تھا کہ باجی سعیدہ کے ہاں اس بہانے جا کر وہ کبھی رہیدہ کے گھر واپس نہ آئے گی۔ مگر اس کی امی نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا اور تنبیہ کی کہ آئندہ اس گھر کا نام نہ لے۔

”اب ہمارا امرنا جینا اسی جگہ ہے۔“

اور رضیہ بے بس ہو کر رہ گئی۔ پیچھے میں پیچھے پھرتے گئے۔

باہر لان میں دھوپ پوکپوکش کے درختوں کی آخری ٹہنیوں کو چوم کر رخصت ہو رہی تھی۔ رہتے رہتے کی زندگی بدستور ٹھیک رہی تھیں۔ رضیہ کھڑکی کے ساتھ لگی اسی طرح کھڑکی تھی اور بے خیالی میں کبھی انھیں کھیلنے دیکھنے لگتی اور کبھی اپنی کمزور داناواں ماں کو ہستہ آہستہ دیکھ کھاتے دیکھ رہی تھی۔ اچانک ایک طرف سے گیند اچھلتی ہوئی آئی اور دلیہ کھاتی بوڑھی عورت کے سر سے ٹکرا کر جھاڑیوں میں جا گری۔ رضیہ کا دل ایک دم ڈوب سا گیا۔ نہ بیدہ کی پہلی نند نے بلند آواز میں یہی طور پر معافی مانگی اور دوسری نند جھاڑیوں میں گیند تلاش کرنے لگی کمزور بوڑھی عورت نے کچھ نہ کہا۔ صرف عاجزی سے ان کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ دلیہ کھانے لگی۔ اور اب اس کے دلیہ میں اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو بھی شامل تھے۔ رضیہ کے دل پر پوچھیاں سی چلنے لگیں۔ اس نے کھڑکی



بند کر دی اور اس کے بند پٹ کے ساتھ سر لگا کر بسکیناں بھرتے ہوئے بچوں کی طرح روننا شروع کر دیا اور باہر دھوپ نہت ہو گئی۔  
 ہمارے گھر گئی تھی اور درختوں پر سے پتے گرنے شروع ہو گئے تھے کہ مسجد کے ہاں چاند ایسا بڑا پیدا ہوا۔ سعیدہ کی  
 سانس، ابھو کے اصرار پر زندہ کے ہاں آئی تو ساتھ اُن کی بوڑھی آچہ کو بھی کٹال بیٹک لیتی آئی۔ اس نے رضیہ کو بھی چلنے کے لیے  
 کہا لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ سعیدہ نے رضیہ کی عدم موجودگی کو ایک لمحہ کے لیے محسوس کیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے بھول گئی  
 سعیدہ نے زندہ، اپنی بوڑھی ماں، زندہ کی دونوں منہوں اور اس کی سانس، سجدوں کو دوسرے کھانے کی دعوت دی تھی۔ کھانے  
 پر سب نے بڑی عطرش دی اور سر اُچی کا اظہار کیا۔ زندہ کا ڈاکر مخاوندہ تو اس قدر کھا گیا کہ اس کا پیٹ اچھڑ گیا اور وہ کافی پرکائی  
 پڑھانے لگا۔ پروڈیوسر نے بہت کم کھانا اور سب سے جدا ہو کر درختوں کی جھاڑوں میں بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ اس کے ارد گرد  
 سانے میں درختوں سے گرے ہوئے زرد پتے بکھرے ہوئے تھے۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اچانک اُسے خیال آیا کہ رضیہ گھر میں  
 نہ ہو گی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے پچھلے سے کیرج میں جا کر مڑ ٹٹھائی۔ نوکر سے کہا کہ وہ ذرا ایشیئن ٹیک جادے۔ اور سیدھا  
 زندہ کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

رضیہ اتنی بڑی خالی کوٹھی میں تنہا تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر سی پر نیم دراز اپنی ڈائری کے پرانے اور راق پڑھ رہی  
 تھی کہ کوٹھی میں کسی کار کے داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ کار کے دھیمے دھیمے ہارن کی آواز بڑی مافوس تھی۔ اس کا دل  
 دھڑکنے لگا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ باہر بوڑھیاں میں پروڈیوسر کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ رضیہ گم سم سمی ہو کر دیں کی دیں  
 کھڑکی رہی۔ یہ کیوں آئے ہیں؟ کیا اُسے لینے آئے ہیں؟ وہ کبھی نہیں جانتے گی۔ کہیں نہیں جائے گی۔ اب یہاں اس کا کون ہے؟ کسی  
 نے آہستہ سے دروازہ پر دستک دی۔ رضیہ جیسے کسی سحر کے زور سے دروازے کی طرف پکی اور خود آچھٹی کھیل دی۔ پروڈیوسر نے  
 جوئے رنگ کے سمر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ افسردہ تھا۔  
 رضیہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”بیٹھے۔“

پروڈیوسر کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے میں بڑی معنی خیز چپ چاپ طاری ہو گئی۔ رضیہ کو پہلی بار اس کمرے کی خاموشی بڑی مافوس  
 محسوس ہو رہی تھی۔ اس خاموشی میں آنے والے دنوں کی ٹھگیں اُمیدیں اور پرانے دنوں کے سوگوار فوسے تھے۔ وہ خاموش تھی لیکن اُسے  
 اُس خاموشی کی پُر محبت سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ سعیدہ کے خاوند نے اپنے مخصوص انداز میں مکہ آمیز آنکھوں کو زندہ اسکیڑ کر کہا۔  
 ”میں ————— میں نہیں بہت کچھ کہنے آیا تھا رضیہ۔ مگر کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری باتوں سے بہت بلند ہو۔ میں نے  
 تمہارے سامنے ہمیشہ لفظوں کے پائسے پھینکے ہیں اور تم زندگی کے بھنور میں اتری ہوئی ہو۔ اب صرف اتنا ہی کہہ دو کہ تم شادی کرو۔  
 سعیدہ نے آجوجی کے مشورے سے ایک دشتہ تلاش کر لیا ہے۔ وہاں مجھے بھی پسند ہے۔ کوشش کرنا کہ اس کے ساتھ زندگی کے دو  
 روز تنہا کھیل کر گزار سکوں۔“

رضیہ آہم کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہ کپ کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں رضیہ۔ اس لیے کہ تمہارے دکھوں کا یہی ایک علاج ہے۔“

”اگر زندگی گزارنا ایک مرض ہے تو مجھے اس کا علاج نہیں چاہیے۔“

پروفیسر کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ وہ ہر قیمت پر رضیہ کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ اس بد نصیب روح کو برت کے گھر سے شگافت میں گرتے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ رضیہ کو اس تباہی سے ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔  
”میرا مطلب یہ نہیں رضیہ۔ میں چاہتا ہوں تم اپنے گھر آیا در ہو۔ تمہارا بھی ایک خوبصورت گھر ہو۔ تمہارے بھی خوبصورت بچے ہوں۔ تمہاری نگہداری بھی کرنے والا کوئی ہو۔ خدا آئینے میں اپنی صورت دیکھو۔ تم کیا تھیں۔ تم کیا بن گئی ہو۔“  
رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اگر خوبصورتی کی تلاش میں نکلا ہوا انسان بد صورت ہو جاتا ہے تو میں دنیا کی سب سے بد صورت عورت ہوں۔ اور اگر نیکی کرنے سے انسان بُرا ہو جاتا ہے تو مجھ سے زیادہ بُرا اور کون ہو گا؟“  
پروفیسر نے سگریٹ سلگایا اور اٹھ کر پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹھنکنے لگا۔ رضیہ کھڑکی سے باہر درختوں پر دھوپ میں چمکتے زرد پتوں کو دیکھ رہی تھی۔

”مجھے زندگی سے محبت ہے اور جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مرنا بھی زندگی میں شامل ہے مجھے موت سے بھی محبت ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں مرنے کے بعد بھی زندہ رہوں گی۔ ہو سکتا ہے میں کل سورج کو طلوع ہوتے نہ دیکھ سکوں۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کل طلوع ہونے والا سورج مجھے نہ دیکھے۔ جہاں میں دفن ہوں گی وہاں نہ دنگلاب کا پھول اُٹکے گا۔ جہاں جس کی موت پر تروتازہ پھول اُگیں وہ کیسے مر سکتا ہے؟.....“  
”لیکن رضیہ.....“

”زندگی گزارنا ایک آرٹ ہے پروفیسر صاحب جیسا سیدھا اور نہ چرل آرٹ، ادا جو لوگ اس آرٹ سے واقف ہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ زندگی کا تعلق انٹلیکٹ سے ہے لیکن زندگی گزارنے کا تعلق انٹلیکٹ سے ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کو مجھ سے دلی ہمدردی ہے۔ اس کے لیے میرا دل خوشی سے بھر رہا ہے۔ لیکن میں اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلنا چاہتی ہوں۔ اگر یہ راستہ پُر سکون جھیلوں پر جانا نکلا تو میں وہاں چاندنی راتوں میں نیلے کنول چن کر آپ کی ہمدردیوں کے تہوار منایا کر دی گی۔ اور اگر تپتے صحراؤں میں جا کر ختم ہو گیا تو میں اپنا صحیح راستہ تلاش کرنے ایک بار پھر آؤں گی۔“  
”ہاں ایک بات آپ سے ضرور کہوں گی۔ اگر تیس مر جاؤں تو میرے لیے ختم نہ کریں۔ میری قبر پر کسی کو آنسو نہ بہانے دیں۔ بڑی دلیری سے زندہ رہیں۔ زندگی کے لالچ کو روک دشنی اور بچ کر رہیں۔ اگر یہ لالچ دھم ہونے لگے اور لکڑیاں ختم ہو جائیں تو بے شک میری تلاش کو جی اس میں جھونک دیں۔ میں مرنے کے بعد بھی زندگی کی جستجو میں جھلنا پسند کروں گی۔“

رضیہ خاموش ہو گئی۔ اس کا سر کمرے کی پشت سے لگا تھا اور زرد چہرے پر ایک عجیب قسم کی گرم روشنی بھانک رہی تھی۔ پروفیسر میز کے ساتھ ٹیک لگائے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر وہ ایک ایک تگے بڑھا۔ اس نے جھجک کر رضیہ کے نازک ہاتھ کو ہتھ سے احترام سے چوما اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ رضیہ ایک عالم خود فراموشی میں ڈوبی جسے کی طرح

نہی رہی۔ باہر کار کے سٹارٹ ہونے اور دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کی آواز سنائی دی۔ مقوڑی دُور جا کر یہ آواز خلا میں کھو گئی۔ رضیہ اپنے ہاتھ کو بڑی افسردہ مسرت کے ساتھ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اس مقدس ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

.....

شام ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک سعیدہ کے ہاں سے کوئی واپس نہ آیا تھا۔ لوگ بھی کہیں سینما وغیرہ دیکھنے چلا گیا۔ خلا تنہا بڑی خالی کو بھٹی میں رضیہ کو اکیلے میں کچھ مبہم سا خوف محسوس ہوئے لگا تھا۔ کچھ دیر وہ لان میں ٹھکتی رہی۔ پھر برآمدے میں بیٹھی پڑھتی رہی اور اس کے بعد اُٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی اور پلنگ پر لیٹ کر سعیدہ کے خاندان سے اپنی آج کی ملاقات، اس کی خاموشی، اپنی باتوں اور پھر اُس کے گھجک کر ہاتھ چومنے کے متعلق سوچنے لگی۔ کمرے میں شام کے پہلے مرحلوب سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے دل میں بتی جلانے کا خیال آیا۔ وہ ابھی بتی جلانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک بار پھر وہی عساری نیم دا سترخ آنکھوں والا ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن آج اُس کے پاؤں میں خوفزدہ لوگ کھڑا ہٹ نہیں تھی۔ وہ بول کر سے کے وسط میں کھڑا تھا جیسے اپنے جہاز کے طرے پر کھڑا قیدیوں کو چاکلیں لگوانے کا حکم دیتے والا ہو۔

رضیہ دھک سے رہ گئی۔ وہ ایک دم اُٹھ بیٹھی۔

”آپ..... آپ کیا جانتے ہیں؟“

”تم جانتی ہو؟“

ڈاکٹر کی آواز میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہ تھی۔ اندھیرے میں اچانک ایک خیالی چمکا۔ رضیہ ٹھک کر کھلی کھڑکی کی طرف پلکی اور ڈاکٹر نے فوراً اسے اپنی مضبوط گرفت میں لیا۔

”اگر تم نے شور مچایا تو یاد رکھو کل تم اور تمہاری سفید باؤں والی ماں سڑک کے کنارے پڑی ہوگی؟“

رضیہ کا جسم ہرٹ کی سہل بن چکا تھا۔ سر دادر ہے جان۔ اس نے ڈاکٹر کے بازوؤں سے نکلنے کی آخری کوشش کی اور اس کے بعد اُسے غصہ آگیا۔ ڈاکٹر نے اُسے اٹھا کر کندھے پر رکھا اور دروازے سے باہر نکل کر کوٹھی کے دوسرے خالی کمرے کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

.....

رات کو جب سب لوگ کار میں بیٹھے واپس آئے تو رضیہ کی بوڑھی امی نے دیکھا کہ رضیہ پلنگ پر بہوش پڑی ہے اور کمرے کی فضا میں خوشی کی بُو پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے بدحواس ہو کر رضیہ کو ہلایا جھلایا اور بھڑبھڑا کر اس سے لیٹ گئی۔ امی کی چیخ کی آواز سن کر سبھی اس کمرے کی طرف دوڑے۔ زبیدہ نے فوراً رضیہ کے نصف حصے پر چادر پھیلادی اور اپنے خاندان کو آواز دی۔ اس کا خاندان بھاگتا ہوا اندر آیا اور اپنی بہن کو دواؤں کا کبس لانے کو کہہ کر مرعیتہ پر جھجک گیا۔

مکھڑ کریں بغل ٹھیک چل رہی ہے۔

رضیہ کو فوراً دو ٹیکے لگا دیے گئے۔ لیکن اُسے ہوش نہ آیا۔ رات بھر اُس کی بڑی بیٹی اور بوڑھی ماں اُس کے پاس بیٹھی رہیں۔ درمیان میں دو ایک بار رضیہ نے آہستہ سے کہا ہتے ہوئے کچھ کہا اور پھر بے ہوش رہی۔ صبح کینٹال بینک والی کوٹھی سے بھی سعیدہ کے سوا باقی سب لوگ ارد گرد کلب روڈ کی جانب دوڑے۔ سعیدہ کے خاندان نے فوراً سے رضیہ کا مرجایا ہوا نیلا چہرہ دیکھا اور باہر نکل گیا۔ رضیہ کا چہرہ نیلا پڑ کر سیاہی مائل ہو گیا تھا اور ناخنوں کا لک بھی نیلا ہٹ مائل ہو رہا تھا۔

کلائیوں اور ہتھیلی کی پشت پر اُبھری ہوئی سبز رنگیں کچھ گئی تھیں۔ اور بند آنکھیں سیاہ حلقوں میں ڈوب چکی تھیں اور اگر اس کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو شاید وہ ڈاکٹر کو اپنے زور پر دیکھ کر پھر کبھی نہ کھلنے کے لیے بند ہو جاتیں۔ رضیہ کی بوڑھی اتنی ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے سہمی ہوئی تھی جیسے وہ اپنی بیٹی کے اوپر موت کے بازوؤں کو جھکے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ تین روز تک رضیہ حیات و موت کی کشمکش میں غرق ہے ہوش پڑی رہی۔ بلڈنگ کسی طرح بند نہ ہو رہی تھی۔ تین روز سے اس کے معدے میں سوائے گلو کو زور اور طاقت کی دوائیوں کے اور کچھ نہ گیا تھا۔

چوتھے روز رات کے کسی لمحے اُس نے موت کے تاریک غار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ ایک بار — موت ایک بار کسی کی تلاش میں، کسی کی جستجو میں، وار دگر دیکھا اور اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ بوڑھی ناتواں ماں نے اپنی بیٹی کا چہرہ اپنے کانپتے ہاتھوں میں ختم کر محبت سے پکارا۔

”میری بیٹی، میری بیٹی، میری رضیہ.....“

رضیہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور وہ کھلنے کے کھلے رہ گئے۔ زبیدہ اور بوڑھی ماں چیخ مار کر کاش سے پھٹ گئیں۔ جاگو! جاگو! میری بیٹی، میری بیٹی، مرنے تو کہا تھا تم کبھی نہیں مر دو گی۔ دیکھو! صندوق میں تیرے بیاہ کے زیور پڑے ہیں اور الماری میں تیری کتابیں تھپے مل رہی ہیں۔ جاگو! جاگو! آدمی آدمی رات تک پڑھنے والی! کتنے بیاہنے والا! اندلسی شہزادہ آگیا ہے وہ دیکھو! اس کا سنہری گھوڑا ابغیر کے درختوں میں کھڑا ہے۔ لیکن رضیہ جا چکی تھی۔ نیلی دھند میں ڈوبی ہوئی گمنام پہاڑیوں کی طرف۔ تاریک کمرے میں پلٹے ہوئے اجنبی جزیروں کی طرف۔ اور زندگی اور موت سے بیزار کرنے والی! ذرا کھڑکی سے باہر دیکھو۔ رات نے تیرے سوگ میں اپنے تمام ستاروں پر سیاہ چادر پھیلادی ہے اور ہوا درختوں کی لٹکتی ہوئی ٹہنیوں سے گلے لگ کر بسکیاں بھر رہی ہے۔ ہمیں ہی اُس جگہ کا راستہ بتائی جاؤ جہاں زعفران اگتی ہے اور جہاں پہنچ کر غزدہ کنواریاں گھرواپس آنا قبول جاتی ہیں۔ اور پھر کھلی کھڑکی میں سے آدمی رات کو چلنے والی ہوا کا جھونکا اُٹھ آیا اور جیسے کسی نے آہ بزرگ خشک آواز میں کہا۔

SO SIGH WE PASSING OVER THE SILVER STRINGS  
WE ARE THE VOICES OF THE WANDERING WINDS  
..... WANDER THOU TOO, O, PRINCE!

”میرے دل رضیہ کو بہری ناک کے آباؤی قبرستان میں اپنے باب کے پتوں میں دفن دیا گیا۔“

دسمبر کی کڑاؤ سردیوں سے۔ بارش ابھی ابھی رُک چکی ہے۔ کینال بینک کی تمام کوٹھڑیوں میں اندھیرا ہے۔ رات ایک کو ٹیٹے کے جھنجھکیوں میں ہلکی ہلکی روشنی چور ہے۔ اور اندر ادھیڑ کا ایک اداس چہرے والا آدمی سیاہ آنسو میں زیرِ جھکا کسی عورت کے ہاتھ کی کھٹی ہوئی پرانی ڈائری پڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں ایک انٹھائی لاغری بھی عورت خان میں پیٹی اپنی بیٹی کی یاد میں آفسو بہا رہی ہے۔

اور کینال بینک سے دور — باغی، کھیتوں، میدانیوں کے اُس پار قصبہ ہری ناگ کے حویلی نا پرانے مکان کو تاریکی نے اپنی جھلکی ہوئی سرد چادر میں لپیٹ رکھا ہے کسی کھرکی میں لمبے نہیں چل رہا۔ اُس کی دیواروں پر گھاس لگ آئی ہے اور گلاب کی پیل نیچے گر پڑی ہے۔ اور یہاں سے جنوب کی طرف نہر کے پار مغل دربار کی گناہ کینز کی تربت پر اُسم کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں اور قریب ہی پرانے قبرستان میں ایک جگہ رضیہ دفن ہے۔ اس کی پختہ قبر پر کائی جی ہے اور اوپر درختوں کی ٹہنیوں میں لٹکا ہوا بارش کا پانی ٹپک رہا ہے، رو رہا ہے۔

اشفاق احمد

”کوئی ہے؟“ میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں نیکس بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور کھپ اندھیرے سے آواز نہ آئی۔  
”مخانیے والوں نے رات کو کو گرفتار کر لیا۔“

اور تارکبی کا بھرت بولا ”تمہارے والوں نے رات کو کو گھر آکر فرمایا۔۔۔ اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔“

داؤ جی نے چمکا کر کہا ”اگر پڑھے کاتبین نوپاس کیسے ہوئے؟ پاس نہیں دے گا تو بڑا آدمی نہیں سکے گا پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟“

اس وقت یہ ترجمہ کر کے پھر نہیں جگاؤں گا۔“

”منہ پر ہنسی“ انھوں نے اتنے لڑکے کو کہا ”میرا بیٹا“۔ یہ سب کے بعد مدت کو بچا کر لے کر آیا۔ جہوں گا۔۔۔ شہناش اب بتا  
”مختلے“ انھوں نے رات کو گویا کر لیا۔

میں نے روٹ کر کہا ”مجھے نہیں آتا۔“

مردہ انہیں کہہ دیتا ہے "انہوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا دو کوشش تو کرو"  
"نہیں کرتا!" میں نے جمل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ڈسٹھ سے اور بوسے نکال کر کٹان گو مرخانہ رافو ما توقیف کر دند۔۔۔ کا کھان گز مرخانہ، نقانے والے، بھونانا نہیں نیا لفظ ہے غنی ترکیب ہے دس مرتبہ کہو۔  
مجھے پتہ تھا کہ یہ بلٹکنے والی نہیں ناچار گز مرخانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤجی نے بڑی لجاجت سے کہا اب سامانہ پانچ بار کہو جب جو گناہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھتے ہوئے کہا "جو لٹا نہیں! صبح اٹھتے ہی پوچھوں گا"  
پھر وہ بدھ سے اٹھتے اور لوٹ گئے۔

شام کو جب ملاجی سے سید پائے کا بنیے کر لوٹا تو خراسیوں دالی لگی۔ سے ہو کر اپنے گھر جایا کرنا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ، بچے، عورتیں، مردے، ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کر بلا ڈھانی" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف کچے کچے مکاؤں کی دیواریں اور سامنے کے رخ آڑی زرخیمی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا آدینچا اور بچا جھگڑا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا، پھر لنگڑے کہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گہروں کی گھڑکیوں اور پیل کی کپڑوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان اس کے بعد گلی میں دروازہ انجم پیدا ہوتا اور قد سے تنگ ہو جاتی پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی تو اس کے دونوں طرف دو لمبی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی۔ اور حد سے زیادہ منساں! اس میں کھیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جونہی میں اس کے دھانے سے باہر نکلوں گا زور سے "نفاٹیں" ہوگا اور میں مرجاؤں گا۔ مگر ڈھانے سے دقت کوئی نہ کوئی ناگہر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں پر کبھی کبھار ایک سفید موٹھوں والا لہا لہا آدمی بھی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے لکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ملس کی بڑی سی گڑھی۔ ڈھانسی غمیدہ مگر پرخالی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدڑ کا تنگ پائیکھامہ اور پاؤں میں نلیٹ بوت۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا جس نے میں اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹھکے لیٹر گردنوں کو ذرا فدا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن جب میں اور میرا بھائی بھائی کے جوڑے پھلیاں پکھنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آئے تھے تو ہر کے بل پر ہی آدمی اپنی گڑھی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کی سفید ٹیٹیا میل مرغی کے پر کی طرح اس کے سر سے چکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا "داؤجی سلام!"

اور داؤجی نے سر ہل کر جواب دیا "جیتے رہو!"  
یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بیحد خوش ہوا اور بخوشی دیر بعد اپنی بیٹی آدمی چلایا "داؤجی سلام"

”جیتے رہو! جیتے رہو! انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھ کر کہا۔ اور میرے بھائی نے پٹاخ سے مجھے زناٹے کا ایک ٹیڑھا دیا۔

”بھئی خورے اگتے“ وہ چچا ”جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھستانا ہے کیا۔“

”بھلا کون ہے وہ؟“

”داڈ جی! میں نے بسور کر کہا۔

”کون داڈ جی“ میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

”وہ جو بیٹھے ہیں وہ داڈ جی“ میں نے آنسو پی کر کہا۔

”بھو اس نہ کر“ میرا بھائی چپکے اور آنکھیں نکال کر بولا ”ہر بات میں میری نقل کرتا ہے گنا۔ بھئی خور!“

پھر میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ ناہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داڈ جی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے مجھے ٹیڑھا کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت ہی تھی۔ بڑا تھا اس لیے ہر بات میں اپنی ٹانگیں بکھاتا تھا۔

داڈ جی سے علیک سلیک تو چوبی گئی تھی۔ اس لیے میں کو شش کر کے گلی سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جا ہے ہوا۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو کچھ ایسی محبت سے کہنے لگتا کہ وہ آ جا ہے ہوا۔

اور آدمی زمین سے ذرا اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا۔ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یہی چلتا رہا اور اس آٹنا میں مجھے اسی قدر معلوم ہو سکا کہ داڈ جی کیورنگی گھر کیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑھتا تھا میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس

گھٹے گھٹائے دو فقرے ہوتے تھے ”جے کیا“ اور ”بھو اس نہ کر“ مگر چند اکا نکھرے کہ میرے عجس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیر پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم بی ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داڈ جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔

اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داڈ جی کھتری تھے اور قصبہ کی نصفی میں موضع نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے بڑا تھا۔ اس کی گڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلی کی طرح

چھوٹا چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی بولتا کہ بچا رستے تھے۔ مگر میں داڈ جی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام بھو سے بکھانا تھا اس لیے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یا رہنے رہنے کا وعدہ کر لیا۔

گرمیوں کی چٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسا نے دلی دو پہر تھی لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق بھر پور بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دو سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پینل کی کیوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی اگے مستطیل صحن سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ حقیقی کے چند پتے



۔۔۔ دنیا کی ایک چوٹی سی کیاوی مٹی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑیوں کا ایک دروازہ جس کی محراب تلے مختصر سی سو فی مٹی گر و رنگی کمرکیاں ڈیوڑھی سے  
تھکے ہینک میں کھاتی تھیں اور ہینک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو اتنی چہند نے چلا کر سبے بے ہمتے "کھا  
اور بکے مچھن کے بچوں بیچ چوڑی کمر ہینک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بڑا پچاسے بے بے شین چلا ہی مٹی اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی  
بڑی سی پتلی سے کپڑے قطع کر رہی مٹی بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی شین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نکاحیں اٹھا کر میری  
طرف آنکھ اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔"  
شین رنگ گئی۔

"ہاں ہاں" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جردان کی رتی مروڑنا اور ٹیڑھے ٹیڑھے  
باؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آگیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے بے نے چمکا کر پوچھا اور میں نے لگا میں جو کاکر آہستہ سے اپنا نام بتایا۔  
"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے" اس لڑکی نے پتلی زمین پر کھڑک کر کہا "ہے نا بے بے"  
"کیوں نہیں بھائی جو بھائی"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی "آفتاب کیا بیٹا؟"  
"آفتاب کا بھائی ہے دادھی" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا "اتنی چند کے ساتھ آیا ہے"  
اندر سے "دادھی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں کے پلٹنا پانچا پانچا چڑھا رکھا تھا اور کڑوا آواز ہوا تھا۔ مگر سر پر کپڑی بونٹو مٹی۔  
بانی کی ایک ہلکی سی بانٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آگے اور میری طرف فوراً دیکھتے ہوئے بولے "ہاں شکل بہت مٹی ہے مگر میرا  
آفتاب بہت دلت و بلستے اور یہ گو مو لو سا ہے" پھر بانٹی فرش پر رکھ کے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس ہی کاٹھ کا ایک  
سٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انہیں بھاڑا اور پھر بانٹی میں محال دئے۔  
"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انہوں نے بانٹی سے بانی کے پتو پھر پھر لٹا لٹا کر پوچھتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی" میں نے بولے سے کہا "پرسوں آیا تھا"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی اباجی کو پتہ ہے"

"اچھا" انہوں نے سر ہل کر کہا "تو اباجی سے پوچھا کر۔" — جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے پوچھا "کو نسا سید پارہ پڑھ رہے ہو؟"

"جو تھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سید کے کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

”مُتَلَفَاتُ السُّنَنِ“ انہوں نے پانی سے باقہ باقہ نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھینکے اور ہوا میں لہرتے رہے۔ سب نے مشین چلائی رہی، وہ لڑکی نعت تھانے سے روٹی نکال کر ہنسنے کی چوکی پر دکانے لگی اور میں جزدان کی ڈھوی کو کھڑا لپیٹا رہا۔ امی چند لمبی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں سنتوں کے ساتھ ساتھ جھینپ کی جیتن گھرائیوں میں اترا اُٹھا رہا تھا۔ معاذِ داؤجی نے لگا ہی میری طرف پھیر کر کہا: ”سورہ فاتحہ سناؤ۔“

”مجھے نہیں آتی جی“ میں نے شرمندہ ہو کر کہا

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا: ”الحمد للہ بھی نہیں جانتے؟“

”الحمد للہ تو جانتا ہوں جی“ میں نے جلد سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے ”ایک ہی بات ہے! ایک ہی بات ہے!“ پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا سناؤ۔“

جب میں سننے لگا تو انہوں نے اپنا پانچواں گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب میں نے دُکلا الصَّلا تیلی کا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے نایاب جی کو الحمد سنائی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمین کیا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤجی اسی طرح بیٹھے رہے بلکہ وہ بھی پتھر ہو گئے۔ اسنے میں اتنی چیز کتا۔ تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا: ”داؤجی سلام“ اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہرے سے جواب دیا ”جیتے رہو“ بے نے مشین روک کر کہا ”کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آجایا کر.....“

”ہاں ہاں آجایا کر“ داؤجی چونک کر بولے ”آفتاب بھی آیا کرتا تھا“ پھر انہوں نے بالٹی پر جھلکے ہوئے کہا ”ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا“ اور فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤجی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤجی بڑے کجخو ہیں۔ زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ ہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ ”اب داؤجی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔“

اماں نے قد سے تلخی سے کہا ”تو مجھ سے پوچھ تو لیتا۔ بے شک آفتاب ان سے بڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے اباجی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انھیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا وہ خفا ہوں گے۔“ پھر اماں نے ذرا ہمدردی کر کہا ”اپنے آبا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔“

میں اباجی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤجی کے ہاں جاتا رہا۔ اور خوب خوب ان سے معبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے میں آہستہ سے ان کے قیبچے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے ”گو لو گیا“ پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے ”کوئی گپ سنا“ اور میں اپنی بساط اور سمجھ کے حجابات ڈھونڈ ڈھانڈھ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنسنے میں یونہی میرے بے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی

میں چہ وہ اپنے جبر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے ہے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان حقیقی تھی لیکن ان کا وہ بڑا سبب ہوتا کہ ایک مال اور ہندو منٹ باتیں اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر ہندو منٹ گپیں چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ سے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے اُلجھنے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال صاف حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے؟ چٹائی میں منہ پھانک کر جواب دیتا ہوں اور وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ" تو میں تنک کر جواب دیتا "وہی" میں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے" اس پر وہ چپکار کر کہتے "میں جو پڑھانا ہوں گو گو" میں جو سکھانا ہوں۔۔۔ سنو! فارسی میں بوریہ، عربی میں حبیبہ میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "دو بخشو دو بخشو" فارسی بھی اور عربی بھی۔ میں نہیں پڑھتا جی معاف کرید" مگر وہ سنی ان سنی کر کے کہتے "میرے فارسی بوریہ عربی حبیبہ اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیدہ بھر لیتا "داؤجی کے الفاظ گھٹتے چلتے جاتے۔۔۔ اتنی چند کتابوں کا کیرا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں بیٹھا کھٹا چھتہ۔ داؤجی اس کے اوقات میں تل نہ ہوتے تھے لیکن ان کے دارا اتنی چند پر بھی برابر ہوتے رہتے وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھر سے پانی پیے آیا "داؤجی نے کتاب سے نکالیں اٹھا کر پوچھا "بیٹا ڈو کا ناؤ کیا ہے؟"

اس نے گلاس منہ کے ساتھ لگائے ٹکائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑ پوچی تلے چھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ داؤجی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اُسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ لکھنے داؤجی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر ایک تنک کر کہتے "قرۃ بیٹا بیٹی تھی تجھ سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑھتی۔ وہ جبر کر جواب دیتی "تو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے بیٹے کھوادیے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہو تو سب بد تو اپنے نکالنے چاہئیں" اور داؤجی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں" اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھا اور اس کے منہ میں جو اتنا کتلی چلی جاتی۔ پہلے کو سنے پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤجی کہتے "ہو انیں چلے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں بے سے کو۔ تم انہیں روکو مت انہیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کمت میں بیٹھنے اور اپنا محبوب حبیبہ اٹھا کر چپکے سے بیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نوبی جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بڑی عادت پڑ گئی اور اس بڑی عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معاملے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن بانی بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیادوں کے تذکرے جنوں بھونوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی گھر یو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہت ٹوٹے تھے۔ ان کے تنگ تار ایک مطلب میں معجون کے چند ڈبوں۔ شربت کی دس پندہ بوتلوں اور دو آتشہ شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ داؤوں کے علاوہ وہ اپنی طبعی تقریر اور حضرت سلیمان کے خاص صمدی تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لیے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھچے چلے آتے اور فیضیاب ہو کر جلتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لیے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کے لانا اور اس کے بدلے میں وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دیک کر انہیں پڑھا کرتا اور صبح دینک سویا رہتا۔ امان

میرے اس مدیہ سے سخت نالاں تھیں، آج کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دوسری میں وہ خلیفہ ضرور حاصل کر دوں گا۔ رات ظلم ہو میرا کہ ایوانوں میں بسر ہوتی اور دن کلاس میں بیچ پر کھڑے ہو کر۔ سرمایہ امتحان میں فیصل ہوتے ہوتے پچا۔ شششاہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقع پر حکیم جی کی مدد سے مامٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی بنا، فسانہ آزاد اور العابدیہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانہ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے لیکن الف لیلہ سکول کے ڈویک میں بند رہتی۔ آخری بیچ پر جغرافیہ کی کتاب تھے سند باد و ہمازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا۔۔۔۔۔

بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے تھوڑے کی کتاب ایم۔ بی۔ بی۔ ڈی سکول پہنچی۔ اسی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اتل آیا تھا۔ چھ لڑکے نیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونہی سٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جاہر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چیٹوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبل کا ہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رجسٹر کی گدی پر آ بیٹھا اور ات گئے دن تک سوچتا رہا کہ اس کی کیا چاہتے اور کہہ رہا تھا چاہئے۔ خدا کا حکم تنگ نہیں تھا اور میں عہد عیار کے ہنگامہ دور اور سند باد و ہمازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سمجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے مسلسل اسی طرح ساکت رہا اور اس گدی پر بیٹھا نہ سیت کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں انان سفید چادر اوڑھ لے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آگئیں اور آج سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی دانی ہے کوئی دلچسپی نہ تھی مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر صبح سویرے بستر پر دانا ہو گیا۔

اگلے دن میرے نیل ہونے والے ساتھیوں میں خوشیا کو ڈور اور ولیم سبیب مسجد کے پھوڑے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے۔ وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دیوبند میں نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھائی جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس نے سال کے اندر اندر دو کاروں خرید لی تھیں۔ میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو سبیب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ میں ایک دفتر ہونا چاہئے اور اس کے سامنے بڑا سامان بورڈ سامان بورڈ کو دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کہ کسی نوٹ لے رہا تھا میں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوکوڈ چمک کر بولا ”یاد دیکھو سب کچھ جانتا ہے۔ یہ بتا کہ تیار ہے یا نہیں؟“

پھر اس نے پلٹ کر دیکھو سے پوچھا ”انا کلی میں دفتر بنائیں گے نا؟“

دیکھو نے خدا سوچ کر کہا ”انا کلی میں بادشاہ عالمی کے پاس دو لاکھ ہی لگائیں ایک سو ہیں؟“

میں نے کہا ”انا کلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انا کلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔“

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ نوٹ پائش کو دیکھا کہ نوکرنے کو شہادت سے منگواتے ہوئے کہا ”چلو جی ڈاکٹر صاحب ملنے ہیں۔“ مکمل ہیں؟“ میں نے برش زبانی پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

”ہسپتال میں“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضر ہیں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے ہمدردی کے میٹھیوں پر چڑھا۔ پھر آہستہ سے جلی دالا دھارہ کھول کر آبا جی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں اسی کے علاوہ داؤ جی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سسکے سسکے داؤ جی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑسی دیکھ کے بعد چپے رہو کی مانوس دعا سنی۔

”ان کو پہچانتے ہو؟“ آبا جی نے سختی سے پوچھا۔

”جے شک؟“ میں نے ایک مہذب سیلز میں کی طرح کہا۔

”جے شک کے بچے، حمازہ دے، میں تیری یہ سب.....“

”نہ نہ ڈاکٹر صاحب“ داؤ جی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ”یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو.....“

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر غمی سے کہا ”آپ نہیں جانتے فشی جی اس لینے نے میری عزت خاک میں ملا دی۔“

”آپ فکر نہ کریں“ داؤ جی نے سر جھکائے کہا ”یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے وہ ایک دن.....“

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا اور انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا ”کیسی بات کرتے ہو فشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی

براہری نہیں کر سکتا۔“

”کر لیگا، کر لیگا۔“ ڈاکٹر صاحب“ داؤ جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”آپ خاطر جمع رکھیں۔“

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے ”میں سیر کو چلنا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ راستے میں

باتیں کریں گے۔“

آبا جی اُسی طرح کرسی پر بیٹھے فشتے کے عالم میں اپنا رجسٹر آٹ پٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے ہیں۔ نے آہستہ آہستہ چل کر جالی حلال

دردانہ کھولا تو داؤ جی نے نیچے سر دکھ کر ڈاکٹر صاحب معمولی نہ جانے کا اچھی بھرا دیبھنے لگا۔

آبا جی نے ویسے ہی چیزیں پٹختے ”اچھا“ کہا اور داؤ جی خدا حافظ کہ میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

داؤ جی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہ کہ اسے اس کی پرے گئے جہاں چلے پہل میاں

سے تعارف ہوتا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے پگھلی تار کر گود میں ڈال لی، سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا ”آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا ادا کر جاؤ گے نہیں اولیٰ نہ لاسکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دواؤں گا۔

میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا.....“

”مجھ سے پڑھائی نہ ہوگی“ میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

”تو اور کیا ہو گا گو تو؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا ”میں بڑسی کر دوں گا، روپیہ کماؤں گا، اور اپنی کارے کر بیاں آؤں گا پھر دیکھنا.....“

اب کے داؤ جی نے نیری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا ”خدا ایک چھوٹے دس کاریں سے لیکن ایک ای بڑھکی کا دھیر نہ

میں بیٹوں کا نہ ڈاکٹر صاحب۔“

میں نے جمل کر کہا ”مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر ماضی میں اپنے بیان خوش۔“

انہوں نے جبراً ہمو کر پوچھا ”میری بھی پروا نہیں؟“ میں کچھ کہنے ہی دالا تھا کہ وہ دُکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے میری

بھی پروا نہیں؟ ادگو میرا بھی پروا نہیں؟“

مجھے اسی کے لہجہ پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا ”آپ کی تو سب کچھ.....، مگر انہوں نے میری بات نہ سنی اور کھنکھنے لگے۔“ اگر سب سے حضرت کے سامنے برسے مزے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا..... تو..... تو..... انہوں نے فوراً پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے ”میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کلمہ میں حضرت مولانا کی خاک پا سے بذر بندہ ہو کر آتا ہے یہ کتنا لعنت کا طوق نہ پہنتا؟ پھر انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور سر بالکل گود میں جھکا کر بوسے میں ذات کا گدڑ بیا۔ میرا باپ منڈاسی کا گوالا۔ میں جہالت کا فرزند۔ میرا خاندان ابو جہل کا خاندانہ اور آقا کی ایک نظر کرم حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے جنت کو منشی جنت وام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی میں کہنا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار..... لوگ سمجھتے ہیں.....“ داؤد جی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں جھوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فلاسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشانی نہ پریشان ان کا زانو پھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا داؤد جی! اور داؤد جی ”میرے آغا، حضرت مولانا، مہربان مرشد“ کا ذہنیہ کئے جاتے۔ جب جذب کا بر عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے ”کیا اچھا موسم ہے۔ دن بھر گرمی پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے“ پھر وہ کچل کی دیوار سے اٹھے اور بولے ”چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے“ میں جیسا سرکش و بد مزاج بن کسان کے ساتھ آیا تھا اس سے کہیں زیادہ منہص اور ٹھیل ان کے ساتھ ٹوٹا۔ گھٹے پیساری یعنی دیسیوب یب کے باپ کی دوکان سے انہوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور افسانے گود میں اٹھا کر سٹی دیئے۔ میں بار بار ان سے لطف لینے کی کوشش کرتا مگر مہمت نہ پڑتی ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع مٹی اور اسی تاح اور جہک میں ڈوبتا اُبھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ عجیب کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا اور وہیں پڑھا کروں گا کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی بچا بیٹا سے بھیجی ہوئی ایک ہر کیکی لائین میں رکھی تھی۔

بزنس میں بننا اور پاں پای کرتی پیکا رڈ اوڑھنے پھرنا میرے منقذ میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والد بھی انہیں لاہور سے پکڑ لائے لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کے کونے شاہدار سال میں داخل ہو چکا ہوتا!

داؤد جی نے میری زندگی اجیرن کر دی، مجھے تباہ کر دیا مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گزارتا اور امت، گرمیوں کی مختصر سی امت، ان کے سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور وہ مونگ رسولی اور مرالہ کی نروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے وہ پھر اُسی سوال کو دہرا رہے ہیں میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انہوں نے پھر انہی نروں کو آگے لاکر آکھا ہے۔ میں جل جانا اور جھڑک کر کہتا ”مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتانا“ تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادہ بیٹے میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کلک بن کر تپلیوں میں اترتی جاتی۔ میں آہستہ سے کہتا ”داؤد جی“

”ہوں!“ ایک گھمبیری آواز آتی۔

”داؤد جی کچھ اور پوچھو۔“

داؤد جی نے کہا ”ہمت ہے آبرو ہو کر تو ہے کو سچے سے ہم نکلے۔“ اس کی ترکیب خودی کر دے۔

میں نے معاف فرمادی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت اہم تر ہے جسے جمع لکھ کر بتاؤ ڈھنگ کوئی اور پہنچے۔"  
انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں کہا "میرا گلو بہت اچھا ہے۔"  
میں نے ذرا سوچ کر گنا شروع کیا بہت اچھا منہ تھا، اسے عورتوں کی زبان پر سنندہ .....  
اور داؤچی اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گئے، ہاتھ اٹھا کر ہنسے جان پر گئے پہلے ہی کہا "ہے سنا لیا یہ بتایا کرو۔"  
میں نے ترکیب بخوی سے جان پھرانے کے لیے پوچھا "آپ مجھے جان پدہ کیوں کہتے ہیں جان داؤچیوں نہیں کہتے؟"  
"مشابہت" وہ عرض ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا ان کے درمیان فارسی  
اصناف نہیں نکلتی۔ جو لوگ دی بدی لکھتے یا پڑھتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں۔ روز بروز اس پادشہ کی طرف سے .....  
اور جب یہ سوچا کہ یہ تو ترکیب بخوی سے بھی خطرناک معاملے ہیں، اچھا گیا ہوں تو جانائی کے کہ پیار سے کہتا "داؤچی اب نمیند  
آ رہی ہے!"

"اور وہ ترکیب بخوی؟" وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہے لاکھ بھانے کو تا اور اور دھڑک کی بازار باتیں کرتا مگر وہ اپنی کھاٹ پناہی سے ہی بچتے رہتے۔ بلکہ اگر ذرا سی دیر  
بہ جاتی تو کمری پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دیتا پڑتا۔  
امی جین کا بچہ چلا گیا تو اس کی بیٹھک بچے مل گئی اور داؤچی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤچی بہت  
اچھے لگنے لگے تھے لیکن ان کی جو باتیں مجھے اُس وقت بڑی لگتی تھیں وہ اب بھی بڑی لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے کسی قدر زیادہ، شاید اس لیے  
کہ اب میں نفسیات کا ایک پونہار عالم ہوں اور داؤچی پر اسے ملانی کتب کے پرورہ تھے۔ سب سے بڑی علت ان کی اُٹھتے بیٹھتے سوال  
پوچھنے کی تھی اور دوسری کہیں کو دوسرے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھنا سہے پڑھنا سہے اور جب اس بدلتی کی موت کا وہی  
قریب آئے تو کہتا ہوں کہ وہ دھیر پر جان دیدے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا، لمبی سیر اور وہ بھی  
صبح کی۔ تقریباً دو سو سوچ نکلنے سے کوئی دو گھنٹے بیٹھتے وہ مجھے بیٹھک میں جگاتے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اٹھ گولو موٹا ہو گیا بیٹا"  
دنیا جان کے حال دینی صبح جگانے کے لیے یہ کہنا کرتے ہیں کہ اٹھ بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا کروہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری نذیل لیا کرتے ہیں  
منانا تو چکا کر کہتے "بھدا ہو جاں کا بیٹا تو گھوڑے پر منلے کا دورہ کیسے کیا کر لگا؟"

اند میں گرم گرم بستری سے اٹھ جڑ کہتا "داؤچی خدا کے لیے مجھے صبح نہ جگاؤ مہا ہے مجھے قتل کر دو۔ مجھے جان سمار دو؟"  
یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر لمحات ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

ہے بے کوان داؤچی سے اسلٹ واسلے کا پیر تھا اور داؤچی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ سارا دن محلے والوں کے کپڑے سیا  
کوتیں اور داؤچی کو کوسنے دیتے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا حقہ آتا تھا مگر بانی میں وہ کنگرے سے پیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار  
جب وہ ناگفتی کالیوں پر آتیں تو داؤچی میرے پاس بیٹھک میں آ جاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کمری پر بیٹھ جاتے۔ بخوڑی دیر بعد کہتے  
"غیبت کن بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے صحت کرے تیری بے بے بھٹیا رہی ہے اور اس کی سرانے میں میں میری فرقہ الہیہ اور بخوڑا بخوڑا  
تو بھی، ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں" اور واقعی بے بے بھٹیا رہی تھی۔ اس کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید، ماتھا بھرا ہمار

اور آنکھیں پٹیاں سی۔ چلتی تو ایسی گھر، پانی کے ساتھ جیسے (خدا بے عی مان کرے) کسی کنسوئیاں بیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بڑی باتیں کہتی کہ وہ دونوں دن رو رو کر بھان بوا کرتی۔ ایک امی چندہ کے ساتھ اس کی منی تھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داؤجی سے پیار نہ تھا۔ یوں تو بی بی بچاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ جتنی ملتی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سہ ماہ نکال۔ مہیوں داؤجی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اُپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رک کر مجھے دیکھا پھر منڈ پر سے جھانک کر بولی "داؤجی پڑھ نہیں رہے تھکوں کی چار پائیاں بنا رہے ہیں"۔

میں غصیل بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا "کچھ کیا نہیں پڑھتا۔ تو کیوں پڑھ کر دیتی ہے۔" — آئی بڑی قابیلہ بی۔

اور داؤجی بیٹھے سے ہانک لگا کر کہتے "نہ نہ گو گو رو بسنوں سے نہیں جھک کر آتے۔"

اور میں زور سے چلاتا "پڑھ رہا ہوں جی جھوٹ بولتی ہے۔"

داؤجی آہستہ آہستہ میسر حیاں چڑھ کر اوپر آ جاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چار پائی دیکھ کر کہتے "مذکرہ بیٹا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اگر ایک بار پھر گڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔"

بی بی کہتی "کاپی اٹھا کر دیکھ تو داؤجی اس کے نیچے ہے وہ چار پائی جس سے کھیل رہا تھا۔"

میں تھراؤ دہ لگا چوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ مکڑیاں اٹھا کر نیچے آ جاتی۔ پھر داؤجی سمجھاتے کہ بی بی یہ سب کچھ تیرے نام کے لیے کہتی ہے۔ ورنہ اُسے کیا پڑی ہے کہ مجھے بتاتی ہے۔ تو میں پر یا پاس اس کی بلا سے! اگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے۔" اور مجھے داؤجی کی یہ بات ہر گز سمجھ نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیوں کر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤجی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر کے اپنی لائیٹیں تیل سے بجھتا اور داؤجی کے یہاں آ جاتا۔ پھر بات کا کھانا جی مجھے داؤجی کے گھر پر ہی مجھوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی داؤجی سکول کی گراؤنڈ میں آکر مجھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سڑک کی بوجھاڑ رہتی۔ سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے۔ پھر مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے، جا کے قصبہ میں منصفی کا کام بیٹھے میں دس دن چوتنا تھا اور وہیں دن منصف صاحب بناؤر کی کچری منصف میں رہتی تھی۔ یہ دس دن داؤجی باقاعدہ کچری میں گزارتے تھے ایک آدمی کو بھی آجاتی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ ناراضاوقات میں دلاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی کڑبیونت اور محلے والوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتے تھے چونکہ تھکے چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا اس لیے وہ داؤجی پر اور بھی حاوی ہو گئی۔ ایک دن حلاب معمول داؤجی کو بیٹے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچری بند ہو گئی تھی اور داؤجی نانائی کے پھیرنے ایک بیٹے پر بیٹھے گڑ کی چاسے بی بی تھے میں نے بوسے سے جا کر ان کی کابستر اٹھالیا اور ان کے گلے میں بانہ ڈال کر کہا "چلے آج میں آپ کو لیٹے آیا ہوں" انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر چاسے کے بڑے بڑے ٹھونٹ بھرے۔ ایک آنہ جیسے نکال کر نانائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے میں نے شرارت سے ناچ کر کہا "گھر چلے، بے بے کو بتاؤں گا کہ آپ جو جری یہاں چلے جیتے ہیں۔"

داؤجی جیسے شرمندگی مٹانے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہو جاتی ہے اور گڑ کی چائے سے ٹھنکی بھی دُور



ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آئینہ گلاس بھر کے دیتا ہے۔ تم اپنی سب سے زکنا خواہ مخواہ بظاہر کفر اکروے گی۔ زنا اتنی پر آئے گی۔“ پھر انھوں نے کچھ خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا: ”س کی تو فطرت ہی ایسی ہے“ اس وحی سنے ماں بچی پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی اسی کے بے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس وقت میں نے سب سے زکنا کئے کہ سبھی ان کے سینہ بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے ان سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اٹھ کبھی نوکر کی معرفت داؤد جی کے ہاں دودھ، پھل اور چینی وغیرہ بھیجے لگیں مگر اس رسد سے داؤد جی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ باں سب سے بے لگا ہوں میں میری متعدد بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرانا ملوث ان کے ہاں سے گریا پاتا تھا اور بے بے گھر پر نہ تھی وہ اپنی سکیموں کے ساتھ بابا سادوی کے جو ہر میں اشتغال کرنے لگی تھی اور گھر میں عورت، داؤد جی اور بی بی جی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤد جی نے کہا ”جیلو آج تیلوں چلے پئیں۔“ میں دکان سے گڑے کر آنا ہوں۔ تم پانی چہلے پر رکھو۔“ بی بی نے جلدی جلدی چو لھا سلگایا۔ میں تیلیں میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤد جی گڑے کر آگئے تو انھوں نے کہا ”تم دونوں اپنے اپنے کھان پر بیٹھو چائے میں بنانا ہوں“ چنانچہ بی بی شیں چلانے لگی اور میں ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ کی مستقیں کھینے لگا۔ داؤد جی چو لھا بھی جھوکے جاتے تھے اور عداوت کے مطالبے مجھے بھی اُدھے اپنے بتاتے جانتے ٹھیکوٹے کہا ”زمین سورج کے گرد گھومتی ہے“ گلیلو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی۔ پانی اُبل رہا تھا۔ داؤد جی خوش ہو رہے تھے اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا کبت گارہے تھے۔ اڈو گولو اڈو گولو! گلیلو کی بات مت بھولنا، گلیلو کی بات مت بھولنا۔ انھوں نے چلے کی پتی کھوٹے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چہلے پر ہی تھا اور داؤد جی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گُل گُل گُل کے ساتھ گولو گلیلو اڈو گولو گلیلو کے مبارہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے حافی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پروں کی طرح ہمارے گھر میں اُتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندہ داخل ہوئی۔ داؤد جی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ نفی ہو گیا۔ چمکتی ہوئی تیلی سے گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھلڈے ایک دوسرے کے پیچھے شہوہ پانے پھرتے تھے اور ذوق کھل چلنے والا بڑھا صحت پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چہلے کی طرف دیکھا اور داؤد جی نے چوکے سے لہٹتے ہوئے صفحت بھرے لہجہ میں کہا ”چائے ہے!“

جے بے نے ایک دو بہتر داؤدھی کی کر میں مالا اور کیا "بڑے بڑے" ہر دو حلقے لاج نہیں آتی۔ تجو بہار پھر سے تجھے ہم کیسے تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھ کو کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھانویں میں گل کی مرقی آج مروں تیرا کی ماضی ہو، تیری آسین پوری ہوں۔ کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکر کی رکھیا نے میرے پنے باندھ دیا۔ . . . . . تجھے موت نہیں آتی . . . . . ۱۰۰۰۰۰ ادوں ہوا تجھے کیوں آئے گی" اسی فقرے کی گرداں کرتے ہوئے جے بے بے بھیرنی کی طرح جو کہ پرچہ می پڑے سے تیلی کیڑ کر چلے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم جلنے کے جھپاکے داؤدھی کی پٹو لپری اور پاؤں پر گرے اور وہ "ادہ تیرا بھلا ہو جائے! ادہ تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔ ان کے اس فوراں بلند انداز فلز کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنے بنانہ رو سکے اور چار دی ہنسی کی آواز ایک ثانیکے لیے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر نک گیا لیکن جے بے نے سب سے جا کر بی بی کو بالوں سے

پڑھا اور چچ کو بولی "میری سوت بہت بڑے سے تیرا کیا کرتا ہے۔ بتائیں تو ابھی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی بجائی کیوں دی؟" لی لی بھاری پھس پھس روئے مٹی تو میں بھی اُٹھ کر اندر ٹھیک میں لٹسک آیا۔ داؤجی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ سکتے اور پاؤں دلا رہے تھے۔ پرہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں کہ لگتا ہی نہ تھی کہ میں! ادنیٰ کے اندر مزہ کر کے ہنسنے لگا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر دار کہ تم کو گوشت مارم بہ میٹھے نہ کہ بہ میٹھے!" "تھوڑی دیر تو لگ کر پھر کہا" میں تو اس کے کون کا میں تھا، ہوں جس کے شکر پڑھنے کی ایک کم نصیب بڑھیا غاٹت چھینکا کوئی تھی؟

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقا تھے نامدار کا ایک ادنیٰ اسلحہ بکوش گرم پانی سے چند چھینے پڑنے پر نالہ و شہیوں کہے تو نصرت ہے اس کی زندگی پر وہ اپنے محبوب کے طفیل تاریخ ہم سے بچائے۔ خدا کے ابراہیم مجھے جرات دلا کر اسے دھوکا دے کر لائے اور اب مجھے صبر کی نصرت دے۔"

میں نے کہا "داؤجی آقا تھے نامدار کون؟"

تو داؤجی کو یہ سن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انہوں نے شفقت سے کہا "جہاں پدیوں نہ پوچھا کہ میرے استاد میرے حضرت لی اور ح کو محبت بیزار نہ کر دے میرے آقا بھی تھے، میرے باپ بھی اندر استاد بھی وہ تیرے دادا استاد ہیں..... دادا استاد....." اور انہوں نے دونوں ہاتھ بیٹھنے پر رکھ لیے۔

آقا تھے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قنعت مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤجی سے سنی۔ یہ وہ آدمی تھا جس نے میں انہوں سے کئی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روض کو شاد اپنیات لے سکتے۔ جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے اور بڑے پوچھا "داؤجی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں اسے آپ کو اور کا کا کیوں کہتے ہیں؟"

داؤجی نے مسکاکر کہا "تجربہ طریقیہ کے ایک زکوٰۃ ایسا بناوے کہ لوگ ہمیں یہ ناشی چنت رام ہے یہ ناشی ہی ہیں وہ عیانہ ہمدون آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چار پائی کے کونے سے آہستہ آہستہ ہسپل کر بستر میں پہنچ گیا اور چاروں طرف رضائی پھیل کر داؤجی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھنے لگتا اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے۔ مجھے چھوٹے چھوٹے دھنوں بعد ذرا راستہ اور پھر خاموش ہو جاتے۔

کھنے لگے میں کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ حضرت مولانا کی بیٹی آؤ کیا آؤ زنتی! میری طرف سے مبارک اٹھا کر فرمایا! چہ پائی زابہ ہمارے پاس آؤ! میں لاسخی ٹیکتا ان کے پاس! اکھڑا ہوا چہنہ پھڑکاؤ روکھو دیات کے ارکے نیم دائرہ بنائے ان کے سانسے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا اور کسی کو آنکھ یا پو پرا اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا "مجھے بد تم کو ہر وہ زبیراں بکریاں چرانی دیکھنے ہیں۔ انھیں چرے چنے کے بیٹے چھوڑ کر جا رہے ہیں آجایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو۔" پھر حضور نے میری عرض سے بغیر پوچھ کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گواروں کی طرح کہا چنتو۔ حضرت مسکرائے۔ تھوڑا سا ہنسنے بھی فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چنت رام ہو گا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ حضور کے شاگرد و کتاب سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھ رہے تھے میرے گلے میں کھدکھلا لہارت تھا پانچا ہمارا کہ بجائے صرف لٹکوت بندھا تھا پاؤں میں اور موڑی کے مٹے جوتے



سپاڑے کی طرح میں نے سب سڈی ایر کی سسٹم کا سامنا دھا پڑا ان کا خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انہوں نے میرے گرائڈ اسٹائی اور ہوسٹے نامبر  
 ۲۰۰۰ دیکھ کے آکے تیری بے کے باغ فضا کم ہوا یا نہیں۔ میں دعوت میں بائی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے کے کوششیں چلاتے اور بی بی  
 کو چوکامات کرتے پایا۔

داؤ جی کی زندگی میں بے سہ والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا جب وہ دیکھتے کہ گھر میں خلق صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی خشک نہیں ہے تو وہ بھار کر کہنے "سب ایک ایک شہرستان" پیسے مجھ سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹے ہی کتنا

لازم تھا کہ دیکھو پراساں کوئی دن اور

تہنا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی رہی اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے: "اوہیں شعرِ مسنون گا، اردو کا کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا" میں کہتا: "جیسے سوچے ویسے" اتنے میں بی بی سٹائے؟

باب بھی سیری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شہید مگر شاہ پور دم در کشید

چه خنجر دباکش قسطنطنیه در کشید

اسی پر داؤد جی ایک مرتبہ پیر آرڈر آرڈر پکارتے

بی بی فینچی رکھ کر کہتا

شوے شد و از خواب علم چشم کشودیم دیدیم که باقی رست شب فتنه نمودیم

واڈجی شاہ باس تو ضرور کہہ جیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے: ”یہاں یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے۔“

پھر وہ بے بسی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا: ”بھئی آج تمہاری بے بسی بھی ایک سنائے گی“ مگر بے بسی ایک ہی روکھا سا جواب

وہی ”مجھے نہیں آتے شیر کبت“ اس پر داماؤی کہتے ”گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی نکا دے“ اس پر بے بے کے ہوت

مسکراتے ہوئے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور وہ افواجی مبین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی ابی چند کا اور کبھی میرا نام ملانک

میر جنتی پھر کہتے ہیں: "میں اپنے اسی گولہ مولو کی شادی پر سرخ گریزی بانی حصولِ کمال بات میں دیکھ کر حیران ہو کر رہ گیا۔" اس کے ساتھ ساتھ جیلوں کی گادر لکاح نامہ پر پورے مستحضر

کہوں گا یہ میں دستور کے مطابق شہر کو نکالوں گا۔ پھر ریت تو وہ کہتے بدلتے نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری پسینوں سے بہتا ہوا بخار یا مسمومیت نہیں

پڑھ رہی ہوگی۔ ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس سے بہت سی چیزیں پکانی سیکھتی ہیں کی۔ پتھر خفے میں بھی ہوشیار ہوگی۔

اس بدستہ کہ قہر یا دنیہ پر دستا کر مادیات گھنڈی ہوتی ہے یا شرعی۔ وہ تو فقر و سب کچھ سناقتی ہوگی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا۔ پہلے اس کو

خطاطی کی تعلیم دونوں گروپوں کے مشترک تھی۔ ان کے مشترکات کو خط مشن کے تحت بیان کیا گیا۔

تیرے ہی پاس رہوں گا۔ میں اس میری بھونہاری سی باتیں کر رہی تھی۔ وہ بات بات پر بغیر شاید بغیر شاید نے کی امداد اور محض کی طرح منہ دیکھا کر

پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکے نیلے خوب نیلے خوب کہتے: جان پدرا چو! اس قدر دھمت می کشی..... خوب..... یاد دلازم.....

اور پڑھیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچائے داؤد جی! چٹائی پر اپنی جھونسی ڈھکیا، اس میں فارسی کے فرائیجاری لکے جاسے۔ ایک دن جب



راؤ ہمارے محلے کا بڑا اپنی کیفیت سا انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ بارہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اسی کا تھا اس میں بیس تیس بھیاں اور دو کاٹھیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام راؤ کو لگی۔ بھئی، میدان میں بیٹھ کر بچا کرتا۔ تقریباً سائے محلے والے اُسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گذرتے ہوئے وہ بوہنی شونہا اُچ زمین پر بھا کر داؤ جی کو ”پنڈتا جے رام جی کی“ کہہ کر سدا م کیا کرتا۔ داؤ جی نے اُسے کئی مرتبہ سمجھا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں۔ کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے بڑے مکھے اور فاضل آدمی کو کہا جاسکتا تھا لیکن راؤ نہیں مانتا تھا وہ اپنی سوچ چکا کر کہتا ہے ”میں جس کے سر پر بودی (مٹی) ہو وہ پنڈت ہی ہوتا ہے“۔ چودوں باروں سے اس کی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے بارے میں جو اُسی ہوتا اور گندی اور فحش بو لیسوں کا ستارہ بھی۔ بی بی کے جانے کے بعد ایک دن جب میں اس سے دودھ لیے گیا تو اس نے شرارت سے آنکھ پیم کر کہ ”سورنی تو بچ گئی یا بواب تو اس گھر میں رہ کر کیا لے گا“ میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈیر پھیرتے ہوئے کہا ”گھر میں گنگا ہستی تھی سچ بتا غوطہ لگایا کہ نہیں“ مجھے اس بات پر غصہ آگیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر میں دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ چکر اکر تخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤ جی کو سارا واقعہ سننا کہ میں دوڑا دوڑا ایسے گھر گیا اور تاجی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت راؤ کی فحاشی میں غلطی ہوئی اور والدین صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت تشدد کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے راؤ داؤ جی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کہنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑا کر کرتا تھا اور وانی داؤ جی کے فاضل سر پر وہ چپٹی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے ”یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آنکھوں میں میرا سر رکھ کر اسے دی سے دھوئی تھی اور گردن لگا کر چمکاتی تھی۔ گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پڑی اُٹارنے کی جسارت نہیں کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال چند میو ریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پرچھا ”شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟“ تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم ساساوند تندرست بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے اور ہم سا خوش قسمت انسان بھی خالی خالی ہو گا۔ جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو۔ میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔ جنس کو فرمائے لگے چنت رام ہمارے پاؤں۔ تبہ تو کر دھبلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں نے کہا اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر بھاڑ کر بھی آپ کے لیے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی عمارت حضور کی ٹانگوں کے لیے نذر کروں لیکن میرا بس نہیں چلنا۔ خاموش ہو گئے اور نگاہیں اُپر اٹھا کر بولے ”خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے۔“ داؤ جی گذرے ایام کی تہ میں اُترتے ہوئے کہہ رہے تھے ”دیں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دینا سنا دم آگیا۔“ مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلا لیتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ دعا دیتے میرے والدین کی خیریت پوچھنے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے ”دو بھی چنت رام اب اس گنا ہوا، کی گٹھڑی کو اٹھا لو“ میں سب دل کی طرح انہیں اٹھاتا اور کمر پر لا کر حویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو۔ کبھی مکہ جانا امید ہے۔ رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تنگ نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے ہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے اور

ابھی جا رہا ہے کہ وہ تباہی میں انہیں دھوکہ کرنے والے چور سے پہچان کر ان کے ہٹکے ہٹکے چور سے جو تار تار اور انہیں بھولی میں رکھ کر دیوار سے لٹک کر بیٹھ جاتا۔ چور تو اسے حضور خود گھسٹ کر صفت کی جانب جاتے تھے۔ جس نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جانے ہوئے دیکھا تھا اس کے بعد جرات نہ ہوئی۔ ان کے چوتھے آتا رہنے کے بعد دامن میں بندھ گیا دینا اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ برائیاں لے کر باؤں پر فٹے۔ درمیان میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر لگا کر جو علی کو ٹوٹا تو فرما تے ہم جانتے ہیں چند نام نہاد ہماری خوشنودی کے لیے نصیب کی سیر کر رہے ہو لیکن ہمیں جرح تکلیف ہوتی ہے۔ ایک نو تلمیذ یہ لٹا لٹا پھرتا ہوں دوسرے تلمیذ راقت، حنا، کراہوں۔ اور حضور سے کون کر لگا کر۔ اور وقت ہی میری زندگی کا نقطہ عروج ہے اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا سرگز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ خدا الہا پھرنا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک نبی ہے جس نے اپنا سارے عرصے لیے وقت کر دیا ہے۔ جس دن میں سب سکند نامہ نہانی یاد کر کے انہیں ملایا اس قدر خوش ہوئے گویا محبت عظیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی ہو۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مال و مال ایک بد دوست تخت میرے سر پہ پھرا اور جب سے ایک روپیہ نہ لکھ کر انعام دیا۔ میں نے اسے بھرا سو دھان کر بوسہ دیا آنکھوں سے دھان اور سکندر کا افسر سمجھ کر گلی میں رکھ دیا۔ وہ لوں ہاتھ اٹھ کر دعا میں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے جو کام ہم سے نہ پہنچا وہ تو نے کر دکھایا۔ تو ایک ہے خدا نے سعادت مجھے نصیب کی۔ جنت و رامتیز تو میری جہان کا چینیستہ نوشاہ بعلی کا پیر ہے اس لیے خدا نے جو رحمتیں تجھے برکت دیتا ہے وہ تجھے اور بھی برکت دے گا۔ تجھے اور کائنات میں نہ آئے گی۔ داؤد جی یہ باتیں کرتے کرتے سر گھٹنوں پر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان فریب آ رہا تھا اور داؤد جی سخت ہونے جا رہے تھے۔ اعنوں نے میرے ہر نامہ رخ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلادیا تھا۔ ایک عرصے سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینا، آٹا تو سب کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو نابریاں کے ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت سکول پہنچنے کا انہوں نے وطیرہ بنالیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے لٹکنے کے بجائے بورڈنگ ہاؤس کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آکر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑھتا ہوں اور صدمی ہونے کے علاوہ بد زبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤد جی کے بچے گویا میرا نیکر کلام ہی گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انہیں گتے گتے سے بھی نہ چوکتا۔ اراض ہو جلت تو بس اسی قدر کہتے مددیکہ لے ڈومنی تو کیسی بائیں کر رہا ہے تیری بیوی بیباہ کر لاؤں گا تو پیٹے اُسے یہی بناؤں گا کہ جانی پدر یہ تیرے بڑے باپ کو گناہ گستاخا "میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر ارضیں زیادہ دکھ ہوتا تو مزہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصہ آتا تھا نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برادر آفتاب کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز سننے نام رکھتے تھے۔ جن میں گوتو انہیں بہت مرعوب تھا۔ طنز و مزاح دوسرے درجہ پر مسر ہوئی اور اخفش اسکو اڑان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں کبھی کبھی میں ان کو بہت دن کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر سبجے کچھ بڑھ رہے ہیں مجھے الجھے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سامنے جہان کی اجداد کو ضرب دے دے کر تنگ آچکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے برے دھکیں کر اُوپٹے اُوپٹے گھسنے لگا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونگٹے دکھاتیں نیوں دستا

داؤد جی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالییاں بجانے لگتا اور تو اسی شروع کر دیتا۔ نیوں نیوں نیوں دستا تے دکھ جینوں

تینوں دستا ————— دستا دستا دستا..... تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گامارونا رونا رونا تھے دکھ تینوں تینوں دستا۔ وہ عینک کے اوپر سے مسکرتے میرے پاس، کمر کا پی اٹھاتے، جھگڑا لگاتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا برا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔ ”مٹی بیٹا“ وہ بڑی محبت سے کہتے ”یہ کوئی مشکل سوال ہے؟“ جو بھی وہ سوال سمجھانے کے لیے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجالانے لگتا ہوں دیکھو یہ! میں تیرا دوست نہیں ہوں؟“ وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

”نہیں!“ میں منہ بھاڑ کر کہتا۔

”تو اور کون ہے؟“ وہ مایوس سے سوچا تے۔

”وہ سچی سرکار“ میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا ”وہ سچی سرکار وہ سب کا پالنے والا ————— بال کرے

سب کا دالی کون؟“

وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ”داؤ جی خطا ہو گئے کیا؟“

وہ مسکراتے لگتے ”جھوٹا عینک! اچھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا ————— مجھے پانی تو پی آئے مے؟“

میں جھوٹ ٹوٹ بڑا مان کر کہتا ”بوجی جب مجھے سوال سمجھنا ہوا داؤ جی کو پانی یاد آ گیا“

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے ”غصہ اسکو ازجوب تجھے پ۔“ اکین کا مریخ نظر آ رہا تھا تو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا

اور اگر ایسا نہ بھی کرنا تو.....“

اور اس کے بعد پتر نہیں داؤ جی کہتے دن تک پانی نہ پیتے۔

فروزی کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ گھنٹہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار

ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑچائی پیسے سے یاد رکھی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جیو میٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤ جی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کمال باؤں پر اپوزیشنیں ہیں نہ پانی یاد کر کے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں

رہنے میں بند کر دیا لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرنا مریخ بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر بہت جھوڑی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے

جیو میٹری کی شکلیں بڑا کر اور مشغیل بن کر آئے تو وہ بھی کچھ پراپوزیشن سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹھتا تھا اور انہیں بہت کوفت ہوتی تھی۔ مجھے

سرنے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پیس لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر

جب کتاب بند کر کے لکھ لکھ کر چند فقروں کے بعد اٹک جاؤ۔ مجھے داؤ جی مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا۔

اور میں باہر صحن میں آ کر سبز جیواں پر میچ کے سج سج روئے لگا لکھائوں پر سر رکھے رہا تھا اور سردی کی لذت سے کانپ رہا تھا۔ اس طرح بیٹھے

بیٹھے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لیے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیڑھ صبح کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور

پھر واپس نہ آؤں۔ جب فہرہ کر جگا اور صبحی قدم آگے بڑھانے کیلئے نہاد پڑا تو داؤ جی کھل اور میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے

پیارے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا ایک لافنا ہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا ”اے بیٹی! تینو مے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔

تو تو بہت ہی کم محنت لگا۔“ پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کھل میں بیٹھ دیا اور میٹھک میں آئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چادر وں پر

رضائی پھینچی اور خود پاؤں اور سر کے کمرے پر بیٹھ گئے۔



انہوں نے کہا کہ تنقیدس چیز ہی ایسی ہے تو اس کے باوجود یوں نالوں بہت ہیں اس سے اور طرت نکار۔ ہوا خدا حضرت مولانا نے پانچ جہد مقادیر اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انہیں میں اچھی طرح سے پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا۔ کوئی بات ایسی نہ تھی جس پر ابھرنے ہوئی میں نے یہ جہاناکر راجھی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی حالت پر پشیمان ہوا وہی باتیں کے ایک مسئلہ پر غور کیا۔ خدا کہ بات اچھڑ گئی۔ میں نے دیا حلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا جب درقنہ کی رو سے مفروضہ کا جواب ٹھیک آتا تھا تبیں علم ہندسہ سے پانچ ثبوت کو نہ پہچتا تھا میں ساری رات کاغذ بیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے دیا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے دست مبارک سے کاغذ پر خط لکھ کر اس میں نام لکھ کر دیا۔ لیکن جہاں لکھے اچھے ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو جی کو فٹ ہوئی۔ فرمانے لگے ”چوترا صاحب ہم تم کو پڑھا نہیں سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک ہو جائے تو شاگرد کو کسی معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔“ میں نے جرات فرمے کہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جہد کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا مرحمت اور ہر شوشہ میرے لیے حکم ربانی سے کم ہیں۔ اس لیے خاموش ہوں جیلا آتے غزوی کے سٹے ایڈیٹر کی کیا مجال! لیکن حضور نے دیکھ ضرور ہوا ہے۔ فرمانے لگے تم بے حد مجاہد آدی ہو۔ بات تو سن لی ہوئی، میں نے سر جھکا کر کہا ”اشاد، فرمانا“ وہی میں حکیم ناصر سید تانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقم لکھ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا۔

————— والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہوں نے بات خفی چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی تباہی کر رہا ہوں جب فارغ ہو گیا تو والدہ سے عرض کر دینا چنانچہ ایام برے اضطراب کی حالت میں گزرے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صمیم جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لایحل مسئلہ سے طبعیت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلی جاننا چاہتا تھا۔ لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ رقم۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس پر حاویہ میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں۔ ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح بیٹھن تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی گل پوچی سے دو روپے چرے اور نصف اس کے لیے چھوڑ کر گاؤں نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میرے دونوں بزرگوں کی مددوں کو مجھ پر مہربان رکھے! دائی میں نے بڑا گناہ کیا اور اب تک میرا سران و دونوں کرم فرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا۔ گاؤں سے نکل کر میں حضور کی سوہلی کے نیچے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھتے تھے۔ گھنٹوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا، بد قسمت ہوں بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عطر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لڑھکی کندھے پر رکھ کر میں وہاں سے چل دیا۔ سن رہا ہے؟ داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رمانی کے بیچ خار پشت بنے میں نے آنکھیں جھپکایں اور بولے سے کہا ”رجی؟“

داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا ”قدرت نے میرا کمال درو کی۔ ان دنوں جا کھل جنید سر سہار والی ریل کی پٹری میں رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن جیتا۔ اس طرح تائید غیبی کے سہارے سو لہ دن جن میں دلی پہنچ گیا۔ منزل مقصود تو آگے آگے تھی لیکن گھر مقصود کا رخ نہ ملتا تھا جس کی سے پوچھتا حکیم ناصر سید تانی

کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملا۔ وہ دن ان کی تلاش جاری رہی۔ دیکھی پینڈہ پاسکا۔ قسمت یا درستی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لیے نئی کوششیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرنا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس پھینک کر گہری نیند سو جانا۔ شل مشہور ہے جو نیند یا بندہ۔ آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی۔ وہاں پھر پھوڑوں کے محلے کی ایک تیرہ دتار گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھٹی ٹی سی کوٹھڑی میں فردکش تھا اور چند دیستوں سے اُدیکھے اونچے گھٹکو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا ”کون ہے؟“ میں نے سلام کر کے کہا ”حکیم صاحب سے مناسبت“ حکیم صاحب دوستوں کے سلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اُسی طرح بیٹھے ہوئے سراسر گرامی ”میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”پنجاب سے آیا ہوں اور..... میں بات پوری بھی نہ کر پاتا تھا کہ زور سے بولے ”اے ہو! جنت رام ہو؟ میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے کھٹکا ہے شاید جنت رام تھا کہ پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر گھر سے فراہ ہو گیا ہے اس کی مدد کرنا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا ہوا تو پاٹ دار آواز میں بولے ”میاں اندر آ جاؤ کیا چپ کا ووزہ رکھا ہے؟ میں ذرا آگے بڑھا تو جی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عودیں لو کی طرح بیٹھے رہے۔ پھر قد سے حکمانہ انداز میں کہا ”دبر خودار میٹھا جاؤ۔ میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا ”بھئی ذرا غصہ دیجئے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا بناؤ ہندسہ کا کو نسما شکر تہا رہی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سون کیا تو انھوں نے اُسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کرتے ہوئے اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر پر بند ہو گئی۔ پھر فرمایا ”بناؤ اپنی انگلی سے میری کمر پر ایک منساوی اساقین۔ مجھ پر مسکتے کا عالم طاری تھا نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے ”میاں جلدی کرو۔ نا بنایا ہوں کا غد تلک کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکی کمر پر کانپتے ہوئی انگلی سے منساوی اساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر حریفی شکل بن چکی تو بولے اب فقط سس سے خط بج پر عمو دگراؤ۔ ایک تو میں گھبرا ہوا تھا۔ دوسرے وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یونہی اٹکل سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر عمو دگرا ناچا ہا تو تیزی سے بولے ”ہے ہے کیا کہتے ہو یہ فقط سس ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ بالیں کندھے سے کوئی چھ انگلی فقط سس ہے وہاں سے خط کھینچو۔۔۔۔۔ اللہ اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی ٹائیس منساوی اساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی۔“ پھر ناؤ جی دتی کے دونوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چینی ہو کر پوچھا ”پھر کیا ہوا داؤ جی؟“ انھوں نے گڑھی سے اٹھتے ہوئے کہا ”رات بہت گزر چکی ہے اب تو سہ جا پھر بتاؤں گا۔“ میں شادی نیچے کی طرح ان کے پیچھے ڈر گیا تو انھوں نے کہا ”پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہوگا۔ اور ان چھوٹی چھٹی پراپوزیشنوں کو بتائے سمجھے گا۔“ میں نے جواب دیا ”محلوا تمہوں کا آپ نکر نہ کریں“ انھوں نے کھڑے کھڑے کھل پیلٹے ہوئے کہا ”بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی جھنوری میں رہا اور اس بحر علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واسی پر میں رو دیا تو دست عبت میرے سر پر پھیر کر کھنکھنے لگے ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا، یہ کہتے ہوئے داؤ جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گم گم جھوڑ کر ہٹاک سے باہر نکل گئے۔

انتہائی کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم بھول رہا تھا۔ داؤچی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے قفس تھنے  
 ڈھانچے پر لکھتے، اسباب تازی بن طویلہ غرض بن۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گذرنا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے سلسل  
 یوں بہت سے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح میرے کمرے سے اٹھ کر باہر گئے۔ آج کل داؤ  
 چی کی منتوں خوشامدوں کا بیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھیسٹ ہوئے  
 میرے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ ٹہلی میں نہ آدم نہ آدم زاد، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤچی مجھے اسی طرح سیر  
 رہے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔ ابھی گراں خوانی دور نہیں ہوئی ابھی طنزورہ بڑبڑا رہا ہے۔ خنڈے سے غصے  
 و اند کے بعد کتنے کوئی شرمناک طنزورہ کسی آہنگ پر بچ کر کیا کہ رہا ہے۔ جب ہم جتنی سے بہت دور نکل گئے اور صبح کی برج ہو اسنے  
 پری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤچی نے میرا بازو پھوٹ دیا۔ سردیوں کا ریشہ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور تھپتھپ رہ گئی۔ قبرستان  
 نڈر کیا کر داؤچی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے پڑھتے جا رہے تھے۔ جب آہستہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے  
 وقت بھی نہ گذرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک تہن غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اس ٹیلے پر رہتی تھیں اور گئے  
 جانے والوں کا کچھ چاہا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤچی نے میرے گلے کے گرد مغلدارھی طرح سپیٹ کر کہا کہ سامنے ان  
 دو بکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دھچک لگاؤ، پھر سو لمبی سانچیں کھینچو اور پھر ڈو، تب میرے پاس آؤں یہاں بیٹھا ہوں۔  
 میں قضیہ سے جان بچانے کے لیے سیدھا ان بکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساختی  
 نام لگایا کہ چھ بکروں کا وقت گذر چکا ہو گا اس کے بعد آہستہ آہستہ انشت کی طرح بکروں کے درمیان دوڑنے لگا۔ جب میں یعنی  
 چار بکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی سانچیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے  
 تھے دوسرے میری پسلی میں ہلکا کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ غصہ پر ہلکا کر داؤچی کو سبٹے ہوئے اٹھاؤں اور گھر سے جا کر خوب  
 خاطر کول اعصاب سے بھر اور دہشت سے زبناں ٹیلے کے پاس پہنچاؤں۔ داؤچی غصہ کی ٹیکڑیوں پر گھنٹوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح  
 رہا رہے تھے اور اوپکے ادبچے اپنا محبوب تہرکا رہے تھے۔

جفا کم کن کہ فردا در دیر محنت سر

بہ پیش عاشقان شرمندہ با صفا

بھئی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشت شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور  
 اس سے کہہ رہے ہوں دیکھو، سوچو، وہی نہیں..... میں نہیں بتا رہا ہوں..... سنا رہا ہوں..... ایک دھمکی دینے جاتے تھے۔  
 چڑچڑ کر ٹھیکریوں پر گرنے اور جفا کم کن جفا کم کن کہتے ہوئے رونے سے نکلے۔ خنڈی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور  
 سے چیخ مار کر عباتے غصہ کی طرف بھاگنے کے پھر بکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤچی ضرور احم اعظم جانتے تھے اور وہ جتن قابو کر رہے تھے۔  
 میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جتن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل اعلیٰ بلند، ہاتھ پیر والا جتن تھا۔ جب داؤچی کا علم اس پر نہ چل  
 سکا تو اس نے انھیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ سے تھے جفا کم کن جفا کم کن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا۔  
 — خنڈی دیر بعد داؤچی آئے انھوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا ”چل طنزورے“ اور میں ڈرنا ڈرتا اسی کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ

میں انہوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی ٹھکی گھڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لیے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لے لے وال فرید اٹھیا اٹھیا!

ن بعد و گر کے پیچھے چلتے ہوئے ہیں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا اس کی ہر لمبی زلفیں کندھوں پر چھوٹنے لگیں اور اس کا سامنا وجود جٹا دھاری ہو گیا۔ اس کے بعد چاہے کوئی میری بونی بونی، مرادیتا میں ان سا ساتھ سیر کو نہ گیا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے اکڑ گئے تھے۔ نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ بچوں والی کنیا کی طرح داؤ جی سے چھٹ گئی، سچ سچ ان سے پٹ گئی اور انھیں دھکا دے کر زمین پر گرادیا۔ وہ چلا۔ غنی ”بڈے ٹوٹکی سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری فادسی ہے۔ تیرا کلام ہے جو اٹھا ہمارے سر پر آگیا ہے۔ تیرے پریت میں گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اُجڑا مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں“ پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی ”میں مر گئی، میں جل گئی تو گو اس بڈے نے میرے اوج کی جان لینے کا پر بند کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے، میرا انگ۔ انگ توڑ دیا ہے“ اسی چند تو داؤ جی کو اپنی زندگی کی طرح عزت بخشا اور اس کی جان کے دشمن بھلا دے کیونکہ ہو سکتے تھے لیکن جنوں کی خشت باری انہی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی جب میں نے بھی بے سہ کی تائید کی تو داؤ جی نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے جھوٹ کر کہا ”تو احمق ہے۔ اور تیری بے ایمانجاہیں۔“ میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا، اے ولے کہ تو شعور کے بجائے غور توں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس۔۔۔ صد افسوس“ بے بے کو اسی طرٹ چلاتے اور داؤ جی کو یوں کراہتے جیور کہ میں، وپر کو چھٹے پر دھوپ میں جا بیٹھا۔ اسی دی شام کو جب میں اپنے گھر سے اڑھا تھا تو راستہ میں راتوں نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا ”سنا با تو تیرے تو کوئی اینٹ ڈھیل تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں“ میں نے اس کیلئے کے منہ لگنا نہ نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤ جی مجھ سے جیو میٹری کی پراپوزیشنیں سننے ہوئے پوچھنے لگے ”کیا تم ابھی جن بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے ”واقعی تو سنا بھولا ہے میں نے آج خواہ مخواہ تجھے جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے رٹیں پھینک سکتے ہیں تم نے جو دہائی مٹری اور چھٹے زور زور کو لگا کر برساتی بڑائی ہے وہ تیرے کسی جن کو کہہ کہ جواب دیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکتے ہی کا کام کرتے ہیں کہ چٹائی بھی جانتے ہیں؟ میں نے جل کر کہا ”جتنے مذاق چاہو کہو کہ جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا داؤ“ داؤ جی نے کہا ”تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو ناقیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لیے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھاٹی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے سہ کے سر میں لگے گی“

پھر بولے ”سن! علم طبع کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی۔

سمجھ گیا؟“

”سمجھ گیا؟ میں نے چہ کر کہا۔“

ہمارے قصہ میں اٹی سکول منور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لیے ہمیں ضلع جانا ہوتا

تھا چنانچہ وہ صبح انکی عجب ہماری جماعت امتحان میں نے لیے متعلق لاہور جاری علی اور لاری کے ارد گرد الدین قسم کے لوگوں کا جھوم جمع تھا اور اس جھوم سے دائرہ جی کیلئے کیچے رہ سکتے تھے۔ اور سب لوگوں کے گھرواٹے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے اور وہی سارے بدل کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ کبیر کی معلومات سے ————— اچھل کر موسم کے تغیر و تبدل پر پہنچ جانے وہاں سے پلٹتے تو ”اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چڑھا ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جھڑپا پتی تھی پھر اتنی تھی“ کہہ کر بوجھتے یہ کون تھا؟

”جہانگیر“ میں نے جواب دیا۔ ”اور وہ عورت؟“ ”نورجہاں“ ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔ ”صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟“ جس نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے ”مثالیں“؟ میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے اور میں ان سے ہان چھڑ کر جلدی سے داخل ہوا تو گھوم کر گھر کی کے پاس آگئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بریک ان تو کوفتروں میں استعمال کر دے ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سائٹس جو کہ چلی تو اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے طبلتے مادیان گھوڑی ماکیاں مرغی..... مادیان گھوڑی..... ماکیاں..... مرغی۔۔۔ ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دہرے ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر سیرے دی انوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ انوار کی صبح داؤد جی کا کوئی نہیں صفحہ لباً خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قواعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسی منبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمیں پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے ذبے نکل رہے تھے جو نمی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا داڈجی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے پیٹ گیا اور اسی منبر! اسی منبر“ کے فخرے لگانے شروع کر دیئے۔ انھوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا ”کوئی سوال غلط ہو گیا؟“ میں نے جھوم کر کہا ”چار دیواری والا“ جھلا کر بوسے ”تو نے کھر کیا ان اور روانے متنی نہ کہے ہوں گے“ میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈاکر پیٹر کی طرح جھلاتے ہوئے کہا ”ہاں جی ہاں جی۔۔۔ گولی مار دو کھر گیوں کو“ داڈجی ڈوبی ہوئی آواز میں بوسے ”نزلے مجھے براؤ کر دیا ظنیر سے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہنا رہا مسلمات کا سوال انگلیں کھول کر حل کرنا گمزنو نے میری بات نہ مانی میں نے فرغائے کہنے۔۔۔۔۔ پورے بیس منبر“ اور داڈجی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی میں فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا، راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے ”اگر ممکن ہے دل کا ہو اتودو ایک منبر ضرور دے گا، تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے“ اُس پرچے کے بعد داڈجی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے۔ وہ رات کے بار بجے تک مجھے اس سرسٹے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے اند بقول ان کے اپنے ایک دوست کے یہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے میرا جانتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤد جی کو یوں تھوڑ دبا گویا میری اسی سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا ادق دوستوں یا رملوں

کے ساتھ ٹھونٹا اور شام کو بناو میں پٹھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤچی کو سلام کوٹنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصرختے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گنہگار کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لیے بھی تیار کر دیں لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سوبار فیملی ہونا گوارا تھا اور سہیل بیلی داؤچی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑ دیئے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا انھوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب بخوی کرو۔ حوالہ دلوں کی کاٹے اندر گھس آئی۔ میں اُسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤچی پوچھ رہے ہیں Cow ٹاؤن ہے یا درب۔ اب ہر قفل کا اندھا پانچ بی جماعت تک پڑھا جاتا ہے کہ کٹے کاٹے عام ہے مگر داؤچی فرما رہے ہیں کہ اتم بھی ہے اور فعل بھی۔ Cow ۲۵ کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھکی دینا۔ اور یہ اُسی دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر ایک وہ دن بھی آیا جب ہم چند دست شکار کھیلنے کے لیے نکلے۔ تو میں نے ان سے درخواست کی کہ مضعی کے آگے سے نہ جانیں کیونکہ وہاں داؤچی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار بندوق اور کار تو سوس کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دے جاتے تو میں کسی بھی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رساٹنے جاتا تو بے سے زیادہ اور داؤچی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کھمکرتے، افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے، میں شرا زنا خیلے خوب خیلے خوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا میں اور باجی لدوؤں کی ایک چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤچی مر جھکائے اپنے ہتھیر پر بیٹھے تھے۔ باجی کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کڑی اٹھالائے اور اپنے بوریسے کے پاس ڈال کر بولے مدد اکثر صاحب آپ کے سلسے شرمندہ ہوں لیکن اسے جیٹو موسم کی خرابی سمجھئے۔ میرا خیال تھا اس کی فرسٹ وہ چرن آجائے گی لیکن نہ اسکی بنفیا دکر درختی.....۔

ایک ہی تو نمبر کم ہے۔ میں نے جھک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے ”تو نہیں جانتا، اس ایک نمبر سے میرا دل دھیم ہو گیا ہے۔ خیر میں اسے مہتاب اللہ خیال کرتا ہوں“

پھر باجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے سے بے کے ساتھ گھبراہٹ میں مشغول ہو گیا۔

اول بول کالج سے ہیں داؤچی کے خطوط کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ سلسلہ بھی

ختم ہو گیا۔

چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤچی کو بھی سلام کرتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کورٹ بینوں اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ کہا کرتے اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کو کسی لے لے۔ اور میں کڑی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انھیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آکر کتابیں دیکھ جاتے۔ امی جتند بوجہ کالج چھوڑ کر تنک میں ملازم ہو گیا تھا اور دتی چلا گیا تھا۔ بے سے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤچی بھی نصفی جاتے تھے لیکن کچھ لاتے نہ تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤچی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آپرٹا پو کھیل کرتی تھیں بنت عمر بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آپرٹا پو میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا تھا مگر کی مختصر مسافت کے سامنے ایسٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکینی دہ اور ٹھکانا بن گیا، انہی ایام میں میں نے اپنی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پکیٹ خرید لیا اور ان پر نہ اباجی کو خط لکھ جاسکتے تھے اور نہ ہی داؤچی کو نہ دیکھ

کی بھینوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی نہ کہ اس کی تعصبات میں۔ ایسے ہی ایئر گورڈیا اور بولوں ہی آیام گذرتے رہے۔

..... ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ ملے ہوئے پھر لڑائی شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوایا۔ ہمارے سیے پر جگہ بہت محفوظ تھی۔ بیٹے سا ہو کار گھر بار چھوڑ کر بھاگ ہے۔ ملے تین دوسرے لوگ خاموش تھے۔ مقررے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی ایک دن ہمارے قصبہ میں بھی چند گھروں کو آگ لگی اور دونوں کوئی پر سخت لڑائی ہوئی۔ فحاشی دانوں اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھڑ کر چل دیئے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤجی کی خبر نیٹے کو بھیجا تو اس جانی بچانی لگی میں عجیب و غریب اجنبی صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر جی داؤجی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے نیچے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھرا کر بتایا کہ داؤجی اور بے بے اپنا گھر چھڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے تھے میرا گلا بندھ گیا۔ اس دن بچے بول لگا جیسے داؤجی بدیشہ بھیت کے بیچے چلے گئے ہیں اور اب نوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے یوں ہوتے تھے۔۔۔۔۔ کوئی تیسرے۔۔۔۔۔ دو فرد اب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے سپاہ گزبنوں کے نام نوٹ کر کے اور اکبر جیو نے کا مددہ کر کے اس لگی سے گذرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی۔ مہاجرین کے لاشیاں پکڑے نچرے لٹا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے نمازستانوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا ”ساتھ کے گاؤں میں کیا ہوا تھا جب لوٹا تا اپنے گھر میں گھسنا چلا گیا“

”کوئی گھر میں؟“ بزرگ نے پوچھا۔  
”رہتی مہاجرین نے گھر میں“ لڑکے نے کہا۔

”پھر؟“ بوڑھے نے پوچھا۔  
”پھر کیا۔ انھوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔

اتنے میں اس بھیڑ سے کسی نے پتلا کرکٹ نہ مارے۔ راتوں رات جلدی آؤ گئے جلدی آؤ۔۔۔ تیری سامی۔۔۔ پنڈت

..... تیری سامی.....

راتوں بکریوں کا دیوڑھاڑے کی طرف سے جا رہا تھا۔ انھیں روک کر اور ایک اٹھٹی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انھوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے مردم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا ”بہن! اچھا آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے۔۔۔۔۔ اسے کچھ مت کہو۔۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔“ خون میں نہائی چند آنکھوں نے ہری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنداسی قوی کر بولا۔

”بتائیں تجھے بھی۔۔۔۔۔ آگیا بڑا چاٹنی ہی کہ۔۔۔۔۔ تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا“ اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا ”انصاف ہو گا شاید“

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ راتوں کی قیادت میں اس کے دوست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور راتوں رات کی مٹوڑی پکڑ کر مل رہا تھا اور پھر مل رہا تھا ”اب بول بتایا اب بول“ اور داؤجی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ان کی پکڑی تار کر کہا۔

”پہلے بودی کا ٹوہری“ اور راتوں نے سوائیں کھٹنے والی درختی سے داؤجی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا ”بلادیں جے؟ اور آؤ۔“  
 نے کہا ”جائے دو بڑا جلسہ، میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا“ پھر اس نے داؤجی کی ٹوہری اٹھاتے ہوئے کہا ”کلمہ پڑھ پڑتا“  
 اور داؤجی آہستہ سے بولے ۔

”لاکوں؟“

راتوں نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپیڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا ”سارے ٹکے بھی کوئی پانچ سات ہیں!“  
 جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو راتوں نے اپنی لامٹی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا ”چل بکریاں تیری انتظامی کرتی ہیں؟“  
 اور ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریڈا اہل رہا ہو!



# ایا

## اوپنڈرنا تھا اشک

افراد :-

صاحب (صاحب) کیا

لاکر

مقام بمبئی

وقت بارہ بجے دن

دہرہ جس کمرے میں اٹھتا ہے وہ ایک متوسط درجہ کے مکان کا ڈرائنگ روم ہے۔ کسی ایسے کشادہ، کھلے، روشن اور ہوادار مکان کا، جو بمبئی کی نواحی زمینوں میں عام ہیں۔ ان پرسنل کی چھتوں کی بجائے کھربل کی چھتیں ہوتی ہیں۔ اور بمبئی کے کچھ سات منزلہ مکانات کے نیچے نیچے ٹیلیفون جیسے گروہوں میں رہنے والے ان کشادہ کھلے مکانات میں اگر ایک عجیب آجودگی سی محسوس کرتے ہیں یہ بیٹھنے کا کمرہ بھی مکان کی پہلی منزل پر ہے جس کا نمبر ات اس کی چھت کے ڈھانچوں، فرشوں اور سائے کی بالکونی سے ملتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں دائیں بائیں دروازے ہیں جو بالکونی کو جاتے ہیں۔ اس دیوار پر درمیان میں ایک گھگ لگا ہے جس میں اس وقت گیارہ بج رہے ہیں۔

کمرے کو اس کے فرنیچر کے لحاظ سے تین حصوں میں مقسم کر سکتے ہیں۔ دائیں دیوار کے ساتھ میز اور کرسی لگی ہوئی ہے۔ اور کتابوں کے ایک پرشے ہیں۔ جس سے یہ حصہ چھوٹی مونی لائبریری یا سٹڈی روم بن گیا ہے۔ سامنے کمرے کے وسط میں کوئی کابینہ پڑا ہے۔ اور ایک چٹائی رکھی ہے۔ اسے بیٹھنے کی جگہ سمجھ لیجئے۔ تیسرے حصے میں، یعنی بائیں طرف چھت سے ایک چھوٹا تنگ روم ہے۔

چھوٹا بمبئی کے متوسط درجے کے نواحی مکانات کا ایک لازمی جزو ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مکان ہوگا جس کے برآمدے یا ڈرائنگ روم میں چھوٹا نہ ہو۔ اس کا خیال چاہے بھرپور کھانا

کھائے بعد منہ دنگی کے مارے کسی جگرانی سیٹھ کے دماغ کی اختراع ہو۔ خواہ کسی مار وادی سینٹے کے دماغ کی ہوگی۔ لیکن اب تو یہ شیواجی کے ساتھ محض چنے کھا کر میوں کی مسافت طے کرنے والے مرہٹے بہادروں کے گھروں کی زینت بھی بننا ہوا ہے۔

بائیں دیوار میں ادھر کو ایک دروازہ ہے جو باہر پرآمد سے میں کھلتا ہے۔ پروردہ آٹھنے پر، میز پر صاحب بیٹھے کچھ کھنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ صاحب سے مراد کسی گورے انگریز سے نہیں۔ یعنی کاہر وہ شخص جو ایک نوکر رکھنے کی توفیق رکھتا ہے۔ تو سے کی طرح کالا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ”صاحب“ اور اپنی بیوی کو ”میم“ کہہوا سکتا ہے۔ —  
”مجھے صاحب کہا کرو“! یہ حکم صادر کرنے کی بھی ضرورت نہیں نوکر اسے اتنی بار صاحب کہہ کر پکارتے گا کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو صاحب پکارنے پر مجبور ہو جائے گا۔

یہ صاحب غیر تو سے کی طرح کالے تو نہیں، لیکن اتنے گورے بھی نہیں۔ ۳۵-۳۶ برس کے خوش شکل نوجوان ہیں۔ غم گینی میں مبتلا۔ ست ہیں۔ اور اس وقت معلوم ہوتا ہے کسی فلمی کہانی کا شارپ ٹھننے میں مصروف ہیں۔

پروردہ آٹھنے کے بیک فٹ بعد بائیں طرف بیک گراؤنڈ میں دستک کی آواز آتی ہے۔ ایک لمحے بعد بائیں دروازے میں سے نوکر جھانکتا ہے۔

نوکر۔ صاحب آپ کی چٹائی آیا ہے۔

صاحب۔ کام کرتے ہوئے بے خیالی سے، پڑائی کون؟

نوکر۔ موٹی سی جواں چھوڑی ہے۔

صاحب۔ رہتو رکام کرتے ہوئے، موٹی!

نوکر۔ صاحب کالی کالی ہے، اتنا بڑا بالوں کا جڑا، بڑی بڑی آنکھیں اور صاحب بڑی جواں ہے۔

صاحب۔ رہتو رہتو بے خیالی میں، نام نہیں پوچھا؟

(دروازے کے قریب بیک گراؤنڈ میں، آیا کی نہایت میٹھی آواز آتی ہے)

آیا۔ میں ہوں سیسیلیا فرنینڈس (C. FERNANDIS) آجاؤں صاحب؟

صاحب۔ (جمہوری کے انداز میں کام چھوڑ کر ایک نیمف سی مسکراہٹ ہنسنے پر لاتے ہوئے، آجاؤ آیا۔

آیا اندر آجاتی ہے۔ نوکر چلا جاتا ہے۔ اگرچہ نوکر نے آیا کو کالی کالی کہا ہے

مگر محض کالے کے لفظ کا استعمال اس کے کالے پن کی ہنسک ہے۔ لیکن شاید

نور کی نظر اس کے رنگ کی نسبت اس کے شباب پر زیادہ رہی۔ اور

اس کے بیان میں اس نے مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ آیا کی عمر میں

ایک برس کی ہے۔ اس کے بڑے بڑے، بڑی بڑی آنکھوں اور  
بھرپور جوانی نے اس کے ذہن کی سیاہی اور ہستانی کی کوتاہی کو یکسر  
بھجھا دیا ہے۔ بڑے سدر بٹنوں، بڑے بڑے اور کٹا سے ڈھکی ہوئی قیمتی  
دھاتی میں میس سے آواز میں مٹھاں اور ایچھے میں نغمہ ہے۔ ہلکے  
وقت کا بڑا کر جاتی ہے۔ صاحب کو صاحب نہیں کو نہیں رہنے کو  
ارہنے اور کو اور .... وغیرہ وغیرہ

آ کو صاحب کے سامنے کرسی کی پشت تمام کرسی ہو جاتی  
ہے۔ ذیل کے مطالعے میں آیا اور صاحب کی حرکات کے محض پسند  
اشیاء دیئے گئے ہیں۔ ہائی ایشن ڈائریکٹری سمجھ داری — RE  
SOURCEFULNESS (پہچھوڑ دیا گیا ہے۔

آیا۔ مسکرا کر سر کو ہٹا سا تخم دیتے ہوئے، میم صاحب چلا گیا صاحب؟

صاحب۔ ہاں آیا!

آیا۔ چھوڑ کر ہے؟

صاحب۔ رہیں کر، تم نے دیکھا ہے!

آیا۔ وہ تو جانے والا تھا۔ میم صاحب بولتا تھا۔ وہ چلا جائیگا تو تم آ کر کام دیکھنا۔

صاحب۔ رہو نٹوں پر لیٹ مسکراہٹ آ جاتی ہے، میم صاحب نے ہنسی کی ہو گی۔ میں تو خود جانے والا ہوں ....  
آیا۔ رکھ رہ؟

صاحب۔ پہاڑ پر! اسی لیے اس نوکر کو جواب نہیں دیا۔

آیا۔ کیوں صاحب، تم تو اور سی رہنے والا تھا۔ میم صاحب بولتا تھا صاحب اور ہی رکے گا۔

(جیسے ابھانے میں کرسی کی پشت چھوڑ میز کا کنارہ تمام لیتی ہے۔ ایک لمحہ کے لیے صاحب کی نگاہ آیا کے بھرپور سینے  
پر چھپتی رہتی ہے چل جاتی ہے)

صاحب۔ (تلم چھوڑ کر ایک تلی سی انڈرائی جیتے ہیں) طبیعت ٹھیک نہیں رہتی آیا۔ میں بھی مہینہ بھر کی پٹی لے کر ادھر سی جا رہا ہوں

آیا۔ (آنکھوں میں عجیب سی ہمدردی اور مستی بھر جاتی۔ سینے کا ابھار میز کے کونے پر زیادہ بڑھ جاتا ہے اور بازو ڈبلا  
پھیل جاتے ہیں، ہاں صاحب تم کتنا ڈبلا ہو گیا ہے دلفی بھر کے لیے صاحب کی آنکھوں میں دھجکتی ہے۔ لیکن صاحب  
کی آنکھیں بالکونی کے خلا میں مٹی ہوئی ہیں، بات کو بڑھاتے ہوئے میز پر ہاتھ بڑھا لیتی ہے، میم صاحب بھی کیسا ڈبلا  
ہو گیا تھا ایسا کیسا صاحب؟

صاحب۔ (کرسی پر پیچھے کی طرف جھکتے ہوئے) پچھلے دنوں کوئی نوکر نہیں تھا اور آیا بھی نہیں۔ میم صاحب کو عادت تو ہے نہیں

سب کام انہیں خود کرنا پڑتا۔ برتس ملنا پانی بھرنا۔ صفائی کرنا۔ رات کو چھرا اور کھٹل کے مارے باہر سونا نہ تھا۔ اور میم صاحب دن رات جاگتا تھا۔

کھٹل کیا صاحب؟

آیا۔ صاحب۔ اسے یہی جسے مانجھوں کہتے ہیں اسے دو لال لال جو بستر میں ہوتے ہیں وہ بگ بگ۔

آیا۔ رہنسی ہے۔ لال شکل کے باوجود نقرائی سنسی، اسے صاب تم اس کو کھٹکھٹا ہے۔

صاحب۔ کھٹکھٹ نہیں، کھٹل کھٹل!

آیا۔ ہاں ہاں رہنسی ہے، اسی سے تو باہر بھی گیا تھا۔ کتنا چھڑکا ڈیریا نکلا تھا؟

صاحب۔ آیا کوئی نہیں تھی، میم صاحب بچے کو دیکھیں کہ گھر کو؟ آیا ل جاتی تو ہم میم صاحب کو جلدی بھی دیتے۔

دوسری پر پیچھے کو جھکتے جھکتے دھڑکے ساتھ مل جاتے ہیں،

د آیا پھر پیچھے کی طرح میز کے کونے سے ٹپ ٹھڑی ہو جاتی ہے،

آیا۔ ہم تو سال بھر تیار سے پاس نوکری کی۔ ہم چھوڑتا آئیں ہن ہنابو اسے فریڈ بولا تیار سے پاس آنے کو ہم کو بہت

تو اس پر تیار ہے۔ تین گھنٹہ ملاؤ آنے جانے میں لگتا ہے۔ تم کو لبا میں نوکری کرو۔

صاحب۔ کیا حال ہے تمہارے بوائے فریڈ کا؟

آیا۔ ہلک تھا اور تو صاحب، ہم اور سے نوکری چھوڑ گیا تو اس کی بھی نوکری چھوٹ گئی۔ اور شراب پیتا تھا اور ہم کو تیار

دیتا۔ ہم کو لبا کا نوکری چھوڑ دیا۔ ہم سے شادی بنانے کو مانگتا تھا۔ ہم بولا۔ ہم بھوکا مر گیا، فٹ پاتھ پر سوئیگا ہن تہے شادی نہیں بنا کیگا۔

د صاحب دوزخ کا تعقیب لگاتے ہیں اور پھر پہلی پوزیشن میں آجاتے ہیں،

صاحب۔ تیار رہی کہیں نہ لگی جی آیا؟

آیا۔ تم کو یہ آیا پسینہ ہے صاب؟

د صاحب کی آنکھوں میں دھمکتی ہوئی چھ میز پر لہنیاں لگا کر بھگ جاتی ہے۔ صاحب کی نگاہ اس کے بھرے سینے

ملکر کر مڑ جاتی ہے،

صاحب۔ تیار رہی پسند کیا۔ واں جے۔ میم صاحب کو پسند ہے۔

آیا۔ یہ جاسی جات کا ہے صاحب، ہم اسے بہت دیر سے جانتے ہیں۔ ہماری بات والوں کے نوکری کرنا تھا۔ سرٹیفیکٹ

کے پاس میں۔ شکل بھی اچھا ہیں۔

صاحب۔ فریڈ جو سنے دفتر کا چہرہ اسی۔ اسے شانتا کرو۔ سے لانے گیا تو اسے لینے بعد واپس آ گیا۔ میں نے پوچھا تو بولا "صا۔"

اس کی شکل اچھی نہیں۔ میں نے کہا لاو سے۔ اگر وہ کام اچھا کرتی ہے تو پچھے گا۔ مجھے کو لبا اس سے عشق کرنا ہے۔

دھیر نقری جیسی فضا میں تو بجتی ہے۔ اور بجتے بجتے دو میز پر  
جھک جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ پھیل کر صاحب کے میز پر پڑے  
ہینے کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

صاحب۔ اور کیا (دکڑے میں گھومنے لگتے ہیں) کیا بہت اچھی ہے۔ شور نہیں مچاتی۔ تنگ نہیں کرتی۔ اپنے کام سے کام لیتی ہے  
ایک جگہ تک کے کام کرتی ہے۔ اور پھر اس کا میچا میچا رہا ہے (جستجو کرتے ہیں) تباہی طرح نہیں ہے۔ کو اب کدھ کام  
کر رہی ہو؟

(دھیر جھوسے پر جھپٹ جاتے ہیں اور اسے جگے سے جھلا دیتے ہیں۔ کیا ان کے قریب جا کھڑی ہوتی ہے)

آیا۔ ملاؤ میں کرنا تھا صاحب!

صاحب۔ راجا تک حرکت کر! ملاؤ!

آیا۔ ہارسوں سے ہم ملاؤ میں تھا۔

صاحب۔ کس کے ہاں؟

آیا۔ اور صاحب، ہم اس صاحب کا نام نہیں جانتا۔ اس پر نے والی جاڑی میم صاحب نے بھیجا تھا۔ آج جھڑا ہو گیا۔

صاحب۔ تھرا جھڑا کہاں نہیں ہوتا۔ کیا بات ہوئی؟

آیا۔ اذیم صاحب بہت کھٹ کھٹ کرتا ہے صاحب۔ اوہ لا۔ تم ایسی ساڑی پہنتا ہے۔ ایسا ہال بنانا ہے۔ تھرا راجا صاحب  
تو ہم سے جانتی ہے۔

صاحب۔ سائمی تیری تھپاری واقعی اچھی ہے۔

آیا۔ ہم بولا۔ ہم تو ایسا ہال بنا چکا۔ ایسا ساڑی پہنچا۔ چوٹ میں کا ہے کوہو ما تو ہم کرتا ہے۔ (اوہ لا۔ ایسی ساڑی پہنچا  
اور نہیں مانگا۔ تم کو کام کرنا ہو چکیا سے کرو۔ ایسا صاحب اور نہیں چھینگا۔ ہم بولا۔ ہم کو ہمارا پگلا دو۔ ہم کو نہیں  
مانگا تو کری۔ اوہ لا صاحب سے پگلا دو۔ صاحب بولا۔ میم صاحب سے ہو۔ ہم تو کٹا لیا۔ بولا۔ جاؤ ہم کو نہیں مانگا پگلا۔  
ہمارا پگلا۔ کہہ کے تم جی ہو جاؤ! ہم چلا آیا اور غلط رک کر صاحب ایک روپیہ ہو تو وینو۔ کوہا با جانے کا کر یہ مانگا ہے  
دو چار آنے کا ناشہ کریگا۔

(صاحب پھر میز پر جا کر بیٹھتے ہیں اور دروازے سے ایک روپیہ نکال کر اسے دیتے ہیں)

صاحب۔ روپیہ دیتے ہوئے کیا تم ناشہ کر کے بھی نہیں چلی؟

آیا۔ میں صاحب۔ صبح ناشتے کو اولوگ کچے نہیں دیتا۔ خالی پی پی ہوتا ہے۔

صاحب۔ تم کھانا کھاؤ گی؟

آیا۔ میں صاحب۔

صاحب۔ ارے کھاؤ روکر کو آواز دے رہے ہیں، جگدیش، جگدیش رلھے بعد نوکر داخل ہوتا ہے۔ روٹی گھر سے آیا ہے۔ ہاتھ

میں پھری اور اوجھ چھل پیا نہ ہے۔

یہ ہماری پرانی آبا ہے۔ کھانا یہیں کھائے گی۔

جی بہنر۔ جگدیش۔

دیکھا جاتا ہے۔ صاحب کی نگاہیں آبا کے سینے سے ٹکراتی ہیں اور غصہ بھر کے یلے دیں بھی رہتی ہیں،

آیا۔ کیوں صاب کیا دھیتا ہے؟

صاحب۔ اچانک نگاہیں ہٹا کر بڑی اچھی ساڑی ہے۔ کتنے کوئی ہے؟

آیا۔ واقعی کی ہے۔ یہ تو پرنٹ ہے۔

صاحب۔ اچھا پرنٹ ہے۔

آیا۔ اور دھوئی کالا ہیں ایسا۔ ساڑی جتنا ہے صاب۔ صاب کیسا لگتا ہے ہم کو؟

ساڑی کو دیکھتے جسم پر پرنٹ کر رہا ہے۔ صاحب اس

کے ساتھ دل ہمس کے حذو حال کو ایک نظر دیکھتے ہیں۔ اور

اضطرابی حرکت کے طور پر پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

صاحب۔ اچھی قسمی ہے۔ لیکن نہیں سفید ساڑی پہنی چاہیئے۔ دیکھو یہ، اب پرنٹ لگتے ہیں۔

آیا۔ کیوں صاب۔

صاحب۔ کوچ کے بازو پر بیٹھتے ہوئے، مائے رنگ پر سفید ساڑی اچھی لگتی ہے۔

آیا۔ ہم سفید ساڑی ہی پہنتا تھا صاب، پن کئی آدمی ہمارے دھچھو لگ جاتا تھا۔ ہم چھوٹا دیا سفید ساڑی پہنتا۔

(صاحب صرف مسکرا دیتے ہیں)

اس میں اور بی جانتی رہا تھا صاب۔ ایک دن کی بات ہے ہم اور وائیکٹر میں کام کرتا تھا صاب۔ ہم ایسا ہی

سفید ساڑی بلاؤں پہننا تھا۔ ایک پنجابی فوجی ٹیکسی میں بیٹھنا تھا۔ اور افسر تھا صاب۔ بلاؤں پہننا تھا۔ ہم کو دیکھ کر اترا بہت

داروپی اسے لاکھا صاب۔ ہمارے پاس آکر بولا۔ تم بھری میں کام کرتا ہے؟ ہم بولا۔ نہیں ہم آیا ہے۔ اور بولا۔ تم

جموت ہو لکھے۔ تم بھری میں کام کرتا ہے۔ تم ہم کو بہت پتہ ہے تم بولا۔ ہم تم کو ماننا بھی نہیں۔ پن صاب اس

نے ہم کو پوچھ کر ٹیکسی میں ڈال لیا۔

(صاحب ہنستے ہیں)

صاحب وہ بہت تھکا تھا۔ بہت داروپی اسے لاکھا۔ ہم چلتا۔ ایک سپاہی بھی آیا، پن اور فوجی افسر بلاؤں بھری میں کام

کرتا ہے، ہمارا فریڈ ہے تم جو۔ اسے ڈراؤں سے بولا کہ گاڑی چلاؤ۔ ہم بہت لگا رہا تھا صاب۔ ہم ڈراؤں سے بولا۔

”وہ کو گاڑی پن صاحب اور ڈراؤں کو مارنے دوڑا۔ اس کے پاس دو بونل دارو تھا صاب۔ ہم سے بولا ہیو! ہم بولا۔

ہم ماننا بھی نہیں۔ اس نے بونل ہمارے سر پر انڈیل دیا صاب۔ ڈراؤں ہماری جانت ماننا بھی اس کو گاڑی روکنے کو بولا۔

جو پانی پر اس سنہ گاڑی نہ کھینچ سکا۔ صاحب۔ نہ اور ضرورتی سے پس نکال لیا۔ اور بولا: ہم جان سے مار دیں گا تو کوئی  
 نہ تپا اسلئے ہوں ہرما۔ تم بھی بہت ڈر کیا صاحب۔ اور فوجی ہم کو تانہ تو کی چیز سے گیا۔ اسنے اپنے کمرے میں پہنچ کر اسنے  
 وہ دوازہ بند کر لیا۔ کھڑکی بھی بند کر دیا۔ ہم صاحب۔ سنہ لکھا گیا۔ پس صاحب ہم بھاگا۔ ہمارا پس بھی وہ گیا۔ اس  
 میں تین روپیہ اسنے تو ڈال دی۔ ایک تھا۔ پن صاحب ہم نے اس کو بھی نہیں دیکھا۔ بھاگ کر یہی مل پھنپا۔ خرچہ کیا اور کو ہالا  
 آ گیا۔

صاحب۔ زور کا قہقہہ لگا۔ تھے ہیں،

تم سے شادی کرنا ہے۔ تم کو ایک دن اور فوجی صاحب۔ لینے نکلا تم اس دن بھاگ کر نہ آؤ گے۔ تم کو بہت پس کرتا ہے ہم  
 تم سے شادی کرنا ہے۔ ہم بولا: تم کو میں بنانا ہے شادی۔ اور ہمارا سب بات دلا دیتا ہے۔ تم ہم کو  
 تم اس دین کا ہم تمہارا نہ توڑا میں کا۔

صاحب۔ پھر جان کر کسی پر ہنستے ہوئے اس کی تم سب کا۔ چوڑے کی تو کیسے۔ چمے کا تم نہیں شادی کیوں نہیں کر سکتی۔

آیا۔ ہم کو ملتا بھی نہیں شادی۔ ہم بھوکا بھر گیا۔ فٹ پاؤں پہ سوئیں گا پن شادی نہیں بنا سکتا۔

صاحب۔ اب تم کو عمر جاتی ہے؟

آیا۔ ہم تو اور ہیں آیا تھا صاحب۔ ہم صاحب بڑا تھا تو کر جانے کو مانگتا ہے۔ ہم کو صاحب کا بڑا ٹکڑا ہے۔ اس کو دیکھنا۔ ہم کیا  
 تو اب تم بڑا گاؤں جانے کو۔ گتا ہے۔ ہم تو اور تو کر بھی چھوٹ میں چھوڑ دیا۔

صاحب۔ تم مجھ سے بدچرتا لینی

آیا۔ ہم کو کیا نام۔ ہم صاحب بولا تھا ہم جا۔ تاریک کو جا میں گا۔ آج پاکی ہے۔ ہم اور کیا ہے۔

صاحب۔ تم کو پتہ صاحب کے ہاں بیجا تھا۔

آیا۔ اس ہم صاحب نے آیا۔ کولا۔

صاحب۔ وہ موتا صاحب جو تمہیں نے لکھا تھا۔ میں اس سے کہوں گا وہ تمہارے بچے تو کر دھوڑ دے گا۔

آیا۔ پھر آکر صاحب کی میز پر بیٹھ جاتی ہے، وہ بڑا ایسا ہے صاحب۔

صاحب۔ کیوں؟

آیا۔ جب ہم پتہ صاحب کے گھر سے چلا تو اور صاحب بولا۔ آیا بیٹا دیکھنے چلیں گا؟ ہم بولا ہم کو نہیں۔ نکلتا ہے بیٹا۔ بولا

چوچا نے پس۔ صاحب اور ہم کو میری پوتلی میں سے گیا۔ ہم ایک کپ چائے پیا۔ اور بولا۔ آیا ہمارے سنگ چوں ہم تم  
 کو بہت پس کرتا ہے۔

صاحب۔ وہ تم کو پس کرتا ہے۔

آیا۔ اس کا اپنا شادی نہیں بنا صاحب۔

صاحب۔ اس کی بوری ہے بہت خوبصورت لیکن میں میں ہے۔

- آگیا۔ اور بڑا ایسا ہے صاب۔
- صاحب۔ اندھیری واسطے صاحب کو بھی اب آیا چاہیئے تم اندھریوں نہیں جاتی؟
- آگیا۔ ہم کو نہیں مانگتا اندھیری۔ وہاں ہم کو ادب و مروت بہت تراش دیتا ہے۔ ہم سب بی کو لے کر بیٹھا ہوتا۔ اور سب بی کو لے کر اوپر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ ہم کو بھی اس کے پھو جانا پڑتا۔ اور ہم کو بہت تراش دیتا تھا۔
- صاحب۔ وہ لہا صاحب اب اندھری نہیں ہے۔
- آگیا۔ اور ہم صاب بھی بہت کھٹ کھٹ کرتا تھا۔
- صاحب۔ رہیں کر، تو پھر اب میں کدھر جیوں نہیں کوئی پسند بھی ہو؟
- آگیا۔ ہم کو تو تم جیسا کھتری صاحب پتہ ہے۔ ہم تہا سنے کھرائی دیروڑا تم ہم کو کبھی تر اس نہیں دیا۔ ہم اچھا سا وی پشیمانہ تم ہم کو کبھی نہیں بولا کھانے کا ہم کو کوئی داندہ نہیں ہوا۔ ہم صاب کھٹ کھٹ بھی کرتا تو تم اس کو بول دیتا۔
- صاحب۔ لیکن تم تو یہاں سے بھی ڈر کر بھاگ گئی۔
- آگیا۔ وہ ہمارا کھٹ ہوائے فریڈ ہم کو لے گیا صاب۔ یہاں کا ہوائے لوگ بھی تو اس دیتا ہے۔ اور دھنی لوگ بھی۔ ہم تو کشتی لیا بیٹی سے۔
- صاحب۔ تم تو دیں میں جانے والا تھا۔
- آگیا۔ دیں میں لیا تھا صاب پر ہمارا دل آؤ نہیں تھا۔
- صاحب۔ تم سے پنہاں جانے کو کہا تھا اس افریقہ والی میم صاحب کے ساتھ
- آگیا۔ نہیں صاب ہم ہر گاؤں جانے کو نہیں مانگتے۔ اور ہمارا کھٹ پٹ ہو گیا میم صاحب سے کر بیٹا ہم ایک بار ایک صاب کے ساتھ دلی گیا۔ ایک ایک میں میم صاب سے ہمارا کھٹ پٹ ہو گیا۔ وہ بولا دلی میں کدھر جائیں گا۔ ہم بولا ہم بھوکا مریں گا فٹ پاخانہ پر مریں گا بن تہا سنے کھریڑ کریں کریں گا۔ ہمارا مات والا کوئی اور نہ تھائیں۔ ہمارے گھے کا ہنسلی ہم نے بیچا تو اور آگیا۔
- صاحب۔ کس اور کے ہاں ڈکوری کر لیتی دلاں۔
- آگیا۔ ہم کو تو کئی لوگ بولتے تھا صاب۔ تم ہنسلی نہ بیچو ہمارے سنگ۔ تو۔ تم کو پیش کر رہیں گا۔ کوئی تھکچہ نہیں ہونے دیں گا بن ہم بولا۔ ہم بھوکا مریں گا۔ فٹ پاخانہ پر سوئیں گا بن دلی میں نہیں رہیں گا۔
- صاحب۔ کچھ لے اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں پھر کندھے جھکا کر قلم اٹھا لیتے ہیں
- صاحب۔ رہیں کر، تم شادی کر دو آگیا۔ میں نے تم سے کئی بار پہلے ہی کہا ہے تہا سنے کی سب گرمی دودھ ہو جائے گی۔
- آگیا۔ ہم کو مانگتا بھی نہیں شادی۔ ہماری جات واسے بڑے سندر لڑکوں نے ہم سے شادی بلانے کو کہا صاب۔ بن ہم کو نہیں مانگتا شادی۔ ہمارا دودن میں کھٹ پٹ ہو جائیں گا۔ دھرمیز پوچھک جاتی ہے۔ لاکھ بھیل کر صاحب کے پیڑ کے پاس پہنچے جاتے ہیں۔ آنکھوں میں دھمی اور آواز میں ملافت آجاتی ہے۔ ہم کو تہا سنے مانگتا ہے صاب۔ کھٹ نہیں مانگتا۔



تم تو تنہا رہے پاس آیا تھا۔ کیم صاحب پر دھماکا۔ چھوکر چلا جائیں گا۔ ہم یہاں رہتا ہوتا تو تم کو کوئی پیچیدہ نہیں ہوتا۔  
صاحب۔ رانگیوں سے غلہ بھر اس کے گناہ سینے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جو ریز کے کونے کو دبا گئے جا۔ ابے ہر بنس پڑتے ہیں،  
تم یہاں رہتی تو ہمارا جیسا بھی برا ہوتا۔

آیا۔ تم کیا رہے صاحب!  
صاحب۔ رہے تو رہا سابق اپنا کام شروع کرتے ہوئے، لو اب جاؤ کھانا دانا کھاؤ پھر جانا  
آیا۔ تم یہاں رہیے گا عاب۔  
صاحب۔ دیکھتے ہوئے، لاں۔  
آیا۔ صاحب آپ مجھے باقہ دوم ہیں یا تو لینے کو مانگتا ہے۔ اتنا گرمی ہے، ہمارے پاس دوسرا ساڑی ہے۔  
صاحب۔ رہے تو رہا کام کرتے ہوئے، تو کیا کہہ رہے تھے؟  
آیا۔ تو ڈول ہے صاحب۔  
صاحب۔ جاؤ تھاؤ۔

ر آیا مسکرائی ہوئی چلی جاتی ہے)  
صاحب۔ لا حول ولاقوة، یہ آیا بھی خوب ہے روکر کو آواز دیتا ہے، جگدیش جگدیش۔  
روکر آتا ہے)  
دیکھو وہ آیا نیچے نہانے لگی ہے۔ کھانا نہیں کھائے گی۔ دل چینگ قسم کی حور ت ہے۔ باتوں میں نہ لگے رہنا۔ کھانا دانا کھلا کر  
ساد کام منا دینا۔  
دکھ چھوڑ کر ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے انگریزی لیتے ہیں)  
راپنے آپ، مو، نیم اور لمبا دیوان یوں ہی اس کے نیچے نہیں مرتے۔  
ر آیا دروازے میں جھانکتی ہے،

آیا۔ صاحب۔  
صاحب۔ کہو۔  
آیا۔ کوئی صاحب کا ٹکڑا ہر تو دیو صاحب۔  
صاحب۔ صابن۔  
آیا۔ پسینہ بہت ہے صاحب۔ کڑا دھونے کا بر تو بھی چلیں گا۔  
صاحب۔ روکر کو آواز دیتے ہیں، جگدیش!  
جگدیش۔ دیکر گراؤ ڈھیں، جی  
صاحب۔ اور ہمارے صابن دانی میں صابن کا چھوٹا ٹکڑا ہے لاؤ۔

- جگدیش - ربیک گراؤ نہیں، جی لایا۔  
 آریا - صاحب اس ٹائم تو اور دھوپ بڑا ہے۔ ہم کچھ دیر اور بالکونی میں آرام کروں۔ شام کو ہم چلا جائیں گا۔  
 صاحب - رہستہ کام کسے ہوئے؟ اچھا۔  
 (جگدیش صاحب کا ٹکڑا لاتا ہے)  
 صاحب - آریا کو دوڑ آیا ہے، چلیں گا۔  
 آریا - چلیں گا صاحب۔ ہم ابھی ہاتھ لے کر آئے۔  
 (چلی جاتی ہے۔ لمبی سانس بھر کر صاحب اُٹھتے ہیں)  
 صاحب - دیکھو جگدیش ہم ابھی دفتر جاتے ہیں۔ کھانا ہم وہیں کھا لیں گے۔ تم شام تک، سب کام ختم کر دو اور کل دیرانچا تک کچھ باقی نہ رہے آریا کے ساتھ ہاتوں میں نہ لگے رہنا۔  
 (چلے جاتے ہیں، پردہ کچھ لمحوں کے لیے گرتا ہے پھر اُٹھتا ہے۔ ٹھڑی میں بارہ بج رہے ہیں صاحب جلدی جلدی داخل ہوتے ہیں اور آستے ہی نوکر کو آواز دیتے ہیں:  
 جگدیش:  
 جگدیش - ربیک گراؤ نہیں، جی آیا۔  
 صاحب - ایک پانی کا گلاس لاؤ۔  
 (ٹکلیوں سے بالکونی کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی زندگی کا نشان ہے یا نہیں۔  
 پھر فاعلوں میں ڈھونڈ کر ایک خالی نکالتے ہیں۔ نوکر پانی لاتا ہے۔)  
 صاحب - رہائی کا گلاس لیتے ہوئے، جلدی میں یہ خالی یہیں رہ گئی رہائی کا گھونٹ پیتے ہیں کھانا کھلا دیا آیا؟  
 جگدیش - جی وہ تو پل گئی۔  
 صاحب - چلی گئی؟  
 جگدیش - اسی وقت آپ کے جاتے ہی۔  
 صاحب - کیوں؟  
 جگدیش - ذرا ساتیل مانگنے آدھ پائی۔ آپ کو نہ دیکھ کر ہوئی۔ صاحب کو بھر گیا، میں بولا دفتر بولی۔ کب آئیں گا؟ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ میں اسی وقت چلی گئی۔ نہ اس نے غل کیا نہ کھانا کھایا۔ یہ روپیہ دے گئی ہے۔ کبھی تھی۔ ہم سمجھتا تھا صاحب گھر گیا میں نے کہا کھانا تو کھاتی جاؤ۔ بولی۔ ہم کو میں مانگتا ہے کھانا۔ جلتے جاتے ہوئی تھی۔ یہ کیسا صاحب ہے؟  
 (صاحب گلاس لاتے ہیں یہ بالکونی کے خدا میں ٹپک رہے ہیں۔ جب پردہ پھر گر جاتا ہے۔)

# اصفہان کے تکبند

(ایک ریڈیائی تمثیل)

## سید امتیاز علی تاج

معرزہ امین، اسلام علیک، مزاج شریف، خالق ارض و ماسے جب سے یہ کائنات پیدا کی ہے، اس آدم کو وہ ستریں کبھی نصیب نہیں ہوئیں جو آج اصفہان میں میسر ہیں اس، ویاوختن و عشق میں کسی شخص کا آئینہ خاطر رنگ آلود نہیں۔ ہمیں اس قدر ستریں حاصل ہیں کہ اگر ہم قصداً غفلتیں ہونا چاہیں جب بھی نہیں ہو سکتے۔ اب مجھے دیکھئے آج، ایک ایسی پریشانی کا سامنا ہے کہ میرے دل کی محبت سے رخصت طلبہ کرنے پر مصر ہیں۔ پرکشتا ہوں البسور نے اور لائے دائے کرنے سے کیا حاصل؟ قہر یہ ہے کہ میں ایک ایسی سید سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس کے دیدار سے میری آنکھیں بہرہ یاب نہیں ہوئیں۔ آپ کا تشاہیر یہ معلوم ہو گا کہ محبت کا مقدس جذبہ محض دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتا یہ آگ بھی کبھی گفٹا رستے میں بدھک اٹھا کر فی ہے۔ چنانچہ اگر ایک سناوا اپنی محبوبہ کی صورت دیکھے بغیر محض اس کے نام پر خدا پر خدا ہو جائے تو آپ اس بچائے کو قصور وار کیونکر ٹھہرا سکتے ہیں؟ رباعی نوخیز میں نے لکھ لی لیکن سوال اب یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کے باپ کی دوسری شریک کی پوری کی جائے؟ آخر تاج ہے۔ ساقی ہی یہ پتہ بھی لگا دی کہ جو شخص اس غافلہ میں شریک ہو نا چاہے رباعی کے ساتھ چاندنی کے دن دینار بھی پیش کرے۔ یہاں لے دے کے ساری پونجی صرف یہ ایک دینار ہے۔ افسوس کہ آپ اسے دیکھنے سے معذور ہیں ہر حال اب فکر ہے تو یہ کہ کیا افسوس پڑے کہ بھونکا جائے جو اسے ایک کے دس دینار فراز آنے لگیں؟ خیر یہ شہ سے ہی ہوتی آئی ہے، کچھ مجھ ہی پر موقوف نہیں۔ بڑے بڑے اہل مال آشفقتہ حلال چہرے ہیں نہ سیدیت پر ہے کہ آج کل کا رونا بار مندا ہے۔ دکان پر اسے لگا ہک نہیں آتے جن سے نو دینار کمانے کی امید ہو سکے لیکن نعمت کا شوق کرنا محضوں کا شیعہ ہے۔ کاتب تقدیر سے کچھ بکھر دیا ہے ہو کر رہے گا۔

(مزید حق کے ساتھ شاد کمال داخل ہوئے)

حکاج : اخاہ آتائے شاہ کمال، خوش آمدید! اگر مجھے معلوم ہو جانا کہ غریب خانے پر آپ قدم رنجہ فرماتے والے ہیں تو میں سارے فرش پر گلاب دیا سین بکھیر دیتا۔ لیکن آپ نے اپنی تشریف آوری کی اطلاع ہی نہ بخشی۔ کیوں خیر نہ آج!

- حضور نے اپنا تنور اس قدر جلایا کہ بکریوں کو بھڑکا دیا؟  
**شہ کمال:** اے کوہ دانش! اے سلطان انظم! بھی ابھی کچھ نیچے ہوئے ہیں نے سنا کہ اصغیان کے متول سوداگر ابن مسیم نے اپنی جہاں دختر کی شادی کر دیئے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا صحیح ہے؟
- حلاج:** ماشاء اللہ! آپ کی سماعت میں اب تک کوئی حیب پیدا نہیں ہونے پایا۔
- شہ کمال:** یہ بھی سنا کہ جو شخص اس کے جمال جہاں آرا کی تعریف میں بہترین رباعی کہہ کر لائے گا وہی اس کا شوہر قرار پائے گا۔
- حلاج:** لیکن میرے محسن اس کے ساتھ بعض شرطیں بہت کڑی بھی ہیں۔
- شہ کمال:** میں بھی تو سنوں وہ کیا ہیں؟ اگر چند اشعار کے عوض جوہری کی کافر ماجرا دختر لے آئے تو، اور چاہئے کیا؟
- حلاج:** رباعی غریب آفتاب سے پہلے تیار ہو جانی چاہئے۔
- شہ کمال:** معمولی بات ہے۔ مجھے ایک گھنٹے کی فرصت ہے اتنی دیر میں چار مصرعے کہہ لینا کیا بڑی بات ہے۔ ارے برادر ایک شیخ کے ہاں ضیافت تھی۔ اس ناچیز نے ضیافت کا سارا کھانا گھنٹہ بھر میں تیار کر کے رکھ دیا تھا اور پھر لطیف یہ کہ ہر ایک کی قطع اور گفت کسی نہ کسی پھول سے مشابہ تھی۔ چنانچہ اس کا نامہ پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔ کیوں ہے نا تو صرف رباعی ہی کہنی ہے؟
- حلاج:** ایک شرط یہ بھی ہے کہ تانیہ میں لڑکی کا نام آئے اور اس طرح لایا جلسے جس طرح جوہری نند و موتی کے نگینے کے ارد گرد اور چاندی کے بیل بوٹے بنا دیتا ہے۔
- شہ کمال:** یعنی دیئے ہی نا جیسے سانچوں میں نان پاؤ تیار کئے جاتے ہیں۔ اے کوچے تو شعر سوچنے بھی لگے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا دماغ کے تنور سے اشعار کے خستہ شیرمال نکلے آ رہے ہیں۔
- حلاج:** یہ بھی ضروری ہے کہ رباعی نہایت پاکیزہ و خوش تعلیق میں لکھ کر پیش کی جائے۔
- شہ کمال:** یہ البتہ ٹیڑھی کھیر ہے تم جانتے ہو لکھنا مجھے آتا نہیں۔
- حلاج:** اس خدمت کے لیے میں جو حاضر ہوں۔
- شہ کمال:** دہم کیا لوگے؟
- حلاج:** آتا اس خاکسار کو چاندی کا ایک دینار دے دیجئے۔ ایسے پاکیزہ خط میں نظم لکھ دوں کہ لوگوں میں ایک بار تو چومگیکیاں ہونے لگیں کہ ہاں بھی شہ کمال کی رباعی واقعی باہر سیمیں کی نظروں سے گزرنے کے قابل ہے۔
- شہ کمال:** منظور۔ یہ تو دینار۔ جو کچھ کہا ہے، تو یہ معاوضہ زیادہ نہیں کہا جاسکتا۔ تو گویا اب رباعی کی طرف توجہ کی جائے اور نہایت لطیف اشعار کہے جائیں۔ ذرا مجھے فکر کرنے دو۔ ہاں تو یوں کہنا چاہئے۔ تو شیخ ہے، میں پروا نہ بڑا
- حلاج:** مگر ایک بات اور۔
- شہ کمال:** یا رقم تو پریشان۔ کئے دیتے ہو بڑھا اور کیا چاہتا ہے۔ کہہ ہی چکو۔
- حلاج:** رباعی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی دیتے ہیں۔

شہ کمال: حرمیں پیر فرقت۔ مگر پردہ نہیں، دس دینا رہی ہیں۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ جی جمع ہوں اور پڑا رہے تو بھول! بھول! بھول!  
لاحول ولا قوت۔ غارت ہو گیا سارا خیال۔ کیسے تھا؟  
(گھنٹی بجتی ہے)

حلاج: کون ہے؟  
آواز (باہر سے): میں ہوں علاؤ الدین عطر فروش!  
حلاج: اندک تشریف لے آئیے۔

(علاؤ الدین داخل ہوتا ہے)  
حلاج: آج تو میری قسمت کا ستارہ زوروں پر ہے اگرچہ آپ کے عطر کے قرابوں سے گلاب کی بو سننے والا دیر کے بھیکے اٹھتے ہیں لیکن مجھے اس وقت اس شخص کا خیر مقدم کرنے کی سعادت حاصل ہے جس کی باتیں عطر سے بھی زیادہ نکلت ہیں۔  
علاؤ الدین: اگر یہ صبح ہے تو یوں کہنا چاہئے کہ قدرت لطیف کاموں کے لیے ان ہی لوگوں کو منتخب کرتی ہے جنہیں سعادت ذوق کی نعمت عطا ہوئی ہے لیکن ذرا دیکھنا یہ ان حضرت کو کہا ہو گیا؟ میرے خیال میں تو ان کی حالت اندیشہ ناک سی ہے۔

حلاج: یہ شہ کمال نانبائی ہیں۔ آپ نے یقیناً انہیں بارہا دیکھا ہوگا۔  
علاؤ الدین: میں نے، لاحول ولا قوتہ الا باللہ۔ میرا ان سے کیا واسطہ، لیکن یہ تو فرمائیے یہ ایسے دشمنانہ انداز میں کیوں گھڑم رہے ہیں؟

حلاج: یہ اس وقت بھر نظم میں غرق، قافیہ کی موجوں کے تھیلے کھا رہے ہیں۔  
علاؤ الدین: کیا کہا، بھر نظم میں غرق؟ نانبائی میں شاعری کی روح کہاں سے آئی۔ کہیں انہیں بھی تو یہ ضبط نہیں ہوا کہ رباعی کہہ کر ماہ سیمیں پری جمال دوزخہ کو حاصل کیا جائے؟ کیا خوب بھگپندر کے سر میں چیمیل کا تیل۔  
شہ کمال: اور بھی یہ کیا شور مچا رہا ہے تم نے۔ اٹھاہ تم ہو میرے دوست علاؤ الدین! وہ اس شیر مال کے دام آج تک ادا ہونے کا ذبت نہیں آئی۔ یاد ہے نا؟ لاحول ولا قوتہ! مصرع ہی دماغ سے نکل گیا تھا۔ کیا تھا۔ یہ گلہائے.....  
علاؤ الدین: کتنا فرسودہ اور پامال خیال ہے۔ جیسے اس شخص کے شیر مال پھیکے اور بے مزا ہوتے ہیں ویسے ہی اشعار بھی بے کیف ہیں۔ لیکن حلاج پہلے میں اپنے یہاں آنے کی غرض دعائیت بیان کر ڈالوں۔ معلوم ہوتا ہے بوڑھے جوہری کے ضبط کا قفقہ تم نے سن لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ابن حسیم خود تو بالکل کوراسے لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا لیکن بوڑھے کو اس بات پر بڑا ناگ ہے کہ اس کی بیٹی ماہ سیمیں.....

حلاج: میں جانتا ہوں یہ اشعار ماہ سیمیں پڑھے گی۔  
علاؤ الدین: بالکل ٹھیک۔ چنانچہ اگر اپنے اشعار میں تم سے لکھواؤں تو اس کا معاوضہ تم کیا لوگے؟  
حلاج: دو دینار!

علاؤ الدین : دونیں بھائی ایک ۔ کامیاب ہو گیا تو سارا بٹوہ تمہارا ۔

حلاج : منظور !

شہ کمال : ( بھائی کو ہٹے ہوئے ) میرا فانیہ تنگ ہو گیا ہے ۔ شعر سو جھٹتا نہیں ۔

علاؤ الدین : تو اب سوال یہ ہے کہ اشعار لطیف ہوں یا جذبات سے لبریز ہوں یا مشکل ہوں ۔

حلاج : تین دینار تو ہو گئے ۔ شاید باقی سات بھی کہیں سے مل رہیں گے ۔

شہ کمال : یہ گھماٹے رنگا رنگیں ۔ یہ گھماٹے رنگا رنگیں ۔

علاؤ الدین : حلاج ! یہاں میرے لیے شعر کہنا ناممکن ہے جب ایک ایسا عجیب غریب انسان اس ہمیت کذائی کے ساتھ شاعری کا

خون کر رہا ہو تو بھلا کوئی شریف آدمی شعر کیونکر کہہ سکتا ہے ؟

حلاج : آپ کہاں لکھنا پسند کریں گے ؟

علاؤ الدین : کوئی نرم اور گدگدی سی جگہ ہوتی یہاں گدیے بھی تو نہیں ہیں ۔ ارے میاں تم کیا آدمی ہو ۔ درویشوں کی طرح زندگی

بسر کرتے ہو ۔

حلاج : آپ یہاں تشریف رکھتے نا ۔

علاؤ الدین : ہوں ۔ خیر لیکن ایک بات سُنا ۔ اگر کوئی اور آئے تو اسے میرے قریب نہ بٹھکنے دینا ۔ میرا دماغ بے حد حساس ہے اور

اثر بڑی جلدی قبول کرتا ہے ۔ پھر میرا ذوق بھی بے حد لطیف و نازک ہے ۔ کوئی غیر فصیح لفظ سُن پاؤں تو ذہنی کوفت

ہوتی ہے اور اگر کسی احمق کا منہ کھلے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر تک طبیعت سکندر جی رہتی ہے ۔

حلاج : الہی تیری پناہ !

علاؤ الدین : تو اب میں شعر کہتا ہوں ۔

( گھنٹی کی آواز )

حلاج : کوئی اور صاحب تشریف لائے ۔ ارے یہ تو حجامت مآب جناب سلیمان حجام ہیں ۔

سلیمان : ( بھاگتا ہوا آیا ہے اس لیے ہانپ رہا ہے ) اماں حلاج سنا تو نے بوڑھے جوہری کا نفعہ جب ڈھنڈورچی پر خبر لے کر

میرے کوچے میں پہنچا تو میں خط بنانا بنانا اٹھ کر اس طرح بھاگا جیسے شیطان جہنم سے نکل کر بھاگے ۔ سارے شہر میں اس

تفعے کا چرچا ہو رہا ہے اور یہ دو شیزہ ہے بھی تو حرم سرائے سلطانی کی زینت بننے کے قابل ۔ اے بھائی تمہارے

دھم دگمان میں تو اس کی انگشتیوں کی صحیح قیمت بھی نہیں آ سکتی ۔ ان کے ٹیکنے اتنے بڑے ہیں کہ .....

حلاج : خدا کے لیے بات کر تے وقت اپنی قبچھی کو یوں نہ گھمائیے ، آپ میری آنکھیں نکال ڈالیں گے ۔

سلیمان : میں تو کہتا ہوں یا رب یہ بیداری کا عالم ہے یا خواب و خیال کی دنیا ۔ میں اس قدر سرور ہوں کہ بچپن کے زمانے کی

طرح ناپسنے کو جی چاہتا ہے ۔ سنو ! میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں ۔ معاوضہ نقد نقد ، جی چاہے پیشگی لے لو اور

اگر تمہیں میں نے اس معرکہ میں فتح پائی اور ماہ سپہیں میرے ہاتھ آ گئی تو قسم کھاتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے اس تجاہلی کے

پیشے سے دست بردار ہو جاؤں گا تو وہ اب میرے شعرا کی بات ہوں اور تم فوراً نہیں کہہ سکتا۔  
 مکی میں سے آواز: اسے بد معاشی نکل باہر کہاں؟ کو چھپ بیٹھا ہے حلاج، سلیمان اندر ہے نا؟  
 سلیمان: دیکھو اگر، یہی ہی کہ بخت یہاں آپہنچا۔ جب ڈھنڈو دہری آیا تو میں اس وقت تک غمت کی دھجی ڈھانسی ترش ترش پرکا تھا۔  
 (گلکیش داخل ہوتا ہے)

- حلاج: خوش آمدید گلکیش!  
 گلکیش: لیکن تم سدا کیوں رہتے ہو؟  
 حلاج: کیونکہ آج بڑی مدت کے بعد آپ کی زیارت ہوئی ہے۔  
 گلکیش: وہ ربوہ کج بخت حجام کیوں بے بد معاشی پر کیا حرکت مٹی؟ آدمی ڈھنڈو آدمی تراشش کو اٹھ بھاگنا۔ شہر کے باب معزز آدمی کو اچھا خاصا مسخرا بنا ڈالا۔ میں اس ہلاکی گرمی میں سوانگ بنا، لگی کوچوں میں سے بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ ادھر تو آئے۔ تجھے بھاگنا سکھاؤں۔  
 حلاج: اہی حضرت ایسا بھی کیا غصہ، ذرا بات تو سنئے۔ سلیمان بُرا آدمی نہیں، البتہ دل کے باخون مجبور ہے، وہ پھر اس وقت ذرا فکر شعر میں بھی مصروف ہے۔  
 گلکیش: کیا کہا شعر؟ ایک بار اس کی ناک میرے ہاتھ آجائے تو اسے سکھاؤں شعر کہنا۔  
 علاؤ الدین: اسے بھی یہ کیا عیب ہے۔ وہ ان کہہ: اس جھکی کو یہاں سے۔  
 شہ کمال: اے نو۔ اتنی دیکھ کے بعد ایک ہی لفظ سوچا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔  
 سلیمان: قبلہ آپ کی باقی ڈھنڈو میں پھر کسی دن تراش دوں گا۔ اس وقت آپ کو معلوم نہیں میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔ مجھے معاف فرمائیے۔  
 گلکیش: ہیں؟ کیا کہا؟  
 حلاج: میں نے کہا حضرت ذرا بات تو سنئے۔ میں نے سنا ہے آپ بڑے کاروباری شخص واقع ہوئے ہیں۔  
 گلکیش: تو پھر؟  
 حلاج: آپ بھی وہی کیجئے ناجویر لوگ کر رہے ہیں۔  
 گلکیش: کیا میں بھی شعر کہوں؟ میں اور شعر؟  
 حلاج: چار مصرعے ہی تو کہنے ہیں۔ خبر آپ نے سن ہی لی ہوگی۔  
 گلکیش: وہی ابن حسیم کا قصہ۔ جی ہاں! یہی ناکہ وہ اپنی لوکی چند شعروں کے عوض بیچ ڈالنا چاہتا ہے۔ ناجائی ان دنوں جو رو پر بہت روپیہ صرف ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی استعداد کہاں۔  
 حلاج: غالباً آپ نے یہ نہیں سنا کہ جہیز میں سناؤنٹ بھی ہاتھ آئیں گے۔  
 گلکیش: کھجے! تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا یہ بات ہے تو میں اس لڑکی کو جیت کر رہوں گا۔

حلاج : بالکل نہیں رہا مگر معنی میں تو پڑے گی۔

گلہبش : نکلنے کی بات دیر سے ہے۔

حلاج : ایک دینار صرف کیجئے تو یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔

گلہبش : اکٹھا ایک دینار۔ یہ تو بہت ہے، نصف دینار کہو۔ اس نصف دینار۔

حلاج : لیکن پاکیزہ، شاعر اگر پاکیزہ خط میں نہ لکھے گئے تو حاصل کیا ہوگا۔

گلہبش : اچھا تو پھر یوں ہی سی۔ یہ تو دینار۔

حلاج : یہ خیال بھی تو سچے ناکر دو کی کے ساتھ ودات کہنی ہاتھ آئے گی۔

علاء الدین : شکر ہے، چلو۔ کسی قدر سکون تو نصیب ہوا۔ تو اب سب سے کافر کوئی نیا اور شک نہ قائم نہ تلاش کر میں۔ ابجد سے قافیہ کی تلاش شروع کرنا چاہئے۔ سیں، آئیں۔ فرسودہ اور پامال قافیہ ہے۔ پائیں۔ نگین، سنگین، شیریں، غمگین۔ نگین اور غمگین اچھے تالیف ہیں، پہلے قافیہ مقرر کر دینا چاہئے۔ خیال خواہ پست ہو اس کی پروا نہیں۔ شاعری کی جان الفاظ کا ترف اور آہنگ ہے۔

گلہبش : (دور سے) اماں علاؤ الدین تم نے تو سفر چاٹ ڈالا۔ جہاں کوئی موزوں ترکیب سوچتی ہے تم اسے غتر ہو کر دیتے ہو۔

سلیمان : کان نہ کھاؤ گلہبش۔ میں اپنی رباعی دل میں دہرا رہا ہوں۔

شہ کمال : اگر بانی ہے تو آپ حضرات کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لیں۔

علاء الدین : یہ مصرعہ دیکھ رہے کاغذ تیرے بلبلیں گاتی ہیں تیرے دسٹے رنگیں کا۔

شہ کمال : سوچ گیا۔ بالکل سوچ گیا۔ سچ نہیں ہے علم بلبل کو ذرا الفت کے آئیں کا۔

علاء الدین : (دراڑ کر) کیا کہا تم نے؟ نہیں ہے علم بلبل کو؟ یہ ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ بلبل کا خیال میرا ہے۔

گلہبش : اتنا ٹکڑا تو ہو گیا۔ کہاں بلبل کہاں نغمہ۔

علاء الدین : تم سب کے سب چور ہو۔ یہ ساری بلبل چوروں کی ٹولی ہے۔

حلاج : آئیں آئیں کیا ہوا انہیں۔ شاعر اور عاشق اور اس پر یہ کیفیت کمر غموں کی طرح لڑ رہے ہیں۔ اس خشک اور سوختہ دنیا میں

شاعر تو ابد رحمت کی طرح ہیں۔ جو خدا کی دنیا کو سیراب و شاداب بناتے ہیں۔ پھر شاعروں کا رہنا مجھڑا کیا معنی؟

سلیمان : (چانک) حلاج، گلہبش، شہ کمال، علاؤ الدین! میں نے رباعی کہہ لی۔

علاء الدین : نہیں نہیں پڑے اس تفسیر کا فیصلہ ہونا چاہئے۔

سلیمان : اماں چھوڑو اس قصے کو۔ جو حلاج تم میرے شعر قلمبند کر دو۔ دیر کی تو میں بھول جاؤں گا۔

کہیں خوشبو ہے۔ بچاں کی کہیں ہے رقص نرسی کا

کہیں بلبل کے .....

علاء الدین : کیا کہا بلبل؟ یعنی تم نے بھی میری بلبل کا خیال چرایا۔ چچا جان کی ریش دمان کی قسم یہ دنیا ٹھکوں سے بھری ہوئی ہے۔



سیمان : کیوں بلبل کے ٹھیکیدار آپ کیسے بن بیٹھے ؟

علاؤ الدین : یہ لفظ پہلے مجھے سوچا تھا۔

شہ کمال : سنا آپ نے حالانکہ سوچا مجھے پہلے تھا۔

گلیش : کہتے مروجی۔ یہ لفظ میرا ہے۔

حلاج : یہ کس خاک جو تک میں بیٹھے آپ لوگ۔ وقت غلوڑا رہ گیا ہے۔ یہ نہ میں نے کہ آسمان کی بلندیوں پر چاند اگرچہ ایک ہی لگتا ہے لیکن اس کو پرستار ہر بار میں موجود ہوتا ہے جو راتوں کے سائے میں اس کی تعریف کے گیت گاتا ہے۔

سیمان : والدہ کی بات کئی ہے۔ اوی عقلند ہے مجھ سے پوچھو تو سب سے بڑے شوق سے اس لفظ کا استعمال کریں۔ الفاظ پر کسی کے باپ کا اجارہ ہے ؟

علاؤ الدین : لیکن مجھے اس سے انکار ہے۔ میں یہ نہیں مانا کرتا۔ میرا ایک معنائ ہے کہ الفاظ کے وہ لے اور ان کی تکرار سے حسن کلام کا خوں ہوتا ہے۔

سیمان : حلاج اس معاملے سے تمہارا کوئی ذاتی تعلق نہیں اس لیے تم ثالث بن کر یہ جھگڑا چکا دو۔

شہ کمال : میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

گلیش : اور میں بھی۔

علاؤ الدین : اور میں بھی۔

حلاج : یہ تو بڑی سیدی سی بات ہے۔ آپ کے اشعار خواہ وہ پر کی طرح روشن ہوں خواہ خام کی تاریکی کی مانند سبک اور لطیف،

یاناہ دی بھری مات کی طرح پڑھنے کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن ان میں فلسفہ ایسے الفاظ کا بازو دیجے جن میں منہل و ریحاں اور مشک و عنبر کی شمیم جاں حراز کا ذکر ہو اور کائنات گلخانے رنگا رنگ سے تختہ گلزار نظر آئے۔ نگہ کی نگاہ بلی بھی اور سوس کی زباں درازی بھی۔ اس میں طبیعت خوش الحان کا نام بھی لائے قری۔ فاختہ، طوطی اور طاووس کا ذکر بھی کیجئے۔ لیکن بلبل ہزار داستان کا نام بھی نہ لیجئے۔

علاؤ الدین : یعنی کوئی بھی بلبل کا ذکر نہ کرے ؟ اس طرح تو میں خسارہ ہی میں رہا لیکن اچھا تم کہتے ہو تو یوں ہی سمی۔

سیمان : تو پھر فیصلہ ہو گیا نا کہ بلبل کا نام اشعار میں نہ آئے گا۔ یوں ہی سمی۔

(پھر سب بیچ کر شعر کہنا شروع کر دیتے ہیں)

حلاج : (دینار گنتے ہوئے) : ایک، دو، تین، چار، پانچ، ————— دنیا میں مجھ سا بد قسمت بھی کوئی نہ ہو گا۔ تاجروں سے

سنا ہے کہ پانچ اور پانچ دس ہوتے ہیں۔ باقی رہے پانچ دینار۔ اب وہ کیونکر حاصل کئے جائیں (سما معین سے مخاطب ہو کر) اسے سننے والو! معلوم نہیں یہی جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی تعریف میں مجھ سے اچھا شعر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن افلاس بہت بڑی لعنت ہے۔ اب اتنا وقت بھی تو نہیں رہا کہ وہ یہ کہیں سے چڑا کر ہی لے آؤں۔ اچھا اگر میں اسے اپنا نہیں بنا سکتا تو اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ اگر وہ میرے ہاتھ نہ آئی جب بھی یہ آفتاب

کی روشنی، ذول اور زمین میں پریم رہتے ہیں، چول اور شعر تو کہیں نہیں گئے۔

**سیلمان :** ( نہایت بلند آواز سنہ ) ہو گئی رباعی۔ حلاج جلدی کرو۔ نکالو قلم اور کاغذ۔ اشعار سیلاب کی طرح بہے چلے آ رہے ہیں اور میری مدح کے نفس کی تیلیاں تو ڈر کر بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ جلدی کرو ورنہ ان کے پاؤں میں حروف کی زنجیریں ڈال دو۔

**حلاج :** تیار رہوں، جو!

**سیلمان :** سہ آغوش میں ترسے دیکھا ہے میں نے محل پر دیں کا

نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دیں کا

مجھے اس رفعت بے کیف بے لذت سے کیا مطلب

**شہ کمال :** آہا ہا ہا کیا خوب رباعی ہے۔ حلاج کھنڈیر اشعر جلدی سے کیا، بلا مضبوطی؟

**سیلمان :** مجھے اس رفعت بے کیف بے لذت سے کیا مطلب

**حلاج :** اسے ہماری شہر میں دونوں ہاتھوں سے نہیں لکھ سکتا۔

**گلہبش :** اے سبحان اللہ یہ تمام اک مرکب سنبھل دیر چاہی و نہ رہی کا۔

**علاؤ الدین :** اماں ہنڈوان چوروں کو ان کی نہ سنو۔ میرے شعر لکھو۔

**سیلمان :** میں نے کہا تھا ”مجھے اس رفعت بے کیف بے لذت سے کیا مطلب“

**علاؤ الدین :** ترا پیکر سہارا ہے میرے احساں غلگلیں کا

**گلہبش :** ترا جسم اک مرکب سنبھل دیر چاہی و نہ رہی کا

**شہ کمال :** جہاں عشق و قوت میں گزر گیا طلق و غمیں کا

**سیلمان :** مری آنکھوں پر منڈلاتا ہے پر تو ماہِ سیمن کا

**حلاج :** یار و ذرا بے کو کھڑے ہو۔ مجھے تو پسینہ آنے لگا۔ افوہ کتنی گرمی ہے سینوں میں شاعری کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ایک ایک کہنے کو۔ سیلمان پہلے تو اپنی رباعی لکھ دو۔

**سیلمان :** آغوش میں ترسے دیکھا ہے میں نے محل پر دیں کا

نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دیں کا

مجھے اس رفعت بے کیف بے لذت سے کیا مطلب

مری آنکھوں پر منڈلاتا ہے پر تو ماہِ سیمن کا

**حلاج :** واہ سبحان اللہ! کیا ولفش اشعار ہیں۔ اسے کا شہیر اشعار میرے ہوتے۔

**علاؤ الدین :** اماں رہنے دو، تم انہیں دلکش کہتے ہو، خدا کی پناہ میں تو سمجھتا ہوں نہایت بھیسے شعر ہیں۔

**سیلمان :** کیوں بے چہرے ہیں بجائے اشعار؟

**علاؤ الدین :** ارے چھوڑو میرا کان۔

حلاج : شہنا کمال ابستم اپنی شاعری کے تورو کا دھکا اٹھاؤ۔ دیکھیں الفاظ کے کچے تیار کرنے میں تمہیں کتنی مہارت ہے۔  
شہ کمال : عجز کرتا ہوں۔

تخیل سے سرے کیا۔ اسعد شہباز و شاہی کا جہاں محض دوستی میں گزر گیا طبع و تخیل کا  
اسی دن زندگی کو زندگی کہہ کر بکاردن کا سرسہ ہاتھوں میں ہو گیا ہاتھ چین ماہ سیل کا  
حلاج : کیا کہتے ہیں۔ واہ، واہ، واہ !

علامہ الدین : شاہ کمال ایک بات میری سزا کرنا چاہیں تو تو چرخہ مرہ بدل ڈالو۔  
حلاج : گلکش آگے آؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔

گلکش : کہتا ہوں کہ  
تو جسم اک مرکب نسل و ریحان و نسریں کا بیاں میں کیا کروں تیرے جمال لذت آگین کا  
میں سچ کہتا ہوں پانی کی طرح سونا بساؤ دنگا بس اک بیل کے لیے جلوہ دکھاؤ ماہ سیل کا  
علامہ الدین : ان اشعار میں دولت کا تذکرہ ضرورت سے زیادہ ہے۔

حلاج : اماں تو کسی کو بھی داد نہ دو گے۔ اچھا اپنے اشعار سنناؤ۔  
علامہ الدین : تمہارا امر اسے تو نکار کیسے کر سکتا ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ جو کچھ کہتا ہے وہ ارادوں میں کہا ہے اور اس بار کے قسم  
بلند پیرشہر کو ایک ایک صدمہ پر پڑا پورا ہفتہ صحت کر دیتے ہیں۔ تو عرض کیا ہے کہ  
تو اپنا رہا ہے۔ مے، حساس، گلکش کا تراخا سنارہ ہے مری شہائے مشکیں کا  
جسے توگوں نے کوٹنے کی پک کہہ کر بکارتا ہوا ہی اڑا تھا بال میرے ماہ سیل کا  
شہ کمال : چہوتہ کا سب تخیل ہے۔

سلیمان : اے شہ کمال، ایک خیال۔  
گلکش : میں تمہیں یہ چڑی ہے کہ کلمہ چینی کر کے دوسروں کے اشعار درست کر رہے ہو۔ وہ بے دویوں ہی وقت تھوڑا ہے مجھے اب  
دس دینار لانے کے لیے جانا چاہیے۔

سلیمان : میں بھی جاتا ہوں۔ چلو سب اپنے اپنے گھر چلیں۔  
شہ کمال : خدا حافظ حلاج، جم بھی آتے ہیں۔

(سب جاتے ہیں)

حلاج : اب شمعیں روشن کر دوں؟ نہیں جب دن بھر کی گرمی کے بعد رات اپنے نازک پردہ دنیا پر پھیلا دیتی ہے تو ارمان بھرے  
دل کی حرکت مدغم پڑ جاتی ہے اور غم بھی شہری معلوم ہوتا ہے۔ شمعیں خاموش ہی رہنے دوں۔ لیکن حلاج اب ان خیالات  
کو چھوڑ۔ یاد دلاؤ بلا اندر اپنے خفیہ جھوٹے کو اپنی محبوب کی آمد کے لیے آراستہ کر۔ الٹی فردوس اور جہنم میں کتنا  
کم فاصلہ ہے۔ سخی بھر سونا ہے جو جنت کی زمینوں اور دوزخ کی اندیتوں کو جدا کرتا ہے۔

شہ کمال : دور سے آہستہ سے علاج !

حلاج : کون، آپ؟ دوسری بار کہئے تشریف لائے؟

شہ کمال : ذرا آہستہ ہو۔ میں نے کہا کرے میں تمہارے سوا کوئی دوسرا تو نہیں؟

حلاج : نہیں۔ یقینی نہ آئے تو شمع روشن کئے دیتا ہوں۔

شہ کمال : نہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے فوراً کہے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں ماہِ سیحیں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اب میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میرے اشعار علاؤ الدین کے اشعار کے سامنے تختی کے اعتبار سے پست ہیں۔ د تو بڑا شاعر عظیم، اور مجھے شعر کہنا کون سا شیر ماں تیار کرنا ہے لیکن اگر تم چاہو تو مجھے کچھ امید ہو سکتی ہے تمہارے قلم کی جنبش اس کے اشعار کو کچھ کا کچھ بنا سکتی ہے۔

حلاج : ذرا دیکھیں تو اس کی، باہمی، یہ رہی۔ ایک دینار دو تو ہو سکتا ہے۔

شہ کمال : بس تو میدان مار لیا میں نے، یہ تو ایک دینار علاوہ ازین شادی کے بعد ضیافت بھی دی جائے گی۔

(جاتا ہے)

حلاج : صرف ایک دینار..... اس سے کیا بن جائے گا؟

سلیمان : (آہستہ سے) علاج !

حلاج : کون ہے، سلیمان؟

سلیمان : ہاں میں ہوں۔ اسے بھیا! مجھے تو اپنی ناکامی کا پورا یقین ہو گیا۔ لیکن اگر اس آڑے وقت میں تم کام آؤ تو.....

حلاج : کوئی فکر نہیں۔ میں سمجھ گیا تھا ماہِ سیحیں۔

سلیمان : میں تمہیں بتاؤں کہ ابنِ حیم کو فنِ شعر سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ تو صرف روپے کا بھوکا ہے، چنانچہ مجھے اندیشہ ہے کہ گلیش کے اشعار اسے بہت پسند آجائیں گے۔ اب تم مہربانی کر کے یہ ایک دینار لو اور مجھے اس پریشانی سے نجات دو۔ میں نے جو اشعار لکھے ہیں انہیں اسی طرح رہنے دو، اور.....

حلاج : میں سمجھ گیا۔

سلیمان : گلیش کے اشعار کو مسخ کر دو۔

حلاج : ہو جائے گا بے فکر رہو۔

سلیمان : تو میں چل دیا۔ (جانے کے بعد)

حلاج : ایک دینار اور ہاتھ آیا۔ اگر اسی طرح آج.....

علاؤ الدین : علاج !

گلیش : علاج !

علاؤ الدین : کون ہے؟

**گلیش :** اسے کہیں سے آنے چکے ہیں تو ایک نہایت ضروری کام کے لیے آیا ہوں۔  
**علاؤ الدین :** خوب! لیکن جناب یہ کیوں سمجھ لیا کہ مجھے ضروری کام نہیں ہے۔ جناب ہی کہیں نہیں ذرا سی دیر کے لیے سرک جاتے؟  
**گلیش :** مشکل ہے۔

**علاؤ الدین :** تو جناب میرے لیے آسان نہیں۔  
**حلاج :** ارے رشتے کیوں مڑتے ہو۔ ادھر آؤ اور میری ایک بات سنو مجھے ایک عجیب دل لگی سو بھی ہے۔ یقیناً تم دونوں اس معرکے میں کامیاب ہونا چاہتے ہو لیکن ایک آدمی تین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر تم دونوں ایک ایک دینار صرف کر دو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اتنا معاوضہ لے کر میں تمہارے حریفوں کے اشعار توڑ دوں گا۔ میں آسانی یہ کر سکتا ہوں۔ ایک خط یا حرفت یا لفظ سے سخی کچھ کے کچھ جو جائیں گے۔ زیادہ معاوضہ تو نہیں ایک ایک دینار میں ایسی پری جمال و دشیزہ ہاتھ آتی ہے۔

**علاؤ الدین :** مجھے اپنے ابن عم کی ڈارمی کی قسم، تم میرے اندازہ سے زیادہ عقلمند ہو۔ مجھے منظور ہے، یہ تو ایک دینار۔  
**گلیش :** نہ معلوم میرے سر پر کیا حماقت سوار ہے کہ اتنا کچھ خرچ کرنے پر تیار ہو رہا ہوں۔ بہر حال یہ راز دینار۔  
**علاؤ الدین :** اب میں جب شہ کمال کی صورت دیکھوں گا تو مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے میں چل دیا۔  
 (جاتا ہے)

**گلیش :** (جاتے ہوئے) اب خواہ کامیاب ہوں یا نا کام، سلیمان کی دال تو گھٹنے نہیں پاتی۔  
**حلاج :** (جلد ۱) ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو۔ بس ایک دینار کی کسر ہے، میری سوئی ہوئی تقدیر اس وقت آنکھیں کھول دے۔

(جلدی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے)  
 اماں گلیش پلٹ آؤ۔ بات تو سنو۔ سچ کہتا ہوں کہ تم نے آج تک اس سے زیادہ ہنگامہ سودا کبھی نہ کیا ہو گا۔  
**گلیش :** خود ہی تو میرا یہ بہتھالیا اور بد معاش خود ہی کہتا ہے کہ میں نے اتنا ہنگامہ سودا کبھی نہ کیا ہو گا۔  
**حلاج :** میں کہتا ہوں جس شخص کو عطر سازی آتی ہے وہ بہر آسانی شعر بھی تصنیف کر سکتا ہے۔ یاد رکھو علاؤ الدین شاعر ہے اور تمہارے اشعار کا تیر نشا نہ پر نہیں بیٹھا۔

**گلیش :** تو اگلے میرا سائے کا سارا روپیہ۔  
**حلاج :** تم بھی کسی قدر احمق ہو۔ اے سنا نہیں کہ دوڑ میں جو گھوڑا سب سے پیچھے ہو غریب وہی جیت جایا کرتا ہے چنانچہ اگر میدان مارنا چاہتے ہو تو ایک چرو شاہی اور دلواد۔

**گلیش :** تم کھاکے کتے ہو کہ جس طرح دوسروں کے اشعار سن گئے ہیں اسی طرح علاؤ الدین کے اشعار بھی سن کر دو گے؟  
**حلاج :** قسم ہے تمہاری ڈارمی کی۔ بلکہ یہ تو میں نے اشعار میں رد و بدل کر بھی دیا۔

**گلیش :** بس مرث ایک لفظ کی تبدیلی؟

**حلاج :** صبر کرو۔ جب ماہ سیمیں تمہارے ہاتھ آگئی اس وقت تمہیں میرے الفاظ کی مدد انت معلوم ہو سکے گی۔

**گلیش :** مگر ایک دینار کی رقم بڑی بھاری ہے۔

**حلاج :** تمہاری مرضی میں جانتا ہوں روپے کے معاملے میں تم بڑے سیانے ہو پرتا خیال نہیں کرتے کہ وطن کے ساتھ دولت کتنی ہاتھ آئے گی۔ اسے تم تو تذبذب میں پڑ گئے۔ پھر انکار ہے کیا؟ یوں ہی سہی ماہ سیمیں تہمدادی قسمت ہی میں نہیں۔

**گلیش :** (آہ بھر کر) اچھا جی لے لو۔

**حلاج :** دس پورے ہو گئے۔ تم خود دس پورے ہو گئے۔

**گلیش :** کیا مطلب؟

**حلاج :** آپ کے دستِ کرم پر دس برکتوں کا نزول ہو۔ غم کی تیرگی دھڑ ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند نکل آیا اگر انسانوں کی دنیا و آخرت اس سے آدھی تیریں اور دلفریب بھی ہوتی جیسی آج نظر آ رہی ہے اور شباب اور محبت کا نور ہمارے سینوں کو یونہی جگمگاتا رہتا تو زندگی ایک ایسی لطیف و پاکیزہ نظر ہوتی کہ شاعر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے۔

**گلیش :** تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو گویا ماہ سیمیں کو حاصل کرنے کا خواب تم بھی دیکھ رہے ہو۔

**حلاج :** ہاں مجھے اعتراض ہے کہ میں غفلت پرست ہوں لیکن حقیقت ہے کہ ہم اپنی زندگی کی تعمیر خود کرتے ہیں اور جب ہم شباب کو بھول جاتے ہیں تو زندگی ایک بیگانہ چیز رہ جاتی ہے جیسی سنو آہٹ سن رہے ہو۔ اس کی پائل کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ اس چھوٹے سے کوپے سے گزر کر ہماری جانب آ رہے ہیں۔

(ماہ سیمیں کے عاشق داخل ہوتے ہیں)

اس کے عاشق شاعر آ رہے ہیں۔ خوش آمدید۔

**شہ کمال :** حلاج ہم نے اسے مسجد کے قریب گزرتے دیکھا ہے۔

**سلیمان :** وہ حسین ہے، بادام کے ہرے ہرے درخت سے زیادہ حسین۔

**علاء الدین :** حلاج تمہارے ہاں آئینہ بھی نہیں؟

**حلاج :** نہیں بندہ پروردہ اب ذرا سرک جا رہا ہے۔ اس کے لیے جگہ چھوڑ دیجئے۔ (ماہ سیمیں کی سواری آتی ہے۔ ساتھ اس کا لاپاہن جیم ہے)

**ابن جیم :** اسے سینے گنبدوں والے شہر صفہاں کے باشندہ! میں نہیں زیادہ دیر تک یہاں ٹھہرنے کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں جو کچھ

کہہ چکا ہوں تم سب نے سنا لیا ہے میں اب ایک ضعیف العمر اور سفید پیش انسان ہوں مجھے لے دے کے اب یہی ایکشن

ہے کہ میرے بیٹے جی میری لڑکی کی شادی ہو جائے۔ تم پوچھو گے کہ میں اپنی لڑکی کو شعر کے عوض کیوں دے دینا چاہتا ہوں۔

میں نے تمہارے امتحان کے لیے سپاہ گری کا کوئی کر توب کیوں تجویز نہیں کیا میرا جواب مختصر ہے۔ جو شخص شاعری سے جو

درحقیقت زندگی کی ساری لطافت کا مجموعہ ہے محبت نہیں کرتا میں اسے فطرت کا باغی اور وحشی سمجھتا ہوں۔ وہ درحقیقت

صرف نام کا انسان ہے اسی طرح جس شخص کے دل نے سخن کے آگے سر جھکا دیا ہے اس نے خواہ کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ

کی ہوں وہ عام لوگوں کی نسبت بہت زیادہ شفیق ہو گا۔ اس لیے حضرات اب آپ میں سے ہر شخص باری باری آئے۔

بڑھکے شاعری کے جوہر دکھائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ جس سے کون شاعری کے میدان میں گونے سبقت لے جاتا ہے اس سحر کو  
میں جو کامیاب ہو گا اسے جس اور دولت کا انعام دیا جائے گا۔

حلاج : اے ماہ سیمیں ! اے ہمارے چاند ! اگرچہ ان اشعار کو ایک بے ہنر کے قلم نے لکھا ہے لیکن کیا آپ ان پر نظر ڈالنا  
گوارا فرمائیں گی؟

ماہ سیمیں : تم حلاج ہو۔ اہل قلم کے بادشاہ حلاج !

حلاج : بادشاہ جب، اگر میری خوشنویسی آپ کو پسند آجائے۔

ماہ سیمیں : اس کاغذ کے نیچے شہ کمال کا نام لکھا ہے۔

شہ کمال : میں ہوں شہ کمال۔ مجھ کا پیشہ ہے کہ یہ اشعار غزل کے اعتبار سے کسی قدر بہت ہیں لیکن آپ جانتی ہیں کہ تمام بلند پایہ شاعر۔۔۔  
ابن حسیم : خاموش۔ ہم اشعار سننے کے لیے ہر تن گوش ہیں۔

ماہ سیمیں : نہ جانے ان دونوں کیوں دلوں لٹا نہیں دیں کا  
نہی دیکھا ہے میں نے پیٹ اس دہا میں تسکین کا

پٹانوں سے بھی موٹی روٹیاں ان کو کھلا دیں گا

اگر مجھ کو میسر ہو خندانہ ماہ سیمیں کا

اباجان ! ظاہر ہے کہ شہ کمالی خواہ کیسا ہی ہنرمند ناٹک ناٹا جائے پر شاعری سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں۔

شہ کمال : لیکن۔ لیکن۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ ان اشعار کا ایک لفظ میرا نہیں ہے۔ حلاج تم بڑے بد معاش ہو۔ خدا نہ کرے کہ میں ایسے  
اشعار لکھوں۔

علاؤ الدین اور گلیش : مگر یہ شعر تمہی نے تو لکھے ہیں۔

شہ کمال : (آتا ہے) میں کتا ہوں بس دل لگی کی حد ہو چکی۔ یہ اشعار ہر گز میرے نہیں۔

علاؤ الدین : ہم کہتے ہیں یہ تمہارے ہیں تمہارے۔

شہ کمال : مجھ پر کسی نے جادو تو نہیں کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرات ! مجھے یقین ہے کہ یہ اشعار میں نے نہیں لکھے۔

ابن حسیم : اچھا اب دوسرے شاعر کی باری ہے۔

ماہ سیمیں : اس کاغذ پر سلیمان کا نام لکھا ہے۔ سلیمان کون ہیں۔

سلیمان : میں ہوں بدرۃ ناچیز سلیمان۔

ماہ سیمیں : مری تھخیل نے مونڈا.....

سلیمان : نہیں۔ نہیں۔ تصور میں ترے دیکھا.....

ابن حسیم : حکومت۔ ہاں بیٹی پڑھ کیا لکھا ہے۔

ماہ سیمیں : —

مری تخیل نے مرثا ہے مرثا زاد مشائیں کا

فرشتے گیت گاتے ہیں مری مقرر جن رنگیں کا

مرے دل میں ہزاروں سترے اب تک پرفاں ہیں

کہ دیکھا ہے قصور میں ہیروئی ماہ سیمیں کا

سلیمان : جی ایسے اشعار لکھنے کی سزا میں ہم نے علاج کا گلا نہ کاٹ ڈالا تو دیکھنا، بیٹا کس معمول میں ہو جو صاحب کے جھاگ میں غوطہ نہ دیا تو میرا نام سلیمان نہیں۔

ابن حسیم : غابر ہے کہ ایسے بیودہ گو، شاعری کے اس معرکے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دوسرے شاعروں کا کلام پڑھو۔  
ماہ سیمیں : علاؤ الدین۔

علاؤ الدین : میں اتنا غمزہ کر دوں کہ میرے ٹوٹے بھوٹے اشعار کو پورے غور سے پڑھنے لگا۔

ماہ سیمیں : بسا ہے میری نس میں معطر زلف مشکیں کا

علاؤ الدین : نہیں نہیں یہ نہیں نہیں یہ کہاں، تیرا بیکو سہارا چہرے.....

ابن حسیم : کوئی اسے چپ کرانے پاں میں پڑھو۔

ماہ سیمیں : —

بسا ہے میری نس میں معطر زلف مشکیں کا

نہ دھوکا کھائے فیروں کے احسانات رنگیں کا

میں بد صورت سہی، بخود اسی بہ بند رسی لوگو

مگر خوشبو سے جی بہلا ہی لوں گا ماہ سیمیں کا

علاؤ الدین : ہائیں۔

ماہ سیمیں : ابا جان! کہیں اس خوشبو دار بندر سے میری شادی نہ کر دیجئے گا بس اب ایک کاغذ اور رہ گیا ہے گلہش۔

ابن حسیم : گلہش صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا انعام آپ کے حصے میں آئے گا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کے اشعار ان لوگوں سے بھی

برے ہوں۔ اس لیے انہیں پڑھنے کی زحمت کیوں اٹھانی جائے۔ میں لڑکی آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔

ماہ سیمیں : لیکن ابا جان! یہ بھی دیکھئے کہ یہ شخص بھیجے گا ہے۔

گلہش : میری اتھا ہے کہ آپ میری گھنڈہ بھر کی محنت کو یوں ضائع نہ کر دیں۔

ماہ سیمیں : میں شعر پڑھتی ہوں —

زمانہ میں بس اک ریشم ہی ہے سلمان تسکین کا

نہ مجھ کو حرص خوشبو کی نہ لالچ جام شیریں کا

اگر سیلے میں میرے ہاتھ تو کیا آپ یوں کیجے

مری دائرہ سے دامن باندھ دیجے ماہ سیمیں کا



محدث : علاج اور کھدو سحیر نے نین دینا دیکھا ہی کسی وقت۔  
سلیمان : اماں تین دینا دل کے پیچھے مرے کیوں جاتے ہو۔ دیکھئے تو یہ شادی کا معاملہ آخر طے کیونکر ہوتا ہے۔

علاج : آہ ماہ سیمیں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

ماہ سیمیں : ان سب نے میری ہنسی اڑائی ہے۔

علاج : نہیں ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں یہ سب کیا دھڑا میرا ہے۔

ابن جسیم : تمہارا صاف صحت کہو کیا بات ہے ورنہ آج خیر نہیں تمہاری۔

علاج : لیجئے ایک اور رباعی جو ابھی پڑھی نہیں گئی۔

ابن جسیم : یہ کس نے کہا ہے ؟

علاج : میں نے !

ابن جسیم : مجھے بتایا گیا ہے کہ تم بے حد غفلت ہو کر کیا دس دینا دیکھا ہے پاس ہیں ؟

علاج : یقیناً ! یہ بھی مجھے اور جو کچھ میرے پاس سے لے لیجئے میری طاقت میری جراتی، میرا منہ میری طبیعت کی جودت اور

حسن کی پرستش کا شاعرانہ جذبہ غرض جو کچھ آپ چاہتے ہو میں پیش کر سکتا ہوں مجھ سے لے لیجئے۔

ابن جسیم : پڑھو۔

ماہ سیمیں : میں اس وقت تک اس کی نظم سنوں گی بھی نہیں جب تک کہ ....

سلیمان : جب تک کہ علاج خود اسے نہ پڑھے گا۔

ماہ سیمیں : ہاں !

علاج : کیوں صاحب ! شاعر اپنا کلام خود بھی پڑھ کر سنا سکتا ہے۔

ابن جسیم : تمہیں اجازت ہے۔

علاج : ہ

روح پُر نور کہ میرے تری چشم جہاں ہیں کا

فلک میں ایک سایہ ہے تیرے گیسوئے مشکیں کا

اے چھوٹوں مگر باختری کو کوثر میں جھگو لاؤں

کہ تاروں سے بھی پاکیزہ ہے دامن ماہ سیمیں کا

ماہ سیمیں : کس قدر دلکش اشعار ہیں۔

سلیمان : نہایت دلغریب، بے حد لطیف ہیں نا علاؤ الدینی ؟

علاؤ الدینی : واقعی پاکیزہ اشعار ہیں۔

ابن جسیم : شک ہے الٹی کہ میری امیدیں برائیں اور میں جو کچھ چاہتا تھا دلیا ہی ہوا۔ اب علاج میرے بیٹے ! یہ تحفہ جسے تم نے اپنی دانائی

اور شاعری سے حاصل کیا ہے تمہارے سوائے ہے۔ خدا کرے کہ تم دونوں، علاج اور ماہ سیمیں، شاعر اداس کی بیوی ایسی

محبت میں قسب رکھ کر حیدر ہادی حیات مستعار ماضی کی بھولی بھری بات میں جلتے تو لوگ بدینہ لکھیں کہ  
 چیزیں ہیں۔ میں نے ہوس دینا اس لیے طلب نہ کئے تھے کہ روپیہ انسان کی ہنرمندی اور قابلیت کا وسیع  
 چاندی کے سکڑوں کو سونے کے سکڑوں میں تبدیل کر کے اپنے الفاظ کی صداقت کا ثبوت دے سکتا ہو  
 حلالج : ایک بات بھی کہ لینے دینے میں سے دو مستوحجے معاف کر دو۔ میں نے آپ سب کو دھوکا دیا، میر  
 کئے دیتا ہوں۔ گھیش اے سونے سے بھری ہوئی پوری قبیلی تم لے لو، تمہیں اپنی رباعی کا معاوضہ مل گیا  
 سناجی کا ایسا چہرہ دیا جائے گا جو اصنافان بحر میں بے نظیر ہوگا۔ شرکال! تمہیں شادی کے روز دنیا نہ  
 دے گا سلیمان، سلیمان کے لیے بھی کوئی اعلیٰ انیس چیز ہونی چاہیے۔  
 سلیمان : مجھے اپنی محبت بخشنے۔

حلالج : بخشتی۔

ماہو سیمیں : اور میں نے ہی۔

# سہیلو

## جاوید اقبال

(فرض حال اگر اس کھیل کے کردار فرضی نہ ہوں تو۔۔)

### منظر

ایک کڑھی کا مالی کرہ جس کا سامنے کا دروازہ اور کھڑکیاں باہر ڈبوڑھی کی جانب کھلتی ہیں وایا دو دروازہ کھانے کے کمرے کی طرف کھلتا ہے اور اس میں بڑی ہوئی کھانے کی بڑی میز پر بوتلوں کے چند جوڑے نظر آ رہے ہیں۔ بایاں دروازہ بند ہے جو اس کمرے کو کسی دوسرے کمرے سے ملاتا ہے۔

فرنش پرگر و وغبار سے اٹا ہوا قابیلن بچھا ہے۔ قابیلن کے ارد گرد ڈوٹے چھوٹے سے صوفے رکھے ہیں۔ دیواروں پر چند بزرگوں کی سیرت ناک قسم کی تصویریں لگی ہیں۔ چھت کا پنکھا پوری نیزی سے چل رہا ہے۔ جو اوقابیلن پر کبھرے ہوئے دو تین جیلے سے نگلیوں میں سے ایک پر سر رکھے، بنیان پہنے تھکے باندھے اور دھڑے منہ سو رہا ہے۔ چند رسالے بھی فرنش پر منتشر پڑے ہیں۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو چند لمحوں کے لئے جو اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باہر ترقی ہوئی دوپہر میں ٹوکے جھکڑ چل رہے ہیں۔ معمول آؤ آؤ کر کھڑکیوں کے دسے کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ معاً سامنے کا دروازہ کھلتا ہے۔ ذکی اور شمیم داخل ہوتے ہیں۔ دونوں بھائی ہیں لیونوں نے ایک جیسی سفید اچکنیں پہن رکھی ہیں۔ دونوں شریفیوں کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔ ذکی ڈبلا گھر دراز قد ہے۔ شمیم قد سے بھرے جسم کا مگر لپٹ قد ہے۔ ذکی میں نسوانیت سی ہے مگر شمیم نے موٹھیں پال رکھی ہیں۔ ذکی کے جسم میں عورتوں جیسی لچک ہے لیکن شمیم چٹان کی طرح سخت ہے۔ ذکی شدید قسم کا جذباتی نوجوان ہے اس لئے اس کی کڑخت جسمانی حرکات اس کے جذبات کے متوازی نہ ہوں

ہوتی ہیں۔ شمیم نسبتاً کم گو اور دمہی طبیعت کا ہے۔

ذکی :- (جوا کو بھنبھرتے ہوئے) اوسے ————— ابھی تک یونہی پڑے ہو ؟ !

جوا :- (جاسی سے کمرے کوٹ بدلتے ہوئے) ہیں ! ————— ماں یارہ آؤ !! (پھر سوجاتا ہے)

شمیم :- (عجیب انداز میں) جناب کو علم بھی ہے اس وقت کیا بھا ہے ؟ !

ذکی :- (جوا کو پھر سے بھنبھرتے ہوئے) بندہ خدا پانچ بج چکے ہیں —

جوا :- (بیچارہ لگتا ہے) ذکی کو کسی دوپہر ٹوٹل گئی ہے۔

ذکی :- (دنگ اکر) خیر سے آپ کے لئے ابھی دوپہر ہی نہیں ٹوٹل ؟ !

شمیم :- (ذکی سے) قصور ان کا نہیں ہے بھائی۔ اس گھر کی فضا ہی کچھ ایسی ہے کجبت۔

جوا :- (اسی انداز میں) میاں مٹیڑھا جاؤ، مجھے کھڑے لوگوں سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔

شمیم :- (اوپر دیکھ کر) ذرا نیچے کی ہوا تو کھالیں۔

ذکی :- (بے قابو ہو کر) توبہ، کس شدت کی گرمی ہے۔

جوا :- (بیزاری سے) یہ اچکن وچکن آنا دو، تم دونوں کی نیکیوں سانچے کے کمرے میں پڑی ہیں، یہیں کر بیٹ رہو۔

شمیم :- (بے پروائی سے) پہلے بھائی سے ایک نازہ قصہ تو سنو۔

جوا :- (دگھبرا کر) کیوں ذکی، خیر تو ہے ؟ !

ذکی :- (بے پروائی سے) اوسے بھی وہی کجبت۔

جوا :- (بیکدم آٹھ کر بیٹھتے ہوئے) کیا پھر کوئی ٹیلیفون آیا ؟ !

ذکی :- (دنگ اکر) کیا تاؤں یار، عجیب مصیبت میں جاں ہے ————— (آہ بھر کر بیٹھتے ہوئے) ظالم نہ تو پہنچتا ہی

میں نہ ٹیلیفون کا نمبر ————— بہتیرا سر ہلکا کر سب بیکار۔ دن میں جوا چار مرتبہ فون آتے ہیں۔ ابند میں تو کسی کو

خبر تک نہ ملتی لیکن اب تو اچھا خاصا افسانہ بن گیا ہے گھر بھر کا۔

جوا :- (تعجب سے) وہ کیسے ؟ !

ذکی :- (افسردگی سے) میں سمجھ لو نا۔ کل میں اتفاق سے آبا کے پاس میٹھا باتیں کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ شامت

اعمال سے چٹو میاں قریب تھے۔ فون سننے ہی دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے ”بھائی“ میں نے

پوچھا ”کہو کیا بات ہے ؟“ ”اے“ ”بھائی“ ”خجی خجی“ ”میں نے کہا“ ”میاں کو کوئی بات بھی تو ہو؟“ پھر

وہی تی خجی خجی ————— تبصر میں سمجھ گیا تھا۔ ”آٹھا اور ٹیلی فون کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں سے جو واپس آتا ہوں تو

قبلہ ابر و سکیڑے بڑے عرصے میں بیٹھتے ہیں۔ پوچھنے لگے ”کس کا ٹیلی فون تھا؟“ میں نے تمہارا نام دیا تو بولے ”کچھ

بھی ہو، میں چھوٹے بچوں کے ساتھ آپ کی اس قسم کی بے تعلقی کو غصے کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ حفظ مراتب بھی

کوئی چیز ہے یا نہیں ؟“ اب میری شکل دیکھو کہ وضاحت بھی نہیں کر سکتا۔

- جواہر :- (پیشی پیشی آنکھوں کے ساتھ) بھئی ہاں واقعی !!
- شیم :- (اسی بلے پروائی سے) اور وہ چوکیدار صاحب کی بھی تو سننا دو۔
- ذکی :- (افسروگی و شہادت سے) اور حردہ چوکیدار ہیں۔ ایک شام جناب کہیں ٹیلی فون سن بیٹھے۔ گھر کے سب افراد موجود تھے۔ یعنی بڑے ابا بھی۔ تم تو ان کی طبیعت سے واقف ہو ہی۔ ہم ان کے سامنے کبھی نکلے سر بھی نہیں بیٹھتے۔ سو میں اور شیم دونوں ترکی ٹوپیاں پہنے دوڑاؤ بیٹھے تھے۔ بڑے ابا حسب عادت آنکھیں بند کر کے کچھ سوچ رہے تھے۔ انداز میں سب خاموش تھے کہ میاں چوکیدار آدھیکے اور لگے بنکارنے ”ذکی بیانی کا شیا پورن“۔ ”سکوت قائم رہا۔ بڑے ابا بدستور سوچتے رہے۔ میں نے چورنگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور کھپکھپا چوکیدار سے آہستہ سے پوچھا ”بھئی کس کا ہے؟“ آپ اسی انداز میں فرمانے لگے ”جی نام دام تو میں جانتا نہیں پر آواز جنابی سے“ یہ سننا تھا کہ میرا دل ٹخنوں میں دھڑکنے لگا۔ بدحواس ہو کے نظریں اٹھانا ہواں تو بڑے ابا مجھے جبری طرح گھور رہے ہیں۔ اللہ ————— تم نو اندازہ لگا سکتے ہو کہ یار پر کیا گزری ہوگی۔
- شیم :- (بیزار ہو کر) کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو کسی لوکیاں میں کینٹ۔
- ذکی :- (بہنسنے ہوئے) بھئی مجھے تو اکثر اس قسم کے فون آتے ہی رہتے ہیں۔
- جواہر :- (سر کھانے ہوئے) مگر یہ تو کسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔
- ذکی :- (اسی انداز میں) آخر شرارت کس کی ہو سکتی ہے، ہمارا تو کوئی بھی دوست۔
- جواہر :- (سجیدگی سے) ممکن ہے عزیز مونا ہو، مجھے تو شیرچر ہے پر بھی شک ہے۔
- شیم :- (دھجلا کر) اسے نہیں بھائی۔ میں نے خود کئی بار گنگو کی ہے۔ بھلا ہم کچھ مرو کی بدلی ہوئی آواز نہیں پہچان سکتے۔
- ذکی :- (سوچتے ہوئے) ہو تو سکتا ہے۔
- شیم :- (بے پروائی سے) واہ! آپ نے بھی ایک ہی کمی !!
- ذکی :- (حافظہ پر زور دے کر) ٹیلی فون پر بولنے والی تو ایک ہے۔
- شیم :- (دکھنگی سے) مگر آپ نے محسوس نہیں کیا، عقب میں ہر وقت زعفران زار کھلا رہتا ہے۔ مجھے تو کوئی غولی معلوم ہوتا ہے تو کیوں کا۔ کئی ہیں، شاید آٹھ دس ہوں۔
- جواہر :- (انجھب و سرسبکی سے) اسے پر ہم تو یقین ہی ہیں۔
- ذکی :- (بہنسنے ہوئے) تو کیا تم نے بڑا اسے کی سوچ رکھی ہے!
- جواہر :- (بلے پروائی سے) میری بلا سے، میں ان باتوں کا فائل ہی کب ہوں۔
- شیم :- (دھنچکے سے) تم تو یہ ہے کہ وہ ہماری شکیلین تک پہچانتی ہیں، خدا جانے۔
- جواہر :- (جیرانی سے) کیا انھوں نے تمھارے تیلے تک بتا دئے؟

ذکی ۱۔ (سنبیدگی سے) ایمان سے —————؛ چند روز ہوئے شمیم نے مونچھیں مونڈی نہیں نا؟  
جواد ۱۔ (عجب سے) ہاں تو —————

ذکی ۱۔ (اسی انداز میں) کہنے لگیں: آپ نے مونچھیں کیوں صاف کرادیں، اب آپ کے نتھنے اور بھی کھلے معلوم ہونے لگیں ہیں۔  
جواد ۱۔ (شمیم سے) اچھا تو، تو جی آپ نے مونچھیں بڑھا دی ہیں؟

شمیم ۱۔ (سنبیدگی سے) نہیں واللہ، یہ بات نہیں ہے۔ مجھ سے تو بھائی نے کہا تھا۔  
ذکی ۱۔ (بھئی مسکراہٹ کے ساتھ) ایک دن تمہارے متعلق بھی پوچھ رہی تھیں۔

جواد ۱۔ (بے قابو ہو کر) کیا کیا —————؟

ذکی ۱۔ (بے پروائی سے) ابھی کہ آپ کے دوست کوئی جواد صاحب بھی ہیں؟

جواد ۱۔ (اسی انداز میں) ہوں، ہوں —————

ذکی ۱۔ (بے پروائی سے) ان کے اگلے دونوں دانت باہر کیسے نکلے ہوئے ہیں؟

جواد ۱۔ (انسروگی سے) اس پر تم نے کیا جواب دیا؟

ذکی ۱۔ (ہنسنے ہوئے) میں نے کہا "چھٹیں ہیں اماں کی گود سے گر پڑے تھے"۔

جواد ۱۔ (نہتے سے) کیلے ہو گئے —————؟

شمیم ۱۔ (بے پروائی سے) بھائی سے کہہ رہی تھیں: سنا ہے آپ کو اپنی آنکھوں پر بڑا ناز ہے، ہمیشہ نیم دار رکھتے ہیں۔  
جواد ۱۔ (ذکی سے) تو تم نے کیا کیا؟

شمیم ۱۔ (اسی انداز میں) بھلا یہ تیلی پر پھیرے والا راز کیوں ناش کرنے۔ گول کر گئے۔  
جواد ۱۔ (تنگ آکر) آخر یہ بدعت کیا ہے؟

ذکی ۱۔ (تنگ آکر) میں تو تنگ آ گیا ہوں۔ صحن میں لکڑیوں تو چوڑو منسوب مجھے دیکھتے ہی دانت نچوڑنے لگتے ہیں۔  
اور سر جو کسیدار صاحب کی "ذہر پر پھیرا سداہٹ دیکھ کر خون میلحدہ مکھوٹا آٹھتا ہے، جھاڑوں تو بڑے آبا کی  
خگی کا احتمال ————— غرض عجب نگوہا ہوا ہوں۔

جواد ۱۔ (حافظہ پر زور دے کر) یہ نتھنے، باہر نکلے ہوئے دانت اور .... اور نیم وا ————— میرا تو خیال ہے ہمارا کوئی نہایت  
ہی قریبی دوست ان لوکیوں کو جانتا ہے۔

شمیم ۱۔ (بے پروائی سے ہنسنے ہوئے) ہمارا کوئی دوست، لوکیوں کا شناسا اور ہمیں خبر تک نہیں۔ بھلا یہاں کسی کے پیٹ  
میں آج تنگ کوئی بات بھی بچی ہے؟

جواد ۱۔ (اسی انداز میں) ممکن ہے ریاض ہو، کہتے ہیں اس کی بہت سی لوکیوں سے شناسائی ہے۔

شمیم ۱۔ (دھارت سے) جھک مارتے ہیں جو یہ کہتے ہیں، آس بچو کہ کوئی جانتا ہوگا۔

ذکی ۱۔ (جواد سے) اور ہاں، ایک دو پہر اسی قسم کا ٹیلیفون بھائی عفاؤ کو بھی آیا۔ بیچارے اپنے دفتر میں بیٹھ کر کام کر رہا

تھے۔ ان کی جلد بازی سے کون واقف نہیں۔ چھوٹے ہی کھنکھے۔ تو پھر ملاقات کا کوئی وقت؟

جواد :- تعجب سے تو کیا ملاقات ہوئی؟  
ذکی :- رجاری رکھتے ہوئے، بھائی عتار ابھی دفتر ہی میں تھے کہ ان کے گھر شیعین ہوا۔ ان کی بیگم بونیں یہ کون ہے؟  
آواز آئی ”پہلے آپ بتائیے آپ کون ہیں؟“ انھوں نے کہا۔ میں بیگم عتار ہوں، فرمائیے؟“ اور اسے جواب  
آیا ”اللہ۔۔۔ آپ سے تو ملنے کو دل بہت بے قرار تھا مگر تعجب نیاز حاصل ہوئے۔ ذری میرا ایک  
کام کر دیجئے، اپنے ان سے کہہ دیجئے کہ اب جو ہمارے یہاں آئیں تو میرا ریشی رومال اور حلی کی شیشی نہ بھولیں۔“

جواد :- (خوفزدہ ہو کر) پھر کیا ہوا؟  
ذکی :- (اسی انداز میں) عتار صاحب جو شام کو خوشی خوشی گھر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیگم سر پہاڑ، منہ پھاڑ کھٹے ٹوٹی  
کھٹولی پر پڑی ہیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی بھابھی صاحبہ نے پتوں کی دھماکنی شروع کر دی بھائی عتار جو ٹپکے  
تو پچھے بھاڑ ان کے گرد ہو گئیں۔ اب تم ہی سوچ لو کہ کیا اوجھڑا ہوا ہوگا۔ رات ہوتے جب ہیں ان سے ملنے گیا  
تو خلاف معمول بستر پر دراز تھے اور ان کی دامنی آنکھ کے گرد گہرے نیلے رنگ کا حلقہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے سب دیکھا  
تو جناب نے بھرائی آواز میں ساری کیفیت کہہ سنائی۔

جواد :- (راہ بھر کر) الامان۔۔۔ بس جی مجھے تو یہ کوئی چندا لیں معلوم ہوتی ہیں۔  
شیمیم :- (بے رخی سے) اسی نہیں، مغرب زدہ ہیں۔ اپنی طرف سے بڑی ظریف طبیعت ہیں۔  
جواد :- (تعجب سے) مگر یہ کہاں کی ظریف طبیعت ہے؟ (دفعہ کے بعد ذکی سے) آخر تم سے کہتی کیا ہیں!!  
ذکی :- (اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے) بھی قصہ آمل میں لوں ہے کہ پچھلے شیمیم کو فون آیا کرتے تھے۔ ایک  
دن بہری طبیعت ہو گئی اور نگیں انگریزی بھارنے، اور اسے جو مسکت جواب ملے تو نگیں اپنی اصلیت پر اور ایسی  
ہر بڑائیں کہ اور وہ بھی غلط سلط لونی شروع کر دی۔

شیمیم :- (جل کر) صاف کیوں نہیں کہنے کہ ایک دن جناب نے میری غیر موجودگی میں انھیں بتا دیا کہ آخر شیمیم کا بڑا بھائی ذکی  
ہے اور وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا۔

ذکی :- جلد بول ہی سہی، آخر بڑے بھائی کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔

جواد :- (تنگ آکر) یا خدا کے لئے جھگڑنا بعد میں پہلے واقعہ تو سن لینے دو۔

ذکی :- (رجاری رکھتے ہوئے) تو جناب شیم صاحب کو پہنچے فون آیا کرتے تھے۔ دست تک حضرت نے ذکر ہی نہ کیا ایک روز  
جو اتفاق سے میری آنکھ دس بجے کھل گئی تو کیا دیکھا ہوں کہ میری شیم صاحب بیٹھے بیٹھو بنا رہے ہیں۔ پوچھا کہ  
بھئی کہاں کن تیار یاں ہیں؟ بولے ”یہ تو طبیعت کچھ کرنے کو چاہ رہی ہے۔“ میں خاموش ہو گیا۔ دو گھنٹے آپ  
کو مٹیاں اکھاڑتے رہے اور میں بکھا گیا۔ ایک بار دو بار، تین بار سڑسٹیک شمار ہی نہیں کے بار صابن لگا دو کر  
ہوئی تو جناب غسل خانہ میں گھس گئے۔ چار بجے کے قریب ملاں سے نکلے تو اب کپڑے پہنے شروع کئے۔ چھ بجے

کے قریب آراستہ چہرہ ہٹا کر لے باہر کی ٹھانی۔ مجھ سے مضبوط ہو سکا۔ پوچھ ہی بیٹھا۔ ”بھئی کہہ دو! بڑی بے اعتنائی سے بولے۔ یہ تو نہیں ٹھیکے دہلے۔“

شیمسم ۱۔ (کھسپائی ہنسی کے ساتھ) تو بد، مبالغے کی بھی حد ہوتی ہے!!

ذکی ۱۔ (جلتے ہوئے) اچھا تو کیا میں —————

جواد ۱۔ (غصہ میں) ہاں بھٹو بھی —————

ذکی ۱۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد جناب منہ اٹھائے۔ اچکن کے سارے ہٹن کھولے چلے آئے ہیں مجھ سے پھر نہ رہا گیا پوچھا۔ ”بھئی یہ پڑھو گی کسی؟“ جواب دیا۔ ”آج سٹامینا کی قرارداد تو تھی۔“

جواد ۱۔ (شیمسم سے) کیوں شیمسم!!

شیمسم ۱۔ (سنبیدگی سے) بھند —————

جواد ۱۔ (حیرانی سے) پھر ملاقات ہوئی؟

ذکی ۱۔ (بے پروائی سے) تو یہ کہہ دو —————!!

شیمسم ۱۔ (سنبیدگی سے) اصل میں —————

ذکی ۱۔ (تخاریت سے) اصل میں کیا معنی۔ اچھے غلطے چند بنے ہو۔ گھنٹہ بھر سنبٹا کے برآمدے میں قواعد تم نے نہیں تو کیا میں نے کی ہے؟

جواد ۱۔ (تعجب سے) کیا کوئی بھی نہ آیا؟

شیمسم ۱۔ (رہے پروائی سے) بھئی میرا ذاتی خیال تو یہی ہے کہ انہیں کوئی کام پڑ گیا ہو گا۔

ذکی ۱۔ (الغبت سے) جی ہاں —————

جواد ۱۔ (بچوں کی طرح) مگر ذکی سے بات چیت کیا رہی!!

شیمسم ۱۔ (سنبیدگی کے ساتھ) بات دراصل یہ ہے کہ میری غیر موجودگی میں بھائی کہیں ان سے گفتگو فرما چکے تھے۔ آج صبح جو میں نے رسیور اٹھایا تو فرم نے لکھا ”کیا ذکیہ آیا۔ یہاں موجود ہیں؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ”جی نہیں، ذکی بھائی موجود ہیں۔ بولیں۔“ اچھا تو انھیں ہی بلوا دیجئے، ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے ”مجھے بڑا طیش آیا۔“

جواد ۱۔ (سراپگی سے) یعنی ادھر تو غنڈہ بیچارے کی گت بڑائی اور ادھر تم دونوں بھائیوں میں کشیدگی —————

ذکی ۱۔ (سنبیدگی سے) ہاں بالکل —————

شیمسم ۱۔ (میرا ارادہ تھا کہ بھائی کو اطلاع نہ دوں۔ میں نے ان سے تو اچھا کہہ دیا مگر ٹیلیفون بند نہ کیا۔ میرا خیالی تھا خود ہی ننگ آکر چھوڑ جائیں گی۔ اب جو میں باہر جانے کے لئے مڑتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھنٹے والی میز کے نیچے سے ایک ہاتھ آہستہ آہستہ ٹیلیفون کی طرف سرک رہا ہے۔ پل بھر کے لئے بھائی صاحب کا سر نمودار ہوا اور دوسرے



لئے سرٹیفیٹوں سمیت پھر میزکے نیچے —————

جواو :- (عجب ہے) ارے نوکی !  
 نوکی :- (کھسپائی مسکراہٹ کے ساتھ) یار یوں اکثر ہو ہی جاتا ہے —  
 (باہر کی ڈیڑھ سی میں سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے)

شیمم :- (جبرانی سے) گھنٹی کون بجا رہا ہے ؟  
 جواو :- (بے پروائی سے) منور ہوگا —  
 نوکی :- (باوازد بلند) شاہ صاحب اندر تشریف لے آئیے —

آواز :- (باہر ہی سے) نہیں بھئی، میں جا رہا ہوں۔  
 شیمم :- (باوازد بلند) میاں کیا صرف آواز سنانے ہی آئے تھے ؟  
 جواو :- (بے پروائی سے) کہاں جا رہے ہو ؟  
 آواز :- (اسی انداز میں) میں فانی آماں کے ہاں ریڈیو سننے جا رہا ہوں۔ علاوہ اس کے میرے عوب دولے ساموں بھی آئے ہوئے ہیں۔

نوکی :- (التجا کرنے ہوئے) باوازد بلند، بھئی ذرا کی ذرا تو دم لے بیٹے ؟  
 آواز :- (اسی انداز میں) کہہ جو دیا نہیں — میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ میں نے زندگی کے بارے میں اپنا نظریہ تبدیل کر لیا ہے۔

شیمم :- (گھبرا کر) آقا اللہ —  
 جواو :- (عجب ہے) مگر آج صبح تو تم اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ رعایت ہی زندگی کا بہترین لائحہ عمل ہے ؟  
 آواز :- (اسی انداز میں) اس کی وجہ شیمم یہ تھی کہ آج صبح میں تمہارے ہاں آ رہا تھا تو ٹانگہ میں میٹھی ہوئی ایک لڑکی نے مجھ پر نگہ غلط انداز ڈال دی تھی۔

نوکی :- (جبرانی سے) اور اب ؟  
 آواز :- (اسی انداز میں) وہ ساتھ والے مکان کی بھٹیاریں ہے نا ؟

شیمم :- (جبرانی سے) کونسی ؟  
 آواز :- (اسی انداز میں) وہی جسے میں کوٹھے کے چھوٹے کے میں سے دیکھا کرتا تھا۔  
 جواو :- (تنگ آکر) ہاں ہاں —

آواز :- (اسی انداز میں) آج وہ پہر جب میں کوٹھے پر چڑھا تو مجھ کو کہہ دیا یا۔ میں نے منڈیر پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کی تو نامراد سامنے بیٹھی تھی، مجھے دیکھنے ہی چین آگئی — آئیے دے میرے شیمم کو، تیرا سر منڈوا کر پھینک دیں گی ابھی! ماش کراؤں گی کہ ساری کوون بازی بھول جاؤ گے " میں نے بہتیرا کہا " نیک بخت کیوں بدگلی

ہو رہی ہو، میری نیت بڑی نہیں تھی، وہ تو اتفاق سے نگاہ پر لگئی۔ مگر وہ بولی۔ ”چھوٹ کی منڈی اور آپ کا قد مٹا۔ اٹھ ٹھہرا تین فٹ، بھلا اتفاق سے نگاہ کیونکر پڑ سکتی ہے۔ اب یہ فیصلہ گھر ملا ہی کرے گا۔“

ذکی :- (خوفزدہ ہو کر) پھر۔۔۔  
آواز :- (اسی انداز میں) میں قنوطی ہو چکا ہوں۔۔۔  
شیم :- (بناوٹی تجسس سے) اب قنوطی ہو چکے ہو؟  
آواز :- (اسی انداز میں) ہاں۔۔۔  
شیم :- (بے پروائی سے) کہتے گھنٹوں کے لئے؟  
آواز :- (اسی انداز میں) اب میں عمر بھر قنوطی ہی رہوں گا۔  
ذکی :- (بے پروائی سے) یہ تو تم ہمیشہ ہی کہا کرتے ہو۔  
آواز :- (اسی انداز میں) اب کی مرتبہ۔۔۔  
جواد :- (اٹھ کر دروازے کی طرف جانے ہوئے) ٹھہرو تو سہی۔۔۔  
آواز :- (دور سے) نہیں، نہیں۔۔۔  
(جلا جاتا ہے)

ذکی :- (پڑ مرو گی سے) چلا گیا۔۔۔  
شیم :- (بٹتے ہوئے) خوب آدمی ہے۔۔۔  
جواد :- (رواپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھنے ہوئے) شیم، تم بتاؤ ہے نہ کہ جس وقت بھائی نے ٹیلیفون پکڑ لیا تو تم۔۔۔  
شیم :- (جیسے کوئی معمولی ہوئی بات یاد آجائے) ہاں، تو میں حیران پریشان دیکھتا رہا۔ ٹھوڑی دیر تک نہ ہوتی رہی پھر دیکھتا ہوں بھائی صاحب نے گانا شروع کر دیا۔  
ذکی :- (شرما کر) ارے بھئی! دھڑ سے غزل کی فرمائش جو ہوئی تھی۔  
جواد :- (دلچسپی سے) پتے ہوئے، تو پھر تم نے کونسی غزل گائی؟  
ذکی :- (بے پروائی سے) ادھی ۲

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے  
جواد :- (مجوم کر) سبحان اللہ۔۔۔ خوب سماں بندھا ہو گا۔  
ذکی :- (افسردگی کے ساتھ) یار، افسوس تو یہ ہے کہ جو بات میں تجیدگی سے کہوں کجغت اسے بھی مذاق سمجھتی ہے  
شیم :- (دنگ آکر) انھیں پوری بات کیوں نہیں سنا دیتے؟  
ذکی :- (جذبات سے بے قابو ہو کر) بس کہنے لگیں۔ ”ہاں، کبھی ملے“ میں نے جواب دیا ”پہلے میرے برادر

کو تھوڑا سوا رکھا ہے۔ جواب مجھ سے ملنے کو کہہ رہی ہیں؟

جواو :- دلچسپی لیتے ہوئے پھر انھوں نے کیا کہا؟

ذکی :- دلچسپی سے (کچھ نہیں) سوائے ہی کے —

جواو :- (اسی انداز میں) تم کیا لہے؟

ذکی :- میں نے کہا "مجھے فرصت نہیں ہے"۔ بولیں یہ آخر آپ سارا دن کیا کرتے رہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا۔

"صبح کوئی گیارہ بجے اٹھ کر ناشتہ کرتا ہوں طبیعت ذرا کسل مند سی ہوتی ہے تو حشفیہ کمانیوں کی کٹ

اٹھا لیتا ہوں۔ اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ کھانے کے بعد جو حشفیہ کمانی ادھوری

جاتی ہے اسے پھر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ اس طرح شام ہو جاتی ہے" کہنے لگیں "پھر شام کو آپ کیا

کرتے ہیں؟ میں نے کہا "شام کو بھنگڑ خانے چلا جاتا ہوں"

جواو :- دلچسپ ہے (بھئی یہ بھنگڑ خانے سے تمہاری کیا مراد تھی؟)

ذکی :- (بے پروائی سے) یہی، تمہارا گھر —

جواو :- (حیرانی سے) میرا گھر!!

ذکی :- (بے پروائی سے) انھوں نے خود ہی اس کا نام بھنگڑ خانہ رکھا ہوا ہے، انھیں معلوم ہے ہم تمام دوست

تمہارے ہاں ہر شام اکٹھے ہوتے ہیں۔

جواو :- (دغرت سے) لاجول ولا قوۃ — بڑی بدتمیز لڑکیاں ہیں!

ذکی :- خیر — میں نے پوچھا "آپ سارا دن کیا کرتی ہیں؟" کہنے لگیں "صبح اٹھتی ہوں، آبا جان اور ننھے بھائی

صاحب دونوں دونا شروع کر دیتے ہیں۔ انھیں چپ کراتی ہوں۔ ناشتہ واشتہ کرا کے اسکول بیچ دیتی

ہوں۔ اس کے بعد گھر کی بھاڑو بہا رو ہے۔ برتن مانجنے ہیں۔ روٹی پکانی ہے — کہیں دوپہر کو شک

ہار کر اپنے بستر پر سیدھی کرنے کے لئے لیٹتی ہوں تو آپ کو ٹیلیفون کر دیتی ہوں"

جواو :- (خوفزدہ ہو کر) اللہ کی پناہ — (تو کہہ کر پکارتے ہوئے) دیوان علی —

ذکی :- (اسی انداز میں) میں نے جواب دیا "تشریف لڑکیوں کو یوں ہی کرنا چاہیے"

جواو :- (دلچسپی سے کہہ کر) پھر — (پھر تو کہہ کر پکارتے ہوئے) ارے کوئی ہے؟

ذکی :- (اسی انداز میں) پھر وہی خمی خمی — کچھ ملے تو بونہی گڈے پھر بولیں "آپ نے شام و سحر پڑھی ہے؟"

میں نے کہا "جی نہیں صبح و شام، دیکھی ہے" اس پر ہنسنے لگیں۔ شاعری پر بحث شروع ہوئی۔ بولیں غالب

اور اقبال بے حاشیہ ہیں —

جواو :- (اسی انداز میں) تو تم نے کیا کہا؟

ذکی :- (بے پروائی سے) میں نے کہا "پھر کیسے پڑھیے"



- ذکی :- اسخیدگی سے ایمان سے !!
- جواد :- جسے قابو ہو کر، مگر کہاں ؟!
- ذکی :- اسے پروائی سے حسن تو ہو۔۔۔
- جواد :- اسی انداز میں، نہ یہ پہلے بناؤ گماں۔ کیا میں بھی جاسکتا ہوں ؟!
- بیم :- رہتے ہوئے، کیوں نہیں۔۔۔ ——— !!
- ذکی :- سرکوشی کے انداز میں، کہنے لگیں: ہم میں تو آٹھ دس اور اب ہی اب کے ویڈیو کو نہیں رہی ہیں۔ مگر شروع شروع میں صرف دو ہی آپس کی باقی لیتا نشر میں ہیں۔ میں نے کہا: "کیوں فوں کرتے ہوئے انھیں شرم نہیں آتی؟" بولیں: "وہ آپ پھر مذاق کرنے لگے۔" میں مصححتاً خاموش ہو گیا۔ پوچھنے لگیں: "ہم آپس کہاں؟" میں نے کہا: "آپ خود ہی مقام بخیر کر دیجئے، غلام حاضر ہو جائیں گے۔" بولیں: "نہیں جہاں آپ کہیں ہیں سوچ میں پڑ گیا۔"
- جواد :- اچھا نہ ہوئے، ہاں، ہاں۔۔۔ تو تم سوچ میں پڑ گئے !!
- ذکی :- اسی انداز میں، پھر میں نے پوچھا: اپنی پہچان تو بنا دیجئے۔" بولیں: "ہم دونوں نے سارا جیساں بازو دھکی ہوں گی اور نفی سینڈل۔" میں چلا یا: "خدا را کہیں نفی سینڈل ہیں کہ نہ آئیے گا۔ ہمارے سر پر بال پٹے ہی اکا دکا ہیں۔" اس پر مزہ قہقہہ پڑے۔
- جواد :- جسے قابو ہو کر، جلد بناؤ، آخر تھری کیا ؟!
- ذکی :- (لے پروائی سے) قصہ مختصر، طے یہ ہوا کہ وہ دونوں ٹیپاں چھوٹے سائیکلوں پر سوار ہو کر۔۔۔
- جواد :- دست سے بے قابو ہو کر، ہاں، ہاں۔۔۔
- ذکی :- اسی انداز میں، تمھارے یہاں پہنچ جائیں گی۔
- جواد :- دیکھم افسردہ ہونے ہوئے، لایا میں ؟!
- ذکی :- (لے پروائی سے) تمھارے یہاں۔۔۔ کیا ہرٹ ہے ؟!
- جواد :- (خستے ہیں آتے ہوئے) عجب نامعقول ہو۔۔۔
- ذکی :- (گھبرا کر) کیوں ؟!
- جواد :- اسی انداز میں، ان سے یہاں آنے کو کہیں کہا۔ کوئی اور جگہ بخیر کی ہوتی ؟!
- بیم :- (جھلا کر) اور کہاں بیٹھ سکتے تھے یا ؟!
- جواد :- اسخیدگی سے انھیں میرے ساتھ کم از کم یوں نہ کرنا چاہیئے تھا ذکی۔۔۔ تم جانتے ہو ہم ہمیں سے ساتھ پڑتے چلے آئے ہیں۔۔۔
- ذکی :- (نسلی آمیز لہجے میں) بھائی متاثر ہو۔۔۔

جواد :- رخصتے میں چھپتے ہوئے، نوادریا کروں۔ بھلا یہاں بیٹھنے کی جگہ بھی ہے۔ ایک ہی نو سو نہ ہے کجنت اور وہ بھی بغير (سپرنگ) کے۔۔۔

شیمم :- (چھپکی ہنسی کے ساتھ) ہوا جواد ا جان کے وقت کا :-

جواد :- اسی انداز میں، ایش ٹرے میں سگرٹ بجھانے کی عادت سے سب ناواقف، وروا زسے کے سامنے نیچے ہوئے سگرٹوں کے اتار لگے ہیں۔ کڑیوں کو اپنے عال پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جہاں چاہیں جالے لگائیں۔۔۔

یہ :- یہ وھولی۔۔۔ آخر وہ تمھارے متعلق کیا نظر یہ قائم کریں گی ؟  
شیمم :- (بے پروائی سے) ہمارے متعلق ان کو کیا نظر یہ قائم کرنا ہے ؟

جواد :- اسی انداز میں، مگر میرے متعلق تو کر رہی گی۔  
ذکی :- (بے پروائی سے) ہیرا کہا، انھیں معلوم ہے تمھارا گھر جگنڑ خانہ ہے۔

جواد :- (جل کر) دام بھی دام ————— میرا گھر —————

شیمم :- (نسلی دیتے ہوئے) تم بعض اوقات ذرا ذرا سی باتیں محسوس کر لیتے ہو۔

جواد :- (پھر خستے ہیں آتے ہوئے) جی تو میں کب رہا تھا کہ میں ان چھو کڑیوں و کڑیوں کا ناکل نہیں ہوں۔ مجھے ان نفرت ہے، ایمان سے مجھے ان سے گلن آتی ہے۔

ذکی :- (گھبرا کر) ابھی یہ وقت بحث کرنے کا نہیں۔ اب تو وہ آیا ہی چاہتی ہوں گی۔

جواد :- (خستے ہیں) تو میں کیا کروں۔ میں انھیں اسی تہد اور بنیان میں ملوں گا۔

شیمم :- (گھبرا کر) اللہ یوں نہ ملنا سارا اثر زائل ہو جائے گا۔ بھائی نے ان پر بڑی ہوا باغداد رکھی ہے۔

جواد :- (تعجب سے) ایمان سے ؟

ذکی :- (سنبیدگی سے) بخدا میں نے ان سے کہہ رکھا ہے کہ تم ایف۔ اے میں پڑھتے ہو۔

جواد :- (قدرے دیمے لے رہے ہیں) مگر یار ذرا سوچو تو سہی، آخر وہ آئیں گی تو چائے کے لئے تو پوچھنا پڑیگا۔ اور میرے پاس تو کل تین ہی پیالیاں ہیں۔ وہ بھی بے جوڑ۔

ذکی :- (بے پروائی سے) تم ان باتوں کی فکر نہ کرو۔

جواد :- (پھر خستے ہیں آتے ہوئے) میں ان باتوں کی فکر نہ کروں تو اور کیوں کرے ؟

شیمم :- (سنبیدگی سے) گھڑی دیکھ کر، بھائی چھپتے ہیں پندرہ منٹ باقی ہیں۔

ذکی :- (گھبرا کر) جواد، کپڑے بدل آؤ۔ وقت ایمان سے بہت کم ہے۔

جواد :- (ڈٹھ کر) کیا معذرت ہے۔ تم نے مجھے اتنے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ بھلا اب میں پندرہ منٹ میں کیوں کر تیار ہو سکتا ہوں ؟

ذکی :- (بے پروائی سے) نہانے دہانے کی ضرورت نہیں، ابھی تم پچھلے عینے ہی تو نہا تھے۔ صرف یہ تہد بدلی کر

- پتوں پہن آؤ۔
- ۱۔ (محل کر) بن صرف تہمد بدل کر سیکون پہن آؤں اور نم جو سبج ہی سے اچکنیں ڈالنے، زلفیں متوار سے۔۔
- ۲۔ (بھیر گھیر کر) بار وقت ضائع نہ کرو ایمان سے۔۔
- ۳۔ (بے پروائی سے) اچھا یہ نگارٹوں کے ٹکڑے تو چن لو۔۔
- ۴۔ (گھیر کر آٹھتے ہوئے) نم جاؤ میاں، میں چنے دیتا ہوں۔
- (ذکی وہیز میں پڑے ہوئے بیگو ٹوں کے ٹکڑے بیٹھے گئے ہیں)
- ۱۔ (شیم سے) شیم، ذرا اس صوفہ کو پکڑو۔۔۔۔۔ (شیم اٹھ کر صوفہ کو پکڑتا ہے) اوسر سے نہیں، وہاں سے۔۔
- (جواو دوسری طرف سے جو پکڑ کر اٹھتا ہے)
- ۲۔ (زور لگا کر اٹھانے ہوئے) ہاں۔۔
- ۳۔ (صوفہ کو اپ بے جاکر) اور اٹھاؤ۔۔۔۔۔ لے۔۔۔۔۔ لے۔۔۔۔۔ اور رکھو ہاں۔۔ (صوفہ دکھائی دیتے ہیں)
- ۴۔ (شیم اسی صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے)۔۔۔۔۔ (ذکی کو پکارتے ہوئے) دیوان علی۔۔۔۔۔ !!
- ۱۔ (زنگ آکر) اب اس سے کیا کہنا ہے؟
- ۲۔ ابھی جا لے آؤ گے گا۔ (دوسرے سے) قابیل پر اگر ایک ہاتھ برش کا پڑ جائے تو چاک اُٹھے۔۔۔۔۔
- ۱۔ (سگریٹ باہر پھینکے ہوئے) اتنا وقت نہیں جو ادخارا۔۔۔۔۔
- ۱۔ (چچ کر نوکر کو پکارتے ہوئے) ابے او دیوان علی۔۔۔۔۔ !! (تھمد کے پڑے سے سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے)
- ۱۔ (باہری سے) جی صاحب !!
- ۱۔ (ذکی سے) در میں جانا ہوں۔
- ۱۔ (وجہ لاکر) اب جا بھی چکے ہیں۔
- ۱۔ (راٹھا کرتے ہوئے) ذرا یہ سگریٹ ختم کر دوں۔۔۔۔۔ (زور زور سے کھنکھاتا ہے)
- ۱۔ (اُسے کندھوں سے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے) نہیں، نہیں۔۔۔۔۔
- ۲۔ (دھڑکنے ہوئے) کہہ ایمان سے میں معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی پہلوان کا اکھاڑہ ہو۔
- (نوکر داخل ہوتا ہے)
- ۱۔ (وہ آواز بلند، جی کیجیے۔۔۔۔۔ !!)
- ۱۔ (اکانوں پر ہاتھ رکھ کر) اسے آہستہ بولا کرو انم سے کئی بار کہا ہے۔۔۔۔۔
- ۱۔ (بے پروائی سے کتھ لگا کر) یہ کئے اٹھا لے جاؤ۔
- (نوکر نے اُٹھا کر تلخہ کمرے کی طرف مڑتا ہے)
- ۱۔ (زنگ آگئے بس اب تم جاؤ گے بھی یا نہیں۔۔۔۔۔

- جواد :- (غیر سنے) دیوان ملے۔۔۔۔۔ یہ کھانے کے کمرے کا دروازہ ہمیشہ کھلتا جاتا۔  
 ذکی :- (وہ بھلا بیٹھتا ہوئے) خدا کے لئے اب جاؤ بھی۔۔۔۔۔  
 جواد :- (عجب و سرانگی سے) پر۔۔۔۔۔ پر۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ ۱۹  
 شمیم :- کیوں اب کیا ہے؟  
 جواد :- اسی نمازیں، اتنا وہ جائیں لی، مگر ان سے مات کیونکر شروع کی جائے گی؟  
 ذکی :- (کچھ سوچ کر غم فگنہ کرنا) ہم دونوں خاموش رہیں گے۔  
 جواد :- (بچوں کی طرح) میں کیوں بیوں؟  
 شمیم :- (گھر تو تھا رہا ہے) نیچے کچھ نہ ہوئے، اماں میں سے ایک اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتا ہے،  
 جواد :- (میل کر) یہ خوب رہی، معاشقہ تم کرو اور زحماں گدیں ہم۔۔۔۔۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں کتنا ہوں جونی کی بہت پٹ ہو جائے۔  
 ذکی :- (گھبرا کر) بھئی اس کا وقت نہیں ہے۔  
 جواد :- (سنجیدہ گی سے) پھر کوئی راؤ تو نکال۔  
 ذکی :- (بے پروائی سے) تم جاؤ، کپڑے بدلنے وقت سوچنا، اور ہم یہاں سوچتے ہیں۔  
 جواد :- (شمیم کو رسل پر ہنسنے دیکھ کر چڑھتے ہوئے) شمیم بھئی، یہ کیا بات ہوئی یہ کوئی رسل پڑھنے کا وقت ہے؟  
 شمیم :- (بے پروائی سے) ایک مضمون اتفاق سے طلب کا آ گیا ہے۔ شاید اسی سے مکمل حل ہو جائے۔  
 ذکی :- (عجب سے) کیا عنوان ہے؟  
 شمیم :- (غیر فطری) اٹھائے۔۔۔۔۔ لڑکیوں کو مرعوب کرنے کا تجربہ طریقہ۔  
 جواد :- (خوش ہو کر) ضرور پڑھو، ممکن ہے کوئی کام کی بات نکل آئے۔  
 ذکی :- (تنگ آ کر) اب تل بھی چکو، یا مچھ نہیں بچاؤ گے۔ میں تو کتنا ہوں صرف تمہارے بدل آؤ۔  
 جواد :- (جانتے ہوئے) ابھی جاتا ہوں۔۔۔۔۔  
 (کچھ دیر سکوت رہتا ہے۔ پھر غصہ سے جواد کی آواز  
 گونجتی ہے۔۔۔۔۔ دیوان ملے۔۔۔۔۔ اسے ادب دیوان ملے  
 صاحب نوردے جاؤ۔۔۔۔۔)  
 ذکی :- (بے بسی سے) جناب ابھی صاحب ہی منگوا رہے ہیں (پھر باؤ از بلند) ارے میاں غصہ نے سے نکل رہی۔  
 (وقفہ) کیوں شمیم، کچھ ملا۔۔۔۔۔ ۱۹  
 شمیم :- (بے پروائی سے) اوں ہوں، ابھی تو کینچٹ بھی لکھ رہا ہے کہ بڑے بڑے جبری اور دلیر آدمی کیونکر لڑکیوں کے  
 سامنے زبان بندی کے عارضے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔



ذکی :- (بے پروائی سے) خیر۔۔۔۔۔

(جو او داخل ہوتا ہے۔ اس نے اب سند کی مانند تلبیہ

باندھ رکھا ہے)

جواد :- (بال جھکتے ہوئے) کو بھئی۔۔۔۔۔ ۱۹

ذکی :- (تعجب سے) ابھی تک توبیہ باندھے پھر ہے ہو؟ (انہا کرنے مجھے، لکڑکپڑے بدل آؤ۔

جواد :- (جانتے ہوئے) اچھا۔۔۔۔۔

(چلا جاتا ہے)

ذکی :- (وقت کے بعد، شبیر میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔

شبیم :- (بے پروائی سے لگاتار پڑھتے ہوئے) ہوں۔۔۔۔۔

ذکی :- کہ شرم کو بالکل پاس نہ آنے دیا جائے۔ جو منہ میں آئے بیدھڑک کہہ ڈالو۔

شبیم :- (جھلاکن پر کوئی ڈھنگ کی بات بھی تو ہو۔

ذکی :- (بے بسی سے) یہ بھی عجیب ہے۔ اچھا تو اسی نعموں میں دیکھو۔۔۔۔۔ (پھر تباہ از بلند کیوں جواد! فاسخ ہو گئے!

آواز :- (ساتھ کے کمرے سے) بس آیا، کپڑے بدل رہا ہوں۔۔۔۔۔

ذکی :- (اُسی انداز میں، خدا کے لئے مائک پٹی نہ یاد نہ کرنا۔

آواز :- (بے پروائی سے) نہیں یار، مجھے تو پتہ نہیں پھنسا بھی عذابِ معلوم ہو رہا ہے، تم کہتے ہو مانگ پٹی نہ کرنا۔ آخر کسی

تو وارو سے ملنا ہو تو تم ان کم کپڑے تو قاعدے کے ہوں۔ اور ویسے تو تم جانتے ہو کہ مجھے ان چھو کبریوں و کبریوں

سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایمان سے سب بھلائے لئے کرنا ہوں۔

ذکی :- (بہتے ہوئے ہلے میاں) یہ ہم پر پارسائی کا رعب۔۔۔۔۔ (ذکر میں گھڑالی چھو جاتا ہے) مائے۔۔۔۔۔

(بے قابو ہو کر، جلدی کر دیا، یہاں تو رشتہ طاری ہو رہا ہے۔

(جو او کو بے میں داخل ہوتا ہے اس نے کپڑے بدل لئے ہیں،

جواد :- (بے پروائی سے) کو بھئی میں تو تیار ہو گیا۔۔۔۔۔ (وقت، شبیم سے) کیوں شبیم؟!

شبیم :- (بغیر نظر سے اٹھائے) ابھی تو دیکھ ہی رہا ہوں۔

جواد :- (سنجیدگی سے) جلد جلد پڑھو میاں۔۔۔۔۔ (وقت، بھئی مجھے اس کمرے کی بیہوشی پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی۔۔۔۔۔

(ذرا رشتہ داران کھول کر دیکھنا چاہیے، شاید فرق پڑ جائے۔

ذکی :- (بے پروائی سے) نہیں یار یہ وقت۔۔۔۔۔

جواد :- (چھت کی طرف دیکھ کر، سفیدی آدھر سے۔۔۔۔۔

شبیم :- (دیکھ کر) کو بھئی مل گیا۔۔۔۔۔!!



و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے، ساڑھیوں تو آپ پر ہی آئیں۔ یہ ریاضی سینڈل کیوں —————؟ (دافروگی سے)  
میں نے عرض کیا تھا کہ —————

و حقارت سے، الجھٹلے —————

— (و ہمارے لئے میں کہتا ہوں کہ صاحب کب آئیں گے؟ مجھ سے تو اب ہٹیں) —————

— (و اب یہ کہانیں، کتنی بڑی کشمکش طاق ہے واللہ۔ تو افریب تو دیکھو۔ —————)

بعد ازاں سے ہر روز، تمہارا اب مذاق چھوڑا ہے۔ سچی بنا ہے آپ ہمیں ٹیڈینوں کیوں کرتی ہیں؟

— (اب تمہیں کون نہیں جانتی ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

!!

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

— (و اب یہ سچی بات ہے؟)

- جواد :- (تعجب سے) کیا ؟  
 شمیم :- (مسرت سے) ”طریقہ“ کیموت نے بخر میں دیا ہے۔  
 ذکی :- (مسرت سے بے قابو ہو کر) پڑھو پڑھو —————  
 شمیم :- (گلدستہ صاف کر کے) لکھا ہے —————  
 جواد :- (بے قابو ہو کر) بولو بھی ؟  
 شمیم :- (سجیدگی سے) لکھا ہے ”خواتین سے ملنے وقت اس امر کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ جب —————  
 ذکی :- (بے قابو ہو کر) ہاں ہاں ————— ؟  
 شمیم :- (اسی انداز میں) کہ جب وہ کمرے میں داخل ہونے لگیں تو مرقعاً اٹھ کھڑے ہوں اور اتنی دیر —————  
 جواد :- (بے صبر ہو کر) کیا کریں ؟  
 شمیم :- (عجاری رکھتے ہوئے) ”کھڑے“ ہیں جب تک کہ خواتین بیٹھ نہ جائیں —————  
 جواد :- (مسرت سے) سبحان اللہ ————— جیسی کیپتے کی بات کہی ہے —————  
 شمیم :- (پھر پڑھتے ہوئے) ”گفتگو کی ابتدا“  
 ذکی :- (بے صبر ہو کر) ہوں، ہوں ؟  
 شمیم :- (اسی انداز میں) ”ہوں ہونی چاہیئے“ —————  
 جواد :- (بے صبری سے) کیونکہ ؟  
 شمیم خاموش رہتا ہے ( )  
 ذکی :- (بے صبری سے) اماں بولو بھی ؟  
 شمیم :- (پڑھو گی) آگے بریکیٹوں میں لکھا ہے ”باقی آئندہ“ —————  
 جواد :- (جھلا کر) لعنت اللہ —————  
 (باہر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے)  
 ذکی :- (گھبرا کر) ارے یہ آواز کیسی ہے ؟  
 شمیم :- (کھڑکی کی طرف دیکھ کر) ٹانگہ معلوم ہوتا ہے۔  
 جواد :- (تعجب سے) ٹانگہ ! ————— (ٹانگہ کھڑکی کی طرف جلتے ہوئے) ٹھہرو میں کھڑکی میں سے دیکھتا ہوں  
 ذکی :- (جبرانی سے) کون ہے ؟  
 شمیم :- (سہم کر) کہیں ارزانی بگلا نہ آگیا ہو۔  
 جواد :- (کھڑکی میں سے جھانک کر) دولہا کیاں آتری ہیں۔  
 شمیم :- (بے قابو ہو کر) لایاں لڑکیاں ؟ (ذکی سے) دیکھو آگئیں۔

- ذکی :- (اٹھتے ہوئے) مگر انہوں نے تو کہا تھا کہ ہم سائیکلوں پر آئیں گی ۱۹ !  
 شمیم :- (بے پروائی سے) سائیکلیں گنجلو بھی تو ہو سکتی ہیں ۔  
 جواد :- (گٹکار جھانکتے ہوئے) دیوان علی سے کچھ لوچھو رہی ہیں ۔ ان میں سے ایک نے دوسری کے کندھے کا ہمارا  
 لے رکھا ہے ۔ بیمار معلوم ہوتی ہے ۔  
 ذکی :- (کھڑکی کی طرف اٹھتے ہوئے) تم نہیں سمجھتے جواد ۔ بڑی چالاک ہیں وہ اب کوئی بنا ڈھونگ رہا یا ہو گا ۔  
 شمیم :- (وہ میں بیٹھے ہوئے) شرارت نواں کی رنگ رنگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔  
 جواد :- (کچھم کچھم کر) ارے ، وہ تو اوجھڑی آرہی ہیں ۔  
 شمیم :- (گھبرا کر) نہیں ۔  
 جواد :- (لبخیر اس کی طرف دیکھتے) ایمان سے ۔  
 ذکی :- (مسرت سے اچھلتے ہوئے) اے سہ ۔  
 جواد :- (سجود کی ہے) کوہِ کریمے موت لگاؤ بارہ قالین سے گرد آؤ شریفی شروع ہو گئی ہے ۔  
 شمیم :- (کھڑکی کی طرف آ کر جھانکتے ہوئے) بخدا وہی ہیں ۔  
 جواد :- (گھبرا کر) شمیم تم اپنے ننھے چھپانے کے لئے ناک پر رومال رکھ لو ۔ ذکی اپنی آنکھیں نیم داکرہ لو ۔  
 ذکی :- (جوا سے) یا تم بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارا منہ بلا ضرورت نہ کھلے ۔  
 شمیم :- (پھر جھانک کر) دیکھو بھائی ، ایک نے کس طرح سہارا لے رکھا ہے جیسے بیمار ہی تو ہے ۔  
 ذکی :- (رسخیدگی سے) ابھی تم دیکھنا تو نہیں آئے ہی کوئی اور سوانگ بھر رہی گی ۔  
 (ذکر داخل ہوتا ہے)

- نوکر :- (بآواز بلند) میاں صاحب !  
 شمیم :- (کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر) ارے آہستہ بولا کہو تم سے کئی بار کہتا ہے ۔  
 جواد :- (نوکر سے) کیوں کیا بات ہے ۱۹ !  
 نوکر :- (دو جیسے لہجے میں) عورتیں ہیں ۔  
 جواد :- (دھستے سے) تو کیا ہوا ۱۹ !  
 نوکر :- (اسی انداز میں) کسی ڈاکٹر واکٹر کا بیچہ رہی ہیں ۔  
 شمیم :- (ذکی سے) تو صاحب دیکھ لیا ۱۹ !  
 جواد :- (بے پروائی سے) میاں انھیں اندر بھیج دو ۔ ہم سب سمجھتے ہیں ۔  
 نوکر :- (اسی انداز میں) بہتر ۔  
 (چلا جاتا ہے)

- ذکی :- (تعب دسرا بھی ہے) خدا کی قسم یہ لوکیں تو بلا کی شہر ہیں۔  
 جواد :- (بے بسی سے) ابھی میں تو انہیں بچنے سے قاصر ہوں۔  
 شمیم :- (کھڑکی میں سے جھانک کر) لو آ رہی ہیں۔  
 جواد :- (کبدم بھاگ کر صوفہ پر بیٹھتے ہوئے) بس اب خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔  
 شمیم :- (کھڑکی سے ہٹ کر فرش پر بیٹھتے ہوئے) فکر نہ کرو۔  
 ذکی :- (روقعے کے بعد تمھارے کان ہل رہے ہیں جواد)۔  
 جواد :- (بے بسی سے) ابھی میں کیا کروں، میرے اختیار میں نہیں ہیں۔ گھبراہٹ میں گفت و خود بخود ہلنا شروع کر دیتے ہیں۔  
 شمیم :- (عذبات سے بے قابو ہو کر) تو بہ۔  
 ذکی :- (صوفے پر گرتے ہوئے) میرا تو دل دھڑک رہا ہے۔  
 (دو لڑکیاں داخل ہوتی ہیں۔ دونوں قبلی صورت ہیں)  
 پہلی :- (جھجک کر دروازہ کھولتے ہوئے) ہم اندر آ سکتی ہیں؟  
 جواد :- (صوفے سے فرش پر بیٹھتے ہوئے) بڑے سوتے۔  
 پہلی :- (دوسری کو صوفے پر بٹھا کر خود ہی بیٹھتے ہوئے) کیا ڈاکٹر صاحب تشریف رکھتے ہیں؟  
 جواد :- (دیر سے) آپ ذرا بیٹھ تو بیٹھتے۔  
 ذکی :- (شمیم کے کان میں) جواد اچھا چل رہا ہے۔  
 شمیم :- (بے پروائی سے) ہاں۔  
 دوسری :- (بہار لگتے ہیں) آبا۔۔۔ آہ۔۔۔ میرا بدن تو بیمار سے پونکھا جا رہا ہے۔  
 پہلی :- (نسائی آمیز لہجے میں) ہمت کرو۔۔۔ (پھر جواد سے) کیا ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود نہیں؟  
 جواد :- (رہتے ہوئے) جی، ہم انہی کا انتظار کر رہے ہیں۔  
 پہلی :- (آہ بھر کر) آپ سب گویا کہ مر رہیں۔  
 جواد :- (گھبرا کر) جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔  
 (کچھ دیر کے لئے سکوت رہتا ہے)  
 ذکی :- (کھاتے ہوئے) آج کی رات سا بڑا دل چڑو رہا ہے۔  
 پہلی :- (جھلا کر) خدا کا ناند کیجئے۔۔۔ میری بہن تو بھونڈی آوازوں سے خفقان شروع ہو جاتا ہے۔  
 دوسری :- (پہلی کے کندھے پر ہر نہ کہتے ہوئے) تم تعیش لے لے، آبا۔۔۔  
 ذکی :- (تعجب سے) مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ سائیکلوں پر آئیں گی؟  
 پہلی :- (نفرت و حقارت سے) کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ، ہم سائیکلوں پر کس طرح آ سکتی تھیں؟!

دلی :- مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اس اڑھیاں تو آپ پر ہی آئیں۔ یہ لفظی بیہوشی کہوں۔۔۔۔۔؟ (افسروں کی تھے) میں نے عرض کیا تھا کہ۔۔۔۔۔

پہلی :- (حقارت سے) کچھ مت۔۔۔۔۔

دوسری :- (بہار لیجے ہیں) اباء و اکثر صاحب کتب آپ کے ہمجہ سے تو اب سہجی۔۔۔۔۔

تیسری :- (جزاؤں کے کان میں) ابھی بڑی شیطان ہے واللہ۔ ورا فریب تو دیکھو۔۔۔۔۔

فولی :- (صوفیہ کے قریب ہو کر) اچھا اب مذاق چھوڑیے۔ بچ بٹائیے آپ ہمیں ٹیلیفون کیوں کرتی ہیں؟

پہلی :- (انصرت سے) آپ نے بھنگ تو نہیں پی ہے؟

فولی :- (بھنگ آکر) تو کیا بھنگ خانے میں نہ بت ضروری پیتے ہیں؟

دوسری :- (بھنگ آکر) یہ کسی دماغی مرض میں مبتلا ہیں آیا۔۔۔۔۔

پہلی :- (دلہ پر دوائی سے) میں سب سمجھتی ہوں۔ بچنے دو۔۔۔۔۔

تھا اور :- (انگے بڑھ کر) دیکھیے نا۔۔۔۔۔ مجھے کم بولنے کی عادت ہے، مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہم سے بہت سی لڑکیاں دلچسپی لیتی ہیں۔

فولی :- (بے قابو ہو کر) یعنی سمجھ لیجئے، کسی گوری لڑکیاں ہمارے صدر دروازے کے سامنے چار پائیاں بچھائے تختہ پتھر پر رہتی ہیں۔۔۔۔۔ (پچھلی کر) اے۔۔۔۔۔ اے۔۔۔۔۔ کیا اب حقتہ پتھر کی؟

پہلی :- (جھلا کر) آپ کو شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے؟

فولی :- (اسی انداز میں) اچھا اب یہ ہے کہ مجھے خروامی کا انتظار ہے۔ آتی ہی ہوگی۔

پہلی :- (غور سے) آپ دلچسپ نہیں۔ ہے میں نے عینک لگا رکھی ہے؟

تیسری :- (دلہ پر دوائی سے) تو کیا ہوا؟

پہلی :- (سہجی لگی سے) یعنی یہ کہ میں یہ بھی لکھی ہوں، کوئی۔۔۔۔۔

تھا اور :- (بٹھتے ہوئے) چہ خوب؟

پہلی :- (جواہر کی طرف مڑ کر) کیا فرمایا آپ نے؟

دوسری :- (بہار لیجے میں) آہا، مینوں دیوالیہ ہیں۔ ان کے منہ نہ لگے۔۔۔۔۔

فولی :- (عالمانہ انداز میں) خاکسار کو علم ہے کہ آپ پڑھی لکھی ہیں۔ آپ نے "شام و بھر" اور "آواز" دونوں پڑھی ہیں۔ غالب کی سمرچ پڑھی ہے اور اقبال کی شاعری آپ کو پسند نہیں۔۔۔۔۔

جواہر :- (بٹھتے ہوئے) مگر میں دونوں سے کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کی شاعری آپ کے ذہن کی رسائی سے بالاتر ہے اس کے اشعار عورتوں کے لئے نہیں ہیں۔

پہلی :- (جمل کر) اور کن کے لئے ہیں؟

جواو :- عجیب ظالمانہ نشان سے ہم جیسے عالموں کے لئے —————

پہلی :- (خفارت سے) اللہ کی سنت —————

جواو :- ابھر بیٹھے ہوئے ہیں درست کہہ رہا ہوں - ایک عورت بھلا صوفیوں کی منازل کے متعلق کیا واقفیت رکھ سکتی ہے

آپ جانتی ہیں فنا فی الشیخ کی منزل کیا ہوتی ہے ؟

پہلی :- (خفارت سے) جی نہیں — آپ ہی وضاحت کر دیجئے۔

جواو :- (گھبرا کر) یعنی ویجئے نا — آہ — فنا فی الشیخ کی منزل گریہ یا کہ بڑی ہی دلچسپ منزل ہے اور اس کی

پہچیدگیاں یعنی میں کیا عرض کروں بہت ہی پیچیدہ ہیں — غالباً آپ سمجھ گئی ہوں گی - غالب نے کیا خوب کہا ہے -

قطرہ اپنا بھی تحقیق میں ہے وریا بیکیں

ویسے میں آپ کی معلومات کے لئے کہہ دوں کہ زندگی فانی ہے، اسی لئے میں گریہوں میں دوپہر کے وقت موت

اوارہ کر سوتا ہوں - آپ نے کبھی عمر و بن کثوم کے اشعار پڑھے ہیں — آہ — کیا پر مغز باتیں کہتا آگے۔

ذکی :- (شہیم کے کان میں) کیوں نہ ہو، آخر ایف نے میں پڑھنا ہے۔

جواو :- (جاری رکھتے ہوئے) اب آپ پوچھیں گی کہ شہیم صاحبے ناک پر دو مالی کیوں رکھا ہوا ہے، میں کہوں گا انھیں

دامی نزلہ ہے - آپ پوچھیں گی ذکی صاحب کی آنکھیں نیم دا کیوں ہیں - میں کہوں گا یہ رات کو خواب میں اکثر

ڈر جانے ہیں - آپ پوچھیں گی میں کم کیوں بولتا ہوں - میں جواباً عرض کروں گا کہ میرے دادا مجذوبہ تھے

کیا کبھی آپ نے آسمان پر کوئوں کو اڑنے دیکھا ہے ؟

پہلی :- (دبے پردائی سے) جی نہیں —

جواو :- (بے بسی سے) پھر آپ نہیں سمجھ سکتیں کہ چاکلیٹ کا مزہ کیسا ہوتا ہے !!

پہلی :- (دوسری سے) تم سنا کہہ رہی تھیں ساجدہ !!

ذکی :- (عجب سے) ارے آپ کا نام ساجدہ ہے ؟

دوسری :- (گھبرا کر) جی ہاں —

ذکی :- (پہلی سے) پھر آپ پردہ پہنیں گی ؟

پہلی :- (عجب سے) جی ؟

شہیم :- (مزے لے کر) شہیم ہوں گی — !!

پہلی :- (تنگ آکر) براہ مہربانی —

جواو :- (مزے بیکر نہیں بھجی عارفہ ہوں گی) — !!

پہلی :- (خفارت سے) میں کہنی ہوں کان مت کھا جئے —



دباہری کی ڈیوڑھی سے سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے۔

آواز :- (نقشِ لمحہ میں) ک۔۔۔ کیا ڈاکہ صاحب آئے؟

تعمیم :- (گھبرا کر) تو یہ ہے، منتور۔

ڈکی :- (خفا سے) پھر آگیا کھنت؟

جواو :- (گھبرا کر) کہیں اس نے اپنا نظریہ نہ بدل لیا ہو۔

آواز :- (دباہری سے) بھئی۔

ڈکی :- (آواز بلند) کہو؟

آواز :- (دباہری سے) میں نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے۔

تعمیم :- (بے پروائی سے) بڑی دیر لگائی یا؟

ڈکی :- (دیکھا چھڑانے ہوئے) اچھا تم جاؤ، ہم کل سٹس لیں گے۔

آواز :- (دباہری سے) میں ابھی سٹس کے دیتا ہوں۔ مجھے جلدی نہیں ہے۔

جواو :- (بے بسی سے) تو یہ ہے بھئی۔

آواز :- (دباہری سے) میں کافی اماں کے ہاں جا رہا تھا۔ وریا کے قریب پہنچا تو مجھے ایک دوست مل گیا، ناٹھانا انداز میں،

وہ تہذیبی عہد سے بھی ایک فٹ چھڑا ہے۔

تعمیم :- (بے پروائی سے) ہو گا۔

آواز :- (دباہری سے) اس کے ساتھ ایک سات فٹ کی لڑکی تھی۔ اس کے گھنٹے سے مل گئے وہ کہہ رہا تھا۔ جانم میں زندگی

سے عاجز آگیا ہوں۔ اگر تم نے مجھ پر ترس نہ کھا یا تو میں دریا میں کود پڑوں گا۔

ڈکی :- (تعجب سے) کہہ بھی کہیں یہ تھا تیرا ایک دوست، ہفتا تو نہیں؟

آواز :- (دباہری سے) ہاں وہی۔۔۔ تو وہ بیچارہ جلد بیکرم سے متاثر ہو کے آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور اسے

گرو میں اٹھا کر ماتھے کا بوسہ لے لیا۔

تعمیم :- (تعجب سے) اماں نہیں؟

آواز :- (دباہری سے) قسم ہے اللہ پاک کی۔۔۔ سہرا میں باغی ہو گیا ہوں۔۔۔ میں نے قومِ طہیت کے خلاف بغاوت

کر دی ہے۔۔۔ ابمان سے کہتا ہوں میں باغی ہوں۔

جواو :- (ڈرتے ڈرتے) آج نہ بولو یا رکونی پکڑ لے گا!!

آواز :- (دباہری سے) میں باغی ہوں۔۔۔ میں باغی ہوں۔۔۔ میں باغی ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

پہلی :- (نفرت سے پوچھتے ہوئے) یہ تھکنے صاحب کی تعریف؟

- جواد :- (مست سے) ہمارے ایک دوست ہیں۔
- شیم :- (پہلے پروائی سے، غصہ کے طالب علم ہیں) —
- ذکی :- (سجیدگی سے) پرفٹ بال بہت اچھا لگتے ہیں۔
- دوسری :- (رنگ آکر) آپا میری طبیعت گھبرا رہی ہے، ڈاکٹر صاحب کس وقت آئیں گے؟
- پہلی :- (جواد سے کڑھکی سے) بتائیے ڈاکٹر صاحب کہاں گئے ہیں؟
- ذکی :- (الٹا کرتے ہوئے) ایمان سے مذاق چھوڑیے، کسی وقت سنجیدہ بھی ہو جائیے۔
- پہلی :- (نفرت سے) میں کتنی ہوں آپ —
- ذکی :- (غیر وجہ دیتے) اللہ قسم آپ کے ٹیلیفونوں نے میری بڑی گت بنائی ہے۔ آپ معاملے کی نزاکت کو ابھی تک سمجھتے ہیں؟
- پہلی :- (غصہ سے) آپ مجھے بتائیں گے یا نہیں؟
- شیم :- (جواد کے کان میں) بنا رہی ہیں!!
- جواد :- (شیم کے کان میں) بھئی کھجوت بڑی۔
- ذکی :- (جاری رکھتے ہوئے) ابھی تو چچا میاں مرچو دتہیں تھے۔ وہ کچھ جینے سے شکار پر گئے جوئے ہیں ورنہ۔
- جواد :- (ایک مہے قابو ہو کر) اخاد — شکار؟ کیا بات ہے شکار کی۔ (آہستہ سے شیم کے کان میں) مجھے کئی بتایا ہے کہ لڑکیوں سے اگر شکار کی باتیں تو بچیں جاتی ہیں۔
- پہلی :- (دھچلا کر) میں کتنی ہوں —
- جواد :- (غیر پروا کئے) شکار — کبھی آپ نے شیر کا شکار کیا ہے؟
- پہلی :- (منت کرتے ہوئے) خدا کے لئے آپ خاموش رہیے۔
- جواد :- (اُسی انداز میں) شیر کا شکار — یعنی ایک مرتبہ میں ننہا سی، اپنی کئی جگہوں میں شیر کے شکار کو لے گیا۔
- شیم :- (جواد کے کان میں) ارے ریاض کے سناے ہوئے فٹے اپنے ساتھ ٹانگ رہے ہو؟
- جواد :- (شیم کے کان میں) چلتے دوڑاں تو۔
- ذکی :- (سجیدگی سے) ایمان سے آپ بھی سمجھی نہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی پاگل نہیں ہے، میں آپ کو یقین دلا۔
- پہلی :- (رنگ آکر) وہ تو ظاہر ہی ہے۔
- جواد :- (نوجواب ایک دفعہ میں اتفاق سے اکیلا جنگل میں نکل گیا جنگل میں بڑی چل پہل تھی۔ گیدڑ مختلف جگہوں پر چرائے لگے۔ میٹھے تھے۔ بندر، چیتے، بانٹھی، جھینے سبھی جھولا جھول رہے تھے۔ ایک طرف لومڑیاں شلواریں پہنے پھر رہی تھیں۔ میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے لکڑ بگڑ سے پوچھا: کہو بھئی، بات کیا ہے؟ بڑی رونقیں ہیں؟ بڑے تعجب سے بولا۔
- ”کیا آپ کو خبر نہیں، ہمارے حضرت بادشاہ سلامت، شہنشاہ شیر برکے ہاں اس ضعیفی کی عمر میں بڑی سنسنی اور آرزوؤں

نے بعد ولی و مدد پیدا ہوا ہے۔ میں آگے تل گیا۔ اب لیا دیکھا ہوا کہ سامنے مسدود پر پتھر باریق چاہیہ کی کاوش دکائی  
 ہے اور شیر صاحب کا وٹکیر کا سارا لئے، عینک لگائے، ربا فیات طر فام پہنچے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہیں آخر کھڑے  
 ہوئے ٹہکتے تپاک سے ملے۔ اور ایسے سا ٹھہر گئے۔ پر ہٹایا۔ ہاتھ دلاؤ دھوئے ہوا ام سے شروع ہوئے۔ کہ بعد وہ دوسرے  
 ان بائیں پھر گئیں پوچھنے لگے۔ آپ کی بندوئی کس کوئی ہے؟ میں نے، میں ایسا کر جی ہر ہور کی ہے کہ لگے  
 اس سے تو صرف بیڑوں کا سنا، ہو سکتا ہے آپ یہاں اس ارادہ سے آئے ہیں؟ میں نے ہاتھ باندھ کر کہا  
 کہ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ ہاں۔ کہہ "میں نے ڈرنے ڈرنے لکنا آپ کے لئے رکھی خاطر  
 وہ نہایت سنجیدگی سے آئے۔ میرا ہاتھ پکڑا اور فریگ کے نیچے میں لگے۔ پھر اپنی بھانجی پر سے بال ہٹانے ہوئے  
 کہنے لگے "سہا بن حاضر ہے۔ شہادت باری ہے۔ میں بہت ناہم ہوا۔ ان کے قدموں پر گرا اور شہادت کہنے لگا۔ اور  
 اسے حاتم طائی کی رسم کا شیر بر آج تک نہ دیکھا۔ سنا ہے پھر۔۔۔۔۔

دوسری :- بے قابو ہو کر آواز اٹھیں چپ کرلو۔ ان کی بکرا اس اب میرے لئے ناقابل برداشت ہوئی ہے۔

پہلی :- سب سے اسی سے خدا را ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔

دوسری :- داکٹر بڑھ کر پیسے آپ تباہیے، آپ نے ٹیلیفون پر ملنے کو کہا تھا یا نہیں؟

پہلی :- ہاں دکر، چلو کہا تھا کمر۔۔۔۔۔

دوسری :- دوسرے سے بے قابو ہو کر آواز اٹھا۔ مان گئیں۔

پہلی :- میرے لئے کر سبحان اللہ۔۔۔۔۔

دوسری :- داکٹر جوڑ کر، ایمان سے میں زندگی سے بالکل بیزار ہوں۔

پہلی :- زبھرائی ہوئی آواز میں، تو پھر دم کیا کریں؟

دوسری :- رشتہ آ میرے لیے ہیں، تجاہل، تغافل تو ہو چکا۔۔۔۔۔ اب یہی قسم کھم اور کیل۔۔۔۔۔

دوسری :- پہلی کے کان میں، آپا میرا تو خیال ہے میں غلطی ہوئی ہے۔

پہلی :- دوسری کے کان میں، غلطی؟ یہ کیونکر۔۔۔۔۔؟

دوسری :- رکھانے کے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھ کر، یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر معلوم نہیں ہوتا۔

شعبہ :- (جواو کے کان میں) ارے جواو۔۔۔۔۔ خدا کی قسم وہ کھانے والے کمرے کی جانب دیکھ رہی ہیں۔

جواو :- روایت پیتے ہوئے، میں نے اس بد بخت دیوان علی سے کہا بھی تھا کہ دروازہ یہی ٹہکتے جانا۔

پہلی :- (دوسری کے کان میں) ڈاکٹر صاحب کا گھر نہیں؟ وہ کیسے؟

دوسری :- (دروازہ کی طرف اشارہ کر کے) دیکھو نا، سامنے کھانے کی میز پر بوٹ رکھے ہیں۔ مجھے تو یہ کوئی بوڑھا لگاؤں

معلوم ہوتا ہے۔

پہلی :- (جواو سے غصہ میں) کیوں صاحب، کیا یہ بوڑھا لگاؤں ہے؟

- جواد :- رنجوں کی طرح، ہی نہیں ————— یہاں تو روتے رہتے ہیں۔  
 دوسری :- رنج کر، ادنیٰ میرے لائق ————— کہاں آچھیں۔  
 پہلی :- جرات سے، میں آپ سے پوچھتی ہوں کیا یہ ڈاکٹر ظہیر الدین کا گھر نہیں ہے ؟  
 ذکی :- راجہ کا اظہار کرتے ہوئے، کون سے ظہیر الدین ؟  
 بشیم :- سر کھلنے ہوئے، اپنے وہی بابر تو نہیں ؟  
 ذکی :- رنج سے اکوڑ سے بابر، ماہیں ؟  
 جواد :- بے پروائی سے، اماں وہی ہمایوں کے آبا ————— !!  
 پہلی :- (اسی انداز میں) اس گھر کا منہ کیا ہے ؟  
 جواد :- راجہ کی طرح، جی، ہونے آٹھ۔  
 پہلی :- (مچلا کر) آہ گستاخ کے دروازے پر تو آٹھ کھٹا ہوا ہے ؟  
 ذکی :- بے پروائی سے، ممکن ہے کسی نے شراکت سے لکھ دیا ہو۔  
 بشیم :- عجائبات کی طرح، تو کیا ہوا۔ فیروں سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔  
 پہلی :- (غصے میں) آپ کو ہم سے دل لگی کتے شرم آتی چاہیے۔ بڑے برعاش ہیں آپ۔  
 بشیم :- (رنج سے) برعاش اور ہم ؟ کیوں بھی۔ بیچڑیک کہہ رہی ہیں !!  
 پہلی :- بے پروائی سے، میں ڈاکٹر ظہیر الدین کے ہاں جاتا ہے۔  
 جواد :- (گھبرا کر) لا حول ولا قوۃ۔ آپ نے پیسے کیوں نہ کہا۔ وہ تو سانچہ کے مکان میں رہتے ہیں۔  
 دوسری :- (اٹھتے ہوئے) اٹھو آیا، میں کہہ رہی تھی یہ کوئی —————  
 جواد :- (محاجت سے) میں معافی چاہتا ہوں، ہمیں —————  
 پہلی :- بے قابو ہو کر، بکھڑے مت ————— !!  
 جواد :- (سر نیچے کر کے) بہت خوب۔  
 پہلی :- (بشیم کی طرف دیکھ کر) میں آپ لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔  
 بشیم :- (سر نیچے کر کے) بہت خوب۔  
 پہلی :- (جل بھن کر) دیکھ نہیں ہے میرے ساتھ بیٹا رہیں ہے۔ ورنہ ابھی پولیس میں رپٹ لکھوا دینی۔ آپ کو ہمیں بلانے کی جرات کیسے ہوئی۔  
 جواد :- (بھرائی ہوئی آواز میں) بولو ذکی، تمہی نہیں پیش نہیں تھے۔  
 ذکی :- (دیکھ کھاتے ہوئے) واہ، انھوں نے خود ہی تو ٹیلیفون پر کہا تھا۔  
 پہلی :- (حقارت سے) ٹیلیفون پر کہا تھا ؟ کس نامعلوم نے آپ سے ٹیلیفون پر کہا تھا ؟ !!

- ذکی :- (اسی انداز میں) آپ ہی تو نہیں۔  
 دوسری :- (بیمار لہجے میں) چلو آپا میری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔  
 حواد :- (سخنیدگی سے) جانتے جانتے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔  
 پہلی :- (فہمتے میں) بچے مت۔ میں ابھی۔۔۔  
 شبیم :- (گھبرا کر) ذکی بھائی، بات کرنا اب؟  
 ذکی :- (بھرائی ہوئی آواز میں) یار، میں کیا بات کروں؟  
 پہلی :- (فہمتے سے بے قابو ہو کر) کیسے کہیں گے، مانہنجا۔۔۔ (غضب خدایا کھنٹوں کو اتنا خیال نہیں کہ بیمار ساتھ)  
 اور انہیں عشق و شوق کی سوجھ بوجھ رہی ہے۔ غلط ہے کہیں کے نامراد۔۔۔  
 دوسری :- (دروازے کی طرف دھکیل کر) چلو آپا، باہر تو نظر۔۔۔  
 (دونوں لڑکیاں پیٹی جباتی ہیں،  
 ذکی :- (اطمینان کی سانس لیکر) ایک دن کے لئے کافی خطاب ہیں۔  
 شبیم :- (بے پروائی سے) میں تو کتنا ہوں شکر کرونگے۔  
 حواد :- (ذکی یار، بڑے افسوس کی بات ہے کہ نرم ابھی تک بالکل نا سمجھ ہو۔  
 (ڈیوڑھی میں سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے)  
 شبیم :- (بے پروائی سے) غالباً منور پھر آیا ہے۔  
 (دروازے کے قریب بسکپاں بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے)  
 ذکی :- (چونک کر) ارے، یہ روک کر رہا ہے؟  
 شبیم :- (راگے بڑھ کر جھانکے ہوئے) منور۔۔۔  
 حواد :- (رندمانتے ہوئے) نہیں؟  
 (دروازہ کھلتا ہے اور منور بیٹے مجھے داخل ہوتا ہے۔  
 منور ایک پیٹ فڈنگٹے ہوئے جسم کا نوجوان ہے جس کے  
 ابرو ہمیشہ حقارت سے اٹھ رہتے ہیں اور جس کی ناک  
 ہمیشہ لذت سے چڑھی رہتی ہے کبھی کبھی اس کی  
 نگاہوں میں گوریوں جیسی چمک نظر آتی ہے)  
 ذکی :- (دہپارے پر چھتے ہوئے) کیوں بھئی، خیریت تو ہے؟  
 شبیم :- (مخاطب ہوتے ہوئے) منور۔۔۔  
 حواد :- (تعجب و سرائیکی سے) آخر بات کیا ہے؟

- منور :- دروتے ہوئے، کچھ نہیں کچھ ———
- ذکی :- (اصرار کرتے ہوئے) نہیں، کچھ ضرور ہے۔
- جواد :- (انتہا کرتے ہوئے) بتاؤ تو سہی ہم کوئی غیر حقوڑی ہیں؟
- شیمیم :- (قہقہے ہوتے) کہو، گھبراؤ نہیں۔
- منور :- (روتے ہوئے) میں بحیثیت ایک باغی کے سائیکل پر اڑا جا رہا تھا کہ رستہ میں مجھے ایک عورت نظر آئی،
- بیچھے سے جوان معلوم ہوتی تھی۔ بھاری سپینہ میں بڑی طرح شرابور تھی۔ نہ جانے کہاں سے پیدل چلی آ رہی تھی
- مجھے بڑا ترس آیا۔ پوچھ بیٹھا۔ آپ اتنی دھوپ میں پیدل چل رہی ہیں ٹانگہ میں کیوں نہیں بیچھ بانیں؟ بولا
- ”بیٹا اگر تمہیں کوئی ٹانگہ مل جائے تو مجھے بٹھا دو۔“ (جذبات سے بے قابو ہو کر زور زور سے روتے
- ہوئے) جب میں نے یہ سنا تو دہریں سے واپس آ گیا۔
- جواد :- (عجب سے) کیوں؟
- منور :- (اسی انداز میں روتے ہوئے) اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی۔
- شیمیم :- (عجب سے) مگر تم تو اپنی نانی اماں کے ہاں ریڈیو سننے جا رہے تھے؟
- منور :- (خسارت سے چیخ کر) نہیں، میں اب نانی اماں کے ہاں ریڈیو سننے کبھی نہیں جاؤں گا۔ ہاں —
- ذکی :- (حیرانی سے) اور تمہارے ماموں؟
- منور :- (ہچکیاں بھرتے ہوئے) میں اپنے عوب والے ماموں سے بھی نہیں ملوں گا۔ ہاں —
- جواد :- (بے پروائی سے) چلو نہ سہی۔ مگر مونچھوں سے یہ آنسو تو پونچھ ڈالو۔
- منور :- (رومال سے ناک صاف کر کے) جواد؟
- جواد :- (پیار سے) کہو کہو؟
- منور :- (روتے ہوئے) مجھے ایک دھوٹی اور بنیان مل جائے گی؟
- جواد :- (قہقہے لگتے ہیں) ضرور۔
- منور :- (قدرے سنبھل کر) اور تنہا کرہ بھی؟
- جواد :- (اسی انداز میں) کیوں نہیں۔
- ذکی :- (رہیا رہ کر) مگر منور میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس وقت تنہائی کے خواہشمند کیوں ہو؟
- منور :- (پھر روتے ہوئے) میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔
- شیمیم :- (عجب اور پیار سے) کیا؟ ایمان سے۔ یہیں بھی بتاؤ؟
- منور :- (وقفہ بعد) میں سوچنا چاہتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا سوچنا چاہیے۔
- ذکی :- (بے قابو ہو کر) ابھی اللہ قسم یہی اس وقت ہم بھی سوچنا چاہتے ہیں۔

ہوا اور ۔۔ (تسلی آمیز لہجے میں) اگر ہم چاروں اسی کمرے کے کونوں میں پڑ کر سوچیں تو انہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا منور۔!

منور۔۔ (بھرائی آواز میں) نہیں۔۔۔

ہوا اور۔۔ (نوکر کو پکارتے ہوئے) دیوان علی۔۔۔!

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر۔۔ (آواز بلند) جی صاحب!

شبنم۔۔ (رنگت اُکڑ کر) اسے آہستہ بولا کہ وہ تم سے کئی بار کہا ہے۔

ہوا اور۔۔ (بے پروائی سے) ذکی اور شبنم صاحب کی ٹیڈی بی، میرے اور بخاریں صاحب کے تھیلے آؤ۔۔۔

نوکر۔۔ (جاتے ہوئے) ہنتر۔۔۔

(چلا جاتا ہے)

شبنم۔۔ (رحمہا ہی لیکر اس صوفے کو پرے سرکا دے، بیٹنے کے لئے تھوڑی جگہ تو ہو جائے۔

ذکی۔۔ (بیٹنے ہوئے) دو چار ٹکٹے بھی منگو لینا بار۔۔۔

————— پیرچہ —————

# تعجب طلب

## شوکت مٹاؤی

مجھے اس وقت جو عقدہ آ رہا تھا یہ عقدہ کی وہ قسم ہے جس کا تجزیہ کرنے کی ہیئت کوشش کی اور کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔ کچھ سمجھو  
میں نہیں آتا کہ یہ عقدہ اتفاقات کی خلعت پر آتا ہے یا اپنی بیچارگی پر، اور ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ میں ان لوگوں کو نہایت حق سمجھتا ہوں جو اس  
قسم کے مرقعوں پر جس شکتی ہوتے ہیں، انہیں سمجھاتے ہیں بلکہ حسب معمول میٹھی میٹھی مسکراہٹ اپنے لبوں پر لیے بیٹھے رہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات  
کوئی نہیں سمجھنے کے لیے جب سفید پتوں ہیں چکے۔ سفید جوتے کے تسمے کس چکے اور ریکٹ ہاتھ میں لے کر باہر جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ بادشہ نرہ  
ہو گئی۔ کام پر وگام پر پانی پھر گیا۔ کپڑے بدلے، ریکٹ کو پریس میں کس دیا اور طے کیا کہ چلا آج اپنی لائبریری میں یہ خوش گوار موسم بسر کریں گے۔ سب کو بتا  
ڈیوڑیا۔ پڑھنے کی ٹینک اسٹائی اور لائبریری میں پہنچ گئے۔ جہاں چاروں طرف المادیوں میں ان مصنفین کی کتابیں چنی ہوئی تھیں جن سے کچھ نہ کچھ فزیت  
رہ چکی ہے۔ ابھی یہ طے نہ کیا تھا کہ اس وقت کس مصنف سے شریف نہا زم حاصل کیا جائے کہ ایک دم بجلی غائب، میرے نزدیک تو اس قسم کے مرقعوں  
عقدہ نہ آتا اگر کم ہے تو یہ علم یقیناً کوئی بیماری ہے جس کا علاج کرنا پڑیگا۔ کتنا اچھا موسم تھا۔ کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں۔ کیسا لطیف آواز  
اس وقت سنا ہے میں، مگر اب آواز غائب کچھ افتار سے یہ بھی نہ دیکھی گیا۔ اب اندھیرے میں گم ہے وقوف بنے بیٹھے ہیں اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ  
کریں تو کیا کریں۔ کچھ دیر روشنی آئے گا، انتظار کیا۔ پھر دایوس ہو کر آرام کر سی پڑیٹ گئے۔ مگر نکلیں اس اندھیرے میں بھی اسی طرف تھیں جہاں وہ جب  
ٹک رہا تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے جگمگا رہا تھا۔ گویا اگر اس طرف سے نگاہ ہٹ گئی تو روشنی آکر واپس چلی جائے گی۔ کہ میں کیوں آؤں جب کہ تم میرے  
منتظر ہی نہیں ہو۔ معلوم نہیں کتنی دیر اسی طرح گم رہے کہ یکایک غصے کے قطر کی بھیجی بھیجی خربہ میں پٹی ہوئی ایک باوقارہ آواز آئی :-

”آداب!“

ماہیٹنے ایک خاتون محترمہ اس کی ترتیب اور رنگوں کے امتزاج میں پورا سلیقہ لیے کھڑی تھیں۔ میں چونک کر اسٹھ کھڑا ہوا اور نوا و خاتون  
کو تعظیم دیتے ہوئے پوچھ گس کی تلاش۔ ہے آپ کو؟

خاتون محترمہ نے اپنی سنجیدگی میں ایک چٹا سا ہنسنے کی حرکت کر کے ہنسے فرمایا عجیب!

میں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد عرض کرنے ہی والا تھا کہ محترمہ! انھیں عجیب نہیں ہے، کہ وہ خود ہل چکیں۔ عجیب بات ہے آپ  
کی لائبریری میں میری کتابیں موجود ہیں اور آپ مجھ کو جانتے نہیں۔ کاش ڈاکٹر گاریر سے ساتھ ہوتے مالم ڈاکٹر ڈوناٹش ہی ساتھ ہوتی کہ تعارف کی رسم  
قرا دیا جوتا۔



میں ایک دم چمک پڑا۔ آپ... آپ... مجاب... مجاب... خیال تو نہیں؟  
 محترمہ مجاب نے میری ہلکا ساٹ سے لطف لیتے ہوئے کہا: کمال کیا کہ اب بھی پہچان لیا۔ آپ مجھے معذرت سے چمکے  
 انسان محسوس ہوتے ہیں۔ آپ نارنگی کا سینڈویچ کھاتے ہیں؟  
 عرض کیا: نارنگی اور ڈبل روٹ، الگ الگ کھانے کا اتفاق ہوا ہے؟  
 محترمہ مجاب نے فرمایا: انہی کا سینڈویچ تو کھایا ہی ہوگا؟  
 عرض کیا: جی نہیں، انہی کا زردہ اجبتہ کھا چلا ہوں اور انہی کے کپڑے بھی چمکے ہیں؟  
 وہ اہلوس ہو گئیں اور مجھے دلو جو نہ ملکا کاش میں نے نارنگی اور انہی کے سینڈویچ کھائے ہوتے، میں اس سلسلے میں معذرت  
 میں نے ہی کو نکھا کہ وہ مجھ سے بڑا بزرگ ہو کر موسم کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اس بار کے بچے گرمیوں کے آسمان پر سبز رنگ کا چاند دم بخود ہے۔  
 ہاتھ ایک تعلیم سکوت اور خوفناک انجمن میں ادب زور لگتی ہے؟  
 اور میں نے نہایت سے رہ چکا ہوں۔ اس لیے کہ ظاہر ہے یہ سب کچھ اس لیے ہوا ہے کہ میں نے نارنگی اور انہی کے  
 سینڈویچ کھائے ہیں اپنی آنکھوں سے ایک آداب و مروت پھر رہے ہیں۔ الامتھ کو محترمہ مجاب نے فرمایا: صبح یہ بادل چوٹ جا رہے تھے اور  
 نیلانی بانی نے دیکھتے ہوئے آسمان پر نارنگی، الگ فائنٹ آفتاب آگ پرمانے کا؟  
 میں نے احمقوں کی طرف کہا: بومڈا کو منظور ہوا؟  
 محترمہ مجاب نے فرمایا: اور پھر وہی کمرے کا تین رنگ کی دپہر ہوگی۔ آپ کے مکان میں کوئی فریڈنس ویڈیو ہے جس سے  
 پچھلے ایشیا کی بہار آفریں گرم صبح کا نظارہ دیکھا جاتا ہے؟  
 میں نے عاجزی سے سر جھکا کر کہا: شاید ایک آدھ کا آستانی ویڈیو جو جس سے ایشیا تو ایشیا، لاہور بھی مشکل نظر آتا ہے؟  
 محترمہ نے فرمایا: یہاں نیلیوں جیم جیموں کے دریا کے پورے ایش سے دل دہکتے ہیں۔ زید وہ راجہ ہے کہ حوصلوں کی پیروی  
 سے ہان پڑی آواز سنائی دے، نہ آسمان کا آگ ایسا ہے جیسے جیسے ہر کیفیت بدل رہا ہو، نہ سمجھ رہے ہیں پر گہری سن چاؤ کیچی ہو، نہ یہاں بچے  
 ہر کے ہر کی نگہت ہے۔ نہ کچے میوؤں میں بھی مرنی ہو، میں جھینکروں کے نغمے بھی نہ بدنی سننے میں آتے ہوں؟  
 میں نے برسی۔ تعدی۔ سے کہا: جی نہیں، تھیرا لیا۔ سے ایک، کلاسیکل اس غائب کرنے میں مگی رہی جائے گا۔ نہایت خوش آواز  
 جھینک رہی ہیں، کبھی تنہا گاتے ہیں، کبھی کورس میں اور رات کو لینڈنگ اپنے۔ الگ جھیر دیتے ہیں۔ ان کے دکانے سننے سننے میں اور کسی کام کا  
 نہیں رہتا؟  
 محترمہ مجاب نے کبھی سے ہر کو دیکھتے ہوئے کہا: وہ نہ آپ بھی آدمی تھے کام کے ہم ہیں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں شوق  
 کے ساتھ صبح الہامی کہ جاسکتا ہے؟  
 میں نے بغیر سمجھ نہایت ہوتوئی سے کہا: درست فرمایا آپ نے؟  
 غالب محترمہ مجاب میری ہے۔ قوی کو تاثر کیوں اور باہر ماست مجھ سے سوال کیا۔ آپ اپنے کتب خانے میں نہ رہیں؟  
 لکھتے ہیں؟

عرض کیا: پڑھنے کے لیے؟  
 کچھ سمجھ میں نہ آیا نہ کیا جواب دیں۔ علی الحساب عرض کر دیا: دلچسپی جو ہوتی ہے پڑھ کر؟  
 وہ سوال کون سے رنگ پر تھی جوئی تھیں: کیا دل چسپی ہوتی ہے؟  
 عرض کیا: یہی کہ — گویا — میرا مطلب یہ ہے کہ خوب ہوتی ہیں آپ کی تصانیف!  
 مجرورہ بخشے: وانی نہ تھیں: کس اعتبار سے؟

عرض کیا: ہر اعتبار سے؟  
 کہنے لگیں: مثلاً جغرافیائی اعتبار سے۔

گھبرا کر کہہ دیا: جی اور کیا۔

وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولیں: میں اپنی سب کتابیں واپس لے جانا چاہتی ہوں۔ آپ فی الحال دوسری کوس کھلا لیجئے اور دانتہ چور بن جایا کیجئے۔ اس سے آپ کے احساس میں بائیدگی پیدا ہوگی۔ کتاب بینی کا شوق ابھی قبل از وقت ہے۔ جی بچے تو پڑھنے کو عزیز ہے۔ غذا کا خاص خیال رکھیے۔ بیج نہ کھاتے ہیں دھانی جیسا کہ کچی گاجر میں، مین اور ٹیس بیوں کا رس آئین ٹماؤ اور سائٹ مونگ پھلیاں۔ کھانے میں سیب کا بھرتہ۔

میں سیب کے بھرتے کی ترکیب پوچھنے والا ہی تھا کہ وہ غائب اور الماری سے ان کی تصانیف بھی غائب۔  
 میں بے تماشہ اس دیکھنے کی طرف: دوڑ دوڑی یا ڈرائیسی تو درکنہ غائب بات فی بھی نہ تھا۔ گراہیں جاتے ہی رہا تھا۔ کہ بہت دور  
 نی آواز سننے پر نکلا دیا۔

”اسلام علیکم؟“

دوپہر کے جسم کے ایک صاحب بیٹا نکلا، پان کھائے، ہاتھ میں ڈیڑھ جڑوہ دبا کے موجود تھے۔ میں نے دیکھا کہ علیکم السلام  
 وہ صاحب بغیر کنی رسمی تعارف کے بولے: ”صحیفہ ادب اور شریعت زورشت میں عورت کے حفظ و ناموس کی بڑی تاکید کی گئی  
 ہے۔ قدیم ایرانیوں میں عورت کے حق ظاہر اور حسن اصن دونوں کے لیے کچھ اصول علم فراست اور قیاد کے لحاظ سے مقرر تھے۔“  
 مرعوب تجرور عرض کیا: درست فرماتے ہیں حضور۔ گوجا ب کی تعریف ہے۔

وہ بکثرت دہا کمانہ انداز سے بولے: آپ کے دھانے کی ممانعت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی راز کو چھپانے کے اہل نہیں۔ آپ کو  
 معلوم ہونا چاہیے کہ شیریں راز کو کی محبوبہ، چالیس صفات جمال میں سے آٹھ بیس پر حاوی تھی، دھانے کی ساخت کی وجہ سے رازداری کی اہلی نہ  
 تھی۔ مگر حسن و اخلاق اور وفاداری کے اعتبار سے وہ بھی اس قدر عزیز تر تھی کہ جب اس کا نہ بہ خسر و بے ویر تعلق کیا گیا اور شریو یہ فرماں دوا ہوا  
 تو اس نے خودکشی سے پہلے اپنے بال کھول دیئے۔ نازک نازک ہاتھوں سے نازک سینہ پر خانہ بواغ انداز قسم کی زمیں لگاتے لگاتے تھک کر خستہ ہو کر  
 آغوش طلب انداز میں گری۔ مگر شریو کے ساتھ رشتہ ازدواج منقطع نہ کیا۔

عرض کیا: اور فریاد اس دمانے میں کہاں تھا؟

عاجزی سے عرض کیا: میں اپنے دھانے کی ساخت سے باوجود آپ کے نام کو راز میں رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ایک تہ کیا ہو، پان لکھ کر بھی یہ سمجھتے ہوئے بڑے ایک جھوٹے وعدے سے دیواروں کے لیے اپنا کام بنائے دینا

میں۔ یہ نہ۔۔۔

میں نے عرض کیا: کوہ نہا۔۔۔ مولانا نیار۔۔۔ ہاؤ فیکچوری۔۔۔ شہاب کی سرگزشت۔۔۔ کیا پڑا اور ساہلی۔۔۔

نیا صاحب نے میرا اسلحہ کام منتقل کرتے ہوئے کہا: آپ نگار کے مزید ہیں؟

عرض کیا: تھا تو گرا ب نہیں ہوں:

وہ جواب دے بغیر بڑے فرسرت اور ہنس آپ کے پاس؟

عرض کیا: تھی گھر میرے ماتہ کی لکیریں، میں انھیں، لہذا یہ ڈالی:

بکھنے لگے: منہ انیات؟

عرض کیا: بچے چھا کرتے تھے دستے انہیں لڑی:

مولانا نے فرمایا: نگار تان اور غلات بنا رکھی آپ کے کتبہ نما میں نہ رہنا چاہیے۔ میں اپنا شمار آئینہ فردشان منبر کوراں میں

کرنا چاہتا ہوں:

اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ عرضے، چھری کے دستے سے اپنی کتابیں داری سے نکالیں اور قبل اس کے کہ میں معذرت کروں داری سے نکل گئے۔ میں دروازے تک ان کے پیچھے پیچھے گیا تا نگار کا چند دوسے گراخی کروں۔ گراخی اس کے کہیں، نہ کہ آواز دینا کسی نے

مجھ کو آواز دی:

"مشر۔۔۔ اے جناب۔۔۔"

معلوم ہو گیا۔ ایک سرزندہ لہجے والوں والی ایسی خاتون ٹھہری تھیں جو اپنے چہرے کی ساخت میں سکرابت یہ تھیں۔ میں نے ان کے غم سے ان کو تعلیم دی۔ وہ اپنے لہجے ہوئے ہاتھوں کے گرا ب حرکت میں لاکر بولیں میں نے آپ کو رو فیہ را دھا کل کو جی کے بارغ سے اٹھا۔ قلعے میں غائب دیکھا ہے جہاں قیل پائیاں چھالی جاتی تھیں اور ادھاپٹھاں تھکا رام کے بھگوان لاتی تھی۔

میں نے چند عبا کر عرض کیا: آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہو رہی ہے؟

خاتون محترم بولیں: آپ کو بران کائیس کی شکایت تو نہیں ہے؟

میں نے کہا: جی ہاں نہیں:

خاتون محترم نے وثوق سے حکم دے دیا: پھر تو اپنی سائیس کا ہونا مزدوری ہے یہی شکایت ڈوبی کو بولگی تھی۔ وہ ایک مذہبی

مذاہب کی ہے جو برابر اداس رہتی ہے:

پچھلے گھبرا کر پوچھا: خدا کے لیے بتا چکے آپ قرۃ العین حیدر تو نہیں؟

وہ بولیں: ہوں تو سہی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ترائی کا وہ پیشی میرے ذہن سے نکل کے لاجواں: نہ انجیرے ایک دھاکھ کی

میں سے سرواغل کر کے کہتا ہے: پھیلندے بچے کا مس ہا ہا؟ اور ناراں مالی جس کے گھر کے آگن میں ہم بیٹھ کر امر و کھاتے تھے۔ یہ لاجواں مجھے غمزدہ

خاموش پانیوں کے کنارے لے جاتا ہے۔ سینٹ کو لہا اگر مجھے میرا دماغ واپس مل گیا تو میں تمہارے سامنے چارٹیس جدولوں کی  
میں نے ہمدردی سے کہا "اللہ نے چھانڈ تو ضرور واپس مل جائے گا۔" پھر "جو اس سے باہوس امیدوار۔"  
وہ اہلک بولیں "آپ کے پاس میرے بھی صنم خانے" ہے؟  
میں نے کہا "جی ہاں!"

دو خوش ہو کر بولیں "اسی میں ہے۔" میرا دماغ اسی میں ہے۔ گاؤں میرے دوست اس خوشی ہیں اور لڑنا ملک زائل ہوا  
مختصر جانیں کچھ کی کو جالوں۔ گڈاؤنٹ کچھ۔۔۔ خدا کے اس نے سادی زکلی ہو۔ اب اس کے سارے پالہ بڑھل ہو جائیں گے اور دنیا  
اب یقیناً ACCEPT کرے گی۔

میں بے وقوفوں کی طرح ان محترمہ کو دیکھتا ہی رہ گیا وہ تیزی سے الماری کی طرف گئیں اور میرے بھی صنم خانے کی جگہ  
خوشی سے اچھل کر بولیں "یقیناً اسے لوٹ۔۔۔ گڈاؤنٹ۔۔۔ اب میں اپنے سنٹر کو لوٹ جاؤں گی اور سینڈ وچ کا ناشتہ کر کے سو جاؤں گی  
گڈ۔۔۔ ناٹ۔۔۔"

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ "علیم السلام" کی طرح "گڈاؤنٹ" کا جواب کیا ہے اور وہ ایک طرف کو نذر کاغذ ہو گئیں، شکریہ ہے کہ  
وقت اور۔۔۔ انوس آواز کاں میں آئی "کہ مجھے سلام" کہ میں کہوں "علیم السلام"  
میں نے کھرا کر کہا "یا اسوٰم علیکم!"

ادب اب غور سے دیکھا تو چو کو شہ سبز نفس کی تو پی۔ لہا سا کرتا، کڑتے پد صد ری اور مٹھوں سے آؤ پی پا جامہ پہنے ایک لالہ دراز  
نہایت ذہانت سے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مجھ کو حیران دیکھ کر نہایت متعاس سے بولے "علیم السلام۔" اور اب سبز میری بات کہ دو مردوں  
محبوب دیکھ کر تو پہلے اپنے جیبوں کا تصرف بھی کر لیا کہ وہ ایسا بڑے گئے تو خدا تم کو بیسوں اور گناہوں سے بچائے گا اور تم پر رحم کرے گا۔ اور یہ  
خدا کسی ہند سے پر رحمت کی مغفرت ہے تو وہ آدمی دل کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ پس میں دل کا بادشاہ بن گیا ہوں اور تم سب کو بھی دل  
بادشاہی تقسیم کرتا ہوں کہ تم بھی میری طرح اپنے گناہوں کو یاد کرو اور خدا سے توبہ کرو اور خدا سے کہو کہ "اے خدا تو بھی مسامحہ فرما۔"  
میں نے ان بزرگ محترم کے تقدس سے دل ہی دل میں لڑکھایا "خداوند شریف تو دیکھیں تاکہ میں شربت یا آئس کریم کو کوئی چیز  
کر لے لی سعادت حاصل کر سکوں!"

بزرگ محترم نے خندہ پیشانی سے فرمایا: "آج میری چھوٹی لڑکی کو بڑا ہونے آئس کریم بنائی تھی میں خواجہ خلی کے بالانا نے ہی  
لام کر دیا تھا کہ یہ پاشا آئس کریم لے کر آئے۔ میں نے کہا بیٹا اس سے مجھے خزن آجاتا ہے میں نہیں کھانا۔ وہ چلے گئے "رحمن ابو طالب سے کہ  
اور لہا کہ کوڑکی دل شکنی ہوگی، پتکے لیجئے۔ میں نے پوری طشتری معاف کر دی اور کہا۔ ہرچ بادا باد میں در شکم برف انداختم۔"

میں نے خوش ہو کر کہا "میں آپ کو پہچان گیا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی!"  
خواجہ صاحب نے فرمایا "آپ تو مجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے عید کا جائزہ ہوں اور پیسے آپ کھینچنے ہی والے ہیں ہوا  
کو یہ عید کر سینٹ!"

میں نے عقیدت سے کہا "آپ کی تعانیف نے آپ سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ مجھے واقعی آپ سے مل کر اتنی ہی خوشی ہوتا"

خواجہ صاحب نے فرمایا: "اگر میں آپ کی خوشی کا بہانہ بن گیا ہوں تو اپنے نور انوار بادشاہی سمجھتا ہوں۔ نہ خوش اعمال لوگ  
نہ بد چلتے ہی ہیں۔"

میں نے عرض کیا: "میں خواجہ صاحب میرے دل میں آپ کی قدر و منزلت کا صحیح رازت پہنچا رہا ہوں کہ آپ ہر لمحے سخت کوشش میں  
خواجہ صاحب نے: "نہ تو کہنے ہیں، جیہ کہتے ہیں، بجز کار و دست کہتے ہیں، خواجہ بادشاہی میں انسانی شہاء کچھتہ میں اور خودیہ ا  
رو میں کہتا ہے کہ واقعی غنیمت کی کثرت ان بھائیوں کی دیا رہے، لیکن اگر میں نام توک کر دوں، تو وہ بھی مجھے توک کہتے گا۔  
میں نے کہا: "خیر، باتیں کرتے ہی رہیں گی جو وہ صاحب۔۔۔ مگر مجھے کہتے ہیں، تو پرچہ لینے دیکھنے کو کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ نے ہراج  
... بادشاہ کا ناکھ کر لیا تھا؟"

خواجہ صاحب نے ہنس کر کہا: "اس میں تعجب کی کیا بات ہے، میرے جہان فرخس نظامی کی وفات کے بعد میں نے شہنشاہ جہان پناوش  
ایک سال انجاءوں میں پڑھا کہ آئندہ ساری رہا میں، جب اسلام ہو گا، میرا قید ہے کہ ہراج برنادر شاہ جہان پناوش نظامی تھے؟  
میں نے حیرت سے کہا: "جی کیا فرمایا۔۔۔ ہراج برنادر شاہ جہان پناوش جہان پناوش نظامی؟"

خواجہ صاحب نے فرمایا: "جی ہاں۔۔۔ میں نے اپنے معارف کی طرح بھی اس حیرت مبذول کر لی ہے کہ وہ اپنی مجلسوں اور بیادوں میں  
نہ بیزل و کس نظامی اور ہراج برنادر شاہ جہان پناوش جہان پناوش نظامی کے نام سے کرنا دیا کریں؟  
میں نے: "راج راجھا کہ ہراج برنادر شاہ جہان پناوش جہان پناوش نظامی کا ناکھ ہرک فارست پر دیا جائے گا یا نیچر یا ذہن پر کہ خواجہ صاحب نے یہ ایک سوال کیا۔  
آپ مہاراجہ کرشن پٹن و مرحوم سے کہی ملے ہیں؟"  
میں نے کہا: "جی نہیں اس سعادت سے نا آشنا ہوں۔"

کہنے لگے: "تو قنوی شمار شمار ضرور پڑیے۔ یہ قنوی مجھوں میں سنا بیٹے۔ یہ قنوی کہنے کہ سنو مرتبہ یعنی سنو آرمیوں کو ضرور دکھائیے  
اور غلیبے۔"

میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر انھار میں مرتبہ میں نے کسی کو سادی نوکھارہ کیا دینا ہوا، مگر خواجہ صاحب نے کتابوں کی الماری سے  
نہ ایک کتاب نکال لی جو میں نے سر تیج ہمارے سر پر کے نام معنون کی تھی خواجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا:۔  
آپ نے یہ بہت اچھا کیا۔۔۔ سر تیج اصل میں اردو کے متراج تھے۔ وہ پہرہ پہن چکا اور وہ کے پہرے تھے۔  
اردو ایک سر تیج ہمارے پہرہ وصال بنے ہوئے میرے فقور میں آ گئے۔ خواجہ صاحب بدستور دل فشانی فرما رہے تھے، اردو  
مردان زبان ہے، ہم سے مراد ہے ہندو اور مسلمان، "ہ سے ہندو اور "م سے مسلمان۔ دونوں مل کر ہوئے "ہم۔"

میں عقیدت کی شدت سے ہلکا کر رہ گیا اور خواجہ صاحب نے اس کو ہلکا بہت کہہ دیا کہ ارشاد فرمایا: "آپ پریم رانی سے  
آرانی ضرور سنا کیجئے، اس سے آپ کے قلب کی رقت میں انجمادی کیفیت پیدا ہوگی۔ اور موسیقی سے لیسیت میں ایک سفر بن جائے گا، اللہ  
پریم ہوائے گا۔"

میں پریم رانی کا پتر ٹٹ لے لے کے لیے پٹل اٹھانے کو بھلا ہی تھا کہ خواجہ صاحب طمانچہ پر خرابا، یہ دینی جلد انداز سے ملے کہ  
منصبت ہر گھنٹے اور ان کی جگہ ایک لاکھڑا ہوا ڈھانچہ ایک لاکھ لکھنے لگا۔ مگر یہ ڈھانچہ بولتا بھی تھا۔

”بچانا مجھے؟“ اور یہ کہہ کر میری پر سے ہونے پڑ پرنسپل سے ایک بھول بنا دیا اور پھر اس بھول کی پتیاں بناتے ہوئے کہا: ”مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا۔ بہت شوق تھا۔ اور ہر روز ملنے کا ارادہ کرتا تھا۔ میں آپ کو اپنی تصویر دکھاتا ہوں۔ میری تصویر دیکھ کر آپ مجھے آسانی سے دیکھ سکیں گے۔ بات یہ ہے کہ یہ اصل تصویر ہے اور میں خود کچھ نقلی سا ہوں۔ اس تصویر میں جو میری آنکھیں ہیں وہ آپ نے دل و دماغ پر چھائی ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ تصویر سب سے اور میں ذرا ہلکا ہوں۔ اس تصویر کو دیکھتے یہ تصویر بھی خاموش ہے اور میرے کچھ بڑے بڑے آدمی اس آنکھیں بھی خاموش ہیں۔ بہت سی عورتیں یہ تصویر دیکھ کر مرنے بنا لیتی ہیں۔ مگر تمہاری میں چلنے سے ان آنکھوں کو چوستی ہیں اسی چوما پائی کی کثرت نے میری نظر کو روک کر دی ہے اور میں ٹیک لگانے لگا ہوں۔“

میں حیرت سے ان حضرت کی باتیں سن رہا تھا مگر وہ نام پوچھنے کی مہلت ہی نہ دیتے تھے، لہذا ہی چلے گئے۔ آپ یقین کیجئے کہ اگر میں عورت ہوتا تو میرے چلنے پیاز کی رنگ کے کھٹے مل کے جہنم کے دیپے کے نیچے میرے سینے کا بھرا یقیناً چنبلیاں کھاتا اور جو کوڑا عجب کو دیکھتا ایک دھکے کے ساتھ اس کی نفیس پٹ جاتیں۔ مگر میں یقیناً ایسی چال نہ بھتا کہ لوگ اوکھی اور بڑی کے جوتے کو میرا یا نیا شوق سمجھتے زمین پر عزا دہشت جس کی سلوٹوں کا کبراؤ سمجھا کرتا۔ میں اس طرح کبھی نہ سوتا کہ بڑی بڑی اداس آنکھیں بند ہوتے ہی دایاں بازو ایک طرف ڈھک جاتا۔

میں نے ”ٹاک“ کر پوچھا: ”حضرت! پہلے یہ تو بتائیجئے کہ میں کس صاحب سے ہمکلام ہوں۔ جناب کا اسم مبارک؟“

وہ صاحب عجیب سرشار انداز سے بولے۔ بہت سے نام ہیں میرے۔ ”مفتی گوشت“۔ ”کھول دو۔“

میں ایک دم چیخا۔ ”اے اے اے۔“ مفتی صاحب۔ سعادت حسن مفتی۔ اردو ماہنامہ ”نثر“ کے انشا پرداز۔“

زیب داستان اور انشا پرداز

مفتی صاحب نے میری بد مذاقی سے بے مزہ ہوتے ہوئے کہا۔ اب ایسی باتیں نہ کیجئے کہ میرا نثر آؤ جاسے۔ میں اس وقت صحیر اور بکا کی ہنری رنگیوں کے متعلق غور کر رہا ہوں اور میرے ذہن میں صرف ہونے والے ہیٹ ابھر رہے ہیں۔“

میں سوچنے لگا۔ یا اللہ اس کا ذہن کس دانی کو دکھایا جاسے، مگر وہ بولتے ہی رہتے۔ اور کیوں جناب! ان کو مغیرہ کیوں کہا جاتا ہے انہیں اغوا کب کیا گیا۔ عزا تو ایک بڑا دانا کب فصل ہے۔ جس میں مراد اور محنت دونوں مرکب ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو بھلنے سے پہلے دونوں رجوں کے تار تار کھینچنا آ سکتے ہیں۔“

میں نے مصفا فی پیش کی۔ مفتی صاحب، خدا گواہ ہے میں نے اس کا نام اغوا یا ان عورتوں اور لڑکیوں کا نام مغیرہ نہیں رکھا ہے وہ تلخی سے بولے۔ تم۔ تم تو شکاری ہو۔ صحافی، انشا نگار اور شاعر قلم اٹھائے شکار میں مصروف ہیں۔ میں تم سے نہیں منا چاہتا۔ تم انسان کو ہندو اور مسلمان کہتے ہو۔ تم کہتے ہو ایک لاکھ ہندو مرایا ایک لاکھ مسلمان مراد۔ تم یہ نہیں کہتے کہ دو لاکھ انسان مرے۔ تم سمجھتے ہو کہ ہندوؤں سے مذہب شکار کیجے جاتے ہیں۔ ہم تو تو۔ چونکہ فرید دیکھا نہیں اور بن بیٹھے انشا پرداز۔“

میں نے منانے کی بہت کوشش کی بلکہ وعدہ کیا کہ پرمٹ لے کر امرتسر جاؤں گا اور چونکہ فرید دیکھ آؤں گا۔ مگر مفتی صاحب تو اب بیگمائی سے جتنے جیسے خیر پاک کا سبز بیگاد۔ میں دل ہی دل میں کہتا ہوں کہ وہ دوازہ سال جا کر واپس لوٹ آیا اور لوٹ کر ایک دم چونک پڑا۔ بڑی بڑی آنکھوں کی ایک سادہ اور معصوم نگہ سادہ اور معصوم سے دہادہ خیف و ڈراہ خاتون جی کو کمزوری نے لڑکی بنا رکھا تھا۔ کڑی ہوئی نظر آئیں اور سلام کے بجائے صرف مسکرا دیں۔ میں بھی مسکرنے کی کوشش میں دانست نکال کر رہ گیا۔ وہ عمر بھر میں۔ آپ بڑے سلی آدمی معلوم ہوتے ہیں کہ

”اب نہ جانے سے گھبرا جاتے ہیں۔ آخر چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کا تصور کیوں نہیں کر جتے، آسمان پر چلتے ہوئے دو دینے دیئے آخر کس کام رہے ہوتے ہیں؟“

میں نے نہ جانے کیوں یہ بے موردہ بات کہہ دی۔ میں سمجھا نہیں سب کہ نہ ہی ہیں :

وہ جل کر بوہیں۔ ”بھئی سہ بھجور۔ ایک ذرا کچھ لپٹے تو جانے کیا ہو جاتا یہاں تلوہ بھی تو نہیں ہتے کہ میں اپنا سر اس پر غصے ماروں۔“

میں نے مذاک شکر ادا کیا۔ آج ہی صبح اس کمرے سے گاؤ کیلئے اٹھایا ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور وہ میرے جواب کی منتظر تھیں۔

”خود بخفا ہو کر بولیں۔ اب کچھ بولو بھی۔ میرا نظارہ دم توڑ نہ رہ جائے۔ جی چاہتا ہے کہ سسٹا کے سب کو روڈوں پر

میں نے جگہ جگہ کر بیٹھے ہوئے کہا۔ میں پر سوچ رہا تھا کہ آپ کون ہو سکتی ہیں :

وہ بولیں۔ میں کئی چو لھے ہیں۔ پہلے اپنے متعلق تو غور کرو، تم کون ہو سکتے ہو۔ میں نے تو غلطی کی جو تمہارے پاس آگئی۔ وقت

پہچوں کی طرح گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ میں نے کہا چلو ان حضرت سے مل آؤ۔ یہاں آکر میرا دھڑکا جواد ل غزاپ سے ڈوب گیا۔ اب یہاں سے

جاؤں گی اور نہ ہی اور پوانی باتوں کے جیسے تھے پڑی کر اسٹی ر ہوں گی۔ میں کسی پر جوت کھول کر بے جان سی لیٹ جاؤں گی اور میرا چہرہ جذبات سے

بالکل خالی ہو گا :

میں نے پہچان لیا اور گویا لغو بلند کیا : آپ ۔۔۔ اجرہ مہرود ۔۔۔“

وہ میری حماقت پر مسکرا دیں : جی نہیں ۔۔۔ خدا کچھ مستور ہوں :

میں نے کہا : وہ ایک ہی بات ہے۔ عہد ایک ہی ہے خواہ کارخانہ اصغر علی کا ہو یا محمد علی کا :

یلاک سر پر شکا ہوا اب روشن ہو گیا۔ گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روشنی آپکی تھی۔ کتابوں سے الماریاں بھر پور تھیں اور تمام

”عصمت غائب تھی۔ کاش کہ میں غائب ہوتیں اور عصمت موجود ہوتے ۔۔۔“

چطرس

از کج

اسے میرے کراچی کے دوست !

چند دن سوئے۔ میں نے اخباریں نہ پڑھی نہ کرچی میں فزونِ سعادت کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو دوئم و ثلثاً تقویروں کی فائزوں کا اہتمام کرے گی۔ دانشِ عود پر محوم نہ ہو سکا کہ اس کے کرتا و ستر کا ان اہل جنوں میں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا کبھی شوق ہے اور مدد سے ہے اور آپ ادب و ادب کا ذوق صحیح رکھتے ہیں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں مدد و مشورہ دے گئے ہوں گے بلکہ محبت نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو۔ اور آپ ہی نے اپنی جانِ سیت سے اپنے خوش مذاق لوگوں کو ایک نفع سے پرہیز کر دیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا ناشدوف نہیں۔ یہ سوجھ کر بہت اطمینان ہوا۔ کیونکہ اپنے ہم خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو مدد و ایک گروہ تقویتِ قلب نصیب ہوگی۔ ورنہ تنہا کتابوں اور تصویروں سے ماز و نہانہ کی باتیں کرتے کرتے انسان نکماب جاتا ہے۔ ذوقِ عیسوی کی ترقی پر تنہائی کی وحشت، اور مخفی غالب آنے لگتی ہے۔ انسان دیوانہ نہیں تو میل وراثت ضرور ہو جاتا ہے۔ اور غالب کا ایک مصرعہ فافہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ مقدمہ ہو تو ساتھ رکھوں ماز و ان کو میں۔

لیکن اسے دوست کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جیل کو نہیں کھٹاکر پاکستان پر ہتھ کا  
 زمانہ آیا ہوا ہے۔ اور آپ جیسے خوش فطروں کو مصوری اور نقاشی کا شوق چرا رہا ہے؟ کسی نے جیسے ہو کے شہر و قبا اور دیگر کی سازش کی کافور  
 نہیں کیا؟ کسی سٹون چپٹر بہ وہ میں آپ، دیں گے نے مسجد میں وغہ کرتے ہوئے آپ کے ہوا و لعب اور تفریح کو شہر پر نغز نہیں کہی؟ اور  
 آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتوے لے کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہ نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی کی گھنٹھ مصلحت میں اور نے یہودی  
 اور تہذیب کے کو کھاد کے ساتھ آپ کو ہمشورہ نہیں دیا کہ بخیر و دار

بہانگ چٹاک غور سے کہ منتخب نیز است؟

اور بالقرن ان باتوں سے بچنے کے لیے تو کیا ضیافت کے موقع پر کسی نیم تعلیم یافتہ سمعہ نے جو خواہ ہیں آپ سے بدلتی کا وہ عہد ہے۔ آپ کی آزاد منشی لاضحہ نہیں آئی؟ اور جب آپ پٹے ہوئے نظر آئے تو آپ پر تہقہ بند نہیں ہوئے؟ اگر آپ کو ایسی منزل پیش نہیں آئیں تو کراچی سے اہل تہقہ کوئی جگہ ہوگی یا پھر ہیزا دی اور بدولی پاک رہی ہوگی۔ اور



آپ کو ابھی دیکھائی یا سنائی نہ آئی ہوگی۔ وہ جس حیرت انگیز طریق پر آپ کو عزت دے گا۔ وہ تو آج کل ایک مہاجر قیام کی طرح بھوکا اور تنگ کسی گھر کے کونے میں سر ہٹا کر دیکھتا ہے اور ہر پڑا پڑیہ میں ہنس دیتا ہے اور اندھیوں میں رہی ہیں۔

پچھلے سال قائد اعظم ہاں تشریف لائے اور وہ باغ جس کو لائس گارڈن کہا کرتے تھے۔ اس میں جو قطعہ روزگار ڈون بھلنا تھا۔ وہاں ایک عظیم الشان پادری ہوئی اس میں جو پاکستانی لاجپور کا بھارتی کاوان تھا۔ روزگار باغ کا نام گلستان فاطمہ رکھا گیا۔ اور یہ نام ایک روز پر لکھ کر باغ میں جو چھوٹی درخت اور ٹوٹی ہوئی خوب صورت محراب اسادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا۔ لیکن اس کی کتبہ ایسی گہرے اور صاف معنی کے مدد سے کے بڑوں کو بھی کسی انیسٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لکھاتے جس کے شرم آتی "گلستان فاطمہ" کی بے ذوق تہنیت سے قطع نظر کیجئے اور اس کے معنوی پن کو جاننے کیجئے جس کی بدولت وہ فریبہ سی اس نام سے مانوس ہوں گے جو وہ پھر کے ذلت و خوارگی کے سائے میں اپنا گرد آلود چہرہ کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں۔ وہ تپوں پوش ہی اس میں کوئی کشش نہیں لگے۔ جو شام کے وقت گزروں میں سوار ہو کر یہاں ٹیٹس کھینے آتے ہیں جہاں جو سے کی بیانی لکھا ہوا آئینوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر خوش و خوار اور دل و دوزخ پر درج ہوئے۔ کیونکہ ایسے ستارے اور موقع کے چلے اس سے بدولت تہنیت کی مائش ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کسی پشتوں سے ملن خوش نویسی کی علمبردار ہے۔ جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس سڑی اور ہنر نہی سے لکھے کہ کاتب قدرت نے ہی ان کو آفرین کیا ہوگا۔ پنجاب کا خطہ وہ قطعہ جسے شعلہ بیانی ایک ہاید اور جہنم کے آگے موہ ہوئے کا خرم حاصل ہے۔ لاہور کا شہر وہ شہر جہاں ہر گلی میں بڑا خوش لایس رہتا ہے اور جہاں ہر مہاجر قیام کے عیسائی و مسلمان ہر ایک کے سامنے ہندوستان ہر ایک کے جادو و رقم و فتنے کے تہہ کو لے لیتے تھے۔ اور ان کے پیچھے سماں کہ اس تقریب سعید پر اس شہر پر ہر سحر کام کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ کھنکھاتے ہیں اور ان کے بھی دائرے غلبہ ہوں اور شہرستان بے ڈھائی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہیں ہر ذاتی کا وسیع نظر آتا اور آپ پشیمان ہو جاتے اور دھڑکتے پھرتے کہ کس کے پاس ہمارے شکایت رول اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی جو کہ ان کی ضرورت پوری ہو آپ کو بدترین کہتے یا آپ سے توقع دیکھتے کہ آپ ہر کجاست کو ٹس بھیجیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ ہر پاکستان میں کیڑے کو اپنے کا اہرام قرا اور آپ کی وفا شناسی پر حرف آجاتا۔

اب آپ اس انہن کے چکر میں اپنے آپ کو کسی منبر پر بیٹھا، اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم جی ہوں اور وہ آپ کو زمانہ غور سے کی اپ بڑت دیں۔ تو آپ ہر اپنے میں درود مند دل رکھتے ہیں۔ یہ کہنے سے کیڑا ہر آئیں گے کہ اسے مسلمان ہر تہا سے آہا و اجداد خدا اور دائرے اور خدایہ کو وہ ذوق رکھتے تھے کہ اس دنیا میں اس کی مشائش سے ملتی ہے۔ کوئی اور طعنے نہ لے سکتی ہو۔ لیکن کس کس منہج سے انہوں نے ازبک سے عشق کیا ہے۔ ان کے ایوان میں آویزاں و جہلوں کو دیکھو۔ ان کے مطلقاً انداز تہذیب شعور کو دیکھو۔ ان کے دھڑلے اور جنوں۔ ان کی مہذبوں اور خالق ہوں۔ ان کے ذہن اور سکون اور مہربوں۔ ان کی قبروں اور ان کے کہلوں کو دیکھو۔ ہر گز پادریہ کا کوئی مقام۔ سلوٹ یا مقدس۔ مستر یا ماقم۔ حشر یا یک دلی۔ خلوت یا محبت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھا یا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف نے لافانی خوش چوب و قلم اس دنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنی پھر کے اجار اور تحفظ کے لیے سب قوتیں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں۔ تمہیں لکھا ہو کہ اس درجہ کو مانتے تھے نہ جانتے دہ گے۔ اور مہر کر لو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانات، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور

دساؤں، تباہی، مہدوں اور تباہی کے مزادوں۔ تباہی کے مزادوں اور تباہی کے لٹس، مڑوں پر جہاں بہاں تباہی کے لٹا، مہد کے خط کیسٹیں گے، اسلوب کا نام روشن کریں گے۔ اور جو نواکتیں اور لافقیں اور دھانیوں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انہیں ان کے مڑوں میں لگے تاکہ جہاں کسی کو تباہی تحریر نہ آئے وہ جان سے کہ یہ مسلمان کا لٹا تھا ہے جس قوم کو دیکھ جو اسے جس سے لیا میں خوشی ملے کا مڑ بن گیا۔ اور جواب بھی اپنی آفرین پر ماز کرتی ہے۔

یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے؟ لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کوہچی میں میں ایسے لوگ؟ فون لٹھک کی خبر کو آپ نے بنائی ہے۔

اور پھر خوش فہمی اسے تو عافیت رہے گی۔ لیکن کیا آگے بھی بڑھیں گے؟ تصویریں کا ذکر بھی کیجئے گا؟ انجاء میں لٹھا تھا کہ آپ تصویروں کی ناقص کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے تو اسے درست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی غیریت سے مطلع کرتے رہتے۔ کیونکہ اگر کوہچی اب سے ایک نسل کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا جرات سے کام لینا پڑے گا اور عجیب نہیں نہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عورت پکڑا کر ہیں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں ہے آپ صبح صبح میں آرٹ سکول کھولیں۔ لاہور، یونیورسٹی کے لٹھک میں آرٹ کمیٹی ایک مضمون کے شامل تھا۔ لیکن یہ ایک مخلوط سائنس تھا۔ جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دست کاری سب چلی چلی بھر پھینک دی گئی تھیں۔ اور اس مضمون کو ایک زمانہ ششواں سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

یہ مضمون اب بھی لٹھک میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک پورے خاتون بستر میں سمجھ مضمون چھاتی ہیں۔ وہ کہیں اور مراد ہو گئیں، اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا۔ کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام خدا نخواستہ کسی مرد کے سپرد ہوتا تو ذرا سے نہ آجائیں گے۔ اور پھر اس مضمون کا عہد بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو نہ کر کے رکھ دی گئی ہے۔ کیونکہ جو تو بھلا کسی کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستوں سے پر لکھو ایچھے کہ ہمیں گانے کا مشق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک مضمون کے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے کہو ایچھا ہے کہ ہماری لڑکیاں ہانڈاؤں کی شکلیں نہ بنائیں کی چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سبب، ناشپاتی، مرتبان یا پامار۔ دیا۔ جھل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی بلایت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ذلیل دی کہ ہانڈاؤں کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز ہانڈاؤں نہیں۔ لڑکوں کو البتہ جائز ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ ڈوٹو میں انسان کی شبیہ ہو ہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہانڈاؤں سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جموٹ ضرور۔ مزیت کر جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ ڈوٹو بھی تو کسی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور یہی ڈوٹو اگر بھی تو پڑے فن کار ہوتے ہیں جواب ملا۔ کہ چاکرستی اور لٹھک سے کام لیا جائے تو ڈوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ عسکریوں کے نزدیک اسی ایک ڈوٹو اگر فرا عام حق اور راستی کا آئینہ وار ہے جو لاہور کے چرلا گھر کے باہر چار آنے میں تصویر کیجئے ہے۔ یہ حال تو ہانڈاؤں کا ہے۔ باقی رہے جھل، پہاڑ، دیہات ویاں جی ایک دن کوئی کوئی حق میں مصوروں کے "جھوٹ" کو گروں سے جا دوپے گا۔ اور آپ چھینتے اور سکتے رہ جائے گا کہ یہ تو دین لوگ ہے لیہ تو بہت بڑا ہے۔ اور آپ کے لٹھکوں سے تصویر لٹھک کر چھا ڈالی جائے گی۔

ان حالات میں چٹائی کے جینے کا امکان کم ہے۔ کوئی بات سچی بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ وخت ملک

جناب کی نگہیاں معلوم ہوتے ہیں، اور میرا سادہانہ تصور میں ماننے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا۔ نہ صرف سردی نہیں بلکہ عزیں بھی  
 ان پتھر، سبز چاک اور بعض اوقات حرم کے ہڈیاں دکھائی دے جاتے ہیں۔ گوشت و عجز سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ چٹائی  
 و تختہ پر دس میں تھکے، خود بیاں، پھندے بہت ہوتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ رنگہ از دوری بیٹے کے لباس کا حشر ہے یا ناقہ  
 کے سادہ سامان کا۔ لیکن چٹائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور برقرار رہے گی۔ یہ کہ وہ اس کے لیے بھی ایک ہمارا معذور ہے۔ اسے  
 فن کر دیا جائے تو یہ وہاں نہ رہے گا۔ نظم جائے گی۔ اور جہاں معذوری یک ہی مذہب سے اسے لے لے پاک ہو جائے گی۔ باقی رہیں انھوں  
 کی قدیم تصویریں یا انسانی معذوری کے قدم منہ سے جو چند لوگوں کے پاس جو تہ تک محدود ہیں یا ان کی مٹیا آتش کے عجائب خانے کی تقسیم  
 نے بعد پاکستان کو مل جائے گی امید ہے۔ تو ان کو کسی اہل ملک کے ملاحظہ کر وام دسوں کے جاسکتے ہیں کیا کہتی ہیں لوگوں کا یہ خیال  
 نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے اہل تھک کوئی جگہ ہوئی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کراچی کو نسا ایسا جزیہ ہے اور کون سے فہ شدہ براغ میں واقع ہے کہ وہ دود کے سمندر کی کوئی  
 لہر دان تک نہ پہنچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور ترقی کی سوچ یہی ہے۔ لیکن یہاں تو تحریک کا دور دورہ ہے۔ مانتوں سے لے جھین کر اس کی  
 جڑ قلم اور مرقوم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا جہان پیدا کیے آپ کو کچھ بچتے کے دیکھتے وہ تحریک کی راہ اختیار کیا ہے۔ لوگ  
 بس چیر کا نعرہ لگا کر اٹھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی چیز کا خون کر لیتے ہیں۔ آپ کہیں کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ تو یہاں  
 بنا بنا کر بازاروں میں دھوم مارتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیکھتے تو تلاش شروع ہو جاتی ہے کہ کس کے  
 دود سے لگائیں؟ آپ حیا کی تلقین کیجئے تو لوگ سر بازا دود توں کے منہ پر غصہ کئے لگتے ہیں۔ اور بچوں پر پناہ پیمانہ زور آڑتے ہیں۔  
 مجھ کو تو سنا دیا ہے افغان کے زندگی اس دور کے طلب میں کیوں ننگ مسلمان؟

ایسے فیض و منصب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ چاہا ہے؟ آرٹ کے لیے توجہ اور انسداد استحکام اور فراغ  
 لازم ہیں۔ یا پھر کوئی دود کوئی آواز کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شعرو سنن نغمہ و رنگ کے طوفان  
 اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کہیں آرٹ ایسے بھی چاہا ہے کہ ہر جیسے کو دولت اور اقتدار کی بوس نے انھیں ادھر ادھر لکھا ہو اور ہر  
 چہرہ اپنی بے لطفی کا بدلہ ہر مہمان کے اور ماہیگر سے پہنچے پڑا ہو۔ نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر  
 قیمت کی پوری چیز نصیب ہو۔ اور لوگ غصے کے ڈر سے نہات پا کر قناعت کی گود میں ڈر آکھ جھپک ہیں۔ نہ کوئی خدائی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس  
 دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو۔ نہ مہرت کا کوئی ایسا جھوٹا آئے کہ دہشتوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھو ہیں اور ہتوں  
 کی سربراہت سے آپ ہی آپ نکلے پیدا ہوں۔ نہ عاقبت کا کوئی گوشہ ایسا چھل آپ کا فن کا مددگار ہو کہ بیٹھا جائے اور آپ کے لیے  
 قصہ بہرین بنانا رہے۔ نہ اس پاس کوئی ایسی ڈالی بستی ہو جہاں شاعر غریب شہرین کر گھوٹا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ جہنی سمجھ کر مٹے  
 کھ لیتے دیں۔ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنائی ہے۔ لیکن دوتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو محراب اخلاق  
 اور حریم کہہ کر جلا دیا جائے۔ چند معذروں پر ادب باشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان کے اوپر ایسے لوگ  
 مسلط کر دیئے جائیں جو ان کے ہنر کو کھردری سے کھردری کسوٹیوں پر رکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ انہیں دوسرے تھا۔ اس  
 کا دور اب گزر گیا۔

میں ابلی مرز کس روش خاص پر نازاں پابستگى رسم و رواج عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو محشرت نہیں سمجھتے اور اسے محض امارت کا دل پہلا دوا نہیں سمجھتے۔ آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جاننا رہی کی تصویر پر اصرار ہو۔ یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ حسن کو اختیار ہے۔ جہاں رہے جو شکل چاہے اختیار کرے صرف یہ ہے کہ زندہ رہے اور امیر و غریب۔ پھوٹے برسے۔ اعلیٰ اعلیٰ منسب پر اپنی بخششیں اور ذاتی فرمائے۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس میں چل دامن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اس مہر و ذہن کو داپس لانا چاہتے ہوں گے۔ تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں۔ کسان کے ہنرمیں سیدانی کے فائدہ کی چھری میں۔ پنہاری کے مٹی کے ٹھروں میں۔ غرض زندگی کے ہر گوشے میں نور پاش ہو۔ لیکن جو محض محض شمعیں یہاں دلوں نمنا رہی ہیں۔ انہیں ہی بکھا دیا گیا۔ تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں۔ وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک سکول اسٹ کے لیے انہیں اس بیگانہ تہتم ماحول میں کئی صحران چھاننے پڑیں گے۔

فرستے نیست کہ در پستوئے آں مدغم نیست روز مولود جہاں کم زشب نام نیست

اگر یہ محض میر و دم ہے تو اسے دوست پھر کراچی سب سے الگ تھلک کوئی جگہ ہوگی تو پھر اسے دوست ہم سب کو دہاں بلدیجئے یا کراچی کو اتنا کیسے کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ دسوخ پیدا کر لیا ہوگا۔ آپ کے اخص اور اصابت دانے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ جسے بڑے انزوں سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ جسے بڑے اہباب محض و عند کا قرب نصیب ہوگا۔ ان سے کہئے کہ۔

منزل ماہرواں و مود بھی دشوار بھی ہے

کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟

# برج بانو

## کنیالال کپور

یہ برج بانو کی داستان ہے۔ برج بانو کون ہے؟ اس کے عجیب و غریب نام کی کیا وجہ ہے؟ یہ تمام سوالات جس آسانی سے کیے جاسکتے ہیں، شاید ان کے جوابات اتنی آسانی سے نہ دیئے جاسکیں تاہم کوشش کروں گا۔ کہ آپ کو برج بانو سے روشناس کرا سکوں۔ برج بانو ایک خوب صورت عورت ہے جو پاکستان سے میرے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے۔ کیا میں اسے انکار کر کے لایا ہوں؟ نہیں صاحب میں تو اتنا شریف و انصاف ہوں کہ خوب صورت عورت تو کہا کسی بد صورت ہواڈن کو بھی انکار نہ کرتا ہوں۔ کیا اسے مجھ سے محبت ہے؟ یہ ذرا پیڑھا سوال ہے۔ اگر آپ یہ پوچھتے کہ کیا مجھے اس سے محبت ہے تو میں یقیناً اس کا جواب اثبات میں دیتا۔ وہ آج کل کہاں ہے؟ وہ میرے گھر میں رہ رہتی ہے۔ آستہ برج بانو کہیں کہتے ہیں؟ یہ سوال مجھ سے کئی شخصوں نے کیا ہے۔ آپ پہلے شخص نہیں ہیں۔ برکتیہ۔ وجہ بیان کیے دیتا ہوں۔ اسے برج بانو کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی ان ہندو ادوار آپ مسلمان تھا۔ آپ کو یقین نہیں آتا؟ بہتر تو یہی ہے کہ آپ مجھ پر اقبلا کر لیں۔ ورنہ مجھے ایک ایسے شخص کی سسند پیش کرنی پڑے گی جو ایک باریش بزرگ ہے۔ جسے اس عورت کی پیدائش کے سب حالات معلوم ہیں۔ اور جسے میری طرح اس عورت سے عشق ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ عورت لوگوں سے عشق کرتی ہے؟ آپ نے غلط سمجھا۔ یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی لوگ اس سے عشق کرنے پر مجبور رہ جاتے ہیں۔ واصل اس عورت کی زبان میں کچھ ایسی موہنی کشش ہے کہ جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے دل و جاں سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میری ہی مثال لیجئے۔ میری عمر تیس برس کی تھی۔ جب میں نے پہلی بار اسے ایک مجلس میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ مجھے فوراً اس سے عشق ہو گیا۔ تیس برس کی عمر ہمارے ملک میں جہاں انسانوں کی اوسط عمر صرف چھبیس سال ہے عشق کرنے کے لیے نہایت غیر موزوں ہے۔ لیکن میں مجبور تھا اور صرف مجھ پر ہی کیا منحصر ہے۔ کتنوں میں ایک شخص دن رات سوچتا رہتا کہ عورت کی زبان کے چٹنا رہے پر کچھ ایسا مرثا کہ ساری عمر اس کا تعلق اس کی زبان کے ور سے لیتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس عورت کی شان میں ایک رباعی بھی تھی۔ جس کا ہر مصرع بانج سو صفات پر مشتمل تھا۔ ہاں تو یہ عورت پاکستان سے میرے ہمراہ آئی ہے۔ لیکن چند دنوں سے اس سے اس سی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ کچھ چند دنوں سے اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ نہ صرف اس سے بلکہ مجھ سے بھی۔ کل کا ذکر ہے۔ ایک بلی چوٹی والے پنڈت جی جو میرے ہمسائے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے: لالہ جی یہ کیا جھگڑا ہے۔ آپ کے گھر ایک ایسی عورت رہتی ہے جس کا باپ مسلمان تھا۔ اور میرے کئی بچے بالوں والے دوست مجھ سے بار بار

کہہ چکے ہیں: ”آپ خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سرحد پار کرنے سے پہلے آپ اسے تلچ کی لہروں کی بنا کر دیکھتے؟“

میں جب ایسی باتیں سنتا ہوں۔ تو مجھے سخت رنج ہوتا ہے۔ لیکن برج بانو کے دل پر جو گزرتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ چاروں طرف سے جلی کٹی سن سن کرتی آگئی ہے۔ آج دوپہر کے وقت جب وہ ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ تو میں نے اس سے کہا: ”سوچ بانو، برا خیال ہے کہ تم پاکستان چلی جاؤ۔ یہاں یہ لوگ تمہیں رہنے نہیں دیں گے۔“

”لیکن کیوں۔“ برج بانو نے پچھا کر کہا۔ ”میرا قصور؟“

”تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارا آپ مسلمان تھا۔“

”لیکن میری ماں تو ہندو تھی۔“

”ولدیت کے معاملے میں ماں کو کوئی نہیں پرچھتا۔“

”یہ عجیب منطق ہے۔“

”جہاں جذبات ہی سب کچھ ہوں وہاں منطق کی دال نہیں لگتی۔“

وہ اودھ بھی اُداس ہو گئی۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ”برج بانو تمہیں اب یہاں سے۔“ اوشیہ ”پہلے جانا ہو گا۔“

ایک لمحہ کے لیے وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ اودھ پھر کہنے لگی۔

”اوشیہ کسی شہر کا نام ہے کیا؟“

”شہر کا نام نہیں۔“ اوشیہ ”ہندی زبان میں ”مزدور“ کو کہتے ہیں۔“

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور کہنے لگی ”میری پڑنائی بھی ”مزدور“ کو ”اوشیہ“ کہا کرتی تھی۔“

میں نے پوچھا: ”تم مزدور کو ”اوشیہ“ کیوں نہیں کہتیں؟“

”برج بانو نے طنز آمیز لہجے میں کہا: ”کہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن زبان نہ کھڑانے لگتی ہے۔“

”بس اسی لیے تمہیں ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔“

ایک سخت برج بانو کے چہرے پر فیض و غضب کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے چلا کر کہا: ”ہندوستان میرا گھر ہے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کس طرح جا سکتی ہوں؟“

”تمہارا گھر پاکستان ہے۔“

یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان میری فتوحات میں سے ہے۔ میرا اصلی وطن ہندوستان ہے۔ میں وہی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ پچھنا جھونپڑی اور شاہی لال تلہہ دہلی میں بسر کیا۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منہ دکھایا۔ دیوان عام میں مجھے سب سے اُدھ کا مسند پر بٹھا یا گیا۔ اور جس وقت میرا ستارہ عروج پر تھا۔ کوئی بنگالی، گجراتی، سندھی جیلد میرے حسن، میری ہونٹ اور منظر کی تاب نہ لا سکا۔

میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان میں رہوں گی۔“

”یہ درست ہے۔ پتہ تو...“

”یہ پرنٹو“ کیا بلا ہوتی ہے جی۔ برج بانو نے شرارت سے کہا۔

”پرنٹو“ ہندی میں ”لیکن“ کو کہتے ہیں۔“

”ہاں یاد آیا۔ میری نانی بھی لیکن“ کو پرنٹو“ کہا کرتی تھی۔

”تمہیں اب لیکن“ کو پرنٹو“ کہنا ہو گا۔“

”معاف کیجئے۔ میں تو ”لیکن“ کو ”لیکن“ ہی کہوں گی۔“

”یہی تو تہاری غلطی ہے۔ اگر ”لیکن“ کو ”پرنٹو“ نہیں کہوں گی۔ تو تمہیں یہاں سمجھ نہ آوے؟“

”ہر وہ شخص.....“

مثلاً ایک غلطی بیچنے والا میری ڈیوڑھی کے آگے بٹھ گیا۔ برج بانو بنا آفری فٹہ مکمل کیے بغیر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہاتھ کے

نائب سے غلطی والے کو بدلتی ہے۔

”غلطی کھائیں گے آپ؟“ وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

”کیا یہ غلطی کھانے کا وقت ہے۔ میں تم سے نہایت اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ تم پاکستان جاؤ گی یا نہیں؟“

”پہلے غلطی کھا لیجئے۔ اس کے بعد ٹھنڈے دال سے آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔“ اور وہ غلطی والے کو مخاطب کر کے

کہتی ہے۔

”کیسی ہے یہ غلطی تہاری۔ میرا مطلب ہے کچھ ٹھکانے کی ہے یا یوہی سی“

”غلطی والا کن انکھیدوں سے برج بانو کے چہرے کی حرکت دیکھتا ہے اور کہتا ہے ”اجی کیا پوچھتی ہیں آپ میری غلطی؟ میری

غلطی ہے ظہیر، لاجواب، شاندار۔“

اسی طرح بانو کے معصوم لبوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے اور غلطی کھائے بغیر غلطی والے کی بتھیل پر پانچ دوپے کا نوٹ رکھ

دیتا ہے اور اس سے چلے جانے کو کہتی ہے۔

”غلطی والا چلا جاتا ہے۔ میں اسے بیٹھنے کے لیے کہتا ہوں۔ لیکن وہ بدستور کھڑی رہتی ہے اور مسکراتی رہتی ہے۔“

”کیا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ پاکستان جا رہی ہونا؟“

وہ میری بات ان سنی کر کے ایک سکھ ڈوبا بیرو کی لادی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ”وہ دیکھئے“

جس لادی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لادی کے فرم پر چند اشعار اردو میں لکھے ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

وہ دو دو باد پہ حسرت سے نظر کیستے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لادی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ایک چھابڑی والا زور سے چلاتا ہوا آگے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ ”چنا زور گرم“

کہتا ہے۔

میل چنا بنا ہے اعلیٰ اس میں ٹوالا مرچ مصالحہ چنا لایا میں بابو مزیدار چنا زور گرم

اب ایک اخبار فروش مکی میں آتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دس بارہ مختلف اردو روزنامے اور رسائل ہیں  
 بالو ایک اردو روزنامہ خریدتی ہے۔ لیکن جو مکی اس کی پہلی نظر سرخی پر پڑتی ہے اس کا رنگ اردو پڑ جاتا ہے۔ پہلی حروف میں  
 ہے۔ ”ہم ہاں تو اب ہندوستان میں نہ رہ سکے گی۔“

ایک خط کے لیے اس پر گویا بجلی سی گئی ہے۔ وہ دم سے زمین پر گر اچا پتی ہے۔ لیکن میں بڑھ کر اس کا دامن نہ  
 لیتا ہوں۔

دو چار دنات ہم دونوں خاموش اور مہوت کمرے رہتے ہیں۔ اس کے بعد میں اس سے کہتا ہوں: ”معد نہ کرو دھان تو  
 پاکستان جانا ہی ہو گا۔“

وہ پھری ہوئی شیرنی کی طرح کوک کر کہتی ہے: ”میں نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

”لیکن حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم۔۔۔۔۔“

”حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔ جب تک ہندوستان میں قلعی والے۔ سکھ۔

اور چٹا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں۔ حکومت میرا بال بھی بچا نہیں کر سکتی۔“

”خدا کی قسم۔ بڑی صندی ہو تم!“

رج ہاں تو سکرا رہی ہے۔ ادب میں قلعی والے کے الفاظ ذہن دہرا رہے ہوں۔ ”لا جواب! شاندار! بے نظیر!!“



# سفر نامہ جہاز بادسندھی کا

شفیق الرحمن

بسم اللہ، دیا چڑھنا، نعمہ زنی عندلیب خانہ، رئیس تراز، راستہ، بدست، بلا کم و کاست، یعنی نہ گریہ جہاز بادسندھی غنی غریب۔ اسے صاحبزادہ آپ کا بھلا کرے۔ مدت مدید و عمر بعد کا ذکر ہے کہ ایک سال پہلے کو ایک نوجوان نجیب و نزار کہ جسے نوجوان کھتا ہے خوش فہم تھی کافی ہاؤس کے دروازے پر زندگی سے بالکل بیزار کھڑا تھا۔ نام اس دروازہ کا جہاز باد تھا۔ مخلص بندھی اور لقب غور و علیہ اس کا فاقہ زدہ تھا۔ اور سر کے بال ماڈرن خواتین کے بالوں سے بھی لمبے تھے۔ ناک پر ایک شکستہ عینک نہ لگی کے دن توڑ رہی تھی۔ شیوا اس نے ہفتے بھر سے نہیں کر دیا تھا۔ بغل میں اس کے کاغذوں کا ایک ہندہ تھا۔ پوشاک اس کی ایسی تھی کہ گمان تک نہ ہوتا کہ اس نے پوشاک کو پہن رکھا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پوشاک ہے جو اسے پہنے ہوئے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نوجوان افسانہ خوں طبع سے متعلق تھا۔

اس نے اپنی سائیکل سنبھالی، ملازم کو اگلے روز بخشیش دینے کا وعدہ کیا اور مال روڈ پر مڑا ہو گیا۔ چوک کے پاس بیرون کو بچے چڑھتا ہے۔ کیمیا ہا ہینچا۔ ایک عادیستان محل کے سامنے اسے کچھ عجیب سی فیلنگ ہوئی جیسے خیالات کر روائی میں دفعتاً الجھن پیدا ہو گئی ہو۔ چونک کر دیکھا تو پچھلے پتے میں نیچر ہو چکا تھا۔ اقدار کا دن تھا اور وہاں بندھنیں۔ یہاں تک کہ وہ حضرات جو ایک پمپ اور نیچر گاہ کے کارساز سامان لے کر سائیکل وکس کھولی۔ بیٹے ہیں۔ اور پر و پرانہ کھلاتے ہیں، غائب غلام ہو چکے تھے۔

انٹے میں محل کے دروازے سے ایک شخص اچھٹ میں کارآمد شے تھامے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر جہاز باد کی جھلک مسرت سے چمک اٹھی، اس نے بڑھ کر کیمپ مانگا۔ اس شخص نے دیدیا۔ جہاز باد نے اسے کھینچا، مڑا، کھانے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ پس پروردگار تبارک و تعالیٰ کو سچے سچے سکھایا کہ اس کا ہر ایک جوڑی سیاہ کھنٹی اور عمدہ مونچھوں سے مزین تھا۔ ادا ہوا۔ اے مرد نادان!

مزید کوشش محنت ہے۔ کیونکہ یہ پمپ نہیں ڈنڈا ہے۔

جہاز باد نے سائیکل ایک طرف رکھ دی اور محل کی جانب متوجہ ہوا۔ دروازے پر فوراً پٹھا تو عینک کے شیئے صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کھاتا تھا۔ "جہاز باد سندھی کھانہ"۔

ذرا قریب گیا تو مرغانِ نوا سخی زمزمہ پر دازسی دل کو بھانے لگی، ہزار و طوطی کی صدائے لگی، خوار و قسام کی خوشبو دل سے دماغ جلا عطار بن گیا۔ ذرا سی دیو میں یہ طبلہ بجنے لگا۔ ریڈیو پر نغمہ دلربا اور رباب کی آواز خوش ہوا۔ فوں میں آئی۔ طعمہ لذیذ کی خوشبو آتی تھی۔ بان

و شکر کی صراحتی نقل کی صدا سناقتی تھی۔ دیکھا کہ احباب بذلہ سنج اور خاتونان ذی مرتبہ رنگ ریاں مناتی ہیں۔ بھولیاں قہقہے لگاتی ہیں۔ جہاز یاد سوچنے لگا کہ صرف خورد اور کلاں کا فرق ہے۔ مگر کوئی مجھ سائے نصیب، بد طالع، بد بخت ہے، کوئی صاحب تاج، تخت ہے۔ اس مکان کے کھن پر بڑی عنایت ہے اور مجھ گناہگار پر یہ عقاب۔ یہ کسی شاہ خاک بارگاہ کا ایوان سپہر تو آمل ہے، یار و صہر موصی ہے۔ کہیں حور ہے تو کہیں غلام ہے۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس مرد قوی مونچھ نے اگر سیغام دیا کہ صاحب مکان نے فرمایا ہے کہ ہمارا سلام بولو۔ جہاز یاد خود دے نہا۔ دیکھ اسلام اور دواغی کا قصد کیا۔ محمد وہ مرد قوی بیکل کہنے لگا کہ صاحب خانہ یاد فرماتے ہیں۔ جہاز یاد سمجھ گیا کہ ہو جو صاحب خانہ کوئی ماہر نفسیات ہے۔ جس نے اتنی دور سے میرا تجزیہ نفسی کر کے خیالات بھانپ لئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسم صیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس مونچھ چھندر نے ہاتھ پڑا اور اندر سے گیا۔ جہاں شاندار دعوت منعقد تھی حیرت ہوئی کہ یا الہی نئی خبر داد محمد بن حسیناں پرفش، شوخ و شنگ رشک گل رخاں فرنگ کیونکر ایک جگہ پر جمع ہیں۔

جہاز یاد مسندھی کلاں بڑے نیاک سے ملا اور گویا ہوا۔ ”اے معزز! انہی حضرت دیکھنے میں تو آپ انٹیکچرل معلوم ہوتے ہیں۔“

جہاز یاد خورد نے اثبات میں سر ہلایا۔ جہاز یاد کلاں کی باچھیں کل گئیں۔ ”الحمد للہ۔ یہ خاکسار بھی کبھی انٹیکچرل تھا۔ یہ سب شہزادیاں اور شہزادے ایسے ہیں جو انٹیکچرل ہیں۔ ہونے والے ہیں یا کبھی تھے۔ آپ ان سے ملے۔“ سب خوب بخل گیر ہو ہو کر ملے۔ اگرچہ جہاز یاد خورد گدگد ہی سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ عید کے روز چھپتا پھرتا۔ ۲۴ بم ایک مہووم سی امید پر اس نے بخل گیر ہونا شروع کر دیا۔ لیکن جب شہزادیوں کا نمبر آیا اور اس نے سرخ لباس والی حسین شہزادی سے بخل گیر ہونے کی کوشش کی تو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“ جب دونوں جہاز یادوں نے ایک دوسرے کا نام سنا تو کمال درجہ غلطو بھی ہوئے اور محفوظ بھی۔

جہاز یاد کلاں نے خورد کو ایک چھوٹا پیگ دینا چاہا تو وہ معذرت خواہی کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”یا پیر و مرشد! ابھی شہزاد نظر آتا ہے۔ غروب آفتاب سے پہلے دیکھی سے گریز کرنا چاہیے۔ البتہ میری وقت کی چیز ہے۔“

جہاز یاد کلاں یہ تقریر سن کر دم بخود رہ گیا، عیش عشق کرنا چاہتا تھا لیکن شہزاد یوں کی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا اور یوں بولا۔ ”اے با مذاق انسان! یہ کلاس ٹوش جان فرما اور بار بار دروازے کی طرف مت دیکھ، تیری سائیکل ہم نے مرمت کے لئے بھیج دی ہے۔ ہوا آسانی کہہ کر وہ جام جہاز یاد خورد نے پیا اور دوسرا اٹھ بیٹھے لگا۔ جہاز یاد کلاں نے اس کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اے نوجوان سلیقہ شعار! ہم خوش ہوئے۔ لیکن یہ مت بھولیو کہ یہ خدا نے خود اجمال کے ہاتھ میں ہے کہ ایک گدائے بے فواید کچھ زدن میں صاحب دولت و بنا ہو کرے۔ اور قارون سے ملد کر کو ذرا سے اشارے سے تر خاک و تباہ کر دے تو ضرور حیران ہو گا کہ کہیں میں کیونکر میسر آئی، یہ فرمانبردار میرے جنہیں سنا ہی دیتا ہے۔ یہ آخر کی بیوقوف غلط شدہ غم صحیح کرتی ہے یہ پڑھتی عقلیں، یہ سب کچھ ہیں بونہی بنیں ملا۔ ہم۔“

”واحد مکلم میدہ استعمال کیجئے۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔

نعمات کیجئے، تو اس کے لئے مجھے کیا کیا صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ اس کا ذکر میں ابھی سناؤں گا۔  
محفل میں بیکنٹ کھیلنے سے بچ گئی۔ کوئی گھڑی نہ رکھنے کا کسی کو ضروری کام یاد آگیا، اس نے کب آتا جان بھٹک کر  
سے ہوں مجھے، کوئی بول دیا کہانی، نئی سترہ نہی ہے کہ بانی یار ہوگی ہے جب سب جا چکے وہ سترہ یاد کروں ہے نور کے سترے  
بوجھ کلاس انڈیلو، کباب سامنے رکھتے اور کھانے لگا۔

جہاز بادِ سندھی کا پہلا سفر

نحشتِ اہل چوں نہد معمار کج

تائزماے رد و محارک

”اے میرے عزیزم! تم کو تو نے اپنا شمار بدل کر دیا جسکی وجہ سے میری زندگی کا ہر لمحہ کونی ضروری کام بدل گیا ہے۔ میری زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے۔

”اسے میرے محترم نام، ادھر آؤ۔۔۔ کی باتوں سے پرہیز فرمادو، اپنا سفر بہان کر۔“

یہ ان دنوں کا ذکر ہے۔ کلاں گویا ہوا۔ کہ جب یہ خانہ ساز کیا گیا تو ان دنوں میں ہوسندھی قوموں کا  
 حملہ میں تھے۔ بی سندھی ہو گئی۔ اس علاقے میں کئی اور بے بی سندھی تھے۔ یہ تھیں جہاں کلاں کا اضافہ کیا۔ انہیں فوجوں فیض فوجوں  
 نے شہر نامی فوجوں حرب و ضرب، فوجوں جمع تقریب میں غامی شہر تھے۔ موسیقی میں وہ ہر رت تھی کہ شہر سا رنگ، سندھ کلیان، شہر  
 شہر، ہر سب جنوبی کا گستا تھا۔ لیکن طبعیت میں اس بڑی ساوٹی تھی کہ ایک ہیہ تھے کہ اس پیش کش کا کچھ نہ لیا، اور کئی دنوں تک  
 ہاتھ نہ دے پھر جب غلطی کا احساس ہوا تو ایک ہیہ کے ہمراہ اسے شخصیت کیا۔ یہ سب کے وجہ تو تھی یہاں سلتا اگر اس سب  
 نے ہوں۔ درہ پھلوں یا پھلوں کے بغیر ہووے اور درخت میرے لئے یہاں تھے۔ نصیب دو تاں علیل ہوا تو نصیب نے ایک کاغذ  
 پر کچھ لکھ کر دیا، حیرت نے گلے میں باندھ لیا اور شفا پائی، بعد میں یہ ہلاکہ وہ تو بڑا بڑا تھا۔ ایک مرتبہ سرمرٹنے پر عامیج سے دریافت  
 کیا کہ اسے کھانا کھانے سے پہلے استعمال کر دوں یا بعد میں۔ نصیب نے فیلوے کے معنی دیکھے تو بڑا بڑا رہ گیا۔ برسوں دو مہر کے کھانے  
 سے بعد سو گیا۔ لیکن کبھی احساس تک نہ ہوا کہ یہی معمولی حرکت کے نتائج فیلوے کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں۔ کثافت جس کا خلق میں فلک  
 نہ فوج گرج پیدا کرتا ہے۔ جب فارغ التعليم ہو یعنی تعلیم نے مجھ سے فراغت پائی تو چند جانشینوں نے سیاست کی طرف رغبت  
 دلائی۔ فدی نے رجوع کیا، اور رات دوئی دن چوگنی تھی نصیب جوئی میری آئیں تھیں برسوں نے کئی جگہ ٹھہری پرج کرنا با متعدد  
 مقامات پر جوتا جلا کئی اخبارات مضبوط ہو گئے۔ اس حیرت انگیز مقبولیت کی وجہ میرے بڑی دوست تھے جو بے معمولی فیلوے کے  
 عرض یہ سب کچھ لکھ دیا کرتے۔ فلک کچھ رفتار کہ میری شہرت ایک آنکھ نہ بھائی اور دفعتاً میری تحریر پر تمام ہوئی، چند ہی مہینوں میں  
 خود عرض دیا مجھے بھول گئی۔ محض میرے دوستوں کی وجہ سے۔

”تو کیا آپ کے یہ دوست داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔“

ہنیں! ان میں سے ایک تو ضلع دار بن گئی اور دوسرا مجسٹریٹ درجہ سونم۔ کچھ دنوں کے لئے تو دنیا بھر میں معلوم ہوئی چر

شاعری کا شوق چرایا محروم شخص کیا۔ غزل میں نظم کا یہ عالم تھا کہ شعر کی درست سے پر بھی تین تالیف سنا تھا اور ولایت سے پر بھی غزل کے لئے آکر طبیعت غیر حاضر ہوتی تو آزاد نظم بڑی آزادی سے کہہ دیا کرتا۔ خدا کا کہنا کیا ہوا کہ گھسرا کے باہر چڑھ چکا کہ لا بورڈنگ ہوا تھا وہ کسی ضرورت مند نے چرایا۔ دروازہ کھلے بورڈ سے رخصت کیا گیا۔ مجھے فرض تبدیل کیا اب دھواخانہ وال جانا پڑا۔ واپس لوٹا تو خطوط کا ایک پلندہ منتظر پایا۔ یہ سب تعزیت نامے تھے جبران تھا کہ کس نے کس کی جان؟ فرین کس کے سپرد کی جو بورڈ دیکھنا ہوں تو کاتب نے غلطی سے خرم کی بجائے مرحوم لکھ دیا تھا۔ ای معاذ بورڈ بدلا۔ لیکن شہر بھر میں رسوا ہو چکا تھا بسند حق شخص کرنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ شاعری ترک کرنا پڑی۔ پھر سوچا کہ اسے مرد باہمت شاعری گنتی لکھ لیا اور بہت سے سفید مشعلے ہیں۔ اس ملک میں انسان کی اداس طبعیت بائیس سال ہے۔ تو یہ عمر کبھی کی گزاری چکا۔ اب اپنے آپ کو محروم ہی سمجھ اور پری میری کی طرف رجوع کر۔ ایک دفعہ نام چمک اٹھا تو دار سے بیار سے ہو جائیں گے چنانچہ اس اجیر نے اس سلسلے میں بڑا مطالعہ کیا بہاول پور اور سندھ کے لکھنوں میں بیشتر وقت گزارا۔ قابل فقیروں سے رفیق حاصل کی۔ جھنگ سے بعید ت افروز ہوا لیکن قیمت میں بکر بکھا تھا۔ کہ کسی ایک لائن کو سنگ نہ کر سکا۔ ایک دل اتفاق سے آڈس۔ کہنے، دھنیا ولف، برٹرینڈ رسل کی کتاب میں ایک کہاوت کے بار اتنی سہمی ملی گئیں کہ خریدنا پڑیں جو کوئی دیکھتا تھا اس لئے ورق گردانی پھر ہو گیا۔ اچھا بہار، میٹھا تھا، اچانک بشارت ہوئی کہ تو انٹیلیکچرل ہے۔ اگرچہ یہ دیر بے بیجا خاکسار نے ورثے میں پایا تھا تاہم خاموشی انٹیلیکچرل کہلاتے شرم آتی تھی۔ چنانچہ میں نے کافی ڈاکر جانا شروع کر دیا۔ پوشاک، غذا، ورزش اور چیلے سے لا پرواہ ہوتا چلا گیا۔ سب سے الگ تھک رہنے لگا۔ پڑوسیوں سے بات کرنا تو ایک طرف ان کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھنا قسمت کے لکھے کو کوئی جتا سکتا ہے۔ میری زندگی ایک انقلاب سے آشنا ہوئی۔ ایک چاندنی رات کو جب میں کافی ہاؤس سے لوٹا۔ تو ایک پردہ بالکل میرے سر کے اوپر سے گذر گیا۔ یہ واقعہ نہ تھا تشویش ہوئی کیونکہ مقامی ہندو سے بڑے شہسخت اور بڑے پوک تھے۔ اندھیرا ہو چکے کے بعد کبھی نظر نہ آئے۔ دل میں یہ شبہ یقین پایا کہ ہونہ یہ پردہ ہا تھا۔ اس مڑوہ جانفزا سے روح کو سرور حاصل ہوا اور طبیعت کو کمال درجہ سکون۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے سب کچھ ساکن ہے۔ زندگی میں تسلی بخش راحت ہے۔ دنیا میں امن ہے اور میں انٹیلیکچرل ہوں!

اچانک ایک سانس دان دوست نے بڑی بڑی خبر سنائی کہ میں ساکن ہرگز نہیں ہوں۔ ہرچیز میں گھنٹے کے بعد زمین کی گردش کی وجہ سے تین سو ساٹھ ڈگری گھوم جاتا ہوں۔ فضاؤں میں کئی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑا جا رہا ہوں۔ سورج کے گرد دہریاں میں کوڑھ میل کی مسافت طے کرتا ہوں اور کبکشاں کی جانب ڈیڑھ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے جھکا جا رہا ہوں۔ ادھر کی گردش اور اُدھر کی گردش، اس طرف اُس طرف، ہر طرف دواں دواں، میرے کانوں میں تیز ہوا سے شوش شوش ہونے لگی۔ چکر چکر آنے لگا۔ فوراً ٹھیکہ شراب دسی، پریچھا۔ (جس میں ہندوستانی شہرہ میچ کر بیٹھے ہیں۔) جب باہر نکلا تو دنیا تاریک تھی۔ دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کر دوں ساٹھ سال شہرہ پر ڈھول کی آواز سنائی دی۔ ساتھ گھنٹی بج رہی تھی۔ دونوں کی ہم آہنگی اس قدر خوش الحان معلوم ہوئی کہ مروجہ جسم میں جان پڑ گئی۔ میں لاشعوری طور پر پیچھے ہو گیا جب چونکا تو اپنے آپ کو اٹھاڑے میں پایا۔ غیر انٹیلیکچرل جو کم کو دیکھ کر بیت بھرا یا۔ پہلا انداز نے طرح طرح کے پٹھے ساتھ بٹھانے ہوئے تھے۔ دہاں اپنے ماموں جان کو بھی دیکھا۔ (کہ خطاب جس نے پہلوان لہندہ کا پایا تھا) وہ ایک ماتہ ہوا میں اٹھائے ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا اٹھاڑے کا طواف کر رہا تھا۔ اس کا بٹھا پیچھے پیچھے تھا۔ غالباً میں نے اپنے علم مخترم کا ذکر نہیں کیا۔ کہ گھسرا کا ایک بیوی مدی کی لہریں طرز کی گھسرا نے تھی جس کا نقشہ ملک فرنگ کے ایک ذی فہم زیرک کا ریگرنے تیار کیا تھا۔ اس کے دروازے پر بیک وقت تین چار موٹریں دکراہل فرنگ کی معافی دیا دو گری کا حیرت انگیز ثبوت ہیں) کھڑی بھجوتی تھیں۔ دہا عشام وہ دہرہ وہ طوطا تھا کہ انٹیلیکچرل جیب سامنے



پس حکم خداوندی ہے۔ مگر جہالت اس کے چہرے پر نہن کی طرح یوں برستی تھی کہ اس ناچیز کو اس کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوتی۔  
"عشق کے امتحانوں کے متعلق کیا فرمائیے؟" اس نے اصرار کیا۔

"یہ دوسرا مصرعہ اسے علم محترم آپ جیسے پیروفتوں کے لئے نہیں، مجھ جیسے نوجوانوں کے لئے ہے، بہتر ہوگا کہ آپ اپنے  
مصرعے کا ہی اپنے اوپر انطباق کریں، میں نے سینہ منکھوتے ہوئے کہا۔

"مجھے ستاروں سے قطعاً دلچسپی نہیں۔" وہ آہ سرد کھینچ کر بولا، مگر دوسری چیز عشق بالکل بکری لائن میں ہے۔ اور بخوددار  
تو گستاخ ہونا جا رہا ہے۔"

اس نے اپنی انگلی کا ٹھیک بنا کر میرے سر کے مخمفر سے گنچ پر مارا، نہایت منترم آواز نکلی جو کانوں کو بھی معلوم ہوئی۔ یہ سب  
خودداری نے معن و علامت شروع کر دی۔ یہی خیال آتا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں پلیٹ خام کٹ خرید کر سٹیشن پہنچا، معلوم  
ہوا کہ صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ پھر سوچا کہ اسے مرد معمول کیوں اپنے ماموں سے ڈرتا چلتا ہے۔ طاقتور بن اور اس کا  
مقابلہ کر۔ اس دن سے میں نے کافی ہاؤس جانا ترک کر دیا۔ اور ساری کتابیں ایک بھٹیاری کے حوالے کیں کہ وہ بغیر ضرورت استعمال  
میں نہ دے۔ اور ریڈیو ٹائپنگ پڑھانے اور گدگد گمانے میں زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر دیا۔ ڈسٹر پلینے کے بعد میں گولیاں کھانا، انجمن کے جلسوں  
نکالتا۔ لچر چار گولیاں، چھوٹا ٹکڑا گدگد، رات کو پانچ گولیاں، ہفتہ گذر ہوا، اطمینان جاننے۔ بدن سے شائیں نکلے گئیں۔ اندھیری سے اندھیری رات  
میں بغیر روشنی کے چل پھر سکتا۔ طاقت کا ایک سمندر تھا، ٹھٹھاٹھٹھٹھ مار رہا تھا۔ اٹھویں دن خواہش پیدا ہوئی کہ شیریں پر سواری کی جائے۔ ٹھٹھا  
اس کو چڑھا لکھ بیٹھا۔ مگر شیریں کو بیچروں میں دھاڑنے والیہ کراہتی راستے تبدیل کر فی جڑی۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ کونوں درم محترم کی خبر لی جائے۔  
چنانچہ اسی ٹکڑے میں ماموں کی مجلس پر پہنچا۔ نوکر چاکر ڈر کر بھاگ گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماموں بستر مباحثت پر بعد حضور و شروع دعا مانگ  
رہا ہے۔ کراہے باری تعالیٰ میرے اس نابکار بھائی کو توفیق دے کہ کافی ہاؤس جانا ترک کر دے۔ اور اپنی روزی خورد کمانے لگے۔ مجھے بھی  
یہی توفیق دے۔ ہم سب کو یہی توفیق دے۔ میں اب بالکل سب دھا ہو گیا ہوں۔ تیری شان ہے کہ جس کی ڈبوڑھی پر پکڑا ڈ اور کبڈی تک جھونتی  
تھیں وہاں اب گدھا تک نظر نہیں آتا۔ خداوند تعالیٰ کہیں مجھے کسی انٹیکچوئل کی بددعا تو نہیں لگی۔"

"بس بس اسے مرد بد بخت اٹھا! میں نے تیرے قیل تن ہونے کا راز پالیا ہے۔ اور خبردار جو کسی انٹیکچوئل کو برا بھلا کہا ہے تو۔  
خبردار جو کسی کو بھی برا بھلا کہا ہے تو۔ کیا ہم سب ایک جیسے نہیں، سب برا نہیں۔ میں بابر ہوں، برادر ڈشاکے۔ برادر ڈشاکے، برادر ڈشاکے، برادر ڈشاکے، برادر ڈشاکے  
کنفیوٹیشن مرادی ہے اس بھڑکے۔"

اسے عزیز ازجان بھانجے، آج سے مجھے اپنا ساتھی سمجھ تیرے حق میں جو دعا کی تھی وہ میں واپس لیتا ہوں۔" اس نے تھر تھر  
کا پٹنے ہوئے کہا۔

دفترت مجھے محسوس ہوا کہ محنت کے ساتھ ساتھ میرے عقیدے بھی بدل چکے ہیں۔ مجھے انٹیکچوئل پنا دو بھر دکھائی دیئے لگا۔ کہ اس  
طبقت میں رہنا برا مشکل ہے۔ ہمیں لوگ سمجھتے نہیں بروقت ملاقات اڑاتے ہیں۔ سارا حجب خراج طبعیوں کی حجب میں چلا جاتا ہے۔ کیونکہ  
محنت اس طبقے کی نہایت خستہ ہوتی ہے۔ ملازمت کے لئے انٹرویو میں جاؤ تو آسان سے سوالوں کے مشکل جواب سن کر کمزور کو احساس  
کمتری ہو جاتا ہے۔ اور وہ خواہ مخواہ قیل کر دیتے ہیں۔ ویسے پہلک علیہ دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہے۔ الغرض ان لوگوں کو سوائے ہوا پھانکنے کے

کچھ میٹر نہیں آتا۔ اور ہوا میں غدا نیست نہیں۔ کچھ تو چھو تو ارادہ اس خاکسار نے اس روز بدلا جو بیدار گاہ میں دروازوں کو کھلیں گئے ہوتے  
 تھے۔ دو فوٹاں بھینکے تھے مگر جاکے تھکنے پر ٹپکے تھے۔ دوڑنے ایک دوسرے کو دیکھا، ہاتھ بھیدے، مسکرائے، اذیت بھات خوشگوار  
 رہنے۔ ایک دوسرے کے برابر سے نکل گئے۔ جب غلطی کا احساس ہوا۔ تو فوراً بند ہوئے۔۔۔ "کہاں چلے گئے؟"۔ "میں تو یہاں ہوں  
 تم؟"۔ "پیدا؟"۔

مرٹے اور بھلے گئے۔ کچھ سے واپس لوٹے۔ لیکن اس مرتبہ یہ نشان نہ لگا گیا۔ میری مرتبہ غلطی یا یہ ممکن کو بھی۔  
 رات کو اس نیاز مند نے ایک خواب دیکھا کہ اپنے ایک اکلکھوٹل دوست سے ملے۔ اس سے ملنے کے وقت جو کہ وہ دیکھ بھریا ہوں تو  
 اس نے پڑا۔ ان کی دم غائب تھی۔ جاگا تو غصت شرمندہ ہو۔۔۔ "اسی دن سے میں نے اس اکلکھوٹل سے ملنے کے بعد  
 بننے سے کنارہ کشی کر لی۔۔۔"۔ "بھئی تو سن رہا ہے اور لکھ رہا ہے؟"  
 "نہیں تو۔۔۔"۔ "جہاز ناخورد دفعہ چاٹا۔"

"ابھی بتائیں کیا کہہ رہا تھا۔۔۔؟"  
 "جہاز ناخورد تھی، رہا زہاد بادی، انہما۔۔۔ باندھی۔۔۔"  
 "معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرا، شہ ہے۔۔۔"  
 "میرا نہیں! یہ میری بہت لمبا تھا، علوم ہوتا ہے کہ یہ اے کیوں تھا۔ اور باہم دم وہ پرنہ کو ان ساتھ جو آپ کے  
 بہت بڑک کے اوپر سے گزرا؟"

اسے ہمد نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پرنہ وہ بوم تھا، کیونکہ اس کے بعد بھی کسی مرتبہ وہ ان حقیر کے سر پر سے گزرتا۔  
 کہ تا قاتل پہلا سفر جہاز ناخورد تھا، شہادت ہو نا جہاز ناخورد تھا، اس وقت وہ آئے کے اگلے روز، جہاز  
 سلامت سفر دوم۔

اگلے روز حسب محفل منعقد ہوئی تو اس میں صریت دو حضرات شامل تھے خور داد، کلاں۔ بہر چند کہ کلاں نے شہزادہ شہزادوں  
 کا بندھن سے انتظار کیا۔ بارڈیفون کیا۔ لیکن باؤسی ہوئی۔ ناچار چائے منگوائی۔ خود چار دیکھ کر نہایت غمگین ہوا ادیہ مصرعہ زبان پر لایا  
 جا۔۔۔ "اکن چاد ورنش۔۔۔ لیکن کلاں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور بولا۔۔۔"

## جہاز ناخوردھی کا دوسرا سفر

حسینوں سے فقط صاحب سلامت و دور کی اچھی

نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دوستی اچھی

اسے عزیزانہ جان ہم نام ایک دن چوک میں نے ایک شخص کو ہجوم کے سامنے تقریر کرتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ سب  
 لوگ برابر ہیں، سب عزیز ہیں، سب بچے ایک سے ہیں۔ لہذا سب کو بڑبڑ حق طے چاہئیں۔ زندگی آسان ہو سکتی، اس میں سفر  
 کیجئے، ساڑھے چار آنے میں سیکڑ سو دیکھئے۔ اندھیرا ہو جانے پر اندھا جائیے۔ اور دشمنی ہونے سے پہلے باہر نکل آئیے، میونسپلٹی

نے کہیں کہیں ریڈیو نمصب کئے ہیں۔ اور ان پر موسیقی (جو اسی فیصدی غلی ریکارڈوں پر مشتمل ہے) اور خبریں سنی جاسکتی ہیں۔ ایک مثال پر کچھ سے ہو کر فدا سی دیریں تازہ رسائل اور نئی کتب کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ایک لمبے سے اور کوٹ سے سردیاں گل سکتی ہیں اور دودھ ٹھیکیں میں سٹوٹوں سے گیامیاں بخرا سکی خوشا۔ سے با سانی محبت کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ مت جھوٹے کسب لڑکے ایک جیسے ہیں۔ اور سب لڑکیاں ایک سی ہیں۔ مثال کے طور پر روس میں —

”وہ روس کا ذکر زبان پر لایا تو مجھے شبہ سا ہوا۔ اگرچہ معلومات اس احقر کی روس کے بارے میں نہایت محدود ہیں۔ تاہم بحث کرنی ہو تو ٹھنٹوں بول سکتا ہے۔ اسے ہم نام خود دتیرا روس کے متعلق کیا خیال ہے؟“  
”اسے ہم نام کلاں معلومات تو میری بھی ایسی دلیسی ہیں۔ اگرچہ میں نے گراڈ تو مارکس کی کھی موئی مشہور و معروف کتب سراپہ داری، پڑھی ہے۔“

”ہنیں یہ کتاب کارل مارکس نے لکھی ہے۔“

”تو وہ بھی تو مارکس براہد میں سے ہوگا۔ مارکس براہدز کو با شاء اللہ کون نہیں جانتا۔“

”خیر تو میں تقریر سناتا رہا، اس نوجوان کے بعد ایک شہزادی نے تقریر شروع کر دی۔ خا سدا نے تقریر سے زبانہ شہزادی میں دلچسپی لی معلوم ہوا کہ اس پاری میں چند شہزادیاں بھی ہیں۔ ان میں سے دو تین شہزادیاں تو والدہ خوب تھیں۔ تاہم سنے عظیم و دل کو ان کی دید سے ترقا پایا۔ اور اپنے تئیں اس ٹولی میں شامل ہونے پر آمادہ پایا۔“

لیکن پتہ چلا کہ شامل ہونا آسان نہیں۔ کافی چھان بین کے بعد یہ لوگ اپنے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ بلدی کو کشش کے بعد میں نے ان کے سر پر دست کا کھوج نکالا۔ کسی نے بتایا کہ ان کے بچے سبزی ہانٹے تازہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ طبیعوں کا اصرار ہے کہ سبزی ہاں بچوں کی بہبودی کے لئے از حد اسند ہیں۔ اور ہر بچے میں کہ نباتات، جمادات اور معدنیات سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ لیکن سبزیوں کو چھوٹے ملک نہیں ہیں نے ان حضرت سے مل کر اس ہم کا بیڑا اٹھایا۔ چند گاجریں تکیوں کے نیچے رکھ دیں۔ کچھ ٹاٹر بلاٹھے طاق رکھے۔ سلیم کتابوں کے نیچے چھپا دیئے۔ بچوں کو جب یہ چیزیں فروزا ملیں تو سمجھے کہ انہوں نے چراتی ہیں۔ خوب سیر ہو کر کھائیں۔ ان کے آہنہ است خوش ہوئے اور ٹو اپنے پیارے کئے کا کرنے گئے۔ جو میل تھا۔ مگر دعائی پیتے سے احتراز کرتا۔ میں نے پہلے تو دعائی اس سب کا بار کئے دہیں میں، ظہرینا چاہی جب اس نے متواتر ناراضا مندی کا اظہار کیا تو شیشی فرش پر تنج دی۔ بس یہ اس سب کا عاقبت اندیش نے زبان سے ساری دعائی چاٹ لی اور کپڑے کے دار کو مینچا۔ وہ حضرت کمال درجہ مہربان ہوئے اور بوسے — ”اسے مرد عاقل تو دولت لغیات سے مالا مال معلوم ہوتا ہے، بنا کیا مانگتا ہے؟“

میں نے آرزو بیان کی کہ کاش کہ مستقل طور پر آپ کی صحبت سے ذوق حاصل ہوتا۔ الحمد للہ کہ اس مرد گرانی نے مجھے اپنی جماعت میں شریک فرمایا۔

ایک ایک دن عیش و کامرانی میں گزرتا۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک سگرٹ کاٹین کھولنا سب اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کپڑے، چیزیں، روپیہ، استعمال کرتے۔ دیسے ہم لباس اچھا پہنتے تھے۔ لیکن جب کام پر جانا ہوتا تو نہایت سادہ اور کھردرا سا لباس ہوتا۔ ایک خاص قسم کے سستے کپڑے کا بنا ہوا۔ سرور ایک عجیب سی ٹوپی ہوتی۔



دانش و تہذیب کا استعمال بھی ضروری تھا۔ ہمارا کام آسان تھا کہ ہم اس اور کتا بنے تعمیر کیا، اور سڑک بنانا، خاص خاص جاسوا میں خرید کر ناہ جہل کوئی کسل کا شہر ہو بہت سے لوگ جمع ہوں وہاں شور و غل مچا کر رنگ میں جنگ ڈال دینا۔ اس کے لئے ہمیں معاوضہ ملتا تھا۔ ہمیں اپنی ٹوٹی کے تعمیر کے علاوہ ہر شخص سے قبی نقص تھا۔ کہ یہ ٹکسار بعض شہزادیوں کے لئے شریک ہوا تھا۔ اس لئے زیادہ نہ لیکھ سکا اور دیکھ کا دیکھا رہا۔ ایک شہزادہ کو کیا ملتی ہے۔ شہزادوں کے قرب سے خرمی صبر و سکیم پر کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ یہ عقیران میں ضرورت سے زیادہ دیکھی ہیں۔ شہزادوں نے سردیوں میں تو خوب تبلیغ کی، گرمیاں آئیں تو نیز دھوپ سے ان کی رنگت اٹھانے لگی۔ ہر جگہ پتھروں اور روت کا غا غوا تھا۔ یہ تھا۔ موٹر میں کئی بار پتھر پڑی اور پیراں چلنے پڑا۔ شہزادوں کو شکایت مل کہ باشندوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔ اور ہم کتنے خود سے ہیں۔ لوگ نہ پڑھتے تھے نہیں بلکہ اب نو روک جم سے چٹنے لگے ہیں۔ بھلا اور شہزادیاں ہماری طرح خدمت کئے کئے کون نہیں نکلتیں۔ اس طرح دیکھ ہی نہیں ہوتا۔ پھر ایک معزز نے سنا کہ ایک شہزادی نے غاں بہادر قلندر پٹک سے شادی کر لی ہے۔ حالانکہ غاں بہادر موصوف کی ذرستہ سے چوسٹہ سب بیویاں صحیح سلامت تھیں۔ دوسری نے ایک راستہ پر درویشنا، جو سب کی راستے میں کافی بزدل تھے۔ جن کی بیوی کئے تعلق افواہیں اڑ رہی تھیں کہ سرگشاں ہو چکی ہیں۔ یا جو نے ڈالی ہیں۔ یہ تازہ شگوفہ جو پھول لا تیرہ تاجیر ساری جو کڑی ایک دم بھولا۔ لیکن پھر ہر جگہ شہزادیوں پر پھر دوسرے کرنا دین محافظ ہے۔ ان کی استقامت کا دم بھرا میں جہالت ہے۔ یہ ایک تیسری شہزادی نے ایک وقت میں بہادر سے عقد کیا جس نے فوراً دوسرے بیچ کر ایک پکا۔ ڈھیری، انفرض خزاں سے پہلے ساری شہزادیاں ٹھکانے لگیں۔ ان میں سے ایک نے دغا کو میں نے لکھ کر بھیجا۔

۱۔ ہو کیا تھا وعدہ نکاح کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

جواب آیا ہے

بہت دنوں کے قابل نے تیرے پیدا کیا  
وہ اک نکاح جو بظاہر نکاح سے کم ہے

ہم طرح طرح کی آزادیاں چاہتے تھے، سوچنے کی آزادی۔ جو جی میں آئے کر گزرنے کی آزادی۔ ایک آزادی نے اس خاکسار کو کمال ذیل و فقار کیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر یا نارا اپنے پاؤں پر گھبھاڑی مار رہا ہے۔ سب دیکھتے ہیں اور کوئی نہ نہیں کہتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ قریب جا کر نصیحت، شہرہ کی ہی تھی کہ نوجوان نے ترجیحا وار کہے ایک میرے پاؤں پر بھی جڑوی۔ دو ماہ ہسپتال میں پڑا رہا۔ قصور نہ میرا تھا نہ اس کا۔ میں نے آزادی گفتار دکھائی تھی اور اس نے آزادی کر دار۔ خدا کا کیا کیا ہو کہ ایک عجیب خواب اس ناخندنی کو نظر آیا۔ ایک راست سویا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جسے گھوڑے پر جوار ہوں اور گھوڑا جنگل میں سے گزر رہا ہے۔ ایک ایک آہ سنائی دی۔ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آہ نمبر دوشی، دوسری بار حیران ہوا۔

"میں نے بھری ہے۔ گھوڑے نے بڑی سلیس آرو میں کہا۔ اور میں کیوں نہ بھروں۔ میں بھی تو جاندار ہوں منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ تم انسانوں کے لئے تو حقوق مانگتے ہو۔ جانوروں نے کوئی ساگنا کیا ہے؟ جانوروں کی عقیدوی کے مطابق ہم سب ارتقا کی مختلف منزلوں پر ہیں۔ بہادر ماخذ ایک ہے۔ لہذا ہم سب ایک دوسرے کے کنہ ہیں۔ اسے میرے کنہ! میں تھک گیا ہوں اب

تم گھوڑے ہزاروں سواری کر دیا۔“

چار دن اچھا۔ اس تحیر کو گھوڑا بٹا پڑا، باری باری ہم نے سواری کی جنگل سے باہر نکل کر خیال آیا کہ اگر دونوں ساتھ ساتھ پہل چلتے تو بہتر تھا۔ زحمت ہوتے وقت میں نے اپنے کزن سے دریافت کیا کہ اگر وہ انسان بننا چاہے تو کسی ماہر نفسیات سے کمرٹو میٹھ کا انتظام کرایا جائے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ بولا۔ ان دونوں تانگے کے گھوڑوں کو چھوڑ کر بقیہ گھوڑوں کی پوزیشن انسان کی پوزیشن سے بدتر جائے۔ صبح جاگا تو بڑا پریشان ہوا۔ اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ تانگے میں بیٹھنے سے احتراز کرنے لگا۔ اور کوئی سواری میسٹر بھی نہ تھی۔ حرکت محال ہو گئی۔ سائیکل چلا چلا کہ برا حال ہوا تو عقیدے سے بدلنے پڑے۔ اور شہر ہزاروں سے بھی تتر بتر ہو گئے۔ کچھ رجاؤں میں جا بے ایک دو ایک ٹرین گئے۔ باقی کے ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ایک رہ گیا تھا۔ اسے بہ وقت یہ دم رہنے لگا کہ ٹرین شاید کہ پولیس خفیہ باشد

وہ بھی سنا کہ نائب تحصیلدار بن گیا۔ اس کے ساتھ میرا دوسرا سفر تمام ہوا۔ عزیز زاد اللہ ایسی نگاہوں سے الماریوں کی طرف مت دیکھ کہ موم بھی پھریں جائے۔ مجھے احساس ہے کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ آج دیسی شراب منگائی ہے کہ چلوں اٹو لکڑی، اگلے روز جب خاتون شب نے چادر سیاہ میں رنج اور چھپایا اور شاہ خاد نے اورنگ سپر ہر جلوہ فرمایا۔ (یعنی جب صبح ہوئی)۔ تو دو نو جہاز بادوں کو آرام کر سیوں پر سوتا پایا۔ کہ ساتھ ان کے چند خرد گوش بھی خوابیدہ تھے۔ آکھ کھلنے پر غنچہ بیج کھنکھلایا۔ مرفان خوش الحان کی تملہ بچی سے کاووں نے لہفت مزید پایا۔ جہاز باد کلاں شرابا اور زبان پر یہ کلمے لایا۔

”اے مرد نیک طینت! بادہ دیسی نہایت تیز نکلا، اب تک حالت خستہ ہے۔ آج اچھی صبح اس شعر کے معنی سمجھ میں آئے ہیں۔“

جو آج بی ہو تو ساقی حرام شے پی ہو

یہ گل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے

یہ بتا کہ تیرے عزیز و اقربا تیرا انتظار تو نہ کرتے ہو گئے۔ شاید حقانے میں پوچھنے گئے ہوں۔“

”میں خدا کے فضل و کرم اور آپ کی دعا سے ناکند ہوں، تو پھر سنا ڈل تیرا سفر۔“

”ذرا صبر فرمائیے، سمندر کلام کو زیر نگام لائے۔“

انتہے میں ملازم نے مزہ دیا تو فرما سنا یا کہ جھوٹا عائد ہی تیار ہے۔ چار پی کر کلاں ضبط نہ کر سکا۔ ادویوں گویا ہوا۔

جہاز باد سندھی کا تیسرا سفر

دل سے شوقی درخ نکو نہ گیا

تا نکلتا جھاگستا کعبو نہ گیا

اے مرد مخلص! میں موسم گرما گزارنے ملتان کے مرغزاروں میں گیا۔ وہ سرزمین جو رنگین مزاجوں کے لئے عبرت افزا گلشن اور مدد لیوں کے لئے دکشا غوث کدہ ہے جب کچھ عرصہ خوش وقت ہو کر واپس لوٹا تو ایک نیا نام سننے میں آیا جس سے کان

فلمی طور پر آتشاقتی — یہ نام تھا ترقی پسندی۔

معلوم ہوا کہ میری غیر ماضی میں ایسی خوشگوار ہوا چلی کہ پچھتہ ترقی پسندی گدا، شاعری ترقی پسند ہوئی۔ ادب ترقی پسند بنا سارا ملک ترقی پسندی کے گئی گا۔ اٹھا یہ غلام بہت خوش ہوا۔ ترقی کو نہیں جانتا، بہت سے احباب جو غلام تھے، ترقی کے لئے دلوں سے نشان تھے۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ پیش قیمت مخالفت بھی دے چکے تھے۔

نوجوان قواس تحریک کے اس قدر گمراہ ہوئے کہ ترقی پسندی کو اپنے نام کے ساتھ بطور ڈگری استعمال کرنے لگے۔ تعارف کرتے وقت ذکر کیا جاتا کہ فلاں ترقی پسند ہے یا نہیں۔

ادھر ترقی پسند ادب کا ریکٹ بڑے زوروں پر تھا۔ یہاں تک چلے پھر زور و ایڑ بڑوں نے حد بندی مقرر کر دی اور ترقی پسند رسالوں اخباروں میں صرف ترقی پسند چیزیں ہی چھپ سکتیں۔

اس فردی نے بڑے شوق سے اس نئے ادب کا مطالعہ کیا۔ اور اسے جو مد حامی سمجھا۔ ہر کتاب دوسری کتاب سے مٹی مٹی تمام انسانے ایک جیسے تھے۔ ساری غزلیں ایک ہی تھیں، حقوڑے سے مطالعے کے بعد اتنی خود اعتمادی آگئی کہ افسانے کا آکاہا چھ کر انعام مانگنا تھا۔ غزل کا مطالعہ سب کر رہے تھے، اشعار میں کیا ہوگا۔ لوگ بڑی سرعت سے ادیب اور شاعر بن رہے تھے، جن حضرات نویں صدیوں پر سارا دن کھومتے یا کافی ہاؤس میں گئیں ہانگتے دیکھا کہ کتاب اس نئی دنیا کے ادب میں نام پیدا کر چکے تھے۔

یہ ترقی پسندی تو کچھ تھا۔ لہذا ادیب بننے کا شوق چرایا، چنانچہ اسی دھن سے ساز ملکہ اسی لئے میں الہ پنا شروع کر دیا میری بیروں پر ترقی پسند مخلوق میں تو واہ واہ ہوئی لیکن کچھ لوگ فواہ فواہ لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے، معلوم ہوا کہ ان دلوں میں مختلف کیمپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے موریر باندھے منظر رہتے ہیں۔ میں کچھ حیران ہوا۔ ادیب ایک بہت بڑے ترقی پسند سے ملا۔ پوچھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ مجھے لے لئے کسی ایک کیمپ میں رہا جائے۔

اس نے بتایا کہ یہ مجھ ضروری ہے۔

میں نے کہا — لیکن ان دونوں کیمپوں میں ہر وقت، فوٹو میں میں ہوتی رہتی ہے یہ مجھے پسند نہیں۔ کیا کوئی غیر جانب دار نہ کر نہیں کہہ سکتا؟

وہ بولا — اگر آپ غیر جانب دار رہنا چاہتے ہیں تو کھٹنا چھوڑ دیجئے۔

چنانچہ برقی نقاد بن گیا۔ اس میں بھی ایک راز مضمر تھا جو ایسی بناؤں کا۔ ترقی پسندی کا فلسفہ کچھ مشکل نہ تھا۔ اپنے جیسے لوگوں کی سدا تعریفیں کرنا۔ جو لوگ کھٹنے کھٹانے کے علاوہ دوسری کمانے کے لئے محنت کرتے ہیں انہیں ادب کا دشمن قرار دینا۔

افسانہ، مقالہ، غزل۔ سب کے لئے سانچے موجود تھے۔ چنانچہ ترقی پسندی کا میل لگانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ صرف ان مسائل پر قلم اٹھایا جائے جن پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تنقید کرتے وقت میں بلاٹ کو جانچتا، مصنف کے پیغام کو۔ پیغام کی افادیت کو۔ ہر چیز میں دی جانے پہچانے مومنوع، وہی مقررہ ترکیبیں اور الفاظ ڈھونڈتا، اگر مل جاتے تو ترقی پسندی کا تھپہ لگا دینا اور نہ مصنف کو گمراہ کرنے والا سرمایہ وار، تنزل پسند اور نہ جانے کیا کیا کہتا۔

آپ نے فرمایا تھا کہ نقاد بننے کی وجہ تسمیہ بیان کریں گے۔ خود نے بات کہی۔

ان قوبات دراصل یہ تھی کہ اس مافی عنہ کو چند افسانہ نگار اور شاعر شہزادیاں پسند تھیں، ان میں سے دو ایک کو نویں نہ سمجھ جاتا تھا۔ اور کئی سال سے لگا تار ان پر فریفتہ تھا۔ لیکن انہوں نے میرا اتنا سا بھی زلزلہ نہیں لیا۔ کھتی دکھتی یہ ایسا ہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ان کی تعریف کرنے کو شاید بے منت ہو جائیں۔ موقوفہ بھی تھا چنانچہ میں نے ان کی تخلیقات کو سرسینا شروع کر دیا۔ ہر دو روز ایک نمبر سے پہلے اپنے ٹھوس مضامین میں ان کی تعریفیں کرتا۔ لیکن تعجب ہوا کہ یہ مدح سرنی رائیگاں گئی۔ کسی سے پتہ نہ چلا کہ یہ کون کون سے نادریوں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مجھے شبہ ہوا۔ ادھر ادھر پوچھتے پراکتشاف ہوا کہ انہوں نے کیا کسی نے بھی نہیں پڑھا، ایسے مضامین یہاں کوئی نہیں پڑھتا کیونکہ انہیں خشک اور قلیل سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی نقدوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

”ان کیہوں کا کیا بنا؟“

”بتا تا ہوں، مٹی۔“ یوں تو یہ تحریک کچھ عرصے پہلے مقبول ہو جاتی ہے لیکن اس نام سے خواہ مخواہ خوش فہمی تھی کہ اب۔ چیزیں نئی ہوں گی۔ حالات سدھ جائیں گے۔ انسان ترقی کرے گا۔ دنیا بہتر ہو جائے گی۔ لیکن آہستہ آہستہ مایوسی چھانے لگی۔ اور بالکل جہل و غم بن کر رہ گیا۔ آج کوئی بات موزنی، اسی بننے اس پر ظلم کھو دی گئی یا افسانہ نگار مینے کتاب۔ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کاپیرک نسا کا غرضی تھا۔ اس قریب کا مقصد غرض تھا۔ تعریف و تہنیت۔ یہ میری نہیں تھی۔ پہلے اب تک غلط فہموں پر SETTING کرتی رہی تھی۔ ان کی زندگی عمل سے خالی تھی۔ ان کا نظریہ حیات مرعیانہ اور فطرتی تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ ہر پڑھنے والے کو مایوس کیا ہو جائے۔ ادب کسی خاص طبقے کی میراث نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ چنانچہ لوگ اس فنی ہنگامے سے تنگ آ گئے۔ ادب ادب سے ایسے بدگمان ہوئے انہوں نے فنی رسالے پڑھنے شروع کر دیئے۔ فنی رسالے تو فراری ادب میں ہی شامل نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ایک عجیب و غریب ادب۔ جنم لیا۔ موقوفہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد حضرات نے تاریخی اور مذہبی ناول لکھنے شروع کر دیئے۔ جو باتوں کا لکھ بکے۔ معلوم ہوا ہے کہ اب ہر ہر ہے۔“

”جی نہیں، ہر تو نہیں ہو رہا۔“ خود جوابی لے کر بولا۔ ”فراری ادب پر مجھے ایک حتم دیدہ واقعہ یاد آ گیا۔ طے ہوا کہ تار ضلع کے جیل میں قیدیوں کو اخلاقی کنڈیں پڑھانی جانیں۔ داروغہ جیل اتفاق سے رجعت پسند تھا۔ سب کتابیں فراری ادب پر سے تھیں یہ نکلا کہ وہ مہینوں کے اندر اندر سارے قیدی فرار ہو گئے۔“

”خیر تو یہ کتنی بدستور ترقی پسند رہا، بعض ایک ماہ بارہ کے عشق کی وجہ سے۔ اس بہت طنز کو میں نے جینا بازار میں دیکھا۔ میں وہ پیشل کتے ملتے جا رہا تھا کہ خیال آیا کہ ذرا دینا بازار کا نظارہ کروں۔ ایک سال پر کچھ خریدنا چاہا لیکن دونوں ہاتھوں کو گھرا پایا۔ ایک صاحب پر شکم کو قریب پارکٹوں کی زنجیروں اس کے ہاتھ میں تھامیں جب خرید سے فراغت ہوئی تو حسینہ مذکور سے کتے طلب کیے۔ اس۔ کد جوں بن سے کہا۔ ایک کتا تو ملی کے پیچھے بھاگ گیا۔“

انگشت بدندان سخت پریشان ہوا اور سوال کیا کہ کیونکر بھاگ گیا۔

”یوں بھاگ گیا۔“ اس نے دوسرا کتا بھاگتے ہوئے کہا۔

کتے تو دونوں مل گئے لیکن ادایہ اس کی اس درجہ بھائی کو بھر عاشق ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آخر شکاری بڑا کر دی۔ اس علاقے میں جتنے اختر حسن، اختر حسین، اختر محمد اختر وغیرہ تھے سب کن ٹالے کرا ناقد ہوئے۔

آخر اپنی کنون کی ملا جاسی۔ وہ حال جاتی ملائیں سے کہ بولی۔ میں آج ہی اسے کھرب میں بلاؤں گی۔ چنانچہ شام کو وہاں پہنچ کر کھرب میں آئی۔ اس وقت سے کہ بھاری فرشی غرارہ پہنے، عطر لگائے، زیور میٹل پہنا کھرب ہمارا کھاتا تھا۔ کھے میں جٹنی، چمپا کلی، مونیوں کی کالا، خار جلی، کافوں میں پتے بالیاں، باغیوں میں حسین بند، الماس کے کڑے، پاؤں میں سر نے سجھنے، ناک میں میری سے کی تھ، انگلیوں میں جو اسرات کی انگوٹھیاں، سر پر چھپکا، اس فوٹو نے دیکھتے ہی یہ شعر بڑھا ہوا۔

جان پڑ جاتی ہے زور میں پہننے سے تر سے  
کہیں اڑ جائے زحمتی تری جسٹن ہو کر

لیکن میری کزن نے بڑا سہو سے ہشت کر کے پیب کرادیا۔ اور اس سے گویا بوٹی۔ کہ کھرب میں بلائے کا توقف بہانہ بنا۔ اصل میں تمہیں ایک پیغام سنانا تھا۔ میرا کزن، جوان و زیبا خرام خوب رنگوں دیکھتے ہی آپ پر شیفہ و دوالہ سوا عشق کا بول بالا ہوا۔ وہ سزا جان سے تمہارے گل رخسار کا عندلیب شیدا ہے۔ آہ سرد اور دل میں درد سے عشق کا مرض پیدا ہے۔ ماشاء اللہ عجیب غریب فوجوان ہے۔ عجب آن بان ہے، لاکھوں جوانوں میں انتخاب ہے۔ حسن و خوبی میں ابرا آپ جواب ہے تم مدونوں کی خوب نبھے گی۔ گہری چھنے گی۔ وہ بھی کم سن، تم بھی جوان، وہ بھی نازک بدن، تم بھی دھواں پاؤں۔ وہ مجھ جیسا دو آفرینی، تم سر زمین زار تازہ منی۔

"افوہ! اتنی میں چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی۔" حسین نے بات کاٹی۔ "والدین میری شادی کا تمہید کو پکے ہیں۔ تمہی مجھے پارٹیوں اور کھرب وغیرہ میں جانے کی اجازت اتنی آسانی سے مل جاتی ہے۔ کئی اخباروں میں اشتہار بھی دیئے گئے ہیں۔ غالباً انھے میں سے میرا سو تمہر چایا جائے گا۔ اگر آپ کے کزن کو اتنا ہی ذوق و شوق ہے تو سو تمہر میں شرکت کرے۔"

حسین کی یہ تقریر پر اس حقیر کو نہایت ترقی پسند معلوم ہوئی اور اس نیاز مند نے اس کے ساتھ رہنا چاہا۔ زیوروں سے ابھی عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں کہ ارادہ ترک کر دیا۔ پیر سامبا ناچنے کی کوشش کی۔ مگر ایک دوسرے کے طبع سانس آپس میں الجھ کر رہ گئے۔ چنانچہ نص کی حسرت، حسرت ہی رہی۔

سو تمہر قریب آیا تو میری کزن نے اخبار میں چھپا ہوا اشتہار دکھایا۔ جو ضرورت رشتہ کے عام اشتہاروں سے ملتا جلتا تھا مگر ترقی پسندی کی سینک لگا کر پڑھا تو عبارت کا مفہوم کچھ بوں سمجھ میں آیا۔

## اشتہار برائے سبک

برخام و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح چھ بجے شہزادی دلیپ جہان کے سوئیکر کا ٹورنامنٹ شروع ہوگا اور مناسب اور معقول امیدواروں کو شہزادی پر عاشق ہونے کی اجازت ہوگی۔ ہنر و کھروہ مند جو ذیل شرائط پر پور سے اترتے ہوں :-  
۱۔ کنوارا ہونے کا سرٹیفکیٹ جس پر صاحب بہادر دیپ کمار کے دستخط ہوں۔ اور امیدوار کے والد کی سالانہ آمدنی اور جائیداد کی تفصیل درج ہو۔

۲۔ تندرستی کا سرٹیفکیٹ جس پر سول سرجن صاحب بہادر کی تصدیق ہو۔

۳۔ دو محرز آدمیوں کے نام اور پتے جو امید دار کے چال چلن کی ضمانت دیں۔ اور اس کے شہنشاہوں

میں سے نہ بولیں۔

۴۔ سرکاری خزانے میں پانچ روپیہ جمع کرانے کی رسید۔

۵۔ طسقاتی چیزیں بشمول زیند اسلحہ اور خان بہادروں کی سفارشیں منسوخ ہیں۔

۶۔ امید دار ایک ہفتے کا راشن، ہسٹراڈ دفاتر ملازم ہمراہ لائیں۔

۷۔ جہاز کو ترجیح دی جائے گی۔

۸۔ کامیاب امید دار کو شہزادی ولیم کے علاوہ جائیداد کا تنہا فی حقہ بطور انعام ملے گا۔

نوٹ۔ سب کو خبردار کیا جاتا ہے کہ خواہ مخواہ عاشق مرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کا امید دار

ایسی برائیاں کھاتی ہوگا جو پچاس روپیہ جرمانہ ادا نہیں دے کی قید تک ہو سکتی ہے۔

اس ناچیز نے اس شاندار ترقی پسند سیرٹ پر اظہار مسرت کیا۔ اور دعا مانگی کہ دنیا کی ہر شہزادی کی شادی اسی طرح ہو کہ اسے خود

کا غنا مل کر کے گھوڑا، منگیا یا سیر بھی لگا کر سوار ہو۔ اور سوئے تو نامنت روانہ ہو، تنہا نہایت شاندار رہا۔ طرح طرح کے امتحان

ملنے لگے۔ آئی کیو (۱۰۵) بھی ٹسٹ کیا گیا جو زیادہ ذہین تھے انہیں نکال دیا گیا۔ اتفاق سے ایک حبشی بھی کہیں سے آئے ٹپکا، اسے سزا

دی گئی اور فہرست سے خارج کر کے وقت اس کے منہ پر سفیدی مل کر شہر میں پھرایا گیا۔ تاکہ سب کو عبرت ہو۔

چند رجعت پسند امید داروں نے آنے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ جائیداد کا کون سا حصہ ملے گا۔ شمالی یا جنوبی، جواب ملنے پر وہ

واقف راست فرار ہو گئے۔ کیونکہ وہ علاقہ نہری نہ تھا۔ وہاں ٹیوب ویل لگانے کی ضرورت تھی۔

غاکساو بھی فائیل حیات کے فائیل تک جا پہنچا۔ اتنے میں نہ جانے شہزادی کے ماموں کا لڑکا کہاں سے آہرا۔ یہ مردک

کہ بچہ نہایت دوزار تھا ایک بہت بڑی جائیداد کا تنہا وارث تھا۔ (اور صحت اس کے باپ کی گرتی جا رہی تھی) اس مردود کے مقابلے

میں یہ ناچیز قلعہ سے مغس تھا۔ مغس عاشق کہلاتے دیسے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ وہ

مغس سب بہادر کھوتی ہے

آدمی کا دوسرا کھوتی ہے

اس کمجنت کے آجانے سے ٹورنٹ کا رنگ ہی بدل گیا۔ نہایت سراپا دارانہ سوالات پوچھنے لگے۔ ادھر شہزادی

کی اہل نے برادر زادے کے نئے روردر برا حال کر لیا۔ آخر وہ سب کے سب رجعت پسند ثابت ہوئے اور فہرست اس مضمون

کے حق میں کیا گیا۔

ٹورنٹ کے نتیجے کی خبر دشتناک سننے ہی موم جامد صبر چاک ہوا۔ مانی باس پہنے اس حال میں تھا کہ نہ سر پہرجو تھا۔ نہ

پاؤں میں کجڑی۔ لیکن شہزادی کے والد نے اس حقیر کو خلافت قریح مبارک باد دی۔ اور کہا کہ لڑکی کو اس کی والدہ نے بچہ بگاڑ رکھا ہے شاید

تو نے حکم کو نہیں دیکھا جو دراصل — بے غم — ہے۔ لڑکی بھی چند سال کے بعد ویسی ہی محم و شیم بن جائے گی۔ اگرچہ بچے مثلاً یا مرغوب

نہیں لیکن واسے نادانی کیا بتاؤں کہ — ع۔ میں اسیر دام فریبی رہا ہوں — اسے نوجوان تو کھاتے میں نہیں رہا — اس کے بعد

سے بولے)۔

تم جی بیاہ کر دو توجہ لا  
 ہم دیکھوں گی فریادوں کو  
 اس بیان سے اس نیاز مند نے علی گڑھ ہوئی لیکن یہ نہیں ہو گیا کہ شہزادیاں، اس ملک کی بہتر زندگی پسند نہیں ہیں۔  
 ”یاد رہے کہ ایک بات پوچھیں؟“ حیدر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔  
 ”دو پوچھ۔“

”اب دو ہی پوچھوں گا۔ بتائیے کہ کبھی آپ کو کسی سے کچھ عینت ہوئی؟“  
 ”ہاں ہوئی تھی۔ پرنسز ادی فارغ التحصیل ہو کر فارغ التحصیل ہو چکی تھی۔ وہیں حیدر نے اس کی مدد کی کہ اس کو اس کے پاس جو  
 بہت سے دیاں اکڑ جایا کرتے۔ وہاں میر نے اسے کورٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے سرخ روشن ہوا ایک خال ہوا۔ یہ خال بھی تو شانی پر ہوتا  
 تھا۔ ریشہ ریشہ کیسٹھوڑی پر اوکسی روز کسی سے غائب ہوا۔ اس عینت سے یہ شہزادیاں پر لایا۔  
 مصحف نسخ پر تم سے خال لکھیا ہوا  
 یہ غلام حبشی حیدر سے لکھیا ہوا  
 اس پر اس نے فوراً مطلع کیا کہ خال وہ معذوری تھا۔ اور میر سے حسن زیارت کی خاطر بنایا جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ  
 کی عینت کی۔“

لال ہیں آپ ہی لب سُرخ پیاں دور رہے  
 ناز کی کہنتی ہے یہ بارگراں دور رہے  
 اس پرنسز ادی نے عجب تمسخر سے فرمایا کہ یہ بان دان کی سرخی نہیں کیسے فیکٹ کی بڑھیا لب شک ہے۔ اگرچہ اس فقیر کو علم تھا  
 کہ اس شک کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ شک نہیں کرتی۔ تاہم موضوع بدلنا پڑا۔ اور پاسٹری کا ذکر چھوڑا وہ بولی۔ میں جانتی ہوں  
 اب اس جملے سے میری خوشامد کرنا چاہتے ہیں۔  
 میں نے چوڑیوں کی طرف دیکھ کر کہا: ”کیا میں انہیں چھوڑ کر کہوں؟“  
 وہ بولی: ”آپ اسی بہانے سے میرا تھکھا مٹا چاہتے ہیں۔“  
 اس صاف گوئی پر یہ درویش باغ باغ ہو گیا۔ شاہ اللہ کیا ترقی پسند محبوب تھی۔ بے حد مسرت کا سامنا ہوا۔ سوچا کہ جب انجام  
 مغرور ہے تو فرار بزدلی میں شامل ہے۔“

بیاہ کا ایک دن معین ہے  
 تینوں رات بھر نہیں آتی

چنانچہ میں نے اسے شادی کے لئے کہہ دیا۔  
 بولی: ”آپ خراٹے تو نہیں لیتے؟“ میں نے نفی میں سر ہلادیا۔

اس پر وہ بولی: "تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جانیے اور میرے والدین کو مٹا لیجئے۔"

یہ جواب بھی ترقی پسند تھا اور اس فدوی کو پسند آیا۔ جس سیدھا اس کے والدین کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔ انہوں نے پہلے تو اس کمترین کا شجرہ نسب حضرت آدم تک دریافت کیا۔ چرچید متعلقین کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے معلوم ہوتا تھا کہ گناہ تمہمت لگا رہے ہیں۔ پھر لڑے۔ اگر تم دونوں ہی سے خدا بخواتم سستہ کسی کا انتقال ہو گیا تو ترقی کے لئے کیا انتظام ہوگا۔ کوئی ذاتی ملکیت نیچے کی پالیسی ہے؟ پھر ہم کو تھوڑے شروع کرو۔ جیسے نیلامی ہو رہی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ ملک ہے اور میری ادا کی ملک ثابت رہے گی۔ آخر آپ اسے بیٹے جو سے ہم کے لئے کون ٹھہریں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین ہے کہ یہ شادی کبھی کا۔ باب نہیں ہو سکتی۔ وہ بولے۔ اگر ہر شہر و ملک لکھا تو دنیا کے سامنے ہماری ناک کھٹ جائے گی۔ خیر یہ غیر مان گیا۔

وہ جانتے تھے کہ پرانی رسومات ساری ادا کی جائیں میں محدثوں کو برا کہہ دوں گا کہ ان کے غل جھانا ایام جمالت کی رسم ہے جب پمیشی کا یہی ایک طریقہ تھا کہ لوگوں کو بلا کر دکھا دیا جاتا تھا کہ واقعی شادی ہوئی ہے تاکہ وہ سب بعد میں گواہ رہیں۔ اب تو فوراً اخبار میں بھیج دیا جاتی ہے۔ اور پھر شہر و دل سے یہ اعتراضات گھبراتا ہے ہاتھ پاؤں میں رشتہ آتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں سچ بول رہا ہوں۔ لیکن وہ بدستور ٹھہر رہے۔

آخر یہ تجویز پیش کی کہ شادی دو حصوں میں ہو۔ پہلے آپ مجھے فارغ کر دیں پھر مہینوں بلکہ سال بھر تک رشتہ نشیناں ملا کر خوب ڈھول بجائیں اور دولت پر سارے ایشیا کو (معدائیشیا نے کو پاک کئے) مدعو کریں۔

وہ کہاں درجہ رحمت پسند نکلے کہ نہ مانے۔

اسی طرح دفت گذر گیا کسی نے مشورہ دیا کہ شہزادی کو منور تو دیکھو۔ دیکھا تو ملیہ بدل چکا تھا۔ جنہوں نے اکھیر نا بال ترشوانا۔ ناخن بانا ان خوبوں کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ جوتوں اور ایک آپ سے کسی روز تجویز میں معلوم ہوئی۔ ٹھہریں سادہ کپڑوں میں دیکھتا تو جھوٹی اور موٹی دکھائی دیتی۔ رنگ دروغنی دگر سے اس شکل دیکھتا محال تھا۔ جتنا خوش وقت و عاشقی کو بلائے گی کبھی رکھتا اور ان رحمت پسندوں کو ان کے حال پر بھڑکاتا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کچھ منزل پسند ایک ترقی پسند کو سر پرانا رکھوا لیا۔ رہے۔ تھے اور وہ خاموش کھڑا برداشت کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر ایک اچھا سا پتھر اٹھا کر کھینچ مارا۔ وہ بلبلاتا ادا بولا۔ "اسے مرد سخن فہم یہ سب تو بے کچھ میں نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ تو تو ترقی پسند سے کچھ بگڑ رہا ہے امید نہ تھی۔"

اس واقعے کے بعد انھیں سی پیدا ہو گئی۔ یکے کے ترقی پسند اور کہاں کی ترقی پسندی۔ لوگ جہاں تھے وہیں کے وہیں ہیں۔ کوئی کسی رخ بھی ترقی نہیں کر رہا۔ دیکھتے ہوئے اور ترقی پسند کے تعلقات ہمیشہ مشیدہ ہی رہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید مجھے شہزادوں کی دگر سے کچھ چڑھ سی ہو گئی تھی۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد یہ جو کہ تنقید نگاری کی بدولت مجھے گڑباں اچھلنے میں خامی جہاز ہو گئی۔ ادھر فلمی پرچوں کی مالک بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ فی فلمی نقادین گیا۔ اور فلمی ستاروں کے متعلق تازہ ترین افواہیں ہم پہنچانے لگا۔ کہ ڈانڈی بڑھنے والے میری نگین تھری مردوں کا بڑی میسروری سے انتظار کیا کرتے۔ فلم ساز اور اداکار مجھ سے ڈرنے لگے۔ کئی حسیناؤں سے اسی بہانے دوستی ہو گئی۔ ترقی پسند اور رحمت پسندوں کا مجھ پر رشک کرنے لگے۔"



پھر کیا ہوا۔؟

"بھڑاک ہوا، مہول ہوا۔" کلاں نے جھلکا کر کہا۔

"ابھی کتنا سفر باقی ہے؟"

"تو بڑا سبے مہر ہے، اچھا لے سفر میں ختم ہوا۔ یونہی طبیعت، بڑا ذہن دہی۔ اکی مرتبہ جب نصرت جوتب آیا تو۔"

ریشم جہاز باد خور و آن دمکا اوپر بولا۔

"صحیح جو کہ ہوا، اس کے لئے محالی کا خواستگار ہوں۔ سزا کے طور پر تیرا سفر دوبارہ سننے کے لئے تیار ہوں۔"

جہاز باطلان مکر کر بولا۔ "ہم صاف کر رہے ہیں۔ اور جو تھا سفر پہلی مرتبہ سن رہے ہیں۔"

## جہاز باد سندھی کا چوتھا سفر

۳۰ فصل: جہاز آتی ہو مونیو شہر اب  
بس سوچ کی نماز مخلصا آٹھا۔ یہ

اسے رفیق دیرینہ ایک رات کا ذکر ہے، میں نے کتنے کوارسے کے لئے ایک درزی کی کتاب اٹھائی، کتا دور جا چکا تھا، ٹہرنا  
دن تو رانی کرنے لگا۔ اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ علی الصبح جواٹھا تو اپنے آپ کو پروتاری پایا۔ سوچا کہ شاید شیتے ایزدی اسی میں ہے کہ پروتاری ہوں  
لہذا م پاؤں۔۔۔"

اسے ہم مدح طوطی گفتار لفظ پروتاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟

"یہ ایک انگریزی لفظ کا غم البدل ہے۔ اردو میں۔ ڈکشنری دیکھ بہت کچھ معلوم ہوگا۔ پروتاری بننا آسان کام نہیں، بڑی ہمت چاہئے  
دن رات بھاری بھاری کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے، لیکن میں جانا پڑتا ہے۔ کٹنگل، الگ، ہوتے ہیں، بہت جلد فروسی نے یہ کورس مکمل کر لیا زندگی  
کی کئی سہیلیاں آگئیں۔ اٹھنا بیٹھنا صرف پروتاریوں میں ہوتا۔ بڑی طبع میں محنتیں جواکتیں۔ پروتاری ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ جس مذہب میں  
او۔ دیگر اہم مسائل پر جدید ترین نظریوں کا اظہار کرنے کی پوری آزادی تھی ہماری انوکھی اور بصیرت افزا باتیں سن کر عوام چوٹک پڑتے، ہر مذہب  
کو ہم تسلیع، اختلاف سمجھتے، انسانی رویے کے عالمگیر قوانین ہمارے لئے اہل اور لغو تھے۔ ہر انسان، ہر اصول، ہر بیان کو ہم نہ صرف شہر کی نظر سے  
دیکھتے بلکہ انہوں میں وحشیانہ اور بدینہ محبت و نفاق وہ جی۔۔۔ ایک رعب تھا، کیا دیدہ تھا۔ سڑک پر پروتاری چلتا تو لوگ ادھر ادھر بیٹھ کر راستہ  
دیکھتے، ٹھٹھک جھٹک کر سلام کرتے۔ کیا خیال جو کوئی ہم سے بحث کر سکے، چند ہی نظروں کے بعد وہ یوں خاموش ہو جاتا جیسے سانپ سونگھ لیا ہو، بڑے  
سے بڑے جرم میں محض چند پروتاریوں کی آمد قیامت برپا کر لیتا تھی۔

"جہاں چلو، پھر پروتاری آگئے۔" کا نعرہ لگا کر وہ ایسے بھاگتے کہ چٹیاں اور چھتا تے چھوڑ جاتے۔

جب ہم نے مقامی پبلک کوالیٹر لگا رکھا تھا وہاں مقامی لوگ یہاں تھے کہ سیدتہ مذہب بات نہ کرتی تھیں۔ وہ ہم۔۔۔ بدگمان تھیں، ہم مذہب  
دوسری ایمان، غلط عقائد۔۔۔ کے پرچمے ضرور اڑاتے تھے لیکن یہ سب دکھا دے کے دیتے تھا، کبھی کبھی ہمارے دل ہی محبت کی آگ سے سلگنے لگتے  
مذہب پڑنے پر ہم خدا کا واسطہ دیا کرتے، مصیبت پڑتی تو وہ عاقل بن جاتے۔ یہ کئی جنس، سراسر کے متعلق ہمارا تجربہ اتنا ہی تھا جتنا غیر پروتاریوں کا لیکن

ہماری معلومات کا ماخذ فراڈر، ڈی ایچ لارنس اور غیر حضرات کی کتابیں تھیں۔ خیالات ان کے تھے بیان ہمارا تھا۔ اگرچہ ہم نے ان مصنفین کا حوالہ کبھی نہیں دیا۔ اور ان میں بتا جھول گیا کہ پروٹوٹاری ایک انقلاب بھی جانتے تھے۔۔۔

کیسا انقلاب؟

”کبھی ایک۔ عالمگیر انقلاب تو کبھی کلی یا غیر کلی انقلاب۔۔۔ بعض اوقات ہم مقامی انقوب پر ہی فضاغت کر جاتے ہیں انقلاب کہیں کسی قسم کا کسی ساز کا۔ چنانچہ ہم بار بار پبلک کو انقلاب کے لئے اکٹھے، ہم چاتے تھے کہ ہنگامے میں ہوں اور افرا تفری پھے، اونگے سادوں تاکہ لوگوں پر ہماری اہمیت واضح ہو جائے۔ لیکن مجھے غصہ تھا تو اس پر کہ ہر لوگوں جو ہم سے دنیا اپنی ہلک سمجھتیں کھب میں وہ دما جو کوئی مجاہد کہ خدا کی پناہ۔ ایک خاص طبقے سے خوب چلبلیں کرتیں۔۔۔ یہ حضرات بھی عجیب تھے، دیسے اچھے بھلے تھے لیکن اپنے آپ کو سید غمراہ اور بد نصیب سمجھتے اس کی وجہ اپنی بے جوڑ شادی بتاتے۔ حالانکہ ہر ایک انشاء اللہ چھ بچوں کا باپ تھا ان کی ایک بی بی رشتہ تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی نہایت غمناک ہے۔ اور وہ بیوی سے تقریباً تقریباً علیحدہ ہو چکے ہیں مانی بڑی دنیا میں کسی نے انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بہانے وہ ہر لڑکی سے غلط کرتے چونکہ ان کے پاس کاریں تھیں اس لئے یہ بورڈواتے۔“

”اس ناچیز کے چچا جان جو تھانیدار ہیں کار رکھتے ہیں۔ کیا وہ بھی بورڈواتے؟“ خود نے پوچھا۔

”ضرور ہونگے۔۔۔ تو یہ شادی شدہ بورڈواتے حضرات دن بھر کاروں میں لڑکیوں کو لئے پھرتے بھٹتے یہ ہے کہ ان میں سے کوئی نہاں برس سے کم نہ تھا پتہ نہیں انہیں اس میں کیا ملتا تھا؟“

”غالبا انہیں سنہ تیس اکتیس کے پرانے ماڈل پسند نہیں تھے۔ اور نئے سٹریم لانڈیر ماڈل حقیقت دیدہ زیب ہوتے ہیں۔“ خود نے مود باز عرض کیا۔

”مگر یہ نئے ماڈل ان کا خوب مذاق اڑاتے، ملتے ہی سوال ہوتا کہ آپ کی تختی کچی کا اب کیا حال ہے؟ آپ کے لڑکے کا بخار اترا؟ بیوی کو کوئی خط آیا؟ بڑی لڑکی کی کب شادی ہو رہی ہے؟ دیکھئے یہیں ضرور بلائیے، مگر یہ بورڈواتے کہ۔۔۔“

”ویسے یہ بورڈواتے ہوتا کیا ہے؟“

”بورڈواتے ہے۔۔۔ (کادں نے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جنبش سے بتانے کی کوشش کی) جو۔۔۔ جو۔۔۔ بالکل بورڈواتے ہوتا ہے کہ فرانس میں سوداگروں کا ایک طبقہ رہتا تھا اسے بورڈواتے کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن یہ کافی عرصے کا ذکر ہے۔“

”یا پیردرشد، یونگ ان پیرس کی نئی شیشی پر ایک افہ بورڈواتے لکھا ہوتا ہے۔“

”اللہ میتر جانتا ہے کہ اس کے کتے میں دخل دینا سخت نادانی ہے۔ تو میں نے لڑکیوں سے ان بورڈواتے حضرات کی خوب برائیاں کہیں اور انہیں بہت سمجھایا۔ یہ بھی کہا کہ یہ سب سرمایہ دار ہیں اور سماج کے دشمن ہیں۔ وہ ہنسے گلیں کہ کار کو چھوڑ کر ان کے پاس چھوٹی موٹری بھی نہیں ہے جنک میں ان کا حساب صفر ہے بلکہ قروض رہتے ہیں۔ میں نے بنا یا کہ سرمایہ دار ہونے کیلئے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے جو پڑھتا آتا ہے۔ وہ بولیں جب سرمایہ نہیں تو ذہنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں خود پروٹوٹاری سے آگیا تھا لیکن یہ لگے کہ وہ معلوم کچھ عرصہ بھانا پڑا۔ آخر ایک دن میں نے آؤ دیکھا۔ تاؤ ایک ذلیل سی پرانی موٹر کہیں سے خریدی اور بورڈواتے بن گیا۔ دہسنے بائیں ہر لڑکی سے غلط کرنا شروع کیا۔ اور ہر جانی کے نام سے شہرت پائی۔“

”آپ تو آپ سر جاتی ہی رہ چکے ہیں۔ ملائے ہاتھ یہ ناشدنی ہی ہو رہی ہے۔ سب سے بڑی ٹریڈی یہ ہے کہ زندگی بھر مختصر  
 ہے۔ اور میں نے اس سے زیادہ میں۔“

”لیکن وہ تین لوگ تو بیچ بچہ انگلیں اور ارادہ اس خاکسار کا شادی کرے گا تھا۔“  
 ”ان سب سے؟“ خود چونک پڑا۔

”نہیں، ایک سے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ کوئی سبب میں وہ صرف لانے کے نقص معلوم کیا جا سکتی ہیں  
 میں دراصل یہ چل جائے کہ ہونے والی ساس کس مزاج کی ہے۔ لیکن میں بہت زیادہ لوگ تو نہیں۔ ان کے لئے خواہ کا گریڈ کیا ہے اور یہ گریڈ اسے ملے گا بھی  
 نہیں۔ یہ بتنے کے کیا امکانات ہیں۔ لیکن مزاج تو نہیں کہ فردا دوسرے مرد سے بات کی اور بھلا ہوگی۔“

”پتہ نہیں۔ البتہ شادی کے متعلق سفیدگی سے صرف ایک طبقہ سوچتا ہے۔ خود دلوں کا طبقہ۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حقیقی مسرت سے  
 اس سب تک آشنا نہیں ہوتا جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی۔ لیکن تب بہت دور ہو چکی ہوتی ہے۔“

یاد تو بات مسرت کا ٹچ چپ چاپ تھا۔ ہر لوگ ان عید (MATERIALISTIC) تھے، جوں جوں وقت گذرنا گیا۔ میں سرخرو سے  
 دراز تھا۔ جہاں تک شادی سے ڈرنے لگا۔ ان لوگوں سے بھی خوف لھتا تو جو سہنے بنتے بال بال بچ گئے۔ ہر رات سونے سے پہلے اس قسم کی دعا مانگا۔  
 کہ۔۔۔ اسے یہ درد گار میرے حال پر رحم فرما۔ شیدہ کی کہیں شادی کر دے۔ زکس بن غفور کی کہیں شادی ہو جائے۔ میں ریشا مہرا میں اور دودھنی غفور  
 میں۔ میں اس نظام کو دے۔“

”لیکن اس کا ہوش دہونے سے کیا تعلق ہے؟“ لاش کو موضوع بدل جائے۔ خود جوانی دیر میں دلکھری دیکھ چکا تھا بولا۔  
 ”بہت اچھا۔ اب اس سفر میں ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔ تجھے یاد ہو گا کہ اٹھ لینے کے سنبھاری ملاقات سمجھتا ہوں۔ یہ سہ ہوتی تھی جس کے  
 نتیجے میں بڑی مصیبتوں کے بعد نکلا تھا۔ میرا بھی ایک ایسے ہی شخص سے واسطہ پڑا۔ سفر سے واپس دقت میں ایک بندرگاہ پر اتارنا تھا۔ بندر  
 ہی بندر۔ تھے وہاں ایک انشورنس ایجنٹ میرے پیچھے لگ گیا۔ ایسا حاقب کسی نے کسی کا نہ کیا ہو گا۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ فقط تین چار گھنٹے مجھے  
 چھوڑنا اور نہ ساتھ رہنا، اس سے دور رہنے کے لئے کیا کیا جتن میں نے نہ رکھے بہت ساجست کی، ڈیرا یا دمکا یا، آخر تنگ آکر خودکشی کی دھلی دی تھی  
 پودہ بولا کہ میں بھی ساتھ خودکشی کر لگا اور پالیسی دینے کے لئے اگلے جہان تک بھجوانا چھوڑ دینا جب میں نے سب کچھ بھینٹ دیا تو بولا اسے مرنیک  
 نصلت با اگر تو واقعی خودکشی کر رہا ہے تو پالیسی مفت ملے لے سین وارث مجھے بنا جا بھے اتنا فخر آیا کہ خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور سید حال باڑی بازار  
 اس الٹ میلہ کا فائدہ نہ سوا کر کے گیا۔ تاکہ کوئی نہ کسب نکالوں۔ سنبھالنے اس سر دنیا کا رونا گوروں کی شراب پلا کر مدہوش کیا تھا۔ لہذا میں نے  
 اسے باؤہ افزگی پلا یا۔ لیکن اثر اٹھا ہوا۔ پی کر وہ اپنے نہیں موش میں نہ رہا۔ کچھ دیر وہاں آیا ہی بک رہا پھر اس تھوڑے دو کوپ کیا۔ سید تیراں ہوا کہ خود اپنے  
 ہاتھوں اسیر دام بلا ہوا۔ خود گرفتار ہو کر رہ گیا۔“

”جب اگلے روز وہ مجھے سڑک پر ملا تو شرمناک صورت دوسری طرف پھرنی۔ اس کے بعد جب کہیں ملا جمل ہو کر رہا جاتا میرا اس طرح میری نجات ہوتی  
 ہے۔ ایلے سے عقیدہ اٹھ گیا۔“

گستاخی محاف۔ خود بولا۔ ”شروع سے اب تک جو واقعات آپ نے سنائے ہیں بالکل الٹ ہیں، غالباً آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں  
 ہے۔ پتہ نہیں آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا یہ سفر بھی نہایت بے ٹکرا رہا۔“

”نکو تو نے مجھے بارہا ٹوکا بھی تو ہے۔ شاید ایک دن میں دوسفر میں کر تو آتا گیا ہے۔ اب آئندہ تجھے ایک لفظ نہ سناؤں گا۔ جب تک نہ بونٹ سی لینے کا وعدہ نہ کرے۔“  
 ”کس کے بونٹ؟ آپ کے؟“  
 ”نہیں اپنے۔“

اور وہ دونوں خداں ہوئے، فرماں ہو کر شک و شبہات دور ہوئے، دل صاف ہوئے اور جہاز بادگاہ کا چوٹا سفر تمام ہوا۔  
 اگلے روز جب شہباز نجوم نے آفتاب پر چل چھینک کر شکار کیا سپاہ انوار کو شکست ہوئی غلیمت کی عمرانی ہوئی تب جہاز بادخود حاضر ہو کر بولا۔ ”یا استاد لگاں اپنا پانچواں سفر بیان کر کہ میں دور و نزدیک تیرے ہاں قیام کر دوں گا۔ اپنی گھڑی بھی کسی کو دے آیا ہوں۔ اور دو یوٹیلیں بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب مجھے سماعت کے لئے تیار سمجھ۔“  
 جہاز باد لگاں نے یوں کلام کیا۔

## جہاز باد سندھی کا پانچواں سفر

”دل دکھایا کسی گھمیں نے کوئی گل توڑا  
 بارغ سے نالہ بلبیل کی صدا آتی ہے“

اس پر خورد پھر بول اٹھا۔ ”بھائی ایک صلاح ہم دیں گے، وہ یہ کہ آئندہ آپ ایسے ادب پٹانگ اور بے عمل شعر کم از کم اپنے محل میں میں نہ پڑھا کریں۔ اب تک جو اشعار حضور نے پڑھے۔ ان کا نقشہ سے کوئی سرکار نہ تھا۔“  
 اسے فوجان مبتدئینت! اعراض کرنا تیری سرشت میں ہے۔ یہ اشعار میں نے روایات قدیم کو مد نظر رکھتے ہوئے پڑھے۔ پلانے زمان میں دستور تھا کہ داستان کوئی اشعار کے بغیر مکمل تھی اسے محض مدد اداری سمجھ۔۔۔ رواداری بشرط استواری اصل ایساں ہے۔“  
 ”رواداری نہیں۔۔۔ دفاواری بشرط استواری۔“ خود نے فقرہ دیا۔  
 ”اچھا بابا دفاواری ہسی۔ لیکن واسطہ ہے تجھے اپنے پیر کا۔ اگر تیرا ہر ہے تو۔۔۔ تو خاموش رہ۔۔۔ آج کا گھر بالکل مختصر ہے۔ اور غالباً آخری سفر ہوگا۔ لہذا آج کی رات سائز درونہ چھیڑ۔“

سن میں زیادہ دیر بورشوا نہ رہ سکا۔ لوگ اس لفظ کے نہ سمجھ کر کہتے نہ سننے لفظ کسی کو آتا تھا۔ بار بار معنی پوچھتے۔ اور حرمیری کا بھی بک چکی تھی سوچا کہ وہی ارتقا کی منزلیں طے کرنے کی غرض سے یہ سفر شروع کئے تھے ورنہ کافی دوس بڑا نہ تھا۔ چنانچہ پھر باہر نکلنے کی ٹھانی۔ موسم گرما گزرنے کے لئے سانچا بل کا رخ کیا۔ کہ اسی بہانے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقات ہو جائیگی۔ وہاں نہ جانے کیا ہوا کہ خیالات اس ناچیز کے دفعہ بدل گئے۔ غالباً یہ ادنیٰ بچے کی صحبت کا اثر تھا کہ خاکسار منزلیں مارتا کہیں کا کہیں جا نکلا۔ آخر اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں تو مجھے آج دیکھ رہا ہے۔ اب میں بالکل بے نیاز ہوں، کسی کی پرواہ نہیں کرتا، مطلب ہو تو خیر و نہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔ کسی کو خط نہیں لکھتا۔ لوگوں سے تب ہی مٹا ہوں اگر کوئی کام ہو۔ بلا غرض کسی کو مدد نہیں کرتا۔ نہ زیادہ سوچتا ہوں۔ محنت کرتا ہوں۔۔۔ بھلا دنیا کے جھیلے آج تک کسی سے ختم ہوتے ہیں۔ جو میں اور تو انہیں ختم کر سکیں گے۔ ہر قسم کی تقریر و تحریر سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔ پڑھنا، لکھنا، اٹھنا، چلنا یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ شہزادیوں کی صورت پر بہ دفائی سے شادی



”تو کیا ہوا؟ خیال ہے کہ چند شرعاً و ذی مرتبہ کو خوش کرنے کے لئے ایک منہ پائے کا معیاری رسالہ جاری کر دوں۔ ویسے نام بدتر سے لوگ کر گئے۔ لیکن نام ہر رسالہ کا۔ گنا ارادہ سے۔۔۔“  
خاکسار: ”ما دہ ہے۔“

”اب جو کہنے سے سب کچھ سن دیا ہے بنا کہ کسی تو بھی ایسی کٹھن منزلوں سے گذرنا ہر کبھی ایسی مصیبتیں تو یہ بھی پڑیں۔۔۔؟“  
خود سے کلاں کا ہاتھ چوما اور آنکھوں میں آنسو لاکر بولا۔ ”آپ واقعی بڑے بڑے معائب سے دوچار ہوئے۔ صبر و استقامت ہوئے۔ اب آپ تنہا اٹھائیں، دل کھول کر کھائیں اور نکھلیں۔ خدا کرے تمام عمر شاد رہو، فائز ہر دم و باہر اور ہر جہ۔“  
اس پر جہانزاد سنہ علی کلاں نے خود کے سر پر دستِ شفقت پیرا۔ اس کا رتبہ اور علی بڑھایا۔ جب تک زندہ رہے۔ وہ جہان اور دو قالب ہو کر رہے۔

خالی زمین و زمان، آفرینندہ سر و جہاں، کار ساز مطلق، قادر و بخت کامر جہاں میں شکر ادا کرنا چاہیے کہ بندوں کو کبھی نہ ہی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ کاتھیمے وقت میں اسی کا فضل آڑے آتا ہے۔  
نتیجہ۔۔۔ پس اسے پیار سے پکارتے تھے اس کو کافی سے یہ خط کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کہانی سے نتیجہ نکلے۔

# شہر اور گاؤں

## فنک پیمیا

شہر کا رہنے والا ہوں۔ اکثر شہری اینٹوں پتھروں کو خوش ناما تو کیب دیکھ کر خوش بھی ہوتے ہیں۔ غریبی کرتے ہیں، مگر بعض پتھریں نہ بچتے ہیں نہ بچتے ہیں۔ چونے گارے سے دماغ محفوظ نہیں۔

شہر وہ ہوتا ہے، جہاں یوان خانے، ڈان خانے، کارخانے، چیل خانے، قہر خانے۔ قہر خانے ہوں۔ نیز چھوٹے قہر خانے اور دیہات مثلاً وگائیں اور ان میں روپیہ کمانے والے سیٹھ، مدرائیں اور عدالتوں میں جج ہوا کر، سفید کو سیاہ دکھنا کر مال دار بن جاتے۔ اسے معززین اور ان کے ایجنٹ۔ بنگ اور ٹکوں سے روپیہ کو ہجرت کرانے والے مہیا۔

گاؤں وہ ہوتا ہے جہاں کسان مٹی کرید کر پیمیا لگاتی کرتا ہے کہ کہیں بیج اور پانی مل کر پھل کا زعفران کھیت تو کہیں شرف

کا سوا۔

شہروں میں دولت کی آبیاری سے گلہائے بدنامی کھلتے ہیں۔ گاؤں میں عزت کے کندھے پر راج کی پوری کیا یہ جانا ہے کہ کھیت انسان نے بنائے اور بنگ شیطان نے اور آخر کار انسان کے کھیت شیطان کے منبر کے ماتھ گردی ہو گئے۔ یہ مبالغہ ہو یا غلط فہمی مگر گاؤں میں عام طور پر محنت کا اجر عزت ہے اور عزت کا نتیجہ یہ کہ گاؤں والے کھانیں بھیجیں اور شہر والے چکیں پر اسٹھے۔

جسے کسان سے محبت ہو۔ مگر جدیقتی سے مٹی نہ کرید سکتا ہو وہ مٹی کو کتاب کے کھنڈوں کی مٹی میں سوتا تلاش کرے۔ مٹی کے لفظوں کے نہایت لگے نیلا آسمان ہے۔ اس آسمان کے اوپر نیچے، اندر باہر اور چاروں طرف برساتن والا ہے۔ دیا اگر نہیں ہے تو جسے ہماری آرزوں کو چمکا کر سنے۔ کیسے ہونا چاہیے۔ اسے شہریوں گت خیروں سے ایک شہری یوں یاد کرنا چاہئے۔

”اے مفت افلاک والے پناہ بندی دہتی! میں دھواں ہوں۔ لوگوں

کی آنکھوں کو مجھ سے تکلیف ہے۔ مجھے آگ کر دے۔“

یہ شہروں کے رہنے والوں نے اپنے شہر کو بندری سے دیکھا ہے؟ صبح و شام ہر شہر پر دھواں کا گھٹا ٹپ ہوتا ہے۔

غنائی شعائیں اس برف کو آسنے سے اکثر قاصر رہتی ہیں اور یہ زیب تن کی عجیب رنگ لاتی ہے یعنی دھواں میں گارا۔ دھواں میں کہ دردت اخیالی کوئی شہری ہوتا ہے جو محض کڑوا دھواں یا غلط کچھڑ نہ ہو۔

گاؤں والے فرشتے نہیں۔ انکے دریاہاں بے خبر ہیں اور اس بے خبری کی بدولت بہت سے مصحت خوانوں سے پر تو ہیں۔ کوئی بڑا شہر نہیں جہاں شاخ اور کھنڈ نہ ہوں۔ کیا لاہور، کیا دہلی کیا آگرہ۔ وہ شہر کیا جس میں کھنڈ نہ ہوں؟ کھنڈ روں کو دیکھ کر شہروں کے رہنے والے یاد دہشکاں کے کھنڈ روں میں قائم کرتے ہیں۔ پدم سلطان بود کے ترانے، میٹھی میٹھی آجری کے جھونکے، لوبیاں ہیں جہاں لوگوں کو خیال نہ ہو کہ شہر میں سلامتی ہیں۔ گاؤں اس نعمت سے محروم ہیں۔ سینکڑوں گاؤں کا کوڑا کوڑا چھان ڈالا آٹے ذوں کی بے مدق سی دکانیں تو دکھائی دیں گے۔

## استخوانِ ماضی

کے تاجروں کی دکان آٹکھ سے اوجھل رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گاؤں والے کا حافظہ کمزور ہے۔ شہر کی ایک باعزت ذہر دستہ ماہر و مہتمم والی شاندار دکان میں پر سودا بچکے دیکھا۔ گاہک نے داخل ہوتے ہی آہ بھری ادا چلا کر کہا۔

”مختصر آج کا نہیں سادی جو کا پیا سا ہوں۔ جواب ملا۔ یہاں روحانی سیل جلدی ہے۔ سدی وری کی کماٹی نہ گنواؤ۔ پریس سے تیار دوا دیکھ رہے تو کیا تو رہے؟ جہاں اتنا صبر کیا ہے کچھ دن اور صبر کرو۔ مرتبہ دقت نہیں ایک نہایت غریبہ نہتہ ایشا رکھائی دے گا۔ گاہک خوش خوش اپنا تمام سرمایہ پیش کر کے رخصت ہوا۔

گاہک گاؤں تھا۔ فرد شدہ شہر تھا۔



# ایک انسان کی موت

شہر کے سب سے بڑے اور بارونق کچی پر ایک انسان کی لاش پڑی ہے۔ وہ بھی ابھی دس منٹ پہلے مر رہا ہے۔ اس نے مالی پر ہرقی کو پھیل کے فٹ ہاتھ پر مڑا۔ اگر وہ پیل کے سین درمیان مڑتا تو بڑی ایک رگ جاتا اور آئے جانے والوں کو تکلیف ہوتی۔ مرنے والے مردہ ہونے والوں سے زیادہ زہر وار انسان ہوتے ہیں۔

”ارے بابے یہ تو شہسود فقیر ہے۔ شہسود فقیر کے ایک کامرند و فقیر نے اکر اعلان کیا۔۔۔ شہسود فقیر نے یہی کہہ کر کے فاصلہ پر بیٹھ کر ایک مانگا کرتا ہے، اس لیے پڑی ہونے کے ساتھ سے اس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ شہسود کے دو لوگوں کو تھکے کر کے درجہ پڑی کا کام کیا ہے۔ چنانچہ وہ ننگا تا بڑا آیا، اس پر جھکا اور چور سی ناخوشانہ نگاہ سمجھو، زوال۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ میں نہ کہتا تھا بھلو ضرور مر جاؤ گے اور تنہا ہی اس جگہ پر مجھے ہی بیٹھ کر ایک مانگہ بڑے گی“

شعبہ وقت کا دعویٰ تھا کہ وہ عین اس اور موقع پر میٹھا کرتا تھا۔ جہاں سے پل کے پہلو سے اُس نے پُر حوصلہ الٹی میٹیا  
نزدق ہوتی ہیں اور اس کے کامرڈ نڈ و فیتھ نے اس اور نیکو کو حاصل کی اُس نے جیسے نہ جانتا اٹھوڑ مار ڈالی تھی۔ جب جا کر شعبہ ملا ہے۔  
نڈو نے اپنے کان پر سے ادھیل بیڑی اتاری ہے اور شعبہ کی لاش کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مچس نکال ہے اور پوری سلاک  
مچس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا ہے۔ میرا اور شعبہ اس سال کا سا تھا۔ ہم باکل بکری دو تئوں کی طرح جب تک مانگا کرتے تھے۔ آہ !  
بھلوان نے اُسے مجھ سے پہچنے والا ہے۔

ایک مختصر سائنس تھری محاذی وہ رونے لگا ہے۔ اور دوتے دوتے قریب سے لڑتی ہوئی ایک آپ ٹو ڈیٹ اور شمال  
حیدر کے سامنے ماتھ پھیلا کر کہنے لگا ہے۔ "بلدی جھوان کے نام پر ایک۔ بیس۔ بھوان تھیں ایہ بنائے رکھے۔"  
شعبہ کا منہ کھلا ہوا ہے۔ کھلے ہوئے منہ میں بیٹک مانگنے کا انداز نہیں ہے۔ لیور کو مرست کچھ اس کے لیے بیٹک مانگنا غیر ضروری  
ہے۔ اُس کے ماتحت سختی سے بچنے ہوئے ہیں۔ اُس کا چہرہ خشک، درد اور پھیلا پھیلا سا ہو گیا ہے۔ کلائی کی ٹریاں اور نیل نیل رگیں پوری  
آب و تاب سے اُبھر آئی ہیں۔ غرض کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر لاش کو خوبصورت کہا جاسکے۔ لباس وہ بدہ اور میل پڑا ہوا ہے  
دو تین جگہوں پر جوہر بند لگے ہوئے ہیں وہ اصلی لباس سے زیادہ صاف اور چمکے ہیں۔ جنہیں دلجو کہہ مرست ہوتی ہے کہ شعبہ کا پوند لگانے کا  
ٹیسٹ کافی عمدہ اور ترقی یافتہ تھا۔

شہسو کی لاش سے ڈیڑھ گز کے فاصلے پر پڑنے لگوں کا سوداگر بونا رام بیٹھا ہے۔ وہ پالش سے چمکائے ہوئے پرانے  
 بوتلوں کو فروخت پانچو پر نہایت نفاست اور تعظیم کے ساتھ سجاوٹ بیٹھا ہے اور اپنے ایک گاک کے ساتھ سودا چمکانے میں مصروف ہے۔  
 وہ شہسو فیر کی گزاری سے ہماری سوج آگاہ نہیں ہے۔ کیونکہ شہسو نے کسی اس سے پرانا بوت نہیں خریدا تھا۔ اسی لیے اسے یہ بھی معلوم نہیں دارا  
 شہسو فیر مر گیا ہے۔ وہ اپنے خواب سے کہہ رہا ہے کہ جناب! میں نے یہ بوت امریکہ کے ایک خاص فوجی آفیسر سے حاصل کیا ہے  
 آپ بھی اسے اپنی فوجی آفیسر معلوم ہوں گے۔

شہسو مر چکا ہے۔ اور ڈیڑھ گز کے فاصلے پر جو شخص ابھی مرا نہیں ہے، فوجی آفیسر بننے میں مصروف ہے۔ اس سے  
 ہرے ایک جوتشی ہانے پھینک رہا ہے۔ اور غیب کے خزانے کو حوصلہ دینے میں جتا ہوا ہے۔ ایک ہندی سی بھاری بھر کم ایجنٹ عمر کی عورت اپنے  
 محلے داخٹ کھول کر بیٹھ رہی ہے اور مردوں کے ہاتھ سادھے کاٹیل تیغ دہی ہے۔ اتھارہ سال کی ایک شہسو ڈنگ گزاری لڑکی اپنے ایک  
 کھوارے عاشق کے ساتھ آس کریم کھا رہی ہے اور کھوارے عاشق کہہ رہا ہے کہ پر آس کو ہم تمہارے برتنوں کی طرح شیریں اور لذیذ ہے ایک دایضو جی  
 چھوڑا اپنے کیوں کی گل شہسو کو کڑی اچھا ہے اس جہن گزاری کی منت خوشامد رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرے کیلے آس کریم سے زیادہ میٹھے  
 اور لذیذ ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ ساری ٹوکری صرف دوائے میں دیتے کو تیار ہے۔ سارا فٹ پاتھ ذرا دھتے میں مصروف ہے۔  
 شہسو کے بارے میں ہر ایک کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مر گیا ہے ایسی اطلاع کافی ہے اس سے زیادہ اصلاح کے لیے ان کے دہن میں جگر  
 نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے ذہن کی اینٹ بنگر پڑنے لگوں، آس کریم، غیب کے خزانوں، سادھے کے تیل اور گے مرے کیوں سے گھڑی مٹی ہے  
 "اسے کیا ہو گیا ہے؟" دانش کے قریب ڈرتے ہوئے ایک معزز ستہ آدمی نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے مر گیا ہے۔" دوسرے معزز آدمی نے نہایت ایلانامی سے جواب دیا ہے۔

"مر کیوں کہا ہے؟"

"سالا لکھیا اور زیادہ بیڑیاں مینا ہو گا۔ اس لیے اسے وہ مر گیا ہو گا۔"

"آپ بھلا دیتے ہیں۔ جیسے بھی دیکھائی دیتا ہے۔ پہلے معزز آدمی نے نہایت مہذبانہ لہجہ میں تاکید کی ہے۔ اور پھر پھر  
 ہلکا چھلکا ہو کر بھلا گیا ہے۔ جیسے اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اڑ گئی ہو۔ اگر اسے یہ نہ بتایا جاتا کہ شہسو دوسرے معزز ہے تو اسے سخت جہان کی کوبہ ہوتا  
 چنانچہ اپنے جہان کی اس کا علاج کر کے وہ طعن ہو کر بھلا گیا ہے۔

"میرے خیال میں کسی سپاہی کو بھلانا چاہیے۔ ایک اور آدمی نے رائے دی ہے۔ ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی رائے دینا پڑتی ہے  
 "میرا خیال ہے، سپاہی کو نہیں بھلا چاہیے۔ دوسرے آدمی نے پہلے آدمی کی رائے کو جڑ سے کاٹ دیا ہے۔

پہلا آدمی: "اے مر گیا ہے اور غصہ میں آکر حبیب سے چھوڑنے نکال کر چبانے لگا ہے۔ اس کی رائے کی رتی جھرتہ نہیں کی گئی  
 ہے۔ لہذا وہ شہسو کی لاش سے سخت ناراض ہو کر بھلا گیا ہے۔ اگر پولیس کے سپاہی کو بھلا کر لاش اس کے حوالے کر دی جاتی تو آخر کسی کا کیا بکر جاتا۔  
 لوگ بھانے پولیس سے اتنا کیوں بدکتے ہیں کہ اپنے مرنے والے بھی اس کے حوالے کرنے سے گھبراتے ہیں۔

مرگ کا ٹریفک نہایت زور شور سے جاری ہے۔ بس، لالیاں، لادیں، موڑنا ٹیکس، ٹرک، سائیکس — سبھی ٹیکس نہایت  
 تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہر ٹیکس کی رفتار کی سوئی اپنے توازن میں ہے اور اپنے معزز نشان پر ڈٹتی ہوئی ہے۔ کسی کا ہڑنڈ ختم نہیں ہو رہا

نہیں۔ یہ کہ اگر میں انفس پر انہیں چڑاؤں۔ جس کی وجہ سے کہیں کہیں جانتے اور شیعہ کی لاش پر آگے۔۔۔ انفرادی میں شاید شیعہ کی موت سے کسی کو  
دشمن نہیں ہے۔ کیونکہ شیعہ انسان تھا اور انسان اور شیعیں میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ انسان عداوت کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ دشمن پر ہونے کا مجموعہ  
ہوتی ہے۔

[illegible]

”اُس کے آؤپ کوئی کلمہ دینا چاہیئے۔ لاش کا کھلا دہنا وعمر نہیں ہے۔۔۔ ایک کھد پوش نے ان نیت کی جہنموں سے پکارا کہ ”اُس کے آؤپ کوئی کلمہ دینا چاہیئے۔ لاش کا کھلا دہنا وعمر نہیں ہے۔۔۔ ایک کھد پوش نے ان نیت کی جہنموں سے پکارا کہ ”اُس کے آؤپ کوئی کلمہ دینا چاہیئے۔ لاش کا کھلا دہنا وعمر نہیں ہے۔۔۔ ایک کھد پوش نے ان نیت کی جہنموں سے پکارا کہ

”اُس کے آپر کوئی کپڑا تو دل دینا چاہیے۔ لاش کا کھلا ہونا عرصہ نہیں ہے۔۔۔ ایک محدود پوشی ہے، ان نیت کی جہنموں سے بچا کر“

انسان کو کھانا ذرہ سے بلند کرنے کا اعلان کیا ہے۔  
معاملہ دھرم کا ہے۔ اسی لیے کوئی آدمی بھی سچی بات منہ نہ کہنے کی ہمت نہیں رہا۔ بلکہ ایک شخص نے تو اسے بڑھ کر ایک میلہ  
پکینڈ کھیس ٹمبھور پر بھی ڈال دیا ہے۔ یہ کھیس خود ٹمبھو کا ہے اور اس کی شقری کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اس کھیس نے انڈیا جبراس کا ساتھی ثابت  
اور اب موت کے وقت بھی وہ دیا ہے۔۔۔ میں نے کچلے کھیس سے سیل پکینی لاش روحا نب دی گئی ہے۔ رنگ سے رنگ بھی کر گیا ہے۔

انسان کو جانور سے بلند کرنے کا اعلان کیا ہے۔  
معاشرہ و عزم کا ہے، اس لیے کوئی آدمی بھی سچی بات منہ نہ کہنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ بلکہ ایک شخص نے تو آگے بڑھ کر ایک میلہ  
چلایا کہ جس شخص پر بھی زوال دیا ہے۔۔۔ پس خود غائب ہو جائے گا، اور اس کی شہرت کے اوپر پڑا خون تھا۔ اس کھیس نے انڈیا جو اس کا ساتھی ثابت  
اور اب موت کے وقت بھی دے دیا ہے۔۔۔ میں نے تجھے کھیس سے پہلے اپنی لاش روحانی ہی گئی ہے۔ رنگ سے رنگ بھی کر گیا ہے۔  
”اس کے منہ پر کھیس مٹ رہا! کسی نے سختی سے پردوش کیا ہے۔“

اس کے منہ پر کھیس مت ڈالو! کسی نے سختی سے پر دھت کیا ہے۔

نہیں ہیں، اوال رو کسی نے ناک پر دھال رکھتے ہوئے کہا ہے۔

نہیں نہیں، مت ڈالو! پرتیکہ چلے گا کہ کھیں گے نیچے مر رہا ہے۔" اُس آدمی نے خرقہ کی گھنٹی بجائی۔

میرپتہ لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

”ضرورت ہے“

”نہیں ہے“

”نے“

”نہیں ہے۔“





اجھا تیرا دلش ہے :

”جی ہاں نندو فیر نے حوش مارا نہ لہجہ میں کہا ہے : بھیک مانگا کرنا تھا، کئی دنوں سے یہاں تھا، آج مر گیا ہے بھارا :  
کوئی بچ نہیں اہلاری جماعت اس کے گویا کو کم کا بند دہشت کر دے گی۔ آہ ! ملک میں بھکاریوں کی کیا حالت ہو رہی ہے  
نندو فیر کو بھکاریوں کے فلسفہ پر بحث میں حصہ لینے لاکوئی شور نہیں ہے اس لیے وہ مضطرب ہے اور کہہ رہا ہے : اسے  
آپ کیسے بھوکا رہے جائیں گے ؟“

مزدوروں کے ذریعے دسے سے باز رکھ کر :

وہ شخص مرنے والا تھا شاید بکھر رہا تھا ہے اس نے دو مزدوروں کو اشارہ سے بولیا ہے۔ اور انہیں حکم دیا ہے کہ لکھس  
کو دسے سے باز رکھ کر ہمارے دفتر تک سے چلو :

نندو فیر نے دستہ بندھوانے میں نہایت بھرتی سے امداد دینا شروع کر دی ہے۔ راہ گیر ایک لاش کو دستہ بندھتا دیکھ کر پھر اٹھتے ہو  
گئے ہیں۔ راتہ اندھنا ایک تماث کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر تماشہ ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کشش ثقل کا اصول ہے۔  
”یہ بہت سہل و سہی ہے۔ انسانی لاش کو دستہ نہیں باز رکھنا چاہیے : ایک راہ گیر نے حضرات سے کہا ہے۔

”تو پھر آپ اپنے گھر سے ایک چارپائی لا کر دے دیجئے :

میں ہوٹل میں رہتا ہوں، میری اپنی چارپائی کوئی نہیں ہے :

ہوٹل والا لطیفہ خوبصورت ہے۔ سب کو مراد سے لیا ہے اور سبھی بے ساختہ ہنس پڑے۔

مجھ دیکھ کر ایک کانسٹیبل فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے ڈنڈا اٹھا کر دُور سے ہی مکارا ہے : ایک طرف ہٹ جاؤ :

کیوں اکتھے ہو رہے ہو اکیا بات ہے ؟“

”یہ شہر فقیر ہے جو مر گیا ہے : خادم قوم نے جیسے کو تباہ کر دیا ہے

”کیوں مر گیا ہے، کیسے مر گیا ہے ؟ کس نے مارا ہے :“ کانسٹیبل نے آئینی سوالات کی بجائے کو دی ہے اور لاش کے سرانے  
اٹنشن ہو کر کھڑا ہو گیا ہے۔ مزدوروں نے دستہ باز رکھ دیا ہے۔ انہیں قانونی آرڈر کا اختیار ہے۔

”یہ لاوارث لاش ہے، اور ہماری جماعت اسے نشان لے رہی ہے : خادم قوم نے فخر کے ساتھ اعلان کیا ہے۔

”کون ہے ہماری جماعت ؟ ہوں ! میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کی برعافیاں۔ تم اسے مار کر اب لاش چھپانا چاہتے ہو ؟“

ڈنڈے کی آمادہ پھر ابھری ہے۔ جس سے سبھی لوگ بہم گئے ہیں۔ کئی کئی کڑا کر نکل گئے ہیں۔ خادم قوم جوش و خروش سے اُبل  
رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

”اس فقیر کے قاتل تم ہو، ہمارا سماج ہے، ہمارا نظام ہے، ہماری سرکار ہے۔ انسان ٹکڑوں پر یوں بھوکے پیاسے مر رہے ہیں

اور تم تھکڑی ہاتھ میں لیے مزدوروں کو گرفتار کرنے کے لیے پھر رہے ہو۔ شیم، شیم ؟“

سبھی لوگ اس تقریر سے متاثر ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ شیم، شیم ؟“

”اپنا بکھر جیب میں رکھ : کانسٹیبل اپنے وقار کو مٹی میں ملنے سے نہیں دیکھ سکتا : میں تمیں گرفتار کرتا ہوں، کیونکہ تم قانونی کا دھڑائی

نہایت ڈرائی رہے ہو؟

سبھی لوگ کاشیبل کی نقل بات سے متاثر نہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ تیم اشیم!

تند و فقیر کی حالت دگرگوں ہے۔۔۔۔۔ اسے قانون کے بار ایک نکتوں کی سمجھ ہیں ہند۔ اس سے وہ فرق۔ دیکھنے کے ایک طے سک  
روانی پرانی جگہ پر جا بیٹھا ہے۔

تم مجھے گرفتار نہیں رہ سکتے۔ میں خادم قوم ہوں، خادم قوم کا ہر وہ فخر سے سرفراز ہے  
”جو چلے، لکھو اس بند کو اور بھلے ہوئے“

”یہ لادادش دشن ہے۔ اس لیے قوم کی بات ہے۔ اسے میں نے بھانپ لیا؟“  
”تم اس لاش کو دقت تک نہیں لے سکتے۔“

”میں اسے لے جانے بیڑیوں کا نہیں۔“

کاشیبل نے اس کی کلائی میں تھکڑی ڈالی وہی ہے لوگ تذبذب میں ہیں کہ دشن کس نے ہاتھوں میں زیادہ غلبہ رہے گی۔ پدیس کے  
خادم قوم کے۔

مجھے شک ہے کہ اس کی موت کے ذمہ دار تم ہو؟ کاشیبل نے خادم قوم پر آخری اور بھرپور وار کیا ہے۔ اس لیے اب تمہارے خلاف  
مقرر چلے گا۔

شعبہ کو کس نے مارا ہے؟ اس سلسلہ میں شعبہ خاموش ہے۔ اپنی موت کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ اپنے دفنانے کے بارے  
میں اس کا اپنا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ کیونکہ شعبہ اپنی لاش کے تغفل سے بے یار و برگ مرا رہا۔ جسے خادم قوم بھٹکڑی میں کر  
ساتھ لے گا۔ اتھ تھانے جا رہا ہے اور نہایت جوشیلے انداز میں کہتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ میں عدالت میں بات کروں گا کہ اس موت کا اصل ذمہ دار  
کون ہے۔۔۔۔۔ میں حق اور صداقت۔۔۔۔۔

وہ چلے گئے ہیں۔ لوگ بھی چلے گئے ہیں۔ شعبہ کی لاش پر سے اربہ مطلع پھر صاف ہو گیا ہے۔

اب شعبہ کی لاش پھر لوگوں سے کٹ گئی ہے

”ہین چارمنٹ اور گڈر گئے ہیں۔“

”ہین چارمنٹ اور“

— دس ہندہ اور

اور پھر لاش میں ایک خفیف سی حرکت۔۔۔۔۔ اموی ہے۔ اس کے منہ سے ایک خفیف سی گواہ لہڑی ہے۔ جیسے کوئی ٹوک ٹوک  
کرنا سنے رہا ہو۔ اس نے نہایت کرب اور اذیت کے ساتھ جو بولے اپنی آنکھیں کھولی ہیں اور بھڑک رہی ہیں۔ اور پھر جسے ہرگز انہی ٹھننے  
کی کوشش کی ہے۔ مگر بہت لمبے عرصے اس سے اٹھانیں جا سکا۔ اس نے چند لمبے معنی الفاظ منہ سے نکالے ہیں۔ اس نے جس جونی ٹرک  
کی موت اپنا ٹپکنا جڑا تھا پھیل دیا ہے۔

تند و فقیر بھاگ رہا تھا تاہم اس کے پاس آگیا ہے۔

”شعبو! — تم .... تمہیں .... چھوہ! تم تو آٹھ بیٹھے ہو، شعبو نے آٹھنے کی کوشش کی ہے مگر اس کامراٹھ نہیں رہا ہے نہ چرکا اس کامریٹر ہے اس لیے وہ شعبو کے سر کو سہاڑا دے گا اسے اٹھا رہا ہے ” تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ “  
” کچھ نہیں، میرا دل ڈوب رہا ہے، کہیں سے پانی لاؤ؟ “

نند و فقیر پانی بیٹھے چہلایا ہے۔ اس کے قدم من من کے بھادی ہو رہے ہیں۔

” گڈ بیاں ایک سنے کی پاؤ “ سامنے کے فٹ پاتھ سے آواز ابھری ہے۔

” ساندھے کا تیل، ساندھے کا تیل یا ایک اور آواز جاگی ہے

” صاحب! بالکل امریکن برٹ ہیں، خالص فوجی .... ایک اور ماٹوس آواز شعبو کے کان میں پڑی ہے۔

شعبو نے ایک ہاتھ اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر رکھا ہے اور دوسرا ہاتھ ایک حیدر راہ گیر جوڑے کی طرف پھیر دیا ہے۔

” جوڑی بنی رہے بالو جی! بھگوان کے نام پہ ایک پیسہ! “



# چند یادیں

عبدالرحمن حقیقتی

آج سے تقریباً بیس سال پہلے ارادہ کیا تھا کہ میں بعض واقعات کو المعبودہ کتنا چلا جاؤں، چاہے وہ خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار مگر ان میں زندگی کی رقی ضرور موجود ہو۔ آہستہ آہستہ یہ کوشش کتاب کی سی شکل اختیار کر گئی۔ اور میں اپنی اس کوشش کو فرسودہ باتیں کہہ کر یاد کرنے لگا۔ اس میں شاعروں، افسانہ نگاروں اور آرٹسٹوں سے ملاقاتوں کے علاوہ بعض ایسے حقائق کا بھی ذکر کیا ہے جن میں سامانِ زندگی کے علاوہ رموزِ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ایک موقع پر ایک مغربی عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ ”تمہارا ماڈل ہے؟“ میں نے جواباً بتلایا کہ ”نہی تو ہوٹ۔ وہ سکاٹلینڈ میں آئینہ میں اپنا جائزہ لے رہی ہو۔ وہ کپڑے کے زیر اثر اپنے آپ کو ناپے لگی۔ اور دوبارہ مغربی انداز میں جیسے غلام کی بصیرت سے منظر ہونے کی کوشش کر رہی ہے، کہنے لگی ”اس ملک میں آرٹسٹوں کو اپنے لیے ماڈل تلاش کرنے میں کافی مشکلیں پیش آتی ہیں گی اور محمد غلام ابن غلام والا معاہدہ تو تھا نہیں، میرے پردہ ادا کرنے کو یقیناً آزادی دیکھی ہو گی اور پھر مجھے اپنی بصیرت اور فہم پر بھروسہ بھی تھا۔ میں نے دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے اور اسی انداز سے کہا مدفکار کو ماڈل تلاش کرنے میں نہ یہاں مشکلیں پیش آتی ہیں اور نہ مغرب میں۔ صرف طرزِ زندگی کا سوال ہے اور وہی فرق ہے۔ میں یورپ دیکھ آیا ہوں۔ کس قدر جذبات سے خالی شہینوں کے گل پرزوں کی طرح رنگ و بو رنگ عورتیں ماڈل بن کر آرٹسٹوں کے سامنے بیٹھ کر اپنی برہمنی کی فائش کیا کرتی ہیں۔ خصوصیت سے اس وقت جب وہ اپنی اکتا ہٹ دور کرنے کے لیے سگریٹ کے بے سود کش لگاتی ہیں تو کتنی بھونڈی اور جذبات سے عاری نظر آتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا، میں نے محسوس کیا تھا وہ ہر سہما سے کے باوجود جسمانی شدتوں کا توازن قائم نہیں رکھ سکتیں اور نہ اپنی عریانی کو چھپا سکتی ہیں۔ تمہارا مطلب غالباً ماڈل سے وہ عورتیں ہیں جو برقع پہنتی ہیں اور مردوں سے حجاب کرتی ہیں۔“ اس موقع پر وہ ذرا مضبوط سے سکاٹلینڈ میں جیسے یہ سے قومی کردار پر طنز کر رہی ہو۔ ساتھ ساتھ وہ آئینہ خود نمائی نکال کر اپنا غازہ اور سرخی دیکھ رہی تھی اور اس میں اضافہ بھی کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے کہا مدافعتی خصوصیت چاہے وہ مرد کی اپنی ہو یا عورت کی، زیادہ قریب ہونے سے ضعیف اور مضلل ہو جاتی ہے۔ خصوصیت سے عورت مرد کے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ ایشیا کا یہ فطری تقاضا ہے کہ وہ عورت کو تاج کے ہیروں اور جواہرات کی طرح اپنے سر کے لیے محفوظ

کئے۔ انہی کی صورت سے تخلیق کا موجب اس لیے نہیں بنی کہ مرد اس کے اوصاف کی پرکھ سے بھی تک مطمئن نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں مغرب میں ان عورت کے تعلق پر سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ اسے ہم متردوں سے کوئی شکایت ہے یا کوئی امید ہے۔ یا وہ رچی بخت ہے۔ کہا یہ سچ نہیں ہے کہ مغرب میں عورت کو اپنے سزا کا احساس کسی وقت بھی نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ یہاں پہنچ کر اس کا عقیدہ دوباروں سے چھو کر دب گیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ کچھ جھینپ ہی گئی تھی۔ یا اسے اپنے سوال کی قیمت بہت زیادہ وصول نہ ہوئی۔

مشرقی زندگی کا سرزد سنا دیا بھی تک اپنے تسلسل کو توڑ نہیں سکا۔ اس کی زندگی میں آج بھی وہ کسک اور روحانی جذبات کی ہم آہنگی موجود ہے جس سے وہ اپنی سلامتی کا حواس ہے مغرب پرستی کے علم کو نے اسے گمراہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اسے اپنی کمتری کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ کیونکہ وہ مشرقی زندگی کے انداز اور اقتدار دونوں کا دشمن ہے۔ اور جب تک اسے اپنی خود پسندی کا جہنم حاصل نہ ہو گا اس وقت تک اپنے دامن کو بچانا اور رہے عیب رکھنا محال ہے۔

مغربی خاتون کا یہ سوال اگرچہ اس کے فطری تقاضوں کی مانند کی گزرتا ہے۔ مگر اس میں تلاش اور سوچنے کے امکانات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مشرقی فن کار کے سامنے اس کے سوال کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں یا ایک الگ سوال ہے۔ تخلیق کار کو چاہئے کہ وہ تخلیق کا سہارا تلاش کرنا رہے۔ اور اپنی روحانی قوتوں سے عارف رہے اور اضمین قابل تعبیر ہو سکے۔ جیسے وہ روایات کی بنا پر کسی فروگزاشت سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ مغرب میں جدید مصوری کا وجود اس اکتا کا لازمی نتیجہ تھا جو قدیم آرٹسٹوں نے شاہکاروں نے سحر کی طرح پیدا کر رکھی تھی اور ہر علم ایسے وجود کا باعث بنی تھا کہ آج کا انسان اس کو بہت دیر تک برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ نگاہیں جو قدیم آرٹسٹوں کے شاہکاروں سے اٹھنے کا نام نہ لیتی تھیں، جدید تحریک سے آہستہ آہستہ رد ہوتی گئیں۔ کیونکہ انھوں نے سنسنی سے تجربات کے ذریعے تخلیق کا مقصد بدل کر رکھ دیا تھا۔ ادھر بیکانی اور کیمیائی وجود ہوں نے صرف نظام زندگی پر ہی اثر ڈالا تھا بلکہ انسان کے سکون کو بھی درجہ برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ اور آرٹسٹ کو اپنے لیے راہ منتخب کرنا ایک اُچھن نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ضروریات زندگی نے ان کی طبیعتوں اور ذہانت پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا تھا اور نجات کا صرف ایک ہی ذریعہ رہ گیا تھا کہ وہ بغاوت کرے اور اپنی فنی صلاحیتوں کا محور بدل دے اس نے اور ایک ایسا نعرہ بلند کرتے جو ان کے تمدن اور تہذیب کا علمبردار ہوتا۔ آہستہ آہستہ ان کا رد عمل بغاوت اور ایسے تجربات ان سے کامیاب ہوئے کہ انھوں نے قدیم آرٹسٹوں کے شاہکاروں کو غنڈی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا اور دنیا ان کی طرف ٹھک گئی۔ مغرب میں اپنی طرز کا ایک واحد اسکول ہے جس نے اپنے شاہکاروں کے لیے ماڈل کا استعمال کیا بھی تو اس طرح جیسے وہ ان کا اپنا کردار ہے۔ قدیم استادوں میں ان کی مثال امبران کے سد اشکل سے نظر آتی ہے۔ نان گوگ جو خود بھی بالینڈ کا ایک باشندہ تھا۔ پوسٹیم اس کا شاہکار زندگی کی تھکن کا مظہر ایک ایسا کردار ہے جو دنیا کے ہر حصے میں ملتے ہیں۔ جن کی اصولی اور فطری بنا یہ ہے کہ اس کو پوسٹیم کو اپنے خانی گوگ سے ایک گہری دھیمی مٹی۔ اور زندگی کے ہزار جھمیلوں کے باوجود وہ اپنے خالق آرٹسٹ کے قریب نہ تھا۔ یہ طرز کار فن مصوری میں ماڈل کے تقلدوں کے لیے مغرب میں بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔ ہاں اعلیٰ ماڈل، زندگی کے ہر موڑ پر ملے ہیں جن کا انتخاب انفرادیت کا حصہ ہے۔ جو ماڈل کی پابندیوں اور عقل کی موٹائیوں سے آزاد ہے۔ کیونکہ زندگی کی مدت تحریک جذبوں میں مضمر ہے اور یہ مدت ہی اخلاق، کردار اور روحانی محرکات کی متلاشی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جدید استادوں کی معراج مشرقیت مشرقی طرز معاشرت، مشرقی طرز نگارش میں ہے۔ وہ وہ ان کے اپنے الفاظ ہیں، کہ وہ مشرقیت کے حسن اور طرز نگارش سے متغیر ہوئے اور اس

حاجی اہانت اور تکنیک کو فنی صلاحیتوں میں بروئے کار لائے۔

آرٹھٹ کی صلاحیتوں کا یہ تقاضا نہیں کہ وہ الجھنیں پیدا کرے۔ رمز شناسی کو ایک سحر بنا دے۔ اور ایک بہت بڑا ڈال کے انشراح کو جوڑ کر  
 نیچے جمادات کی ہر جھلک دنیا کے خوبصورت سے خوبصورت بدن کی یونانی سے بالا ہے اور جدید تعلیم کا ارتقاء بھی کی تکمیل کے لیے ہمیشہ کردار کی اہمیت  
 کو ترجیح دیتا ہے اور غریب فن کے لیے جہاں وہ چاہے اسے ڈال کر دیکھ دیتا ہے۔ مشرقی آرٹسٹ کی طرح نہ ہمارا ڈال ناقص نقطہ ہے اور نہ ہمارا ڈال  
 بلکہ کو قطعی تقاضا سمجھتا ہے اور اسی اصول پر تمام ازم جمع ہیں۔ اور یہی اصول اس کو اپنے فطرتاً کب سزل سے بچا کرتا ہے۔

مغرب میں کج قوت و غیرت نے جس بلند آہنگی سے لغو بلندی کیا ہے اس سے چلی سدا چول کے فن میں یہ قوت ان کے ہاں نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہے۔ مشرقی مصوری میں مغل آرٹ نے شہید شکاری میں ایک وصف پایا۔ ایک تھا جس سے ان کے فن کی انفرادیت۔ اس ذات کی معاشرت و برابری شان و شوکت بادشاہ اور مصاحب کی پہچان کی عکاسی ہوتی ہے۔ نگریہ میں نہیں ملتا نہ جیترمن، نگریہ دھس، غریب بے اور نذر معلوم تا و عبد الصمد نے جہانگیر، شاہ جہان، محمد ظفر و مغل یانور جہاں کو اپنے سانسے بھجور مادی کے بٹھایا ہو جس طرح فینا ڈوٹے مولانا کو ایک مادی کی تثبیت سے بٹھایا تھا وہ اپنے شاہدات سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کے ملاحظہ کا نقص تھا۔ ان کے وسائل بھی ایسے تھے اور یہی ایک وجہ تھی کہ انھوں نے جمالیات پر جسمانی اجزاء کو قربان کر رکھا تھا۔ چاہے اس کے برابر کچھ ہی تھے۔

پیرس سے برلن جانے کے لیے جب میں اپنی سیٹ والے ڈبے میں پہنچا تو اتفاق سے میرا ہفت ایک ایسا آرٹسٹ تھا جو ان دو ملکوں میں ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنی اہمیت رکھتا تھا۔ میری ملاقات فریج آرٹسٹ اینڈ آرٹ برین سے ہوئی اور جب ہم بدھ اور دھرم کی باتوں سے گھوم کر امپریشن ازم اور سوانیے ازم کو برا بھلا کہہ چکے اور بعض انفرادی آرٹسٹوں کے متعلق گفتگو کرنے لگے تو آرٹ برین نے کہا تو اوس ٹورس ہا سٹریجی اپنی تخلیق کے متعلق یقیناً بہت عجیب و غریب تھا۔ اس کا قول ہے کہ وہ ہر رات ایک نئی عورت سے ہم بسترا کر لیتے ہیں تاکہ اس کی ہر ہر ایک ایک نئی تخلیق کا پیش خمیہ ہو۔ مرکزی خیال صرف اس قدر تھا کہ اس پر بحث ہوتی رہی۔ مگر تخلیق کے بارے میں کوئی قطعی اصول وضع نہ ہو سکا کیونکہ میں اپنے مرکزی خیال پر قائم رہا کہ تخلیق زندگی کے رجحانات کا کتنا ہی اہم مسئلہ کہیں نہ ہو مگر اس کا نتیجہ مادی کی فتنہ و فاسا سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ وہ پیرس کا رہنے والا تھا، اسے حرام و حلال، ستر اور تنگ کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اس نے یہاں تک بھی اپنے عقیدے کا اظہار کر دیا تھا کہ جب حیوان اور پرند ہمارے روبرو بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو کیوں ہم یہ جرائم نہ کریں کہ ننگے پھر کریں اور سب کے سامنے عورتیں بچے بننا کریں۔ میں نے اسے بار بار احساس دلایا کہ پیرس میں یقیناً ایسا ہوتا ہے۔ میں نے انہوں کو سڑکوں اور فٹ پاتھ اور گی کوچوں کے موڑوں پر عورتوں اور مردوں کو بدحواس دیکھا ہے اور یہ شرف پیرس ہی کو حاصل ہے جس نے آزادی کے لیے جنگ کی دنیا کو ستم و فتنہ دیا۔ دکنہریگو، موباساکن، فلاپیر، بال زاک، برگساں، ودان، کورسے، جینی، ربیناٹے، تیتے، گولیس اور ٹونی دراکاں جیسے پُر خلوص فنکار جیسے جنھوں نے ہمیشہ دنیا کے جہود کو نور اور انکا کو ختم کیا۔ ارتقا کے مسئلے کو سلجھایا۔ عوام کو اپنی فہم و داری کا احساس دلایا۔ وہ ملک اتنی بڑی دولت کے ہوتے ہوئے آج مسافروں کے رحم پر ہے جو براختل ہاوس میں فرانس کی کنکاریوں کی قیمتیں چکاتے ہیں۔ جسی اور انہ کہہ کر کبھی مذہم کی قیمت نہیں دیتے۔

وہ پریمیزی تھا اس نے اپنے فطری تقاضے پھر ٹوس ٹوس کا ذکر اس ضمن میں چھیڑ دیا کہ وہ عیس کی برائندہ زندگی کا

ترجمان تھا۔ وہ گھنٹے اور ڈنک بھرے واقعات کو تنگ دینے والا تھا۔ میں ادھر ادھر کی باتوں سے ہٹ کر چپ ہو رہا۔ کیونکہ اس قسم کی کچھ کامیابی کوئی تجربہ برآمد نہیں ہوا۔ اس پر بھی میں نے یہ ضرور کہا تھا۔ ٹولس ٹولس میں بربریت کی سی ہو آتی ہے مگر محام کی نمائندگی کا نشانہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کی مصوری سے اس کے اپنے قول کی کتنی بھی تصدیق ہوتی ہو مگر اس کی ہر تصویر اس کے ذہنی اتار چڑھاؤ کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے فن کے نقطہ نظر سے اس کے آرٹ کا درجہ بہت بلند ہو۔ اس میں اس کے ماحول کی عکاسی اور ترجمانی ہو۔ لیکن جہاں تک اخلاقی کا تعلق ہے اس کا نظریہ فرانس تک محدود ہے۔ جہاں دن رات سوائے نفسانی خواہشات اور برہنگی کے مظاہروں کے دوسری کوئی قوت و ماحول پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جب ہم ریمبران اور روبنز کی بنائی ہوئی ننکی تصویروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ٹولس ان کے سامنے خود ننکا، بے ستر، جنسی ٹھکن کا مارا ہوا نظر آتا ہے۔ اس وحشت اور برہنگی میں ان عورتوں کی تصویروں کے سوا دوسری کوئی عورت نظر نہیں آتی جنہیں زمانے نے جنا اور نہ باپ نے ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا ہے۔ پیرس کتنا ریچڈ اور گدلا شہر ہے۔ ٹولس ان کے قول اور نقطہ نظر سے یہ واضح بھی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں اس کے آرٹ کے صحیح مقاصد کو سمجھنے کے لیے اس زندگی کا مطالعہ بھی ضرور ہے کہ اس دنیا کے لوگ کس قدر گھناؤنے، کس قدر بد ذوق، جنس کے خریدار ذلیل زندگی کی ہر ذلالت سے دوچار ہیں، حالانکہ وہ خود ایک امیر زادہ تھا۔ پھر اس کے گھر کی حمان مٹی۔

ملاؤل کی روایات کے سلسلہ میں مجھے ریمبران کا نظریہ بہت پسند ہے۔ اس نے خود کو ماڈل سمجھا اور اس کی اپنی بنائی ہوئی اپنی شبیہیں سوکے قریب مٹی میں جو ایک کم فہم کے نزدیک ایک سے ایک نہیں مٹی لیکن ہر شبیہ میں ریمبران کا اپنا کردار، اپنے اوصاف، اپنی ادھیل نہیں ہوتا۔ اس نے جب بادشاہ سے اپنے سامنے ایک ماڈل کی حیثیت سے بیٹھنے کی درخواست کی اور بادشاہ بھی ایک بلند عیار شخص کا خوشی کو پورا کرنے کی غرض سے اس کے ہاں آیا تو اس نے اسے وہ لباس پیش کیا جس میں وہ اس کی تصویر بنانے کا خواہاں تھا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ وہ ایک فقیر کا پوشیدہ لباس تھا۔ بادشاہ باوجود ہر جاہ و جلال کے اسے گد اگر نظر آ رہا تھا جو مقدس انجیل کا ایک کردار تھا۔ اور میرے نزدیک یہی ایک اختیار ہے جو ٹولس ٹولس اور ریمبران کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ ریمبران کی ہر عورت ابلی مریم، مال، بہن اور محبوبہ جس کو ماں نے جنا اور باپ نے شفقت کی گود میں اسے پالا ہو سکتا ہے۔ ٹولس ٹولس ریمبران سے تقریباً تین سو سال بعد فرانس میں پیدا ہوا اور وہیں مر گیا۔ اس کا فن اس کی اپنی انفرادیت کا سہارا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ کیونکہ اس سے انسانی منزل اخلاقی بندھنوں سے بھی اپنے آپ کو آزاد تصور کرتا ہے۔ اس کی ہر عورت گھناؤنی زندگی کی حامل ہے۔ نہ اسے ماں نے جنا ہے اور نہ باپ کی شفقت اسے نصیب ہوئی۔

مہذبہ آرٹ کی تحریک کے اسباب کچھ بھی ہوں وہ ایک رد عمل ہے۔ وہ ایک انتشار ہے جس کے پشت پناہ میکائی او کیماٹی جوہر ہیں۔ جب سے دنیا نے فن کے ساتھ انسافیت کو وابستہ پایا ہے۔ یہ موجودہ تحریک اپنی اہمیت کی ذمہ دار ہے۔ اس کا دعویٰ ہے وہ آزادی اور سچائی کی علامت ہے۔ اس سے آرٹ کا وہ ابتدائی دور پھر سے جنم لیتا ہے جسے وحشت اور بربریت نے اظہار خیال کے لیے نہیں بلکہ اظہار خیال کی پرستش کے لیے تخلیق کیا تھا۔ جس میں دیوتا، خدا اور محبوب سمجھی شامل تھے۔ موجودہ تحریکوں کے رجحانات ذہنی جمود، فنی نشروں کی ٹھکن کے قفا حے ہیں۔ اس وقت فکروں کی طرف سے ہی نہیں بلکہ اس فن کے قدر شناسوں میں بھی بے اطمینانی اور تنہایت پائی جاتی تھی۔ مشین اور کیمیائی ترقی نے آرٹ کو زندگی کے اور قریب کر دیا ہے تاکہ وہ فطری خود غافل کو

زیادہ سے زیادہ ترقی پسندانہ انداز میں دیکھنے کا جو تجربہ جاسے۔

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں یہ پیمائشیں آرٹسٹوں کو اور بھی زیادہ فطرتاً ہی خصوصیت سے رہنمائی اور رہنمائی سے ان مغلکہ یوں کی جس خلوص سے رہبری کی ہے، ایسا کوئی اور آرٹسٹ نظر نہیں آتا مگر گوگس، گوگ، سیزا، شیشے اور پیکا سو موجودہ فن کو مریض خیال کرتے رہے اور کتے رہے آرٹ کو پھر سے جنم دینے میں اس کی جیت ہے۔

انیسویں صدی کا اختتام نہ ہوا تھا کہ PRIMITIVE ART نے مختلف شکلوں میں مختلف ملکوں میں امتیاز حاصل کیا اور دیکھنے دیکھنے کی صورتوں میں سامنے آیا اور دنیا نے اسے قبول کر لیا۔ وحشی قوموں نے اپنی بربریت کو اپنے دہوتا کے تناسب اور خود خال کو، اور مذہبی توہمات کو جہاں چھوڑا تھا، وہاں سے اس کی ابتدا کی صدیوں کے بعد ترقی پسندانہ رجحانات کے زیر اثر اس سے تعاون کیا گیا اور اپنے سامنے فرعون کے مجسموں کو، جینیٹس کی برتری کو رکھا گیا، اور ہر بربریت اور اختصار کو حل قرار دیا گیا۔ اس اسکولی کے تمام فائدے سائنٹفک تجزیہ کے لیے کیپٹی اور میکائی فنیوری سے استفادہ کرتے رہے اور فن اپنی عظمت کے مطابق ہندو دینا سے وابستہ ہو گیا۔

جاپان کے لافانی آرٹسٹ بکتائی نے عرب کی ہندسی شکلوں نے، ایران کی نسخ اور مستطین خطاطی نے جدید آرٹ کو متاثر کیا جس میں فرانس، لندن، امریکہ، ہندوستان اور جاپان نے حصہ لیا۔ اور جو بھی جدید تحریک میں شامل ہوا اس نے سوئی ہوئی قوتوں کو تھمھ کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اور آخری دم تک اس کا ساتھ دیا۔

مشرق کی وہ سرزمین جس پر آرٹ کے پہلے شاہکار نے جنم لیا وہ زمین مصر ہے۔ اس کے بعد فلسطین، ایران اور ہندوستان نے اپنے ماحول، اپنی معاشرت کی بنا پر بڑے بڑے شاہکار تخلیق کئے۔ یہ سب آرٹسٹ اور صنایع زمانہ آل کے مغلکہ تھے، زمانہ آل ان کی پرکھتی، ان کے ماڈل وہ کردار تھے جن میں زندگی تھی۔ ناقابلِ تسخیر عمل تھا۔ جن میں انسان اور انسانیت کے پھلنے پھولنے کے امکان تھے۔ ان کی ذہانت اور ان کا شعور انھیں سمجھ سکا تھا۔ فراغ نہ مصر کے مجسمے ان کے انتہاد اور ان کے وقت اور عظمت پر ہی روشنی نہیں ڈالتے بلکہ ان میں فن کی وہ تمام قوتیں، صلاحیتیں اور حقائق پائے جاتے ہیں جن کی طرف دیکھ کر آج کا انسان متحیر ہی نہیں رہ جاتا بلکہ وہ سوچتا چلا جاتا ہے کہ خدا نے انہیں لکن لافانی قوتوں سے سرفراز کیا تھا۔ پتھروں کا سادہ اور فساد کا جسم دے کر کیوں انہیں کچل کر رکھ دیا تھا۔ ان مجسموں کا ابدی سرور اقتدار اور مملکت ہی نہیں وہ اعلیٰ ترین اوصاف ہیں جن سے فنکار کی نیت، پاکیزگی اور اس کے خلوص کا اظہار ہوتا ہے اور وہ کیفیت جو ان کے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے انفرادی نوعیت کی ہے۔ ان کے مطالعہ سے کبھی افشاء پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک سہا سہا لطیفہ بلان ان کے ہمارے درمیان حائل ہوتا ہے کہ ہم رموز زندگی اور انسانی عظمت سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ اثر آخری ذل کی بدولت نہیں کردار کی تشکیل سے ہے جو ہزاروں سال گزر جانے پر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ فنکار اپنے شاہکاروں کو مادہ اور زیب کم درجہ تشبیہوں سے، اختصار سے تشکیل دیتے تھے۔ ظاہری طور پر ان کا مقصد سر شاہکار کو آسان، عام فہم، قابلِ تعبیر بنانا ہوتا تھا۔ مگر جب ان پر مبصروں نے نگاہیں گاڑ دیں تو انھیں ان کے معنی فرعون کے دعووں سے بھی زیادہ بلند اور عمیق نظر آنے لگے اور فن کی پرکھ رکھنے والوں نے بادشاہ اور رعیت کے تعلق کو چھوڑ کر ان کو ان کی ذاتی خصوصیات سے الگ کر کے صرف کردار اور شاہکاروں کو تخلیق کی رو سے دیکھنے پر قناعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب جو مادہ پرستی میں پیش قدمی

ماڈل کی برسنش سے منکر ہو کر فوٹو گرافی کے مسئلے سے بھی گزر کر ایشیا کی اس غیر فانی عظمت کا احترام کرنے لگا۔  
 رودان کے بعد اپٹامین کا دور آیا۔ ڈوبسن اور مور نے دنیا کی توجہ کو کھینچا۔ پیکا سونے اپنے آرٹ کے تجربات میں نیا اضافہ کیا تو دنیا بھر میں اس تحریک نے انتشار پیدا کر دیا۔ اور فن کے پرکھنے والوں نے بھی مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع پایا اور ابتدائی آرٹ کی جبر مکعبیت نے لے لی۔ پیچیدگیاں در پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں اور جدید آرٹسٹوں کی سائنس کوئی تحریک نہ دے سکی اور وہ اپنی بوجھل بہت میں شعبہ بازی پر اتار آئے اور اپنی پیچیدگیوں کا کوئی حل پیش نہ کر سکے۔ اس فن کے بانیوں کو جب ذرا روشنی ملتی ہے تو وہ منہ کھول کر اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی غلط طریق پر غلط راہ پر کھڑے ہیں۔ پیکا سوا اپنے گننے سر پر کونز بٹھا دکھڑے باہر نکل آتا ہے اور کبھی نیم تنہ ملی سے لپٹا ہوا اپنی بے نیاز یوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کبھی ستر سال کی عمر میں اٹھارہ سالہ لڑکی سے شادی رچا کر چھوٹے پیکا سو کا اعلان کرتا ہے۔ شہرت اس کے دروازے پر کھڑی ہے، وہ اسے اور ہوا دیتا ہے اور کہتا ہے سیدھے سادے خط، سلاگی اور اختصار فن کی روح ہے۔

# نقوش کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست

زیر ادارت : احمد ندیم قاسمی ، باجرہ مسرور

احمد ندیم قاسمی  
ذراؤن ہاشمی  
خدیجہ مستور

I

ہماری دنیا : مرید قلعہیں  
ہمارا سماں : کچھ تو کہنے  
قدیم آقا ہیں : پروہشی ہیں (کرشن چندر) "مہم"  
نئی دنیا کو سلام (سردار جعفری) "تافت"

۲

طالع : باجرہ مسرور  
مقالے : جہان نو ہوا سے پیدا : فیض احمد فیض  
تقیہ دولت : علامہ غلام مرشد  
سیاسی بران اور ہمارا ادب : انظار حسین  
ادبیئے اردو کی خدمت میں : غلام حیدرانی بقی  
بالقہ قدریں : شیر محمد اختر  
فریب ہمار : جاں نثار اختر  
فریب : علی سردار جعفری  
لمحہ دلبری : فکرتونوی  
یہ بہار : عنیا جان دھری  
خیر مقدم : جعفر طاہر  
پرگیت : منجول حسین احمد پوری  
عنقوان مشابہ : احمد ندیم قاسمی  
ٹامک ٹوٹے : خدیجہ مستور  
رات بھر : اختر اورینزی  
لمحات اندر لمحات : شوکت قتلوی  
زرد و پستہ : میکہم گوداکی  
غزلیں : انجم رومانی  
غزل : شاد عارفی

باجرہ مسرور : غلام حسن قادری  
غلام حسن قادری : عزیز محمد  
غلام رسول مہر : غلام پیہ  
حقیقہ جان دھری : سیلاب اکبر آبادی  
سیلاب اکبر آبادی : احمد ندیم قاسمی  
یوسف ظفر : یوسف ظفر  
قیوم نظر : قیوم نظر  
تقیل شفا : تقیل شفا  
کرشن چندر : کرشن چندر  
احمد ندیم قاسمی : احمد ندیم قاسمی  
باجرہ مسرور : باجرہ مسرور  
عزیز محمد : عزیز محمد  
ولیم سینسم : ولیم سینسم  
اثر لکھنوی : اثر لکھنوی  
اختر شیرانی : اختر شیرانی  
فران گوہر پوری : فران گوہر پوری  
حقیقہ ہوشیار پوری : حقیقہ ہوشیار پوری  
علی سردار جعفری : علی سردار جعفری  
احمد ندیم قاسمی : احمد ندیم قاسمی  
سیعت الدین سیعت : سیعت الدین سیعت  
مختار صدیقی : مختار صدیقی  
عبدالمجید عدم : عبدالمجید عدم  
ڈاکٹر عبدالحق : ڈاکٹر عبدالحق  
سیلاب اکبر آبادی : سیلاب اکبر آبادی  
خواجہ احمد خاں : خواجہ احمد خاں  
میاں فتح : میاں فتح  
رزا و جہان : رزا و جہان  
غلام الدین پھیل عثمانی : غلام الدین پھیل عثمانی  
اردو زبان : اردو زبان  
خطبہ صدارت : خطبہ صدارت  
باحیات : باحیات  
رباعیات : رباعیات  
بربروان : بربروان  
مناجات : مناجات  
مشورہ : مشورہ  
افسانے : افسانے  
بھیروان کا مندر ملین : بھیروان کا مندر ملین  
میں آئے ان بھوں : میں آئے ان بھوں  
بڑے انسان بنے بیٹھے ہو : بڑے انسان بنے بیٹھے ہو  
میرا دشمن میرا بھائی : میرا دشمن میرا بھائی  
ناخشاں : ناخشاں  
غزل مسلسل : غزل مسلسل  
دو غزلیں : دو غزلیں  
برگ سبز : برگ سبز  
لکھا - ٹچہ چیدہ : لکھا - ٹچہ چیدہ  
غزل : غزل  
غزل : غزل  
غزل : غزل  
دو غزلیں : دو غزلیں  
ہماری زبان : ہماری زبان

غزل	عبد العزیز فطرت	سپاہی	کرشن چندر
غزل	مجید امجد	چڑھے چڑیا کی کہانی	احمد عباس
غزل	قدیم نظر	نہرت کیوں بھئی؟	عوبذ محمد
غزل	احمد ندیم قاسمی	آندھی میں چراغ	ممتاز شیریں
ہماری زبان	نیاز فتحپوری	ہمد	جاوید اقبال
	آل احمد سرور	غزل	حفیظ ہرشنیاری پوری
	اختر اور بیوی	غزل	عبد المجید سالک
	عوبذ محمد	غزل	اثر لکھنوی
	معینی احسن جذبی	غزل	عبد المجید عدم
	خواجہ احمد عباس	غزل	اختر شیرانی
ہماری دنیا	منہا مغربی باسٹ کے نئے تہور	غزل	اختر ہوشیار پوری
ہمارا سماج	کچھ تو کہئے	غزل	احمد ندیم قاسمی
منہا	نغم کے اثرات	غزل	ڈاکٹر باقر
نئی کتابیں	محافض	غزل	عبادت بریلوی
	آجڑ شب		آغا شہد

ہماری دنیا آج کی دنیا  
ہمارا سماج مسئلہ نواں اور ادیب زبیدہ نریس  
نظم منہا  
نئی کتابیں حیفہ عیوب سلطان (عمود بنگوری) "ہم"  
دور ہے پر (شیر محمد اختر) "ہم"  
نئے اور پرانے چراغ (آل احمد سرور) "ثقافت"  
اقبال کے خط عظیم گیم کے نام "ثقافت"  
ماہ نو (ماہنامہ) "ثقافت"  
گوچ (طفیل ملک) ظہیر باہر

۴ (آزادی نمبر)

طالع	ہاجرہ مسور
طنز و مزاح	دوست کے نام - "پطرس"
برج بانو	کنہیا لال کپور
شہر اور گاؤں	"فلک پیم"
کون (نظم)	شفیق الرحمن
منہا	منہا بہار عشق خواجہ احمد فاروقی
ادیب حسب الوطنی اور نعلانی	احتشام حسین
اختر شیرانی	آل احمد سرور
ارسطو کا تصور المیہ	جاوید اقبال

طالع	احمد ندیم قاسمی
جہاں قادی تدریس	ڈاکٹر تاثیر
فکاشتہ روزگار	غلام رسول مہر
تہ قی پسندادبا و حسب الوطنی	ساحر لدھیانوی
پاکستان کی قومی زبان	ڈاکٹر محمد عبد اللہ باری علیگ
تقسیم دولت	علامہ غلام مرشد
زبان کا مسئلہ	نکد تونسوی
درد و اند	جگر مراد آبادی
رباعیات	جوش طبع آبادی
صد البھرا	اختر الالبان
سمندر	محمود خالد حمیری
ایک شام	قصہ حق حسین خالد
یہ بچوں	قیوم نظر
رواں ہے سفینہ	سیف الدین سیف
پڑوسی	قتیل شغائی
ثواب	فارغ بخاری
ٹوا بے گناہ ملک	احمد ندیم قاسمی
افسانے	سعادت احسن منٹو







غزل مجید شاہد  
غزل قمر شاہمی

غزل غریب جاوید  
ہمارے دنیا معاہدہ شمالی اعلانک ایوب احمد کرمانی  
ہمارے نام از طوطا اور افلاطون کی سرزمین مسعود جمال  
ہماری تحریک

نئی کتابیں انجمن ترقی پسند مصنفین  
جاوید کا خاص نمبر عبداللہ ملک  
دو ماہی شاہراہ ظہیر مابر  
جب سخن بہرہ رافقا "دقائق"  
اشہارات

۷ (امن نمبر)

طلوع باجرہ مسرور  
احترام آدمی علامہ اقبال  
روکلا کے کھنڈروں کا منظر احمد ندیم قاسمی  
(روداد روداد امن کا نگار گیس)  
اسے ماؤ، ہنڈ، بیٹیو! ظاہر باجرہ  
(روداد بوداد بیت امن کا نگار گیس)  
ہیماں ڈالرائے تھے ہیں صابرہ زبیدی (نیویارک)  
(روداد نیویارک امن کا نگار گیس)  
روداد وائٹ کی سرزمین میں (ادارہ)

تہذیب ناقابل تہذیب ایلیا اپری برگ ترجمہ کرمانی  
کیا ہائے جی کا خون رانگ جا بجا کا مسوڈیا نکلا ترجمہ احمد اہی  
عالمگیر امن کا نگار گیس پیرس کا نقشہ

پاکستان کے دانشوروں کا اعلان نامہ

مہندستان کے دانشوروں کا اعلان نامہ

چنگ کنگ سے چلی نکلا احمد ندیم قاسمی

..... ان بھوی چرخ اعلیٰ مختار رحمان بھری

دیسے ملہاؤ سا خلیو مسعود حسین

نشانت سندیس سماجی ماہر ہروی

نصادم حسن طاہر

سیل انوار ظہور فطر

اندھرا محمد دم محمدی الدین

چنگ بلراج سومل

نظمیں

میرا نظم  
رات ساکت ہے

میں اکیدہ زجاوید سلام بھلی شہری

اک دنیا اپنی ریاض قادر

تھنے تاجور سامری

حقیقت پسند احمد ظفر

مربی کرشن چندر

بیرو شامے پہلے پیر شام کے بعد احمد ندیم قاسمی

سناؤ سے دور خدیجہ مستور

نزل ہے کہاں تیری؟ ابراہیم جلیس

جھنڈا اور بچا ہے ہمارا شکید اختر

لفٹوش سلطان الحسن

جدوجہد کو بابا یاشی (مترجمہ حمید اختر)

غزل شاد عارفی

غزل عدم

غزل ظہور فطر

غزل باقی صدیقی

غزل صہب اکھنوی

غزل حسن طاہر

غزل اشعر بیچ آبادی

غزل شہاب انصاری

غزل عالم فخرپوری

غزل

ہمارے نام یہاں نکاروں کا خوان بہانہ مسعود جمال

ہماری تحریک :- انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور اور راولپنڈی کے

ہفتہ وار اجلاسوں کی کاروائیاں

نئی کتابیں نیا دور (فسادات نمبر) محمد صفدر

۸ (آزادی نمبر)

طلوع باجرہ مسرور

ایچک کے باغ میں عبدالرحمن چغتائی

ادب اور قراءیت ڈاکٹر امجد حسین

آتش کی صوفیہ شاعری احتشام حسین

ماضی کے ادب کا لبرے متعلق ممتاز حسین

میرزا فرحت الدین عجیب اختر انصاری

ترقی پسند تحریک عبادت بریلوی

مقالے







نظم	جگر مراد آبادی	غزل	سرمه
نکوت پری	مختار اکبر آبادی	غزل	عدم
پلو سے نئے وہ در کھلے	سوامی مایروی	غزل	منیا جانندھری
نرادش	جسمل نقوی	غزل	رازمراہ آبادی
غزل	اثر لکھنوی	غزل	عبدالعزیز فطرت
غزل	عدم	غزل	اثر صہبائی
غزل	اثر صہبائی	غزل	فعلی احمد کریم فضل
غزل	یوسف خضر	غزل	عاطف غزنوی
غزل	سیرت شمنوی	غزل	فطیر صدیقی
غزل	شبان اظہر	غزل	محمد صدیق کلیم
غزل	شبانو لکھنوی	غزل	الطاف مشہدی
غزل	جلیب انشہر	غزل	چیلپی گوٹی
غزل	بانی صدیقی	غزل	گدیش وہم و گماں سے نکلا رنعت سروش
غزل	اقبال صفی پوری	غزل	جشن عید یا جشن ماقم
غزل	شرت بخاری	غزل	شاعر لکھنوی
غزل	ادیب سہارنپوری	غزل	نصیر احمد زار
غزل	مظفر اکبر آبادی	غزل	ہم سفر سے
غزل	عابد حسری	غزل	رام کھلاون
غزل	نور احمد	غزل	مشاعر
غزل	سعاد حسن منٹو	غزل	بہار کا گیت
غزل	شوکت خاٹوی	غزل	کوئین کا بیوپاری
غزل	سلیم بانڈے	غزل	پہاڑی مینا
غزل	اثر لکھنوی	غزل	ہمارے نبی
غزل	جلگن ناٹھ آزاد	غزل	پاکستان پس منظر و پیش منظر
غزل		غزل	افضل مرزا جالندھری
افسانے	جلی منڈل	غزل	
افسانے	مردوٹو	غزل	
افسانے	لیاقت نندو معاہدہ	غزل	
نئی کتابیں	گرتے گھر	غزل	
نئی کتابیں	چھان پی	غزل	
نئی کتابیں	بیکریاں	غزل	

(سالنامہ) ۱۵-۱۶

ذکر تاثیر	ہائے وہ میر کا رول نہ رہا	ذکر تاثیر	ڈاکٹر تاثیر
لندن کی ایک شام	ڈاکٹر تاثیر	لندن کی ایک شام	ڈاکٹر تاثیر
مرثیاس کا نقشہ جی اجاب	عبدالحمید سالک، عابد علی عابد	مرثیاس کا نقشہ جی اجاب	عبدالحمید سالک، عابد علی عابد
(ذکر تاثیر)	صوفی تبسم، حفیظ جالندھری	(ذکر تاثیر)	صوفی تبسم، حفیظ جالندھری
	خلیفہ عبدالحمید، اندیا ز علی تاج		خلیفہ عبدالحمید، اندیا ز علی تاج
	ایس اے رحمن، فیض احمد فیض		ایس اے رحمن، فیض احمد فیض
	عبدالرحمن چغتائی، حفیظہ شیار پوری		عبدالرحمن چغتائی، حفیظہ شیار پوری
مقالے	ان کی باتوں میں گوئی کی خوشبو پطرس	مقالے	ان کی باتوں میں گوئی کی خوشبو پطرس
	واحد علی شاہ		واحد علی شاہ
	تقاضا اور تقاضے		تقاضا اور تقاضے
	عبد الرحمن چغتائی		عبد الرحمن چغتائی
	عرب کے لئے نسل ندر کا استعمال		عرب کے لئے نسل ندر کا استعمال
	عندلیب شادانی		عندلیب شادانی

مقالے	طرح	مقالے	طرح
پاکیزہ خیالیاں	میر ناصر علی (مرحوم)	پاکیزہ خیالیاں	میر ناصر علی (مرحوم)
اندلس کے آثار علمیہ	نیاز فتحپوری	اندلس کے آثار علمیہ	نیاز فتحپوری
نہیں ناوول	جلال الدین اکبر	نہیں ناوول	جلال الدین اکبر
اقبال کی ایک نظم پر علمی تنقید	مظفر علی سید	اقبال کی ایک نظم پر علمی تنقید	مظفر علی سید
یہ میراجی ہیں	منظر ممتاز	یہ میراجی ہیں	منظر ممتاز
غالب کی تصدیق	خیر بھوردی	غالب کی تصدیق	خیر بھوردی
غزل	فراق گورکھپوری	غزل	فراق گورکھپوری
غزل	رضا علی وحشت	غزل	رضا علی وحشت

باقی صدیقی غزل  
عبدالصغیر فطرت غزل  
صفیہ شمیم طبع آبادی غزل  
نظر حیدر آبادی غزل  
مضطر اکبر آبادی غزل  
باقر ہمدی غزل  
قمر لاشمی غزل  
فرید بخش قادری غزل  
باقر رضوی غزل  
آغا صادق غزل  
نفیس حیات غزل  
افضل حسین اظہر غزل  
ظہر نقبال حسنہ غزل  
چرش طبع آبادی رباعیات  
حکمراد آبادی قطعات  
میراجی پھیل بیچ شیطان کی رباعیات  
جسٹ ناقد آزاد گیتوں کی کوئلیا بوسے  
سلام بھیل شہری ایک دن  
قبیہم نظر منزل  
عبد الحمید بھٹی بس بھول بھی جاؤ  
عشرت رحمانی زندگی کی پکار

امام امجد دہ دیکھو  
قرۃ العینی حیدر برنارڈ شتا  
احمد ندیم قاسمی رئیس خانہ  
اوپندر ناتھ اٹک ادبی چمک بھونٹنا  
سعادت حسن منٹو بسم اللہ  
بلونت سنگھ دودھ بھری گلیاں  
عزیز احمد ناسیانی  
شوکت قحانوی سانچہ کو پیرچ  
فیاض محمود اور زندگی چلتی رہی  
صوفی بستم چہرہ دھری  
اشفاق احمد اتنی  
اسے حمید دہ ڈالیاں چھین کی  
انتصار حسین رشندہ  
مواد

### نظمیں

### برنارڈ شتا افسانے

کچھ کس ادب پالے نے { سید عابد علی عابد  
کچھ زیادہ متاثر کیا {  
اردو ادب کے بعض موجودہ { ابوہدایت صدیقی  
میلانات {  
جدید اردو ادب کے بعض {  
مسائل { ڈاکٹر عبادت بریلوی  
غالب کا نظریہ شعر مرتزحین  
میر سے بھی صدم خانے جلال الدین احمد  
قدیم اردو کی درزیہ شہزادان نصیر الدین اعظمی  
مرے بو ریاض الاسلام  
فقوش بجا مشرت انصاری  
اقبال کی شہسوی میں طنز کا لہر شمس الدین صدیقی  
میں میراجی کو نہیں جانا شوکت قحانوی  
ردی کے بھاؤ اشتقاق احمد  
غزل رضا علی وحشت گلکنزی  
غزل حکمراد آبادی  
غزل عذیب شادانی  
غزل عابد علی عابد  
غزل عبد الحمید عدم  
غزل تنبیل شفاقی  
غزل عبد الملطیف پیش (مرحوم)  
غزل قیوم نظر  
غزل انجم رومانی  
غزل امین عزیز سیانکوٹی  
غزل مختار صدیقی  
غزل سلام بھیل شہری  
غزل ہلالی سید باری  
غزل حیرت شملوی  
غزل اقبال صفی پوری  
غزل شاعر لکھنوی  
غزل حنا جان بھری  
غزل ناصر کاظمی  
غزل اختر سید شہزاد پوری  
غزل تابش دہلوی  
غزل ادیب سہارنپوری

### میراجی غزلیں





غزل	شہرت بجلدی	حسن تخلیق	احمد ندیم قاسمی
نوار	ہمارے دوش پر (افسانہ) انور سجاد	تجدیدی	اشتر الالبان
مقالے	تم سبڑھنے کی لگن (نظم) فردا زیدی	ساز	عبدالمجید عدم
	کو حریف خود یا کچھ لوفرنے (غزل) انوار حسین ناشی	منزل	مجید امجد
	طبقہ معتزلہ	عطا کر صاحب	محمد رحماندھری
	بر تار و شا	سیاہوں کی آواز	مشور علیگ
	ناہید کی داستان	مشرقی بنگال	جگن ناتھ آزاد
	قطبہ شہزی کی لسانی خصوصیتاً احتشام حسین	بتالے نگار عین زاید گینی	سلام بھلی شہری
	باری صاحب	بھگوان تو ان میں کوئی نہیں	سوامی مارہروی
	غند کی ادنی تاریخ کا ایک حق خواجہ احمد فاروقی	ہیں	خاطر غزنوی
	ناولٹ کی تکنیک	انٹظار	عبدالصمد بڑ فطرت
	بلتسان کے لوگ گیت	نقد و نظر	نارنگ بخاری
	ہندوستان میں مغلیہ فن صوری ربیعہ سلطانہ	یہ سہائے بیسویک و حالے	جلیل ملک
	ماہ نقابانی چندا	مقالے (۱) شجرہ و شاعر	
	فتح خاں، رابعہ		

### ۲۲-۲۱

افسانے	سایہ	غلام عباس	غلام شادانی
موزیل	سعدت حسن منٹو	نظیر اکبر آبادی کا عہد	ابوالکلیث صدیقی
الحمد للہ	احمد ندیم قاسمی	شاد عظیم آبادی	عزیز احمد
ریت کا تودا	ممتاز مفتی	خسرو	غلام جیلانی برق
شاید کہ بہار آئی	علی عباس حسینی	آکھڑ و کھٹہ تو پہچان مجھے	انتظا حسین
وہی زمانہ، وہی فسانہ	قرۃ العین حیدر	سر شمایا تھا کہ سنگ یاد آیا	اخلاق احمد دہلوی
تیسری کروش	صہدہ ناقد	غزل	جگر مراد آبادی
ذلیل ہیئتہ	ابراہیم جلیس	غزل	فراق گورکھپوری
چور	شہاب احمد دہلوی	غزل	آنند نرائن ملہ
سہیلی کے نام	اسے - حمید	غزل	اثر کھنوی
مجھ	انتظا حسین	غزل	عابد علی عابد
روک کے کنارے	سعدت حسن منٹو	غزل	رضا علی وحشت
اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو	جوش ملیح آبادی	غزل	غلام مصطفیٰ تبسم
اکبر نامہ	اکبر الہ آبادی	غزل	اسرار الحق مجاز
بار خاطر	شوکت قنادی	غزل	عبدالمجید عدم
رباعیات	جوش ملیح آبادی	غزل	قتیل شگافی
سدا پا	جگر مراد آبادی	غزل	نہالی سید ہاروی
انقلابی	نہ - راشد	غزل	شعری بھوپالی
		غزل	شاد عارفی
		غزل	ناصر کاظمی
		غزل	ناصر کاظمی

غزلیں

مکاتیب

نظمیں

جوہر الہیہ، راہِ بندہ، سلوک، مددِ خدا، انوار، شوکتِ صدیقی،  
تسلیمِ سلیم چغتاری، بلونتِ سنگھ، مددِ خدا، انوار، شوکتِ صدیقی،  
عشرتِ رحمانی، محمود باغی، زراہدہ قیصر، رفیعہ سلطانہ،  
تیسرے وقتِ عظیم

۲۳-۲۴

خلووع	محمد طفیل
ناولٹ	لونت سنگھ
افسانے	سعد حسن منڈ
	احمد ندیم قاسمی
	رینا ز شیریں
	اشفاق احمد
	افتخار حسین
	اسے محمد
	فکر تونسوی
	صبح صادق حمید
	حجاب انصاری علی
	جوش ملیح آبادی
	فراق گورکھپوری
	اثر کھنوی
	احمد ندیم قاسمی
	اختر الایمان
	مجید امجد
	ابن انشاؤ
	پروفیسر شورو
	یوسف ظفر
	سلام محلی شہری
	حمایت علی شاعر
	قرآن جلالی
	شوکت تھانوی
	فراق گورکھپوری
	حفیظ ہوشیار پوری
	مجنون گورکھپوری
	عابد علی عابد
	آل احمد سرور

### نظمیں

### مرکب ترتیب نظمیں

غزل	ممتاز صدیقی
غزل	باقی صدیقی
غزل	اکبر، راجپوری
غزل	سلیم احمد
غزل	نور مجتہدی
غزل	شانی الحق حقی
غزل	شیر کھنوی
غزل	نابش دیوی
غزل	نارغ سجاری
غزل	قیوم نظر
غزل	شہرت سجاری
غزل	تاجہ رسانی
غزل	رضا ہمدانی
غزل	بابش صدیقی
غزل	اختر انصاری، گبر آبادی
غزل	انجم علی
غزل	فخر حیدر آبادی
غزل	منیر نیازی
غزل	پروفیسر آغا صادق
غزل	عبد اللہ خاور
غزل	شہزاد احمد
غزل	احمد ظفر
غزل	جمیل ملک

### مقالے (۲) ادب و تنقید

ہماری داستانیں	ممتاز عظیم
سرمایہ الہیاتی خط اور افادیت	منار حسین
غزل کا مستقبل	عبادت بریلوی
امریکی ہجارت نامہ	اثر کھنوی
ایسی مہندی ایسی مستی	جلال الدین احمد
توزیب کی بنیادیں	سید علی عباس جلال پوری

### ادب

ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، تاجی عبد الغفار، ڈاکٹر یوسف حسین،  
محمد الہین زور، خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، احتشام حسین، متاثرین  
شیخ محمد امجدیل پانی پتی، حامد علی خاں، اثر کھنوی، ضاعی وحشت، شوریگان  
شاد عارفی، محمود عابدی، نگار تونسوی، تاجہ رسانی، لیکن خان، ڈاکٹر محمد کھنوی، کرن چند

### مختصر افسانے مدجائی

سعادت حسنی	آئندہ رانی ملے	غزل
حیات اللہ انصاری	اثر لکھنوی	غزل
عزیز احمد	احسان دانش	غزل
مرتاز مفتی	حکیم ناقد آزاد	غزل
محمد علی رودلو	عدم	غزل
ہاجرہ مسرور	تعبیر کاظمی	غزل
شوکت قانوی	تقبیل شغلی	غزل
خدیجہ سنو	شاد عارفی	غزل
حجاب امتیاز علی	نامہ کاظمی	غزل
مہر ناز	نامہ کاظمی	غزل
اشفاق احمد	انجم رومانی	غزل
انظام حسین	شہرت بخاری	غزل
عادل رشید	راؤ مراد آبادی	غزل
کرشن چندر	اقبال صفی پوری	غزل
خواجہ احمد عباس	باقی صدیقی	غزل
عصمت چغتائی	قرآن لوی	غزل
(عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کے خطوط سے ایک ہی کتاب کی ترتیب)	شاہ لکھنوی	غزل
شاہد لطیف اور اخلاق احمد	ظہور نظر	غزل
مرواج سون سنگھ	نور بجنوری	غزل
یرید یوروم تھا	عابد حسینی	غزل
نئے افسانے گلار چاندنی اور انہ جیرا	نجم نقوی	غزل
برجیا	عابد علی عابد	غزل
جب وحشت کا جگر چیرا	محی الدین زور	غزل
بڑی ہو بیگم	خواجہ احمد فاروقی	غزل
لندن لیٹر	نصیر حیدر	غزل
رپورتاژ	شیخ محمد اسماعیل بانی بیتی	غزل
تراجم - مختصر افسانے	حفیظہ شاہ پوری	غزل
پینچ پریمیر (دہلی)	خطبہ صدارت	غزل
خون کا رشتہ (گجراتی)	محبت پر کیا گدڑی	غزل
مقتول (دہلی)	نقش فریادی پر ایک نظر	غزل
خواب (ممبئی)		
کچھ قیدیوں کے پاس میں (فرانسیسی)		
پیغمبر اخلاق (دہلی)		
تنہا گریختی (انگریزی)		
ایک ریل کا حادثہ (برمنگھم)		
سعید جاہ اور عدنان (ڈیج)		
	احمد ندیم قاسمی	غزل
	علی عباس حسینی	غزل
	تسلیم سلیم جتوئی	غزل

### مقالے

### طویل مختصر افسانے

۲۶-۲۵ (افسانہ نمبر)

سنا

جل پری

حیات نو



۲۹-۳۰ (پنج سادہ نمبر)

مقالے	طرح	محمد طفیل
حالی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون { تذکرہ رحمانیہ }	مولانا حالی	
آسان اردو	ڈاکٹر عبدالحق	
تفصیل دہلوی تصانیف پر کتابداری	ڈاکٹر مختار الدین احمد	
اسلامی ادب	فراق گورکھپوری	
واجد علی شاہ کی ایک نادر تصنیف	ڈاکٹر ابو لیث صدیقی	
باغ و بہار کے فسوفی کردار	سیدہ قمار عظیم	
صدر الدین آزاد کے	خواجہ احمد فاروقی	
غیر مطبوعہ خطوط		
نوال کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سعادت بریلوی	
ناسخ کی جذبات نگاری	ڈاکٹر عبدلیب شادانی	
مرزے دار شاہ	محمد حسن حسینی	
چند یادیں	عبد الرحمن چغتائی	
انگریزی ناول کا اردو ناول پر اثر	ڈاکٹر احسن فاروقی	
غالب اور حیدر آباد	ڈاکٹر نصیر الدین خان	
نظائیں، نقولیں، اختلاط و مارط	چروش طبع آبادی	
غزل	فراق گورکھپوری	
غزل	فیض احمد فیض	
شباب کے پھیول	احمد ندیم قاسمی	
غزل	عابد علی عابد	
غزل	آل احمد سرور	
غزل	اشرف کھنوی	
دعوت نامہ	احسان دانش	
غزل	صوفی بستم	
آخری ملاقات	اختر الایمان	
غزل	اختر انصاری	
نوروز	عبد الحمید عدم	
غزل	عبد الحمید عدم	
دہلی	تقیہ شفقانی	
غزل	تقیہ شفقانی	

شاعر	محمد امجد
غزل	رضا علی وحشت
افسانہ آں شبے	نگین ناغہ آزاد
غزل	مشاعر عارفی
ملاح	پرویز شہزاد
غزل	انجم رومانوی
نئے رائجے	محمد رحمان شہری
غزل	ناصر کاظمی
نہند کی ندی	عویز شاہ مدنی
غزل	عبد الحمید بعلبی
سحر سے پہلے	ظہور نظر
غزل	باقی صدیقی
انقلابی	قادر بخاری
غزل	سدام بھلی شہری
خفاہ گندم	خاطر غزنوی
غزل	احمد فراز
سرحد	نور بھجوری
غزل	شاہد کھنوی
دیپ سے دیپ جلے	احمد ریاض
غزل	زہرہ نگاہ
ایک سورت کے نام	احمد ظفر
غزل	عبد المعز بظفرت
دن ڈھلے	منیر نیازی
غزل	جلیل ملک
وقت اور زندگی	عویز شاہ مدنی
غزل	اختر ہوشیار پوری
غزل	محمد شاہد
افسانے - دیو رتاژ، طنز، ڈرامے	
سٹون بگ	احمد ندیم قاسمی
تنہائی دمسلسل	محزون گورکھپوری
پانی کا درخت	کرشن چندر
پانچواں مقدمہ	سعادت حسن منٹو
رجیم بابا	علی عباس حسینی
بندہ پرورد کب ملک	کنہیا لال کپور
میرا گھر	مستاز مفتی



۳۵-۳۶

### مقالے

اممول نادری (نیر مطبوعہ) مولانا حالی (مرحوم)  
 پنج اکبر سہلہ حسن قادری  
 کچیر کے بارے میں قاضی عبدالودود  
 ڈاکٹر راوہا کرشنی اور قاضی ڈاکٹر غلام جیلانی برزق  
 اردو غزل ڈاکٹر ابو الیث صدیق  
 قیسی کا نظریہ شعر ڈاکٹر وحید قریشی  
 ادب میں روایت اور بغاوت { آنسہ شہناز ہاشمی  
 کارشتہ

### نظمیں غزلیں

جوش بیخ آبادی غزل شکست زنداں  
 جگر مراد آبادی غزل  
 فراق گورکھپوری غزل  
 عابد علی عابد غزل  
 اتر کھنوی غزل  
 آل احمد سرور غزل  
 شاد عارفی غزل  
 عایم غزل  
 عدم غزل  
 نظیر کا شمیری غزل  
 مجید امجد غزل  
 عکین ناقد آزاد غزل  
 پرو فیس سرور غزل  
 حیرت شملوی غزل  
 عبد المجید بھٹی غزل  
 شاد کھنوی غزل  
 غلام غفر غزل  
 اقبال صفی پوری غزل  
 حامد عویض مدنی غزل  
 سلیم احمد غزل  
 نور مجنوری غزل  
 احمد فراز غزل  
 تیغ الد آبادی غزل  
 سلیم و احد سلیم غزل  
 عارف عبد المتین غزل

کراہتے ہوئے دل  
 ایک کہانی، ایک افسانہ

اسلم کی لطافتیں غلام جیلانی برق  
 عزیز شادانی کا فنون نظیر صدیقی  
 فراق گورکھپوری غزل  
 عابد علی عابد غزل  
 عزیز شادانی غزل  
 احمد ندیم قاسمی غزل  
 رضا علی رحمت غزل  
 کیفی چریا کوٹی غزل  
 اختر انصاری غزل  
 محمود جالندھری غزل  
 مجید امجد غزل  
 شاد عارفی غزل  
 جگن ناقد آزاد غزل  
 ناصر کاظمی غزل  
 سلام کھلی شہری غزل  
 فضل غزل  
 راز مراد آبادی غزل  
 باقی صدیقی غزل  
 جمیل ملک غزل  
 احمد ریاض غزل

ظہر و مزاج چچا رام کے نام دو ملاحظہ  
 خاموش نغمے غزل  
 سگریٹ پیسے کی آزادی غزل  
 افسانے، ڈرامے غزل

ادب پر ناقد اشک غزل  
 سعادت حسن منٹو غزل  
 غلام عباس غزل  
 احمد ندیم قاسمی غزل  
 انور عظیم غزل  
 پرکاش چند غزل  
 غلام علی چودھری غزل  
 انیس احمد غزل

آل احمد سرور  
 محمد طفیل

### شخصیات

جگر مراد آبادی  
 جگر صاحب



نہال  
نہال نے  
ثبوت منفی  
ثبوت سنگہ حبیب  
پتیا  
مدت آپ کے لئے  
اجنستا  
بدعین عورت  
خواجہ کی چیزیا  
لی زرا  
حکیم کی بیگم  
خلش (درہ) ایرا احمد  
نیزاجم  
نیزاجم کے بعد (آرٹھ) محمود حسن احسنی  
کچھ فسانہ عجائب کے بارچیں رشید احمد صدیقی  
پہلے قاعدہ  
شکرت تھانوی  
تخصیبات فراق گورکھپوری  
فراق کی شخصیت  
فراق صاحب  
اسلامی ادب میری گزارش  
انجمن ادبی رسائل پاکستان (ساقی سے)

۳۷-۳۸ (افسانہ نیر)

(۱)  
نکھی کی نانی  
برودہ فروش  
شادی  
کالی تیزی  
مکڑی کا جال  
مسوری سہارہ  
چچا جان  
گماری کے انٹے  
گمہ بنتیا  
نکھی کی نانی  
برودہ فروش  
شادی  
کالی تیزی  
مکڑی کا جال  
مسوری سہارہ  
چچا جان  
گماری کے انٹے  
گمہ بنتیا

اب یہاں کوئی نہیں کوئی  
تسلیم سلیم جھنڈا  
نہیں آئیگا

بھابی جان  
زرد گلاب  
مردی عورت، کالا مرد  
ابراہیم جلیس

احمد  
اجنبی لڑکی  
انسان کا درخت  
بھنور اور چھانچا  
گریز  
آپا  
مالک  
رنگ سنگ  
فٹ پائری  
ست بھائی (۲)  
منا  
کنیز  
ریوے یکیش  
خکار گاہ سے  
لالہ صحرانی  
گلڈریا  
مردہ گھر  
کچی نبولی  
نئے سال کا آخری دن  
یا قوت اور لیمپ  
دوسری شادی  
عصمت جغتائی  
بلونت سنگھ  
حیات اللہ انصاری  
شکرت تھانوی  
نور وار د بونے  
تقدیر زندہ ہے  
اردو افسانے میں روایت اور تجربے  
جسمہ لینے والے: سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی،  
سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مسرور  
انتظار حسینی، حمید اختر، شکرت تھانوی۔

۳۹-۴۰

ملور  
بحوث تخلیق کی جمہوریت  
قرۃ العین حیدر  
محمد طفیل  
(اسلامی ادب)

اسلامی ادب  
ادب برائے حافظیت  
اسلامی ادب  
ادب میں یہ تقسیم کیوں؟  
اسلامی ادب کا مسئلہ  
آفتاب احمد، ڈاکٹر احسن قادری، حامد حسن قادری  
ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر بریلیٹ صدیقی

افسانے گفتگو  
محبت میں ہوئی۔  
حکیم بانا  
پیش کشی کمانی  
گھر کی عورت  
تغیر شیخ  
میمونی  
مرثیے  
ریت کی دیوار  
پوسٹ آفس  
شخصیات احمد ندیم قاسمی  
نوریم صاحب

کوشی چندر  
ل۔ احمد  
علی عباس حسینی  
سعادت حسن منٹو  
مست زعفرانی  
آغا بابو  
خاطر نقوی  
ترجمہ شاہد احمد دہلوی  
ترجمہ شروین کمار وراما  
ترجمہ غلام حسینی مصطفیٰ  
عبادت بریلوی  
محمد طفیل

۴۱-۴۲ (غزل نمبر)

(۱)  
دلی دکنی  
سودا  
مصطفیٰ  
جرات  
نظیر اکبر آبادی  
مومن  
بہادر شاہ ظفر  
ناخ  
میر میسنائی  
حالی  
شاد عظیم آبادی  
آزاد انصاری  
اقبال  
مصغر گوٹروی  
مگر سراد آبادی  
فراق  
یگانہ  
حقیقہ جالندھری  
فیض احمد فیض  
ناثیر  
عبدالحمید ساکت

میر تقی میر  
درود  
میر حسن  
انشاء  
غالب  
ذوق  
شیفہ  
آتش  
دارغ  
اکبر الہ آبادی  
ریاض خیر آبادی  
آرزو لکھنوی  
حسرت مولائی  
فانی بدایونی  
جوش ملیح آبادی  
آثر لکھنوی  
سیلاب  
انجمن شیرانی  
حقیقہ جوشیار پوری  
عابد علی عابد

نغمیں نغمیں راجیات  
غزل  
غزل  
غزل  
غزل  
غزل  
میں سے دہان تک  
غزل  
تنہا  
غزل  
قبول کی محبت  
غزل  
مروضہ کی تلاش  
راستے  
دایپی  
غزل  
غزل  
بہاری بی بی بہین کے سیاہوں  
فاصلہ  
غزل  
ایک اجنبی لڑکی  
تین زمانے  
غزل  
غزل  
غزل  
دلالمہ  
غزل  
غزل  
غزل

جوش ملیح آبادی  
آثر لکھنوی  
فراق گوکھپوری  
عابد علی عابد  
احسان دانش  
احمد ندیم قاسمی  
شاد عارفی  
مجید امجد  
جلیل خدوائی  
مدد  
عرش طیبانی  
تقیل شغائی  
پروندہ سرشار  
ایم انشا  
باقی صدیقی  
شاعر لکھنوی  
سوامی مادھوی  
تیغ الہ آبادی  
خلیل الرحمن عظمیٰ  
ورد بخوری  
احمد ریاض  
شہرت بخاری  
نظر حیدر آبادی  
قمر اجنادی  
حمایت علی شاعر  
سلیم واحد سلیم  
جمیل ملک  
تنویر نقوی

چرخ حسن حسرت	مردنی تبسم	حقیق ماکس پوری	حسن مار پوری
اصول دانش	سافر نظامی	فرخ ناردی	کشتی داتریر و پوری
خود انصاری	شاد عارفی	سوپر مولانا محمد علی	دلی شاہجہاں پوری
نہالی سید پوری	اسرار الحق مجاز	بیگم وادلی	آغا حشر کاشمیری
معینی حسن جذبی	احمد مدیم قاسمی	دشت گلگتوی	آسی الدلی
محمد امجد عدم	سیف الدین سیف	ماجور نجیب آبادی	عبد اللطیف پٹن
غنیہ کاشمیری	فتیل شغائی	ظفر تابان	عن لیب شادانی
ساتو کدھیا نوزی	مجدوح سلطان پوری	علی اختر حیدر آبادی	تلوک چند محرم
گھٹیل مدایونی	فضل احمد کریم فطی	آنند نرائش ملا	روش صدیقی
ناصر کاظمی	ابن النشار	میراجی	جوش علیانی
سراج دکنی	شاہ دیارک آبرو	جلال الدین اکبر	آل احمد سرور
شاہ حاتم	فعال	ماہر القادری	سراج الدین ظفر
منظر جان جاناں	میر سوز	مختار صدیقی	یوسف ظفر
قائم چاند پوری	بیگم	انجم رومانی	قیوم نظر
بیان، تراجم احمد	حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت	حیرت شعلوی	سکندر علی دھند
میر محمدی بیدار	عبدالحی تابان	ادیب سہا پوری	ذوالفقار علی بخاری
سید محمد میر اختر	جعفر علی حسرت	غلام ربانی تابان	راز مراد آبادی
سعادت یار خاں رنگین	شاہ نصیر الدین نصیر	شان الحق حق	مجید امجد
ممنون	شہیدی	باقی صدیقی	حکمی ناقد آزاد
دربار کھنوی	مدبا کھنوی	عوش علیانی	ظہور نظر
نسیم کھنوی، دیا شنکر	رند کھنوی	منیا جانندھری	احمد رباق
نسیم دہلوی، نواب رزا اختر علی	غلیہ دہلوی	احمد راجی	عارف عبدالستین
مرزا قربانی علی بیگ سالک	مجدوح، میر صدی	شہرت بخاری	ظہر آزاد احمد
جلال کھنوی	نسیم کھنوی	سلام بھلی شری	شاعر کھنوی
صابر دہلوی	ظہار رام پوری	جعفر طاہر	حبیب اشرف
بیان یزدانی میر علی	حفظ جو پوری	کیمین حسن کلیم	سلیم احمد
بیمودہ دہلوی	چکبست	نور بجنوری	اصغر سلیم
نظم علی خانی	وحید الدین نسیم پانی پتی	سافر صدیقی	عظیم مر نطقی
شرکت بگرای	عشر کھنوی		
منظر خیر آبادی	شبلی نعمانی		
حسن بریلوی	نسیم بہرت پوری		
بہزاد دہلوی	ساتو دہلوی، امر ناقد		
سائل دہلوی	آغا شاعر دہلوی		
ضقی کھنوی	ناطق کھنوی		
ناطق گل و گلشوی	نور کھنوی		

(۴)

(۳)

(۵)

آفتاب شاہ عالم بادشاہ  
 آصف نواب زیر آصف اللہ و لہو  
 آشتیہ مرزا و ناطق بھٹے خاں  
 اسد، میرامانی  
 انیس، میر بر علی  
 امیر، مظفر علی

جیل ملک

آرزو، سراج الدین علی خاں  
 امیر، نواب محمد یار خاں  
 احسن، مرزا احسن علی  
 انجام، عہدہ الملک امیر خاں  
 امید، قریب باش خاں

اشتیاق، ولی، امیر سرسندی  
 باقم، صاحب سیر  
 امین، خواجہ حسن الدین  
 امانت، کهنوی  
 اختر، نواب و امیر علی شاه  
 احسان، شاه جهان پوری  
 اثر، ابد و امام  
 بقا، صیغ، بقا، وند  
 بیجا، شاه جهان پوری  
 بہار، گلشن ابدی  
 جمل، حیات باقی  
 قلی، لالہ شکارام  
 تشنہ، محمد علی  
 ثناء، خواجہ ابوالدین محمد علی  
 خوشش، شیخ محمد و حسن  
 حوزی، میر محمد باقر  
 حسامی، حسام الدین حیدر  
 حسین، سید صادق علی  
 دیوانہ، رشتہ سرب کش  
 رشک، علی اوسط  
 رششان، نواب ابوالدین محمد علی  
 راقم، قمر الدین  
 زکی، نواب محمد زکریا خان  
 سلیمان، نواب میرزا محمد علی خان  
 شوق، قدوائی، احمد علی خان  
 قمر، امیر لعل علیا علیا علیا  
 شیدا، صیغ، الملک حکیم محمد علی  
 صبا، لالہ کاظمی علی  
 صنعت، مراد مادی  
 شمع، میر محمد الدین  
 عاجز، عارف الدین محمد علی  
 عارف، حکیم نواب علی خان  
 فراق، آفتاب اللہ  
 قدوی، لا پوری  
 حق، قاضی ابوالدین کهنوی  
 احمد، میرزا حسن  
 امانت، میرزا امانی  
 افسوس، میر شیر علی  
 آفتاب، مفتی صدر الدین  
 احمد، میرزا عبدالعزیز علی گورگانی  
 اسلم، میر علی  
 جو، میرزا احمد علی  
 برق، کهنوی، مرزا محمد رضا  
 بسمل، سوہانی  
 بیتاب، حکیم آبادی  
 تنہا، محمد علی  
 قلی، میر حسن  
 ثناء، کهنوی، ذاکر حسین  
 جوی، مرزا انیس بیگ  
 حیران، میر سعید علی  
 حیا، مرزا زکیم الدین  
 خاک، میرزا محمد یار  
 خلیق، میر مستوفی  
 دیکر، مادی پوری  
 رشکی، نواب محمد علی خانی  
 راج، مولوی عبدالرحمن  
 رستا، امیر علی (تلمیذ داغ)  
 سجاد، میر سجاد اکبر آبادی  
 سحر، جویا علی  
 شاو، غازی پوری، حکیم سید محمد  
 شاد، ہمارا کشتی پرستاد  
 شفق، محمد پوری  
 صبیحہ، بیکرانی، سید فرزند احمد  
 ضیا، میر ضیا الدین  
 طاہر، فرخ آبادی  
 عشق، عظیم آبادی  
 عظیم، مرزا عظیم بیگ  
 فقیر، میر محمد الدین  
 قدرت، شاہ قدرت اللہ  
 قدوائی، سید غلام حسین

کمال، شاہ کمال الدین  
 گستاخ، رامپوری، کر امت اللہ  
 مانجی، مرزا محمد یار بیگ  
 منت، میر قمر الدین  
 فتنہ، میاں نور الاسلام  
 تہر، حاتم علی  
 منیر، گلگاہ آبادی  
 محوی، کهنوی، مولوی محمد حسین  
 نیاز، شاہ نیاز پوری  
 ناظم، نواب یوسف علی خان  
 ندرت، میر علی شعیب احمد  
 ولا، مظفر علی خان  
 دنا، رامپوری، حکیم عبداللہ علی خان  
 بدایت، شیخ بدایت اللہ  
 بحر، شاہ پوری، نواب انیس علیا  
 (۶) ہری چند اختر  
 اسد، ملتان  
 عشرت، رحمان  
 وحید، قربانی  
 شاد، زمین کار  
 غنیمت، جادوی  
 محمد، نسیم  
 اختر، ہوشیار پوری  
 خاطر، غوثی  
 فارغ، بجاری  
 سلیم، واحد سلیم  
 مر، قاضی ابوالدین  
 زہرہ، گلگاہ  
 نواب، شاہ جهان بیگ شیریں  
 نزاکت  
 امرا، حبان زہیرہ کهنوی  
 موتی، حبان موتی  
 لطیف، محمدی حبان صاحب کهنوی  
 دیکر، امرا حبان  
 شہزاد، حبان شہزاد  
 قلی، نواب فقیر محمد علی  
 محبت، مرزا حسین علی  
 مفتی، مرزا ابراہیم بیگ  
 محبت، شیخ ولی اللہ  
 مروت، صغیر علی  
 معرفت، مرزا الہی بخش  
 مظهر، پوری، حکیم اسد علی خان  
 شاد، محمد امالی  
 لڑا، ظہور اللہ خان  
 نظر، کهنوی، نوبت راستہ  
 واقف، شاہ واقف  
 وحید، الہ آبادی  
 ہادی، میر محمد جواد  
 باخمی، میر باخمی  
 ہوس، نواب مرزا محمد تقی  
 شہری، جویا علی  
 کشتی، ملتان  
 شرکت، نقلاوی  
 خلیل، الرحمن اعظمی  
 حوزی، انیس احمد  
 کیفت، حکیم ہاشم حبان  
 تاج، جویا  
 اقبال، صفی پوری  
 احمد، فراق  
 رضا، ہمدانی  
 احمد، نظیر  
 اد، اجضری جابوئی  
 نواب، اختر محل اختر  
 نواب، بادشاہ محل عالم  
 قرن، حبان مشتیزی کهنوی  
 رینت، بیگم نازک  
 بیگ، حبان خیریں  
 شاد، حسین باندی بنالوسی  
 نور، حبان ناز

محمد طفیل	طرح	ڈرامے
ادیبند تاجہ خٹک	تکے کا سہارا	
امجد حسین	کلاؤ ناٹش موت سنیا ناس	
کنہیا لال کپور	مشکنت	افسانے
سلام بھلی شری	بابا نور	
احمد ندیم قاسمی	غزل	
سعادت حسن (غزل)	چادر گوٹ	
ممتاز مفتی	ناختہ کی چوچ میں دانہ	
دیوبند رتیار مٹھی	مصنفہ اش کا خوب	
لی۔ احمد	بھیا دیو ج	
ابوالفضل صدیقی	کچھ ہوا ڈبہ	
انتظار حسین	چپکھارا	
جیلانی بانو	نظمیں، غزلیں، غجوتی برسات	
جوش ملیح آبادی	جنگ	
فراق گورکھپوری	غزل	
جگر مراد آبادی	غزل	
فیض احمد فیض	غزل	
فراق گورکھپوری	غزل	
اثر لکھنوی	غزل	
ہادی علی عابد	غزل	
احمد ندیم قاسمی	شکر	
اختر انصاری	غزل	
احسان دانش	غزل	
ابن انشاء	اداس رات کے آنکھ میں	
خدا عارفی	غزل	
شمال سیوہاروی	غزل	
عبد المجید حیرت	غزل	
جگتی ناتھ آزاد	غزل	
پروفیسر شورش	مدیر نقوش کے نام	
جلیل قدوائی	غزل	
ناصر کاظمی	غزل	
تبیح آبادی	ایک نظم	
منیر نیازی	لیلا	

محمد طفیل	طرح	ڈرامے
ڈیوید زلیخا	ڈیوید زلیخا	
کتنے کی موت	کتنے کی موت	
بھنگن	بھنگن	افسانے
گڑیا لکھ	گڑیا لکھ	
پا بریدہ	پا بریدہ	
چھوٹے سو گئے	چھوٹے سو گئے	
وڈر لینڈ میں	وڈر لینڈ میں	
شاہراہ عبدالغنی	شاہراہ عبدالغنی	
لمبی حسینہ	لمبی حسینہ	
بار خاطر	بار خاطر	مرکب تریب
فراق اپنے خطوط کی روشنی میں	فراق اپنے خطوط کی روشنی میں	فراق گورکھپوری
غزل اور منتخب لیں	غزل اور منتخب لیں	
(۱)	مولانا حالی، آل احمد سرور، سیار فقیر، سید احتشام حسین، عبد السلام ندوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، حاجتین قادری، عہدت بریلوی، ڈاکٹر مسعود حسن، جنوی، سید قاری عظیم، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین، سید باسند حسین، سید اعجاز حسین، فیض احمد فیض، علی سرور، جعفری۔	
(۲)	ولی دکنی، سراج دکنی، آبرہہ، حافظ فغان، میر تقی میر، مسودا، میر درد، مظہر جان جاناں، سوز، شیخ قائم، یقین، میر محمدی بیدار، عبدالحی تاباں، میر انور، نگین، مصطفیٰ، غلام حسن، جواہر، الفضل، نظیر اکبر آبادی، نصیر و ممنون، مغالب، موسیٰ، ذوق، بہادر شاہ ظفر، شبلیہ، ناسخ، آتش، شہبیدی، سالک، مجروح، داغ، اہرینائی، حالی، جلال، تسلیم، اکبر، ریاض، آرزو لکھنوی، اقبال، حسرت موہانی، ہضر گوگردی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، جوش، سداق، میرزا یگانہ، حفیظ جالندھری، سیماب۔	
	سکیمپور محمد (اردو غزل کا مستقبل)	
	حصہ لینے والے :- عبد المجید سالک، صدیقی تبسم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سبط حسن، سید قاری عظیم، کلیم الدین احمد، جوش، سداق، اقبال، حسرت موہانی، ہضر گوگردی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، جوش، سداق، میرزا یگانہ، حفیظ جالندھری، سیماب۔	
	ممت	
	غزل	
	فراق گورکھپوری	

شہسب علی مولوی عبدالحق فواب خواجہ عبدالحق  
آزاد کھنڈی چودہری حبیب احمد  
(۲) ڈاکٹر مولوی عبدالحق عبادت بریلوی  
ابوالکلام آزاد غلام رسول مہر  
علامہ تاتاریہ کیفی رحمت قطعی  
خواجہ حسن نظامی ملاد احمدی

مولانا محمد المصباح دیوبادی حکیم عبدالحق دریا بادی  
ڈاکٹر ذاکر حسین ڈاکٹر سید عابد حسین  
مرزا محمد سعید اشرف صہبوی  
مولانا حامد حسن قادری ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی  
رشید احمد صدیقی آل احمد سرور  
بجنوں گوہر کھنڈی فراق گوہر کھنڈی  
ڈاکٹر زور ربیعہ سلطانہ  
آثر کھنڈی شیخ ممتاز حسین چوہدری  
جگر صاحب رشید احمد صدیقی

حفیظ جالندھری عرب بزم ملک  
امجد حیدر آبادی نصیر الدین دہلوی  
عابد صاحب محمد طفیل  
مخفی کستانی میرزا ادیب  
مولانا صلاح الدین احمد وزیر آغا  
چودہری محمد علی ردووی بیگم اخلاق حسین  
عندلیب شادانی ڈاکٹر شوکت مہزوری  
ڈاکٹر شوکت مہزوری سید مشکور عظیم  
منٹو ماموں (۳) حامد جلال  
کرشن چندر ہندو ناقد  
حصمت چغتائی خالد لطیف  
راجندر سنگھ بیدی کنہیا لال کپور  
احمد ندیم قاسمی خدیجہ مستور  
خواجہ احمد عباس صالحہ عابد حسین  
ممتاز مفتی مسعود قریشی  
قرۃ العین حیدر ابن سعید  
دیونند ستیا رتھی پرکاش پندت  
خدیجہ مستور ہاجرہ مسرور  
شفیق الرحمن محمد خالد اختر  
تسلیم سلیم چغتائی سلمیٰ خورشید منیر

غزل نور مجنوی  
جے بیگم کرل احمد ریاض  
غزل فارغ بخاری  
غزل جمیل ملک  
باغ و بہار اور قبولِ عالم سید وقار عظیم  
جہانِ غالب قاضی عبدالودود  
میر کاظمی شعور ڈاکٹر عبادت بریلوی  
اقبال اور گادش ٹیپو اور کوکت غلام جیلانی  
نئی اسے گرافیا اسلوب احمد انصاری  
شب بیداری مولفین  
ان کی باتوں میں ملکوں کی خوشبو حافظ محمد شیرانی  
ڈاکٹر تاثیر، حامد حسنی قادری

۴۷-۴۸ (تخصیصات منیر)

شخصیت شخصیت نگار  
محمد حسین آزاد آغا محمد باقر  
مولانا شبلی نعمانی سید صباح الدین عبدالحق  
حالی خواجہ غلام الحسین  
مہدی افادی عبدالمصباح دریا بادی  
مولانا عبدالحق شمس خاکی قزلباش  
گرامی سوز بزم ملک  
مولانا عبدالحق سلیم روشن بانی پی  
مرزا رسوا علی عباس حسین  
آغا حشر عشرت رحمانی  
میر ناصر علی انصار نامری  
مولانا راشد الخیری فضل احمد خاں دیوبند  
اقبال ڈاکٹر خلیفہ عبدالحق  
غانی جوش طبع آبادی  
مرزا عظیم بیگ چغتائی شاہد احمد دیوبند  
سید سجاد حیدر یلدرم قرۃ العین حیدر  
مولوی عنایت اللہ بھوی شیخ محمد اسماعیل پانی پتی  
پروفیسر شیرانی ڈاکٹر سید عبداللہ  
مرزا فرحت اللہ بیگ مرزا حصمت اللہ بیگ  
حسرت مولوی جمیل قدوائی  
مولانا سید سلیمان ندوی سید صباح الدین عبدالحق

نقیض احمد نقیض  
 کنہیا لال کچھو  
 شہد احمد بلوی  
 کلیم احمد بنی احمد  
 سرور صاحب  
 لاہور کی چند ادبی شخصیتیں  
 ولی کی چند ادبی شخصیتیں  
 کلکتہ کی چند ادبی شخصیتیں  
 حیدر آباد دکن کی چند  
 ادبی شخصیتیں  
 سر سید احمد خان  
 ڈپٹی مڈر احمد  
 ریاض علی خیر آبادی  
 پریم چند  
 سر عبدالقادر  
 ڈاکٹر تاثیر  
 میراجی  
 شورش کا خمیری  
 ابو الجبر ہودودی  
 صوفی مجسم  
 احتشام حسین  
 احمد ندیم قاسمی  
 نصیر بابہ  
 خلیل الرحمن داؤدی  
 اقبال عظیم  
 سائرہ خانم  
 مکین حسن کلیم  
 پریم ناتھ دور  
 شوکت تھانوی  
 احمد ندیم قاسمی  
 عشرت رحمانی

## منٹو کی غیر مطلوبہ کہانیاں

بائی بائی  
 بارش  
 تصویر  
 نصیبہ  
 خود کشی  
 ایک زائدہ ایک فاحشہ شیدا  
 کشیش  
 مانی جتنے  
 افشا نے راز  
 حادثہ  
 بدتمیزی  
 پشاور سے لاہور تک  
 جھلی پھولان  
 بڑھا کھوٹ

منٹو کی منتخب تخلیقات :- جگمگ ، سو ذیل ، می ، بالو گولہ ،  
 کالی شہر ، قوہ شیک سنگھ ، اس موجد صابر ہیں ، نیا قانون ،  
 شہید ساز ، سیاہ ماسیے

منٹو کا فن  
 منٹو کی فنی تکنیکیں  
 منٹو کا فن  
 منٹو کا مقام  
 گنگا منہ شہ  
 منٹو  
 منٹو کی حقیقت نگاری  
 سعادت حسن منٹو کی یاد میں  
 منٹو کی شخصیت  
 میرادوست ، میرادوست  
 منٹو ، میرادوست  
 منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط  
 احمد ندیم قاسمی  
 جوہانہ نسکا  
 رحمدل دہشت پسند  
 ابو سعید قریشی  
 منٹو ماموں کی موت  
 حامد حلال  
 منٹو کی موت  
 غلام عباس  
 منٹو کی زندگی  
 محمد طفیل

## شخصیات نمبر کے بارے میں

ہودی عبدالحق ، نیاز فقہوری ، عبد المجید سالک ، عروشی و سپروز  
 رشید احمد صدیقی ، یانک رام ، احتشام حسین ، مسعودین ہودی  
 کرشن چندر ، ڈاکٹر سید امجد حسین ، امیس نے رحمت ، خواجہ احمد فاروقی  
 غلام عباس ، آغا شہرمت ، زاد عارفی ، حجاب اسیرانی  
 نگر تونسوی ، ابن الفشاد ، فارغ بخاری ، حیلانی بانو

منا صدیقی





صمد کا راز  
 دلہن کی پوشاک  
 بیویوں کا بھجور  
 افسانوی مہنامیں کا دور  
 شہزادہ کا باز اڑیں گستاخاں  
 ہو کھٹکی کی سیر  
 جہاں آباد  
 دیباہوں کی لکھ بانی  
 نود و پشیمان  
 ریاکار  
 بہت کی بیٹی  
 حاجی بخلول کا ہومیں  
 اردو افسانہ  
 غارت خان و گلستان  
 طوق آدم  
 کیو پڑوس لیلی  
 سمن پوش  
 بھینٹ  
 تیسری جنس  
 کفن  
 جہاں شمار  
 چینی کی ناگوشتی  
 پریم کی چوڑیاں  
 اندھا دیوتا  
 تہن پیسے کی جھوکی  
 مید گھمٹی  
 ڈالی کا جوگ  
 زندگی  
 لاری میں  
 کہ عالم دوبارہ نیست  
 لیل  
 کیا کر  
 دولت خاندن

(پہلا دور)

(دوسرا دور)

تازو  
 دھن تیرگی  
 جنت قمر  
 لکھ ماتا  
 رسیدہ  
 سنبھالا  
 نیند نہیں آتی  
 مہارٹوں کی ایک رات  
 دلی کی سیر  
 جوان مودی  
 زندگی کے موڑ پر  
 نیا قانون  
 گرہیں  
 چو بختی کا جوڑا  
 ہماری گلی  
 آنندی  
 پریشور سنگھ  
 آپا  
 زعفران کے پھول  
 مجھے جانے دو  
 حماروں کی یونہی  
 نئی مصیبتیں  
 حرام جادی  
 زریں تاج  
 آخری کوشش  
 بیگن کا پودا  
 لال دھرتی  
 گلیاں اور کانٹے  
 جگمگ  
 بھالو  
 خون  
 جلا وطنی  
 میٹھی سے پھلے بلالے پھلے  
 میرزا ادیب  
 صادق الخیری  
 شیر محمد اختر  
 مسز عبدالغفار  
 صالحہ عابد حسین  
 سجاد عظیم  
 رشید جہاں  
 محمود الظفر  
 کہنشی چندر  
 سعادت حسن منٹو  
 راجندر سنگھ بیدی  
 عصمت چغتائی  
 احمد علی  
 غلام عباس  
 احمد رفیع تھاکر  
 ممتاز مفتی  
 خواجہ احمد عباس  
 اختر حسین اسٹے پوری  
 ملک راج آنند  
 رشید جہاں  
 حسنی عسکری  
 عزیز احمد  
 حیات اللہ انصاری  
 اوپنڈنا تھاٹک  
 دیو نند ستیا دتی  
 اختر اور بڑی  
 بلونت سنگھ  
 ہاجرہ مسرور  
 انور  
 قرۃ العین حیدر  
 خدیجہ ستور

(تیسرا دور)

(چوتھا دور)

مذہب احمد کے مذہبی افکار و کلام احمد کی سچی تفصیلات  
یاد بھانڈ  
محل نظر

جذبہ عشق نہیں شہپر پر غارت نہیں  
یہ تیرگی شب ہی کچھ صبح ملاز آئی  
نہ وہ غارت کسی رگبذر کو دیکھتے ہیں  
زلف سرکش بے نیاز ہی وحش  
رشتہ ساجوہاں دست و گریباں میں دیکھا  
دحوال سا اک سمت اٹھ رہا ہے شرابے اُڑ اڑ کے آ رہے ؟

نظم: ہا ہنگ جنوں	مکاتیب	فراق کے خطوط
مرطالعم	صاحب	فراق گورکھپوری
نظمیں غزلوں	رباعیات	جوش ملیح آبادی
دکھان سخی	حبیب حیدر دست	فراق گورکھپوری
غزل	عابد علی عابد	فیض احمد فیض
غزل	صدیقی تبسم	عابد علی عابد
غزل	عدم	صدیقی تبسم
قطعات	اختر انصاری	عدم
غزل	غلام ربانی تاباں	اختر انصاری
گفتگوئے بہار	انشیاء علی عروشی	غلام ربانی تاباں
غزل	میکش اکبر آبادی	انشیاء علی عروشی
غزل	شاد عارفی	میکش اکبر آبادی
غزل	فضل احمد کریم فضل	شاد عارفی
غزل	عبد المجید حیدر	فضل احمد کریم فضل
تبسم کی چوری	صحور رحمان دھری	عبد المجید حیدر
غزل	ناصر کاظمی	صحور رحمان دھری
غزل	مشاعر کھنڈی	ناصر کاظمی
غزل	اقبال مصطفی پوری	مشاعر کھنڈی
سہرورد اندھیرا ہے	نور مجنوری	اقبال مصطفی پوری

غزل  
خداؤں سے اترو  
حمایت ملی شاعر  
احمد ریاض  
خیل الرحمن اعظمی

جینی  
اللہ  
تائیتہ  
زندہ چھوٹے  
سرحد صوبہ  
ٹوٹ گیا ایک ٹاٹا  
سمندر اور زمین کے  
کھڑا  
سرگزشت  
جہاں میں رہتا ہوں  
آب حیات

پاجی ولایت  
آکھہ مجھئی  
ابا ادرتب  
روپ چند  
تجاور  
گدڑا (پانچول دور)

آغا بار  
شکید اختر  
ہنس راج و مہر  
مدلیقہ بیگم سیواری  
عبدالرحمن جغتائی  
اشفاق احمد

راہوں کے دیس ہیں  
اے حمید  
بیسرا آدمی  
شوکت صدیقی  
اچھو دھیا  
انتظار حسین  
سمجھوتہ  
پرکاش پیٹل  
چاند بھگیا  
سر لادیوی  
موم کی مریم  
جیلڈی بانو  
نور عظیم  
نور عکسی جیوان

مقالات داستان سے افسانے تک  
 مختصر افسانے کا فن  
 مغربی افسانہ کا اثر  
 اردو افسانہ پر { ممتاز شیریں  
 اردو افسانے کا مستقبل محمد حسن عسکری  
 اردو افسانے میں روایت { (طا کرہ)  
 اور ترقی

54-55

مقالے ڈپٹی نذیر احمد کا ذہنی تجربہ ڈاکٹر سید امجد احسن  
نذیر احمد کی انفرادیت ڈاکٹر سید عبداللہ





نیکین کاظمی	نیکین کاظمی
خلیل الرحمن اعظمی	خلیل الرحمن اعظمی
شاہ ولی الرحمن کاکوی	شاہ ولی الرحمن کاکوی
سید قاری بخاری	سید قاری بخاری
محمد اسماعیل پانی پتی	محمد اسماعیل پانی پتی
محمد الدین مارہروی	محمد الدین مارہروی
ڈاکٹر سید محمود	ڈاکٹر سید محمود
احمد بن علی	احمد بن علی
ڈاکٹر سید اعجاز حسین	ڈاکٹر سید اعجاز حسین
ابوالخیر مودودی	ابوالخیر مودودی
ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
غلام یحییٰ	غلام یحییٰ
ممتاز حسین چمنپوری	ممتاز حسین چمنپوری
مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی	مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی
محمد دین فوق	محمد دین فوق
خواجہ شمس الدین	خواجہ شمس الدین
صغیر احمد صدیقی	صغیر احمد صدیقی
محمد وارث کامل	محمد وارث کامل
ممتاز حسین چمنپوری	ممتاز حسین چمنپوری
مشیم زرداری	مشیم زرداری
میاں بشیر احمد	میاں بشیر احمد
محمد الدین احمد آردو	محمد الدین احمد آردو
محمد وارث کامل	محمد وارث کامل

۶۱-۶۲ (سال ہجری)

چور (غیر مطبوعہ)	سعدت حسن منٹو
امضای کے نگینہ	امتیاز علی تاج
حاجا حاتم طائی کا	کنہیا لال کچور
دلت چور اور چاند	بلونت سنگھ
ہادق سرے کا پیش	حجاب امتیاز علی
ایک پھول، ایک کار	منند ناٹھ
سلت دن کی بادشاہت	کشمیری لال ڈاکر
زینہ	ابو سعید قریشی
ایک انسان کی موت	فکر قوسوی
پکی اینٹ	غلام علی چمنپوری

جیل امدان	جیل امدان
احمد سعید	احمد سعید
سنگھ راٹھی	سنگھ راٹھی
محمد سی انیس سو ستون	محمد سی انیس سو ستون
سید ثریا سلطنت	سید ثریا سلطنت
الوار حسن ڈاٹھی	الوار حسن ڈاٹھی
جوش علی آبادی	جوش علی آبادی
جگر مراد آبادی	جگر مراد آبادی
سیاب اکبر آبادی	سیاب اکبر آبادی
عابد علی عابد	عابد علی عابد
احمد نیر تاحی	احمد نیر تاحی
سراج لکھنوی	سراج لکھنوی
آمنہ ٹرائننگ	آمنہ ٹرائننگ
سحین جلی	سحین جلی
اختر انصاری	اختر انصاری
عدم	عدم
فضل احمد کریم فضلی	فضل احمد کریم فضلی
عروشی راجپوری	عروشی راجپوری
شاد عارفی	شاد عارفی
اشک راجپوری	اشک راجپوری
شور علیگ	شور علیگ
شور علیگ	شور علیگ
قتیل مشقانی	قتیل مشقانی
غلام، بابی تاباں	غلام، بابی تاباں
حیرت شملوی	حیرت شملوی
اکرم رومانی	اکرم رومانی
جلی ناٹھ آزاد	جلی ناٹھ آزاد
رازمراہ آبادی	رازمراہ آبادی
ناصر کاظمی	ناصر کاظمی
سوامی مارہروی	سوامی مارہروی
ظہور نظر	ظہور نظر
ظہور نظر	ظہور نظر
شنام لکھنوی	شنام لکھنوی
نور بجنوری	نور بجنوری

نعلیں غزلیں

عبد الحمید عدم  
بائتر لکھنوی

پہلا خط  
دوسرا خط

42-42

گر خن چنڊر  
خديجہ مستور  
بلونت سنگھ  
شبکت عقالوی  
اے حمید  
کشمیری لالہ ذاکر  
بو سعید قریشی

محل مر  
آمرے  
عات، چور اور چاند  
ادارہ مجبور و تکفین  
پر دشم، پر دشم  
پر داند کے زخم  
مٹی

محمد سعید  
شہور الہی  
نئی سنگھ  
بید الرحمن صدیقی  
رشن چندر  
ناٹا مار

سفید چادر  
پاگل کنوں  
مریم  
گولڑکا پیڑ  
نیا گھر  
روپیہ جلتا ہے

ق گور کچوری  
ق گور کچوری  
ق گور کچوری  
ق گور کچوری

فنیہ پارس  
فنیہ ہندی  
زل  
زل  
ا

المجد  
المجد  
المجد  
المجد  
المجد

ملک کی  
کارن  
ل  
تو دگی

مجدد  
محقق آزاد  
مطبع آبادی  
نوی

س  
دم  
یات

مائی  
شیلو  
مئی

میں بھڑکی باتیں ہیں

مصطفیٰ احمدی  
 میر نازی  
 دعوہ قریشی  
 صحبت علی شاہ  
 احمد ریاض  
 آغا صادق  
 پریم دہ بستی  
 مظہر امام  
 جمیل ملک  
 اختر ہوشیار پوری  
 شکیب جلالی  
 مظہر امام  
 بلیں حشمی  
 قمر مدی  
 لانا محمد علی جوہر

انا عبد المجيد ديبا باري  
 فخ محمد اكرام  
 به الدين احمد  
 نبي عبد الوود  
 راود بنهي  
 اجند ناه شيدا

اکرم محمد حسن  
اردو حید قریشی  
اب احمد

سید ابوالفتح مودودی  
مختار الدین احمد آرزو  
ارٹھی  
لب محفوظ

ملک  
میں قذوائی  
مجلس  
لی

مقالے

فہرست شخصیات

۱۹۵۹ء کے کچھ ہی بنیادی پیدل مولانا غلام رسول میر  
۱۹۵۷ء میں اپنا علم پر کیا گوری شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

۶۵-۶۶ (مکاتیب نمبر)

علم و ادب میں خطوط کا درجہ	غلام رسول میر
اردو خط نگاری	ڈاکٹر سید عبد اللہ
اردو کے منفرد مکتوب نگار	مالک رام
مشاہیر ادب (سوانح)	محمد عبداللہ فریشی
غالب دہلوی	۸ خطوط
سید احمد خاں	۶ خطوط
محمد حسین آزاد	۵ خطوط
امیر سینائی	۴ خطوط
داغ	۴ خطوط
منشی ذکار اللہ	۴ خطوط
ڈپٹی نذیر احمد	۷ خطوط
مولانا حالی	۴ خطوط
نواب حسن الملک	۳ خطوط
نواب ذکار الملک	۹ خطوط
جلال کھٹونی	۴ خطوط
شبلی نعمانی	۴ خطوط
اکبر الہ آبادی	۶ خطوط
شاد عظیم آبادی	۱۰ خطوط
مولانا عبد اللہ عظیم شرر	۱۰ خطوط
ڈاکٹر سید محمود	۳ خطوط
رسانہ امپوری	۷ خطوط
سید احمد دہلوی	۷ خطوط
ریاض خیر آبادی	۹ خطوط
غلام قادر گرامی	۶ خطوط
سید آزاد امام اثر	۳ خطوط
نظم طباطبائی	۶ خطوط
حبیب الرحمن	۸ خطوط
علامہ انبیا	۹ خطوط
سر عید القادر	۳ خطوط
مولانا محمد علی جوہر	۱۰ خطوط
مولانا شوکت علی	۴ خطوط

خزل	شاد و عافی
خزل	انتباہ علی ہوشی
خزل	جدید ہجرت
خزل	جدید ہجرت
پیام نظرت	پروغیر شور
خزل	پروغیر شور
خزل	الحکم دومان
خزل	سلام مچھن شہری
خزل	فوز بکھری
خزل	اقبال صغی پوری
خزل	نواب تنیس الحسن
خزل	مصطفیٰ زیدی
خزل	حمایت علی شاعر
میراث	فارغ بخاری
بر لوگ	احمد ریاض
میں اور ہم	پرویز شہادی
رباحیات	شکیب جلدی
بھنگا ہوا مسافر	بلراج کول
اک جھل سی لڑائی	عظیم قسیمی
خزل	پریم وار برہمی
خزل	افضل پرویز
خزل	مظہر امام
خزل	رضا بھدانی
خزل	جیل ملک
خزل	احمد ظفر
خزل	ظفر قبیل
خزل	رفعت سلطان
خزل	عباس کھجاسی
نثر نگاروں کی شاعری	مولانا عبد اللہ ماجد بیادی
اردو شاعری پر پختہ اثرات	ڈاکٹر محی الدین زور
مرزا سواکی تنقید نگاری	ڈاکٹر محمد حسن
اردو جہان کا ایک نثر	محمد طاہر قادری
اشارہ یا استعداد	ڈاکٹر شہزاد سبزواری
مرقعہ اکبر تجریدی	سید علی عباس جلالپوری
ملک حبیب احمد خاں	غلام رسول انور

نمائے

۷ خطوط	شادان بگرامی	۳۱ خطوط	مرکش پریشان
۱۴ خطوط	سیاب اکبر آبادی	۳۲ خطوط	بیژد جانی
۷ خطوط	فرحت المذہب	۲ خطوط	خواجہ حشر کندی
۷ خطوط	قانی بدایونی	۳۱ خطوط	ماشاء الخیری
۵ خطوط	آرزو کھنوی	۶ خطوط	حکیم اجل خاں
۷ خطوط	عمود مشیرانی	۳۱ خطوط	سائل دہلوی
۳۱ خطوط	تاج و بخت آبادی	۹ خطوط	محمد دین فوق
۵ خطوط	یگانہ چنگیزی	۳۱ خطوط	ڈاکٹر انصاری
۲۸ خطوط	قاضی عبدالغفار	۸ خطوط	غلام حبیب نیرنگ
۳۱ خطوط	سلطان حیدر جوش	۳۱ خطوط	سرحد ہادر سپر
۹ خطوط	اختر خیبرانی	۱۰ خطوط	آغا شاعر قزلباش
۳۱ خطوط	ڈاکٹر تاثیر	۳۱ خطوط	ظفر الملک
۹ خطوط	عبدالسلام ندوی	۲۶ خطوط	احسن مارہروی
۳۱ خطوط	چراغ حسن حسرت	۱۱ خطوط	صفی کھنوی
۸ خطوط	اختر جوناگڑھی	۶ خطوط	دیازائیں بیگم
ایک خط	(۲) سید نذیر حسین محدث دہلوی	۶ خطوط	وحید الدین سلیم
۳۱ خطوط	نواب سرسبز اللہ خاں	۱۰ خطوط	نصیر حسین خیال
۲ خطوط	محمد سیح اللہ	۳۱ خطوط	جالب دہلوی
ایک خط	ابو محمد عبدالغنی	۶۱ خطوط	سید سلیمان ندوی
۲ خطوط	سر آسمان شاہ	۹ خطوط	خواجہ حسن نظامی
ایک خط	سید شوکت حسن شوکت فہمی	۲۱ خطوط	داتر بیگم
ایک خط	مولانا اعظم علی آزاد	۶ خطوط	منظر حسن بیلانی
ایک خط	رضا بگرامی آرزو	۸ خطوط	سجاد حیدر بیدرم
ایک خط	نواب صدر الدین حسین	۵ خطوط	مظفرت اللہ خاں
ایک خط	میر شکوہ آبادی	۹ خطوط	سر راس مسعود
ایک خط	مولوی خدابخش	۵ خطوط	مرزا محمد بادی عزیز کھنوی
ایک خط	سید عبدالحمی	ایک خط	خواجہ عزیز الدین عزیز کھنوی
۲ خطوط	سید عباس حسن فصاحت	۳۱ خطوط	مفتی کفایت اللہ
ایک خط	امیر علی رضوی	۳۱ خطوط	عبدالرحمن بخنوری
ایک خط	حبش امیر علی	۲۸ خطوط	ملشی پریم چند
۲ خطوط	سید علی بگرامی	۹ خطوط	احضر گوٹہ ندوی
ایک خط	سید میر حسن	۱۱ خطوط	حسرت موہانی
ایک خط	مولانا میر حسن	۱۲ خطوط	دعشت گلگتوی
۲ خطوط	عبدالرزاق کاندھری	۱۹ خطوط	پروفسر محفوظ الحسن
ایک خط	شاہ سلیمان پھولاری	۲۸ خطوط	مشی میڈریشاد





ایک خط	ممتاز مفتی	ایک خط	ڈاکٹر تارا چند
ایک خط	بلونت سنگھ	ایک خط	فراق گورکھپوری
ایک خط	سوپر احمد	ایک خط	مالک نام
ایک خط	قرۃ العین	ایک خط	ڈاکٹر علی الدین زور
ایک خط	عجائب امتیاز علی	ایک خط	امتیاز علی مرثی
ایک خط	ہاجرہ مسرور	ایک خط	سید مسعود حسن رضوی
ایک خط	خدیجہ مستور	ایک خط	شیخ محمد اکرام
ایک خط	تسلیم سیم چٹاری	ایک خط	پروین سجاد حسن قادری
ایک خط	کنہیا لال کپور	ایک خط	پروین سیم محمد شفیع
ایک خط	شکوہت نقوی	ایک خط	مرواہ حسین احمد دتی
ایک خط	معین احسن جذبی	ایک خط	شیخ محمد عبداللہ
۲ خطوط	میراجی	ایک خط	جوش طبع آبادی
۳ خطوط	منٹو	ایک خط	حنیفہ جالبہری
۴ خطوط	مجاز	ایک خط	حکیم مراد آبادی
		ایک خط	نوح تاروی
		ایک خط	اثر لکھنوی
		ایک خط	آل احمد مسرور
		ایک خط	مفتی راہینہ آرزو
		ایک خط	سید احتشام حسین
		ایک خط	اختر حسین رائے پوری
		ایک خط	محمد حسن عسکری
		ایک خط	عذیب شادانی
		ایک خط	جوش ملیح آبادی
		ایک خط	سید امتیاز علی تاج
		ایک خط	فیض احمد فیض
		ایک خط	ای۔م۔ رائے
		ایک خط	کرشن چندر
		ایک خط	عصمت
		ایک خط	احمد علی
		ایک خط	راجندر سنگھ بیدی
		ایک خط	غلام عباس
		ایک خط	حیات اللہ انصاری
		ایک خط	علی عباس حسینی
		ایک خط	خواجہ احمد عباس
		ایک خط	احمد ندیم قاسمی
		ایک خط	ادیندہ ناتھ اشک

۶۷ — ۶۸ (دس سالہ نمبر)

محمد طفیل	طلوع
قرۃ العین حیدر	رپورتاژ ستمبر کا چاند
عصمت چٹائی	افسانے کلہوکی ماں
کرشن چندر	پریتو
احمد ندیم قاسمی	ماہنامہ
علی عباس حسینی	قلمی
ممتاز مفتی	دھند
بلونت سنگھ	رات، چور اور چاند
خدیجہ مستور	دل کی پیاس
اسے حمید	تاریک صلیب اور زرد چاند
ہندہ ناتھ	جو بکلیں
کشمیری لال ڈاکر	رات کی آنکھیں
جیلانی بانو	ایمان کی سلامتی
صادق حسینی	انسان اور صلیب
دیوندر رائے	دو ہزار روپے کا چیک
احمد سجد	انسان، اس کا گھوڑا اور خدا
نام لعل	بچتے چہرا
ڈاکٹر شفیق	ایک رات
ہاجرہ مسرور	درائے کھلی کھڑکیاں

منازع سامع  
تو خطبہ تقریری چراغِ انوارِ اسلام  
کشمکشِ لال کپور

ہمارے دوزخِ بیت  
غزلیں حکمِ صلح

غزل  
مشرق و مغرب  
غزل  
ایک مفلوج مددِ سبک

غزل  
غزل  
غزل  
غزل

غزل  
غزل  
غزل  
غزل

غزل  
غزل  
غزل  
غزل

غزل  
غزل  
غزل  
غزل

غزل  
غزل  
غزل  
غزل

غزل  
غزل  
غزل  
غزل

غزل  
غزل  
غزل  
غزل

غزل  
غزل  
غزل  
غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

غزل

احمد ریاض

خطبہ امام

کوثر نیازی

کوثر نیازی

حبیب حسینی

حبیب ملک

احمد ظفر

ظفر انبال

آتش لدھیانوی

ابن، انشا

پانچ چینی نظمیں کیسے کیسے لکھی

چکنو سے!

کوچ

سرخ رنگ دھوؤ نہیں

برفت کا گالا

عبد القادر سروری

پرو فیض علم الدین سالک

محمد عبداللہ قریشی

حضرت سید احمد بریلوی کی

داستانِ جہاد

میکش اکبر آبادی

غلام محمد شعلہ

واسد علی شاہ اور ان کی

بیگمات کے خطوط

قطب شاہی دور میں اردو ادب کی

رقعات

سید علی عباس جلاپوری

منظور الہی

م۔ ط

ع۔ ق

م۔ ط

ع۔ ق

م۔ ط

ع۔ ق

م۔ ط

ع۔ ق

مقالے

دارالاشکوہ کا دیوان

گل بگاؤنی

حضرت سید احمد بریلوی کی

داستانِ جہاد

اگرہ کی ردی شخصیتیں

غالب کی شاعری

واسد علی شاہ اور ان کی

بیگمات کے خطوط

قطب شاہی دور میں اردو ادب کی

رقعات

شیوہ جو مزدی کا آغاز

قرۃ العین طاہرہ

خونی جگر ہونے تک

داغ داغ اجالا

تبصرے

خونی جگر ہونے تک

داغ داغ اجالا

تبصرے

خونی جگر ہونے تک

داغ داغ اجالا

تبصرے

خونی جگر ہونے تک

# نقوش میں شائع ہونے والی تخلیقات کا خاکہ

(سلسلہ ۱۹۴۷ء سے سلسلہ ۱۹۵۷ء تک)

زمانہ ادارت: اگلی ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور

نمبر شمار	شمارہ نمبر	صفحات	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	نظریں	غزلیں	نظم و نثر	کتاب و صحائف
۱	۱	۷	۵			۶	۹	۲۷	۸۴
۲	۲	۸	۲			۷	۶	۲۵	۸۰
۳	۳	۱۰	۵	۱		۹	۷	۳۲	۱۰۴
۴	۴ (آزادی خبر)	۱۱	۷	۱		۱۳	۱۳	۴۵	۲۶۴
۵	۵	۱۷	۸	۱		۱۴	۹	۴۹	۱۹۸
۶	۶	۷	۵			۱۲	۸	۳۲	۱۲۰
۷	۷ (من خبر)	۱۲	۷			۱۴	۹	۴۲	۱۵۲
۸	۸ (آزادی خبر)	۱۰	۱۰			۲۲	۲۰	۶۲	۲۴۰
۹	۹	۴	۵			۸	۷	۲۴	۸۰
۱۰	۱۰	۴	۴			۹	۶	۲۳	۷۲
	میزان	۹۰	۶۰	۳		۱۱۴	۹۴	۳۶۱	۱۳۹۴

زمانہ ادارت: سید وقار عظیم

۱۱	۱۱ (خاص خبر)	۱۱	۱۲			۱۰	۱۷	۵۰	۲۰۰
۱۲	۱۳	۴	۴			۵	۱۴	۲۷	۷۲
۱۳	۱۴	۶	۵			۴	۱۴	۲۷	۷۲
۱۴	۱۵ (سالنامہ)	۱۸	۱۲			۱۰	۳۴	۷۴	۲۴۴
۱۵	۱۸ (آزادی خبر)	۳	۲	۱	۴			۱۰	۲۸۸
	میزان	۴۲	۳۵	۱	۴	۲۹	۷۷	۱۸۸	۸۷۶

زمانہ ادارت: محمد طفیل

۱۶	۲۰، ۱۹	۱۳	۱۰	۱		۱۵	۲۲	۶۱	۲۳۲
۱۷	۲۲، ۲۱	۱۵	۱۲			۱۶	۳۸	۸۱	۲۹۴

نمبر شمار	شمارہ نمبر	صفحات	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	تکلیفیں	غریب	مکمل تصانیف	تبدیل شدہ
۱۸	۲۳، ۲۲	۹	۹		۱	۱۲	۲۶	۵۷	۲۳۰
۱۹	۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸	۲	۳۸۰					۴۰	۴۰۰
۲۰	۲۷، ۲۸	۱۱	۹			۱۹	۲۰	۵۹	۲۳۰
۲۱	۲۹، ۳۰ (پیکار)	۱۶	۱۵	۱		۲۰	۲۵	۷۷	۴۰۸
۲۲	۳۱، ۳۲	۱۰	۱۰	۱		۶	۲۰	۴۷	۲۰۸
۲۳	۳۳، ۳۴	۱۱	۷	۱		۵	۱۳	۳۸	۲۰۸
۲۴	۳۵، ۳۶	۱۳	۱۱			۱۱	۱۷	۵۲	۲۳۸
۲۵	۳۷، ۳۸ (افسانے)	۱	۴۰					۴۱	۵۰۶
۲۶	۳۹، ۴۰	۸	۱۰			۱۲	۱۶	۴۶	۲۱۶
۲۷	۴۱، ۴۲ (غزل نمبر)						۸۱۵	۸۱۵	۴۸۰۰
۲۸	۴۳، ۴۴ (نیم غزل نمبر)	۵	۷	۲				۱۳	۲۵۶
۲۹	۴۵، ۴۶	۷	۸	۴		۸	۱۶	۲۳	۲۶۴
۳۰	۴۷، ۴۸ (قصیدہ نمبر)	۸۶							۷۰۰
۳۱	۴۹، ۵۰ (مثنوی نمبر)	۱۵	۳۰					۳۵	۳۸۴
۳۲	۵۱، ۵۲	۵	۱۰	۱	۱	۹	۱۶	۴۲	۲۳۸
۳۳	۵۳، ۵۴ (افسانہ نمبر)	۵	۱۱۰					۱۱۵	۱۰۹۰
۳۴	۵۵، ۵۶	۹	۸			۱۱	۱۷	۴۵	۲۰۸
۳۵	۵۷، ۵۸	۱۰	۷	۲		۱۲	۲۱	۵۲	۲۳۲
۳۶	۵۹، ۶۰ (قصیدہ نمبر)	۸۸						۸۸	۸۱۴
۳۷	۶۱، ۶۲ (سکندر)	۲۱	۱۶			۱۳	۲۹	۸۰	۳۸۴
۳۸	۶۳، ۶۴	۹	۱۱	۲		۱۴	۳۲	۶۸	۳۱۲
۳۹	۶۵، ۶۶ (مکاتیب نمبر)	۴	۱۲					۱۲۱۷	۱۰۳۸
۴۰	۶۷، ۶۸ (دو سالہ نمبر)	۱۲	۱۷	۲		۱۹	۲۲	۷۲	۴۵۶
	میزبان	۳۸۵	۱۷	۱۷	۲	۲۰۳	۱۱۶۶	۲۰۸	۱۰۰۰۶
	کل میزان	۵۱۷	۲۱	۶	۶	۳۲۶	۱۳۳۷	۲۷۱۷	۱۲۲۷۶

# ہماری کتابیں

۵/-	عزیز احمد	نبی آدمی	۶/-	شوکت قانوی	نیو فر
۱۰/-	"	خلفائے محمد	۳/۸	"	مولانا
۴/۸	جگر مراد آبادی	شعاعہ طور	۶/-	"	غزالہ
۲/-	رسوا	امراؤ جان ادا	۳/-	"	خدا خواستہ
۴/۸	ابوسعید قریشی	منٹو	۳/-	"	سودیشی ریل
۲/۸	عدم	قول و قرار	۳/۸	"	کتیا
۳/-	"	بیچ و خم	۳/۸	"	ساج کو آج
۳/-	منٹو	سرکندوں کے پیچھے	۲/۸	"	سسرال
۳/-	احمد زید قاسمی	آنچل	۳/۸	"	کارٹون
۲/-	"	بازار حیات	۳/۸	"	ماد دولت
۶/-	"	نقوش لطیف	۲/۸	"	بقراط
۲/۸	ڈاکٹر تانیر	عزیز کے نام	۴/-	"	جوڑ توڑ
۵/-	عابد علی عابد	ید بیضا	۲/۸	"	مضامین شوکت
۲/۸	ایم ایمن تنہا	سیاست الہیہ	۱۰/۸	"	قاضی جی (تین حصے)
۴/-	"	مضامین بحال الدین افغانی	۲/۸	"	غائب کے ڈرامے
۲/۸	رشید اختر ندوی	پندرہ انگشت	۳/-	"	غیرت وغیرہ
۳/-	محمد طفیل	صاحب	۲/۸	"	بھابی
۳/-	عابد علی عابد	انتقاد	۲/-	قتیل شفقانی	یومرن

ادارہ فروغِ اردو، لاہور

# مدیر نقوش

محمد طفیل

میرے بارے میں کسی رسمی طرح دورانیں بنتی چلی گئیں۔ کچھ لوگ مجھ سے ارادت رکھتے ہیں اور یہ ان کے دل کی فیاضی ہے۔ بعض لوگ مجھے دشمن سے یاد کرتے ہیں اور یہ ان کے دل کی تارافنی ہے۔ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں۔ اس کا فیصلہ آج نہیں، کل ہو گا۔ میں نے اپنی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے۔ یہ اوراق انہیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے کہ میں کتنا بُرا اور کتنا اچھا ہوں۔

ابوالکلام

آج میں آپ کی ان حضرات سے ملاقات کرنا ہوں جو اس سے پہلے اپنے کئی دوستوں کی پگڑیاں اچھال چکے ہیں اور دعوے یہ کرتے رہے ہیں کہ میں تو صاف گو قسم کا انسان ہوں۔ ارادہ ہے آج انہیں بھی صاف گوئی کی کسوٹی پر رکھ دیا جائے۔ صورت دیکھنے تو مسکین، بھولے بھالے، تجربہ مند اس کے برعکس، میں انہیں ۱۹۲۲ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ حضرت مجھے اب تک چمکے پر چمکے دیئے جارہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا؟ مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں ان کا بچپن کا دوست ہوں۔ اُس وقت کا دوست، جب یہ بجائے چلنے کے رہیں گے تھے اور اسی ادھی کہہ کر دھڑکی مانگا کرتے تھے۔

بعض نامعلوم کا خیال ہے کہ طفیل صاحب ایسے شریعت آدمی اگر پیدا ہونے بند نہیں ہوئے تو کیا بے ضرور ہو گئے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ اب تو ایسا برانڈ آتا ہی نہیں۔ یہ بھی اگر ان سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تو نقصان کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض بے تکلف دوست انہیں بے ضرور اور بے مقصد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہ جوں جوں بڑھتے گئے۔ والد کی مسلسل اور حیاں لیوا بیماری کی وجہ سے غریبی جو ان ہوتی گئی۔ وہ وقت بھی آیا کہ جب دو وقت کی روٹی کے بھی لالے بڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بے چارے کی تعلیم اور حوری رہی۔ انہیں ہائی اسکول میں پڑھتے تو دیکھا گیا ہے مگر ان کے پاس کوئی قلم و کتبھیسی۔ بنیڈ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے اکثر یہ فقرہ سننے میں آتا ہے۔ اچی سرٹیکٹ کو چھوڑیے۔ آج کل تو سکولوں اور کالجوں میں جہالت کے سرٹیکٹ جیتے ہیں۔

ان کی تیسری جماعت کا ایک واقعہ بھی آج تک یاد ہے۔ جب یہ حضرت اول درجہ کے گنہگار تھے اور خوب پٹا کرتے تھے۔ اگر استاد نے گھر پر کرنے کے لیے کام دیا تو یہ پٹائی سے نیچے کے لیے اپنے بی بی بھتیگوں کے گھروں پر جا کر، انہیں باتوں میں لگا کر، آنکھ پٹی کر باؤں کی عدم موجودگی سے غائدہ، عشا کر، اُس دن کام مکمل ہوئے صفحہ ہی پھاڑ لایا کرتے تھے۔ اس طرح خود سرخرو ہو کر دوسروں کو عیبت میں ڈال دیا کرتے تھے اور استاد اُن بیچاروں کو یہ کہہ کر خوب پٹا کرتے تھے ————— ”ہوئی، کسی نے کاپی میں سے صفحے پھاڑ لئے ہیں۔“

شمار ————— ہوں کاپی میں سے صفحے ————— تو ایک تو کام نہیں کرتے۔ دوسرے مجھوٹ بولتے ہیں۔

ایک دن، ان کا ایک ہم سبق، ان کے ہاتھ کی صفائی سے پٹ رہا تھا تو یہ اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے اٹھے اور اقرار کر لیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ صحیح ہے اور قصور وار میں ہوں۔ استاد نے ان کی صاف گوئی کی کوئی قدر نہ کی۔ اُسے اتنی عسکائی کی کراسول کی دیوار تک سمجھ گئیں۔ تب سے نہ جانے کیا ہوا کہ یہ پٹھائی میں نیزہ ہو گئے۔ اتنے تیز کہ استاد ان پر غور کرنے لگے۔

ان کی اس سے بھی پہلے کی مانتیں مجھے یاد ہیں۔ جو ممکن ہے اب ان کے لیے وجہ قنصلت نہ ہوں۔ مگر وہ باتیں ان کے صنفیل کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد دے ہی سکتی ہیں۔ یہ اپنے ماضی کی یادوں کو یکسر بھلا دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ انھیں یاد آتی جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی جھجھلا کر یہ شعر بھی دہراتے ہوئے پائے گئے ہیں۔

یا و ماضی عذاب ہے یا رب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ابھی یہ چار پانچ برس ہی کے ہوں گے کہ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنی خوب گت بنوائی۔ — رشتے، چچے اور کپا، گھر والوں نے جناب کی یہ حالت دیکھی تو بھڑوں کے چھتے کو حلاؤ ڈالا۔ کوئی دو سہین بعد بھڑوں نے بھر وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ انھوں نے دوبارہ چھتے میں ہاتھ ڈال کر، پنا حنیہ حسب سابق بنالیا۔ آج جبکہ اس واقعہ کو تیس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت ترک نہیں کی۔

انہی دنوں کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ جب یہ حضرت ٹھیک سے چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی ممانی کے ہاں ڈاکہ ڈالا۔ وہ بیچاری سب سے چھپ کر، چار پائی کے نیچے، زمین میں سوراخ کر کے اور اُس میں مٹی کا ایک چھوٹا سا آنچور لگا کر پیسے جوڑا کرتی تھیں۔ یہ حضرت ریگتے، چلتے موقعہ وار دات پر پہنچ گئے۔ ڈھکنا اٹھایا، پیسے نکالے، مٹی میں دبائے۔ برآمدے میں پہنچے تو برے بچوں نے چھین چھین کر خوب مزے کئے۔

چند دنوں کے بعد یہ حضرت پھر اُسی دفتہ پر، جتنے بھی پیسے ہاتھ آئے نکال لائے۔ ممانی نے موقعہ پر ہی چوڑ کو پکڑ لیا۔ خوب پٹا۔ پٹنی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں۔ ہائے ہائے طفیل تیرا بیڑا غرق، تو نے مجھ ”تمڑی“ کی ساری پونجی لٹا دی۔

کہتے ہیں کہ چور چوری سے چائے بھی تو بیر پھیری سے باز نہیں آتا۔ ایسی صاحب میرا پھیری کے ساتھ چوری سے بھی باز نہ آئے۔ جب یہ چھوٹے سے تھے تو چھوٹے چور تھے۔ بڑے بڑے تو بڑے چور ثابت ہوئے۔ پیسے ممانی کی اکٹیاں، دونیاں



جیسے چرایا کرتے تھے۔ سیٹے برس تو والدہ کی بڑی احتیاط سے چھپائی ہوئی نوہے کی سن، ونچی میں سے روپے تک چرانے لگے۔ یہ شہد کوئی جمنہ روٹھے پہلا ہوگا کہ والدہ کو ان کی شرافت کا علم ہو گیا۔ اس سے پہلے اس لیے پتہ نہ چلا کہ یہ چوری میں بھی عقل سے کام لیا کرتے تھے اور ایک ان میں، اب یاد دہانوں سے زیادہ شدید چرایا کرتے تھے۔

چوری میں لڑکھو بیارہوں گی۔ مگر ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک نہ ایک دن آدمی پکڑا جاتا ہے۔ چنانچہ طفیل صاحب بھی پکڑے گئے۔ ایک طوفان برپا ہو گیا۔ محلے والوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ صاحبزادے سے چوری ہے۔ ان کی والدہ نے چور کو والد صاحب کے حوالے کر دیا اور والد صاحب سے تقاضے کی طرف، اب طفیل صاحب رو رو کر منت سماحت کر رہے ہیں۔ ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ ناک دگڑ رہے ہیں۔ مگر والد صاحب اس سے صدمہ نہیں کھاتے۔

جب قحطانہ قریب آگیا تو جناب طفیل کے ہاتھ پاؤں اور بھرتے۔ جھکا دے کر دائی صاحب کی مضبوط گرفت سے اپنی ملائی پھرائی اور گھٹ بھاگے۔ ان کے والد صاحب، ورزہ سے پکارتے ہی رہ گئے۔ پکڑ پکڑ چور ہے۔ اب لوگوں کو کیسے یقین آئے کہ یہ جو جھوٹا سالانہ صریح پاؤں رکھ کر بھاگے جا رہا ہے، چور بھی ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد انھیں چوری سے، ایسی نفرت ہوئی کہ باقی زندگی میں، اس آرٹ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ورنہ طفیل صاحب تو اب بھی کہتے ہیں کہ میری ابتدا بڑی شاندار تھی۔

جب برس نہ اٹھا رہا ہو۔ کے ہوسٹے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ درخت اور والد کا جنازہ ایک ساتھ اٹھا۔ اب انھیں نہ صرف خود کو مار کر اپنا پیٹ بھرنا تھا بلکہ ایک چھوٹے سے گھرانے کی مال روٹی کی بھی فکر و تنگی تھی۔ اتنی سی جان اور زندگی لی یہ سب سے کھٹن راہ۔

چھ سالہ برس انھوں نے خوشنویسی کے کام پر ضائع کر دیے۔ مگر اس میں سے کچھ میں انداز بھی کیا۔ اس رقم سے، ایک دوست نے ان کے پاس سے پشیمان ہو کر، نو روپے کی رقم لے لی۔ اتنا تو آج کی دنیا میں، کچھ کم خطرہ نہیں ہوتا۔ اس پر ان کے بھی حین خوابوں کی تعبیر وہی ہوئی۔ جو معمولاً متوقع ہوتی ہے۔

اس واقعہ کا ان کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ بے زاری اور بے کاری میں جب نئی میسر نہ ہو گئے تو سلسلہ میں، انھوں نے ادارہ فروغ اردو کی داغ بیل ڈالی۔ ابتداً جو کچھ گزری، اس کی داستان کیا پوچھتے ہیں۔ بس یوں جاننے پریشانیوں اور مشایخوں کا یہ کہیں جانی برسوں ہی مقابلہ کرتی رہی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ یہ شکے دس گھر لوٹے، مٹھے پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئے۔ والدہ نے انھیں یوں پریشان دیکھا تو پوچھا ”بیشا کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں“

”کوئی بات تو ضرور ہے“

”بات یہ ہے کہ میں ساری دنیا سے اکیسے ہی لڑ رہا ہوں۔ کوئی بھی تو نہیں ہے جو میرا ساتھ دے۔ نہ رشتہ دار، نہ دوست؟“

”میرے سب عشق ہے مگر تو اکیلا نہیں ہے“  
 ”جی ہاں! میرے ساتھ ساری خدائی ہے“  
 ”تیرے ساتھ تیرے سوا کچھ ہے؟ تیری انگلیں ہیں۔ تیرے ارادے ہیں۔ اور میرا خدا۔“  
 ”سب کچھ میرے ساتھ ہے۔ مگر خدا میرے ساتھ نہیں“  
 ”ایسی کو اس نہیں کیا کرتے“  
 ”میں بھی انسان ہوں۔ بچپن سے اب تک ہزار دکھ بھیلے ہیں۔ مگر اب تک خدا کو ترس نہیں آیا“  
 ”دیکھ میں تجھے دو باتوں کی نصیحت کرتی ہوں۔ ایک یہ کہ صبر و ضبط کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ دوسرے کسی بھی کام کو ناممکن نہ جاننا۔“

غصیل صاحب نے ہمیشہ اپنے دوستوں کے رومانس کو برصغیرات بدنام کیا ہے۔ دل چاہتا ہے آج ان حضرات کا بھی کچھ لکھ دیا جائے۔ کئی عرصہ پہلے ایک صاحب نے غالباً انھیں بیوقوف سمجھ کر ان سے ذرا ویسی قسم کی غلطوکتا بت شروع کر دی۔ جب انھیں ان صاحب کی طرف سے پہلا خط ملا تو یہ پاگل خانے کی بیڑ میں پڑ ہی سمجھ گئے۔ وہ غلطوکتا بت نہایت دلچسپ تھی۔ سینکڑوں خطوں کا آنا جانا رہا۔ اگر محترم نے اظہارِ بے تکلفی فرمایا تو انھوں نے مفتی وقت بن کر فوراً ڈانٹ پلائی کہ یہ بات غلط، اگر محترم نے کوئی شرارت کی تو انھوں نے چھوٹی عرصہ بڑے میاں بن کر بڑی ہی سنی خیز ”بھوں“ کر کے شرارت کا مزہ بھی کر لیا کر دیا۔ اگر انھوں نے کوئی لگاؤ کی بات کی تو انھوں نے اپنا رشتہ ہی اس سے مختلف بنا دیا۔ غرض جتنی بھی نالائقیوں ان سے سرزد ہو سکتی تھیں۔ وہ ہو گئیں۔ آخری نالائقی یہ کی کہ اس دو طرفہ غلطوکتا بت ہی کو ایک دن جلا ڈالا۔ جبکہ ان میں سے ایک ایک خط کو خود آں جناب نے ایک ایک دو دو دن کی ریاضت سے کھا جلا تھا آج یہ خرد کو شمشیر کر کے بھی لکھنا چاہیں تو اُس جیسا ایک خط نہیں لکھ سکیں گے۔

ان سے واقعات پر۔ یہ کبھی ناول ہی لکھیں گے (بشرطیکہ انھیں کسی طرح ایک دو سو کی قید ہو جائے۔ ورنہ فرست کہاں) جس کی ضمانت کوئی چھ سو صلیات تو ہوگی۔ اُس میں ہیرو کی ہزدنی، نالائقی اور بیوقوفیوں کے ساتھ۔ دوسرے کی بہن سے اپنے بھائی کا پیار ملے گا۔

زندگی کے اس ابتدائی غلط تجربے ہی کی بنا پر، ان کا خیال یہ ہے کہ عورت ہی کو مرد پر عاشق ہونا چاہیے۔ مرد کو عورت پر ہرگز ہرگز عاشق نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت پر عاشق ہوتا ہے تو انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

یہ خواہ مخواہ کے ناصع مشفق بھی، ایک دن ایک صاحبہ انھیں ادارہ فروغِ اردو پر اکھلا پا کر ایک نہایت باتزاری قسم کا حویاں ناول خریدنے آئیں تو انھوں نے بھوں ہاں ہی نہ کی۔

وہ صاحبہ قدرے ترن کر بولیں۔ ”میں پوچھتی ہوں۔ خالص ناول ہے؟“  
 ”ہے تو مگر آپ کو نہ دوں گا۔“

”کیوں؟“

”وہ نادل بڑا مریاں ہے۔“

وہ بھٹا کر بولیں۔ ”تو مجھے بتائیے۔ آپ میرے سر پرست کب سے کہتے ہیں؟“

اس طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے مگر سوال یہ ہے کہ طفیل صاحب کو دوسروں کی بہنوں کے بارے میں، اپنی بہن کی طرح سچے کا کیا حق ہے؟ اگر حق ہے تو جب جواب ملتا ہے تو ایسے کیوں ٹھوٹے ہیں۔

ابھی کوئی ایک برس کی بات ہوگی کہ شامت اعمال اُس دن بھی یہ اکیلے ہی بیٹھے اپنے خیالوں کی دنیا میں گم تھے کہ ایک صاحب دندنائی ہوئی آئیں اور ان سے پوچھا۔ ”کنواری؟“ ہے؟

یہ بڑے پریشان ہوئے۔ مگر اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔ ”جی!“

”میں پوچھتی ہوں۔ دخترباکرہ کا اردو ترجمہ ہے؟“

”میں فارسی نہیں سمجھتا۔“

”تو کیا اردو بھی نہیں جانتے؟“

”جی نہیں۔“

طفیل صاحب کے اس جواب پر پہلے تو مسکراتے تھے مگر پھر پاؤں تک دیکھا۔ پھر پاؤں سے مرتکب اور انہی کے جواب ”جی نہیں“

کو اس انداز سے لٹایا۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ چند کہیں کا۔

طفیل صاحب سوائے اپنی ذات کے، ہر بات میں فحاشی کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور خوب صورت چیزوں پر تو جان بھی دیتے ہیں۔ یقین کیجئے، انھیں اس حد تک خوبصورتی خرابا ہے کہ کچھ نہ پوچھنے۔ ہر چیز میں حسن ڈھونڈتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن یہ اپنے نہایت ہی بے تکلف دوست سے کہہ رہے تھے۔ ”دیکھو! یاد رکھنا ہے کہ کنواری صاحبہ کن خوبصورت ہے۔“

خود ان کی اپنی ذات کا یہ حال ہے کہ اگر نیا کوٹ بھٹ گا ہے تو بھٹ جائے۔ پتلون پر چائے گر گئی ہے تو گر جائے۔ یہ پیٹے ہوئے کوٹ اور چائے گر گئی پتلون کے ساتھ بھی یہ خوشی منا کرتے چلے جائیں گے۔ پالش کے معاملے میں ان کے بوٹ عموماً خیم ہی ملے۔ مٹائی کے بغیر کوٹ اور جوتے ہیں اور بازار میں اکیلے جاتے ہوئے باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی پاگل!

ان میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر ایک انتظامی خوبی ایسی ہے کہ باقی تمام خوبیاں ان کے سامنے ہی ہیں۔ ان کے خاص خاص دوست جانتے ہیں کہ دعوت کے دن طفیل صاحب کو کھانا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چنانچہ انھیں حکم مل جاتا ہے کہ اب ہم کھانے پینے کا سامان ہمالوں کے سامنے رکھنے والے ہیں لہذا یا تو آپ یہاں سے چلے جائیں۔ یا ادھر کا رخ اس وقت کریں۔ جب ہم خارج ہو جائیں۔ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ یہ طفیل صاحب کے دوستوں کی کتنی زیادتی ہے۔ ویسے آپ اس کا فیصلہ ان کے انتظام کے ماتحت جو ایک شادی ہوئی تھی۔ اُس کا ذکر مٹیلنے کے بعد کریں۔

ان کے ایک نہایت ہی عزیز دوست نے انہیں بلایا کہ میری بہن کی شادی ہے اس میں شرکت کر کے میرا ہاتھ بٹاؤ۔ چنانچہ یہ پہلے پھر اسے وغیرہ کا کام مسمیٰ اور کے سرود تھا۔ ان کے ذمہ صرف یہ کام تھا کہ برات کو اپنی نگرانی میں کھانا کھلا دیتا اور جب دو لہا گھر میں داخل ہوتا تو یہ بار پہناتا دیتا۔

باتوں کی آواز قریب آنے لگی تو ان کے ہوش اُٹنے لگے۔ جوں جوں برات قریب آتی گئی، ان کے کان پیچھے اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ برات صحن میں داخل ہو گئی۔ اب انہیں دو لہا نظر نہیں آتا۔ پہلے لگا دیکھا ہوتا تھا۔ پھر حال کھٹا تھا۔ اس لیے دو لہا بن کر بھی آدمی ہی تھا۔ انہوں نے گھبراہٹ میں کسی اور کو دو لہا بجائی کا خطاب دے ڈالا۔

اب کھانا اُگل رہا ہے اور یہ شور مچا رہے ہیں۔ پلاؤ کی کتنی دیکیں ہیں۔ آٹھ۔ آٹھ سے کیا بنے گا۔ یہ حضرت تو پورے شہر کو لے کر آئے ہیں۔ شور با۔ دو۔ ڈال دو پانی۔ در نہ مارے جاؤ گے۔ اسی اثنا میں دو ایک بچے پلاؤ کی میٹ لے کر ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلنے چاہ رہے تھے۔ یہ بوکھلائے ہوئے تو تھکے ہی، انہوں نے رکھ کے جوتائے در تھپڑ ایک بچے کو رسید کیا تو وہ کم بخت پلاؤ پھینک زور زور سے رونے لگا۔ اب یہ اُسے منا رہے ہیں۔ یعنی خدا کے لیے چپ ہو جاؤ اور پلاؤ کی ایک چھوڑ دو پلیٹیں لے جاؤ۔ مگر وہ ایسا صدمی۔ پھر نہ پلاؤ دیتا تھا نہ چپ ہوتا تھا۔ آنا ناٹا انہیں ایک ترکیب سوجھی بھٹ ایک روپیہ جیب سے نکالا۔ بچے کی پھینکی پر رکھا۔ ساتھ ہی ہاتھ جوڑے، تب کہیں پھر راضی ہوا۔ اس پر بھی اُس بچے نے جا کر اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ماں بھی بچے کی طرح بڑی جھلی ماسٹ تھیں۔ ایک دم گامیوں پر اُتر آئیں۔ زنا نے میں گالیاں مل رہی تھیں۔ مردانے میں پلاؤ مل رہا تھا۔

جب برات چلی گئی اور گھر کے لوگ اکٹھے ہو کر بیٹھے تو سب کے سب ان کی باتیں یاد کر کے ہنس رہے تھے اور یہ پریشان ہو رہے تھے کہ خفی بھی باتیں ان سے منسوب کی جا رہی ہیں۔ وہ سب کی سب غلط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ، اپنی انتظامی صلاحیتوں کی یوں سنجیدگی دیکھ کر، اُمیدوار کے لیے تو بہ ہی کر چکے ہیں کہ اب کسی کی برات آئے یا جنازہ اسٹے۔ پر وہ ہی نہیں کرنی چاہئے۔

ان کے سر سے والد کا سایہ اُس وقت اٹھا۔ جب یہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھے (مگر فردوسی سلا ۱۹ء) اور والدہ کا سایہ اُس وقت اٹھا (ہر جون ۱۹۵۹ء) جب یہ اس دنیا میں آبرو مندانہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق، یہ سب کچھ والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ طفیل صاحب کا اپنی والدہ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی بارگاہ میں، کسی شمار قطار میں ضرور تھیں۔

بہاری سے دو دن پہلے کی باتیں آپ بھی سُن لیں :-

”بیٹا یہ میری آخری بیماری ہے“

”یہ بھی کوئی بیماری ہے۔ بخار ہی تو ہے“

”ہے تو بخار، مگر چھوڑا ان باتوں کو، شام کو کتنے بچے لوٹ گئے؟“

”میں؟“

”میرا دل چاہتا ہے کہ تم جلدی سے آ جاؤ۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں جاتا ہی نہیں۔“

”نہیں نہیں، بات کوئی نہیں۔ مگر آنا جلدی سے، ایک کام ہے۔“

یہ پہلے تو گئے۔ مگر ان کے دل میں کھد بڈی لگی رہی کہ والدہ نے جلدی واپس آنے کو کہا ہے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ یہ اس دن میں سنبھلے ہی لوٹ آئے۔ دیکھا تو والدہ کی سانس اکھڑی ہوئی ہے۔ بہت گھبراہٹ سے خوراک کھڑ کو بلانا لے۔ دوائی دی گئی۔ سانس بحال ہو گئی۔ بخار بھی ہلکا ہو گیا۔

دوسرے دن پھر سانس اکھڑ گئی۔ تو یہ پھر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑے۔ مگر ان کی والدہ نے واپس بلا لیا اور بڑے حوصلے سے لے بیٹھا تو جو کچھ چاہتا ہے۔ وہ اب پورا نہ ہو گا۔

ان کی والدہ ایسی باتیں کرتی ہی رہیں۔ قدر یہ ڈاکٹر کو بلانا لے۔ سانس ضرور اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ مگر ظاہری حالت بڑی اچھی تھی۔ تین چار دن ہیں، بخار سے مرعین کی حالت بھلا خراب ہی کتنی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر نے دوائی دی۔ سانس پھر بحال ہو گئی۔ بخار بالکل اُتر گیا۔ بظاہر سب کی عید ہو گئی۔

طفیل صاحب نے بھی الٹ کا شکرا دیا اور والدہ سے کہا: ”بخار بھی اُتر گیا۔ سانس بھی ٹھیک سے آنے لگی ہے۔“

اس پر جواب تو کچھ نہ ملا۔ البتہ مسکرائیں ضرور، جیسے کہہ رہی ہوں۔ ہلکا کہیں کا۔

یہ اس دن کہیں بھی نہ گئے۔ سارا دن ہنسی خوشی کی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر میں دشتہ واروں کا آنا جانا دیکھ کر دل گدگدا رہا۔ رات ہوئی تو کوئی گیارہ بجے والدہ نے ان سے سو جانے کے لیے امر کر دیا۔

رات کے ایک بجے کے قریب والدہ نے انہیں بلایا۔ یہ ہڑبڑا کر اسٹے۔ قریب آئے تو والدہ نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا: ”بیٹا میں اس دنیا سے جا رہی ہوں۔ اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کا خیال رکھنا۔ دیکھنا وہ دنیا میں کسی طرح بھی آکر نہ ہوں۔ یہ کہہ کر چھاتی سے لگا لیا اور یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس پر ان کی والدہ کہنے لگیں: ”روؤ نہیں ابھی مجھے بڑی باتیں کرنی ہیں۔ حوصلے سے کہو۔“

”حوصلے سے کام کس طرح لوں؟ کیا کروں؟“

یہ تو پھر ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ والدہ نے ایک ایک کو پاس بلا کر پیار کیا۔ دعائیں دیں۔ چھوٹوں کو بھی، بڑوں کو بھی، جب یہ (بغیر ڈاکٹر کے) واپس لوٹے تو سب کے سب رو رہے تھے اور والدہ سب کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں: ”دیکھو، ٹرنک کھول کر، جو سب سے اچھا جوڑا ہو۔ وہ میرے یتیم بھتیجے کی شادی پر دے دینا۔ میں نے نہ تو کسی کا کچھ دینا ہے اور نہ ہی کچھ لینا ہے۔ میرے کانوں میں جو سونے کے بوندے ہیں وہ ہٹانے والی کو دے دینا۔ چاروں جمعہ انوں پر یتیموں کو بلا کر کھانا کھلا دینا۔“

اب صبح ہونے ہی والی تھی۔ یہ پھر ڈاکٹر کی تلاش میں نکلے۔ والدہ کو بہت چلا تو انہوں نے انہیں روک کر بلوایا۔ ڈاکٹر کو لانے سے منع کیا۔ یہ بھی کہا: ”اب کوئی فائدہ نہیں۔ میرے پاس میٹھو۔ مگر یہ نہ مانے۔ ڈاکٹر کو لانے کے لیے چل ہی دیئے۔“

ڈاکٹر کو سے کر جب یہ واپس آئے تو ان کی والدہ ان کی ممانی اور بیگم سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے ہنلا دو۔ وہ چپ تھیں۔ کیا کرتیں۔ ایک دن پہلے تک تو بخارا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ہنلایا جائے۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر اور دوائی دے کر چلا گیا۔ یہ بھی کہہ گیا۔ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ بلاوجہ گھبرا رہے ہیں۔

جب بیگم اور ممانی ہنلانے پر راضی نہ ہوئیں تو والدہ نے پھر ان کی طرف دیکھا اور اصرار کیا یہ ان سے کہو۔ مجھے ہنلا دیں۔ پتہ نہیں یہ کیا سوچ رہی ہیں مگر مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے۔“

میں بھی چپ ہو گیا۔ ماموں صاحب بھی چپ ہو گئے۔ ممانی بھی چپ ہو گئیں۔ میرے اٹا سے پر بیگم نے اٹھ کر پانی گرم کیا۔ جب پانی گرم ہو گیا تو والدہ خود چا پانی سے اٹھیں۔ بیگم اور ممانی نے سہارا ضرور دیا۔ مگر وہ غصہ لگانے میں جا کر خود اپنے ہاتھوں سے صابن ملیل کر نہائیں۔ ہنلانے کے بعد، سپید چیل کر واپس آئیں اور بیگم سے کہا۔ ”میرے بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر لکھی کر دو۔“ جب یہ سارے کام ہو گئے تو ہلکی سی آواز میں ہوں ہوں کرنے لگیں۔

طفیل صاحب نے پوچھا۔ ”اتال کیا بات ہے؟“

”بیٹا تیرا میرا یہ رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تو میں پرایا مال ہوں۔“

اس کے بعد ایک منٹ خاموش رہیں۔ پھر اوپچی آواز سے پڑھا۔ ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔“ اس کے بعد وہ پھر کچھ نہ بولیں۔ حالانکہ سب بلاتے ہی رہے۔

موت اور اس کا اتنا خندہ پیشانی سے استقبال، ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ والدہ کے انتقال سے، طفیل صاحب بچھو کے رہ گئے ہیں۔ کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا۔ ہر وقت کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ شاید یہی سوچتے ہوں کہ دنیا کے یہ سارے بکھیرے کتنے عارضی اور کتنے بے حقیقت ہیں۔

اگر آپ کی ان سے بے تکلفی ہے تو یہ کافی حد تک شگفتہ ثابت ہوں گے۔ تکلف کے تعلقات ہیں تو یہ آپ کو اتنا بور کر دیں گے کہ آپ پریشان ہو جائیں گے اور سوچیں گے، الٹی کس بدصورتی سے واسطہ پڑا ہے جس کے نہ منہ میں زبان ہے۔ نہ دماغ میں بھیجہ، حالانکہ صاحب ضرورت ہیں دونوں چیزیں۔ اگر مخاطب بھی کم گو اور بے تکلف نہ ہو تو پھر لطف ہی آجائے گا۔ مجاز لکھنوی اور طفیل لاہوری کے مابین، ایک بار بڑے مزے کی باتیں ہوئی تھیں اور یہ گفتگو کوئی چون گھنٹہ کے عرصہ میں ہوئی ہوگی۔ آپ پیٹے بھی شاید ایک بار پڑھ چکے ہوں۔ ایک بار اور سہی! ابتدا طفیل صاحب کرتے ہیں :

”خیریت؟“

”جی ہاں!“

”چپ چپ کیوں ہیں؟“

”بونہی“

”کافی دیر سکوت کے بعد“ ”ابھی تو آپ کچھ دن رہیں گے؟“

”جی ہاں!“  
”آپ بولتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟“

”یہی“

”اچھا“

”جی ہاں“

(مدیر کا کافی دیر سکوت کے بعد) ”لکھنؤ دیکھا؟“

”کچھ کچھ“

”کافی کیسی ہے؟“

”حکومتی“

”فشریت ملگواؤں؟“

”پیم اللہ!“

”اچھا یہ بتائیے۔ اس رفتار سے آپ والٹاس تک کب پہنچیں گے؟“

انھیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں۔ جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی غلط فہمی نے انہیں مدیر تقرض بنا دیا تھا۔ ورنہ یہ اور تقرض کی وارث! ہنہ!

یہ غلط فہمی انھیں یوں بھی ہوئی کہ تقریباً تمام مشاعروں اور ادیبوں سے، ان کے ذاتی اور اچھے مراسم تھے۔ ان میں سے کوئی دوست تھا نہ کوئی بھائی، ان کے مدیر ہونے کے فوراً بعد، بھائی دوست بن گئے اور دوست دشمن، الحمد للہ کہ آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کا کوئی دوست ہی نہیں۔ سب اپنے اپنے دلوں میں بھرے بیٹھے ہیں۔

اس میں ان کے دوستوں کا کوئی قصور نہیں۔ اول تو انھیں مدیر ہی نہیں بننا چاہئے تھا۔ اگر بن بیٹھے تھے تو انھیں دوستانہ حقوق کا احترام کرنا چاہئے تھا۔ مثال کے طور پر، ان کا کوئی دوست، میل دو میل سے چل کر آتا ہے اور یہ ہیں منبر کی دھن میں غرق ادب پوچھتا ہے: ”طویل صاحب خیریت ہے؟“

”یار کرشن چندر نے افسانہ نہیں بھیا“

”اوہو!“

”جی ہاں!“

مد بھائی اور بچے تو اچھے ہیں؟“

”امید ہے کل تک ضرور آجائے گا۔ مجھے کرشن نے خط لکھا تھا۔ افسانہ لکھ لیا ہے۔ صاف کر کے دو روز تک مجھدوں گا۔“

”بھائی! میں پوچھ رہا ہوں۔ بھائی اور بچے تو ٹھیک ہیں؟“

”معاف کرنا چاہتی تھی، ان کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک ہفتہ سے گھر بارہ بجے سے پہلے نہیں جا سکا۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کے چلا آتا ہوں تاکہ پرچہ جلد آجائے۔ ہاں بھٹک چڑی ضرور ہے کہ جاوید کو بخار آ رہا ہے۔“

”اوہو! کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟“

”پرچہ چھپ جانے تو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں۔ پھر ایک دم کاتب صاحب سے مخاطب ہو کر، ”بھئی کتابت کتنی ختم ہوئی؟“ وہ دوست، جو بیمار اور مارے خلوص کے چل کے آیا تھا۔ وہ ان کے پاس آکر ان کے نقوش خریدنے پر لیشان ہو جاتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ سوچتا ہے شاید یہ اب بھی آدمی کے جامد میں آجائیں اور کوئی ڈھنگ سے بات کریں۔ یہ اپنی دھن میں مست، منہ ہی کی ”تعمیر و تکفین“ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ بالآخر خلوص کی زد میں آیا ہوا دوست، ان کی یہ حالت دیکھ کر، جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ تب یہ چرکتے ہیں اور پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ، اُس کا بازو پکڑ کر کہتے ہیں: ”یار چائے تو پی لو۔“

”میں اتنی دُور سے آپ کے پاس صحت چائے پینے آیا تھا؟“

تب انھیں اپنی نالائقی، مردم بیزاری اور دوست کشی کا احساس ہوتا ہے۔ دوست سے معافی مانگتے ہیں۔ اسے باہر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ مگر وہ جو دوست کے خلوص کو نہیں گنتی ہے۔ اُس کا ان کے پاس کوئی ملاوا نہیں ہوتا۔ دوستوں کو ناراض کیا۔ بھائی مراد دوستی تک بھی آئے۔ غرض اتنے انہماک کے بعد انھوں نے جو نمبر مرتب کئے، ان کے بارے میں لکھنے سے ایک خط آتا ہے:-

”آپ نے شخصیات نمبر میں ہر ایرے غیرے کو شامل کیا ہے۔ مگر بھر پر معمرین نہ چھاپا۔“

اب آپ سے کون دوستی رکھے۔

ایک اور خط بھیجی سے آتا ہے:

”آپ بھی عجیب چیز ثابت ہوئے۔ افسانہ نمبر میں، جو آپ نے میرا افسانہ لیا ہے۔ وہ میرا سب سے گھٹیا افسانہ تھا۔ آخر آپ نے یہ مجھ سے کس دقت کا انتقام لیا ہے؟“

کراچی سے ایک شاعر نے زبانی پیغام بھیجا:-

”آپ نے نوزلی نمبر میں فیض کی تو چھ نوزلیں چھاپی ہیں اور میری صرف ایک، کیا میں فیض سے گھٹیا شاعر ہوں۔ اگر آپ کو شاعری کی الف بے کا پتہ نہیں تو کسی سے پوچھ لیا ہوتا۔“

لاہور واسے پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ وہ شخصیات نمبر میں بھی نہیں آئے تھے۔ افسانہ بھی اُن کا گھٹیا شامل ہو گیا تھا۔ نوزلی نمبر میں بھی کسی کی ایک نوزلی آئی تھی اور کسی کی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ نمبروں نے جانے کی میز پر بیٹھ کر یہ پروگرام بنایا کہ ہم سب نقوش کے دستہ چلیے ہیں۔ ایک نے کہا۔ میں طویل کا گر بیان پکڑوں گا۔ دوسرے نے کہا۔ میں گھونٹہ ماروں گا۔ تیسرے نے کہا۔ میں مصلحتاً بیچ بچاؤ کر اؤں گا۔ مگر تم اپنا کام کرتے جانا۔

خیر میان تک تو غنیمت تھا۔ کوئی انھیں گالی دے لے تو دسے لے۔ کوئی تھپڑ مار کر خوش ہو لے تو ہو لے۔ مگر ایک دن ایسا ہوا کہ لاہور سے کراچی جاتے ہوئے اخبار نویسوں نے یہ پروگرام بنایا کہ واپسی پر مدبر نقوش کی خبر لی جائے۔ بنیاد سجاد ظہیر کے



اس نے کو بتایا۔ جسے طفیل صاحب نے پہلے ہی کاٹ چھانڈ کر کھل سے کافی بے ضرر بنا دیا تھا۔ مگر یہ اس کا اقرار پھر بھی کرتے ہیں کہ اُس صورت میں بھی اُس میں قابل اعتراض باتیں تھیں (میرا عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ اس سے مدیر نقوش کی نیت کا توازن ادا ہو ہی سکتا تھا۔ جبکہ اسی قسم کا ایک نوٹ افسانے کی ابتدا میں ہی موجود تھا۔

قباحت یہ تھی کہ طفیل صاحب کے نزدیک اُس افسانے کی شمولیت یوں ضروری تھی کہ وہ افسانہ نمبر کی صورت میں، ایک طرح کی نادر بخ مزب کر رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ اُس دور کے اس انداز کے افسانے بھی آئیں۔ جب مذہب سے بیزاری، خطا اور سوال کا تسلسلہ (نقد و ثبات) اور انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ اور اسی غلط روش کو دکھانے کے لیے طفیل صاحب نے ایسے اولیٰ کی شمولیت ضروری سمجھی تھی۔

چنانچہ ایک دم طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مخالفت میں بھی، موافقت میں بھی، مخالفت زیادہ مٹی، موافقت کم، حالانکہ بعض لوگ کہتے ہی رہے کہ طفیل کی نیت کی طرف بھی دیکھو۔ اُس کا ہرگز یہ مقصد نہیں جو ہم لوگ سمجھ رہے ہیں۔ مگر صاحب کو ن سنا تھا۔ پڑا عمدہ پلان بنایا گیا تھا۔ مسجدوں میں مدیر نقوش کو معطون کیا گیا۔ مچی دروازے کے باہر جلسہ ہوا۔ پکٹنگ کے پردہ گرام بنے۔ کسی نے سو جا دفتر کو آگ لگا دی۔ سب نے کسی نے سوچا سب جان سے مار دیا جائے۔ اور یہ سارا منگامہ اُس جان ناثوں کے بارے میں تھا۔ جس نے کبھی سراسر اسٹاک کے بین دیکھا کہ یہ لکڑی کس طرف سے آئی ہے۔

مدیر نقوش کو جب اپنی موت سامنے نظر آئی تو انہوں نے خدا سے التجا کی — تو تو عظیم بذات الصدور ہے۔ میرے بھی پسینے کے بھیدوں کو جاننا ہے اور میرے مخالفوں کے بھی۔ — اور مرد و ستون نے سمجھایا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ تو اخباروں میں لوگوں سے معافی مانگ لے اور اس افسانے ہی کو حذف کر دے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس دنیا میں ان کی گستاخی کا یوں فیصلہ ہوا۔ اب انہیں آخرت کے فیصلے کا انتظار ہے۔ ممکن ہے وہ اس سے مختلف ہو۔

انہوں نے اپنے بارے میں جب بھی خود کیا تو — ایک طفیل کے اندر دوسرا طفیل بھی چھپا ہوا پایا۔ ایک طفیل تو وہ ہے جس سے ہندوؤں کا احترام کرنا سیکھا ہے۔ جو پڑھے لکھوں کے سامنے غالب علما نہ حیثیت میں بیٹھتا ہے۔ جس نے چھوٹوں اور بڑوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہا ہے اور اپنے آپ کو بالکل مبتدی جانا ہے۔

دوسرا طفیل مدیر نقوش ہے۔ جب یہ کرسی ادا کرتے ہیں تو ان کا دماغ عرش پر ہوتا ہے۔ اُس وقت انہیں بڑے سے بڑے علامہ کی تخلیق میں بھی نقائص نظر آتے ہیں۔ اپنے ذہن کی اسی ثرائی کی بنا پر کئی بڑے بڑے لکھنے والوں کی چیزیں ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کر چکے ہیں۔

آپ خود ہی سوچیں۔ جس کی افسانہ نگاری میں دھوم ہو۔ نقاد اُسے صعب اول کا افسانہ نگار مانیں۔ اس کے افسانے کو اگر مدیر نقوش ناقابلِ اشاعت قرار دے دے تو کیا وہ ان سے خوش ہوگا۔ وہ تو یہی کہے گا نا کہ جاہلی ہے یہ۔

جس شاعر کی نظم یا غزل دس ہزار کے مجمع میں پڑھی گئی ہو اور اسے سامعین نے دل کھول کر داد بھی دی ہو۔ وہ بھی اگر مدیر نقوش کی نظر میں نہ پچھے تو پھر شاعر بے چارہ ان کی شاعرانہ سوچ بوجھ پر ناختر پڑھے یا نہ پڑھے۔

جس نقاد نے تمام مغربی نقادوں کو پڑھا ہو (امد اتفاق سے) اپنے ان کے تنقیدی سرمایہ سے استفادہ نہ کیا ہو) ہوسا  
حوالے پہ حوالے دے کر معنوں کو بھاری بھر کم بنا دیا ہو۔ وہ معنوں میں اگر نقوش میں نہ چھپے تو پھر آپ ہی بتائیں مدیر نقوش کی عقل  
کیا جلتے یا نہ کیا جائے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ لطیفہ بھی ہے،

ایک نقاد نے (اب ان کا نام کیا لوں) انہیں ایک معنوں لکھا۔ اچھے خاصے بڑے نام دے نقاد تھے جب وہ معن  
پڑھا تو انہیں نہ چھا۔ جناب نقاد کو بڑے احترام کے ساتھ لکھ دیا کہ یہ معنوں نقوش میں نہ چھپ سکے گا اور اس میں فلاں فلاں فقر  
وہ صاحب بڑے برہم ہوئے۔ پہلے تو وہ نقوش اور مدیر نقوش کی تعریفیں کرتے تھکا نہ کرتے تھے۔ پھر ایک دم معنوں  
کی گامیوں پر اتر آئے۔ مثلاً نالائی اور بدترین قسم کے الفاظ بے دریغ استعمال کر ڈالے۔

اللہ کی شان ملاحظہ ہو۔ بعد میں وہ معنوں لگا کر جیسے بڑے پرچے میں چھپ گیا۔ تب تو وہ صاحب اور چڑھے۔ ا  
اور خط لکھا۔ جس میں مزید سنایا گیا تھا کہ وہ معنوں نیاز فقہوری جیسے علامہ نے تو پسند فرمایا ہے۔ مگر جناب جیسے ”چڑھے“ تھے ”نہ  
کر دیا تھا۔ یہ واقعہ اپنی جگہ ضرور صحیح ہے۔ مگر طفیل صاحب آج بھی دیا ننداری کے ساتھ یہ خیال ہے کہ نیاز صاحب لاکھ علامہ  
میرے ذہنی گرو سہی، نگار اُدو کا تعلیم انشان پر چہ سہی۔ مگر وہ معنوں نقوش میں چھپنے کے قابل نہ تھا۔

انہیں اپنے رسالے اور اس کے کام سے اتنا عشق ہے کہ کیا کسی عاشق کو اپنے محبوب سے ہوگا۔ بلا مبالغہ انہوں  
اپنے ایک ایک نمبر پر اتنی اتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پر ہی آئی ہے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں۔ جن دنوں کوئی خاص نمبر زیر ترتیب  
ہوتا ہے تو ان کا دس بارہ پندرہ دن کم ہو جاتا ہے۔ نہ وقت پر کھانا کھانا۔ نہ سونا، دن رات کام، صبح کے جتنے جتنے اگر رات کے  
بارہ ایک یا دو تین بج گئے ہیں تو بھی انہیں کچھ پروا نہیں۔ بلکہ مگن ہیں۔ مرت ہیں۔

ایک بار یہ ہو کہ یہ اپنے دفتر سے رات کے بارہ بجے لوٹے۔ بیگم سے کہا۔ کھانا لاؤ۔ وہ بیچاری آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ  
کھانا گرم کر کے لائی۔ دیکھا تو یہ پھر نقوش کے عشق میں غرق، کابیاں پڑھ رہے ہیں۔

بیگم نے، شوہر کو اپنے سہاگ کا واسطہ دے کر کہا ”خدا کے لیے کام کو بند کر دیجئے۔ بہت ہو چکی۔ اب کھانا کھائیے  
کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔“

یہ اُسے منت سماجت سے کہتے ہیں ”خدا کے لیے چپ رہو۔ لوگوں کو نہ جگاؤ۔ میرے منہ میں لڑائے ڈالنی جاؤ تا کہ کھانا  
میں ہو جائے اور کام ہی، یوں کھانا کھایا۔ رات کے تین بجے سوئے۔ مگر بیگم کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دی۔ صبح سات بجے جگا دینا۔  
بیگم کے لیے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ اُس نے سات بجے جگا دیا۔ اب ان سے اٹھائیں نہیں کھلتیں۔ ایک  
دن کی جگائی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔ یہاں تو روز کا قہر تھا۔ بیگم برہمی اور طنز سے کہتی ہیں۔ ”اب اٹھتے کیوں نہیں۔ رسالہ ریٹ ہوا  
جاملے ہے۔“ یہ کہتے ہیں ”اٹھنا تو چاہتا ہوں مگر آنکھیں نہیں کھلتیں۔“

پھر طفیل صاحب پچکار کے بیگم سے کہتے ہیں ”میرے قریب آؤ میرے پوٹوں کو زور سے اُپر کرنا۔ تاکہ میری آنکھیں

کھیں اور میں اٹھ سکوں۔

ملکی ہے کوئی صاحب اسے زیب داستان ہی کھیں۔ مگر ہے یہ واقعہ، اب یوں کبھی کسی نہیں ہوتا۔ بلکہ اب تو ان کی زندگی پر نئی نگاہ رہی ہے۔ یوہی گزر جائے گی۔ زندگی کی لطافتیں اور مسرتیں انہیں ہر آواز بلند پکار رہی رہتی ہیں۔ مگر یہ انی سب سے بے نیا ہو چکے ہیں۔ جیسے بالکل مردہ ہوں۔

قیافہ شناسی میں بھی یہ بڑے ماہر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں صورت دیکھ کر، ہر کسی کے کیریکٹر کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ ایک بار وہ ان کے ایک اخبار نویس دوست، تانگے پر سوار، غم دیکھنے جا رہے تھے۔ معاً ایک تانگہ پاس سے گزرا، اُس میں نقاب لٹے، ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ چاندی صورت، اُس پر بھی میک آپ، انی کے اخبار نویس دوست نے، اُسے دیکھتے ہی انہیں متاثر کیا۔ یہ بھی متوجہ ہوئے اور فتویٰ دے دیا۔ یہ لڑکی آوارہ ہے۔

”اُسے نہیں؟“

”مشرط لگاؤ۔“

”جو کہو؟“

اب ان کے لیے، یہ ثابت کرنا کہ یہ لڑکی آوارہ ہے بڑا دشوار تھا۔ آج کل آوارہ کھیاں کہاں آوارہ دکھتی ہیں۔ ادا حراں کے دست کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ لڑکی قطعاً آوارہ نہیں ہے۔ اب یہ کہتے تو کیا کرتے۔

انہوں نے تانگے والے سے کہا: ”میاں کو چوان، ذرا اپنے گھوڑے کو دوڑاؤ اور اُس تانگے کے برابر چلو۔“ کوچوان نے ان کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ مگر زبان سے یہ کہا: ”بہت اچھا سرکار۔“ اب ان کا تانگہ، اس تانگے کے برابر برابر چل رہا ہے۔ لڑکی نے بھی اس بات کو تاثر لیا۔ انہوں نے اس سے پہلے کبھی کسی لڑکی کو آوارہ ثابت نہیں کہا تھا۔ اس لیے پیسے جھوٹے رہے تھے۔ اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے، انہوں نے لڑکی کی طرف، تین چار منٹ تک مٹکی باز دھکے دیکھا۔

لڑکی نے بھی پہلو بدلا اور اپنی ران سے ہاتھ اٹھا کر بڑے مہذب انداز میں سلام کیا۔ اب تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دوست کے چٹکی لی اور اسے نظروں ہی نظروں میں سمجھایا۔ دیکھا بچو ہم نہ کہتے تھے۔ تانگہ میلو ڈروڑ پھینچ گیا۔ جہاں کا تانگے والے سے ملے کہ کے آئے تھے۔ تانگے والے نے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اسے کہا۔ ”نکرنہ کرو تانگہ اُدھر لے چلو۔ جدھر وہ تانگہ جا رہا ہے۔ منہ مانگے دام ملیں گے۔“

”بہت اچھا سرکار، پر یہ کام بڑا ٹیڑھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھی تھانے کی ہوا کھاؤں۔“

”دبھٹی جو خدا کو منظور!“

”خدا ان کو کیا منظور ہو گا۔ اس نقصے کو چھوڑ بیٹے۔ وہ تو ہے ہی بد معاش، دیکھا ابھی سلام کر رہی تھی۔“ کوچوان کے ان ریمارکس پر انہوں نے اپنے دوست کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے انہوں نے مونٹ ایوڈسٹ فتح کر لی ہو۔

یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر ان کا تاثر اس تانگے کے ساتھ تھا جتنا رہا۔ یہ دل میں سوچتے ہی تھے کہ ہٹاؤ اس قصے کو، آخر کیا فائدہ، مگر زبان نے دل کا ساتھ نہ دیا۔ تانگے بڑے چلتے رہے۔ وہ لڑکی بھی ٹھیک لگائے دیکھتی رہی اور یہ بھی، کبھی وہ اپنے پریشان بالوں کو سمجھاتی، کبھی یہ مسکراتے، کبھی وہ خداسی تن کے بیٹھ جاتی، کبھی یہ ہاتھ سے بالوں کو سنوارتے، کبھی وہ مسکراتی، کبھی یہ سہم جاتے غرض انہی پوچھیوں میں، اس کا تاثر ایک جگہ رک گیا اور ان کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔

کوچوان نے پوچھا: ”دو کون بالو جی تانگے کو؟“

”نہیں“

”پھر“

”سرپٹ دوڑاؤ؟“

گھوڑا سرپٹ دوڑاتا رہا۔ مگر یہ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ گھوڑا تیز دوڑ رہا تھا یا یہ۔

کھیلوں میں بھی یہ کئی بازیوں سے حدودِ جبر دلچسپی لیتے ہیں۔ اتنی دلچسپی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ کیرم بورڈ اور تاش میں اسے گم نہیں ہیں۔ جتنے پتنگ بازی اور کرکٹ ہیں۔

کوئی پندرہ سال بعد پچھلے برس انھیں پتنگ بازی کا پھر سے ابال آیا۔ گھر میں اعلان کر دیا۔ اب کے بسنت پر پتنگیں بڑھ چکی۔ بچے، بڑے سب حیران، یونی ہانک دی ہے۔ اب اس عمر میں بچوں والا مشغلہ کیا اختیار کریں گے۔ مگر بسنت سے ایک دن پہلے چھپچھپ گھوٹوں کے دوہرنے ”مٹکوائے گئے۔ درجنوں چھوٹی بڑی پتنگیں ساتھ آئیں۔ رات بھر کتے باندھتے رہے۔ جس وقت موذن نے اذان دی۔ انھوں نے منہ پر پرچہ رکھ کے دیکھا، تو اس وقت کوئی بھی جیالا پتنگ بڑھائے ہوئے نہ تھا۔ خاصہ اندھیرا تھا۔ پتنگ بڑھے تو کیسے بڑھے۔ البتہ ہمیں کہیں چھتروں پر، ایک ایک دو دو من چلے، کھڑے محسوس ہوئے۔ مگر نظر نہ آئے۔

غٹوڑی دیر بعد انھوں نے ”وہ کاٹا“ کا زور دار نعرہ لگایا اور اپنی پتنگ بڑھادی۔ اردوں کے بھی حوصلے بڑھے۔ انھوں نے بھی جوا بادہ کاٹا کا نعرہ لگایا۔ پھر کیا تھا آنا فنا حریف پیدا کر دیے۔

قسمت کے دھنی یہ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ہوا بھی خوب تیز تھی۔ انھوں نے جس سے بیچ لڑایا۔ کاٹا، جب حریفوں نے دیکھا کہ یہ تو مضایا کر رہے ہیں تو تین تین چار چار اکٹھے حملہ آور ہوئے۔ اس میں بھی زیادہ تر میدان انہی کے ہاتھ رہا۔ اس پاس کے محلوں میں دھاک مچ گئی۔ بھگت خدا یہ اب اپنے علاقہ میں، دوسرے سال سے پتنگ بازی میں چیمپئن چلے آ رہے ہیں۔

انھیں لمبے بیچ لڑا ہے مگر آنا ہے۔ ”کچھ کچھ“ کو یہ قطعاً پسند نہیں کرتے کہتے ہیں دشمن کو اپنے جوہر دکھانے کے پورے موقع دینا چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کے اتنے لمبے بیچ جاتے تھے کہ پتنگ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ لڑو کے برابر نظر بھی آئی تو کیا۔

ایک لمبے بیچ میں، ان کے ہاتھ ڈور کی مسلسل رگڑ سے لہو لہان ہو گئے۔ کبھی کہتے رہے کہ پتنگ میں دسے جیسے ہاتھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ برابر ات اُت سی کرتے ڈور دینے رہے۔ کوئی آدھ پون گھنٹہ کی جدوجہد کے بعد

بہ انھوں نے بیچ کا مانتا، تب انھوں نے ہنگ اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کی۔ بڑھی ہوئی قنک کو جب اتاراجا ہوا تھا تو دورہ ان کے خون سے مانی ہوئی تھی۔

کرکٹ کا بھی شوق، انھیں بڑا لگا ہے۔ فہر سے باہر چلی ہو رہے ہوں تو یہ اپنے دفتر ہی میں ریڈیو لے جائیں گے۔ جب تک جی جوتا رہے گا۔ بلا کر کو منٹری سننے رہیں گے۔ ہزاروں کام ہوں۔ کچھ نہیں کریں گے۔ کوئی مٹنے والا بھی آئے تو بات ہی نہیں کریں گے۔ باتیں ہوں گی بھی تو کرکٹ ہی کے بارے میں۔

سبھی قابل ذکر بیچ انھوں نے یا نو دیکھے ہوں گے پاسے ہوں گے۔ ابھی پاکستان میں آسٹریلیا کے بیچ ہوئے ہیں۔ یہ ریڈیو سے ایک منٹ کے لیے بھی نہ بیٹھ۔ کوئی ابھی بہت لگائے تو یہ خوش ہوئے تھے۔ کوئی اچھا گیند پھینکے تو یہ خوش ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ بیٹیاں بھی بجاتے تھے۔ لپٹے سے، انھیں ان کی پوزیشن ادا کرتی تھی۔ در نہ یہ بیقرار اس کے لیے بھی تھے۔  
یوں ہی ہوا ہے کہ کو منٹری سننے سننے آئندہ بے حد خوش ہو گئے۔ زور زور سے سیٹیاں بجانے لگ گئے۔ پوری قوت سے تالیاں پیٹنے لگے۔ پھر نوکر آواز دی۔ جلدی سے پانچ روپے کے لٹو لا۔ وجہ پوچھی گئی تو بتایا ہاروے آؤٹ ہو گیا ہے۔

ان کی صحت یوں تو کبھی زیادہ اچھی نہیں رہی۔ چھوٹے موٹے میسوں عارضے لاتی رہے۔ مگر یہ ہمارا بعد قسم کے بیمار بہت ہی کم ہوئے۔ مگر صاحب ایک بار ہوئے، خوب ہوئے۔ مزا آگیا۔ یہ قصہ سن کر کلمہ کا یہ کہ بیٹھے بٹھائے بیمار ہو گئے۔ سو کے اٹھے طبیعت مصلح پائی۔ چل فدی کو نکلے۔ گھر تک واپس پہنچنا مشکل ہو گیا۔ بیٹے تو پیر لیٹ ہی گئے۔  
بہتر سے دوا دارو اور ٹونے لٹے۔ پورے مگر طبیعت نہ مصلحی۔ بڑتی ہی گئی۔ معاملہ دواؤں سے دعاؤں تک پہنچا۔ مگر دواؤں ہی علاج بیکار ثابت ہوئے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے بھی جواب دے دیا۔ جب یہ خوشخبری عام ہوئی کہ جناب طفیل اب ایک دو دن کے صحت ہیں تو ان کے قریبی دوست آخری دیدار کو ان پہنچے۔

”ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ اب آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔“

”اب آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔“

”بھار ہکا ہو گیا ہے۔“

”انشاء اللہ کل تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

طفیل صاحب یہ ساری باتیں سننے رہے۔ بولنے تک کی ہمت نہ تھی۔ فقارت اتنی تھی کہ اگر منہ پر کتھی بیٹھ جاتی تھی تو ہاتھ اٹھا کر اسے ہٹانے تک کی ہمت نہ تھی۔ بس ہڈیوں کا ایک پھر تھا۔ جو چار پائی پر بار تھا۔ یہ اپنے دوستوں کو ان کی باتوں کا جواب دینا چاہتے تھے۔ مگر زبان ساخنہ نہ دیتی تھی۔ اپنی اس حد تک معذوری پر ان کے آنسو نکل آئے۔ دوستوں نے آنسو پونپکھے تو انھوں نے سنائی نہ دینے والی آواز میں دوستوں کی باتوں کا جواب دیا یہ تھا۔

”ڈاکٹروں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے۔ جو آپ حضرات کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ جی بھی معلوم ہے۔ مگر میں ضرور صحت یاب ہوں گا۔ آج نہیں تو کل، میرا ہی فیصلہ ڈاکٹروں کو سنا دینا۔“

غیر معمولی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر، یہ موت کے منہ سے بھی نکل آئے۔ قوتِ ارادی کے استحکام ہی نے انھیں زندگی میں آہ  
بنایا ہے۔ ان کے پاس اگر کوئی دولت ہے تو یہی۔ اگر انھیں ابھی کسی حوکت پر ناز ہے تو اسی پر۔

جب موت ان کے سامنے ناچ رہی تھی۔ تو یہ خدا سے ہی میں جو باتیں کرتے تھے۔ وہ کچھ اسی قسم کی تھیں :-  
”اے اللہ میں تجھ سے درگزر کی انتہا کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے زندگی عجز ہے۔ بلکہ اس لیے کہ میری امکون اور آرزوؤں  
خون بھرا جدار ہے۔ میں اس دنیا میں اگر کیڑوں کوڑوں کی سی زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ تو مجھے اتنی جھلت دے کہ میں اپنے ارمانوں  
پورا کر سکوں۔ میں اپنے لیے نہیں۔ دوسروں کے لیے زندگی چاہتا ہوں۔ میری موت آج نہیں تو کل واقع ہو جائے گی۔ مگر تو مجھے  
دلوں اور ارمانوں کی تکمیل کے لیے زندہ رکھ۔ جنھوں نے میرے ذہن سے نکل کر ابھی تک زندگی کی ایک ساعت بھی نہیں گزاری“

کئی دنوں کی بات ہے کہ یو۔ پی کے ایک صاحب، ان کے پاس آئے۔ انھوں نے انھیں بھی یو۔ پی کا بھریا اور لگے پچا ہوا  
کی بٹائیاں کھانے پچائی یہ ہوتے ہیں۔ پچائی وہ ہوتے ہیں۔ میری ترغیہوں میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ مجھے ستانے ہیں  
پچکے سنتے ہیں۔ جب انھوں نے کہا۔ پچائی بڑے حرام زادے ہوتے ہیں تو انھوں نے اپنے نوکر سے کہا ”صاحب کے لیے چائے لانا  
چائے کاٹن کر یو۔ پی والے صاحب سمجھے ہوں گے۔ یہ بھی پچائیوں کے ہاتھوں میں ہوا ہے۔ وہ اور چڑھے۔ پھر تو وہ مارا  
ہن کی گامیوں تک آگئے۔ غلیل صاحب نے دوسرے نوکر سے کہا ”صاحب کے لیے مٹھائی کا بھی انتظام کرو“

چائے آئی۔ مٹھائی آئی۔ دونوں نے خوب کھائی اور پی۔ ہنسنے لگی رہے۔ پیار سے باتیں بھی کرتے رہے۔ جب وہ صاحب جا  
گئے تو انھوں نے ان سے پوچھا ”آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟“

”یہ پوچھ کر کیا کیجئے گا؟“

”نہیں بتائیے؟“

”جہانے دیکھئے؟“

”آپ کو میری قسم؟“

”میں پچائی ہوں؟“

یہ شکل و صورت کے اعتبار سے میں لونڈے سے ہیں۔ مدیر فتوح ہونے کا مطلب تو یہ تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد جیسا جتہ پہنا  
کہتے۔ سرسید ایسی وارھی ہوتی۔ ابوالکلام جیسا رعب و دبدبہ ہوتا۔ برعکس اس کے یہ سید سے سادے آدمی کا بچہ ہیں۔ نہ رعب نہ بچہ  
ان کی شکل و صورت سے زیادہ ان کے نام کا اثر ہے۔ ایک لطیفہ آپ بھی سن لیں :-

ان کے چھوٹے موٹے کام تعارفی رقعوں سے ہو جایا کرتے ہیں۔ جو کام ہوا۔ جس سے ہوا۔ تعارف ہو یا نہ ہو دکھ کر کہہ دیا۔  
ہو کیا لوگ غوث کرتے ہیں۔ لکھا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ یہ اپنے ایک کام کے لیے، خواہ ایک دفتر میں جا لکھے حتیٰ اٹھا کہ صاحب سے ملے اور غیر تعارف لکھے۔ وہ نہایت

”کھائی سے پیش آئے یہاں تاہم ہی نہیں کرا پائے تھے کہ وہ صاحب برے کیا بات ہے؟“

”جی اچھے آپ سے ایک کام ہے؟“

”کیا کام ہے؟“

”جی وہ ذرا —“

”آپ لوگ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے، میرے ہیڈ کلرک سے ملنے۔ پرنٹنگ ٹرنٹ سے ملنے میرے سینٹ سے ملنے۔ سیدھا منہ اٹھاتے ہیں اور میرے پاس چلے آتے ہیں۔ سہ چٹرائی، ان صاحب کو کس نے اندہ آئے کیا؟“

”جی غلط ہو گئی؟“

”مخبردار جو آئندہ کوئی یوں اندر آیا؟“

”بہتر بننا؟“

”ڈرامے کا یہ سین ان کے سامنے انہی تیزی سے گورا کر یہ سنٹ پٹا گئے۔ گردن لٹکانے اپنے دفتر پہنچے ٹیلیفون اٹھا کر انہی صاحب سے بات کی۔“

”میں نقوش کے دفتر سے طفیل بول رہا ہوں۔“

”کیسے حضور مزاج تو اچھے ہیں؟“

”جی ہاں انڈا کا شک ہے۔“

”فرمائیے آج کیسے بھول گئے۔ مدت کے بعد یاد فرمایا۔ کوئی میرے لائق خدمت ہے؟“

”یہ ایک ذرا سا کام ہے۔“

”آپ اپنے چٹرائی کو چھٹ دے کر بیچ دیں۔ ابھی ہو جائے گا۔“

”بہت اچھا چٹرائی کو بیچ رہا ہوں۔“

”دیکھئے کبھی ملاقات کی بھی کوئی صورت نکلنی چاہئے۔“

”جی!“

”میں کتنا ہوں کبھی دفتر آئیے نا!“

”آ آ — اچ — اچھا —!“

ان کی زندگی کے ایک دو خوش کن واقعات یہ ہیں جن پر آج بھی خوشی ہوتی ہے۔

ابھی یہ اپنے کاروبار کی ابتدائی ایلیج پر تھے۔ چند ملے جی ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھے۔ ان دنوں انہوں نے ایک دکان سے آرٹ میٹر کا ایک ریم خرید لیا۔ ایک مزدور کے سر پر اٹھوایا۔ دو آنے کی اجرت مقرر ہوئی۔ بارش کی وجہ سے بازار کی پڑے لپٹ تھا۔ آرٹ میٹر پر اچھلاواں ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ مزدور سے بار بار کہتے تھے۔ دیکھو جی احتیاط سے چلو۔ کاغذ کو مضبوطی

ہے بکراؤ۔ مگر کیا تو پچاس روپے کا دیم تباہ ہو جائے گا۔ یہ فقرہ انہوں نے ایک بار نہیں۔ تین چار بار دہرایا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وہ دیم  
میر سے پھسل کر زمین پر گر گیا اور کچھ دھڑکیں مٹا گیا۔ مزدور کا بچنے لگا۔ یہ چپ رہے۔ مزدور نے کاغذ سمیٹا۔ ساتھ چل دیا۔ دفتر پہنچ کر  
اس نے کاغذ ایک کوسے میں رکھ دیا اور غاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے جیب سے چار اکٹیاں نکالیں اور مزدور کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

مزدور غر مندہ ہو کر بولا۔ ”آپ سے دو آنے ملے ہوئے تھے۔“

دو آنے اس صورت میں تھے۔ جب تم کاغذ کو صبح سالم لے آئے۔

”جی!“

”اب تم چونی کے قصدا رہو۔“

ابھی پانچ چودہ کی بات ہے کہ یہ سائیکل پر سوار صبح سویرے ہی والدہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جا رہے تھے کہ سبیل  
والد کے پاس انہیں ایک پانچ لڑکا ملا۔ جو چہنچہ سب بالکل ہی معذور تھا۔ اس نے التجا کے انداز میں، ان سے کہا ”مجھے سائیکل پر بٹھا کر  
لگا لگا دام ہسپتالی تک لے جائیں۔ انہیں جلد ہی مٹی۔ مگر گتے مگر لڑکے کی خواہش ان کا برابر تعاقب کرتی رہی۔ یہ قبرستان کے قریب پہنچے  
گئے ہوں گے۔ مگر لڑکے کی بات وہیں سے نہیں اتری مٹی۔ وہیں سے اترتی تو کجا، پریشانی بڑھنے لگی۔ چنانچہ یہ اٹھے پاؤں پٹھے۔  
لڑکے کو سائیکل پر بٹھایا۔ خود پیدل چل کر اسے ہسپتال تک پہنچایا۔ لڑکا کتا رہا۔ سائیکل پر سوار ہو جائیں، آپ کو جلدی ہو گی۔ یہ جواب  
دیتے۔ نہیں پیدل چلنے میں لطف آ رہا ہے۔

جب لڑکا منزل مقصود پر پہنچ گیا تو انہوں نے اس سے معافی مانگی۔ میں جلدی میں تھا۔ اس لیے اپنے فرض سے غافل ہو گیا تھا۔  
ایسی ہی بیوقوفی کی ایک بات اور بھی مٹی میں۔ ایک دن یہ صبح سویرے ہی اپنے دفتر اس لیے آکر بیٹھے کہ ایک مزدوری  
کام کو پٹا لیا جائے۔ خوب گرمیوں کے دن تھے۔ ہینکھا کھولا۔ کاغذ، قلم، دو ات لے کر بیٹھے۔ خوب موڈ میں تھے۔ اتنے میں ملک سے  
پکٹے کے ساتھ کوئی چیز لگی۔ یہ اسٹے، ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ایک چڑیا پکٹے سے لڑا کر گری پڑی ہے۔ فوراً پکے۔ چڑیا کو اٹھایا۔  
جو اوڑھوٹی ہوئی مٹی۔ انہوں نے اسے اپنے ہاتھوں کی گرم آنکھوں میں لیا اور پانی پانی کا وہ شور مچایا، جسے پانی کے بغیر یہ خود ہی کسے  
جا رہے ہوں۔ چڑیا نے پانی پیا تو وہ مٹ کر گئے۔ لگی۔ مگر اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ وہ جان سے تو نہ گئی۔ مگر داخلی ہو گئی تھی۔  
انہوں نے اسے ایک اونچی جگہ پر بٹھا دیا۔ مگر خود سارا دن کوئی کام نہ کر سکے۔ وہ مزدوری کام بھی ہاتھ پھیلا کر رہ گیا۔

یہ جو بڑی بڑی باتوں کو بولی جانتے ہیں۔ بعض اوقات یونہی اگر بھی جانتے ہیں۔ یہ سچ پاس دقت ہوتے ہیں۔ جب سان کی  
نیت پر عمل کیا جائے۔ وہ بڑی سے بڑی بات ہوئی اور گئی۔

پطرس بزرگ کے سلسلے میں، انہوں نے کئی ایک لکھنے والوں کو خط لکھے۔ ان میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ فیملین کے انکیشن  
لکھنے والے ڈاکٹر نہیں۔ اس کے ڈاکٹر، بڑا رعب اور طنطنہ ہے۔ ان کا سبھی لکھنے والے کے سامنے بھکی مٹی بنے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جوابی  
میں آئے۔ کچھ رہتے ہیں۔ کچھ تو ملتا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فیملین صاحب کے خط کے جواب میں لکھا۔



طفیل صاحب قہار!

میں آپ سے مرے ہوئے آدمیوں کو نیچے گا کیا ڈھنگ نکالا ہے۔ دیکھائی یہ بات ابھی  
نہیں سمجھ تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے آپ لوگ دینی اور دھرم کے لوگوں کے لئے  
اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مرے اور اس کا خیر نکالیں۔ خواہ جیتے ہی اس کی  
طرف مرنے کے بھی کسی نے نہ دیکھا ہو۔ بخاری میرا دوست تھا اور میں اس کے بیٹے  
بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ابھی اس موڈ میں نہیں ہوں اور کم از کم مردہ خیر  
کے لیے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ مردہ خیروں نے مجھے اس قدر حراساں کیا ہے  
کہ میں نے اپنی وصیت میں لکھ دیا ہوا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کسی کو میرا  
مردہ خیر شائع نہ کرنے دیا جائے۔ کیونکہ مجھے اب یہ بالکل خارج طور پر نظر آ رہا  
ہے کہ کوئی منافع خور ضرور میرے نام زندہ "کو مردہ فردوسی" کے بدلے  
بیچ کر پیسے بنائے گا اور مجھے یہ ضرور ہے کہ "مردہ کی خدمت کرنے والے" پر کام  
نہ کرے۔

جس وقت انھیں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط ملا تو انھوں نے اپنے اوپر ہر اہمیت سے بھیجیں کہ اور نکال شخصی نوعیت کے خیر نہیں لکھ سکتے  
میں اپنی عقیدت کے اظہار میں خیر نکالتے ہیں۔ لوگ اسے منافع خوری کا ایک حیلہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھیں سختی سے چیتے کی طرح ان پر جوابی  
حکم کیا :-

برادر مہربان سلام سنو!

آپ کے خط میں اگر صرف یہی لکھا ہوتا کہ میں مضمون نہیں لکھ سکتا تو شاید میں چپ  
بہ جاتا۔ مگر اب تو جواب عرض کرنا ضروری ہو گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اور آپ کے مرنے پر کوئی بھی رسالہ خیر نہیں نکالے گا  
بلکہ شاید لوگ یہ کہیں، چلو اچھا ہوا کہ مرنا۔ البتہ ہمارے گھر والے ہیں جو میں سے  
اس لیے کہ ہماری ذات سے ان کا عقار وابستہ ہو گا۔ میری یہ بات شاید اب  
دل لگی کا درجہ رکھے مگر مجھے اس کے کچھ ہونے پر سو فیصد یقین ہے کہ کسی کے لیے  
بچھڑا نہیں، کسی کے لیے میں ایمان الہیہ الگ الگ ہیں۔

"مردہ خیر" کی ترکیب مجھے پسند آئی۔ غالباً آپ یہ چاہتے ہیں کہ خیر خیر بلندی کی  
طرح زندگی میں ہر اہم شخصیت کا جلوس نکال دیا جائے۔ اگر کسی کا جلوس اس  
کی زندگی میں نہ لگے تو پھر بعد میں ہی نہ لگے۔ میں اس کا مخالف نہیں ہوں۔ بلکہ کوئی  
ادیب اس دنیا سے چھوٹتا ہے تو باقیوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اسے خیر خیر

پیش کریں۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ جی میں ایک یہ بھی کہ مرحوم کے بارے میں مسائل زیر  
نکالیں۔

دیکھئے نقوش اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بڑی شخصیتوں کی آرٹ لے کر ابھرے۔ بلکہ  
اللہ کے فضل سے اس نے اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ وہ اگر پطرس خبر نہیں نکالے گا  
تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے نقوش نکالا تھا اور یہ سمجھ کے نکالا تھا کہ ٹو ایک  
بڑا ٹیکا آرٹ تھا۔ اسے خراج عقیدت پیش کرنا چاہئے مگر اس پر بعض متعلق قسم سے  
لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ نقوش کا یہ مقام نہ تھا۔ پھر اس کا دوسرا پہلو بھی لیجئے۔  
نقوش کا پہلا ایڈیشن آج بھی بازار میں ملتا ہے مگر میرے دوسرے نمبروں کے تین تین جارجیا  
ایڈیشن چھپے۔ بعض کرنے کا مطلب یہ ہے میری یہ کوششیں صرف مالی منفعت کے باعث  
نہیں ہیں بلکہ ایک ادیب سے عقیدت کا اظہار ہیں۔

معاف کیجئے گا۔ میں نے اکثر یہ اندازہ لگا یا کہ آپ اچھی باتوں کے برے پہلوؤں پر بھی  
سوچتے رہتے ہیں۔ یہ آپ کی خوبی بھی ہے اور بُرائی بھی۔ پڑھ کر افسوسناک ہے؟  
اس کا اب فیصلہ کوئی کرے؟

امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ آپ نے ”پیاری باتیں“ لکھیں۔ میں نے پیاری باتیں  
سنائیں۔ والسلام

اب چونکہ یہ سلسلہ نقوش منافع خوری کی بات چل نکلی ہے۔ تو طفیل صاحب کا ایک خط اور بھی پڑھ لیں۔ جو انھوں نے اپنے  
دوسرے دوست اختر انصاری کو لکھا تھا:۔

برادر، سلام سنون!

آپ کی شکایت بالکل بجا ہے کہ آپ کی تمام تخلیقات کا انتخاب اب تک چھپ جانا چاہئے تھا۔  
یہ شکایت نہ صرف سو فیصد حق بجانب ہے۔ بلکہ حساب کی دوسرے اگر دوسو فیصد بھی درست ہو سکتی  
تو بھی ٹھیک تھا۔ تو بھی غلط نہ ہوتا۔

مگر یاد کیا بتاؤں۔ یہ جو نقوش کی بیماری میری جان کو لگی ہے۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میرا  
لاکھوں کا ادارہ جو پڑ ہو گیا ہے۔ نہ کوئی نئی کتاب چھپتی ہے نہ کسی پرانی کتاب کا نیا ایڈیشن آنے ہے  
پریس بھی میری بے توجہی کا بُری طرح شکار ہے۔ خود بڑا پریشان ہوں۔ کئی بار اپنے اوپر غصہ آتا  
ہے (ادارہ اور پریس کی حالت دیکھ کر) جی چاہتا ہے یا تو خود کشتی کروں۔ یا نقوش کو بند کر دوں۔  
تا کہ میں تادمہ قسم کا آدمی ہی جاؤں اور وہ سب کچھ کروں۔ جو میرے لیے دنیاوی اعتبار سے زیادہ  
سودمند ہو۔ یہ خیال کرتا ہوں تو نقوش مجھ پر بیت کی تمام تر تڑپا دینے والی اداؤں کے ساتھ

میرے عوام پر پرت بن کر گر جاتا ہے اور میں پھر ایک زخم خوردہ عاشق کی طرح اس پر ہلکی تباہی ہو جاتا ہوں۔ ہلک جاتا ہوں۔ ہار جاتا ہوں۔

میں برہنہ ہوں کہتا کہ مجھے نقوش میں مالی اعتبار سے نقصان ہوتا ہے۔ میں تو بہ کتنا جاہلتا ہوں کہ مجھے نقوش کے حسن و جمال میں مزید تابانی پیدا کرنے کے لیے اتنا کچھ کرنا پڑتا ہے کہ باقی کے سائے کام ٹھپ ہو گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو بہ حیثیت مجھ کو ہی یہ سودا منہ کا پڑ رہا ہے۔

میرے عشق نے جو میری حالت بنا رکھی ہے وہ سب کچھ آپ سے کہ دی ہے۔ اس وجہ سے میں آپ کی کتاب کی جلد تراشاحت سے مجبور رہا۔ والسلام!

ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ طفیل صاحب بڑے نفاست پسند ہیں۔ اس کا اقرار اور لوگوں نے بھی کیا ہے۔ مگر میں بھی آپ کو انکی نفاست پسندی اور کاہلی کا حال ایک ساتھ ہی سنا دوں۔

جس دن ان کے قلم کی نب خراب ہو۔ سیاہی اچھی نہ ہو۔ کاغذ اچھا نہ ہو۔ یہ کسی کو خط ہی نہیں لکھیں گے۔ خواہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ پھر جس دن یہ سب چیزیں اچھی ہوں گی۔ یہ خط پر خط لکھتے چلے جائیں گے۔ حتیٰ کہ بلاوجہ بھی خط لکھتے رہیں گے جس دن انھیں خط لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو بہ بچاس بچاس ساتھ ساتھ خط لکھ ڈالیں گے۔

ان کی میر مستودات، ضروری اور غیر ضروری کاغذات سے ہٹی رہتی ہے۔ ان کے ارد گرد بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اگر ایک ٹٹے سے لٹافے میں ضروری خط اور مستوٹے پڑے ہیں تو دوسرے لٹافے میں بھی، غرض میں یوں لٹافوں میں، اگر کسی چیز کی انھیں ضرورت پڑ جائے تو ضروری نہیں وہ اسی دن مل جائے۔

کبھی کبھی ان کا بچہ بڑی، میز کی یہ حالت دیکھ کر، سائے لٹافوں کو ایک جگہ باندھ کر، کسی دوسری جگہ رکھ دیتا ہے۔ وہ بھی کیا کرے۔ وہ برداشت نہیں کرتا کہ میز کو مال گو دام بننا دیکھے۔ مگر یہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ ہر کاغذ کو قیمتی سمجھ کر اپنے سے دور کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ہر کاغذ کو غیر ضروری سمجھ کر ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی قیمتی مستوٹے بھی وقتی طور پر گم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ انھیں ہفتوں اور مہینوں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ پسند نہیں کہ کوئی کام آسانی سے ہو جائے۔ یہ ہر آسان کام میں خود دشواریاں پیدا کر کے پھر سے اُسے آسانی بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

ایک دن ایک صاحب انھیں اپنی ایک غول دے گئے۔ انھوں نے رکھی۔ دوسرے تیسرے دن وہ صاحب تشریف لائے اور پوچھا "میری غول چھپے گی؟"

"نہیں"

"اچھا پھر مجھے واپس کر دیجئے۔"

"پتہ نہیں اب کہاں ہے؟"

"نہیں میز پر ہوگی۔ ڈھونڈ لے دیجئے۔"

میری زندگی

میری زندگی میں کم از کم ایک بار یہ فقرہ بھی لکھ دینا چاہیے کہ میں نے کبھی نہیں سنا۔

میں نے اس بات سے پہلے حد تک نہیں سمجھا تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی مشہور ہے ہی نہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ان کی زندگی کو نقصان دے گا۔ تو شکر گزار ہو جاتا ہوں کہ یہ سب میری زندگی میں نہ ہو گیا۔ کسی وقت نے انہیں در غلہ ایک حکومت وقت کو اپنے کارناموں سے مطلع کروا دیا تھا کہ کام کے بدلے اور کچھ نہیں تو کیا دے گا۔ یہ بڑے خوش اسلوب لوگوں کا ایک بڑا سا بلدا بنا کر بھیج دیا اور اب اس تاریخ کا انتظار کرنے لگے جس دن حکام کی طرف سے ان کو یہ شہر لایا جائے گا۔ یہ خطاب — جتنا بڑا صاحب دہ تاریخ بھی آئی جس دن یہ کام ہوتا ہے۔ اب یہ بار بار ناموں کو دے رہا ہے۔ مگر اب اس سے آگے بڑھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ان کی دنیا میں چلے آئے اور یہ کچھ لیا کچھ حکومت کے لیے بڑا اور بڑا کام دیا ہے۔ اب کوئی انہیں لاکھ لاکھ کی میاں، تمہیں تو کسی نے منہ لگایا ہی نہیں۔ مگر یہ کسی کی کب سنتے ہیں۔ اپنی جگہ پر ہوتے ہیں۔ اپنے قصور است کی دنیا میں بہتے ہیں جو ان کی لکھتوں اور آرزو دگیوں کا واحد سہارا ہے۔

یہ کبھی بھی بولیں سوچتے ہیں :-

”ہر قسمی محال میں آج میرا جی تو کیا ہو۔ بہت سے لوگ تو خوش ہوئے گئے۔ کچھ خدا ترس قسم کے لوگ، (میری تمام تر نالائقی باوجود) شاید یہ کہیں کہ اچھا ہی آدمی تھا۔ جن کو ادب سے شغف ہو گا۔ وہ تمہیں سے یہ کہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اچھے اچھے فنکار اور پس — خور کیے میرے بعد، میری زندگی کا حاصل ہی ایک فقرہ ہو گا۔ صرف اسی ایک فقرے کے لیے میں نے کیا کیا کچھ کیا ہے؟ دنیا تباہ دی ہے۔ مجھے زندگی کی دل کشیوں اور مسرتوں سے واسطہ نہیں رہا۔ دن رات کام کرتا ہوں۔ دن رات کرتا ہوں۔ رات کرتا ہوں۔ دن رات کام کرتا ہوں۔

یار دوستوں سے ملنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بیوی سے بولنا میرے مقدور میں نہیں۔ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر — کس لیے؟ — صرف ایک فقرے کے لیے۔ اگر میں میں جوتی میں مر گیا۔ جس کے بڑے امکانات ہیں تو میرے بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا بھی کوئی نہ ہو گا اور بچے اس فقرے کو چاٹا کریں گے۔ ”ہمارے اتنے بڑے بڑے اچھے بچے کالے تھے۔“ ہر حال ان کے بعد جو کچھ بھی ہو انہوں نے اپنی زندگی صرف اسی ایک فقرے کے لیے ضائع کر دی ہے۔

(تانی)

مفت خیراتی ایسوسی ایشن اسلامیہ دہلی



جے شک پیارا اور بے حد پیارا کیوں نہوتا۔ ماں کی نعمت، اس کی نگہداشت اور آسٹرملک کی غریباں کارگر  
 ہیں۔ دانشمند ہیں وہ مائیں جو اپنے بچوں کی پرورش آسٹرملک سے کرتی ہیں۔ خواہ ماں کے دودھ کی کمی کو پورا  
 کرنے کے لئے دیا جائے یا دودھ چھٹ جانے پر، آسٹرملک ماں کے دودھ کا بہتر بن بدل ہے۔  
 آسٹرملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں فولاد بلیا گیا ہے تاکہ بچوں میں  
 خون کی کمی نہ ہونے پائے اور بڑیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن ڈی بھی شامل کیا گیا ہے۔  
 جی ہاں! یہی وجہ ہے کہ مائیں پٹھے استہاد کے ساتھ بچوں کو آسٹرملک دیتی ہیں۔

آسٹرملک  
 ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل



ہم اسم الغنیہ صفت  
نہج اس پاک بازار  
مالات زندگی پر مشتمل  
ہرادی کی اس کتاب  
ہدایت کا موجب

قیمت  
۳/-

پیش  
زاس  
اور  
مجلد

# مشک

نخالد

نیلو فر شرکت تعاونی کا یہ ناول بے حد  
مقبول ہو رہا ہے۔ اگر آپ نے اب تک  
اسے نہیں پڑھا تو آپ مزاجیاد  
کی ایک نادر کتاب کے  
سے محروم ہیں۔

قیمت  
۶/-

حضرت خالد بن ولید کے مجاہدانہ کاموں سے کرن واقف  
سیرالہ کی شخصیت میں بحیثیت انسان کے کیا کی غلطیاں تھیں۔  
کیا اثر ڈالا۔ یہ کتاب عربی کے مشہور شخصیت نگار عباس محمود العقاد  
اُردو ادب میں پہلی پیش کش ہے۔

## عرب کے تین مد

اسلام نے کئی صاحبِ تدبیر شخصیات پیدا کیں مگر منیر بن شعیر  
پوری تاریخ میں کم ملیں گے۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ کیسے  
نبیوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ مگر الوافہ کی تصنیف ہے جس کے قلم

العاص  
بن ضام  
بقلم  
۶-

بھابی

تجسیر بھابی مٹی کی بھو بھائی۔ یہ کہاوت تو نہ جانے کب سے  
نے اس کو واقعہ کر دکھایا ہے کہ جب کبھی ملے ایک نئی خانہ  
بھی کہہ کر تعارف کرایا کہ ان سے ملے یہ آپ کی بھابی ہیں۔ لا  
انداز بیان میں مزا آگیا۔

پہے مگر  
اور ہر  
اوراد

## نمک مرچ

شرکت تعاونی کے مزاجیہ مضامین کا مجموعہ  
ہر مضمون جانِ نرافت ہے۔

قیمت  
۳/-

ادارہ

فروغ اردو

بارخ

۳/-

قیمت







